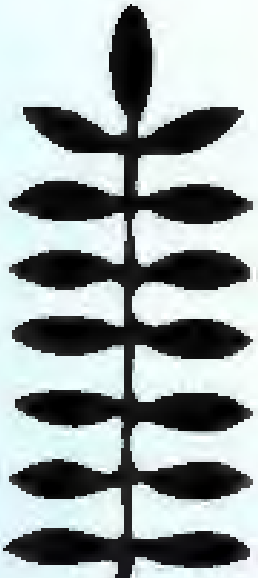




جنگ اور امن

(War and Peace)



لیو ٹالسٹائی | شاہد حمید

ریڈنگز (کلاسکس)

ساقی آرٹسٹک

PDF BOOK COMPANY

مدد، مشاورت، تجاویز اور شکایات:



Muhammad Husnain Siyalvi

0305-6406067

Sidrah Tahir

0334-0120123

Muhammad Saqib Riyaz

0344-7227224

عظمت ڈرانے کے ساتھ ساتھ اپنی طرف بلاتی بھی ہے، اس کشش سے کون بچ سکتا ہے۔ ”جنگ اور امن“ وہیل مچھلی کی جسامت اور شان و شوکت کی حامل ہے۔ پر شکوہ، آزاد، خوش آشام مگر انسانی ذہن کو ایک مہم پر اکساتی ہوئی۔ اس ناول کو پڑھتے ہوئے کسی کو تند برفانی طوفان کی یاد آئی، کسی کو سمندری طغیانیوں کی اور کسی نے آتش فشاں سے لاوے کو ابلتا ہوا دیکھا۔ ”جنگ اور امن“ کا موضوع نیولین کا حملہ، روسیوں کی شکست، ماسکو کا خالی ہونا اور پھر روسیوں کی فتح مگر اس حاشیے میں تو زندگی کا پورا میلہ کیا زندگی کا طوفان ہے۔ گھریلو زندگی، خواب گاہیں، بگھیاں، برف باری، برف گاڑیاں، مکان، سڑکیں، لوگ، دعوتیں، تاش کی بازیاں، تھیسر، ناچ گھر، انسانی تعلقات کے رنگوں کی دھنک، موسموں کی شدت اور فطری مناظر کا بیان، روسی سماج کے مختلف طبقے، فری میسن، پھر جنگی مہمات، فوجیوں کی زندگی، جنگی حکمت عملی کا بیان... پھر تاریخی کردار غرضیکہ زندگی کے اس طوفان کی کس کس لہر کو دیکھا جائے، روسی سماج کی زندگی اتنی وسعتوں کے ساتھ کسی ناول میں کب سا سکی تھی۔

ڈاکٹر سہیل احمد خان

جنگ اور امن

جنگ اور امن



القاسم پبلیکیشنز
ریڈنگز کا اشاعتی ادارہ

لاہور

جملہ حقوق © القاب پبلیکیشنز

اشاعت اول

القاب پبلیکیشنز 2021

القاب پبلیکیشنز اور ڈیجیٹل لائبریری کے ذریعے پیش ہے۔

اس کتاب کے کسی بھی حصہ کو کسی بھی صورت اور کسی بھی مقصد کے لیے استعمال کرنے سے پہلے ناشر سے اجازت لینا ضروری ہے۔

سرورق: مہدی تابھی

خطاطی: نوری نسعلیق

ڈیجیٹل پبلیکیشنز (ISBN)

978-9-69-640174-2

طباعت

مکتبہ جدید پریس، ایچ بی آر روڈ، لاہور

القاب پبلیکیشنز

K-12، مین بلیوارڈ، گلبرگ 2، لاہور 54660

پاکستان

فون: 92 42 3575 7877

publications@readings.com.pk

www.readings.com.pk

فہرست

ix

xv

xxiv

xxiv

xxvii

xxx

xxdii

xxdii

xl.ii

xl.v

xl.vii

xl.viii

xl.viii

xl.ix

حیات طالسٹانی — اجمالی خاکہ

”جنگ اور امن“ — ایک تعارف

معروضات و تصریحات

مثنیٰ

انگریزی تراجم

ترجمے کی مشکلات

زمانی و مکانی پس منظر

روسی تاریخ

روسی مذہب

خطابات

ہوزار

فرائضی کا استعمال

روسی تقویم

روسی قاصدے

سہیل احمد خان

0305 6406067

PDF Book Company

XLIX

ناول کا عنوان

L

فرہنگ

L

عسکریت

LI

مذہب

LII

سویستی

LIII

متفرقات

LIV

اہم کردار

LVII

تشریحات

LIX

چیدہ چیدہ واقعات کی تاریخیں

1

پہلی کتاب

3

حصہ اول: جولائی 1805

149

حصہ دوم: اکتوبر 1805

267

حصہ سوم: نومبر 1805

391

دوسری کتاب

393

حصہ اول: 1806

462

حصہ دوم: 1807

557

حصہ سوم: 1808-1810

655

حصہ چہارم: 1810-1811

720

حصہ پنجم: 1811-1812

811

تیسری کتاب

813

حصہ اول: مئی، جون، جولائی 1812

916

حصہ دوم: اگست 1812

1095

حصہ سوم: ستمبر 1812

چوتھی کتاب

1235

1237

1304

1359

1416

حصہ اول: اگست 1812

حصہ دوم: اکتوبر 1812

حصہ سوم: اکتوبر، نومبر 1812

حصہ چہارم: نومبر، دسمبر 1812

1483

1485

1553

1599

1599

1609

حصہ اول: 1813-1820

حصہ دوم:

”جنگ اور امن“ کے متعلق چند باتیں: لیوٹا سٹائی

حواشی



حیات طاسطائی

اجمالی خاکہ

نوٹ: تمام تاریخیں جولین کیلنڈر کے مطابق ہیں۔ دیگر اہم واقعات قوسین میں تحریر کیے گئے ہیں۔

1825ء (کنولس اول کی تخت نشینی۔ چودہ دسمبر کو دسمبری تحریک کچل دی گئی اور طاسطائی کے ایک رشتے دار پرنس سری گریگور یوج وکونسکی کو بغاوت میں حصہ لینے کے جرم میں سائبیریا بھیج دیا گیا)۔

1828ء 28 اگست کو یاسنایا پولیاننا صوبہ قولا میں کاؤنٹ نکولائی طاسطائی کے چوتھے بیٹے لیونکولا یوج طاسطائی کی پیدائش۔

1830ء والدہ کا انتقال۔

1837ء والد کا انتقال۔ (پوشکن کی ڈوئیل میں ہلاکت)

1838ء داری کا انتقال۔

1841ء حالہ ایکساندرا (کاؤنٹس اوتساکن) کا انتقال (طاسطائی کی والدہ کے انتقال کے بعد وہی بچوں کی دیکھ بھال کرتی تھی)۔ طاسطائی کو اپنے بھائیوں اور اکلوتی بہن کے ساتھ پھوپھی پیلا گیا۔ شکوہ کے پاس قازان بھیج دیا جاتا ہے۔ (ارمنٹوف کی ڈوئیل میں ہلاکت)

1842ء طاسطائی کا بھائی ورغلاکراسے بازار حسن لے جاتا ہے اور طاسطائی اپنی ”دیشیزگی“ سے محروم ہو جاتا ہے۔ اسی سال وہ روس کا مطالعہ کرتا ہے (مقدس سنود کا سربراہ کاؤنٹ این اے پراتا سوف ماسکو کے استقف اعظم کو انجیل کی روسی زبان میں تفسیر لکھنے سے منع کر دیتا ہے)۔

1844ء طاسطائی قازان یونیورسٹی سے میٹرک کا امتحان پاس کرتا ہے۔ (روسی فوج کا چیفینا پر قبضہ)

1847ء یونیورسٹی میں عربی اور فارسی زبان کا مطالعہ، طاسطائی کا مرض خبیثہ میں مبتلا ہونا، آبائی ورثے میں

حصہ ملنا اور یاسنایا پولیاننا واپسی۔

(ہرزن کارڈس چھوڑنا اور کبھی واپس نہ آنا)

1848ء طالسٹائی سینٹ پیٹرز برگ پہنچتا ہے، یونیورسٹی سے قانون کے دو امتحان پاس کرتا ہے اور تولا میں
مجموعیہ مقرر ہوتا ہے۔ (روس کا ہنگری پر حملہ۔ دستوریہ فکسی کو سزائے موت اور پھر معافی ملتی ہے،
اور سائبیریا بھیج دیا جاتا ہے۔)

1850ء طالسٹائی کا ماسکو میں قیام، ایک تنہائی رشتے دار سے جزدی محبت اور "تاریخ دیروز" کی اشاعت۔

1851ء کاکیشیاں روانگی۔ طالسٹائی میں "بچپن" تحریر کرتا ہے۔

1852ء فوج میں بھرتی۔ ایک رسالے میں کہانی Raid کی اشاعت۔

(8 اکتوبر روس اور ترکی کے مابین جنگ کا آغاز۔)

1854ء طالسٹائی کو فوج میں کمیشن ملتا ہے اور اسے بخارست بھیج دیا جاتا ہے۔ (مارچ فرانس اور برطانیہ کا روس
کے خلاف لندن جنگ اور سیستاپول کا محاصرہ۔) نومبر طالسٹائی سیستاپول پہنچتا ہے۔ (دستوریہ فکسی
کی رہائی)

1855ء سیستاپول میں جنگی خدمات۔ (سیستاپول پر اتحادیوں کا قبضہ) Sebastopol in May اور
Sebastopol in December کی اشاعت۔ طالسٹائی بہت بڑی رقم جوئے میں ہار جاتا ہے۔
(زارنگولس اول کا انتقال اور مصلح رارائیکساں در دوم کی تخت نشینی۔) نومبر طالسٹائی کی پیٹرز برگ واپسی۔
فیت، نیکراسوف، تورکنیف و دوسرے ادیبوں سے ملاقاتیں اور فیت سے تاحیات دوستی کا آغاز۔
(تورکنیف کے ناول Rudin کی اشاعت۔)

1856ء (21 جنوری: طالسٹائی کے بھائی دیمیتری کا انتقال۔) "طوفان برف" "دو ہونڈار" اور "رومی جاگیردار"
کی اشاعت۔ (مارچ روس، ترکی، برطانیہ اور فرانس کے مابین صلح۔) 26 نومبر طالسٹائی کا فوج
سے استعفیٰ۔

1857ء Youth کی اشاعت۔ تورکنیف اور نیکراسوف کی معیت میں دورہ فرانس۔ سوئٹزر لینڈ کی سیر۔

1858ء اپنے ایک زری مقدم کی بجائی اکیسیا باز کسان کے ساتھ طویل المدت تعلقات کا آغاز۔
(گچاروف کے ناول Oblomov کی اشاعت۔)

1859ء "تین اموات" اور "خاندانی سرت" کی اشاعت۔ یاسنایا پولیانہ میں سکول کی تاسیس۔

1860ء طالسٹائی کا دوسرا اور آخری غیر ملکی دورہ۔ جرمنی میں سب سے اولاد بھائی گولائی سے ملاقات۔ گولائی کا
حب دلی سے انتقال۔ طالسٹائی اپنا بیشتر مال متاع جوئے میں ہار چکا تھا، اب بھائی کا ورثہ کام آتا ہے۔
(جنگ وراسن" میں پرس آندرے کا کردار جزدی طور پر اسی بھائی کی زندگی سے ماخوذ ہے۔)
دسمبر دورہ مردم اور اپنے رشتے دار پرنس سرگی وکونسکی سے ملاقات۔

- 1861ء دورہ پیرس لندن۔ مصحف آرٹلز اور ہرزن سے ملاقاتیں۔ براستہ رسلز روس واپسی۔
 (19 فروری: زرعی غلاموں کی جاگیرداروں کے تسلط سے آزادی۔)
 28 اپریل: تورکئیہ کو ڈسکل کا چیئنج۔ وجہ: طاسطائی کی ہمشیرہ ماریا سے تورکئیہ کے تعلقات۔
 (تورکئیہ کے ناول ”باپ بیٹے“ کی اشاعت)۔ طاسطائی کے ناجائز بیٹے اور مستقبل کے کوچوان جیونی کی پیدائش۔
- 1862ء یاسٹایا پوسیانامیگزین کی اشاعت۔ پولیس کا چھاپا۔ 23 ستمبر: ماسکو کے معالج پیرس کی دختر سوفیا سے شادی۔ (دونوں کے تیرہ بچے پیدا ہوئے، صرف آٹھ سن بلوغ کو پہنچے۔)
- 1863ء ”قارقی“ کی اشاعت اور ”جنگ اور امن“ کی تحریر شروع۔ پہلے بیٹے کی پیدائش۔
- 1864ء بیٹی تاتیانہ کی پیدائش۔ (لندن میں مارکس کی فرسٹ انٹرمیڈیٹ کا قیام)
- 1865ء ”جنگ اور امن“ کے حصہ اول کی اشاعت۔ (دستویو نسکی کے ”برم و سزا“ اور لیسکوف کے ”لیڈی میکبیتھ آف متسینک“ کی اشاعت)
- 1866ء کورٹ مارشل میں ایک فوجی جوان کی رکالت اور ناکامی۔
- 1867ء طاسطائی کی سالی تانیا پیرس (”جنگ اور امن“ کی نسا) کی شادی۔
- 1869ء ”جنگ اور امن“ کی تکمیل۔ (دستویو نسکی کے ناول Idiot کی اشاعت۔)
- 1870ء فلسفہ، ڈرامے اور یونانی زبان کا مطالعہ (ہرزن کا انتقال اور ولادی میراچ پولیانوف (لینن) کی پیدائش۔)
- 1871ء (دستویو نسکی کے ناول Devils کی اشاعت۔)
- 1872ء God Sees the Truth but Waits اور ”کاکیشیا کا قیدی“ کی اشاعت۔ (مارکس کے ”سرمایہ“ کی روسی زبان میں پہلی اشاعت۔) گھر میں نظر بندی۔
- 1873ء اپنے خاندان کے ساتھ سارا میں اپنی نئی جاگیر کا دورہ۔ سارا کے قحط زدگان کے لیے چندے کی اپیل۔
- 1875ء ”آئنا کارنینا“ کی ابتدا کی اقب ط کی اشاعت۔ موت کا خوف۔ خودکشی کی خواہش۔
 (روس میں محروروں کی اولین انجمن کا قیام اور ادویسکی کی زیر دست ہڑتال۔)
- 1876ء (سرمایہ کارنکی کے خلاف اعلان جنگ۔ پیٹر برگ میں انقلابی طلباء کے مظاہرے۔)
- 1877ء ”آئنا کارنینا“ کی تکمیل۔ ناشر کا آخری حصہ چھاپنے سے انکار۔ طاسطائی کا آرٹھوڈوکس مذہب میں اعتقاد متزلزل۔ (24 اپریل: روس کا ترکی کے خلاف اعلان جنگ۔ دستویو نسکی جیسے محب الوطنوں کا نعرہ کہ قسطنطنیہ پر آرٹھوڈوکس روس کا حق بنتا ہے۔)
- 1878ء پیوتر پاول قلعے میں دوسری تحریک کے رہنماؤں سے ملاقات۔ آرٹھوڈوکس عقیدے سے دست برداری۔

- تورکلیف سے صلح۔ (رہیں اور ترکی کے مابین معاہدہ صلح بلغاریہ کا قیام۔)
- 1879ء What I Believe لکھنے کے کام کا آغاز۔ (زار کو قتل کرے کی متعدد کوششیں۔)
- [ادب دساری آنروج و جگاشوٹلی (شالین) کی پیدائش۔]
- 1880ء (امپراطورہ کا انتقال۔ رار کی اپنی داشتہ سے شادی۔ آذربائیجان میں تیل کی تلاش کا آغاز۔ دستو یوفسکی کے ”کرنا زوف برادران“ کی اشاعت۔)
- 1881ء زار کے نام خط۔ What Men Live by کی تحریر۔ خانقاہ پچینا کا دورہ۔
- (دستو یوفسکی کا انتقال۔ رار کا قتل۔ الیکسندر سوم کی تخت نشینی۔ رجعت پسندوں کا عروج اور اصلاح پسندوں کی پسپائی۔)
- 1882ء بیوی کے صرار پر ماسکو میں مکان کی خرید۔ عبرانی کا مطالعہ۔ خطاب سے دست بردار ہونے کی کوشش اور گھر سے بھاگنے کی دھمکی۔ (پیشیز برگ اور قازان یونیورسٹیوں میں ہنگامے اور سنسرشپ کے شکنجے میں مزید پختی۔)
- 1883ء What I Believe کی اشاعت۔ اپنی تمام جائیداد کے لیے بیوی کے نام مختار نامہ۔ (پلیچن زوف کے ”سوشلزم اور سیاسی جدوجہد کی ہیئت کی اشاعت“ اور اس کی جماعت ”مارکسسٹ بریشن گروپ“ کا چنیوا میں قیام۔ تورکلیف کا انتقال اور موت سے قبل اپنی آخری تحریر میں طالسٹائی سے فن کی دنیا میں واپس آنے کی اپیل۔)
- 1884ء طالسٹائی کا نوٹ پڑھنے کا دھندا۔ What I Believe پر پابندی۔ سوفیا کتابوں کی، جواب خاندان کی آمدنی کا بڑا ذریعہ ہیں، اشاعت کا کام سنبھال لیتی ہے۔ (اخبار ”مادر وطن“ کی بندش۔)
- 1885ء کریمیا کا دورہ۔ گوشت خوری، شراب نوشی، تمباکو نوشی اور شکار سے توہم چھوٹنے اور ناک کے بال چمکوف کے تعاون سے جریدہ Intermediary کی تالیف۔ ”جہاں محبت ہے، خدا ہے“ کی اشاعت۔
- 1886ء What then Must We Do? اور ”ایوان ایلیچ“ کی اشاعت۔ خرساں کا اسقف اعظم طالسٹائی کو مرتد قرار دیتا ہے۔ (چخوف کی کہانیوں کے پہلے مجموعے کی اشاعت۔)
- 1887ء on Life کی اشاعت۔ (لینن کے بھائی سمیت پانچ طالب علموں کو زار کو قتل کرنے کی کوشش کے الزم میں پھانسی۔)
- 1888ء طالسٹائی کا ڈرامہ ”اندھیرے کی قوت“ پیرس سٹیج پر۔ آخری بیٹے کی پیدائش۔ The Kreutzer Sonata کی تحریر اور بندش۔
- 1890ء زار سے درخواست اور بحولہ بالا ناولٹ کی اشاعت کی اجازت۔
- 1891ء تمباکو نوشی اور شراب نوشی کے خلاف مہم۔ کتابوں کے کاپی رائٹ سے دست برداری اور خاندان میں

- جائیداد کی تقسیم۔ ملک میں قحط اور طاعون کی امدادی سرگرمیاں۔
- 1892ء قحط زدگان کی امداد کا کام جاری۔ ہنری ثوری کے حق میں مقالے کی اشاعت (قیت کا انتقال)
- 1893ء Kingdom of God is within You کی بیرون ملک اشاعت۔
- 1894ء Christianity & Pacifism کی اشاعت۔ (ایکسا ندر سوم کی وفات۔ نکوس دوم اور اس کی غیر مقبول جرمن بیوی (ملکہ وکنوریہ کی نواسی) کی تخت نشینی۔ کسانوں کو پاسپورٹ دینے کی ممانعت اور ان پر پرمٹ کے بغیر امپراطوریہ کے اندر سفر کرنے کی پابندی۔ شائین کا ایک مذہبی درسگاہ میں داخلہ۔)
- 1895ء (نکوس دوم کا شامندہ حکومت کے قیام کے تصور کو یعنی خوب قرار دینا۔ یمن اور اس کے ساتھیوں کی گرفتاری اور نظر بندی۔ یمن کا نمونے سے مرتے مرتے بچنا، سوئٹزر لینڈ میں جلا وطنی اور پانچا لوف سے ملاقات، روس واپسی اور سائبیریا میں جلا وطنی۔)
- 1896ء زار سے طاعون کی گرفتاری کا مطالبہ۔
- 1897ء ”حاجی مراد“ کا آغاز۔ (طاعون کے مستقبل کے سوانح نگار بریوکوف اور جرت کوف کی گرفتاری۔)
- 1898ء What is Art کی شاعت۔ بیٹے سرچی کی کینیڈا روانگی۔
- 1899ء (طلباء کے ہنگامے۔ تمام یونیورسٹیاں عارضی طور پر بند۔) Resurrection کی تکمیل۔ (شائین کا مذہبی درسگاہ سے نکلنا اور انقلابی گروپوں سے ملاقاتیں کرنا۔)
- 1900ء (فن لینڈ میں روسی زبان کی مادی تعلیم۔ مارکسی جماعت کے پہلے جریدے Iskra (شعلہ) کا جرائد سائبیریا سے یمن کی واپسی اور بیرون ملک روانگی)
- 1901ء طاعون کی آرتھروڈکس چرچ سے اخراج اور سنود کے فتویٰ کے خلاف اس کا جواب۔ گورکی اور چیخوف سے ملاقاتیں۔ (چیخوف کا ڈرامہ ”تین بہنیں“ سٹیج پر۔)
- 1902ء ”مذہب کیا ہے“ کی تکمیل۔ شیکسپیر کا دوبار مطالعہ۔ (گورنمندرکوف، وزیر داخلہ اور محض دیکھا، ہم شخصیات کا قتل)
- 1903ء میٹھوکیوں اور بولشویکوں کے مابین پھوٹ۔
- 1904ء (جاپان کے ساتھ جنگ۔ پورٹ آرتھر پر حملہ اور روسی بیڑے کی تباہی۔) طاعون کی جنگ کے خلاف احتجاجی رسالہ۔ (یمن کے اخبار Forward) کا جرائد۔
- 1905ء پولیس کا چھاپہ اور مختلف مضامین پر قبضہ۔ (جنوری۔ عام ہڑتال۔ زار کے چچا گرینڈ ڈوک سرچی کا قتل۔ جنگ کا اختتام۔ مئی فیسٹو۔ ”انقلاب“ 1905ء۔ وٹ (Witte) عملا روس کا پہلا وزیراعظم بن جاتا ہے۔ نکوس دوم اور امپراطور کی ”اللہ لوگ“ ماسپوٹین کی خدمت میں حاضری۔)
- 1906ء بیوی کی شدید بیماری اور چھوٹی بیٹی ماشا کا انتقال (دوما۔ پارلیمنٹ۔ کارکی افتتاح۔)

- 1907ء پولیس کا یہ سنایا پویمانہ پر چھپے ورطہ اسطائی کی کتابوں پر قبضہ۔ بندرگاہ کے بڑتالی مزدوروں کے ہاتھوں بھائی کا قتل۔ لٹیروں کا یہ سنایا پویمانہ پر حملہ اور پولیس کی مدد سے بیوی کے جائید کو بچانے کی کوشش پر طاسطائی کا اظہار تاسف۔ کاپی رائٹ، مسودوں، ڈائریوں وغیرہ کے سلسلے میں مہیاں بیوی کا جھگڑا۔
- 1908ء سزائے موت کے خلاف رسالے ”میں خاموش نہیں رہ سکتا“ کی اشاعت۔ 28 اگست اتنی ویں سالگرہ کی تقریبات۔ سیکرٹری این، یں گو سیف کی گرفتاری اور جلا وطنی۔
- 1909ء کاپی رائٹ، مسودوں، ڈائریوں وغیرہ کے متعلق مزید جھگڑے۔ سوفیا کے پانگل پن میں اضافہ۔
- 1910ء گھر سے غائب۔ 7 نومبر۔ استایا اور یلوے شیشن پر انتقال۔ خاندانی جاگیر یا سالی پو لیانا میں تدفین۔
- رواں کے عیب بیت قبول کرنے کے بعد یہ پہلا جنازہ تھا جس میں کوئی نہ ہی رسوم ادا نہ کی گئیں۔
- (راسپوتین کی، مہر ا طورہ کو پارلیمنٹ کو توڑنے کی تلقین۔)

ماخذ

- اسے این ولسن طاسطائی۔ (ہیش ہملٹن، لندن)
- ایٹراڈ: لائف آف طاسطائی۔ (اکسفرڈ یونیورسٹی پریس)
- ہنری گفرڈ دیباچہ ”وار اینڈ پیس“ بہتر جملہ ایٹراڈ ولوئیز ماڈ (اکسفرڈ یونیورسٹی پریس)

”جنگ اور امن“: ایک تعارف

طالستانی کے عظیم ناول کا تعارف تحریر کرتے ہوئے جے بی پڑمٹلی کا ایک جملہ یاد آیا۔ پڑمٹلی نے بیسویں صدی کے ناول نگار جان کوپر پوویس (John Cowper Powys) کی آپ بیتی کا ایک تعارف تحریر کیا ہے۔ پوویس بچے دور کے بعض دوسرے ناول نگاروں کے مقابلے میں کم شہرت یافتہ تھا لیکن اس کی تحریروں میں وسعت بہت ہے۔ یہی کیفیت اس کی آپ بیتی کی بھی ہے۔ اس شکوہ کے پیش نظر پڑمٹلی نے کہا کہ اس آپ بیتی کے ساتھ میرے تعارف کی حیثیت یہ ہے جیسے نیاگرا آبشار کے سامنے پانی کاٹل۔ اگر پوویس کی دنیا کی وسعتوں کے سامنے پڑمٹلی جیسے صاحب طرز کو یہ احساس ہوا تو طالستانی کے عظیم الجثہ ناول کے سامنے رود کے ایک مضمون نگار کے لیے کون سی مثال دی جائے؟ پھر بھی عظمت ڈرانے کے ساتھ ساتھ اپنی طرف بلاتی بھی ہے، اس کشش سے کون بچ سکتا ہے۔ ”جنگ اور امن“ ڈھیل مچھلی کی جسامت اور شان و شوکت کی حامل ہے۔ پر شکوہ، آزاد، خوں آشام مگر انسانی ذہن کو ایک مہم پر اکساتی ہوئی بھی۔ اس ناول کو پڑھتے ہوئے کسی کو تند برفانی طوفانوں کی یاد آئی، کسی کو سمندری طغیانیوں کی، کسی نے آتش فشاں سے لادے کو اچلتے ہوئے دکھا اور کوئی ٹی، می لارنس کی طرح پکارا تھا، ”طالستانی، یہ شخص توکل کی مشرتی ہوا جیسا ہے جس کے مقابل آنکھیں کھولیں تو آنکھوں میں آنسو تیرنے لگتے ہیں ورنہ انسان کچھ دیر کے لیے گونگا ہو جاتا ہے۔“ ”جنگ اور امن“ پر تبصرہ کرتے ہوئے اس وسعت کو نقادوں نے شدت سے محسوس کیا، کچھ دیر کے لیے گنگ ہو کر رہ گئے مگر پھر برسے لے بھی اور اب یہ بول متحدہ تصنیف اور مضامین میں ڈھل چکے ہیں۔ روسی ادیبوں کے ابتدائی تاثرات سے یورپی ادیبوں اور ناقدین کی تحریروں تک اور اردو میں پروفیسر محمد مجیب اور ظ۔ انصاری جیسے روسی ادیب کے ہمارے اپنے مزاج شناسوں کے جائزوں تک۔ انگریزی زبان کے ناول نگار اے این ولسن نے طالستانی کی ایک نئی ضخیم سوانح عمری لکھی ہے جو 1988ء میں شائع ہوئی۔ اس کتاب کے آغاز میں اس نے اس امر کی طرف توجہ دلائی ہے کہ روس کی جدید ریاست دنیا کے نقشے کا تقریباً چھٹا حصہ گھیرے ہوئے ہے مگر لگ بھگ یہی رقبہ اس سلطنت کا بھی تھا جس پر ملکہ کیتھرائن دی گریٹ نے 1762ء سے 1796ء تک حکومت کی۔ پیٹر دی گریٹ کو جائز طور پر جدید روسی ریاست کا معمار اول قرار دیا جاتا ہے مگر سلطنت کی صحیح معنوں میں

حد بندی ملکہ کیسٹرائن کے دور میں ہوئی۔ پولینڈ پر قبضہ کیا گیا، جنوب کی طرف سلطنت بحیرہ اسود کی سمت اور وسیع ہوئی۔ سلطنت کی یہ وسعت بہت سی انتظامی مشکلات بھی پیدا کرتی تھی، چنانچہ حکمران طبقوں اور نوکر شاہی کا شکنجہ فرد کی زندگی اور ادبوں کو بری طرح کستا گیا۔ لوگوں کی تحریروں میں اس حقیقت کی مختلف شکلیں دیکھی جاسکتی ہیں۔ کیسٹرائن کے دور کی اس مخصوص فضا نے اشرافیہ کے ایک مضبوط طبقے کو جنم دیا اور کسانوں کی زندگی جاگیروں کے مالکان کے رحم و کرم پر ہو گئی۔ یوں ایک ایسا درجہ بند ساج بننے لگا جس میں اقتدار اشرافیہ طبقے کے ہی ہاتھوں میں تھا۔ یہ نظام اپنے اندر ایسی جکڑ بندی رکھتا تھا کہ ایک اینٹ نکلنے سے پوری عمارت کے دھڑام سے گر جانے کا خوف تھا؛ چنانچہ انیسویں صدی میں بادشاہ، نئے خیالات، یورپ سے ابھرنے والے نئے انقلابی اور جمہوری تصورات، حتیٰ کہ کسی قسم کی اصلاح سے بھی خوف کھاتے رہے۔ نئے تصورات اور مروجہ خیالات کا ٹکراؤ، روسی ناولوں میں اتنی بار یہ موضوع ابھرا ہے کہ یہ ددلانے کی بھی ضرورت نہیں۔ دسن کا کہنا ہے کہ کیسٹرائن جو اصل میں جرمن شہزادی تھی سلطنت کی اس غیر معمولی وسعت کی وجہ سے اسے باقی دنیا سے کٹا ہوا بھی بنا گئی۔ باہر کے خیالات یا باہر کی دنیا سے تعلق تو ایک طرف، بہت سے روسیوں کو تو خود اسی سلطنت میں سفر کا شوق نہیں ہوتا تھا۔ مگر ہوا بدل رہی تھی، یورپ کی جنگیں اس سلسلے میں محرک ثابت ہوئیں۔ روسی فوجی دستے پولینڈ، جرمنی، فرانس اور آسٹریا گئے، یورپین کے دور کا روسی حکمران الیکساندر اول نسبتاً آزاد خیال سمجھا جاتا تھا مگر معمولی اصلاح کے تصور سے بھی لرزاں تھا۔ اب جنگوں نے باہر کی دنیا کے تصورات روس کے اندر لا کر پھینک دیے اور گھر آنے والے فوجیوں کی زبان پر سیاسی اور سماجی مساوات کا تذکرہ بھی رہنے لگا۔ دانشوروں، شاعروں اور ادیبوں کی ٹولی تو نئی ہواؤں کو بہت پہلے محسوس کر سکتی ہے پھر بھی انیسویں صدی کے شروع میں جہاں جرمنی میں گوٹے اور شلر کا واقع تخلیقی سرمایہ منظر عام پر آ رہا تھا، انگلستان میں بائرن اور شیلی کے پر جوش فتنے ابھر رہے تھے، سکاٹ کے ناول شائع ہو رہے تھے، روس کی ادبی فضا بوجھل تھی مگر پھر دیکھتے ہی دیکھتے موسم بدلا اور رت گدرائی۔ ازمنہ، گوگل، پلیسکی اور بعض دوسرے ادیب، سب سے بڑھ کر پشکن جس کے بارے میں اے این ولسن کا کہنا ہے کہ ایسے ادیب کے ظاہر ہونے کے بعد روسی ادب کیا خود روس کا بدل جانا بھی ناگزیر تھا۔ پشکن نے روسی ادیبوں کو سکھایا کہ عام روسی تعلیم یافتہ طبقے کے تصور کے برعکس فرانسیسی زبان پر عبوری، اجتہاد و روکاوت کو جنم نہیں دیتا۔ پھر اس کی مثال سے یہ بھی ثابت ہو کہ پور پور میں روسی ہوتے ہوئے بھی روسی نظام حکومت کے مظالم و دس کی سبب معنویت کی مزاحمت کیسے کی جاسکتی ہے۔ اس نے کل انیسویں سال کی عمر پاگی۔ اور 1837ء میں ایک ڈوئل میں مرنے سے پہلے روسی ادب کو ایک نئے شعور سے آشنا کر گیا۔ اے این ولسن کو تو یہ سارا دور ملکہ اتر چھ اول کے دور میں انگریزی ادب میں ظاہر ہونے والے تحریک کے مراحل دکھائی دیا ہے۔ پشکن کے بعد روسی شاعروں اور ناول نگاروں کے نئے قافلے خیمہ گلن ہوئے۔ انھیں میں کاؤنٹ لیوٹو لائی وچ طاسطانی بھی تھا جو اپنی پیدائش 28 اگست 1828ء اور وفات 7 نومبر 1910ء کے درمیان بچا کی سالہ دور حیات میں اتنا تحریری سرمایہ چھوڑ گیا جو نوے جلدوں میں سما سکا۔ اس نے ”جنگ اور امن“

جیسے عظیم رزمیہ کے ساتھ ”آئنا کارینا“ جیسا ناول بھی اپنی یادگار چھوڑا جسے دنیا کی بہترین پریم کہانیوں میں شمار کیا گیا۔ اس کی کہانیاں، چھوٹے ناول، پھر ناول نگاری کو ترک کرنے کے بعد بطور مصلح اور نظریہ ساز اس کی تحریروں کا دفتر، سب اس داستان کے مختلف اجزاء ہیں جنہیں جوڑنے سے ایک ایسے شخص کی تصویر ابھرتی ہے جو اپنے ترم تر تضادات اور بوالعجبیوں سمیت آدمیوں میں جن کی سی طاقت کا مظہر تھا۔ جورج سٹائر نے اپنی تصنیف ”طاسطائی یا دستویو فسکی“ میں دونوں کو ناول نگاری کے دو ایسے قطب بنا دیا ہے جو انسانی تخیل کی دو سمتوں کی عظیم تر ترجمانی کرتے ہیں۔ سٹائر نے اسی ایم فور سٹر کا ایک جملہ نقل کیا ہے ”کوئی انگریزی ناول نگار عظیم نہیں جتنا کہ طاسطائی۔ اس کا مطلب ہے کہ کسی نے انسانی زندگی کی گھریلو اور سوریاتی جہت، دونوں کی ایسی مکمل تصویر نہیں دکھائی۔“ دوسری طرف کوئی انگریزی ناول نگار ایسا نہیں جس نے روح میں ایسی سیاحت کی جو دستویو فسکی کا وصف خاص ہے۔ سٹائر کا کہنا ہے کہ فور سٹر کی رائے کو انگریزی ادب تک کیوں محدود رکھا جائے۔ طاسطائی عظیم رزمیہ نگار ہے اور دستویو فسکی عظیم المیہ نگار۔

طاسطائی اپنے دور کے بڑے ادیبوں میں اس کی خد سے ممتاز تھا کہ وہ اعلیٰ ترین سماجی طبقے سے تعلق رکھتا تھا۔ شرافت سے تو بہت سے دوسرے ادیبوں کا بھی تعلق تھا مگر طاسطائی کے خاندان کا تو دربار سے بھی ربط تھا تاہم وہ دو سال کا تھا کہ اس کی ماں فوت ہو گئی اور نو سالہ طاسطائی باپ کے سرائے سے بھی محروم ہو گیا۔ پروفیسر محمد مجیب نے اپنی تصنیف ”روسی ادب“ (پہلی اشاعت 1940ء) میں طاسطائی کی ابتدائی زندگی کی انجھنوں کی طرف اشارہ کیا ہے ”حساس اور جوشیلی طبیعت جیسی کہ طاسطائی کی تھی تربیت اور تعلیم کو بڑی مشکل سے قبول کرتی ہے۔“ جن رشتے داروں نے اس کی اور اس کے بھائی بہنوں کی پرورش کی وہ اس سے محبت تو کرتے تھے مگر اس کی طبیعت کو سمجھنے کی صلاحیت نہ رکھتے تھے۔“ ”کورس ختم کیے بغیر یونیورسٹی کو چھوڑ کر جائیداد کا انتظام کرنے کے بہانے گھر چلا گیا۔“ ”مجیب صاحب طاسطائی کے روزنامے اور اس کی یادداشتوں کے حوالے سے بتاتے ہیں کہ اس کی ”طبیعت کی کلی“ 1851ء میں قفقاز جا کر ”کھلی“۔ جہاں وہ نظریات کی گود میں بچے کی طرح تھا۔ غالباً قفقاز ہی کے قیام نے اسے اپنی زندگی کے افسانوی بیان پر نظر ثانی کے لیے مائل کیا۔ ”سرگزشت کی یہ نئی ترتیب تاریخی نہ تھی اس وجہ سے اس کو انس نہ کہا گیا“ یہ پروفیسر مجیب طاسطائی کی ابتدائی تصنیف ”بچپن“ کے بارے میں بتاتے ہیں۔ ”بچپن“ کے بعد ”لڑکپن“ اور ”جوانی“ کا تذکرہ ہے۔ ابتدائی تحریروں ہی سے طاسطائی کی قوت مشاہدہ پوری طرح ظاہر ہو رہی تھی نومبر 1853ء میں روس اور ترکی کی جنگ ہوئی۔ انگلستان اور فرانس اس وقت ترکوں کی طرف تھے۔ کریمیا کے جزیرہ نما پر حملہ ہوا۔ طاسطائی بھی وطنیت کے جوش میں اس جنگ میں شامل ہوا۔ جنگ نے بھی اسے کچھ قسے دیے۔ کریمیا سے واپسی پر اس کا شمار اہم ادیبوں میں ہونے لگا مگر اس کے مخصوص مزاج کو بتر و گراد کے دہلی حلقوں میں زیادہ کشش نظر نہ آئی۔ اس کے منصوبہ ساز ذہن کی بے چینی اسے کسانوں کی طرف لے گئی، اپنے قسیمی نظریات کے تحت اپنے کسانوں کے لیے ایک درس گاہ بھی قائم کی۔ ان نظریات کے تحت اس کے بقول روسی تعلیم کے برعکس

ایسی آزاد شخصیت پیدا ہو سکتی تھی جس میں خدا و انسانیت کی ہمدردی کا شعور ہو۔ پھر ”گھر کے سکھ“ جیسا قابل توجہ ناول لکھا، اس عرصے میں طاسطائی کی شادی بھی ہوئی۔ ان مرحلوں سے گزرنے کے بعد ”جنگ اور امن“ جیسے بڑے ناول کی بنیاد پڑی۔ ”جنگ اور امن“ جیسا ناول طویل ریاضت چاہتا تھا۔ طاسطائی کے سوانح نگار آئری توپا (Henri Troyat) کی تصنیف 1965ء میں فرانس میں شائع ہوئی اور 1967ء میں اس کا انگریزی ترجمہ ہوا۔ یہ سوانح عمری تحقیق اور اسلوب دونوں کے اعتبار سے ممتاز ہے۔ توپا نے ”جنگ اور امن“ کی تخلیق، اس کی اشاعت اور ابتدائی رد عمل کا قصہ کچھ یوں سنایا ہے۔ طاسطائی دراصل 1825ء کی اس بغاوت پر کتاب لکھنا چاہتا تھا جس میں فوجی فخر اور مثالیت پسند شرفا شامل تھے۔ اس بغاوت کی ناکامی کے بعد اس کے قائدین کو نکولس اول نے سائبیریا بھجوا دیا۔ وزیر اعلیٰ کا اندر دوم کے زمانے میں کہیں 1856ء میں انھیں واپس آنے کی اجازت مل سکی۔ طاسطائی عسکری زندگی کے تجربے اور اپنی مثالیت پسندی کی وجہ سے اس سے ذہنی تعلق محسوس کرتا تھا لیکن جب اس نے ان کی تاریخ پر غور کرنا شروع کیا تو اس پر یہ حقیقت منکشف ہونے لگی کہ ان میں سے اکثر پولین کے خلاف مہمت میں شامل تھے اور ان کے آدرش اور ان کی آزادی خیالی میں فرانس میں قیام کا بڑا دخل تھا۔ چنانچہ اپنے موضوع کی مکمل تفہیم کے لیے 1812ء تا 1814ء کے زمانے کو سمجھنا پڑا مگر روس کی فتح کا یہ دائرہ 1805ء کی تباہی سے بھی متعلق تھا۔ یونان پارٹ کے خلاف فتح سے پہلے اس کے ہاتھوں شکست اور ذلت بھی تو قومی تاریخ کا اسم باب تھی۔ اس موضوع کو پھیلاتے ہوئے طاسطائی اس کے افق کی وسعت سے حیرت زدہ ہو گیا۔ 1825ء کی بغاوت اب ضمنی مسئلہ رہ گئی اور ناول کا منصوبہ اب کچھ یوں ہو گیا کہ اس میں تاریخ کے بڑے واقعات اور سماج کے بالائی طبقوں کی خاندانی زندگی کا ٹکراؤ بیان ہوگا۔ اس میں پولین، الیسا ندر جیسے تاریخی کردار بھی ہوں گے اور تخیلی کردار بھی۔ تخیلی کرداروں کے لیے وہ حربہ استعمال ہوا جو ناول نگاروں کا مقدر ہے یعنی اپنے جانے پہچانے کرداروں کی شخصیتوں کو تخیلی رنگ کی آمیزش سے پیش کرنا، چنانچہ طاسطائی کے سوانح نگار بتاتے ہیں کہ ناسا کا کردار دراصل اس کی سالی تاسیا کا ہے البتہ اس میں کچھ عناصر اس کی بیوی سوفیا کے بھی شامل کیے گئے ہیں۔ نکولس دستوف کا کردار اس کے والد کے کردار سے مماثلت رکھتا ہے۔ اسی طرح مختلف کرداروں کے بارے میں تحقیق کی گئی۔ خیرہ طاسطائی نے ناول پر کام شروع کیا، یا تو یہاں کے لفظوں میں ”عظیم ریاضت“ کا آغاز کیا۔ وہ پولین کے حملے کے متعلق کتابیں پڑھنے لگا۔ بہت سے بوزے جو اس حملے کے شاہد تھے ان سے بات چیت ہوئی۔ 1863ء اور 1864ء میں طاسطائی نے اس عہد کی فضا سے شناسائی کے لیے ریاضت کی۔ تحریر کا مرحلہ آیا تو مسلسل تراش خراش مسودے میں سات سات بار تہذیبیوں تک پہنچی، اسی دوران میں شکار کرتے ہوئے وہ گھوڑے سے گرا، بے ہوش ہوا، بازو ٹوٹا، ہوش آیا تو گھوڑا بھاگ چکا تھا، خیرہ کسی طرح گھسٹتا ہوا سڑک تک پہنچا۔ کچھ لوگوں نے ٹھہرایا، علاج کا مرحلہ شروع ہوا۔ بستی کا طبیب پھسڈی نکلا، بار بار بازو جوڑنے پر بھی ٹھیک نہ بیٹھا۔ آخری بار بازو جوڑنے کے بعد جب طاسطائی نے راتفل چھٹی تو روکی ٹیس پورے بازو میں پھیل گئی، آخر اس کے سر نے اسے ماسکو بلایا اور سر اور اس کے

دوسرے ڈاکٹر دوستوں نے علاج کیا۔ طالسٹائی کا مطالعہ جاری رہا، بعد میں اس نے جنگ کے میدانوں کا بھی مشاہدہ کیا۔ فروری 1865ء میں کتاب کا پہلا حصہ شائع ہوا مگر لوگ پوری طرح اس کی کاوشوں کی وسعت کو سمجھ نہ پائے۔ بھانت بھانت کی بولیاں تھیں۔ آزاوخیل وائٹس ورتو اسی چیز پر معترض تھے کہ اس نے ”زندہ“ بحثوں کو چھوڑ کر ساٹھ سال پہلے کے عہد کو ناؤں کا موضوع کیوں بنایا۔ تورگنیف کے رد عمل کا طالسٹائی کو بے چینی سے انتظار تھا مگر وہ بھی اس حصے کو پسند نہ کر سکا۔ طالسٹائی اس رد عمل سے، یوں نہیں ہوا، کام جاری رہا، بعد میں خور تورگنیف کی رائے کچھ بدلی۔ ادھر طالسٹائی کا مطالعہ بھی جاری تھا۔ وکٹر ہیوگو کا ”لامرزاہیل“، شرپن ہار کا فلسفہ، پردھون کے اشتراک کی نظریات جس میں پر تشدد انقلاب کی بات تھی مگر نجی ملکیت کو یکسر ختم کرنا مقصود نہ تھا۔ اسی قسم کے کتنے ہی افکار تھے جن سے طالسٹائی کا شعور نگرا رہا تھا۔ پھر وہ تاریخ داں جن کے نظریات ناؤں میں خاص وضعوں میں ڈھلے اور جن کے اثرات کی نشان دہی ایسا ویرن نے اپنے ایک اہم مضمون میں کی ہے۔ 1869ء میں یہ ویل جیسی کتاب مکمل ہوئی۔ اب چھ جلدوں کے مکمل ایڈیشن پر رد عمل مختلف تھا۔ پر جوش صاحب اس ناول کی خوبیاں گنانے لگے، تورگنیف ناول کے فلسفے کو تو قبول نہ کر سکا بلکہ اس نے کہا کہ جن ادیبوں کی تعظیم ادھوری ہو اور وہ اپنی کوشش سے سے پورا کرنے کی کوشش کریں، ان کا فلسفہ ہمیشہ کچا ہوتا ہے، مگر طالسٹائی کے مشاہدے کا وہ قائل ہو گیا۔ رات کا منظر، شکار کا منظر، ایسے کتنے ہی حصے تھے جن کی دوبارے بغیر کون رہ سکتا تھا۔ غرضیکہ ناول اپنے پیچھے روشنی کی طویل لکیریں بکھیر گیا۔ ناول کو روس کا ”تومی رزمیہ“ تصور کیا گیا حتیٰ کہ اشتراکی روس میں بھی قومی افتخار کے نشان کے طور پر اس کو اہمیت دی گئی۔ خود بنسن نے انقلاب سے پہلے طالسٹائی کے بارے میں کچھ مضامین لکھتے ہوئے طالسٹائی کی بورڈ واسیت کے باوجود بنیادی سوال اٹھایا، ”طالسٹائی سے پہلے روسی ادب میں کسان کہاں تھے؟“، لینن کے اس سوال نے ہنگامی کے مشہور مارکسی نقاد لوکاچ سے ایسے تنقیدی تبصرے تحریر کرائے جو طالسٹائی کے بارے میں مارکسی تنقید کا اعلیٰ ترین اظہار کہہ سکتے ہیں مگر مارکسی نقاد کے لیے مشکلات بھی تھیں مثلاً ایک روسی نقاد نے پردھون کے افکار سے اس ناول کی مماثلتوں پر کتاب لکھی تو اسے دبا دیا گیا۔ پردھون اشتراک کی نظریات تو رکھتا تھا مگر رکیکیت سے الگ، اس لیے یہ کتاب اس دور کی فضا میں قبول نہیں ہو سکتی تھی۔ خیر یہ بعد کے قصے ہیں۔ ادھر ناول کی تکمیل کے بعد سچے زکار کی طرح طالسٹائی کے دل میں ایک سناٹا بھر گیا۔ ”کیا میں کبھی اور بھی کچھ لکھ سکوں گا؟“ یہ سوال اسے ستانے لگا۔ طالسٹائی کا اضطراب آسا دل کہاں ہار مانتا تھا پھر ”آنا کارینا“ کی داغ بیل پڑی۔ 1878ء میں اس ناول کی اشاعت نے لوگوں کو اور بھی چوٹ لگایا۔ یہ دوسرے انداز کی کہانی تھی اور بطور ناول کئی نقادوں کے نزدیک ”جنگ اور امن“ سے بھی عظیم اور روسی ثقافت کی حقیقی ترجمان۔ پھر طالسٹائی کی تحریروں کا رخ ہی مڑ گیا اور وہ ”مہاتما“ ظاہر ہوا جس کی اصلاحی تحریروں کے اثرات ہمارے ادب میں پریم چند کے زمانے سے شروع ہوتے ہیں۔ طالسٹائی کے مذہبی اور تعلیمی نظریات، ”جنگ اور امن“، ”آنا کارینا“ جیسے ناولوں کے خالق کا ارب سے منحرف ہونا جسے ہمارے محنوں کو رکھوڑی نے ”ادبی ارتداد“ کہا ہے، حکومتی نظام سسر اور کلیسا سے اس کا ٹکراؤ،

پنی بیوی اور خاندان سے اس کے تعلقات کا اتنا چڑھاؤ اس کے جنازے پر مداحوں کا ہجوم، کتنی ہی باتیں ہیں جو اس کے سوانح نگاروں نے تفصیل سے بیان کی ہیں مگر ”جنگ اور امن“ کے ایک مختصر تعارف میں ان کا سہانا مشکل ہے۔

”جنگ اور امن“ کا موضوع وہی ہے جس کی طرف پہلے اشارہ کیا گیا ہے یعنی پھولین کا حملہ، روسیوں کی شکست، ماسکو کا خالی ہونا اور پھر روسیوں کی فتح مگر اس حاشیے میں تو زندگی کا پورا سیلہ کیا زندگی کا طوفان ہے۔ گھر میں زندگی، خواب کا ہیں، گھیاں، برف، برف، برف، گاڑیاں، مکان، سڑکیں، لوگ، دعوتیں، تاش کی بازیاں، تھیکر، رواج گھر (کسی نقاد نے کیا خوب لکھا ہے کہ روسی ناولوں میں کرداروں کی نفسیاتی کیفیت کے بیان میں رواج گھر کی کیا اہمیت ہے اس پر تو پوری کتاب لکھی جاسکتی ہے)۔ انسانی تعلقات کے رنگوں کی دھنک، موسموں کی شدت اور فطری مناظر کا بیان، روسی سماج کے مختلف طبقے، فری میسن، پھر جنگی سہات، فوجیوں کی زندگی، جنگی شکست، عملی کا بیان جس کے بارے میں مقرر صین بھی سامنے آئے اور فوجی تجربہ رکھنے والوں نے حاسطائی کا دفاع بھی کیا۔ پھر تاریخی کردار غرضیکہ زندگی کے اس طوفان کی کس کس لہر کو دیکھا جائے، روسی سماج کی زندگی اتنی دستوں کے ساتھ کسی ناول میں کب سما سکی تھی، ایسا ہی وسیع حاسطائی کا ذخیرہ الفاظ بھی تھا۔ روسی ادب کے ایک امریکی مزاج دان ایڈیٹورسن نے تو لکھا ہے کہ ”اگر کوئی روسی زبان سے کچھ شناسائی کے بعد صرف اس ناول کو پڑھ لے تو تقریباً تین چوتھائی روسی زبان کا ماہر ہو چکا ہوگا۔“

”جنگ اور امن“ میں حاسطائی نے تاریخی واقعات اور گھریلو زندگی کے تقابل سے آتش گیر کیفیات پیدا کی ہیں جن کا سراسر انسانی مقدر سے جالٹا ہے۔ حاسطائی کا فلسفہ کہانی سے ہٹ کر بار بار تاریخ کے فلسفے پر طویل اظہار خیال بڑے بڑوں کی ہمت پرست کر دیتا ہے اور لوگوں کو اس میں بالخصوص آخری حصوں میں وہ کیفیت محسوس ہوئی ہے جو عظیم سلطنت کی انتشار کے زمانے میں ہوتی ہے۔ جارج سنائر نے لکھا ہے کہ ”لوگ اس چیز کو فراموش کر دیتے ہیں کہ یہ ناول رزمیہ انداز پر ہے ہوئے ہے اور رزمیہ کسی جگہ ختم نہیں ہوتے، یہ دھار تو بہت ہی چلا جاتا ہے۔ حاسطائی کا تقابل تو ہر جیسے وہی رزمیہ نگاروں ہی سے ہو سکتا ہے۔“ بہر حال حاسطائی کے تاریخی نظریات کا بیان حویل کیوں نہ ہو اور کہانی کا سراپکڑ کر چلنے والا تاریخی کتنا ہی مضطرب کیوں نہ ہو کہانی بھی تو ان سے ہندھی ہوئی ہے۔

حاسطائی کا خیال تھا کہ مورخین ”بھولے بادشاہ“ ہیں جو کسی جنگ کے آغاز کے بارے میں کسی واقعہ یا چند واقعات کو اس کا حتمی سبب سمجھ لیتے ہیں۔ کسی بادشاہ یا فاتح کے کردار واقعات کو اکٹھا کر دیتے ہیں اور یہ نہیں دیکھتے کہ واقعات کا الجھاؤ کتنا گہرا ہے اور عام لوگوں کی زندگیوں کیسے اس ڈور سے بندھ جاتی ہیں اور کیسے انہیں انسان اس بربادی کے دائرے میں آجاتے ہیں۔ تاریخی واقعات کا ایک سراغ غیر عقلی سطحوں اور جبریت کے حصار میں ہوتا ہے۔ ان واقعات کی جتنی عقلی توجیہات کی جاتی ہیں اسی تناسب سے یہ غیر عقلی دکھائی دیتے ہیں۔ تاریخ یعنی بنی آدم کی غیر شعوری، عالم گیر اجتماعی زندگی کا حادثہ ہوں اور فانیوں کی زندگی کے ایک ایک پل کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرتی ہے۔ سورخ یا تو چند واقعات کو من ماسے طریقے سے جن لیتے ہیں یا کسی فرد واحد۔ بادشاہ یا سپہ سالار کے

انفال کا جائزہ لیا جاتا ہے جیسے اس کے انفال بے شمار افراد کے عزائم کے حاصل کل کے مساوی ہوں۔ طاسطائی کا کہنا ہے کہ انیسویں صدی کے پہلے پچاس سالوں میں کروڑوں انسانوں کی غیر معمولی حرکت، سنا کاروائی، شغل کو ترک کر کے یورپ کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک پہنچنا، ایک دوسرے کو لوٹا، خون میں نہلانا، زندگی کے چلن کا منقلب ہو جانا، کامرائیوں اور مایوسیوں سے دوچار ہونا، کیا یہ سب پیچیدہ عناصر فرد واحد کے انفال کے ذریعے سمجھے جاسکتے ہیں، کیا کروڑوں اثر کو عظیم اشیا کا سبب قرار دیا جاسکتا ہے؟ طاسطائی کے لفظوں میں ”تاریخ کے قوانین کا مطالعہ کرنے کے لیے ہمیں اپنے مشاہدے کا موضوع تبدیل کرنا ہوگا۔ ہمیں بادشاہوں، وزیروں اور جنرلوں کو ایک طرف رکھ دینا چاہیے اور ان متجانس اور خرد ترین عناصر کا، جو عام لوگوں پر اثر انداز ہوتے ہیں مطالعہ کرنا چاہیے۔ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ تاریخ کے قوانین کی تفہیم کے لیے اس طرف پیش رفت کرنا نہ ان کے لیے کہاں تک ممکن ہے لیکن یہ بالکل حیا ہے کہ صرف اسی ذریعے تاریخ کے قوانین کی دریافت ممکن ہے۔“

ان تاریخی مباحث سے الجھن ہو تو طاسطائی کے بیانے کی طرف پلٹا جاسکتا ہے مگر یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ طاسطائی جیسے بڑے ناول نگاروں کا بیان یہ جہاں ظاہری سطح پر سادہ نظر آئے وہاں بھی بڑی گہرائی ہوتی ہے اور ان گہرائیوں کا ادراک بھی فلسفے سے کم مشکل میں نہیں ڈالتا، ہاں سطح کو دیکھ کر جی خوش کر لینے کو بہت سمجھ لینے کی آزادی قاری کا اپنا حق ہے۔ بیانے کے سسے میں طاسطائی کی منظر کشی ہے جس میں بھیڑیے کے شکار جیسے وہ مناظر بھی ہیں جن سے نقادوں کو ہوسر کی یاد آئی ہے، کرداروں کے احساسات کا بیان بھی ہے مگر فی الحال ان بہت سی مثالوں کو چھوڑ کر صرف دو نگاروں کی مدد سے دیکھتے ہیں کہ طاسطائی کا تخلیقی تخیل متضاد چیزوں کو جوڑ کر کیسے کیسے نتائج خذ کرنے پر قدرت رکھتا تھا۔ پہلا منظر وہ ہے جہاں بیڑ پٹی زندگی اور دم دار تارے میں مشابہت محسوس کرتا ہے۔

”مورا کیس لینسی کہ ہر چلیس؟“ کو جوان نے دریافت کیا۔

”کہہ؟“ بیڑ نے اپنے آپ سے پوچھا۔ ”میں کہاں جاسکتا ہوں؟ کلب تو یقیناً نہیں جاسکوں گا اور نہ دو گوں سے ملنے والے گھر۔“ محبت اور شفقت کے جن جذبات کا اسے تجربہ ہوا تھا۔ ناشائے اپنے اشکوں کے بیچ میں سے اسے جن ملائم اور متشکر نگاہوں سے آخری مرتبہ دیکھا تھا، ان چیزوں کے مقابلے میں اسے تمام انسان قابل رحم اور بد نصیب دکھائی دے رہے تھے۔

”گھر؟“ بیڑ نے کہا اور اس بات کے باوجود کہ درج حرارت نقطہجمد سے دس درجے نیچے گر چکا تھا اس نے بے چوڑے چٹکے سینے پر پچھ کی پوسٹین کے کوٹ کے ٹمن کھول دیے اور مسرت کے احساس سے سرشار تازہ ہوا، بھیڑوں میں کھینچنے لگا۔

مطلع صاف تھا اور پلا پڑ رہا تھا۔ گندی فلیٹسڑکوں، جن پر روشنی ناکافی تھی اور ساہ بھتوں کے اوپر تاریک اور ستاروں بھرا آسمان پھیلا ہوا تھا۔ بیڑ نے جب غفلتی باندھ کر آسمان کی طرف دیکھا، جب وہ

آرہا سکوائر میں داخل ہوا اس کی نگاہوں کے سامنے ستاروں سے معمور فلک کی لامحدود وسعتیں سامنے آئیں۔ اس آکاش کے تقریباً مرکز میں پری پستنسکی خیابان کے اوپر 1812ء کا جسم تاباں اور درخشاں دم دار ستارہ جگمگا رہا تھا۔ یہ چاروں اطراف سے دوسرے ستاروں میں، جو آسمان پر بکھرے چمک رہے تھے، محصور تھا، لیکن یہ باقی ستاروں سے اس لحاظ سے مختلف تھا کہ یہ اس کی نسبت زمین سے کہیں زیادہ قریب تھا۔ اس کی روشنی سفید براق اور اس کی بے حد طویل دم اوپر کو ابھی ہوئی تھی۔ لوگ کہتے تھے کہ یہ دم دار ستارہ اپنے جنم میں ہر قسم کے مصائب اور آفات سے لے کر آیا ہے اور قرب قیامت کا پیش خیمہ ہے۔ لیکن اس درخشاں اور تاباں دم دار ستارے نے جس کی بسی اور خیرہ کن دم تھی، پھر کے اس میں کسی نوع کے خوف کا جذبہ نہ ابھرا، اس کے برعکس وہ مسرت و شادمانی سے سرشار اور اشکوں سے بھرپور آنکھوں سے اسے بغور دیکھ رہا تھا۔ اسے یہ ستارہ نامحدود خلا میں ناقابل تصور تیز رفتاری سے اپنے محور کے گردش کرنے کے بعد سیاہ آسمان میں اپنی منتخب جگہ اسی طرح گزرا نظر آ رہا تھا جیسے کوئی زمین میں کھسا کھڑا ہو، دکھائی دیتا ہے۔ وہ بڑی جانفشانی سے اپنی دم سیدھی اوپر اٹھائے ہوئے تھا، اور متعدد دیگر چمکتے ستاروں کے مابین جگمگا رہا اور اپنی سفید روشنی کی نمائش کر رہا تھا۔ پھر کو یوں لگا کہ یہ ستارہ اس کی اپنی مداح سے، جو نرم و گد ز ہو چکی تھی، در بلند یوں کی طرف اٹھ چکی تھی، پوری طرح ہم آہنگ ہے۔ (ترجمہ شاہ حمید)

اندرونی احساسات اور فطری مظهر کا ایسا گہیراں میل آسانی سے ممکن نہیں۔ روح کے ایک مخصوص تجربے کے بعد گہرا ہونے کی کیفیت بظاہر منحوس ستارے کو بھی کتنا قابل قبول بنا رہی ہے۔ تطہیر کی یہ کون سی شکل ہے؟ زندگی کے اثبات کا یہ کون سا مرحلہ ہے؟ دوسری مثال کسی فرد کی نہیں، یہاں شہر کی تصویر ہے، ماسکو خالی ڈھنڈار پڑا ہے، اس وقت ملکہ کے بغیر شہر کی مکینوں کے چہرے کا منسلک بیاں ہوا ہے۔ حیاتیاتی علم اور حشرات کے عالم کو کس طرح انسانی زندگی سے ملا دیا ہے، ایسی فنکاری ہی تو یہاں ہے جس میں جادو جگاتی ہے، کہانیاں تو بچے بھی سنا دیتے ہیں۔

”دیریں، شہر ماسکو خالی ڈھنڈا رہا، یوں شہر میں لوگ اب بھی موجود تھے۔ غالباً آبادی کا پچاسواں حصہ بچھے رہ گیا تھا۔ لیکن شہر خالی تھا اور یہ اسی طرح خالی تھا جس طرح شہر کی مکینوں کا چھٹا ملکہ کی ہدم موجودگی کے سبب خالی اور مرگ پذیر ہو جاتا ہے۔ بے ملکہ چھٹا روح حیات سے یکسر عاری ہوتا ہے، بے شک سطحی نظروں سے دیکھنے میں دوسرے چہروں کی طرح زندگی سے بھرپور دکھائی دیتا ہے۔ وہ بہرہ کی حدت میں شہر کی مکیناں بغیر ملکہ کے چہرے کے اور اس خوش دلی سے منڈلاتی پھرتی نظر آتی ہیں جس طرح دوڑی حیات چہروں کے اوپر منڈلاتی دکھائی دیتی ہیں۔ وہ اسی انداز سے اڑتی اور اس کے اندر آتی اور باہر جاتی ہیں اور دور سے شہر کی مہک بھی محسوس ہوتی ہے لیکن آدمی کو اس کا ذرا احتیاط سے جائزہ لینے کی ضرورت ہے اور

اسے صاف معلوم ہو جائے گا کہ اس میں زندگی کی رتی باقی نہیں رہی۔ نکھیریں کے اندر داخل ہونے اور باہر نکلنے کا انداز وہ نہیں ہوتا جو پہلے تھا اور کھپوں پالنے والے شخص کو اس بات کا شدت سے احساس ہونے لگتا ہے کہ آواز اور مہک۔ دونوں میں پہلے کی نسبت نمایاں فرق آ گیا ہے۔ جب وہ بیمار چھتے کی دیوار کو کھٹکھٹاتا ہے تو ہزاروں کھیاں بجائے اس کے کہ پہلے کی طرح آناٹا مستفرد عمل کا اظہار کریں، بھنسنائی ہوئی آئیں، تہدید کی انداز سے اسے پروں کو پھیلائیں اور انھیں بہ سرعت جھلانے کھٹکھٹائی اور زندہ و توانا کھٹکھٹا ہٹ پیدا کریں، اس کی کھکھلی اور بے ربط، بھنسنائٹ جو اجاڑ چھتے کے مختلف حصوں سے آتی ہے، اس کا استنبال کرتی ہے۔“

(ترجمہ شاہ حید)

یہ مفصل بیان جو چھتے کے جلنے جانے پر ختم ہوتا ہے حیرت انگیز مشاہداتی قوت کے ذریعے شہر کے مقدر کی عجیب اور گہری تمثیل بن جاتا ہے۔ ناول میں طاسطائی کے تخلیقی تخیل کے ایسے حیرت انگیز کرشمے تو جگہ جگہ ملیں گے۔ روس میں پچھلے چند برسوں میں ایسی زبردست تبدیلیاں آئی ہیں جن کی جتنی عقلی تفسیریں آرہی ہیں طاسطائی کے فلسفے کے مطابق وہ اور غیر عقلی محسوس ہوتی ہیں۔ کیا کسی نظام کی ناکامی یا ان تبدیلیوں کو افراد کے حوالے سے سمجھا جائے یا کوئی طاسطائی کی طرح واقعات کو دور تک جا کر سمجھنے کی کوشش کرے گا۔ ”جنگ اور امن“ گوروس کا قومی رزمیہ سمجھا گیا، اب روس مختلف ریاستوں کی دولت مشترکہ بن چکا ہے۔ یہ دولت مشترکہ کتنی کسی ہوگی، کتنی ڈھیلی، بھی کیا کہا جاسکتا ہے۔ طاسطائی کا رزمیہ اب روسی فیڈریشن سے متعلق ہے یا باقی ریاستیں بھی مشترکہ ورٹے کا کوئی گہرا احساس پیدا کریں گی؟ خیر ان مسائل کے بارے میں جو بھی کہیں طاسطائی کا ناول تو اب عالمی ادب کا کلاسیک بن چکا ہے۔ ہر زبان کو اس سے رابطہ پیدا کرنا ہے۔ طاسطائی نے مخصوص صورت حال میں روسی انسان کا ردعمل دکھایا ہے مگر اس کے ہاں مسئلہ تو انسانی مقدر کا ہے۔

سہیل احمد خان

معروضات و تصریحات

متن

طالسطائی نے اپنے ناول ”جنگ اور امن“ کو جسے روس کی ”نیشنل ایپک“ (قومی رزمیہ) کہا جاتا ہے، 1863ء میں لکھنا شروع کیا۔ اکتوبر 1863ء میں اس کی شریک حیات سوفیا نے اپنے روزنامے میں تحریر کیا ”آج کل وہ نئی کتاب لکھنے میں مصروف ہیں۔ انھیں دو ”تاریخ 1812ء“ (History of 1812) کہتے ہیں۔ تاہم ”1865ء میں یہ ”1805ء“ کے نام سے قسط وار حصے شہود پر آئی اور بعد میں یہی ”جنگ اور امن“ کا پہلا حصہ بنی۔

لکھنے کا کام چلتا رہا۔ 1866ء کے اواخر میں اس نے سوفیا کے مشورے پر کان دھرا اور پورے ناول کو خود کتابی شکل میں شائع کرنے کا بیڑا اٹھایا۔ ایک دوست سے ایک ہزار روپے ادھار لیے (اس نے ان میں سے اچھی خاصی رقم جوتوں اور سموری جینوں کی خریداری پر صرف کردی) اور ایک آرٹسٹ سے مختلف کرداروں کی تصاویر بنوائیں۔ 1876ء میں کتاب کے نام کا فیصلہ ہوا۔ ”1805ء“ کے نسخے میں کانی کانٹ چھانٹ ہوئی، متعدد دسے ابواب کا اضافہ کیا گیا یا انھیں از سر نو لکھا گیا، اور کتاب کے چار حصوں میں چھپنے کا اعلان کر دیا گیا۔ مگر کتاب کا حجم بڑھتا جا رہا تھا اور 1868ء میں اخباروں میں اعلان شائع ہوا کہ کتاب پانچ حصوں پر مشتمل ہوگی، تاہم جو لوگ چار حصوں کی پیشگی قیمت ادا کر چکے ہیں، انھیں پانچواں حصہ مفت فراہم کیا جائے گا!

دریں اثنا پہلے تین حصے چھپ چکے تھے اور دھڑا دھڑک رہے تھے لیکن طالسطائی کا قلم کہیں رکتا ہی نہیں تھا۔ چوتھا حصہ شائع ہوا۔ 1869ء میں پہلے پانچویں اور پھر چھٹے حصے کی اشاعت عمل میں آئی۔ یوں خداوند کر کے کتاب تکمیل تک پہنچ ہی گئی۔

”جنگ اور امن“ کا جو حصہ ”1805ء“ کے نام سے قسط وار شائع ہوا تھا، طالسطائی کے سوانح نگار اور نقاد اسے پہلا ایڈیشن قرار دیتے ہیں۔ اس میں مصنف نے فرانسیسی کا (بالخصوص مکالموں میں) دل کھول کر استعمال کیا تھا (فرانسیسی روسیوں کا اوڑھنا پھوننا بن چکی تھی۔ بعض لوگوں کو تو اپنی زبان آتی ہی نہیں تھی، وہ صرف فرانسیسی بولتے اور لکھتے تھے)۔ دوسرے ایڈیشن میں اس نے کثرت بیشتر مقامات پر فرانسیسی کو روسی قالب پہنا دیا۔

طالسطائی خوش خط نہیں تھا۔ وہ بار ایک لکھنے کے ساتھ ساتھ حروف بھی ایک دوسرے کے قریب جوڑ کر لکھتا تھا۔ اوپر سے وہ مسودے میں بار بار ترامیم کرتا رہتا تھا۔ یوں ایک قسم کی پھڑکی سی بن جاتی تھی اور اسے سمجھنا خاصا دشوار امر تھا۔ اس مشکل کا ایک حل یہ نکالا گیا کہ طالسطائی جو کچھ دن کے اوقات میں لکھتا، سوفیارات کو مصنوعی اور ناکافی روشنی میں اس کی نقل تیار کرتی اور یہی نقل پریس میں بھیجی جاتی۔ مہارت اور پوری کوشش کے باوجود سونیا بھی الفاظ سے بچ نہ سکی۔ کہا جاتا ہے کہ طالسطائی کے اصل مسودے اور سونیا کی نقل میں 1886 تا قضاات (discrepancies) ہیں۔

جب کتاب چھپ کر آئی، اس نے سوچا کہ یہ تو بہت برا ہوا۔ ایک تو وہ ان الفاظ کی اصلاح کرنا، دوسرے بعض مقامات پر فرانسیسی مکانات کو دوبارہ داخل کرنا اور تیسرے کہیں کہیں اسلوب بیان کو بہتر بنانا چاہتا تھا۔ چنانچہ اس نے دوسرے ایڈیشن کا ایک نسخہ پکڑا، قلم اٹھایا اور اس میں ترامیم و تفسیح شروع کر دی۔ (اس مرتبہ اس نے کتاب کو چھ کی بجائے چار حصوں میں تقسیم کر دیا۔) جب یہ کام مکمل ہو گیا، اس نے اصلاح شدہ نسخہ اپنے معتد دوست نکولائی نکلایوویچ ستراخوف کو بھیج دیا کہ وہ اپنی نگرانی میں کتاب چھپوادے۔ کتاب کی طباعت کے دوران میں دونوں کے مابین عطف کتابت ہوتی رہی۔ ستراخوف اسے سب کچھ بتاتا رہا لیکن اس نے یہ کہیں اتر نہیں کیا کہ وہ طالسطائی کا (خود ساختہ) ایڈیٹر بن گیا ہے اور اس میں مزید ترامیم کر رہا ہے۔ چنانچہ جب 1873ء میں ناول کا تیسرا ایڈیشن شائع ہوا تو اس میں طالسطائی اور ستراخوف دونوں کی ترامیم شامل تھیں۔ اسی ایڈیشن سے ملتا جلتا پہلے چوتھا اور 1886ء میں پانچواں ایڈیشن زیر طباعت سے آ رہا تھا۔

سترخوف کی بیشتر ترامیم ایک ایک دو دو یا تین تین الفاظ پر مشتمل ہیں۔ مثلاً طالسطائی نے لکھا: ”کہیں ایک سوداگر رہتا تھا۔“ سترخوف نے اسے ”تڑھنی میں ایک سوداگر رہتا تھا“ میں تبدیل کر دیا۔ طالسطائی نے ایک شخص کے متعلق لکھا کہ اسے قید با مشقت کی سزا ہوئی، سترخوف نے اسے قید با مشقت ہی نہیں دی، اسے سائبیریا بھی بھیج دیا۔ طالسطائی نے لفظ ”تصادم“ تحریر کیا، سترخوف نے اسے ”ناخوشگوار تصادم“ بنا دیا۔ طالسطائی نے لکھا: ”وہ گانا گانے لگا۔“ سترخوف نے اسے ”وہ پھٹی پھٹی آواز میں گانا گانے لگا۔“ بنا دیا۔ اس قسم کی ترامیم ہر صفحے اور اکثر جگہ تقریباً ہر جملے میں موجود ہیں۔ میں دوسو گننے کے بعد تھک گیا اور آگے ہاتھ اٹھا لیا۔

یہ ترامیم بذات خود قابل ستائش نہیں۔ کسی بھی تخلیقی مصنف کے ساتھ اس طرح کی دل لگی کو پسند نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن سترخوف نے ان ادنیٰ ترامیم پر ہی اکتفا نہیں کیا۔ اس کے ہاتھ میں قلم تھا۔ کہیں وہ سطروں کی سطریں قلم زد کرنے (ویسے اس نے یہ کام سبوتا کم کیا ہے) اور کہیں سطروں کی سطریں پتی طرف سے بڑھانے (یہ کام اس نے فراخ دلی سے کیا ہے) لگا اور ایک جگہ تو اس نے آدھا صفحہ خود لکھا اور ناول میں شامل کر دیا۔

• طالسطائی کو سترخوف پر کتنا اعتماد تھا، اس کا ثبوت یہ ہے کہ اس نے اپنے پہلے وصیت نامے میں تحریر کیا کہ ”اس کے چہنچہ بھی کاغذات ہیں انھیں سترخوف، چمت خروف اور کاؤشس سونیا طالسطائی، جس طرح چاہیں اٹھانے لگا دیں۔“ (اس کا سن دس)

ستراخوف کی مشترکہ بیباں، جن کے متعلق روز میری ایڈمنڈز کا کہنا ہے کہ ان کا ترجمے پر کوئی خاص اثر نہیں پڑتا، اسلوب اور زبان و بیان کی باریکیوں سے متعلق ہیں۔ یہ تبدیلیاں کس قسم کی ہیں جب تک اصل روی متن تک رسائی حاصل نہ ہو، ان کے متعلق کوئی رائے زنی نہیں کی جاسکتی، مگر یہ تراجم اور اضافے خواہ کتنے ہی متاثر کن کیوں نہ ہوں، بہر حال تحریفات کے ذمے میں ہی شمار ہوں گے۔ بد قسمتی یہ ہوئی کہ جوائنڈیشن اس کی ریگرنائی شائع ہوئے وہی قابل اعتبار ٹھہرے کیونکہ کسی کو خیال بھی نہیں، سکتا تھا کہ طالسٹائی کی کوئی دوسرا شخص بھی اصطلاح کر سکتا ہے۔

1930ء کی دہائی میں جب طالسٹائی کی تمام تحریروں (یہ تحریروں نوے صدوں میں سائیں) کو جوبلی ایڈیشن کے نام سے شائع کرنے کا پروگرام بنایا تو این این آکا پووا، این کے گورڈی، این این گو سیف اور ایم بی خراب چنکو پر مشتمل ایڈیٹروں کا بورڈ یہ فیصلہ نہ کر پایا کہ وہ ”جنگ اور امن“ کے کون سے ایڈیشن کو اپنے متن کی بنیاد بنائیں۔ انھوں نے اپنی 1930-1933ء کی طباعت کے لیے پانچویں (مطبوعہ 1886ء) اور 1937ء کی طباعت کے لیے دوسرے ایڈیشن (مطبوعہ 1868-1869ء) کو منتخب کیا۔ لیکن انہوں میں جو الجھن تھی، وہ دور نہ ہو سکی۔

1937ء کی اشاعت کے چند سال بعد ہی انتہائی اہم دستاویزات کا انکشاف ہوا۔ طالسٹائی نے 1873ء میں تیسرے ایڈیشن کی تیاری کے لیے جو خطوط لکھے تھے، وہ سارے کے سارے ڈھونڈ نکالے گئے اور دوسرے ایڈیشن کے نسخے پر طالسٹائی اور بعد میں سترخوف نے تراجم کی تھیں، وہ بھی مل گیا۔ اب مستند نسخے کی تیاری کا کام مادام زیدین شنور کے سپرد ہوا۔

مادام زیدین شنور لکھتی ہیں: ”اب ہمیں اس امر کے کہ طالسٹائی نے کیا تراجم کی تھیں اور سترخوف نے کیا، ناقابل تردید شواہد مل گئے ہیں۔ خطوط سے اس بات کا واضح ثبوت ملتا ہے کہ سترخوف نے جو تراجم کی تھیں، وہ اس نے طالسٹائی کو دکھائے بغیر ہی کتاب کا نظر ثانی شدہ مسودہ پر اس میں بھیج دیا۔ چنانچہ طالسٹائی کو یہ تراجم دیکھنے کا بھی موقع نہ مل سکا ورنہ اس نے کبھی ان کی صحت کی تصدیق کی۔ ان نو دریافت دستاویزات سے یہ بات قطعی طور پر ثابت ہو جاتی ہے کہ ناول کی مشترکہ بیباں طالسٹائی کے بجائے سترخوف کے قلم کا نتیجہ ہیں۔ چنانچہ 1873ء اور 1886ء کے ایڈیشنوں کی بنیاد پر بعد میں جتنے بھی ایڈیشن شائع ہوئے، وہ صحیح نہیں ہیں کیونکہ ان دونوں کی ترتیب میں طالسٹائی کا کوئی ہاتھ نہیں تھا۔“

چنانچہ مادام زیدین شنور نے اس نو دریافت مواد کی روشنی میں ”جنگ اور امن“ کی از سر نو تدوین کا کام شروع کیا۔ اب کے اس نے اپنے نسخے کی بنیاد 1868-1869ء کے ایڈیشن کو بنایا، کیونکہ اس میں سب حک و اضافے طالسٹائی کے اپنے تھے اور اس نے 1873ء کے ایڈیشن کی صرف وہی تراجم، جو طالسٹائی نے اپنے ہاتھ سے کی تھیں، شامل کیں۔ مادام زیدین شنور کا مرتب کردہ نسخہ، جسے مستند قرار دیا جاسکتا ہے، پلیٹ پبلشنگ ہاؤس فارلنڈر پیر ماسکونے چار حصوں میں 1963ء میں شائع کیا۔

یہ ترجمہ ایسی نسخے کے انگریزی ترجمے پر مشتمل ہے۔

انگریزی تراجم

سوچا تو راقم الحروف نے بھی یہی تھا کہ ”جنگ اور امن“ کا اردو ترجمہ براہ راست روی زبان سے کیا جائے۔ اس مقصد کے لیے راقم الحروف نے روی زبان سیکھنا بھی شروع کر دی۔ کچھ شدید ہو بھی گئی لیکن بیچ میں کچھ ایسی مشکلات کا، جو استاد کے بغیر حل نہیں ہو سکتی تھیں، سامنا کرنا پڑا (اور استاد کہیں ملنا نہیں تھا) کہ مجبوراً کوشش ترک کرنا پڑی اور انگریزی تراجم کا سہارا لینا پڑا۔

جہاں تک راقم الحروف کی معلومات کا تعلق ہے، انگریزی میں ”جنگ اور امن“ کے پانچ مختلف تراجم شائع ہوئے ہیں اور ان میں پہلے چار 1885ء کے ایڈیشن پر مبنی ہیں۔

1۔ گنام ترجمہ: خاصا پرانا ترجمہ ہے۔ پہلی بار کتب شائع ہوا، معلوم نہیں ہو سکا، اب تے جے ایم فٹنٹ اینڈ سنز نے اسے پہلی بار Every Man's Library Series میں 1911ء میں چھپا پا اور 1932ء میں اس پر نظر ثانی کرائی۔ خاصا جنگ ترجمہ ہے۔ بعض مقامات پر مترجم سے سنگین غلطیوں کا ارتکاب ہوا ہے۔ (مثلاً ایک جگہ دلو خوف اپنے قازقوں کو حکم دیتا ہے کہ وہ فرانسیسیوں پر حملہ کرنے سے پہلے پیادہ دوسے کا انتظار کر لیں، اس مترجم نے پیادہ دستوں کو گھڑ سو روست بنا دیا ہے۔) بعض مقامات پر، جہاں بات سمجھ میں نہیں آئی، مترجم جملوں کے جملے چھوڑ دیتا ہے یا پھر ایسا پیچیدہ طرز بیان اختیار کرتا ہے کہ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ کہنا کیا چاہتا ہے۔

2۔ گارنیت (Constance Garnett) گارنیت بہت ذہین خاتون تھیں۔ زبان بھی بہت خوبصورت لکھتی تھیں اور روی مصنف کے سب سے زیادہ ترجمہ بھی اس نے کیے ہیں مگر اس نے روی زبان اور معاشرت کو سمجھنے میں بہت ٹھوکریں کھائی ہیں۔ نقادوں نے اس کے ترجمہ میں لاتعداد غلطی کی نشان دہی کی ہے۔ مشہور روسی نژاد امریکی ناول نگار اور نقاد ٹاؤکوف نے تو اسے خالص طور پر تنقید کا نشانہ بنایا ہے۔ اس کے ایک نقاد کا کہنا ہے: ”گارنیت شاید اس لیے غلطیاں کرتی تھیں کیونکہ اس زمانے میں اوکسفرڈ یونیورسٹی پریس نے روی انگریزی لغت شائع نہیں کی تھی۔ اوکسفرڈ کی لغت، جو بعد میں شائع ہوئی، بذات خود ناقص ہے۔ گارنیت نے جو لغات استعمال کیے ہوں گے، وہ تو بالکل ہی گمے گزرے ہوں گے۔“ (کریگ رین، سنٹن ریویو آف بکس، 13 جون 1991ء)

3۔ ماڈ (Louise & Aymer Maude)۔ یہ دونوں مترجم میاں بیوی تھے۔ اگرچہ دونوں انگریز تھے لیکن انھیں دوسرے مترجمین پر یقین حاصل تھی کہ لوئیز ماسکو میں پیدا ہوئی اور چالیس سال وہیں مقیم رہی۔ ایمر نے دو سال ماسکو میں تعلیم پائی اور 23 برس روس میں قیام بذریعہ۔ دونوں کو روسی زبان پر عبور حاصل تھا اور وہ روسی معاشرت سے بخوبی آگاہ تھے۔ اس کے علاوہ دونوں طاسطائی کے حلقے میں شامل تھے۔ (ایمر ماڈ تو اس کا دوست اور کسی حد تک مرید بھی تھا۔) پھر انھوں نے اپنے ”کرو“ کے ناموں کے جو تراجم کیے، حالطائی نے انھیں جتہ جتہ دیکھا اور پسندیدگی کی سند عطا کی۔ راقم الحروف کے خیال میں ”جنگ اور امن“ کا بہترین اور قابل اعتماد ترجمہ یہی ہے، اگلی دونوں مترجمین اس کی محض خوشہ چیں معلوم ہوتی ہیں۔ تاہم، ڈکے ترجمے میں ایک گڑ

بڑا تو یہ ہے کہ اس نے روسیوں کے مسیحی (یا ذاتی) ناموں کو انگریزی قالب پہنا دیا ہے، مثلاً آندرے کو اینڈری، لیدا کو لڈیجہ اور پیوٹر کو پیٹر بنا دیا ہے۔ اس سے ناولوں کی روسی فضا متاثر ہوئی ہے۔ دوسری خرابی یہ ہے کہ یہ ترجمہ بھی 1885ء ہی کے ایڈیشن پر مبنی ہے لیکن اس میں مترجمیں کا کوئی قصور نہیں کیونکہ اس وقت 1885ء کا ایڈیشن ہی صحیح سمجھا جاتا تھا۔

ماڈ کے ترجمے کی اضافی خوبی یہ ہے کہ اس میں تاریخی واقعات و شخصیات اور روسیوں کے رائج نام اور رسم و رواج پر حواشی بھی شامل ہیں۔ شروع میں یہ حواشی مترجمین نے ہی تحریر کیے تھے لیکن، سکومیں ”جنگ اور امن“ کے مستند نسخے کی شاعت کے بعد جب 1983ء میں اس ترجمے کے پبلشر اوسفرڈ یونیورسٹی پریس نے کتابت کی ترتیب میں تبدیلی کی، اسے چھ کی بجائے چار حصوں (یا کتب) میں تقسیم کیا اور تین کی بجائے دو جلدوں میں شائع کرنے کا منصوبہ بنایا، تو اس کے ایڈیٹر ہنری گفرڈ نے نئی معلومات کی روشنی میں حواشی پر نظر ثانی کی کچھ خارج کر دیے، کچھ میں ترامیم کیں اور کچھ بالکل نئے سرے سے لکھے۔ راقم الحروف نے ان حواشی سے خاص فائدہ اٹھایا ہے لیکن الجھاؤ سے بچنے کے لیے حوالہ صرف ماڈ کا دیا ہے۔

4۔ روز میری ایڈمنڈز (Rosemary Edmonds) ایڈمنڈز انگریزی، روسی، فرانسیسی، اطالوی اور قدیم سلاوی زبانوں کی عالم ہے۔ اس کا ترجمہ پہلی بار ”پینگوئن کلاسیکس“ سیریز میں 1957ء میں شائع ہوا۔ اگرچہ اس نے ماڈ کی خاصی خوش چینی کی ہے، اس کا اپنا اسلوب نگارش شستہ، سلیس و سیدھا سدا ہے، کہیں کوئی خاص الجھاؤ نہیں۔ جو بات دوسرے تراجم سے واضح نہیں ہوتی، وہ یہاں اکثر صاف ہو جاتی ہے۔ اپنے ترجمے کے 1973ء کے ایڈیشن میں اس نے دعویٰ کیا کہ سکومیں ”جنگ اور امن“ کے مستند ایڈیشن کی اشاعت کے بعد اس نے اپنی کتاب میں ترامیم کر دی ہیں لیکن یہ دعویٰ زبانی معصوم ہوتا ہے، عملاً کہیں نظر نہیں آتا۔ پھر اگر ماڈ نے روسیوں کے مسیحی ناموں کو انگریزی قالب پہنا دیا ہے، ایڈمنڈز نے پیچھے رہنا مناسب نہ سمجھا اور اس نے روسی مردوں، درجہ داروں کے خاندانی نام انگریزی انداز سے ایک ہی طرح لکھ دیے ہیں۔ مثلاً وہ رستوف کی نسوانی صورت رستووا نہیں لکھتی، رستوف ہی تحریر کرتی ہے۔ اس سے بھی ناول کی روسی فضا متاثر ہوتی ہے۔

5۔ این ڈونلگن (Ann Dunnigan) یہ امریکی ترجمہ ہے اور غالباً اکلوتا امریکی ترجمہ ہے۔ اسے نیوا میریکن لائبریری نے پہلی مرتبہ 1968ء میں شائع کیا تھا۔ روز میری ایڈمنڈز کی طرح این ڈونلگن نے بھی روسی مصنفین کی کتابوں کے مترجم کی حیثیت سے خاصی شہرت حاصل کی ہے۔ روز میری ایڈمنڈز کی طرح وہ بھی ماڈ کی خاصی خوش چینی کرتی نظر آتی ہے اور بعض مقامات پر اس کا طرز نگارش خاصا ژولیدہ اور لفاظی سے پر ہے تاہم انگریزی میں یہ واحد ترجمہ ہے جو مستند روسی ایڈیشن سے مطابقت رکھتا ہے۔ اگرچہ راقم الحروف نے ماڈ اور ایڈمنڈز کے تراجم سے خاصا استفادہ کیا ہے لیکن اس نے متن این ڈونلگن کا ہی اختیار کیا ہے۔

میرے اس ترجمے کے بعد انگریزی میں ”جنگ اور امن“ کے دوسرے تراجم شائع ہوئے ہیں۔ 2005ء میں روسی زبان کے پروفیسر انٹینی برگز (Briggs) کا ترجمہ طبع ہوا۔ اسے اختتامی ترجمہ قرار دیا گیا ہے کیونکہ اس میں

روسی سپاہیوں کی سہیلنگ کا ترجمہ انگریزی سہیلنگ میں کیا گیا ہے۔

2007 میں رچرڈ پیور (Peaver) اور اس کی اہلیہ ماریہ ولنونسکی کا ترجمہ اشاعت پذیر ہوا۔ پیور امریکی ہے جب کہ ماریہ ولنونسکی روسی انس۔ لاریہ ولنونسکی روسی نادلوں کا لفظی ترجمہ کرتی ہے کیونکہ اسے انگریزی زبان پر اتنا عبور حاصل نہیں۔ پیور اس کے ترجموں کی تراش خراش کرتا اور نوک چلک سنوارتا ہے۔ دونوں کو ”آنا کارینا“ اور ”کرانا زوف برادران“ کے ترجموں پر اعتراضات بھی مل چکے ہیں۔ ان کے ”جنگ اور امن“ کے ترجمے کو بھی بہت سراہا گیا ہے۔

ترجمے کی مشکلات

غائب کی طرح حالطائی اشکال پسند بھی ہے اور اس کی تحریریں سہل ممتنع کا شاہکار بھی ہیں، بلکہ بعض مقامات پر اس کی آسان عبارتیں مترجم کے لیے زیادہ مشکلات کھڑی کرتی ہیں۔ There is a There, and There is Someone There is the future life The Someone is God. بقدر بہت آسان عبارت ہے لیکن ترجمہ کرنے میں تین شخص تو دن میں تارے نظر آنے لگتے ہیں۔ ”جنگ اور امن“ تو بالکل زالی دنیا ہے۔ مہد سے لہد تک انسان کی کون سی مصروفیت (activity) ذہنی درجہ ذاتی کیفیت، معاشرت کا کون سا گردش اور کون سا علم ہے جسے مصنف نے کسی نہ کسی طرح اس میں گھسیٹ ڈال لیا ہو۔ بعض اشغال (مثلاً تیر اندازی) اور علوم کی یورپی اصطلاحات کے اردو مترادفات ملتے ہی نہیں اور اگر خود گھڑے جائیں تو کوئی انہیں سمجھے گا نہیں۔ مجبوراً انہیں یا تو یوں کا توں لکھ دیا گیا ہے اور تشریح حواشی میں کر دی گئی ہے یا پھر دسواختی فقرہوں سے کام چلایا گیا ہے۔ بعض اوقات پنجابی میں بالکل صحیح مترادفات مل جاتے ہیں لیکن پنجابی کا استعمال بعض لوگوں کو ناگوار گزرتا ہے۔ چنانچہ میں نے اس سے زیادہ تراstrazli کیا ہے۔

مغربی زبانیں ساخت اور مزج کے اعتبار سے ہماری زبانوں سے بالکل مختلف ہیں۔ ان زبانوں میں رموز اوقاف (punctuations) کا خاص خیال رکھا جاتا ہے۔ اس لیے طویل سے طویل جملہ لکھنا ممکن ہے (اور ڈھیل

• انگریزی میں رموز اوقاف سے بڑے بڑے کام لیے گئے ہیں۔ اس کی ایک دلچسپ مثال اے جے ٹامسن Thomson اور اے ڈی مارٹینٹ (Martinet) نے اپنی کتاب ”اے پرکیکل انگلش گرامر“ (مطبوعہ آکسفورڈ یونیورسٹی) میں دی ہے۔

His brother who is an artist is my friend.

His brother, who is an artist, is my friend

بظاہر دونوں فقرے ایک جیسے ہیں لیکن ان کے معانی میں بہت فرق ہے۔ پہلے فقرے میں بھائیوں کی تعداد ایک سے زیادہ ہے اور یہاں مراد وہ بھائی ہے جو کہ آرٹسٹ ہے۔ دوسرے فقرے میں بھائی صرف ایک ہے اور Commas کے درمیان میں جربات کی گئی ہے اس کی حیثیت محض اضافی ہے۔ چنانچہ پہلے فقرے میں اگر brother کی جگہ father لکھ دیا جائے، تو نہ صرف فقرہ غلط ہو جائے گا بلکہ اس سے بڑی بد فہمی کا تصور بھی ناممکن ہے۔

پورا کلمے سنے پر

ایک اور مثال دیکھیں۔

ڈینو نے تو پورے پورے صنف کا جملہ لکھ دیا ہے۔ (قرآن مجید میں بھی رموز اوقاف کا خصوصی مقام ہے اور اسی لیے لاتعداد طویل آیات موجود ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ عربی، فارسی اور اردو کے ادیبوں اور مصنفوں نے اس اہم شعبے کو کیوں نظر انداز کر رکھا ہے۔ اردو اخبار پڑھیں تو، کثرت اوقات پورے پورے کالم میں کہیں کوئی علامت دکھائی نہیں دیتی اور پتا ہی نہیں چلتا کہ فقرہ کہاں سے شروع ہو اور کہاں ختم ہو۔) اردو ترجمے میں طویل فقروں کو توڑ کر متعدد چھوٹے فقروں میں تقسیم کر دیا جاتا ہے۔ میں نے بھی یہ کام کیا ہے لیکن بعض اوقات اس توڑ پھوڑ کا نتیجہ اچھا برآمد نہیں ہوتا، عبارت کی روانی میں بہت فرق آ جاتا ہے۔ چنانچہ متعدد مقامات پر میں نے ایسا کرنے سے احتراز برتا ہے اور انگریزی کی طرح ذیلی جملے (کلاز) کو اس کے سرخ (antecedent) سے مل کر اور اوقاف کو استعمال کر کے ذرا طویل فقرے لکھے ہیں۔ یہ شعوری کوشش ہے، پتا نہیں قارئین اور ناقدین کا رد عمل کیا ہو۔

اوقاف کے ضمن میں ایک اور بات جو آپ کو ترجمے میں نظر آئے گی، وہ نقطوں کا استعمال ہے۔ اس کتاب میں جہاں بھی نقطے لگائے گئے ہیں، انگریزی کی طرح ایک مقدم پر صرف تین ہی لگائے گئے ہیں، ان کا ڈھیر نہیں لگایا گیا۔ مکالمات میں میں نے این ڈونکین کا تتبع کیا ہے۔ نقطے اس امر کی علامت ہیں کہ متکلم بات کہتے کہتے رک گیا ہے اور جہاں کوئی دوسرا شخص قطع کلائی کرتا ہے، وہاں (لیکر) ڈیش استعمال کی گئی ہے۔

ترجمہ فی نسبہ اصل کی محض نقالی یا مھونڈاچہ ہوتا ہے، لاکھ کوشش کے باوجود مولوی مدنی کی بات پیدا نہیں ہوتی۔ لفظ اپنے مخصوص، جس کی پیداوار ہوتا ہے اور اس کے اپنے تلذذات (connotations) ہوتے ہیں۔ (کپ 'سٹے کی لائٹ' اور 'ٹیار' کا کیا ترجمہ کریں گے؟) پھر زبان و بیان کی اپنی ہفتائیں اور باریکیاں (nuances) اپنی جگہ۔ "جان دی، دی ہوئی اسی کی تھی، حق تو یوں ہے کہ حق ادا نہ ہوا" کا آپ ترجمہ تو کر لیں گے لیکن اصل کا مزہ کہاں سے مانیں گے۔ ٹھیک ترجمے در ترجمے میں تو بات اور بھی بگڑ جاتی ہے۔ اصل کا کچھ پتا نہیں ہوتا۔ بس اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مارنا پڑتی ہیں۔ روی زبان کی اپنی انفرادیت ہے۔ یہ کئی لحاظ سے انگریزی سے خاصی مختلف اور اردو سے متی جلتی ہے۔ انگریزی کے برعکس اس میں "ریٹیکل the, an, a" نہیں ہوتے۔ چنانچہ روکی لفظ dom کا مطلب موقع محل کی مناسبت سے house (مکان)، a house یا the house ہو سکتا ہے۔ دوسرے روی is, am, are جیسے الفاظ حذف کر دیتے ہیں۔ جب وہ یہ کہنا چاہیں گے کہ "اسٹن ڈاکٹر ہے"، وہ صرف یہ کہیں گے۔ Ahto — doktor (روکی زبان میں h کا تلفظ ہوتا ہے۔)

بقیہ کچھ سنے سے
But there is plenty of evidence that the young, who matter most are
certainly not content to sit back and listen all the time.
But there is plenty of evidence that the young, who matter most, are
certainly not content to sit back and listen all the time.
پہلے جیسے میں نوجوانوں سے مراد ان نوجوان ہیں اور انھیں معاشرے کا اہم ترین طبقہ گردانا گیا ہے لیکن دوسرے جملے میں نوجوانوں
سے مراد وہ چند گئے چنے نوجوان ہیں جن کی اپنی کوئی حیثیت ہے۔
مجھے اس سے بجز لفظ نہیں ملتا۔

تیسرے روی میں سوالیہ یا اندیشہ جملے نہیں ہوتے، صرف لہجے یا مفہوم سے پتا چلتا ہے کہ سوال پوچھا جا رہا ہے یا محض سیدھی سادی بات کہی جا رہی ہے۔ ہمارے ہاں بھی بعض اوقات یہی انداز اختیار کیا جاتا ہے۔ مثلاً ”آپ آگئے؟“ میں نے ”جنگ اور امن“ کے پانچوں، مگر بڑی تراجم دیکھے ہیں اور اس قسم کے جملوں میں ان میں اکثر اختلاف پایا جاتا ہے، کوئی انھیں سوا یہ، کوئی مذاہنیہ اور کوئی بیونیہ جنادیتا ہے۔ اس کے علاوہ روی کا انگریزی کے وسیلے سے ترجمہ کرتے وقت ایک اور دقت پیش آتی ہے۔ طاسطائی کے واجب الاحرام مفسر، لٹویا نژاد برطانوی فلسفی و رموز سر آئی زائیا برلن (Berlin) نے تو رکٹیف کے ڈرامے ”A Month in the Country“ کا ترجمہ کرتے وقت اس طرف اشارہ کیا ہے یعنی اردو کی طرح روی میں بھی اپنے سے بڑے کی تعظیم کے لیے جمع کا صیغہ استعمال ہوتا ہے۔ تو رکٹیف کے مذکورہ بالا ڈرامے میں نوکر اپنے آقا کے بارے میں کہتا ہے: ”وہ کمرے میں ہیں۔“ اگر اس کا انگریزی میں ترجمہ ”They are in their room“ کیا جائے تو مضحکہ خیز معلوم ہوگا۔ اس لیے جب انگریزی تراجموں کو بنیاد بنا کر کسی روی ناول یا کہانی کو اردو کا قالب پہنایا جائے تو قطعاً معلوم نہیں ہوتا کہ کہاں تعظیم کے لیے جمع کا صیغہ استعمال ہوگا، صرف تنگا چلانا پڑتا ہے۔

پھر انگریزی مترجمین اتنے بھی مترو عن الخلف نہیں جتنا کہ شاید ہم انھیں سمجھتے ہیں۔ ”جنگ اور امن“ میں بعض ایسے مقامات بھی آئے ہیں جہاں وہ بھی صحیح مفہوم خذ کرنے سے قاصر رہے ہیں اور انھوں نے ژولیرہ، اور بعض اوقات بے معنی فقرہوں میں بات ابھانے کی کوشش کی ہے۔ بعض مقامات پر میں اور محمد سلیم الرحمن گھنٹوں سر جوڑ کر بیٹھے رہے لیکن دونوں کو سر مل نہ پیر۔

اپنی طرف سے میں نے پوری ایمانداری سے کوشش کی ہے کہ طاسطائی نے جو کچھ (مستند روی ایڈیشن مطبوعہ 1962-1963ء کی ایڈیٹر کے مطابق) خود تحریر کیا تھا، اسے بحیثیت قارئین تک پہنچا دوں۔ اپنی جانب سے میں نے کوئی تحریف نہیں کی (صرف بعض مقامات پر جہاں مناسب الفاظ نہیں ملے، تشریحی جملوں میں ترجمہ کر دیا)، نہ کوئی چیز ایراد کی ہے اور نہ عہد کوئی جملہ یا عبارت چھوڑی ہے، میں اس کا اطلاع کر سکا ہوں یا نہیں، یہ الگ بات ہے۔ مجھے اپنی کوتاہیوں کا احساس ہے اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ میرا ترجمہ کوئی مثالی ترجمہ نہیں۔ قارئین غلطیاں تلاش کرنا چاہیں، ایک نہیں، شاید کئی مل جائیں۔ غالباً یہ زبان و بیان کی خامیوں سے بھی ہرانا نہیں۔ یہ ترجمہ مجھ سے کسی زیادہ باصلاحیت شخص کو کرنا چاہیے تھا۔ میں نے اس ادکھلی میں سراں لیے دے دیا کیونکہ سوا سو سال گزرنے کے باوجود اردو اس عظیم فن پارے سے محروم تھی۔ انگریزی کا محاورہ Fools rush in where angels fear to tread شاید میرے ہی جیسے لوگوں کے لیے وضع کیا گیا تھا۔

ترجمے کے دوران میں اگرچہ میں اپنے بے شمار دوستوں سے صلاح مشورہ کرتا رہا اور اکثر اوقات انھیں تنگ بھی کرتا رہا (میں ان سب کا ممنون ہوں) لیکن جس شخص نے بیستانی پر شکن لائے بغیر قدم قدم پر میری رہنمائی کی بلکہ بعض پورے پورے جملوں کا ترجمہ خود کیا، وہ محمد سلیم الرحمن ہیں (وہیے انھوں نے یہ ترجمہ پڑھا نہیں۔ اس لیے اس

کے صحیح یا غلط ہونے کی ذمہ داری ان پر قطعاً عائد نہیں ہوتی) میرے پاس الفاظ نہیں جن سے میں ان کا شکریہ ادا کر سکوں۔ میں ڈاکٹر سہیل احمد خاں کا بھی ممنون ہوں کہ انھوں نے اس ترجمے کے لیے عالمانہ اور بصیرت افروز ذہنی چہرے ہی تحریر نہیں کیا بلکہ ترجمہ (جستہ جستہ) پڑھا اور اپنے قیمتی مشوروں سے نوازا۔ اس ترجمے کی تکمیل کا سہرا بھی اگر کسی کے سر بندھتا ہے تو انھیں کے۔ ایک موقع ایسا بھی آیا تھا کہ مجھے یہ کام اپنی بساط سے بڑھ کر معلوم ہوا اور میں تقریباً اختتام پر پہنچ کر اس سے ہاتھ اٹھا لینا چاہتا تھا۔ یہ صرف سہیل احمد خاں ہی تھے جن کی متواتر حوصلہ افزائی (اور بعض اوقات ڈانٹ ڈپٹ بھی) نے مجھے اس میں مصروف رکھا اور یوں میں اسے برا بھلا مکمل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔

طاسطائی (اس کے اپنے نام کا روسی تلفظ طلستہ ہے) نے اپنے اس ناول میں تقریباً ساڑھے تین سو روسی، ایک سو فرانسیسی، ستر جرمن، دو متعدد دیگر یورپی اقوام کے کردار شامل کیے ہیں۔ ان سب کی حتی الامکان صحت کے ساتھ اردو میں منتقلی (transliteration) خاصاً نیڑھا کام تھا۔ اگرچہ میں سے ان ناموں کی مردود صورتوں کو، جو کسی نہ کسی وجہ سے ہمارے ہاں مقبول ہو گئی ہیں، نہیں چھیڑا اور انھیں جوں کا توں رہنے دیا ہے مثلاً میں نے پیرس کو پانچی، ماسکو کو مسکو، اور نیولین کو نا پولیون نہیں بنایا۔ حالانکہ روسی ملائم زبان ہے اور اس میں ٹ، ورڈ نہیں ہوتے، میں نے پیٹر اعظم کو پیوٹر اعظم نہیں لکھا، صرف پیٹر اعظم اور پیٹر زبرگ کو پیوٹر برگ نہیں بلکہ پیٹر زبرگ ہی رہنے دیا ہے۔) جہاں تک باقی ناموں کا تعلق ہے، میں نے ان کے صحیح تلفظ تحریر کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس سلسلے میں مجھے جن دوستوں اور کرم فرماؤں کا تعاون حاصل رہا، ان میں خالد احمد مدیر "فرنٹئیر پوسٹ" لاہور (روسی)، محمد اکرام چغتائی اردو سائنس بورڈ (جرمن) اور خالد مسعود مدنی پروفیسر آف انگلش، گورنمنٹ کالج لاہور (فرانسیسی) خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان سب کا شکریہ مجھ پر واجب ہے۔ تاہم اگر میں نے کوئی نام غلط لکھا ہے، تو اس کا الزام مجھ پر آئے گا، ہو سکتا ہے میں غلط سمجھ ہوں۔

ناول میں حواشی درنا اور دیگر تصریحات لکھنا عجیب سا معلوم ہوتا ہے۔ میں نے یہ اس لیے تحریر کیے ہیں تاکہ عام قاری کو کچھ آسانی رہے۔ روسی تاریخ کا مختصر جائزہ اس لیے پیش کیا گیا ہے کیونکہ "جنگ اور امن" اس میں پوری طرح گندھا ہوا ہے اور اس کے بغیر اس کی تفہیم مشکل ہے۔

لاہور

شاہد حمید

3 اپریل 1992

زمانی و مکانی پس منظر

روسی تاریخ

نوٹ اس تحریر میں تاریخیں موجودہ یعنی گریگورین کیلنڈر کے مطابق دی گئی ہیں۔ طالع طائی کے ناول میں یہ تاریخیں پرانے یعنی جولین کیلنڈر کے مطابق ہیں۔ دونوں میں 13 ماہوں کا فرق ہے۔ موجودہ کیلنڈر کی رو سے یارو دینو کی لڑائی سات ستمبر 1812 کو جب کہ روسی حساب سے 28 اگست 1812 کو ہوئی تھی۔

25 دسمبر 1991 کو سوویت یونین کا شیرازہ بکھرنے سے پہلے روس کا کل رقبہ دنیا کے چھٹے حصے پر محیط تھا لیکن دسویں صدی سے قبل اس نام کا کوئی ملک روئے زمین پر موجود نہیں تھا۔ تقریباً ایک ہزار سال قبل سیکنڈے نیویا (سوڈن، ناروے، ڈنمارک وغیرہ) کے باشندوں کا، جنھیں عام طور پر وائی کنگ (Vikings) کہا جاتا ہے، خروج شروع ہوا۔ کچھ لوگ برطانوی جزائر اور مغربی یورپ کے دیگر ممالک کی طرف چلے گئے اور کچھ نے مشرق کا رخ کیا اور اس علاقے میں، جسے بعد میں روس کا نام دیا گیا، آباد ہو گئے۔ ان لوگوں کو تدریم روسی تذکروں میں Varangians یا Rus (اسی لیے اس ملک کا نام Russia یا روس پڑا) کہا گیا ہے۔ نوواردوں میں ایک شہزادہ، جس کا نام رورک (Rurik) تھا، شامل تھا۔ (عالمطائی کا نانا پرنس نکودائی سرچی اورچو دکنسکی — ناول میں پرنس نکولائی آندر یوچ بکنسکی — اپنا سلسلہ نسب اسی شہزادے رورک سے جوڑتا تھا اور اپنے آپ کو رورک سے بہتر سمجھتا تھا کہ اس کا تعلق رومانوف خاندان سے تھا۔) شہزادہ رورک نے مقامی سلاوا باشندوں کی امداد سے یوکرین کے موجودہ ورائل حکومت کیف کے ارد گرد اپنی ریاست قائم کی اور یہی ریاست پھیلتے پھیلتے عظیم سلطنت کا روپ دھار گئی۔ روسی مورخین کے مطابق نئی راست کا قیام 862 میں عمل میں آیا تھا۔ بعد ازاں شہزادہ رورک کو روس کے شاہی خاندان کا بانی قرار دیا گیا۔

صدیوں تک روس مختلف چھوٹی چھوٹی ریاستوں پر مشتمل ڈھیلی ڈھالی فیڈریشن میں منسلک رہا۔ ان ریاستوں کے بادشاہ اور شہزادے آپس میں بھی الجھتے رہے اور مل جل کر بیرونی حملہ آوروں کے خلاف اپنا دفاع بھی کرتے

رہے۔ جب تیرھویں صدی میں منگولوں، بالخصوص ان کے تاتاری قبیلے نے چنگیز خاں اور بعد ازاں ہلاکو خاں کی سربراہی میں شمالی چین، وسط ایشیا اور خلافت عباسیہ میں بارہا شروع کی، تو ان کی ایک شاخ جنوبی روس بھی پہنچ گئی اور اس نے 1223 میں روسیوں کو عبرت ناک شکست دی۔ تاہم تاتاری واپس لوٹ گئے۔ 1237 میں وہ دوبارہ حملہ آور ہوئے۔ اب کے انھوں نے نہ صرف روسیوں کو ناکوں چنے چبوائے بلکہ 1237 اور 1241 کے درمیان میں جرمنی، پولینڈ اور ہنگری کی افواج کو بھی تہس نہس کر دیا۔ لیکن قبلائی خاں (دالی چین) کی وفات (1294) کے بعد وہ متحد نہ رہ سکے اور زیادہ تر کاکیشیا (قفقاز) اور گردونواح کے علاقوں میں آباد ہو گئے۔ تاہم انھوں نے روسیوں کو رہائے رکھا وہ دوسریوں تک ان سے خراج وصول کرتے رہے اور روس کی مختلف ریاستوں کو ایک دوسرے کے خلاف لڑاتے رہے۔

دوبارہ شریاست، سکونے، جس نے اپنی مرکزی حیثیت کی وجہ سے آئندہ اہم کردار ادا کرنا تھا اور جس کا نام پہلی مرتبہ 1147 میں سننے میں آیا تھا، اپنی اہمیت جتنا شروع کر دی تھی۔ یہاں کے حکمران ایوان (اول) کالیتا (جس کی ایک پاکسہ زور) (1328-1340) نے تاتاریوں سے وعدہ لیا کہ وہ روس کے اندرونی معاملات میں مداخلت نہیں کریں گے اور اس کے عوض اس نے دوسری روسی ریاستوں کے حکمرانوں سے خراج وصول کرنے کا فیصلہ اپنے دے لے لیا، تاہم اس کے پوتے دمتری کی تاتاریوں سے ان میں ہو گئی اور اس نے 8 ستمبر 1380 کو تاتاریوں کو زبردست شکست دی۔ تاتاری پٹ تو گئے لیکن وہ روس پر برابر حملے کرتے رہے اور کئی بار ماسکو کے دروازوں تک پہنچ گئے۔ تاہم ان کے وقار کو سخت دھچکا لگ چکا تھا اور ان کے ناقابل مفتوح ہونے کی شہرت داغ دار ہو چکی تھی۔

ادھر دوسری ریاستوں کے مقابلے میں ریاست ماسکو کے وقار اور اہمیت میں اضافہ ہوتا رہا۔ یہاں کے حکمران ایوان سوم (یا ایوان عظیم) (1462-1505) نے بتدریج دوسری روسی ریاستوں کو اپنا مطیع بنانا اور انھیں ہڑپ کرنا شروع کر دیا اور 1478 میں اس نے کیف کی آزادی بھی ختم کر دی۔ تاتاریوں کا خطرہ بھی ٹل چکا تھا۔ لاتعداد تاتاری روس میں آباد ہو چکے اور مقامی سلاو باشندوں کے ساتھ باہمی شادیاں کر کے ان میں گھل مل چکے تھے۔ یوں آہستہ آہستہ روسی سلطنت وجود میں آنے لگی لیکن صحیح معنوں میں اسے پہلی بار عروج ایوان سوم کے پوتے ایوان چہارم کے عہد میں حاصل ہوا۔ یہ پہلا روسی حکمران تھا جس نے اپنے لیے تیسرا (زار) کا لقب استعمال کیا۔ اس زمانے کے، اشراف کی بیشتر تعداد اس کے خلاف تھی۔ مختلف حکمرانوں کو تاتاریوں کے خلاف اپنی جدوجہد میں افراد اور وسائل کی ضرورت پڑتی تھی۔ وہ ہندوستان کے مغلوں کی طرح بڑے بڑے قطععات اراضی مختلف اشخاص کو بخش دیتے تھے اور اس کے معاوضے میں اپنی سپاہ کے لیے نفری ہتھیار اور دوسری ضروریات حاصل کرتے تھے۔ ان مالکان اراضی کو بویار یا روسی اشراف کہا جاتا تھا۔ یہ لوگ دھیرے دھیرے اپنی قوت پکڑ گئے کہ

ن کے کس فوں کی حیثیت محض غلاموں کی رہ گئی اور خود ار کے لیے بھی خطرے کا باعث بنے گئے۔ ایوان چہارم سے اس کی فکر ہوئی اور انھوں نے پرنس کرنسکی کی قیادت میں علم بغاوت بلند کر دیا۔ ایوان چہارم کچی گویاں نہیں کھیل تھا۔ وہ مخالفین سے پناہ جانتا تھا۔ اس نے نہ صرف باغیوں کو شکست دی بلکہ جن جن کرائس مسوت کے گھاٹ اتار دیا۔ اسی سبب اسے تاریخ میں خوف ناک ایوان (Ivan the terrible) کہا جاتا ہے۔ ایوان چہارم روس کا بلا شرکت غیرے حکمران بن گیا لیکن کسانوں کی حالت میں کوئی تبدیلی نہ آئی، وہ بدستور غلام کے غلام رہے۔

ایوان چہارم نے راستہ دکھا دیا تھا۔ مگر چاس کے بعد متعدد ضعیف ارادہ اور عقل سے کورے در بھی تخت نشین ہوئے لیکن اس کی مطلق العنانی اور مستبدانہ اختیارات میں کبھی کمی واقع نہ ہوئی۔ تاہم ایوان چہارم کے بعد جس زور نے سب سے زیادہ شہرت حاصل کی وہ پیٹر (پیٹر) اعظم تھا لیکن اس کی تخت نشینی سے پہلے روسی تاریخ کا ایک اہم واقعہ رونما ہو چکا تھا۔ 1584 میں ایوان چہارم کی موت کے بعد اس کا بیٹا فیودر اول تخت نشین ہوا۔ یہ انتہائی نادان اور کمزور حکمران تھا۔ اصل اختیارات ایک بار پھر بویاروں، بالخصوص ایوان چہارم کی چٹلی بیوی اناسٹاشیا کے بھائی نکیتارومانوف کے ہاتھ آ گئے۔ فیودر اول یوں توں کر کے اپنا وقت گزار گیا۔ وہ راولد تھا اور 1605 تک اس کا بھائی بورس تخت نشین رہا۔ اس کے انتقال پر حکومت اس کے بیٹے فیودر دوم کو ملی ضرور لیکن بویاروں نے اسے تخت نشینی کے پہلے ہی سب معزول کیا اور بعد میں قتل کر دیا۔ اس پر بویاروں اور نچلے طبقے کے، جس کی رہنمائی قازق کر رہے تھے، مین شین گئی اور تخت کے مختلف جھوٹے سچے دعوے دہر بر سر اقتدار آتے اور معزول قتل ہوتے رہے۔ 1613 میں ایوان چہارم کے برادر نسبتی نکیتارومانوف کے پوتے میخائیل نے یلیشیا اسٹھی کی، مخالفوں کو شکست دی اور گیارہ جوانی کو خود روس کا زار بن گیا۔ اب تک روس پر پرنس رورک کا خاندان حکمرانی کرتا چلا آیا تھا، میخائیل کے تخت نشین ہونے پر حکومت کی باگ ڈور رومانوفوں کے ہاتھ آ گئی اور 1917 کے انقلاب تک وہی روس کے سیاہ و سپید کے مالک بنے رہے۔

1645 میں میخائیل کی وفات کے بعد اس کا بیٹا الیکسی اول تخت نشین ہوا۔ اس کے عہد حکومت میں قوی اسمبلی نے نیا آئین، جس کی رو سے کسانوں کی غلامی کو قانونی حیثیت حاصل ہو گئی (اور جو 1823 تک نافذ العمل رہا) منظور کیا۔ اسی دور میں پولینڈ سے جنگ ہوئی اور یوکرین دوبارہ روس میں شامل کر لیا گیا۔ لیکن روس کو اصل عروج الیکسی اول کے بیٹے پیٹر اول (پیٹر اعظم) کے عہد حکومت (1689 تا 1725) میں حاصل ہوا۔ اب تک روس تعلیم و تمدن کے اعتبار سے پسماندہ ملک تھا۔ پیٹر اعظم پہلے روسی حکمران تھا جس نے (گمنای کے پردے میں) غیر ملکی (فرانس، انگلستان، اور ہالینڈ) کا دورہ کیا اور اپنے ملک کو "مغربی" بنانے کا عزم لے کر واپس آیا۔ اس نے آتے ہی بویاروں کی اسمبلی ختم کر دی اور اس کی جگہ نوامکان پر مشتمل سینیٹ قائم کی۔ انتظامیہ کی از سر نو تنظیم کی اور اسے کالجوں (colleges) کا نام دیا، اشراف کے لیے ملک کی خدمات سرانجام دینا لازمی قرار دیا اور اس مقصد

کے لیے مناسب کا سلسلہ دار نظام (hierarchy) قائم کیا۔ کلیسائی نظام میں بطریق (patriarch) کا عہدہ اڑایا اور اس کی جگہ اساقفہ (bishops) پر مشتمل مقدس سبود (Synod) یا مجلس قائم کی اور غیر مذہبی شخصیت (layman) کو اس کا سربراہ (procutor) مقرر کیا۔ اس نے تجارت، صنعت اور تعلیم کو بھی فروغ دیا۔ (کینڈی آف سائنس نے اس کے انتقال کے ایک سال بعد کام شروع کیا۔) پیٹر اعظم نے اپنی سلطنت کو بھی وسعت دی۔ اگرچہ مغرب میں ترکوں کے خلاف لڑائیوں میں اسے خاص کامیابی نہ ہوئی لیکن جنوب میں سویڈن سے معاہدے کے بعد اسے بحیرہ بالٹک کی بعض ریاستوں (بشمول استونیا) اور جزیروں پر قبضہ مل گیا اور یوں اسے سمندر کے راستے مغربی یورپ تک رسائی حاصل ہو گئی۔ کہا جاتا ہے کہ پیٹر اعظم نے بحر ہند کے گرم پانیوں تک پہنچنے کا خواب بھی دیکھا تھا لیکن اس کا یہ خواب شرمندہ تکمیل نہ ہو سکا اور سوویت یونین کے جسے غرے ہونے کے بعد اس کے حقیقت کا روپ دھارنے کے امکانات شاید بالکل ہی معدوم ہو گئے ہیں۔ پیٹر اعظم نے خلیج فن لینڈ کے کنارے نیا شہر بھی آباد کیا۔ اس کا نام سینٹ پیٹرز برگ رکھا اور اسے ملک کا صدر مقام قرار دیا۔

پیٹر اعظم کے بعد مختلف حکمران آئے اور گئے لیکن اس کی بیٹی سادانا کا دور حکومت (1741 تا 1762)، جسے اشراف کے ”عہد زریں“ کے نام سے جانا جاتا ہے، اس لیے یادگار ہے کہ اشراف نے اپنے آپ کو مملکت کی لازمی خدمات سرانجام دینے کے بوجھ سے آزاد اور اپنے حقوق و مراعات میں بے پناہ ضائع کرالیا۔ روس کی پہلی یونیورسٹی اسی زمانے میں (1755) میں ماسکو میں قائم ہوئی درجہ پیدروسی ادب کے بانی بارتولومیو رے سٹری (Restreli) کی اصل کاوشیں منظر عام پر آئیں۔

روسی بہت عرصہ پہلے ہی مشرق کی طرف بڑھنے لگے اور سرے سے سائبیریا پر قبضہ کر چکے تھے، تاہم پیٹر اعظم کے بعد روس کی عظیم ترین حکمران کیتریں اعظم (1762 تا 1796) تھیں۔ کیتریں جرمن شہزادی تھیں اور اس کا اصل نام سوفیا تھا۔ اس نے پیٹر اعظم کے نواسے پیٹر سوم سے، جو اپنی خالہ سوتلا کے انتقال پر 1762 میں تخت نشین ہوا، شادی کی تھی۔ پیٹر سوم کی اپنی کوئی شخصیت نہیں تھی۔ اس کی بیوی نے سے اسی سہا آرنوف برادران کی مدد سے ہلاک کرادیا اور کیتریں دم کے نام سے خود تخت سنبھال لیا۔ اس کے عہد حکومت میں مملکت کی سرحدوں میں بے حد توسیع ہوئی۔ کہا جاتا ہے کہ سوویت یونین کا شیرازہ بکھرنے سے پہلے روس کی جو سرحدیں تھیں، وہ کم و بیش اسی کی قائم کردہ تھیں۔ اس نے سویڈن سے آدھا پولینڈ جیٹنا، ترکوں سے کریمیا، تھیبایا اور متعدد دوسرے علاقوں پر قبضہ کیا۔ کیتریں ایک طرف لڑائی ہی منظر و التیر سے متاثر تھیں اور اس نے ”قذافی“ آمرانہ نظام قائم کرنے کی کوشش کی اور

• سینٹ پیٹرز برگ 1917ء تک روس کا دارالسلطنت رہا۔ ”برگ“ جرمن لفظ ہے۔ پہلی جنگ عظیم میں جب روسی جرمنی کے خلاف برسرِ کار ہوئے، انھوں نے اس کا نام پیٹر گراٹ (پترو گراڈ = پیٹر کا شہر) رکھ دیا۔ کیتریں کے برسرِ اقتدار آنے کے بعد اسے لینن گراڈ میں بدل دیا گیا۔ کیورم کے زوال کے بعد اس کا سابقہ نام سینٹ پیٹرز برگ دوبارہ بحال کر دیا گیا ہے۔ ”جنگ اور امن“ میں دالستانی سینٹ کا لفظ کہیں استعمال نہیں کرتا صرف پیٹرز برگ لکھتا ہے۔

دوسری طرف اشراف کو، جن کی وہ حکومت پر قبضہ کرنے کے لیے مرہون منت تھی، خوش کرنے کے لیے یوکرین کے کسانوں کے، جو اب تک نسبتاً آزاد تھے، گلوں میں غلامی (serfdom) کا پٹا ڈال دیا۔ طاسطائی کا نانا پرنس نکول کی دکنوٹسکی درہمیز (’جنگ اور امن‘ کا ہیرو) کا باپ کاؤنٹ پزوفوف اس کی حکومت کے اہم ستون تھے۔

الیکساندر اول

کیٹرین اعظم کا پوتا الیکساندر اول (1801 تا 1825) اپنے باپ پاول اول کی موت پر تخت نشین ہوا۔ طاسطائی کے ناول ’جنگ اور امن‘ کا تعلق اسی کے عہد حکومت سے ہے۔ الیکساندر اول نے اپنی حکمرانی کا آغاز قیدیوں اور جلاوطنوں کو، مہمانی دے کر کیا۔ اس نے ایڈام سانی کی ممانعت کی، غیر ملکی مطبوعات پر سے پابندیاں اٹھائیں اور اپنے معتد درباریوں تک رتورسکی، کوچوبی، تار دست سیف اور پیوتر گنٹاف کی مدد سے اصلاحات اور نئے آئین کا خاکہ تیار کیا۔ نیا آئین تو نافذ نہ ہو سکا لیکن انتظامیہ میں پر، نے ”کالجوں“ کی جگہ جدید وزارتیں ضرور قائم ہو گئیں۔ سب سے بڑی بات اس نے یہی کہ اس نے ان جاگیرداروں کو، جو اپنے زرعی غلاموں کے حالات میں تہذیبیاء رہنا چاہتے تھے، ایسا کرنے کی اجازت دے دی (پرنس آندرے اور پیٹر دونوں نے اس رعایت سے فائدہ اٹھا کر اپنے غلاموں کو آزادی دینے کی کوشش کی۔ پرنس آندرے تو کامیاب رہا لیکن پیٹر کے عزائم اس کے سٹیوارڈ نے ناکام بنا دیے) اور اس کا یہ اقدام بالآخر غلامی کی تہذیب پر منتج ہوا۔

لیکن الیکساندر مختلف جنگوں میں الجھ گیا۔ پہلے اس نے جارجیا پر قبضہ کیا۔ اس پر اس کی ایرانیوں سے جنگ ہوئی۔ ایرانیوں نے زک اٹھائی اور انھیں راجستان اور شہر خروں کے حوالے کرنا پڑے۔ اسی زمانے میں روسیوں نے الاسکا (جس پر وہ اٹھارہویں صدی میں قبضہ کر چکے تھے) میں قلعے تعمیر کیے اور شمالی کیلیفورنیا کو بھی اپنے حملوں کا نشانہ بنایا۔ مگر اس کے عہد کا سب سے بڑا واقعہ روس اور فرانس کی جنگ ہے (اور یہی جنگ ’جنگ اور امن‘ کا موضوع ہے)۔

فرانسیسیوں اور روسیوں کی چیقلش کا پہلا دور 1805 سے 1807 تک کے سالوں پر محیط ہے۔ روسیوں اور اس کے اتحادیوں کو پے درپے شکستوں کا سامنا کرنا پڑا اور ان کے نتیجے کے طور پر ”معاہدہ ٹلٹ“ وجود میں آیا اور الیکساندر وینو لین دوست بن گئے۔

1806 سے 1812 تک روسی ترکوں کے خلاف برسر پیکار رہے۔ 1812 میں دونوں کے مابین بھاری معاہدہ صلح طے پایا۔ ترکوں نے دریائے ڈینیوب کے ارد گرد بہت سے علاقے روسیوں کے حوالے کر دیے۔ 1808 اور 1809 میں روس سوئیڈن سے بھی نیچہ آزمائی کرنا رہا اور سوئیڈن سے فن لینڈ چھیننے میں کامیاب ہو گیا۔

ان جنگوں سے فراغت پانے کے بعد الیکساندر نے میخائیل سپے رانسکی کو اپنا مشیر اعلیٰ مقرر کیا اور اصلاحات کے مسودے پر از سر نو کام شروع ہوا۔ نئے قوانین مرتب کرنے کے لیے کونسل آف سٹیٹ قائم ہوئی (طاسطائی نے

نادر میں نے قوانین کا مسودہ تیار کرنے کا کام پرنس آندرے بکنو سکی کے سپرد کیا ہے، وزیرانہوں کی تنظیم نو کی گئی اور اویس بار باقاعدہ بجٹ پاس ہو۔ پرنس بکنو سکی نے نئے آئین کا خاکہ بھی پیش کیا لیکن قدامت پسندوں کی مخالفت اور نادر سے اختلافات کے باعث اسے مستعفی ہونا پڑا اور 1812 میں اسے (عارضی طور پر) شہر بدر کر دیا گیا۔

ایکسا ندر کے عہد کے بارے میں اور جو کچھ تحریر کیا گیا ہے، ”جنگ اور امن“ میں اس کا تفصیلی ذکر موجود ہے لیکن اس نادر میں جس تاریخ ساز واقعے کی گہری چھاپ لگی ہے، وہ نیپولین کا روس پر حملہ ہے۔

نیپولین

نیپولین 1769 میں کارمیکا میں پیدا ہوا۔ وہ بچپن میں ہی فوجی انسر بننے کے خواب دیکھتا تھا، چنانچہ وہ عمر دس سال مٹری سکول میں داخل ہو گیا اور تعلیم مکمل کرنے کے بعد فوج میں بھرتی ہو گیا۔ چونکہ اس کا قد چھوٹا تھا، اس کے ہم دروسوں نے اسے ”لٹل کارپورل“ پکارنا شروع کر دیا اور یہ خطاب تاحیات اس کے ساتھ چپکا رہا۔ 1789 میں فرانس میں انقلاب برپا ہوا۔ نیپولین نے بھی اس میں حصہ لیا اور کارمیکا میں جمہوری تحریک کی بڑھ چڑھ کر مدد کرتا رہا۔ 1793 میں اسے کیپٹن بنا دیا گیا۔ اس نے اسی سال انگریزوں کو بحیرہ روم کے ساحل پر فرانسیسی بندرگاہ تولون سے نکلنے پر مجبور کر دیا اور اسے مختصر عرصے میں بریگیڈیئر جنرل بنا دیا گیا۔

دو سال بعد وہ دارالسلطنت پیرس واپس آیا۔ یہاں اسے ہجوم پر گولی چلوا کر حکومت کے خلاف بغاوت فرو کر دی اور پہلی بار نیپولین کا نام عوام کے کانوں تک پہنچا۔ 1798 میں اس نے مشہور فرانسیسی نواب ژوزف آرنے کی بیوہ، جوزسین سے، جس کے پہلے ہی دو بچے تھے، شادی کی، مگر شادی کے دو روز ہی بعد اسے فرانسیسی فوج کی، جو اطالیہ پر چڑھائی کر رہی تھی، کمان سنبھالنے کا حکم ملا۔ نیپولین نے بہت جلد ثابت کر دیا کہ وہ ذہین و فطین جرنیل ہے، اپنی سپاہ میں جوش و خروش پیدا کرے کی صلاحیت سے بہرہ ور ہے اور انھیں اپنے لیے اپنی جانیں قربان کرنے کے لیے آمادہ کر سکتا ہے۔ اس کے علاوہ اس نے یہ بھی ثابت کر دیا کہ وہ کامیاب سفارت کار بھی ہے۔ اس نے اپنی حکومت کے عمال کی خواہشات کے علی الرغم اپنی شرائط پر اطالیہ سے صلح کی اور اپنی حکومت کو فن کے نادر نمونے اور مال قیمت بھیج کر شغف اکر دیا۔

اس کی ان اعمالوں اور دیگر ابتدائی فتوحات کے بعد مقبوضہ علاقوں کے باشندے اس کا دایہانہ استقبال کرتے تھے، کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ وہ انھیں مستبد حکمرانوں سے نجات دلانے کا اور انھیں انقلاب فرانس کی نئی آزادیوں سے روشناس کرائے گا۔ وہ جو حکومتیں قائم کرتا تھا، وہ شروع کے سالوں میں واقعی لوگوں کے لیے بہتر ثابت ہوئیں لیکن کچھ عرصے کے بعد وہ اپنے انقلابی خیالات بھول گیا اور اب اس کی فتوحات کا مقصد مزید علاقے ہتھیانا اور اپنے آپ کو طاقتور بنانا رہ گیا تھا۔

نیپولین صرف 26 سال کی عمر میں جرنیل بن چکا تھا اور ”نیپولین کی جنگوں“ کا آغاز اس کی اوائل جبری میں ہی

شروع ہو گیا تھا۔ 1796 اور 1797 میں اس نے اطالیہ اور آسٹریا کو پے درپے شکستوں سے دوچار کیا اور تقریباً سارے اطالیہ پر قبضہ کر لیا (بعد میں اس نے اطالیہ کو چھوٹی چھوٹی بادشاہتوں اور ڈچیزوں میں تقسیم کر دیا اور اسی تقسیم کے نتیجے میں اس کی فوج کا جرنیل اور اس کا برادر نسبتی ایک وقت میں نیپلز کا نام نہاد "بادشاہ" بنا)۔ اس نے مصر فتح کرنے کی کوشش کی کیونکہ وہ اس راستے سے برصغیر پہنچنا چاہتا تھا لیکن انگریزوں نے رینگ میں بھنگ ڈال دی اور اسے مجبوراً اپنا منصوبہ ترک کرنا پڑا۔ اس کی سب سے بڑی آرزو انگلستان کو فتح کرنا تھا لیکن اس کی یہ آرزو کبھی پوری نہ ہو سکی۔

1799 میں اس نے لڑ، نیسی حکومت کا تختہ الٹ دیا اور اپنے دیگر دوستاؤں کے ساتھ مل کر اپنی حکومت تشکیل دی۔ یہ لوگ آپے آپ کو "قونصل" (Consul) کہتے تھے۔ نیوین رفتہ رفتہ اپنے اختیارات بڑھاتا رہا۔ پہلے وہ فرسٹ قونصل بنا اور پھر 1804 میں اس نے اپنے امپراطور ہونے کا اعلان کر دیا۔ پوپ بنفس نفیس اسے تاج پہنانے آیا۔ تقریب میں پوپ نے تاج اٹھایا اور اس کے سر پر رکھنا چاہا لیکن نیوین نے ہاتھ پٹھا کرتاج چکڑ لیا اور خود اپنے سر پر بجالایا۔ اس سے وہ یہ ثابت کرنا چاہتا تھا کہ گو پوپ اس کو امپراطور تسلیم کرتا ہے لیکن وہ امپراطور اپنی ہی ہمت اور کوشش سے بنا ہے۔ بعد میں اس نے اپنی بادشاہت کے بارے میں ریفرنڈم کر دیا۔ اس کے حق میں 329،72،35 اور خلاف 2569 ووٹ آئے۔

نیوین نے اپنے عہد حکومت میں تعلیمی اصلاحات نافذ کیں، ناپ تول کا عشاری نظام رائج کیا اور سب سے بڑھ کر تعزیرات کا نیا نظام، جسے "قوانین نیوین" کہا جاتا ہے، متعارف کر دیا۔

چند سال یورپ میں امن رہا لیکن 1805 میں نیوین کے سر میں ایک بار پھر فتوحات کا سودا سا گیا۔ اس نے آسٹریا پر حملہ بول دیا اور متحد کامیابیوں حاصل کیں لیکن اصل معرکہ اوسترلٹس میں ("جنگ اور امن" کی پہلی کتاب میں پوری تفصیل موجود ہے) 2 دسمبر 1805 کو پیش آیا۔ یہاں اس نے آسٹریا اور روس کی متحدہ فوج کو شکست فاش دی۔ نیوین کی یہ کامیابی اس کے عظیم ترین کارناموں میں شمار ہوتی ہے۔ شکست کے بعد روسی تو روس واپس چلے گئے اور آسٹریا نیوین کے قدموں میں بچھ گیا۔ اس لڑائی کے نتیجے میں یورپ کا نقشہ تبدیل ہوا۔ آسٹریا اور پرشیا کو بہت سے علاقوں سے محروم ہونا پڑا۔ نیوین کا بڑا بھائی جوزف برونا پارٹ نیپلز اور چھوٹا بھائی لوئی برونا پارٹ ہالینڈ کا بادشاہ مقرر ہوا۔ نیوین کے برادر نسبتی موعا کوڈلوک اور مارشل بیچ تیجے کو پرنس کا خطاب ملا۔ لیکن اسی سال نیوین کی بحریر کوڑک اٹھنا پڑی اور وہ ٹریفالگر کی لڑائی میں انگریز ایڈمرل ہو ریشو نیلسن کے ہاتھوں ہٹ گئی۔

1806 میں نیوین پرشیا کے خلاف نبرد آنا رہا۔ اس نے 14 اکتوبر کو وینا اور وینٹ کے مقامات پر پرشیا کی فوجوں کی دھنائی کر دی اور 27 اکتوبر کو برلن پر قبضہ کر لیا۔ اس نے برطانیہ کا محاصرہ کرنے کے لیے 29 اکتوبر کو برلن سے فرمان جاری کیا۔ اس فرمان کی رو سے براعظمی نظام (Continental System) وجود میں آیا اور اس نظام کے تحت اکثر یورپی ممالک نے عہد کیا کہ وہ آپس میں تو تجارت کریں گے لیکن برطانیہ اور اس کے اتحادیوں کا بائیکاٹ کریں

گئے۔ روس نے اس نظام کو ماننے سے انکار کر دیا اور بعد میں اس کا بھی انکار نپولین کے روس پر حملے کا سبب بنا۔ اس عرصے کے دوران میں فرانسیسی سپاہ مختلف مقامات پر خلافت عثمانیہ اور برطانیہ کے خلاف لڑتی بھڑکتی رہی۔ تاہم چودہ جون 1807 کو اس کا ایک بار پھر فریڈرینٹ کے مقام پر روسیوں سے تصادم ہوا۔ روسیوں کو شکست ہوئی اور ژنرال ایکسندر نپولین اور شاہ پرشیا کے ساتھ صلح کرنے پر مجبور ہو گیا۔ یہ معاہدہ ٹلٹز کے مقام پر ہوا۔ اس کی رو سے روسیوں نے نپولین کو امپراطور تسلیم کر لیا، اس کی اکثر شرائط مان لیں اور خفیہ طور پر یہ وعدہ بھی کیا کہ وہ برطانیہ کے خلاف فرانس کا ساتھ دیں گے۔

1808 کے دوران میں فرانسیسی ہسپانیہ اور پرتگال میں انگریزوں اور ان کے حلیفوں کے خلاف برسرِ پیکار رہے۔ ادھر آسٹریا میں قوم پرستی کی تحریک چل پڑی۔ نپولین کو انگریزوں کے خلاف جو مشکلات پیش آ رہی تھیں، ان سے اہالیانِ آسٹریا کے حوصلے بڑھ گئے۔ انھوں نے اس صورت حال سے فائدہ اٹھانے کا فیصلہ کر لیا اور وہ ایک لاکھ ستر ہزار کی فوج لے کر یورپ پر چڑھ دوڑے۔ نپولین بھاگا بھاگا ہسپانیہ سے یورپا پہنچا۔ اس نے 19 اور 23 اپریل کے مابین ایک سوشل اور کئی دوسرے مقامات پر آسٹریویوں کو بیٹا اور 13 مئی کو وینا پر قبضہ کر لیا۔ 21 و 22 مئی کو اسپرن اور دسسلنگ کے مقامات پر نپولین کو شکست ہوئی اور وہ پیچھے ہٹنے پر مجبور ہو گیا۔ لیکن اس نے اپنی فوجیں دوبارہ مجتمع کیں، ایک بار پھر دو یا تین ڈیویژنیں عبور کیا اور پانچ چھ جولائی کو واکراٹام کی لڑائی میں آسٹریویوں کو فیصلہ کن شکست دی۔ آسٹریویوں کو نہ صرف بہت سے علاقوں سے محروم ہونا پڑا بلکہ اپنے امپراطور فرانتس کی دختر آرج ڈچس ماری لوئیز اس کے عقد میں دینا پڑی۔ (نپولین اپنے حساب سے اپنی پہلی بیوی جوزیفین کو طلاق دے چکا تھا کیونکہ وہ ولی عہد پیدا کرنے میں ناکام رہی تھی)۔ آسٹریوی شہزادی سے اس کی شادی اپریل 1810 میں ہوئی۔

معاہدہ ٹلٹز کی رو سے ژنرال ایکسندر کو فن لینڈ پر قبضہ کرنے کا اختیار مل چکا تھا اور اس کی فوج نے 1808 میں اسے عملی شکل بھی دے دی۔ ادھر نپولین اور پوپ کے مابین اختلافات بڑھنے لگے (پوپ نے طلاق کی منظوری دینے سے انکار کر دیا تھا)۔ 17 مئی 1809 کو نپولین نے پوپ کے زیرنگیں ریاستوں کو فرانس میں شامل کر لیا۔ پوپ نے اس کے جواب میں 10 جون کو اسے رومن کیتھولک مذہب سے نکال دیا۔ نپولین نے اس کا حساب یوں چکایا کہ خود پوپ کو گرفتار کر لیا اور اسے نظر بند کر دیا۔

1812 میں خود نپولین تو روس میں الجھ گیا لیکن اس کی جو سپاہ ہسپانیہ میں انگریزوں کے خلاف برسرِ پیکار تھی، 12 اگست کو انگریز کمانڈر ڈیوک آف انگلن سے فیصلہ کن شکست کھا گئی۔

روس پر فرانسیسی حملہ

فرانس نے روس پر کیوں حملہ کیا، مغربی سوریخین نے اس کی متعدد وجوہ گنوائی ہیں۔ چند ایک درج ذیل ہیں۔
(1) نپولین اور ایکسندر دونوں یورپ کی قیادت کے دعویدار تھے۔ (2) نپولین کی آسٹریوی شہزادی سے

شرابی سے الیکساندر کے کان کھڑے ہو گئے۔ وہ سمجھنے لگا کہ فرانس اور آسٹریا اس کے خلاف متحدہ محاذ بنا رہے ہیں۔ (3) روس نے پولین کے نافذ کردہ براعظمی نظام کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ (4) پولین روس کو خلافت عثمانیہ میں اپنی سن مالی کرنے کی جارت دینے پر آمادہ نہیں تھا اور الیکساندر اس بات پر اس سے خفا تھا۔ (5) آسٹریا کے خلاف فیصلہ کن فتح حاصل کرنے کے بعد پولین نے گریٹ ڈچ آف وار میں، جو معاہدہ ٹلٹ کے تحت بحال ہوئی تھی، مغربی گلیشیا کا علاقہ شامل کر دیا۔ الیکساندر سمجھا کہ اس طرح وہ شاید پولینڈ کی مملکت اور سرلو کاظم کرنا چاہتا ہے۔ (6) پولین نے براعظمی نظام کی خلاف ورزی کرنے پر الیکساندر کے ایک قریبی قرابت دار ڈیوک آف اولڈن برگ کو گدی سے محروم کر دیا تھا اور اس کا علاقہ اپنی مملکت میں شامل کر لیا تھا۔

دونوں فریقوں نے جنگ کی تیاریاں شروع کر دیں۔ پولین نے آسٹریا (جس نے تیس ہزار) اور پرشیا (جس نے بیس ہزار افراد مہیا کرنے کا عہد کیا) سے سمجھوتہ کر لیا۔ سویڈن نے، جسے پولین نے برطانیہ کا مقاطعہ کرنے پر مجبور کر دیا تھا، اپنے نئے حکمران ہرنالڈوٹ کی قیادت میں فرانسیسی بھوکا اتار پھینکا اور اپریل 1812 میں روس کے ساتھ معاہدہ پیرز برگ طے کر لیا۔ اس کی مدد سے اسے ناروے، جو پہلے ڈنمارک کے ماتحت تھا، قبضہ کرنے کا اختیار مل گیا اور وہ شمالی جرمنی میں فرانسیسیوں کے خلاف محاذ کھولنے پر رضامند ہو گیا۔ 18 مئی کو روسیوں نے بخارست میں ترکوں سے صلح کر لی اور جون میں برطانیہ نے روس اور سویڈن کے ساتھ اپنے اختلافات طے کر لیے۔

ادھر پولین کی روس پر حملہ کرنے کی تیاریاں زور شور سے جاری تھیں۔ ابتدا میں اس کی سپاہ چار لاکھ بیس ہزار افراد پر مشتمل تھی۔ بڑھتے بڑھتے اس کی تعداد چھ لاکھ تک پہنچ گئی اور یہ غالباً اس زمانے کی سب سے بڑی فوج تھی۔ یہ صرف جزوی طور پر فرانسیسی تھی، بیشتر نفری اطالیہ، پولینڈ، سیرنٹور لینڈ، ہالینڈ، آسٹریا اور جرمنی کی متعدد ریاستوں کے بھانت بھانت کے باشندوں پر مشتمل تھی۔

جون 1812 میں پولین نے اپنی افواج کی معیت میں دریائے نیمن، جو روس اور باقی یورپ کے مابین حد فاصل قائم کرتا تھا، عبور کیا اور ولنا پر قبضہ کر لیا۔ روسی فوج کی قیادت بارکلی ڈتولی (Barclay de Tolly) کے ہاتھ میں تھی۔ روسیوں نے کہیں بھی جم کر مقابلہ نہ کیا، وہ لڑے بغیر پیچھے ہٹتے رہے تاکہ وہ سمولنسک پہنچ گئے۔ سترہ اور اٹھارہ اگست کو فرانسیسیوں نے سمولنسک کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔ بارکلی ڈتولی کو تنقید کا نشانہ بنایا گیا اور اس کی جگہ لیلڈ مارشل کوٹوزوف کو نیا کمانڈر انچیف مقرر کیا گیا۔ سات ستمبر کو دونوں افواج کے مابین دریائے مسکو کے کنارے بارودینو میں ٹھکان کارن پڑا اور ہزاروں آدمی کھیت رہے۔ روسی پسپا ہو گئے۔ انھوں نے ماسکو کے دفاع کا خیال ترک کر دیا اور مزید جنوب کی طرف چلے گئے۔

ماسکو قریب قریب خالی ہو گیا اور چودہ ستمبر کو فرانسیسیوں نے اس پر قبضہ کر لیا۔ پندرہ اور انیس ستمبر کے مابین شہر میں جگہ جگہ آگ بھڑک اٹھی۔ اگرچہ طاہطائی کو اس سے اتفاق نہیں لیکن یورپی اور روسی مورخین صراحت کرتے

ہیں کہ روسیوں نے یہ آگ بے شدہ منصوبے کے تحت لگائی تھی تاکہ ماسکو میں فرانسیسیوں کا جینہ دہا کر دیا جائے۔ نپولین نے الیسا ندر کو صلیب کی پینکشن کی لیکن زار نے نکاسا جواب دے دیا۔ نپولین بڑی مشکل میں پھنس گیا۔ وہ اپنے ٹھکانوں سے بہت دور پہنچ چکا تھا اور اس کے لیے پٹی نوج کو مطمئن کرنا ناممکن ہو گیا۔ اس نے واپسی کی ٹھانی اور وہ 19 اکتوبر کو ماسکو سے کوچ کر گیا۔ راستے میں اس کا یار دسلوٹس (24 اکتوبر) اور دیاز (3 نومبر) میں روسیوں سے تصادم ہوا۔ ادھر قازقوں اور دوسرے بے قاعدہ دستوں نے گوریلا کارروائیوں سے اس کی فوج کا ناقضہ بند کر دیا اور اس پر مستتر وہ کہ شدید جائزوں کا موسم شروع ہو گیا۔ ناکافی خوراک، موسم کی سختیاں اور گوریلا کارروائیاں سبھی فرانسیسی سپاہ کا بھر کس نکال رہی تھیں۔ رہی سہی کسر کراٹایا اور بیریزینا کی لڑکیوں نے پوری کر دی۔ نپولین بیرس بھگ گیا اور اس کی فوج کے بمشکل ایک ہکھراوا اپنی جان بچا کر واپس جاسکے۔

اس کے بعد نپولین پر کیا مٹی یاروں کی تاریخ میں کیا واقعات پیش آئے، ان کا ناول کے موضوع سے کوئی خاص تعلق نہیں۔ چند باتیں حواشی میں آئیں گی۔ البتہ ایک واقعے کا ذکر خالی زراچکی نہیں کیونکہ اس کا طالع طائی کی ذات سے گہرا تعلق ہے اور اس نے ”جنگ اور امن“ سے پہلے اس کے متعلق ناول لکھنے کا سوچا تھا۔

دسمبر کی یاد دیکاری تحریک

فرانسیسیوں کے فرار کے بعد الیسا ندر اس نے ایک بار پھر داخلی امور پر توجہ دی اور وہ کہنے کو آئینی اصلاحات کے بارے میں اپنے مشیروں کے ساتھ مشورے کرنے لگا لیکن عملاً اس کا ہر قدم رجعت پسندی کی سمت میں اٹھ رہا تھا اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ اس نے اصلاحات کے کٹر مخالف جنرل آراک چیف کو اپنا مشیر اعلیٰ مقرر کیا۔ اس کے اس اقدام کا نتیجہ یہ ہوا کہ عوام الناس، بالخصوص نوجوان فوجی افسروں میں، جو مغرب کی بہرل ازم سے آشنا ہو چکے تھے، اس کی مخالفت بڑھ گئی۔ 1817 میں نوج میں متعدد خفیہ سوسائٹیاں قائم ہو گئیں۔ ان سوسائٹیوں نے بالآخر پیٹر برگ میں شمالی سوسائٹی (یہ آئینی بادشاہت کے حق میں تھی اور زرعی غلامی کا نظام ختم کرنا چاہتی تھی، وغیرہ) اور کیف میں جنوبی سوسائٹی (یہ ملک میں جمہوری نظام قائم کرنا اور زمین کسانوں میں تقسیم کرنے کی خواہش مند تھی، وغیرہ) کا روپ دھار لیا۔

الیسا ندر مارا دلہ تھا۔ اس کے دو بھائی تھے، کونستانٹن اور نکولس۔ الیسا ندر نے 1822 میں اعلان کیا کہ اس کا جانشین گرینڈ ڈیوک نکولس ہوگا کیونکہ اس کا ایک بیٹا بھی تھا اور وہ روس کے آرتھوڈوکس مذہب کا کٹر حامی بھی تھا۔ مخالفین کونستانٹن کے حق میں تھے۔ ان کا خیال تھا کہ مغربی ممالک میں کافی عرصہ جلا وطنی کی زندگی گزارنے کے بعد اس کے خیالات لیبرل ہو چکے ہیں (غالباً یہ محض مفروضہ تھا)۔ 19 نومبر 1825 کو الیسا ندر انتقال کر گیا۔ شمالی اور جنوبی دونوں سوسائٹیوں نے کوشش کی کہ کسی طرح کونستانٹن کو زار بنوا دیا جائے۔ اس مقصد کے لیے رائے عامہ ہموار کرنے کے لیے ان کے پاس صرف ایک ماہ تھا تاہم چودہ دسمبر کو گرینڈ ڈیوک نکولس اول کے نام سے ملک کا

حکمران بن گیا۔ پیٹرز برگ میں مقیم فوج دو گروہوں میں بٹ گئی۔ تین ہزار افراد انقلاب کے حق میں اور نو ہزار نئے زار کے وفادار تھے۔ فریقین میں دن بھر رسہ کشی ہوتی رہی۔ آخر کار زار کا بیٹا نہمبرلبرین ہو گیا اور اس نے اپنے وفاداروں کو باغیوں پر گولی چلانے کا حکم دے دیا۔ باغی مقابلہ کے بغیر فرار ہو گئے اور کلوس تیس سال کے لیے روس کا انتہائی ظالم اور جاہل حکمران بن گیا۔

باغی، جنھیں دسمبری کی رعایت سے دسمبری (روسی میں دیکابری) کہا جاتا ہے، پکڑے گئے۔ چھ سو سے پوچھ گچھ ہوئی، ایک سو تیس پر مقدمہ چلا، پانچ کو سزائے موت ملی اور اکتیس کو تاحیات سائبیریا بھیج دیا گیا۔ جن لوگوں کو سائبیریا جلا وطن کیا گیا، ان میں طاسطائی کی والدہ کا قریبی عزیز میجر جنرل پرنس سرچی گرگور یوچ وکلوسکی بھی شامل تھا۔ اسے اس کی جاکیروں اور خطاب سے محروم کر دیا گیا اور پابجولاں زار کی خدمت میں پیش کیا گیا۔ زار نے اسے طرز و تشبیہ کاٹ نہ بنایا اور اسے ”بیوقوف“ کہا۔ تاہم اس کی نوجوان رفیقہ حیات اسے ”بیوقوف“ نہیں سمجھتی تھی۔ اس نے اپنا شیر خوار بچہ چھوڑا اور خود اپنے شوہر کے ساتھ سائبیریا چلی گئی۔

کلوس اس نے 1855 میں انتقال کیا اور الیکساندر دوم تخت نشین ہوا۔ اس نے تمام باغیوں کو معافی دے دی۔ پرنس وکلوسکی سائبیریا سے واپس آ گیا لیکن روس میں قیام کرنے کے بجائے اٹالیہ چلا گیا۔ طاسطائی نے اس سے دس سال ملاقات کی۔ وہ اس کے نزدیک ہیرو تھا اور وہ اس کی پرستش کرتا تھا۔ طاسطائی دسمبری تحریک سے بہت متاثر تھا اور جانتا تھا کہ اگر یہ کامیاب ہو جاتی تو روس کی تاریخ کا دھارا بدل جاتا۔ اسے ہمیشہ یہ احساس ستاتا رہا کہ وہ بعد از وقت پیدا ہوا ہے اور یوں اس تحریک میں شامل ہونے کی سعادت سے محروم رہا ہے۔ اس نے یہی اس تحریک کے متعلق ناول لکھ کر پوری کرنے کی کوشش کی۔ اصل میں وہ ”جنگ اور امن“ کی بجائے یہی ناول لکھتا چاہتا تھا لیکن جب اس نے اس تحریک کے متعلق مواد اکٹھا کرنے کا کام شروع کیا (اس نے چند ایوان لکھ بھی لیے تھے) اسے اندازہ ہو کہ جو کچھ وہ کہنا چاہتا ہے، وہ اس تحریک کے حوالے سے نہیں کہہ سکتا۔ چنانچہ اس نے مزید پیچھے پلٹ کر دیکھا۔ نیولین کاروس پر حملہ اس کے خیالوں کا مرکز بن گیا اور یوں دنیا کا عظیم ترین ناول وجود میں آیا۔

روسی مذہب

مسلمانوں کی طرح عیسائی بھی مختلف فرقوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ شرع میں کچھ فرقے، بالخصوص اسکندریہ کے پادری آریوس (Arius) (عام عیسائی اسے بدعتی کہتے ہیں) کے پیروکار، خدا کی وحدانیت اور بعض تثلیث (باپ، بیٹا اور روح القدس) میں یقین رکھتے تھے۔ 325 میں ترکی کے ایک قصبے نیقیاہ (Nicaea) میں تقریباً تین سو اساتذہ کا اجتماع ہوا اور اس میں کثرت رائے سے تثلیث کو عیسائیت کا بنیادی ستون قرار دیا گیا۔ اسے نیقیہ کی رعایت سے ”نقادہ عقیدہ“ کہا جاتا ہے۔

اس زمانے میں رومی سلطنت کا، جو یورپ کے اکثر ملک، شمالی افریقہ اور مغربی ایشیا پر مشتمل تھی، ڈنکانج رہا تھا۔ عیسائیت کو فروغ بھی اسی سلطنت میں حاصل ہوا۔ ایشیا، افریقہ اور یونان کے لوگ نسبتاً زیادہ راسخ العقیدہ تھے، چنانچہ وہ آرتھوڈوکس (Orthodox) کہلائے۔ یورپی عیسائیوں کا مسلک لاطینی کہلایا اور بعد میں یہی رومن کیتھولک مذہب بنا۔ (سولہویں صدی میں رومن کیتھولک مسلک میں دراڑیں پڑیں۔، رٹن لوٹھر کے حامیوں نے بغاوت کر دی اور وہ پروٹسٹنٹ کہلائے۔ ان پروٹسٹنٹوں کی ایک شاخ کلیہ نے انگلستان ہے۔)

رومن کیتھولک فرقے کا سربراہ پوپ کہلاتا ہے۔ وہ خود مختار بادشاہوں کی طرح روم کے ایک علاقے میں، جسے وٹیکن (Holy See) کہا جاتا ہے، رہتا ہے۔ اس کی معاونت کارڈینل (cardinal)، جو ایک طرح سے اس کے وزیر ہوتے ہیں، کرتے ہیں اور یہی پہلے پوپ کی وفات پر نئے پوپ کا انتخاب کرتے ہیں۔ علاقائی نظام چلانے کے لیے آرچ بشپ (استقف اعظم) اور بشپ مقرر کیے جاتے ہیں۔ بشپ کا علاقہ استقفیہ (diocese) کہلاتا ہے، اس کا کلیسا اپنے علاقے کا سب سے بڑا گرجا ہوتا ہے اور جس شہر میں وہ رہتا ہے، اسے See کہتے ہیں۔ بشپ کے نیچے پادری ہوتے ہیں۔ پادری کا اپنا علاقہ (parish) اور گرجا ہوتا ہے۔ اس کی معاونت ڈیکن (deacon) (مجتہم صدقات وغیرہ) اور نائب ڈیکن کرتے ہیں۔ یہ بعد میں ترقی کر کے خود پادری بن جاتے ہیں۔ دوسرے فرقوں میں پوپ اور کارڈینل نہیں ہوتے، ہوائی نظم و اس کی طرح کا ہے۔

447 میں ہسپانیہ میں ایک نئی تحریک اٹھی۔ اس نے ”نقادہی عقیدے“ میں نیا اضافہ کر دیا اور قرار دیا کہ روح القدس باپ سے ہی نہیں، بیٹے سے بھی منبثق ہے۔ اسے انبثاق روح القدس (Procession of Holy Spirit) بھی کہتے ہیں۔ رومن کیتھولک مذہب نے سرکاری طور پر اس اضافے کو گیارہویں صدی میں صحیح تسلیم کر لیا۔ آرتھوڈوکس مسلک نے اس کی مخالفت کی۔ رومی سلطنت پہلے ہی در حصوں۔ مشرقی اور مغربی۔ میں تقسیم ہو چکی تھی۔ دونوں کا مذہب بھی عیسوی علیحدہ ہو گیا۔ مشرقیوں نے پوپ کی سیادت بھی قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ انھوں نے اپنے مذہب کے چار حلقے بنائے۔ ہر حلقے کا سربراہ بطریق (patriarch) کہلایا اور بریڈنٹیم، انطاکیہ، سکندریہ اور قسطنطنیہ ان کے صدر مقام قرار پائے۔ (بعد میں روسیوں نے ماسکو میں اپنا بطریق صدر مقام بنالیا۔ پھر جارجیا، سربیا، بلغاریہ اور رومانیہ میں بھی بطریق مقرر ہوئے۔) آرتھوڈوکس مسلک کے پیروکار زیادہ تر مغربی ایشیا، یونان، روس، قبرص، البانیہ، یوگوسلاویہ، چیکو سلواکیا، سربیا، پولینڈ اور بلغاریہ میں پائے جاتے ہیں۔ رومی تاریکین وطن نے بعض دوسرے ممالک میں بھی شاخیں قائم کر لی ہیں۔

آرتھوڈوکس کلیسیائی نظام میں اصل اختیارات اس فقہ کے، جن کا غیر شادی شدہ ہونا ضروری ہوتا ہے، ہاتھ میں ہوتے ہیں۔ ان کے معاونین پادری، جو عہدے کا حلف، ٹھانے کے بعد شادی کر سکتے ہیں، ہوتے ہیں۔ ڈیکن اور نائب ڈیکن (آداب رسوم و عبادات) میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ آرتھوڈوکس کلیسیا اپنے آپ کو واحد سچا یعنی روح القدس کا ظہور صرف خدا کا نہیں بلکہ اس کے ”بیٹے“ یعنی حضرت یسعی کا بھی سربراہانت ہے۔

کلیب تصور کرتا ہے اور صرف نقادوں کی عقیدے کو مانتا ہے۔ اس کی عبادت کا طریق کار ساکرامنٹی (sacramental) ہے اور عشاء ربانی اور قدیم لٹوریا (liturgy) کے گرد گھومتا ہے۔ عشاء ربانی کی رسم بڑے رکھ رکھاؤ اور سنجیدگی سے ادا کی جاتی ہے اور حمد سائزوں کے بغیر گائی جاتی ہے۔ ایقونے کی تعظیم اس مسلک کی بہ لائق خصوصیت ہے، محسموں، مورتیوں اور دیگر مابعدی شےوں کی ممانعت ہے۔ سب سے بڑا تہوار ایسٹر ہے اور جو لین کیلنڈر کی وجہ سے اس کی تاریخیں مغربی ایسٹر سے مختلف ہیں۔

رومن میں عیسائیت قسطنطنیہ سے آئی۔ نظریاً روسی آرٹھوڈوکس اسی مسلک کے پیروکار بنے۔ سب سے پہلا روسی حکمران، جو عیسائی بنا، ولادی میر (980) تھا۔ وہ سینٹ ولادی میر کہلاتا ہے۔ اس کے بعد اس کی رعایا جوتی درجوتی عیسائیت اختیار کرنے لگی۔ روس کو قسطنطنیہ کے بطریق کے علاقے میں شامل کر لیا گیا۔

چند دہائیوں میں مشرقی اور مغربی کلیسا میں اتحاد کی بات چلی۔ روسی حکمران باسل دوم (1425 تا 1492) نے اس میں شامل ہونے سے انکار کر دیا۔ روسی کلیسا قدرے آزاد ہو گیا اور روسی مطران (metropolitan) یا اسقف اعظم، جو ایوان کا لیٹا کے عہد میں ماسکو منتقل ہو چکا تھا، آہستہ آہستہ روسی کلیسا کا سربراہ بن گیا۔ فیودر اول (1554 تا 1598) کے دور حکومت میں روسی بطریقیت (patriarchate) کا قیام عمل میں آیا اور روسی کلیسا مطلقاً آزاد ہو گیا۔ پیٹر اعظم نے مذہب پر حکومتی گرفت مضبوط کرنے کے لیے بطریقیت کا ادارہ ختم کر دیا۔ اس نے اس وقت پر مشتمل مقدس سنوڈ یا مجلس قائم کی اور اس کا سربراہ (procutor) غیر پادری مقرر کر دیا۔

خطابات

روسی سلطنت کے بعد جب یورپ مختلف ممالک میں تقسیم ہوا، مقامی بادشاہوں اور شہزادوں نے اپنے اقتدار کو مستحکم کرنے اور اسے دوام بخشنے کے لیے بڑے بڑے نطعات اراضی امر اپنے منظور نظر افراد اور اپنی جائز و ناجائز اولاد میں بانٹا اور انھیں مختلف خطابات سے نوازا شروع کر دیا۔ بتدریج یہ خطابات پانچ طبقوں بیرن، وائی کاؤنٹ، کاؤنٹ (برطانیہ ارل)، مارکوئیس اور ڈیوک کی شکل اختیار کر گئے۔ عام طور پر ایک شخص کے پاس صرف ایک خطاب ہوتا تھا۔ برطانیہ میں بعض اوقات ایک شخص ایک سے زیادہ خطابات کا مالک بھی ہوتا ہے (ڈیوک آف لینسٹر مارکوئیس آف کنڈیر، ارل آف اوفالی اور وائی کاؤنٹ آف لینسٹر بھی ہے) لیکن وہ پہچانا صرف بڑے خطاب سے ہی جاتا ہے اور ایک وقت میں اصل خطاب صرف ایک ہی شخص کے پاس ہوتا ہے اور اس شخص کو دارالامراء (ہاؤس آف لارڈز) میں بیٹھنے کی اجازت ہوتی ہے۔

جہاں تک برطانوی خطاب یافتہ اشخاص کی اولاد کا تعلق ہے، انھیں سرکاری طور پر نہ کوئی خطاب اور نہ کوئی استحقاق حاصل ہوتا ہے، البتہ وہ نگرہی (courtesy) خطابات استعمال کر سکتی ہے۔ ڈیوک کا بڑا بیٹا مارکوئیس اور مارکوئیس کا ارل (باقی بیٹے پیٹریاں لارڈ اور میڈی)، ارل کا بڑا بیٹا وائی کاؤنٹ اور وائی کاؤنٹ کا لارڈ اور باقی بیٹے

بیٹیاں اور بیرون کے سارے بیٹے بیٹیاں اپنے ناموں کے ساتھ آئرلینڈ کا دم چھل لگا سکتی ہیں۔ (انگریزی ادب کے ایک جانے پہچانے نقاد لارڈ (ڈیوڈ) سیسل اور ڈوروتھی سیرز (Sayers) کے ناولوں کے سراغ رساں ہیرو لارڈ (ہیئر) دھڑی کو اسی قسم کے خطابات حاصل تھے۔) بعض اوقات ان نگرانی خطابات کے استعمال میں بڑی الجھنیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ مثلاً ڈیوک آف بک لوخ کا بڑا بیٹا ارل، در چھوٹے بیٹے لارڈ کہلاتے ہیں جب کہ اس آف مارینڈ کیلی کا بڑا بیٹا لارڈ در چھوٹے آئرلینڈ ہیں لیکن بیٹی آئرلینڈ کی بجائے لیڈی ہے۔ ڈیوک کی بیوی ڈچس، ارل کی کاؤنٹس اور لارڈ کی لیڈی کہلاتی ہے لیکن بیوہ کے نام کے ساتھ لفظ Dowager کا اضافہ ہو جاتا ہے۔

پوتے پوتیاں کے سلسلے میں یہ نظام اور بھی پیچیدہ ہو جاتا ہے۔ 1976ء میں ڈیوک آف لینسٹر کے خود کشی کرنے سے پہلے اس کی تین بیٹیاں موجود تھیں۔ ایک تصویر میں سربراہ خاندان کو ڈیوک آف لینسٹر، بڑے بیٹے کو، ارک بیکس آف کنڈری، بڑے پوتے کو اس آف ارفاں اور بڑے پڑپوتے کو وائی کاؤنٹ آف لینسٹر لکھا گیا ہے۔ عجیب گورکھ دھندا ہے خود انگریزوں کی سمجھ میں بھی مشکل سے ہی آتا ہے۔

پھر برطانیہ میں ایک عجیب و غریب قانون، جسے Law of Primogeniture کہا جاتا ہے، مروج ہے اس کی رو سے خطاب، دوسری جائیداد کا مالک بڑا بیٹا بنتا ہے (اگر صرف بیٹیاں ہوں، تو قریب ترین عزیز اور اگر دور پار کوئی بھی سرد عزیز نہ ہو، پھر چھٹی، خطاب اور جائیداد دونوں بحق سرکار ضبط قرار پاتے ہیں) جہاں تک باقی بچوں کا تعلق ہے، باپ کی مرضی ہے انھیں کچھ نقد رقم دے دے ورنہ جوتیاں چناتے پھریں، اپنے لیے روزگار تلاش کریں (لارڈ ڈیوڈ سیسل کو تدریسی ملازمت اختیار کرنا پڑی) یا پھر شادی کے لیے کسی سوٹی اسامی کو پھنسیں (جین آسٹن کے ناول Pride & Prejudice میں ایک ارل کا بیٹا فٹز ولیم ہیروئن الزبتھ ہینٹ کو پسند کرنے کے باوجود اس سے اس لیے شادی نہیں کر سکتا کیونکہ وہ تمہوں نہیں ہے)۔

برطانیہ (اور پہلے فرانس میں بھی) میں اسرا کے خطابات کے ساتھ کوئی نہ کوئی مقام ضرور وابستہ ہوتا ہے مثلاً ڈیوک آف سرسٹ، ارل آف کرائسٹ۔ لیکن ان کی جواوا و خطابات سے محروم رہتی ہے، وہ اپنے خاندانی نام استعمال کرنے لگتی ہے۔ مثلاً ڈیوک آف ہیڈفرڈ کے بھائی بندرسل اور ما کوئیس آف سالسبری کے سیسل کہلاتے ہیں۔ اگر خطاب یافتہ شخص کا پورا نام لکھا ہو تو خاندانی نام کے ساتھ مارڈ، پھر اصل خطاب آئے گا۔ مثلاً لارڈ ماڈسٹ بیٹن، ارل آف برما۔

برطانوی خطاب یافتگان کو مخاطب کرنا یا خطوط پر ان کا پتا لکھنا بھی پیچیدہ عمل ہے۔ تمام تفصیلات کئی صفحات پر آتی ہیں، تاہم ڈیوک کو پرنس (یا غیر موجودگی میں ہیر) گریس اور باقیوں کو لارڈ کہا جاسکتا ہے۔

برطانوی خطابات کے مقابلے میں روسی خطابات کا نظام بہت سرد اور سہل تھا۔ اس کے صرف تین مدارج تھے: ہیرن، کاؤنٹ اور پرنس۔ (روس میں ڈیوک کا نعم البدل "پرنس" اور زار کی اولاد پرنس نہیں بلکہ آرج ڈیوک یا گرینڈ ڈیوک کہلاتا تھا۔) خطاب یافتہ اشخاص کی تمام اولاد اور اولاد کی اولاد پیدا ہوتے ہی بلا تخصیص خاندانی

خطاب کی مستحق ہو جاتی تھی۔ ناول میں پرنس نکولان بلکوسکی کا بیٹا اور پوتا دونوں ہی پرنس اور بیٹی پرنس کہلاتی ہے۔ خود طاسلائی بہن بھائیوں میں سب سے چھوٹا ہونے کے، وجود کا ڈنٹ تھا۔ پھر یہ خطاب خاندانی اور ذاتی دونوں ناموں سے پہلے لکھا جاسکتا ہے اور کسی مقام سے بھی اس کا کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

انگریزوں کے برعکس روسی خطاب یا فیتہ اشخاص کو مخاطب کرنا بھی مشکل کام نہیں تھا۔ سبھی کو پور (اور غیر حاضری میں ہر) ایکسی لینسی کہا جاسکتا تھا۔ صرف کو تو زوف کے لیے، جب وہ کاؤنٹ سے پرنس بنایا گیا، پور (اور غیر حاضری میں ہر) سیرین ہائی نس استعمال ہوتا تھا۔ اس کی کوئی وجہ نہیں بتائی گئی۔

روسیوں میں چائیڈ صرف بڑے بیٹے کے حصے میں نہیں آتی تھی، بلکہ یہ بد تخصیص جنس سب احواد میں تقسیم ہوتی تھی اور بعض اوقات اس شخص کا مسکن بھی چھوٹے بچوں کو مل جاتا تھا۔ ناول میں پرنس ہاریا اپنے باپ کے مسکن ”بالڈلنز“ اور حقیقی زندگی میں طاسلائی اپنی والدہ کے مسکن ”یاسٹا یا پولیاننا“ کا مالک بنتا ہے۔

برطانیہ کے ماسوائے تمام یورپ میں مرانی خطابات کا سلسلہ ختم ہو چکا ہے لیکن جن لوگوں کو ان کے استعمال کا چرکا ہے، وہ سب بھی انھیں اپنے ناموں کے ساتھ لگانا نہیں بھولتے۔ برطانیہ میں طاسلائی خاندان کا ایک تارک وطن، نکولائی طاسلائی، جو خیر سے تاریخی ناول بھی لکھتا ہے، اب بھی اپنے آپ کو کاؤنٹ نکولائی طاسلائی کہتا ہے۔ (خود ہرے ہاں انگریز کے رخصت ہوئے کے باوجود بعض لوگ اپنے ناموں کے ساتھ خطابات لکھنا فخر کی بات سمجھتے ہیں۔ مشہور ”مڈسار“ سیاست دان ”نواہزادہ“ نصر اللہ جیسی جاگتی مثال ہیں۔ ”سرکار پرست“ سسٹم لگی خطابات سے دست کش ہو چکے ہیں لیکن ”انگریز دشمن“ احراری ہونے کے باوجود نصر اللہ خاں آفرودم تک چٹے رہے۔)

ہوزار

رومی سلطنت کے عروج کے زمانے میں وسطی یورپ میں دریائے ڈینیوب کے دونوں کناروں پر اس علاقے میں جسے آج کل ہنگری کہا جاتا ہے، ایک قوم گلیار آباد تھی۔ گلیار بنیادی طور پر موسیقی پالتے تھے لیکن وہ غضب کے گھڑسوار بھی تھے۔ ایک رومی جرنیل نے ان کے متعلق لکھا ہے: ”انھیں اپنے دشمنوں پر اچانک حملے کرنے کا بہت شوق تھا۔ وہ برق رفتاری سے ادھر ادھر سے آتے، بے قاعدہ صفیں بناتے اور اپنے مخالفوں پر ٹوٹ پڑتے، انھیں بھری نقصان پہنچانے کے بعد تڑپتا ہوا جاتے اور واپس لوٹ جاتے۔“ صدیوں تک یہ لوگ رومی سلطنت کے لیے مذاپ بنے رہے۔

جب 1453 میں ترکوں نے سلطان محمد دوم کی قیادت میں قسطنطنیہ سر کر لیا، یورپی حکمرانوں میں خوف کی لہر دوڑ گئی۔ اس نئے خطرے سے بچنے کے لیے 1458 میں ہنگری کے بادشاہ متھیس کاروتیس نے حکم دیا کہ باقاعدہ فوج کی مدد کے لیے گلیاروں کا ہر گاؤں ہر میں میں سے ایک شخص لازماً بے قاعدہ سپاہ میں بھرتی کرائے۔ ہنگری زبان میں ہس کے لیے لفظ nusz استعمال ہوتا ہے، چنانچہ ”ہوزار“ (nuszár) کا مطلب ہسواں ہوا۔ انگریزی

میں یہ Hussar ہوتا اور روسی میں چونکہ h نہیں ہوتا اس لیے وہاں اس نے ”گسار“ (gusar) شکل اختیار کر لی۔
 شرقی یورپ میں ترکوں کی فتوحات کا سلسلہ جاری رہا۔ 1683 میں تین ہزار ترکوں نے دینا کا محاصرہ کر
 لیا۔ یہی عرصہ دو ماہ جاری رہا۔ پھر ایک روز بوقت طلوع آفتاب عجیب و غریب منظر دیکھنے میں آیا۔ نیزوں پر پڑ
 لہراتے، بظاہر پروں پر اڑتے، جھللاتی رنگارنگ دریاں پہنے گھڑسوار نمودار ہوئے اور ترکوں پر ٹوٹ پڑے۔ یہ
 حملہ اتنا اچانک اور اتنی بے خبری کے عالم میں کیا گیا تھا کہ ترک سنبھل نہ سکے اور ان کے پاؤں اکھڑ گئے۔ مغربی
 ممالک اسلامی یلغار سے بچ گئے۔

نوار دگھڑسوار بادشاہ پوینڈ کے ہوزروں پر مشتمل ہزاروں دستہ تھے۔ بہت جلد ہوزاروں کا تصور دوسرے
 یورپی ممالک میں پھیل گیا اور مختصر عرصے میں روس، آسٹریا، فرانس، اطالیہ، برطانیہ اور متعدد دیگر ممالک نے بھی
 ہوزار دستہ بھرتی کر لیے اور ان کے مخصوص لباس۔ پشیمی ٹوپوں (شکو)، بھڑوں کی کھانوں کے چنوں، تنک
 بر جسوں اور گھنٹوں تک بوٹوں۔ کو ردی کی شکل دے دی۔ ہوزار آزاد رو تھے، معمول کی جکڑ بندیاں ناپسند کرتے
 تھے، ہتھیاروں کے استعمال میں مہارت کے دلدادہ تھے اور غیر معمولی جرأت و لیری کے کاموں کی دل کھول کر
 داد دیتے تھے۔ چنانچہ عام فوج انھیں پسندیدگی کی نگاہوں سے نہیں دیکھتی تھی۔

فرانسیسی کا استعمال

طاسٹائی کے ناول ”جنگ اور امن“ کا تعلق جس زمانے سے ہے، اس میں روس کے پڑھے لکھے اور اونچے طبقوں
 میں فرانسیسی بہت مقبول تھی۔ عام لوگ تو مادری زبان استعمال کرتے تھے لیکن امرا اور تعلیم یافتہ لوگوں کا اوڑھنا
 پچھونا فرانسیسی تھی۔ وہ بولتے بھی فرانسیسی اور لکھتے بھی فرانسیسی ہی تھے، بعض لوگوں کو تو اپنی زبان آتی ہی نہیں تھی۔
 جب روس کا فرانس کے ساتھ ٹکراؤ ہوا، ان لوگوں کی رگ حسیت جاگی اور وہ روسی کی طرف پلٹنے لگے۔ جیسا کہ
 ناول میں جولی کا راگینا اپنی سہیلی ٹرس ماریا بلکونسکی کے نام اپنے ”فرانسیسی زدہ“ (Frenchified) خط میں بتاتی
 ہے، بعض لوگوں کو اپنی زبان سیکھنے کے لیے باقاعدہ یونیورسٹی کی خدمات حاصل کرنا پڑیں۔ یہی وجہ ہے کہ ”جنگ اور امن“
 میں فرانسیسی کا بکثرت استعمال ہوا ہے۔

روسی تقویم

مغربی یورپ میں (موجودہ) گرگورین کیلنڈر سترھویں صدی میں مروج ہو گیا تھا لیکن روسی موجودہ صدی کے
 آغاز تک (پرانے) جولین کیلنڈر پر کاربند رہے۔ چنانچہ طاسٹائی نے ”جنگ اور امن“ میں تمام تاریخیں جولین
 کیلنڈر ہی کے حساب سے دی ہیں۔ دونوں کیلنڈروں میں بارہ ایام کا فرق ہے۔ باروینو کی لڑائی روسی حساب سے

26 اگست اور مغربی تقویم کے مطابق 7 ستمبر 1812 کو ہوئی تھی۔

روسی فاصلے

روس میں فاصلے ناپنے کے لیے درست (verst) استعمال ہوتا تھا۔ ایک درست تقریباً درجہائی میل کے برابر ہوتا ہے۔ طالسٹائی نے فاصلے درست کے حساب سے دیے ہیں۔ چونکہ ہم میل سے زیادہ آشنا ہیں، میں نے روز میری ایڈمنڈز کے متنوع میں درست میلوں میں تبدیل کر دیے ہیں۔ (ناول کے ساتھ یہ میری واحد چھیڑ خانی ہے۔)

ناول کا عنوان

ابتدا میں جس وقت یہ ناول قسط وار ”دی رشین میجر“ نامی رسالے میں شائع ہو رہا تھا تو اس کا نام ”1805“ رکھا گیا تھا۔ لیکن جب ناول شاخ در شاخ پھیلتا ہوا آگے بڑھا اور ایک پورے دور پر محیط ہوتا نظر آیا تو وسعت بیان سے نباہ کی خاطر ناول کے نام میں تبدیلی ناگزیر ہو گئی۔ چنانچہ جب بالآخر وہ کتابی صورت میں سامنے آیا تو پرانا عنوان ”1805“ مسترد کر کے اسے ”جنگ اور امن“ کا نام دیا گیا۔ اس نئے نام کا حسن یہ ہے کہ روسی زبان میں ”امن“ کے لیے جو لفظ (Mir) مستعمل ہے اس کے معنی بہت وسیع ہیں۔ امن کے علاوہ اس سے نہ صرف دنیا مراد ہے بلکہ یہ کائنات اور کیونٹی کا مطلب بھی ادا کرتا ہے۔ جنگ کے لیے روسی لفظ Volna ہے اور بقول جون بلی رڈی میں ان دونوں لفظوں کی یکجائی سے مابعد الطبیعیاتی آن بان رکھنے والے وسیع طیف کے جو معانی وجود میں آتے ہیں ان کو کسی دوسری زبان میں جوں کا توں منتقل کرنا مرعال ہے۔ غالباً معانی کی اسی تہداری کے پیش نظر طالسٹائی نے ناول کے لیے یہ نام پسند کیا۔

فرہنگ

عسکریت

ایسیرل گارڈز: یہ روسی فوج کے بہترین سپاہیوں اور افسروں پر مشتمل ہوتے تھے۔ ان کا کام فرماں روا کے وقت کی حفاظت کرنا اور بوقت ضرورت جنگی خدمات سرانجام دینا ہوتا تھا۔ ان میں شامل ہونا باعث فخر سمجھا جاتا تھا۔
اولان (Uhlans) پوینٹڈ اور پرشیا کے نیزہ بردار گھڑ سوار۔

ڈریگون (Dragoons) یہ شروع میں پیادہ سپاہی ہوتے تھے۔ انھیں مرل گھوڑے فراہم کیے جاتے تھے اور یہ ان پر سوار ہو کر میدان جنگ میں پہنچتے تھے، وہاں گھوڑوں سے نیچے اترتے اور پیادہ لڑائی میں شریک ہوتے۔ بعد ازاں انھوں نے گھڑ سواروں کی طرح لڑنا سیکھ لیا۔ سترھویں اور انیسویں صدی تک وہ بھاری اسلحہ سے عیس ہوتے تھے۔

شاف: فوجی کمانڈر کا عملہ۔ اس کا کام جنگی منصوبے بنانا، انتظامی امور نبھانا اور لڑاکا فوج کے ساتھ رابطہ قائم رکھنا ہوتا تھا۔ اس کے جوئیر ارکان ایجوٹ، ایڈی کاٹک اور ادولی افسر کہلاتے تھے۔

شاسر (Shasseurs): فرانسیسی فوج کے بعض گھڑ سوار وریبہ دستے۔ یہ ہلکے ہتھیاروں سے مسلح ہوتے تھے اور تیزی سے ادھر ادھر جا سکتے تھے۔

کوارٹر ماسٹر: فوج کا وہ شعبہ جس کا کام خوراک، وردیوں، اسلحہ اور دیگر سامان رسد فراہم کرنا ہوتا ہے۔
گنال (cannon): ایک قسم کی پرانی توپ، گھوڑا گاڑی پر لدی ہوتی تھی۔

گرپ شٹ (grapeshot): لوہے کی گولیوں کا ہتھیار۔ گنال میں رکھ کر چلاتے تھے۔
گرینیڈیرز (grenadiers): دتی بم پھینکتے تھے۔

لیشیا بے قاعدہ فوج۔ عام شہریوں اور فارغ شدہ فوجیوں پر مشتمل ہوتی تھی۔ ہنگامی حالات میں فوجی خدمات سرانجام دیتی تھی۔

نوٹ: عام افواج کی طرح روسی افواج بھی کورس (corps)، ڈویژنوں، رجمنٹوں وغیرہ پر مشتمل ہوتی تھی۔ آج

کل کور کی نفری عام طور پر بیس پچیس ہزار ہوتی ہے لیکن زاروں کی کور تقریباً دس ہزار افراد پر مشتمل ہوتی تھی۔

مذہب

ایقون۔ حضرت عیسیٰ، حضرت مریم، فرشتوں اور مقدس، ستیوں کی تصاویر۔ عموماً چوبی تختوں پر کندہ کی جاتی ہیں۔ صرف آرتھوڈوکس مسک کے پیر و کار استعمال کرتے ہیں۔ رومن کیتھولک اور پروٹسٹنٹ ان کے مخالف ہیں۔ آرتھوڈوکس گرجوں میں کم از کم دو ایقون ضرور ہوتے ہیں۔ دروازے کی دائیں جانب عیسیٰ اور بائیں جانب مریم کا ایقون سجایا جاتا ہے۔ اکثر لوگ اپنے گھروں میں بھی رکھتے ہیں۔

اعتراف گناہ (confession) عیسائیت میں ارتکاب گناہ بندے اور خدا کے مابین معاملہ نہیں، موت سے پہلے کم از کم ایک بار پادری کے سامنے اپنے گناہوں کا اعتراف کرنا پڑتا ہے، ورنہ بخشش کی امید نہیں کی جاسکتی۔ انجیل اربعہ (Gospels) متی، مرقس، یوحنا اور یوحنا کی روایت کردہ انجیلیں۔ ان میں حضرت عیسیٰ کے حالات زندگی اور تعلقات مندرج ہیں اور نئے عہد نامے میں شامل ہیں۔

ساکرامنٹ / سر مقدس (Sacrament) عیسائیت کی مقدس رسم۔ عیسائیت میں سات ساکرامنٹ ہیں۔ اصطلاح شراکت پاک، تصدیق، کفارہ، آخری مسح، پاک درجات اور نکاح۔

اصطلاح یا پختہ (baptism) کسی شخص کے گناہ دھونے کے لیے اس پر مقدس پانی چھڑکا جاتا ہے۔ بعض مسالک اسے پانی میں نہلاتے ہیں۔ بچوں کو ان کی پیدائش کے بعد پختہ دیا جاتا ہے اور اس کا سنگی نام رکھا جاتا ہے۔ ایسے مواقع پر اس کے دینی باپ اور دینی ماں، جو اس کی مناسب مذہبی تعلیم کی ذمہ داری اٹھاتے ہیں، موجود ہوتے ہیں۔

شراکت پاک یا رفاقت مسیحی (Communion) مسیحی روایات کے مطابق عیسیٰ نے اپنے حواریوں کے ساتھ جو آخری کھانا کھایا، وہ ”روٹی“ اور ”مے انگور“ پر مشتمل تھا۔ کہا جاتا ہے کہ جب عیسیٰ نے روٹی توڑی تو کہا ”یہ میرا جسم ہے۔“ اور جب حواریوں میں مے تقسیم کی تو کہا ”یہ میرا خون ہے۔“ رومن کیتھولک عقیدے کے پیرو کہتے ہیں کہ اس رسم کی ادائیگی کے دوران میں مسیح واقعی حاضر ناظر ہوتے ہیں کیونکہ گرجے میں میز پر رکھی ہوئی روٹی اور مے ان کے ”جسم“ میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ گرجے میں ادائیگی رسم کے دوران میں مدلی اور مے ”مقدس میز“ پر رکھی ہوتی ہے۔ عبادت گاہوں میں مے کے سامنے دو زانو ہو جاتے ہیں اور پادری ہر ایک کی زبان پر لقمہ (host) رکھتا جاتا ہے۔

تصدیق (confirmation) ہر عیسائی کو رسمی طور پر گرجے میں اپنے مذہب کی تصدیق کرانا پڑتی ہے۔ کفارہ (penance) عیسائی مذہب کا ایک عمل، جس میں اعتراف گناہ، توبہ، عقوبت نفس وغیرہ کی منزلیں شامل ہوتی ہیں۔

آخری مسح یا تہین آخر (extreme unction). شدید بیمار یا قریب المرگ شخص کو مسح دینے کی رسم۔

پاک درجات یا درجات قسوست (Holy Orders) پادری بنانے کی رسم۔

نکاح (matrimony): رسم نکاح۔

سینٹ (Saint): مقدس ہستی یا دلی۔ عیسائیت میں صرف مرحوم شخص ہی سینٹ بنایا جاسکتا ہے اور جس شخص کو اس کے نیک اعمال کی وجہ سے یہ درجہ دیا جاتا ہے، وہ عام عقیدے کے مطابق ”جنت نصیب“ ہوتا ہے اور اسے خداوند سے مخصوص اشخاص کی شفاعت کا اختیار ہوتا ہے۔ رومن کیتھولک مسلک میں کسی شخص کو سینٹ قرار دینے (Canonization) کا اعلان پوپ کرتا ہے۔ ایسے موقع پر وکیل خداوند (advocatus Dei) اور وکیل شیطان (advocatus diaboli) پیش ہوتے ہیں۔ وکیل شیطان اسے سینٹ قرار دینے کی مخالفت کرتا ہے اور اس کے اعمال میں کٹڑے نکالتا ہے۔ وکیل خداوند اس کی صفائی پیش کرتا ہے۔ اگر وکیل خداوند جیت جائے تو پھر اسے سینٹ کا درجہ دے دیا جاتا ہے۔

ہر سینٹ کا اپنا یوم ضیافت ہوتا ہے۔ اس موقع پر اسے دعاؤں میں یاد کیا جاتا ہے۔ اکثر عیسائی اپنے بچوں کے نام کسی نہ کسی سینٹ (سینٹ مرد اور عورتیں دونوں ہوتے ہیں) کے نام پر رکھتے ہیں شاید ان کا بچہ ان جیسا ہو جائے۔ پروٹسٹنٹوں میں سینٹ نہیں ہوتے۔

حزبور (تبع حزیر) (Psalms): پرانے عہد نامے میں ڈیڑھ سو کے قریب نغمے یا حمدیں (hymns) ہیں، انھیں حزایر کہا جاتا ہے۔ یہودیوں اور عیسائیوں کے نزدیک، جو انھیں معبدوں اور گرجوں میں گاتے ہیں، یہ دنیا کے بہترین نغمے ہیں۔

مکتوبات (Epistles): نئے عہد نامے میں اکس ابواب مختلف اشخاص کے خطوط پر مشتمل ہیں، انھیں ”مکتوبات“ کہا جاتا ہے۔ مشہور ترین خطوط سینٹ پال (پولوس) کے ہیں اور اس رعایت سے انھیں (Pauline Epistles) مکاتیب پولوس کہا جاتا ہے۔

ماندہ یا میز مقدس یا الطار (Altar): گرجے کے مقدس ترین مقام پر ایک میز یا بندنگی چھترہ۔ اس پر ”روٹی“ اور ”نئے“ رکھی جاتی ہے۔

یوحنستی قربانی یا عبادت (mass): رومن کیتھولک اور آرتھوڈوکس مسالک میں عبادت کا اجتماعی طریقہ۔ اس عبادت میں لوگ مل جل کر دعائیں مانگتے ہیں اور ان کی عبادت کا یہ انداز عیسائی کے آخری کھانے کی یاد دلاتا ہے۔ پروٹسٹنٹ مسلک میں اسے ”سندے سروں“ (عبادت اتوار) کہا جاتا ہے۔

نوٹ: مذہبی اصطلاحات کے ترجمے English - Urdu Dictionary of Christian Terminology
مطبوعہ کریمین سٹڈی سنٹر اور لپنڈی سے لیے گئے ہیں۔

اوپرا (opera): غنائی تئیس، اس ڈرامے میں اداکار گفتگو کرنے کے بجائے نغمات گاتے ہیں۔
 ایریا (aria): ایک قسم کا پیچیدہ نغمہ۔ اسے اوپرا میں صرف ایک اداکار گاتا ہے۔
 اورچ (overture): موسیقی کا خاصا چھوٹا ٹکڑا۔ یہ دہیرے یا ڈرامے کے تعارف کے طور پر تحریر کیا جاتا ہے اور آرکسٹرا پر بجایا جاتا ہے۔
 کنڈکٹر (conductor): کنڈکٹر آرکسٹرا کے سامنے کھڑا ہوتا ہے اور سازندوں کی رہنمائی کرتا ہے۔
 سوناتا (sonata): کلاسیکی راگ۔ پیانو، وائلن یا بعض دوسرے آلات موسیقی کے لیے ترتیب دیا جاتا ہے۔ اس کی کئی لکھیاں ہوتی ہیں لیکن نمبر سب کا ایک ہی ہوتا ہے۔

متفرقات

بیلف (bailliff): زمینوں کا منتظم۔ یہ اعتبار عہدہ شیوارڈ سے کم تر ہوتا تھا۔
 نمائندہ (delegat): کسانوں کے مسائل زمیندار تک پہنچاتا تھا۔
 نمبردار (elder): گاؤں میں زمیندار کا نمائندہ۔
 شیوارڈ (steward): زمیندار کی جاگیر اور دیگر املاک کا منتظم۔
 بٹلر (butler): بڑے گھرانوں کا سب سے اہم نوکر۔ عام طور پر شرابوں اور دسترخوان کا انچارج ہوتا ہے۔ اس کے اصل فرائض کیا ہیں، کوئی یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ پرنس ڈیانا نے ایک مرتبہ یہی سوال اپنے بٹلر سے کیا۔ اس نے جواب دیا: ”مالک کو خوش رکھنا۔“
 ڈنر (dinner): دن کا اہم ترین کھانا (chief meal)۔ اس کے وقت کا تعین نہیں کیا جاسکتا۔ ملکہ وکٹوریہ کے زمانے میں دوپہر کے کھانے کو ڈنر کہتے تھے اور آج کل عموماً شام کے کھانے کو۔ اس ناول میں جہاں بھی اس کا ذکر آیا ہے، اس کے کھانے کا وقت چار اور پانچ کا درمیانی وقت قرار دیا جاسکتا ہے۔ کاؤتس رستووا کے ہاں یہ چار بجے شروع ہوتا تھا۔ (پہلی کتاب، حصہ اول باب ۱۱)
 سپر (supper): رات کو سونے سے پہلے کھایا جاتا تھا اور عام طور پر ہلکی پھلکی اشیائے خورد و نوش پر مشتمل ہوتا تھا۔ ویسے آج کل بعض لوگ شام کے بڑے کھانے کو بھی سپر کہتے ہیں۔

اہم کردار

بڑا خوف

باپ	کاؤنٹ کیرل وں دی مریج
بیٹا	پیٹر بکر لویج (پیٹر، پیٹر و شکا)
کاؤنٹ بڑا خوف کی بھانجیاں	پرنس کاترینا سمیو نوونا ماسوئووا (کاتس)
	پرنس اولگا سمیو نوونا ماسوئووا
	پرنس سوئی سمیو نوونا، سوئووا

گورا بگن

باپ	پرنس واسیلی سرکھیج
بیٹا	پرنس اناطول
بیٹا	پرنس اپولیت
ٹیٹا بھرت سے شادی کرتی ہے	پرنس ہلمین (ایلمین، ایلمینا) واسیو نا گورا گینا

بلکونسکی

باپ	پرنس نکولا آندر یوچ
بیٹا	پرنس آندر سے نکولا یوچ
ٹیٹا	پرنس ہاریا (ہری، ہاشا) نکولا یوچا بلکونسکیا
پرنس آندر سے کی بیوی	پرنس ہلسا (ہسے، ہسادتا) کارلوونا بلکونسکیا بخت معینین
پوتا	پرنس نکولسکا (نکولینکا)

کاؤنٹ الیا آندرچ	باب
کاؤنٹس سٹالیا (سٹالی) رستو دایست شین شین	کاؤنٹ الیا کی بیوی
کاؤنٹ کورائی ایلیچ (کھولاس کولیا)	بیٹا
کاؤنٹ پینا (پیتروشکا)	بیٹا
کاؤنٹس ویرا الینچنا	بھئی
کاؤنٹس سٹالیا (سٹالی)	بھئی
سونیا الیکسا مدرزنا (سونیا سوئیوشکا، سوئی)	کاؤنٹس سٹالیا کی بھانجی

ورڈو بیتسکوئے

پرنس آنتائیچا کیلرو نادرو بیتسکایا	ماں
پرنس بوریس (بوریسکا، بوریس)	بیٹا

دیگر

آل پانچ	پرنس بکونسکی کا سٹیوارڈ
ماریا درترونا آفروسیووا	”خوف ناگ“ خاتون
ایکسی وچ آئی اوسف باز دیق	فری مین تحریک کارہنما
ہلمین	سفارت کار
الفانسے (ڈوف) کارلک برگ	جرمن نژاد فوجی افسر، ویرا سے شادی کرتا ہے۔
تھون	پرنس بکونسکی کا ملازم خاص
ٹمو جن	پیادہ فوج کا افسر
ٹو جن	توپ خانے کا افسر
فیدیا ولوف	فوجی افسر، ایک قسم کا غنڈا
داسکی دسترچ (داسکا) دینی سوف	فوجی افسر
کاؤنٹ زشتوپ جن	گورنر اسکو۔ (نقلی نہیں، اصل آدمی تھا)
شین شین	کاؤنٹس سٹالیا رستو دا کارشتے دار

آنتا (آنیت) پادرونا شیر

پلاٹون کارائیف

ٹولی (لودنا) کاراگینا

راوروکا

الکساندر اول

میٹا سکی لاری اوداویچ کوکوزوف

نیولین بونا پارت

سابقہ امپراطورہ، ریا کی مصاحبہ

گسان فوجی

متمول دوشیزہ، بورس سے شادی کرتی ہے۔

وئی سوف کا اردلی

چند تاریخی کردار

راوروک

روسی افواج کا کمانڈر انچیف

شہنشاہ فرانس۔

تشریحات

- 1- روسی نام عام طور پر تین اجزا پر مشتمل ہوتے ہیں۔ پہلا جزو ذاتی یا سچی نام کہلاتا ہے۔ دوسرے جزو سے عربوں کی طرح ولادت کا اظہار ہوتا ہے۔ مثلاً آندرے نکولائیویچ کا مطلب آندرے ابن نکولائی ہے۔
- 2- تیسرا جزو خاندانی نام (surname) ہوتا ہے لیکن مردوں اور عورتوں کو ایک ہی نام لکھی سے نہیں ہٹا جاتا۔ عورتوں کی انفرادیت برقرار رکھنے کے لیے، خاندانی نام کے آخر میں عام طور پر حرف a کا اضافہ کر دیا جاتا ہے۔ مثلاً Karenina سے Karenina (کارنینا)۔
- 3- کسی بھی دوسری قوم کے مقابلے میں روسی مختصر نام یا عرف استعمال کرنے کے زیادہ شوقین ہیں، مثلاً میخائیل ماشا اور مار باماری یا ماشا بن جاتے ہیں۔ ہماری طرح بعض لوگوں کی پوری زندگی ان کا اصل نام پکارے بغیر گزر جاتی ہے۔ پتروشکارستوف کو کبھی کسی نے پتروشکا نہیں کہا، آخر دم تک پتیا ہی رہا۔
- 4- روسی زبان میں ح یا ہ (h) نہیں ہوتی۔ سٹر کی بیوی کا اصل نام ولینا واسیلیووا بہنو خودا (شادی سے قبل کوراگینا) اور مختصر نام الین (Ellen = یونانی الین) ہے۔ میں نے انگریز سترجین کے تنبیج میں ہیلین (Helene) کو ترجیح دی ہے کیونکہ الین آف ٹرائے کی وجہ سے اس سے ہمارے کان زیادہ آشنا ہیں۔
- 5- حرف v اگر روسی ناموں کے آخر میں آئے تو اس کا تلفظ (F) ہوتا ہے، لیکن اگر درمیان میں آئے پھر دواؤسی رہتا ہے۔ مثلاً Rostov اور Rostova کو رستوف اور رستووا لکھا اور پڑھا جائے گا۔
- 6- مغرب میں عام آرمیوں کو عموماً ان کے خاندانی نام سے پکارا اور لکھا جاتا ہے۔ مگر بادشاہوں کو ان کے سچی ناموں سے جانا جاتا ہے جیسے شاہ جارج ششم، نہ کہ شاہ دغدر۔ نپولین کا خاندانی نام بوونا پارٹ (Buonaparte) تھا۔ اس کے آباؤ اجداد نسلا اطالوی تھے اور پندرہویں صدی میں بحیرہ روم کے جزیرے کارمیکا میں آباد ہو گئے تھے۔ نپولین کی پیدائش سے ایک سال پہلے کارمیکا پر فرانس نے قبضہ کر لیا اور یوں وہ فرانسیسی شہری کی حیثیت سے تولد ہوا اور ہوش سنبھالنے کے بعد اس نے اپنا نام فرانسیسی انداز میں Bona parte (بونا پارٹ) لکھنا شروع کر دیا۔ جب نپولین نے اپنے آپ کو فرانس کا امپراطور قرار

دے دیں، فطری طور پر وہ، پیرا طور پر، لیکن بن گیا۔ روسیوں نے اس کی شاہی حیثیت کو کبھی تسلیم نہ کیا، وہ اسے ہمیشہ اس کے خاندانی نام یونا پارت سے پکارتے رہے اور جب اس سے شدید نفرت کا اظہار کرنا مقصود ہوتا، وہ اسے یونا پارت کہتے (کہ، پیرا طور پر ایک طرف، وہ فرانسیسی بھی نہیں ہے)۔

7- میں نے Emperor کا ترجمہ ”شہنشاہ“ نہیں کیا بلکہ ایرانیوں کے تنج میں ”امپراطور“ (ای ایچ پامر نے اپنی ڈکشنری آف پرنسپل اینگلو سیکس مطبوعہ 1876ء میں ”امپراطور“ لکھا ہے) کو ترجیح دی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ”شہنشاہ“ کا لقب ہر بادشاہ اختیار کر لیتا تھا جب کہ پیرا طور پر اپنے ہی ملک کا نہیں، بلکہ ایماپٹر (Empire) کا سربراہ ہوتا تھا۔ محمد سلیم الرحمن کے خیال میں اس کا صحیح ترجمہ ”سلطان“ ہو سکتا ہے (سلطان کی بیوی سطانہ ہوگی)۔ لیکن سلطان و سلطانہ دونوں مسلمانوں کے لیے مخصوص ہو چکے ہیں، چنانچہ بن کا استعمال مناسب نہ سمجھا گیا۔ اسی طرح ”ایمپرس“ کے لیے ”امپراطورہ“ اور ”ایماپٹر“ کے لیے ”امپراطوریہ“ استعمال کیا گیا ہے۔

8- اگرچہ زار یوچ (tsarevitch) کے معانی ”زار کا بیٹا“ ہیں، لیکن یہ لفظ ”رلی عہد“ کے لیے، خواہ وہ زار کا بیٹا ہو یا نہ ہو، استعمال ہوتا تھا۔ ایسے تداروں ماوہد تھا، اس کا ولی عہد اس کا بھائی تھا اور اس رعایت سے زار یوچ کہلاتا تھا۔

9- انگریزی کے برعکس روسی الفاظ میں کوئی حرف شاہی ساکت ہوتا ہے۔ چنانچہ روسی tsar کو زار نہیں بلکہ تسار کہتے ہیں۔ زار اور اس کی مختلف صورتیں (Tzar, Czar وغیرہ) سب انگریزوں اور امریکیوں کی اختراع ہیں۔ تاہم عامہ رجحان کے پیش نظر اور الجھاؤ سے بچنے کے لیے میں نے بھی ”زار“ ہی استعمال کیا ہے۔

چیدہ چیدہ واقعات کی تاریخیں

نوٹ تمام تاریخیں جوہن کیلنڈر کے مطابق ہیں۔ انہیں موجودہ کیلنڈر کے مطابق بنانے کے لیے ہر تاریخ میں 1۵ دن کا اضافہ کر دیا جائے۔

1805

- ۱1 اکتوبر کوئزونٹ براؤناؤ کے نزدیک ریجنٹ کا معائنہ کرتا ہے۔ بدقسمت میک کی آمد۔
- 23 اکتوبر روسی فوج دریائے انیس عبور کرتی ہے۔
- 24 اکتوبر اسم سنٹس میں لڑائی۔
- 28 اکتوبر روسی فوج دریائے ڈینیوب عبور کرتی ہے۔
- 4 نومبر نیولین شون برن سے موفا کے نام مراسلہ تحریر کرتا ہے۔
- شون گراہرن کی لڑائی۔
- 19 نومبر اوسٹریٹس میں جنگی کونسل کا اجلاس۔
- 20 نومبر اوسٹریٹس کی لڑائی۔

1807

- 27 جنوری پروئے شش آئی لاؤ کی لڑائی۔
- 2 جون فریڈلانٹ کی لڑائی۔
- 13 جون ٹلزٹ میں نیولین اور ایکسائندر کی ملاقات۔

1812

- 17 مئی نیولین کی ڈریسڈن سے روانگی

- 12 جون نیولین درماتے نمین عبور کرتا ہے اور روس میں داخل ہو جاتا ہے۔
- 14 جون ایکساندر بالاشیف کو نیولین کے پاس بھیجتا ہے۔
- 13 جولائی پاؤلو گرات ہوزاروں کی استرووتا میں کارروائی
- 4 اگست آل پانچ سمونسک پہنچتا ہے اور قازنگ کی آوازیں سنتا ہے۔
- 5 اگست سمونسک پر بم باری
- 7 اگست پرنس نکولائی بلکونسکی بالڈ ہلز سے باکوچا رافوروانہ ہوتا ہے۔
- 8 اگست کوتوزوف کمانڈر انچیف مقرر کیا جاتا ہے۔
- 10 اگست پرنس آندرے کی رجمنٹ بالڈ ہلز کے برابر سے گزرتی ہے۔
- 17 اگست کوتوزوف ساریووز انمش چے پہنچتا ہے اور فوج کی کمان سنبھال لیتا ہے۔
- 24 اگست شیداردینو مورچے کی لڑائی
- 26 اگست باردوینو کی لڑائی
- 27 اگست روسی فوج کی پسپائی
- یکم ستمبر روسی فوج ماسکو کو اس کے حالی پر چھوڑ دیتی ہے۔
- 2 ستمبر فرانسیسی فوج ماسکو میں داخل ہوتی ہے۔
- ماسکو میں جگہ جگہ آگ بھڑکنے لگتی ہے۔
- 12 اکتوبر فرانسیسیوں کے خلاف گوریلا کارروائیوں کا آغاز
- 16 اکتوبر نیولین اور فرانسیسیوں کا ماسکو سے فرار
- 10 اکتوبر نیولین قازقوں کے ہتھے پڑھنے سے بال بال ہوتا ہے۔
- 5 نومبر نیولین اپنی فوج کو کراسنایا چھوڑ کر خود مغرب کی طرف چل پڑتا ہے۔
- 6 نومبر کراسنایا میں فرانسیسیوں کا قتل عام
- دریائے میریزینا عبور کرنے کے دوران لاتعداد فرانسیسی ڈوب جاتے ہیں۔
- 29 نومبر کوتوزوف ولنا پہنچتا ہے اور 1812 کی مہم ختم ہو جاتی ہے۔

پہلی کتاب

نوٹ۔ اس ترجمے میں War کے لیے 'جنگ' اور battle کے لیے 'ٹرائی' کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔

”اچھا، مائی ڈیر پرنس، گویا جینوآ اور لوکا کی حیثیت اب یوانا پارتوں² کی ذاتی جاگیروں سے زیادہ نہیں رہی۔ نہیں، نہیں، میں تمہیں خبردار کیے دیتی ہوں کہ اگر تم اب بھی یہ نہ مانے کہ اس کا سیدھا سادا مطلب جنگ ہے، اور یہ کہ یہ دجال — اور میرا یہ ایمان ہے کہ یہ شخص واقعتاً دجال ہے — جس جس نوع کی نابکاریوں، خباثتوں اور ظالمانہ کارروائیوں کا مرتکب ہوا ہے، اگر تم پھر کبھی انہیں درگزر کرنے کے روادار ہو، پھر سمجھو کہ آئندہ سے میری اور تمہاری کٹی ہوئی۔ پھر میں تمہیں نہ تو اپنا دوست تصور کروں گی اور نہ اپنا وفادار غلام، جس کا تم ہر وقت ڈھوں پیٹتے رہتے ہو۔ خیر چھوڑو، یہ بتاؤ اب تمہاری طبیعت کیسی ہے؟ حال چال کیا ہے؟ اوہو، میں سمجھ گئی، میں خواہ مخواہ تمہارے دسان خطا کیے دے رہی ہوں۔ اچھا، بیٹھو، مجھے اس بارے میں سب کچھ بتاؤ۔“

یہ قصہ 1805ء کی جولائی کی ایک شام کا ہے اور جو خاتون مصروف کلام تھی، اس کا نام آنتیا پاولوونا شیرر (Anna Pavlovna Scherer) تھا۔ وہ خاصی جانی پہچانی ہستی کی مالک تھی۔ کیوں نہ ہوتی آخر وہ، درملکہ ماریا فیودورنا (Maria Fyodorovna) کی مصاحبہ اور محرم و دمساز تھی۔ جو کلمات اوپر تحریر کیے گئے ہیں، وہ ان کے ساتھ پرنس واسیلی (Vasily) کا، جو صاحب رسوخ اور مدبر سیاست دان تھا، اور جو اس کی محفل شب میں حاضر ہونے والا اولین مہمان تھا، خیر مقدم کر رہی تھی۔

آنتیا پاولوونا چند دنوں سے کھانسی میں مبتلا تھی۔ اس کی یہ کھانسی بھول اس کے اپنے لُلو (فلو، نیا لفظ تھا اور محض اونچے طبقے میں استعمال ہوتا تھا) کا شاخسانہ تھی۔ اسی صبح اس کے ذاتی خدمت گار نے، جو گہرے سرخ رنگ کی وردی میں ملبوس تھا، فرانسیسی زبان میں تحریر مختصر رقعات مختلف گھروں میں تقسیم کیے تھے۔ ان تمام رقعات میں بلا تخصیص ایک ہی قسم کی زبان استعمال کی گئی تھی:

(Monsieur le Comte (or mon prince)، اگر کوئی خاص معروفیت مانع نہ ہو اور اگر

ایک لاجارونا توں مریضہ کی محبت میں شام کے چند بھات گزارنا آپ کے لیے بار خاطر نہ ہو، پھر

رات کو سات بجے شام اور دس بجے شب کے مابین اپنے مرید خانے پر آپ کی تشریف آوری پر
بے پایاں مسرت ہوگی۔

آنیت شیریر

”Mon Dien، خدا خیر کرے، کیا زبردست چڑھائی ہے!“ پرنس نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔ وہ اس
طرزِ مخاطب اور اندازِ خیر مقدم سے مطلق پریشان نہیں ہوا تھا۔ وہ درباری یونیفارم میں، جس پر کشیدہ کاری کی ہوئی
تھی، ملبوس تھا۔ اس کی چٹوڑیں ہر جس نما تھی اور اس کے جوتے نیچی ایڑی کے تھے۔ اس کے سینے پر مختلف اعزازی
فیجے اور ستارے آویزاں تھے اور اس کے سپاٹ چہرے پر طمانیت رقصاں تھی۔ وہ نہایت شستہ اور پاکیزہ فرنیسی
(کیونکہ یہی وہ زبان تھی جس میں ہمارے دادے پر دادے نہ صرف اظہارِ خیال کرتے تھے بلکہ سوچتے بھی اسی میں
تھے) میں باتیں کر رہا تھا۔ اس کے لہجے میں ایسے سربر آوردہ شخص کا پرسکون اور مریدانہ انداز بھلک رہا تھا جس کی عمر
طویل شاہی دربار اور فیش اسل طبع کے مابین اٹھتے بیٹھتے گزری ہو۔ وہ آتنا پاؤ لو دنا کے قریب آیا، اپنا چمکتا دمکتا گجاسر،
جو خوشبو سے منظر تھا، اس کے آگے کیا تا کہ وہ اسے چھی طرح دیکھ سکے، اس کے ہاتھ پر بوسہ دیا اور پھر باطمینان قلب
صوفے پر بیٹھ گیا۔

”Chere amie، پہلے تو مجھے یہ بتائیں کہ نصیب دشمنان، تمہاری طبیعت کیسی ہے؟ اس بارے میں میری
تشویش دور کرو۔“ اس نے پتی آواز، اور لہجے میں کسی قسم کی تبدیلی لائے بغیر کہا۔ صاف ظاہر تھا کہ اس روایتی
ہمدردی اور تشویش کے نیچے ایک نوع کی بے یازگی ہی نہیں، تسخیر بھی پوشیدہ تھا۔
”مگر کوئی شخص اخلاقی کشمکش میں مبتلا ہو، پھر اس کی طبیعت درست کیسے رہ سکتی ہے؟ اگر کوئی بھلا مانس ذرا
بھی ذی حس ہو، وہ بھلا اس زمانے میں کیسے پرسکون رہ سکتا ہے؟“ آنا پاؤ لو دنا نے کہا۔ ”میرا خیال ہے آج پوری
شام تم یہیں گزارو گے۔“

”انگریزی سفیر جس ضیافت کا اہتمام کر رہا ہے، اس کا کیا بے گا؟ آج چہرہ شنبہ ہے۔ مجھے وہاں اپنی شکل
دکھانا ہوگی،“ پرنس نے جواب دیا۔ ”میری بیٹی ادھر ہی آ رہی ہے، وہ مجھے وہاں پہنچا دے گی۔“
”میرا خیال تھا کہ آج کی ضیافتیں اور جشن منسوخ ہو گئے ہیں۔ مجھے یہ کہنے میں ذرا باک نہیں کہ یہ دعوتیں،
جس اور آتش بازیوں اب اعصاب پر سوار ہونے لگی ہیں۔“

”اگر انھیں معلوم ہوتا کہ تمہاری یہی خواہش ہے، تو وہ آج کی ضیافت لازماً ملتوی کر دیتے۔“ پرنس نے
مشینی انداز سے کہا۔ وہ ایک ایسی گھڑی کی، ننگ گنگو کر رہا تھا جس کو چابی دی جا چکی ہو (اور اب وہ آپ ہی آپ

نک نک کیے جا رہی ہو۔ وہ اپنی عادت سے مجبور تھا اور ایسی باتیں کہتا رہتا تھا جن کے متعلق اسے مطلق توقع نہیں ہوتی تھی کہ کوئی ان کا یقین کرے گا۔

”مجھ سے دل لگی مت کرو، مائی ڈیر۔ نو واسل سیف (Novosiltsev) کے مراسلے کے متعلق کیا فیصلہ ہوا ہے؟ تم تو سب کچھ جانتے ہو۔“

”اس میں بھلا جانے کی کیا بات ہے؟“ پرنس نے کہا۔ اس کے لہجے میں اکتاہٹ اور سرد مہری تھی۔

”کیا فیصلہ ہوا ہے؟ نتیجہ یہ اخذ ہوا ہے کہ نیو یمن اپنی کشتیاں جلا چکا ہے اور مجھے یقین ہے کہ ہم بھی اپنی کشتیاں جلانے کی تیاریاں کر رہے ہیں۔“

پرنس ہمیشہ اکتائے اکتائے لہجے میں بات کرتا تھا، بالکل اس اداکار کی طرح جو کسی بھولے سرے ڈرے میں اپنا پارٹ دہرا رہا ہو۔ اس کے برعکس اگر چہ آتنا پاولوونا چالیس کے پیٹے میں داخل ہو چکی تھی، اس کی گفتگو ہمیشہ ہنسنے، جذبات اور توانائی سے بھرپور ہوتی تھی۔ اپنے جوش و جذبے کا پوری قوت سے اظہار کرتا اس کا مجلس رویہ بن چکا تھا اور بعض اوقات جب اس کی طبیعت مائل بہ اندر دگی ہوتی تھی، تب بھی وہ اپنے جوش و جذبے کے اظہار میں پوری شدت اور توانائی بردے کا رلاتی تھی تاکہ ان لوگوں کو، جو اسے جانتے تھے، کسی قسم کی مایوسی کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ مصنوعی تبسم، جو ہر آن اس کے لبوں کے اڑدیں پڑوس رقصاں رہتا تھا، اگر چہ اس کے تھکے تھکے اور مضطرب چہرے سے میل نہیں کھاتا تھا، لیکن اس امر کی غم زنی ضرور کرتا تھا کہ اسے اپنے اس دل آویز عیب کا احساس ہے تو کسی، تاہم بگڑے بچے کی طرح وہ اپنے اس عیب کی اصلاح نہ تو کرنا چاہتی تھی، نہ کر سکتی تھی اور نہ کرنا ضروری سمجھتی تھی۔

گفتگو سیاست کے بارے میں ہو رہی تھی کہ بیچ میں آتنا پاولوونا پھٹ پڑی۔

”او نہ، آسٹریا کے متعلق تو مجھ سے بات ہی نہ کرو۔ ممکن ہے اس بارے میں میرا علم بالکل صفر ہو لیکن آسٹریا نے نہ تو کبھی جنگ کی خواہش کی ہے اور نہ کبھی وہ جنگ چاہے گا۔ وہ ہمارے ساتھ ہے وفا کی کر رہا ہے۔ روس کو تنہا یورپ کے نجات دہندہ کا کردار ادا کرنا ہوگا۔ کاتب تقدیر نے اسے ہمارے شفیق محسن اور مربی کے بارے میں رقم کر دیا ہے۔ اس کا انھیں پورا پورا احساس ہے اور اس پر وہ پورا بھی اتریں گے۔ یہی ایک بات ہے جس کا مجھے سو فیصد یقین ہے۔ ہمارے نیک سیرت اور عظیم تر سپر طور کے کندھوں پر اس ردے زمین پر عظیم ترین ذمے داری آن پڑی ہے، ورنہ اسے پاکیزہ اخلاق اور شریف انفس انسان ہیں کہ (مجھے یقین ہے کہ) خود خداوند بھی ان کا ساتھ نہیں چھوڑے گا۔ جس فریضے کو نبھانے کی ذمے داری مقدر نے انھیں سونپ دی ہے، وہ اس سے پہلوئی نہیں کریں گے بلکہ سے بہ انداز احسن سرانجام دیں گے اور انقلاب کے نوسرے سامپ کا، جو اس قاتل اور مفسدہ پرداز بدعتی کی ذات کے حوالے سے پہلے سے کہیں زیادہ بھیانک صورت اختیار کر چکا ہے، ہر کچل کر رکھ دیں گے۔ بھلے مانس اور نیک لوگوں کا جو خون بہا ہے، اس کا کفارہ بھی ہمیں داکرنا ہوگا اور اس کا انتقام بھی ہمیں کولینا ہوگا۔ میں تم سے

پوچھتی ہوں کہ ہم کس پر اعتبار کر سکتے ہیں؟ انگلستان، جس کی نس نس میں تجارتی جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے، امپراطور الکساندر (Aleksander) کی روح کامل کی بلندی اور رفعت کو نہ تو سمجھ سکتا ہے اور نہ کبھی سمجھ پائے گا۔ اس نے المٹا خاں کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ وہ تو یہ سمجھتا ہے کہ جو کچھ ہم (روی) کر رہے ہیں اس کے پس پردہ ماننا ہمارے کوئی خود غرضانہ مقاصد کا فرمایا ہے اور اگر یہ مقاصد اوپر کی سطح پر نظر نہیں آتے تو کہیں نہ کہیں زیریں سطح ضرور پوشیدہ ہوں گے۔ انھوں نے نو داسلت سیف سے کیا کہا؟ کچھ بھی نہیں۔ یہ انگریز نہ تو یہ سمجھ پائے ہیں اور نہ ان میں اتنی عقل و فراست ہے کہ وہ یہ سمجھ سکیں کہ ہمارے امپراطور اتنے بے غرض اور عالی ظرف ہیں کہ وہ دوسروں کی خاطر اپنے حرم مقادرات کی بھیٹ دے سکتے ہیں۔ وہ اپنی ذات کے لیے کچھ نہیں چاہتے لیکن عالم اور انسانیت کی بھلائی کے لیے وہ سب کچھ کرنے کے لیے تیار ہیں۔ انھوں (انگریزوں) نے آخر وعدہ کس بات کا کیا ہے؟ کسی کا بھی تو نہیں۔ اور جو تھوڑا بہت وعدہ کیا بھی ہے، اسے وہ بھول گئے ہیں۔ پرشیا (Prussia) پہلے ہی یہ ڈھنڈورا پیٹ چکا ہے کہ یونان پارت تا قابل تسخیر ہے اور سارا یورپ متحد ہو کر بھی چاہے، پھر بھی اس کا مقابلہ کرنے کی سکت پیدا نہیں کر سکتا۔۔۔ ورنہ ہارڈن برگ (Hardenberg) یا ہوگ ولس (Haugwitz) جو کچھ کہتے ہیں، مجھے ان کے ایک غلط پر بھی اعتبار نہیں۔ اہل پرشیا کی یہ مشہور زمانہ غیر جانبداری پھندے سے بڑھ کر کچھ نہیں۔ مجھے صرف خداوند کی ذات اور اپنے محبوب، فیض انجور امپراطور کے عالی مرتبت مقدر پر اعتبار ہے۔ ہمارے حضور یورپ کا دفاع کریں گے؟ وہ اپنا تک خاموش ہو گئی۔ جس جوش اور دلولے کے ساتھ وہ تقریر کر رہی تھی، اس کی تندی پر اس کے اپنے ہونٹوں پر کھسپائی مسکراہٹ نمودار ہو گئی۔

”میرا خیال ہے کہ اگر ہم اپنے ڈیرنٹ نیسکے روڈے (Wintzenge rode) کی بجائے تسمیں اپنا سفیر بنا کر بھیجے۔“ پرنس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا، ”تو اپنے تیز دھڑار حصوں سے تم پرشیا کے بادشاہ کو آسانی سے مسخر کر لیتیں۔ تم فصاحت و بلاغت کے کیا وہ یا بہائی ہو مجھے چاہئے کا نہیں پوچھو گی؟“

”بس ایک منٹ۔“ وہ اب پرسکون ہو چکی تھی اور اس نے مزید کہا: ”ہاں، چلتے چلتے میں تسمیں یہ بھی بتا دوں کہ آج رات میرے ہاں دو خمرے دار ہستیاں آ رہی ہیں۔ ان میں سے ایک کا ڈنٹ موخت مارغ (Mortemart) ہے۔ دو خاں¹⁰ خاندان کے ویلے سے اس کی رشتہ داری مونٹ موغنیسی¹¹ خاندان سے، جس کا شمار فرانس کے سرکردہ گھرانوں میں ہوتا ہے، بھی ہے۔ جو لوگ (فرانس سے) ہجرت کر کے یہاں آئے ہیں، موخت مارغ ان میں سچا اور کمر شخص ہے۔ دوسرا آدی صدر راہب مور یو (Morio) ہے۔ تم اس ٹالہ روڈر گار شخصیت سے تو واقف ہی ہو گے؟ امپراطور اسے اپنے دربار میں بازیابی کا شرف عطا کر چکے ہیں۔ تسمیں اس بارے میں کوئی اطلاع ملی؟“

”مجھے ان سے مل کر بہت خوشی ہو گی،“ پرنس نے جواب دیا، ”لیکن یہ تو بتاؤ“ اب کے اس کا انداز گفتگو ایک قسم کی دانستہ پردائی اختیار کر چکا تھا گویا اس وقت جو سوال وہ پرچھنا چاہتا تھا، وہ بیٹھے اٹھائے اتفاقاً اس کے ذہن

میں رہ آیا تھا جب کہ اصل حقیقت یہ تھی کہ اس کی آمد کا بڑا مقصد ہی یہ تھا کہ وہ اس سوال کی ٹوہ لگا سکے۔ ”کیا یہ بات درست ہے کہ مادرِ ملکہ بیرن فنک (Funk) کو دینا میں فرسٹ سیکرٹری مقرر کرانا چاہتی ہیں؟ عام تاثر یہ ہے کہ اس شخص میں کوئی خاص خوبی نہیں۔“

پرنس وائیلی یہ عہدہ اپنے بیٹے کے لیے حاصل کرنے کا متنبی تھا لیکن دوسرے لوگ امپراطورہ ماریا فیودرونا کی وساطت سے اس پر بیرن کا تقرر کرانا چاہتے تھے۔

آئنا پاولوونا نے اپنی آنکھیں میچ لیں۔ یہ اس امر کی علامت تھی کہ امپراطورہ جو کام مناسب سمجھتی تھی، اس کی یا کسی دوسرے شخص کی یہ مجال نہیں کہ اس پر حرف گیری کر سکے۔

”مادرِ امپراطورہ سے بیرن فنک کی سفارش خود ان کی اپنی ہمشیرہ محترمہ نے فرمائی تھی،“ اس نے خشک اور پُر حزن لہجہ میں بس یہی کہنے پر اکتفا کیا۔

جونہی آئنا پاولوونا کی زبان پر امپراطورہ کا نام آیا، اس کے چہرے پر نہایت عیشت اور پر خلوص جان سپاری، پر جوش عقیدت اور عزت و احترام کے جذبات اُمٹ آئے۔ ان جذبات میں افسردگی کی آمیزش بھی تھی۔ امپراطورہ اس کی مربیہ تھی اور جب بھی وہ اپنی اس عالی نسب اور نامور مربیہ کا نام لیتی، اس کے چہرے کی یہی کیفیت ہو جاتی۔ اس نے بتایا کہ امپراطورہ نے بہ کمال لطف و کرم بیرن فنک پر بے حد شفقت فرمائی تھی۔ اس کے ساتھ ہی اس کے چہرے پر حزن و ملال کے بادل دوبارہ چھا گئے۔

پرنس نے اپنی بے اعتنائی کا رد یہ برقرار رکھا اور خاموش رہا۔ آئنا پاولوونا نے اسے ہلکی سی ڈانٹ یوں پلا دی تھی کہ اس نے ایک ایسے شخص کا ذکر، جس کی سفارش امپراطورہ سے کی گئی تھی، غیر محتاط اور پر تحقیر انداز سے کرنے کی جرأت کی تھی۔ لیکن وہ ایسی خاتون تھی جس نے ساری عمر شاعی دربار کی چوکھٹ پر جیس سائی کرتے بتائی تھی۔ چنانچہ اس میں عیاری، حاضر جوابی اور موقع محل کے مطابق بات کرنے کا سلیقہ فطرتاً کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ وہ اس کی دل جوئی کرنا چاہتی تھی۔

”کیوں نہ چلتے چلتے تمہارے خاندان کا کچھ ذکر ہو جائے؟“ وہ گویا ہوئی۔ ”تم جانتے ہو کہ جب سے تمہاری بیٹی نے محفلوں میں آنا جانا شروع کیا ہے،¹ اس نے سب کے دل موہ لیے ہیں۔ لوگ کہتے ہیں کہ اس کا حسن چاند کو شرماتا ہے۔“

شکریہ اور احترام کا اظہار کرنے کے لیے پرنس جھک کر آداب بجالایا۔

کچھ دیر خاموشی رہی۔ ”میں اکثر سوچتی ہوں،“ آئنا پاولوونا نے پھر کہنا شروع کیا۔ وہ پرنس کے ذرا قریب کھسک آئی اور ازراہ التفات مسکرا دی گویا وہ اس بات کا عندیہ دینا چاہتی ہو کہ اب سیاست اور سماجی موضوعات کے بارے میں مزید کچھ کہنے سننے کی ضرورت نہیں رہی بلکہ خلوت میں بے تکلفانہ اور رازدارانہ گفتگو کرنے کا وقت آگیا ہے۔ ”میں اکثر سوچتی ہوں کہ بعض اوقات زندگی کی نعمتیں کیوں غیر منصفانہ انداز سے تقسیم ہو جاتی ہیں۔“

(خود اپنے آپ کو دیکھو) مقدر نے آخر تمہیں ہی کیوں دو۔ میں تمہارے سب سے چھوٹے بیٹے اناطول کا ذکر گول کر رہی ہوں کیونکہ وہ مجھے پسند نہیں ہے۔“ اس نے یہ لفاظ اپنی بھویں میکینز سے اور کچھ اس لہجے سے کہے گویا اس کی بات حرف آخر ہے اور سننے والے اسے بلا چون و چرا صحیح تسلیم کر لے گا۔ ”دو پیارے اور کن موہنے بچوں سے نوازنے کے لیے جن لیا ہے؟ اور سچی بات تو یہ ہے کہ تم ان کی وہ قدر نہیں کرتے جتنی کہ دوسرے کرتے ہیں۔ چنانچہ تم اس بات کے مستحق نہیں کہ ان کے باپ کہلو اؤ۔“

اور ایک بار پھر اس کے لبوں پر وہ جد آور تبسم لہرائے لگا۔
 ”تم چاہتی کیا ہو؟ لا داتر¹³ کے الفاظ میں شاید مجھے بچوں سے لاڈ پیار کرنا نہیں آتا،“ پرنس نے بھن کر جواب دیا۔

”یہ سخرگی چھوڑ دو۔ میں تمہارے ساتھ انتہائی سنجیدہ گفتگو کرنا چاہتی ہوں۔ تم جانتے ہو کہ میں تمہارے چھوٹے بیٹے سے بے حد ناخوش ہوں اور ہاں، یہ بات باہر نہ نکلے۔“ (اس کے ساتھ اس کے چہرے پر وہی حزن و ملال کے باد چھ گئے۔) ”چند دن ہوئے، کچھ لوگ امپراطور کی موجودگی میں اس کے متعلق باتیں بنا رہے تھے... اور ہر شخص تم پر ترس کھاتا تھا۔“

پرنس چپ سا دھمے بیٹھا رہا۔ وہ بھی ذر کی ذرا خاموش ہو گئی۔ تاہم جواب کے انتظار میں وہ سنی خیز انداز میں اسے دیکھتی رہی۔ پرنس واسیلی کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔

”میں اس کے متعلق کیا کر سکتا ہوں؟“ آخر کار وہ گویا ہوا۔ ”تم جانتی ہو کہ باپ اپنے بچوں کی تعلیم کے سلسلے میں جو کچھ کر سکتا ہے، وہ سب کچھ میں نے کیا لیکن وہ دونوں ہی گھ مڑ نکلے۔ اپولیت (Ippolit) کم از کم بھرا مانس احق ہے۔ لیکن اناطول (Anatole) حق بھی ہے اور کبھی نچلا بھی نہیں بیٹھ سکتا۔ دونوں میں یہی واحد فرق ہے۔“ اس نے کہا اور مسکراتے لگا لیکن اب کے اس کی مسکراہٹ میں معمول سے ہٹ کر غیر فطری پن اور گرما گرمی تھی۔ نتیجتاً اس کے دہانے کے گرد پیش کی کیریں غیر متوقع طور پر بھڑی اور مکدہ دکھائی دینے لگیں۔

”لیکن تم جیسے مردوں کے ہاں بچے پیدا ہی کیوں ہوتے ہیں؟ اگر تم باپ نہ ہوتے، تو مجھے تمہاری ذات میں کیڑے ڈالنے کا موقع دستیاب نہ ہوتا،“ آنا پولوڈونا نے سراٹھا کر جواب دیا۔ وہ غور و فکر میں ڈوبی معلوم ہوتی تھی۔

”میں تمہارا بونا دار غلام ہوں اور صرف تمہارے سامنے ہی اس بات کا اعتراف کر سکتا ہوں کہ میرے بچے۔ میرے بچے میری زندگی کا سب سے بڑا روگ ہیں۔ یہ وہ صلیب¹⁴ ہے جو اٹھائے بنائیں نہیں پڑتی۔ میں اس شخص کی توجیہ اسی طرح کرتا ہوں۔ خیر، تم چاہتی کیا ہو؟“ وہ چپ ہو گیا۔ اس کے دوتیرے سے یہ دکھائی پڑتا تھا جیسے اس نے ظالم مقدر کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا ہو۔

آنا پولوڈونا گہری سوچ میں کھو گئی۔

”کیا تم نے کبھی اپنے شاہ خرچ بیٹے اناطول کی شادی کے بارے میں سوچا ہے؟“ اس نے پوچھا۔ ”لوگ

کہتے ہیں کہ جن بودھی بیسیوں کی اپنی شادی نہیں ہوئی ہوتی، انھیں رشتے مٹتے کرانے کا فیصلہ ہوتا ہے۔ خود مجھ میں یہ کمزوری ہے یا نہیں، اس کا مجھے کبھی شعور نہیں ہو۔ تاہم میں ایک ننھی ننھی گڑیا سی دوشیزہ کو جانتی ہوں۔ وہ ہماری عزیزہ ہے اور اپنے باپ سے بے حد آزر دہ۔ اس کا نام پرنس بکونسکا یا (Bolkonskaya) ہے۔“

پرنس واسلی نے کوئی جواب دیا لیکن جس پھرتی اور عجلت کے ساتھ وہ اپنے حاشیے پر درودے کر بھولی بھری باتیں یاد کرنے کی کوشش کر رہا تھا، وہ صرف گھگھ دیا دار شخص ہی کا خاصہ ہوتا ہے۔ پھر اس نے جس انداز سے اپنے سر کو خفیف سی جنبش دی، وہ اس امر کی علامت تھی کہ سے جو معصومات فراہم کی گئی ہیں، وہ ان کی نوعیت اور اہمیت سمجھ گیا ہے اور ان پر سوچ بچار کر رہا ہے۔

”کیا تمہیں معلوم ہے کہ اس صاحب زادے پر میرا سالانہ چالیس ہزار روپے خرچ ہو رہا ہے؟“ بٹھا ہر ہیکہ نظر آ رہا تھا کہ اسے اپنے خیالات کی افسردہ رد پر قابو پانے میں سخت دشواری کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ اس نے کچھ دیر توقف کیا اور پھر گویا ہوا: ”اگر اس کے یہی پتھن رہے، پھر پانچ سال میں یہ رقم کہاں سے کہاں تک پہنچ جائے گی؟“ یہ ہیں باپ بننے کے فوائد! خیر، یہ پرنس امیر کیر ہے؟“

”اس کا باپ بے پناہ دولت کا مالک ہے اور کتھوں بھی پرلے درجے کا ہے۔ وہ شہر سے دور دیہات میں رہتا ہے۔ تمہیں معلوم ہوگا کہ یہ وہی مشہور معروف پرنس بکونسکی (Bolkonsky) ہے جسے اس زمانے میں فوج سے ریٹائر کر دیا گیا تھا جب مرحوم امپراطور ابھی قید حیات تھے۔ یاروں نے اسے ’شاہ پرشیا‘ کا لقب دے رکھا تھا۔ وہ بے حد ہوشیار اور سیانا آدمی ہے اور اس کے ساتھ ہی ذرا سنگی بھی ہے۔ آسانی سے قابو میں نہیں آئے گا۔ پیاری لڑکی کتنی دکھی ہے، اس کا تم اندازہ بھی نہیں کر سکتے۔ اس لڑکی کا ایک بھائی بھی ہے۔ وہ کو تو زوف کا ایڈی کا نگ ہے اور اس نے حاشی میں لے مینین (Lisa Meinen) سے شادی کی ہے۔ وہ آج شام یہاں آئے گا۔“

”ڈیزر آنیت (Annette)، سنو“ پرنس نے کہا۔ اس نے اچانک اپنی دمساز کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام لیا اور بتائیں کیوں، اسے نیچے جھکا دیا۔ ”میری خاطر یہ معاملہ طے کرادو۔ پھر سمجھ لو کہ میں عمر بھر کے لیے تمہارا غلام بے دام بن گیا۔ بلکہ گلام جیسا کہ میرا دیہاتی کارندہ میرے نام اپنی رپورٹوں میں اپنے متعلق لکھتا ہے۔ وہ سلجھے ہوئے اور متمول خاندان کی دوشیزہ ہے۔ میں بھی یہی کچھ چاہتا ہوں۔“

پھر اس نے نہایت بے تکلفی اور پراعتماد عنائی کے ساتھ، جو صرف اسی کا خاصہ تھی اور یوں اسے دوسروں سے ممتاز کرتی تھی، امپراطورہ کی مصاحبہ کا ہاتھ اپنے ہونٹوں تک بلند کیا اور اس پر اپنے بوسے کے نشانات ثبت کرنے کے بعد اسے ہلکے ہلکے پیچھے جھلانے لگا۔ اس کے بعد وہ دوبارہ کرسی میں دھنس گیا اور منگلی باندھ کر اوپر خد میں دیکھنے لگا۔

”صبر اور انتظار کرو،“ آنا پاولوونا نے سوچتے ہوئے کہا۔ ”میں آج شام ہی نو جوان بکونسکی کی اہلیہ لسا سے بات کروں گی۔ شاید یہ قبل کسی طور سے چڑھ جائے۔ شاید تمہارا خاندان پہلا خاندان ہوگا جس میں کنواری

بڑھیا کے طور طریقے دیکھنے کی ابتدا کروں گی۔“

2

آنا پاولوونا کے گھر تنگ دوسری روتی میں بتدریج اضافہ ہونے لگا۔ پیٹرز برگ¹⁵ کے بالائی طبقے کے سرکردہ اسباب وہاں موجود تھے۔ عمر اور کردار کے اعتبار سے ان میں بھانت بھانت کے لوگ شامل تھے۔ ان میں صرف ایک قدر مشترک تھی کہ ان سب کا تعلق معاشرے کے ایک ہی طبقے سے تھا۔ پرنس وایسلی کی دختر نیک اختر، چندے آفتاب چندے ماہتاب، ہیلین (Helene)، اپنے والد کو سفیر کی حیثیت میں پہنچانے کے لیے آئی تھی۔ اس نے جولیاں س زب تن کر رکھا تھا، اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ بال (ball) میں شریک ہونے کی تیاری کر کے آئی تھی۔ اس نے اپنے بیوسات پر سپر طور کی مصاحبہ کا اعتبار لی نشان بھی ٹانگ رکھا تھا۔ کوچک پرنس بلکونسکا یا بھی، جس کے متعلق مشہور تھا کہ وہ پیٹرز برگ کی عظیم ترین سحر آفریں خاتون ہے، روتی افروز تھی۔ اس کا گزشتہ سر، کے دوران میں بیاہ ہوا تھا۔ چونکہ اس کا پاؤں بھاری تھا اس لیے وہ بڑے پیمانے کی تقریبات میں شرکت کرنے سے احتراز برتے لگی تھی لیکن چھوٹی موٹی محفولوں میں اب بھی پہنچ جاتی تھی۔ پرنس دیسی کا بیٹا پولیت موخت مارغ کی، جس کا تعارف بھی اس نے خود ہی کر لیا، معیت میں آیا۔ صدر راہب سور یو اور متعدد دیگر افراد بھی حاضر تھے۔

”تم ابھی تک ma tante سے نہیں ملے؟“ یا ”کیا تم ma tante سے واقف نہیں؟“ آنا پاولوونا ہر نئے آنے والے مہمان سے یہی سوال پوچھتی اور نہایت سنجیدہ اور پردقار انداز سے اسے ایک کوتاہ قامت بزرگ خاتون کے پاس لے جاتی۔ اس خاتون نے اپنے سر پر جو ٹوپی اوڑھی ہوئی تھی، اس پر رہن کی ونچی اونچی کلغیاں لگی ہوئی تھیں اور جونہی مہمان پہنچنا شروع ہوئے، وہ دوسرے کمرے سے نکل کر یہاں آگئی تھی۔ آنا پاولوونا اس کے قریب پہنچنے پر اپنی نگاہیں مہمان کے جسم سے ma tante کے چہرے پر منتقل کرتی، اسے مہمان کا نام بتاتی اور واپس چلی جاتی۔

ہر مہمان اس غیر معروف، غیر دلچسپ اور غیر ضروری ma tante سے علیک سلیک کی رسم پوری کرتا جبکہ آنا پاولوونا سنجیدہ اور پرہیزگار توجہ سے علیک سلیک کی یہ کارروائی دیکھتی اور بزبان خاموشی اس پر صدمہ دیتی۔ ma tante ہر شخص سے اس کی، بچی اور اسپر طورہ کی صحت کے بارے میں ایک جیسے الفاظ کہتی۔ البتہ اسپر طورہ کے بارے میں وہ اتنا اضافہ کرتی ”خداوند کا شکر ہے کہ آج ان کی طبیعت بہتر ہے۔“ ہر مہمان کی یہ کوشش ہوتی کہ وہ اس بڑھیا سے جلد از جلد ہنڈ چھڑائے لیکن شائستگی کے تقاضے کے پیش نظر وہ اپنی بے قراری کو علانیہ ظاہر نہ ہونے دیتا تاہم جونہی علیک سلیک کا صبر آرزو، فریضہ پورا ہوتا، وہ اطمینان کی سانس لیتا، پر سے ہٹا اور پوری شام ایک بار بھی اس کے قریب نہ پھٹکتا۔

نوع پر نس بلکوسکا یا اپنا کشیدہ کاری کا سامان، جو اس نے تختیں تھیلے میں، جس پر سنہری تاروں سے کڑھائی کی گئی تھی، رکھا ہوا تھا، اپنے ساتھ لائی تھی۔ اس کا پتلا نفیس بالائی ہونٹ، جس پر باریک سبزے نے ہلکا ہلکا سا سایہ بنا رکھا تھا، اتنا چھوٹا تھا کہ اس کے دانت چھپ گئے نہ چھپتے۔ یہ ہونٹ جب اوپر اٹھتا، بہت خوبصورت معلوم ہوتا لیکن جب یہ زیریں ہونٹ سے ملنے نیچے گرنا، تو اس کی خوبصورتی اور دل کشی میں اور بھی اضافہ ہو جاتا۔ جیسا کہ انتہائی دل کش خواتین کے ساتھ ہمیشہ ہوتا ہے، اس کی یہی خالی — بالائی ہونٹ کا چھوٹا پن اور نرم وادھن — ایک خاص قسم کی خوبصورتی بن گئی تھی جو محض اسی سے مخصوص تھی۔ اس نازک اندام، چھوٹی موٹی حسین کڑیا کو، جس کا انگ، تنگ تندرستی ورتوانائی سے بھرپور تھا، جو عنقریب ماں بننے والی تھی اور جو اپنے بوجھ کو یوں اٹھائے پھر رہی تھی، جیسے یہ کوئی نہایت ہلکی پھلکی چیز ہو، جو شخص بھی دیکھتا، اس کا دل باغ باغ ہو جاتا۔ بوڑھوں اور افسردہ دل اور بالی نو جوانوں کو، جب اس کی صحبت میں چند لمحات گزارنے اور اس سے چند باتیں کرنے کا موقع میسر آتا، یوں محسوس ہوتا جیسے ان کے دگ دپے میں یہ جوش اور ولولہ سرایت کر گیا ہو۔ اس کے ساتھ گفتگو کے دوران میں جب آدمی کو ہر ہر لفظ پر اس کی درخشاں مسکراہٹ اور اس کے صاف شفاف سپید دانتوں کی چمک دمک نظر آتی، تو اسے کچھ اس قسم کا احساس ہوتا جیسے اس کی خون بدل گئی ہو اور آج شام وہ خاص طور پر خوشی سے نہاں ہو گیا ہو۔ بد تخصیص یہ بات ہر شخص کے بارے میں درست تھی۔

کوچک پرنس کا تھیل اس کے بازو میں لٹک رہا تھا۔ اس نے جھومتے جھومتے، ننھے ننھے قدم اٹھاتے، میز کے گرد چکر کاٹا اور تقری سادار کے قریب صوفے پر بیٹھ گئی۔ وہ یوں پر مسرت انداز سے اپنے لباس کی شکنیں درست کر رہی تھی جیسے کام خواہ کیسا ہی کیوں نہ ہو لیکن جب وہ اس میں ہاتھ ڈالتی ہے، وہ نہ صرف خود بلکہ اس کے گرد و پیش دیگر تمام لوگ بھی اس سے یکساں مسرور ہوتے ہیں

”میں اپنا کھکھرو ساتھ لے آئی ہوں،“ اس نے اپنا بیک کھرتے اور حاضرین محفل پر عمومی نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ ”دیکھو، آہستہ!“ اس نے اپنی میزبان کی جانب مڑتے ہوئے کہا ”میرا خیال ہے کہ تم نے میرے ساتھ کوئی چکر و گرن نہیں چلایا ہوگا۔ تم نے لکھا تھا کہ یہ بالکل مختصر سی محفل ہوگی۔ دیکھ لو، میں کوئی خاص بن ستور کر نہیں آئی۔“ اور اس نے اپنے بازو آگے بڑھا دیے تاکہ وہ اپنے انتہائی نفیس اور دیدہ زیب ڈریس کی جسے لیس کی خوبصورت جھال سے آراستہ کیا گیا تھا اور جس پر ربن کی خاصی چوڑی پٹی بندھی تھی، نمود کر سکے۔

”لہذا، گھبراؤ نہیں، تم دوسروں کی نسبت سدا زیادہ حسین نظر آؤ گی،“ آنا پاولوونا نے جواب دیا۔

”آپ کو شاید معلوم ہے کہ میرے شوہر مجھ سے پیچھا چھڑا رہے ہیں،“ لسانے سی لہجہ ورحب معمول فرامشی میں ایک جرنیل سے مخاطب ہو کر کہا۔ ”وہ موت سے ہم کنار ہونا چاہتے ہیں۔ آپ بتائیں،“ اب کے اس نے پرنس وایلی سے بات کرتے ہوئے کہا، ”کہ یہ غلیظ اور وایلیات جنگ کیوں برپا کی جا رہی ہے؟“ اور اس کے جواب کا انتظار کیے بغیر وہ اس کی حسین و جمیل بیٹی ہیلیں کی جانب متوجہ ہو گئی۔

”یہ ننھی ننھی پرنس کتنی خوبصورت اور دلکش ہے، جی چاہتا ہے کہ آدمی اس کی پرستش کرتا رہے،“ پرنس وائیلی نے زریب آٹنا پاولوونا سے کہا۔

اس کے بعد جو لوگ آئے، ان میں ایک تندرست و توانا اور بھرے بھرے جسم کا مالک نو جوان تھا۔ اس کے سر کے بال خاصے باریک کئے ہوئے تھے۔ آنکھوں پر چشمہ، جسم پر ہلکے رنگ کی بر جس، جس کا اس دور میں عام چلن تھا بھورا زریب کوٹ اور قمیص کے منوں کے اوپر سفید جھار تھی۔ یہ نو مند نو جوان کاؤنٹ بزوونوف کا، جو ہمرا طورہ کیٹھرن کا نامی گرامی مصاحب تھا اور اب ہاسکو میں ستر مرگ پر درار تھا، غیر صحیح النسب بیٹا تھا۔ اس نو جوان کا نام پیئر (Pierre) تھا۔ چونکہ وہ حالی ہی میں دس اور سے، جہاں وہ بغرض تعلیم متیم تھا، ہوا تھا، اس سے وہ ابھی تک کسی سرکاری منصب پر فائز نہیں ہوا تھا۔ اونچے طبقے کی محافل میں بھی یہ اس کا اولین دور و تھا۔

آٹنا پاولوونا نے محض سر کی جنبش سے اس کا خیر مقدم کیا۔ اس کا یہ انداز صرف ان اشخاص کے لیے مخصوص تھا جو اس کے ڈرائنگ روم میں آنے والوں میں حفظ مراتب کے اعتبار سے پہلی ترین سطح پر ہوتے۔ اس برائے نام علیک سلیک کے باوجود، جب اس نے پیئر کو اندر آتے دیکھا، اس کے چہرے پر بے چینی اور دوسو سوں کے سائے لہرائے گئے جیسے وہ کوئی مہیب درندہ ہو اور اس کے ڈرائنگ روم کے ماحول کے لیے قطعی اجنبی۔ یہ درست ہے کہ ڈیل ڈول کے اعتبار سے وہ محفل میں موجود کسی بھی دوسرے شخص کی نسبت قدرے جسیم تھا لیکن اسے دیکھ کر آٹنا پاولوونا کے اوسان جس طرح خفا ہوئے، اس کی صرف یہی توجہ یہ ہو سکتی تھی کہ شرمیلی اور انتہائی فطری وضع قطع کے باوجود وہ ذہین اور ہاریک چین شخص تھا۔ اور یہی چیز اسے ڈرائنگ روم میں موجود ہر دوسرے شخص سے ممتاز کرتی تھی۔

”مسید پیئر، یہ آپ کی بڑی لوازش ہوگی کہ آپ ایک عاجز اور لاچار مریفہ سے ملنے تشریف لے چلیں،“ آٹنا پاولوونا نے اپنی آٹنی کے ساتھ، جب وہ اسے اس کی خدمت میں پیش کرنے کے لیے لے جا رہی تھی، بے چین نگاہوں کا تبادلہ کرتے ہوئے کہا۔

جواب میں پیئر بڑبڑایا لیکن اس نے یہ کہا، یہ کسی کے پلے نہ پڑا اور وہ کمرے میں چاروں اطراف متحس نگاہیں دوڑاتا رہا۔ جب وہ ستر آٹنی کی جانب جا رہا تھا، ننھی ننھی پرنس کو یوں دفور سرت سے جھک کر آداب بجا لایا جیسے وہ اس کی بے تکلف دوست ہو۔ آٹنا پاولوونا کے اندیشے بالکل صحیح ثابت ہوئے۔ پیئر سے اتنا بھی نہ ہوا کہ وہ اپرا طورہ کی صحت کے بارے میں ادھیڑ عمر خاتون کی تقریر ختم ہونے کا انتظار ہی کر لیتا۔ یہ تقریر ابھی جاری تھی کہ پیئر دوسری طرف چل دیا۔ آٹنا پاولوونا اس کی اس حرکت پر ششدر رہ گئی۔ اس نے اس کا بازو پکڑا اور اس سے پوچھنے لگی:

”تم صدراہب سور یو سے واقف ہو؟ انتہائی دلچسپ شخص ہیں...“

”ہاں، مستقل امن کے بارے میں ان کا منصوبہ میرے علم میں آیا ہے۔ بظاہر بہت دلکش منصوبہ ہے لیکن قابل عمل نہیں۔“

”نہیں، تم ایسا نہیں کہہ سکتے“ آتنا پاولوونا نے جواب دیا۔ اس نے یہ الفاظ محض اس لیے کہے کیونکہ کچھ کہنا اس کا فرض بنتا تھا اور وہ میربان کی حیثیت سے، چنی ڈسے داریاں دوبارہ سنبھال چاہتی تھی۔ لیکن دیر سے ایک مزید بدتمیزی سرور ہو گئی۔ پہلے تو اس نے یہ کیا کہ ایک خاتون کو اپنی بات مکمل کرنے کا موقع نہ دیا بلکہ اسے بیچ منجدھار میں چھوڑ چلتا بنا اور اب یہ حرکت کی کہ دوسری خاتون کو، جو اس سے پٹہ چھڑانے کی فکر میں تھی، روک لیا۔ اس نے گردن جھکائی، اپنے دونوں پاؤں ایک دوسرے سے خاصے دور دور فرش پر جمائے اور آتنا پاولوونا کو سمجھانے لگا کہ اس کے خیال میں صدر راہب کا منصوبہ کیوں خیالی اور ناقابل عمل ہے۔

”ہم اس کے متعلق بعد میں گفتگو کریں گے“ آتنا پاولوونا نے چہرے پر مسکراہٹ بکھیر کر کہا۔

اور اس نوجوان سے، جو نہ آداب محفل سے آشنا تھا اور نہ بے بات کرنے کا سلیقہ جانتا تھا، جان چھڑا کر آتنا پاولوونا نے میربان کی ڈسے داریاں دوبارہ سنبھال لیں۔ وہ اپنے مہمانوں کی باتیں کان لگا کر سن رہی تھی اور ہر چیز کا بنور جائزہ لے رہی تھی تاکہ گفتگو کے دوران میں جو نہی کوئی رخسہ آئے، وہ جھپک کر مدد فراہم کر سکے۔ دھماکہ کا تنے کی مل کے سپردانہ کی طرح، جو اپنے ماتحت مزدوروں کو کام پر لگانے کے بعد مشینوں کے مابین گھومنے پھرنے لگتا ہے تاکہ اگر کہیں کسی تکلے میں کوئی خرابی نظر آئے جو چلتے چلتے بند ہو گیا ہو معمول سے زیادہ شور کرنے لگا ہو یا دستور کے برعکس چمیں چمیں کی آوازیں پیدا کرنے لگا ہو، تو جھٹ پٹ لپک کر جاتا ہے، مشین کی رفتار ڈھیلی کرتا ہے، اس کا نقش دور کرتا اور اسے دوبارہ درست طریقے سے چلا دیتا ہے، آتنا پاولوونا بھی بعینہ ہی طرح اپنے ڈرائنگ روم میں گھوم پھر رہی تھی۔ کبھی وہ اس گروپ کے پاس پہنچتی جو باتیں کرتے کرتے خاموش ہو جاتا یا اس گروپ کے پاس جو شائستگی کے تمام تقاضوں کو بالائے طاق رکھ کر اونچے اونچے لمحوں سے بڑا چھت سر پر اٹھ رہا ہوتا۔ وہ ایک آدھ لفظ کہتی اور یوں گفتگو کی مشین کو دوبارہ صحیح ڈگر پر ڈال دیتی۔ ان تفکرات کے مابین بھی میٹر کے متعلق اس کی پریشانی خاص طور پر ہو رہی تھی۔ جب کبھی وہ یہ سننے کے لیے کہ موخت، غ کے حلقے میں کیا موضوع زیر بحث ہے اور یا صدر راہب مور یو کے ارد گرد جن لوگوں نے گھیرا ڈال رکھا ہے، وہ ان سے کیا کہہ رہا ہے، پہنچتا، وہ اندیشناک نظروں سے، سے بغور دیکھنے لگتی۔

میٹر نے سر لٹک غیر میں تعلیم حاصل کی تھی۔ آتنا پاولوونا کی محفل روس میں اس کی اولین محفل تھی۔ وہ جانتا تھا کہ پیٹرز برگ کے تمام دانشور یہاں جمع ہیں۔ یہاں جو گفتگو ہو رہی تھی، وہ چاہتا تھا کہ اس کا ایک ایک لفظ اس کے کانوں تک پہنچ جائے۔ اس بچے کی طرح، جسے کھلونوں کی دکان میں کھلا چھوڑ دیا گیا ہو کہ وہ جو کھلونا چاہے، چن لے اور جس کی سمجھ میں نہ آئے کہ وہ کیا منتخب کرے اور کیا نہ کرے، اسے بھی یہ خوف دامن گیر تھا کہ وہ کوئی اہم بات سننے سے نہ رہ جائے۔ چنانچہ کبھی وہ ایک گروپ کی طرف لپکتا اور کبھی دوسرے کی طرف۔ جب اسے وہاں موجود حضرات کے چہروں پر خود غما دار استعجابات نظر آتے، اسے ہر دم توقع ہوتی کہ اب کوئی انتہائی سیانی بات سننے کو ملے گی۔ آخر کار وہ مور یو کے حلقے میں پہنچ گیا۔ یہاں جو گفتگو ہو رہی تھی، وہ سے دلچسپ معطوم ہوئی۔ وہ یہیں جم گیا

اور جیسا کہ نوجوانوں کا دیر ہوتا ہے، وہ انتظار کرنے لگا کہ موقع ملے تو وہ بھی اپنے خیالات کا اظہار کرے۔

3

آٹنا پاؤلوونا کی محفل پورے جوہن پر تھی۔ چاروں اطراف تکے مستقلاً اور متواتر بٹھنا رہے تھے۔ *ma ante* اس کی واحد ہم نشیں خاتون کے علاوہ جس کا چہرہ متفکر اور غم آلود تھا، اور جو اس زمین و فطین محفل میں اپنے آپ کو اجنبی محسوس کر رہی تھی، حاضرین تین گروہوں میں منقسم ہو چکے تھے۔ ایک ٹولی صدور، ہب سور یو کے گرد جمع ہو گئی تھی۔ بے زیادہ تر مرد حضرات پر مشتمل تھی نوجوانوں کا گروپ پرنس و بیسی کی پری جمال دختر ہیلین اور کوچک پرنس کے، جس کا چہرہ گلاب کی طرح تر و تازہ اور جس کا حسن چاند کو شرماتا تھا لیکن جس کا جسم عمر کے اعتبار سے نسبتاً پھولا ہو، تھا، آس پاس بیٹھا تھا۔ تیسرے حلقے نے سوخت، ماغ اور آٹنا پاؤلوونا کو اپنے گھیرے میں لے رکھا تھا۔

دائی کاؤنٹ سوخت، ماغ نوجوان اور اس کی شخصیت سحر انگیز تھی۔ اس کے چہرے مہرے پر شائستگی اور خوش خلقی نمایاں تھی اور اس کے اطوار پرستیدہ تھے۔ صاف نظر آ رہا تھا کہ وہ اپنے آپ کو نامور سستی تصور کرتا ہے لیکن تہذیب و شرافت کے تقاضوں کے پیش نظر اس نے اپنے آپ کو ان لوگوں کے رحم و کرم پر، جن کی صحبت میں اسے بیٹھنا پڑا تھا، چھوڑ دیا ہے۔ ادھر آٹنا پاؤلوونا اسے اپنے مہمانوں کے سامنے صریحاً ایسی لذیذ شے کے طور پر پیش کر رہی تھی جسے دیکھ کر منہ میں پانی بھر آئے۔ جس طرح کسی ہوٹل کا چاک ہیڈ ریٹر گوشت کے پارچے کو، جسے کوئی بھی شخص، جو اسے غلیظ باورچی خانے میں دیکھ چکا ہو کھانے پر مائل نہ ہو، خاص طور پر منتخب چکوان بنا کر پیش کرے اور کہے کہ ”واہ واہ، اس سے عمدہ کھانے کی چیز آج تک نہیں بکی،“ بعینہً اس شرم آٹنا پاؤلوونا بھی پہلے دائی کاؤنٹ کو اور پھر صدور راہب سور یو کو اپنے مہمانوں کے سامنے انتہائی لذیذ اور چٹارے دار کھانوں کے طور پر پیش کر رہی تھی۔ وہ لوگ جو سوخت، ماغ کے گرد حلقہ بنائے بیٹھے تھے، فوراً ہی ڈیوک آف آس غیاں کی سزائے موت کے متعلق بحث کرنے لگے۔ دائی کاؤنٹ نے خیال ظاہر کیا کہ ڈیوک کو اس کی اپنی عالی ظرفی لے ڈوبی اور بوانا پارت کو اس کے ساتھ جو عناد تھا، اس کے پیچھے حاصل اور ذلتی وجوہ تھیں۔

”اٹاہ، دائی کاؤنٹ، آپ ہمیں ان کے بارے میں ضرور آگاہ کریں،“ وہ خوشی سے یوں سرشار ہو رہی تھی جیسے اس کے منہ سے نہایت زبردست فقرہ نکل گیا ہو۔ ”دائی کاؤنٹ، آپ ہمیں ان کے بارے میں ضرور آگاہ کریں۔“ دائی کاؤنٹ خوش اطلاقی سے مسکرایا اور یہ جتانے کے لیے کہ وہ تعمیل ارشاد کے لیے تیار ہے، اس نے اپنی گردن کو خم دیا۔ آٹنا پاؤلوونا نے اس کے گرد جھکٹھا لگا دیا اور ہر شخص سے کہتی پھری کہ وہ آئے اور اس کی کہانی سنے۔

”دائی کاؤنٹ ڈیوک کو ذلتی طور پر جانتے تھے،“ آٹنا پاؤلوونا نے فرامیسی میں اپنے مہمان کے کان میں کہا۔ ”دائی کاؤنٹ کو کہانی سنانے کے فن میں یہ طوطی حاصل ہے،“ اس نے دوسرے مہمان سے سرگوشی کی۔ ”بڑے مہذب اور سچے ہوئے اسان میں،“ تیسرے سے کہا۔ یوں دائی کاؤنٹ کو حاضرین کے سامنے نہایت نفیس، ہشتہ

اور سودمندانہ انداز سے پیش کیا گیا بالکل اسی طرح جس طرح مصالحوں میں خوب بھنے ہوئے گوشت کے پارچے
طشتری میں سجا بنا کر مہمانوں کے سامنے پیش کیے جاتے ہیں۔

وائی کاؤنٹ کے چہرے پر خفیف سی مسکراہٹ تیرنے لگی۔ مطلب یہ کہ وہ اپنی کتھا سنانے کے لیے
تیار ہے۔

”Chere“ ہیلین، تم بھی ادھر جاؤ،“ آنا پاولوونا نے پری تمثال پرنس سے کہا جو کچھ ذرا پرے دوسرے
گروپ کے مرکز میں بیٹھی تھی۔

پرنس ہیلین مسکرائی۔ اس کی یہ مسکراہٹ کامل حسین عورت کی مسکراہٹ تھی۔ وہ اسے ہر دم اپنے چہرے پر
سجائے رکھتی تھی اور اس میں کبھی کسی تبدیلی کی روانہ نہیں ہوتی تھی۔ یہ اس وقت بھی اس کے چہرے پر موجود تھی
جب وہ ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی تھی اور اب بھی وہاں رقص کناں تھی۔ وہ انٹش اور آنا پاولوونا کی جانب چل
پڑی۔ اس کا جسم رقص کے سفید گاؤن میں، جو گہرے ہزرنگ کی جھلروں سے مزین تھا، ہلبوں تھا۔ اس کے ہیرے
جواہرات جگمگا رہے تھے، اس کی بالوں کی آب دتاب دیدلی تھی اور اس کے صاف شفاف سپید شانوں کی چمک دمک
نگاہوں کو خیرہ کر رہی تھی۔ چلنے میں اس کے گاؤن سے ہلکی ہلکی سی سرسراہٹ کی گونج پیدا ہو رہی تھی۔ مردوں کے
بچوں بچ گزرتے، جو اپنے آپ سے راستہ دیتے جا رہے تھے، کسی خاص شخص کو اپنی نگاہوں کا مرکز بنائے بغیر وہ کبھی
پر اپنی مسکراہٹیں اٹھ کر کرتی جاری تھی گویا کہ، زرد تلطف و عنایت وہ ہر مرد کو یہ استحقاق عطا کر رہی تھی کہ وہ اس کی
حسین و جلیل صورت، اس کے خوش وضع اور سڈوش ثنوں، پشت اور سینے کی۔ جو اس زمانے کے رواج کے مطابق
اس کے گاؤن میں خاصے آشکار ہو رہے تھے۔ تحسین کر سکیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ بال روم کا سارا گھیر اپنی ذات
میں سمیٹ کر رہے آئی ہے۔ ہیلین اتنی حسین و دل آویز تھی کہ نہ صرف اس میں عشوہ گری کی نام کو بھی جھلک نہیں تھی
بلکہ اس کے برعکس کچھ یوں محسوس ہوتا تھا کہ وہ اپنے حسن و جمال پر، جس پر کسی انگشت نمائی کی گنجائش نہیں تھی اور
جو لاریب تسخیر جہاں کی خرابی سے بہرہ ور تھا، قریب قریب نام و محبوب ہے۔ اس کا یہ حسن جہاں سوز اپنے عقب
میں جو قیامت ڈھارہا تھا، معلوم ہوتا تھا کہ وہ اس کی شدت کو کم کرنا چاہتی ہے لیکن اس معاملے میں اپنے آپ کو
قلعہ بے بس پار ہی ہے۔

”واہ واہ، کیا حسن بہا خیر ہے!“ جو بھی اسے دیکھتا، دیکھتا ہی رہ جاتا اور حیرت کے عالم میں پکاراٹھتا اور جب
وہ وائی کاؤنٹ کے سامنے نشست پر بیٹھ گئی اور اپنے غیر متغیر قسم کی کرنیں اس پر بکھیرنے لگی، اس کے کندھے
اچک گئے اور نگاہیں نیچے جھک گئیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ اس کے لیے یہ نظارہ غیر معمولی ہے اور اسے دیکھنے کی اس
میں تاب نہیں ہے۔

”ادام، اس قسم کے حاضرین کے سامنے مجھے اپنی لیاقت اور مہارت پر اعتبار نہیں رہا،“ اس نے مسکراتے اور

اپنی گردن کو خم دیتے ہوئے کہا۔

پرس نے اپنا گدار برہنہ بازو تپائی پر نکا دیا اور جواب دینے کی زحمت سے بے نیاز محض تبسم بکھیرنے اور انتظار کرنے پر اکتفا کیا۔ جب تک کہانی چلتی رہی، وہ تن کر سیدھی بیٹھی رہی۔ ہاں، کبھی کبھار وہ اپنے خوش وضع اور مدور بازو پر، جو نہایت قریے اور نفاست سے تپائی پر نکا ہوا تھا اور کبھی اس سے بھی بڑھ کر اپنے روپ دنت سینے پر، جسے ہیروں سے مرصع ٹیکس نے ڈھانپ رکھا تھا اور جسے وہ بار بار درست کر رہی تھی، نگاہ غلط انداز ڈال لیتی۔ وقتاً فوقتاً اس کا رھیان اپنے گاؤن کی طرف پلٹ جاتا اور وہ اس کی شکنیں درست کرنے لگتی۔ جب کبھی کہانی میں کوئی ولولہ انگیز موڑ آتا اور وہ سامعین کے دلوں پر گہرے نقوش ثبت کرنے لگتی، وہ پلٹ کر آٹنا پاؤلوونا پر اچھتی نظر ڈالتی اور جس نوع کا تاثر اسے امپراطورہ کی مصاحبہ کے چہرے پر دکھائی دیتا، ویسا ہی اپنے چہرے پر نمایاں کر لیتی۔ اس کے بعد اس کی روشن دتا ہندو مسکراہٹ دوبارہ لوٹ آتی۔

کوچک پرس بھی ہیلین کے تعاقب میں اپنی نشست سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

”ظہر و۔ میں اپنا کانٹھ کبڑ سنبھال لوں، اس نے کہا۔ ”ارے، تم کن سوچوں میں گم ہو؟ ادھر آؤ،“ وہ بولتے بولتے پرس اپولیت کی جانب متوجہ ہوئی اور اس سے کہنے لگی: ”میرا بیک اٹھا لاؤ۔“

جب کوچک پرس ہر شخص کو دیکھ کر مسکراتی اور اس سے ایک آدھ لفظ کہتی آگے بڑھی، کمرے میں بل چل پیدا ہو گئی۔ وہ بوٹھی ہنستی مسکراتی اپنی نشست پر بیٹھ گئی۔

”اب میں بالکل ٹھیک ہوں،“ اس نے اعلان کیا۔ پھر اس نے اپنی کڑھائی اٹھائی اور روئی کا دنت سے بولی کسدہ اپنی کہانی شروع کر دی۔

پرس اپولیت نے اس کا بیک اسے چھایا، کرسی کھسکائی اور اس کے قریب بیٹھ گیا۔

پرس اپولیت کو دیکھ کر جس چیز کا شدت سے احساس ہوتا تھا وہ یہ نہیں تھا کہ اس کے اور اس کی حسین و جمیل ہمشیرہ کے، مابین غیر معمولی مشابہت پائی جاتی ہے بلکہ یہ تھا کہ مشابہت کے باوجود وہ اتنا بد صورت تھا کہ آدمی حیران رہ جاتا۔ اس کے خدا خال بچتہ ہی تھے جو اس کی ہمشیرہ کے تھے۔ تاہم جہاں تک بہن کا تعلق تھا، اس کا چہرہ روشن دتا ہندو، آسودہ و مطمئن اور نو خیر جوانی سے بھرپور جاوداں مسکراہٹ سے ہمہ وقت منور دتا ہاں رہتا اور تناسب کے اعتبار سے اس کا جسم غیر معمولی طور پر کلاسیکی حسن کا شاہکار تھا۔ ادھر یہی کہانی یہ حال تھا کہ جو شخص بھی اسے دیکھتا، اسے زبردہ کر یہی خیال آتا کہ یہ شخص سدا کا مورکھ، ہونق، شک مزاج اور ڈھٹائی کی حد تک خود بین و خور آرا ہے۔ اس کا بدن لاغر و کمزور تھا۔ اس کی آنکھیں، ناک اور دانت کچھ یوں سکرے رہتے کہ اس کی شکل مضحک نظر آنے لگتی اور وہ دنیا جہاں سے ہزار شخص دکھائی پڑتا۔ رہے اس کے بازو اور ٹانگیں، وہ کبھی سیدھے نہ رہتے، ہمیشہ غیر فطری پوزیشن اختیار کیے رہتے۔

”یہ بھوت پریت کی کہانی تو نہیں؟“ اس نے کوچک پرس کے قریب بیٹھتے اور یہ غلت لمبی کہانی کا چشمہ

یوں درست کرتے ہوئے فرامیسی میں پوچھا جیسے اس کے بغیر اس کے منہ سے بات نہیں نکل سکتی تھی۔
 ”ارے، مکی ڈیئر، بالکل نہیں،“ کہانی گو نے کندھے اچکا کر ترست جواب دیا۔ اس سوال نے اس کی شرم
 کر دی تھی۔

”دراصل مجھے بھوتوں کی کہانیوں سے شدید نفرت ہے۔“ پرنس اپولیت نے یہ الفاظ کچھ اس انداز سے کہے
 کہ معلوم ہوتا تھا کہ اس پر اپنے ہی الفاظ کا مفہوم اس وقت واضح ہوتا ہے جب وہ انھیں ادا کر چکا ہوتا ہے۔
 اس نے ایسی کامل خود اعتمادی سے بات کی کہ کوئی بھی یہ نہ سمجھ سکا کہ اس نے غضب کی بذلہ بنی دکھائی ہے یا
 بالکل احمقانہ جملہ کہا ہے۔ وہ گہرے سبز رنگ کا ڈریس کوٹ، بر جس، جس کا رنگ بقول اس کے ڈریسنگ پری کی
 ران کے رنگ سے مشابہ تھا، لمبی ریشمی جرابیں اور نیچی ایڑیوں کے جوتے پہنے ہوئے تھا۔

وائی کاؤنٹ نے خوش بیانی اور چابک دستی سے ڈیوک آف آل غریب کا قصہ سنایا۔ اس زمانے میں یہ عام سنا سنایا
 جاتا تھا۔ اس کے مطابق ہوا یہ کہ ڈیوک ایک روز چھپتا چھپتا میرس چلا گیا۔ میرس میں اس نے مادام بوٹھی¹⁸ سے ملاقات
 کرنا تھی۔ اچانک وہاں اس کی مدد بھیڑ نیولین سے ہو گئی جو خود بھی اس مشہور و معروف اداکارہ کے غمزوں اور دادوں
 سے لطف اندوز ہوا کرتا تھا۔ نیولین نے جب ڈیوک کو وہاں دکھا، اس پر غشی طاری ہو گئی (اس پر غشی کے یہ درے اکثر
 پڑا کرتے تھے)۔ یوں وہ ڈیوک کے قبضہ قدرت میں آ گیا۔ ڈیوک نے اس موقع سے کسی قسم کا فائدہ اٹھانے سے
 احتراز کیا تاہم یوانا پارت نے ڈیوک کی اس حالی غرنی کا حساب یوں چکایا کہ اسے بعد ازاں گولیوں سے بھنوا دیا۔
 یہ کہانی دلچسپ اور پر لطف تھی، خاص طور پر اس کا وہ حصہ جہاں دونوں رقیب اچانک ایک دوسرے کو پہچان
 لیتے ہیں، خاصا متاثر رے دار تھا۔ خواتین کے قلوب پر اس کا بالخصوص گہرا اثر ہوا۔

”بہت خوب! بے حد مزے دار!“ آتنا پاولوونا نے داد دی اور تسخیرانہ انداز سے کوچک پرنس کو دیکھنے لگی۔
 ”بہت خوب! بہت پر لطف!“ کوچک پرنس نے زیر لب کہا۔ پھر اس نے سوئی کڑھائی میں یوں ٹانک دی
 جیسے کہانی کی رنجیسی اور لذت نے اس کے لیے اپنا کام جاری رکھنا ناممکن بنا دیا ہو۔

محفل پر عمومی خاموشی چھائی رہی۔ وائی کاؤنٹ نے اسے داد و تحسین محمول کیا۔ وہ اپنی جگہ مطمئن و مسرور
 تھا اور مسکرا رہا تھا۔ وہ اپنا سلسلہ کلام پھر سے جوڑنا چاہتا تھا کہ آتنا پاولوونا نے دیکھا کہ وہ نو جوان جس کی آمد پر وہ اتنا
 شیشائی تھی اور جسے اس نے ایک لٹلے کے لیے بھی نظروں سے اوجھل نہیں ہونے دیا تھا، بڑے جوش و جذبے اور
 زور شور سے صدر راہب سے باتیں کر رہا ہے۔ وہ جھٹ پٹ خطرے کے مقام کی طرف لپکی۔ اور سچی بات یہ ہے
 کہ ڈیئر نے صدر راہب کو تو اذنِ قوت کے متعلق گفتگو میں الجھایا تھا۔ صدر راہب اس نو جوان کے خلوص اور
 جوش و جذبے سے بہت متاثر ہو چکا تھا اور اس موضوع میں اس کی دلچسپی پوری طرح بیدار ہو گئی تھی۔ چنانچہ اب وہ
 اپنے پسندیدہ نظریے کی بالتفصیل وضاحت کر رہا تھا۔ دونوں آدمی جس ذوق و شوق اور فطری انداز سے ایک
 دوسرے سے باتیں کر رہے تھے، وہ آتنا پاولوونا کو بالکل نہیں بھاسکتا تھا۔

”ذرائع یورپی قوت کا توازن اور ملوثی، توام، صدر راہب کہہ رہا تھا۔“ ضرورت اس بات کی ہے کہ روس جیسی صرف ایک طاقت۔ وہ بریت کے لیے بھلے بدنام ہو۔ بے غرضی سے ایک ایسے اتحاد کی سربراہ بن جائے جس کا مقصد وحید یورپ میں قوت کے توازن کو برقرار رکھنا ہو، پھر بیڑا پار ہو جائے گا اور دنیا تباہی کے غار میں گرنے سے بچ جائے گی۔“

”لیکن آپ اس قسم کا توازن قائم کیسے کریں گے؟“ کوئٹر نے اپنی بات کا آغاز کیا۔

عین اس لمحے آنا پادلوونا وہاں پہنچ گئی۔ اس نے میٹر کو درشت نظروں سے گھورا اور صدر راہب سے پوچھنے لگی کہ وہ روکی آب دہو اسے کس طرح نیٹ رہا ہے۔ اٹلوی کے چہرے کا رنگ آنا ناسبد مل ہو گیا۔ وہاں مکروہ قسم کی منافقت اور عداوت جھلکنے لگی۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ جب بھی خواتین سے مخاطب ہوتا ہے، وہ عادتاً اپنے چہرے پر اسی قسم کا خول چڑھا لیتا ہے۔

”یہ میری خوش نصیبی ہے کہ شرفانے مجھے اپنی محفلوں میں شرف باریابی بخشا ہے۔ اس کی۔ خاص طور پر خواتین کی۔ خیرہ کن بذلہ سخی اور تہذیبی رکھ رکھاؤ نے مجھ پر اتنا طلسم طاری کر دیا ہے کہ مجھے، تمام موقع ہی نہیں مل سکا کہ میں یہاں کی آب دہو کے بارے میں کچھ سوچ سکوں،“ اس نے جواب دیا۔

آنا پادلوونا قطعاً یہ نہیں چاہتی تھی کہ صدر راہب اور میٹر اس کی نظروں سے اوجھل ہو جائیں۔ چنانچہ اس بات کو فحشی بنانے کے لیے کہ وہ ہر دم اس کی نگاہوں میں رہیں، وہ انھیں بڑے جھگڑے میں تھپیٹ لائی۔

عین اسی وقت ایک نیا چہرہ ڈرائنگ روم میں نمودار ہوا۔ نووارد کو چمک پر نس کا شوہر پرس آندرے بکونسکی تھا۔ وہ درمیانی قامت کا انتہائی خوش شکل نوجوان تھا۔ اس کے خدو خال نمایاں لیکن جذبات سے عاری تھے۔ اس کی تھکی تھکی اور مضطرب صورت سے لے کر آہستہ رو، بچے تلے قدموں تک، ایک ایک چیز بانگ دہل امدان کر رہی تھی کہ وہ اپنی جینل، زندہ دس اور شوخ رفیقہ حیات سے قطعی مختلف ہے۔ یہ بالکل واضح تھا کہ کمرے میں جو لوگ موجود ہیں، وہ ان سے محض واقف ہی نہیں بلکہ وہ ان سے اتنا اکٹا چکا ہے کہ اس کے لیے ان کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنا اور ان کی باتیں سننا بھی دو بھر ہر ہے۔ اس تمام چہروں میں سے، جن سے اسے اتنی بیزاری ہو رہی تھی، سب سے بیزار کن چہرہ اس کی اپنی من موہنی تھی مٹی بیوی کا تھا۔ جو بھی اس کی نظر اس پر پڑی، اس کے خوبصورت چہرے کی شکل کچھ اس طرح بگڑ گئی جیسے اس نے کڑوی کسی گولی بچھ لی ہو۔ اس نے جھٹ پٹ اپنا منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ آگے بڑھا آنا پادلوونا کے ہاتھ پر یوسہ شیش کیا اور نیم دا آنکھوں سے مجمع کا جائزہ لینے لگا۔

”پرس، لام پر جا رہے ہو؟“ آنا پادلوونا نے اس سے فرانسیسی میں پوچھا۔

”جنرل کو تو زوف نے“ اس نے فرانسیسیوں کی طرح نام کے آخری حصے پر زور دیتے ہوئے کہا، ”بکمال شفقت مجھے اپنا ایڈی کاٹنگ مقرر کر لیا ہے۔“

”اور لسا؟“

”وہ گاؤں چلی جائے گی۔“

”تمہیں شرم نہیں آتی کہ تم ہمیں اپنی پرکشش رفیقہ حیات کی صحبت سے محروم کر رہے ہو؟“

”سندرے،“ اس کی بیوی نے اسی غمزہ واداسے، جو وہ دوسروں کے ساتھ اختیار کر لیتی تھی، اپنے شوہر سے

مخاطب ہو کر کہا، ”وائی کاؤنٹ ہمیں مارام یو غمگی اور بونا پارت کا مزے دار تصدیق رہے ہیں۔“

پرنس آندرے نے بھوس سکیڑیں اور وہاں سے پرے ہٹ گیا۔

جب سے پرنس آندرے کمرے میں داخل ہو تھا، بیئر مسلسل سے کچھ ایسی نظروں سے دیکھ رہا تھا جن میں

سرت بھی تھی اور پیار بھی۔ اب وہ اس کے پاس پہنچا اور اس کا بازو اپنے ہاتھ میں تھام لیا۔ جب پرنس آندرے کو

محسوس ہوا کہ کوئی شخص اس کا جسم چھو رہا ہے، غصے سے اس کی بھوسیں تن گئیں لیکن جب اس نے مڑ کر دیکھا اور اس

کی نظر بیئر کے ہنستے مسکراتے چہرے پر پڑی، اس کا اپنا چہرہ غیر متوقع طور پر دوستانہ اور شفقتانہ جسم سے مکمل اٹھا۔

”ارے، تم!۔ ان چیخیں اور بے فکر ہوگوں کی محفل میں؟ کہاں راجہ بھوج، کہاں گنگا تلی؟“ اس نے بیئر

سے کہا۔

”مجھے معلوم تھا کہ تم یہاں مل جاؤ گے،“ بیئر نے کہا۔ ”رات کا کھانا میں تمہارے ساتھ کھاؤں گا۔ ٹھیک

ہے؟“ اس نے دھیمی آواز میں کہا تا کہ وائی کاؤنٹ کی کہانی میں، جو وہ دوبارہ شروع کر رہا تھا، خلل نہ پڑے۔

”دلیس، بالکل نہیں!“ پرنس آندرے نے یوں ہنستے اور بیئر کا ہاتھ دباتے ہوئے کہا کہ بھلا پوچھنے کی کیا

بات ہے۔

ابھی وہ کچھ اور کہنا چاہتا تھا کہ اس لمحے پرنس واسیلی اور اس کی بیٹی اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ وہ رخصت ہونا

چاہتے تھے۔ مرد حضرات بھی اپنی اپنی نشستوں سے اٹھ کر کھڑے ہو گئے تا کہ انھیں گزرنے میں دقت نہ ہو۔

”مائی ڈیئر وائی کاؤنٹ، معافی چاہتا ہوں،“ پرنس واسیلی نے فرامیسی سے کہا۔ اس نے شفقت سے اس کا

بازو تھام لیا تا کہ وہ اٹھنے کی زحمت سے بچ سکے۔ ”بد قسمی سے مجھے سفیر محترم کی خیانت میں شریک ہونا ہے ورنہ کس

بھلے مانس کا جی چاہتا ہے کہ آپ کی تقریر دلپذیر کے درمیان اٹھ کر چلا جائے۔ آپ کی گفتگو میں جو خلل پڑا ہے،

اس پر میں شرمندہ ہوں۔ اُمید ہے کہ آپ برا نہیں مانیں گے۔“ پھر وہ آنتا پادلوونا کی طرف مڑا اور بولا، ”افسوس،

صد افسوس کہ مجھے تمہاری اس شاندار محفل سے یوں اٹھ کر جانا پڑ رہا ہے۔“

اس کی بیٹی پرنس ہمیں اپنا نہ در نہ گاؤں سنبھالتی ہوئی کرسیوں کے بیچوں بیچ چلنے لگی اور اس کے حسین

چہرے پر اس کی درخشاں مسکراہٹ اور بھی درخشاں نظر آرہی تھی۔ جب وہ بیئر کے قریب سے گزری، تو خوشی کے

عالم میں اس پر نہ صرف وجد اور کیفیت بلکہ رعب حسن سے ایک قسم کی ہیبت بھی طاری ہو گئی۔

”واوا، کیا حسن ہے!“ پرنس آندرے نے کہا۔

”دریں چہ شک،“ بیئر نے کہا۔

چلتے چلتے پرنس واسیلی نے پیٹر کا ہاتھ مضبوطی سے اپنے ہاتھ میں پکڑ لیا اور آستنا پاؤلوونا سے مخاطب ہو کر کہنے لگا۔
 ”اس رچھ کے بچے کو میری خاطر تیس رو تہذیب سکھا دو۔ یہ پورے ایک ماہ سے میرے گھر میں پڑا ہے اور
 میں آج پہلی مرتبہ اسے شرف کی محفل میں دیکھ رہا ہوں کسی نوجوان کے لیے تیز طرار عورتوں کی صحبت سے بڑھ کر
 اور کوئی چیز ضروری نہیں ہوتی۔“

4

آستنا پاؤلوونا سکرائی اور اس نے قول دیا کہ وہ پیٹر کو اپنی پردہ داری میں لے لے گی۔ اسے معلوم تھا کہ پرنس واسیلی
 سسرال کے حوالے سے اس کے باپ کا قرابت دار تھا۔

جو بزرگ خاتون ma tante کے پاس بیٹھی تھی، لپک جھپک اٹھی اور اس نے انتظار گاہ میں پرنس واسیلی کو
 روک لیا۔ اس نے اپنے مشفق و رخم آلود چہرے پر مصنعا حس دلچسپی کا لبادہ ڈھک رکھا تھا، وہ اب مطلقاً نا پید ہو گیا۔
 اب وہاں اندیشوں، دوسروں اور پریشانیوں کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا۔

”پرنس، آپ میرے پرنس کے بارے میں کیا جرمائے ہیں؟“ اس نے انتظار گاہ میں پرنس واسیلی سے
 دریافت کیا۔ (اس نے جب پرنس کا نام لیا، حرف ”واؤ“ پر خاص طور پر زور دیا۔) ”اب پیٹرز برگ میں میرے
 لیے مزید قیام کرنا ممکن نہیں رہا۔ آپ صرف اتنا فرمادیں کہ میں اسے کیا بتاؤں؟“

اگرچہ پرنس واسیلی نے اس کی بات بڑی بے دردی سے، جس کے ڈانڈے بدتمیزی سے جا ملتے تھے، سنی اور
 اس نے اپنی بے قراری چھپانے کی مطلق کوشش نہ کی، لیکن وہ بھی اپنی دھن کی پکی تھی۔ وہ دل آویز لیکن لجاجت
 سے بھرپور انداز سے مسکرانے لگی اور اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تمام لیا تا کہ اسے جانے سے روک سکے۔

”اپہر طور سے کچھ عرض کرنا آپ کے لیے مطلق دشوار نہیں ہے۔ بس اتنی سی بات ہے کہ اس کا تیار لہ فوراً
 گارڈز¹⁹ میں ہو جائے، اس نے ملتی جلتی لہجے سے کہا۔

”پرنس، خاطر جمع رکھو، مجھ سے جو کچھ بن پڑا، ضرور کروں گا۔“ پرنس واسیلی نے جواب دیا۔ ”لیکن
 اپہر طور سے اس قسم کی سفارش کرنا آسان کام نہیں۔ میرا مشورہ ہے کہ آپ پرنس گالت سین (Goitsyn) کی
 وساطت سے درو ماتسیف (Rumyantsev) تک رسائی حاصل کریں۔ عقل مندی کا یہی بہترین راستہ ہے۔“

یہ بزرگ خاتون پرنس درو بیتسکا یا (Drubetskaya) تھی۔ اگرچہ اس کا تعلق روس کے ایک سربراہ اور در
 خاندان سے تھا لیکن چونکہ وہ مفلوک الحال تھی اور بدلتوں سے گوشہ تنہائی میں زندگی کے یا مہتر رہی تھی، یوں اس کا
 اپنے سابقہ بارسوخ دوستوں سے رابطہ منقطع ہو چکا تھا۔ پیٹرز برگ میں اس کی آمد کی غرض یہ تھی کہ وہ اپنے اکلوتے
 بیٹے کو گارڈز کے دستوں میں تعینات کرائے۔ اس نے آستنا پاؤلوونا کی دعوت میں شریک ہونے کا دعوت نامہ محض
 اس لیے حاصل کیا تھا کہ پرنس واسیلی سے ملاقات کر سکے۔ اور صرف اس مقصد کے حصول کی خاطر وہ وائی کاؤنٹ

کی کہانی سنتی رہی۔ پرنس دیکسی نے جب اسے نکاسا جواب دے دیا، وہ بہت پریشان ہوئی۔ اور اس کے چہرے پر، جو کبھی خوبصورت تھا، آزر دگی کے بادل سیاہی لگن ہو گئے۔ لیکن اس نے ہمت نہ ہاری۔ اس کی یہ کیفیت صرف چند ثانیے رہی۔ وہ ایک بار پھر مسکرائی اور اس نے پرنس واسلی کا، زرد پہلے سے بھی زیادہ مضبوطی سے تھام لیا۔

”پرنس، سنیں،“ وہ گویا ہوئی۔ ”میں نے اس سے قبل آپ سے کسی چیز کا مطالبہ نہیں کیا اور نہ آئندہ کبھی کروں گی۔ میں نے کبھی آپ کو یہ نہیں بتایا کہ آپ کی میرے والد کے ساتھ دوستی تھی۔ لیکن اب میں خداوند کے نام پر آپ سے التجا کرتی ہوں کہ آپ میرے بیٹے کا کام کرا دیں،“ اس نے بہ عجلت مزید کہا۔ ”میں آپ کو ہمیشہ اپنا محسن گردانوں گی۔ نہیں، نہیں، آپ غصہ نہ کریں بلکہ مجھ سے وعدہ کریں۔ میں نے گالت سین سے بات کی تھی لیکن انھوں نے انکار کر دیا۔ آپ جب چھوٹے تھے، بڑی مروت اور نیکی کا مظاہرہ کیا کرتے تھے، ایک بار پھر وہی مروت اور دیادگی دکھ دیں۔“ اس نے یہ الفاظ فراموشی میں کہے۔ مگر چہ اس کی آنکھوں میں آنسو جھلسا رہے تھے، وہ مسکراتے کی کوشش کر رہی تھی۔

”پاپا، ہمیں دیر ہو جائے گی،“ پرنس ہیلین نے جو دلیز پر کھڑی انتظار کر رہی تھی، اپنی خوبصورت گردن کھٹکرا کر اپنے کلاسیکی انداز کے حسین شانوں کے اوپر سے جھٹکتے ہوئے کہا۔

لیکن اثر و رسوخ، یہ سرمایہ ہے جو سینت سینت کر رکھنا پڑتا ہے ورنہ وہ چشم زدن میں پار ہو جائے گا۔ پرنس واسلی اس حقیقت سے خوب آگاہ تھا۔ جب ایک مرتبہ وہ اس حقیقت کی تہ تک پہنچ گیا کہ اگر وہ ہر کدو مدکی، جو منہ اٹھائے اس کے پاس چلا آتا تھا، سفارشیں کرتا رہا، پھر وہ دن دور نہیں جب وہ اپنے لیے کچھ بھی نہیں مانگ سکے گا، چنانچہ وہ اپنا اثر و رسوخ شاز و نادرا ہی استعمال کرتا تھا۔ تاہم پرنس درویش کا یا جب دوبارہ اس سے ملتی ہوئی، ضمیر سے ملتی جلتی چیز نے اسے ٹھوکا دیا۔ وہ اسے جو کچھ یاد دلا رہی تھی، سنی بر حقیقت تھا۔ مذمت کے بتدائی دور میں اس نے ترقی کی جو منارل طے کی تھیں، ان کے لیے وہ اس کے باپ کا مرہون منت تھا۔ مزید برآں، وہ اس کے اطوار سے صاف بھٹپ گیا کہ یہ خاتون ان عورتوں میں شمار کی جاسکتی ہے جو اگر کسی چیز کا تہیہ کر لیں۔ خاص طور پر اگر وہ مائیں بھی ہوں۔ پھر جو ہو، سو ہو، ان کے قدم اس وقت تک پیچھے نہیں ہٹیں گے جب تک ان کا مدعا حاصل نہیں ہو جاتا۔ اور اگر ان کی ہمت نہ مانی جائے تو، پھر وہ روز روز بلکہ گھڑی گھڑی آپ کا تعاقب کرتی اور آپ کو فریاد سناتی رہیں گی اور اگر ضروری ہوا، پھر ہنگامہ کھڑا کرنے سے بھی دریغ نہیں کریں گی۔ اس آخری سوچ نے اس کے قدم ڈگمگا دیے۔

”مائی ڈیئر آئنہ میٹا کیوونا،“ اس نے حسب معمول بے تکلفی اور عادت پرستے ہوئے کہا۔ ”آپ کا حکم سرائیکھوں پر، لیکن میرے لیے اس کی تعمیل ناممکن ہے۔ تاہم محض یہ جتانے کے لیے کہ میں آپ کا کتنا گرویدہ ہوں اور آپ کے والد کی یادوں کی میرے دل میں کتنی قدر ہے، میں یہ ناممکن بھی کر گزروں گا۔ آپ کے صاحب زادے کا جادو گارڈز میں ہو جائے گا۔ میں یہ ذمہ داری نبھانے کا عہد کرتا ہوں۔ اب آپ کی تسلی ہوگی؟“

”میرے عزیز، آپ میرے محسن ہیں مجھے آپ سے یہی توقع تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ آپ کتنے شفقتی ہیں۔“

وہ جانے کے لیے نڑا۔

”ذرا ٹھہریں۔ میں صرف ایک اور گزارش پیش کرنا چاہتی ہوں۔ جب اس کا تبادلہ گارڈز میں ہو جائے۔“
یہاں وہ قدرے ہنچکچی، ”آپ کی میٹائیل اماری اوناوچ کو تو زونف²⁰ کے ساتھ بڑی دوستی ہے۔ آپ ان سے سفارش کر دیں کہ وہ بورس کو پناہ ایجوٹنٹ مقرر کر لیں۔ پھر میں مطمئن ہو جاؤں گی۔ اس کے بعد دوبارہ کبھی...“
پرنس واسلی مسکرا دیا۔

”میں اس کا وعدہ نہیں کرتا۔ آپ کو پتا نہیں کہ جب سے کو تو زونف کمانڈر انچیف مقرر ہوئے ہیں، لوگوں نے کیسے ان کا ہاتھ بند کر رکھا ہے۔ انھوں نے خود مجھے بتایا ہے کہ، سکو کی تمام ماؤں نے یہ سزائیں کر لی ہیں کہ وہ اپنے اپنے سپوت اس کی تحویل میں دے دیں گی تاکہ وہ انھیں اپنے ایجوٹنٹ مقرر کر سکے۔“
”نہیں، میرے عزیز محسن، مجھ سے وعدہ کریں۔ ورنہ میں آپ کو جانے نہیں دوں گی۔“

”پاپا، اس کی منہ جبین دختر نے اپنے سابقہ بچے کا اعادہ کرتے ہوئے کہا: ”ہمیں دیر ہو جائے گی۔“
”اچھا، خدا حافظ، آپ دیکھ رہی ہیں کہ معاملہ گرگوں ہو رہا ہے...“
”پھر آپ میرا طور سے کل بات کریں گے؟“

”بالکل، کئی بات ہے۔ لیکن کو تو زونف کے متعلق میں کوئی وعدہ نہیں کر سکتا۔“

”نہیں، واسلی، وعدہ کرو۔ وعدہ۔“ آنا میٹائیلوونا نے اسی بناوٹی پرشباب عشوہ طراز مسکراہٹ سے کہا جو کسی زمانے میں، جب وہ جوان تھی، اسے پھبتی تھی لیکن اب جب کہ اس کے چہرے پر جھریاں پڑ چکی تھیں، اسے بالکل زیب نہیں دیتی تھی۔

گتہ تھ کہ اسے یہ مطلق یاد نہیں رہا کہ وہ عمر کی کس منزل پر پہنچ چکی ہے اور محض عادت کے بل بوتے پر ان تمام عشووں اور غمروں کو بروئے کار لا رہی تھی جو ازل سے منف نازک کا خاصہ رہے ہیں۔ لیکن جونہی وہ نظروں سے اوجھل ہوا، اس کے چہرے نے سرد مہری اور تصنع کے وہی سابقہ تیور اختیار کر لیے۔ وہ دوبارہ اس گروپ میں لوٹ آئی جس میں وائی کاؤنٹ ابھی تک داستان طرازی میں مصروف تھا۔ وہ ایک بار پھر جھوٹ موٹ ظاہر کرنے لگی کہ اس سے زیادہ کسی کو اس داستان میں دلچسپی نہیں جانتا کہ اصل بات یہ ہے کہ اب جب کہ اس کا الو سیدھا ہو چکا تھا، وہ محض اس ناڑ میں تھی کہ جونہی موقع ملے، وہاں سے کھسک جائے۔

”یہ جو میلان میں تاج پوشی کا تازہ ترین نائک رچا گیا ہے، اس کے متعلق آپ لوگوں کا کیا خیال ہے؟“
آنا پاولوونا نے فرانسسی میں پوچھا۔ ”ذرا تصور کریں کہ موسیو بونا پارت تخت پر متمکن ہے اور جینیوا و او اور لوکا کے باشندے اس کی بارگاہ میں عرضیاں پیش کر رہے ہیں۔ کیسا مضحکہ خیز منظر ہوگا؟ سحر انگیز؟ انسان سوچے تو پاگل ہو جائے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ساری دنیا اپنے ہوش و حواس گنوا بیٹھی ہے۔“
پرنس آندرے کے لبوں پر طنز یہ مسکراہٹ پھیل گئی۔ وہ سیدھا آنا پاولوونا کے چہرے پر نگاہیں گاڑے

ہوئے تھا۔

*"Dieu me la donne, gare a qui la touche!" (یہ الفاظ نبولین نے جب کہے تھے جب تاج اس کے سر پر رکھا جا رہا تھا۔) "منا ہے کہ اس نے جب یہ الفاظ کہے، وہ بہت پروتار نظر آ رہا تھا۔" پرنس آندرے نے کہا اور اس نے یہ جملہ اٹالوی زبان میں دہرایا:

"Dio mi la donna, quai a chi la tocca!"

"مجھے امید ہے کہ یہ آخری تنکا ثابت ہوگا،" آنتاپاولوونا نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "خود مختار حکمران اس شخص کو، جو ہر کسی کے لیے جیتا جاگتا خطرہ بن چکا ہے، مزید برداشت نہیں کر سکیں گے۔"

"خود مختار حکمران؟" وائی کاؤنٹ نے شائستہ لیکن بچھے بچھے لہجے سے کہا۔ "مادام، میرا اشارہ روس کی طرف نہیں۔ آخر ان حضرات نے لوئی شانزدہم،²¹ ملکہ عالیہ یا مادام الخربتھ کے لیے کیا کیا؟ کچھ بھی تو نہیں۔" اب وہ جوش و خروش سے تھریے کر رہا تھا۔ "اور عین، میں کہ اس لوگوں نے فرانس کے شاہی خاندان یوغ یوں سے جو خداری کی تھی، اب یہ اسی کی سزا بھگت رہے ہیں۔ خود مختار حکمران؟ ارغ تھو! یہ غاصب کو مبارکباد پیش کرنے اپنے اپنے غیر بھیج رہے ہیں۔" اس نے نفرت و حقارت سے آہ بھری اور ایک مرتبہ پھر پہلو بدلیا۔

پرنس اپولیت نے، جو کچھ مدت سے بینک لگائے وائی کاؤنٹ کو ٹنگی باندھ کر دیکھے جا رہا تھا، ان الفاظ پر اچانک اپنے جسم کو پوری طرح کوچک پرنس کی جانب کھمایا اور اس سے ایک سوئی طلب کی۔ اس سے وہ میز پر کاندے²² خاندان کا نشان نقش کرنے لگا۔ در نہایت سنجیدگی سے، سے سمجھانے لگا کہ یہ کن کن چیزوں سے عبارت ہے۔

"یہ سرخ عصا ہے، اس پر لا جو ردی دغا نے کھدے ہوئے ہیں۔"

پرنس سنتی رہی اور مسکراتی رہی۔

"اگر ہونا پارت مزید ایک برس فرانس کے تحت پر متمکن رہا،" وائی کاؤنٹ نے، پنا سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔ اس کایات کرنے کا انداز ایک ایسے شخص کا تھا جو اپنی دانست میں یہ سمجھتا ہے کہ زیر بحث موضوع پر اسے دوسروں سے زیادہ دسترس حاصل ہے۔ اس لیے وہ اس چیز کی قطعاً پردا کیے بغیر کہ دوسروں کی اس معاملے میں کیا رائے یا سوچ ہے، اپنی ہی ہانکے چلا جاتا ہے۔ "معاملات حد سے بہت آگے نکل چکے ہیں۔ اگر سازشوں، جبر و استبداد، جلا وطنیوں اور پھانسیوں کا یہ سلسلہ یونہی رہا، پھر میں یہ پیش گوئی کر سکتا ہوں کہ اعلیٰ طبقے۔ فرانسیسی اعلیٰ طبقے۔ کا ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خاتمہ ہو جائے گا۔ اور پھر۔" اس نے کندھے چکائے اور یوں ہاتھ پھیلائے جیسے وہ یہ ظاہر کرنا چاہتا ہو کہ اسے مثبت ایزدی کے سامنے دم مارنے کی مجال نہیں ہے۔

چیز کچھ کہنے کے لیے زبان کھولنا چاہتا تھا کیونکہ اس گفتگو میں اسے بہت دلچسپی ہو رہی تھی لیکن آنتاپاولوونا، جو مسلسل اس پر چوکس نگاہیں جمائے ہوئے تھی، بیچ میں بول پڑی۔

* یہ تاج خداوند کی دیں ہے۔ اب جو شخص اسے ہاتھ لگاتا ہے، سوچ بچ کر لگائے۔

”امپراطور الیکساندر: اس نے اسی اور پر لال لہجے میں کہا جو بادشاہی خاندان کا ذکر کرتے پر وہ اختیار کر لیتی تھی۔“ یہ عدل فرما چکے ہیں کہ فرانسیسی جس قسم کا چاہیں طرز حکومت اختیار کر لیں، انھیں کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ اور میں سمجھتی ہوں کہ جونہی غاصب سے نجات ملی، پوری قوم جائز بادشاہ کی آغوش میں چلی جائے گی۔“ اس نے اپنی بات ختم کرتے ہوئے کہا۔ وہ شاہ پسند تارک وطن (emigre) کی دل جوئی کرنے کی پوری کوشش کر رہی تھی۔

”مجھے اس بارے میں شک ہے۔“ پرنس آندرے نے کہا۔ ”موسیو والی کاؤنٹ نے بالکل سچی کہا ہے کہ معاملات بہت آگے نکل چکے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ سابق حکومت بحال کرنا امر محال ہے۔“

”جو کچھ میں نے سنا ہے،“ میئر نے شرارتی جاتے دوبارہ گفتگو میں دخل دیتے ہوئے کہا: ”اس سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ فرانس کے تقریباً تمام سر ایلے ہی پولین کا دم بھرنے لگے ہیں۔“

”یہ محض بوانا پارت کے حمایتیوں کا پراپیگنڈہ ہے،“ والی کاؤنٹ نے میئر کی طرف دیکھے بغیر ترکی جواب دیا۔ ”نی الحال یہ معلوم کرنا کہ فرانس کی رائے عامہ کیا چاہتی ہے، ناممکن ہے۔“

”بوانا پارت نے بھی یہی کہا ہے،“ پرنس آندرے نے طنز یہ انداز سے مسکراتے ہوئے کہا۔

یہ بات بالکل عیاں تھی کہ اس نے والی کاؤنٹ کو پسند نہیں کیا تھا اور وہ اس کی جانب دیکھے بغیر اسے اپنے حملوں کا نشانہ بنا رہا تھا۔

”میں نے انھیں شان و شکوہ کا راستہ دکھایا لیکن وہ اسے اختیار کرنے کے لیے تیار نہ ہوئے،“ اس نے مختصر وقفے کے بعد ایک بار پھر پولین کے الفاظ کا حوالہ دیتے ہوئے کہا۔ ”میں نے اپنے دیوان کے دروازے وا کر دیے اور لوگ ہجوم درہجوم اندر چلے گئے۔ اس نے یہ خود دعویٰ کیا، مجھے نہیں معلوم کہ اس میں وہ حق بجانب تھا یا نہیں۔“

”بالکل نہیں،“ والی کاؤنٹ نے تڑاخ سے جواب دیا۔ ”ڈیوک آف آں غیاں کے قتل کے بعد اس کے کٹر حمایتیوں نے بھی اسے ہیرو سمجھنا ترک کر دیا ہے، اگر چند لوگوں کی نگاہوں میں وہ ہیرو تھا بھی،“ اس نے آنا پادلوونا کی جانب مڑتے ہوئے کہا: ”تو جب سے ڈیوک کا قتل ہوا ہے آسانوس پر ایک اور شہید کا اضافہ ہو گیا ہے اور اسی نسبت سے روئے زمین پر ایک ہیرو کم ہو گیا ہے۔“

والی کاؤنٹ کے اس جیسے پرداد و تحسین چھوڑ کرنے کے لیے آنا پادلوونا اور دوسرے اصحاب کو ابھی خندہ رو رہے تھے کہ سونے کا موقع بھی نہ ملا تھا کہ پھر ایک بار پھر بے دھڑک میدان میں کود پڑا۔ اور اگرچہ آنا پادلوونا کا ماتھا ٹھک رہا تھا کہ وہ کوئی احمقانہ بات ہی کہے گا لیکن وہ اسے لب کشائی سے باز نہ رکھ سکی۔

”ڈیوک آف آں غیاں کی سر رائے سوت سیاسی ضرورت تھی،“ میئر نے کہا۔ ”اور میں سمجھتا ہوں کہ پولین نے اس واقعے کی ذمہ داری قبول کرنے میں جو معمولی سی بھی اچکا پھٹ نہیں دکھائی، وہ اس امر کا ثبوت ہے کہ وہ نہایت عالی ظرف اور شریف النفس انسان ہے۔“

”خداوند! میرے خداوند!“ آنتا پاؤلوونا نے دہشت زدہ ہو کر زیر لب کہا۔

”اجی، موسیو ہیئر، آپ کے خیال میں کسی شخص کو قتل کرنا جالی ظلمتی اور شرافت انفس کا ثبوت ہے؟“

کوچک پرنس نے مسکراتے اور ہنسیک اپنے قریب کھسکاتے ہوئے کہا۔

”ایخ، ایخ!.. اوو، اوو!“ بیک وقت متعدد آوازیں سنائی دیں۔

”بہت خوب!“ پرنس اپولیت نے انگریزی میں کہا اور اپنی ران کو پھیلی سے پٹنے لگا۔

وائی کاؤنٹ نے شخص کندھے اچکانے پر اکتھا کیا۔ ہیئر نے نہایت سنجیدگی اور متانت سے، پٹے جیسے کے

دپر سے سامعین پر نگاہ ڈالی۔

”میں نے جو کچھ کہا ہے، اس کی وجہ یہ ہے“ اس نے جلد بازی سے کام لیتے ہوئے کہا۔ ”کہ جب انقلاب

آیا، بوغ بون خاندان کے افراد دم دہا کر بھاگ گئے اور عامتہ الناس کو انارکی (زراعت) کے حوالے کر گئے۔ نیو لین

واحد شخص تھا جو اس انقلاب کو سمجھتا بھی تھا اور اس پر قابو پانے کی صلاحیت سے بھی بہرہ ور تھا۔ چنانچہ جب اس کے

سامنے عام بھلائی کا مسئلہ آیا، اسے فرد واحد کو موت کے سپرد کرنے میں ذرا بھی خمیر کی حلش محسوس نہ ہوئی۔“

”کیا تم یہاں دوسری میز پر آنا پسند کرو گے؟“ آنتا پاؤلوونا نے اس سے پوچھا۔

ہیئر نے اس کی بات سنی ان سنی کر دی اور اپنی تقریر جاری رکھی۔

”ہاں، بالکل۔“ اس نے وجدانی کیفیت کے زیر اثر بلند آہنگ لہجے سے کہا: ”نیو لین عظیم ہے کیونکہ وہ

انقلاب سے بہت اونچا اٹھ گیا ہے۔ اس نے اس کے مشقی اور برے پہلوؤں کو مٹا دیا اور اس کے مثبت اور اچھے

پہلوؤں۔ شہریوں کے مابین مسافات، اخبارات اور تقریر کی آزادی کو برقرار رکھا۔ اور شخص یہی وجہ ہے کہ وہ

اقتدار اپنے ہاتھ میں لے سکا۔“

”جی، بجا فرمایا۔ لیکن میں کہوں گا کہ جب اس نے اقتدار پر قبضہ کیا، اگر وہ قتل کا ارتکاب کرنے کے

بجائے اسے جائز اور قانونی وارث سلطنت کے حوالے کر دیتا،“ وائی کاؤنٹ نے کہا: ”میں اسے عظیم انسان قرار

دینے سے دریغ نہ کرتا۔“

”وہ یہ نہیں کر سکتا تھا۔ عوام الناس نے اقتدار اس کے حوالے ہی اس لیے کیا تھا کہ وہ انہیں بوغ بونوں

کے تسلط سے نجات دلائے اور اس لیے بھی کیونکہ وہ اسے عظیم انسان تصور کرتے تھے۔ انقلاب پر شکوہ چیز تھا،“

ہیئر نے اپنی تقریر جاری رکھتے ہوئے کہا۔ وہ اپنے اس نامعاقبت اندیش، دراشتعال انگیز بیان سے یہ ظاہر کر رہا تھا کہ

ابھی وہ نو عمر اور نا تجربہ کار ہے، اور اس کی بس یہی خواہش ہے کہ جو کچھ اس کے دس میں ہے، اسے بلا کم و کاست

ٹراک پڑا کر اگل دے۔

”انقلاب برپا کرنا اور شاہی خاندان کے افراد کو موت کے گھاٹ اتارنا کوئی بہت ارفع، اعلیٰ کام ہے؟ اس

کے بعد؟۔ خیر، تم اس میز پر آنا پسند نہیں کرو گے؟“ آنتا پاؤلوونا نے اپنی بات دہرائی۔

”Contrat Social“ والی کاؤنٹ نے خوش اخلاقی اور ملائمت سے کہا۔

”میں شاہی خاندانوں کے افراد کے قتل کا ذکر نہیں کر رہا، میں تصورات کی بات کر رہا ہوں۔“

”بہا فرمایا! لوٹ مار، غارتگری، قتل عام، شاہی افراد کی ہلاکت کے تصورات،“ طنزیہ آواز نے پھر دخل دیا۔

”اس میں شک نہیں کہ جبر و دستیوں کے واقعات ضرور ہوئے لیکن یہ باتیں اتنی اہم نہیں۔ اہمیت جن

باتوں کو حاصل ہے وہ انسانوں کے حقوق، تعصبات سے چھٹکارا اور شہریوں کے مابین مساوات ہیں۔ اور پولیس

نے ان تمام اصولوں کو ملحوظ خاطر رکھا ہے اور انھیں ضائع نہیں ہونے دیا۔“

”حریت اور مساوات،“ والی کاؤنٹ نے یوں ناک بھوں چڑھا کر کہا جیسے آخر کار اس نے یہ تہیہ کر لیا ہو کہ وہ

اس نوجوان پر یہ ثابت کر دے گا کہ اس کے دلائل کتنے بودے اور احمقانہ ہیں۔ ”حریت اور مساوات،“ محض بلند ہنگ

الفاظ ہیں، ادنیٰ رکان پھیکا پکوان۔ انھیں اپنی وقت کھوئے مدتیں بیت چکی ہیں۔ حریت اور مساوات کسے پسند نہیں؟

خود ہمارے نجات دہندہ یسوع مسیح، ان کا پرچار کر چکے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ جب سے انقلاب آیا ہے، کیا لوگوں نے

موت و شادمانی کی زندگی گزارنا شروع کر دیا ہے؟ بالکل نہیں۔ حقیقت اس کے عکس ہے۔ ہم نے آزادی کی تمنا کی تھی اور

یوانا پارت نے اسے ملیا میٹ کر دیا۔“

پرنس اندرے مسکرا رہا تھا۔ وہ کبھی دبیر، کبھی والی کاؤنٹ اور کبھی آٹنا پاو لوونا کو دیکھنے لگا۔ بے تمام تر مجلسی

تجربے کے باوجود آٹنا پاو لوونا دبیر کی دھم کہ خیر تقریر کے ابتدائی کلمات سن کر ہی دہشت زدہ ہو گئی تھی لیکن جب اس

نے دیکھا کہ دبیر کی بے ادبی، بے حرمتی اور زیر زبانی پڑنی باتیں بھی والی کاؤنٹ کو طیش دلانے میں ناکام رہی ہیں تو

سے پختہ یقین ہو گیا کہ اس کو یوں دیا نامکن نہیں رہا۔ چنانچہ اس نے اپنی تمام صلاحیتیں مجتمع کیں اور والی کاؤنٹ

کی حمایت میں دبیر پر پل پڑی۔

”لیکن الی ڈیر سوسیدو دبیر، تم کسی ایسے عظیم شخص کی حمایت کس طرح کر سکتے ہو جو نہ کوئی جواز دھونڈتا ہے، نہ

مقدسے کے جنم جھٹ میں پڑتا ہے، آؤ دیکھنا تاؤ، ڈیوک کو بھی اور عام آدمی کو بھی موت کے گھاٹ اتروا دیتا ہے؟“

”موسیدو، میں آپ سے یہ پوچھنا چاہوں گا کہ اٹھارہ بنو میر کو جو کچھ پیش آیا، اس کی آپ کیا توجیہ کریں گے؟

کیا یہ سراسر فریب نہیں تھا؟ ایسا قانونی حیلہ جو کسی لحاظ سے بھی کسی عظیم انسان کے طرز عمل سے لگا نہیں کھاتا۔“

”پھر وہاں ان جنگ جن کا اس نے افریقہ میں قتل عام کیا، بڑی بھیا تک حرکت تھی اس کی؟“ کوچک پرنس

نے کہا اور اس کا بدن کپکپانے لگا۔

”آپ مائیں پانہ مانیں، اس شخص کا شرفاء سے کوئی تعلق نہیں، بالکل کی کمین ہے،“ پرنس اپولیت نے دخل

اندازی کرتے ہوئے کہا۔

• عمرانی معاہدہ: مدد اور اٹھارویں صدی کے بعض فلسفیوں کا نظریہ تھا کہ انسانی معاشرت کی بنیاد ایک معاہدے پر ہوئی تھی جو

انسانوں نے مل کر طے کیا تھا۔

پیٹر کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کس کس کی بات کا جواب دے۔ اس نے پہلے ایک، پھر دوسرے کی جانب دیکھا اور مسکرائے لگا۔ اس کی مسکراہٹ دوسرے لوگوں کی نیم دلائے مسکراہٹ سے قطعی مختلف تھی۔ جب وہ مسکرایا، اس کا سنجیدہ، بلکہ کسی قدر کل کھرا اور روکھا چہرہ آناٹا ناغاب ہو گیا اور اس کی جگہ نیا چہرہ نمودار ہو گیا جو بچوں کے چہروں کی طرح معصوم، شفیق بلکہ کسی حد تک احمقانہ بھی تھا جو پکار پکار کر اعلان کرتا نظر آ رہا تھا کہ بھائی مجھے معاف کر دو۔

وائی کاؤنٹ پر، جو پہلی مرتبہ اس کی شکل دیکھ رہا تھا، یہ بات ردِ ردشن کی طرح عیاں ہو گئی کہ اس حریت و جمہوریت کے دلدادہ و انقلاب فرانس کے کٹر حامی نوجوان کی شخصیت کسی طور پر بھی اتنی مرعوب کن نہیں ہوتا کہ اس کی گفتگو سے مترشح ہوتا تھا۔

ہر شخص خاموش تھا۔

”آپ لوگوں نے یہ کیسے امید باندھ لی کہ وہ آپ سب کے سوالوں کا ہر ایک وقت جواب دے سکے گا؟“

پرنس آندرے نے کہا۔ ”اس کے علاوہ قابلِ غور نکتہ یہ ہے کہ جب ہم کسی مہربانستان کے فعال و اعمال کا جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں اس کے ان اعمال کے، جو اس سے نجی حیثیت سے سرزد ہوتے ہیں اور ان اعمال کے، جو وہ جنرل یا امپراطور کی حیثیت سے سرانجام دیتا ہے، مابین حد فاصل کھینچنا ہوگی۔ میرے خیال میں درست طریقہ یہی ہے۔“

”بالکل، بالکل!“ پیٹر جھٹ بول پڑا۔ تائید کے اس مظاہرے نے اس کی ہاتھیں کھلا دی تھیں۔

”ہمیں یہ تسلیم کرنا ہوگا“ پرنس آندرے نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا، ”کہ اگر کوئی²⁵ کے پل پر بحیثیت انسان پھولین کا رویہ عظیم تھا۔ جائزہ کے ہسپتال میں وہ جس طرح طاعون کے مریضوں سے ہاتھ ملاتا رہا، وہ بھی اس کی عظمت کی دلیل ہے۔ لیکن... اس کی کچھ دیگر حرکات ایسی ہیں کہ اس کا جو زحمت کش کرنا کارے دارو ہے۔“

پیٹر کی باتوں نے لوگوں کو جس طرح خش و خج میں ڈال دیا تھا، معلوم ہوتا تھا کہ پرنس آندرے اس کیفیت کی شدت میں تخفیف کرنا چاہتا ہے۔ وہ اپنی نشست سے اٹھ اور ہاتھ سے اپنی زدِ وجہ کو اشارہ کیا کہ اب انھیں اجازت طلب کرنا چاہیے۔

اچانک پرنس اپولیت اٹھا، اس نے دونوں بازو لہرائے اور لوگوں کو جانے سے روک دیا۔ اس نے انھیں دعوت دی کہ وہ دوبارہ اپنی نشستوں پر بیٹھ جائیں اور اس کی بات سنیں۔

”واہ!“ اس نے اپنی گفتگو کا آغاز کیا۔ ”دوستو، آج میں نے ایک نہایت دلچسپ اور لذیذ قصہ سنا تھا۔ یہ قصہ ایک واقعے کے بارے میں ہے جو ماسکو میں پیش آیا تھا۔ میرے دل میں کھد بھد ہو رہی ہے کہ میں یہ قصہ آپ لوگوں کو ضرور سناؤں۔ جناب وائی کاؤنٹ، معافی چاہتا ہوں۔ مجھے یہ قصہ روئی میں سنانا ہو گا ورنہ اس کا سارا سزا کر کر اہو جائے گا۔“

اور پرنس اپولیت کچھ اس قسم کی ردی زبان بولنے لگا کہ کوئی بھی فرانسیسی، جو بارہ ماہ روس میں گزار چکا ہو، با آسانی بول سکتا ہے۔ تمام حاضرین ہر تن گوش تھے، آخر پرنس نے ہیمن اور پرزور اصرار کیا تھا کہ وہ اس کی کہانی

منے کے لیے رک جائیں۔

”سکو میں ایک خاتون رہتی ہے une came۔ یہ خاتون بے حد کنجوس بلکہ مکھی چوس ہے۔ یہ خاتون دروردی پوش ملازم رکھنا چاہتی تھی۔ ان کا کام اس کی گاڑی میں پیچھی جانب کھڑے ہونا تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ اس کے یہ دونوں خدمت گار بے ترنگے ہوں۔ اپنے اپنے ذوق کی بات ہوتی ہے اور اس کا ذوق بھی تھا۔ اس کی ایک خادمہ (femme de chambre) تھی اور یہ بھی بہت لمبی ترنگی تھی۔ اس خاتون نے کہا۔“

یہاں پرنس اپولیت رک گیا اور کچھ سوچنے لگا۔ معلوم ہوتا تھا کہ اسے اپنے خیالات مجتمع کرنے میں وقت پیش آرہی ہے۔

”اس نے کہا۔ ارے، ہاں، اس نے کہا لڑکی، (femme de chambre) livree (وردی) پہن کر گاڑی کے عقب میں کھڑی ہو جاؤ درمیرے ساتھ fairedes visites (مجھے کچھ لوگوں سے ملاقاتیں کرنا ہے۔“)

یہاں پرنس اپولیت پرنسی کا دورہ پڑ گیا اور بیشتر اس کے کہ حاضرین میں سے کوئی شخص خندہ زن ہوتا، وہ خود ہی زور زور سے قہقہے پر قہقہہ لگانے لگا۔ بد قسمتی سے سامعین پر اس کا الٹا اثر ہوا۔ تاہم چند اشخاص، جن میں آگناپا و لوونا اور مندر خاتون شامل تھیں، اخلافاً مسکرا دیے۔

”وہ گاڑی میں روانہ ہو گئیں۔ اچانک تیز ہوا کا جھونکا آیا اور خادمہ کا ہیٹ اڑا لے گیا۔ اس کے لمبے بال پریشان ہو گئے۔“ اب اس کے لیے مزید ضبط کرنا مشکل ہو گیا اور اپنے طویل اور فلک شگاف قہقہوں کے مابین اس نے کہا ”اور سارے شہر میں اس واقعے کی دھوم مچ گئی۔“

اور اس کے ساتھ ہی اس کی کہانی ختم ہو گئی۔ اگرچہ کسی کی سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ اس نے یہ کہانی کیوں سنائی تھی پھر ردی میں ہی کیوں سنانے پر اصرار کیا تھا، آگناپا و لوونا اور دوسرے اصحاب اس کی معاملہ فہمی کے قائل ہو گئے کہ موسیو وینر نے جس منہ پھٹ انداز سے اپنے خیالات کا اظہار کیا تھا، اس حکایت نے نہایت خوشگوار طریقے سے اس کے اثرات زائل کر دیے ہیں۔

جب کہانی ختم ہو گئی، گھنگوکار خ تہریل ہو گیا۔ گزشتہ اور آئندہ بال اور تھیمز موضوع بحث بنے اور حاضرین آپس میں ملے کرنے لگے کہ کون کس سے کہاں ملے گا۔

5

مہمانوں نے آگناپا و لوونا کا شکریہ ادا کیا کہ اس نے نہایت charmante solree کا اہتمام کیا اور رخصت ہونے لگے۔

• دل آویز محفل

حیرت کی کیفیت یہ تھی کہ اونٹ رے اونٹ تیری کون سی کل سیدھی۔ اس کا جسم کڑھپ، بے ہنگم، لمبے ٹخیم اور عام انسانوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ لمبوتر تھا۔ اس کے ہاتھوں کی رنگت سرخ اور وہ بھاری بھرکم تھے۔ لوگ کہتے تھے کہ ڈرائنگ روم میں داخل ہونے کا سیکہ کیا ہے، اس سے وہ بالکل بے بہرہ تھا اور جہاں تک وہاں سے رخصت ہونے کا تعلق ہے، اس کے بارے میں وہ اور بھی کون تھا۔ اسے یہ معلوم ہی نہیں تھا کہ اجازت چاہنے سے قبل اپنی میزبان کے ساتھ چند خوشگوار کلمات کا جادلہ کیسے کیا جاتا ہے۔ ستم بالائے ستم، حضرت غائب دماغ بھی تھے۔ اب جب وہ جانے کے لیے اٹھا، اس نے اپنی ٹوپی اٹھانے کے بجائے کسی جرنیل کی ٹکونی ٹوپی اٹھالی اور اس کے پھند نے مروڑنے لگا تا آنکہ جرنیل نے اس سے یہ نہ کہہ دیا، ”جناب، میری ٹوپی مجھے لوٹا دیں۔“ یہ ٹھیک ہے کہ وہ غائب دماغ تھا، اور ڈرائنگ روم میں داخل ہونے اور گفتگو کرنے کے سیکھے سے نا آشنا تھا لیکن اس کی اس تمام کوتاہیوں کی تلافی یوں ہو جاتی تھی کہ وہ شفیق، نرم خو، سیدھا سادا اور منکسر المزاج انسان تھا۔ آٹنا پاولوونا اس کی جانب متوجہ ہوئی اور مسکرت مسکنت سے گردن کو خم دیا۔ یہ اس امر کی علامت تھی کہ اس نے اس کی لغزش معاف کر دی ہے۔

”مائی ڈیر موسیو بیئر، مجھے امید ہے کہ تم سے پھر ملاقات ہوگی اور مجھے یہ بھی امید ہے کہ تم اپنے خیالات تبدیل کر لو گے۔“

حیرت نے کوئی جواب نہ دیا، صرف جھک کر آداب بجا لیا۔ ایک بار پھر انھیں اس کے چہرے پر جو تہم نظر آیا وہ یہ کہتا معلوم ہوتا تھا، ”میرے خیالات بدلیں نہ بدلیں، آپ یہ دیکھیں کہ میں کتنا نحس، بھلا اور نیک طبیعت انسان ہوں۔“ اور ہر شخص، بشمول آٹنا پاولوونا، کو جلی طور پر یہ محسوس ہوتا تھا کہ وہ ٹھیک کہہ رہا ہے۔

پرنس آندرے استقبال کرے میں جا چکا تھا۔ اس نے اپنے کندھے خدمت گار کے سامنے جھکا دیے تاکہ وہ اسے اس کا اور کوٹ اڑھادے۔ وہ اپنی شریک حیات اور پرنس اپولیت کی، جوان کے پیچھے پیچھے وہاں آگیا تھا، بے معنی گفتگو تعلق سے سن رہا تھا۔ پرنس اپولیت خوبصورت حامد کوچک پرنس کے بالکل قریب کھڑا تھا اور اپنی عینک میں سے اسے ٹکلی باندھ کر دیکھ رہا تھا۔

”آنیت، اب تم اندر چلی جاؤ ورنہ تمہیں زکام ہو جائے گا،“ کوچک پرنس نے آٹنا پاولوونا سے اجازت لیتے ہوئے کہا۔ ”مجھ کو کہ بات سنی ہو گئی ہے؟“ اس نے مدھم آواز سے کہا۔

آٹنا پاولوونا کوچک پرنس کی ہند کے ساتھ انا طول کا رشتہ کرانے کے لیے جو پھنڑی پکار رہی تھی، اس کے متعلق وہ اس سے پہلے ہی بات کر چکی تھی۔

”مائی ڈیر، میں اس معاملے میں بالکل تمہارے رحم و کرم پر ہوں،“ آٹنا پاولوونا نے بھی زیر لب کہا۔ ”بس اسے خط لکھ دینا اور پھر مجھے بتانا کہ اس کے باپ کا اس بارے میں کیا رد عمل ہے۔ اچھا، au revoir۔“ اور وہ

استقبالہ کرے سے باہر نکل گئی۔

پرنس اپولیت کو چمک پرنس کے نزدیک ہو گیا اور اس کے چہرے کے قریب سر جھکا کر سرگوشیوں میں کچھ کہنے لگا۔

در خدمت گار، ایک اس کا اپنا اور دوسرا پرنس کا، ان کی گفتگو کے ختم ہونے کا انتظار کر رہے تھے۔ ایک کے ہاتھوں میں شال تھی اور دوسرے کے سر دشا اور کوٹ۔ گفتگو فرانسیسی میں ہو رہی تھی اور ان کی سمجھ سے بالاتر۔ لیکن وہ یوں کان لگائے کن رہے تھے جیسے ایک ایک لفظ سمجھ رہے ہوں لیکن ظاہر نہیں کرنا چاہتے کہ وہ سب کچھ سمجھ رہے ہیں۔ کو چمک پرنس اپنی عادت کے مطابق جب بات کرنی تھی، مسکرائے لگتی تھی اور جب سنتی تھی، ہنس پڑتی تھی۔

’میں بے حد خوش ہوں کہ سفیر کی پارٹی میں نہیں گیا۔ کتنی بوریٹ ہوتی۔ یہاں شام بہت پر طف گزری۔ پر لطف تھی نا؟‘

’لوگ کہتے ہیں کہ بال بہت زبردست ہوگا‘ پرنس نے اپنا زیریں لب سیکڑتے ہوئے کہا۔ ’تمام حسین و جمیل خواتین اس میں شریک ہوں گی۔‘

’ساری نہیں۔ تم وہاں کہاں ہوگی۔ پھر ساری کیسے؟‘ پرنس اپولیت نے ہنستے اور ہانچیں کھاتے کہا۔ اس نے جھپٹ کر خدمت گار سے شال چھین لی اور اسے قدرے ایک طرف دھکیل دیا تاکہ وہ اپنے ہاتھوں اسے پرنس کو ڈھال سکے۔ جب وہ شال اڑھا چکا اس نے اپنے بازو اس کے جسم کے گرد لپٹے رہنے دیے (اس نے یہ حرکت دانستہ کی تھی یا انارزی پن کا اس میں دخل تھا، کوئی بھی یقین سے نہیں بتا سکتا تھا) جیسے وہ اس سے ہم آغوش ہونے کی کوشش کر رہا ہو۔

پرنس بھی تک مسکرا رہی تھی اور مسکراتے مسکراتے ہایت شائستگی سے پیچھے ہٹ گئی۔ پھر وہ مڑی اور اس نے ایک نظر اپنے خاوند پر ڈالی۔ پرنس آندرے کی آنکھیں بند تھیں۔ معصوم ہوتا تھا کہ تھکاوٹ سے اس کا جسم چور ہو رہا ہے اور اس کی آنکھیں تیند سے بوجھل ہو رہی ہیں۔

’چلیں؟‘ اس نے اپنی بیوی سے پوچھا لیکن اس کی نگاہیں کہیں اور تھیں۔

پرنس اپولیت نے بہ عجلت اپنا اور کوٹ، جو اس زمانے کے فیشن کے مطابق اس کی ایڑیوں تک پہنچتا تھا، پہنا اور اس میں الجھتا اور ٹھوکریں کھاتا کو چمک پرنس کے پیچھے پیچھے پورچ کی طرف بھاگا جہاں خدمت گار سے گاڑی میں بیٹھنے میں مدد سے رہا تھا۔

’پرنس! au revoir۔‘ اس کی زبان بھی اسی طرح لڑکھارہی تھی جیسے کہ اس کے پاؤں۔

پرنس نے اپنی سکرٹ سنبھالی اور تیرہ دھار گاڑی میں بیٹھنے لگی۔ اس کا خاوند اپنی ششیر درست کر رہا تھا۔ اور پرنس اپولیت مدد کے بہانے دونوں کے لیے رکاوٹ بنا ہوا تھا۔

’محترم، اجازت ہے؟‘ پرنس آندرے نے پرنس پوپٹ کو روکی میں قرش روٹی سے ڈانٹتے ہوئے کہا۔

”میجر، میں تمہارا انتظار کروں گا۔“ اب اسی آواز میں پیرا اور بیگانگی کی چاشنی تھی۔

اسپ سوار کو چوان نے گھوڑوں کو چابک دکھایا۔ پیسے کھڑکھڑائے اور گاڑی چلنے لگی۔ پرنس اپولیت میٹرھیوں پر کھڑا تھا۔ وقفے وقفے کے بعد اس کی ہنسی چھوٹنے لگتی۔ وہ دائی کاؤنٹ کا انتظار کر رہا تھا۔ اس نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ وہ اسے اس کے گھر پہنچا دے گا۔



”راہ بھائی راہ، تمہاری کو چک (little) پرنس بڑے ٹھکے کی خاتون ہے۔ چہ خوب!“ دائی کاؤنٹ نے گاڑی میں پرنس اپولیت کے پاس بیٹھتے ہوئے کہا۔ ”واقعاً نہایت نفیس اور پر رفعت!“ اس نے اپنی انگلیوں کی پوروں کو چوما۔ ”دربانگلن فرامیسی ہے!“

اپولیت کھلکھلا کر ہنس پڑا۔

”تم جتنے تو بہت بھولے ہو لیکن تمہیں معلوم ہے کہ تم ہو بہت خوف ناک شخص،“ دائی کاؤنٹ نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”مجھے بے چارے خاندان پر بہت ترس آتا ہے۔ ہے تو چھوٹا سا انسر لیکن بنائیوں ہے جیسے سلطنت کا ولی عہد ہی ہو۔“

اپولیت پھر دانت نکوس کر ہنسنے لگا اور ہنستے ہنستے اس نے جواب دیا:

”اور تم کہتے تھے کہ ہماری ردی ٹورنیں تمہاری فرانسیسی خواتین سے لگا نہیں کھا سکتیں۔ بات صرف اتنی ہے کہ آدمی کو ان سے نہننے کا سلیقہ آنا چاہیے اور بس۔“



میجر دوسروں سے پہلے پہنچ گیا۔ پرنس آندرے سے اس کی بے تکلفی تھی، یوں وہ سیدھا اس کے عٹڈی روم میں چل گیا اور حسب عادت صوفے پر ٹانگیں پیر کر بیٹ گیا۔ اس نے شیلف سے جو پہلی کتاب (یہ جولیسن سیزر کی یادداشتوں پر مشتمل تھی) اس کے ہاتھ آئی، اٹھالی اور کہنی پر سر جھکا کر اسے درمیان میں سے پڑھنے لگا۔

”یہ تم نے مادموزیل شیرے سے کیا سلوک کر دیا؟ اب واقعی اس کی طبیعت ناساز ہو جائے گی،“ پرنس آندرے نے کہا۔ وہ اپنے ننھے منے سفید ہاتھ مسلما عٹڈی روم میں داخل ہو چکا تھا۔

میجر نے کچھ اس طرح صوفے پر کروٹ بدلی کہ وہ چرچا کرنے لگا۔ اس نے اپنا پریشانی چہرہ اٹھا کر آندرے کی جانب دیکھا، مسکرایا اور ہاتھ کے اشارے سے اس کے سول کو گول کر دیا۔

”تم جانتے ہو کہ وہ صدر راہب بہت دلچسپ شخص ہے لیکن وہ حالات کا صحیح زاویے سے جائزہ نہیں لیتا۔ میری رائے میں مستقل امن ممکن ہے لیکن۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ میں اپنا مدعا کس طرح بیان کروں۔ لیکن طاقت کا

توازن قائم کر کے نہیں۔“

یہ بالکل عیاں تھا کہ آندرے کو اس قسم کے مجرد مسائل میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

”mon cher، آدمی جو کچھ سوچتا سمجھتا ہے، اس کا جگہ جگہ اظہار ممکن نہیں۔ خیر، چھوڑو، اب یہ بتاؤ کہ تم نے فیصلہ کیا ہے؟ ہارس گارڈز میں بھرتی ہو گے یا سفارت سنبھالنے کا ارادہ ہے؟“ مختصر خاموشی کے بعد آندرے نے پوچھا۔

ہیئر آئی پالٹی مار کر صوفے پر بیٹھ گیا۔

”اگر میں یہ کہوں کہ ابھی تک میرا ذہن صاف نہیں ہوا، تو تم مان لو گے؟ سچ پوچھو تو مجھے دونوں میں سے ایک بھی پسند نہیں۔“

”لیکن تمہیں کسی نہ کسی کے بارے میں فیصلہ تو کرنا ہی ہو گا۔ تمہارے والد نظر کر رہے ہیں۔“

ہیئر ابھی دس برس کا تھا کہ اسے ایک راہب کی سمیت میں، جو اس کا ٹیوٹر مقرر ہوا تھا، ملک سے باہر بھیج دیا گیا۔ وہ وہیں ستیم رہا تا آنکہ اس کی عمر میں سال ہو گئی۔ جب وہ واپس ماسکو پہنچا، اس کے باپ نے راہب کی چھٹی کردی اور نو جوان سے کہا۔ ”اب تم پیٹرز برگ چلے جاؤ۔ وہاں حالات کا جائزہ لو اور اپنے لیے کوئی ملازمت منتخب کرو۔ تمہیں جو کچھ پسند آئے گا، میں اس سے اتفاق کر لوں گا۔ میں نے پرنس داسلی کے نام خط تحریر کر دیا ہے۔ یہ رہا وہ اور کچھ رقم بھی۔ مجھے ہر چیز کے بارے میں مطلع کرتے رہنا اور میں ہر طرح تمہاری مدد کروں گا۔“ خیر تمین مہینوں سے اس ایڈیٹر بن میں مصروف تھا کہ وہ یہ فیصلہ کر سکے کہ اسے کون سی ملازمت اختیار کرنا ہے۔ لیکن وہ ابھی تک ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا تھا۔ آندرے اس سے اسی انتخاب کے بارے میں دریافت کر رہا تھا۔ ہیئر اپنی پیشانی مسلتے لگا۔

”وہ غائب فری مین ہے،“ اس نے صدر راہب کے بارے میں، جس کے ساتھ اس کی اسی شام ملاقات ہوئی تھی، اظہار خیال کرتے ہوئے کہا۔

”یہ نری بکواس ہے؟“ پرنس آندرے نے اسے ٹوکتے ہوئے کہا۔ ”ہمیں سنجیدہ معاملات کے بارے میں گفتگو کرنا ہے۔ تم ہارس گارڈز کے دفتر گئے تھے؟“

”نہیں، میں وہاں نہیں گیا۔ لیکن مجھے ایک بات سوجھی ہے۔ اور میں اس کے متعلق تمہارے ساتھ گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔ یہ جنگ نیو لین کے خلاف ہے۔ اگر یہ جنگ آزادی کی جنگ ہوتی، تو بات میرے پلے پڑ جاتی اور میں سب سے پہلے فوج میں بھرتی ہوتا۔ لیکن دنیا کی عظیم ترین ہستی کے خلاف انگلستان اور آسٹریا کی مدد کرنا۔ یہ چیر غلط ہے۔“

ہیئر کے بچکانہ بیان پر پرنس آندرے محض کندھے اچکا کر رہ گیا۔ اس کے رویے سے مترشح ہوتا تھا کہ اس

قسم کی احمقہ نہ گفتگو کا جواب دینا اس کے لبس کی بات نہیں۔ اور سچ تو یہ ہے کہ میٹر کے بھولے کلمات کا جواب اس کے علاوہ اور کچھ ہو ہی نہیں سکتا تھا جو پرنس آندرے نے اسے دیا:

”مگر ہر شخص محض اپنے عقائد کی خاطر جنگ کرے، پھر کوئی جنگ نہیں ہوگی۔“

”اور یہ تو بہت ہی اعلیٰ بات ہوگی!“ میٹر کا جواب تھا۔

پرنس آندرے لبس پڑا۔ اس کی ہنسی طنز یہ تھی۔

”ممکن ہے یہ بہت اعلیٰ بات ہو لیکن ایسا کبھی ہوگا نہیں۔“

”تم کیوں جنگ کرنے جا رہے ہو؟“ میٹر نے سوال کیا۔

”کیوں؟ پتا نہیں۔ اس لیے کہ مجھے جانا چاہیے۔ علاوہ ازیں، میں اس لیے جا رہا ہوں۔ اس نے توقف

کیا،“ میں اس لیے جا رہا ہوں کہ میں یہاں جس قسم کی زندگی گزار رہا ہوں۔ یہ زندگی۔ میری پسند کی نہیں۔“

6

ماحقہ کمرے میں کسی عورت کے لبس کی سرسراہٹ سنائی دی۔ پرنس آندرے یوں اچھوٹے جیسے وہ ٹینڈر سے بیدار ہوا ہو اور اس کے چہرے پر وہی تیور مایاں ہو گئے جو آنا پاولوونا کے ڈرائنگ روم میں نظر آئے تھے۔ میٹر نے اپنے پاؤں مسونے سے نیچے اتار دیے۔ پرنس آندرے آئی۔ وہ اپنا لباس تبدیل کر چکی تھی۔ اس کی پوشاک اب نسبتاً سادہ تھی لیکن تازگی اور نفاست میں پہلے سے کم تر نہیں تھی۔ پرنس آندرے اٹھا اور اس نے نہایت شائستگی سے اس کے بیٹھنے کے لیے کرسی بچھا دی۔

”میں اکثر سوچتی ہوں،“ اس نے حسب معمول فراہمی میں اپنی گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔ اس کے ساتھ ہی وہ تیزی سے آگے بڑھی اور دیکھتی بھالتی خواہ مخواہ کی احتیاط برتنی کرسی پر فردکش ہو گئی، ”کہ آخر آئیت نے آج تک شادی کیوں نہیں کی؟ آپ تمام مرد حضرات بھی کتنے احق ہیں کہ کسی نے اس سے عقد نہیں کیا۔ بات ذرا سخت ہے اور اس کے لیے میں معافی چاہتی ہوں لیکن میں اتنا ضرور کہوں گی کہ عورتوں کے ہارے میں تم لوگ بالکل پیدل ہو۔ موسیو میٹر، تم بڑے کٹ جتتی ہو۔“

”میری ابھی تک آپ کے شوہر سے بحث چل رہی ہے۔ میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ آخر یہ جنگ میں کیوں شریک ہونا چاہتے ہیں؟“ میٹر نے کہا۔ اس کے انداز میں وہ بھوک قلعاً مفقود تھی جس کا نوجوان خاتون کی موجودگی میں نوجوان مرد شکار ہو جاتے ہیں۔

پرنس اچھل پڑی۔ معلوم ہوتا تھا کہ میٹر نے اس کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا ہے۔

”آہ بالکل یہی بات میں کہتی ہوں۔ مجھے بالکل سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر مردوں کا جنگ کے بغیر گزارہ کیوں نہیں ہو سکتا۔ ہم عورتوں کو اس کی خواہش کیوں محسوس نہیں ہوتی، ضرورت ہی پیش نہیں آتی؟ خود انصاف

کرد۔ میں انھیں اکثر کہتی رہتی ہوں! یہ ٹھہرے انگل کے ایڈی کانگ۔ کتنا زبردست عہدہ ہے! کتنی شہرت ہے ان کی! کتنی عزت حاصل ہے انھیں۔ پچھلے دنوں کی بات ہے۔ اپراکسنوں (Apraksins) کے ہاں میں نے ایک خاتون کو یہ پوچھتے سنا: "ہائیں، یہی مشہور و معروف پرنس آندرے ہیں، میں جھوٹ نہیں کہتی، سچ عرض کر رہی ہوں۔" وہ ہنس پڑی۔ "یہ جہاں بھی جاتے ہیں، ان کی اسی طرح آؤ بھگت ہوتی ہے۔ یہ چاہیں تو نہایت آسانی سے امپراطور کے بھی یڈی کانگ مقرر ہو سکتے ہیں۔ تمہیں معلوم ہے کہ امپراطور نے ان کے ساتھ نہایت شفقت سے کلام کیا تھا۔ میری اور آنیت کی بات ہوئی تھی۔ ہم دونوں کا خیال ہے کہ انھیں یہ عہدہ کسی دشت کے بغیر مل سکتا ہے۔ آپ کی کیا رائے ہے؟"

میر نے اچھٹی ٹگاہوں سے پرنس آندرے کو دیکھا۔ اسے اندازہ ہو گیا کہ وہ اس گفتگو سے ناخوش ہے۔ چنانچہ اس نے جواب دینے سے احتراز کیا۔

"کب جارہے ہو؟" وہ اس سے پوچھنے لگا۔

"اس کی روانگی کے متعلق کوئی بات نہ کریں۔ اس کا ذکر بھی اپنی زبان پر نہ لائیں! مجھے اس بارے میں ایک لفظ بھی سننا گوارا نہیں!" پرنس نے اسی من موہے، کھلنڈرے، شوخ اور طعنا زلیجے میں کہا جو اس نے آنا پالوونا کی محفل میں اپولیت کے ساتھ اپنایا تھا لیکن جو اس کے خاندانی دائرے سے، جس کا میٹر عملدار کن بن چکا تھا، ہر سچا کوئی مطابقت نہ رکھتا تھا۔ "آج جب مجھے یہ خیال آیا کہ ان کی روانگی کے بعد ان تمام خوشگوار وابستگیوں کا خاتمہ ہو جائے گا۔ پھر آندرے تمہیں پتا ہے کہ "اور وہ اپنے خاندان کی طرف متوجہ ہوئی، اسے متنی خیرنگاہوں سے دیکھا اور اس کے سر سے سر جوڑ کر بولی: "مجھے اندیشہ ہے، مجھے اندیشہ ہے۔" اور اس کا جسم بید بخنوں کی طرح کانپنے لگا۔ اس کے خاندان نے اسے یوں دیکھا جیسے اسے چنبا ہو رہا ہے کہ اس کے اپنے اور میٹر کے عداوہ کمرے میں یہ تیسرا شخص کون آگیا ہے۔ اس نے بخ بستہ شائستگی سے دریافت کیا:

"سا، تمہیں کس بات کا اندیشہ ہے؟ میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔"

"تمہیں معلوم ہے کہ مرد کتنے خود پسند ہوتے ہیں، سب کے سب، خود پسند، انا کے بارے ہوئے، محض اپنے کسی خبط کی، خدا معلوم یہ کیا ہے، تسکین کی خاطر یہ مجھے چھوڑ کر جا رہے ہیں، گاؤں میں مجھے اکیلی بند کر رہے ہیں۔" یہ کیوں بھول جاتی ہو کہ میرے ابا جان اور بہن بھی وہیں ہیں، "پرنس نے طاقت سے کہا۔

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟ میں تو وہاں تنہا ہوں گی۔ نہ کوئی دوست نہ کوئی سگی... اور پھر بھی یہ مجھ سے امید رکھتے ہیں کہ میں کسی قسم کا خوف دل میں نہ لوں۔"

اب اس کے لہجے میں چڑچڑاہٹ اور اس کے اوپر کی جانب اٹھے ہوئے ہونٹ سے کسی قسم کی مسرت چمکتی نہیں دکھائی دے رہی تھی بلکہ اس نے اس کے چہرے کی شکل یوں بگاڑ دی تھی کہ اب وہ خوبصورت و شیرازہ کا نہیں کسی اجڈ گھری کا چہرہ معلوم ہوتا تھا۔ وہ خاموش ہو گئی جیسے اسے یہ بات نازیبا نظر آ رہی ہو کہ وہ اپنا کپا چٹھا

بیٹر کی موجودگی میں بیان کر رہی ہے۔

”میں اب بھی یہ سمجھ نہیں سکا کہ آخر تمہیں اندیشہ کس بات کا ہے؟“ پرنس آندرے نے پیش میں آئے بغیر ہموار لہجے میں اپنی بات دہرائی۔ اس کی نگاہیں سسل اپنی بیوی کے چہرے پر مرکوز تھیں۔

پرنس شرملا گئی، اس کے چہرے کی رنگت سرخ ہو گئی اور وہ عالم، یوسی میں اپنے بازو نصف میں لہرانے لگی۔

”ہائے آندرے، تم کتنے بدل گئے ہو بالکل بدل گئے ہو۔“

”ڈاکٹر نے تمہیں ہدایت کی تھی کہ تمہیں جلدی سو جانا چاہیے،“ پرنس آندرے نے کہا۔ ”بہتر ہے کہ اب تم جاؤ اور آرام کرو۔“

پرنس خاموش رہی لیکن اس کا کہن ہونٹ، جس پر باریک سبز داگ رہا تھا، اچانک تھر تھرانے لگا۔ پرنس آندرے نے کندھے اچکائے، اپنی نشست سے اٹھا اور کمرے میں پکڑ کاٹنے لگا۔

بھورا بھال بیٹر حیرانی اور پریشانی کے عالم میں بینک میں سے جھانک جھانک کر دیکھنے لگا۔ اس کی نظریں کبھی پرنس پر پڑتیں اور کبھی اس کی رقیقہ حیات پر۔ بے چینی اسے کسی کل چین سے بیٹھنے نہیں دے رہی تھی۔ وہ اپنی جگہ سے ہل جیسے اٹھنا چاہتا ہو لیکن اس نے اپنا ارادہ تبدیل کر لیا۔

”اگر موسیو بیٹر یہاں موجود ہیں، تو میں کیوں براہِ نون؟“ کوچک پرنس اچانک پھٹ پڑی۔ اس کا خوبصورت چہرہ بدست ہو گیا اور وہ مضحک دکھائی دینے لگا۔ وہ روٹھ گئی ہو رہی تھی۔ ”آندرے، میں بہت دنوں سے تم سے یہ پوچھنا چاہ رہی تھی کہ میرے ساتھ تمہارے ردیے میں اتنی تبدیلی کیوں آگئی ہے؟ مجھ سے کیا گناہ سرزد ہوا ہے؟ تم جنگ پر جا رہے ہو اور تمہیں مجھ پر ذرا بھی ترس نہیں آتا۔ آخر کیوں؟“

”کسا!“ پرنس نے صرف یہی کہا لیکن اس ایک لفظ میں منت سہجست تھی، دھمکی تھی اور سب سے بڑھ کر یہ خود اعتمادی کہ وہ جو کچھ کہہ رہی ہے، اس پر سے ہچھٹانا پڑے گا۔

”تم مجھ سے یوں پیش آتے ہو جیسے میں روگی ہوں یا دودھ پیتی بچی۔“ وہ سانس روکے بغیر اپنی ہی ہانکے چلی گئی۔ ”میں سب سمجھ گئی ہوں۔ چھ ماہ قبل تمہارا یہ دتیر، نہیں تھا جو آج ہے، یا تھا؟“

”کسا، میں تمہارے پاؤں پڑتا ہوں کہ اب تم بس کرو،“ پرنس آندرے نے اور بھی واضح انداز سے کہا۔ اس گفتگو کے دوران میں بیٹر کی بے چینی اور اضطراب میں لفظ بہ لفظ اضافہ ہوتا گیا۔ وہ اٹھا اور پرنس کے قریب جا کھڑا ہوا۔ لگتا تھا کہ اس سے آنسوؤں کا یہ منظر برداشت نہیں ہو سکے گا بلکہ اس کے اپنے آنسو چھٹک پڑیں گے۔

”پرنس، اپنے آپ کو یوں ہلکان نہ کرو، تمہیں وہم ہو گیا ہے کیونکہ۔ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں، مجھے خود تجربہ ہو چکا ہے۔ وجہ یہ ہے۔ اس کا سبب یہ ہے۔ نہیں، معافی چاہتا ہوں۔ میں ٹھہر رہا ہوں کا آدمی، میرا یہاں کیا کام۔ آپ خواہ مخواہ پریشان نہ ہوں۔ خدا حافظ۔“

پرنس آندرے نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

”نہیں، سیر، ذرا ٹھہرو۔ پرنس اتنی شفیق ہیں کہ وہ یہ قطعاً نہیں چاہیں گی کہ مجھے تمہاری صحبت میں جو ایک شام گزرنے کا موقع ملا ہے، وہ مجھے اس سے محروم کر دیں۔“

”ہونہ۔ یہ بس اپنے بارے میں ہی سوچتے ہیں!“ پرنس نے چلا کر کہا۔ اب اسے اتنا شدید غصہ آچکا تھا کہ وہ بے اختیار رونے لگی۔

”اس!“ پرنس آندرے نے اتنی بلند آواز سے پکارا کہ معلوم ہوتا تھا کہ اب اس کے صبر کا پیمانہ پھٹک چکا ہے۔ اور پرنس کا خوبصورت تھا سنا چہرہ، جو گہری کے چہرے سے مشابہ ہو گیا تھا، اچانک تبدیل ہو گیا۔ اب وہاں وحشت اور خوف کے سائے لہرا رہے تھے، اس کی حالت رقت انگیز تھی اور کہہ رہی تھی کہ مجھ پر ترس کھاؤ۔ اس کی خوش نما آنکھیں اپنے شوہر کی جانب یوں دیکھ رہی تھیں جیسے اس پر اس کا اعتبار اٹھ گیا ہو۔ اور اس کے چہرے پر وہی ڈر ورنداست چھا گئی جس کا مظاہرہ داکٹر کرتا ہے جو اپنی مضحک دم تیزی لیکن ناقوانی سے گھمانے لگتا ہے۔

”Mon Dieu mon Dieu“ وہ بڑبڑاتی۔ اس نے ایک ہاتھ سے اپنی سکرٹ سنبھالی، اپنے خاوند کی طرف بڑھی، اور اس کی پیشانی پر بوسہ ثبت کر لیا۔

”Bon soir!“ وہ بولا، اٹھا اور اس نے یوں نستعلیق انداز سے اس کے ہاتھ کو چوما جیسے وہ اس کی بیوی نہیں، پرانی عورت ہو۔



دونوں دہست خاموش رہے۔ ان میں سے کوئی بھی مہر سکوت توڑنا نہیں چاہتا تھا۔ وقتاً فوقتاً پرنس آندرے پر گھمبیری نظروں سے گزرتا۔ پرنس اپنے ننھے سنے ہاتھوں سے اپنی پیشانی سہلاتا رہا۔

”چلو چلیں اور کچھ کھاپی لیں!“ اس نے آہ بھرتے ہوئے کہا۔ وہ اپنی نشست سے اٹھا اور دروازے کی جانب چل پڑا۔

وہ ٹھاٹ رارڈ اینٹک روم میں داخل ہوئے۔ اس کی حال ہی میں از سر نو تزئین ہوئی تھی اور اس پر پانی کی طرح روپیہ بہایا گیا تھا۔ رومالوں (napkins) سے لے کر چاندی، چینی اور بلور کے ظروفوں تک، ہر چیز پکار پکار کر کہہ رہی تھی کہ میں بالکل تازہ و ارد ہوں اور بالکل ویسی ہوں جیسی نو بہا ہوتا جوڑوں کے گھر ہونا چاہیے۔ کھانا ابھی جاری تھا کہ پرنس آندرے نے کئی میز پر لگائی اور وہ ایک ایسے شخص کی طرح، جو مدتوں سے جل بھن رہا ہو اور اب اچانک اپنے شکوے شکایتوں کا دفتر کھولنے پر تل گیا ہو، بولنے لگا۔ اس کے لہجے میں اعصابی جھجھکاؤ تھا اور یہ

• میرے آقا، میرے دیوتا

• شب بھرا

ایک ایسی چیز تھی جو اس سے قبل ہیئر کے مشاہدے میں نہیں آئی تھی۔

”میرے دوست، کبھی شادی کا نام نہ لینا۔ میرا تمہیں یہ مشورہ ہے کہ کانوں کو ہاتھ لگاؤ اور اس وقت تک شادی کے قریب بھی نہ پھٹکو جب تک اپنے آپ سے یہ نہ کہہ سکو کہ جو کچھ مجھ سے ہو سکتا تھا، میں نے کر لیا ہے۔“ اور اس وقت کا نقطہ رکرا جب اس عورت کے لیے، جسے تم نے اپنا جیون ساتھی بنانے کے لیے منتخب کیا ہے، تمہارے دل میں پیار نام کی کوئی چیز باقی نہ رہے اور اس کا ظاہر و باطن پوری طرح تم پر میاں نہ ہو جائے۔ بصورت دیگر تم اتنی زبردست اور ادیت ناک غلطی کا ارتکاب کر بیٹھو گے کہ اس کا مداوا تمہارے بس میں نہیں رہے گا۔ جب تم بوڑھے ہو جاؤ، تمہارے قواء مشکل ہو جائیں، کام کے رہو نہ کاج کے، پھر بے شک شادی کر لو۔ ورنہ تم میں جتنی بھی خوبیاں، صلاحیتیں، دراعلیٰ خصوصیات ہیں، ضائع ہو جائیں گی۔ معمولی معمولی باتیں ان کا پچھوڑ نکال دیں گی۔ یہ ٹکڑ ٹکڑ میرے منہ کی طرف کیوں دیکھ رہے ہو؟ میں سچ عرض کر رہا ہوں، قطعاً کسی مبالغے سے کام نہیں لے رہا۔ اگر تم سمجھتے ہو کہ مستقبل میں تم کوئی معرکہ سرانجام دے سکتے ہو، تو قدم قدم پر تمہیں یہ احساس ہوگا کہ سب کچھ ختم ہو گیا ہے، ہر دروازہ بند ہو گیا ہے، صرف ایک دروازہ کھلا رہ گیا ہے اور وہ ڈرائنگ روم کا دروازہ ہے۔ وہاں تم اپنے آپ کو کسی درباری تہچے یا کسی گھامڑ کی سطح پر پاؤ گے۔ خیر، اس معاملے میں مزید کیا کہا جاسکتا ہے؟...“ اور اس نے زور زور سے اپنے بازو فضا میں لہرائے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ چھوڑو، اس مسئلے پر مٹی رالو۔

ہیئر نے اپنا چشمہ تارویا۔ اس سے اس کے چہرے کی شکل تبدیل ہو گئی اور اب وہ پہلے سے بھی زیادہ شفیق اور نیک طبیعت دکھائی دینے لگا۔ وہ اپنے دوست کو بے نگاہہ تجب دیکھ رہا تھا۔

”میری بیوی!“ پرنس آندرے نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا، ”میری بیوی نہایت نفیس خاتون ہے۔ اس کا شمار ان محدودے چند خواتین میں کیا جاسکتا ہے جن کے متعلق یہ دعویٰ کیا جاسکتا ہے کہ ان کے ہاتھوں میں ان کے مردوں کا ناموس محفوظ ہے لیکن میں خداوند کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اس وقت میری سب سے بڑی آرزو یہ ہے کہ کاش میں شادی شدہ نہ ہوتا اس مقصد کے لیے میں بڑی سے بڑی قربانی دینے کو تیار ہوں۔ تم پہلے اور واحد شخص ہو جس کے سامنے میں نے اپنا سینہ کھول کر رکھ دیا ہے اور وہ بھی اس لیے کیونکہ میں تمہیں پسند کرتا ہوں۔“ جب وہ یہ باتیں کر رہا تھا اس کے اور اس بلکونسکی کے مابین مشابہت کم سے کم تر ہوتی جا رہی تھی، جو نیم بند آنکھوں کے ساتھ آٹنا پاؤں لودنا کی کرسی پر آرام سے پاؤں پیارے بیٹھا اور نیم والیوں سے فرانسیسی کلمات کی جگالی کر رہا تھا۔ اب اس کے چپکے ہوئے گالوں کا رداں رداں اعصابی توانائی کے ساتھ تھر تھرا رہا تھا۔ اس کی آنکھیں جن میں ازاں بیشتر زندگی کی حرارت بھی ہوئی نظر آتی تھی، اب خیرہ کن روشنی سے مسموم نظر آ رہی تھیں۔ بظاہر یہی معلوم ہو رہا تھا کہ عام حالات میں چاہے وہ کتنا ہی بے جان کیوں نہ نظر آئے، لیکن جب چڑچڑاپن اس پر سوار ہوتا ہے، وہ بے حد قوی اور توانا دکھائی دینے لگتا ہے۔

”میں اس قسم کی گفتگو کیوں کر رہا ہوں، تم نہیں سمجھ سکو گے،“ اس نے اپنے سلسلہ کلام کو آگے بڑھاتے

ہوے کہا: ”لیکن تم سمجھو تو جانو کہ یہی میری زندگی کی کہانی ہے۔ تم یوٹا پارت اور اس کے عروج کی باتیں کرتے ہو۔“
 (حالانکہ بیئر نے یوٹا پارت کا بالکل ذکر نہیں کیا تھا)۔ ”تم یوٹا پارت کی باتیں کرتے ہو۔ جب وہ اپنے حصول مقصد کے لیے جدوجہد میں مصروف تھا، وہ قدم بہ قدم آگے بڑھا۔ اس کے ہاتھ پاؤں نہیں بندھے تھے، وہ آزاد تھا۔ اپنے مقصد کے علاوہ اسے کسی اور چیز کی مابست سوچنا نہیں ہوتا تھا اور اس نے اپنا مقصد حاصل کر لیا۔ لیکن ایک مرتبہ تم اپنے آپ کو کسی عورت کے ساتھ تھپی کر لو، پھر سمجھ لو کہ تمہارے ہاتھ پاؤں زنجیروں میں جکڑ گئے۔۔۔ تمہاری آزادی چھین گئی۔ تمہاری آرزوئیں اور انگلیں، تمہارے جذبے اور صلاحیتیں، تمہارے لیے بھاری بوجھ بن جاتی ہیں، اور تمہیں ہلکان کیے دیتی ہیں، تمہیں زندہ و مرگور کر دیتی ہیں، درتم محض کفِ افسوس ملتے رہتے ہو کہ ہائے یہ میں نے کیا کیا۔ ڈرائنگ روم، لٹاپ شاپ باتیں، ہل، خود بینی و خود پسندی، بے ہودگیاں اور ہرزہ سرائیاں۔ یہ ہے وہ طلسمی حلقہ جس نے میرے ارد گرد حصار قائم کر رکھا ہے اور جس سے وہائی پاتا میرے لیے امر محال ہے۔ اب جب کہ میں جنگ۔ عظیم ترین جنگ جو کبھی برپا ہوئی ہے۔ میں شرکت کے لیے پرتول رہا ہوں، مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ میں جاہل مطلق ہوں اور میں کسی کام کے لیے موزوں نہیں۔ اس وقت میری شہرت یہ ہے کہ میری شخصیت دل آویز ہے، میں نکتہ رس اور بذلہ منجھ ہوں، میرے کاٹ دار جملوں کا جواب نہیں۔“ پرنس آندرے کی زبان قینچی کی طرح رواں دواں تھی۔ ”اور آٹنا پاولوونا کے ڈرائنگ روم میں ہر کس و نا کس میری باتیں غور سے سنتا ہے۔ اور یہ عقل سے کورا اعلیٰ طبقہ جس کے بغیر میری بیوی زندہ نہیں رہ سکتی اور یہ خواتین۔ کاش تمہیں علم ہوتا کہ یہ نازک مزاج، درتیس الطبع خواتین، بلکہ عمومی اعتبار سے تمام عورتیں، کیا ہوتی ہیں، میرے والد بالکل بجا فرماتے ہیں کہ عورتیں ہر معاملے میں خود غرض، خود بین و خود پسند، کند ذہن اور گھٹیا ذہنیت کی مالک ہوتی ہیں۔ جب یہ اپنی اصلی فطرت سے پردہ اٹھاتی ہیں تو ان کا یہی روپ سامنے آتا ہے۔ جب یہ محافل میں اٹھتی بیٹھتی ہیں تو احساس ہوتا ہے کہ ان میں کچھ نہ کچھ گہرائی اور گیرائی ضرور ہے لیکن حقیقتاً وہ بالکل خالی، تہی اور کوری ہوتی ہیں۔ نہیں، میرے عزیز دوست، شادی مت، کرو۔“ پرنس آندرے نے اپنی بات ختم کرتے ہوئے کہا۔

”مجھے یہ بات بہت عجیب بلکہ خلاف عقل معلوم ہوتی ہے،“ بیئر نے جواب دیا۔ ”کہ تم۔ تم اپنے آپ کو نا اہل گردانتے ہو اور اپنے بارے میں یہ تصور کرنے لگے ہو کہ تمہاری زندگی تباہ و برباد ہو گئی ہے۔ ابھی تو تمہارے سامنے سارے راستے کھلے ہیں، سارے راستے درتم۔“

اس نے اپنی بات ادھوری چھوڑ دی لیکن اس کا لہجہ غمازی کر رہا تھا کہ اپنے دوست کی اس کے دل میں کتنی قدر ہے اور وہ مستقبل میں اس کی ذات سے کتنی امیدیں وابستہ کیے ہوئے ہے۔

”یہ اس قسم کی گفتگو کیوں کر رہا ہے؟“ بیئر دوطہ حیرت میں گم تھا۔ چونکہ اسے اس کی ذات ان تمام خوبیوں سے، جنہیں ایک لفظ میں قوتِ ارادی کہا جاسکتا ہے، بدرجائہم متصف نظر آتی تھی جب کہ وہ خود ان سے تہی دامن تھا، اس لیے وہ اسے صورتِ کامل تصور کرتا تھا۔ سے سب سے زیادہ تعجب اس بات پر ہوتا تھا کہ پرنس آندرے ہر قسم

کے لوگوں میں، خواہ ان کا تعلق کسی بھی شعبہ حیات سے ہو یا آسانی اور بلا جھک گھل مل جاتا ہے، اس کا حافظہ غضب کا ہے، اس کی عیبت مسلمہ ہے (وہ سب کچھ پڑھ چکا تھا، سب کچھ جانتا تھا اور ہر چیز کے بارے میں اپنی رائے رکھتا تھا) اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اسے کام کرنے اور سطلانے میں جت جانے کا ہنر بھی آتا ہے اور اس کے لیے ہمت دھوڑنے سے بھی بہرہ ور ہے۔ اور اگر کبھی اس کے ذہن میں یہ بات آئی بھی کہ جس قسم کی فلسفیانہ مویشا فیس اور خیال آرائیوں کی خود اسے خاص طور پر لٹ پڑی ہوئی تھی، آندرے کو ان میں کوئی ورک نہیں، تو وہ اسے کوئی بڑی خامی نہیں سمجھتا تھا بلکہ قوت کی علامت تصور کرتا تھا۔

جس طرح مشین کے پیہوں کو صحیح اور ہموار طریقے سے چلانے کے لیے انھیں تیل دینا ضروری ہوتا ہے، اس طرح کسی شخص کے ساتھ آپ کے تعلقات خواہ کتنے ہی دوستانہ اور الجھوڑے پاک کیوں نہ ہوں، خوشامد و تملق اور تعریف و توصیف کے بغیر کام نہیں بننا۔

”میرا بیڑا تو غرق ہو ہی چکا ہے،“ پرنس آندرے نے کہا۔ ”پھر میرے متعلق ہی گفتگو کیوں؟ آؤ، اب تمہارے بارے میں باتیں کریں۔“ اس نے خاموشی کے مختصر لمحے کے بعد پھر کہا شروع کیا۔ اپنے اطمینان بخش خیالات پر وہ مسکرا رہا تھا۔

اس کی مسکراہٹ آناٹائیٹیر کے چہرے پر منعکس ہو گئی۔

”میرے بارے میں گفتگو کرنے کے لیے ہے ہی کیا؟“ بیٹر نے بے فکر اور پرسرت انداز سے مسکراتے اور اپنے ہونٹ نیم دا کرتے ہوئے کہا۔ ”میں کیا ہوں؟ یہی نا کہ جنم حرام!“ اچانک اسے شرم محسوس ہوئی اور اس کا چہرہ عنابی ہو گیا۔ صاف نظر آ رہا تھا کہ اسے یہ ٹکراوا کرنے کے لیے بڑی ہمت سے کام لینا پڑا تھا۔ ”نہ نام نہ مال۔ اور سچی بات یہ ہے۔“ لیکن اس نے یہ بتانے سے گریز کیا کہ سچی بات کیا تھی۔ ”فی الحال میں آزاد ہوں اور خوب طوف اندوز ہو رہا ہوں۔ صرف اتنی بات میری سمجھ میں نہیں آتی کہ آخر میں کروں کیا۔ اور اسی بارے میں میں تم سے سنجیدگی سے مشورہ کرنا چاہتا تھا۔“

پرنس آندرے نے اسے شفقت آمیز نگاہوں سے دیکھا۔ اگرچہ اس کی نظریں محبت اور مروت سے معمور تھیں لیکن وہ یہ غمازی بھی کر رہی تھیں کہ اسے اپنی برتری کا بخوبی احساس ہے۔

”تم مجھے بہت عزیز ہو، خاص طور پر اس لیے کیونکہ ہمارے حلقہ احباب میں تم واحد جیتے جاگتے انسان ہو۔“ ہاں، تم بالکل ٹھیک ٹھاک ہو۔ تم میں کوئی کمی نہیں۔ تم جو (پیشہ) چاہے، منتخب کر لو، کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ تم ہر جگہ پورے اترو گے۔ ہاں، صرف ایک کام کرو۔ صرف ان کوراگنوں (Kuragins) سے ملنا جنہ اور ان کے طور طریقے برتنا چھوڑ دو۔ یہ لہو و لعل، بدکاری، بے اعتدالی، غیر معمولی شراب نوشی اور اس قسم کی دیگر باتیں تمہیں زیب نہیں دیتیں۔۔۔“

”عزیز دوست، کیا یہ میرے بس کی بات ہے؟“ بیکر نے کندھا اچکاتے ہوئے فرامیسی میں کہا۔ ”مورتیں،“

مائی ڈیئر، عورتیں!“

”میں سمجھا نہیں۔“ پرنس آندرے نے زرت جواب دیا۔ ”اگر عورتیں مہذب و در عزت مآب ہوں، تو اور بات ہے لیکن جن عورتوں۔ عورتیں اور شرب۔ کے ساتھ کوراگن کا سیل جول ہے، لا حول و لا قوۃ، میری سمجھ سے وہ ہالا ہیں۔“

خیر پرنس واسیلی کے ہاں مقیم تھا اور اس کے بیٹے اناطول کی عیاشیوں میں برابر کا شریک ہوتا تھا۔ یہ وہی اناطول تھا جسے سدھارنے کے لیے وہ اس کی شادی پرنس آندرے کی ہمشیرہ کے ساتھ طے کرانے کے منصوبے باندھ رہے تھے۔

”فہمیں معصوم ہے؟“ خیر نے سمجھا اس انداز سے کہ جیسے ابھی ابھی اسے کوئی بہت عمدہ خیال سوچا ہو۔ ”میں بہت سنجیدہ ہوں، ہنسنے کی بات نہیں۔ میں بہت دیر سے سوچ رہا ہوں کہ اس قسم کی زندگی (جو میں اور اناطول گزار رہے ہیں) میں مناسب طریقے سے سوچنا اور کسی نتیجے پر پہنچنا ناممکن ہے۔ میرا سر چکرانے لگا ہے اور میرے پاس جو رقم تھی، وہ ضائع ہو چکی ہے۔ اس نے مجھے آج شام بھی مدعو کیا تھا لیکن میں جاؤں گا نہیں۔“

”کیا تم اپنی عزت کی قسم کھا کر وعدہ کرتے ہو کہ تم نہیں جاؤ گے؟“

”عزت کی قسم۔“



جب پیر پتے دوست سے رخصت ہوا، رات کا ایک سے زیادہ بج چکا تھا اور یہ جون کی ان راتوں میں سے ایک رات تھی جب پیٹر برگ کا آسمان تاباں و درخشاں ہوتا ہے۔ اس نے گھوڑا گاڑی پکڑی۔ اس کا ارادہ تھا کہ وہ سیدھا گھر جائے گا لیکن جوں جوں وہ مکان کے قریب سے قریب تر ہوتا گیا، اس خیال کی شدت اتنی ہی تیز سے تیز تر ہوتی چلی گئی کہ اس قسم کی رات میں آدمی کو تیند آئے، قطعی ناممکن۔ رات رات نہیں تھی، معلوم ہوتا تھا کہ ابھی ابھی سورج غروب ہوا ہے یا صبح انگڑائی لے کر بیدار ہو رہی ہے۔ مطلع اتنا روشن تھا کہ اچاڑنگلی کوچوں میں دور دور تک سب کچھ صاف نظر آ رہا تھا۔ رستے میں اسے یاد آیا کہ اناطول کوراگن نے آج رات اپنے دوستوں کو ناش کی باری لگانے کے لیے مدعو کیا ہے۔ اس کے بعد حسب معمول سے نوشی کا دور چلے گا اور انجام کار پیٹر کے پسندیدہ مشغلے سے دہا ہلایا جائے گا۔

اس نے سوچا۔ ”چلو، کوراگن کے ہاں چلتے ہیں، مزہ آئے گا۔“

اچانک اسے یاد آیا کہ اس نے پرنس آندرے کو قول دیا تھا کہ وہ دوبارہ وہاں نہیں جائے گا۔ لیکن جیسے کہ عام طور پر ان لوگوں کی رجن کا کردار ہوتا ہے، عادت ہوتی ہے، اسے بھی اس شدید خواہش نے اپنے ہلکنے میں جکڑ لیا کہ چلو آج آخری بار میاش، جس کی لت میں وہ گرفتار ہو چکا تھا، کریں، پھر تو بہ کر لیں گے۔ چنانچہ اس نے

انا طول کے ہاں جانے کا فیصلہ کر لیا۔ پھر اسے یہ خیال آیا کہ اس نے پریس آندرے کے ساتھ جو وعدہ کیا ہے، اس کی کوئی وقعت نہیں کیونکہ اس سے قبل وہ انا طول کو یہ قول دے چکا تھا کہ ”میں ضرور آؤں گا“ ”علاوہ ازیں“ وہ آپ ہی آپ دلائل دینے لگا، ”عزت کی قسم کھا کر اس قسم کے جو قول و قرار کیے جاتے ہیں، وہ محض رسمی باتیں ہوتی ہیں، ان کے کوئی خاص معنی نہیں ہوتے، خاص طور پر جب آدمی یہ سوچے کہ ہو سکتا ہے کہ کل میری روح نفس عنصری سے پرواز کر جائے یا کوئی ایسا غیر معمولی واقعہ پیش آجائے کہ عزت یا بے عزتی کا مسئلہ دھرے کا دھرا رہ جائے۔“ اس قسم کی جھٹ بازی، جو تمام عزائم اور فیصلوں پر لکیر پھیر دیتی ہے سوئزر کو اکثر سوجھتی رہتی تھی۔ وہ کوراگن کے ہاں چلا گیا۔

جب میٹر ہارس گاڑڈ کی پیرکوں کے قریب اس کشادہ مکان میں پہنچا جہاں انا طول رہائش پذیر تھا، وہ پورج میں، جہاں روشنی ہو رہی تھی، چلتا، میٹرھیاں پھلانگتا، اور دروازے میں سے، جو کھلا تھا، گزرتا مکان کے اندر داخل ہو گیا۔ استقبالہ کمرے میں کوئی شخص نہیں تھا۔ خالی بوتلیں، دور کوٹ اور بر کے بازلی جوتے ادھر ادھر بکھرے پڑے تھے۔ چاروں اطراف انگوری شراب کی بوتلیں پھیلی ہوئی تھیں۔ پر سے دور لوگوں کے ہاتھ کرنے اور چیخنے چلانے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔

تاش کی بازی ختم ہو چکی تھی اور رات کا آخری کھانا بھی کھایا جا چکا تھا، تاہم مہمان بھی رخصت نہیں ہوئے تھے۔ میٹر نے اپنا دور کوٹ اتار کر ایک طرف پھینکا اور پہلے کمرے میں داخل ہو گیا۔ وہاں ابھی تک میٹر پر کھانے کی بچی بچی اشیاء پڑی تھیں اور باوردی خدمت گار یہ سمجھ کر کہ اب اسے دیکھے وال کوئی نہیں ہے، چوری چوری گلاسوں کی تلچھٹ پینے میں مصروف تھا۔ اس سے اگلے کمرے میں ہنگامہ ہائے دھوپ پاتا تھا۔ جانی بیچانی آوازوں کے شور و غل، فلک شکنانہ قہقہوں اور ایک ریچھ کے غرانے کی آوازیں صاف سنائی دے رہی تھیں۔ تقریباً آٹھ نو نوجوان جوش و خروش کے عالم میں ایک کھلے درتچے کے قریب اکٹوم کیے ہوئے تھے۔ تین دوسرے ایک ریچھ کے ساتھ چہلپیں کر رہے تھے۔ ان میں سے ایک اس کی زنجیر کھینچ رہا اور دوسروں کو ڈرانے کی کوشش کر رہا تھا۔

”میں سٹیونز (Stevens) پر سوردنل لگاتا ہوں!“ ایک نے چلا کر کہا۔

”یاد رہے کہ کسی چیز کا سہارا نہیں لیا جاسکے گا!“ دوسرے نے رگیں بھڑا کر کہا۔

”میں اپنی رقم دلوخوف (Dolokhov) پر لگاؤں گا!“ تیسرے کی گرج دار آواز سنائی دی۔ ”کوراگن، تم ن

شرطوں کے گواہ ہو!“

”بروین (Bruin) کو چھوڑ دو۔ شرط بندھ گئی۔“

”اسے ایک ہی سانس میں پوری بوتل چڑھانا ہوگی ورنہ وہ شرط ہار جائے گا۔“

”یاکوف (Yakov) بوتل لڑا یا کوف!“ سیربان نے کہا۔ وہ دراز قد خوش شکل نوجوان تھا اور گردن کے عین

درمیان میں کھڑا تھا۔ اس نے اپنا کوٹ اتارا ہوا تھا اور اس کی بڑھیا سونی قمیص کے بٹن کھلے تھے۔ ”حضرات، ذرا

توقف کریں۔ وہ آگیا ہے ہیلو، پتروشکا (Petrushka)، میرے پیارے دوست! اس نے میٹر کو آؤ زدی۔ ایک اور شخص کی۔ اس شخص کا قد درمیانہ اور اس کی آنکھیں نیلی اور صاف شفاف تھیں۔ آواز بھی سنائی دی۔ یہ آواز دوسرے اشخاص کی آوازوں سے قطعی مختلف تھی۔ جہاں باقی لوگ نشے میں دھت تھے، یہ شخص اپنے آپ میں تھا۔

”دھر آؤ اور شرطوں کے گواہ بنو“ وہ درپے میں سے پکارا۔

اس شخص کا نام دلوخوف تھا۔ وہ سمیونووسکی (Semyonovsky) رجسٹر میں کپتان تھا۔ وہ بدنام جوہری اور بات بے بات ڈونٹل لڑنے کا شوقین تھا۔ وہ اناطول کے ہاں قیم پذیر تھا۔ میٹر نے چاروں اطراف نظریں گھما کر دیکھا۔ خوشی سے اس کی ہاتھیں کھلی جا رہی تھیں۔

”میں کچھ سمجھا نہیں۔ یہاں کیا ہو رہا ہے؟“

”گھبرو۔ ابھی اس پر نشہ نہیں چڑھا۔ بوتل لاؤ،“ اناطول نے میز پر سے ایک گلاس اٹھاتے اور میٹر کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے کہا۔

”سب سے پہلے کچھ پیو!“

میٹر ایک کے بعد دوسرا اور دوسرے کے بعد تیسرا گلاس غناخت چڑھانے لگا۔ وہ نظریں چرا کر نشے میں دھت مہمانوں کو، جنہوں نے درپے کے گرد و پیش دوبارہ جھمکھنا لگایا تھا، دیکھ رہا اور ان کی اناب شناب باتیں سن رہا تھا۔ اناطول بار بار اس کا گلاس بھرتا اور اس کے ساتھ ساتھ اسے بتاتا جا رہا تھا کہ دلوخوف نے بحریہ کے ایک انگریز افسر شیونز کے ساتھ شرط بندی ہے کہ وہ چوتھی منزل کی کمز کی بیرونی چوکھٹ پر انگلیں نیچے نکا کر مر شراب کی پوری بوتل پی جائے گا۔

”میرے شیر، سب پی جاؤ، ختم کر دو،“ اناطول نے میٹر کے گلاس میں بقیہ بوتل اندھیلے ہوئے کہا، ”ورنہ میں تمہیں بخشوں گا نہیں۔“

”نہیں، اب میں مزید نہیں پی سکتا،“ میٹر نے اناطول کو ایک طرف دھکیلتے اور درپے کا رخ کرتے ہوئے کہا۔ دلوخوف انگریز کا بار دھامے واضح اور صحیح انداز سے شرائط کے قواعد گنوارہا تھا۔ اس کے مخاطب زیادہ تر میٹر اور اناطول تھے۔

دلوخوف کا قد درمیانہ، بال گھونگریا لے اور آنکھیں نیلی اور روش تھیں۔ اس کی عمر تقریباً پچیس برس تھی۔ پیادہ فوج کے تمام افسروں کی طرح اس نے بھی اپنی سونچیں صفا چٹ کر رکھی تھیں۔ چنانچہ اس کا دہانہ، جو اس کے چہرے پر ہرے کا نمایاں ترین حصہ تھا، واضح انداز سے نظر آ رہا تھا۔ اس کے دہن کے خطوط نقاست سے ترشے ہوئے تھے۔ اس کے بالائی ہونٹ کے نوک دائرہ درمیانی حصے نے اس کے مضبوط زیریں ہونٹ کو فیصلہ کن انداز سے بھینچ رکھا تھا اور دوسکراہٹوں سے ملتی جلتی کوئی نئے مسلسل اس کے منہ کے دونوں کناروں پر کھیل رہی تھی۔ اس

کے ساتھ ساتھ اس کی آنکھوں سے شجاعت، جسارت، حقارت اور ذہانت ٹپک رہی تھی اور ان دونوں چیزوں نے مل کر اس کے چہرے پر کچھ اس قسم کا نقش ابھار دیا تھا کہ اس کی طرف دھیان نہ دینا ناممکن تھا۔ دلخوف کے پاس نہ دھن دولت تھی، نہ اثر و رسوخ، اور نہ سفارش۔ اور اس امر کے باوجود کہ اناطول ہزاروں روپے بے دریغ خرچ کر دیتا تھا، دلخوف نے اس کے ساتھ رہنے کی کچھ ایسی راہ ڈھونڈ لی تھی کہ وہ تمام لوگ، جو ان دونوں کو جانتے تھے۔ اور جن میں خود اناطولی بھی شامل تھا۔ اناطول سے زیادہ اس کی عزت کرتے تھے۔ دلخوف کو بھی قسم کے کھیل کھیلنا آتا تھا اور تقریباً ہمیشہ جیت بھی اسی کی ہوتی تھی۔ شراب وہ خوراک ہی کیوں نہ پی جائے، رہتا ہمیشہ اپنے ہوش میں تھا۔ اس زمانے میں شیرز برگ کے جو لوگ اپنی شاہ خزیروں، خرمستیوں اور تماشاہچیوں کے طفیل بدنام تھے، ان میں دلخوف اور گوراکن سر فہرست تھے۔

رم کی بوتل لائی گئی۔ دو خدمت گار کھڑکی کی چوکھٹ، جس نے بیرونی دہلیز پر کسی کے لیے بیٹھنا محال کر دیا تھا، اکھاڑ رہے تھے۔ ان کے چاروں طرف لوگ غل غپاڑا کر رہے اور انہیں طرح طرح کے احکام دے رہے تھے۔ یوں وہ بے چارے خاصی گھبراہٹ و دلخوف زدگی کا شکار ہو رہے تھے اور انہیں اپنا کام کرنے میں وقت برباد آرہی تھی۔

اناطول نے سب عادت گردن اکڑائی اور لمبے لمبے ڈنگ بھرتا کھڑکی کی جانب چل پڑا۔ اس کا شدت سے جی چاہ رہا تھا کہ جو چیز بھی اس کے ہاتھ آئے، اسے وہ توڑ کر چچی کر چچی کر دے۔ اس نے خدمت گاروں کو دھکا دے کر ایک طرف کر دیا اور خود کھڑکی کے پٹ پر ہاتھ ڈال دیا لیکن پٹ تھا کہ اکھڑتا ہی نہیں تھا۔ اس نے پٹ کے ایک خانے پر بھرپور وار کیا اور اس کے پرچے اڑا دیے۔

”سموٹ! اب تم زور لگاؤ،“ اس نے میئر سے مخاطب ہو کر کہا۔

میئر نے کھڑکی کی افقی سلاخ پکڑی، زور سے کھینچی اور بلوط کا چوکھٹا دھڑم دھڑم نیچے آ کر۔

”اے! ہر پھینک دو درندہ لوگ کہیں گے کہ میں نے اس کا سہارا لیا تھا،“ دلخوف نے کہا۔

”تو یہ انگریزوں کی بے رہا ہے؟ ہونہ؟“ سب ٹھیک ٹھاک ہے نا؟“ اناطول نے پوچھا۔

”بالکل!“ میئر نے جواب دیا۔ اس کی نگاہیں دلخوف پر جمی ہوئی تھیں جس نے رم کی بوتل اٹھالی تھی اور

کھڑکی کی جانب چار ہاتھ جس میں فلک کی روشنی، جوج کے دھندلکے اور طلوع آفتاب کی سرخی کا آمیزہ تھی، نظر آرہی تھی۔

ہاتھ میں رم کی بوتل تھا سے دلخوف نے جست لگائی اور کھڑکی کی اندرونی چوکھٹ پر پہنچ گیا۔

”ستوا!“ اس نے کھڑکی کی چوکھٹ پر کھڑے ہوتے اور کمرے کی جانب منہ کرتے ہوئے چلا کر کہا۔

سب لوگ خاموش ہو گئے۔

”میں شرط لگاتا ہوں!“ وہ فرانسیسی میں تقریر چھڑکا تھا تا کہ انگریز اس کی بات سمجھ سکے لیکن اس کی

فرانسیسی واجبی سی تھی۔ ”میں شرط لگاؤں ۲ ہوں پچاس شاہی۔ یا تم اسے سو کرنا چاہتے ہو؟“ اس نے انگریز سے مخاطب ہو کر پوچھا۔

”نہیں۔ پچاس،“ انگریز نے جواب دیا۔

”بہت اچھا! پھر پچاس ہی سہی۔ کہ میں کھڑکی کے باہر اس جگہ (وہ نیچے جھکا اور اس نے ڈھلوان چوکھٹ کی جانب اشارہ کیا) بیٹھ کر اور کسی چیز کا سہارا لیے بغیر روم کی یہ پوری بوتل منہ سے ہٹائے بغیر بی جاؤں گا۔ ٹھیک ہے؟“

”بالکل ٹھیک،“ انگریز نے جواب دیا۔

انا طول انگریز کی طرف مڑا، اس نے اس کے کوٹ کا بٹن پکڑا اور اس کی جانب نیچے (انگریز کوتاہ قد تھا) دیکھتے ہوئے انگریزی میں شرط کے قواعد دہرانے لگا۔

”ٹھہرو!“ دلخوف نے چلا کر کہا۔ اس نے ان کی توجہ اپنی طرف مبذول کرانے کے لیے بوتل کھڑکی کے ایک جانب ٹکرا دی۔ ”ٹھہرو، کوراگن، میری بات غور سے سنو۔ اگر کوئی اور شخص یہ کام کر دکھائے گا، میں اسے پورے سودوں گا۔ سمجھ گئے؟“

انگریز نے اپنے سر کو ٹھنڈی جینس دینے پر اکتفا کیا لیکن اس نے یہ بالکل ظاہر نہ ہونے دیا کہ اسے یہ شرط قبول ہے یا نہیں۔ انا طول ابھی تک اس کے کوٹ کا بٹن پکڑے ہوئے تھا اور اس امر کے باوجود کہ انگریز اپنے سر کی جینس سے بار بار یہ واضح کر رہا تھا کہ وہ سمجھ گیا ہے، دلخوف نے جو کچھ کہا تھا، وہ اس کا انگریزی میں ترجمہ کرتا رہا۔

چھری سے بدن کا ایک ٹو جوان، جولائف گا رڈز میں ہونڈارا فسر تھا اور جو ساری شام جوئے میں رقم ہارتا رہا تھا، کھڑکی کی اندرونی چوکھٹ پر جا چڑھا، اس نے اپنا سر باہر نکالا اور نیچے جھانکنے لگا۔

”او... ہوا“ جب اس نے نیچے پتھر ملی گزر گاہ پر نظر دوڑائی، اس کی اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی نیچے رہ گئی۔

”نیکو اس بند کرو!“ دلخوف دہارنا اور اس نے اسے یوں دھکا دیا کہ اس کے پاؤں اس کے مہینروں کی خادار پھر کیوں میں پھنس گئے اور اس نے نہایت بے ہنگم انداز سے کمرے میں چھلانگ لگا دی۔

دلخوف نے بوتل کھڑکی کی چوکھٹ پر رکھ دی جہاں سے اسے اٹھانا آسان ہوگا۔ پھر وہ نہایت آہستگی اور احتیاط کے ساتھ درتے کے اندر ریگنٹے لگا۔ وہ نیچے بیٹھا، اپنی ٹانگیں لٹکائیں اور اس نے اپنے ہاتھوں سے کھڑکی کے دونوں پہلوؤں کو مضبوطی سے تھام کر اپنی پوزیشن درست کی۔ پہلے وہ قدرے دائیں، پھر بائیں گھوما۔ اس کے بعد اس نے اپنے ہاتھ چھوڑے اور بوتل اٹھاں۔ انا طول دوسرے تیاں لے آیا اور اس نے انھیں چوکھٹ پر جوادیا حالانکہ وہاں پہلے ہی کافی روشنی تھی۔ سفید قمیص میں لپٹی ہوئی دلخوف کی پشت اور اس کا گھونگر بلا سر دونوں اطراف سے روشن ہو گئے۔ سبھی لوگ کھڑکی کے گرد ہجوم بنا کر کھڑے ہو گئے اور انگریز اس کے بالکل سامنے آ گیا۔ پھر

مسکرا رہا تھا لیکن وہ منہ سے کچھ نہ بولا۔ ایک شخص، جو عمر میں دوسروں سے بڑا تھا، آگے بڑھا۔ اس کے چہرے پر خفگی اور خوف کے آثار ہو رہے تھے۔ وہ دلوخوف کی قمیص پر ہاتھ ڈالنا چاہتا تھا۔

”حضرات، یہ زاپا گل ہے!“ اس قدرے سمجھدار شخص نے با آواز بلند کہا۔ ”یہ آدمی اپنے آپ کو موت کے کنوئیں میں دھکیل رہا ہے۔“

اناطول نے اسے روک لیا۔

”اسے مت چھوؤ۔ تم اسے گھبرا دو گے۔ وہ نیچے گر پڑے گا اور ہلاک ہو جائے گا۔ پھر کیا ہوگا؟۔ ہو بہو؟“

دلوخوف نے چاروں اطراف نظریں دوڑائیں۔ اس نے ایک بار پھر اپنے دونوں ہاتھوں کا سہارا لیا اور ٹھیک ہو کر بیٹھ گیا۔

”اگر پھر کسی نے داخل در محمولات دیا،“ اس نے اپنے پتلے اور بھینچے ہوئے ہونٹوں سے الفاظ چبا چبا کر اور

”ہستہ آہستہ ادا کرتے ہوئے کہا، ”میں پلک جھپکنے میں اسے اٹھا کر نیچے پھینک دوں گا۔ سمجھے؟“

ان الفاظ کے ساتھ اس نے دوبارہ اپنا جسم گھمایا، ہاتھ نیچے گرائے، بوتل اٹھائی اور اسے اپنے لبوں تک

لے گیا۔ جب اس نے اپنا سر پیچھے کی طرف جھکا اور اپنا توازن درست کرنے کے لیے اپنا خالی ہاتھ اوپر اٹھایا۔

ایک وردی پوش خدمت گار، جو شکستہ شیشے کے کڑے اکٹھا کرنے نیچے جھکا ہوا تھا، اپنی نگاہیں کھڑکی اور دلوخوف

سے ہٹائے بنا، اسی حالت میں کھڑا رہا۔ اناطول تن کر سیدھا کھڑا ہو گیا۔ حیرت و تعجب سے اس کی آنکھیں پھٹی

جا رہی تھیں۔ انگریز ہونٹ بھیچے ایک جانب کھڑا یہ منظر دیکھ رہا تھا۔ وہ آدمی، جو اس معاملے کو ختم کرنا چاہتا تھا،

کمرے کے ایک کونے میں بھاگ گیا، دھم سے صوفے پر گرا اور اس نے اپنا مستردیوار کی طرف کر لیا۔ بیئر نے اپنی

آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیے۔ اگرچہ اس کے چہرے پر خوف اور وحشت کی کیریں صاف پڑی جاسکتی تھیں، لیکن ہلکی

پھٹکی مسکراہٹ یا اس سے ملتی جلتی چیز اب بھی وہاں موجود تھی۔ کمرے میں مکمل سکوت چھایا ہوا تھا۔ بیئر نے ہاتھ

آنکھوں سے اٹھائے۔ دلوخوف ابھی تک بیچنہ اسی حالت میں بیٹھا تھا تاہم اس کا سر اتنا پیچھے کی طرف ڈھلک گیا

تھا کہ اس کے گھونگر یا لے باں اس کی قمیص کے کنارے کو چھونے لگے تھے۔ جس ہاتھ میں وہ بوتل پکڑے ہوئے تھا، وہ

بتدریج اوپر، حریف اور پرانے لگا۔ اعصابی تناؤ کی وجہ سے اس کا ہاتھ کانپنے لگا۔ جوں جوں بوتل اوپر اٹھتی گئی، توں

توں اس کا سر پیچھے ڈھلکنا گیا۔ دیکھنے والے دیکھ رہے تھے کہ بوتل خالی ہوتی جا رہی ہے۔

”اس کام میں اتنی دیر کیوں ہو رہی ہے؟“ بیئر سوچ رہا تھا۔ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ نصف سے زیادہ گھنٹہ

بیت چکا ہے۔

دلوخوف کی پشت پر اچانک جھرجھری آگئی اور وحشت کے عالم میں اس کا ہاتھ کپکپانے لگا۔ جس ذحلوان

چوکھٹ پر وہ بیٹھا تھا، اس پر اپنے تمام جسم کو آگے پیچھے کھسکانے کے لیے اتنا ہی کالی تھا۔ چنانچہ وہ کھسکنے لگا۔

اعصابی تناؤ سے اس کا سر اور بازو پہلے سے بھی زیادہ کپکپانے لگے۔ اس کا ایک بازو یوں گھوما جیسے وہ کھڑکی کی

چوکھٹ پکڑنا چاہتا ہو لیکن وہ دوبارہ پیچھے ہٹ گیا۔ میئر نے ایک بار پھر اپنی آنکھیں ڈھانپ لیں اور تہیہ کرنے لگا کہ اب وہ انھیں دوبارہ نہیں کھولے گا۔ اچانک اسے احساس ہوا کہ اس کے چاروں اطراف لمبی چل برپا ہے۔ اس نے اپنی نگاہیں اوپر اٹھائیں۔ دلو خوف کھڑکی کی چوکھٹ پر کھڑا تھا۔ اس کے چہرے کا رنگ فق ہو چکا تھا لیکن اس کے روم روم سے مسرت پھوٹی پڑ رہی تھی۔

”خالی!“

اس نے بوتل انگریز کی طرف اچھال دی جس نے بہت صفائی کے ساتھ سے پکڑ لیا۔ دلو خوف نے نیچے جھلنگ لگا دی۔ اس کے منہ سے روم کی سخت بو آرہی تھی۔

”واہ واہ اشپاش!... دل گردے والے بچہ ہے! شرط جیتنے کا مزہ آگیا! اب بھی مزہ نہ آیا، پھر لغت ہے!“ چاروں اطراف سے آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔

انگریز نے پناہؤ نکال اور رقم گننے لگا۔ دلو خوف کی بھویں تن گئیں لیکن اس نے پنی زبان بند رکھی۔ میئر لپک کر کھڑکی پر چڑھ گیا۔

”حضرات، ہے کوئی مائی کالال، جو مجھ سے شرط لگانا چاہتا ہو! میں بھی یہ کر دکھاؤں گا!“ اس نے اچانک چلا کر کہا۔ ”چلیں، شرط درط چھوڑیں۔ میں ویسے ہی کیے دیتا ہوں۔ ان سے کہو کہ بوتل لائیں۔ میں کروں گا۔ بوتل منگائیں!“

”آنے دو۔ اسے کرنے دو!“ دلو خوف نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”تمہارا داغ تو نہیں چل گیا؟ تمہیں یہ کام کرنے کون دے گا؟.. میز میوں پر کھڑا ہوا نہیں جاتا۔ بے چارے کا ویسے ہی سر گھونٹنے لگتا ہے!“ ایک پارگی مختلف آوازیں سنائی دیں۔

”مجھے روم کی بوتل پکڑائیں۔ میں اسے غٹائی پی جاؤں گا!“ میئر نے چلا کر کہا۔ وہ ایک میز کی طرف آیا اور شرابیوں کی طرح اسے دھڑا دھڑ پینے لگا۔ اس کے بعد وہ دوبارہ چوکھٹ پر چڑھنے لگا۔

انھوں نے اسے بازوؤں سے پکڑ لیا لیکن وہ اتنا کڑا تھا کہ کسی کے بھی قابو میں نہیں آ رہا تھا۔ جو بھی اس کے قریب گیا، اس نے اسے اٹھا کر دور پھینچ دیا۔

”ٹھہرو۔ تم لوگ یوں اسے لگام نہیں دے سکو گے!“ انا طول نے کہا۔ ”ٹھہرو۔ صرف میں اسے الو بنا سکتا ہوں... سنو!“ اس نے چلا کر کہا۔ ”یہاں ہم تمہیں ضرور چڑھائیں گے لیکن آج ہم سب کے گھر جا رہے ہیں۔“

”پھر تمہارے کس بات کا؟ چلو، ابھی چلو!“ میئر نے چلا کر کہا۔ ”آؤ چلیں۔ اور برومن کو بھی اپنے ساتھ لے چلتے ہیں۔“

اس نے ریچھ کو اپنے بازوؤں میں پکڑا اور اس کے ساتھ کمرے میں ناپٹے لگا۔

آنا پاولوونا کی محفل میں پرنس واسیلی نے پرنس دروجیتسکا یا کے ساتھ، جس نے اس سے اپنے اکلوتے بیٹے کے لیے النجا کی تھی، جو وعدہ کیا تھا، وہ اس نے ایفہ کر دیا۔ معاملہ امیر اطور کی خدمت میں پیش کیا گیا۔ استنا کی اجازت مل گئی اور پورس کو جو نیر کمشنڈ افسر کی حیثیت سے سمونووسکی گارڈز میں تبدیل کر دیا گیا۔ تاہم آنا میخائیلوونا کے ترم حیلے اور کوششیں اسے کو تو زوف کا ایجوٹنٹ یا اس کے عملے کا رکن مقرر کرانے میں ناکام رہیں۔ جس شام آنا پاولوونا کے ہاں محفل منعقد ہوئی تھی، اس کے چند روز بعد آنا میخائیلوونا ماسکو لوٹ آئی اور سیدھی اپنے کھاتے پر رشتے داروں رستوفوں کے²⁸ ہاں جا چکی۔ وہ جب بھی ماسکو وار ہوتی، اس کا قیام لامحار انھیں کے ہاں ہوا کرتا تھا اور اس کا تخت جگر اور نور چشم پورینکا، جو محل ہی میں عام فوج میں بھرتی ہوا تھا، درجس کا جو نیر کمشنڈ افسر کی حیثیت سے پچھلے دنوں گارڈز میں تبادلہ ہوا تھا، انھیں رستوفوں کے ہاں بل بڑھ کر جواں ہوا تھا کیونکہ وہ چھٹ پنے سے ہی ان کے ہاں مقیم تھا۔ گارڈز، اس پیشتر ہی دس اگست کو پیٹرز برگ روانہ ہو چکے تھے لیکن اس کا صاحب زادہ ابھی تک ماسکو میں قیام پذیر تھا کیونکہ اس نے اپنی ضروریات کی اشیا خریدنا تھیں۔ اس نے بعد میں گارڈز کے دستوں میں شامل ہونا تھا جب انھوں نے رادزیوی لوف²⁹ کی طرف کوچ کرنا تھا۔

رستوف ہاں اور چھوٹی بیٹی۔ دونوں کا نام بتایا تھا۔ کا یوم نام³⁰ سنار ہے تھے۔ صبح ہی سے ان کی گھر کی طرف، جو پورسکا یا سٹریٹ پر واقع تھا اور جس سے ماسکو کا بچہ بچہ واقف تھا، گھوڑا گاڑیوں کا ایسا تاننا بندھا تھا کہ ختم ہونے کا نام ہی نہیں لیتا تھا۔ دوست احباب ہاں بیٹی کو ہدیہ تہنیت پیش کرنے جوق در جوق چلے آ رہے تھے۔ کاؤٹش اور اس کی خوش شکل بڑی بیٹی ڈرائنگ روم میں بیٹھی تھیں اور مہمانوں کا خیر مقدم کر رہی تھیں۔

کاؤٹش کی عمر تقریباً پینتالیس برس تھی۔ اس کا دبلا پتلا چہرہ شرقی قسم کا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ بچے جن جن کر۔ وہ ایک درجن بچوں کو جنم دے چکی تھی۔ تھک چکی ہے۔ اس کے ٹھہر ٹھہر کر باتیں کرنے اور چلنے پھرنے کے۔ اس کا بنیادی سبب اس کی جسمانی کمزوری تھی۔ انداز نے اسے ایسا دقا ر عطا کر دیا تھا کہ دوسرے اس کا احترام کرنے پر مجبور ہو جاتے تھے۔ پرنس آنا میخائیلوونا دروجیتسکا یا خاندان کی رکن ہونے کی حیثیت سے مہمانوں کا استقبال اور ان کی خاطر مدارت کرنے میں ہاتھ بٹا رہی تھی۔ لڑکے لڑکیاں اس کا ردوائی میں شریک ہونا ضروری نہیں سمجھتے تھے اور عقبی کروں میں بیٹھے تھے۔ رخصتی پر کاؤٹش مہمانوں سے ہاتھ ملاتا، ان کے ساتھ دروازے تک آتا اور ان سب کو ڈنر میں شریک ہونے کی دعوت دیتا۔

”ma chere“ یا ”mon cher“ میں آپ کا بے حد ممنون ہوں، شکر گزار ہوں۔“ اس بات سے قطع نظر کہ نو آمد مہمان سماجی مرحبے کے لحاظ سے اس سے چھوٹا ہے یا بڑا، وہ سب کو بلا تفریق و امتیاز ایک ہی

* دونوں کا مطلب ”مائی ڈیر“ ہے۔ اول الذکر سے خواتین اور سوغزالہ کر سے مردوں کو غالب کیا جاتا ہے۔

انداز سے حق طلب کیے جا رہا تھا اور تو اور اس کے لہجے میں بھی کسی قسم کی تبدیلی نہیں آتی تھی۔ ”میں اپنی طرف سے اور اپنی دو عزیز از جان ہستیوں کی طرف سے، جن کا آج ہم نام دن منا رہے ہیں، آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ ہاں، mon cher، کھانا کھانے ضرور واپس آنا۔ اگر آپ تشریف نہ لائے تو کچھ میں کہ میری آپ سے ناراضی ہوگی، ma chere، میں تمام افراد خانہ کی طرف سے آپ کو کھانے کی دعوت دیتا ہوں۔“

جب وہ یہ الفاظ دہراتا تھا، اس کے گول منہ، ہنس کھ، گداز اور صفا چٹ چہرے کے تیوروں میں کسی نوع کی تبدیلی نہ آتی۔ وہ سب کے ساتھ ہاتھ یکساں مضبوط انداز سے دبا کر ملاتا تھا اور ایک ہی طرح بار بار خمیدہ ہو جاتا تھا۔ جونہی وہ ایک مہمان کو رخصت کرنے کے بعد ڈرائنگ روم میں واپس آتا، کرسی کھینچ کر کسی دوسرے مہمان کے قریب، جو ابھی تک ڈرائنگ روم میں موجود ہوتا، بیٹھ جاتا۔ وہ ایک ایسے شخص کے انداز میں، جو زندگی سے پیار کرتا اور اس سے بھرپور مٹھتا جاتا ہو، ہشاش بشاش اپنی ٹانگیں پسارتا، ہاتھ گھٹنوں پر رکھتا، بڑی سنجیدگی سے اپنے سر کو آگے پیچھے بھداتا، اور کبھی ردی میں اور کبھی واجبی، لیکن خود اعتمادی سے پُر، نرانیسی میں موسم کے بارے میں قیس آرائی کرتا یا از خود صحت کے متعلق مشورے دینے لگتا۔ تب اس آدمی کی، سند، جو اپنا فرض نبھاتے نبھاتے خاصا تھک چکا ہو لیکن اس سے جان چھڑانے کے بجائے اسے مسلسل ادا کیے جا رہا ہو، وہ کسی اور مہمان یا مہمانوں کو دروازے تک رخصت کرنے کے لیے اٹھ کھڑا ہوتا۔ وہ اپنے سر کو، جہاں صرف خال خال بال، اور وہ بھی سفید ہو چلے تھے، رہ گئے تھے، ہلکے ہلکے سہلانا درانیس دوبارہ کھانے کی دعوت دیتا۔ کبھی کبھار وہ مہمانوں کو رخصت کرنے کے بعد استقبالیہ کمرے سے سیدھا ڈرائنگ روم میں جانے کے بجائے پود گھر اور نعمت خانے میں سے گزرتا، اسٹیج وچرین ڈرائنگ روم میں، جس کا فرش سنگ مرمر کا تھا، جہاں انہی (80) مہمانوں کے لیے دسترخوان بچھا یا جا رہا تھا، آ جاتا۔ وہ وردی پوش ملازمین کو چاندی اور چینی کے ظروف لاتے، انھیں میز پر آگے پیچھے کرتے اور ریشمی چادریں بچھاتے دیکھتا اور دستری واسلی وچ کو، جو خود بھی طبقہ شرقا سے تعلق رکھتا تھا اور اس کے تمام امور کی نگہداشت کرتا تھا، بد بھیجتا۔

”معتز کا، دھیان رکھنا، ہر چیز دیکھنی ہونا چاہیے جیسا کہ اسے ہونا چاہیے۔ ہاں یہ ٹھیک ہے۔“ وہ طویل وچرین میز پر، جو پوری کی پوری کھولی اور بچھائی جا رہی تھی، اطمینان کی نگاہیں دوڑاتے کہتا۔ ”اصل چیز یہ ہے کہ آپ مہمانوں کو خدمت کس قسم کی بہم پہنچاتے ہیں۔ خیر، تمہیں پتا ہی ہے۔“ اور وہ چہرے پر مطمئن مسکراہٹ سجائے واپس ڈرائنگ روم میں چلا جاتا۔

”ماریا لوونا کاراگینا (Karagina) اور ان کی دختر نیک اختر“ کاؤٹس کے عظیم الجثہ وردی پوش خدمت گار نے دروازے سے دھمکی آواز میں اطلاع دی۔

کاؤٹس نے سوار کی ہڈائی ڈبیا میں سے، جس پر اس کے خاوند کی تصویر نقش تھی، چٹکی بھر سوار نکالنے سے پہلے ایک لحظہ سوچا:

”ان مہمانوں نے میرا کچھ مر نکال دیا ہے۔ یہ آخری مہمان ہوگی جس سے میں ملوں گی۔ یہ عورت بلا کی طمع ساز اور ظاہر دار ہے۔“ پھر اس نے خدمت گار سے کہا: ”اے، نذر بھیج دو۔“ اس کے بچے میں کچھ اتنی بھرپور پڑ مردگی تھی جیسے وہ یہ کہہ رہی ہو: ”اس سے تو بہتر تھا کہ تم مجھے شکستے میں کس دیتے۔“

ایک بلند قامت اور تنومند خاتون، جس کے اندر میں بڑی رعونت تھی، اپنی سکرٹ سرسراتی ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی۔ اس کے پیچھے پیچھے اس کی بیٹی تھی۔ اس کا چہرہ بیضوی اور لب متہسم تھے۔

”chere comtesse! صدیاں بیت گئیں۔ آپ سے ملاقات ہی نہیں ہو سکی۔ ادھر یہ چار پائی سے لگ گئی، بے چاری بچی... راز و سود سکیوں (Razumovskys) کے بال میں... اور کاؤنٹس اپرا کستا... میری خوشی کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا...“

جوشیلی اور شکستہ نسوانی آوازیں، جو ایک دوسری کو کاٹ رہی تھیں اور ریشمی لباسوں کی سرسراہٹ اور کرسیوں کی گھس گھساہٹ میں گھل مل رہی تھیں، سنائی دیں۔ پھر اس قسم کی گفتگو شروع ہو گئی جو ایک ہی ڈگر پر چلتی رہتی ہے تا آنکہ جو نئی دلیں وقف آتا ہے، مہمان خواتین اٹھ کر کھڑی ہو جاتی ہیں، اپنی سکرٹس سرسراتی ہیں اور کہتی ہیں ”کتنا مزہ آیا... اماں کی طبیعت... اور کاؤنٹس اپرا کستا...“ اور وہ ایک بار پھر اپنی سکرٹس سرسراتی، بھٹکتاں استقبالیہ کمرے کا رخ کرتی، اپنے سموری کوٹ یا چفے پہنتی اور رخصت ہو جاتی ہیں۔ گفتگو ان دنوں کے اہم ترین موضوع۔ امیر کبیر معمر کاؤنٹ ہزدخوف (Bezukhov) کی۔ جس کی شہرت یہ تھی کہ وہ اپر اطورہ کیتھرین کے عہد کے خوش شکل ترین انسانوں میں سے تھا، علالت اور اس کے ناجائز بیٹے، بیٹر کے بارے میں تھی جس نے آلتاپا ولودا کی محفل شب میں بڑی ناشائستگی کا مظاہرہ کیا۔

”مجھے بے چارے کاؤنٹ پر بڑا ترس آرہا ہے“ ایک مہمان خاتون نے کہا۔ ”ان کی صحت پہلے ہی قابل رشک نہیں تھی۔ ادھر صاحب زادے جو حرکتیں فرما رہے ہیں، ان کا صدمہ الگ ایہ باتیں ان کے لیے جان لیوا ثابت ہوں گی!“

”بھلا ہوا کیا تھا؟“ کاؤنٹس نے انجان بن کر پوچھا، جانا نکہ کاؤنٹ کو جس بنا پر صدمہ اٹھانا پڑا تھا، وہ اس کے متعلق اس روز کم از کم چندہ مرتبہ سن چکی تھی۔

”سنی تعلیم کا یہی نتیجہ نکلتا ہے!“ اس کی مہمان سہیلی نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”جب یہ نوجوان ممالک غیر میں مقیم تھا، اس وقت بھی سے کھلی ڈھیل دی گئی۔ اب میں نے سنا ہے کہ اس نے پیٹرز برگ میں ایسی ایسی ناشدنی حرکات کی ہیں کہ تو یہ ہی بھلی! اے پولیس کی نگرانی میں شہر بدر کر دیا گیا ہے۔“

”واقعی؟“ کاؤنٹس نے پوچھا۔

”بات یہ ہے کہ وہ بری صحبت میں پھنس گیا ہے،“ پولیس آفیسر میخائیلوفا نے مدخلت کرتے ہوئے کہا۔

”لوگ کہتے ہیں کہ پتا نہیں کہ وہ، پولیس واسلی کا فرزند اور ایک اور نوجوان، جس کا نام دلخوف بتایا جاتا ہے، کیا قیامت برپا کرنے والے ہیں! ان میں سے دو کو اپنے کیے کی سزا مل گئی ہے۔ دلخوف کی تنزیل ہو گئی ہے۔ اس کی افسری چھن گئی ہے اور اب اسے نوج میں معمولی عہدے پر لگادیا گیا ہے۔ بزدل خوف کے صاحب زادے کو یہاں ماسکو بھیج دیا گیا ہے۔ جہاں تک انا طول کو راگن کا تعلق ہے، اس کے باپ نے معاملہ ٹھپ ٹھپا دیا ہے۔ تاہم اسے بھی پیٹرز برگ سے باہر بھیجنا پڑا۔“

”یہ بہت بد ذات اور لنگے ہیں، خاص طور پر دلخوف۔“ مہمان خاتون نے حاشیہ آرائی کی۔ ”وہ ماریا اوانوونا دلخووا کا بیٹا ہے۔ وہ خود بہت معزز خاتون ہیں لیکن گھوڑی کے ساتھ قسمت نے کیا ہاتھ کیا کیا آپ کبھی یہ تصور کر سکتی ہیں کہ انہوں نے حرکت کیا کی تھی؟۔ یہ تینوں کہیں سے ایک ریپچہ پکڑائے، اسے انہوں نے گاڑی میں سوار کیا اور ایکٹریسوں سے ملنے چل دیے۔ پولیس کو سن گئی۔ اس نے انھیں روکنا چاہا، انہوں نے الٹا پولیس مین کو ریپچہ کے اوپر باندھ دیا اور دونوں کو سویٹکا نہر میں ڈھکیل دیا۔ ریپچہ، جس کے اوپر پولیس مین باندھ تھا، پانی میں تیرنے لگا۔“

”مائی ڈیئر، کیا زبردست نقشہ ہو گا اس پولیس والے کا!“ کاؤنٹ نے ہنسی سے بے قابو ہوتے ہوئے کہا۔

”اٹنہ، بہت بری حالت تھی بے چارے کی! کاؤنٹ، بھلا اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے؟“

لیکن خود خواتین بھی اپنی ہنسی پر قابو نہ پاسکیں۔

”لوگوں نے بڑی مشکل سے پولیس مین کی گلو خلاصی کرائی،“ مہمان خاتون نے اپنا سلسلہ کلام دوبارہ جوڑتے ہوئے کہا۔ ”کرل ولادی مروچ بزدل خوف کے صاحب زادے نے دل بہلانے کے لیے خوب طریقہ تلاش کیا!“ اس نے مزید کہا۔ ”اور لوگ کہتے ہیں کہ وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ اور ہوشیار ہے۔ ممالک غیر میں تعلیم دلانے کا یہی انجام ہوتا ہے۔ وہ بے شک بہت متمول ہے لیکن مجھے امید ہے کہ یہاں ماسکو میں کوئی اسے منہ نہیں لگائے گا اور کبھی اپنے ہاں مدعو نہیں کرے گا۔ کچھ لوگ میرا اس سے تعارف کرنا چاہتے تھے لیکن میں نے کورا جواب دے دیا۔ تا بابانا! میری بیٹیاں ہیں، مجھے ان کا برا بھلا سوچنا ہے۔“

”آپ نے یہ کیوں کہا کہ وہ بہت متمول ہے؟“ کاؤنٹ کے تمام بچے نا جائز ہیں، ”کاؤنٹس نے نوجوان لڑکیوں کو، جو جھوٹ پٹ جھوٹ مرٹ یوں بن گئیں جیسے انہوں نے کچھ سنا ہی نہیں، پرے ہٹاتے ہوئے کہا۔ ”مجھے یقین ہے کہ میری بھی ولد لڑتا ہے۔“

”میرا خیال ہے کہ اس کے، س قسم کے بچوں کی تعداد جس کے لگ بھگ تو ہوگی،“ مہمان خاتون نے ناک سکڑتے ہوئے کہا۔

پولیس آفائیسر کیلونا نے گفتگو میں پھر مداخلت کی۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ یہ جانا چاہتی تھی کہ اس کے تعلقات کا سلسلہ بہت دراز ہے اور ادنیٰ طبقے میں جو کچھ ہوتا تھا، اس سے وہ پوری طرح باخبر ہے۔

”حق بات یہ ہے،“ اس نے متنی خیز نیم سرگوشی میں کہا۔ ”کاؤنٹ کرل ولادی مروچ کی کرتوتوں سے ایک زمانہ واقف ہے۔ اسے بھی یہ معلوم نہیں کہ اس کے بچوں کی کل تعداد کتنی ہے، لیکن یہ جیڑ اس کا چیتا ہے۔“

”صرف ایک برس پہلے بڑے میاں کتنے خوش شکل تھے!“ کاؤنٹس نے اظہار خیال کیا۔ ”اس سے زیادہ خوش شکل مرد میں نے آج تک نہیں دیکھا۔“

”لیکن اب وہ بہت بدس گیا ہے،“ آنا میخائیلوونا نے کہا۔ ”لیکن جیسا کہ میں عرض کر رہی تھی، اپنی بیوی کے حوالے سے پرنس واسیلی ساری جائیداد کا واحد وارث ہے۔ تاہم کاؤنٹ کو جیڑ سے بہت لگاؤ ہے۔ اس نے اسے تعلیم دلانے کے لیے بڑے جو حکم اٹھائے بلکہ امپراطور کو بھی اس کے بارے میں درخواست ارسال کی۔ چنانچہ کسی کو یہ معلوم نہیں کہ اگر اس کا انتقال ہو گیا (اور اس کی حالت اتنی غیر ہے کہ ہر دم یہی خیال آتا ہے کہ وہ اب ہی، کہ اب گیا۔ انھوں نے پیٹرز برگ سے ڈاکٹر لوٹین (Lottin) کو بلا بھیجا ہے)، تو اس کی بے حساب جائیداد کسے ملے گی، جیڑ کو یا پرنس واسیلی کو؟ چالیس ہزار تو اس کے زرعی غلام ہیں اور دیکھوں کر ڈروں روبل مستزاد! مجھے ان باتوں کا خوب علم ہے کیونکہ پرنس واسیلی نے خود مجھے بتایا تھا۔ علاوہ ازیں کرل ولادی مروچ میری امی کے چچا زاد بھائی کا بیٹا ہے۔ اور وہ میرے یوریا کا دینی باپ ہے۔“ اور اس نے یہ آخری بات کچھ یوں کہی جیسے اس کے نزدیک اس کی کائی برابر بھی اہمیت نہ ہو۔

”پرنس واسیلی کل ماسکو تشریف لائے تھے،“ مہمان خاتون نے کہا۔ ”مجھے معلوم ہوا ہے کہ وہ کسی معاملے کے سلسلے میں یہاں آئے ہیں،“ مہمان خاتون نے کہا۔

”ہاں، تاہم یہ بات باہر نہیں نکلنا چاہیے،“ پرنس آنا میخائیلوونا نے کہا۔ ”معائنہ محض بہانہ ہے۔ جب اسے معلوم ہوا کہ کاؤنٹ کرل ولادی مروچ کی حالت بہت دگرگوں ہے، وہ اسے دیکھنے چلا آیا۔“

”ma chere، آپ جو چاہیں کہتی رہیں، لیکن اس مذاق کا جواب نہیں!“ کاؤنٹ نے کہا اور جب اس نے دیکھا کہ بزرگ مہمان خاتون اس کی بات پر کوئی توجہ نہیں دے رہی، وہ نوجوان لڑکیوں سے مخاطب ہوا اور کہنے لگا ”اس پولیس مین کی جو گت نئی ہوگی، اس کا میں خوب تصور کر سکتا ہوں۔“

اور اس کے ساتھ ہی یہ دکھانے کے لیے کہ پولیس مین کا کیا نقشہ بنا ہوگا، وہ اپنے بازو دھرانے لگا۔ اس پر ایک بار پھر ہنسی کا دورہ پڑ گیا اور وہ فلک شگاف تہقیر لگانے لگا۔ اس کا بھاری بھر کم جسم اس شخص کے جسم کی طرح لرزنے لگا جو ہمیشہ کھاتا بھی خوب ہے اور اس سے بھی بڑھ کر یقیناً پیتا بھی ڈٹ کر ہے۔

”آپ ضرور بالضرور تشریف لائیں اور ہمارے ساتھ کھانا تناول فرمائیں،“ اس نے کہا۔

کاؤٹش نے اپنی مہمانوں پر نظر دوڑائی۔ وہ خوش اخلاقی سے مسکرا رہی تھی لیکن اس نے یہ حقیقت چھپانے کی ذرا بھی کوشش نہ کی کہ اگر اس کی مہمان اٹھ کھڑی ہوں اور رخصت ہو جائیں، اسے قطعاً کوئی افسوس نہیں ہوگا۔ مہمان خاتون کی بیٹی پہلے ہی اپنے ڈریس کی ٹانگیں سیدھی کرے لگی تھی اور وہ استفہامیہ انداز سے اپنی ماں کی جانب دیکھ رہی تھی کہ اچانک ملحقہ کمرے سے لڑکوں لڑکیوں کی دردناکے کی طرف بھاگنے اور یک کرسی کے نیچے گرنے کی آواز سنائی دی۔ اتنے میں ایک تیرہ سالہ دو شیرہ، جس نے اپنی چھوٹی سی مہل کی سکرٹ کی تہوں میں کچھ چھپایا ہوا تھا، اندھا دھند بھاگتی دوڑتی ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی اور کمرے کے عین درمیان میں آ کر۔ یہ بالکل عیاں تھا، وہ جس طرح سر پٹ بھاگی آئی تھی، اس کا حاصل یہ ہوا کہ وہ اپنے ارادے اور خواہش کے علی الرغم کافی دور نکل آئی۔ عین اس لمحے ایک طاسب علم، جس کے کوٹ کے کارکارنگ قرعزی تھا، گارڈز کا ایک افسر، ایک پندرہ سالہ لڑکی در ایک ننھا لڑکا، جس کا جسم بھرا بھرا اور گل بی تھا اور جو چھوٹے کوٹ میں لمبوس تھا، دردناکے پر مسرور ہوئے۔ کاؤٹ اچھل پڑا۔ اس نے اپنے بازو پھیلائے اور دلہراتے بل کھاتے آگے بڑھا تا کہ وہ ننھی منی دو شیرہ کو اپنے بازوؤں میں سمیٹ سکے۔

”اور یہ رہی ہماری وہ گڑیا“ اس نے ہنستے مسکراتے کہا، ”جس کا آج ہم نام دن منار ہے ہیں۔“
 ”ma chere، ہر کام کا وقت ہوتا ہے،“ کاؤٹش نے مصنوعی رعب سے کہا۔ ”الیا، آپ ہمیشہ اسے لگاڑتے رہتے ہیں،“ اک نے اپنے خاوند سے مزید کہا۔

”Bon jour, ma chere, je vous felicite“ مہمان خاتون نے کہا۔

”Quelle dei cieuse enfant!“ اس نے ماں سے مخاطب ہو کر کہا۔

ننھی منی دو شیرہ اتنی حسین تو نہیں تھی لیکن اس کی نس نس زندگی کی حرارت سے معمور تھی۔ اس کی آنکھیں سیاہ اور دہن فراخ تھا۔ اندھا دھند دوڑنے کے دوران میں اس کا شلوکا اس کے بچگانہ شانے سے ڈسک گیا تھا۔ افراتفری میں کالی زلفیں پریشان ہو رہی تھیں۔ اس کے بہن بازو برہنہ تھے اور اس کی ننھی منی ٹانگیں لیس سے آراستہ چٹلون میں ملفوف تھیں، اور وہ اپنے پاؤں میں نیچی ایڑی کے سلپر پہنے ہوئے تھی۔ وہ عمر کے اس دلکش دور میں سے گزر رہی تھی جب بڑکی بچی نہیں رہتی لیکن بچی ابھی نو خیز بڑکی کے روپ میں نہیں ڈھلی ہوتی۔ اپنے باپ کی بانہوں سے چھوٹ کر وہ اپنی ماں کی طرف بھاگی اور اس کی ڈانٹ ڈپٹ کی پروا کیے بغیر اس نے اپنا تھمتا تا چہرہ اپنی ماں کے لیس کے کالر میں چھپایا اور کھلکھلا کر ہنسنے لگی۔ ہنستے ہنستے اس نے گڑیا کے بارے میں، جو اس نے اپنی سکرٹ کی تہوں سے برآمد کی تھی، کچھ بتانے کی کوشش کی۔

”آپ دیکھتی ہیں نا؟... میری گڑیا۔ سیسی۔ دیکھتی ہیں نا، وہ...“

”ماں ڈیرہم کیسی ہو، نام دن مبارک۔“

”کتنی پیاری بچی ہے!“

لیکن مناشا سے مزید کچھ نہ کہا گیا۔ اسے ہر چیز بہت پر مذاق معلوم ہو رہی تھی۔ وہ بے اختیار اپنی ماں کی گود میں کرپڑی اور کچھ اس طرح کھلکھلا کر ہنسنے لگی کہ متین و مہذب مہمان خاتون اس کا ساتھ دیے بغیر نہ رہ سکی۔

”اب اٹھو اور بھاگ جاؤ۔ اور ہاں، یہ اپنی ننھی منی چڑیل بھی اپنے ساتھ لیتی جاؤ،“ اس کی ماں نے اسے مھوٹ مھوٹ کی سرزنش کرتے ہوئے کہا۔ ”یہ میری سب سے چھوٹی بیٹی ہے،“ اس نے مہمان خاتون کی جانب مڑ کر کہا۔

مناشا نے اپنی ماں کے کالر سے سر باہر نکالا، اپنی ہنسی کے آنسوؤں کے بیچ میں سے اسے دیکھا اور دوبارہ اپنا چہرہ چھپا لیا۔

مہمان خاتون نے، جو اس خاندانی تماشے کی تحسین کرنے پر مجبور تھی، یہی مناسب خیال کیا کہ وہ خود بھی اس میں شریک ہو جائے۔

”ہائی ڈیر، یہ تو بتاؤ،“ اس نے مناشا سے کہا، ”یہ میسی تمہاری کیا لگتی ہے؟ میرا خیال ہے کہ بیٹی ہوگی؟“

مناشا کو اپنے پیچھے نہ مشغولوں کے متعلق خاتون کا سر پر ستانہ لہجہ پسند نہ آیا۔ اس نے جواب تو نہ دیا، البتہ فکر مندی سے اسے گفتگوئی ہانکھ گردیکھنے لگی۔

دریں اثنا تئیس کے دیگر رکان۔ آنا مین، نیلو ونا کا بیٹا بورس (افسر)، کارڈنٹ کا بڑا صاحب زادہ نکولائی (طالب علم)، اس کی چندرہ سالہ بھانجی سونیا اور اس کا چھوٹا بیٹا چتر دشا۔ سبھی ڈرائنگ روم میں اپنی اپنی نشستوں پر بیٹھ چکے تھے، اور اس کوشش میں تھے، جو ان کے چہروں سے صاف میاں ہو رہی تھی کہ ان کے جسموں کی بوٹی بوٹی سے جو گفتگوئی، زندہ دلی اور بشارت پھوٹی پڑ رہی تھی، اسے تہذیب و آداب کے دائروں میں رکھ سکیں۔ غصی کمروں میں، جہاں سے وہ ماتند آندھی بھاگتے چلے آ رہے تھے، ان کی جو گفتگو ہوتی رہی تھی، اس گفتگو سے جو یہاں ہو رہی تھی، کہیں زیادہ دلچسپ ور پر لطف تھی کیونکہ یہاں انھیں مجبوراً شہر کی گلیوں اور افواہیں، موسم اور پراکسنا کے بارے میں گفتگو سننا پڑ رہی تھی۔ چنانچہ انھیں جب بھی آپس میں نظریں ملانے کا موقع ملا، ان کے لیے اپنی ہنسی ضبط کرنا مشکل ہو جاتا۔

دونوں نوجوان۔ افسر اور طالب علم۔ بچپن ہی سے ایک دوسرے کے دوست تھے، اور باوجود یکہ دونوں ہم عمر تھے، در دونوں خوش شکل تھے، ایک دوسرے سے قطعاً مشابہ نہیں تھے۔ بورس درز قامت تھا اور اس کا رنگ صاف تھا۔ اس کے غدو خال ملائم اور متناسب تھے۔ نکولائی کا قد چھوٹا، بال گھونگھریالے اور وہ چہرے ہرے کے اعتبار سے صاف گوا اور راست باز تھا۔ اس کے بامائی ہونٹ پر سبزہ نمودار ہونا شروع ہو چکا تھا۔ اس کی شکل و صورت دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ یہ شخص جوش و دلولہ سے معمور ہے، جلد باز ہے اور کوئی قدم اٹھانے سے پہلے زیادہ سوچ بچار نہیں کرنا۔ نکولائی جب ڈرائنگ روم میں داخل ہوا، وہ شرما گیا اور اس کا چہرہ تھمتھانے لگا۔ بظاہر یہی معلوم ہوتا تھا کہ اس نے کچھ کہنے کے لیے سوچنے کی کوشش کی تھی لیکن ناکام رہا۔ اس کے برعکس بورس کو اس قسم کی کوئی دشواری پیش نہ

آئی اور وہ نہایت آسانی سے کمرے کے ماحول میں گھل مل گیا۔ وہ نہایت پرسکون بچے میں مزے لے لے کر بتانے لگا کہ وہ میسجی یعنی گڑیا کو اس وقت سے جانتا ہے جب یہ ابھی نو عمر تھی، اس کی ناک ٹھکست وریخت کی شکار نہیں ہوئی تھی۔ ان پانچ برسوں کے دوران میں، جب سے وہ اسے جانتا ہے، وہ کس طرح عمر کی منازل طے کرتی رہی اور کبرسنی کی طرف بڑھتی رہی۔ اور اب بیماری کی کھوپڑی میں دراڑیں پڑ گئی ہیں۔ جب اس نے یہ اندازہ کیا، اس نے آنکھ اٹھا کر تماشا کی جانب دیکھا لیکن اس نے اپنا منہ دوسری طرف کر لیا اور وہ اپنے چھوٹے بھائی کو، جس نے اپنی آنکھیں پینچی ہوئی تھیں اور جس کا خاموش منہ سے بدن کپکپانے لگا تھا، دیکھنے لگی۔ تاشا کو مزید مضطرب کیا۔ اس نے کد کڑا لگایا اور اپنی سبک رتن ننھی ننھی ٹانگوں سے جتن تیز بھاگ سکتی تھی، بھاگتی کمرے سے باہر نکل گئی۔ بورس نے اپنے اوساں، بحال رکھے اور مطلق پریشان نہ ہو۔

”میرا خیال ہے، اماں، کہ آپ کہیں باہر جانا چاہتی تھیں۔ ٹھیک کہا میں نے؟“ اس نے اپنی والدہ کی جانب مڑ کر مسکراتے ہوئے کہا۔ ”آپ نہ، میں تو گاڑی لے آؤں؟“

”ہاں بیٹ، جاؤ، انھیں کہو کہ تیار ہو جائیں،“ وہ اس کے جواب میں مسکراتے ہوئے بولی۔

بورس چپ چاپ کمرے سے باہر نکل گیا، اور تاشا کو ڈھونڈنے لگا۔ گداڑ جسم چھوٹا لڑکا بھی خفگی کے عالم میں ان کے پیچھے بھاگا۔ معلوم ہوتا تھا کہ اسے غصہ اس لیے آرہا ہے کہ جیسے اس کے سارے پردگراں کا ستیاناس ہو گیا ہو۔

9

نوریز مہمان ددشیرہ اور کاؤٹس کی بڑی صاحب زادی (جراپنی بمشیرہ سے چار سال بڑی تھی اور بالعموم کے طور طریقے پٹانے لگی تھی) کے عہادہ کمرے میں جو نو جوان رہ گئے، وہ نکو مائی اور بھانجی سونیا تھے۔ سونیا وٹلی بتلی اور نازک ند، ستم تھی۔ اس کا قد چھوٹا، رنگ صاف و رہا ہال بھورے تھے۔ اس کی آنکھیں، جن پر لانی اور گھنی پلکیں سایہ قلع تھیں، نرم و گداز تھیں۔ سیاہ بالوں کی وہ ہری موٹی پٹی اس کے سر کے گرد پٹی ہوئی تھی۔ اس کے جسم اور خاص طور پر اس کی گردن اور اس کے دلے پتلے لیکن خوش وضع اور مضبوط برہنہ بازوؤں پر چھنی رنگت کی جھلک نمایاں تھی۔ اس کی خوش خرام اور دل رہا چال، اس کے مہین اعصاف کی ملائمت اور چلک، اور اس کے اطوار میں خاصی نوع کی پادشہ اس کا رکھ رکھاؤ اور اس کی کم گوئی، ان سب باتوں کو دیکھ کر دی کو یہ احساس ہوتا تھا کہ وہ سن موہنی، بھولی بھالی اور نیم بالید، بلوگڈری ہے۔ ہونہار بردا کے چکنے چکنے پات۔ وہ کسی روز پھل پھول کر ننھی منی حسین و جمیل بی مانوہن جائے گی۔ وہ جس انداز سے مسکراتی تھی، اس سے یہ مترشح ہوتا تھا کہ ڈرامنگ روم میں عمومی نوعیت کی جو گفتگو ہو رہی ہے، اس میں اسے بہت دلچسپی ہے لیکن کوشش کے باوجود اس کی آنکھیں، جو لانی اور گھنی پلکوں میں مستور تھیں، اپنے خالہ کی طرف، جو عنقریب فوج میں شہریت کے لیے روانہ ہونے والی تھیں، اٹھ جاتیں اور اسے کچھ اس قدر چچکانہ پرستش کے انداز سے دیکھنے لگتی کہ وہ ایک لحظہ کے لیے بھی کسی کو قریب شد سے سکی۔ اور یہ بات اظہر من الشمس

نہی کہ بلوگڑی محض اس لیے ذرا آرام سے بیٹھی ہے کیونکہ وہ اس تاک میں تھی کہ جو نئی موقع ملے وہ پھرتی سے چھٹا لنگ لائے اور بورس اور مٹاشا کی طرح اپنے خالہ زاد کے ساتھ ذرا لنگ روم سے کھسک جائے اور اس کے ساتھ چھلیں کرے۔

”جی ہاں، ma chere“ کاؤنٹ نے اپنی مہمان کو مخاطب کرتے اور گولائی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”اب چونکہ اس کا دوست بورس انسر بن چکا ہے، یہ بھی پیچھے نہیں رہنا چاہتا اور دوستی نبھانے کے لیے یونیورسٹی کو خیر یاد کھد رہا ہے اور مجھے،“ اپنے بوڑھے باپ کو بھی، بے سہارا چھوڑے جا رہا ہے۔ ma chere اسے فوج میں خدمات سرانجام دینے کا شوق چڑھایا ہے حالانکہ محکمہ دستاویزات سرکار میں اچھا بھلا عہدہ اس کا انتظار کر رہا ہے۔ آپ کے خیال میں دوستی اسے کہتے ہیں؟“

”لیکن سنا ہے کہ جنگ کا اعلان ہو چکا ہے،“ مہمان خاتون نے کہا۔

”اس قسم کے اعلانوں کے متعلق ہم مدتوں سے سنتے چلے آ رہے ہیں،“ کاؤنٹ نے جواب دیا، ”اور اس طرح کے اعلان بار بار ہوتے رہیں گے لیکن ہوگا ہوا گا کچھ نہیں اور حالات جوں کے توں ہی رہیں گے۔ ma chere... آپ اسے دوستی کہیں گی؟“ اس نے اپنی بات کا عادیہ کرتے ہوئے کہا۔ ”وہ ہوزاروں³¹ میں شامل ہو رہا ہے۔“

مہمان خاتون کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا جواب دے۔ اس نے محض اپنا سر ہلا دیا۔

”اس میں دوستی کو کوئی دخل نہیں،“ گولائی نے شعلہ بھسوکا ہوتے اور اپنا یوں دفاع کرتے کہا جیسے اس پر کسی نے شرمناک الزام لگا دیا ہو۔ ”اس میں دوستی کا قطعاً کوئی دخل نہیں۔ سیدھی بات یہ ہے کہ میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ طعنا میرا، حجام فوجی ملازمت کی طرف ہے۔“

اس نے اپنی خالہ زاد اور نوخیز مہمان، دو شیزہ پر نظر ڈالی۔ دونوں اسے پسندیدگی کی نگاہوں سے دیکھ رہی اور مسکرا رہی تھیں۔

”ہوزاروں کی پاولوگرہات رجمنٹ کا کرنل شو برٹ آج شام ہمارے ہاں کھانے پر آ رہا ہے۔ وہ ان دنوں چھٹی پر آیا ہوا ہے اور واپسی پر گولائی کو اپنے ساتھ لے جائے گا۔ میں کیا کر سکتا ہوں؟“ اس نے یوں اپنے کندھے اچکائے، جیسے اسے اس معاملے کی، جو بظاہر اس کے اعصاب پر سوار ہو چکا تھا، کوئی پروا نہ ہو۔

”پاپا، میں آپ سے پہلے بھی یہ عرض کر چکا ہوں کہ اگر آپ کو میرا جانا گوارا نہیں، میں نہیں جاؤں گا۔ لیکن میں جانتا ہوں کہ میں فوج کے علاوہ کسی اور شعبے کے لیے سوزوں نہیں۔ میں نہ سفارت کا اہل ہوں اور نہ کلرکی کر سکتا ہوں۔ میں جو کچھ محسوس کرتا ہوں، مجھے اس پر پردہ ڈالنا نہیں آتا۔“ وہ یہ باتیں بھی کرتا جاتا تھا اور سو نیا اور نوخیز مہمان دو شیزہ کو خوش شکل نو جوان کی طرح ایسی نظروں سے دیکھتا جاتا تھا جیسے وہ ان سے پیار کی پیٹلیں بڑھا رہا ہو۔

چھوٹی بلوگڑی، جو اسے دیکھ دیکھ کر اپنی آنکھیں سینک رہی تھی، یوں دکھائی دے رہی تھی جیسے وہ ابھی ابھی

کہ کڑے لگانا اور پھر سے اپنی کامل ہونگیزہ فطرت کا اظہار کرنا شروع کر دے گی۔

”ٹھیک ہے، ٹھیک ہے!“ معمر کاؤنٹ نے کہا۔ ”یہ ہمیشہ اسی طرح بھڑک اٹھتا ہے۔ اس بونا پارت سے ان سب کے دماغ گھما دیے ہیں۔ یہ سب انہی سوچوس میں غلطیاں دہرائے رہتے ہیں کہ وہ معمولی لیفٹیننٹ تھا، ترقی کر کے امپراطور کیسے بن گیا۔ خیر، کیوں نہ سوچیں؟“ کاؤنٹ، یہ دیکھے بغیر کہ اس کی مہمان کے لبوں پر ہنسنا مسکراہٹ پھیلی ہوئی ہے، اپنی ہانک چلا گیا۔

بزرگ بونا پارت کے متعلق باتیں کرتے لگے۔ ادھر، دام کاراگن کی دختر بھولی نوجوان رستوں پر ڈورے ڈالنے لگی۔

”بڑے افسوس کی بات ہے کہ حضرت کو آپ آرکھاروفس (Arkharovs) کے ہاں تشریف نہ رہے۔ آپ مجھے بے حد یاد آئے، اس نے سعادت سے مسکرتے ہوئے اس سے کہا۔

اس آپ آپ پر نوجوان پھور نہ سما یا۔ وہ کھسک کر اس کے قریب ہو گیا اور خندوں دہن جوی کے ساتھ راز دارانہ گفتگو کرنے لگا۔ وہ اپنے ماحول سے اتنا بیگانہ ہو چکا تھا کہ اسے یہ احساس ہی نہ ہوا کہ اس کی غیر شعوری پیار بھری مسکراہٹ نے سونیا کے قلب حاسد میں خنجر پیوست کر دیا ہے۔ اس کا چہرہ تسمنہ رہا تھا اور وہ زبردستی مسکراتے کی جگہ درد کر رہی تھی۔ گفتگو کے دوران میں نکولائی کی نظر اس پر پڑی۔ جواب میں اس نے اسے ایسی نگاہوں سے دیکھا جیسے وہ اسے ابھی کچھ چبا جائے گی۔ اس کے لیے اپنے آنسوؤں کو روکنا اور اپنے چہرے پر مصنوعی مسکراہٹ سجانا ناممکن ہوتا جا رہا تھا۔ آخر اس سے نہ رہا گیا، وہ اٹھی اور کمرے سے باہر نکل گئی۔ نکولائی کا سارا جوش و خروش جھاگ کی مانند بجھ گیا۔ جونہی گفتگو میں ذرا وقفہ آیا، وہ اٹھا اور سونیا کی تلاش میں باہر نکل گیا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

”یہ آج کے نوجوان بھی خوب ہیں! کھلے بندوں اپنی محبتوں کا اظہار کرتے پھرتے ہیں۔ نہ چھپاتے ہیں، نہ شرماتے ہیں،“ آتنا میخائیلوونا نے نکولائی کی طرف، جب وہ کمرے سے باہر نکل رہا تھا، اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”عم ز اودوں کا یوں ایک دوسرے کے قریب رہنا بڑے خطرناک نتائج کا حامل ہو سکتا ہے،“ اس نے فرانسیسی میں مزید حاشیہ آرائی کی۔

”ہاں“ جب روشنی کی کرنیں، جو یہ نوجوان اپنے ساتھ لائے تھے، ان کے جاتے ہی نظروں سے اوجھل ہو گئیں، تو کاؤنٹس نے لب کشائی کی۔ پھر ایک سوال کے جواب میں، جو کسی نے اس سے پوچھا نہیں تھا لیکن جو مسلسل اس کے ذہن میں گردش کر رہا تھا، وہ گویا ہوئی: ”ہم کتنے مصائب جھیلنے ہیں، کتنے جو حکم اٹھاتے ہیں، تب کہیں خوشی کا منہ دیکھنا نصیب ہوتا ہے! اور حق بات یہ ہے کہ اب بھی مسرت کے مقابلے میں تشویش کا پلڑا زیادہ بھاری ہے۔ دل پر ہمیشہ خوف سوار رہتا ہے، ہر وقت ڈر چھا رہتا ہے! لڑکے ہو یا لڑکیاں، عمر کا یہ دور دونوں کے لیے، ندرتوں اور خطرات سے بھرا ہوتا ہے۔“

”اس کا تمام تر انحصار اس بات پر ہوتا ہے کہ ان کی تربیت کیسے ہوئی ہے،“ مہمان خاتون نے حاشیہ آرائی کی۔
 ”جی، آپ درست فرماتی ہیں،“ کاؤنٹس نے اپنا سلسلہ کلام جوڑتے ہوئے کہا۔ ”خداوند کا شکر ہے کہ اب تک میرا بچوں کے ساتھ رویہ وستوبہ کا رہا ہے اور مجھے ان کا مکمل اعتماد حاصل رہا ہے،“ وہ کہے جا رہی تھی۔
 لیکن وہ بھی اسی مٹا لٹے کی مرتکب ہو رہی تھی جس کا ارتکاب اکثر ولدین کرتے رہتے ہیں جو یہ مفروضہ گھڑ لیتے ہیں کہ ان کے بچے اپنا کوئی راز ان سے نہیں چھپانے۔ ”میں جانتی ہوں کہ میں ہمیشہ اپنی بیٹیوں کی خاص الخاص *confidante* رہوں گی اور وہ کبھی اپنے دلوں کے بھید مجھ سے نہیں چھپائیں گی۔ اور اگر میرا گومائی اپنی جلد بازی یا نا عاقبت اندیشی کی وجہ سے کبھی کوئی حماقت کر بیٹھا (لڑکے لڑکے ہی ہوتے ہیں، ان سے ایسی حرکت بعید نہیں)، وہ بہر حال اس قسم کی نہیں ہوگی جیسی پرنسز برگ کے نوجوانوں سے سرزد ہوئی تھی۔“

”بالکل، بالکل۔ یہ سبھی کے سبھی کے نوجوان قابل تعریف ہیں،“ کاؤنٹ نے اس کی ہاں میں ہاں ملائے ہوئے کہا۔ اس نے ان تمام سوالات کا، جو الجھاؤ اور پریشانیوں کا سبب بنتے ہیں، جواب اس بات میں ڈھونڈ لیا تھا کہ ہر چیز نفیس اور بہت عمدہ ہے۔ ”خیر، اب کیا کیا جاسکتا ہے؟ اس کے سر میں یہ فتناس سما گیا ہے کہ وہ ہوزاروں کی رجمنٹ میں ہی افسر بنے گا۔ ان حالات میں *ma chere* میں کیا کر سکتا ہوں؟“

”آپ کی چھوٹی بیٹی کتنی پیاری ہے!“ مہمان خاتون نے کہا۔ ”منگھی منی، آتش کی پرکالہ!“
 ”جی ہاں۔ بالکل منگھی منی آتش کی پرکالہ“ کاؤنٹ نے کہا۔ ”مجھ پر گئی ہے۔ اس کی آواز کتنی دلکش ہے! گرچہ وہ میری بیٹی ہے لیکن جب میں یہ کہتا ہوں کہ وہ کسی روز گلوکارہ بنے گی، تو میں کوئی سبالف نہیں کرتا۔ وہ سالو مولی بنی ہوگی۔ ہم نے اس کی تربیت کے لیے اٹالوی اٹالیتی کی خدمت حاصل کی ہیں۔“

”اتنی کم سنی میں؟ میں نے سنا ہے کہ گر کم سنی میں گانا گانے کی تربیت دی جائے تو آواز خراب ہو جاتی ہے۔“
 ”کم سن! نہیں، بالکل نہیں!“ کاؤنٹ نے کہا۔ ”کیا ہمارے زمانے کی ماؤں کی بارہ تیرہ سال کی عمر میں شادیاں نہیں ہو جاتی تھیں؟“

”اور وہ ابھی سے بورس کی محبت میں گرفتار ہو گئی ہے! اس کے متعلق آپ کیا کہیں گی؟“ کاؤنٹس نے بورس کی ماں کو دھیمی مسکراہٹ سے دیکھتے ہوئے کہا۔ اور اس نے ایک ایسے تصور کا، جو بظاہر ہمیشہ اس کے ذہن میں سوار رہا تھا، تعاقب کرتے ہوئے کہا۔ ”دیکھیں نا، اگر میں اس کے ساتھ سختی برتوں اور اسے ایسا کرنے سے منع کر دوں۔ خدا جانتا ہے کہ وہ میری پشت پیچھے تھائی میں کیا کرتے ہیں۔ (کاؤنٹس کہنا یہ چاہتی تھی کہ وہ شاید بورس دکنار کرتے ہیں) لیکن صحیح بات یہ ہے کہ وہ منہ سے جو لفظ بھی نکالتی ہے، مجھے اس کا علم ہوتا ہے۔ وہ شام کو دوڑی دوڑی میرے پاس آتی ہے اور از خود ایک ایک بات مجھے بتا دیتی ہے۔ شاید میں اس کی عادتیں بگاڑ رہی ہوں لیکن خدا شاہد ہے کہ میرے خیال میں بہترین طریقہ یہی ہے۔ میں نے اپنی بڑی بیٹی کے معاملے میں ذرا سختی برتی تھی۔“

”جی ہاں، میری تربیت بالکل مختلف طریقے سے ہوئی تھی،“ خوبرو کا وٹنٹس دیرانے مسکراتے ہوئے کہا۔
لیکن دیرا جب مسکراتی تھی، تو جیسا کہ عام طور پر ہوتا ہے، اس کی مسکراہٹ سے اس کے حسن میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا تھا، اس کے برعکس اس سے اس کے چہرے کی صورت غیر فطری اور چٹانچہ ناگوار ہو جاتی۔ دیرا خوب رو تھی، اس کی تربیت بہت اچھی ہوئی تھی، وہ اچھی طالبہ تھی اور احمق تو بالکل نہیں تھی۔ اس کی آواز میں دلکشی تھی اور اس نے جو کچھ ابھی ابھی کہا تھا، وہ صحیح بھی تھا اور موقع محل کے مطابق بھی۔ لیکن عجیب بات یہ تھی کہ مہمانوں نے بھی اور کا وٹنٹس نے بھی، اس کی طرف یوں دیکھا جیسے وہ دریافت کرنا چاہتی ہو کہ آخر اس نے اس قسم کی بات کی ہی کیوں۔ اور ن سب کی حالت یہ تھی کہ نہ جائے مائدن نہ پائے رفتن۔

”یہ تو ہمیشہ سے ہوتا چلا آیا ہے کہ لوگ اپنا سارا زور اپنے پہونٹھی کے پچوس پر لگا دیتے ہیں۔ وہ انھیں غیر معمولی ہستیاں بنا دینا چاہتے ہیں،“ مہمان خاتون نے رائے زنی کی۔

”ma chere،“ ہنس اس سے انکار نہیں۔ ہماری پیاری کا وٹنٹس نے دیرا پر کچھ زیادہ ہی محنت کی،“ کا وٹنٹ نے کہا۔ ”خیر، اس سے کیا بگڑا؟ بہر حال وہ قابل تعریف بیٹی ہے،“ اس نے دیرا پر پسندیدگی کی نگاہ ڈالتے ہوئے کہا۔

مہمان خواتین اٹھ کھڑی ہوئیں اور اجازت چاہی۔ جانے سے پہلے انھوں نے وعدہ کیا کہ وہ عشاء پر ضرور آئیں گی۔

”کیا آداب پائے ہیں! میرا خیال تھا کہ یہ کبھی جانے کا نام نہیں لیں گی!“ کا وٹنٹس نے انھیں رخصت کرنے کے بعد کہا۔

10

جب نسا شا بھاگتی روڑتی باہر گئی تھی، وہ صرف پود گھر تک پہنچی تھی کہ رک گئی اور وہاں کھڑے ہو کر وہ گفتگو سننے لگی جو ڈرائنگ روم میں ہو رہی تھی۔ دراصل اسے بورس کا انتظار تھا کہ وہ کب باہر آتا ہے۔ جلد ہی وہ بے تاب ہو گئی اور زور زور سے پاؤں زمین پر دھنسنے لگی۔ اس کے آنسو تھے کہ اب نکلے کہ ب نکلے کیونکہ وہ بلا توقف اس کے پیچھے پیچھے نہیں آیا تھا۔ لیکن جب اس نے نوجوان شخص کے، جو درمیانی چال چلا کر رہا تھا، دبے پاؤں آنے کی آہٹ سنی، اس نے آؤد کھانہ تاؤ، ہبٹ چلا ننگ لگائی، پھولوں کے مابین تھکی اور وہاں چھپ گئی۔

بورس کی کچھ دیے پود گھر میں کھڑا بیچکچا کارہا اور اپنے گرد و پیش نظر کی روڑا تارہا۔ گرد کا ایک ذرہ اس کی وردی سے گستاخی کر بیٹھا، اس نے اسے جھاز کرا لگ کیا۔ پھر وہ آئینے کے سامنے جا کھڑا ہوا اور اپنے خوش شکل چہرے کا جائزہ لینے لگا۔ نسا نے اپنی جگہ سے، جہاں وہ چھپی کھڑی تھی، مطلق جنبش نہ کی۔ وہ صرف یہ دیکھنا چاہتی تھی کہ اب وہ کیا کرتا ہے۔ وہ کچھ دیر آئینے کے روبرو کھڑا رہا، اپنا عکس دیکھ کر مسکراتا رہا اور پھر نالیف سمت چل پڑا۔ نسا

ادھر۔ ”اور وہ پود گھر میں اسے عین اس جگہ لے گئی جہاں وہ گملوں کے درمیان چھپی ہوئی تھی۔
”یہ کچھ کیا ہے؟“ اس نے پوچھا۔

وہ ہڑبڑا گئی اور ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ اتنے میں اسے وہ گڑیا نظر آ گئی، جو اس نے کسی گملے میں پھینک دی تھی۔
”اس گڑیا کو بوسہ دو!“

بورس نے اس کے پر اشتیاق چہرے کو بڑی توجہ اور پیار سے دیکھا لیکن جواب دینے سے محترز رہا۔
”تم یہ کام نہیں کرنا چاہتے۔ خیر، پھر ادھر آؤ۔“ اس نے اپنی گڑیا پھینک دی اور پودوں کے اندر خامہ دور چلی گئی۔ ”اور قریب، اور قریب۔“ وہ کاٹا بھوسی کر رہی تھی۔

اس نے نوجوان افسر کی آستینیں پکڑیں اور اس کے تھمتھاتے چہرے پر خوف اور مسرت کے جذبات اٹھ آئے۔
”تم میرا بوسہ لینا چاہو گے؟“ اس نے اتنا آہنگی سے کہا کہ اس کی آواز بمشکل سنائی دی۔ وہ اسے دزدیدہ نگاہوں سے دیکھ رہی اور مسکرا رہی تھی لیکن جوش و جذبے نے اسے اتنا ہلکان کر دیا تھا کہ اس کی آنکھیں اشک آلود ہو گئیں۔

بورس شرمایا گیا اور اس کے رخسار سرخ ہو گئے۔

”تم نرمی احمق ہو!“ اس نے کہا۔ وہ اس کے تریب دوزانو ہو گیا، اس کے رخسار سرخ سے سرخ تر ہوتے جا رہے تھے لیکن اس نے کیا کرایا کچھ نہ، بس انتظار کرتا رہا۔

چونکہ وہ جست لگا کر ایک گملے پر چڑھ گئی تاکہ وہ اس سے اونچا ہو سکے۔ پھر وہ اس سے یوں بغل گیر ہو گئی کہ اس کے سین پر ہنہ باز اس کی گردن کے اوپر کے حصے کے گرد محائل ہو گئے۔ اس نے اپنے بالوں کو پھیلی جانب جھٹکا اور اس کے لبوں پر بھرپور بوسہ ثبت کر دیا۔ پھر وہ نیچے اتری اور دوسری سمت گملوں کے بیچ میں کھڑی ہو گئی۔ اس نے اپنا سر جھکایا اور انتظار کرنے لگی۔

”نہاں! تم جانتی ہو کہ میں تمہیں چاہتا ہوں لیکن...“

”کیا تمہیں واقعی مجھ سے محبت ہے؟“ نہاں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے پوچھا۔

”ہاں، مجھے تم سے محبت ہے لیکن میری۔ میری تم سے التجا ہے کہ ہمیں آئندہ ایسی حرکت نہیں کرنا چاہیے... چار سال گزر جانے دو پھر میں تمہیں شادی کی تجویز پیش کروں گا۔“

نہاں گہری سوچ بچار میں کھو گئی۔

”خیر، چودہ، پندرہ، سولہ...“ وہ اپنی تکی تکی انگلیوں پر کھینچنے لگی اور بولی۔

”ٹھیک ہے! پھر طے ہو گیا؟“

”بالکل طے!“ بورس نے جواب دیا۔

”ہمیشہ ہمیشہ کے لیے؟“ نہاں نے مٹی لڑکی کے استفسار کیا۔ ”تا آنکہ ہمیں موت نہیں آ جاتی؟“

اور اس کے چہرے پر مسرت و شادمانی دوڑ گئی۔ اس نے اس کا بازو تھاما اور آہستہ آہستہ چلتی اس کے ساتھ نشست گاہ میں داخل ہو گئی۔

11

مہمانوں کا استقبال کرتے کرتے کاؤٹس اتنا عاجز آ گئی کہ اس نے حکم دیا کہ اب کسی کو اندر نہ آنے دیا جائے، تاہم استقبال کمرے میں تعینات دربان کو یہ ہدایت کر دی گئی کہ جو مہمان بھی درہمیکہ پیش کرنے آئیں، انھیں رات کے کھانے کی لازماً دعوت دی جائے۔ کاؤٹس کی اپنی بچپن کی سہیلی پرنسس آئنایٹا سیلوونا کے ساتھ بالٹاؤ گنگنگو کرنے کی خواہش شدید سے شدید تر ہوتی جا رہی تھی کیونکہ جب سے وہ بیٹرز برگ سے لوٹی تھی، اس کی اس کے ساتھ باقاعدہ نشست نہیں ہوئی تھی۔ آئنایٹا سیلوونا کا چہرہ غم آلود لیکن دل آویز تھا۔ اس نے اپنی کرسی گھسیٹی اور کاؤٹس کے بالکل قریب بیٹھ گئی۔

”میں نے کبھی تم سے کوئی چیز نہیں چھپائی اور نہ چھپاؤں گی“ آئنایٹا سیلوونا نے کہا۔ ”اب ہماری پرانی سہیلیاں رہ ہی کتنی گئی ہیں! اس لیے میں تمہاری دوستی کی قدر کرتی ہوں۔“

آئنایٹا سیلوونا نے ویرا کی طرف دیکھا اور رک گئی۔ کاؤٹس نے اپنی سہیلی کا ہاتھ دبا دیا۔

”ویرا! اس نے اپنی بڑی بیٹی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ صاف معلوم ہوتا تھا کہ وہ اس کی چیتھی نہیں۔“ تم میں ذرا بھی عقل نہیں؟ آخر تمہاری سمجھ میں یہ کیوں نہیں آتا کہ تمہاری یہاں ضرورت نہیں۔ دوسری بچیوں کے پاس چلی جاؤ یا۔“

خوش شکل ویرہ حقارت سے مسکرائی لیکن یہ قطعاً ظاہر نہ ہوا کہ اس کے جذبات کو کوئی ٹھیس پہنچی ہے۔

”اماں، اگر پہلے فرمادیتیں، میں فوراً چلی جاتی،“ اس نے جواب دیا اور اپنے کمرے کی طرف جانے کے لیے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

جب وہ نشست کمرے میں سے گزر رہی تھی، اسے دونوں کھڑکیوں کے سامنے دو جوڑے نظر آئے۔ ویرک گئی اور مسکرنے لگی۔ اس کی مسکراہٹ میں حقارت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ سوٹیا نکولائی کے بالکل قریب بیٹھی تھی اور وہ اس کے لیے چند اشعار نقل کر رہا تھا۔ یہ اس کی اولیں شعری کوشش تھی۔ بورس اور نٹاشا دوسری کھڑکی کے رد برد بیٹھے تھے۔ جونہی انھوں نے ویرا کو اندر آتے دیکھا، وہ ہاتھیں کرتے کرتے خاموش ہو گئے۔ سوٹیا اور نٹاشا سے بھرمانہ لیکن پر مسرت لگا ہیں اٹھا کر ویرا کی جانب دیکھا۔

اگر کوئی شخص ان دو ننھی منی بچیوں کو یوں محبت میں سرشار دیکھتا، وہ خوش بھی ہوتا اور متاثر بھی، لیکن معلوم ہوتا تھا کہ جب ویرا نے انھیں اس کیفیت میں دیکھا، اس کے قلب و ذہن میں اس قسم کے خوشگوار حساسات بیدار نہ ہوئے۔

”میں نے کتنی مرتبہ کہا ہے کہ میری اشیاء کو ہاتھ نہ لگایا کرو؟ تمہارا اپنا کمرہ ہے،“ اس نے نکولائی کے ہاتھ

سے دوات چھینتے ہوئے کہا۔

”صرف ایک منٹ، صرف ایک منٹ۔“ اس نے دوات میں قلم ڈبوتے ہوئے کہا۔

”تم لوگ ہمیشہ غلط وقت پر کام کرنے کے اسلوب ڈھونڈ لیتے ہو،“ ویرا نے کہا۔ ”جس طریقے سے تم کد کڑے لگاتے ڈرائنگ روم میں آئے، اس پر ہر شخص کو بہت شرمندگی محسوس ہوئی۔“

اس حقیقت کے باوجود کہ جو کچھ اس نے کہا تھا، وہ صحیح تھا یا پھر اس لیے کہ اس نے یہ بات کہہ دی تھی، کسی نے جواباً کچھ نہ کہا۔ چاروں نے محض نگاہوں کا تبادلہ کرنے پر اکتفا کیا۔ دوات ہاتھ میں پکڑے ویرا کمرے میں کھڑی رہی۔

”نناشا اور بورس، ذرا اپنی عمریں دیکھو۔ بعد اس عمر میں تم دونوں کے، مین کیا راز ہو سکتے ہیں؟ یا تم دونوں کے مائین؟ یہ نری حماقت نہیں، تو اور کیا ہے؟“

”ہی؟ تمہارا اس سے کیا تعلق واسطہ ہے؟“ نناشانے نری سے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔

معلوم ہوتا تھا کہ اس روز وہ معمول سے کہیں بڑھ کر ہر شخص کے ساتھ شفقت اور محبت کا ہر تاؤ کر رہی تھی۔ ”تمہاری حرکتیں اتنی احمقانہ ہیں کہ مجھے تم لوگوں کو دیکھ کر شرم محسوس ہونے لگی ہے،“ ویرا نے کہا۔ ”راز، ہونہا۔“

”ہر شخص کے اپنے راز ہوتے ہیں۔ ہم نے تو کبھی تمہارے اور برگ کے معاملات میں دخل نہیں دیا،“ نناشانے ذرا گرم ہو کر کہا۔

”اور میرا خیال ہے کہ تمہیں دینا بھی نہیں چاہیے،“ ویرا نے جواب دیا۔ ”کیونکہ جو کچھ میں کرتی ہوں، اس کا کوئی پہلو مصیوب نہیں ہوتا۔ لیکن بورس کے ساتھ تمہارا جو رویہ ہے، میں اس کے بارے میں اماں کو ضرور بتاؤں گی۔“

”نناشیا الی پچنا میرے ساتھ بہت اچھی طرح پیش آتی ہے،“ بورس نے کہا۔ ”مجھے اس سے کوئی شکایت نہیں۔“

”بورس، تم چپ رہو۔ تم بڑے سفارت کار ہو۔“ (لفظ سفارت کار ان خاص معنوں میں جو اس کے ساتھ وابستہ ہیں، بچوں میں بہت مقبول تھا۔)

”مجھے سخت کوفت ہو رہی ہے،“ نناشانے کہا۔ ”جینی اذیت سے اس کی آواز کپکپا رہی تھی۔“ آخر یہ میرے پیچھے ہی کیوں ہاتھ دھو کر پڑی رہتی ہے۔“ اس کے بعد وہ ویرا کی جانب متوجہ ہوئی اور بولی: ”تم کبھی نہیں سمجھ پاؤ گی کیونکہ تم نے کبھی کسی سے محبت نہیں کی ہے۔ تمہارے سینے میں دل نہیں۔ تم کچھ نہیں ہو، بس مادام ڈگائلی ہو (ویرا کو یہ لقب نکوٹائی نے دیا تھا اور بہت ہنک آمیز سمجھا جاتا تھا۔) ”تمہاری سب سے بڑی راحت یہ ہے کہ دوسروں کی راہ میں روڑے اٹکائے جائیں اور انھیں پریشان کیا جائے۔ جاؤ اور جتنا جی چاہے، برگ کے ساتھ محبت کی جھوٹی چٹائی بچھیں بڑھاؤ،“ اس نے تیزی سے اپنی بات ختم کرتے ہوئے کہا۔

”خیر، میں مہمانوں کی موجودگی میں لڑکوں کا بیچنا نہیں کرتی۔“

”چھوڑو، اس کا مطلب حل ہو گیا ہے،“ نکوٹائی نے دخل انداز ہوتے ہوئے کہا۔ ”یہ ہر شخص کو کڑوی کسلی ت

چکی اور پریشان کر چکی ہے۔ آؤ دوسری چلتے ہیں۔“

چاروں خوف زدہ پرندوں کے جھنڈ کی طرح اٹھے در کمرے سے باہر نکل گئے۔

”کڑوی کیسی باتیں تو مجھے کہی گئی ہیں،“ دیرانے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ ”میں نے کسی سے کڑوی کیسی

بات نہیں کہی۔“

”مادام ڈگانی، مادام ڈگانی!“ دروازے میں تہقہ بار آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔

خوش شکل دیر، ہر شخص کو ہراساں و پریشان کرنے کے بعد مسکرائے لگی۔ اسے جو کچھ کہا گیا تھا، بظاہر اس کا

اس پر کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ وہ آئینے کے سامنے جا کھڑی ہوئی اور اپنے بال اور سکارف درست کرنے لگی۔ معلوم

ہوتا تھا کہ اپنے حسین و جمیل چہرے کو دیکھ کر وہ پہلے سے بھی کہیں زیادہ سرد مہر اور پرسکون ہو گئی ہے۔



اور ڈرائنگ روم میں ابھی گفتگو جاری تھی۔

”آہ، مائی ڈیر،“ کاؤتس نے کہا۔ ”میری زندگی بھی پھولوں کی سیج نہیں ہے۔ آپ کے خیال میں کیا مجھے

یہ نظر نہیں آ رہا کہ اگر ہمارے پچھن اسی طرح جاری رہے، تو ہماری جمع جتنی بہت جلد ٹھکانے لگ جائے گی؟ ایک تو

ہمیں ان کا کلب لے بیٹھا ہے اور اوپر سے ان کی نرم طبیعت اور سخاوتیں۔ جب ہم گاؤں جاتے ہیں، پھر بھی کوئی

سکون نہیں ملتا۔ تھیکر شکار اور خد جانے اور کیا کچھ! خیر، میرا ذکر چھوڑ دو، اب تم بتاؤ کہ تم ان تمام امور سے کیسے

نپٹ لیتی ہو؟ آئیٹ، تمہیں دیکھ کر مجھے اکثر حیرت ہوتی ہے۔ اتنی عمر ہو گئی ہے، پھر بھی تم تنہا گھوڑا گاڑی میں

کبھی ماسکو آرہی ہو اور کبھی پٹریز برگ جا رہی ہو۔ اتنے ڈیر سارے وزیروں اور بار سون لوگوں سے ملتی ہو اور

تمہیں انہیں اپنے انگوٹھے کے نیچے رکھنے کا گر بھی آتا ہے۔ یہ سب باتیں آدمی کو درط حیرت میں ڈال دیتی ہیں۔

یہ بتاؤ، تم یہ سب کچھ کیسے کر لیتی ہو؟ مجھ سے تو شاید کچھ بھی نہ ہو سکے۔“

”آہ، میری پیاری سہیلی!“ آنا میٹا نیلوونا نے جواب دیا۔ ”حدانہ کرے کہ تمہیں زندگی کے کسی بھی مرحلے

پر یہ علم ہو کہ تم بیوہ ہو گئی ہو اور تمہارے ہاتھ پلے بھی کچھ نہیں رہا۔ تمہارا صرف ایک ہی بیٹا ہو، جس سے تم ٹوٹ کر

بیار کرتی ہو اور جسے تم اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز رکھتی ہو۔ جب آدمی ایسی صورت سے دوچار ہوتا ہے، پھر سب

کچھ سمجھ جاتا ہے۔“ اس نے قدرے فخر و افتخار سے اپنی بات جاری رکھی۔ ”مقدمے بازی نے مجھے سب کچھ

سکھا دیا ہے۔ سب جب کبھی مجھے کسی بڑی توپ سے ملاقات کی ضرورت پیش آتی ہے، میں رفتہ تحریر کرتی ہوں:

’پرنس فلاں فلاں مسٹر فلاں فلاں سے ملاقات کی متنی ہے۔‘ پھر میں گاڑی پکڑتی ہوں اور چکر لگانا شروع کر دیتی

ہوں۔ کبھی دو، کبھی تین اور بعض اوقات چار مرتبہ بھی جانا پڑتا ہے تا آنکہ میرا مقصد حل ہو جاتا ہے۔ اور میں اس

بات کی مطلق پروا نہیں کرتی کہ وہ میرے بارے میں کیا سوچتے ہوں گے۔“

”خیر، یہ بتاؤ کہ تم نے یورینکا کے بارے میں کس سے بات کی تھی؟“ کاؤنٹس نے پوچھا۔ ”تمہارا بیٹا، ماشاء اللہ، پہلے ہی گاؤں میں افسر بن چکا ہے جب کہ میرا بیٹا صرف کیڈٹ کی حیثیت سے بھرتی ہو رہا ہے۔ کوئی نہیں جو اس کے لیے اتنی دوزدھوپ کر سکے۔ تم نے کس سے بات کی تھی؟“

”پرنس واسیلی۔ انھوں نے بے حد مہربانی فرمائی۔ وہ فرار سب کچھ کرنے کے لیے تیار ہو گئے۔ انھوں نے سارا معاملہ اسی طرح کے گوش گزار کر دیا۔“ پرنس سینٹا کیلوونا کا جوش و خروش دیدنی تھا۔ وہ یہ بھی بھول گئی کہ اپنا الو سیدھا کرانے کے لیے اسے کتنی ذلت اور خواری اٹھانا پڑی تھی۔

”کیا پرنس واسیلی اب بہت عمر رسیدہ ہو گئے ہیں؟“ کاؤنٹس نے دریافت کیا۔ ”رومانشیویوں نے ایک مرتبہ اپنے ہاں ڈرامہ کرایا تھا۔ اس میں ہم سب نے اداکاری کی تھی۔ تب سے میری ان سے ملاقات نہیں ہوئی۔ میرا خیال ہے کہ وہ مجھے بھول گئے ہوں گے۔ اس زمانے میں تو وہ میرے آگے پیچھے پھرا کرتے تھے۔“ کاؤنٹس بھولی بھری باتیں یاد کر رہی تھی اور مسکرا رہی تھی۔

”وہ بالکل ویسے کے ویسے ہیں؟“ آئنہ سینٹا کیلوونا نے جواب دیا۔ ”ہمیشہ کی طرح دوسروں پر شفقت فرمانے میں پیش پیش۔ اعلیٰ منصب پر فائز ہونے کے باوجود ان کا دماغ خراب نہیں ہوا۔ پرنس، مجھے بے حد افسوس ہے کہ میں آپ کی صرف معمولی سی خدمت کر سکا۔ انھوں نے مجھ سے فرمایا۔ ”آپ جب چاہیں، مجھے حکم دیں، میں حاضر ہوں۔“ اس میں قطعاً کسی شے کی کوئی گنجائش نہیں کہ وہ نہایت نفیس انسان اور قابل اعتبار قربت دار ہیں۔۔۔ نتان، تم جانتی ہو کہ مجھے اپنے بیٹے سے کتنی محبت ہے۔ اس کی خوشی کے لیے میں سب کچھ کرنے کے لیے تیار ہوں۔ لیکن میرے حالات اتنے دگرگوں ہو چکے ہیں،“ آئنہ سینٹا کیلوونا نے اپنی آواز دھیمی کر لی لیکن وہ بولتی گئی۔ ”اتنے دگرگوں، کہ میری حالت بالکل سقیم ہو گئی ہے۔ اس ملعون مقدمے پر میرا سب کچھ اٹھ چکا ہے اور اس میں پیش رفت نام کو بھی نہیں ہوئی۔ کیا تم یقین کر لو گی کہ میرے پاس پھوڑی کوڑی بھی نہیں رہتی۔ ورا ب تو یہ سوچ سوچ کر میرے دماغ کے پرچے اڑ گئے ہیں کہ بورس کی وردی اور دیگر فوجی لوازمات کے لیے رقم کہاں سے آئے گی۔“ اس نے اپنا رومال نکالا اور رونے لگی۔ ”مجھے پانچ سو روپے چاہئیں اور میرے پاس ہے کیا، بچپس روپے کا صرف ایک نوٹ۔۔۔ اب کاؤنٹ کرس ولادی مردیچ بزدل خوف میری واحد امید رہ گئے ہیں۔ اگر انھوں نے اپنے دینی پسر کی۔۔۔ تم جانتی ہو کہ وہ بوریا کے دینی باپ ہیں۔۔۔ مدد کرنے میں رض مندی کا اظہار نہ کیا اور اس کی ضروریات پورا کرنے کے لیے کچھ رقم نڈی، تو میری ساری کوششوں پر پانی پھر جائے گا۔۔۔ مجھ میں قطعاً متاثر بل بوتہ نہیں کہ میں اس کی وردی خرید سکوں اور اس کی دیگر ضروریات پوری کر سکوں۔“

کاؤنٹس اس کتھا سے اتنا متاثر ہوئی کہ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بریز ہو گئیں اور وہ گہرے سوچ بچار میں کھو گئی۔

”میں اکثر سوچتی ہوں،“ پرنس نے کہا۔ ”شاید ایسا کرنا غلط ہے لیکن میں اکثر سوچتی ہوں کہ ایک کاؤنٹ کرل

ولادی مروچ بزدخوف ہیں۔ قارون کے خزانے کے مالک۔۔۔ اور تن تہ۔۔۔ اور وہ زندہ کس کی خاطر ہیں؟ زندگی ن کے لیے بوجھ بن چکی ہے جب کہ بوریا ابھی اپنی زندگی کی شروعات کر رہا ہے۔“

”وہ اپنے تر کے میں بورس کے لیے یقیناً کچھ نہ کچھ چھوڑ جائیں گے،“ کاؤنٹس نے کہا۔

’خدا جانے، Chere amie، یہ دھن دوست والے بڑے خود غرض ہوتے ہیں۔ بہر حال میں بورس کو پکڑتی ہوں اور ابھی اسی وقت ان سے ملنے چلی جاتی ہوں۔ میں انہیں لگی لپٹی رکھے بغیر صاف صاف بتا دوں گی کہ میرے حالات کیسے ہیں۔ میرے بیٹے کا مقدر واؤں پر لگا ہوا ہے۔ ایسے میں لوگ میرے متعلق کیا سوچتے ہیں، مجھے اس کی مطلق پروا نہیں۔“ پرنس اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ ”ابھی روپے ہیں اور تمہارا کھانا چاہیے ہوگا۔ میں وقت پر واپس آ جاؤں گی۔“

اور پیٹرز برگ کی عملی خاتون کی طرح، جو یہ جانتی ہے کہ اپنے وقت کا زیادہ سے زیادہ فائدہ کس طرح اٹھایا جاسکتا ہے، آٹنا میخائیلوونا نے اپنے بیٹے کو بلایا اور اس کو ساتھ لے کر استقبالیہ کمرے کی طرف چل دی۔

”خدا حافظ، مائی ڈارلنگ۔“ اس نے کاؤنٹس سے کہا جو دروازے تک اس کے ساتھ آئی تھی اور سرگوشی کے انداز میں، تاکہ اس کا بیٹا نہ سن سکے، اس سے کہا ”میری کامیابی کی دعا کرتا“

”ma chere، کیا تم واقعی کاؤنٹ کرل ولادی مروچ کے ہاں جا رہی ہو؟“ کاؤنٹ نے ڈائمنڈ روم سے استقبالیہ کمرے میں پہنچ کر پوچھا۔ ”اگر ان کی طبیعت بہتر ہو، پھر بیٹر سے کہیے گا کہ وہ کھانا ہمارے ساتھ کھائے۔ تمہیں معلوم ہے کہ وہ پیسے بھی ہمارے ہاں آیا کرتا تھا۔ اور بچوں کے ساتھ رقص کیا کرتا تھا۔ ma chere، اسے مدعو کرنا نہ بھولنا، ہم نے طاریس باورچی کی خدمات حاصل کی ہیں، آج ہم دیکھیں گے کہ وہ کیا کرتب دکھاتا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ کاؤنٹ اروف نے کبھی کاہے کو ایسی دعوت کی ہوگی جیسی کہ ہم کر رہے ہیں۔“

12

”mon cher بورس،“ پرنس آٹنا میخائیلوونا نے اپنے بیٹے کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ان کی گاڑی، جس میں وہ سوار تھے، بھوسی سے ڈھکی سڑک پر گزرتی کاؤنٹ کرل ولادی مروچ کے محل نما مکان کے وسیع و عریض احاطے میں داخل ہو چکی تھی۔ ”mon cher بورس،“ اس نے اپنے بوسیدہ کوٹ میں سے اپنا ہاتھ نکالتے اور اسے جھینپتے، جھپکتے، پیار سے اپنے بیٹے کے بازو پر رکھتے ہوئے کہا۔ ”ان کے ساتھ ادب سے پیش آنا اور ان کی باتیں توجہ سے سننا۔ کاؤنٹ کرل ولادی مروچ بہر حال تمہارے دینی باپ ہیں اور تمہارے مستقبل کا انحصار سراسر ان پر ہے۔ mon cher، تم دوسروں کے دل موہنا جانتے ہو۔ بس ان کے ساتھ بھی یہ ہی برتاؤ کرنا کہ وہ تمہارے گرویدہ ہو جائیں۔“

”اگر اس کا نتیجہ ہماری تہلیل کی صورت میں نہیں، بلکہ کسی اور انداز میں برآمد ہوا، تبھی میں صحیح معنوں میں آپ کے حکم کی تعمیل کر سکوں گا،“ اس کے بیٹے نے سرد مہری سے جواب دیا۔ ”بہر حال، میں آپ سے وعدہ کر چکا ہوں، میں اپنی طرف سے کوئی دقیقہ فرد گزاشت نہیں کروں گا۔ آپ خاطر جمع رکھیں۔“

اگرچہ استقبالیہ کمرے میں تعینات دربان یہ دیکھ چکا تھا کہ کسی کی گاڑی دروازے پر کھڑی ہے، اس نے ماں اور بیٹے (ان دونوں نے کسی سے یہ نہیں کہا تھا کہ وہ ان کی آمد کی اندر اطلاع کر دے، بلکہ وہ خود ہی بلوری غلام گردش میں سے، جس کی دونوں اطراف طاقتوں میں جیسے سجے ہوئے تھے، گزرتے استقبالیہ کمرے میں داخل ہو گئے تھے) کا بغور جائزہ لیتے اور خاتون کے بوسیدہ کوٹ کو گھورتے ہوئے پوچھا: ”آپ محترم کاؤنٹ سے ملنے تشریف لائے ہیں یا محترمہ پرنس سے؟“ اور جب اسے معلوم ہوا کہ وہ کاؤنٹ سے ملاقات کرنے کے ارادے سے آئے ہیں، اس نے کہا: ”ہر ایکسی لینسی کی طبیعت آج بہت زیادہ خراب ہو چکی ہے اور وہ کسی بھی مہمان سے نہیں مل سکتے۔“

”بہتر ہے کہ ہم واپس چلے چلیں،“ بیٹے نے فراہمی میں کہا۔

”mon cher“، ماں نے منت سماجت کے انداز میں کہا اور اس نے ایک بار پھر اپنا ہاتھ اس کے بار پر رکھ دیا گویا یہ کوئی جادو کی چھتری تھی جس کے چھوتے ہی اس کا پارہ نیچے آ جائے گا اور اس کے اندر نیا ولولہ بیدار ہو جائے گا۔

بورس نے لب کشائی سے احتراز کیا تاہم اپنا اور کوٹ اتارے بغیر وہ استقبالیہ انداز سے اپنی ماں کی جانب دیکھے لگا۔

”میرے محترم،“ ٹائیٹانیا کیلودن نے استقبالیہ میں تعینات دربان کی چابوسی کرتے ہوئے کہا، ”مجھے معلوم ہے کہ کاؤنٹ کرل ولادی مروج کی حالت خاصی خراب ہے۔ اسی لیے میں حاضر ہوئی ہوں۔ میں ان کی عزیز ہوں۔ محترم، میں انھیں پریشان نہیں کروں گی۔ مجھے صرف پرنس واسیلی سرگیچ ج سے ملنا ہے۔ میرا خیال ہے کہ وہ یہیں مقیم ہیں۔ بس اتنی مہربانی کر دو کہ انھیں میری آمد کے بارے میں اطلاع دے دو۔“

دربان نے بڑی بیزارگی سے گھنٹی کی ری کھینچی۔ گھنٹی وپر کی منزل پر بھی۔ دربان نے اپنا دھیان دوسری طرف کر لیا۔

”پرنس دروہیسکا یا پرنس واسیلی سرگیچ ج سے ملنے تشریف لائی ہیں،“ اس نے ایک دردی پوش ملازم کو، جو بڑا، چلی ایزی کے جوتے اور مارنگ کوٹ پہنے ہوئے تھے اور جو دو ٹوٹا دو ٹوٹا میٹرھیوں کے اوپر سے سرخے پر پہنچا تھا اور نیچے جھانک رہا تھا، پکار کر بتایا۔

ماں نے اپنے ریشمی ڈریس کی، جس پر یارنگ چڑھا یا گیا تھا، ٹخنیں درست کیں، استقبالیہ کمرے میں ساختہ وینس قد آدم دیواری آئینے کے سامنے اپنے صیغے پر نظر ڈالی اور اپنے چلی ایزی کے جوتوں میں تیز قدم اٹھاتی، میڑھیوں پر، جن پر قالین بچھے ہوئے تھے، چڑھنے لگی۔

”mon cher“ اپنا دُعا دہ یاد رکھنا، اس نے اپنے بیٹے کے بازو پر ایک بار پھر چھکی دے کر اس کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے کہا۔

بیٹا سرد مہر انداز سے ماں کے پیچھے چل پڑا۔ اس کی نگاہیں جھکی ہوئی تھیں۔ وہ خاصے بڑے کمرے میں داخل ہوئے۔ اس کا ایک دروازہ اس اپارٹمنٹ میں کھلتا تھا جس پر پرنس واسیلی قابض تھا جب ماں میٹا ہاں کمرے کے درمیان میں پہنچے اور ایک مستردی پوش ملازم سے، جون کی آمد پر اچھل کر کھڑا ہو گیا تھا، راستہ دریافت کرنے کا ارادہ کر رہے تھے، ایک دروازے کی کانسی کی چٹختی گھوٹی اور پرنس واسیلی، مخمیں کوٹ، جن پر صرف ایک ستارہ آویزاں تھا (اس کی عادت تھی کہ وہ گھر میں اسی قسم کا بس پہنتا تھا)، ریب تر کیے، ایک خوش شکل شخص کی، جس کے سر کے بال سیاہ تھے، معیت میں باہر آیا۔ یہ شخص پیٹرز برگ کا نامی گرامی معائنہ لوٹیں تھا۔

”بھریہ بات یقینی ہے؟“ پرنس پوچھ رہا تھا۔
 ”محترم پرنس، غلطی بشری تھا خا ہے۔ کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ اس سے کبھی کوئی غلطی سرزد نہیں ہوئی۔ لیکن...“ ڈاکٹر نے جواب دیا۔ وہ حرف رکھتے آواز میں ادا کر رہا تھا اور ملٹنی، لفظ فرانسیزی لہجے میں اڑھکارہ تھا۔
 ”ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔“

استے میں پرنس واسیلی کی نظر آنا میخانیلوونا اور اس کے بیٹے پر پڑی۔ اس نے سر کی جنبش سے ڈاکٹر کی چھٹی کردی اور خود ان کی جانب بڑھا۔ اس کے چہرے پر سوایہ نشان تھا۔ بیٹے نے دیکھا کہ اس کی ماں کی نگاہوں میں اچانک حزن و ملالی آگیا ہے۔ وہ قدرے مسکرایا۔

”اف، پرنس، ہماری دوبارہ ملاقات کن انوس ناک حالات میں ہو رہی ہے۔ ہمارے محترم عزیز کی اب نصیب دشمنان، طبیعت کیسی ہے؟“ اس نے یوں پوچھا جیسے اسے ان نگاہوں کا، جن سے سرد مہری اور توہین ٹپک رہی تھی اور جو سے گھور گھور کر دیکھ رہی تھیں، کوئی علم ہی نہ ہو۔

پرنس واسیلی نے پہلے اسے گھور کر دیکھا اور پھر کچھ اس قسم کی استفسار سے نظریں بوریں کے چہرے پر جمائیں جیسے اسے سمجھ میں نہ آ رہا ہو کہ یہ کون شخص ہے اور کیوں آیا ہے۔ بوریں نے شائستگی سے جھک کر سلام کیا۔ پرنس واسیلی نے اس سلام کا کوئی جواب نہ دیا۔ وہ ”نا میخانیلوونا کی جانب متوجہ ہوا، اپنے سر اور بوریں کو جنبش دی اور اشارہ کیا کہ بریض کے بچنے کی کم ہی امید رہ گئی ہے۔“

”واقعی؟“ آنا میخانیلوونا نے واویلا کیا۔ ”کتنی بھیا تک خبر ہے! سوچ کر دل دہل جاتا ہے۔ یہ میرا بیٹا ہے،“ اس نے بوریں کا تعارف کراتے ہوئے کہا۔ ”یہ ذاتی طور پر آپ کا شکر یہ ادا کرنا چاہتا تھا۔“

بوریں نے دوبارہ جھک کر شائستگی سے سلام کیا۔
 ”پرنس، یقین کریں کہ آپ نے ہمارے لیے جو کچھ کیا ہے، ماں کی حیثیت سے میں اسے کبھی فراموش نہیں

کر سکوں گی۔“

”مائی ڈیر آئنا میخانیاوونا، مجھے خوشی ہے کہ میں آپ کے لیے کچھ کر سکا،“ پرنس وائیلی نے اپنی قمیص کے بٹنوں کے اوپر جھالدر درست کرتے ہوئے کہا۔ وہ آئنا میخانیاوونا کے سامنے، جو اس کی زیر بار احسان تھی، جس لہجے اور انداز سے بات کر رہا تھا، اس سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ وہ آئنا پادلوونا کی محفل شب کی نسبت یہاں ماسکومس پہنے آپ کو کہیں زیادہ اہم بنا کر پیش کر رہا ہے۔

”ملازمت کے دوران میں اپنے فرائض احسن طریقے سے نبھانے اور اپنے آپ کو اپنے عہدے کا اہل ثابت کرنے کی پوری کوشش کرو،“ اس نے بورس کے ساتھ سخت ہوجہ اختیار کرتے ہوئے کہا۔ ”میں خوش ہوں... یہاں چھٹی پر آئے ہو؟“ اس نے حسب عادت سپاٹ لہجے میں دریافت کیا۔

”یوٹرا کیسی لینسی، میں نئی رجسٹر میں اپنی تقرری کے احکام کا انتظار کر رہا ہوں،“ بورس نے جواب دیا۔ اس کے لہجے سے نہ تو یہ مترشح ہو رہا تھا کہ سے پرنس کے کڑوے کیلے انداز گفتگو سے کوئی رنج پہنچا ہے اور نہ یہ ظاہر ہوتا تھا کہ وہ گفتگو مزید آگے بڑھانے کا متمنی ہے، بلکہ وہ اتنے تحمل، بردباری اور احترام سے بات کر رہا تھا کہ پرنس اسے ٹوٹنے پر مجبور ہو گیا۔

”تم اپنی داندہ کے ہاں قیام پذیر ہو؟“

”میں کاؤنٹس رستووا کے ہاں ٹھہرا ہوا ہوں۔“ اور اس کے ساتھ اس نے دوبارہ ”یوٹرا کیسی لینسی“ کا اضافہ کر دیا۔ ”یہ وی الیا رستوف ہیں جنہوں نے سالی ٹن ٹن سے شادی کی تھی،“ آئنا میخانیاوونا نے کہا۔ ”مجھے معلوم ہے، مجھے معلوم ہے،“ پرنس وائیلی نے حسب معمول یک سرے لہجے میں کہا۔ ”میں یہ کبھی نہیں سمجھ سکا کہ شمالی نے اس ناپختہ اور ناکندہ تراش پلے کے ساتھ شادی کرنے کا فیصلہ کیسے کر لیا،“ اس نے فرانسیسی میں اضافہ کرتے ہوئے کہا۔ ”وہ تو بالکل ہی احتیاج اور فضول آدمی ہے اور اس پر طرہ یہ کہ لوگوں کے بقول جواری بھی ہے۔“ ”لیکن، mon prince، وہ بہت شفیق انسان ہیں!“ آئنا میخانیاوونا نے رقت انگیز مسکراہٹ سے کہا۔ اس کا یہ انداز چٹلی کھا رہا تھا کہ اس کی رائے میں کاؤنٹ رستوف کی جو بھداڑا لگی گئی ہے، اس کا وہ پوری طرح مستحق ضرور ہے لیکن بہر حال اس کی یہ التجا ہے کہ پرنس کو مسر کاؤنٹ کے بارے میں اتنا سخت رویہ نہیں اختیار کرنا چاہیے۔ ”ڈاکٹر کیا کہتے ہیں؟“ اس نے کچھ توقف کے بعد دریافت کیا۔ اس کے متفکر چہرے پر دوبارہ رنج و غم کے بادل چھا گئے۔

”کوئی خاص امید نہیں رہ گئی،“ پرنس نے جواب دیا۔

”انگل نے مجھ پر اور بوریا پر جو عنایات اور نوازشات فرمائی ہیں، میری شدید خواہش تھی کہ میں ان کے بارے میں ایک بار پھر ان کا شکریہ ادا کر سکتی۔ بورس ان کا دینی بیٹا ہے۔“ اس نے یہ آخری جملہ کچھ اس انداز سے

کہا کہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ یہ توقع کر رہی ہے کہ اس اطلاع کے ملتے ہی پرنس کی باچھیں کھل جائیں گی۔

پرنس واسلی کی بھویں سکڑ گئیں اور وہ سوچ چار میں غرق ہو گیا۔ آتنا میخائیلوونا تاڑ گئی کہ اسے یہ اندیشہ لاحق ہو گیا ہے کہ کاؤنٹ بزخوف کی دراشت میں وہ اس کی حریف ہے۔ چنانچہ وہ باچھیں اسے اطمینان دلانے لگی۔

”اگر مجھے انگل کے ساتھ جی محبت اور لگاؤت ہوتا“ اس نے لفظ ”انگل“ بڑے یقین اور بے اعتنائی سے ادا کیا۔ ”میں ان کے کردار سے خوب آگاہ ہوں۔ وہ شریف، عالی منش اور راست باز ہیں۔ لیکن آپ جانتے ہیں کہ ان کے پاس پرنسوں کے علاوہ ور کوئی نہیں اور یہ پرنسیں بھی اتنی نامور اور ناتجربہ کار ہیں۔“ اس نے اپنا سر جھکا لیا اور زیر لب بولی: ”پرنس، کیا انھوں (بزخوف) نے اپنے آخری فرائض ادا کر دیے ہیں؟ یہ آخری لمحات بہت قیمتی ہیں۔ اگر کوئی شخص ن سے یہ آخری فرائض نبھانے کے لیے ان کے پاس چھا جائے، تو ان کی جو حالت ہے، اس سے بدتر نہیں ہوگی۔ اور اگر وہ واقعی شدید بیمار ہیں، پھر انھیں (آنے والے وقت کے لیے) تیار کرانا ہوگا۔ پرنس، ہم عورتوں کو“ اور وہ شیریں انداز سے مسکرائی ”ہمیشہ علم ہوتا ہے کہ ان مواقع پر کیا کہوانا ہے اور کیا نہیں کہوانا۔ مجھے لازماً ان کے پاس جانا ہوگا۔ اس بات سے قطع نظر کہ ایسا کرنے سے مجھے کتنی تکلیف، کتنا دکھ برداشت کرنا ہوگا... لیکن میں دکھ بھیلنے اور مصائب برداشت کرنے کی عادی ہو چکی ہوں۔“

بظاہر یہی معلوم ہوتا تھا کہ پرنس واسلی اچھی طرح سمجھ گیا ہے جیسا کہ آنا شیریر کے ہاں یہ بات اس کے ذہن نشین ہو گئی تھی کہ آتنا میخائیلوونا سے اتنی آسانی سے جان نہیں چھرائی جاسکے گی۔

”ہائی ڈیڑ آتنا میخائیلوونا، اس قسم کی ملاقات ان پر بھاری بوجھ نہیں بنے گی؟“ اس نے پوچھا۔ ”ہمیں شام تک انتظار کر لینا چاہیے۔ ڈاکٹروں کا خیال ہے کہ ان کی حالت مازک سے مازک تر ہوتی جا رہی ہے۔“

”لیکن پرنس، ایسے موقع پر تاخیر کرنا ناممکن ہے۔ ذرا سوچیں، ان کی نجات داؤں پر لگی ہوئی ہے۔ بڑی بھیانک صورت حال ہے! عیسائیت کے پیروکار کے فرائض...“

اندرونی کمروں کا دروازہ کھلا اور ایک پرنس، جو رشتے کے اعتبار سے کاؤنٹ کی بھانجی تھی، ہال کمرے میں آئی۔ اس کے چہرے پر سرد مہری اور بے مروتی نمایاں تھی۔ اس کی لابی کمر کی اس کی ٹانگوں کی جسامت سے قطعاً کوئی مناسبت نہیں تھی۔

پرنس واسلی اس کی جانب متوجہ ہوا۔

”اب ان کی طبیعت کیسی ہے؟“

”بالکل جوں کی توں۔ اس غل غپ ڈسے میں آپ اور کس بات کی توقع کر سکتے ہیں۔“ اس نے پرنس آتنا میخائیلوونا کی جانب یوں دیکھا جیسے وہ کوئی پرانی خاتون ہو۔

’انما chore‘ میں تو آپ کو پہچان ہی نہ سکی،“ اس نے سر سے مسکراتے اور کاؤنٹ کی بھانجی کی طرف تقریباً بھاگتے ہوئے کہا۔ ”میں آپ کو اپنی خدمات پیش کرنے اور انگل کی تیمارداری میں آپ کا ہاتھ

بٹانے آئی ہوں۔ آپ کو جو کچھ کہیں برداشت کرنا پڑی ہیں، مجھے ان کا خوب اندازہ ہے،“ اس نے اپنی آنکھوں کی پتلیاں گھماتے ہوئے ہمدردانہ انداز میں کہا۔

پرنس نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس سے اتنا بھی نہ ہوا کہ ذرا سی مسکراہی دیتی بلکہ وہ پھرتی سے ہر نکل گئی۔ آٹنا میخ کیلودنا نے میدان مار لیا تھا۔ اس نے اپنے دستاں اتارے اور آرام کرسی پر جم کر بیٹھ گئی۔ پھر اس نے پرنس واسیلی کو دعوت دی کہ وہ بھی اس کے قریب بیٹھ جائے۔

”بورس،“ اس نے اپنے بٹے سے مسکرتے ہوئے کہا۔ ”میں اپنے انگل، کاؤنٹ، سے ملنے جا رہی ہوں۔ میری جان، تم یوں کہہ کہ بیٹر کے پاس چلے جاؤ اور ہاں، رستوں کی طرف سے اسے مدعو کرنا نہ بھولنا۔ انھوں نے اسے کھانے پر بلایا ہے،“ اس نے پرنس سے مخاطب ہو کر کہا۔ ”میرا خیال ہے کہ شاید اس کا چاٹنا ممکن نہ ہو۔“

”اس کے برعکس،“ پرنس نے جھل کر جواب دیا۔ ”اگر تم اس نوجوان سے میرا پیٹہ چھڑا سکو، مجھے قلبی مسرت ہوگی۔ وہ یہاں سے ملنے کا نام تک نہیں لیتا اور ادھر کاؤنٹ نے اس سے ایک دفعہ بھی ملے کو نہیں کہا۔“ اور پرنس اپنے کندھے اچکانے لگا۔

ایک باوردی خدمت گار بورس کو نیچے لے گیا۔ وہاں سے وہ میز صیباں چڑھتے پیوٹر کرلووچ کے کمرے میں چلے گئے۔

13

پیٹرز برگ میں پیر اپنے لیے کوئی ملازمت منتخب کرنے میں ہی ناکام نہیں رہا تھا، ستم بالائے ستم، اسے واقعی ہنگامہ آرائی کے الزام میں شہر بدر کر دیا گیا اور واپس، اسکو بھیج دیا گیا تھا۔ کاؤنٹس رستووا کے ہاں اس کے متعلق جو کہانی بیان کی گئی تھی، وہ سولہ آنے درست تھی۔ پیٹر پولیس مین کو پچھ کی پشت پر باندھنے کے فعل میں برابر کا شریک تھا۔ وہ گزشتہ کئی دنوں سے، اسکو میں تھا اور حسب معمول اپنے باپ کے گھر میں مقیم تھا۔ اگرچہ اس نے یہ مفروضہ بنا لیا تھا کہ اس کی داستان ازاں پیٹستر ہی، اسکو کے ہر کہہ دہ کی زبان پر چکی ہوگی اور ان خواتین نے۔ جنھوں نے اس کے باپ کو اپنے نرغے میں لے رکھا تھا اور جو کبھی بھیلے وقتوں میں بھی اس کی حمایت پر ہاں نہیں ہوتی تھیں۔ اس سنہری موقع سے، زمانہ فائدہ اٹھا یا ہوگا اور کاؤنٹ کو اس کے خلاف بھڑکایا ہوگا، پھر بھی وہ جس روز اسکو پہنچا، سیدھا مکان کے اس حصے کی طرف، جہاں اس کا باپ رہا کرتا تھا، چلا گیا۔

جب وہ ڈرائنگ روم میں، جہاں عام طور پر پرنسوں کا قبضہ رہتا تھا، داخل ہوا، اس نے خواتین کو آداب کہا۔ ان میں سے دو اپنے بچے کشیدہ کاری کے فریم لیے بیٹھی تھیں اور تیسری با آواز بلند کتاب پڑھ رہی تھی۔ کتاب سب سے بڑی پڑھ رہی تھی۔ وہ انتہائی صاف ستھرے اور بے داغ لباس میں ملبوس تھی۔ اس کی کمر لہمی تھی اور اس کے چہرے پر درشتی جھلک رہی تھی۔ یہ وہی دو شیزہ تھی جس کی آٹنا میخ کیلودنا سے ملاقات ہوئی تھی۔

جہاں تک اس سے چھوٹی دونوں دوشیزوں کا تعلق تھا، وہ دونوں ہی قبول صورت تھیں اور ان کی رنگت سرخ و سپید تھی۔ ان کے مابین فرق صرف یہ تھا کہ ایک کے ہونٹ پر تل تھا جس نے اس کے حسن میں مزید اضافہ کر دیا تھا۔ وہ دونوں کڑھائی میں مصروف تھیں۔ بیٹر کا استقبال یوں کیا گیا جیسے وہ کوئی بھوت پرست ہو یا جدام کا مریض۔ بڑی پرنس پڑھتے پڑھتے رک گئی۔ اس کی مٹی گم ہو گئی اور وہ اسے گھور گھور کر دیکھنے لگی۔ دوسری کا رویہ بھی اپنی بہن جیسا تھا۔ لیکن جہاں تک تیسری کا تعلق ہے، وہ جس کے ہونٹ پر تل تھا، بے اعتبار مزاج خوش باش اور مسخرگی کی دلدہ تھی۔ وہ اپنے کشیدہ کاری کے فریم پر جھک گئی۔ لاریب وہ اپنا تبسم چھپانے کی نگہ دور کر رہی تھی کیونکہ اس نے یہ بھانپ لیا تھا کہ بڑا پر تفنن منظر دیکھنے کو ملے گا۔ اس سے اپنی فہمی چھپائے نہیں چھپتی تھی۔ چنانچہ وہ نیچے جھکی، فریم میں سے اون نکالی اور یوں ظاہر کرنے لگی جیسے وہ نمونے کا بخور جائزہ لینے کی کوشش کر رہی ہو۔

”Bon jour, ma cousine,” بیٹر نے کہا ”آپ لوگوں نے مجھے پہچانا نہیں؟“

”میں تمہیں خوب اچھی طرح، بلکہ ضرورت سے زیادہ اچھی طرح، پہچانتی ہوں۔“

”کاؤنٹ کی طبیعت کیسی ہے؟ کیا ان سے ملاقات ہو سکتی ہے؟“ بیٹر نے حسب معمول بے ہنگم انداز سے پوچھا لیکن وہ شرمایا مطلق نہیں۔

”کاؤنٹ جسٹس اور دہنی، دونوں اقسام کے عوارض میں مبتلا ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ تم نے ان کے دہنی عوارض میں اضافہ کرنے میں کوئی کسر روا نہیں رکھی۔“

”کاؤنٹ سے میری ملاقات ہو سکتی ہے؟“ بیٹر نے اپنا سوال دہرایا۔

”ہونہہ.. اگر تمہارا انھیں ہلاک کرنے، انھیں سیدھے موت کے گھاٹ اتارنے کا ارادہ ہے، پھر ان سے ملاقات کر سکتے ہو۔ اولگاہ جاؤ، وردیکھ کر آؤ کہ ان کا سوپ تیار ہوا یا نہیں۔ ان کے کھانا تناول فرمانے کا وقت ہوا چاہتا ہے،“ اس نے حریص کہا۔ اس قسم کی باتوں سے وہ دراصل بیٹر کو یہ تاثر دینا چاہتی تھی کہ وہ مصروف ہیں اور مصروف بھی اس کے باپ کی تکالیف کم کرنے میں۔ ایک وہ ہے جو اسے محض پریشان کرنے پر تلا ہوا ہے۔

اولگاہا ہرجلی گئی۔ بیٹر کچھ دیر کھڑا اور اپنی بہنوں کو دیکھتا رہا۔ پھر وہ جھکا اور بولا

”میں اپنے کمرے میں جا رہا ہوں۔ مجھے بتا دینا کہ میں ان سے کب ملاقات کر سکتا ہوں۔“

وہ باہر نکل گیا۔ اس کے پیچھے پیچھے اس کی اس بہن کی، جس کے ہونٹ پر تل تھا، دلی دلی لیکن کھٹکھٹاتی ہنسی کی آواز آرہی تھی۔

اسکے روز پرنس واسیلی پہنچ گیا اور اس نے کاؤنٹ کے گھر میں ڈیراجہ لیا۔ اس نے بیٹر کو بلایا اور کہا: ”عزیزم، اگر یہاں بھی تمہارا وہی رویہ رہا جو بیٹرڈ برگ میں تھا، تو تمہارا انجام قطعی خوش کن نہیں ہوگا۔“

مجھے تم سے بس یہی کہنا تھا۔ کاؤنٹ سخت بیمار ہیں۔ تمہارا اس سے ملاقات کرنا قطعی ناممکن ہے۔“

سو وہ دن اور یہ دن، میٹر کو کسی نے نہیں چھیڑا تھا۔ وہ اپنا وقت اوپر اپنے کمرے میں گزارد رہا تھا۔

جب بورس اس کے دروازے پر پہنچا، وہ اپنے کمرے میں چکر لگا رہا تھا۔ کبھی کبھار وہ کسی کوٹے میں رک جاتا اور تنہا آئینہ انداز سے جانب و نوار بازو دہرانے لگتا جیسے وہ کسی نادیدہ دشمن کے سینے میں شمشیر گھونپ رہا ہو۔ وہ جھٹکے کے اوپر سے شعلہ باز لگا ہوں سے گھورتا اور دوبارہ کمرے کے چکر کاٹنے میں مصروف ہو جاتا۔ اس اثنا کے دوران میں وہ مسلسل اپنے کندھے اچکا تا، بازو دہراتا اور منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑاتا جاتا۔

”انگلستان کا بیڑا غرق ہو گیا،“ اس نے غراتے اور اپنی انگلی کسی نادیدہ شے کی جانب کھماتے ہوئے کہا۔
 ”ہٹ کو، جس نے اپنے وطن سے بھی غداری کی ہے اور اقوام کے حقوق سے بھی، اپنے کیے کی سزا مل کر رہے گی۔“
 لیکن بیشتر اس کے کہ میٹر، جو اس وقت اپنے آپ کو نیولین تصور کر رہا تھا اور جس نے ابھی ابھی خیالوں ہی خیالوں میں رودبار انگلستان کو عبور کرنے کا خطرناک مرحلہ ہی طے نہیں کر لیا تھا بلکہ لندن کو بھی تسخیر کر لیا تھا، ہٹ کو اپنے کیے کی سزا سناتا، اس نے ایک خوش شکل و متناسب الاعضا، نو جوان انسان کو کمرے میں داخل ہوتے دیکھا۔
 میٹر کے قدم رک گئے۔ دونوں کی آخری ملاقات تب ہوئی تھی جب بورس ابھی چودہ سال کا طفل نوخیز تھا۔ اگرچہ میٹر کو بالکل یاد نہیں آ رہا تھا کہ نووارد کون ہے، اس نے پھر بھی اپنی عادت کے موافق فی البدیہہ اور نفس تکھ طریقے سے اس کا خیر مقدم کیا۔ وہ دوستانہ انداز سے مسکرایا اور اس سے ہاتھ ملا دیا۔

”آپ نے مجھے پہچانا؟“ بورس نے خوشگوار انداز سے مسکراتے لیکن کسی قسم کی گرم جوشی کا مظاہرہ کیے بغیر پوچھا۔
 ”میں اپنی اماں کے ساتھ کاؤنٹ سے ملنے آیا تھا لیکن معلوم ہوتا ہے کہ ان کی طبیعت بالکل ٹھیک نہیں ہے۔“
 ”جی ہاں۔ آثار سے کچھ بھی نظر آتا ہے۔ اور لوگ ہیں کہ انھیں ایک منٹ آرام نہیں کرنے دیتے، میٹر نے جو ب دیا۔“ یا اللہ یہ کون شخص ہے؟ اسے مطلق یاد نہیں آ رہا تھا۔

بورس بھانپ گیا کہ میٹر اسے پہچان نہیں سکا۔ تاہم اس نے اپنا تعارف کرانا تصحیح اوقات تصور کیا۔ وہ قطعاً گھبرائے شرمائے بغیر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پورے استہساک سے اسے دیکھنے لگا۔

”کاؤنٹ رستوف نے آج شام آپ کو کھانا تناول کرنے کی دعوت دی ہے،“ اس نے خاصے طویل وقفے کے بعد، جس کے دوران میں میٹر بڑی بے چینی محسوس کرتا رہا، کہا۔

”اور کاؤنٹ رستوف؟“ میٹر نے فوراً سر سے مظلوم ہو کر کہا۔ ”پھر تم ان کے صاحب زادے الیا ہو گے؟“
 میں بھی کتنا احمق ہوں کہ تمہیں ایک نظر پہچان ہی نہ سکا۔ تمہیں یاد ہے۔ بہت پرانی بات ہے۔ کہ ہم سیریاٹا کرنے مادام یا کووا کے ہمراہ کھشکوں کی پہاڑی پر گئے تھے۔“

”آپ غلط فہمی کا شکار ہو رہے ہیں،“ بورس نے جان بوجھ کر گردن اکڑا کر اور قدرے پر تحقیر انداز سے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”میں بورس ہوں۔ آنا یسٹا کیوونا درو جیسکا یا کا بیٹا۔ لیا سینٹر کاؤنٹ رستوف کا اسم گرامی

ہے۔ ان کے صاحب زادے کا نام نکولائی ہے۔ درمیں کسی دام یا کووا کو کو نہیں جانتا۔“
 میٹر نے اپنے سر کو جنبش دی اور پنے، ردیوں گھمانے پھرانے لگا جیسے شہد کی مکھیوں یا پتھروں نے اس پر
 پلخہ کر دی ہو۔

”ارے، میں کیا سوچ رہا ہوں۔ میں نے ہر چیز گڈمڈ کر دی ہے! ماسکو میں اتنے عزیز واقارب ہیں کہ گنا
 نامکن اتم بورس ہو۔ ہاں، اب معلوم ہو کہ ہم کہاں ہیں۔ خیر تمہارا بولاں³⁴ ہم کے بارے میں کیا خیال ہے؟
 میرے خیال کے مطابق یہ سراسر قابل غم ہے بشرطیکہ ویلنیو³⁵ سے کوئی حماقت سرزد نہ ہو جائے۔“
 بورس کے فرشتوں کو بھی خبر نہیں تھی کہ بولاں ہم کسی چیز یا کام ہے۔ اس نے کبھی اخبارات کو ہاتھ نہیں لگایا
 تھا۔ اور وہاں ویلنیو، اس کا نام وہ پہلی مرتبہ سن رہا تھا۔

”یہاں ماسکو میں ہم سیاست کی بجائے ڈنر پارٹیوں اور چھوٹی چچی فوہوں کا زیادہ متقرب کرتے ہیں۔“
 اس نے اپنے پرسکون استہزائی انداز سے کہا۔ ”اس ہم کے بارے میں نہ میں کچھ جانتا ہوں اور نہ میں نے اس
 کے بارے میں کبھی سوچا ہے۔ ماسکو کے باشندے زیادہ تر گپ شپ میں مصروف رہتے ہیں۔“ اس نے اچنی بات
 جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”نی حال ان کی گفتگو کے موضوعات آپ اور کاؤنٹ ہیں۔“

میٹر حسب معمول نیک طبیعتی سے مسکرا دیا گویا اسے اس چیز کا اندیشہ لاحق ہو کہ کہیں اس کے رفیق کے منہ
 سے کوئی ایسی بات نہ نکل جائے جس پر اسے بعد میں پشیمانی ہو۔ لیکن بورس جو بات کہہ رہا تھا، ڈکے کی چوٹ کہہ
 رہا تھا۔ اس کا لہجہ اگرچہ خشک تھا لیکن اس کا ایک ایک لفظ صاف سمجھ میں آ رہا تھا اور وہ کسی قسم کے ہیر پھیر سے کام
 نہیں لے رہا تھا۔ اس کی نگاہیں میٹر کی نگاہوں میں پست نہیں۔

”ماسکو میں لوگوں کو گیس ہانکنے اور افواہیں اڑانے کے علاوہ اور کام نہیں۔“ وہ بولنا چلا گیا۔ ”ہر شخص یہ سوچ سوچ
 کر پاگل ہوا جا رہا ہے کہ کاؤنٹ اپنے قارڈن کے خزانے کا والی وارث کسے بنا جائیں گے، حالانکہ یہ بھی ہو سکتا
 ہے کہ وہ ہم سب سے زیادہ عمر پائیں اور میں پورے خلوص سے یہ امید کرتا ہوں کہ وہ تادور بندہ رہیں گے۔“
 ”لیکن یہ ردیہ قابل افسوس ہے،“ میٹر نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ”واقلاً قابل افسوس۔“

میٹر کو مسلسل یہ خوف کھائے جا رہا تھا کہ اس نو جوان افسر نے نادانستہ اس قسم کی جو گفتگو شروع کر دی ہے،
 کہیں یہ نہ ہو کہ یہ بعد میں اس کے لیے شرمساری اور خجالت کا باعث بن جائے۔

”اور یہ بات تو آپ کو بھی معلوم ہو ہی گئی ہوگی،“ بورس نے تدریجاً تمنا کرتے ہوئے کہا۔ ”پنے لہجہ یا انداز میں کسی
 قسم کی تبدیلی لائے بغیر کہا۔“ اور یہ بات آپ نے بھی محسوس کر لی ہوگی کہ ہر شخص اس دولت مند آدمی سے کچھ نہ
 کچھ ہتھیانے کی فکر میں لگا ہوا ہے۔“

”لگتا تو ایسا ہی ہے،“ میٹر نے سوچا۔

”میں آپ کو صرف یہی بتانا چاہتا تھا تاکہ کسی غلط فہمی کی صحجائش نہ رہے کہ اگر آپ نے مجھے اور میری ماں کو

بھی اس زمرے میں شمار کیا، تو یہ آپ کی بڑی بھوس ہوگی۔ ہم مفلس ضرور ہیں لیکن جہاں تک میرا تعلق ہے، محض اس لیے کہ آپ کے والد ماجد بے حد متحمل ہیں، میں انھیں اپنا قرابت دار تسلیم نہیں کرتا۔ اور چتے چلتے یہ بھی عرض کیے دیتا ہوں کہ نہ میں اور نہ میری ماں کبھی ان کے سامنے گڑ گڑائیں گے یا ان سے کچھ دھوکے کریں گے۔“

بورس جو کچھ کہہ رہا تھا، خاصی دیر تک وہ بیٹر کی سمجھ میں نہ آیا لیکن جب بات اس کے پلے پڑ گئی، اس نے صوفے سے جست لگائی، اضطرابی اور بے ہنگم انداز سے بورس کی کھائی پکڑی اور اس سے زیادہ شرماتے اور تھمتھمتے ہوئے، ایک ایسے جذبے کے ساتھ جس میں خفت اور جھٹاہٹ کی آمیزش تھی، بولنے لگا

”ہونہ، عجیب بات کر رہے ہو! تمہارا خیال ہے کہ میں۔۔ لیکن کوئی شخص ایسا سوچ بھی کیسے سکتا ہے۔ میں خوب جانتا ہوں۔“

بورس نے دوبارہ اس کی بات کاٹ دی۔

”مجھے خوشی ہے کہ میں نے سب کچھ صاف بیان کر دیا ہے۔ اگر آپ کو میری باتیں پسند نہ آئی ہوں، تو میں معذرت خواہ ہوں۔“ بجائے اس کے کہ بیٹر اس کا اضطراب دور کرتا، اس نے اسٹائپر کو اطمینان دہاتے ہوئے کہا۔ ”اور مجھے مید ہے کہ جو کچھ میں نے عرض کیا ہے، اس سے آپ کے جذبات کو ٹھیس نہیں پہنچی ہوگی۔ میں ہمیشہ اس اصول پر عمل کرتا ہوں کہ بات ہیر پھیر کے بغیر کہنا چاہیے۔۔ خیر، آپ یہ فرمائیں کہ میں انھیں کیا جواب پہنچاؤں؟ آپ رستوفوف کے ڈنر میں شرکت فرمائیں گے؟“

بھاری اور ناخوشگوار فریضے سے فراغت پانے اور اپنی جگہ دوسرے شخص کو کڈھب صورت حال میں پھنسانے کے بعد بورس ہلکا پھلکا محسوس کرنے لگا اور اس کی زندہ دلی دوبارہ لوٹ آئی۔

”پرستو! بیٹر نے دوبارہ پرسکون ہونے کے بعد کہا ”تم بڑے عجیب آدمی ہو۔ ابھی بھی تم نے جو باتیں کہی ہیں، وہ اچھی، بلکہ بہت اچھی ہیں۔ اب تم مجھے جانتے نہیں ہو۔ طویل عرصے سے ہماری کوئی ملاقات نہیں ہوئی۔ بلکہ یوں کہو کہ بچپن کے بعد ہم کبھی ایک دوسرے سے نہیں ملے۔ تم شاید سوچ رہے ہو کہ میں میں سمجھ گیا ہوں، خوب اچھی طرح سمجھ گیا ہوں۔ خود مجھ سے یہ کبھی نہ ہوتا، مجھ میں اتنا حوصلہ نہیں لیکن یہ بات ہے بہت زبردست۔ میں بے حد خوش ہوں کہ کھارے ساتھ تعارف ہو گیا۔ کتنی عجیب بات ہے،“ اس نے کچھ توقف کرنے اور مسکرائے کے بعد کہا، ”کہ تم میرے مارے میں اس طرح سوچتے ہو!“ وہ ہنسنے لگا۔ ”خیر چھوڑو، مجھے امید ہے کہ ہم ایک دوسرے کو بہتر طور پر سمجھنے لگیں گے۔“ اس نے بورس کا ہاتھ دبایا۔ ”تمہیں معلوم ہے کہ کاؤنٹ سے میری ایک بھی ملاقات نہیں ہوئی۔ انھوں نے مجھے بلایا ہی نہیں۔ بحیثیت انسان مجھے ان پر ترس آتا ہے۔ لیکن میں کیا کر سکتا ہوں؟“

”تو آپ کے خیال میں پولین، اپنی فوجیں پارلے جانے میں کامیاب ہو جائے گا؟“ بورس نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

بیزر سمجھ گیا کہ بورس موضوع تبدیل کرنا چاہتا ہے۔ وہ خود بھی یہی چاہتا تھا۔ چنانچہ وہ بولاس مہم کے مثبت اور مثبت پہلوؤں کی وضاحت کرنے لگا۔

وردی پوش خدمت گار بورس کو بلانے آ گیا۔ پرنس آنا میخائیلوونا داپس جاری تھی۔ بیزر نے وعدہ کیا کہ وہ ذہن میں ضرور شرکت کرے گا اور اس طرح اسے بورس کو زیادہ بہتر انداز میں جاننے کا موقع مل جائے گا اور اس نے اپنے چشمے کے اوپر سے جھانکتے اور دوستانہ انداز سے اس کی نگاہوں سے نگاہیں ملاتے گرم جوش سے اس سے مصافحہ کیا۔

بورس کی روانگی کے بعد بیزر مزید کچھ دیر کمرے کے چکر لگاتا رہا لیکن اب وہ اپنے کسی خیالی دشمن پر کموار نہیں لہرا رہا بلکہ اس قابل پسند ذہین اور پر عزم نوجوان کو یاد کر کے مسکرا رہا تھا۔

جیسا کہ وائل عمری میں، خاص طور پر اگر اس دور میں آدمی تنہائی کی زندگی گزار رہا ہو، اکثر ہوتا ہے، بیزر بھی اس نوجوان کے بارے میں رقیق القلب ہو گیا۔ وہ رقیق القلب کیوں ہوا، اس کی تشریح کرنا ناممکن ہے۔ اس نے جی میں ٹھان لیا کہ وہ اس نوجوان کے ساتھ بلا تاخیر دوستی کے مراسم استوار کرے گا۔

پرنس واسیلی نے پرنس کو رخصت کیا۔ پرنس کی آنکھوں پر رومال تھا۔ لگتا تھا کہ اس کے آنسو اب گرے کہ اب گرے۔

”ان کی حالت تشویش ناک ہے، بہت تشویش ناک!“ اس نے کہا۔ ”لیکن میں اپنا فرض ہر حال میں نبھاؤں گی۔ میں داپس آؤں گی اور ساری رات اتنا کے سر ہانے گزار دوں گی۔ انھیں ہرگز یوں نہیں چھوڑا جا سکتا۔ یک ایک لمحہ قیمتی ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر پرنسین کس بات کا انتظار کر رہی ہیں! انشاء اللہ، میں انھیں تیار کرتے گا کوئی نہ کوئی طریقہ ڈھونڈ نکالوں گی... Adieu, mon prince، خدا آپ کا حامی و ناصر ہو۔“

”Adieu, ma bonne“ پرنس نے اس سے پیچھا چھڑاتے ہوئے کہا۔

”اوہ، ان کی حالت بے حد تشویش ناک ہے،“ ماں نے اپنے بیٹے سے کہا۔ وہ دونوں گاڑی میں بیٹھ چکے تھے۔ ”وہ شاید ہی کسی کو پہچانتے ہوں گے۔“

”اماں، میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا۔ بیزر کے بارے میں ان کا کیا رویہ ہے؟“ بیٹے نے پوچھا۔

”مائی ڈیئر، وصیت سے سب معلوم ہو جائے گا۔ ہمارے مقدر کا انکھار بھی اسی پر ہے۔“

”آپ نے یہ کیسے سوچ لیا کہ وہ ہمارے لیے کچھ چھوڑ جائیں گے؟“

”آہ، مائی ڈیئر، وہ اتنے میرا اور ہم اچھے غریب ہیں!“

”لیکن اماں، یہ تو کوئی خاص وجہ نہ ہوئی۔“

پرنس، خدا حافظ۔

”خدا حافظ، مائی ڈیئر۔“

”اوہ، میرے خدایا! میرے خدایا! وہ کتنے شدید بیمار ہیں!“ ماں نے میں کرتے ہوئے کہا۔

14

جب آٹھ سینے کیلونا نے اپنے بیٹے کے ہمراہ کاؤنٹ کرل ول دی مروج بڑو خوف سے ملاقات کرنے کی غرض سے گاڑی میں بیٹھ کر روانہ ہو گئی، کاؤنٹس رستوں کا کافی دیر ایکلی بیٹھی رہی۔ وہ بار بار رومال سے اپنی آنکھیں پرچھ رہی تھی۔ آخر کار اس نے گھنٹی بجائی۔

”مائی ڈیئر، تمہیں کیا تکلیف ہے؟“ اس نے خادمہ سے جس نے چند منٹوں کے لیے سے انتظار میں رکھا تھا، ترش روئی سے پوچھا۔ ”اگر تمہیں سیری خدمت کرنا پسند نہیں، میں تمہیں کوئی دوسرا کام سونپ دیتی ہوں۔“ اپنی سہیلی کی بد نصیبی اور شرمناک مفلوک الحالی نے کاؤنٹس کی طبیعت بہت مکدر کر دی تھی، اور جب بھی اس کی یہ کیفیت ہوتی تھی، وہ اس کا، ظہار اپنی خادمہ کو ”مائی ڈیئر“ جیسے رسمی کلمات سے مخاطب کر کے کیا کرتی تھی۔

”مارم، میں شرمندہ ہوں اور معافی چاہتی ہوں،“ ملازمہ نے جواب دیا

”جاؤ، اور کاؤنٹ کو بلا لاؤ۔“

کاؤنٹ بیچ کی بھدی چال چلتا پلک جھپکنے میں حاضر ہو گیا۔ وہ حسب معمول اپنی اہلیہ کے سامنے یوں محسوس کر رہا تھا جیسے وہ کسی چھوٹے موٹے جرم کا ارتکاب کر بیٹھا ہو۔

”اٹھا، ننھی منی کاؤنٹس، مرغی کی کیا غضب کی بھنائی ہوئی ہے! ارہی مدیرا،³⁶ تو اس کا کوئی جواب ہی نہیں۔ میں نے خود چکھ کر دیکھا ہے۔ میں نے اس طارن باورچی کو بلانے کے لیے ایک ہزار روپے صرف کیے تھے۔ یہ تم بیکار نہیں گئی۔ وہ اس کا پوری طرح مستحق ہے!“

وہ اپنی بیوی کے قریب بیٹھ گیا۔ اس نے خوشگوار انداز سے کہیاں گھنٹوں پر جس میں اور اپنے سفید پاؤں میں انگلی پھیرنے لگا۔

”ننھی منی کاؤنٹس، میرے لیے کیا حکم ہے؟“

”مائی ڈیئر، بات یہ ہے۔ ارے، یہ داغ کہاں سے آ گیا؟“ وہ اس کی داسکٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ ”ہونہ ہو یہ مرغی کا داغ ہے؟“ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”کاؤنٹ، دیکھیں، مجھے کچھ رقم درکار ہے۔“

اس نے یہ کہا اور اس کے ساتھ ہی اس کے چہرے پر اداسی اور ملال کے پادل چھا گئے۔

”اوہ، ننھی منی کاؤنٹس!...“ وہ بولا اور اپنی پاکٹ بک نکلنے لگا۔

”کاؤنٹ، مجھے اچھی خاصی رقم کی ضرورت ہے۔ مجھے پانچ سو روپے درکار ہیں۔“ اور وہ اپنا سوتی رومال نکال کر اپنے خاوند کی داسکٹ پر چھینے لگی۔

”ابھی لیں، اسی وقت حاضر ہیں! ارے بھئی، ادھر کون ہے؟“ اس نے ایک ایسے شخص کے لہجے میں پکار کر

کہا جسے یہ یقین ہوتا ہے کہ وہ جس شخص کو بھی آواز دے گا، روزِ تار و زتا اس کی خدمت میں حاضر ہو جائے گا۔
”متنکا کو میرے پاس بھیج دو۔“

متنکا کا تعلق اونچے گھرانے سے تھا۔ اس کی پرورش کاؤنٹ کے گھر میں ہوئی تھی اور اب وہ اس کے تمام امور کی نگہداشت کرتا تھا۔ وہ دبے پاؤں کمرے میں داخل ہوا۔

”مائی ڈیئر لوجوان سنو...“ کاؤنٹ نے مؤدبہ لوجوان سے، جو کمرے میں آچکا تھا، کہا۔ ”جاؤ اور میرے لیے...“ اس نے کچھ دیر سوچا۔ ”ہاں، سات سو رطل لے آؤ۔ ارے ہاں، بھینسی ہار کی طرح نوٹ تڑے مزے، کٹے پھٹے اور گندے وندے نہ ہوں بلکہ کرا رہے اور کھکتے ہوں۔ کاؤنٹس کو پیش کرنا ہیں۔“

”ہاں، متنکا، صاف ستھرے۔ مہربانی ہوگی،“ کاؤنٹس نے اس آہ بھرتے ہوئے کہا۔
”مضور آپ کو یہ نوٹ کب چاہئیں؟“ متنکا نے پوچھا۔ ”یوٹرا کیسی لینسی، میں آپ کو مجبوراً مطلع کر رہا ہوں کہ...“ تاہم جب اس نے کاؤنٹ کو لمبی لمبی اور تیز تیز سانسیں دیتے دیکھ جو اس امر کی علامت تھی کہ کاؤنٹ کا پارہ چڑھے والا ہے، وہ جھٹ پٹ گویا ہوا، ”مجھے یاد ہی نہیں رہا تھا۔ کیا یہ نوٹ ابھی آپ کی خدمت میں حاضر کر دیے جائیں؟“

”بالکل، ابھی وراسی وقت۔ جن قدموں جاؤ، انھی قدموں واپس آؤ، ورنوٹ کاؤنٹس کی خدمت میں پیش کر دو... یہ متنکا کتنا انمول شخص ہے،“ لوجوان شخص کے کمرے سے نکل جانے کے بعد کاؤنٹ نے مسکرا کر کہا۔
”کبھی کوئی چیز ناممکن نہیں ہوتی۔ بس یہی بات مجھ سے برداشت نہیں ہوتی۔ ہر چیز ممکن ہے۔“
”آہ، روپیہ، کاؤنٹ، روپیہ۔ یہ دنیا میں کتنے ہی دکھوں اور غموں کا سبب بنتا ہے،“ کاؤنٹس نے کہا۔
”لیکن مجھے اس رقم کی شدید ضرورت ہے۔“

”میری ننھی مٹی کاؤنٹس، آپ کی شاہ خرچیوں کے گھر گھر چرے ہیں،“ کاؤنٹ نے کہا۔ اس نے اپنی بیوی کے ہاتھ پر بوسہ دیا اور واپس اپنے شادی روم میں چلا گیا۔

جب آٹھ بجے ٹیبلو دنا کاؤنٹ بزدل خوف کے ہاں سے واپس لوٹی، رقم بالکل نئے کھنک دار نوٹوں کی شکل میں کاؤنٹس کی چھوٹی میز پر رومال کے نیچے دھری تھی۔ وہ تازگی کہ کاؤنٹس کو کوئی چیز پریشان کر رہی ہے۔
”خیر، مائی ڈیئر، ان کی کیا خبر، کی ہو؟“

”اف، ان کی حالت بے حد تشویش ناک ہے! وہ اتنے بیمار ہیں۔ اسے بیمار ہیں کہ ان کی صورت پہچانی نہیں جاتی! میں صرف چند منٹ وہاں ٹھہری اور ایک آدمی فقط کے علاوہ کچھ نہ کہہ سکی۔“

”آنیت، خدا کے لیے مجھے انکار نہ کرنا،“ کاؤنٹس اچانک اس کی بات کاٹ کر بولی۔ اس کے رخساروں پر مرنی نمودار ہو گئی جو اس کے مہین، دبے پتلے، ہڈی دار اور بزرگانہ چہرے پر کچھ عجیب معلوم ہو رہی تھی۔ اس نے رومال کے نیچے سے رقم نکالی۔

آٹنا میٹا کیلونا پلک جھپکنے میں اس کے عزائم بھنب گئی۔ وہ دونوں ہو گئی تاکہ من سب اقت پر اس سے بغل گیر ہو سکے۔

”یہ میری طرف سے بورس کے لیے ہے۔ اس کی دردی کے لیے۔“

آٹنا میٹا کیلونا نے جھٹ بٹ اپنے بازو اس کی کمر کے گرد حائل کر دیے اور ٹپ ٹپ آنسو بہنے لگی۔ کاؤنٹس کی آنکھیں بھی اشک بار ہو گئیں۔ وہ رورہی تھیں کیونکہ وہ سہیلیاں تھیں، کیونکہ وہ دونوں دل کی نرم تھیں، کیونکہ بچپن سے وہ ایک دوسرے کی دوست تھیں، تو کیا پھر انھیں روپے پیسے جیسی گھٹیا چیز کے بارے میں مشوش ہونا چاہیے تھا اور کیوں کہ اس کی جوانی کی رستہ بیت چکی تھی... لیکن ان کے ’نوسو دونوں‘ کو رستہ پہنچ رہے تھے۔

15

کاؤنٹس رستووا اپنی بیٹیوں اور کثیر تعداد مہمانوں کے ساتھ ڈرائنگ روم میں ذرا جمائے ہوئے تھی۔ شرف کو کاؤنٹ اپنے سٹڈی روم میں لے گیا تھا۔ وہاں ان کی تواضع چیدہ اور بڑھیا ترکی تب کو کے پاپوں سے کی جا رہی تھی۔ وقتاً فوقتاً وہ باہر جاتا اور دریافت کرتا۔ ”کیا وہ، بھی تک نہیں آئیں؟“ انھیں ماریا دمتریوونا آکروسیمووا (Akrosimova)³⁷ کا انتظار تھا، اونچے طبقے میں یہ خاتون مہیب اثر دھن کہلاتی تھی۔ اس کی شہرت کا سبب اس کی دولت یا مرتبہ نہیں بلکہ اس کی صف گوئی اور کھرے اور بے لگ اطوار تھے۔ ماریا دمتریوونا سے شادی خاندان بھی شناسا تھا اور، سکو اور پیٹریز برگ کا بچہ بچہ اس سے واقف تھا۔ دونوں شہروں کے باشندے اس کے بارے میں اظہار استعجاب بھی کرتے تھے، دل ہی دل میں اس کی بد تمیزیوں پر ہنستے بھی تھے اور اس کے متعلق ایک دوسرے کو لطیفے اور قصے کہانیاں بھی سناتے تھے۔ تاہم بلا متناہب اس سے ڈرتے وراس کا احترام کرتے تھے۔

کاؤنٹ رستوف کا ڈرائنگ روم دھومیں سے تاریک ہو رہا تھا۔ گفتگو کا موضوع وہ سرکاری اعلان نامہ تھا جس میں جنگ کا اعلان کیا گیا تھا اور لوگوں سے نوح میں بھرتی ہونے کے لیے کہا گیا تھا۔ ابھی تک کسی نے بھی اعلان نامے کا ہذاست خود مطالعہ نہیں کیا تھا لیکن اس کا علم سبھی کو تھا۔ کاؤنٹ دو مہمانوں کے مابین، جو پاپ کے کش لگا رہے اور آپس میں باتیں کر رہے تھے، گدے دار چوکی پر بیٹھا تھا۔ وہ خود نہ پامپ پی رہا ورنہ باتیں کر رہا تھا لیکن وہ ان دونوں کو ایسی مسرت سے، جو چھپائے چھپتی نہیں تھی، دیکھ رہا تھا اور ان کے دلائل کو (خود اسی نے انھیں ایک دوسرے کے خلاف بھڑکایا تھا) غور سے سن رہا تھا۔

ان دونوں حریفوں میں ایک عام شہری تھا۔ اس کی داڑھی اور مونچھیں صفا چٹ تھیں۔ اس کا چہرہ دبلا پتلا اور تھریوں زدہ تھا۔ شکل و صورت سے ظاہر ہوتا تھا کہ خاصا چڑچڑا آدی ہے۔ اگرچہ وہ ادھیڑ عمر میں داخل ہو چکا تھا لیکن جہاں تک اس کے لباس کا تعلق ہے، وہ انتہائی فیشن زدہ لو جوانوں سے کم نہیں تھا۔ اس نے گدے دار چوکی پر یوں پاؤں لٹکائے ہوئے تھے جیسے یہ اس کا اپنا گھر ہو۔ اس نے پامپ کا صبرینا، ہانڈ اپنے منہ کے ایک کونے کے اندر

دور تک گھسیڑ رکھا تھا۔ وہ گا ہے بگا ہے کش لیتا اور آنکھیں سکیڑتا۔ وہ کاؤنٹس کا چچا اور بھائی شن شن (Shinshin) تھا اور بھی تک تجربہ کی زندگی گزار رہا تھا۔ ماسکو کے ڈرائنگ روموں میں اس کے متعلق جو باتیں بتائی جاتی تھیں، ان کے مطابق اس کی زبان خاصی ہرملی تھی۔ اپنے ہم جلیس کے ساتھ اس کے مشفقانہ رویے سے یہ احساس جھلک رہا تھا کہ اس کا مخاطب کم تر حیثیت کا۔ لک ہے اور وہ اسے گفتگو کا موقع فراہم کر کے اس پر بڑی نوازش کر رہا ہے۔ اس کا یہ ہم جلیس گارڈز میں افسر تھا۔ اس کا چہرہ تازہ اور گال گلابی تھے۔ اس نے جس طرح رگڑ رگڑ کر اپنے جسم کی صفائی کی تھی، باؤں کی کنگھی چوٹی کی تھی اور جس قسم کا لباس پہنا ہوا تھا، اس میں کوئی عیب نہیں ڈھونڈا جا سکتا تھا۔ اس نے پائپ کا ٹبرین دہانہ اپنے خوش وضع منہ کے عین درمیان میں ٹکایا ہوا تھا۔ وہ بہت نفاست سے سرخ ہونٹوں سے دھواں اندر کھینچتا اور چھوٹے چھوٹے مرغولوں کی صورت میں، ہرنگاں دیتا۔ یہ لیغٹینٹ برگ (Berg) تھا وریمو نووسکی رجنٹ میں فسر تھا۔ بورس نے اپنے رہنمائی میں شمولیت کے لیے اسی کے ساتھ سر پر روانہ ہونا تھا اور یہی وہ شخص تھا جس کے بارے میں نٹاشا نے اپنی بڑی بہن کو طعنہ دیا تھا کہ وہ اس کا سنگیتر ہے۔ کاؤنٹ ان دونوں کے درمیان بیٹھتا تھا اور ان کی باتیں دھیان سے سن رہا تھا۔ اس کا دل پسند مشغلہ ناش کاکیل بوسن، جس کا رہ بے حد شوقین تھا، کھیلنا اور دوسروں کی خاص طور پر اس وقت جب وہ گفتگو کے فن سے آشنا اور اشخاص کو یک دوسرے کے خلاف بھڑانے میں کامیاب ہو جاتا۔ باتیں سننا تھا۔

”چنانچہ ہر در، mon tres honorable الفانسی کارلویچ“ شن شن نے طعنیہ نسی پہنچے، اور اپنی گفتگو میں روسی بول چال کے نہایت معمولی الفاظ و تراکیب میں فرانسیسی کی نہایت خوبصورت اور دلکش تراکیب کی آمیزش کرتے ہوئے کہا جو اس کے انداز کی نمایاں خصوصیت تھی، Vous Comptezvous faire des rentes sur l'etat اپنی بی کمپنی سے منافع کمانے کی ترکیبیں لڑا رہے ہیں۔“

”بالکل نہیں، قطعاً نہیں، محترم پیوتر نکولا کی ورج، میں تو صرف یہ ثابت کرنا چاہتا تھا کہ پیادہ فوج کے مقابلے میں گھڑسوار فوج کی نوکری گھانے کا سودا ہے۔ چنانچہ محترم پیوتر نکولا کی ورج، اگر آپ میری پوزیشن کے متعلق غور فرمائیں۔“

برگ کی عادت یہ تھی کہ وہ، ہمیشہ جیسے لہجے میں، نہایت شائستگی سے بات کرتا تھا اور جوابات کہتا تھا اور اتنی دلچسپی ہوتی تھی کہ اس کا کوئی دوسرا مفہوم اخذ کرنا ناممکن ہوتا تھا۔ اس کی گفتگو کی ایک اور خصوصیت یہ تھی کہ وہ ہمیشہ اپنے ہی، بارے میں باتیں کرتا تھا اور اگر گفتگو کا موضوع تبدیل ہو جائے اور وہ کسی ایسی چیز کے بارے میں ہونے لگے جس کا اس کی ذات سے براہ راست کوئی تعلق نہ ہو، وہ منہ میں گھنگھٹیاں ڈال کر بیٹھ جاتا اور بکشتائی سے احتراز کرتا۔ وہ ایک وقت میں گھنٹوں چپ چاپ بیٹھ سکتا تھا۔ اس دوران میں نہ وہ خود شرمسار ہوتا اور نہ کسی

”میرے پیارے عزت نامہ۔“

”نواب میں حکومت سے رقم بٹورنے کی سوچ رہے ہیں۔“

دوسرے کو شرمسار ہونے دیتا۔ لیکن جونہی گنگو کا رخ پلٹتا اور اسے محسوس ہوتا کہ اس کا تعلق براہ راست اس کی ذات سے ہے، اس کے منہ کا قفل کھل جاتا۔ وہ بے نکان اور جی بھر کر باتیں کرتا اور دیکھنے والوں کو نظر آتا کہ وہ اپنی ہی باتوں سے خوب لطف اندوز ہو رہا ہے۔

”محترم پیوتر گولڈ کی وجہ، ذرا میری پوزیشن پر غور فرمائیں۔ گر میں گھڑ سوار فوج میں نکار ہتا، مجھے ہر چار ماہ بعد دوسروں سے زیادہ کچھ ملتا، حالانکہ میرا عہدہ لیفٹیننٹ کا ہے۔ لیکن موجودہ حیثیت میں مجھے دوسو تیس روپے کی یافت ہوتی ہے، اس نے شن شن اور کاؤنٹ پر مسکراہٹ کی کہ میں بکھیرتے ہوئے کہا جیسے اسے اس بارے میں مطلق شک و شبہ نہ ہو کہ جس قسم کی کامیابی کے خواب وہ دیکھتا ہے، وہی ہر شخص کی زندگی کا مقصد اولیٰ اور منتہائے آرزو ہے۔“ اس کے علاوہ، جناب پیوتر گولڈ کی وجہ، گارڈز میں تبادلے کا فائدہ یہ ہوگا کہ مجھے وہاں ایسی جگہ مل سکے گی جہاں میں لوگوں کی نگاہوں میں آسکوں گا،“ برگ نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔“ اور پیادہ گارڈز میں جدی جلدی اور تواتر سے اسامیاں خالی ہوتی رہتی ہیں۔ پھر یہ بھی سوچیں کہ دوسو تیس روپے سے کیا کچھ نہیں کیا جا سکتا۔ میں کچھ رقم پس انداز بھی کر لیتا ہوں اور کچھ پیسے اپنے والد محترم کو بھی بھیج دیتا ہوں،“ وہ دھوئیں کے کش اڑاتا بولتا چلا گیا۔

”La balance y est...“ کہاوت کہتی ہے کہ جرمن دھیلا بچانے کے لیے پتھر بھی نچوڑ سکتے ہیں،“ شن نے پائپ منہ کے دوسرے نوٹے میں گھسیڑتے اور کاؤنٹ کو آنکھ مار تے ہوئے کہا۔

کاؤنٹ کھٹکھٹلا کر ہنس پڑا۔ جب دوسرے مہمانوں نے دیکھا کہ گنگو شن شن کر رہا ہے، وہ بھی اس کی باتیں سننے اس کے گرد اکٹھے ہو گئے۔ برگ پر نہ دل لگی اثر انداز ہوئی اور اسے یہ احساس ہوا کہ اس کی باتیں بے اعتنائی سے کنی جارہی ہیں۔ وہ ان چیزوں سے بے نیاز یہ بتانے میں مشغول ہو گیا کہ گارڈز میں تبادلہ ہو جانے کے بعد وہ کس طرح اپنے کیڈٹ کور کے ساتھیوں سے ایک قدم آگے نکل گیا ہے، پھر یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جنگ کے دوران میں کمپنی کا کمانڈر ہلاک ہو جائے، اس صورت میں سینئر انسری حیثیت سے وہ نہایت آسانی سے اس کی جگہ پر مقرر ہو سکتا ہے۔ پھر اس نے یہ بتایا کہ رجمنٹ میں ہر شخص اسے بہ نظر پسندیدگی دیکھتا ہے اور اس کے پاپا اس سے بے حد خوش ہیں۔ صاف ظاہر تھا کہ برگ جو کچھ کہہ رہا تھا، اس سے خوب لطف اندوز ہو رہا تھا اور غالباً یہ بات اس کے ذہن و گمان میں بھی نہ آئی ہوگی کہ لوگوں کو اور چیزوں میں بھی دلچسپی ہو سکتی ہے لیکن اس کے اظہار اتنے پسندیدہ تھے، جو بات وہ کہتا تھا اتنی سنجیدگی سے کہتا تھا، اور اس کی طفلانہ انا پرستی کی معصومیت اتنی واضح تھی کہ اس نے اپنے سامعین سے ہتھیار ڈالوا لیے۔

”خیر، صاحب زادے، آپ جہاں بھی جائیں۔ پیادہ فوج میں یا گھڑ سوار رجمنٹوں میں۔ میری پیشین گوئی یہ ہے کہ آپ بہت ترقی کریں گے!“ شن شن نے گدے دار چوکی سے پاؤں ہٹاتے اور برگ کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر فرمایا۔

پر تھکی دیتے ہوئے کہا۔

برگ خوشی سے پھولانہ سٹایا اور مسکراتے لگا۔ کاؤنٹ اپنے مہمانوں کو دوبارہ ڈرائنگ روم میں لے گیا



کھانے سے پہلے یہ وہ وقت تھا جب مہمانوں کو یہ توقع بندھنے لگتی ہے کہ طعام کا بلا دالب آ رہی چاہتا ہے اور یوں وہ طویل گفتگو سے اجتناب برتنے لگتے ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ کمرے میں ادھر ادھر گھومنا اور کچھ نہ کچھ بولتے رہنا اپنا فرض گردانتے ہیں تاکہ وہ یہ جتائیں کہ وہ دسترخوان پر پہنچنے کے لیے قطعاً بے چین نہیں ہیں۔ میزبان میاں بیوی مسلسل دروازے کی جانب دیکھتے رہتے ہیں اور کبھی کبھار آپس میں نگاہوں کا تبادلہ بھی کر لیتے ہیں۔ اس سے مہمان یہ اندازہ لگانے کی کوشش کرتے ہیں کہ کس شخص یا کس چیز کا انتظار ہو رہا ہے۔ شاید یہ کوئی بہت قریبی عزیز ہے یا پھر کوئی ڈش ابھی تیاری کے مراحل میں سے گزر رہی ہے۔

حیئر ڈنر کے آغاز سے چند ہی منٹ پہلے پہنچا اور اس کی نظریں جس اولین کرسی پر پڑیں، وہ بے ہنگم انداز سے اس پر بیٹھ گیا۔ یہ کرسی کمرے کے عین درمیان میں پڑی تھی اور یوں وہ ہر آنے والے کے لیے رکاوٹ بن گیا۔ کاؤنٹس نے اسے باتوں میں لگانا چاہا لیکن اس کی نگاہیں کمرے میں چاروں طرف گھومتی رہیں۔ وہ اپنے جیسے میں سے یوں ادھر ادھر بھاٹک رہا تھا جیسے وہ کسی شخص کو تلاش کر رہا ہو۔ کاؤنٹس اس سے جو کچھ بھی پوچھتے، وہ اس کا جواب ”ہوں، ہاں“ میں ہی دینے پر اکتفا کرتا۔ وہ سب کے لیے زحمت کا باعث بنا ہوا تھا لیکن وہ واحد شخص تھا جسے اس کا کوئی احساس نہیں تھا۔ رچھ کا واقعہ اکثر دیگر مہمانوں کے علم میں تھا اور وہ اس کچھ شیم، بٹے کٹے اور بھد ہر مسکین شخص کو تجسس نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ انھیں تعجب اس بات پر تھا کہ یہ چپ چاپ، خاموش طبع اور آرام طلب آدمی پولیس مین کے ساتھ اس قسم کی شرارت کیسے کر سکتا ہے۔

”ماں کو میں تم حال ہی میں آئے ہو گے؟“ کاؤنٹس نے اس سے پوچھا۔

”ہی، مادام،“ اس نے اپنے گرد و پیش جھانکتے ہوئے کہا۔

”ابھی تم میرے میاں سے تو نہیں ملے ہو گے؟“

”نہیں، مادام،“ اس نے بے نیلے انداز سے مسکراتے ہوئے کہا۔

”میرا خیال ہے کہ کچھ عرصہ قبل تم بیس میں مقیم تھے۔ بڑی دلچسپ جگہ ہو گی؟“

”بہت دلچسپ۔“

کاؤنٹس نے آٹنا میخانیلوونا سے نگاہوں کا تبادلہ کیا۔ آٹنا میخانیلوونا کو احساس ہوا کہ اس سے یہ توقع کی جا رہی ہے کہ وہ اس نوجوان کا دل بہلائے۔ چنانچہ وہ اس کے قریب بیٹھ گئی اور اس سے اس کے باپ کے بارے میں باتیں کرنے لگی لیکن حیئر نے اس کے ساتھ بھی وہی سلوک کیا جو وہ کاؤنٹس کے ساتھ کر چکا تھا، وہ اس کی

باتوں کا جواب بھی محض ہوں، ہاں ہی میں دیتا رہا۔ دیگر مہمان آپس میں باتیں کرنے میں مشغول تھے۔
 ”راز دہود سکی... بے حد پرکشش تھا۔ آپ کی بڑی عنایت ہے... کاؤنٹس اپرا کسنا...“ اس قسم کے الفاظ اور
 فقرات چاروں اطراف سنائی دے رہے تھے۔

کاؤنٹس ابھی اور استقبالیہ کمرے کی طرف چل دی۔

”ماریا دستر دیونا؟“ اسے کہتے سنا گیا۔

”جی ہاں، میں ہی ہوں۔“ کرسٹ نسوانی آواز سنائی دی اور اس کے ساتھ ہی، ماریا دستر یونا کمرے میں
 داخل ہو گئی۔

بالکل ہی معمر خواتین کے علاوہ باقی تمام عورتیں، کیہ کنواری، کیا شادی شدہ، سبھی اٹھ کر کھڑی ہو گئیں۔ ماریا دستر یونا
 دروازے میں رک گئی۔ وہ دراز قدر اور قدرے خربہ اندام عورت تھی اور پچاس کے پینے میں تھی۔ اس کے بال گھونگھریالے
 تھے اور وہ تن کر سیدھی کھڑی تھی۔ وہ ظاہریہ کر رہی تھی کہ وہ اپنے ڈریس کی آستینیں، جو خاصی فراخ تھیں، درست کر
 رہی ہے لیکن حقیقتاً وہ مہمانوں کا بنظر غائر جائزہ لے رہی تھی۔ ماریا دستر یونا ہمیشہ روی زبان میں گفتگو کرتی تھی۔

”میں اپنی پیاری بہن کے نام دن پر اسے اور اس کے بچوں کو بدیہ تحریک پیش کرتی ہوں،“ اس نے بلند آہنگ
 اور گھبر آواز میں کہا جس کے شور میں باقی تمام آوازیں ڈوب گئیں۔ ”اور پرانے پانی، تم؟ تمہارا کیا حال ہے؟“
 اس نے کاؤنٹ سے، جو اس کے ہاتھ کو بوسہ دے رہا تھا، مخاطب ہو کر پوچھا۔ ”میرا خیال ہے کہ تم یہاں ماسکو میں
 بالکل بور ہو رہے ہو گے؟ کتوں کے ساتھ شکار پر جانے کا موقع نہیں ملتا ہوگا؟ لیکن میرے دوست، کیا بھی کیا جا
 سکتا ہے؟۔ یہ نو خیز پرندے پر پرزے نکال رہے ہیں۔“ اور اس نے ہاتھ سے لڑکیوں کی طرف اشارہ کیا۔ ”تم
 چاہو یا نہ چاہو، بہر حال تمہیں ان کے لیے برتلاش کرنا ہی ہوں گے۔ خیر، میری تازق (ماریا دستر یونا تاشا کو
 ہمیشہ تازق کہتی تھی) کیسی ہے؟“ اس نے لڑکی کے، جو خوش خوش اور بلا جھجک اس کے ہاتھ پر بوسہ دینے کے لیے
 آگے آ رہی تھی، بازو پر تھکی دیتے ہوئے کہا۔ ”مجھے معلوم ہے کہ یہ بچی آفت کی پرکالہ ہے لیکن اس سے کیا فرق
 پڑتا ہے۔ مجھے یہ بہت عزیز ہے۔“

اس نے اپنے بھاری بھر کم ہینڈ بیگ میں سے ناشپاتی کی شکل کے دو آویزے، جن میں قیمتی جواہر جڑے
 تھے، نکالے، ورنہ انھیں تاشا کو، جس کا نام دن پر چہرہ خوشی سے چمک دکھ رہا تھا، پہنانے کے بعد وہ ایک ایک دوسری
 جانب متوجہ ہوئی اور اس نے بیئر کو اپنے نشانے کی زد میں لے لیا۔

”اٹا، مائی ڈیئر ذرا ادھر آنا!“ اس نے ملائم اور دھیمالوجہ، جو بالکل جعلی تھا، اختیار کرتے ہوئے کہا۔ ”مائی ڈیئر،
 ذرا ادھر آنا!“ اور اس نے دھمکی آمیز انداز سے اپنی آستینیں ذرا اوپر چڑھ لیں۔

بیئر آگے آگیا اور بھولے بچوں کی طرح جھٹے میں سے اسے دیکھنے لگا۔

”مائی ڈیئر، آگے آؤ نا، ذرا اور آگے!“ جس زمانے میں تمہارا باپ دربار کا چہیتا تھا، میں واحد شخص تھی جو بچی

بات اس کے منہ پر کہہ دیا کرتی تھی اور اب میرا یہ مقدس فرض بنتا ہے کہ تمہارے ساتھ بھی وہی سلوک کروں۔“ اس نے توقف کیا۔ سب لوگ دم سادھے خاموش بیٹھے رہے۔ وہ سب محسوس کر رہے تھے کہ یہ تو ابھی شروعات ہے، آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا۔

”بڑے سڑے کے آدمی ہوتے، یقیناً سڑے کے آدمی اسے دیکھو، اس کا باپ بستر مرگ پر پڑا ہے اور اسے اٹھیلیاں سوجھ رہی ہیں۔ پولیس کے آدمی کو بجھ کے اوپر اٹھاتا ہے اور اپنا دل پشوری کرتا ہے اشرم چہکتی ایست کہ پیش مرزاں بیاؤ! بڑے بڑے میٹ ہیں حضور! پانی میں ڈوب سرو۔ لام پر کیوں نہیں چلے جاتے؟ کچھ تو بھلا ہو گا۔“ وہ ایک طرف ہٹی اور اپنا ہاتھ کاؤنٹ کے ہاتھ میں دے دیا جس کے لیے اپنی ہلکی پرتا بو پانا مشکل ہو رہا تھا۔

”اچھا، چھوڑ دو۔ میرا خیال ہے کہ اب ہمیں کھانا شروع کر دینا چاہیے۔ درست؟“ ماریا دمیتریوونا نے کہا۔ کاؤنٹ ماریا دمیتریوونا کی معیت میں آگے آگے چل پڑا۔ ان کے پیچھے پیچھے ہوزاردستوں کے کرل کا بازو تھامے کاؤنٹس سری تھی۔ یہ کرل ان کے لیے بہت اہم تھا کیونکہ نکولائی نے اسی کے ساتھ جانا اور اپنی رجسٹر میں شامل ہونا تھا۔ آٹا میخانیکوونا کا ساتھ شن شن نے دیا۔ برگ نے پنا بازو دیرا کو تھما دیا۔ متبسم جولی کا راگنا نے نکولائی کے ساتھ دسترخوان کا رخ کیا۔ ان کے بعد دوسرے جوڑے چل پڑے۔ ان کی لمبی قطار ڈائننگ روم کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک پھیل چکی تھی۔ سب سے آخر میں بچوں کی باری آئی۔ وہ اپنے انا لیتوں اور گورنرس کے ساتھ آ رہے تھے۔ ملازمین کا جم غفیر، ادھر ادھر بھاگا پھر رہا تھا۔ کرسیاں رگڑیں کھا رہی تھیں۔ جب مہمان اپنی اپنی نشستوں پر بیٹھ گئے، ادھر گیلری میں کاؤنٹ کا نجی آرکسٹرا موسیقی کی دھنیں بکھیرنے لگا۔ تاہم ۵۵ تینوں کے اندر اندر چھری کانٹوں کی کھٹکھٹاہٹ، آوازوں کی بھنبھناہٹ اور پیروں کے قدموں کی دہلی آہٹ میں موسیقی کی تانیں دب گئیں۔ میز کے ایک سرے پر کاؤنٹس فردکش تھی۔ اس کے دائیں ہاتھ ماریا دمیتریوونا اور بائیں ہاتھ آٹا میخانیکوونا بیٹھی تھیں۔ باقی خواتین کو میز کی لمبائی کے رخ نشیں ملیں۔ میز کا دوسرا سرا کاؤنٹ نے سنبھال لیا۔ اس کے دائیں جانب شن شن اور بائیں ہوزاردوں کی رجسٹر کا کرل متسکن تھا۔ باقی حضرات خواتین کے سامنے میز کی دوسری جانب بیٹھ گئے۔ لیوون لڑکے لڑکیاں میز کی ایک طرف، ویرا برگ کے ساتھ اور جیڑ بوس سے اگلی کرسی پر۔ ان کے انا لیت اور گورنرس دوسری جانب تھیں۔

کاؤنٹ بڑی مستعدی سے اپنے پڑوسی کا گلاس بھرتا جاتا، (وہ اپنا گلاس بھرتا نہ بھولتا) اور بلوری صراحیوں اور فردٹ کے پیالوں کے عقب سے اپنی بیوی کو، جس نے نیسے رہنوں سے مزین اور نجی ٹوپلی پہنی ہوئی تھی، دکھاتا جاتا۔ میزبان کی حیثیت سے اپنے فرائض نظر انداز کیے بغیر کاؤنٹس بھی انسانوں کے ڈھیر کے عقب میں بار بار اپنے شوہر پر معنی خیز نظریں ڈال رہی تھی۔ آج اسے اپنے خاوند کے رخساروں کی لالی اور قلیل بالوں کے مقابلے میں اس کے سر کا گنجا پن کچھ زیادہ ہی کھل رہا تھا۔

میز کی جس جانب خواتین بیٹھی تھیں، ادھر سے آوازوں کی بھنبھناہٹ مسلسل سنائی دے رہی تھی۔ ادھر

مردوں کی آؤزیں بھی بند سے بلند تر ہوتی جا رہی تھیں۔ خاص طور پر ہونزاروں کی رجسٹ کا کرٹل خاصا باؤل ہوتا جا رہا تھا۔ اس کے رخسار سرخ سے سرخ تر ہوتے جا رہے تھے اور وہ کھانے پینے کی اشیاء اتنی زیادہ مقدار میں اپنے حلق کے اندر اٹھیل رہا تھا کہ کاؤنٹ کو سے دوسرے مہمانوں کے سامنے بطور نمونہ پیش کرنا پڑ رہا تھا کہ وہ بھی اس کی تقلید کریں۔ برگ وریا پر ملٹم مسکراہٹ نچھاور کر رہا تھا اور اسے سمجھا رہا تھا کہ محبت ارضی نہیں بلکہ سماوی جذبہ ہے۔ بورس اپنے نئے دوست میٹر کو مہمانوں کے حسب نسب سے آگاہ اور مناشا کے ساتھ، جو اس کی مخالف سمت بیٹھی تھی، نگاہوں کا تبادلہ کر رہا تھا۔ میٹر کا دھیان باتوں کی طرف کم کر کھانے کی طرف زیادہ تھا۔ وہ بڑھ بڑھ کر ہاتھ مار رہا تھا اور ساتھ ساتھ مہمانوں کے چہروں کا بنظر غائر جائزہ لیتا جاتا تھا۔ طعام کے آغاز میں جو دو سوپ پیش کیے گئے، اس نے ان میں سے جنگلی فاختہ کے سوپ کو ترجیح دی۔ اس کے بعد اللہ دے اور بندہ بے پھل کی پائیوں سے بے کر مرغی کے گوشت تک، کوئی ڈش ایسی نہیں تھی جسے اس نے کھانے کی ہامی نہ بھری ہو اور نہ اس نے کسی قسم کی شراب رائیگاں جانے دی۔ بٹلر انواع و اقسام کی شراب کی بوتلیں، جن کے گرد رومال لپیٹے ہوئے تھے، پر اسرار طریقے سے پڑوسی کے کندھے کے اوپر سے دھکیلتا اور اس کے سامنے کر دیتا۔ ”کڑوی مدیرا“، ہنگری کی سے انگوڑی۔ رائن لینڈ کی سے سرخ۔“ وہ اسے زیر لب بتاتا جاتا۔ ہر مہمان کے گے چار بلوری گلاس، جن پر کاؤنٹ کا مولوگرام نقش تھا، دھڑے تھے۔ میٹر ان میں سے ایک انگلی پکچواٹھا تا، اسے بھرتا اور سرے لے لے کر پینے لگتا۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ مہمانوں کو، جن میں ہر آن اضافہ ہو رہا تھا، بہ نگاہ لطف و کرم دیکھتا جاتا۔

مناشا بورس کے بالقابل بیٹھی تھی۔ وہ اسے ایسے ہی دیکھ رہی تھی جیسے تیرہ سالہ لڑکی اس لڑکے کو، جس کے دام الفت میں وہ گرفتار ہو چکی ہو اور جس کا وہ اولیں بار بوسہ لے چکی ہو، دیکھتی ہے۔ کبھی کبھار اس کی نگاہ بھٹک جاتی اور میٹر پر جا ملتی۔ اور جب میٹر کو یہ احساس ہوتا کہ یہ دلچسپ اور ننھی منی کھلنڈری لڑکی اسے دیکھ رہی ہے، اس کا جی چاہتا کہ وہ قہقہے لگاتا چلا جائے۔ لیکن کیوں؟ اس کی وجہ وہ خود بھی نہیں جانتا تھا۔

نگولائی سونیا سے کچھ دور جولی کاراگنا کے قریب بیٹھا تھا۔ وہ اس کے ساتھ پھر وہی باشعوری مسکراہٹ اپنے چہرے پر سجائے باتیں کر رہا تھا۔ کہنے کو سونیا بھی اس مسکراہٹ کا جواب دے رہی تھی لیکن صاف نظر آ رہا تھا کہ وہ حسد کے انگاروں پر لوٹ رہی ہے۔ کبھی اس کا چہرہ تنہا نے لگتا اور کبھی اس کی رنگت پہلی پڑ جاتی۔ اس کا انگ انگ یہ لڑکھانے کے لیے بے تاب ہو رہا تھا کہ کسی طرح اسے اس گفتگو کی، جو جولی اور نگولائی کے مابین ہو رہی تھی، من گھڑی مل سکے۔

ایک گورنس عالم اضطراب میں ادھر ادھر دیکھ رہی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ اس بات کا تہیہ کر چکی ہے کہ جوئی کسی شخص نے بیچوں کو ذرا بھی گھور کر دیکھا، وہ اس کی جڑی اوھیر دے گی۔ جرمن نیوٹر انواع و اقسام کے سالنوں، میٹھوں اور شرابیوں کے نام اپنے ذہن میں محفوظ کرنے کی کوشش کر رہا تھا تا کہ جوئی موقع ملے، وہ ان کی تنبیہات اپنے خاندان کو جرمنی بھیج سکے۔ اسے اس وقت شدید غصہ آیا جب بٹلر ایک رومال میں لپٹی بوتل پکڑے اس کی

مرف دیکھے بغیر آگے نکل گیا۔ اس کے ماتھے پر بل پڑ گئے اور وہ یہ ظاہر کرنے کی تیگ و دو کرنے لگا کہ اسے اس مخصوص شراب کی خاص طلب نہیں ہے لیکن اذیت اس لیے ہو رہی ہے کہ کوئی بھی شخص یہ نہیں سمجھتا کہ وہ سبب کا اس لیے طلب گار نہیں ہے کہ وہ پیاسا یا تھک رہا ہے بلکہ وہ تو اسے اس لیے حاصل کرنے کا خواہش مند ہے کیونکہ وہ ایسا نداری سے اپنے علم میں اضافہ کرنے کا متمنی ہے۔

16

میز کے جس کنارے مرد حضرات بیٹھے تھے، وہاں گرمی گفتار میں لفظ بہ لفظ اضافہ ہونے لگا، کرنل انھیں بتا رہا تھا کہ بیئر برگ میں جنگ کا اعلان نامہ پہلے ہی منظر عام پر آ چکا ہے اور جس نقل کا اس نے مطالعہ کیا تھا، وہ خاص ایلچی کے ذریعے کانڈرا چیف تک پہنچا چکی تھی۔

”آخر ہمیں کس کتے نے کاٹا ہے کہ ہم یونائیٹڈ کنگڈم کے خلاف طبل جنگ بجا رہے ہیں؟“ شن شن نے سوال اٹھایا۔ ”وہ پہلے ہی آسٹریا کی کچی دبا چکا ہے۔ اب ہماری باری ہے؟“

کرنل لائے تھ اور ٹکڑے جسم کا مالک خوش باش اور پراعتاد جرمن تھا۔ وہ روس سے ٹوٹ کر محبت کرتا تھا اور قرائن بتا رہے تھے کہ اسے جنگوں کا خاص تجربہ ہے۔ شن شن کی بات سن کر وہ غصے سے کھولنے لگا۔

”ہم جنگ میں کیوں کود رہے ہیں، اس کی وجہ میرے محترم، وہی ہے جس کا ذکر امپراطور اعلان نامے میں کر چکے ہیں۔ انھوں نے فرمایا ہے کہ روس کے سر پر جو خطرہ منڈلا رہا ہے، سلطنت کی سلامتی، اس کے وقار، اس کے معاہدوں کو، جو ضعف پہنچنے کا اندیشہ ہے، اس سے وہ انعام نہیں برت سکتے۔“ اس نے جرمن لہجے میں بات کرتے ہوئے کہا۔ اس نے لفظ ”معاہدوں“ پر خاص طور پر زور دیا گویا سارے مسئلے کی روح اسی ایک لفظ میں کٹی ہوئی تھی۔ جہاں تک سرکاری امور کا تعلق ہے، اس کا حافظہ بلا کا تھا۔ اس کا خاص وصف یہ تھا کہ وہ انھیں بلا کم و کاست یاد رکھتا تھا اور اس معاملے میں کبھی کسی غلطی کا مرتکب نہیں ہوتا تھا۔ چنانچہ اب اس نے اسی حافضے کی مدد سے اعلان نامے کے تعارفی کلمات دہرائے:

”اور امپراطور کی خواہش، جو ان کا واحد اور ناقابل تنسیخ مقصد ہے، یہ ہے کہ یورپ میں مستحکم اور دیرپا بنیادوں پر امن قائم کیا جائے۔ چنانچہ انھوں نے یہ فیصلہ فرمایا ہے کہ ہماری افواج کا کچھ حصہ سرحد پار پہنچا دیا جائے تاکہ اس مقصد کے حصول کے لیے نئی کوششیں روپ عمل لائی جاسکیں۔ تو جناب عالی، یہ ہیں وہ وجوہ۔ آیا کچھ خیال شریف میں؟“ اس نے مقصدی انداز سے اپنی بات ختم کرتے اور شراب کا گلاس پورے کا پورا چڑھاتے ہوئے کاؤنٹ کی طرف دیکھا کہ وہ اس کے بیان کو پسندیدگی کی سند عطا کرے۔

”آپ نے وہ پرانی کہاوت سنی ہے کہ سوچی رے سوچی، سوچی کیوں، ہر ٹکڑے مارتے پھرتے ہو۔ تمہاری خیرا میں ہے کہ اپنے ہی گھر میں رہو اور اپنی ہی باڈوں کی مرمت کرو؟“ شن شن نے بھوٹے سکیڑتے اور چہرے

پر مسکراہٹ بکھیرتے دریافت کیا ”یہ کہاوت ہم پر پوری طرح صادق آتی ہے۔ خود سواروف کا بھی کچھ مرکل گیا تھا اور آج ہم دوسرا سواروف کہاں سے لائیں گے؟ میں پوچھتا ہوں۔“ وہ مسلسل روی سے فرانسیسی اور فرانسیسی سے روی کی طرف پلٹتا جاتا تھا۔

”ہمیں اپنے خون کے آخری قطرے کے بہ جانے تک بڑنا ہوگا“ کرل نے میز پر مٹکا مارتے ہوئے کہا۔
 ”اور اپنے امپراطور کی خاطر اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کرنا ہوگا۔ تب کہیں معاملات صحیح رخ اختیار کر سکیں گے۔ اس ضمن میں ہمیں جھٹ بازی حتیٰ ما مکان کم سے کم“ اس نے غلط ”حتیٰ اما مکان“ رک رک کر ادا کیا۔ ”حتی۔۔۔ اما مکان کم سے کم کرنا ہوگی۔“ پھر اس نے کاؤنٹ کی جانب اپنی توجہ مبذول کرتے ہوئے اپنی بات یوں ختم کی: ”ہم بوڑھے ہوزار اسی انداز سے سوچتے ہیں۔ ہماری نگاہوں میں محاسبے کی بس یہی نوعیت ہے اور اس کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ اور ہاں نوجوان، تم نو عمر بھی ہو اور ہوزاروں میں بھی نئے نئے شامل ہوئے ہو، تمہارا اس بارے میں کیا خیال ہے؟“ اس نے ٹکولائی کی طرف مڑتے ہوئے اس سے پوچھا، جس نے جب یہ دیکھا کہ ٹکولو کا رخ جنگ کی طرف پلٹ گیا ہے، اپنی توجہ پتی ہم جلیس سے ہٹا لی تھی اور بڑے دھین کے ساتھ کرل کی باتیں سن رہا تھا۔

”مجھے آپ سے پورا پورا اتفاق ہے،“ ٹکولائی نے جواب دیا۔ اس کا چہرہ تھمتھا رہا تھا۔ وہ اپنی پالیٹ کو یوں تروڑ مروڑ اور اور پنے گلاس کو یوں آگے پیچھے دھکیل رہا تھا جیسے اسے یہ اندیشہ ہو کہ اس لمحے وہ خطرہ عظیم میں پھنس گیا ہے اور اب اس سے عہدہ برآ ہونے کے لیے مرنے مارنے پر تل جانے کا تہیہ کر رہا ہے۔ ”مجھے یقین ہے کہ ہم روسیوں کو فاتح سے ہم کنار ہونا چاہیے یا موت کو لگے لگایا جا رہے،“ اس نے کہا۔ لیکن جب الفاظ اس کے منہ سے نکل چکے، دوسروں کی طرح اسے بھی یہ محسوس ہوا کہ یہ (اتفاق) ضرورت سے کچھ زیادہ ہی جوشیلے اور بلند آہنگ ہیں، چنانچہ وہ بے تکے اور بے عمل ہیں۔

”ابھی آپ نے جن خیالات کا اظہار کیا، وہ بہت خوبصورت اور دیدہ افروز تھے،“ جولی نے تبصرہ کیا اور ساتھ ہی اس کی آہٹ لگی گئی۔

جب ٹکولائی تقریر کر رہا تھا، سونیا سر سے پاؤں تک کانپ رہی تھی۔ اسے اتنی شرم محسوس ہو رہی تھی کہ اس کا چہرہ ہی نہیں، کانوں کی لویں، بلکہ ن سے نیچے گردن اور کندھے بھی سرخ ہو گئے۔
 پیٹر نے کرل کی تقریر سنی اور اظہارِ پسندیدگی کے لیے اپنی گردن ہلا دی۔
 ”بہت اعلیٰ جذبات ہیں،“ اس نے کہا۔

”یہ نوجوان سچا اور کھرا ہوزار ہے؟“ کرل نے ایک بار پھر میز پر زار سے مٹکا مارتے ہوئے با آواز بلند کہا۔
 ”آپ لوگ اتنا شور و غل کیوں کر رہے ہیں؟“ اچانک میز کے دوسرے سرے سے ماریا متر یونا کی گھبراہٹ سے آواز سنائی دی۔ ”یہ تم میز پر کئے کیوں مار رہے ہو؟“ اس نے ہوزار کو ڈانٹتے ہوئے پوچھا۔ ”آخر اس طرح چیخ و جھج کر چھت سر پر اٹھانے کی کیا تنگ ہے؟ تمہارا خیال ہے کہ یہاں تم فرانسیسیوں سے بھڑ رہے ہو؟“

”میں خدا لگتی مات کہہ رہا ہوں،“ ہوزار کرٹل نے مسکرا کر کہا۔

”ہم جنگ کے بارے میں گفتگو کر رہے ہیں،“ کاؤنٹ نے گل پھاڑ کر کہا، تاکہ اس کی آواز میز کے دوسرے کنارے پہنچ سکے۔ ”آپ جانتی ہیں کہ میرا لخت جگر بھی، ماریا دستریونا میرا لخت جگر بھی، محاذ جنگ پر جا رہا ہے۔“

”ہونہ، میرے چار بیٹے فوج میں ہیں لیکن میں تو کوئی دار بچا نہیں کر رہی۔ یہ سب کچھ خداوند کے اختیار میں ہے۔ موت نے آنا ہے، تو بستر پر بھی اس سے کوئی مفر نہیں اور اگر خداوند نے تمہیں بچانا ہے، پھر میدان جنگ میں بھی تمہارا ہل بیکا نہیں ہو سکتا،“ ماریا دستریونا نے کہا۔ اس کی کھٹک دار آواز بے ساختہ میز کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک پہنچ رہی تھی۔

”آپ نے بجا رشاد فرمایا۔“

گفتگو میں ایک بار پھر ٹھہراؤ آ گیا۔ یہ زیادہ تر میز کے کناروں پر مرکوز تھی، جہاں ایک طرف مرد اور دوسری طرف خواتین یک دوسرے سے باتیں کرنے میں مشغول تھیں۔

”تم پوچھ سکو گی!“ ناسا کا چھوٹا بھائی کہہ رہا تھا۔ ”دیکھ لیا، تم نہیں پوچھ سکتیں!“

”پوچھ سکتی ہوں، بالکل پوچھوں گی!“ ناسا نے تڑاخ سے جواب دیا۔

سرست بخش، درنا، قبت، عدیش، حزم سے اس کا چہرہ تسمانے لگا۔ وہ اپنی کرسی سے اٹھی اور نیم ایستادہ کھڑی ہو گئی۔ اس نے میز کی طرف، جو اس کے سامنے بیٹھا ہوا تھا، ایسی نگاہوں سے دیکھا جیسے اسے دعوت دے رہی ہو کہ جو کچھ پیش آنے والا ہے، وہ بھی اس کا مشاہدہ کرے۔ پھر اس نے مڑ کر اپنی ماں کی طرف دیکھا۔

”ماما!“ اس کی کھٹکتی، گونج دار بچکانہ آواز کمرے کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک سنائی دی۔

”کیا بات ہے؟“ کاؤنٹس نے گھبرا کر پوچھا۔ لیکن جب اس نے اپنی بیٹی کی جانب دیکھا، تو اسے احساس ہوا کہ وہ کوئی شرارت کرنا چاہتی ہے۔ اس نے پتی گردن کو یوں جھٹکا دیا جیسے وہ اپنی بیٹی کو سرزنش کر رہی ہو اور اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کر رہی ہو۔ اس نے اپنی انگلی بھی درست انداز سے اس کی طرف لہرائی۔

کمرے میں مرگ آسا سکوت طاری ہو گیا۔

”ماما، آج بیٹھا کیا بنا ہے؟“ ناسا کی توفیر آواز اور بھی واضح اور محکمہ دار لہجے سے گونجی۔

کاؤنٹس نے ماتھے پر تیوریاں چڑھانے کی کوشش کی لیکن ناکام رہی۔ ماریا دستریونا نے اپنی موٹی انگلی اس کی طرف لہرائی۔

”قازق!“ اس نے دھمکی آمیز انداز سے کہا۔

اکثر مہمانوں کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس شرخی اور شرارت پر کس طرح کا رد عمل ظاہر کریں۔ چنانچہ وہ اس کے والدین کی سمت میں دیکھنے لگے۔

”خبردار!“ کاؤنٹس نے کہا۔

”ما، آج بیٹھ کر بتا ہے؟“ نسا شائے دریدہ دامن اور منہ پھٹ انداز سے پوچھا۔ اس کے انگ انگ سے مسرت پھوٹی پڑ رہی تھی اور اسے پورا اعتماد تھا کہ اس کی اس شوخی کا برا نہیں منایا جائے گا۔
سو نیا اور فرہما کی نگہ چٹا ہنستے ہنستے دوہرے ہو گئے۔

”دیکھا، میں نے پوچھ لیا،“ نسا شائے اپنے چھوٹے بھائی اور میٹر کے، جس پر ایک بار پھر اس نے اچھتی نگاہ ڈالی تھی، کان میں کہا۔

”آئس کریم۔ لیکن تمہیں کچھ نہیں ملے گا،“ مرید متر یونا نے کہا۔

نسا شائے گئی کہ ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔ چنانچہ اس نے مرید متر یونا کو بھی ملکا کر دیا۔
”مرید متر یونا، کون سی آئس کریم؟ مجھے ویلہ بالکل پسند نہیں،“ اس نے کہا۔
”کاجر کی آئس کریم۔“

”نہیں، کون سی، مرید متر یونا، کون سی؟“ اس نے چلا کر کہا۔ ”میں جانتا جاہتی ہوں۔“

مرید متر یونا اور کاؤنٹس کھلکھدا کر ہنس پڑیں اور ہاتی مہمان بھی اس ہنسی میں شریک ہو گئے۔ انہیں ہنسی مرید متر یونا کے جواب پر نہیں آئی تھی بلکہ انہیں اس بھی مٹی مڑکی کی ناقابل یقین دلیری اور فراست نے ہنسا دیا تھا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ کوئی شخص، مرید متر یونا کے ساتھ اتنی جرأت، بے باکی اور جذباتی سے پیش آ سکتا ہے۔

نسا شائے اس وقت خاموش ہوئی جب اسے بتایا گیا کہ آئس کریم انٹاس کی ہوگی۔ آئس کریم سے پہلے مہمانوں کی تواضع ٹمپکوں سے کی گئی۔ سرزینہ دو بارہ بجنے لگا۔ کاؤنٹ اور کاؤنٹس نے ایک دوسرے کو بوسہ دیا اور تمام مہمان کاؤنٹس کو مہارک سلامت پیش کرنے کے لیے اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ میز پر موجود ہر شخص اپنا گلاس کاؤنٹ، بچوں اور دوسرے لوگوں کے گلاسوں سے نکرانے لگا۔ ایک بار پھر بیرے، ادھر ادھر بھاگنے پھرنے لگے، کرسیاں گھسیٹیں جانے لگیں اور وہ جس ترتیب سے ڈائننگ روم میں داخل ہوئے تھے، اسی ترتیب سے لیکن پہلے کی نسبت زیادہ سرخ چہروں کے ساتھ واپس ڈرائنگ روم اور کاؤنٹ کے شڈی روم میں چلے گئے۔

17

ٹائٹس کی میز پر بچھادی گئیں اور بوسٹن⁴¹ کے کھیل کے لیے پارٹیاں ترتیب دے دی گئیں۔ اور کاؤنٹ کے مہمان دونوں ڈرائنگ روموں، شڈی روم، ورنشست گاہ میں ڈٹ گئے۔

کاؤنٹس کی تحریک پر نوجوان لڑکے لڑکیاں کلاوی کارڈ (Clavi Chord) اور ہارپ (harp) (آلات موسیقی) کے گرد اکٹھے ہو گئے۔ حاضرین کی مشترکہ درخواست پر سب سے پہلے جولی نے ہارپ پر ہلکی پھلکی دھن طرز بدل بدل کر بجائی۔ اس کے بعد اس نے دوسری نوجوان خواتین کے ساتھ مل کر نسا شائے اور نکولائی سے، جو اپنی خواتین جیلا جیتوں کی بنا پر خامے جانے پہچانے تھے، درخواست کی کہ وہ کوئی نغمہ سنائیں۔ نسا شائے جب یہ دیکھا کہ

اس کے ساتھ ایسا سلوک ہو رہا ہے، جیسے وہ بالغ خاتون ہو، وہ بظاہر اس پر بہت مازاں معلوم ہو رہی تھی، لیکن اس کے باوجود شرمناک رہی تھی۔

”کون سا نغمہ گائیں؟“ اس نے پوچھا۔

”پیشہ؟“ نکول کی نے سمجھایا۔

”اچھا، پھر جدی کرو۔ بورس ادھر آؤ،“ ناسا نے کہا۔ ”سونیا کہاں ہے؟“

اس نے ادھر ادھر بھاگنا دوزائی لیکن جب اسے اپنی پہلی کمرے میں نظر نہ آئی، وہ اس کی تلاش میں بھاگتی دوزئی باہر نکل گئی۔

”ناسا بھاگتی، چھلانگیں لگاتی، سونیا کے کمرے میں پہنچی لیکن جب اس نے دیکھا کہ سونیا وہاں نہیں ہے، وہ برق رفتاری سے زمری کی طرف دوڑنے لگی۔ لیکن سونیا وہاں بھی نہیں تھی۔ ناسا کو خیال آیا کہ سونیا اس صندوق پر، جو راہداری میں پڑا تھا، بیٹھی ہوگی۔ رستوف گھرانے میں یہ دستور بن گیا تھا کہ جوڑیاں آنسو بہانا چاہتیں، وہ اسی صندوق پر بیٹھ کر بہا کر تیں۔ سونیا واقعی وہاں موجود تھی۔ صندوق کے اوپر، یا کاغذ و حار کی دار بستر، جس میں پر بھرے ہوئے تھے، رکھ ہوا تھا۔ وہ اس پر سر نہوڑائے لیٹی ہوئی تھی۔ اس کا بھین جالی دار ڈریس ٹریڈ ہو رہا تھا۔ وہ اپنا چہرہ اپنی باریک انگلیوں میں چھپائے یوں ہو کے لے کر رو رہی تھی کہ اس کے ننھے منے کندھے کپکپا رہے تھے۔ ناسا کا چہرہ، جو نام دن کے موقع پر صبح سے چمک دکھ رہا تھا، یک دم متغیر ہو گیا۔ اس کی آنکھیں ٹھہر گئیں، اس کا گلا سکڑ گیا اور اس کے منہ کے کنارے لٹک گئے۔

”سونیا، کیا ہوا؟ کیا بات ہے؟“ کیا بات ہے؟، او۔ ہو کچھ تو بولو!“

ناسا کو یہ معلوم ہو چکا تھا کہ سونیا رو رہی ہے۔ ناسا کا لمبا چوڑا منہ کھل گیا اور یوں وہ خاصا بد صورت نظر آنے لگا۔ وہ بھی رودھ پیتے بچے کی طرح رونے لگی لیکن کیوں؟ اس کی وجہ سے خود بھی معلوم نہیں تھی۔ سونیا نے اپنا سر اٹھانے اور جواب دینے کی کوشش کی تاہم ناکام رہی اور اس نے اپنا چہرہ مزید بستر کے اندر کر لیا۔ ناسا دھاریوں والے بستر کے اوپر بیٹھ گئی، اس نے اپنے بازو اپنی سہیلی کے گلے میں لٹکائے اور رونے لگی۔ سونیا نے ہمت کر کے اپنے آپ کو سنبھالا۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ وہ اپنے آنسو پوچھنے اور اسے سب کچھ بتانے لگی۔

”نکولیز کا ہفتے شرے میں چلے جائیں گے۔ ان کے۔ ان کے کاغذات۔ کچھ گئے ہیں۔ انہوں نے خود مجھے بتایا ہے۔ تاہم مجھے رونا نہیں چاہیے تھا۔“ اور اس نے کاغذ کا پرزہ نکالا۔ اس پر نکولائی نے شعار تحریر کیے تھے۔ ”مجھے رونا نہیں چاہیے۔“ لیکن تم۔ تم کیا، کوئی بھی۔ یہ نہیں سمجھ پاؤ گی کہ وہ کتنے پیچھے اور نیک ہیں۔“

جب اسے خیال آیا کہ وہ کتنا اچھا اور نیک ہے، اس کے دوبارہ ٹپ ٹپ آنسو بہنے لگے۔

”تمہارا معاملہ بالکل ٹھیک ٹھاک ہے۔ میں جتنی نہیں ہوں۔ مجھے تم سے، وریس سے بھی، محبت ہے۔“ اس نے کوشش کر کے اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے کہا۔ ”وہ نفیس انسان ہیں۔ تمہارے راستے میں کوئی رکاوٹ نہیں

ہے۔ لیکن نکولائی میرے خلیفے ہیں۔ اور ہمیں شادی کے لیے۔ اجازت لینا ہوگی۔ اور یہ اجازت صرف اسقف اعظم سے مل سکتی ہے۔ ورنہ ناممکن۔ اس کے علاوہ گرویرا نے ماما (سونیا کا ڈنٹس کو ماما کہا کرتی تھی) کو بتا دیا کہ میں نکولائی کا کیریئر برباد کر رہی ہوں، کہ میں کشور، سنگ دل اور ناشکری ہوں جب کہ حقیقت یہ ہے۔ خدا شاہد ہے۔ اور اس نے اپنے سینے پر صلیب کا نشان بنایا۔ ”کہ میں ان (کا ڈنٹس) سے اور تم سب سے سوائے دیراکے، اتنی شدید محبت کرتی ہوں۔ لیکن وہ (دیرا) ایسی کیوں ہے... میں نے اس کا کیا بگاڑا ہے؟ میں تمہاری اتنی احسان مند ہوں کہ میں اپنا سب کچھ قربان کر سکتی ہوں۔ لیکن میرے پاس ہے کیا جو میں قربان کر سکوں...؟“

سونیا سے مزید کچھ نہ کہا گیا۔ اس نے دوبارہ اپنا چہرہ اپنے ہاتھوں میں چھپ لیا اور پروں کے بستر پر گر پڑی۔ ناشائے اسے تسلی دینے کی کوشش کی لیکن اس کے چہرے کے تاثرات سے واضح طور پر دکھائی دے رہا تھا کہ وہ اپنی سہیلی کی مشکلات کی گہیرا کو پوری طرح سمجھتی ہے۔

”سونیا“ اس نے اچانک گڑ گڑا کر کہا جیسے ابھی ابھی اسے ابہام ہوا ہو اور اسے اپنی خلیفہ کے مصائب کی صحیح نوعیت کا ادراک ہو گیا ہو۔ ”مجھے یقین ہے کہ کھانے کے بعد دیرا نے مارا تمہیں کچھ کہا ہوگا۔ ٹھیک؟“

”ہاں، یہ اشعار، جو کچھ نکولائی نے اپنے ہاتھ سے تحریر کیے تھے اور کچھ میں نے نقل کیے تھے، اسے میری میز پر پڑے مل گئے اور اس نے مجھ سے کہا کہ وہ انھیں ماما کو دکھا دے گی۔ اس نے یہ بھی کہا کہ میں ناشکری ہوں، یہ کہ ماما کبھی میری ان سے شادی نہیں ہونے دیں گی اور یہ کہ وہ جونی سے شادی کریں گے۔ اور یہ تو تم نے بھی دیکھا ہوگا کہ وہ کس طرح سارا دن اس کا دم چھلا بنے رہے ہیں۔ وہ ناشائے کیوں؟“

اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اب کے اس کے آنسو روکے رکھتے نہیں تھے۔ ناشائے اسے اٹھا کر بٹھایا، اپنے بازو اس کے گلے میں ڈالے اور خود اپنے آنسوؤں کے بیچ مسکراتے ہوئے سے تسلی دلا سادینے لگی۔

”سونیا ڈارلنگ، اس کی باتوں پر مت جاؤ! مت جاؤ اس کی باتوں پر تمہیں یاد ہے کہ ہم تینوں۔ تم، میں اور نکولائی۔ چند روز قبل نشست گاہ میں کسی گفتگو کر رہے تھے؟ اور ہم نے یہ بھی طے کیا تھا کہ ہر مسئلہ کیسے نپایا جائے گا؟ مجھے صحیح صحیح تو یاد نہیں کہ فیصلہ کیا ہوا تھا لیکن تمہیں اتنا تو یاد ہوگا کہ ہمیں حالات اتنے گہیر نظر نہیں آئے تھے بلکہ سارا گار ہی دکھائی دیے تھے اور ہر بات ممکن معلوم ہوتی تھی۔ یہ بھی تو دیکھو کہ ماموں شن شن کے بھائی کی شادی پہلی چیز ہی کی چیچیری سے ہوئی تھی اور ہم تو دوسری چیز ہی کے خلیفے ہیں۔ اور یورس کا کہنا ہے کہ کوئی مشکل پیش نہیں آئے گی۔ تمہیں معلوم ہے کہ میں نے انھیں سب کچھ بتا دیا ہے۔ وہ اتنے سمجھ دار اور نیک خصلت ہیں!“ ناشائے نے کہا۔ ”سونیا، مائی ڈارلنگ، میری جاں سونیا، مت رو!“ اس نے اسے چومتے اور ہنستے ہوئے کہا۔ ”دیرا کینہ پرور ہے امت پر داکر اس کی سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہو جائے گا۔ اور وہ امی سے کچھ نہیں کہہ سکے گی، نکولائی خود ہی انھیں بتا دے گا۔ اور جونی کو تو وہ جونی کے برابر بھی نہیں سمجھتا۔“

اور ناشائے اس کی پیشانی چوم لی۔ سونیا اٹھ کر بیٹھ گئی۔ ننھی بلونگڑی کے تن مردہ میں پھر سے جان پڑ گئی۔

اس کی آنکھوں میں چمک آگئی اور یوں محسوس ہونے لگا جیسے وہ ابھی بھی پھیری لے گی، ہاتھ پل کر اپنے پنجوں پر کھڑی ہو جائے گی اور جیسا کہ بلوگزیوں کی عادت ہوتی ہے، اپنی دم زور سے لہرائے گی، مڑاک کی آواز آئے گی وروہ گیند کے ساتھ کھیلنے لگے گی۔

”تمہارے خیال میں یونہی ہوگا؟۔۔ سچ سچ، بالکل ایسے ہی؟“ اس نے پھرتی سے اپنے ڈریس کی شکنیں وریالوں کی ابھی لٹیں درست کرتے ہوئے کہا۔

”سچ سچ، بالکل ایسے ہی؟“ فنا شانے اپنی کھلی کے بالوں کی ایک لٹ، جو ڈھیلی ہو گئی تھی اور قابو میں نہیں آ رہی تھی، اس کے جوڑے میں دوبارہ اٹکاتے ہوئے کہا۔
اور وہ دونوں ہنس پڑیں۔

”اچھا، پھر چپے ہیں اور چشمہ گاتی ہیں۔“
”چلو، چلیں!“

”تمہیں معلوم ہے کہ وہ موٹا بیئر، جو میرے سامنے بیٹھا تھا، بڑا ہنسوڑ ہے؟“ فنا شانے چاک رک کر کہا۔
”آج، خدا کی قسم، بڑا لطف آرہا ہے!“
اور اس نے راہداری میں دوڑ لگا دی۔

سو نیا اپنے ڈریس پر ردئیں دار پر، جو وہاں چمٹ گئے تھے، جھڑتے اور اشعار کا کاغذ چروں کے نیچے اپنے دبے پتلے سینے پر چھپاتے متمتاتے چہرے اور ہلکے پھلکے پر مسرت قدموں کے ساتھ راہداری میں فنا شا کے پیچھے پیچھے بھاگتے دوڑتے شست گاہ میں داخل ہو گئی۔

مہمانوں کی درخواست پر نوجوان لڑکے اور لڑکیاں ”چشمہ“ گائے گئے۔ اس گیت نے، جسے چار اشخاص مل کر گاتے تھے، سامعین کے دل موہ لیے۔ پھر کھلائی نے ایک نغمہ چھیڑ دیا۔ یہ اس نے حال ہی میں سیکھا اور یاد کیا تھا۔

ایک حسین شب چاند کی مدھم روشنی کے نیچے
یہ جان کر طبیعت پر وجد طاری ہونے لگتا ہے
کہ اس (بھری پری) دنیا میں کوئی تو ہے
جو صرف تیرے ہی پارے میں سوچتا ہے!

اور حسین دنازک انگلیاں
جو کبھی تھکنے کا نام نہیں لیتیں

زریں بربط کے تاروں پر آہستہ آہستہ پھر رہی ہیں
اور بے خود گردینے والا نغمہ الاپ رہی ہیں

یہ نغمہ تھے، اور صرف تجھے پکار رہا ہے!
ایک روز جب فردوس کی ٹھنڈی ہوا کس چلیں گی
تیرا دوست، افسوس، صد افسوس، اس دنیا سے کوچ کر چکا ہوگا!

اس نے پناہ نغمہ بھی بمشکل کھل کیا تھا، کہ نہ جوان لڑکے ور لڑکیاں بال روم میں رقص کی تیاریوں میں مصروف ہو گئے اور ادھر گیلری میں سازندوں کے کھنکارنے اور ان کے قدموں کے کھٹکھٹنے کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔



پیر ڈرائنگ روم میں بیٹھا تھا۔ چونکہ وہ ابھی حال ہی میں ممالک غیر سے لوٹا تھا، شن شن نے اسے اپنے اڑنگے میں کس لیا اور اسے سیاسی بحث میں ابھالیا۔ متعدد دیگر افراد بھی اس بحث میں شریک ہو گئے لیکن خود پیر کو اس سے اکتاہٹ ہونے لگی۔ جب موسیقی کی دھنیں بہنے لگیں، ناشا ڈرائنگ روم میں گئی۔ اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ وہ سیدھی پیر کے پاس پہنچی اور شرماتے لجاتے لہجے میں اس سے بولی

”ماما نے مجھے ہدایت کی ہے کہ میں آپ سے درخواست کروں کہ آپ بھی رقص میں شریک ہوں۔“
”مجھے اندیشہ ہے کہ رقص کی معینہ چت پھرت میں کہیں مجھ سے گڑ بڑا ہٹ نہ ہو جائے،“ پیر نے جواب میں کہا۔ ”لیکن، اگر تم میری رہنمائی کرنے کی ہامی بھرو۔“ اور وہ ملی پتلی نرم و نازک دد شیزہ کے سامنے جھک کر اس نے اپنا بھاری بھر کم بازو اسے تھما دیا۔

جب دوسرے جوڑے اپنی منہیں درست کر رہے تھے اور سازندے دھنیں درست کر رہے تھے، پیر اپنی ننھی منی ریفقہ کے ساتھ نیچے بیٹھ گیا۔ ناشا خوشی سے بے حال ہو رہی تھی۔ اسے ایک بانگ مرد کے ساتھ، جو ابھی حال ہی میں پرانے دیس سے واپس آیا تھا، رقص کرنا تھا۔ وہ اس کے قریب کچھ اس انداز سے چٹھی ہوئی تھی کہ سب کی نگاہیں اسی پر پڑ رہی تھیں۔ وہ اس کے ساتھ کچھ اس طرح گفتگو کر رہی تھی، جیسے وہ ہنسی نہ ہو، بلکہ بانگ عورت ہو۔ اس کے ایک ہاتھ میں پٹکیا تھی جو ایک خاتون نے اسے تھما دی تھی۔ اس نے تجربہ کار اور جہاں دیدہ خاتون کے اطوار پنا لیے (خدا جانے اس نے یہ اطوار کہاں سے سیکھے تھے) اور اپنے آپ کو پٹکیا جھلنے لگی۔ وہ اپنے ساتھی کے ساتھ باتیں بھی کرتی جاتی تھی اور پٹکے کی ادٹ میں نکلیوں سے اسے دیکھتی بھی جاتی تھی۔

”ارے، اس لڑکی کے بارے میں کیا خیال ہے؟ ذرا اس پر نگاہ تو ڈالیں!“ کاؤٹنس نے بال روم میں سے گزرتے اور متحیر نگاہوں سے ناشا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
ناشا کا چہرہ سرخ ہو گیا اور وہ ہنسنے لگی۔

”اچھا واقعی ماما؟ پر آپ نے یہ کہا کیوں؟ آخر اس میں اچھبے کی کون سی بات ہے؟“



رقص کے تیسرے دور کے دوران میں، ڈرائنگ روم سے جہاں کاؤنٹ اور ماریا دستریوں نسبتاً معمر اور نامور مہمانوں کے ساتھ ناش کھیتے میں مصروف تھے، کرسیوں کے گھسٹنے کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ ان میں سے بیشتر اصحاب اٹھ کر کھڑے ہو گئے، وہ اپنے اعضاء سیدھے کرنے لگے کیونکہ اتنا طویل عرصہ بیٹھے بیٹھے وہ اکڑ گئے تھے۔ پھر انھوں نے اپنے پرس اور پاکٹ بکس ایک طرف رکھیں اور بال روم کا رخ کرنے لگے۔ سب سے پہلے کاؤنٹ اور ماریا دستریوں اندر داخل ہوئے۔ وہ دونوں خوشی سے پاؤں ہلے جا رہے تھے۔ کاؤنٹ کو دل لگی سو جھمی۔ اس نے پہلے ڈانس کے انداز میں اپنا بازو خمد کیا اور جیسے وہ رسم نبھا رہا ہو، اسے ماریا دستریوں کے ہاتھ میں دے دیا۔ وہ سیدھا تن کر کھڑا ہو گیا۔ بائیں شجاعوں کی طرح مسرت سے اس کا چہرہ دمک رہا تھا اور جب رقص کی آخری چلت پھرت اختتام پذیر ہوئی، اس نے تاں بجا کر اوپر گیلری میں سزندوں کو اشارہ کیا اور پہلے وائکن نواز سے چلا کر دریافت کیا۔

”سیسی اورن، تمہیں ڈینیل کو پر کی دھن آتی ہے؟“

یہ کاؤنٹ کا پسندیدہ رقص تھا۔ اپنے شباب کے زمانے میں وہ بھی رقص کرتا تھا۔ (اگر صحیح انداز سے دیکھا جائے تو ڈینیل کو پر مکمل رقص نہیں تھا، بلکہ انگریزی لوک رقص ⁴³ اسٹیکیز کی ایک چلت پھرت یا زرت تھا۔)

”ڈرا پاپا کو دیکھیں!“ نانا شانے تمام حاضرین سے پورے زور سے چلا کر کہا۔ وہ یہ بھوس گئی تھی کہ بچی ہونے کے باوجود وہ خود بھی ہنسی مرد کے ساتھ رقص کر رہی تھی۔ وہ ہنستے ہنستے دوہری ہو گئی اور اس کا سر، جس پر گھونگر یا لے بال تھے، اس کے گھٹنوں کو چھونے لگا۔ پورا کمرہ اس کی ہنسی سے گونج اٹھا۔

اور خدا لگتی بات یہ ہے کہ جب حاضرین نے اس ہنسوز اور خوش طبع معمر شریف زادے کو اپنی باوقار اور پر شکوہ ساتھی (ماریا دستریوں اس سے رہی تھی) کے پاس کھڑے دیکھا، وہ مسرت کے عالم میں مسکرانے لگے۔ اپنے شانوں کو پیچھے جھٹکتے، خمد بازوؤں کو آگے بڑھاتے اور اس کے ساتھ موسیقی کے سرور کا ساتھ دیتے، پاروں کی انگلیوں ذرا آگے نکالتے، ایک پاؤں سے ہلکے ہلکے تھاپ دیتے اور اپنے گول مٹول چہرے پر تبسم کی کرنیں بکھیرتے، جس سے اس کے خدو خال اور بھی پھیل گئے، کاؤنٹ نے اشارتاً ناظرین کو یہ بھادیا کہ انھیں آئندہ لحاکت میں کن چیزوں کی توقع کرنا چاہیے۔ جو نہی ڈینیل کو پر کی تیز، جوشیلی اور متوالی دھنیں کانوں میں رس گھولنے لگیں (یہ دھنیں بہت آفریں دیہاتی رقص کی دھنوں سے مشابہ تھیں)، بال روم کے تمام دروازوں پر گھریلو ماز میں کی بھیڑ لگ گئی۔ مرد ایک طرف کھڑے تھے درخور تیس دوسری طرف۔ ان سب کے چہرے دمک رہے تھے اور وہ اپنے آقا کو رنگ دلیاں مناتے دیکھنے آئے تھے۔

”آقا کو دیکھو، بالکل عقاب ہیں عقاب“ ایک دروازے پر بوڑھی آیا کی بند آہنگ آواز سنائی دی۔

کاؤنٹ خوبصورت رقص کر رہا تھا اور سے اپنے رقص کی رعنائی کا خود بھی احساس تھا۔ لیکن اس کی رقیقہ نہ رقص کر سکتی تھی اور نہ اسے اس کی پروا تھی۔ اس کا بھاری بھر کم تن ونوش الف سیدھا کھڑا تھا اور اس کے فریبہ گداز باز اس کے پہلوؤں پر ڈھلکے ہوئے تھے۔ (اس نے اپنا چشمہ کاؤنٹس کے سپرد کر دیا تھا۔) اس کا صرف درشت لیکن خوش شکل چہرہ رقص میں مصروف تھا۔ جو کچھ کاؤنٹ کے دل و دماغ میں تھا، اس کا اظہار سراپا اس کے گول منوں جسم سے ہو رہا تھا۔ اس کے برعکس ماریا دمتریونا اپنا مفہوم صرف اپنی ہر لحظہ پھیلتی مسکراہٹ اور اپنی پھڑ پھڑاتی ناک کے ذریعے ادا کر رہی تھی۔ لیکن ایک طرف اگر کاؤنٹ نے حاضرین کے دل اپنے صبار فقاہ پاؤوں کی پھرتی اور غیر متوقع طور پر اپنی دس ربائلوں سے جیت لیے، تو دوسری طرف ماریا دمتریونا نے، ہنگامے نہ پھٹکری رنگ بھی چوکھا آئے، زور بھی حاصل نہ لگایا لیکن حاضرین کے قلوب پر وہی نقوش ثبت کر دیے جو کاؤنٹ نے کیے تھے۔ وہ صرف اپنے کندھے ہل رہی تھی، یا موڑ کاٹتے ہوئے بازو جھکا لیتی اور یا پھر پاؤوں کی تھاپ سے موسیقی کی لے کا ساتھ دے دیتی۔ چونکہ وہ خاصی لمبیم عورت تھی اور عادتاً مزاج کے اعتبار سے بھی بڑی سخت اور درشت۔ اس لیے اس کی ت چھوٹی چھوٹی اداؤں پر ہی لوگوں نے جی کھول کر داد دی۔ رقص تیز اور تیز سے تیز تر ہوتا گیا۔ دوسرے جوڑے بھی مصروف رقص تھے لیکن کسی نے ان کی طرف توجہ نہ دی اور نہ انھوں نے ان کی توجہ اپنی طرف مبذول کرانے کی کوشش کی۔ تمام حاضرین کاؤنٹ اور ماریا دمتریونا کو دیکھنے میں منہمک تھے۔ ناشا کبھی اس کا ڈریس کیچنٹی، در کبھی اس کی آستین گھسیٹتی اور زور دے کر انھیں کہتی، ”دیکھیں، پاپا، کیا کر رہے ہیں؟“ لیکن اس کی قطعاً کوئی ضرورت نہ تھی کیونکہ سبھی کی نگاہیں رقصاں جوڑے پر مرکوز تھیں اور کوئی بھی انھیں ادھر ادھر ہٹانے کا روادار نہیں تھا۔ رقص کے دوران میں جو وقفے آتے، ان میں ہاپتا، زور زور سے سانس لیتا، کاؤنٹ سازندوں کی طرف اشارہ کرنا اور انھیں ما آواز بلند پکار کر کہتا کہ وہ دھن تیز، اور تیز بجانیں۔ کاؤنٹ، تیز، تیز تر، تیز تر میں پھر کی طرح گھومے جا رہا تھا۔ اس کی حرکات میں سبک رفتاری ہی نہیں بلکہ سلیقہ اور ہنرمندی بھی تھی۔ وہ اپنی ساتھی کے گرد دیوانہ وار گھوم رہا تھا۔ کبھی وہ پاؤوں کی انگلیوں پر اور کبھی یڑیوں پر رقص کرنے لگتا تا آنکہ اس نے اپنی رقیقہ کو اٹھ با، گھمایا اور اپنی جگہ پر لاکھڑا کیا، اور یوں اپنے رقص کی آخری حرکات پایہ تکمیل کو پہنچا دیں۔ پھر اس نے اپنے پاؤوں کو ذرا سر پچھلی جانب جھٹکا دیا، اپنے سینے سے تر سر کو خیدہ کیا، اپنے بازو کو دور تک لہرایا اور مسکرانے لگا۔ قہقہوں کا شور بلند ہوا اور دو تحسین کے ڈونگرے برسنے لگے۔ اور سب سے اونچی آواز سٹاش کی تھی۔ دونوں ساکت و خاموش کھڑے تھے۔ وہ دھوکئی کی طرح ہانپ رہے تھے اور سوتی رومالوں سے اپنے چہرے پونچھ رہے تھے۔

”تو یہ تھا ڈیٹیل کو پرا“ ماریا دمتریونا نے گہری سانس لیتے اور اپنی آستین اندر گھسوتے ہوئے کہا۔

ہو رہے تھے، چھٹا۔ سنگیز رقص ہو رہا تھا اور جب خستہ و در ماندہ بادورچی اور وردی پوش ماز میں سپر تیار کر رہے تھے، عین انھی لمحات کے دوراں میں کاؤنٹ بزدل خوف پر فانی کا چھٹا حملہ ہوا۔ ڈاکٹروں نے اعلان کر دیا کہ اب اس کے بچنے کی کوئی امید نہیں رہی۔ ستر مرگ پر در ز شخص خود تو کچھ بول نہیں سکتا تھا، اس لیے اس کی جانب سے کسی دوسرے شخص نے گناہوں کا اعتراف نامہ پڑھا، عشاءے ربانی کی رسم کی اور نیکی عمل میں لائی گئی اور مقدس روغن سے اس کا مسح کرنے کی تیاریاں ہونے لگیں۔ اس قسم کے حالات میں عام طور پر گھروں میں ہل چل اور امید و بیم کی جو کیفیت دیکھنے میں آتی ہے، اس کا اظہار یہاں بھی ہونے لگا۔ باہر سڑک پر چیمیز و تکفین کرنے والوں کا ہجوم اکٹھا ہو گیا تھا۔ انھیں توقع تھی کہ کاؤنٹ کا جنازہ خوب دھوم سے اٹھے گا اور ان کے وارے نیارے ہو جائیں گے۔ تاہم کاؤنٹ کے محل نما مکان میں گاڑیوں کا جو مسلسل بانٹا بندھا تھا، ان میں سوار لوگوں کی نگاہوں سے بچنے کے لیے وہ پھرتی سے ان کی اوٹ میں ہو جاتے۔ ماسکو کا گورنر جنرل، جو کاؤنٹ کی صحت کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے مسلسل اپنے ایجوٹ بھیجتا رہا تھا، امپراطورہ کی تھرمین کے دربار کے نامی گرامی مصاحب کو آخری لواحق کہنے کے لیے اس شام بذات خود آ گیا۔

آراستہ و پیراستہ استقبال کمرے میں ملاقاتیوں کا ہجوم اتنا بڑھ گیا تھا کہ تل دھرنے کو جگہ باقی نہیں رہ گئی تھی۔ اور جب گورنر جنرل مریض کے پاس قریباً آدھ گھنٹہ تہا بیٹھنے کے بعد باہر نکل، تو ہر شخص احترا لمانا اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ تمام ملاقاتی جھک کر تسلیمات، بجا لائے لیکن گورنر جنرل نے ان کے سلام پر خاص دھیان نہ دیا۔ اس کی کوشش تھی کہ وہ حتی الامکان جلد از جلد وہاں سے کھسک جائے تاکہ وہ ڈاکٹروں، پادریوں اور رعیت داروں کی نگاہوں سے، جو اس پر مرکوز ہو گئی تھیں، بچ سکے۔ پرنس واسیلی، جو گزشتہ چند دنوں کے دوران میں خاصا دبدب اور پھیلا ہو گیا تھا، اسے دروازے تک چھوڑنے آیا۔ وہ سرگوشیوں میں بار بار کوئی بات اس کے سامنے دہرا رہا تھا۔

جب پرنس واسیلی گورنر جنرل کو باہر پہنچا آیا، وہ واپس آیا اور استقبال ہال میں دوسروں سے الگ تھلگ کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس نے بیٹی ایک ٹانگ دوسری ٹانگ پر دھری، کہنی گھٹنے پر نکائی اور دونوں ہاتھوں سے آنکھیں چھپا لیں۔ وہ کچھ دیر یونہی بیٹھا رہا، پھر اٹھا، خوف زدہ نگاہوں سے دائیں بائیں جھانکا اور اپنی عادت کے برعکس تیز قدم اٹھاتا اس طویل راہداری میں چھنے لگا جو مکان کے عقبی حصے میں پرنسوں کے اپارٹمنٹ میں جاتی تھی۔ جو لوگ نیم روشن استقبال کمرے میں بیٹھے تھے، وقفوں وقفوں سے آپس میں سرگوشیاں کرنے لگتے اور جب کسی شخص کے اندر جانے یا باہر نکلنے پر وہ دروازہ چڑھتا، جو کاؤنٹ کے، جس پر نزاع کا، لم طاری تھا، اپارٹمنٹ میں کھلتا تھا، وہ خاموش ہو جاتے اور ایسی نگاہوں سے، جن میں تجسس یا بیم ورجا کی کیفیت سمائی ہوتی، دیکھنے لگتے۔

”حیات نسانی کی گھڑیاں معین ہیں،“ ایک بزرگ پادری نے ایک خاتون سے کہا، جو اس کے پاس بیٹھی اور محمودانہ انداز سے اس کی گفتگوں رہی تھی۔ ”یہ گھڑیاں معین ہیں۔ ان سے کوئی مفر نہیں۔“

”آپ کے خیال میں مقدس روغن سے مسح کرنے میں تاخیر نہیں ہوگئی؟“ خاتون نے پادری کو اس کے

عہدے سے مخاطب کر کے یوں کہا جیسے اس معاملے میں اس کی اپنی کوئی رائے نہ ہو۔

”مادام، صبح کی یہ رسم بہت پر جلال ہوتی ہے۔ بڑے بڑے کاہن پانی ہو جاتا ہے،“ پارمی نے، اپنے گنبھ سر پر، جس پر چند گنے چنے بال رہ گئے تھے اور جنہیں اس نے کنگھی کی مدد سے ساری کھوپڑی پر پھیلا لیا تھا، ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

”وہ کون تھا؟ خود گورر جنرل؟“ کمرے کے دوسرے کونے میں بیٹھے ایک شخص نے دریافت کی۔ ”دیکھنے میں بالکل نو جوان نظر آتا تھا!“

”وہ ساٹھ سے اوپر نکل چکے ہیں۔ سنا ہے کہ اب کاؤنٹ کسی کو نہیں پہچانتے۔ کیا وہ مقدس روغن سے ان کا صبح کرنے کی تیاریوں میں مصروف ہیں؟“

”میں ایک ایسے شخص کو جانتا ہوں جس کا یہ صبح سات مرتبہ کیا گیا۔“
منجھلی پرنس مریض کے کمرے سے باہر آئی۔ رد و کر اس کی آنکھیں سرخ ہو چکی تھیں۔ وہ ڈاکٹر لوغین کے پاس بیٹھ گئی جو خود میز پر کہنی ٹکائے، بڑے فیسے سے امپراطورہ کی تھریں کی تصویر کے نیچے بیٹھا تھا۔

”خوبصورت!“ ڈاکٹر نے موسم کے متعلق ایک سوال کے جواب میں کہا۔ ”پرنس، موسم بہت سہانا ہے علاوہ ازیں، یوں بھی، سکو بچھ کر یہی محسوس ہوتا ہے کہ آپ دیہات میں آگئے ہیں۔“

”واقعی؟“ پرنس نے لمبی سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”پھر انھیں پینے کو کچھ دیا جاسکتا ہے؟“
لوغین سوچنے لگا۔

”انھوں نے دوا پی لی ہے؟“

”ہاں۔“

ڈاکٹر نے سرسری نگاہ گھڑی پر ڈالی۔

”ابے ہوئے پانی کا گلاس بھرو۔ اس میں چٹکی بھر (اس نے اپنی نرم و نازک انگلیوں سے اشارہ کر کے سمجھا کہ چٹکی سے اس کی کیا مراد ہے) کریم آف ٹارٹر ڈال دو۔۔۔“

”ایسا مریض کبھی دیکھا؟“ شاہنشاہ نے ایک جرمن ڈاکٹر ایک ایجوٹ سے کہہ رہا تھا، ”جو فالج کے تیسرے حملے کے بعد جان برہو گیا ہو۔“

”کتنا صحت مند تھا یہ شخص!“ ایجوٹ نے کہا۔ ”اور اس کی ڈھیروں دولت کس کے حصے میں آئے گی؟“
اس نے زیر لب اضافہ کیا۔

”کوئی نہ کوئی امیدوار مل ہی جائے گا،“ جرمن نے خندہ روئی سے جواب دیا۔

”ایک بار پھر دروازہ چرچا اور سب کی نگاہیں اس جانب اٹھ گئیں۔“ منجھلی پرنس وہ مشروب، جو اس نے لوغین کی ہدایات کے مطابق تیار کیا تھا، مریض کے کمرے میں لے جا رہی تھی۔

جرمن ڈاکٹر وین کے پاس آیا۔

”کیا خیال ہے وہ آج رات گزار جائیں گے؟“ جرمن نے گھٹیا فرانسیزی میں پوچھا۔

وین نے ہونٹ بھیجنے سے درخت نشی کے اظہار کے لیے اپنی انگلی اس کی ناک کے سامنے ہرانے لگا۔

”زیادہ سے زیادہ آج رات“ اس نے زیر لب کہا وروہاں سے ہٹ گیا۔ وہ خوش سلیقگی سے مسکرا رہا تھا۔

کیونکہ اسے یہ اطمینان تھا کہ اس نے نہ صرف مریض کی حالت کا صحیح صحیح ادراک کر لیا تھا بلکہ اس کا اظہار کرنے پر بھی اسے قدرت حاصل تھی۔



48 (الف)
دریں اثناء پرنس داسلی پرنس کے نیم تاریک کمرے کا دروازہ کھول چکا تھا۔ القوانات کے نیچے صرف دو یقینی لیب
جل رہے تھے۔ سودہ بوبان اور پھولوں کی خوشگوار مہک پھیلی ہوئی تھی۔ کمرے میں فرنیچر کی کوتاہ اشیا از قسم میز،
خاندان الماریاں اور دوسری الم غلم چیزیں بھری پڑی تھیں۔ سکرین کے عقب میں اونچے چنگ کی، جس کے اندر
پرندوں کے مہین پر بھرے ہوئے تھے، سفید چادریں نظر آ رہی تھیں۔ ایک چھوٹا سا کتا بھونکنے لگا۔

”اوہ، بھائی جان، آپ؟“

پرنس اٹھ کر کھڑی ہو گئی اور اپنے بال سنوارنے لگی۔ اس کے بال ہمیشہ ہی اور اب بھی غیر معمولی طور پر
سنے ہوار تھے کہ وہ اور اس کی کھوپڑی ایک ہی چیز لگتے تھے اور معلوم ہوتا تھا کہ ان پر کسی نے وارنش کر دیا ہے۔

”کیا بات ہے؟“ کچھ ہوتو نہیں گیا؟“ اس نے پوچھا۔ ”مجھ پر ہر وقت خوف سوار رہتا ہے۔“

”نہیں، حالت جوں کی توں ہے، کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ کاتش، میں تم سے کچھ باتیں کرنے آیا ہوں۔“

کاروہری باتیں۔ ”پرنس داسلی نے بڑبڑاتے ہوئے کہا، اور اس کرسی پر، جو پرنس نے خالی کی تھی، یوں بیٹھ گیا
جیسے تھکن سے اس کا برا حال ہو۔ ”تم اس کمرے کو خاصا گرم رکھتی ہو!“ اس نے حاشیہ راک کی اور بولا، ”اچھا،
بیٹھو، کام کی باتیں ہو جائیں۔“

”میرا خیال تھا کہ شاید کچھ ہو گیا ہے،“ پرنس نے کہا۔ وہ پرنس کے بالقلیل بیٹھ گئی اور اس کی باتیں سننے
کے لیے تیار۔ اس کے چہرے پر کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی، ہمیشہ کی طرح پتھر کا، سخت گیر اور مترد۔ ”بھائی جان،
میں کوشش کر رہی تھی کہ کچھ نیندا جائے لیکن بے سود۔“

”خیر، مائی ڈیر، کیا حال ہے؟“ پرنس داسلی نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے اور حسب عادت اسے نیچے
جھکاتے ہوئے کہا۔

یہ بالکل واضح تھا کہ اس نے جس انداز سے سوال کیا تھا، وہ ان باتوں کی طرف اشارہ کرتا تھا جو وہ دونوں
بخوبی سمجھتے تھے ورنہ انھیں الفاظ میں بیان کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے تھے۔

پرنس، جس کی کمر اس کی ٹانگوں کے مقابلے میں غیر متناسب طور پر لمبی تھی، جسم اکڑائے بیٹھی تھی۔ اس کی ملنگی متورم آنکھیں، جو ہر قسم کے جذبات سے عاری تھیں، سیدھی پرنس پر جمی ہوئی تھیں۔ اس نے اپنے سر کو ہلکا سا جھٹکا دیا، لمبی سانس لی اور ایقونات دیکھنے لگی۔ اس کی ان حرکات کی دو طرح توجیہ کی جاسکتی تھی۔ وہ یا تو اس انداز سے اپنے دل اور لگن کا اظہار کر رہی تھی یا پھر وہ یہ جتاننا چاہتی تھی کہ وہ بہت تھک چکی ہے اور اب امید کر رہی ہے کہ مصیبت سے چھٹکارا زیادہ دور نہیں۔

”تمہارے خیال میں میرے لیے یہ کوئی آسان کام ہے؟“ پرنس نے کہا۔ ”میں ڈاک گاڑی کے گھوڑے کی طرح تھک کر چور ہو چکا ہوں۔ میرا بند بندہ در در کر رہا ہے۔ ہم، کاتش مجھے تم سے کچھ گفتگو کرنا ہے، بے حد بنجیدہ گفتگو۔“ پرنس واسلی سے مزید کچھ نہ کہا گیا۔ زود حسی اور اضطراب کے عالم میں پہلے اس کا ایک طرف کا اور پھر دوسری طرف کا رخسار پھڑپھڑانے لگا اور اس کے چہرے پر ناگواری کا احساس ابھر آیا۔ اس کی یہ کیفیت ڈرائنگ روموں میں کبھی نہیں ہوئی تھی۔ اس کی آنکھیں بھی مختلف نظر آ رہی تھیں۔ ایک لمحے وہ بڑی ڈھٹائی سے چٹھل بازی کرتی دکھائی دیتیں اور دوسرے لمحے وہ گھبراہٹ اور خوف زدگی سے ادھر ادھر دیکھنے لگتیں۔

پرنس اپنے دبلے پتلے اور خشک ہاتھوں سے ایک چھوٹا سا کتا، جو اس کی گود میں لیٹا ہوا تھا، تھامے ہوئے انہماک سے پرنس کی آنکھوں میں جھانک رہی تھی لیکن یہ بات بالکل واضح تھی کہ خود اسے صبح تک یونہی میٹھنا پڑے، وہ مہر سکوت ہرگز نہیں توڑے گی۔

”مائی ڈیئر پرنس اور ہمیشہ، کاترینا سمیونوونا، تمہیں معلوم ہی ہے؟“ پرنس نے گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔ صاف نظر آ رہا تھا کہ وہ جو کچھ کہنا چاہتا تھا، اسے نوک زبان پر لانے کے لیے اسے باطنی کشاکش میں سے گزرنا پڑ رہا ہے۔ ”تمہیں معلوم ہی ہے کہ اس قسم کے مواقع پر، جن کا آج ہمیں سامنا کرنا پڑ رہا ہے، ہمیں سب ہاتھوں کے بارے میں سوچنا پڑے گا۔ ہمیں مستقبل کے بارے میں اور آپ سب کے بارے میں غور و فکر کرنا ہوگا۔ میں تم سب کو اس طرح عزیز رکھتا ہوں جیسے کہ تم سب میری اپنی بیٹیاں ہو۔ یہ تم بھی، اچھی طرح جانتی ہو۔“

پرنس کی جذبات سے عاری نگاہیں بدستور اسی طرح پرنس پر جمی ہوئی تھیں، ان میں سو برابر تبدیلی نہیں آئی تھی۔ ”اور پھر مجھے اپنے خاندان کے بارے میں بھی سوچنا ہوگا؟“ پرنس واسلی نے ٹک مزاحی سے ایک چھوٹی ہیر کو ایک طرف دھکیلتے اور اس کی نگاہوں سے گریز کرتے ہوئے کہا۔ ”کاتش، تم جانتی ہو کہ ہم۔ تم، مونتوف ہمیشہ گان اور میری اہلیہ۔ کاؤنٹ کے واحد بلا واسطہ وارث ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ اس قسم کے امور کے بارے میں باتیں کرنے یا سوچنے سے تمہیں کتنی اذیت میں سے گزرنا پڑ رہا ہے۔ میرے لیے بھی یہ آسان معاملہ نہیں۔ لیکن میری عزیز دوست، میں پچاس کی دہائی میں داخل ہو چکا ہوں اور مجھے ہر قسم کی صورت حال کا سامنا کرنے کے لیے تیار رہنا چاہیے تمہیں معلوم ہے کہ میں نے ہیکر کو بلا بھیجا ہے؟ کاؤنٹ کے سیدھا اس کی تصویر کی جانب اشارہ کرتے ہوئے واضح عندیہ دیا تھا کہ وہ اس سے ملاقات کرنے کا مطالبہ کر رہا ہے۔“

پرنس نے استفہامیہ نگاہوں سے پرنس کی جانب دیکھا لیکن وہ یہ فیصلہ نہ کر سکا کہ ابھی اس نے جو کچھ کہا تھا، وہ اس کے متعلق سوچ رہی ہے یا محض اسے گھور گھور کر دیکھ رہی ہے۔

”بھائی جان، ایک دم جو میں کبھی مانگتا نہیں بھولتی،“ اس نے جواب دیا، ”یہ ہے کہ خداوندان پر اپنی رحمت نازل فرمائیں اور ان کی قابلِ تکریم روح کو امن و سکون کے ساتھ اس دنیائے دوس سے رخصت۔“

”ہاں، بالکل، بالکل!“ پرنس واسیلی نے بے صبری سے اس کی بات کاٹ دی۔ وہ اپنے گنجے سر کو سہلانے اور جس میز کو اس نے ابھی پرے دھکیلا تھا، برہنہ کے عالم میں اپنی طرف کھینچنے لگا۔ ”لیکن... درحقیقت... اصل میں... جیسا کہ تمہیں خود بھی معلوم ہے کہ کاؤنٹ نے پچھلی سردیوں کے دوران میں وصیت نامہ تیار کر لیا تھا۔ اس میں انہوں نے ہمیں، جو ان کے بلا واسطہ وارث ہیں، نظر انداز کر دیا تھا اور اپنی تمام جائیداد پیٹر کے نام کر دی تھی۔“

”وصیت جو چاہے، کہتی رہے،“ پرنس نے خاطر جمعی سے جواب دیا، ”اس کی ہمیں قطعاً کوئی پروا نہیں۔ پیٹر جائیداد کا وارث نہیں بن سکا، وہ ختم حرام ہے۔“

”لیکن ma chere!“ پرنس واسیلی چانک پھٹ پڑا۔ وہ مغلوب الغضب ہو رہا تھا اور تیز تیز بولنے لگا تھا۔ اس نے میز مضبوطی سے پکڑی اور کہنے لگا: ”فرض کریں کہ کاؤنٹ نے امپراطور کے نام درخواست تحریر کر دی ہو کہ پیٹر کو ان کی جائز اولاد تسلیم کر لیا جائے، پھر کیا ہوگا؟ کیا تمہیں معلوم ہے کہ کاؤنٹ نے جو خدمات سرانجام دی ہیں، ان کے پیش نظر اس کی خواہش کو قبولیت کی سند مل سکتی ہے۔“

پرنس ان لوگوں کی طرح، جو یہ سمجھتے ہیں کہ زیر بحث موضوع کے بارے میں ان کی معلومات ان اشخاص سے جن سے وہ گفتگو کر رہے ہوتے ہیں، کہیں زیادہ ہیں، مسکرا دی۔

”میں تمہیں کچھ اور بھی بتانا چاہتا ہوں،“ پرنس نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے اپنا سلسلہ کلام جاری رکھا، ”اگرچہ درخواست تحریر ہو گئی تھی لیکن ارساں نہیں کی گئی تھی۔ تاہم امپراطور کو اس کا علم ضرور ہے۔ مسئلہ صرف یہ ہے اسے تلف کر دیا گیا ہے یا نہیں؟ اگر نہیں، پھر جوئی... قصہ ختم ہو جائے گا۔“ اس نے بی سانس لی اور آہ بھری۔ اس طریقے سے وہ اسے یہ سمجھانا چاہتا تھا کہ اس کا ”جب قصہ ختم ہو جائے گا“ کے الفاظ سے مفہوم کیا ہے۔ ”اور کاؤنٹ کے کاغذات کھولے جائیں گے، وصیت نامہ اور اس کے ساتھ غسلک یہ درخواست امپراطور کی خدمت میں پیش کر دیے جائیں گے۔ تب یہ درخواست یقیناً منظور کر لی جائے گی۔ پیٹر اس کا جائز پٹا تسلیم کر لیا جائے گا اور اس کا تمام مال و متاع وراثت میں اسے منتقل ہو جائے گا۔“

”اور ہمارا حصہ؟“ پرنس نے دریافت کیا۔ اور وہ یوں طنزیہ انداز سے مسکرا دی جیسے دنیا میں ہر چیز ممکن ہے، لیکن انھیں ”ان کے حصے“ سے محروم کیا جانا ناممکن ہے۔

”Mais, ma pauvre Kalish!“ یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہے۔ وہ یک ایک پانی کا واحد

جائز وارث ہوگا۔ اور تمہیں۔ تمہیں ایک دھڑی بھی نہیں مل سکے گی! عزیز! من تمہیں لہذا علم ہونا چاہیے کہ وصیت نامہ اور درخواست تحریر ہوئے تھے یا نہیں؟ اور اگر ہوئے تھے، پھر انہیں تلف کر دیا گیا تھا یا نہیں؟ اگر وہ کہیں ادھر ادھر ہو گئے ہوں، پھر تمہیں لہذا یہ معلوم کرنا ہوگا کہ وہ کہاں ہیں۔ تمہیں انہیں ضرور ہاضمہ و صحت کا دوا دینا ہوگا۔“

”یہ تو حدود سے تجاوز کرنے کے مترادف ہوگا!“ پرنس نے زہر خند کرتے ہوئے کہا۔ لیکن اس کی جوتون جو کچھ کہہ رہی تھی، اس میں قطعاً کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ ”میں عورت ہوں اور اگر چاہے آپ یہ سمجھتے ہیں کہ ہم سب فائز الحفل ہیں، میں اتنا ضرور جانتی ہوں، ختم حرام ختم حرام ہی رہتا ہے، وہ جائیداد کا وارث نہیں بن سکتا!“ اس نے ختم حرام کا ترجمہ بھی فرانسیسی میں ”Un batard“ کر دیا۔ گویا کاؤنٹ جو دیل دے رہا تھا، اس فرانسیسی ترجمے سے باطل قرار پائے گی۔

”کانش، آخر تم سمجھتی کیوں نہیں؟ تم اتنی ذہین ہو۔ تم سمجھتی کیوں نہیں کہ اگر کاؤنٹ نے میرا طور کے نام بیدرخواست تحریر کر دی ہے کہ ان کے بیٹے کو ان کا جائز وارث تسلیم کر لیا جائے، اس کا مفہوم یہ بنتا ہے کہ بیٹے کو نہیں بلکہ کاؤنٹ بزدخوف بن جاتا ہے اور وصیت نامے کی شرائط کے مطابق ہر چیز کا وارث ٹھہرایا جائے گا؟ اور اگر وصیت نامہ اور درخواست تلف نہیں ہوتے، تمہارے ہاتھ پہنچے نہیں گئے گا۔ البتہ تم اپنے دس کو تسلی ضرور دے سکو گی کہ تم نے اپنا فرض ایمانداری سے نبھایا اور کوئی کوتاہی نہیں کی، وغیرہ وغیرہ، ہاں اللہ اللہ خیر سلا۔“

”یہ تو مجھے معلوم ہے کہ وصیت نامہ تیار کیا گیا تھا لیکن مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ قانونی اعتبار سے یہ بے ضابطہ اور ساقط ہے اور آپ بھائی جان، مجھے یہ دکھائی دیتا ہے کہ آپ مجھے بالکل ہی گودن سمجھتے ہیں۔“ پرنس نے کہا اور اس کے چہرے پر کچھ اس قسم کے تاثرات ہو پیدا ہو گئے جو عام طور پر خواتین کے چہروں پر اس وقت نمودار ہوتے ہیں، جب وہ یہ سمجھتی ہیں کہ انہوں نے کوئی بے حد ظریفانہ یا کاٹ دار بات کہہ دی ہے۔

”مالی ڈیر پرنس کا ترینا سمجھو تو دنا!“ پرنس واسیلی نے قدرے جھلا کر کہا۔ ”میں یہاں تمہارے ساتھ ٹوٹکار کرنے نہیں آیا۔ میری آمد کا مقصد تمہارے ساتھ تمہارے مفادات کے بارے میں گفتگو کرنا تھا، جیسے ایک عزیز اپنے کسی دوسرے عزیز، مہربان، نیک خصلت اور سچے کمرے عزیز، کے ساتھ کرتا ہے۔ میں دسیوں مرتبہ تمہیں بتا چکا ہوں اور ایک بار پھر بتاتے دیتا ہوں کہ اگر کاؤنٹ کے کاغذات میں امیرا طور کے نام درخواست اور پیئر کے حق میں وصیت نامہ پایا گیا، پھر، میری بیماری، نہ تم اور نہ تمہاری ہمشیرگان وراثت میں حصے دار بن سکیں گی۔ اگر تمہیں میری بات پر اعتبار نہیں آتا، پھر ماہرین کی بات کا یقین کر لو۔ میری ابھی ابھی دستری انوف رچ“ (وہ خاندان کا قانونی مشیر تھا) ”سے گفتگو ہوئی ہے اور اس کی رائے بھی بیعت ہوئی ہے جو میری ہے۔“

بظاہر پرنس کے خیالات میں اچانک تبدیلی رونما ہوئی۔ اس کے مہین ہونٹوں کی رنگت پہلی ہو گئی (اس کی آنکھیں جوں کی توں رہیں) اور وہ ایسی شدد کے ساتھ بھٹ پڑی کہ وہ خود بھی حیرت زدہ رہ گئی۔

”چلو، یہ بھی اچھا ہوا!“ اس نے کہا۔ ”میں نے نہ پہلے کسی چیز کی تشنگی کی تھی اور نہ مجھے اب کسی چیز کی تشنگی ہے!“

اس کی گود میں جو چھوٹا کتا بیٹھا تھا، اس نے اسے پرے دھکیل دیا اور خود اپنے زریں کی شکنیں درست کرنے لگی۔

”تو یہ ہے ان کی، حسان مندی! جن لوگوں نے ان کی خاطر دن رات ایک کر دیا، ہر چیز، ہر آرام تنج دیا، اس کا بدلہ انھیں یہ ملا“ اس نے کہا۔ ”بہت خوب! بہت اعلیٰ اپرنس، مجھے کچھ نہیں چاہیے!“

”بجی، لیکن تم اکیسی نہیں ہو۔ تمھاری بہنیں بھی ہیں!“ اپرنس نے کھٹاک سے جواب دیا۔

لیکن اپرنس اس کی بات نہیں سن رہی تھی۔

”ہاں، مجھے کافی عرصہ پہلے اس کا علم ہو گیا تھا لیکن میں بھول گئی تھی۔ میں جانتی ہوں کہ مجھے اس گھر میں کیسگی، وجل و فریب، حسد، ساز باز، لگائی بجھائی اور احسان ناشناسی، بدترین احسان ناشناسی، کے علاوہ اور کچھ نہیں ملے گا۔ مجھے کسی چیز کی توقع ہی نہیں کرنا چاہیے تھی...“

”تمہیں معلوم ہے کہ وصیت نامہ کہاں ہے یا نہیں معلوم؟“ اپرنس نے پوچھا۔ اس کے رخسار پہلے کی نسبت کہیں زیادہ پھڑپھڑا رہے تھے۔

”ہاں، میں اسحق تھی! میں لوگوں کی باتوں میں آگئی، اس کی ذات پر اعتماد کرتی رہی، ان سے محبت کرتی رہی، ان کے لیے قربانیاں دیتی رہی۔ لیکن مجھے کیا ملا؟ کامیابیاں صرف کینوں اور رذیلوں کے حصے میں آتی ہیں۔ میں جانتی ہوں کہ یہ سب کس کا کیا دھرا ہے!“

اپرنس نے اٹھنا چاہا لیکن اپرنس نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور اسے دوبارہ نیچے بٹھا دیا۔ وہ کوئی ایسی ہستی دکھائی دے رہی تھی جس کا اچانک تمام بنی نوع انسان سے اعتماد اٹھ گیا ہو۔ اس نے اپنے ہم نقشب کو یوں گھور کر دیکھا جیسے وہ اسے کچا ہی چبا جائے گی۔

”میری دوست، ابھی کچھ نہیں گزرا، اب بھی ہمارے پاس وقت ہے۔ یہ درگھو، کاتش، یہ سب کچھ اتفاقاً، بل قصد ہوا۔ غصے اور بیماری کے عالم میں ہوا، اور اس کے بعد ذہن سے نکل گیا۔ مائی ڈیئر، ہمارے ذمے یہ فرض عاید ہوتا ہے کہ غلطی کا مداوا کریں، انھیں اس نا انصافی کا مرتکب نہ ہونے دیں اور یوں ان کے آخری لمحات کو آسان بنا دیں۔ اب جب کہ ان کی روح نفسِ عنصری سے پرواز کیا جا رہی ہے، ہمیں چاہیے کہ ہم انھیں اپنے ساتھ یہ احساس لے کر نہ جانے دیں کہ انھوں نے ان لوگوں کی زندگی میں بس گھوڑ دیا ہے جنھوں نے۔“

”جنھوں نے ان کی خاطر تن من دھن، سب کچھ قربان کر دیا۔“ اپرنس نے اس کا جملہ مکمل کر دیا۔ اپرنس دوبارہ اٹھ کھڑی ہوتی لیکن اپرنس نے مضبوطی سے اس کا ہاتھ تھامے رکھا۔ ”لیکن انھوں نے اس کی رتی برابر قدر نہ کی۔ نہیں، بھائی جان!“ اس نے آہ بھری اور پھر بولی۔ ”مجھے یہ بات ہمیشہ یاد رہے گی کہ اس دنیا میں آدمی کو کسی کسی ملے کی توقع نہیں کرنا چاہیے۔ اس دنیا میں عزت، انصاف نام کی کوئی شے نہیں، اس دنیا میں صرف مکاری اور بدی کا سکہ چلتا ہے۔“

”چھوڑ دو، جانے دو۔ اپنے آپ کو سنبھاؤ۔ میں جانتا ہوں کہ تم جیت گئی نیک خصلت ہو!“
 ”نہیں، میں بد خصلت ہوں۔“

”میں تمہاری خصلت جانتا ہوں!“ پرنس نے اپنی بات دہرائی۔ ”تمہاری رفاقت کی قدر کرتا ہوں اور میری خواہش ہے کہ تمہاری بھی میرے متعلق یہی رائے ہو۔ اپنے آپ کو ہلکان نہ کرو۔ ہمیں عقل سے کام لینا چاہیے۔ ابھی ہمارے پاس وقت ہے۔ شاید ایک دن یا ایک گھنٹہ۔ تمہیں وصیت نامے کے بارے میں جو کچھ معلوم ہے، مجھے سب بتا دو اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ یہ جانا نہایت ضروری ہے کہ یہ ہے کہیں۔ ہم اسے فوراً ٹھائیں گے اور کاؤنٹ کے پاس لے چلیں گے۔ اس میں شک و شبہ کی قطعاً گنجائش نہیں کہ وہ اس کے متعلق بھول چکے ہوں اور اسے تلف کرنا چاہیں گے۔ تمہیں سمجھ لینا چاہیے کہ میری صرف ایک ہی آرزو ہے کہ ان کی خواہشات پر لطف اور معاملہ کیا جائے۔ صرف یہی ایک وجہ تھی کہ میں یہاں چلا آیا۔ میں صرف تمہاری اور ان کی مدد کرنے آیا ہوں۔“

”لب میں سب کچھ سمجھ گئی ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ اس کے پیچھے کس کا سازشی ذہن کام کر رہا ہے۔ مجھے معلوم ہے!“ پرنس نے کہا۔

”جان من، اس وقت مسئلہ یہ نہیں۔“

”یہ وہی ہے جس کے آپ مر رہے ہو، یہ وہی جادوگر نے آتنا میٹھا کیلو دنا ہے۔ میں اسے جوتی کی ٹوک پر بند رکھوں، اس سے چھاڑ دینی نہ دلاؤں۔ مردود، بد ذات، کیسی!“

”ہم وقت ضائع کر رہے ہیں۔“

”وہ، مجھ سے مت کلام کریں! بھیجی سردیوں میں یہ چوروں کی طرح یہاں گھس آئی۔ اس نے وہ وہ لگائی بجھائی کی اور خاص طور پر سونی کے متعلق ایسے ایسے غلیظ و شرمناک قصے کہانیاں سنائیں۔ میں انہیں دہر بھی نہیں سکتی۔ کہ کاؤنٹ کی طبیعت واقعتاً ناساز ہو گئی۔ وہ دو ہفتے ہم سب سے ناراض رہے اور ہماری شکل دیکھنے کے بھی روادار نہ ہوئے۔ مجھے معلوم ہے کہ کاؤنٹ نے انہیں ایام کے دوران میں یہ مکر دیا، غلیظ اور نجس دستاویز تحریر کی تھی اور میں یہی سمجھتی رہی کہ یہ بے معنی ہے، اس کی کوئی وقعت نہیں۔“

”اب ہوئی نا صحیح بات۔ لیکن تم نے اس کے متعلق مجھے پہلے کیوں نہ بتایا؟“

”یہ اس جہی تھیلے میں بند ہے جس پر نقش و نگار بنے ہوئے ہیں اور جسے وہ ہر وقت اپنے بچے کے نیچے دھریں رکھتے ہیں۔ اب میں سمجھ گئی ہوں۔“ پرنس نے اس کے سوال کو نظر انداز کر دیا اور بولتی چلی گئی۔ ”اگر مجھ سے کوئی گناہ سرزد ہوا ہے، بہت بڑا گناہ، جس کا مجھے حساب کتاب دینا ہوگا، تو وہ گناہ یہ ہے کہ مجھے اس روٹیل عورت سے سخت نفرت ہے۔“ وہ تقریباً چلا رہی تھی اور اس کی اتنی کاپیٹ ہو چکی تھی کہ وہ بالکل مختلف عورت بن چکی تھی۔ ”یہ عورت ہر وقت یہاں چوروں کی طرح کیوں تھسکتی ہے؟ میں اس سے برابر کا حساب چکاؤں گی، اس کی پوری طرح خبر لوں گی!“ اب اس کا وقت آ پہنچا ہے!“

جس دوران میں استقبالہ کرے اور پرنس کے اپارٹمنٹ میں یہ مختلف اقسام کی گفتگوئیں ہو رہی تھیں، کاؤنٹ بزدخوف کے محل نما مکان کے محن میں ایک گاڑی جس میں میٹر (جسے جابھیج گیا تھا) اور آئنا میخانیلوونا (جس نے میٹر کے ساتھ آئنا ضروری تصور کیا تھا) سوار تھے داخل ہوئی۔ جب گاڑی کے پہیوں کی جڑ جڑا ہٹ بھوسے میں دب گئی جو درپچوں کے نیچے بچھایا گیا تھا، آئنا میخانیلوونا کو، جس نے میٹر سے ہمدردی اور تسلی کے چند کلمات کہنے کے لیے اپنا رخ اس کی طرف کر لیا تھا، احساس ہوا کہ وہ اپنے کونے میں سویا ہوا ہے۔ اس نے اسے جگایا۔ میٹر نے اپنی خمار آلود آنکھیں کھولیں، اور آئنا میخانیلوونا کے پیچھے پیچھے گاڑی سے نیچے اترنے لگا۔ اچانک اسے خیال آیا کہ اسے اپنے باب سے، جس کا دم و پیس تھا، ملاقات کرنا ہے۔ اس نے دیکھا کہ ان کی گاڑی مین گیٹ میں سے نہیں، بلکہ کسی دروازے میں سے اندر آئی ہے۔ جوئی اس نے گاڑی سے پاؤں نیچے دھرا، دو آدمی، جو لباس سے دکھار دکھائی دیتے تھے فوراً پوندے بھاگے اور دروازے سے نکل کر دیوار کی اوٹ میں دب کر کھڑے ہو گئے۔ میٹر کچھ دیر اپنی جگہ کھڑا رہا۔ اس نے دیکھا کہ وہاں صرف بھی دو اشخاص ہی نہیں بلکہ ان جیسے متعدد دیگر افراد بھی مکان کی دونوں جانب دیواروں کے سایوں میں کھڑے ہیں۔ لیکن نہ آئنا میخانیلوونا اور نہ وردی پوش ملازموں اور کوچوانوں نے، جنہوں نے انہیں راز مآد کچھ لیا ہوگا، ان کی طرف قطعاً کوئی دھیان دیا۔ چنانچہ وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ اگر یہ لوگ کوئی دھیان نہیں دے رہے، پھر خیریت ہی ہوگی۔ وہ آئنا میخانیلوونا کے، جو تنگ اور نیم روشن میٹرمیاں چڑھ رہی تھیں اور بار بار بار مڑ کر پیچھے دیکھ رہی اور اسے تیز قدم ٹھانے کی تلقین کر رہی تھیں، پیچھے پیچھے چل پڑا۔ اگرچہ میٹر کی مطلق سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس کا عقلمی زینے سے اوپر جانا کیوں ضروری ہے، تاہم آئنا میخانیلوونا جس اعتماد اور جھلت کا مظاہرہ کر رہی تھی، اس سے اس نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ بلا شک و شبہ یہ ضروری ہے۔ جب وہ زینے کے درمیان میں پہنچے، چند اشخاص، جو بالٹیاں اٹھائے اور بوٹ کھٹکھٹاتے نیچے بھاگے جا رہے تھے، ان سے ٹکرائے اور انہیں قریب قریب گرا دیا۔ وہ لوگ سمٹ کر دیوار کے ساتھ لگ گئے تاکہ میٹر اور آئنا میخانیلوونا آسانی سے گزر جائیں۔ انہوں نے ان دونوں کو وہاں دیکھ کر قطعاً کسی قسم کی حیرت کا اظہار نہ کیا۔

”پرنسوں کے اپارٹمنٹ کو یہی راستہ جاتا ہے؟“ آئنا میخانیلوونا نے دریافت کیا۔

”ہی ہاں۔ دھڑ! ایک وردی پوش ملازم نے بے دھڑک بلند آواز سے جواب دیا۔ اس کے اس رویے

سے یہ ظاہر ہوتا تھا جیسے ہر چیز کی کھلی چھٹی مل گئی ہو۔ ”دام، بائیں جانب کا دروازہ۔“

”شاید کاؤنٹ نے مجھے بلایا ہی نہیں،“ میٹر نے اوپر پہنچ کر کہا۔ ”بہتر ہے میں اپنے کمرے میں چلا

جاؤں۔“

آئنا میخانیلوونا رک گئی تھی۔ وہ اس کا انتظار کر رہی تھی۔

”mon ami“ اس نے اسی انداز سے اس کے بازو پر ہاتھ رکھا جس طرح چند گھنٹے پیشتر اس نے اپنے بچے کے بازو پر رکھا تھا۔ ”تمہیں شاید یقین نہ آئے لیکن جکی بات یہ ہے کہ میں بھی اسی کرب میں سے جس میں سے تمہیں گزرنا پڑ رہا ہے، گزر رہی ہوں۔ لیکن تم مرد ہو، مرد بنو!“

”واقعی، کیا یہ بہتر نہیں ہوگا کہ میں ویس چلا جاؤں؟“ اس نے اپنے چشمے میں سے اس پر ہر شفقت نگاہیں ڈالتے ہوئے کہا۔

”mon ami، تمہارے ساتھ جو بھی زیادتیاں ہوئی ہوں، انھیں بھد دو۔ صرف تنہا یاد رکھو کہ وہ تمہارے داند محترم ہیں۔ وہ شاید موت کے بے رحم ہاتھوں میں ہیں؛“ اس نے لمبی سانس لی اور بولی، ”میں تمہارے بچپن سے ہی تمہارے ساتھ اسی طرح پیار کرتی رہی ہوں جیسے تم میرے اپنے لخت جگر ہو۔ بیٹر، مجھ پر بھروسہ کرو۔ میں تمہارے مفادات آنکھ سے ادھیل نہیں ہونے دوں گی۔“

وہ کہہ رہی تھی بیٹر مطلق سمجھ نہ سکا۔ لیکن اسے محسوس ہوا اور پہلے سے بھی کہیں زیادہ شدید طور پر، کہ یہ سب کچھ ہونا ہی تھا اور وہ آئنا میٹا کیلورنا کے، جو پہلے ہی دروازہ کھولنے میں مصروف تھی، پیچھے پیچھے بھگی بلی بنا چل پڑا۔ یہ دروازہ ایک عقی نقیش دالان میں کھلتا تھا۔ پرنسوں کا سمر ملازم وہاں ایک کونے میں بیٹھا تھا اور جرائیں بن رہا تھا بیٹر مکان کے اس حصے میں کبھی نہیں آیا تھا۔ اسے تو کبھی شبہ بھی نہیں ہوا تھا کہ ادھر بھی کوئی عمارت موجود ہوگی۔ آئنا میٹا کیلورنا نے ایک ملازم سے، جوڑے پر پان کا گلاس سجائے بھگم بھگ ان کے قریب سے گزر رہی تھی، پرنسوں کی صحت کے بارے میں دریافت کیا۔ اس نے نوکرائی کو ”ہائی ڈیر“ جیسے بے تکلفانہ القابات سے پکار کر اسے ذرا مکھن بھی لگا دیا تھا، اور پتھر کی رہداری میں اپنے ساتھ پٹر کو آگے گھسیٹ لیا۔ بائیں طرف کا پہلا دروازہ پرنسوں کے اپارٹمنٹ میں کھلتا تھا۔ جلد بازی میں مارمرکب سے بھیدنے کا خیال نہ رہا (اس وقت محل میں تمام کاموں میں جلد بازی کا مظاہرہ ہو رہا تھا) اور جب بیٹر اور آئنا میٹا کیلورنا ادھر سے گزرے، ان کی نظریں بے اختیار کمرے کے اندر بھٹکنے لگیں جس میں پرنس واسلی اور بڑی پرنس مجوگٹکو تھے۔ انھیں دیکھ کر پرنس واسلی گڑبڑا گیا اور اپنی کرسی میں پیچھے کی جانب دھنس گیا۔ پرنس نے جست لگائی، تشدد و انداز سے بازو لہرایا اور پورا زور لگا کر دھماکے سے دروازہ بند کر دیا۔

اس کا یہ فعل اس کے معمولات پر سکون روپے کے اتار بٹکس، اور پرنس واسلی کے چہرے پر وحشت کے آثار اس کی عام آن بان اور وجہ ہمت سے اس قدر مختلف تھے کہ بیٹر کے قدم رک گئے اور وہ چشمے میں سے اپنی رہبر کی جانب دیکھنے لگا۔ آئنا میٹا کیلورنا نے کسی تعجب کا اظہار نہ کیا، صرف ہلکی سی مسکراہٹ اس کے چہرے پر نمودار ہوئی اور اس نے یوں آہ بھری جیسے وہ جتنا چاہتی ہو کہ سے صرف اسی بات کی توقع تھی۔

”mon ami، مرد بیٹر۔ تمہارے مفادات کی نگہبانی اب میں کروں گی؛“ اس نے اس کی استفہامی نظروں

کے جواب میں کہا اور وہ راہداری میں اور بھی تیز حیز قدم اٹھانے لگی۔

پیٹر کی سمجھ میں نہیں رہا تھا کہ یہ سب کیا ہے اور یہ بات تو مطلق اس کے پے نہیں پڑ رہی تھی کہ اس کے مشادات کی نگرانی کا کیا مفہوم ہوتا ہے۔ تاہم اسے محسوس ہوا کہ یہ سب کچھ ہونا ہی تھا۔ راہداری سے وا کاؤنٹ کے پیش دالان سے ملحق کمرے میں چھپے گئے۔ یہ ان سرد اور پر شکوہ کمروں میں سے تھا جہاں پیٹر ہمیشہ سامنے کے دروازے میں سے اندر آیا کرتا تھا۔ لیکن اب اس کمرے میں بھی ایک خالی باتھ روم پڑا تھا اور کسی نے پانی قالین پر اچھال دیا تھا۔ ایک ملازم اور ایک نائب پادری عموماً ان اٹھائے دے پاؤں ان کے قریب سے گزر گئے۔ انھوں نے ان کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ یہ دونوں استقبالیہ کمرے میں داخل ہو گئے۔ یہ کمرہ سڑک کا دیکھا بھالا تھا۔ اس میں وہ اطالوی طرز کے درتپے تھے جو پود گھر کی طرف کھاتے تھے، مہر طورہ کی تھریں کے بالائی دھڑکا بھمکتا تھا اور اس کی قد آدم تصویر آویزاں تھی۔ یہاں وہی اشخاص انھیں کرسیوں پر تقریباً اسی طرح بیٹھے ابھی تک ایک دوسرے سے سرگوشیوں میں باتیں کر رہے تھے۔ جب ان کی نظریں آٹا میخانہ لوڈنا کے زرد اور پر مٹال چہرے پر پڑیں اور انھوں نے دروازہ درہماری بھر کمزور جواں کو مسکین صورت بنائے اس کے پیچھے جاتے دیکھا، تو مکمل سکوت طاری ہو گیا۔

آٹا میخانہ لوڈنا کا چہرہ پکار پکار کر کہہ رہا تھا کہ اسے اس بات کا بخوبی احساس ہے کہ فیصلہ کن گھڑی آچکی ہے۔ پیٹر برگ کی مستعد خاتون کا اندر اپنانے اور پیٹر کو اپنے پہلو سے چمٹائے وہ سہ پہر کی نسبت اور بھی زیادہ دلیری سے کمرے میں داخل ہو گئی۔ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ چونکہ وہ اس شخص کو اپنے ہمراہ لائی ہے جس سے قریب الگ آدمی ملنے کا متنی ہے، اس لیے اس کی پنی آمد پر بھی کوئی ردک ٹوک نہیں ہوگی۔ اس نے سرعت سے کمرے کے چاروں اطراف نگاہیں دوڑائیں اور فوراً اندازہ لگایا کہ واؤنٹ کا روحانی تسخیر وہیں موجود ہے۔ وہ لپک بھپک اس کی طرف بڑھی اور اس کے سامنے دوڑا تو ہو گئی لیکن وہ جھکی تھی زیادہ نہیں جتنا کہ بظاہر عیب کے زیر اثر اس کا جسم سمٹ اور سکڑ گیا۔ اس نے مودب ہو کر پہلے، یک اور پھر دوسرے پادری کی دعائیں لیں۔

”خدا کا شکر ہے کہ ہم وقت پر پہنچ گئے“ اس نے ایک پادری سے کہا۔ ”ہم گھردالوں پر سخت خوف طاری تھا۔ یہ نوجوان، محترم واؤنٹ کے فرزند بلند ہیں،“ اس نے زیر لب مزید کہا۔ ”کتنا اذیت ناک لمحہ ہے!“

جب وہ یہ کچھ کہہ چکی، اس نے ڈاکٹر کی طرف رخ کیا۔

”ڈاکٹر صاحب،“ اس نے اس سے کہا، ”یہ نوجوان محترم واؤنٹ کا فرزند بلند ہے... کوئی امید ہے؟“

ڈاکٹر نے منہ سے کچھ نہ کہا۔ اس نے سرعت سے اپنی نگاہیں اوپر اٹھائیں اور کندھے اچکا دیے۔ آٹا میخانہ لوڈنا نے بھی بالکل اسی انداز سے اپنی نگاہیں اور کندھے اوپر اٹھا دیے۔ اس نے اپنی آنکھیں تقریباً بند کر لیں، لمبی سانس لی اور پیٹر کی جانب متوجہ ہو گئی۔ اس نے پیٹر کو بر ملا عزت و تکریم دی، اسے نرم واداس لہجے سے مخاطب کیا اور بولی:

”خداوند سے رحم و کرم کی امید رکھو!“ اور ایک چھوٹے صوفے کی طرف، جہاں اسے بیٹھنا اور اس کا انتظار کرنا تھا، اشارہ کیا، بالکل دے پاؤں اس دروازے کی جانب بڑھی جس پر سب کی نگاہیں لگی ہوئی تھیں، اسے اتنا

آہستگی سے کھولا کہ نام کو بھی کوئی آواز سنائی نہ دی اور اس کے پیچھے روپوش ہو گئی۔

پیٹر چونکہ یہ ٹھان چکا تھا کہ وہ تمام امور میں اپنی مرشد کی ہدایات پر عمل کرے گا، چنانچہ وہ اس صوفی کی طرف، جس کی جانب اشارہ کیا گیا تھا، چل پڑا۔ اسے اندازہ ہو کہ جو بھی آغایا میخانیلوونا نظروں سے اوجھل ہوئی، کمرے میں موجود تمام لوگوں کی نگاہیں، جن میں بخشس سے کچھ زیادہ ہی بھرا ہوا تھا، اس پر مرکوز ہو گئی ہیں۔ اس نے دیکھا کہ وہ بھی ایک دوسرے کے ساتھ سرگوشیاں کر رہے ہیں اور اسے ہیبت زدہ بلکہ خوشامدانہ نظروں سے دیکھ رہے ہیں۔ اس کے ساتھ کچھ اس قسم کی عزت و تکریم کا برتاؤ کیا جا رہا تھا جس کا اسے پہلے کبھی تجربہ نہیں ہوا تھا۔ وہ محترمہ جو پادریوں سے گفتگو میں مصروف تھی، اگرچہ اس کے لیے بالکل اجنبی تھی، پھر بھی وہ اپنی نشست سے اٹھی اور اپنی کرسی اسے پیش کر دی۔ اس کا ایک دستاں نیچے گر پڑا تھا، ایک ایجوٹمنٹ نے اسے اٹھایا اور اسے تھما دیا۔ جب وہ ڈاکٹروں کے قریب سے گزرا وہ نہ صرف احتراماً خاموش ہو گئے بلکہ ایک طرف بھی ہٹ گئے تاکہ اسے گزرنے میں دقت نہ ہو۔ ابتداً پیٹر خاتون کو تکلیف دینے کے بجائے کسی دوسری کرسی پر بیٹھنا، چنانچہ خود اٹھنا اور ڈاکٹروں کے، جو ہرگز اس کے راستے میں رکاوٹ نہیں تھے، گرد مخضر چکر کاٹ کر گزرنا چاہتا تھا لیکن اچانک اسے محسوس ہوا کہ اس کی یہ حرکات بالکل بھونڈی تصور ہوں گی۔ اس کی رگ رگ میں یہ احساس سما گیا کہ آج کی رات اسے ایک ایسے شخص کے قارب میں ڈھلانا ہے جسے ضرورت سے زیادہ منجیدہ رسوم ادا کرنا ہیں اور یہ وہ باتیں ہیں جن کی ہر آدمی اس سے امید کر رہا ہے۔ چنانچہ اس کا یہ فرض بنتا ہے کہ وہ ان کی ان خدمات سے استفادہ کرے۔ اس نے ایک لفظ بھی کہے بغیر ایجوٹمنٹ سے دستاں قبول کر لیا اور خاتون کی نشست پر بیٹھ گیا۔ اس نے اپنے بھاری بھر کم ہاتھ اپنے گھٹنوں پر، جو اس نے مناسب انداز سے ٹکائے ہوئے تھے، رکھ لیے۔ اس کے بیٹھنے کے انداز میں اتنی معصومیت و بھولپن تھا کہ وہ آدمی نہیں، مصری مجسمہ معلوم ہوتا تھا۔ اپنے دل میں وہ پوری طرح یہ فیصلہ کر چکا تھا کہ جو کچھ وقوع پذیر ہو رہا ہے، بالکل ویسے ہی ہو رہا ہے، جیسے کہ اسے ہونا چاہیے۔ آج کی رات اسے اپنے خیالات کی رود میں بہنا چاہیے نہ ان کے مطابق عمل کرنا چاہیے مبادا کہ اس کا ذہن گڑبڑا جائے اور کوئی احتمالہ حرکت اس سے سرزد ہو جائے۔ اسے چاہیے کہ وہ ان لوگوں کی، جنہوں نے اس کی رہنمائی کا بیڑا اٹھایا ہے، ہدایات پر پورا پورا عمل کرے۔

ابھی دو منٹ بھی نہ گزرے تھے کہ پرنس واسیلی گردن اکڑائے اور اوپر کوٹ، جس پر تین ستارے آویزاں تھے، پہنے یہ انداز شاہانہ اندر داخل ہو۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ صبح کی نسبت زیادہ دبلا ہو گیا ہے۔ وہ اپنی آنکھیں، جو معمول سے زیادہ بڑی دکھائی دے رہی تھیں، گھما پھرا کر کمرے کا جائزہ لینے لگا تا آنکہ اسے پیٹر نظر آ گیا۔ وہ اس کے پاس پہنچا، اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھا (یہ کام اس نے اس سے پہلے کبھی نہیں کیا تھا) اور اسے نیچے کی جانب کھینچا جیسے وہ پوری طرح تحقیق کر لینا چاہتا ہو کہ وہ مضبوطی سے اپنی جگہ جڑا ہوا ہے یا نہیں۔

”عزیزم، حوصلہ، حوصلہ۔ انہوں نے تمہیں ملاقات کے لیے بلایا ہے۔ چلو، اچھا ہی ہوا۔“

وہ جانے ہی وال تھا کہ میٹر نے اضطرابی طور پر اس سے پوچھ لیا:
 ”ان کی طبیعت۔“ وہ ہلکے پھلکے لگا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ قریب المرگ شخص کو ”کاؤنٹ“ کہنا
 مناسب رہے گا یا نہیں۔ اور اسے ”پاپ“ کہتے اسے شرم آ رہی تھی۔

”آدھ گھنٹہ قبل ان پر ایک اور حملہ ہوا تھا۔ عزیزم، حوصلہ۔“

میٹر ذہنی طور پر اتنا گڑبڑا چکا تھا کہ اسے لفظ ”حملہ“ پوری طرح سمجھ میں نہ آیا۔ اس نے یہ مفہوم اخذ کیا کہ
 کاؤنٹ کو شاید کسی مادی چیز سے ضرب لگائی گئی ہے۔ وہ بالکل بوکھلا گیا اور پرنس داسکی کو دیکھنے لگا۔ یہ اسے بعد میں
 احساس ہوا کہ ”حملہ“ سے مراد ”حملہ مرض“ تھا۔ پرنس داسکی نے چلتے چلتے چند الفاظ بوعین سے کہے اور بچوں کے بل
 دروازے کے اندر داخل ہو گیا۔ بچوں کے بل چلن اس کے لیے آسان نہیں تھا اور ہر قدم پر اس کا سارا جسم بے ڈھنگے
 انداز سے ڈولنے لگتا تھا۔ سب سے بڑی پرنس، اس کے بعد پادری، نائب پادری اور متعدد نوکر چاکر اس کے
 پیچھے پیچھے چل پڑے۔ کمرے سے مختلف اشیاء کے ادھر ادھر کرنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ آخر کار آٹنا میٹا کیلونا
 بھاگتی دوڑتی باہر آئی۔ اس کا چہرہ ابھی تک زرد تھا لیکن اپنے فرائض کی ادائیگی کے لیے وہ بہت اہم العزم دکھائی
 دے رہی تھی۔ اس نے اپنا ہاتھ میٹر کے بازو پر رکھا اور بولی:

”رحمت خداوندی بے پایاں ہے، بے کنار ہے! مقدس تیل سے مسح کرنے کی رسم شروع ہوا چاہتی ہے۔ چلو“
 میٹر کمرے کے اندر چلا گیا۔ اس کے پاؤں نرم و گداز قالین میں رشتے چارے تھے۔ اس نے دیکھا کہ
 اجنبی خاتون، ایجوٹنٹ اور چند نوکر چاکر اس کے پیچھے پیچھے چلے آ رہے ہیں۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ اب کمرے میں
 داخل ہونے کے لیے کسی اجازت کی ضرورت نہیں رہی۔

20

میٹر اس وسیع و عریض کمرے سے اچھی طرح واقف تھا۔ ستونوں اور ایک محراب نے اسے مختلف خانوں میں تقسیم کر
 دیا تھا اور اس کی دیواروں پر ایرانی قالین لٹک رہے تھے۔ کمرے کا وہ حصہ جو ستونوں کے عقب میں تھا، جہاں
 ایک طرف مہاگنی درخت کی لکڑی کا خاصا ادنچا پلنگ، جس کے اوپر اور چاروں اطراف ریشمی پردے تھے ہوئے
 تھے، دھرا تھا اور دوسری طرف ایقونات کا بھاری بھرکم صندوق رکھا تھا، قرمزی روشنیوں سے خوب منور تھا جیسے شام
 کی عبادت کے وقت گرجا روشن ہوتا ہے۔ ایقونات کے صندوق کے چمکتے دکتے ریشمی غلافوں کے نیچے والتیر
 کرسی پڑی تھی۔ اس کرسی پر میٹر کو اپنے والد، کاؤنٹ بزدخوف، کی جانی پہچانی اور پرشکوہ شکل نظر آئی۔ کاؤنٹ
 کے نیچے دو دھیا سفید ہموار تکیے، جنہیں ابھی ابھی تبدیل کیا گیا تھا، پڑے تھے۔ کمرے پاؤں تک اس کا جسم
 شکار سے مارتی سبز دلائی سے ڈھنپا ہوا تھا۔ اس کی اونچی پیشانی کے اوپر اس کے سفید گھنے بال تھے جنہیں اکیہ کر شیر
 کی ایال کی یاد تازہ ہو جاتی تھی۔ اس کے خوش شکل شرفی چہرے پر روس کی مخصوص جھریاں پڑی ہوئی تھیں۔ وہ

ایقونات کے نیچے سیدھا لیٹا ہوا تھا اور اس کے نیم شیم ہاتھ لف سے باہر نکلے ہوئے تھے۔ اس کے دائیں ہاتھ میں، جس کی ہتھیلی اسٹی کردی گئی تھی، انگوٹھے اور انگشت شہادت کے درمیان باریک موم بتی پھنسا دی گئی تھی اور ایک بزرگ موزم صوفے کے اوپر جھکا اسے اوپر اٹھائے ہوئے تھا۔

صوفے کے رد گرد پادری کھڑے تھے۔ ان کے لمبے لمبے بالوں کے بھڑکیے چمھاتے پنوں پر لپک رہے تھے۔ انھوں نے اپنے ہاتھوں میں باریک موم بتیاں، جو جل رہی تھیں، تھم رکھی تھیں اور وہ آہستہ آہستہ ہاتھ بوجھتے اور منانت سے مذہبی رسوم داکر رہے تھے۔ ان سے ذرا پیچھے اپنی آنکھوں پر رومال رکھے دونوں چھوٹی پرنسسیں کھڑی تھیں اور ان سے ایک آدھ آنچ آگے سب سے بڑی کاتش تھی۔ اس کے چہرے پر عزم اور شکاری سوچ نمایاں تھی۔ اس نے ایک لکھے کے لیے بھی اپنی نگاہیں ایقونات سے نہ ہٹائیں۔ وہ گویا یہ جتنا چاہتی تھی کہ اگر اس کی توجہ ہٹ گئی اور اس کی نظریں دھرا دھر بھٹک گئیں تو اس کی ذمہ داری اس پر عاید نہیں کی جا سکے گی۔ آئنا میٹا کیو دونا دروازے کے قریب اجنبی خاتون کے پاس کھڑی تھی۔ اس کے چہرے پر مسکینی اور رنج و ملال لپک رہے تھے اور کچھ اس قسم کا تاثر ابھرتا تھا جیسے وہ آج سب کو معاف کر دینے کا تہیہ کر چکی ہو۔ پرنس واسلی دروازے کے دوسری جانب مریض کے صوفے کے بالکل ساتھ جڑا کھڑا تھا۔ اس نے اپنا بازو صوفے کی پشت پر، جس پر نقش و نگار کندہ تھے اور جو غسل کے غلاف میں لپٹا ہوا تھا، ٹکا رکھا تھا۔ صوفے کو اس نے اپنی سہولت کے پیش نظر گھسیٹ کر ذرا آگے پیچھے کر لیا تھا۔ وہ باتیں ہاتھ میں باریک موم بتی تھمے ہوئے تھا اور دائیں ہاتھ سے اپنے سینے پر صیب کا نشان بنا رہا تھا۔ صیب کا نشان بنانے کے دوران میں جب اس کی انگلیاں اس کی پیشانی کو چھوتیں، وہ اپنی نگاہیں اوپر اٹھا لیتا۔ وہ اپنے چہرے پر مٹین پارسائی کا نقاب اوڑھے ہوئے تھے اور یہ تاثر دے رہا تھا کہ وہ خدا کی مرضی کے سامنے سر تسلیم خم کر رہا ہے۔ اس کے اس انداز سے یہ مترشح ہوتا تھا کہ وہ دوسروں کو یہ یاد کرانا چاہتا ہے کہ اگر تم میرے جذبات و احساسات کا ادراک نہیں کر سکتے تو میں تم پر خدا کی پھٹکار بھیجتا ہوں۔“

اس کے عقب میں ایجوٹنٹ، ڈاکٹر اور مرد ملازمین کھڑے تھے۔ جس طرح کلیسا میں مرد اور خواتین الگ الگ نشستوں پر بیٹھتے ہیں، بعینہ یہاں بھی وہ علیحدہ علیحدہ ٹکڑیوں میں بٹ گئے تھے۔ کبھی خاموشی سے اپنے سینوں پر صیب کے نشانات بنا رہے تھے۔ کمرے میں مکمل سکوت طاری تھا، صرف مناجات پڑھے جانے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں اور ان مناجات کا درد بھی بہت دھیمے آہنگ سے ہو رہا تھا۔ ورد کے دوران میں جب کبھی وقفہ آتا تب بھی کوئی شخص اپنی زبان نہ کھولتا۔ حاضرین یا تو آہیں بھرنے لگتے یا بے چینی کے عالم میں اپنے پاؤں آگے پیچھے کھینچنے لگتے۔

آئنا میٹا کیو دونا کچھ اس انداز سے، جس سے یہ عندیہ ملتا تھا کہ وہ بہت اہم ہستی ہے اور جانتی ہے کہ وہ کیا کر رہی ہے، آگے بڑھی اور چلتے چلتے کمرے کی دوسری جانب میں اس جگہ پہنچی جہاں میٹر کھڑا تھا۔ وہاں پہنچنے کے بعد اس نے ایک باریک موم بتی اسے تھادی۔ میٹر نے اس موم بتی کو جودیا۔ میٹر ان لوگوں کو، جو اس کے ارد گرد

کھڑے تھے، دیکھنے میں محو تھا۔ اس نے موسمِ قحطی جلد تو لی لیکن جس ہاتھ میں وہ اسے تھامے ہوئے تھا، اسی سے وہ اپنے سینے پر صلیب کا نشان بنانے لگا۔

سب سے چھوٹی پرنس، جس کا نام سونی تھا، جس کے رخسار گلابی اور جس کے ہونٹ پر تل کا نشان تھا اور جو کھیل تماشے اور ہنسی مذاق کی دودادہ تھی، سے دیکھ رہی تھی۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ تیرنے لگی تاہم اس نے اسے روماس سے ڈھنپ لیا اور کافی دیر تک یونہی کھڑی رہی۔ تاہم جب اس نے دوبارہ نظریں اٹھائیں اور بیئر کی جانب دیکھا، وہ ایک بار پھر ہنسنے لگی۔ بظاہر یہی معلوم ہوتا تھا کہ جونہی وہ اس کی طرف دیکھے گی، اپنی ہنسی پر قابو نہیں پاسکے گی۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اس کے لیے یہ بھی ممکن نہیں تھا کہ وہ اس کی جانب دیکھے ہی نہ۔ چنانچہ بیئر کو بار بار دیکھنے اور اس پر ہنسنے کی ترغیب سے بچنے کے لیے وہ چپکے سے ایک ستون کے پیچھے کھسک گئی۔

مناجات کے ورد کے دوران میں پادریوں کی آوازیں ایک دم خاموش ہو گئیں، وہ وہ آپس میں سرگوشیاں کرنے لگے۔ بزرگ ملازم، جس نے کاؤنٹ کا ہاتھ تھام رکھا تھا، خواتین کی جانب متوجہ ہوا اور اس نے انھیں کچھ کہا۔ آٹھائی گھنٹہ بعد آگے بڑھی، مریض کے سامنے جنگی وراپے عقب میں ہاتھ کے اشارے سے نوٹیں کو ہلایا۔ فرنیچری ڈاکٹر ایک ستون کے ساتھ ٹیک لگائے کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں موسمِ قحطی تو نہیں تھی لیکن اس کے احتیاطی انداز سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ بھلے وہ غیر ملکی اور پیردکار بھی مختلف مسلک کا ہے، تاہم اس کے سامنے جو مذہبی رسوم ادا کی جارہی ہیں، وہ نہ صرف ان کی اہمیت سے پوری طرح آگاہ ہے بلکہ انھیں بنظر تحسین بھی دیکھتا ہے۔ وہ آگے بڑھا اور اگرچہ اس کے قدموں کی چاپ خاص دھیمی تھی، لیکن اس کی چال ایک ایسے شخص کی تھی جس کا شائبہ اپنے پورے جہنم پر ہو۔ اس نے اپنی نرم دنازک انگلیوں سے مریض کا وہ ہاتھ اوپر اٹھایا جو ہنرِ کف پر پڑا تھا، اسے اٹا کیا، نبض کا معائنہ کیا اور کچھ دیر سوچتا رہا۔ مریض کو کوئی مشروب پلایا گیا۔ وقتی طور پر مریض کے ارد گرد لوگوں کا جھکھٹا بن گیا تھا لیکن کچھ ہی دیر میں یہ ہجوم چھٹ گیا اور لوگ اپنی اپنی جگہوں پر واپس چلے گئے۔ مناجات کا درد دوبارہ شروع ہو گیا۔ اس وقفے کے دوران میں بیئر نے دیکھا کہ پرنس دایلی نقش و نگار سے حیرن صوفے سے، جس کے ساتھ وہ ٹیک لگائے کھڑا تھا، عین اسی انداز سے کہ مجھے معلوم ہے کہ میں کیا کرنے والا ہوں اور جسے نہیں معلوم، اس پر خدا کی بھٹکار، آگے بڑھا لیکن اس مرتبہ وہ مریض کے قریب نہیں گیا بلکہ اس کے صوفے سے آگے نکل گیا اور سیدھا بڑی پرنس کے پاس پہنچ گیا۔ وہاں سے وہ دونوں کمرے کے انتہائی سرے کی طرف، جہاں ریشمی پردوں کے نیچے اونچا پلنگ پڑا تھا، چل دیے۔ وہ وہاں رکے نہیں بلکہ عقبی دروازے سے باہر نکل گئے۔ تاہم مناجات کے ختم ہونے سے پہلے وہ دونوں الگ الگ واپس آ گئے اور دوبارہ اپنی اپنی جگہوں پر کھڑے ہو گئے۔ بیئر نے دوسری باتوں کی طرح، جو وہاں پیش آرہی تھیں، اس واقعہ پر بھی کوئی خاص توجہ نہ دی۔ وہ تودل میں بھی یہی فیصلہ کر چکا تھا کہ اس شام جو کچھ ظہور پذیر ہو رہا ہے، وہ وہی ہے جو ہونا چاہیے تھا۔

مناجات کا درد ختم ہو گیا۔ ایک پادری نے مریض کو بدیہہ نہایت پیش کیا کہ اسے اسطباغ مل گیا ہے۔ کاؤنٹ

نے کوئی جنبش نہ کی، وہ حسب سابق سکت اور بے جان پڑا رہا۔ اس کے ارد گرد ہنگامے کی فضا پیدا ہو گئی تھی۔ لوگ ادھر ادھر بھاگے دوڑے پھر رہے تھے اور سرگوشیوں میں باتیں کر رہے تھے۔ بلند ترین آواز آتا میخائیلوونا کی تھی۔

ہیئر نے اسے کہتے سنا:

”انھیں لازماً یہاں سے اٹھا کر بستر پر لانا ہوگا۔ یہاں یہ ناممکن ہوگا!“

ڈکٹروں، نوکروں، چاکروں اور پرنسوں نے مریض کے ارد گرد کچھ اس طرح گھیرا ڈال رکھا تھا کہ ہیئر کے لیے اس کا شرعی چہرہ اور اس کے اوپر اس کے گھنے بالوں کا چھتار رکھنا ممکن نہیں رہا تھا جب کہ مناجات کے ورد کے دوران میں اسے شک و دہش چہرے بھی نظر آتے رہے تھے لیکن یہ چہرہ ایک ثانیے کے لیے بھی اس کی نظروں سے اوجھل نہیں ہوا تھا۔ جن لوگوں نے صوفی کے ارد گرد گھیرا ڈال رکھا تھا، ان کی مختلط حرکات و سکنات سے اس نے یہ اندازہ لگایا کہ وہ قریب المرگ شخص کو اٹھا چکے ہیں اور اب اسے پلنگ کی جانب لے جا رہے ہیں۔

”میرا بازو پکڑ لو، نہیں تو تم انھیں نیچے گر دو گے!“ اس نے ایک ملازم کو خوف زدگی کے عالم میں کانٹا پھوسی کرتے سنا۔ ”ڈرا نیچے! ایک اور یہاں آجائے!..“ دو دوسرے اشخاص نے دہائی دی۔ اور جن لوگوں نے مریض کو اٹھا رکھا تھا، وہ یوں ہانپ رہے تھے اور یوں اپنے پاؤں گھسیٹ گھسیٹ کر چل رہے تھے، جیسے وہ بوجھ، جو وہ اٹھائے ہوئے تھے، ان کی است سے کہیں زیادہ ہے۔

مریض کو اٹھانے والوں میں آنتا میخائیلوونا بھی شامل تھی۔ جب وہ ہیئر کے برابر سے گزرے، اسے ان کے سروں اور پشتوں کے اوپر سے قریب المرگ شخص کے چوڑے چپکے مضبوط دھانا اور عریاں سینے اور اس کے نیم شیم شٹنوں، جو اس لیے اوپر اٹھ گئے تھے کہ اٹھانے والوں نے اس کی بغلوں کے نیچے ہاتھ دے رکھے تھے، اور اس کے سفید، گھونگر یا لے اور شیر کی طرح کے گھنے بالوں کی عارضی جھلک دکھائی دی۔ موت کی آمد بھی اس کے اس سر، غیر معمولی طور پر اونچی پیشانی، رخساروں کی ابھریں ہڈیوں، خوش شکل اور شہوانی دہن اور سرد مہر و رشاہانہ دھار کی حامل آنکھوں کا کچھ نہیں بگاڑ سکی تھی۔ اس کا حلیہ، اس کا چہرہ مہرہ اور خدو خال ہیچ نہ رہی تھے جو اس نے تین ماہ قبل، جب کاؤنٹ نے اسے ہیئر زبرگ کے سفر پر روانہ کیا تھا، دیکھے تھے۔ لیکن اب یہ سر، جب اسے اٹھانے والوں کے ناموار قدم فرش پر پڑتے تھے، بے چارگی کے عام میں ہلکورے کھائے لگتا اور اس کی سرد اور بے حس آنکھیں کسی چیز پر ٹکنے سے قاصر تھیں۔

اونچے پلنگ کے ارد گرد کئی منٹ کھلبلی مچی رہی اور پھر وہ لوگ، جو مریض کو اٹھا کر وہاں لائے تھے، ادھر ادھر ہو گئے۔ آنتا میخائیلوونا نے ہیئر کا بازو چھوا اور کہا: ”آؤ۔“ ہیئر اس کی معیت میں پلنگ کے قریب آیا جہاں مریض کو ان رسوم کی مناسبت سے، جو چند دن پہلے سرانجام دی گئی تھیں، ابھی ابھی پر شکوہ انداز سے لٹایا گیا تھا۔ تکیوں کے سہارے اس کا سر اونچا کر دیا گیا تھا۔ اس کے ہاتھ، جن کی ہتھیلیاں لٹے رخ تھیں، موزوں انداز سے سبز کاف پر رکھے ہوئے تھے۔ جب ہیئر قریب آیا، کاؤنٹ نے سیدھا اس کی جانب دیکھا لیکن اس کی نگاہوں کا مفہوم اور

اہمیت کیا تھی، کوئی بھی شخص اس کی تہہ تک پہنچنے سے قاصر تھا۔ یا تو یہ ہر قسم کے مہلوم سے خالی تھیں اور دیکھ اس لیے رہی تھیں کیونکہ آنکھوں کا کام دیکھنا قرار پایا ہے۔ یا پھر یہ مطالبہ دمفاہیم سے بھرپور تھیں۔ پیئر متاثر تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے اور کیا نہ کرے۔ اس نے استغفہ میہ نگاہوں سے اپنی رہنما کی جانب دیکھا۔ آنا میخائیلوونا نے عجلت سے آنکھوں ہی آنکھوں سے بیمار آدمی کے ہاتھ کی طرف اشارہ کیا اور اس کے ساتھ ہی اپنے ہونٹ یوں پچکائے جیسے وہ بوسہ لے رہی ہو۔ پیئر نے نہایت حزم و احتیاط کے ساتھ اپنی گردن آگے بڑھائی تاکہ کہیں حائف کی اگاڑ پچھڑ نہ ہو جائے، اور آنا میخائیلوونا کی ہدایت کے مطابق بڑی بڑی ہڈیوں والے ٹھم ٹھم ہاتھ پر اپنے ہونٹ پیوست کر دیے۔ کاؤنٹ کا ہاتھ تو کچھ، اس کے جسم کے ایک روم نے بھی مطمئن کوئی حرکت نہ کی۔ بابا سے کیا کرنا تھا، یہ جاننے کے لیے اس نے ایک بار پھر سوالیہ نظروں سے آنا میخائیلوونا کی طرف دیکھا۔ اس نے آنکھوں ہی آنکھوں میں، ایک بازوؤں والی کرسی کی جانب، جو اونچے پلنگ کے قریب پڑی تھی، اشارہ کیا۔ پیئر تعمیل حکم کے جذبے کے ساتھ اس پر بیٹھ گیا لیکن اس کی نگاہیں اب بھی بیداریافت کر رہی تھیں کہ آیا وہ صحیح سمت عمل کر رہا ہے۔ آنا میخائیلوونا نے پسندیدگی سے اپنی گردن کو ٹھم دے دیا۔ پیئر نے دوبارہ مصری مجسمے کا بھولا اور مناسب انداز اختیار کر لیا۔ اسے بظاہر اس چیز سے کوفت ہو رہی تھی کہ اس کے بے ہنگم، بے ڈول، مضبوط اور بھاری بھر کم جسم نے، اتنی زیادہ جگہ گھیر رکھی ہے۔ اپنی طرف سے بطور تمدنی وہ پوری کوشش کر رہا تھا کہ وہ اتنا سکر کر بیٹھے کہ حتی الامکان چھوٹے سے چھوٹا نظر آئے۔ اس نے اچھٹی سی نگاہ کاؤنٹ پر ڈالی۔ کاؤنٹ کی نظریں لب بھی اسی مقام پر گزری ہوئی تھیں جہاں بیٹھنے سے پہلے پیئر کا سر تھا۔

آنا میخائیلوونا کے تیور بتا رہے تھے کہ بابا بیٹے کے مابین، ان آخری لمحات کی رقت انگیز گیسبھرتا سے وہ بخوبی آگاہ ہے۔ یہ کیفیت دو منٹ رہی لیکن پیئر کو یہ دو منٹ ایک گھنٹہ محسوس ہوئے۔ اچانک کاؤنٹ کے چہرے کے توانا عضلات اور لکیریں پھڑکنے لگیں۔ پھر کت کے اس عمل میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ خوش شکل دہن مسخ ہونے لگا (صرف اب پیئر کو یہ احساس ہوا کہ اس کا بابا بالکل قریب المرگ ہے) اور اس مسخ شدہ دہن سے گلو گرفتہ اور کسی کی سمجھ میں نہ آنے والی آواز برآمد ہوئی۔ آنا میخائیلوونا نے نہایت انتہاک سے مریض کی آنکھوں میں جھانک کر دیکھا اور یہ معلوم کرنے کے لیے کہ وہ کیا چاہتا ہے، اس نے پہلے پیئر اور پھر اس کے شروپ کی طرف اشارہ کیا۔ اس کے بعد اس نے استغفہ میہ سرگوشی میں پرنس واسیلی کا نام لیا اور آخر کار حائف کی جانب انگلی اٹھائی۔ مریض کی آنکھوں اور چہرے سے بے تابی ٹپک رہی تھی۔ اس نے اس ملازم کی طرف، جو مسلسل اس کے سر ہانے کھڑا تھا، دیکھنے کی کوشش کی۔

’وہ دوسری طرف کروٹ بدلنا چاہتے ہیں‘ ملازم نے کاؤنٹ کے بھاری بھر کم جسم کو موڑنے کی تیاری کرتے ہوئے کہا۔

اس کی مدد کے لیے پیئر اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

جب کاؤنٹ کو کروٹ دلائی جا رہی تھی، اس کا ایک بازو یوں پھیلی جا رہا تھا جیسے اس میں زندگی کی کوئی رمت باقی نہ رہی ہو۔ اس نے اسے آگے کھینچنے کے لیے جلد جھد کی لیکن بے سود۔ اس بے جان بازو کو دیکھ کر بیٹر پر دہشت طاری ہو گئی۔ کاؤنٹ نے بیٹر کے چہرے پر یہ دہشت پڑھ لی یا اس کے قریب امرگ دماغ میں بجلی کی طرح کوئی دوسرا خیال کوئدا، اس نے بہر حال پسے اپنے سرکش بازو، اس کے بعد بیٹر کے دہشت زدہ چہرے اور آخر ایک بار پھر اپنے بازو پر نظر دوڑائی۔ اس کے چہرے پر مریں اور دل دوز مسکراہٹ نمودار ہوئی جس کی اس کے خدو خال سے قطعی کوئی مناسبت نہیں تھی۔ یوں دکھائی دے رہا تھا کہ اس کی یہ مسکراہٹ اس کی بے بسی اور لچاری کی تضحیک کر رہی ہے۔ جب بیٹر نے اس مسکراہٹ کو دیکھا، اسے اپنے سینے میں غیر متوقع کپکپاہٹ اور اپنی ناک میں کھٹکھٹاہٹ کا احساس ہوا۔ اس کی آنکھیں اشک آلود ہو گئیں اور ان میں دھندلاہٹ آ گئی۔ سرلیض کو کروٹ دلا دی گئی۔ اب اس کے چہرے کا رخ ریوڑ کی سمت تھا۔ اس کی آنکھیں گئی۔

”اں پر غنودگی طاری ہو رہی ہے،“ آٹا میٹھا کیلودنا نے ایک پرس کو، جو اپنی باری لینے چنگ کی جانب آ رہی تھی، دیکھ کر کہا۔ ”آؤ چلیں۔“

بیٹر کمرے سے باہر نکل گیا۔

21

استقبالیہ کمرے میں پرس واسیلی اور بڑی پرس کے علاوہ اور کوئی شخص نہیں تھا۔ دونوں امپر طورہ کی تھریں کی تصویر کے نیچے بیٹھے تھے اور آپس میں بڑے اشتیاق سے باتیں کر رہے تھے۔ جونہی ان کی نظریں بیٹر اور اس کی ہمراہی پر پڑیں، وہ مہربوب ہو گئے۔ بیٹر کو خیال آیا کہ مجھے دیکھ کر پرس نے کچھ چھپانے کی کوشش کی ہے۔ ویسے پرس اس وقت زیر لب کہہ رہی تھی:

”مجھے یہ عورت ایک آنکھ نہیں بھاتی۔ یہ میری برداشت سے باہر ہے۔“

”کاتش نے چھوٹے ڈرائنگ روم میں چائے کا انتظام کر دیا ہے،“ پرس واسیلی نے آٹا میٹھا کیلودنا سے کہا۔

”میری بے چاری آٹا میٹھا کیلودنا، جاؤ اور کچھ کھا پی لو، ورنہ تمہاری ہمت جواب دے جائے گی۔“

بیٹر سے اس نے کچھ نہ کہا، محض از روہمدی کندھے کے نیچے اس کے بازو کو راد پادیا۔ بیٹر اور آٹا میٹھا کیلودنا چھوٹے ڈرائنگ روم میں چلے گئے۔

”اگر آپ رات بھر سونہ سکے ہوں، تو تازہ دم ہونے کے لیے اس عمدہ رومی چائے کی صرف ایک پیالی کافی

ہے، اس سے بڑھ کر آپ کو اور کوئی چیز نہیں مل سکے گی۔“ نوٹین دبے دبے جوش و خروش سے تقریر جھاز رہا تھا۔

چھوٹے گول ڈرائنگ روم میں ایک میز کے سامنے، جس پر سپرکی سرداشیا پڑی تھیں، کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں

پیمین کی ساختہ دستے بغیر نیس ونا زک پیالی تھی اور وہ چائے کی چمکیاں لے رہا تھا۔

اس اور اس رات کاؤنٹ بزدلوں کے گھر میں جتنے اشخاص موجود تھے، وہ سبھی اس وقت میز کے گرد ہجوم کیے ہوئے تھے تاکہ کچھ کھاپی کراچی تو انائی بجمع کر سکیں۔ میز کو یہ چھوٹا گول ڈرائنگ روم، جس میں کینے نصب تھے اور چھوٹی چھوٹی میز پر پڑی تھیں، خوب اچھی طرح یاد تھا۔ میز کو چونکہ قص کرنا نہیں آتا تھا، چنانچہ جب کبھی اس حویلی میں بال کا اہتمام ہوتا، وہ آئینوں سے مزین اس گول ڈرائنگ روم میں بیٹھنا پسند کرتا اور باں گاؤنوں میں ملبوس خواتین کو دیکھتا رہا جو اپنے برہنہ شانے ہیروں، جواہرات، اور موتیوں سے سجائے کمرے میں آتیں، چکا چوندا آئینوں میں اپنی صورتوں کا جائزہ لیتیں اور آگے گزر جاتیں۔ اب جب کہ نیم شب کا وقت تھا، وہی کمرہ محض نیم روشن تھا کیونکہ یہاں صرف درموم بتیاں جل رہی تھیں۔ چائے کے لوازمات ایک چھوٹی میز پر بے ترتیب پڑے تھے۔ بھانت بھانت کے نشین لوگوں کا ہجوم کرسیوں پر بیٹھ ہوا تھا۔ وہ آپس میں سرگوشیوں میں باتیں کر رہے تھے۔ ان کے، ایک ایک لفظ اور ایک ایک حرکت سے یہ مترشح ہو رہا تھا کہ بیڈ روم میں جو کچھ وقوع پذیر ہو چکا تھا اور جو وقوع پذیر ہونا تھا، وہ اس سے قطعاً قفل نہیں ہیں۔

میز کا دل تو بہت لپکا رہا تھا لیکن اس نے کھانے کی کسی شے کو ہاتھ نہ لگایا۔ اس نے اپنی مرشد پر استغناء کیا۔ ڈالیں، درد دیکھا کہ وہ بچوں کے بل کمرے سے باہر نکل رہی ہے اور استقبال کمرے کی طرف، جہاں پرنس واسلی اور بڑی پرنس بیٹھے تھے، واپس جاری ہے۔ میز نے فرض کر لیا کہ ایسا بھی ہونا تھا۔ وہ کچھ دیر شش و پنج میں پڑا رہا، پھر اٹھا اور اس کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔ اس نے دیکھا کہ آٹنا میخا کیلوونا پرنس کے قریب کھڑی ہے۔ دونوں مشتعل تھیں درد دیکھے لہجوں میں آپس میں تو تو میں میں کر رہی تھیں۔

”نادام، یہ فیصلہ مجھے کرنے دیں کہ کیا کرنا ہے اور کیا نہیں کرنا،“ پرنس کہہ رہی تھی۔ بظاہر اس کا پارہ اسی طرح چڑھا ہوا تھا، جس طرح اس وقت چڑھا تھا جب اس نے دھماکے سے اپنے کمرے کا دروازہ بند کیا تھا۔

”لیکن، مائی ڈیر پرنس،“ آٹنا میخا کیلوونا نے شیریں اور دل میں گھر کر جانے والے لہجے کے ساتھ جواب دیا۔ اس کے ساتھ ہی وہ بیڈ روم کے دروازے کی راہ میں سد سکندری بن کر کھڑی ہو گئی اور یوں اس نے پرنس کو اندر داخل ہونے کے موقع سے محروم کر دیا۔ ”ایسے وقت جب کہ انکل کو، رام کی شدید ضرورت ہے، انھیں یوں پریشان کرنا ان کے لیے باعث آزار نہیں ہوگا؟ اب جب کہ ان کی روح ستر آخرت کے لیے تیار کر دی گئی ہے، ان کے ساتھ دنیاوی امور کے بارے میں گفتگو کرنا کچھ چچا نہیں۔“

پرنس واسلی بازوؤں والی کرسی پر حسب عادت لات پر لات دھرے بیٹھا تھا۔ اس کے رخسار بے طرح پھرنک رہے تھے اور جب کبھی ان میں ٹھہراؤ آتا، کچھ یوں لگتا جیسے ان پر گوشت کی تہیں چڑھی ہوئی ہیں۔ لیکن اس نے انداز کچھ اس قسم کا بنا رکھا تھا جیسے اسے اس گفتگو سے، جو ان درخواستیں کے مابین ہو رہی تھی، کوئی تعلق واسطہ نہ ہو۔

”مائی ڈیر آٹنا میخا کیلوونا، چھوڑو، جانے دو، کاتش جو کچھ کرنا چاہتی ہے، اسے کرنے دو۔ تمہیں معلوم ہی ہے کہ کاؤنٹ اس سے کتنا پیار کرتے ہیں۔“

”مجھے تو یہ بھی معلوم نہیں کہ اس دستاویز میں ہے کیا،“ پرنس نے نقشہ نگار سے مزین تھیلے کی طرف، جو اس نے ہاتھ میں پکڑ رکھا تھا، اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”میں صرف اتنا جانتی ہوں کہ ان کا اصل وصیت نامہ ان کی میز کی راز میں پڑا ہے اور یہ شخص کاغذ ہے جو کہیں بھول و دل گیا تھا۔“

اس نے آٹا میخانیلوونا سے آگے نکلنے کی کوشش کی لیکن نا کام رہی۔ آٹا میخانیلوونا نے جست لگائی اور ایک بار پھر اس کے راستے میں دیوار بن کر کھڑی ہو گئی۔

”میری عزیز، مہربان پرنس، مجھے معلوم ہے۔“ اور آٹا میخانیلوونا نے جھپٹ کر تھیلے پر ہاتھ ڈال دیا اور اسے یوں کس کر پکڑ لیا کہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ اسے آسانی سے نہیں چھوڑے گی۔ ”ڈیئر پرنس، میں آپ سے التجا کرتی ہوں، آپ کے سامنے ہاتھ جوڑتی ہوں، ان پر رحم کریں، ترس کھائیں۔“ *Je vous en Conjure*۔ پرنس خاموش تھی۔ جو واحد آواز سنائی دے رہی تھی، اس سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ دونوں میں تھیلے پر قبضہ جمانے کے لیے زور آزمائی ہو رہی ہے۔ لیکن اس امر کے متعلق شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہ تھی کہ اگر پرنس نے بکشتائی کی ہوتی، وہ اور تو سب کچھ کہہ سکتی تھی لیکن آٹا میخانیلوونا کی تحسین بالکل نہ کرتی۔ گرچہ تھیلے پر مؤخر الذکر کی گرفت نہایت مضبوط تھی لیکن اس کے لہجے میں کوئی تبدیلی نہ آئی۔ اس نے بدستور اپنے شیریں اور نرم انداز سے کہا: ”میں، میرے عزیز بچے، ادھر آنا۔ میرا خیال ہے کہ خاندانی اجلاس میں اس کا موجود ہونا بے محل نہیں۔ کیوں پرنس، میں نے ٹھیک کہا نا؟“

”بھائی جان، آپ کیوں نہیں بولتے؟“ پرنس اچانک چیخ پڑی۔ اس کی چیخ اتنی بلند تھی کہ وہ لوگ، جو ڈرائنگ روم میں موجود تھے، انھوں نے بھی سن لی اور وہ گھبرا گئے۔ ”آپ چپ کیوں بیٹھے ہیں؟ ادھر یک غیر عورت خواہ مخواہ ہمارے گھریلو معاملات میں ٹانگ اڑا رہی ہے اور قریب البرگ شخص کی عین چوکھٹ پر کھڑی ہو کر، وہم بچارہ ہے۔ سارشن!“ وہ سفاکانہ انداز سے غراتے ہوئے چلائی اور پورا زور لگا کر تھیلا کھینچنے لگی۔

آٹا میخانیلوونا ایک دو قدم مزید آگے بڑھ آئی اور اس نے تھیلے پر اپنی گرفت اور بھی مضبوط کر دی۔ ”افوہ“ *C'est ridicule!* ”پرنس وائیلی نے متعجب اور علامت انگیز انداز سے کہا اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

”چھوڑ دو، جانے دو۔ میں کہتا ہوں چھوڑ دو!“

پرنس نے تھیلا چھوڑ دیا۔

”اور تم بھی؟“

آٹا میخانیلوونا نے اس کے حکم کی تعمیل نہ کی۔

”میں کہتا ہوں چھوڑ دو! میں ساری ذمے داری اپنے سر لے لوں گا۔ میں خود چکر پوچھ لیتا ہوں۔ میں۔“

”میں آپ کی مدد کرتی ہوں۔“

”یہ کیا بے ہودگی ہے!“

تسل ہو گئی؟“

”لیکن Mon prince“ آتنا میخائیلوونا نے پھٹ جواب دیا۔ ”اب جب کہ انھیں متبرک اسطبارغ مل چکا ہے، انھیں کچھ دیر سکون منا چاہیے! بیئر، دھر آؤ، تمھاری کیا رائے ہے؟“ اس نے نوجوان کی طرف متوجہ ہو کر پوچھا۔ وہ ب ان کے قریب آچکا تھا اور ہکا بکا ہو کر پرنس کے جس نے آن ہن اور وہاہت کا لہارہ پھینک دیا تھا، غضب آلود چہرے اور پرنس واسیلی کے پھڑکتے ہوئے رخساروں کو دیکھ رہا تھا۔

”یاد رکھو تمھیں اس کے سانچ بھگتنا پڑیں گے،“ پرنس واسیلی نے بڑی درشتی سے کہا۔ ”تمھیں پتا ہی نہیں کہ تم کیا کر رہی ہو۔“

”رذیل عورت!“ پرنس نے اچانک آتنا میخائیلوونا پر جھپٹتے اور اس کے ہاتھوں سے تھیلا چھینتے ہوئے چلا کر کہا۔

پرنس واسیلی نے سر جھکالیا، اور اپنے ہاتھ آگے پھیلا دیے۔

عین اسی لمحے، وہی ہیبت ناک دروازہ، جسے بیئر اتنی مدت سے دیکھتا چلا آیا تھا، اور جسے ہمیشہ نہایت آہستگی اور خاموشی سے کھولا جاتا تھا، اچانک زبردست دھماکے سے کھلا اور دیوار کے ساتھ جا ٹکرایا۔ اس کے ساتھ ہی بجھلی پرنس ہاتھ ملتی اور تیز تیز بھاگتی باہر آئی۔

”یہ آپ لوگ کیا کر رہے ہیں؟“ اس نے مدد بھیجی ہو کر کہا۔ ”وہ آخری سانس لے رہے ہیں اور آپ نے مجھے اکیلا ان کے پاس چھوڑ دیا ہے!“

بڑی پرنس نے تھیلا نیچے گرا دیا۔ آتنا میخائیلوونا تیزی سے نیچے جھکی، اس نے فساد کی جڑ تھیلے پر جھپٹا، اور اسے پہ بھگت اٹھایا اور بیئر درم میں بھاگ گئی۔ بڑی پرنس اور پرنس واسیلی نے اپنے حواس درست کیے اور اس کے پیچھے ہو لیے۔ چند ثانیوں کے بعد پرنس دوبارہ باہر آئی۔ اس کا رنگ فق اور چہرہ سخت ہو چکا تھا۔ وہ اپنا زیریں ہونٹ چبا رہی تھی۔ جب اس کی نظر بیئر پر پڑی، اس کے چہرے پر ایسی شدید نفرت پیدا ہو گئی کہ اس پر قابو پانا اس کے بس کی بات نہ رہی۔

”اب تم جشن منا سکتے ہو،“ اس نے کہا، ”تمھیں تو اسی وقت کا انتظار تھا!“

اور وہ سسکیاں لے کر رونے لگی۔ اس نے اپنا چہرہ رومال میں چھپایا اور کمرے سے بھاگ گئی۔

اس کے بعد جو شخص کمرے میں آیا، وہ پرنس واسیلی تھا۔ جس صوفے پر بیئر بیٹھا تھا، وہ لڑکھڑاتا، ڈگدگا تا اس کی طرف بڑھا اور بے اختیار اس پر گر پڑا۔ اس نے اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیے۔ بیئر نے دیکھا کہ اس کے چہرے کا رنگ زرد ہو چکا ہے اور اس کا جیڑ ایوں پھڑک اور کانپ رہا ہے جیسے اسے جھلسا دینے والا بخار ہو گیا ہو۔

”آہ میرے دوست،“ اس نے بیئر کی کبھی اپنے ہاتھ میں پکڑتے زیر لب کہا۔ اس کی آواز میں اتنی ملاصحت

مائی پرنس

اور غلوں تھا کہ بیٹر کو اس سے پہلے کبھی اس کا مشاہدہ نہیں ہوا تھا۔ ”ہم کتنے مہیب گناہوں کا ارتکاب کرتے ہیں، کیسے کیسے مکر اور فریب کرتے ہیں۔ یہ سب کس لیے؟ میرے دوست، میں سٹھ کے پیٹے میں داخل ہو چاہتا ہوں۔ میں، میں بھی۔ ہر چیز کا نجا مٹتا ہے۔ موت بے حد ہشت ناک چیز ہے۔“ اور وہ رونے لگا۔

”نٹائیخا کیو دنا سب سے آخر میں باہر آئی۔ وہ آہستہ آہستہ رہے پاؤں چلتی بیٹر کے قریب آئی۔

”بیٹر!“ اس نے کہا۔

”بیٹر نے استغہا سیہ ٹگا ہوں سے سے دیکھا۔ آٹائیخا کیو دنا نے نوجوان شخص کی پیشانی چومی اور اسے اپنے آنسوؤں سے بھگو دیا اس نے کچھ دیر توقف کیا اور پھر بولی۔

”وہ اس دنیا میں نہیں رہے۔“

بیٹر نے چشمے میں سے اس کی طرف دیکھا۔

”او، میں تمہارے ساتھ چلتی ہوں۔ کوشش کرو کہ تمہیں رونا آ جائے۔ آنسوؤں سے بڑھ کر کسی چیز میں راحت نہیں ملتی۔“

وہ اسے تاریک ڈرائنگ روم میں لے گئی۔ بیٹر خوش تھا کیونکہ یہاں اندھیرے میں کوئی شخص اس کا چہرہ نہیں دیکھ سکتا تھا۔ آٹائیخا کیو دنا نے سے وہیں چھوڑ دیا اور جب وہ واپس آئی وہ اپنا سر بازو پر رکھے گہری نیند سو رہا ہوا تھا۔

اگلی صبح آٹائیخا کیو دنا نے بیٹر سے کہا

”out, mon cher یہ صرف تمہارا ہی نہیں، ہم سب کا نقصان ہوا ہے۔ لیکن خداوند تمہیں حوصلہ اور ہمت دیں گے۔ تم نوجوان ہو اور مجھے یقین ہے کہ اب تم بے پناہ دولت کے مالک ہو۔ وصیت نامہ ابھی کھو، نہیں گیا۔ میں تمہیں اتنی اچھی طرح جانتی ہوں کہ میں پورے اعتماد سے کہہ سکتی ہوں کہ اس (دولت) سے تمہارا داغ نہیں پھر جائے گا۔ تاہم تمہاری ذمے داریوں میں زبردست اضافہ ہو جائے گا۔ تمہیں اب مرد بننا ہو گا۔“

بیٹر خاموش رہا۔

”mon cher، میں شاید بعد میں تمہیں بتا سکوں گی کہ اگر میں یہاں نہ ہوتی، پھر خدا معلوم یہاں کیا ہو جاتا! انکل نے پرسوں ہی مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ وہ بورس کو نہیں بھولیں گے لیکن انہیں (اپنا وعدہ ایذا کرنے کا) وقت ہی نہ ملا۔ mon cher، مجھے امید ہے کہ اب تم اپنے باپ کی خواہشات کا احترام کرو گے اور انہیں پایہ تکمیل تک پہنچاؤ گے۔“

بیٹر کی خاک سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کیا کہہ رہی ہے۔ وہ شرماتا رہا تھا اور اس کے چہرے کا رنگ سرخ ہو رہا تھا۔

وہ چپ چاپ آٹائیخا کیو دنا کی جانب دنگ رہا۔

جس: کابلی ورتو ہم۔ اور انسان صرف دو خوبیوں سے مار مال ہیں توانائی اور ذہانت۔ اپنی بیٹی کی تعلیم دتدریس وہ خود کرتا تھا۔ اور اس میں ان دونوں بنیادی خوبیوں کا نفوذ کرنے کی غرض سے وہ اسے الجبرا اور جیومیٹری کے اسباق دیا کرتا تھا۔ اس نے اس کی زندگی کا لائحہ عمل کچھ اس طور ترتیب دیا تھا کہ وہ ہمہ وقت مصروف رہتی تھی اور اسے فراغت کا ایک لمحہ بھی میسر نہیں آتا تھا۔ وہ خود بھی مسلسل کام میں جتا رہا کرتا تھا۔ اپنی یادداشتیں تحریر کرتا، اعلیٰ ریاضی کے مسائل حل کرتا، خراج پر سوار کی ڈبیاں بناتا، باغیچہ سینچتا، یا عمارت سازی کی جو اس کی جاگیر پر متواتر جاری رہتی، نگرانی کرتا۔ چونکہ کام کی بنیادی شرط باقاعدگی ہے، پرنس کے طرز حیات میں باقاعدگی پر اتنی سخت سے عمل کیا جاتا تھا کہ اس میں عین سیکر نکالنے کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی تھی۔ طعام کے اوقات بھی انہی شرائط کے تابع تھے۔ وہ عین مقررہ ساعت پر پہنچتا اور اس میں ایک آدھ منٹ کی کمی بیشی کا بھی روادار نہ ہوتا۔ بیٹی سے لے کر ملازمین تک، جتنے بھی لوگوں کا اس سے واسطہ پڑتا تھا، ان سب کے ساتھ اس کا رویہ درشت اور سخت گیر ہوتا اور فرائض کی ادائیگی میں وہ ذرہ برابر کوتاہی برداشت نہ کرتا۔ چنانچہ سفاکی اور سنگ دلی کا مظاہرہ کیے بغیر اس نے ان کے دلوں پر ایسی دہشت اور دھاک بٹھادی تھی کہ ستمو سے ستمو شخص کی یہ بجل نہیں تھی کہ اس کے سامنے چوں چرا کرتا۔

اس امر کے باوجود کہ اب وہ ریٹائرمنٹ کی زندگی گزار رہا تھا اور مملکت کے امور میں اس کا کوئی اثر و رسوخ باقی نہیں رہا تھا، اس صوبے کا ہر اہلکار، جس میں اس کی جاگیر واقع تھی، اس کی خدمت میں حاضر ہونا اپنا فرض سمجھتا تصور کرتا اور اس کے بلند و بالا استقبالیہ کمرے میں میں عین اسی طرح انتظار کرتا جس طرح ہر تعمیرات، باغبان اور پرنس، ماریا کرتی تا آنکہ وہ ملاقات کے عین معینہ وقت پر وہاں پہنچ جاتا۔ جب سٹڈی روم کا انتہائی اونچا دروازہ کھلتا اور نہایت پست قامت بزرگ شخص اپنے چھوٹے چھوٹے پڑ مردہ ہاتھوں، پاؤں چھتر کی دگ اور سفید گھنے ابروؤں (جب کبھی خفگی کے عالم میں اس کے ماتھے پر بل پڑتے، اس کے یہ گھنے ابرو اس کی زیرک اور جوانوں کی طرح کی چسکی آنکھوں کی چمک دمک چھپا لیتے) کے ساتھ استقبالیہ کمرے میں داخل ہوتا، تو اس سرکاری اہلکار پر بھی وہی رعب، بلکہ ایک قسم کا خوف بھی، طاری ہو جاتا جو دوسرے لوگوں پر ہوتا تھا۔

جس روز نو جوانوں نے آنا تھا، پرنس ماریا روزمرہ کے معمول کے مطابق عین معینہ وقت پر صبح کا سلام عرض کرنے استقبالیہ کمرے میں داخل ہوئی۔ وہ خوف سے کپکپا رہی تھی اور اپنے سینے پر صلیب کے نشانات بنا رہی تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ دل میں دعائیں بھی مانگتی جا رہی تھی۔ وہ ہر روز اپنے باپ سے ملاقات کرنے جاتی اور ہر روز ہی دعائیں کرتی کہ اپنے والد سے اس کی ملاقات بخیر و خوبی سر انجام پا جائے۔

ایک بوڑھا خدمت گار، جس نے اپنے بالوں پر خوشبودار پاؤں چھتر رکھا تھا اور جو استقبالیہ کمرے میں بیٹھا تھا، چپ چاپ اٹھا اور دھیمی آواز میں بولا:

”برائے مہربانی اللہ تشریف لے چلیں۔“

دروازے میں سے خراج کی ایک رنگی آواز سنائی دے رہی تھی۔ پرنس نے ڈرتے جھپٹے دروازہ کھولا۔

دروازہ آسانی سے اور بغیر چرچرائے کھل گیا۔ پرس نے کچھ دیر وہیں توقف کیا۔ پرس نے، جو اپنے خراؤ پر مصروف کار تھا، نگاہ اوپر اٹھائی لیکن اپنے کام میں مشغول رہا۔

وسیع و عریض سلڈی روم ایسی اشیاء سے اٹا پڑا تھا، جو ہر مسلسل استعمال میں آتی رہتی تھیں۔ ایک خاصی بڑی میز تھی، یہ کتابوں اور نقشوں سے بٹی ہوئی تھی۔ کتابوں کی اونچی اونچی الماریاں تھیں۔ ان کے پٹ شیشے کے تھے اور ان کے تالوں میں چابیاں لٹک رہی تھیں۔ ایک اور میز تھی۔ یہ اتنی اونچی تھی کہ آدمی کھڑا ہو کر اس پر لکھائی کا کام کر سکتا تھا اور اس پر ایک کھلی کاپی پڑی تھی۔ ایک خراؤ تھا۔ اس کے قریب مختلف اوزار ترتیب سے رکھے ہوئے تھے۔ دائرہ میسونڈے کا سا، ان بھی ادھر ادھر پڑا تھا۔ ان تمام اشیاء پر ایک نظر ڈالنے سے یہ احساس ہوتا تھا کہ یہاں مختلف النوع سرگرمیاں منظم انداز سے مسلسل جاری رہتی ہیں۔ پرس اپنے چھوٹے چھوٹے پاؤں کو، جن میں اس نے کارچوبی تاناری بوٹ پہنے ہوئے تھے، جس انداز سے حرکت دے رہا تھا اور اپنے دیے پتلے لیکن قوی ہاتھوں سے جس طرح دباؤ ڈال رہا تھا، اس سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ اس میں جفاکش بڑھاپے کی توانائی بدرجہ اتم موجود ہے، وہ سخت سے سخت حالات کا مقابلہ کر سکتا ہے اور ناقابل تسخیر ہے۔ اس نے اپنے خراؤ کو چند مزید چکر دیے، اس کے بعد پیڈل سے پاؤں ہٹایا، جھنجھکی کو صاف کیا، اسے تھلی میں، جو خراؤ کے ساتھ لٹک رہی تھی، ڈالا، میز کی طرف بڑھا اور بیٹی سے آگے آنے کو کہا۔ وہ اپنے بچوں کو دعائیں دینے یا ان کے سروں پر ہاتھ بھرنے کا قائل نہیں تھا۔ چنانچہ اس نے اپنا ٹھنڈا رخسار جس پر ہل اگے ہوئے تھے کیونکہ اس نے ابھی تک شیونہیں بنائی تھی، اپنی بیٹی کے آگے کر دیا تاکہ وہ اسے بوسہ دے سکے اور درشت لہجے (لیکن اس کی نگاہوں میں شفقت اور توجہ تھی) سے گویا ہوا:

”تم ٹھیک ہو؟ بہت خوب، بیٹھو۔“

اس نے ایک کاپی اٹھائی۔ اس پر اس نے اپنے ہاتھ سے جیومیٹری کے اسباق تحریر کیے تھے، اور پاؤں سے کرسی گھسیٹ کر آگے کر لی۔

”کل کا کام؟“ اس نے غفلت سے مطلوبہ صفحہ پلٹے اور اس پر ایک پیرے سے دوسرے پیرے تک اپنے خاثرہ نشانوں سے نشانات بناتے ہوئے کہا۔

پرس میز پر رکھی کاپی پر جھک گئی۔

”ظہیر، تمہارے لیے خط بھی ہے،“ معر شخص نے اچانک کہا اور تھلی سے، جو میز کے ساتھ لٹک رہی تھی،

خط نکالا اور اسے میز پر پھینک دیا۔ مکتوب پر پانسوئی ہاتھوں کا تحریر کیا ہوا تھا۔

پرس کی نظر جب خط پر پڑی، اس کے گالوں پر سرخ دھبے نمودار ہو گئے۔ اس نے جھپا جھپ خط اٹھایا

اور اس کے اوپر اپنا سر جھکا دیا۔

”ایلو⁴⁸ز کا ہے؟“ پرس نے سرد مہر جسم سے پوچھا۔ سکرانے سے اس کے دانت نمایاں ہو گئے۔ ان پر

کرپڑا جما ہوا تھا لیکن وہ ابھی تک صحت مند تھے۔

”جی ہاں، جولی کا ہے،“ پرنس نے ڈرتے جھپکتے دیکھتے اور پچھلے نذر سے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔
 ”میں دو اور خطوط یونہی تمہارے سپرد کردوں گا لیکن تیسرا لازماً پڑھوں گا،“ پرنس نے درشتی سے کہا۔ ”میرا خیال ہے کہ تم ڈھیروں واہیات باتیں لکھتی رہتی ہو میں تیسرا ضرور پڑھوں گا۔“
 ”mon pere، گر آپ چاہیں تو بے شک یہ بھی پڑھ لیں،“ پرنس نے خط آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔
 اس کے گال پہلے سے بھی زیادہ تھمارے تھے۔

”میں نے کہا تھا کہ تیسرا، صرف تیسرا،“ پرنس نے ترش روئی سے جواب دیا۔ اس نے خط پر بے ہنگام اپنی کہنیاں میز پر ٹکا دیں اور وہ کاپی، جس پر جیومیٹری کی شکلیں بنی ہوئی تھیں، اپنی طرف گھسیٹ لی۔
 ”دیکھو، مادام،“ بوڑھے نے اپنی بیٹی کے بالکل قریب کاپی پر جھکتے اور اپنا بازو اس کی کرسی کی پشت پر رکھتے ہوئے کہا۔ ماریا کو محسوس ہوا کہ وہ تنہا کو اور بڑھاپے کی تلخ دنا گور بو میں، جسے اس نے مدتوں سے اپنے باپ کے ساتھ ساتھ وابستہ کر رکھا تھا، گھر گئی ہے۔ ”دیکھو، مادام، یہ کونیں برابر ہیں۔ زاویہ اب ج کو بخور دیکھو۔“
 پرنس نے اپنے باپ کی چچماتی آنکھوں کی سمت، جو اس کے بالکل قریب تھیں، ڈرتے کانپتے رکھا۔ سرخ دھبے اس کے رخساروں پر ابھرنے اور غائب ہونے لگے۔ یہ بالکل عیوں تھا کہ وہ جو کچھ کہہ رہا تھا، اس کا ایک لفظ بھی اس کے پلے نہیں پڑ رہا تھا اور وہ اتنی ہراساں اور خوف زدہ تھی کہ اس کا باپ بعد ازاں خواہ کتنی ہی بار اور کتنی ہی وضاحت سے اسے سمجھانے کی کوشش کرے، اس کا ذرا سے کچھ سمجھنے نہیں دے گا۔ اس سے قطع نظر کہ غلط استاد کی تھی یا شاگرد کی، ہوتا ہر روز یہی تھا۔ پرنس کی آنکھیں ڈبڈبائے لگتیں، اسے نہ کچھ نظر آتا اور نہ سنائی دیتا۔
 اسے صرف اپنے باپ کے درشت اور خشک چہرے کی قربت کا، اس کی سانس کا اور اس کی تلخ اور ناگوار بو کا احساس ہوتا۔ اس کے ذہن پر صرف ایک ہی دھن سوار رہتی کہ وہ جتنی جلد ہو سکے، سڑی روم سے فرار ہو جائے اور اپنے کمرے کی تنہائی اور خاموشی میں مسئلہ حل کرنے کی کوشش کرے۔ قہر مرد کا پارہ چڑھ جاتا، وہ کھٹکھٹا ہٹ سے اپنی کرسی پیچھے دھکیل دیتا اور اسے کھینچ کر پھر میز کے قریب کریتا۔ اگرچہ اس کی پوری کوشش ہوتی کہ وہ ضبط سے کام لے، غیظ و غضب کو اپنے در پر سوار نہ ہونے دے لیکن ہوتا اس کے برعکس۔ وہ تقریباً ہمیشہ ہی جوش میں آ جاتا، اسے سخت سوت کہتا اور بعض اوقات کاپی اٹھا کر دور پھینک دیتا۔

پرنس نے جواب غلط دیا۔

”کیسی احمق لڑکی ہے!“ پرنس نے دہڑتے ہوئے کہا۔ اس نے کاپی ایک طرف دھکیل دی اور غصے کے عالم میں منہ دوسری طرف پھیر لیا۔

تاہم وہ جھپا کے سے اٹھ کھڑا ہوا، کمرے میں ایک آدھ چکر لگایا، دوبارہ واپس آیا، ہلکے سے اپنی بیٹی کے سر پر ہاتھ رکھا، کرسی آگے کھینچی، پیچھے بیٹھا اور دوبارہ تشریح کرنے لگا۔

”پرنس، یوں کام نہیں چلے گا، یوں کام نہیں چلے گا،“ اس نے پرنس سے کہا، جو کاپی اٹھ چکی اور واپس جانے کے لیے تیار ہو رہی تھی۔ ”مادام، ریاضی بڑا زبردست شغل ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ تم بھی دوسری ناقص عقل عورتوں کی طرح نظر آؤ۔ مستقل مزاجی سے جتی رہو۔ تم اسے پسند کرنے لگو گی۔“ اس نے اس کے گالوں پر تھپکی دی۔ ”یہ تمھارے دماغ کے تمام جالے صاف کر دے گی اور اس میں سے تمام فضول باتیں نکال دے گی۔“ اس نے جانے کی کوشش کی لیکن اس نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روک دیا۔ اس نے اپنی دراز میں سے ایک بالکل نئی کتاب، جس کے ابھی صفحات بھی کالے نہیں گئے تھے، نکالی۔

”اور یہ لو۔ تمھاری ویلوا نے کسی قسم کی، کلید اسرار،⁴⁹ بھیجی ہے۔ مذہبی موضوع ہے۔ لیکن میں کسی کے عقائد میں دخل نہیں دیتا۔ میں نے اس پر سرسری نظر ڈالی ہے۔ پکڑا اور اب چلتی بنو۔“

پرنس ماریا واپس اپنے کمرے میں چلی گئی۔ اس کے چہرے پر اداسی اور خوف کے جو تاثرات تھے، وہ شاید ہی کبھی اس کا پیچھا چھوڑتے ہوں گے۔ انھوں نے ایک غضب یہ ڈھایا تھا کہ انھوں نے اس کی شکل و صورت، جو پہلے ہی معمولی اور پیلی تھی، اور بھی معمولی اور پیلی بنا دی تھی۔ وہ اپنے نکلنے کی میز کے سامنے جس پر بے شمار تصویریں⁵⁰، کتابیں اور کاغذات ادھر ادھر بکھرے پڑے تھے، بیٹھ گئی۔ باپ جتنا قرینے اور ترتیب کا دلدادہ تھا، بیٹی اتنی ہی بدتر تھی اور عدم قرینے کی شوقین تھی۔ اس نے جیو میٹری کی کاپی نیچے رکھی اور بڑی بے صبری سے خط کھولنے لگی۔ یہ اس کی بچپن کی بے تکلف ترین کیلی، جولی کا راگنا کا، جو دستونوں کے نام دن کی غیافت میں شریک تھی، تحریر کردہ تھا۔

جولی نے یہ خط قرآنیسی میں لکھا تھا۔

میری عزیز از جاں اور قابل قدر سہیلی۔

یہ مفارقت بھی کتنی بھیاںک اور لذیت ناک چیز ہے! اگرچہ میں اپنے آپ کو جتنی راہتی ہوں کہ میری نصف زندگی اور سرتنیں تمھاری ذات کے ساتھ منسلک ہیں اور یہ کہ ان فاصلوں کے باوجود، جنھوں نے ہمارے مابین دوریاں حائل کر رکھی ہیں، ہمارے قلوب ناوید و رشتوں میں ایک دوسرے کے ساتھ پیوست ہیں، پھر بھی میرا دل تقدیر کے خلاف مائل بغاوت رہتا ہے اور ان راحتوں اور تفریحات کے باوجود، جنھوں نے میرے گرد و پیش حصار بنایا ہوا ہے، میں خاص قسم کی پوشیدہ اور اسی پر غالب نہیں آسکتی جو اس وقت سے میرے کلیجے کو مسوں رہی ہے جب سے ہم دونوں کے درمیان جدائی کی خلیج حائل ہوئی ہے۔ گزشتہ گریسوں کی طرح، جب ہم تمھارے وسیع و عریض سٹڈی روم میں بیٹھے صوفے۔ ”ہمارا راز دان صوفے۔“ پر بیٹھا کرتی تھیں، اس مرتبہ بھی ہم کیوں یک جا نہیں ہو سکتیں؟ جس طرح آج سے تین ماہ قبل مجھے تمھاری آنکھوں جھیل کی طرح گہری، پرسکون اور دل آویز آنکھوں۔ سے اخلاقی قوت ملا کرتی تھی، دوبارہ کیوں نہیں مل

سکتی؟ کتنا پیار تھا مجھے تمہاری ان آنکھوں سے اور اب جب کہ میں یہ مکتوب تحریر کر رہی ہوں، مجھے یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے وہ آنکھیں اب بھی میرے سامنے موجود ہیں۔

یہاں تک پڑھنے کے بعد پرنس ماریا نے ٹھنڈی سانس بھری اور دائیں طرف دیواری آئینے میں جھانکنے لگی۔ آئینے میں دبلے پتلے چہرے اور کروڑوں اتواں اور بدزیب جسم کا عکس نظر آ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں، جو ہمیشہ اس رہا کرتی تھیں، آئینے میں عکس کو خاص طور پر یاس دانا میدی سے دیکھنے لگیں۔ ”وہ مجھے پھسلا رہی ہے، خواہ مخواہ میری تعریفوں کے پل باندھ رہی ہے“ پرنس نے دوبارہ خط پڑھتے ہوئے سوچا۔ لیکن جونی نے اس کی خواہ مخواہ تعریف نہیں کی تھی۔ پرنس کی آنکھیں غزالی، گہری اور تابناک (بعض اوقات ترویوں محسوس ہوتا تھا کہ ان میں سے گرم روشنی کی کرنیں پھوٹ رہی ہیں) تھیں اور واقعاً اتنی خوبصورت تھیں کہ اس امر کے باوجود کہ اس کی شکل و شباہت بالکل معمولی تھی، انھوں نے اس میں وہ کشش پیدا کر دی تھی جو حسن و جمال سے کہیں بڑھ کر تھی۔ لیکن خود پرنس کو اپنی آنکھوں کی خوبصورتی کا کبھی اندازہ نہیں ہوا تھا۔ یہ خوبصورتی اس وقت نمایاں ہو کر سامنے آتی تھی جب وہ اپنے بارے میں سوچ نہیں رہی ہوتی تھی۔ جیسا کہ عام طور پر ہر شخص کے ساتھ ہوتا ہے، وہ جو خفی آئینے میں اپنی شکل دیکھتی، اس کے چہرے پر غیر فطری تناؤ اور بد صورتی سایہ ٹگن ہو جاتی۔

پرنس دوبارہ خط پڑھنے میں مصروف ہو گئی۔

ماں کو میں جنگ کے علاوہ اور کسی موضوع پر گفتگو نہیں ہوتی۔ میرا ایک بھائی پہلے ہی پروس میں مدھار چکا ہے اور دوسرا گارڈز میں، جو سرحد کی طرف کوچ کرنے کے لیے پرتول رہے ہیں، بھرتی ہو گیا ہے۔ ہمارے محبوب اپنا طور پتیر زرگ سے روانہ ہو چکے ہیں اور سنا ہے کہ وہ اپنی ذات یا برکات کو جنگ کی بھٹی میں جھونکنے کا عزم کر چکے ہیں۔ ہماری دعا ہے کہ ہمارے فرشتہ خصلت، سپر طور، جنھیں خداوند نے ازراہ لطف و کرم ہمارا حکراں بنایا ہے، کاریبکا کے اس عفریت کو، جس نے یورپ کے امن و سکون کو غارت کر رکھا ہے، شکست فاش سے دو چار کر سکیں۔ بھائیوں کا تو ذکر ہی کیا، اس جنگ نے مجھے ایک ایسی ہستی سے بھی جو مجھے اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز ہے، محروم کر دیا ہے۔ میری مراد لو جو ان نکولائی رستوف سے ہے۔ وہ اپنے دلوں اور جوش و خروش کے بیش نظر ٹپے بیٹھ ہی نہیں سکتے۔ چنانچہ انھوں نے فوج میں بھرتی ہونے کے لیے یونیورسٹی کو خیر باد کہہ دیا ہے اور ہاں، خواہر عزیز، مجھے تمہارے سامنے یہ اعتراف کرنے میں کوئی باک نہیں کہ ان کی اٹھتی جوانی کے باوجود فوج میں بھرتی ہونے کے لیے ان کی روانگی میرے لیے ناقابل برداشت رنج و الم کا سبب بنی ہے۔ یہ نو جوان، جن کا ذکر میں نے گزشتہ گریموں کے دوران میں تم سے کیا تھا، اسے شریف و نجیب اور صحیح معنوں میں اسے نوجوان ہیں کہ ڈھونڈا کرو چہاں رخ زیبائے کر، پھر بھی ان

کا شیل نہ ملے کیونکہ حال یہ ہے کہ کئی زمانہ میں برس کے چھوکرے بھی سن رسیدہ بزرگ دکھائی دیتے ہیں! ان کا سب سے بڑا وصف یہ ہے کہ وہ جو بات کہتے ہیں، صاف صاف کہتے ہیں، کوئی لگی لپٹی نہیں رکھتے۔ پھر کیا دل پایا ہے انھوں نے! وہ اتنے پاک دامن اور شاعر مزاج ہیں کہ ان کے ساتھ مجھے جو راہ و رسم، اس کی نوعیت خواہ کتنی ہی عارضی اور ناپائیدار کیوں نہ ہو، بڑھانے کا موقع ملے، اس نے میرے اس قلبِ حزن کو، جو پیسے ہی اتنی گہری جوت کھا چکا اور زخم زخم ہو چکا ہے، کئی خوشیوں اور سرتوں کا گہوارہ بنا دیا ہے۔ ایک دوسرے سے کیسے جدا ہوئے اور اس موقع پر ہم نے ایک دوسرے سے کیا کہا، کیا سنا، کسی روز تمہیں اس کی پوری تفصیل سناؤں گی، ابھی گھاؤ تازہ ہیں، ان کا نہ چھیڑنا ہی بہتر ہے۔ آہ، میری عزیز سہیلی، تم خوش نصیب ہو کہ بھی تمہیں ان دل پذیر سرتوں اور دل فگار آلام سے ہالا نہیں پڑا! تم خوش نصیب ہو کیونکہ سو خیر اللہ کر کی کمک بہت شدید اور گہری ہوتی ہے۔ میں جانتی ہوں کہ کاؤنٹ نگرمائی ابھی اتنے نوخیز ہیں کہ وہ میرے لیے ہدم سے بڑھ کر اور کچھ نہیں ہو سکتے لیکن اس شیریں رفاقت، اس پاکیزہ اور شاعرانہ تکلفی نے میرے قلبِ ناشدہ کی تمام حسرتوں کی تکمیل کر دی ہے۔ اب اس کے متعلق مزید کچھ کہنے سننے کی ضرورت نہیں۔ اتنا ہی کافی ہے۔

عظیم ترین خیر امر وہ جس کی حدائے ہر گشت سارے ماسکو میں سنائی دے رہی ہے، معمر کاؤنٹ بزدخوف کا انتقال پر دل اور ان کی میراث ہے۔ مقامِ خیرت ہے کہ جنوں پر نسوں کو تر کے کا انتہائی قلیل حصہ ملا ہے اور سبے پرنس واسلی، ان کی تو لٹیا ہی ڈوب گئی ہے، دھیلا ہاتھ نہیں آیا۔ اور یہ سو سو بیڑی جنہیں ورثے میں سب کچھ مل گیا ہے۔ اور مزید برآں، انھیں صحیح النسب بھی تسلیم کر لیا گیا ہے۔ ان تمام باتوں کا ماحصل یہ ہے کہ سو سو بیڑی محض، ویرانی نہیں رہے بلکہ کاؤنٹ بزدخوف بن گئے ہیں اور مملکت روس کی وسیع ترین جائیداد اور دوست ان کے قدموں پر زحیر ہو گئی ہے۔ انواہوں کے مطابق پرنس واسلی نے اس معاملے میں نہایت گھٹیا کردار کا مظاہرہ کیا۔ وہ اب نہ دکائے اور سر نہ ہوڑائے واپس پیٹرز برگ چلے گئے ہیں۔ مجھے اقرار ہے کہ ترکوں اور روسیوں کے بارے میں میرا علم صفر ہے۔ میں صرف اتنا جانتی ہوں کہ یہ نوجوان، جنہیں ہم سب محض سو سو بیڑی کے نام سے موسوم کرتے تھے، اب کاؤنٹ بزدخوف کا روپ دھار چکے ہیں اور مملکت روس کی وسیع ترین جائیداد اور دھن دوست ان کے قبضے میں آ گیا ہے۔ مجھے یہ دیکھ کر بہت تعجب ہوتا ہے کہ وہ انہیں، جن کی بیوی شادی کی عمر کو پہنچ گئی ہیں، اور خود یہ نوخیز رو شیرائیں بھی، اس فردِ واحد کے بارے میں ایسا کیسی اپنے لب و لہجہ اور رویے میں تبدیلی لے آئی ہیں۔ (ویسے آپس کی بات ہے کہ یہ شخص کبھی میرے جی کو نہیں بھایا، مجھے یہ ہمیشہ گھٹیا نمونہ ہی نظر آیا۔) جس طرح گزشتہ سالوں کے دوران میں ماسکو کے لوگ مجھے ایسے ایسے اشخاص سے، جن میں سے اکثر کو میں جانتی تک نہیں، منسوب کر کے محفوظ ہوتے رہے ہیں، اسی طرح اب ان خدا اور سلفے رشتہ کرانے والیوں نے مجھے کاؤنٹس، بزدخوف اور ایسا

ہے۔ لیکن تم خود سمجھ دار ہو، مجھے اس کی رتی برابر خواہش نہیں۔

شادی کا ذکر چل ہی نکلا ہے تو پھر نگہ ہاتھوں یہ بھی سنتی چلو کہ جگت خارہ آنا میخانیلوونانے مجھے سخت رازداری کی تلقین کر کے تمھاری شادی کے بارے میں ایک منصوبے سے آگاہ کیا تھا۔ چانتی ہو کہ تمھاری یہ شادی کس کے ساتھ ہوگی؟ بھلا متوقع امیدوار پرنس واسیلی کے تخت جگرانا طول کے علاوہ اور کون ہو سکتا ہے! ان لوگوں کا منصوبہ یہ ہے کہ اناطوس کا بیوہ کسی صاحب حیثیت اور نامور و شہزادہ کے ساتھ کر دیا جائے تاکہ وہ کسی طور سدھر جائے۔ اس کے عزیز واقارب کے حساب سے قرعہ قائل تمھارے نام نکلا ہے۔ تمھاری اس سب سے کیا رائے ہوگی، مجھے اس کے متعلق کچھ معلوم نہیں تاہم اس بارے میں تمھیں آگاہ کرنا میں نے اپنا فرض گردانا۔ سنا ہے کہ وہ سببہ حد خوش شکل ہے لیکن لا اہلی اور بے گام بھی حد سے زیادہ ہے۔ میں اس کے بارے میں بس اتنی ہی معلومات، کشی کر سکی ہوں۔

خیر گپ شپ کا ٹی ہو چکی۔ میں کاغذ کا دوسرا ورق بھی ختم کیا چاہتی ہوں۔ ادھر ماما حکم دے رہی ہیں کہ میں اپراکسوں کی ضیافت میں شرکت کروں۔

میں شریعت کی جو کتاب تمھیں بھیج رہی ہوں، اسے ضرور پڑھنا۔ آج کل یہاں ہر شخص اس کا دیوانہ ہو رہا ہے۔ اگرچہ اس میں بعض باتیں مشکل ہیں اور وہ کمزور ذہنوں کی دسترس میں نہیں آ سکتیں، پھر بھی یہ تصنیف بہت عمدہ اور قابل ستائش ہے۔ اس کے پڑھنے سے روح کو شانتی ملتی ہے اور وہ بلند یوں پر پرواز کرنے لگتی ہے۔ خدا حافظ۔ آپ کے ابا جان کو آداب عرض کرتی ہوں اور مادام بوغین کو سلام پیش کرتی ہوں۔ میں دس کی گھرائیوں سے تمھارے ساتھ معافیت کرتی ہوں۔

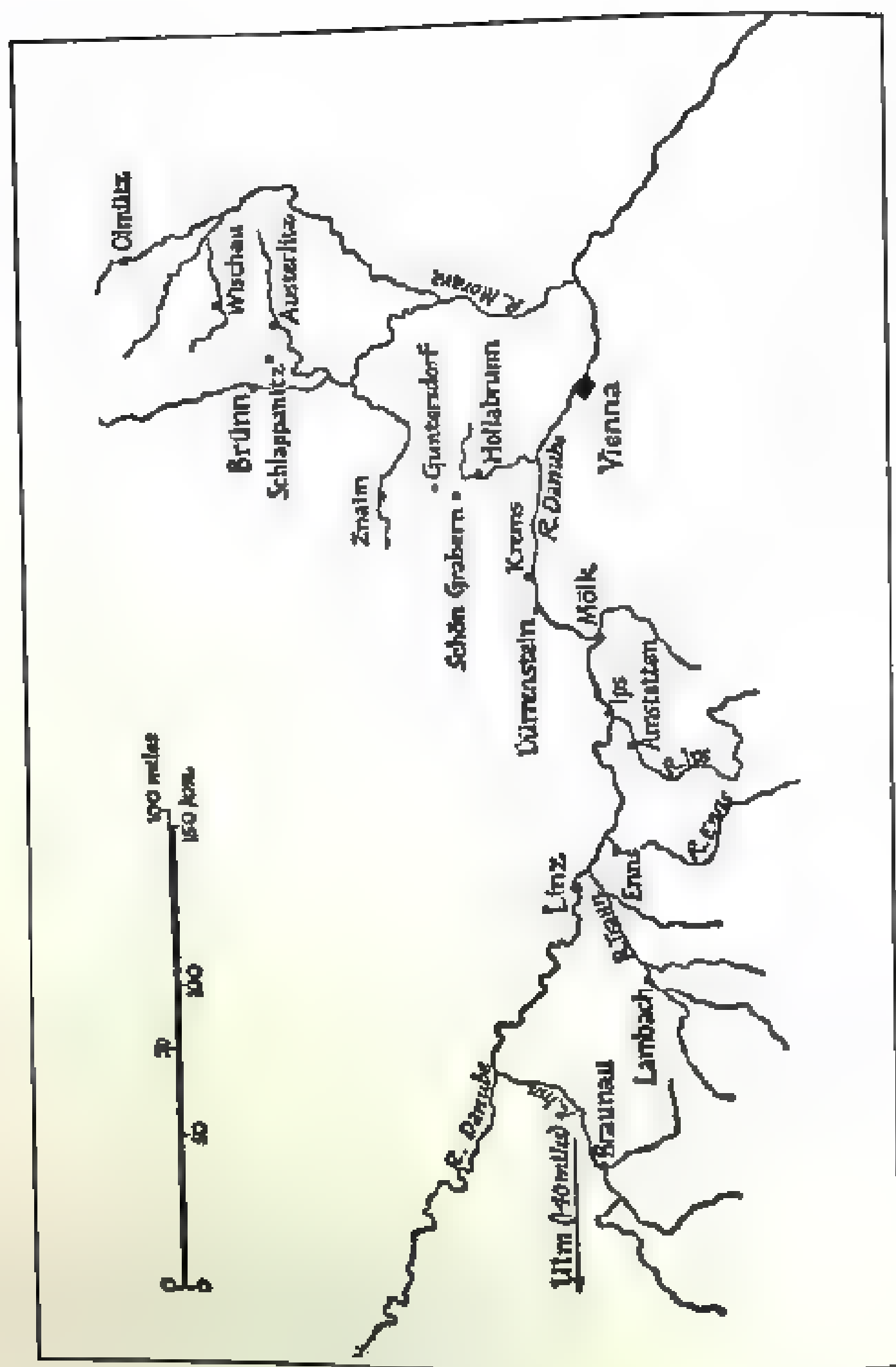
جولی

پس تحریر ۔ اپنے بھائی اور ان کی ننھی ننھی پرکشش بیگم کے متعلق مجھے ضرور لکھنا۔

پرنس کچھ دیر گھر سے سوچ بچار میں مستغرق رہی۔ حسرت انگیز مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر کھیلتی رہی، اور اس کے چہرے کی، جسے اس کی تابدر آنکھوں نے روشن و منور کر دیا تھا، کھل کا یا پلٹ ہو گئی۔ چانک وہ اٹھی اور بھاری قدموں کرے کی دوسری جانب میز کے قریب پہنچی۔ اس نے کاغذ کا ورق اٹھایا اور اس کا ہاتھ بہ سرعت اس پر چلنے لگا۔ اس نے فرانسیسی میں مندرجہ ذیل جواب تحریر کیا

میری گرانقدر اور عزیز بہیلی۔

تمھارے تیرہ تاریخ کے مکتوب نے میرا دل باغ باغ کر دیا۔ میری شاعر صفت جولی گویا تمھیں اب بھی



مجھ سے پیار ہے، جس مفارقت کو تم نے جی بھر کر کوسنے سنائے ہیں، معلوم ہوتا ہے کہ اس نے تم پر اپنا روائی اثر نہیں دکھایا۔ تم عدم موجودگی کی شکایات کرتی ہو۔ اگر میں، وہاں میں، جس سے وہ تمام اعزہ و احباب چھین گئے جس سے مجھے بہت لگاؤ ہے، شکوہ زبان پر لانے کا حوصلہ کروں، پھر مجھے کیا پیر یہ بیان اختیار کرنا ہوگا؟ آہ، اگر میں تسکین قلب کے لیے مذہب کا سہارا حاصل نہ ہو زندگی محض مرقع غم والا مبن جائے۔

تم نے یہ کیسے فرض کر لیا کہ میں اس نوجوان کے ساتھ تمہاری دل بستگی کو بغیر حمیس نہیں دیکھوں گی اور تمہیں تلخ ترش ستانے سے باز نہیں رہوں گی؟ میں اس قسم کے معاملات میں اپنے ماسوا کسی دوسرے کو سان پر پڑھانے کی قائل نہیں ہوں۔ میں دوسروں کے ان جذبات کو سمجھتی ہوں اور چونکہ مجھے بھی اس قسم کا کوئی حقیقی تجربہ نہیں ہو، اس لیے اگر میں انہیں پسندیدگی کی سند نہیں دے سکتی، میں انہیں ملامت کے سزاوار بھی نہیں ٹھہرا سکتی۔ میں صرف بتا جاتی ہوں کہ تم جیسی شاعر مزاج اور محبت شناس و شیرہ کے در میں کسی نوجوان کی خوبصورتی اور پرکشش آنکھیں جو جذبات ابھارتی ہیں، ان کی نسبت وہ محبت جو ہم عیسائی ہونے کے ناتے عام انسانوں، اپنے ہم یوں اور اپنے دشمنوں سے کرتے ہیں، کہیں ارفع، قابل قدر، شیریں اور نفیس ہے۔

کاؤنٹ بزوفوف کی وفات صرت آیت کی خبر ہمیں تمہارا خط موصول ہونے سے پہلے ہی مل چکی تھی اور میرے ابا جان کی طبیعت اس سے سخت مکدر ہوئی تھی۔ وہ فرماتے ہیں کہ کاؤنٹ بزوفوف اور وہ ایک عظیم عہد کے آخری نمائندے تھے، کاؤنٹ چل پے اور اب ان کی باری ہے۔ تاہم ان کا یہ کوشش ہوگی کہ وہ اپنی باری کو جسے الامکان زیادہ سے زیادہ حرمے تک ڈالتے رہیں۔ خداوند سے دعا ہے کہ وہ ہمیں اس ہول ناک سانحے سے محفوظ فرمائے۔

جہاں تک میٹر کا تعلق ہے، میں تمہاری رائے سے اتفاق نہیں کر سکتی۔ میں انہیں بچپن سے ہی جانتی ہوں۔ مجھے ہمیشہ یہ محسوس ہوا کہ وہ غیر معمولی طور پر نیک دل انسان ہیں اور یہ وہ خوبی ہے جو انسانوں میں مجھے سب سے زیادہ پسند ہے۔ جہاں تک ان کے ترکے اور پرنس واسیلی کے کردار کا تعلق ہے، یہ بات دونوں کے لیے لم ناک ہے۔ آہ، میری پیاری سہیلی، ہمارے پاک نجات دہندہ نے بالکل صحیح فرمایا ہے کہ ادنٹ سوئے کے ناکے میں سے با آسانی گزر سکتا ہے لیکن دولت مند شخص کے لیے جنت میں داخل ہونا مشکل ہے۔ مجھے پرنس واسیلی پر ترس آرہا ہے لیکن اس سے بھی زیادہ مجھے میٹر کی حالت قابل رحم نظر آتی ہے کہ ابھی بے چارے نے جوانی کی دلہیز پر قدم رکھا ہی تھا کہ اتنی بھاری دولت کے بوجھ تلخ دب گیا! کیسی کیسی ترغیبات اس کا راستہ روک کر کٹری ہو جائیں گی اگر مجھ سے کوئی پوچھے کہ میری اس دھرتی پر سب سے بڑی خواہش کیا ہے، میرا جواب ہوگا کہ کاش میں غریب ترین بھکاری سے بھی غریب تر ہو جاؤں!

میری پیاری سہیلی، میں تمہارا ہزار بار شکریہ ادا کرتی ہوں کہ تم نے مجھے وہ کتاب بھیجی جو ماسکو میں اتنی

قبولیت عامہ حاصل کر چکی ہے کہ ہر شخص اس کا شیفتہ ہو چکا ہے۔ چونکہ ہم نے خورہی مجھے بتا دیا ہے کہ اس میں اگرچہ بعض بہت اچھی باتیں ہیں لیکن اس میں بعض باتیں ایسی بھی ہیں کہ وہ کمزور ذہنوں کی دھڑکیں میں نہیں آسکتیں۔ میری ناقص رائے میں ایک ایسی کتاب پر، جو ناقابل فہم ہو اور چنانچہ اس سے حاصل بھی کچھ نہ کیا جاسکا ہو، وقت ضائع کرنا فضول ہے۔ میں یہ بات کبھی سمجھ نہیں سکی کہ آخر بعض لوگوں کو سزیت کی کتابیں پڑھنے کا اتنا جنون کیوں ہوتا ہے حالانکہ یہ کتابیں ان کے دماغوں میں محض شکوک و شبہات کے بیج بوتی، ان کے راہوار تخیل کو بھڑکاتی، ان میں مبالغہ آرائی کے رجحان کو ہوا دیتی ہیں اور اس طرح انہیں پراگندہ خیالی کا شکار بناتی ہیں۔ یہ سارے شاخہ نے مسیحی دین کی سادگی کی نفی کرتے ہیں۔ اس سے تو بہتر یہی ہے کہ ہم محض ان جیل اور مکتوبات کا مطالعہ کرتے رہیں۔ ان میں جو امر رور موز پوشیدہ ہیں، ہمیں انہیں کھنکھانے کی سعی نہیں کرنا چاہیے۔ آخر ہم اور ہماری حیثیت ہے ہی کیا؟ یہی نا کہ ہم بد بخت گم گار ہیں۔ پھر جب تک ہم اس فانی پوست میں، جس نے ہمارے اور لایزال (خدا) کے مابین فیرتہ داخل نقاب حائل کر رکھا ہے، بیسویں ہیں، ہم یہ کیسے توقع کر سکتے ہیں کہ ہمیں پروردگار عالم کے گیسو اور مقدس رموز کا محرم بنایا جائے گا؟ ہمارے لیے احسن تر بات یہ ہے کہ اس دنیائے دوں میں ہمارے پاک نجات دہندہ نے ہماری رہنمائی کے لیے جو رفیع و برتر اصول چھوڑے ہیں، ہم اپنے آپ کو ان کے مطالعے تک محدود کریں، ان پر عمل کریں اور اپنے آپ کو ان کے مطابق ڈھال لیں۔ آئیں، ہم یہ تسلیم کر لیں کہ ہم اپنے ضعیف و ناتواں انسانی اذہان کی باگیں جتنی کم ڈھیلی چھوڑیں گے، اتنی ہی زیادہ ہم اپنے خداوند کی رضا حاصل کر سکیں گے، جو اس تمام علم کو جس کا منبع اس کی ذات نہیں، مسترد کر دیتا ہے۔ اس نے اپنی رحمت کے پیش نظر جس علم کو ہماری نگاہوں سے پوشیدہ رکھا ہے، اس کی تہہ تک پہنچنے کے لیے ہم جتنے کم ہاتھ پاؤں ماریں گے، اتنی ہی عجلت سے وہ سے اپنی الوہی روح کی وساطت سے ہم پر آشکار کر دے گا۔

ابا جان نے مجھ سے کسی امید دار کا ذکر نہیں کیا، انہوں نے مجھے صرف اتنا ہی بتایا ہے کہ انہیں ایک خدا موصول ہوا ہے اور انہیں توقع ہے کہ پرس واسیلی عنقریب ملے آئیں گے۔ جہاں تک میرے متعلق شادی کے اس منصوبے کا تعلق ہے، تو میری عزیر اور گرام قدر سبیلی، میں صرف اتنا ہی عرض کر سکتی ہوں کہ میری رائے میں شادی حکم خداوندی ہے اور ہم سب کو اس حکم کی لازماً پابندی کرنا چاہیے۔ مگر قادر مطلق نے کبھی مجھ پر بیوی اور ماں کی ذمے داریوں کا بوجھ ڈال، اور ان فرائض کی انجام دہی کا کام خواد کتنا ہی کٹھن اور دشوار کیوں نہ ہو، میری حقہ المقدور بھی کوشش ہوگی کہ میں انہیں احسن اور ایماندارانہ انداز سے سمجھاؤں اور جس شخص کو وہ میرا شوہر بنائے گا، میں کبھی اس کے بارے میں اپنے جذبات کی نوعیت کی چھان پچک کر کے اپنے آپ کو پریشانیوں اور تفکرات میں مبتلا نہیں کروں گی۔

مجھے اپنے بھائی جان کا محبت نامہ موصول ہوا ہے۔ اس میں انہوں نے یہ اطلاع ارسال کی ہے کہ وہ اور ان

کی شریک حیات بالذات تشریف مار رہے ہیں۔ ان کی آمد سے جو خوشی ہوگی، وہ بالکل عارضی نوعیت کی ہوگی کیونکہ وہ اس ناپسندیدہ جنگ میں، جس نے، خدا جانے کیوں اور کیسے، ہم سب کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے، حصہ لینے کے لیے دوبارہ واپس چلے جائیں گے۔ جنگ کی باتیں صرف وہیں نہیں، جہاں تم ہو۔ دنیاوی امور اور اعلیٰ طبقے کا مرکز۔ ہوتیں بلکہ یہاں چہرے لگا ہوں اور قدرتی طور پر پرسکون فضاؤں میں محبت مشقت۔ شہروں کے باسی دیہاتی زندگی کا یہی نقشہ کھینچتے ہیں۔ کے باہر بھی جنگ کی، فوجیوں کے چہرے ہوتے ہیں اور وہ نہایت کرب ناک انداز سے اپنے وجود کا احساس دلاتی ہیں۔ بجا جان کی گفتگو کا موضوع بھی فوج کشی اور جوبانی فوج کشی ہی ہوتا ہے۔ ان کی باتیں میرے فہم و ادراک میں نہیں آتیں۔ پرسوں کا واقعہ ہے۔ میں اپنی عادت کے مطابق گاؤں میں گھوم رہی تھی کہ مجھے انتہائی دل خراش منظر نظر آیا۔ یہ رنگ روٹوں کا قافلہ تھا۔ انھیں ہمارے لوگوں میں سے لازمی بھرتی کے قانون کے تحت بھرتی کیا گیا تھا اور اب انھیں فوج میں شمولیت کے لیے روانہ کیا جا رہا تھا۔ جو لوگ رخصت ہو رہے تھے، ان کی ماؤں، بیویوں اور بچوں کی حالت دیکھی نہیں جاتی تھی۔ ان لوگوں کا رونہ دھونا کیلئے میں تیرہن کر رہا تھا کچھ ہوں محسوس ہوتا تھا کہ انسان اپنے پاک نجات دہندہ کے فرائین فراموش کر چکے ہیں۔ انھوں نے تبلیغ کی تھی کہ آدمی آدمی سے محبت کرے اور ایک دوسرے کی زیادتیاں معاف کر دے لیکن آج کے انسان کا سب سے بڑا وصف یہ تصور کیا جاتا ہے کہ اسے دوسرے انسانوں کو موت کے گھاٹ اتارنے کے فن پر کتنا عبور حاصل ہے۔

پیاری اور اچھی سہیلی، خدا حافظ۔ میری دعا ہے کہ ہمارے پاک نجات دہندہ اور ان کی پاک تریں ماں ہمیں اپنے مقدس اور جلیل القدر حفظ و امان میں رکھیں!

ماریا

”پرنس، آپ خط لکھ رہی ہیں؟ میں تو فارغ ہو چکی ہوں۔ میں نے اپنی بے چارگی ماں کے نام عریضہ تحریر کیا ہے۔“ تبسم مادموریل یونین نے اپنے شیریں اور خلوت آمیز لہجے میں کہا۔ وہ بہت تیز تیز گفتگو کرتی تھی اور پرنس جس گھٹے گھٹے، افسردہ اور بوجھل ماحول میں پرنس نے رہی تھی، اس میں وہ بالکل نئی قسم کا ذہنی رویہ۔ چنبل، شوخ، زندہ دل اور شاد و مطمئن۔ لے کر آئی تھی۔

”پرنس، میں یہ بتانا اپنا فرض سمجھتی ہوں،“ اس نے اپنی آواز دہی کرتے ہوئے کہا، ”کہ پرنس کی میخائیل ایوانچ سے ٹکرا۔ ٹکراؤ“ اس نے لفظ ٹکراؤ پر خاص طور پر زور دیتے ہوئے اسے دہرایا اور (فرائیسیوں کی طرح) حرف ’ر‘ کو یوں کھٹکتے ہوئے لہجے سے ادا کیا جیسے وہ اپنی ہی آواز سن کر خوشی سے پھولی نہ سار ہی ہو۔“ ہو گئی ہے۔ ان کا حراج بے حد برہم ہو رہا ہے اور وہ بہت کبیدہ خاطر نظر آ رہے ہیں۔ ذرا ہوشیار رہنا۔ تمہیں معلوم ہے۔“

”آہ، میری پیاری سہیلی،“ پرنس ماریا نے جواب دیا۔ ”میں آپ سے پہلے بھی یہ درخواست کر چکی ہوں

کہ آپ مجھے کبھی شیشی نہ بتایا کریں کہ اب جان کے مزاج کیسے ہیں۔ میں نے ان کا کبھی ہی کمرہ نہیں کیا اور نہ میں دوسروں کو یہ اجازت دے سکتی ہوں کہ وہ ان کا کمرہ کریں۔“

پرنس نے اپنی گھڑی پر اچھتی سی نظر ڈالی۔ اسے احساس ہوا کہ کلاوی کارڈ پر مشق کرنے کا جو وقت مقرر ہے، اس میں پہلے ہی پانچ منٹ کی تاخیر ہو چکی ہے۔ وہ فوراً ہی نشست گاہ کی طرف لپکی۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں ڈر رہی تھیں۔ روزمرہ کے نظام اراوقات کے مطابق پرنس دن کے بارہ اور دو بجے کے دوران میں قیلو کر تا تھا اور یہی وقت پرنس کے لیے کلاوی کارڈ پر موسیقی کی مشق کے لیے مقرر تھا۔

23

سفید بالوں والا وردی پوش خدمت گاراستقبالیہ کمرے میں بیٹھا تھا۔ اگرچہ اس پر غنودگی طاری تھی، پھر بھی اسے پرنس کے، جو اپنے بے حد کشادہ منہ کی روم میں قیلو کر رہا تھا، خرائٹوں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ مکان کے دوسرے حصے سے، بند دروازوں میں سے، موسیقار ڈوسک کے ترتیب شدہ راگ، سونائیا کے مشکل قطعات۔ جنہیں بیس بیس مرتبہ دہرایا جا رہا تھا۔ بجائے جانے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔

دو ریں اٹاپورج میں ایک کوچ⁵¹ اور ایک برتسکا⁵² آ کر رکیں۔ پرنس آندرے کوچ سے نیچے اتر، اس نے اپنی کوچک، اہلیہ کا ہاتھ پکڑا، اسے نیچے اترنے میں مدد دی اور اسے مکان میں پہلے جانے دیا۔ بوڑھے تیخون (Tikhon) نے، جس کے سر پر سفید بالوں کی وگ بھی تھی، استقبالیہ کمرے کے دروازے میں سے اپنی گردن باہر نکالی، اس نے انھیں دے لفظوں بتایا کہ پرنس آرام فرما رہے ہیں اور شتابی سے دروازہ بند کر دیا۔ تیخون جانتا تھا کہ خواہ پنا آئے یا کوئی دوسرا کتنا ہی غیر معمولی واقعہ پیش آ جائے، روزمرہ کے معمول میں کسی قسم کا خلل برداشت نہیں کیا جائے گا۔ تیخون کی طرح بظاہر پرنس آندرے بھی اس سے آگاہ تھا۔ اس نے اپنی گھڑی پر نظر دوڑا کی جیسے وہ یہ معلوم کرنا چاہتا ہو کہ اس کی عدم موجودگی کے دوران میں اس کے باپ کی عادات میں کوئی تبدیلی تو نہیں آگئی اور جب اسے اطمینان ہو گیا کہ نہیں، ایسی کوئی بات نہیں، وہ اپنی اہلیہ کی جانب متوجہ ہو اور بولا:

”وہ بیس منٹ میں بیدار ہو جائیں گے۔ آؤ، پرنس ماریا کے پاس چلتے ہیں۔“

اس عرصے کے دوران میں کوچک پرنس قدرے زبردست ہو گئی تھی لیکن جب وہ بات کرتی تھی، اس کی آنکھیں اور روئیں دار چھوٹا بالائی ہونٹ، جو تبسم کرنے سے اوپر اٹھ جاتا تھا، اب بھی ہمیشہ کی طرح ہشاش بشاش اور دفریب نظر آتے تھے۔

”ارے، یہ تو پورا محل ہے،“ اس نے اپنے گرد پیش نگاہیں دوڑاتے ہوئے فرانسیزی میں اپنے خاندان سے کہا۔ اس کے چہرے پر بالکل اس قسم کے تاثرات نمایاں ہو رہے تھے جس قسم کے ان لوگوں کے چہروں پر ظاہر ہوتے ہیں جو بال کے انعقاد پر اپنی میربان کو ہدیہ تحسین پیش کر رہے ہوتے ہیں۔ ”چلیں، آئیں، ہزار تیز قدم اٹھائیں۔“

تیز، اس نے پیچھے مڑ کر اپنے خاوند، تجن اور ایک وردی پوش ملازم کی طرف، جوان کے ساتھ ہوسیا تھا، دیکھتے اور مسکراتے ہوئے کہا۔ ”موسیقی کی مشق ماریا کر رہی ہے؟ ہم دبے پاؤں چلیں گے اور اسے بے خبری میں جا لیں گے۔“ پرنس آندرے اس کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔ اس کا انداز شائستہ تھا لیکن اس کے چہرے پر ادا کی ٹپک رہی تھی۔ ”تجن، معلوم ہوتا ہے کہ تم بڑھاپے کی زد میں آ گئے ہو،“ اس نے چلتے چلتے بوڑھے ملازم سے، جو اس کا ہاتھ چوم رہا تھا، کہا۔

بیشتر اس کے کہ وہ اس کمرے تک، جس میں سے کلاوی کارڈ کے بجنے کی آوازیں آرہی تھیں، پہنچے، ایک بغلی دروازے میں سے خوش شکل فرانسیسی خاتون، مادم بوغین۔ جس کے سر کے بال سنہری تھے، باہر آ گئی۔ بظاہر وہ خوشی سے نہال ہو رہی تھی۔

’اٹھا، پرنس کی تو خوشی سے باچھیں کھل جائیں گی‘ اس نے کہا۔ ”مجھے انھیں اطلاع کر دینا چاہیے۔“ ”نہیں، بالکل نہیں، نوازش ہوگی۔ آپ مادموزیل بوغین ہیں؟“ ”کوچک پرنس نے اس کا بوسہ لیتے ہوئے کہا۔“ اپنی تندگی دوستی کے حوالے سے میں پہلے ہی آپ کو جانتی ہوں۔ اسے آج ہماری آمد کی توقع نہیں!“ وہ نشست گاہ کے دروازے کی جانب، جہاں سے موسیقی کے ایک ہی قطعے کے بار بار دہرائے جانے کی آواز آرہی تھی، چل پڑیں۔ پرنس آندرے وہیں رک گیا۔ اس کی بھوئیں تن گئیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ اسے یہ فکر کھائے جا رہی تھی کہ کہیں کوئی ناگوار صورت نہ پیدا ہو جائے۔

کوچک پرنس آندرے چلی گئی۔ موسیقی قطعہ مکمل ہونے سے پہلے ہی بیچ میں رک گئی۔ پہلے بیچ کی آواز سنائی دی۔ اس کے بعد پرنس ماریا کے بھاری قدموں اور بوس وکن کی آوازیں آنے لگیں۔ جب پرنس آندرے اندر آیا، دونوں پرنسسیں، جن کی واحد ملاقات اس کی شادی کے موقع پر ہوئی تھی، ایک دوسرے کے بازوؤں میں لپٹی ہوئی تھیں اور خطراری طور پر لیکن بڑی گرم جوشی سے ایک دوسرے کی بلائیں لے رہی تھیں۔ مادموزیل بوغین سے پر ہاتھ رکھے ان کے قریب کھڑی تھی اور سرور ہو رہی تھی۔ اس کی کیفیت سے اندازہ ہو رہا تھا کہ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا کہ وہ خوشی کے عالم میں بلند آہنگ تھیمے لگائے یا رونا شروع کر دے۔ پرنس آندرے نے کندھے اچکا دیے اور کچھ اس طرح ناک بھوں چڑھانے لگا جس طرح موسیقی کا دلدادہ شخص غلط سرسٹنے پر چڑھاتا ہے۔ دونوں خواتین نے ایک دوسرے کو چھوڑ دیا اور ایک بار پھر، جیسے انھیں اندیشہ ہو کہ کہیں ان سے کوئی کوتاہی نہ ہوگئی ہو، ایک دوسرے کے ہاتھ چومنے لگیں، الگ ہوئیں اور دوبارہ ایک دوسرے کے رخساروں پر بوسوں کی بارش کرنے لگیں اور یہ دیکھ کر تو پرنس آندرے بالکل شینا گیا کہ دونوں رونے لگ گئی ہیں اور ان کی چوما چائی از سر نو شروع ہوگئی ہے۔ مادموزیل بوغین کی آنکھیں اشک بار ہو چلی تھیں۔ یہ بالکل ظاہر تھا کہ پرنس آندرے بے حد مضطرب اور بے چین ہو رہا ہے لیکن دونوں خواتین کو گلے مل کر رونا بالکل فطری معلوم ہو رہا تھا اور یہ بات تو وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھیں کہ اس موقع پر انھیں اس سے مختلف رویہ اپنانا چاہیے تھا۔

”Ah, ma chere ... Ah, Marie ...“ دونوں بیک وقت بولنے اور پھر ہنسنے لگیں۔

”کل رات میں نے خواب دیکھا تھا۔“

”تو تمہیں ہمارے آنے کی امید تھی۔ ارے، ماری، تم تو بالکل سوکھ ہو گئی ہو۔“

”اور تم، تم اتنا پھیل گئی ہو!“

”میں نے پرنس کو فوراً پہچان لیا تھا۔“ دموزیل بوٹھین نے بیچ میں اپنی ٹانگ دی۔

”اور میں نے تو سوچا بھی نہیں تھا۔۔۔“ پرنس ماریا نے با آواز بلند کہا۔ ”ارے، آندرے، میں نے آپ کو

تو دیکھا ہی نہیں۔“

پرنس آندرے اور اس کی ہم شیرہ نے ایک دوسرے کے ہاتھ تھم لیے اور ایک دوسرے کو بوسہ دیا۔ پرنس نے اپنی ہم شیرہ سے کہا۔ ”تمہاری عادتیں بالکل تبدیل نہیں ہوئیں۔ اب بھی بچوں کی طرح روتی ہو۔“ پرنس ماریا کی گرم جوش محبت بھری اور حلیم نگاہیں اپنے بھائی کے چہرے پر ٹھہر گئیں۔ اس لمحے اس کی غزالی، تابناک اور اشکبار آنکھیں بے حد خوبصورت تھیں۔

کوچک پرنس نگا نار ہولے جا رہی تھی۔ اس کا روٹیں دار کوتاہ بالائی ہونٹ مسلسل اوپر نیچے رقص کر رہا تھا۔ جب یہ ملائمت سے زیریں گلابی ہونٹ کو چھونے کے بعد تیزی سے اوپر اٹھتا، اس کی ہنسی مسکراتی آنکھیں اور دانت موتیوں کی طرح جگمگاٹھتے۔ راستے میں انھیں سپانکی پہاڑی پر چھوٹا موٹا حادثہ پیش آیا تھا لیکن جو اس کی موجودہ حالت کے پیش نظر سنگین صورت بھی اختیار کر سکتا تھا۔ اب وہ اس کی تفصیلات بیان کر رہی تھی۔ پھر دم لیے بغیر اس نے انکشاف کیا کہ وہ اپنے تمام ڈریس پیئرز برگ بھول آئی ہے اور اب خدا جانے وہ یہاں کیا پہنا کرے گی، آندرے بالکل بدل گیا ہے، کئی اودھت سوانے کسی بوڑھے کھوسٹ سے شادی کر لی ہے اور یہ کہ اس کی نظروں میں پرنس ماریا کے لیے سونوؤں پر، جیتا جاگتا برہ ہے۔ لیکن اس کے متعلق وہ بعد میں باتیں کریں گی۔

پرنس ماریا مہربان بیٹھی مسلسل اپنے بھائی کو دیکھے جا رہی تھی۔ اس کی خوبصورت آنکھیں محبت اور اداسی سے لبریز تھیں اور اس کے نہاں خانہ دماغ میں اپنے ہی خیالات کی رو بہرہی تھی جس کا اس کی بھانج کی گفتگو سے کوئی تعلق نہ تھا۔ اس کی بھانج جب پیئرز برگ کی تازہ ترین ضیافت کا ذکر کر رہی تھی، وہ بیچ میں بول پڑی اور اپنے بھائی سے مخاطب ہو کر کہنے لگی:

”آندرے، آپ واقعی جنگ پر جا رہے ہیں؟“

لسا کی بھی آنکھیں گئی۔

”سچ پوچھو تو کل،“ اس نے جواب دیا۔

”یہ مجھے یہاں چھوڑے جا رہے ہیں۔ خدا جانے کیوں؟ حالانکہ انھیں یہیں ترقی۔“

پرنس ماریا نے اس کی بات ختم ہونے کا انتہار نہ کیا بلکہ اپنے خیالات کی روکا تہ قب کرتے ہوئے وہ اپنی
بہوج کی طرف متوجہ ہوئی، اس کے سراپے پر پیار بھری نظر ڈالی اور بولی۔
”یقینی بات ہے؟“

کوچک پرنس کا چہرہ متغیر ہو گیا۔

”ہاں، بالکل یقینی؟“ اس نے جواب دیا اور آہ بھری۔ ”یہ سب کچھ کتنا عجیب ہے...“
اس کا ہونٹ لٹک گیا۔ اس نے اپنا چہرہ پٹی منہ کے قریب کیا اور خلاف توقع اس کی آنکھوں سے اشک
برداں ہو گئے۔

”اے آرام کی ضرورت ہے؟“ پرنس آندرے نے تیوریاں چڑھاتے ہوئے کہا۔ ”کیوں لسا؟ میں نے
ٹھیک کہا یا نہیں؟ اے اپنے کمرے میں لے جاؤ۔ اتنے میں میں ابا جان سے مل لیتا ہوں۔ کیسے ہیں وہ؟“ بالکل
ویسے ہی؟“

”جی ہاں، بالکل ویسے ہی۔ مسموم نہیں کہ آپ کو کیسے دکھائی دیں؟“ پرنس نے خوش ہو کر جواب دیا۔
”وہی رنگا بندھا دستور العمل، وہی خیابانوں کی سیر؟“ پرنس نے پوچھا اور اس کے چہرے پر خفیف سی
مسکراہٹ نمودار ہو گئی۔ اس کی یہ مسکراہٹ غریزی کر رہی تھی کہ اپنے باپ سے محبت اور اس کا احترام کرنے کے
باوجود وہ اس کی کمزوریوں سے نا آشنا نہیں ہے۔

”وہی دستور العمل، خراب۔ نیز ریاضی اور میرے جیومیٹری کے اسباق؟“ پرنس ماریا نے مسرت سے
جواب دیا جیسے اس کے جیومیٹری کے اسباق اس کی زندگی کی عظیم ترین راحتوں میں سے ہوں۔

جب بیس منٹ گزر گئے اور سحر پرنس کے بیدار ہونے کا وقت آ گیا، تیوریاں نوجوان پرنس کو بلانے آ گیا
تاکہ وہ اپنے باپ سے ملاقات کر سکے۔ بوڑھے باپ نے اپنے بیٹے کی آمد کے احترام میں لگے بندھے معمول میں
یہ تبدیلی کی کہ اس نے حکم دیا کہ ”میں ڈنر کے لیے لباس تبدیل کر رہا ہوں۔ اس دوران میں وہ مجھ سے ملنے میرے
اپارٹمنٹ میں آ سکتا ہے۔“ پرنس پرانی وضع کا لباس زیب تن کرتا تھا۔ وہ خفتان پہنتا اور بالوں پر پاؤڈر چھڑکتا
تھا۔ جب پرنس آندرے (اب اس کے چہرے پر نہ اس قسم کی جھلکاہٹ تھی اور نہ اس کا رویہ وہ تھا جو وہ ڈرائنگ
رہمیں میں اختیار کر رہا تھا بلکہ اب وہاں وہی شگفتگی اور خوش طبعی جھلک رہی تھی جس کا مظاہرہ اس نے بیٹر سے
اپنی ملاقات کے دوران میں کیا تھا) اپنے باپ کے کمرے میں پہنچا، مرد بزرگ ڈرائنگ گاؤن میں ملبوس کرسی پر
بیٹھا تھا (اس کرسی پر قیمتی اور نفیس مراکشی چمڑا چھا ہوا تھا) اور تیوریاں اس کے بال سنو رہا تھا۔

”اٹھا، سو رہا ہے اور اتو تم بونا پارٹ سے دو دو ہاتھ کرنا چاہتے ہو؟“ اس نے اپنے سر کو جس پر پاؤڈر چھڑکا
ہوا تھا حتیٰ المقدور گھماتے ہوئے پوچھا۔ (اس کے گندھے ہوئے بالوں کا سرا تیوریاں کے ہاتھوں میں تھا اور یوں وہ
اپنی مرضی سے سر نہیں گھما سکتا تھا)۔ ”اس سے زرا دھیان سے نہ پڑھا، ورنہ وہ دن دور نہیں جب وہ ہمیں بھی اپنے

محکوموں کی فہرست میں شامل کر لے گا۔ تمہاری طبیعت کیسی ہے؟“ اس نے اپنا گال آگے بڑھا دیا۔

قیلولے کے بعد بوڑھا ترنگ میں آچکا تھا۔ (اس کا تول تھا کہ ڈنر کے بعد قیلولہ نقرہ ہے لیکن اس سے پہلے فرا سونا ہے۔) اس نے گھنے ابروؤں کے نیچے سے اپنے بیٹے کو پرسرت ٹیکھی نگاہوں سے دیکھا۔ پرنس آندرے نے اپنے باپ کو اس مقام پر، جس کی طرف اشارہ کیا گیا تھا، بوسہ دیا۔ اس نے گفتگو کے لیے اپنے باپ کے محبوب موضوع — جہد موجود کے لشکریوں، بالخصوص بوٹا پارت کا مذاق اڑانا — کے متعلق لب کشائی کرنے سے احتراز کیا۔

”جی ابا جان، میں آپ کی خدمت میں حاضری دینے آیا ہوں۔ میری اہلیہ بھی میرے ساتھ آئی ہے۔ وہ امیر سے ہے،“ پرنس آندرے نے اپنے باپ کے چہرے کی یک ایک حرکت کا پرشوق اور مؤدبانہ نگاہوں سے تعجب کرتے ہوئے کہا۔ ”نصیب دشمن!، آپ کی طبیعت کیسی ہے؟“

”میرے بیٹے، طبیعت صرف احمقوں یا اوباشوں کی خراب ہوتی ہے اور مجھے تم جانتے ہی ہو کہ میں کس کینڈے کا آدمی ہوں۔ صبح سے شام تک محنت مشقت کرتا ہوں، اکل و شرب میں اعتدال برتتا ہوں۔ چنانچہ، میری طبیعت بالکل ٹھیک ٹھاک ہے۔“

”خدا کا شکر ہے،“ اس کے بیٹے نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”خدا کا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اب مجھے بتاؤ،“ اس نے اپنے دل پسند موضوع کی طرف گہر کرتے ہوئے کہا۔ ”جرمنوں نے اس نئی سائنس کے ذریعے، جسے تم سڑبچی کہتے ہو، تمہیں پولین کے خلاف ہمدردانہ ہونے کی کیسی تربیت دی ہے؟“

پرنس آندرے مسکرایا۔

”ابا جان، مجھے اپنے حواس مجتمع کرنے کا موقع عنایت فرمائیں،“ اس نے کچھ اس طرح مسکرا کر یہ الفاظ کہے جس سے معلوم ہوتا تھا کہ اس کے باپ میں جو نظر انداز کیے جانے کے قابل اور فی کمزوریاں ہیں، ان کے باوجود وہ اس سے محبت اور اس کا احترام کرتا رہے گا۔ ”ابھی مجھے آرام کرنے کا موقع نہیں ملا۔“

”فغصول، داہیات!“ بوڑھے آدمی نے با آواز بلند کہا۔ اس نے سیدر دیکھنے کے لیے کہ اس کے بال خوب کس کر گوندھ دیے گئے ہیں یا نہیں، انھیں زور سے جھٹکا اور پھر اپنے بیٹے کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر بولا۔ ”تمہاری بیوی کے لیے ہر چیز سجا ہوا دی گئی ہے۔ ماریا اس کی ضروریات کا خیال رکھے گی اور اسے سب کچھ دے گی۔ وہ طوطوں کی طرح ٹھیں ٹھیں بھی کیا کریں گی۔ خیر، اس کا خیال رکھنا عورتوں کا کام ہے۔ میں بہت خوش ہوں کہ وہ یہاں آگئی ہے۔ آؤ، بیٹھو اور باتیں کریں۔ مک ہیل زین (Michelsen) کی فوج کیا کر رہی ہے، اس کی سمجھ مجھے آ رہی ہے اور طالسٹانی کی فوج کی بھی۔ دونوں اکٹھے ہی میدان جنگ میں اتریں گے۔ لیکن یہ جنوبی فوج کیا کر رہی ہے؟ ہر شیا غیر جانبدار ہے۔ اس کا مجھے معلوم ہے۔ آسٹریا کے کیا عزائم ہیں؟“ اس

نے پوچھا۔ وہ کرسی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور کمرے میں چہل قدمی کرنے لگا۔ تنخون اس کے پیچھے پیچھے بھاگ رہا تھا اور اسے مختلف لمبوسات تھمارہا تھا۔ ”سوئڈن کے متعلق کیا خیال ہے؟ کیا وہ دریائے پومرنیا کے پار آجائے گا؟“

پرنس آندرے کو محسوس ہوا کہ اس کے باپ نے جو سوالات اٹھائے ہیں، وہ ان کے فوری جوابات پر مصر ہے، چنانچہ وہ مجوزہ مہم کی حربی تدابیر پر روشنی ڈالنے لگا۔ شروع میں وہ قدرے متاثر تھا، پھر جوں جوں وہ آگے بڑھتا گیا، اس کے جوش و خروش میں اضافہ ہوتا گیا اور جیسا کہ اس کی عادت تھی، وہ غیر شعوری طور پر فرانسیسی میں اپنا مافی الصمیر ادا کرنے لگا۔ اس نے بتایا کہ کیسے نوے ہزار سپاہ پرشیا کو دھمکانے کے لیے تیار کھڑی ہے تاکہ اسے غیر جانبداری ترک کرنے پر مجبور کیا جائے اور جنگ میں ٹھیسٹ ہو جائے، کیسے اس سپاہ کا ایک حصہ سٹراس لٹڈ کے مقام پر سوئڈن کی فوجوں سے جا ملے گا کیسے دولاکھ بیس ہزار آسٹریائی لشکر کی ایک لاکھ بیس ہزار روسی فوجیوں کے دوش بدوش اٹایہ میں اور دریائے رائن کے کنارے برسرِ پیکار ہوں گے، کیسے پچاس ہزار روسی، وراختے ہی انگریز نیپلز میں داخل ہوں گے اور یوں پانچ لاکھ افراد پر مشتمل یہ سپاہ کیسے مختلف مقامات پر فرانسیسیوں پر حملہ آور ہوگی۔ معمر پرنس نے اس منصوبے میں ذرا بھی دلچسپی کا اظہار نہ کیا۔ وہ بس کمرے میں چکر کاٹنے اور اپنا لباس تبدیل کرنے میں مشغول رہا۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ اس نے اپنے کان بند کر رکھے ہیں تاہم اس نے غیر متوقع طور پر تین مرتبہ آندرے کی بات میں مداخلت کی اور ایک بار جب اس نے اسے روکا تو یہ کہا:

”سفید، سفید!“

اس کا مطلب یہ تھا کہ تنخون نے اسے اس کی مطلوبہ واسکٹ نہیں دی تھی۔ دوسری مرتبہ جب اس نے اسے ٹوکا تو پوچھا:

”زیچگی عنقریب ہوگی؟“ اور ملامت کن انداز سے اپنا سر جھٹکتے ہوئے بولا: ”یہ تو بہت برا ہوا۔ خیر، تم اپنی بات جاری رکھو، جاری رکھو۔“

تیسری مداخلت تب ہوئی جب آندرے اپنا بیان ختم کیا چاہتا تھا۔ بوڑھا گنگنا نے لگا۔

”Malbrouk s'en va-t-en guerre. Dieu sait quand reviendra.“

اس کا بیٹا مسکرا دیا۔

”میں نے یہ تو نہیں کہا کہ میں اس منصوبے کے حق میں ہوں؟“ اس نے کہا۔ ”میں تو محض آپ کو یہ بتا رہا تھا کہ یہ ہے کیا۔ پولین بھی اس وقت تک کوئی منصوبہ وضع کر چکا ہوگا اور وہ اس سے زیادہ حراب نہیں ہوگا۔“

”خیر، تم نے مجھے کوئی نئی بات نہیں بتائی،“ بوڑھے نے کہا۔ اور وہ بے دھیانی میں لپک جھپک پھر زیر لب گلے لگا:

”Dieu sait quand reviendra“

”مال بروک جنگ پر جا رہا ہے۔ خدا جانتے یہ کہاں ہوگی۔ (عالمیابہ فرانس کا کوئی لوگ گیت ہے۔)“

اور بولا: ”اچھا، اب ڈاننگ روم میں پہنچ جاؤ۔“

24

شیو کرنے اور پاؤڈر لگانے کے بعد پرنس مقررہ وقت پر ڈاننگ روم میں داخل ہوا۔ وہاں پرنس، ریا، اس کی بہن ورمادوسز مل یونین اس کا انتظار کر رہی تھیں۔ پرنس کا میر تقی میرات بھی وہیں موجود تھا۔ اس کے آجر کے دس میں ہج نہیں کیا سوج آئی کہ اسے بھی دسترخوان پر بلایا جائے لگا حالانکہ اپنے بے حیثیت مرتبے کے پیش نظر اسے یہ توقع نہیں تھی کہ اس کی اس طرح عزت افزائی کی جائے گی۔ پرنس معاشرتی حفظ مراتب پر سختی سے عمل کرنے کا قائل تھا۔ چنانچہ وہ اعلیٰ سے اعلیٰ صوبائی اہلکاروں کو بھی شاذ و نادر ہی اپنے دسترخوان پر مدعو کرتا۔ لیکن ایک ایسی یہ جتانے کے لیے کہ اس کی نظروں میں تمام انسان برابر ہیں، اس نے میٹائیل ایوانوویچ (وہ ہمیشہ کمرے کے ایک کونے میں جا کر دھاری دار رومال میں ناک مرکا کرتا تھا) کو اپنے دسترخوان پر بٹھانا شروع کر دیا۔ ورمادوسز ایک سے زیادہ مرتبہ پٹی جینی کو سمجھا چکا تھا کہ میٹائیل ایوانوویچ ”مجھ سے یا تم سے رتی برابر بھی بدتر نہیں ہے۔“ پرنس کی یہ عادت بن گئی تھی کہ وہ دسترخوان پر کسی دوسرے شخص کی نسبت کم گفتار میر تقی میرات کو زیادہ مخاطب کیا کرتا تھا۔

ڈاننگ روم میں، جس کی چھت بھی مکان کے دوسرے کمروں کی طرح بے انتہا بلند تھی، گھر کے افراد اور وردی پوش ملازمین، جو ہر کرسی کے پیچھے کھڑے تھے، پرنس کی آمد کا انتظار کر رہے تھے، بازو پر ٹیپکس نکاتے، بلمرہز کی آرائشی کا جائزہ لے رہا اور اشاروں ہی اشاروں میں وردی پوش ملازمین کو ہدایت دے رہا تھا۔ وہ بے چینی کے عالم میں کبھی دیواری کلاک کو اور کبھی اس دروازے کو، جس میں سے پرنس کے اندر آنے کی توقع تھی، دیکھنے لگتا۔ پرنس آندرے ایک بے چوڑے سنہری فریم پر نظریں جمائے کھڑا تھا۔ یہ فریم اس کے لیے نیا تھا۔ اس میں پرنس بلکونسکی کا شجرہ نسب پیوست تھا۔ اس کے بالکل بل دوسری دیوار پر اتنا ہی بڑا ایک اور فریم لٹک رہا تھا۔ فریم میں ایک دالنی ریاست کی بھدی تصویر (معلوم ہوتا تھا کہ یہ کسی گھریلو فنکار کی کاوش کا نتیجہ تھی) آویزاں تھی۔ وال کے سر پر تاج رکھا ہوا تھا اور دعویٰ کے مطابق وہ رورک⁵⁴ کے اخلاف میں سے تھا اور بلکونسکی خاندان کا مورث اعلیٰ تھا۔ پرنس آندرے، شجرہ نسب پر غور کرتا اور اپنا سر جھٹک رہا۔ پھر وہ اس شخص کی طرح، جو کسی ایسی تصویر کو دیکھ کر جو اس حد تک اصل سے مشابہ ہو کہ پر نفس معلوم ہو، نفس پڑتا ہے، ہنسنے لگا۔

”بالکل ان سے مشابہ ہے،“ اس نے پرنس ماریا سے، جو اس کے قریب آن کھڑی ہوئی تھی، کہا۔ پرنس نے بہ نگاہ حیرت اپنے بھائی کی جانب دیکھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آخر وہ مسکرا کس چیز پر رہا ہے۔ اس کا باپ جو کچھ بھی کرتا تھا، وہ اس کے اندر احترام کا یہ جذبہ سوجزن کر دیتا تھا جو اسے اس پر کسی قسم کی بھی نکتہ چینی کرنے کی اجازت نہیں دیتا تھا۔

”مانا کہ ہم سب میں سے کوئی بھی کمزوریوں سے مبرا نہیں،“ آندرے نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے

کہا۔ ”لیکن اتنا بھی کیا؟ وہ اتنے ذہین و فہم شخص ہیں، پھر ان حرافات کا مطلب؟“

جس بے باکی اور دیدہ دہیری سے پرنس ہاریا کے بھائی نے نکتہ چینی کی تھی، وہ اس کا کبھی تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔ وہ احتجاج کیا ہی چاہتی تھی کہ انھیں سنڈی روم سے ان قدموں کی، جس کے وہ اتنی دیر سے منتظر تھے، چاپ ستائی دی۔ پرنس حسب معمول اپنی پھرتیلی، چاق چو بند اور البیلی چال چلا یوں اندر داخل ہوا جیسے وہ عموماً اپنے سیمائی انداز کا گھر کے جامد اور بے لوج معمول سے تقابل کر رہا ہو۔ جونہی اس نے پاؤں اندر رکھا، جیم کلاک نے دو بجے اور ڈرائنگ روم کے کلاک نے اس سے بھی اونچی آواز میں اس کا جواب دیا۔ پرنس پتھر کا بت بن کر کھڑا ہو گیا۔ کھنے اور نیچے نکلنے ہوئے ابروؤں کے زیر سایہ اس کی تیر اور چٹیلی نگاہوں نے کمرے میں موجود تمام لوگوں کا عینق جائزہ لیا اور وہ کوچک پرنس پر ٹھہر گئیں۔ اس موقع پر پرنس کو وہی کچھ محسوس ہوا جو زہر کی آمد پر اس کے درباریوں کو ہوتا ہے۔ اسے بھی ہیبت اور احترام کے انھیں جذبات کا، جو بوڑھے نے اپنے گرد و پیش کے لوگوں کے دلوں میں ابھار دیے تھے، تجربہ ہوا۔ پرنس نے اس کے بالوں پر ہاتھ پھیرا اور بے ڈھنگے انداز سے اس کی گردن کو سہلایا۔

”میں خوش ہوں کہ تم یہاں آگئی ہو،“ اس نے کہا۔ وہ کچھ دیر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے کھڑا رہا، پھر حیزی سے مڑا اور میز کے سامنے اپنی نشست پر بیٹھ گیا۔ ”بیٹھو، بیٹھو، یعنی نیل ایوا لودوچ، بیٹھو!“ اس نے اپنی بہو کو اپنے نزدیک ایک کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ ایک دروی پوش ملازم نے لپک کر کرسی پیچھے دھکیل دی تاکہ وہ اس پر با آسانی بیٹھ سکے۔

”خوب! خوب!“ اس نے اس کی گول مثول صورت دیکھ کر کہا، ”تم نے بہت جلد بازی سے کام لیا ہے۔“

”یہ اچھی بات نہیں ہے!“

وہ حسب معمول خشک، سرد مہر اور ناخوشگوار انداز سے ہنسا لیکن اس کی مسکراہٹ اس کے لبوں تک ہی رہی، اس کی آنکھیں اس سے چمکی رہیں۔

”تمہیں سیر کرتے رہنا چاہیے۔ زیادہ سے زیادہ سیر کرو، زیادہ سے زیادہ۔“

وہ جو کچھ کہہ رہا تھا، کوچک پرنس کو یاد آتا کہ اس کی نہیں دیا یا پھر وہ سننا ہی نہیں چاہتی تھی۔ وہ مہربان بیٹھی رہی اور بظاہر بدحواس و مضطرب دکھائی دے رہی تھی۔ پرنس نے اس سے اس کے باپ کی خیریت دریافت کی۔ تب وہ مسکرائی اور باتیں کرنے لگی۔ اور جب اس نے باہمی دوستوں اور واقف کاروں کے بارے میں سوالات کیے، اس کے جوش و خروش میں اور بھی اضافہ ہو گیا اور اس کی زبان لہجہ کی طرح چلنے لگی۔ وہ سے مختلف لوگوں کے سلام اور پیغامات پہنچانے اور شہر کی گپ شپ سنانے لگی۔

”بے چاری کاؤٹس اپر اکسٹا کا شو ہر چل بسا ہے۔ اس نے ردو کر اپنی آنکھیں سوجلی ہیں،“ وہ کہہ رہی تھی۔ اس کی گفتگو مزاحی اور بشارت میں لکھ بے لکھ اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ جوں جوں اس کی چلبلاہٹ بڑھتی گئی،

توں پر نس کا پارہ چڑھتا گیا اور وہ درشت سے درشت تر لگا ہوں سے اسے دیکھنے لگا۔ پھر چانک، جیسے وہ اس کا کافی مطالعہ کر چکا ہو اور اس کے بارے میں اپنے ذہن میں واضح رائے قائم کر چکا ہو، اس نے اپنا دھیان دوسری جانب ہٹایا اور میخانیکل ایوانو وچ سے مخاطب ہو کر بولا

”خیر، میخانیکل ایوانو وچ، ہمارے دوست بونا پارت کی شامت آگئی ہے۔ پر نس آندرے“ (وہ اپنے بے کا ذکر ہمیشہ بدیں الفاظ ہی کرتا تھا) مجھے ان افواج کے بارے میں بتا رہے تھے جو اس کے خلاف نبرد آزما ہونے کے لیے مجتمع کی گئی ہیں۔ ادھر تم اور میں ہمیشہ یہی کہتے رہے کہ یہ شخص دھیلے کا ہے نہ پاؤ کا۔“

میخانیکل ایوانو وچ یہ سمجھنے سے قطعی قاصر تھا کہ اس ”تم“ میں نے بونا پارت کے متعلق اس قسم کی گفتگو کی تھی۔ تاہم اسے جھٹ پٹ یہ اندازہ ہو گیا کہ اس کا آقا اسے اپنی ڈھریا کر اپنے دل پسند موضوع کو زیر بحث لانا چاہتا ہے۔ اس کا دماغ چکر ا گیا اور وہ ہر اس امر پر ہنسنا شروع کر دیا جو اس کی جانب دیکھے لگا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ دیکھیں، پردہ غیب سے کیا ظہور پذیر ہوتا ہے۔

”شاہر عظیم“ پر نس نے میری تعمیرات کی جانب اشارہ کرتے ہوئے اپنے بیٹے سے کہا۔

اور گفتگو دوبارہ جنگ، بونا پارت، اس عہد کے دوسرے جرنیلوں اور مدبر سیاستدانوں کے متعلق ہونے لگی۔ بظاہر یہی نظر آ رہا تھا کہ پر نس کو نہ صرف اس بات کا پختہ یقین ہے کہ نہ صرف ان تمام شخصیات میں سیاسی اسرار و رموز اور عسکری امور کی اتنی بھی سوچ بوجھ نہیں جتنی کہ ایک بچے میں ہوتی ہے، بونا پارت حقیر فرانسسی بونا ہے اور اس کی دھوم مچھن اس لیے مچ گئی ہے کیونکہ اس کا مقابلہ کرنے کے لیے پاتوکن⁵⁵ اور سواروف جیسے لوگ نہیں رہے بلکہ وہ بڑے وثوق سے یہ دعویٰ بھی کر سکتا ہے کہ یورپ کو کسی نوع کی سیاسی مشکلات درپیش نہیں، نہ اسے کسی جنگ و جنگ کا خطرہ لاحق ہے، لوگوں نے خواہ مخواہ بات کا بنگلہ بنا لیا ہے۔ چلیوں کا ایک تماشا ہو رہا ہے، عہد موجود کے یہ (نام نہاد عظیم) لوگ اس تماشے میں حصہ لے رہے ہیں اور ظاہر یہ کر رہے ہیں کہ وہ واقعی حقیقی کھیل کھیل رہے ہیں۔ ان لوگوں پر اس کا باپ طنز و تعریض کے جو تیر برسا رہا تھا، پر نس آندرے خندہ پیشانی سے ان کے داسہہ رہا تھا اور بظاہر اس کی گفتگو سے حلف امدوز بھی ہو رہا تھا۔

”ماضی ہمیشہ سہانا دکھائی دیتا ہے“ اس نے کہا۔ ”لیکن کیا یہی سواروف اس پھندے میں، جو سونو نے اس کے لیے تیار کیا تھا، پھنس نہیں گیا تھا اور پھر اسے اس میں سے نکلنے کی کوئی صورت بچھائی نہیں دیتی تھی؟“

”تمہیں کس نے بتایا؟ کس نے؟“ پر نس نے چلا چلا کر پوچھا۔ ”سواروف؟“ اور اس نے اپنی پلیٹ اٹھا کر ایک طرف پھینک دی لیکن تھن نے بڑی پھرتی اور ہوشیاری سے اسے راستے ہی میں دبوچ لیا۔ ”سواروف!۔ غور کرو، پر نس آندرے! دونوں فریڈرک⁵⁷ اور سواروف موغرا! ہونہہ، اگر سواروف کے ہاتھ بندھے نہ ہوتے تو یہ موغوقیدی بنایا جا چکا ہوتا۔ لیکن سواروف کے ہاتھ تو Hofs-kriegs-wurst-schnapps-Rath⁵⁸ نے باندھے رکھے تھے۔ اس صورت حال میں تو خود ابھیس بھی اپنے آپ کو بے بس پاتا ہے۔ عنقریب تم خود دریافت کر لو گے

کہ یہ Hof's-Kriegs wurst-schnapps-Rath کیا ہیں۔ اگر سواروف ان سے نہ نہٹ سکا تو یہ مائیکل کو توروف کس کھیتی کی سون ہے کہ وہ انھیں سنبھال لے گا؟ نہیں، برخوردار، بالکل نہیں، اس نے اپنا سلسلہ کلام آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”تم اور تمھارے جرنیل بونا پارت کو مات نہیں دے سکیں گے۔ تمہیں چند فرانسیسیوں کو بلانا پڑے گا۔ چور کو پکڑنا ہو تو اس کے پیچھے چور لگاؤ۔ انھوں نے فرانسیسی موغو کو واپس لانے کے لیے جرمن پاس⁵⁹ کو نیدیارک روانہ کیا۔“ (وہ اس تجویز کی طرف اشارہ کر رہا تھا جس کے مطابق موغو کوروس میں ملازمت کی پیشکش کی گئی تھی۔) ”خوب معاملہ ہے! کیا تمھارے خیال میں پاتوکن، سواروف، مارلوف⁶⁰ اور ان کے بھائی بند جرمن تھے؟ نہیں، برخوردار، بالکل نہیں۔ یہ تو تمھاری عقل گھاس چرنے نکل گئی ہے یا پھر میں ہی سنبھال گیا ہوں۔ خداوند تم پر رحم کرے!۔ خیر، دیکھا جائے گا۔ اللہ اللہ، بونا پارت عظیم سپہ سالار بن گیا ہے! ہونہ، تمہو، رخ تمہو!۔“

”میں یہ نہیں کہتا کہ یہ تمام منصوبے بے عیب ہیں۔ البتہ یہ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ آپ نے بونا پارت کے متعلق اس قسم کی رائے کیسے قائم کر لی۔ آپ کا جتنا جی چاہے، ہمیں مذاق اڑائیں لیکن حقیقت حقیقت ہے، بونا پارت عظیم جرنیل ہے۔“

”مینا مکمل الیوانوویچ!“ بوڑھے پرنس نے سیر تعمیرات کو، جو بھنا ہوا گوشت کھانے میں مصروف تھا اور اپنے تئیں سمجھ بیٹھا تھا کہ اسے فراموش کر دیا گیا ہے، دہاڑتے ہوئے پکارا۔ ”میں نے تمہیں بتایا نہیں تھا کہ نیولین شاطر عظیم ہے، ازیر دست جنگی چالیں چلتا ہے؟ اور یہ صاحب زادے صاحب بھی یہی فرماتے ہیں۔“

”یقیناً، یوزا کیسی لینسی،“ سیر تعمیرات نے جواب دیا۔

ایک بار پھر پرنس بر فلی ہنسی ہنس دیا۔

”بونا پارت منہ میں چاندی کا چھپنے لے کر پیدا ہوا تھا۔ اس کی سپہ اول درجے کی ہے۔ علاوہ ازیں، اس نے اپنا آغاز جرمنوں پر حملوں سے کیا تھا اور یہ جرمن کیا چیز ہیں؟ نیم بیدار اور نیم خفتہ آدمی بھی ان کے چھکے چھڑ سکتا ہے۔ ابتدائے آفرینش سے ہر ایرا غیر جرمنوں کی بنائی کر چکا ہے۔ اور وہ خود ہیچے رے کسی کی بھی دھنائی نہیں کرتے۔ بس ایک دوسرے کی مار کٹائی کرتے رہتے ہیں۔ تو یہ ہیں وہ لوگ، جن کے خلاف اس نے برسرِ پیکار ہو کر اپنی شہرت کو چار چاند لگائے ہیں۔“

اور پرنس ان تمام فاش غلطیوں کا تجزیہ کرنے لگا جن کا اس کے خیال کے مطابق نیولین نے اپنی مہموں اور سیاست کاریوں میں ارتکاب کیا تھا۔ اس کے بیٹے نے اسے جھٹلانے کی کوشش نہ کی لیکن اتنی بات واضح تھی کہ جس طرح وہ اپنی کسی بھی دلیل سے اپنے باپ کو قائل نہیں کر سکا تھا، اس کے باپ کے دماغ بھی اسے کسی طرح بھی متاثر نہیں کر سکے تھے۔ وہ اپنے باپ کی تقریر سن رہا تھا لیکن کوئی جواب دینے سے احتراز کرتا رہا۔ تاہم اسے حیرت اس بات پر تھی کہ اس بوڑھے شخص کو، جو کئی برسوں سے تنہا گاؤں میں زندگی بسر کر رہا تھا، یورپ کے ان تمام حالیہ سیاسی اور عسکری واقعات کا علم کیسے ہو گیا کہ وہ ان کے بارے میں نہ صرف پوری تفصیلات سے آگاہ تھا بلکہ

ان پر اتنی صحت کے ساتھ بحث بھی کر سکتا تھا۔

”تم سمجھتے ہو کہ میں بوزھا ہو گیا ہوں اور موجودہ حالات واقعات سمجھنے سے معذور ہوں؟“ اس نے اپنی تقریر سیٹھتے ہوئے کہا، ”لیکن یہ چیزیں ہر دم میرے ذہن پر سوار رہتی ہیں اور مجھے اندر ہی اندر گھن کی طرح کھاری ہیں۔ مجھے راتوں کو نیند نہیں آتی۔ خیر، چھوڑو ان باتوں کو۔ یہ بتاؤ کہ تمہارے اس عظیم سپہ سالار نے کہاں کہاں اپنے آپ کو مٹوایا ہے؟“

”یہ بڑی لمبی داستان ہے؟“ اس کے بیٹے نے جواب دیا۔

”پھر اپنے بونا پارٹ کے پاس چلے جاؤ اما دام بونین، تمہارے اس ٹھکانے (پاؤڈر روم) ⁶¹ امپراطور کے ایک ارمدا ج! اس نے استعانت فراموشی میں کہا۔

”محترم پرنس، آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ میں بونا پارٹ کی طرف دار نہیں ہوں۔“

”Dieu salt quand reviendra...“ پرنس بے سرے انداز سے گنگنا نے لگا۔ پھر وہ کھلکھلا کر ہنس پڑا (اس کی ہنسی سماعت کے لیے اور بھی بارگراں تھی)۔ وہ دسترخواں سے اٹھا اور باہر نکل گیا۔

کوچک پرنس اس بحث اور بقیہ ڈنر کے دوران میں بالکل چپ چاپ بیٹھی رہی۔ وہ خوف زدہ لگا ہوں سے کبھی اپنے خسر اور کبھی پرنس ماریہ کو دیکھنے لگتی۔ جب سب لوگ دسترخوان سے اٹھ گئے، اس نے اپنی نند کا ہاتھ پکڑا اور دوسرے کمرے کی طرف چل دی۔

”تمہارے ابا کتنے تیز طرار اور سیانے آدمی ہیں!“ اس نے کہا۔ ”شاید یہی وجہ ہے کہ انھیں دیکھ کر مجھ پر لرزہ طاری ہونے لگا ہے۔“

”اور وہ مہربان بھی بہت ہیں؟“ پرنس ماریہ نے جواب دیا۔

25

پرنس آندرے نے اگلی شام روانہ ہونا تھا۔ معمر پرنس نے اپنے معمولات میں کوئی فرق نہ آنے دیا بلکہ وہ روز کی طرح ڈنر کے بعد اپنے کمرے میں چھ گیا۔ کوچک پرنس اپنی نند کے پاس تھی۔ پرنس آندرے سفری کوٹ، جس کے شانوں پر عہدے کے امتیازی نشانات کی چٹیاں آویزاں نہیں تھیں، پہنے، اپنے ذاتی خدمت گار کے ساتھ ان کمروں میں، جو اس کے استعمال کے لیے مخصوص کر دیے گئے تھے، سامان باندھنے بندھوانے میں مصروف تھا۔ جب وہ گاڑی کا خود معائنہ کر چکا اور اس میں اپنے ٹریک رکھوا چکا، اس نے گھوڑے جوتے کا حکم دیا۔ اب کمرے میں صرف وہی اشیاء پڑی تھیں جنہیں وہ ہمیشہ اپنے پاس رکھتا تھا۔ ان اشیاء میں اس کا گولک (مٹی باکس)، بوتلیں رکھنے کا خاصا بڑا تقری سندو قچہ، دو ترکی پستول اور شمشیر۔ یہ شمشیر اسے اس کے باپ نے جتنے میں دی تھی، وہ اسے اچا کوف ⁶² کے محاصرے سے لایا تھا۔ شامل تھی۔ پرنس آندرے کا یہ سارا سفری سامان بالکل صحیح حالت میں

نہا، نیا کورا صاف ستھرا، غلہ فوں میں بند، جن کے اوپر بیٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔

وہ لوگ جو سوچ بچار کے اہل ہوتے ہیں، جب سفر پر روانہ ہوتے ہیں یا اپنے طرز حیات میں کوئی تبدیلی لانے ہیں، ان کے ذہان پر سنجیدگی غلبہ پالیتی ہے۔ ایسے مواقع پر عام طور پر آدمی اپنے ماضی کا جائزہ لیتا ہے اور مستقبل کی مصوبہ بندی کرتا ہے۔ پرنس آندرے کے چہرے بشرے پر شفقت، فکر مندی و ردِ دل گرنگی کے احساست نمایاں ہو رہے تھے۔ کمر ہاتھ باندھے وہ کمرے میں تیز تیز چکر کاٹ رہا تھا۔ وہ بالکل سامنے دیکھ رہا تھا اور سوچ بچار میں ڈوبا ہوا بار بار اپنا سر جھٹک رہا تھا۔ کیا اسے محاذ جنگ پر جانے کی بنا پر ضمیر کی سکک محسوس ہو رہی تھی؟ اپنی شریک حیات سے چھڑنے کا دکھ ہو رہا تھا؟ یا شاید یہ دونوں ہی باتیں تھیں؟ لیکن صریحاً وہ یہ بالکل نہیں چاہتا تھا کہ کوئی اسے اس کیفیت میں دیکھے۔ چنانچہ جونہی اسے راہداری میں قدموں کی آہٹ سنائی دی، اس نے بہ سرعت اپنے ہاتھ کھوس لیے اور میز کے قریب یوں کھڑا ہو گیا جیسے وہ اپنے گولک کا ڈھکن بند کر رہا ہو۔ اس کا چہرہ حسب معمول پر سکون تھا اور اس کے جذبات کا اندازہ کرنا ناممکن۔ جن بھاری قدموں کی چاپ اسے سنائی دی تھی، وہ پرنس مار یا کے تھے۔

”مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ نے گھوڑے جوتے کا حکم دے دیا ہے،“ اس نے ہانپتے کانپتے کہا۔ (بظاہر یہی نظر آ رہا تھا کہ وہ دوڑتی آئی ہے۔) ”اور میری کتنی تمنا تھی کہ مجھے تنہائی میں آپ سے کچھ باتیں کرنے کی فراغت مل جاتی۔ صرف خداوند جانتے ہیں کہ اس مرتبہ ہم کتنی دیر ایک دوسرے سے چھڑے رہیں گے۔ میرے یہاں آنے پر آپ ناراض تو نہیں ہوئے؟ اندر دشا، آپ بالکل بدل گئے ہیں،“ اس نے مزید کہا جیسے وہ اپنے سوال کی وضاحت کر رہی ہو۔

جیسے ہی اس نے اسے اندر دشا کہا، وہ مسکرا پڑی۔ جب وہ یہ سوچتی کہ یہ ردِ کھا، سخت گیر اور خوش شکل شخص وہی اندر دشا ہے، جو کبھی دبلا پتلا شرارتی لڑکا ہوا کرتا تھا اور بچپن میں اس کے ساتھ کھیل کرتا تھا، تو اسے بظاہر یہ بہت عجیب معلوم ہوتا۔

”ک کہاں ہے؟“ اس نے پوچھا۔ اس کے سوال کے جواب میں اس نے بکھر مسکرانے پر اکتفا کیا۔

”وہ اتنی نڈھال ہو چکی تھی کہ وہ میرے کمرے میں صوفے پر ہی سو گئی۔ آخا، آندرے، کیا شاندار بیوی ملی ہے آپ کو؟“ اس نے اپنے بھائی کے رخ صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ”بالکل بچی معلوم ہوتی ہے، من موہنی، شگفتہ، وہ شگفتہ مزاج۔ میں تو اس پر فدا ہو گئی ہوں۔“

پرنس آندرے چپ رہا۔ تاہم اس کے چہرے پر جو طنز اور تحقیر نمودار ہوئی تھی، پرنس مار یا نے اسے بھانپ لیا۔

”آندرے، ہمیں اپنی کمزوریوں سے درگزر کرنا چاہیے۔ کون ہے جو ان سے بڑا ہے؟ یہ ست بھولیں کہ اس کا تعلق ہیئرز برگ کے اعلیٰ ترین طبقے سے ہے، وہیں وہ گھولی پھری ہے اور وہیں اس کی تعلیم و تربیت ہوئی ہے۔ اب وہ

جس ماحول میں آئی ہے، وہ اس کے لیے اتنا خوش کن نہیں ہے۔ ہمیں ہمیشہ یہ سوچنا چاہیے کہ دوسروں کی جگہ ہم ہوتے، تو ہم کیا کرتے۔ "Tout comprendre, C'est tout pardonner"۔ ذرا سوچیں، جس قسم کی زندگی بسر کرنے کی وہ عادی تھی، وہ تو گئی چھوٹ، خاندان سے وہ بچھڑ رہی ہے، دیہاتی فضا میں اسے تنہا رہنا ہوگا۔ اور وہ بھی اس حالت میں، کیا حال ہوگا بے چاری کا اتنا مشکل ہوگا اس کے لیے یہ سب کچھ۔"

پرنس آندرے نے پٹی، ہمشیرہ پر ایک نظر ڈالی اور یوں مسکرایا جس طرح ہم ان لوگوں کو دیکھ کر مسکراتے ہیں جن کے متعلق ہمیں یہ گمان ہوتا ہے کہ ہم انہیں پوری طرح سمجھتے ہیں۔

"تم گاؤں میں رہتی ہو۔ تمہیں تو بے زندگی اتنی بھیا تک نظر نہیں آتی،" اس نے کہا۔

"میں۔ میرا معاملہ مختلف ہے۔ آپ میری بات کیوں کرتے ہیں؟ مجھے کسی دوسری قسم کی زندگی کی کوئی تمنا نہیں بلکہ میں تمنا کر ہی نہیں سکتی کیونکہ مجھے کسی دور طرز حیات کا علم ہی نہیں۔ لیکن، آندرے، ذرا سوچیں، اگر اعلیٰ شہری طبقے کی کسی نوجوان خاتون کو اس کی زندگی کے بہترین برسوں کے دوران میں دیہات میں رہنے پر مجبور کر دیا جائے اور وہ بھی تنہا۔ تنہا اس لیے کیونکہ آپ کو معلوم ہے کہ ابا جان ہمہ وقت مصروف رہتے ہیں اور وہی میں، تو آپ جانتے ہی ہیں کہ مجھ میں اتنی صلاحیت کہاں کہ میں ایک ایسی خاتون کو، جو شہروں کے اعلیٰ ترین طبقوں میں گھومنے پھرنے کی عادی ہو، صحیح معنوں میں اس کے شایان شان صحبت فراہم کر سکوں۔ لے دے کے صرف مادام بوغین۔"

"مجھے تمہاری یہ مادام بوغین ایک آنکھ نہیں بھاتی،" پرنس آندرے نے کہا۔

"اف، ایسا نہ کہیں۔ وہ بہت نفیس اور بہریان خاتون ہیں۔ اس سے بھی زیادہ اہم بات یہ ہے کہ ان کی حالت قابل رحم ہے۔ ان کا کوئی بھی نہیں، کوئی بھی نہیں۔ خدا لگتی کہوں تو مجھے ان کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں۔ بلکہ ایک لحاظ سے وہ میرے لیے خوشخواہ کی رکاوٹ ہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ میں سدا کی تنہائی پسند ہوں اور میری یہ عادت روز بروز پختہ سے پختہ تر ہوتی جا رہی ہے۔ مجھے تنہا رہنا پسند ہے۔ ابا جان کو وہ بہت پسند ہیں۔ ایک مادام بوغین اور دوسرے میخانیل ایوانوویچ، ان دو اشخاص کے ساتھ ان کا رویہ ہمیشہ دوستانہ اور مشفقانہ رہا ہے۔ کیونکہ وہ ان دونوں کے محسن ہیں۔ جیسا کہ (انگریز ناول نگار) سٹرن (Stern) نے کہا ہے: "ہم لوگوں سے محبت اس لیے نہیں کرتے کہ انہوں نے ہمارے ساتھ بھلائی کی ہوتی ہے بلکہ وہ ہمیں اس لیے اچھے لگتے ہیں کہ ہم نے ان سے بھلائی کی ہوتی ہے۔" ابا جان نے جب ان کے سر پر دست شفقت رکھا، وہ بے گھر اور بے درہنگی تھیں۔ وہ بے حد ایک مزاج خاتون ہیں اور ابا جان کو ان کا خواندگی کا بلند آہنگ انداز پسند ہے۔ وہ انہیں شام کو کتابیں پڑھ کر سناتی ہیں اور پڑھتی بھی بہت خوبصورت انداز سے ہیں۔"

"ماریا، میں لگی لٹی رکھے بغیر یہ کہوں گا کہ ابا جان نے جو مزاج پایا ہے، وہ بعض اوقات تمہارے لیے خاصا

روح فرسا ہونا ہوگا۔ ٹھیک ہے؟“ پرنس آندرے نے اچانک پوچھا۔

اس سوال پر پرنس ماریا پہلے تو متحیر ہوئی اور پھر بالکل ہی ہکا بکا۔ اس کا منہ کھٹے کا کھٹے رہ گیا۔

”روح فرسا؟... میرے لیے روح فرسا میرے لیے!“ اس نے ہکلاتے ہوئے کہا۔

”وہ کرخت تو سدا کے تھے لیکن اب مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ ان کا رویہ بھی تکلیف دہ ہوتا جا رہا ہے۔“ وہ

اپنے باپ کا ذکر جس اکثر انداز سے کر رہا تھا، اس کا بظاہر مقصد یہ تو یہ تھا کہ وہ اپنی بہن کو الجھن میں ڈالنا چاہتا تھا یا پھر یہ کہ وہ اس کا امتحان لینا چاہتا تھا۔

”آندرے، آپ بہت اچھے آدمی ہیں لیکن آپ کو اپنی عقل و دانش پر ایک طرح کا گھمنڈ ہے،“ پرنس نے کہا۔ اس نے یہ نہیں دیکھا کہ گفتگو کس کچ پر جا رہی ہے بلکہ وہ اپنے ہی خیالات کی رو میں بہے جا رہی تھی۔ ”اور یہ گناہ عظیم ہے۔ ہم اپنے والد، جد کا کیسے محاکمہ کر سکتے ہیں اور ہمیں یہ حق کس نے دیا ہے؟ پھر اگر ہم یہ محاکمہ کرنے پر تل بھی جائیں، تو جس طرح کے والد میرے ہیں، وہ محاکمے کی صورت میں بھی عزت و احترام کے جذبات ہی ابھاریں گے اور کچھ نہیں۔ مجھے تو ان کے ساتھ زندگی بسر کرنے سے اطمینان قلب اور حقیقی مسرت حاصل ہوتی ہے۔ میری تو صرف یہی آرزو ہے کہ کاش آپ سب لوگ بھی اتنے ہی دل شدار و سرور ہوتے جتنی کہ میں ہوں۔“

آندرے نے یوں سر ہلایا جیسے اسے اس کی بات کا یقین نہ آیا ہو۔

”مجھے جس واحد چیز سے کوفت ہوتی ہے، آندرے، میں آپ کو سچ سچ بتاؤں گی۔ وہ مذہب کے بارے میں، با جان کا رویہ ہے۔ میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ ان جیسا زبردست فہم و فراست کا مالک شخص روز روشن کی طرح عیاں اشیا کا ادراک کرنے میں کیوں ناکام رہتا ہے اور کس طرح راہ راست سے بھٹک جاتا ہے۔ صرف یہ چیز ہے جس سے مجھے واقعی دکھ ہوتا ہے۔ تاہم اس معاملے میں بھی مجھے حالیہ دنوں میں بہتری کی کرن دکھائی دینے لگی ہے۔ وہ ان باتوں کا جس طرح تسخیراڑا تے تھے، اب اس میں وہ کٹ نہیں رہی جو پہلے ہوا کرتی تھی۔ اور ایک روز تو انھوں نے کمال کر دکھایا، انھوں نے ایک راہب کو شرفِ ملاقات بخشا اور اس کے ساتھ طویل گفتگو فرمائی۔“

”خیر، مائی ڈیئر، میرا خیال ہے کہ تم اور تمھارا راہب اپنا بارود بیکار ضائع کر رہے ہیں،“ پرنس آندرے نے اسے چھیڑتے ہوئے کہا لیکن اس کے لہجے میں بہت مٹھاس تھی۔

”اف، بھائی جان، میں خداوند سے صرف دعا کر سکتی ہوں کہ وہ میری امیدیں برالائیں۔ آندرے،“ اس نے کچھ دیر بیچکپانے کے بعد ڈرتے ڈرتے کہا: ”مجھے آپ سے کچھ درخواست کرنا ہے۔“

”مائی ڈیئر، کیا چاہیے؟“

”نہیں، پہلے آپ وعدہ کریں کہ آپ انکار نہیں کریں گے۔ میں جو کچھ کرنا چاہتی ہوں، اس سے آپ کو کوئی تکلیف نہیں ہوگی اور نہ وہ کسی بھی اعتبار سے آپ کی شان سے بعید ہوگا۔ وعدہ کریں، اندر دشا!“ اس نے کہا اور

بے ہنڈ بیگ میں ہاتھ ڈال دیا۔ لیکن اس کے اندر جو کچھ اس کے ہاتھ میں تھا، وہ اسے باہر نکالتے جھجک رہی تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ جو کچھ وہ تھا، وہ ہارے ہوئے ہے، وہ وہی چیز ہے جس کی وہ اپنے بھائی سے التجا کر رہی تھی اور صرف اسی صورت میں دکھائی جاسکتی تھی کہ اس کی درخواست کو پیشگی قبولیت حاصل ہو جائے۔

وہ شرمائے لپٹے اپنے بھائی کو دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں التجا تھی۔

”خواہ یہ میرے لیے اچھی خاصی مصیبت کا باعث بن جائے،“... پرنس آندرے نے جواب دیا۔ وہ کچھ یوں غصہ کر رہا تھا جیسے اسے اندر زد ہو گیا ہو کہ اس کی ہمشیرہ کے ہاتھ میں کیا ہے۔

”آپ کا جو جی چاہے، سوچیں، میں صرف اتنا جانتی ہوں کہ آپ میرے لیے باپ کی مانند ہیں۔ لیکن یہ کام میری خاطر کر دیں۔ ضرور، بالضرور، میں آپ سے التجا کرتی ہوں! ہمارے ابا جان کے ابا جان، دادا حضور، جس جنگ میں بھی شریک ہوئے، اسے بہن کر ہوئے۔“ ہنڈ بیگ میں جس چیز پر اس کا ہاتھ تھا، وہ اس نے ابھی تک باہر نہیں نکالی تھی۔ ”تو آپ وعدہ کرتے ہیں؟“

”بالکل۔ یہ ہے کیا؟“

”آندرے، میں آپ کو یہ مقدس ایقونہ دینے کی سعادت حاصل کر رہی ہوں۔ آپ وعدہ کریں کہ آپ اسے کبھی اپنے جسم سے علیحدہ نہیں کریں گے۔ آپ وعدہ کرتے ہیں؟“

”یہ نہ کوئی منوں بھاری چیز ہے اور نہ اس کے پہننے سے میری گردن کا منکا ٹوٹے گا... چونکہ تمہاری خوشی ہے۔“ پرنس آندرے نے کہا۔ لیکن جو نبی اسے احساس ہوا کہ اس کے اس بھونڈے مذاق سے اس کی بہن کو بہت دکھ ہوا ہے، اسے ندامت ہوئی اور اس نے بنا تاخیر کہا: ”مائی ڈیئر، لاؤ، میں بہن لیتا ہوں، مجھے خوشی ہوگی، اچھی خوشی۔“

”آپ چاہیں یا نہ چاہیں، وہ بہر حال آپ کا تحفہ فرمائیں گے اور آپ کو اپنے رحم و کرم سے نوازیں گے۔ وہ آپ کو اپنے حضور لے جائیں گے کیونکہ صرف وہی مہارت و راسخ کے مین ہیں،“ اس نے کہا۔ جذبات سے اس کا گلارنہ گھٹ گیا تھا۔ اس نے نہایت عقیدت و احترام کے ساتھ اپنے دونوں ہاتھوں سے اپنے بھائی کو نجات دہندہ کا قدیم الوضع بھوی تصویر چھ پیش کیا۔ تصویر بچے میں چہرے کا رنگ مائل تھا۔ یہ فرتی فریم میں آدراں تھا اور اس کے ساتھ چاندی کی زنجیر، جس پر نہایت مہارت اور صفائی سے نقش و نگار بنائے گئے تھے، لٹک رہی تھی۔

اس نے اپنے سینے پر صلیب کا نشان بنایا، ایقونے کو بوسہ دیا اور آندرے کو تمنا دیا۔

”آندرے، نوازش ہوگی، میری خاطر...“

اس کی بڑی بڑی ڈری بھی آنکھیں ملائم روشنی سے چمک رہی تھیں۔ ان آنکھوں نے اس کے دلے پتلے چہرے کو بھی تابانی بخش دی اور اسے خوبصورت بنا دیا۔ اس کے بھائی نے ایقونہ لینے کے لیے ہاتھ آگے بڑھایا لیکن اس نے اسے روک دیا۔ آندرے سمجھ گیا۔ اس نے اپنے سینے پر صلیب کا نشان بنایا اور ایقونے کو بوسہ دیا۔

اس کے چہرے سے محبت بھی ٹپک رہی تھی کیونکہ اس کے دل پر گہرا اثر ہوا تھا اور ساتھ ہی اس پر طنز بھی ہو رہا تھا۔
”شکریہ مائی ڈیر!“

اس نے اس کی پیشانی پر بوسہ دیا اور دوبارہ صوفے پر بیٹھ گئی۔ دونوں کچھ دیر خاموش رہے۔
”آندرے، جیسا کہ میں عرض کر چکی ہوں آپ نے ہمیشہ ہی شفقت اور دریا دلی کا مظاہرہ کیا ہے۔ اب بھی اسی شفقت اور دریا دلی سے کام میں۔ لسا کے ساتھ کڑا رویہ اختیار نہ کریں۔“ اس نے کہنا شروع کیا۔ ”وہ بہت پیاری، بہت اچھی ہے اور فی الحال اس کی پوزیشن بڑی نازک ہے۔“
”ناشا، میرا خیال ہے کہ میں نے تم سے کوئی ایسی بات نہیں کہی جس سے میری بیوی کی نفسیاتی کا کوئی پہلو نکلتا ہو۔ میں نے اس پر نہ تو کوئی نکتہ چینی کی ہے اور نہ یہ کہا ہے کہ میں اس سے مطمئن نہیں۔ پھر تم یہ سب کچھ مجھ سے کیوں کہہ رہی ہو؟“

پرنس ماریا کے چہرے پر سرخ دھبے نمودار ہو گئے اور وہ یوں کم صم بٹھٹی رہی جیسے وہ اپنے آپ کو مجرم گردان رہی ہو۔

”میں نے تو تم سے کچھ نہیں کہا لیکن معلوم ہوتا ہے کہ کوئی دوسرا شخص مجھ سے ضرور کان بھرتا رہا ہے۔ اس سے مجھے رنج پہنچا ہے۔“

پرنس ماریا کے رخساروں، پیشانی اور گردن پر سرخ دھبے اور بھی گہرے ہو گئے۔ وہ کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن اس کے منہ سے ایک لفظ بھی نہ نکل سکا۔ اس کے بھائی نے ٹھیک اندازہ لگایا تھا۔ کوچک پرنس ڈنر کے بعد روتی رہی تھی، رچگی کے سلسلے میں اسے جو اندیشے لاحق تھے، خوف سے جس طرح اس کی جان نکلی جا رہی تھی، اس نے ان کا تذکرہ کیا تھا اور اس نے اپنے خسر اور خاندان کے متعلق بھی کچھ کہا تھا۔ رونے دھونے کے بعد وہ سو گئی تھی۔ پرنس آندرے کو اپنی بہن سے ہمدردی ہو رہی تھی۔

”ناشا۔ ایک بات پہلے باندھ لو۔ میری بیوی نے کبھی کوئی ایسی حرکت نہیں کی جس پر میں اسے ملامت کر سکوں۔ میں نے اسے نہ کبھی ملامت کی ہے اور نہ کبھی کڑوں گا۔ اور نہ میں نے اس کے ساتھ کبھی ایسا سلوک کیا ہے جس پر میں اپنے آپ کو ملامت کر سکوں۔ حالات خواہ کیسے ہی رنج کیوں نہ، اختیار کر لیں، میرے اس رویے میں کبھی کوئی تبدیلی نہیں آئے گی۔ لیکن اگر تم سچائی معلوم کرنا چاہتی ہو۔ اگر تم یہ جاننا چاہتی ہو کہ میں خوش ہوں؟۔ نہیں کیا وہ خوش ہے؟ نہیں! ایسا کیوں ہے؟ مجھے نہیں معلوم...“

اس نے یہ کہا، اپنی جگہ سے اٹھا، اپنی بہن کے پاس پہنچا، نیچے جھکا اور اس کی پیشانی پر بوسہ ثبت کر دیا۔
مروت، محبت اور شفقت کے ملے جلے جذبات کی غیر معمولی اونے اس کی حسین آنکھوں کو منور کر دیا تھا لیکن وہ اس کی طرف نہیں بلکہ اس کے سر کے اوپر کھلے دروازے کی تاریکی کی جانب دیکھ رہا تھا۔

”آئی، اس کے پاس چلیں، خدا حافظ کہنے کا وقت آ گیا ہے۔ یا۔ تم ایسی ہی چلی چلا اور اسے جگا دو۔ میں

ابھی آتا ہوں۔ پتہ دیکھا؟“ اس نے اپنے خدمت گار کو آواز دی۔ ”ادھر آؤ۔ یہ سامان اٹھا کر لے چلو۔ اسے میں کے اوپر رکھ دینا اور یہ دیکھیں طرف۔“

پرنس ماریا اٹھ کر کھڑی ہو گئی اور دروازے کی طرف چل پڑی۔ پھر وہ رک گئی وریولی۔

”آندرے، اگر آپ یقین کی دولت سے مال مال ہوتے، آپ خداوند سے دعا کرتے کہ جو محبت آپ محسوس نہیں کرتے، وہ سے آپ کی جھوٹی میں ڈال دیں، اور آپ کی دعا قبول ہو جاتی۔“

”ہاں... ایسا ہو سکتا تھا،“ پرنس آندرے نے کہا۔ ”ماشا، جاؤ، میں ایک آدھ منٹ میں پہنچتا ہوں۔“

جب پرنس آندرے مکان کے دونوں حصوں کو ملنے والی غلام گردش میں سے گزرتا اپنے ہم شیرہ کے کمرے کی طرف جا رہا تھا، اس کا سامنا مادموزیل یوفین سے ہو گیا۔ وہ شیریں انداز سے مسکرا رہی تھی۔ الگ تھک راہداریوں میں وہ اس روز تیسری بار اسے ملی تھی اور ہر بار اس کے چہرے پر وہی بھولی بھالی اور وجد آفریں مسکراہٹ تیرتی رہی تھی۔

”ادو! میرا خیال تھا کہ آپ آپے کمرے میں ہوں گے،“ وہ بولی۔ کوئی خاص ہی وجہ ہوگی کہ شرم سے اس کے رخسار سرخ ہو گئے اور اس نے اپنی نگاہیں نیچے جھکا لیں۔

پرنس آندرے نے اسے درشتی سے گھور کر دیکھا۔ اچانک اس پر جھانپت سوار ہو گئی۔ اس نے نہ تو اپنی زبان ہلائی اور نہ اس کی آنکھوں میں جھانک کر دیکھا، وہ بس اس قدر حقارت سے اس کی پیشانی اور اس کے بالوں کو ہانکی باندھ کر دیکھا کہ فرانسیسی خاتون کے گال تھمتانے لگے اور وہ ایک نغظ کہے بغیر وہاں سے کھسک گئی۔

جب وہ اپنی ہم شیرہ کے کمرے میں داخل ہوا، اس کی بیوی بیدار ہو چکی تھی اور اس کی ننھی منی ہشاش بشاش غوغاں کھلے دروازے سے باہر سنائی دے رہی تھی۔ وہ حسب معمول فرانسیسی میں چہچہا رہی تھی اور ایک رفتار سے جا رہی تھی کہ معلوم ہوتا تھا کہ طویل زبان بندی کے بعد اس کے منہ کا قفل کھل گیا ہے اور وہ اگلی جھپٹ ساری کسر پوری کرنا چاہتی ہے۔

”نہیں، ذرا بڑھی کاؤٹنس زوب و کو پنے تصور میں ماؤ۔ سر پر مصنوعی زلفیں اور منہ میں مصنوعی دانت۔“⁶³ یوں معلوم ہوتا ہے کہ وہ وقت کو شکست دینے کی کوشش کر رہی ہے۔ ہا، ہا، ہا، ماریا!“

پرنس آندرے اس سے پہلے ہی پانچ مرتبہ دوسروں کی صحبت میں اپنی بیوی کو کاؤٹنس زوب و اس کے متعلق بیچہ یہی باتیں کرتے اور سی قسم کا تہمتہ لگاتے سن چکا تھا۔ وہ دبے پاؤں کمرے میں داخل ہوا۔ گل رنگ اور فریب اندام کو چپک پرنس آرام کرسی پر بیٹھی تھی۔ کشیدہ کاری کا سامان اس کے ہاتھوں میں تھا اور وہ دم لیے بغیر باتیں کہے جا رہی تھی۔ وہ وہی گھسی پٹی یادداشتیں دہرا رہی تھی، یہاں تک کہ جملے اور الفاظ تک وہی تھے۔ پرنس آندرے اس کے پاس پہنچا، اس نے اس کے بالوں کو سہلایا اور اس سے دریافت کیا ”سفر کی تھکاوٹ دور ہوئی؟“ اس نے اس کے سوال کا جواب دیا اور وہ بارہ اپنی نثر میں مصروف ہو گئی۔

ساقی انٹرنیٹ

PDF BOOK COMPANY



Muhammad Hushain Syakir

0305-6406067

Sidrah Tahir

0334-0120123

Muhammad Saqib Riyaz

0344-7227224

پورچ میں چھ گھنٹوں والی گاڑی کھڑی تھی۔ یہ خزاں کی رات تھی اور اتنی تاریک کہ کو جوان کو گھوڑے کے ہم نظر نہیں آ رہے تھے۔ ہاتھوں میں لٹینیں پکڑے نوکر ادھر ادھر بھاگے پھر رہے تھے۔ وسیع و عریض مکان کے بند درجوں میں روشنیوں جھلسلا رہی تھیں۔ گھریلو ملازمین (جن کی حیثیت غلاموں سے زیادہ نہ تھی) بیرونی ہال میں ہجوم کیے ہوئے تھے تاکہ وہ پرس کو الوداع کہہ سکیں۔ انتظار گاہ میں افراد خاندان۔ میٹائیل ایوانوویچ، مادموزیل بوغین پرس ہار یا اور کوچک پرس۔ منتظر کھڑے تھے۔ بوڑھا پرس تنہائی میں اپنے بیٹے کو رخصت کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ اس نے اسے اپنے سٹڈی روم میں بل بھیجا تھا۔ باقی سب لوگ ان کی آمد کا انتظار کر رہے تھے۔ جب پرس آندرے سٹڈی روم میں داخل ہوا، اس کا باپ وقیانوسی چشمہ لگائے اور سفید ڈریسنگ گائون، جس میں وہ اپنے بیٹے کے سوا کسی اور سے ملاقات نہیں کرتا تھا، پہنے، میز کے سامنے بیٹھا کچھ لکھ رہا تھا۔ اس نے نظریں اوپر اٹھائیں:

’جار ہے ہو؟‘ اور وہ لکھتا رہا۔

’میں اجازت لینے حاضر ہوا ہوں۔‘

’مجھے یہاں بوسہ دو،‘ اس نے اپنے گال کی طرف اشارہ کیا۔ ’شکریہ، شکریہ‘

’آپ میرا شکریہ کیوں ادا کر رہے ہیں؟‘

’اس لیے کہ تم نے کسی ہچکچاہٹ کا مظاہرہ نہیں کیا، اس لیے کہ تم کسی عورت کے ازار بند سے بندھے نہیں رہے۔ تم نے ہر چیز پر فرض کو ترجیح دی ہے۔ شکریہ شکریہ!‘ اور وہ لکھتا رہا۔ اس کا قلم کاغذ پر گھسٹ رہا اور سیاہی کے چھینے اڑا رہا تھا۔ ’تم نے کچھ کہنا ہے تو کہہ ڈالو، میں بیک وقت دو کام کر سکتا ہوں۔‘

’اپنی بیوی کے متعلق۔ میں شرمندہ ہوں کہ اسے آپ کے لیے باندھے جا رہا ہوں۔۔۔ ان حالات میں۔‘

’کیا فنسول باتیں کر رہے ہو؟ یہ بتاؤ! تمہیں چاہیے کیا؟‘

’جب بچگی کا وقت آئے، ماسکو سے کسی accoucheur کو بلا لیں۔ اسے یہیں ٹھہریں۔۔۔‘

پرس لکھتے لکھتے رک گیا اور اس نے اپنی خشم گیس لگائیں یوں اپنے بیٹے پر گناہیں جیسے وہ سمجھ نہ سکا ہو کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔

’میں جانتا ہوں کہ اگر قدرت مہربان نہ ہوئی، پھر کوئی سمجھ نہیں کر سکتا،‘ پرس آندرے نے کہا۔ وہ بظاہر اغاگز بڑا گیا تھا کہ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کہے اور کیا نہ کہے۔ ’میں جانتا ہوں کہ بچگی کے دس لکھ کیسوں میں صرف ایک ایسا ہوتا ہے جب صورت حال مشکل ہو جاتی ہے۔ لیکن اسے وہم ہو گیا ہے اور مجھے بھی۔ لوگ اسے طرح طرح کی کہانیاں سناتے رہتے ہیں۔ اس نے خواب بھی دیکھ لیا ہے اور وہ خوف زدہ ہے۔‘

’اخوں۔۔۔‘ معمر پرس منہ ہی منہ میں بڑبڑایا اور جو کچھ وہ لکھ رہا تھا، اسے ختم کرتے ہوئے بولا:

’ابروضع حل۔‘

”میں انتظام کروں گا۔“

اس نے خوبصورت دائرے بناتے ہوئے اپنے دستخط کیے، پھر اچانک اپنے بیٹے کی طرف متوجہ ہوا اور ہنسنے لگا۔
”گڑبڑ گھوٹا ل، ہونہ؟“

”ابا جان، گڑبڑ گھوٹا کیا؟“

”ہیگم،“ معمر پرنس نے منہ پھٹ لیکن پرستی انداز سے کہا۔

”میں سمجھا نہیں،“ پرنس آندرے نے کہا۔

”ہاں، برخوردار، اب کچھ نہیں ہو سکتا،“ معمر پرنس نے کہا۔ ”یہ سب ایک جیسی ہوتی ہیں۔ لیکن بتم فیہ شادی شدہ بننے سے رہے۔ فکر نہ کرو۔ میں کسی کو نہیں بتاؤں گا۔ لیکن تمہیں خود اس کا علم ہے۔“

اس نے اپنے بیٹے کا ہاتھ اپنی چھوٹی چھوٹی استخوانی انگلیوں کی آہنی گرفت میں جکڑ لیا اور اسے زور سے جھٹکادیا اور اپنی نگاہیں سیدھی اس کے چہرے پر لگا دیں۔ اس کی نظروں میں اتنی تیزی و سرعت تھی کہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ دوسرے شخص کی باطنی کیفیت بھی بھانپ سکتا ہے۔ اور وہ ایک مرتبہ پھر اپنی سرد مہراندہی ہنسنے لگا۔

اس کے بیٹے کے منہ سے آہ نکل گئی اور اس کی یہ آہ اس بات کا اقرار تھی کہ اس کے باپ نے اسے سمجھنے میں کوئی غلطی نہیں کی تھی۔ بوڑھے نے خط تہہ کیا اور اسے لفافے میں بند کر دیا۔ اس نے اپنی روایتی پھرتی سے بھپٹ کر لکھا اٹھائی، لفافے پر رکھی اور اس پر مہر ثبت کر دی۔

”تم کبھی کیا سکتے ہو؟ وہ ملکہ حسن ہے، اخیر، فکر نہ کرو، میں ہر چیز کا خیال رکھوں گا،“ اس نے خط پر ہر لگاتے اچانک اپنے واضح اور پرتو دار انداز سے کہا۔

آندرے خاموش رہا۔ یہ احساس کہ اس کا باپ اسے سمجھتا ہے، طرب انگیز بھی تھا ورنہ کرب ناک بھی۔
بوڑھا اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور اس نے خط اپنے بیٹے کے ہاتھ میں تھما دیا۔

”آؤ،“ اس نے کہا۔ ”تمہیں بیوی کے بارے میں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ مجھ سے جو کچھ بن پڑا، ضرور کروں گا۔ اب سو۔ خط میٹائل ال ری اونارچ کو دے دینا۔ میں نے اسے لکھا ہے کہ وہ تمہیں صحیح جگہوں پر استعمال کرے اور تمہیں زیادہ عرصے تک ایجوٹ نہ بنائے رکھے۔ یہ بڑا اگلیا عہدہ ہے، اسے جانا کہ وہ مجھے یاد ہے اور میں اسے پسند کرتا ہوں۔ وہ تمہارے ساتھ کس طرح پیش آتا ہے، مجھے اس کے بارے میں ضرور لکھنا۔ اگر اس نے تمہارے ساتھ اچھا برتاؤ کیا، پھر بے شک اس کی ماتحتی میں کام کرتے رہنا، نکولائی آندر یوچ بلکونسکی کے بیٹے کو محض اس لیے دوسروں کا دہل نہیں بننا چاہیے کہ یہ خوش اخلاقی کا تقاضا ہے۔“

وہ اتنی سرعت سے باتیں کر رہا تھا کہ آدرے الفاظ صحیح ہی میں کھا جاتا تھا لیکن اس کا بیٹا اس کا عادی تھا اور جو کچھ وہ کہنا چاہتا تھا، اسے با آسانی سمجھ جاتا تھا۔ وہ اسے ڈیک کے قریب لے گیا، اس کا ڈھکنا اٹھایا، دراز کھولی اور ایک کاپی نکالی۔ پوری کاپی شروع سے آخر تک پر تھی اور اس کے اپنے ہاتھ سے لکھی ہوئی تھی۔ اس کا خط خاصا

موتا تھا لیکن سطور ایک دوسرے سے جوڑ جوڑ کر تحریر کی گئی تھیں۔

”میں غائباً تم سے پہلے ملک عدم کے سفر پر روانہ ہو جاؤں گا۔ یاد رکھو کہ یہ میری یادداشتیں ہیں۔ انھیں میرے انتقال کے بعد امپراطور کی خدمت اقدس میں پیش کیا جانا ہے۔ یہ لمبا رڈ ہاؤس کا ⁶⁵ٹنڈ اور خط ہے۔ یہ دراصل انعام ہے اور اس شخص کو دیا جائے گا جو ان جنگوں کی، جو سواروف کی سپہ سالاری میں لڑی گئی تھیں، تاریخ مرتب کرے گا۔ اسے اکادمی بھیج دینا۔ یہ چند تحریریں ہیں تمہارے لیے قلم بندی ہیں، انھیں میرے انتقال کے بعد پڑھ لینا، تمہارے لیے یہ کارآمد ہوں گی۔“

آندرے نے اپنے باپ سے یہ نہیں کہا کہ وہ لاریب عمر نوج پائیں گے۔ وہ محسوس کر رہا تھا کہ اس قسم کی بات کہنے کی ضرورت نہیں۔

”ابا جان، آپ نے جو کچھ فرمایا ہے، میں وہ سب کچھ کروں گا۔“

”خوب، پھر الوداع،“ اس نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا تا کہ وہ اسے چوم سکے اور اس کے ساتھ بغل گیر ہو گیا۔ ”پرنس آندرے، ایک بات یاد رکھنا۔ اگر تم زندہ نہ بچے، تو بڑھاپے میں یہ میرے لیے بڑا دھچکا ہو گا۔“ چانک اس نے اپنی بات سچ میں چھوڑ دی اور پھر ایک اکیلی چڑچڑ سے انداز سے کہنے لگا۔ ”اگر کل کلاں مجھ تک یہ اطلاع پہنچی کہ تمہارا رویہ اور کردار نکومائی بلکونسکی کے فرزند کے شاہان شان نہیں تو مجھے۔ شرمندگی ہوگی!“ وہ چیخ رہا تھا۔

”ابا جان، آپ کو مجھ سے یہ کہنے کی ضرورت نہیں تھی!“ بیٹے نے مسکرا کر جواب دیا۔

بوڑھا خا سولٹ رہا۔

”میں ایک اور درخواست بھی آپ کے گوش گزار کرنا چاہتا تھا!“ پرنس آندرے نے اپنا سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”اگر میں زندہ نہ بچا اور اگر میرے ہاں بیٹا تولد ہو، اسے کسی کو یہاں سے لے جانے نہ دیں، اپنے پاس ہی رکھیں اور جیسا کہ میں نے کل عرض کیا تھا، اس کی یہیں پرورش کریں اور اسے یہیں تعلیم دلائیں... یہ میری التجا ہے!“

”تمہاری بیوی کو اسے لے جانے نہ دوں؟“ بوڑھے نے دریافت کیا اور کھلکھلا کر ہنس پڑا۔

وہ دونوں چپ چاپ رو برو کھڑے تھے۔ معمر آدمی کی تیز نگاہیں اپنے بیٹے کی آنکھوں پر مرکوز تھیں۔ اس کے چہرے کے زیریں حصے پر کچھکی طاری تھی۔

”ہم ایک دوسرے کو الوداع کہہ چکے ہیں۔ جاؤ!“ اس نے اچانک کہا۔ ”جاؤ!“ اس نے سٹڈی روم کا دروازہ کھولتے اور غصیلی آواز میں چلا کر کہا۔

”کیا ہوا، کیا ہوا؟“ دونوں پرنسوں نے پرنس آندرے کو دیکھتے ہوئے بیک آواز پوچھا۔ دونوں کو معمر پرنس کی عارضی جھٹک دکھائی دی تھی۔ وہ سفید زریں تک گاؤں میں ملیں تھا۔ اس کی آنکھوں پر چشمہ بھی تھا لیکن اس

کے سر پر دگ نہیں تھی اور وہ قہر آلود آواز میں چہرہ ہاتھ۔

پرنس آندرے نے لمبی سانس لی لیکن خاموش رہا۔

”خیر!“ اس نے اپنی اہیہ کی طرف متوجہ ہو کر کہا لیکن اس کی یہ ”خیر“ کانوس کو اتنی ہی برقی اور تسخیر انگیز محسوس ہوئی جیسے اس نے یہ کہا ہو، خیر، تمہیں جو اداکاری کرنا ہے، کر لو!“

”آندرے۔ ابھی سے؟“ کوچک پرنس نے کہا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں ورنہ بے بسی سے اپنے شوہر کو نگے جارہی تھی۔

آندرے نے اسے اپنی آغوش میں لے لیا۔ کوچک پرنس نے چیخ ماری اور عام بے ہوشی میں اس کے کندھے پر گر پڑی۔

دو جس کندھے پر جھکی ہوئی تھی، اس نے بڑی احتیاط سے اسے چھڑایا، اس کے چہرے پر نظر دوڑائی اور اسے آرام کرسی پر لٹا دیا۔

”ماری، اللوداع،“ اس نے ماتم آواز سے اپنی بہن سے کہا، اس کا ہاتھ پکڑا، اسے چوما اور تیز تیز قدم اٹھاتا باہر نکل گیا۔

کوچک پرنس کرسی پر لیٹی ورماد سوزیل بوغین اس کی کنپٹیاں سہلاتی رہی۔ پرنس ماریا نے اپنی بھونج کو سہارا دے رکھا تھا۔ اس کی خوبصورت آنکھیں اشکوں سے لبریز تھیں اور وہ پیچم اس دروازے کی جانب دیکھے جارہی تھی جس میں سے اس کا بھائی رخصت ہوا تھا۔ اس نے اس کی جانب صلیب کا نشان بنایا۔ سٹڈی روم سے بوڑھے پرنس کے غیظ و غضب سے بار بار ناک سڑکنے کی آوازیں یوں آرہی تھیں جیسے پستول کی گولیاں چل رہی ہوں۔ پرنس آندرے ابھی بمشکل گھر سے باہر گیا ہوگا کہ دھماکے سے سٹڈی روم کا دروازہ کھلا اور سفید ڈریسنگ گاؤن میں ملبوس بوڑھے کی گھبر صورت دکھائی دی۔

”چلا گیا؟ خوب!“ اس نے کہا، بے ہوش کوچک پرنس پر غضب آلود نگاہ ڈالی، ناپسندیدگی سے اپنی گردن جھٹکی اور دھماکے سے دروازہ بند کر دیا۔

اکتوبر 1805 کے دوران میں روسی فوجیں آرج ڈی آف آسٹریا کے قصبات اور دیہات میں پڑاؤ ڈالنے پڑی تھیں اور روس سے مسلسل تازہ دم دستے بھی آرہے تھے۔ وہ براؤناؤ کے قریب ڈیرے ڈال رہے تھے اور جن مقامی باشندوں کے قریب مقیم ہو رہے تھے، ان پر بھاری بوجھ بن رہے تھے۔ براؤناؤ کمانڈر انچیف کو تو زور دیا کہ ہڈ کوار ٹر تھا۔

گیارہ اکتوبر 1805 کو ایک پیادہ رجمنٹ براؤناؤ پہنچی۔ وہ شہر سے آدھ میل ادھر رک گئی۔ یہاں اس نے کمانڈر انچیف کا انتظار کرنا تھا تاکہ وہ اس کا معائنہ کر سکے۔ یہ ٹھیک ہے کہ اس علاقے اور اس کے گرد و پیش کی فضا۔ یہاں پھلوں کے باغات، پتھروں کی باڑیں، ٹاتلوں والی چھتیں اور دروازے پر پہاڑیاں تھیں۔ قطعاً غیر روسی تھی اور جو باشندے فوجیوں کو بہت گھبرائے تھے، وہ بھی روسی نہیں تھے۔ لیکن اس تمام حقائق کے باوجود یہ رجمنٹ کسی بھی دوسری رجمنٹ کے، جو قلب روس میں واقع کسی مقام پر پڑاؤ ڈالے معائنہ کا انتظار کر رہی ہو، بالکل مماثل تھی۔

کوچ کے آخری روز بوقت شام حکم موصول ہوا کہ کمانڈر انچیف اس رجمنٹ کا معائنہ بحالت کوچ کریں گے۔ اگرچہ حکم کی عبارت پوری طرح رجمنٹل کمانڈر کی سمجھ میں نہیں آئی تھی اور سوال پیدا ہوا تھا کہ آیا انھیں پوری وردیاں پہن کر پیش ہونے کی ہدایت کی گئی ہے یا کچھ رعایت برتی گئی ہے۔ تاہم مختلف بیالیسوں کے کمانڈروں کے ساتھ صلاح مشورے کے بعد طے پایا کہ انھیں پوری وردیاں ہی پہننا چاہئیں۔ ان کے اس فیصلے کا محرک یہ اصول تھا "کافی حد تک نہ جھکنے کی نسبت کافی سے زیادہ جھکنا بہتر ہوتا ہے۔" چنانچہ بیس میل کی مسافت طے کرنے کے بعد بھی جوانوں کو پلک بیک جھپکنے کا موقع میسر نہ آیا اور ان کی ساری رات مختلف اشیاء کی صفائی ستھرائی اور مرمتیں کرتے گزر گئی۔ رہے انجینٹ اور کمپنی کمانڈر، وہ مختلف طریقوں سے جمع تفریق کرتے رہے۔ ان احتیاطی تدابیر کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب صبح طلوع ہوئی، رجمنٹ کے دو ہزار جوان اور اسر۔ جنھوں نے کوچ کے آخری روز گھسٹے پھسٹے اور بے مہارتی کی صورت اختیار کر لی تھی۔ اپنے اپنے مقام پر اپنے اپنے فرائض سنبھالے

کوٹوروف اپنی سپاہ کو لے کر بہ تعجل آرج ڈیوک فرڈی ہینڈ اور جنرل میک کے زیرِ کمان افواج کے ساتھ چلے۔ کوٹوروف کے خیال میں یہ اتحاد قرین مصلحت نہ تھا اور اپنے نقطہ نظر کو منوانے کے لیے دوسرے دکانوں کے علاوہ اس کا ارادہ آشرودی جنرل کو یہ بھی دکھانا تھا کہ روسی فوجیں جس حالت میں روس سے پہنچی ہیں، وہ انتہائی خستہ اور تاملِ رحم ہے۔ وہ رجمنٹ کا معنہ اسی مقصد کے پیش نظر کرنا چاہتا تھا۔ رجمنٹ کی خستہ حالت جتنی زیادہ خستہ و خراب ہوتی، کمانڈر انچیف کو اتنی ہی زیادہ خوشی ہوتی۔ اگرچہ ایجوٹ کو ان حالات کا علم نہیں تھا، تاہم اس نے رجمنٹل کمانڈر کو یہ بین حکم پہنچا دیا کہ جوانوں کے اجسام پر اور کوٹ اور ان کی کمریوں پر تھپے ہونے چاہئیں ورنہ کمانڈر انچیف ناراض ہوں گے۔

یہ سن کر رجمنٹل کمانڈر کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ اس کا سر جھک گیا۔ کندھے پیچک گئے اور وہ بے بسی سے اپنے بازو ہوا میں لہرائے لگا۔

”ستیاناس“ وہ دہاڑا۔ ”میٹائل مٹرخ، میں نے تمہیں بتایا نہیں تھا کہ پوری وردی سے مراد یہ تھا کہ اور کوٹ پہنے جائیں،“ اس نے بٹالین کمانڈر کی سرزنش کرتے ہوئے کہا۔ ”اف، میرے خدا یا،“ اس کے منہ سے مزید نکلا۔ اس کے ساتھ وہ پر حزم انداز سے آگے بڑھا۔ ”کمپنی کمانڈر صاحبان!“ اس نے یک لہری آواز میں چلا کر کہا جو حکم دینے کی عادی تھی۔ ”سارجنٹ۔ مہجر صاحبان!۔۔۔ وہ کب تک تشریف لے آئیں گے؟“ اس نے ایسے احترام کے ساتھ ایجوٹ سے یہ سوال دریافت کیا جو واضح طور پر اس شخصیت کے وقار کے عین مطابق تھا جس کی طرف وہ اشارہ کر رہا تھا۔

”میرا خیال ہے،“ ایک گھنٹے میں۔“

”ہمیں در دیاں تبدیل کرنے کے لیے وقت مل جائے گا؟“

”جنرل، میں کچھ کہہ نہیں سکتا۔“

رجمنٹل کمانڈر خود جوانوں کی صفوں میں کھس گیا اور حکم دینے لگا کہ وہ اور کوٹ پہن لیں۔ کمپنیوں کے کمانڈر منتشر ہو گئے اور اپنی اپنی کمپنیوں میں چلے گئے۔ سارجنٹ۔ مہجر ادھر ادھر بھاگنے دوڑنے لگے (اور کوٹوں کی حالت اتنی اچھی نہیں تھی)۔ اس ترت پھرت کا نتیجہ یہ ہوا کہ نوجوانوں میں، جو ابھی ابھی منظم اور با ترتیب صفیں بنائے خاموش کھڑے تھے، کھلبلی مچ گئی، وہ دائیں بائیں، آگے پیچھے دھکم دھکا کرنے اور بھانت بھانت کی بولیاں بولنے لگے۔ وہ کندھوں کو جھٹکتے، کمریوں میں تھپے اوپر اچھالتے، ان کی پٹیاں کھولتے، جلد بازی سے اپنے اور کوٹ نکالتے اور ان کا سیدھا جس طرح بھی ہو سکتا، انھیں پہننے کی کوشش کرتے پھر رہے تھے۔ کسی کے بازو اوپر اٹھ رہے تھے اور کوئی انھیں آستینوں میں گھسیڑنے کی کوشش کر رہا تھا۔

آدھ گھنٹہ اسی تک وہ میں صرف ہو گیا لیکن بہر حال وہ اپنی صفیں دوبارہ منظم کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ فرق صرف یہ آیا کہ پہلے وہ سیاہ منظر پیش کر رہے تھے، اب اس منظر کا رنگ تبدیل ہو گیا اور وہ سرخی ہو گیا۔ رجمنٹل

کمانڈر ایک مرتبہ پھر اکڑتا اور پھوندنے کی چال چٹا صفوں کے بالکل سامنے آگیا اور دور سے ان کا معائنہ کرنے لگا۔
”ہونہہ! یہ کیا ہے؟ اس نے رکستے ہوئے چلا کر کہا۔“ تیسری کمپنی کا کمانڈر!۔“

”تیسری کمپنی کے کمانڈر جنرل کے پاس پہنچ جائیں! تیسری کمپنی کے کمانڈر جنرل کے پاس۔ تیسری کمپنی کے کمانڈر۔۔۔“

معا حکم صف بہ صف گردش کرنے لگا۔ ایک ایجوٹ صفوں میں گھس گیا اور خود ماتھے افسر کو تلاش کرنے لگا۔ دھروہ لوگ جو حکم صف بہ صف پہنچا رہے تھے، اگرچہ وہ بڑے ذوق و شوق اور دلولے کے ساتھ آوازیں بلند کر رہے تھے، لیکن آخری صف تک پہنچتے پہنچتے پیغام کی اوجیت بالکل تہریل ہو گئی۔ اصل حکم کے مطابق تیسری کمپنی کے کمانڈر نے جنرل کی خدمت میں حاضر ہونا تھا لیکن معاملہ جب گڑبڑا یا تو پیغام یہ پہنچا۔ ”جنرل صاحب تیسری کمپنی کے کمانڈر کے پاس آ رہے ہیں۔“ اور میں اٹا مفتودا لٹھر، فسر اپنی کمپنی کے عقب سے نمودار ہو چکا تھا۔ اگرچہ وہ ادھیڑ عمر کو پہنچ گیا تھا اور اسے بھانگنے دوڑنے کی عادت بھی نہیں رہی تھی، اس نے دھکی لگا دی۔ وہ پاؤں رکھتا کہیں اور وہ پڑتا کہیں تھا۔ یوں وہ ہانپتا کا پیتا جنرل کی طرف چل پڑا۔ کمپنیشن کی حالت اس بچے کی ہو رہی تھی جس نے اپنا سبق یاد نہ کیا ہو اور اسے سبق سنانے کا حکم مل ہو۔ اس کے سرخ چہرے (اس کے چہرے کی سرخی لاریب کثرت شراب نوشی کا اثر تھی) پر دھبے نمودار ہو گئے اور گھبراہٹ سے اس کے ہونٹ پھڑکنے لگے۔ کمپنیشن کی سانس پھول رہی تھی اور جوں جوں وہ منزل کے قریب ہوتا جا رہا تھا، اس کی رفتار سست پڑتی جا رہی تھی۔ جنرل نے اس کا عمیق نظروں سے سر سے پاؤں تک جائزہ لیا۔

”چند روز میں تم اپنے جوانوں کو اپنی کوٹ پہنانے لگو گے! یہ کیا ہے؟“ اس نے چلا کر پوچھا۔ اس کا لپٹا جیڑا آگے کو لٹک گیا اور اس نے تیسری کمپنی کی صفوں میں ایک جوان کی طرف، جس نے دوسروں کے برعکس بڑھیا کپڑے کا اور کوٹ پہنا ہوا تھا اور یوں ان سے بالکل مختلف نظر آ رہا تھا، اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”اور تم خود کہاں تھے؟ کمانڈر انچیف صاحب تشریف لایا ہی چاہتے ہیں اور تم اپنی جگہ سے غائب ہو! ایس چہ بوا لٹھی ایست! اور رجنٹ کا معائنہ ہو رہا ہے۔ ورا دھرم اپنے جوانوں کو چھیل چھیلے لباس پہنا رہے ہو۔ تمہیں اس کا خفیہ راز جھگستا پڑے گا۔ کیا کہتے ہو؟“

کمپنی کمانڈر نے ایک سیکنڈ کے لیے بھی اپنی ٹکاہیں اپنے افسر اعلیٰ کے چہرے سے نہ ہٹائیں۔ اس کی دو انگلیاں اس کی ٹوپی کے سامنے کے حصے پر تھیں اور وہ لٹک رہا تھا اس پر اپنی گرفت سخت کرتی جا رہی تھیں جیسے اس کی یہ کوشش اس کی حیات کی واحد امید رہ گئی ہو۔

”خیر، تم منہ سے کچھ پھونٹے کیوں نہیں؟ یہ کون ہے جسے تم نے ہنگری والوں کی طرح ہٹا سنا کر کھڑا کیا ہوا ہے؟“ اس نے طنز کے تیکھے تیر چلاتے ہوئے پوچھا۔
”یوڑا کیسی لیس۔“

”یہ سب یوٹرا ایکسی لینسی، یوٹرا ایکسی لگا رکھی ہے؟ ہونہ، یوٹرا ایکسی لینسی! تم کہنا کیا چاہتے ہو؟“

”یوٹرا ایکسی لینسی، وہ دلو خوف ہے، وہی دلو خوف جسے کیپٹن سے سپاہی بنا دیا گیا تھا،“ کیپٹن نے دھیمے لہجے

سے جواب دیا۔

”ہونہ اس کی جنرل ہوئی تھی یا ترقی؟ وہ فیلڈ مارشل مقرر ہوا تھا یا عام سپاہی؟ اگر وہ سپاہی ہے، پھر وہ عام سپاہیوں کی وردی پہنے۔“

”یوٹرا ایکسی لینسی، آپ نے کوچ کے دوران میں خود ہی اسے اجازت مرحمت فرمائی تھی۔“

”میں نے اجازت دی تھی؟ یہ تم لو جوان ہمیشہ اسی قسم کی باتیں کہتے رہتے ہو،“ جنرل نے قدرے ٹھنڈے پڑتے ہوئے کہا۔ ”ہونہ، اجازت! ذرا ڈھیل دے دو اور تم لوگ...“ جنرل کا پارہ بھر بلند ہونے لگا۔ ”اور تم... جاؤ، مہربانی فرماؤ اور اپنے جوانوں کو گھج وردی پہناؤ۔“

جنرل نے مڑ کر ایجنٹ کی طرف دیکھا اور ایک بار پھر کپکپاتا اور پھونکنے کی چال چلا رجنٹ کی جانب چل پڑا۔ اس نے جس غیظ و غضب کا مظاہرہ کیا تھا، بظاہر معلوم ہوتا تھا کہ وہ اس پر بہت مسرور ہے۔ اب وہ جوانوں کی صفوں کے درمیان میں سے گزر رہا تھا اور اپنے غیظ و غضب کے اظہار کے لیے مزید یہاں تلاش کر رہا تھا۔ اس نے ایک افسر کو محض اس لیے جھڑپا دی کیونکہ اس نے اپنے عہدے کے نشان کو چکایا نہیں تھا اور دوسرے کو اس لیے ڈانٹ دیا کہ اس کی صفیں قدرے بے ترتیب تھیں۔ یوں چلتے چلاتے وہ تیسری کیمپی کے قریب پہنچ گیا۔

”یہ تم کھڑے کیسے ہو؟ یہ تمہاری ٹانگ کو کیوں ہوا؟ تمہاری ٹانگ!“ وہ کرب ناک آواز میں چلا رہا تھا۔ بھی اس کے اور دلو خوف کے، جس نے یٹا، وور کوٹ پہنا ہوا تھا، مابین پانچ آدمی حائل تھے۔

دلو خوف نے اپنی خمیدہ ٹانگ سیدھی کی۔ اس کی شفاف نیلی آنکھیں گستاخانہ انداز سے جنرل کے چہرے کو گھور رہی تھیں۔

”یہ یٹا کوٹ کیوں؟ اتار داسے!... سار جٹ، بھجرا، اس کا کوٹ بدل دو۔ یہ۔“ وہ اپنا جملہ ختم کرنے میں کامیاب نہ ہو سکا۔

”جنرل، حکام کی تعمیل کرنا میرا فرض ہے لیکن کوئی میری۔“

”یہاں جوانوں کے مابین کوئی گفتگو نہیں ہو سکتی! میں اس کی اجازت نہیں دے سکتا، بالکل نہیں!“

”کوئی میری تو بن کرے، یہ میں برداشت نہیں کر سکتا اور نہ کوئی مجھے مجبور کر سکتا ہے،“ دلو خوف نے بلند اور گونجدار آواز میں اپنی بات ختم کرتے ہوئے کہا۔

جنرل اور جوان کی آنکھیں چار ہوئیں۔ جنرل کی زبان لنگ ہوئی اور اس نے ٹیش میں آ کر، اپنا سکارف جھاس کی گردن کے گرد اچھی طرح کسا ہوا تھا، نیچے گھسیٹ لیا۔

”جناب، اپنا کوٹ تبدیل کر لیں، نوڈش ہوگی۔ میری آپ سے بھی درخواست ہے،“ اس نے یہ الفاظ

کہے اور وہاں سے چل دیے۔

2

”وہ آرہے ہیں!“ یحییٰ اسی لمحے ایک سنتری نے چلا کر کہا۔

رجنٹل کمانڈر کا چہرہ تھمتانے لگا وہ اپنے گھوڑے کی طرف بھاگا۔ کاپتے لرزتے ہاتھوں سے رکاب پکڑی، زمین پر چھلانگ لگائی، سیدھا ہوا، اپنی شمشیر پر ہاتھ ڈالا، چہرے پر عزم و مصمم اور مسرت و شادمانی کے تاثرات نقش کیے، اپنے منہ کا ایک کنارہ کھولا اور چلا کر حکم دینے کے لیے تیار ہو گیا۔ رجنٹ یوں پھڑپھڑا رہی تھی جیسے پرندہ چونچ سے پر سنوارتے انھیں پھڑپھڑاتا ہے۔ اس کے بعد کامل سکوت طاری ہو گیا۔

”ایٹن۔ ٹن۔“ جنرل روح کو لرزادینے والی آواز سے دباڑا۔ اس کی اس آواز سے یہ مترشح ہو رہا تھا کہ وہ خود بہت خوش ہے، اسے اپنی رجنٹل کے نظم و ضبط پر ناز ہے اور وہ تازہ وارد کی گئی انچیف کو ”جی آباں نوں“ کہہ رہا ہے۔

کشتارہ و بہائی سڑک پر، جس کے دونوں کناروں کے ساتھ ساتھ ٹھہرائے سایہ دار کھڑے تھے، وہاں ایک کبودی کالا شمسودار ہوئی۔ اس میں چھ گھوڑے جتے ہوئے تھے اور وہ خراماں خراماں چلی آ رہی تھی۔ اس کے سپرنگ تدرے کھڑکھڑا رہے تھے۔ کالا شمس کے عقب میں کمانڈر انچیف کے عملے کے ارکان اور کردشیاں³ ہاشموں پر مشتمل حفاظتی دستے کے جوان بھی گے آرہے تھے۔ گاڑی میں کوٹوزوف کے ساتھ جو آسٹروی جرنیل بیٹھا تھا، وہ سفید وردی میں، جو ردیوں کی سیاہ وردیوں کے مابین عجیب معصوم ہو رہی تھی، ملبوس تھا۔ جب گاڑی رجنٹل کے قریب پہنچی، وہ رک گئی۔ کوٹوزوف اور آسٹروی جرنیل آپس میں قریب باتیں کر رہے تھے۔ کوٹوزوف مسکرا رہا تھا۔ مسکراتے مسکراتے اس نے اپنا پاؤں پائیدان پر رکھا اور یوں بھاری بھر کم انداز سے اتر اچھے ان دو ہزار جوانوں کا، جو سانس روکے اسے اور رجنٹل کمانڈر کو بغور دیکھ رہے تھے، کوئی وجود ہی نہ ہو۔

حکم کے الفاظ کو سنے اور ایک بار پھر رجنٹل کی صفوں میں ہلچل سی پیدا ہو گئی۔ جوانوں نے ہتھیار بلند کیے کھنکھاتی آوازیں ابھریں اور سلامی دی گئی۔ اس کے بعد جو مرگ آسا سکوت طاری ہوا، اسے کمانڈر انچیف کی نجیف آواز نے توڑا۔

”ہزار ایکسی۔ سی۔ لین۔ سی۔ زندہ باد،“ رجنٹل نے فلک شکاف نعرہ بلند کیا۔ اس کے بعد پھر وہی سکوت چھا گیا۔

ابتداء میں جب رجنٹل سلامی پیش کرنے کے لیے متحرک تھی، کوٹوزوف ایک ہی جگہ بت بنا کھڑا رہا۔ پھر وہ سفید وردی میں ملبوس جرنیل اور اپنے عملے کے ارکان کے ساتھ صفوں کے مابین پیس چلنے لگا۔ جس انداز سے رجنٹل کمانڈر نے کوٹوزوف کو سیلوٹ کیا تھا (وہ یوں سیدھا تن کر کھڑا تھا جیسے وہ بالکل ہی

حکم کا غلام ہو اور اس کی نگاہیں مسلسل اپنے چیف کے چہرے پر مرکوز رہیں (اور جس انداز سے وہ جرنیلوں کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا) اس کے لیے اپنے ڈنگ گاتے قدموں پر قابو پانا مشکل ہو رہا تھا اور اس نے اپنا جسم کافی آگے جھکا رکھا تھا تاکہ وہ کم انڈر انچیف کا ایک ایک لفظ سن سکے اور اس کے معمولی سے معمولی اشارے پر وہ بیان رکھ سکے) اس سے صاف مترشح ہو رہا تھا کہ کم انڈنگ افسر کی حیثیت سے اپنے فرائض نبھاتے اسے وہ خوشی نہیں ہوتی ہوگی جتنی کہ ماتحت افسر کی حیثیت سے اپنی ذمہ داریاں پوری کرتے اسے ہو رہی تھی۔

یہ اس کا انڈر کی محنت شاقہ اور سخت نظم و ضبط کا صدقہ تھا کہ یہ رجسٹ ان ہائی رجمنٹوں کے مقابلے میں، جو اس کے ساتھ ساتھ براؤناؤ پکٹی تھیں، نسبتاً بہت بہتر حالت میں تھیں۔ جو لوگ بیمار ہو گئے تھے یا اپنی سست رفتاری کے سبب پیچھے رہ گئے تھے، ان کی تعداد صرف دو سو بنتی تھی۔ یونوں کے علاوہ ہر چیز ٹھیک ٹھاک تھی۔

کوئٹزوف صفوں کے مابین گھومنا پھرتا رہا۔ کبھی کبھار وہ رک جاتا اور افسروں اور بعض اوقات جوانوں سے بھی جنہیں وہ ترکوں کے خلاف ہم کے زمانے سے جانتا تھا، ہمدردی اور شفقت کے چند کلمات کہتا۔ جب اس کی نظر ان کے بوٹوں پر پڑتی، اسے بہت افسوس ہوتا اور وہ اپنی گردن جھٹکنے لگتا۔ پھر وہ کچھ اس انداز سے آسٹری جرنیل کی توجہ ان کی طرف مبذول کراتا جیسے وہ یہ کہنا چاہتا ہو: ”میں کسی کو الزام نہیں دیتا لیکن آپ خود اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ن بے چاروں کی حالت کتنی خستہ و خراب ہے!“ جتنی مرتبہ بھی یہ واقعہ پیش آیا، رجمنٹل کمانڈر لپک کر آتا کہ اس کی رجسٹ کے بارے میں کم انڈر انچیف کے منہ سے جو کچھ نکلے، کہیں وہ اس کا ایک لفظ بھی سننے سے محروم نہ رہ جائے اور یوں اس کی شامت آجائے۔

کوئٹزوف کے عقب میں اس کے عملے کے ارکان آرہے تھے۔ ان کی تعداد لگ بھگ بیس تھی۔ اس کے اور کوئٹزوف کے مابین اتنا معمولی فاصلہ تھا کہ بات خواہ کتنے ہی دھیمے لہجے میں کی جاتی، وہ اسے بخوبی سن سکتے تھے۔ یہ افسر آپس میں باتیں کر رہے تھے اور کبھی کبھی ان کی ہنسی بھی نکل جاتی تھی۔ کمانڈر انچیف کے نزدیک تریں لپک خوش شکل ایجوٹ تھا۔ یہ پرنس بلکونسکی تھا۔ اس کے برابر اس کا رفیق نیکس وٹسکی (Nesvitsky) تھا۔ دراز قد نیکس وٹسکی کا جسم نہایت قوی و خوب گٹھا ہوا تھا۔ اس کا خوش وضع اور ہنستا مسکراتا چہرہ طبعی نیک نیتی کا آئینہ دار تھا۔ اس کی آنکھیں دھلی دھلائی، صاف شفاف اور روشن روشن تھیں۔ نیکس وٹسکی کے لیے اپنی ہنسی پر قابو پانا مشکل ہو رہا تھا۔ اس کی اس ہنسی کا سبب ایک سانوا سلونا ہوزار افسر، جو اس کے دوڑ بدوڑ چلا آ رہا تھا، بنا تھا۔ یہ افسر اپنے چہرے پر سنجیدگی سجائے اور اپنی آنکھیں بغیر جھپکائے رجمنٹل کمانڈر کی پشت پر نگاہیں جمائے ہوئے تھا اور اس کی ایک ایک حرکت کی نقل اتار رہا تھا۔ ہر بار جب جرنیل چلا اور آگے جھکتا، ہوزار افسر بیٹھ چلا اور آگے جھک جاتا۔ نیکس وٹسکی نے جہاں جا رہا تھا اور دوسروں کو ٹھوکے دے رہا تھا کہ وہ بھی اس منخرے کی حرکات کو دیکھیں اور ان سے لطف اندوز ہوں۔

کوئٹزوف دھیرے دھیرے، ہولے ہولے، آگے ہی آگے بڑھتا چلا گیا۔ ہزاروں لوگ دیدے پھاڑے

کھڑے تھے تاکہ انھیں اپنے چیف کی ایک جھلک نظر آجائے۔ جب وہ تیسری کمپنی کے قریب پہنچا، وہ ایک دم رک گیا۔ اس کے عمے کے ارکان یہ اندازہ نہ لگا سکے کہ وہ یوں رک جائے گا، چنانچہ وہ بمشکل اس سے ٹکراتے ٹکراتے بچے۔ ”ارے، تموخن (Timokhin)“ اس نے سرخ ناک والے کیپٹن کو، جس کی نیلے کوٹ کی وجہ سے انھیں خاص ڈانٹ ڈپٹ ہوتی تھی، پہچانتے ہوئے کہا۔

جب رجمنٹل کمانڈر تموخن کو جھڑپا رہا تھا، کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ جس طرح وہ تن کر مودب کھڑا ہوا تھا، جھاڑ کے دوران میں کوئی اس سے زیادہ مودب تن کر کھڑا ہو سکتا ہے۔ لیکن اب جب کمانڈر انچیف اس سے مخاطب ہوا، تو کہنے کو تو وہ سیدھا تن کر کھڑا ہو گیا لیکن جلد ہی نظر آنے لگا کہ وہ زیادہ دیر تک اسی انداز میں کھڑا رہا، اس کا ذہن اسے زبردست تناؤ کا شکار ہو جائے گا کہ اس کے لیے برداشت کرنا مشکل ہو جائے گا اور اس کا بولورام ہو جائے گا۔ کوٹوزوف کو اس کی اس کیفیت کا اندازہ ہو گیا، اس نے اس کی خیر خیریت دریافت کی، ٹیک تمناؤں کا اظہار کیا اور تیزی سے آگے بڑھ گیا۔ اس کے پھولے پھولے چہرے پر، جسے ایک زخم کے نشان نے داغ دار بنا دیا تھا، چیف مسکراہٹ جو بمشکل نظر آتی تھی، نمودار ہو گئی۔

”ایک اور اسماعیلی کامریڈ“ اس نے کہا۔ ”جی دارا نسرے اتم اس سے مطمئن ہو؟“ اس نے رجمنٹل کمانڈر سے پوچھا۔

اور جرنیل، اس امر سے بالکل بے آگاہ، کہ ہوزار افسر جس طرح اس کی نقل اتار رہا تھا کہ اگر وہ آئینے میں اپنی شکل دیکھتا تو سے اپنے عکس اور افسر کے مابین بال برابر فرق نظر نہ آتا، تیزی سے آگے لپکا اور بولا

”بالکل، بالکل، یوڑیکسی لینس؟“

”ہم سب میں چھوٹی موٹی کمزوریاں ہوتی ہیں،“ کوٹوزوف نے مسکراتے اور اس سے پرے ہٹتے ہوئے کہا۔ ”یہ بس ذرا شراب کیاب کا رسیا ہے۔“

کمانڈنگ افسر کو اندیشہ لاحق ہوا کہ کہیں اس کا الزہم اس کے سر نہ دھردیا جائے، چنانچہ اس نے خاموش رہنا ہی بہتر سمجھا۔ عین اس وقت ہوزار افسر کی نگاہ سرخ ناک والے کیپٹن کے، جس نے اپنا پیٹ اندر کی جانب کھینچ رکھا تھا، چہرے پر پڑی۔ اس نے اس کے انداز اور چہرے ہرے کی تکی مکمل نقل اتاری کہ نیس وٹسکی کی خواہ مخواہ ہنسی نکل گئی۔ کوٹوزوف نے مڑ کر پیچھے دیکھا، ہوزار افسر نے کسی نہ کسی طرح اپنے اوپر قابو پا لیا، اس کی شکل پہلے تو قدرے مضحک ہو گئی اور جب کوٹوزوف کی نگاہ اس پر پڑی، تو وہ یوں نظر آنے لگا جیسے اس سے زیادہ معصوم، بے بیخودہ اور مودب آری کوئی اور ہو ہی نہیں سکتا۔

تیسری کمپنی سب سے آخر میں تھی۔ کوٹوزوف وہیں رک گیا۔ وہ کچھ یوں اپنے خیالات میں کھویا ہوا تھا جیسے کچھ یاد کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔ پرنس آندرے آگے بڑھا اور اس سے فرانسیسی میں سرگوشی کرنے لگا۔

”آپ نے مجھے ہدایت کی تھی کہ میں آپ کو افسر دلو خوف کے، جسے کیپٹن سے عام سپاہی بنا دیا گیا ہے،“

ہارے میں یاد دہانی کرا دوں؟“ اس نے کہا۔
 ”کہاں ہے یہ دلوفوف؟“

دولوفوف، جو بٹا اور کوٹ اتار کر عام سپاہی کا سرسئی اور کوٹ پہن چکا تھا، کب چوکنے والا تھا۔
 تناسب جسم، سنہری بالوں اور نیلی آنکھوں والے سپاہی نے بلائے جانے کا انتظار تک نہ کیا۔ وہ اپنی صف
 سے آگے نکل آیا، کمانڈر انچیف کی طرف قدم بڑھایا اور ہندوق اٹھا کر اسے سلامی دی۔
 ”کوئی شکایت؟“ کوٹوزوف نے بھوئیں سکیڑتے ہوئے پوچھا۔

”یہی دلوفوف ہے؟“ پرنس آندرے نے کہا۔

”مجھے امید ہے کہ تم نے سبق سیکھ لیا ہوگا۔ اپنے فرائض نبھاتے رہو۔ زار رحم دل ہیں۔ اور اگر تم نے استحقاق
 ثابت کر دکھایا، میں تمہیں نظر انداز نہیں کروں گا۔“

صف شفاف نیلی، آنکھیں اس، لیری اور جرأت سے کمانڈر انچیف کو دیکھنے لگیں جس سے انھوں نے
 رجمنٹل کمانڈر کوں کھا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ یہ نگاہیں روایت کے اس پردے کو، جس نے کمانڈر انچیف اور عام سپاہی
 کے مابین اتنا طویل فاصلہ طمان دیا تھا، تار تار کر دیں گی۔

”یوزاکیسی لینسی، میں ایک درخواست کوں گزار کرنا چاہتا ہوں،“ دولوفوف نے سوچے سمجھے انداز سے اپنی
 محکمہ ورکھکتی ہوئی آواز میں کہا۔ ”میری گزارش یہ ہے کہ مجھے اپنے قصور کی عافی کرنے اور ہر میسٹی اپرا طور اور
 روس کے ساتھ اپنی وفا شعاری جتانے کا موقع عنایت کیا جائے۔“

کوٹوزوف نے اپنا منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ وہی جگہ گاہٹ جو اس وقت اس کی آنکھوں میں نمودار ہو گئی تھی
 جب اس نے توخن کی طرف پشت کی تھی، دوبارہ نمودار آئی۔ پھر اس نے اپنی بھوئیں یوں سکیڑیں جیسے وہ یہ اعلان
 کر رہی ہیں کہ دولوفوف نے جو کچھ کہا ہے یا جو کچھ وہ کہہ سکتا ہے، اس کا اسے مدتوں سے علم ہے، وہ اس قسم کی باتوں
 سے شک آچکا ہے اور یہ وہ نہیں ہیں، جن کی ضرورت ہے۔

رجمنٹ مختلف کمپنیوں میں منقسم ہو گئی اور اپنے پڑاؤ کے نکلے مقام کی طرف، جو براؤناؤ سے زیادہ دور نہیں
 تھا، چل پڑی۔ انھیں امید تھی کہ وہاں انھیں جوتے اور وردیاں بھی مل جائیں گی اور جان لیوا سفر کے بعد پاؤں
 پیاسے کا موقع بھی میسر آ جائے گا۔

”پراخوراگنا تچ، تمہارے دل میں میرے خلاف کوئی بغض تو نہیں ہوگا؟“ گھوڑے پر سوار رجمنٹل
 کمانڈر نے تیسری کمپنی کے، جو اپنی جائے قیام کی طرف کوچ کر رہی تھی، برابر آتے ہوئے کیپٹن توخن سے، جو
 سب سے آگے آگے پیدل جا رہا تھا، کہا۔ اب جب کہ معائنہ کامیابی کے ساتھ اختتام پذیر ہو چکا تھا، رجمنٹل
 جاسے میں پھول نہ سارہا تھا، اس کی یہ بے پناہ مسرت اس کے روم روم سے پک رہی تھی کیونکہ کوشش کے باوجود وہ
 اسے چھپا نہیں سکا تھا۔ ”زار کی ملازمت میں، آپ کچھ نہیں کر سکتے... سلامی کے دوران میں بعض اوقات...“

آدمی کی طبیعت سمجھ جاتی ہے... سب سے پہلے میں تم سے معذرت خواہ ہوں، تم تو مجھے جانتے ہی ہو... بہت خوش گئے ہیں!“ اور اس نے اپنا ہاتھ کیپٹن کی طرف بڑھا دیا۔

”چھوڑیں جنرل، میں بھلا اتنی بڑی گستاخی کیسے کر سکتا ہوں؟“ کیپٹن نے جواب دیا۔ اس کی ناک پہلے سے بھی زیادہ سرخ ہو گئی اور وہ مسکرانے لگا۔ جب وہ مسکرایا اور اس کا منہ کھلا، تو یہ انکشاف ہوا کہ اس کے سامنے کے دانت عائب ہیں۔ اصل میں اس کے یہ دونوں دانت اسماعیل کے تھبے میں بندوق کا کٹا لگنے سے ٹوٹ گئے تھے۔

”اور تم دلوخوف کو بھی بتا سکتے ہو کہ میں اسے فراموش نہیں کروں گا، اسے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ لیکن یہ تو بتاؤ، میں اس کے بارے میں پوچھنا چاہ رہا تھا۔ اب اس کا رویہ ٹھیک ہے؟ عمومی طور پر کیا وہ...“

”یورز ایکسی لینسی، جہاں تک سرکاری امور کی انجام دہی کا تعلق ہے، وہ بے حد فرض شناس ہے، چھوٹی سے چھوٹی جزئیات کا پورا خیال رکھتا ہے۔ لیکن اس کا مزاج...“

”کیا ہوا اس کے مزاج کو؟“ رجنٹل کمانڈر نے پوچھا۔

”مختلف ایام میں اس کی کیفیت مختلف ہوتی ہے۔ گھڑی میں تو لہ گھڑی میں، شہ۔ ایک روز وہ چھٹی خاصی معاملہ نہیں، خرد مندی اور بھگت ہٹ کا مظاہرہ کرتا ہے لیکن اس سے اگلے روز بالکل جنگلی حیوان بن جاتا ہے۔ آپ یقین نہیں کریں گے لیکن یہ حقیقت ہے کہ اس نے پولینڈ میں ایک یہودی کو تقریباً ہلاک کر دیا تھا۔“

”خیر، خیر،“ رجنٹل کمانڈر نے کہا۔ ”پھر بھی اگر کوئی نو جوان کسی مصیبت میں پھنس جائے، اس پر ترس کیا جانا چاہیے۔ تمہیں معلوم ہے کہ اس کے بارہ سوخ نوگوں کے ساتھ تعلقات ہیں... چنانچہ تمہیں صرف...“

”جی، یورز ایکسی لینسی،“ آپ نے بجا فرمایا۔ تومخن نے مسکراتے ہوئے کہا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ کمانڈر کا مدعا سمجھ گیا ہے۔

”اے، ہاں۔“

رجنٹل کمانڈر نے عام سپاہیوں کے مابین دلوخوف کو ڈھونڈ نکالا۔ اس نے اس کے قریب پہنچ کر گھوڑے کی بائیں کھنچ لیں اور اس سے مخاطب ہو کر بولا۔

”پہلی جھڑپ کے بعد۔ عہدے کی پٹیاں۔“

دلوخوف نے نظریں اوپر اٹھائیں لیکن اس نے زبان بند رکھی۔ اس کے چہرے پر جو طرہ مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی، اس میں بھی کسی قسم کی تبدیلی رونما نہ ہوئی۔

”سب معاملہ ٹھیک ٹھاک بھگت گیا،“ رجنٹل کمانڈر نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”تمام جوانوں کے لیے دوڑ کا درکار ہوگی،“ اس نے خاصی بلند آواز میں کہا تا کہ سب ہی بھی اس کی بات سن سکیں۔ ”میں تم سب کا شکر یہ ادا کرتا ہوں! ہم سب خداوند کے شکر گزار ہیں!“ اور اس نے اپنا گھوڑا اگلی کمانی کی طرف بڑھا دیا۔

”بہت بھلا آدمی ہے۔ اس کی ماتحتی میں کام کرنا اتنا مشکل نہیں،“ تومخن نے اپنے ایک ماتحت افسر سے،

جو اس کی اردول میں سفر کر رہا تھا، کہا۔

”دوسرے الفاظ میں۔۔۔ پان کا بادشاہ!“ ماتحت افسر نے ہنستے ہوئے کہا۔ (یار لوگ رجنفل کی ٹرک کو پان کا بادشاہ کہتے تھے۔)

معائنے کے بعد افسروں کی خوشگوار ذہنی کیفیت کا اثر جوانوں میں بھی سرایت کر گیا۔ کہنیاں ہشاش بشاش منزل کی طرف گامزن تھیں۔ مختلف سپاہی آپس میں حویاتیں کر رہے تھے، ان کی گونج چاروں اطراف سنائی دے رہی تھی۔

”کچھ سنا کہ کو تو زلف کا ماہ ہے؟“

”بالکل درست ہے کا نا ہی نہیں، پورا اندھا ہے۔“

”نہیں بھائی، اس کی مینائی تمھاری مینائی سے زیادہ تیز ہے۔ بوٹ، ٹانگوں کی پٹیاں⁵ سالے کی نظروں سے کچھ بھی نہیں بچا۔“

”یار، جب اس نے میرے پاؤں کی طرف دیکھا۔ میرے جی میں آیا۔“

”اور اس کے ساتھ جو آسٹروی آیا تھا، سالا، یوں دکھائی دیوے تھے جیسے کسی نے اس کے بدن پر چاک رگڑ دیا ہو۔ بالکل آٹے کی طرح چٹا تھا! میں شرط لگانا ہوں کہ جیسے ہم اپنی بندوقیں چمکا دے ہیں، وہ رگڑ رگڑ کر اپنے بدن چمکا دے۔“

”بھئی فیڈیشو! اس نے یہ نہیں بتایا کہ جنگ کب شروع ہو دے ہے؟ سنا ہے کہ یوانا پارت آپے برو نو وریج کیا ہے۔“

”یوانا پارت؟ اس کوڑھ مغز کی بھی سنو، اس پیارے کو کچھ پتا ہی نہیں؟ پرشیا والوں نے ہتھیار اٹھا لیے ہیں اور آسٹریا والے لٹھ لیے ان کے پیچھے پھر رہے ہیں۔ جب وہ ن کی ٹھکانی کر لیں گے، یوانا پارت کے ساتھ جنگ شروع ہو جائے گی۔۔۔ اور یہ کہ ہے کہ یوانا پارت برو نو وریج میں ہے۔ اسی سے پتا چل جا دے ہے کہ سالے کا بھیجا خان ہو دے، تمھارا بھلا اسی میں ہو دے کہ پنے کان کھول کر رکھا کرو!“

”یہ کو ارٹرما سٹرنر⁶ے گاؤ دی ہیں! ان کی کرنیاں دیکھو، پانچویں کمپنی گاؤں میں پہنچ بھی گئی ہے۔ جب تک ہم وہاں پہنچیں گے، وہ اپنا کھانا دانا پکا بھی چکے ہوں گے۔“

”تکتے کے پلے، ہمیں کوئی رس وں ہی کھلا دو۔“

”تم نے کل مجھے تمباکو دیا تھا؟ بالکل نہیں، خیر، برچشم قلندر۔ ہم تمھاری طرح تھڑ دے تھوڑے ہیں، یہ لورا اور سوچ کر!“

”یہ ہمیں رہیں رکھنے کا حکم کیوں نہیں دیتے؟ خالی پیٹ ابھی چار میل اور چلنا ہوگا۔“

”خاطر تو جرموں نے ہاری کی کہ ہمیں اپنی گاڑیوں میں اٹھالائے۔ کیا آرام سے سفر کٹا!۔۔۔ مزا آ گیا!“

”یار، یہاں کے لوگوں میں عقل و قل نہیں۔ ادھر پیچھے سرے پولستانی سلوم ہو دیں تھے لیکن تھے تو روسی

تاج کے ماتحت۔ یہاں تو، بھی، جرمن ہی جرمن نظر آویں ہیں۔“
 ”گوئے، آگے آجائیں،“ کیپٹن کا حکم سنائی دیا۔

اور مختلف صفوں سے کوئی بیس اشخاص بھاگتے دوڑتے آگے آگئے۔ اس کا لیڈر ایک نقارچی تھا۔ اس نے گویوں کے سامنے اپنا بازو لہرایا، اور ایک طویل عسکری گیت شروع ہو گیا۔ اس کا ابتدائی بول تھا: ”صبح طلوع ہوئی اور سورج بلند ہونے لگا،“ اور اس کے اختتامی الفاظ یہ تھے: ”دوستو فادر کامینسکی (Kamensky) کے ساتھ ساتھ شان و شکوہ کی منزل کی طرف قدم بڑھاتے چلو۔“ اس گیت کے الفاظ اور دھنیں ترکی کے خلاف جنگ کے دوران میں ترتیب دی گئی تھیں۔ اب جب کہ یہ گیت آسٹریا میں گایا جا رہا تھا، ”قادر کامینسکی“ کو ”قادر کوتاروف“ میں تبدیل کر دیا گیا۔

آخری الفاظ عسکری انداز میں گج بجا کر ادا کرتے اور فضا میں اپنا بازو یوں لہراتے جیسے وہ کوئی چیز اٹھا کر نیچے پلک رہا ہو، نقارچی نے، جس کا بدن چھریا، چہرہ خوش شکل اور عمر چالیس ساں تھی، اپنی آنکھیں سکیڑا اور کڑی نگاہوں سے اپنے گویوں کا جائزہ لیا۔ جب اسے اطمینان ہو گیا کہ ان سب کی نظریں خود اس پر جمی ہوئی ہیں، اس نے یوں اپنے بازو بلند کیے جیسے وہ کسی تاریدہ لیکن بیش بہا چیز کو نہایت احتیاط سے اپنے سر کے اوپر اٹھا رہا ہو۔ وہ اپنے بازو کوئی سینکڑن فضا میں تھا سے رہا اور پھر آندھی کی طرح انھیں نیچے پلک دیا۔
 ”اف، کاشا، من، کاشا، من۔۔۔“ اس نے بتا دی۔

اور بیس آوازیں ٹیپ کا مصرعہ دہرانے لگیں۔ اور وہ شخص جو چوبی آلات بجا رہا تھا، اپنے آلات کے بوجھ کے باوجود کمپنی کے ردِ داپے کندھے جھٹکاتا اور پھرتی سے کلیں بھرتا کھی آگے نکل آتا اور کبھی لپک کر پیچھے ہٹ جاتا۔ وہ اپنے آلات یوں کھٹکھٹا رہا تھا جیسے کسی کو دھمکا رہا ہو۔ سپاہی موسیقی کی لے کے ساتھ اپنے بازو لہراتے آگے بڑھنے لگے۔ ان کے قدم آپ ہی آپ بان کے ساتھ تھرک رہے تھے۔ کمپنی کے عقب میں پیہوں کی گڑگڑاہٹ، پیہرگوں کی جیرجیراہٹ اور گھوڑوں کے سموں کی رپ رپ سنائی دے رہی تھی۔ کوتوزوف اور اس کے حملے کے ارکان واپس شہر جا رہے تھے۔ کمانڈر نیچیف نے ہاتھ کے اشارے سے یہ حند پیدا کیا کہ جوان تسلی اور اطمینان سے اپنا سفر جاری رکھیں جب کہ وہ خود اور اس کے حالی موالی یوں شکلیں بنا رہے تھے جیسے وہ گانے بجانے کی آوازوں، سپاہیوں کی انجیل کو اور خوش باش اور تھرکیے جوانوں کے انداز سفر سے بہت محفوظ ہو رہے ہوں۔ مہنے کی دوسری صف میں، جدھر سے کوتوزوف کی گاڑی گزر رہی تھی، نمایاں ترین شخص، نیلی آنکھوں والا سپاہی رلوخوف تھا۔ وہ نہایت نفاست اور فریٹ سے، پنا جسم لہرا رہا تھا اور تھرکتے میں موسیقی کا پورا پورا ساتھ دے رہا تھا۔ وہ کوتوزوف اور اس کے ہمراہیوں کو یوں دیکھ رہا تھا جیسے ان پر ترس کھا رہا ہو کہ وہ ایسے سے کمپنی کے ساتھ سفر کرنے کی سعادت سے محروم ہو رہے ہیں۔ کوتوزوف کے حملے میں شامل جس ہوراریفٹینٹ نے شخص کمانڈر کی نقلیں تھاری تھیں، وہ پیچھے رہ گیا اور اپنا گھوڑا بھگا تا دلوخوف کے پاس پہنچا۔

ہو رہے تھے زورکوف (Zherkov) کسی زمانے میں پیٹرز برگ کے ان شوریدہ سروں کے گردہ میں شامل تھا جس کا سر غنہ دلوفوف تھا۔ جب اس نے دیار غیر میں دلوفوف کو جس کی حیثیت اب عام سپاہی کی تھی، دیکھا، اس نے اس سے مٹا مناسب نہ سمجھا لیکن اب جب کہ کو تو زورف دلوفوف سے ہم کلام ہو چکا تھا، اس نے مطعون سر کو پرانے دوستوں کے بے تکلفہ مذاکرے سے مخاطب کیا۔

”یار، کیسے ہو؟“ اس نے اپنا گھوڑا کھینچنے کے عین برابر کر گانے بجانے کے شور میں سوال کیا۔

”میں کیسے ہوں؟“ دلوفوف نے سرد مہری سے جواب دیا، ”جیسا تمہیں نظر آ رہا ہوں۔“

زورکوف نے کھلے ڈھلے اور بے تکلف سچے سے سواں کیا تھا۔ دلوفوف نے اس کا عدا سرد مہری سے جواب دیا تھا لیکن مسیقی کی جوشیلے نے اس سوال و جواب کو خام لطف بخش دیا۔

”اور تمہاری اپنے افسروں کے ساتھ کیسے بھر رہی ہے؟“

”بالکل ٹھیک۔ وہ بھلے لوگ ہیں۔ تم نے کمانڈر انچیف کے سٹاف میں شامل ہونے کے لیے کون سا چور دروازہ ڈھونڈ لیا؟“

”مجھے شامل کیا گیا تھا۔ میں اس وقت ڈیوٹی پر ہوں۔“

دونوں چپ ہو گئے۔

”وہ جو تھی اس نے اپنی دائیں کلائی اوپر ٹھکی اور شاہیں فضا میں اچھال دیا۔“ گیت چل رہا تھا۔ ان الفاظ نے بے ساختہ جوانوں کی رو جس گرمادیں اور ان کے اندر نیر و لولہ بیدار کر دیا۔ اگر گیت اثر انگیز کیفیت کا حامل نہ ہوتا، ان کی گفتگو شاید مختلف ہوتی۔

”یہ سچ ہے کہ آسٹریائی شکست کھا گئے ہیں؟“ دلوفوف نے پوچھا۔

”سننے میں تو یہی آیا ہے لیکن حقیقت کیا ہے، خدا ہی جانے!“

”میں خوش ہوں،“ گیت کے تقاضے کے مطابق دلوفوف نے غیر مبہم اور پھر تیلے انداز سے جواب دیا۔

”کسی روز شام کو آؤ، تاش کی بازی ہو جائے گی۔ کیا خیال ہے؟“

”کیوں؟... قاتلو پیسے آگئے ہیں؟“

”ضرور آتا۔“

”میں نہیں آ سکتا۔ میں قسم کھا چکا ہوں کہ جب تک ترقی نہیں مل جاتی، جوئے اور شراب کے قریب بھی نہیں پھکوں گا۔“

”لیکن یہاں میں سر کے سے پہلے نہیں ہوگی۔“

”نہ کھا جائے گا۔“

وا ایک بار پھر خاموش ہو گئے۔

”خیر، اگر کسی چیز کی ضرورت ہو، آ جانا۔ آدمی اگر شاف میں شامل ہو تو کچھ نہ کچھ کام آ ہی سکتا ہے۔“
دلو خوف کی ہنسی نکل گئی۔

”تم کیوں پریشان ہوتے ہو۔ اگر مجھے کسی چیز کی ضرورت محسوس ہوئی، میں مانگوں گا نہیں، ساٹھا کر لے آؤں گا۔“

”اف، خیر، میں صرف یہی۔“

”اور میں صرف یہی۔“

”خدا حافظ۔“

”نیک تمنائیں۔“

”اور اوپر بلند قضا میں اور دور، بہت دور

سرزمین وطن کی جانب...“

ڈرکوف نے گھوڑے کو ہمیز لگایا۔ گھوڑا جوش میں آ گیا اور پھیل کود کرنے لگا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کون سا قدم پہلے بڑھائے۔ پھر وہ سر پٹ بھاگتا کچینی سے آگے نکل گیا اور گاڑی کے ساتھ جا ملا۔ دوڑتے میں اس کے قدم آپ ہی آپ موہنتی کا ساتھ دے رہے تھے۔

3

محائے سے واپسی کے بعد کو تو زوف آسٹروی جرنیل کو اپنے پرائیویٹ کمرے میں لے گیا۔ اس نے اپنے ایجنٹ کو بلایا اور اسے حکم دیا کہ وہ وہ کاغذات، جن پر نوآمد دستوں کی خستہ حالی کے کوائف درج ہیں اور وہ خطوط، جو ہر اول افواج کے کمانڈر آرچ ڈیوک فرڈی نینڈ کی جانب سے موصول ہوئے ہیں، لے آئے۔ پرنس بلکونسکی مطلوب کاغذات سمیت حاضر ہو گیا۔ کو تو زوف اور جنگی کونسل کا آسٹروی رکن میز کے سامنے بیٹھے تھے۔ میز پر ایک منصوبہ بچھا ہوا تھا۔

”آھاہ!..“ کو تو زوف نے نگاہیں اوپر اٹھاتے اور جو کچھ وہ کہہ رہا تھا، اسے فرانسیسی میں بیان کرتے ہوئے کچھ اس انداز سے یہ انداز یہ لفظ ادا کیا جیسے اس کے ذریعے اس نے اپنے ایجنٹ کو وہیں ٹھہرنے کی دعوت دی ہو۔ ”جنرل، مجھے صرف ایک بات عرض کرنا ہے،“ کو تو زوف نے کہا۔ اس کی ادائیگی ورلجے کے تارچہ ماڈ میں کچھ ایسی پر لطف مشکلی اور نفاست تھی کہ سامع مجبور ہو جاتا تھا کہ وہ اس کے ایک ایک لفظ کو، جو خوب سوچ سمجھ کر ادا کیا جاتا تھا، پوری توجہ اور دھیان سے سنے۔ بظاہر وہ خود بھی اپنی آواز سن کر مسحور ہو جاتا تھا۔ ”مجھے صرف ایک

بات عرض کرتا ہے اور وہ بات یہ ہے کہ اگر معاملے کا انحصار میری ذاتی خواہشات پر ہوتا، تو ہر میسجی اپنی طور فرانس (Franz) (حکمران آسٹریا) کی آرزو کبھی کی پوری ہو چکی ہوتی۔ میں بہت پہلے آرچ ڈیوک کے ساتھ جا رہا ہوتا اور آپ میری بات پر اعتبار کریں کیونکہ میں یہ اپنی عزت کی قسم کھا کر کہہ رہا ہوں کہ ذاتی طور پر مجھے بہت خوشی ہوتی کہ فوج کی اہلی کمان، ایک ایسے جنرل کے حوالے کر دی جاتی۔ اور آسٹریا میں ایسے اشخاص بکثرت موجود ہیں۔ جو مجھ سے زیادہ باخبر، درز یا درہ چابک دست ہوتا اور یوں میں ان بھاری ذمے داریوں کے بوجھ سے آزاد ہو جاتا، لیکن جنرل، کیا کیا جائے، حالات بعض اوقات، اتنی تاریک صورت اختیار کر لیتے ہیں کہ وہ ہمارے بس میں نہیں رہتے۔“

دروٹوزوف یوں مسکرایا جیسے وہ یہ کہہ رہا ہو: ”آپ کو پورا اختیار حاصل ہے کہ آپ بے شک میری بات کا اعتبار نہ کریں اور آپ میری بات کا اعتبار کرتے ہیں یا نہیں، مجھے اس کی مطلق پروا نہیں ہے۔ لیکن تمہارے پاس مجھے بتانے کی معمولی سی وجہ بھی نہیں۔ اور سارا نکتہ بس یہی ہے۔“

معلوم ہوتا تھا کہ آسٹریائی جنرل مطمئن نہیں ہو سکا۔ لیکن اس کے پاس دروٹوزوف کو ترکی بہ ترکی جواب دینے کے سامان اور کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔

”اس کے برعکس،“ اس نے ایسے چڑچڑے اور غصیلے لہجے میں جواب دیا کہ اس کے الفاظ میں جس طرح کی چالپوسی پائی جاتی تھی، یہ لہجہ اس کی تردید کر رہا تھا۔ ”اس کے برعکس مشترکہ کارروائی کے ضمن میں یورپ کی کسی لینسی نے جو حصہ لیا ہے، ہر میسجی اس کی بے پناہ قدر کرتے ہیں۔ لیکن ہمیں یہ یقین ہے کہ روسی افواج اور ان کے کمانڈر انچیف جنگوں میں جس قسم کی کامیابیوں کا سہرا اپنے سر باندھنے کے عادی ہو چکے ہیں، موجودہ تاخیر انہیں اس سے محروم کر رہی ہے۔“ اس نے اپنی بات کی تان ایک ایسے جملے پر توڑی جو صاف معلوم ہوتا تھا کہ پہلے سے سوچا ہوا ہے۔

دروٹوزوف نے اپنا سر خم کر دیا لیکن اس کی سکرابٹ میں کوئی فرق نہ آیا۔

”لیکن مجھے اتنا پختہ یقین ہے،“ اس نے کہا۔ ”اور ہر ہائی انس آرچ ڈیوک فرڈی نینڈ نے میری جس تازہ ترین نقطہ سے عزت افزائی کی ہے، اس کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد مجھے یہ فرض کرنا ہی پڑتا ہے کہ جنرل میک جیسے سینے اور قابل کمانڈر کی سرکردگی میں آسٹریائی فوج نے فیصلہ کن فتح حاصل کر لی ہوگی اور اب انہیں ہماری امداد کی تلخ کوئی ضرورت نہیں ہوگی۔“

جنرل کی تیوریاں چٹھ گئیں۔ اگرچہ آسٹریائی شکست کے متعلق کوئی واضح خبر نہیں آئی تھی لیکن واقعی شہادتیں تو زیادہ تھیں کہ ناموافق افواہوں کی، جو دھڑلہ مزل پھیل رہی تھیں، خواہ مخواہ تصدیق ہو جاتی تھی۔ چنانچہ دروٹوزوف نے آسٹریائی فتح کا جو مفروضہ قائم کیا تھا، اس کی حیثیت طنز سے زیادہ نہیں رہ جاتی تھی۔ لیکن دروٹوزوف بڑے سکون اور خوش اخلاقی سے مسکراتا رہا۔ اس کے چہرے مہرے سے اس امر کا عندیہ مل رہا تھا کہ اسے یہ مفروضہ گھڑنے کا حق حاصل ہے اور حقیقتاً اسے جنرل میک کی جانب سے جو آخری عہد موصول ہوا تھا، اس میں واقعی فتح کا ثرہ سنایا گیا تھا اور یہ بتایا گیا تھا کہ حرب و ضرب کے قواعد کے مطابق اس کی فوج غنیمت کی فوج کے مقابلے میں بہتر پوزیشن میں ہے۔

”مجھے وہ خط دکھانا“ کوٹوزوف نے پرنس آندرے سے مخاطب ہو کر کہا۔ ”ذرا مہربانی فرمائیں اور توجہ سے سنیں۔“ کوٹوزوف کے دامن کے کناروں پر طنز مسکراہٹ نمودار ہو رہی تھی۔ وہ آرج ڈیوک فرڈی نیتز کے مراسلے سے آشروی جنرل کے سامنے جرمن زبان میں مندرجہ ذیل عبارت پڑھنے لگا۔

ہم نے ستر ہزار افراد پر مشتمل سپاہ مجتمع کر لی ہے تاکہ کرغیم دریائے سیح عبور کرنے کی کوشش کرے، تو اس پر حملہ کیا جائے اور اسے شکست سے دوچار کیا جاسکے۔ چونکہ ہم قصبہ الم پر پہلے ہی قابض ہو چکے ہیں، اس لیے دریائے ڈینیوب کے دونوں کناروں پر تسلط حاصل ہونے کی وجہ سے ہمیں جو فائدہ دستیاب تھا، اسے برقرار رکھنے میں اب ہمیں ناکامی کا منہ نہیں دیکھنا پڑے گا۔ چنانچہ اگر دشمن نے دریائے سیح کو عبور نہ کیا، پھر ہم قوت اس کے رسد و رساں کے سلسلے کو اپنے حملے کی رو میں لے سکیں گے، زیریں جانب دریائے ڈینیوب دوبارہ عبور کریں گے، کرغیم نے ہمارے دفاعی اتحادی کے خلاف اپنی پوری فوج جھونکنے کا فیصلہ کیا، تو اس کے عزائم پر پانی پھیر دیں گے۔ چنانچہ ہم اعتماد و یقین کے ساتھ اس وقت کا انتظار کریں گے جب روس کی شاہی فوج پوری طرح کیل کانٹے سے لیس ہو جائے گی۔ پھر ہمیں مشترکہ طور پر یہ گڑھا کھودنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئے گی جس میں ہم کرغیم کو دھکیل سکیں گے کیونکہ وہ اسی کا مستحق ہے۔

جب کوٹوزوف اس عبارت کا آخری جملہ پڑھ چکا، اس نے گہری اور لمبی سانس لی اور جنگی کونسل کے رکن کو توجہ اور بے نگاہ لطف و کرم دیکھنے لگا۔

”لیکن، ہیڈ ایکسی لینسی، آپ اس دانا مقولے سے اچھی طرح آگاہ ہیں جو ہمیں تلقین کرتا ہے کہ ہمیں بدترین صورت حال کے لیے تیار رہنا چاہیے“ آشروی جنرل نے کہا۔ نظر بظاہر اس کی یہی خواہش تھی کہ انہی مذاق سے احتراز کیا جائے اور بحیدگی سے کام کی بات کی جائے۔ وہ آرزو اور پرہیز نظر وں سے ایجوٹ کو دیکھنے لگا۔

”جنرل، معذرت چاہتا ہوں،“ کوٹوزوف نے مداخلت کرتے اور پرنس آندرے کی جانب توجہ مبذول کرتے ہوئے کہا۔ ”برخوردار، ذرا پک کر جاذ اور کز لودسکی (Kozlovsky) سے، وہ تمام اطلاعات، جو ہمارے تجربوں سے موصوع ہوئی ہیں، لے آؤ۔ یہ دو مراسلے کاؤٹ نوسٹیتس (Nostitz) کے ہیں اور یہ خط آرج ڈیوک فرڈی نیتز کا ہے۔ انہیں اٹھاؤ اور یہ بھی“ اس نے متعدد کاغذات اسے چھاتے ہوئے کہا۔ ”ان سب کی مدد سے فراہمی میں مختصر لیکن جامع مضمون تیار کر دو۔ آشروی فوج کی حرکات و سکنات کے بارے میں ہمیں جتنی معلومات حاصل ہوئی ہیں، اس میں ان سب کا احاطہ ہو جانا چاہیے۔ جب یہ مکمل ہو جائے، اسے ہیڈ ایکسی لینسی کے حوالے کر دینا۔“

پرنس آندرے نے اپنا سر کچھ اس طرح خم کیا جیسے وہ بیٹا شردینا چاہتا ہو کہ شروع سے آخر تک جو کچھ وہاں کہا گیا تھا، وہ نہ صرف اسے سمجھ چکا ہے بلکہ اسے یہ عندیہ بھی مل چکا ہے کہ کوٹوزوف اسے کیا بتانا چاہتا ہے۔ اس نے کاغذات سمیٹے، ایک بی مار جھک کر دونوں جرنیلوں کو سلام کیا اور خاموشی سے قالین کے فرش پر چلتا باہر انتظار گاہ میں چل گیا۔

اگرچہ پرنس آندرے کو دس چھوڑے زیادہ مدت نہیں گزری تھی، لیکن اتنے عرصے ہی کے دوران میں اس میں معتد بہ تبدیلیاں رونما ہو چکی تھیں۔ اس کے چہرے کی کیفیات، آنکھوں اور ہاتھوں کی حرکات و سکنات، چال وصال، غرضیکہ اس کی کوئی چیز ایسی نہیں تھی جس میں اس کے سابقہ دکھاوے، تصنع، سہل انگاری یا آرام طلبی کا شائبہ تک نظر آتا ہو۔ اب وہ شکل و صورت سے ایسا شخص نظر آتا تھا جس کے پاس یہ سوچنے کی فرصت نہیں تھی کہ وہ دوسروں کو کس طرح اور کس حد تک متاثر کر رہا ہے۔ وہ ہر وقت اپنے کام سے، جو اسے دلچسپ اور خوشگوار معلوم ہوتا تھا، کام رکھتا تھا۔ اس کے چہرے بشرے سے یہ واضح ہوتا تھا کہ وہ جن لوگوں کے بیچ میں ہے، ان سے اور اپنے آپ سے بے حد مطمئن ہے۔ اس کی مسکراہٹ روشن تر اور دلکش تر اور اس کی نظروں کو آواز تر ہوتی جا رہی تھی۔

کوٹوزوف نے، جس کے ساتھ وہ پولینڈ میں آکر ملا تھا، اسے گرم جوشی سے خوش آمدید کہا تھا اور اس سے وعدہ کیا تھا کہ وہ اسے طاق قسیاں کی رحمت نہیں بنائے گا۔ وہ اسے دوسرے بیخونوں پر ترجیح دیتا تھا، اسے اپنے ساتھ دیا نالے گیا تھا اور انتہائی اہم امور اس کے سپرد کرتا تھا۔ دیا نالے کوٹوزوف نے اپنے سابق رفیق اور پرنس آندرے کے والد کے نام ایک خط میں تحریر کیا تھا:

آپ کے صاحب زادے نے اپنی قابلیت، محنت شاقہ اور مضبوطی کردار کے ذریعے یہ ثابت کر دکھایا ہے کہ ہونہار بروے کے چکنے چکنے پات۔ وہ لازماً زبردست ترقی کرے گا اور ستار افسر بنے گا۔ یہ میری خوش نصیبی ہے کہ مجھے ایسا ماتحت ملا ہے۔

کوٹوزوف کے شاف فسروں اور فوج میں بالعموم پرنس آندرے کو، جیسا کہ پیئرز برگ کے اعلیٰ حلقوں میں اس کے ساتھ ہوا تھا، دو مختلف اور متضاد قسم کی شہرتیں حاصل ہوئی تھیں۔ بعض افسران، اور یہ لوگ اقلیت میں تھے، اسے اپنے آپ سے اور ہر دوسرے شخص سے مختلف سمجھتے تھے، انہیں توقع تھی کہ وہ کارہائے نمایاں سرانجام دے گا۔ وہ اس کی بات توجہ سے سنتے تھے، اس کی تمسین کرتے تھے اور اس کے نقش قدم پر چلتے تھے۔ ان کے ساتھ اس کا رویہ فطری اور خوش گوار ہوتا تھا۔ جہاں تک اکثریت کا تعلق ہے، وہ اسے ناپسند کرتی تھی، اسے سرد مہر، منکب اور بد مزاج تصور کرتی تھی۔ لیکن ان لوگوں کے مابین پرنس آندرے ایک ایسی بارع شخصیت کا روپ دھار لیتا تھا کہ وہ اس کا احترام بھی کرتے تھے اور اس سے خوف بھی کھاتے تھے۔

کاغذات ہاتھ میں تھامے جب پرنس آندرے انتظار گاہ میں داخل ہوا، وہ سیدھا زیوٹی افسر اور اپنے منسلک کارکن لوڈسکی کے، جو کتاب پکڑے درتپے کے قریب بیٹھا تھا، پاس پہنچا۔

”پرنس، کیا بات ہے؟“

”مجھے ایک محضر نامہ تیار کرنے کا حکم ملا ہے۔ اس میں وہ وجوہات، جن کے پیش نظر ہم پیش قدمی نہیں کر رہے، گنوائی جانا ہیں۔“

”اور ہم یہ پیش قدمی کیوں نہیں کر رہے؟“

پرنس آندرے نے اپنے کندھے اچکا دیے۔

”میک کی کوئی خبر؟“ کز لوڈسکی نے پوچھا۔

”کوئی نہیں۔“

”اگر یہ سچ ہے کہ وہ شکست کھا گیا ہے، ہمیں اس کی اطلاع مل جانا چاہیے تھی۔“

”عالمیاب“ پرنس آندرے نے باہری دروازے کی جانب جاتے ہوئے کہا۔

عین اس وقت ایک بلند قامت آشردی جرنیل، اپنے سر کے گرد سیاہ رومال باندھے، بدن پر اور کوٹ پہنے اور اور کوٹ پر آرڈر آف ماریاٹریسا (تمنہ) سجائے، تیز تیر چلتا کمرے میں داخل ہوا اور اس نے اپنے پیچھے کھناک سے دروازہ بند کر دیا۔ پرنس آندرے چلتے چلتے رک گیا۔

”کمانڈر انچیف کو تو زوف ہیں؟“ جرنیل نے بہ بھلت کر سخت جرمن لہجے میں دریافت کیا۔ اس نے ادھر ادھر نظر دوڑائی اور رے کے بغیر سیدھا کو تو زوف کے پرائیویٹ کمرے کی طرف بڑھنے لگا۔

”جناب کمانڈر انچیف مصروف ہیں،“ کز لوڈسکی نے تیزی سے نامعلوم جرنیل کی طرف لپکتے اور اس کا راستہ روکتے ہوئے کہا۔ ”میں انھیں کیا بتاؤں کہ کون صاحب تشریف لائے ہیں؟“

جرنیل کا چہرہ مکر ہو گیا اور اس کے ہونٹ پھڑکنے اور کپکانے لگے۔ اس نے نوٹ بک نکالی، جلدی سے اس پر پنسل سے گھسیٹ کر کچھ لکھا، ورق پھاڑا، اسے کز لوڈسکی کے حوالے کیا اور خود تیزی سے درتپے کی طرف بڑھ گیا۔ وہاں وہ بے اختیار کرسی پر گر پڑا اور افسران کو یوں دیکھنے لگا جیسے بزبان حال پکار رہا ہو ”تم لوگ مجھے یوں گھور گھور کر کیوں دیکھ رہے ہو؟“ پھر اس نے اپنا سراو پراٹھا یا، گردن آگے بڑھائی کو یا کہ وہ کچھ کہنا چاہتا ہوا اور فوراً ہی بناوٹی بے نیازی کے ساتھ زپر لب کچھ گنگنا نے لگا۔ اس کے منہ سے کچھ عجیب و غریب آواز برآمد ہوئی لیکن دیکھتے ہی دیکھتے بند ہو گئی۔

پرائیویٹ کمرے کا دروازہ کھلا اور دہلیز پر کو تو زوف کی شکل نمودار ہوئی۔ سر کے گرد پٹی پیٹے جرنیل یوں کو تو زوف کی جانب لپکا جیسے وہ کسی خطرے سے بھاگ رہا ہو۔ اس کا جسم آگے جھکا ہوا تھا اور اس کی دلی بلی ٹانگیں تیز اور لمبے لمبے ڈگ بھرتی جا رہی تھیں۔

”آپ اپنے سامنے بد قسمت میک کو دیکھ رہے ہیں،“ وہ فرانسیسی میں بولا اور اس کا گلہ منہ بھر گیا۔
کوٹوزوف ایک لمحے کے لیے دروازے میں بت بنا کھڑا رہا۔ اس کا چہرہ بالکل سپاٹ تھا۔ پھر وہاں لہروں
کی طرح بل پڑنے لگے لیکن اس کی پیشانی صاف اور ہموار تھی۔ اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں، احتراماً اپنا سر جھکا
دیا اور ایک لفظ کہے بغیر میک کو پہلے کمرے کے اندر جانے دیا اور دروازہ خود بند کرنے لگا۔

الم کے مقام پر آسٹریویوں کے شکست کھانے اور ان کی ساری فوج کے ہتھیار ڈالنے کے بارے میں جو
افواہ گردش کر رہی تھی، وہ صحیح ثابت ہوئی۔ آدھ گھنٹے کے اندر اندر ایجوٹوں کو ان احکام کے ساتھ مختلف سمتوں میں
 روانہ کر دیا گیا کہ روسی فوجوں کو، جواب تک ہاتھ میں ہاتھ دھڑے بیٹھی تھیں، منقریب غنیم کا سامنا کرنا ہوگا۔

پرس آندرے ان محدودے چند شاف افسروں میں شامل تھا جن کی زیادہ تر دلچسپی کا محور جنگ کی عمومی رفتار
تھی۔ جب اس نے میک کو دیکھا اور اسے اس کی شکست فاش کی تفصیلات معلوم ہوئیں، اسے احساس ہو کہ وہ آدھی
جنگ ہار چکے ہیں۔ روسی فوج جن مشکلات میں گھر گئی تھی، ان کا اسے پورا اندازہ ہو چکا تھا۔ اس فوج نے جن مصائب
کا سامنا کرنا تھا اور خود اسے اس ضمن میں جو کردار ادا کرنا تھا، اس کا پورا نقشہ واضح طور پر اس کے ذہن میں گھوم گیا۔
شکیر سٹروویوں کو جو شرم ناک ہزیمت اٹھانا پڑی تھی، اس پر اسے اپنی رگ رگ میں خوشی کی ہر دوڑتے محسوس ہوئی۔
اسے سرت اس بات پر ہو رہی تھی کہ سواروف کے زمانے کے بعد پہلی مرتبہ روسی فوجیں فرانسیسیوں کے خلاف صف آرا
ہو رہی تھیں اور خود اسے بھی اس معرکے میں شریک ہونے کا موقع مل رہا تھا۔ یہ وقوعہ شاید ایک ہفتے کے اندر اندر ظہور پذیر
ہو جائے۔ اگرچہ اسے یہ اندیشہ تھا کہ کہیں پولین کی غیر معمولی ذہانت روسیوں کی شجاعت پر بازی نہ لے جائے لیکن
اس کے ساتھ ساتھ اس کے لیے یہ امر بھی ناقابل برداشت تھا کہ اس کا ہیرو کسی قسم کی رسوائی سے دوچار ہو۔

انہی خیالات میں، جنہوں نے اس کے اندر نیا جوش پیدا کر دیا تھا اور اسے پریشانیوں میں بھی جھلا کر دیا تھا،
نقطاں دہچپاں وہ اپنے باپ کو خط لکھنے اپنے کمرے کی طرف چل پڑا۔ یہ فریضہ وہ روزانہ سرانجام دیا کرتا تھا۔
راہداری میں اس کی ملاقات نینس وٹسکی، جس کے ساتھ وہ ایک ہی کمرے میں رہتا تھا، اور نکال ڈرکوف سے ہو
گئی۔ وہ حسب معمول قہقہے لگا رہے تھے۔

”یہ تم نے منہ کیوں بنا رکھا ہے؟“ نینس وٹسکی نے پرس آندرے کے پڑمزدہ چہرے اور جھمکاتی آنکھوں کو دیکھ
کر کہا۔

”قہقہے لگانے کی بھی کوئی وجہ نہیں!“ بلکنوٹسکی نے تروت جواب دیا۔

ادھر جب پرس آندرے کانیس وٹسکی اور ڈرکوف سے آنا سامنا ہو رہا تھا، راہداری کی دوسری سمت سے
ایک آسٹری جرنیل، سٹروخ، (Strauch) جو روسی فوجوں کو رستہ پہنچانے کے کام کی نگرانی کے لیے کوٹوزوف کے
شاف میں شامل تھا اور جنگی کونسل کا رکن، جو کل شام یہاں پہنچا تھا، نمودار ہوئے۔ راہداری خاصی کشادہ تھی اور اس
مکان کی جگہ ضرور تھی کہ آسٹری جرنیل تینوں افسروں کے برابر سے کسی مشکل کے بغیر گزر جاتے لیکن ڈرکوف نے

نہیں دتسکی کو ایک طرف دھکیلتے ہوئے ہانتے کا نپتے نعرہ مستانہ بند کیا۔

”وہ تشریف لارہے ہیں! وہ تشریف لارہے ہیں! ہٹو بچو، راستہ دہ!“

جرنیلوں نے پہلو بچا کر چپکے سے گزر جانا چاہا۔ ان کے چہروں بشریوں سے یہ ترشح ہو رہا تھا کہ وہ اس تکلیف دہ احترام سے گریز کرنا چاہتے ہیں۔ ڈرکوف کے چہرے پر احمقانہ تبسم پھیل گیا۔ معلوم ہوتا تھا کہ اس کے لیے اسے چھپانا ناممکن ہو گیا ہے۔

”یہ بڑا کیسی لینیسی!“ اس نے آگے بڑھتے ہوئے اور آستروی جنرل سے جرمن میں مخاطب ہو کر کہا۔ ”اس بھدا دہب و احترام آپ کی خدمت میں ہدیہ تحریک پیش کرتا ہوں۔“

اس نے تعظیماً اپنے سر جھکا دیا اور پھر کسی مدر سر رقص کے نوعمر بچے کی طرح بے ڈھنگے پن سے پہلے ہٹا دیا۔ پاؤں اور پھر دوسرا گھسیٹ لیا۔

جنگی کونسل کے رکن نے اسے گھور کر دیکھا لیکن جب اس کی احمقانہ مسکراہٹ میں عجیبگی نظر آئی، وہ اسے توجہ دینے پر مجبور ہو گیا۔

”جنرل، میں بھدا دہب و احترام آپ کی خدمت میں ہدیہ تحریک پیش کرتا ہوں۔ جنرل میک تشریف لے گئے ہیں۔ وہ بھلے چنگے ہیں، صرف معمولی خراشیں آئی ہیں۔“ یہاں ”اس نے اپنے سر کی طرف اشارہ کرتے اور مسکراتے ہوئے مزید کہا۔

جرنیل کی پیشانی شکن آلود ہو گئی، وہ ایک طرف ہٹا اور آگے چلے لگا۔

”Gott, wie naiv!“ وہ چند قدم آگے جا کر غصے سے پکارا۔

نہیں دتسکی کھٹکھٹا کر ہنس پڑا اور اس نے اپنے بازو پرس آندرے کے گلے میں جھانک کر دیے۔ لیکن بلکوسکی نے، جس کا چہرہ مزید پڑمردہ ہو چکا تھا، اسے دھکیل کر ایک طرف کر دیا۔ وہ غصے سے پھنکار رہا تھا اور اس عام میں وہ ڈرکوف کی طرف متوجہ ہوا۔ میک کی آمد، شکست کی خبر اور روسی فوجوں کو جو مسائل و مشکلات درپیش تھیں، ان کے بارے میں اس کے خیالات نے اس کے اندر جو جھنجھلاہٹ پیدا کر دی تھی، اس نے اس کا اظہار ڈرکوف کے مذاق پر اپنے غیظ و غضب کے ذریعے کیا۔

”حضور، اگر آپ کو مسخرہ بننے کا اتنا ہی شوق ہے،“ اس نے طنز کے خیر چلاتے ہوئے کہا، (اس کا بیڑا قدرے کپکپا رہا تھا) ”تو میں آپ کو روک نہیں سکتا۔ لیکن میں آں جناب کو متنبہ کیے دیتا ہوں کہ اگر آپ نے آئندہ میری موجودگی میں اس قسم کی کوئی احمقانہ حرکت فرمائی تو میں آپ کو چھٹی کا رو دھ یا دلا دوں گا اور آپ کو یہ ذہن نشین کرادوں گا کہ آپ کو کس قسم کا رویہ اختیار کرنا چاہیے۔“

اس کے اس طرح پھٹ پڑنے پر نہیں دتسکی اور ڈرکوف دونوں بھونچکے رہ گئے اور وہ چپ چاپ

میرے خدایا! کیا احمق شخص ہے!

وہاں سے بھاڑ پھاڑ کر اسے دیکھنے لگے۔

”یار، میں نے تو اسے محض ہدیہ تبریک پیش کیا تھا۔“

”میں آپ کے ساتھ مذاق نہیں کر رہا۔ برائے مہربانی خاموش رہیں!“ بلکونسکی نے چلا کر کہا۔ اس نے نہیں دتسکی کو بازو سے پکڑا اور وہاں سے چل پڑا۔ ڈرکوف وہیں کھڑا رہا۔ وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ کیا کہے اور کیا نہ کہے۔

”یار، یہ تمہیں کیا ہو گیا ہے؟“ نہیں دتسکی نے اس کا غصہ ٹھنڈا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

”کیا ہو گیا ہے؟“ پرنس آندرے نے یا آواز بلند کہا۔ اس کے جذبات میں اتنی ہلچل مچی ہوئی تھی کہ وہ چلتے چلتے رک گیا۔ ”تمہاری سمجھ میں کیوں نہیں آ رہا؟۔ ہم پاتو، فسر ہیں جو اپنے نزار اور پٹی مادر وطن کی خدمت پر مامور ہیں، جو اپنے دوستوں کی کامرانیوں پر خوش ہوتے اور ان کی ناکامیوں پر خون کے آنسو بہاتے ہیں یا پھر ہم بھڑے کے ٹٹوں پر جنھیں اپنے آقائے ولی تحت کے امور میں کوئی دلچسپی نہیں، بس اپنے حلوے، ٹڈے سے غرض ہے۔ چائیس ہزار اشخاص قہا کے گھاٹ اتار دیے گئے، ہمارے اتحادی کی فوج میا سیٹ کر دی گئی اور تمہیں اس میں دل لگی کا پہلو نظر آتا ہے!“ اس نے فرانسیسی میں کہا جیسے جو کچھ وہ کہہ رہا تھا، اس زبان کے استعمال سے اس میں رو رہا تھا۔ ”اس اڑھائی کوڑی کے آدمی کو، جسے تم نے چنا دوست بنا رکھا ہے، شاید اس قسم کی حرکتیں زیب دیتی ہوں لیکن تمہیں، تمہیں نہیں، بالکل نہیں! صرف گلی کوچوں میں آوارگی کرنے والے لوٹڈے اس نوع کی خرافات سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں!“ اس نے دوبارہ روسی زبان میں اپنا مدعا ادا کرتے ہوئے کہا۔ لیکن جب اس نے دیکھا کہ ڈرکوف ابھی اتنا قریب ہے کہ ان کی باتیں اس تک پہنچ سکتی ہیں، اس نے اپنے ان الفاظ کے نیچے بھی فرانسیسی لہجہ اختیار کر لیا۔

وہ کچھ دیر تک کمر انتھار کرتا رہا کہ شاید لیفٹیننٹ جواب میں کچھ کہے گا لیکن ڈرکوف دوسری جانب مڑ گیا اور راہداری سے باہر نکل گیا۔

4

پاولو گراٹ ہوزار رجسٹ براؤناؤ سے دو میل دور مقیم تھی۔ جس سکواڈرن میں گولائی رستوف بحیثیت کیڈٹ فہدات سرانجام دے رہا تھا، اس کا قیام ایک جرمن گاؤں سالزے نیک میں تھا۔ گاؤں کا بہترین مکان سکواڈرن کمانڈر کیپٹن دینی سوف کی، جسے ساری گھڑ سوار ڈویژن میں واسکا دینی سوف کے نام سے جانا جاتا تھا، تحویل میں دے دیا گیا تھا۔ جب سے کیڈٹ رستوف پولینڈ میں رجسٹ میں شامل ہوا تھا وہ اور دینی سوف ایک ہی مکان اور خیمے میں رہتے چلے آ رہے تھے۔

آٹھ اکتوبر کو یعنی جس روز میک کی شکست کی خبر نے فوجی ہیڈ کوارٹر میں کھلبلی مچا دی تھی، اس سکواڈرن کے

افسردگی کی پڑاؤ میں زندگی حسب معمول پر سکون انداز سے رواں دواں تھی۔ رستوف، جسے گھوڑوں کے لیے پارہ اور چھینا اکٹھا کرنے کے لیے بھیجا گیا تھا، صبح سویرے جب واپس آیا، دینی سوف، جو ساری رات جوئے میں رزم ہار رہا تھا، ابھی اپنی رہائش گاہ پر وٹ کر نہیں آیا تھا۔ کیڈٹ کی وردی پہنے اور گھوڑے پر سوار رستوف پورچ میں داخل ہوا۔ اس نے اپنے گھوڑے کو لگام دی، نوجوانوں کی لچک دار پھرتی کے ساتھ زین کے اوپر سے اپنی ٹانگ گھمائی، رکاب میں پاؤں رکھے، کچھ سوچا جیسے اسے گھوڑے سے اتارتے دکھ ہو رہا ہو، پھر نیچے جست لگائی اور ایک اردلی کو پکارا۔

”آخا، ہندارینکو، میرے عزیز دوست!“ اس نے ہوزار سے، جو سر پر پاؤں رکھے گھوڑے کی جانب بھاگا آ رہا تھا، مخاطب ہو کر کہا۔ ”بو بھئی، سنبالو اسے۔ ذرا اسے ٹھہراؤ دھلاؤ۔“ اس نے اس برادرانہ گرم جوشی سے کہا جو نیک طبیعت نوجوان سرخوشی کے عالم میں ہر کہہ دمہ کے لیے اختیار کرتے ہیں۔

”بہت اچھا، یوٹرا کیسی لینسی،“ یوکرینی نے بٹاشت سے اپنے سر کو جنبش دیتے ہوئے کہا۔
 ”دیکھو، اسے ذرا ٹھیک ٹھاک طریقے سے ٹھہلاؤ۔“

ایک اور ہوزار گھوڑے کی طرف بگنٹ بھاگا آ رہا تھا لیکن ہندارینکو پیچھے ہی اکبری لگام، جس میں کانٹے کے بغیر دانہ تھا، گھوڑے کے سر پر ڈال چکا تھا۔ بالکل عیاں تھا کہ کیڈٹ بخشیش کے معاملے میں دریا دل تھا اور جو شخص بھی اس کی خدمت کرتا تھا، اس کے دارے نیارے ہو جاتے تھے۔ رستوف کچھ دیر پورچ کی میز صیوں پر کڑا گھوڑے کی گردن اور اس کے پہلو تھپکا رہا۔

”بہت شاندار، بہت اعلیٰ! بہت زبردست گھوڑا ثابت ہوگا!“ اس نے مسکراتے ہوئے اپنے آپ سے کہا۔ اس نے اپنی شمشیر پکڑی اور بھگم بھاگ پورچ کی میز صیوں طے کرنے لگا۔ اس کے ہمیز ٹھٹھکتے رہے تھے۔ تنگ ناسن اور نوکیلی نوپا اوڑھے، اور دو شانہ ہاتھ میں پکڑے اس کے جرمن مالک مکان نے گائیوں کے چہرے کے پیچھے سے، جہاں وہ گوبر سیٹ رہا تھا، جھانک کر باہر دیکھا۔ رستوف کو دیکھتے ہی اس کے چہرے پر رونق آ گئی۔ وہ خوش حالی سے مسکرایا۔ اس نے آنکھ ماری اور کہا:

”Schon, gut Morgen! Schon, gut Morgen!“ صاف ظاہر تھا کہ نوجوان شخص سے علیک سلیک کر کے اسے قلبی مسرت ہو رہی تھی۔

”ابھی سے مصروف ہو گئے؟“ رستوف نے اس کے سلام کا جواب دیتے جرمن میں پوچھا۔ اس کے پر اشتیاقی چہرے پر ہمیشہ کی طرح پر مسرت اور برادرانہ مسرت کھیل رہی تھی۔ ”آشردی زندہ باد! روسی زندہ باد! امپراطور الیکساندر زندہ باد!“ جرمن مالک مکان بار بار جو خمرے لگایا کرتا تھا، وہ بھی اس کی زبان میں وہی خمرے بلند کر رہا تھا۔

جرمن ہنس پڑا، وہ چپھر سے ہار نکلا، اس نے اپنی ٹوپی اتاری، اسے اپنے سر کے اوپر بلند کرتے اور پیپروں کا پورا زور لگاتے پکارا
 ”کل عالم زندہ باد!“

اگرچہ نہ تو جرمن کے پاس، جو گائیوں کا چھپر صاف کر رہا تھا اور نہ رستوف کے پاس، جو اپنی پلٹن کے ساتھ چارہ اور چبينا اکٹھا کرنے میں مصروف رہا تھا، خوشی منانے کی کوئی خاص وجہ تھی، تاہم انھوں نے ایک دوسرے کی جانب براہ راست اخوت اور کامل مسرت و انبساط سے دیکھا، باہمی پیار و محبت کی عدست کے طور پر اپنے اپنے سروں کو گھمایا اور اپنی اپنی راہ چل پڑے۔ جرمن واپس اپنے چپھر میں چلا گیا اور رستوف نے اپنی قیام گاہ کا، جس میں وہ دینی سوف کے ساتھ رہ رہا تھا، رخ کیا۔

”تمہارے آقا کہاں ہیں؟“ اس نے دینی سوف کے اردلی لاوردشکا سے پوچھا۔ لاوردشکا کو ساری رجسٹرائی تھی اور اسے چھٹا ہوا بد معاش تصور کرتی تھی۔

”وہ شام سے گھر نہیں آئے۔ لازمًا ہار رہے ہوں گے،“ لاوردشکا نے جواب دیا۔ ”اب میں بھی سمجھ گیا ہوں۔ اگر وہ جیت جائیں، پھر جلدی لوٹ آتے ہیں، ڈیگیں جو مارنا ہوتی ہیں۔ لیکن اگر وہ صبح تک واپس نہ آئیں، اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ حضور پٹ چکے ہیں۔ پھر جب ان کی واپسی ہوگی، غصے سے ان کا خون کھول رہا ہوگا۔ کافی بناؤں؟“
 ”بالکل اور ابھی۔“

دس سٹ بعد لاوردشکا کافی لے آیا۔

”میں، وہ بھی آگئے ہیں،“ اس نے کہا۔ ”آئی شامت؟“

رستوف نے کمز کی میں سے باہر بھانک کر دیکھا۔ اسے دینی سوف واپس گھر آتے نظر آیا۔

دینی سوف کو تاد قامت تھا۔ سرخ چہرہ، سیاہ اور روشن آنکھیں، کالے اور ڈولیدہ بال۔ اس نے ہزاروں کا جفہ، جس کے بٹن کھلے تھے، پہنا ہوا تھا۔ اس کی چٹون کشادہ اور ڈھیلی ڈھالی تھی۔ اس کے سر پر شا کو تھی اور وہ پیچھے کوڑھلک رہی تھی۔ وہ سر نہ ہوڑائے اور منہ لٹکائے پورے میں داخل ہوا۔

”لاوردشکا؟“ اس نے بلند اور غصیلی آواز میں چلا کر کہا۔ ”اے، لوکی دم، یہ اتارو!“

”جی اتار رہا ہوں،“ لاوردشکا کا جواب سنائی دیا۔

”ارے تم اٹھ بھی گئے؟“ دینی سوف نے کمرے میں آتے ہوئے پوچھا۔

”میں ہو گئیں،“ رستوف نے جواب دیا۔ ”میں لکھا اس اور چبينا لانے گیا تھا۔ مادام ماشڈے سے بھی مل چکا ہوں۔“

”واقعی؟“ برادر، اپنی تو قسمت ہی پھوٹ گئی۔ ساری رات ہار تے گزری، کتے کے پلے کی طرح، ”دینی سوف

نے چلا چلا کر کہا۔ ”واہ ری قسمت! جب مقدر ہی کھوٹا ہو، پھر آدمی کیا کر سکتا ہے، جو نبی تم رخصت ہوئے، وہ اسے ساتھ یہ چکر شروع ہو گیا اور ساری رات جاری رہا۔ بے چارے!“

اپنا منہ سکیڑتے اور اپنے مہین اور مضبوط دانت یوں نکوتے، جیسے وہ کھیانی ہنسی ہنس رہا ہو، وہ اپنے ہاتھوں کی معمول سے نسبتاً چھوٹی لیکن موٹی انگلیاں اپنے گھنے سیاہ بالوں میں، جو جنگل کے درختوں کی طرح آپس میں الجھے ہوئے تھے، پھیرنے لگا۔

”مجھے کس شیطان نے بہکایا کہ میں اس چوہے،“ (ایک افسر جس کا عرف ’چوہا‘ تھا) ”کے پاس چلا گیا۔“ اس نے اپنے دونوں ہاتھوں سے اپنی پیشانی اور گالوں کو تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ ”کیا تم سوچ سکتے ہو کہ اس نے مجھے ایک بھی پٹا۔ ہاں ایک بھی پٹا۔ نہیں دیا؟“

اس نے سلگتا ہوا پائپ، جو اس کی طرف بڑھا ہوا گیا تھا، مضبوطی سے اپنی مٹھی میں پکڑا، اسے اتنی قوت سے فرش پر دے مارا کہ اس میں سے شرارے نکلنے لگے اور خود چلا چلا کر باتیں کرتا رہا۔

”وہ سنکل تو دوسروں کو جیتنے دیتا ہے لیکن اگر شرط دینی کر دی جائے، پھر خود ہاتھ مار جاتا ہے۔ سنکل آپ کو دے دیتا ہے اور ذلیل خود تھک لیتا ہے۔“

اس نے شرارے ادھر ادھر بکھیر دیے، پائپ کرچی کرچی کر دیا اور اسے پرے پھینک دیا۔ وہ کچھ دیر خاموش رہا، پھر اس نے اچانک رستوف پر نگاہ دوڑائی، اس کی سیاہ آنکھیں شرمات سے چمک رہی تھیں اور بول:

”کاش یہاں چند خواتین ہی ہوتیں! ایسے میں تو یہاں پینے پلانے کے علاوہ اور کچھ نہیں ہو سکتا۔ کاش جنگ ونگ ہی شروع ہو جائے!... ابے، کون ہے؟“ اس نے دروازے کے باہر کسی کے بھاری ہونٹوں کے کھٹکھٹانے اور مہیڑوں کے کھٹکھٹانے کی آواز سن کر چلا کر پوچھ۔ ”آؤ زبرد ہوئی اور کوئی شخص موڈ باندا انداز سے کھکار۔“

”کوادرٹ ماسٹر،“ لا اور وٹکا نے کہا۔

دینی سوف کے ماتھے کی لکیریں اور بھی گہری ہو گئیں۔

”کیا مصیبت ہے!“ وہ بڑبڑایا اور اس نے اپنا پرس، جس میں چند طلائی سکے تھے، نیچے پٹک دیا۔

”رستوف، بھیا، ذرا گنتا کہ اس میں کتنی رقم بچی ہے۔ پھر اسے نیچے کے نیچے رکھ لیا،“ اس نے کہا اور خود کوادرٹ ماسٹر سے ملنے باہر چلا گیا۔

رستوف نے رقم نکالی، مشینی انداز سے نئے اور پرانے سکوں کی علیحدہ علیحدہ ڈھیریاں بنائیں اور انہیں جھٹکے لگا۔

”اٹا، تکیا، من! آداب عرض۔ کیا حال ہے؟ اپنا تو رات کہاڑا ہو گیا، انہوں نے سب کچھ جھٹھالیا!“

کمرے سے دینی سوف کی آواز سنائی دی۔

”کہاں؟ بایکوف کے؟“ اس نے کہا۔ ”... مجھے معلوم تھا۔“ سینی کی سی آواز سنائی دی۔ اس کے ساتھ ہی کوتاہ قامت لیغٹینٹ تلیرن، جو اسی سکواڈرن میں تھا، کمرے میں داخل ہوا۔

رستوف نے پرس بجے کے نیچے رکھ لیا اور ایک ننھے سے مرطوب ہاتھ کو، جو اس کی طرف بڑھایا گیا تھا، اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ ہاتھ نہیں کیا وجہ ہوئی لیکن ہوا یہ کہ مہم پر روانگی سے ذرا قبل تلیانن کا گارڈز سے تبادلہ کر دیا گیا۔ رجمنٹ میں اس کی کارکردگی اطمینان بخش تھی لیکن اسے پسند نہیں کیا جاتا تھا اور جہاں تک رستوف کا تعلق ہے، اسے اس سے اللہ واسطے کی منافرت تھی۔ وہ اپنی اس منافرت پر نہ قابو پاسکا تھا اور نہ اسے چھپانے میں کامیاب ہو تھا۔

”اچھا، جوان، میرے رخ کا کیا حال ہے؟“ (رخ نو خیز گھوڑے کا نام تھا اور اسے تلیانن نے رستوف کے ہاتھ فروخت کیا تھا۔)

لیفٹیننٹ جب بھی کسی شخص سے مخاطب ہوتا، وہ کبھی اس کے چہرے کی طرف نہ دیکھتا۔ اس کی نگاہیں مسلسل ایک شے سے دوسری شے کی طرف منتقل ہوتی رہتیں۔

”میں نے آج صبح تمہیں اس پر سواری کرتے دیکھا تھا۔“

”اوہ! وہ بالکل ٹھیک ہے۔ اچھا گھوڑا ہے۔“ رستوف نے جواب دیا۔ حالانکہ گھوڑا سات سو روپے کی خطیر رقم کے، جو اس نے ادا کی تھی، نصف کے برابر بھی نہ تھا۔ اس کی اگل ہائیں ہانگ کچھ کچھ لنگڑانے لگی ہے، اس نے مزید کہا۔

”متم ترخ گیا ہے؟ ارے، یہ تو کچھ بھی نہیں۔ میں تمہیں بتا دوں گا کہ کیا کرنا چاہیے۔ کون سا نعل استعمال کرنا ہے۔“

”ضرور، عنایت ہوگی،“ رستوف نے کہا۔

”میں بتاؤں گا، ضرور بتاؤں گا۔ اس میں۔ راز کی کوئی بات تو ہے نہیں۔ تم میرا شکریہ ادا کرو گے کہ میں نے یہ گھوڑا تمہیں دے دیا۔“

”پھر میں گھوڑا منگوا لوں،“ رستوف نے کہا۔ اسے یہ فکر کھائے جا رہی تھی کہ کسی طرح تلیانن سے خلاصی ہو اور وہ باہر نکل گیا تاکہ گھوڑا لانے کا حکم دے سکے۔

غلام گردش میں دینی سوف بیٹھا تھا۔ وہ پاسپ پر جھکا ہوا تھا۔ اس کے سامنے کوارٹر ماسٹر بیٹھا تھا۔ وہ اسے کوئی رپورٹ دے رہا تھا۔

رستوف کو دیکھ کر دینی سوف نے، پنامہ سکیٹر لیا اور اپنے کندھے کے اوپر انگوٹھے سے اس کبرے کی طرف، جس میں تلیانن بیٹھا تھا، اشارہ کرتے ہوئے اپنے ماتھے پر ٹھکن ڈال لیے اور کراہت سے اس کا جسم تھر تھرانے لگا۔

”ارخ تمہو! مجھے وہ شخص ایک آنکھ نہیں بھاتا،“ اس نے کوارٹر ماسٹر کی بھی پروا نہ کی۔

رستوف نے یوں کندھے اچکائے جیسے وہ یہ کہنا چاہتا ہو: ”پسند تو مجھے بھی نہیں لیکن آدمی کر بھی کیا سکتا ہے؟“ اس نے اپنا حکم دیا اور دوبارہ تلیانن کے پاس چھا گیا۔

تلیا ن اسی اہل انگار انداز میں جس میں رستوف اسے چھوڑ کر گیا تھا، بیٹھا تھا۔ وہ اپنے چھوٹے بھروسے
سفید ہاتھ مسل رہا تھا۔

”بعض لوگ واقعی قابل نفیس اور کریمہ ہوتے ہیں،“ رستوف نے کمرے میں داخل ہوتے وقت سوچا۔
”چھا، تم نے گھوڑا مانے کا حکم دے دیا؟“ تلیا ن نے اٹھتے ہوئے اور بے دھیانی سے ادھر ادھر دیکھتے
ہوئے پوچھا۔
”ہاں۔“

”آؤ، چلیں۔ میں تو محض اس لیے آیا تھا کہ میں دینی سوف سے، اس حکم کے بارے میں جو کل دیا گیا تھا،
دریافت کر سکوں۔ دینی سوف، تمہیں یہ احکام مل گئے ہیں؟“
”نہیں، ابھی نہیں۔ تم لوگ کہاں جا رہے ہو؟“

”میں اس نوجوان کو سمجھانا چاہتا ہوں کہ نعل کیسے لگایا جاتا ہے،“ تلیا ن نے کہا۔
وہ پورچ میں سے گزرتے اسٹبل میں پہنچ گئے۔ لیفٹیننٹ نے رستوف کو دکھایا کہ گھوڑے کو نعل کیسے لگایا
جاتا ہے اور اپنے مسکن کی طرف چل دیا۔

جب رستوف واپس آیا، دینی سوف ایک میز کے سامنے، جس پر دوڈکا کی بوتل اور ایک ساج (sausage)
دھر تھا، بیٹھا تھا۔ وہ اپنے سامنے کاغذ رکھے اس پر قلم گھسیٹ گھسیٹ کر کچھ لکھ رہا تھا۔ اس نے اس نگاہ سے
رستوف کو دیکھا اور بولا:
”میں اسے لکھ رہا ہوں،“ اس نے کہا۔

کلا نیاں میز پر جھکائے اور قلم ہاتھ میں تھا، وہ بظاہر بہت خوش تھا، کیونکہ وہ جو کچھ خط میں لکھنا چاہتا تھا،
اسے اب زبانی بیان کرنے کا موقع دستیاب آ گیا تھا کیونکہ لکھنے کی نسبت گفتگو زیادہ تیزی سے کی جاسکتی ہے۔
”دوست، تمہیں معلوم ہے!“ اس نے کہا، ”جب تک ہم کسی کی زلف گرہ گیر کا ایر نہیں ہوتے۔ ہم فید
میں کھوئے رہتے ہیں۔ ہمارا حیر مٹی سے اٹھا ہے۔ لیکن ایک مرتبہ محبت میں گرفتار ہو جاؤ۔ تم دیوتا بن جاؤ گے،
پاک، صاف اور پوڑ، بالکل اس دن کی طرح، جس روز ہماری پیدائش عمل میں آئی ہوتی ہے۔۔۔ اب کون آپکا؟ اس
سے کہہ دو کہ جہنم میں جائے، میں مصروف ہوں۔“ اس نے چلا کر لاورو شکا سے کہا۔ لاورو شکا اس کے پاس آپکا
اور اس سے مطلق خوف زدہ نہ ہوا۔

”بوجھیں تو بھلا کون ہے یہ؟ آپ نے خود ہی تو انہیں بلایا تھا۔ کوادرٹا سرچیے لینے آئے ہیں؟“
دینی سوف کی تیور ماں چڑھ گئیں۔ وہ چلا کر کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن اس نے اپنا ارادہ بدل دیا۔
”کیا مصیبت ہے!“ وہ زیر لب بڑبڑایا۔ ”پرس میں کتنی رقم بچی ہے؟“ اس نے رستوف سے پوچھا۔
”سات نئی اور تین پرانی اشرفیاں۔“

”خ! خانہ خراب! یہ تم مٹی کی سورت بنے کیوں کھڑے ہو؟ جاؤ اور اسے بلا لاؤ“ اس نے چلا کر لاوردوشکا سے کہا۔

”رینی سوف، بھائی جان، اگر آپ برا نہ منائیں تو میں آپ کو کچھ رقم ادھار دے سکتا ہوں۔ آپ جانتے ہی ہیں کہ میرے پاس کچھ پیسے ہیں۔“ رستوف نے کہا۔ شرم سے اس کا چہرہ لاسا سرخ ہو رہا تھا۔

”مجھے دوستوں سے ادھار لینا پسند نہیں۔ بالکل پسند نہیں۔“ رینی سوف نے کہا۔

”لیکن اگر دوستوں کی طرح آپ نے مجھ سے بھی پیسے نہ لیے تو میں آپ سے ناراض ہو جاؤں گا۔ میں جھوٹ نہیں کہہ رہا، میرے پاس واقعی پیسے ہیں۔“ رستوف نے اپنی بات دہرائی۔

”کہہ جو دیا کہ نہیں۔“

رینی سوف نیکی کے نیچے سے پرس اٹھانے پلنگ کی طرف چل پڑا۔

”کہاں رکھا تھا، رستوف؟“

”زیریں نیکی کے نیچے۔“

”لیکن یہاں تو نہیں ہے۔“

رینی سوف نے دونوں نیکی اٹھا کر فرش پر پٹک دیے۔ پرس وہاں نہیں تھا۔

”یہ تو بڑی عجیب بات ہے!“ اس نے کہا۔

”ٹھہریں۔ آپ نے کہیں اسے نیچے تو نہیں گرا دیا؟“ اس نے ایک ایک کر کے نیکی اٹھائے اور انھیں خوب اچھی طرح جھاڑا۔

اس نے لحاف گھسیٹ کر کھینچا اور اسے بھی خوب اچھی طرح جھاڑا۔ پرس نہ ملا۔

”کہیں میں ہی تو نہیں بھول گیا؟ نہیں۔ مجھے یاد ہے کہ میں یہاں سوچتا رہا کہ آپ اسے ہمیشہ نیکی کے نیچے رکھا کرتے تھے، بالکل دھینے کی طرح۔“ رستوف نے کہا۔ ”میں نے اسے بالکل یہیں رکھا تھا۔ یہ کیا کہاں؟“ اس نے لاوردوشکا کی جانب مڑتے ہوئے دیکھا۔

”میں تو کمرے میں آیا ہی نہیں۔ وہیں ہوگا جہاں آپ نے رکھا تھا۔“

”لیکن وہ نہیں ہے!“

”تم ہمیشہ یہی کرتے ہو۔ ہمیشہ چیزیں ادھر ادھر پھینکتے رہتے ہو اور پھر بھول جاتے ہو۔ اپنی جیبوں میں دیکھو۔“ رینی سوف نے کہا۔

”جیبیں۔ اگر دھینے کا تصور میرے ذہن میں نہ آتا...“ رستوف نے کہا۔ ”لیکن مجھے یاد ہے کہ میں نے اسے یہیں رکھا تھا۔“

لاوردوشکا نے پلنگ کی ایک ایک چیز کنگال ڈالی۔ اس کے نیچے بھی جہاں تک کر دیکھا اور میز کے نیچے بھی۔

ایک ایک چیز کی تلاشی لینے کے بعد وہ کمرے کے عین درمیان میں ساکت کھڑا ہو گیا۔ دینی سوف خاموشی سے اس کی تمام حرکات کا جائزہ لیتا رہا۔ اور جب لا درو شکا نے جھنجھلا کر اپنے ہاتھ اوپر اٹھائے، دینی سوف رستوف کی جانب دیکھنے لگا۔

”رستوف، تم نے سکول کے بچوں کی طرح کوئی شرارت تو نہیں کی؟“

رستوف کو محسوس ہوا کہ دینی سوف کی نگاہیں اس پر گڑی ہوئی ہیں۔ اس نے اپنی نظریں اوپر اٹھائیں لیکن جھٹ پٹ نیچے گرائیں۔ وہ سارا خون، جو اسے یوں لگا تھا جیسے اس کے زخموں میں جمع ہو گیا ہو، باڑھ، رکر اس کے چہرے اور آنکھوں میں گھس گیا۔ اس کا دم گھٹنے لگا۔

”کپ کے اور ایفٹیننٹ کے علاوہ اور کوئی شخص اس کمرے میں نہیں آیا۔ یہ یہیں کہیں ہوگا،“ لا درو شکا نے کہہ کر ابلیس کی اولاد جلدی کرو اور اسے تلاش کرو،“ دینی سوف نے اچانک دھاڑتے ہوئے کہا۔ اس کا رنگ لال سرخ ہو گیا اور وہ دھمکی آمیز انداز سے کہہ لہراتا اردلی کی طرف بھاگا۔ ”اگر وہ پرس نہ ملا تو میں مار کر تمہارا بھرکس نکال دوں گا! میں کسی کو نہیں بخشوں گا، سب کی پٹائی کر دوں گا۔“

دینی سوف کی نظروں سے بچتا بچتا رستوف اپنے کوٹ کے مٹن بند کرنے لگا۔ پھر اس نے اپنی شمشیر خیم میں ڈالی اور ٹوپی سر پر رکھ لی۔

”پرس لاؤ، ڈھونڈنا ہوگا، یہ میرا حکم ہے!“ دینی سوف نے اپنے اردلی کے کندھے جھنجھوڑتے اور اسے زور سے دیوار کے ساتھ لکراتے ہوئے چلا کر کہا۔

”دینی سوف، اسے چھوڑ دیں۔ مجھے معلوم ہے کہ اسے کون اٹھ کر لے گیا ہے،“ رستوف نے نظریں اٹھائے بغیر دروازے کی جانب جاتے ہوئے کہا۔

دینی سوف رک گیا، اس نے کچھ دیر سوچا اور جب اسے اندازہ ہو گیا کہ رستوف کے الفاظ کا کیا مفہوم بنا ہے، تو اس نے اس کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیا۔

”بالکل وہی بات!“ وہ اتنے زور سے دھاڑا کہ اس کی گردن اور پیشانی کی رگیں رسیوں کی طرح نمایاں ہو گئیں۔ ”میرا خیال ہے کہ تمہارا دماغ جل گیا ہے! میں یہ نہیں ہونے دوں گا۔ پرس یہیں ہے! میں اس لنگے کی چڑی اور چیزوں کا، پھر یہ خود بخود دل جائے گا۔“

”مجھے معلوم ہے کہ اسے کون اٹھا لے گیا ہے،“ رستوف نے دروازے کی جانب بڑھتے ہوئے ٹوکڑیاں زبان سے اپنی بات دہراتے ہوئے کہا۔

”اور میں تمہیں بتائے دیتا ہوں۔ اس قسم کی حرکت کا نام بھی نہ لینا،“ دینی سوف کیڈٹ کو روکنے کے لیے اس کی طرف بھاگتے ہوئے چلایا۔

”رستوف نے جھٹکے سے اچھا بازو چھڑایا اور دینی سوف کی نگاہوں میں نگاہیں ڈال کر دیکھنے لگا۔ وہ اٹھا

غضب ناک اور پر عزم نظر آ رہا تھا جیسے دینی سونے اس کا بدترین دشمن ہو۔

”آپ کو اندازہ ہے کہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟“ اس نے کیکپاتی آواز میں پوچھا۔ ”کمرے میں میرے علاوہ اور کوئی نہیں آیا۔ چنانچہ اگر میں نہیں... پھر“

اس سے اپنی بات ختم نہ کی جا سکی ورنہ تیزی سے کمرے سے باہر نکل گیا۔

”میرے تمہارا بیڑا غرق۔ تم سب کا بیڑا غرق!“ یہ آخری الفاظ تھے جو رستوف کے کانوں تک پہنچے۔ رستوف تلیانن کی قیام گاہ پر چلا گیا۔

”مالک گھر پر نہیں۔ ہیڈ کوارٹر گئے ہوئے ہیں!“ تلیانن کے اردلی نے اسے اطلاع دی۔ ”کچھ ہو گیا؟“ اس نے پوچھا۔ کیڈٹ کے متوحش چہرے نے اسے دندے میں ڈال دیا تھا۔

”نہیں۔ کچھ نہیں۔“

”آپ کو بس ذرا سی تاخیر ہوگئی،“ اردلی نے کہا۔

سٹاف ہیڈ کوارٹر سالزے نیک سے تقریباً دو میل دور تھا۔ رستوف واپس کمرہ نہ گیا۔ اس نے گھوڑا پکڑا اور دھر چل دیا۔ گاؤں میں ریسٹوران تھا۔ افسران یہاں اکٹرا کر آتے تھے۔ جب رستوف اس کے قریب پہنچا، اسے روانہ کے قریب تلیانن کا گھوڑا نظر آ گیا۔

ریستوران کے دوسرے کمرے میں تلیانن بیٹھا تھا۔ اس کے سامنے میز پر ساج کی پیٹ اور شراب کی بوتل رکھی ہوئی تھی۔

”اٹھا، جوان، تو تم یہاں بھی پہنچ گئے؟“ اس نے مسکراتے اور اپنی بھویں اوپر اٹھاتے ہوئے کہا۔

”ہاں،“ رستوف نے یوں کہا جیسے یہ ایک لفظ بھی داکرتے ہوئے اسے خاصی تکلیف ہو رہی ہو۔

وہ اگلی میز پر بیٹھ گیا۔ دونوں آدمی خاموش تھے۔ کمرے میں ایک روسی افسر اور دو جرمن باشندے بھی تھے۔ نہ کسی نے کچھ کہا اور نہ کچھ سنائی دے رہا تھا۔ صرف لیفٹیننٹ کے پچانچ کھانے اور پلیٹوں پر چھری کانٹوں کے ٹھکانے کی آوازیں آرہی تھیں۔ جب تلیانن اپنا لچ ختم کر چکا، اس نے جیب سے ڈبل پرس نکالا، اسے اپنی جھوٹی پھوٹی سفید ٹیڑھی میزمری انگلیوں سے کھولا، ایک اشرفی، ٹھائی، اپنی بھویں بلند کیں اور اسے ہیرے کو پکڑا دیا۔

”ذرا جلدی کرنا،“ اس نے کہا۔

سکھنیا گور تھا۔ رستوف اٹھا اور تلیانن کے قریب جا کھڑا ہوا۔

”ذرا یہ پرس دکھانا،“ اس نے مدھم، اتنی مدھم کہ بمشکل سنائی دیتی آواز میں کہا۔

تلیانن کی بھویں ابھی تک، وپر کی جانب اٹھی ہوئی تھیں۔ اس کی آنکھوں میں کوٹ کوٹ کر عیاری بھری ہوئی تھی۔ تاہم اس نے پرس اسے تھما دیا۔ ”بہت عمدہ پرس ہے... بالکل... بالکل۔“ اس نے کہا۔ اچانک اس کا رنگ فق ہو گیا۔ ”جوان، ذرا دیکھو تو سہی؟“ اس نے مزید کہا۔

رستوف نے پرس پکڑ لیا، اس کا بخور جاگڑا لیا۔ اس کے اندر جو رقم تھی، اس نے اس پر بھی نظر ڈالی اور اس کے بعد وہ تکیا بن کر کود کھینچنے لگا۔ لیفٹیننٹ کی نگاہیں حسب معمول ادھر ادھر بھٹک رہی تھیں اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے اس پر گفتگو طاری ہو گئی۔

”جب ہم ویانا جائیں گے، میں سب کچھ وہاں بنا دوں گا۔ لیکن ان ننھے ننھے گندے مندرے تصویر میں ایک بھی کام کی چیز نہیں کہ آدمی پیسہ خرچ کرے،“ اس نے کہا۔ ”لاڈ، جوان، یہ مجھے واپس کر دو۔ میں جا رہا ہوں۔“

رستوف چپ رہا۔

اور تم؟ تمہارا کیا ارادہ ہے؟ لہجہ کر رہے ہو؟ میراں کا کھانا بہت اچھا ہوتا ہے،“ تکیا بن نے مزید کہا۔ ”لاڈ، یہ مجھے دے دو۔“

اس نے اچھا ہاتھ بڑھایا اور پرس پکڑ لیا۔ رستوف نے چھوڑ دیا۔ پرس پکڑنے کے بعد تکیا بن سے اپنی بر جس کی جیب میں ڈالنے لگا۔ اس نے، اپنی بھویں لاڈلی انداز سے اوپر اٹھائی ہوئی تھیں اور اس کا منہ ارادہ کھلا تھا جیسے وہ یہ کہہ رہا ہو۔ ”ہاں، ہاں، یہ میں اپنی جیب میں ڈال رہا ہوں۔ سیدھا سادا معاملہ ہے۔ یہ میرا مسئلہ ہے، کسی دوسرے کو اس میں ٹانگ اڑانے کی ضرورت نہیں۔“

”اچھا، جوان،“ اس نے آہ بھرتے ہوئے اور دزدیدہ نظروں سے رستوف کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ برقی شعلے کی طرح تکیا بن کی آنکھوں سے چنگاری نکلی، رستوف کی آنکھوں کی طرف لپکی، واپس ہوئی، ہر لپکی۔ متعدد بار یہی ہوا لیکن پلک جھپکنے میں ختم ہو گیا۔

ادھر آؤ، رستوف نے تکیا بن کا بازو پکڑتے اور اسے کھڑکی کی طرف تقریباً گھسیٹتے ہوئے کہا۔ ”یہ ماں دینی سوف کا ہے۔ یہ تم اڑالائے ہو،“ اس نے چپکے سے اس کے کان میں کہا۔

”کیا؟ کیا؟ تمہیں اتنی جرأت کیسے ہوئی؟ کیا؟“ تکیا بن بڑبڑایا۔

لیکن اس کے منہ سے جو الفاظ نکل رہے تھے، ان سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ یہ شخص، پوسیوں میں گھرا ہوا ہے، اس کی حالت قابل رحم ہے اور وہ معافی کی بھیک مانگ رہا ہے۔ جونہی رستوف کے کانوں نے اس کا یہ انداز تسلیم کیا، اسے محسوس ہوا کہ اس کے سینے سے بھاری بوجھ اتر گیا اور اس کے تمام شکوک رفع ہو گئے ہیں۔ اس کا جی باغ باغ ہو گیا لیکن اس کے ساتھ ہی اسے اس بد نصیب شخص پر، جو اس کے سامنے کھڑا تھا، ترس آنے لگا۔ تاہم اس نے جس کام کا بیڑا اٹھایا تھا، اس نے اسے پایہ تکمیل تک پہنچانا تھا۔

”خدا جانے، یہاں لوگ کیا سوچیں،“ تکیا بن جھپٹ کر ٹوپی اٹھاتے اور بے آباد چھوٹے کمرے کی طرف لپکتے ہوئے بڑبڑایا۔ ”تمہیں اپنی اس حرکت کا جواز پیش کرنا ہوگا۔“

”مجھے معلوم ہے اور میں ثابت کر دوں گا،“ رستوف نے کہا۔

”میں۔“

تلیان کے زرد اور خوف زدہ چہرے کی ایک ایک رگ پھڑکنے اور کاچنے لگی۔ اس کی نگاہیں ادھر ادھر بھٹک رہی تھیں لیکن وہ ایک مرتبہ بھی رستوف کی نگاہوں کا سامنا نہ کر سکیں۔

”کاؤنٹ رستوف مت بیڑا غرق کرو۔ ایک لوجوان کا! یہ رہا خانہ برباد رہا! اٹھاؤ!“ اس نے میز پر اشرفیاں پھٹتے ہوئے کہا۔ ”میرا بوڑھا باپ ہے، ماں ہے!“

رستوف نے اشرفیاں اٹھا لیں۔ وہ تلیان کی نظروں سے نظریں نہ ملا سکا اور ایک لفظ کہے بغیر باہر چل پڑا۔ جب وہ دروازے کے قریب پہنچا، وہ رک گیا اور اس نے مڑ کر پیچھے دیکھا

”خدا یا!“ اس کے منہ سے نکلا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ ”تم نے یہ کیوں کیا؟“

”کاؤنٹ۔“ تلیان نے اس کے قریب آتے ہوئے کہا۔

”مت چھوڑ مجھے!“ رستوف نے پیچھے ہٹتے ہوئے کہا۔ ”اگر تمہیں پیسے چاہئیں، تو یہ دے۔“

اس نے پرک اس کے منہ پر دے مارا اور خود رستوران سے باہر بھاگ گیا۔

5

اس تمام رات سو ف کے مکان پر سکواڈرن کے فسرؤں کے مابین گرم بحث ہو رہی تھی۔

”رستوف، میرا خیال ہے کہ تمہیں کرنل سے معذرت کرنا چاہیے، ایک دراز قد کمیشن نے، جس کے نقوش مرنے، چہرہ جھریاں زدہ، بال کھجڑی اور مونچھیں بھاری بھرکم تھیں، رستوف کو، جو جوش و خروش سے لال سرخ ہو رہا تھا، مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

کچھ ایسا ہیج آن پڑا کہ دوسرے کمیشن کرسٹن کوڈونیل لڑنا پڑی، دونوں مرتبہ اس کی تنزلی عمل میں آئی اور دونوں ہی بار اسے دوبارہ اپنے عہدے پر بحال کر دیا گیا۔

”میں کسی کو یہ اجازت نہیں دے سکتا کہ وہ مجھ کو دروغ گو کہے!“ رستوف نے ٹیکھی آواز میں چلا کر کہا۔ ”انہوں نے مجھ سے کہا کہ میں جھوٹ بولی رہا ہوں اور میں نے ان سے کہا کہ وہ جھوٹ بول رہے ہیں اور معاملہ یہاں ختم ہو گیا۔ ان کا جی چاہے تو ہر روز میری ڈیوٹی لگا دیں اور جی چاہے تو مجھے گرفتار کر دیں۔ لیکن کوئی شخص مجھے معافی مانگنے پر مجبور نہیں کر سکتا کیونکہ اگر وہ رخصت کمانڈر کی حیثیت سے میری تشفی کرنا اپنی شان کے خلاف سمجھتے ہیں پھر۔“

”بیٹے، ذرا صبر۔ میری بات کان کھول کر سنو،“ سٹاف کمیشن نے اپنی مونچھوں کو تادو دیتے اپنے مدغم لیکن کمر پر لہجے میں اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ”تم نے دوسرے انسرؤں کی موجودگی میں رخصت کمانڈر کو بتایا کہ ایک انسر نے چور کی کار کا کتاب کیا ہے اور اس نے۔“

”یہ میرا قصور نہیں کہ گفتگو دوسرے انسرؤں کی موجودگی میں شروع ہو گئی۔ شاید مجھے ان کے سامنے بات نہیں

کرنا چاہیے تھا لیکن میں ڈپلومیٹ نہیں۔ اسی لیے میں ہونہاروں میں بھرتی ہوا تھا۔ میرا خیال تھا کہ یہاں باریک بینیوں اور سوشل گائیڈوں کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔ لیکن وہ فرماتے ہیں کہ میں کذب بیانی کر رہا ہوں۔ سو انہیں چاہیے کہ وہ میری تشفی کریں۔“

”یہ تو سب ٹھیک ہے۔ کوئی یہ نہیں کہتا کہ تم بزدل ہو لیکن اصل مسئلہ یہ نہیں۔ کیڈٹ افسر سے رخصت کمانڈر معذرت طلب کرے، ناممکن۔ دینی سوف سے پوچھ لو۔“

دینی سوف کل کھرے پن سے اپنی سونچیں چبار ہا اور گفتگو سن رہا تھا۔ صاف نظر رہا تھا کہ وہ اس گفتگو میں کوئی حصہ لینا نہیں چاہتا۔ اس نے سٹاف کیپٹن کے سوال کا جواب اپنا سرنگی میں ہل کر دیا۔

”تم نے دوسرے افسروں کی موجودگی میں اس ناگوار واقعے کا ذکر کیا؟“ سٹاف کیپٹن نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”باگڈانچ (رخصت کمانڈر) نے تمہیں چپ کرادیا۔“

”انھوں نے مجھے چپ نہیں کرایا۔ انھوں نے یہ کہا کہ میں سچ نہیں بول رہا۔“

”بہت اچھا۔ چنانچہ تم ان کے سامنے جی بھر کر وہاں بات باتیں کرتے رہے۔ اور تمہیں معذرت کرنا ہی ہوگی۔“

”ہرگز نہیں،“ رستوف نے چلا کر کہا۔

”مجھے تم سے یہ امید نہیں تھی،“ سٹاف کیپٹن نے سنجیدہ اور سخت انداز اپناتے ہوئے کہا۔ ”تم معذرت کرنے سے انکار کر رہے ہو۔ لیکن برخوردار، ستونہ تم ان کے سامنے ہی نہیں، بلکہ ہم سب کے سامنے، ساری رجنٹ کے سامنے، سر سر قصور دار ہو۔ بات کچھ یوں بنتی ہے: تمہیں چاہیے تھا کہ سوچ بچار کرتے، کسی سے صلاح مشورہ کرتے کہ اس معاملے سے کسی طرح بچنا چاہیے۔ لیکن تم نے اس قسم کی زحمت اٹھانے کی ضرورت محسوس نہ کی۔ تم سیدھے وہاں گئے اور سب کچھ افسروں کے سامنے اگل دیا۔ کنٹرل کیا کرتے؟ افسر کا کورٹ مارشل کرتے اور ساری رجنٹ کے منہ پر سیاہی مل دیتے؟ چونکہ اس میں ایک لفٹنگ آگیا ہے، اس لیے ساری رجنٹ کو بدنامی کے اتھاہ غار میں پھینک دیتے؟ تمہاری یہی سوچ ہے؟ ہوگی۔ لیکن ہم اس طرح نہیں سوچتے۔ اور باگڈانچ نے بہت اچھا کیا کہ یہ کہہ دیا کہ تم سچ نہیں بول رہے۔ یہ صورت حال خوشگوار تو نہیں لیکن اس کے علاوہ اور چارہ کار بھی کیا تھا؟ برخوردار، تم نے خود بیل کو دعوت دی ہے کہ آؤ اور مجھے مارو۔ لیکن اب جب کہ وہ اس معاملے پر مٹی ڈال رہا ہے چاہتے ہیں تم اکڑنوں دکھاتے ہو اور کہتے ہو کہ میں معذرت نہیں کروں گا اور اس مسئلے کو چاروں وانگ پھیلاؤں گا۔ تمہیں دراز یوٹی دے دی گئی تو تم سمجھنے لگے کہ تمہاری تو جین ہوئی ہے۔ لیکن اگر تم ایک بزرگ اور واجب التحظیم افسر سے معذرت کر لو، تو تمہارا کیا بکڑ جائے گا؟ باگڈانچ میں لکھ خامیاں ہیں لیکن وہ دلیر اور واجب التحظیم بزرگ کمانڈر ضرور ہیں۔ تم اپنی ناراضگی کا اظہار کرنے میں تو ذرا بھی تاخیر کے روادار نہیں ہو لیکن پوری رجنٹ کی تو بین کرنے میں تمہیں قطعاً کوئی عار محسوس نہیں ہوتی،“ سٹاف افسر کی آواز کپکپانے لگی۔ ”برخوردار، تمہیں رجنٹ میں آئے ابھی جمعہ آٹھ دن ہوئے ہیں۔ تم آج یہاں ہوکل کہیں انجیوٹ بن کر چلے جاؤ گے۔ اگر کل کلاں لوگوں

نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ پادلو گرات افسروں میں چور بھی موجود ہیں! تو تمہیں کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ لیکن ہمارا معاملہ اس سے مختلف ہے۔ کیوں دینی سوف؟ میں نے ٹھیک کہا نا؟ ہمارے لیے ما زما فرق پڑے گا۔“

دینی سوف خاموش رہا۔ وہ اپنی جگہ سے ہلک نہیں۔ البتہ وقتاً فوقتاً اپنی دغدغاتی نگاہیں رستوف پر ضرور ڈال لیتا۔

”تمہیں اپنی خودداری عزیز ہے اور تم معذرت نہیں کرنا چاہتے لیکن ہم عمر رسیدہ لوگوں کو جو اس رجنٹ میں پہلے بڑھے، جنہوں نے اس میں اپنی جوانیاں بتا دیں اور جو انشاء اللہ اسی میں موت کو گلے لگائیں گے، اس کا عز و قار عزیز از جان ہے۔ اور باگ داغچ یہ بات جانتا ہے۔ صاحب زادے، تمہیں کیا معلوم کہ یہ رجنٹ ہمیں کتنی عزیز ہے! در تم، تم غلطی پر ہو، بالکل غلطی پر ہو۔ تم برساتے ہو، تو مساتے پھر دیکھیں میں اپنے دل کی بات ضرور زبان پر لاؤں گا۔ تم غلطی پر ہو!“

اور سٹاف انسراٹھ کر پکڑا ہو گیا اور اس نے اپنا منہ دوسری طرف پھیر لیا۔
”انہوں نے بالکل ٹھیک کہا ہے۔ لعنت بھیجوا!“ دینی سوف نے اچھٹے ہوئے کہا۔ ”رستوف، چانے دو، غصہ تھوک دو!“

رستوف کے چہرے کا رنگ بھی سرخ ہو رہا تھا اور کبھی زرد۔ اس نے پہلے ایک افسر کی طرف دیکھا اور پھر دوسرے کی طرف۔

”نہیں، دوستو، نہیں۔ آپ کو اس طرح سوچنا بھی نہیں چاہیے۔ میں بالکل سمجھ گیا ہوں۔ لیکن باتیں ہٹانے کا نائدہ“ میں اپنے افعال سے ثابت کر دوں گا کہ اس رجنٹ کا عز و وقار۔ خیر، بہر حال، قصور میرا ہی ہے!“ اس کی آنکھیں اشک آلود ہو گئیں۔ ”قصور دار سراسر میں ہوں۔ اچھا، اب آپ اور کیا چاہتے ہیں؟“
”کاؤنٹ، یہ ہوئی نہ بات!“ سٹاف کیپٹن نے رستوف کی طرف مڑتے اور اپنے بھاری ہاتھ سے اس کے کندھے پر تھکی دیتے ہوئے با آواز بلند کہا۔

”میری سنیں۔“ دینی سوف نے کہا۔ ”یہ بہت اچھا آدمی ہے!“
”کاؤنٹ، یہ اور بھی اچھا ہوا ہے،“ سٹاف کیپٹن نے ایک بار پھر اسے یوں اس کے خطاب سے پکارتے ہوئے کہا جیسے وہ اس کے اعتراف پر صا د کر رہا ہو۔ ”یوڑا کیسی لیننسی، چائیں اور معذرت کر لیں۔ جی ہاں، جائیں۔“
”دوستو، میں سب کچھ کرنے کے لیے تیار ہوں۔ اب آپ میری زبان سے ایک لفظ تک نہیں سنیں گے،“ رستوف نے ملتی جلتی لہجے سے کہا۔ ”لیکن میں معافی نہیں مانگ سکتا۔ خدا کی قسم، نہیں مانگ سکتا۔ آپ جو جی چاہے، کریں، یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ میں کسی ننھے منے بچے کی طرح جاؤں اور گڑگڑا کر معافی مانگوں؟“

دینی سوف ہنسنے لگا۔

”اگر تم نے معذرت نہ کی، تو یہ تمہارے حق میں اور بھی برا ہوگا۔ باگ داغچ دل میں رکھ رکھے گا۔ وہ تمہیں

تمھاری ہٹ دھرمی کا مزہ چکھ دے گا،" کرشن نے کہا۔

"خدا کی قسم، یہ ہٹ دھرمی نہیں۔ میں جو کچھ محسوس کر رہا ہوں، اسے بیان کرنے سے قاصر ہوں۔ قاصر ہوں۔"

"خیر، جیسے تمھاری مرضی،" سٹاف کیپٹن نے کہا۔ "اور وہ لفنگا کہاں گیا؟" اس نے دینی سوف سے پوچھا۔
"اس نے ناسازی سطح کی بنا پر رخصت کی درخواست بھیج دی ہے اور کل ویسے بھی اس کی ڈیوٹی نہیں ہے،" دینی سوف نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔

"ناسازی سطح ہی ہونا چاہیے۔ اور کوئی یہاں نہیں چل سکتا،" سٹاف کیپٹن نے کہا۔
"بھلے وہ بیمار ہو یا چنگا، میرے سامنے بالکل نہ آئے۔ میں اس کا گلا گھونٹ دوں گا!" دینی سوف نے غور غور لہجے سے چلائے ہوئے کہا۔

عین اسی وقت ڈرکوف کمرے میں داخل ہوا۔
"آپ کیسے آئے؟" متعدد انسروں نے بیک آواز اس سے دریافت کیا۔
"حضرات، ہمارا میدان جنگ کی طرف کوچ ہو رہا ہے۔ میک نے اپنی تمام فوج سمیت تھپڑا ل دی ہے۔" صحیح نہیں ہے!"
"میں خود اس سے مل چکا ہوں۔"

"کیا؟ آپ نے جیتے جاگتے میک کو دکھا ہے؟ بازوؤں اور ٹانگوں سمیت؟"
"میدان جنگ کی طرف! جنگ ایار، اتنی زبردست خبر لائے ہیں، انھیں تو پوری بوتل پلانا چاہیے! لیکن آپ یہاں کیسے آ گئے؟"

"اس ابلیس میک کی وجہ سے مجھے دوبارہ رجسٹ میں بھیج دیا گیا ہے۔ ایک آسٹروی جرنیل نے میری شکایت کر دی تھی۔ میں نے میک کی آمد پر اسے ہدیہ تبریک پیش کیا تھا۔ رستوف، تمہیں کیا ہوا؟ معلوم ہوتا ہے کہ ابھی ابھی کھوتے ہوئے حمام سے باہر آئے ہو۔"

"یار، ہم گزشتہ دو روز سے عجیب چکر میں پھنسے ہوئے ہیں۔"
ایک ایجنٹ اندر آیا۔ ڈرکوف جو خبر لایا تھا، اس نے اس کی تصدیق کر دی۔ انھیں حکم ملا۔ "کل کوچ ہو گا۔"
"حضرات، ہم محاذ پر جا رہے ہیں!"
"اچھا، خداوند کا شکر ہے! ہم مدتوں سے بیکار بیٹھے تھے!"



"کوٹوروف دائیں دیانا کی جانب¹⁰ چل پڑا۔ اس نے اپنے عقب میں براؤناؤ کے مقام پر دریائے ان (An) کا

درلنس کے مقام پر دریائے ٹراؤن (Traun) کا پل تباہ کر دیا۔ 23 اکتوبر کو روسی فوجیں دریائے انیس (Enns) عبور کر رہی تھیں۔ دوپہر کے وقت روسیوں کی ساز و سامان سے لدی پھندی گاڑیاں، توپ خانہ اور انواج کے پرے پل کے دونوں اطراف انیس قصبے میں سے گزر رہے تھے۔

اس روز موسم قدرے گرم تھا اور بارش ہو رہی تھی۔ مہینہ خریف کا تھا۔ پل کی حفاظت کے لیے پہاڑیوں پر روسی توپ خانہ متعین کر دیا گیا تھا۔ ان پہاڑیوں سے چاروں اطراف کا وسیع و عریض منظر صاف دکھائی دے رہا تھا لیکن کبھی کبھار آری ترچھی بارش مگزی کے جانے کی طرح باریک چادر تان دیتی اور یوں یہ منظر دھندلا جاتا۔ پھر اچانک دھوپ نکل آتی، ایک ایک سارا منظر دوبارہ وسعت اختیار کر لیتا اور دور دور کی اشیاء واضح طور پر نظر آئے لگتیں جیسے ان پر ابھی ابھی رنگ و روغن بھیرا گیا ہو۔ ان پہاڑیوں کے نیچے ننھا سا قصبہ، اپنے سرخ و سفید چھتوں والے مکانات، عظیم گرجے اور پل (جس کے دونوں کناروں پر روسی فوجوں کے جتنے موجود تھے) سمیت دکھائی دے رہا تھا۔ دریائے ڈینیوب کے موڑ پر، جہاں دریائے انیس اس میں شامل ہوتا ہے، چند عری جہاز، ایک جریرہ اور ایک قلعہ اپنا منظر دکھا رہے تھے۔ قلعے کے روگرد پار تھا جو دریائے انیس اور دریائے ڈینیوب کے، جس کا سلکتانی اور نا سوار مغربی کنارہ صنوبر کے جنگلات سے ڈھکا ہوا تھا، مشترکہ پانیوں میں محصور تھا۔ جنگل کے عقب میں سبز چوٹیوں اور نیلگوں دادیوں کا پر سرار پس منظر تھا۔ اس سے بھی آگے خودر صنوبر کے درختوں کا، جو بظاہر آج تک انسانوں کی دست برد سے محفوظ رہے تھے، ایک اور خودر جنگل تھا۔ وہیں کہیں عیسائی رہبوں کی خانقاہ تھی جس کے بلند و بالا مینار ان صنوبر کے درختوں سے بھی اونچے تھے۔ وہیں دریائے انیس کے پار بہت دور پہاڑی پردن کی گھڑ سوار فوج کے گشتی سپاہی دیکھے جاسکتے تھے۔

عقلمندی سپاہ کا کمانڈنگ جرنیل اپنے ایک مشاف افسر کے ساتھ پہاڑی پر ہلکی جنگی توپوں کے مابین کھڑا تھا۔ وہ درین میں سے عسکری نقطہ نگاہ سے علاقے کے خدوخال کا جائزہ لے رہا تھا۔ اس کے ذرا پیچھے ٹیس و تسکی، جسے کمانڈر انچیف نے عقلمندی فوج میں بھیج دیا تھا، ایک توپ گاڑی کے دنبائے پر بیٹھا ہوا تھا۔ جو قازق اس کے ہمراہ آیا تھا، وہ اسے تھمیلدا اور صراحی پیش کر چکا تھا اور وہ ٹیسٹوں اور اصل Doppel kummei سے بعض افسروں کی خاطر بدارت کر رہا تھا۔ یہ افسران بہ طیب خاطر اس کے گرد اکٹھے ہو گئے تھے۔ ان میں سے بعض گیلی گھاس پر آلتی پالتی مارے بیٹھے تھے اور بعض محض دوزانو ہو رہے تھے۔

”جی، جس آسٹروی شہزادے نے یہاں قلعہ تعمیر کر لیا تھا، وہ کوئی احمق شخص نہیں تھا۔ یہ بہت خوبصورت اور پر شکوہ مقام ہے لیکن حضرات، آپ کھا کیوں نہیں رہے؟“ ٹیس و تسکی نے کہا۔

”پرنس، آپ کا بہت، بہت شکریہ“ ایک افسر نے جواب دیا۔ وہ اسی بات پر خوش تھا کہ اسے ایک اہم

نوٹ (Post) ایک قسم کا سورس جس میں مصالحے و روگشت، مہزیاں، جام یا پھل برے ہونے ہیں۔

”Dop pel kummei۔ جرمن شراب۔ اس میں زہرے کی چاشنی ہوتی ہے۔“

شاف افسر کے ساتھ بات کرنے کا موقع مل رہا ہے۔ یہ واقعی خوبصورت جگہ ہے۔ ہم پارک کے بالکل قریب سے گزرے تھے اور وہاں ہمیں دوہرن بھی دکھائی دیے تھے۔ اور یہ محل کتنا پر شکوہ ہے؟“

”پرنس، ملاحظہ فرمائیں،“ ایک اور افسر نے کہا۔ اس کا جی تو بہت چاہتا تھا کہ وہ ایک اور میسٹی کھائے لیکن اسے مزید کھاتے شرم محسوس ہو رہی تھی۔ چنانچہ وہ جھوٹ موٹ یوں ظاہر کر رہا تھا جیسے وہ بنظر غائر گردائیش کے منظر کا جائزہ لے رہا ہو۔ ”ہماری پیادہ فوج پہلے ہی وہاں پہنچ چکی ہے۔ وہ ادھر، گاؤں کے پار چراگاہ میں ہمارے تین جوان کوئی چیز ٹھسٹ رہے ہیں۔ وہ منوں میں اس تلخے کا صفایا کر دیں گے،“ اس نے صریحاً پسندیدگی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

”بالکل کر دیں گے، شک کی کوئی گنجائش ہی نہیں،“ نیس وٹسکی نے کہا۔ ”لیکن میں چاہتا ہوں،“ اس نے اپنے خوش شکل، درمردوب ہونٹوں میں میسٹی دباتے ہوئے مزید کہا، ”کہ میں کھسکا کھسکا نادیاں پہنچ جاؤں۔ اس نے پہاڑی پر واقع خانقاہ کے میناروں کی طرف اشارہ کیا۔ وہ مسکرا رہا تھا، اس کی آنکھیں سکڑ گئیں اور ان میں روشنی جھلکاتے لگی۔“ حضرات، واقعی بڑا لطف آئے گا۔“

افسران ہنس پڑے۔

’ذرا راہبوں کو ڈرائیں گے۔ سنا ہے کہ ان میں چند نوخیز اطالوی حسینائیں ہیں۔ میں اپنی زندگی کے پانچ سال ان کے قدموں پر پنچا در کروں گا۔ یقیناً مانیں، بالکل کر دوں گا؟“

”وہ خود بھی بہت بور ہو رہی ہوں گی،“ ایک افسر نے جو دوسروں کی نسبت ذرا زیادہ جرأت مند تھا، ہنسنے ہوئے کہا۔

دیس اشاف افسر، جو پیش منظر میں کھڑا تھا، ہاتھ کے اشارے سے جرنیل کی توجہ کسی چیز کی جانب دلا رہا تھا۔ جرنیل نے اپنی دوہرین سے دیکھا۔

”ہاں، تم نے ٹھیک کہا، ٹھیک کہا،“ اس نے دوہرین نیچے کرتے اور کندھے چکاتے برا فروختگی سے کہا۔ ”تم ٹھیک کہتے ہو۔ وہ پل پر ابھیں قارئنگ کی زد میں لینا چاہتے ہیں۔ لیکن وہ وہاں بیکار وقت کیوں ضائع کر رہے ہیں؟“

خالف سمت دشمن جنگی آنکھ سے بھی نظر آ رہا تھا۔ اس کے توپ خانے سے دو دوہیا سفید دھواں بلند ہوا اور اس کے ساتھ ہی کہیں دور سے کوئی چلنے کی آواز آئی اور ہمارے لشکر کی بل کی جانب بھاگتے دکھائی دیے۔

نیس وٹسکی دانت نکوستا توپ سے نیچے اتر اور مسکراتا جرنیل کے پاس پہنچا۔

”یوز ایکسی لینسی، آپ ایک آدھ لقمہ لینا پسند فرمائیں گے؟“ اس نے دریافت کیا۔

”بڑی خرابی ہو رہی ہے،“ جرنیل نے اس کے سوال کا جواب دیے بغیر کہا۔ ”ہمارے جوان ضرورت سے زیادہ مست رہیں۔“

”یوز ایکسی لینسی، حکم فرمائیں تو میں گھوڑے پر وہاں چلا جاتا ہوں،“ نیس وٹسکی نے پوچھا۔

”ضرور، مہربانی ہوگی!“ جرنیل نے جواب دیا۔ اور اس نے ایک حکم، جو پسے ہی بالتفصیل جاری کیا جا چکا تھا، دہرا دیا۔ ”ہزاروں سے کہہ دو کہ انھیں سب سے آخر میں دریا عبور کرنا ہے جیسا کہ میں حکم دے چکا ہوں، انھیں بل کوئذرا آتش بھی کرنا ہے۔ درپل پر آتش کیر مادے کا بھی دوبارہ معائنہ کرنا ہے۔“

”بہت اچھا!“ نہیں تسکی نے کہا۔

اس نے قازق کو، جو گھوڑے کی لگام پکڑے کھڑ تھا، بدایا، اور اسے حکم دیا کہ وہ جمیلہ اور صراحی سمیٹ لے۔

گرچہ اس کا چشم بھاری بھر کم تھا لیکن وہ نہایت پھرتی سے اچھلا اور گھوڑے پر سوار ہو گیا۔

”میر خیال ہے کہ اب مجھے راہبات سے ملاقات کا موقع میسر آئی جائے گا!“ اس نے خندہ دامن افسروں سے، جو سے ٹیڑھے میڑھے پہاڑی راستے پر جاتے دیکھ رہے تھے، کہا۔

”کیپٹن، آؤ زردیکھیں کہ یہ کہاں تک مار کرتی ہیں۔ ذرا انھیں آزماؤ تو سہی!“ جرنیل نے توپ خانے کے افسر سے کہا۔ ”وقت بھی گزر جائے گا اور کچھ تفریح بھی ہو جائے گی۔“

”توپوں پر پہنچ جاؤ!“ افسر نے حکم دیا۔

پلک جھپکے میں توپچی بٹلیں بجاتے درخبرے لگاتے پڑاؤ کے اردوں سے توپوں کے پاس پہنچ گئے اور گولے بھرنے لگے۔

”بہر ایک!“ حکم سنائی دیا۔

نمبر ایک سے پھرتی سے ایک طرف چھلانگ لگا دی۔ توپ دغی، گوش خراش آواز سنائی دی، پہاڑی کے نیچے جو ہمارے سپاہی تھے، اس کے سروں کے اوپر ایک گولہ سنسنا اور دشمن سے خاصا دور ادھر ہی گر پڑا۔ دھوکے کا مرغورہ بلند ہوا اور یہ نشان دی کر گیا کہ گولہ کہاں گرا اور پھٹا تھا۔

آواز کی سماعت پر افسروں اور جوانوں کے چہروں پر رونق آگئی۔ وہ سبھی اٹھ کر کھڑے ہو گئے اور پہاڑی کے دامن میں اپنے فوجیوں کی، جو صاف دکھائی دے رہے تھے، اور دشمن کی، جو ادھر آ رہا تھا لیکن ابھی خاصا دور تھا، حرکات و سکنات بخور دیکھنے لگے۔ عین اسی لمحے بادلوں کی اوٹ سے سورج اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ برآمد ہوا۔ توپ کی واحد پرٹکوتہ آواز اور درخشندہ دتا بندہ دھوپ یوں گلے ملیں کہ شگفتگی و فرحت ساری فضا پر محیط ہو گئی۔

7

غیم کی توپوں کے دو گولے پل کے، جہاں جوانوں کا جم غفیر تھا، اوپر سے گزرتے دریا کی دوسری سمت گر چکے تھے۔ پرنس نہیں تسکی گھوڑے سے اتر چکا تھا اور بل کے پتوں بچا کھڑا تھا۔ اس کا بھاری بھر کم جسم بھیڑ اور جنگ کے درمیان میں پھنسا ہوا تھا۔ اس نے ہستے مسکراتے پیچھے مڑ کر اپنے قازق کی، جو دونوں گھوڑوں کی لگامیں تھامے اس سے کئی قدم دور کھڑا تھا، جانب دیکھا۔ جو بھی پرنس نہیں تسکی آگے بڑھنے کی کوشش کرتا، انہوں اور گاڑیوں کا ریلہ اسے

پیچھے دھکیل دیتا۔ وہ دوبارہ جنگل کے ساتھ چپک جا تا اور مسکراے کے عداوہ اور کچھ نہ کر سکتا۔

”برخوردار، ذرا سنبھل کر“ قازق نے ایک گاڑی بان فوجی سے، جو سامان سے لدی پھند کی گاڑی پیادہ سپاہیوں کے، جو ہر ہراس کے یہوں اور گھوڑوں سے لکر رہے تھے، سچ میں سے گزارنے کی تنگ درد کر رہا تھا، چلا کر کہا۔ ”کیسے آدمی ہو؟ ایک منٹ صبر نہیں ہوتا؟ دیکھتے نہیں جرنیل گزرتا چاہتے ہیں؟“

لیکن گاڑی بان پر لفظ ”جرنیل“ کا کوئی اثر نہ ہوا۔ وہ بدستور ان فوجیوں کو، جو اس کے راستے کی دیوار بنے ہوئے تھے، چلا چلا کر متنبہ کر رہا تھا۔

”ٹھیکو، دوستو، بائیں طرف رہو! رک جاؤ!“

لیکن ”دوست“ تھے کہ کندھے سے کندھا بھڑائے، ایک دوسرے کی سنگینوں میں سنگینیں پھنسائے، دھکم پیل کرتے ہجوم در ہجوم، انبوہ در انبوہ، آگے بڑھے جا رہے تھے۔ پرنس نہیں دتسکی جنگل کے اوپر جھکا دیا، ایش کی تیز رفترا شوریدہ سر اور پیاب موجوں کو ستون سے ٹکراتے، جھاگ اڑاتے، غیر مختتم دائرے اور پھنود بناتے دیکھ رہا تھا۔ جب اس نے سر اٹھ کر پیچھے دیکھا تو اسے پل کے اوپر بھی دیکھی ہی نہیں نظر آئیں لیکن یہ لہریں زندہ اور جیتی جاگتی تھیں اور انھیں فوجی، جھل لڑا درسیاں، جھجے دار ٹرڈلی ٹوپیاں، فوجی تھیلے، دتی بندوقیں، سنگینیں، بخردلی ٹوپوں کے نیچے چوڑی ہڈیوں اور پچکلے ہوئے گالوں واسے جھکے، اندہ اور بے رونق چہرے اور لیس دار کچڑ میں، جس نے پل کو ڈھانپا ہو تھا، لتھڑے پاؤں بنا رہے تھے۔ جس طرح نیچے دریا نے ایش کی لہروں پر سفید جھاگ کے گالے نمودار ہو رہے تھے، ایسے ہی پل کے اوپر انسانوں کی ایک رنگی اور بے کیف لہروں کے مابین زبردستی راستہ بنا تا فوجی چھے میں ملیں کوئی انسر، جس کا چہرہ عام فوجی چہرہ سے قطعی مختلف دکھائی دیتا، آ نکلتا۔ جس طرح بعض اوقات کوئی تختہ، دریائی موجوں کے ساتھ بہتا چلا جاتا، بعینہ کوئی ہوندر، جو پیدل آ رہا ہوتا، کوئی ردلی یا کوئی شہر کا باشندہ، پیادہ فوجیوں کی لہروں کے ساتھ بہتا گزر جاتا۔ پھر جس طرح بعض اوقات کوئی چوٹی شہتیر دریا کی سطح پر تیرتا آ کے نکل جاتا، بالکل اسی طرح سامان سے لدی پھندی اور چمڑے سے ڈھکی گاڑی چاروں اطراف سے لوگوں کے ہجوم میں گہری نمودار ہوتی اور پل پر کھسکتی چلی جاتی۔

”انھیں دیکھو، کیا جوق در جوق چھے آرہے ہیں! معلوم ہوتا ہے کہ بند پھٹ گیا ہے!“ قازق نے کہا۔

ہجوم میں یوں پھنسا کھڑ تھا کہ اسے باہر نکلنے کی کوئی امید نظر نہیں آ رہی تھی۔ ”ابھی کتنے، درائیں گے؟“

”ایک کم دس لاکھ!“ پھنسا پرانا کوٹ پہنے ایک خوش مزاج جوان نے جواب دیا۔ اس نے، کچھ ماری اور نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

اس کے پیچھے پیچھے ایک سن رسیدہ مھس آ رہا تھا۔

”اگر اس“ (اس کی مراد غنیمت تھا) ”نے پل پر گولوں کی بارش کر دی،“ اس نے آ زردہ لہجے سے کہا، ”تو تمھیں، تا موقع بھی نہیں ملے گا کہ ذرا رک کر اپنے جسم کو ہی کھرچ سکو۔“

وہ گزر گیا۔ اس کے پیچھے پیچھے ایک اور سپاہی آ رہا تھا۔ وہ چھکڑے پر سوار تھا۔

”ہا کی مار، یہ ناٹگوں کی پٹیاں کہاں گھسیڑ دی ہیں؟“ ایک روٹی نے، جو گاڑی کے پیچھے پیچھے بھاگا آ رہا تھا، اس کے عقبی سامان کی اسٹ پلٹ کر رہا تھا، چلا کر پوچھا۔

وہ درگاڑی دونوں گزر گئے۔ اس کے بعد ایک فوجیوں کا گروہ آیا۔ یہ لوگ جنگ میں تھے اور زور زور سے تپتے لگا رہے تھے۔ صاف معلوم ہوتا تھا کہ وہ ڈٹ کر پیتے رہے ہیں۔

پھر، یہ اس نے کیا کیا، اپنی بندوق اٹھائی اور اس کا کندا اس کے رانٹوں میں گھسیڑ دیا۔ ”ان میں سے ایک، جس نے اوور کوٹ کی آستینیں اوپر پڑھائی ہوئی تھیں، اپنا ہاتھ لہرا کر سرت واغساٹ سے کہہ رہا تھا۔

”ہاں، ہمارا سلی۔ ٹھہ بہت مزیدار تھی!“ دوسرے نے فلک شکاف قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ وہ بھی آگے نکل گئے۔ چنانچہ یرنس نیس دسکی کو یہ کبھی معلوم نہ ہو سکا کہ کندا کس کے رانٹوں میں گھسیڑا گیا تھا، اور اس کے ساتھ پٹھکا کیا تعلق تھا۔

”کیا بھگدیر بھی ہوئی ہے! اگر اس نے ایک بھی گولی چلا دی، تو دل میں یہی خیال آئے گا کہ یہاں قتل عام ہو رہا ہے!“ ایک مار جنٹ نے غصیلے اور ملامت آمیز انداز سے کہا۔

”جب گولی میرے کان کے قریب سے سنسناتی گزری، میں یہی سمجھا کہ اب خیر نہیں!“ ایک فوجی سپاہی نے جس کا ہاتھ ساڈمرفق تھا، کہا۔ اس کے لیے اپنی ہنسی پر قابو پانا مشکل ہو رہا تھا۔ ”واقعی، میں یہی سمجھا ڈرے کہ مارے میری روح فنا ہوتی جا رہی تھی۔ بڑی تکی حالت تھی!“ اس نے یوں کہا جیسے وہ اپنے خوف پر شخی بگھا رہا ہو۔

وہ بھی گزر گیا۔ اس کے پیچھے ایک چھکڑا آ رہا تھا۔ سامان کی جتنی گاڑیاں گزری تھیں، یہ ان سے بالکل مختلف تھا۔ یہ جرمن چھکڑا تھا، اسے دو گھوڑے کھینچ رہے تھے، یہ ٹھسا ٹھس لدا ہوا تھا اور اس پر جو کچھ لدا ہوا تھا، وہ بظاہر کسی گمر کا پور سا زور سامان تھا۔ اس چھکڑے کو ایک جرمن ہانک رہا تھا۔ چھکڑے کے عقب میں ایک عمدہ نسل کی چٹکبری گائے، جس کا ایک تھن پہاڑ کا پہاڑ تھا، بندھی ہوئی تھی۔ سامان کے عین اوپر پروں کے بیڈ پر ایک عورت، جس کی گود میں ایک دودھ پیتا بچہ تھا، ایک بڑھیا اور ایک سرخ و سپید گالوں والی صحت مند جرمن لڑکی بیٹھی تھی۔ لاریب ان اجڑے بگڑے کسانوں کو خاص پر مٹ دیا گیا تھا۔ تمام سپاہیوں کی نگاہیں ان عورتوں پر جمی ہوئی تھیں۔ جب چھکڑا بہت دھیمی رفتار سے چل رہا تھا، ان کی تمام باتوں کا موضوع یہی نوعمر خواتین تھیں۔ ہر چہرے پر تقریباً ایک ہی قسم کی مسکراہٹ رقصاں تھیں اور یہ مسکراہٹ ان بیہودہ خیالات کی آئینہ دور تھی جو وہ ان عورتوں کے بارے میں اپنے تلوکب میں پال رہے تھے۔

”معلوم ہوتا ہے کہ جرمن بھی بھگ رہے ہیں!“

”یہ میس میس سچا دوا!“ ایک اور سپاہی نے جرمن سے، جو غصہ بھی کھا رہا تھا اور ڈر بھی رہا تھا، مخاطب ہو کر کہا۔ جرمن کے چلتا رہا۔

”دیکھو، کیسی گڑبائی بنی جی نہیں، بالکل شیٹن کی بیجیاں ہیں!“
 ”فیاد اتوف، کیا خیال ہے تمہیں ان کے پاس نہ ٹھہرا دیا جائے؟“
 ”یار، اپنی ایسی قسمت کہاں؟“

”کہاں جا رہے ہو؟“ پیادہ فوج کے ایک افسر نے پوچھا وہ سیب کھتا جاتا تھا اور جب خورد لڑکی پاس کی نظر پڑتی، اس کی باتیں کھنکھناتیں۔

جرمن نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ وہ یہ ظاہر کر رہا تھا کہ سوال اس کی سمجھ میں نہیں آیا۔
 ”پسند ہے تو لے لو،“ افسر نے لڑکی کو سیب پکڑاتے ہوئے کہا۔

وہ مسکرا دی اور اس نے سیب پکڑ لیا۔ پل پر موجود دوسرے لوگوں کی طرح پرنس نئس وئسکی بھی اس وقت تک عورتوں کے چہروں سے اپنی آنکھیں اٹھانہ سکا جب تک وہ نظروں سے اوجھل نہ ہو گئیں۔ جب وہ گزر گئیں، وہی سیاہی اور وہی ان کی گفتگو باقی رہ گئی۔ آخر کار وہ سب چلتے چلتے اچانک رک گئے۔ جیسا کہ اکثر ایسے مواقع پر ہوتا ہے، یہاں بھی وہی ہوا۔ ایک کمپنی کے چھٹروں کے گھوڑے اچانک پل کے اختتام پر رک گئے اور یوں سارے ہجوم کو مجبوراً انتظار کرنا پڑا۔

”ہم رک کیوں گئے ہیں؟ یہاں کوئی نظم و ضبط ہونا چاہیے،“ سیاہی کہہ رہے تھے۔ ”لوکی دم، دیکھئے کیوں دے رہے ہو؟ ذرا صبر نہیں کر سکتے؟ اگر اس نے پل کو آگ لگا دی، صورت حال بدتر ہو جائے گی۔ دیکھو، یہاں ایک افسر بھی پھنسے ہوئے ہیں۔“ رکے ہوئے ہجوم سے بھانت بھانت کی آدڑیں بلند ہو رہی تھیں۔ بھی لوگ آپس میں دھکم دھکا ہو رہے تھے اور ایک دوسرے کو پل کے سرے کی جانب دھکیل رہے تھے۔

پل کے نیچے دریائے نئس کے پانیوں پر نظریں دوڑاتے دوڑاتے، اچانک پرنس نئس وئسکی کو ایک ایسی آواز سنائی دی جو اس نے پہلے نہیں سنی تھی۔ یہ آواز کسی ایسی چیز کی تھی جو خاصی بڑی تھی اور پانی میں بچکولے کھاتی پرست آگے بڑھی چلی آرہی تھی۔

”دھیان رکھنا، کتنی دور جاتی ہے!“ قریب کھڑے سیاہی نے گیسیر لہجے سے کہا۔
 ”یہ شاید ہمیں بھت دلا رہی ہے کہ ہم بھی ذرا تیز چلیں،“ دوسرے نے بے چین ہو کر کہا۔
 ہجوم پھر آگے بڑھنے لگا۔

پرنس نئس وئسکی کو احساس ہوا کہ یہ تو توپ کا گولہ ہے۔

”قازق، ابے، میرا گھوڑا؟ اس نے ہا آواز بلند کہا۔“ ارے، تم نے راستہ کیوں روک رکھا ہے؟ ایک طرف ہٹ جاؤ ایک طرف ہٹ جاؤ!“

وہ بڑی مشکلوں سے اپنے گھوڑے تک پہنچا۔ وہ آگے بڑھتا جا رہا تھا اور ساتھ ساتھ ”ہنو، ہنو“ چلاتا جاتا تھا۔ سیاہی بچک کر ایک طرف ہٹنے لگے تاکہ اس کے لیے راستہ بن سکے لیکن وہ معا آگے بڑھ آئے اور یوں اس کی

ہاتھیں ان کے بچ پھنس کر رہ گئیں۔ تاہم جو لوگ اس کے قریب تھے، الزام انہیں نہیں دیا جاسکتا تھا کیونکہ خود انہیں عقب سے زبردست دھکے پڑ رہے تھے۔

”نہیں تسکی! نہیں تسکی! اے لعنتی!“ اسے عقب سے کرحشت آواز سنائی دی۔

نہیں تسکی نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ کوئی چند رہ قدم دور اسے واسکا دینی سوف کا سرخ چہرہ دکھائی دیا۔ دونوں کے مابین بیادہ نوج کے پر ہجوم رہیے نے، جو آگے کی جانب بڑھ رہا تھا، دیوار کھڑی کی ہوئی تھی۔ دینی سوف نے اپنے زولید بالوں پر پھیلی جانب لٹپلی ہوئی تھی اور اس نے اپنا چہا ہانکے انداز سے کندھے پر ڈال ہوا تھا۔

”ان شیطان کے چبیوں، ان اٹلیس کے تھنوں، سے کہو کہ مجھے گزرنے دیں،“ دسکا دینی سوف نے چلا کر کہا۔

دوغینہ غضب سے کانپ رہا تھا۔ اس کی کونکلوں سے بھی زیادہ سیاہ آنکھیں، اپنی خونخوار پتلیوں سمیت، چمک اور گھوم رہی تھیں جب کہ وہ خود اپنی نیام میں بند شمشیر کو اپنے ہاتھ میں، جو اتنا ہی سرخ تھا جتن کہ اس کا چہرہ، پکڑے فضا میں لہرا رہا تھا۔

”اٹھاہ اواسیا“ نہیں تسکی نے، جس نے اسے دیکھ کر دلی مسرت کا اظہار کیا، کہا۔ ”یہاں کیا کر رہے ہو؟“

”ہمارے سکواڈرن کے لیے آگے بڑھنا ناممکن ہو گیا ہے!“ دینی سوف نے غصے سے لال چلا ہوتے، اپنے سفید دانت کھوستے اور اپنے امیل بدوی گھوڑے کو ہمیز لگاتے چلا کر جواب دیا۔ دائیں بائیں گھوڑے کے جسم پر تنگی نہیں چبھ رہی تھیں۔ وہ اپنے کان پکڑ پکڑا، نتھنے پھلا اور دہانے سے جھاگ اڑا رہا تھا۔ جب وہ اپنے سم بل کے تختے پر پھٹا، تو گونج کی آواز پیدا ہوتی۔ بظاہر معلوم ہو رہا تھا کہ اگر اس کے سوار نے اسے جارت دے دی، وہ جنگل کے پار چھلانگ لگا دے گا۔

”یہ کیا ہے؟ آدی ہیں یا بھیڑیں؟ بالکل بھیڑیں! ہٹو، راستہ دو! اے جھکڑے والے ابے شیطان کی اولاد! رک جاؤ! میں اس تلوار سے تمہاری جک بوتلی کروں گا!“ اس نے چلا کر کہا۔ ”اس نے واقعی اپنی تلوار نیام سے نکال لی اور اسے فضا میں لہرا لے لگا۔

سپاہیوں کے چہروں پر مردنی چھا گئی اور وہ گھبر کر پیچھے کی جانب سکر گئے۔ دینی سوف نہیں تسکی سے جا ملا۔

”یہ کیا؟ آج تم نشے میں نہیں ہو؟“ پرنس نہیں تسکی نے اس کے قریب آنے پر اس سے پوچھا۔

”جینے پلانے کا موقع ہی نہیں ملتا،“ واسکا دینی سوف نے جواب دیا۔ ”یہ سارا دن رجنٹ کو ادھر ادھر بھگائے بھرتے ہیں۔ اگر ہمیں لڑنا ہی ہے۔ پھر آئیں، لڑیں، دیکھیں بات کی؟ لیکن خدا جانے یہ سب کھٹ راگ کیا ہے؟“

”واہ، آج تو تم بالکل پانکے بنے ہوے ہو!“ پرنس نہیں تسکی نے اس کے نئے چغے، اور اس کی کانٹھی کے نئے خلاف کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

دینی سوف مسکراتے لگا۔ اس نے اپنے جڑی کیسے سے سطر رومال نکال اور اسے پرنس نہیں تسکی کی ناک تلے دھکیل دیا۔

”بالکل! میں میدان کارز میں جا رہا ہوں۔ میں نے شیو بنالی ہے، دانت صاف کر لیے ہیں اور اپنے جسم پر خوشبو لے لی ہے۔“

ایک توپرس نہیں تسکی کی جی شخصیت بارعب تھی، پھر اس کے ساتھ اس کا قارق تھا اور اوپر سے دہلی سرف کا، جو اپنی شمشیر لہرا رہا تھا اور پھپھڑوں کا پورا زور لگا کر چلا رہا تھا، عزم آہنی تھا۔ چنانچہ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ ہجوم میں پھنستے پھنساتے اور گھسٹتے گھسٹاتے پل کے دوسرے کنارے پر پہنچ ہی گئے اور وہاں انھوں نے پیادہ فوج کو روک لیا۔ وہیں پرس نہیں تسکی کو وہ کرٹل بھی، جسے اس نے پیغام پہنچانا تھا مل گیا۔ جب اس کا فریضہ مکمل ہو گیا، وہ گھوڑے پر سوار ہوا اور پس چل پڑا۔

راستہ صاف کر چکنے کے بعد دہلی سرف پل کے کنارے پر نکارہا۔ وہ اپنے نا آختہ گھوڑے کی، جو زمین پر پاؤں شیخ رہا تھا اور سہڑا کر اپنے ساتھیوں کے قافلے کے ساتھ جاٹنے کی کوشش کر رہا تھا، لگام ڈھبے ڈھالے انداز سے پکڑے اپنے سکواڈرن کو اپنی جانب آتے دیکھ رہا تھا۔ سوس کے پل کے تختوں سے ٹکرائے سے کچھ ایسا غلط بلند ہو رہا تھا کہ معلوم ہوتا تھا کہ بے شمار گھوڑے سر پٹ بھاگے آرہے ہیں۔ آگے آگے افسران تھے اور ان کے پیچھے پیچھے جوان، جو چار چار کی ٹولیاں بنائے ایک دوسرے کے برابر برابر چلے آرہے تھے۔ سکواڈرن سارے پل پر پھیل چکا تھا اور اس کا ہر اول دوسرے سرے کو چھونے لگا تھا۔

فوج کی مختلف یونٹوں کی جب ایک دوسرے سے ٹکڑھ بھٹھرتی ہے، ان کا باہمی رویہ کچھ اس قسم کا ہوتا ہے جیسے انھیں ایک دوسرے سے کوئی تعلق واسطہ نہ ہو بلکہ وہ اس سے بھی ایک قدم آگے نکل جاتی ہیں، ایک دوسرے کے خلاف بغض کا مظاہرہ کرتی ہیں اور ایک دوسرے پر آوازے کستی ہیں۔ کچھ اسی قسم کے احساسات و جذبات کا اظہار پیدل فوج کے وہ سپاہی کر رہے تھے جنھیں پل پار کرنے سے روک دیا گیا تھا اور جو روندی مسلی کیچڑ میں دھنسنے گھوڑوں پر سوار صاف ستمرے اور چھیل چھیلے ہزاروں کو منظم انداز سے گزرتے دیکھ رہے تھے۔

”واہ بھائی واہ، کی رنگ نکالا ہے سالوں نے، معلوم ہوتا ہے بن ٹھن کر میسے جا رہے ہیں!“ ایک نے آواز دے کر۔
”کام کے نہ کاج کے، سومن اناج کے۔ انھیں پیادہ ہی اس لیے جاتا ہے کہ ان کی نمائش کی جائے!“
دوسرے نے لقمہ دیا۔

”بے پیدل چلنے والا، دھول مت اڑاؤ!“ ایک ہونزار نے ایک پیدل سپاہی کا، جس پر اس کے اچھلتے کودتے گھوڑے نے ابھی ابھی کیچڑ کے پھینٹے برساتے تھے، مذاق اڑاتے ہوئے کہا۔

”میرے بس میں ہوتا تو میں تمھاری کمر پر فوجی تھیلا، دکر تمھیں وردن کی مشقت پر بھیج دیتا۔ تمھارا یہ طلائی فیتہ کچھ تو گھسٹا!“ پیدل سپاہی نے آستین سے کیچڑ آلود چہرہ پر مچھتے ہوئے کہا۔ ”جس طرح تم وہاں بیٹھے ہو، مرد کم، کیوتری زیادہ معلوم ہوتے ہو۔“

”ذکن، افسروں کو چاہیے کہ تمھیں بھی گھوڑے پر بٹھا دیں۔ بہت اچھے رکھائی دو گے۔ ہونہ، کیا خیال

ہے۔“ ایک کارپورل نے ایک کوتاہ قامت دبے پتلے سپاہی سے، جو اپنے تھیلے کے بوجھ تلے دوہرا ہوا جا رہا تھا، دل لگی کرتے ہوئے کہا۔

”اپنی ٹانگوں میں لٹھی پھسالو۔ سمجھ لو کہ گھوڑے پر سوار ہو گئے،“ ایک ہونڈار نے چلا کر کہا۔



پیادہ فوج کے بھایا سپاہیوں نے صفیں درست کر لیں۔ یوں وہ با آسانی اور بہ غلٹ میں عبور کر گئے۔ آخر کار جب سماں سے مددے پھندے تمام چھکڑے گزر گئے، بھیڑ چھٹ گئی اور آخری بٹالین مل پار کرنے لگی۔ دینی سوف کے سکواڈرن کے بعض ہونڈاروں کو دشمن کا سامنا کرنے کے لیے دریا کے دوسرے کنارے پر رہنے دیا گیا۔ اگرچہ مخالف سمت کی پہاڑیوں سے دشمن دور فاصلے پر دیکھا جاسکتا تھا لیکن نیچے پل سے وہ ابھی نظر نہیں آ رہا تھا کیونکہ اس دریا کا، جس میں دریا بہہ رہا تھا، افق صرف آدھ دور میل دور بلند گھاٹی کی وجہ سے محدود ہو گیا تھا۔ اس گھاٹی کے سامنے ویرانہ تھا جس میں ہمارے قازق گھڑ سوار دستے کے گشتی چہرے دار یہاں وہاں گھومتے پھرتے دیکھے جاسکتے تھے تاکہ وہ دشمن کی قتل و حرکت پر نظر رکھ سکیں۔ مخالف ڈھواں کی چوٹی پر جو سڑک بنی ہوئی تھی، اچانک اس پر نیلی دردوں میں ملیں فوجی بمبار توپ خانہ نمودار ہوئے۔ یہ فرانسیسی تھے۔ قازق گشتی سپاہی بھاگتے دوڑتے پہاڑی سے نیچے اتر آئے۔ اگرچہ دینی سوف کے سکواڈرن کے تمام افسروں اور جوانوں نے یہ حملہ یہ دینے کی پوری کوشش کی تھی کہ ان کا دھیان کہیں اور ہے ورنہ آپس میں محض جھمپیں کر رہے ہیں لیکن درحقیقت ان کی توجہ ہمہ وقت پہاڑی کی چوٹی پر مرکوز تھی اور وہ یہ سوچ رہے تھے کہ وہاں کیا ہو رہا ہوگا۔ اتنے میں انھیں افق پر دھبے ابھرتے دکھائی دیتے۔ انھوں نے انھیں پہچان لیا کہ یہ دشمن کے سپاہی ہیں۔

سہ پہر کے وقت موسم نکھر گیا اور دریا نے ڈینیوب اور اس سے ملحقہ پہاڑیوں کے اوپر آفتاب، جو آہستہ آہستہ مغرب کی جانب بڑھ رہا تھا، اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ چمک رہا تھا۔ ہوا بالکل بندھی اور دھندلے دھندے کے بھرپور کی چوٹی سے دشمن کے زور شور سے باتیں کرنے اور بگل بجانے کی آوازیں صاف سنائی دینے لگی تھیں۔ اب گھڑ سوار فوج کے محدودے چند گشتی سپاہیوں کے ماسوا سکواڈرن اور دشمن کے مابین اور کچھ نہیں تھا۔ ان دونوں کے درمیان صرف سات سو گز وسیع ویرانہ حائل تھا۔ دشمن قازق بگل بند کر چکا تھا اور وہ سنگین، بھیب، ناقابل رسائی غیر مرئی حد فاصل، جو دونوں کو ایک دوسرے سے علیحدہ کرتی ہے، اور بھی واضح طور پر محسوس کی جانے لگی تھی۔

”اس حد فاصل سے، جو زندگی اور موت کے درمیان باریک پردہ حائل کرتی ہے، ایک قدم بھی ادھر بڑھو، تو سمجھ لو کہ اب تم سب بھٹی، کرب و اذیت اور اجل کی وادی میں داخل ہو گئے اور وہاں کیا ہے؟“ وہاں، اس کھیت کے پار، اس درخت کے پیچھے، اس چھت کے نیچے؟ یہ سب چیزیں دھوپ میں چمک رہی ہیں لیکن کوئی نہیں جانتا کہ وہاں کون ہے۔ لیکن کون ہے جو جانتا نہیں چاہتا؟ اس حد فاصل کو عبور کرنے کا تصور ہی دل پر ہوں غاری کر دیتا

ہے لیکن اسے عبور کرنے کو جی لپچاتا بھی ہے۔ تم خوب جانتے ہو کہ تمہیں اس کے پار جانا ہی ہو گا۔ ورنہ یہ معلوم کرنا ہی ہو گا کہ دوسری طرف کیا ہے بالکل اسی طرح جس طرح کسی دن تمہیں لازماً یہ دریافت کرنا ہو گا کہ موت سے آگے کیا ہے۔ لیکن تم تو انا ہو، قوی ہو، صحت مند ہو، تمہارے اندر جوش بھرا ہوا ہے، تمہارا خون کھوس رہا ہے اور تم ان لوگوں میں محصور ہو جو تمہاری ہی طرح تو انا ہیں اور جوش و جذبے سے معمور۔ "ہر وہ شخص، جو اپنے سامنے اپنے دشمن کو دیکھتا ہے، اس طرح سوچتا نہیں، تو کم از کم اس طرح محسوس ضرور کرتا ہے۔ اور یہی موقع پر جو کچھ دوسرا پذیر ہوتا ہے، اس کے بارے میں اس کے ذہن میں جو تاثرات مترتب ہوتے ہیں، انہیں یہ احساسات ایک خاص قسم کی تجلی اور مسرت بخش چٹخارہ عطا کر دیتے ہیں۔

اس گھائی سے، جس پر دشمن قابض تھا، دھوکے کا مرغولہ فف میں بلند ہوا اور ایک توپ کا آہنی گولہ ہورار سکواڈرن کے سروں کے اوپر سے سنسنا تا گزر گیا۔ افسرین، جو اکٹھے کھڑے تھے، بکھر گئے۔ ہوزاروں نے نہایت احتیاط سے اپنے گھوڑوں کی صف بندی شروع کر دی۔ پورے سکواڈرن پر خاموشی طاری تھی۔ سبھی کی نگاہیں سامنے اپنے دشمن پر اور حکم کے انتظار میں اپنے سکواڈرن کمانڈر پر جمی ہوئی تھیں۔ توپ کا دوسرا اور پھر تیسرا آہنی گولہ آیا اور سروں کے اوپر سے گزر گیا۔ صاف تھا ہر تھا کہ حریف ہوزاروں کو اپنا نشانہ بنا رہا تھا لیکن گولے تھے کہ ایک ہی رفتار سے آتے، ان کے سروں کے اوپر سے گزرتے اور ان کے عقب میں کہیں جا گرتے۔ ہوزاروں نے ایک بار بھی پیچھے مڑ کر نہ دیکھا لیکن جو نہی گولہ آتا، سروں کے اوپر ہی۔ وپ اس کے گزرنے کی صدا سنائی دیتی، وہ سب کے سب، جن کے چہرے اتنے مماثل لیکن اتنے مختلف تھے، اپنی سانسیں روک لیتے، اپنی رکابوں میں اچھل پڑتے اور دوبارہ نیچے گر پڑتے۔ کچھ یوں معلوم ہوا تھا جیسے یہ سب کچھ کسی حکم کے تحت ہو رہا ہو۔

اپنی گردنیں گھمائے بغیر سپاہی ایک دوسرے کو ترجیحی نگاہوں سے دیکھتے۔ سبھی کو یہ احساس تھا کہ ان کے ساتھ کسی طرح متاثر ہوئے ہیں۔ دینی سون سے بگلی تک، ہر شخص کے چہرے اور ٹھوڑی پر کشمکش، گھبراہٹ اور بے چینی کی یکساں لکیریں نمودار ہو چکی تھیں۔ سارے جٹ سپاہیوں کو یوں گھور گھور کر دیکھ رہا تھا جیسے وہ انہیں کچا چا جانے کی دھمکی دے رہا ہو۔ جب بھی گولہ اوپر ہی وپر گزرتا، کیڈٹ سرانوف پھرتی سے سر نیچے جھکا لیتا۔ ران پر اپنی لنگڑی ٹانگ کے باوجود رخ خوبصورت گھوڑا تھا۔ سوار دستوف میسرے میں شامل تھا۔ اس کے چہرے پر در سے کے اس طالب علم کا، جسے یک ایسا امتحان دینے کے لیے، جس کے متعلق اسے کامل یقین ہو کہ وہ اس میں سرخرو ہو گا، حاضرین کی کثیر تعداد کے سامنے بلایا گیا ہو، احساس طمانیت و مسرت جھلک رہا تھا۔ اس کا چہرہ روشن اور پرسکون تھا اور وہ ہر شخص کی جانب یوں دیکھ رہا تھا جیسے انہیں یہ سمجھ رہا ہو کہ "دیکھو، میں اس گولہ باری میں بھی کتنا آسودہ اور مطمئن ہوں۔" لیکن اس کے چہرے پر بھی غیر ارادی طور پر دہن کے قریب وہی قدرے نئی اور درشت لکیر ابھرائی تھی۔

"یہ دہریے کون اچھل رہا ہے؟ کیڈٹ سرانوف! بری بات ہے۔ میری طرف دیکھو!" کیپٹن دینی سون

نے، جو آرام سے ایک جگہ کھڑا نہیں رہ سکتا تھا اور سکوڈرن کے سامنے ادھر ادھر گھوڑا دوڑانے پھر رہا تھا، چلا کر کہا۔
 دینی سوف کا رویں دار، سانوا اور چپٹی ناک والا چہرہ اور اس کا پورے کا پورا کوتاہ لیکن گٹھیل جسم اپنے ہال دار
 سیدے ہاتھوں اور چھوٹی چھوٹی لیکن موٹی انگلیوں سمیت بالکل ویسا ہی جیسا کہ وہ عموماً لیکن خصوصاً شام کے وقت
 جب کہ وہ دو بوتلیں چڑھ چکا ہوتا تھا، نظر آتا تھا، دکھائی دے رہا تھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ وہ معمول سے زیادہ سرخ
 ہو رہا تھا۔ اپنے جھبرے سرکویوں پچھلی جانب جھٹکتے، جس طرح پرندے پانی پیتے وقت جھٹکتے ہیں اور اپنے عمدہ در
 اصل عربی گھوڑے کو بے رحمی سے مہیر لگاتے وہ سرپٹ سکوڈرن کے دوسرے بازو کی جانب بھاگنے لگا۔ وہ یوں
 دکھائی دے رہا تھا جیسے ابھی ابھی زین کی عقی جانب گز پڑے گا۔ اس بھگ دوڑ کے دوران میں وہ جوانوں کو چلا چلا
 کر حرکت آواز سے حکم دے رہا تھا کہ وہ اپنے اپنے پستولوں کا خیال رکھیں۔ گھوڑے پر سوار وہ کرشن کے پاس
 پہنچا شاف کمیشن جس گھوڑی پر سوار تھا، اس کی کانٹھی چوڑی اور طبیعت مسکین تھی۔ اس کی اپنی مونچھیں لمبی اور چہرہ
 حسب معمول سنجیدہ تھا لیکن اس کی آنکھیں معمول سے بڑھ کر روش اور فروزاں تھیں۔ وہ آہستہ آہستہ چلا دینی سوف
 کی جانب آیا۔

”خیر، اس نے دینی سوف سے کہا۔ ”لڑائی کی نوبت نہیں آئے گی۔ آپ خود دیکھ لیں گے کہ ہم پیچھے ہٹ
 جائیں گے۔“

”خدا جانے کیا ہو رہا ہے“ دینی سوف نے غرا کر کہا۔ ”اھا، رستوف!“ وہ کیڈٹ کے سرور و شاداں
 چہرے کو دیکھ کر چلایا، ”خیر، تمہیں زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑے گا۔“

اور وہ انداز پسندیدگی مسکرانے لگا۔ اس میں شک نہیں تھا کہ کیڈٹ کو دیکھ کر وہ واقعی خوش ہوا تھا۔ رستوف
 سر سے پاؤں تک نہال ہو گیا۔ عین اسی لمحے کمانڈر پل پر نمودار ہوا۔ دینی سوف گھوڑا سرپٹ دوڑاتا اس کی جانب
 چل چلا۔

”یوڑا کیسی لینس، ہمیں حملہ کرنا چاہیے! میں انہیں بھگا دوں گا!“

”حملے کا کوئی حکم موصول نہیں ہوا،“ کمانڈر نے اکتاہٹ سے جواب دیا اور اپنا منہ یوں کیٹر لیا جیسے کسی کبھی
 نے اس کا ناک میں دم کر رکھا ہو۔ ”تم یہاں کیوں رکے ہو؟ دیکھتے نہیں کہ خبر بھی پیچھے جا رہے ہیں؟ اپنا
 سکوڈرن پیچھے لے جاؤ۔“

سکوڈرن میں عبور کر گیا۔ ایک بھی آدمی ضائع کیے بغیر وہ گولہ باری کی زد سے باہر نکل گیا۔ دوسرے
 سکوڈرن نے، جو اس جگہ تھا جہاں جھڑپ کا امکان ہو سکتا تھا، اس کی تھلید کی اور آخری قازق بھی دریا کے کنارے
 سے ادھر آ گیا۔

پل عبور کرنے کے بعد پادلو گرات رجمنٹ کے دونوں سکوڈرن پہاڑی پر چڑھ گئے۔ رجمنٹل کمانڈر کارل
 یوکر، فوج شہریت گھوڑا بھاگا تا دینی سوف کے سکوڈرن کے ساتھ آ ملا اور حرے حرے سے چلا آگے نکل گیا۔ اس

کا راستہ رستوف سے زیادہ دور نہیں تھا وراگرچہ تلہنن کے واقعے کے بعد یہ ان کی پہلی ملاقات تھی، اس نے اس کی جانب مطلق توجہ شدی۔ رستوف کو محسوس ہوا کہ وہ میدان کارنہ میں ہے اور اس شخص کے رحم و کرم پر اس پر یہ انکشاف ہو کہ اس آدمی کے ساتھ اس کا جو تنازعہ ہوا تھا، اس میں قصور سراسر اس کا پتا تھا۔ چنانچہ جب رستوف کمانڈر اس کے قریب سے گزرا، وہ اس کے کسرتی جسم، صحت مند کمر اور گردن سے، جس پر سرخ خوبصورت بال لہلہا رہے تھے، اپنی توجہ ہٹانہ سکا۔ اسے خیال آیا کہ ”کمانڈر جو مجھ سے یوں ہم کلام ہوئے بغیر گزر گیا ہے، ظاہر یہ کر رہا ہے کہ اس نے مجھے دیکھا ہی نہیں اور معلوم یہ ہوتا ہے کہ اس کا اصل نٹ میری جرات اور دلیری کا امتحان لینا ہے۔“ چنانچہ وہ اپنے گھوڑے پر تن کر بیٹھ گیا اور اپنے گرد پیش یوں دیکھنے لگا جیسے وہ بہت خوش ہو۔ اس کے ذہن میں ایک خیال یہ آیا: ”کمانڈر میرے قریب سے اس لیے گزرا ہے تاکہ وہ اپنی بہادری کی نمائش کر سکے۔“ پھر اچانک ایک اور خیال بجلی کے کوندے کی طرح اس کے ذہن میں لپکا کہ اس کا دشمن عمداً اسکو ڈرنے کو ایک ایسی مہم پر بھیج دے گا جس کا حاصل تو کچھ نہ ہو، لیکن اصل مقصد اسے، یعنی رستوف کو، سزا دینا ہو۔ اس نے دل ہی دل میں تصور کیا کہ ”حملے کے بعد بوگ دانو وچ اس جگہ پہنچ جائے گا جہاں میں رخی حالت میں پڑا ہوں گا اور بڑی درپردہ کا مظاہرہ کرتے ہوئے میری طرف صلح کا ہاتھ بڑھا دے گا۔“

اونچے کندھے والا ڈرکوف، جسے پاؤ لوگ رات رجنٹ کے تمام ہوز ارا چھی طرح جانتے تھے کیونکہ اسے اس رجنٹ کو چھوڑے زیادہ دن نہیں بیتے تھے، گھوڑے پر سوار رجنٹل کمانڈر کے پاس آیا۔ جنرل ہیڈ کوارٹرز سے نکالے جانے کے بعد وہ رجنٹ میں واپس نہیں آیا تھا بلکہ اس نے کچھ اس قسم کا چکر چلایا کہ وہ پرنس باگ راتیاں کا اردلی فسر مقرر ہو گیا۔ اس کا کہنا یہ تھا: ”میں بے وقوف تھوڑے ہی ہوں کہ کاڈ پر اپنی جان کھپاؤں، جب کہ سٹاف میں شامل ہونے سے ہاتھ پاؤں بھی خاص ہلنا نہیں پڑتے اور یافت بھی کہیں زیادہ ہوتی ہے۔“ اب وہ غنیمت پاد کے کمانڈر کا حکم لے کر اپنے سابق چیف کے پاس جا رہا تھا۔

”کرنل!“ اس نے رستوف کے دشمن کو گھیر سنجیدگی سے مخاطب کرتے اور اس کے ساتھیوں پر سرسری نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ ”حکم یہ ہے کہ یہاں رکا جائے اور پل کونڈر آتش کر دیا جائے۔“

”یہ حکم کسے دیا گیا ہے؟“ کرنل نے منہ بناتے ہوئے کہا۔

”کرنل، میں دثوث سے تو نہیں کہہ سکتا کہ حکم کسے دیا گیا ہے،“ لیفٹیننٹ نے نہایت سنجیدگی سے جواب دیا۔ ”پرنس نے مجھے صرف یہ حکم دیا تھا: جاؤ اور کرنل کو بتاؤ کہ ہوز ارا فوراً اداہیں آجائیں اور پل کونڈر آتش کر دیں۔“

ڈرکوف کے پیچھے پیچھے ایک اور سٹاف افسر گیا۔ وہ بھی کرنل کے نام ہی پیغام لایا تھا۔ اس سٹاف افسر کے بعد تو منڈ پرنس نیس و تسکی اپنا تازق گھوڑا، جسے اس کا بوجھ اٹھانے میں بڑی مشکل پیش آرہی تھی، سرپٹ دوڑاتا ہوا آ پہنچا۔

”کرنل، یہ کیا؟“ وہ ابھی اپنا گھوڑا اہنگائے آ رہا تھا، ورنہ وہ سے ہی چلانے لگا تھا۔ ”میں نے آپ سے عرض

یہ تھا کہ پل کو آگ لگا دی جائے۔ اب کسی شخص نے سارا معاملہ گزیرا دیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہاں جتنے بھی لوگ موجود ہیں، ان سب کے دماغ ماؤف ہو گئے ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا ہو رہا ہے۔“

کرٹل نے، رادنا رجنٹ کو روک لیا اور پرنس نہیں دتسکی کی طرف متوجہ ہو گیا۔

”آتش گیر مادے کے متعلق تم نے ضرور بات کی تھی،“ اس نے اپنے جرمین لہجے میں کہا۔ ”لیکن پل کو آگ لگانے کے بارے میں تم نے کچھ نہیں کہا تھا۔“

”لیکن، مائی ڈیر فیو،“ پرنس نہیں دتسکی نے گھوڑے کی لگام کھینچتے ہوئے کہا۔ اس نے اپنی ٹوپی اتاری اور اپنا بھاری بھر کم ہاتھ اپنے بالوں پر، جو پسینے سے کیلے ہو رہے تھے، پھیرنے لگا۔ ”جب آپ نے آتش گیر مادہ پل پر رکھ دیا تھا، پھر یہ بتانے کی کیا ضرورت تھی کہ اسے آگ لگا دی جائے۔“

”سٹرٹاف، فیفسر، میں تمہارا ڈیر نیلو نہیں ہوں۔ اور تم نے مجھے یہ نہیں کہا تھا کہ میں پل کو آگ لگا دوں! میں اپنے زرائع خوب سمجھتا ہوں اور میرا دستور یہ ہے کہ میں احکام پر حرف بہ حرف¹² عمل کرتا ہوں۔ تم نے کہا تھا کہ پل جلایا جائے گا۔ اب میں تم سے ان تمام اشیاء کا جو تقدس کا درجہ رکھتی ہیں، واسطوے کر پوچھتا ہوں کہ اس سے یہ کیسے فرض کر لیا گیا کہ مجھے یہ معلوم ہو گیا تھا کہ یہ کس نے جلانا ہے۔“

”اچھا۔ لیکن ہوتا تو ہمیشہ ایسے ہی ہے،“ پرنس نہیں دتسکی نے اپنا ہاتھ لہراتے ہوئے کہا۔ ”تم یہاں کیسے آ گئے؟“ اس نے ڈرکوف کی طرف مڑ کر پوچھا۔

”میں بھی یہی پیغام لے کر آیا تھا۔ لیکن تمہارا جسم تو گیلا ہو رہا ہے۔ آؤ، ذرا نچوڑ دوں۔“

”سٹرٹاف، فیفسر، تم کہہ رہے تھے۔“ کرٹل نے اپنے لہجے میں مقلوبیت بھرتے ہوئے کہا۔

”کرٹل،“ سٹاف افسر نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ”آپ ذرا جلدی کریں، ورنہ دشمن اپنی گجائیں¹³ آگے لے آئے گا اور ہم پر گریپ شٹل کی بارش کر دے گا۔“

کرٹل نے خاموشی سے سٹاف افسر، ٹومند پرنس نہیں دتسکی اور ڈرکوف کی جانب دیکھا اور اپنی بھوئیں سکھڑ لیں۔

”میں لگا دوں گا آگ پل کو،“ اس نے نہایت سنجیدگی سے کہا۔ گویا کہ وہ انھیں یہ بتا دینا چاہتا تھا کہ اس کے ساتھ جو نارواریہ اختیار کیا گیا ہے، اس کے باوجود وہ صحیح طرز عمل کا مظاہرہ کرے گا۔

کرٹل نے اپنی لائیو اور گھیللی ٹانگوں کے ساتھ گھوڑے کو یوں ہمیز لگایا گویا کہ اس ساری بد مزگی کا ذمہ ور وہ تھا۔ وہ وہاں سے چلا اور سکواڈرن نمبر 7 کو، جس میں دینی سوف کی سرکردگی میں رستوف خدمات سرانجام دے رہا تھا، حکم دیا کہ وہ پل کی طرف مراجعت کرے۔

”بالکل وہی ہو جو میں نے سوچا تھا،“ رستوف نے اپنے آپ سے کہا۔ ”یہ میرا امتحان لینا چاہتا ہے۔“ اس کا دل اٹھ گیا اور سارا خون چہرے میں سمٹ آیا۔ ”وہ آج دیکھ لے گا کہ میں ڈراک نہیں ہوں!“ اس نے سوچا۔

سکواڈرن کے جوانوں کے بے فکر چہروں پر پھر وہی سنجیدگی غالب آ گئی جو گولہ باری کے دوران میں ان پر

طاری ہوئی تھی۔ رستوف اپنے دشمن کرنل کی طرف ٹھٹھکی باندھ کر دیکھتا رہا۔ اسے امید تھی کہ اس نے جو قیاس آرائی کی تھی، اس کی وہاں توثیق ہو جائے گی۔ لیکن کرنل، جیسا کہ اس کا دستور تھا، میدان جنگ میں اپنی صورت پر مہارت اور خشونت اوڑھ لیتا۔ اب بھی اس کی یہی کیفیت تھی۔ اس نے ایک مرتبہ بھی مڑ کر رستوف کی طرف نہ دیکھا۔

حکم کے الفاظ چاروں طرف سنائی دیے۔

”جلدی! جلدی!“ اسے متعدد آوازیں اپنے قریب سنائی دیں۔

ہوڑ رگھوڑوں سے نیچے اترنے لگے۔ جلد بازی میں ان کی تلواریں لگاموں میں پھنس گئیں اور ان کے مہیز جھنجھٹانے لگے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ انھیں کیا کرنا ہے۔ انھوں نے اپنے سینوں پر صلیب کے نشانات بنائے۔ رستوف اب کرنل کی جانب نہیں دیکھ رہا تھا، اس کے پاس اتنا وقت ہی نہیں تھا۔ اسے یہ خوف کھائے جا رہا تھا کہ وہ ہوزاروں کے معیار پر پورا نہیں اتر سکے گا اور اس کا دس ڈوبنے لگا۔ جب اس نے گھوڑا سائیکس کے سپرد کیا، اس کا ہاتھ کپکپا رہا تھا اور اسے محسوس ہونے لگا کہ اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا ہے۔ دینی سوف گھوڑے پر سوار اس کے قریب سے گزر گیا۔ وہ پچھلی جانب جھکا ہوا تھا اور با آواز بلند کچھ کہہ رہا تھا۔ رستوف کو کچھ نظر نہیں آ رہا تھا، تاہم ہوزار اس کے چاروں اطراف بھاگے پھر رہے تھے۔ ان کے مہیزا الجھ رہے تھے اور ششیریں کمرار ہی تھیں۔

”سٹریچر!“ کسی نے اس کے عقب میں چلا کر کہا۔

رستوف کی سمجھ میں نہ آیا کہ یہ سٹریچر کیوں منگوائے جا رہے ہیں۔ وہ دوڑتا رہا۔ اس کی کوشش تھی کہ وہ دوسروں سے آگے نکل جائے۔ لیکن جونہی وہ پل کے قریب پہنچا، اس کا پاؤں بیس دار اور پامال کچھڑ پر پڑا۔ اس کا وہیان کہیں اور تھا۔ وہ نیچے نہ دیکھ سکا۔ وہ پھسل گیا، اس کے ہاتھ نیچے اور وہ خود ان کے اوپر گر پڑا۔ دوسرے اس سے آگے نکل گئے۔

”کیپٹن، دونوں اطراف!“ اسے کرنل کی آواز سنائی دی۔ وہ گھوڑے پر سوار اس سے آگے نکل گیا تھا اور پل کے قریب رک گیا تھا۔ اس کے چہرے پر کامرائی اور مسرت نپک رہی تھی۔

رستوف نے بر جس پر رگڑ کر اپنے ہاتھ پونچھے، اپنے دشمن پر نگاہ ڈالی اور یہ مفروضہ باندھ کر کہ وہ جتنا آگے جائے گا، اتنا ہی بہتر ہوگا، اس نے بھاگنے کا عزم کیا۔ لیکن بوگدانوویچ نے فی الحقیقت اس کی جانب دیکھے، اسے پیچھے بٹھیر چلا کر اس سے کہا:

”یہ پل پر کون بھاگا جا رہا ہے؟ کیڈٹ، دائیں طرف ہٹ جاؤ۔ واپس پیچھے آ جاؤ؟“ اس کی آواز غصے سے لرز رہی تھی۔ پھر وہ دینی سوف کی طرف، جو اپنی نظاہری دلیری کی نمائش کرتا پل کے تختوں پر پہنچ گیا تھا، متوجہ ہوا۔

”کیپٹن، آخر خطرہ مول لینے کی کیا ضرورت ہے؟ بہتر ہے کہ نیچے اتر آؤ،“ کرنل نے کہا۔

”اسے ہر گولی پناہ نہ دھونڈ لیتی ہے،“ کوئی سوف نے زین پر بیٹھے بیٹھے جواب دیا۔

دیں ٹاپرپس نیس، تسکی، ڈرکوف اور شاف انسر توپوں کے نشانے کی زد سے باہر کھٹے کھڑے تھے۔ کبھی وہ پہلی شاہ کو کمرے بہر کوٹ، جن پر طلّائی جہازیں لگی ہوئی تھیں اور ٹیلی بر جسٹس پہنچے سپاہیوں کو، جن کا چھوٹا سا گروہ پل کے آس پاس جمکھا لگائے کھڑا تھا، دیکھنے لگتے، اور کبھی ان کی نظریں مست مخالف اٹھ جاتیں اور انھیں نیلے اور کوٹ اور گھوڑوں پر سوار ٹولیاں، جنھیں با آسانی توپ خانہ شناخت کیا جاسکتا تھا، اور جو اوہر بڑھتی آ رہی تھیں، نظر آنے لگتیں۔

”یہ پل نظر آتش کر سکیں گے یا نہیں؟ وہاں کون پہلے پہنچ سکے گا؟ یہ کرتے پڑتے وہاں پہنچ جائیں گے اور پل کو آگ لگا دیں گے یا فرامیسی اتنے قریب آجائیں گے کہ انھیں با آسانی گریپ شاٹ کا نشانہ بنالیں اور ان سب کو موت کے گھاٹ اتار دیں گے؟“ یہ تھے وہ سوالات جو ان فوجیوں میں سے، جو پل کی بالائی جانب پہاڑی پر کھڑے تھے، کوئی بھی اپنے آپ سے پوچھے بغیر نہیں رہ سکتا تھا اور اس کے ساتھ ہی اس کا دل ڈوبنے لگتا تھا۔ ان سب کی نگاہیں شام کی تیز روشنی میں پل پر، ہزاروں پر اور نیلے اور کوٹوں پر، جو گینگنیں اور بندوقیں تھامے مست مخالف سے آگے بڑھے آ رہے تھے، لگی ہوئی تھیں۔

”اف! ہزاروں کی شامت آگئی!“ نیس و تسکی نے کہا۔ ”ب وہ گریپ شاٹ کی زد میں ہیں۔“

”اسے چاہیے تھا کہ اسے سارے جوان اپنے ساتھ نہ لے جاتا،“ شاف انسر نے کہا۔

”بالکل ٹھیک،“ پریس نیس و تسکی نے کہا۔ ”ہرأت مند جوان تو دو ہی کافی تھے۔“

”واہ، یوڑا کیسی لینیسی!“ ڈرکوف نے ہزاروں سے نظریں ہٹائے بغیر اور اسی سادہ لوح انداز سے، جس سے یہ اندازہ لگانا ممکن تھا کہ وہ سنجیدگی سے بات کر رہا ہے یا محض مذاق کر رہا ہے، دخل دیتے ہوئے کہا۔ ”واہ، یوڑا کیسی لینیسی، واہ! کیا بات ارشاد فرمائی ہے“ اگر صرف دوا دی بھیج دیے جائیں، پھر ہمیں دلا دی میر تمغہ اور فیتہ کون دے گا؟ لیکن اب اگر وہ سارے کے سارے بھیج جائیں، سکو اڈرن کو انعام و کرام کا مستحق قرار دیا جائے گا اور ممکن ہے کہ خود کرنل کے ہاتھ بھی کوئی فیتہ دیے آجائے۔ ہمارے باگ دانودج خوب جانتے ہیں کہ اس قسم کے سمر کے کس طرح سراخجام دیے جاتے ہیں۔“

”وہ رہا!“ شاف انسر نے چلا کر کہا۔ ”انھوں نے گریپ شاٹ درغ دیا ہے!“

اس نے فرامیسی توپوں کی طرف، جنھیں توپ گاڑیوں سے علیحدہ کیا جا رہا اور پرے ہٹایا جا رہا تھا، اشارہ کیا۔ فرامیسیوں کی سمت سے، ان ٹولیوں کے، جن کے پاس گنگنا لیں تھیں، جج میں سے دھوکے کا مرغولہ بلند ہوا۔ پھر تقریباً ایک وقت دوسرا اور تیسرا مرغولہ اوپر اٹھا۔ عین اس وقت جب پہلا آہنی گولہ دھنسنے کی آواز ان کے کانوں تک پہنچی، چوتھی مرتبہ دھواں بہ جانب آسمان پرواز کرتا دکھائی دیا۔ پھر یکے بعد دیگرے دوا وازی اور اس کے بعد تیسری سنائی دی۔

”اف! افو۔ہ!“ پریس نیس و تسکی کراہنے لگا۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ سخت اذیت میں مبتلا ہے۔ اس نے شاف انسر کا بازو مضبوطی سے اپنی گرفت میں لے لیا اور بولا: ”دیکھو، دیکھو، ایک جوان گر پڑا ہے! ایک جوان گر پڑا ہے!“

”دو۔ میں یقین سے کہہ سکتا ہوں۔“

”اگر میں زار ہوتا تو کبھی جنگ کے پھندے میں نہ پڑتا؛ پرس نہیں دسکی نے منہ دوسری طرف پھیرے ہوئے کہا۔

فرانسیسیوں نے پھرتی سے دوبارہ توپوں میں گولے بھرے۔ نیلے اور کوٹوں میں ملبوس ان کی پیادہ فوج پیرہ دوڑ لگاتے پل کی جانب بڑھی۔ بے قاعدہ وقتوں کے بعد دھوئیں کے مرغولے پھر بند ہونے لگے۔ گریپ شاٹ پھٹتے اور کھڑکھڑاتے، دھڑ دھڑاتے پل پر آگرتے۔ لیکن اس مرتبہ پرس نہیں دسکی کو نظر نہ آسکا کہ وہاں کیا اور ہے۔ پل پر سے دھوئیں کا دہیز بدل بلند ہو رہا تھا۔ ہوزار اسے آگ لگانے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ فرانسیسی توپیں ان پر گولے برسا رہی تھیں لیکن اب کے اس گولہ باری کا مقصد ان کے کام میں رکاوٹ ڈالنا نہیں تھا بلکہ یہ گولہ باری اس لیے ہو رہی تھی کہ کیونکہ شست باندھی جا چکی تھی اور حریف، جسے نشانہ بنایا جا سکتا تھا، سامنے موجود تھا۔ جب تک ہوزار اپنی اپنے گھوڑوں تک پہنچے، فرانسیسیوں کو گریپ شاٹ کے تین روند برس نے کا موقع مل گیا۔ دو مرتبہ ان کا نشانہ بالکل خطا گیا اور گولے بہت اوپر نکل گئے لیکن تیسرا روند ہوزاروں کے ایک گروپ کے عین درمیان میں گرا اور تین جوان نیچے گر پڑے۔

رستوف اپنی دھڑبن میں مصروف تھا اور باگ دانو وچ کے ساتھ اپنے تعلقات کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ وہ پل پر رک گیا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے اور کدھر جائے۔ وہاں کوئی شخص ایسا نہیں تھا جس کی وہ گردن کاٹ سکتا (اس کا خیال تھا کہ جنگ میں یہی کچھ ہوتا ہے)۔ وہ پل کو نذر آتش کرنے میں بھی کوئی مدد نہیں دے سکتا تھا کیونکہ دوسرے سپاہیوں کی طرح وہ پرال کا کوئی سٹھ اپنے ساتھ نہیں لایا تھا۔ وہ وہیں کھڑا ادھر ادھر رکھتا رہا۔ اچانک اسے دھڑ دھڑاہٹ سنائی دی جیسے کوئی شخص پل پر ہتھوڑی سے اخروٹ توڑ رہا ہو اور ایک ہوزار، جو بالکل اس کے قریب کھڑا تھا، چیخا کر اہتا اور جنگلے کے ساتھ ٹکراتا نیچے گر پڑا۔ دوسروں کے ساتھ رستوف بھی دھڑبھاگا اور ایک بار کسی نے چلا کر کہا، ”سٹریچر!“ چار اشخاص نے ہوزار پر ہاتھ رکھے اور اسے اوپر اٹھانے لگے۔

”او۔ او۔ او۔ ہ۔ ہ۔ یسوع مسیح کا واسطہ، مجھے چھوڑ دو!“ زخمی آدمی چلا رہا تھا۔ تاہم اسے اٹھالیا گیا اور سٹریچر پر ڈال دیا گیا۔

نکولائی رستوف ایک طرف ہٹ گیا جیسے وہ کچھ تلاش کر رہا ہو اس نے دور فاصلے پر دریائے ڈینیوب کے پانیوں، آسمان اور سورج پر نظریں ٹکا دیں۔ آسمان کتنا خوبصورت، کتنا نیلگوں، کتنا پرسکون، کتنا عمیق نظر آ رہا تھا! روبہ زوال آفتاب کتنا درخشندہ اور عظیم و جلیل تھا! اور دریائے ڈینیوب کی آب و تاب کتنی طام تھی! اور یہ، راہبیت کی خانقاہ، پر اسرار، اتھا واد یوں اور جنگلوں سے، جن کے صنوبر کے درخت چوٹیوں تک برف میں ملفوف تھے آگے، بہت آگے، نیلگوں کو ہزاروں کا منظر اور بھی دلکش، اور بھی دلچسپ تھا!... ہر طرف امن تھا، سکون تھا... البساط و شادابی تھی... ”کاش میں وہاں ہوتا! پھر مجھے کسی چیز کی تمنہ نہ ہوتی، خو ہش نہ ہوتی، آرزو نہ ہوتی!“ رستوف نے

سوچا۔ ”صرف مجھ میں، اس رعب میں، کتنی زیادہ مسرت ہے لیکن یہاں... آہیں ہیں، مصائب ہیں، اندیشے ہیں، اور یہ غیر یقینی اور جلد بازی ہے... یہاں، وہ پھر چیخ رہے ہیں، چلا رہے ہیں، کہیں پیچھے بھاگ رہے ہیں اور، اور میں بھی ان کے ساتھ بھاگ جاؤں گا جب کہ یہ۔۔۔ موت۔۔۔ یہاں، میرے اوپر، میرے گرد و پیش منڈلا رہی ہے... صرف ایک لمحے کی بات ہے... پھر مجھے یہ سورج، یہ پانی، یہ وادی، کبھی دوبارہ دیکھنے کا موقع نہیں ملے گا۔“

عین اسی وقت سورج بادلوں میں ردپوش ہو گیا اور رستوف کو مزید سترچ نظر آئے۔ اور موت اور سترچروں کا خوف، اور سورج اور زندگی سے محبت۔۔۔ سب کچھ آپس میں گڈمڈ ہو گیا۔ اسے تفکرات نے کچھ اس طرح گھیرا کہ اس کا جی مٹانے لگا۔

”یار رب العالمین! تم آسمانوں کی بندیوں پر جلوہ فروز ہو، مجھے ہر بل سے بچاؤ، میری خھاؤں سے درگزر نہیو، اپنے حفظ و امان میں رکھو!“ اس نے اپنے آپ سے سرگوشی کی۔

ہوزار بھاگتے دوڑتے واپس ان لوگوں کے پاس، جنہوں نے ان کے گھوڑے تھام رکھے تھے، پہنچ گئے۔ وہ اب پرسکون ہو چلے تھے، دوران کی باتیں صاف سنائی دینے لگی تھیں۔ اور سترچ نظر دوسروں سے اوجھل ہو گئے۔

”برادر، پھر تم ہارود کی بوسنگھ چکے ہو!“ دینی سوف نے سن اس کے کان کے قریب چنا کر کہا۔

”قصہ ختم بھی ہو گیا... اور میں ذرا کم ہوں،“ رستوف نے سوچا۔ اس نے گہری آہ بھری اور اپنے سائیس کی طرف چل دیا۔ اس نے اپنے گھوڑے، رخ، کی، جو ایک ٹانگ پر کھڑا آرام کر رہا تھا، لگام پکڑی اور اس پر سوار ہونے لگا۔

”کیا وہ گریپ شاٹ تھا؟“ اس نے دینی سوف سے پوچھا۔

”بالکل، کیسا خوف ناک گریپ شاٹ تھا!“ دینی سوف نے گلا پھاڑتے ہوئے کہا۔ ”تم لوگ واقعی بہادر سپوت ہو اور سچ پوچھو تو یہ کام ہے بہت گھناؤنا! رہ گیا احمد۔ اصل مزہ اسی میں آتا ہے۔ تم ان کے کشتوں کے پٹے لگا سکتے ہو۔ لیکن یہ کام، توبہ توبہ! بہت گھنیا بہت پرخطر ہے۔ وہ تمہارے اوپریوں کو لے برسا رہے تھے جیسے نشانے بازی کی مشق کر رہے ہوں۔“

اور دینی سوف گھوڑے پر سوار اس گردپ کی طرف، جو ہتھکل کا ٹڈر، پرس نہیں دسکی، ڈرکوف اور شاف انس پر مشتمل تھا، اور رستوف سے زیادہ دور نہیں تھا، چل دیا۔

”معلوم ہوتا ہے کہ کسی نے بھی نہیں دیکھا۔“ رستوف نے سوچا۔

اور واقعاً کسی نے بھی کچھ نہیں دیکھا تھا کیونکہ ہر شخص اس جہانی کیفیت سے، جس کا گولہ باری کے دوران میں کیڈٹ کو پہلی مرتبہ تجربہ ہوا تھا، آگاہ تھا۔

”آپ کو رپورٹ ارسال کرنے کے لیے زبردست مواصلات کیا ہے؟“ ڈرکوف نے کہا۔ ”مجھے مت بھولنا،“

”وہیکس تو سیکنڈ لیفٹیننٹ ہی ہوا دینا“

”پرنس کو مطلع کر دینا کہ میں بے پل کو جلا دیا ہے“ کرنل نے مسرت سے جھومتے ہوئے کہا۔
 ”درا کر انھوں نے نقصانات کی تفصیل پوچھ لی، پھر؟“

”وہ قابل ذکر نہیں ہیں“ کرنل نے تراخ سے جواب دیا۔ ”دو ہزار زخمی ہوئے اور ایک موقع پر ہی ہلاک“
 اس نے اپنی مسرت چھپائے بغیر کہا۔ جب اس نے کڑا کے کے ساتھ یہ خوبصورت ”جملہ موقع پر ہی ہلاک ہو گیا“
 ادا کیا۔ اس کی باتیں کھلی جارہی تھیں اور اس سے اپنی مسکراہٹ پر قابو نہ پایا جاسکا۔

9

کوٹوزوف کی زیر قیادت پینتیس ہزار افراد پر مشتمل روسی فوج دریائے ڈینیوب کے کنارے کے ساتھ ساتھ پہنچ رہی تھی۔ یہ فوج کچھ ایسی مشکلات میں گھر چکی تھی جن کا پہلے سے کوئی اندازہ نہیں لگایا جاسکتا تھا۔ فرانسیسیوں کی سپاہ، جو ایک لاکھ نفوس پر مشتمل تھی اور جس کی قیادت یونا پارٹ کر رہا تھا، اس کا تقابلی کر رہی تھی۔ مقامی باشندے اس کے ساتھ خاصیت برتنے لگے تھے۔ اپنے اتحادیوں پر اس کا اعتماد اٹھ چکا تھا۔ خوراک کی رسد روز بروز کم ہوتی جا رہی تھی اور فائدہ کشی کا بھوت سروں پر منڈا رہا تھا۔ جب انیم اس کے قریب پہنچتا، یہ رک جاتی۔ اس کا عظمیٰ بیش تر حریف کے ہراول سے دو دو ہاتھ کرنا اور اسے پیچھے بھگا دینا۔ لیکن ان جھڑپوں میں زور محض اس بات پر ہوتا کہ اپنے ساز و سامان کو خاص نقصان پہنچوائے بغیر پسپائی کا سفر جاری رکھا جائے۔ اس قسم کی جھڑپیں لمبا، ام سٹیٹن اور مولک¹⁵ کے مقامات پر ہوئیں۔ لیکن روسیوں نے میدان ہائے کارزار میں جس جرأت اور مستقل مزاجی کا مظاہرہ کیا۔ اور جس کا اعتراف خود انیم نے بھی کیا۔ اس کے باوجود ان لڑائیوں کا صرف یہ نتیجہ برآمد ہوا کہ پسپائی میں اور بھی عجلت دکھائی جانے لگی۔ وہ آشر دی سپاہ، جو ام کی جنگ میں گرفتار ہونے سے بچ گئی تھی اور برادناؤ میں کوٹوزوف کی فوج میں شامل ہو گئی تھی، اب روسیوں سے علیحدہ ہو گئی اور کوٹوزوف کے پاس صرف اس کی اپنی کمزور، ور تھکی ماندہ فوج باقی رہ گئی۔ ان حالات میں دینا نا کے دفاع کے بارے میں سوچا بھی نہیں جاسکتا تھا۔ جارحانہ کارروائی کرنے کے لیے آشر دی ہوف کرگزراٹ (دسج تر جنگی کونسل) نے نہایت سوچ بچار کے بعد حریات کی جدید سائنس کے مطابق جو منصوبہ بنایا تھا اور جسے اس نے کوٹوزوف کو، اس کے دینا میں قیام کے دوران میں، پیش کیا تھا، اس پر عمل کرنے کا وقت گزر چکا تھا۔ کوٹوزوف اپنی فوج کا وہ حشر، جو میک کی سپاہ کا ہوا تھا، نہیں کراتا چاہتا تھا۔ اب اس کے سامنے ایک ہی مقصد۔ اور اس مقصد کا حصول بھی تقریباً ناممکن معلوم ہو رہا تھا۔ رہ گیا تھا کہ وہ کسی نہ کسی طرح اس فوج سے، جو روس سے آرہی تھی، جا ملے۔

28 اکتوبر کو کوٹوزوف نے اپنی فوج کے ہمراہ دریائے ڈینیوب عبور کیا اور پائیں کنارے پر ہولیا۔ اب چونکہ اس کے اور فرانسیسی سپاہ کے بیشتر حصے کے درمیان دریائے ڈینیوب حائل ہو چکا تھا، اس نے پہلی مرتبہ انیم کے سامنے ڈٹ جانے کا فیصلہ کیا۔ تیس اکتوبر کو اس نے مونلیر (Monlier) کی ڈویژن پر، جو پائیں کنارے پر تھی، حملہ

کی اور اسے شکست کا مزہ چکھایا۔ اس لڑائی کے دوران میں پہلی مرتبہ کچھ بل غنیمت۔ علم، بجائیں اور دو جرنیل۔
 روسیوں کے ہاتھ لگا۔ دو ہفتوں کی پسپائی کے بعد روسی فوج نے پہلی مرتبہ کہیں قیام کیا، دشمن سے دو دو ہاتھ کیے اور
 اب کے نہ صرف میدان جنگ میں سرخروئی حاصل کی بلکہ اس نے فرانسیسیوں کو پسپا ہونے پر بھی مجبور کر دیا۔
 اگرچہ سپاہی تھک کر چور ہو چکے تھے، ان کی وردیاں تار تار ہو رہی تھیں اور پیچھے رہ جانے والوں، بیماروں، زخمیوں
 اور ہلاک شدگان کی صورت میں اس کی فوج کی تعداد ایک تہائی کم ہو گئی تھی اور گرچہ کریمس (Krems) کے
 بہتے لوں، در بڑے بڑے مکانات میں، چھتیں شفا خانوں میں تبدیل کر دیا تھا، اتنی گنجائش نہیں رہ گئی تھی کہ ان میں
 تمام بیمار اور رخمی سما سکتے (کوٹوزوف نے بعض زخمیوں اور بیماروں کو دریا کے دوسرے کنارے پر ہی پھوڑ دیا تھا۔
 انہیں محض ایک خط، جس میں دشمن سے، انسانیت برتنے کی اپیل کی گئی تھی، دے دیا گیا تھا)۔ ان تمام امور کے
 باوجود کریمس کے مقام پر دشمن سے جو جھڑپ مولی گئی اور مورخ تیخ کے خد ف جو فتح حاصل کی گئی، اس نے سپاہ
 کے حوصلے اچھے خاصے بلند کر دیے۔ تاہم اس قسم کی خوش کن افواہیں کہ روس سے تازہ دم فوج پہنچا رہی جاتی ہے،
 آسٹری فوج نے غنیم کے خلاف کامیابی حاصل کر لی ہے اور ہونا پارت کی فوج بدحواسی کے عالم میں پسپا ہو رہی
 ہے، جو عام گردش کر رہی تھیں، محض دماغی اختراعات تھیں اور حقیقت سے ان کا دور کا بھی واسطہ نہیں تھا۔

لڑائی کے دوران میں پرنس آندرے آسٹری جرنیل شٹ (Schmidt) کی، جو میدان جنگ میں مار گیا
 تھا، اردل میں رہا تھا۔ وہ گھوڑا، جس پر وہ خود سوار تھا، زخمی ہو گیا تھا اور ایک گولی اس کے اپنے ہاتھ کو پھینکی گزر گئی
 تھی۔ یہ کہ کمانڈر انچیف اس پر مہربان تھا، اس کا اظہار اس نے یوں کیا کہ اسے فتح کی نوید پہنچانے آسٹریا کے
 شاہی دربار روانہ کیا۔ فرانسیسی خطرے کے پیش نظر آسٹری شاہی دربار اب ویانا نہیں رہا تھا بلکہ برن (Brunn)
 چلا گیا تھا۔ جس روز معرکہ کارزار پہنچا تھا، اسی شام وہ کوٹوزوف کے نامہ دوستوف (Dokhturov) کا پیغام لے کر
 کریمس پہنچا تھا۔ اگرچہ اس پر پہچانی کیفیت طاری تھی لیکن تھکاوٹ اسے نام کو بھی نہیں تھی۔ (بظاہر پرنس آندرے
 کا وجود لاغر و ناتواں تھا، لیکن وہ توانا سے تو نا اشنا خاص کی نسبت ٹکان با آسانی برداشت کرنے کی سکت رکھتا تھا۔)
 اس نے ابھی دم بھی نہ لیا تھا کہ اپنی کی حیثیت سے برن بھیج دیا گیا۔ جس شخص کو اس قسم کا پیغام پہنچانے کا فریضہ
 سونپا جاتا، اسے نہ صرف تمنے اور دیگر انعامات و کرامات کا سزاوار شہر ایا جاتا بلکہ اس کی ترقی بھی یقینی ہو جاتی۔

رات اندھیری تھی۔ آسمان پر صرف ستارے جھگڑا رہے تھے۔ گزشتہ روز، جو روز جنگ تھا، برف باری ہوئی
 تھی۔ اس برف میں سڑک تاریک لکیر بن گئی تھی۔ پرنس آندرے ڈاک گاڑی میں سفر کر رہا تھا اور اس کا ذہن مختلف
 خیالات کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ کبھی وہ ان تاثرات کا، جو حالیہ سر کے نے اس کے دل و دماغ پر مرتب کیے تھے،
 جائزہ لینے لگتا اور کبھی وہ جھوم جھوم کر یہ سوچنے لگتا کہ جو فتح کی خوش خبری وہ لے کر جا رہا ہے، آسٹریا کے عہدین
 ملکیت اسے سن کر کتنے خوش ہوں گے۔ پھر اسے وہ منظر یاد آئے لگتا جب اس نے کمانڈر انچیف اور اپنے احباب کو
 معاذ اللہ کہا تھا۔ اس کی گاڑی خاصی تیز جا رہی تھی اور وہ مسلسل سوچ رہا اور یادیں تازہ کر رہا تھا۔ وہ ایک ایسے شخص

کے، جسے آخر کار وہ مسرت، جس کا اسے حرم دراز سے انتظار تھا، مل گئی ہو، احساسات و جذبات سے سرشار ہو رہا تھا۔ جونکی وہ آنکھیں بند کرتا، اس کے کانوں میں گولہ باری کی آوازیں گونجنے لگتیں اور ان آوازوں میں پیوں کی کھڑکھڑاہٹ اور فتح مندی کا نشیلا احساس آمیز ہو جاتا۔ پھر اس کے دماغ میں ایک نیا تصور، بھرا کہ روی سر پہ پاؤں رکھے بھگ رہے ہیں اور وہ خود ہاک ہو چکا ہے۔ لیکن اس نے یہ غفلت اپنے آپ کو جگایا اور اس پر کچھ اس قسم کی مسرت کا نشہ طاری ہو گیا گویا اس پر ابھی ابھی یہ انکشاف ہوا ہو کہ حقیقتاً ایسا نہیں ہے بلکہ اس کے برعکس جن لوگوں نے راہ فرار اختیار کی تھی، وہ وہی نہیں تھے، فرامیسی تھے۔ اسے ایک بار پھر فتح کی تفصیلات اور میدان جنگ میں چنی پر سکون ریلری یاد آگئی۔ وہ مطمئن ہو گیا اور اسے اونگھ آگئی۔ ستاروں بھری تاریک رات بیت گئی اور اس کے عقب میں روشن، سہانی صبح طلوع ہوئی۔ گھوڑے سرپٹ بھاگے جا رہے تھے۔ دھوپ میں برف پگھلتنے لگی تھی اور سڑک کے دونوں کناروں پر مختلف النوع جنگلات، کھیت اور دیہات مسلسل نظروں کے سامنے ابھرتے رہے۔ جن مقامات پر ڈاک گاڑیاں ٹھہر کر تھیں، ایسے ہی ایک مقام پر اسے زخمی روسیوں کا ایک قافلہ مل گیا۔ سب سے اگلی گاڑی میں بار برداری کا انچارج افسر پاؤں پیارے بیٹھ تھا۔ وہ ایک سپاہی کو مسلسل بے نقطہ سنائے جا رہا تھا۔ زخمی جرمن چمکڑوں پر سوار تھے۔ ہر چمکڑے میں چھ یا چھ سے بھی زیادہ غلیظ انسان، جن کے مختلف اعضا پیروں میں مستور تھے، پڑے تھے اور پتھریلی سڑک پر پٹکولے کھا رہے تھے۔ ان میں سے بعض باتیں کر رہے تھے (اسے روسی القاعدہ سنائی دے)، بعض ڈبل روٹی چبا رہے تھے اور جنہیں گہرے زخم آئے تھے، وہ بیمار بچوں کی ٹڈھال، لچسپا کے ساتھ آنکھیں پھاڑ پھڑ کر چپ چاپ اپنی کوء، جوان کے برابر بگٹ گاڑی بھگائے جا رہا تھا، دیکھ رہے تھے۔ پرنس آندرے نے گاڑی بان کو گاڑی روکنے کا حکم دیا اور ایک سپاہی سے پوچھنے لگا کہ وہ کس معرکے میں زخمی ہوئے ہیں۔

”پرسوں، ڈینیوب کے کنارے“ سپاہی نے جواب دیا۔

پرنس آندرے نے اپنا پرس لگا لیا اور سپاہی کو تین اشرفیاں دیں۔

”یہ ان سب کے لیے ہیں“ اس نے ایک افسر کی طرف، جو اس کے قریب آ گیا تھا، مڑتے ہوئے کہا۔

”جوانو، خداوند تمہیں جلد از جلد صحت یاب فرمائے“ اس نے سپاہیوں سے کہا۔ ”ابھی بہت کچھ کرنا ہے۔“

”جناب عالی، کوئی خبر؟“ افسر نے پوچھا۔ اسے توقع تھی کہ وہ پرنس آندرے کو باتوں میں لگا لے گا۔

”اچھی خبر ہے۔ چلو، اس سے اپنے گاڑی بان سے کہا اور گاڑی فرامیسی بھرنے لگی۔

جب پرنس آندرے برن پہنچا، اچھا خاصہ اندھیرا پھا چکا تھا۔ اس کے چاروں اطراف اونچے اونچے مکانات کھڑے تھے۔ گلیوں اور بازاروں میں جگہ جگہ روشنیاں ایستادہ تھیں۔ گھروں اور دکانوں سے بھی روشنیاں چھن چھن کر باہر آرہی تھیں۔ پتھریلی سڑکوں پر خوبصورت اور دیدہ زیب گاڑیاں کھڑکھڑاتی آ جا رہی تھیں۔ فرسک وہاں جیتے جگتے بڑے شہر کی دوپوری فضا موجود تھی، جو اس نوعی کے لیے، جو کمپوں میں زندگی گزارنے کے بعد

تازہ تازہ وارد ہوا ہو، بہت خزش کن ہوتی ہے۔ جب وہ کل کے قریب پہنچا، عاجلانہ سفر اور رات بھر کی بے خوابی و بے آرامی کے باوجود اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اس میں پہلے سے بھی زیادہ جوش و ولولہ بھر گیا ہو۔ صرف اس کی درخشاں آنکھیں قدرے بے کل تھیں اور خیالات تھے کہ غیر معمولی تیز رفتاری سے ریے کی صورت میں یکے بعد دیگرے چلے آ رہے تھے لیکن ان میں کسی قسم کا الجھاؤ نہیں تھا۔ اس نے ایک بار پھر جنگ کی تعصبات یاد کیں مگر اب اس میں کوئی اختلافت نہیں تھا بلکہ اس کے ذہن میں ان کی ایسی واضح اور بیخ صورت بن گئی تھی جس میں وہ انہیں پھر طور فرمائش کے سامنے پیش کرنا چاہتا تھا۔ وہ ان تمام سوالات کو بھی، جو اس سے باتوں باتوں میں پوچھے جاسکتے تھے، تصور میں لایا اور اس نے ان کے ممکنہ جوابات بھی سوچ لیے۔ اسے تو قلع تھی کہ اسے فوراً پھر طور کی خدمت میں پیش کر دیا جائے گا لیکن جب وہ محل کے صدر دروازے پر پہنچا، ایک سرکاری فسر بھاگتا بھاگتا اس کے پاس آیا اور جب اسے معلوم ہو کہ وہ اپنی ہے، وہ اسے، ایک اور دروازے کی جانب لے گیا۔

”یوریکسی لینسی، جب آپ راہداری کے اختتام پر پہنچیں، دائیں طرف گھوم جائیں، وہاں آپ کی ملاقات ڈیوٹی ایڈی کاٹنگ سے ہوگی،“ اس افسر نے کہا۔ ”وہ آپ کو وزیر جنگ کے پاس لے جائے گا۔“

پرنس آندرے کی ملاقات ایڈی کاٹنگ سے ہو گئی۔ اس نے اسے انتظار کرنے کو کہا اور خود وزیر جنگ کے پاس چلا گیا۔ پانچ منٹ بعد وہ وہاں آیا۔ اس نے احتراماً جھک کر پرنس آندرے کو سلام کیا اور اس سے اپنے آگے آگے چلنے کی درخواست کی۔ وہ اسے راہداری میں سے گزرتا ایک پرائیویٹ کمرے میں، جہاں وزیر جنگ کام میں جتا ہوا تھا، لے گیا۔ ایڈی کاٹنگ ضرورت سے کچھ زیادہ ہی اٹک را اور شائستگی کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ اس طرح کے رویے سے وہ یہ کوشش کر رہا ہے کہ روڈی ایجوٹ کو کسی نوع کی بے تکلفی برتنے کا موقع نہ دیا جائے۔

پرنس آندرے جب وزیر جنگ کے کمرے کے دروازے کے قریب پہنچا، اس کے پرستہ جذبات پر اچھی خاصی دس پڑ چکی تھی۔ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ اس کے ساتھ ہٹک آمیز برتاؤ کیا جا رہا ہے۔ کچھ تو اسے خوشخبری کا پیغام، نے پراتنا فخر تھا لیکن اسے علم بھی نہ ہو سکا کہ کب، لیکن اس کا فخر و مبہت کا احساس نفرت و حقارت کے جذبے میں ڈھل چکا تھا حالانکہ ایسی کوئی بات نہیں ہوئی تھی جو اس کے اس تنفر کا سبب بنتی۔ اس کے ذریعہ فراغ نے اسے اسی دم ایک ایسے نکتہ بھرا دیا جس کی بنا پر وہ یہ سمجھنے لگا کہ سے ایڈی کاٹنگ اور وزیر جنگ سے جو نفرت ہوئے گی ہے، اس میں وہ حق بجانب ہے۔ ”ان لوگوں نے بارود کی کبھی بوبھی نہیں سونگھی، شیدا سی لیے وہ یہ سمجھتے ہیں کہ فتوحات حاصل کرنا بہت آسان ہے،“ اس نے سوچا۔ حقارت سے اس کی آنکھیں سکن گئیں۔ وہ وزیر کے کمرے میں عمداً آہستہ آہستہ داخل ہوا اور جب اس نے وزیر کو خاصی بڑی میز کے سامنے بیٹھے اور دو تین منٹ تک اپنی طرف کوئی توجہ نہ دیتے دیکھا، تو اس کی نفرت اور بھی شدید ہو گئی۔ وزیر اپنا گنجا سر، جس کے کناروں پر کہیں اکا دکا سفید بال تھے، اوموم بتیوں کے، بین جھکائے، چند کاغذات کا مطالعہ کر رہا اور چنل سے ان پر نشانات لگا رہا تھا۔ دروازہ کھلنے اور قدموں کی آواز سننے کے بعد بھی اس نے اپنی نگاہیں اوپر نہ اٹھائیں اور آخر تک یہی تاثر دیتا رہا کہ وہ بہت

مصروف ہے۔

”یہ اٹھاؤ اور انہیں پہنچا دو“ اس نے کاغذات کا پلندہ اپنے یڈی کا ٹک کے حوالے کرتے اور اب بھی اٹیچی پر کوئی توجہ دے بغیر کہا۔

پرنس آندرے کو محسوس ہوا کہ وزیر جنگ کو جتنے بھی امور پٹا نے ہیں، ان میں اسے کوٹوزوف کی فوج کی کارروائیوں سے یا تو سب سے کم دلچسپی ہے یا پھر وہ ردی اٹیچی کو اس قسم کا محض تاثر دینا چاہتا ہے۔ ”لیکن مجھے اس کی کوئی پروا نہیں“ اس نے سوچا۔ وزیر نے باقی ماندہ کاغذات سمیٹے، ان کے کونے سیدھے کیے اور پنا سر اپر اٹھایا۔ اس کا سر معمولی سر نہیں تھا، یہ امتیازی وردائش مندانہ سر تھا۔ لیکن جونہی وہ پرنس آندرے کی طرف متوجہ ہوا، اس کے چہرے بشرے سے جو زیر کی اور عزم صمیم جھلک رہا تھا، وہ آن کی آن میں کچھ اس طرح تبدیل ہوا کہ معلوم ہونے لگا کہ وہ یہ تبدیلی شعوری طور پر اور عادتاً کرتا ہے۔ اب اس کے چہرے پر وہ احمقانہ مسکراہٹ کھیل رہی تھی، جو ان لوگوں کا، جن کے پاس عرضی گزاروں کا تانا باندھ رہا ہے، خاصہ ہوتی ہے اور ایسے مواقع پر ان کی یہ مسکراہٹ فطری نہیں بلکہ کھلم کھلا منافقت کی پیداوار ہوتی ہے۔

”جنرل فیلڈ مارشل کوٹوزوف کی طرف سے؟“ اس نے پوچھا۔ ”میرا خیال ہے اچھی خبر ہی ہوگی؟ سوخ تچ کے ساتھ جھڑپ ہوئی؟ فتح؟ ہونا ہی چاہیے تھی، مدتوں سے انتظار تھا!“

اس نے مراسدہ، جو اسی کے نام تھا، لے لیا اور اسے پڑھنے لگا۔ اس کا چہرہ مول اور افسردہ تھا۔ ”ادہ میرے خدایا! میرے خدایا! شمت!“ اس نے جرسن میں کہا، ”اتنا بڑا حادثہ اتنی عظیم آفت!“ اس نے مراسلے پر سرسری نظر ڈالی، اسے میز پر رکھا اور پرنس آندرے کی جانب دیکھنے لگا۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ کچھ سوچ رہا ہے۔

”کتنا بڑا صدمہ! تم کہتے ہو کہ معرکہ فیصلہ کن رہا، لیکن موخ تچ تو بکڑا نہیں گیا۔“ وہ پھر سوچ بچار میں کھو گیا۔ ”اگر چہ شمت کی موت، اتنا بڑا حادثہ ہے کہ فتح بھی اس کی حدی نہیں کر سکتی، پھر بھی مجھے خوشی ہے کہ تم انہیں خبر لائے ہو۔ اس میں شک نہیں کہ ہر یکجہشی تم سے ملنا چاہیں گے، لیکن آج نہیں۔ میں تمہارا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ اب جاؤ، آرام کرو۔ کل سلاہی کے بعد شاہی دربار پہنچ جانا، فکر نہ کرو میں انہیں مطلع کر دوں گا۔“ احمقانہ مسکراہٹ، جو اس کی گفتگو کے دوران میں غائب ہو گئی تھی، عود کر آئی۔

”خدا حافظ، تمہارا بہت بہت شکریہ۔ ہر یکجہشی میرا طور پر تم سے ملنا پسند فرمائیں،“ اس نے دوبارہ کہا اور پنا سر نیچے جھکا لیا۔

جب پرنس آندرے محل سے رخصت ہوا، اسے محسوس ہوا کہ فتح نے اسے جو دلولہ اور مسرت فراہم کی تھی، وہ اب وزیر جنگ اور اس کے شائستہ یڈی کا ٹک کے بے اعتبار حم و کرم پر ہے۔ آنا فانا اس کے خیالات کا سارا ادھر تبدیل ہو گیا۔ اسے محسوس ہونے لگا کہ معرکہ پنا ہوئے مدتیں بیت چکی ہیں اور اس کی صرف مدھم ہی یاد اس کے

ذہن میں باقی رہ گئی ہے۔

10

ہرن میں پرنس آندرے نے اپنے دوست اور روسی سفارت کار بلیبین (Bilibin) کے ہاں قیام کیا۔
 ”اٹھا، مائی ڈیئر پرنس، تم سے بڑھ کر بھلا اور کون مہمان ہو سکتا ہے جسے دیکھ کر طبیعت باغ باغ ہو جائے“
 بلیبین نے پرنس آندرے کا خیر مقدم کرتے ہوئے کہا۔ ”فرانشس، پرنس کا سامان میرے بیڈروم میں پہنچا دو“ اس نے
 مازم سے، جو بلکونسکی کو اپنے ساتھ بے آرہا تھا، کہا۔ ”تو تم فتح کے قیسم ہو؟ بہت خوب! ادھر میں ہوں کہ طبیعت
 ہی ٹھیک نہیں ہوتی۔ خود دیکھ لو۔“

نہانے دھونے، ورکپٹے تبدیل کرنے کے بعد پرنس آندرے سفارت کار کے مرصع اور پر تکلف مٹھی روم
 میں داخل ہوا اور کھانا، جو خاص طور پر اسی کے لیے تیار کیا گیا تھا، کھانے لگا۔ بلیبین پاؤں پیاد کر آرام سے آتش دان
 کے قریب بیٹھ گیا۔

مہم کی، جس کے دوران میں پرنس صفائی کی سہولتوں اور زندگی کی اعلیٰ آسائشوں سے محروم رہا تھا، بات
 چھوڑیں، سفر کے بعد اب جب وہ اس مرصع اور پر تکلف، حول میں، جس کا وہ بلیبین سے صاری چلا آرہا تھا، داخل ہوا،
 سکون و راحت کا خوشگوار احساس اس کی رگ رگ میں سما گیا۔ علاوہ ازیں آسٹریا والوں نے اس کا جس طرح
 استقبال کیا تھا، اس کے بعد اگر وہ روسی میں نہیں (وہ فرانسیسی میں گفتگو کر رہے تھے) تو کم از کم ایک روسی سے تو
 باتیں کر رہا تھا اور یہی چیز اس کے دل کا مرجھایا ہوا کنول کھلانے کے لیے کافی تھی (اس نے یہ فرض کر لیا تھا کہ اس
 نمائے میں روسیوں کو عام طور پر سزئیوں سے جوگن آتی تھی، بلیبین بھی اس میں شریک ہو گا)۔

بلیبین پینتیس کے لگ بھگ تھا۔ وہ کنوارا تھا اور اسی حلقے سے، جس سے پرنس آندرے کا تعلق تھا، متعلق
 تھا۔ وہ پیٹرز برگ میں ایک دوسرے کے شاسا تھے لیکن ان کے تعلقات میں گرم جوشی اور بے تکلفی تب آئی
 جب پرنس آندرے کو تو زوف کے ساتھ ویانا میں قیام پذیر تھا۔ جس طرح پرنس آندرے، ایک ایسا نوجوان تھا جس
 کے متعلق با آسانی یہ پیش گوئی کی جاسکتی تھی کہ وہ سپاہ گری میں بلند مقام حاصل کرے گا، بعینہ بلیبین کے متعلق یہ کہا
 جاسکتا تھا کہ وہ سفارت کاری کے میدان میں اس سے بھی اونچا نام کمائے گا۔ وہ نوجوان تھا لیکن سفارت کاری
 میں نو آسوز نہیں تھا۔ اس نے سولہ سال کی عمر میں یہ ملازمت اختیار کی تھی، پیرس اور کوپن ہیگن میں خدمات سرانجام
 دے چکا تھا اور اب ویانا میں خاصے اہم عہدہ پر فائز تھا۔ آسٹروی چانسلر (وزیر اعظم) اور ویانا میں ہمارا سفیر دونوں
 اسے جانتے تھے اور اس کی قدر کرتے تھے۔ وہ ان لاتعداد سفارت کاروں کی، جن کی استعداد زیادہ تر منفی ہوتی ہے
 اور جو یہ سمجھتے ہیں کہ فرانسیسی میں شد بد حاصل کر لینا اور بعض باتوں سے احتراز کرنا ہی سفارت کاری کی معراج ہے،
 گندہ نہیں تھا۔ اس کا شمار ان معدودے چند لوگوں میں ہوتا ہے، جنہیں کام پسند ہوتا ہے اور کام کرنا آتا بھی ہے۔ اور

فطری آنکسی کے باوجود وہ حضرات پوری پوری رات اپنی ڈیسک پر گزار دیتا کام کی نوعیت خود کیسی ہی کہیں نہ ہو وہ تمام امور یکساں سمیٹے اور نفاست سے سرانجام دیتا۔ اس کی دلچسپی کا محور سوال ”کیوں“ نہیں بلکہ ”کیسے“ ہوتا تھا۔ سفارتی معاملے کی نوعیت کیا ہے، اس کے لیے اس سے کوئی فرق نہ پڑتا۔ مراسلہ ہو، یادداشت بار پور ہو، اسے ان سب کو، ہر شے حکیمانہ اور خوش اسلوبانہ انداز سے تیار کرنے میں بہت لطف آتا تھا۔ جو کچھ وہ تحریر کرتا تھا، وہ اپنی جگہ قابل قدر ہوتا تھا لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس کی خدمات اس لیے بھی بہت گراں قدر تصور کی جاتی تھیں کیونکہ اسے اعلیٰ عہدوں پر فائز حکام کے ساتھ گفتگو کرنے اور ان سے عہدہ برآ ہونے کے فن میں مہارت نامہ حاصل تھی۔

ہمیں جس طرح کام سے لطف اندوز ہوتا تھا، بعینہ وہ گفتگو سے بھی حظ اٹھاتا تھا بشرطیکہ یہ خستہ اور بذلتی سے معمور ہو۔ جب وہ اونچے لوگوں کی صحبت میں بیٹھتا، وہ ہمیشہ اسی تاثر میں رہتا کہ موقع آئے اور وہ کوئی انوکھی اور قابل توجہ بات کہہ سکے۔ وہ گفتگو میں صرف اسی وقت شریک ہوتا جب اس کے لیے ایسا کرنا ممکن ہوتا۔ اس کی گفتگو میں ہمیشہ عمومی دلچسپی کے حامل طبع زاد، نکتہ رس اور نستعلیق جملوں کی خفیف مقدار لازماً شامل ہوتی۔ فصاحت و بلاغت کے شادکار بہ جیسے جنھیں وہ اپنے ذہن کی لیبارٹری میں پہلے ہی کچھ اس طور تیار کر لیتا کہ اس کا ہدایت با آسانی ہو جاتا۔ مقصد غالباً یہ ہوتا تھا کہ اعلیٰ طبقے کا کند ذہن سے کند ذہن شخص بھی اپنے دماغ پر مار ڈالے بغیر انھیں یاد رکھ سکے اور ایک ڈرائنگ روم سے دوسرے ڈرائنگ روم تک دہراتا پھرے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ پلیمن کی ہڈیوں و ہاتھ کے مختلف ڈرائنگ روموں میں دہرائی جاتی تھیں اور اکثر نام نہاد، ہم امور پر اثر انداز ہوتی تھیں۔

اس کے دبے پتلے، تھکے ماندے زرد چہرے پر شکنیں پڑی رہتی تھیں اور یہ ہمیشہ اتنی ہی صاف ستھری و رحلی دھلائی نظر آتی تھیں جتنی کہ کسی شخص کی نگلیاں غسل کے بعد دکھائی دیتی ہیں۔ اس کے چہرے پر جو تاثرات ہوید ہوتے تھے، ان شکنوں کی حرکات و سکنات انھیں وجود میں لانے کے لیے اہم کردار ادا کرتی تھیں۔ ایک موقع آتا جب اس کی بھویں تن جاتیں اور اس کی پیشانی مسکن آلود ہو جاتی۔ دوسرے موقع پر اس کی بھویں نیچے گر پڑتیں اور اس کے رخساروں پر مسکن محیط ہو جاتے۔ اس کی اندر کو دھنسی ہوئی چھوٹی چھوٹی آنکھوں سے راست بازی ٹپکنی اور وہ ہر دم مسکراتی نظر آتی تھیں۔

”خیر، اب ہمیں اپنے کارہائے نماں سے آگاہ کرو“ اس نے کہا۔

بلکونسکی نے کسی قسم کی مبالغہ آرائی سے کام لے بغیر معرکے کی تفصیلات بیان کر دیں۔ اس نے اس کے دوران میں اپنا ذکر ایک مرتبہ بھی نہ کیا اور اس کے بعد اس نے بتایا کہ وزیر جنگ کے ہاتھوں اس کی کیا درگت بنی ہے۔

”انھوں نے میرا اور میری خبر کا یوں استقبال کیا جیسے میں کوئی نہایت ادب پے نگ داستان ساز ہا ہوں“ اس نے اپنی بات ختم کرتے ہوئے کہا۔

پلیمن طنزیہ انداز سے مسکرایا اور اس کے چہرے کی شکنوں کا تناؤ کم ہو گیا۔

ہاہم، مائی ڈیئر، اس نے کچھ فاصلے سے اپنے مانتوں کا جائزہ لیتے اور باتیں آنکھ کے اوپر جلد کو سیکڑتے ہوئے کہا۔ ”میں اگرچہ اس روٹی آرتھوڈوکس فوج کا احترام کرتا ہوں، لیکن اس کے باوجود میں یہ ضرور کہوں گا کہ تمہاری فتح میں فتح کی خوشبو عبق ہے۔“

وہ اسی انداز سے بولتا چلا گیا۔ اس نے اپنے مائی انضیر کے اظہار کے لیے فرنیسی کو ذریعہ بنایا تھا۔ روٹی رہبان کے الفاظ وہ تبھی استعمال کرتا تھا جب وہ ان پر حقارت آمیز زور دینا چاہتا تھا۔

”جی ہاں یہ ہے کہ تم لوگ اپنی ساری سپاہ کے ساتھ بدقسمت موٹے تیغ پر، جس کے پاس صرف ایک ڈیرن فوج تھی، چڑھ دوڑے اور اس کے باوجود وہ تمہاری آنکھوں میں دھوں جھونک کر بچ نکلنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس میں فتح کے شادیانے بجانے کی کون سی بات ہے؟“

”مجھے تم سے اتفاق نہیں،“ پرنس آندرے نے جواب دیا۔ ”اگر سنجیدگی سے دیکھا جائے تو ہم سچی بگھارے ہنر یہ کہہ سکتے ہیں کہ اہم کی نسبت یہاں ہم نے بہتر کارکردگی کا مظاہرہ کیا ہے۔“

”آخر تم لوگوں نے ہمارے لیے ایک، صرف ایک مارشل کیوں نہیں پکڑا؟“

”اس کی وجہ یہ ہے کہ میدان جنگ میں نہ وہ ترتیب ہوتی ہے جو پریڈ گراؤنڈ میں ہوتی ہے اور نہ وہاں سب کچھ اسی توقعات کے مطابق وقوع پذیر ہوتا ہے۔ جیسا کہ میں تمہیں بتا چکا ہوں، ہمیں امید تھی کہ ہم صبح زیادہ سے زیادہ سات بجے تک ان کے عقب پر حملہ کر سکیں گے لیکن شام کے پانچ بج گئے اور ہم وہاں پہنچ بھی نہ سکے۔“

”اور تم لوگ صبح سات بجے تک کیوں نہ پہنچ سکے؟ تمہیں وہاں صبح سات بجے پہنچنا چاہیے تھا،“ ہلیپن نے مکرانے ہوئے کہا۔ ”تمہیں وہاں صبح سات بجے پہنچنا چاہیے تھا۔“

”اور تم سفارت کاری کے ذریعے ہونا پارت سے یہ کیوں متوانہ سکے کہ وہ جیو آ پر چڑھائی نہ کرے کیونکہ یہی اس کے حق میں بہتر تھا؟“ پرنس آندرے نے ترکی پر ترکی جواب دیتے ہوئے کہا۔

”میں جانتا ہوں،“ ہلیپن نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ”تم یہ سوچ رہے ہو کہ آگ کے قریب صوفے پر بیٹھ کر مارشوں کو پکڑنا بہت آسان کام ہے۔ تمہاری بات درست ہے لیکن یہ سوال پھر بھی اپنی جگہ قائم ہے کہ تم لوگوں نے اسے پکڑا کیوں نہ؟ اور صرف وزیر جنگ ہی نہیں بلکہ اگر نرینجی امپراطور بھی تمہاری اس کامرانی پر کوئی زیادہ خوشی کا اظہار نہ کریں، تو تمہیں حیران نہیں ہونا چاہیے۔ بلکہ خود مجھے، روٹی سفارت خانے کے بدقسمت سیکرٹری کو بھی، کوئی خاص خوشی نہیں ہوئی۔“

اس نے اپنی نگاہیں سیدھی پرنس آندرے پر گاڑ دیں اور معاہدے کی پیشانی تمام ٹکٹوں سے صاف ہو گئی۔

”دوست، اب کیوں پوچھنے کی میری باری ہے؟“ ہلیپن نے کہا۔ ”مجھے اعتراف ہے کہ میں کچھ نہیں سمجھ سکا۔ لیکن یہاں سفارت کی باریکیاں، جو میری کمزور دنیا تو اس عقل کی رسائی سے باہر ہیں، مزاحم ہو رہی ہوں۔ لیکن میرے بچے کچھ نہیں پڑا۔ میک پوری سپاہ سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے۔“ رچ ڈیوک فرڈی ہینڈ اور آرچ ڈیوک کارل

زندگی کی کوئی علامت ظاہر نہیں کرتے اور ایک سے بڑھ کر ایک غلطی کا ارتکاب کیے جا رہے ہیں۔ صرف ایک کو تو زونف ہے جو فتح سے ہم کنار ہوتا ہے، فرانسیسیوں کے طلسم کو تار تار کر دیتا ہے اور وزیر جنگ اتنی دلچسپی کا بھی اظہار نہیں کرتے کہ تفصیلات ہی دریافت کر لیں۔“

”ہائی ڈیڑ فیلو، اس کی وجہ بالکل عیاں ہے۔ واہ واہ نزار کی، روس کی، روسی مسلک کی ہولی ہے۔ بہت خوب! لیکن ہمیں۔ میرا مطلب آسٹری دربار ہے۔ تمہاری فتوحات سے ہمیں کیا غرض؟ ہمیں تو ایسی فتح کی ج آرج ڈیوک کارل یا آرج ڈیوک فرڈی ہینڈ نے۔ تمہیں معلوم ہے کہ آرج ڈیوک کوئی ہو، (ان کی نگاہوں میں) کبھی اچھے ہیں۔ پائی ہو، نوید سناؤ، خواہ یہ فتح ہونا پارت کے کسی فائر بریگیڈ کو شکست دے کر حاصل کی گئی ہو۔ پھر یہ صحیح معنوں میں خبر ہوگی اور اس کا خیر مقدم تو پوں کی سلامی سے ہوگا۔ لیکن تم نے جو حرکت کی ہے (کہ یونین کے ایک جرنیل کو ہر دیا)، وہ محض ہمیں چڑانے کے لیے کی ہے۔ آرج ڈیوک کارل ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا ہے۔ آرج ڈیوک فرڈی ہینڈ کی مٹی پیدا ہو گئی ہے۔ تم لوگوں نے دیا نا کو اپنے حال پر چھوڑ دیا، اس کے دفاع سے ہاتھ اٹھا لیا، گو یہ تم یہ کہہ رہے ہو ’خدا ہمارے ساتھ ہے اور وہ ہماری مدد کرتا ہے لیکن‘ (تمہارے لیے ہم دعا ہی کر سکتے ہیں کہ) خدا تمہاری اور تمہارے پایہ تخت کی مدد فرمائے! ہمارا واحد جرنیل، جس کے ہم سب فدائی تھے، شہید تھا اور تم نے اسے بھی گولی کے منہ میں دے دیا اور اوپر سے چلے آئے ہیں ہمیں فتح کی مبارک باد دینے! تمہیں ماننا ہوگا کہ جس قسم کی خبر تم مانے ہو اس سے زیادہ جھنجھلنے والی چیز کا تصور بھی محال ہے۔ اس کے متعلق تو یہی کہا جائے گا کہ جان بوجھ کر زخموں پر نمک پاشی کی گئی ہے۔ علوہ اریں، فرض کرو تمہیں واقعی کوئی زبردست فتح حاصل ہو جاتی ہے یا آرج ڈیوک کارل ہی کہیں کامیابی سے ہم کنار ہو جاتا ہے، واقعات جس نہج پر جا رہے ہیں، یہ ایک آدھ فتح کیسے ان کا رخ تبدیل کر سکے گی؟ دیا نا پر فرانسیسیوں کا قبضہ ہو جانے کے بعد یہ سب بدلتی کی راگنیاں ہیں۔“

”کس چیز پر۔ قبضہ ہو گیا؟ دیا نا پر قبضہ ہو گیا؟“

”نہ صرف دیا نا پر قبضہ ہو گیا ہے بلکہ پیرلیس شون برن (Schonbrun) پہنچ گیا ہے اور کاؤنٹ، ہمارے ڈیڑ کاؤنٹ درینا (Vibna) اس سے احکام وصول کرنے جاتے ہیں۔“

سفر کے دوران میں بلکوسکی کو جو تھکا دٹ ہوئی، طرح طرح کے خیالات جس طرح اس کے ذہن پر عطر کرتے رہے، برن میں اس کا جس طرح استقبال ہوا اور پھر اس نے جو کھانا کھایا خاص طور پر اس کے بعد اسے محسوس ہوا کہ وہ اس قابل نہیں رہا کہ جو کچھ وہ سن رہا ہے، اس کی پوری اہمیت کا ادراک کر سکے۔

”کاؤنٹ لک ٹین فیلس (Lichtenfels) آج صبح یہاں آیا تھا،‘ بطمین بولتا چلا گیا۔“ اس نے مجھے ایک مراسلہ دکھایا۔ فرانسیسیوں نے دیا نا پر قبضہ کرنے کے بعد جو پریڈ کی اور فتح کا جشن منانے کے لیے پریس سوغا (Murat) کے ایمپرائر جو جو شعبہ کاریاں رکھا تھیں، ان سب کی تفصیل اس مراسلے میں مندرج تھیں۔ اب تم سمجھ گئے ہو

مے کہ تم لوگوں نے جو فتح حاصل کی ہے، وہ کوئی ایسی چیز نہیں جس پر خوشیاں منائی جائیں اور تمہارا بطور نجات دہندہ استقبال کیا جائے۔“

”بچ پوچھو تو مجھے اس کی پروا نہیں، بالکل پروا نہیں؟“ پرنس آندرے نے کہا۔ سب اس کی سمجھ میں یہ بات آ رہی تھی کہ آسٹریا کی پایہ تخت کے ستون جیسے گھبرو، قعات کے تناظر میں کرمس کی فتح کسی خاص ہیئت کی حامل نہیں تھی۔ ”دیوانا پر دشمن کا کیسے قبضہ ہوا؟ وہاں پل تھا، پل کے ادھر مورچہ تھا، جس کا بہت شہرہ تھا، پرنس اوریز پرگ (Auersperg) تھا، ان سب کا کیا بنا؟ ہم نے تو سنا تھا کہ پرنس اوریز پرگ دفاع کر رہا ہے،“ اس نے کہا۔

پرنس اوریز پرگ دریا کے اس کنارے، یعنی ہمارے کنارے، مقیم ہے اور ہمارا دفاع کر رہا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس معاملے میں وہ خاصا پھسندی ثابت ہو رہا ہے، تاہم وہ ہمارا دفاع کر رہا ہے۔ لیکن دیوانہ مخائف کنارے پر ہے۔ نہیں، پل پر بھی قبضہ نہیں ہوا اور میرا اندازہ ہے کہ وہ اس پر قبضہ کریں گے بھی نہیں کیونکہ اس کے نیچے سرنگیں بچا دی گئی ہیں اور اسے اڑ دیے کا حکم جاری ہو چکا ہے۔ بصورت دیگر ہم مدتوں پہلے بوہیمیا کی پہاڑیوں پر پناہ لے چکے ہوتے۔ اور تم اور تمہاری فوج دونوں اطراف کی آتش بازی کے، جین پگنس جاتی اور تمہارا برا حشر ہوتا۔“

”لیکن اب بھی اس کا مطلب یہ نہیں نکلتا کہ ہم کا خاتمہ ہو گیا ہے؟“ پرنس آندرے نے کہا۔

”ہونہہ، میرا خیال ہے کہ ہو گیا ہے۔ اور یہاں کے بڑے بڑے کوڑھ مغز بھی اسی خیال کے حامی ہیں۔ لیکن ان میں اتنی (اخلاقی) جرأت نہیں کہ وہ (کھلے بندوں) اس کا اظہار کر سکیں۔ ہو گا دعویٰ جس کا اظہار میں نے ہم کے آغاز میں کیا تھا۔ معاملہ تمہاری ڈورنشتائن (Durenstein) جیسی جھڑپوں سے طے نہیں ہو گا۔ اصولاً معاملات کا تصفیہ بارود کے ذریعے نہیں ہوتا بلکہ انھیں صرف وہی لوگ، جو ان کا سبب بنتے ہیں، سلجھ سکتے ہیں۔“

بہمن نے اپنے ہی مقولے کا حوالہ دیتے ہوئے کہا۔ اور جب اس نے ایک آدھ منٹ کا توقف کیا، اس کی پیشانی کی شکنیں درست ہو گئیں۔ ”اب مسئلہ صرف یہ ہے کہ اپنا طور الیکساندر وورشیا کے مابین جو طاقات¹⁸ طے پائی ہے، وہ کیا رنگ لاتی ہے۔ اگر پرشیا اتحاد میں شامل ہو گیا، مسٹر یا بھی اپنے پتے دکھانے پر مجبور ہو جائے گا اور جگ ہو کر رہے گی۔ اگر یہ اتحاد معرض وجود میں نہ آئے، پھر معاملہ صرف اتنا رہ جائے گا کہ کامپونر میو دوم کی دفعت کہاں مرتب ہوتی ہیں۔“

”کیسا غیر معمولی تابعدار روزگار شخص ہے!“ پرنس آندرے نے اپنی ننھی منی بند منھی اچانک میز پر مارتے ہوئے کہا۔ ”واہ کیا قسمت پائی ہے اس آدمی نے!“

”بونا پارت؟“ بہمن نے رازدارانہ انداز سے کہا اور اس نے اپنی بھویں یوں سکیر لیں جیسے وہ کوئی بڑی ظریفانہ بات کہنا چاہتا ہو۔ ”بونا پارت؟“ اس نے پہلے الف پر بطور خاص زور دیتے ہوئے دوبارہ کہا۔ ”میں یقیناً یہ سمجھتا ہوں کہ اب جب کہ وہ شون برن سے آسٹریا والوں کے لیے احکام جاری کر رہا ہے، ہمیں چاہیے کہ ہم اسے الف سے نجات حاصل کر لینے دیں۔ میں یقیناً اس جدت کو اختیار کر دوں گا اور اسے محض بونا پارت²⁰ کہوں گا۔“

”نہیں یار، مذاق چھوڑو،“ پرنس آندرے نے کہا۔ ”کیا تم واقعی یہ سمجھتے ہو کہ ہم کا خاتمہ ہو گیا ہے۔“

”میر تو یہی خیال ہے۔ آسٹریا کو یہ خوف بنایا گیا ہے اور وہ اس کا عدی نہیں ہے۔ وہ یقیناً جوانی وار کرے گا۔ اسے لو بنایا گیا ہے کیونکہ اولاً اس کے صوبوں کو تاخت و تاراج کر دیا گیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ مقدس²¹ رومی فوج بدترین انداز سے لوٹ مار کر رہی ہے۔ اس کی فوج بربادی کی بھیشت چڑھا دی گئی ہے اور اس کے ہاتھ تخت پر قبضہ جمایا گیا ہے۔ اور یہ سب کچھ اس لیے تاکہ ہر سبجٹی آف ساروینیا²² کی آنکھوں کو رحت مل سکے۔ یہی وجہ ہے۔ اور یہ بات ہمارے درمیان ہی رہے۔ کیوں کہ میری چھٹی حس مجھ سے یہ کہہ رہی ہے۔ کہ ہمارے ساتھ قریب کیا جا رہا ہے اور یہ مجھے بتا رہی ہے کہ اندر خانے فرانس کے ساتھ صلح کا ڈول ڈال جا رہا ہے، لگاتار کی جارہی ہیں تاکہ اس کا معاہدہ، خفیہ معاہدہ، طے کیا جاسکے۔“

”ناممکن!“ پرنس آندرے نے کہا۔ ”یہ تو انتہائی گھٹیا حرکت ہوگی۔“

”اس کا جواب تو وقت ہی دے گا،“ بیٹین نے جواب دیا۔ ایک بار پھر اس کی پیشانی کی شکنیں رست ہونے لگیں۔ یہ اس امر کی علامت تھی کہ گفتگو ختم ہو چکی ہے۔

پرنس آندرے اس کمرے میں، جو اس کے لیے تیار کیا گیا تھا، چلا گیا۔ پردوں کے پٹنگ پر صاف ستھری چادریں بچھی تھیں۔ نیچے گرم اور معطر تھے۔ وہ لیٹ گیا۔ اسے محسوس ہونے لگا کہ جس بڑائی کی خبر وہ لایا تھا وہ اس سے دور، کہیں دور تھی۔ برشیکی معاہدہ، آسٹریا کی غداری، یونا پارٹ کی نئی فتوحات، اگلے روز کی پریٹ، سلامی اور دربار، امپراطور فرانتس سے اس کی ملاقات۔ یہ تھیں وہ باتیں جن میں اس کا رباغ لکھا ہوا تھا۔

اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ لیکن ایک ایک گولیوں کے ترختے، توپوں کے دھاڑنے اور گاڑیوں کے پہیوں کے کھڑکھڑانے کی آوازیں اس کے کانوں میں گونجنے لگیں۔ ایک بار پھر اسے پہاڑی کے دامن میں بندوبست بھاگتے نظر آئے۔ فرانسیسی قارنگ کر رہے تھے اور وہ ایک بار پھر شمشیر کی معیت میں گھوڑے پر جا رہا تھا۔ چاروں اطراف سے گولیاں آ رہی تھیں اور ان کے کانوں کے قریب سنسناتی گزرتی جا رہی تھیں۔ اس کا دل دھک دھک کرنے لگا اور بچپن کے بعد اویس بار سے زندگی دس گن پیاری اور پر لطف محسوس ہونے لگی۔

اس کی آنکھ کھل گئی۔۔۔

”ہاں، یہ سب کچھ وقوع پذیر ہوا تھا،“ اس نے کہا۔ وہ اپنے آپ بچوں کی طرح مسکرانے لگا اور جوانوں کی مانند گھوڑے بچ کر سو گیا۔

اگلے روز وہ دیر سے جاگا۔ اپنے حالیہ اثرات کا جائزہ لینے کے دوران میں اس کے ذہن میں جو پہلا خیال آیا وہ یہ تھا کہ آج اسے امپراطور فرانتس کی خدمت میں پیش کیا جائے گا۔ اس نے دیرین جنگ، شائستہ ایڈی کا سنگ بیٹین

اور گزشتہ شب کی گفتگو کو یاد کیا۔ دربار میں حاضری دینے کے لیے اس نے اپنی پوری فوجی وردی، جسے اس نے کافی عرصے سے نہیں پہنا تھا، زیب تن کی اور بلیمن کے شڈی روم میں چا گیا۔ اس کے ہاتھ پر پٹی بندھی ہوئی تھی لیکن وہ تازہ دم ہو چکا تھا، اس کے دلوں نے جوان تھے اور وہ خوب نظر آ رہا تھا۔ شڈی روم میں اس کی مدد بھیڑ سٹارتی عملے کے چار رکان سے ہو گئی۔ وہ پرنس اپولیت کو راگن سے، جو سفارت خانے میں سیکرٹری تھا، پہلے ہی آشنا تھا۔ باقیوں کا تعارف بلیمن نے کرا دیا۔

وہ اصحاب، جو بلیمن سے ملنے آئے تھے، کھتے پیتے اور خوش طبع لو جوان تھے۔ دیانا کی طرح انھوں نے یہاں بھی ایک حلقہ خاص بنالیا تھا۔ اس حلقے کی قیادت بلیمن کے ہاتھوں میں تھی اور انھوں نے اس کا نام Les Notres ("ہم") رکھ دیا تھا۔ یہ بھروسہ تھا اور عام طور پر اس کے رکان صرف سفارت کاری بن سکتے تھے۔ ان لوگوں کو جن چیزوں سے لچبی تھی، ان کا بظاہر سیاست یا جنگ سے کوئی واسطہ نہیں تھا۔ ان کی یہ دلچسپیاں اعلیٰ طبقے، بعض خاص لیاصل خواتین اور معازست کے سرکاری پہلو کے گرد گھومتی تھیں۔ ان اصحاب نے بلا توقف پرنس آندرے کو اپنے قبیعے کا فرد تسلیم کر لیا اور یہ وہ عزت افزائی تھی جو ہر کس و ناکس کے حصے میں نہیں آتی تھی۔ ایک تو شائستگی کا تقاضا تھا، دوسرے گفتگو بہر طور کسی نہ کسی طرح شروع ہونا ہی تھی، چنانچہ انھوں نے از رہ اخلاق اس سے فوج اور حالیہ جھڑپ کے بارے میں چند سوالات دریافت کیے۔ اس کے بعد وہ دوبارہ بے تکلیف گئیں ہانکنے اور انسی مذاق کی باتیں کرنے لگے۔

"لیکن اس سارے قصے کا سب سے مزیدار پہلو یہ ہے،" ایک نے اس سانچے کا، جو اس کے ساتھی سفارت کار کے ساتھ پیش آیا تھا، ذکر کرتے ہوئے کہا، "کہ چانسلر نے اسے لگی لپٹی رکھے بغیر بتا دیا ہے کہ لندن میں اس کی تعیناتی ترقی ہے اور اسے اس تعیناتی کو سمجھنا بھی ترقی ہی چاہیے۔ اس پر اس نے جو جو شکلیں بنائیں، کیا تم ان کا تصور کر سکتے ہو؟"

"لیکن، دوستو، اس معاملے کا بدترین پہلو یہ ہے۔" یہاں میں کوراگن کے راز سے پردہ ٹھار ہا ہوں۔ کس بے چارے پر جو اتنا دیرپا ہے، اس کا نادمہ سرا اس بد ذات، اس دون وال کو ہوا ہے۔" ²⁴ پرنس اپولیت مزے سے آرام کرسی پر بیٹھا تھا۔ اس نے اپنی ٹانگیں کرسی کے بازو پر پساری ہوئی تھیں۔ وہ ہنس پڑا "پھونڈ دیا، جانے دیا۔"

"ارے، تم دونوں! تم مارا آستین!" ان سب نے با آواز بلند چلا کر کہا۔ "بلکہ کسی جہیں شاید علم نہیں ہے، بلیمن نے پرنس آندرے کی جانب متوجہ ہو کر کہا۔ "فرانسیسی فوج نے۔" معاف کرنا میں غلطی سے روسی فوج کہنے والا تھا۔ جو مظالم ڈھائے ہیں، وہ ان تباہ کاریوں کے، جو یہ خواتین کی معنوں پر برپا کرتا رہتا ہے، مقابلے میں بے حیثیت ٹھہرتے ہیں۔"

"عورت تو مرد کی رفیق ہے،" پرنس اپولیت نے فرانسیسی میں اعلان کیا اور اپنے چشمے میں سے اپنی ٹانگوں

کہ جو اس نے بازو کے اوپر ٹکائی ہوئی شخص، دیکھنے لگا۔

بلیسن اور اس کے احباب نے اپنی نگاہیں سیدھی اپولیت کے چہرے پر گاڑ دیں اور کھلکھلا کر ہنسنے لگے۔
پرنس آندرے کو یاد آیا کہ یہ تو وہی اپولیت ہے جس کا اسے اپنے آپ سے یہ قرار کرنا پڑا کہ اپنی بیوی کی وجہ سے وہ اس شخص سے حسد کرنے لگا تھا۔ اس کے اپنے حلقے میں ہر کوئی مذاقی اڑایا کرتا تھا۔
”لیکن تمہاری مہرج تو میں اب کرانا ہوں،“ بلیسن نے سرگوشیوں میں بلکونسکی سے کہا۔ ”جب کورامی سیاست پر بحث کرتا ہے، بہت لطف آتا ہے۔ دیکھنا، کتنا سنجیدہ ہو جاتا ہے!“

وہ اپولیت کے قریب بیٹھ گیا اور پیشانی سکیز کر اس کے ساتھ سیاست پر باتیں کرنے لگا۔ پرنس آندرے اور دوسرے لوگ ان کے گرد اکٹھے ہو گئے۔

”برلن کی کابینہ اتحاد کے بارے میں اپنی رائے دینے سے قاصر ہے،“ اپولیت نے ان پر معنی خیز نظریں ڈالتے ہوئے کہا۔ ”کچھ بتائے بغیر۔ جیسا کہ ان کے تازہ ترین مراسلے سے۔ تم سمجھتے ہی ہو،... تم سمجھتے ہی ہو اور علاوہ ازیں، اگر ہر میسجی امپراطور ہمارے معاہدے کے اصول سے انحراف نہیں کرتے۔ پھر وہ میری بات بھی ختم نہیں ہوئی،“ اس نے پرنس آندرے سے اس کی کلائی پکڑتے ہوئے کہا۔ ”میرا خیال ہے کہ مداخلت عدم مداخلت سے کہیں بہتر ہے اور...“ اس نے توقف کیا۔ ”علاوہ ازیں، اگر انھیں ہمارا اٹھارہ نومبر کا مراسلہ نہیں مانتا تو اسے فیصلہ کن امر قرار نہیں دیا جاسکتا۔ تو قصہ یوں ختم ہوگا۔“

اور اس نے بلکونسکی کی کلائی چھوڑ دی۔ یہ اس چیز کی علامت تھی کہ وہ اپنی بات ختم کر چکا ہے۔
”ڈیمو سٹینیج²⁵ میں نے تمہیں اس کنکری سے، جو تم اپنے سنہری دہن میں چھپائے پھرتے ہو، بچھا لے،“ بلیسن نے جواب دیا۔ اس کی دانست میں اس کا یہ جملہ اتنا تلخ تھا کہ وہ بالکل مطمئن ہو گیا۔ یہ کہ وہ بہت مطمئن تھا، اس کا اظہار یوں ہوا کہ اس کے سر پر جو چند ایک ہال تھے، وہ حرکت کرنے لگے تھے۔

سب لوگ ہنسنے لگے اور بلند ترین ہنسی پویت کی تھی۔ بظاہر وہ اذیت میں مبتلا تھا اور اسے سانس لینے میں دشواری پیش آرہی تھی لیکن وہ اپنی شوریدہ سرہنسی پر، جس نے اس کے چہرے پر، جو عام طور پر جذبات سے عاری ہوتا تھا، شج کی کیفیت پیدا کر دی تھی، قابو نہیں پاسکتا تھا۔

”حضرات، ذرا توجہ فرمائیں،“ بلیسن نے کہا۔ ”بلکونسی یہاں برن میں میرا مہمان ہے۔ میں اس کی بہترین خاطر مہارت کرنا چاہتا ہوں اور حتی الامکان اسے زندگی کی تمام نعمتیں فراہم کر دینا چاہتا ہوں۔ اگر ہم وہاں میں ہوتے، تو یہ کام بہت آسان ہوتا۔ لیکن اس مورادی بل²⁶ میں بے شمار مشکلات حائل ہیں۔ اس لیے میں تم سب سے درخواست کرتا ہوں کہ اس معاملے میں میری مدد کریں۔ برن میں مہمان نوازی کے جتنے لوازم بھی موجود ہیں، وہ ہمیں مل جل کر اسے سہیا کرنا چاہئیں۔ تم اسے تھکراؤ اور میں اعلیٰ طبقے میں لے جاؤں گا۔ رہائش خواہمیں، ان کا ذمہ اپولیت لے گا۔“

”ہمیں اسے ایکلی سے ضرور ملنا چاہیے۔ اس میں اتنی کشش ہے کہ آدمی دیوانہ وار اس کی طرف کھنچا جاتا ہے، ایک صاحب نے اپنی انگلیوں کے آخری سرے چومتے ہوئے گویا فحاشی کی۔

”بہشت مجھوں ہی میں اس خونخوار فوجی کا دل ایسی چیزوں سے، جن میں انسان دیکھیں گا پہلو زیادہ ہو، بہرہ ناپا ہے،“ ہلیمن نے کہا۔

”حضرات، میرا خیال ہے کہ میں آپ احباب کی مہمان نوازی سے مستفید نہیں ہو سکوں گا۔ میری روانگی کا وقت ہو چکی گیا،“ بلکونسکی نے اپنی گھڑی پر طائرانہ نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

”کہاں؟“

”امپراطور کی خدمت میں۔“

”اوہ اوہ اوہ!“

”اچھا خدا حافظ، بلکونسکی۔“

”پرنس! خدا حافظ، ڈنر پر ذرا جلدی آئے گا۔“

”ہم تمہارا خیال رکھیں گے۔“

”جب تمہاری امپراطور سے ملاقات ہو، تمہیں جو رسد فراہم کی گئی ہے اور راستوں کی جس طرح نشان دہی کی گئی ہے، اس کی تعریف کرنا نہ بھولنا،“ ہلیمن نے استقبال پر کمرے تک اس کا ساتھ دیتے ہوئے کہا۔

”میں ان کی تعریف ضرور کرنا چاہتا ہوں لیکن جن باتوں کا مجھے علم ہے، ان کی بنا پر ایسا کرنا ممکن نہیں،“ بلکونسکی نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

”بہرہ، جہاں تک ممکن ہو، اسے باتوں میں، لہجائے رکھنا۔ اسے لوگوں کو شرف باریابی بخشنے کا بہت شوق ہے، لیکن خود باتیں کرنا پسند نہیں۔ اور وہ باتیں کر سکتا ہی نہیں۔ تمہیں خود معلوم ہو جائے گا۔“

12

شاہی دربار میں امپراطور فرانس نے بلکونسکی کے، جو آسٹرویائی افسروں کے مابین اپنی جائے مقررہ پر کھڑا تھا، چہرے کو محض بغور دیکھا اور اپنی لمبی گردن ہلا دی۔ لیکن دربار کے اختتام پر اسی ایڈی کاٹک نے، جس سے اس کی گزشتہ روز کی انداز سے ملاقات ہوئی تھی، اسے پیغام دیا کہ امپراطور اسے شرف باریابی بخشنے کے خواہش مند ہیں۔ امپراطور فرانس نے کمرے کے بیچ کھڑے کھڑے اس کا استقبال کیا۔ ابھی گفتگو کا آغاز بھی نہ ہونے پایا تھا کہ بلکونسکی کو شدت سے احساس ہوا کہ امپراطور کھڑا کھڑا ہے اور سمجھ نہیں پا رہا کہ اسے کیا کہنا چاہیے۔ اس کا چہرہ بھی سرخ ہو رہا تھا۔

”مجھے بتاؤ کہ لڑائی کب شروع ہوئی تھی؟“ اس نے بہ عجلت دریافت کیا۔

پرنس آندرے نے جواب دیا۔ اس کے بعد جو مزید سوالات پوچھے گئے، وہ بھی بالکل سیدھے سادے تھے۔ ”کو تو زوف خیریت سے تھے؟ تمہیں کریمس سے روانہ ہوئے کتنے دن ہو چکے ہیں؟“ ”علیٰ ہذا القیاس۔“ امپراطور یوں لب کشائی کر رہا تھا جیسے اس کا واحد مقصد محض چند گئے گئے سوالات پوچھنا ہو۔ چونکہ ان سوالات کے جوابات بالکل ظاہر و عیاں تھے، اس لیے اسے ان میں قطعاً کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

”لڑائی کتنے بجے شروع ہوئی تھی؟“ امپراطور نے دریافت کیا۔

”یورمبشٹی، میں تو یہ نہیں بتا سکتا کہ محاذ پر لڑائی کتنے بجے شروع ہوئی تھی لیکن ڈورگھائن میں، جہاں کہ میں خود موجود تھا، ہماری سپاہ نے شام چھ بجے اپنے حملے کا آغاز کیا تھا،“ بلکونسکی نے جواب دیا۔ اب اس کے جوش و خروش میں اضافہ ہونے لگا تھا اور اسے یہ امید بندھ چکی تھی کہ جو کچھ وہ جانتا تھا، جو کچھ اس نے دیکھا تھا، ورنہ سب کے بارے میں اس نے اپنے ذہن میں جو نقشہ ترتیب دیا تھا، اب اسے کما حقہ بیان کرنے کا اسے موقع میسر آ جائے گا۔ لیکن امپراطور مسکرا دیا اور اس نے اس کی بات کاٹ دی، ”کتنے میل؟“

”کہاں سے کہاں تک؟ یورمبشٹی۔“

”ڈورگھائن سے کریمس تک۔“

”ساڑھے تین میل، یورمبشٹی۔“

”فرانسیسیوں نے ہایاں کتنا رہ خالی کر دیا ہے؟“

”ہمارے تجربوں کے مطابق ان کے آخری آدمی کی کشتی رات پار جا چکی تھی۔“

”کریمس میں تمہارے پاس چارہ اور چھینا کافی ہے؟“

”چارہ اور چھینا اتنا فراہم نہیں کیا گیا کہ۔“

امپراطور نے پھر اس کی بات کاٹ دی، ”جنرل شٹ کتنے بجے ہلک ہوئے؟“

”میرا خیال ہے کہ سات بجے۔“

”سات بجے؟ بہت افسوسناک! اے خدا فوس ناک!“

امپراطور نے شکر یہ ادا کیا اور گردن جھکا دی۔ پرنس آندرے پیچھے ہٹ گیا اور چلک جھپکنے میں درباریوں نے اس کے گرد گھیرا ڈال لیا۔ چاروں اطراف سے اسے دوستانہ نگاہوں اور دوستانہ الفاظ کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ اسی ایڈری کاٹنگ نے اسے جھڑپلا دی کہ وہ محل میں کیوں نہ ٹھہر اور اس نے اسے اپنا مکان پیش کر دیا۔ وزیر جنگ بھی اس کے پاس آیا اور اسے یہ تہنیت پیش کیا کہ امپراطور اسے (تمنہ) آرڈر آف ماریٹریل اور جے سوم عطا فرما رہے ہیں۔ امپراطور کے چیمبرلین نے اسے مطلع کیا کہ ہر میجسٹری اس سے ملاقات کرنے کی تمنی ہے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کس کس کی بات کا جواب دے اور اسے اپنے حواس بحال کرنے میں چند منٹ صرف ہو گئے۔ اتنے میں روسی سفیر وہاں پہنچ گیا۔ اس نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا، اسے در پیچ کے پاس لے گیا اور

اس سے باتیں کرنے لگا۔

بلیمن کی پیش گوئی کے برعکس وہ جو خیر لایا تھا، اس پر خوشیاں سنائی گئیں۔ بارگاہ الہی میں شکر ادا کرنے کے لیے خاص مذہبی تقریب کے انعقاد کا حکم جاری کیا گیا۔ کوئزوف کو (تمغہ) گریڈ کراس آف ماریٹریا سے نوازا گیا اور ساری فوج کو انعامات و اکرامات کا مستحق ٹھہرایا گیا۔ بلکونسکی کے پاس دعوت ناموں کا ڈیسرگ گیا اور اس کا سارا دن آسٹریا کی چیدہ چیدہ شخصیات سے ملنے ملانے میں صرف ہو گیا۔ تقریباً پانچ بجے شام، جب وہ لوگوں سے ان کے گھروں پر ملاقاتیں کرنے سے فارغ ہوا، اس نے بلیمن کی جائے رہائش کا رخ کیا۔ وہ دل ہی دل میں وہ اس خط کا، جو اس نے اپنے باپ کو تحریر کرنا تھا اور جس میں اس نے لڑائی اور اپنے سفر برن کی تفصیلات بیان کرنا تھیں، نفس مضمون سوچ رہا تھا۔ تاہم گھر واپس پہنچنے سے پہلے وہ ہم کے لیے چند کتابیں خریدنے ایک دکان پر رک گیا۔ بلیمن کے دروازے پر اسے ایک برتکا، جو سامان سے نصف بھر چکی تھی، کھڑکی نظر آئی۔ بلیمن کا ملازم فرانسس دروازے میں سے ٹرک نکالنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن اس سے نکل نہیں رہا تھا۔

”کیا ہوا؟“ بلکونسکی نے دریافت کیا۔

”اوہ، یوڑا کیسی لیلیسی، آپ؟“ فرانسس بدقت تمام برتکا پر ٹرک چڑھاتے ہوئے بولا۔ ”ہم مزید آگے جا رہے ہیں۔ وہ حرام زادہ ہمارے تعاقب میں یہاں آیا ہی چاہتا ہے۔“

”کیا ہوا؟ کیا کچھ رہے ہو تم؟“ فرانسس آندرے نے پوچھا۔

بلیمن اسے ملنے باہر آ گیا۔ عام طور پر اس کا چہرہ پرسکون رہتا تھا لیکن اب اس پر اضطراب سایہ فلک تھا۔ ”اب تمہیں تسلیم کرنا ہی ہوگا کہ اس ویٹا کے بلی کا قصہ بھی خوب ہے!“ اس نے کہا۔ ”انہیں ایک گولی بھی نہیں چلانا پڑی اور پل پر بھی قابض ہو گئے۔“

فرانسس آندرے کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔

”جس بات کو شہر کا ہر کو جوان جانتا ہے، وہ تمہیں کیوں معلوم نہ ہو سکی؟ کہاں تھے تم؟“

”میں آرج ڈچس سے ملنے چلا گیا تھا۔ وہاں تو میں نے کچھ نہیں سنا۔“

”اور تم نے یہ بھی نہیں دیکھا کہ ہر جگہ لوگ سامان باندھ رہے ہیں؟“

”نہیں، میں نے کچھ نہیں دیکھا۔ لیکن یہ کیا ہو رہا ہے؟“ فرانسس آندرے نے صبر کا دامن ہاتھ سے چھوڑتے ہوئے پوچھا۔

”ہو کیا رہا ہے؟ ہو یہ رہا ہے کہ جس پل کا اوپر بزرگ دفاع کر رہا تھا، وہ فرانسیسیوں نے عبور کر لیا ہے۔“

چونکہ پل کو اڑایا نہیں گیا تھا، چنانچہ موخا برق رفتاری سے ادھر آ رہا ہے اور ایک دور دراز میں برن پہنچ جائے گا۔“

”کیا۔ یہاں؟ اگر پل کے نیچے سرنگیں بچا دی گئی تھیں، پھر اسے اڑایا کیوں نہ گیا؟“

”یہ سوال تو میں تم سے پوچھ رہا ہوں۔ کسی کو بھی نہیں بلکہ خود یونا پارت کو بھی اس کیوں کا جواب معلوم نہیں۔“

بلکونسل اپنے کندھے جھٹک کر رہ گیا۔

”اگر انھوں نے پل عبور کر لیا ہے، سکا مطلب یہ ہوا کہ فوج بیکار ہو گئی۔ اس کا رابطہ منقطع ہو جائے گا۔“
 ”اصل نکتہ یہ نہیں،“ ہلمین نے جواب دیا۔ ”سنو! جیسا کہ میں نے تمہیں بتایا تھا کہ فرانسیسی دیانا میں داخل ہو گئے تھے۔ بہت خوب ان کے روز یعنی دیروز، یہ مارشل حضرات موغنا، لان (Lannes) اور بلییاسخ (Belliard)، تینوں کے تینوں گاسکن ہیں۔ وہ گھوڑوں پر سوار ہوتے ہیں اور پل پر پہنچ جاتے ہیں۔ حضرات ان میں سے ایک کہتا ہے۔ اس پل کے نیچے سرنگیں ہیں اور اس کا توڑ کرنے کے لیے جوابی سرنگیں بچھائی جا چکی ہیں۔ پل کے پار دفاعی مورچہ بھی بہت زبردست ہے۔ ان کے پاس پندرہ ہزار سپاہ ہے۔ اس سپاہ کو حکم دیا جا چکا ہے کہ پل اڑا دیا جائے اور تیس دریا عبور کرنے سے روکا جائے۔ لیکن اگر ہم پل پر قبضہ کر لیتے ہیں، ہمارے عالی مقام، امپراطور نہیں بہت خوش ہوں گے۔ چنانچہ ہم تینوں چلتے ہیں اور پل پر قبضہ کر لیتے ہیں۔“ بالکل ٹھیک، آؤ چلیں، دوسرے جواب دیتے ہیں۔ یوں وہ چل پڑتے ہیں اور پل پر قبضہ کر لیتے ہیں۔ وہ اسے عبور کرتے ہیں اور جب کہ ان کی ساری فوج ڈینیوب کے اس کنارے پہنچ چکی ہے، انھوں نے پتارخ ہماری، تمھاری اور تمھارے رسل و رسائل کے ذرائع کی طرف کر لیا ہے۔“

”مذاق چھوڑو،“ پرنس آندرے نے مسخیدگی سے کہا۔

اس خبر سے اسے دکھ بھی ہوا اور خوشی بھی۔ جونہی سے احساس ہوا کہ روسی فوج ایک ایسی صورت حال میں پھنس گئی ہے جس میں اس کے سرخ رو ہونے کا کوئی امکان نہیں، اپنے آپ ایک خیال اس کے ذہن میں کوندے کی طرح پکا کہ وہ خود وہ شخص ہے جس کے مقدر میں اس کی رہنمائی کرنا اور اسے اس صورت حال سے باہر نکالنا ہے۔ یہ اس کا قولوں ہو گا جو اسے غیر معروف انسروں کی صف سے اوپر اٹھ دے گا اور شہرت کے ذریعے پر کھڑا کر دے گا۔ ہلمین کی باتیں سنتے سنتے اس نے ہوئی قلعے تعمیر کرنا شروع کر دیے تھے۔ ”جب میں فوج میں واپس جاؤں گا، میں جنگی کونسل کے سامنے اپنا منصوبہ پیش کروں گا۔ میرا منصوبہ واحد منصوبہ ہو گا جو فوج کو بچائے گا اور پھر مجھے ہی اس منصوبے کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لیے کہا جائے گا۔“

”مذاق چھوڑو،“ اس نے کہا۔

”میں مذاق نہیں کر رہا،“ ہلمین نے اپنی بات جاری رکھی۔ ”اس سے زیادہ صحیح، درافسوس ناک بات اور کوئی نہیں ہو سکتی۔ یہ تینوں حضرات تنہا پل پر کتے ہیں اور سفید رومال لہراتے ہیں۔ وہ ڈیوٹی آفیسر کو قائل کر لیتے ہیں کہ یہ صلح کی نشانی ہے، وہ تینوں مارشل ہیں اور پرنس اور پرنس پرگ سے گفت و شنید کرنے جا رہے ہیں۔ وہ انھیں مورچے کا اندر آنے دیتا ہے۔ وہ گاسکن ہیں اور جیسا کہ گاسکنوں کا دیرہ ہے، وہ اسے ایک ہزار ایک در فطینیا³¹ سنا دیتے ہیں۔ وہ اسے بتاتے ہیں کہ جنگ ختم ہو چکی ہے، امپراطور فرانس نے بونا پارت کے ساتھ ملاقات کا نظام کیا ہے اور وہ پرنس اور پرنس پرگ سے ملاقات کرنے کے متمنی ہیں، وغیرہ وغیرہ۔ انسر اور پرنس پرگ کو پیغام بھیجتا

ہے کہ وہ تشریف لائے۔ یہ حضرات افسروں سے گھل مل جاتے ہیں، ان کے ساتھ معاف کرتے ہیں، لطیفہ سنتے ہیں، اور یک گجال پر بیٹھ جاتے ہیں۔ دریں اثنا ایک فرانسیسی بڑے لپٹن چپے سے پل پر پہنچ جاتی ہے اور کسی کو بتا بھی نہیں چلا۔ فرانسیسی سپاہی آتش گیر مادے کی بوریاں اٹھا کر دریا میں پھینک دیتے ہیں اور مورچے کی جانب پیش قدمی کرنے لگتے ہیں۔ آخر کار لیفٹیننٹ جنرل، ہمارے ڈیپریٹس اوریز برگ، دان سوٹرن، جنس نفیس تشریف لے آتے ہیں۔ ہمارے عزیز ترین دشمن صاحب! غنچہ سپاہ آسٹریا صاحب ترکی جنگوں کے ہیرو صاحب ا حرب و ضرب فتم، اب ہم مصافحہ کر سکتے ہیں۔ امپراطور نیپولین پرنس اوریز برگ سے ملاقات کرنے کے لیے بے قرار ہیں۔ قصہ مختصر، یہ حضرات، جو نہی گاسکن نہیں ہیں، اسے خوبصورت غظوں اور جموں کی وہ، ردیتے ہیں کہ اس کے لیے جواب دینا ناممکن ہو جاتا ہے۔ فرانسیسی، رشلوں نے جس برق رفتار بے تکلفی کا مظاہرہ کیا، وہ اس سے اس قدر مسور ہوا، موعا کے فرغل اور شتر مرغ کے پردوں نے اس کی آنکھیں کچھ اس طرح چندھیا دیں کہ اسے جس آگ کا رخ ان کی طرف کرنا چاہیے تھا، وہ اس کی اپنی آنکھوں میں چلنے لگی۔ "بلین جس جوش و خروش اور دلوے کے ساتھ تقریر کر رہا تھا، اس کے باوجود اس نے وقت دینا ضروری خیال کیا تا کہ بلکونسکی کو اتنا موقع مل سکے کہ وہ اس کی خطابت اور بدلتی کی تحسین کر سکے۔" فرانسیسی بنالین سوختہ پا مورچے کی طرف بڑھتی ہے، گجالوں کے منہ کیسے ٹھونک کر بند کر دیتی ہے اور پل پر قبضہ کر لیتی ہے۔ لیکن سب سے پر لطف بات یہ ہے، "اس نے اپنا سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔" اس پر کہانی کا طلسم کچھ اس بری طرح سوار ہوا کہ وہ اپنی پریشانیاں بھی بھول گیا۔ جس سارجنٹ کے سپرد وہ گجال، جسے اس نے داغ کر یہ اشارہ دینا تھا کہ سرنگوں کو گ لگا دی اور پل کو تباہ کر دیا جائے، کی گئی تھی، اس سارجنٹ نے جب فرانسیسی سپاہ کو پل کی طرف بھاگتے ہوئے دیکھا، وہ اپنی گجال داغنے ہی والا تھا کہ، ان نے اس کا ہاتھ روک لیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ سارجنٹ اپنے جرنیل سے زیادہ سمجھدار تھا۔ وہ اوریز برگ کے پاس پہنچتا ہے اور اس سے کہتا ہے: "پرنس! آپ سے فریب کیا گیا ہے۔ فرانسیسی تو یہاں آ بھی گئے ہیں! موعا ٹاڑ جاتا ہے کہ اگر سارجنٹ کو مزید بات کرنے کا موقع دیا گیا، بنا ہٹا یا کھیل بگڑ جائے گا۔ چنانچہ وہ سچے گاسکن کی طرح جھوٹ موٹ حیرت کا اظہار کرتا ہے اور مڑ کر اوریز برگ سے کہتا ہے: "آسٹریا کے نظم و ضبط کے توکل عالم میں جیسے تھے، کہاں گیا وہ؟ آپ کا، تحت اور آپ سے یوں بات کرے، حد ہو گئی! ایسی بات صرف نابے کو ہی سوجھ سکتی ہے! پرنس اوریز برگ کو محسوس ہوتا ہے کہ اس کا وقار داؤں پر لگ گیا ہے، چنانچہ وہ سارجنٹ کی گرفتاری کا حکم دے دیتا ہے۔ تمہیں بہر حال یہ تسلیم کرنا ہی پڑے گا کہ ویانا پل کی راستان بے حد نڈیر ہے۔ یہ نہ فری حیات سجا اور نہ اسے بزدلی کہا جاسکتا ہے۔"

"پھر غالباً یہ خدا دی ہے،" پرنس آندرے نے کہا۔ وہ اپنے تحیل میں غیب لے اور کوٹ، زخم، توپوں کا احوال، گولہ باری واضح طور پر دیکھ رہا تھا اور پھر جو چیز اس کے لیے سرخاب کا پر بننے والی تھی، اس کی جھلک بھی اس کے ذہن میں گھوم گئی۔

”نہیں، یہ بھی نہیں۔ اس سے تو دربار کو ایک طرح کی فضیلت حاصل ہو جاتی ہے،‘‘ ہیبین بولتا چلا گیا۔ ”یہ نہ غداری ہے، نہ بزدلی اور نہ بے جہتی۔ یہ بالکل وہی ہے جو لم میں ہوا تھا۔۔۔“ معلوم ہوتا تھا کہ وہ کوئی سوزوں لفظ یا ترکیب ڈھونڈ رہا تھا۔ ”یہ بالکل وہی حرکت ہے جو میک نے کی تھی۔ یوں سمجھو کہ ہمیں میک کرویا گیا ہے۔“ اس نے اپنی بات ختم کر دی۔ وہ یوں محسوس کر رہا تھا جیسے اس نے کوئی نیا لفظ تخلیق کر دیا ہو اور اب ہر کہہ دہرہ اس کی چمکائی کرتا پھرے گا۔

اس کے ابروؤں کی شکلیں دوبارہ درست ہو گئیں۔ یہ اس مرکی علامت تھی کہ وہ اپنی کارکردگی پر مطمئن ہے۔ اس کے چہرے پر ہلکی ہلکی مسکراہٹ کھیل رہی تھی اور وہ اپنے ناخنوں کا بخور جائزہ لے رہا تھا۔

”اب کہاں کے ارادے ہیں؟“ اس نے پرس آندرے سے، جو ٹھکڑا ہو گیا تھا اور اپنے کمرے کی طرف جا رہا تھا، دریافت کیا۔

”مجھے جانا ہوگا۔“

”کہاں؟“

”فوج میں۔“

”لیکن تم تو مزید دندن ٹھہرنا چاہتے تھے۔“

”نہیں، مجھے فوراً روانہ ہونا ہوگا۔“

اور پرس اپنی روانگی کے بارے میں ہدایات دینے کے بعد اپنے کمرے کی طرف چل پڑا۔

”میرے دوست، تم جانتے ہو،“ ہیبین نے اس کے پیچھے پیچھے آتے ہوئے کہا۔ ”میں تمہارے بارے میں سوچ رہا ہوں۔ تم کیوں جا رہے ہو؟“

اور اس بات کے ثبوت میں کہ جو دلائل وہ دینے والا تھا، ان کی تردید ممکن ہی نہیں، اس کے چہرے کی تمام شکنیں کا نور ہو گئیں۔

پرس آندرے نے اس پر استغہامیہ نگاہ ڈالی اور کوئی جواب نہ دیا۔

”تم کیوں جا رہے ہو؟ مجھے معلوم ہے۔ تمہارا خیال ہے کہ جب فوج خطرے کی زد میں ہو، تو تمہارا یہ فرض بنتا ہے کہ تم پر لگا کر وہاں پہنچ جاؤ۔ مائی ڈیئر، میں خوب سمجھتا ہوں۔ اسی کا نام ہیر وازم ہے۔“

”نہیں، بالکل نہیں،“ پرس آندرے نے کہا۔

”لیکن تم تو فلسفی ہو، پھر پورے (فلسفی) کیوں نہیں بنتے؟ مسئلے کا دوسرا پہلو بھی دیکھو۔ پھر تمہیں معلوم ہوگا کہ اپنی سوچ کے عملی اصرار تمہارا یہ فرض بنتا ہے کہ تم اپنے آپ کا خیال رکھا کرو۔ دیگر تمام باتیں دوسروں پر، جو کسی اور کام کے اہل نہیں، چھوڑ دو۔ تمہیں واپس پہنچنے کا کوئی حکم نہیں دیا گیا اور تمہیں یہاں سے فارغ نہیں کیا گیا۔ چنانچہ ہمیں ٹھہرنا اور ہمارے ساتھ چلنا ہے کہ ہم اول ملٹس (Olmütz) جا رہے ہیں اور اول ملٹس بہت دلکش

اور پیارا تھبہ ہے۔ تم بڑے آرام اور سہولت سے میری گاڑی میں وہاں جا سکتے ہو۔“
 ”ہلپین، یہ مسخرگیاں چھوڑ دو،“ بلکوسکی نے کہا۔

”میں دوست کی حیثیت سے تمہارے ساتھ بڑے خلوص سے بات کر رہا تھا۔ ذرا سوچو! جب تم یہاں قیام کر سکتے ہو پھر تم کہاں اور کیوں جا رہے ہو؟ تمہارا واسطہ دو میں سے ایک چیز سے ہے۔“ جب اس نے یہ الفاظ کہے، اس کی بائیں کچھلی کی جلد پر شکنیں پڑ گئیں۔ ”بات تو تمہارے اپنی رجسٹر میں واپس پہنچنے سے پہلے ہی معاہدہ امن تکمیل تک پہنچ جائے گا یا پھر کو تو زوف کی تمام فوج کے مقدر میں جو شکست اور رسوائی لکھی جا چکی ہے، تم اس میں برابر کے شریک بن جاؤ گے۔“

یہ محسوس کرتے ہوئے کہ مختصر لائیوٹیل ہے، ہلپین نے اپنی شکنیں درست کر لیں۔

”میں اس بارے میں بحث میں نہیں پڑ سکتا،“ پرنس آندرے نے سرد مہری سے کہا۔ لیکن وہ کچھ سوچ رہا تھا اور اس نے کہا: ”میں جا رہا ہوں تا کہ فوج کو بچا سکوں۔“
 ”مائی ڈیئر فیلو۔ تم واقعی ہیرد ہو،“ ہلپین نے کہا۔

13

بلکوسکی نے وزیر جنگ سے اجازت لی اور اسی رات روانہ ہو گیا۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ اسے فوج کہاں ملے گی اور پھر اسے یہ اندیشہ بھی لاحق تھا کہ شاہراہ کریس پر سفر کے دوران میں وہ کہیں فرانسیسیوں کے ہتھے ہی نہ چڑھ جائے۔
 برن میں ہر وہ شخص، جس کا تعلق دربار سے تھا، اپنا سامان باندھ اور سفر کی تیاریاں کر رہا تھا۔ بھاری سامان پیچھے ہی اول سٹس روانہ کیا جا چکا تھا۔

ایٹلس ڈورس (Etzelsdors) کے قریب پرنس آندرے اس شاہراہ پر، جس کے ساتھ ساتھ روسی فوج انتہائی بدترتیبی کے عالم میں سروں پر پاؤں رکھے بھاگی جا رہی تھی، پہنچ گیا۔ سڑک سامان کے چھکڑوں سے اتنی پیٹی پڑی تھی کہ ان میں سے سواری کی گاڑی کے لیے گز رانا ناممکن تھا۔ پرنس آندرے نے ایک قازق کدھر سے گھوڑا اور قازق اردلی لیا اور سامان کے چھکڑوں کو پیچھے چھوڑنا آگے بڑھنے لگا۔ وہ بھوکا تھا، پیاسا تھا اور اس کے جسم کا ایک ایک جوڑ درد کر رہا تھا لیکن اس پر ایک ہی دھن سوار تھی کہ وہ کسی نہ کسی طرح جلد از جلد کمانڈر انچیف اور سامان کو تلاش کر لے۔ سفر کے دوران میں اسے فوج کی حالت کے بارے میں انتہائی منحوس افواہیں سننے کو ملیں اور جس بد نظمی کے ساتھ سپاہ مارا مار بھاگی جا رہی تھی اس سے ان افواہوں کی تصدیق ہو رہی تھی۔

”جس روسی فوج کو برطانوی سونے کی کشش ادھر کھینچ لائی ہے، ہم اس کا وہی حشر کر دیں گے۔ وہی حشر، جو اس سپاہ کا، جو الم میں لڑنے آئی تھی، ہوا تھا...“ اسے بوٹا پارت کے حکم کے یہ الفاظ، جو اس نے ہم کے آغاز میں اپنی فوج سے خطاب کے دوران میں کہے تھے، یاد آ گئے۔ ان الفاظ نے اسے اپنے ہیرد کی فطانت پر درط حیرت

میں ڈل دیا۔ ان سے ایک طرف اسے اپنے پندار کے صنم کدے کے دیران ہونے کا حساس ہوا اور دوسری طرف اسے یہ امید بھی ہونے لگی کہ اب وہ نام کما سکے گا۔ ”اگر موت کو گلے لگانے کے علاوہ اور کوئی چارہ کار باقی نہیں رہا، اس نے سوچا، ”پھر میں موت کو لبیک کہنے کے لیے بھی تیار ہوں اور میں کسی دوسرے کی نسبت بدتر انداز سے نہیں مردں گا۔“

مختلف فوجی دستے، جن کا سلسلہ ختم ہونے کا نام نہیں لیتا تھا، انفرادی کے عالم میں ایک دوسرے سے الگ ٹھلک چلے جا رہے تھے۔ سامان سے لدے پھندے چھٹڑے، توپ خانے کی پونٹیں، ان کے بعد پھر چھٹڑے اور ٹکڑے طور پر ہر قسم کی گاڑیاں ایک دوسرے سے آگے نکلنے کی کوشش میں آپس میں گتھم گتھا ہو رہی تھیں۔ کچنریلی سڑک پر، ایک دوسرے کے لیے رکاوٹ بن رہی تھیں اور بعض اوقات تین تین چار چار ایک دوسرے کے برابر ہو جاتی تھیں۔ آگے پیچھے، دائیں بائیں، چاروں اطراف سے تاحد سماعت پہیوں کی گھڑ گھڑاہٹ، ویکو ب چھٹڑوں اور توپ گاڑیوں کی گھڑ گھڑاہٹ، چابکوں کی ترخ پڑخ، سموں کی دڈر دڈر، کوچوانوں کی چیخ پکار، اور جواؤں، اردلیوں اور انسروں کی گان گلوچ کی آوازیں کانوں کے پردے پھاڑے دے رہی تھیں۔ جہاں تک نظر کام کرتی تھی سڑک کے دونوں کناروں پر گھوڑے گرے پڑے دکھائی دے رہے تھے۔ ان میں سے بعض کو اتنا مارا پیٹا گیا تھا کہ ان کی چھڑی ادھڑ گئی تھی۔ یہاں وہاں شکستہ گاڑیاں بھی کھڑی تھیں۔ ان کے قریب اکا دکا جوان بیٹھے کسی کا انتظار کر رہے تھے۔ بعض سپاہی اپنی کپینوں سے چھٹڑے تھے اور ہجوم در ہجوم قریبی دیہاتوں کا رخ کر رہے تھے۔ وہاں لوٹ مار کر رہے تھے۔ جو واپس آ رہے تھے، وہ اپنے ساتھ بھینٹیں، مرغیاں، گھاس، چھینا اور الم غلم اشیاء بھری بوریاں لا رہے تھے۔ سڑک کی ہر چڑھاٹی اور اترائی پر ہجوم پہلے سے کہیں زیادہ گھنا ہو جاتا اور شور و غل تھا کہ کہیں قہمنے کا نام نہ لیتا۔ سپاہی ایڑیوں تک کیمچڑ میں دھسے ہوئے تھے اور توپوں اور چھٹڑوں کے سہارے آگے بڑھ رہے تھے۔ چھانٹے سر سر رہے تھے، گھوڑوں کے پاؤں پھسل رہے تھے اور قدموں کے نشانات پلک جھپکنے میں مٹ رہے تھے۔ پیچھے پھڑے تھے کہ بار بار چلانے سے پیٹے جا رہے تھے۔ وہ انسر، جو سپاہی کی نگرانی پر مامور تھا، گھوڑوں پر گاڑیوں کے آگے پیچھے بھاگے پھر رہے تھے۔ اس ہاؤش میں ان کی آواز بمشکل سنائی دے رہی تھی۔ ان کے چہروں سے صاف ٹپک رہا تھا کہ وہ اس بد نظمی پر قابو پانے کی امید کھو چکے ہیں۔

بلکونسکی یہ سب کچھ دیکھتا تھا اور نفرت سے منہ دوسری طرف موڑ لیتا تھا۔ ”اور یہ ہماری مذہبی روایات کی حامل پیاری فوج ہے،“ اس نے ملین کے اخطا ظیاد کرتے ہوئے سوچا۔

گھوڑے پر سوار وہ ایک قافلے کے پاس پہنچا۔ وہ کمانڈر انچیف کا انا پنا معلوم کرنا چاہتا تھا۔ اس کے بالکل بال مقابل ایک عجیب و غریب گاڑی متحرک تھی۔ اسے صرف ایک گھوڑا کھینچ رہا تھا۔ صاف نظر آ رہا تھا کہ جو اہل بل فوجیوں کے ہاتھ لگی، انہوں نے اس سے یہ گاڑی کھڑی کر لی تھی۔ یہ نہ چھٹڑا تھی نہ ٹیم اور نہ کالاں، بلکہ ان کے بین بین کوئی چیز تھی۔ اسے ایک فوجی ہاتھ رہا تھا۔ اور اس کے عقبی حصے میں ایک عورت، جس نے اپنے جسم

کے گردشاں لپیٹ رکھی تھی، پیٹھی تھی۔ پرنس آندرے گاڑی کے قریب پہنچا۔ وہ ایک جوان سے اپنا سوال پوچھا ہی چاہتا تھا کہ اس کی توجہ اس عورت کی چیخ پکار کی طرف مبذول ہوگئی۔ اصل میں ہوا یہ تھا کہ قالے کے انچارج افسر نے اس جوان کو، جو اس عورت کی گاڑی ہانک رہا تھا، چابک مارنے کی کوشش کی تھی کیونکہ وہ دوسروں سے آگے نکلتا چاہتا تھا لیکن اس کی زد میں یہ عورت آگئی۔ یوں وہ محض راویلا ہی نہیں کرنے لگی بلکہ اس نے اپنی چیخوں سے ”سہن سر پر اٹھالیا۔ جب اسے پرنس آندرے نظر آیا، وہ گاڑی سے باہر کی جانب جھکی، اپنے دے پتلے باروشل سے باہر نکالے اور انھیں ادھر ادھر گھساتے ہوئے چلا چلا کر کہنے لگی۔

”ایجوئنٹ! مسٹر ایجوئنٹ... خدا کے لیے... مجھے بچاؤ... کیا بنے گا ہارا؟... میں شامروں کی ساتویں رجمنٹ کے ڈاکٹر کی بیوی ہوں۔ یہ ہمیں گزرنے نہیں دیتے۔ ام پیچھے رو گئے ہیں اور اپنے ساتھیوں سے ہٹ گئے ہیں۔“

میں بار بار کرتھارا پلٹتھمن بنا دوں گا! پیچھے ہٹو!“ غصے سے آگ بگولہ افسر نے فوجی کو جوان سے کہا۔ ”اس بے ہودہ عورت کو لے کر پیچھے ہٹ جاؤ!“

”مسٹر ایجوئنٹ، مجھے بچاؤ! کیا بنے گا ہارا؟“ ڈاکٹر کی بیوی نے پھیپھڑوں کا پورا زور لگا کر کہا۔ ”اس گاڑی کو گزر جانے دیں۔ نوازش ہوگی۔ دیکھتے نہیں، اس میں زنا زہ سوار ہے؟“ پرنس آندرے نے گھوڑے پر بیٹھے بیٹھے افسر کے پاس پہنچ کر کہا۔

افسر نے اس پر سرسری نگاہ ڈالی اور جواب دیے بغیر فوجی کو جوان کی طرف متوجہ ہوا۔

”میں تمھاری ایسی ٹیم کی کر دوں گا۔ واپس!“

”میں کہتا ہوں انھیں گزر جانے دو!“ پرنس آندرے نے ہونٹ پیچھے ہوئے دوبارہ کہا۔

”تم کون ہو؟“ افسر نے اچانک یوں غضب بٹاک ہو کر کہا جیسے وہ نشے سے مخمور ہو۔ ”میں پوچھتا ہوں۔ کون ہو تم؟ تمھارا خیال ہے کہ یہاں تمھارا حکم چلتا ہے؟ یہاں کمان سیرے ہاتھ میں ہے، تمھارے نہیں! چلو، ہٹو پیچھے!“ اس نے دوبارہ کہا۔ ”ورنہ مار مار کر میں تمھارا پیٹھن بنا دوں گا۔“

بظاہر اس افسر کو اپنا یہ جملہ بہت پسند تھا۔

”اس نے اس سختی ایجوئنٹ کی خوب خبر لی ہے، پیچھے سے آواز کی دی۔“

پرنس آندرے سمجھ گیا کہ اندھے اور نیشیلے پیش نے اس افسر کو اس حاست تک پہنچا دیا ہے کہ خود اسے معلوم نہیں کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ اسے یہ احساس بھی ہوا کہ اس نے عجیب اسوع گاڑی میں سوار عورت کی جو حمایت کی ہے، اس سے دوسروں کو اس کا مذاق ڈانے کا موقع مل گیا ہے اور یہ وہ چیز تھی جس سے وہ دنیا کی کسی بھی دوسری چیز کے مقابلے میں زیادہ خائف تھا۔ لیکن وہ اپنی جہلت کے اشارے پر چل رہا تھا۔ اس افسر نے بمشکل اپنا جملہ ختم کیا ہوگا کہ پرنس آندرے، غیظ و غضب نے جس کے چہرے کی شکل بگاڑ دی تھی، گھوڑے پر سوار اس کی طرف

”پرنس، آپ کو اپنا سامان دامان کچھ نہیں ملے گا اور خدا جانے کہ آپ کے اردلی پیوتر کا کیا بنا،“ دوسرے انچوسٹ نے کہا۔

”ہیڈ کوارٹر کہاں ہے؟“

”ہمیں رست زنائم (Znaim) میں گزارنا ہے۔“

”مجھے جو کچھ چاہیے، میں نے دو گھوڑوں پر لاد لیا ہے،“ ٹیس، وٹسکی نے کہا۔ ”انھوں نے کیا لا جواب بیکنگ کی ہے! میں چاہوں تو اسے اٹھ کر بوئسیا کی پہاڑیاں عبور کر لوں۔ برادر، بڑا پتلا حاکم ہے! لیکن تمہیں کیا ہوا ہے؟ تم لازماً بیمار ہو گئے، بری طرح کانپ رہے ہو!“ ٹیس وٹسکی نے کہا۔ اس نے پرنس کو یوں جھرجھری لیتے دیکھ لیا تھا جیسے اسے بجلی کا جھٹکا لگا ہو۔

”کچھ نہیں،“ پرنس آندرے نے جواب دیا۔

اسے ابھی ابھی ڈاکٹر کی بیوی اور قافلے کے افسر کے ساتھ اپنی حالیہ ٹھہر بھڑیا دآئی تھی۔

”کمانڈر انچیف یہاں کیا کر رہے ہیں؟“ اس نے پوچھا۔

”مجھے کچھ معلوم نہیں،“ ٹیس وٹسکی نے جواب دیا۔

”خیر، میں صرف ایک بات جانتا ہوں۔ یہ سب کچھ شرمناک، شرمناک، انتہائی شرمناک ہے!“ پرنس آندرے نے کہا اور وہ اس مکان کی طرف، جس میں کمانڈر انچیف مقیم تھا، چل پڑا۔

باہر کو تو زونف کی گاڑی، اس کے مناف کے گھوڑے اور قازق، جو آپس میں با آواز بلند باتیں کر رہے تھے، کھڑے تھے۔ پرنس آندرے ان کے قریب سے گزرتا راہداری میں داخل ہو گیا۔ اسے بتایا گیا کہ کو تو زونف اندر ہی ہے اور اس کے ساتھ باگ راتیاں اور دے روٹر (Weyrother) ہیں۔ وہ روٹر آسٹروی جرنیل تھا۔ وہ ٹشٹ کی ہدایت کے بعد اس کی جگہ تعینات ہوا تھا۔ راہداری میں کوتاہ قامت کز لوو سکی آلتی پالتی مارنے ایک کلرک کے سامنے بیٹھا تھا۔ کلرک اپنی وردی کے کف دوہرے کیے ایک الٹے ٹب پر کچھ تیز تیز لکھنے میں مصروف تھا۔ کز لوو سکی کی شکل سے معلوم ہوتا تھا کہ ٹھکن سے اس کا برا حال ہے۔ بظاہر وہ ساری رات نہیں سویا تھا۔ اس نے پرنس آندرے کو سرسری نگاہوں سے دیکھا لیکن اتنا بھی نہ کیا کہ ذرا اپنی گردن کو بھی خم دے کر علیک سلیک کر لیتا۔

”دوسری سطر... لکھ لی تم نے؟“ اس نے پوچھا اور کلرک کو لکھانے میں مصروف رہا۔

”کیف گریڈ ریڈر کی پہلی رجسٹر، پادولیا۔“

”حضور، میں اتنا تیز نہیں لکھ سکتا،“ کلرک نے کز لوو سکی کو غصیلی اور گستاخانہ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ کو تو زونف کی آواز دروازے سے باہر سنائی دے رہی تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ جوش میں آیا ہوا ہے اور سخت خفا ہے۔ ایک اجنبی آواز نے اسے ٹوکا۔ ان آوازوں کا شور شرابا، کز لوو سکی کا اس کی جانب بے توجہی سے دیکھنا، متوجش کلرک کا گستاخانہ رویہ، کز لوو سکی اور کلرک کا کمانڈر انچیف کے اسے نزدیک ٹب کے سامنے فرش پر بیٹھنا،

قازقوں کا گھوڑوں کی لگا میں تھامے درتے کے عین نیچے ملک شگاب قہقہے لگاتا، ان تمام باتوں سے پرنس آندے کو یہ محسوس ہوا کہ کوئی انتہائی اہم درقیامت خیز واقعہ ظہور پذیر ہونے والا ہے۔

اس نے کز لودسکی سے کچھ پوچھا اور کہا کہ اسے اس کا فوری جواب چاہیے۔
 ”پرنس، ایک منٹ،“ کز لودسکی نے کہا، ”... باگ راتیاں کے دستوں کی تقسیم و ترتیب۔“
 ”یہ ہتھیار ڈالنے کا کیا چکر ہے؟“

”ہتھیار ڈالنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ لڑائی کے حکام جاری ہو چکے ہیں۔“

جس دروازے سے آوازیں آرہی تھیں، پرنس آندرے ادھر چل پڑا۔ وہ ابھی دروازہ کھولنے کا ارادہ ہی کر رہا تھا کہ آوازیں بند ہو گئیں، دروازہ کھلا اور کوتوزوف، جس کی ناک طوطے کی ناک سے مشابہ تھی، درجس کے گال پھولے پھولے تھے نمودار ہو۔ اگرچہ پرنس آندرے اس کے بالکل سامنے کھڑا تھا، مگر انڈرائیچیف کی اکلون صحیح سلامت آنکھ میں جو ہار تھا، اس نے اس سے اندازہ لگایا کہ وہ اپنے ہی خیالات و تفکرات میں اتنا مستغرق ہے کہ اسے گرد و پیش کچھ سمجھائی نہیں دے رہا۔ اس نے سیدھا اپنے ایجوٹٹ کے چہرے کی جانب دیکھا لیکن اسے کچھ معلوم نہ ہو سکا کہ یہ کون ہے۔

”اوہ، ختم کر لیا؟“ اس نے کز لودسکی سے پوچھا۔

”صرف ایک منٹ، پورٹ ایکسی لینسی۔“

سوکھاسز، ارہیز عمر، یہ نہ قاست باگراتیاں، جس کے چہرے پر مشرقیوں کے انداز کا عزم جھلک رہا تھا لیکن جو جذبات سے قطعاً عاری تھا، انڈرائیچیف کے پیچھے پیچھے باہر آگیا۔

”مجھے آپ کی خدمت میں حاضر ہونے کا شرف حاصل ہو رہا ہے۔“ پرنس آندرے نے دوسری مرتبہ اس قدرے بآواز بلند بولتے اور کوتوزوف کے ہاتھ میں لفافہ چھماتے ہوئے کہا۔

”اچھا، دیا تا ہے؟ بہت خوب! بعد میں، بعد میں!“

کوتوزوف باگراتیاں کے ساتھ پورچ کی طرف چل پڑا۔

”اچھا، پرنس، خدا حافظ!“ اس نے باگراتیاں سے کہا۔ ”یسوع مسیح تمہارے حامی و ناصر ہوں۔ تمہاری اس عظیم مہم میں میری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں۔“

کوتوزوف کا چہرہ اچانک ملائم ہو گیا اور اس کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔ اس نے ہائیں ہاتھ سے باگراتیاں کو اپنی جانب کھینچ لیا اور دائیں ہاتھ سے، جس میں اس نے انگوٹھی پہنی ہوئی تھی، اس کے جسم پر ایسے انداز سے صلیب کا نشان بنایا جس سے صاف نظر آتا تھا کہ وہ عادتاً ایسا کرتا ہے۔ اس نے اپنا پھونکا پھولا رخسار آگے بڑھا دیا لیکن باگراتیاں نے اس کی بجائے اس کی گردن پر بوسہ دیا۔

”یسوع مسیح تمہارے حامی و ناصر ہوں!“ کوتوزوف نے دوبارہ کہا اور اپنی گاڑی کی طرف چل پڑا۔

”میرے ساتھ اندر آ جاؤ“ اس نے بلکونسکی سے کہا۔

”پورے کیسی لینسی، میں چاہتا ہوں کہ میں یہاں کسی کام آؤں۔ اگر آپ اجازت مرحمت فرمائیں، میں پنس ہاگراتیاں کی سپاہ کے ساتھ ٹھہر جاتا ہوں۔“

”اندر آ جاؤ“ کوٹوزوف نے کہا اور یہ دیکھتے ہوئے کہ پنس آندرے ہچکچا رہا ہے، اس نے مزید کہا، ”خود مجھے اچھے انسروں کی ضرورت ہے، خود مجھے ان کی ضرورت ہے۔“

وہ گاڑی میں بیٹھ گئے اور چند منٹ خاموشی سے سفر کرتے رہے۔

”ابھی ہمیں بہت کچھ کرنا ہے، ابھی بہت کام ہیں،“ اس نے یوں کہا جیسے بلکونسکی کے قلب و دماغ میں جو کچھ گھوم رہا تھا، وہ ایک معمر شخص کی ژرف نگاہی اور فرست سے سب کچھ سمجھتا ہے۔ ”اگر اس کی سپاہ کا دسواں حصہ بھی کل صبح سلامت واپس آ گیا، میں خداوند کے حضور سجدہ شکر بجا لوں گا“ اس نے مزید کہا جیسے وہ اپنے آپ سے باتیں کر رہا ہو۔

پنس آندرے نے کوٹوزوف کے چہرے پر، جو اس سے ایک آدھ فٹ دور تھا، سرسری نگاہ ڈالی اور اس نے وہاں غیر رادی طور پر خالی خانہ چشم اور اس کی کپٹی کے نزدیک، جہاں اسماعیل کے معرکے میں ایک گولی اس کی کھوپڑی کو چیرتی ہوئی نکل گئی تھی، زخموں کے گہرے اور واضح نشانات دیکھ لیے جنہیں خوب دھودھا کر صاف کر دیا گیا تھا۔ ”ہاں۔“ اس نے سوچا۔ ”اسے ان اشخاص کے اطراف کے متعلق یوں پرسکون لہجے سے بات کرنے کا حق حاصل ہے۔“

”اسی لیے میں نے گزارش کی تھی کہ مجھے اس سپاہ میں بھیج دیا جائے،“ اس نے کہا۔

کوٹوزوف نے کوئی جواب نہ دیا۔ معصوم ہوتا تھا کہ جو کچھ وہ کہہ رہا تھا، وہ سب بھول چکا ہے۔ دراب اپنے خیالات میں متفرق ہے۔ پانچ منٹ بعد اس نے گاڑی کے چک دار سپرنگوں پر آرام سے جھولتے ہوئے پنس آندرے کی جانب مڑ کر دیکھا۔ اس کے چہرے پر پریشانی کے قطعاً کوئی آثار نہیں تھے۔ وہ اس سے امپر طور سے اس کی ملاقات، معرکہ کریکس کے بارے میں درباریوں کے تاثرات اور اپنی جان پہچان کی بعض خواتین کے بارے میں سوالات پوچھنے لگا۔ اس کے لہجے میں مزے کی کاٹ تھی۔

14

نیم نومبر کو کوٹوزوف کو اپنے ایک مخبر کے ذریعے یہ اطلاع مل گئی تھی کہ وہ جس فوج کی کمان کر رہا ہے، اس کی حالت خاصی ہلکی ہے اور اس سے کسی کارنامے کی توقع باندھنا عبث ہے۔ مخبر نے بتایا تھا کہ فرانسیسیوں نے دینا کا پل پار کر لیا ہے اور اب ان کا ایک عظیم جیش اس شڑک کی طرف، جس پر روس سے آنے والی سپاہ سفر کر رہی ہے، بڑھ رہا ہے۔ اگر کوٹوزوف نے کریکس کے مقام پر قیام کرنے کا فیصلہ کر لیا، پولین کا ڈیڑھ ماگھ افراد پر مشتمل جیش اس کا اس فوج کے ساتھ رابطہ مکمل طور پر منقطع کر دے گا، اس کی چالیس ہزار تھکی ماندہ سپاہ گھیرے میں آجائے گی اور اس کا

بھی وہی حال ہوگا جوالم کے مقام پر سیک کا ہوا تھا۔ اگر اس نے اس شاہراہ کو، جو اس کا رابطہ روس سے آنے والی فوج کے ساتھ قائم کرتی ہے، ترک کرنے کا فیصلہ کیا، پھر اسے بوہیمیا کی پہاڑیوں کے پتھروں بیچ انجینی علاقوں میں، جہل سڑک نام کی کوئی چیز موجود نہیں، سفر کرنا، غنیم کی برتر افواج کے خلاف اپنا دفاع کرنا اور آسٹروی جرنیل بکس ہاؤڈن (Buxhowden) کے زیرِ کمان فوج کے ساتھ رابطہ قائم کرنے کی تمام امیدوں سے ہاتھ دھوٹا ہوگا۔ اگر کوٹوزوف نے اس خیال کے پیش نظر کہ روس سے آنے والی فوج کے ساتھ اس کا ملاپ ہو سکے، کریکس سے، دل موٹس جانے والی شاہراہ کے ساتھ ساتھ پسپائی اختیار کی، پھر خدشہ یہ ہے کہ فرانسیسی، جو دیانا میں پل عبور کر چکے ہیں، اس کے ارادے بھی نہ پھیلے ہی اس کا راستہ روک لیں گے اور یوں اسے، جب کہ بھاری سامان اور گاڑیاں اس کے پاؤں کی زنجیر بن چکی ہیں، کوچ کے دوران میں ایک ایسے غنیم کے خلاف، جس کی طاقت اس سے سہ چاند زیادہ ہے اور جو اسے دو اطراف سے گھیرے میں لے لے گا، نبرد آزما ہونا پڑے گا۔

کوٹوزوف نے آخری راستہ اختیار کرنے کا فیصلہ کیا۔

نمبر نے اطلاع دی کہ فرانسیسی دیانا پل عبور کرنے کے بعد مارا مار کرتے زنائیم کی طرف پیش قدمی کر رہے ہیں، جو ادھر جہر کوٹوزوف پسپا ہو رہا تھا، جیسا سٹھ میل کے فاصلے پر تھا۔ فوج کے تحفظ کی بہترین صورت یہی نظر آتی تھی کہ وہ فرانسیسیوں سے پہلے زنائیم پہنچ جائے۔ اگر اس نے فرانسیسیوں کو پیسے وہاں پہنچ جانے دیا، پھر اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اس کی فوج کو بھی اسی ڈسٹ اور رسوائی سے دوچار ہونا پڑے گا جوالم کے مقام پر آسٹروی فوج کے حصے میں آئی تھی یا پھر اس کا بالکل بولورام ہو جائے گا۔ لیکن اپنی ساری سپاہ کے ساتھ فرانسیسیوں سے پیسے بچنا ناممکن تھا انھوں نے دیانا سے زنائیم تک جس سڑک پر سفر کرنا تھا وہ اس سڑک سے، جس پر کوچ کرتے اسے کریکس سے زنائیم پہنچنا تھا، طویل بھی کم تھی اور اس کی حالت بھی اس سے بہتر تھی۔

جس رات کوٹوزوف کو یہ اطلاع موصول ہوئی، اس نے چار ہزار افراد پر مشتمل باگراتیاں کا ہرادل دست کریکس زنائیم روڈ سے پہاڑیوں کے پار شرقی جانب دیانا زنائیم روڈ کی طرف روانہ کر دیا۔ باگراتیاں نے یہ کوچ راستے میں کہیں آرام کیے بغیر کرنا تھا، اس نے دیانا زنائیم روڈ پر اس طرح قیام کرنا تھا کہ اس کا رخ دیانا کی طرف اور پشت زنائیم کی طرف ہو، اور اگر وہ وہاں فرانسیسیوں سے پہلے پہنچے میں کامیاب ہو گیا تو اسے انھیں حتی الامکان زیادہ سے زیادہ عرصے تک وہاں الجھائے رکھنا تھا۔ جہاں تک کوٹوزوف کا تعلق تھا، وہ اپنی بار برداری کی تمام گاڑیوں سمیت سیدھا زنائیم جا رہا تھا۔

رات طوفانی، علاقہ پہاڑی، سڑک کا اتنا تھکا تھکا ہوا کہ پیاسے، ان کے جوتے ٹوٹے ٹوٹے، ایک تھکی سپاہ بھگتی بھگتی پیچھے رہ گئی، پھر بھی باگراتیاں تیس میل کا فاصلہ طے کر کے فرانسیسیوں سے، جو دیانا سے ہولا برن (Hollabrunn) آرہے تھے، چند گھنٹے پہلے پہنچ گیا۔ کوٹوزوف کو اپنی بار برداری کی گاڑیوں سمیت زنائیم پہنچنے کے لیے ابھی چند اور ایام درکار تھے۔ اس کے شاخصانے کے طور پر باگراتیاں کو اپنی چار ہزار بھوک پیاسی اور

تھکی ماندہ سپاہ کے ساتھ غنیم کی پوری فوج کو کئی دن ہول برون رو کے رکھنا اور اس سے مقابلہ کرنا تھا۔ بظاہر یہ کام ناممکن نظر آتا تھا۔ لیکن قدرت کے رنگ نیارے ہیں اور ایک عجوبے نے ناممکن کو ممکن بنا دیا۔ فرانسیسیوں نے ایک گولی چلائے بغیر ویانا میں کوپے قبضے میں لینے کے لیے جو ٹانگہ رچایا تھا، اس کی کامیابی نے موغا کو یہ ترغیب دی کہ وہ کوٹوزوف کے ساتھ بھی ایسا ہی پاکھنڈ رچائے۔ جب زنائم روڈ پر اس کا آنا سامنا باگراتیاں کے کمزور دستے سے ہوا، اس نے سمجھا کہ کوٹوزوف کی کل فوج یہی ہے۔ اس امید میں کہ وہ اس سپاہ کا بالکل ہی بھروسہ نکال دے گا، وہ ان دستوں کا جواب بھی دینا سے چلے آ رہے تھے، انتظار کرنے لگا۔ اس مقصد کے پیش نظر اس نے تین یوم کی عارضی جنگ بندی اس شرط پر پیش کی کہ دونوں فوجوں میں سے کوئی بھی اپنی پوزیشن تبدیل نہیں کرے گی بلکہ جو جہاں ہے وہیں رہے گا۔ موغا نے دھوئی کیا کہ چونکہ مذاکرات امن پہلے ہی شروع ہو چکے ہیں، اس لیے وہ جس مارسی جنگ بندی کی پیشکش کر رہا ہے، اس کا مقصد غیر ضروری خونریزی سے گریز کرنا ہے۔ آسٹروی جرنل کاؤنٹ ٹوسٹیز، جو ہراول چوکیوں پر قابض تھا، جھانسنے میں آ گیا۔ اس نے عارضی جنگ بندی کے پیغام کو صحیح تسلیم کر لیا اور وہاں سے مراجعت کر گیا۔ یوں باگراتیاں کا دستہ خطرے کی زد میں آ گیا۔ ایک اور اپنی روسی صفوں میں پہنچی۔ اس نے وہاں بھی امن مذاکرات کے بارے میں اعلان کیا اور تین یوم کی عارضی جنگ بندی کی پیشکش کی۔ باگراتیاں نے جواب دیا کہ اسے تین روز کی جنگ بندی قبول کرنے یا مسترد کرنے کا کوئی اختیار نہیں۔ اس نے اس تجویز کے بارے میں ایک رپورٹ تیار کی اور اپنے ایجوٹنٹ کے ہاتھ کوٹوزوف کو بھیج دی۔

عارضی جنگ بندی کوٹوزوف کے پاس وقت حاصل کرنے کا واحد ذریعہ تھی۔ اس سے باگراتیاں کی تھکی ماندہ فوج کو آرام کرنے کا موقع میسر آ جاتا اور بار بار ہمدرد گازیوں کو (جن کی حرکات و سکنات فرانسیسیوں سے پوشیدہ رکھی گئی تھی) کو اگر زنائم نہیں، تو زنائم سے ایک منزل اور پہنچنے کی مہلت مل جاتی۔ عارضی جنگ بندی کی پیشکش نے فوج کو بچانے کا واحد اور بالکل غیر متوقع موقع فراہم کر دیا تھا۔ جوئی کوٹوزوف کو یہ اطلاع موصول ہوئی اس نے بلا تاخیر ایجوٹنٹ جرنل ونٹ ٹسکے روڈے کو، جو اس کے شاٹ میں شامل تھا، غنیم کے کیمپ میں بھیج دیا۔ ونٹ ٹسکے روڈے نے نہ صرف جنگ بندی قبول کرنا تھی بلکہ ہتھیار ڈالنے کی شرائط بھی تجویز کرنا تھیں۔ دریں اثنا کوٹوزوف نے اپنے تمام ایجوٹنٹ واپس بھیج دیے تاکہ وہ پوری فوج کے سامان سے لدے پھندے چٹکڑوں کو انتہائی تیز رفتاری سے کریمس زنائم روڈ پر ہٹکوا سکیں۔ باگراتیاں کی بھوک پیاس اور تھکی ماندہ سپاہ، جس نے تمام فوج اور بار ہمدرد کی گاڑیوں کو تحفظ فراہم کرنا تھا، اپنے سے آٹھ گنا دشمن کے سامنے ہاتھ پاؤں پیر کر بیٹھ گئی۔

کوٹوزوف کی دونوں توقعات کہ ہتھیار ڈالنے کی تجاویز، جو اسے کسی چیز کا پابند تو نہیں بناتی تھیں، لیکن اس کے بار ہمدردی کے متعدد پونٹوں کو نکل جانے کا موقع فراہم کرتی تھیں اور یہ کہ موغا کی سنگین غلطی بہت جلد پکڑی جائے گی، صحیح ثابت ہوئیں۔ جوئی بونا پارت کو، جو ہول برون سے سولہ میل دور شون برن میں قیام پذیر تھا، موغا کا مراسلہ اور عارضی جنگ بندی اور ہتھیار ڈالنے کی تجاویز موصول ہوئیں، وہ چال سمجھ گیا اور اس نے موغا کے نام

مندرجہ ذیل خط³² تحریر کیا۔

شون برن، 26 جنوری 1805

وقت آٹھ بجے صبح

یام پرنس موٹا

مجھے اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کرنے کے لیے الفاظ نہیں ملتے۔ تم میرے صرف ہراؤں دستے کے کمانڈر ہو اور تمہیں میرے احکام کے بغیر عارضی جنگ بندی کے اہتمام کرنے کا کوئی اختیار حاصل نہیں۔ تم مجھے میری ساری مہم کے فوائد سے محروم کرنے کا موجب بن رہے ہو۔ اس عارضی جنگ بندی کو بلا تاخیر ختم کرو اور تخیم پر چڑھائی کرو۔ انھیں بتا دو کہ جس جرنیل نے ہتھیار ڈالنے کی شرٹکا پر دستخط کیے تھے، اسے یہ اختیار کسی نے نہیں دیا تھا۔ یہ اختیار روس کے امپراطور کے علاوہ اور کسی کو حاصل نہیں۔

بہر حال اگر روس کے امپراطور نے اس پیشق کی کسی بھی دقت توثیق کر دی، میں بھی اس کی توثیق کر دوں گا۔ لیکن یہ بھٹس چال ہے۔ آگے بڑھو اور روسی فوج کو تیس تیس کر دو۔ تم ان کے سامان اور توپ خانے پر قبضہ کرنے کی پوری مشین میں ہو۔

روسی امپراطور کا ایڈی کاٹنگ ہے۔ جب افسروں کے پاس اختیارات نہ ہوں، ان کی حیثیت صفر ہوتی ہے۔ اس شخص کے پاس ٹھکانا کوئی اختیار نہیں تھا۔ ویٹاپل پر آسٹری فریب کھا گئے اور اب امپراطور کا ایڈی کاٹنگ تمہیں الونٹار ہے۔

نیلین

بونا پارت کا ایجوٹنٹ یہ تہدید آمیز خط لیے سر پٹ گھوڑا دوڑاتا فوراً موٹا کے پاس پہنچ گیا۔ بونا پارت اپنے جرنیلوں پر کوئی اعتبار نہیں رہا تھا۔ اس نے اپنے سارے گارڈز اکٹھے کیے اور ان کے ہمراہ میدان جنگ کی طرف روانہ ہو گیا۔ اسے اندیشہ لاحق ہو گیا تھا کہ اس کا شکار جو پکے پھل کی طرح اس کی بھولی میں گرنے کے لیے تیار تھا، کہیں بچ کر نہ نکل جائے۔ دریں اثنا باگ راتیاں کے دستے کے چار ہزار جوان، تین ایام میں پہلی مرتبہ چیمپ میں خوشی خوشی آگ جلانے، اسے تاپنے، اپنے آپ کو خشک کرنے اور اپنا دال دلیا تیار کرنے میں مصروف ہو گئے۔ پورے دستے میں ایک شخص کو بھی یہ معلوم نہیں تھا کہ ان پر کی آذت ٹوٹنے والی ہے۔

پہنچ گیا اور اس نے باگ راتیاں کو اپنی حاضری کی رپورٹ پیش کر دی۔ پولین کا ایکوئنٹ ابھی موغا کے پاس نہیں پہنچا تھا، چنانچہ لڑائی کا آغاز نہیں ہوا تھا۔ حالات کا عمومی رخ کیا تھا، اس کے بارے میں باگ باتیاں کے دے میں کسی کو بھی کچھ معلوم نہیں تھا۔ وہ امن کی باتیں ضرور کرتے تھے لیکن انھیں یقین نہیں آتا تھا کہ یہ ممکن ہے۔ وہ سارزت کی باتیں کرتے تھے لیکن انھیں یقین نہیں آتا تھا کہ لڑائی ان کے سروں پر منڈلا رہی ہے۔

باگ راتیاں کو معلوم تھا کہ بلکونسکی منظور نظر اور معتد ایکوئنٹ ہے۔ چنانچہ اس نے اسے اچھی خاصی وقت دی اور نمایاں عزت و احترام سے اس کا استقبال کیا۔ اس نے اسے بتایا کہ اسی روز یا اس سے اگلے روز لڑائی ہوگی اور اسے یہ پینچش کی کہ ”چاہے تو تم میرے ساتھ رہ سکتے ہو اور جی چاہے تو بے شک عقبی یونٹوں میں چلے جاؤ تاکہ جب پسپائی کا وقت آئے، تو نگرانی کر سکو کہ یہ پسپائی سلیقے اور ترتیب سے ہو۔ یہ کام بھی بہت اہم ہے۔“

”تاہم میرا خیال ہے کہ آج شاید لڑائی نہ ہو،“ باگ راتیاں نے کچھ اس انداز سے کہا جیسے وہ پرنس آندرے کی ڈھارس بندھانا چاہتا ہو۔

”شاف ہیڈ کو آرڈرز میں جو چھوٹے موٹے ہلکے ایلے افسر تعینات ہیں، اگر یہ بھی انھیں میں سے ہے اور اسے تمہارے کمانے یہاں بھیجا گیا ہے، پھر اسے عقبی یونٹوں میں چلے جانا چاہیے، وہاں اسے با آسانی اعزاز مل سکے گا۔ لیکن اگر یہ میرے ساتھ ٹھہرنا چاہتا ہے، اس کی مرضی۔ اگر یہ دلیر افسر ہے، پھر کسی نہ کسی کام آ ہی جائے گا،“

باگ راتیاں نے سوچا۔

پرنس آندرے نے جواب دیے بغیر صرف اتنا کہا کہ اسے سپاہ کی پوزیشنوں اور تقسیم و ترتیب کا جائزہ لینے کی اجازت دی جائے تاکہ جب اسے حکم دے کر بھیجا جائے تو اسے یہ معلوم ہو کہ اسے کہاں جانا ہے۔ اس روز جو آدمی ڈیوٹی آفسر کے فرائض سرانجام دے رہا تھا، وہ وجہ صورت تھا، ہر وقت بنا ٹھنار ہوتا تھا اور انگشت شہادت پر ہیرے کی جزاؤں انگلی پہنتا تھا۔ وہ ہر وقت فرنیسی میں بات کرنے کے لیے تیار رہتا تھا، لیکن جب فرانیسی بولتا تھا، تو اس کا ناس مار دیتا تھا۔ پرنس آندرے کی رہنمائی کے لیے اسے بلایا گیا۔

وہ جدھر بھی گئے، ان کا سامنا بارش سے شرابور افسروں سے ہوا۔ ان کے چہروں پر مردنی چھٹی ہوئی تھی اور وہ یوں دکھائی دے رہے تھے جیسے انھیں کسی چیز کی تلاش ہو۔ رہ گئے جوان، وہ گاؤں سے دروازے، بچیں اور بائیس کھینٹے لا رہے تھے۔

”ادھر دیکھیں۔ ہم انھیں روک نہیں سکتے،“ شاف افسر نے جوانوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”افسروں نے انھیں سن مانی کرنے کا موقع دیا ہے۔ اور ذرا ادھر ملاحظہ فرمائیں،“ اس نے کیٹین کی طرف، جو ایک خیمے میں قائم کر دی گئی تھی، انگلی اٹھاتے ہوئے کہا۔ ”یہ لوگ یہاں اکٹھے ہو جاتے ہیں اور یہیں بیٹھے رہتے ہیں۔ آج صبح میں نے ان سب کو یہاں سے چلا کیا تھا، لیکن دیکھیں، یہاں پھر بھیٹر لگ گئی ہے۔ پرنس، آپ مجھے ذرا اجازت مرحمت فرمائیں، میں ان سب کو بھگا کر ابھی واپس آ جاؤں گا، ذرا دیر نہیں لگاؤں گا۔“

”چلو، میں بھی چلتا ہوں۔ میں کچھ خیر اور ایک آدھ روں خرید لوں گا!“ پرنس آندرے نے کہا۔ اسے اب تک کچھ کھانے کا موقع نہیں ملا تھا۔

”پرنس، آپ نے پہلے کیوں نہ فرمایا۔ میں آپ کی خدمت میں کچھ نہ کچھ پیش کر سکتا تھا۔“

وہ گھوڑوں سے ترے اور خیمے کے اندر چلے گئے۔ وہاں متعدد افسر، جن کے چہرے تھک رہے تھے اور تھکاوٹ سے ٹھہاں دکھائی دے رہے تھے، میزوں کے سامنے بیٹھے تھے اور خور و نوش میں مصروف تھے۔

”حضرات، یہ کیا ہو رہا ہے؟“ شاف افسر نے ایک ایسے شخص کے، جو اپنی بات متعدد مرتبہ ہر اچانک، نادبی لہجے میں کہا۔ ”آپ جانتے ہیں کہ اگر آپ اسی طرح اپنے فرائض منصبی سے غیر حاضر رہے، اس سے کسی کا بھلا نہیں ہوگا۔ پرنس نے حکم دیا تھا کہ کوئی بھی شخص اپنے تعیناتی کے مقام سے ادھر ادھر نہ جائے۔ اور جناب کیپٹن، وہ توپ خانے کے ایک ربلے پتلے، گندے مندرے، کوتاہ قامت افسر کی جانب، جو محض چراغیں پہنے کھڑا تھا، ان کے اندر سے ذرا پہلے اس نے اپنے بوٹ کیٹین کے مالک کے سپرد کر دیے تھے تاکہ وہ انھیں سکھا دے اور غیر فطری انداز سے مسکرا رہا تھا، متوجہ ہوں۔“ کیپٹن توشن (Tushin)، آپ کو شرم آنا چاہیے؟“ شاف افسر بولا۔ ”گیا۔“ خیال تھا کہ توپ خانے کے افسر کی حیثیت سے آپ دوسروں کے سامنے مثال پیش کریں گے اور ایک آپ ہیں کہ بوٹ بھی نہیں پہنے۔ ابھی خطرے کی گھنٹی بجے گی اور بوٹوں کے بغیر آپ خوب تماشہ بنیں گے۔“ شاف افسر مسکرایا۔ ”حضرات، مہربانی فرمائیں اور جہاں جہاں آپ کی ڈیوٹی لگی ہے فوراً وہاں پہنچ جائیں۔ آپ سب، ہاں، سب کے سب!“ اس نے رعب مچاڑتے ہوئے کہا۔

پرنس آندرے نے جب توشن پر نگاہ ڈالی، وہ مسکرائے بنا شدہ سکا۔ توشن خاموشی سے کھینچیں نکالنا بھی ایک پاؤں پر اور کبھی دوسرے پاؤں پر زور دینے لگتا اور اپنی موٹی موٹی، ذہین اور شفیق آنکھوں سے کبھی پرنس آندرے اور کبھی شاف افسر کو دیکھنے لگتا۔

”جو ان کہتے ہیں کہ اگر آدمی نے بوٹ نہ پہنے ہوں، وہ زیادہ پھر تیز ہو جاتا ہے،“ کیپٹن توشن نے جیسے شرماتے کہا۔ صاف نظر آ رہا تھا کہ وہ جس ناگوار صورت حال میں پھنس گیا تھا، سخرے پن کے ذریعے اس سے چمکا کر حاصل کرنا چاہتا ہے۔

لیکن جو خفیہ الفاظ اس کے منہ سے نکلے، وہ بھانپ گیا کہ نشانہ خطا گیا ہے۔ وہ شرم سار ہو رہا تھا اور اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے اور کیا نہ کرے۔

”مہربانی فرمائیں، وراچی اپنی ڈیوٹی کے مقامات پر تشریف لے جائیں،“ شاف افسر نے اپنی مناسبت برقرار رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

پرنس آندرے نے ایک بار پھر توپ خانے کے کوتاہ قامت افسر کو جھپٹتی ٹکا ہوں سے دیکھا۔ کوئی ایسا چیز تھی، جو انوکھی تھی، قطعی غیر عسکری تھی اور قدرے مضحک تھی، لیکن وہ جو کچھ بھی تھی، تجھی انتہائی دلکش۔

شاف افسر اور پرنس آندرے گھوڑوں پر سوار ہوئے اور آگے چل دیے۔

رستے میں وہ مسلسل مختلف یونٹوں کے جوانوں اور افسروں سے ملتے ملائے اور انھیں پیچھے چھوڑتے رہے۔ یوں وہ چلتے چلتے گاؤں سے آگے نکل گئے۔ یہاں انھیں اپنی بائیں جانب دمے نظر آئے۔ یہ تازہ تازہ سرخ مٹی کھود کر بنائے جا رہے تھے۔ نچ بستہ ہوا کے باوجود جوانوں کی متعدد جماعتیں صرف قیصیں پہنے سفید چوٹیوں کی طرح مٹی کی بن تعمیرات پر کام کر رہی تھیں۔ پشت پناہ کے پیچھے ان دیکھے ہاتھ سرخ مٹی کے بیلچوں کے بیلچے پھینک رہے تھے۔ پرنس آندرے اور شاف افسر دمے کے پاس گئے، اس کا معائنہ کیا اور آگے نکل گئے۔ دمے کے بالکل پیچھے انھیں درجنوں جوان بھاگتے نظر آتے، وہ نظروں سے اوجھل ہوتے، تو ان کی جگہ دوسرے آجاتے۔ یوں کام مسلسل جاری تھا۔ فضا میں ناگوار بدبو پھیلی ہوئی تھی، اس سے بچنے کے لیے انھیں اپنی ناکوں پر روبال رکھنے اور گھوڑے تیز دوڑانا پڑے۔

”پرنس، یہ ہیں کمپ کی زندگی کی دلکشاں،“ شاف افسر نے فرانسیسی میں کہا۔

وہ مخالف پہاڑی کی سمت میں چل پڑے۔ اس کی چوٹی سے فرانسیسیوں کو دیکھا جاسکتا تھا۔ پرنس آندرے رک گیا اور موقع کا معائنہ کرنے لگا۔

دیکھیں، یہاں ہم نے توپ گڑھیاں بنائی ہوئی ہیں،“ شاف افسر نے بلند ترین مقام کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”اس کی کمان اس عجیب الخلق شخص کے، جو وہاں بغیر بوٹوں کے بیٹھا تھا، ہاتھ میں ہے۔ وہاں سے آپ سب کچھ دیکھ سکتے ہیں۔ محترم، آئیں، وہاں چلتے ہیں۔“

”بہت بہت شکریہ میں اکیلا ہی وہاں چلا جاؤں گا،“ پرنس آندرے نے، جو شاف افسر سے ہنڈ چھڑانے کی فکر میں تھا، کہا۔ ”اب آپ مزید تکلیف نہ کریں۔“

شاف افسر پیچھے ہی ٹھہرا رہا اور پرنس آندرے اکیلا آگے چل پڑا۔

وہ جوں جوں آگے بڑھتا اور دشمن کے قریب سے قریب تر ہوتا گیا، جوان زیادہ سے زیادہ منظم اور ہشاش بشاش نظر آنے لگے۔ اسے سب سے زیادہ بد نظمی اور افسردگی بار برداری کے دستوں میں، جو زنائم کی طرف جا رہے تھے اور جنھیں اس نے صبح دیکھا تھا، نظر آئی تھی حالانکہ وہ فرانسیسیوں سے سات میل دور تھے۔ گرنٹ میں بھی کسی حد تک خوف اور پریشانی کے سائے لہرا رہے تھے۔ لیکن پرنس آندرے جوں جوں فرانسیسیوں کے نزدیک ہوتا گیا، اسے اسے جوت زیادہ پر حوصلہ اور پراعتماد دکھائی دینے لگے۔ اوور کوٹوں میں ملبوس جوانوں نے صفیں بنائی ہوئی تھیں اور سار جٹ ہجرا اور کمپنیوں کے افسران کی گنتی کرنے میں مصروف تھے۔ وہ ہر سیکشن کے آخری آدمی کی پسیلوں میں ٹھوکا لگاتے اور اسے کہتے کہ وہ اپنا حوصلہ پست نہ ہونے دے۔

فوجی جوان سارے علاقے میں پھیلے ہوئے تھے۔ شبیر اور سوختنی لکڑی اکٹھا کر رہے تھے، پناہ گاہیں تعمیر کر رہے تھے۔ جس رہے تھے اور ایک دوسرے کے ساتھ گھل مل کر باتیں کر رہے تھے۔ کمپ میں جہاں جہاں لاؤریشن

کیے گئے تھے، ان کے ارد گرد جہاں اکٹھے ہو گئے تھے۔ کوئی آگ ٹاپ رہا تھا، کوئی قمیص یا ٹانگوں کے گرد لپٹنے والی بنیاں خشک کر رہا تھا، کوئی اور کوٹ یا بوٹوں کی مرمت کر رہا تھا اور بعض دیگوں اور دیگچوں کے گرد جنگھلا کے کھڑے تھے۔ ایک کمپنی میں کھانا تیار ہو چکا تھا اور جوان گرسنہ لگا ہوں سے دیگوں کو، جن میں سے بھپ نکل رہی تھی، دیکھ رہے تھے۔ وہ سب کھانے کے چکھے جانے کا انتظار کر رہے تھے۔ جو کھانا چکھا جاتا تھا، اس کا پیالہ بھر جا چکا تھا۔ ایک کوارٹر ماسٹر سارجنٹ اسے ایک افسر کے پاس، جو پناہ گاہ کے سامنے شہتیر پر بیٹھا تھا، لے جا رہا تھا۔

ایک اور کمپنی میں۔ اور یہ کمپنی بہت خوش نصیب تھی کیونکہ سب کمپنیوں کے پاس دوڑ کا شراب نہیں تھی۔ ایک سارجنٹ میجر کے گرد، جس کا جسم چوڑا چکلا اور جس کے چہرے پر چمک کے داغوں کی بھرمار تھی، جوانوں کا جم غفیر کھڑا تھا۔ سارجنٹ میجر پیچھے کوزہ زور سے ہلارہا اور ان کے پیالے بھرنا جا رہا تھا۔ جون موب انداز سے انھیں اپنے لبوں تک اٹھاتے، سردوں کو بچھلی جانب جھٹکتے، دوڑ کا حلق میں انڈیلتے، ہونٹ چانتے، انھیں اپنے کوٹوں کی آستینوں پر پونچھتے، اور پہلے کی نسبت کہیں زیادہ ہشاش بشاش واپس چلے جاتے۔ اس کے چہرے ہاتھ پر سکون اور مطمئن تھے جیسے یہ سب کچھ دشمن کی عین ناک تلے اور ایک سی لڑائی سے، جس میں ان میں سے کم از کم نصف کو ماریں وہیں کھیت رہنا تھا، قبل نہیں، بلکہ زمانہ اس میں ان کی آبائی سرزمین پر ہو رہا ہو۔

شمار جمنٹ کے برابر سے گزرنے کے بعد پرس آندرے کیف گرینڈیرز کی صفوں میں داخل ہو گیا۔ گرینڈیرز کی اس برجمنٹ کے لیے تڑنگے اور نومند جوان بھی انھی سرگرمیوں میں مشغول تھے۔ ان کے کمانڈر کا ڈیرا قریب ہی تھا اور دوسروں کی نسبت ذرا اونچی پر واقع تھا۔ یہیں اس کا سامنا گرینڈیرز کی ایک ایسی پٹن سے ہوا جس کا ایک جوان باقیوں کے سامنے تنگ دھڑنگ زمین پر پڑا تھا۔ دو جوانوں نے اسے اپنے ہاتھوں میں جکڑ رکھا تھا جب کہ ان کے باقی رہتا چھڑیاں فضا میں لہرا اور باری باری مناسب وقفوں کے بعد اس کی برہنہ پشت پر مار رہے تھے۔ وہ جوان غیر انسانی انداز سے چلا رہا تھا۔ ایک ہٹا کنا میجر صف کے سامنے چکر لگا رہا تھا اور اس کی چیخ پکار کو نظر انداز کرتے کھڑ رہا تھا۔

”سپاہی کا چوری کرنا اس کے لیے باعث تنگ و غار ہے۔ سپاہی کو دیانت دار، راست باز اور سچی دار ہونا چاہیے۔ اگر وہ اپنے کسی ساتھی کی اشیا چراتا ہے، وہ بہت بے حیا اور فحش انسان ہے، غم خیز ہے، ہارو، اور مارو“ اور چھڑیوں کی سنناہٹ، قیامت خیز اور غیر فطری چیخوں کا سلسلہ جاری رہا۔

”مارو، اور مارو!“ میجر نے کہا۔

ایک نوجوان افسر جس کے چہرے پر اذیت اور پریشانی کے آثار تھے، اس مار کٹائی کا منظر برداشت نہ کر سکا۔ وہ وہاں سے پرے ہٹ گیا اور استنبہا میہنگا ہوں سے ایجوٹ کو، جو گھوڑے پر سوار ادھر سے گزر رہا تھا، دیکھنے لگا۔ پرس آندرے سب سے اگلی صف کے قریب پہنچنے کے بعد اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ دائیں اور بائیں دونوں پہلوؤں پر ہماری اور غنیم کی جنگی صفیں ایک دوسرے سے خاصی دور تھیں۔ لیکن جہاں تک قلب کا تعلق ہے، جہاں

صبح عارضی جنگ کا معاہدہ کرنے والے سفارت کاروں کا گزر ہوا تھا، وہ ایک دوسرے کے اتنا قریب تھیں کہ جون یک دوسرے کے چہرے دیکھ سکتے اور آپس میں گفتگو کر سکتے تھے۔ انگلی صف میں محض فوجی ہی نہیں تھے بلکہ دونوں اطراف پچاس تماشائی بھی، جو ہنستے مسکراتے ان اجنبی، غیر ملکی دشمنوں کو دیکھ رہے تھے، جمع ہو گئے تھے۔

حادثہ صبح سویرے ہی یہ حکم دیا جا چکا تھا کہ کوئی غیر متعلق شخص انگلی جنگی صفوں کے قریب پھٹکنے نہ پائے، افسران ان مقامی باشندوں کو پیچھے دھکیلنے میں ناکام رہے تھے۔ جو جوان انگلی صف میں تعینات تھے، تماشائی گروں کی طرح اپنے تجسس کا اظہار کرنے لگے۔ ان کا دھیان اب فرانسیسیوں کی طرف نہیں تھا بلکہ ان کی توجہ سراسر ان ترش نیوں کی طرف منتقل ہو چکی تھی کیونکہ جن جوانوں نے ان کی جگہ لینا تھی، ان کا انتظار کرتے کرتے وہ خاص ہوریت محسوس کرنے لگے تھے۔ پرنس آندرے نے اپنا گھوڑا روک لیا اور فرانسیسیوں کا جائزہ لینے لگا۔

”ادھر دیکھو! دیکھو!“ ایک جوان نے ایک روسی بندوچی کی طرف، جو ایک انسر کی معیت میں صف سے آگے نکل گیا تھا اور بڑے جوشیلے اور تیز تیز انداز سے ایک فرانسیسی گریینیڈیر سے بانٹ کر رہا تھا، انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے کہا: ”سنو، کیسے بڑھ کر بڑیں؟“ ”نک رہا ہے! فرانسیسی کو بات کرنے کا موقع ہی نہیں دے رہا۔ خوب! تمہارا کیا خیال ہے، سدراروف؟“

”ٹھہرو۔ غور سے سنو۔ بہت خوب! بہت اعلیٰ!“ سدراروف نے کہا۔ اس کے متعلق عام خیال تھا کہ اسے فرانسیسی میں بات کرنے میں مہارت تامہ حاصل ہے۔

وہ سپاہی، جس کے متعلق یہ دونوں جوان آپس میں چھلیں کر رہے تھے، دلخوف تھا۔ پرنس آندرے نے اسے پہچان لیا۔ وہ رک گیا تا کہ وہ جو کچھ کہہ رہا ہے، اسے سن سکے۔ دلخوف اور اس کا کیپٹن میسرے سے، جہاں ان کی کئی تعینات تھی، آئے تھے۔

”بولتے جاؤ، بولتے جاؤ!“ کیپٹن اسے اکسارہا تھا۔ وہ آگے کی طرف بھاگا ہوا تھا تا کہ وہ ایک ایک لفظ سن سکے حادثہ جو گفتگو ہو رہی تھی، وہ اس کی سمجھ سے قطعی بالاتھا۔ ”دوبارہ، نوازش۔ وہ کیا کہہ رہا ہے؟“

دلخوف نے کیپٹن کی بات سنی ان سنی کر دی اور کوئی جواب نہ دیا۔ اس کی فرانسیسی گریینیڈیر سے تو تو میں میں شروع ہو گئی تھی۔ توقع کے مطابق ان کا موضوع گفتگو لڑائی تھا۔ فرانسیسی آسٹروپیوں اور روسیوں کو ایک دوسرے سے غلط ملط کر رہا تھا اور اصرار کر رہا تھا کہ الم کے میدان جنگ میں روسیوں نے شکست کھائی تھی اور وہاں سے دم دبا کر بھاگ گئے تھے۔ اس کے برعکس دلخوف دعویٰ کر رہا تھا کہ آج تک کوئی مائی کارل روسیوں کو شکست نہیں دے سکا، بلکہ فرانسیسی روسیوں سے پیٹے رہے ہیں۔

”ہمیں حکم ملا ہے کہ ہم تمہیں یہاں سے مار بھاگیں اور ہم تمہیں بھاگ کر رہیں گے۔“
”تورا ہوشیار رہنا، کہیں تم اور تمہارے سارے قازق پکڑے نہ جائیں،“ فرانسیسی گریینیڈیر نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

خیر انہیسی اور تماشاخانہ ہنس پڑے۔

”ہم تمہیں اسی طرح تگنی کا ناچ نہادیں گے جس طرح سواروف نے نہی یا تھا۔“

⁂ Ou' est-ce qu'il chante?⁂ ایک فرانسیسی نے پوچھا۔

”مگز رے زمانوں کی داستان سنا رہا ہے؟“ دوسرے نے کہا۔ اس کا انداز تھا کہ دلہ خوف کسی بھولی بہن

جنگ کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔

”اوپر اطور نے جس طرح دوسروں کو دن کو تارے دکھائے ہیں، تھیں بھی دکھا دیں گے۔“

”یوناپورٹ“ وہ خوف نے کہنا شروع کیا لیکن فرانیسی نے اسے ٹوک دیا۔

”بوتا پرت نہیں،۔۔۔ وہ امیر اطور ہیں۔ امیر اطور کا مقدس خطاب صرف انھیں زیب دیتا ہے،“ اس نے

غضب ناک لہے کہا۔

”جہنم میں گیا تمھارا امیر الطور!“

اس کے ساتھ ہی دل و خون سے اسے روی زبان میں غلیظ گالی دی، بندوق کندھے پر رکھی اور وہاں سے چل رہا۔

”مہربان لو، آؤ چلیں،“ اس نے کیپٹن سے کہا۔

”یہ ہے فراہمی میں گفتگو کرنے کا انداز،“ اگلی صف کے جوانوں نے کہا۔ ”سدا روف، اب تمھاری پارٹی ہے“

سدا روئے آنکھیں جھپکائیں، اس نے فرانسیسی نو جیوں کی طرف رخ کیا، درجس قدر تیز بول سکتا تھا،

اتنی تیزی سے بے معنی آواز میں نکالنے لگا۔

کھڑی۔ مالا۔ تافا۔ سانی۔ موتر۔ کاسکا۔ وہ بک بک کیے جا رہا تھا لیکن ساتھ ساتھ یہ کوشش کر رہا تھا

کس اس کے منہ سے جو الفاظ نکل رہے ہیں، وہ دوسروں کو بامعنی معلوم ہوں۔

[illegible]

شرعاً کر دیے کہ فرامیسی بھی ان کا ساتھ دیے بغیر نہ رہ سکے۔ بظاہر تو یہی معلوم ہوتا تھا کہ سپاہی اپنی بندوقیں اور

پھینکیں گے، گو لے بارود کو آگ لگا دیں گے اور امن چین کی بانسری بجاتے جہاز جلد گھروں کو واپس لوٹ

جانی

لیکن بدوقیس بھری رہیں، مکانوں اور دیواروں کے زونڈ اور ایچ ڈی کے آزمائشوں سے کھلم کھلا اور توہمیں،

جو گاڑیوں سے علیحدہ کر لی گئی تھیں، جوں کی توں ایک دوسرے کے بالٹا بن کھڑی رہیں۔

یہاں سے سارے میدان جنگ کا منظر نظر آ سکتا تھا۔ وہ گھوڑے سے اتر اور جو چار توپیں گاڑیوں سے عینہ کی گئی تھیں ان میں سے آخری کے قریب کافی دیر تک کھڑا رہا۔ ایک توپ خانے کا سنتری، جو توپوں کے سامنے ادھر ادھر چکر لگا رہا تھا، افسر کو دیکھ کر مودب کھڑا ہونا چاہتا تھا لیکن اشارے کو دیکھ کر اپنے تلے تلے مہموں کے ساتھ دوبارہ بے کیف اور بے جنگ چکر کاٹنے لگا۔ توپوں کے عقب میں توپ گاڑیاں تھیں اور ان سے بھی خاصا پیچھے گھوڑوں کو باندھنے کے رے اور ڈنڈے اور توپ خانے کے سپاہیوں کا پڑاؤ تھا، جہاں جگہ جگہ الاؤ روشن تھے۔ آخری توپ سے ذرا دور بائیں جانب ایک نئی جھونپڑی تھی۔ اسے درختوں کی شاخوں کو آپس میں گوندھ کر بنایا گیا تھا۔ اس جھونپڑی سے افسروں کی زور شور سے باتیں کرنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔

یہ بات درست تھی کہ اس توپ گڑھی سے ردی فوجوں کی ساری تقسیم و ترتیب اور غنیم کی فوج کا بیشتر حصہ صاف نظر آ رہا تھا۔ اس کے بالکل بالقابل پہاڑی کی چوٹی پر شیون گراہرن کا گاؤں دکھایا جاسکتا تھا۔ دائیں بائیں تین مقامات ایسے تھے جہاں فرانسیسی پڑاؤ کے الاؤوں کے دھوؤں کے، ہین فرانسیسی سپاہ کے، حالانکہ اس کا بیشتر حصہ لاریب گاؤں کے اندر اور پہاڑی کے پیچھے مقیم تھا، ہجوم پہچاننا ممکن تھا۔ گاؤں کی بائیں جانب دھوکے میں توپ گڑھی سے ملتی جلتی کوئی چیز نظر آ رہی تھی لیکن گنگی آنکھ سے اس کا صاف صاف دیکھنا آسان نہ تھا۔ ہمارا سینہ قدرے سیدھی ڈھلوان پر، جو فرانسیسیوں کے سردوں کے عین اوپر اٹھی ہوئی تھی، ادھر ادھر بکھرا ہوا تھا۔ وہاں ہماری زیادہ فوج اور انتہائی آخری سرے پر ڈریگون متعین تھے۔ وہ ندی جو ہمارے اور شیون گراہرن کے درمیان حائل تھی اس تک پہنچنے کا سیدھا ترین راستہ، جو عمودی ڈھلوان پر سے گزرتا تھا، قلب میں واقع توشن کی توپ گڑھی سے جہاں پرنس آندرے کفر پوریشنوں کا جائزہ لے رہا تھا، شروع ہوتا تھا۔ بائیں طرف ہماری سپاہ جھنڈ کے قریب متعین تھیں۔ وہاں ہماری زیادہ فوج کے جوانوں کے، جو سختی لکڑی کاٹ رہے تھے، الاؤوں سے دھواں نکلا دیکھا جاسکتا تھا۔ فرانسیسی صف بندی ہماری صف بندی کی نسبت کہیں زیادہ لمبی چوڑی تھی اور صاف نظر آ رہا تھا کہ دروڑوں بازوؤں سے ہا آسانی ہمیں اپنے نرغے میں لے سکتے ہیں۔ ہماری پوزیشن کے عقب میں عسکری کھائی تھی۔ اس کے کنارے عمودی اور دشوار گزار تھے۔ چنانچہ اس میں سے توپ خانے اور گھڑسوار دستوں کے لیے پسپائی اختیار کرنا خاصا مشکل ہوگا۔

پرنس آندرے نے، اپنی نوٹ بک نکالی، ایک گجٹل پر اپنی کہنی نکالی اور فوجوں کی تقسیم و ترتیب کا نقشہ بنانے لگا۔ اس نے دو مقامات نشان زدہ کر دیے۔ اس کا ارادہ تھا کہ وہ ان کے بارے میں باگ راتیاں سے بات کرے گا۔ اہل وہ یہ تجویز پیش کرے گا کہ سارا توپ خانہ قلب میں مجتمع کر دیا جائے۔ دوم: گھڑسوار فوج کو پیچھے ہٹا لیا جائے اور کھائی کی دوسری جانب تعینات کر دیا جائے۔ کمانڈر انچیف کی مسلسل حاضری بھرتے رہنے، کثیر التعداد افواج کی نقل و حرکت اور عمومی ترتیب و تنظیم کا مطالعہ کرنے اور مختلف جنگوں کے تاریخی واقعات و کوائف کا متواتر جائزہ لینے کے بعد پرنس آندرے کے لیے یہ امر بالکل فطری تھا کہ مستقبل قریب میں عسکری کارروائیاں جو رخ اختیار کریں

گی، اس کا عمومی نقش اپنے ذہن میں مرتب کرے۔ اس کے دماغ میں جن دواہم امکانات نے سر اٹھایا، وہ یہ تھے ”اگر غنیم نے میسنے پر حملہ کیا، اس نے اپنے آپ سے کہا، ”کیف گریٹینڈیرز اور پادولیا شامروس کو اس دقت تک اپنی پوزیشنوں پر ڈٹے رہنا پڑے گا جب تک قلب سے محفوظ دستے ان کی مدد کو نہ پہنچ جائیں۔ اس صورت میں ڈریگون ان کے پہلو پر حملہ کر سکتے ہیں اور انھیں پیچھے دھکیل سکتے ہیں۔ اگر انھوں نے ہمارے قلب پر حملہ کیا تو ہم اپنی مرکزی توپ گڑھی اس پہاڑی پر بنادیں گے اور اس کی آڑ میں اپنا میسر، پیچھے ہٹائیں گے اور مختلف پوزیشنوں کو یکے بعد دیگرے گھاتی میں لے جائیں گے، اس نے استدلال کیا۔

جب تک وہ گجناں کے پاس کھڑا رہا، سے جھوپڑی سے افسروں کی باتیں کرنے کی آواز میں سیم اور صاف سنائی دیتی رہیں لیکن جیسا کہ اکثر ہوتا ہے، وہ جو کچھ کہہ رہے تھے، اس کے ایک لفظ کا مفہوم بھی اس کے پلے نہ پڑا۔ تاہم ایک ایسی اسے احساس ہوا کہ ان کے لبوں میں نہایتی سنجیدگی اور گمبھیرتا آگئی ہے، خود بخود اس کے کان کمرے ہو گئے اور وہ بے اختیار ان کی باتیں سننے لگا۔

”نہیں، آئی ڈیر فیلو، ایک آواز، جو سماعت کو بھلی لگی اور جو پرنس آندرے کو کچھ جانی پہچانی محسوس ہوئی۔ سنائی دی۔ ”میری گزارش یہ ہے کہ اگر یہ جاننا ممکن ہو کہ مابعد موت کیا وقوع پذیر ہوگا، پھر ہم میں سے کسی کو بھی موت سے خوف نہیں آئے گا۔ میرے دوست، میں سچ عرض کر رہا ہوں۔“

ایک دوسری اور نسبتاً کم عمر آواز نے پہلی آواز کو کاٹا ”خوف آئے یا نہ آئے لیکن اس سے مفروضہ؟ اس خیال است و محال است و جنوں۔“

”خوف تو ہر حال آتا ہی ہے، اے عالم فاضل لوگو! کڑا کے دار تیسری آواز نے پہلی دونوں آوازوں کو ٹوٹے ہوئے کہا۔ ”تم توپ خانے والے بڑے سیانے اور ہوشیار آدمی ہو۔ تم جو جی چاہے۔ شراب، کباب، بیکٹ۔ اپنے ساتھ لے جاسکتے ہو۔“

ظاہر تھا کہ اس کڑا کے دار آواز کا، لک پیا وہ فوج کا افسر تھا۔ ”ہاں، ڈرتو ہمیشہ آتا ہی ہے،“ پہلے مقرر نے، جس کی آواز سننا معلوم ہوتی تھی، اپنی بات جاری رکھی۔ ”ان چیزوں سے آتا ہے جن کا ہمیں علم نہیں ہوتا۔ آپ خواہ کتنی ہی باریہ کہتے رہیں کہ نفس عنصری سے رہائی پانے کے بعد روح جانب افلاک محور ہو جاتی ہے، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ہم جانتے ہیں کہ فلک ایک کچھ نہیں۔ اور صرف فضا ہے۔“

کڑا کے دار آواز نے توپ خانے کے افسر کو ٹوکا۔ ”چھوڑ دینا۔ تو سن، اپنی باتاتی برائڈی کے ہی دو گھونٹ پلا دو،“ اس نے کہا۔ ”ہائیں، یہ تو وہی افسر ہے جو کینٹین میں بولوں کے بغیر کھڑا تھا،“ پرنس آندرے نے سوچا۔ وہ اس خوشگوار آواز کو، جو فلسفہ بگھار رہی تھی، پہچان گیا تھا اور بہت خوش ہوا تھا۔

”بہاؤتی براؤڈی؟“ ارے واہ! کیوں نہیں؟“ توشن نے کہا۔ ”پھر بھی حیات مستقبل کو بچے تصور میں لانا۔“
 اس کی بات ادھوری رہ گئی۔ عین اس لمحے فضا میں سنسناہٹ سنائی دی۔ قریب، قریب تر، تیز تر، تیز تر، بلند، بلند تر، اور گھناں کا گولہ، گویا اس کی سنسناہٹ نے جو کچھ کہنا چاہا تھا، وہ ابھی تک ختم نہیں ہوا تھا، جھونپڑی کے قریب دھماکے سے پھٹ گیا اور اس نے ایک ایسی قوت کے ساتھ، جو ماورائے انسان تھی، مٹی کی بو چھڑا چھاں دی۔ تصادم تارزہ خیز تھا کہ خود دھرتی میا کی چٹخیں نکل گئیں۔

عین اسی لمحے کوتاہ قامت توشن، جس کے ذہن اور پر شفقت چہرے پر زردی کھنڈر ہی تھی، منہ کے کونے میں تنہا مٹا پامپ دبائے سرپٹ بھاگتا دوسروں سے پہلے جھونپڑی سے برآمد ہوا۔ اس کے پیچھے پیچھے وہ افسر تھا جس کی آواز کڑا کے دار تھی۔ وہ تیز طرار اور بانکا جیلا جوان تھا۔ وہ سر پر پاؤں رکھے اپنی کپہنی کی طرف بھاگا جا رہا تھا اور بھاگتے بھاگتے اپنے گوٹ کے مٹن بند کرنا جا رہا تھا۔

17

پرنس آندرے گھوڑے پر سوار ہو گیا لیکن وہ اپنی جگہ سے ہٹا نہیں بلکہ وہیں توپ گڑھی کے قریب کھڑا رہا اور گھناں کا، جس سے آہنی گولہ داغا گیا تھا، دھواں دیکھا رہا۔ اس کے سامنے جو وسیع و عریض منظر پھیلا ہوا تھا، اس نے پہلے اس پر نظریں دوڑائیں۔ اسے صرف یہی نظر آیا کہ فرانسیسیوں کے جتھے، جواب تک بے شغلی میں وقت گزار رہے تھے، اب متحرک ہو گئے ہیں اور بائیں جانب واقعاً توپ گڑھی تھی۔ وہاں ابھی تک فضا پر دھواں محیط تھا۔ دو فرانسیسی، جو گھوڑوں پر سوار تھے، پہاڑی پر سرپٹ دوڑے جا رہے تھے۔ غنیم کا ایک چھوٹا سا پرا، جو صاف دکھائی دے رہا تھا، پہاڑی سے نیچے اتر رہا تھا۔ یہ لوگ عاقباً سب سے اگلی صف کے سپاہیوں کو کمک پہنچانے جا رہے تھے۔ ابھی پہلے گولے کا دھواں تحلیل نہیں ہوا تھا کہ ایک اور سرخی لیکر نمودار ہوئی اور اس کے ساتھ ہی گونج دار آواز سنائی دی۔ سرکہ آرائی کا آغاز ہو چکا تھا! پرنس آندرے نے اپنا گھوڑا موڑا اور پرنس یاگ راتیاں کی تلاش میں سرپٹ گرنٹ کی سمت بھاگنے لگا۔ اسے اپنے عقب میں گولہ باری کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ گولے دھننے کا شور غل بلند سے بلند تر ہوتا جا رہا تھا۔ ظاہر ہے کہ ہماری توپوں نے جوابی کارروائی شروع کر دی تھی۔ ڈھلوان کے نیچے، جہاں سے عارضی جنگ بندی کے ایلمچی گزرے تھے، دستی بندو قوں کے چلنے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ فرانسیسی ایلمچی لے مارووا (Le marrois) گھوڑا سرپٹ دوڑاتے ابھی ابھی بوٹا پارت کا تہدید آمیز مراسلہ لے کر پہنچا تھا۔ موٹا کو اپنی غلطی کا احساس ہو چکا تھا اور وہ اس پر تلہا رہا تھا۔ اپنی اس حماقت کا ازالہ کرنے کے لیے وہ بہت بے چین تھا۔ چنانچہ ایک لمحے کی تاخیر روار کھے بغیر اس نے روکی سہ کے دونوں پہلوؤں کو نرغے میں لینے اور اس کے قلب پر حملہ کرنے کے لیے اپنی فوج کو حرکت دی۔ اسے امید تھی کہ سورج کے غروب ہونے اور امپراطور کے آنے سے پہلے وہ اس حقیر سپاہ کو، جو اس کے سامنے کھڑی تھی، نہیں نہیں کر دے گا۔

”شروع ہوگئی، یہاں، سامنے!“ پرنس آندرے نے سوچا۔ اسے محسوس ہوا کہ اس کا دل دھک دھک کر رہا ہے۔ لیکن میرا تو لوں کہاں اور کیسے؟ تو سچ پڑیر ہوگا؟“

کینپوں کے، جو ابھی پندرہ منٹ پہلے دل دہکا کھا رہی اور دوڑ کا پی رہی تھیں، پیچھے بچ گزرتے اسے ہر طرف جوان اسی پھرتی سے صفیں بناتے اور اپنے ہتھیاروں کا بغور جائزہ لیتے نظر آتے۔ اسے ان سب کے چہروں پر وہی اشتیاق، جو وہ اپنے دل میں محسوس کر رہا تھا، تیرتا نظر آیا۔

”شروع ہوگئی! یہاں، سامنے! پر ہیبت لیکن طرب ناک!“ ہر فسر اور جوان کے چہرے سے یہی مترغ ہر رہا تھا۔

وہ دسے، جو تھیں کے مراحل طے کر رہے تھے، ابھی تک وہ ان تک نہیں پہنچا تھا کہ اسے بے کیف غزاں روزہ شام کی ملگجی روشنی میں چند گھڑ سوار اپنی طرف آتے دکھائی دیے۔ سب سے اگلے سوار نے کازن چٹا اور اسٹراخانہ³⁴ ٹوپی پہنی ہوئی تھی۔ وہ پرنس باگ راتیاں تھا۔ پرنس آندرے رک گیا اور اس کا انتظار کرنے لگا۔ پرنس باگ راتیاں نے گھوڑے کو گام دی اور پرنس آندرے کو پہچانتے ہوئے اپنی گردن کو ذرا سا خم دے کر اس کے سلام کا جواب دیا۔ پرنس آندرے نے جو کچھ دیکھا تھا، وہ اسے بتانے لگا۔ اس دوران میں پرنس باگ راتیاں سامنے دیکھا رہا۔

یہ احساس کہ ”شروع ہوگئی! یہاں، سامنے!“ پرنس باگ راتیاں کے درشت گندی چہرے پر بھی، جس نیم بند، نیم غنودہ اور نادر حشاں³⁵ نکھیں تھیں، پڑھا جاسکتا تھا۔ پرنس آندرے نے اس جذبات سے عاری چہرے کو پر اضطراب تجسس سے رکھا۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ ”یہ شخص اس لمحے اگر واقعی کچھ سوچ رہا یا محسوس کر رہا ہے، کاش میں بتا سکتا، کہ وہ کیا ہے۔ اس جذبات سے عاری چہرے کے پیچھے کچھ ہے بھی یا نہیں؟“ وہ اسے دیکھ رہا اور حیران ہو رہا تھا۔ پرنس آندرے نے پرنس باگ راتیاں کو جو کچھ بتایا تھا، اس نے یہ ظاہر کرنے کے لیے کہ اسے اس سے اتفاق ہے، اپنی گردن ہلا دی اور اس نے لفظ ”خوب!“ یوں کہا جیسے جو کچھ پیش آیا تھا، اور جو کچھ اسے بتایا گیا تھا، وہ اس کی توقعات کے عین مطابق تھا۔ پرنس آندرے، جس کا سر پیٹ گھوڑا دوڑاتے دوڑاتے دم پھول گیا تھا، تیز تیز گفتگو کر رہا تھا۔ پرنس باگ راتیاں، جس کا لہجہ شرعی تھا، ٹھہر ٹھہر کر رک رک کر باتیں کر رہا تھا جیسے وہ یہ بتانا چاہتا ہو کہ آخر اتنی بھی جدی کیا ہے۔ تاہم وہ اپنا گھوڑا تو شن کی توپ گڑھی کی سمت دگی دوڑانے لگا۔ شاف کے ارکان کے ساتھ پرنس آندرے بھی اس کے پیچھے ہو گیا۔

پرنس باگ راتیاں کی جماعت ایک شاف افسر، اس کے ذاتی ایجوٹنٹ ڈرکوف، ایک اردلی افسر، ڈیوٹی افسر، جو بہت خوبصورت لیکن دم کٹے گھوڑے پر سوار تھا، ایک سویلین افسر اور، ایک آڈیٹر پر، جو محض تجسس کی خاطر اجازت لے کر محاذ جنگ کی طرف چل پڑا تھا، مشتمل تھی۔ آڈیٹر سے تن و توش کا آدمی تھا اور اس کا چہرہ بھی خوب بھرا بھرا تھا۔ وہ اپنے گرد و پیش پر نظریں دوڑاتا اور مسکراتا جا رہا تھا۔ اس کے چہرے بشرے سے معلوم ہوتا تھا کہ جہاں تک مسکری امور کا تعلق ہے، ان کے بارے میں وہ بالکل معصوم ہے لیکن سنے ماحول میں بہت خوش ہے۔

ہوڑا رہا، قارتوں اور انچوٹوں کے مابین شری لبادہ پہنے اور کانوائے افسر کے گھوڑے پر، جس پر زین کسی ہوئی تھی، سوار بچکولے کھاتے وہ ایک طرف تماشہ نظر آ رہا تھا۔

”یہ لڑائی کا منظر دیکھنے کے شوقین ہیں“ ڈرکوف نے آڈیٹر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بلکوسکی سے کہا۔

”لیکن بے چارے کے پیٹ میں ابھی سے ہول اٹھنا شروع ہو گیا ہے۔“

”چھوڑیں، آپ کافی کچھ کہہ چکے ہیں،“ آڈیٹر نے مسکراتے ہوئے کہا۔ بظاہر اس کی مسکراہٹ معصومانہ تھی لیکن پھر بھی اس میں مکاری جھلکتی تھی۔ وہ یوں ظاہر کر رہا تھا جیسے ڈرکوف اس کا مذاق نہیں اڑا رہا بلکہ اس کی خوشامد کر رہا ہے اور اب وہ عہد امتحان کا حق دکھائی دینے کی کوشش کر رہا تھا جتنا وہ حقیقتاً تھا نہیں۔

”Tres drole, mon monsieur prince“ ڈیوٹی افسر نے کہا۔ (اسے یاد آیا کہ فرانسیسی میں لفظ پرنس ادا کرنے کا کوئی انوکھا انداز ہے لیکن خود اس سے صحیح قسم کا انداز برتا نہ جاسکا۔)

”یہ کیا تھا؟“ آڈیٹر نے معصومانہ مسکراہٹ سے پوچھا۔

”فرانسیسی بسکٹ،“ ڈرکوف نے جواب دیا۔

”یہی وہ چیز ہے جس سے وہ آپ کو نشانہ بناتے ہیں؟“ آڈیٹر نے پوچھا۔ ”کتنی بری بات ہے!“

معلوم ہوتا تھا کہ وہ خوشی سے پھول کر کیا ہو جائے گا۔ اس کے منہ سے یہ الفاظ مشکل نکلے ہوں گے کہ یکا یکی ایک بار پھر دہشت ناک سنسناتی آواز سنائی دی۔ اچانک کوئی نرم و گداز چیز دم سے نیچے گری اور سنسناتی آواز بند ہو گئی۔ ایک قازق، جوان کے ذرا دائیں طرف اور آڈیٹر کے پیچھے پیچھے آ رہا تھا، اپنے گھوڑے سمیت زمین بوس ہو گیا۔ ڈرکوف اور شان افسر اپنی اپنی زین پر آگے کو بھک گئے اور وہاں سے اپنے گھوڑے ہٹا کر پرے لے گئے۔ آڈیٹر رک گیا۔ وہ قازق کے عین سامنے کھڑا تھا اور بڑے تجسس اور انتہاک سے اس کا جائزہ لے رہا تھا۔ قازق جہاں نہانی سے رخصت ہو چکا تھا لیکن اس کا گھوڑا ابھی تک ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔

پرنس باگ راتیاں نے اپنی آنکھیں سیٹھریں اور اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ اس کی پارٹی میں جو افراد تفری ہگ ہوئی تھی اسے جب اس کا سبب دکھائی دیا، اس نے یوں بے نیازی سے اپنی نگاہیں پھیر لیں جیسے وہ یہ کہہ رہا ہو کہ ”بھلا اس چھوٹی چھوٹی باتوں کے متعلق پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے؟“ اس نے مشاق سوار کی طرح اپنے گھوڑے کی باگیں کھینچیں اور ذرا آگے جھک کر اپنی شمشیر، جو اس کے چغے میں الجھ گئی تھی، علیحدہ کی۔ یہ قدم وضع کی شمشیر تھی اور اب عام طور پر استعمال نہیں ہوتی تھی۔ پرنس آندرے کو وہ قصہ، جس کے مطابق سوارف نے اطالیہ میں اپنی شمشیر باگ راتیاں کو دے دی تھی، یاد آ گیا۔ یہ یاد اس سے خاص طور پر بہت خوشگوار معلوم ہوئی۔ وہ توپ گڑھی میں، جہاں سے پرنس آندرے نے میدان جنگ کا جائزہ لیا تھا، پہنچ گئے تھے۔

”یہ کس کی کمپنی ہے؟“ پرنس باگ راتیاں نے ایک توپچی سے، جو گولہ بارود کے بکس کے قریب کھڑا تھا۔

”یہ پرنس۔ ری سٹری ہے۔“

دریافت کیا۔

اس نے پوچھ تو دس کی کہنی ہے؟ "تھا لیکن حقیقتاً اس کا مطلب یہ تھا: "تمہیں یہاں ڈر نہیں محسوس ہوتا، اور تو بچی اس کا مطلب سمجھ گیا تھا۔

"پوز ایکسی لینسی، کیپٹن توشن کی؟" تو بچی نے، جس کے بال سرخ تھے، درجس کے چہرے پر دس دے تھے، خوش دلی سے جواب دیا۔

"ارے، ہاں۔" باگراتیاں بے توجہی سے بڑبڑایا جیسے وہ کسی سوچ میں کھویا ہوا ہو۔ اور وہ توپ گاڑیوں سے پرے اس گبنال کی جانب، جو سب سے آگے نصب تھی، چل پڑا۔

جونہی وہ اس گبنال کے قریب پہنچا، اسے داغ دیا گیا۔ زبردست دھماکا ہوا جس سے اس کی اور اس کے ساتھیوں کی وقتی طور پر سماعت جاتی رہی۔ دھوئیں میں، جس نے ایک بیک گبنال کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا، انہیں تو بچی نظر آنے لگے تھے۔ تو بچیوں نے گبنال کو اپنی گرفت میں لے لیا تھا اور وہ گھسیٹ گھسٹ کر اسے جلد اچلا اپنی سابقہ پوزیشن پر نصب کرنے کے لیے بڑی چوٹی کا زور لگا رہے تھے۔ تو بچی نمبر ایک بھری بھر کم جے اور چوڑے چکے سینے کا مالک جو ان تھا۔ اس نے صفائی کرنے والی سلاح پکڑی اور چھلانگ لگا کر پیچھے پر چڑھ گیا۔ تو بچی نمبر 2 نے کپکپاتے ہاتھوں سے گولہ گبنال کے رہانے میں گھسیڑ دیا۔ افسر توشن، جس کا قد چھوٹا اور شانے مدور تھے، توپ گاڑی کے عقبی حصے سے ٹکراتا آگے کو بھاگا۔ جرنیل کی موجودگی سے بے خبر اس نے اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں سے اپنی آنکھوں پر سایہ کیا اور درآگے دیکھنے لگا۔

"اسے دو پوائنٹ اوپر اٹھا دو۔ پھر اس کا نشانہ بالکل ٹھیک بیٹھے گا،" اس نے اپنی باریک آواز میں دھنسنے جو اس کی جسامت سے لگانے کھاتی تھی، پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "نمبر 2!" اس نے حلق سے سنی جیسی آواز نکالتے ہوئے کہا۔ "میدوی دینف، انا کے بھیجے اڑا دو!"

باگراتیاں نے اسے پکارا اور وہ جرنیل کی طرف چل پڑا۔ اس نے شرمیلے اور بے جھگم انداز سے اپنی تین آنکھیں اپنی ٹوپی کی طرف اٹھائی ہوئی تھیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ فوجیوں کی طرح سیلوٹ نہیں کر رہا بلکہ پارہوں کی مانند دھارے رہا ہے۔ اگرچہ توشن کی گچھلیس وادی پر ہم دہری کے لیے نصب کی گئی تھیں لیکن وہ ان کے ذریعے شیون گراہرن گاؤں پر جس کے سامنے فرانسیسی فوج کا اجتماع ہو رہا تھا، آتش کیر کو لے پھنکوا رہا تھا۔

توشن کو کسی نے یہ حکم نہیں دیا تھا کہ اس نے کہاں اور کس پر گولہ باری کرانا ہے لیکن اپنے سارجنٹ بھڑا ذخار چھکو کے ساتھ صلاح مشورہ کرنے کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ گاؤں کو آگ لگانا بہت مفید رہے گا۔

افسر کی رپورٹ کے جواب میں باگراتیاں نے "خوب!" کہا اور اس کی نگاہوں کے سامنے سارے میدان جنگ کا جو نقشہ بھر رہا تھا، اس کا یوں جائزہ لینے لگا جیسے وہ کچھ سوچ رہا ہو۔

فرانسیسی پیش قدمی کرتے دائیں جانب ہمارے قریب ترین آپہنچے تھے۔ جس پہاڑی پر کیف رجسٹ تعینات

تھی، اس کے نیچے گھاٹی میں، جس میں ندی بہہ رہی تھی، توپوں کی گڑ گڑاہٹ اور گھن گرج سنائی دے رہی تھی۔ دائیں جانب دور، بہت دور، ڈریگنوں سے بھی کہیں آگے، سٹاف افسر نے باگراتیاں کی توجہ فرانسیسی فوج کے پرے کی طرف دلائی۔ جوبیس پنے گھیرے میں سے رہا تھا، بائیں طرف بلحقہ جنگل تا افاق پھیلا ہوا تھا۔

پرس باگراتیاں نے حکم دیا کہ قلب کی دو ٹائٹنیں سمیٹنے کو کمک پہنچانے کے لیے بھیج دی جائیں۔ سٹاف افسر نے حوصے سے کام لے کر پرس سے گزرش کی کہ اگر یہ ٹائٹنیں یہاں سے ہٹائی گئیں، پھر کچالوں کو آڑ حاصل نہیں رہے گی۔ پرس باگراتیاں افسر کی جانب مڑا اور اپنی نادر خشاں آنکھوں سے اسے گھورنے لگا۔ پرس آندرے کو ایسے لگا کہ افسر نے جو کچھ کہا تھا، درست کہا تھا اور اس کی تردید ممکن نہیں تھی۔ لیکن عین اسی لمحے رستم کا نڈر کا، جو نیچے گھاٹی میں تھا، ایک ایجوٹ سربٹ گھوڑا دوڑاتا یہ خبر لایا کہ فرانسیسی بہت بڑی تعداد میں ان کی جانب بڑھ رہے ہیں، رجمنٹ کی صف بندی رد ہم برہم ہوگئی ہے اور بے ترتیبی کی حالت میں کیف گریڈ ریز کی طرف پسپا ہو رہی ہے۔ پرس باگراتیاں نے منظوری اور پسندیدگی کی علامت کے طور پر اپنا سر قدرے نیچے جھکا دیا۔ وہ گھوڑے پر آہستہ آہستہ دائیں سمت چلا گیا اور اس حکم کے ساتھ کہ فرانسیسیوں پر حملہ کر دیا جائے، اس نے ڈریگنوں کی جانب اپنا ایجوٹ بھیج دیا۔ لیکن ایجوٹ آدھ گھٹے بعد واپس آگیا اور یہ اطلاع لایا کہ ڈریگنوں کا کمانڈر پہلے ہی پسپائی اختیار کر کے گھاٹی کے پار جا چکا ہے کیونکہ توپوں کا اس کی جانب کھول دیا گیا اور وہ بے کار اپنے آدمیوں سے ہاتھ کھو رہا تھا۔ چنانچہ اس نے اسی میں خیریت جانی کہ وہ بلا توقف جنگل میں چلا جائے۔

”خوب!“ باگراتیاں نے کہا۔

جب وہ گھوڑے پر سوار توپ گڑھی سے رخصت ہو رہا تھا، بائیں جانب کے جنگل سے بھی فائرنگ کی آوازیں سنائی دیے گئیں۔ چونکہ میسرہ تنازیہ دور تھا کہ خود اس کے لیے وہاں جانا ممکن نہیں تھا۔ چنانچہ باگراتیاں نے ڈرکوف کو کمانڈنگ جنرل۔ دی کمانڈنگ جنرل جس کی رجمنٹ کا کو تو زوف نے براؤناؤ میں معائنہ کیا تھا۔ کے پاس بھیجا تا کہ اسے وہ یہ پیغام دے سکے کہ وہ حتیٰ ال مکان جلد از جلد پسپائی اختیار کر کے گھاٹی کے پار چلا جائے کیونکہ سمنہ غالباً زیادہ دیر تک دشمن کا مقابلہ نہیں کر سکے گا۔ لیکن جہاں تک تو شن اور اس ٹائٹن کا، جو اسے آڑ فراہم کر رہی تھی، تعلق تھا، ان سے بالکل صرف نظر کر لیا گیا۔ پرس باگراتیاں کا کمانڈنگ افسروں کے ساتھ جو تبادلہ خیالات ہوا اور اس نے انھیں جو حکام دیے، پرس آندرے نے انھیں بغور سنا اور یہ دیکھ کر اس کی حیرت کی انتہاء نہ رہی کہ حقیقتاً کوئی احکام و حکام دیے ہی نہیں گئے تھے بلکہ پرس باگراتیاں نے محض یہ جاننے کی کوشش کی تھی کہ جو کچھ ضرورت کے تحت، محض اتنا تائیونٹ کمانڈروں کے ایمپر ہوا، وہ سب کچھ اسی کے حکم پر ہوا یا کم از کم اس کے عزائم کے عین مطابق ہوا۔ پرس آندرے نے اندازہ لگایا کہ جو کچھ وقوع پذیر ہوا، اس میں اتفاق کو بڑا دخل حاصل تھا اور اس میں کمانڈر کی مرضی کسی طور شامل نہیں تھی۔ تاہم پرس باگراتیاں نے جس موقع شناسی کا مظاہرہ کیا تھا، اس نے اس کی موجودگی کو بہت اہم بنادیا تھا۔ کمانڈنگ افسراں، جو منہ لگائے اس کی خدمت میں حاضر ہوئے

تھے، دوبارہ پر سکون ہو گئے۔ جوانوں اور افسروں نے نہایت خوش دلی سے اس کا خیر مقدم کیا، اس کی موجودگی میں ان کے حوصلے ٹوٹ آئے اور وہ اس کے سامنے اپنی جرأت اور دلیری کا مظاہرہ کرنے کے لیے بے تاب نظر آنے لگے۔

18

باگ راتیاں ہمارے دائیں بازو کے بلند ترین مقام پر پہنچنے کے بعد گھوڑے پر سوار پہاڑی کے نیچے، جہاں سے توپوں کے چلنے کی آوازیں تو سنائی دے رہی تھیں لیکن جہاں دھوئیں کی وجہ سے نظر کچھ نہیں آ رہا تھا، اترنے لگا۔ وہ گھائی کے جتن قریب ہوئے گئے، نظر انہیں اتنا ہی کم آنے لگا لیکن اصل میدان جنگ کے وہ اپنے آپ کو اتنا ہی قریب محسوس کرنے لگے۔ انھوں نے زخمیوں سے سیل ملاقاتیں شروع کر دیں۔ ایک زخمی شخص کے سر سے خون بہہ رہا تھا اور اس کی ٹوپی ندارد۔ دوسرا ہی اس کی بغلوں میں اپنے بازو پھنسائے اسے گھسیٹنے لیے جا رہے تھے۔ وہ چھٹیکس مار رہا تھا اور بار بار خون کی تے کر رہا تھا۔ صاف نظر آ رہا تھا کہ گولی نے اس کے منہ یا حلق کو نشانہ بنایا تھا۔ ایک اور شخص اپنی دستی بندوق کھو چکا تھا۔ وہ بڑے حوصلے اور ہمت سے اکیلا چلا جا رہا تھا۔ وہ کراہتا اور اپنی زخمی بازو کو، جس سے خون نکل نکل کر اس کے کوٹ پر یوں گر رہا تھا جیسے بوتل کا منہ کھول دیا گیا ہو، فضا میں لہرا رہا تھا۔ اس کے چہرے سے درد سے زیادہ خوف کا اظہار ہو رہا تھا۔ وہ صرف چند ٹاپے قبل زخمی ہوا تھا۔ سڑک عبور کرنے کے بعد وہ ایک عمودی ڈھلوان سے نیچے اترنے لگے۔ یہاں انھیں متعدد جون زمین پر لیٹے نظر آئے۔ یہاں انھیں فوجیوں کا ایک جھوم بھی ملا۔ ان میں سے بعض لوگوں کو خراش تک نہیں آئی تھی۔ یہ جوان پہاڑی پر چڑھ رہے تھے۔ ان کی سانسیں پھولی ہوئی تھیں اور جنرل کو دیکھنے کے باوجود وہ آپس میں زور شور سے باتیں کر رہے تھے اور اپنا مضمون واضح کرنے کے لیے پوری قوت سے اپنے بازو دہرا رہے تھے۔ اب دھوئیں کی چادر میں سے سرگئی اور رکٹوں کی صفیں نظر آنے لگی تھیں اور جب ایک افسر کی نگاہ باگ راتیاں پر پڑی، وہ پسپائی اختیار کرنے والے جھوم کی طرف لپکا اور چلا چلا کر انھیں واپس آنے کا حکم دینے لگا۔ گھوڑے پر سوار باگ راتیاں اس صف کے قریب پہنچا جہاں کبھی ایک اور کبھی دوسری جگہ سے پے درپے گولوں کی گڑگڑاہٹ سنائی دے رہی تھی۔ شور و غل اتنا زیادہ تھا کہ جوانوں کو واپس بلائے کے لیے جواز وازیں بلند کی جا رہی تھیں، وہ اس میں دب گئی تھیں۔ ساری فضا میں دھوئیں کی برباس رہتی ہی تھی۔ بارود نے جو شیلے جوانوں کے چہروں پر کالک مل دی تھی۔ بعض اپنی گتیاؤں کی صفائی کرنے والی سلاخیں چلا رہے تھے، بعض پیالوں میں بارود ڈال رہے تھے یا اپنی تھیلیوں سے کارتوس نکال رہے تھے۔ کچھ لوگ فائرنگ کر رہے تھے، لیکن وہ کس پر فائرنگ کر رہے تھے، دھوئیں کی وجہ سے اس کا کھوج لگا ہوا مشکل تھا اور یہ دھواں اتنا گاڑھا تھا کہ ہوا بھی اسے تحلیل نہیں کر پا رہی تھی۔ ایک خوشگوار بھینکتی اور مستحالی آواز بھی بار سنائی دے رہی تھی۔

”یہاں کیا ہو رہا ہے؟“ پرس آندرے کو تعجب ہو رہا تھا اور وہ جوانوں کے جھوم کی طرف بڑھتے لگا۔ ”پہاڑی“

مف نہیں ہو سکتی: یہ سب لوگ ایک دوسرے میں گھسے ہوئے ہیں۔ یہ بھی نہیں کہا جاسکتا کہ یہ ہلے بول رہے ہیں کیونکہ وہ اپنی جگہوں سے ہل جل نہیں رہے۔ ان کی ترتیب بمشکل مرتب³⁶ بھی نہیں ہے کیونکہ انھیں اس ترتیب سے کھڑا ہی نہیں کیا گیا۔ پھر یہ کیا ہے؟“

رجنٹ کا کمانڈر بدل پٹلا، چیف ایڈ معمر شخص تھا۔ اس کے چہرے پر خوشگوار مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔ اس کے تھکے ہوئے پوٹوں نے اس کی بوڑھی آنکھوں کو نصف سے زیادہ ڈھانپ رکھا تھا اور اس کے چہرے کو شقی بنا دیا تھا۔ وہ گھوڑے پر سوار ہاگراتیاں کی جانب آیا اور اس نے اس کا یوں استقبال کیا جیسے کوئی شخص اپنے معزز مہمان کو خوش آمدید کہتا ہے۔ اس نے پرنس باگراتیاں کو اطلاع دی کہ اس کی رجنٹ پر فرانسیسی گھڑسواروں نے حملہ کیا تھا اور اگرچہ حملہ پسپا کر دیا گیا ہے لیکن اسے اپنے نصف سے زیادہ جوانوں سے ہاتھ دھونا پڑے ہیں۔ جب اس نے یہ کہا کہ حملہ پسپا کر دیا گیا ہے، اس کی رجنٹ کے ساتھ جو کچھ جیتا تھا، اپنی دانست میں وہ اس کے متعلق عسکری اصطلاح استعمال کر رہا تھا لیکن درحقیقت اسے خود بھی یہ معلوم نہیں تھا کہ جو جوان اس کی تحویل میں دیے گئے تھے، آدھ گھنٹے کے دوران میں ان پر کیا حادثہ گزرا ہے اور وہ یقین کے ساتھ یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ آیا حملہ پسپا کر دیا گیا ہے یا اس کی اپنی رجنٹ کے بچے ادھر گئے ہیں۔

وہ صرف اتنا جانتا تھا کہ معمر کے کی ابتدا میں اس کی رجنٹ پر گھنٹوں کے گولے اور دستی بم دھڑا دھڑا کرنے لگے اور اس کے جوانوں کو اپنی زد میں لینے لگے تھے۔ پھر کسی شخص نے چلا کر کہا، ”گھڑسوار فوج“ اور ہمارے جوان فائرنگ کرنے لگے۔ لیکن ان کا ہدف اسپ سوار فوج نہیں تھی کیونکہ وہ منظر سے غائب ہو گئی تھی بلکہ ان کا نشانہ فرانسیسی پیادہ فوج تھی جو گھاٹی میں داخل ہو گئی تھی اور ہمارے آدھیوں پر فائرنگ کر رہی تھی۔

پرنس باگراتیاں نے اپنے سر کو ہلکی سی جنبش دی۔ یہ اس امر کی علامت تھی کہ جو کچھ ہوا، وہ اس کی خواہش اور توقع کے عین مطابق ہوا۔ اس نے اپنے ایک ایجوٹ کو بلایا اور اسے حکم دیا کہ وہ چھٹے شامروں کی دو بٹالینوں کو، جن کے قریب سے وہ ابھی ابھی گزر کر آئے تھے، یہاں بسے آئے۔ اس سے پرنس باگراتیاں کے چہرے پر جوتیل رونا ہوئی، اس نے پرنس آندرے کو چونکا دیا۔ وہاں اسے اسی فرحت آگئیں عزم صمیم کا ارتکا نظر آیا جو اس شخص کے چہرے پر، جو کسی ایسے روز، جب بلا کی گرمی پڑ رہی ہو، اس کے پانی میں چھلانگ لگانے سے پہلے اس وقت دکھائی دیتا ہے جب وہ دوڑتا دوڑتا آخری چند قدم اٹھا رہا ہوتا ہے۔ اب اس کی آنکھیں نہ نیم غنودہ تھیں اور نہ نادر نشان اور نہ وہ جھوٹ موٹ کی سوچ بچار کا ڈراما کر رہا تھا۔ شکرے کی مدد اور سفاک آنکھیں فرط انبساط سے اچلی چارہ تھیں اور قدرے حقارت سے سامنے دیکھ رہی تھیں لیکن کسی چیز پر تک نہیں رہی تھیں۔ تاہم اس کی حرکات و سکنات اب بھی ٹپ ٹپ تھیں اور ان میں کوئی تیزی نہیں آئی تھی۔

رجنٹل کمانڈر باگراتیاں کی طرف متوجہ ہوا اور اس سے التجا کرنے لگا کہ وہ واپس چلا جائے کیونکہ وہاں بہت خطرہ تھا۔ ”پھر ایکسی لینسی، میں آپ سے مؤدبانہ گزارش کرتا ہوں کہ خدا را آپ واپس تشریف لے جائیں۔“

اس نے اس معاملے میں سٹاف افسر سے بھی، جس نے اپنا منہ دوسری طرف پھیر لیا تھا، استمداد چاہی۔ ”دیکھ رہے ہیں نا آپ!“ اس نے گولیوں کی طرف جو ان کے ارد گرد مسلسل بجھتی، سنسنائی، گنگنائی کر رہی تھیں، توجہ دلاتے ہوئے کہا۔ اس کا منت سماجت اور گئے شکوے کا انداز بالکل اس بڑھتی کا ساتھ جو کسی سفید پوش سے، جسے اس نے کلہاڑا اٹھاتے دیکھ لیا ہو، کہتا ہے ”ہم تو اس کے عادی ہیں لیکن آپ کے دست مبارک پر چھالے پڑ جائیں گے۔“ وہ یوں باتیں کر رہا تھا جیسے وہ گویاں اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گی اور اس کی شیم بند آنکھوں نے اس کے الفاظ کو اور بھی ترغیب آمیز بنا دیا تھا۔ سٹاف افسر نے کرنل کی تائید کی اور پر زور انداز میں واپس چلنے کو کہا لیکن پریس باگ راتیاں نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس نے محض یہ حکم دینے پر اکتفا کیا کہ فائرنگ بند کر دی جائے اور صف بندی از سر نو کی جائے تاکہ ان دو بٹالینوں کے لیے، جو آ رہی تھیں، گنجائش پیدا کی جاسکے۔ جب وہ یہ احکام دے رہا تھا، بالکل بالکل ہو چنے گل اور اس نے دھوئیں کی اس چادر کو، جو دائیں سے بائیں پوری گھائی پر پھیلی ہوئی تھی، یوں ہٹا دیا جیسے کوئی غیر سرگرمی کا کام کر رہا ہو، اور بالقابل پہاڑی، جسے فرانسیسی عبور کر رہے تھے، دکھائی دینے لگی۔ غیر ارادی طور پر تمام لوگوں کی نگاہیں فرانسیسی کالم (پرے) پر، جو ناہموار سطح پر چکر کاٹتا، ورن کی سمت پیش قدمی کرتا آ رہا تھا، جم کر رہ گئیں۔ انھیں سپاہیوں کی سونے جھوٹے چشم کی ٹوپیاں پہلے ہی دکھائی دینے لگی تھیں۔ اب وہ عام سپاہیوں اور افسروں کے مابین امتیاز کر سکتے تھے اور ان کے علم کو اپنے بانس کے ساتھ ٹکراتے دیکھ سکتے تھے۔

”وہ، کیا وقار ہے ان کے کوچ میں!“ باگ راتیاں کے عملے کے کسی رکن نے نعرہ تحسین بلند کیا۔

کالم کا ہر اول پہلے ہی گھائی میں داخل ہو چکا تھا۔ تصادم گھائی کے اس جانب ہو گا۔۔۔

ہماری رجمنٹ کے، جو ازیں جیستر ہی ایک سرگرم لڑچکی تھی، بچے کھچے جوانوں نے جلدی جلدی دوبارہ صف بندی کی اور دائیں طرف ہٹ گئے۔ ان کے پیچھے پیچھے، رجمنٹ سے پھٹ جانے والوں کو ادھر ادھر منتشر کرتے، چھٹے شمار کی دو بٹالینیں دل آویز ترتیب بنائے آ رہی تھیں۔ ابھی وہ باگ راتیاں کے قریب نہیں پہنچی تھیں لیکن انہوں نے کاہجوم کا ہجوم قدم سے قدم ملائے مارچ کرتا آ رہا تھا اور پاؤں کی بھری دھمک سنائی دینے لگی تھی۔ باگ راتیاں کے قریب تریں میسرہ تھا۔ اس کا کپہنی کا ٹڈر خاصا بارعب شخصیت کا، لک تھا۔ اس کے گول منوں چہرے پر حماقت نیک رہی تھی لیکن وہ بہت مسرور نظر آ رہا تھا۔ یہ وہی شخص تھا جو جھوپڑی سے سرپٹ بھاگا چ رہا تھا۔ فی الحال اس کے ذہن پر ایک ہی دھن سوار تھی کہ جس طرح بھی ہو، اپنے اعلیٰ افسروں کے سامنے دیدہ زیب انداز سے مارچ پاسٹ کرنا گزرے۔

پرلے کے دوران میں سب سے اعلیٰ صف کے اشخاص کو اپنی ذات پر جو اعتماد ہوتا ہے، اسی اعتماد و اطمینان کے ساتھ وہ اپنی ٹھیلی ناگوں پر گئے کھسکا، پھلستا چلا آ رہا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ چل نہیں رہا بلکہ پیر رہا ہے۔ معمولی سی کوشش کے بغیر وہ بالکل سیدھا ہوتا تھا اور جس پہل انداز سے مارچ کر رہا تھا وہ سپاہیوں کے، جو قدم سے قدم ملائے اس کے ساتھ آ رہے تھے، ہماری قدسوں کی تھاپ سے زبردست تضاد پیش کر رہا تھا۔ وہ اپنی ٹانگ

کے ساتھ دلی تلی، مہین اور مارک برہنہ شمشیر چٹائے ہوئے تھا (یہ شمشیر اتنی چھوٹی اور منحنی تھی کہ کسی طور ہتھیار معلوم نہیں ہوتی تھی)۔ وہ کبھی اپنے اعلیٰ افسروں پر اچھتی نگاہ ڈالتا اور کبھی پیچھے اپنے جوانوں پر۔ اس کے قوی جتن میں اتنی چمک تھی کہ مڑ کر آگے پیچھے دیکھنے کے باوجود اس کے قدم بالکل صحیح انداز سے زمین پر پڑ رہے تھے۔ معلوم ہوتا تھا کہ اس کی روح کی ساری قوتیں مجتمع ہو چکی ہیں اور اس بات کا تہیہ کر چکی ہیں کہ وہ اسے اس کے افسروں کے سامنے ممکن حد تک بہترین انداز سے گزاریں گی۔ اور خوشی سے اس کی باجھیں کھلی جا رہی تھیں کیونکہ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو رہا ہے۔ ”لیفٹ... لیفٹ...“ معلوم ہوتا تھا کہ ہر دوسرے قدم پر دو جی ای جی میں یہی دہراتا جا رہا ہے۔ سپاہیوں کی متحرک دیوار اس کے ساتھ قدم سے قدم ملنے مارچ کر رہی تھی۔ یہ سپاہی خیلوں اور ہتھیاروں کے بوجھ سے دبے ہوئے تھے، ہر چہرے پر اپنے اپنے انداز کی سنجیدگی اور رشتی چھائی ہوئی تھی لیکن وہ سبھی کے سبھی یکساں آہنگ کے ساتھ مارچ کر رہے تھے جیسے یہ سینکڑوں سپاہی اپنے اپنے ذہنوں میں ”لیفٹ... لیفٹ... لیفٹ“ کی گردان کر رہے ہوں۔ ایک نموند میجر جس کی سانس پھول چکی تھی در جس کا پاؤں اکھڑ گیا تھا، سڑک کے کنارے جھاڑی کے گرد گھوم گیا۔ ایک سپاہی، جو دوسروں سے پگھل گیا تھا، اس بات پر طوں تھا کہ وہ دوسروں سے پیچھے کیوں رہ گیا ہے۔ اس نے دوڑ لگا دی تاکہ وہ اپنی کمپنی کے ساتھ جا ملے۔ اس کوشش میں وہ ہانپنے لگا۔ گھناٹا کا ایک گولہ آیا۔ وہ ہوا کو چیرتا اور باگرتیاں اور اس کے ہمراہیوں کے سروں کے اوپر ہی اوپر اڑتا کالم کے بیچ آگرا جیسے وہ بھی ”لیفٹ... لیفٹ... لیفٹ...“ کے آہنگ سے مسحور ہو گیا ہو اور اس کا ساتھ دینے آ گیا ہو۔

”میں ایک دوسرے کے قریب مٹ جائیں،“ کمپنی کمانڈر کی روح پرور آواز گونجی۔

سپاہی نیم دائرہ بنائے اس جگہ کے، جہاں گولہ گرا تھا، برابر گزرتے رہے۔ ایک مسمران کمشنڈ افسر، جو مجروحین و ہلاک شدگان کے قریب رک گیا تھا اور یوں پیچھے رہ گیا تھا، ایک جھپک آگے بھاگا آ رہا تھا اور خشم ناک نگاہوں سے سڑک پر پیچھے دیکھتا جا رہا تھا۔ بھاگتے بھاگتے اس نے قلاب بھری اور اپنے ساتھیوں کے ساتھ قدم سے قدم مل کر چلنے لگا۔ نحوست زدہ خاموشی میں ”لیفٹ... لیفٹ... لیفٹ...“ کی آوازیں گونج رہی تھیں اور قدموں کے ایک ساتھ زمین سے ٹکرنے سے ایک رنگی صوت فضا میں بکھر رہی تھی۔

”شاہاٹ، جوانو!“ باگ راتیاں نے کہا۔

یورٹ۔ ایک۔ سی۔ لیسی۔ کی خاطر! ”صفوں سے خلط ملط آوازیں آئیں۔“

ایک بد مزاج اور اکل کھرے سپاہی نے مارچ کے دوران میں نعرہ لگاتے لگاتے مڑکیوں باگ راتیاں کی طرف دیکھا جیسے وہ یہ کہہ رہا ہو۔ ”تمہیں پتا ہی ہے، ہمارے بتانے کی کیا ضرورت ہے؟“ ایک دوسرا منہ پھاڑے چلا رہا تھا۔ اس نے مطلقاً نگاہیں پھیر کر ادھر ادھر نہ دیکھا جیسے اسے اندیشہ ہو کہ اس کی توجہ بٹ جائے گی۔

رہنے اور تھیلے اتارنے کا حکم دے دیا گیا۔

جو صفیں باگراتیاں سے آگے نکل گئی تھیں، اس نے گھوڑے پر سواران کے گرد چکر لگایا اور پھر نیچے اتر آیا۔ اس نے بائیں، ایک قازق کے سپرد کر دیں، اپنا چٹا اتارا اور وہ بھی اسے تھما دیا۔ پھر اس نے اپنی ٹانگیں سپرد کیں اور اپنی ٹوپی درست کر کے رکھی۔ فرانسیسی کالم کا ہر دل، جس کے افسر آگے آگے آرہے تھے، پہاڑی کے دامن سے منظر عام پر آگیا۔

”آگے بڑھو، خدا تمہارا حامی و ناصر ہوا“ باگراتیاں نے اپنی کراہی اور گونج دار آواز میں کہا اور ایک لمحے کے لیے اگلی صف کی طرف متوجہ ہو گیا۔ پھر وہ اپنے بازوؤں کو آہستہ آہستہ لہر تا، بسپ سواروں کی بے انگم چال چلا غیر ہموار سطح پر یوں قدم آگے بڑھانے لگا کہ اب گرا، اب گرا۔

پرنس آندرے کو محسوس ہوا کہ کوئی نادیدہ طاقت اسے ہٹکائے لیے جارہی ہے اور اسے اپنے رگ و پے میں تیز دست خوشی کے دوڑنے کا احساس ہوا۔

فرانسیسی اب قریب پہنچ رہے تھے۔ پرنس آندرے پرنس باگراتیاں کے ساتھ ساتھ جا رہا تھا۔ اسے ان کی کار تو سوں کی پیشیاں، اور سرخ فیتے ہلکات کے چہرے بھی صاف دکھائی دے رہے تھے۔ (اسے ایک معزز انہی افسر واضح طور پر نظر آیا۔ اس نے ٹانگوں کے گرد ساق پوش لپیٹے ہوئے تھے اور اس کے پاؤں ٹیڑھے میڑھے تھے۔ وہ جھاز یوں کا سہارا لیتا بدقت پہاڑی سر کر رہا تھا۔) پرنس باگراتیاں نے مزید کوئی حکم نہ دیا۔ وہ چپ سادے صفوں کے آگے چلا رہا۔

دفعہ فرانسیسیوں کے، جن پہلے ایک، پھر دوسری، اس کے بعد تیسری گولی کے چلنے کی آواز سنائی دی۔ ان کی شکستہ صفوں سے دھواں بلند ہونے لگا اور توپیں شعلے اگلنے لگیں۔ ہمارے متعدد جوان نیچے گر پڑے۔ ان میں وہ فسر بھی، جس کا چہرہ گوس مٹول تھا اور جواتی آن بان اور تمکنت سے مار ج کرتا آیا تھا، شامل تھا۔ لیکن جو وہی پہلا گولہ پھٹنے کی آواز آئی، باگراتیاں نے پیچھے مڑ کر دیکھا اور نعرہ لگایا: ”شا باش!“

”شا۔ شا۔ شا۔ شا۔ شا۔“ یہ آواز صف بہ صف آخری کنارے تک گونجنے لگی۔ ہمارے جوانوں کا جوش و خروش دیدنی تھا۔ وہ باگراتیاں سے ہی نہیں، بلکہ ایک دوسرے سے بھی آگے نکلنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اگرچہ ان کی اپنی صفیں قدرے انتشار کا شکار ہو رہی تھیں لیکن ان کا شوق اور سرمت مہینز کا کام دے رہی تھی اور وہ بے ترتیب غنیمت سے نپٹے سرعت پہاڑی سے نیچے اترنے لگے۔³⁷

چھٹے شماروں کے حملے نے ہمارے مکے کی پسپائی کے لیے آڑ مہیا کر دی۔ قلب میں قوتن کی بھولی بھری ٹوپ گڑھی شیون گراہن کو آگ لگانے میں کامیاب رہی تھی اور یوں اس نے فرانسیسی پیش قدمی میں رخنہ ڈال دیا تھا۔ فرانسیسی آگ، جسے ہوا پھیلا رہی تھی، بجھانے کے لیے رک گئے اور ہمیں پسپا ہونے کے لیے وقت مل گیا۔ قلب کو گھائی کے

دوسری جانب ہٹا لیا گیا۔ اس کام میں تعجیل کی گئی اور کچھ افراتفری بھی دیکھنے میں آئی۔ تاہم مختلف یونٹیں ایک دوسرے میں خلل ملط نہ ہوئیں۔ لیکن میسرے پر، جو پیادہ فوج کی، زوف اور پادولیا، جمنوں اور پادلوگرات ہوزاروں پر مشتمل تھا، آئندہ ہمدرد ہو گیا۔ لان کی سربراہی میں برتر فرانسسیسی سپاہ نے اسے اپنے نرغے میں لے لیا اور اس میں ظلمتشار پکڑ دیا۔ باگراتیاں نے ڈرکوف کو یہ حکم دے کر کمانڈنگ جنرل کے پاس بھیجا کہ میسرہ بلا تاخیر پیچھے ہٹ جائے۔

ڈرکوف نے اپنی ٹوپی سے ہاتھ اٹھائے بغیر چابک دستی کے ساتھ پٹا گھوٹا موٹا اور ہوا ہو گیا۔ لیکن وہ باگراتیاں سے چند قدم ہی آگے گیا ہو گا کہ اس کی ہمت جواب دے گئی۔ اس پر اس قدر زبردست خوف غالب آ گیا کہ جہاں خطرہ تھا، وہاں جانے کو اس کا جی نہ مانا۔

جب وہ میسرے میں پہنچ گیا تو بجائے اس کے کہ وہ آگے وہاں جاتا جہاں فائرنگ ہو رہی تھی، وہ ایسی جگہ جنرل اور اس کے عملے کو تلاش کرنے لگا جہاں ان کے ہونے کا کوئی خاص امکان نہیں تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ پیغام پہنچانے میں ناکام رہا۔

سینارٹی کے اعتبار سے میسرے کی کمان کا حق اس کمانڈر کو حاصل تھا جس کی رجمنٹ کا کو تو زوف نے براؤنڈاؤ میں محاذ کیا تھا اور جس میں دلو خوف عام سپاہی کی حیثیت سے خدمات سرانجام دے رہا تھا۔ لیکن انتہائی بائیں بازو کی کمان پادلوگرات رجمنٹ کے، جس میں رستوف شامل تھا، کمانڈر کو سونپ دی گئی تھی۔ اس کا نتیجہ غلط فہمی کی صورت میں برآمد ہوا۔ دونوں کمانڈر ایک دوسرے سے نالاں تھے اور ایسے وقت، جب کہ میسنہ پہلے ہی کچھ دیر سے معرکہ رانی میں الجھا ہوا تھا اور فرانسسیسی ہلہ بول چکے تھے، وہ بحث مباحثے میں، جس کا واحد مقصد ایک دوسرے کی ٹانگ گھسیٹنا تھا، مشغول تھے۔ اس کا انجام یہ ہوا کہ دونوں رجمنٹیں، ایک پیادہ اور دوسری گھڑسوار، کسی لحاظ سے بھی ساز و مت کے لیے، جو سروں پر منڈلا رہی تھی، تیار نہ تھیں۔ عام سپاہی سے لے کر جنرل تک کسی کو بھی لڑائی چھڑنے کی توقع نہیں تھی اور بھی دل جمعی سے پرامن سرگرمیوں میں مصروف تھے۔ سوار گھوڑوں کو چبھنا کھلارہے تھے اور پیادہ سپاہی ایندھن اٹھا کر رہے تھے۔

”یہ ٹھیک ہے کہ رتبے کے اعتبار سے وہ مجھ سے سینئر ہے“ ہوزاروں کے جرمن کرنل نے تمھاتے اور جرمن لہجے میں اپنے ایجوٹٹ سے، جو گھوڑے پر سوار اس کے پاس پہنچا تھا، مخاطب ہو کر کہا۔ ”چنانچہ جو اس کا جی چاہے، کرے، میں اپنے ہوزاروں کی قربانی نہیں دے سکتا۔ بگلی اپسپائی کا بگل بجا دوا“

لیکن معاملات گڑبڑا رہے تھے اور فوری توجہ کے متقاضی تھے۔ میسنے اور قلب میں گجلاؤں اور بندوٹوں کی ٹلی جلی آوازیں دہاڑ رہی تھیں۔ لان کے چابک دست نشانچیوں کے کوٹ ازیں جھٹری دکھائی دینے لگے تھے کیونکہ وہ بھی چکی بند عبور کر چکے تھے اور وہ بالکل قریب صف بندی میں مصروف تھے۔

وہ جنرل، جس کے ہاتھ میں پیادہ فوج کی کمان تھی، لڑکھڑاتے ڈنگاتے اپنے گھوڑے تک پہنچا، اس پر سوار ہوا اسیدحاتن کر بیٹھا اور پادلوگرات رجمنٹ کے کمانڈر کی طرف چل پڑا۔ دونوں کمانڈروں نے اپنی گردنوں

کو ذرا سہم دے کر ایک دوسرے کو سلام کیا لیکن اندر سے ان کے دل صاف نہیں تھے، ان میں بغض اور کدورت بھری ہوئی تھی۔

”کرنل، میں ایک بار پھر عرض کیے دیتا ہوں،“ جرنیل نے کہا۔ ”میں اپنے نصف جوان جنگل میں نہیں چھوڑ سکتا۔ میری آپ سے التجا ہے کہ اس مقام پر آپ قابض ہو جائیں اور حملے کے لیے تیاریاں شروع کر دیں۔“ اور میری آپ سے التجا ہے کہ جس پھٹے سے آپ کا تعلق نہ ہو، اس میں ٹانگ نہ بھنسا کیں،“ کرنل نے ترش روئی سے جواب دیا۔ ”اگر آپ اسپ سوار فوج کے افسر ہوتے۔“

”کرنل، میں اسپ سوار فوج کا افسر تو نہیں ہوں لیکن میں روسی فوج کا جرنیل ضرور ہوں۔ اور اگر آپ کو اس حقیقت کا علم نہ ہو۔“

”سیورٹ ایکسی لینسی، میں اس سے پوری طرح آگاہ ہوں،“ کرنل نے اچانک چما کر کہا۔ وہ غصے سے ال بھیکا ہو رہا تھا اور اپنے گھوڑے کو ہمیز لگایا چاہتا تھا۔ ”ذرا نوازش فرمائیں اور میرے ساتھ اگلی صف تک تشریف لے چلیں۔ آپ کو خود معلوم ہو جائے گا کہ یہ مقام قابل مہارت نہیں ہے۔ میں آپ کا جی خوش کرنے کے لیے اپنے جوانوں کو جا ہی کے غار میں نہیں دھکیل سکتا۔“

”کرنل، آپ اپنا مقام بھول رہے ہیں۔ میرا اپنا جی خوش کرنے سے کوئی تعلق نہیں۔ میں ایسی بات کہنے کی اجازت نہیں دیتا ہوں۔“

جرنیل نے کرنیل کی درخواست کو اپنی جرأت کے لیے چیلنج تصور کیا۔ اس نے اپنا سینہ پھلایا اور ناک بھولا چڑھاتے اس کے ساتھ گھوڑے پر اگلی صفوں کی طرف چل پڑا جیسے وہاں گولیوں کی بوچھاڑ میں ان کے تمام اختلافات کا فیصلہ ہو جائے گا۔ وہ اگلی صف میں پہنچ گئے۔ متعدد گولیاں سنسناتی ان کے برابر سے گزر گئیں اور وہ منہ باندھے رک گئے۔ اگلی صف سے کوئی نئی چیز دیکھنے کو نہ ملی بلکہ جہاں وہ پہلے کھڑے تھے وہاں سے بھی یہ صاف نظر آ رہا تھا کہ جھاڑیوں اور گھائی نے اسپ سوار فوج کے لیے کسی قسم کی کارروائی کرنا ناممکن بنا دیا ہے اور یہ کہ فرانسیسی ہارے میسرے کو گھیرے میں لے رہے ہیں۔ جرنیل اور کرنیل نے ایک دوسرے کی جانب معنی خیز اور قہر آلود نگاہوں سے دیکھا جیسے دوسرے لڑائی کے لیے پرتول رہے ہوں اور وہ دونوں میں سے ہر ایک کی کوشش بے سود ہی تھی، کہ وہ حریف میں بزدلی کی کوئی رت ڈھونڈ سکے۔ دونوں آزمائش میں پورے اترے۔ چونکہ کہنے سننے کے لیے کچھ رو نہیں گیا تھا اور چونکہ دونوں میں سے کوئی بھی دوسرے کو یہ دعویٰ جتانے کا موقع نہیں دینا چاہتا تھا کہ پہلے وہ گولیوں کی مار کے میدان سے پیچھے ہٹا ہے، لیکن ہے کہ وہ غیر معین عرصے تک یونہی کھڑے رہے اور ایک دوسرے کی جرأت اور حوصلے کا امتحان لیتے رہے اگر انھیں اپنے پیچھے جنگل میں تڑتا ہٹ اور کھٹے گھٹے اور غلط ملط شور و غل کی آوازیں سنائی نہ دیتیں۔ وہ سپاہی جو سختی لکڑی اکٹھا کرنے میں مصروف تھے، فرانسیسیوں نے ان پر حملہ کر دیا تھا۔ اب ہونہاروں کے لیے پیارہ فوج کے ساتھ سپاہی اختیار کرنا ممکن نہ رہا۔ بائیں جانب فرانسیسی فوج نے

ان کی پسائی کی تمام راہیں مسدود کر دی تھیں۔ ان حالات میں لڑائی کا میدان ان کے لیے خواہ کتنا ہی غیر موزوں کیوں نہ ہوتا، ان کے لیے بیٹا گز پر ہو گیا تھا کہ وہ غنیم پر حملہ کریں تاکہ اپنے لیے گزرنے کا راستہ بنا سکیں۔

جس سکواڈرن میں رستوف متعین تھا، اسے اتنا بھی موقع نہ ملا کہ وہ ڈھنگ سے گھوڑوں پر سوار ہو جاتے۔ انھیں رکن اور غنیم کا سامنا کرنا پڑا۔ اس کے، ورنیم کے مابین کوئی چیز حائل نہیں تھی۔ صرف بے یقینی اور خوف کی ہمایک لکیر دونوں کے مابین بالکل اسی طرح کھینچی ہوئی تھی جس طرح زندگی اور موت کے درمیان ایک باریک لکیر ہوتی ہے۔ بھی اس لکیر سے آگاہ تھے اور یہ سوال، کہ آیا وہ اس لکیر کو پار کریں گے یا نہیں اور اگر کریں گے تو کیسے، ان سب کو پریشانی میں ڈال رہا تھا۔

کرنل گھوڑے پر سوار اگلی صف تک آیا۔ اس نے برا فروختگی سے افسروں کے سوالات کے جوابات دیے اور ایک ایسے شخص کی طرح، جس کی جان پرینی ہوئی ہو اور وہ اپنی مرضی کرنے پر تلا ہوا ہو، اس نے کوئی حکم دے دیا۔ کسی شخص نے بھی واضح انداز سے تو کچھ نہ کہا لیکن سارے سکواڈرن میں حملے کی افواہ پھیل گئی۔ صف بندی کا حکم گوبنچے لگا اور میانوں سے ششیریں کھینچنے کی آوازیں گوبنچے لگیں۔ تاہم اپنی جگہ سے ہلا کوئی بھی نہ۔ میسرے کے پیادہ فوجیوں اور ہزاروں دونوں کومسوس ہونے لگا کہ کمانڈروں کو خود معلوم نہیں کہ کیا کرنا ہے اور ان کی یہ ہچکچاہٹ جوانوں میں سرایت کرنے لگی۔

”کاش، یہ ذرا جلدی کریں!“ رستوف نے سوچا۔ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ حملے کے ساتھ جو سرتیں وابستہ ہوتی ہیں جن کے متعلق اس نے اپنے ساتھیوں سے اتنا کچھ سن رکھا تھا، انھیں بچھنے کی گھڑی آچکی ہے۔

”جوانو، آگے بڑھو، خدا تمہارا حامی و ناصر ہو!“ دینی سوف کی کڑا کے دار آواز سنائی دی۔ ”بڑھو، تیزی سے آگے بڑھو!“

اگلی صف کے گھوڑوں کے پٹھے جھولنے لگے۔ رخ (رستوف کا گھوڑا) منہ زور ہو گیا، اس نے اپنی نگام کشی اور خود ہی چلنے لگا۔

دائیں جانب رستوف کو اپنے ہزاروں کی سب سے اگلی صفیں نظر آئیں اور ان سے بھی کہیں آگے ایک ملگجی لکیر تھی۔ وہ اسے صحیح طور پر پہچان نہ سکا لیکن اس نے اسے غنیم محمول کیا۔ گولیوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں لیکن یہ کہیں دور سے آرہی تھیں۔

”تیز تر!“ حکم کا لفظ سنائی دیا۔ رستوف کو محسوس ہوا کہ رخ کے پہلو نیچے ڈھلک رہے ہیں۔ دراصل گھوڑا سر پٹ بھاگا جا رہا تھا۔

رستوف نے اپنے گھوڑے کی نقل و حرکت کا پیشگی اندازہ لگا لیا تھا اور وہ مسرت سے جھوم رہا تھا۔ اس نے اپنے سامنے ایک اکلوتا درخت دیکھ لیا تھا۔ ابتداً یہ درخت عین اس جگہ کھڑا تھا جہاں اس کے خیال میں تنی ڈراؤنی لکیر تھی لیکن اب جب کہ وہ اس لکیر کو عبور کر چکا تھا، اسے نہ صرف یہ کہ کسی ڈراؤنی شے سے واسطہ نہیں تھا بلکہ اس

کے برعکس ہر لمحہ پہلے کی نسبت زیادہ راحت نشان اور دلچسپ سے دلچسپ تر ہوتا جا رہا تھا۔

”اٹھو، میں ان کے کشتوں کے پستے لگا دوں گا! مزہ آجائے گا!“ رستوف نے سوچا۔ اس نے رخ کو مہینے لگایا اور گھوڑے کو پوری رفتار سے دوڑا دیا۔ چنانچہ وہ دوسروں سے آگے نکل گئے۔ دشمن اب دکھائی دینے لگا تھا۔ اچانک برج درخت کے دستہ چاروب کی، نند کوئی خاصی چوڑی چیز سنسناتی سکواڈرن کے بیچ میں سے گزر گئی۔ رستوف نے ضرب لگانے کے لیے اپنی شمشیر بلند کی لیکن عین اس لمحے ایک سپاہی نے، جس کا نام نکولکو تھا اور جو اس سے آگے آگے گھوڑا سر پٹ بھاگنے جا رہا تھا، اپنا رخ بدل دیا اور رستوف کو یوں محسوس ہوا، جیسے وہ خواب دیکھ رہا ہو۔ وہ غیر فطری رفتار سے بھاگا بھی جا رہا تھا لیکن اپنی جگہ سے ہل بھی نہیں رہا تھا۔ عقب سے ایک اور ہونہار، جس کا نام بندار چوک تھا اور جسے وہ جانتا تھا، اس سے آگے آیا اور اسے خشم ناک نگاہوں سے دیکھنے لگا۔ بندار چوک کا گھوڑا بدک گیا اور سر پٹ آگے بھاگنے لگا۔

”یہ کیا؟ میں ہل جل نہیں رہا؟ میں گر پڑا ہوں؟ ہاک ہو گیا ہوں؟“ رستوف نے اپنے آپ سے یہ سوالات پوچھے اور اسی لمحے ان کے جوابات بھی دیے۔ وہ کھیت کے بیچ میں اکیلا تھا۔ اسے اپنے گرد و پیش حرکت پذیر گھوڑے اور سوار تو نظر نہ آئے، البتہ غیر متحرک زمین اور وہ ³⁸ ضرور دکھائی دے رہے تھے۔ اس کے پیچھے گرم گرم خون تھا۔

”نہیں، میں زخمی ہو چکا ہوں اور میرا گھوڑا ہلاک۔“

رخ نے اپنی انگلی ٹانگوں پر کھڑا ہونے کی کوشش کی لیکن اس سے اٹھانہ گیا اور وہ دوبارہ نیچے گر پڑا۔ اس نے اپنے سوار کی ٹانگ بھی نیچے دہالی۔ گھوڑے کے سر سے خون بہہ رہا تھا۔ وہ زور لگاتا لیکن اٹھنے میں ناکام رہتا۔ رستوف نے بھی اٹھنے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہو سکا۔ اس کا نیا م زین میں پھنس گیا تھا۔ ہارے آدمی کہاں تھے اور فراموشی کہاں تھی، اسے کچھ معلوم نہیں تھا۔ اس کے آس پاس کوئی ذی روح نہیں تھا۔

اس نے اپنی ٹانگ چھڑائی اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ”وہ لکیر جس نے دونوں افواج کے مابین اتنی واضح حد فاصل قائم کر دی تھی، کہاں ہے؟ یہ کس فریق کے قبضے میں ہے؟“ اس نے اپنے آپ سے پوچھا لیکن کوئی جواب نہ دے سکا۔ ”کیا میرے ساتھ کوئی گڑبڑ ہو گئی ہے؟ کیا یہاں یہی کچھ ہوتا ہے؟ اگر ایسا ہے، پھر آدمی کو ان حالات میں کیا کرنا چاہیے؟“ اس نے اٹھتے اٹھتے اپنے آپ سے پوچھا۔ اس لمحے اسے یہ محسوس ہوا کہ اس کے بازو کے ساتھ جوئیں ہو چکا تھا، کوئی قاتل چیز لٹک رہی ہے۔ معصوم ہوتا تھا کہ یہ ہاتھ اس کا اپنا ہاتھ نہیں ہے۔ اس نے اس کا غور معائنہ کیا لیکن وہاں اسے خون کا کوئی نشان نظر نہ آیا۔

”لٹاؤ، یہاں کچھ لوگ ہیں!“ اس نے متعدد اشخاص کو اپنی طرف بھاگتے دیکھ کر سوچا۔ اس کے دل کا کون کھل گیا۔ ”یہ میری مدد کریں گے۔“

جو شخص سب سے آگے آگے بھاگا آ رہا تھا، اس کا رنگ گندمی، چہرہ دھوپ میں جھلسا ہوا، اور ناک خم دار

تھی۔ اس کے سر پر نامانوس شا کو (ٹوپی) تھی اور وہ نیسے کوٹ میں ملبوس تھا۔ اس کے عقب میں دو اور اشخاص اور مناسب کے پیچھے متعدد مزید آدمی بھاگے آرہے تھے۔ ان میں سے ایک نے کوئی عجیب بات کہی لیکن روسی میں نہیں۔ عقب میں اسی قسم کی ٹوپیاں پہنے جو لوگ تھے، ان میں ایک روسی ہو کر تھا۔ انہوں نے اسے بازوؤں سے پکڑ رکھا تھا اور اس کے پیچھے کوئی اس کا گھوڑا تھا۔ بھڑے ہوئے تھا۔

”یہ ضرور ہمارا ہی کوئی جوان ہوگا۔ اسے انہوں نے قیدی بنالیا ہے۔۔۔ ہاں۔ کیا یہ مجھے بھی پکڑ لیں گے؟ یہ کون لوگ ہیں؟“ رستوف سوچ رہا تھا۔ اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔ ”کیا یہ فرانسیسی ہیں؟“ وہ ٹھٹھکی باندھ کر فرانسیسیوں کو، جو قریب آرہے تھے، دیکھ رہا تھا۔ اگرچہ ایک ہی ثانیہ قبل وہ انہیں لوگوں تک پہنچنے اور ان کے کشتوں کے پٹے لگانے کے لیے سرپٹ بھاگا جا رہا تھا، اب ان کا قریب اسے اتنا بھیانک معلوم ہو رہا تھا کہ اس کے لیے اپنی آنکھوں پر یقین کرنا مشکل تھا۔ ”یہ کون ہیں؟ یہ کیوں بھاگے آرہے ہیں؟ کیا یہ میری طرف آرہے ہیں؟ واقعی میری طرف آرہے ہیں؟ اور کیوں؟ مجھے مارنے کے لیے؟ مجھے، جس سے ہر کوئی پیار کرتا ہے؟“ اسے اپنی ماں کی، اپنے خاندان کی، اپنے دوستوں کی، سبھی کی محبت یاد آئی اور دشمن اسے ہلاک کرنے کے ارادے باندھ رہا ہے، ناممکن۔ ”لیکن شاید۔۔۔ وہ مجھے ہلاک کرنا ہی چاہتے ہیں؟“ وہ دس سیکنڈ سے زیادہ پٹی جگہ کھڑا رہا۔ گل محمد بنا رہا۔ اسے اپنی صورت حال کی سمجھ نہیں آرہی تھی۔

وہ فرانسیسی، وہی جس کی ٹاک خم دار تھی، جو سب سے آگے آگے تھا، اب اتنا قریب پہنچ چکا تھا کہ اس کا چہرہ دیکھ کر اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ وہ کیا سوچ رہا ہے۔ یہ شخص، جو اپنی سنگین آگے جھکائے اور سانس روکے تیز قدموں اس کی جانب بھاگا آرہا تھا، اس کے جوشیے اور، جنہی سراپے نے رستوف کے دل پر دہشت بٹھادی۔ اس نے پناہ توں پکڑ لیکن گولی چلانے کے بجائے اسے فرانسیسی کی طرف پھینک دیا اور خود پورا زور لگا کر جھڑی کی طرف بھاگنے لگا۔ انیس کے بل کی جانب ٹیش قدمی کے دوران میں اس کے ذہن میں جو شکوک بھرے تھے اور جس لنگش سے وہ دوچار ہوا تھا، اب جبکہ وہ بھاگا جا رہا تھا، وہ دونوں منقود ہو چکے تھے۔ اب اس کے قلب میں جو احساسات سر اٹھ رہے تھے، وہ وہی تھے جو اس خرگوش کے، جو شکاری کتوں سے جان چھڑانے کے لیے ہوا سے ہتھی کرنا جانتا ہے، دل میں پیدا ہوتے ہیں۔ اس کے سر سے وجود کو اس واحد جذبے نے اپنی گرفت میں جکڑ لیا تھا کہ اس کی پریشانی اور سرور و مطمئن زندگی کو خطرہ لاحق ہے۔ وہ اندھا دھند بازوؤں کو پھلانگتا اس بے سوچے سمجھے برقی رفتار کے ساتھ، جس کا مظاہرہ وہ کھیلوں کے دوران میں کیا کرتا تھا، کھیت پار کرنے لگا۔ کبھی کبھار وہ اپنا درونیک طینت اور نوجوان چہرہ گھما کر پیچھے دیکھتا اور اسے اپنے سر سے جسم میں دہشت کی لہر دوڑتی محسوس ہوتی۔

”ہینکس، ہاتھ ہے کہ میں دیکھوں ہی نہ۔“ اس نے سوچا لیکن جب وہ جھاڑیوں کے قریب پہنچا، اس نے ایک بار پھر سرری نکالوں سے پیچھے دیکھا۔ فرانسیسی پیچھے رہ گئے تھے بلکہ وہ جو سب سے آگے تھا، اس کی رفتار بھی دھمی دھمی تھی اور پیچھے مڑ کر اپنے کسی ساتھی سے، جو خاصا دور تھا، چلا چلا کر کچھ کہہ رہا تھا۔ رستوف نے قدم روک

لیے۔ ”کہیں نہ کہیں کوئی غلطی ہوئی ہے!“ وہ سوچنے لگا۔ ”یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ وہ مجھے ہلاک کرنا چاہتے ہوں۔“
 وریں اٹنا اسے اپنا بابا یاں بازو اتنا بوجھل محسوس ہونے لگا جیسے اس کے ساتھ سو پاؤنڈ کا وزن لٹکا دیا گیا ہو۔ وہ حریر
 دوڑ لگانے سے معذور تھا۔ فرانسیسی بھی رک گئے اور انہوں نے شست باندھ لی۔ گولی، پہلے ایک، پھر دوسری اس
 کے قریب سے سنسناتی گزر گئی اس نے اپنی پچی کھچی قوت مجتمع کی، اپنا بابا یاں ہاتھ دائیں ہاتھ میں پکڑا اور
 جھاڑیوں کی جانب بھاگنے لگا۔ تھوڑیوں میں روس کے مشاق نہ ٹھہری تھے۔

20

وہ پیادہ رنٹھیں، جن پر بے خبری میں جنگل میں حملہ ہوا تھا، بھاگ پڑیں۔ مختلف کمپنیاں آپس میں غلط ملط ہو گئیں
 اور یوں انہوں نے بے ترتیب ہجوموں کی صورت میں پسپائی اختیار کر لی۔ ایک سیاہی خوف و ہراس کے عالم میں
 بے نکاحہ ”کٹ گئے؟“ جولاہی میں اٹا بھیا تک محسوس ہوتا ہے، لگانے لگا۔ اور سردا ہجوم دہشت کے احساس
 کے ساتھ ساتھ اس نعرے کی پیٹ میں آ گیا۔

”گھیرے میں آ گئے! کٹ گئے! مارے گئے!“ وہ چلاتے اور بھگتے جا رہے تھے۔

یونہی جرنیل کو اپنے عقب میں فائرنگ اور چیخ پکار کی آوازیں سنائی دیں، اسے احساس ہوا کہ اس کی
 رجمنٹ کے ساتھ کوئی ناگفتی واردات ہو گئی ہے۔ وہ سالہا سال سے فوج میں خدمات سر انجام دے رہا تھا، اسے
 مثالی افسر تصور کیا جاتا تھا اور اسے کبھی ملامت نہیں کی گئی تھی۔ جب اسے یہ خیال آیا کہ شاید اب اسے غفلت یا بالکل
 کامرنگ قرار دے دیا جائے گا، اس کے ہاتھ پاؤں پھوٹ گئے۔ اب اسے نہ تو نا فرمان گھڑ سوار کرل یا در ہا اور نہ
 جرنیل کی حیثیت سے اپنے وقار کا دھیان رہا۔ سب سے بڑی بات یہ ہوئی کہ اسے نہ تو خطرے کا کوئی احساس رہا
 اور نہ یہ یاد رہا کہ اسے اپنی ذات کا کیسے تحفظ کرنا ہے۔ اس نے اپنی کانٹھ کی اگلی سوٹھ پکڑی، گھوڑے کو بھیر لگایا اور
 گویوں کی بوچھاڑ میں، جو اس کے چاروں طرف گر رہی تھیں لیکن خوش قسمتی سے وہ ان کی زد سے بچتا جا رہا تھا،
 اسے سر پٹ اپنی رجمنٹ کی سمت میں دوڑانے لگا۔ اسے صرف ایک ہی چیز کی تمنا تھی، وہ یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ
 ہو کیا رہا ہے، ورنہ اگر اس سے کسی غلطی کا ارتکاب ہوا ہے، وہ اس کی طاقی یا ارالہ کیسے کر سکتا ہے تاکہ بائیس سال کی
 مثالی ملازمت کے بعد، جس کے دوران میں اسے کبھی ملامت نہیں کی گئی تھی، اب اس پر کوئی حرف نہ آئے۔

فرانسیسیوں کے مابین سر پٹ گھوڑا دوڑاتے دوڑاتے وہ صحیح سلامت جنگل کے پار اس میدان میں پہنچا
 جہاں ہمارے جوان احکام کی پروا کیے بغیر ترتر بھاگے جا رہے تھے اور پہاڑی سے نیچے اتر رہے تھے۔ اعلیٰ
 جیسے جیسے کی گھڑی، جو جنگلوں کے پانسے پلٹ دیتی ہے، آچکنی تھی۔ کیا سپاہیوں کا یہ بے ہنگم ہجوم اپنے کمانڈر کی
 آواز پر کان دھرے گا یا وہ محض اس پر اپنی گتھی لگا لے گا اور بھاگتا رہے گا؟ وہ اپنی بلند اور گوج دار آواز سے، جو کبھی
 ان کے دلوں پر دہشت شہادت تھی، چنگھاڑ رہا تھا۔ عالم غریظ و غضب میں اس کا چہرہ مال بھوکا ہو رہا تھا، اس کی

شکل بجز جگہ تھی، اور وہ پیچھا نہیں جا رہا تھا۔ وہ فضا میں اپنی شمشیر لہرا رہا تھا۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود سپاہی شور مچاتے، فضا میں گوسیاں چلاتے اور احکام کی خلاف ورزی کرتے اندھا دھند بھاگے جا رہے تھے۔ وہ اخلاقی کمون، جو جنگوں کے پانے پلٹ دیتا ہے، بظاہر اپنا وزن خوف و ہراس کے پڑے میں ڈال رہا تھا۔

ایک نو فضا میں بارود کا دھواں رچا بسا تھا۔ دوسرے جرنیل نے چیخ پکار بھی بہت کی تھی۔ ان سب باتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس پر کھانسی کا دردہ پڑ گیا اور وہ مایوسی کے عالم میں پتھر کا بت بن کر کھڑا ہو گیا۔ عین اس وقت جب ہر چیز ہاتھ سے نکلی جا رہی تھی، نہ جانے فرانسیسی، جنھوں نے حملہ کیا تھا، کیوں اچانک اور بظاہر بلاوجہ کھجلی جانب بھاگ اٹھے اور جنگل کے پار کہیں غائب ہو گئے۔ اب درختوں کے بیچ روں کے مشاق ٹٹا ٹھپوں کی شکلیں نظر آنے لگیں۔ یہ توخن کی کہنی تھی اور یہ واحد کہنی تھی جس نے جنگل میں اپنا نظم و ضبط برقرار رکھا تھا۔ انھوں نے ایک کھائی میں گھات لگائی اور غیر متوقع طور پر فرانسیسیوں پر ہلہ بول دیا۔ حالانکہ توخن کا اسلحہ صرف ایک شمشیر پر مشتمل تھا، وہ اتنے فلک شکاف نعرے لگاتا اور اتنے بخونانہ عزم کا مظاہرہ کرتا غنیم کی طرف بھگا کہ فرانسیسیوں کو سنبھلنے کا موقع ہی نہ ملا، انھوں نے اپنے ہتھیار پھینکے اور دوڑ لگا دی۔ دلو خوف نے، جو توخن کے برابر برابر بھاگا آ رہا تھا، نہایت قریب سے ایک فرانسیسی کو اپنے نشانے کی زد میں لیا اور اسے ہلاک کر دیا۔ پھر وہ پہلے شخص تھا جس نے ایک فرانسیسی کو، جو ہتھیار ڈال رہا تھا، کالر سے پکڑ لیا۔ ہمارے بھگوڑے واپس آ گئے۔ بالائیوں کو از سر نو ترتیب دیا گیا اور فرانسیسی، جنھوں نے ہمارے میسرے کو تقریباً دو حصوں میں بانٹ دیا تھا، دقتی طور پر پیچھے دھکیں دیے گئے۔ ہمارے محفوظ رستے وہاں پہنچنے میں کامیاب ہو گئے اور بھاگنے والوں نے قدم رد کر دیے۔

رجمنٹل کمانڈر میجر اکاٹوموف کے ساتھ چل کر کھڑا تھا اور پسپا ہونے والی کہنیوں کی واپس کا معائنہ کر رہا تھا۔ اسے میں ایک سپاہی آیا۔ اس نے اس کی رکاب تھامی اور قریب قریب اس کے جسم کا سہارا لے کر کھڑا ہو گیا۔ اس سپاہی نے نفیس کپڑے کا ٹیلا کوٹ پہنا ہوا تھا لیکن اس کے پاس نہ تھیلا تھا اور نہ شا کو۔ اس کے سر پر پٹی بندھی ہوئی تھی اور اس کے کندھے پر فرانسیسی کار تو سوں کی پٹی لٹک رہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ان سروں کی شمشیر تھی۔ اس کا چہرہ زرد تھا۔ اس کی نیلی آنکھیں گستاخانہ انداز سے رجمنٹل کمانڈر کو گھور رہی تھیں اور اس کے ہونٹ جھسم تھے۔ اگرچہ کمانڈر میجر اکاٹوموف کو احکام دینے میں مصروف تھا، وہ اس سپاہی پر توجہ دے بغیر نہ رہ سکا۔

”یہ فرانسیسی، یہ رہیں ہاں غنیمت کی دہشتاںیاں،“ دلو خوف نے فرانسیسی شمشیر اور کار تو سوں کی پٹی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”میں نے ایک افسر کو قیدی بنایا ہے۔ میں نے کہنی کو روک لیا تھا، اس نے رک رک کر کہا۔ تھکاوٹ سے اس کی سانس پھول رہی تھی۔“ ساری کہنی گواہی دے سکتی ہے۔ یہ فرانسیسی، میری درخواست ہے کہ آپ یہ سب کچھ یاد رکھیں!“

”بہت اچھا! بہت اچھا!“ جرنیل نے جواب دیا اور وہ دوبارہ میجر اکاٹوموف کی طرف متوجہ ہو گیا۔ لیکن دلو خوف اپنی جگہ کھڑا رہا۔ اس نے رومال کی، جو اس نے اپنے سر کے گرد لپیٹا ہوا تھا، گرہیں کھوئیں،

اسے اتارا اور اپنے بالوں میں خمد خون دکھانے لگا۔
 ”سنگین کا زخم۔ میں سب سے اگلی صف میں رہا۔ یوزا یکسی لینسی، پورکھیں۔“



توشن کی توپ گڑھی فراموش کی جا چکی تھی اور معرکہ آرائی کے بالکل اختتام پر پرس باگراتیاں نے، جسے ابھی تک سب سے گولہ باری کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں، بڑی بڑی افسر اور بعد ازاں پرس آندرے کو یہ حکم دے کر بھیجا کہ گنا میں حتی الامکان جلد از جلد پیچھے ہٹالی جائیں۔ توشن کی گناہوں کو آڑ سپہ کرنے کی غرض سے اس کے قریب جو سپاہ متعین کی گئی تھی، معرکہ کے عین درمیان میں کسی کے حکم پر واپس آگئی تھی لیکن گناہوں نے اپنی فائرنگ جاری رکھی۔ فرانسیسیوں نے ان پر اس لیے بغیر نہ کیا کیونکہ یہ بات ان کے دہم دگمان میں بھی نہیں آسکتی تھی کہ کوئی شخص، جس کی گناہوں کو قطعاً کوئی تحفظ حاصل نہ ہو، گولہ باری جاری رکھنے کا حوصلہ کر سکتا ہے۔ اس کے برعکس اس پٹا میں کی جوشی کارروائیوں سے فرانسیسیوں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ روسی فوج کا بیشتر حصہ قلب میں مرکوز ہوگا۔ دوسرے انھوں نے اس مقام پر طوفانی حملہ کرنے کی کوشش کی لیکن دونوں ہی مرتبہ پہاڑی پر نصب ان چار گناہوں نے، جنھیں کوئی آڑ حاصل نہیں تھی، انھیں پیچھے بھگا دیا۔

پرس باگراتیاں ابھی زیادہ دور نہیں گیا ہوگا کہ توشن شیون گراہرن کو آگ لگانے میں کامیاب ہو گیا۔
 ”دیکھو، دیکھو! کیسے چیخ پکار کر رہے ہیں! آگ لگ گئی! گاؤں جل رہا ہے! دھواں دیکھو! بہت خوب! بہت اعلیٰ! وہ دھواں دیکھو، دیکھو تو سہی!“ توپ گڑھی کا عملہ جوش و خروش سے نعرے بلند کر رہا تھا۔ ان کے حوصلے بلند ہو چکے تھے۔

احکام کا انتظار کیے بغیر تمام گناہیں آگ کی جانب، جس نے وسیع و عریض رقبے کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا، گولے برسائے جاری تھیں۔ جب کوئی گولہ داغا جاتا ”واہ، واہ! شاہاش“ کا شور و غل مچا ہو جاتا۔ ”بہت اعلیٰ! وہ مارا! دیکھو۔ کیا نشانہ لگا ہے!“ معلوم ہوتا تھا کہ وہ ایک دوسرے کو اکسار ہے اور ایک دوسرے کی پیٹھ ٹھونک رہے ہیں۔ ادھر ہوانے آگ کو اور بھی بھڑکا دیا تھا اور وہ سرعت سے پھیلتی جا رہی تھی۔ جو فرانسیسی کالم گاؤں سے آگے بڑھ گئے تھے، واپس لوٹ گئے لیکن انھیں یہاں جوڑک اٹھانا پڑی تھی، اس کا بدلہ چکانے کے لیے غنیم نے گاؤں کی شرقی سمت میں دس توپیں گاڑ دیں اور توشن کی توپ گڑھی پر فائرنگ شروع کر دی۔

گاؤں کو آگ لگانے اور فرانسیسیوں پر گولے برسائے میں قسمت نے ہمارے جوانوں کو جس کامیابی سے ہمکنار کیا تھا، اس پر بچکانہ انداز سے خوشیاں منانے کے دوران میں انھوں نے غنیم کی ان توپوں کی طرف دھیان ہی نہ دیا۔ ہمارے توپچیوں کو ان کی موجودگی کا علم تب ہوا جب پہلے دو اور ان کے سوا بعد مزید چار گولے ہماری توپوں کے مابین آ گئے۔ ایک گولے نے دو گھوڑوں کو اگلے جہان پہنچا دیا اور دوسرے نے گولے بارود کے ہتھکڑے

کے کہ جوان کی ٹانگ، ٹاڈی۔ تاہم ہمارے جوانوں کا جو جذبہ ایک مرتبہ بیدار ہو چکا تھا، وہ سرد نہ ہوا، صرف اس کی نوعیت تبدیل ہو گئی۔ جو گھوڑے ہلاک ہو گئے تھے، ان کی جگہ محفوظ توپ گاڑی کے گھوڑے جوت دیے گئے۔ زخمیوں کو دہاں سے ہٹا لیا گیا اور دس توپوں کے مقابلے میں چار بجنا میں ڈٹ گئیں۔ توپن کا ایک ساتھی افسر معرکہ آرائی کے آغاز میں ہی جاں بحق ہو گیا تھا اور ایک گھنٹے کے اندر ندر بجنا لوں پر تعینات حملے کے چالیس ارکان میں سے سترہ بھڑ ہو چکے تھے۔ لیکن ان کے حوصلوں اور دلولوں میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ وہ مرتبہ انھیں فرانسیزی اپنے بالکل قریب نیچے رکھائی دیے اور انھوں نے ان پر گریپ شاٹ برسا دیے۔

ٹانٹوشن اپنی ناتواں اور بے ڈھنگی حرکات و سکنات کے ساتھ مسلسل اپنے اردلی سے کہے جا رہا تھا: ”یہ ہوئی نہ بات! اب اس خوشی میں ایک اور پاسب سلگا دو!“ پھر اس میں سے چنگاریاں بکھیرتا وہ آگے کی جانب دوڑ پڑتا، اپنے ننھے سنے ہاتھوں سے اپنی آنکھوں پر سایہ کرتا اور نیچے فرانسیزیوں کو جھانکنے لگتا۔

”بھو، ان کے پر نیچے اڑا دو“ وہ بار بار کہہ جاتا۔ وہ توپوں کے پیروں پر ہاتھ ڈالتا اور خود ہی ان کی پوزیشنیں درست کرنے لگتا۔

چاروں طرف دھوئیں کے بادل چھائے ہوئے تھے۔ توپوں کا بیہم شور دغل کانوں کے پردے پھاڑے دے رہا تھا۔ جب کوئی گجناں گولہ اگلتی اور شور بند ہوتا، توپن بے اختیار اچھل پڑتا۔ لیکن اسے کسی پلے قرار نہیں تھا۔ منہ میں پائپ دبا ئے وہ بھاگتا دوڑتا کبھی ایک گجناں کے پاس پہنچتا اور کبھی دوسری کے پاس۔ کبھی نشانہ درست کرتا، کبھی گولے گنتا، کبھی مردہ یا زخمی گھوڑے ہٹاتا اور اس کی جگہ نیا گھوڑا جتاتا۔ وہ جہاں بھی جاتا اپنی ناتواں، نیکی، اور شہد بذب آواز میں احکام دیتا جاتا۔ اس کا چہرہ جوشیلے سے جوشیلا تر ہوتا جا رہا تھا۔ صرف اسی وقت جب اس کا کوئی جوان ہلاک یا زخمی ہو کر گرتا، وہ اپنی نگاہیں دوسری طرف پھیر دیتا، اس کی بھویں تن جاتیں اور اپنے آدمیوں پر، جو جیسا کہ عام طور پر ہوتا ہے، زخمیوں یا مردوں کو اٹھانے میں متامل ہوتے، برسنے لگتا۔ جہاں تک سپاہیوں کا تعلق ہے، ان میں زیادہ تر انفراد خوش شکل اور خوش رو تھے اور جیسا کہ عام طور پر توپ خانے کی کمپنی میں ہوتا ہے، وہ اپنے فسرول سے دو چار انجیل پڑھتے تھے اور ان کے سینوں سے دگنے فراخ تھے لیکن وہ بھی اپنے کمانڈر کی طرف یوں دیکھتے تھے جیسے مشکل صورت حال میں بچے اپنے بڑوں کی جانب دیکھتے ہیں اور اس کے چہرے پر جو اثرات ہو پیدا ہوتے، وہ لا ریب ان کے چہروں پر بھی منعکس ہو جاتے۔

ایک تو شور دغل اتنا زیادہ تھا کہ کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ دوسرے حالات مکمل اسہاک اور جاں نشانی کے متقاضی تھے۔ چنانچہ توپن کو خوف کا معمولی سا ناگوار احساس تک نہ ہوا اور یہ خیال کہ وہ ہلاک یا بری طرح زخمی ہو سکتا ہے، اس کی سوچوں سے کوسوں دور تھا۔ اس کے برعکس اس کی دھڑا آفریں سرت میں لختہ بہ لختہ ہوتا جا رہا تھا۔ اس نے جب پہلی مرتبہ دشمن کو دیکھا اور اس پر اولیں گولہ داغا تھا، اسے محسوس ہو رہا تھا کہ اس بات کو بیٹے بہت عرصہ۔ شاید یہ کل کی بات ہے۔ گزر چکا ہے اور دھرتی کے جس ٹکڑے پر وہ کھڑا ہے، وہ اس کی مدتوں کی جانی پہچانی در

آبائی سرزمین ہے۔ اگرچہ اسے ایک ایک بات یاد تھی، اس نے معاملے کے ہر پہلو پر خوب سوچ بچار کیا تھا اور اس نے ہر وہ کام، جو اس کی پوزیشن میں بہترین سے بہترین انسرے متوقع تھا، کیا تھا، پھر بھی اس کی ذہنی کیفیت کچھ اس شخص کی تھی جس پر بخار کی وجہ سے ذہنی کیفیت طاری ہو یا جو نشے میں چور ہو۔

اس کی توہیں اتنا شور و غل پا کر رہی تھیں کہ کانوں کے پردے پھٹے جا رہے تھے۔ دشمن کے مثل منہ اور چٹھنار ہے تھے۔ گنگالوں پر جو جوان متحین تھے، ان کے چہرے تھمارے تھے اور ان کے اہان پسینے میں شرابور تھے۔ سپاہیوں اور گھوڑوں کے اجسام سے خوں بہہ رہا تھا۔ دشمن کی سست دھوئیں کے چھوٹے چھوٹے مرغولوں میں بلند ہو رہے تھے۔ (جب بھی کوئی مرغول اوپر اٹھتا، اس کے معابعد کوئی آہنی گولہ اوپر ہی اوپر آتا اور پھونکھی دھرتی، کبھی نہن، توپ یا گھوڑے سے ٹکر جاتا۔) ان تمام مناظر اور صوات نے اپنی ہی نوعیت کی عجوبہ گرد گار دیا اس کے ذہن میں متشکل کردی تھی اور وہ اس موقع پر اسے لطف و راحت بہم پہنچ رہی تھی۔ تصورات کی اس دنیا میں اسے دشمن کی توہیں توہیں معلوم نہیں ہو رہی تھیں بلکہ اس کی نگاہوں میں وہ ایسے پائپ تھے جن سے کوئی ناپیدا تمباکو نوشی وقتاً فوقتاً دھوئیں کے بادل اڑا رہا تھا۔

”وہ پھر کس سے رہا ہے؟“ توٹن منہ ہی منہ میں بڑبڑایا۔ اس کے سامنے دھوئیں کا بادل بہراتا، تلکھاتا پہاڑی کے اوپر بلند ہو رہا تھا اور ہوا اسے دھجی کی مانند بائیں جانب اڑائے لیے جا رہی تھی۔ ”تو یہ ہے اس کا پہلی گولہ۔ ہم اسے انھیں کی طرف لوٹا دیں گے۔“

”جناب، کیا فرمایا؟“ ایک توپچی نے پوچھا۔ وہ اس کے قریب کھڑا تھا اور اسے بڑبڑاتے سن چکا تھا۔ ”کچھ نہیں۔ شیل...“ اس نے جواب دیا۔ ”ا تو یہ اب تمھاری باری ہے!“ اس نے اپنے آپ سے کہا۔ اس نے اپنے تصور میں اس بھاری بھرکم اور قدیم وضع گنگال کا، جو سب سے آخر میں نصب تھی، نام اتوا رکھ دیا تھا۔ اپنی توپوں کے گرد و پیش جو فرانسیسی بصورت ہجوم کھڑے تھے، وہ اسے چہرئیاں معلوم ہو رہے تھے۔ خوابوں کی اس دنیا میں دوسری گنگال کا وجہہ و شکل توپچی نمبر 1، جو کثرت سے بے نوشی کرتا تھا، اس کا اکل تھا۔ کسی دوسرے کی نسبت توٹن اسے زیادہ دیکھتا تھا اور اس کی ایک ایک حرکت سے اپنا دل پشوری کرتا تھا۔ پہاڑی کے دامن میں دستی بندو قوں کی آوازیں کبھی بلند ہو جاتیں اور کبھی مدھم پڑ جاتیں۔ ان آوازوں کو سن کر اسے ہل محسوس ہوتا جیسے کوئی شخص سانس لے رہا ہو۔ وہ ان آوازوں کے زیر و بم کو کان لگا کر سنتا۔

”اٹھا، وہ پھر سانس لینے لگی ہے؟“ اس نے اپنے آپ سے کہا۔

وہ اپنے تصور میں اپنے آپ کو یو قاست اور انتہائی شہرور انسان، جو دونوں ہاتھوں سے فرانسیسیوں پر آٹلی گولے پھینک رہا تھا، سمجھنے لگا۔

”ہونہر، ا تو یہ، جان من، مجھے مایوس نہ کرنا!“ اس نے کہا۔ اسے اپنے سر کے اوپر عجیب و غریب اور نالوں آواز گونجتی سنائی دی اور وہ توپ سے پرے ہٹنے لگا۔

”کیپٹن توشن! کیپٹن!“

توشن کا دس بیٹھ گیا۔ اس نے اپنے گرد و پیش نظر دوڑائی۔ یہ وہی مشاف افسر تھا جس نے اسے گرنٹ میں خیمے کی کمینین سے باہر نکالا تھا۔ وہ اسے با آواز بلند پکار رہا تھا اور اس کی سانس پھول رہی تھی۔

”کیا بات ہے؟ تمہارا دماغ تو نہیں چل گیا؟ دو دفعہ تمہیں پیچھے ہٹنے کا حکم دیا گیا اور تم...“

”ان لوگوں نے مجھ پر کیوں چڑھائی کر دی ہے؟“ توشن نے سوچا اور اس نے اپنے افسر اعلیٰ کی جانب

خوف زدہ نگاہوں سے دیکھا۔

”میں... میں نے نہیں...“ اس نے دو انگلیوں سے اپنی ٹوپی چھوتے ہوئے کہا۔ ”میں“

لیکن افسر جو کچھ کہنا چاہتا تھا، وہ اسے ختم نہ کر سکا۔ گجناں کا گولہ آیا اور اس کے سر کے بالکل قریب سے اڑتا گزر گیا۔ اس سے بچنے کے لیے وہ اپنے گھوڑے پر نیچے جھک گیا۔ اس نے توقف کیا۔ وہ کچھ مزید کہنا چاہتا تھا کہ دوسرا گولہ آیا اور اس کی زپاں بندی کر گیا۔ اس نے گھوڑا سموز اور وہاں سے ہوا ہو گیا۔

”پیچھے آ جاؤ! سب پیچھے آ جاؤ!“ وہ دُور سے با آواز بلند پکارنے لگا۔

جوان ہٹنے لگے۔ چند ثانیے بعد ایک ایجوٹن وہی حکم لے کر آ گیا۔

یہ پرنس آندرے تھا۔ جس علاقے میں توشن کی توپیں نصب تھیں، وہاں گھوڑا دوڑاتے پہلی چیز، جس پر اس کی نظر پڑی، ایک اس جتنا گھوڑا تھا۔ اس کی ایک ٹانگ ٹوٹ چکی تھی اور وہ جتے ہوئے گھوڑوں کے قریب دروناک آواز سے بلہا رہا تھا۔ اس کی ٹانگ سے یوں خون نکل رہا تھا جیسے جشتے سے پانی بہتا ہے۔ توپ گاڑیوں کے مابین متعدد ان فی لاشیں پڑی تھیں۔ اس کے پیچھے پیچھے متعدد گولے اس کے سر کے اوپر سے سفتائے گزر گئے اور اس کے سارے جسم میں سنسنی دوڑ گئی۔ لیکن خوف زدگی کے محض تصور ہی نے اسے نیا حوصلہ بخش دیا۔ ”میں خوف سے مغلوب نہیں ہو سکتا۔“ اس نے سوچا اور وہ گجناں لوں کے مابین آہستہ آہستہ نیچے اتر آیا۔ اس نے حکم پہنچا دیا لیکن تھپ گڑھی سے راہنرا اختیار نہ کی۔ اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ اپنے سامنے توپیں اکھڑوائے اور انھیں پیچھے بھجوائے گا۔ لاشیں پھاٹکتے و فرانیسیہوں کی زبردست گولہ باری کا سامنا کرتے وہ اور توشن مل جل کر توپیں ہٹوانے لگے۔

”ایک مشاف افسر صاحب ابھی یہاں تشریف لائے تھے اور آتے ہی یوں غائب ہو گئے جیسے گدھے کے سر سے سینک!“ ایک توپچی نے پرنس آندرے سے کہا۔ ”جناب، وہ آپ سے قطعی مختلف تھے۔“

پرنس آندرے نے توشن سے کوئی کلام نہ کیا۔ وہ اتنے مصروف تھے کہ معلوم ہونا تھا کہ انھیں ایک دوسرے کی شکل دیکھنے کا بھی موقع نہیں مل رہا۔ جب چار میں سے دو گجناں لوں کو، جو صحیح سلامت بچ گئی تھیں، گاڑیوں کے پیچھے باندھ دیا گیا اور پرنس آندرے پہاڑی سے نیچے اترنے لگا (ایک ٹوٹی پھوٹی گجناں اور ایک ہودنر پیچھے چھوڑ دی گئی) وہ توشن کے پاس گیا۔

”اچھا، خدا حافظ، پھر ملاقات ہوگی!“ اس نے توشن کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔

”خدا حافظ، عزیز دوست،“ تو شن نے کہا۔ ”محترم، خدا حافظ، میرے عزیز دوست!“ اس نے کہا درہا نہیں کیوں اس کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔

21

ہوا تھم گئی تھی۔ میدان جنگ پر سیاہ طوفانی بادل چھاپ چکے تھے اور وہ بھی دور فقی پر توپوں کے دھوئیں میں تحلیل ہو رہے تھے۔ اندھیرا بڑھتا جا رہا تھا اور دو مقامات پر گاؤں کی آگ اور بھی وضع طور پر دکھائی دینے لگی تھی۔ توپوں کی گولہ باری مدھم ہو رہی تھی لیکن عقب میں اور دائیں پہلو کی جانب دستی تندو قوں کی آوازیں قریب سے قریب تر آتی محسوس ہو رہی تھیں اور ان کی تعداد بھی پہلے کی نسبت زیادہ ہو رہی تھی۔ جونہی تو شن مسلسل زخموں سے بچتا پھرتا ہی توپوں سمیت گھائی میں داخل ہوا اور قارنگ کی زد سے باہر نکل آیا، اس کی ملاقات متعدد شاف افسروں سے ہوئی۔ ان میں ٹرکوف بھی شامل تھا۔ اسے دو مرتبہ تو شن کی توپ گڑھی کی طرف بھیجا گیا تھا لیکن وہ ایک مرتبہ بھی وہاں پہنچ نہ پایا تھا۔ ان سب نے ایک دوسرے کی بات کاٹتے اسے احکام پہنچانا یا اپنے احکام سنانا شروع کر دیے۔ وہ اسے بتا رہے تھے کہ اس نے کہاں اور کیسے پہنچنا ہے۔ وہ اسے ملاست کر رہے، جھاڑ چار ہے اور ڈانٹ رہے تھے۔ تو شن نے کوئی حکم نہ دیا اور چپ چاپ۔ اسے زبان کھولتے خوف آ رہا تھا کیونکہ ہر لفظ، جو اس کے کان میں پڑتا تھا، اسے روکھا کر رہا تھا۔ توپ خانے کے پھنچر گھوڑے پر سوار وہ ان کے پیچھے پیچھے چلا رہا۔ اگرچہ حکم یہی تھا کہ زخموں کو ان کے حال پر چھوڑ دیا جائے، ان میں سے کئی ایک گھسنے گھساتے سپاہیوں کے پیچھے آ رہے تھے اور گڑگڑا گڑگڑا کر التجائیں کر رہے تھے کہ انھیں توپ گاڑیوں پر بٹھالیا جائے۔ پیادہ فوج کا زندہ دل ورنس کھ افسر، جو جنگ چھڑنے سے ذرا پہلے تو شن کی جھوپڑی سے بھاگتا باہر آیا تھا، ماتوینا توپ کی گاڑی میں سٹا دیا گیا۔ ایک گولی اس کے پیٹ میں جھنسن گئی تھی۔ پہاڑی کے دامن سے ایک زبردور ہوزار کیڈٹ، جس نے ایک ہاتھ سے دوسرے کو سہارا دے رکھا تھا تو شن کے پاس پہنچا اور اس سے توپ گاڑی پر بیٹھنے کی اجازت طلب کرنے لگا۔

”کیپٹن، خدا کے لیے، میرا بازو زخمی ہو چکا ہے،“ اس نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ ”خدا کے لیے... مجھ سے چلا نہیں جاتا۔ خدا کے لیے!“

صاف نظر آ رہا تھا کہ یہ کیڈٹ جگہ جگہ لٹ ماٹتا رہا تھا لیکن کہیں بھی اس کی شتوائی نہیں ہوئی تھی۔

”خدا کا واسطہ، ان سے فرمائیں کہ مجھے بٹھالیں۔“

”بٹھاؤ، بھئی، اسے، بٹھا لو اسے،“ تو شن نے کہا۔ ”انکل، اس کے نیچے کوٹ رکھ دو،“ اس نے اپنے پسندیدہ سپاہی سے کہا۔ ”لیکن وہ زخمی افسر کہاں ہے؟“

”ہم نے اسے اتار دیا تھا۔ اس کی روح اس کے جسم کا ساتھ چھوڑ گئی تھی،“ کسی نے بتایا۔

”اسے اوپر چڑھنے میں سہارا دو۔ بیٹھ جاؤ، برخودار، بیٹھ جاؤ۔ اسٹانوف، کوٹ بچھا دو۔“

یہ کیڈٹ رستوف تھا۔ اس کا رنگ زرد تھا، اس کے ہونٹ کپکپا رہے تھے اور بخار سے جسم پھنک رہا تھا۔ وہ ایک بازو سے دوسرے کو سہارا دیے ہوئے تھا۔ اسے ”ماتوینا“ کے، دبی گنجل جس سے انھوں نے ابھی ابھی مرحوم افسر کی لاش اتاری تھی، اوپر بٹھا دیا گیا۔ انھوں نے اس کے پیچھے جو کوٹ بچھایا تھا، وہ خون آلود تھا اور اس سے اس کی ہر جس اور آستین داغ دار ہو گئی تھی۔

”برخودار، یہ کیا۔ تم زخمی ہو؟“ توشن نے اس گنجل کی طرف، جس پر رستوف بیٹھا تھا، بڑھتے ہوئے پوچھا۔
 ”نہیں، صرف سوچ آئی ہے۔“
 ”پھر گاڑی پر خون کیوں ہے؟“

”جناب، یہ اس افسر کا ہے۔ وہی یہاں داغ دھبے ڈال گیا ہے،“ ایک توپچی نے جواب دیا۔ وہ اپنے کوٹ کی آستین سے یوں خون پونچھ رہا تھا جیسے اپنی توپ کی اس حالت پر معذرت کر رہا ہو۔

انھوں نے پورا زور لگا دیا اور کچھ مدد پر وہ سپاہیوں سے لی اور یوں وہ جوں توں کر کے توپیں نیلے پر پہنچانے میں کامیاب ہو گئے۔ جب وہ کنٹرول ڈورف گاؤں پہنچے، وہ رک گئے۔ اب تاریکی اتنی زیادہ پھیل چکی تھی کہ دس قدم دور جوانوں کی وردی پہچاننا بھی ممکن نہیں رہا تھا۔ فائرنگ مدھم ہونے لگی تھی۔ اچانک قریب ہی دائیں جانب گولہوں کی بوچھاڑ اور چیخ پکار کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ گولی چھوٹی، شعلہ لپکتا درآن کی آن اندر میرا چھٹ جاتا۔ یہ فرانسیسیوں کا آخری حملہ تھا اور جر سپاہی گاؤں کے مکانوں میں گھات لگائے ہوئے تھے، وہ اس کا جواب دے رہے تھے۔ ایک بار پھر گاؤں میں بھگدڑ مچ گئی لیکن توشن کی توپوں کو آگے بڑھنے کے لیے راستہ بندل سکا۔ وہ اس کے توپچی اور ہوزار کیڈٹ، چپ چاپ نگاہوں ہی نگاہوں میں ایک دوسرے سے تبادلہ خیالات اور اپنے مقدر کا انتظار کرنے لگے۔ جب دونوں جانب گولیاں چلنے کی رفتار ختم گئی، ایک بغلی گلی سے جوان برآمد ہوئے۔ وہ آہیں ملن زور شور سے باتیں کر رہے تھے۔

”ہیئر دلف، زخمی تو نہیں ہوئے؟“ ایک شخص نے کہا۔

”دوست، ہم نے بھی ایمنٹ کا خواب پتھر سے دیا۔ اب انھیں ہمارے ساتھ چھیڑ خانی کی جرأت نہیں ہوگی،“ دوسرے نے کہا۔

”ہاتھ کو ہاتھ بھائی نہیں دے رہا تھا۔ سالے بچے ہی لوگوں کو بھونٹتے رہے! اندھیرے میں کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ کچھ پینے پلانے کو ہے؟“

فرانسیسیوں کا آخری حملہ بھی ناکام رہا۔ توشن کی توپیں ایک بار پھر آگے چل پڑیں۔ شہد کی کھیلوں کی طرح مجھناتے پیادہ سپاہیوں نے ان کے گرد یوں گھیرا ڈال لیا تھا جیسے فریم میں تصویر جڑوی گئی ہو۔

تاریکی میں یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے کوئی نا دیدہ، افسردہ دریا، جس کا رخ ہمیشہ ایک ہی طرف رہتا ہے، بہا جا

رہا ہو۔ کانٹا پھوسیاں اور زیر لب گفتگوئیں، گھوڑوں کی ٹاپیں اور پیہوں کی چرچاہٹ، سبھی مل جل کر بچتے پانی کی طرح بھینٹا رہی تھیں۔ اس عام بھینٹا ہٹ سے بلند زخیوں کی کراہیں اور آہیں تھیں۔ دررات کی تاریکی میں کسی دوسری آواز کی نسبت زیادہ واضح سنائی دے رہی تھیں۔ وہ اس اندھیرے کو بھی، جو فوج کو اپنے گھیرے میں لے رہا تھا، اپنی لپیٹ میں لیتی محسوس ہو رہی تھیں۔ آہیں اور تاریکی گھل مل کر سبکا ہو گئی تھیں۔ کچھ دیر بعد متحرک ہجوم میں جوش و خروش کی لہر دوڑ گئی۔ سفید گھوڑے پر کوئی سوار، جس کے پیچھے پیچھے اس کے سٹاف افسر تھے، ان کے برابر سے گزر گیا اور جاتے جاتے کچھ کہہ گیا۔

”اس نے کیا کہا تھا؟ اب ہمیں کہاں جانا ہے؟ کہاں پڑاؤ کرنا ہے؟ اس نے ہمارا شکریہ ادا کیا تھا؟“

چاروں اطراف پر اشتیاق سوالات پوچھتے جا رہے تھے اور متحرک ہجوم پورے کا پورے آپس میں پھنس گیا۔ (معلوم ہوتا تھا کہ جو لوگ آگے تھے، رک گئے تھے) اور خبر پھیل گئی کہ رکسنے کا حکم جاری ہو گیا ہے۔ کھڑی سڑک پر جو جہاں تھا، وہیں رک گیا۔

الادروشن ہو گئے اور باتوں کی آوازیں بلند سے بلند تر ہونے لگیں۔ کیپٹن توشن نے اپنی کمپنی کو احکام دیے کے بعد کیڈٹ کے بے سفری شفا خانے پاؤ اکثر کی تلاش میں اپنا ایک سپاہی بھگادیا اور خود الاؤ کے قریب، جو اس کے جوانوں نے سڑک کے کنارے جلا یا تھا، بیٹھ گیا۔ رستوف بھی کھٹکتا گھٹکتا آگ کے قریب پہنچ گیا۔ درہ، ٹھنڈک اور سیلن نے اس کا پیرا کر دیا تھا، اسے سخت بخار تھا اور اس کا سارا جسم کانپ رہا تھا۔ اس پر غنودگی غالب آتی جا رہی تھی لیکن اس کے بازو میں جو بلا خیز درد ہو رہا تھا، وہ اسے سونے نہیں دے رہا تھا۔ اس نے ہر انداز سے بیٹھ کر دیکھا لیکن اس کے درد میں کوئی افادہ نہ ہوا۔ وہ اپنی آنکھیں بند کرتا، کھولتا، بند کرتا، پھر کھول لیتا، کبھی آگ کے سرخ سرخ شعلوں اور کبھی توشن کے، جو اس کے قریب ہی آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا، پھر میرے اور خمدہ بدن کو دیکھنے لگتا۔ توشن کی موٹی موٹی شفتیں اور ذہین آنکھیں، جن میں ہمدردی و رحم جھلک رہا تھا، اس پر جمی ہوئی تھیں۔ رستوف سمجھ رہا تھا کہ وہ دل کی گہرائیوں سے اس کی ہر ممکن مدد کرنا چاہتا ہے لیکن کچھ کرنے سے معذور ہے۔

انہیں اپنے چاروں اطراف پیادہ فوجیوں کے قدموں کی چاپ اور ان کے باتیں کرنے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ کوئی بیدل گھوم رہا تھا اور کوئی گھوڑے پر سوار تھا۔ سبھی ان کے آس پاس اپنے اپنا ٹھکانا بنانے کی فکر میں تھے۔ آدمیوں کی گفتگو، قدموں کی چاپ، کچڑ میں گھوڑوں کی رپ رپ اور الاؤوں میں لکڑیوں کی چیخ، دور و نزدیک کی سب آوازیں آپس میں گھل مل کر تھر تھراتی بھینٹا ہٹ کی صورت اختیار کر گئی تھیں۔

فسردہ اور نادیدہ دریا ب اندھیرے میں رواں دواں نہیں رہا تھا، اب اس نے تاریک سمندر کا، جو طوفان کے بعد اچھلتا، بل کھاتا اور پھر دم بڑ جاتا ہے، قاسب اختیار کر لیا تھا۔ رستوف خالی خالی نظروں سے خد میں گھوم رہا تھا اور اس کے گرد و پیش جو کچھ ہو رہا تھا، کان لگائے اسے سن رہا تھا۔ ایک پیادہ سپاہی الاؤ کے قریب آیا، اڑیوں کے بل زمین پر بیٹھا، اپنے ہاتھ آگ کی طرف پھیلائے اور منہ پھیر کر دوسری طرف دیکھنے لگا۔

”جناب، کوئی اعتراض تو نہیں؟“ اس نے بے یقینی سے توشن سے مخاطب ہو کر پوچھا۔ ”جناب، میں اپنی کہنی سے ہتھڑگی ہوں۔ مجھے تو یہ بھی پتا نہیں کہ میں کہاں ہوں۔۔۔ پھوٹے میرے بھاگ۔۔۔“

اسی وقت زیادہ فوج کا ایک افسر بھی، جس کے رخسار پر پٹی بندھی ہوئی تھی، آگ کے قریب آگیا۔ اس نے توشن سے کہا کہ تو میں ذرا پرے چٹائی جائیں تاکہ چھکڑے گزر سکیں۔ وہ گیا ہی تھا کہ دو سپاہی آگ کی طرف لپکے۔ وہ آپس میں مصلحت کا تبادلہ کر رہے اور مکمل منگا ہو رہے تھے۔ جھگڑا ایک بوٹ کا تھا جسے وہ ایک دوسرے سے چھیننے کی کوشش کر رہے تھے۔

”تمہیں یہ پتا اند تھا، ہونہہ! تمہارا مطلب کیا ہے؟ بڑے چالاک بتتے ہو۔ تم یوں، سانی سے نہیں چھوٹ سکو گے،“ ان میں سے ایک کرخت آواز میں چلا چلا کر کہہ رہا تھا۔

پھر ایک دہد پٹلا زور و سپاہی آیا۔ اس نے ساق پوش، جوخون آلود تھی، اپنی گردن کے گرد پیٹ رکھی تھی۔ اس نے ترش روئی سے توپچی کو مخاطب کیا اور اس سے پانی طلب کیا۔

”کیا یہ ضروری ہے کہ آدمی کتے کی موت مرے؟“ اس نے کہا۔

توشن نے اپنے آدمیوں سے کہا کہ وہ اس شخص کو پانی دیں۔ اس کے بعد ایک خوش طبع شخص آیا اور اس نے زیادہ فوج کے لیے جلتی ہوئی لکڑی کا ٹکڑا لگا۔

”یہ لڑکوں کا بھی خیال کرو۔ راہ مولاجلتی ہوئی لکڑی کا ٹکڑا دے دو۔ ہم دھتو، اللہ بھلا کرے، مول بھلا کرے! آگ کا شکر یہ! ہم اسے بعد سودا پس کر دیں گے،“ اس نے کہا اور جلتی ہوئی لکڑی لے کر اندھیرے کی طرف چلا گیا۔

وہ گیا ہی تھا کہ چار سپاہی ادور کوٹ میں کوئی دزدنی شے لپیٹے آگ کے قریب سے گزرے۔ ان میں سے ایک کا پاؤں کسی چیز سے ٹکرا گیا۔

”بیزافرق، کس الو کے چٹھے نے یہ لکڑیاں سڑک پر رکھی ہیں؟“ وہ غرایا۔

”یہ مرچکا ہے۔ اسے اٹھا کر لے جانے کا فائدہ؟“ ان میں سے ایک نے کہا۔

”کو اس بند کرو!“

اور وہ اپنے بوجھ سمیت تاریکی میں غائب ہو گئے۔

”کیا حال ہے؟ ابھی دروہو رہا ہے؟“ توشن نے رستوف سے زیر لب پوچھا۔

”جی ہاں۔“

”جناب، آپ کو جرنیل یا دفنار ہے ہیں۔ وہ ادھر جھونپڑے میں ہیں،“ ایک توپچی نے توشن کے قریب پہنچ کر کہا۔

”خوددار، ابھی آیا۔“

تو شن اٹھ کر کھڑ ہو گیا۔ اس نے اور کوٹ کے بٹن بند کیے، اسے کھینچ کھینچ کر درست کیا اور چل پڑ۔
تو بچیوں نے جہاں الاؤشن کیا تھا، وہاں سے کچھ ہی دور پرنس باگ راتیاں کے لیے عارضی چوبلی مکان
تیار کر لیا تھا۔ وہاں وہ مختلف یونٹوں کے کمانڈروں کے ساتھ، جو اس مکان پر اکٹھے ہو گئے تھے، باتیں کر رہا اور کھانا
کھا رہا تھا۔ وہاں وہ پست قد بوڑھا تھا جس کی آنکھیں نیم بند رہتی تھیں، وہ نندیدوں کی طرح دسبے کی ہڈی بھنڈ
رہا تھا۔ وہ وہی جرنیل تھا، جس نے بائیس سال بے داغ ملازمت کی تھی۔ اس کا چہرہ کھانا کھانے اور دوڑ کا کام
پینے کے بعد ختم رہا تھا۔ شاف افسر تھا۔ اس کی انگلی پر بہر دار انگلی تھی۔ ڈرکوف تھا۔ وہ بہت گھبرایا ہوا تھا وہ کبھی
ایک شخص کو اور کبھی دوسرے شخص کو دیکھنے لگتا۔ پھر پرنس آندرے تھا۔ اس کا چہرہ زرد، ہونٹ نیچے ہوئے اور آنکھیں
بے قرار لیکن روشن تھیں۔

جھونپڑے کے ایک کونے میں ایک پھریرا استاد تھا۔ اسے فرانسیسیوں سے چھینا گیا تھا۔ وہ آڈیٹر، جس
کے چہرے پر بچوں کی ہی معصومیت تھی، یہ معلوم کرنے کے لیے کہ اس کی بناوٹ میں کون سا کپڑا استعمال ہوا ہے،
اس پر، نگلیاں پھیر رہا تھا۔ وہ الجھن میں گرفتار تھا اور بار بار اپنی گردن جھٹک رہا تھا۔ شاید اسے پھریرے میں واقعی
دلچسپی تھی یا شاید اس کے لیے کھانے کی میز کی طرف دیکھنا ممکن نہ تھا کیونکہ وہاں اس کے لیے کوئی نشست فراہم
نہیں کی گئی تھی۔ ڈریگنوں نے جس فرانسیسی کرنیل کو قیدی بنایا تھا، وہ ملحقہ جھونپڑے میں تھا۔ ہمارے افسران جن
درحق اس کا دیدار کرنے جا رہے تھے۔ پرنس باگ راتیاں فردا فردا کمانڈروں کا شکر یہ ادا کر رہا تھا اور سر کے اور
اپنے نقصانات کے بارے میں تفصیلات دریافت کر رہا تھا۔ جس جرنیل کی رجنٹ کا براؤناؤ کے مقام پر معائنہ ہوا
تھا، وہ پرنس کو بتا رہا تھا کہ ”جو نئی سر کے کا آغاز ہوا، میں جنگل سے ہر نکل آیا۔ جو گوگ ایندھن کے لیے درخت
کاٹ رہے تھے انہیں مجتمع کیا، فرانسیسیوں کو اپنے قریب سے گزرنے دیا، اپنی دو ٹالیوں کے ساتھ ان پر
سگینوں سے حملہ کر دیا اور ان کا کچھو سر نکال دیا۔“

”یوٹر ایکسی لینسی، جب میں نے دیکھا کہ ان کی پہلی ٹالین کی صفوں میں شگاف پڑ گئے ہیں، میں مزک
کے بیچ کھڑا ہو گیا اور سوچنے لگا، میں انہیں گزر جانے دوں گا، پھر ان پر پوری ٹالین کے ساتھ گولیوں کا بیڑا
دوں گا۔ اور میں نے کیا بھی یہی۔“

جرنیل کی یہ زبردست خواہش تھی کہ وہ بالکل ایسا ہی کرتا اور جب اسے ایسا کرنے میں ناکامی ہوئی ہے اسے انا
انسوں ہوا کہ اب اسے یہ محسوس ہونے لگا کہ بیسہ ایسا ہی ہوا تھا اور شاید درحقیقت ایسا ہوا بھی ہو۔ اس بھانجڑ بھوسے
میں کیا یہ دُوق سے کہا جاسکتا تھا کہ کیا ہوا اور کیا نہیں ہو؟

”یوٹر ایکسی لینسی، علاوہ ازیں مجھے یہ بات آپ کے علم میں لے آنا چاہیے،“ اس نے اپنی بات جاری
رکھتے ہوئے کہا۔ اسے کو تو زوف کے ساتھ دلو خوف کی گنگلو اور خود اپنے ساتھ اس کی آخری ملاقات یاد آگئی تھی،
”کہ سپاہی دلو خوف نے، جس کی تنز کر دی گئی تھی، میری آنکھوں کے سامنے ایک فرانسیسی افسر کو قیدی بنایا تھا اور

اس نے میدان جنگ میں زبردست شجاعت، درجرات کا مظاہرہ کیا تھا۔

”یوزا کیسی لیلی، جب پاؤلو گرات ہوزاروں نے دھاوا بولا تھا، میں بھی وہیں موجود تھا،“ ژرکوف نے مضطرب لگا ہوں سے، اپنے گرد و پیش دیکھتے ہوئے کہا۔ اس نے پورے دن کے دوران میں ایک بھی ہوزر نہیں دیکھا تھا اور کھس ایک پیادہ افسر سے ان کے متعلق باتیں کی تھیں ”انہوں نے ان کے دو مربع شکل دتے تھے جس میں کروبیہ۔“ ژرکوف کی بات سن کر کئی افسر مسکرائے لگے۔ ان کا خیال تھا کہ وہ حسب معمول دل لگی کر رہا ہے لیکن جب انہیں احساس ہوا کہ وہ جو کچھ کہہ رہا ہے اس سے ہماری فوج کے ماتھے پر جھومر بٹکا ہے اور اس کے اس روز کے کارناموں کی تحسین ہوتی ہے، ان کے چہرہ پر سنجیدگی طاری ہو گئی حالانکہ بن میں سے کئی ایک اس امر سے بخوبی آگاہ تھے کہ جو کچھ وہ کہہ رہا تھا، سراسر جھوٹ تھا اور حقائق سے اس کا دور کا بھی کوئی تعلق نہیں تھا۔ پرنس باگراتیاں بزرگ کرل کی طرف متوجہ ہوا۔

”حضرات، میں آپ سب کا شکر گزار ہوں۔ ہماری پیادہ سپاہ ہو، اسپ سوار ہوں یا توپ خانہ، انفرس بھی یونوں نے شجاعت اور بہادری کے جوہر دکھائے ہیں۔ لیکن یہ بات میری سمجھ میں نہیں آتی کہ قلب کی دو بجنا لیں وہیں کیوں چھوڑ دی گئیں؟“ اس نے کمرے میں بٹھانہ لگا ہیں دوڑتے ہوئے کہا۔ (پرنس باگراتیاں نے میسرے کی توپوں کے بارے میں کچھ نہ پوچھا کیونکہ اسے معلوم ہو چکا تھا کہ وہاں کی تمام بجنا لیں معرکے کے آغاز میں ہی ہاتھ سے جاتی رہی تھیں۔) ”میرا خیال ہے کہ تمہیں ہی میں نے ادھر بھیجا تھا،“ اس نے ڈیوٹی افسر سے مخاطب ہو کر کہا۔ ”ایک تو بیکار ہو گئی تھی،“ شاف افسر نے جواب دیا۔ ”لیکن دوسری کا کیا بنا، خود میری سمجھ میں نہیں آ رہا۔ میں سارا عرصہ خود وہاں موجود رہا اور ہدایات دیتا رہا۔ میں وہاں سے کچھ ہی دیر پہلے لوٹا تھا... یہ درست ہے کہ وہاں حالات ذرا نازک تھے،“ اس نے انکساری سے مزید کہا۔

کسی نے بتایا کہ کیپٹن تو شن کا پڑاؤ قریب ہی گاؤں میں ہے اور اسے پہلے ہی بلایا جا چکا ہے۔

”اٹھا، آپ بھی تو دیں تھے،“ پرنس باگراتیاں نے پرنس آندرے سے مخاطب ہو کر کہا۔

”میرا خیال ہے کہ ہماری ملاقات ہوتے ہوئے رہ گئی ہوگی۔ ادھر میں وہاں سے چلے ہوں گا اور ادھر آپ وہاں پہنچ گئے ہوں گے۔“ شاف افسر نے پرنس آندرے کی طرف خوش اخلاقی سے مسکراتے ہوئے کہا۔

”مجھے آپ کی شکل دیکھنے کا شرف حاصل نہیں ہوا،“ پرنس آندرے نے سردھری سے جواب دیا۔

سب کی زبانیں گنگ ہو گئیں۔ دروازے پر تو شن نمودار ہوا۔ جھوپڑے میں جرنیلوں کا جھکھا تھا۔ وہ بچتا بچاتا، لڑتا سہتا ان کے عقب سے گزرنے لگا۔ ہمیشہ کی طرح وہ اب بھی اپنے اعلیٰ افسروں کی موجودگی میں بوکھل رہا تھا۔ سراسیمگی میں اسے پھریرے کا بانس بھی نظر نہ آیا، اس نے اس سے ٹھوکر کھائی اور بال بال گرتے بچا۔ کئی افسروں کی ہنسی نکل گئی۔

”ایک توپ وہیں کیوں چھوڑ دی گئی؟“ پرنس باگراتیاں نے تیوریاں چڑھاتے پوچھا لیکن اس کی خفگی کا سبب

اتنا کوشش نہیں تھا جتنا کہ وہ انفران تھے جو نس رہے تھے اور جن میں ڈرکوف کے پٹنے کی آواز سب سے اڑتی تھی۔ صرف اب جب کہ توشن اپنے ہم مقتدر افسروں کے سامنے کھڑا تھا، اسے اپنے جرم کی سنگینی کا احساس ہوا کہ وہ دو توپوں سے ہاتھ دھو بیٹھا ہے اور خود ابھی تک زندہ ہے۔ اس کے لیے تو یہ ڈوب مرنے کا مقام تھا۔ وہ اتنی بھجالی کیفیت میں سے گزرتا رہا تھا کہ اس نے اس لمحے تک اس معاملے کے بارے میں سوچا تک نہیں تھا۔ افسروں کے قہقہوں نے اسے مزید بوکھلادیا۔ وہ باگ راتیاں کے سامنے کھڑا تھا۔ اس کے ہونٹ کپکپا رہے تھے، دراستہ کچھ بھجائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ ڈرتا جھجکتا صرف اتنا کہہ سکا:

”یوزرائیکسی لیننی... مجھے معلوم نہیں... میرے پاس نفی نہیں تھی، یوزرائیکسی لیننی۔“

”جو دستہ تمہیں آڑ پہنچا رہا تھا، تمہیں چاہیے تھا کہ تم اس سے کچھ جوان لے لیتے۔“

توشن نے یہ نہیں کہا کہ وہاں کوئی ایسا دستہ نہیں تھا جو اسے آڑ فراہم کرنا چاہتا ہو۔ یہ بات حقیقتاً سولہ آنے درست تھی۔ اسے اندیشہ تھا کہ کہیں اس کی وجہ سے کوئی دوسرا افسر مصیبت میں نہ پھنس جائے۔ وہ چپ چاپ باگ راتیاں کے چہرے کی جانب یوں دیکھ رہا تھا جیسے کوئی بوکھلایا طفل کتب اپنے مختن کی طرف دیکھتا ہے۔

خاموشی کچھ لمبی قائم رہی۔ پرنس باگ راتیاں بظاہر سخت رویہ اختیار کرنا نہیں چاہتا تھا اور اسے محسوس ہو کہ اس کے پاس کہنے سننے کو کچھ ہے بھی نہیں۔ دوسروں نے دخل اندازی کا حوصلہ نہ کیا۔ پرنس آندرے نے تنکھیروں سے توشن کی طرف دیکھا۔ بے چینی سے اس کی انگلیاں پھڑک رہی تھیں۔

”یوزرائیکسی لیننی،“ پرنس آندرے کی جھکی آواز نے مہر سکوت توڑ دی۔ ”آپ نے ازراہ کرم مجھے توشن کی توپ گڑھی کی جانب بھیجا تھا۔ جب میں وہاں پہنچا، مجھے معلوم ہوا کہ توشن کے دو تہائی جوان اور گولے ہلاک ہو چکے ہیں، دو توپیں ناکارہ ہو چکی ہیں اور وہاں کوئی ایسا دستہ نہیں تھا جو آڑ فراہم کر سکتا۔“

بلکونسکی نے گفتگو کے دوران میں جذبات کو اپنے اوپر حاوی نہیں ہونے دیا تھا۔ پرنس باگ راتیاں اور توشن دونوں محکمگی باندھے اسے دیکھ رہے تھے۔

”اور یوزرائیکسی لیننی، اگر آپ مجھے اپنی رائے ظاہر کرنے کی اجازت مرحمت فرمائیں،“ اس نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا، ”تو میں یہ عرض کروں گا کہ آج ہمیں جو کامیابی حاصل ہوئی ہے، اس کا سہرا زیادہ تر اس توپ گڑھی کی کارروائی اور کیپٹن توشن اور اس کی کمپنی کی دیر نہ فوت برداشت کے سر بندھتا ہے،“ پرنس آندرے نے کہا اور جواب کا انتظار کیے بغیر دسترخواں سے اٹھا اور ایک طرف ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔

پرنس باگ راتیاں نے توشن کی جانب دیکھا۔ یہ صاف ظاہر تھا کہ پرنس آندرے نے روکے پھکے انداز سے ہی سبکی لیکن جس بے لاگ طریقے سے درودھ کا درودھ اور پانی کا پانی کیا تھا، وہ اس پر شک و شبہ کا اظہار کرنے میں متاثر تھا لیکن اسے پوری طرح تسلیم کرنے کو بھی اس کا جی نہیں چاہتا تھا۔ اس نے اپنی گردن جھکائی اور توشن سے کہا کہ وہ جاسکتا ہے۔ پرنس آندرے بھی اس کے ساتھ باہر نکل گیا۔

”پیارے دوست! شکریہ، آج آپ نے مجھے مصیبت سے بچا لیا،“ توٹن نے اس سے کہا۔
پرنس آندرے نے اس کی طرف دیکھا اور کچھ کہے بغیر اپنی راہ چل دیا۔ وہ بے حد مضطرب اور ادا اس تھا۔ یہ
سب کچھ کتنا عجیب تھا! اس کی توقعات سے قطعی مختلف!



”یہ کون ہیں؟ یہ یہاں کیوں ہیں؟ یہ کیا چاہتے ہیں؟ یہ سب کب ختم ہوگا؟“ رستوف کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔
اس کے سامنے ہر آن سائے تبدیل ہو رہے تھے اور وہ انھیں دیکھنے میں محو تھا۔ اس کے بازو میں جو درد ہو رہا تھا،
اس کی شدت میں اور بھی اضافہ ہو گیا تھا۔ لمحہ بہ لمحہ غنودگی اس پر غالب آتی جا رہی تھی اور اس کے لیے اس کی
مقاومت کرنا مشکل ہوتا جا رہا تھا۔ اس کی نگاہوں کے سامنے ارغوانی دائرے رقص کر رہے تھے۔ اس آوازوں اور
چہروں کے بارے میں اس کے تاثرات اور اس کا اکلاپے کا احساس، یہ تمام چیزیں اس کے تحس و ترد میں گھل مل
گئی تھیں۔ یہی۔ زخمی اور غیر زخمی فوجی، دونوں۔ تو وہ لوگ تھے جو اپنے بوجھ تلے اسے دبا رہے تھے اور اس کا
یکجور نکال رہے تھے، اس کی نسوں کو مروڑ رہے تھے اور اس کے موج زدہ بازو اور کندھے کی کھال جھل رہے
تھے۔ ان سے پنڈ چھڑانے کے لیے اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

ایک لمحے کے لیے اسے اٹکھ آگئی۔ فراموشی کے اس مختصر وقفے کے دوران میں لاتعداد اشیاء اسے خوب
میں جی بھٹک دکھا گئیں: اس کی والدہ اور اس کے بھاری بھرکم سفید ہاتھ، سونیا کے دبے پتلے اور ننھے منے
کندھے، ناسا کا ہنسا مسکراتا چہرہ اور آنکھیں، دینی سوف کی آواز اور مونچھیں، ملیانن اور تلیانن اور ہاگ دانوویچ
کے ساتھ سارا معاملہ۔ وہ سارا معاملہ اس سپاہی کے ساتھ، جس کی ”وازا“ اتنی کرخت تھی، یوں خطا ملط ہو گیا تھا کہ
انھیں ایک دوسرے سے علیحدہ کرنا ممکن نہ رہا تھا اور یہی وہ معاملہ اور یہی وہ سپاہی تھے، جو اس کے بازو کو اتنی
شعادت اور سفاکی سے کھینچ رہے تھے، دبا رہے تھے، ایک ہی جانب کھینچے جا رہے تھے کہ درد سے اس کی چھین نکل
جا رہی تھیں۔ اس نے ان سے اپنا پنڈ چھڑانا چاہا، لیکن انھوں نے اس کے بازو کو ایک لمحے کے لیے بھی بال برابر
جنہش نہ کرنے دی۔ کاش وہ سے نہ کھینچیں، زور نہ لگائیں، پھر یہ ٹھیک ہو جائے گا۔ درد جاتا رہے گا۔

اس نے آنکھیں کھول دیں اور اوپر دیکھنے لگا۔ رات کی سیاہ چھتری چنگاریوں کی لوسے ایک گز سے کم اوپر
تلی ہوئی تھی۔ برف کے گالے اس روشنی میں پھڑ پھڑا رہے تھے۔ توٹن واپس نہیں آیا تھا، ڈاکٹر پہنچا نہیں تھا۔ وہ
اکیلا تھا۔ صرف ایک سپاہی اس کے پاس تھا۔ وہ بے چارہ آگ کی دوسری جانب بیٹھا ہوا تھا اور اپنے تنک دھڑنگ
دبے پتلے سانولے جسم کو گرما رہا تھا۔

”کسی کو میری پروا نہیں!“ رستوف نے سوچا۔ ”کوئی نہیں جو میری مدد کرے یا مجھ پر ترس کھائے! لیکن
ایک وقت وہ تھا جب میں اپنے گھر تھا۔ تو نا وصحت مند، سرور مطمئن، مجھے چاہا جاتا تھا، مجھ سے محبت کی جاتی

تھی، اس کی آنکھل گئی اور وہ بے اختیار کرا بنے لگا۔

”دور ہو رہا ہے؟“ سپاہی نے پوچھا۔ وہ اپنی قمیض آگ پر ہلا جلا رہا تھا۔ اس نے جواب کا انتظار تک نہ کیا۔ وہ درندے کی طرح غرایا اور بولا: ”آج رخمیوں کا شمار قط رہی نہیں رہا۔ بھینک، ہول ناک!“

رستوف نے سپاہی کی بات پر کوئی دھیان نہ دیا۔ وہ ٹھنکی باندھے برف کے چالوں کو جو آگ کے دہرے پھڑپھڑا رہے تھے، دیکھ رہا اور ارضی روس میں اپنا گھریا ذکر رہا تھا۔ سردیوں میں بھی اس کا مکان گرم اور روشنی ہوتا تھا، وہ فرکانرم نرم کوٹ پہنا کرتا تھا، برف پر چلنے کے لیے تیز رفتاری سے بھرتی تھی۔ اس کا جسم صحت مند تھا اور ب سے بڑھ کر اس کے گھروالوں کو اس سے پیار تھا اور وہ اس کی فکر کرتے تھے۔ ”پھر میں یہاں کیوں آیا؟“ اسے اچنچا ہو رہا تھا۔

گلے روز فرانسیسیوں نے دوبارہ حملہ نہ کیا اور باگ رتیاں کی بچی کھچی سپاہ کو تو زوہ کی فوج کے ماتھے پھر جاملی۔

پرنس وائلی ایسا شخص نہیں تھا جو اپنے منصوبے سوچ سمجھ کر بناتا ہے اور اپنا الو سیدھا کرنے کے لیے دوسروں کو گزند پہنچانے کے فن سے وہ اس سے بھی کم آشنا تھا۔ وہ سیدھا سادا دنیا دار شخص تھا۔ وہ جس چیز میں ہاتھ ڈالتا تھا، اس میں کامیابی اس کے پاؤں جومتی تھی اور کامیاب ہونا اس کی عادت بن گیا تھا۔ مختلف تجاویز و ترکیب، جن سے اس کی زندگی کی تمام تر دلچسپیاں عبارت آرا ہوتی تھیں، اس کے ذہن میں تشکیل ضرور پاتی رہتیں لیکن وہ ان کے لیے ان حالات اور اشخاص کا، جن سے اس کا واسطہ پڑتا رہتا تھا، رین منت ہوتا تھا، خود اس نے کبھی ان کا گہرائی اور گہرائی سے معائنہ اور مطالعہ نہیں کیا ہوتا تھا۔ اس کے ذہن میں ایک وقت میں ایک دو نہیں بلکہ درجنوں منصوبے ہوتے تھے۔ اس میں سے بعض تشکیل کے محض ابتدائی مراحل طے کر رہے ہوتے، بعض تکمیل کے قریب ہوتے اور بعض ٹوٹ پھوٹ کے عمل میں سے گزر رہے ہوتے۔ مثلاً اس نے کبھی اپنے آپ سے یہ نہیں کہا: ”فلاں آدمی صاحب رسوخ ہے، مجھے اس کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھانا اور اس کا اعتماد حاصل کرنا چاہیے اور اس کے ذریعے خصوصی رعایت حاصل کرنا چاہیے۔“ اور نہ اس نے اپنے آپ سے یہ کہا: ”ویٹر مالدار اسای ہے۔ مجھے اسے بھلا بھسلا کر اپنی بیٹی سے شادی کرنے اور مجھے چالیس ہزار روپے، جن کی مجھے اشد ضرورت ہے، ادھار دینے کے لیے رضامند کر لینا چاہیے۔“ چنانچہ جب بھی کسی بار سوخ ہستی سے اس کا آمنا سامنا ہوتا، اس کے اندر کی آواز اسے فوراً بتا دیتی کہ یہ شخص کارآمد ثابت ہو سکتا ہے۔ چنانچہ وہ اس کے ساتھ واقفیت پیدا کرتا اور کسی پیشگی منصوبہ بندی کے بغیر، جوئی موقع ملتا، اس کا اعتماد حاصل کرتا، اس کی چالپوسی کرتا، اس کی تعریفوں کے پل باندھتا، اس کے ساتھ بے تکلفی پیدا کرتا اور جب دیکھتا کہ لوہا گرم ہو گیا ہے، مطلب کی بات زبان پر لے آتا۔

”جب تک ماسکو میں مقیم رہا، ویٹر کے ساتھ جزار ہا۔ اس کے لیے اس نے جنٹلمین آف بیڈ جمیر¹ کا، جو اس زمانے میں مرتبے کے اعتبار سے کونسل آف سٹیٹ کے برابر ہوتا تھا، پرداۃ تقرری بھی حاصل کر لیا۔ اور پھر جب اس نے ویٹر ز برگ جانے کا قصد کیا، اس نے نو عمر ویٹر سے اصرار کیا کہ: ”تمہیں میرے ساتھ چلنا ہوگا اور غریب خانے پر عیاقیم کرنا ہوگا۔“ نکلا ہر وہ یہی کر رہا تھا کہ وہ جو کچھ کر رہا ہے، اس کے بارے میں اس نے پہلے سے کچھ نہیں

سوچا لیکن اس نے جیٹر کے ساتھ اپنی بیٹی کا رشتہ طے کرانے کے لیے ایڑی چوٹی کا روڑ لگا دیا۔ گردہ پیشگی منصوبہ بنانے کا عادی ہوتا تو اس کا رویہ نہ اتنا فطری ہوتا اور نہ ہر شخص کے ساتھ سماجی اعتبار سے خواہ وہ اس سے فردِ فرد ہوتا یا برتر، اپنے تعلقات میں اتنے بھوپین اور بے سانسگی کا مظاہرہ کرتا۔ وہ ہمیشہ ان لوگوں کی طرف، جو اس سے زیادہ دھن دولت یا اختیار و اقتدار کے مالک ہوتے، ہچکچلا جاتا۔ اس کی خوبی یہ تھی (وہ یہ خوبی بہت کم لوگوں میں ہوتی ہے) کہ وہ خوب جانتا تھا کہ اپنی مطلب برآری کے لیے دوسروں کو استعمال کرنے کا صحیح موقع کون سا ہے اور وہ اس موقع سے بھرپور فائدہ اٹھاتا تھا۔

جیٹر، جس کا ابھی حال ہی میں نہ آگیا تھا اور نہ پیچھا ور جو ہر قسم کے تفکرات اور پریشانیوں سے آزاد تھا غیر متوقع طور پر کاؤنٹ بزدخوف اور صاحب حیثیت شخص بن گیا۔ اب وہ اس بری طرح مصروفیتوں میں گھر گیا اور لوگوں کے اتنے زبردست نرنے میں آگیا کہ اسے صرف رات کو، جب وہ بستر پر دراز ہوتا، تنہائی کا کوئی لمحہ میسر آتا۔ اسے کاغذات پر دستخط کرنا پڑتے، سرکاری دفاتر میں حاضری دینا پڑتی، کیوں؟ یہ عقدہ وہ کبھی حل نہ کر پاتا، اپنے جیل سٹیواریڈ سے سوالات و جوابات کرنا پڑتے، ہاسکو کے قرب و جوار میں اپنی جاگیروں پر جانا پڑتا اور بے شمار اشخاص سے ملاقاتیں کرنا پڑتیں۔ یہ وہ لوگ تھے جو پہلے اس کے وجود سے ہی منکر تھے لیکن اگر اب اس نے ان سے ملنے سے انکار کیا ہوتا تو انھیں دکھ پہنچتا اور وہ اس سے ناراض ہو جاتے۔ بھانت بھانت کے لوگ۔ کاروباری ہر شے اور واقف کار۔ کبھی نو عمر رئیس سے محبت کا دم بھرتے، دوستی جتاتے اور اس کے ساتھ بڑی شفقت سے پیش آتے۔ ان سب کو یہ پختہ یقین تھا اور اس کا اظہار کرنے میں وہ ذرہ برابر ہچکچاہٹ کا مظاہرہ نہ کرتے کہ وہ اعلیٰ خوبیوں کا مالک انسان ہے۔ اس قسم کے جملے مسلسل اس کے کانوں میں پڑنے لگے۔ ”آپ کی غیر معمولی شفقت کے طفیل،“ ”آپ کی دریاہی اور فیاضی کا شکریہ،“ ”کاؤنٹ، آپ خود اتنے معزز اور ستورہ صفات ہیں،“ ”یا“ ”کاش وہ شخص بھی اتنا ہی ذہین اور سمجھدار ہوتا جتنا کہ آپ ہیں،“ ”ویرہ و غیرہ، حتیٰ کہ خود اسے بھی اپنی غیر معمولی شفقت اور استثنائی ذہانت و وفات کا یقین ہونے لگا۔ اسے یہ باتیں یوں بھی قابل اعتبار معلوم ہوئیں کہ وہ اپنے نہاں خانہ دل میں اپنے آپ کو ہمیشہ ہی شفیق اور ذہین و فطین انسان سمجھتا رہا تھا۔ وہ لوگ، جو پہلے اس کے خلاف خبیث باطن اور کینہ رکھتے تھے، اب کھلم کھلا اس سے عناد برتتے تھے، اب اس کے ساتھ مطلق محبت سے پیش آنے لگے۔ آتش مزاج بڑی پرنس، جس کی کمر لانی، درجس کے بال گڑیوں کے بالوں کی طرح نرم اور ملائم تھے اور جو ناک پر کبھی نہیں بیٹھنے دیتی تھی، چھینرو پھین کی رسوم کے اختتام پر جیٹر کے کمرے میں آئی اور اس نے جھکی جھکی نگاہوں اور شرمسار لہجے میں اسے بتایا۔ ”ماضی میں ہم دونوں کے مابین جن غلط فہمیوں نے جنم لیا تھا، میں سچے دل سے ان کے بارے میں معذرت خواہ ہوں۔ مجھے احساس ہے کہ مجھے آپ سے کچھ مانگنے کا کوئی حق نہیں تاہم میں آپ سے صرف اتنی درخواست کرنا ہوں کہ مجھے جس حد سے سے دوچار ہونا پڑا ہے، اس کے بعد مجھے اس گھر میں، جو مجھے بے حد عزیز ہے اور جس کی خاطر میں نے اتنی قربانیاں دی ہیں، مزید چند ہفتے قیام کی مہلت عطا کریں۔“ اس نے یہ الفاظ کہے اور اس کی

آنکھوں سے بے اختیار ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ اس مجسمہ نما پرس میں یہ تبدیلی دیکھ کر میٹر کے دل پر گہرا اثر ہوا۔ اس نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں پکڑا اور اس سے معافی کا طلب گار ہو گیا۔ کس لیے یہ اسے خود بھی معلوم نہ ہو۔ بعد ازاں بڑی پرس نے اسی دن میٹر کے لیے دھاری دار سکارف بننا شروع کر دیا اور اس کے بارے میں اس کا رویہ یکسر تبدیل ہو گیا۔

”نائی ڈیئر، یہ کام میری خاطر کر دو۔ آخر بے چاری کو مرحوم کے ہاتھوں بہت کچھ سہنا پڑا تھا، پرس دایلی نے میٹر کو دستاویز تھماتے ہوئے کہا۔ اگر میٹر اس پر دستخط کر دیتا، پرس کو مالی منفعت حاصل ہو جاتی۔

یوں بھی پرس دایلی نے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ اس ہڈی کا۔ یہ دراصل تیس ہزار روپے کا پرائیمری نوٹ تھا پھینکنا ضروری ہے۔ اگر پرس دایلی بے چاری پرس کو یہ رقم دلوانے کا اہتمام نہ کرتا، تو اس بات کا اندیشہ تھا کہ جرمی تھیس کے سلسلے میں اس نے جو کردار ادا کیا تھا، اس کا راز طشت از بام ہو جاتا۔ میٹر نے دستاویز پر دستخط کر دیے اور اس کے بعد پرس کا رویہ در بھی شفقت آمیز ہو گیا۔ چھوٹی بہنیں بھی خاص طور پر سب سے چھوٹی، جس کے بالائن ہونٹ پر تل تھا، جو خوب رو تھی اور جس کی مسکراہٹیں اور یوگلاہٹیں، اسے اکثر مجبور کر دیا کرتی تھیں۔ اس سے پیار جتانے لگیں۔

میٹر کے نزدیک یہ بات بالکل فطری تھی کہ ہر شخص اسے احتیاج رکھے اور اگر کوئی شخص اسے پسند نہ کرتا تو اسے یہ چیز قطعی غیر فطری معلوم ہوتی۔ چنانچہ یہ اسی سوچ کا نتیجہ تھا کہ جن لوگوں نے اس کے گرد گھیرا ڈال ہوا تھا، وہ اس کے خلوص پر ایمان لائے بغیر نہ رہ سکا۔ علاوہ ازیں اس کے پاس تناوقت نہیں تھا کہ وہ اپنے آپ سے یہ پوچھ سکتا کہ یہ لوگ مخلص ہیں یا نہیں۔ وہ ہر وقت مصروف رہتا تھا اور اس پر مدام ہلکے پھلکے اور خوشگوار، رشتے کی کیفیت طاری رہتی تھی۔ اسے محسوس ہوتا کہ وہ کسی اہم تحریک کا مرکز ہے اور اسے مسلسل یہ احساس ستاتا رہتا کہ اس سے کچھ توقعات وابستہ ہیں، اسے ان توقعات کو پورا کرنا ہو گا ورنہ لوگوں کو دکھ اور مایوسی ہوگی اور لیکن یہ کہ اگر اس نے یہ کام کر دیا یا اس کام میں ہاتھ ڈال دیا تو سب کچھ ٹھیک ٹھیک ہو جائے گا۔ چنانچہ وہ وہی کچھ کرتا تھا جس کی اس سے توقع کی جاتی تھی لیکن وہ جو کچھ بھی کرتا تھا، اس کا کوئی خوشگوار نتیجہ برآمد نہیں ہوتا تھا، اس کی توقعات وہ مستقبل سے بانٹھ لیتا تھا۔

ان ابتدائی ایام کے دوران میں میٹر کے معاملات کی باگ ڈور اور خود میٹر کی تکمیل کسی دوسرے شخص کی نسبت پرس دایلی کے ہاتھ میں زیادہ تھی۔ کاؤنٹ بزدخوف کے انتقال کے بعد اس نے میٹر کو اپنے قبضے سے نکلنے نہ دیا۔ وہ ظاہریوں کرتا تھا جیسے اسے ایک منٹ کی فرصت نہ ہو، وہ گونا گوں مصروفیات کے بوجھ تلے دب چکا ہو تھک چکا ہو، مزاج ہو چکا ہو اور اس کا کچھ مرکل چکا ہو لیکن اس کا دل، تناؤم و گداز ہے کہ وہ اس بے یار و مددگار نوجوان کو قسمت کے تھیرے کھانے اور لپے لپٹنے لوگوں کی سازشوں کا شکار بننے کی اجازت نہیں دے گا کیونکہ وہ بہرحال اس کے دوست کا صاحب زادہ اور اس ناتے خزانہ قارون کا مالک تھا۔ کاؤنٹ بزدخوف کی رحلت کے بعد

اس نے جو چند ایام ماسکو میں گزارے، ان کے دوران میں وہ میٹر کو اپنے پاس بلا لیتا یا خود اس کے پاس چلا جاتا اور ہر دم اسے مشوروں سے نو زنا رہتا کہ اسے کیا کرنا یا کیا نہیں کرنا چاہیے۔ وہ جب بھی لب کشائی کرتا، اس کا لہجہ تھکا تھا ہوتا اور پر اعتماد بھی، گویا وہ اسے یہ بتا رہا ہو۔ ”برخوردار، تم اچھی طرح جانتے ہو کہ مختلف امور و معاملات نے میرا نام میں دم کر رکھا ہے اور محض انسانی ہمدردی کا جذبہ مجھے تمہارے معاملات میں دلچسپی لینے کے لیے مجبور کر رہا ہے اور علاوہ انہیں تمہیں یہ بھی معلوم ہے کہ جو مشورے اور تجویزیں میں تمہیں دیتا ہوں، صرف وہی قابل عمل ہوتی ہیں۔“

”خیر، میرے عزیز آخر کار ہم کل روانہ ہوئی جائیں گے،“ پرنس واسیلی نے ایک روز کہا۔ اس نے اپنی آنکھیں بند کر لی تھیں اور میٹر کی نگاہ پر یوں اپنی انگلیوں پھیر رہا تھا جیسے یہ معاملہ مدتوں پہلے دونوں کے درمیان طے ہو چکا ہو اور اس کے علاوہ اس کا اور کوئی فیصلہ ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ ”کل ہماری روانگی ہے۔ میں تمہیں اپنی گاڑی میں نشست دے دوں گا۔ میں بہت خوش ہوں۔ یہاں ہمارے تمام امور طے پا چکے ہیں۔ مجھے بہت عرصہ پہلے یہاں سے رخصت ہو جانا چاہیے تھا۔ اور مجھے چانسٹر کا یہ مراسلہ موصول ہوا ہے۔ میں نے تمہاری طرف سے درخواست دی تھی۔ تمہیں سفارتی سروں میں لے لیا گیا ہے اور تم جینٹلمین آف بیڈ چیمبر بنادیے گئے ہو۔ اب سفارتی ملازمت کے دروازے تم پر کھل گئے ہیں۔“

تھکے تھکے اور پر حاد لہجے کے پیچھے جونوت تھی، اس کے باوجود میٹر، جو کافی عرصے سے کوئی ملازمت اختیار کرنے کے بارے میں سوچتا رہا تھا، احتجاج کیا چاہتا تھا لیکن پرنس واسیلی نے اپنے مدد بھرے لہجے میں، جو وہ صرف اسی وقت اختیار کرتا تھا جب وہ اپنی بات میں کسی قسم کی مداخلت کے امکان کو ختم کرنا چاہتا تھا اور یہ سمجھتا تھا کہ مخاطب سے اپنی بات منوانے کے لیے اس کے لیے انتہائی اقدامات کرنا لازمی ہے، اسے ٹوک دیا۔

”لیکن مالی ڈیپٹر، میں نے یہ کام اپنی خاطر، اپنے ضمیر کو مطمئن کرنے کے لیے کیا اور میرا شکریہ دا کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ کسی نے آج تک یہ شکایت نہیں کی کہ اس کے ساتھ حد درجہ محبت کی جاتی ہے۔ علاوہ انہیں تمہارے ہاتھ پاؤں تو بندھ نہیں گئے، تم آزاد ہو اور تمہارا جی چاہے تو کل ہی اس پر ٹھوکر مار سکتے ہو۔ لیکن جب تم پیٹرز برگ پہنچ جاؤ گے، ہر چیز اپنی آنکھوں سے دیکھ سکو گے۔ اب وقت، گھیا ہے کہ تم تلخ اور بھی تک پاؤں اپنے ذہن کی تختی سے کھرچ ڈالو۔“ پرنس واسیلی نے لمبی سانس لی۔ ”چنانچہ، عزیزم، سب کچھ طے پا گیا۔ وہ گئی تمہاری گاڑی اس میں میرا ذاتی ملازم سفر کرے گا۔ اور ہاں، یہ تو میں تقریباً بھول ہی گیا تھا،“ اس نے مزید کہا۔ ”تمہارے والد نے میرا کچھ حساب چکانا تھا۔ چنانچہ ریازان کی جاگیر سے مجھے کچھ رقم موصول ہوگئی ہیں، وہ میں اپنے پاس رکھ لوں گا۔ تمہیں ان کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم بعد میں حساب برابر کر لیں گے۔“

پرنس واسیلی نے ریازان کی جاگیر سے موصولہ جن رقم کا ذکر کیا تھا، وہ حقیقتاً ہزاروں روبلوں پر مشتمل نہیں اور یہ آراکسانوؤں⁵ سے بطور مکان موصول ہوئی تھیں۔ یہ اس نے اپنے پاس رکھ لیں۔

پیٹرز برگ میں بھی میٹر کو اسی قسم کی شفقت اور پیار نے اپنے حصار میں لے لیا جس کا سامنا اسے ماسکو میں

کرا پڑ تھا۔ واسیلی نے اس کے لیے جو عہدہ حاصل کیا تھا وہ اسے قبول کرنے سے انکار نہیں کر سکتا تھا۔ (اصلاً یہ عہدہ برائے نام تھا کیونکہ پیٹر کو کچھ کرنا نہیں پڑتا تھا لیکن اس سے وقار بہت وابستہ تھا۔) پھر یہاں شناسائیوں، دھوٹوں اور ناجی ذمے داریوں کا سلسلہ اتنا دراز تھا کہ پیٹر ماسکو میں بھی کیا بکھل یا ہوگا جو یہاں بکھل یا۔ وہ ہر وقت دوڑ دھوپ میں لگا رہتا اور مستقبل سے سہنی امیدیں، جو کبھی پوری نہ ہوتیں، وابستہ کرتا رہا۔

اس کے کنوارے شناساؤں میں سے بہت سے لوگ اب پیٹرز برگ میں موجود نہیں تھے۔ گارڈز اب جنگی خدمات سرانجام دے رہے تھے۔ دلو خوف کی تنزلی ہو گئی تھی اور اب وہ عام سپاہی تھا۔ اناطول۔ در کہیں مضافات میں فوجی ملازمت کر رہا تھا اور پرنس آندرے ملک سے باہر تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پیٹر کو اب پنی ش میں اس طرح گزارنے کے مواقع دستیاب نہیں تھے جس طرح وہ، انھیں ازیں چھتر گزارنے کا عادی تھا۔ اور نہ اب اسے کسی ایسے دوست کی رفقت میسر تھی جو عمر میں اس سے بڑا ہوتا، جس کی رائے کا وہ احترام کر سکتا، جس کے ساتھ وہ بے تکلف گفتگو کر سکتا، اور یوں اپنے دل کی بھڑاس نکال سکتا۔ اس کا سارا وقت ڈنڈوں اور بال پارٹیوں میں اور ان سے بڑھ کر پرنس واسیلی کی بھاری بھر کم اہلیہ، بڑی پرنس، اور اس کی حسین و جمیل دختر ہیلین کی صحبتوں میں کٹ رہا تھا۔

پیٹر کے بارے میں اونچے طبقے کا رویہ جس طرح تبدیل ہوا تھا، دوسروں کی طرح آلتا پالوونا شیریں نے بھی اسے اس کا احساس دلایا۔

مجھے دنوں میں آلتا پالوونا کی موجودگی میں پیٹر کو ہمیشہ یہ خیال ستاتا رہا کہ جو کچھ وہ کہہ رہا ہے، نامناسب، بے لگا اور بے محل ہے۔ یہ باتیں جب تک اس کے ذہن میں تشکیں پاتی رہتیں، اسے بے حد معقول اور خردمندانہ معلوم ہوتیں لیکن جونہی وہ اس کے منہ سے نکلتیں، وہ بے سنی اور احقانہ دکھائی دینے لگتیں۔ اس کے برعکس اپولیت کی انتہائی راستی اور بے مغز گفتگو حاضرین پر اس طرح اثر انداز ہوتی کہ انھیں وہ بہت معقول اور سحر انگیز معلوم ہونے لگتی۔ اب پیٹر جو کچھ کہتا تھا، اس کی تعریف میں زمین آسمان کے ملا بے مادے جاتے۔ ”وہ واہ، سبحان اللہ، و نہ کیا خوبصورت بات کہی ہے“ کے ڈوگرے برسائے جانے لگتے۔ اگر آلتا پالوونا خود اس طرح تحسین نہ بھی کرتی، تب بھی اسے صاف نظر آ جاتا کہ اب کرنے کو اس کا دل چل رہا ہے لیکن وہ چپ اس لیے رہتی ہے کیونکہ وہ اس کے منکر مزاجی کے جذبے کو نہیں پہنچتا چاہتی۔

1805-1806 کی سردیوں کے آغاز میں پیٹر کو آلتا پالوونا کا ردائی جگہ بی دعوت نامہ موصول ہوا۔ اس کے

ادار میں یہ ایڑا دی عبارت (پوسٹ سکرپٹ) مندرج تھی

”چند سے آفتاب چند سے، ہتاب ہیلین بھی، جسے آدمی بار بار دیکھتا ہے، وہ پھر بھی اس کی طبیعت سیر نہیں ہوتی، جلوہ افروز ہو رہی ہیں۔“

جب پیٹر نے یہ تحریر پڑھی، اسے پہلی مرتبہ احساس ہو (حالانکہ دوسرے لوگ پہلے ہی ناڑ چکے تھے) کہ ہیلین اور اس کے ماہن کوئی تعلق قائم ہو چکا ہے۔ وہ اس تصور سے یوں بدکا جیسے اس پر کوئی ایسی بھاری ذمے داری ڈالی

جاری ہو جس سے عہدہ برآ ہونا اس کے بس کی بات نہ ہو۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ تصور آتا ہے نا اور خوش کن تھا کہ اس کا دل باغ باغ ہو گیا۔

آتنا پاولوونا کی محفل بالکل ویسی ہی تھی جیسی کہ اس کی سابقہ محفل تھی۔ لیکن اس مرتبہ اس نے اپنے مہمانوں کے سامنے جو نیا تولید انجوبہ پیش کیا، وہ سوخت باغ نہیں تھا، بلکہ ایک سفارت کار تھا۔ وہ ابھی ابھی برلن سے آیا تھا اور اپنے ساتھ امپراطور الیکساندر کے دورہ پوٹسڈم کی تازہ ترین خبرے کر آیا تھا۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ ان دو جلیل القدر امپراطوروں نے، جو آپس میں دوست بھی ہیں، نئی نوع انسان کے دشمن کے خلاف انصاف کا علم بلند کرنے کی خاطر کس طرح ناقابل تحمیل معاہدے کی پابندی کرنے کا عہد کیا ہے۔

آتنا پاولوونا نے قدرے پر مدلل انداز سے میئر کا استقبال کیا۔ حال ہی میں کاؤنٹ بزدخوف کے انتقال سے نوجوان کو جو صدمہ برداشت کرنا پڑا تھا، یہ لاریب اس کی طرف اشارہ تھا۔ (ہر شخص مسلسل میئر کو یہ باور کرانا چاہتا تھا کہ اسے اس کے والد کے انتقال پر گہرا صدمہ پہنچا ہے حالانکہ جہاں تک اس کا اپنا تعلق تھا، اسے اپنے باپ سے کوئی خاص انس نہیں تھا۔) آتنا پاولوونا کا یہ رنج و ملال بالکل اس رنج و ملال سے مشابہ تھا جس کا اظہار وہ پہلی واجب الاحترام امپراطورہ ماریا فیودورونا کے ذکر پر کیا کرتی تھی۔ میئر اس چاچلوسی پر پھولا نہ سکیا۔

آتنا پاولوونا نے اپنے ڈرائنگ روم میں مختلف گروپ اپنی روایتی چابک دستی اور مہارت سے ترتیب دیے تھے۔ سب سے بڑے گروپ میں پرنس واسیلی اور متعدد جرنیل نمایاں تھے۔ سفارت کار کو اپنے ساتھ بٹھانے کا شرف بھی اسی گروپ کے حصے میں آیا تھا۔ ایک دوسرا گروپ چائے کی میز کے گرد جمع تھا۔ میئر اول الذکر گروپ کے ساتھ بیٹھنے کو ترجیح دیتا لیکن آتنا پاولوونا نے۔ اس پر اسی قسم کی گھبراہٹ اور بدحواسی طاری تھی، جس کا مظاہرہ جرنیل جس کے پاس میدان جنگ میں ایک ہزار ایک بالکل نئی اور اختراعی تجاویز ہوں لیکن اس کے پاس ان میں سے ایک پر بھی عمل کرنے کا وقت نہ ہو، کرتا ہے۔ جو نئی میئر کو دکھا، اس نے اپنی انگشت شہادت اس کی آئینہ پر رکھی اور گویا ہوئی:

”سنو، آج کی شام کے لیے میرے ذہن میں تمہارے لیے خاص منصوبہ ہے۔“ اس نے ہیلین کی جانب توجہ کی اور اسے دیکھ کر سکرائی۔ ”ہیلین، جان من، میری آنٹی تمہاری پرستش کرتی ہے۔ اس کا دل رکھو۔ جاؤ، اور اس منٹ کے لیے اس کے پاس بیٹھ جاؤ۔ میں یہ بھی نہیں چاہتی کہ تم وہاں کسی قسم کی بوریٹ محسوس کرو۔ ہمارے ڈیئر کاؤنٹ تشریف لے آئے ہیں۔ یہ تمہارا ساتھ دینے میں ذرا ہچکچاہٹ محسوس نہیں کریں گے۔“

حسین دجیل ہیلین آنٹی کی طرف چل پڑی لیکن آتنا پاولوونا نے میئر کو روک لیا۔ اس کا انداز کچھ اس قسم کا تھا جیسے وہ اسے چند آخری لیکن ضروری ہدایات دینا چاہتی ہو۔

”کیا اس کا حسن حسن جہاں سوز نہیں ہے؟“ اس نے پر شکوہ سینہ کی جانب، جس کی موج خرام کل کترنا جاری تھی، اشارہ کرتے ہوئے میئر سے کہا۔ ”اس کے انداز نقوش پانودیکھو، کیا رعنائی ہے، کیا دل ربائی ہے! آتنا

بال عمر اور تپ بہ سلیقہ، یہ کل شناسی 'اطوار و اسالیب' اتنے کامل و بے عیب کہ انگلی اٹھانے کی گنجائش نہیں، یہ سب سچے در پر خلوص قلب کی علامتیں ہیں۔ اس آدمی کی، جو اس کا دل مٹھی میں کر لے، خوش نصیبی قابل رشک ہے! ایک یہ شخص بھی، جسے دنیا داری سے دور کا بھی واسطہ نہ ہو، اس کے شوہر کی حیثیت سے اعلیٰ طبقے میں ممتاز مقام حاصل کرنے میں ناکام نہیں ہو سکتا۔ تمہارا کیا خیال ہے؟ میں صرف تمہارا عندیہ معلوم کرنے کی خواہش مند تھی؟" آنا پاولوونا نے کہا اور اس نے بیٹر کا ہاتھ چھوڑ دیا۔

جہاں تک ہیلین کے بے عیب اور کامل اطوار و اسالیب کا تعلق ہے، بیٹر پورے خلوص کے ساتھ آنا پاولوونا سے متفق تھا۔ اگر اس کے ذہن میں ہیلین کا کبھی خیال آیا بھی تو اس کی وجہ محض یہ تھی کہ وہ غیر معمولی حسن و جمال سے بہرہ ور تھی اور اسے نچے طبقے کی محافل میں پروقاہر دیا اختیار کرنے اور اپنے اوپر پر سکون متانت طاری کرنے کی صلاحیت سے مالا مال تھی۔

معر آئی نے اپنے گوشہ عزلت میں دونوں نوجوانوں کو خوش آمدید کہا لیکن معلوم ہوتا تھا کہ اس کے دل میں ہیلین کی جو قدر و منزلت تھی، اسے اس کا اظہار کرنے کا اتنا شوق نہیں تھا جتنا کہ وہ اپنے اس خوف کی، جو وہ آنا پاولوونا سے کھاتی تھی، نمائش کرنا ضروری خیال کرتی تھی۔ اس نے اپنی بھانجی کی جانب یوں دیکھ جیسے وہ یہ دریافت کرنا چاہتی ہو کہ "میں اس دونوں نوجوانوں کا کیا کروں؟" آنا پاولوونا نے دوبارہ اپنی انگلی بیٹر کی آستین پر رکھ دی اور بولی۔ "مجھے یقین ہے کہ آئندہ تمہیں کبھی شکایت نہیں ہوگی کہ میرے گھر میں کسی شخص کو بوریٹ ہوتی ہے۔" اور اس نے چھبستی نگاہ ہیلین پر ڈالی۔

ہیلین کچھ اس اداسے مسکرائی جیسے وہ یہ کہنا چاہتی ہو کہ "میں یہ مان ہی نہیں سکتی کہ کبھی ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ کوئی شخص میری طرف دیکھے اور میرا جادو اس پر نہ چلے۔" "نئی کھنکاری، اپنا آپ دہن لگلا اور گلا صاف کرتے ہوئے فرانسیسی میں بولی کہ اسے ہیلین سے مل کر بہت خوش ہوئی ہے۔ پھر وہ بیٹر کی جانب متوجہ ہوئی اور کھنکار کر اس نے اس کا بھی اسی طرح خیر مقدم کیا۔ گفتگو رک رک کر ہو رہی تھی اور بالکل بے کیف تھی۔ لیکن اس کے بیچ میں ہیلین نے بیٹر کی جانب دیکھا اور اسے بچینہ اسی خوبصورت اور دل کش تبسم سے نوازا جس کا مظاہرہ وہ ہر شخص سے کرتی رہتی تھی۔ بیٹر اس تبسم کا اتنا عادی ہو چکا تھا اور اس کے لیے یہ ہر قسم کے مفہوم سے اتنا معری تھا کہ اس نے اس کی طرف کوئی دھیان نہ دیا۔ اس موقع پر آئی نسوار کی ان ڈیبوں کا، جو بیٹر کے باپ کاؤنٹ بزدخوف نے جمع کی تھیں، اور کر رہی تھی اور اس نے انہیں اپنی نسوار کی ڈیبا دکھائی۔ پرنس ہیلین نے درخواست کی "آئی، ڈیبا کے اچکن پر آپ کے شوہر کی جو تصویر کندہ ہے، آپ ہمیں اس کی زیارت کرائیں۔"

"قابلیت تصویر وایسے (Vinesse) نے منقش کی ہے،" بیٹر نے ایک نامور تصویر چہ ساز کا نام لیتے ہوئے کہا۔ اور وہ ڈیبا اٹھانے کے لیے میز پر جھک گیا لیکن اس عرصے کے دوران میں وہ اس گفتگو کو بھی، جو دوسری میز پر ہو رہی تھی، سننے کی کوشش کرتا رہا۔

وہ نیم استادہ ہو گیا۔ اس کا ارادہ میز کا چکر لگا کر آئی کے قریب پہنچنے کا تھا لیکن آنٹی نے ڈبیا اٹھائی، ہمیں کی پشت کے پیچھے تھمائی اور میز کی طرف بڑھادی۔ ہیلیں آگے جھک گئی تاکہ آنٹی کو ڈبیا بڑھانے کے لیے ہلکے سکے اور مسکرا کر گرد و پیش دیکھنے لگی۔ جیب کہ اس کی عادت تھی وہ شام کی محفلوں میں ہمیشہ اس قسم کا ڈریس پہنا کرتی تھی جس کی اس نے اپنے فیشن کے مطابق، گاڑی اور پچھاڑی دونوں خاص نیچے تک کھلی ہوتی تھیں۔ اس کے جسم کا بالائی حصہ جو میز کو ہمیشہ یوں محسوس ہوتا تھا، جیسے سنگ مرمر کا بنا ہو، اس کے اتنا قریب تھا کہ اس کی کوتاہ بین نگاہیں اس کی سرسری گردن اور شانوں کے ردع پر درحس اور دلکشی کو دیکھے بغیر نہ رہ سکیں اور اس کے لب اس کے اتنا نزدیک تھے کہ اگر وہ اپنا سر خفیف سا نیچے جھکا تا وہ انھیں مس کرنے لگتا۔ اس کے جسم کی حرارت اور اس کے پرفیوم کی معطر خوشبو اس کے نتھنوں میں گھسی جا رہی تھی۔ وہ جب سانس لیتی، اس کا کارسیٹ مرتعش ہو جاتا، ہلکی سی آواز پیدا ہوتی اور اسے وہ بھی سنائی دے جاتی۔ سرسری حسن کی بجائے، جو اس کے ڈریس سے مل کر ایک کل کی تشکیل کر رہا تھا، اب اسے اس کا جسم، جسے شخص اس کے ملبوسات نے ڈھانپ رکھا تھا، لپچاتا، ورغلا تا نظر آیا۔ اور جب ایک مرتبہ اسے ان نگاہوں سے دیکھ چکا، وہ اسے کسی بھی دوسرے انداز سے دیکھنے کے قابل نہ رہا، بعینہ اس طرح جس طرح جب ہماری نگاہوں سے کسی سراب کا پردہ اٹھتا ہے، ہم کبھی دوبارہ اس کی طرف رجوع نہیں کرتے۔

اس نے اپنی گردن پچھلی جانب گھمائی اور اپنی درختاں سیاہ آنکھوں سے اسے دیکھنے اور سکرانے لگی۔
 ”تو تم نے کبھی پہلے یہ اندازہ نہیں لگایا تھا کہ میں کتنی حسین ہوں؟“ وہ کہتی محسوس ہو رہی تھی۔ ”تم نے کبھی نہیں دیکھا تھا کہ میں عورت ہوں؟ ہاں میں عورت ہوں اور میں کسی کی بھی ہو سکتی ہوں۔ بلکہ تمھاری بھی، اس کی آنکھیں کہہ رہی تھیں۔

اور اس لمحے میز کو یہ احساس ہوا کہ سیلین اس کی بیوی بن سکتی ہے بلکہ اسے بنانا ہی ہوگا کیونکہ اس کے عہدہ اور کوئی صورت ہو ہی نہیں سکتی۔ اسے اس امر کا اتنا پختہ یقین تھا کہ اسے محسوس ہونے لگا کہ وہ اس کے ساتھ گرجے میں کھڑے ہے اور ان دونوں کا نکاح پڑھایا جا رہا ہے۔ لیکن یہ کیسے ہوگا اور کب ہوگا، اس کے متعلق وہ کچھ نہیں جانتا تھا۔ اسے یہ بھی علم نہیں تھا کہ اس کام کا انجام اچھا ہوگا یا برا (حقیقتاً کسی وجہ کی بنا پر وہ نہاں خائے دل میں یہ محسوس کر رہا تھا کہ اس کا انجام برا ہی ہوگا) لیکن وہ اتنا جانتا تھا کہ یہ کام ہوگا ضرور۔

میئر نے اپنی نگاہیں جھکا دیں، دوبارہ اوپر اٹھائیں اور یہ تصور کرنے کی کوشش کی کہ وہ ایک ایسی حیثیت ہے جو اس سے بہت دور ہے، اس سے اس کا کوئی تعلق نہیں، وہ اس کے لیے بالکل اجنبی ہے۔ آج تک وہ اسے کبھی جھٹا اور اسے ایسے ہی جانتا رہا تھا۔ لیکن اب؟ اب اس کے لیے ایسا کرنا ممکن نہیں تھا۔ اس کی حالت بالکل ایسے شخص کی تھی جو درخت میں دوڑ رہا تھا اس کا چمکا دیکھتا ہے اور سمجھنے لگتا ہے کہ وہ کوئی درخت دیکھ رہا ہے لیکن جس طرح جب وہ ایک مرتبہ اس کے پیچھے کوٹھاس کے پیچھے کے طور پر پہچان لیتا ہے، اسے کبھی دوبارہ درخت تصور نہیں کر سکتا، بعینہ اب وہ بھی اسے دوبارہ کوئی دور دراز کی اجنبی حیثیت تصور کرنے سے قاصر تھا۔ وہ اس کے بے پناہ قریب تھی، اسے اپنی

مٹی میں لے چکی تھی، اسے اپنے سحر میں گرفتار کر چکی تھی اور اب ان دونوں کے مابین کوئی رکاوٹ باقی نہیں رہ گئی تھی اور گر کوئی رکاوٹ رہ بھی گئی تھی تو وہ اس کی اپنی قوت ارادی تھی۔

”اچھا، میں تمہیں تمہارے گوشے میں چھوڑے جا رہی ہوں۔ مجھے نظر آرہا ہے کہ تم یہاں بالکل ٹھیک ٹھاک ہو، اسے سنا پاؤ دونوں کی آواز کہتی سنائی دی۔

دریئر کو فکر لگ گئی اور وہ سوچنے لگا کہ کہیں اس سے کوئی قابل مذمت حرکت تو سرزد نہیں ہوئی۔ اس کا چہرہ مریخ ہو گیا اور وہ اپنے گرد پیش نظریں دوڑانے لگا۔ اسے محسوس ہوا کہ اس کے ساتھ جو درد گزری ہے، جس طرح اسے اس کا غم ہے باقی لوگوں کو بھی اس کے ہارے میں آگاہی ہوگئی ہے۔

کچھ دیر بعد جب وہ بڑے حلقے میں شامل ہو گیا، آٹنا پاؤ دونوں نے اس سے کہا۔

”سنا ہے کہ تم پیئرز برگ میں اپنے مکان کی تزئین و آرائش کر رہے ہو؟“

اور یہ بات درست تھی۔ میر عمادات نے اسے بتایا تھا کہ ایسا کرنا ضروری ہے اور یہ جانے بغیر کہ ایسا کرنا کیوں ضروری ہے، اس نے پیئرز برگ میں اپنی وسیع و عریض حویلی کی از سر نو تزئین و آرائش شروع کرادی تھی۔

”یہ تم بہت اچھا کر رہے ہو۔ تاہم میرا مشورہ یہ ہے کہ اپنی رہائش پر نس و سلی کے دولت کدے پر ہی رکھنا۔ جس کوئی کو پرس جیسا دوست مل جائے، وہ کبھی گھائے میں نہیں رہتا، آٹنا پاؤ دونوں نے پرس واسلی کی جانب مسکراتے ہوئے کہا۔ ”مجھے ان باتوں کا کچھ کچھ علم ہے۔ ٹھیک کہانا میں نے؟ تم ابھی بالکل نو عمر ہو۔ تمہیں مشوروں کی ضرورت ہے۔ میں بڑی بوڑھیوں کی طرح باتیں کر رہی ہوں۔ مجھے امید ہے کہ تم ان کا برا نہیں مناؤ گے۔“ جس طرح خواتین اپنی عمر کا تذکرہ کرنے کے بعد کچھ وقفہ دیتی ہیں تاکہ مخاطب کو جواب میں کچھ کہنے کا موقع مل سکے، وہ بھی بولتے بولتے رک گئی۔ ”ہاں اگر تم شادی کرو، پھر دوسری بات ہے۔“

اس نے دونوں کو ایک ہی نگاہ میں سمولیا۔ نہ پیئر نے ہیلین کی جانب دیکھا اور نہ ہیلین نے پیئر کی طرف لیکن وہ اب بھی اس کے بے پناہ قریب تھی۔ اس نے ٹوٹے پھوٹے لہجے سے کچھ کہا اور شرانے لگا۔

جب پیئر گھر پہنچا، نیت اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی، وہ بار بار بھی سوچتا رہا کہ اس کے ساتھ کیا واردات گزری ہے، کیا تو وہ پیش آیا ہے؟ کچھ بھی تو نہیں۔ اسے صرف اتنا احساس ہوا تھا کہ وہ عورت، جسے وہ اس وقت بھی جانتا تھا جب وہ ابھی محض بچی تھی، وہ عورت، جس کے حسن کا جب بھی ذکر آتا، وہ بے اعتنائی سے جواب دیتا تھا۔ ”ہاں، اچھی شکل ہے“ اس کی اپنی بن سکتی ہے۔

”لیکن وہ تو نری احمق ہے۔ میں خود بار بار کہہ چکا ہوں کہ وہ بالکل احمق ہے،“ اس نے اپنے آپ سے کہا۔ ”میرے دل میں وہ جو جذبات انگیزت کرتی ہے، وہ محبت کے جذبات نہیں کہے جاسکتے۔ اس کے برعکس مجھے ان جذبات سے، جو وہ ابھرتی ہے، گھن آتی ہے، میرے نزدیک وہ قابل نفرتین ہیں۔ میں نے تو یہاں تک سنا ہے کہ اس کا اپنا بھائی اتنا طول اس سے محبت کرتا تھا اور وہ اس سے کہنے والے کہتے ہیں کہ بڑا زبردست سیکنڈ ہوا تھا

اور یہی وجہ ہے کہ اسے کہیں باہر بھیج دیا گیا۔ اور اپولیت اس کا بھائی ہے۔۔۔ پرنس واسیلی اس کا باپ ہے۔۔۔ یہ سب گزرتا ہے، اس نے سوچا۔ لیکن ابھی وہ غور و فکر میں محو تھا (اور اس کا یہ غور و فکر کسی نتیجے پر نہیں پہنچ پایا تھا کہ اس نے غور کو مسکراتے پایا)۔ اور اسے یہ احساس ہونے لگا کہ پہلے خیال کے بطن سے ایک نیا سلسلہ خیالات پر پرزے نکال رہا ہے اور عین اس وقت جب وہ یہ سوچ رہا تھا کہ یہ عورت بیکار محض ہے، وہ ایک اور خواب بھی دیکھ رہا تھا کہ وہ اس طرح ایک روز اس کی بیوی بن کر آئے گی، کیسے اس پر اپنا تن من مٹا کرے گی، عین ممکن ہے کہ وہ مختلف بن جائے اور اس نے اس کے متعلق جو کچھ سوچا اور سنا ہے، وہ جھوٹ کا پیشہ رہ ثابت ہو جائے۔ اور ایک بار پھر اس نے اس کا اس حیثیت سے تصور نہیں کیا کہ وہ ”پرنس واسیلی کی بیٹی ہے“ بلکہ اس کے خیالوں میں اس کا سراپا، جو صرف سر کی گاؤن میں مستور تھا، در آیا۔ ”لیکن یہ خیال مجھے پہلے کبھی کیوں نہ سوجھا؟“ اور ایک مرتبہ پھر اس نے اپنے آپ کو بتایا کہ یہ شادی ناممکن ہے، اس میں ضرور کوئی ایسی بات ہے جس سے گھٹن آتی ہے، جو معلوم ہوتا ہے کہ غیر فطری ہے، سو جب رسوائی ہے۔ اس نے اس کی حالیہ باتوں اور نگاہوں کو دوران لوگوں کی باتوں اور نگاہوں کو، جنہوں نے انہیں اکٹھے دیکھا تھا، یاد کیا۔ آٹنا پاؤلووٹا نے جو کچھ کہا تھا اور جب وہ اس سے اس کے مکان کے بارے میں گفتگو کر رہی تھی، تب اس نے اسے جس انداز سے دیکھا تھا، اس نے وہ بھی یاد کیا۔ پرنس واسیلی اور دوسرے لوگوں نے اس قسم کے جو سیکندروں اشارے کئے تھے، وہ انہیں بھی اپنے ذہن میں لایا اور یہ سوچ سوچ کر اس کے ہاتھ پاؤں پھولنے لگے کہ کہیں اس نے ازیں پیشتر ہی اپنے آپ کو کوئی ایسا کام کرنے کا، جو بظاہر غلط تھا اور جواہر نہیں کرنا چاہیے تھا، پابند تو نہیں بنالیا؟ لیکن جس لمحے اسے اس ایتھان کا تجربہ ہو رہا تھا، اس کے کہاں خانہ دماغ کے کسی دوسرے کونے میں اس کی تصویر اپنے کامل نسائی حسن کے ساتھ نمودار ہونے لگی۔

2

نومبر 1805 کے دوران میں پرنس واسیلی کو مجبوراً چار صوبوں کے انسپکشن کے دورے پر جانا پڑا۔ اس نے اس دورے کی اجازت دو مقاصد کے پیش نظر حاصل کی تھی۔ ایک تو وہ اپنی جاگیروں کا، جنہیں اس نے کبھی پلٹ کر نہیں دیکھا تھا، چکر لگانا چاہتا تھا۔ دوسرے وہ اپنے بیٹے اناطول (جس کی رجمنٹ اس کے راستے میں ہی متعین تھی) کو ہرا لے کر پرنس نکولائی آندر یوچ بلکوسکی کے ہاں جانا چاہتا تھا تاکہ اس امیر کیر یوڈھے شخص کی بیٹی کے ساتھ جیسے جیسے اس کی شادی کا ڈول ڈال سکے۔ لیکن کہیں دور جانے اور ان نئے معاملات میں ہاتھ ڈالنے سے قبل وہ وینز کا تفتیش طے کر لینا چاہتا تھا۔ یہ بدست ہے کہ وینز نے حال ہی میں صبح سے شام تک پورا پورا دن گھر میں، یعنی پرنس واسیلی کی حویلی میں، جہاں وہ قیام پذیر تھا، گزارنا شروع کر دیا تھا اور (جیسا کہ عاشق کا تیرہ ہینا چاہیے) ہیلین کی موجودگی میں خاصی جوشیلی، احمقانہ اور عقل و خرد سے کوری حرکات کرتا رہتا تھا، لیکن ابھی تک نیل منڈھے نہیں چڑھی تھی۔ چھٹی بھی کیسے؟ اس نے شادی کا کوئی عندیہ ہی نہیں دیا تھا۔

”معاملات جا تو ٹھیک نہج پر رہے ہیں لیکن ان کا کوئی فیصلہ بھی تو ہونا چاہیے،“ ایک صبح پرنس واسلی نے ٹھنڈی اور پر طال آہ بھرتے ہوئے اپنے آپ سے کہا۔ وہ محسوس کر رہا تھا کہ اس بات کے بان جو دکھ بیتر اس کے احسانوں کے برچھ تے دبا ہوا ہے (خیر پھوڑ واس قصبے کو)، اس معاملے میں مناسب رویہ اختیار نہیں کر رہا۔ ”جوانی۔۔۔“

نادی۔۔۔ خدا اس کا حامی و ناصر ہو،“ وہ سوچ رہا تھا اور دل ہی دل میں اپنی دریا دلی، ورنیک دلی پر خوش ہو رہا تھا۔ ”لیکن یہ معاملہ بہر صورت انجام کو پہنچنا چاہیے۔ پرسوں ایسٹا کا نام دن ہے۔ میں چند لوگوں کو دعوت پر بلاؤں گا۔ اگر وہ پھر بھی یہ نہ سمجھا کہ اسے کیا کرنا ہے، پھر اسے انجام تک پہنچانا میرا کام ہوگا۔ ہاں، میرا کام، میں اس کا باپ ہوں!“

جس رات آٹنا یا ولودتا کے ہاں محفل منعقد ہوئی تھی، بیتر نے اس کا بقایا حصہ پریشانیوں میں گھٹنے اور جاگتے رہنے میں گزارا تھا۔ تاہم وہ یہ فیصلہ کر چکا تھا کہ ہیلین کے ساتھ شادی الیہ ہوگی، لہذا اسے اس کی صحبت سے گریز کرنا اور وہاں سے رخصت ہو جانا چاہیے لیکن چھ ہفتے گزر گئے اور وہ پرنس واسلی کے ہاں ڈیرا ڈالے رہا۔ یہ سوچ سوچ کر اس کی روح فنا ہوتی رہتی تھی کہ لوگوں کی نگاہوں میں، ہر دن کے گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کا باہمی رشتہ مستحکم سے مستحکم ہوتا جا رہا ہے، یہ کہ اس نے ماضی میں اپنے ذہن میں اس کے بارے میں جو تصویر ت باندھ رکھے تھے، اب ان کی طرف لوٹنا ناممکن ہے، یہ کہ وہ اس سے عہدگی کا خیال بھی دل میں نہیں لاسکتا اور یہ کہ اسے اپنا مقدر اس کے مقدر کے ساتھ نہی کرنا ہی ہوگا حالانکہ اس کی چھٹی حس پکار پکار کر اس سے کہہ رہی تھی کہ یہ نہایت خطرناک حرکت ہوگی۔ لیکن چچ یہ آن پڑا کہ پرنس واسلی کی حویلی (جہاں دایم گزشتہ میں شادی ہی کبھی کوئی دعوت منعقد ہوتی تھی) میں آئے روز کوئی نہ کوئی محفل یا تقریب سجنے لگی اور اسے مجبوراً ان دعوتوں میں شامل ہونا پڑتا اور نہ اس پر یہ الزام آتا کہ وہ دوسروں کی خوشیوں میں کھنڈت ڈال رہا ہے ورنہ اسے خواہ مخواہ پریشان کر رہا ہے۔ یوں تو ایسے مواقع بہت کم آتے جب پرنس واسلی گھر پر ہوتا لیکن جب بھی ایسا موقع آتا، وہ بیتر کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیتا، اسے اپنی طرف گھسیٹتا اور بے دھیانی میں اپنا صفا چٹ، جھریوں دار رخسار بوسے کے لیے اس کی طرف بڑھاتا اور کہتا: ”اچھا، اب کل ملاقات ہوگی۔“ یا ”شام کو کھانے پر گھر پہنچ جانا ورنہ میں تمہاری شکل تک نہیں دیکھوں گا“ یا ”تمہاری خاطر آج میں کہیں نہیں جاؤں گا۔“ اور علیٰ ہذا القیاس اور جب بھی وہ (بقول اس کے) بیتر کی خاطر گھر ٹھہرتا وہ اس سے بمشکل ایک دو الفاظ کا تبادلہ کرتا۔ ادھر بیتر کا یہ حال تھا کہ اسے مایوس کرنا اسے اپنے بس کی بات معلوم نہیں ہوتا تھا۔ وہ ہر روز اپنے آپ سے ایک ہی بات کی تکرار کرتا رہتا تھا۔ ”وقت آگیا ہے کہ اب میں اسے (ہیلین کو) اچھی طرح جان جاؤں اور یہ سمجھنے کی کوشش کروں کہ وہ حقیقتاً ہے کیا۔ کیا میں پہلے غلطی پر تھا یا اب غلطی کا مرتکب ہو رہا ہوں؟ نہیں، وہ احمق نہیں ہے، وہ سلجھی ہوئی نوجوان خاتون ہے،“ وہ بعض اوقات اپنے آپ سے کہتا۔ ”وہ کبھی غلط قدم نہیں اٹھاتی، کبھی ناعاقبت اندیشانہ بات نہیں کہتی۔ وہ بہت کم بولتی ہے لیکن جو کچھ بھی کہتی ہے اس میں کوئی الجھاؤ یا بیچ نہیں ہوتا، بلکہ ہمیشہ صاف و رکھری بات کرتی ہے۔ پھر وہ احمق تو نہ ہوگی۔ نہیں، وہ سلجھی ہوئی خاتون ہے۔ وہ کبھی بدحواس نہیں ہوتی، کبھی گڑبڑاتی نہیں، کبھی الجھن میں گرفتار نہیں ہوتی۔ پھر وہ

بدعورت کیسے ہو سکتی ہے؟“

کثر ایسا ہوتا کہ وہ اس کی موجودگی میں استدلال کرنے یا با آواز بلند سوچنے لگتا۔ اور وہ ہمیشہ اپنے رد عمل کا اظہار یوں کرتی کہ جو ب میں کوئی مختصر لیکن بر محل بات کہہ دیتی۔ اس سے وہ یہ ظاہر کر دیتی کہ جو کچھ وہ کہہ رہا ہے، اس میں خود اسے کوئی دلچسپی نہیں۔ یا پھر خاموش اسے دیکھتی اور مسکراتی رہتی۔ اس سے میٹر کو یہ محسوس ہوتا کہ کسی دوسری چیز کی نسبت اپنے اس انداز سے اس نے اپنی فوقیت زیادہ واضح طور پر جتادی ہے، چنانچہ اگر وہ اپنے اس تقسیم کے مقابلے میں تمام دلائل و براہین کو بیکار اور لایعنی شے سمجھتی ہے، تو ٹھیک ہی سمجھتی ہے۔

وہ جب بھی اس کی طرف متوجہ ہوتی، روشن و تابندہ مسکراہٹ اس کے چہرے پر کھیل رہی ہوتی، ایسی مسکراہٹ جیسے وہ سے اپنا راز داں بنا رہی ہو اور یہ مسکراہٹ صرف اسی کے لیے ہو۔ اس مسکراہٹ میں اس مسکراہٹ کی نسبت جو عام طور پر اس کے چہرے پر تھی رہتی تھی اور جس کا ہدف ہانٹا ہوتے تھے، کوئی زیادہ معنی فر چیز تھی۔ میٹر خوب جانتا تھا کہ ہر شخص اس بات کا منتظر ہے کہ وہ اپنی زبان سے صرف ایک لفظ کہہ دے، ایک خاص مد عبور کر جائے اور وہ یہ بھی جانتا تھا کہ جلد یا بدیر وہ یہ مد عبور کر جائے گا۔ تاہم اس ہول ناک قدم کا محض تصور ہی اس پر ایک قسم کا ناقابل فہم لرزہ طاری کرنے کے لیے کافی تھا۔ ان چھ ہفتوں کے دوران میں اسے یہ محسوس ہوتا رہا کہ وہ اس ہسپ پاتال کی جانب دیوانہ وار کھینچا جا رہا ہے۔ در روز بروز اس کے قریب سے قریب تر ہونا جا رہا ہے۔ ان عرصے کے دوران میں اس نے اپنے آپ سے کوئی ایک ہزار مرتبہ پوچھا: ”یہ میں کیا کر رہا ہوں؟ مجھے صرف ایک چیز کی ضرورت ہے اور وہ ہے عزم مصمم ایسا عزم مصمم مجھ میں ہے ہی نہیں؟“

اس نے کسی فیصلے پر پہنچنے کی کوشش کی۔ وہ جانتا تھا کہ وہ قوت ارادی سے تہی دامن نہیں اور حقیقت بھی یہی تھی کہ اس میں قوت ارادی موجود تھی۔ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ جہاں تک اس معاملے کا تعلق ہے، وہ قوت ارادی سے عاری ہو چکا ہے اور اس پر اسے بہت دکھ ہوا۔ میٹر کا شمار ان لوگوں میں کیا جاسکتا ہے جو اپنے آپ کو صرف تھی توانا اور قوی محسوس کرتے ہیں جب ان کا ضمیر کا ملاپاک اور صاف ہو۔ لیکن اس دن سے، جب وہ آنا پالوڈنا کے ہاں نسوار کی ڈیبا پر جھکا تھا اور (نفسانی) خواہش نے اس پر تغلب پالیا تھا، اسے غیر شعوری طور پر یہ احساس ستائے جا رہا تھا کہ پنی اس نفسانی خواہش کے ذریعے وہ گناہ کا مرکب ہوا ہے، در اس کے اسی احساس نے اس کی قوت ارادی کو مفلوج کر دیا تھا۔

ہیلین کے نام دن پرنس واسیلی کے ہاں دعوت شبینہ کا اہتمام کیا گیا، جس میں صرف گنے چنے مہمانوں۔ اس کی اہلیہ کے بقول صرف قریب ترین اور عزیز ترین رشتہ داروں اور دوستوں۔ کو مدعو کیا گیا تھا۔ ان تمام دوستوں اور رشتے داروں کو اشاروں کنایوں میں سمجھا دیا گیا تھا کہ اس شام پرنس کے مقدر کا فیصلہ ہو جائے گا۔ مہمان کھانے کی میز پر بٹھا دیے گئے۔ پرنس کو راگنا، جو بھاری بھر کم اور بارعب خاتون تھی اور کسی زمانے میں ص حب جمال بھی تھی، کمری صدارت پر حتمکن تھی۔ اس کے دائیں بائیں اس کے انتہائی معزز مہمان۔ ایک بزرگ جنرل، اس

آنکھوں سے بے اختیار ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ اس مجسمہ فنانس میں یہ تبدیلی دیکھ کر بیئر کے دل پر گہرا اثر ہوا، اس نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں پکڑ لیا اور اس سے معافی کا طلب گار ہو گیا۔ کس لیے یہ اسے خود بھی معلوم نہ ہوا۔ بعد ازاں بڑی پرس نے اسی دن بیئر کے لیے دھاری دار سکارف بننا شروع کر دیا اور اس کے بارے میں اس کا رویہ یکسر تبدیل ہو گیا۔

”نالی ڈیئر، یہ کام میری خاطر کر دو۔ آخر بے چاری کو مرحوم کے ہاتھوں بہت کچھ سہنا پڑا تھا،“ پرس واسلی نے بیئر کو دستاویز دکھاتے ہوئے کہا۔ اگر بیئر اس پر دستخط کر دیتا، پرس کو مالی منفعت حاصل ہو جاتی۔

پرس بھی پرس واسلی نے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ اس ہڈی کا۔ یہ دراصل تیس ہزار روپے کا پرا میسری نوٹ تھا۔ پچھلے ضروری ہے۔ اگر پرس واسلی بے چاری پرس کو یہ رقم دلوانے کا اہتمام نہ کرتا، تو اس بات کا اندیشہ تھا کہ جی تھپے کے سسے میں اس نے جو کردار داکیا تھا، اس کا راز طشت از بام ہو جاتا۔ بیئر نے دستاویز پر دستخط کر دیے، اور اس کے بعد پرس کا رویہ اور بھی شفقت آمیز ہو گیا۔ چھوٹی بہنیں بھی خاص طور پر سب سے چھوٹی، جس کے بالائی ہونٹ پر تل تھا، جو خوب رو تھی اور جس کی مسکراہٹیں اور بوکھلاہٹیں، اسے اکثر محبوب کر دیا کرتی تھیں۔ اس سے پیار جتانے لگیں۔

بیئر کے نزدیک یہ بات بالکل فطری تھی کہ ہر شخص اسے اتنا پیار کرے اور اگر کون شخص اسے پسند نہ کرتا تو اسے یہ چیز قطعی غیر فطری معلوم ہوتی۔ چنانچہ یہ اسی سوچ کا نتیجہ تھا کہ جن لوگوں نے اس کے گرد گھیرا ڈالا ہوا تھا، وہ ان کے خلوص پر ایمان لائے بغیر نہ رہ سکا۔ علاوہ ازیں اس کے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ وہ اپنے آپ سے یہ پوچھ سکا کہ یہ لوگ مخلص ہیں یا نہیں۔ وہ ہر وقت مصروف رہتا تھا اور اس پر دم ہلکے پھلکے اور خوشگوار نیشے کی کیفیت طاری رہتی تھی۔ اسے محسوس ہوتا کہ وہ کسی اہم تحریک کا مرکز ہے اور اسے مسلسل یہ احساس ستاتا رہتا کہ اس سے کچھ توقعات وابستہ ہیں، اسے ان توقعات کو پورا کرنا ہو گا ورنہ لوگوں کو دکھ اور مایوسی ہوگی اور لیکن یہ کہ اگر اس نے یہ کام کر دیا یا اس کام میں ہاتھ ڈال دیا تو سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ چنانچہ وہ وہی کچھ کرتا تھا جس کی اس سے توقع کی جاتی تھی لیکن وہ جو کچھ بھی کرتا تھا، اس کا کوئی خوشگوار نتیجہ برآمد نہیں ہوتا تھا، اس کی توقعات وہ مستقبل سے باندھ لیتا تھا۔

ان ابتدائی ایام کے دوران میں بیئر کے معاملات کی باگ ڈور اور خورد و خیر کی تکمیل کسی دوسرے شخص کی نسبت پرس واسلی کے ہاتھ میں زیادہ تھی۔ کاؤنٹ بزدخوف کے انتقال کے بعد اس نے بیئر کو اپنے قبضے سے نکلے نہ دیا۔ وہ ظاہریوں کرتا تھا جیسے اسے ایک منٹ کی فرصت شہ ہو، وہ گونا گوں مصروفیات کے بوجھ تلے دب چکا ہو، تھک چکا ہو، زچ ہو چکا ہو اور اس کا کچھ مرنگل چکا ہو لیکن اس کا دس اتنا نرم و گداز ہے کہ وہ اس بے یار و مددگار نوجوان کو قسمت کے تھپڑے کھانے اور لپے لفٹے لوگوں کی سازشوں کا شکار بننے کی اجازت نہیں دے گا کیونکہ وہ بہ حال اس کے دوست کا صاحب زادہ اور اس نائے خزانہ قارون کا مالک تھا۔ کاؤنٹ بزدخوف کی رحلت کے بعد

”بے مروت نہ بنو!“ آتنا پاؤ لو دنانے میز کے دوسرے سرے سے اس کے سامنے دھکی آمیز انداز سے اٹھ کر لہراتے ہوئے کہا۔ ”ہمارے نیک دل دیا زیتونف قابل قدر اور نفیس انسان ہیں۔“

تمام حقارت کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ معلوم ہوتا تھا کہ کرسی صدارت کے کس پاس، جو سحرز مہمان فردکش ہیں، وہ سب کے سب شگفتگی کے عالم میں ہیں اور ان میں سے ہر ایک کچھ نہ کچھ دل لگی کرنے پر تیار ہوا ہے۔ صرغیٹر اور ہیلین میز کے تقریباً آخری سرے پر ایک دوسرے کے پہلو بہ پہلو بھر بلب بیٹھے تھے۔ وہی دبی سکر اپن دونوں کے چہروں کو روشن دتا ہاں بنا رہی تھی۔ اس سکر ہٹ کا سر جی کزج سے کوئی تعلق نہ تھا۔ بلکہ یہ اس امر کا صریح دے رہی تھی کہ دونوں اتنے شرمیلے ہیں کہ اپنے جذبات کا کھل کر اظہار نہیں کر سکتے۔ دوسرے خواہ کتنی ہی باتیں کرتے رہیں، ہنستے رہیں، ایک دوسرے کی ٹانگ گھسیٹتے اور آپس میں دل لگی کرتے رہیں، اعلیٰ اقسام کی رائیگاں شراہیں پیتے رہیں، بھنے گوشت کی قاقیں صاف کرتے رہیں، رنگ برنگی آنکس کریوں سے لطف اندوز ہوتے رہیں، محتاط انداز سے نوجوان جوڑے سے نظریں چراتے رہیں، بظاہر ان پر توجہ نہ دیں اور یوں ظاہر کرتے رہیں جیسے انہوں نے انہیں دیکھا ہی نہیں، بھلے یہ سب کچھ ہو، لیکن کبھی کبھار جو لگا ہیں گھوم پھر کر ذرا کی ذرا انہیں دیکھتیں، ان سے کسی نہ کسی طور پر یہ صاف محسوس ہوتا تھا کہ سر جی کزج کی کہانی، ہنسی ٹھٹھا اور محض ناؤ نوٹس، یہ سب بہانے ہیں اور دراصل تقریب میں موجود ہر شخص کی توجہ کا مرکز یہ جوڑا۔ صرغیٹر اور ہیلین۔ ہے۔

پرنس واسیلی سر جی کزج کی سسکیوں کی نکلیں اتارتا رہا لیکن اس کی نظریں بار بار بھٹک کر اپنی بیٹی پر جا پڑتی اور جب وہ ہنس رہا ہوتا، اس کا چہرہ مہرہ یہ پیغام دے رہا ہوتا: ”فکر کی کوئی بات نہیں۔ سارا معاملہ ٹھیک ٹھاک چل رہا ہے۔ آج رات قطعی فیصلہ ہو جائے گا۔“ آتنا پاؤ لو دنانے نے مدت آمیز انداز سے انگلی اس کی طرف لہر کی تھی کہ اس نے ”ہمارے نیک دل دیا زیتونف“ کا مذاق اڑایا تھا لیکن یہ اوپری بات تھی۔ پرنس واسیلی نے اس کی نگاہوں میں، جو صرغیٹر پر جمی ہوئی تھیں، اپنے مستقبل کے داماد اور اپنی بیٹی کی مسرتوں پر تہنیت کا پیغام پڑھ لیا تھا۔ بڑی پرنس کو راگنائے ماحقہ کرسی پر نشست خاتون کو شراب کا گلاس پیش کرتے ہوئے اندوہ ناک آہ بھری اور تنک عزائم سے اپنی بیٹی کی جانب دیکھا اور اس کی آہ یہ کہتی محسوس ہو رہی تھی: ”مائی ڈیئر، اب میرے اور تمہارے کرنے کے لیے کچھ باقی نہیں رہ گیا۔ بس مے شیریں کی چسکیاں لیتے رہیں۔ اب تو ان نوجوانوں کی باری ہے کہ وہ کھلم کھلا اور اشتعال انگیز انداز سے اپنی مسرتوں کا اظہار کرتے پھریں!“ ”اور میں یہ ساری داہیات گنگو کیوں کر رہا ہوں جیسے مجھے اس میں بہت دلچسپی ہو۔“ ایک سفارت کار نے پریموں کے پر مسرت چہرہ پر طائرانہ نظریں ڈالتے ہوئے سوچا۔ ”خوشی تو وہ ہے!“

جن چھوٹی چھوٹی بے نیکی، بے وقعت اور مصنوعی دلچسپیوں نے محفل کو ایک لڑی میں پرو دیا تھا، ان کے مائیدی کشش کے سادے جذبے نے، جو درخوش شکل اور صحت مند نوجوان ایک دوسرے کے لیے محسوس کر رہے تھے، پالی تھی۔ اور یہ انسانی جنبہ ہر دوسری چیز پر حاوی ہو چکا تھا اور ان کی تمام بنیادی گپ شپ اور اثر کو مات دے چکا تھا۔

چٹکے اور لٹپٹے کھوکھے ہو گئے۔ خبریں پر لطف نہ رہیں۔ جوش و خروش اور گرمی صرف مانگے مانگے اور دھکے دھکی کی تھی۔ نہ صرف مہمانوں کو بلکہ دسترخواں پر تعینات بیروں کو بھی کچھ ایسی محسوس ہو رہا تھا۔ یہ بیرے جب حسین و مدہ جس حسین اور اس کے منور و درخشاں چہرے کو دیکھتے یا جب ان کی نظریں بیئر کے چوڑے چٹکے، سرخ، پرست اور قدرے بے چین خدو خاں پر پڑتیں، انھیں اپنے فرائض انجام دینا یاد نہ ہوتا۔ کچھ یوں نظر آ رہا تھا جیسے شمعوں کی روشنی ان سرور و مطمئن چہروں پر مرکوز ہو گئی ہے۔

بیئر جانتا تھا کہ ان تمام امور کا مرکزی نقطہ وہ خود ہے۔ اپنے اس مقام پر سے خوشی بھی ہو رہی تھی اور کچھ کچھ شرمساری بھی محسوس ہو رہی تھی۔ اس کی کیفیت اس شخص کی تھی جو کسی مصروفیت میں مستغرق ہو۔ اسے کوئی چیز نہ صاف سنائی دے رہی تھی، نہ نظر آ رہی تھی اور نہ اس کے پلے پڑ رہی تھی۔ صرف کبھی کبھار دنیا کے حقیقت سے کچھ غیر مربوط خیارات غیر متوقع طور پر ہلک جھپکنے میں اس کے ذہن میں دوڑ آتے۔

”تو مدہ انجیم کو پہنچ گیا!“ اس نے سوچا۔ ”یہ سب کچھ کیسے ہو گیا؟ اور اتنی غلت سے! اب مجھے معلوم ہو گیا ہے کہ نہ محض اس کی خاطر، نہ محض میری خاطر، بلکہ ہر شخص کی خاطر، یہ لازماً وقوع پذیر ہو ہی جانا چاہیے۔ یہ سب لوگ اس کی امید لگائے بیٹھے ہیں، یہ سب اس کے وقوع پذیر ہونے کے بارے میں اسے پر اعتماد ہیں کہ میں انھیں مایوس نہیں کر سکتا، نہیں کر سکتا۔ لیکن یہ ہو گا کیسے؟ مجھے کچھ معلوم نہیں تاہم یہ ہو گا یقیناً!“ بیئر نے ان جنگلاتی شانوں کو، جو براہ راست اس کی نگاہوں کی زد میں تھے، دیکھتے ہوئے سوچا۔

پھر اچانک اسے احساسِ خجالت نے آگھیرا۔ اسے یہ سوچ سوچ کر کوفت ہونے لگی کہ وہ سب کی نگاہوں کا مرکز ہے، وہ اسے خوش قسمت انسان تصور کرتے ہیں، حالانکہ اس کی شکل و صورت واقعی سی ہے، وہ اسے بیئر، جو اپنی پہلی کوشش میں دبائے بیٹھا ہے، سمجھ رہے ہیں۔ ”لیکن غالباً ہمیشہ ایسے ہی ہوتا آیا ہے اور شاید ہونا بھی ایسے ہی چاہیے۔“ اس نے اپنے آپ کو تسلی دینے کی کوشش کی۔ ”لیکن میں نے کیا کیا تھا جو یہ ہو گیا؟ اس کی شروعات کب ہوئی تھی؟ میں نے ماسکو سے یہاں تک کا سفر پرنس دایلی کی معیت میں کیا تھا۔ اس وقت تک تو ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ اس کے بعد میں نے اس کے گھر میں اپنا ٹھکانا بنالیا۔ بظاہر کوئی ایسی وجہ نہیں تھی کہ میں اس کے گھر میں نہ ٹھہرتا۔ پھر میں اس (ہیلین) کے ساتھ تاش کی بازیاں لگا رہا، اس کا پرس اٹھائے گاڑی میں اس کے ساتھ بھر جاتا رہا۔ اس کی شروعات کب ہوئی؟ یہ سب کچھ کیسے ہو گیا؟ اور یہاں میں اس کے منگیتر کی حیثیت سے اس کے پہلو میں بیٹھا ہوں اور اس کی قربت، اس کی سنوں کے زبردیم، اس کی حرکات و سکنات، اس کے حسن و جمال کو دیکھ رہا، سن رہا اور محسوس کر رہا ہوں۔“ پھر ایک ایک اسے یوں لگا کہ غیر معمولی حسن و جمال کی مالک ہیلین نہیں بلکہ وہ خود ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سب کی نگاہیں اس پر مرکوز ہیں اور اس ہمہ گیر تعریف و تحسین نے اسے شاداں و فرحاں کر دیا۔ وہ سیدھا تن کر بیٹھ گیا، اس نے اپنی گردن اور پراٹھائی اور اپنی خوش قسمتی پر اس کے دل میں لہو پھوٹنے لگے۔

اچانک اسے ایک جانی پہچانی آواز، جو دوسری مرتبہ اس سے مخاطب ہوئی تھی، سنائی دی۔ لیکن بیئر اپنی ہی

سوچوں میں اتنا مستغرق تھا کہ اسے کچھ معلوم نہ ہوا کہ اس سے کیا کہا جا رہا ہے۔

”میں پوچھ رہا ہوں کہ تمہیں بلکونسکی کا آخری خط کب موصول ہوا تھا؟“ پرنس واسیلی نے تیسری مرتبہ اپنا سوال دہرایا۔ ”عزیزم، تم کتنے غائب دماغ ہو۔“

پرنس واسیلی مسکرا کر لگا اور پیئر نے دیکھا کہ کمرے میں موجود تمام اشخاص کی نگاہیں اس پر اور ہیلین پر جمی ہوئی ہیں اور وہ مسکرا رہے ہیں۔ ”خیر، اس سے کیا فرق پڑتا ہے، کیونکہ تمہیں پہلے ہی سب کچھ معلوم ہے؟“ پیئر نے سوچا۔ ”اور حقیقت ہے بھی یہی۔“ اور وہ اپنے بھیسے مانس اور طفلانہ انداز سے مسکرا دیا اور ہیلین بھی مجسم ہو گئی۔

”تمہیں یہ خط کب ملا تھا؟ کیا یہ اول موٹس سے آیا تھا؟“ پرنس واسیلی نے ایک بار پھر پوچھا۔ اس کے پوچھنے کا انداز کچھ اس قسم کا تھا جیسے وہ کوئی جھگڑا طے کرانا چاہتا ہو۔

”لوگ اس طرح کی سسطی اور معمولی باتیں کیوں سوچتے ہیں؟ کیوں کرتے ہیں؟“ پیئر نے بے یقینی سے سہا۔

”جی ہاں، اول موٹس سے،“ پیئر نے آہ بھرتے ہوئے جواب دیا۔

کھانے کے بعد پیئر اور اس کی رفیقہ دوسروں کے پیچھے پیچھے ڈرائنگ روم میں چلے گئے۔ مہمان رخصت ہونے لگے۔ بعضوں نے بوتل رواگنی ہیلین کو خدا حافظ بھی نہ کہا۔ دوسرے اس کے پاس آئے ضرور لیکن انہیں یہ فکر دامن گیر تھی کہ وہ کہیں اس کی توجہ بخیرہ امور سے ہٹانے کے موجب نہ بن رہے ہوں۔ چنانچہ وہ اس کے پاس صرف ایک آدھ منٹ ٹھہرتے، ان سے اجازت چاہتے اور اسے اتنا بھی موقع نہ دیتے کہ وہ انہیں دروازے تک ہی پھوڑے لگے اور خود ہی بہ عجلت اپنے اپنے گھر کی طرف چل پڑتے۔ سفارت کار پر مال خاموشی سے باہر نکل گیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ پیئر کی شادمانی کے مقابلے میں اس کی سفارتی ملازمت بیکار چیز ہے۔ بزرگ جرنیل کی بیوی نے جب اس سے پوچھا کہ ”اب آپ کی ٹانگ کیسی ہے؟“ اس کا پارہ چڑھ گیا اور وہ منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑانے لگا۔

”اُف، یہ بڑھیا کتنی احمق ہے۔“ اس نے سوچا۔ ”ادھر اس ہیلین واسیلیوٹا کو دیکھو، پچاس کی بھی ہو جائے، پھر بھی اس کا حسن ماند نہیں پڑے گا۔“

”میرا خیال ہے کہ مجھے تمہیں ہدیہ تحریک پیش کر ہی دینا چاہیے،“ آنا پاولوونا نے پرنس کو راگنا کا گرم جوش سے بوسے لیتے ہوئے اس کے کان میں کہا۔ ”اگر مجھے یہ کم بخت درویشیت نہ ستاتا تو میں کچھ دیر در رک جاتی۔“

پرنس نے کوئی جواب نہ دیا۔ اپنی بیٹی کو یوں خوش دیکھ کر اس کے دل میں ہوک اٹھی تھی اور وہ جل بھن کر کباب ہو گئی تھی۔

جب مہمان رخصت ہو رہے تھے، آخر کافی دیر تک ہیلین کے ساتھ چھوٹے ڈرائنگ روم میں، جہاں وہ بیٹھے ہوئے تھے، تنہا براجمان رہا۔ گزشتہ چھ ہفتوں کے دوران میں انہیں پیسے بھی کڑ تنہا چھوڑ دیا جاتا رہا تھا لیکن اس نے کبھی اس سے اپنی محبت کا اظہار نہیں کیا تھا۔ اب اسے محسوس ہوا کہ ایسا کرنا اس کا فرض بنتا ہے تاہم اسے فیصلہ کرنے میں دشواری پیش آرہی تھی کہ یہ آخری قدم کیسے اٹھایا جائے۔ اسے مدامت ہونے لگی کہ وہ ہیلین سے

کیوں جز بیٹھا ہے، اس کے پہلو میں بیٹھنے کا حق اس کا نہیں کسی اور کا بنتا ہے۔ اس کے اندر کی آواز کہہ رہی تھی۔
 ”یہ خوشی تمہارے لیے نہیں۔ اس خوشی کا استحقاق ان لوگوں کو پہنچتا ہے جن کے دلوں میں وہ کچھ نہیں جو تمہارے
 دل میں ہے۔“ لیکن اسے بہر حال کچھ نہ کچھ تو کہنا ہی تھا۔ چنانچہ اس نے گفتگو کا آغاز یوں کیا: ”آج کی شام کیسی
 رہی؟ کچھ لطف آیا؟“ اس نے اس کا جواب حسب عادت سادگی سے دیا اور بولی: ”میں نے اپنی زندگی میں اور بھی
 نام دن منائے ہیں لیکن جو مزہ آج کیا، کبھی نہیں آیا۔“

بعض انتہائی قریبی رشتے دار ابھی رخصت نہیں ہوئے تھے۔ وہ بڑے ڈرائنگ روم میں بیٹھے تھے۔ پرنس واسلی
 مرل چال چلتا بیئر کے پاس پہنچا۔ میز اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور بولا کہ خاصی دیر ہو گئی ہے۔ پرنس واسلی نے درشتی
 سے گھور کر اسے یوں استفہامیہ انداز سے دیکھا کہ جیسے اس نے جو کچھ ابھی سنا تھا، وہ اتنا عجیب تھا کہ اسے اپنے
 کانوں پر یقین نہیں آرہا۔ لیکن پھر درشتی کا ردیہ تبدیل ہو گیا۔ پرنس واسلی نے میز کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا، محبت
 بھرے انداز سے مسکرایا اور اسے اپنے قریب بٹھالیا۔

”خیر، ایلینا،“ اس نے دلچسپی اپنی بیٹی سے مخاطب ہو کر پوچھا۔ اس کے استحقاقی لہجے میں وہ دائمی ملاحت
 اور محبت تھی جو ان وادین میں، جو اپنے بچوں کی ان کی شیر خوارگی کے زمانے سے ناز برداری کرتے چلے آئے
 ہوں، فطرتاً موجود ہوتی ہے لیکن پرنس واسلی نے یہ لہجہ دوسرے والدین کی محض نقالی کرتے ہوئے اختیار کیا تھا۔
 اور وہ دوبارہ میز کی جانب متوجہ ہوا۔ ”سرچی کزنج“... ”ملکت کے گوشے“... اس نے اپنی واسکٹ کا اوپر
 کاٹن کھینچتے ہوئے اعادہ کیا۔

میز مسکرا دیا لیکن اس کی مسکراہٹ سے یہ بالکل عیاں تھا کہ وہ یہ بات بخوبی سمجھتا ہے کہ پرنس واسلی کوئی احوال
 سرچی کزنج کے قصے میں قطعاً کوئی دلچسپی نہیں ہے اور پرنس واسلی کو اندازہ ہو گیا کہ میز بات کی تہ تک پہنچ گیا
 ہے۔ معادہ منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑایا اور وہاں سے چل دیا۔ میز کو یوں لگا کہ پرنس واسلی بھی حواس باختہ ہے۔
 میز نے جب اس معمر دنیا دار شخص کو کچھ یوں بدحواس ہوتے دیکھا، اس کے دل پر چوٹ لگی۔ اس نے ہیلین کی
 جانب دیکھا۔ اور وہ بھی بدحواس نظر آئی اور اس کی شکل و صورت یہ کہتے دکھائی دی: ”ہونہ! قصور سراسر تمہارا ہے۔“
 ”اب قدم اٹھانا گزیر ہو گیا ہے لیکن اٹھاؤں تو کیسے اٹھاؤں؟ مجھ میں اس کی ہمت ہی نہیں ہے“ میز نے
 سوچا۔ اب وہ دوبارہ غیر متعلق امور کے بارے میں گفتگو کرنے لگا اور پوچھنے لگا: ”یہ سرچی کزنج کا قصہ کیا ہے؟ میں
 پوری طرح سن نہیں پایا تھا۔“ ہیلین نے مسکرا کر جواب دیا: ”میرا بھی یہی حال ہے۔ میں بھی نہیں سن سکی تھی۔“
 جب پرنس واسلی دوبارہ ڈرائنگ روم میں آیا، اس کی بیوی ایک معمر خاتون کے ساتھ میز کے بارے میں
 نزدیک گفتگو کر رہی تھی۔

”مائی ڈیئر ہر شے تو بہت شاندار ہے لیکن جہاں تک پر مسرت زندگی کا تعلق ہے...“
 ”رشتے افلاک پر طے ہوتے ہیں،“ معمر خاتون نے جواب دیا۔

پرنس واسکی اپنی دھن میں چتا دور ایک کونے میں صوفے پر بیٹھ گیا۔ وہ یوں بن رہا تھا جیسے اسے خواب کی باتیں سنائی ہی نہ دی ہوں۔ اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ اسے اونگھ، گئی ہے۔ اس کا ر جھونے ہی لگا تھا کہ اس نے اپنی آنکھیں کھول دیں۔

”آلائن، ذرا جا کر تو دیکھو وہ کیا کر رہے ہیں،“ اس نے اپنی بیوی سے فرانسسکی میں کہا۔

پرنس دروازے کے قریب گئی۔ اس کی چال میں وقار لیکن بے ہمتائی تھی۔ اس نے جھانک کر چھوٹے ڈرائنگ روم میں دیکھا۔ میٹر اور میسین پہلے کی طرح ڈرائنگ روم میں بیٹھے تھے اور باتیں کر رہے تھے۔

”ہائل، جو پہلے کر رہے تھے،“ اس نے اپنے خاوند کو جواب دیا۔

پرنس واسکی کے ابرو تن گئے۔ اس کا منہ ایک طرف کو جھکا ہوا تھا۔ اس کے رخسار پھڑک رہے تھے اور اس کے چہرے پر وہی بھونڈا اور ناخوشگوار تاثر ابھر آیا تھا جو محض اس کے ساتھ مخصوص تھا۔ اس نے اپنے آپ کو اچھی طرح ہدایا جدیا اور پر عزم چال چلتا خواب میں سے آگے نکل گیا اور چھوٹے ڈرائنگ روم میں داخل ہو گیا۔ وہ پرست غلبت کے ساتھ میٹر کے پاس پہنچا۔ جب میٹر نے اس کے چہرے پر غیر معمولی سرت رقصاں دیکھی، اس کا دل بیٹھ گیا اور وہ خوف زدگی کے عالم میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

”خدا کا شکر ہے!“ پرنس واسکی نے کہا۔ ”ہیگم نے ابھی بھی مجھے سب کچھ بتا دیا ہے!“ اس نے اپنا ایک بازو میٹر کی کمر اور دوسرا اپنی جیب کی کمر کے گرد حائل کر دیا۔ ”میرے عزیز بیٹے ایلینا۔ میں بہت، بہت خوش ہوں!“ اس کی آواز لڑکھڑاہی تھی۔ ”مجھے تمہارے والد سے بہت پیار تھا۔ اور یہ تمہاری بہت اچھی بیوی ثابت ہوگی۔ خداوند تم دونوں پر اپنی برکتیں نازل فرمائے!“

وہ پہلے اپنی جیب اور پھر میٹر سے بغل گیر ہو گیا اور اس نے بوڑھے آدمی کے ہونٹوں سے میٹر کے گال چوم لیے۔ آنسوؤں سے اس کے رخسار سچا بھگ گئے۔

”پرنس، ادھر آنا،“ اس نے آواز دی۔

بڑی پرنس اندر آگئی، اور اس کے بھی آنسو بہنے لگے۔ معمر خاتون نے آنکھوں پر رومیاں رکھ لیا۔ انہوں نے حذر کی باتیں لیں، در میٹر نے ہر ہر میسین کے ہاتھوں پر بوسے ثبت کیے۔ چند ٹاپے بعد انھیں پھر تنہا چھوڑ دیا گیا۔

”یہ سب کچھ ہونا ہی تھا۔ اس کے علاوہ اور کچھ ہو ہی نہیں سکتا تھا،“ میٹر نے سوچا۔ ”چنانچہ یہ سب اچھا سنی ما حاصل ہے کہ جو ہوا اچھا ہوا یا برا ہوا؟ اچھی بات یہ ہے کہ معاملہ اب صاف ہو گیا ہے اور جن شکوک و شبہات نے میرا ناک میں دم کر رکھا تھا، وہ اب ختم ہو گئے ہیں۔“

میٹر چپ چاپ بیٹھ رہا۔ اس نے نئی منگیترا کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام رکھا تھا اور وہ اس کے حسیں و خوش نما سینے کے زیر و بم کا مشاہدہ کر رہا تھا۔

”ہیلین!“ اس نے با آواز بلند کہا اور چپ ہو گیا۔

”اں مواقع پر ہمیشہ کوئی خاص بات کہی جاتی ہے،“ اس نے سوچا لیکن پوری کوشش کے باوجود اسے مطلق یاد نہ آ سکا کہ یہ بات ہے کیا۔ اس نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا اور وہ جھک کر اس کے اور قریب ہو گئی۔ اس کا چہرہ ہنسنے لگا اور گلاب کی طرح سرخ ہو رہا تھا۔

”اے، یہ اتار دو۔۔۔ یہ۔۔۔“ وہ اس کے چہرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔

پیر نے اپنا چشمہ اتار دیا۔ لوگ جب چشمہ اتارتے ہیں، تو ان کی آنکھیں عجیب عجیب نظر کرنے لگتی ہیں۔ پیر نے جب چشمہ اتارا، اس کی آنکھیں عجیب تو نظر آئیں ہی، علاوہ ازیں ان میں بے کسی اور خوف جھلک رہا تھا اور وہ کچھ پوچھتی دکھائی دے رہی تھیں۔ وہ نیچے جھک کر اس کا ہاتھ چومنا چاہتا تھا لیکن وہ اس سے زیادہ تیز نکلی۔ اس نے پاک جھپک طوفانی انداز سے اپنے سر کو جنبش دی، اس کے ہونٹوں کو راستے میں ہی روک لیا اور انھیں اپنے ہونٹوں پر وصول کر لیا۔ اس نے جس بے باکی کا مظاہرہ کیا تھا، اس سے اس کا چہرہ ناگوار طور پر بد ہیئت ہو گیا اور اس تہہ کیل پر پیر کو سخت جھٹکا لگا۔

”اب بچھتاؤ کیا ہوت، جو ہونا تھا ہو چکا، اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ علاوہ ازیں مجھے اس سے محبت ہے،“ پیر نے سوچا۔

”Je vous aime“ اس نے کہا۔ اسے یاد آ گیا تھا کہ ایسے موقع پر کیا کہا جاتا ہے۔

لیکن یہ لحاظ اسے اور دورے محسوس ہو رہے تھے کہ سے اپنے آپ سے شرم آنے لگی۔

چھ ہفتے بعد اس کی شادی ہو گئی اور وہ پیرز برگ میں کاؤنٹ بزدخوف کے محل نما مکان میں، جس کی حال میں ازسرنو تزئین و آرائش کی گئی تھی، منتقل ہو گیا۔ لوگ کہتے تھے کہ وہ بڑا بھانگوان ہے کہ حسین و جمیل بیوی اور کمرہ داروں کا مالک ہے۔

3

دسمبر 1805 کے دوران میں معمر پرنس نکول کی آندر یوویچ بلکونسکی کو پرنس واسیلی کا خط ملا۔ اس میں اس نے اطلاع دی تھی کہ وہ اپنے بیٹے کی معیت میں اس سے ملاقات کرنے آرہا ہے۔ ”میرے معزز محسن، میں انسپیکشن کے سلسلے میں دورے پر روانہ ہو رہا ہوں۔ ستر بہتر میل کا چکر ضرور پڑے گا لیکن خوشی کا مقام یہ ہے کہ آپ سے ملاقات ہو جائے گی،“ پرنس واسیلی نے لکھا تھا۔ ”میرا بیٹا اناطول، جو واپس فوج میں جا رہا ہے، میرے ساتھ ہوگا۔ اس کے دل میں آپ کی ذات ستودہ صفات کے لیے جو عزت و احترام ہے، اس میں وہ کسی طرح بھی اپنے باپ سے کم نہیں۔ مجھے امید ہے کہ آپ اسے اس کا ذاتی طور پر اظہار کرنے کے لیے اجازت مرحمت فرمائیں گے۔“

”میرے خیال میں ماری کو مخلوط محفلوں میں لے جانے کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ رشتے خود ہی چلے آ رہے ہیں۔“

”میں تم سے محبت کرتا ہوں!“

ہیں، کوچک پرنس نے خبر سن کر ناقابل اندیشی سے کہا۔

پرنس نکولائی آندر یوویچ کی پیشانی پر بل پڑ گئے لیکن اس نے منہ سے کچھ نہ کہا۔

خط موصول ہونے کے دو ہفتے بعد پرنس واسیلی کے عازم اپنے آقا کی آمد سے ایک روز پہلے ہی پہنچ گئے۔ اس سے اگلے دن وہ خود بھی اپنے بیٹے کے ہمراہ نمودار ہو گیا۔

پرنس واسیلی کے کردار کے بارے میں سن رسیدہ بلکونسکی کی رائے کبھی اچھی نہیں رہی تھی۔ اور خاص طور پر ماضی قریب میں پاؤں اور الیکساندر کے عہد ہائے حکومت میں پرنس واسیلی کو جو بلند مراتب اور اعزازات حاصل ہوئے تھے، انہوں نے اس کی بدگمانی میں مزید اضافہ کر دیا تھا۔ خط میں جو ڈھکے چھپے اشارے تھے اور جن کا کوچک پرنس نے برملا اظہار کر دیا تھا، انھیں پڑھ کر اس کے کان کھڑے ہو گئے اور وہ اس کی آمد کا مقصد سمجھ گیا۔ اس کے متعلق اس کی رائے تو پہلے ہی اچھی نہیں تھی، اور اب وہ معاندانہ حقارت میں تبدیل ہو گئی۔ چنانچہ وہ جب بھی اس کا ذکر کرتا، اس کے نتھنے پھڑکنے لگتے اور وہ غیظ و غضب سے غرائے لگتا۔

جس روز پرنس واسیلی کی آمد متوقع تھی، پرنس نکولائی آندر یوویچ کا مزاج خاص طور پر براہم ہو رہا تھا۔ اور وہ غصے سے پھنکار رہا تھا۔ آیا اس کا مزاج اس لیے براہم تھا کہ پرنس واسیلی آرہا تھا یا یہ کہ وہ پہلے ہی کسی بات پر جھلایا ہوا تھا اور متوقع آمد نے جلتی پر تیل کا کام کیا تھا، بہر حال حقیقت خواہ کچھ ہی ہو، امر واقعہ یہ ہے کہ وہ آگ بگولا ضرور ہو رہا تھا اور اس صبح تین پہلے ہی میر عمارات کو مشورہ دے چکا تھا کہ وہ پرنس کی خدمت میں رپورٹ پیش کرنے کی حماقت نہ کرے۔

”آپ سن رہے ہیں تاکہ وہ کیسے چل رہے ہیں؟“ تین نے میر عمارات کی توجہ پرنس کے پاؤں کی چاب کی طرف دلاتے ہوئے کہا۔ ”کیسے دھپ دھپ ن کی ایزی سیدھی نیچے آرہی ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ اس کا مطلب کیا ہے۔“

تاہم سن رسیدہ پرنس نے اپنی ٹوپی اور کوٹ، جس کا اسٹرسموری اور جس کے کالر کا رنگ سیاہ تھا، پہنا اور حسب معمول نوبے سیر کے لیے نکل گیا۔ گزشتہ روز برف باری ہوئی تھی اور جس پگڈنڈی کے ساتھ ساتھ پرنس نکولائی آندر یوویچ گرین ہاؤسوں کی طرف جاتا تھا، اس کی صفائی ہو چکی تھی۔ برف میں کہیں کہیں جھاڑو کے پھرنے کے نشانات نظر آرہے تھے اور ایک جگہ جہاں برف کا کنارہ ڈھلک گیا تھا (ان کناروں نے پگڈنڈی کے دونوں اطراف حد بندی کر رکھی تھی)، پیچھے بھنسا ہوا تھا اور اسے یوں کاتوں و ہیں چھوڑ دیا گیا تھا۔ پرنس گرین ہاؤس، زرعی نیم غلاموں¹³ کے کچے کچے مکانات اور بیرونی عمارتوں¹⁴ کے بیکوں بیچ چلا رہا۔ اس کی پیشانی پر شکنیں اور دبا ہوا پرتالے پڑے ہوئے تھے۔

”کیا برف گاڑی (سلیج) گزر سکتی ہے؟“ اس نے اپنے سٹیوارڈ سے پوچھا۔ اس کا سٹیوارڈ شکل و صورت کے اعتبار سے اپنے آقا سے مشابہت رکھتا تھا اور چہرے بشرے سے معزز شخص دکھائی دیتا تھا۔ وہ گھر کی طرف واپس

کے دوران میں اس کے ہم رکاب تھا۔

”یوزر ایکسی لینس، برف خامی گہری ہے۔ میں شاید اس سڑک (ایونیو) کی صفائی کر رہا ہوں۔“

پرنس نے اپنے سر کو جنبش دی اور پورچ کی طرف چل دیا۔

”خداوند کا شکر ہے!“ سٹیوارڈ نے سوچا۔ ”طوفان باد و باران گزر گیا ہے!“

”یوزر ایکسی لینس، گاڑی پر گز رنا خاصا دشوار ہوگا۔“ سٹیوارڈ نے مزید کہا۔ ”یوزر ایکسی لینس، سنا ہے کہ کوئی

وزیر آپ سے ملاقات کرنے تشریف لا رہے ہیں۔“

پرنس واپس مڑا اور سٹیوارڈ کو آتش بارنگاہوں سے دیکھنے لگا۔

”کیا؟ وزیر؟ کیسا وزیر؟ تمہیں یہ حکم کس نے دیا تھا؟“ وہ اپنی کمرخت اور تنگی آواز میں دہاڑنے لگا۔ ”تم میری

جی، پرنس، کے لیے تو سڑکیں صاف نہیں کراتے لیکن وزیر کے لیے ضرور کرتے ہو! میں کسی وزیر شہزیر کو نہیں جانتا۔“

”یوزر ایکسی لینس، میں نے سوچا۔“

”تم نے سوچا!“ پرنس چلا۔ اس کی گفتگو لحظہ بہ لحظہ تیز تر اور بے ربط ہوتی جا رہی تھی۔ ”تم نے سوچا!۔“

حرام زدو! لچو! لنگو!... سوچنا میں تمہیں سکھاؤں گا!“

اس نے اپنی چھتری اوپر اٹھائی، اسے جھمایا اور اگر سٹیوارڈ آل پانچ جمبلی طور پر پک کر ایک طرف نہ ہو جاتا،

تو اس نے اسے اس پر ضرور برسا دیا ہوتا۔

”تم نے سوچا!... لچو! لنگو!“ پرنس تیزی سے دہاڑا۔

آل پانچ نے ضرب سے بچنے کے لیے جس بے باکی کا مظاہرہ کیا تھا، اس پر وہ سخت شرمندہ تھا۔ وہ پرنس

کے قریب آیا اور عاجزی سے اپنا گنجا سر اس کے سامنے جھکا دیا۔ پرنس کو اس کی شاید یہی ادا بھانگی۔ وہ زبانی کلامی

”لچو! لنگو! سڑک پر دوبارہ برف بچھا دو!“ کی گردان کرتا رہا لیکن اس نے اپنی چھتری دوبارہ اوپر نہ اٹھائی بلکہ تیز

تیز قدم اٹھاتا مکان میں داخل ہو گیا۔

پرنس ماریا اور، دموزیل بوغین کو معصوم تھا کہ آج پرنس کا مزاج سخت براہم ہے، پھر بھی انہوں نے ذرے

پہلے اس کا انتظار کرنا مناسب سمجھا۔ مادموزیل کے چہرے پر بے نیازی اور شکستگی، جو یہ کہتی محسوس ہو رہی تھی: ”مجھے

کچھ معلوم نہیں، میں بالکل وہی ہوں جو کہ عام طور پر ہوتی ہوں،“ رقص کر رہی تھی۔ پرنس ماریا کا رنگ فق اور اس

کے دل پر خوف سوار تھا۔ اس نے اپنی نگاہیں نیچے جھکائی ہوئی تھیں۔ پرنس ماریا کے لیے ایک مصیبت اور تھی۔ وہ

جانتی تھی کہ ایسے مواقع پر اسے مادموزیل بوغین کا رویہ اپنانا چاہیے لیکن وہ ایسا کرنے سے معذور تھی۔ ”گر میں

جھوٹ موٹ یہ ظاہر کروں کہ مجھے ان کے مزاج کی برہمی کا علم ہی نہیں، تو وہ یہ سمجھیں گے کہ مجھے ان سے کوئی

بہتر دی نہیں!“ اس نے سوچا۔ ”اور اگر میں کچھ اس طرح کا رویہ اختیار کر لوں کہ خود میرا مزاج درست نہیں تو وہ یہ

فرمانیک کے (اور جیسا کہ وہ اکثر فرماتے رہتے ہیں) کہ میں خواہ مخواہ مت بھڑکے پھر رہی ہوں۔“

پرنس نے اپنی بیٹی کے ڈرے سہے چہرے پر نگاہ ڈالی اور اس کے نتھنے پھڑپھڑانے لگے۔

”اجت!“ وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑایا۔ ”اور وہ دوسری کہاں ہے؟ یہاں پہلے ہی کھسر پھسر ہو رہی ہے۔“ اس نے قیاس کے گھوڑے دوڑائے اور ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ جب اسے کمرے میں کوچک پرنس نہ دکھائی دی تو بولا:

”پرنس نہیں آئی؟ کہاں چھپ گئی ہے؟“

”ن کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے،“ مادموزیل بوغین نے اپنے چورے چہرے پر مسکراہٹ بکھیرتے ہوئے کہا۔ ”وہ آج نہیں آسکیں گی۔ ان کی حالت کے پیش نظر یہ بات بالکل فطری ہے۔“

”اونہہ، ہونہہ۔ اچھا، ہا!“ پرنس بڑبڑایا اور کرسی پر بیٹھ گیا۔

اسے محسوس ہوا کہ اس کی پلیٹ صاف نہیں ہے۔ اس نے اس پر ایک دھبے کی طرف اشارہ کیا اور اسے اٹھا کر پرے پھینک دیا۔ تھون نے اسے راستے میں ہی دیوچ لیا اور بٹلر کے حوالے کر دیا۔

کوچک پرنس کی طبیعت خراب نہیں تھی لیکن اسے پرنس سے اتنا خوف تھا کہ جب اسے معلوم ہوا کہ کراچ اس کا مزاج بے حد خفا ہے، اس نے کئی کانٹے کا تہیہ کر لیا۔

”نیرے بیٹ میں جو بچہ ہے، مجھے اس کا خوف کھائے جا رہا ہے!“ اس نے مادموزیل بوغین سے کہا۔ ”نہہ، جانے اس خوف کا کیا نتیجہ نکلے!“

عام طور پر کوچک پرنس پر مسلسل اپنے خسر کا ہوا سوار رہتا۔ وہ اس سے خوف ہی نہیں، گھن بھی کھاتی تھی لیکن اس پر خوف اس بری طرح سوار تھا کہ اسے خود بھی یہ احساس نہ ہو سکا کہ وہ اسے ناپسند کرتی ہے۔ پرنس اس ناپسندیدگی کا رد عمل ناپسندیدگی سے ظاہر کرتا تھا لیکن اس کی یہ ناپسندیدگی عقارت کے سات پردوں تلے چھپی رہتی تھی۔ جوں جوں پرنس بالذات کی زندگی سے مانوس ہوتی گئی، توں توں وہ مادموزیل بوغین کی خاص طور پر گرویدہ ہوتی چلی گئی۔ وہ اپنے دن اس کی صحبت میں گزارتی، راتوں کو اسے اپنے کمرے میں سونے کی دعوت دیتی، اکثر اس کے ساتھ اپنے خسر کی باتیں کرتی اور اسے (خسر کو) اپنی نکتہ چینی کا ہدف بناتی۔

”mon prince، آج ہمارے ہاں مہمان شریف لا رہے ہیں،“ مادموزیل نے اپنی گلابی انگلیوں سے اپنا ڈزنیپکس (napkin) کھولتے ہوئے کہا۔ ”ہیز، کیسی لیکسی کوراگن اور ان کا صاحب زادہ؟“ اس نے استفہامی انداز سے مزید کہا۔

”اخنہہ۔“ یہاں کیسی لیکسی کتے کا ہڈا ہے۔ اس کی اولیں ملازمت اسے میں نے ہی دلائی تھی،“ پرنس نے ناک بھونچے چڑھاتے ہوئے کہا۔ ”اور اس کا بیٹا یہاں کیوں آ رہا ہے، مجھے اس کی کوئی ٹنگ نظر نہیں آئی۔“ پرنس لساوٹا کارلوڈنا اور پرنس ماریا کو اس کی کوئی سن گن ہو تو ہو، مجھے بالکل معلوم نہیں کہ وہ اپنے بیٹے کو یہاں کیوں لا رہا ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ وہ یہاں آئے۔“ اور اس نے اپنی بیٹی کی طرف، جس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا، دیکھا۔

• مائی پرنس (محترم پرنس)

”تمہاری طبیعت ٹھیک ہے؟ کہیں تم اس ڈویژن کا جیسا کہ اس گھن چکر آل پاچ نے آج صبح اسے پکارا تھا، رعب تو طاری نہیں ہو گیا؟“

”ہیں، mon pere۔“

مادرموزیل بوغین نے گفتگو کے لیے جس موضوع کا انتخاب کیا تھا، اس میں اگرچہ اسے کامیابی نہیں ہوئی تھی، پھر بھی اس نے ہمت نہ ہاری بلکہ گریں ہاؤسوں اور ایک پھول کی، جو ابھی ابھی کھل رہا تھا، خوبصورتی کے بارے میں عظمت، انداز سے باتیں کرتی رہی اور جب پرنس نے اپنا سوپ ختم کیا، وہ خاصا ٹھنڈا پڑچکا تھا۔

کھانے کے بعد وہ اپنی بہو سے ملنے چلا گیا۔ کوچک پرنس ایک چھوٹی میز کے سامنے بیٹھی تھی اور اپنی خادمہ کے ساتھ گپ شپ کر رہی تھی۔ اپنے خسر کو دیکھ کر اس کا رنگ فق ہو گیا۔

کوچک پرنس خاصی تبدیل ہو چکی تھی۔ اب وہ خوش شکل نہیں بلکہ بد صورت نظر آ رہی تھی۔ اس کے رخسار پچک چکے تھے، ہونٹ اکڑ گئے تھے اور آنکھیں اندر دھنس رہی تھیں۔

”جی ہاں، طبیعت کچھ بوجھل سی ہے۔“ اس نے پرنس کے سوال کے جواب میں کہا۔

”کچھ چاہیے تو بتاؤ۔“

”non, merci, mon pere“

وہ باہر نکل گیا اور سیدھا استقبالیہ میں چلا گیا۔ یہاں آل پاچ سر جھکائے کھڑا تھا۔

”سڑک پر دوبارہ برف دھکیل دی گئی ہے؟“

”جی ہاں، پورے ایکسپریس لینسی۔ خدا کے لیے مجھے معاف فرمادیں۔ یہ میری تری حماقت تھی۔“

پرنس نے غیر فطری انداز سے قہقہہ لگاتے ہوئے اس کی بات کاٹ دی۔ ”ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔“ اس نے اپنا ہاتھ اس پاچ کی طرف بڑھ دیا تاکہ وہ اسے جوم سکے۔ اور وہ اپنے سٹڈی روم میں چلا گیا۔

اس شام پرنس واسیلی پہنچ گیا۔ سہیہ دار سڑک پر کوچا انوں اور نوکروں چا کر دن نے اس کا استقبال کیا۔ وہ جیسے چلاتے اس کی برف گاڑیاں اس سڑک پر، جس پر جان بوجھ کر برف بچھائی گئی تھی، دھکیلتے مکان کے ایک بازو کی جانب لے گئے۔

پرنس واسیلی اور اناطول کو علیحدہ علیحدہ پارٹمنٹوں میں پہنچا دیا گیا۔

اناطول نے اپنا اوور کوٹ اتارنا، روٹوں ہاتھ کو لھوں پر رکھے اور بے دھیانی سے مسکراتے، اپنی خوبصورت غزالی آنکھیں میز کے، جس کے سامنے وہ بیٹھ چکا تھا، ایک کونے پر جمادیں۔ وہ سمجھتا تھا کہ اس کی ساری زندگی عیش و تفریح کا، جو کوئی نہ کوئی شخص کسی نہ کسی وجہ کی بنا پر اسے بہم پہنچانے کے لیے مجبور ہے، غیر ختم سلسلہ ہے۔

”مائی قار (اما جان)“

”کچھ نہیں، شکریہ اما جان۔“

چنانچہ وہ ایک کھڑبڑھے اور ایک بد صورت دوشیزہ سے، جسے وراثت میں خطاب اور ڈیڑھروں دولت ملنا تھی، جو ملنے آیا تھا، تو اس ملاقات کو بھی وہ اسی انداز سے دیکھتا تھا۔ ”ممکن ہے کہ یہ سب کچھ بہت اچھا بلکہ شاید دلچسپ بھی ثابت ہو،“ وہ قیاس آرائیاں کر رہا تھا۔ ”اگر اس کے پاس واقعی دولت کے اعتبار ہیں، پھر اس کے ساتھ شادی کرنے میں ہرج ہی کیا ہے؟ دولت کوئی کھانے کا سودا تو ہے نہیں۔“

اس نے نہایت توجہ اور نفاست سے، جو اس کی فطرت ثانیہ بن چکی تھی، شیوہ بنائی، اپنے بدن پر سینٹ جیمز اور اپنے چہرے پر اپنی مخصوص شگفتگی اور زندہ دلی، جو ہر شخص کا دل سودھ لیتی تھی، سچائے اپنے باپ کے کمرے کی طرف چل پڑا۔ دو دروی پوش ملازم پرنس واسلی کو، جو اپنے کرد و پیش مختلف اشیا کو بہت دلچسپی اور اشتیاق سے دیکھ رہا تھا، لباس پہنا رہے تھے۔ جب اس کا بیٹا کمرے میں داخل ہوا، اس نے بہ طیب خاطر اپنی گردن یوں ہلائی جیسے وہ یہ کہہ رہا ہو: ”خوب امیری بھی یہی خواہش تھی کہ تم بالکل اسی طرح نظر آؤ۔“

”اباجان، مذاق چھوڑیں۔ یہ بتائیں، کیا وہ واقعی بہت کر رہا نظر ہے؟ جی؟“ اناطوں نے دریافت کیا۔ معلوم ہوتا تھا کہ سفر کے دوران میں وہ جس موضوع پر ایک سے زیادہ مرتبہ گفتگو کر چکے تھے، وہ اس کا سلسلہ دوبارہ شروع کر رہا ہے۔

”دیکھو، کافی کچھ کہا جا چکا ہے اب ان قصوں قصوں کو چھوڑو! اہم بات یہ ہے کہ تم بزرگ پرنس کے ساتھ حزم و احتیاط اور حترام کا رویہ اپنانے کی کوشش کرو۔“

”اگر اس نے تمہارا نفیستی کی، میں چلا،“ اناطول نے کہا۔ ”یہ بڑھے میری برداشت سے باہر ہیں۔ ہونہا“

”یا اور کھو کہ تمہارا سب کچھ یہیں داؤ پر لگا ہوا ہے۔“

دو ایسٹ انڈیا کمپنیوں کے کمرے میں نہ صرف وزیر اور اس کے بیٹے کی آمد کی اطلاع پہنچ چکی تھی بلکہ دونوں کا حلیہ بھی تفصیل سے بیان کیا جا چکا تھا۔

پرنس مار یا اپنے کمرے میں تباہی مٹھی تھی اور اپنی گھبراہٹ پر قابو پانے کی بے سود کوشش کر رہی تھی۔ ”انہوں نے خط کیوں لکھا تھا، سائے اس بارے میں مجھے کیوں بتایا تھا؟ ایسا کبھی نہیں ہو سکتا!“ اس نے آئینے میں اپنی شکل دیکھتے ہوئے اپنے آپ سے کہا۔ ”میں ڈراما گرام میں کیسے جاؤں گی؟ اگر وہ مجھے پسند آئی جائیں، پھر بھی میں ان کے ساتھ نظری رویہ اختیار نہیں کر سکیں گی۔“ اس کا اپنا باپ اسے کن ٹکا ہوں سے دیکھے گا، اس کا محض تصور ہی اس پر ہول طاری کرنے کے لیے کافی تھا۔

کوچک پرنس اور مادموزیل بوئین کو خادمہ ماسٹا کی وساطت سے وزیر کے بیٹے کے بارے میں ضروری معلومات پہلے ہی حاصل ہو چکی تھیں۔ وہ بہت خوش شکل تھا۔ اس کے رخسار گلابی اور ابرو سیاہ تھے۔ باپ اپنے پاؤں گھسیٹ گھسیٹ کر بہت مشکوں سے میٹھیوں چڑھا تھا جب کہ صاحب زادہ مثل عقاب پھرتا اور سوختا تھا۔ وہ ایک وقت میں تین تین میٹھیوں پھلا گتا جا رہا تھا۔ اس رپورٹ کے موصول ہونے کے بعد کوچک پرنس اور

مادامزلی بوغین پرنس ماریا کے، جسے غلام گردش سے ان دونوں کی جوڑیلی باتوں کی آواز ازیں چبھتی ہی سنائے دینے لگی تھی، کمرے کی طرف چل پڑیں۔

”ماری، پتا ہے وہ لوگ آگئے ہیں؟“ کوچک پرنس نے بطخ کی بھدی چال چلتے اور دھڑام سے آرام کریں پر گرتے ہوئے کہا۔

وہ صبح کے وقت عام طور پر جس قسم کا ڈھیلا ڈھالا گاڈن پہنا کرتی تھی، اب وہ اس میں لمبوس نہیں تھی بلکہ اب اس نے اپنا بہترین ڈریس زیب تن کر رکھا تھا۔ اس نے اپنے بال بنانے میں خاصا وقت صرف کیا تھا اور انہیں خوبصورت بنانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ اس کے چہرے پر زندہ دلی اور شگفتگی جھلک رہی تھی۔ تاہم وہ اپنے ڈھیلے ڈھالے اور پیچھے خدو خال کو چھپانے میں ناکام رہی تھی۔ اگرچہ وہ اسی انداز سے نئی ٹھنی تھی جس طرح بن ٹھن کر وہ پیئرز برگ کے اعلیٰ طبقوں میں گھوما کرتی تھی لیکن اس کی یہ نوازی اس کے کسی کام نہ آئی۔ صاف نظر آرہا تھا کہ وہ اپنی کشش کھو چکی ہے۔ اس کے برعکس مادام بوغین نے اپنے لباس اور طے میں کچھ اس قسم کی تبدیلیاں کی تھیں کہ وہ کھٹکتی نہیں تھیں اور یوں اس کا تروتازہ اور خوش شکل چہرہ اور بھی پرکشش ہو گیا تھا۔

”جان، تم نے کپڑے تبدیل نہیں کرو گی؟“ اس نے اپنی گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔ ”زیپر پرنس، ابھی نوکر چاکر اطلاع دینے آجائیں گے کہ مہمان ڈرائنگ روم میں تشریف لے آئے ہیں۔ ہمیں چند منٹ بعد ادھر جانا ہو گا اور ادھر تم ہو کہ تم نے اپنا حلیہ درست کرنے کے لیے کچھ بھی نہیں کیا!“

کوچک پرنس اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ اپنی مائندہ کو بلانے کے لیے اس نے گھنٹی بجائی اور خود شاں و فرحاں اپنا داروغہ لڑنے لگی کہ پرنس ماریا کے لیے کون سا لباس مناسب رہے گا اور یہ اسے کس طرح پہنایا جائے گا۔

ایک تو پرنس ماریا کی خودداری کو اس بات پر نہیں پہنچتی تھی کہ جو شخص اس کے رشتے کا امیدوار بن کر آیا ہے اس کی آمد پر اس پر بوکھلاہٹ اور گھبراہٹ طاری ہو گئی ہے۔ لیکن اس سے بھی زیادہ دکھ کی بات یہ تھی کہ اس کی دونوں سہیلیاں یہ سمجھتی تھیں کہ اس کا اس کیفیت میں گزرنا مذہبی امر ہے۔ اگر وہ انہیں بتاتی کہ اسے اپنے آپ پر اور ان دونوں پر کتنی شرم آرہی ہے تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ وہ کھلم کھلا اپنے اضطراب کا اقرار کر رہی ہے۔ اگر وہ ڈریس کے بارے میں ان کی تجاویز اور مشوروں کو ٹھکراتی ہے تو اس کے معانی یہ ہوں گے کہ وہ اس سے دل لگی کا سلسلہ تادیر جاری رکھیں گی اور اپنی تجاویز پر اصرار کرتی رہیں گی۔ اس کا چہرہ تھمتھانے لگا، اس کی خوبصورت آنکھیں دھندلا گئیں، اس کے گالوں پر سرخ دھبے نمودار ہو گئے اور جب اس نے مادام بوغین اور لسا کے حکم کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا، اس کے چہرے پر وہی غیر دلکش تاثر ابھر آیا، جسے وہ اکثر اپنے اوپر طاری کر لیا کرتی تھی اور جو اس بات کا مظہر ہوتا تھا کہ وہ یہ سمجھتی ہے کہ اس کے ساتھ بڑی زیادتی کی جارہی ہے۔ دونوں خواتین چاہتی تھیں کہ اس کی اس طرح آرائش کر دی جائے کہ وہ خوش شکل نظر آئے اور اس معاملے میں وہ بالکل قلعہ تھیں۔ اس کی شکل و صورت اتنی معمولی تھی کہ ان کے وہم و گمان میں بھی نہ تھی یہ نہیں آیا تھا کہ وہ ان کی رقیب بن سکتی ہے۔ چنانچہ وہ بہ طیب خاطر اسے

ڈریس پہنانے میں مصروف ہو گئیں۔ عام خواتین کی طرح وہ بھی بہت بھولی بھالی تھیں اور اس خیالِ عام میں مبتلا کہ لباس چہرے کو خوش شکل اور پرکشش بنا سکتا ہے۔

”مائی ڈیر، یہ ڈریس تم پر بالکل نہیں پھرتا،“ لسانے پرے ہتے اور پرنس، ریا کو ایک پہلو سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”تمہارے پاس عنابی ڈریس ہے۔ وہ منگوالو۔ میں بالکل سچ کہہ رہی ہوں۔ عین ممکن ہے کہ آج کا دن تمہاری زندگی میں اہم موڑ ثابت ہو۔ رہا یہ ڈریس، اس کا رنگ بہت ہلکا ہے۔ یہ تم پر بالکل نہیں پھرتا۔ یہ قطعی غیر موزوں ہے!“

قصور دراصل ڈریس کا نہیں تھا۔ سچی بات یہ ہے کہ پرنس ماریا کے نہ تو چہرے میں اور نہ اس کے بات سرائے میں کسی قسم کی کوئی خوبصورتی تھی۔ لیکن مادموزیل بوغین اور کوچک پرنس کی سمجھ میں یہ نکتہ نہ آ سکا وہ اب بھی یہ سمجھتی تھیں کہ اگر اس کے بالوں میں کنگھی کر کے انھیں ذرا اوپر اٹھا دیا جائے، ان میں نیلارین لگا دیا جائے، اور اس کے عنابی ڈریس پر، ذرا نیچلی جانب، نیلا پنکا یا اسی قسم کی کوئی دوسری چیز باندھ دی جائے تو سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ وہ یہ حقیقت فراموش کر گئیں کہ ڈریس سبھی چہروں اور شکلوں صورتوں میں کوئی تبدیلی نہیں لائی جاسکتی۔ زیب و زینت اور تزئین و آرائش میں خواہ کتنی ہی ترامیم کیوں نہ کر دی جائیں، چہرے میں کوئی انقلاب برپا نہیں کیا جاسکتا، وہ ویسے کا ویسا مسمولی اور قابلِ رحم رہے گا۔ وہ جو تبدیلی چاہتیں، پرنس ماریا چپ چاپ مان جاتی۔ درحقیقت تبدیلیوں کے بعد جب اس کے سر کے ہاں وہ پراٹھا دیے گئے (اس اسلوب نے نہ صرف اس کی شکل و صورت بالکل تبدیل کر دی بلکہ وہ پہلے سے بھی بدتر ہو گئی)، اسے عنابی ڈریس پہنا دیا گیا اور اس کی کمر کے گرد پنکا باندھ دیا گیا۔ کوچک پرنس نے اس کے گرد وہ چکر لگائے، اس کے ڈریس کی ایک آدھ شکن درست کی، اپنے ننھے سنے ہاتھ سے اس کے پٹکے کو ذرا ادھر ادھر کھینچا اور تب سر جھکائے اس نے پہلے ایک اور پھر دوسرے پہلو سے اس کا تنقیدی جائزہ لیا۔

”نہیں، بات نہیں بنی،“ اس نے پورے یقین سے کہا اور عالم مایوسی میں اپنے ہاتھ اوپر اٹھا دیے۔ ”نہیں، ماری، نہیں۔ یہ ڈریس تمہیں بالکل نہیں چلتا۔ مجھے تو تم اپنے روزمرہ کے سرمئی ڈریس میں زیادہ بھلی معلوم ہوتی ہو۔ کاتیا، میری خاطر ذرا روڑ کر جانا،“ اس نے خادمہ سے مخاطب ہو کر کہا۔ ”جاؤ، پرنس کا سرمئی لباس لے آؤ۔ مادموزیل بوغین، تم دیکھتی جانا کہ میں اس کے ذریعے کیا کیا کمال دکھاتی ہوں؟“ اس نے فنی چابک دستی کا بیچلی لطف لیتے ہوئے کہا۔

جب کا تیا مطلوبہ ڈریس لے آئی، پرنس ماریا آئینے کے سامنے بے حس و حرکت بیٹھی رہی۔ اس کی نگاہیں اپنے چہرے پر بیوست تھیں اور وہ اپنی اشک آلود آنکھوں اور کپکپاتے لبوں کو دیکھ رہی تھی۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ وہ ابھی مردے کی۔

”ڈیر پرنس، صبر! مادموزیل بوغین نے کہا۔ ”ذرا ایک کوشش اور کر لینے دیں۔“

کوچک پرنس نے خادمہ سے ڈریس لیا اور پرنس ماریا کے پاس آ گئی۔

”اب ہم سادہ لیکن دلکش چیز آزمائیں گے“ اس نے کہا۔

تین آوازیں۔ کوچک پرنس کی، مادسوزیل بوغیوں کی اور کاتیا کی، جو کسی بات پر خواہ مخواہ ہنسے جا رہی تھی۔ آپس میں یوں کھل مل کر شگفتہ شور و غل پیا کر رہی تھیں جیسے پرندے خوشی کے عالم میں چہچہاتے ہیں۔

”نہیں، مجھے اکیس چھوڑ دیں“ پرنس ماریا نے کہا۔

اس کی آواز میں اتنی گھبرتا، اتنا کرب تھا کہ چھب ہٹ یک دم ختم ہو گئی۔ وہ ان موٹی موٹی، خوبصورت اور متکثر آنکھوں کو، جو آنسوؤں سے پریر تھیں اور جو مستحیاناہ انداز سے ان کی جانب دیکھ رہی تھیں، ہٹنے لگیں۔ ان تینوں کو احساس ہو گیا کہ مزید اصرار نہ صرف بیکار ہے بلکہ ظلم کے مترادف ہے۔

”اچھا، اور کچھ نہیں تو کم از کم اپنے بالوں کا سٹائل ہی تبدیل کرالو“ کوچک پرنس نے کہا۔ ”میں نے تمہیں بتایا بھی تھا“ اس نے مل مت انگیز انداز سے، مادسوزیل بوغیوں سے مخاطب ہو کر کہا۔ ”کہ ماریا کا چہرہ ان چہروں میں سے ہے جن پر بالوں کا یہ اسلوب یا نکل نہیں پھبتا۔ ذرا بھی نہیں۔ اب ذرا مہربانی کرو اور اسے تبدیل کردو۔“

”نہیں، نہیں، جاؤ اور مجھے میرے حال پر چھوڑ دو، میرے لیے یہ سب کچھ بے معنی ہے،“ روتی چلاتی آواز سنائی دی۔

مادسوزیل بوغیوں در کوچک پرنس کو اپنے دلوں میں یہ اعتراف کرنا پڑا کہ اس سوانح میں پرنس، ماریا کی شکل و صورت بالکل معمولی بلکہ معمولی سے بھی کہیں بدتر دکھائی دیتی ہے۔ لیکن اب وقت ہاتھ سے نکل چکا تھا اور کچھ نہیں کیا جاسکتا تھا۔ وہ انہیں ایسی نگاہوں سے دیکھ رہی تھی جن سے وہ بخوبی آشنا تھیں۔ یہ نگاہیں، نہائی فکر مند اور اداس تھیں۔ ان نگاہوں سے وہ خوف زدہ نہ ہوئیں (خوف ایک ایسے جذبہ تھا جسے ماریا کبھی کسی کے دل میں پیدا نہ کر سکی)، لیکن وہ اتنا ضرور جانتی تھیں کہ جب وہ ان نگاہوں سے دیکھتی ہے اس کی زباں گنگ اور اس کا رویہ بے لوج ہو جاتا ہے۔

”تم اسے تبدیل کر لوگی، کر لوگی نا؟“ کسانے کہا اور جب پرنس ماریا نے کوئی جواب دیا، وہ کمرے سے باہر نکل گئی۔

پرنس ماریا کو تنہا چھوڑ دیا گیا۔ اس نے سہاکی درخواست پر غل نہ کیا۔ اس نے نہ صرف اپنے بالوں کو جوں کا توں رہنے دیا بلکہ اپنی شکل بھی آئینے میں نہ دیکھی۔ اس نے اپنے بازو بے چارگی کے عالم میں اپنے پہلوؤں پر گرادیے، آنکھیں جھکا کر نیچے بیٹھ گئی اور سوچنے لگی۔ اس کے خیالوں میں ایک ایسے خاوند کا، جو بے حد زور آور، قوی العزم اور ناقابل تصور حد تک پرکشش تھا، خاکہ ابھرنے لگا۔ وہ اچانک آیا اور اسے اٹھا کر اپنی دنیا میں، جو اس کی اپنی دنیا سے قطعی مختلف اور سرسبز کا گہوارہ تھی، لے گیا۔ اس کے ذہن میں ایک بچے کی تصویر بھی متشکل ہو گئی۔ یہ بچہ اس کا اپنا بچہ تھا اور اس بچے سے، جسے اس نے ایک روز قبل اپنی نرس کی بیٹی کی یا نہوں میں دیکھا تھا،

مشابہ تھا۔ تصویر میں یہ اس کی چھ تیوں کے ساتھ چمٹا ہوا تھا۔ خدند پاس کھڑا تھا اور پیار سے اسے اور اپنے کو دیکھ رہا تھا۔ ”لیکن نہیں، ایسا نہیں ہو سکتا۔ میں بہت بد صورت ہوں،“ اس نے سوچا۔

”چائے پر تشریف لے چلیں۔ محترم پرنس، سیدھے ادھر آ رہے ہیں،“ دروازے کے باہر ایک عائدہ کہہ رہی تھی۔

وہ ہڑبڑا گئی اور دوبارہ اپنے آپ میں آگئی۔ وہ جو کچھ ابھی ابھی سوچ رہی تھی، اس نے اس کی رورنٹ کر دی۔ نیچے جانے سے پہلے وہ گوشہ عبادت میں گئی اور ہاتھ باندھے نجات دہندہ کے بڑے ایقونے کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ اس کی نظر میں نجات دہندہ کے سانو لے چہرے پر، جو ایقونہ یسپ کی روشنی میں چمک رہا تھا، جمی ہوئی تھیں۔ وہ خاصی دیر تک یونہی کھڑی رہی۔ شکوک و شبہات اس کی روح میں سر اٹھا رہے تھے اور اسے اپنے اپنے پلے تھے۔ کیا محبت کی ہمد کے لیے ارضی محبت کی، مسرت اس کے حصے میں آ سکتی ہے؟ پرنس ماریا کے ذہن میں شادی کے بارے میں جو خیالات راد پارہے تھے، ان میں وہ ایسی مسرت کا تصور بندھ رہی تھی جو اپنا گھر اور اپنے بچے پاکر حاصل ہوتی ہے لیکن اس کی عظیم ترین اور مخفی ترین آرزو ارضی محبت کا حصول تھی۔ اپنی اس تمنا کو وہ دوسروں سے اور خود اپنے آپ سے جتنا چھپانے کی کوشش کرتی، یہ اتنا ہی اور تو انا ہو جاتی۔ ”اف، میرے ضد یا!“ اس نے کہا۔ ”جو شیطانی تصورات میرے دل میں سر اٹھا رہے ہیں، میں ان کا قلع قمع کیسے کروں؟ میں ان رذیل اور شرمناک تخیلات سے کیسے دائمی چھٹکارا حاصل کروں تاکہ یکسوئی سے تمھاری رضا پوری کر سکوں؟“ اور اس نے یہ سوال پوچھا ہی تھا کہ جواب خداوندی خود بخود اس کے دل میں دے آیا۔ ”اپنے لیے کسی چیز کی تمنا نہ کر جو نہ کر۔ بے زور، حامد نہ بن۔ انسان کا مستقبل اور تیرا اپنا مقدر تجھ سے پوشیدہ ہی رہنا چاہیے۔ لیکن زندگی یوں گزرے کہ خواہ کچھ ہی کیوں نہ پیش آئے، تو اس کے لیے تیار رہ۔ اگر خدا کو از دواجی فرائض کے سلسلے میں تیری آزمائش منظور ہوئی تو تجھے اس کی رضا کی تکمیل کے لیے تیار رہنا چاہیے۔“ اس تسکین آور خیال پر (لیکن اب بھی اسے یہی امید تھی کہ ایک نہ یک دن اس کا ارضی محبت کا خوب ضرور شرمندہ تکمیل ہو جائے گا) پرنس ماریا نے آہ بھری، اپنے بچے، صلیب کا نشان بنایا اور میٹھیوں اترنے لگی۔ اسے شاید اپنے ذہن کا خیال تھا، اور شاید اپنے بالوں کے شائل کا۔ اس نے یہ تک نہ سوچا کہ وہ کمرے میں کیسے داخل ہوگی اور گفتگو کس ڈھب سے کرے گی۔ خدا کی، جس کے حکم کے بغیر سر کا ایک بال بھی نہیں جھڑ سکتا، رضا کے مقابلے میں ان چیزوں کی کیا اہمیت ہو سکتی تھی؟

جب پرنس ماریا نیچے آئی، پرنس داسلی، اور اس کا بیٹا جو اس سے پہلے ہی ڈرائنگ روم میں پہنچ چکے تھے، کوچک پرنس اور مادموزیل بوغین کے ساتھ باتیں کر رہے تھے۔ جو بھی وہ بوجھل قدم اٹھاتے اور ایڑیوں کے مل چلنے کرے میں داخل ہوئی، مرد حضرات اور مادموزیل بوغین اٹھ کر کھڑے ہو گئے اور کوچک پرنس نے اس کی طرف اشارہ

کرتے ہوئے کہا: "Voila Marie!" پرنس ماریا نے ان سب کو دیکھا اور تفصیل سے دیکھا۔ اس نے دیکھا کہ اسے دیکھتے ہی پرنس دایلی کے چہرے پر سنجیدگی طاری ہو گئی لیکن اس نے معاً سے جھٹک دیا اور مسکراتے لگا۔ اس نے دیکھا کہ کوچک پرنس پنجس نگاہوں سے مہمانوں کے چہروں کا جائزہ لے رہی ہے تاکہ وہ یہ معلوم کر سکے کہ ماری نے ان پر کیا تاثرات ثبت کیے ہیں۔ اس نے مادموزیل بوغین کے رہن اور خوشنما چہرے پر بھی نظر دوڑائی۔ اس نے دیکھا کہ وہ معمول سے کہیں زیادہ شگفتہ ہے اور اس کی نگاہیں اس (انا طول) پر مرکوز ہیں۔ لیکن جہاں تک اس کا اپنا تعلق تھا، وہ اسے (انا طول کو) نہ دیکھ سکی۔ وہ جب کمرے میں داخل ہوئی، اسے کوئی گرائڈیں، خیرہ کن اور خوش شکل چیز پنی طرف حرکت کرتی نظر آئی۔ سب سے پہلے پرنس دایلی اس کی جانب بڑھا۔ اس نے اس کی تنہی پیشانی پر، جو اس کے ہاتھ پر جھکی ہوئی تھی، بوسہ دیا اور کہا: "جو کچھ آپ فرما رہے ہیں، اس کے برعکس مجھے آپ بہت اچھی طرح یاد ہیں۔" پھر انا طول اس کے قریب آیا۔ وہ اب بھی اسے نہ دیکھ سکی۔ اسے صرف اتنا محسوس ہو کہ ایک نرم دنازک ہاتھ نے اس کا ہاتھ مضبوطی سے تھام لیا ہے اور اوپر اس کے اپنے ہونٹ ایک سفید پیشانی سے، جس پر ہلکے سنہری بال تھے، مس ہوئے ہیں۔ ان بالوں سے یوماد (pomade) کی لپٹیں آرہی تھیں۔ جب اس نے اس پر اپنی نظریں ڈالی وہ اس کے حسن و جمال سے مسحور ہو گئی۔ انا طول ایک ٹانگ پر وزن ڈالے کھڑا تھا۔ اس کی دوسری ٹانگ آہستہ آہستہ جھول رہی تھی۔ اس نے اپنا سینہ پھلایا ہوا تھا اور اس کی کمر شکل کمان تھی۔ اس کے دائیں ہاتھ کا انگوٹھا اس کی وردی کے ایک ٹن سے کھیل رہا تھا، درودہ پنا سر قدرے ایک طرف بھکائے ہوئے تھا۔ پرنس کو دیکھ کر اس کے چہرے پر خفیف سی مسکراہٹ آ گئی لیکن وہ منہ سے کچھ نہ بولا۔ معلوم ہوتا تھا کہ اس کا دھیان کسی اور طرف ہے اور وہ اس کے بارے میں بالکل نہیں سوچ رہا۔

انا طول نہ تو حاضر جواب تھا اور نہ اسے بڑھ بڑھ کر باتیں بنانے کا فن آتا تھا، لیکن اس میں ایک خوبی تھی کہ وہ مشکل سے مشکل حالات میں بھی پرسکون رہتا اور کبھی خود اعتمادی کا دامن ہاتھ سے جانے نہ دیتا۔ اور یہ وہ خوبی ہے جو ادنیٰ طے میں بہت کام آتی ہے۔ اگر کوئی شخص کسی دوسرے شخص سے متعارف ہونے کے دوران میں خود اعتمادی کے فقدان کی وجہ سے خاموشی اختیار کر لے اور اپنی حرکات و سکنات سے یہ ظاہر کر دے کہ اسے خود بھی یہ شعور ہے کہ اس کی یہ خاموشی آداب کے منافی ہے، وہ بات کرنا چاہتا ہے لیکن اسے کوئی بات سوچتی نہیں، تو اس سے کوئی اچھا اثر مترتب نہیں ہوتا۔ لیکن انا طول چپ کار و زور رکھ سکتا تھا، اس کی ٹانگ جھول سکتی تھی اور وہ مزے مزے سے پرنس کے بالوں کا جائزہ لے سکتا تھا۔ یہ بالکل عیاں تھا کہ وہ اس انداز سے جتنی دیر چاہے، خاموشی اختیار کر سکتا ہے اور قطعاً پریشان نہیں ہوگا۔ وہ یہ کہتا نظر آ رہا تھا: "اگر کسی شخص کو یہ خاموشی نہیں بھاتی، وہ خود بات کر سکتا ہے لیکن جہاں تک میرا اپنا تعلق ہے، مجھے قطعاً پروا نہیں۔" علاوہ ازیں جہاں تک خواتین سے اس کے رویے کا تعلق تھا، وہ کچھ ایسے پر غوث انداز سے انھیں یا احساس دلاتا کہ وہ جانتا ہے کہ وہ ان سے بدتر ہے اور کسی دوسری چیز کی نسبت اس کا بھی

طریق ان کے قلوب میں تجسس، ہیبت بلکہ محبت تک کے جذبات ابھار دیتا۔ اس کا یہ رویہ یہ تھا جو یہ کہتا دکھائی دیتا تھا ”میں تمہیں جانتا ہوں، بالکل جانتا ہوں لیکن مجھے کیا ضرورت ہے کہ میں تمہارے بارے میں فکر کرتا بھروسہ ہاں، اگر میں فکر کروں تو تمہیں ضرور مسرت ہوگی!“ کسی خاتون سے ملاقات کے متعلق وہ شاید حقیقتاً اس طرح نہیں سوچتا تھا (اس کا امکان کم ہی ہے کیونکہ وہ سوچتا ہی کب تھا)، لیکن اس کی شکل و صورت اور اطوار سے یہی تاثر مترشح ہوتا تھا۔ پرنس ماریا کو اسی طرح محسوس ہوا اور گویا یہ دکھانے کے لیے کراسے، اپنی طرف رغبت کرنے کی اس کے دل میں کوئی تمنا نہیں ہے، وہ اس کے باپ کی طرف متوجہ ہو گئی۔

گفتگو عمومی نوعیت کی اور خاصی پر جوش تھی۔ اس کا سہرا کو چمک پرنس کے سر بندھتا تھا۔ وہ پنارد میں دار ہوش دل کش انداز سے اپنے سفید دانتوں کے اوپر نیچے گھماتے ہوئے خوب چمک رہی تھی۔ وہ پرنس واسیلی کے ساتھ شہر اور چنچل انداز سے پیش آرہی تھی۔ یہ انداز زیادہ مردہ لوگ اپناتے ہیں جو باتونی ہوتے ہیں ورنہ زندگی کے بارے میں جن کا رویہ ہوتا ہے یا بربادش کوئی کہ عالم دوبارہ نیست۔ وہ ایک دوسرے پر پھبتیاں کس سکتے ہیں، ایک دوسرے کی ہانگ گھسیٹ سکتے ہیں اور بھولی، سری دلچسپ یادیں جن سے دوسرے بالکل بے خبر ہوتے ہیں، تازہ کر سکتے ہیں۔ درحقیقت ان کے مابین نہ کوئی بے تکلفی ہوتی ہے اور نہ اس کی کوئی مشترکہ یادیں ہوتی ہیں۔ کو چمک پرنس اور پرنس واسیلی کے باہمی تعلقات کی بھی یہی کیفیت تھی۔ تاہم پرنس واسیلی نے جھٹ پٹ اس کا ہجرا اختیار کر لیا اور کو چمک پرنس نے انا طول کو بھی، جس سے اس کی کوئی خاص واقفیت نہ تھی، ان دلچسپ اور پر تفتن واقعات کی، جو کبھی منہ، تہو پر نکلا ہر نہیں ہوئے تھے، یادیں تازہ کرنے میں اپنے ساتھ ملا لیا۔ دموزیل بوغیں بھی گفتگو میں حصہ لینے لگی۔ اور نوادہ پرنس ماریا کو بھی اتنا طوفانے لگا کہ وہ بھی اس ہنسی مذاق میں شریک ہو گئی۔

”ڈیئر پرنس، کم، نرم یہاں ہم آپ کی صحبت سے پوری طرح عطف اندوز ہو سکتے ہیں،“ کو چمک پرنس نے پرنس واسیلی سے فرانسسی میں کہا۔ (اس کا فرانسیسی میں بات کرنا طے شدہ امر تھا)۔ ”یہ آتنا پارلور دنیا کی محفل نہیں کہ آپ آسانی سے عجب دے سکیں گے۔ آپ کو Cete Chere آسیت بار ہے؟“

”بالکل، لیکن اس کی طرح تم مجھ سے سیاست کی باتیں نہیں کرو گی؟“

”اور وہ ہماری چھوٹی سی چوڑے کی میز؟“

”ہاں، بالکل۔“

تم کبھی آسیت کے ہاں کیوں نہیں آئے؟“ اس نے انا طول سے پوچھا۔ ”ارے ہاں، مجھے معلوم ہے، مجھے معلوم ہے،“ اس نے ذرا آنکھ مار کر کہا۔ ”تمہارے بھائی ابویت نے مجھے تمہارے کارناموں کی دلچسپ کہانیاں سنائی تھیں اداہ دادہ!“ اور اس نے اسے خاموش رکھنے کے لیے اپنی انگلی اس کی جانب لہرائی۔ ”پیرس میں تم جو شرارتیں کرتے رہے، ان کے متعلق بھی اس نے مجھے بتایا تھا!“

”اپریت نے تمہیں یہ نہیں بتایا تھا؟ پرنس و سلی نے اپنے بیٹے کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔ اس نے کوچک پرنس کا ہاتھ پوں، پٹی گرفت میں تھا م رکھا تھا جیسے وہ زقند لگا کر بھاگا چاہتی ہو اور اس نے بڑی مشکل سے اسے روک رکھا ہو۔“ کیا اس نے تمہیں یہ نہیں بتایا تھا کہ وہ کس طرح ہماری اس ننھی منی پرکشش پرنس کے غم میں کھل جا رہا ہے اور انہوں نے اسے کیسے دھتا بتایا؟ اجی پرنس، یہ تو خواتین میں ہیرا ہیں ہیرا،“ اس نے پرنس ماریا کی طرف لگا ہیں پھیرتے ہوئے کہا۔

جب پرنس کا ذکر آیا، مادموزیل بریٹس کو بھی موقع مل گیا اور وہ بھی یادیں تازہ کرنے کی اس عمومی گفتگو میں شریک ہو گئی۔ اس نے کچھ جرأت دکھائی ورناتوں سے پوچھنے لگی: ”آپ کو پرنس سے واپس آئے زیادہ عرصہ تو نہیں ہوا ہوگا؟ کیسا لگا آپ کو یہ شہر؟“ ناطول فرانیسی خاتون کے سوالات کے جوابات دینے پر فوراً آمادہ ہو گیا۔ وہ اسے دیکھتا بھی جانتا تھا، مسکرا بھی رہا تھا ورناس کے بالائی وطن کے بارے میں گفتگو بھی کیے جا رہا تھا۔ جب سے اس نے ننھی منی ماریٹا کو دیکھا تھا، وہ اس نتیجے پر پہنچ چکا تھا کہ بالڈلز کا ماحول بہرحال، تا بھی بے لطف اور غیر دلچسپ نہیں جتنا کہ وہ سمجھتا تھا۔ ”میری نہیں، بالکل نہیں۔“ اس نے گہری نظروں سے اسے تاڑتے ہوئے سوچا۔ ”یہ ننھی منی رفیقہ بری نہیں۔ بالکل نہیں۔ مجھے امید ہے کہ جب ماری شادی ہو جائے گی، وہ اسے بھی اپنے ساتھ لے آئے گی۔ یہ ننھی منی چیز خاصی پیاری ہے۔“

معمر پرنس سنڈی روم میں لباس تبدیل کر رہا تھا۔ اسے کوئی جلدی نہیں تھی۔ اس کی پیشانی ٹسکن آلود تھی اور وہ یہ سوچ رہا تھا کہ اسے کیا کرنا ہوگا۔ ان مہمانوں کی آمد نے اسے برا فروخت کر دیا تھا۔ ”پرنس واسلی اور اس کے بیٹے کا مجھ سے کیا تعلق؟ پرنس واسلی سطحی سطحی شیخی خور ہے۔۔۔ ورناس کا بیٹا باپ ہی کا نمونہ ہوگا،“ وہ آپ ہی آپ بڑبڑا رہا تھا۔ جو چیز اس کی خفگی کا سبب بنی تھی، وہ یہ تھی کہ اس آمد نے اس کے ذہن میں غیر حل شدہ مسئلے کو، جسے وہ نظر انداز کرنے کی مسلسل کوشش کرتا رہتا تھا اور جس کے بارے میں وہ ہر دم اپنے آپ کو فریب دیتا رہتا تھا، تازہ کر دیا تھا۔ مسئلہ یہ تھا کہ آیا وہ کبھی اپنی بیٹی کو اپنے سے جدا کر پائے گا ورناس اس کے شوہر کے سپرد کر سکے گا؟ پرنس ہمیشہ اس مسئلے سے کئی کتر اتار رہا کیونکہ وہ خوب اچھی طرح جانتا تھا کہ اگر اس نے صحیح انداز سے اس مسئلے پر غور کیا، تو وہ اس کا زمانہ منصفانہ جواب دے گا اور انصاف کی نہ صرف اس کے جذبات کے ساتھ کھینچا جاتی ہوگی بلکہ اس کے زندہ رہنے کے امکانات بھی اس کی بھینٹ چڑھ جائیں گے۔ بظاہر یہی نظر آتا تھا کہ اس کے نزدیک پرنس ماریا کی کوئی وقعت نہیں لیکن وہ پرنس ماریا کے بغیر زندگی گزارنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ ”آخر، اسے بیاہر چانے کی ضرورت ہی کیا ہے؟“ اس نے سوچا۔ ”یہی ناکہ شادی کے بعد غائبانہ کڑھا کرے گی۔ لسا ہی کو سلو۔ آئندہ سے شادی کی۔ آج اس سے بہتر شوہر ملنا دشوار ہے۔ لیکن کیا وہ اپنی قسمت پر قانع ہے؟ اور ماریا سے محبت کی شادی کون کرے گا؟ مشکل واجبی، جسم بے جگم، بے ڈوں۔ جو بھی اس سے شادی کرے گا، اس لیے کہسے گا کہ اس کے پاس دھن دوست ہے، اسے ادنیٰ نچے لوگوں سے نسبت ہے۔ پھر ایسی عورتوں کی کوئی کمی ہے کہ

بوزھی ہوئیں لیکن ابھی تک ناکتھا ہیں؟ ان کی حالت، اتنی گنگی گزری بھی نہیں، خاصی خوش ہیں؟“ پرنس نکولا کی کندہ یونانی لباس بھی تبدیل کرنا جا رہا تھا اور کچھ اس انداز سے سوچتا بھی جا رہا تھا۔ تاہم جس سوال کو وہ معرض التوا میں ڈالتا رہا تھا، وہ فوری جواب کا متقاضی تھا۔ پرنس واسیلی اپنے ہمراہ اپنے بیٹے کو لے کر آیا تھا۔ اس کے عزائم بالکل واضح تھے۔ وہ رشتے کی تجویز پیش کرے گا اور لاریب آج یا کل غیر تبہم جواب چاہے گا۔ اس کا نام اور سوسائٹی میں مقام ٹھیک ٹھیک ہے۔ ”خیر، میں اس رشتے کے خلاف نہیں ہوں“ پرنس نے اپنے آپ سے کہا ”بشرطیکہ صاحب زادہ اس (پرنس ماریا) کے لائق ہو اور یہی ہم معصوم کریں گے۔“

”اور یہی ہم معصوم کریں گے“ اس نے با آواز بلند ہراتے ہوئے کہا۔ ”یہی ہم معصوم کریں گے؟“

”وہ حسب معمول تیز تیز قدم اٹھاتا ڈرائنگ روم میں داخل ہوا اور اس نے سرعت سے بیک نظر تمام حاضرین کا جائزہ لیا۔ اسے کوچک پرنس کی تبدیلی لباس، مادموزیل بونفین کا ربن، پرنس ماریا کے بالوں کا ہیئت شاکل، اناطول اور فرانسسی عورت کی مسکراہٹیں اور عام گفتگو کے مابین اپنی مٹی کا اکلا پا خاص طور پر کھٹکا۔“ ہونٹوں کی طرح نئی ٹھنی ٹھنی ہے؟“ اس نے اپنی بیٹی کی طرف کیسے توڑنگا ہوں سے دیکھتے ہوئے سوچا۔ ”بے حیا، بے شرم اور ایک وہ ہے کہ اس کی طرف دیکھ کر بھی نہیں رہا!“

وہ پرنس واسیلی کی طرف گیا۔ ”خوب، کیا حال ہے، کیا حال ہے؟ تم سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔“

”دوستی کے سامنے فاصلوں کی کیا حیثیت ہے؟“ پرنس واسیلی نے حسب معمول عا جانہ، پراعتماد اور بے تکلفانہ لہجے سے کہا۔ ”یہ میرا دوسرا بیٹا ہے۔ میری التجا ہے کہ آپ اس کے سر پر جیسا کہ ہم کہا کرتے ہیں، شفقت کا ہاتھ رکھیں۔“

پرنس نکولا کی کندہ یونانی لباس کا گہری نظر سے جائزہ لیا۔ ”اچھا جوان ہے، اچھا جوان ہے،“ اس نے کہا۔ ”خیر آؤ اور میرا بوسہ لو“ اور اس نے اپنا گال آگے بڑھا دیا۔

اناطول نے معمر شخص کا بوسہ لیا اور تجسس اور کامل یکسوئی سے اسے دیکھنے لگا۔ وہ ہر آن یہ توقع کر رہا تھا کہ اس نے اب کوئی انوکھی حرکت کی، اب کی۔ اس کے بارے میں اس کا باپ پہلے ہی سے بتا چکا تھا۔

پرنس نکولا کی آندر پوچھ صوفے کے کونے پر اپنی معمول کی نشست پر بیٹھ گیا۔ اس نے پرنس واسیلی کے لیے آرام کر سکی تھیں، اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور اس سے سیاسی امور اور دیگر خیروں کے متعلق سوالات پوچھنے لگا۔

بھاہردہ پرنس واسیلی کی باتیں کان لگا کر سن رہا تھا لیکن اس کی نگاہیں مسلسل پرنس ماریا پر مرکوز رہیں۔

”گویا انھوں نے ازیں بیشتر ہی پوسٹڈم سے خط کتابت شروع کر دی ہے؟“ اس نے پرنس واسیلی کے آخری الفاظ دہراتے ہوئے کہا۔ پھر وہ اچانک اٹھا اور اپنی بیٹی کی طرف چل پڑا۔ ”تم نے پناہ چلیا اپنے ان مہمانوں کی خاطر بنایا ہے؟“ اس نے کہا۔ ”خوب، بہت خوب اتم نے بالوں کا یہ شاکل مہمانوں کی خاطر اختیار کیا ہے، تو میں ان مہمانوں کی موجودگی میں تمہیں حکم دیتا ہوں کہ آئندہ میری اجازت کے بغیر اپنے لباس کے رنگ ڈھنگ میں کوئی

”جی ہاں، آج کل ہر چیز مختلف ہے۔ ہر شے میں نیا پن ہے۔ اچھا جوان ہے، اچھا جوان ہے۔ آؤ، زہا میرے کمرے تک چلتے ہیں۔“

اس نے پرنس واسیلی کا بازو تھام لیا اور اسے اپنے سفیدی روم کی طرف لے گیا۔

جونی انھیں تہائی میسر آئی، پرنس واسیلی نے اپنی امیدوں اور آرزوؤں سے پردہ ہٹانے میں ڈھیل نہ کی۔
 ”تمہارا خیال ہے کہ میں نے اس کے پاؤں میں بیڑیاں ڈال رکھی ہیں کہ میں اس سے جدا نہیں ہو سکتا؟“
 سمیر پرنس نے بھڑکتے ہوئے کہا۔ ”وہ چاہے تو بے شک کل چلی جائے۔ میں صرف ایک بات بتانا چاہتا ہوں۔ میں اپنے مستقبل کے داماد کو بہتر طور پر جانا چاہتا ہوں۔ تمہیں میرے اصولوں کا پتا ہی ہے۔ میں کوئی چیز چھپانے کا قائل نہیں، ہر بات اعلیٰ اور بر ملا ہونا چاہیے اس کل تمہاری موجودگی میں اس کی رائے دریافت کر دوں گا۔ اگر وہ رضی ہوئی، پھر آپ کا صاحب زادہ مزید قیام کر سکتا ہے۔ وہ کچھ عرصہ یہاں قیام کرے، پھر میں دیکھوں گا،“ سمیر پرنس کے نتھنے پھڑپھڑانے لگے۔ ”وہ (اس کی بیٹی) شادی کر لے، مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔“ وہ اسی تیکھے لہجے سے جس سے اس نے اپنے بیٹے کو خدا حافظ کہا تھا، چلانے لگا۔

”میں آپ کے ساتھ صاف کوئی سے کام لوں گا،“ پرنس واسیلی نے ایک ایسے عیار شخص کے، جسے اس کا پختہ یقین ہو کہ اسے زیرک اور تیز فہم ہم نوا کے ساتھ عیاری برتاؤ حاصل ہے، انداز سے کہا۔ ”اس میں کام نہیں کہ آپ کو دلوں کے بھید تک رسائی حاصل کرنے میں ملکہ حاصل ہے۔ ناطول کوئی نابھہ روزگار شخصیت نہیں۔ لیکن دیا نندار، نیک دل نو جوان، فرماں بردار بیٹا اور اچھا قرابت دار ضرور ہے۔“
 ”ٹھیک ہے، ٹھیک ہے، دیکھا جائے گا۔“

جیسا کہ عام طور پر ان عورتوں کے ساتھ، جو کافی عرصے سے مردانہ صحبتوں سے دور الگ تھلگ زندگی بسر کرتی چلی آئی ہوں، اناطول کی آمد پر پرنس نکولائی، آئندہ یوچ کے گھر لے کے کئی عینوں خواتین کو بھی یہی محسوس ہوا کہ اب تک انھوں نے جو زیست کی ہے، وہ حقیقی معنوں میں زیست نہیں، بلکہ کچھ اور تھا۔ ان کے سوچنے، محسوس کرنے اور مشاہدہ کرنے کی صلاحیتیں ایک ایسی ریس گنا بڑھ گئیں اور انھیں یوں لگا کہ ان کی زندگیاں، جواب تک اندھیرے کی جی تھیں، ایک ایسی نئی روشنی سے، جو محالی سے بھرپور تھی، جگمگا اٹھی ہیں۔

پرنس، ریا کو نہ اپنی شکل و صورت کا دھیان رہا اور نہ اسے اپنے بالوں کا شائل یاد رہا۔ اس شخص کا، جو شاید اس کا خاندان بن جائے، خوش شکل اور شگفتہ چہرہ اس کی تمام توجہ کا مرکز بن گیا۔ وہ اسے شفیق، باعزم، مردانہ صفات سے بہرہ ور، عالی ظرف اور بلند فطرت انسان نظر آیا۔ اسے پختہ یقین تھا کہ وہ ان خوبیوں سے محض ہے۔ اس کے تخیل میں مستقبل کی شامی شدہ زندگی کے بارے میں ہزاروں خواب بننے اور ابھرتے رہے۔ اس نے انھیں اپنے ذہن سے نکالے اور انھیں دبانے کے لیے بہت ہاتھ پاؤں مارے۔

”پران کے ساتھ میرا رویہ سرد مہر اند اور مغائز اند نہیں ہے؟“ پرنس نے سوچا۔ ”میں اپنے آپ کو ضبط کی زنجیروں

میں اس لیے جکڑنے کی کوششیں کر رہی ہوں کیونکہ ازیں بیشتر ہی عالم حیرت میں مجھے اپنی روح کی گہرائیوں میں محسوس ہونے لگا ہے کہ میں ان کے بے حد قریب ہوں۔ اللہ یہ بات درست ہے کہ جو کچھ میں ان کے بارے میں سوچ رہی ہوں، انھیں اس کا کوئی علم نہیں ہے اور عین ممکن ہے کہ وہ ابھی سمجھ بیٹھیں کہ میں انھیں پسند ہی نہیں کرتی۔“ اور پرنس بار یاسے اپنے مہمان کے ساتھ گرم جوشی کا رویہ اختیار کرنے کی کوشش کی لیکن اس معاملے میں وہ بالکل پسزدی تھی، اسے پتا ہی نہیں تھا کہ یہ کام کیسے کیا جاتا ہے۔

”بے چاری لڑکی! یہ تو بالکل ہی گئی گزری ہے۔ خوبصورتی تو اس کو چھو کر بھی نہیں گزری،“ انا طول نے سوچا۔ مادوزیل یوین کے، جڑا نا طول کی آمد پر آپے سے باہر ہوئی جا رہی تھی، خیالات مختلف نوعیت کے تھے۔ وہ خوبصورت تھی، جوان تھی اور اس بات کے باوجود کہ معاشرے میں اس کا کوئی واضح مقام نہیں تھا، اس کا کوئی سگی ساتھی تھانہ کوئی عزیز رشتے دار، وہ اپنے آبائی وطن سے بھی بہت دور تھی، یہ امر یقینی تھا کہ وہ اپنی ساری عمر پرنس گولڈی آندر یوچ کی خدمت کرنے، اسے کتب، اخبارات اور رسائل پڑھ کر سنانے اور اس کی بیٹی کی رفیقہ بن کر گزرنے کی رودادار نہیں تھی۔ وہ مدت مدید سے کسی ایسے ردی پرنس کا، جو اس بد صورت، بد قطع اور بد لباس پرنس کے مقابلے میں اس کی فوقیت آنا فانا بھنپ جائے گا، اس کی تحسین کرے گا، آؤ دیکھنا تازہ جھٹ پٹ اس کی زلف گدگد کرے گا، سیر ہو جائے گا اور اسے کندھوں پر بٹھا کر اپنے ساتھ لے جائے گا، انتظار کر رہی تھی۔ اور خدا کی قدرت، اس ردی پرنس نے آخر اپنا جلوہ دکھا ہی دیا!

مادوزیل یوین کو ایک کہانی، جو کسی زمانے میں اسے اس کی خالہ نے سنائی تھی، یاد تھی۔ اس کہانی کا انجام اس نے خود گھڑ لیا تھا۔ وہ اسے بار بار اپنے دل میں دہراتی اور مزے لیتی رہتی تھی۔ یہ کہانی ایک دوشیزہ کے، جسے کسی نے ورغلا لیا تھا، بارے میں تھی۔ اس کی بے چاری ماں (sa pauvre mere) اس کے پاس آئی اور اسے پھکار کرنے لگی کہ اس نے نکاح کیے بغیر مرد کی بامادتی کیوں قبول کر لی۔ دام یوین نے اپنے تصورات میں یہ کہانی ایسے یعنی جو اسے ورغلا تا ہے، بار بار سنائی تھی اور کہانی سناتے سناتے اکثر اس کی آنکھیں شک بار ہو جاتی رہی تھیں۔ ”اب وہ جیتا جاگتا سچ سچ کا ردی پرنس، آگیا ہے۔ وہ مجھے بھگالے جائے گا، بے چاری ماں موقع وار دست پر آ موجود ہوگی اور وہ مجھ سے شادی کر لے گا۔“ مادوزیل یوین جب انا طول سے چرس کے بارے میں گفتگو کر رہی تھی، مستقبل کی یہ تصویر اس کے ذہن میں ابھر رہی تھی۔ یہ نہیں کہ اس نے شعوری طور پر اس بارے میں سوچا سمجھا اور اس کے مطابق اپنا طریق عمل متعین کیا تھا (اس نے ایک لمحے کے لیے بھی اس پر غور نہیں کیا تھا کہ اسے کیا کرنا چاہیے)۔ یہ سب کچھ تو اس کے باطن میں مدتوں پہلے سے تیار و موجود تھا اور اب جب کہ انا طول منظر پر آگیا تھا، یہ سارا تانا بانا اس کی ذات کے گرد مکمل ہو گیا۔ اور وہ ہر ممکن انداز سے اپنے آپ کو اس کے سامنے زیادہ سے زیادہ پرکشش بنا کر پیش کرنے کی سعی میں جت گئی۔

جس طرح جب تجربے کا جنگی گھوڑے کے کانوں میں اٹکل کی آواز آتی ہے، اس کی ٹانگیں خود بخود متحرک

ہو جاتی ہیں اور وہ سبک گامی کے لیے بے قرار ہونے لگتا ہے، ناطول کی آمد نے کوچک پرنس پر بھی کچھ ایسا ہی اثر دکھایا۔ وہ یہ بھول گئی کہ اس کی حالت کیا ہے، اور غیر شعوری طور پر عیشہ و غمزہ و ادا کے جانے پہچانے گرا زمانے پر حل گئی۔ اگرچہ اس کا اپنا اوسیدھا کرنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا، پھر بھی اس نے اپنا دامن پہچانے کی کوئی کوشش نہ کی۔ اس کی نادانی اور سادہ لوحی اسے یہ پٹی پڑھا رہی تھی کہ جو ہوسو ہو، بس تفریح کا موقع ہاتھ سے نکلنا نہیں چاہیے۔

اگرچہ نسوانی صفتوں میں عام طور پر ناطول کا رویہ اس مرد کا ہوتا تھا جو اس بات سے تنگ آچکا ہوتا ہے کہ جہاں بھی جاتا ہے، عورتیں اس کا تعاقب شروع کر دیتی ہیں، تاہم اس کی موجودگی ان تین عورتوں پر جس مرد اثر انداز ہوئی تھی، اس سے اس کی اتنا کو خاص تسکین پہنچی۔ علاوہ انہیں وہ، دسوزیل بوغین میں، جو خوش شکل بھی تھی اور جذبات کو برا بھلا بھی کرتی تھی، وہی پر جوش حیوانی کشش محسوس کرنے لگا جو سرعت سے اس پر غالب آجاتی تھی اور اسے اسفل تریں اور انتہائی ناعاقبت اندیشانہ حرکات پر مجبور کر دیتی تھی۔

چائے کے بعد تمام لوگ سنگ روم میں چلے گئے۔ وہاں پرنس ماریا سے کلاوی کارڈ (Clavichord) پر نغمہ ستانے کی فرمائش کی گئی۔ ناطول آیا اور مادسوزیل بوغین کے بربر کھڑا ہو گیا۔ وہ اپنی کہنیوں پر جھکا اور اس نے اپنی نگاہیں، جن میں مسرت اور مسکراہٹ چھلک رہی تھی، پرنس ماریا پر گاڑ دیں۔ پرنس کو احساس تھا کہ یہ نظریں اس پر جمی ہوئی ہیں، یہ احساس اس کے لیے سرور کن بھی تھا اور اذیت ناک بھی۔ وہ ساز پر اپنے پسندیدہ کھانسی لٹے (sonata) کی دھن بجا رہی تھی، اس کی دھن نے اسے اس کے اپنے ہی شعری عالم میں پہنچا دیا تھا اور اس نظر نے جو اسے اپنے بدن پر محسوس ہو رہی تھی، اس شعریت میں مزید چار چاند لگا دیے تھے۔ تاہم اس (ناطول) کی نگاہیں اگرچہ اس (پرنس) پر مرکوز تھیں، لیکن جو کچھ وہ کہہ رہی تھی، اس کا اس کی ذات سے کوئی تعلق نہ تھا بلکہ وہ مادسوزیل بوغین کے پاؤں سے، جسے وہ کلاوی کارڈ کے نیچے اپنے پاؤں سے چھو رہا تھا، منسلک تھیں۔ مادسوزیل بوغین کی نگاہیں بھی پرنس ماریا پر جمی ہوئی تھیں۔ اس کی آنکھوں میں امید بھی تھی، سرور بھی اور اس کے ساتھ ان میں خوف کے سائے بھی لہرا رہے تھے۔ یہ کیفیت پرنس کے لیے بھی نئی تھی۔

”وہ مجھ سے کتنا پیار کرتا ہے!“ پرنس ماریا نے سوچا۔ ”اب میں کتنی خوش ہوں! ایسی سہیلی اور ایسے شوہر کی موجودگی میں تو میری خوشیوں کا کوئی ٹھکانا ہی نہیں رہے گا! شوہر۔ کیا یہ واقعی ممکن ہے؟“ وہ سوچتی اور دریائے حیرت میں ڈوبتی رہی۔ اس میں اتنا حوصلہ نہ تھا کہ وہ نگاہیں اٹھا کر اس کا چہرہ دیکھ سکے۔ تاہم اسے اتنا احساس ضرور تھا کہ وہ نگاہیں اسی پر مرکوز ہیں۔

پیر کے بعد جب محفل بکھر گئی اور سب لوگ اپنی اپنی خواجگاہوں کی طرف چلنے لگے، ناطول نے پرنس ماریا کے ہاتھ پر بوسہ ثبت کر دیا۔ یہ تو اس کی سمجھ میں بھی نہ آیا کہ اس میں اتنی جرأت کہاں سے آگئی لیکن جونہی اس کا خوبصورت چہرہ اس کی کوتاہ بین آنکھوں کے سامنے آیا، اس نے اپنی نگاہیں اس پر گاڑ دیں۔ اس کے بعد وہ مادام بوغین کے پاس گیا اور اس نے اس کا ہاتھ بھی چوم لیا۔ (اس کی یہ حرکت مسلمہ آداب کے خلاف تھی لیکن وہ

ہر کام اتنی سادگی، درخود اعتمادی سے کرتا تھا کہ اس کی یہ حرکت بھی بری نہ لگی (۱)، دموزیل بوغین شرم سے پانی پانی ہو گئی اور سر بگمیاں پرنس ماریا کو دیکھنے لگی۔

”اس تمیز، اس سلیقے پر داد دینے کو جی چاہتا ہے!“ پرنس ماریا نے سوچا۔ ”کیا یہ ممکن ہے کہ آملی (دموزیل بوغین) یہ سمجھتی ہو کہ میں اس سے حسد کرتی ہوں اور اسے مجھ سے جوا تھا بے ریا پیار اور لگاؤ ہے، میں اس کی قدر نہیں کرتی؟“

وہ اس کے پاس پہنچی اور اس نے گرم جوشی سے اس کے رخساروں پر بوسہ دیا۔ اناطول کوچک پرنس کے قریب گیا۔

”نہیں، نہیں! جب تمہارے ابا جان مجھے خط لکھیں گے اور یہ اطلاع دیں گے کہ تم آدمی بن گئے ہو، میں تمہیں اپنے ہاتھ پر بوسہ دینے کی اجازت دے دوں گی۔ اس سے پہلے بالکل نہیں!“ اس نے کہا۔ اور مسکراتے اور اس کی جانب انگلی لہراتے وہ کمرے سے باہر نکل گئی۔

5

وہ اپنے اپنے کمروں میں چھ گئے۔ اناطول تو بیٹے ہی خواب خرگوش کے مزے لینے لگا لیکن دوسروں کی آنکھوں سے نیند کوسوں دور تھی اور وہ بھی دیر تک کروٹیں بدلتے رہے۔

”کیا یہ، جنہی، خوب رو اور خوب سیرت شخص میرا خاوند بن جائے گا؟ خوب سیرت اصل بات یہی ہے!“ پرنس ماریا نے سوچا اور ایک خاص قسم کی دہشت، جو اس نے اس سے پہلے تقریباً کبھی محسوس نہیں کی تھی، اس پر غالب آگئی۔ اس میں اتنا بوتا نہ تھا کہ اپنے گرد و پیش دیکھ سکے۔ اسے یہ دھڑکا لگا ہوا تھا کہ کوئی شخص سکرین¹⁵ کے پیچھے تاریک کونے میں دبکا کھڑا ہے۔ اور یہ کوئی شخص وہ۔ اٹلیس۔ ہے اور یہ وہ آدمی بھی تھا جس کی پیشانی سفید، ابرو سیاہ اور لب سرخ تھے۔

اس نے گھٹنی بجائی۔ خادمہ حاضر ہو گئی۔ اس نے کہا: ”میں میرے کمرے میں سو جاؤ۔“

دموزیل بوغین اس رات خاصی دیر تک پود گھر میں ٹہلتی رہی۔ اسے توقع (جو فتنہ برآب ثابت ہوئی) تھی کہ کئی رات کوئی آئے گا۔ وہ کبھی مسکراتے لگتی اور کبھی اس کی آنکھوں سے اشک رواں ہو جاتے کیونکہ اپنے تعزیمت میں گرنے پر اسے اپنی، بے چاری ماں، کی خیالی ڈانٹ ڈپٹ یاد آ جاتی۔

کوچک پرنس مسلسل اپنی خادمہ سے گلہ شکوہ کرتی رہی کہ آج اس نے بستر ڈھنگ سے نہیں بچھایا۔ اس سے نڈر سیدھا بیٹھا جاتا ہے اور نہ پہلو کے بل۔ اسے قرار آتا ہے نہ سکون۔ اس کا بوجھ اس کے لیے عذاب بنا ہوا تھا۔ اب جب کہ اناطول پہنچ گیا تھا، یہ بوجھ پہلے سے بھی زیادہ مصیبت بن گیا تھا۔ اس (اناطول) کی موجودگی نے اسے واضح طور پر ان دنوں کی، جب وہ اس بوجھ سے آزاد تھی، جب ہر چیز ہلکی پھلکی اور مسرت سے معمور تھی، یاد دلادی

تھی۔ وہ ڈریسنگ گاؤن اور شبینہ ٹوپی پہنے آرام کرسی پر بیٹھی تھی۔ کاتیا جس کی آنکھیں نیند سے بوجھل اور ہل پریشان تھیں، پردوں کا بھاری بچھونا اٹا پلٹا رہی اور جھاڑ رہی تھی۔ ساتھ ہی ساتھ وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑا بھی رہی تھی۔

”میں نے کہا تھا کہ یہ کہیں پچکا ہوا اور کہیں ابھرا ہوا ہے!“ کوچک پرنس نے اپنی بات دہرائی۔ اگر مجھے نیند آجائے تو میں بہت خوش ہوں گی۔ یہ میرا قصور نہیں ہے۔“ اور اس کی آواز اس بچے کی، جو معلوم ہوتا ہے کہ ابھی ابھی رووے گا، آواز کی طرح گرنے لگی۔

معمر پرنس بھی جاگ رہا تھا۔ تھون کو نیم غنودگی کے عالم میں اس کے خشم ناک انداز سے پاؤں بیٹھنے اور نتھنے پھڑپھڑانے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ معمر پرنس کو محسوس ہو رہا تھا کہ اسے اپنی بیٹی کے حوسے تو بین برداشت کرنا پڑ رہی ہے اور یہ تو بین اور بھی تکلیف دہ تھی کیونکہ اس کا تعلق اس کی اپنی ذات سے نہیں بلکہ ایک دوسری ہستی سے تھا اور یہ دوسری ہستی اس کی اپنی بیٹی تھی جو اسے اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز تھی۔ اس نے اپنے آپ کو بتایا: ”میں اس سارے معاملے پر غور کروں گا اور پھر فیصلہ کروں گا کہ صحیح راہ عمل کیا ہے۔“ وہ یہ تو نہ کر سکا لیکن غصے سے مزید ضرور جلتا بھٹتا رہا۔

”یہل مرد آیا نہیں۔ اور وہ سب کچھ بھول بیٹھی۔ اس نے مجھے۔ اپنے باپ کو۔ بھی بھلا دیا۔ کد کڑے لگائی پھر رہی ہے، نئے نئے طریقوں سے کنگھی چوٹی کرتی ہے، چٹا اچھالتی پھرتی ہے۔ اپنی شکل یوں بناتی ہے کہ پہچانی ہی نہیں جاتی۔ کتنی خوش ہے کہ باپ سے چنڈ چھوٹا جانتی بھی ہے کہ میں برائے وں گا۔۔۔ ارغ تھو!۔۔۔ ارغ تھو۔۔۔“

مجھے معلوم ہی نہ ہو سکا کہ وہ الو کا پٹھا صرف بوغین پر نظریں رکھے ہوئے ہے۔ (مجھے اس بوغین سے چیخا چھڑانا ہوگا)۔ اس بے وقوف لڑکی کا چندا رکھا گیا کہ اسے یہ سب کچھ نظر ہی نہیں آ رہا؟ اگر پتا نہیں تو کم از کم میری لحاظ کرتی۔ اسے سمجھانا ہی پڑے گا کہ یہ کون سا مخزاسے جوتی کی ٹوک کے برابر بھی نہیں سمجھتا اور صرف بوغین پر نظریں جمائے ہوئے ہے۔ اس میں چندا نام کی کوئی چیز نہیں، میں اسے بتاؤں گا کہ چندا کیا ہوتا ہے۔“

معمر پرنس اچھی طرح جانتا تھا کہ اگر اس نے اپنی بیٹی کو بتایا کہ وہ خیال خام میں جلتا ہے اور فریب کھاری ہے، اتنا طول اس سے نہیں، ماداموزیل بوغین سے محبت جتا رہا ہے، تو وہ اس کی اما کو نہیں پہنچائے گا اور اس کا ہنا مقصد (اس سے جدا نہ ہونا) پورا ہو جائے گا۔ اس خیال نے اسے ایک سو کر دیا۔ اس نے تھون کو آواز دی اور فریڈ کپڑے اتارنے لگا۔

”ابلیس ہی انھیں یہاں آیا ہے!“ وہ سوچ رہا تھا جب کہ تھون اس کی محسوس ہڈیوں پر، جن پر نام کو بھی گوشت نہیں تھا، لبتہ چھان سفید بالوں سے ڈھکی ہوئی تھی، شبینہ قیصر پہنارہ تھا۔ ”میں نے انھیں کب بلایا تھا؟ بین بلائے نازل ہو گئے اور میری زندگی جو تھوڑی بہت جتنی بھی رہ گئی ہے۔ درہم برہم کر گئے ہیں۔ خدا کے ان سے!“ وہ بڑبڑایا جب کہ اس کا سر ابھی تک شبینہ قیصر میں مستور تھا۔

بعض اوقات پرنس کے خیالات جس طرح خود بخود زبان پر آ جاتے تھے اور وہ یا آواز بلند ان کا اظہار

کرنے لگتا تھا، تجھون اس کا عادی تھا۔ چنانچہ جب اس کا غصیلا اور استغباریہ چہرہ شبینہ تیس سے برآمد ہوا، اس نے سکون و تحمل سے اس کا سامنا کیا۔
”سو مجھے؟“

تم جسے خدمت گاروں کی طرح تجھون بھی جیسی طور پر اپنے آقا کے خیالات کی روکا، اندازہ لگانے میں ماہر ہو چکا تھا۔ وہ سمجھ گیا کہ سوال کا شرہ پرس و، سیلی اور اس کے سینے کی طرف ہے۔

”یوہڑا کیسی لیس، معزز مہر نوں نے بتیاں بھادی ہیں اور وہ بستر دں پر لیٹ گئے ہیں۔“

”کوئی وجہ نہیں تھی، بالکل کوئی وجہ نہیں تھی...“ پرس سرمت بڑبڑاتے جا رہا تھا۔ اس نے پاؤں سلیر دں میں اور بازو ڈریسنگ گارڈن کی استیوں میں گھسیڑے اور جس صوفے پر وہ سویا کرتا تھا، اس کی طرف چل پڑا۔

اگرچہ انا طول اور مادموزیل یونین کے مابین کوئی بات نہ ہوئی تھی لیکن جہاں تک ان کے رومان کے پہلے مرحلے کا۔ ”بے چاری ماں“ کی آمد کے منظر تک۔ تعلق ہے، وہ ایک دوسرے کا منشا پوری طرح سمجھ گئے تھے۔ انھیں محسوس ہو چکا تھا کہ انھیں خلوت میں ایک دوسرے سے بہت کچھ کہنا ہے۔ چنانچہ آفتاب ابھی طلوع بھی نہیں ہوا تھا کہ انھوں نے تنہائی میں ملاقات کرنے کا موقع ڈھونڈنا شروع کر دیا۔ جب پرس ماریا مقررہ وقت پر اپنے باپ کے کمرے میں چلی گئی، مادموزیل یونین اور انا طول پود گھر میں، کنبھے ہو گئے۔

پرس ماریا جب اپنے باپ کے شڈی روم کے دروازے کے قریب پہنچی، اس کا دس معمول سے کہیں زیادہ دھک دھک کر رہا تھا۔ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ ہر شخص کو نہ صرف معلوم ہے کہ آج اس کے مقدر کا فیصلہ ہو جائے گا بلکہ وہ یہ بھی جانتا ہے کہ وہ خود اس کے بارے میں کیا سوچ رہی ہے۔ اسے یہ بات تجھون کے چہرے پر تحریر نظر آئی اور پرس واسیلی کے ذاتی خدمت گار کے چہرے پر بھی منعکس ہون دکھائی دی۔ اس سے اس کی مڈھ بھینٹ غلام گردش میں ہوئی تھی۔ وہ اپنے آقا کے لیے پانی لیے جا رہا تھا اور جھک کر اسے تسلیمات بجالایا تھا۔

اس صبح معمر پرس اپنی بیٹی کے ساتھ نہایت پر شفقت لیکن محتاط انداز سے پیش آیا۔ اس کے چہرے پر جو کشیدگی ہو رہی تھی، پرس اس سے بخوبی آگاہ تھی۔ یہ وہی کشیدگی تھی جو ہمیشہ اس وقت اس کے چہرے پر ظاہر ہوا کرتی تھی جب وہ حساب کا کوئی سوال سمجھنے میں ناکام رہتی تھی، وہ جھلا جاتا تھا، اس کی پڑمرہ مٹھیاں بھیج جاتی تھیں، اپنی کرسی سے اٹھتا اور درجا کر کھڑا ہو جاتا تھا۔ اس کے بعد وہ وہی الفاظ بار بار دہرائی زبان سے دہرائے لگتا تھا۔

وہ اس کے ساتھ شائستہ لیکن رسمی انداز سے گفتگو کر رہا تھا اور جاتا خیر مطلب کی بات نہ مان پر لے آیا۔

”مجھے ایک تجویز پیش کی گئی ہے اور اس تجویز کا تعلق تمہاری ذات سے ہے،“ اس نے غیر فطری انداز سے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”میر، خیال ہے کہ یہ قیازہ تو تم نے بھی لگایا ہوگا کہ پرس واسیلی اپنے متوسل (کوئی خاص بات عن تھی کہ پرس گولائی آندر یورج نے انا طول کے لیے ’متوسل‘ کا لفظ استعمال کیا) کے مراد جو یہاں آیا ہے، تو اس کی وجہ یہ نہیں کہ اسے مجھ میں کوئی کشش نظر آئی تھی۔ گزشتہ رات اس نے مجھے تمہارے متعلق تجویز پیش کی۔ تم

میرے اصولوں کو جانتی ہو۔ میں یہ معاملہ تمہارے سپرد کر رہا ہوں۔“

”mon pere، میں کیا سمجھوں کہ آپ کا مطلب کیا ہے؟“ پرنس نے زیر لب کہا۔ شرم سے چہرے اس کا چہرہ سرخ ہوا اور پھر اس کا رنگ فق ہو گیا۔

”تم کیا سمجھو کہ میرا مطلب کیا ہے؟“ اس کے باپ نے مال بھبھوکا ہو کر کہا۔ ”تم پرنس واسکی کو بطور ہدیہ مل ہو اور اس نے اپنے متوسل کی طرف سے شخصیں شادی کا پیغام دیا ہے۔ یہ ہے میرا مطلب۔ کچھ آیا تمہارے خیال شریف میں؟... میں پوچھتا ہوں کہ تم کیا سمجھی ہو؟“

”mon pere، مجھے کچھ معلوم نہیں کہ آپ کی اس بارے میں کیا رائے ہے؟“ پرنس نے زیر لب کہا۔ ”میری؟ میری؟ میرا اس سے کیا تعلق؟ مجھے اس سے نکال دو! شادی میں نے نہیں کرنا۔ تمہاری کیا رائے ہے؟ اصل بات یہی معلوم ہونا چاہیے۔“

پرنس اتنا سمجھ گئی کہ وہ شادی کے اس پیغام پر خوش نہیں ہے لیکن اس کے ساتھ ہی اس کے ذہن میں یہ خیال آیا کہ جہاں تک اس کی شادی کا تعلق ہے، اس کا فیصلہ یا تو سچ ہو جائے گا یا پھر وہ ہمیشہ لکیر بنی رہے گی۔ اس نے اپنی نگاہیں نیچے جھکا لیں تاکہ وہ ان نظروں سے بچ سکیں جن کے متعلق اسے محسوس ہو رہا تھا کہ اگر وہ اپنی اس پرکڑی رہیں، پھر وہ سوچنے سمجھنے کی تمام صلاحیتوں سے محروم ہو جائے گی اور حکم کی تعمیل بجالانے کے عداوار کچھ نہیں کر سکے گی کیونکہ یہ اس کی عادت بن چکی تھی۔

”میری صرف ایک ہی آرزو ہے کہ میں آپ کی خواہشات کے مطابق عمل کروں؟“ اس نے کہا۔ ”لیکن اگر مجھے صرف یہی بتانا ہے کہ میں کیا چاہتی ہوں۔“ لیکن ابھی وہ اپنی بات ختم نہ کر پائی تھی کہ پرنس نے اسے ٹوک دیا۔ ”بہت خوب!“ اس نے گلا پھاڑ کر کہا۔ ”شخصیں تمہارے چہرہ سمیت تو لے ہی جائے گا لیکن مادہ سوزیل بوشمن اسے جھونکے میں مل جائے گی۔ وظیفہ زبردست دوا داکرے گی اور رہی تم، تم۔“

پرنس اذھیلا پڑ گیا۔ اس کے الفاظ نے اس کی بیٹی پر جو اثر کیا تھا، وہ اسے نظر آ رہا تھا۔ پرنس نے اپنی نگاہیں جھکا لیں اور اس کے آنسو تھے کہ اب چپکے، کہ اب چپکے۔

”چھوڑ دو، جانے دو۔ میں تو صرف مذاق کر رہا تھا، صرف مذاق!“ اس نے کہا۔ ”پرنس، یہ بات اپنے لیے باندھ لو۔ میں اس اصول پر قائم ہوں کہ ہر نو جوان خاتون کو یہ پورا حق حاصل ہے کہ اپنے شوہر کا انتخاب داخدا کرے۔ میری طرف سے تمہیں پوری آزادی حاصل ہے۔ لیکن اتنا یاد رکھو کہ تمہاری زندگی کی خوشیوں کا انحصار تمہارے اپنے فیصلے پر ہے۔ میرے متعلق بات کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔“

”لیکن mon pere مجھے معلوم نہیں ہے۔“

”بحث کی ضرورت نہیں ہے اور حکم کا بندہ ہے اور ہر حالت میں حکم کی تعمیل کرے گا۔ اگر اسے حکم ملا کہ وہ تمہارے ساتھ شادی کر لے، اسے کوئی عذر نہیں ہوگا اور اگر اسے کسی اور کے ساتھ رشتہ مناکحت میں منسلک ہونے کے لیے کہا گیا، وہ پھر بھی سرتابی نہیں کرے گا۔ لیکن تمہارے اوپر ایسی کوئی پابندی نہیں، تم اپنے انتخاب میں آزاد ہو۔ اپنے کمرے میں چلی جاؤ اس معاملے کے بارے میں سوچ بچار کرو۔ ایک گھنٹے میں واپس آ جاؤ اور اس کی موجودگی میں مجھے بتا دو۔ صرف ایک کا، ہاں یا نہا“ مجھے معلوم ہے کہ تم اس سلسلے میں دطائف پڑھو گی اور دعائیں مانگو گی۔ خیر، اگر تم دعائیں مانگنا چاہو، ضرور مانگو۔ بس اب جاؤ...“ پرنس چلی گئی لیکن وہ ابھی تک ”ہاں یا نہا“ کا نعرہ ”نہا“ چلنے جا رہا تھا۔ اس کے پاؤں ڈنگا رہے تھے جیسے اس پر سکتہ طاری ہو گیا ہو۔ وہ چلتا، لڑکھڑاتا کرے سے باہر نکل گیا۔

اس کے مقدر کا فیصد ہو گیا تھا اور یہ فیصد اس کی خوشیوں کے حق میں ہوا تھا۔ لیکن اس کے باپ نے مادموزیل بوغین کے بارے میں جو کچھ کہا تھا۔ بڑی بھیا تک تہمت تھا۔ ”تا یہ تہمت صحیح نہیں تھی لیکن اس میں کوئی کلام نہیں کہ وہ تھی بہت بھیا تک اور وہ اس کے حلق بار بار سوچ رہی تھی کیونکہ وہ اس کے ذہن سے نکلتی ہی نہ تھی۔ سوچتے سوچتے وہ سیدھی پود گھر میں پہنچ گئی۔ اسے نہ کچھ سنائی دے رہا تھا اور نہ دکھائی۔ مادموزیل بوغین کی (وہ سرگوشیوں میں باتیں کر رہی تھی) جانی پہچانی آواز نے اس کے تمام حواس بیدار کر دیے۔ اس نے اپنی نگاہیں اوپر اٹھائیں اور اسے چند لمحوں میں فرانسس کی عورت سے ہم آغوش ہوتا اور اس کے کان میں کچھ کہتا دکھائی دیا۔ جب اناطول کی نظر پرنس ماریا پر پڑی، اس کا خوبصورت چہرہ درشت زدہ ہو گیا تاہم اس نے مادموزیل بوغین کو، جس نے پرنس ماریا کو نہیں دیکھا تھا، اپنی آغوش سے فوراً علیحدہ نہ کیا۔

”کون ہو تم؟ کیا چاہتی ہو؟ ذرا ٹھہرو“ اناطول کا چہرہ کہتا محسوس ہو رہا تھا۔ پرنس ماریا چپ سادھے انہیں دیکھتی رہی۔ وہ اس کی تفہیم نہ کر سکی۔ بالآخر مادموزیل بوغین کی چیخ نکل گئی اور وہ وہاں سے بھاگ گئی۔ اناطول نے یوں مسکرا کر، جیسے اسے بہت لطف آ رہا ہو، پرنس ماریا کو جھک کر سلام کیا گویا وہ اسے دعوت دے رہا ہو کہ اس الونکھے واقعے پر وہ بھی اس کے ساتھ تہمت لگائے۔ پھر اس نے اپنے کندھے سے جھٹکائے۔ اور اس دروازے کی طرف، جو اس کے پار ٹنٹ میں کھلتا تھا، چل پڑا۔

ایک گھنٹے بعد میڈون آیا اور اس نے پرنس ماریا کو بتایا ”بزرگ پرنس آپ کو یاد فرما رہے ہیں اور پرنس واسلی سرکینوچ بھی وہیں ہیں۔“ جب تیختون کمرے میں داخل ہوا، پرنس ماریا مادموزیل بوغین کو، جو زار و قطار در رہی تھی، اپنے بازوؤں میں سیٹے صوفے پر بیٹھی تھی اور ہولے ہولے اس کا سر سہلا رہی تھی۔ پرنس کی خوبصورت آنکھوں کی سابقہ چمک دمک اور متانت دوبارہ لوٹ آئی تھی اور وہ مادموزیل بوغین کے ننھے منے پر جمال چہرے کو بہ نگاہ لطف و شفقت دیکھ رہی تھی۔

”نہیں، پرنس، میں آپ کی عنایات سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے محروم ہو گئی ہوں،“ مادموزیل بوغین نے کہا۔

”کیوں؟ میں تو تمہیں پہلے سے بھی زیادہ یہ رکھنے لگی ہوں،“ پرنس ماریا نے جواب دیا۔ ”اور تمہاری خوشیوں کے لیے مجھ سے جو بن پڑا، ضرور کروں گی۔“

”لیکن دل میں تو آپ مجھ سے نفرت ہی کرتی رہیں گی۔ آپ اتنی پاک صاف ہیں کہ آپ سمجھ ہی نہیں سکتیں کہ حیوانی جذبات کس طرح انسان پر غالب آ جاتے ہیں۔ کاش ma pauvre mere۔“

”میں سب کچھ سمجھتی ہوں،“ پرنس ماریا نے اپنے چہرے پر اداس مسکراہٹ سمجھرتے ہوئے کہا۔ ”مائی ڈیر، اپنے آپ کو سنبھالو۔ اب میں اباجان کے پاس جا رہی ہوں،“ اس نے یہ الفاظ کہے، اور باہر نکل گئی۔

پرنس واسیلی ایک ٹانگ دوسری ٹانگ پر رکھے بیٹھا تھا۔ اس کے ہاتھ میں نسوار کی ڈبیا، اور چہرے پر جذباتی تبسم تھا۔ اس کا یہ تبسم بزبان حال پکار پکار کر کہہ رہا تھا کہ ”میں اتنا شدید طور پر متاثر ہوا ہوں کہ اپنی حساسیت پر رونے اور ہٹنے کے لیے مجبور ہوں۔“ جب پرنس اندر آئی، اس نے چٹکی بھر نسوار بہ عجلت اپنی ناک میں ڈال دی۔

”اٹھا، مائی ڈیر، مائی ڈیر!“ اس نے اٹھتے اور اس کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھامتے ہوئے کہا۔ اس نے لمبی سانس لی اور پھر بولا ”میرے بیٹے کا مقدر تمہارے ہاتھ میں ہے۔ مائی ڈیر، میری جان، میری عزیز، نیک دل ماری، اپنے فیصلے سے ہمیں، گاہ کرو۔ میں نے تمہیں ہمیشہ اپنی بیٹی کی طرح چاہا ہے۔“

وہ پیچھے ہٹ گیا اور سچ مچ کا آنسو اس کی آنکھ سے ٹپک پڑا۔

”اٹھو، اٹھو!“ پرنس نکولا کی آندریوچ کے نتھنے پھڑپھڑائے اور وہ گویا ہوا: ”پرنس نے اپنے سوتلے اپنے صاحب زادے۔ کی جانب سے تمہیں شادی کی تجویز پیش کی ہے۔ تم پرنس اناطول کو رنگن کی بیوی بنا چاہتی ہو یا نہیں؟ جواب دو: ہاں یا نہ!“ اس نے گلا پھاڑتے ہوئے کہا۔ ”میری رائے کیا ہے، یہ میں بعد میں بتاؤں گا۔ ہاں، میرے میری اور صرف میری ہوگی،“ اس نے پرنس واسیلی کی ملتجیانہ نگاہوں کے جواب میں مزید کہا۔ ”ہاں یا نہ؟ ہونہر؟“

”اباجان، میری تمنا یہ ہے کہ میں کبھی آپ کو چھوڑ کر نہ جاؤں، کبھی آپ سے علیحدہ گھر نہ بناؤں۔ میں شادی نہیں کرنا چاہتی،“ اس نے بہت پر اعتماد سچے سے کہا۔ اس نے اپنی خوبصورت آنکھیں اپنے باپ کے چہرے سے پرنس واسیلی کے چہرے کی طرف منتقل کر دیں۔

”واہیات، فضول، واہیات، واہیات، واہیات!“ مصر پر نرس چلا کر کہہ رہا تھا۔ اس کی پیشانی ٹپکنے لگی اور اس نے اپنی بیٹی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں پکڑ لیا۔ اس نے اس کا ہوسہ تو نہیں لیا البتہ اس نے اپنی پیشانی نیچے جھکا دی اور اس کی پیشانی کے ساتھ محض چھوادی۔ پھر اس نے جو ہاتھ تھام رکھا تھا، اسے اتنے زور سے بھینچا کہ پرنس کو جھرجھری آگئی اور اس کی چیخ نکل گئی۔

پرنس واسیلی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ”اگر اجازت ہو تو میں یہ عرض کروں گا کہ یہ وہ لمحہ ہے جو میں اجازت

فراموش نہیں کر سکوں گا، کبھی نہیں بھلا سکوں گا۔ لیکن مائی ڈیر، کیا تم ہمیں دنیوی امید بھی نہیں دلاؤ گی کہ ہم کبھی تمہارے دل کو، جو اتنا نیک، اتنا فیاض ہے، جیت پائیں گے؟ صرف، شاید ہی کہہ دو۔ مستقبل کا اور چھوڑ نہیں۔ صرف شاید کہہ دو۔“

”پرنس، میں نے جو کچھ عرض کیا ہے، وہی ہے، جو میرے دل میں ہے۔ آپ نے جو میری قدر افزائی فرمائی ہے، میں اس کے لیے آپ کی ممنون ہوں لیکن میں آپ کے صاحب زادے کی شریک حیات کبھی نہیں بن سکتی۔“

”مائی ڈیر فریو، یہ معاملہ ختم ہو گیا، انجام کو پہنچ گیا! تم سے مل کر بہت خوشی ہوئی، مجھے خوشی ہے کہ تم یہاں آئے۔ پرنس، اپنے کمرے میں واپس چلی جاؤ۔ جاؤ!“ مہر پرنس نے کہا۔ ”تمہیں مل کر بہت خوشی ہوئی،“ اس نے دوبارہ کہا اور پرنس وائیلی سے بغل گیر ہو گیا۔

”میری افتاد طبع مختلف قسم کی ہے،“ پرنس ماریا سوچ رہی تھی۔ ”میری مرثت کا تقاضا ہے کہ میں باغدانہ دیگر مسرت کی جستجو کروں۔ محبت اور ایثار و قربانی کی راہ پر چلوں، پھر میری جھولی خوشیوں سے بھر سکے گی۔ اور میں اس بے چاری آرمیلی کو ضرور خوشی کا سامان بہم پہنچاؤں گی خواہ مجھے اس کی کتنی ہی قیمت کیوں نہ چکانا پڑے۔ وہ اسے دیوانہ وار چاہتی ہے اور جو کچھ اس سے سرزد ہوا ہے۔ اس پر وہ خون روتی ہے۔ ان دونوں کوشاکی کے بندھن میں باندھنے کے لیے مجھ سے جو بن پڑا، ضرور کروں گی۔ اگر وہ اتنا دولت مند نہیں ہے، پھر میں اس (بوشین) کو دساکل مہیا کروں گی۔ میں ابا جان کے پاؤں پکڑ لوں گی، میں آندرے سے تقاضا کروں گی۔ جب وہ اس کی شریک حیات بن جائے گی، میرا دل شاد ہو جائے گا۔ کتنی بد قسمت ہے بیچاری! جھنسی، بے یار و مددگار، تنہا! اوہ، میرے خدایا، وہ اس کو کتنا لوٹ کر پیار کرتی ہوگی کہ اپنا آپ بھی بھلا بیٹھی! شاپد میں نے بھی یہی کیا ہوتا!“ پرنس ہاریا نے سوچا۔

6

رستخون کوکانی عرصے تک نکو مائی کی کوئی خبر نہ مل سکی تا آنکہ آدمی سردیاں نکل گئیں، پھر کہیں کاؤنٹ کو ایک خط، جسے اس کے لختہ جگر نے اپنے ہاتھ سے لکھا تھا، چھایا گیا۔ اسے ملتے ہی وہ دوسروں کی نظروں سے پتھا پچاتا اور بچوں کے مل چلا اپنے سٹڈی روم میں چلا گیا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں اور اسے خط پڑھنے کی جلدی تھی۔ اس نے دروازہ بند کیا اور خط پڑھنے لگا۔

جب آگنا میٹا نیلو ونا کو خط کے متعلق معلوم ہوا (گھر میں جو کچھ ہوتا تھا، اسے اس کی ایک ایک بات معلوم ہو جاتی تھی)، وہ دبے پاؤں کاؤنٹ کے کمرے میں کھسک گئی۔ اس نے دیکھا کہ کاؤنٹ ہاتھ میں خط پکڑے بیک وقت سسکیاں بھی بھر رہا ہے اور پرنس بھی رہا ہے۔

اگرچہ آگنا میٹا نیلو ونا کے حالات بہتر ہو گئے تھے، مگر وہ ابھی تک رستخون کے ہاں لگی ہوئی تھی۔

”مائی ڈیر فریو؟“ اس نے پر ملاں لہجے سے دریافت کیا۔ وہ موقع محل کے مطابق ہر قسم کی ہمدردی جتانے

کے لیے تیار تھی۔

کاؤنٹ اور بھی زور زور سے سسکیاں لینے لگا۔

”نکوشکا... خط... مجروح... ہو سکتا ہے... مالی ڈیڑہ... مجروح... میرا نخت جگر... کوچک کاؤنٹس... بڑی... افسر بن گیا... خدا کا شکر ہے! ہم ننھی منی کاؤنٹس کو کیسے بتائیں گے؟“

آنا میٹا سیلوونا اس کے قریب بیٹھ گئی، اپنے رومال سے اس کے، وہ جو خط پر ٹپکے تھے اور خود اپنے، آنسو پونچھے، خود خط پڑھا، کاؤنٹ کو تسلی دل سادیا اور پھر اپنا فیصلہ سنایا کہ وہ ڈنر پر اور ڈنر کے بعد چائے تک کے عرصے کے دوران میں کاؤنٹس کو تیار کرے گی اور اگر غد وند کا فضل شامل رہا، وہ چائے کے اختتام پر اسے سب کچھ بتا دے گی۔

ڈنر کے دوران میں آنا میٹا سیلوونا جنگ کے متعلق افواہوں اور نکوشکا کے بارے میں باتیں کرتی رہی۔ گرچہ اسے پہلے ہی معلوم تھا، پھر بھی اس نے، متفہم رکھا کہ اس کا آخری خط کب موصول ہوا تھا۔ پھر خود ہی بولا، ”میرا خیال ہے کہ شاید آج ہی اس کا کوئی خط موصول ہو جائے۔“ جب بھی ان اشاروں کنایوں سے کاؤنٹس کو کوئی تشویش ہوتی، وہ گھبرا کر کبھی کاؤنٹ، اور کبھی آنا میٹا سیلوونا کی طرف دیکھنے لگتی۔ موخر الذکر جھٹ پٹ صورت ہال سنبھال لیتی اور بڑی مہارت اور چابک دستی سے گفتگو کا رخ روزمرہ کی چھوٹی موٹی باتوں کی طرف موڑ دیتی۔ نہانا پورے خاندان کی وہ واحد فرد تھی جسے لب و لہجہ کے، تارچڑھاؤ، اچھلتی نظروں اور چہروں کے تاثرات کی خفیف ترین باریکیوں کا ادراک کرنے کا خداداد ملکہ حاصل تھا۔ اس کے ڈنر کے آغاز میں ہی کانا کھڑے ہو گئے۔ وہ محض کر رہی تھی کہ دال میں کہیں کانا کالا ہے، اس کا باپ اور آنا میٹا سیلوونا کچھ چھپا رہے ہیں اور جو کچھ وہ چھپا رہے ہیں، اس کا تعلق اس کے بھائی سے ہے اور آنا میٹا سیلوونا جس انداز سے گفتگو کر رہی ہے، اس کا مقصد انھیں ہی ڈھکی چھپی بات سننے کے لیے تیار کرنا ہے۔ اپنی تمام تر بے باکی کے باوجود (نناشا اچھی طرح جانتی تھی کہ اس کی ماں ہر اس چیز کے بارے میں جس کا تعلق نکوشکا سے بنتا تھا، بے حد حساس ہے) وہ ڈنر کے دوران میں کوئی سوال پوچھنے کا حوصلہ نہ کر سکی۔ لیکن اس کے دس میں جو گھد بڑ ہو رہی تھی، وہ اسے کسی کل چین نہیں لینے دے رہی تھی۔ اس سے ٹھیک طرح کھانا بھی نہیں کھایا جارہا تھا اور گورنس کی ڈانٹ ڈپٹ کے باوجود وہ کرسی پر بار بار پہنچا رہی تھی۔ ڈنر کے بعد وہ سر پر پاؤں رکھ کر آنا میٹا سیلوونا کے پیچھے بھاگی، اسے اسے سنگ روم میں جا پکڑا اور کچا اس کی اس کی گردن پر سوار ہو گئی۔

”آئی ڈی رلگ، مجھے بتائیں کہ معاملہ کیا ہے؟“

”مالی ڈیڑہ، کچھ بھی تو نہیں۔“

”نہیں، اچھی آئی، پیاری آئی، چھوڑ دوں گی میں بھی نہیں آپ کو۔ میں یقین کے ساتھ کہہ سکتی ہوں کہ کوئی نہ کوئی بات ضرور ہے اور آپ کو یہ بات معلوم ہے۔“

آنا میخائیلوونا نے اپنی گردن کو زور سے جھٹکا۔ ”mon enfant، تم نری آفت کی پڑیا ہو۔“
 ”نکولینکا کا خط؟ مجھے پکا یقین ہے کہ بالکل یہی بات ہے!“ ننا شائے گلا پھاڑ کر کہا۔ اس نے
 آنا میخائیلوونا کے چہرے پر توشیح پڑھ لی تھی۔

”خدا کے لیے محتاط رہنا۔ تمہیں معلوم ہے کہ اس سے تمہاری امی کو کتنا صدمہ پہنچے گا۔“
 ”ضرور، ضرور، صرف مجھے بتادیں!۔ نہیں بتائیں گی؟ اچھا، پھر میں جانتی ہوں اور ابھی بتاتی ہوں!“
 ”ننا، میں کیوں نہ اس شرط پر کہ وہ کسی سے ذکر نہیں کرے گی، اسے مختصر خط کے مندرجات بتا دیے۔
 ”ہمیں، بالکل نہیں۔ وعدہ رہا،“ ننا شائے نے اپنے سینے پر صلیب کا نشان بناتے ہوئے کہا اور سونیا کی تلاش
 میں بھگے لگی۔

نکولینکا رنجی خط! اس نے کامرانی کے نشے سے جھومتے ہوئے کہا۔
 ”نکولاس؟“ سونیا صرف یہی کہہ سکی اور نانا کا اس کا رنگ فق ہو گیا۔
 ننا شائے جب سونیا پر اپنے بھائی کی جراحت کی خبر کا یوں اثر ہوتے دیکھا، اسے پہلی مرتبہ اس اعلان کی
 شگینی کا احساس ہوا۔

وہ جھٹ پٹ سونیا کی طرف لگی، اس کے گلے میں اپنے بازو و حائل کیے اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔
 ”انہیں بڑا معمولی ذمہ آیا ہے۔ ان کی ترقی ہو گئی ہے اور اب وہ انسرین گئے ہیں۔ انہوں نے خط اپنے
 ہاتھ سے لکھا ہے!“ اس نے اشکوں اور آنسوؤں کے ماہین کہا۔
 ”صاف نظر آ گیا ہے کہ تمام عورتیں بس بچوں کی طرح رونا ہی جانتی ہیں!“ پیتا نے کہا۔ وہ لمبے لمبے اور
 پرہیزگار ڈنگ بھرتا کرے میں چکر لگا رہا تھا۔ ”میں بہت خوش، واقعی بہت خوش ہوں کہ میرے بھائی نے اتنی نمایاں
 کارکردگی کا مظاہرہ کیا ہے۔ تم لوگوں کو بس دھاڑیں، رمار مار کر رونا ہی آتا ہے۔ تمہاری سمجھ میں کچھ نہیں آئے گا۔“
 ننا شائے آنسو بہاتے بہاتے مسکرا پڑی۔

”تم نے خط پڑھا نہیں؟“ سونیا نے پوچھا۔
 ”نہیں، لیکن وہ کہہ رہی تھیں کہ سب معاملہ ختم ختم ہو گیا ہے اور یہ کہ وہ اب انسرین گئے ہیں۔“
 ”خدا کا شکر ہے!“ سونیا نے اپنے سینے پر صلیب کا نشان بناتے ہوئے کہا۔ ”انہوں نے شاید تمہیں پوری
 بات نہیں بتائی ہے۔ آؤ، امی کے پاس چلتے ہیں۔“

چتا چپ چاپ کمرے کے چکر لگا رہا اور پھر بولا: ”اگر میں نکولینکا کی جگہ ہوتا، تو کئی مزید فرانسیسیوں کو
 جہنم داخل کر دیتا۔ سالے، بڑے بد معاش ہیں! میں اتنے، اتنے مارتا کہ ڈھیر لگ جاتا،“ پیتا کہے جا رہا تھا۔
 ”پیتا، چپ کر دو۔ تم نرے احمق ہو!“

”احق میں نہیں، احق وہ میں جو خواہ مخواہ، نسو بہا نے بیٹھ جاتی ہیں،“ پیتا نے جواب دیا۔
 ”تمہیں وہ یاد ہیں؟“ چند لمحوں کی خاموشی کے بعد مناشا نے چانک پوچھا۔
 سونیا مسکرائی: ”نکولاس یاد ہے؟“

”نہیں، سونیا، میرا مطلب یہ تھا کہ کیا وہ تمہیں اتنی اچھی طرح یاد ہیں کہ تم ان کی ایک ایک بات یاد کر سکو؟“ مناشا نے پر زور انداز سے پتا باز دلہراتے ہوئے کہا۔ ظاہر تھا کہ وہ اپنے الفاظ کو نہایت بنجیدہ معنی پہنچانے کی کوشش کر رہی تھی۔ ”میں بھی نکولینکا کو یاد کر سکتی ہوں،“ اس نے کہا۔ ”لیکن مجھے بورس اس طرح یاد نہیں،“ اسے بالکل یاد نہیں کر سکتی۔“

”کیا؟ تمہیں بورس یاد نہیں ہے؟“ سونیا نے حیران ہو کر پوچھا۔

”یہ بات نہیں کہ وہ مجھے یاد نہیں۔ مجھے معلوم ہے کہ اس کی شکل و صورت کیسی ہے۔ لیکن میں جس طرح کہیں کو یاد کر سکتی ہوں، اسے اس طرح یاد نہیں کر سکتی۔ محض آنکھیں بند کرنے کی بات ہے اور وہ مجھے سامنے دکائی دینے لگتے ہیں۔ لیکن بورس۔ نہیں۔“ (اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔) ”نہیں۔ کچھ بھی نہیں۔“

”اف، مناشا؟“ اس نے کچھ یوں دغیر سرت سے بے خود ہو کر وراپنے چہرے پر نگہبہتا طاری کرنے ہوئے کہا جیسے وہ تو کچھ کہنا چاہتی تھی، وہ اسے اس قابل نہیں سمجھتی کہ وہ اس کی سماعت کر سکے بلکہ وہ کسی دوسرے شخص سے، جس کے ساتھ ٹھنھا مذاق کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا، مخاطب تھی۔ ”جب ایک مرتبہ مجھے تمہارے بھائی کے ساتھ محبت ہو گئی، یہی سمجھا کہ میں بس اسی کی ہو گئی۔ اب خواہ اسے کچھ ہو جائے یا مجھے، میں آخری سانس تک اس سے صحبت کرتی رہوں گی۔“

مناشا اسے متحیر اور متحس نگاہوں سے دیکھنے لگی لیکن وہ منہ سے کچھ نہ بولی۔ اسے محسوس ہوا کہ سونیا نے جو کچھ کہا ہے، مبنی بر حقیقت ہے۔ ایسی محبت حقیقتاً موجود ہے۔ لیکن جہاں تک اس کا اپنا تعلق تھا، اسے اس قسم کا کوئی تجربہ نہیں ہوا تھا۔ اسے یقین تھا کہ ایسی محبت کا وجود ممکن ہے لیکن وہ اس کی تنہیم کرنے سے قاصر تھی۔
 ”انھیں خط لکھیں؟“ اس نے پوچھا۔

سونیا سوچ میں پڑ گئی۔ یہ سوال کہ نکولاس کو خط کیسے لکھا جائے یا یہ کہ اسے خط لکھنا بھی چاہیے یا نہیں، اسے سخت اذیت پہنچا رہا تھا۔ ”اب جب کہ وہ افسر بن چکا ہے اور زخم خوردہ ہیرو ہے، اسے اپنے متعلق یاد دلانا مناسب ہے یا نہیں؟ کہیں وہ یہ تو نہیں سمجھے گا کہ میرے بارے میں اس نے جس ذمے داری کی ہامی بھری تھی میں اس کے بہانے اسے یاد تو نہیں دلا رہی؟“

”مجھے پتا نہیں۔ میرا خیال ہے کہ اگر اس نے مجھے خط لکھا۔ میں بھی ضرور لکھوں گی،“ اس نے شرمائے ہوئے کہا۔

”تم انھیں خط لکھتے شرمائو گی تو نہیں؟“

سو نیا سکرائی۔ ”نہیں۔“

”خیر، مجھے تو بورس کو لکھتے بڑی شرم آئے گی اور میں لکھوں گی بھی نہیں۔“

”اس میں شرم کی کیا بات ہے؟“

”پتا نہیں۔ کچھ اچھا نہیں لگتا۔ بس شرم آرہی ہے۔“

”مجھے معلوم ہے کہ اسے کیوں شرم آرہی ہے،“ پیتا نے کہا۔ ناشا نے زیریں چستر اس سے جو کچھ کہا تھا، اس نے اس کے تن بدن میں آگ لگا دی تھی۔ ”بتاؤں، کیوں؟ اسے اس موٹے سے، وہی جو مینک پہنتا ہے،“ (پیتا نے اپنے ہم نام کاؤنٹ بزو خوف کا نقشہ انہی الفاظ میں کھینچا تھا) ”عشش ہو گیا تھا۔ اب یہ اس گویے پر مرنی ہے۔“ (اس کا اشارہ ناشا کے اطالوی میوزک ٹیچر کی طرف تھا) ”اس لیے اسے شرم آرہی ہے۔“

”پیتا، تم نرے کا ٹھکے الو ہے۔“

”ماما، میں تم سے بڑا کاٹھ کا الونہیں ہوں،“ نوساہ پیتا نے ایک بزرگ بریگیڈیر کے انداز سے کہا۔

آٹنا میخانیلوونا نے ڈنر پر جو اشارے دیے تھے، انہوں نے کاؤنٹس کو (اچھی بری خبر سننے کے لیے) تیار کر دیا تھا۔ وہ اپنے کمرے میں چلی گئی اور آرام کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس کی نظریں نسوار کی ڈیپا کے ڈھکنے پر اپنے تختہ جگر کے تصویر پر مرکوز تھیں اور اس کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔ آٹنا میخانیلوونا، ہاتھ میں خط پکڑے، پنجرے کے بل چلتی، کاؤنٹس کے کمرے کی طرف آئی اور دروازے پر رک گئی۔

”آپ اندر نہ آئیں،“ اس نے مستحکم کاؤنٹ سے کہا۔ ”بعد میں آجائیں۔“ وہ اندر چلی گئی اور اپنے پیچھے دروازہ

بھینر دیا۔

کاؤنٹ نے روزین قفل پر اپنا کان لگا دیا اور سننے لگا۔ ابتدا میں اسے ادھر ادھر کی باتیں سنائی دیں۔ پھر آٹنا میخانیلوونا نے لمبی چوڑی تقریر شروع کر دی۔ اس کے بعد چیخ کی آواز سنائی دی اور پھر خاموشی چھا گئی۔ تب دیکھا کہ دونوں عورتیں اکٹھی بولنے اور خوشی سے چہچہانے لگیں۔ آخر کار قدموں کی چاپ سنائی دی اور آٹنا میخانیلوونا نے دروازہ کھول دیا۔ اس کا چہرہ خرم و مساباات سے دک رہا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ کوئی جراح قطع عضو کے کسی مشکل آپریشن سے فارغ ہوا ہے۔ وراہ اپنی مہارت کی داد وصول کرنے کے لیے عامتہ اناس کو اندر آنے کی دعوت دے رہا ہے۔

”سر ہو گیا!“ اس نے فتح مندی کے احساس سے جھومتے ہوئے کاؤنٹ سے کہا اور کاؤنٹس کی طرف، جو ایک ہاتھ میں نسوار کی ڈیپا، جس پر تصویر چہ تھا، اور دوسرے میں خط تھا سے ہوئے تھی اور انہیں باری باری اپنے لکھلکے سے لگا رہی تھی، اشارہ کیا۔

جب اس نے کاؤنٹ کو دیکھا، اس نے اپنے بازو پھیرا دیے اور اس کے سنبھے سر کو اپنی آغوش میں لے لیا۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ اس کی چوٹی کے اوپر سے تصویر پر خط کو بھی دیکھتی جا رہی تھی اور اس نے انہیں ایک

مرتبہ پھر چومنے کے لیے ہستہ ہستہ بے باں سر یک طرف دھکیل دیا۔

دیر، نانا شاہ سو نیا اور پتیا بھی کمرے میں آگئے اور خط دوبارہ پڑھا جانے لگا۔ فوج کی پیش قدمی، ان دنوں انہیں جن میں اس نے حصہ لیا تھا اور پٹی ترقی کی اجمالی روداد بیان کرنے کے بعد گولائی نے اپنے والدین کی دست برداری کی تھی اور ان سے اپنے حق میں دعا کرنے کی درخواست کی تھی۔ اس نے دیر، نانا شاہ، اور پتیا کے متعلق لکھا کہ وہ ان کے ہاتھوں کو بھی بوسہ دیتا ہے۔ اس نے موسیو شیلنگ، مادام شوس اور اپنی سابقہ آیا کو سلام بھیجا تھا۔ آخر میں اس نے اپنا کی تھی: ”میری طرف سے پیاری سو نیا کا بوسہ لیں۔ میں اب بھی اس سے پیار کرتا ہوں اور اس کے بارے میں میرے خیالات اب بھی وہی ہیں جو پہلے تھے۔“ جب سو نیا نے یہ سب کچھ سنا، وہ شر، گئی اور اس کی آنکھیں رہنے لگیں۔ وہ ان نگاہوں کی، جو اسے دیکھ رہی تھیں، تاب نہ لاسکی اور بال روم میں بھگ گئی وہاں وہ اتنا مچی، گھومی اور کودی کہ اس کی سکرٹ غبارے کی طرح پھول گئی اور وہ خوشی سے تھمتھاتے اور مسکراتے فرش پر ڈھیر ہو گئی۔ کاؤنٹس رو رہی تھی۔

”اما، آپ کیوں رو رہی ہیں؟“ دیر، نانا نے پوچھا۔ ”اس نے جو کچھ لکھا ہے، ہمیں اس پر خوشی ہونا چاہیے نہ کہ رونا۔“ بات بالکل ٹھیک تھی۔ لیکن کاؤنٹ، کاؤنٹس اور نانا شاہ، بھی اسے ملامت آمیز نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ ”یہ کس پر مبنی ہے؟“ کاؤنٹس سوچ رہی تھی۔

نگوشکا کا خط سنکر دوس مرتبہ پڑھا گیا۔ جن لوگوں کو اس قابل سمجھا گیا کہ انہیں یہ خط سنایا جاسکتا ہے، انہیں کاؤنٹس کی خدمت میں ضرور ہونا پڑتا کیونکہ وہ اسے ہاتھ سے چھوڑنے کے لیے تیار نہیں تھی۔ ٹیوٹر، آبا، نکا اور متعدد دوست آتے اور کاؤنٹس خود انہیں خط پڑھ کر سناتی۔ ہر بار اسے نیا لطف آتا اور ہر مرتبہ اس پر اپنے کوشاکی نئی خوبیاں آشکار ہونے لگتیں۔ اسے یہ بات کتنی عجیب، غیر معمولی اور فرحت آگئیں معلوم ہوتی کہ اس کا بیٹا۔ جس کے ننھے منے اور مہین اعضا آج سے بیس سال قبل اسے اپنے پیٹ میں خفیف گردش کرتے محسوس ہوتے تھے، وہ بیٹا جس کے بارے میں اس کا کاؤنٹ سے، جو خود ضرورت سے زیادہ اس کی ناز برداری کیا کرتا تھا، جھگڑا ہو جایا کرتا تھا، وہ بیٹا جس نے ”nanny“ سے پہلے ”pear“ کہنا سیکھا تھا۔ آج اس کا وہی بیٹا دیار غیر میں، اجنبی ممالک میں ٹڈر جگہ ہے، اکیلا ہے، بے بار و مددگار ہے، لیکن مردوں کے کارنامے سر انجام دے رہا ہے۔ قرن ہاتھ کا یہ عالمگیر تجربہ کہ بچے پالنے سے پالی میں پہنچ جاتے ہیں اور محسوس بھی نہیں ہونے دیتے، کاؤنٹس کے نزدیک کوئی وجود نہیں رکھتا تھا۔ اس کا بیٹا جب ایک منزل سے دوسری منزل میں داخل ہوتا، کاؤنٹس اسے غیر معمولی واقعہ قرار دیتی جیسے اربوں انسانوں نے ازیں قبل بالکل اسی طرح نمود کی منازل طے نہیں کی تھیں۔ جس طرح آج سے بیس سال پہلے اسے یہ بات ناقابل یقین دکھائی دیتی تھی کہ ننھی ننھی مخلوق جو اس کے قلب کے نیچے کہیں رہی تھی، ایک

روزِ عظیم چار کرے گی، اس کی چھ تیوں کا رودھ ہے گی یا باتیں کرے گی بعینہ آج اس کے لیے یہ یقین کرنا ممکن ہو رہا تھا کہ دی نہی منی مخلوق تو ی تن اور قوی رہل افسر بن گئی ہے، فرزندوں اور مردوں کے معیار کو چھوٹے لگی ہے، اس کے خط سے تو یہی ظاہر ہوتا تھا۔

”کیا اسلوب بیان ہے! کس خوبصورت انداز سے اس نے ہر چیز کا نقشہ کھینچا ہے!“ اس نے خط کی بیانیہ عبارت پڑھتے ہوئے کہا۔ ”کتنا بڑا دل پایا ہے اس نے! اپنے بارے میں کچھ بھی نہیں لکھا۔ ایک لفظ تک تحریر نہیں کیا۔ کوئی دینی سرف ہے، اس کا لبا چوڑا تہ کرہ ہے، مگر وہ خود دوسروں کی نسبت غالباً کہیں زیادہ بہادر ہے۔ میں ہمیشہ کہتی تھی، ہمیشہ کہتی تھی، جب وہ اتنا سادہ تھا، میں ہمیشہ کہتی تھی۔“

گھر کے تمام افراد ایک ہفتے سے زیادہ کلوشکا کے نام خطوط لکھنے میں مصروف رہے۔ انھوں نے ابتدائی مسودے تیار کیے، ان پر بار بار نظر ثانی کی اور پھر انھیں خوش خط تحریر کیا۔ نو کمشن یافتہ افسر کی وردیاں بنانے اور اس کی دوسری ضروریات فراہم کرنے کے لیے جو روپیہ پیسہ اور دیگر اشیاء درکار تھیں، کاؤنٹس کی زیر نگرانی اور کاؤنٹ کی بھاگ دوڑ کے بعد جمع کی گئیں۔ ”نمائے خانیلو دنا عمی عورت تھی۔ وہ فوجی حکام سے اپنے اور اپنے بیٹے کے لیے خاصی مراعات حاصل کرنے میں کامیاب رہی تھی۔ ان مراعات میں اپنے بیٹے کے ساتھ مراسلت کی سہولت بھی شامل تھی۔ اسے گارڈز کے کمانڈر گرینڈ ڈیوک کانتاشن پادوودج کے نام خطوط ارسال کرنے کے موقع میسر تھے۔ دستوں نے فرض کر لیا کہ خطوط پراحتا پراحتا، روسی گارڈز مقیم دساور: ہی کافی ہے۔ اگر گارڈز کے کمانڈر گرینڈ ڈیوک کو خط مل سکتا ہے، پھر کوئی وجہ نہیں کہ یہ پادوگرات رجمنٹ تک، جو غالباً کہیں ڈس پڑس میں ہی مقیم ہوگی، نہ پہنچ سکے۔ چنانچہ یہ فیصلہ کر لیا گیا کہ خطوط اور رقوم ڈیوک کے اپنی کی دسالت سے بورس تک پہنچادی جائیں اور بورس انھیں کلوشکا تک پہنچانے کا بندوبست کر دے گا۔ کاؤنٹ نے اپنے بیٹے کے نام جو سامان بھیجا، اس میں کاؤنٹ، کاؤنٹس، پیتا، ویرا، اننا شا ورسونیا کے خطوط اور اس کی وردی اور دیگر ضروریات کے لیے چھ ہزار روبل کی رقوم شامل تھیں۔

7

کلوشکا کے جنگجو دستے جو اول موٹس کے قریب رجوار میں ڈیرے ڈالنے پڑے تھے، ہارٹوہر کوردی اور آسٹروی دونوں پہرہ طوروں کو سلامی دیے کی تیاریاں کر رہے تھے۔ گارڈز تازہ تازہ روس سے واپس ہوئے تھے۔ انھوں نے رات اول موٹس سے دس میل دور گزاری۔ انھیں سلامی کے لیے صبح دس بجے سیدھا اول موٹس کے میدان میں پہنچنا تھا۔ اس روز کلوشکا کی رستوف کو بورس کا رقعہ ملا۔ اس میں اس نے اسے اطلاع دی تھی۔ ”اسما عیلوف“¹⁷ رجمنٹ اور موٹس سے دس میل ادھر مقیم ہے۔ میں تم سے ملنا چاہتا ہوں کہ کیونکہ میں تمہیں ایک خط اور کچھ رقم پہنچانا چاہتا ہوں! کب جب کہ اپنی ہم کے بعد فوجی دستے اول موٹس کے نزدیک قیام پزیر تھے، رستوف کو روپے پیسے کی خاص طور پر

ضرورت محسوس ہو رہی تھی کیونکہ ان کے کمپ میں عارضی دکانوں کی، جو ہر قسم کے مال و اسباب سے اُلٹی تھیں، بھر مار ہو گئی تھی اور آسٹروی یہودی فروخت کے لیے ایسی ایسی اشیاء جنہیں خریدنے کو ہر شخص کا جی لپکتا تھا، پیش کر رہے تھے۔ ہم کے دوران میں پاؤلو گرات ہوواروں کو جو تمغے، دریاوارڈ ملے تھے، ان کا جشن منانے کے لیے یکے بعد دیگرے دعوتیں منعقد ہو رہی تھیں۔ پھر لوگ تفریح منانے جوت در جوت اول موٹس کے چکر کاٹ رہے تھے۔ وہاں ایک ہنگر دی خاتون کیرولین نے ایک ریسٹوران، جس میں بیروں کی خدمات لڑکیاں سرانجام دیتی تھیں، کھولا تھا۔ رستوف کی کیڈٹ سے لیفٹیننٹ کی جو رتی ہوئی تھی، اس کا س نے پچھلے دنوں جشن منایا تھا۔ اس نے دینی سوف کا گھوڑا بند بھی خرید لیا تھا اور یوں وہ ہما شاسب کا مقروض ہو گیا تھا۔ بورس کا رتھ ملنے کے بعد اس نے گھوڑا پکڑا اور اپنے ایک ساتھی افسر کی معیت میں اول موٹس پہنچ گیا۔ وہاں انھوں نے کھانا کھایا اور ایک بوتل سے انگور پی۔ اس کے بعد وہ اپنے بچپن کے دوست کی تلاش میں اکیلا ہی گارڈز کے کمپ کی طرف چل پڑے۔

رستوف کو ابھی تک دروی خریدنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ اس نے کیڈٹوں کا وہی پرانا سرنا کوٹ، جس پر ہام پاپیوں کی صلیب کشیدہ تھی، پہن رکھا تھا۔ اس کی بر جس کی حالت خاصی خستہ تھی۔ اس کی چری پشت گھس گئی تھی۔ وہ اپنا افسرانہ خنجر اس پھندے دار ڈوری کے ساتھ، جو ششیر باندھنے کے کام آتی تھی، باندھے ہوئے تھے۔ جس ردی گھوڑے پر سوار تھا، وہ اس نے ہم کے دوران میں ایک قازق سے خریدا تھا۔ اس نے ہوزاروں کی ٹوپی، جو ٹیڑھی میڑھی ہو چکی تھی، بالکین سے سر کے ایک جانب ٹکائی ہوئی تھی۔ جب وہ اسما سیلون رجسٹ کی طرف جا رہا تھا، اسے یہ فکر کھائے جا رہی تھی کہ بورس اور اس کے ساتھی اس کے جیسے کے۔ وہ شکل صورت سے بالکل جاکو ہوزار، جو میدان جنگ میں فائرنگ کا سامنا کر چکا ہو، معلوم ہوتا تھا۔ بارے میں کیا رائے قائم کریں گے۔

اپنے کوچ کے تمام عرصے کے دوران میں گارڈز اپنی صفائی ستھرائی اور ضبط و نظم کی جس طرح نمائش کرتے چلے آئے تھے، اس سے یہ تاثر ملتا تھا کہ وہ کسی تفریحی دورے پر نکلے ہوئے ہیں۔ انھوں نے سفر چھوٹی چھوٹی منزلوں سے کرتے آرام اور سہولت سے طے کیا تھا۔ ان کے تھیلے سامان کے چھٹروں پر لدے تھے اور راستے میں انھوں نے جہاں بھی قیام کیا، آسٹروی حکام نے ان کے افسروں کی سرغن کھانوں سے تواضع کی۔ رتھیں جینڈ بجاتے شہر میں داخل ہوتیں اور ہینڈ بجاتے رخصت ہوتیں اور گریڈڈ یوک کے حکم پر جوانوں نے سارا سفر قدم سے قدم مار کر طے کیا (اس نکتے پر گارڈز بہت دلوں کی لیتے تھے)۔ انسران پیدل تھے اور سب اپنی اپنی جگہیں سنبھالے رہے۔ پورے سفر کے دوران میں بورس برگ کی، جو ہم کے دوران میں کمپن بن چکا تھا اور اب کہنی کمانڈر کے نرائش

سرانجام دے رہا تھا، معیت میں رہا اور اسی کے ساتھ قیام کرتا رہا۔ برگ اپنا ہر کام نہایت پھرتی اور مستعدی سے کرتا تھا اور پابندی رقت کا خاص خیال رکھتا تھا۔ یوں وہ اپنے سینئر افسروں کا اعتماد حاصل کرنے اور اپنے الی اور نہایت سودمندانہ بنیادوں پر ستوار کرنے میں کامیاب رہا تھا۔ بورس نے اسی عرصے کے دوران میں متعدد ایسے اشخاص کے ساتھ، جو بوقت ضرورت اس کے کام آسکتے تھے، روابط برپا کیے تھے اور ایک سفارشی خط کے، جو اس

نے بیٹرسے حاصل کیا تھا، حوالے سے اس نے پریس آفیسر سے بلکونسکی تک رسائی حاصل کر لی۔ اسے امید تھی کہ وہ اس کی وساطت سے کمانڈر انچیف کے شاف میں شامل ہو سکے گا۔

برگ اور بورس دونوں نئی اسبے درغ اور بے عیب وردیوں میں ملبوس تھے۔ گزشتہ روز کے کوچ کے بعد انھیں جو تھکاوٹ محسوس ہوئی تھی، آرام کے بعد وہ بھی دور ہو گئی تھی اور اب صاف تھرے مکان میں، جہاں انھیں الاٹ ہوا تھا، بیٹھے شطرنج کی بازی لگا رہے تھے۔ برگ نے خاصا بڑا سموکنگ پائپ اپنے گھٹنوں کے بیچ گھسیڑ رکھا تھا۔ بورس، اپنی مخصوص درستی اور مہارت کو بروئے کار لا کر اپنی نرم و نازک سفید انگلیوں کے ساتھ مہروس کا اہرام تعمیر کر رہا تھا اور اس انتظار میں کہ اس کا ساتھی کب چار چلتا ہے، اس کے چہرے کی جانب دیکھ رہا تھا۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ صرف اپنے کھیل کے بارے میں سوچ رہا ہے کیونکہ یہ اس کی عادت تھی کہ وہ اپنی توجہ ہمیشہ صرف اس کام پر، جو وہ کر رہا ہوتا، مرکوز رکھتا تھا۔

”اچھا، اب کیسے بچو گے؟“ اس نے پوچھا۔

”کوشش کریں گے،“ برگ نے ایک پیادے کو چھیڑتے اور جھٹ پٹ اپنا ہاتھ پیچھے کھینچتے ہوئے کہا۔ اسی لمحے دروازہ کھلا۔

”انہو، یہ رہا وہ!“ رستوف نے نعرہ مارا۔ ”اور برگ بھی! ارے واہ، petitfan, ellay cushay“
”domir، اس نے اپنی نرس کا غلط سلطہ فرانسیسی میں جملہ، جس پر وہ اور بورس خوب ہنسا کرتے تھے، دہراتے ہوئے کہا۔

”واللہ تم تو بالکل بدل گئے ہو!“ بورس نے رستوف کا استقبال کرتے ہوئے کہا لیکن انھیں کے دوران میں وہ ان چند مہروں کو، جو ذرا ادھر ادھر ہو گئے تھے، ٹھیک کرنا نہ بھولا۔

وہ اپنے دوست سے معاف نہ کرنا چاہتا تھا لیکن نکلوانی پیچھے ہٹ گیا۔ شباب کی ایک خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ بیسپے پٹائے راستوں پر چلنے سے خائف رہتا ہے، تقلید سے روگردانی کرنا چاہتا ہے، اپنے اسرار کا اظہار نئے اور انوکھے انداز سے کرنے پر پھلتا ہے، بزرگوں نے جو روایتی اسالیب اپنائے ہوتے ہیں، ان سے گریز کرتا ہے کیونکہ اس کے نزدیک ان کی اساس منافقت پر ہوتی ہے۔ چنانچہ نکلوانی بھی اپنے دوست سے ملاقات کے موقع پر کوئی ایسی حرکت، جو کسی نے نہ کی تھی، سنی ہو، کرنا چاہتا تھا۔ وہ بورس کے چنگی لے سکتا تھا، اسے دھکا دے سکتا تھا لیکن مدد اپنی بوسہ بازی کا رد ادا نہیں ہو سکتا تھا، اس کا یہ تھا کہ یہ تو ہر کوئی کرتا پھر رہا تھا۔ اس کے برعکس بورس اس سے پرسکون اور دوستانہ انداز سے بغل گیر ہوا اور اس نے تیس مرتبہ اس کے بوسے لیے۔

دونوں کو نئے تقریبات میں، وہ ہو چکے تھے۔ وہ عمر کے اس دور میں سے گزر رہے تھے جب نوجوان عملی زندگی میں پہلا قدم اٹھاتے ہیں۔ ان کی جب ملاقات ہوتی ہے، انھیں ایک دوسرے میں زبردست تبدیلیاں نظر آتی ہیں۔ درحقیقت یہ تبدیلیاں ان حالات و اشخاص کی، جن کے مابین انھوں نے یہ اولیں قدم اٹھایا ہوتا ہے، عکاس ہوتی ہیں۔ چنانچہ اپنی گزشتہ

ملاقات کے بعد وہ تھامے تبدیل ہو چکے تھے اور دونوں اپنی ان تبدیلیوں کی نمائش کرنے کے لیے بہت جہاد تھے۔
 ”ارے خدا کی پشکار تم لوگوں پر، بڑے بائکے، جھیل جھیلے بنے پھرتے ہو! اتنے سٹے سٹے اور دھلے دھلائے،
 معلوم ہوتا ہے کہ ابھی، ابھی ضیافت سے واپس آئے ہو! نہ کہ ہم برگشتہ نصیبوں کی طرح محاذ جنگ سے!“ رستوف
 نے عسکری اکڑفوں سے پنی گرد آلود بر جس کی طرف اشارہ کرتے اور خاصے تیکھے لہجے سے بات کرتے ہوئے کہا۔
 اس کا یہ انداز گفتگو بورس کے لیے بالکل نیا تھا۔

رستوف کی چیخنی چنگھاڑتی آواز سن کر جرمن مالک مکان نے دروازے کے اندر جھانک کر دیکھا۔

”اچھی ہے، کیا فیاں ہے؟“ رستوف نے آنکھ مارتے ہوئے کہا۔

”تم اتنا چلا کیوں رہے ہو؟ تم ان کی روح فنا کر دو گے،“ بورس نے کہا۔ ”مجھے، میدان نہیں تھی کہ تم آج آؤ
 گے،“ اس نے مزید کہا۔ ”میں نے تمہیں کو تو روف کے ایک ایجوٹنٹ — بلکونسکی، جو اللہ ق سے میرا دوست ہے۔
 کے ذریعے رقعہ بھیجا تھا۔ میں نے یہ سوچا بھی نہیں تھا کہ وہ اسے اتنی جلدی تمہیں پہنچا دے گا۔ خیر، تمہارا حال کیا
 ہے؟ قارئنگ بھی بھگت چکے؟“

جواب دیے بغیر رستوف نے اپنے بازو کی طرف، جس پر پٹی بندھی ہوئی تھی، اشارہ کیا، سینٹ جارج کراں
 (تمغہ)، جو عسکری انداز سے ایک دھمکے سے اس کی دردی کے ساتھ لٹک رہا تھا، ذرا آگے پیچھے کھینچا اور ہلر
 مسکر کر برگ پر نگاہ ڈالی۔

”دیکھ لو،“ اس نے کہا۔

”ہاں، بالکل،“ ہاں، ہاں!“ برگ نے خندہ لبی سے کہا۔ ”ہمارا ٹوچ بھی بہت پر شکوہ تھا۔ تمہیں معلوم
 ہونا چاہیے کہ ہنز میسرل ہائی نس نے بیشتر سفر ہماری رجمنٹ کے دوش بدوش کیا۔ چنانچہ ہم ہر قسم کی سہولت اور
 آرام سے بہرہ یاب ہوئے۔ پولینڈ میں ہمارے اعزاز میں جو تقریر بات، ڈنر اور ناچ کی محافل منعقد ہوئیں،
 میں ان کی تفصیل بتانے سے قاصر ہوں، بلکہ انھیں صحیح انداز میں بیان کرنا اس پیچ مدان کے بس کی بات ہی
 نہیں! از ایوچ¹⁸ ہم تمام افسروں کے ساتھ نہایت شفقت سے پیش آتے رہے۔“

اور دونوں دوست ایک دوسرے کو اپنے اپنے کارناموں کی تفصیل سناتے رہے۔ ایک نے ہوزدوں کی
 رنگ ریسوں اور محاذ جنگ پر ان کی زندگی کے بارے میں بتایا اور دوسرے نے اعلیٰ ترین شخصیات کی کان میں
 خدمات سرانجام دینے کے فوائد و سہولتیں سنوائیں، وغیرہ وغیرہ۔

”ارے، تم گارڈز!“ رستوف نے کہا۔ ”خیر، چھوڑو، آؤ دھڑ رز سے ذرا شغل ہو جائے۔“

بورس نے برا سامنا نہ کیا۔ ”اگر واقعی تمہاری یہی خواہش ہے۔“ وہ اپنے پٹنگ کی طرف گیا۔ صاف تھمرے
 ٹیکوں کے نیچے سے اپنا پرس نکالا اور انگوری شراب منگوانے کے لیے آدمی بھیج دیا۔ ”اور میرے پاس تمہاری جو رزم
 اور خط ہے، وہ میں تمہیں دیے دیتا ہوں۔“

رستوف نے روپیہ صوفیہ پر چھال دیا، خط پکڑا، اپنی دووں بائیں میز پر نکائیں اور اسے پڑھنے بیٹھ گیا۔ کئی سطور پڑھنے کے بعد اس نے خوشخوار نگاہوں سے برگ کی جانب دیکھا۔ جب دونوں کی نظریں چار ہوئیں، اس نے اپنا چہرہ خط کے پیچھے چھپایا۔

”معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے تمہیں خاصی بڑی رقم بھیجی ہے،“ برگ نے ورنی پر کی طرف جس کے بوجھ سے صوفیہ پر ہلکا سا گڑھ نمودار ہو گیا تھا، دیکھتے ہوئے کہا۔ ”ایک ہم ہیں کہ تنخواہ سے دال دلیا چلانے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں۔ کاؤنٹ، جہاں تک میرا تعلق ہے، میں تمہیں بتا سکتا ہوں کہ۔“

”دیکھو، دوست،“ رستوف نے برگ سے کہا۔ ”جب گھر سے تمہیں کوئی خط موصول ہوگا اور اپنے کسی عزیز سے، جس سے تم بہت کچھ پوچھنا چاہو گے، تمہاری ملاقات ہوگی، اگر میں وہاں موجود ہوں، میں بلاتا خیر وہاں سے کھسک جاؤں گا اور تمہارے پھندے میں ۲ گنگ نہیں اڑاؤں گا! اب ذرا مہربانی فرماؤ اور سیدھے سادے یہاں سے تشریف لے جاؤ۔ جاؤ، چلے جاؤ، کہیں بھی چلے جاؤ۔ خواہ جہنم میں جاؤ لیکن چلے جاؤ!“ اس نے حلق کا پورا زور لگا کر کہا۔ پھر اس نے معاً اس کا کندھا پکڑا، خوش خلقی سے اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ اس نے زبانی کلامی حس بدتمیزی کا مظاہرہ کیا تھا، اس کی طرف سے کرنا چاہتا ہے۔ ”یار، ناراض نہ ہونا،“ اس نے مزید کہا۔ ”تمہارے جیسے پرانے دوست کے ساتھ میں لگی لپٹی رکھے بغیر بات کرتا ہوں۔“

”چھوڑو کاؤنٹ۔ میں تمہاری بات سمجھ گیا ہوں،“ برگ نے اٹھتے دیکھتی گھٹی آواز حلق سے نکالتے ہوئے کہا۔ ”یوں کیوں نہیں کرتے کہ پنے میزبانوں کے ہاں چلے جاؤ۔ انھوں نے تمہیں دعوت تو دی تھی،“ بورس نے تجویز پیش کی۔

برگ نے اپنا بہترین اور انتہائی صاف ستھر کوٹ، جس پر کوئی دھبہ یا گرو کا معمولی سا ذرہ بھی دکھائی نہیں دیتا تھا، پہنا، آئینے کے سامنے کھڑا ہوا اور کینٹیوں پر اپنے بال، جو اس نے الیکساندر پاولوویچ کے اعزاز میں ترشوائے اور ہوائے تھے، درست کیے۔ اور جب اسے رستوف کے چہرے مہرے کو دیکھ کر یقین ہو گیا کہ اس کا کوٹ دیکھ بیا گیا ہے، وہ خوش خلقی سے مسکرایا اور باہر نکل گیا۔

”میں بھی نرا درندہ ہوں، واقعی!“ رستوف خط پڑھتے پڑھتے بڑبڑایا۔
”کیوں؟“

”میں بالکل نڈر ہوں۔ پہلے تو گھردلوں کو خط تک نہ لکھا اور جب لکھا، ان کے اوسان خطا کرا دیے،“ اس نے اپنی بات ابھرائی اور اس کا چہرہ اور کان سرخ ہو گئے۔ ”خیر، چھوڑو۔ تم نے گادرینا کو شراب لانے بھیجا تھا۔ بہت خوب، پھر ہو جائے کچھ شغل؟“

گھردلوں نے اسے جو خطوط بھیجے تھے، ان میں ایک سفارشی رقمہ باگ راتیاں کے نام تھا۔ معمر کاؤتس نے یہ خط آٹنا میخائیلوونا کے مشورے پر اپنے ملنے ماننے والوں کی وساطت سے حاصل کیا تھا اور اپنے بیٹے کو بھیج

دیا تھا۔ اس نے اپنے لخت جگر کو تلقین کی تھی کہ وہ یہ خط مکتوب الیہ کو لازماً پہنچا دے اور اس سے فائدہ اٹھائے۔
 ”بالکل فضول چیز ہے مجھے اس سے کیا لینا ہے؟“ رستوف نے خط میز کے نیچے پھینکتے ہوئے کہا۔
 ”یہ تم نے پھینک کیوں دیا ہے؟“ بورس نے پوچھا۔

”سفارشی قسم کا رقعہ ہے۔ جہنم میں جائے، مجھے اس سے کیا لینا ہے؟“

”جہنم میں کیوں جائے؟“ بورس نے خط اٹھاتے اور اس پر درج پتا پڑھتے ہوئے کہا۔ ”یہ خط تمہارے
 بہت کام آسکتا ہے۔“

”مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے اور نہ میں کسی کا ایجوٹٹ بننا چاہتا ہوں۔“

”کیوں نہیں؟“ بورس نے پوچھا۔

”یہ چیچک گیروں کی نوکری ہے!“

”سمجھ گیا۔ تم ابھی تک خوابوں کی دنیا میں رہتے ہو،“ بورس نے اپنی گردن جھٹکاتے ہوئے کہا۔

”اور تم نے ابھی تک موقع شناسی نہیں چھوڑی۔ خیر، چھوڑوان باتوں کو، ان کی یہاں کوئی تک نہیں ہے

اب بتاؤ، تمہارا حال کیا ہے؟“ رستوف نے پوچھا۔

”تمہارے سامنے ہی ہے۔ اب تک تو ہر چیز ٹھیک ٹھاک ہے۔ لیکن میں ایک بات کا اعتراف کرنا ہوں

کہ میں محاذ پر نہیں رہنا چاہتا، میرا دل چاہتا ہے کہ میں جھٹ پٹ ایجوٹٹ بن جاؤں۔“

”کیوں؟“

”وہ اس لیے جب ایک دفعہ آپ نے فوجی پیشہ اختیار کر لیا، پھر آپ کو چاہیے کہ اس میں زیادہ سے زیادہ

ترقی کے مواقع تلاش کریں۔“

”ہر نہ، تو یہ وجہ ہے...“ رستوف نے کہا۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ کچھ اور سوچ رہا ہے۔

اس نے نہایت توجہ اور استفہامیہ نگاہوں سے اپنے دوست کے چہرے کی طرف دیکھا۔ کچھ یوں معلوم ہوتا

تھا کہ وہ کسی سوال کا جواب تلاش کرنے کی ناکام کوشش کر رہا ہے۔

من رسید و گادرینا شراب لے آیا۔

”اب ہم الفانسے کارلوویچ¹⁹ کو نہ بلا لیں؟“ بورس نے پوچھا۔ ”پینے پلانے میں وہ تمہارا ساتھ دے سکے گا،

میں نہیں۔“

”ہاں، بلا لو۔ تمہاری اس بہن کے ساتھ کیسے قسمتی ہے؟“ رستوف نے حقارت سے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

”وہ انتہائی نفیس، کھرا اور شگفتہ مزاج آدمی ہے،“ بورس نے جواب دیا۔

رستوف نے ایک بار نہایت توجہ سے بورس کے چہرے کی طرف دیکھا اور آہ بھری۔ برگ واپس آگیا۔

سے نوشی کے دوران میں تینوں افسروں کے مابین گفتگو میں خاصی گراگری آگئی۔ گارڈز کے افسروں نے رستوف

کو اپنے کوچ کے بارے میں بتایا۔ سفر کے دوران میں ان کی روس، پولینڈ اور ممالک غیر میں جس طرح خاطر تواضع ہوئی تھی، انھوں نے اس کی تفصیلات کھول کر بیان کیں۔ انھوں نے اپنے کمانڈر کے فرمودات اور اقبال پر روشنی ڈالی اور اس کی شفقت و درید مزاجی کے قصے سنائے۔ جن امور سے برگ کا براہ راست تعلق نہ بنتا تھا، وہ حسب معمول ان کے بارے میں چپ سادھے رہتا تھا، تاہم جب گریٹ ڈیوک کی آتش مزاجی کا ذکر آیا، اس نے مزے لے لے کر بتایا کہ وہ اس سے کس طرح عہدہ برآ ہو تھا۔ ”گالیٹیا میں قیام کے دوران میں ایک مرتبہ گریٹ ڈیوک رجنٹوں کا معائنہ فرما رہے تھے کہ انھیں کوئی بے قاعدگی نظر آگئی۔ اس پر ان کا پارہ چڑھ گیا لیکن جب میرا ان سے سامنا ہوا، میں انھیں ٹھنڈا کرنے میں کامیاب ہو گیا۔“ برگ شکستہ مزاجی سے مسکرایا اور بتانے لگا: ”گریٹ ڈیوک گھوڑے پر سوار میرے قریب پہنچے اور چلا کر بولے، ’آرنوٹ۔‘“ (یہ زیرو پوچ کی دس پسندیدہ نام تھی اور وہ اسے انتہائی غصے کے عالم میں استعمال کیا کرتا تھا۔) ”اور اس نے کپنی کمانڈر یعنی مجھے بل بھیجا۔

”کاؤنٹ، کیا تم یقین کرو گے کہ مجھے ذرا بھی خوف محسوس نہ ہو کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ میں راستی پر ہوں۔ کاؤنٹ، تم جانتے ہو کہ رجنٹ کے احکام اور قواعد مجھے اسی طرح حفظ ہیں جس طرح دعائے ربانی۔ میں سیدھی سادی حقیقت بیان کر رہا ہوں، ڈون کی نہیں لے رہا۔ چنانچہ، کاؤنٹ، یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ میری کپنی میں کبھی غفلت یا لاپرواہی نہیں برتی گئی۔ میرا ضمیر صاف تھا۔ میں نے قدم آگے بڑھایا۔“ (برگ اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور عملی طور پر بتانے لگا کہ وہ ڈیوک کے سامنے کس طرح پیش ہوا تھا۔ اس نے اپنی ٹوپی کے جھجکے کو جس انداز سے چھوا، اس کے بعد یہ تصور کرنا قطعی ناممکن تھا کہ کوئی اور شخص اس سے بڑھ کر بھی مؤدب اور مطمئن ہو سکتا ہے یا نہیں۔) ”خیر وہ اہل پڑے۔ وہ مجھے برا بھلا کہے جا رہے تھے، جن طعن کیے جا رہے تھے، جھاڑ پٹائے جا رہے تھے۔ کبھی وہ مجھے، آرنوٹ، کہتے، کبھی ’معاون‘ اور کبھی سائیر یا بھیجنے کی دھمکی دیتے۔ میرے لیے یہ اتنا زندگی کا مسئلہ نہیں رہا تھا جتنا کہ موت کا بن چکا تھا۔“ برگ نے زیر کی سے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”میں جانتا تھا کہ میں راستی پر ہوں چنانچہ میں منہ میں گنگنٹیاں ڈالے کھڑا رہا۔ کاؤنٹ، یہ بہترین ترکیب نہ تھی؟“ کیا بات ہے، تم گونگے ہو، بہرے ہو؟ انھوں نے چلا کر کہا۔ میں پھر بھی خاموش رہا۔ گلے روز جو ہدایات موصول ہوئیں، ان میں اس واقعے کا ذکر تک نہیں تھا۔ اگر آدمی اپنے اوسان بحال رکھے، تو اس کا یہ ناکدہ ہوتا ہے اواقعی، کاؤنٹ، میں صحیح عرض کر رہا ہوں،“ برگ نے اپنے پائپ کا کش لیتے وردھوں کے مرغولے ہاتے ہوئے کہا۔

”ہاں، تمہارا رویہ قابل تحریف تھا!“ رستوف نے کہا۔

لیکن بورس بھانپ گیا کہ رستوف برگ کی بھڑاڑانا چاہتا ہے، چنانچہ اس نے نہایت چابک دستی سے موضوع تبدیل کر دیا۔ اس نے رستوف سے کہا: ”یہ بتاؤ کہ تمہیں یہ رزم کہاں اور کیسے آیا؟“ اس پر رستوف خوش ہو گیا اور وہ انھیں تفصیلات بتانے لگا۔ جوں جوں وہ اس بارے میں گفتگو کرتا گیا، توں توں اس کا جوش و خروش بڑھتا گیا۔ اس نے شون گراہن کی جھڑپ بالکل ان لوگوں کے جنھوں نے کسی جنگ میں شرکت کی ہوتی ہے، انداز میں

بین کی۔ یہ لوگ عام طور پر واقعات کو اس طرح بیان نہیں کرتے جس طرح وہ وقوع پذیر ہوئے ہوتے ہیں بلکہ وہ انھیں اس طرح پیش کرتے ہیں جس طرح انھوں نے دوسرے لوگوں کو اس کا ذکر کرتے سنا ہوتا ہے۔ یوں وہ ان واقعات کو کہیں زیادہ پر شکوہ بنا دیتے ہیں اور وہ وہ نہیں رہتے جو حقیقتاً وقوع پذیر ہوئے ہوتے ہیں۔ رستوف راست باز نو جوان تھا اور وہ کسی صورت میں بھی دیدہ دانستہ جھوٹ نہیں بولتا تھا۔ اس نے گفتگو کا انداز اس برادے سے کیا تھا کہ وہ بالکل وہی کچھ، جو درحقیقت پیش آیا تھا، بیان کرے گا۔ لیکن وہ نامحسوس، غیر شعوری اور ناگزیر طور پر دروغ گوئی کا شکار ہو گیا۔ اس کی طرح اس کے سامعین نے گھڑ سوار دستے کے حملے کے متعلق بے شمار داستانیں سنی تھیں اور حتمی اصل میں کیا تھا، اس کے بارے میں اپنے ذہن میں ایک واضح تصور باندھ لیا تھا۔ وہ بھی اس وقت اسی قسم کی کہانی سننے کی توقع کر رہے تھے۔ اگر وہ انھیں صحیح صورت حال سے آگاہ کرنا، انھیں یقین ہی نہ آتا اور اس سے بھی بدتر بات یہ ہوتی کہ وہ یہ سمجھنے لگتے کہ خود رستوف غلط بیانی کر رہا ہے کیونکہ رستوف کے ساتھ وہ کچھ پیش نہیں آیا تھا جو عام طور پر ان لوگوں کے ساتھ، جو گھڑ سوار دستوں کے حملوں میں حصہ لیتے ہیں، پیش آیا ہوتا ہے۔ وہ انھیں یہ سیدھی سادی بات نہ بتا سکا کہ وہ خاصی تیز رفتاری سے گھوڑوں پر روانہ ہوئے تھے لیکن وہ خود گھوڑے سے گر پڑا تھا، اس کے بازو میں سوچ آگئی تھی، ایک فرانسیسی سے بچنے کے لیے وہ سر پر پاؤں رکھ کے بھاگا تھا اور جنگل میں جا چھپا تھا۔ علاوہ ازیں اگر وہ ہر بات بالکل اسی طرح بیان کرتا جس طرح وہ وقوع پذیر ہوئی تھی، اسے اچھے خاصے ضبط نفس سے کام لینا پڑتا۔ سچ بولنا بڑا مشکل کام ہے اور نو جوان شاذ و نادر ہی اس کے بل بوتے پر ہیں۔ اس کے سامعین یہ توقع کر رہے تھے کہ وہ انھیں یہ بتائے گا کہ وہ کس طرح جوش میں آکر اپنے آپ کو فراموش کر بیٹھا، مثل ہونان دشمن کی صفوں پر چھپنا، دائیں دائیں جو بھی اس کی لپٹ میں آیا، اس نے اسے تھخ کر دیا کس طرح اس کی شمشیر نے خون کا ذائقہ چکھا اور پھر کس طرح وہ نڈھال ہو کر نیچے گر پڑا، وغیرہ وغیرہ۔ اور اس نے انھیں بتایا بھی یہی کچھ۔ کہانی کے دوران میں جب وہ یہ کہہ رہا تھا کہ ”تم لوگ یہ تصور بھی نہیں کر سکتے کہ حمے کے دوران میں انسان پر کس طرح کا جنون طاری ہو جاتا ہے،“ پرنس آندرے بکھوٹسکی، جس کا بورس منتظر تھا، کمرے میں داخل ہو۔ پرنس آندرے کو نو جوانوں کی سرپرستی کر کے لطف آتا تھا اور جب نو جوان اس کے اثر و سوغ کے پیش نظر اس سے کوئی درخواست کرتے تھے، اس کی انا کو بہت تسکین پہنچتی تھی۔ بورس ایک روز قبل اس پر اچھا تاثر قائم کرنے میں کامیاب رہا تھا۔ چنانچہ اس نو جوان کے ساتھ اس کا رویہ ہمدردانہ ہو گیا تھا اور وہ اس کی درخواست کو قبولیت بخشنے میں خوشی محسوس کر رہا تھا۔ کو تو زرف نے اسے زار یوچ کو چند کاغذات پہنچانے کے لیے بھیجا تھا۔ اس نے سوچا کہ چلتے چلتے کہ وہ اس نو جوان سے بھی ملتا جائے۔ چنانچہ وہ اس امید میں کہ وہ اکیلا ہی ہوگا، اندر آ گیا۔ جب اس نے ٹرا کا ہزار کو اپنے کارنامے سناتے دیکھا (پرنس آندرے اس قسم کے اشخاص برداشت نہیں کر سکتا تھا) وہ بورس کی طرف دوستانہ انداز سے مسکرایا لیکن جھکے جھکے اور غڈھل انداز سے صوفے پر بیٹھنے سے قبل رستوف کو، جسے اس نے سر کی معمولی جنبش سے سلام کیا تھا، دیکھ کر اس کے ماتھے پر شکنیں پڑ گئیں اور اس کی آنکھیں سکڑ گئیں۔ اس کی

طبیعت میں ملال آگیا کیونکہ وہ ناپسندیدہ لوگوں کی صحبت میں پھنس گیا تھا۔ رستوف سمجھ گیا اور اس کا چہرہ لال بھبرا ہو گیا۔ تاہم اس نے کوئی پروا نہ کی کیونکہ یہ آدمی اس کے نزدیک پرکاؤ کے برابر بھی نہ تھا لیکن جب اس نے نگاہ اٹھا کر بورس کی طرف دیکھا، تو اسے یوں لگا جیسے وہ بھی جنگجو ہوزار کی وجہ سے شرمندہ ہو رہا ہے۔ اس امر کے باوجود کہ پرنس آندرے کا بچہ ناخوشنوار اور فظریہ تھا، اور اس بات کے باوجود کہ رستوف اپنے نقطہ نظر کے اعتبار سے ایک جنگجو انسان کی حیثیت سے ان چھوٹے موٹے شاف ایگونیوں کو، جن میں واضح طور پر یہ نووارد بھی شامل تھا، بنظر حقارت دیکھتا تھا، وہ (رستوف) جھینپ گیا، اس کا چہرہ سرخ ہو گیا اور اس نے خاموشی اختیار کر لی۔

بورس نے پوچھا: ”شاف افسروں کو کوئی خبر ملی ہے؟ اگر آپ نامناسب سمجھیں، تو یہ بھی فرمادیں کہ ہمارا آئندہ لائحہ عمل کیا ہوگا؟“

”ہم غالباً پیش قدمی کریں گے،“ بلکونسکی نے کہا۔ صاف نظر آ رہا تھا کہ اجنبیوں کی موجودگی میں وہ مزید کچھ کہنے سے ہچکچا رہا ہے۔

برگ نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا اور بڑی لجاجت سے بولا: ”منا ہے کہ کمپنی کا اندرون کا گھوڑا اداؤنس دکن کیا جا رہا ہے؟“ اس کے جواب میں پرنس نے مسکراتے ہوئے کہا: ”اتنے منجیدہ سرکاری مسئلے پر میں اپنی رائے ظاہر کرنے کی جسارت نہیں کر سکتا۔“ اس جواب پر برگ کو بہت حنف آیا اور وہ ہنس پڑا۔

”جہاں تک تمہارے مسئلے کا تعلق ہے،“ پرنس آندرے نے بورس کی طرف متوجہ ہو کر کہا، ”ہم اس کے بارے میں بعد میں بات کریں گے۔“ اس نے اچھٹی سی نظر رستوف پر ڈالی اور مزید کہا: ”معاذے کے بعد میرے پاس آ جانا، مجھ سے جو ہوسکا، ضرور کروں گا۔“

اس سے سرسری نگاہوں سے کمرے کا جائزہ لیا اور پھر رستوف کی طرف متوجہ ہو گیا۔ رستوف کی بچکانہ کوفت، جس پر اس کے لیے قابو پانا مشکل ہو رہا تھا، اب برہمی میں تبدیل ہو گئی۔ پرنس آندرے نے اس پر دھیان دینا اپنی شان کے منافی سمجھا اور بولا:

”میرا خیال ہے کہ ہم شون گراہرن کے معرکے کے بارے میں گفتگو کر رہے تھے۔ تم وہاں تھے؟“

”تھا،“ رستوف نے جھٹکا کر کہا جیسے وہ ایجنٹ کی توہین کرنا چاہتا ہو۔

بلکونسکی ہوزار کی ذہنی کیفیت سے آگاہ تھا اور اس پر وہ کچھ مظلوظ بھی ہوا تھا۔ وہ قدرے حقارت سے مسکرایا۔

”ہاں، اس جھڑپ کے بارے میں طرح طرح کی داستانیں سننے میں آرہی ہیں،“ اس نے کہا۔

”داستانیں، جی ہاں!“ رستوف نے با آواز بلند چلا کر کہا۔ اس نے پہلے بورس کو اور پھر بلکونسکی کو ایسی

نگاہوں سے دیکھا، جو اچانک شعلہ بار ہو گئی تھیں۔ ”جی ہاں، داستانیں بے شمار ہیں۔ لیکن ہماری داستانیں ان بہادروں کی، جو وہاں موجود تھے اور جنہوں نے دشمن کی قاتلنگ کا سامنا کیا تھا، داستانیں ہیں ہماری داستانوں میں کچھ وزن ہے۔ یہ داستانیں نشتہ نفس لوگوں کی، جو شاف میں شامل ہیں، ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے

رہتے ہیں اور مفت میں تمغوں سے نوازے جاتے ہیں، راستانوں سے مختلف ہیں!“

”وہ طبقہ جس کے بارے میں تمہارا خیال ہے، کہ میں بھی اس کا فرد ہوں؟“ پرنس آندرے نے بڑے تحمل سے پوچھا اور وہ یوں مسکرایا جیسے وہ بہت محفوظ ہو رہا ہو۔

اس شخص کے تحمل اور صبر نفس کو دیکھ کر رستوف کے دل میں غصہ بھر گیا، جس میں عجیب و غریب انداز سے اس آدمی کے لیے احترام کا جذبہ شامل ہو گیا تھا۔

”میں آپ کی بات نہیں کر رہا،“ اس نے کہا۔ ”میں آپ کو جانتا نہیں اور چکی بات یہ ہے کہ مجھے آپ کی پروا بھی نہیں۔ میں عمومی اعتبار سے سٹاف افسروں کی بات کر رہا تھا۔“

”اور میں تمہیں اتنا بتائے دیتا ہوں“ پرنس آندرے نے پرسکون ٹھکانے سے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا، ”کہ

تم میری توہین کرنے کے خواہش مند ہو۔ اگر تم میں عزت نفس اور خودداری کا فقدان ہے، پھر ایسا کرنا کوئی مشکل کام نہیں لیکن تم نے اس مقصد کے لیے جو مقام اور وقت منتخب کیا ہے، وہ بالکل نامناسب ہے۔ چند دنوں میں میں عظیم

اور کہیں سنجیدہ معرکہ آرائی میں شریک ہونا ہے اور اس کے علاوہ اگر بد قسمتی سے تمہیں میرا چہرہ مہرہ اچھا نہیں لگنا تو اس میں درد نہیں سکونے کا، جنہوں نے مجھے بتایا ہے کہ وہ تمہارے بہت پرانے دوست ہیں، قطعاً کوئی قصور نہیں۔

تاہم“ اس نے اٹھتے ہوئے کہا: ”تم میرا نام بھی جانتے ہو اور تمہیں یہ بھی معلوم ہے کہ میں کہاں مل سکتا ہوں۔ لیکن یاد رکھو،“ اس نے مزید کہا: ”میں نہیں سمجھتا کہ میری یا تمہاری کوئی توہین ہوئی ہے اور ایک ایسے شخص کی حیثیت سے،

جو عمر میں تم سے بڑا ہے، میں تمہیں یہ مشورہ دوں گا کہ اس قہقہے کو اب جانے دو... درد نہیں سکونے، میں مجھے کو معاف کے بعد تمہارا منتظر رہوں گا۔ خدا حافظ۔“ اس نے اپنی بات ختم کی، دونوں کو ذرا جھک کر سلام کیا اور باہر نکل گیا۔

پرنس آندرے جب جاچکا، تب کہیں رستوف کو وہ جواب سوچا جو اس کے خیال کے مطابق اسے دینا چاہیے تھا۔ چونکہ یہ جواب وقت پر اس کے دماغ میں نہیں آتا تھا، اسے اور بھی غصہ آ گیا اور وہ حل بھیں کرکب اور

گیا۔ اس نے حکم دیا کہ اس کا گھوڑا بلاتا خیر حاضر کیا جائے۔ اس نے سرد مہری سے بورس سے اجازت لی اور روانہ ہو گیا۔ تمام راستہ اسے یہ سوال پریشان کرتا رہا کہ اس معاملے پر مٹی ڈالی جائے یا کل ہیڈ کو ارٹھر جا کر اس گھنڈی

ایجوٹ کو ڈیکل لڑنے پر نلکارا جائے۔ ایک موقع پر وہ محاسنت سے اس مسرت کے، جو اسے اس خردماغ، کمزور دماغ اور پست قامت شخص کو اس کے پستول کا سامنا کرتے وقت کپکپاتے دیکھ کر ہوئی، بارے میں سوچنے لگا، لیکن اگلے ہی لمحے جب اسے یہ محسوس ہوا کہ وہ جن لوگوں کو جانتا ہے ان میں سے کسی کو بھی وہ دوست بنانا اتنا پسند نہیں کرے گا جتنا

کہ اس قابل نفرت منحنی ایجوٹ کو، اس کی حیرت کی کوئی انتہاء نہ رہی۔

رہتے، جو تازہ تازہ روک سے آئے تھے اور وہ جو کو تو زوف کے ساتھ مختلف معرکہ آریوں میں شرکت کر چکے تھے، روہوں شامل تھے۔ دونوں اسپر اموروں نے اسی ہزار افراد پر مشتمل مشترک سپاہ سے سہائی لی۔ روہی اسپر امور کے ساتھ اس کا ولی عہد زار یوچ اور آشروکی اسپر امور کے ساتھ اس کا ولی عہد آریچ ڈیوک تھا۔

دھل دھلائی اور صاف ستھری وردیوں میں ملبوس سپاہ علی الصبح میدان میں مجتمع ہو گئی تھی اور قلعے کے سامنے صف بندی کر رہی تھی۔ وقفے وقفے سے ان سروں کے حکم پر ہزاروں ٹانگیں اور سنگینیں متحرک ہو جاتیں یا رک جاتیں، پرچم لہراتے مڑتیں، وقفوں کے دوران میں صف بندی کرتیں اور دوسری اقسام کی وردیوں میں ملبوس پیادہ فوج کی ایسی ہی صف بندیوں کے گرد چکر کاٹنے لگتیں۔ ان سے کچھ دور سب سواروں کے، جن کی ررق برق وردیوں میں کبودی، ارغوانی اور زمردی پٹیاں پیوست تھیں، دستے تھے اور ان کے آگے آگے مشکلی، کیت اور سرنگی گھوڑوں پر عمدہ وردیاں جوان کے اجسام پر خوب چسب رہی تھیں، پہنے ہینڈ باجے والے تھے۔ وقفے وقفے سے گھوڑوں کے سم باقاعدہ تال میل کے ساتھ زمین پر گرتے اور گھڑ سواروں کا ساز و سامان چھینچھانے لگتا۔ سب سواروں اور پیادہ دستوں کے مابین توپ خانے کی لمبی قندار رینگتی جا رہی تھی۔ گھنٹالوں پر نیلے رنگ، روغن کیا گیا تھا اور وہ خوب چمک رہی تھیں۔ ان گھنٹالوں کے فلیکوں سے مخصوص قسم کی بو آ رہی تھی۔ جن گاڑیوں پر وہ لدی ہوئی تھیں، وہ ان کے بوجھ سے دبئی جا رہی تھیں اور ڈھٹائی سے ڈھچک ڈھچک کرتی اپنی مقررہ پوزیشنوں کی طرف بڑھ رہی تھیں۔ نہ صرف جرنیل، جو اپنے سکارفوں، تمغوں اور اعزازوں سمیت اپنی مکمل وردیوں میں بیویں تھے، جنھوں نے اپنی دلی تکی یا سوئی کرسی حد لامکان حد تک اندر کو بھینچ رکھی تھی اور جن کی گردنیں جنگ کالروں میں پچی ہوئی تھیں، افسر جو بن ٹھن کر اور خوشبوئیں لگا کر آئے تھے، بلکہ عام سپاہی، جو پوری طرح تیار ہو کر آئے تھے، جن میں سے ہر ایک نے ہاتھ منہ دھویا اور سلیٹے سے شیو بنائی تھی، اور اپنے ہتھیاروں اور دوسرے سامان کو صاف کیا اور چمکایا تھا، اور گھوڑے بھی، جن کے اجسام کھریوں سے رگڑ رگڑ کر اتنے صاف کیے گئے تھے کہ وہ سرن کی طرح جھلنے لگے تھے اور جن کی ایلیں شکنیں دور کرنے کے لیے پانی میں بھگوئی گئی تھیں،۔ سبھی یہ محسوس کر رہے تھے کہ جو کچھ قلعہ پذیر ہو رہا ہے، نہایت اہم، بنجیدہ اور پر وقار ہے، اس لیے اس کے بارے میں کسی قسم کا تساہل یا لاپرواہی نہیں برتنا چاہیے۔ ہر جرنیل اور سپاہی کو، اپنی بے وقعتی کا احساس تھا اور وہ اس بات سے آگاہ تھا کہ انسانوں کے اس سمندر میں اس کی حیثیت ریت کے ذرے سے زیادہ نہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اسے اپنی قوت کا شعور بھی تھا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ وہ عظیم نکل کا جزو ہے۔

جہل پہل اور محنت مشقت نور کے تراکے ہی سے شروع ہو گئی تھی۔ دس بجے تک ہر چیز مقررہ ترتیب کے مطابق آرہی تھی اور فوجی دستے وسیع و عریض میدان میں اپنی اپنی صفیں بنا چکے تھے۔ ساری فوج تین طبقوں میں صف آرا کی گئی تھی۔ سب سے آگے گھڑ سوار دستے تھے، ان کے عقب میں توپ خانہ اور سب سے آخر میں پیادہ سپاہ تھی۔ فوج کی مختلف شاخوں کو تو زوف کے لڑاکا دستے (جن کی دائیں جانب سب سے آگلی صف

میں پادلو گرات ہوا رکھڑے تھے، گارڈز، وہ جنگجو چمٹیں جو ابھی ابھی روس سے آئی تھیں اور آسٹریا پہاڑ کے مابین کشادہ سڑک برابر قافلہ رکھ گیا تھا لیکن وہ سب کی سب ایک جیسی ترتیب بنائے اپنی اپنی صفوں میں اپنے اپنے کمانڈر کے ساتھ کھڑی تھیں۔

جس طرح ہوا چٹوں میں سرسراہٹ گزرتی رہتی ہے، اسی طرح ایک سے دوسری اور دوسری سے تیسری صف کی کانپھوسیوں کے ذریعے یہ اطلاع پہنچنے لگی کہ ”وہ آرہے ہیں! وہ آرہے ہیں!“ خوف و ہراس کی آوازیں سنائی دینے لگیں اور دستے آخری تیاریوں میں مصروف ہو گئے۔ اگرچہ اس روز ہو بند تھی لیکن عین کی لمحہ ان کے سروں کے اوپر ہلکی ہلکی باد نسیم سر اٹھانے لگی۔ نیزوں پر پھریرے پھڑ پھڑانے لگے اور بلند پرچم اپنے بانسوں کے ساتھ ٹکرانے لگے۔ معلوم ہوتا تھا کہ اس ہلکی پھلکی جنبش کے ساتھ فوج فی نفسہ امپراطوروں کی آمد پر اپنی خوشی کا اظہار کر رہی ہے۔ واحد آواز ”اٹینشن“ سنائی دی۔ پھر جس طرح بوقت طلوع آفتاب کیے بعد دیگرے مرغوں کی ٹکڑوں کی صدائیں کانوں سے ٹکراتی ہیں، بعینہ یہ آواز بھی مختلف مقامات پر دہرائی گئی اور اس کے بعد کال سکوت طاری ہو گیا۔

مرگ آسہ خاموشی کے دوران میں صرف گھوڑوں کے سہوں کے زمین سے ٹکرانے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ یہ گھوڑے، امپراطوروں اور ان کے مشاف افسروں کے تھے۔ جو نہی دونوں امپراطور بازو کی جانب بڑھے، اسپ سور فوج کی فرسٹ رجمنٹ کے ہنگلیوں نے عمومی کوچ کا ترانہ چھیڑ دیا۔ معلوم ہوتا تھا کہ نہ صرف ہنگلیوں بلکہ بحیثیت مجموعی ساری فوج نے امپراطوروں کی آمد پر خوشی سے سرشار ہو کر فی ابد یہ یہ آوازیں اٹھانا شروع کر دی ہیں۔ موسیقی کی تانوں میں صرف امپراطور الیکسندر کی پرشب اور فرحت بخش آواز سنی جاسکتی تھی۔ جو نہی اس کے لبوں سے ”خوش آمدید“ کے الفاظ ادا ہوئے، فرسٹ رجمنٹ کے جوان ”ہرا“ (”Hurrah!“) کے فلک شکاف نعرے بلند کرنے لگے۔ ان کے نعروں کی آواز اتنی بلند، طویل اور فرحت آ کا رہی کہ خود جوانوں پر ہی ہجوم کی، جس کا وہ حصہ تھے، تعدد اور قوت کا اتنا رعب پڑا کہ وہ ہیبت زدہ رہ گئے۔

رستوں کو تو زرف کی فوج کی، جس کی طرف زار سب سے پہلے آیا، سب سے اگلی صفوں میں کھڑا تھا۔ زار کی آمد پر اس نے وہی کچھ محسوس کیا جو فوج کے باقی تمام افراد محسوس کر رہے تھے۔ یہ حساس تھا خود فراموشی کا طمانت کے پر فر شعور کا، اور اس شخص کے ساتھ، جس کے اعزاز میں یہ پروقا تقریب منعقد ہو رہی تھی، پر جوش جاں فانی کلمہ سے محسوس ہوا کہ اس آدمی کے ابد کے ایک اشارے پر یہ زبردست ہجوم (جس میں وہ بے وقعت ذرہ بھی، جو کہ وہ خود تھا، شامل تھا) آگ میں کور جائے گا، پانی میں چھلانگ لگا دے گا، جرائم کے ارتکاب پر آمادہ ہو جائے گا، موت کو گلے لگائے گا یا جرأت و دلیری کے عظیم ترین کارنامے سر انجام دینے پر تیار ہو جائے گا۔ اور جب اسے محسوس ہوا کہ یہ اشارہ ان کے سروں پر منڈلا رہا ہے، اسے جھرجھری آگئی، اس کا جسم تھر تھرانے لگا اور اس کے دل کی حرکت رک گئی۔

عمومی کوچ کی دھنوں کی معیت میں مختلف رجمشیں کیے بعد دیگرے امپراطور کو خوش آمدید کہہ رہی تھیں۔ جہاں وہ کسی رجسٹ کے قریب پہنچتا، چاروں اطراف سے فصا "ہڑا، ہڑا، ہڑا" کے نعروں سے گونج اٹھتی۔ اس کے بعد عوامی کوچ کی دھن بجتی اور ایک بار پھر "ہڑا، ہڑا" کے فلک شکاف نعرے بلند ہونے لگتے۔ یہ آوازیں لحظہ بہ لحظہ بلند سے بلند تر ہوتی جا رہی تھیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ اس کے شور و غل سے کانوں کے پردے پھٹ جائیں گے۔ امپراطور کی آمد تک ہر رجسٹ پتھر کے بت کی طرح ساکت و صامت کھڑی رہتی لیکن جو نئی وہ اس کے برابر آتا، اس بت میں جان پڑ جاتی ورنہ جن رجمشوں کا موسیٰ کر کے آیا ہوتا، ان کی آوازوں کے ساتھ آواز نہ کر نعرہ بلند کرنے لگتا۔ ان آوازوں کے مہیب اور کانوں کے پردے پھڑپھڑانے والے شور و غل اور پتھروں کی طرح چپ چاپ کھڑے فوجی دستوں کے مابین سینکڑوں ٹاف افسر خراماں خراماں لیکن تپاں میل کے ساتھ گھوڑوں پر سوار چلے آ رہے تھے اور ان کے آگے آگے دو اشخاص۔ دونوں امپراطور۔ تھے اور یہی وہ اشخاص تھے جن پر تمام سپاہ کی بھرپور، غیر منقسم اور پر جوش توجہ مرکوز تھی۔

طرح رارنہ جواں امپراطور ایکسا ندر ہارس گارڈز کی وردی میں ملبوس تھا۔ اس کے سر پر تڑھکی ٹوپی تھی۔ اس کے مدد داخل دگش تھے اور اس کی آواز دھیمی ہونے کے باوجود پاٹ رہی تھی۔ وہ سب کی آنکھوں کا ہمارا تھا، اور سبھی نگاہیں اس پر مرکوز تھیں۔

رستوف بلگیوں کے آس پاس کھڑا تھا۔ اس کی خیر نگاہوں نے زار کو دور ہی سے پہچان لیا تھا اور وہ اس کی آمد کا منظر بخوردیکھ رہا تھا۔ جب ان کے مابین بیس قدموں کا فاصلہ رہ گیا اور گولائی اس کے خوبصورت، شگفتہ اور پر شباب چہرے کے ایک ایک خدوخال میں امتیاز کرنے لگا، اس کے باطن میں محبت اور وجد آفریں مسرت کا چشمہ، جس کا اسے پہلے کبھی تجربہ نہیں ہوا تھا، رواں ہو گیا۔ اسے زار کی ایک ایک چیز۔ اس کا ایک ایک خدوخال، ایک ایک اشارہ، ایک ایک جنبش۔ و قریب معلوم ہونے لگی۔

زار پاؤں گرات رجسٹ کے سامنے رک گیا۔ اس نے فرانیسی میں آسٹردی امپراطور سے کچھ کہا اور مسکرائے لگا۔

اس مسکراہٹ کو دیکھ کر رستوف بھی بے اختیار مسکرا دیا اور اسے اپنے دل میں امپراطور کی محبت پہلے سے بھی کہیں زیادہ امنڈتی محسوس ہوئی۔ وہ کسی نہ کسی انداز سے اپنی محبت کا اظہار کرنے کے لیے بے قراں ہو رہا تھا۔ چونکہ اسے معلوم تھا کہ یہ ناممکن ہے، وہ روٹکھا ہو گیا۔ زار نے رجمشل کا نذر کو بلایا اور اس سے چند الفاظ کہے۔

"اب، خدایا، اگر زار مجھ سے ہم کلام ہو گئے، پھر کیا ہوگا؟" رستوف نے سوچا۔ "خوشی سے میرا تودم ہی نکل جائے گا۔"

زار نے انہروں کو بھی مخاطب کیا۔

"جٹلمین، میں آپ سب کا ممنون ہوں۔" (رستوف کو اس کا ہر لفظ سادہ سی لفظ معلوم ہوتا تھا۔) "میں آپ

سب کا تہہ دس سے مشکور ہوں۔“

اگر رستوف وہیں اور اسی وقت اپنے زار پر جان قربان کر سکتا، اسے کتنی راحت ہوتی!

”آپ حضرات نے اپنی ہمت کے بل بوتے پر سینٹ جارج کے غلام حاصل کر لیے ہیں اور مجھے معلوم ہے

کہ آپ صاحبان ان کے اہل ثابت ہوں گے۔“

”کاش میں ان پر اپنی جان فدا کر سکتا، انہیں اپنی جان کا نذرانہ پیش کر سکتا!“

زار نے کچھ اور بھی کہا لیکن رستوف کو وہ سنائی نہ دیا اور سپاہیوں نے اپنے پیچھے لوگوں کا پورا زور لگا کر فریاد

بلند کیا: ”ہرا!“

رستوف بھی اپنی زمین پر جھک کر پوری قوت سے نعرے لگانے لگا۔ وہ چاہتا تھا کہ وہ اپنی وجد اور مسرت کا پوری طرح اظہار کر سکے، اس کوشش میں خواہ وہ مجروح ہی کیوں نہ ہو جائے۔

زار کئی سیکنڈ ہوا زاموں کی طرف رخ کیے کھڑا رہا۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ کچھ متذبذب ہے۔

”امپراطور کیسے متذبذب ہو سکتے ہیں؟“ رستوف سوچ رہا تھا۔ لیکن زار کے باقی تمام افعال کی طرح اسے اس کا یہ متذبذب بھی پر شکوہ اور مسحور کن نظر آ رہا تھا۔

تاہم زار کا یہ متذبذب صرف ایک ثانیہ برقرار رہا۔ اس نے اپنے پاؤں سے، جس میں وہ اس زمانے کے فیشن کے مطابق جنگ اور نوکدار جوتے پہنے ہوئے تھا، اپنی مختصر دم والی کیمت گھوڑی کو، جس پر وہ سو رہا تھا، ایڑ لگائی، سفید دستانوں میں ملفوف ہاتھوں سے لگام تھامی اور وہاں سے آگے بڑھ گیا۔ اس کے پیچھے پیچھے ایڑی کانگوں کی فوج کی فوج ڈولتی ڈولتی چلی آرہی تھی۔ وہ دوسری رستمیوں کے سامنے رستار کا تار گئے ہی آگے چلتا گیا جہاں تک ایڑی کانگوں کے بیچ میں، جنہوں نے دونوں امپراطوروں کو اپنے نرغے میں لے رکھا تھا، رستوف کو اس کے بیٹ کے صرف سفید پر ہی دکھائی دینے لگے۔

ایڑی کانگوں کے اس جلوں میں رستوف کو بکونسکی کی شکل بھی نظر آئی۔ وہ اپنے گھوڑے پر ڈھیلے اچھے انداز سے بیٹھا تھا اور ماحول سے بیگانہ معلوم ہو رہا تھا۔ رستوف کو اس کے ساتھ اپنی دیروزہ جھڑپ یاد آگئی اور وہ سوچنے لگا کہ اسے ڈولتی ڈولتی لڑنے کے لیے چیلنج دیا جائے یا نہ۔ ”بالکل نہیں!“ اسے اب خیال آیا۔ ”اس موقع پر اس قسم کی باتیں سوچنے کا یا ان کے ذکر کرنے کا فائدہ؟ محبت، وجد آفریں مسرت اور جاں نثاری کے اس عالم میں ہمارے چھوٹے موٹے جھگڑوں اور بے عزتیوں کی اہمیت ہی کیا رہ جاتی ہے؟ اب میں ہر شخص سے پیار کرتا ہوں۔ اس کی خطائیں معاف کرتا ہوں۔“

جب امپراطور تقریباً تمام رستمیوں کا معائنہ کر چکا، رکی مارچ پست شروع ہو گیا اور رستوف اپنے ہاتھ گھوڑے پر، جو اس نے دینی سوف سے خریدا تھا، سوار اپنے سکواڈرن کے عقب میں چلنے لگا۔ یہ الفاظ مگر وہ اکیلا جا رہا تھا اور امپراطور کو صرف نظر آ سکتا تھا۔

امپراطور کے قریب پہنچنے سے پہلے رستوف نے، جو بہت عمدہ لہجہ سوار تھا، اپنے گھوڑے کو دوسرے مہینے لگایا اور اسے اچھی خاصی تیز رننا را اختیار کرنے پر مجبور کر دیا۔ گھوڑا بھی جب جوش میں آتا تھا، اسی رفتار سے دوڑنا اس کی عادت بن گیا تھا۔ اس نے جھگ اڑا لی تھو تھنی جھکائی اور اپنی دم اوپر اٹھالی۔ امپراطور اسی کی طرف دیکھ رہا تھا اور معلوم ہوتا تھا کہ گھوڑے کو بھی یہ احساس ہے کہ امپراطور کی نگاہیں اس پر پڑ رہی ہیں۔ وہ اپنی ٹانگوں کو خوبصورت اور دلکش انداز سے اچھالتا، جیسے زمین کو چھوئے بغیر نصاب میں اڑا جا رہا ہو۔ بے حد دل آویز چال چلتا امپراطور کے سامنے سے گزر گیا۔

رستوف خود بھی، اپنی ٹانگیں خاصی پیچھی جانب شکائے، پنہ پیٹ غر کو بھینچے اور اپنے آپ کو گھوڑے ہی کا جزو سمجھتے، جیسا کہ دینی سوف نے بعد میں کہا تھا: ”پانکل ایلین کی طرح،“ امپراطور کے برابر سے گزر گیا۔

”پاؤلو گراتو۔ شاہاش!“ امپراطور نے کہا۔

”میرے خدایا! اگر وہ اسی وقت مجھے آگ میں کود جانے کا حکم دے دیں، مجھے کتنی مسرت ہوگی!“ رستوف نے سوچا۔

جب مارچ پاسٹ ختم ہو گیا، نو آبدہ سپاہ اور کو تو زوف کی زیر کمان فوج کے افسر ٹولیوں میں بٹ گئے اور ان امرات کے، جو عطا کیے گئے تھے، آسٹریویوں اور ان کی وردیوں، اگلی صفوں اور بونا پارت کے بارے میں گفتگو کرنے لگے۔ ان کا خیال تھا کہ اگر پرشیا کی سین²³ میں مقیم کر پہنچ گئی اور روسیوں اور آسٹریویوں کے دوش بدوش جنگ میں حصہ لینے پر آمادہ ہو گئی، پھر بونا پارت کا کیا حشر ہوگا۔

لیکن تمام ٹولیوں کی گفتگو کا سب سے بڑا موضوع امپراطور ایکسا ندر تھا۔ اس نے جو کچھ کہا تھا، اس کا ایک ایک نفاذ ہرایا گیا اور اس کے ایک ایک اشارے کا مسرت و شادمانی سے ذکر کیا گیا۔

ان سب کی صرف ایک ہی خواہش تھی کہ وہ زار کے زیر کمان برق رفتاری سے دشمن پر پل پڑیں۔ انھیں یقین تھا کہ امپراطور کی قیادت میں وہ ہر شخص کا، خواہ وہ کوئی بھی کیوں نہ ہو، بھر کس نکال دیں گے۔ مارچ پاسٹ کے بعد رستوف اور باقی افسروں کا بھی یہی خیال تھا۔ اگر انھیں گزشتہ دو لڑائیوں میں کامیابی ہو بھی جاتی، تب بھی انھیں اپنی نصرت کے بارے میں وہ اعتقاد نہ ہوتا جو کہ اب تھا۔

معاذ کے اگلے روز بورس نے اپنی بہترین وردی، ہنی، کامیابی کے لیے اپنے دست برگ کی دعائیں دینے لگیں۔ لیکن اور ہلکوسکی سے ملاقات کرنے کے لیے اول مونس روانہ ہو گیا۔ اسے امید تھی کہ وہ اس کے توسط سے امکانی طور پر بہترین اسمائی پر فائز ہونے میں کامیاب ہو جائے گا۔ اس کی ترجیح کسی اہم شخصیت کا ایجوٹ متقرر ہونا تھا کیونکہ فوج کا یہ عہدہ اسے خاص طور پر بہت پرکشش نظر آتا تھا۔ ”رستوف کا کیا ہے، اس کا باپ اسے یک مشت دس ہزار روبل

بھیج دیتا ہے، اس لیے وہ اس قسم کی گفتگو کر سکتا ہے کہ اسے کسی کی جہیز سائی کرنا یا کسی کا چچہ بننا منظور نہیں رہتا جہاں تک میرا تعلق ہے، اپنی ملازمت میں ترقی کرنے کے لیے میرے پاس عقل و ذہانت کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں۔ اس لیے مجھے جو بھی موقع ملتا ہے، میں اس سے قطع نظر نہیں کر سکتا، میں اس سے پورا پورا فائدہ اٹھاؤں گا۔“

اس روز اول موٹس میں اسے پرنس آندرے تو نہ ملا، تاہم محض شہر دیکھنے کے بعد، جہاں فوج کے ہر رکن کا ہیڈ کوارٹر تھا، مختلف سفارتی عہدیدار تعینات تھے اور دونوں امپراطور اپنے اپنے سٹاف افسروں، درباریوں اور افراد خانہ کے ہمراہ مقیم تھے، اس کی اس بلند و برتر دنیا میں داخل ہونے کی خواہش شدید تر ہو گئی۔

اس کی وہاں کوئی جان پہچان نہ تھی۔ اگرچہ اس نے گارڈز کی پھیل چھیلی وردی زیب تن کی ہوئی تھی اس کے باوجود اسے یہ مبہم بالشان شخصیات، جن میں درباری اور فوجی افسردہوں ہی شامل تھے، جو اپنے سیول اور وردیوں پر تمغے، کافیاں، ورعہدوں کے نشانات سجائے اپنی ٹخاٹ دار گاڑیاں ادھر ادھر بھگائے پھر رہی تھیں، اپنے آپ سے، جو گارڈز کا محض معمولی افسر تھا، اتنی برتر اور فائق نظر آئیں کہ وہ نہ صرف اس کا وجود تسلیم کرنے کے لیے تیار نہ تھیں بلکہ واضح طور پر معلوم ہوتا تھا کہ یہ ان کے بس کی بات ہی نہیں۔ کمانڈر ایچیف کو تو زوف کے ہیڈ کوارٹر میں، جہاں اس نے بلکونسکی کے متعلق دریافت کیا تھا، تمام ایجنٹوں نے ہی نہیں بلکہ اربوں نے بھی اسے یوں دیکھا تھا جیسے وہ اسے یہ جتنا چاہتے ہوں، ”تم جیسے لاتعداد افسر یہاں منڈلاتے رہتے ہیں، اجازت میاں، اپنا کام کرو، ہم تم لوگوں سے بالکل تنگ آچکے ہیں۔“ اس کے باوجود یا شاید اسی بنا پر اس نے اگلے روز یعنی پندرہ ذی قعدہ کو دوبارہ، دس موٹس کا رخ کیا۔ جس مکان میں کو تو زوف مقیم تھا، وہ وہاں پہنچا اور اس نے بلکونسکی کے متعلق استفسار کیا۔ پرنس آندرے اندر ہی تھا اور بورس کو ایک کشادہ ہال میں جو غالباً کسی زمانے میں قصہ دسورد کے بے استعمال ہوتا تھا لیکن اب جس میں پانچ بیگ، مختلف انسام کا فرنیچر (میز، کرسیاں وغیرہ)، اور ایک کلاوی کار، پڑا تھا، پہنچا دیا گیا۔ دروازے کے بالکل قریب ایک ایجنٹ ایرانی ڈریسنگ گارڈن میں ملیوں میز کے سامنے بیٹھا تھا اور کچھ لکھ رہا تھا۔ دوسرا بیگ پر لیٹا ہوا تھا۔ یہ نہیں دیکھی تھا۔ جس کا جسم کچھ شیم اور چہرے کا رنگ۔ سرخ تھا اس کے ہاتھ اس کی گردن کے نیچے تھے اور وہ ایک اسر کے ساتھ، جو اس کے قریب بیٹھا ہوا تھا، ہنسی مذاق کی باتیں کر رہا تھا۔ تیسرا کلاوی کار ڈیوڈی و لڑکی دھنیں بجا رہا تھا۔ چوتھا گلاوی کار ڈیوڈی پر جھکا ہوا تھا اور ان دھنوں کو گنگا رہا تھا۔ بلکونسکی کمرے میں نہیں تھا۔ جو صحن وہاں موجود تھے، ان میں سے کسی نے بورس کو دیکھ کر اپنی جگہ سے خفیف سی حرکت بھی نہ کی۔ اس شخص نے، جو کچھ لکھ رہا تھا اور جس سے بورس نے استفسار کیا تھا، ترش روئی سے اس کی جانب دیکھا اور کہا: ”بلکونسکی ڈیوڈی پر ہیں اور اگر تمہیں ان سے ملنا ہی ہے، بائیں طرف استقبالیے میں چلو۔“ بورس نے اس کا شکریہ ادا کیا اور استقبالیے میں چلا گیا۔ اس کمرے میں دس بارہ افسر اور جرنیل تھے۔ جب بورس اندر داخل ہوا، پرنس آندرے، جس کی نگاہیں حقارت آمیز انداز سے نیچے کو جھکی ہوئی تھیں (یہ وہ مخصوص نگاہیں تھیں جو شانستہ انداز سے تھکاوٹ کا اظہار کرتی ہیں اور الفاظ کی طرح صاف کہتی دکھائی دیتی ہیں:

”اگر یہ میرا فرض نہ ہوتا، میں ایک تاشیہ بھی تمہارے ساتھ بات چیت کرنا گوارا نہ کرتا“، کسی روسی جرنیل کی گفتگو سن رہا تھا۔ یہ جرنیل معمر تھا۔ اس کے سینے پر بے شمار تمغے سجے ہوئے تھے۔ وہ یوں سیدھا تن کر کھڑا تھا کہ معلوم ہوتا تھا کہ تقریباً بیچوں کے بل ایسا وہ ہے۔ اس کے سرخ چہرے پر وہ چاٹوسی، جو صرف فوجیوں ہی کے لیے مخصوص ہے، جھلک رہی تھی۔ وہ پرنس آندرے کو کسی معاملے کے بارے میں رپورٹ پیش کر رہا تھا۔

”بہت اچھا۔ اب ذرا اتنی مہربانی فرمائیں کہ کچھ دیر انتظار کریں“ پرنس آندرے نے جرنیل سے کہا۔ وہ روسی فریسی لہجے میں بول رہا تھا اور وہ یہ مصنوعی لہجہ صرف اسی وقت اختیار کرتا تھا جب اس نے اپنی حقارت کا اظہار کرنا ہوتا تھا۔ اتنے میں اس کی نظر بورس پر پڑی اور اس نے جرنیل کو بالکل ہی نظر انداز کر دیا۔ (بے چارہ جرنیل اس کے پیچھے بھاگا اور التجائیں کرنے لگا کہ اس کی مات سنی جائے)۔ اس نے گردن کو خم دے کر بورس کا خیر مقدم کیا اور چہرے پر تبسم سجائے اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔

جس چیز کا بورس کو پہلے ہی خفیف سا شبہ تھا، اب وہ اس پر پوری طرح میاں ہو گئی کہ فوج میں ماتحتی اور نظم و ضبط ایک تو وہ ہوتا ہے جس کا ذکر عسکری قواعد و ضوابط کی کتاب میں کیا جاتا ہے اور جسے وہ اور رجمنٹ کا ہر جوان بخوبی جانتا ہے لیکن اس کے علاوہ ایک مزید اور زیادہ اساسی ماتحتی بھی ہوتی ہے۔ یہ وہ ماتحتی ہے جو اس جرنیل کو، جس کے چہرے کی رنگت سرخ ہے، اور جو تن کر سیدھا کھڑا ہے، مجبور کرتی ہے کہ وہ مؤدب ہو کر انتظار کرے کیونکہ کیپٹن بلکونسکی نے اپنا دل بہلانے کے لیے لیفٹیننٹ دروہیسکوئے سے کپ شپ لگانا زیادہ ضروری سمجھا ہے۔ بورس نے پہلے سے بھی زیادہ عزم کے ساتھ یہ تہیہ کر لیا کہ آئندہ وہ تحریری ضوابط پر اتنا عمل نہیں کرے گا جتنا وہ ان غیر تحریری قواعد پر کاربند ہوگا۔ اسے محسوس ہوا کہ محض اس حقیقت نے کہ اس کی سفارش پرنس آندرے سے ہو چکی ہے، اسے ایک دم جرنیل سے، جو دوسرے حالات میں، محاذ پر، گارڈز کے اوں لیفٹیننٹ کو توپ دم کرنے کے اختیار سے بہرہ ور تھا، اور پراٹھا دیا تھا۔ پرنس آندرے اس کے قریب آیا اور اس نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام لیا۔

”مجھے افسوس ہے کہ میں کل تمہیں یہاں سٹل سکا میرا سارا دن جرنیوں سے نپٹتے گزر گیا۔ ہم دس روز²⁴ کے ساتھ افواج کی تقسیم و ترتیب دیکھنے چلے گئے تھے۔ اور جب کوئی جرمن یہ فیصلہ کر لیتا ہے کہ وہ ہر چیز بلام و کاست بیان کرے گا۔ پھر آخری سراسر ہاتھ میں آنا مشکل ہو جاتا ہے!“

بورس یوں مسکرایا جیسے پرنس آندرے جو کچھ کہہ رہا تھا، وہ سب سمجھ گیا ہو بلکہ وہ جن باتوں کی طرف اشارہ کر رہا تھا، وہ بچے بچے کو بھی معلوم ہیں۔ لیکن درحقیقت وہ دس روز کا نام اور افواج کی تقسیم و ترتیب جیسا اصطلاح زندگی میں لو لیں بار سن رہا تھا۔

”اچھا دوست، تو تم ابھی تک ایجوٹ بننے کے خواہش مند ہو؟ میں تمہارے بارے میں سوچتا رہوں۔“

”جی ہاں، میں سوچ رہا تھا۔۔۔“ بورس نے کسی وجہ سے شرما تے ہوئے کہا، ”کہ کمانڈر انچیف کے نام درخواست بھیج دوں۔ پرنس کو راگن نے انہیں میرے بارے میں خط لکھا تھا۔ میں محض اس لیے استفسار کرنا چاہتا تھا کیونکہ

مجھے اندیشہ ہے کہ گاؤں جنگ میں شریک نہیں کیے جائیں گے، اس نے یوں کہا جیسے وہ اپنی صفائی بیان کر رہا ہے۔
 ”خوب! خوب! ہم اس کے متعلق تفصیل سے بات کریں گے،“ پرنس آندرے نے کہا۔ ”بس مجھے ذرا
 اتنی اجازت دو کہ میں ان صاحب کا کام پٹا دوں، پھر میں تمہاری خدمت کے لیے حاضر ہو جاؤں گا۔“

جب پرنس آندرے سرخ چہرے والے جرنیل کی طرف سے رپورٹ پیش کرنے چلا گیا، اس صاحب نے
 جو بظاہر غیر تحریری قواعد و ضوابط کے نواسد کے متعلق بورس کے نقطہ نظر سے متفق نہیں تھا، اس بے ادب لیفٹیننٹ کی
 جوابجوٹ کے ساتھ اس کی گفتگو میں نخل ہوا تھا، شعلہ بارنگا ہوں سے یوں رگتا رہا کہ گھبرا کر دیکھا کہ بورس کو بے چینی
 محسوس ہونے لگی۔ وہ وہاں سے پرے چل گیا اور بے قراری سے پرنس آندرے کی کمانڈر انچیف کے کمرے سے
 واپسی کا انتظار کرنے لگا۔

”اچھا دوست، میں تمہیں پہلے بھی بتا چکا ہوں کہ میں تمہارے متعلق سوچتا رہا ہوں،“ پرنس آندرے نے،
 جب وہ اس کشادہ کمرے میں، جس میں مکہ دی کارڈ پڑا تھا، چلے گئے، کہا۔ ”تمہارا کمانڈر انچیف کے پاس جا
 نتیجہ خیز ثابت نہیں ہوگا۔ وہ تمہارے ساتھ انتہائی شائستگی اور اخلاق سے پیش آئیں گے اور تمہیں اپنے ساتھ کھا
 کھانے کی دعوت دیں گے۔“ (”غیر تحریری قواعد و ضوابط کے مطابق یہ اتنا برا بھی نہیں ہوگا“ بورس نے سوچا۔)
 ”لیکن اس سے زیادہ اور کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ لیکن میں تمہیں بتاتا ہوں کہ ہم کیا کریں گے۔ میرے ایک بہت
 اچھے دوست ہیں۔ ان کا نام پرنس ولگور وکوف ہے۔ وہ ایجوٹ جنرل ہیں اور بہت اچھے انسان ہیں۔ تمہیں شاید
 معلوم نہ ہو لیکن حقیقت یہ ہے کہ کوٹوروف، اس کے شاف افسروں اور ہم سب لوگوں کی، جو یہاں موجود ہیں، اس
 وقت بالکل کوئی اہمیت نہیں ہے۔ اب ہر بات کا مرکز خود زار ہیں۔ ہم سیدھے ولگور وکوف کے پاس چلتے ہیں۔
 مجھے بہر حال ان سے ملنے جانا ہی تھا اور میں تمہارے بارے میں ان سے پہلے ہی بات کر چکا ہوں۔ دیکھتے ہیں کہ
 تمہیں اپنے شاف میں شامل کرتے ہیں یا کوئی اور اچھی، ساری ڈھونڈتے ہیں۔“

پرنس آندرے کو جب کسی فوجی کی رہنمائی کرنے اور دنیوی کامرانی کے حصول میں اس کی مدد کرنے کا
 موقع ملا، وہ بڑے دلوے اور جوش و خروش سے یہ فریضہ سرانجام دیتا اس کا پندار اسے خود اپنے لیے اس قسم کی
 مدد تلاش کرنے کی کبھی اجازت نہ دیتا لیکن دوسروں کی مدد کرنے کے بہانے اس کا تعلق اس جلتے سے، جو لوگوں
 پر نوازشات کرتا ہے اور جس میں اسے کشش نظر آتی تھی، استوار ہو جاتا۔ اس نے پھر رضا و رغبت بورس کے کام کا
 بیڑا اٹھایا اور اس کے ساتھ پرنس ولگور وکوف سے ملنے چلا گیا۔

جب وہ اول موٹس کے اس محل میں پہنچے جہاں دونوں اہمراہوں اور خدام و حشم قیام پذیر تھے، جھٹ پٹ کا
 وقت ہو چکا تھا۔

اس روز جنگی کونسل کا اجلاس منعقد ہوا تھا۔ اس میں دونوں اہمراہوں اور ہون کریمزراٹ (سیج زجل
 کونسل) کے ارکان نے شرکت کی تھی۔ اجلاس نے کوٹوروف اور شوارٹس برگ جیسے جہاندیدہ اور سرور کرم چاند

جریلوں کے مشورے کے علی الرغم بد تاخیر پیش قدمی کرنے اور ہونا پارت سے دو دو ہاتھ کرنے کا فیصلہ صادر کر دیا تھا۔ اجلاس پرنس آندرے اور بورس کے، جو پرنس دگلورڈ کوف کی تلاش میں اُدھر آئے تھے، محل میں پہنچنے سے ذرا پہلے اختتام پذیر ہوا تھا۔ جنگی کونسل کے لو جو ان ارکان کے ٹولے کو اس روز جو کامیابی ہوئی تھی، ابھی تک ہر شخص پر اس کا سحر طاری تھا۔ جن اشخاص نے پیش قدمی کو موخر کرنے اور کسی نہ کسی بہانے انتظار کرنے پر زور دیا تھا، ان کی رائے اس طرح بیک زبان دبا دی گئی اور حملے کے فوائد کے حق میں اتنے فیصلہ کن ثبوت پیش کر کے ان کے دلائل مسترد کر دیے گئے کہ کونسل میں جو امور۔ متوقع لڑائی اور یقینی فتح۔ زیر بحث آئے، وہ مستقبل سے نہیں، بلکہ ماضی سے متعلق معلوم ہونے لگے۔ (ان دلائل کے مطابق) تمام فوائد ہمارے حق میں جاتے تھے۔ ہماری فوج غیر، جو لاریب نیولین کی فوج سے برتر تھی، ایک مقام پر مجتمع تھی۔ امپراطوروں کی موجودگی نے فوجی دستوں میں نیا جوش اور دلولہ پیدا کر دیا تھا اور وہ دشمن کے خلاف صف آرا ہونے کے لیے بہ تاب تھے۔ وہ مقامات جو جنگی نقطہ نظر سے اہم تھے اور جہاں سرکہ آرائی کی توقع کی جاسکتی تھی، ان کی ایک ایک تفصیل آسٹروی سپاہ کے کمانڈر جنرل دے روڈر کو معلوم تھی۔ (خوش قسمتی کی بات یہ تھی کہ جن میدانوں میں فرانسیسیوں کے ساتھ معرکہ آرائی ہونا تھی، وہاں گزشتہ سال آسٹروی فوج نے جنگی مشقیں کی تھیں۔) ملحقہ علاقہ بھی جانا پہچانا تھا اور اس کی چھوٹی سے چھوٹی تفصیلات نقشے پر دکھادی گئی تھی۔ اس کے برعکس ہونا پارت، جو بظاہر کمزور ہو چکا تھا، کچھ بھی نہیں کر رہا تھا۔

جن لوگوں نے فوری حملے کی پر زور حمایت کی تھی، ان میں دگلورڈ کوف شامل تھا۔ وہ ابھی ابھی کونسل کے اجلاس سے واپس آیا تھا۔ تھکا دہش سے اس کا جسم چور چور ہورہا تھا لیکن اس کے جوش و خروش میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ انھیں جو کامیابی حاصل ہوئی تھی، وہ اس کے شے سے سرشار تھا۔ پرنس آندرے نے اپنے متوسل کا تعارف کرایا۔ پرنس دگلورڈ کوف نے شائستگی اور تپاک سے بورس سے ہاتھ ملایا لیکن زبان سے کچھ نہ کہا۔ صاف نظر آرہا تھا کہ اس وقت جو چیز اس کے دماغ پر حاوی تھی، وہ اس کا تذکرہ کرنے سے باز نہیں رہ سکتا۔ چنانچہ وہ پرنس آندرے کے ساتھ فرانسیسی میں گفتگو کرنے لگا۔

”خیر، مائی ڈیئر فیلو، آج ہم نے زبردست معرکہ سر کیا ہے اس کے نتیجے کے طور پر جو اصلی جنگ برپا ہوگی، خدا کرے کہ ہمیں اس میں بھی اسی طرح کی کامیابی حاصل ہو۔ تاہم، مائی ڈیئر فیلو،“ اس نے اکھڑا اور پر جوش انداز سے کہا، ”مجھے اعتراف ہے کہ میں نے آسٹرویوں، اور خاص طور پر دے روڈر کے ساتھ انصاف نہیں برتا۔ انھوں نے نقشے اور منصوبے تیار کرنے میں بڑی عرق ریزی سے کام کیا ہے۔ باریک سے باریک تفصیل بڑی صحت اور درستی سے بیان کی ہے۔ علاقے کے بارے میں ان کی معلومات بے پناہ ہیں۔ چنانچہ انھوں نے ہر صورت حال سے نپٹنے کی پیش بندی کر دی ہے۔ یوں، مائی ڈیئر فیلو، حالات جس طرح اب ہمارے لیے سازگار ہیں، یہ سوچا بھی نہیں جاسکتا کہ ان سے کبھی بہتر ہمیں میسر کیسے گئے۔ آسٹری صحت و درستی اور ردی جرات دشمنیت کے اعتراف کے بعد آپ کو اور کیا چاہیے؟“

”تو حملے کا حتمی فیصلہ ہو گیا ہے؟“ بلکوسکی نے پوچھا۔

”اور مائی ڈیر فیو، میرے خیال کے مطابق ہونا پارت کی کیفیت یہ ہوگئی ہے، حکومت مشکل و گرنہ حکومت مشکل۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا کہ آگے بڑھے یا پیچھے ہے۔ جس میں معلوم ہونا چاہیے کہ اس کا آج ہی امپراطور کے نام قد آیا ہے۔“ ڈنگور و کوف یوں مسکرایا جیسے وہ بہت کچھ جانتا ہو۔

”واقعی؟ کیا لکھا ہے اس نے؟“ بلکنسکی نے استفسار کیا۔

”لا۔ را۔ لی۔ ری۔ لاء۔ لا۔ رائیری۔ را! غاں۔ غاں الفضول، بکواس! اس کا اصل مقصد مہبت حاصل کرنا ہے۔ میں تمہیں بتائے دیتا ہوں کہ اب وہ ہماری مٹھی میں آچکا ہے۔ یہ بالکل یقینی بات ہے! لیکن سب سے مزید اور بات یہ ہوئی:“ اس نے اچانک خوش مزاجی سے ہنستے ہوئے کہا: ”کہ ہمیں سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ جوب میں اسے خطاب کیسے کریں! انصاف²⁶ اسے نہیں لکھ سکتے تھے اور یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ اسے اپرا طور کہا خارج از سوال تھا۔ پھر اچانک مجھے خیال آیا کہ جنرل بوٹا پارٹ مناسب رہے گا۔“

”اسے امپر اطور تسلیم نہ کرنے اور جزل یونا پارت پکارنے کے مابین تو بڑا فرق ہے،“ بلکونسکی نے کہا۔
 ”یہی تو اصل نکتہ ہے،“ دگلور کو ف نے ہنستے ہوئے اس کی بات کاٹ دی۔ ”بھین کو جاننے ہو؟۔ اس کے کائے؟
 پانی نہیں مانگتا۔ اس نے تجویز پیش کی کہ اسے تھ صوبہ دشمن بنی نوع انسان کا لقب دیا جائے،“ دگلور کو ف
 نے دل جمعی سے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔

”بس اتنا ہی؟“ بلکونسکی نے پوچھا۔

”تاہم یہ پلیسین ہی تھا جس نے خطاب کی سنجیدہ صورت ڈھونڈ نکالی۔ وہ انتہائی سنجھے دار اور تیز فہم آدمی ہے۔“

”اور یہ خطاب کیا تھا؟“

”سربراہ حکومت فرانس کے نام ‘Au Chef du gouvernement Francais’، ولگور کو ف نے
تعمیر خا طر جمعی سے کہا۔ ”اچھا ہے۔ کیا خیال ہے؟“

”اچھا تو ہے لیکن اس کے تن بدن میں آگ لگا دے گا“ بلکونسکی نے اظہار خیال کیا۔

”ارے ہاں، بالکل لگا دے گا! میرا بھائی اسے جانتا ہے۔ وہ پیرک میں اس۔ اس موجودہ اس پر اظہار کے ساتھ ایک سے زیادہ مرتبہ کھانا کھا چکا ہے۔ اس نے مجھے بتایا ہے کہ اس نے اس سے زیادہ بار یک میں اور حیدر سفارت کار نہیں دیکھا کیوں نہ ہو، آخر کار، تم جانتے ہو، کہ اس میں فرانسیسی چابک دستی اور اٹالوی جمہوریت دونوں عناصر کا استخراج ہے۔ تم نے اس کا اور کاؤنٹ مارکوف کا قصہ تو سنا ہوگا۔ کاؤنٹ مارکوف واحد شخص تھا جو اس سے بچنے کا گر جانتا تھا۔ تمہیں وہ رومال والے قصہ یاد ہے؟“

اور باتونی دنگور کو فکھی پورس کی جاب اور کبھی پرنس آندرے کی جاب دیکھنے لگا اور قصہ سنانے لگا۔

سمانے گرا دیا۔ اسے یقیناً یہ توقع ہوگی کہ مارکوف اسے ٹھائے گا اور اس کے حوالے کر دے گا۔ مارکوف نے کیا کیا؟ بجائے اس کے وہ اس کا روماس اٹھاتا، اس نے اپنا رومال اس کے قریب گرا دیا، پھر وہ نیچے جھکا، اپنا رومال اٹھا یا اور یونیا پارت گا وہیں پڑا رہنے دیا۔“

”بہت اعلیٰ!“ بلکونسکی نے کہا۔ ”لیکن پرنس، میں آپ کی خدمت میں اس نوجوان کی طرف سے درخواست گزار رہن کر حاضر ہوا ہوں۔ آپ جانتے ہیں کہ۔“

لیکن پرنس آندرے کی بات ابھی ختم نہ ہوئی تھی کہ ایک ایڈی کا جگ اندر آ گیا اور اس نے پیغام دیا کہ پرنس دگلوروف کو زار نے یاد کیا ہے۔

”کیا مصیبت ہے!“ دگلوروف نے یہ عجلت اٹھتے اور پرنس آندرے اور بورس کے ساتھ ہاتھ ملائے ہوئے کہا۔ ”تم جانتے ہو کہ مجھ سے جو کچھ بن پڑا، تمہارے اور اس پرکشش نوجوان کے لیے کرنے میں مجھے بہت راحت ہوگی۔“ اگرچہ اس کے چہرے مہرے پر شوخی اور غیر سنجیدگی ہو رہی تھی، اس نے ایک بار پھر پورے خلوص کے ساتھ بورس سے ہاتھ ملایا۔ ”تم خود سمجھ گئے ہو گے کہ... حیر، پھر کبھی سہی۔“

اعلیٰ حکام کے اتنا قریب ہونے کا، جتنا کہ بورس خود کو اس وقت محسوس کر رہا تھا، محض تصور ہی اس کے لیے بے حد سہنا اور دلور انگیز تھا۔ اسے یہ احساس تھا کہ اس کا رابطہ ان سرچشموں سے ہے جو اس اجہوم کی بے حس کا وہ پتی رجسٹ میں اپنے آپ کو مختصر، حقیر اور غیر اہم جز سمجھتا تھا، اور یہ سبکل حرکات و سکنات کو دوبارہ عمل لاتے ہیں۔

وہ راہداری میں دگلوروف کے پیچھے پیچھے جا رہے تھے کہ ان کا سامنا ایک پست قامت شخص (وہ اسی دروازے میں سے، جس میں سے دگلوروف زار سے ملنے اندر گیا تھا، باہر آیا تھا) سے ہو گیا۔ اس کے چہرے بشرے سے بہانت و فراست ٹپکتی تھی۔ اس کے جڑے خاصے نمایاں اور ابھرواں تھے لیکن انھوں نے اس کی شکل بگاڑنے کی بجائے اس کے تیوروں کو خاص قسم کی شگفتگی اور تحرک بخش دیا تھا۔ اس کوتاہ قامت شخص نے دوستوں کی طرح گردن کو خم دے کر دگلوروف کو سلام کیا لیکن پرنس آندرے کو سر دھرا نہ نظروں سے گھور کر دیکھا اور سیدھا چلتا اس کی طرف آیا۔ اسے اسید تھی کہ پرنس آندرے یا تو اسے جھک کر سلام کرے گا یا اس کے رستے سے ہٹ جائے گا۔ پرنس آندرے نے دونوں میں سے کچھ بھی نہ کیا اس کے چہرے پر خصومت کے آثار ہو رہے تھے۔ وہ ایک طرف ہٹ گیا اور راہداری کی دوسری سمت چل گیا۔

”یہ کون تھا؟“ بورس نے پوچھا۔

”یہ وزیر خارجہ آدم تساروورسکی ہے۔ اس کا شمار ملک کی مایہ ناز شخصیات میں ہوتا ہے لیکن میرے نزدیک یہ انجانی کمزور آدمی ہے۔ اسی قسم کے اشخاص اقوام کی قسمتوں کے فیصلے کرتے ہیں۔“ پرنس آندرے کے منہ سے آہ نکلی، جسے وہ بانہ سکا۔ اس کے ساتھ ہی وہ محل سے باہر نکل گئے۔

اگلے روز فوجوں نے میدان جنگ میں اپنی پوزیشنیں سنبھال لیں اور بورس اوٹسرٹس کی بڑائی تک بلکونسکی

اور دلگورو کو ف دلوں میں سے کسی سے بھی ملاقات کرنے میں کامیاب نہ ہو سکا اور اسے اسامیلوف دجسٹ میں مزید کچھ عرصہ کام کرنا پڑا۔

10

سولہ مارچ کو صبح سویرے دہلی سوف کا سکواڈرن، جس میں نکولائی رستوف خدمات سرانجام دے رہا تھا اور جو پرلے باگ راتیاں کے دستے میں شامل تھا، ان لوگوں کے بقول ”کھلی فضا میں رات بسر کرنے“ کے بعد مارچ کرنا ہوا میدان جنگ میں داخل ہوا۔ فوج کے دوسرے کالموں کے پیچھے کوئی پون میل چلنے کے بعد اسے شاہراہ پر رکنے کا حکم ملا۔ رستوف نے قازقوں، ہونزاروں کے پہلے اور دوسرے سکواڈرنوں، زیادہ ٹالسٹینوں اور توپ خانے کو اپنے برابر سے گزرتے اور آگے جاتے رکھا۔ ان کے بعد جنرل باگ راتیاں اور جنرل دلگورو کو ف اپنے اپنے بھگلوں کے ساتھ آئے اور گھوڑوں پر سوار آگے نکل گئے۔ معرکے میں حصہ لینے کی توقع میں اسے جنگ کے جس خوف کا تجربہ ہوا تھا، پہلے کی طرح اس خوف پر قابو پانے کے لیے اسے جس داخلی کشمکش میں سے گزرنا پڑا تھا اور معرکے میں سچے ہونزار کی طرح اس نے نمایاں کارکردگی دکھانے کے جو خواب دیکھے تھے، وہ سب بیکار ثابت ہوئے۔ اس کے سکواڈرن کو محفوظ دستے کے طور پر پیچھے چھوڑ دیا گیا تھا اور نکولائی رستوف کو وہ دن سخت بوریٹ اور کو فٹ کے عالم میں گزرا کرنا پڑا۔

تقریباً نو بجے صبح اسے اپنے آگے فارنگ اور ”ہڑا“ کی آوازیں سنائی دیں اور اس نے مجرڈین (جن کی تعداد اگرچہ زیادہ نہیں تھی) کو واپس لاتے دیکھا۔ آخر میں اسے فرانسیسی اسپ سواروں کا پورا دستہ نظر آیا۔ انھیں قازقوں کی ایک کمپنی اپنی نگرانی میں لارہی تھی۔ معصوم ہوتا تھا کہ معرکہ انجام کو پہنچ گیا ہے۔ اگرچہ یہ بظاہر کوئی بڑا معرکہ نہیں تھا تاہم کامیابی پر منج ہوا تھا۔ جو افسر اور جوان واپس آئے وہ زبردست فتح کا ڈنکا بجاتے اور فٹس ہاؤ قصبے پر قبضے اور پورے فرانسیسی دستے کی گرفتاری کے متعلق باتیں کرتے آرہے تھے۔

رات بے پناہ ہلاکتا تھا لیکن دن کو مطلع صاف ہو گیا اور دھوپ نکل آئی۔ روز خزاں کی خیرہ کن روشنی نو بجے مارنی کے عین مطابق تھی۔ اس فتح کا چرچا صرف ان لوگوں کی، جنہوں نے اس معرکے میں حصہ لیا تھا، زبانونوں سے ہی نہیں ہو رہا تھا بلکہ رستوف کے قریب سے جو جوان، افسر، جرنیل اور ایجوٹ گزر رہے تھے، ان سب کے خوشی سے تسماتے چہرے بھی اس کی غمازی کر رہے تھے۔ اور نکولائی جسے اس خوف کے عالم میں، جو جنگ سے پہلے فوجیوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے، بیکار گزرتا پڑا تھا، اب در بھی افسردہ ہو گیا کیونکہ اس پر سرت دن اسے محض کھیاں مارنے کے لیے پیچھے چھوڑ دیا گیا تھا۔

”رستوف، آؤ یار، ہم اپنے غم و غم کو بوتل میں غرق کر دیں!“ دہلی سوف نے سڑک کے کنارے بیٹھے ہوئے کہا۔ اس کے پاس بوتل اور کچھ کھانے کی اشیاء تھیں۔

افسروں نے دینی سوف کی بوتل اور کھانے کی اشیاء کے گرد دائرہ بنالیا اور کھانے پینے اور باتیں کرنے میں مصروف ہو گئے۔

”ادھر دیکھو، وہ ایک اور پکڑے مار رہے ہیں!“ ایک فسر نے ایک فرانسیسی سوار کی، جسے دو قازق پیدل ہکائے مار رہے تھے، جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

ان میں سے ایک ایک بہت خوبصورت اور گرائنڈیل گھوڑے کی، جسے انھوں نے اس قیدی سے چھینا تھا، لگام تھا جسے ہوئے تھا۔

”یہ گھوڑا ہمیں بچاؤ!“ دینی سوف نے قازق سے چلا کر کہا۔

”جناب عالی، اگر آپ کی یہی خواہش ہے، پھر ٹھیک ہے۔“

افسر اٹھے اور گھوڑے اور قازقوں کے ارد گرد کھڑے ہو گئے۔ نو جوان فرانسیسی اسپ سوار ایل زاس²⁸ کا باشندہ تھا اور حسن لہجے میں فرانسیسی بولتا تھا۔ پریشانی اور اضطراب سے اس کا دم پھول رہا تھا۔ اس کا چہرہ سرخ تھا۔ جونہی سے فرانسیسی زبان میں گفتگو سنائی دی وہ جھٹ پٹ افسروں کی طرف لپکا اور کبھی ایک اور کبھی دوسرے کو مخاطب کرنے لگا۔ ”گر کار پورل بیچ میں نہ آتا،“ اس نے بتایا، ”تو میں کبھی گرفتار نہ ہوتا۔ قصور میرا نہیں بلکہ کارپورل کا تھا۔ میں نے اسے بتایا بھی کہ ادھر ردی ہیں لیکن اس کے باوجود اس نے مجھے گھوڑوں کی جھولیس اٹھانے بھیج دیا۔“ وہ ہر جیسے کے بعد اپنے گھوڑے کو تھپکی دیتا اور کہتا: ”انھیں فرمائیں کہ میرے گھوڑے کو کوئی گزند نہ پہنچائیں!“ صاف ٹک رہا تھا کہ اسے یہ اندازہ ہی نہیں تھا کہ وہ کہاں ہے۔ ایک موقع پر وہ اپنی گرفتاری کا جواز پیش کرنے لگا اور دوسرے پر وہ اپنے سپاہیانہ نظم و ضبط اور فوجی خدمات کے لیے اپنے جوش و خروش کا یوں ذکر کرنا شروع کر دیا، جیسے وہ اپنے اعلیٰ افسروں کے سامنے کھڑا ہو۔ وہ ہماری عقی سپاہ میں فرانسیسی فوج کا بالکل نیا اور مختلف ماحول، جو ہمارے لیے اتنا جنسی تھا، لایا تھا۔

قازق تیس تیس روپے کے دو طلائی سکوں کے عوض گھوڑا فروخت کرنے پر آمادہ ہو گئے اور رستوف نے، جو گھر سے رقم سوسوں ہونے کے بعد تمام افسروں میں امیر ترین شخص بن چکا تھا، اسے خرید لیا۔

جب گھوڑا رستوف کے حوالے کر دیا گیا، فرانسیسی قیدی نے اسے خوش طبعی سے مشورہ دیا ”میرے گھوڑے کو گزند نہ پہنچنے دینا۔“

رستوف مسکرا دیا۔ اس نے فرانسیسی اسپ سوار کو اطمینان دے دیا اور اسے کچھ رقم بھی دی۔

”چلو، چلو!“ قازقوں نے قیدی کے بازو پر ہاتھ رکھا اور اسے چلنے کا اشارہ کیا۔

”امیرا طور! امیرا طور!“ اچانک ہوزاروں کے نعرے سنائی دینے لگے۔

ایک ایک بڑی گہما گہمی اور ابل جھل کا احساس ہونے لگا۔ رستوف نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ اسے سڑک پر متعدد گھڑسوار، جنھوں نے اپنی ٹوپوں میں کلخیاں سجائی ہوئی تھیں، دکھائی دیے۔ پلک جھپکنے میں ہر شخص اپنے اپنے

مقام پر پہنچ گیا اور انتظار کرنے لگا۔

رستوف کو معلوم ہے اور نہ یاد ہے کہ وہ کیسے اپنے گھوڑے تک پہنچا اور کیسے اس پر سوار ہوا۔ جنگی بھانے میں اس کا یہ تاسف فضا میں تھلیل ہو گیا کہ اسے معرکے میں حصہ لینے کا موقع نہیں ملا تھا۔ ان لوگوں کے بیچ، جو اسے ایک آنکھ نہ بھاتے تھے، اسے جو اکتاہٹ ہو رہی تھی، اب وہ بھی جاتی رہی اور اسے اپنی ذات بھی فراموش ہو گئی۔ اپنے آپ کو امپراطور کے حضور پا کر اس پر والہانہ حوشی جاری ہو گئی اور یوں اس کا جودن شغل بیکاری میں گزرا تھا، اس کی سلامتی ہو گئی۔ وہ عاشق کی طرح پھولے نہ سانا تھا کہ بھر کی گھڑیاں ختم ہوئیں اور وقت وصال آ پہنچا لیکن جب وہ وقت آیا، اسے اتنا حوصلہ نہ ہوا کہ وہ نگاہیں اٹھ کر ہی دیکھ لیتا لیکن نگاہیں اٹھانے کی ضرورت بھی نہ تھی، اس کے بغیر ہی یہ وجد آفریں، حساس کہ وہ اسے اپنے قریب سے نوا رہا ہے، اس کے رگ و پے میں سانا جا رہا تھا۔ اسے اس کا اندازہ نہ صرف قافلے کے سو روں کے گھوڑوں کے سموں کی ٹاپوں سے ہو رہا تھا کہ وہ آ رہا ہے بلکہ اس بات سے بھی کہ جوں جوں وہ قریب آ رہا تھا، اس کے گرد و پیش ہر چیز روشن تر، سرور تر، معنی خیز تر اور بٹا ش تر ہوتی جا رہی تھی۔ یہ آفتاب اپنی شاہانہ اور شفیق کرنیں بکھیرتا اس کے قریب سے قریب تر ہوتا گیا اور اسے یہ محسوس ہونے لگا کہ وہ ان کرنوں کی لیٹ میں آتا جا رہا ہے۔ اسے اس کی آواز بھی سنائی دی۔ یہ آواز شفقت سے بھرپور، پرسکون اور رعب دار بھی تھی اور اس میں ایک قسم کی معصومیت بھی تھی۔ اچانک مرگ آسا سکوت، جو رستوف کو بالکل موزوں دکھائی دیا، طاری ہو گیا اور اس میں امپراطور کی آواز گونجنے لگی:

"Les husaards de Pavlograd" اس نے دریافت کیا۔

"Le reserve, Sire" آواز سنائی دی۔ یہ آواز اس مافوق الفطرت آواز کے، جس نے "Les

"hussards de Pavlograd" کہا تھا، مقابلے میں بالکل بشری معصوم ہوتی تھی۔

زارر رستوف کے بالکل بالمقابل آ گیا اور وہیں رک گیا۔ تین روں قبل محاسن کے دوران میں رارکا جو چہرہ رکھائی دیا تھا، اس کے مقابلے میں یہ چہرہ کہیں زیادہ خوبصورت تھا۔ اس سے شگفتگی اور شباب۔ شباب معصوم کی وہ شعائیں پھوٹ رہی تھیں کہ جلیل القدر امپراطور کا چہرہ ہونے کے باوجود اس پر چودہ سالہ نو خیز طفل کی شفی کا گماں ہوتا تھا۔ سکواڈرن کا بے (دھیانی سے جائزہ لیتے لیتے امپراطور کی نظریں رستوف کی نظروں سے گرا گئیں اور وہیں ٹھہر گئیں۔ ٹھہرنے کا یہ عمل دو سیکنڈ سے بھی کم عرصے میں مکمل ہو گیا لیکن انھوں نے رستوف کی روح میں ٹل چل مچادی۔ رستوف کی روح میں جو ٹل چل پڑی تھی، امپراطور اسے سمجھایا نہیں سمجھا (رستوف کو یہی محسوس ہوا کہ وہ ہر چیز سمجھ گیا ہے) لیکن اس کی نیلی آنکھیں بہر حال دو سیکنڈ رستوف کے چہرے پر مرکوز رہیں۔ ان سے نرم دگر اندر دھکی کی کرنیں پھوٹ رہی تھیں۔ پھر یک بیک اس نے اپنی نگاہیں اوپر اٹھائیں، اچانک اپنے ہاتھ پاؤں سے اپنے

یہ پاؤں گرت ہو جا رہے ہیں؟

عالی جاہ، محفوظ رہتہ

گھوڑے کو بالکی سی مہیڑ لگائی اور اسے سر پٹ دوڑا دیا۔

نوجوان امپراطور کو جب اپنے سامنے فارنگ کی آواز سنائی دی، اس کے دل میں نفس نفس میدان جنگ میں جانے کی جو آرزو بھل رہی تھی، وہ اس پر قابو نہ پاسکا اور اپنے درباریوں کے احتجاج کے باوجود اس نے تیسرے عالم کو، جس کے وہ عقب میں رہا تھا، بارہ بجے پیچھے چھوڑا اور ہرادل دستوں کی جانب سر پٹ گھوڑا بھگانے لگا۔ تاہم وہ ابھی ہزاروں تک پہنچ نہ پایا تھا کہ اسے متعدد ایجوٹس مل گئے۔ انھوں نے اسے بتایا کہ معرکہ سر کر لیا گیا ہے۔ اس لڑائی میں اور کچھ تو حاصل نہ ہوا، اتنا ضرور ہو کہ ایک فرانسیسی سکواڈرن گرفتار کر لیا گیا لیکن اسے دشمن کے حلف زبردست فتح بنا کر پیش کیا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ زار اور ساری فوج۔ خاص طور پر جب کہ دھواں ابھی تک میدان جنگ پر چھایا ہوا تھا۔ کو یہ یقین ہو گیا کہ فرانسیسی پٹ گئے ہیں اور پپائی اختیار کرنے پر مجبور ہو گئے ہیں۔

زار کے گزرنے کے چند منٹ بعد پادلوگرات ڈویژن کو آگے بڑھنے کا حکم ملا۔ رستوف کو زار ایک بار پھر جرمنی کے چھوٹے سے قصبے فش ہاؤ میں نظر آیا۔ قصبے کے تجارتی مرکز میں، جہاں زار کی آمد سے قبل زبردست فارنگ ہوئی تھی، بے شمار رخی اور ہرک شدگان پڑے تھے۔ کسی کے پاس اتنا وقت نہ تھا کہ انھیں وہاں سے ہٹاتا۔ اپنے مخالف افسروں، درباریوں کے جیش میں محصور اور اپنی کوتاہ قاست اور کیت گھوڑی پر، جو اس گھوڑی سے مختلف تھی جس پر اس نے سحائے کے روز سوار کی تھی، سوار زار ایک طرف بھاگا، اس نے نہایت نفاست اور سلیقے سے چھوٹی دو رہین آنکھوں پر لگائی اور ایک سپاہی کو، جس کا نچا سرخون میں لتھڑا پڑا تھا، دیکھنے لگا۔ زخمی سپاہی کا جسم اتنا عظیم، اجڑا اور گھٹاؤنا تھا کہ رستوف کو زار کو اس کے اتنا قریب دیکھ کر سخت دھچکا محسوس ہوا۔ اس نے دیکھا کہ زار کے مدد رشانے کچھ یوں سکڑ گئے ہیں جیسے کڑا کے کی سردی کی وجہ سے ان پر کچکی طاری ہو گئی ہو۔ اس نے یہ بھی دیکھا کہ اس کا بیاں پاؤں بے اختیار کانپ رہا ہے اور اس کے مہیڑ سے بار بار گھوڑی کے پہلو میں ٹھوکے لگ رہے ہیں۔ تاہم گھوڑی اتنے اچھے طریقے سے سدھائی گئی تھی کہ اس پر کچھ اثر نہیں ہو رہا تھا، اس نے اپنی جگہ سے مطلق جنبش نہ کی اور لا تعلق رہیں کھڑی رہی۔ ایک ایجوٹس اپنے گھوڑے سے نیچے اترا، اس نے سپاہی کو اپنے بازوؤں میں اٹھا لیا اور اسے سٹریچر پر، جو وہاں لایا گیا تھا، لٹا دیا۔ سپاہی کو اپنے لگا۔

”آرام سے، آرام سے، کیا تم ذرا دھیرج سے کام نہیں لے سکتے؟“ زار نے کہا۔ بظاہر یہی نظر آ رہا تھا کہ سپاہی سے، جو موت کے کنارے پہنچ چکا تھا، زیادہ اسے تکلیف ہو رہی ہے اور وہ وہاں سے آگے چل دیا۔

رستوف نے دیکھا کہ زار کی آنکھوں میں آنسو امنڈ آئے ہیں اور جب وہ گھوڑی پر سرار وہاں سے رخصت ہو رہا تھا، اس نے اسے تسار تو رسکی سے کہتے سننا، ”جنگ کتنی بھیانک چیز ہے، کتنی بھیانک!“ اور یہی الفاظ اس نے فرانسیسی میں بھی دہرائے۔

ہرادل دسے فش ہاؤ سے ذرا دھیر تعینات کیے گئے تھے۔ وہاں سے دشمن کی صفیں صاف دکھائی دیتی تھیں۔ ذرا

گولی چلتی اور غنیم پیچھے ہٹ جاتا۔ دن بھر یہی سلسلہ چلتا رہا۔ ہر اول تک زار کا شکر یہ پہنچا دیا گیا۔ انعامات و اکرام کے وعدے کیے گئے اور جوانوں کو دوڑ کا کارگزار بن دیا گیا۔ کیمپ میں جگہ جگہ الودیشن رہے اور سپاہیوں کے گیت گزشتہ شب کی نسبت زیادہ شادمانی سے گونجتے رہے۔

اس رات دینی سوف نے میجر کی حیثیت سے اپنی ترقی کا جشن منایا۔ رنگ ریلوں کے اختتام پر دستوب نے جو پہلے ہی خوب ڈٹ کرے نوشی کر چکا تھا، امپر طور کا جام صحت تجویز کیا۔ ”لیکن یہ جام صحت ہمارے امپر مقتدر امپر طور کے لیے، جیسا کہ انھیں سرکاری تقریبات پر کہا جاتا ہے، نہیں ہوگا“ اس نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ”بلکہ ہم یہ جام صحت اپنے زار کے لیے، جو نیک نفس، مسخو رکھ اور عظیم انسان ہیں، نوش کریں گے۔ آئیں، ہم ان کا اور اس فتح کا، جو ہمیں فرانسیسیوں پر یقیناً حاصل ہوگی، جام (صحت) پیئیں۔“

”اگرچہ ہم ان کے خلاف پہلے ہی برسرِ پیکار ہو چکے ہیں“ اس نے کہا، ”اور ہم نے شون گرابرن میں ان کا کوئی خاٹہ نہیں کیا تھا۔ اب جب کہ وہ نفس نفس ہاری قیادت فرما رہے ہیں، ہم کیا کچھ نہیں کر گزریں گے! ہم جتنے سکرے ان کی خاطر موت کو گلے لگا لیں گے۔ کیوں حضرات، ہم ایسا کر گزریں گے نا؟ شاید میرا بات کرنے کا طریقہ صحیح نہیں ہے۔ میں پی بھی تو بہت چکا ہوں۔ لیکن میں محسوس کچھ اسی طرح کر رہا ہوں اور آپ کے احکامات بھی ایسے ہی ہیں۔ آئیں، الیکساندر اول کا جام صحت نوش کریں! ہرا!“

”ہرا!“ افسروں نے جوش و خروش سے نعرہ لگایا۔

تجربہ کار اور مسخر کر سٹن کا نعرہ بیس سالہ رستوف کے نعرے سے کسی طور کم پر جوش اور کم پر خلوص نہیں تھا۔ جب افسر جام صحت پی چکے اور اپنے اپنے گلاس پاش پاش کر چکے، کرسٹن نے نئے گلاس بھرے اور اپنے اپنا گلاس ہاتھ میں پکڑا اور صرف قیصر اور بر جس پہنے جوانوں کے الاؤوں کی طرف چل پڑا۔ وہاں اس نے پی لیسی سفید سرچھوں اور کھلے سینے کے ساتھ بہ اندازہ شہانہ اپنا بازو اوپر اٹھا کر لہرایا۔

”جوانو، اپنے ہمہ مقتدر امپر طور کا اور دشمنوں کے خلاف فتح کا جام پیو! ہرا!“ اس نے تجربہ کار ہونڈاروں کے بلند آہنگ انداز سے چلا کر کہا۔

اس کے رد گرد ہونڈاروں کا ہجوم اکٹھا ہو گیا اور ان سب نے اس کے بلند ہانگ اعدان کے جواب میں ”زور سے نعرے لگائے اور ٹالیاں بجاتیں۔“

جب رات بھیک گئی اور تمام لوگ اپنے اپنے ٹھکانوں پر چلے گئے، دینی سوف نے اپنے چوڑے چلے ٹھکانے ہاتھ سے اپنے چہینے رستوف کے کندھے پر تھکی دی اور کہا:

”جب لڑائی کے دوران میں میرے شیر کو محبت کرنے کے لیے اور کوئی نہ ملے، وہ رات ہی کے عشق میں گرنا ہو گیا۔“

”دینی سوف، اس کا مذاق نہ اڑاؤ!“ رستوف نے چہرہ کر کہا۔ ”یہ بہت خوبصورت اور ارفع و اعلیٰ جذبہ ہے۔“

چنانچہ۔“

”ہاں مجھے، دوست، ماں گئے۔ میں بھی اس میں برابر کا شریک ہوں اور اسے پسند کرتا ہوں۔“
”نہیں، تم نہیں سمجھ سکو گے!“

اور رستوف ٹھہرا اور دواؤں کے، مین بے مقصد گھومنے لگا۔ وہ جاگتے یہ خواب بنے گا کہ مرنے میں کتنا لطف آئے گا۔ اس نے یہ خواب نہیں بنا کہ وہ اپنی جان کیسے بچائے گا (اس میں اس قسم کا خواب بننے کا یہ راز تھا)، بلکہ وہ تو محض اپنے امپراطور کی آنکھوں کے سامنے اپنی جان جان آفریں کے سپرد کرنا چاہتا تھا۔ وہ درحقیقت زار، روسی، فوج کے کردار اور آئندہ فتح کی امید کے عشق میں گرفتار ہو گیا تھا اور اوسٹریٹس کی جنگ سے قبل کے ان یادگار ایام کے دوران میں صرف اسی اکبر پر اس قسم کے احساسات حاوی نہیں تھے بلکہ نوے فیصد جوان اپنے زار اور روسی فوج کے کردار کے سحر میں، پنا آپ بھوس چکے تھے، اہل ان کا جذبہ اتنا شدید نہیں تھا جتنا کہ رستوف کا تھا۔

11

اگلے روز زارٹش ہاؤس میں مقیم رہا۔ اس کا طبیب ویلیئے (Villier) متعدد مرتبہ اس کے پاس بلایا گیا، ہیڈ کوارٹر اور نزدیکی سپاہ میں یہ خبر گردش کرنے لگی کہ امپراطور کی طبیعت نامناسب ہے۔ اس کے حاشیہ نشینوں نے اطلاع دی کہ اس نے نہ کچھ کھایا ہے اور نہ پیا ہے اور اس نے رات بھی بے آرامی میں گزاری ہے۔ اس کی اس ناسازی طبع کا سبب یہ بتایا گیا کہ ہلاک شدہ گاں اور زخمیوں کے منظر نے اس کی حساس روح کو شدید طور پر متاثر کیا ہے۔

سبزہ تاریخ کو پوچھئے، ایک فرانسیسی افسر، جو صلح کا علم لہراتے امپراطور سے ملاقات کی درخواست کرتا آیا تھا، بیرونی چوکوں سے فٹس ہاؤس پہنچایا گیا۔ اس افسر کا نام ساداغی (Savary) تھا۔ زار کو ابھی ابھی غند آئی تھی۔ چنانچہ ساداغی کو، انتظار کرنا پڑا۔ اسے دوپہر کے وقت امپراطور کی خدمت میں پیش کیا گیا۔ ایک گھنٹہ بعد وہ پرنس دگلورڈ کوف کی معیت میں فرانسیسیوں کی بیرونی چوکوں کی جانب دوڑ نہ ہو گیا۔

انواہ پھیل گئی کہ ساداغی صلح کا پیغام اور امپراطور الیکساندر اور نیولین کے مابین ملاقات کی عجوبہ لے کر آیا ہے۔ ساری فوج کو یہ خبر سن کر کہ ذاتی ملاقات کی تجویز مسترد کر دی گئی ہے، بہت خوشی اور فخر محسوس ہوا۔ نیولین کے ساتھ مذاکرات کرنے کے لیے فٹس ہاؤس کے قانع پرنس دگلورڈ کوف کو ساداغی کے ہمراہ بھیجا گیا تاکہ یہ معلوم کیا جا سکے کہ عام توقعات کے برعکس مذاکرات کی یہ پیشکش صلح کی سچی خواہش پر مبنی ہے یا نہیں۔

دن ڈھلے دگلورڈ کوف واپس آ گیا۔ وہ سیدھا زار کے پاس پہنچا اور کافی دیر تک وہیں رہا۔
اٹھارہ اور انیس نومبر کو فوج سے دو یوم کی فٹس قدمی کی۔ مختصر جھڑپ کے بعد دشمن کی بیرونی چوکیاں پہا ہو گئیں۔ انیس تاریخ کی دوپہر کو فوج کے، علی ترین حلقوں میں بڑا جوش و خروش اور زبردست مصروفیت دیکھنے کو ملی۔ یہ کیفیت بیس تاریخ کی صبح تک جاری رہی اور اسی تاریخ کو اوسٹریٹس کا یادگار معرکہ برپا ہوا۔

انہیں تاریخ کی دوپہر تک مصروفیت اور جوشیلی گفتگو امپراطوروں کے ہیڈ کوارٹر تک محدود رہی۔ وہیں السراں آتے جاتے رہے اور وہیں سے ایجنٹوں کو مختلف سمتوں میں بھیجا جاتا رہا۔ دوپہر کے بعد مصروفیت کا رخ کوئٹہ کی طرف اور مختلف ڈویژنل کمانڈروں کے ہیڈ کوارٹروں کی طرف ہو گیا۔ شام ہوتے ہوتے ایجنٹوں نے اس کارروائی کو فوج کے گوشے گوشے تک پھیرا دیا۔ انہیں تاریخ کی رات اسی ہزار پر مشتمل متحدہ سپاہ کھلے آسمان تلے اپنی عارضی قیام گاہوں سے اٹھی، مختلف آوازوں کا بھنھنا ہٹ گونجنے لگی اور چھ میل طویل مجمع حرکت کرنے لگا۔

جو پرزور مصروفیت امپراطوروں کے ہیڈ کوارٹر میں بوقت صبح شروع ہوئی تھی اور جس نے ان تمام حرکات و سکنات کو جو وسیع و عریض علاقے میں دو روز تک نمایاں ہونے لگی تھیں، ہمیز دینی تھی، کسی عظیم المیہ کا اور کلاک کی مرکزی چرخ کی پہلی جنبش کی مانند تھی۔ ایک کے بعد دوسری، دوسری کے بعد تیسری اور یوں ساری چرخیاں متحرک ہو جاتی ہیں اور بتدریج ان کی رفتار تیز اور تیز سے تیز تر ہونا شروع ہو جاتی ہے۔ بیرم (levers) اور دندانے دار چرخ (cogwheels) اپنے اپنے کام کا آغاز کر دیتے ہیں، گجھر (chimes) بجنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں، ہندسے نمایاں ہو جاتے ہیں اور اس ابتدائی فعلیت کے شاخسانے کے طور پر سوئیاں معینہ وقت کے حسب سے آگے بڑھنے لگتی ہیں۔

عسکری مشین کی ساخت کلاک کی ساخت کے بالکل مشابہ ہوتی ہے۔ جس طرح کلاک میں جب ایک مرتبہ قوت متحرکہ فراہم کر دی جائے، وہ لازماً اور بلا روک ٹوک آخری نتیجے کی طرف بڑھنا شروع ہو جاتی ہے، اس طرح عسکری مشین کے کل پرزوں کو جب ایک مرتبہ متحرک کر دیا جاتا ہے، وہ بلا مدافعت اپنے منطقی انجام کی طرف رواں دواں ہو جاتے ہیں۔ لیکن کلاک کے پرزوں کی طرح عسکری مشین کے تمام پرزے بیک وقت متحرک نہیں ہوتے۔ ابتداً بعض پیسے اور چرخیاں غیر متحرک رہتی ہیں۔ قوت متحرکہ فراہم ہونے پر مختلف چرخیاں اپنے دھروں سے رگڑ کھانے لگتی ہیں، دندانے گرفت مضبوط کرنے لگتے ہیں، اور چرخیاں اپنی تیز حرکت کے دوران میں گھبر گھبراہٹ کی آوازیں پیدا کرنا شروع کر دیتی ہیں لیکن قریبی چرخ بالکل ساکن اور غیر متحرک رہتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ سینکڑوں سال تک اس کی یہی کیفیت رہے گی۔ لیکن پھر یک لمحہ آتا ہے کہ بیرم اسے بھی اپنی گرفت میں لے لیتا ہے اور بیرم کے اس عمل کے رد عمل کے طور پر یہ چرخ چرات ہے، گھومتی ہے اور پھر عام حرکت میں، جس کا نتیجہ اور مقصد اس کی سمجھ سے بالا ہوتا ہے، حصہ لینے لگتی ہے۔

جس طرح کلاک میں بے شمار پیسوں اور چرخوں کے پیچیدہ عمل کا نتیجہ صرف یہ ہوتا ہے کہ وقت کا اظہار کرنے کے لیے سوئیاں آہستہ آہستہ اور معین رفتار کے ساتھ متحرک ہو جاتی ہیں بعینہ اوسٹریس کی جنگ میں۔ تین امپراطوروں کی نام نہاد جنگ۔ ایک لاکھ ساٹھ ہزار روسیوں اور فرانسیسیوں کی پیچیدہ مصروفیات۔ ان کے جذبوں، امنگوں، امیدوں، حسرتوں، اہانتوں، مصیبتوں، تعلیوں، ندریشوں اور گرم جوشیوں۔ کا نتیجہ بصورت شکست برآمد ہوا۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہیں کہ انسانی تاریخ کے ڈاکٹر پر سوئی مدھم رفتار سے جنبش کرنے لگی۔

پرنس آندرے اس روز ڈیوٹی پر تھا اور وہ مسلسل کمانڈر نیچیف کی خدمت میں حاضر رہا۔
 شام چھ بجے کو تو زوف امپراطور کے ہیڈ کوارٹر گیا۔ وہاں وہ کچھ دیر ار کے ساتھ گفتگو کرتا رہا اور اس کے
 بعد دربار کے گریڈ مارشل²⁹ کا ڈنٹ ہالسٹی سے ملنے چلا گیا۔

لکونسکی نے اس وقفے سے فائدہ اٹھایا اور آئندہ کی کارروائی کے بارے میں تفصیلات معلوم کرنے کی غرض
 سے دلگورڈکوف کے پاس چلا گیا۔ پرنس آندرے کو احساس ہوا تھا کہ کو تو زوف کسی چیز کے بارے میں متفکر اور مول
 ہے۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ امپراطور کے ہیڈ کوارٹر میں تعینات لوگ اس (کو تو زوف) سے مطمئن نہیں ہیں اور
 انہوں نے اس کے بارے میں جو تیرہ اختیار کر رکھا ہے، اس سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ انہیں ان باتوں کا، جن کے
 بارے میں دوسرے لاعلم ہیں، علم ہے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ دلگورڈکوف سے بات کرنا چاہتا تھا۔

”کیا حال ہے، mon cher“ دلگورڈکوف نے کہا۔ وہ پلیمن کے ساتھ بیٹھا چائے پی رہا تھا۔ ”کل
 جشن بپا ہوگا۔ تمہارے صاحب کے مزاج کیسے ہیں۔ کبیدہ خاطر ہیں؟“

”میں یہ تو نہیں کہوں گا کہ وہ کبیدہ خاطر ہیں لیکن میرا خیال ہے کہ وہ چاہتے ہیں کہ ان کی بات سنی جائے۔“
 ”خوب، جنگی کونسل میں ان کی بات سنی گئی تھی اور جب بھی وہ معقول نقطہ نظر بیان کریں گے، ان کی بات
 سنی جائے گی۔ لیکن اب جب کہ ہمارے مشترکہ حملے کے مکان نے بونا پارت کے اوسان خطہ کر دیے ہیں،
 تاخیری حربے، اختیار کرنے اور ٹال مٹول کی پالیسی پر عمل کرنے کی اجازت۔ نہیں، یہ ناممکن ہے۔“

”لیکن آپ تو بونا پارت سے ملاقات کر چکے ہیں۔ ٹھیک ہے نا؟“ پرنس آندرے نے کہا۔ ”اس کے
 بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟ اس نے آپ پر کیا نقش چھوڑا تھا؟“

”ہاں، میری اس سے ملاقات ہوئی تھی اور مجھے یقین ہو چکا ہے کہ وہ جتنا ہمارے مشترکہ حملے کے امکان
 سے خائف ہے، اتنا اور کسی چیز سے نہیں؛ دلگورڈکوف نے اپنی بات دہراتے ہوئے کہا۔ معلوم ہوتا تھا کہ پولین
 سے ملاقات کے بعد اس نے جو نتائج اخذ کیے تھے، وہ اس کے نزدیک بہت وقیح تھے۔ ”اگر وہ لڑائی سے خوف
 زدہ نہیں ہے، پھر اس نے یہ ملاقات کرنے کی خواہش کا اظہار کیوں کیا؟ مذاکرات کا ڈول کیوں ڈالتا چاہا؟ اور
 سب سے بڑھ کر اس نے پسپائی کیوں اختیار کی جب کہ پسپائی اس کے طریقہ جنگ کے بالکل برعکس ہے؟ میری
 بات مانو، وہ خوف زدہ ہے عمومی معرکے کے تصور سے اس کی جان نکلی جا رہی ہے۔ اس کے لیے فیصلہ کن گھڑی
 آچکی ہے۔ میرے ان الفاظ کو یاد رکھو۔“

”لیکن یہ فرمائیں کہ وہ دیکھنے میں کیسا نظر آتا ہے؟“ پرنس آندرے نے دوبارہ استفسار کیا۔

”یہ وہی سرنگی اور کوٹ پہنتا ہے۔ اسے اس بات کا بہت فکر رہتا ہے کہ اسے یور میسٹی کہہ کر غی طیب کیا
 جاتا ہے یا نہیں۔ اور جب میں اسے اس نوع کا کوئی خطاب مرحمت نہ کیا، اسے سخت تکلیف پہنچی۔ بس وہ اسی

قسم کا آدمی ہے، اس کے علاوہ کچھ نہیں، ”دگور وکوف نے بلیپین کی طرف مسکرا کر دیکھتے ہوئے کہا۔ ”میں بروک کو تو زوف کا غیر مشروط احترام کرتا ہوں لیکن اس کے باوجود میں یہ کہوں گا، ”اس نے، اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا، ”کہ اب جب کہ وہ بلاشبہ ہماری مٹھی میں ہے، اگر ہم انتظار کرتے رہے اور سے یونہی بچ نکلے یا اپنے ساتھ دھما کھینے کا موقع فراہم کرتے رہے، ہم سے بڑا حتم اور کوئی نہیں ہوگا۔ نہیں، ایسا نہیں ہو سکتا۔ ہمیں سو زوف، اور اس کا یہ اصول کبھی فراموش نہیں کرنا چاہیے۔ ”مخالف فریق کو کبھی یہ موقع نہیں دینا چاہیے کہ وہ آپ پر جنگ میں حملہ آور ہو سکے، اس سے کہیں بہتر یہ بات ہے کہ آپ خود اس پر چڑھائی کر دیں۔ ”میری بات پلے باندھ لو کہ یہ تامل سے کام لینے اور معاملات کو معرض تعویق میں ڈالنے والے بزرگوں کے تجربے کے مقابلے میں نوجوانوں کی توانائی کہیں بہتر رہے ہو رہتا ہے۔“

”لیکن ہم کس مقام سے اس پر پورش کریں گے؟ میں نے آج سیر دنی چڑکیوں کا دورہ کیا تھا اور اس بات کا تعین کرنا کہ اس کی افواج کی بڑی تعداد کہاں متعین ہے، ناممکن دکھائی دیا، ”پرنس آندرے نے کہا۔
اس نے خود حملے کا جو منصوبہ بنایا تھا، وہ دگور وکوف کے سامنے اس کی تفصیلات بیان کرنا چاہتا تھا۔
”اس چیز کی کوئی خاص اہمیت نہیں،“ دگور وکوف بیچ میں بوس پڑا۔ وہ غلٹ سے اٹھا اور میز پر جو نقشہ پڑا تھا، اسے کھولنے لگا۔ ”ہر ناگہانی صورت حال کا توڑ سوچ لیا گیا ہے۔ مگر اس نے برن کے مقام پر پاؤں جمانے کی کوشش کی۔“

پرنس آندرے اس منصوبے کی خامیاں بیان کرنے، اور اپنے منصوبے کی وضاحت کرتے لگا۔ اس کا منصوبہ اتنا ہی اچھا ہو سکتا تھا جتنا کہ وہ روٹر کا تھا لیکن مصیبت یہ تھی کہ اس کا منصوبہ ابھی تک اس کے اپنے ذہن میں نہ۔ جوئی پرنس آندرے وہ روٹر کے منصوبے کی خامیاں اور اپنے منصوبے کی خوبیاں گنوانے لگا، پرنس دگور وکوف نے اس کی بات سنی ان سنی کرنا شروع کر دیا، اور بے دھیانی سے نقشے کی طرف نہیں بلکہ پرنس آندرے کے چہرے کی طرف ہنسنے لگا۔

”خیر، آج کو تو زوف کے ہاں جنگی کونسل کا اجلاس ہوگا، تم وہاں اپنے خیالات کا اظہار کر لینا،“ دگور وکوف نے کہا۔

”میرا بھی یہی ارادہ ہے،“ پرنس آندرے نے نقشے سے پرے ہٹتے ہوئے کہا۔
”حضرات، آپ کس بات پر چھٹبھلا رہے ہیں؟“ بلیپین نے پوچھا۔ وہ اب تک چپ چاپ ان کی گفتگو سنا، مسکراتا اور جی جی میں محظوظ ہوتا رہا تھا۔ صاف نظر آ رہا تھا کہ اسے اب ٹھنڈا ڈراے کی سوجھی ہے۔ ”کل فریق نصیب ہو یا شکست کا سامنا کرنا پڑے، بروسی فوج کی راج دھج میں کوئی فرق نہیں آئے گا۔ کو تو زوف کے علاوہ، ایک ہی روسی ایسا نہیں جس کے پاس کسی کالم کی کمان ہو۔ ہمارے کمانڈر کون ہیں؟ ہر جنرل ویمپ³⁰ فن، کاؤنٹ لاٹونو³¹، پرنس نک یمن، چٹائین، پرنس ہوائن لوئے اور آخر میں پرنس پرش، جس کا نام دوسرے پولستانی ناموں جیسے ہے۔“

”چپ رہ، چغس خور، خدا کے چور،“ دنگور کو ف نے کہا۔ ”تم نے جو کہا، درست نہیں ہے۔ دو رو سیوں، جنرل، میں چاروں۔ مبلور اور دو ج اور دختوروف۔ کے پاس کالموں کی کمان ہے اور اگر تیسرے۔ کاؤنٹ آراک چیف۔ کے اعصاب کمزور نہ ہوتے تو اسے بھی یہ کمان مل جاتی۔“

”میرا خیال ہے کہ میخائیل الاری اور ناوچ (کو تو زوف) واپس تشریف لے آئے ہیں،“ پرنس آندرے نے کہا۔ ”حضرات، میں آپ کی خوش بختی اور کامیابی کے لیے دعا گو ہوں،“ اس نے مزید کہا دو رو، دنگور کو ف اور پیپن سے مصافحہ کرنے کے بعد رخصت ہو گیا۔

جب وہ ہیڈ کوارٹر کی طرف واپس جا رہے تھے، پرنس آندرے کو تو زوف سے، جو گاڑی میں اس کے برابر مہربان بیٹھا تھا، پوچھے بنانہ رہ سکا ”کل کی لڑائی کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟“ کو تو زوف نے اپنے ایجوٹنٹ پر گیسر نگاہ ڈالی، اس نے کچھ دیر توقف کیا اور پھر کہا:

”میرا خیال ہے کہ ہم اس معرکے میں پٹ جائیں گے۔ میں نے کاؤنٹ حاسطائی سے یہی بات کہی تھی اور ان سے درخوست کی تھی کہ وہ اسے امپراطور کے گوش گزار کر دیں۔ تمہارے خیال میں اس نے کیا جواب دیا ہوگا؟“ جنرل، میں چاول اور کھٹ کھانے میں مصروف ہوں۔ رہے عسکری امور، تم جانو یا تمہارا کام، مجھے بالکل یہی جواب ملا تھا۔“

12

اسی شام نو بجے کے درالعدد سے روڈ اپنا منصوبہ لے کر کو تو زوف کے ہیڈ کوارٹر پہنچا جہاں جنگی کونسل کا اجلاس منعقد ہوا تھا۔ تمام کالموں کے کمانڈروں کو وہیں بلا لیا گیا تھا اور پرنس باگ راتیاں کے علاوہ، جس نے آنے سے انکار کر دیا تھا، باقی تمام حضرات مقررہ وقت پر پہنچ گئے۔

دسے روڈ، جو بخورہ لڑائی کے منصوبوں کا پوری طرح ذمے دار تھا، اپنی پھرتی اور جوش و خروش کے باعث، سوئے سوئے اور اکھڑے اکھڑے کو تو زوف کے مقابلے میں، جو بادل نا خواستہ جنگی کونسل کے چیئر میں اور قائم کا کردار ادا کر رہا تھا زبردست تضاد پیش کر رہا تھا۔ صاف نظر آ رہا تھا کہ دسے روڈ اپنے آپ کو ایک ایسی تحریک کا، جسے اب کسی صورت دہایا نہیں جاسکتا تھا، سربراہ تصور کرتا تھا۔ اس کی کیفیت اس گھوڑے کی تھی جو ایک ایسی گاڑی میں، جس پر دنی سادات مداحو ورجوئز رقاری سے پہاڑی سے نیچے اتر رہی ہو، جتا ہو۔ گاڑی کو وہ کھینچ رہا تھا یا گاڑی اسے آگے دھکیل رہی تھی، اس کے متعلق وہ کچھ بتانے سے قاصر تھا۔ تاہم وہ اس کے ساتھ سرپٹ بھاگا ضرور جا رہا تھا اور اس کے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ وہ یہ سوچ سکتا کہ اس کی یہ نقل و حرکت اسے کہاں لے جائے گی۔ دسے روڈ اس روز دو مرتبہ غنیم کے ہراول دستوں کا جائزہ لینے گیا تھا۔ اس نے اپنے جائزے کی رپورٹ پیش کرنے اور متعلقہ تفصیلات بیان کرنے کے لیے دو، روڈوں، امپراطوروں سے ملاقات کی تھی۔ اس کے بعد وہ اپنے دفتر

گیا تھا۔ وہاں اس نے فوجوں کی تقسیم اور مختلف مقامات پر ان کی تعیناتی کے بارے میں جرمن زبان میں تفصیلات قلم بند کرائی تھیں۔ اب اس کا جوڑ جوڑ درد کر رہا تھا اور وہ اسی حالت میں کوٹوروف کے ہاں پہنچ گیا تھا۔

لگتا تھا کہ وہ اپنے ہی خیالات میں اتنا غلط و بیجاں ہے کہ اسے کمانڈر انچیف کی تعظیم کرنا بھی یاد نہ رہا۔ اس نے اس کو ٹوک دیا اور خود سرعت رفتاری اور غیر واضح انداز سے بولنے لگا۔ اس نے اس شخص کی طرف جس سے وہ مخاطب تھا، آنکھ اٹھ کر بھی نہ دیکھی، اور اس سے جو سوالات دریافت کیے گئے، وہ ان کے جوابات دے میں ناکام رہا۔ اس کے کپڑوں پر کچھڑ کے چھینٹے پڑے ہوئے تھے اور اس کا یہ انداز یہ غمازی کر رہا تھا کہ وہ تھکن سے نڈھال ہے، ذہنی طور پر پریشان ہے اور اس کی حالت قابل رحم ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اس کا رویہ متغیر ہوا اور خود اعتمادی سے بھر پور تھا۔

کوٹوروف اوسٹریٹس کے نزدیک کسی نواب کے قلعے میں، جو نہ تو اتنا بڑا تھا اور نہ اس سے کسی قسم کی مارت کا اظہار ہوتا تھا، مقیم تھا۔ کشادہ ڈرائنگ روم میں، جسے کمانڈر انچیف کے دفتر میں تبدیل کر دیا گیا تھا، کوٹوروف، دس روٹروں جتنی کونسل کے ارکان جمع تھے۔ وہ چائے پی رہے تھے اور جنرل باگ راتیاں کا انتخاب کر رہے تھے تاکہ کارروائی شروع کی جاسکے۔ آخر کار باگ راتیاں کا اردلی آیا اور اس نے اطلاع دی کہ "پرنس تشریف نہیں لائیں گے۔" "پرنس آئندے اس بارے میں کمانڈر انچیف کو مطلع کرنے اندر آیا۔ اس سے قبل وہ کمانڈر انچیف سے کونسل کے اجلاس میں شرکت کی اجازت حاصل کر چکا تھا۔ چنانچہ اس اجازت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے وہ کمرے میں ہی موجود رہا۔

"چونکہ باگ راتیاں نہیں آ رہے، ہمیں کارروائی کا آغاز کر دینا چاہیے،" دس روٹروں نے تیزی سے اٹھتے اور اس میز کی طرف، جس پر برن کے قرب و جوار کا خاصا بڑا نقشہ کھل پڑا تھا، بڑھتے ہوئے کہا۔

کوٹوروف آرام کرسی پر بیٹھا تھا۔ اس کی وردی کے بٹن کھلے تھے، چنانچہ اس کی فرہ گردن کا سر سے بول باہر نکلی ہوئی تھی جیسے وہ بندھن سے چھٹکارا پانے کی فکر میں ہو۔ اس کے بوڑھے، سولے اور لچھے ہاتھ مناسب انداز سے کرسی کے بار وڈل پر رکھے ہوئے تھے۔ وہ تقریباً سویا ہوا تھا، اسے جب دس روٹروں کی آواز سنائی دی، اس نے بڑی مشکل سے، اپنی واحد آنکھ کھولی۔

"ہاں، ہاں، شروع کریں۔ پہلے ہی خاصی دیر ہو چکی ہے،" اس نے اظہار اتفاق کے طور پر اپنی گردن کا جنبش دی۔ اس کے ساتھ ہی اس کا سر نیچے ڈھلک گیا اور اس کی آنکھ بند ہو گئی۔

اگر وائل میں کونسل کے ارکان کا یہ خیال تھا کہ کوٹوروف سولے کا صرف بکر کر رہا ہے، اب خواندگی کے دوراں میں، اس کی ناک سے جو آوازیں نکلتا شروع ہوئیں، وہ اس امر کا کافی ثبوت فراہم کر رہی تھیں کہ فوجوں کی تقسیم و ترتیب یا اس قسم کی کسی دوسری چیز کے بارے میں اپنی حقارت کا اظہار کرنے کی نسبت وہ کہیں زیادہ سنجیدہ معاملے میں مشغول ہے۔ وہ ایک ایسی انسانی ضرورت کی، جس کے آگے بند نہیں باندھا جاسکتا، شفی میں مصروف

تھا۔ بہ الفاظ دیگر وہ سو رہا تھا، حقیقتاً گہری نیند میں کھو چکا تھا۔

دس روٹر، ایک۔ یہ ٹھیک کی طرح، جسے ایک منٹ بھی ضائع کرنا گوارا نہیں ہوتا، ڈرائیو کے بڑھا، اس نے کوئزوف پر ایک نظر ڈالی اور جب سے یہ اطمینان ہو گیا کہ وہ واقعی خراب خرگوش کے مزے لے رہا ہے، اس نے ایک کاغذ اٹھایا اور سپاٹ اور ایک رنگی آواز میں آئندہ جنگ میں فوجوں کی جو تقسیم و ترتیب ہونا تھی، بیان کرنے لگا۔ اس نے اپنے منصوبے کا جو عنوان سوچا تھا، وہ بھی پڑھ دیا۔

”کونسل ٹش، اور سوکول ٹش³² کے عقب میں غنیم کی پوزیشنوں پر یورش کرنے والی فوج کی تقسیم و ترتیب۔“

تقسیم و ترتیب خاصی سچ در سچ اور کھلم کھلا تھی۔ اصل مسودہ جرمن زبان میں تھا اور اس میں کہا گیا تھا

”اس بات کو مد نظر رکھتے ہوئے کہ غنیم کا مینہ جنگلات پہاڑیوں پر مقیم ہے اور اس کا میسرہ ان جوہڑوں سے، جو کہ کونسل ٹش اور سوکول ٹش کے گرد پیش میں پائے جاتے ہیں، بہت آگے تک پھیلا ہوا ہے، اور مزید یہ کہ اس کے میسرے کے سامنے ہمارا مینہ پھیل ہوا ہے، اس لیے اگر غنیم کے اس موخر، لہذا کر پہلو پر حملہ کیا جائے، تو یہ ہمارے حق میں جائے گا، خاص طور پر اس صورت میں کہ، گریٹ سوکول ٹش، اور کونسل ٹش کے دیہات پر قبضہ جھلیں، پھر ہم غنیم کے پہلو پر پہنچیں گے، یوں ہم خود پائش اور ٹوراسا جنگل کے مابین میدانی علاقے میں اس کا تعاقب کر سکیں گے اور اس طریقے سے خود پائش اور بیلوٹش کی تنگناؤں سے، جنہوں نے غنیم پر پردہ تان رکھا ہے، دور رہ سکیں گے۔ اس مقصد کے پیش نظر یہ ضروری ہے کہ، فرسٹ کالم آگے بڑھتا ہے۔ سیکنڈ کالم آگے بڑھتا ہے۔ تیسرا کالم آگے بڑھتا ہے۔“ وغیرہ، وغیرہ، دس روٹر نے پڑھ کر سنایا۔

معلوم ہوتا تھا کہ جرنیل ان پیچیدہ ہدایات کو بدلنا خواستہ من رہے ہیں۔ جنرل بکس ہیڈن، جس کا قد دراز اور بار بھورے تھے، دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے کھڑا تھا۔ اس کی نگاہیں شمع فروزاں کو گھور رہی تھیں اور وہ یوں دکھائی دے رہا تھا کہ وہ نہ صرف کچھ من ہی نہیں رہا بلکہ وہ یہ بھی نہیں چاہتا تھا کہ کوئی یہ سمجھے کہ وہ من رہا ہے۔ دس روٹر کے بالکل سامنے جڑیں میسورا دوونج، جس کا چہرہ سرخ و سپید تھا اور جس کی فراخ دروشت آنکھیں، جو پوری طرح کھلی ہوئی تھیں، دس روٹر پر مرکوز تھیں، عسکری انداز سے بیٹھا تھا۔ اس کے ہاتھ گھٹنوں پر اور کہنیاں پہلوؤں پر تھیں۔ وہ اپنے کندھے اچکائے اور مونچھوں کو بل دے کر اوپر اٹھائے ہوئے تھا۔ اس نے زباں نہ کھولنے کی ضد باندھ رکھی تھی اور وہ ٹھنکی باندھے دس روٹر کے چہرے کو دیکھ رہا تھا اور اس نے اپنی یہ نظریں صرف اسی وقت وہاں سے ہٹائیں جب آسٹروی چیف آف سٹاف اپنی خواندگی مکمل کر چکا۔ تب اس نے بائیں انداز سے دوسرے جرنیلوں کی طرف دیکھا لیکن اس کی ان معنی خیز نظروں سے یہ انداز، گمانا ممکن تھا کہ وہ فوجوں کی تقسیم و ترتیب کے منصوبے سے متعلق ہے یا غیر متعلق، مطمئن ہے یا غیر مطمئن۔ وہ شخص، جو دس روٹر کے قریب تریں بیٹھا ہوا تھا، کاؤنٹ لارڈ فوٹ تھا۔ اس کے چہرے پر پراسرار مسکراہٹ کھیل رہی تھی اور اس کی یہ مسکراہٹ اس کے مخصوص جنوبی فرانسیسی چہرے سے ایک نکتے کے لیے بھی غائب نہ ہوئی۔ وہ لگا تار اپنی ہی انگلیوں کو۔ جن کے سروں سے وہ اپنی نسوار کی طلائی

ڈبیا کو، جس پر تصویر چہ نقش تھا، بطور مشغل گھما پھر رہا تھا۔ نیکے جا رہا تھا۔ ایک طویل ترین جھلے کے عین درمیان میں اس نے ڈبیا کو گھمانا پھرنا بند کیا، مگر دن اوپر اٹھائی اور مختصراً شائستگی سے، جو اس کے باریک باریک ہونٹوں کے آخری کناروں تک پھیلی ہوئی تھی، وہ روتھ کوٹو کا کیونکہ وہ کچھ کہنا چاہتا تھا۔ لیکن آسٹروی جرنیل نے قطعاً کوئی توقف نہ کیا اور اپنی ہی دھن میں پڑھتا رہا۔ غیظ و غضب سے اس کی جیس شہن آلود ہو گئی اور اس نے پی ٹی کھائیاں یوں جھٹکیں جیسے وہ یہ کہنا چاہتا ہو۔ ”تم اپنی رائے بعد میں دے دینا، فی الحال بہرانی فرماؤ، نقشے پر دیکھو اور میری بات سنو۔“ لائٹ غوں نے اپنی نگاہیں اوپر اٹھائیں اور بوکھلے ہٹ کے عالم میں میلور اور ورج کی طرف یوں دیکھنے کا جیسے وضاحت طلب کر رہا ہو لیکن جب اس کی نظریں معنی خیز نظروں سے، جن میں کوئی معافی نہیں تھی، چار ہوئیں، اس نے آزرگی سے اپنی نگاہیں نیچے جھکا لیں اور دوبارہ سواری کی ڈبیا آگے پیچھے گھمانے لگا۔

”جغرافیہ کا درس۔“ وہ یوں بڑبڑانا جیسے شخص اپنے آپ سے بڑبڑا رہا ہو، پھر بھی اس کی آواز اتنی بلند ضرور تھی کہ دوسروں کے کانوں تک بھی پہنچ گئی۔

پرزے بڑبڑکی نے مودب لیکن باوقار شائستگی کے ساتھ اپنے اس کان کی، جو وہ روتھ کے قریب تریں تھا، لوٹوں کو چھو آ۔ وہ بالکل اس شخص کی طرح، جو سراپا توجہ بنا ہوا ہو، دکھائی دے رہا تھا۔ پست قامت و خوروف، جو چہرے ہرے سے ثابت قدم، سختی اور منکسر المزاج دکھائی دیتا تھا، وہ روتھ کے بالکل سامنے بیٹھا تھا۔ دیکھنے ہوئے نقشے کے اوپر جھکا ہوا تھا اور بڑے انہماک اور ایمانداری سے فوجوں کی تقسیم و ترتیب اور اچھٹی علاقے کا مطالعہ کر رہا تھا۔ اس نے متعدد مرتبہ وہ روتھ کو اپنے الفاظ، جو وہ سن نہیں سکا تھا، دہرانے اور دیہاتوں کے مشکل نام دوبارہ پڑھنے کے لیے کہا۔ وہ روتھ قلیل کرتا رہا اور دختوروف انھیں کاغذ پر تحریر کرتا رہا۔

جب خواندگی، جو ایک گھنٹے سے زیادہ عرصے تک جاری رہی تھی، مکمل ہو گئی، لائٹ غوں نے ایک مرتبہ سواری ڈبیا دھرا دھرا لڑھکائے کا مشغل ترک کیا اور وہ روتھ یا کسی بھی دوسرے شخص کی جانب خاص طور پر دیکھے بغیر کہ: ”فوجوں کی تقسیم و ترتیب کے اس منصوبے پر عمل کرنا کارے دار ہوگا کیونکہ اس میں یہ فرض کر لیا گیا ہے کہ ہمیں غیم کی پوری افواج کی پوزیشن کا علم ہے حالانکہ حقیقتاً ہمیں اس بارے میں کچھ بھی معلوم نہیں کیونکہ وہ لگا تار حرکت کر رہی ہیں۔“ لائٹ غوں کے اعتراضات میں بڑا وزن تھا لیکن یہ بالکل عیاں تھا کہ ان اعتراضات کے درپے اس کا بڑا مقصد وہ روتھ پر۔ جس نے، فواج کی تقسیم و ترتیب سے متعلق اپنا منصوبہ کچھ اس قسم کی خود اعتمادی سے پیش کیا تھا جیسے وہ مدرسے کے طالب علموں کے گرد سے مخاطب ہو۔ یہ واضح کرنا تھا کہ اس کا واسطہ حقوق سے نہیں بلکہ ایسے اشتغال سے پڑا ہے جو عسکری اور جنگی امور کے بارے میں اسے ایک دربان نہیں سکھا سکتے ہیں۔

جب وہ روتھ کی، جس کے لہجے میں اکتاہٹ کی حد تک یکسانیت تھی، آواز آنا بند ہو گئی، کوٹو زولی نے یوں آنکھیں کھول دیں جیسے پن چکنا چکی کی گھر گھر کی آواز بند ہونے پر اچانک بیدار ہو جاتا ہے۔ اس نے لائٹ غوں کے اعتراضات یوں سنے جیسے وہ یہ کہہ رہا ہو: ”تم ابھی تک وہی بے تکی اور دہیات باتیں کہتے جا رہے

ہو۔“ اس نے جھٹ پٹ اپنی ہتھکھیں دوبارہ بند کر لیں اور اپنی گردن کو پہلے سے بھی زیادہ نیچے ڈھک جانے دیا۔
لائٹنگوں کی پوری کوشش یہ تھی کہ منصوبے کے خالق کی حیثیت سے وہ دے روٹر کی عسکری انا کو زیادہ سے
زیادہ نہیں پہنچائے۔ اس نے یہ دلیل پیش کی کہ ”ہو سکتا ہے کہ بونا پارٹ اتنا موثر ہی نہ دے کہ ہم اس پر حملہ کر
سکیں، اس کے برعکس وہ خود با آسانی ہم پر حملہ کر سکتا ہے۔ یوں وہ ہماری پوری تقسیم و ترتیب کو درہم برہم کر سکتا اور
اسے بیکار بنا سکتا ہے۔“ دے روٹر نے کسی بھی اعتراض کو جوتی کی نوک پر نہ لکھا اور جواب میں محض حقارت آمیز
انداز سے مسکراتا رہا۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ مخالفانہ تنقید سے، خواہ وہ کیسی ہی کیوں نہ ہو، نپٹنے کے لیے پوری طرح
تیار رہ کر کے آیا تھا۔

”اگر اس میں حمد کرنے کی ہمت ہوتی، وہ آج کرچکا ہوتا،“ اس نے بھنا کر جواب دیا۔

”دوسرے الفاظ میں آپ کا خیال یہ ہے کہ اس میں اتنی سکت نہیں؟“ لائٹنگوں نے دریافت کیا۔

اس کے پاس زیادہ سے زیادہ چالیس ہزار کی نفی ہے،“ اس نے ایک ایسے طیب کی طرح کہا جس سے
کوئی نرس اس کے طریقہ علاج کی وضاحت طلب کر رہی ہو۔

”اس صورت میں وہ ہمارے حملے کا انتظار کر کے اپنی تباہی کو دعوت دے رہا ہے۔“ لائٹنگوں نے اپنے
چہرے پر پراسرار اور طنزیہ مسکراہٹ بکھیرتے ہوئے ترکی بہ ترکی جواب دیا اور ایک بار پھر تائید کے لیے
میلورادو رچ کی، جو اس کے قریب بیٹھا تھا، جانب دیکھا۔

لیکن معلوم ہوتا تھا کہ اس وقت میلورادو رچ کا دھیان کسی اور طرف ہے۔ اسے معلوم ہی نہیں تھا کہ جرنل
کس مسئلے پر بحث کر رہے ہیں۔

”ma toi“، اس نے کہا، ”کل میدان جنگ میں سب کچھ سامنے آ جائے گا۔“

دے روٹر پھر مسکرایا۔ اس کی مسکراہٹ سے یہ عندیہ مل رہا تھا کہ جن امور کے بارے میں وہ خود قائل ہو چکا
تھا اور دونوں ”بہرہ مقتدر“ امیر اطوروں کو قائل کر چکا تھا، انھیں ان روی جرنیلوں کے سامنے ثابت کرنا اور ان پر ان
کے اعتراضات کا جواب دینا اس کے نزدیک بالکل احمقانہ اور عجیب بات ہوگی۔

”مغنیہ نے اپنے مختلف کیمپوں کے الاؤ بھجوا دیے ہیں اور وہاں سے مسلسل شور و غل کی صدائیں دے رہی
ہیں۔ اس کا کیا مطلب ہے؟ یا تو وہ پسپائی اختیار کر رہے ہیں اور یہ واحد چیز ہے جس سے ہمیں کوئی اندیشہ لاحق
ہونا چاہیے، یا پھر وہ اپنی پوزیشنیں تبدیل کر رہے ہیں۔“ وہ ایک بار پھر مسکرایا۔ ”وہ بے شک فوراً سا جنگل میں نئی
پوزیشنیں قائم کر لیں، ہمارے لیے کوئی فرق نہیں پڑتا بلکہ ہم اچھی خاصی کوفت سے بچ جائیں گے۔ ہمارا منصوبہ
جزئیات سمیت جوں کا توں رہے گا اور اس میں سو برابر فرق نہیں آئے گا۔“

”یہ کیسے ہو سکتا ہے؟“ پرنس آئندے نے کہا۔ وہ خاصی دیرینہ اپنے شکوک و شبہات کا ظہار کرنے کے

لیے موقع کی تلاش میں تھ۔

کو تو زوف جاگ گیا۔ اس نے کھنکار کر اپنا گلا صاف کیا اور ادھر، دھر جرنیوں کو دیکھا۔

”حضرات، فوجوں کی جو تقسیم و ترتیب ہو چکی ہے، اب اس میں کل۔۔۔ بلکہ یوں کہیے کہ آج کیونکر شب آدھی سے زیادہ بیت چکی ہے۔ کوئی ترمیم و ترمیم نہیں ہو سکتی۔“ اس نے کہا۔ ”آپ اس کے بارے میں سن چکے ہیں۔ ہم سب اپنے اپنے فرائض و اکریریں گے اور ماقبل نہ جنگ اس سے بڑھ کر اور کوئی چہرہ اہم نہیں۔“ اس نے کچھ توقف کیا اور کہا ”کہ رات اچھی طرح سویا جائے۔“

وہ اپنی جگہ سے کچھ اس طرح ہلکا کہ جیسے وہ اٹھنا چاہتا ہو۔ جرنیوں نے ذرا جھک کر سلام کیا اور واپس چلے گئے۔ رات نصف سے زیادہ بھیگ چکی تھی۔ پرنس آندرے باہر نکل آیا۔



جنگی کونسل کے اجلاس نے جس میں پرنس آندرے کو اپنی توقعات کے برعکس اپنے خیالات ظاہر کرنے کا موقع ملا تھا، اسے قدرے تذبذب اور بے چینی میں مبتلا کر دیا۔ سچا کون تھا۔ دنگور و کوف اور دے روٹریا کو تو زوف، ان دونوں اور دوسرے جو حملے کے منصوبے سے متفق نہیں تھے؟ وہ اس بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا۔ ”لیکن سواں یہ ہے کہ کیا کو تو زوف کے لیے براہ راست رار کے سامنے اپنے خیالات کا اظہار کرنا واقعی ناممکن تھا؟ کیا مختلف انداز سے اس کا اہتمام نہیں کیا جاسکتا تھا؟ کیا یہ ممکن ہے کہ ذاتی اور درباری ضروریات کے پیش نظر ہزاروں انہوئوں کی زندگی کو، میری زندگی کو، خود میری زندگی کو“ اس نے سوچا، ”معرض فطر میں زائل دیا جائے؟... ہاں، یہ یقین ممکن ہے کہ میں کل ہلاک ہو جاؤں۔“

موت کے اس تصور پر اس کے ذہن میں ایک ایسی، بہت ہی دور افتادہ اور انتہائی ذاتی نوعیت کی یادیں سراٹھانے لگیں۔ اسے اپنے باپ اور بیوی سے اپنی آخری ملاقات یاد آئی، اپنی بیوی کے ساتھ محبت کے دھندلے ایام یاد آئے، اس نے اس کے پاؤں بھاری ہونے کے متعلق سوچا اور اسے اس پر، وراپنے آپ پر ترس آنے لگا۔ اس کی ذہنی حالت سخت بھائی اور بوجھل ہوتی جا رہی تھی اور وہ اسی کیفیت میں اس مکان سے، جس میں اسے اور نہیں دسکی کو ٹھہرایا گیا تھا، باہر نکل گیا اور اس کے سامنے چکر لگانے لگا۔

یہ دھندلی رات تھی اور چاند کی روشنی پر اسرار انداز سے دھند میں سے چھن چھن کر آرہی تھی۔ ”ہاں، کل کل!“ اس نے سوچا۔ ”شاید یہ کل میری زیست کا آخری دن ہو۔ پھر نہ یہ یادیں ہوں گی اور نہ میرے لیے ان کے کوئی معافی ہوں گے۔ شاید کل۔۔۔ یقیناً کل۔۔۔ میرا تھ ٹھک رہا ہے کہ کل پہلی مرتبہ، جو کچھ مجھ سے ہوسکا، مجھے کر کے دکھانا ہو گا۔“ اور اس کے ذہن میں لڑائی، شکست، ایک مقام پر گھمسان کے رن اور تمام کمانڈروں کے تذبذب کا خاکہ ابھرنے لگا اور آخر کار وہ مسرت بخش لمحہ، جس کا اس نے، تا طویل انتظار کیا تھا، جب نیو یمن کی سرکہ تلوں

میں کامیابی کی طرح اسے بھی فیصلہ کن کامرانی حاصل ہوگی، اس کے ذہن کی گرفت میں آئی گیا۔ وہ ثابت قدمی اور کسی قسم کے الجھاؤ کے بغیر کوٹو زوف، دسے روڈ اور ایسراطوروں کے سامنے اپنے خیالات کا اظہار کرتا ہے۔ اس کے نظریات کی صحت سبھی کو متاثر کرتی ہے لیکن انھیں عملی جامہ پہنانے کے لیے کوئی بھی آمادہ نہیں ہوتا۔ چنانچہ وہ خود ایک رجسٹ، ایک ڈویژن کی کمان اس شرط کے ساتھ سنبھال لیتا ہے کہ کوئی شخص بھی اس کے احکام میں دخل اندازی نہیں کرے گا۔ وہ اس ڈویژن کو فیصلہ کن مقام پر لے جاتا ہے اور تنہا فتح سے ہسٹنا ہو جاتا ہے۔

”اور موت اور مصائب کے بارے میں کیا خیال ہے؟“ ایک دوسری آواز آئی۔ لیکن پرنس آندرے نے اس آواز کو نظر انداز کر دیا اور اپنی کامیابیوں اور کامرائیوں کے ہوئی قلعے تعمیر کرتا رہا۔ اس سے اگلی لڑائی کی منصوبہ بندی وہ کیا ہی کرتا ہے۔ کہنے کو تو وہ کوٹو زوف کا صرف ایجوٹنٹ ہے لیکن وہ سب کچھ تنہا کرتا ہے۔ کوٹو زوف کو الگ کر دیا جاتا ہے اور اس کی جگہ اسے تعینات کر دیا جاتا ہے۔ ”خیر اور پھر؟“ دوسری آواز پر چھتی ہے۔ ”فرض کر دو کہ تم درجن بار زخمی یا ہدک ہونے سے بچ جاتے ہو، تمہارے ساتھ غداری بھی کوئی شخص نہیں کرتا... تب کیا؟“

”خیر، تب“ پرنس، آندرے خود ہی جواب دیتا ہے۔ ”میں جانا نہیں چاہتا۔ تاہم، اگر میں نام کمانے کی آرزو کرتا ہوں، عوام میں مقبول ہونا اور ان سے متناکس کرانا چاہتا ہوں، صرف انہی چیزوں کی تمنا کرتا ہوں، ان کے علاوہ کسی اور چیز کی خواہش نہیں کرتا، اور صرف انھیں کی خاطر زندگی بتا رہا ہوں، پھر ان کے لیے مجھے موردِ الزام نہیں ٹھہرایا جاسکتا۔ ہاں، صرف انھیں چیزوں کے لیے! میں کبھی کسی کو کچھ نہیں بتاؤں گا۔ لیکن میرے خدایا، اگر مجھے نام و نمود اور انسانوں کی تحسین کے علاوہ کسی اور چیز کی قضا کوئی پروا نہیں، پھر میں کیا کر سکتا ہوں؟ موت، رخم، خاندان کا اہل۔ مجھے کسی سے خوف محسوس نہیں ہوتا۔ اگرچہ متعدد ہستیاں میرے لیے بے حد عزیز اور بیش بہا ہیں۔ اور اس میں سب سے عزیز ترین باپ، بہن، اور بیوی ہیں۔ آپ کو یہ بات خواہ کتنی ہی بھیا تک اور غیر فطری کیوں نہ محسوس ہو، میں ان سب کی بلاتا خیر بعینت چڑھا سکتا ہوں، بشرطیکہ مجھے شان و شکوہ اور ناموری کا ایک لمحہ نصیب ہو جائے، انسانوں پر فتح و ظفر حاصل ہو جائے اور ان انسانوں کی، جنہیں میں نہ جانتا ہوں اور نہ کبھی جان پاؤں گا، محبت مل جائے۔ ان انسانوں کی، جو یہاں موجود ہیں، محبت سے بہرہ ور ہو جائیں۔“ اس نے اس آوازوں پر، جو کوٹو زوف کے مکان کے احاطے سے آ رہی تھیں، کان لگاتے ہوئے سوچا۔

جو اردلی سامان باندھ رہے تھے، یہ آوازیں انھیں کی تھیں۔ ان میں سے ایک، غالباً کوپوان، کوٹو زوف کے ”عزیز عمر باورچی“ (اس کا نام تیت تھا اور پرنس آندرے اسے جانتا تھا) سے دل لگی کر رہا تھا۔

”تیت، وہ تیت!“

”کیا ہے؟“ تیت نے پوچھا۔

”تیت، بھوسا جھاڑ بچیت!“ دل لگی باز نہ کیا۔

”بھڑ میں جاؤ!“ باورچی کی آواز سنائی دی لیکن اردلیوں اور نوکروں چاکروں کے قہقہوں کے شور و غل

میں رہ گئی۔

”بہر حال کچھ بھی ہو، واحد چیز جس سے مجھے پیار ہے اور جس کی میرے دل میں قدر ہے، یہ ہے کہ میں تمام انسانوں پر فتح و نصرت حاصل کروں۔ میں صرف اس پر اسرار قوت اور شان و شکوہ کی، جو اس دھند میں میرے اوپر منڈلا رہی ہے، قدر کرتا ہوں۔“

13

ایسی رات رستوف باگراتیوں کے دستے کے سامنے ایک پلٹن کے ہمراہ بیرونی چوکیوں کے آس پاس محنتی ڈیول سرانجام دے رہا تھا۔ اس کے ہونڈاروں کو دود کی صورت میں بیرونی چوکیوں کے قرب و جوار میں متعین کیا گیا تھا اور وہ خود گھوڑے پر سوار کبھی ادھر اور کبھی اُدھر آ جا رہا تھا۔ زبردست غنودگی اسے اپنی گرفت میں لے رہی تھی اور وہ اس پر غائب آنے کی پوری کوشش کر رہا تھا۔ اپنے پیچھے وسیع و عریض میدان میں اسے اپنی فوج کے اداؤ، جو مختلف مقامات پر روشن کیے گئے تھے، نظر آرہے تھے۔ دھند میں یہ اداؤ ہلکی ہلکی لودے رہے تھے۔ اس کے سامنے دھندلی تاریکی تھی۔ پورے غور سے دیکھنے کے باوجود اسے اس دھند میں تاریکی میں کچھ بھی نظر نہیں آرہا تھا۔ بعض اوقات ظلمت کا پردہ ذرا کھٹک جاتا لیکن اگلے ہی لمحے گھٹا ٹپ اندھیرا چھا جاتا۔ دور فاصلے پر، جہاں خیال تھا کہ غنیمتیں ہوں گی، سے یوں نظر آتا کہ ننھی مٹی روشنیاں ٹٹھا رہی ہیں، لیکن پھر یہی ٹٹھا ہٹ اسے فریب نظر معلوم ہونے لگتی۔ اس کی آنکھیں بار بار بند ہو رہی تھیں۔ اس کے تصور میں پہلے زار، پھر دینی سوف اور اس کے بعد ماسکو کی تصاویر بھرنے لگتیں۔ وہ جھٹ پٹ اپنی آنکھیں کھول دیتا اور اسے محاسبے سامنے صرف اس گھوڑے کا، جس پر وہ سوار تھا، سر اور کان نظر آتے یا پھر ہونڈاروں کی شکلیں دکھائی دیتیں لیکن وہ بھی صرف اس وقت جب وہ ان سے صرف چھوٹے م دور رہ جاتا۔ لیکن وہ فاصلے پر وہی دھندلی تاریکی چھائی ہوئی تھی۔

”کیوں نہیں؟ ایسا آسانی ہو سکتا ہے،“ رستوف خیال گھوڑے دوڑا رہا تھا، ”کہ رار کی مجھ سے اپنا ٹکڑا بھینٹ ہو جائے اور وہ مجھے حکم دیں، جیسا کہ وہ کسی بھی افسر کو دے سکتے ہیں کہ چاؤ اور دیکھو کہ ادھر کیا ہو رہا ہے۔ اس قسم کی متعدد کہانیاں سننے میں آئی ہیں کہ ان کی اللہ قیہ کسی افسر سے ملاقات ہو گئی، وہ انھوں نے اسے اپنے شاف میں شامل کر لیا۔ اگر وہ مجھے اپنے اثر و رسوخ کسی اسامی پر تعینات کر لیں، کتنا لطف آئے گا! میں ان کی سلامتی کا پورا پورا خیال رکھوں گا، انھیں سب کچھ سچ سچ بتایا کروں گا اور وہ لوگ، جو ان سے غداری کے مرتکب ہوتے ہیں، ان کا بھانڈا بیچ جو رہے پھوڑا کروں گا۔“ اور اسی طرح اسے اپنی محبت اور جاں نثاری کا جو خاکہ اس نے اپنے ذہن میں ترتیب دیا تھا، اس کو رنگین بنانے کے لیے اس نے کسی دشمن یا غدار جرم کا تصور کیا جسے نہ صرف ہلاک کر کے اسے مسرت ہوگی بلکہ نذر کی نگاہوں کے عین سامنے وہ اسے تھپتھپا کر راحت محسوس کرے گا۔

”میں کہاں ہوں؟ ارے ہاں، گشت پر۔ پاس دوڑا اور راج ورڈ شافٹ، اول موٹس۔ یہ ستنی ماہوں کی

بات ہے کہ کل میں محفوظ دسنے کی حیثیت سے رکھا جائے گا۔۔۔ اس نے سوچا۔ ”میں درخواست کروں گا کہ مجھے محاذ پر بھیج دیا جائے۔ زار سے ملاقات کرنے کا میرے پاس شاید یہی واحد موقع ہوگا۔ ہاں، کچھ دیر میں مجھے یہاں سے چھٹی مل جائے گی اور گشت بر میری جگہ اور کوئی آدمی آجائے گا۔ میں ایک بار پھر یہاں کا گھوڑے پر چکر لگاتا ہوں۔ جب میں واپس آؤں گا، میں سیدھا جرنیل کے پاس جاؤں گا اور ان سے عرصہ کروں گا۔“ وہ زمین پر سیدھا تن کر بیٹھ گیا ورنہ وہ اپنے ہونہاروں کا سہہ کرنے چل دیا۔ اسے احساس ہوا کہ مطلع پہلے کی نسبت روشن تر ہو رہا ہے۔ انیس طرف اسے ڈھلان کی جھلک نظر آگئی۔ معلوم ہوتا تھا کہ اس کا پہلو روشن ہو گیا ہے۔ اس کے بالقابل ٹیلا تھا۔ یہ پوار کی طرح سیدھا تھا اور اس کے اوپر سفید پٹی تھی۔ رستوف کی سمجھ میں نہ آیا کہ یہ کیا ہے: ”کیا یہ جنگل کے بیچ میں کوئی کھلا علاقہ ہے جسے چاند نے اجاگر کر دیا ہے؟ برف ہے جو بھی پگھل نہیں آیا سفید مکانات ہیں؟“ اسے یہ بھی خیال آیا کہ اسے اس سفید پٹی پر کوئی چیز حرکت کرتی نظر آئی ہے۔ ”یہ ماڑی برف ہوگی۔ وہ دھپا۔۔۔ دھپا۔“

unetaché نٹاشا، میری ہمشیرہ، اس کی سیاہ آنکھیں۔۔۔ نٹاشا۔۔۔ جب میں اسے بتاؤں گا کہ میری زار سے ملاقات ہوئی تھی، اس کی آنکھیں حیرت سے کھلی کی کھلی نہیں رہ جائیں گی؟ نٹاشا، میری ہمشیر پکڑنا۔۔۔

”جناب دائیں طرف رہیں، ادھر چھ ڈیاں ہیں،“ رستوف کو ایک ہونہار کی آواز سنائی دی۔ وہ خند کے عالم میں گھوڑے پر سوار اس ہونہار کے قریب سے گزر رہا تھا۔

ناگہاں رستوف نے پناہ، جو تقریباً گھوڑے کی ایال پر گر پڑا تھا، اوپر اٹھایا اور اپنا گھوڑا ہونہار کے برابر روک لیا۔ وہ بچکا نہ خنودگی سے، جو اس پر غائب آگئی تھی، پیچھے نہ پھڑا سکا۔ ”لیکن میں سوچ کیا رہا تھا؟ مجھے بھولنا نہیں چاہیے۔ میں زار سے کیسے بات کروں گا؟ نہیں، یہ بات نہیں ہے۔ یہ تو مسئلہ مفرد ہے۔ ارے، ہاں، نٹاشا۔۔۔ ہمشیرہ۔۔۔ اڑا دو۔۔۔ تہ تیغ کر دو۔۔۔ کسے؟ ہونہار، ارے ہاں، موچکھوں والے ہونہار۔۔۔ موچکھوں والا ہونہار خیالیں تو رسکا، پر جا رہا تھا۔۔۔ میں اس کے متعلق بھی سوچ رہا تھا، میں کریم کے مکاں کے سامنے۔۔۔ بوڑھا کریم۔۔۔ اٹھا، اور دینی سوف اچھا انسان ہے۔ لیکن یہ سب بکو اس ہے۔ فی الحال اصل بات یہ ہے۔ کہ زار یہاں ہے! اس نے مجھے کیسے رکھا تھا، وہ مجھ سے کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن اسے ہمت نہ ہوئی۔ نہیں، یہ میں تھا جس کی ہمت جواب دے گئی تھی۔ لیکن یہ سب بکو اس ہے۔ اصل بات یہ ہے۔۔۔ مجھے اہم بات، جو میں سوچ رہا تھا، بھلانا نہیں چاہیے۔ ہاں، نٹاشا، ہمشیرہ۔۔۔ ہاں، ہاں، ہاں، بالکل یہی بات ہے!“ اور ایک مرتبہ پھر اس کا سر گھوڑے کی ایال پر بھٹک گیا۔ ایک ایک اسے یوں لگا کہ کوئی شخص اس پر گولی چلا رہا ہے۔ ”کیا؟ کیا؟ کیا؟ ان کی گردنیں اڑا دو۔ کیا؟“ اس نے جاگتے ہوئے کہا۔

یہیں اس لمحے جب رستوف نے آنکھیں کھولیں، اسے اپنے سامنے غنیم کی سمت کافی دیر تک انسانوں کے چہنچہنے چلانے کی آوازیں سنائی دیتی رہیں۔ ان آوازوں کو سن کر اس کے اور اس کے قریب دوسرے ہونہار کے گھوڑے

نے اپنی کنوتیاں کھڑی کر لیں۔ جس علاقے سے آوازیں آرہی تھیں، ادھر دفعتاً پہلے گگ کا ایک شعلہ بھڑکا اور پھر گگیا، اس کے بعد دوسرا اور دوسرے کے بعد تیسرا، پھر چوتھا، اور جدھر فرانسیسی تھے، ادھر پہاڑی پر آگیاں ہی آگیاں روشن ہو گئیں اور چیخنے چلانے کی آوازیں بلند سے بلند تر ہونے لگیں۔ رستوف کو فرانسیسی سنائی دی لیکن وہ الفاظ کی شناخت نہ کر سکا۔ بے شمار آوازیں کا شور و غل اتنا زیادہ تھا کہ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کون کیا کہہ رہا ہے۔ وہ صرف ”آ۔ آ۔ آ؟“ اور ”را۔ را۔ را!“ ہی سن سکتا تھا۔

”یہ کیا ہے؟ تمہارا کیا خیال ہے؟“ رستوف نے اپنے قریب ہوزار کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔ ”یہ سب کچھ
غنیم کے گیمپ میں ہو رہا ہوگا؟ یقیناً؟“
ہوزار نے کوئی جواب نہ دیا۔

”ہونہد! تمہیں کچھ سنائی نہیں دے رہا؟“ رستوف نے جواب کے لیے مناسب انتظار کرنے کے بعد کہا۔
 ”جناب علی، کچھ کہا نہیں جاسکتا،“ ہوزارے جھجکتے جھجکتے جواب دیا۔
 ”سہت کے اعتبار سے تو غنیم ہی ہونا چاہیے،“ رستوف نے اپنی بات دہرائی۔

”ممکن ہے وہی ہو، ممکن ہے کہ کچھ بھی نہ ہو“ ہوزر نے کہا۔ ”اندھیرا بہت زیادہ ہے۔ جبردار، ہوشیار“ اس نے اپنے گھوڑے سے، جس کی بے چینی میں لحظہ بہ لحظہ اضافہ ہو رہا تھا، چلا کر کہا۔

رستوف کا اپنا گھوڑا بھی خاصا بے قرار ہو رہا تھا۔ وروہ تین بجے زمین پر پڑا تھا، اس کی کوتیلا کھڑکی ہو گئی تھیں اور وہ ادھر، جدھر آ گئیں روش تھیں، دیکھے جا رہا تھا۔ شور و غل بلند سے بلند تر ہوتا جا رہا تھا وروہ اس غل غلاڑے میں، جو صرف ہزاروں افراد پر مشتمل فوج میں ہی برپا ہو سکتا ہے، جذب ہو رہا تھا۔ آنگوں کا یہ سلسلہ حویل سے حویل تر ہوتا چلا گیا۔ یہ لازماً فرانسسی سپاہ کا پڑاؤ ہو گا۔ رستوف کی آنکھوں سے عینداب کا نور ہو چکی تھی۔ غنیم کے پر جوش قبضہ داروں اور سرت دشاہانی سے بھرپور بند آوازوں نے اس کے جذبات کو متلاطم کر دیا تھا۔

۴ "Vive l'Empereur... l'Empereur!" اسے واضح طور پر سنائی دیا۔

”یہ تو زیادہ دور نہیں ہوں گے، شاید ندی کے اس پار ہی ہوں،“ اس نے ہورار سے کہا۔

ہوڑا رنے کوئی جواب نہ دیا، صرف آہ بھری پھر وہ غصے کے عالم میں اپنا گل کھنکارنے لگا۔
 انھیں گشت کی لکیر کے ساتھ ساتھ گھوڑے کے اچھی خاصی رنٹار سے بھاگنے کی آواز سنائی دینے لگی۔
 اچانک تاریکی میں سے ہوڑا روں کے کسی سار جنت کی شکل نمودار ہوئی، وہ آدمی نہیں، عظیم الجثہ ہاتھی نظر آتا تھا۔
 ”جناب عالی، حرنیل صاحبان!“ گھوڑے پر سوار سار جنت نے رستوف کے قریب جا کر کہا۔

جواب دیا، میں صاحبان! گھوڑے پر سوار سار جٹ کے رستوں کے قریب جا کر رہا تھا۔
 رستوں کا دھیان ابھی تک ادھر، جدھر گیس روشن ہو رہی اور شور و شب کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں، وہاں
 ہوا تھامہ دھر رہا تھا سار جٹ کے ساتھ ان متعدد دشمنوں سے، جو بیرونی چوکیوں کے برابر آ رہے تھے، ملنے چل پڑا۔

ان میں سے ایک سفید گھوڑے پر سوار تھا۔ پرنس ہاگ راتیاں اور پرنس دلگور دگوف اپنے بکونٹوں کی معیت میں غیم کے کیمپ میں روشنیوں اور غل غپاڑے کے عجیب و غریب منظر کی تفتیش کرنے آئے تھے۔ رستوف گھوڑے پر سوار پرنس ہاگ راتیاں کے پاس پہنچا اور اس کی خدمت میں اپنی رپورٹ پیش کی۔ اس کے بعد وہ بکونٹوں میں جا شامل ہوا اور جو کچھ جرنیل کہہ رہے تھے، اسے بغور سننے لگا۔

”سیری بات کا یقین کریں،“ پرنس دلگور دگوف پرنس ہاگ راتیاں سے کہہ رہا تھا۔ ”یہ کچھ بھی نہیں، بس چال ہے۔ وہ سپاہی ہو چکا ہے اور ہمیں مغالطہ دینے کے لیے اپنے عقلمندی و ستون کو آگیاں جلانے اور ہنگامہ ہار ہو برپا کرنے کا حکم دے گیا ہے۔“

”میں سمجھتا ہوں کہ یہ بات نہیں ہے،“ ہاگ راتیاں نے کہا۔ ”میں نے انہیں آج شام اسی ٹیلے پر دکھا تھا۔ مگر انہوں نے سپاہی اختیار کی ہوئی، وہ وہاں سے بھی پیچھے ہٹ چکے ہوتے۔“ آفسر، اس نے رستوف کی جانب متوجہ ہو کر کہا، ”ان کی گشتی چوکیاں اور دستے بھی تک وہیں ہیں؟“

”یہزیکس لینس، آج شام تک تو وہیں تھے لیکن اس وقت صورت حال کیا ہے میں اس کے متعلق یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ میں چند ہونہر، ساتھ لے جاؤں اور معلوم کر آؤں؟“ رستوف نے پوچھا۔

”اگر راتیاں ہچکچایا اور اس نے جواب دینے سے ہشتر دھند میں رستوف کا چہرہ دیکھنے کی کوشش کی۔“

”اچھا... جاؤ اور دیکھو،“ اس نے مختصر توقف کے بعد جواب دیا۔

”بہت اچھا، جناب عالی۔“

رستوف نے اپنے گھوڑے کو ہمیز لگایا۔ اس نے سہار جٹ فید چٹکو اور دو دوسرے ہونہروں کو بلایا، انہیں اپنے پیچھے آنے کا حکم دیا، جس طرف سے شور و غل کی آوازیں آرہی تھیں (اور یہ آوازیں بھی تک سنائی دے رہی تھیں) اور گھوڑے بھاگنے اور پہاڑی سے نیچے اترنے لگا۔ اس پر اسرار، پرخطر اور دور دراز سمت تین ہونہروں کی معیت میں جاتے رستوف کی خوف سے جان بھی نکلی جارہی تھی اور خوشی سے ہاتھیں بھی کھلی جا رہی تھیں کیونکہ اس سے پیشتر کوئی بھی ادھر نہیں گیا تھا۔ ہاگ راتیاں نے پہاڑی کی چوٹی سے چلا کر اسے کہا کہ وہ ندی کے پار نہ جائے لیکن اس نے یوں ظاہر کیا کہ جیسے اسے یہ حکم سنائی ہی نہیں دیا اور کہیں رے کے بغیر آگے اور مزید آگے چلا گیا۔ وہ مسلسل جھاڑیوں کو درخت اور تنگ دھار یک گھانٹوں کو انسان سمجھتا رہا لیکن ہر بار اسے اپنی غلطی کا احساس ہوتا رہا۔ جب ایک مرتبہ وہ پہاڑی سے نیچے اتر گیا، اسے ندی اپنی اور نہ غنیم کی کوئی سگ دکھائی دی تاہم فرانسیسیوں کا شور و غل پہلے کی نسبت بلند تر اور واضح تر ہوتا چلا گیا۔ ہادی میں اسے اپنے سامنے دریا سے ملتی جلتی چیز نظر آئی لیکن جب وہ اس کے قریب پہنچا، معلوم ہوا، بیدار یا نہیں، سڑک ہے۔ یہاں پہنچ کر اس نے گھوڑے کو لگام دی۔ اب اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ سڑک پر چلا رہا ہے یا اسے پار کر جائے اور سیاہ میدان میں گزرتا پہاڑی پر چڑھ جائے۔ سڑک دھند میں چمک رہی تھی اور اس پر چھنا کم پر خطر تھا کیونکہ اگر کوئی شخص اس پر آ رہا ہوتا، اسے دیکھنا آسان ہوتا۔

”میرے پیچھے پیچھے آؤ“ اس نے حکم دیا درگھوڑا دوڑاتے اس مقام کی طرف، جہاں شام کو فرانسیسیوں نے گشتی چوکیاں قائم کی تھیں، پہاڑی پر چڑھنے لگا۔

”جناب عالی، وہ ادھر ہے!“ ایک ہوازنے پیچھے سے پکار کر کہا۔

پیشتر اس کے کہ رستوف اس دھندلے سایے کو، جو ایک ایک دھندیل سے نمودار ہوا تھا، پہچان سکا۔ گشتی چوکی اور بندوق چلنے کی آواز سنائی دی۔ ایک گولی روتی اور سنسناتی فضا میں بلند ہوئی اور پلک جھپکنے میں دروازہ سے باہر نکل گئی۔ دوسری بندوق کا نشانہ خطا گیا لیکن اس کے پیالے سے روشنی ضرور نمودار ہوئی۔ رستوف نے اپنا گھوڑا موڑا اور سر پٹ چھپلی جانب بھاگنے لگا۔ وقفے وقفے سے مزید چار یا پندرہ بندوق دھننے کی آواز سنائی دی اور چار مزید گولیاں ایک دوسری سے مختلف انداز سے سنسناتی آگے گزرا اور دھند میں غائب ہو گئیں۔ رستوف نے پے گھوڑے کی، جسے اسی کی طرح فائرنگ نے نہال کر دیا تھا، لگام کھینچی اور اس کی رفتار ڈھیل کر دی۔ ”اور چلاؤ، چلاؤ،“ اس کے باطن میں کوئی سرور و مضمین آواز کہہ رہی تھی لیکن مزید کوئی گولی نہ آئی۔

جب تک وہ باگ رتیاں کے قریب نہ پہنچ گیا، وہ اپنے گھوڑے کو سر پٹ دوڑانے سے احتراز کرتا رہا۔ جب وہ جرنیل کے قریب پہنچا، وہ سیلوٹ کے لیے اپنا ہاتھ اٹھا کر ٹوپی تک لے گیا۔ دلوں کو ابھی تک اصرار کیے جا رہا تھا کہ فرانسیسی پسپا ہو چکے ہیں اور محض ہمیں دھوکا دینے کے لیے انھوں نے الاد روشن کر رکھے ہیں۔

”اس سے کیا ثابت ہوا؟“ جب رستوف واپس آیا وہ کہہ رہا تھا۔ ”وہ پسپا ہو سکتے ہیں اور اپنی گشتی چوکیاں چھوڑ سکتے ہیں۔“

”پرنس، صاف ظاہر ہے کہ وہ ابھی تک نہیں گئے!“ باگ رتیاں نے کہا۔ ”کل صبح تک انتظار کریں، کل ہمیں سب کچھ معلوم ہو جائے گا۔“

”یوڈائیسی لینسی، گشتی چوکیاں ابھی تک پہاڑی پر موجود ہیں، بالکل انہی مقامات پر، جہاں وہ کل شام تھیں۔“ رستوف نے رپورٹ دی۔ وہ نیچے جھک گیا لیکن سیلوٹ کے لیے اس کا ہاتھ ابھی تک اوپر اٹھا ہوا تھا۔ اس کا خاص طور پر گولیوں کی آوازوں نے، اس کے چہرے پر جو ہر مسرت تبسم بکھیر دیا تھا، وہ اسے چھپانے میں ناکام رہا تھا۔

”خوب! خوب!“ باگ رتیاں نے کہا۔ ”آفیسر، تمہارا شکریہ۔“

”یوڈائیسی لینسی!“ رستوف نے کہا۔ ”میں کچھ عرض کر سکتا ہوں؟“

”کیا چاہتے ہو؟“

”کل میرا سکواڈرں محفوظ دستہ قرار دے دیا جائے گا۔ میری درخواست ہے کہ مجھے فرسٹ سکواڈرں میں شامل کر دیا جائے۔“

”کیا نام ہے تمہارا؟“

”کاؤنٹ رستوف۔“

”اٹھا، بہت خوب۔ تم بطور ارادہ لی افسر میرے ساتھ رہ سکتے ہو۔“

”تم ایسا، اندر تک کے صاحبزادے ہو؟“ ولگوں کو ف نے پوچھا۔

رستوف نے کوئی جواب نہ دیا۔

”پیریکسی لینس، میں اسے کچل بات سمجھوں۔“

”میں حکم جاری کر دوں گا۔“

”عین ممکن ہے کہ کل مجھے پیغام پہنچانے کے لیے امپراطور کی خدمت میں روانہ کر دیا جائے،“ رستوف

نے سوچا۔ ”شکر ہے خداوند کا!“



غیم کے کیمپ میں جو دشمنیں دکھائی دے رہی تھیں اور وہاں سے جو شور و غل کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں، اس کی وجہ یہ تھی کہ جب فوجیوں کو پولیس کا حکم پڑھ کر سنایا جا رہا تھا، وہ بہ نفس نفیس گھوڑے پر سوار عارضی قیام گاہوں میں آ گیا تھا۔ جب جوانوں نے اسے دیکھا، انھوں نے پرال کے کچے ترور مردز کر مشعلیں بنالیں، وہ اس کے آگے پیچھے بھاگنے اور "Vive l'Empereur" کے نعرے بلند کرنے لگے۔ پولیس نے جو حکم جاری کیا تھا، وہ درج ذیل ہے:

جوانو! ہم کے مقام پر آشوری سپاہ کو جو شکست ہوئی تھی، اس کا انتقام لینے روئی فوج تمہارے خلاف پیش قدمی کرتی آرہی ہے۔ یہی بلینش ہیں جنہیں تم نے ہولابرڈ³⁶ کے مقام پر ہزیمت سے دوچار کیا تھا اور جن کا تم اس وقت سے تعاقب کرتے کرتے یہاں پہنچ گئے ہو۔ جس پوزیشن پر ہم قابض ہیں، وہ بہت مستحکم اور مضبوط ہے۔ اگر انھوں نے دائیں جانب سے مجھے اپنے گمیرے میں لینے کی کوشش کی، ان کا اپنا ایک بازو میری زد میں آ جائے گا۔ جوانو، میں خود تمہاری بٹالینوں کی قیادت کر دوں گا۔ گرم نے اپنی روایتی جرأت اور شجاعت سے غیم کی صفوں میں افراتفری اور انتشار پیدا کر دیا، میں تمہیں گولہ باری کی زد میں نہیں آنے دوں گا۔ لیکن اگر ایک ٹاپے کے لیے بھی ہمیں یہ شبہ ہوا کہ فتح ہمارے ہاتھ سے نکل جا رہی ہے، تم دیکھو گے کہ تمہارا امپراطور غیم کی فائرنگ کا سامنا کرنے سب سے آگے نکل آیا ہے۔ چنانچہ فتح کے بارے میں کسی بھی قسم کی بے یقینی کو قطعاً ہوا نہیں ملنا چاہیے اور مردز تو یہ اور بھی ضروری ہے کیونکہ آج فرانس کی پیدو فوج کا عز و وقار، جس سے ہماری قوم کا عز و وقار وابستہ ہے، خطرے میں ہے۔

دشمنوں کے ہٹانے کے بہانے صفوں کو قطعاً درہم برہم نہ ہونے دیا جائے۔ آج ہر جوان کے قلب و ذہن میں یہ خیال پوری طرح جاگزیں ہو جانا چاہیے کہ ہمیں انگلستان کے ان بھارے کے ٹوہوں کو شکست فاش

سے دو چار کرنا ہے کیونکہ ان کے قلوب میں ہماری قوم کے خلاف نفرت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے اس فتح سے ہماری مہم اپنے اختتام کو پہنچ جائے گی اور ہم واپس اپنے سران صدہ مقام چلے جائیں گے۔ وہاں وہ تازہ دم دستے، جنہیں اس وقت فرانس میں بھرتی کیا جا رہا ہے، ہمارے ساتھ شامل ہو جائیں گے۔ پھر میں جو صلح نامہ طے کر دوں گا، وہ میری قوم کے، تمہارے اور خود میرے شایان شان ہوگا۔

14

صبح کے پانچ بج چکے تھے لیکن رات ہنوز خاصی تاریک تھی۔ قلب، محفوظ اور باگراتیاں کا مینہ ابھی تک حرکت میں نہیں آیا تھا۔ تاہم میسرے کی پیادہ سپاہ، گھڑ سو، رنوج اور توپ خانے کے دستے بیدار ہو چکے تھے ورتیاریوں میں جست گئے تھے۔ اس میسرے نے پہاڑیوں سے اتر کر فرانسیسی مینے پر حملہ کرنا اور منصوبے کے مطابق اسے پھینکا³⁷ کے کوہستانوں میں دھکیلنا تھا۔ پڑوسیوں جو جگہ جگہ الود روشن کیے گئے تھے، ان میں ہر قسم کی الہا اور فالتو اشیاء پینک دی گئیں اور یوں جو دھواں اٹھا، وہ آنکھوں میں چھینے لگا۔ فضا سرد اور تاریک تھی۔ افسرانِ شتابی سے چائے غریل اور ناشتہ ٹھونس رہے تھے۔ جوانوں نے الاؤوں کے گرد جھگھٹا کر رکھا تھا۔ وہ ریں چہارے، وراپنے آپ کو گرم کرنے کے لیے پاؤں سے زمین پر ٹھوکریں مار رہے تھے۔ وہ عارضی جھونپڑیوں، کرسیاں، میزیں، پیسے، تسلی، غرضیکہ ہر وہ چیز، جس کی انہیں ضرورت نہیں رہی تھی باجسے وہ اپنے ساتھ نہیں لے جاسکتے تھے، آگ میں جھونک رہے تھے۔

آسٹرویائی فوج کے گائیڈ، جنہوں نے ہر اول دستوں کے مابین پیغام رسانی کے فرائض سرانجام دیے تھے، مختلف دستوں کے مابین آ جا رہے تھے۔ جوئی کوئی آسٹرویائی افسر کسی رجمنٹل کمانڈر کے ذریعے کے قریب دکھائی دینا اس رجمنٹ میں لی چل سچ جاتی۔ جوان الاؤوں سے بھاگنے، اپنے پاپ اپنے بونوں میں ٹھونسنے، پے نیچے سامان گاڑیوں پر بھینکنے، اپنی بندوٹیں سنبھالنے اور صفیں ترتیب دینے لگتے۔ افسرانِ کوٹوں کے من بند کرتے، شمشیر اور نیام درست کرتے اور چیختے چلاتے صفوں کے مابین چکر کاٹنے لگتے۔ اردلی اور کوچان گھوڑے جوڑنے، گاڑیوں پر سامان رکھنے اور اسے باندھنے لگتے۔ ایجوینٹ اور بٹالینوں اور رجمنٹوں کے کمانڈر اپنے گھوڑوں پر سوار ہونے، سینوں پر صلیب کے نشانات بنانے اور جن لوگوں نے سامان گاڑیوں کے ساتھ رہنا تھا، انہیں آخری ہدایات و احکام دینے اور ذمہ داریاں تفویض کرنے لگتے اور یوں ہزاروں تدموں کی ایک رنگ تھاپ گونجنے لگتی۔ مختلف کالم آگے بڑھنے لگے، لیکن انہیں معلوم نہیں تھا کہ وہ کدھر جا رہے ہیں۔ چونکہ ان کے گرد و پیش انسانوں کا ٹھکانہ نہیں مانتا تھا، دھواں تھا اور دھند تھی جو ہر آن بڑھتی جا رہی تھی، اس لیے انہیں نہ وہ مقامات، جدھر وہ جا رہے تھے اور نہ وہ جہاں سے وہ روانہ ہوئے تھے نظر آ رہے تھے۔

جس طرح جہاز کے طیارے کا دائرہ عمل محدود ہوتا ہے، بعینہ وہی کیفیت اس سپاہی کی، جو پیش قدمی میں حرکت کرتا ہے، ہوتی ہے۔ اس کی رجمنٹ اسے چاروں اطراف سے گھیر لیتی ہے، اس کے ادھر ادھر ہٹنے یا باہر

نکلنے کی راہیں مسدود کر دیتی ہے اور اسے اپنے ساتھ بہائے لیے جاتی ہے، وہ خواہ کتنا ہی دور نکل جائے، کتنے ہی ان جانے، خطرناک، مستحکم علاقے میں گھس جائے وہ اسی طرح۔ جس طرح ملاح ہمیشہ ایک سے عرشوں، مستولوں، جیوں اور درسیوں میں محصور رہتا ہے۔ انھیں رفیقوں، جوانوں، سر جٹ، سمجھایوان میترج، کہنی کے کتے ڈچکا اور افسروں میں، جس سے اس کا دور اندہ واسطہ پڑتا ہے، گمراہ رہتا ہے۔ جیسے جہاز کے ملاح کو تھکا اس امر کی پروا نہیں ہوتی کہ سمندر کے جس حصے میں وہ سفر کر رہا ہے، اس کا عرض بلد یا طول بلد کیا ہے، کوچ کے دوران میں عام فوجی سپاہی کا رویہ بھی کچھ اسی قسم کا ہوتا ہے۔ تاہم ان تمام باتوں کے باوجود روز جنگ فوج کی اخلاقی فضا میں ایک نوع کی درشت آواز۔ خد جانے یہ کہاں سے اور کیسے آتی ہے۔ گونجنے لگتی ہے۔ یہ سب کو سنائی دیتی ہے اور اس امر کا اعلان کر رہی ہوتی ہے کہ کوئی گھبر اور نصہ کن واقعہ پیش آنے والا ہے۔ یہ ان تمام فوجیوں کے اندر غیر معمولی تجسس ابھار دیتی ہے۔ جنگ کے روز جوانوں کے سینے جوش و خروش سے معمور ہو جاتے ہیں، وہ رجسٹ کے مفادات سے دورا ہونے کی سعی کرتے ہیں اور ان کے گرد پیش جو کچھ ظہور پذیر ہو رہا ہوتا ہے، وہ اسے توجہ سے سنتے، غور سے دیکھتے اور اس کے بارے میں ذوق و شوق سے سوالات پوچھتے ہیں۔

دھند کی چادر اتنی دبیز ہو گئی تھی کہ اس امر کے باوجود کہ روشنی پھیلتی جا رہی تھی، انھیں دس قدم سے آگے کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ جھڑباں تناور درخت اور ہموار زمین چٹانوں اور ڈھلوانوں سے بھرپور دکھائی دے رہی تھی۔ کہیں بھی اور کسی سمت سے بھی ان کا اچانک غنیم سے، جو عین ممکن تھا کہ محض دس قدم آگے کہیں روپوش ہو، تصادم ہو سکتا تھا۔ لیکن کالم کافی دیر تک آگے بڑھتے رہے۔ ہر جگہ وہی دھند تھی۔ کہیں اترائی تھی، کہیں چڑھائی تھی، بائیں تھیں، باغات تھے، وہ کبھی ان کے اندر گزرتے اور کبھی ان کے اوپر چکر لگاتے۔ سارا علاقہ نیا اور انجانا تھا اور غنیم کا دور دور تک پتا نہیں تھا۔ اس کے برعکس جوانوں کے قلوب میں یہ احساس جاگزیں ہو رہا تھا کہ ان کے آگے پیچھے، دائیں بائیں، غرضیکہ ہر طرف روسی کالم یک ہی سمت میں کوچ کر رہے ہیں۔ یہ معلوم ہونے پر کہ جس انجانے علاقے کی طرف وہ گامزن ہے، بے شمار دیگر جوان بھی اسی طرف جا رہے ہیں، ہر شخص کا حوصلہ بڑھ جاتا۔

”دھردیکھو کر سکی³⁸ بھی ادھر ہی گئے ہیں،“ عام سپاہی آپس میں کہہ رہے تھے۔

”دوستو کتنی زبردست بات ہے۔ دیکھو، ہم نے کتنی بڑی فوج اکٹھی کر لی ہے۔ گزشتہ رات میں کپ

کے ارڈر دیکھ رہا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ سارا ہاسکوا سنڈ آیا ہے۔ ان کا سلسلہ ختم ہونے کا نام ہی نہیں لیتا تھا!“

اگرچہ کوئی بھی کالم کا کمانڈر نہ تو عام سپاہیوں تک پہنچا اور نہ کسی نے ان سے بات کی (جیسا کہ جنگی کونسل کے اجلاس میں دیکھنے میں آیا تھا کہ وہ دیر بحث معاملے کے بارے میں اسنے افسردہ اور غیر مطمئن تھے کہ انھوں نے محض احکام کی تعمیل کرنے پر اکتفا کیا، انھوں نے جوانوں کا حوصلہ بڑھانے کے لیے ذرا بھی تردد نہ کیا)، تاہم جیسا کہ جوانوں کا وتیرہ ہوتا ہے کہ وہ جب بھی معرکے میں شریک ہونے، یا خصوصاً غنیم پر یورش کرنے کے سلسلے میں، پیش قدمی کرتے ہیں، بڑی خوش طبعی اور بٹاشت کا مظاہرہ کرتے ہیں، وہ اب بھی ایک دوسرے سے چمکیں کر رہے

اور اپنی فطری زندہ دلی کا اظہار کر رہے تھے۔ لیکن دبیز جند میں لگ بھگ ایک گھنٹہ رنج کرنے کے بعد فوج کا بیشتر حصہ رکنے پر مجبور ہو گیا اور عام جوانوں میں بھی یہ ناخوشگوار احساس پھیلنے لگا کہ صفوں میں انفرادی اور بد نظمی رہ پارہی ہے۔ اس قسم کا احساس کیسے سرایت کرتا ہے، اس کی تشریح کرنا مشکل ہے لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ غیر معمولی رفتار اور صحت کے ساتھ نفوذ کرتا ہے اور یہ بالکل اسی غیر محسوس اور اٹل انداز سے، جس انداز سے پانی کو ہستانی واوی میں رستا ہے، سرایت کرتا ہے۔ اگر ردی فوج تنہا ہوتی اور اس کے ساتھ اس کا کوئی اتحادی نہ ہوتا، عین ممکن ہے کہ بد نظمی، در انفرادی کے اس احساس کے یقین کامل میں ڈھلنے میں کافی وقت صرف ہوتا، لیکن موجودہ حالت میں جرموں کو اس بد نظمی کا ذمے دار ٹھہرانا بطور خاص خوشگوار اور فطری معصوم ہوتا تھا۔ در ہر شخص کو یہ یقین تھا کہ یہ خطرناک ابتری سبب خور³⁹ جرموں کی پیدا کردہ ہے۔

”ہم رک کیوں گئے ہیں؟ راستہ بند ہے؟ فرانسیسیوں سے ہمارا تصادم شروع ہو گیا ہے؟“
 ”نہیں، سنائی تو کچھ نہیں دیتا۔ اگر کچھ سنائی دیتا، پھر یہ ثابت ہو جاتا کہ فرانسیسیوں نے ڈرنگ شروع کر دی ہے۔“

”انھیں ہمیں پیش قدمی کرانے کی جلدی تھی، چنانچہ ہم چل پڑے۔ اور اب ہم بیچ میدان میں بے سبب اور بے جواز کھڑے ہیں۔ ان معون جرموں نے ہر چیز گڑبڑادی ہے انرے کا ٹھکے والو ہیں!“
 ”میں بتاؤں کہ میں کیا کرتا۔ میں انھیں آگے محاذ پر بھیج دیتا، لیکن یقیناً انہوں نے اذنا ہمارے عقب میں ہاتھ پیر سمیٹے پڑے ہوں گے۔ اور ایک ہم ہیں کہ کچھ کھانا نہ پیا، یہاں بیچ میدان میں پھنسے کھڑے ہیں!“
 ”میں پوچھتا ہوں کہ ہم آگے بڑھ سکیں گے یا نہیں ہیں؟ سنا ہے کہ گھڑ سو راستہ روکے کھڑے ہیں، ایک افسر نے کہا۔“

”لعلت ہواں جرموں پر! انھیں اپنے ہی دیس کا کچھ پتا نہیں!“ ایک اور نے کہا۔
 ”تمہارا ڈویژن کون سا ہے؟“ ایک، بیجوٹنٹ نے، جو گھوڑے پر آ رہا تھا چلا کر پوچھا۔
 ”اٹھارہویں۔“

”پھر تم یہاں کیا کر رہے ہو؟ تمہیں تو بہت عرصہ پہلے ہی ذر پر موجود ہونا چاہیے تھا۔ ب تم غروب آفتاب تک بھی وہاں پہنچ نہیں پاؤ گے۔ کیا احمقانہ احکام ہیں! انھیں خود معلوم نہیں کہ یہ کیا کر رہے ہیں،“ افسر نے کہا اور گھوڑے پر آگے چلتا ہوا۔

اس کے بعد ایک جرنیل گھوڑا دوڑاتا آیا۔ وہ ردی نہیں بلکہ کسی غیر ملکی زبان میں چلا چلا کر کچھ کہہ رہا تھا۔
 ”تاں پھڑاں، تاں پھڑاں ایہ کیا کیا بک بک کر رہا ہے؟ بول ہے کہ جو، یک غلط بھی پلے پڑا ہو،“ ایک جوان نے جرنیل کی، جو آگے نکل گیا تھا، نقل اتار تے ہوئے کہا۔ ”جی چاہتا ہے کہ ان سب کی گردنیں اڑا دیا۔“
 ”لشکے کہیں گے!“

”ہمیں وہاں دس بجے سے پہلے پہنچنے کا حکم ملا تھا اور ابھی ہم نے آدھا راستہ بھی طے نہیں کیا۔ کیسے زبردست احکام ہیں!“ چاروں اطراف اسی قسم کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔

اور جوش و خروش کے جس جذبے کے ساتھ سپاہ نے کوچ کیا تھا، اس کی جگہ بے تحاشہ انتظامات اور جرموں کے خلاف غم و غصے نے لے لی تھی۔

بد نظمی کا سبب یہ امر بنا کہ جب آسٹروی گھڑ سوار دستے بائیں طرف بڑھ رہے تھے، ہائی کمان کو معلوم ہو کہ ہمارا قلعہ ہمارے سینے سے خاصا دور ہٹ گیا ہے اور تمام سپہ سواروں کو حکم دے دیا گیا کہ وہ دائیں طرف چلیں۔ چونکہ ہزاروں گھڑ سوار پیادہ فوج کے سامنے سے گزر رہے تھے، پیادہ فوج کو لازماً مار کنا پڑا۔

فوجی دستوں کے آگے، ایک آسٹروی گائیڈ اور ایک روسی جرنیل کے ماتین، جھگڑا اٹھ کھڑا ہوا۔ روسی جرنیل چلا چلا کر مطالبہ کر رہا تھا کہ رسالے کو روکا جائے۔ آسٹروی افسر کا استدلال یہ تھا کہ قصور دار وہ نہیں، ہائی کمان ہے۔ دریں اثنا فوجی پتھر کے بت بنے کھڑے تھے۔ ان کے حوصلے ٹوٹتے جا رہے تھے اور لڑائی میں ان کی دلچسپی مدھم پڑتی جا رہی تھی۔ ایک گھنٹے کی تاخیر کے بعد وہ آخر کار آگے بڑھنے اور پہاڑی سے نیچے ترے لگے۔ بلند یوں پر دھند چھٹن شروع ہو گئی تھی لیکن واوی میں، جہاں جواں تر رہے تھے، اس کی دبیز چادر دھیس کی دھیس کی ہوئی تھی۔ شروع میں گویاں بے قاعدہ دھنوں سے چلی تھیں۔ تراخ تراخ۔ پھر باقاعدگی سے ڈرنگ ہونے لگی اور اس میں تیزی بھی آگئی۔ یوں گولڈ بارخ ندی کے قریب معرکے کا آغاز ہو گیا۔

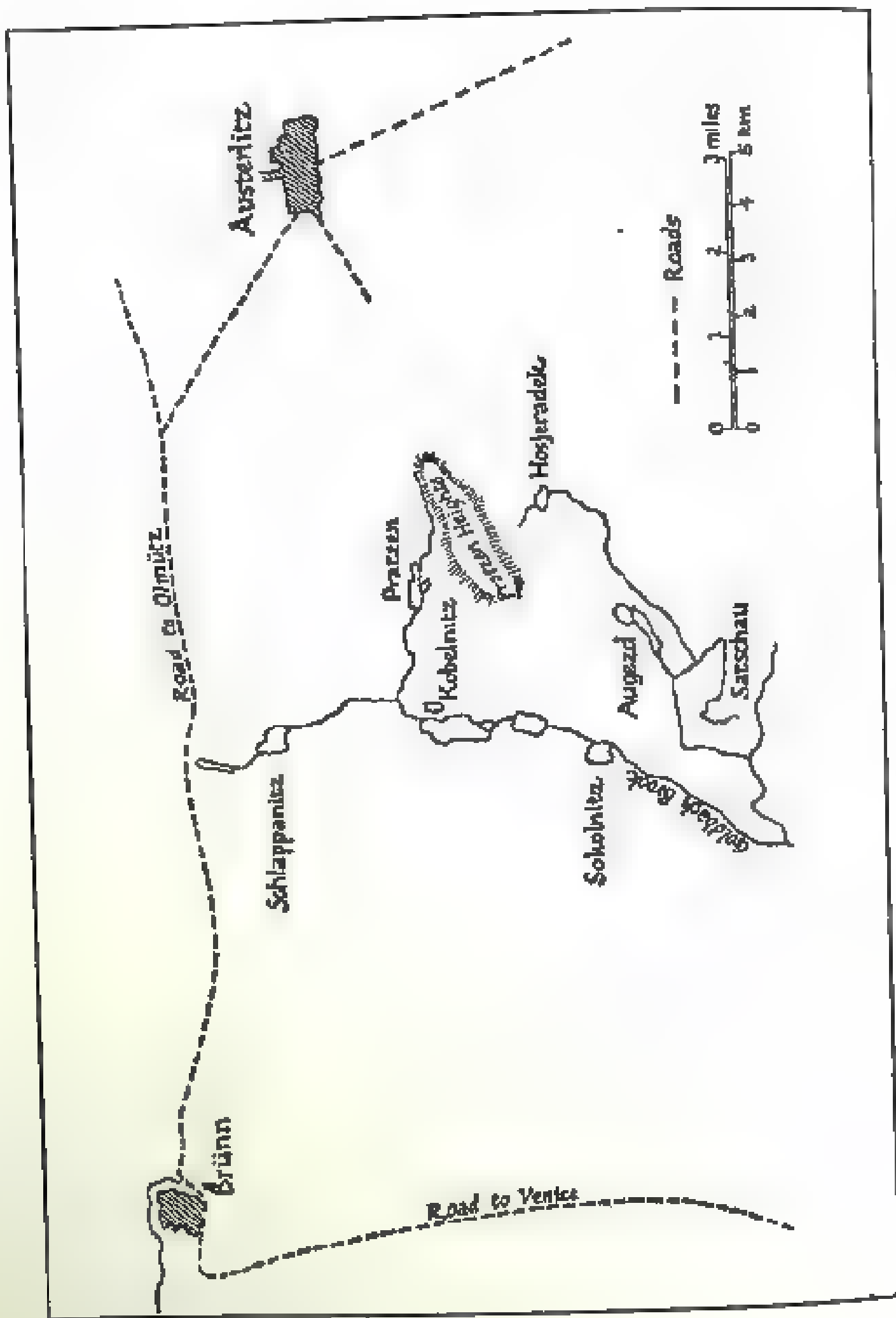
روسیوں کو یہ توقع نہیں تھی کہ غنیم سے ان کا تصادم ندی کے قریب ہو جائے گا لیکن اب اچانک وہ دھند میں اس سے ٹکرائے۔ انھیں اپنے کمانڈنگ افسروں کی طرف سے حوصلہ افزائی کا ایک لفظ تک سنائی نہ دیا۔ عام سپاہیوں میں یہ حساس سرایت کر چکا تھا کہ انھیں ہی جنگ پر پہنچنے میں تاخیر ہو گئی ہے اور سب سے بڑی بات یہ ہوئی کہ انھیں دھند میں نہ سامنے کچھ نظر آتا تھا اور نہ دائیں بائیں۔ ان تمام باتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ فائرنگ تو ضرور کرنے لگے لیکن اس میں نہ تیزی تھی اور نہ جوش و خروش۔ وہ آگے بڑھتے اور پھر رک جاتے۔ انھیں افسروں اور ایجنٹوں کی جانب سے وقت پر ایک بھی حکم نہ ملا۔ خود افسر اور ایجنٹ جنہی اور ناماوس علاقے میں ادھر ادھر بھاگے پھر رہے تھے اور انھیں اپنے اپنے یونٹ تلاش کرنے میں دقت پیش آرہی تھی۔ پہلے، دوسرے اور تیسرے کالم کے لیے، جو پہاڑی سے نیچے اترے تھے، معرکہ آرائی کا آغاز کچھ ان خطوط پر ہوا۔ چوتھا کالم، جس کے ساتھ کولونڈ تھا، پراٹ من پہاڑی پر کھڑا تھا۔

نیچے، جہاں معرکہ آرائی کی ابتدا ہو چکی تھی، ابھی تک دبیز دھند چھائی ہوئی تھی۔ بلندی پر مطلع کھرنے لگا تھا لیکن سامنے کیا ہو رہا تھا، کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ کیا غنیم کی تمام سپاہ، جیسا کہ ہم نے مفروضہ تراش لیا تھا، چھ میل دور تھی یا وہ دھند کی اس چادر کے کہیں آس پاس تھی، اس بارے میں کسی کو نو بجے تک کوئی علم نہ ہو سکا۔

نو بجی بج گئے۔ نیچے دھند، عریکراس کی طرح پھیلی ہوئی تھی لیکن شلا پائس کے گاؤں میں، جو ہندی پر واقع

تھا اور جہاں پولین اپنے مارشلوں میں گھبراہٹ کھڑا تھا، اچھی خاصی روشنی ہو چکی تھی۔ پولین کے دو پر صاف نیلگوں آسمان تھا اور آفتاب کا وسیع و عریض کرہ دھند کے دو دھیا سمندر کی سطح پر کسی عظیم الجثہ، کھوکھلے قمر مزی "تیراک پیہ" کی مانند کچپا رہا تھا۔ تمام فرانسیسی سپاہ، بلکہ خود پولین اور اس کے عملے کے ارکان تک، سوکول ٹس اور خلا پائس کے ندی نالوں اور گھٹنوں کے، جہاں ہم اپنی پوزیشنیں سنبھالنا اور غنیم کے ساتھ دو دو ہاتھ کرنا چاہتے تھے، پار نہیں تھے بلکہ وہ انھیں عبور کر کے ادھر آچکے تھے اور ہماری فوج کے اتنے قریب تھے کہ پولین دور بین کے بغیر غلطی آنکھ سے ہمارے پیادے اور سوار کے مابین تیز کر سکتا تھا۔ پولین اس نیلے کورٹ میں، جو وہ اطالیہ میں اپنی تمام مہموں کے دوران میں پہنا کرتا تھا، ملبوس تھا۔ وہ اپنے کوتاہ قامت سرمئی عربی گھوڑے پر سوار تھا اور اپنے ہارشلوں سے ڈرا آگے کھڑا تھا۔ وہ چپ چاپ ان پہاڑیوں کو، جو کہر کے سمندر سے برآمد ہو رہی تھیں اور جن کے اوپر دور فاصلے پر روسی افواج حرکت پذیر تھیں، دیکھ رہا اور فائرنگ کی، جو نیچے وادی میں جاری تھی، آوازیں سن رہا تھا۔ اس کے چہرے۔ جوان دنوں ابھی تک دبلا پتلا تھا۔ کا ایک پٹھا بھی بل نہیں رہا تھا۔ اس کی جگمگاتی آنکھیں نہایت، شہاک کے ساتھ ایک ہی مقام پر مرکوز تھیں۔ اس کے انداز سے صحیح ثابت ہو رہے تھے۔ روسی فوج کا ایک حصہ پہلے ہی وادی میں اتر چکا تھا اور جو ہڑوں اور پھیلوں کی جانب گامزن تھا۔ اور دوسرا حصہ پراٹ سن پہاڑی کو، جسے وہ اپنی پوزیشن کے لیے کلیدی مقام تصور کرتا تھا اور جس پر وہ حملہ کرنے کا ارادہ کیا، ہوئے تھا، خالی کر رہا تھا۔ اسے دھند میں سے پرائسن گاؤں کے قریب دو پہاڑیوں کے، مین گہری وادی میں سنگینیں چمکتی نظر آئیں۔ روسی دستے گاتار ایک ہی سمت میں وادیوں کی جانب بڑھ رہے اور یکے بعد دیگرے دھند میں غائب ہو رہے تھے۔ گزشتہ شام اسے جو اطلاعات موصول ہوئی تھیں، رات کے دوران میں بیرونی چوکیوں کے قریب رجوار میں اسے پہیوں اور تدموں کی جوا وازیں سنائی دی تھیں، روسی دستے جس بترتیب سے حرکت کر رہے تھے اور اس نے خود جو قیاس آرائیوں کی تھیں، اس سب شہادتوں سے اسے واضح طور پر یہ احساس ہوا کہ اتحاد کی سمجھتے ہیں کہ وہ ان سے آگے کہیں بہت دور ہے۔ اسے یہ اندازہ بھی ہوا کہ پراٹ سن کے اڑوں پڑوں میں جو دستے حرکت کر رہے ہیں، ان پر روسی فوج کا قلب مشتمل ہے اور یہ قلب اتنا کمزور ہو چکا ہے کہ اس پر کامیاب حملہ کیا جا سکتا ہے۔ پھر بھی اس نے ہنوز معرکہ آرائی کا آغاز نہ کیا۔

وہ یوم اس کے لیے یوم نصرت تھا۔ اس روز اس کی تاج پوشی کی سالگرہ تھی۔ وہ تڑکے چند گھنٹے سویا تھا لیکن جب جاگا، وہ اپنے آپ کو تروتازہ اور توانا محسوس کر رہا تھا۔ اس کے حوصلے بلند اور امیدیں جوان تھیں۔ وہ اپنے گھوڑے پر سوار ہوا اور میدان جنگ کی طرف روانہ ہو گیا۔ اس کی ذہنی کیفیت کچھ اس طور آسودہ و مختلف تھی جب آدمی کو ہر چیز ممکن معلوم ہوتی ہے اور وہ جس کام میں بھی ہاتھ ڈالتا ہے، اس میں کامیابی سے ہم کنار ہوتا ہے۔ بالکل بے حس و حرکت بیٹھا تھا۔ اس کی نظریں ان چوٹیوں پر، جو دھند سے ادا پر نظر آ رہی تھیں، لگی ہوئی تھیں۔ اس کے سر چہرے پر اعتماد اور خود اطمینانی سے بھرپور وہ مسرت، جو آپ کو کسی گرفتار محبت اور شاداں و مسرور نو خیز لڑکے کے چہرے بشرے پر نظر آتی ہے، جھلک رہی تھی۔ اس کے مارشل اس کے پیچھے رہے۔ ان میں اتنی جرأت نہ تھی کہ



وہ اس کے خیالات میں غل ہو سکتے۔ وہ کبھی پراٹ سن کی پہاڑیوں اور کبھی سورج کی طرف، جو دھند کے اوپر تیر رہا تھا، دیکھنے لگتا۔

جب سورج دھند سے پوری طرح نکل آیا اور کھیت اور دھندوں اس کی خیر و کن روشنی میں نہا گئے، اس نے گویا معرکے کی ابتدا کرنے کے لیے وہ اسی کا منتظر تھا۔ اپنے سڈول اور خوش وضع ہاتھ سے دستار اٹارا، اس سے مارشلوں کو اشارہ کیا اور جنگ شروع کرنے کا حکم دے دیا۔ مارشل ایجوٹوں کی معیت میں مختلف سمتوں میں گھوڑے سریت دوڑانے لگے اور چند منٹ بعد فرانسیسی فوج کا بڑا حصہ، پراٹ سن کی اس پہاڑی کی جانب، جسے روپی دتے، جو کہ بائیں ہاتھ و دی میں اتر رہے تھے، بتدریج خالی کر رہے تھے، برداں وداں ہو گیا۔

15

آٹھ بجے صبح کو نوزوف میلورادو وچ کے چوتھے کالم کی قیادت کرتا ہوا گھوڑے پر سو پرائسن کی طرف روانہ ہوا۔ اس کالم نے پرزے بڑی سکی اور لائن غون کے کالموں کی، جو پہلے ہی پہاڑی سے نیچے اتر چکے تھے، جگہ لینا تھی۔ اس نے سب سے، گلی رجمنٹ کے جو نوں سے علیک سبک کی اور انہیں آگے بڑھے کا حکم دیا۔ اپنے اس عمل سے اس نے یہ ظاہر کر دیا کہ وہ اس کالم کی قیادت خود کرے گا۔ جب وہ پرائسن گاؤں میں داخل ہوا، وہ رک گیا۔ پرنس آندرے، جو کمانڈر انچیف کے شاف کے ل تعداددار کان میں شامل تھا، اس کے بالکل پیچھے تھا۔ پرنس آندرے کی کیفیت کچھ اس شخص کی تھی جسے مدتوں سے کسی لمحے کا انتظار ہو اور جب وہ لمحہ آ پہنچتا ہے، ایک طرف اس کے دل میں کھلبلی مچنے لگتی ہے اور وہ اعصابی چڑچڑے پن کی گرفت میں آنے لگتا ہے اور دوسری طرف وہ آپے سے باہر نہیں ہوتا بلکہ دھیرا اور پرسکون رہتا ہے۔ اسے یہ پختہ یقین تھا کہ آج کے صحر کے میں وہ وہی کارنامہ، جو پولین نے تو لوں میں یا آرکول کے پل پر سر انجام دیا تھا، دکھائے گا۔ یہ کیسے ہوگا؟ اس بارے میں وہ کچھ نہیں جانتا تھا لیکن اس بارے میں اس کے قلب و دماغ میں قطعاً کوئی شبہ نہیں تھا کہ ایسا ہوگا اور لازماً ہوگا۔ ہماری افواج کہاں کہاں اور کس کس طرح تعینات تھیں، اس کے متعلق ہماری فوج میں اگر کسی کو علم ہو سکتا تھا، تو اسے بھی تھا۔ اس کا اپنا عسکری اور جنگی منصوبہ، جس پر عمل درآمد کے بارے میں اب سوچنا بھی سچی حاصل تھا، فراموش کر دیا گیا تھا۔ اس نے دے رد فر کے منصوبے کو اپنا لیا تھا اور اب وہ یہ سوچ رہا تھا کہ کہاں کہاں ناگہانی صورت حال کے پیدا ہونے کا امکان ہو سکتا ہے۔ اس کے علاوہ وہ اپنے ذہن میں وہ نئی تدابیر بھی، جن کے متعلق اسے سرعت سوچنا اور فیصلہ کرنا ہوگا، تشکیل دے رہا تھا۔

بائیں طرف، نیچے دھند میں دو ناریدہ قوتوں کے مابین گولیوں کے جادلے کی آوازیں سنی جاسکتی تھیں۔ پرنس آندرے کو محسوس ہوا کہ لڑائی زیادہ ترویں مرکوز رہے گی، وہیں مشکلات درپیش ہوں گی ”اور دین“ اس نے سوچا، ”مجھے ایک بریگیڈ یا ڈویژن دے کر بھیجا جائے گا اور میں، ہاتھوں میں عظم، ٹھائے، آگے بڑھوں گا اور جو بھی میرے سامنے آیا، اسے گاجر مولی کی طرح کاٹ کر رکھ دوں گا۔“

جو ہالینس گزر رہی تھیں، ان کے علم دیکھ کر پرنس آندرے متاثر ہوئے ہٹانہ رہ سکا۔ انھیں دیکھ کر دو گنا ہار بھی سوچتا رہا۔ ”عین ممکن ہے کہ یہی علم تھا مگر میں فوج کی قیادت کروں۔“

دن چڑھتے چڑھتے پہاڑی سے دھند کلیتا غائب ہو گئی۔ اس کی باقیات میں صرف سفید پانی رہ گیا تھا اور وہ بھی اب شبنم میں تبدیل ہو رہا تھا۔ لیکن وادیوں میں کہرا ابھی تک دودھیا سمندر کی مانند موجود تھی۔ وادی میں بائیں طرف، جہاں ہمارے فوجی دستے اترے تھے اور جہاں سے گولیوں کے چھنے کی آوازیں آرہی تھیں، کچھ بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ پہاڑی کے اوپر نکھر نکھر ایلا آسمان پھیل ہوا تھا اور دائیں طرف آفتاب کا کرہ عظیم۔ سامنے دور بہت دور اس کہرا کی سمندر کے آخری کنارے کے پار درختوں سے گھرے ہوئے ٹیلے دکھائی دے رہے تھے۔ مفراتے کے مطابق غنیم کو وہیں کہیں ہونا چاہیے تھا اور وہاں اب کوئی چیز دکھائی دے رہی تھی۔ دائیں طرف گاڑا زوہند کے علاقے میں داخل ہو رہے تھے۔ ان کے گھوڑوں کی ٹاپیں اور پیہوں کی کھڑکھڑاہٹ صاف سنائی دے رہی تھی اور کبھی کبھار ان کی ٹگینوں کی چمک بھی نظر آ جاتی۔ بائیں طرف گاؤں کے پار اسپ سواروں کے اسی قسم کے ہجوم آگے بڑھتے اور دھند کے سمندر میں روپوش ہوتے دیکھے جاسکتے تھے۔ سامنے اور عقب میں یہ وہ فوج رواں دواں تھی۔ کمانڈر انچیف گاؤں کے سرے پر کھڑا تھا اور فوجی دستوں کو اپنے قریب سے گزرتے دیکھ رہا تھا۔ اس صبح کو تو زونف تھکا تھکا اور چڑچڑا نظر آ رہا تھا۔ جو پیادہ فوج اس کے پاس سے گزر رہی تھی، وہ کسی حکم کے بغیر رک گئی۔ معلوم ہوتا تھا کہ اس کے سامنے کوئی رکاوٹ آگئی ہے۔

”ہونہہ، انھیں حکم دو کہ ہالین کالم بنائیں اور گاؤں کا چکر کاٹ کر آگے نکل جائیں!“ اس نے خفگی سے ایک جرنیل سے، جو گھوڑے پر سوار اس کے پاس پہنچا تھا، کہا۔ ”یوڑا یکسی بیسی، مائی ڈیر سر، آپ کی سمجھ میں یہ بات کیوں نہیں آتی کہ اب جب کہ ہم دشمن کے خلاف ٹبردارا ہونے جا رہے ہیں، گاؤں کی ٹیرھی میڑھی اور جنگ گلیوں میں صفیں بنا کر گزرنانا ممکن ہے!“

”یوڑا یکسی بیسی، میرا ارادہ تھا کہ گاؤں کی دوسری جانب اور سرنوصف بندی کی جائے۔“ کو تو زونف جھنجھکی سے مسکرایا۔ ”کیا کہتے ہیں آپ کے اجنب غنیم کی عین ناک تلے صف بندی کریں گے! بہت اعلیٰ!“

”یوڑا یکسی بیسی، غنیم ابھی بہت دور ہے۔ فوجوں کی تقسیم و ترتیب کے منصوبے کے مطابق۔“ ”تقسیم و ترتیب!“ کو تو زونف کا لہجہ تلخ ہو گیا۔ ”اور تمہیں اس کے متعلق کس نے بتایا تھا؟ تمہیں جو حکم رہا“ رہا ہے، وہی کرو۔ نوازش ہوگی۔“

”جی، جناب عالی۔“

”mon cher“، میں تمہیں نے پرنس آندرے سے کھسک پھسک کرتے ہوئے کہا۔ ”آج بابے کا مزاج بہت

برہم ہو رہا ہے۔“

ایک آسٹروی افسر جس نے سفید وردی زیب تن کی ہوئی تھی اور اپنی ٹوپی میں بزر پھدنے پر درکھے تھے، سرپٹ گھوڑا دوڑاتے کو تو زوف کے پاس پہنچا اور امپراطور کا حوالہ دے کر دریافت کیا کہ چوتھ کالم لڑائی میں شریک ہو گیا ہے یا نہیں؟

کو تو زوف نے جواب دیے بغیر ہی منہ دوسری طرف پھیر دیا۔ اتفاق سے اس کی نظر پرنس آندرے پر، جو اس کے قریب کھڑا تھا، پڑ گئی۔ اس کے چہرے سے جو عناد و بغض جھلک رہا تھا، بلکونسکی کو دیکھ کر اس کی شدت میں کچھ کمی آگئی، گویا وہ اس امر کا اعتراف کر رہا تھا کہ جو کچھ وقوع پذیر ہو رہا ہے، اس کے بے اس کے ایجوٹ کو کسی صورت میں بھی مورد الزام نہیں ٹھہرایا جاسکتا۔ اس نے آسٹروی ایجوٹ کو بھی تک کوئی جواب نہیں دیا تھا، اس سے پہلے ہی وہ بلکونسکی کی طرف متوجہ ہوا اور فرانسیسی میں اسے کہا

”mon cher“، ذرا جانا اور دیکھنا کہ تیسر کالم گاؤں سے نکل گیا ہے یا نہیں۔ انھیں کہو کہ وہ جہاں ہیں، وہیں رک جائیں اور میرے احکام کا انتظار کریں۔“

پرنس آندرے ابھی روانہ ہی ہوا تھا کہ کمانڈر انچیف نے اسے واپس بلا لیا۔

”اور ان سے پوچھو کہ ماہر نشا نچی تعینات کر دیے گئے ہیں یا نہیں؟“ اس نے مزید حکم دیا۔ ”وہ کیا کر رہے ہیں، کیا کر رہے ہیں!“ وہ آپ ہی آپ بڑبڑایا۔ آسٹروی افسر کو اس نے ابھی تک کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ پرنس آندرے حکم کی تعمیل کرنے کے لیے گھوڑے پر ہوا ہو گیا۔

جو چالیس آگے جا رہی تھیں، انھیں پیچھے چھوڑتے ہوئے اس نے تیسرے ڈویژن کو روک لیا اور اس بات کی بھی تصدیق کر لی کہ ہمارے کاسوں کے آگے فی الواقع کوئی ماہر نشا نچی نہیں تھے۔ رجمنٹ کے سربراہ کرنل کو جب ماہر نشا نچیوں کی تعیناتی کے بارے میں کمانڈر انچیف کے احکام موصول ہوئے، اس کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ اس وقت تک اسے پختہ یقین تھا کہ اس کے آگے دیگر دستے ہیں اور غنیم اس سے چھ میل سے کم دور نہیں ہو سکتا۔ یہ بات یہ ہے کہ اسے ایک خبر ڈھلوان کے علاوہ (اور وہ بھی دبیز دھند میں مستور تھی) کچھ بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس فرد گزشت کی صلاحی کرنے کے متعلق کمانڈر انچیف کا حکم پہنچانے کے بعد پرنس آندرے اپنا گھوڑا سرپٹ روڑا بنا دیا پس آ گیا۔

کو تو زوف ابھی تک وہیں کھڑا تھا۔ ذہنی عمر نے اس کے یکم شمیم اور فریبہ جسم کو کسل مند بنا دیا تھا اور وہ زمین پر ڈھلکا ہوا تھا۔ اس کی واحد آنکھ بند تھی اور وہ جھکے ماندے انداز سے جانیوں لے رہا تھا۔ دستوں نے ابھی تک کوئی حرکت نہیں کی تھی بلکہ وہ ہتھیار زمین پر رکھے احکام کا انتظار کر رہے تھے۔

”ٹھیک ہے، ٹھیک ہے!“ اس نے پرنس آندرے سے کہا اور ایک جرنیل کی طرف، جو ہاتھ میں گھڑی پکڑے کھدہ ہاتھ کا تھا کہ چونکہ بائیں بازو کے تمام دستے اس سے پہلے ہی نیچے اتر چکے ہیں، انھیں بھی روانہ ہو جانا

چاہیے، متوجہ ہو گیا۔

”یوزر ایکسی لینس، ابھی بہت دقت ہے،“ کوٹوزوف جمائی لیتے ہوئے بڑبڑایا۔ ”بہت دقت ہے،“ اس نے دوبارہ کہا۔

اس دقت کوٹوزوف کے عقب میں خاصے فاصلے سے رجمنوں کے سیٹ کرنے کی آوازیں فضا میں گونجیں اور بہ سرعت ان کے قریب سے قریب تر بند ہونے لگیں کیونکہ ان کا سلسلہ ان روسی کالموں کے، جو پیش قدمی کر رہے تھے، ایک سرے سے دوسرے سرے تک پھیل چکا تھا۔ صاف نظر آ رہا تھا کہ جس شخص یا اشخاص کا اس انداز سے استقبال ہو رہا تھا، وہ برق رفتاری سے گھوڑے بھگائے آ رہے ہیں۔ جب اس رجمنٹ کے جوان، جن کے سامنے کوٹوزوف کھڑا تھا، گلے پھڑپھڑ کر نعرے لگانے لگے، وہ گھوڑے پر سوار چند قدم ایک طرف گیا اور تیوریاں چڑھ کر پیچھے دیکھنے لگا۔ پرائسن روڈ پر رنگا رنگ وردیوں میں ملبوس گھڑسواروں کا بظاہر پورا سکوڈرن سرپٹ گھوڑے بھگائے آ رہا تھا۔ ان میں سے دو باقیوں سے آگے تھے اور وہ ایک دوسرے کے برابر امداد دھند گھوڑے دوڑا رہے تھے۔ ان میں سے ایک کے جسم پر سیاہ وردی تھی اور اس کی ٹوپی میں سفید کلغی لہری تھی۔ وہ جس گھوڑی پر سوار تھا اس کا رنگ سرخی مائل بھورا اور دم قدرے چھوٹی تھی۔ دوسرے گھڑسوار کی وردی سفید اور گھوڑا مشکلی تھا۔ یہ دونوں امپراطور تھے اور ان کے پیچھے پیچھے ان کے حوالی موال آ رہے تھے۔ کوٹوزوف ایک کایاں تھا۔ اس نے محاذ جنگ کے تجربہ کار سپاہی کے پر تضرع انداز سے ”ایمنش“ کا حکم دیا اور سیٹ کرنا امپراطوروں کی طرف بڑھا۔ پلک جھپکنے میں اس کی وضع قطع اور طور طریقے میں تغیر نکلی آ گیا۔ اس کا انداز اس ماتحت کا تھا جو چوں چرا کیے بغیر حکم کی تعمیل کرتا ہے۔ وہ ہنمود احترام کے ساتھ، جسے امپراطور الیکساندر نے دائمی طور پر پسند نہیں کیا، آگے آیا اور اس نے سیٹ کیا۔

امپراطور کے نوجوان اور سرور و مطمئن چہرے پر نکذر کے جو آثار نمودار ہوئے تھے، وہ روشن و شفاف آسمان پر دھند کے گالوں کی طرح آئے اور اپنی جھلک دکھا کر غائب ہو گئے۔ جب وہ اولی موس کے میدان میں، جہاں بلکونسکی نے اسے پہلی مرتبہ بدیش میں دیکھا تھا، سلامی پینے آیا تھا، تب بھی اس کا جسم بدل پتلا ہی دکھائی دیا تھا لیکن اب ناسازی طبع کے بعد وہ نہتہ اور بھی لاغر نظر آ رہا تھا۔ تاہم اس کی خوبصورت سرنگی آنکھوں میں شان و شکوہ اور ملائمت کا وہی سکھور کن امتزاج تھا۔ اس کے نرم و نازک اور مہین ب اب بھی اپنے اوپر مختلف اقسام کے مطالب جاری کرنے پر قادر تھے اور اس کے چہرے سے اب بھی اسی معصومیت اور نیک دلی کا، ظہار ہو رہا تھا۔

اولی موس کی سلامی کے دوران میں اس کے انداز میں شاہانہ ممکنیت اور وقار زیادہ جھلک رہا تھا لیکن یہاں اس کے کانگ انگ سے توانائی اور مسرت پھوٹ رہی تھی۔ دو میل سرپٹ گھوڑی دوڑانے کے بعد اس کا چہرہ قدرے متمسک ہوا تھا۔ اس نے اپنی گھوڑی کو نگام دی، اطمینان کا سانس لیا اور گردن گھما کر پیچھے اپنے عملے کے ارکان پر، جو اسی کی طرح نوجوان اور جوشیلے تھے، نظر ڈالی۔ تسار تو رسکی، نوو اسلت سیف، پرنس ولکونسکی، ستر ونگاٹوف اور دوسرے

بھی مختلف مزاج نوجوان تھے اور زرق برق ملبوسات پہنے ہوئے تھے۔ جن گھوڑوں پر وہ سوار تھے، وہ خوش شکل، خوب سدھے ہوئے اور تازہ دم تھے۔ لیکن سرپٹ بھاگنے سے ان کے ابدان اندرے گرم ہو گئے تھے۔ وہ آئے اور زار کے پیچھے رک گئے۔ ان کے چہروں پر تبسم تھا اور وہ آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ امپراطور فرانس بھی نوجوان تھا۔ اس کا چہرہ کتابی اور رگ سرخ و سفید تھا۔ وہ اپنے خوبصورت نا آختہ مشکلی سب پر سیدھا تن کر بیٹھا ہوا تھا اور اپنی سوچوں میں مستغرق بے فکری سے ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔ اس نے اپنے ایک ایجنٹ کو، جس کے تن پر سفید وردی تھی، بلایا اور اس سے کچھ پوچھا۔ ”وہ غالباً یہ پوچھ رہا ہے کہ وہ کب روانہ ہوئے تھے؟“ پرنس آندرے نے اپنے پرانے شناسا کو دیکھ کر سوچا۔ برن کے مقام پر اس کی اس سے جملہ قات ہوئی تھی، اسے یاد آگئی، اور اس کے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے اس مسکراہٹ کو دبانے کی کوشش بھی کی لیکن کامیابی نہ ہوئی۔ امپراطوروں کا ذاتی شاف ریس اور آشریا کی لڑاکا جھگڑوں اور گارڈز کے پییدہ نو عمر اردی افسروں پر مشتمل تھا۔ ان میں شاہی اصطبل کے گھوڑوں کی دیکھ بھال کرنے والے سائیکس بھی شامل تھے اور وہ زار کے قاتلوں گھوڑے، جو بہت خوبصورت تھے اور جن کی زینوں پر نقش و نگار بنے ہوئے تھے، تھے۔

جس طرح دریچہ کھلنے پر کمرے میں، جہاں دم گھٹا محسوس ہوتا ہے، تازہ ہوا کا جھونکا داخل ہو جاتا ہے، بعینہ ان ذہین و فطین نوجوانوں کی آمد پر کوٹوزوف کے اندر وہ پڑ مردہ شاف کو شباب، تو نائی اور اعتماد کا سرانی کی لپٹیں آتی محسوس ہوئیں۔

”میخائیل ازاری او ناوچ، تم شروع کیوں نہیں کرتے؟“ زار نے کھڑے گھاٹ کوٹوزوف سے پوچھا۔ اس کے ساتھ اس نے شائستگی سے امپراطور فرانس کی جانب دیکھا۔

”یوزمبجشی، میں انتظار کر رہا ہوں،“ کوٹوزوف نے احتراماً آگے کی طرف جھکتے ہوئے کہا۔

ندرے ناک بھوں چڑھاتے زار نے اپنا کان یوں آگے بڑھایا جیسے اسے سنائی نہ دیا ہو۔

”یوزمبجشی، میں انتظار کر رہا ہوں،“ کوٹوزوف نے دوبارہ کہا۔ (پرنس آندرے نے دیکھا کہ جب

کوٹوزوف نے لفظ ”انتظار“ دہرایا، اس کا باپائی ہونٹ غیر قطری انداز سے پھڑپھڑائے لگا تھا۔) ”ابھی تک تمام کالم اکٹھے نہیں کیے جاسکے۔“

زار نے اس کی بات سن تو لی لیکن صاف معلوم ہوتا تھا کہ وہ اس جواب پر ناخوش ہے۔ اس نے اپنے ندرے مدور شانے اچکا دیے اور نو واسل سیف کی جانب، جو اس کے قریب کھڑا تھا، یوں دیکھ جیسے وہ اس سے کوٹوزوف کی شکایت کر رہا ہو۔

”میخائیل ازاری او ناوچ، ہم اس وقت زار تسین سیڈو میں تو نہیں کہ جب تک تمام رجنٹیں اکٹھی نہ ہو جائیں، پریڈ شروع نہیں کی جاسکتی،“ زار نے ایک بار پھر امپراطور فرانس کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ (اس نے جس انداز سے امپراطور فرانس کو دیکھا تھا، اس سے یہ سترخ ہوتا تھا کہ وہ اس سے یہ درخواست کر رہا ہے کہ ”بھئی دی،

اگر تم گنگو میں شریک ہونا نہیں چاہتے، پھر جو میں کہہ رہا ہوں، کم از کم وہ تو سنو۔“
لیکن امپراطور فرانس ادھر ادھر دیکھتا رہا اور اس نے مطلق کوئی توجہ نہ دی۔

”جلی جاہ، بالکل یہی وجہ ہے کہ میں شروع نہیں کر رہا“ کوٹوزوف نے گونج دار آواز میں کہا۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ اس امر کو ناممکن بنانا چاہتا تھا کہ اس کی بات کسی کے کانوں تک پہنچی ہی نہیں۔ اور ایک بار پھر اس کا ہامائی ہوش پھڑپھڑانے لگا۔ ”ہم یہاں نہ پریڈ کرنے آئے ورنہ ہم زار تسین میڈوم میں ہیں،“ اس نے واضح اور سچے سچے نواز سے کہا۔

جب اس نے یہ الفاظ کہے، زار کے شان میں جتنے لوگ شامل تھے، ان سب نے آپس میں ٹکا ہوں کا، جن سے ملاست اور ناپسندیدگی کا، ظہار ہوا تھا، تارالہ کیا۔ ”یہ شخص عمر کے اعتبار سے خواہ کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو اسے اس قسم کا طرزِ خطاب یقیناً اختیار نہیں کرنا چاہیے،“ یہ نگاہیں کہتی محسوس ہو رہی تھیں۔

امپراطور نے استغلاں اور، نہماک کے ساتھ کوٹوزوف کی آنکھوں میں جھانک کر دیکھا۔ وہ منتظر تھا کہ کوٹوزوف مزید کچھ کہے گا لیکن معلوم ہوتا تھا کہ کوٹوزوف بھی احترام سے سر جھکائے انتظار کر رہا ہے۔ یہ خاموشی تقریباً ایک منٹ جاری رہی۔

تاہم، اگر یہ ہریمینشی کا فرمان ہے...“ کوٹوزوف نے اپنا سر ادا پر اٹھاتے ہوئے کہا۔ وہ یوں بن رہا تھا جیسے وہ کوئی کندہ بن جرنیل ہو، استدعاں کرنے کے فن سے نا آشنا ہو اور صرف حکم بجالانا جانتا ہو۔

اس نے اپنے گھوڑے پر ہاتھ پھیرا، کام کمانڈر میلورادو وچ کو بلایا اور اسے آگے بڑھنے کا حکم دیا۔ سپاہ متحرک ہو گئی۔ نوڈگورد کی دوینا لینیس اور آپ شیردن کی ایک رجمنٹ پرا طور کے برابر سے گزری اور آگے نکل گئیں۔

جب آپ شیردن رجمنٹ کوچ کر رہی تھی، میلورادو وچ نے، جس کا چہرہ ٹائڈ کی طرح سرخ تھا اور جس نے اوور کوٹ تو نہیں پہنا تھا لیکن جس نے اپنی وردی پر اپنے تمام تنھے دراعزازات سجا رکھے تھے اور جس کی زچھا ٹوپی پر پردوں کا بہت بڑا گچھا ٹکا ہوا تھا، اپنے گھوڑے کو سرپٹ دوڑایا، چستی سے سیلوٹ کیا گھوڑے کو کام دلی اور اسے زار کے سامنے روک لیا۔

”جرنیل، خد وند تمہارا حامی و ناصر ہو،“ زار نے کہا۔

”Ma foi, sire“، جو کچھ ہمارے بس میں ہوا، ہم یقیناً کریں گے،“ میلورادو وچ نے خوش مزاجی سے فرانسسی میں کہا۔ اس کا رائیسی لہجہ واضحی ساتھ تھا۔ اس پر زار کے عینے کے ارکان طنزیہ انداز سے مسکراتے گئے۔
میلورادو وچ نے تیزی سے اپنا گھوڑا، سوڈا اور زار سے کچھ دور اس کے عقب میں جا کھڑا ہوا۔ امپراطور کی موجودگی نے آپ شیردن کے جوانوں میں تازہ دلولہ پیدا کر دیا۔ وہ قدم سے قدم ملاتے امپراطوروں اور ان کے

شاف افسروں کے برابر خاصے جوش و خروش اور تیز رفتاری سے گزرنے لگے۔

”جوانو،“ مبلورادو ووج نے اپنے بلند آہنگ، پر اعتماد اور ولولہ انگیز سہجے سے پچھلے پھروں کا پورا زور مگنا کر کہا۔ فائرنگ کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں، لڑائی صحیح معنوں میں شروع ہو چاہی تھی، پھر اس کے سامنے آپ شیرون رجسٹ کے شجیع دویر جوان تھے جو کسی زمانے میں سواروف کے زیرِ کمان اس کے ساتھ لڑ چکے تھے اور اب پھر تیلے انداز سے دونوں امپراطوروں کے برابر سے گزر رہے تھے۔ صاف معلوم ہوتا تھا کہ ان سب باتوں نے دل جل کر اسے کچھ اس قسم کی بھائی کیفیت میں مبتلا کر دیا ہے کہ وہ زار کی موجودگی بھی بھول گیا اور چہا کر کہنے لگا: ”یہ پہلا گاؤں نہیں ہے جس پر ہمیں قبضہ کرنا ہے۔“

”ہم سر دھڑکی باری نگاریں گے،“ جوانوں نے چہا کر جواب دیا۔

اس اچانک نعرے بازی سے زار کی گھوڑی بدک گئی۔ یہ گھوڑی جس پر سوار ہو کر زاروں میں مختلف دستوں سے مدد لیا کرنا تھا، اب اسے اسٹریٹس کے میدان جنگ میں لے آئی تھی۔ اس نے جس طرح امپرس فیلڈ میں اس کے ہائیک پاؤں کے زپروایا نہ ٹھوکوں کو صبر و تحمل سے برداشت کیا تھا اور فائرنگ کی آوازیں سن کر اپنی کنوئیاں کھڑی کر لی تھیں، اب بھی وہ اسی طرح اس کے ٹھوکوں کو صبر و تحمل سے برداشت کر رہی تھی اور اس نے فائرنگ کی آوازیں سن کر اپنے کان کھڑے کر لیے تھے۔ لیکن یہ فائرنگ کیوں ہو رہی ہے؟ امپراطور فرانس کا نا آختہ گھوڑا کیوں اس کے اتنا قریب کھڑا ہے؟ اسے ان باتوں کی مطلق سمجھ نہیں آرہی تھی۔ اسے یہ بھی قطعاً معلوم نہیں تھا کہ اس روز اس کا سوار کیا کہہ رہا، سوچ رہا، محسوس کر رہا ہے۔

زار سکراتا ہوا اپنے عمے کے ایک رکن کی طرف متوجہ ہوا اور اس نے آپ شیرون رجسٹ کے جری جوانوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس سے کچھ کہا۔

16

کونڈرف اپنے بیجوٹوں کی معیت میں دھیرے دھیرے رائفل بردار سواروں کے پیچھے پیچھے جا رہا تھا۔ کالم کے عقب میں کوئی نصف میل چلنے کے بعد وہ ایک الگ تھلگ عمارت کے۔ جو کسی زمانے میں دیہی ہوٹل اور سے خانے کے طور پر استعمال ہوتی ہوگی۔ قریب ٹھہر گیا۔ یہاں سے دوسری دو مختلف سمتوں سے نیچے وادی میں اترتی تھیں اور اس وقت دونوں رواں رواں دستوں سے اثاثات بھری پڑی تھیں۔

دھند چھٹ شروع ہو گئی تھی۔ کوئی ڈیڑھ میل پرے مخاف پہاڑی پر دشمن کے دھندلے دھندلے نقوش دکھائی دے رہے تھے۔ ہائیک طرف نیچے وادی میں فائرنگ کی آوازیں زیادہ واضح سنائی دینے لگی تھیں۔ کونڈرف رک گیا تھا اور ایک آسٹروی جرنیل کے ساتھ محو گفتگو تھا۔ پرنس آندرے، جو چند قدم دور ان کے پیچھے کھڑا تھا اور انھیں بنور دیکھ رہا تھا، ایک ایجوٹ کی طرف متوجہ ہوا اور اس سے دسی دور بین مانگنے لگا۔

”دیکھیں، دیکھیں!“ ایجوٹسٹ نے کہا۔ حیرت سے اس کی آنکھیں پھٹی جا رہی تھیں۔ دور فاصلے پر جو فوجی رستے تھے، وہ ان کی طرف نہیں بلکہ پہاڑی سے نیچے کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔ ”باپ رے باپ، یہ تو فرانسیسی ہیں۔“ دونوں جرنیل، اور ایجوٹسٹ دستی دور بین کی طرف لپکے اور ایک دوسرے سے پھینکا جھپٹی کرنے لگے۔ ایک ایک ان کے چہروں کی رنگت تبدیل ہو گئی اور ان پر خوف و دہشت کی پرچھائیں منڈلانے لگیں۔ فرانسیسیوں کے متعلق یہ فرض کر لیا گیا تھا کہ وہ کوئی ڈیڑھ میل دور ہوں گے لیکن پلک جھپکنے میں وہ ہمارے سروں پر آ موجود ہوئے تھے۔ ”یہ غنیم ہے؟... نہیں!۔ ہاں، دیکھیں، وہی ہے... یقیناً وہی ہے۔ اس کا کیا مطلب ہوا؟“ مختلف آوازیں سنائی دیں۔

اپنے دائیں طرف، اس مقام سے جہاں کو تو زوف کھڑا تھا، پانچ سو قدم سے بھی کم فاصلے پر، پرنس آندرے نے اپنی نگلی آنکھ سے فرانسیسی فوجیوں کا گھنا اور پرہجوم کالم دیکھا۔ وہ آپ شیردن رجمنٹ سے مقابلہ کرنے آگے آ رہا تھا۔

”وہی ہیں۔ فیملہ کن گھڑی آ پٹنی ہے۔ یہ میرے کچھ کرنے کا موقع ہے!“ پرنس آندرے نے سوچا۔ اس نے اپنے گھوڑے کو ہمیز لگایا اور کو تو زوف کے قریب پہنچا۔

”یو ایکسی لینسی، آپ شیردن رجمنٹ کو روک لینا چاہیے!“ اس نے گل پھاڑتے ہوئے کہا۔

لیکن عین اسی لمحے دھوکے کے بادل نے ہر چیز کو اپنی پلیٹ میں لے لیا۔ فائرنگ کی آوازیں بالکل قریب سے سنائی دیں لگیں اور ایک آواز نے، جو پرنس آندرے سے دو قدم سے زیادہ دور نہیں تھی، منصوبہ نہ لیکن خوف زدہ انداز سے چدا کر کہا۔ ”دوستو، اپنا کام تمام ہو گیا!“ یہ آواز سن کر، جیسا کہ حکم کی آواز سننے پر ہوتا ہے، ہر شخص نے دوڑ لگا دی۔

افرا تفری اور انتشار کے عالم میں لوگوں کے ہجوم ادھر، جہاں پانچ سنٹ پشتر فوجی رستے امپراطوروں کو سلامی دیتے گزر رہے تھے، بھاگنے لگے اور اس بھگدڑ میں لختہ بہ لختہ اضافہ ہونے لگا۔ نہ صرف اس بھگدڑ کا مشکل ہو گیا تھا بلکہ بھگدڑ میں اس کا ساتھ نہ دینا بھی ناممکن ہو گیا تھا۔ بلکونسکی کی صرف یہ کوشش تھی کہ وہ کو تو زوف سے پچھڑنے نہ پائے۔ وہ حیران پریشان ادھر ادھر دیکھ رہا تھا اور اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ ہو کیا رہا ہے۔ غصے سے نہیں ونسکی کا چہرہ لال بھبھوکا ہو رہا تھا اور معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنے آپے میں نہیں رہا۔ وہ چل چلا کر کو تو زوف سے کہہ رہا تھا کہ وہ بھٹ پٹ وہاں سے فرار ہو جائے ورنہ، سے قیدی بنالیا جائے گا۔ کو تو زوف نے جیب سے رومال نکالا اور جواب دیے بغیر جہر کھڑا تھا وہیں کھڑا رہا۔ اس کے رخسار سے خون بہہ رہا تھا۔ پرنس آندرے دھکم دھکا کرتا اس کے قریب پہنچا۔

”آپ زخمی ہو گئے ہیں؟“ اس نے پوچھا۔ اس کا جیڑ، کپکپا رہا تھا اور وہ اسے قابو میں رکھنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔

”رغم یہاں نہیں ہے“ اس نے رومال سے اپنا رخسار سہلے ہوئے کہا۔ ”بلکہ وہاں ہے“ اس نے بھگتے فوجیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”انھیں روکنا“ اس نے چلا کر کہا اور اس کے ساتھ اسے غالباً یہ احساس ہو گیا کہ انھیں روکنا ناممکن ہے۔ چنانچہ اس نے اپنے گھوڑے کو چابک دکھا با اور دائیں طرف چل پڑا۔ بھگڑوں کا تازہ رویا آیا اور اسے اپنے ساتھ بہا تا پیچھے لے گیا۔

فوجی اتنا زبردست جم غفیر بنائے بھاگ رہے تھے کہ جو شخص ایک بار اس کی لپیٹ میں آ گیا، اس کے لیے اس سے باہر نکلنا ناممکن ہو گیا۔ کوئی شخص گلہ پھاڑ پھڑ کر چھارہ تھا: ”چلو، چلو، انتظار کس بات کا؟“ ایک اور شخص اسی جگہ مڑا اور اس نے فضا میں گولی چلا دی۔ تیسرے نے بالکل اسی گھوڑے کو، جس پر کو تو زوف سوار تھا، ضرب لگا دی۔ ان لوگوں کے اس سلبے بے پناہ سے کو تو زوف بڑی مشکل سے اپنے آپ کو علیحدہ کرنے میں کامیاب ہوا۔ وہ بائیں طرف مڑا اور اپنے عملے کے رکات کے ساتھ، جن کی تعداد نصف سے بھی کم رہ گئی تھی، نزدیک ہی اس سمت بڑھا جدھر سے توپوں کے گولے اگلنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ پرنس آندرے نے، جو کو تو زوف کے قریب رہنے کی کوشش کر رہا تھا، دھکم پیل کرتے ہجوم میں سے راستہ بنایا۔ اسے دھوئیں میں سے پہاڑی پر ایک روسی توپ خانہ نظر آیا۔ اس نے دیکھا کہ توپیں ابھی تک گولہ باری کر رہی ہیں اور فرانسیسی ان کی طرف بھاگے آرہے ہیں۔ اس سے بھی ذرا اونچی پر کچھ روسی پیادہ سپاہ کھڑی تھی۔ یہ سپاہ نہ تو توپچیوں کی مدد کرنے کے لیے آگے جا رہی تھی اور نہ بھگڑوں کے ساتھ پیچھے ہٹ رہی تھی۔ ایک جرنیل، جو گھوڑے پر سوار تھا۔ اس پیادہ بریگیڈ سے الگ ہوا اور کو تو زوف کی طرف چل پڑا۔ کو تو زوف کے ذاتی عملے کے صرف چار ارکان اس کے ساتھ رہ گئے تھے۔ ان سب کے رنگ فاقے تھے اور وہ آپس میں خاموش نگاہوں کا تبادلہ کر رہے تھے۔

”ان مدبختوں کو روکنا“ کو تو زوف نے بھگڑے فوجیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ہانپتے کانپتے جرنیل سے کہا۔

لیکن عین اس موقع پر، اس نے جو الفاظ استعمال کیے تھے، گویا کہ ان کے انتقام کے طور پر، پرندوں کے غول کی طرح گویوں کی بوچھاڑ آئی اور جمنٹ اور کو تو زوف کے عملے کے سروں کے اوپر سنسناتی گزر گئی۔ فرانسیسی توپ خانے پر حملہ کر رہے تھے۔ انھوں نے کو تو زوف کو دیکھ لیا تھا، اور اب وہ اس پر بھی فائرنگ کر رہے تھے۔ گویوں کی اس بوچھاڑ کے بعد جمنٹل کمانڈر نے اپنی ہانگ تھام دی۔ متعدد فوجی نیچے گر چکے تھے اور ایک میکنڈیفینٹ نے، جو اپنے ہاتھوں میں علم اٹھائے ہوئے تھا، اسے نیچے گر جانے دیا۔ علم لہرایا، نیچے گرا اور جو جوان قریب کھڑے تھے، ان کی بندوقوں میں پھنس گیا۔ فوجیوں نے حکم کے بغیر فائرنگ شروع کر دی۔

”او۔ او۔ او!“ کو تو زوف کی آنکھل گئی اور وہ مایوسی کے عالم میں ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ ”بلکوسکی“ اس نے سرگوشی کی۔ اسے معلوم تھا کہ وہ بوڑھا ہو چکا ہے اور بالکل بے بس ہے۔ اس کے اس علم نے اس کی آواز میں کیکپاہٹ پیدا کر دی تھی۔ ”بلکوسکی“ اس نے شکست خوردہ بٹالین اور دشمن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے سرگوشی

کی: ”یہ کیا ہے؟“

اس کی بات ابھی مکمل نہ ہونے پائی تھی کہ پرنس آندرے نے، جس کا غصہ اور خجالت سے گلہ مندہ گیا تھا، گھوڑے سے چھٹنگ لگا دی، درودہ غلغلی کی طرف بھاگنے لگا۔

”جو، نو، آگے بڑھو،“ وہ بچوں کی ٹیکھی آواز سے چلایا۔

”وہ لحد آگیا ہے!“ اس نے غلغلی کا ہنس تھامتے اور ان گولیوں سے، جن کا بظاہر وہ نشانہ تھا، لطف اندوز ہوتے ہوئے سوچا۔

متعدد جوان ڈھیر ہو گئے۔

”ہڑا“ پرنس آندرے نے با آواز بلند نعرہ لگایا اور پھد مشکل بھاری علم اٹھائے آگے بھاگ پڑا۔ یہ یقین تھا کہ ساری بٹالین اس کی پیروی کرے گی۔

اور وہ واقعی محض چند ہی قدم آگے دوڑا ہوگا کہ پہلے ایک جوان، پھر دوسرا اور اس کے بعد پوری کی پوری بٹالین ”ہڑا“ کے نعرے بلند کرتے آگے دوڑ پڑی اور اس کے ساتھ جا ملی۔ بٹالین کے ایک سار جنٹ نے رقبہ لگائی اور علم، جو وزن کی وجہ سے پرنس آندرے کے ہاتھوں میں ڈوس رہا تھا، تھام لیا۔ لیکن وہ تڑت ہلاک ہو گیا۔ پرنس آندرے نے دوبارہ علم پکڑ لیا اور اسے ہنس سے گھسیٹتے بٹالین کے ساتھ درڑنے لگا۔ اسے اپنے سامنے، اپنے چند توپچی نظر آئے۔ ان میں سے کچھ ابھی تک دست بدست لڑ رہے تھے اور باقی گننا لیس چھوڑ چھاڑ اس کی طرف بھاگے آ رہے تھے۔ اس نے فرانسیسی پیادوں کو توپ خانے کے گھوڑوں کی لگا میں پکڑتے اور گننا لوں کا رخ سونے دیکھا۔ اب پرنس آندرے اور بٹالین اور گننا لوں کے درمیان صرف بیس قدم کا فاصلہ رہ گیا تھا۔ اسے اپنے سر کے اوپر گولیوں کی غیر مختتم سنسناہٹ سنائی دے رہی تھی۔ اس کے دائیں بائیں فوجی مسلسل ڈھے رہے اور کرا رہے تھے۔ لیکن اس نے ان کی طرف مڑ کر بھی نہ دیکھا۔ اس کا دھیان صرف سامنے لگا ہوا تھا اور وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ وہاں۔ توپ خانے کے گرد و پیش۔ کیا ہو رہا ہے۔۔۔ اب ایک توپچی کی۔ جس کے سر کے بال سرخ تھے اور جس کی ٹوپی گولی لگنے سے ایک طرف ڈھلک گئی تھی۔ شکل واضح طور پر نظر آنے لگی تھی۔ وہ توپ صاف کرنے والا سلاخ کا ایک سرا پکڑے اسے اپنی جانب کھینچ رہا تھا جب کہ فرانسیسی اس کے دوسرے سرے پر زور لگا رہا تھا۔ اسے ان دونوں جوانوں کے مضطرب لیکن خشم ناک چہرے بخوبی دکھائی دے رہے تھے۔ صاف نظر آ رہا تھا کہ ان دونوں کو خود بھی علم نہیں تھا کہ وہ کیا کر رہے ہیں۔

”یہ کیا کرنا چاہتے ہیں؟“ پرنس آندرے نے ان دونوں کو دیکھتے ہوئے سوچا۔ ”یہ سرخ بالوں والا توپچی

بھاگ کیوں نہیں جاتا کیونکہ یہ غیر مسلح ہے؟ فرانسیسی اس کے جسم میں سنگین کیوں نہیں بھونک دیتا؟“ وہ زیادہ دور بھاگ بھی نہیں سکے گا کیونکہ اس کے زیادہ دور جانے سے پہلے فرانسیسی کو اپنی سنگین یاد آ جائے گی اور وہ اسے اس کے جسم میں اتار دے گا۔“

ایک در فرانسیسی، جو اپنی بدوق بھر چکا تھا حقیقتاً ہاتھ پائی کرتے جوڑے کی جانب لپکا۔ سرخ، لوس والا توپچی سداخ چھین چکا تھا لیکن وہ اس امر سے قطعی بے خبر تھا کہ اس کے ساتھ کیا پیش آنے والا ہے۔ لیکن پرنس آندرے اس کا انجیم نہ دیکھ سکا۔ اسے اچانک یوں محسوس ہوا جیسے کسی نوجی نے، جو اس کے کہیں آس پاس کھڑا تھا، اس کے سر پر بھاری لاٹھی دے ماری ہو۔ اسے چوٹ کا احساس تو ہو، لیکن اس سے بھی بدتر بات یہ ہوئی کہ درد نے اس کی توجہ بناوی درودہ جس چیز پر نظر رہا، اسے دیکھنے سے قاصر رہا۔

”یہ کیا ہے؟ کیا میں گر رہا ہوں؟ میری ٹانگیں جواب دے رہی ہیں؟“ اس نے سوچا اور پشت کے بل نیچے گر پڑا۔

”اس نے اپنی آنکھیں کھول دیں۔ اسے امید تھی کہ وہ یہ دیکھ سکے گا کہ توپچی اور فرانسیسی کے مابین کشمکش کا انجام کیا ہوا۔ وہ یہ جانتا چاہتا تھا کہ سرخ بالوں والا توپچی ہلک ہو گیا ہے یا بچ گیا ہے، توپچی غنیم کے قبضے میں چلی گئی ہیں یا بچالی گئی ہیں۔ لیکن اسے کچھ نظر نہ آیا۔ اب اس کے سر کے اوپر آسمان۔ بلند و بالا آسمان۔ کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ یہ آسمان صاف نہیں تھا، سرخی بادل دے پاؤں، آہستہ آہستہ، اسے اپنی لپیٹ میں لے رہے تھے۔ ”یہاں کتنا سکوت، کتنا سکون، کتنی اہبت ہے! اس سے، جب میں دوڑ رہا تھا، کس قدر مختلف!“ پرنس آندرے نے سوچا۔ ”اس سے قطعی مختلف جب ہم دوڑ رہے، چار رہے اور لڑ رہے تھے! اس توپچی اور فرانسیسی سے بھی مختلف، جن کے چہرے مضطرب اور خشم ناک تھے اور جو سداخ ہتھیار کے لیے آپس میں الجھ رہے تھے۔ یہ بادل بھی جو اس بلند بام، لامتناہی آسمان پر تیر رہے ہیں، کتنے مختلف نظر آ رہے ہیں! میں نے اس آسمان کو پہلے کبھی کیوں نہیں دیکھا؟ میں کتن خوش ہوں کہ میں نے آخر اسے دریافت کر لی ہے! اس لامتناہی فلک کے سوا باقی سب کچھ بے جا غرور، تکبر اور فریب ہے، اس کے علاوہ سب کچھ بیچ ہے، بے حقیقت ہے! لیکن یہ بھی کہاں ہے؟ اس کا بھی کوئی وجود نہیں۔ کچھ بھی نہیں۔ صرف سکوت ہے، سکون ہے۔ خداوند کا شکر ہے۔“

17

ہزاریمند، جس کی کمان جنرل ہاگ راتیاں کے ہاتھ میں تھی، نو بجے تک جنگ میں شریک نہیں ہوا تھا۔ وہ دلوور کوف کے اس مطالبے کی، کہ کارروائی شروع کر دی جائے، تکمیل بھی نہیں کرنا چاہتا تھا اور دے داری سے پہلے ہی اختیار کرنے کا بھی آرزو مند تھا۔ چنانچہ اس نے دلوور کوف کو تجویز پیش کی کہ کسی شخص کو بھیج کر کمانڈر انچیف سے دریافت کر لیا جائے۔ ہاگ راتیاں جانتا تھا کہ چونکہ میسنے اور میسرے کے مابین سات میل کا فاصلہ حائل ہے، اس لیے اگر پیغام رساں ہلاک نہ بھی ہوا (اور اس کے، رہے جانے کا پورا امکان تھا) اور وہ کمانڈر انچیف کو محفوظ نکالے میں کامیاب ہو بھی گیا (اور یہ امر خاصا دشوار تھا) پھر بھی وہ شام سے پہلے واپس نہیں آسکے گا۔

ہاگ راتیاں نے اپنی خرابی اور خوابیدہ آنکھیں، جو بر قسم کے تاثر سے عاری تھیں، اپنے عملے کی جانب

منعطف کر دیں اور سب سے پہلے اس کی نظر رستوف کے، جس کا دل جوش و خروش سے بلیوں اچھل رہا تھا، نظر آنے لگا۔ اس نے اسے بھیج دیا۔

”یوٹرکیسی لینسی، اگر کمانڈر انچیف سے پہلے مجھے ہزیمبسنی اسپر اہور مل گئے، پھر؟“ رستوف نے پناہ اپنی ٹوپی کی طرف اٹھاتے ہوئے کہا۔

”تو تم یہ پیغام ہزیمبسنی کو دے دینا،“ دنگوروف نے عجلت سے دخل اندازی کرتے ہوئے کہا۔

گشتی ڈیوٹی سے چھٹی مل جانے کے بعد رستوف کو صبح طلوع ہونے سے قبل چند گھنٹے سونے کا موقع مل گیا تھا۔ اب وہ ہشاش بشاش تھا، اس کے عزائم جون تھے درڈر اسے چھو کر بھی نہیں گیا تھا۔ اس کی حرکات و سکنات میں لوج اور پھر تیلپن تھا اور اسے اپنے مقدر پر کامل اعتماد تھا۔ اس کی ذہنی کیفیت کچھ اس قسم کی تھی جب ہر کام ممکن، خوشگوار اور آسان معلوم ہوتا ہے۔

اس روز اس کی تمام امیدیں برآ رہی تھیں۔ اس دن گھسان کارن پڑنا تھا اور اس نے اس میں شرکت کرنا تھی۔ اتنا ہی نہیں بلکہ وہ دلیر ترین جرنیل کا اردنی انسر تھا۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہوئی کہ اسے کوئی رول اور با شاید خود زار تک بھی پیغام پہنچانے کے لیے روانہ کیا جا رہا تھا۔ یہ پچھلی صبح تھی، اس کے نیچے بہت عمدہ گھوڑا تھا اور اس کا دل سرت و انبساط سے معمور تھا۔ احکام وصول کرنے کے بعد اس نے گھوڑے کی باگ ڈھیلی چھوڑی اور سے سر ہٹ بھگانے لگا۔ ابتدا میں وہ گھوڑا باگ راتیاں کے دستوں کے، جو ابھی تک لڑائی میں شریک نہیں ہوئے تھے اور ساکت و صامت کھڑے تھے، بچوں بیچ دوڑاتا رہا۔ پھر وہ اس محلے میں، جس پر یواروف کا رسالہ قابض تھا، داخل ہو گیا۔ یہاں اسے کچھ چہل پہل اور لڑائی کی تیاری کے آثار دکھائی دیے۔ جب وہ یواروف کے رسالے کی حد سے آگے نکل گیا، اسے ہندوتوں اور توپوں کے چلنے کی آوازیں واضح طور پر سنائی دینے لگیں۔ فائرنگ کا شور بھل بلند سے بلند تر ہوتا جا رہا تھا۔

نیم سحر میں اسے جو آوازیں سنائی دینا شروع ہو گئی تھیں، وہ پہلے کی طرح بے قاعدہ وقفوں سے، گادکا ہندوتی یا کبھی کبھار ایک آدھ توپ کے چلنے کی آواز نہیں تھی، بلکہ اب پراٹ سن پہاڑیوں کی دھوانوں سے ہندوتوں کی مسلسل فائرنگ کی گونج بلند ہو رہی تھی اور بیچ بیچ میں توپیں اسنے تواتر اور زور شور سے دہانے لگتی تھیں کہ ان میں اتنا ہار کرنا ممکن ہو جاتا تھا کیونکہ ان کی آواز عمومی شور و غل میں نہ غم ہو جاتی تھی۔

سے پہاڑی کے پہلو پر ہندوتوں کے دھوئیں کے مرغولے ایک دوسرے کا تعاقب کرتے نظر آ رہے تھے جب کہ توپوں کے دھوؤں کے بادل فضا میں تیر رہے تھے اور آپس میں گھل مل رہے تھے۔ سنگینوں کی چمک دک سے، جو دھوؤں میں نظر آ رہی تھی، وہ پیادہ فوج کے متحرک ہجوموں اور گولے بارود کے سبز ڈالوں سمیت توپ خانے کی چھدری صفوں کے مابین امتیاز کر سکتا تھا۔

یہ دیکھنے کے لیے کہ وہاں کیا ہو رہا ہے، رستوف نے ایک ٹائیپ کے لیے اپنا گھوڑا ایک نیچے پردک بیا۔

لیکن پوری توجہ اور انتہاک سے دیکھنے کے باوجود وہ یہ سمجھنے میں اور معلوم کرنے میں قطعاً ناکام رہا کہ وہاں کیا ظہور پذیر ہو رہا ہے۔ کسی قسم کے آدمی دھوئیں میں ادھر ادھر بھاگے پھر رہے تھے، سپاہیوں کی صفیں کبھی آگے ہو جاتیں اور کبھی پیچھے۔ یہ معلوم کرنا کہ وہ کون تھے، کہاں جا رہے تھے اور کیوں جا رہے تھے، ناممکن تھا۔ ان منظر اور آوازوں نے اس کے دس میں قطعاً کسی قسم کا کوئی دوسرہ یا مایوسی پیدا نہ کی بلکہ اس کی توانائی اور عزم مصمم کو مزید جلا دے دی۔

”چلو، چلو، آگے بڑھو، انھیں سبق سکھا دو“ اسے جو آوازیں سنائی دے رہی تھیں، ان کے بارے میں یہ اس کا ذہنی رد عمل تھا۔ وہ ایک بار پھر اپنا گھوڑا سر پٹ بھگانے لگا اور جس علاقے میں پہلے ہی فوج برسرِ پیکار تھی، وہ اس کے اندر ہی اندر دور تک چلا گیا۔

”یہاں کے حالات کیسے ہوں گے، مجھے کچھ معلوم نہیں۔ میرا خیال ہے کہ ٹھیک ہی ہوں گے“ رستوف نے سوچا۔

چند آشروری دستوں کے درمیان میں سے گزرتے رستوف نے دیکھا کہ صفوں کا گلا حصہ جو کہ گارڈز پر مشتمل تھا، پہلے ہی جنگی کارروائی شروع کر چکا ہے۔

”یہ تو در بھی اچھا ہوا! میں اسے قریب سے دیکھ سکوں گا“ اس نے سوچا۔ وہ اگلی صفوں کے تقریباً برابر برابر جا رہا تھا۔ چند اسپ سوار سر پٹ گھوڑے دوڑاتے اس کی جانب آئے۔ یہ ہماری اولان رجمنٹ کے جوان تھے اور میدان جنگ سے ترتر بھاگے آرہے تھے۔ رستوف جب ان کے قریب پہنچا، اسے سوا ایک گھڑ سوار نظر آیا۔ وہ خون میں تر تھا لیکن اپنا گھوڑا سر پٹ بھگائے جا رہا تھا۔

”یہ میرا مسئلہ نہیں ہے“ رستوف نے سوچا۔ اس کے بعد وہ بھی چند سو قدم ہی دور گیا ہوگا کہ اسے اپنے بائیں طرف ایک وسیع دعریض میدان پورے کا پورا اسپ سواروں کے جم غفیر سے اٹا نظر آیا۔ وہ سیاہ گھوڑوں پر سوار تھے اور ان کی سفید شفاف وردیاں آنکھیں خیرہ کر رہی تھیں۔ وہ دکل چال چلتے اور اس کا راستہ کاٹتے سیدھے اسی کی طرف آرہے تھے۔ رستوف ان لوگوں کے راستے سے ہٹنے کے لیے پنا گھوڑا انتہائی تیز رفتاری سے دوڑانے لگا۔ اگر وہ اپنی رفتار پر چلتے رہتے، وہ صاف بچ کر نکل جاتا لیکن وہ اپنی رفتار بڑھانے لگے اور ان میں سے چند ایک نے تو اپنے گھوڑے سر پٹ دوڑ دیے۔ رستوف کو گھوڑوں کی ٹاپ اور ہتھیاروں کی کھنکھناہٹ قریب سے قریب تر سنائی دینے لگی اور اسے ان کے گھوڑے، ان کی شکلیں بلکہ ان کے چہرے بھی واضح سے واضح تر دکھائی دینے لگے۔ یہ ہمارے ہارس گارڈز تھے۔ وہ فرانسیسی رسالے پر، جوان کی طرف پیش قدمی کرتا نظر آ رہا تھا، حملہ کرنے جا رہے تھے۔

ہارس گارڈز اپنے گھوڑے خاصا تیز بھاگ رہے تھے لیکن انھوں نے ان کی لگا میں پوری طرح ڈھیلی نہیں چھوڑی تھیں۔ رستوف کو اب ان کے چہرے صاف دکھائی دے رہے تھے اور اسے ایک افسر کا، جو اصل گھوڑے پر

سور تھا، حکم 'ٹوٹ پڑا' جو اس نے چا کر دیا تھا، سنائی دے گیا۔ رستوف کو خدشہ لاحق ہو گیا کہ فرانسیسیوں پر حملے کے دوران میں وہ کہیں پاؤں تلے ہی نہ کچلا جائے یا ان کے ساتھ آگے نہ نکل جائے، چنانچہ اس نے اپنا گھوڑا سرپٹ دوڑاتے، اس کی صفوں سے باہر نکلنے کی کوشش کی لیکن پورا زور لگانے کے باوجود وہ کامیاب نہ ہو سکا اور بیچ میں ہی پھنسا رہا۔

ہارس گارڈز کا آخری جوان عظیم الجثہ شخص تھا۔ اس کے چہرے پر چیچک کے داغ تھے۔ اس کی نظر جب رستوف پر پڑی، اس کے ماتھے پر شکنیں پڑ گئیں اور اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا کیونکہ وہ اس کے عین سامنے تھا اور اس کے ساتھ اس کا تصادم ناگزیر تھا۔ اگر رستوف کے دہن میں اپنا چابک گارڈز کے اس جوان کے گھوڑے کے سامنے ہرانے کا خیال نہ، تا تو یہ اسپ سوار یقیناً رستوف اور اس کے عربی گھوڑے (وہ ان ہاتھی کے ذیل ذیل کے لوگوں، دوران کے گھوڑوں کے مقابلے میں، اپنے آپ کو بالکل حقیر محسوس کر رہا تھا) کو زمین پر گرادیتا۔ سولہ⁴¹ باشت اونچا بھری بھر کم سیاہ فام گھوڑا بدک گیا اور اس نے اپنی کنتیاں نیچھی جانب ڈھلکائیں لیکن چیچک زدہ سوار نے اپنے بہت بڑے بڑے میزروں سے ٹھوکر ماری اور گھوڑا اپنی دم زور زور سے لہراتا اور اپنی گردن آگے بڑھاتا پہلے سے بھی کہیں زیادہ تیز رفتار سے بھاگنے لگا۔ گارڈز کے سوار رستوف کے برابرے بمشکل آگے نکلے ہوں گے کہ اس نے انھیں 'ہڑا' کے حربے بلند کرتے سنے۔ اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا اور اسے سب سے اگلی صفیں کسی غیر ملکی گھڑ سواروں کی، جن کے شانوں پر سرخ فیتے آویزاں تھے اور جولا ریب فرانسیسی ہی ہو سکتے تھے، صفوں سے بھڑتے نظر آئیں۔ اس کے علاوہ اسے اور کچھ نظر نہ آیا کیونکہ اس کے معاملہ کہیں سے توپوں نے دھواں اٹھا شروع کر دیا تھا اور ساری فضا تیرہ دتار ہو گئی تھی۔

جس وقت ہارس گارڈز اس سے آگے نکل گئے اور دھوئیں میں ادھل ہو گئے، رستوف کے لیے یہ فیصلہ کن دشوار ہو گیا کہ وہ ان کے پیچھے بھاگے یا ادھر جائے جہاں اسے بھیجا گیا تھا۔ ہارس گارڈز کا یہ حملہ اتنا زبردست تھا کہ نور فرانسیسی بھی ہکا بکا رہ گئے۔ رستوف کو بعد زان یہ سن کر سخت صدمہ پہنچا کہ ان جسم اور خوش وضع جوانوں اور طرح دار اور صاحب حیثیت نو جوان افسروں اور کیڈٹوں پر، جو ہزاروں رد بل کے گھوڑے دوڑاتے اس کے برابرے گز رہے تھے، مشتمل جیش کے بیشتر افراد اس حملے میں اپنی جانوں سے ہاتھ دھو بیٹھے اور ان میں سے صرف اٹھارہ زندہ بچ سکے تھے۔

"مجھے ان سے حسد کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ مجھے بھی کوئی نہ کوئی موقع مل ہی جائے گا۔ ممکن ہے کہ مجھے چند لمحوں کے دوران میں میری زار سے ہی ملاقات ہو جائے،" رستوف سرپٹ گھوڑا بھگاتا اور سوچتا جا رہا تھا۔ جب وہ پیدہ گارڈز کے قریب پہنچا، اسے احساس ہوا کہ توپوں کے گولے ان کے سروں اور گردن پیش کے اوپر ہی اوپر برق رفتاری سے اڑ رہے ہیں۔ اسے یہ احساس ان کی سنسنی آمیز سن کر اتنا نہیں ہوا جتنا کہ جوانوں کے چہروں پر اضطراب اور افسروں کی غیر نظری عسکری متانت دیکھ کر ہوا۔

وہ پیادہ گارڈز کی رجمنٹ کی ایک صف کے عقب میں سے گزر رہا تھا کہ اسے ایک آواز، جو سے اس کا نام لے کر پکار رہی تھی، سنائی دی۔
”رستوف!“

”کیا؟“ اس نے جواباً دریافت کیا۔

”کیا سمجھے؟ ہم محاذ پر پہنچ چکے ہیں! ہماری رجمنٹ حملہ کر چکی ہے!“ بورس نے کہا۔ اس کے چہرے پر وہ پرست مسکراہٹ، جوان جوانوں کے، جو زندگی میں اولین مرتبہ فرائض کی زد میں آئے ہوتے ہیں، چہروں پر نظر آتی ہے، بھیل رہی تھی

رستوف رک گیا۔ ”وائچی!“ اس نے کہا۔ ”خیر، تمہارے اس حملے کا کیا بنا؟“

”ہم نے انہیں پیچھے دھکیل دیا ہے،“ بورس نے کہا۔ جوش و خروش نے اسے پُرگوینا دیا تھا۔ ”کیا تم تصور کر سکتے ہو...“

اور وہ اسے بتانے لگا کہ گارڈز پوزیشنیں سنبھال چکے تھے کہ انہیں، اپنے سامنے فوجی دتے نظر آئے۔ گارڈز نے سمجھا کہ یہ آسٹروی جیش ہے لیکن جب انہیں دستوں نے ان پر توپ کے گولے برسانا شروع کر دیے، انہیں اپنی غلطی کا احساس ہو گیا اور ان پر یہ بات روشن ہو گئی کہ وہ محاذ جنگ کے قریب پہنچ گئے ہیں۔ یوں انہیں غیر متوقع طور پر معرکہ آرائی میں شریک ہونا پڑا۔

رستوف بورس کی پوری بات سنے بغیر آگے چل پڑا۔

”کہاں جا رہے ہو؟“ بورس نے پوچھا۔

”ہنر میچسٹی کے پاس۔ پیغام لے کر۔“

”وہ تو اصرار ہیں،“ بورس نے کہا۔ اس نے سمجھا کہ رستوف نے ”ہنر میچسٹی“ انہیں بلکہ ”ہنر ہائی نس“ کہا ہے۔

اس نے گریڈ ڈیوک کی طرف دیکھا، جو ہارس گارڈز کا ہیلمٹ اور چند پہنے ان سے تقریباً سو قدم کے فاصلے پر کھڑا تھا اور اپنے کندھے، چکائے، درماتھے پر ٹل ڈالے سفید وردی میں بیوس کسی زبردور آسٹروی افسر سے چلا چلا کر کچھ کہہ رہا تھا۔

”لیکن وہ تو گریڈ ڈیوک ہیں اور مجھے کمانڈر مخیف یا زار کی خدمت میں حاضر ہونے کے لیے بھیجا گیا ہے،“ رستوف نے کہا اور اس کے ساتھ ہی اس نے اپنے گھوڑے کو ہمیز لگانا چاہا۔

”کاؤنٹ کاؤنٹ!“ برگ گل پھاڑ پھاڑ کر چلا رہا تھا۔ وہ دوسری سمت سے بھاگا چلا آ رہا تھا اور اس کا جوش و خروش بورس سے کم نہیں تھا۔ ”کاؤنٹ، میرا دیاں ہاتھ زخمی ہو گیا ہے،“ اس نے اپنا ہاتھ، جو خون آلود روناں میں لپٹا ہوا تھا، دکھاتے ہوئے کہا۔ ”اور میں محاذ پر ہی موجود رہا۔ کاؤنٹ، مجھے اپنی شمشیر بائیں ہاتھ میں پکڑنا پڑی۔ ہمارے خاندان۔ وان برگ گھرنے۔ کے افراد پشتوں سے نائٹ چلے آ رہے ہیں۔“

برگ نے کچھ اور بھی کہا لیکن رستوف اس کی بات سنی ان سنی کر کے وہاں سے گھوڑا بھگائے گیا۔
گارڈز کو بھگتے اور ایک خالی علاقے میں سے گزرنے کے بعد رستوف ادھر چل پڑا جہاں محفوظ دینے
تعیینات تھے۔ اس کا مقصد محاذ جنگ سے دور رہنا تھا۔ وہ ایک مرتبہ پہلے ہی خط کھا چکا تھا اور گارڈز کے محلے کے
دوران میں خود بخود گلی صفوں میں پہنچ گیا تھا۔ اب جس جگہ سے توپوں اور بندوqbوں کی فائرنگ کی آواز آتی، وہ اس
سے دور رہتا اور لہا چکر کاٹ کر آگے نکل جاتا۔ اچانک اسے اپنے سامنے اپنی فوجوں کے عقب میں اپنے بالکل
قریب، جہاں وہ کبھی یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ یہاں غنیم موجود ہوگا، فائرنگ کی آوازیں سنائی دیں۔

”یہ کیا ہو سکتا ہے؟“ رستوف حیرت و استعجاب سے سوچنے لگا۔ ”غنیم ہماری فوج کے عقب میں پہنچ گیا
ہے؟ ناممکن۔“ اچانک اسے اپنی ذہن اور اس ساری ٹرکی کے انجم کے بارے میں زبردست اندیشہ لاحق
ہو گیا۔ ”یہ جو کچھ بھی ہو، اب اس کے گرد چکر کاٹنا بیٹھ ہے۔ مجھے یہیں کہیں کمانڈر انچیف کوڑھونڈنا ہوگا۔ کرب
کچھ جانتا رہا، پھر میرا یہ فرض بنتا ہے کہ باقیوں کی طرح میں بھی اپنی جاں نثار کردوں۔“

وہ پرائسن گاؤں کے علاقے سے، جو مختلف اقسام کی افواج سے پٹا پڑا تھا، جتنا دور نکلتا گیا، بدشگولی کا
احساس، جس نے، یکا یکی اسے اپنی گرفت میں لے لیا تھا، شدید سے شدید تر ہوتا گیا۔

”اس کا کیا مطلب ہے؟ اس کا کیا مطلب ہے؟ یہ کس پر فائرنگ ہو رہی ہے؟ یہ فائرنگ کون کر رہا ہے؟“
رستوف روسی اور آسٹریوی سپاہیوں سے، جو منتشر ہجوموں کی صورت میں اس کے راستے پر بھاگے چلے آ رہے تھے،
مسلح پوچھتا رہا۔

”خدا ہی جانے! انھوں نے سب کو ہلاک کر دیا ہے، ہمارا بیڑا غرق ہو گیا ہے!“ اسے جوانوں نے روسی،
جرمن اور چیک زبانوں میں جواب دیا۔ وہ سب بے ترتیب سردوں پر پاؤں رکھے بھاگے چلے آ رہے تھے۔
رستوف کی طرح انھیں بھی کچھ معلوم نہیں تھا کہ ہو کیا رہا ہے۔

سڑک پر رخیوں کی بھی اچھی خاصی تعداد جا رہی تھی۔ عام شور و غل میں گالیوں، چیخوں، درکراہوں کی
آمیزش ہو رہی تھی۔ فائرنگ کی شدت میں تخفیف ہونے لگی کہیں بعد میں رستوف کو معلوم ہوا کہ روسی اور آسٹریوی
سپاہی ایک دوسرے پر فائرنگ کر رہے تھے۔

”میرے خدایا! اس کا کیا مطلب ہے؟ یہاں کیا ہو رہا ہے؟ کسی بھی سمجھدار یہاں تشریف لا سکتے ہیں اور
اپنی آنکھوں سے یہ سب کچھ دیکھ سکتے ہیں!... لیکن نہیں، یہ ٹھکی بھر بد سماشوں کی کارستانی معلوم ہوتی ہے۔ یہ بہت
جلد ختم ہو جائے گی۔ یہ وہ معاملہ نہیں ہو سکتا۔ بالکل نہیں ہو سکتا،“ اس نے سوچا۔ ”مجھے جلد از جلد ان سے آگے نکل
جانا چاہیے، جلد از جلد!“

شکست اور فرار کا تصور ہی رستوف کے لیے سواہن روح تھا۔ اگرچہ اسے پرائسن پہاڑی پر، عین اس مقام
پر، جہاں اسے کمانڈر انچیف کو تلاش کرنے کا حکم دیا گیا تھا، فراموشی تو پیش اور فراموشی دے کر نظر آ رہے تھے،

یقین نہیں آ رہا تھا، یقین آ ہی نہیں سکتا تھا کہ وہ وہاں ہوں گے۔

18

رستوف کو حکم دیا گیا تھا کہ وہ کمانڈر انچیف اور زار کو پرائسن گارڈس کے قرب و جوار میں تلاش کرے۔ وہ تو کجا، کسی کمانڈنگ افسر کا بھی اتنا پتا معلوم نہیں ہو رہا تھا۔ ہر طرف صرف مختلف نو جیوں کے بے ترتیب ہجوم اندھا دھند بھاگے پھر رہے تھے۔ وہ اپنے گھوڑے کو، جو پہلے ہی تھک کر چور ہو چکا تھا، اور تیز بھگانے کی کوشش کر رہا تھا تا کہ وہ جلد از جلد اس بھیڑ سے آگے نکل جائے۔ لیکن وہ جوں جوں آگے بڑھتا گیا، توں توں ہجوم پہلے سے کہیں زیادہ بے ترتیب اور بے حوصلہ نظر آنے لگتے۔ وہ جس شاہراہ پر چل کر آیا تھا، اس پر ہر قسم کی دو پہیہ اور چار پہیہ گاڑیوں کا، جن میں ہر قسم کی رہنمائی کے رخمی اور غیر رخمی روسی و آسٹریائی جوان ٹھسٹھس بھرے ہوئے تھے، ازدحام تھا۔ فرنیسی توپ خانہ پرائسن پہاڑی پر نصب تھا اور ان کے گولوں تلے، جو منہوس آوازیں پیدا کرتے لوگوں کے سروں کے اوپر سے گزر رہے تھے، یہ ہجوم بٹھنکار رہا تھا اور لختہ لختہ اس کی تعداد میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔

”زر کہاں ہیں؟ کو تو زوف کہاں ہیں؟“ رستوف ہر اس شخص سے، جسے وہ روکنے میں کامیاب ہو جاتا تھا، یہی سوال پوچھتا جا رہا تھا لیکن کسی سے بھی اسے تسلی بخش جواب نہ مل سکا۔ آخر کار اس نے ایک سپاہی کا کار پکڑ لیا اور اسے جواب دینے پر مجبور کر دیا۔

”ارے بھائی، وہ تو کبھی کے رنو چکر ہو چکے ہیں!“ سپاہی نے کسی بات پر ہنستے اور اپنے آپ کو چھڑاتے ہوئے کہا۔

رستوف نے اس سپاہی کو، جو بظاہر نشے میں چور معلوم ہوتا تھا، چھوڑا، کسی اہم شخصیت کے اردلی یا سائیکس کا گھوڑا پکڑا اور اس سے سوال جواب کرنے لگا۔ اس شخص نے اسے بتایا کہ زار بری طرح زخمی ہو گیا ہے اور کوئی ایک گھنٹہ پہلے اسے انتہائی تیز رفتار گاڑی پر بٹھا کر اسی شاہراہ پر کہیں دور پہنچا دیا گیا ہے۔

”ایسا نہیں ہو سکتا،“ رستوف نے کہا۔ ”یہ کوئی اور شخص ہوگا۔“

”بادشاہوں میں نے اپنی آنکھوں سے انھیں دیکھا تھا،“ اردلی نے اطمینان سے اپنے دانت کھستے ہوئے کہا۔

”میں زار کو اتنی مرتبہ پیٹرز برگ میں دیکھ چکا ہوں کہ میرا خیال ہے کہ میں اب انھیں آسانی سے پہچان سکتا ہوں۔ وہ گاڑی میں بیٹھے تھے، ان کا رنگ بالکل سفید ہو چکا تھا اور وہ چار سیاہ فام گھوڑے بھاگ نہیں رہے تھے بلکہ اڑ رہے تھے۔ واہ واہ! کیا رفتار تھی ان کی! میں زار کے گھوڑے بھی پہچانتا ہوں اور الیا ایوانوویچ کو بھی۔ میرے خیال میں الیا زار کے ملاوہ کسی بھی دوسرے شخص کو اپنی گاڑی میں نہیں لے جائے گا۔“

رستوف نے گھوڑا چھوڑ دیا۔ وہ آگے بڑھتا چاہتا تھا کہ ایک زخمی افسر، جو اس کے قریب سے گزر رہا تھا، اس سے مخاطب ہو۔

”آپ کسے ملنا چاہتے ہیں؟“ افسر نے پوچھا۔ ”کانڈرا نیچیف؟ اچی، وہ تو توپ کے گولے سے ہلاک ہو چکے ہیں۔ وہ ہماری رجمنٹ میں تھے کہ گور آیا اور سیدھا ان کے سینے سے نکل گیا۔“

”ہلاک نہیں، زخمی ہوئے تھے،“ ایک دوسرے افسر نے اس کی تصحیح کی۔

”کون، کو تو زون؟“ رستوف نے پوچھا۔

”کو تو زون نہیں۔ لیکن اس کا نام کیا ہے؟۔ خیر، کیا فرق پڑتا ہے۔ سب ایک جیسے ہی ہیں جو لوگ زندہ بچ گئے ہیں، ان کی تعداد زیادہ نہیں۔ تم ادھر چلے جاؤ، اس گاؤں کی طرف۔ تمام کمانڈنگ افسر وہیں ہیں، اس بڑے ہونڈے راڈے گاؤں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ اور خود آگے چل دیا۔

رستوف آہستہ رو جا رہا تھا۔ اسے کچھ معلوم نہیں تھا کہ وہ کس کے پاس جا رہا ہے اور کیوں جا رہا ہے۔ زار زخمی ہو چکا تھا، لڑائی ہماری جا چکی تھی۔ اب اس بارے میں کسی شک و شبہ کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہ گئی تھی۔ وہ اس سمت، جدھر اسے اشارہ کیا گیا تھا، چل پڑا۔ دور کا صلے پر اسے بیٹار ورکھیا دکھائی دینے لگے۔ بھاگ دوڑ کی ضرورت کیا تھی؟ اگر زار اور کو تو زون زندہ بھی ہوں، اور زخمی بھی نہ ہوئے ہوں، اس کے پاس انھیں بتانے کے لیے رہ ہی کیا گیا تھا؟

”جناب، اس سڑک پر جائیں۔ ادھر تو آپ پلک جھپکنے میں ہلاک ہو جائیں گے،“ ایک سپاہی نے گلاباؤں کے اسے متنبہ کیا۔ ”ادھر آپ ہلاک ہو جائیں گے!“

”ارے، تم کیا کہہ رہے ہو؟“ ایک دوسرے نے کہا۔ ”انھوں نے کہاں جانا ہے؟ وہ راستہ چھوٹا ہے۔“

رستوف نے کچھ سوچا اور پھر اس راستے پر جس کے بارے میں اسے بتایا گیا تھا کہ وہاں موت اس کا انتظار کر رہی ہے، چل پڑا۔

”اب کیا فرق پڑتا ہے؟ اگر زار زخمی ہو چکے ہیں، مجھے اپنی چٹری بچانے کی کوشش کرنا چاہیے؟“ اس نے سوچا۔ وہ گھوڑے پر سو رہا تھا، جہاں پر انھوں نے فرار کے دوران میں سب سے زیادہ تعداد میں آدمی ہلاک ہوئے تھے، چلنے لگا۔ فرانسیسیوں نے ابھی تک اس علاقے کو اپنے قبضے میں نہیں لیا تھا اور وہاں جنھیں کوئی چوٹ نہیں آئی تھی یا معمولی زخم آئے تھے۔ کبھی کے اسے خالی کر چکے تھے۔ جس طرح اس زرعی کھیت میں، جس پر خوب اچھی طرح قلبہ رانی کی گئی ہو، جا بجا کھاد کے ڈھیر پڑے ہوتے ہیں، یہ میدان بھی پورے کا پورا زخمی اور ہلاک شدگان سے چاڑھا تھا۔ ہر دو ایکڑ رقبے میں دس دس پندرہ پندرہ اشخاص پڑے تھے۔ زخمی رنگ رنگ کر دو دو تین تین کی ٹولہوں میں اکٹھے ہو گئے تھے۔ ان کی تکلیف دہ چیخیں اور کراہیں، جو رستوف کو بعض اوقات معنوی معلوم ہونے لگتی تھیں، صاف سنائی اور کلیجہ جھلکتی کیے دے رہی تھیں۔ مصائب و آلام میں مبتلا ان لوگوں سے نظریں پھرانے کے لیے رستوف نے اپنے گھوڑے کی رفتار تیز کر دی۔ اسے خوف محسوس ہو رہا تھا۔ اسے خوف اپنی زندگی کا نہیں تھا بلکہ اس بات کا تھا کہ اس میں ضروری حوصلے کی کمی ہے اور وہ جانتا تھا کہ وہ ان بد قسمت اشخاص کے منظر

کو دیکھنے کی تاب نہیں لاسکے گا۔

فرانسیسیوں نے اس میدان پر، جو زخمیوں اور ہلاک شدگان سے چاڑھا تھا، فائرنگ کا سلسلہ بند کر دیا تھا کیونکہ یہاں زندگی کے کوئی آثار نظر نہیں آ رہے تھے۔ لیکن جب انھوں نے ایک ایجوٹنٹ کو اس میں سے گزرتے دیکھا، انھوں نے ایک توپ کا رخ اس کی طرف موڑ دیا اور متعدد گولے داغ دیے۔ ایک طرف یہ منحوس ستمنازی آوریں تھیں، دوسری طرف میدان میں لاشیں ہی لاشیں بکھری پڑی تھیں۔ ان دونوں نے اس کے سینے میں مختلف اقسام کے احساسات کو جنم دیا لیکن وہ بالآخر گھل مل کر دہشت اور خود رنجی کے دو حادثات میں تبدیل ہو گئے۔ اسے اپنی ماں کا آخری خط یاد آیا۔ ”اگر وہ اب کسی طرح مجھے اس میدان میں، جہاں توپ نے مجھے اپنے نشانے کی زد میں لے رکھا ہے، اس نے سوچا، دیکھ سکے، وہ کیا محسوس کرے گی؟“

ہوڑے گاؤں میں روسی تھے، اگرچہ وہ بھی ذہنی انتشار کا شکار تھے لیکن میدان جنگ سے پسپائی اختیار کرنے کے دوران میں ان کی صفوں میں وہ بے رتبی نہیں تھی جس کا مظاہرہ دوسروں نے کیا تھا۔ وہ فرانسیسی فوجیوں کی زد سے باہر آ چکے تھے اور غنیمت کی بند دلوں کی آوازیں بہت دور محسوس ہوتی تھیں۔ یہاں ہر شخص کو یہ وضع طور پر نظر آ رہا تھا کہ لڑائی ہماری جا چکی ہے اور وہ کھسے عام اس کا اعلان کرتا پھر رہا تھا۔ جس جس آدمی سے رستوف نے زاریا کو توف کے بارے میں دریافت کیا، ان میں سے کوئی بھی اسے یہ نہ بتا سکا کہ وہ کہاں ہیں۔ بعض نے کہا کہ یہ انواہ کہ زار زخمی ہو چکا ہے، درست ہے۔ دوسروں نے کہا کہ ”نہیں، ایسی کوئی بات نہیں ہے۔“ انھوں نے اس جھوٹی رپورٹ کی توضیح یوں کی کہ زار کی گاڑی میدان جنگ سے فرار ہو گئی تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ زوردار دہشت زدہ گریٹر، رشل کاؤنٹ حاکم سلطانی بھی تھا، جو زار کے ذاتی عملے کے دیگر ارکان کے ہمراہ گھوڑے پر میدان جنگ میں آیا تھا۔ ایک افسر نے رستوف کو بتایا کہ اس نے بائیں جانب کے گاؤں کے عقب میں ہیڈ کوارٹر کے کسی کارندے کو دیکھا تھا۔ رستوف کو اب یہ امید تو نہیں رہی تھی کہ وہ کسی کو تلاش کر سکے گا وہ محض اپنے ضمیر کی تسلی کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ وہ ادھر چل پڑا۔ وہ کوئی دو میل دور گیا ہوگا اور آخری روسی سپاہی سے آگے نکل چکا تھا کہ اسے گھوڑوں پر سوار دو اشراف نظر آئے۔ وہ ایک کھائی کے، جو کسی گھر سے ملحقہ بنریوں کے باغ کے ارد گردنی ہوئی تھی، سامنے رک گئے تھے۔ ان میں سے ایک کی، جس کی ٹوپی میں سفید کلنی آویزاں تھی، شکل رستوف کو جانی پہچانی معلوم ہوئی۔ دوسرا شاندار کیت گھوڑے پر سوار تھا (رستوف کو محسوس ہوا کہ اس نے یہ گھوڑا بھی کہیں دیکھا ہے)۔ جب وہ کھائی کے نزدیک پہنچا، اس نے گھوڑے کو مہینز لگایا، اس کی لگام ڈھیلی چھوڑی، ہلکے پھلکے انداز سے کھائی کے اوپر جست لگائی اور باغ میں داخل ہو گیا۔ گھوڑے کے پیچھے پاؤں کنارے سے نکرائے اور سٹی کا سمبولی سا کھڑا پیچھے کر پڑا۔ وہ پھرتی سے واپس مڑا، اس نے کھائی کے اوپر دوبارہ جست لگائی اور نہایت احترام کے ساتھ اس کمر سوار سے، جس کی ٹوپی میں سفید کلنی آویزاں تھی، مخاطب ہوا۔ وہ بظاہر اسے یہ سمجھا رہا تھا کہ اسے بھی ایسا ہی کرنا چاہیے۔ سوار نے، جس کی شکل رستوف کو جانی پہچانی معلوم ہوئی تھی اور جس پر اس نے ساری توجہ مرکوز

کر رہی تھی، سر کو جھکا دیا اور اپنے ہاتھ سے انکار کا اشارہ کر دیا۔ اس اشارے سے رستوف کو یہ معلوم ہوا کہ یہ تو اس کا امپراطور ہے جس کے بارے میں وہ رنج و الم کا اظہار کرتا اور جس کی وہ پرستش کرتا رہا ہے۔

”لیکن یہ وہ نہیں ہو سکتے۔ اجاڑ میدان کے بیچ میں تن تہا، رستوف نے سوچا۔

عین اسی لمحے الیکساندر نے اپنی گردن گھمائی اور رستوف کو وہ محبوب خد و خاب، جو اس کے ذہن کی تختی پر واضح انداز سے ترسم ہو چکے تھے، نظر آ گئے۔ زار کا رنگ فق تھا۔ اس کے رخسار اندر کو دھنسے ہوئے تھے اور اس کی آنکھیں خالی خالی تھیں۔ لیکن اس کے چہرے کی دلکشی اور ملائمت اور بھی نمایاں ہو گئی تھی۔ اسے دیکھ کر رستوف پھولانہ سمایا۔ وہ جانتا تھا کہ وہ اس کے قریب جا سکتا ہے بلکہ بیچ پوچھ جائے تو اسے جانا چاہیے اور وہ اسے وہ پیغام جس کے متعلق دلگور کوف نے اسے حکم دیا تھا کہ اسے پہنچایا جائے، پہنچانا چاہیے۔ لیکن جس طرح گرفتار محبت نوجوان مدتوں اس امید پر زندہ رہتا ہے کہ ایک نہ ایک دن اسے اپنی محبوبہ سے نہائی میں ملاقات کا موقع میرا جائے گا لیکن جب یہ موقع آتا ہے، اور اسے اس کی صوت میسر آتی ہے، اس کے ہاتھ پاؤں پھوس جاتے ہیں، اس کے جسم پر کچکی طاری ہو جاتی ہے اور جن جذبات کا اظہار کرنے کے لیے اس نے راتیں خواب دیکھتے گزاری ہوتی ہیں، وہ انہیں بیان کرنے کا حوصلہ نہیں پاتا، بزدلوں کی طرح مدد کی تلاش میں ادھر ادھر نظر میں دوڑاتا ہے، کوشش کرتا ہے کہ کسی طرح ملاقات میں تاخیر ہو جائے یا راہ فرار کی کوئی صورت نکل آئے۔ اسی طرح اب جب کہ رستوف کو وہ چیز، جس کے حصول کے لیے اس نے دنیا کی ہر چیز سے زیادہ تمنا کی تھی، مل گئی تھی، اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ زار کے قریب کیسے آئے اور اس کے ذہن میں ہزاروں دلائل سر اٹھانے لگے کہ اب کرنا بے موقع، بے محل، غیر مناسب اور ناممکن ہے۔

”کیا کروں؟ مجھے تو کچھ یوں محسوس ہوتا ہے کہ اب جب کہ وہ تنہا رہ گئے ہیں اور مایوسی کے اتھو سندھ میں ڈوبے ہوئے ہیں، مجھے ان سے ملاقات کرنے کا جو موقع میسر آ گیا ہے، اگر میں اس سے فائدہ اٹھا لوں، میرا جی تو باغ باغ ہو جائے گا، لیکن یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ اس افسوس ناک لمحے میں انہیں کسی اجنبی چہرے کو دیکھنا ناگوار لگے یا شاید ذہنی تکلیف پہنچے۔ علاوہ ازیں اب جب کہ ان کو دیکھنے سے میرا دل دھڑکنے بند ہو گیا ہے، اور میری زبان خشک ہو گئی ہے، میں انہیں کہہ بھی کیا سکتا ہوں؟“

اس نے اپنے تشیل میں جو تعداد تقریریں، جو اس نے زار کے سامنے کرنا تھیں، تیار کی تھیں، اب اسے ان میں سے ایک بھی یاد نہ آ سکی۔ وہ تقاریر زیادہ تر مختلف حالات کے لیے سوچی گئی تھیں اور انہیں فتح و نصرت کے مواقع پر، خاص طور پر اس وقت جب وہ زخموں سے چور بستر مرگ پر پڑا اور اپنی زندگی کی آخری سانسیں گن رہا ہوگا، ادا کیا جانا تھا۔ اپنے شجاعانہ کارناموں کے لیے وہ زار کا شکریہ وصول کر چکا ہوگا اور جس محبت کا اظہار وہ اپنے ہی عملا کر کے دکھا چکا ہوگا، اب جان کنی کے دوران میں الفاظ کی صورت میں داکر رہا ہوگا۔

”اب جب کہ تمام کے چار بج چکے ہیں اور جنگ ہماری جا چکی ہے، میں زار سے یہ پوچھنے کی جرات ہے

کر سکتا ہوں کہ میسے کے متعلق ان کے احکام کیا ہیں؟ نہیں، مجھے یقیناً ان کے قریب بھی پہنچنا نہیں چاہیے۔ مجھے ان کے خیالات میں خلل نہیں ہونا چاہیے۔ ان کی غصیلی نگاہ یا اظہارِ ناپسندیدگی کا سامنا کرنے کی نسبت ہزار بار موت کو گلے لگانا زیادہ بہتر ہے۔ رستوف نے فیصلہ کیا اور اپنے دل میں مایوسی و مدل سمائے وہاں سے چل پڑا لیکن وہ بار بار مڑ کر زار کو، جو ابھی تک حیسں کی کیفیت میں وہیں کھڑا تھا، دیکھتا رہا۔

جب رستوف دل ہی دل میں اس قسم کا استدلال کر رہا تھا اور غم و اندوہ کی حالت میں وہاں سے روانہ ہو رہا تھا، اتفاق سے کیپٹن وان ٹول کا ادھر سے گزر ہوا اور زار پر نظر پڑتے ہی وہ سیدھا اس کے پاس چلا گیا، اسے اپنی خدمات پیش کیں اور اسے پیدل کھائی عبور کرنے میں مدد دی۔ زار کی طبیعت نامساں ہو رہی تھی اور وہ آرام کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ وہ ایک سیب کے درخت تلے بیٹھ گیا، ورون ٹول اس کے پاس بٹھارہا۔ دورِ فاصعے پر رستوف کو یہ دیکھ کر رشک بھی آرہا تھا اور اسے ندامت بھی ہو رہی تھی کہ وہ ان ٹول بڑی گرم جوشی سے زار سے طویل گفتگو کر رہا ہے۔ زار نے اپنی آنکھیں ڈھانپ رکھی تھیں اور وہ وان ٹول کا ہاتھ دیا رہا تھا۔ بظاہر یہی معلوم ہو رہا تھا کہ وہ رو رہا ہے۔

”اور اس کی جگہ میں ہو سکتا تھا!“ رستوف نے سوچا۔ زار کی حالت دیکھ کر اسے اتنا ترس آیا کہ اس کے لیے اپنے ہنسودوں کو رد کنا مشکل ہو گیا۔ مایوسی نے اسے پوری طرح اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔ اسی عالم میں وہ وہاں سے چل پڑا۔ اسے کچھ پتا نہیں تھا کہ وہ کہاں جا رہا ہے اور کیوں جا رہا ہے۔

اس کی مایوسی اس حساس سے اور بھی شدید ہو گئی تھی کہ اس کے رنج و الم کا سبب اس کی اپنی کم ہمتی تھی۔

وہ چاہتا تو زار کے پاس جاسکتا تھا۔ نہ صرف جاسکتا تھا بلکہ اسے جانا چاہیے تھا۔ اپنی جان ناری جتانے کا یہ فقید المثال موقع تھا اور اس نے اس سے فائدہ نہیں اٹھایا تھا۔ ”یہ میں نے کیا کیا؟“ وہ سوچ رہا تھا۔ اس نے اپنے گھوڑے کا رخ بدل دیا اور اسے سر پٹ بھگاتا اس جگہ پہنچا جہاں اس نے پہلے پہلے زار کو دیکھا تھا۔ لیکن اب کھائی کی دوسری جانب نہ کوئی بندہ تھا نہ بشر۔ صرف چند گاڑیاں اور چھکڑے گزر رہے تھے۔ ایک کوچوان کی زبانی اسے معلوم ہوا کہ کوٹوزوف کا محلہ قریب ہی کے گاؤں میں مقیم ہے اور چھکڑے ادھر ہی جا رہے ہیں۔ رستوف ان کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔

اس کے آگے کوٹوزوف کا ساتیس چند گھوڑے، جن کے اجسام پر جھول پڑے تھے، ہٹائے جا رہا تھا۔ اس کے پیچھے ایک چھکڑا اور چھکڑے کے پیچھے ایک گھریلو ملازم، جس کی ٹانگیں ٹیڑھی، سر پر چھبے دار ٹوپی اور جسم پر بھیڑ کی کھال کا کوٹ تھا، جا رہا تھا۔

”تیت، ادوہ تیت!“ ساتیس نے کہا۔

”کیا ہے؟“ بوڑھے نے بے دھیانی سے جواب دیا۔

”تیت، بھوسہ زہر پھیت!“

”آہن! انوکھی دم!“ بوڑھے نے کہا اور غصے سے زمین پر تھوک دیا۔

کچھ دیر خاموشی رہی اور اس کے بعد اس مذاق کو دوبارہ دہرایا گیا۔



اس روز شام کے پانچ بجے تک تمام مقامات پر لڑائی جاری جا چکی تھی۔ ایک سو سے زائد گنائیس فرانسیسیوں نے قبضے میں جا چکی تھیں۔ پرنسے بزیوسکی اور اس کی کور ہتھیار ڈال چکی تھی۔ جہاں تک دوسرے کالموں کا تعلق ہے، ان کے نصف کے قریب جوان موت کے گھاٹ اتر چکے تھے اور باقی بے ترتیب ہجوموں کی صورت میں پہاڑی اختیار کر رہے تھے۔

لڑخوں اور دختر دوف کے بچے کچھ لشکری اوگڈ گاؤں کے قریب بندوں اور جو ہڑوں کے کناروں پر بد نظمی اور بے ترتیبی سے بھیڑ لگائے جمع تھے۔

شام کے چھ بجے جس واحد فائرنگ کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں، وہ فرانسیسیوں کی اوگڈ ڈیم پر گولہ باری تھی۔ فرانسیسیوں نے متعدد توپیں پرائسن کی پہاڑی پر نصب کر لی تھیں اور وہ وہیں سے ہمارے جوانوں پر، جو پہاڑ ہو رہے تھے، یہ گولہ باری کر رہے تھے۔

عقب میں دختر دوف، در کچھ دوسرے اشخاص نے چند ہائینیں اکٹھی کر لی تھیں اور وہ مسلسل فرانسیسی رسالے پر، جو ہمارے دستوں کا تعاقب کر رہے تھے، فائرنگ کر رہے تھے۔ شام کا دھند لگا گہرا ہو رہا تھا۔ اوگڈ ڈیم خاص تنگ تھا۔ اس کے قریب جو پن چکی تھی، کئی سالوں سے اس کے مالک کا یہ دستور تھا کہ وہ چھجے دار ٹوپلی بھین لٹا ڈیم پر بیٹھ جاتا اور اسن و سکون سے مچھلیاں پکڑتا رہتا۔ اس دوران میں اس کا پوتا آستینیں چڑھائے، پانی کے پیے میں ہاتھ ڈالے، اچھلتی کودتی مچھلیوں کے ساتھ، جو اس کے ہاتھ سے پھسل پھسل جاتیں، کھیلتا رہتا۔ سوراویا کے باشندے نیلے کوٹ اور ریشم دار ٹوپیاں پہنے، برسوں سے اسی ڈیم کے ساتھ ساتھ اپنی گاڑیاں، جن پر گندم لدی ہوئی تھی اور جن میں رو دو گھوڑے جتے ہوتے تھے، ہانکتے لاتے رہے اور پن چکی پر گندم پسوانے کے بعد اپنی گاڑیاں، جو انہیں بکھرنے سے سفید نظر آئے لگتیں، اسی ڈیم کے ساتھ ساتھ چلتے واپس لے جاتے رہے تھے۔ ڈیم اب بھی دکان تھا لیکن اب اس پر توپوں اور پھکڑوں کے مابین، گھوڑوں کے قدموں تلے اور گاڑیوں کے پہیوں کے بیچ جوان گھڑیاں بنے جا رہے تھے۔ موت کے خوف نے ان کے چہرے بگاڑ دیے تھے، دھکم پیل میں وہ ایک دوسرے کو کچل رہے تھے، دم کھٹنے سے ہلاک ہو رہے تھے، ہلاک شدگان کے اوپر چھل نکلیں لگا رہے تھے، ایک دوسرے کی ہانت کا باعث بن رہے تھے۔ وہ یہ سب کچھ اس لیے کر رہے تھے تاکہ وہ چند قدم آگے بڑھ سکیں۔ وہ آگے بڑھتے ضرور تھے لیکن خود بھی اسی طرح ہلاک ہو رہے تھے۔

ہر دس سیکنڈ بعد ایک گولہ لہرا تا، بل کھتا، ہوا سے نکرتا آتا اور گڑاپ سے اس ہجوم کے مابین گر پڑتا، کوئی شیل ان کے درمیان پھٹ جاتا۔ کچھ لوگ ہلاک ہو جاتے اور ان کے خون کے چھینٹے ان اشخاص پر، جو ان کے

قریب ہوتے، جا پڑتے۔

دلو خوف کا بازو زخمی ہو چکا تھا اور وہ اپنی کمپنی (اسے اب انسریٹا یا گیا تھا) کے دس بارہ جوانوں کے ساتھ پیدل چل رہا تھا۔ اس کا رینشل کمانڈر، جو گھوڑے پر سوار تھا، ان کے ساتھ تھا۔ پوری رینجٹ میں صرف یہی اشخاص زندہ بچے تھے۔ دھکم پیل میں ہجوم انھیں اپنے ساتھ بہائے لیے جا رہا تھا۔ جب وہ ڈیم کے قریب پہنچے، وہ چاروں اطراف سے بھینٹ میں پھنس گئے۔ وہ اب نہ آگے جاسکتے تھے اور نہ پیچھے ہٹ سکتے تھے کیونکہ آگے ایک گھوڑا گھماں کے نیچے گر پڑا تھا اور ہجوم اسے گھسیٹنے میں مصروف تھا۔ توپ کا ایک گولہ آیا۔ ایک شخص ان کے عقب میں ہلاک ہو گیا اور ایک ان کے سامنے گر پڑا۔ خون کے چھینٹوں نے دلو خوف کو تر کر دیا۔ ہجوم میں لوگ بری طرح ایک دوسرے میں پھنسے ہوئے تھے، وہ آگے بڑھنے کے لیے زور لگا رہے تھے، چند قدم چلتے بھی لیکن پھر رک جاتے۔

”سو قدم مزید آگے نکل گئے تو میں راز مانچ جاؤں گا لیکن یہاں دوسٹ اور ٹھہرے رہے، میں یقیناً بے موت مارا جاؤں گا“ ہر شخص اسی انداز سے سوچ رہا تھا۔

دلو خوف نے جو ہجوم کے عین درمیان میں تھا، دھکا مارا اور ڈیم کے کنارے پر پہنچ گیا۔ اس عمل میں اس نے ردیوں نیچے گرا دیے۔ چکی کے تالاب کی سطح برف نے ڈھانپ رکھی تھی اور یہاں پھسلن ہو رہی تھی۔

”ادھر آ جاؤ“ دلو خوف نے برف پر، جو اس کے بوجھ تلے چرچرانے لگی تھی، چھلانگتے ہوئے چلا کر کہا۔ ”ہاں طرف آ جاؤ“ اس نے جوانوں سے، جو توپ اٹھائے آرہے تھے، چد کر با آواز بلند کہا۔ ”یہاں پاؤں ٹک رہے ہیں!“ برف نے اس کا بوجھ سہارا تو لیا لیکن وہ اس کے پاؤں تلے چٹختے اور آگے پیچھے جھولنے لگی۔ صاف نظر آ رہا تھا کہ وہ گھماں اور چند مزید لوگوں کا بوجھ تو کیا برداشت کرے گی، خود اس کا اپنا وزن بھی نہیں اٹھا سکے گی۔ اسے دیکھ کر جوانوں نے کنارے کی جانب دھکم پیل شروع کر دی لیکن وہ برف پر چڑھنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ گھوڑے پر سوار جرنیل نے اس راستے پر، جو ڈیم کو جاتا تھا، پہنچ کر اپنا ہاتھ اوپر اٹھایا اور دلو خوف سے کچھ کہنے کے لیے اپنا منہ کھولا۔ اچانک گھماں کا ایک گولہ ہجوم کے سروں کے اتنے قریب سے اڑتا گزرا کہ ہر شخص نیچے جھک گیا۔ گولے کے ہرانے بل کھانے اور اس کے کسی نرم شے سے ٹکرانے کی آواز پیدا ہوئی۔ جرنیل اپنے گھوڑے سے نیچے گر پڑا اور اپنے ہی خون میں بہا گیا۔ کسی شخص نے اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا اور نہ اسے اٹھانے کے متعلق سوچا۔

”برف پر چڑھ جاؤ! برف پر چڑھ جاؤ! چلو، چلو! مڑو! سنا نہیں تم نے؟ چلو!“ جرنیل کے گولے کی رد میں گرنے کے بعد بے شمار آوازیں گلے پھڑپھاڑ کر کہہ رہی تھیں حالانکہ کسی کو بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ چلا چلا کر کیا کہہ رہے اور کیوں کہہ رہے ہیں۔

پیچھے سے ایک توپ گاڑی، جو بھی ابھی ڈیم تک پہنچی تھی، برف کی طرف سوز دی گئی۔ ڈیم سے فوجیوں کے ہجوم دوڑ دوڑ کر برف سے ڈھکے ہوئے پن چکی کے تالاب پر چڑھنے لگے۔ ان میں سے ایک کے پاؤں تلے برف چٹختی گئی اور اس کی ٹانگ پھسل کر پانی میں چلی گئی۔ اس نے سیدھا ہونے کی کوشش کی اور کمر تک پانی میں

دھنس گیا۔ اس کے نزدیک جو جوان تھے وہ بچکپائے اور توپ گاڑی کے کو جوان نے اپنے گھوڑے رک لیے لیکن اس کے پیچھے آوازیں چلائے جا رہی تھیں ”برف پر چڑھو برف پر چڑھو! تم رک کیوں گئے ہو؟ چلو آگے چلو“ اور جہم میں خوف و ہشت کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ توپ گاڑی کے نزدیک جو جوان تھے، وہ اپنے بازو لہرائے اور گھوڑوں پر گھونسے برسانے لگے تاکہ انھیں مڑنے اور چھٹنے پر مجبور کیا جاسکے۔ گھوڑے کناروں سے ہٹنے لگے۔ برف، جواب تک پیدل آدمیوں کا بوجھ اٹھانے میں کامیاب رہی تھی، نیچے دھنسنے لگی۔ اس کا بہت بڑا ٹکرا، جس پر تقریباً چالیس آدمی موجود تھے، ٹوٹنے لگا۔ کچھ لوگ اگلی طرف گرے اور کچھ پچھلی طرف۔ وہ پانی میں گرتے اور ایک دوسرے کو ڈبو تے جا رہے تھے۔

توپوں کے گولے ابھی تک باقاعدہ دھنوسے سروں کے اوپر سنسناتے گزر رہے تھے۔ ان میں سے چھ ایک برف پر گرتے، دھماکے کی آواز پیدا کرتے اور پانی میں ڈوب جاتے۔ تاہم ان کی بیشتر تعداد ان جرائن کے، جنہوں نے ڈیم، چکی کے تار ب اور ندی کے کناروں پر بھٹ کر رکھی تھی، عین درمیان میں گر رہے تھے۔

19

پرائسن پہاڑی پر، جہاں وہ اپنے ہاتھوں میں پرچم کا بانس تھامے کھڑا تھا، پرنس آندرے بکنوسکی پڑا تھا۔ اس کا کثیر مقدار میں خون بہہ رہا تھا اور غیر شعوری طور پر اس کی مدھم، کرب ناک اور طفلانہ کراہیں نکل رہی تھیں۔

شام ڈھلے اس کی کراہیں بند ہو گئیں اور وہ بالکل ساکت ہو گیا۔ اسے کچھ علم نہیں تھا کہ وہ کتنی دیر بے ہوش رہا ہے۔ چانک اسے دوبارہ محسوس ہوا کہ وہ زندہ ہے اور اس کے سر میں روح سوز اور دل خراش درد ہو رہا ہے۔

”وہ بلند دبالا آسمان، جسے میں نے آج ہی دیکھا تھا اور جس سے میں ازیں بیشتر کبھی آشنا نہیں تھا، کہاں ہے؟“ اس کے ذہن میں جس اولیں خیال نے رہ پائی، وہ یہی تھی۔ ”اس اذیت سے بھی میں پہلے آشنا نہیں تھا“

اس نے سوچا۔ ”نہیں، اس سے پہلے مجھے کچھ نہیں، بالکل کچھ نہیں معلوم تھا۔ لیکن میں ہوں کہاں؟“

وہ غور سے سننے لگا۔ اسے گھوڑوں کی ٹاپیں اور فرانسیسی میں باتیں کرنے کی آوازیں سنائی دیں۔ اس نے

اپنی آنکھیں کھول دیں۔ اس کے سر پر ایک بار پھر وہی بلند دبالا آسمان تھا۔ بادل اٹھ رہے تھے، وراں کے چٹائی

اسے نیلگوں ابدیت کی جھلک دکھائی دی۔ اس نے نہ اپنی گردن گھمائی اور نہ ان لوگوں کو دیکھا۔ گھوڑوں کی ٹاپیں

اور ان کی آوازیں اسے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ اس کے قریب پہنچ کر رک گئے ہیں۔

یہ نیولین تھا۔ اس کی معیت میں اس کے دو یڈی کاٹنگ تھے۔ میدان جنگ کا چکر لگانے کے بعد یوہا پارت

نے آخری حکم یہ دیا تھا کہ وہ توپیں، جو اوگنڈ ڈیم پر گولہ باری کر رہی ہیں، ان کی تعداد میں اضافہ کر دیا جائے۔ اور

اب وہ ان زحمیوں، اور ہلاک شدگان کا، جو میدان جنگ میں بکھرے پڑے تھے، جائزہ لے رہا تھا۔

”مجھے آدمی ہیں یہ!“ نیولین نے ایک رومی سپاہی کی، جس کا کام دستی بم پھینکنا تھا، لاش دیکھ کر کہا۔ (نہ پانی

وندھے منہ پڑا تھا، اس کا چہرہ زمین کے اندر دھنسا ہوا تھا، اس کی گردن سیاہ ہو چکی تھی اور اس کا ایک بازو، جو پیچھے ہی کڑچکا تھا، باہر کی طرف نکل ہوا تھا۔

”عالی جاہ! تو پولوں کا گولہ بارود ختم ہو چکا ہے،“ ایک ایجوٹٹ نے طماع دی وہ سیدھا اس توپ خانے سے، جو اگڈ ٹیم پر ہم پر سار ہا تھا، آ رہا تھا۔

”محفوظ سے کچھ منگوا لو،“ نیولین نے کہا۔ وہ چند قدم چلا، پھر رک گیا اور نیچے پرنس آندرے کو، جو پشت کے بل پڑا تھا، دیکھنے لگا۔ پرچم کا بالنس، جو پرنس آندرے کے ساتھ گرا تھا، اس کے قریب پڑا تھا۔ (فرانسیسی نشانی کے طور پر پرچم پہلے ہی اتار چکے تھے۔)

”کیا بڑھیا موت ہے“ نیولین نے بلکونسکی کو ٹشکی باندھ کر دیکھتے ہوئے کہا۔

پرنس آندرے کو حساس ہوا کہ یہ جملہ اس کے بارے میں کہا گیا ہے اور جس شخص نے یہ جملہ کہا ہے، وہ نیولین ہے۔ وہ سن چکا تھا کہ شکلم کو ”عالی جاہ“ کے لقب سے مخاطب کیا گیا ہے لیکن اسے یہ لحاظ بالکل اسی طرح سنائی دیے تھے، جس طرح مکھی کی بھینسناہٹ سنائی دیتی ہے۔ نہ صرف یہ کہ اسے ان میں کوئی دلچسپی نہیں تھی بلکہ اس نے ان کی طرف بھی کوئی توجہ نہیں دی تھی اور انھیں فوراً بھول گیا تھا۔ اس کے سر میں سوزش ہو رہی تھی، اسے محسوس ہو رہا تھا کہ اس کا خون ضائع ہو رہا ہے اور سے اپنے دپر، دور، بہت دور، بلند و بالا، ابدی آسمان نظر آیا۔ وہ جانتا تھا کہ یہ نیولین۔ اس کا ہیرا۔ ہے، لیکن اس لمحے اس کی روح اور بلند و بالا، بے پایاں آسمان کے مابین، جس پر بادل تیر رہے تھے، جو کچھ ظہور پذیر ہو رہا تھا، اس کے مقابلے میں نیولین اسے بالکل چھوٹا اور حقیر نظر آیا۔ اس لمحے اس کے لیے یہ بات قطعی بے معنی تھی کہ اس کے سر پر کون کھڑا ہے اور اس کے بارے میں کیا کہا جا رہا ہے۔ اسے تو صرف اس بات کی خوشی تھی کہ وہاں چند لوگ موجود ہیں، وہ صرف یہ چاہتا تھا کہ وہ اس کی مدد کریں اور اس کی زندگی، جواب اسے اتنی حسین نظر آ رہی تھی کہ اس کے بارے میں اس کا رویہ یکسر تبدیل ہو گیا تھا، بھل کرنے کے لیے ہاتھ پاؤں ہٹائیں۔ اس نے ہٹے جٹنے اور کچھ کہنے کے لیے انتہائی زبردست کوشش کی۔ اس نے ناتوانی سے اپنی ٹانگ کو جنبش دی اور اتنے مدھم اور مرےضاندہ انداز سے آہ بھری کہ خود اسے اپنے اوپر ترس آ گیا۔

”ارے، یہ تو زندہ ہے!“ نیولین نے کہا۔ ”اس نوجوان کو اٹھاؤ اور مرہم پٹی کی چوکی پر لے چلو!“

نیولین نے یہ کہا اور مارشل لائن کی جانب بڑھا۔ مارشل نے ہاتھ میں ٹوپی پکڑ رکھی تھی اور وہ مسکرا رہا تھا۔ وہ اسے فتح کی مبارک باد دینے آیا تھا۔

پرنس آندرے کو مزید کچھ یاد نہ رہا۔ اسے جس طرح اٹھا کر شریچر پر لٹایا گیا، منتقلی کے دوران میں جو ہلکولے آئے اور مرہم پٹی کی چوکی پر اس کے زخموں کو جس طرح کرایا گیا، اس سے اتنا شدید درد ہوا کہ وہ اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھا۔ اسے ہوش صرف اس وقت آیا جب شام و محل چکی تھی اور اسے دوسرے زخمی اور اسیر روسی انصران کے ساتھ ہسپتال منتقل کیا جا چکا تھا۔ اس منتقلی کے دوران میں اسے محسوس ہوا کہ اس کی کچھ توانائی عود کر آئی

ہے۔ اب وہ اپنے گرد پیش نظر میں دوڑانے بلکہ بکشی کرنے کے بھی قابل ہو گیا تھا۔

ہوش میں آنے کے بعد جو اولیں الفاظ اس کے کانوں میں پڑے، وہ ایک فرانسیسی کانوائے افسر کے تھے۔ وہ تیز تیز باتیں کر رہا اور کہہ رہا تھا

”ہمیں یہیں رک جانا چاہیے۔ امپراطور سیدھے ادھر تشریف لارہے ہوں گے اور وہ ان عالی نسب اسیروں کو دیکھ کر خوش ہوں گے۔“

”آج تو اتنی زیادہ تعداد میں قیدی بکڑے گئے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے کہ پوری روسی فوج ہی اسیر ہو گئی ہے۔ میرا خیال ہے کہ وہ انھیں دیکھ دیکھ کر اکٹا چکے ہوں گے،“ دوسرے افسر نے کہا۔

”بہر حال سنا ہے کہ بیادلی امپراطور الیکساندر کے تمام گارڈز کا کمانڈر ہے،“ اس نے ایک مجروح روسی افسر کی طرف، جو ہارس گارڈز کی سفید وردی میں بیوس تھا، اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

بلکونسکی نے پرنس ریپن (Repnin) کو پہچان لیا۔ اس سے اس کی ملاقات پیٹری برگ کی محفلوں میں ہوئی تھی۔ اس کے قریب ایک انیس سالہ نوجوان کھڑا تھا۔ وہ بھی ہارس گارڈز کا افسر تھا اور زخمی تھا۔

بوناپارٹ سرپنٹ گھوڑا اور ڈاٹا آیا۔ یہاں پہنچ کر اس نے رگام کھینچ لی۔

”یہاں سینٹر افسر کون ہے؟“ اس نے اسیروں کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

انھوں نے کرنل ریپن کا نام لیا۔

”تم امپراطور الیکساندر کے ہارس گارڈز رجمنٹ کے کمانڈر ہو؟“ نیولین نے پوچھا۔

”میں سکواڈرن کمانڈر تھا،“ ریپن نے جواب دیا۔

”تمھاری رجمنٹ نے اپنے فرائض احسن طریقے سے نبھائے؟“ نیولین نے کہا۔

”ایک عظیم سالار کی تعریف و تحسین سپاہی کا سب سے بڑا انعام ہے،“ ریپن نے جواب دیا۔

”میں اسے نہایت مسرت سے تم پر نچھاور کرتا ہوں،“ نیولین نے کہا۔ ”تمھارے قریب یہ نوجوان کون

ہے؟“ پرنس ریپن نے اس کا نام لیفٹیننٹ سنچے لن بتایا۔

نیولین اسے دیکھ کر مسکرایا اور بولا، ”بھی اس کی عمر ہی کیا ہے کہ ہمارے ساتھ بھڑنے آ گیا۔“

”نو عمری شجاعت و جرأت کے راستے میں دیوار نہیں بنتی،“ نوجوان نے زریب کہا۔ اس کا گلہ بندہ رہا تھا۔

”واہ، واہ! بہت عمدہ جواب ہے،“ نیولین نے کہا۔ ”نوجوان تم بہت ترقی کر دے گے۔“

پرنس آندرے جسے، امپراطور کے سامنے اسیروں کی نمائش مکمل کرنے کے لیے آگے لایا گیا تھا، اس کی توجہ

اپنی طرف مبذول کرنے میں ناکام رہا۔ نیولین اسے پہلے ہی میدان جنگ میں دیکھ چکا تھا اور نظر آ رہا تھا کہ

اسے یہ بات یاد ہے۔ اس نے اسی لقب ”نوجوان“ سے، جو بلکونسکی کو پہلی مرتبہ دیکھنے کے بعد اس کے ذہن میں

چپک گیا تھا، مخاطب کیا۔

”تو جوں، تم؟“ اس نے کہا۔ ”mon brave، کیا حال ہے؟“

اگرچہ پانچ منٹ قبل پرنس سندرے ن سپاہیوں سے، جو اسے اٹھ کر لارے تھے، چند الفاظ کہنے میں کامیاب رہا تھا، لیکن اب جب کہ اس کی نگاہیں نیولین پر جمی ہوئی تھیں، وہ خاموش رہا۔... نیولین جن چیزوں میں دلچسپی لے رہا تھا، وہ بلند و بالا، منصف مزاج اور کریم النفس فلک کے مقابلے میں، جسے وہ دیکھ اور سمجھ چکا تھا، اسے اتنی حقیر و معمولی محسوس ہوئیں، اور خود اس کا ہیرو، جو اپنی فتح دکا سرنی کے موقع پر اپنی جس بچا پوچ خود پسندی و مسرت کا اظہار کر رہا تھا، اس وقت اتنا گھٹیا دکھائی دیا کہ وہ اسے جواب دیے سے قاصر تھا۔

دراصل بات یہ تھی کہ ضعف و ناتوانی، خیابانِ خون، اذیت اور قرب مرگ نے اس کے ذہن میں جن متین و برتر خیالات کی رد چلا دی تھی، ان کے مقابلے میں اسے ہر چیز بیکار، فضول اور بے حقیقت نظر آ رہی تھی۔ وہ نیولین کی آنکھوں میں دیکھ رہا، اور سوچ رہا تھا کہ عظمت کتنی غیر اہم ہے، زندگی، جسے کوئی بھی سمجھ نہیں سکا ہے، کتنی بے حیثیت ہے اور سب سے بڑھ کو موت، جس کی کوئی زلی روح نہ تفہیم کر سکا ہے اور نہ شرت، کتنی بے وقعت ہے۔

امپراطور جواب کا انتظار کیے بغیر اپنے ایک انس کی طرف متوجہ ہوا اور بولا۔

”ان شرفاء کا پورا خیال رکھیں اور انھیں میرے کمپ میں پہنچادیں۔ میرے ڈاکٹر مانچے (Larrey) سے کہیں کہ وہ ان کے زخموں کا معائنہ کرے۔“ Au revoir پرنس ریپٹن۔“

اس نے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور ہو سے باتیں کرنے لگا۔ مسرت و اطمینان سے اس کا چہرہ دمک رہا تھا۔ ان سپاہیوں نے، جو پرنس سندرے کو اٹھا کر لائے تھے، وہ طلائی تعویذ، جو پرنس ماریا نے اپنے بھائی کے گلے میں حائل کیا تھا، اتار لیا تھا۔ لیکن جب انھوں نے ان اسیروں کے بارے میں امپراطور کو دوستانہ رویہ اپناتے دیکھا، انھوں نے یہ جھٹ پٹ اسے لوٹا دیا۔ پرنس آندرے کو یہ معلوم نہ ہو سکا کہ یہ اس کے گلے میں کیسے لٹکایا گیا یا کس نے لٹکایا ہے، لیکن اس کی نازک طلائی زنجیر جو شبیہ بنی ہوئی تھی، وہ اچانک اس کے سینے پر وردی کے باہر دکھائی دینے لگی۔

”اگر ہر چیز اتنی ہی واضح، غیر مبہم اور سیدھی سادی ہو،“ پرنس سندرے نے اس شبیہ پر، جو اس کی ہمشیرہ نے اسے ادب و احترام اور جوش و جذبہ سے اس کے گلے میں حائل کی تھی، نظریں نکالتے ہوئے سوچا، ”جتنی پرنس ماریا کو نظر آتی ہے تو اس سے بہتر بات اور کیا ہوگی، اور کیا ہوگی اگر آدمی کو یہ معلوم ہو کہ اس زندگی میں بدر کہاں ڈھونڈی جاسکتی ہے اور بعد از مرگ، مرتد سے آگے، کس چیز کی توقع کی جاسکتی ہے، اس سے بہتر بات اور کیا ہوگی، اور کیا ہوگی! اگر میں یہ کہہ سکوں ’خدایا! مجھ پر کرم فرما! مجھے کتنی خوشی اور سکون محسوس ہو۔ لیکن میں یہ کہوں کس سے؟ کسی اس طاقت سے۔ جس کی نہ تعریف ممکن ہے اور نہ تفہیم۔ جس سے میں نہ صرف یہ کہ استدعا

نہیں کر سکتا بلکہ جسے میں اپنے الفاظ میں بیان بھی نہیں کر سکتا۔ جو یا تو عظیم ترین ہے یا پھر کچھ بھی نہیں، اس نے اپنے آپ سے کہا۔ ”یہ پھر اس خد سے جسے ماریا نے اس تعویذ میں دی ہے؟ کچھ بھی تو یقینی نہیں ہے، بالکل یقینی نہیں ہے، سوائے اس بات کے کہ ہر شے، شے ہے، میری سمجھ میں تو صرف یہی چیز آتی ہے یا پھر کسی اور چیز کی، جو ناقابل فہم لیکن اہم ترین ہے، عظمت!“

سڑیچ حرکت کرنے لگے۔ ہر چکولے پر اسے دوبارہ ناقابل برداشت درد محسوس ہونے لگا۔ اس کا بخار بڑھنے لگا اور اس پر ہندی کی کیفیت طاری ہونے لگی۔ اپنے باپ، بیوی، مشیرہ اور اپنے بیٹے کی، جس نے مستقبل قریب میں جہنم لینا تھا، تصویریں، لڑائی سے ایک رات قبل اس نے ان کے لیے جو شفقت و محبت محسوس کی تھی، حقیر و کوتاہ قامت پولین کی شکل و صورت در سب سے بڑھ کر وہ بلند و بالا فلک۔ ہندی کی کیفیت میں اس کی آنکھوں کے سامنے جو سائے لہرا رہے تھے، یہ اس کے بڑے بڑے عناصر تھے۔

بالندہ کی پرسکون گھریلو زندگی، درطمانیت بخش مسرت کا خاکہ اس کے ذہن میں ابھرنے لگا۔ وہ اپنی اس مسرت سے لطف اندوز ہو رہا تھا کہ نتھے منے نیو مین کا ہیروئی نمودار ہونے لگا۔ معلوم ہوتا تھا کہ اس کا نقطہ نظر محدود ہے۔ وہ سنگدل نہ انداز سے دوسروں کی پتا پر خوش ہو رہا ہے۔ اس کے بعد پھر وہی شکوک و شبہات درہن اڑتیں اور کرب۔۔۔ صرف فلک امن و سکون کی نوید سنار ہا تھا۔

صبح کے طلوع ہونے پر اس کے تمام خراب بے ہوشی اور نسیان کی تاریکی اور انتشار میں مدغم ہو گئے اور اپنے وجود سے محروم ہو گئے۔ نیو مین کے ڈاکٹر لانگے کے خیال کے مطابق یہ کیفیت کچھ اس قسم کی تھی کہ صحت یابی کی نسبت موت کا امکان زیادہ تھا۔

”یہ شخص اعصابی اور صفرادی ہے،“ ڈاکٹر لانگے نے کہا۔ ”یہ صحت یاب نہیں ہو سکے گا۔“

ان دوسرے اشخاص کی طرح، جن کی صحت یابی کی کوئی امید نہیں رہ گئی تھی، پرنس آندرے کو بھی مقامی ہسپتالوں کی محافظت میں دے دیا گیا۔

دوسری کتاب

1806 کے اوائل میں گولڈی رستون چھٹی پر گھر آیا۔ دینی سوف بھی اپنے گھر وارانہڈ¹ جا رہا تھا۔ رستون نے اسے سکوتیک اپنے ساتھ سفر کرنے اور وہاں اپنے ہاں قیام کرنے کے لیے مارہ کر لیا۔ ماسکو سے دو منزل اور دینی سوف کی بے ایک دوست سے ملاقات ہوئی، اور اس نے اس کے ساتھ مل کر تین بوتل شراب پی۔ اور اس امر کے باوجود کہ گاڑیوں کی سسل آمدورفت کی وجہ سے سڑک پر جگہ جگہ گڑھے اور کھڈے بنے ہوئے تھے، وہ سلیج (برف گاڑی) کے نچلے حصے میں رستون کے برابر گھوڑے بیچ کر سویا رہا۔ جہاں تک رستون کا تعلق ہے، جوں جوں ماسکو قریب آتا گیا، توں توں اس کی بے چینی اور بے قراری میں اضافہ ہوتا گیا۔

”ابھی کتنا دور ہے؟ کتنا دور ہے؟“ اب، یہ ناقابل برداشت گللی کوچے، یہ دکانیں، ٹیکریوں کے سائن بورڈ، ٹریٹ لیمپ اور سلیجیں ختم ہونے میں ہی نہیں آتے!“ رستون جھنجھلا رہا تھا۔ وہ شہر کے دروازے پر اپنی اپنی چھٹی کے اجازت نامے پیش کر چکے تھے اور اب ماسکو کے کوچوں اور بازاروں میں سے گزر رہے تھے۔

”دینی سوف ہم پہنچ گئے!“ ارے، سو گئے!“ اس نے کہا اور اس نے اپنا سارا جسم یوں آگے کو جھکا لیا گویا کہ اس کے ایسا کرنے سے سلیج کی رفتار تیز ہو جائے گی۔

دینی سوف نے کوئی جواب نہ دیا۔

”چوک کے اس کونے میں گاڑی بان (اخار کا اڈا) ہے۔ اور وہ خود بخار ہے۔ اس کے پاس ابھی تک وہی کھوڑا ہے! اور وہ وہی ننھی ننھی دکان جہاں سے ہم جنریریڈ خرید کرتے تھے! ذرا جلدی کرو!“

”کون سا مکان ہے؟“ ڈرائیور نے پوچھا۔

وہ کھڑا رہا۔ متاثر نہ ہوا۔ نظر نہیں آتا؟ وہ ہمارا مکان ہے!“ رستون نے کہا۔ ”بالکل وہی مکان ہے، بالکل وہی!“

دینی سوف اور دینی سوف! سمجھو کہ ہم پہنچ گئے!“

دینی سوف نے اپنے سر اٹھایا اور کھنکار کر گلا صاف کیا لیکن وہ منہ سے کچھ نہ بولا۔

”دیسٹری!“ رستون نے اپنے وردی پوش ملازم سے کہا جو ڈرائیور کے ساتھ بیٹھا تھا۔ ”وہ ہمارے گھر کی

روشنیاں ہیں۔ ٹھیک ہے؟“

”جی، جناب، اور وہ روشنی آپ کے ابا جان کے سنڈی روم سے آرہی ہے۔“

”تو گویا وہ ابھی تک سوئے نہیں؟ تمہارا کیا خیال ہے؟ ہاں، ذرا دھیان رکھنا، فوراً میرا نیا کوٹ نکالنا۔ بھوننا، رستوف نے اپنی نئی نئی موچھوں میں انگلی پھیرتے ہوئے مزید کہا۔ ”خیر، چلے چلو!“ اس نے گلہ پھر کر ڈرائیور سے کہا۔ ”واسکا، بجاگ بھی جاؤ،“ اس نے دینی سون کی جانب، جو ایک بار پھر جھومنے لگا تھا، متوجہ ہو کر کہا۔ ”چھوٹا، بھئی جلد کرونا!۔ تمہیں دو ڈکاکے لیے چاندی کے تین روپل ملیں گے۔ لیکن جلدی کرو!“ رستوف نے چلا کر کہا حالانکہ سلیج اس کے گھر سے صرف تین مکان دور تھی۔

سے یوں لگ رہا تھا جیسے گھوڑے بالکل حرکت نہیں کر رہے۔ آخر کار سلیج دائیں طرف مڑی اور پورچ کے سامنے پہنچ کر رک گئی۔ رستوف کو اپنے سر کے دیر جانی پیچائی ٹنگائی، جس کے پلستر کا ایک کونا ٹوٹ چکا تھا، میڑھیاں اور پستی بان پتھر نظر آئے۔ اس نے گاڑی رکنے کا انتہا نہ کیا، نیچے جست لگائی اور قلائعیں بھرنا استقبالیہ کرے کی طرف بھاگ پڑا۔ مکان میں نہ تو زندگی کے کوئی آثار دکھائی دیتے تھے اور نہ وہ کسی مہمان کے استقبال کے لیے تیار نظر آتا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ اسے اس بات کی مطلق پروا نہیں کہ کون آیا ہے۔ استقبالیہ کرے میں کوئی تنفس نہیں تھا۔ ”نف میرے خدایا یہاں خیریت ہے؟“ رستوف نے سوچا۔ وہ ایک ٹائیے کے لیے رک گیا کیونکہ اس کا دل ڈوب رہا تھا۔ تاہم وہ پھر دوڑنے لگا اور جانا پہچانا میڑھا میڑھا زینہ چڑھنے لگا۔ دروازے کا دہی پرانا ہینڈل تھا، اور وہ ہمیشہ کی طرح اب بھی ڈھیل ڈھال تھا۔ اگر اس ہینڈل کی مناسب انداز سے صفائی نہ کی جاتی، کاؤنٹرس آگ کو رہا ہو جایا کرتی تھی۔ پیش داناں میں چربی کی صرب ایک موم جی جل رہی تھی۔

من رسیدہ یعنی نیکل صندوق پر سویا پڑا تھا۔ خدشہ گار پرا کوئی، جو اتنا ٹکڑا تھا کہ وہ عقب سے گاڑی اوپر اٹھ سکتا تھا، اس کے جوتوں پر رنگین پھندے ٹانگ رہا تھا۔ جب دروازہ کھل، اس نے نگاہیں اٹھا کر اوپر دیکھا اور سنا اس کے خوب آلودہ اور بے حس چہرے کی کایا کلپ ہو گئی۔ اب وہاں پر مسرت، استعجاب جھلک رہا تھا۔

”یار خیم! یا کریم! جھومنے کا ڈنٹ!“ اس نے اپنے نوجوان آقا کو پہچان کر با آواز بلند کہا۔ ”آپ؟ جھومنے صاحب!“

رستوف کو دیکھ کر پرا کوئی بالکل بوندل گیا اور اس کا جسم تھر تھرنے لگا۔ اسی ہیجانی کیفیت میں وہ ڈرائنگ روم کی طرف بھاگا۔ اس کا ارادہ غائب اس کی آمد کی اطلاع کرنا تھا۔ تاہم اس نے اپنا فیصلہ بدل دیا اور وہ واپس آ گیا اور اپنے نوجوان آقا کا شانہ چومنے لگا۔

”سب خیریت سے ہیں؟“ رستوف نے اپنا بازو پیچھے کھینچتے ہوئے پوچھا۔

”بالکل، بالکل! خداوند کا شکر ہے! سب خیر سلا ہے! خداوند کا شکر ہے! وہ ابھی ابھی سپر سے فارغ ہوئے ہیں۔ یوٹرا کیسی لینسی، مجھے اپنا چہرہ نو دیکھائیں!“

”ہر چیز بالکل ٹھیک ٹھاک ہے؟“
 ”خدا، دند کا شکر ہے! خدا دند کا شکر ہے!“

رستوف دینی سوف کو بالکل فراموش کر چکا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ کوئی دوسرا شخص اس کی آمد کا اعلان کرے۔ چنانچہ اس نے اپنا سموری کوٹ اتار اور بیچوس کے بل تیز تیز قدم اٹھاتا تاریک کشتہ بال روم میں داخل ہوا۔ ہر چیز جوں کی توں تھی۔ وہی تاش کی تہ کی میزیں اور وہی فانوس جس پر غلاف لیٹا ہوا تھا۔ لیکن کسی شخص کی نظر پہلے ہی فوجان آقا پر پڑ چکی تھی اور اس کے ڈرائنگ روم میں پہنچنے سے پیشتر ہی کوئی چیز برق رفتار طوفان کی مانند بغلی دروازے سے لپکی، اور اس سے بغل گیر ہونے اور تڑاق پڑاق اس کے بوسے سے لپکی۔ پھر اسی قسم کی دوسری اور تیسری مخلوق دوسرے دروازوں سے برآمد ہوئی، وہی بغل گیری، وہی چوہا چاٹی، وہی شور و شغب اور وہی خوشی کے آنسو۔ اسے کچھ پتا نہیں چل رہا تھا کہ یا یا کون ہے، متا شا کون ہے، اور پیتا کون ہے۔ ہر کوئی چلا رہا تھا، بولے جا رہا تھا اور ساتھ ساتھ اسے چومے جا رہا تھا۔ صرف اس کی اماں وہاں نہیں تھی۔ اور وہ یہ بات بھانپ گیا۔

”اور مجھے پتا ہی نہیں تھا۔ کلوٹسکا۔ میری جان!“

”وہ“ بھی گیا۔ ہمارا بیٹا، ہمارا لخت جگر... ڈرائنگ کو یا! کتا بدل گیا ہے!.. موسم بیاں کہاں ہیں؟...“

چائے؟“

”مجھے بھی بوسہ دو!“

”مجھے بھی، ڈرائنگ!“

سونیا، متا شا، پیتا، آنا میٹا کیلورنا، ویرا اور معمر کاؤنٹ، سبھی اس سے معاف کر رہے تھے، بغل گیر ہو رہے تھے۔ نوکر چاکر، خادائیں، ورمائیں سب اسی کمرے میں اکٹھا ہو گئے۔ وہ چلا رہے تھے اور آہ اور داہ کر رہے تھے۔ پیتا اس کی ٹانگوں کے ساتھ چبٹ گیا۔

”مجھے بھی!“ وہ چلائے جا رہا تھا۔

متا شانے، سے اپنی جانب گھسیٹ رہا اور اس کے چہرے پر بوسوں کی بارش کر دی۔ وہ دائیں بائیں، آگے پیچھے، اوپر نیچے، ایک ہی جگہ کمری کی طرح اچھل کود رہی تھی لیکن اس کے کوٹ کا دامن نہیں چھوڑ رہی تھی اور عالم انبساط میں چپخیں مار رہی تھی۔

چاروں اطراف محبت بھری نگاہیں تھیں۔ آنکھیں خوشی کے آنسوؤں سے چھلک رہی تھیں۔ ہونٹ بوس دکنار کے تھیں۔

گلاب کی طرح سرخ سونیا اس کے بازو سے چسپ ہوئی تھی۔ کامل مسرت نے اس کے چہرے کو فروزاں کر دیا تھا اور وہ دلہنہ شوق سے اس کی آنکھوں میں، جنہیں دیکھنے کی وہ دل میں تنہا سجائے بیٹھی تھی، جھانک رہی تھی۔ اب اس کا من سولہ کا ہو گیا تھا اور اس کا جو بن نکھر چکا تھا۔ اور اس پر مسرت اور دجا آفریں یجانی موقع پر اس کے

حسن کو خاص طور پر چار چاند لگ گئے تھے۔ وہ اسے مسلسل ٹنگی باندھے دیکھے جا رہی تھی اور وہاں سے نگاہیں اٹھانے کے لیے حوصلہ نہیں پارہی تھی۔ وہ مسکرائے جا رہی تھی اور اپنی سانس روکے ہوئے تھی۔ رستوف نے اسے متحرک نگاہوں سے دیکھا لیکن اس کی نگاہیں ابھی تک کسی ہستی کو ڈھونڈ رہی تھیں، اس کا انتظار کر رہی تھیں۔ مگر رسیدہ کاؤنٹس ابھی تک نہیں آئی تھی لیکن ایک ایک دروازے پر قدموں کی چاپ سائی دی تاہم یہ قدم اتنے تیز رفتار تھے کہ اسے خیال گزرا کہ یہ اس کی ماں کے نہیں ہو سکتے۔

تاہم یہ وہی تھی۔ وہ نئے گاؤں میں، جو اس نے نہیں دیکھا تھا کیونکہ یہ اس کی عدم موجودگی کے دوران میں بنویا گیا تھا، بلبوس تھی۔ دوسروں نے اسے چھوڑ دیا اور وہ اس کی طرف پکا۔ جب وہ دونوں ایک دوسرے کے قریب آئے، وہ اس کے سینے پر ڈھیر ہو گئی۔ اس کی آنکھوں سے اشکوں کا سیل رواں تھا، وہ اپنا چہرہ اوپر اٹھانے سے قاصر تھی کیونکہ وہ اسے اس کے ہونازوں کے کوٹ کی سرخسٹیاں پر گزر رہی تھی۔

دینی سوف کمرے میں آچکا تھا۔ کسی کی اس پر نظر نہیں پڑی تھی۔ وہ انھیں دیکھ رہا اور اپنے آنسو پونچھ رہا تھا۔
 ”واہیل دینی سوف، آپ کے صاحب زادے کا دوست،“ اس نے کاؤنٹ سے، جو اسے فہم یہ نگاہوں سے اس کی جانب دیکھ رہا تھا، اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا۔

”خوش آمدید مجھے معلوم ہے، معلوم ہے کہ آپ کون ہیں؟“ کاؤنٹ نے دینی سوف سے معاف کرتے اور اس کا بوسہ لیتے ہوئے کہا۔ ”نکولشکا نے مجھے آپ کے بارے میں لکھا تھا۔ نیتاشا، ویرا، ادھر آؤ۔ یہ دینی سوف ہیں۔“
 مسرت و وجد سے سرشار وہی چہرے دینی سوف کو، جس کے جسم پر باں اسی بال تھے، دیکھنے لگے اور انھوں نے اس کے گرد گھیرا ڈال لیا۔

”ڈارلنگ دینی سوف!“ نیتاشا منہائی۔ وہ خوشی سے پاگل ہوئی جا رہی تھی۔ وہ وقت میں بھرتی برق رفتاری سے اس کی طرف آئی، اس کے گلے میں بازو جمائے لیے اور اسے دھڑا دھڑا چومنے لگی۔

نیتاشا کی اس عجیبہ روزگار حرکت نے ہر شخص کو حواس باختہ کر دیا۔ دینی سوف کا چہرہ شرم سے سرخ ہو گیا لیکن وہ مسکرا رہا تھا۔ اس نے نیتاشا کا ہاتھ، اپنے ہاتھ میں لیا اور اس پر بوسہ دیا۔

دینی سوف کو اس کمرے میں، جون کے لیے تیار کیا گیا تھا، کچنچا دیا گیا اور تمام رستوف سنگ روم میں نکولشکا کے ارد گرد جمع ہو گئے۔

معمراً کاؤنٹس اس کے برابر بیٹھی تھی۔ وہ اس کا ہاتھ نہیں چھوڑ رہی تھی اور منٹ منٹ بعد اسے چومنے لگتی تھی۔ دوسروں نے اس کے ارد گرد ہنگامہ کر رکھا تھا۔ ان کی آنکھوں میں پیار تھا، پرستش تھی، وہ جدھر دیکھتا تھا، جولفظ کہتا تھا، جو اشارہ کرتا تھا، وہ سب کچھ اپنی نگاہوں میں سمورے تھے۔ اس کا بھائی اور انہیں اس کے قریب بیٹھنے کے لیے زور زبانی کر رہے تھے۔ ان کی توںکار اس بات پر ہو رہی تھی کہ اس کی چائے کون لائے، روہانی کون لائے۔ پائپ کون لائے۔

وہ اس پر جو محبت چھاور کر رہے تھے، اس نے اس کی پانچویں کھلا دی تھیں۔ لیکن ملاقات کا اولیس لودا تا کیف آگیا تھا کہ اسے اپنی موجودہ خوشی اور صوری محسوس ہو رہی تھی، وہ ہر آن مزید، ہل من مزید، ہل من مزید کی توقع کیے جا رہا تھا۔ سفر کے بعد مسافر اگلی صبح دس بجے تک سوے رہے۔

ماحقہ کمرے میں تینخیں، شمشیریں، تھپے، چڑی کیسے، کھلے ٹرنک اور گندے بوت بکھرے پڑے تھے۔ ہوتوں کے درمے جوڑے، جن پر بھیڑ لگے تھے، ابھی ابھی دیوار کے ساتھ رکھ دیے گئے تھے۔ ملازمین چاہچیاں، گرم پانی اور خوب جھانڈے پونچھے لمبوسات لا رہے تھے۔ وہاں مردانہ خوشبو یا تہ بھی تھیں اور تہا کو کی بو بھی۔

”ارے گولینکا۔ میرا پاپ!“ و سکا دینی سوف کی بھاری آواز سنائی دی۔ ”رستوف۔ اٹھ جاؤ!“ رستوف نے آنکھیں ملاتے، جو معلوم ہو رہا تھا کہ آپس میں جڑ گئی ہیں، گرم تنکے سے اپنا سر اوپر اٹھایا۔ اس کے ہال پر نشان اور ڈوبیدہ تھے۔

”کیوں؟ دیر ہو گئی؟“

”دیر؟ حضور دس بجنا چاہتے ہیں!“ انگلی کمرے سے، جہاں سے کلف لگے بیٹی کوٹوں کی سرسراہٹ اور لڑکیوں کی کھسک پھرا اور ہنسنے ہنسانے کی صدا سنیں بھی آ ہی تھیں، نتاشا کی آواز سنائی دی۔

دروازہ بھری برادر کھل اور کسی تیلی چیز، رہنوس، سیاہ زلفوں اور پر مسرت چہروں کی جھلک دکھائی دی۔ یہ نتاشا، سویا در پیتا تھے۔ وہ یہ معلوم کرنے آئے تھے کہ وہ اٹھ گئے ہیں یا نہیں۔

”گولینکا، اب اٹھ بھی جاؤ،“ دروازے پر ایک مرتبہ پھر نتاشا کی آواز سنائی دی۔ ”ابھی فوراً!“

دریں اثنا پیتا نے بیرونی کمرے میں شمشیریں ڈھونڈ لی تھیں اور اپنے قبضے میں لے لی تھیں۔ پھر اس نے اس لطف دہرے سے، جو فوجی بھائی کو دیکھ کر لڑکے ہلے محسوس کرتے ہیں، بیڈروم کا دروازہ کھول دیا۔ اسے اتنا بھی یاد نہ آ کہ نو خیز لڑکیوں کے لیے مردوں کو ایسی حالت میں، جب انھوں نے موزوں کپڑے نہ پہنے ہوں، دیکھنا مناسب نہیں ہے۔

”یہ آپ کی شمشیر ہے؟“ اس نے چلا کر پوچھا۔

لڑکیاں پچھلی طرف کود گئیں۔ دینی سوف نے اپنی بالوں بھری ٹانگیں کبیل میں چھپالیں اور خوف و ہراس کے عالم میں اپنے دوست سے استمداد کا جو یا ہوا۔ جس دروازے سے چٹا اندر آیا تھا، بند ہو گیا۔ باہر سے کھٹکھٹ کر چنے کی آوازیں آرہی تھیں۔

”گولینکا، اپنا ڈریسنگ گاؤن پہنو اور باہر آ جاؤ،“ نتاشا نے اپنے بھائی کو پکارا۔

”یہ شمشیر آپ کی ہے؟“ پیتا نے پوچھا، ”یا آپ کی؟“ اس نے غلامانہ احترام کے ساتھ دینی سوف سے، جس کی سیاہ آنکھیں تھیں، اپنی طب ہو کر پوچھا۔

رستوف نے تڑپ کر پھرت اپنے پاؤں میں کچھ پہنا، اپنا ڈریسنگ گاوڈن گھسیٹ کر جسم پر ڈال اور باہر نکل آیا۔
 نٹاشا ایک مہینہ والا بوٹ پہن چکی تھی اور دوسرے میں چار پازل ڈال رہی تھی کہ وہ اندر آ گیا۔ سونیا بیٹھنے سے قبل
 اپنی سکرٹ کو غمرے کی طرح پھلانے کے لیے لنو کی مانند گھوم رہی تھی۔ دونوں کے نیو فری ڈریس تھے اور بالکل
 ایک جیسے تھے۔ اور دونوں کے چہرے تازہ، گلابی اور شاداں تھے۔ سونیا نے وہاں سے بھاگنے میں ہی خیریت جانی
 لیکن نٹاشا نے اپنے بھائی کا بازو تھما، اسے سنگ روم میں لے گئی اور وہاں دونوں پا میں کرنے لگے۔ وہ ہزاروں
 معمولی معمولی چیزوں کے متعلق، جو صرف انھیں کی دلچسپی کی تھیں، دتا بڑ توڑ ایک دوسرے سے سوالات کر رہے تھے اور
 ہر شکل ایک دوسرے کو ان کے جوابات دینے کا موقع دے رہے تھے۔ دونوں میں سے جو بھی جوابات بھی کہتا، نٹاشا
 اس پر ہنس پڑتی، اس لیے نہیں کہ وہ بہت دلچسپ باتیں کر رہے تھے بلکہ اس لیے کہ وہ اتنی شاداں و فرحان تھی کہ وہ
 اپنی سرٹ پر قابو نہیں پا رہی تھی اور بات بے بات ہنس رہی تھی۔

”واہ واہ! بہت خوب! بہت اعلیٰ!“ وہ ہر بات کے جواب میں کہے جا رہی تھی۔

رستوف کو گھر سے نکلے اٹھارہ مہینے بیت چکے تھے اور اسے محسوس ہوا کہ اس عرصے کے دوران میں اس کا چہرہ
 خالص، پچکانہ سکر اہٹ سے عاری رہا ہے۔ لیکن محبت کی اس حرارت بخش کرنوں کے زیر اثر اس کی یہ سکر اہٹ ایک بار
 پھر بوٹ آئی۔ اس کی روح جھوم رہی تھی اور اس کا چہرہ کھل اٹھا تھا۔

”نہیں۔ لیکن سنو۔ اب ہم بالغ مرد بن گئے ہو۔ ٹھیک ہے نا؟ میں بہت خوش ہوں کہ تم میرے بھائی ہو۔“
 نٹاشا نے اپنے بھائی کی مونچھوں کو چھوتے ہوئے کہا۔ ”میں یہ جانتا چاہتی ہوں کہ تم مردنی الحقیقت ہوتے کیا
 ہو؟ کیا تم ہمارے جیسے ہو؟“

”نہیں۔ لیکن سونیا کیوں بھاگ گئی؟“

”آخ، یہ بڑی لمبی داستان ہے تم اسے کیا کہہ کر بلاؤ گے۔ تم یا آپ؟“

”چاہیں۔ جیسا موقع ہوا،“ رستوف نے کہا۔

”اسے آپ ہی کہو۔ عنایت ہوگی۔ وجہ میں بعد میں بتاؤں گی۔“

”لیکن کیوں؟“

”بہت اچھا، پھر لو، میں ابھی بنائے دیتی ہوں۔ تم جانتے ہو کہ سونیا میری عزیز تر سہیلی ہے۔ ایسی سہیلی
 کہ میں نے اس کی خاطر اپنا بازو جھالیا۔ لو جو کچھ لو۔“

اس نے اپنے ماں، مہین اور نرم و نازک بازو سے ٹمبل کی اسٹین، وپرکھسکاری اور کہنی سے خاصا اوپر شانے
 کے نزدیک سرخ نشان دکھایا (یہ نشان اتنی اونچی جگہ تھا کہ بال گاؤن میں بھی مستور رہتا۔)

”یہ میں نے اس سے کیا کیونکہ میں اسے اپنی محبت کا ثبوت دینا چاہتی تھی۔ میں نے صرف یہ کیا کہ مسٹر
 آگ پر گرم کیا اور اسے یہ یہاں دیا۔“

اس کمرے میں جو کبھی اس کی پڑھائی کا کمرہ ہوتا تھا، اپنے بازوؤں میں کشن تھامے، صوفے پر بیٹھے اور مناشا کی آنکھوں میں، جن میں دیوانگی کی حد تک جوش و خروش جھلک رہا تھا، رستون بچپن درخاندان کی حدود میں داخل ہو گیا۔ اگرچہ یہ دوسروں کے لیے کوئی معافی نہیں رکھتی تھیں تاہم زندگی میں جو چند اشیاء سے عظیم ترین مسرت بہم پہنچاتی تھیں، یہ ان میں شامل تھیں۔ چنانچہ محبت کا ثبوت بہم پہنچانے کے لیے بے بازو کو جلا لینے کا نفل اسے مہل نظر نہ آیا۔ وہ اس کی گتہ کھٹکتا تھا اور اسے کوئی حیرت نہ ہوئی۔

”اور پھر؟ یا بس؟“

”خیر، ہم ایسی سہیلیاں ہیں، اتنی دوست ہیں، کہ بس کچھ نہ پوچھواری وہ مسطر دلی بات۔ وہ بس فضول سی حرکت تھی۔ لیکن ہاری دوستی امر ہے۔ جب وہ کسی سے محبت کرتی ہے، زندگی بھر کے لیے اس کی ہو جاتی ہے۔ مجھے اس کی سمجھ نہیں آتی۔ میں بڑی لٹلگو ہوں فوراً بھول جاتی ہوں۔“

”خیر، اس کے بعد۔“

”خیر، وہ مجھ سے اسی طرح محبت کرتی ہے۔۔۔ اور تم سے بھی۔“

اچانک مناشا کا چہرہ شرم سے سرخ ہو گیا۔

”خیر، تمہیں یاد ہے کہ تمہارے جانے سے پہلے... خیر، وہ کہتی ہے کہ تمہیں یہ سب کچھ بھول جانا ہوگا۔ وہ کہتی ہے، میں ان سے ہمیشہ یاد کرتی رہوں گی لیکن انہیں آزاد کر دوں گی۔“ ہے ناکتنی خوبصورت۔ اور شاندار بات اسے نا؟ بے حد شاندار نہیں؟“ مناشا نے یہ سب کچھ اتنی متانت اور جذبے سے پوچھا کہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ اس بارے میں آہوں اور شکوں سے بات کر چکی ہے۔

رستون سوچ میں پڑ گیا۔ ”میں کبھی اپنے قول سے نہیں پھرتا؟“ اس نے کہا۔ ”علاوہ ازیں سونیا اتنی پرکشش ہے کہ کوئی احمق ہی اس مسرت کو ٹھکرا سکے گا۔“

”بالکل ٹھیک کہا تم نے!“ مناشا نے حلق پھاڑ کر کہا۔ ”وہ اور میں اس بارے میں پہلے ہی بات کر چکی ہیں۔ ہمیں معلوم تھا کہ تم بھی کہو گے لیکن اس سے بات نہیں بنے گی۔ کیا تم سمجھتے نہیں کہ اگر تم نے یہ کہا۔ اگر تم نے اپنے آپ کو اپنے قول کا پابند سمجھ لیا، تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اس نے جو کچھ کہا ہے، کسی خاص مقصد کے پیش نظر کہا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ تم اس سے کسی مجبوری کے تحت شادی کر رہے ہو اور یہ بالکل غلط بات ہوگی۔“

رستون سمجھ گیا کہ وہ اس معاملے میں خوب سوچ بچ کر چکی ہیں۔ اگرچہ گزشتہ رات سونیا کے حسن نے اس کی توجہ اپنی جانب مبذول کرائی تھی لیکن آج جب اس نے اس کی جھلک دیکھی، وہ پہلے کی نسبت کہیں زیادہ حسین نظر آئی۔ وہ سولہ برس کی پرکشش دہشیزہ تھی اور بظاہر اس کے ساتھ دیوانگی کی حد تک محبت کرتی تھی (اس بارے میں اسے ایک سیکنڈ کے لیے بھی کوئی شبہ نہ ہو)۔ ”پھر میں اس سے کیوں محبت بلکہ شادی نہ کروں؟“ اس نے سوچا۔ ”لیکن فی الحال نہیں۔ ابھی میرے سامنے اور قسم کی خوشیاں اور دلچسپیاں ہیں۔ ہاں،“ اس نے نتیجے پر پہنچتے

ہوے دل میں کہا۔ ”وہ اس مسئلے کے متعلق خوب چھاں پھٹک کر چکی ہیں۔ مجھے آزادی رہنا چاہیے۔“

”اچھا تم ٹھیک ہی کہتی ہو،“ اس نے کہا۔ ”چھوڑو اس قصے کو، اس بارے میں ہم بعد میں بات کریں گے۔ میں بے حد خوش ہوں کہ میں تم لوگوں میں دوبارہ پہنچ گیا ہوں۔“ اس نے مزید کہا۔ ”اور ہاں، تمہارا اپنے بارے میں کیا خیال ہے۔ تم ابھی تک بورس کے نام کی مالا جپ رہی ہو؟“

”چھوڑو، کیا فضول بات لے بیٹھے ہو؟“ ناسا نے کھلکھلا کر ہنستے ہوئے کہا۔ ”میں نے اس کے بارے میں۔ اور نہ کسی دوسرے کے بارے میں کبھی سوچا تک نہیں۔ مجھے ان باتوں سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔“

”واقعی؟ پھر اب تمہیں کن باتوں میں دلچسپی ہے؟“

”مجھے؟“ ناسا نے دہرایا۔ ”ور اس کا چہرہ خوشی سے دسکتے لگا۔“ تم نے کبھی ڈو پورخ کو دیکھا ہے مشہور و معروف فرانسیسی رقاصہ؟۔ پھر تم کچھ نہیں سمجھ پاؤ گے۔“

ناسا نے اپنے بارودوں کو خم دیا، رقاصوں کی، نندا اپنی سکرٹ پھیلائی، چند قدم پیچھے بھاگی، مڑی، ٹکلی بھری، پھرتی سے اپنے ننھے پاؤں کو ایک دوسرے سے منسلک کیا، اور پھر چند قدم پنجوں کے بل چلی (وہ یہ سب کچھ پہلے ڈانس کے انداز میں کر رہی تھی)۔

”دیکھو، میں کیسے کھڑی ہوں؟ دیکھو!“ لیکن وہ اپنے پنجوں پر تادیر کھڑی نہ رہ سکی۔ ”مجھے اب اس میں دلچسپی ہے! میں کبھی شادی وادی نہیں کروں گی!۔ میں رقاصہ بننا چاہتی ہوں۔ بس یہ بات کسی کو بتانا نہیں۔“

رستوف اتنے زور زور اور مسرت سے بھرپور قہقہے لگانے لگا کہ جب ان کی آوازیں بیڈروم میں دیٹی سوف کے کانوں تک پہنچیں، اسے رشک آنے لگا اور خود سناٹا بھی اس کا ساتھ دیے بنانہ رہ سکی۔

”کیا خیال ہے، یہ خوبصورت منصوبہ نہیں ہے؟“ وہ بار بار پوچھتے جا رہی تھی۔

”اچھا ہے۔ تو تم اب بورس سے شادی نہیں کرو گی؟“

ناسا کے تلووں سے آگ لگ گئی۔ ”مجھے کسی سے شادی وادی نہیں کرنا۔ جب وہ آئے گا، میں خود اسے بتا دوں گی!“

”واقعی؟“

”لیکن یہ فضول بات ہے۔“ ناسا بے لگام بولتی چلی گئی۔ ”خیر، یہ بتاؤ، دیٹی سوف اچھا آدمی ہے؟“

”بہت۔“

”اچھا، پھر خدا حافظ، جاؤ اور کپڑے پہنو۔ کیا وہ بہت خوف ناک ہے؟۔ وہ، یعنی دیٹی سوف؟“

”خوف ناک کیوں؟“ نکولا کی نے پوچھا۔ ”نہیں، واسکا بہت نفیس آدمی ہے۔“

”تم اسے واسکا کہتے ہو؟ بڑا مضحکہ خیز نام ہے واقعی بہت نفیس آدمی ہے؟“

”بے حد نفیس!“

”خیر، جلدی کرو۔ ہم ناشتا کھائے کریں گے۔“

دور تا شاہی اور بیلے ڈانس کی طرح اٹھتی اور بیچوں کے بل چلتی کمرے سے باہر نکل گئی۔ لیکن وہ مسکرا رہی تھی اور اس طرح صرف چند رہ سہا لکھڑا و دیشیزہ ہی، جو بہت خوش ہو، مسکرا سکتی ہے۔

جب ڈرائنگ روم میں رستونف کا سونیا سے آمنا سامنا ہوا، وہ شرم سے سرخ ہو گیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس سے کس طرح پیش آئے۔ گزشتہ شب ملاقات کے اولین پرست لکھوں میں انھوں نے ایک دوسرے کو جہان تھا لیکن انھیں محسوس ہو رہا تھا کہ آج اس کا سول ہی پیدا نہیں ہوتا۔ وہ محسوس کر رہا تھا کہ اس کی والدہ اور، بشیرگان سمیت ہر شخص کی نگاہیں اسی پر مرکوز ہیں اور وہ یہ جاننے کے لیے بے تاب ہیں کہ وہ اس کے ساتھ کس قسم کا رویہ اختیار کرتا ہے۔ اس نے اس کے ہاتھ پر بوسہ دیا اور اسے ”آپ“ اور ”سونیا“ کہہ کر نئی طب کیا لیکن جب ان کی نگاہیں چار ہوئیں، وہ ایک دوسرے کو تم کہہ رہی تھیں اور پرطف بوسوں کی حکایت سنارہی تھیں۔ اس کی نظریں سعانی کی طلب گار تھیں کیونکہ اس نے مناشا کے ذریعے اسے اس کا قوں یا دولانے کی جرأت کی تھی اور وہ اس کی محبت کا شکریہ ادا کر رہی تھیں۔ ادھر اس کی نگاہیں اس کا شکریہ ادا کر رہی تھیں کہ اس نے اسے بندھنوں سے آزاد کرنے کی پیشکش کی تھی، اور اسے بتا رہی تھیں کہ خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہو، وہ اس کی محبت سے کبھی دستکش نہیں ہوگا کیونکہ اس سے محبت نہ کرنا ناممکن تھا۔

”کتنی عجیب بات ہے،“ ویرا نے عمومی خوشی کا لہجہ منتخب کرتے ہوئے کہا، ”کہ سونیا اور نکولیز کا ایک دوسرے کو ”آپ“ کہہ رہے ہیں اور ایک دوسرے کے ساتھ اجنبیوں کی طرح پیش آ رہے ہیں۔“

ویرا نے درست بات کہی تھی جیسا کہ وہ عام طور پر درست باتیں ہی کہتی تھی لیکن اس کی اکثر باتوں کی طرح اس کی اس بات پر بھی ہر شخص۔ صرف سونیا، نکولائی اور مناشا ہی نہیں بلکہ معمر کاؤنٹس کو بھی، جسے یہ فکر کھائے جا رہی تھی کہ اس کا بیٹا سونیا سے جو محبت کرتا ہے، وہ اس کے راستے کی دیو رہن جائے گی اور وہ کسی صاحب حیثیت گمر نے میں شادی نہیں کر سکے گا۔ بے چینی محسوس کرنے لگا اور کاؤنٹس تو بیر بہوٹی کی، غند سرخ ہو گئی۔

رستونف کو یہ دیکھ کر بہت حیرت ہوئی کہ دینی سوف بن ٹھن کر۔ اس کی وردی نئی نکور تھی، بالوں سے پوماد اور جسم سے پینٹ کی لپٹیں آ رہی تھیں۔ ڈرائنگ روم میں آیا تھا۔ وہ ڈرائنگ روم میں بھی اتنا ہی بانکا سجیلا تھا جتنا کہ میدان جنگ میں ہوتا تھا اور وہ گئے خواتین و حضرات، وہ ان کے ساتھ توقع سے بڑھ کر ملنساری سے پیش آ رہا تھا۔

2

نکولائی رستونف کے فوج سے واپس ماسکو پہنچنے کے بعد اس کے خاندانی حلقے نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا تھا۔ وہ ان کا سہارا، ہیرا اور ڈرائنگ نکولس کا تھا۔ رشتے داروں کی نگاہوں میں وہ پرکشش، خوب زو، شائستہ اور گہرہ جوان تھا۔ اس کے احباب اسے ہزاروں کا خوش شکل لیفٹیننٹ اور طرح دار قاص تصور کرتے تھے۔ ان کے خیال کے مطابق

ماسکو میں دوشیراؤں کے رشتے کے لیے اسے بہترین جواز شمار کیا جاسکتا تھا۔

رستوف ماسکو کے بچے بچے سے واقف تھے اور اس سارے عمر کا ڈنٹ کے پاس روپیہ پیسہ بھی داخل تھا کیونکہ اس سال اس کی زمینیں از سر نو پٹے پر چڑھائی گئی تھیں۔ چنانچہ نکورائی کو اپنا ”دکلی گھوڑا“، نئے فیشن کی خوبصورت برنس، جو ابھی ماسکو میں کہیں نظر نہیں آئی تھی اور تازہ ترین زیرائیں کے انتہائی نوکیے بوٹ، جن کے ساتھ چاندی کے چھوٹے چھوٹے مہینے پوست تھے مل گئے۔ اور وہ اپنا وقت انتہائی خوشگوار انداز سے گزار رہا تھا۔ گرچہ اپنے آپ کو زندگی کی پرانی زگر کے مطابق ڈھالنے میں اسے کچھ وقت لگا لیکن دوبارہ گھر پہنچ کر اس کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ تھا اور وہ خوب لطف اندوز ہو رہا تھا۔ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ وہ بلوغت کی حدود میں داخل ہو گیا ہے اور لڑکے سے مرہون بن گیا ہے۔ انجیل مقدس کے امتحان میں نکل ہونے پر اس کا مایوسی کے اچھا سمندر میں ڈوب جانا، سلیج ڈرائیور کو مارا لگی کرنے کے لیے اس کا وقتاً فوقتاً گاڑی سے ادھار لینا، چوری چھپے سونیا سے یوں دکنا کرنا، اسے یہ تمام باتیں اور حرکتیں اب بچکانہ دکھائی دیتی تھیں اور وہ ان سے بے انتہا دور نکل آیا تھا۔ اب وہ ہوزاروں کی رجسٹر میں لیفٹیننٹ تھا، فوجی کوٹ، جس میں روپلی موبف لگی ہوئی تھی، پہنتا تھا، اپنے سینے پر عسکری تمغہ، مینٹ چارج کر اس، آویزاں کرتا تھا ریس سے وابستہ مشہور اور معزز اشخاص کی، جو عمر میں بھی اس سے بڑے تھے، صحبت میں اٹھتا بیٹھتا تھا اور ایک ریس کے لیے خود اپنے ”دکلی“ گھوڑے کی تربیت کر رہا تھا۔ شہر کی ایک خیابان پر ایک خاتون رہائش پذیر تھی، وہ ایک شام اس کے ہاں بھی گزرا آیا تھا، رخاروں کے ہاں جب محفل رقص (بال) منعقد ہوئی تھی، (پولستان رقص) بازو کا آغاز اسی نے کیا تھا۔ اس نے نیلڈ مارشل کامینسکی کے ساتھ جنگ پر بحث و تمجیس کی تھی۔ وہ اکثر انگلش کلب جایا کرتا۔ ایک چالیس سالہ کرل کے ساتھ، جس سے دینی سوف نے اس کا تعارف کرایا تھا، دوستی کا م بھرتا تھا۔

ماسکو میں قیام کے دوران میں اس کا اپر طور کے لیے جوش و خروش قدرے ٹھنڈا پڑ گیا تھا کیونکہ وہ اس سے ملاقات نہیں کر سکا تھا تاہم وہ اکثر اس کا اور اس کے ساتھ اپنے لگاؤ کا ذکر کرتا رہتا تھا۔ وہ اشارتا اور کنایا جتنا کرتا تھا کہ وہ اس ضمن میں انھیں ساری باتیں نہیں بتا سکتا کیونکہ اپنے اپر طور کے بارے میں اس کے جو احساسات ہیں، انھیں سمجھنا ہر آدمی کے بس کی بات نہیں۔ اس زمانے میں عام لوگ ذرا الیکٹرانک پاولودج (ماسکو کے باشندے اسے ”انسان کے بھیس میں فرشتہ“ قرار دیتے تھے) سے جس طرح ٹوٹ کر پیار کرتے تھے، وہ اس میں بدول و جان ان کے ساتھ تھا۔

فوج میں دوبارہ جانے سے قبل ماسکو میں اپنے اس مختصر قیام کے دوران میں رستوف سونیا کے زیادہ قریب نہ آ سکا بلکہ اس کے برعکس وہ اس سے دور ہوتا گیا۔ وہ بے حد خوش رہا، خوش اندام اور پر کشش تھی اور بظاہر اس پر جان چھڑکتی تھی لیکن وہ اوائل شباب کے اس دور میں سے گزر رہا تھا جب انسان یہ محسوس کرتا ہے کہ سے بہت کچھ کرنا ہے لیکن اس بہت کچھ کے لیے اسے وقت نہیں ملتا۔ اس عمر میں نوجوان بندھنوں سے مدد ہے اور اپنی آزادی کو، جو اسے بہت سی دوسری چیزوں کے لیے درکار ہوتی ہے، بہت بیش قیمت گردانتا ہے۔ اپنے ماسکو میں

قیام کے دوران میں اسے جب بھی سونیا کا دھیان آتا، وہ اپنے آپ سے کہا کرتا ”خوب س جیسی اور بہت، جنہیں میں نے ابھی دیکھ بھی نہیں ہے، مل جائیں گی۔ محبت کے لیے بھی بہت وقت پڑا ہے اور جب جی چاہے گا، یہ کام بھی کر لیں گے، فی الحال میرے پاس فرصت نہیں ہے۔“ علاوہ ازیں اسے یہ محسوس ہوتا تھا کہ سوانی محبت اس کی مردانہ وجہت کے شایان شان نہیں۔ وہ رقص کی محفوں میں جاتا، درخواتین کی صحبتوں میں اٹھتا بیٹھا ضرور لیکن بننا اس طرح تھا جیسے وہ یہ سب کچھ اپنی مرضی کے خلاف کر رہا ہو۔ گھڑ دوڑ میں جانا، انگلش کلب میں اٹھنا بیٹھنا، دینی سونے کے ساتھ بلا ٹوشی کرنا اور، ایک خاص مکان کے چکر کاٹنا۔ یہ سب دوسری نوعیت کے امور تھے اور ہانگے جیسے ہونڈار کے لیے بالکل موزوں۔

وائل مارچ میں من رسیدہ کاؤنٹ الیا آندر بیچ رستوف انگلش کلب میں پرنس ہگ راتیاں کے اعزاز میں ضیافت کا اہتمام کرنے میں بری طرح مصروف تھا۔

ڈریسنگ گاؤن میں لمبوس وہ بال روم کے چکر لگا رہا تھا اور ڈنر کے لیے ایسپیریٹس، تازہ کھیروں، سٹرابیری، پچھڑوں کے گشت اور پچھل کے متعلق کلب کے دروغے اور کلب کے مشہور و معروف میٹینج، فیکوئسٹ، کو احکام دے رہا تھا۔ کاؤنٹ اسی تاریخ سے، جس روز کلب کا قیام عمل میں آیا تھا، اس کا رکن اور گیمٹی کا ممبر چلا رہا تھا۔ باگراتیاں کے اعزاز میں اس ضیافت کا انتظام اس لیے اس کے سپرد کیا گیا تھا کیونکہ ایسے اشخاص، جنہیں اس کی طرح لمبی چوڑی، در پر تکلف دعوتیں کرنے کا تجربہ تھا، بہت کم تھے بلکہ ان کی تعداد انگلیوں پر گنی جاسکتی تھی اور ایسا شخص تو ڈھونڈنے سے بھی نہ ملتا جو ضرورت پڑنے پر اس قسم کی دعوتوں کے کامیاب انعقاد کے لیے اپنا روپیہ صرف کر سکتا یا صرف کرنے کے لیے تیار ہو سکتا۔ داروغہ اور میٹینج، اس کے احکام بخوشی من اور بجا رہے تھے کیونکہ وہ خوب جانتے تھے کہ اس نوعیت کی ضیافت سے، جس کے اہتمام میں اس کے علاوہ اور کوئی شخص شامل نہیں تھا اور جس پر ہزاروں روپے اٹھ جانا تھے، وہ اچھی خاصی کمائی کر سکتے ہیں۔

”اور تاج خردی⁷ تو لازماً ہونا چاہیے۔ تمہیں معلوم ہی ہے کہ بیٹیوں⁸ میں بھرتا ہے۔“

”گو بائین اقسام کے ٹھنڈے کھانے ہوئے؟“ میٹینج نے پوچھا۔

کاؤنٹ اپنا سر کھراٹے اور سوچنے لگا۔

”تمہیں تو ماری ہیں، اس سے کم نہیں ہو سکتے۔۔۔ اڈے کی ساس⁹ والا سدا، ایک تو یہ ہوا۔۔۔“ اس نے اپنی ایک انگلی مردڑے ہوئے کہا۔

”پھر میرے ذمے بڑی sterlets¹⁰ منگوانا ہیں؟“ داروغہ نے دریافت کیا۔

”ہاں بھائی! اگر اٹھوں نے قیست نہ بھی گھٹائی، پھر بھی منگوانا تو پڑے گی۔“

”ارورے، میں تو بھول ہی گیا تھا۔ ہمیں دسترخوان پر ایک اور چیز کا اضافہ کرنا ہوگا۔ اف، میرے خدا یا،“

”پچاس روپے کر بیٹھ گیا۔“ پھول کون مائے گا؟ متکا، اے متکا، گھوڑا پکڑو۔ درپک کر جاگیر (یہ جاگیر ماسکو کے

بالکل قریب تھی) پر جاؤ، اس نے اپنے سیوارڈ سے کہا، جو اس کے پکارنے پر حاضر ہو گیا تھا۔ ”اور ہاغبان، کم سے کہو کہ وہ فوراً کھیت مزدوروں کو کام پر لگا دے اور اسے یہ بھی بتاؤ کہ گرین ہڈیوں میں جو کچھ بھی ہے، نمدے میں لپیٹ کر یہاں پہنچا دے۔ جہ تک میرے پاس یہاں دو گیلے موجود ہونا چاہئیں۔“

متعدد مزید احکام سنانے کے بعد وہ آرام کی غرض سے اپنی ”فل کاؤنٹس“ کے پاس جانا چاہتا تھا کہ اسے کوئی ہم بات یاد آگئی، وہ واپس مڑا، اس نے داروغے اور میر مطبخ کو بلایا اور انھیں اضافی ہدایات دیتے لگا۔ دروازے پر مردانہ قدموں کی ہلکی پھلکی چاپ اور مہیزوں کی جھنکار سنائی دی اور نو جوان کاؤنٹس، جس کی چھوٹی چھوٹی سیاہ مونچھیں تھیں، جس کا ماسکو میں آرام وہ زندگی گزارنے کے بعد رنگ نکھرا آیا تھا اور جو پہلے کی نسبت کہیں زیادہ خوب رو نظر آ رہا تھا، اندر آیا۔

”آہ، میرے پیارے بیٹے، میرا سر گھوم رہا ہے!“ بوڑھے نے اپنے بیٹے کی جانب قدرے ڈھٹائی سے مسکرا کر دیکھتے ہوئے کہا۔ ”اگر تم میرا ذرا سا ہاتھ بنا دو... مجھے ابھی گلوکاروں کا انتظام کرنا ہے۔ رکشہ تو میرا ہوا ہوگا۔ کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ ہم جیسی سنگیت کاروں کو بھی بلالیں؟ تم فوجی حضرات اس قسم کی چیزیں پسند کرتے ہو۔“

”بابا، یہ کیا ہو رہا ہے؟ میرا خیال ہے کہ پرنس باگ راتیاں نے شون گراہرن کے معرکے کی تیاریوں کے سلسلے میں اتنی کٹھنوں میں نہیں اٹھائی ہوں گی جتنی آپ یہاں اٹھا رہے ہیں، اس کے بیٹے نے مسکراتے ہوئے کہا۔

معرک کاؤنٹس نے جھوٹ موٹ غصے کا اظہار کرتے ہوئے کہا ”تمہیں باتیں بنانا خوب آتا ہے۔ مزہ تو جب ہے کہ خود کام کر کے دکھاؤ!“

کاؤنٹس میر مطبخ کی طرف، جو بڑی سمجھ بوجھ اور احترام کے ساتھ کبھی بیٹے اور کبھی باپ کو دیکھ رہا تھا، متوجہ ہوا۔

”ٹھیکو تست، یہ آج کل کے نوجوان آخر چاہتے کیا ہیں؟“ اس نے کہا۔ ”ہم بڑھوں ٹھنڈوں کا مذاق اڑاتے؟“

”بالکل یور ایکسی لینسی، وہ صرف مزیدار کھانے کھانا جانتے ہیں۔ لیکن ان کھانوں کا اہتمام کیسے کرنا ہے اور انھیں دسترخوان پر کیسے سجانا ہے۔ ان باتوں سے انھیں کوئی سروکار نہیں۔“

”ٹھیک، بالکل ٹھیک!“ کاؤنٹس نے با آواز بلند کہا اور ناچتے کودتے اور اپنے بیٹے کو دونوں ہاتھوں سے پکڑتے ہوئے چل کر کہنے لگا ”پچو، اب بچ کر کہاں جاؤ گے؟ ٹھنڈے ٹھنڈے درگھوڑوں والی سلج پکڑو، بڑو خوف کے ہاں جاؤ اور ان سے بولو کہ کاؤنٹ الیا آندر بچ نے سٹرا بیری اور تازہ اناس منگوائے ہیں۔ تمہیں یہ اور کبھی نہیں ملیں گے۔ اگر وہ گھر پر موجود نہ ہوئے، پھر تمہیں اندر جانا ہوگا اور پرنسوں سے ملنا ہوگا۔ جب وہاں سے فارغ ہو جاؤ، پھر راز گولائی کو جیوان اپاٹکا کو پتا معلوم ہے۔ جاؤ، وہاں، لوشکا جیسی کو۔ وہی تمہیں یاد ہوگا، جس نے قازقوں کے سفید کوٹ میں کاؤنٹ ارلوف کے ہاں رقص کیا تھا۔ تلاش کرو اور اسے میرے پاس لے آؤ۔“

”جیسی لڑکیاں بھی لے آؤں؟“ نکولائی نے پتے ہوئے پوچھا۔

”مٹھہر ہے، ذرا!“

اسی سچے آئنا میخائیلوونا دے بے پاؤں کمرے میں داخل ہوئی۔ اس کے چہرے پر تردد اور مصروفیت کی چھپ گئی ہوئی تھی اور اس کے ساتھ ہی اس کے چہرے پر ہمیشہ کی طرح مسکینی ٹپک رہی تھی۔ اگرچہ یہ ادنیٰ شاذ ہی کوئی آٹا ہوگا جب وہ اس کے سر پر، جب وہ محض ڈریسنگ گاؤن میں ملبوس ہوتا تھا، نازل نہیں ہوتی ہوگی۔ لیکن اس کا پناہ حال تھا کہ اس موقع پر وہ سدا ہڑبزا جاتا تھا اور اپنے پٹناوے کے لیے معافی کا خواستگار ہو جاتا تھا۔

”ہائی ڈیز کاؤنٹ“ اس نے جھپٹتے، شرارتے، لچاتے اور اپنی سسکیں بند کرتے ہوئے کہا، ”چھوڑیں، کیوں شرمندہ کرتے ہیں ایز خوف کے ہاں میں خود جاؤں گی۔ نو جوان بڑ خوف ابھی ابھی لوٹے ہیں اور ہمیں جو کچھ (دیکھ رہے) وہ سب ان کے گرین ہاؤسوں سے مل جائے گا۔ مجھے بہر حال ان سے منافی ہے۔ انہوں نے مجھے بورس کا خط بھیجا ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ اب بورس سٹاف کا رکن بن گیا ہے!“

کاؤنٹ کی باچھیں کھل گئیں کہ آئنا میخائیلوونا نے اس کا ایک کام اپنے ذمے لے لیا ہے اور اس نے حکم دیا کہ اس کے بے چھوٹی بدگامی میں گھوڑا جوت دیا جائے۔

”بڑ خوف سے کہنا کہ وہ بھی ضیافت میں آجائے۔ میں اس کا نام فہرست میں درج کر لوں گا۔ اس کی زوجہ محترمہ اس کے ساتھ آئی ہے؟“

آئنا میخائیلوونا نے اپنی نظریں اوپر اٹھائیں اور اس کے چہرے پر گہری دای چھ گئی۔

”میرے دوست، افسوس، صدا افسوس، وہ انتہائی بدقسمت انسان ہے،“ اس نے کہا۔ ”جو اطلاعات ہمیں موصول ہوئی ہیں، اگر وہ درست ہیں، پھر یہ معاملہ بہت بھیانک صورت اختیار کر گیا ہے۔ اور جب ہم اس کی خوشیوں کا جشن منا رہے تھے، اس قسم کی صورت حال ہمارے خواب و خیال میں بھی نہیں آئی تھی! اور یہ نوجوان بڑ خوف، کتابتد پایہ اور فرشتہ صفت آدمی ہے، جی ہاں، مجھے دل کی گہرائیوں سے اس پر ترس آرہا ہے۔ میں جیسے نیسے اس کی دس جوئی کی کوشش کروں گی۔“

”کیا ہوا؟ کیا ہوا؟“ باپ بیٹے دونوں رستونوں نے پوچھا۔

آئنا میخائیلوونا نے گہری آہ بھری۔

”سننا ہے کہ مار یا ایوانوونا کے بیٹے دلو خوف نے اس کی بیوی کی عزت خاک میں ملا دی ہے،“ اس نے پراسرار انداز سے سرگوشی کرتے ہوئے کہا۔ ”میر نے اس شخص کو ہاتھوں ہاتھ لیا، پیٹرز برگ میں اسے اپنے گھر کھانے کی دعوت دی اور اب اب جب کہ وہ یہاں آگئی ہے، یہ مؤافقتہ پرواز اس کے پیچھے پیچھے بھیج گیا ہے!“ آئنا میخائیلوونا نے کہا۔ وہ بظاہر تو میسر سے ہمدردی جتنا چاہتی تھی لیکن اس کا لہجہ اور اس کا نیم تبسم اس بات کی غریزی کھارہ تھا کہ وہ غیر ارادی طور پر اس نئے فتنہ پرداز کی، جیسا کہ اس نے دلو خوف کو کہا تھا، ناز برداری کر رہی ہے۔ ”سننا ہے کہ اس بلائے ناگہانی نے اس بے چارے کی کمر توڑ دی ہے۔“

”بہر حال، ان سے کہیں کہ وہ کلب ضرور آئیں۔ یہ معاملہ خود بخود ختم ہو جائے گا۔ یہ ضیافت بہت پر تکلف

ہوگی!

اگلے روز تین مارچ کو دوپہر کے ایک بجے کے ذرا بعد انگلش کلب کے اڑھائی سوار کان اور ان کے پیاس مہمان اپنے مہمان خصوصی اور آسٹری میم کے ہیرد پرنس باگ رتوں کی آمد کا انتظار کر رہے تھے۔

اوسٹریٹس کے معرکے کی خبر جب ماسکو پہنچی، شہر کے لوگ بالکل بوکھلا گئے۔ اس زمانے میں روسی فتوحات کے اتنے عادی ہو چکے تھے کہ جب ایک شکست کی خبر موصول ہوئی، اسے بعض لوگوں نے صحیح ماننے سے انکار کر دیا جب کہ دوسروں نے اس کی توجیہ یوں کی کہ لڑنا استثنائی نوعیت کے حالات پیش آئے ہوں گے، جیسی یہ غیر معمولی واقعہ رہا ہوا۔ جب دسمبر میں یہ خبر گردش کرنے لگی، انگلش کلب میں، جہاں شہر کی اہم، نامی گرامی اور باخبر ستیاں جمع ہوتی تھیں، جنگ اور آخری معرکے کے بارے میں ایک لفظ تک نہ کہا گیا۔ معلوم ہوتا تھا کہ سب لوگوں نے سب کشائی نہ کرنے کی سازش کر رکھی ہے۔ وہ اشخاص۔ کاؤنٹ رستوپ چن، پرنس یوری ولادی میردوچ دلگاروی، والیوینف، کاؤنٹ مارکوف، اور پرنس دیاز۔ مسکی۔ جو گفتگو کا رخ متعین کیا کرتے تھے، کلب سے غیر حاضر ہونے لگے اور بچے گھروں میں اپنے بے تکلف احباب سے ملنے ملنے لگے۔ چنانچہ ماسکو کے دو باشندے (جن میں کاؤنٹ الیا آندریچ رستوف شامل تھا)، جو اپنے خیالات و آراء دوسروں سے مستعار لیا کرتے تھے، کچھ عرصہ جنگ کے بارے میں کوئی واضح رائے قائم نہ کر سکے اور نہ انھیں کوئی ایسا شخص مل جوا ان کی رہنمائی کر سکتا۔ ماسکو کے ہاسیوں کو محسوس ہو رہا تھا کہ کہیں نہ کہیں کوئی نہ کوئی گزیر ضرور ہے لیکن ان کے لیے یہ جاننا دشوار تھا کہ وہ خبر بد کے متعلق کیا سوچیں۔ چنانچہ انھوں نے عافیت اسی میں جانی کہ خاموشی بہتر ہے۔ تاہم کچھ دنوں کے بعد زعمائے شہر، جو کلب میں دوسروں کی آراء پر اثر انداز ہوتے تھے، بالکل اسی طرح اپنے گھروں سے برآمد ہوئے جس طرح جیوری کے ارکان جیوری روم سے برآمد ہوتے ہیں۔ اب ہر شخص اپنے خیالات کا اظہار واضح اور دونوں انداز سے کرنے لگا۔ کبھی کسی نے یہ نہیں مانتا تھا کہ روسی شکست کھا گئے ہیں اور اگر انھیں کوئی بتاتا بھی کہ وہ میدان جنگ میں پٹ گئے ہیں، انھیں کبھی یقین نہ آتا کیونکہ ان کے خیال کے مطابق اس قسم کا وقوعہ کبھی پیش ہی نہیں سکتا تھا۔ چنانچہ اب جب یہ واقعہ ظہور پذیر ہو گیا، اس کی وجوہات تلاش کی گئیں، پھر ہر بات سورج کی طرح عیاں ہو گئی اور ماسکو کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک لوگ ایک ہی قسم کی باتوں کی جگائی کرنے لگے۔ شکست کی جو وجوہات دریافت کی گئیں، وہ یہ تھیں: آسٹریوں کی غداری، محکمہ رسد کی خامیاں اور نالائقیاں، پولستانی جرمن ہرزے بڑیوکی اور فرانسیسی جرنیل لانزخون کی شک حرای، کوتوزوف کی نااہلی اور زار کی نوعمری اور نا تجربہ کاری (اور یہ آخری بات سرگوشیوں میں کہی جاتی تھی)، کہ اس نے نکتے اور بے حیثیت لوگوں پر اعتماد کیا۔ لیکن ہر شخص یہ بات دلوے سے کہتا تھا کہ فوج، یعنی روسی فوج، فقید المثال ہے کیونکہ وہ جرات و شجاعت کے بھڑانہ کارنامے سرانجام دے چکی ہے۔ عام سپاہی، انسرا اور جرنیل۔ بلا تخصیص سبھی ہیرو تھے۔ لیکن ہیروؤں کا بھی ہیرو باگ راتیاں تھا۔ وہ شون گر برن اور اوسٹریٹس کے معرکوں میں کارہائے نمایاں سرانجام دے چکا تھا۔ اوسٹریٹس کے

میدان سے جب فوج پسپا ہونے لگی، اس کا کالم واحد کالم تھا جس میں کوئی بھگدڑ نہیں مچی، اس نے اپنے سے دس گنا دشمن کو اپنے قریب بھی نہ پھٹکنے دیا اور جب پسپا ہوا، قاعدے قریب سے ہوا۔ اور جس چیز نے اسے ہاسکو کا عوامی ہیرو بننے میں مدد دی، وہ یہ تھی کہ اس کا اس شہر سے کوئی تعلق و ربط نہیں تھا۔ اس کی ذات کے حوالے سے عام روئی سپاہی کے لیے، جس کی نہ کوئی سفارش ہوتی ہے اور نہ جسے سازشوں سے کوئی سروکار ہوتا ہے، عزت و احترام کا اظہار کیا جاسکتا تھا۔ لوگوں کے ذہنوں میں یہ بات بیٹھ چکی تھی کہ عام روئی سپاہی وہی ہے جو اطالیہ کی مہموں میں، درباروں کی کمر میں زبردست کارنامے سرانجام دے چکا تھا، اس لیے وہ اس کی تحسین کرنے کا جواز تلاش کر سکتے تھے۔ اس کے علاوہ باگ راتیاں کو اس لیے بھی عزت افزائی کا مستحق ٹھہرایا گیا تھا کیونکہ کو تو زردف کے بارے میں ناپسندیدگی اور ناخوشی کا اظہار کرنے کا یہ ممکنہ طور پر بہترین طریقہ تھا۔

”اگر باگ راتیاں کا کوئی وجود نہ ہوتا، تو اسے لازماً گھڑنا پڑتا،” بذلہ سخ شن نے والٹیر کی پیروڈی کرتے ہوئے کہا۔

کو تو زردف کے متعلق ایک لفظ بھی نہ کہا گیا۔ جو چند ایک اشخاص اس کا نام زبان پر لاتے بھی تھے، وہ زیر لب اسے بے نقط سناتے تھے، اسے درباری، تھالی کا بیٹنگن اور بواہوس کہتے تھے۔

”سارے شہر میں پرنس دنگارو کی کاہیہ قوں گونج رہا تھا،” جو شخص مٹی سے ٹھیکر بنائے گا، اس کے ہاتھ پاؤں بکے تو ہوں گے۔“ یہ قول ایک طرف ہماری سابقہ فتوحات کی یاد دلاتا تھا، دوسری طرف اب ہمیں جو شکست کا سامنا کرنا پڑا، اس کے لیے مرہم کا کام دیتا تھا۔ پھر رستوپ جن کی یہ بات بھی بچے بچے کی زبان پر تھی ”فرانسیس سپاہی کو آمادہ پیکار کرنے کے لیے غلو سے کام لینا پڑتا ہے۔ جرمنوں کو منطقی دلائل سے قائل کرنا پڑتا ہے کہ آگے بڑھنے کی نسبت راہ فرار اختیار کرنے میں زیادہ خطرات نہیں ہیں لیکن جہاں تک روسیوں کا تعلق ہے، انھیں روکنا پڑتا ہے اور سمجھنا پڑتا ہے کہ وہ آہستہ روئی سے کام میں!“ اوٹو ٹرنس کے میدان میں ہمارے افسروں اور جوانوں نے جس نام نہاد، نفردی شجاعت اور مردانگی کے جوہر دکھائے تھے، ان کے متعلق ہر روزی سے نئی کہانیاں تراشی جا رہی تھیں۔ ایک نے پرچم کی حفاظت کی تھی، دوسرے نے نصف درجن فرانسیسیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا، تیسرا تو تہ پانچ توپوں میں گولے بھرتا رہا۔ وہ لوگ جو برگ کے نام سے بھی واقف نہیں تھے، کہتے تھے کہ جب اس کا دیباہ ہاتھ ڈھکی ہو گیا، اس نے ہائیں ہاتھ میں ششیر پکڑی اور غنیم کی صفوں میں گھس گیا۔ بلونسکی کے متعلق کسی نے ایک لفظ بھی نہ کہا۔ صرف ان لوگوں کو، جو اسے قریب سے جانتے تھے، ملال تھا کہ وہ عالم شباب میں جان ہار گیا اور اپنے پیچھے جلد بیوی ورنکی باپ چھوڑ گیا تھا۔

نمنا مارچ کو انگلش کلب کے تمام کمرے گفتگو کی بجائے ہاٹ سے گونج رہے تھے۔ جس طرح موسم بہار میں شہد کی مکھیاں

ہجوم درہجوم امنڈ آتی ہیں، بیچ بچ کے ارکان اور مہمان ادھر ادھر گھوم پھر رہے تھے، بیٹھے تھے کھڑے تھے، سوٹنگ کرتے اور ایک دوسرے سے علیحدہ ہو جاتے تھے۔ بعض درویشوں اور بعض ڈریس کوٹوں¹² میں بلنس تھے۔ چند ایک نے اپنے بالوں میں پاؤڈر چھڑکا ہوا تھا اور ان کے ابدان روی کفستان میں بلنوف تھے۔ ہر دروازے پر نوکر چاکر اور بیرے کھڑے تھے۔ انھوں نے مخصوص دریاں، اونچی جرابیں اور تسمے دار جوتے پہنے ہوئے تھے اور سردی پر وگلیں، جن پر پاؤڈر چھڑکا ہوا تھا، لگائی ہوئی تھیں۔ ان کی پوری کوشش تھی کہ وہ کلب کے ارکان اور ان کے مہمانوں کی ایک حرکت کا پیشگی اندازہ لگالیں تاکہ انھیں سوزوں انداز سے اپنی خدمات پیش کر سکیں۔ جو لوگ کلب میں موجود تھے، ان کی اکثریت معزز اور بزرگ اشخاص پر مشتمل تھی۔ ان کے چہرے کشادہ اور پر اعتماد، نگاہیں موٹی اور آواز میں اور اشارے پر حزم تھے۔ اس طبقے کے ارکان اور مہمان اپنی مخصوص، مکی نشستوں پر متمکن تھے اور اپنے مخصوص دائمی حلقوں میں مجالس جمائے ہوئے تھے۔ اقلیت کبھی کبھار یا اتفاقاً آئے والے مہمانوں پر مشتمل تھی۔ بہ لوگ زیادہ تر نوجوان تھے اور ان میں دیٹی سون، رستوف اور دلوخوف (جو حال ہی میں بحال ہو چکا تھا اور ایک بار پھر سمیونووسکی رجسٹر میں انسر تھا) وغیرہ شامل تھے۔ ان نوجوانوں، خاص طور پر ان میں سے ان اشخاص کے، جو افسر تھے، چہروں سے صاف عیاں تھا کہ وہ بزرگوں کا احترام ضرور کرتے ہیں لیکن اس انداز سے، جیسے وہ ان پر احسان کر رہے ہوں۔ وہ پرانی نسل کو یہ کہتے محسوس ہوتے تھے: ”ہم آپ لوگوں کے ساتھ عزت و احترام سے ضرور پیش آ رہے ہیں لیکن یہ سب بھو میں کہ مستقبل کے مالک ہم ہیں۔“

نیس و تسکی وہاں کلب کے پرانے رکن کی حیثیت سے آیا تھا۔ میئر، جس نے بیوی کے حکم پر سر کے بال بڑھا لیے تھے، درچشمہ اتار دیا تھا، کمر د میں بے مقصد گھوم پھر رہا تھا۔ اس کا لباس فیشن ابل تھا لیکن اس کے چہرے پر اداسی اور حزن و ملال ٹپک رہا تھا۔ دوسرے مقامات کی طرح یہاں بھی اس کی امارت کی بنا پر اس کے تلوے چائے والوں نے اس کا گہراؤ کر رکھا تھا۔ اسے ان خوشامدیوں اور کاسہ لیسوں کو لالہ بالی انداز سے نظر انداز کرنے اور ان کے ساتھ حقارت کا برتاؤ کرنے کی عادت پڑ چکی تھی اور یہاں بھی وہ ان کے ساتھ اسی قسم کا سلوک کر رہا تھا۔

عمر کے اعتبار سے اس کا تعلق نوجوان نسل سے بنتا تھا لیکن اس کی دولت، ضرور سوخ اور تعلقات نے اسے بزرگ اور قابل احترام مہمانوں کی صف میں لاکڑا رکھا تھا۔ چنانچہ وہ کبھی ایک حلقے میں بیٹھ جاتا اور کبھی دوسرے میں۔ بعض بزرگ ترین اور ممتاز ترین ارکان اپنے اپنے حلقوں کے مرکز میں گئے تھے اور ان مشہور و معروف اصحاب کی گفتگو سننے کے لیے ابھی بھی احترام و تکریم کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ سب سے بڑے حلقے کاؤنٹ رستوپچین، والیوئیف ورناری شمس کے، روڈر دینے ہوئے تھے۔ رستوپچین بتا رہا تھا کہ راہ فرار اچھا رکھنے والے آسٹریا نے کس طرح روسیوں کو پاؤں تلے روند ڈالا، اور روسیوں نے کس طرح سنگینوں کی نوک پر ان میں سے اپنا راستہ بنایا۔ والیوئیف بڑے رازدارانہ انداز سے اپنے حلقے کو مطلع کر رہا تھا کہ یواریف کو پیٹرن برگ سے اس مقصد کے لیے یہاں بھیجا گیا ہے کہ وہ یہ معلوم کرے کہ اوٹرلٹس کے بارے میں ہالیان ماسکو کیا سوچ رہے ہیں۔ تیسرے

عرب میں ناری شکن سڑوی جنگی کونسل کے اس اجلاس کی، جس میں آسٹروی جرنیلوں کی حماقتوں کے جواب میں سواروف نے مرغ کی طرح بانگ دی تھی، دروداد بیان کر رہا تھا۔ شبن نے، جو قریب کھڑا تھا، مذاق اڑانے کی کوشش کی۔ اس نے کہا ”معلوم ہوتا ہے کہ کو تو زوف سواروف سے اتنی آسانی کی بات بھی نہ سیکھ سکا کہ مرغ کی طرح بانگ دینے کا کیا طریقہ ہے۔“ لیکن کلب کے بزرگ ارکان بذلہ سچ کی طرف شتم گیس نگاہوں سے دیکھنے لگے۔ دریوں انھوں نے اسے بدور کرا دیا کہ کو تو زوف کا اس انداز سے ذکر کرنے کا نہ یہ موقع ہے ورنہ مقام۔

کاؤنٹ الی آندرچ رستوف، جن کے چہرے پر تعجیل اور ذہنی مصروفیت ٹپک رہی تھی، نرم دلائم بوٹ پہنے ڈانگ روم در ذرائع روم کے، مین گھوم پھر رہا تھا۔ وہ اہم اور غیر اہم میں امتیاز کیے بغیر رواداری سے مہمانوں کا، جن سب کو وہ جانتا تھا، استقبال کر رہا تھا۔ اس دوران میں اس کی نگاہیں وقتاً فوقتاً اپنے خوش اندام اور ہانکے جیلے بیٹے کو ڈھونڈنے لگتیں۔ جب وہ اسے نظر آجاتا، وہ جی بھر کر سے دیکھتا اور خوشی کے عالم میں اسے آنکھ مارتا۔ نو جوان رستوف ایک درتچے کے قریب دلوخوف کے ساتھ کھڑا تھا۔ وہ دلوخوف سے حال ہی میں متعارف ہوا تھا اور اس کی بہت قدر کرتا تھا۔ من رسیدہ کاؤنٹ ان کے پاس آیا اور اس نے دلوخوف کے ساتھ مصافحہ کیا۔

”مجھے اسید ہے کہ آپ ہمارے ہاں تشریف لائیں گے اور ہمیں ملاقات کا موقع دیں گے... تو آپ میرے بیٹے کے دوست ہیں۔ وہاں اکٹھے رہے۔ اور کٹھے بہادری کے کارنامے سرانجام دیتے رہے... اناخہ۔“ اس کی آگناجج mon vieux.. کیا حال چل ہیں؟“ لیکن چستر اس کے کہ وہ بزرگ شخص سے، جو دھر سے گزر رہا تھا، علیک سلیک ختم کرنا، عام بل چل گئی۔ ایک ملازم بھاگتا بھاگتا اندر آیا اور اس نے ہیبت زدگی کے عالم میں اعلان کیا۔

”وہ تشریف لے آئے ہیں!“

گھنٹیاں بجے لگیں، شیوار ڈاک کرا آگے بڑھے اور مہمان، جو مختلف کمروں میں بکھرے ہوئے تھے، بڑے ڈرائنگ روم میں یوں ہجوم کرنے لگے جیسے چھانچ میں گندم کے دانے اکٹھے ہو جاتے ہیں اور ان سب کی استقبالیہ کمرے کے دروازے پر بھیڑ لگ گئی۔

باگ رتیاں پیش دلائن کے دروازے پر ٹوپی یا شمشیر کے بغیر نمودار ہوا۔ اس نے کلب کے رواج کے مطابق بیرونوں چیزیں ہاں پورٹر کے سپرد کر دی تھیں۔ اپنی استرخانی ٹوپی یا ایسی چابک کے بجائے، جن کے ساتھ ماتھ رستوف نے اسے اسٹریٹس کے سسر کے سے قبل دیکھا تھا، وہ اب نئی ورنیٹاٹک وردی میں بلبس تھا۔ اس کے تمام روی، اور غیر ملکی تہفے شمسو شار آف سینٹ جارج اس کے بائیں سینے پر آویزاں تھے۔ معلوم ہوتا تھا کہ اس نے اپنے مالوں اور موٹھیوں کی تازہ تازہ تراش خراش کرائی ہے لیکن اس سے اس کی شکل و صورت میں بہتری کے کوئی آثار پیدا نہ ہوئے، بلکہ پہلے سے کچھ بدتر ہی ہو گئی۔ اس کے اطوار سے کچھ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ سیلے پر آنکلا

ہو۔ شادمانی سے اس کی باچھیں کھل جا رہی تھیں لیکن اس کی یہ بھولی بھالی مسرت اس کے ٹھیلے اور شہزاد جسم پر چڑ نہیں رہی تھی بلکہ اس نے اس کی صورت قدرے مریضانہ خیز بنا دی تھی۔ ہرکلی سیف اور فیورور پیترو درج پو رول جو اس کے ساتھ آئے تھے، دروازے کے پاس رک گئے تاکہ مہمان خصوصی کی حیثیت سے وہ ان سے پہلے اندر داخل ہو سکے۔ باگراتیاں کو قدرے خفت محسوس ہوئی اور وہ ان کی شائستگی سے فائدہ اٹھانے پر متامل تھیں۔ دروازے پر معمولی سی تاخیر ہو گئی تاہم بالآخر وہ پہلے داخل ہونے پر آمادہ ہو گیا۔ اس نے استقبال کر کے چوٹی فرش کو اٹک لیکن بھونڈے انداز سے پار کیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اپنے ہاتھوں کا کیا کرے۔ اسے گلہ باری کے دوران میں ایک ایسے کھیت میں سے، جس میں تازہ تازہ دہل چلا یا گیا ہو، گزرنا ہوتا جیسا کہ اس سے شون گرابرن کے میدان میں کر سکر رجنٹ کی قیادت کرتے ہوئے کیا تھا، تو اسے زیادہ آسانی محسوس ہوئی۔ کلب کمیٹی کے ارکان نے اس کا پہلے دروازے پر استقبال کیا، اس کی شان میں چند کلمات کہے کہ وہ اتنی ہاموہ ہستی سے مل کر کتنا خوش ہوئے ہیں اور انھوں نے اس کے جواب کا انتظار کیے بغیر، یوں کہیے کہ اسے اپنے قبضے میں لے لیا اور اسے ڈرائنگ روم کی طرف لے چلے۔ کمرے میں داخل ہونا ناممکن تھا کیونکہ لمبروں اور مہمانوں کی بھڑگی ہوئی تھی وہ ایک دوسرے کے ساتھ دھکم پیل کر رہے تھے اور اچھل اچھل کر ایک دوسرے کے کندھوں کے اوپر سے اس کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے یوں تنگ دروازے پر تھے جیسے وہ انسان نہیں، کوئی نایاب درندہ ہو۔ کاؤنٹ الیا آندرچ رستوف جتنے مسکراتے اور بار بار ”مائی ڈیئر، رستہ چھوڑ دو، مائی ڈیئر، رستہ چھوڑ دو“ کی گردن کرتے کسی بھی دوسرے شخص کی نسبت زیادہ زور آوری سے کام لیتا ہجوم میں گھستا چلا گیا۔ یوں وہ مہمانوں کو ڈرائنگ روم میں سے گھیا اور وہاں انھیں مرکزی صوفے پر بٹھا دیا۔ کلب کی کرنا دھرتا اور ممتاز شخصیتوں نے مہمانوں کے گرد گھیرا ڈال دیا۔ کاؤنٹ الیا آندرچ رستوف ایک بار پھر ہجوم میں دھکم پیل کرتا کمرے سے باہر نکل گیا اور ایک منٹ بعد کمیٹی کے ایک رکن کے ساتھ دوبارہ آن موجوں ہوا۔ کمیٹی کا یہ رکن چاندی کی خاصی لمبی چوڑی کشتی لے کر آیا تھا۔ اس نے یہ کشتی باگ رتیاں کی خدمت میں پیش کر دی۔ کشتی پر تعسیدہ جوہیر کی شان میں لکھا اور چھاپا گیا تھا، رکھا ہوا تھا۔ جب باگ رتیاں کی نظر کشتی پر پڑی، اس کے پسینے چھوٹ گئے اور وہ ادھر ادھر جھانکنے لگا جیسے استبداد کا متلاشی ہو۔ لیکن تمام نگاہیں مطالبہ کر رہی تھیں کہ وہ سر تسلیم خم کر دے۔ باگ رتیاں کو محسوس ہوا کہ وہ ان لوگوں کے رحم و کرم پر ہے، چنانچہ اس نے برعزم انداز سے کشتی کو دونوں ہاتھوں سے اٹھ لیا اور وہ غصیلی اور بدست آمیز نظروں سے کاؤنٹ کو، جو اسے وہاں مانے کا ذمے دار تھا، گھورنے لگا۔ تاہم کوئی شخص آگے بڑھا، اس نے ازرہ سروت یہ کشتی اس سے پکڑ لی (دورنہ بخاہر بھی نظر آتا تھا کہ وہ اسے غروب آفتاب تک تھامے رہے گا اور کھانا بھی اسے اٹھائے اٹھائے زہر مار کرے گا) اور اس کی توجہ اشعار کی جانب مبذول کرائی۔ ”بہت اچھا، میں انھیں پڑھ لیتا ہوں،“ باگ رتیاں کا چہرہ مہرہ کہتا محسوس ہو رہا تھا۔ اس نے اپنی نڈھال نگاہیں کاغذ پر جمائیں اور نہایت سنجیدگی اور اسہاک سے پڑھنے لگا۔ تاہم شاعر نے اپنا کلام اٹھایا اور بزبان خویش بلند آواز سے پڑھنا شروع کر دیا۔ باگ رتیاں نے گردن جھکالی اور سننے لگا۔

تم ایسا مرد کے عہد حکومت کی شان و شکوہ ہو
 تم ہمارے ٹائیٹل کے تخت کے محافظ ہو!
 تم نڈر و سپاہی ہو لیکن شفیق و بہریان سردار
 میدان جنگ میں تم سیزر لیکن گھر میں رہتی اس¹⁵۔

منکبر بچہ لیکن بھی سمجھ گیا ہے کہ تم کون ہو
 اب اس میں تخی جرات نہیں کہ وہ تمہارے
 لشکر کے ساتھ نکلے،
 باگراتیاں، کوئی نہیں جو تمہیں ہراسکے۔

لیکن قصیدہ ابھی ختم نہیں ہوا تھا کہ کلب کا در و درخشاں اندر آیا اور اس نے بلند اور پر زور آواز میں اعلان کیا کہ ”کھانا لگا دیا گیا ہے!“ دروازہ کھول دیا گیا اور ڈرائنگ روم میں پولستانی رقص ”پوانیز“ کی دھنوں کی صدا گونجنے لگی۔ ”یہ در و درخشاں تمہیں فتح مبارک ہو!“ کاؤنٹ الیا آندرچک نے شاعر کو، جو اپنے اشعار سنائے جا رہا تھا، قہر آلود نگاہوں سے دیکھا اور باگ رتیاں کے سامنے تسیمات بجالایا۔ تمام لوگ یہ محسوس کرتے ہوئے کہ ڈنر شعر و شاعری سے کہیں زیادہ اہم ہے، ”ٹھکے کھڑے ہوئے۔ باگ رتیاں ایک بار پھر سب سے آگے آگے، در باقی اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگے۔ ڈرائنگ روم میں اسے مہمان خصوصی کی نشست پر بٹھایا گیا۔ اس کے دونوں اطراف دونوں ایکس ندر۔ بیکلی شیف اور اری ٹیکن۔ بیٹھ گئے (یہ امپراطور کے نام کی طرف باریک اشارہ تھا)۔ تین سوا شخاص نے اپنے اپنے مرتبے اور اہمیت کے اعتبار سے ڈرائنگ روم میں اپنی اپنی نشستیں سنبھال لیں۔ جو شخص جتنا زیادہ اہم تھا، وہ اتنا ہی معزز مہمان کے قریب تھا، بالکل اسی طرح جس طرح پانی از خود اپنی سطح در یافت کر لیتا ہے۔

ڈر کے آغاز سے ڈرائیو کاؤنٹ، الیا آندرچک نے اپنے بیٹے کو پرس کی خدمت میں پیش کیا۔ باگ رتیاں سے اسے پہچان لیا اور اس سے چند الفاظ کہے۔ اس کی اس روز کی دوسری باتوں کی طرح اس کے یہ الفاظ بھی بے تکے اور سبب ربط تھے۔ تاہم جب باگ رتیاں اس کے بیٹے سے گفتگو کر رہا تھا، کاؤنٹ الیا آندرچک بڑے فخر و مسرت سے حاضرین کو دیکھ رہا تھا۔

نگر لائی رستوف، دینی سوف اور اپنے نئے دوست دلوخوف کے ساتھ میز کے تقریباً درمیان میں بیٹھ گیا۔ دیگر افس و تنکی ان کے بالکل بل بیٹھے تھے۔ کاؤنٹ الیا آندرچک، جو، سکودی مہمان نوازی کی بحسب مثال تھا، کمیٹی کے دیگر ارکان کے ساتھ باگ رتیاں کے سامنے بیٹھ گیا اور اس کی خدمت میں مصروف ہو گیا۔

اس کی کوششیں بیکار نہیں گئی تھیں۔ مرغن اور سادہ، دونوں اقسام کی غذائیں، کھانے والوں کے لیے

پر تکلف طعام کا انتہام کیا گیا تھا۔ تاہم جب تک دعوت اختتام کو نہ پہنچ گئی، وہ بے کلی محسوس کرتا رہا۔ وہ بٹلر کو آنکھ سے اشارے کرتا، نوکروں چاکروں گوسرگوشیوں میں ہدایات دیتا اور ہر متوقع دش کا نہایت بے چنگی سے انتظار کرتا رہا۔ ہر چیز اعلیٰ پیمانے کی تھی۔ کھانے کے بعد دوسرے دور کے دوران میں، جو کہ عظیم الجثہ سٹریٹ فچلی پر مشتمل تھا (اور جسے دیکھ کر کاؤنٹ خود شعوری مسرت سے سرخ ہو گیا)، بیروں نے بوتلوں کے کاگ کھوتا اور شیمپیں گلاسوں میں اٹھیلنا شروع کر دی۔ پچھلی کے بعد، جس نے کسی حد تک سنسنی پیدا کر دی تھی، کاؤنٹ نے کمیٹی کے دیگر ارکان کے ساتھ نگاہوں کا تبادلہ کیا۔ ”متحدہ جام ہائے صحت تجویز کیے جاتا ہیں۔ وقت ہے کہ اب یہ کام شروع کر دیا جائے!“ اس نے کانا پھوسی کرتے ہوئے کہا اور وہ گلاس ہاتھ میں پکڑے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ تمام لوگ خاموش ہو گئے اور انتظار کرنے لگے کہ وہ کیا کہتا ہے۔

”میں مقتدر اعلیٰ امپراطور کا جام صحت تجویز کرنا ہوں!“ اس نے گلا پھاڑتے ہوئے کہا اور اس کی ٹہنی آنکھوں میں مسرت اور جوش و خروش کے آنسو امنڈ آئے۔

موسیقاروں نے سن کی آن میں ”بہادر روسیو، تمہیں فتح مبارک ہو!“ کا ترانہ چھیڑ دیا۔ تمام لوگ اٹھ کر کھڑے ہو گئے اور ”ہڑ ہڑا“ کے نعرے بند کرنے لگے۔ اور باگراتیاں نے بھی بالکل اسی آہنگ سے، جس آہنگ سے اس نے شون گراہرن کے میدان میں نعرہ لگایا تھا، ”ہڑا“ کا نعرہ لگا دیا۔ نو جوان رستوف کی دھدھان آواز تین صد آوازوں میں بلند تر تھی۔ وہ تقریباً رو پڑا۔

”ہمارے مقتدر اعلیٰ امپراطور کا اقبال بلند ہوا!“ اس نے چہرہ کر کہا۔ ”ہڑا“ اس نے ایک ہی سانس میں گلاں خالی کر دیا، اور اسے فرش پر بیٹھ دیا۔

متعدد دیگر اشخاص نے اس کی مثال پر عمل کیا اور خاصی دیر تک ہنگامہ ہاؤد ہو پیا رہا۔ اس کے اختتام پر بیروں اور ملازموں نے فرش سے کرجیاں اٹھا لیں۔ ہد گد کرنے پر تمام لوگ بے حد خوش تھے، اور مسکرا رہے تھے۔ وہ دوبارہ نشستوں پر بیٹھ گئے اور آپس میں باتیں کرنے لگے۔

کاؤنٹ الیا آندرچیک ایک بار پھر اٹھا۔ اس کی پلیٹ کے قریب کاغذ کا ایک پرزہ پڑا تھا۔ اس نے اس پر نگاہ دوڑائی اور یوں ”اب میں اپنی آخری ہم کے ہیرو ہیرو تریا نووچ باگرتیاں کا جام صحت تجویز کرتا ہوں۔“ اور ایک بار پھر اس کی نیلی آنکھیں آبدیدہ ہو گئیں۔

اس مرتبہ موسیقاروں نے ترانہ نہ چھیڑا بلکہ ایک غنائیہ، جس کی دھنیں کسی پاول ایوانوویچ کو لورڈ¹⁸ نے ترتیب دی تھیں، چھیڑ دیا:

روسی تمام رکاوٹیں نہیں نہیں کر دیتے ہیں۔

ان کی شجاعت فتح کی ضمانت ہے۔

ہمارے پاس باگ راتیاں ہے
چنانچہ تمام دشمن گھٹنے ٹیک دیتے ہیں۔

عنائے کے اختتام پر مختلف اشخاص کے جام ہائے صحت تجویز کیے گئے۔ ہر جام صحت کے اختتام پر کاؤنٹ الیا آندرچج پر پہلے سے زیادہ رقت جاری ہو جاتی۔ گلاس پاش پاش ہوتے چلے گئے اور چیخ و پکار بلند سے بلند تر۔ یسکی شیف، ہری ٹسکن، یودوف، دنگوروف، اپراکسن، والیوویف، کلب کمیٹی کے ارکان کلب کے تمام ممبران اور ان کے مہمانوں کے جام ہائے صحت تجویز ہوئے اور آخر کار سیافنت کے منتقم کاؤنٹ الیا آندرچج رستوف کی باری آئی۔ جب یہ جام صحت تجویز ہوا، کاؤنٹ نے جیب سے رومال نکالا، اپنا چہرہ ڈھانپا اور سیدھے سمجھاؤر دنا شروع کر دیا۔

4

وٹر لوخوف اور نکولائی رستوف کے بالحق مل بیٹھ تھے۔ اس نے ہمیشہ کی طرح نندیدوں کی مانند ڈٹ کر کھانا کھایا اور جام پر جام لٹھا دھائے۔ تاہم ان لوگوں کو، جو اسے جانتے تھے، اس میں عظیم تغیر نظر آیا۔ وہ ڈنر کے دوران میں ہمہ وقت خاموش رہا۔ کبھی وہ آنکھیں جھپکاتا اور ناک بھوس چڑھاتا دھرا دھرا دیکھنے لگتا اور کبھی ایک ہی جگہ نظریں گاڑ کر اور بالکل بے دھیانی کے عالم میں انگلی سے، پٹی ناک کا بانسا ملے لگتا۔ اس کے چہرے پر حزن و ملال اور مایوسی کے بادل چھائے ہوئے تھے۔ یوں نظر آ رہا تھا کہ اس کے گرد و پیش جو کچھ ہو رہا ہے، وہ اسے نہ دیکھ اور نہ سن رہا ہے بلکہ وہ کسی اذیت ناک، اور غیر حل شدہ مسئلے میں مستغرق ہے۔

یہ غیر حل شدہ مسئلہ، جو اس کے لیے اذیت کا باعث بنا ہوا تھا، ان اشاروں کا رین منت تھا، جو ماسکو میں اس کی پھوپھی نزارہین بڑی پرس نے اس کی بیوی اور دلوخوف کے، بین بے تکلفی کی طرف کیے تھے اور اس میں کچھ ہاتھ اس گمنام خط کا بھی تھا جو اسے اس صبح موصول ہوا تھا اور عام گمنام خطوں کی طرح اس میں اسے گھٹیا اور شوخ انداز سے مطلع کیا گیا تھا کہ ”تم آنکھوں پر بیکار چشمہ پڑھائے پھرتے ہو۔ تمہیں کچھ نظر نہیں آتا لیکن ساری دنیا دیکھ رہی ہے کہ تمہاری بیوی دلوخوف کے ساتھ عشق کی چینگلیں بڑھا رہی ہے۔“ پیٹر کو پرس کے اشاروں اور خط کے مندرجات پر قطعاً یقین نہیں آیا تھا لیکن اب جب کہ دلوخوف اس کے بالمقابل بیٹھا تھا، اسے اس سے آنکھ ملاتے خوف محسوس ہو رہا تھا۔ جب بھی اس کی نگاہیں دلوخوف کی خوبصورت اور گستاخ آنکھوں سے ٹکراتیں، اسے یوں لگتا جیسے اس کی روح میں کوئی مہیب اور انسانیت سوز چیز کھب گئی ہو اور وہ ایک ایسی نئی نظریں پر سے ہٹا لیتا۔

پیٹر غیر ارادی طور پر اپنی بیوی کے ماضی اور دلوخوف کے ساتھ اس کے رویے کو یاد کرنے لگا۔ اب اسے محسوس ہوا کہ اگر خط کے مندرجات اس کی اپنی بیوی کے متعلق نہ ہوتے، وہ شاید درست ہی ہوتے یا کم از کم انہیں درست ہونا چاہیے تھا۔ اسے یاد آیا کہ دلوخوف، جو جنگ کے بعد بحال ہو چکا تھا، کس طرح پیٹرز برگ لوٹا اور اس

کے پاس آیا تھا۔ اوائل عمری میں وہ لڑکر جس قسم کی شرارتیں کیا کرتے تھے، انھوں نے ان کے بائیں دوستی کے رشتے استوار کر دیے تھے اور اسی دوستی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے دلوخوف میدھا اس کے گھر چلا آیا تھا۔ میٹر نے اسے نہ صرف اپنے ہاں ٹھہرایا بلکہ اسے رقم بھی قرض دی۔ میٹر کو یاد آیا کہ ہمیں نے کس طرح ہنسے مسکراتے اپنے گھر میں دلوخوف کے قیام پر عدم اطمینان کا اظہار کیا تھا، کس سنگی انداز سے دلوخوف نے اس کے سامنے اس کی بیوی کے حسن کی تعریف کی تھی اور ان کے ماسکو چلے آنے تک وہ کس طرح اپنی آمد کے بعد ایک دن کے لیے بھی ان کے گھر سے باہر نہیں رہا تھا۔

”اس میں کوئی کلام نہیں کہ دلوخوف بہت دجیہ اور خوش اندام ہے۔“ میٹر نے سوچا۔ ”اور میں اسے جانتا ہوں۔ محض اس لیے کہ میں نے اس کی خاطر بھاگ دوڑ کی، اس کی مدد کی اور اسے دوست بنایا، سے مجھ پر کچھ اچھالنے اور میرا مسئلہ اڑائے میں خاص طور پر کشش نظر آئی ہوگی۔ میں جانتا ہوں، سمجھتا ہوں کہ میرے اعتماد کو، اگر واقعی یہ درست ہے، ٹھیس پہنچا کر، اس نے اپنی مسرت میں کتنا اونچا راحسوس کیا ہوگا۔ ہاں، اگر یہ بات درست ہو، لیکن مجھے اس کا یقین نہیں آتا۔ مجھے اس پر یقین کرنے کا کوئی حق حاصل نہیں اور میں اس کا یقین نہیں کر سکتا۔“

سنگی کے لمحات میں دلوخوف کے چہرے پر جس قسم کے تاثرات ہو رہے تھے، وہ سے یاد آئے۔ خلا جب اس نے پولیس میں کور پچھ کے ساتھ باندھ اور اسے پانی میں کر، یا تھا یا کسی نوع کے شتعال کے بغیر اس نے ایک شخص کو ڈویل لڑنے کے لیے چیلنج دے دیا تھا یا پنے ہستوں کی گولی سے سلیج ڈرائیور کے گھوڑے کو ہلاک کر دیا تھا۔ یہ سارے واقعات اس کے ذہن میں ابھر آئے اور اسے یاد آیا کہ دلوخوف کے چہرے پر سفاکانہ تاثرات صرف اسی وقت نظر آتے تھے جب وہ اس کی طرف دیکھ رہا ہوتا۔ ”ہاں، یہ شخص غنڈا ہے،“ میٹر نے سوچا۔ ”کسی شخص کی جان لینا اس کے لیے کوئی معنی نہیں رکھتا۔ وہ غالباً یہ سمجھتا ہے کہ ہر شخص اس سے خوف کھاتا ہے، اور یہ تصور اس کے لیے مسرت کا باعث بنتا ہوگا۔ وہ لازماً یہ سوچتا ہوگا کہ میں بھی اس سے خائف ہوں اور سچی بات یہ ہے کہ میں واقعی اس سے خائف ہوں۔“ اس نے سوچا اور اسے ایک مرتبہ پھر اپنی روح میں کوئی مہیب اور انسانی سوز چیز کھینچی محسوس ہوئی۔

دلوخوف، دینی سوف اور دستوف میٹر کے بالمقابل بیٹھے تھے اور بے حد شاداں و مسرور نظر آ رہے تھے۔ دستوف اپنے دونوں دوستوں کے ساتھ مزے مزے سے گفتگو کر رہا تھا۔ ان میں سے ایک ہانکا جھیل ہوا تھا جب کہ دوسرا بھانام ڈویل باز اور او باش شخص تھا۔ دلوخوف کبھی کبھار میٹر پر، جو دنیا وافیہا سے بے خبر، اپنی سوچوں میں مستغرق اور اپنے بھر کم ڈیل ڈول کی بنا پر ضیافت میں بہت نمایاں نظر آ رہا تھا، ہتھریہ نظر ڈال لیتا۔ دستوف میٹر کو اس لیے عجیبانہ نظروں سے دیکھ رہا تھا کیونکہ پہلی بات تو یہ تھی کہ وہ خود ہوا تھا اور ہوا کی نگاہوں میں میٹر شخص دوست مند سریلین، حسین ذمیل خاتون کا خاوند اور بڑی بی تھا۔ دوسرے میٹر نے، جو اپنے خیالات میں کھویا ہوا تھا اور بے دھیان سے دھرا دھرا لگا ہیں گھما رہا تھا، دستوف کو پہچانا نہیں تھا اور نہ اس کے سلام کا جواب دیا تھا۔ جب امپرا طور کا جام

صوت تجویز ہوا میٹر جواپنی ادھیڑ بن میں مصروف تھا، نہ اٹھ کر کھڑا ہوا اور نہ اس نے پنا گلاس اوپر اٹھایا۔
 "تمہیں کیا ہوا ہے؟" رستوف نے چلا کر کہا۔ "تم نے سنائیں کہ اسپر طور کا جام صحت پیا جا رہا ہے؟"
 میٹر نے لمبی سانس لی، فرس برداری سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا، اپنا گلاس خالی کیا اور جب سب لوگ بیٹھ گئے،
 وہ یک دل سے رستوف کی طرف متوجہ ہوا اور اسے دیکھ کر مسکرائے لگا۔
 "ارے، میں نے تمہیں پہچانا ہی نہیں!"

لیکن رستوف چیخنے چلانے میں اتنا مصروف تھا کہ اسے کچھ سنائی نہ دیا۔
 "تم ذرا نو، یہ تعارف کیوں نہیں کرا لیتے؟" دلوخوف نے رستوف سے کہا۔
 "مجھے لعنت سمجھو، یہ نرا الحق ہے!" رستوف نے کہا۔

"خوبصورت عورتوں کے خاندانوں سے ہمیشہ بنا کر رکھنا چاہیے،" دینی سوف نے لقمہ دیا۔
 وہ جو کچھ کہہ رہے تھے، میٹر کو سنائی نہ دیا لیکن وہ اتنا سمجھ گیا کہ وہ اسی کے بارے میں باتیں کر رہے ہیں۔
 اس کا رنگ سرخ ہو گیا اور اس نے پنا منہ دوسری طرف پھیر لیا۔

"ہائیں، اب ہم خوبصورت عورتوں کا جام صحت نوش کریں؟" دلوخوف نے کہا اگرچہ اس کی ہاتھیں کھلی
 جاری تھیں، تاہم اس نے اپنے چہرے پر سنجیدگی طاری کر لی۔ وہ میٹر کی طرف متوجہ ہوا اور اس نے اپنا گلاس اوپر
 اٹھایا۔ پتر دشکا خوبصورت عورتوں اور ان کے عاشقوں کی صحت کے نام پر! اس نے مزید کہا۔

میٹر نے نظریں جھکائے اور دلوخوف کی جانب دیکھے یا اس کی بات کا جواب دیے بغیر اپنا گلاس ہونٹوں سے
 اٹھالیا۔ ایک وردی پوش ملازم نے، جو کو تو زوف کا غنائیہ تقسیم کر رہا تھا، ایک نقل میٹر کے سامنے رکھ دی کیونکہ اس کا
 شمار انتہائی سربرآوردہ مہمانوں میں ہوتا تھا۔ اس نے یہ نقل اٹھائی ہی تھی کہ دلوخوف میز پر آگے جھکا، اس نے جھینا
 مار کر کاغذ اس کے ہاتھ سے چھینا اور اسے پڑھنا شروع کر دیا۔ میٹر نے دلوخوف کی جانب دیکھا اور پھر اپنی نظریں
 جھکا لیں۔ جس مہیب اور انسانیت سوز چیز کا احساس دُزر کے سارے عرصے کے دوران میں اسے ڈستار ہا تھا اس
 نے دوبارہ اسے اپنی گرفت میں جکڑ لیا۔ اس نے اپنے بے ڈول اور بھاری بھر کم جسم کو میز پر جھکایا اور اسے ذرا
 آگے بڑھا کر چلایا۔

"تمہیں یہ پکڑنے کی جرات کیسے ہوئی؟"

نہیں دسکی اور اس کے دائیں پڑوسی نے جب یہ چیخ پکاری اور انھوں نے یہ بھی دیکھ لیا کہ اس کا مخاطب کون
 ہے، ان کے اوسن خطا ہو گئے اور وہ جھٹ پٹ بزدل خوف کی طرف متوجہ ہوئے۔

"نہیں، نہیں، جانے دیں! چھوڑیں! کیا کر رہے ہیں آپ؟" انھوں نے زبردست کہا۔ خوف سے ان کی
 آوازیں لرز رہی تھیں۔

دلوخوف نے اپنی صاف شفاف، سفاک اور ہشاش بشاش آنکھوں سے میٹر کی جانب دیکھا۔ معلوم ہوتا تھا

کہ اس کی نگاہیں یہ کہہ رہی ہیں ”مجھے تو یہی بات پسند ہے!“
 ”جاد، میں نہیں دیتا!“ اس نے دو ٹوک انداز سے کہا۔

پیٹر کا رنگ فق ہو گیا، اس کے ہونٹ کپکپانے لگے اور اس نے دو خوف کے ہاتھ سے کانڈ چھین کر پرزے پرزے کر دیا۔

”تم۔ تم۔ بد معاش!۔ میں تمہیں چیخ دیتا ہوں!“ اس نے پرزہ در انداز سے چلا کر کہا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے کرسی دھکیل کر ایک طرف کر دی اور دسترخوان سے اٹھ کھڑا ہوا۔

جونہی پیٹر کی زبان سے یہ الفاظ نکلے، اسے محسوس ہوا کہ اس کی بیوی کی تقصیر کا مسئلہ، جو گزشتہ چوبیس گھنٹوں سے اس کے لیے سوہانِ روح بنا ہوا تھا، قطعی اور ناقابل تردید انداز سے صحیح ثابت ہو گیا ہے۔ اسے اس (اپنی بیوی) سے گھن آنے لگی اور اس کے ساتھ اس کا رشتہ دائمی طور پر منقطع ہو گیا۔

دینی سوف کی منت سماجت کے باوجود کہ رستوف کو اس معاملے میں قطعاً مداخلت نہیں کرنا چاہیے، وہ دو خوف کا سینکڑ بننے کے لیے آمادہ ہو گیا۔ چنانچہ اس نے ڈنر کے بعد پیٹر کے سینکڑ نہیں تسکی کے ساتھ ڈوسٹل کے انتظامات طے کیے۔ پیٹر گھر چلا گیا لیکن رستوف دو خوف اور اپنی سوف کے ساتھ کلب میں ہی بٹھہرا رہا اور گئی رات تک چسیوں اور دوسرے گلوکاروں کے نشانات مستار ہ۔

”اچھا، خدا حافظ، کل سا کولنگی جنگل میں ملاقات ہوگی،“ دو خوف نے کلب سے رخصت ہوتے ہوئے رستوف سے کہا۔

”تم پریشان تو نہیں ہو؟“ رستوف نے پوچھا۔

دو خوف رک گیا۔ ”دیکھو، ڈوسٹل کیسے لڑی جاتی ہے، اس کا سارا راز میں تمہیں دو لفظوں میں بتائے دیتا ہوں۔ اگر ڈوسٹل لڑنے سے پہلے آدمی اپنا وصیت نامہ تیار کرنے اور اپنے والدین کے نام محبت بھرے خطوط لکھنے بیٹھ جائے اور دل میں یہ گمان کرنے لگے کہ کہیں میں مارا ہی نہ جاؤں۔ پھر سمجھ لو کہ اس سے بڑا حتمی اور کوئی نہیں اور اس کا بیڑا غرق ہو گیا لیکن اگر وہ اپنے دل میں یہ پختہ یقین پیدا کر لے کہ اس نے اپنے حریف کو حتی الامکان جلد از جلد اور لازماً موت کی نیند سلانا ہے، پھر اس کا بال بھی بیکا نہیں ہوگا۔ ہمارے ہاں کا ستر کا ایک ریچھوں کا شکاری تھا۔ وہ مجھ سے کہا کرتا تھا: ”ٹھیک ہے کہ آدمی کو ریچھ سے خوف آتا ہے، لیکن جونہی اس کی نظر اس پر پڑتی ہے، اس کا سارا خوف پادری ہوا ہو جاتا ہے اور اس کے دل میں صرف یہ اندیشہ جاگزیں ہو جاتا ہے کہ کہیں یہ بچ کر نہ نکل جائے۔ میری کیفیت بھی سمجھ اسی قسم کی ہے۔ اچھا، پیرے، کل ملاقات ہوگی۔“

انگلی صبح آٹھ بجے پیٹر اور نہیں تسکی سا کولنگی جنگل پہنچے۔ انھوں نے رستوف، دو خوف اور دینی سوف کو پہلے ہی وہاں موجود پایا۔ پیٹر کے چہرے مہرے سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ کسی ایسی ادھیڑ بین میں، جس کا موجودہ معاملے سے کوئی تعلق نہیں، مصروف ہے۔ اس کا وحشت زدہ چہرہ زرد ہو چکا تھا۔ بظاہر وہ ساری رات سو نہیں سکا

تھا۔ وہ کھوئے کھوئے انداز میں ادھر ادھر دیکھ رہا تھا اور جتنی آنکھیں یوں جھپک رہا تھا جیسے وہ تیز دھوپ میں چندھیا گئی ہوں۔ اس کے ذہن پر صرف دو خیالات بے قبضہ جمار کھا تھا۔ اول: اپنی بیوی کی تقصیر، رات بھر جاگنے کے بعد اس بارے میں اس کے دماغ میں شک و شبہ کی رمت بھی باقی نہیں رہ گئی تھی۔ دوم: دل و خوف کی بے تقصیری۔ اسے بھلا ایک ایسے شخص کے، جس کی اس کی نگاہوں میں کوئی ہمت نہیں تھی، ناموس کے تحفظ سے کیا سروکار ہو سکتا تھا۔ اگر اس کی جگہ میں ہوتا تو شاید میں بھی یہی کرتا، ”خیر نے سوچا۔“ واقعی مجھے یقین ہے کہ میں نے بھی یہی کیا ہوتا۔ پھر یہ ڈوئیل، یہ قتل کیوں؟ یا میں اسے ہلاک کر دوں گا یا وہ میرے بیچھے، کہنی یا گھٹنے میں گولی اتار دے گا۔ کیا میں یہاں سے فرار نہیں ہو سکتا؟ بھاگ نہیں سکتا؟ کہیں غائب نہیں ہو سکتا؟“ کچھ اس قسم کے سوالات اس کے ذہن میں گردش کر رہے تھے۔ لیکن جب وہ اس نوعیت کے تصورات میں کھویا ہوا تھا، وہ کچھ ایسے عجیب پر سکون اور لائق انداز سے ادھر ادھر دیکھ رہا تھا کہ دیکھنے والے اس کا احترام کرنے پر مجبور تھے۔

”کتنی دیر ہے؟ وہ تیار ہو گئے؟“ اس نے پوچھا۔

جب تیاریاں مکمل ہو گئیں، پستولوں میں گولیاں بھر دی گئیں اور برف میں شمشیریں گاڑ دی گئیں تاکہ ان مقامات کی جہاں تک وہ بڑھ سکتے تھے، حد بندی ہو جائے، نیس و تسکی میئر کے پاس آیا۔

”کاؤنٹ، اگر اس انتہائی گہیرے لہجے میں میں نے آپ کو پوری حقیقت سے خبردار نہ کیا،“ اس نے لڑکھڑاتی آواز میں اس سے کہا، ”تو میں سمجھوں گا کہ میں اپنا فرض نبھانے میں ناکام رہا ہوں اور آپ نے مجھے اپنا سیکنڈ منتخب کر کے مجھ پر جس اعتماد کا اظہار کیا ہے اور میری جو عزت انزائی کی ہے، اس کا اپنے آپ کو اہل نہیں ثابت کر سکا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ معاملے کو یہاں تک پہنچانے میں در اس سلسلے میں خون بہانے کی کافی وجوہات موجود نہیں۔ غلطی آپ کی تھی۔ آپ اپنے غصے پر قابو نہ پاسکے۔“

”ہاں، بالکل انتہائی احمقانہ حرکت تھی۔“

”پھر مجھے اجازت دیں کہ میں آپ کی طرف سے تاسف کا اظہار کر دوں اور مجھے امید ہے کہ ہمارے مخالفین آپ کی معذرت قبول کریں گے،“ نیس و تسکی نے کہا۔ (اس معاملے میں جو لوگ شریک تھے یا اس سے ملتے جلتے دیگر معاملات میں جو لوگ شریک ہوتے ہیں، ان سب کی طرح اس کا بھی یہ خیال تھا کہ حقیقی ڈوئیل کی نوبت نہیں آئے گی۔) ”کاؤنٹ، آپ جانتے ہیں کہ معاملات کو اس مقام تک، جہاں ان کی تلافی ناممکن ہو جائے، لے جانے کی نسبت یہ بات زیادہ باعث عزت ہے کہ آدمی اپنی غلطی تسلیم کر لے۔ یوں طرفین میں سے کسی کی بھی توہین نہیں ہوتی۔ پھر مجھے اجازت دیں کہ میں۔“

”نہیں، اب کہنے سننے کے لیے رہ ہی کیا گیا ہے؟“ خیر نے کہا۔ ”اب کچھ فرق نہیں پڑے گا سب تیاریاں مکمل ہو گئیں؟ مجھے صرف اتنا بتا دیں کہ مجھے کہاں جانا ہے اور کہاں گولی چلانا ہے؟“ اس نے اپنے چہرے پر غیر فطری انداز سے نرم و گداز سکرابٹ لاتے ہوئے کہا۔

اس نے پستول پکڑ لیا اور پوچھنے لگا کہ اس کا گھوڑا کس طرح کام کرتا ہے۔ وہ یہ سوالات اس لیے پوچھ رہا تھا کہ اس نے زندگی بھر پستول کو ہاتھ تک نہیں لگایا تھا۔ اور یہ وہ حقیقت تھی جس کا وہ اعتراف کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ ”ارے ہاں، بالکل اسی طرح.. مجھے معلوم تو تھا لیکن میں بھول گیا تھا۔“

”معذرت کیسی؟ بالکل نہیں، ہرگز نہیں۔“ دلوخوف دینی سوف (جو اپنے طور پر صبح کرانے کی کوشش کر رہا تھا) سے کہہ رہا تھا۔ وہ بھی مقررہ مقام پر پہنچ گیا۔

ڈوئیل کے لیے جو جگہ منتخب کی گئی تھی، اس سڑک سے، جس پر سیلج گاڑیاں کھڑی کی گئی تھیں، اسی قدم دور تھی۔ جنگل کا یہ مقام بالکل چھیل تھا اور صنوبر کے درختوں میں گھرا ہوا تھا۔ اس کی سطح برف سے، جو گزشتہ چند دنوں سے پگھلنے لگی تھی، ڈھکی ہوئی تھی۔ دونوں حریف ایک دوسرے سے چالیس قدم دور اس خاں جگہ کے کناروں پر کھڑے ہو گئے۔ دونوں کے سیکنڈوں نے فاصلہ اپنے قدموں کے نشانات، اس مقام سے جہاں وہ کھڑے تھے، اس مقام تک، جہاں نہیں دسکی اور دینی سوف کی شمشیریں حد بندی کرنے کے لیے ایک دوسری سے دس قدم دور زمین میں گاڑ دی گئی تھیں، گہری اور گہری برف پر ثبت کر دیے تھے۔ برف پگھل رہی تھی اور دھند چھائی ہوئی تھی۔ چالیس قدم کے فاصلے پر کچھ بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ کٹی سنٹ سے سب تیاریاں مکمل تھیں لیکن وہ ابھی تک ابتدا کرنے سے ہچکچا رہے تھے۔ ہر شخص مہربلب تھا۔

5

”چلو، پھر شروع کریں!“ دلوخوف نے کہا۔

”یقیناً،“ پیئر نے اسی طرح مسکراتے ہوئے کہا۔

فصا پر ایک قسم کی دہشت کا احساس حاوی تھا۔ صاف نظر آرہا تھا کہ یہ معاملہ، جو اسی دل لگی سے شروع ہوا تھا، اب کسی صورت میں بھی اس سے پیچھا نہیں چھڑایا جاسکے گا۔ اب اسے اپنے انجام کو پہنچنا تھا، انسانوں کے نشانہ کو اس میں کوئی دخل نہیں رہا تھا۔ پہلے دینی سوف حد بندی کی طرف بڑھا اور اس نے اعلان کیا:

”چونکہ حریف صلح کرنے سے انکاری ہیں، اس لیے کارروائی کا آغاز ہو جانا چاہیے۔ اپنے اپنے پستول تمام لیں۔ میں گنتی کروں گا۔ جب میں تین تک پہنچوں، آگے بڑھنا شروع کر دیں.. لیجئے.. ایک.. دو!.. تین!“

اس نے قہر آلود انداز سے چلا کر کہا اور ایک طرف ہٹ گیا۔

حریف اس پگھلنے والی برف پر چلنے سے بن گئی تھی، چلتے چلتے بڑھنے لگے۔ اب وہ ایک دوسرے کے قریب سے قریب تر آرہے تھے اور انھیں ایک دوسرے کی شکلیں نظر آنے لگی تھیں۔ جب وہ درمیانی حد بندی کے قریب پہنچ گئے، انھیں یہ حق حاصل ہو گیا کہ وہ جب چاہیں، ایک دوسرے پر گولی چلا دیں۔ دلوخوف اپنا پستول ہند کیے بغیر آہستہ آہستہ چل رہا تھا۔ اس کی جگہ گاتی، صاف شفاف، نیلی آنکھیں اپنے حریف کے چہرے پر مرکوز

نہیں حسب معمول اس کے لیوں پر ہلکی مسکراہٹ تیر رہی تھی۔

لفظ ”تین“ پر بیڑ بھرتی سے آگے بڑھا، برف پر جو پگڈنڈی بن گئی تھی، غلٹ میں وہ اس سے قدرے پرے ہٹ گیا اور اس کے پاؤں گہری برف میں دھنس گئے۔ اس کے دائیں ہاتھ میں، جو اس کے جسم سے خاصا آگے نکلا ہوا تھا، پستول تھا۔ صاف نظر آ رہا تھا کہ اسے یہ اندیشہ دامن گیر ہے کہ کہیں وہ اپنی ہی گولی کا نشانہ نہ بن جائے۔ اس کا جی پلکار رہا تھا کہ وہ اپنے بائیں ہاتھ سے اپنے دائیں ہاتھ کو سہارا دے دے۔ چونکہ وہ جانتا تھا کہ اسے ایسا نہیں کرنا چاہیے، اس نے نہایت احتیاط سے اپنا بایں ہاتھ پیچھے کیے رکھا۔ چھ قدم آگے بڑھنے اور پگڈنڈی سے بھٹک کر برف میں دھنسنے کے بعد بیڑ نے اپنے پاؤں پر نظر ڈالی اور پھر غلٹ سے دلوخوف کی طرف رکھا۔ پھر جیسا کہ اسے سمجھا یا گیا تھا، اس نے اپنی انگلی کو خم دیا اور گولی چلا دی۔ اسے یہ قطعاً توقع نہیں تھی کہ گولی چلنے سے اتنی زبردست آواز پیدا ہوگی۔ چنانچہ جب یہ آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی، وہ گھبرا کر اچھل پڑا، پھر وہ اپنے رد عمل پر سکرابا اور اپنی جگہ ساکن کھڑا ہو گیا۔ دھند کی وجہ سے دھواں اور بھی گہرا ہو گیا تھا۔ یوں ایک لمحے کے لیے اسے کچھ بھی نظر نہ آیا لیکن وہ جس گولی کا انتظار کر رہا تھا، توقع کے برعکس اسے اس کی آواز سنائی نہ دی۔ صرف دلوخوف کے تیز قدموں کی چاپ اس کے کانوں سے ٹکرار ہی تھی اور اب دھوکے میں اس کی شکل بھی وضع طور پر دکھائی دینے لگی تھی۔ اس نے ایک ہاتھ سے اپنا بایں پیہو مضبوطی سے تھام رکھا تھا اور دوسرے میں پستول، جو نیچے کی جانب ٹک رہا تھا، پکڑ رکھا تھا۔ اس کے چہرے کا رنگ فق ہو چکا تھا۔ رستوف بھگم بھاگ اس کے پاس آیا اور اس سے کچھ کہنے لگا:

”۱۔ میں...“ دلوخوف بڑبڑایا۔ اس کے دانت بچنے ہوئے تھے۔ ”نہیں، معاملہ ابھی ختم نہیں ہوا۔“

اور وہ بیچارگی سے گھسٹا گھسٹا ہوتا چند قدم آگے بڑھا، شمیر کے قریب پہنچا اور اس کے پاس برف میں دھنس گیا۔ اس کا بایں ہاتھ خون سے تر تھا۔ اس نے اسے اپنے کوٹ پر پونچھا اور اس کے ساتھ اپنے آپ کو سہارا دیا۔ اس کا چہرہ زرد، پیشانی شکن آلود اور جسم بید بخنوں کی طرح کانپ رہا تھا۔

”مہربان۔“ دلوخوف نے بولنا چاہا لیکن ابتداً وہ لفظ صحیح طور پر ادا نہ کر سکا۔ ”مہربانی کرو!“ آخر وہ بڑی دقت سے کہہ پایا

بیڑ کے لیے جی سسکیوں اور آہوں پر قابو پانا مشکل ہو رہا تھا اور وہ دلوخوف کی طرف بھاگے لگا۔ وہ شمیروں کے مابین جگہ پار کر جاتا کہ دلوخوف نے چلا کر اس سے کہا:

”اپنی امداد ہندی کی طرف!“

اور بیڑ سمجھ گیا کہ اس کا مطلب کیا ہے۔ چنانچہ وہ اپنی سمت کی شمیر کے قریب رک گیا۔ اب دونوں کے مابین صرف دس قدم کا فاصلہ رہ گیا تھا۔ دلوخوف نے اپنا سر نیچے جھکایا اور مر بھلوں کی طرح منحنی بھر برف دانتوں سے کاٹ لی۔ پھر اس نے اپنا سر اوپر اٹھایا، جسم سیدھا کیا، ناکھیں میٹیں اور بیٹھ گیا۔ وہ کشش ثقل کا مضبوط مرکز

تلاش کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ ٹھنڈی برف چوس اور نگل رہا تھا۔ مگر چہ اس کے ہونٹ سیکپ رہے تھے لیکن اب بھی متبسم تھے۔ اپنی بچی کبھی قوت کو مجتمع کرنے کے لیے اسے جو زور لگانا پڑا تھا اور اس کی نگاہوں میں جو مٹی صمت تھی، ان دونوں نے، اس کی آنکھوں کو جھگکا دیا تھا۔ اس نے اپنا پستول اٹھایا اور شستہ لی۔

”ایک طرف ہٹ جاؤ! اپنے پستول کو بطور آڑ استعمال کرنا“ نہیں دتسکی نے چلا کر کہا۔

”اپنے آپ کو بچو!“ دینی سوف بھی چلائے بغیر نہ رہ سکا حالانکہ اس کا تعلق فریق مخالف سے تھا۔

وینٹر کے چہرے پر درد مندی اور پچھتاوے کی لطیف مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ اس نے اپنی آنکھیں اور بازو پھیلا رکھے تھے اور اس کی چوڑی چمکی چھاتی دلو خوف کے بالکل سامنے تھی۔ یوں وہ اپنے حریف کے سامنے بالکل غیر محفوظ تھا۔ وہ پر سال نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ دینی سوف، رستوف اور نیس دتسکی نے اپنی اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ اسی لمحے انھیں گولی چلنے اور دلو خوف کے غضب ناک انداز سے چنگھاڑنے کی آوازیں سنائی دیں۔

”نشانہ خطا گیا!“ دلو خوف نے بار بار بلند کہا اور یوں نیچے گر پڑا جیسے اس کے جسم میں جان باقی نہ رہی ہو۔ وہ دندھے منہ پڑا تھا۔

وینٹر نے اپنا سر پکڑ لیا اور ایک طرف ہٹ گیا۔ وہ گہری برف میں لمبے لمبے ڈگ بھرتا جنگل کی طرف جا رہا تھا اور بے ربط الفاظ بڑبڑاتا جا رہا تھا۔

”حققت، حققت! موت... دروغ گوئیاں۔“ وہ بار بار دہرائے جا رہا تھا اور اس کے ماتھے کی لکیریں گہری ہوتی جا رہی تھیں۔

نیس دتسکی نے اسے روکا اور گھر لے گیا۔

رستوف اور دینی سوف زخمی آدمی کو اپنے ساتھ لے گئے۔

سبج میں دلو خوف چپ چاپ لیٹا ہوا تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ اس سے جو سوالات پوچھے جا رہے تھے، وہ ان کے جواب میں ایک لفظ بھی نہیں کہہ رہا تھا۔ لیکن جب وہ ماسکو میں داخل ہوئے، وہ ایک دم ہوش میں آ گیا، اس نے بدقت اپنا سر اوپر اٹھایا اور رستوف کا، جو اس کے قریب بیٹھا تھا، ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ رستوف کو حساس ہوا کہ دلو خوف کے چہرے کے تاثرات کا ملا تبدیل ہو چکے ہیں اور وہاں ایک قسم کی نرمی اور غایت انہماط جھلک رہا ہے۔

”اتنے جتنے ہو؟ اب طبیعت کیسی ہے؟“

”اچھی نہیں! لیکن یہ بات اہم نہیں... میرے دوست،“ دلو خوف نے ہانپنے کا بیٹے کہا۔ ”ہم کہاں ہیں؟ میں جانتا ہوں کہ ماسکو میں میری کوئی اہمیت نہیں۔ لیکن میں نے اسے، رڈالا ہے، رڈالا ہے... وہ اس سے جانبر نہیں ہو سکے گی، جانبر نہیں ہو سکے گی...“

”کون؟“ رستوف نے پوچھا۔

”میری ماں، میری ماں۔ میری فرشتہ صفت ماں۔ میری پیاری، فرشتہ صفت ماں۔“ اور دلو خوف نے رستوف کا ہاتھ دبایا اور اس کے آنسو چھلکنے لگے۔

جب وہ قدرے پرسکون ہو گیا، اس نے رستوف کو بتایا کہ وہ اپنی ماں کے ساتھ رہتا ہے اور اگر اسے معلوم ہو گیا کہ وہ مر رہا ہے، تو وہ اس صدمے سے جانبر نہیں ہو سکے گی۔ اس نے رستوف سے گڑ گڑا کر کہا کہ وہ جائے اور اسے اس صدمے کے لیے تیار کرے۔

رستوف اس کی خواہش کی تکمیل کرنے کے لیے چلا گیا اور اسے یہ معلوم کر کے سخت حیرانی ہوئی کہ دلو خوف، جو اتنی بڑھکیں مارتا ہے اور دوسروں پر دھونس جھاتا ہے، ماسکو میں اپنی بوڑھی ماں اور خیدہ کمر بہن کے ساتھ رہتا ہے۔ شاید ہی کوئی بیٹا اپنی ماں سے اور کوئی بھائی بہن سے اتنا پیار کرتا ہوگا جتنا کہ وہ کرتا تھا۔



گزشتہ کچھ عرصے سے بیٹر کی اپنی بیوی سے صحت میں شاید ہی کبھی ملاقات ہوئی ہوگی۔ پیٹرنز برگ اور ماسکو، دونوں مقامات پر، ان کامکان مسلسل مہمانوں سے آباد رہتا تھا۔ ڈوئٹل کی رات وہ اپنی خواب گاہ میں جانے کے بجائے، جیسا کہ وہ، کثرت کیا کرتا تھا، اپنے باپ کے کتہ وہ شادی روم میں ٹھہرا رہا۔ دراصل یہ وہی کمر تھا جس میں بوڑھے کاؤنٹ نے اپنی جان جان انفرس کے سپرد کی تھی۔

گزشتہ رات، جب اس کی روح پر اتنا کچھ بیتا تھا، خواہ کتنی ہی ذیت ناک رہی ہو، لیکن اب اسے اس سے بھی شدید تر افیتوں کا تجربہ ہونے لگا۔ وہ صوفے پر لیٹ گیا اور سونے کی کوشش کرنے لگا تا کہ اس کے ساتھ جو واردات گزری تھی، اسے بھلا سکے لیکن وہ ایسا نہ کر سکا۔ نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی، کوسوں دور رہی۔ جذبات، احساسات، خیالات اور یادداشتوں کا ایسا طوفانی ریل اس کے ذہن میں در آیا کہ نیند تو نیند، وہ پلک تک نہ جھپکا سکا۔ سے کسی پہلو قرار نہیں تھا اور وہ بار بار کروٹیں بدل رہا تھا تا آنکہ اس نے پلنگ سے جست لگائی اور چیز تیز لگ بھرتا کمرے کے چکر لگانے لگا۔

ایک لمحے کے دوران میں وہ اسے بعینہ ویسے ہی دکھائی دی جیسے وہ شادی کے ابتدائی ایام کے دوران میں ہوتی تھی وہی برہنہ شانے، وہی پوجھل پلکیں اور مخمور دے خود آنکھیں۔ لیکن ایک، سچی اسے اس کے ساتھ دلو خوف کا فرہمورت، گستاخ اور سفاکانہ انداز سے تمسخر اڑاتا چہرہ، جیسے کہ اس نے ضیافت میں دیکھا تھا، نظر آیا اور پھر یہی چہرہ، جب وہ چکرایا اور برف پر گرا تھا، پیدا پڑ گیا تھا، کپکپانے لگا تھا اور افیت میں مبتلا دکھائی دینے لگا تھا۔

”ہوا کیا ہے؟“ اس نے اپنے آپ سے پوچھا۔ ”میں نے اس کے بار کو قتل کر دیا ہے۔ ہاں، اپنی بیوی کے بار کو قتل کر دیا ہے۔ ہاں، یہی ہوا۔ اور کیوں؟ مجھ سے یہ حرکت مرزد کیوں ہوئی؟“ اس لیے کہ تم نے اس کے ساتھ شادی کی تھی،“ باطنی آواز نے جواب دیا۔

”لیکن اس میں میر کیا قصور تھا؟“ اس نے اپنے آپ سے پوچھا۔ ”تمہارا قصور یہ تھا کہ تمہیں اس سے محبت تو تھی لیکن اس سے بیاہر جانے چل پڑے۔ تم نے اسے بھی دھوکا دیا اور اپنے آپ کو بھی۔“ اور اسے وہ لحد واضح طور پر یاد آگیا جب پرنس واسیلی کے ہاں سپر کے بعد اس نے وہ الفاظ، جنہیں زبان پر لانے میں اسے سخت رقت ہو رہی تھی، اگل دیے تھے۔ *Ja vous aime*۔ ”یہ سارا بکھیرا وہیں سے شروع ہو، تھا۔ مجھے اس وقت بھی محسوس ہوا تھا،“ اس نے سوچا، ”بالکل محسوس ہوا تھا کہ یہ غلط ہے اور یہ کہ مجھے ایسا کرنے کا کوئی حق نہیں۔ اور انجام کار وہی ہوا جس کا مجھے اندیشہ تھا۔“ اسے اپنی اپنی سون یا د آ یا اور اس یاد پر اس کا چہرہ بالوں لال ہو گیا۔ پھر وہ واقف ہو بھڑائے نہیں بھلتا تھا۔ اس کی یاد اس کے ذہن میں یوں تازہ تھی جیسے یہ کل کی بات ہو لیکن یہ یاد اتنی کڑوی تھی کہ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ کسی نے اس کی ہنک کر دی ہے اور وہ سخت شرمندہ ہو رہا ہے۔ ہوا یہ کہ شادی کے چند دن بعد وہ یک روز دوبہر سے ذرا قبل ریٹھی ڈرینگ گارڈن پہنچے اپنے بیڈروم سے سنڈی روم میں آیا۔ یہاں اس کی مٹھ بیٹھ اپنے ہیڈ میٹوارڈ سے ہو گئی۔ اس شخص نے نیاز مندانہ انداز سے جھک کر اسے سلام کیا، اس کے چہرے اور ڈرینگ گارڈن پر نظر ڈالی اور اپنے لبوں پر یوں خفیف سی مسکراہٹ لایا جیسے وہ مؤدبانہ انداز سے اسے جتا رہا ہو۔ ”آپ کی بہت دسرت کے کیا کہنے! میں اس کی اصلیت خوب سمجھتا ہوں۔“

”لیکن کتنی ہی بار میں اس کی ذات پر غرورناز محسوس کرتا رہا!“ وہ سوچ رہا تھا۔ ”مجھے فخر تھا کہ اس کا صن ملوٹی ہے، وہ جب محسوس و تقریبوں میں جاتی تھی اور وہاں جس قسم کے سلیقے اور موقع شناسی کا مظاہرہ کرتی تھی، میں اس پر ناز کرتا تھا میرے جس مکان میں وہ سارے بیٹرز برگ کو مدعو کیا کرتی تھی، وہ میرے لیے باعث صدا افتکار تھا۔ پھر مجھے یہ گھمنڈ تھا کہ وہ اتنی حسین ہے لیکن اس تک دوسروں کی رسائی نہیں ہو سکتی۔ یہ ہیں وہ چیزیں جن پر میں ڈون کی لیتا رہا ہوں اس وقت میں سوچا کرتا تھا کہ میں اسے سمجھ نہیں سکا ہوں، جب بھی میں نے اس کے کردار اور چال چلن کے بارے میں سوچا، میں نے بار بار اپنے آپ کو یہی بتایا کہ ’قصور تمہارا اپنا ہے، تم اسے سمجھ ہی نہیں سکے ہو، اس کے چہرے مہرے پر جو دائمی سکون اور اطمینان جھلکتا تھا، میں سمجھ نہ سکا کہ ایسا کیوں ہے۔ مجھے یہ بھی معلوم نہ ہوسکا وہ کسی بھی قسم کے شوق اور خواہش میں دلچسپی کیوں نہیں لیتی، حالانکہ یہ بالکل واضح تھا کہ اس سارے گورکھ دھندے کی کلید صرف ایک لفظ ہوں کاری ہے یہ عورت ہوں کار ہے۔ اب جب کہ یہ لفظ میرے منہ سے ادا ہو گیا ہے، سارا معاملہ روز روشن کی طرح عیاں ہو گیا ہے۔“

”انا طوں¹⁸ اس سے رقم ادھار لینے آیا کرتا تھا اور اس کے برہنہ شانوں پر بوسے ثبت کیا کرتا تھا۔ وہ اسے روپیہ پیسہ تو نہیں دیتی تھی لیکن چوما چانی پر معترض نہیں ہوتی تھی۔ اس کا باپ مذاق مذاق میں اس کا جذبہ، حسد بیدار کرنے کی کوشش کرتا اور وہ پرسکون تبسم کے ساتھ جواب دیتی، میں اتنی احمق نہیں کہ حسد کرنے لگوں۔ اور میرے متعلق کہتی: ان کا جو جی چاہے، کرتے رہیں۔ ایک مرتبہ میں نے اس سے پوچھا، ”تمہیں کوئی ایسی علامات محسوس

• میں تم سے محبت کرتا ہوں۔

ہوتی ہیں، جن سے معلوم ہو کہ تم امید سے ہو۔ اس نے حقارت سے قہقہہ لگایا اور کہا 'میں تنہا بیوقوف نہیں ہوں کہ بچوں کی تمنا کرنے لگوں اور ہاتھ مارا بچہ، اس کی نوبت تو میں کبھی بھی نہیں آنے دوں گی۔'

سوچتے سوچتے اسے یاد آیا کہ اس کی بیوی نہایت گھٹیا، عامیانہ اور ناشائستہ خیالات کا اظہار کرتی ہے۔ انہائی اونچے شرابی طبقے میں پرورش پانے کے باوجود بے ہودہ ہزاری کلمات فطرتاً ہی کی زبان سے ادا ہوتے ہیں۔ 'میں لوکی پنچھی نہیں ہوں... ہاتھ کھٹکن کو آرسی کیا، آزما کر دیکھ لو۔ جاؤ، دفع ہو جاؤ۔' وہ اس قسم کے کلمات اکثر کہتی۔ جوانوں اور بوڑھوں، مردوں اور عورتوں، وہ جس طرح بھی کو اپنا گرویدہ بنا سکتی تھی، اسے دیکھ کر بیٹر کی سمجھ میں نہ آتا کہ آخر اسے اس عورت سے محبت کیوں نہیں ہے۔ 'نہیں، مجھے اس سے کبھی بھی محبت نہیں ہوئی،' اس نے اپنے آپ سے کہا۔ 'مجھے معلوم ہے کہ یہ عورت ہوس کار ہے،' اس نے اپنی بات دہرائی۔ 'لیکن مجھ میں اتنا حوصلہ نہیں تھا کہ میں اس کا اقرار کر سکتا۔'

'اور اب دو خوف... وہ ادھر برف پر بیٹھا ہے اور زیر دستی مسکرانے کی کوشش کر رہا ہے، اور شاید زندگی کی آخری سانس لے رہا ہے... میں نے اپنے کیے پر جو ندامت کا اظہار کیا، اس نے اس کا جواب بڑھک مار کر دیا۔'

بیٹر ان لوگوں میں تھا جو غلط فہمی پر اس قسم کے کر دہر کے، جسے کمزور کہا جاتا ہے، مالک ہوتے ہیں، لیکن اس کے باوجود وہ اپنے مہربان کا دکھڑا سنانے کے لیے کسی راز دان کو تلاش نہیں کرتے، بلکہ تنہا ان سے نیٹے کی سلی کرتے ہیں۔

'ہر معاملے میں وہی تصور وار ٹھہرتی ہے، صرف اسی کا دامن آلودہ نظر آتا ہے،' اس نے اپنے آپ سے کہا۔ 'لیکن ایسی باتوں کا فائدہ؟ میں نے کنوئیں میں چھلنگ لگائی ہی کیوں؟ اپنا دامن اس کے پتوں سے بندھا ہی کیوں؟ میں نے اس سے یہ کہا ہی کیوں: 'Ja vous aime' حالانکہ یہ جھوٹ تھا بلکہ جھوٹ سے بھی بدتر۔ مجرم میں ہوں اور سب کچھ مجھے ہی بھیلنا ہو گا... یہ سب کچھ کیا؟ اپنے نام پر دھتا، اپنی زندگی کے رنج و محن؟ ادبہ، یہ سب لائسنس باتیں ہیں؟' اس نے سوچا۔ 'میری بدنامی اور بے عزتی۔ یہ سب باتیں روایتی ہیں، مجھ سے ان کا کیا تعلق؟'

'لوئی شانزدہم کا سر اس لیے قلم کر دیا گیا کیونکہ ان کا دعویٰ یہ تھا: 'یہ شخص بے حیا، بے شرم در خطا کار ہے۔' (بیٹر کے ذہن میں خیال آیا۔) 'اور اپنے نقطہ نظر سے وہ لوگ ٹھیک تھے۔ اسی طرح اپنے نقطہ نظر سے وہ لوگ بھی ٹھیک تھے۔ جنہوں نے اسے باقاعدہ دلی (سیٹ) تسلیم کیا اور اس کی خاطر شہادت کا جام نوش کر گئے۔ پھر غولس پیچے کا سر گلوئین سے کاٹ دیا گیا کیونکہ وہ ظالم، جابر اور مستبد تھا۔ صحیح کون ہے اور غلط کون ہے؟ کوئی بھی نہیں۔ لیکن جب تک آپ زندہ ہیں۔ زندہ رہیں۔ کل آپ مرجائیں گے، جس طرح ایک گھنٹہ پہلے میں مر سکتا تھا۔ جب ابد کے مقابلے میں آپ نے صرف ایک ثانیہ زندگی گزارنا ہے، پھر خواہ مخواہ تردد کرنے اور اپنے آپ کو ایذا پہنچانے کا فائدہ؟'

لیکن عین اس وقت جب وہ یہ سمجھ رہا تھا کہ اس قسم کے خیالات نے اسے پرسکون بنا دیا ہے، ایک ایسی اس کا

وہ ہوا، جب وہ شہر و مد سے اس کے سامنے اپنی منافقانہ محبت کا اقرار کر رہا تھا، اس کے سامنے آکھڑا ہوا اسے محسوس ہونے لگا کہ اس کے جسم کا سر راخون نچڑا کر اس کے قلب میں جمع ہو گیا ہے۔ سے اٹھ کر کھڑے ہوا، ادھر ادھر چکر لگانا اور جو کچھ اس کے ہاتھ میں آیا، اسے توڑنا اور پرزے پرزے کرنا پڑا۔

”آخر میں نے اس سے یہ کہا ہی کیوں 'ja vous aime'؟“ وہ بار بار اپنے آپ سے یہ سوال کرتا رہا اور جب یہ سوال دسویں مرتبہ دہرا چکا، مولیئر کا ایک جملہ اس کے ذہن میں دائرہ ہوا۔ ”آخر کس ولد الزانے اس سے یہ کہا تھا کہ وہ اس پنگے میں ہاتھ ڈالے؟“ اور وہ اپنے آپ پر ہنسنے لگا۔

رات کے دوران میں ہیئر نے اپنے وردی پوش ملازم کو بلایا اور اسے ہدایت کی کہ وہ پیئرز برگ جانے کے بے رشتہ سفر باندھ لے۔ جس مکان میں وہ رہتی تھی، اب اس میں رہنا اس کے لیے ممکن نہیں تھا اور نہ اس کے ساتھ کسی قسم کی بول چال کی کوئی گنجائش تھی۔ اس نے تہیہ کر لیا کہ وہ اگلے روز ہی روانہ ہو جائے گا اور جانے سے پہلے اس کے نام ایک خط جس میں وہ اسے مطلع کر دے گا کہ اس نے اس سے مستقل علیحدگی کا فیصلہ کر لیا ہے، چھوڑ جائے گا۔ جب صبح کو پیئر کا وردی پوش ملازم اس کی کافی نے کر سٹڈی روم میں آیا، وہ صوفے پر سو یا پڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں کھلی کتاب تھی۔ اس نے آنکھیں کھول دیں اور کچھ دیر گھبراہٹ گھبراہٹ نظروں سے ادھر ادھر نگاہیں دوڑاتا رہا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کہاں ہے۔

”کاؤنٹس پوچھ رہی ہیں کہ یوزر ایکسی لینسی گھر پر ہی ہیں؟“ ملازم نے کہا۔

لیکن بیشتر اس کے کہ پیئر یہ فیصلہ کر پاتا کہ اس کا جواب کیا ہوگا، کاؤنٹس بنفس نفیس بڑی دل جمعی اور شاہدہ انداز سے ٹھمکتی کمرے کے اندر داخل ہو گئی۔ وہ سفید ساٹن کے ڈھیلے ڈھلے ڈیرنگ گاؤن میں، جس پر نفرتی نکل بوئے کشیدہ کیے ہوئے تھے، ملبوس تھی۔ اس نے اپنے بال سیدھے سادے انداز سے سنوارے ہوئے تھے۔ اس کے انتہائی خوبصورت سر کے ارد گرد دو بھاری بھاری مینڈھیوں سہرے کی طرح پٹی ہوئی تھیں۔ (ظاہری دماغی کے باوجود اس کی کشادہ سرسری پیشانی پر قہر آلود کیر تھی۔ اس نے کمال سکون اور تحمل کے ساتھ ملازم کی موجودگی میں لب کشائی سے احتراز کیا۔ اسے ڈوئل کے بارے میں علم تھا اور وہ اسی کے متعلق گفتگو کرنے آئی تھی۔ تاہم جب تک ملازم نے کافی کی ٹرے یز پر نہ رکھ دی اور کمرے سے باہر نہ نکل گیا، وہ انتظار کرتی رہی۔

پیئر نے ذرتے جھپکتے اسے چشمے کے اوپر سے جھانک کر دیکھا۔ اس کی حالت اس خرگوش کی تھی جو شکاری کتوں کے گھیرے میں آچکا ہو اور اپنے دشمنوں کی نگاہوں کے سامنے کان دبائے چپ چاپ پڑا ہو۔ اس نے اپنا مطالعہ جاری رکھنے کی کوشش کی۔ پھر اسے احساس ہوا کہ ایسا کرنا نا تو ممکن ہے اور نہ ترین عقل۔ چنانچہ اس نے ڈرتے جھپکتے دوبارہ اس کی طرف دیکھا۔ وہ بیٹھی نہیں بلکہ حقارت آمیز انداز سے مسکراتی کھڑی رہی۔ وہ محض نوکر کے جانے کی منتظر تھی۔

”یہ کیسے؟ میں جانتا چاہتی ہوں کہ حضور کیا حرکات فرما رہے ہیں؟“ اس نے درشتی سے پوچھا۔

”ہیں؟ میں نے کیا...؟“ پیٹر بڑبڑایا۔

”ہیرو بننے کی کوشش کر رہے تھے؟ خیر، مجھے جواب دو کہ یہ ڈویل چہ معنی دار؟ تم ثابت کرنا چاہتے ہو؟ کیا۔ میں تم سے پوچھ رہی ہوں۔“

پیٹر نے بھری بھرم انداز سے صوفے پر کروٹ ماری اور اپنا منہ کھولا لیکن اس سے کوئی جواب بن نہ پڑا۔
 ”اگر تم جواب نہیں دو گے، تو میں تمہیں بتائے دیتی ہوں،“ ہیلین نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”تم جو کہہ سکتے ہو، جھٹ اس پر ایمان آئے ہو۔ تمہیں بتایا گیا...“ وہ ہنس پڑی، ”کہ وہ خوف میرا amant ہے۔“
 اس نے یہ بات اپنے بے ہودہ بازری لہجے سے فرانسیسی میں کہی۔ اس نے لفظ ”amant“ اسی بے نیازی اور لاپرواہی سے ادا کیا جس طرح کہ وہ کسی بھی دوسرے لفظ کو ادا کرتی تھی۔ ”اور تم نے اس بات کو صحیح مان لیا اتم نے اس سے ثابت کیا کیا ہے؟ ہونہ، تم نے اس ڈویل سے کیا ثابت کیا ہے؟ یہی تا کہ تم الو کے پٹھے ہو، احمق ہو، گاؤں کی ہو۔ لیکن تمہاری یہ صفات کوئی ڈھکی چھپی تو ہیں نہیں، ان سے ہر ایرا غیر واقف ہے لیکن تمہاری اس حرکت کا نتیجہ کیا ہوگا؟ یہی تا کہ میں ماسکوں والوں کی نظروں میں ذلیل ہو جاؤں گی، وہ میرا مذاق اڑائیں گے، گھر گھر اس بات کا چرچا ہوگا کہ تم نے اتنی پی، اتنی پی کہ بدست ہو گئے، اپنے آپ میں نہ رہے اور تمہیں معلوم ہی نہ ہو سکا کہ تم کر کی رہے ہو، اور پھر یہی تا کہ تم نے ایک ایسے شخص کو لاکارا، جس سے تم باوجود حسد کرنے لگے تھے۔“ ہیلین کا پارہ چڑھتا گیا اور اس کی آواز بلند سے بلند تر ہونے لگی۔ ”خالا کہ وہ ایک ایسا آدمی ہے جو ہر لحاظ سے تم سے بڑا ہے...“
 ”اوہہ... اوہہہ...“ پیٹر خراپا۔ اس کی بھوئیں تن گئیں لیکن اس نے نہ تو اس کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھا اور نہ اپنی جگہ سے ہٹ کر حرکت کی۔

”اور تم نے یہ کیوں یقین کر لیا کہ وہ میرا پارہ ہے؟ کیوں؟ محض اس لیے کہ مجھے اس کی صحبت پسند ہے؟ اگر تم ہست چالاک ہوتے، تمہاری شخصیت پسندیدہ ہوتی، میں تمہاری صحبت کو ترجیح دیتی۔“
 ”مجھ سے کوئی بات نہ کرو۔ میں تمہارے سامنے ہاتھ جوڑتا ہوں۔“ پیٹر نے بھرائی ہوئی آواز سے سرکوشی کی۔

”میں کیوں بات نہ کروں؟ میں جو چاہوں، کہہ سکتی ہوں اور میں تمہیں صاف صاف بتائے دیتی ہوں کہ اسکی بیویاں، جن کے خاوند تم جیسے ہوں اور وہ amants نہ بنائیں، ڈھونڈے سے نہیں ملیں گی، لیکن میں نے ایسا نہیں کیا۔“

پیٹر نے کچھ کہنا چاہا اور جب وہ اس کی جانب دیکھ رہا تھا، اس کی آنکھیں کچھ عجیب و غریب قسم کا پیغام دے رہی تھیں لیکن وہ اس پیغام کا مفہوم نہ سمجھ سکی۔ وہ دوبارہ لیٹ گیا۔ وہ اس وقت شدید جسمانی کرب میں مبتلا تھا۔ اسے اپنے سینے میں کھنچ کر محسوس ہوا اور اس کے لیے سانس لینا ناممکن ہو گیا۔ وہ جانتا تھا کہ اپنے اس کرب کو ختم

کرنے کے لیے اسے کچھ کرنا ہوگا، لیکن جو کچھ وہ کرنا چاہتا تھا وہ بے حد بھیانک اور لرزہ خیز تھا۔
 ”بہتر ہے کہ ہم ایک دوسرے سے علیحدگی اختیار کر لیں،“ وہ گلوگیر لہجے سے بڑبڑایا۔
 ”علیحدگی؟ میری جگہ سے، ہو جاؤ عیحدہ، مجھے کیا۔ لیکن ایک شرط پر، تمہیں مجھے ڈھیروں جائیداد دینا ہوگی۔“
 ہیلین نے کہا۔ ”علیحدگی! مجھے ڈرانا چاہتے ہو؟“

ہیئر نے صوفے سے جست لگائی اور لڑکھڑاتاؤ گرگاتا، اس کی طرف بھگا۔

”میں تمہیں جان سے مار ڈالوں گا!“ اس نے دھاڑتے ہوئے کہا اور ایسی قوت کے ساتھ، جس کا اسے علم ہی نہیں تھا کہ وہ اس کا مالک ہے، اس نے جھپٹ کر ایک میز کی مرمریں تختی اکھاڑی اور اسے لفظ میں لہراتا، ایک قدم اس کی طرف بڑھا۔

ہیلین کے چہرے پر مردنی چھا گئی، کاٹھ تو جسم میں خون نہیں اس کی چیخیں نکل گئیں اور وہ اچھل کر اس سے پرے ہٹ گئی۔ ہیئر میں اپنے باپ کی فطرت ظاہر ہونے لگی۔ جنونی غیظ و غضب کا شدید جدہ اس پر عاصب آگیا۔ اس نے سنگ مرمر کی تختی نیچے پھینک دی اور وہ کرچی کرچی ہو گئی۔ ہیئر نے اپنے بازو پھیلائے اور ہمیں کود پونے بے ہنگم انداز سے آگے کی جانب لپکا۔

”یہاں سے نکل جاؤ!“ اس نے ایسی ڈراؤنی آواز سے چھا کر کہا کہ سارے گھر میں اس کی گونج سنائی دی اور ہر شخص پر دہشت طاری ہو گئی۔

اگر ہیلین وہاں سے سر پر پاؤں رکھ کر نہ بھگ جاتی، خدا ہی جانتا ہے کہ وہ کیا کر بیٹھت۔
 ایک بجتے کے، اندر اندر ہیئر نے وسطی اور شمالی روڈ² میں واقع اپنی تمام جاگیروں کے، جو اس کی جائیداد کے نصف سے زائد حصے پر مشتمل تھیں، بظلم و نسق کا مختار نامہ اپنی بیوی کے سپرد کر دیا اور خود اکیلا ہیئر زبرگ روانہ ہو گیا۔

7

ہانڈلز میں اوٹسٹس کی جنگ اور پرنس آندرے کی گم شدگی کی خبر پہنچے دو ماہ بیت چکے تھے۔ سفارت خانے کے ذریعے متعدد خطوط ارسال کیے گئے اور ہر قسم کی تحقیقات کی گئیں۔ لیکن اس تمام کارروائیوں کے باوجود تو اس کی لاش دستیاب ہوئی اور نہ اسیرن جنگ کی فہرست میں اس کا نام آیا۔ اس کے عزیز واقارب کے لیے جو حقیقت سب سے زیادہ سوہان روح تھی، وہ یہ امکان تھا کہ اسے اس علاقے کے باشندوں نے اٹھالیا ہوگا۔ دراب وہ اجنیوں کے مابین تنہا پڑا ہوگا۔ پتا نہیں وہ زندگی کی آخری سانسیں گمن رہا ہے یا صحت یاب ہو رہا ہے، تاہم یہ بات یقینی تھی کہ وہ اپنے متعلق کوئی اطلاع دینے سے قاصر ہے۔ اخبارات، جس کی وساطت سے معمر پرنس کو سب سے پہلے اوٹسٹس کے مقام پر شکست کا علم ہوا تھا، حسب معمول ادھوری اور گول مول خبریں چھاپ رہے تھے کہ روسی کس طرح زبردست جنگی کارنامے سرانجام دینے کے بعد پاپائی اختیار کرنے پر مجبور ہوئے تھے اور ان کی یہ

پاپائی بڑے نظم و ضبط سے عمل میں آئی تھی۔ مسٹر پرنس اس سرکاری اطلاع سے سمجھ گیا کہ ہماری فوج پٹ یگی ہے۔ اوٹرنس کے معرکے کے ایک ہفتہ بعد اسے کوٹوزوف کا طویل خط موصول ہوا۔ اس کے بیٹے کے ساتھ جنگ میں جو کچھ بیٹا تھا، اس خط میں اس کی تفصیل بیان کی گئی تھی۔

’آپ کا بیٹا‘ کوٹوزوف نے تحریر کیا تھا، ’ایک رجمنٹ کی قیادت کر رہا تھا۔ اس نے اپنے ہاتھوں میں علم تھام رکھا تھا۔ وردہ میری نگاہوں کے سامنے سوراخوں کی طرح رہیں پر گرا تھا۔ اس نے جس شجاعت کا مظاہرہ کیا، وہ اس کے والد محترم اور مادر وطن کے شایان شان تھی۔ مجھے اور ساری فوج کو اس بات کا ملاں ہے کہ ہمیں، بھی تک یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ وہ زندہ ہے یا نہیں۔ میں اپنی بھی اور آپ کی بھی اس امید سے ڈھارس بندھاتا ہوں کہ آپ کا صاحب زادہ زندہ ہے، ورنہ اس کا نام ان انسروں میں، جو میدان جنگ میں پائے گئے اور جن کی فہرست عارضی صلح نامے کے تحت سیرے سیر دی گئی تھی، ضرور شامل ہوتا۔“

مسٹر پرنس کو یہ خط بوقت شام، جب وہ اپنے منڈی روم میں اکیلا تھا، ملا تھا۔ اگلی صبح وہ حسب معمول سیر کے لیے باہر نکلا تاہم وہ بے سٹیرارڈ، باغبان یا میر تعمیرات میں سے کسی سے بھی بات کرنے پر آمادہ نہیں تھا اور اگرچہ اس کے چہرے پر حزن وصال برس رہا تھا، اس سے کسی سے کچھ بھی نہ کہا۔

اور جب پرنس مار یا مقررہ وقت پر اس کی خدمت میں حاضر ہوئی، وہ خراہ پر کام کر رہا تھا اور اس نے حسب معمول آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔

”آہا، پرنس ماریا!“ اس نے اچانک جھپٹی نیچے پھینکتے ہوئے غیر فطری آواز سے کہا۔ (پہلے اپنے ہی زور پر حرکت کرتا رہا۔ اس کی جرخ چوں کس طرح، ہستہ آہستہ اختتام پذیر ہوئی، پرنس ماریا کو مدتوں یاد رہی کیونکہ اس کے بعد جو کچھ ظہور پذیر ہوا، وہ اس کے حافظے میں محفوظ رہ گیا تھا اور یوں اس دنوں چیزوں کے، میں تعلق قائم ہو گیا تھا) جب وہ اس کے قریب پہنچی اور اسے اس کا چہرہ نظر آیا، اس کا دل ڈوب گیا اور اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیر چھا گیا۔ اس کے باپ کے چہرے پر نہ اسی تھی اور نہ وہ مرجھایا ہوا تھا۔ وہاں بس غیظ و غضب جھلک رہا تھا اور جس انداز سے وہ کام کر رہا تھا، وہ غیر فطری تھا۔ اس نے جب اپنے باپ کی یہ کیفیت دیکھی، وہ سمجھ گئی کہ اس پر کوئی زبردست مصیبت نازل ہوا چاہی ہے۔ یہ مصیبت اسے ریزہ ریزہ کر دے گی ورنہ اس کی زندگی کی بدترین مصیبت ہوگی۔ اس مصیبت کا اسے ابھی تک کوئی تجربہ نہیں ہوا تھا، اس کا کوئی مددگار نہیں تھا اور یہ اس کی سمجھ سے بالاتر تھی۔ اور اس مصیبت کا تعلق ایک ایسے شخص کی، جس سے وہ محبت کرتی تھی، موت سے تھا۔

”mon pere!“ آندرے نے کہا۔ اگرچہ جسمانی اعتبار سے پرنس بونگی تھی اور رعنائی سے جہی دامن، لیکن اس کی گفتار میں جو غم و اندوہ اور خود فراموشی تھی، اس میں ایک ایسا حسن تھا جو مٹائے مٹ نہیں سکتا تھا۔ اس کا باپ اس کی نظروں کی تاب نہ لا سکا، اس نے سسکی لی اور منہ دوسری طرف پھیر لیا۔

”مجھے اطلاع موصول ہوئی ہے۔ اس کا نام نہ ہرک شدگان میں ہے اور نہ اسیروں میں... کو تو زوف نے لکھا ہے، اس کی اتنی تنگی چیخ نکل گئی جیسے وہ اس طرح چل کر اپنی بیٹی کو وہاں سے بھگانا چاہتا ہو، کہ وہ ہلاک ہو چکا ہے؟“

پرنس کی نہ تو ہمت نے جواب دیا اور نہ اس کے ہوش و حواس زائل ہوئے۔ اس کا رنگ پہلے ہی پیلا پڑ چکا تھا لیکن جب اس نے یہ الفاظ سنے، اس کے چہرے کی کایا پلٹ گئی اور اس کی خوبصورت اور منور آنکھوں سے نور کی شعاعیں پھوٹنے لگیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ شادمانی، مادرائے فطرت شادمانی، جو اس دنیائے دلوں کی مسرتوں اور غموں سے الگ تھلگ کوئی چیز تھی، اس کے عظیم داخلی کرب پر حاوی ہو گئی ہے۔ اپنے باپ کا جو خوف اس پر سوار رہا تھا، وہ اس نے فراموش کر دیا۔ وہ اس کے قریب گئی، اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا، اسے اپنے نزدیک کھینچا اور اپنا بازو اس کی دلی بستی، سوکھی مرجھائی گردن میں حائل کر دیا۔

”mon pere“ اس نے کہا۔ ”آپ مجھ سے در نہ نہیں، آئیں، ہم اکٹھے مل کر روتے ہیں۔“

”بد معاش! لے لے لے!“ بوڑھے نے اپنا منہ پھیرتے ہوئے دھاڑتے ہوئے کہا۔ ”خرا مزادے، فوج کا بیڑا غرق کر رہے ہیں! جوانوں کو موت کے گھاٹ اتار رہے ہیں! اور کیوں؟ جاؤ، جاؤ اور سہا کو بتاؤ۔“

پرنس بے چارگی کے عالم میں بے اختیار اپنے باپ کے قریب ایک بازوؤں والی کرسی پر گر پڑی اور دے لگی۔ اسے اپنا بھائی عین عین اسی طرح نظر آ رہا تھا جس طرح وہ اس وقت دکھائی دے رہا تھا جب وہ اسے اور سہا کو خدا حافظ کہہ رہا تھا۔ اس وقت اس کے انداز میں شفقت بھی تھی، دور رحمت بھی۔ پھر اس کے ذہن میں اس کی جو تصویر ابھری، وہ اس وقت کی تھی جب وہ اس کے گلے میں ایٹوٹہ حائل کر رہی تھی۔ وہ خوش بھی ہو رہا تھا اور اس کے چہرے پر طنز بھی ہو رہا تھا۔ ”کیا اسے اعتقاد کی دوست مل گئی تھی؟ کیا اسے اپنی بے اعتقادی پر غمت ہوئی تھی؟ کیا اب وہ وہاں۔ ابدی امن و برکتوں کی اقلیم میں ہے؟“ وہ سوچ رہی تھی۔

”mon pere“ مجھے بتائیں کہ یہ ہو کیسے؟“ اس نے شک بہاتے ہوئے پوچھا۔

”جاؤ، چلی جاؤ یہاں سے! وہ اس لڑائی میں، جس میں روس کے بہترین فرزند، روسی شان و شکوہ کے اہل موت کے منہ میں دھکیل دیے گئے، ہلاک ہوا۔ پرنس ماریا، جاؤ، جاؤ اور سہا کو بتاؤ۔ میں بعد میں آؤں گا۔“

جب پرنس، ریا اپنے باپ (کے کمرے) سے واپس آئی، کوچک پرنس پنا کام لیے بیٹھ رہی تھی۔ اس نے نگاہیں اوپر اٹھا کر دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں وہ داخلی اطمینان اور مسرت، جو صرف حاملہ خواتین سے مخصوص ہوتی ہے، جھلک رہی تھی۔ صاف نظر آ رہا تھا کہ اس کی نگاہیں پرنس ماریا کو نہیں دیکھ رہی بلکہ وہ اس کی اپنی ذات کے اندر، دور کہیں گہرائیوں میں، کسی سرور اور پراسرار چیز کو، جو وہاں رونما ہو رہی تھی، دیکھ رہی تھیں۔

”ماری!“ اس نے کشیدہ کاری کے فریم سے پرے ہٹتے اور اپنی کمر بھلی جانب جھکاتے ہوئے کہا۔ ”مجھے اپنا ہاتھ پکڑاؤ۔“

اس نے پرنس ماریا کا ہاتھ پکڑ لیا اور اسے اپنے پیٹ پر رکھ دیا۔ اس کی آنکھیں پر امید انداز سے سکر رہی تھیں، اس کا رد میں دار ہونٹ اوپر اٹھ اور بچوں کی معصوم سکر اہٹ سے آراستہ اوپر ہی اٹھا رہا۔

پرنس ماریا اس کے سامنے دور انو ہو گئی اور اس نے اپنی بھانج کے ڈریس کی تھوں میں اپنا منہ چھپا لیا۔
 ”وہیں۔ وہیں۔ تمہیں کچھ محسوس ہو؟ مجھے کتن عجیب محسوس ہوتا ہے! اور ماریا تمہیں معلوم ہے کہ میں اس سے بے پناہ محبت کروں گی؟“ لسانے کہا اور وہ ایسی نگاہوں سے، جن میں مسرت چھلک رہی تھی، اپنی منہ کو دیکھنے لگی۔

پرنس ماریا اپنا سر اوپر نہ ٹھسکی۔ وہ رو رہی تھی۔

”ماشا، کیا بات ہے؟“

”کچھ نہیں۔ بس کچھ ادا سی محسوس ہو رہی ہے۔ آندے کے بارے میں اس تھی؟“ اس نے اپنی بھانج کے گھٹنوں پر اپنی آنکھیں پونچھتے ہوئے کہا۔

صبح کے دوران میں پرنس ماریا نے متعدد مرتبہ اپنی بھانج کو (بری خبر سننے کے لیے) تیار کرنے کی سعی کی لیکن ہر بار اس کے آنسو رواں ہو گئے۔ اگرچہ کوچک پرنس عام طور پر اپنے گرد و پیش کی اشیاء پر کوئی خاص توجہ نہیں دیتی تھی، ان آنسوؤں سے، جن کی وہ کوئی توجہ نہ کرنے سے قاصر تھی، اس کے دل پر خوف بیٹھنے لگا۔ اس نے زبان سے تو کچھ نہ کہا لیکن بے چینی و راضطرب کے عالم میں وہ یوں ادھر ادھر نظریں دوڑانے لگی جیسے اسے کسی چیز کی تلاش ہو۔ رُسرے قبل، ستمبر پرنس، جس سے وہ سدا خوف کھاتی تھی، اس کے کمرے میں آیا۔ آج وہ خاص طور پر اضطرب اور چڑچڑاہٹ سے آ رہا تھا۔ تاہم وہ کچھ کہے بغیر ہر نکل گیا۔ کوچک پرنس نے پرنس ماریا پر بگاڑ ڈالی اور پھر کچھ دیر بیٹھی سوچتی رہی۔ اس کے چہرے پر داخلی انہماک، جو صرف حاملہ خواتین کا خاصہ ہوتا ہے، دکھائی دے رہا تھا۔ وہ پھر وہ اچانک رونے لگی۔

”آندے کی کوئی خبر آئی ہے؟“ اس نے پوچھا۔

”نہیں۔ تمہیں معلوم ہے کہ ابھی کوئی زیادہ وقت تو گزرا نہیں، اتنی جلدی خبر کیسے آسکتی ہے؟ تاہم man بہت فکر مند ہیں اور مجھے خوف محسوس ہو رہا ہے۔“

”گویا خبر دیر کچھ نہیں؟“

”کچھ نہیں،“ پرنس ماریا نے کہا۔ اس کی منور آنکھیں پر عزم انداز سے بھانج کو دیکھ رہی تھیں۔

وہ فیصلہ کر چکی تھی کہ وہ اپنی بھانج کو کچھ نہیں بتائے گی اور اس نے اپنے باپ کو بھی منالیا تھا کہ جب تک زندگی، جو چند دنوں میں متوقع تھی، نہیں ہو جاتی، وہ اس خوف ناک خبر کی اسے ہوا تک نہیں لگنے دے گی۔ پرنس ماریا اور ستمبر پرنس دونوں نے اپنے اپنے انداز سے اپنے غم کو چھپایا اور برداشت کیا۔ ستمبر پرنس نے کوئی امید باندھنے سے انکار کر دیا۔ وہ فیصلہ کر چکا تھا کہ پرنس آندے سے ہلاک ہو چکا ہے اور اگرچہ اس نے اپنے بیٹے کا اتنا پتا معلوم کرنے کی

غرض سے ایک سرکاری ملازم آسٹریا بھجوا دیا تھا، اس نے اس کی بدگارتعمیر کرنے کے لیے ماسکو آرڈر دے دیا۔ اس کا ارادہ تھا کہ اپنے بیٹے کی نشانی کے طور پر وہ اس کی یہ یادگار اپنے باغیچے میں بنوائے گا۔ وہ ہر شخص کو بتا چکا تھا کہ اس کا بیٹا جاگ ہو چکا ہے۔ اس نے اپنا طرزِ حیات کسی قسم کی تبدیلی لائے بغیر برقرار رکھنے کی کوشش کی لیکن وہ اندر سے ٹوٹ چکا تھا، اور اس کی ہمت جواب دیتی جا رہی تھی۔ اس کا گھومنا پھرنا، کھانا پینا، اور سونا، ابھی کم ہوتا جا رہا تھا اور وہ روز بروز کمزور سے کمزور تر ہونے لگا۔ پرنس، ریا آس کی ڈوری سے چٹکی رہی۔ وہ اپنے بھائی کے بے اسی طرح دعائیں کرتی تھی جیسے وہ بقیہ حیات ہو اور وہ ہر دم اس کی واپسی کی خبر کی منتظر رہتی تھی۔

8

"Ma bonne amie"۔ کوچک پرنس نے انیس مارچ کی صبح ناشتے کے بعد کہا۔ اس کا رویہ درہونہ ہمیشہ کی طرح اوپر اٹھا ہوا تھا لیکن جب سے وہ دہشت ناک خبر موصول ہوئی تھی، اس گھر کی ہر مسکراہٹ، ہر لفظ، بلکہ قدموں کی ہر چاب پر بھی غم راندہ کی چھاپ لگ چکی تھی۔ اگرچہ کوچک پرنس سب سے نابعد تھی لیکن عمومی کیفیت سے وہ بھی متاثر ہو چکی تھی۔ چنانچہ اب اس کی مسکراہٹ کچھ ایسی تھی کہ آدمی کو خواہ مخوہ عمومی اداسی کی یاد آ جاتی تھی۔ "Ma bonne amie" مجھے اندیشہ ہے کہ مجھے آج کا، بھوسٹو کا باورچن، "fruschtique" اس نہیں آیا۔

"نائی ڈارلنگ، کیا بات ہے؟ تمہارا رنگ زرد پڑ چکا ہے۔ تم واقعی بہت زرد ہو رہی ہو" پرنس ماریا نے خوف زدہ ہو کر کہا اور اپنی بھانج کی طرف بھاگی۔ اس کے پاؤں نرم دگدار لیکن چال بھاری اور بے ڈول تھی۔ "یوڑ ایکسی لینس، ہم ماریا باگدانو دنا کونہ بلا لیں؟" ایک حادثہ نے، جو کمرے میں موجود تھی، پوچھا۔ (ماریا باگدانو دنا داتی تھی، پڑوسی قبے میں رہتی تھی ورگزشتہ دو ہفتے سے بالڈ ہڑا جا رہی تھی۔)

"ہائل، ہائل، پرنس ماریا نے اپنی رضا مندی کا اظہار کر دیا۔ "شاید یہی بات ہے۔ میں خود جاتی ہوں۔ my ange، جو ملے کرو۔"

اس نے لسا کا بوسہ لیا اور کمرے سے باہر نکلنا چاہا۔

"اف، نہیں! نہیں!" کوچک پرنس زور دوتی تھی۔ اس پر مستزاد، اس کا چہرہ اس سر کی غمازی کر رہا تھا کہ اسے جو جسمانی مشقت بھگتنا تھی، وہ اس سے بچوں کی طرح خوف زدہ تھی۔ "نہیں، ماریا، نہیں، مجھے صرف بد ہضمی کی شکایت ہے۔ ہاں، ماریا، کہہ دو کہ یہ صرف بد ہضمی ہے۔ کہہ دو نا کہ یہ بد ہضمی ہے!" اور کوچک پرنس رونے لگی اور بچوں کی طرح دہمی اور قدرے بناوٹی انداز سے اپنے ہاتھ مسلے لگی۔

پرنس ماریا کمرے سے باہر بھاگ گئی۔ وہ ماریا باگدانو دنا کو جانے گئی تھی۔

"Oh mon Dieu! Mon Dieu!" اسے اپنے پیچھے آوازیں سنائی دیں۔

دائی پہلے ہی ادھر آ رہی تھی۔ وہ اپنے ننھے منے اور گداز سفید ہاتھ یوں پرسکون انداز سے مل رہی تھی جیسے وہ بڑی اہمیت جتلا رہی ہو۔

"ماریا باگدانوونا! میرا خیال ہے کہ آواز ہو گیا ہے!" پرس ماریا نے کہا۔ خوف و دہشت سے اس کی ہاتھوں کی پتلیاں پھیل گئی تھیں۔

"اچھا! پرس، خداوند کا شکر کرنا چاہیے،" ماریا باگدانوونا نے اپنی چال میں کسی قسم کی تیزی پیدا کیے بغیر کہا۔ "آپ جیسی نوجوان خواتین کو ایسی باتیں جاننے کی ضرورت نہیں ہے۔"

"لیکن ماسکو سے جس ڈاکٹر نے آنا تھا، وہ ابھی تک کیوں نہیں آیا؟" پرس ماریا نے پوچھا۔ (سا اور پرس اندرے کی خواہشات کے پیش نظر انھوں نے کافی دن پہلے ہی ڈاکٹر سنگوانے کے لیے، ماسکو پیغام بھجوایا تھا اور وہ توقع کر رہے تھے کہ وہ اب آیا کاب آیا۔)

"پرس، گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ آپ فکر نہ کریں،" ماریا باگدانوونا نے کہا۔ "ہم ڈاکٹر کے بغیر ہی چھا بھلا کام چلا لیں گے۔"

پانچ منٹ بعد پرس ماریا کو اپنے کمرے میں کچھ اس قسم کی آواز سنائی دی جیسے اس کے دروازے کے سامنے سے کوئی درنی چیز اٹھ کر لے جاتی جا رہی ہو۔ اس نے باہر جھانکا اور دیکھا کہ ملازمین پرس اندرے کے منڈی روم سے بڑ چری صوفہ اٹھا کر بیڈ روم میں لے جا رہے ہیں۔ ان کے چہرے بچھے بچھے اور سنجیدہ تھے۔

پرس ماریا اپنے کمرے میں، کیلی جینٹی تھی۔ گھر میں جو مختلف اقسام کی آوازیں پیدا ہو رہی تھیں، وہ انھیں بغور سن رہی تھی۔ وقتاً فوقتاً جب کوئی شخص ادھر سے گزرتا، وہ پناہ دروازہ کھولتی اور دیکھنے لگتی کہ راہداری میں کیا ہو رہا ہے۔ متعدد دھور تمیں، جو چپ چاپ بیڈ روم کے اندر جا رہی ہوتیں یا وہاں سے باہر نکل رہی ہوتیں، پرس ماریا پر نظر ڈالتیں اور اپنی رہ لیتیں۔ وہ کوئی سوال پوچھنے کی جرأت نہ کرتی بلکہ دروازہ بند کرتی اور اپنے کمرے میں واپس چلی جاتی۔ کبھی وہ واپس آ کر م کرسی پر بیٹھ جاتی، کبھی کتاب مناجات پڑھنے لگتی اور کبھی ایقونوں کی الماری کے سامنے دوز نو ہو جاتی۔ اسے یہ دیکھ کر حیرت بھی ہوئی اور دکھ بھی پہنچا کہ دعاؤں کی تلاوت کرنے کے باوجود اس کی گھبراہٹ میں کوئی تخفیف نہیں ہوئی تھی۔ چائیک دروازہ آسٹل سے کھلا اور اس کی بوڑھی نرس پراسکوویا ساواھینا، جو شادی اس کے کمرے میں آئی تھی کیونکہ معمر پرس نے اس کی ممانعت کر رکھی تھی، اپنے سر پر رومال لپیٹے دھیز پر دکھائی دی۔

"ناہیکا، میں کچھ دیر تمہارے ساتھ بیٹھنے آئی ہوں،" نرس نے کہا۔ "اور جان من، یہ دیکھو، میں وہ شمعیں، جو پرس کی شادی پر استعمال ہوئی تھیں، لائی ہوں۔ ہم یہ ان کے سینٹ کے ایقون کے سامنے روشن کریں گے۔"

"اف، نرس، میں بہت خوش ہوں!"

”مائی ڈارنگ، خداوند رحیم ہے۔“

نرس نے سنہری شمعیں الیقونوں کے سامنے روشن کر دیں اور اپنی کڑھائی لے کر دروازے کے قریب بیٹھ گئی۔ نرس ماریا نے ایک کتاب اٹھائی اور پڑھنے لگی۔ صرف اسی وقت جب انھیں آوازیں یا قدموں کی چاپ سنائی دیتی، وہ ایک دوسرے کی طرف دیکھتیں۔ نرس کی نگاہیں مترد اور تجسس ہوتیں جب کہ نرس کی پراعتماد اپنے کمرے میں بیٹھے نرس، ماریا کو جن جذبات کا تجربہ ہو رہا تھا، وہ سارے گھر پر سایہ فلکن تھے اور ہر شخص ان کی لپیٹ میں آچکا تھا۔ لیکن اس قدیم توہم کے پیش نظر کہ جو عورت دروزہ میں مبتلا ہو، جتنے کم لوگوں کو اس کی اذیت کا علم ہوگا، اسے اتنی ہی کم تکلیف ہوگی، ہر شخص یہ جھوٹ موٹ ظاہر کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ اسے کچھ معلوم نہیں کہ کیا ہو رہا ہے۔ کسی کی زبان پر اس کا ذکر نہ آیا۔ نرس کے گھر میں ویسے ہی جو ہر دم متانت اور سنجیدگی چھائی رہتی تھی، وہ تو تھی ہی، اس کے علاوہ یہ واضح کیفیت بھی نفہ میں محسوس کی جاسکتی تھی کہ سب کو ایک ہی قسم کی تشویش لاحق ہے، سب کے قلوب نرم دگداز ہو گئے ہیں اور سب اس امر سے آگاہ ہیں کہ اس لمحے کوئی عظیم اور ناقابل فہم چیز پچھل کے مراحل طے کر رہی ہے۔

خادماؤں کے کمرے میں کسی قسم کی ہنسی کی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ ملازمین کے کمرے میں بھی لوگ منتظر، خاموش اور چوکس بیٹھے تھے۔ نوکروں چاکروں کے مکاتوں میں سشعلیں اور موم بتیاں جل رہی تھیں اور ایک شخص بھی سویا نہیں تھا۔ معمر نرس زور زور سے اپنی ایڑیاں فرش پر پٹختا سنڈی روم میں ادھر ادھر چکر کاٹ رہا تھا۔ اس نے تنہا کو مار یا باگدا نو دنا کے پاس بھیجا۔

”اس سے صرف اتنا کہنا: مجھے نرس نے دریافت کرنے بھیجا ہے۔“ اور وہ جو بھی جواب دے، واپس آکر مجھے بتانا۔“

”نرس کو بتادو کہ دروزہ شروع ہو گیا ہے،“ ماریا باگدا نو دنا نے پیغام بر پر معنی خیز انداز سے نظر اٹاتے ہوئے کہا۔

تنہا واپس چلا گیا اور اس نے نرس کو یہ اطلاع پہنچا دی۔

”بہت اچھا،“ نرس نے کہا اور دروازہ بند کر لیا۔ اس کے بعد تنہا کو سنڈی روم سے ہلکی سے ہلکی آواز بھی سنائی نہ دی۔

کچھ دیر بعد تنہا دوبارہ سنڈی روم میں داخل ہوا اور یہاں نہ یہ بتایا کہ وہ موم بتیاں تراشنا چاہتا ہے۔ اس نے دیکھا کہ نرس صوفے پر دراز ہے۔ جب اس نے غور سے اس پر نظر دوڑائی، اسے معلوم ہوا کہ نرس کے چہرے پر زبردست فکر تشویش کے آثار موجود ہیں۔ اس نے اپنے سر کو جھٹکا دیا، وہ بے پاؤں چلتا اس کے قریب پہنچا، اس کے کندھے پر بوسہ دیا اور موم بتیاں بجھائے یا یہ بتائے بغیر کہ وہ کیوں اندر آیا تھا، باہر نکل گیا۔

کارگاہ حیات کی انتہائی گہیر چیتاں اپنے جادے پر رواں دواں تھیں۔ شام گزر گئی، رات آگئی۔ ناقابل

اور اک کی موجودگی میں ”ب کیا ہوگا؟“ کے احساس میں کوئی تخفیف ہوئی نہ دلوں کا گداز کسی طور کم ہو، بلکہ دونوں باتوں میں پہلے کی نسبت کچھ اضافہ ہی ہوا۔ کسی شخص کو بھی نیند نہ آئی۔



یہ مارچ کی ان راتوں میں سے ایک رات تھی جب زمستان اپنی تمام حشر سامانیوں کے ساتھ ایک بار پھر اپنی سیادت بحال کرنے پر تلا نظر آتا تھا۔ وہ اپنے چیختے چلاتے چنگھڑتے طوفانوں کے آخری تھیمڑوں اور زبردست برف باری کی جلو میں حملہ آور ہو رہا تھا۔ کچھ یوں محسوس ہو رہا تھا کہ وہ اپنے انتقام کی آگ بجھانے کے لیے برسرِ بیکار ہے۔ ماسکو سے جس جرمن ڈاکٹر نے آنا تھا، اس کی آمد ہر آن متوقع تھی۔ جن گھوڑوں کو اس کی گاڑی میں باری باری بٹھاتا تھا، انھیں شاہراہ پر بھیج دیا گیا تھا۔ مختلف چور ہوں میں متعدد دگھڑ سوار بھی کھڑے کر دیے گئے تھے۔ ان کے پاس لائینیں تھیں۔ انھوں نے اند میرے میں ڈاکٹر کو راستہ دکھانا تھا تا کہ وہ سڑک کے کھڈوں اور برف سے مستور پانی کے گڑھوں سے محفوظ رہ سکے۔

پرنس ماریا مدتوں پہلے کتاب تیاگ چکی تھی اور اس کی روشن دتا باں نکلیں نرس کے جھریوں زدہ چہرے پر جس کی وہ ایک ایک لکیر سے بخوبی آشنا تھی، اس کے سفید بالوں کی لٹ پر، جو اس کے رومال سے چمچ لگ آئی تھی اور اس کی ڈھیلی ڈھالی جلد پر، جو اس کی ٹھوڑی کے نیچے ڈھلک رہی تھی، جمی ہوئی تھیں۔

نرس سواشینا، کڑھائی ہاتھ میں پکڑے، زیر لب کہانی سنارہی تھی کہ مرحومہ پرنس نے کس طرح کشتی نیف کے مقام پر دئی کے بجائے ایک مولد اوکی عورت کی مدد سے پرنس ماریا کو جنم دیا تھا۔ وہ یہ کہانی اس سے قبل کوئی سو مرتبہ سنا چکی تھی لیکن اب وہ جو کچھ کہہ رہی تھی، اس کا نہ اسے خود کوئی علم ہو رہا تھا اور نہ اس کی آواز اسے سنائی دے رہی تھی۔

”فد وندر جیم ہے۔ ڈاکٹروں کی ضرورت نہیں ہے،“ اس نے کہا۔

اچانک تیز ہوا کا جھونکا آیا اور در پہچے کے واحد چوکھٹے سے گرانے لگا (سردیوں کے اختتام پر، جب کوئیں دوبارہ چھپھانے لگتی تھیں، پرنس کے حکم پر کھڑکیوں کے دہرے چوکھٹوں میں سے ایک ایک چوکھٹا اتار لیا جاتا تھا)۔ در پہچے کی چٹخی ڈھیلی ڈھالی تھی، وہ کھل گئی اور بوٹے دار ریشمی پردے پھڑپھڑانے لگے اور موم جی بجھ گئی۔ پرنس ماریا پر کبھی طاری ہو گئی، نرس جو جرب بن رہی تھی، وہ اس نے نیچے رکھ دی، انھی در پہچے کی جانب گئی، باہر جگ اور کھٹے پٹ کو پکڑنے کی کوشش کرنے لگی۔ سرد ہوا میں اس کے رومال کے کنارے اور اس کے سفید بالوں کی ڈھیلی نہیں پھڑپھڑانے لگیں۔

پرنس، مائی ڈیئر، خیابان پر کسی شخص کی گاڑی آرہی ہے،“ اس نے پٹ پکڑنے اور سے بند کیے بغیر کہا۔ ”لائینیں بھی ہیں۔ ضرور ڈاکٹر ہوں گے۔“

”اف، میرے خدایا! اف، شکر ہے خداوند!“ پرنس ماریا نے کہا۔ ”مجھے جانا اور اس کا استقبال کرنا چاہیے۔ انھیں بروی نہیں آتی۔“

پرنس ماریا نے کندھوں پر شمال لیشی اور ڈاکٹر سے ملنے باہر بھاگی۔ جب وہ پیش دہلیز میں سے گزری تھی، اس نے کھڑکی میں سے باہر جھانکا۔ اسے ایک گاڑی اور لائینیں نظر آئیں۔ گاڑی دروازے پر کھڑی تھی۔ وہ آگے بڑھی اور زینے کے قریب پہنچی۔ زینے کے جنگلے کے کھمبے پر چربی کی موسمی چپکے چپکے آنسو بہا رہی تھی۔ دردی پوش ملازم قہقہہ ایک اور موسم جی تھا۔ میٹھیوں کے درمیانی مچان پر مہوت کھڑا تھا۔ اس سے بھی نیچے، جہاں زینہ گھومتا تھا، کسی اور شخص کے، جس نے بھاری بوٹ پہنے ہوئے تھے، قدموں کی چاپ سٹائی دے رہی تھی۔ ایک آواز، جو پرنس ماریا کو جانی پہچانی محسوس ہوئی، کچھ کہہ رہی تھی۔

”خدا کا شکر ہے!“ آواز نے کہا۔ ”اور ابا جان؟“

”وہ سو گئے ہیں،“ بلر دی میاں نے کہا۔ وہ زینے کے نیچے کھڑا تھا۔

پھر آواز نے کچھ مزید کہا۔ وردیمپل نے اس کا جواب دیا۔ اب بھاری بوٹوں کی چاپ زینے کے اس سوڑے، جوٹا ہوں سے اوجھل تھا، سٹائی دے رہی تھی۔ یہ شخص، جو کوئی بھی تھا، خاصی تیر رفتار سے اوپر آ رہا تھا۔

”یہ تو آندرے ہیں!“ پرنس ماریا نے سوچا۔ ”نہیں، یہ وہ نہیں ہو سکتے۔ یہ بالکل انہونی بات ہوگی!“

جس لمحے اس کے ذہن میں یہ خیال آیا، پرنس آندرے کا چہرہ اور شکل، زینے کے اس مچان پر جہاں دردی پوش ملازم موسم جی پکڑے کھڑا تھا، نظر آئے گئے۔ پرنس آندرے کے جسم پر سمور کا کوٹ تھا۔ کوٹ کے کارکوبرف نے نہایت رکھا تھا۔ ”ہاں، یہ وہی ہیں لیکن مہین اور زردرو۔“ عجیب و غریب قسم کی نرمی اور پریشانی نے اس کے چہرے کو بالکل تبدیل کر دیا تھا۔ وہ زینے کے اوپر آیا اور اپنی ہمشیرہ سے لپٹ گیا۔

”تمہیں میرا خط نہیں ملا؟“ اس نے پوچھا اور جواب کا انتظار کیے بغیر، جو واقعاً اسے ملتا بھی نہ کیونکہ پرنس میں گفتگو کرنے کی سکت نہیں رہ گئی تھی، وہ نیچے اتر گیا اور ڈاکٹر کے ساتھ، جو اس کے پیچھے بیٹھا آ رہا تھا (دونوں کی ملاقات آخری اڈے پر ہوئی تھی)، ہرجیت دوبارہ اوپر آیا اور ایک بار پھر اپنی بہن سے لپٹ گیا۔

”ڈیر، شا! قسمت کے رنگ ڈھنگ بھی کتنے ترالے ہیں!“ اس نے کہا۔

اس نے کوٹ اور بوٹ اتار کر ایک طرف پھینکے اور کوچک پرنس کے کمرے کی طرف چل پڑا۔

کوچک پرنس سر پر سفید ٹوپی پہنے تکیوں کے سہارے لیٹی ہوئی تھی۔ (اس کا دروزہ ابھی ابھی ختم ہو تھا۔) اس کی سیاہ زلفیں لہراتی، بل کھاتی، اس کے رخساروں کے، جن پر سوجن تھی اور جو پسینے سے تر تھے، ارد گرد گھبراڈالے ہوئے تھیں۔ اس کا ننھا منادل آویز گلابی دامن رویں دار بوٹ سیت کھلاتا تھا اور وہ خوشی کے عالم میں مسک رہی تھی۔

پرنس آندرے کمرے میں داخل ہوا، اور وہ اس صوفے کی، جس پر وہ درختی، پائنتی کے قریب رک گیا اور اس کے رد کردہ ہو گیا۔ اس کی جھگاتی آنکھیں، جو طفلانہ اندیشوں اور جوش و خروش سے ملبو تھیں، آندرے کے چہرے پر ٹھہر گئیں۔ ”میں تم سے محبت کرتی ہوں۔ میں نے کسی کا کچھ نہیں بگاڑا۔ پھر مجھے اس ازیت میں سے کیوں گزرنا پڑا ہے؟ میری مدد کرو!“ اس کی نگاہیں کبھی محسوس ہو رہی تھیں۔ اسے اپنا خاوند نظر آ رہا تھا لیکن عین اس وقت اس کے سامنے اس کی موجودگی کی معنی رکھتی تھی، وہ اس کی تفہیم کرنے سے قاصر تھی۔ پرنس آندرے مڑا، صوفے کی ایک جانب کھڑا ہوا اور اس نے اس کی پیشانی پر بوسہ ثبت کر دیا۔

”ہائی ڈارلنگ!“ اس نے کہا۔ اس نے اس سے پہلے اس کے لیے یہ لفظ کبھی استعمال نہیں کیا تھا۔ ”خدا رحیم ہے۔“

وہ متحس نگاہوں سے اسے دیکھنے لگی۔ اس کی نظروں میں ہجگانہ زبردستی تھی۔

”مجھے امید تھی کہ تم میری مدد کرو گے لیکن مجھے یہ مدد نہیں ملی، نہیں ملی۔ تم سے بھی نہیں!“ اس کی نگاہیں کہہ رہی تھیں۔ وہ اس کی آمد پر حیران نہیں ہوئی تھی۔ اسے یہ اندازہ ہی نہ ہوا کہ وہ آگیا ہے۔ اس کی آمد کا اس کی ازیت، درتسکین سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ دروزہ پھر شروع ہو گیا اور ماریہ باگدا نووانے پرنس آندرے کو مشورہ دیا کہ وہ کمرے سے باہر چلا جائے۔

ڈاکٹر اندر آگیا۔ پرنس آندرے کمرے سے باہر نکل گیا۔ اس کی پرنس ماریہ سے دوبارہ ٹھہر ہو گئی اور وہ اس کے پاس چلا گیا۔ وہ سرگوشیوں میں باتیں کرنے لگے لیکن بار بار خاموش ہو جاتے۔ وہ انتظار کر رہے تھے اور کان لگائے سن رہے تھے۔

”ہائی ڈیئر، جائیں!“ پرنس نے کہا۔

پرنس آندرے دوبارہ، پٹی بیوی کے اپارٹمنٹ میں چلا گیا اور ملحقہ کمرے میں بیٹھ کر انتظار کرنے لگا۔ بیڈروم سے ایک عورت باہر نکلی۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اثر رہی تھیں اور اس نے جب پرنس آندرے کو دیکھا، تو بالکل گڑبگڑ گئی۔ پرنس آندرے نے اپنا چہرہ اپنے ہاتھوں میں ڈھانپ لیا اور کئی منٹ یونہی بیٹھا رہا۔ ملحقہ کمرے سے چیخنے چلانے اور کراسنے کی لاچار اور دل دوز حیوانی آوازیں آرہی تھیں۔ وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا، دروازے کے قریب پہنچا اور سے کھولنے کی کوشش کرنے لگا۔ کوئی شخص اسے اندر سے بند کیے ہوئے تھا۔

”آپ اندر نہیں آسکتے؟ نہیں آسکتے!“ ادھر سے کوئی رہشت زدہ آواز میں کہہ رہا تھا۔

وہ کمرے میں چھل قدمی کرنے لگا۔ چٹخیں بند ہو گئیں۔ کئی سیکنڈ گزر گئے۔ پھر ایک ایکی بیڈروم سے دل خراش جی بلند ہوئی۔ ”یہ وہ نہیں ہو سکتی، وہ ایسی چیخ نہیں مار سکتی۔“ پرنس آندرے سرپٹ دروازے کی طرف بھاگا۔ چیخ ایسا موت آپ مر گئی اور ایک (مولود) بچے کے رونے کی آواز سنائی دی۔

”یہ لوگ بچے کو وہاں کیوں لے گئے ہیں؟“ پرنس آندرے کو اس لمحے تعجب ہو رہا تھا۔ ”بچہ؟ کیسا بچہ... یہ بچہ“

پیدا ہوا ہے؟“

جب اسے اچانک اس روم کی خوش کن معنویت کی سمجھ آئی، آنسوؤں سے اس کا گلہ بندھ گیا۔ اس نے دونوں کہنیاں درستی کی چوکت پر نکالیں اور بچوں کی مانند ہلکنے لگا۔

دروازہ کھلا۔ ڈاکٹر کمرے سے باہر آیا۔ اس نے کوٹ تار ہوا تھا، اور قمیص کی آستینیں اوپر چڑھائی ہوئی تھیں۔ اس کی رنگت اڑی ہوئی تھی اور جڑا کانپ رہا تھا۔ پرنس آندرے اس کی جانب بڑھا لیکن ڈاکٹر نے اس پر مضربہ نگاہ ڈالی اور ایک لفظ کہے بغیر گئے نکل گیا۔ ایک عورت دیوانہ وار بھاگتی باہر آئی اور پرنس آندرے کو دیکھ کر چوکت پر ہی رک گئی۔ وہ ہچکچا رہی تھی۔ پرنس آندرے اپنی بیوی کے کمرے میں چلا گیا۔ وہ انتقال کر چکی تھی۔ وہ بالکل اسی حالت میں، جس میں اس نے اسے چند منٹ قبل دیکھا تھا، لیٹی ہوئی تھی۔ اور اس امر کے باوجود کہ اس کی آنکھیں ایک مقام پر ٹھہر چکی تھیں اور اس کے رخساروں پر زردی کھنڈ گئی تھی لیکن رومیں دروازائی ہونٹ سمیت اس کے منہ نے دل آویز، شریلے اور بچکانہ چہرے پر کوئی تبدیلی رونما نہیں ہوئی تھی

”میں تم سب سے محبت کرتی ہوں اور میں نے کسی کا کچھ نہیں بگاڑا اور یہ تم نے میرے ساتھ کیا کر دیا ہے؟“ دلخشا، دل خراش، بے جان چہرہ کہہ رہا تھا۔

کمرے کے ایک کونے میں کوئی ننھی مٹی اور سرخ سرخ شے مار یا بگدا نودنا کے لرزے کا پتے ہاتھوں میں غرق اور چھیں چھیں کی آوازیں بلند کر رہی تھی۔



دو گھنٹے بعد پرنس آندرے دبے پاؤں اپنے باپ کے سٹڈی روم میں داخل ہو۔ بوڑھے کو ہر بات کا پیچھے ہٹا ہوا چکا تھا۔ وہ دروازے کے نزدیک کھڑا تھا اور جونکی یہ واہوائ اس کے ضعیف اور بے سوج بازو تھکے کی طرح پے پیچنے کی گردن کے گرد لپٹ گئے اور ایک لفظ کہے بغیر وہ بچوں کی طرح سسکیاں لینے لگا۔



تین روز بعد کوچک پرنس کو سپرد خاک کر دیا گیا۔ پرنس آندرے آگے بڑھا اور تابوت کے پہلو میں کھڑا ہو گیا کہ وہ اسے آخری مرتبہ خدا حافظ کہہ سکے۔ اگرچہ اس کی آنکھیں بند تھیں لیکن تابوت میں بھی اس کا چہرہ جوں کا توں تھا۔ ”اے تم نے میرے ساتھ کیا کر دیا ہے؟“ وہ اب بھی یہی کہتا نظر آ رہا تھا۔ پرنس آندرے کو محسوس ہوا کہ اس کی روح پارہ پارہ ہو گئی ہے اور یہ کہ اس سے ایک ایسا جرم سرزد ہوا ہے جس کی شدت صحیح کر سکتا ہے اور نہ جسے وہ نرا ہوش کر سکتا ہے۔ وہ رد بھی نہیں سکتا تھا۔ بڑے میاں بھی آئے در انھوں نے اس کے جتنے سنے مومی ہاتھ (اس کے

دونوں ہاتھ اس کے سینے پر ایک دوسرے کے اوپر پڑے تھے) پر بوسہ دیا۔ انھیں بھی اس کا چہرہ کہہ رہا تھا: "اف! یہ تم نے میرے ساتھ کیا کر دیا ہے؟۔ اور کیوں؟" اور اس چہرے کو دیکھ کر بڑے میاں بہت بھنائے اور واپس مڑ گئے۔



مزید پانچ دن گزر گئے۔ پھر چھوٹے پرنس نکولائی، اندر یوچ کو ہتھمہ دینے کی رسم ادا کی گئی۔ جس کھل میں وہ بیٹھا ہو تھا، وردہ پلانے والی اما نے اسے اپنی ٹھوڑی سے تھم رکھا تھا جب کہ پادری ہنس کے سرطوب پر سے شیر خوار کی سرخ آلود پتیلیوں اور تلوں پر مسخ کرتا رہا۔

شیر خوار کا دینی باپ، جو اس کا دادا تھا، اس خوف سے لرزاں دترساں تھا کہ کہیں بچہ اس کے ہاتھوں سے نیچے نہ گر پڑے۔ تاہم وہ اسے ٹین کے اس شکستہ برتن کے، جس میں ہتھکے کا پانی گرایا جاتا تھا، پاس لے گیا۔ وہاں اس نے اسے اس کی دہائی، اس پرنس ماریا کے سر دکھ دیا۔ پرنس آندرے ملحقہ کمرے میں بیٹھا تھا۔ اس کا کلیجہ اس فکر سے اس کے منہ سے باہر نکل رہا تھا کہ کہیں وہ اسے برتن میں ہی نہ ڈبو دیں۔ وہ رسم کے چند از چند ختم ہونے کا انتظار کر رہا تھا۔ جب ترس بچے کو اس کے پاس لائی، اس کی رگ رگ میں خوشی کی ہر دوڑ گئی اور وہ نظریں اوپر اٹھا کر دیکھنے لگا۔ جب ترس نے اسے اس نیک شگون کے متعلق بتایا کہ موم کا وہ کٹڑا، جس میں شیر خوار کے بال تھے، جب ہتھکے کے پانی کے برتن میں پھینکا گیا، وہ ڈوبا نہیں بلکہ حیرت انگیز رہا، تو اس نے پسندیدگی کے اظہار کے طور پر اپنی گردن ہلا دی۔

10

لوخوف اور بزوخوف کے مابین ڈویل میں رستوف نے جو کردار ادا کیا تھا، معمر کاؤنٹ کی مساعی سے اسے دبا دیا گیا۔ توقع تو اسے یہی تھی کہ اس کی تنہا کردی جائے گی اور اسے عام سپاہیوں میں بھیج دیا جائے گا لیکن ہو یہ کہ سے ماسکو کے گورنر جنرل کا ایجنٹ مقرر کر دیا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اپنے خاندان کے باقی افراد کے ساتھ گاؤں نہ جاسکا بلکہ اپنے نئے فرائض نبھانے کے سلسلے میں اسے ساری گرمیوں کے دوران میں ماسکو میں قیام کرنا پڑا۔ لوخوف صحت یاب ہو گیا۔ بحالی صحت کے زمانے میں رستوف کا اس کے ساتھ گہریارانہ ہو گیا۔ ماساؤنی صبح کے دوران میں وہ اپنی داندہ کے، جو اس سے بے انتہا اور پر جوش محبت کرتی تھی، گھر بسر پر درار رہا۔ بوڑھی ماریا ایوانووا رستوف کو بھی پسند کرنے لگی کیونکہ وہ اس کے نڈیا کا دوست تھا۔ وہ کثرت اپنے بیٹے کے متعلق اس سے باتیں کیا کرتی تھی۔

"ہاں کاؤنٹ،" وہ کہا کرتی، "بیدل کا تناصف اور پاک ہے کہ ہمارے زمانے کے بد عنوان معاشرے کا ساتھ نہیں اسے سکتا۔ نیکی کی اب کسی کو پروا نہیں رہی۔ ہر شخص نیکی کو اپنے لیے بامشونگ سمجھتا ہے۔ اب، کاؤنٹ،

مجھے بتاؤ کہ بروخوف نے جو کچھ کیا، وہ ٹھیک تھا اس کے شایان شان تھا؟ اور فدیہ کی شرافت رکھو۔ یہاں سے جی جان سے چاہتا تھا اور اب بھی اس کے خلاف ایک لفظ تک اپنی زبان پر نہیں لاتا۔ پیٹرز برگ میں انھوں نے جو شرارتیں کیں اور پولیس مین کے ساتھ جو حرکت کی، اس میں یہ کبھی شامل تھے۔ تھے یا نہیں؟ لیکن بروخوف کا بال بھی بیکانہ ہوا جب کہ سارا نزلہ فدیہ پر گرا۔ سے کیا کچھ برداشت نہ کرنا پڑا؟ ٹھیک ہے کہ وہ بحال ہو چکا ہے۔ لیکن وہ سے بحال کرنے سے انکار بھی کیسے کر سکتے تھے؟ میں سمجھتی ہوں کہ ادھر (میدان جنگ میں)، دروہن کے اس جیسے دلیر اور جانباز سپوتوں کی تعداد کوئی خاص نہ تھی۔ ورا ب؟۔ یہ ڈوئیل! کیا یہ لوگ ہر قسم کے جذبے اور عزت و آبرو کے احساس سے عاری ہو چکے ہیں؟ یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ اکلوتا بیٹا ہے، اسے ڈوئیل کے لیے لٹکارنا اور پھر اس طرح اسے سیدھا گولی کا نشانہ بنانا مردانگی ہے؟ یہ تو کوئی نیکی ہمارے کام آگئی اور خداوند کا شکر ہے کہ اس نے ہم پر رحم فرمایا! پھر یہ سارا ہڈیاں گٹا کیوں؟ آج کے زمانے میں کون ہے جس کے ذمے چھپے معاشقے نہیں چلتے؟ اگر اسے اتنا ہی حسد تھا، میری ناقص رائے کے مطابق، اسے اس کا فوراً اظہار کر دینا چاہیے تھا، پورے بارہ ماہ انتظار نہیں کرتے رہنا چاہیے تھا۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ فدیہ اس کا مقروض ہے، اس لیے وہ اس کے ساتھ لڑنے سے انکار کر دے گا لیکن اس کے باوجود اس نے اسے لٹکارنے کی ہمت کی! کتنی گھٹیا، کتنی وہی حرکت ہے! میرے عزیز کاؤسٹ، میں جانتی ہوں کہ تم فدیہ کو سمجھتے ہو اور یقیناً مانو، اس لیے میں تمہیں دل کی گہرائیوں سے پیار کرتی ہوں۔ بہت کم لوگ ہوں گے، جو اسے سمجھ سکے ہوں گے۔ وہ تو فرشتہ خصلت اور نہایت ہنس پائی انسان ہے۔

بحالی صحت کے زمانے میں خود بروخوف رستوف سے جس قسم کی گفتگو کیا کرتا تھا، بہت کم لوگوں کو یہ یقین ہو سکتی تھی کہ وہ اس طرح کی باتیں کر سکتا ہے۔

”میں جانتا ہوں کہ لوگ مجھے بدتمیز شخص سمجھتے ہیں،“ وہ کہا کرتا۔ ”وہ جو کچھ کہتے ہیں، شوق سے کہتے رہیں! مجھے جن لوگوں سے محبت ہے، ان کے علاوہ مجھے کسی اور شخص کی رتی برابر پروا نہیں۔ لیکن میں جس شخص سے پیار کرتا ہوں، اس کی خاطر اپنی جان بھی قربان کر سکتا ہوں۔ لیکن جہاں تک دوسروں کا تعلق ہے، اگر وہ میرے راستے کی دیوار بنے، میں ان کا گلا بھی گھونٹ سکتا ہوں۔ میری ایک پیاری، و جب تعظیم اور گرانقدر ماں ہے یا بھروسہ دو تین دوست ہیں جن میں تم بھی شامل ہو۔ رہے باقی لوگ، میں ان پر صرف اس حد تک توجہ دیتا ہوں کہ وہ میرے لیے کتنے کارآمد یا ضرر رساں ہیں، دوران میں سے بیشتر، خاص طور پر عورتیں، ضرر رساں ہی ہیں۔ ہاں، میرے پیارے دوست، اس نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا، میں ایسے مردوں سے، جو محبت کرنے ہیں، شریف النفس اور عالی رماغ ہیں، ملا ہوں لیکن مجھے ابھی تک کوئی ایسی عورت۔ وہ کاؤسٹس ہو یا اور جن۔، جو بکاؤ، سامان ہو، نہیں ملی۔ مجھے عورت میں جس ملکوتی پاکیزگی اور دفا شعاری کی جستجو ہے، وہ آج تک دستیاب نہیں ہوئی۔ اگر مجھے کہیں ایسی عورت مل گئی، میں اس پر اپنی جان نثار کر دوں گا۔ لیکن وہ۔“ اور اس نے ہاتھ سے کچھ اس قسم کا اشارہ کیا جس سے نفرت اور حقارت کا اظہار ہوتا تھا۔ ”اور میری بات کا یقین کرو، اگر میں ابھی تک زندگی کو نگاہ بند

دیکھتا ہوں، تو اس کی وجہ محض یہ ہے کہ مجھے اب بھی یہ عقائد ہیں کہ مجھے ایک نہ ایک روز ایسی قدرتی ہستی، جو میری تخلیق کر دے گی، مجھے پاکیزہ بنادے گی اور مجھے آسمان تک ٹھارے گی، ضرور مل جائے گی۔ لیکن تم ان باتوں کو نہیں سمجھ سکو گے۔“

”اجی صاحب، میں بالکل سمجھ گیا ہوں،“ رستوف نے، جو بری طرح اپنے نئے دوست کے زیرِ اثر آچکا

تھا، کہا۔



خریف کے دنوں میں رستوف واپس ماسکو آ گئے۔ جاڑوں کے آغاز میں دینی سوف بھی لوٹ آیا اور اس کے ہاں ہی قیام پذیر ہو گیا۔ 1806 کے زمستان کے ابتدائی مہینے، جو کوماکی رستوف نے ماسکو میں گزارے، وہ اس کی اور اس کے خاندان کی زندگی کے انتہائی مسرت بخش اور سرور کن ایام میں سے تھے۔ کوماکی خاصی بڑی تعداد میں نو عمر اور نوجوان لڑکے اپنے والدین کے گھروں میں رہتا تھا۔ دیرانیوں سال کی خوش شکل دوشیزہ تھی۔ سولہ سالہ سونیا اپنی ذات میں نورمیدہ کلی کی تمام دلکش خصوصیات سموئے ہوئے تھی۔ نیم بالک اور نیم دوشیزہ ناسا ایک لمبے بچکانہ مسخریاں کرتی تھی اور اگلے ہی لمحے مسکور کن دوشیزگی کا طلسم بکھیرنے لگتی تھی۔

جن گھروں میں نوجوان اور پرکشش دوشیزائیں ہوتی ہیں، وہاں کی فضاؤں میں محبت کی خوشبودیں سن گئی جاسکتی ہیں۔ رستوفوں کے گھر میں بھی اس کی موجودگی کا احساس ہوتا تھا، اگرچہ کھلے بندوں اس کا کوئی خاص ذکر نہیں ہوتا تھا۔ ہر نوجوان، جو رستوفوں کے گھر میں قدم رکھتا تھا اور ان زرد و اثر پذیر ہتے سکر اتے چہروں (جو لاریب اپنی ہی خوشیوں پر مسکراتے تھے) کو دیکھتا اور ان نو عمر دوشیزوں کو، جن کی امیدیں جوان تھیں اور جو ہر وقت ہر کام میں ہاتھ ڈالنے کے لیے پابہ رکاب رہتی تھیں، جس طرح بے ربط لیکن دوستانہ انداز سے چچھاتی تھیں اور ساز و آہنگ کے فی البدیہہ جادو جگاتی تھیں، سنتا تھا، اس کا بھی دل چل چلا جاتا تھا۔ اس، حوال میں جس طرح نو عمر وصال چمن رستوف محبت کی زلف گرہ گیر کے اسیر ہونے اور مسرتوں اور شادمانیوں کی توقعات ہاندھنے کے لیے پیہم کمر بستہ رہتے تھے، اسے بھی اسی قسم کے جذبات کا تجربہ ہونے لگتا تھا۔

جن نوجوانوں کو رستوف نے اپنے گھرانے سے متعارف کرایا، ان میں دل و خوف بھی تھا۔ ناسا کے، سوا گھر کا ہر فرد اسے ہنسنے پر مجبور دیکھتا تھا۔ اس کے سلسلے میں وہ اپنے بھائی سے قریب تر رہا۔ جھگڑا پی۔ اس کا اصرار تھا کہ وہ بدعات ہے، اور اس نے بزدل خوف کے ساتھ جو ڈونسل لڑی تھی، اس میں پیئر کا موقف صحیح در دل و خوف کا غلط تھا۔ دایہ بھی کہتی تھی کہ یہ شخص اسے ایک آنکھ نہیں بھاتا، یہ کج سرشت اور کج فطرت ہے۔

”میرے بچنے کے لیے ہے ہی کیا؟“ اس نے بالقصد ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کرتے ہوئے گلہ پھاڑ کر کہا۔ ”وہ فاسق دغا باز اور پتھر دل ہے۔ اور تم جانتے ہو کہ میں تمہارے اس دینی سوف کو پسند کرتی ہوں۔ حالانکہ وہ بھی تمہارا

مین ہے اور تلاش مینوں کی ساری حرکتیں کرتا ہے۔ پھر بھی میں اسے پسند کرتی ہوں۔ آیا خیال شریف میں؟ میں تمام باتیں خوب سمجھتی ہوں۔ صرف اتنی بات ہے کہ مجھے اپنا مافی الضمیر ادا کرنا نہیں آتا۔ یہ شخص جو کچھ بھی کرتا ہے، پہلے سے اچھی طرح سوچا سمجھا ہوتا ہے اور یہی بات مجھے پسند نہیں ہے۔ جہاں تک دینی سوف ہے۔“

”ارخ، دینی سوف کا مسئلہ کچھ اور ہے،“ رستوف نے جواب دیا۔ اپنے ان الفاظ سے وہ مین السطور سے متاثر چاہتا تھا کہ دلوخوف کے مقابلے میں دینی سوف کی حیثیت پر کاہ کے بھی برابر نہیں۔ ”تمہیں یہ سمجھنا ہوگا کہ دلوخوف کتنا عظیم انسان ہے۔ اسے تب دیکھو جب وہ اپنی ماں کے پاس ہوتا ہے۔ کیا اس پایا ہے اس شخص نے؟“

”خیر، میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتی لیکن اس شخص کی موجودگی میں مجھے بے کلی محسوس ہونے لگتی ہے۔ تمہیں معلوم ہے کہ وہ سونیا سے محبت کرنے لگا ہے؟“

”کیا بیک بک کر رہی ہو...“

”مجھے اس بارے میں یقین ہے۔ تم خود دیکھ لو گے۔“

ناتاشا کا قیافہ صحیح ثابت ہوا۔ دلوخوف، جو اصولاً خواتین کی صحبت کی پرورائیں کرتا تھا، اس گھر میں بار بار آنے لگا۔ اور اس سوال کا کہ وہ کس کی خاطر آتا ہے (حالانکہ کوئی بھی اسے زبان پر نہ مانتا تھا)، بہت جلد جواب مل گیا۔ وہ سونیا کو دیکھنے آتا تھا۔ اور گرچہ سونیا کو کبھی اقرار کا حوصلہ نہ ہوسکا، وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ دیکھ کر آتا ہے اور جب بھی وہ آتا تھا، اس کا چہرہ پیر بہوٹی کی طرح سرخ ہو جاتا تھا۔

دلوخوف اکثر رستوفوں کے ہاں کھانا کھایا کرتا تھا اور شہر کی، جس تقریب میں وہ شریک ہوتے تھے، وہ وہاں جانا کبھی نہیں بھولتا تھا۔ ڈاسنگ ماسٹر فوگل ”نوجوانوں کے لیے اجتماعی رقصوں“ (بال) کا اہتمام کیا کرتا تھا۔ رستوف ان رقصوں میں ہمیشہ موجود ہوتے تھے۔ دلوخوف بھی ان میں جانے لگا۔ وہ سب کی نظروں کے سامنے سونیا کو اپنی توجہ کا مرکز بنالیتا تھا اور اسے کچھ اس انداز سے دیکھتا تھا کہ نہ صرف وہ اس کی نگاہوں کی تاب نہ لا سکتی اور شرم سے سرخ ہو جاتی، بلکہ جب سمرکاؤٹس اور ناتاشا بھی اس کی ان نگاہوں کو دیکھتیں، انھیں بھی شرمندگی کا احساس ہونے لگا۔ صاف ظاہر تھا کہ یہ مضبوط دلتوانا اور اجنبی شخص اس سانولی سلونی اور طرح دار دو شیرہ کی، جو کسی اور کی محبت کا دم بھرتی تھی، زلفوں کا بری طرح اسیر ہو چکا تھا۔

رستوف کو دلوخوف اور سونیا کے مابین نئی بات نظر آئی، لیکن یہ نئے تعلقات کیا تھے، اس کے لیے ان کی نوعیت طے کرنا مشکل ہو رہا تھا۔ ”یہ ہمیشہ کسی نہ کسی کی محبت کا دم بھرتی رہتی ہیں،“ اس نے ناتاشا اور سونیا کے متعلق سوچتے ہوئے اپنے آپ سے کہا۔ لیکن دلوخوف اور سونیا کی محبت میں اسے جو سکون ملا کرتا تھا، اب نہیں ملتا تھا اور وہ پہلے کی نسبت گھر میں کم وقت گزارنے لگا۔

1806 کے پت جھڑ کے مہینوں میں ایک بار پھر ہر شخص کی زبان پر پولین کے ساتھ جنگ کا ذکر آنے لگا۔ گزشتہ سال کی نسبت اب لوگ جنگ کا تذکرہ زیادہ جوش و خروش سے کرتے تھے۔ فرمان جاری ہو گیا کہ ہر ہزار

اشخاص میں سے نہ صرف دس کو باقاعدہ فوج میں بلکہ مزید نوکویلیا میں بھرتی کیا جائے گا۔ ہر جگہ نیولین کے لئے لپے جا رہے تھے اور ماسکوی میں گنگو کا واحد موضوع جنگ، جو سروں پر منڈلا رہی تھی، بن گئی تھی۔ جہاں تک دستوف گھرانے کا تعلق ہے، سے ان جنگی تیاریوں میں صرف اتنی دلچسپی تھی کہ کسی طرح کوشش کا سکومس رہ جائے لیکن وہ خود اس کا ذکر کرنے کے لئے بھی تیار نہیں تھا۔ وہ صرف یہ انتظار کر رہا تھا کہ دینی سوف کی چھٹی ختم ہو اور وہ اس کے ساتھ کرس کے بعد دوبارہ اپنی رجنٹ میں چلا جائے۔ بجائے اس کے کہ قریبی روالگی اس کے پاؤں کی زنجیر بنی اور اس کے دلوں پر اس ڈالتی، اس نے اٹا میز کا کام دیا اور وہ پیسے سے بڑھ چڑھ کر تفریحات کرنے لگا، وہ گھر کم کم تیار دنیا توں، تفریہوں اور اجتماعی رقص کی محفلوں میں زیادہ جانے لگا۔

11

کرس کی تیسری تعطیل کے روز نکولائی نے گھر پر ہی کھانا کھایا عار نکہ گزشتہ کچھ عرصے سے اس نے ایسا شاذ ہی کیا تھا۔ یہ پر تکلف لورائی ڈرتھا کیونکہ اس نے اور دینی سوف نے تہوار روز دو از دہم کے اگلے روز اپنی اپنی رجنٹوں میں حاضری دینے کے لئے روانہ ہونا تھا۔ دو خوف اور دینی سوف سمیت تقریباً بیس اشخاص موجود تھے۔

اگرچہ دستوفوں کے گھر میں محبت کا کھلے بندوں کوئی خاص ذکر نہیں ہوتا تھا لیکن ان تعطیلات کے دوران میں یہ جس طرح فضا میں رہتی رہی تھی اور اس نے جس طرح ہر چیز کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا، ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ ”شادمانی اور سرت کے لمحات سمیت لو، یہ کہہ رہی تھی۔ ”محبت کرو اور محبت کرو! اس عالم ناپائیدار میں بس یہی چیز حقیقی ہے۔ باقی سب حقت ہے۔ یہی ایک چیز ہے جس میں یہاں ہمیں دلچسپی ہے!“

ان تمام مقدمات کا، جہاں اسے جانا چاہیے تھا، جہاں اسے مدعو کیا گیا تھا، چکر لگائے بغیر اور حسب معمول گھوڑوں کی دو جڑیوں کا کچھ سر نکال دینے کے بعد نکولائی ڈنر سے ذرا قبل لوٹ آیا۔ جونہی وہ اندر داخل ہوا، اسے احساس ہوا کہ گھر کی فضا، جس میں محبت کی خوشبو بکھری رہتی تھی، کشیدگی سے مملو ہو چکی ہے۔ اسے یہ احساس بھی ہو کہ حاضرین عجیب طرح کی بے کلمی اور بے قراری محسوس کر رہے ہیں۔ سونیا، دلو خوف اور سحر کا ڈنٹس خاص طور پر مضطرب اور پریشان تھے۔ نناش بھی قدرے گھبرا رہی تھی لیکن دوسروں کی نسبت ذرا کم۔ نکولائی سمجھ گیا کہ ڈنر سے قبل سونیا اور دلو خوف کے مابین مازنا کوئی وقوع پیش آیا ہوگا۔ یہاں اس کی جہلی موقع شناسی کام آئی اور ڈنر کے دوران میں وہ دلوں کے ساتھ بڑی حلیم الطبعی اور احتیاط سے پیش آتا رہا۔ اسی شام فوگل کے ہاں پل، جس کا وہ چھٹیوں کے دوران میں اپنے شاگردوں کے سے، تمام کیا کرتا تھا، منعقد ہونا تھا۔

”نگولین کا تم فوگل کے ہاں آرہے ہو؟ ضرور آنا،“ نناش نے کہا۔ ”انھوں نے خاص طور پر تمہیں بلایا ہے۔“

واپس دسرج (دینی سوف) بھی جائیں گے۔“

”چھوٹی کا ڈنٹس کے حکم پر تو میں کنوئیں میں بھی چھلا لگ لگانے کو تیار ہوں،“ دینی سوف نے مذاق مذاق

میں نتاشا کے ٹائٹ کا منصب سنبھال لیا تھا۔" میں pas de chale²⁸ قمیص کرنے کے لیے بالکل تیار ہوں۔"

"اگر مجھے وقت ملا،" نکولائی نے جواب دیا۔ "آرخاروف دعوت کا اہتمام کر رہے ہیں۔ میں نے جاننے والے کی ہامی بھری تھی تمہارا کیا ارادہ ہے؟" اس نے دو خوف کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔

جونہی اس کے منہ سے یہ الفاظ نکلے، اسے اندازہ ہو گیا کہ اسے یہ سواں پوچھنا ہی نہیں چاہیے تھا۔

"شاید..." ولو خوف نے سونیا کو سرد و غضب ناک لگا ہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ پھر نکولائی سے اس کے ماتھے پر ہل پڑ گئے اور وہ نکولائی کو بالکل اسی طرح، جس طرح اس نے ضیافت کے موقع پر میز کو کلب میں دیکھا تھا دیکھنے لگا۔

"کوئی نہ کوئی گڑبڑ ضرور ہے،" نکولائی نے سوچا اور اس کے تیانے کی یوں تصدیق ہو گئی کہ ذرے کے معابد ولو خوف رخصت ہو گیا۔ اس نے نتاشا کو اپنے پاس بدایا اور اس سے پوچھتے لگا کہ معاملہ کیا ہے۔

"میں تمہیں ہی ڈھونڈ رہی تھی،" نتاشا نے اس کی طرف دوڑتے ہوئے کہا۔ "میں نے تمہیں بتایا بھی تھا لیکن تمہیں یقین ہی نہ آیا،" اس نے بڑے طعمران سے کہا۔ "اس نے سونیا کو شادی کی تجویز پیش کی تھی۔"

اگرچہ حایہ ایام کے دوران میں نکولائی نے سونیا کو شادی اپنے خیالات کا سرگز بنایا تھا، لیکن جب اس نے یہ بات سنی، اسے اپنی روح پر آ رہے چلتے محسوس ہوئے۔ بے چیز یتیم لڑکی کے لیے دو خوف مناسب اور بعض اوقات سے نہایت شاندار بر تھا۔ اگر معمر کاؤٹش اور اعلیٰ طبقے کے نقطہ نظر سے دیکھا جاتا تو اس بات کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کہ وہ اسے مسترد کرتی۔ چنانچہ نکولائی کا اولین رد عمل یہی تھا اور اسے سونیا پر شدید غصہ آیا۔ وہ یہ کہا ہی چاہتا تھا: "یہ تو بہت اچھی بات تھی۔ اسے بچکانہ وعدے وعید بھلا دینا چاہیے تھے اور اس کی تجویز قبول کر لیا چاہیے تھا۔" لیکن اسے یہ بات کہنے کا موقع ہی نہ مل سکا کیونکہ نتاشا اپنی ہی بات کے جاری تھی۔

"کیا تم سوچ سکتے ہو۔ کہ اس نے اسے ٹھکرا دیا، نکاس جواب دے دیا،" نتاشا نے کہا اور مختصر وقفے کے بعد اس نے مزید کہا: "اس نے اسے بتا دیا ہے کہ وہ کسی اور سے پیار کرتی ہے۔"

"ہاں، میری سونیا یہی کر سکتی تھی اور کچھ نہیں!" نکولائی نے سوچا۔

"اور اماں نے اس کے بہترے ترے منتیں کیوں وہ انکار ہی کرتی رہی۔ میں جانتی ہوں کہ جب وہ کسی بات کا تہیہ کریتی ہے، پھر وہ اس میں کوئی تبدیلی نہیں کرتی۔"

"اماں اسے مناتی رہی کہ وہ انکار نہ کرے؟" نکولائی نے مدت آمیز انداز سے کہا۔

"ہاں،" نتاشا نے کہا۔ "نکولائی، تم جانتے ہو۔ ناراض نہ ہونا۔ لیکن مجھے معلوم ہے کہ تم اس سے شادی نہیں کرو گے۔ مجھے معلوم ہے، مجھے کیسے معلوم ہوا یہ صرف خداوند کو معلوم ہے، لیکن میں پورے یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ تم اس سے شادی نہیں کرو گے۔"

"خیر، یہ ایک ایسی بات ہے جس کے متعلق تم کچھ نہیں جانتی ہو،" نکولائی نے کہا۔ "لیکن میں اس سے"

بات کرنا چاہتا ہوں۔ سو نیا کتنی اچھی ہے۔“ اس نے مسکراتے ہوئے اضافہ کیا۔
 ”ہاں، وہ واقعی بہت اچھی ہے۔ میں اسے تمہارے پاس بھیج دیتی ہوں۔“
 اور مٹاشا نے اپنے بھائی کا بوسہ دیا اور وہاں سے رونو چکر ہو گئی۔

ایک منٹ بعد سو نیا آ گئی۔ وہ سبھی سبھی، بدحواس اور خط کار نظر آرہی تھی۔ کو مائی اس کے پاس گیا اور اس نے اس کے ہاتھ پر بوسہ دیا۔ جب سے وہ واپس آیا تھا، دونوں کی تنہائی میں یہ پہلی ملاقات تھی اور پہلی بار انھوں نے ایک دوسرے کے ساتھ رلزدنیا کی باتیں کیں۔

”سوئی،“ وہ اس سے مخاطب ہوا۔ ابتداً وہ خاصا جھینپ رہا تھا، لیکن جوں جوں اس کی زبان کھلتی گئی، توں توں اس کا حوصلہ بڑھتا چلا گیا۔ ”اگر تمہارا ارادہ ایک ایسے شخص کو، جو نہ صرف نہایت اچھا اور فائدے مند رہے۔ بلکہ وہ نہایت قابل تعریف اور عالی منشا انسان ہے۔۔۔ اور میرا دوست۔“

سوئی نے اسے ٹوک دیا۔ وہ اسے اندیشہ ناک و رمتجیانہ نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔ ”کولس، مجھ سے کہیں وہ بات نہ کہہ دینا،“ اس نے کہا۔

”لیکن مجھے کہنا ہی ہو گا۔ ممکن ہے کہ یہ بات کہنے کا میرا حق نہ دیتا ہو لیکن بہتر یہی ہے کہ میں یہ بات کہہ ہی دوں۔ اگر تم سے میری وجہ سے ٹھکرارہی ہو، پھر مجھے تم سے کئی بات کہنا ہی ہو گی۔ مجھے یقین ہے کہ کسی دوسرے کی نسبت میں تم سے کہیں زیادہ محبت کرتا ہوں۔“
 ”میرے لیے اتنا ہی کافی ہے،“ سوئی نے کہا۔

”نہیں، میں کوئی ہزار مرتبہ گرفتار محبت ہو چکا ہوں اور آئندہ بھی ہوتا رہوں گا۔ لیکن جو یک نکتہ، اعتماد اور محبت تمہارے متعلق محسوس کرتا ہوں، کسی اور کے متعلق محسوس نہیں کرتا۔ پھر میں جوان ہوں۔ اس کو یہ بات پسند نہیں۔ حیرت میں صرف، تاکہ کہنا چاہتا ہوں کہ میں کسی قسم کا وعدہ نہیں کر سکتا۔ اسی لیے میں چاہتا ہوں کہ تم دو خوف کی پیشکش پر غور کرو،“ اس نے کہا۔ اسے اپنے دوست کا نام زبان پر لاتے بڑی دقت محسوس ہو رہی تھی۔

”مجھ سے ایسی باتیں مت کہو۔ مجھے کچھ نہیں چاہیے۔ میں تم سے بھائیوں کی طرح پیار کرتی ہوں اور ہمیشہ کرتی رہوں گی۔ اور مجھے، درحقیقت نہیں چاہیے۔“

”تم فرشتہ ہو۔ میں تمہارے لائق نہیں ہوں۔ لیکن مجھے ہمیشہ یہی دھڑکا لگا رہتا ہے کہ میں تمہیں کہیں غلط راستے پر نہ ڈال دوں۔“

اور اس نے دوبارہ سو نیا کا ہاتھ چوم لیا۔

نہیں ہوتی۔ یہ خیال ان ماؤں کا ہوتا جب وہ اپنے نو خیر لڑکے لڑکیوں کو قدم سے قدم ملا کر رقص، مس کا ہنر انھوں نے حال ہی میں سیکھا ہوتا کرتے دیکھتیں۔ خود ان نو خیر لڑکے لڑکیوں کا بھی رقص کے دوران میں یہی خیال ہوتا۔ ناچتے ناچتے ان کے اجسام تھکاوٹ سے چور ہو جاتے اور یوں لگتا کہ وہ ابھی گرے، ابھی گرے لیکن ان کی طبیعت نہ بھرتی اور وہ رقص کرتے چلے جاتے۔ وہ مرد اور خواتین، جن کا شباب پھٹ پڑتا، جو آتی تو سر پرستی کے جذبے کے تحت تھیں لیکن جب وہ بھی لطف و مسرت سے سرشار ہونے لگتیں، پھر وہ بھی اسی قسم کی آرا کا اظہار کرنے لگتیں۔ اس سال اجتماعی رقص کی ان محافل کی بدولت دور شے طے ہو گئے۔ گور چاکوف خاندان کی دو پرنسپسوں کو یہیں پر ملے اور بعد میں انھیں سے ان کی شادیاں ہوئیں۔ یوں رقص کی ان محفلیوں کو مزید شہرت حاصل ہو گئی۔ اس قسم کی دوسری محفل سے جو چیر ان محافل کو ممتاز کرتی تھی، وہ یہ تھی کہ ایک تو یہاں کوئی میزبان، نہ مرد نہ عورت، نہیں ہوتا تھا۔ دوسرے نیک طینت فوگل کی موجودگی تھی۔ وہ مہمانوں سے ٹکٹ وصول کرنے کے دوران میں پھنپھری کی طرح ادھر ادھر بھاگا پھرتا اور اپنے نن کے اصحابوں کے مطابق کسی کو جھک کر سلام کرتا اور کسی کے ساتھ رگڑ کھا جاتا۔ ان محافل کی ایک اور خصوصیت یہ تھی کہ یہاں صرف وہی لوگ، جو واقعی رقص کرتا اور اس سے لطف اندوز ہونا چاہتے تھے، آنے تھے۔ ان لوگوں میں تیرہ تیرہ چودہ چودہ سالہ اعلیٰ دوشیزائیں، جنھوں نے زندگی میں اولیں بار لبا ڈریں پہنا ہوتا تھا، خاص طور پر شامل ہوتی تھیں۔ ان کی مسکراہٹوں میں سرستی اور آنکھوں میں جھمکاہٹ ہوتی۔ چند ایک کو چھوڑ کر وہ بھی حسین و جمیل ہوتیں یا حسین و جمیل نظر آتیں۔ بعض اوقات بہترین شاگرد، جن میں ننا شا، جو غیر معمولی طور پر سبیلی اور طرح دار تھی اور بہترین میں سے بھی بہترین تھی، شامل ہوتی رقص شامل (pas de challe) بھی کرنے لیکن سال کی اس آخری محفل میں صرف فرانسیسی رقص ²⁹ecossaise، انگریزی رقص ³⁰anglaise اور پولستانی رقص مازورکا (mazurka) کا، جس کا ابھی ابھی رواج شروع ہوا تھا، مظاہرہ کیا گیا۔ فوگل نے بزدخوف کے محل نما مکان میں ایک بال روم مستعد کر لیا تھا اور جیسا کہ ہر شخص نے کہا، رقص کی یہ محفل انتہائی کامیاب رہی۔ وہاں درحضور خوش شکل دوشیزائیں تھیں در دستوں کی لڑکیاں حسین ترین دوشیزاؤں میں سے تھیں۔ اس روز سب دشا مالہ ان دونوں کے انگ، نگ سے پھوٹ رہی تھی۔ اسی روز سونیا کو دلوخوف نے شادی کا پیغام دیا تھا۔ وہ اس نے ٹھکرا دیا تھا۔ پھر اس کی نکوائی سے باتیں ہوئی تھیں ان تمام چیزوں نے اس پر سرور و وجد کی وہ کیفیت طاری کر دی کہ وہ اپنے کمرے میں کد کڑے لگاتی پھری اور خادمہ کو س کی سینڈھیبا بنانے میں سخت رقت پیش آئی۔ اب یہاں رقص کی محفل میں اضطراری مسرت و انبساط نے اس کے چہرے کو درخشاں و تابندہ بنا دیا تھا۔ ننا شا، جس نے زندگی میں اولین بار لبا ڈریں پہنا تھا اور رقص کی حقیقی اور جیتی جاگتی محفل میں شریک ہوئی تھی، اس سے بھی زیادہ خوش تھی۔ دونوں بڑکیاں سفید مٹل کے ڈریسوں میں، جن پر گلابی رہن آویزاں تھے، ملبوس تھیں۔

ننا شانے جو ننکی بال روم کے اندر قدم رکھا، وہ محبت میں غمور ہو گئی۔ وہ کسی فرد واحد پر فدا نہیں ہو رہی تھی بلکہ اسے ہر کس و نا کس پر پیارا رہا تھا۔ جس شخص پر بھی اس کی نگاہ پڑتی، وقتی طور پر وہ اس کی محبت میں گرفتار ہو جاتی۔

”اف، یہ ہاں، یہ ماحول، کتنا خوبصورت، کتنا دلکش ہے!“ وہ بار بار دوڑتی سونیا کے پاس جاتی اور اس سے کہتی رہتی۔

کولہائی اور دینی سوف ادھر ادھر گھوم پھر رہے تھے اور رقص کرنے والوں کو یوں دیکھ رہے تھے جیسے اس پر بڑی کرم فرمائی کر رہے ہوں۔

”وہ کتنی خوبصورت ہے۔ ایک روز وہ سچ مچ حسن کی دیوی ہوگی!“ دینی سوف نے کہا۔

”کون؟“

”کاکوشنس مناشا، دینی سوف نے جواب دیا۔ ”کیا رقص کرتی ہے؟ کیا رعنائی ہے؟“ اس نے توقف کے بعد مزید کہا۔

”کس کا ذکر کر رہے ہو؟“

”تمہاری ہمشیرہ کا، اور کس کا؟“ دینی سوف نے جھٹکا کر کہا۔

”رستوف نے کھیس نکال دیں۔“

”Mon cher Comte“ کو تاہ ثابت فوگل نے رستوف کی طرف آتے ہوئے کہا۔ ”تم میرے بہترین شاگردوں میں ہو، تمہیں ضرور رقص کرنا چاہیے! دیکھو، ایک سے ایک بڑھ کر حسین ہیں!“ اس نے دینی سوف سے بھی یہی درخواست کی۔ وہ بھی اس کا پرانا شاگرد تھا۔

”Non, mon cher!“ دینی سوف نے کہا۔ ”میں دور سے کھڑے ہو کر تماشا دیکھنے کو ترجیح دوں گا۔ آپ کو یاد نہیں کہ آپ کی تعلیمات کا مجھ پر خاک اتر نہیں ہوا تھا؟“

”ارے نہیں!“ فوگل نے جھٹ پٹ اسے یقین دلایا۔ ”بات صرف اتنی ہے کہ تم توجہ ذرا کم دیتے تھے، ورنہ تم میں ذہانت کی کمی نہیں تھی۔ ارے ہاں، تم واقعی ذہین تھے!“

آرکسٹرانے مازور کا کی، جس کا نیا نیا رواج ہوا تھا، رخصتیں چھیڑ دیں۔ کولہائی فوگل کو جواب نہیں دے سکتا تھا اور اس نے سوئے کر رقص کی دعوت دی۔ دینی سوف بزرگ خواتین کے پاس بیٹھ گیا۔ اپنی ہمشیرہ پر جھکتے اور موسیقی کی دھن پر اپنا پاؤں تھرکاتے وہ نہیں دلچسپ تھے کہانیاں سنانے اور ہنسانے لگا لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس کی نگاہیں رقص کنندگان پر مرکوز تھیں۔ پہلی جوڑی فوگل اور مناشا کی تھی (مناشا اس کی بہترین طالبہ اور اس کے لیے سرمایہ فخر و مباہات تھی)۔ فوگل نے اپنے ننھے منے پاؤں کی، جو ڈھیلے ڈھالے، ور نرم جوتوں میں مستور تھے، پکڑتے اور سبک رفتار سے پہلے مناشا کے ساتھ، جو شرمیلی رہی تھیں لیکن پورے انہماک سے اپنے قدم اس کے قدموں سے مل رہی تھیں، تپکی کی طرح کمرے کا چکر لگایا۔ دینی سوف نے ایک لمحوں کے لیے بھی اسے اپنی نگاہوں

”مالی ڈیر کا ڈنٹ“

”نہیں، مالی ڈیر۔“

سے اوجھل نہ ہونے دیا۔ وہ اپنی شمشیر سے موسیقی کی بے کا اس طرح ساتھ دے رہا تھا کہ صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ اگر وہ رقص میں شریک نہیں تھا، تو اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ اسے رقص کرنا آتا نہیں تھا، بلکہ اس لیے کہ اسے اس کی پروا نہیں تھی۔ ایک موقع پر، جب رقص چلت پھرت سے خاص قسم کا خاکہ بنا رہے تھے، اس نے رستوف کی جو اس کے قریب سے گزر رہا تھا، ہاتھ کے اشارے سے بلایا اور کہا:

”یہ اصلی رقص نہیں ہے،“ اس نے کہا۔ ”یہ کس قسم کا پولستانی مازدر کا ہے؟ لیکن وہ بہت دل آویز انداز سے رقص کر رہی ہے۔“

نگولائی جانتا تھا کہ دینی سوف جس ماہر انداز سے مازدر کا رقص کرتا تھا، اس کے لیے اس نے خود پولینڈ میں بڑی شہرت حاصل کر لی تھی۔ چنانچہ وہ بھگم بھاگ نناشا کے پاس پہنچی اور بولا

”جاؤ اور دینی سوف کو اپنا ساتھی چنو۔ وہ صحیح معنوں میں رقص ہے۔ اس کا رقص دیکھ کر آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جاتی ہیں!“

جب نناشا کی دوبارہ باری آئی، وہ اٹھی اور اپنے ننھے منے خوبصورت منقش جوتے پہنے شرماتے اور تیز چلتے اکیلی اس کونے کی، جہاں دینی سوف بیٹھ تھا، جانب بڑھی۔ وہ جانتی تھی کہ ہر شخص کی نظریں اس پر لگی ہوئی ہیں اور منتظر ہیں کہ وہ کیا کرتی ہے۔ نگولائی نے دیکھا کہ وہ مسک رہے ہیں اور آپس میں تکرار کر رہے ہیں۔ دینی سوف انکار کر رہا تھا حالانکہ خوشی سے اس کی ہاتھیں کھلی جا رہی تھیں۔ وہ ان کی طرف بھاگا۔

”داسیلی دمرچ، مان بھی جائیں!“ نناشا کہہ رہی تھی، ”مان بھی جائیں نا!“

”نہیں، کاؤنٹس، میری جان بخش دو!“ دینی سوف نے کہا۔

”داسکا، جانے بھی دو!“ نگولائی نے کہا۔

”میں پوری شام آپ کو گانا سناؤں گی،“ نناشا نے وعدہ کیا۔

”یہ ننھی منی ساحرہ، مجھ سے جوچی چاہے، کرا سکتی ہے!“ دینی سوف نے اپنی شمشیر اتارتے ہوئے کہا۔

وہ کرسیوں کے عقب سے باہر آیا، مضبوطی سے اپنی رفیقہ کا بازو تھا، سر کو جھکا دیا، ایک قدم آگے بڑھایا اور تال کا انتظار کرنے لگا۔ صرف اسی وقت جب وہ یا تو گھوڑے پر سوار ہوتا یا مازدر کا رقص کر رہا ہوتا، لوگوں کا دھیان اس کی کوتاہ قستی کی طرف نہ جاتا۔ صرف انھیں اوقات کے دوران میں وہ واقعی یا نکا بجیا، جو وہ خود کو سمجھتا تھا، نظر آتا۔ موسیقی کی صحیح تال پر اس نے شوخ اور فاتحانہ انداز سے اپنی رفیقہ کو ترچھی نگاہوں سے دیکھا۔ ایک ایک پاؤں سے فرش پر ٹھوکر ماری اور یوں سیدھا بھاگا کہ معلوم ہوتا تھا کہ جو کرسیاں سامنے پڑی تھیں، ان پر اس کی نظر نہیں پڑی۔ پھر ہمیز کھنکھاتے در اپنے پاؤں الگ، لگ فرش پر جاتے وہ آناٹا مارک گیا اور اپنی ایڑیوں پر کھڑا ہو گیا۔ وہ ایک سیکنڈ یونہی کھڑا رہا۔ پھر اپنے ہمیز کھنکھاتے اس نے دونوں پاؤں سے فرش پر ٹھوکر ماری، سرعت سے گھوما، تب اپنی بائیں ایڑی دائیں ایڑی سے ٹکرائی اور دوبارہ دائرے کی صورت میں گھوم گیا۔ نناشا بھانپ گئی

کہ اس کے عزائم کیا ہیں۔ اس نے خود کو اس کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔ وہ وہی کچھ کر رہی تھی، جو وہ کر رہا تھا، لیکن وہ خود بھی سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ وہ یہ سب کچھ کیسے کر رہی ہے۔ دینی سوف نے پہلے اسے دائیں ہاتھ سے لٹو کی طرح گھمایا اور پھر بائیں سے۔ ایک گھٹنے پر اس کے سامنے جھکا، اسے اپنے گرد ایک چکر دیا اور دست لگا کر یوں اضطراری طور پر تندی کی طرح آگے بھگا گویا کہ وہ دم لیے بغیر دوڑتے دوڑتے سارے کمرے پار کر جائے گا۔ پھر وہ ایک دم رکا اور اس نے ایک بار پھر بالکل انوکھے اور غیر متوقع انداز سے مختلف قسم کی چلت پھرت کا مظاہرہ کیا۔ اپنی رفیقہ کو اس کی کرسی کے سامنے مشائی سے لٹو کی طرح گھماتے کے بعد اس نے اپنی ایڑیاں ایک دوسرے سے ٹکرائیں اور اس کے سامنے دوڑ نو ہو گیا۔ مناشا نے اسے جھک کر سلام تک نہ کیا۔ وہ بوکھلائی ہوئی تھی اور یوں مسکرا مسکرا کر اسے گھورائی تھی جیسے وہ اسے پہچان نہ رہی ہو۔

”یہ کیا تھا؟“ اس نے ہانپتے ہوئے پوچھا۔

اگرچہ فوگل کی دانست میں یہ صحیح مازور کا نہیں تھا، پھر بھی دینی سوف کی مہارت نے سب کو مسحور کر دیا تھا۔ ریشزائیں بار بار اس کے پاس آئیں اور اسے اپنی رفیقہ بنانے کی درخواست کرتیں۔ جہاں تک بزرگوں کا تعلق تھا، وہ پولینڈ درجیتے ایام یاد کرنے لگے۔ مازور کا کے بعد دینی سوف کا چہرہ تسمتہ نے لگا اور وہ رومال سے اپنے چہرے کا پسینہ پونچھتا مناشا کے قریب بیٹھ گیا۔ اس نے محفل کے اختتام تک مناشا کا پیچھا نہ چھوڑا۔

13

اس کے بعد دو دن گزر گئے۔ اس دوران میں دلوخوف رستوف سے ملنے نہ خود اس کے گھر گیا اور جب رستوف اس کے اپنے گھر آیا، وہ وہاں اسے ملا۔ تیسرے روز رستوف کو اس کا رقعہ ملا

میرا کبھی تمہارے گھر دوبارہ آنے کا ارادہ نہیں۔ اس کی وجہ سے تم خود بھی واقف ہو۔ میں اپنی رجسٹر میں وہ ایسک جا رہا ہوں۔ آج رات میں اپنے دوستوں کو الوداعی سپردے رہا ہوں۔ انگلش ہوٹل آ جاتا۔

تھینکر سے فارغ ہونے کے بعد، جہاں وہ اپنے خاندان اور دینی سوف کے ہمراہ گیا تھا، رستوف دس بجے میدم انگلش ہوٹل چلا گیا۔ سے بلاتا خیر ہوٹل کے بہترین کمرے میں، جو دلوخوف نے شام کے لیے ریزرو کر لیا تھا، پہنچا دیا گیا۔

تقریباً بیس، شخامس نے میز کے، جس کے سامنے دلوخوف دو سو مٹیوں کے، مابین بیٹھا ہوا تھا، ارد گرد ہجوم کر رکھا تھا۔ میز پر طلائی سکوں اور نوٹوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ (یہاں تو ربازی ہو رہی تھی۔) دلوخوف ہتھ پانٹ رہا تھا اور دھوئے کی رقم کا نیچا رچ تھا۔ جب سے سونیا نے دلوخوف کا رشتہ ٹھکرایا تھا، رستوف کی اس سے ملاقات نہیں ہوئی

تھی اور اب جب کہ دونوں کی مڈھ بھینٹ ہونے والی تھی، اس کے تصور ہی سے اس پر گھبراہٹ طاری ہونے لگی تھی۔
جونی رستوف کمرے میں داخل ہوا، دو خوف کی آنکھوں میں چمک آگئی اور اس نے سر دھرا نہ نگاہوں سے
اسے یوں دیکھا جیسے وہ اس کا بہت دیر سے منتظر ہو۔

’ہاری کچھ دنوں سے ملاقات نہیں ہوئی،‘ اس نے کہا۔ ’تمھاری تشریف آوری کا شکریہ۔ میں ذرا لیپے
ہاٹ لوں۔ پھر تمھارا یہ خادم ایلوشا اپنے ماڈلشکر سمیت تمھاری خدمت میں حاضر ہو جائے گا۔‘
’میں ایک دوسرے تمھارے گھر گیا تھا،‘ رستوف نے کہا اور اس کی رنگت سرخ ہو گئی۔

دو خوف نے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ ’جی چاہے تو تم بھی داؤ لگا دو،‘ اس نے کہا۔
ایک مرتبہ رستوف کی دو خوف سے کچھ عجیب قسم کی گفتگو ہوئی تھی، اب اسے وہ یاد آ گئی۔ ’صرف اتنی ہی یہ
سمجھتے ہیں کہ اگر قسمت کی دیوی مہربان ہو، وہ جوئے میں جیت جائیں گے،‘ دو خوف نے اس وقت کہا تھا۔
’یہ تم میرے ساتھ کھیلنے سے گھبراتے ہو؟‘ دو خوف نے اس سے کچھ اس انداز سے پوچھا جیسے وہ جو کچھ
سوچ رہا تھا، اس کا اسے الہام ہو گیا ہو۔ دو خوف مسکرا رہا تھا۔

اس مسکراہٹ کے عقب میں رستوف کو اس کی وہی ڈھنسی کیفیت، جو اس نے اس میں کلب کی دعوت میں
اور متعدد دیگر مواقع پر دیکھی تھی، نظر آئی۔ ایسے مواقع پر رستوف کو ہمیشہ یہی احساس ہوا تھا کہ دو خوف روزمرہ کی
زندگی کی یکسانیت سے اکتا چکا ہے۔ اور اس سے دامن چھڑانے کے لیے اسے کوئی عجیب و غریب لیکن زیادہ تر سفاکانہ
حرکت کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے۔

رستوف کو بے چینی ہونے لگی۔ وہ دماغ سوزی کرنے لگا کہ اسے کوئی ایسا لطیفہ یا پر لطف جملہ یاد آجائے
جس سے وہ دو خوف کے سوال کا ترکی بہ ترکی جواب دے سکے لیکن وائے حسرت، اس کے ذہن میں کچھ بھی نہ
آیا۔ اور یوں بھی اسے جواب دینے کا موقع ہی نہ مل سکا کیونکہ دو خوف نے، جس کی نگاہیں سیدھی اس کے چہرے
پر جمی ہوئی تھیں، نہایت آہستہ آہستہ، ایک ایک لفظ چبا کر، تاکہ ہر کوئی اس کی بات سن سکے، اس سے کہا۔

’تمہیں یاد ہے کہ ہم دونوں نے تاش کے متعلق باتیں کی تھیں... میں نے کہا تھا: ’صرف اتنی ہی یہ سمجھتے
ہیں کہ اگر قسمت کی دیوی مہربان ہو وہ جوئے میں جیت جائیں گے۔ تاش میں آدمی کو محتاط ہو کر کھیلنا چاہیے۔‘ آج
میں اس کی آزمائش کرنا چاہتا ہوں۔‘

’تم قسمت آزما چاہتے ہو یا احتیاط؟‘ رستوف نے پوچھا۔

’بہتر ہے کہ تم نہ ہی کھیلو،‘ دو خوف نے تاش کی نئی گڈی، جو اس نے ابھی ابھی کھوں تھی، اچھالتے ہوئے
کہا۔ ’دوستو، تم لگا دو۔‘

دو خوف نے تم آگے دھکیل دی اور پتے باٹنے کی تیاریاں کرنے لگا۔ رستوف اس کے قریب بیٹھ گیا، راستہ
کھینچنے سے متنبہ رہا۔ دو خوف بار بار اس پر نظریں ڈالتا رہا۔

”خیر تم کھیلتے کیوں نہیں؟“ اس نے پوچھا۔

درغیب بات یہ ہوئی کہ رستوف کو اضطراری طور پر یہ محسوس ہوا کہ اسے چٹالے لینا چاہیے۔ چنانچہ اس نے پتا پکڑا، اس پر معمولی رقم لگائی اور کھیل میں شریک ہو گیا۔

”میرے پاس پیسے نہیں ہیں،“ اس نے کہا۔

”مجھے تم پر اعتبار ہے۔“

رستوف نے پتے پر پانچ روپے لگائے اور ہار گیا۔ اس نے مزید پانچ روپے لگائے اور وہ ن سے بھی ہاتھ دھو بیٹھا۔ دلوخوف مسلسل دس پتوں تک اسے مار دیتا یعنی ہراتا رہا۔

”دوستو!“ دلوخوف نے متعدد بار پتے بانٹنے کے بعد کہا۔ ”مہربانی فرمائیں اور اپنی اپنی رقم اپنے اپنے پتوں پر رکھ دیں، ورنہ مجھ سے حساب میں گڑبڑ ہو جائے گی۔“

ایک کھلاڑی نے کہا: ”مجھے امید ہے کہ تم مجھ پر اعتبار کر لو گے۔“

”ٹھیک ہے تم پر اعتبار کیا جاسکتا ہے لیکن مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں گڑبڑ نہ ہو جائے۔ اس لیے میں یہ درخواست کروں گا کہ اپنی اپنی رقم اپنے اپنے پتوں پر رکھ دیں،“ دلوخوف نے کہا۔ ”تمہیں نکل کر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم بعد میں حساب کتاب کر لیں گے،“ اس نے رستوف کی طرف متوجہ ہو کر مزید کہا۔

کھیل جاری رہا۔ ایک پیرا مسلسل شیمپین لانا رہا۔

رستوف ہر پتے پر مار کھاتا رہا اور آٹھ سو روپے کا مقروض ہو گیا۔ ابھی اس نے ایک پتے پر الفاظ ”آٹھ سو روپے“ لکھے ہی تھے کہ اس نے، جب اس کے گلاس میں شیمپین انڈلی جا رہی تھی، اپنا ارادہ بدل دیا اور داؤں کی مقررہ رقم میں روپے تحریر کرنا چاہی۔

”چلنے دو،“ دلوخوف نے کہا حالانکہ بظاہر یہی نظر آ رہا تھا کہ اس نے رستوف کی طرف دیکھا تک نہیں۔ ”نہد ہی تم یہ ساری رقم دوبارہ جیت جاؤ گے۔ میں دوسروں سے ہار رہا ہوں لیکن تم سے جیت رہا ہوں... یا تم مجھ سے خوف زدہ ہو؟“ اس نے پوچھا۔

رستوف نے اس کی بات پر عمل کیا۔ اس نے آٹھ سو روپے کی رقم داؤں پر لگی رہنے دی اور پان کا ستا، جس کا ایک کونا پھٹا ہوا تھا اور جسے اس نے فرش سے اٹھایا تھا، نیچے رکھ دیا۔ بعد میں اسے یہ پتا اچھی طرح یاد رہا۔ اس نے پان کا ستا، جس پر اس نے چاک کے شکستہ ٹکڑے کے ساتھ بالکل واضح انداز سے، ”800“ کے اعداد لکھے تھے، نیچے رکھتے ہوئے، نیم گرم شیمپین کا گلاس، جو کسی نے اس کے ہاتھ میں تھما دیا تھا، خالی کر دیا تھا۔ وہ دلوخوف کے الفاظ پر مسکرا رہا تھا اور اس نے ڈوبتے دل کے ساتھ دلوخوف کے ہاتھوں کی، جن میں تاش کی گڈی تھی ہوئی تھی، جانب دیکھا تھا۔ وہ انتظار کر رہا تھا کہ پان کا ستا اب نکلا، کباب نکلا۔ رستوف کے پان کے اس سٹے کے جیتنے یا اسٹے پر بہت کچھ منحصر تھا۔ گزشتہ اتوار کاؤنٹ الیا آندرےچ نے اپنے بیٹے کو دو ہزار روپے دیے تھے اور اگرچہ اس

نے روپے پیسے کے بارے میں کبھی اپنی مشکلات کا ذکر نہیں کیا تھا، اس نے سے صاف صاف بتا دیا تھا کہ مٹی سے پہلے وہ اسے مزید کچھ نہیں دے سکے گا چنانچہ اس نے اس سے کہا تھا کہ اب کی بار وہ ذرا کفایت شعاری سے کام لے۔ ٹکولائی نے اسے بتا دیا تھا کہ یہ رقم اس کی ضروریات کے لیے کافی ہے اور اس نے پکا وعدہ کیا تھا کہ وہ قبل از بہار مزید کچھ نہیں مانگے گا۔ اب اس رقم میں سے صرف بارہ سو روپے باقی رہ گئے تھے۔ چنانچہ پان کے اس ستے کا مطلب یہ تھا کہ وہ نہ صرف سولہ سو روپے ہار رہا تھا بلکہ اسے اپنے وعدے سے بھی مکرنا پڑے گا۔ وہ ڈوبتے دل کے ساتھ دلو خوف کے ہاتھوں کی طرف دیکھنے اور سوچنے لگا۔ ”اگر مجھے وہ پتا مل گیا، میں اپنی ٹوپی اٹھادیں گا اور گھر چلا جاؤں گا۔ وہاں میں دینی سوف، نتاشا اور سونیا کے ساتھ سپر کھانے کا اور یقیناً کبھی دوبارہ تاش کو ہاتھ نہیں لگاؤں گا۔“ اسی لمحے اس کی آنکھوں کے سامنے اس کی گھریلو زندگی۔ چتا کے ساتھ لطیفے بازی، سونپ کے ساتھ از دنیا زکی باتیں، نتاشا کے ساتھ دوگانے، اپنے باپ کے ساتھ درختی تاش کی بازیوں، بلکہ پوارسکا یا سٹریٹ پر واقع اپنے گھر کا آرام دہ بستر بھی۔ اتنے واضح و روشنی انداز کے ساتھ اس کی نگاہوں کے سامنے ابھرنے لگی گویا کہ یہ کوئی ایسی نعمت تھی جو وہ مدتوں پہلے کھو چکا تھا اور جس کی اس نے اب تک قدر نہیں کی تھی۔ وہ یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ایک فضول اتفاق، جس کی وجہ سے اگر سات کا پتا بائیں کی بجائے دائیں جانب گر پڑے، اسے اس سرت سے، جو اس نے بھی ابھی در یافت کی تھی، جس کا ابھی ابھی اس پر انکشاف ہوا تھا، محروم کر سکتا ہے اور فلاکت و کبت کے حلق پاتاں میں، جس سے وہ ابھی تک نا آشنا نا بلد تھا، دھکیل سکتا ہے۔ یہ نہیں ہو سکتا تھا، پھر بھی وہ وہشت زدہ دل کے ساتھ دلو خوف کے ہاتھوں کی حرکات کا جائزہ لے رہا اور انتظار کر رہا تھا۔ ان بڑی بڑی ہڈیوں والے سرخ ہاتھوں نے، جن کی ردائیں در کھائیاں قمیص کے کفوں (cuffs) کے پیچھے نظر آرہی تھیں، جنوں کی گندی نیچے رکھ دی اور گلاس اور پائپ، جو اسے تھمائے جا رہے تھے، پکڑ لیے۔

”تو تمہیں میرے ساتھ کھیتے کوئی خوف نہیں آ رہا؟“ دلو خوف نے اپنی بات دہرائی۔ وہ اپنی کرسی کے ساتھ ٹیک لگا کر یوں بیٹھ گیا جیسے وہ کوئی بہت مزیدار کہانی سنانے کا ارادہ کر رہا ہو۔ وہ مسکراتے اور اٹھینان سے سوچ سوچ کر بولنے لگا:

”حضرات، مجھے بتایا گیا ہے کہ ماسکو میں یہ افواہ پھیلی ہوئی ہے کہ میں تاش میں ہاتھ کی صفائی دکھانا

ہوں۔ چنانچہ میرا مشورہ یہ ہے کہ آپ لوگ ہوشیار رہیں۔“

”پتے پانٹو، جلدی کرو!“ رستوف نے کہا۔

”اف، ماسکو کے یہ گپ باز!“ دلو خوف نے کہا اور اس نے مسکرتے ہوئے پتے اٹھا لیے۔

”آ۔ ہا!“ رستوف کی تقریباً جھج نکل گئی اور اس کے دونوں ہاتھ اوپر اٹھ گئے۔

جس ستے کی اسے ضرورت تھی، وہ سب سے اوپر پڑا تھا۔ گڈی کا سب سے پہلا پتا وہی تھا اس میں جتنی

رقم ادا کرنے کی سکت تھی، وہ اس سے زیادہ ہار چکا تھا۔

بہر حال اپنے آپ کو جادہ مت کر دے، ”دلو خوف“ رستوف پر طائر نے نظر ڈالتے ہوئے کہا اور پتے ہاں اشارہ کیا۔

14

ایک گھنٹے اور تیس منٹ بعد اکثر کل ٹریوں کو اپنے کھیل میں کوئی خاص سنجیدہ دلچسپی نہ رہی۔

کھیل کی ساری دلچسپی رستوف پر مرکوز ہو چکی تھی۔ سولہ سو روپے کے بجائے اب اس کے نام کے سامنے رقوم کا خاصا بڑا کالم بن چکا تھا۔ اس کے اپنے حساب سے ان رقوم کی میزان دس ہزار تھی۔ مبہم سے انداز سے اسے محسوس ہو رہا تھا کہ یہ دس نہیں بلکہ پندرہ ہزار ہے۔ حقیقتاً یہ میزان تیس ہزار روپے سے متجاوز ہو چکی تھی۔ دلو خوف اب قصبے کہانیاں نہ سن رہا اور نہ سن رہا تھا۔ رستوف اپنے ہاتھوں سے جی بھی حرکت کرتا، وہ اس پر نگاہ ڈالتا۔ وہ کبھی کبھار ان رقوم پر بھی، جو رستوف کے نام کے سامنے لکھی جا رہی تھیں، نظر ڈال لیتا۔ اس نے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ اس وقت تک کھیتا رہے گا جب تک رقم کی کل میزان بیستالیس ہزار تک نہیں پہنچ جاتی۔ اس نے یہ رقم اس لیے طے کی تھی کیونکہ اس کی اور سو دیا کی ہمدردوں کا مجموعہ بھی بنتا تھا۔

رستوف دونوں ہاتھوں میں سر تھا۔ میز کے سامنے بیٹھا تھا۔ میز پر مختلف رقوم تھریں تھیں، وہ شرب سے داغ در ہو چکی تھی اور پتوں سے بٹی پڑی تھی۔ ایک دل خراش احساس نے رستوف کا پیچھا نہ چھوڑا: ”بڑی بڑی ہڈیوں والے یہ سرخ ہاتھ، جن کے بال قیسم کے کھوں تلے نظر آ رہے ہیں، جن سے وہ پیار بھی کرتا۔ ہاں اور نفرت بھی کھاتا رہا ہے، اسے اپنے شکبے میں کسے ہوئے ہیں۔“

”چھ سو روپے، اگا، پوٹھائی داؤ، نہلا... اسے دوبارہ جیتنا ناممکن ہے! گھر میں کتنا سکون اور آرام تھا! ظلم، دگنا یا برابر۔ ایسا نہیں ہو سکتا! لیکن یہ شخص میرے ساتھ یہ سلوک کیوں کر رہا ہے؟“ رستوف کو تعجب ہو رہا تھا۔ بعض اوقات وہ کسی پتے پر خاصی بڑی رقم لگا دیتا لیکن دلو خوف انکار کر دیتا اور داؤ کی رقم وہ خود متعین کرتا۔ ٹکڑائی سر تسلیم خم کر دیتا۔ ایک لمحے وہ بالکل اسی طرح دعا مانگنے لگتا جس طرح اس نے اس وقت، جب وہ دریائے انش کے پل پر فارنگ کی زد میں آ گیا تھا، مانگی تھی۔ دوسرے لمحے اسے یہ خیال آنے لگا کہ مڑے مڑے پتوں کی گندی سے جواگ پتا برآمد ہوگا، وہ اس کا بیڑا پار کر دے گا۔ کبھی وہ اپنے کوٹ کی ڈوریاں کٹنے لگتا، اسی نمبر کا پتا اٹھاتا اور اسی کے مطابق اپنے نقصانات کی تلافی کے لیے داؤں کی رقم لگاتا۔ کبھی وہ دوسرے کھلاڑیوں سے استمداد کی خواہش کرنے لگتا اور کبھی دلو خوف کے سردہر چہرے کی جانب دیکھنے اور یہ معلوم کرنے کی کوشش کرنے لگتا کہ وہ کیا سوچ رہا ہے۔

”وہ جانتا ہے کہ یہ نقصان میرے لیے کیا معافی رکھتا ہے؟“ اس نے اپنے آپ سے کہا۔ ”وہ یقیناً مجھے بتا ہی کے غار میں دھکیلنا نہیں چاہے گا! آخر یہ میرا دوست تھا اور میں اس سے محبت کرتا تھا۔ لیکن یہ اس کا تصور نہیں۔ اگر اس کی قسمت ہی اتنی تیز ہے، پھر وہ کیا کر سکتا ہے؟ لیکن تصور میرا بھی نہیں ہے؟“ اس نے دل ہی دل میں

سوچا۔ ”میں نے کوئی جرم نہیں کیا۔ کیا میں نے کسی شخص کو قتل کیا ہے، کسی کی توہین کا مرتکب ہوا ہوں یا کسی کا برا بھلا ہے؟ ابھی تھوڑی دیر پہلے میں اس میز پر یہ خیال لے کر آیا تھا کہ میں سو روپل جیتوں گا تا کہ اماں کے نام دن پر زیورات کا ڈبا خرید سکوں اور پھر گھر چل جاؤں گا۔ کتنا خوش تھا میں، نہ فکر نہ غم، تھلی کی طرح آزاد تب مجھے یہ اندازہ ہی نہیں تھا کہ میں کتنا خوش ہوں۔ وہ کیفیت کب ختم ہوئی اور حالات نے یہ نیا اور بھیانک رخ کب اختیار کیا؟ اس تبدیلی کی علامت کیا تھی؟ میں اس سارے عرصے کے دوران میں اسی میز پر اور اسی جگہ بیٹھا رہا ہوں، سچے اٹھاتا رہا ہوں، انھیں نیچے رکھتا رہا ہوں اور ان بڑی بڑی ہڈیوں و سارے مشاق ہاتھوں کو دیکھتا رہا ہوں۔ یہ کب ہوا اور کیوں ہوا؟ میں تندرست ہوں، توانا ہوں، جیسا تھا ویسا ہی ہوں اور جہاں تھا، ابھی تک وہیں ہوں۔ نہیں، ایسا نہیں ہو سکتا! یقیناً انجام کار اس کا نتیجہ کچھ برآمد نہیں ہوگا۔“

وہ لالوں لال ہو گیا اور پسینے میں نہا گیا حالانکہ کمر گرم نہیں تھا۔ اس کے چہرے پر وحشت برسنے لگی تھی اور اس کی حالت قابل رحم ہو چکی تھی۔ یہ کیفیت اس لیے بھی اور بھی نمایاں ہو رہی تھی کیونکہ وہ پرسکون ہونے کی سعی کر رہا تھا لیکن اپنی اس کوشش میں اسے قطعاً کوئی کامیابی نہیں ہو رہی تھی۔

اس کے نام کے آگے رقم کی میزان تینتالیس ہزار کے منہوس ہندسے تک پہنچ چکی تھی۔ رستوف نے ابھی ابھی سچے کا کوٹنا مسوز کر، جس کا مطلب یہ تھا کہ اس کے حساب میں تین ہزار روپل کی جو رقم درج کی گئی تھی، وہ اسے دگنا کرنا چاہتا ہے، اگلا داؤ کھینے کی تیاری کی تھی لیکن دلوخوف نے جوں کی گڈی میز پر شیخ کر ایک طرف دھکیل دی اور بہ عجلت رستوف کے ذمے قرضے کی رقم کی میزان کرنے لگا۔ جب اس نے کل میزان ہاتھ پر زور دے کر واضح انداز سے لکھی، چاک ٹوٹ گیا۔

”میسر، میسر کا وقت ہو گیا اور جیسی بھی آگے ہیں!“

اور واقعی سانولے مردوں اور غورتوں کا جتنا اپنے جھپسی لہجے سے بات کرتا باہر کی خشک فضا سے ندر آ رہا تھا۔ گولی کی سمجھ گیا تھا کہ تماشا ختم ہو چکا ہے، پھر بھی اس نے بے رخی سے کہا

”کیا؟ مزید نہیں کھیلو گے؟ میرے ہاتھ کتنا اچھا پتا آیا تھا!“

وہ یوں بات کر رہا تھا جیسے وہ چیز، جس میں اسے دلچسپی تھی، کھیل کا لطف تھا۔

”س معاملہ ختم ہوتا ہو گیا۔ میرا بیڑا غرق ہو گیا ہے!“ اس نے سوچا۔ ”کاش میرے بیچے میں سے گولی پار ہو جائے۔ اب میری قسمت میں یہی کچھ رہ گیا ہے۔“ لیکن اس وقت جب وہ ان خطوط پر سوچ رہا تھا، اس نے بے شبہ خاطر کہا: ”اچھا، بس ایک بازی اور ہو جائے۔“

”بہت اچھا!“ دلوخوف نے جواب دیا۔ وہ رقم کی میزان کر چکا تھا۔ ”بہت اچھا! چلو، اکیس روپل کی بازی لگاؤ،“ اس نے اکیس کے عدد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ تینتالیس ہزار کی رقم سے بس یہی رقم زیادہ تھی۔ اس نے گڈی اٹھائی اور سچے بانٹنے کی تیاری کرنے لگا۔

رستوف نے فرماں برداری سے اپنے پتے کا کونا سیدھا کیا اور اس نے جس چھ ہزار کے لکھنے کا ارادہ کیا تھا، اس کی بجائے اس نے احتیاط سے اکیس کا عدد تحریر کر دیا۔

”میرے بے کوئی فرق نہیں پڑتا،“ اس نے کہا۔ ”میں صرف یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ آیا یہ وہاں جیت جاؤ گے یا مجھے جیتے دو گے؟“

دلوخوف نہایت بخیرگی سے پتے، ٹٹے لگا۔ اس، اس لمحے رستوف کو ان سرخ ہاتھوں سے، جن کی انگلیں صغیر اور کھپپیں بالوں سے بھرپور تھیں اور جو اسے اپنی گرفت میں لیے ہوئے تھے، گھن محسوس ہونے لگی۔ وہ اس کی جانب آگرا۔

”کاؤنٹ، تم میرے تینتالیس ہزار روپے کے مقرض ہو،“ دلوخوف نے میز سے اٹھتے اور انگڑائی لیتے ہوئے کہا۔ ”اتنی دیر بیٹھے بیٹھے آدمی لڑنا تھک جاتا ہے۔“

”ہاں، میں بھی کچھ تھک گیا ہوں،“ رستوف نے کہا۔

دلوخوف نے اس کی بات کاٹ دی جیسے وہ سے یاد دلانا چاہتا ہو کہ دل لگی کرنا اس کا کام نہیں ہے۔

”کاؤنٹ، مجھے رقم کب ملے گی؟“

رستوف کا چہرہ سرخ ہو گیا اور وہ دلوخوف کو ہاتھ کمرے میں لے گیا۔

”میں اتنی بڑی رقم فی الفور ادا نہیں کر سکتا۔ کہو تو پروٹوٹ³² لکھ دوں؟“ اس نے پوچھا۔

”خیر، رستوف،“ دلوخوف نے مسرت سے کھلتے اور نکولائی کی آنکھوں میں چھکتے ہوئے کہا: ”تمہیں یہ

کہاوت تو معلوم ہوگی ’جو مہبت کی بازی جیتتے ہیں‘ تاش کی بازی ہار جاتے ہیں۔“ مجھے معلوم ہے کہ تمہاری ظہری بہن تم پر مٹی جان سے فدا ہے۔“

”آف، اس شخص کے جال میں پھنس کر مجھے کتنی کوفت محسوس ہو رہی ہے!“ رستوف نے سوچا۔

وہ جانتا تھا کہ جب وہ اس ضیاع کے بارے میں اپنے ابا اور ماں کو بتائے گا، انہیں کتنا صدمہ پہنچے گا۔

اسے محسوس ہو رہا تھا کہ اگر اسے کسی طرح اس جھنجھٹ سے نجات مل جائے، اس کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہیں رہے گا۔

اور اسے یہ بھی احساس ہوا کہ دلوخوف کو معلوم ہے کہ اگر وہ چاہے، تو اسے اس شرمندگی و رازیت سے نجات دلا سکتا ہے لیکن اب وہ اس کے ساتھ ملی اور چوہے کا کھیل کھیلنا چاہتا تھا۔

”تمہاری ظہری۔“ دلوخوف نے کہنا شروع کیا لیکن نکولائی نے اس کی بات کاٹ دی۔

”بیمیری خالصہ زاد کا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے اور اس کا ذکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں،“ اس نے غیظ و غضب سے دہاڑتے ہوئے کہا۔

”پھر تم ادا لگی کب کرو گے؟“ دلوخوف نے مطالبہ کیا۔

”نکل،“ رستوف نے کہا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

”کل“ کہتا اور ہر وقت لہجہ اختیار کرنا مشکل کام نہیں تھا لیکن بہنوں، بھائی، ماں اور باپ سے آنکھ ملانا، اعتراض کرنا اور وعدہ کرنے کے بعد ایسی رقم کا مطالبہ کرنا، جس پر اس کا کوئی حق نہیں بنتا تھا، بہت سہاں روح تھا۔ جب وہ گھر پہنچا، وہ لوگ ابھی سوئے نہیں تھے۔ نو جوان تھیٹر سے واپس آنے اور سپر کھانے کے بعد کلاوی کارڈ کے گرد جمع تھے۔ جونہی نکلوانی نے بال روم میں قدم رکھا، عشق و محبت کی شاعرانہ فضا نے، جو ان سر دیوں کے دوران میں اس گھر پر چھائی ہوئی تھی، اسے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ معلوم ہوتا تھا کہ دلخوف کے پیغام اور فوکل کے بال کے بعد سو نیا اور نسا شا کے گرد یہ فضا اور بھی گہیر ہو گئی ہے بالکل ایسے ہی جیسے طوفان سے قبل آسمان تیرہ دتاریک ہو جاتا ہے۔ تھیٹر جانے سے پہلے سو نیا اور نسا شا نے ہلکے سیلگوں ڈریس پہنے تھے۔ وہ ان میں بہت کھل لگ رہی تھیں اور انھیں اس کا احساس بھی تھا۔ وہ سرور و متہمس کلاوی کارڈ کے پاس کھڑی تھیں۔ ویراشن کے ساتھ ڈرائنگ روم میں شطرنج کھیل رہی تھی۔ سمر کاؤتس، جو اپنے بیٹے اور شوہر کی گھر والہی کا انتظار کر رہی تھی، ایک کن رسیدہ خاتون کے ساتھ، جو ان کے پاس ہی رہتی تھی، پیشکش کھیلنے میں مصروف تھی۔ ری سون جگمگاتی آنکھوں اور ڈالیدہ بالوں سمیت کلاوی کارڈ کے سامنے بیٹھا تھا۔ اس نے ایک ٹانگ پچھلی جانب رکائی ہوں تھی۔ وہ اپنی چھوٹی چھوٹی انگلیوں کے ساتھ کلاوی کارڈ کے تار جھنجھٹاتے اور آنکھیں منکاتے اپنی باریک اور کمر دی لیکن سرنال کے اعتبار سے بالکل صحیح آواز میں اپنی ایک نظم ”ساحرہ“³⁴ جسے اس نے خود ہی تحریر کیا تھا اور خود ہی اس کی موسیقی ترتیب دی تھی، گارہا تھا:

جادو گرئی، یہ تو بتا یہ کون سا جادو ہے

کہ تو نے مجھے

دوبارہ بربط کے سامنے لے بٹھایا ہے

وہ کون سی آگ ہے جو میرے دل میں بھڑک اٹھی ہے؟

وہ کیسا دجد ہے جو میری انگلیوں کو سنسنار ہا ہے؟

دو بڑے جوشیلے لہجے سے گارہا تھا۔ اس کی سیاہ اور شفاف آنکھیں خوف زدہ لیکن سرور و مطمئن نسا شا پر منعکس ہو رہی تھیں۔

”بہت خوب! بہت اعلیٰ آواز! وادہ!“ نسا شا نے یا آواز بلند کہا۔ ”ایک بند اور ہو جائے“ اس نے کہا۔ اسے

یہ معلوم ہی نہیں ہو سکا تھا کہ نکلوانی آپکا ہے۔

”کچھ نہیں بدلا ہے سب کچھ جوں کا توں ہی ہے“ نکلوانی نے ڈرائنگ روم میں، جہاں اسے ویرا اپنی اماں

اور بزرگ خاتون نظر آئیں، جھانکتے ہوئے سوچا۔

”آہ! ہمارا ٹکوبینکا آگیا ہے!“ مناشا نے اس کی جانب دوڑتے ہوئے کہا۔

”پاپا گھر پر ہیں؟“ نکولا کی نے پوچھا۔

”میں بہت خوش ہوں کہ تم آگئے ہو!“ مناشا نے اس کے سول کا جواب دیے بغیر قدرے اونچی آواز سے کہا۔

”یہاں بہت مزے کی باتیں ہو رہی ہیں! جانتے ہو کہ وہ سیلی دمیترج میری خاطر ایک دن مزید رک گئے ہیں؟“

”کو کا، تم آگئے؟ ڈارلنگ، ادھر آؤ!“ معمر کاؤنٹس ڈرائنگ روم سے پکاری۔

نکولا کی اپنی ماں کے پاس چل گیا، اس کے ہاتھ کو بوسہ دیا، ایک لفظ کہے بغیر اس کی میز کے سامنے جا بیٹھا اور اس کے ہاتھوں کو، جو میز پر تاش کے سچے ترتیب دینے میں مصروف تھے، دیکھنے لگا۔ بال روم میں قہقہے اور سرور آوازیں گونج رہی تھیں۔ وہ لوگ مناشا کو گانا گانے پر آمادہ کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

”ٹھیک ٹھیک، ٹھیک ہے!“ دینی سوف نے با آواز بلند کہا۔ ”اب یہاں سے کام نہیں چلے گا۔ اب بار کارول³⁵ گانے کی تمھاری باری ہے۔ میں تمھارے سامنے ہاتھ جوڑتا ہوں!“

کاؤنٹس نے اپنے چپ چاپ بیٹے کی جانب دیکھا۔

”کیا بات ہے؟“ اس نے پوچھا۔

”اٹھ، کچھ نہیں!“ اس نے یوں جواب دیا جیسے ایک ہی سوال کے بار بار پوچھے جانے پر وہ تنگ آگیا ہو۔

”پاپا جلدی گھر سوٹ آئیں گے؟“

”امید تو یہی ہے۔“

”ان کے نزدیک سب کچھ جوں کا توں ہے۔ انھیں کیا پتا، اب میرا کیا بنے گا؟“ نکولا کی نے سوچا۔ وہ اٹھا اور واپس بال روم میں چلا گیا۔

سونیا کلاوی کارڈ کے سامنے بیٹھی تھی۔ وہ دینی سوف کے پسندیدہ نغمے ”بار کارول“ کے ابتدائی سُر نکال رہی تھی۔ مناشا گانا گانے کی تیاری کر رہی تھی اور دینی سوف، سے مٹھوٹکا ہوں سے دیکھ رہا تھا۔ نکولا کی کمرے میں چکر کاٹنے لگا۔

”یہ اس سے گانا کیوں گوانا چاہتے ہیں؟ وہ کیسے گاسکتی ہے؟ تناخوش ہونے کی کوئی بات بھی تو نہیں!“ اس نے سوچا۔

سونیا نے گیت کے قتلحے کا پہلا سُر نکالا۔

”اف، میرے خدا! میں تباہ ہو چکا ہوں، میری عزت مٹی میں مل چکی ہے! اب میرے لیے صرف یہی چیز رہ گئی ہے کہ ایک گولی آئے اور میرے بھیسے کو پاش پاش کر دے۔ گانے رانے کا مجھ سے کیا کام!“ اس نے سوچا۔

”یہاں سے چلا نہ جاؤں؟ لیکن کہاں؟ مجھے کوئی پروا نہیں۔ یہ گانے گاتے رہیں!“

وہ کمرے کے اندر چکر لگاتا اور طویل نظروں سے دینی سوف اور ٹکیوں کو دیکھتا رہا لیکن وہ ان سے نظر میں چراتا

”نکولینکا، کیا بات ہے؟“ سونیا کی نگاہیں، جب وہ انتہاک سے اسے دیکھ رہی تھیں، اس سے پوچھ رہی تھیں۔ وہ جھٹ پٹ سمجھ گئی تھی کہ اس کے ساتھ ضرور کوئی سانحہ پیش آیا ہے۔ وہ اس سے پرے ہٹ گیا۔ ناشائے بھی، کہ بے حد حساس لڑکی تھی، فی الفور اپنے بھائی کی کیفیت بھانپ لی تھی۔ اگرچہ وہ اس کی کیفیت بھانپ چکی تھی، تاہم اس وقت اس پر کچھ اس قسم کا کیف و نشط طاری تھا کہ اس پر اندوہ و ملال، ادا کی یہ ملامت نفس کی پرچھائیاں بھی نہیں پڑ سکتی تھیں۔ چنانچہ اس نے اپنے آپ کو عہد آ (جیسا کہ نو خیز لڑکے لڑکیوں کا اکثر شیوہ ہوتا ہے) دھڑکے میں رکھا۔ ”نہیں، میں اس وقت، اتنی خوش ہوں، اتنی خوش ہوں کہ کسی بھی دوسرے شخص کے ابتلا میں اس کے ساتھ ہمدردی جتا کر اپنے مزہ کر کر نہیں کرنا چاہتی۔“ وہ محسوس کر رہی تھی اور اس نے اپنے آپ سے کہا، ”اف، شاید یہ میرا وہم ہو یا میں نے اسے غلط سمجھا ہو جب کہ حقیقتاً وہ اسی طرح سرور ہو جس طرح کہ میں ہوں۔“

”سونیا، ذرا،“ وہ کمرے کے عین درمیان میں، جہاں اس کے خیال کے مطابق آواز زیادہ واضح انداز سے سنائی دے سکتی تھی، پہنچ کر بولی۔

پیلے رقا صوں کی طرح اپنی گردن اٹھائے اور بازوؤں کو بے جا انداز سے ڈھیلے چھوڑے ناشائے لپک چلتی کمرے کے درمیان میں پہنچی، مڑی اور ساکت و صامت کھڑی ہو گئی۔

”ہاں، یہ میں ہوں!“ وہ دینی سوف کی پر اشتیاق اور پراشہاک نگاہوں کے، جو اس کا تعاقب کر رہی تھیں، جواب میں کہتی محسوس ہو رہی تھیں۔

”آخر یہ اتنا خوش کیوں ہے؟“ نکولائی نے اپنی مشیر کی جانب دیکھتے ہوئے سوچا۔ ”آخر اس کے مزاج پر کوئی بات گراں کیوں نہیں گزرتی؟ اسے کسی بات پر شرم کیوں نہیں آتی؟“

ناشائے پہلے نر اٹھایا، اس کے گلے کی رگیں پھول گئیں، جو بنا امنگنے لگا اور اس کی آنکھوں میں سنجیدگی سا گئی۔ اس لمحے وہ ہر شخص اور ہر شے کو فراموش کر چکی تھی اور اس کے متبسم لبوں سے کچھ اس قسم کی آوازیں نکلنے لگیں جو اتنے ہی وقفوں وقفوں کے بعد اور اتنے ہی دورانیے کے بے نکال تو ہر کوئی سکتا ہے، جنہیں آپ ہزار مرتبہ سنیں آپ پر کوئی اثر نہیں ہوگا لیکن ایک ہزار ایکویں مرتبہ وہ آپ کو جنمھنار پیتی ہیں، آپ کے رگ دپے میں اتر جاتی ہیں اور آپ کو رلا دیتی ہیں۔

ان سردیوں کے دوران میں ناشائے نے پہلی مرتبہ اپنی گلوکاری پر سنجیدگی سے توجہ دی تھی۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ دینی سوف اس کی آواز کی جی کھوں کر تعریف کرتا تھا۔ اب وہ بچوں کی طرح نہیں گاتی تھی۔ ازیں جیستر اس کی آواز میں جس طرح کی گدگداہٹ، ناچنگلی اور چلبلاہٹ کا احساس ہوتا تھا اور یہ تاثر ابھرتا تھا کہ وہ خواہ مخواہ زور لگا رہی ہے، وہ اب غائب ہو چکا تھا۔ جن باؤرق اور باشوق اشخاص نے اس کا گانا سنا تھا، ان کا خیال تھا کہ وہ ابھی تک اچھ نہیں گاتی۔ ”اس کی آواز کی تربیت نہیں ہوئی ہے،“ ان سب کی یہ رائے تھی ”اس کی آواز خوبصورت

ہے لیکن اس کی تربیت ہونا چاہیے۔" تاہم اس قسم کی باتیں عام طور پر اس وقت کہی جاتی تھیں جب اس کا گانا ختم ہوے کچھ ماہ بیت چکا ہوتا تھا۔ لیکن جب وہ اس غیر تربیت یافتہ آواز کو، جو سانس کے لیے غلط مقامات پر رکتی اور ایک سر سے دوسرے سر تک پہنچنے میں دلت محسوس کر رہی ہوتی، سن رہے ہوتے، وہ بھی دم بخود اس (آواز) سے نہ صرف مفلوج ہو رہے ہوتے بلکہ آواز دکر رہے ہوتے کہ کاش انھیں اسے دوبارہ سننے کا موقع میسر آ سکے۔ اس کی آواز میں ماضی و دھندلہ کی پاکیزگی، اپنی اثر انگیزی کے بارے میں عدم آگہی اور ایسی مخمض نفاس تھی، جو محض قدرت کی دین تھی، کسی انسان کی سکھائی ہوئی نہیں تھی، اور گلوکاری کے دوران میں وہ صدی اور پرکاری کے حس فقدان کا مظاہرہ کرتی تھی، یہ نفاس اس کا اتنا ناگزیر جز تھی کہ معلوم ہوتا تھا کہ اس آواز میں اگر ذرہ برابر تبدیلی کرنے کی کوشش کی گئی تو اس کا سارا حسن غارت ہو جائے گا۔

"یہ کیا ہے؟" گولائی نے حیرت زدگی سے سوچا۔ وہ، تا بہوت ہو چکا تھا کہ اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ "یہ سے کیا ہو گیا ہے؟ یہ آج کس طرح گارہی ہے؟" اور ایک ایک اس کی کل کائنات سے سنا کر اگلے سر اور اگلے بول کا جینگی نہ رہ نہ گانے پر مرکوز ہو گئی۔ کائنات کی ہر چیز تین تاہوں میں منقسم ہو چکی تھی: Oh, mio... crudele al fatto، دو، تین... ایک، دو، تین... ایک۔ "نف ہمارے یہ لایعنی دنیا!" گولائی نے سوچا۔ "ہر ساری باتیں، روپیہ پیسہ، دلو خوف، بغض و عداوت، عزت و آبرو۔۔۔ سب بکھڑاتے ہیں۔ لیکن یہ۔۔۔ یہ اصل ہے۔ خیر، ناسا، خیر، ڈرنگ، اچھا، میری بہن! یہ ساتواں سر کیسے اٹھائے گی؟... ارے، اٹھا گئی! اف میرے خدایا!" اور اس امر سے آگاہ ہوئے بغیر کہ وہ اس کے سر کے ساتھ سر ملا کر رہا ہے، وہ اس کے مقابلے میں ذرا بھی آواز میں اس کا ساتھ دینے لگا۔ "اف، میرے خدایا، یہ کتنا خوبصورت ہے! کیا میں نے واقعی یہ سراٹھایا تھا؟ کتنا جمیل القدر ہے۔" اس نے سوچا۔

اس کی روح کا تار کیسے جھنجھنایا تھا؟ رستوف کی ذات کا وہ حصہ، جو ارفع ترین تھا، کیسے متاثر ہوا تھا! اور اس کی دست کا یہی حصہ دنیا کی باقی تمام اشیاء سے مختلف تھا اور دنیا کی تمام اشیاء سے ارفع تر تھا۔ جوئے کے نقصانات، دلو خوف اور وعدے سوا عید! سب پیچھے تھے، حقیر تھے! آدمی قتل کر دے، ڈاکہ ڈال دے، پھر بھی خوش رہ سکتا تھا۔۔۔

16

موسیقی سے جتنا لطف اندوز رستوف اس شام ہوا، اس سے قبل کبھی نہیں ہوا تھا۔ لیکن جو نبی ناسا نے ہارکاروں ختم کیا، حقیقت پھر سامنے آن موجود ہوئی۔ وہ ایک لفظ کہے بغیر کمرے سے باہر نکل گیا اور چلی منزل پر اپنے کمرے میں چلا گیا۔ کوئی چندرہ منٹ بعد معمر کا زنت کلب سے واپس آ گیا۔ وہ بہت سرور اور مطمئن تھا۔ اس کی گاڑی کی آواز سن کر گولائی اس کے پاس پہنچا۔

My credulous love (میرے بھولے بھالے محبوب)۔ اس زمانے میں اطالوی موسیقی اور اطالوی گیت بہت مقبول تھے۔

”اٹھا، آج تو خوب موج اڑائی ہوگی؟“ الیا آندرچ نے اپنے بیٹے کو دیکھ کر غرور و اہتاج سے مسکراتے ہوئے کہا۔

نکولائی نے ”ہاں“ کہنے کی کوشش کی لیکن اس کی زبان گنگ ہو گئی اور اس کی قریب قریب ہلکی نکل گئی۔ کاؤنٹ اپنا پائپ جلا رہا تھا۔ اسے اپنے بیٹے کی کیفیت نظر نہ آئی۔

”خیر، کچھ بغیر چ رہ بھی نہیں!“ نکولائی نے پہلی اور آخری مرتبہ سوچا۔ اور اچانک انتہائی لا بالی لہجے سے جو خود اسے بھی کربہ محسوس ہوا، وہ اپنے باپ سے یوں مخاطب ہوا جیسے وہ اس سے شہر جانے کے لیے تھکن گازی کی فرمائش کر رہا ہو۔

”پاپا، میں ایک غرض لے کر آپ کے پاس آیا ہوں۔ میں تقریباً بھول ہی چلا تھا... مجھے کچھ رقم چاہیے۔“ ”واقعی؟“ اس کے باپ نے، جس کی طبیعت خاص طور پر جولائی پر تھی، کہا۔ ”میں نے کہا تھا کہ تمہارے لیے یہ کافی نہیں ہوگی۔ کتنی رقم چاہیے؟“

”بڑی سے بھی زیادہ!“ نکولائی نے کہا۔ اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا اور وہ نہایت احتیاط اور لا پرواہانہ انداز سے مسکرا رہا تھا۔ اپنی اس حرکت پر وہ مدتوں اپنے آپ کو معاف نہ کر سکا۔ ”میں تاش میں کچھ رقم، میرا مطلب ہے کہ اچھی خاصی رقم، درحقیقت بہت بڑی رقم۔ سینتالیس ہزار روبل۔ ہار گیا ہوں۔“ ”کیا؟ کسے۔ تم مذاق کر رہے ہو!“ مسٹر کاؤنٹ کی، جیسا کہ ایسے مواقع پر بڑے بوڑھوں کے ساتھ ہوتا ہے، چیخ نکل گئی۔ گندی نمک اس کا رنگ سرخ ہو گیا اور اس پر ایک قسم کا سکتہ طاری ہو گیا۔

”میں وعدہ کر چکا ہوں کہ میں یہ رقم کل ادا کر دوں گا،“ رستوف نے کہا۔ ”چھ!۔“ کاؤنٹ نے بے چارگی سے ہاتھ دپرا چھالتے اور بے اختیار صوفے پر گرتے ہوئے کہا۔ ”ب کچھ نہیں ہو سکتا! ہر شخص کے ساتھ یہی کچھ ہوتا رہتا ہے،“ اس کے بیٹے نے بے ساختگی اور بے باکی سے کہا، حالانکہ وہ دل ہی دل میں اپنے آپ کو کام کا نہ کاج کا لنگٹا شخص، جو چاہتا بھی ہے، پھر بھی پوری زندگی اپنے جرم کی تلافی نہیں کر سکتا، گردان رہا تھا۔

وہ اپنے باپ کے ہاتھوں کو چومنا اور اس کے سامنے دوزانو ہو کر اس سے معافی مانگنا چاہتا تھا لیکن اس کے بجائے وہ اسے لا پرواہانہ، اور ایک اعتبار سے گستاخانہ بھی، انداز سے اسے بتا رہا تھا کہ ہر شخص کے ساتھ یہی کچھ ہوتا رہتا ہے۔

کاؤنٹ الیا آندرچ نے جب اپنے بیٹے کے منہ سے یہ الفاظ سنے، اس کی لگا ہی جھک گئیں اور وہ اضطرابی طور پر یوں پہلو بدلے لگا جیسے اسے کسی چیز کی تلاش ہو۔

”ہاں، ہاں،“ وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑاتے لگا، ”اتنی بڑی رقم اکٹھا کرنا خاصا مشکل کام ہوگا۔ مجھے اندیشہ ہے خاصا مشکل کام ہوگا... ہر شخص کے ساتھ ہوتا رہتا ہے... ہاں، ہر شخص کے ساتھ ہوتا رہتا ہے...“ اور اس نے

بچے بیٹے کے چہرے پر اچھتی نگاہ ڈالی اور کمرے سے باہر نکل گیا۔
 نکور کی مخالفت کا سامنا کرنے کے لیے تیار تھا لیکن اسے یہ توقع نہیں تھی۔
 ”پاپا پاپا پاپا“ اس نے ہچکیاں لیتے اپنے باپ کو پکارا، ”مجھے معاف فرمادیں!“ اور اس نے اپنے باپ کا ہاتھ پکڑا، اسے دبایا، ہونٹوں سے لگایا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔



جب باپ بیٹے کے سامنے یہ مکالمہ ہو رہا تھا، ماں بیٹی بھی گفتگو میں، جو کسی لحاظ سے کم اہم نہ تھی، مصروف تھیں۔
 ناشا جوش و خروش کے عالم میں بھاگتی دوڑتی اپنی ماں کے پاس آئی تھی۔
 ”اماں! اماں! اماں! انھوں نے مجھے...“
 ”انھوں نے کیا؟“

”انھوں نے مجھے شادی کی تجویز پیش کی ہے! اماں! اماں! اس نے با آواز بلند کہا۔
 کاؤنٹس کو اپنے کانوں پر یطین نہ آیا۔ دینی سوف نے شادی کی تجویز پیش کی تھی اور کسے؟ اس باشت برابر چھوڑ کر کوہنا شا کو، جو چند دن پہلے گڑیوں سے کھیلتی پھرتی تھی اور اب بھی سکول میں تعلیم پا رہی تھی۔
 ”ناشا، یہ کیا کہو اس ہے، ایسی باتیں منہ سے نہیں نکالتے،“ اسے اب بھی یہی امید تھی کہ اس کی بیٹی مذاق کر رہی ہے۔

”بکو اس، راہ میں آپ کو حقیقت بتا رہی ہوں،“ ناشا نے برہمی سے کہا۔ ”میں آپ سے دریافت کرنے آئی تھی کہ مجھے کیا کرنا چاہیے اور ایک آپ ہیں کہ اسے بکو اس کہہ رہی ہیں!“
 کاؤنٹس اپنے کندھے سے اچکائے لگی۔

”اگر موسیو دینی سوف نے واقعی تمہیں شادی کی تجویز پیش کی ہے تو اس سے کہو کہ وہ نرا الحق ہے اور بس۔“
 ”نہیں، وہ جہت نہیں ہیں!“ ناشا نے سنجیدگی اور خفگی سے کہا۔

”اچھا، پھر تم کیا چاہتی ہو؟ معلوم ہوتا ہے کہ تم سب کو آج کل محبت کا بخار ہو گیا ہے۔ خیر، اگر تمہیں اس سے محبت ہوگئی ہے، پھر جاؤ اور اس سے بیاہ رہ چالو،“ کاؤنٹس نے جھنجھلا کر ہنستے ہوئے کہا۔ ”اور خداوند تمہارے نصیب بلند کرے!“

”نہیں، اماں، مجھے ان سے محبت و جہت نہیں ہے۔ میرا خیال ہے کہ مجھے ان سے محبت نہیں۔“

”اچھا، پھر جاؤ اور اسے بتا دو۔“

”اماں، آپ ناراض ہیں؟ ڈارلنگ، آپ ناراض نہ ہوں۔ اس میں پھلا میرا کیا قصور ہے؟ یا ہے؟“
 ”نہیں۔ لیکن مائی ڈیئر، تم چاہتی کیا ہو؟ تم چاہتی ہو کہ میں جاؤں اور اسے بتا آؤں؟“ کاؤنٹس نے

مسکراتے ہوئے پوچھا۔

”نہیں، یہ کام میں جوہر کر دیں گی۔ آپ صرف اتنا بتادیں کہ میں کہوں کیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے لیے یہ باتیں ہاتھ کا کھیل ہے؟“ ماں کی مسکراہٹ کے جواب میں اس نے بھی مسکراتے ہوئے کہا۔ ”لیکن کاش آپ نے اپنی آنکھوں سے یہ دیکھا ہوتا کہ انھوں نے یہ تجویز پیش کیے کی تھی! آپ کو معلوم ہے کہ مجھے یقین ہے کہ انھوں نے جو کچھ کہا ہے، وہ ان کا منشا نہیں تھا۔ بس یونہی ان کے من سے نکل گیا۔“

”خیر، بہر حال تمہیں اس سے انکار کر دینا چاہیے۔“

”نہیں، مجھے یہاں نہیں کرنا چاہیے۔ مجھے ان پر ترس آرہا ہے۔ کتنے اچھے میں دہا۔“

”پھر اس کی پیشکش قبول کرلو۔ اچھا ہے کہ تم شادی کر لو ورنہ موقع ہاتھ سے نکل جائے گا۔“ کاؤنٹس نے گہڑے اور ہنڈی کے نشتر چلاتے ہوئے کہا۔

”نہیں، ماں، نہیں۔ لیکن مجھے ان پر ترس آرہا ہے کہ سمجھ میں نہیں آتا کہ ان سے کہوں تو کیا کہوں۔“

”نہیں، تمہیں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں خود اس سے بات کر دیں گی۔“ کاؤنٹس نے کہا۔ سے تلمباہٹ اس بات پر ہو رہی تھی کہ لوگ اس کی ننھی منی منشا کے ساتھ یوں پیش آرہے ہیں جیسے وہ سن بلوغ کو پہنچ چکی ہو۔

”نہیں۔ بالکل نہیں! میں خود انھیں بتاؤں گی۔ آپ دروازے پر آکر سن لیں۔“ اور منشا نے دوڑ گادی، ڈرائنگ روم عبور کیا اور بال روم میں، جہاں دینی سوف اپنا چہرہ ہاتھوں میں چھپائے ابھی تک کلاوی کارڈ کے پاس اسی کرسی پر بیٹھا تھا، گھس گئی۔

اس کے قدموں کی ہلکی پھلکی چاپ سن کر اس نے جست لگائی اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

”تمنا!، اس نے کہا۔“ میری قسمت کا فیصلہ سنا دو۔ یہ تمہارے ہاتھ میں ہے!“

”واہیلی دمیتریچ، مجھے آپ سے ہمدردی ہے! نہیں، لیکن آپ اتنے اچھے ہیں۔ لیکن یہ نہیں ہو سکتا۔ لیکن دوست کی حیثیت سے میں ہمیشہ آپ کو چاہتی رہی ہوں گی۔“

دینی سوف اس کے ہاتھ پر جھک گیا۔ منشا کو عجیب و غریب اور ناقابل فہم آوازیں سنائی دیں اور اس نے دینی سوف کے کمر درے، گھونگھریاے، سیاہ سر پر بوسہ ثبت کر دیا۔ اسی لمحے انھیں کاؤنٹس کے ڈرائس کی سبک رفتار سرسراہٹ سنائی دی اور وہ ان دونوں کے پاس پہنچ گئی۔

”واہیلی دمیتریچ، آپ نے ہماری جو عزت افزائی فرمائی ہے، میں اس کے لیے آپ کی ممنون ہوں۔“ اس نے شرمائے گھبرائے انداز سے کہا لیکن دینی سوف کو اس کے لہجہ میں چھین محسوس ہوئی۔ ”لیکن میری بیٹی بھی بالکل ہی نو عمر ہے۔ آپ چونکہ میرے بیٹے کے دوست ہیں، اس لیے میرا خیال ہے کہ آپ کو پہلے مجھ سے بات کرنا چاہیے تھی۔ اگر آپ نے یہ طریقہ اختیار کیا ہوتا تو مجھے آپ کو اس طرح جواب دینے پر مجبور نہ ہونا پڑتا۔“

”کاؤنٹس...“ دینی سوف نے فچی نگاہوں اور مجرم چہرے سے کہنا شروع کیا۔ اس نے مزید کچھ کہنا چاہا لیکن اس کی زبان لڑکھڑا گئی۔

تاہم اس کی یہ حالت دیکھی نہ گئی۔ اس کے ضبط و سکون کے بندھن ٹوٹ گئے اور وہ زار و قطار رونے لگی۔

”کاؤنٹس... مجھ سے غلطی ہو گئی،“ دینی سوف لڑکھڑاتی زبان سے کہتا چلا گیا، ”میں آپ کی صاحبزادی اور آپ کے سارے خاندان کی پرستش کرتا ہوں، اتنی کہ میں ایک بار نہیں بلکہ دو بار آپ سب پر اپنی جان بچھ کر سکتا ہوں۔“ اس نے کاؤنٹس کی طرف دیکھا لیکن جب اس نے دیکھا کہ اس کے چہرے پر ابھی تک درخشندگی موجود ہے، اس نے کہا: ”اچھا، کاؤنٹس، خدا حافظ۔“ اس نے اس کے ہاتھ پر بوسہ دیا اور سٹار پر نظر ڈالے بغیر تیز اور پر عزم قدموں کے ساتھ کمرے سے باہر نکل گیا۔



اگلے روز رستوف نے دینی سوف کو رخصت کر دیا کیونکہ اب وہ ماسکو میں مزید ایک دن بھی قیام نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس کے ماسکو کے تمام دوستوں نے اسے جیسیوں کے ریستوران میں الوداعی دھوٹ دی۔ اسے کچھ یاد نہیں کہ انھوں نے اسے سلج میں کیسے سوار کیا اور اس نے کیسے سفر کی پہلی تین منازل طے کیں۔

رہتی سوف کی روانگی کے بعد رستوف مزید دو ہفتے ماسکو میں مقیم رہا۔ اسے رقم کا انتظار تھا اور کاؤنٹ کے لیے اس کا فوری بندوبست کرنا ممکن نہ تھا۔ اس نے گھر سے باہر نکلنا ترک کر دیا اور اپنا بیشتر وقت لڑکیوں کے کمرے میں صرف کرنے لگا۔

سوئیٹا سے پہلے سے بھی زیادہ پیار کرنے لگی اور بالکل اسی کی ہو کر رہ گئی۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ وہ اسے جتنا چاہتی ہے کہ اس نے جوئے میں ہار کر ایسا کارنامہ سرانجام دیا ہے جس سے وہ اس کی نظروں میں اور بھی محبوب ہو گیا ہے لیکن گولڈ کی پنے آپ کو اس کے قابل نہیں سمجھتا تھا۔

اس نے لڑکیوں کے لیم اشعار اور موسیقی سے بھر دیے۔ اور جب آخر کار اس نے نومبر کے اواخر میں دلخوف کو تینتالیس ہزار روپے بھیج دیے اور رسید وصول کر لی، اس نے دوستوں اور وقف کاروں کو خد حافظ کہے بغیر رخصت سفر سنبھالا اور اپنی رجسٹر میں، جو پہلے ہی پولینڈ پہنچ چکی تھی، شامل ہونے روانہ ہو گیا۔

اپنی بیوی سے ٹوٹ نہیں ہو جانے کے بعد میٹر عازم پیئرز برگ ہو گیا۔ ترزھوک کی ڈاک چوکی پر یہ تو گھوڑے دستیاب نہ تھے، یا پھر مہتمم انھیں مہیا کرنے پر آمادہ نہیں تھا۔ چنانچہ میٹر کو مجبوراً وہیں ٹھہرنا پڑا۔ اپنا دور کوٹ وغیرہ، تارے وغیرہ صوفے پر دراز ہو گیا، اس کے سامنے جو میز پڑی تھی، اس نے اس پر اپنے پاؤں، جو بھاری بھر کم بوتلوں میں محفوظ تھے، دھرے اور سوچ بچار میں مستغرق ہو گیا۔

”سوٹ کیس اندر لے آؤں؟... بستر بچھا دوں؟... چائے چاہیے؟“ وردی پوش ملازم بار بار بوجھے جارہا تھا۔

میٹر کوئی جواب نہیں دیتا تھا۔ وہ نہ کچھ دیکھ رہا تھا اور نہ سن رہا تھا۔ جب سے وہ پچھلی ڈاک چوکی سے روانہ ہوا تھا، وہ گہری سوچوں میں ڈوبا ہوا تھا اور، بھی تک اسی ایک مسئلے پر غور و فکر کیے جا رہا تھا۔ اور یہ مسئلہ، تاہم تھا کہ جو کچھ اس کے گرد پیش وقوع پذیر ہوا تھا، اسے اس پر توجہ دینے کی کوئی فرصت نہیں تھی۔ وہ فی الحال جس ادھیڑ بن میں مصروف تھا، اس کے مقابلے میں جہاں تک اس قسم کے امور آباد پیئرز برگ جلدی پہنچ جائے گا یاد دیر سے؟ آیا اسے ڈاک چوکی پر سونے کی جگہ مل سکے گی یا نہیں؟ وغیرہم، کا تعلق ہے، ان میں دلچسپی لینا تو دور کی بات ہے، وہ تو اس مسئلے کے، کہ آیا سے یہاں چند گھنٹے گزارنے ہوں گے یا باقی ماندہ ساری زندگی، بارے میں بھی کامل بے نیازی برت رہا تھا۔

اس کا ملازم، ڈاک چوکی کا مہتمم، اس کی بیوی اور ایک کسان عورت، جو ترزھوک کی کڑھائی سلائی کی اشیاء فروخت کر رہی تھی، سبھی اس کے کمرے میں آتے اور اپنی اپنی خدمات پیش کرتے رہے۔ میز سے پاؤں اتارے بغیر بیٹھ نکلیوں سے ان اشخاص پر سرسری نگاہ ڈالتا اور بس۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ لوگ چاہتے کیا ہیں یا ان مسائل میں وہ الجھا ہوا ہے، انھیں حل کیے بغیر یہ زندگی کی گاڑی کیسے کھینچے جا رہے ہیں۔ جس روز وہ ڈوئیل کے بعد ساکول کی جنگل سے واپس آیا تھا، اسی روز وہ انھی مسائل میں مستغرق ہو گیا تھا اور اس نے اپنی پہلی اذیت ناک اور بے خواب شب گزاری تھی۔ اور اب کے سفر کی تنہائی میں وہ خام قوت سے اس پر حملہ آور ہو گئے تھے۔ اس

بات سے قطع نظر کہ وہ خواہ کچھ ہی کیوں نہ سوچ رہا ہوتا، اس کا دھین لا محالہ انہی مسائل کی طرف پلٹ آتا۔ وہ انہیں نہ حل کر سکتا تھا اور نہ ان کے بارے میں غور و فکر کیے بنا رہ سکتا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ اس بڑے بیچ کا، جس نے اس کی زندگی کے مختلف حصوں کو مربوط کر رکھا تھا، دھماکہ اتر گیا ہے۔ اب بیچ اندر چاتا تھا اور نہ باہر نکلتا تھا بلکہ ایک ہی جگہ کے بغیر گھومے جا رہا تھا۔

ڈاک چوکی کا مہتمم اندر آیا اور بہت لمبی جھٹ سے بولا: "پوڑا کیسی لینسی، بس دو گھنٹے اور انتظار فرمائیں، اس کے بعد (خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہو جائے) میں آپ کی خدمت عالیہ میں گھوڑے ضرور پیش کر دوں گا۔" یہ شخص صریحاً جھوٹ بول رہا تھا۔ وہ مسافر سے محض مزید پیسے اٹھانا چاہتا تھا۔

"یہ اچھا ہے یا برا؟" میئر نے اپنے آپ سے پوچھا۔ "میرے لیے اچھا اور اگلے مسافر کے لیے برا۔ اور جہاں تک اس ذات شریف کا تعلق ہے، یہ اس کے علاوہ ور کر بھی کیا سکتا ہے؟ آخر اس کے بھی تو پیٹ لگا ہے! اس نے مجھے بتایا تھا کہ ایک مرتبہ ایک افسر نے اس کی محض اس لیے پٹائی کر دی تھی کیونکہ اس نے ڈاک کے گھوڑے ایک عام مسافر کو دے دیے تھے۔ درآں حالانکہ افسر نے اس کی پٹائی صرف اس لیے کی تھی کیونکہ اسے حتیٰ الامکان جلد از جلد روانہ ہونا تھا۔ اور میں نے دلخوف پر محض اس لیے کوئی چلاری کیونکہ میں سمجھتا تھا کہ میری عزت پر حملہ ہوا ہے۔ اور کوئی شاز و دم کی گردن اس سے ٹاپ دی گئی کیونکہ اسے مجرم ٹھہرایا گیا تھا لیکن جن لوگوں نے اسے ہلاک کر یا تھا، اگلے سال انہیں۔ بالکل انہیں وجوہ کی بنا پر۔ موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ برا کیا ہے؟ اچھا کیا ہے؟ آدمی پیار کس سے کرے اور نفرت کس سے کھائے؟ آدمی کس لیے زندہ رہتا ہے اور میں کون ہوں؟ زندگی کیا ہے اور موت کیا ہے؟ یہ سب کچھ کس کے تابع ہے؟" اس نے اپنے آپ سے پوچھا۔

ان میں سے کسی سوال کا بھی کوئی جواب نہیں تھا۔ لے دے کے صرف ایک دروہ بھی غیر منطقی جواب، جو کسی طرح بھی ان سوالات کا جواب نہیں بناتا تھا، رہ جاتا تھا۔ "تم مرجاؤ گے۔ اور یہ سب کچھ ختم ہو جائے گا۔ تم مرجاؤ گے اور تمہیں سب کچھ معلوم ہو جائے گا۔ یا پھر تم سوالات پوچھنا چھوڑ دو گے۔" لیکن مرنے سے بھی تو خوف آتا ہے۔

ترجمہ کی خواہش فریاد عورت چیختی چنگھاڑتی آواز سے اپنا مال، خاص طور پر بکرے کے چمڑے کے جوتوں کا، ہٹا مارا لگائے جا رہی تھی۔ "میرے پاس سینکڑوں روپے ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ ان کا کیا کر دوں اور ایک پیسہ کہ بوسیدہ کوٹ پہنے وہاں لہریں دتر ساں کھڑی مجھے گھورے جا رہی ہے، میئر نے سوچا۔" "سے روپیہ کیوں چاہیے؟ گویا روپیہ میں اتنی قوت موجود ہے کہ وہ بال بر بر اس کی مسرت اور ذہنی سکون میں اضافہ کر سکتا ہے۔ کیا دنیا میں کوئی ایسی چیز، جو اسے یا مجھے بدی یا موت کے نتیجے میں کسے جانے سے ذرا بھی بچا سکے موجود ہے؟ موت، جو ہر چیز کو مٹی میں تبدیل کر دیتی ہے، آج آجائے گی یا کل۔ بہرحال اس کے آنے میں صرف اتنا وقت، جو ہر کے مقابلے میں محض ایک لمحہ ہے، صرف ہو گا۔" اس نے ایک بار پھر بیچ کو، جس کا دھکا ترچکا تھا، مردڑا لیکن

کچھ حاصل نہ ہوا وہ بیچ اپنی جگہ گھومتا رہا۔

اس کے مازم نے اسے داسوزا کا ناول، جو بصورتِ خطوط تحریر کیا گیا تھا اور جس کے نصف اوراق ابھی کاٹے جانے تھے، بھجوا دیا۔ کسی ایسی ہی ذہن نشد کو نیکی کے راستے پر چلنے میں جن مصائب اور دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا اور اسے اس راستے کے جن جن کانتوں کو چھنا پڑا، وہ ان کے بارے میں پڑھنے لگا۔ اسے تعجب اس بات پر ہو رہا تھا کہ جس شخص نے اسے دوشیزگی سے محروم کیا، اس نے اس کے خلاف مزاحمت کیوں کی تھی جب کہ وہ اسے دل و جان سے چاہتی تھی؟ خداوند اس کے دل میں اس قسم کے ناگہانی جذبے کو، جو اس کے محبت کے ارادوں کے خلاف جاتا تھا، تحریک نہیں دے سکتا تھا؟ میری بیوی نے۔ جیسا کہ وہ کبھی تھی۔ کبھی اس قسم کی مزاحمت نہیں کی اور غالباً وہ ٹھیک تھی۔ کچھ بھی دریافت نہیں ہو سکا، "میر نے اپنے آپ سے کہا۔" کچھ بھی مشکل نہیں کیا جاسکا۔ جو کچھ ہم معلوم کر سکتے ہیں، صرف یہ ہے کہ ہمیں کچھ بھی معلوم نہیں۔ اور انسانی عقل کی بس یہی معراج ہے۔"

اسے اپنے اندر اور باہر ہر شے ڈولیدہ، بے معنی اور گھن و ٹی نظر آرہی تھی لیکن اپنے تمام حالات و واقعات سے اسے جو کراہت ہو رہی تھی، وہ ناگوار طبع ضرور کسی لیکن اسی میں اسے اطمینان کا پہلو بھی نظر آرہا تھا۔ "یہ ایک ایسی لینی، کیا میں آپ سے یہ درخواست کرنے کی جسارت کر سکتا ہوں کہ آپ اس کمرے میں کچھ جگہ ان صاحب کو بھی دے دیں؟" ڈاک چوکی کے جہتسم نے ایک اور مسافر کو، جسے گھوڑوں کی قلت کی وجہ سے رکنا پڑا تھا، اندر لاتے ہوئے پوچھا۔

نوادار ایک سن رسیدہ شخص تھا۔ اس کا جسم گھٹا ہوا، ہڈیاں بڑی بڑی اور چہرہ سانوٹا اور جھریاں زدہ تھا۔ اس کے منگھی ابرو غیر واضح سرخی رنگ کی ریش آنکھوں کے اوپر چھائے ہوئے تھے۔

میر نے اپنے پاؤں میز سے اتار لیے۔ وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور اس بستر کی طرف، جو اس کے لیے بچھایا گیا تھا، چل پڑا اور اس پر لیٹ گیا۔ وہ کبھی کبھار اجنبی کی جانب، جو اس پر کوئی توجہ نہیں دے رہا تھا، اپنی نظر ڈال لیتا۔ اجنبی کے چہرے مہرے پر گھیرنا اور تھکاوٹ ٹپک رہی تھی اور وہ بڑی جانفشانی سے اپنے نوکر کی مدد سے اپنا اور رکوٹ اور دوسرے فالٹو کیڑے اتار رہا تھا۔ اس نے بھیڑ کی کھال کا جس کے اوپر سونے کیڑا منڈھا ہوا تھا، بوسیدہ کوٹ اور موزے، جو اس نے اپنی مہینہ استخوانی ٹانگوں پر چڑھائے ہوئے تھے، نہ اتارے۔ مسافر سونے پر بیٹھ گیا، اس نے اپنی کٹہرہ کپٹیاں اور اچھی طرح منڈھا ہوا سر اس کی پشت پر ٹکایا اور بزدل خوف کو دیکھنے لگا۔ اس کے چہرے پر جو درشتی، ذہانت اور فرست ٹپک رہی تھی، میر اس سے بہت متاثر ہوا۔ اس کا اس اجنبی کے ساتھ باتیں کرنے کو جی چاہتا تھا لیکن جب اس نے سڑکوں کی حالت کے بارے میں اس سے سوال پوچھنے کا ارادہ کیا، مسافر اپنی آنکھیں بند کر چکا تھا اور اپنے جھریاں زدہ بوڑھے ہاتھوں کو، جن کی ایک انگلی پر ایک بھاری بھر کم انگلی، جس کے اوپر کھوپڑی کا نشان ثبت تھا، چڑھی ہوئی تھی، ایک دوسرے کے اوپر رکھ چکا تھا۔ اجنبی اپنی جگہ پھر کایا بنا بیٹھا تھا اور ذرا بھی ہل جل نہیں رہا تھا۔ میر کا خیال تھا کہ وہ یا تو آرام کر رہا ہے اور یا پھر عیسق اور پر سکوت سوچ

پیار میں مستغرق ہے۔ اس کا نوکر بھی زرد رو، سوکھا سڑ اور تھریاں زدہ بوڑھا پھوس تھا۔ اس کا چہرہ مونچھوں اور داڑھی سے بے نیاز تھا، اس لیے نہیں کہ اس نے انھیں منڈوایا ہوا تھا، بلکہ اس لیے کہ وہ ”جما زرد کھودا“ تھا۔ پھر تیل بوڑھا نوکر ترست پھرت اپنے آقا کا سفری سامان طباخی کھوٹے، چائے بنانے کی اشیاء لکانے اور کھولتے ہوئے پانی کا سہارا ندر لانے میں مصروف تھا۔ جب سب کچھ تیار ہو گیا، اجنبی نے اپنی آنکھیں کھول دیں وروہ میزک جانب لپکا۔ اس نے ایک گگ میں اپنے لیے چائے انڈیلی، دوسرے میں ”کھودے“ کے لیے اور ”کھودے“ کا گگ، س کے حوالے کر دیا۔ پیئر کر بے گلی نے آگھیرا اور اسے اس اجنبی کے ساتھ بات کرنے کی ضرورت کا اور بھی شدت سے احساس ہونے لگا، بلکہ اس کے نزدیک اب کام کرنا ناگزیر ہو چکا تھا۔

نوکر، پنا خالی گگ واپس لے آیا اور اس نے اسے الٹا کر نیچے رکھ دیا۔ اس نے ایک طرف گڑ کی زلی بھی، جو ایک طرف سے دنتوں سے کتری ہوئی تھی، رکھ دی۔ پھر اس نے کہا: ”آپ کو کچھ ورتو نہیں چاہیے؟“

”نہیں، بس میری کتاب مجھے دے دو۔“

نوکر نے اسے اس کی کتاب تھمادی۔ پیئر نے سوچا کہ یہ لازماً کوئی مناجات کی کتاب ہوگی۔ اجنبی اس کے مطالعے میں محو ہو گیا۔ پیئر چپ چاپ اسے دیکھتا رہا کچھ سوچتا رہا۔ اچانک، اجنبی نے کتاب نیچے رکھ دی۔ جس لمحے کا وہ مطالعہ کر رہا تھا، وہاں اس نے نشانی رکھی اور کتاب بند کر دی۔ ایک مرتبہ اس نے آنکھیں بند کر لیں، سونے کی پشت پر، پنا سر نکایا اور دوبارہ اپنی سابقہ صورت اختیار کر لی۔ پیئر ابھی تک اسے دیکھے جا رہا تھا۔ وہ اپنی نظریں وہاں سے ہٹا نہیں پایا تھا کہ پیر سال شخص نے اپنی آنکھیں کھول دیں اور اپنی درشت اور کھوڑا آنکھیں اس کے ہارے پر گاڑ دیں۔

پیئر بوکھلا گیا اور ان نظروں سے بچنے کی کوشش کرنے لگا لیکن شعلہ قام آنکھوں نے اسے اپنے شکنجے میں جکڑ لیا۔

2

”اگر مجھے غلطی نہیں لگی تو میں یہ کہوں گا کہ مجھے کاؤنٹ بزد خوف سے ہم کلام ہونے کا شرف حاصل ہو رہا ہے،“

اجنبی نے بلند آہنگ اور نپے تلے لہجے سے کہا۔

پیئر خاموش رہا اور جواب طلب نگاہوں سے جستمے میں سے شکلم کو دیکھتا رہا۔

”محترم، میں آپ کا اور آپ کی بیٹا کا احوال سن چکا ہوں،“ اجنبی نے اپنی بات آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

معلوم ہوتا تھا کہ اس نے لفظ پیئر پر خصوصی زور دیا ہے گویا کہ وہ یہ کہنا چاہتا ہو کہ ”ہاں، بیٹا! اما سکو میں تمہارے ساتھ جو کچھ بیٹا تمہارا جوجی چاہے، اسے نام دے لو لیکن میں اسے پیٹا ہی کہوں گا۔“ اور اس نے کہا: ”محترم، مجھے آپ کے ساتھ دلی ہمدردی ہے۔“

ہیئر کا چہرہ تہمتا نے لگا، اس نے چشم زدن میں اپنے پاؤں نیچے اتارے اور شرماتے گھبراتے اور اپنے چہرے پر زبردستی مسکراہٹ پیدا کرتے وہ سن رسیدہ شخص کی طرف جھکا۔

”محترم، میں یہ باتیں تجسس کی خاطر نہیں بلکہ گنہگار جوہ کی بنا پر کہہ رہا ہوں۔“

اس نے توقف کیا۔ اس کی نگاہیں ابھی تک ہیئر پر جمی ہوئی تھیں۔ پھر وہ ہٹا اور صوفے کے ایک طرف بیٹھ گیا جیسے وہ ہیئر کو دعوت دے رہا ہو کہ وہ آئے اور اس کے قریب بیٹھ جائے۔ اگرچہ ہیئر کو اس معترض شخص کے ساتھ بات کرنے میں تامل تھا، وہ غیر راوی طور پر اس کی اطاعت بجا لایا، اپنی جگہ سے اٹھا، اس کی طرف بڑھا اور اس کے قریب بیٹھ گیا۔

”محترم، آپ ادا اس ہیں، ناشد ہیں،“ اجنبی نے اپنا سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”آپ نوجوان ہیں اور میں بوڑھا۔ جہاں تک میرے بس میں ہوا، میں آپ کی مدد کرنا چاہوں گا۔“

”بالکل، بالکل،“ ہیئر نے غیر فطری انداز سے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”میں آپ کا بے حد ممنون ہوں۔ کیا میں یہ پوچھ سکتا ہوں کہ آپ کہاں سے تشریف لائے ہیں؟“

اجنبی کا چہرہ مروت سے عاری تھا بلکہ ایک عین غلط سے اس پر درشتی اور سرد مہری سا یہ فلن تھی لیکن اس کے باوجود ہیئر کو اپنے نئے ملاقاتی کے چہرے اور الفاظ، دونوں میں ہی، دلکشی نظر آئی۔

”لیکن اگر کسی وجہ کی بنا پر آپ کو مجھ سے گفتگو کرنے میں ناگواری محسوس ہو،“ معترض شخص نے کہا، آپ مجھ سے فرمادیں۔“ اور وہ ایک بالکل غیر متوقع نرم و ملائم اور پدرانہ شفقت سے مسکراتے لگا۔

”اجی، نہیں، بالکل نہیں، اس کے برعکس آپ کا تحارف حاصل ہونے پر مجھے بے پناہ خوشی ہو رہی ہے!“ ہیئر نے کہا اور اس نے ایک بار پھر اجنبی کے ہاتھوں پر نظر دوڑائی، اور اس کی انگوٹھی کو، جس پر کھوپڑی کی شبیہ۔ مسن تحریک کی علامت۔ منقش تھی، بغور دیکھنے لگا۔

”اگر آپ اجازت مرحمت فرمائیں،“ اس نے کہا، ”میں یہ پوچھنا چاہوں گا کہ آیا آپ مسن ہیں؟“

”جی ہاں، میرا فری میسنوں کی برادری سے تعلق ہے،“ اجنبی نے ہیئر کی آنکھوں کی طرف بغور دیکھتے ہوئے کہا۔ ”میں ان کی اور اپنی طرف سے آپ کی جانب دست اخوت بڑھاتا ہوں۔“

”معاف کیجیے،“ ہیئر نے کہا۔ ایک طرف وہ اعتماد تھا، جو اس مسن کی شخصیت نے اس کی ذات میں بھری تھا، اور دوسری طرف اس کی میسنوں کے عقائد کا ہر دم مذاق اڑانے کی عادت کہنہ تھی۔ ب وہ ان دونوں جذبول کے مابین ٹھول رہا تھا۔ ”معاف کیجیے، سمجھ میں نہیں آتا کہ میں آپ کو کیسے سمجھاؤں۔ معاف کیجیے، کائنات کے سارے نظریے کے بارے میں میرے تصورات آپ لوگوں کے تصورات سے اتنے مختلف ہیں کہ ہم ایک دوسرے کو سمجھ نہیں پائیں گے۔“

”میں آپ کے انداز فکر سے آگاہ ہوں،“ فری میسن نے کہا۔ ”آپ کا یہ انداز فکر، اور آپ سمجھتے ہیں کہ یہ

آپ کی پنی کا دشمن کا نتیجہ ہے، اور اصل عام انسانوں کی، کثرت کا انداز فکر ہے اور یہ تکبر، آنکسی اور مصلحت کا غیر متغیر حاصل ہے۔ محترم، معاف کیجیے، اگر میں اس سے آگاہ نہ ہوتا، میں آپ سے کلام نہ کرتا۔ آپ کا انداز فکر سراسر مغالطے پر مبنی ہے۔“

”بالکل اسی طرح، جس طرح مجھے گمان ہوتا ہے کہ آپ بھی مغالطے کا شکار ہیں،“ پیئر نے دھیمی مسکراہٹ سے کہا۔

”میں یہ دعویٰ کرنے کی تو ہرگز جسارت نہیں کروں گا کہ میں نے صداقت دریافت کر لی ہے“ فری میسن نے کہا۔ اس کا ہجرت اور رشتہ ورنہ ناطق تھا کہ پیئر بتدریج اس سے شدید سے شدید تر متاثر ہو رہا تھا۔ ”کوئی شخص فی نفسہ صداقت تک رسائی حاصل نہیں کر سکتا۔ ہمارے جد امجد (حضرت) آدم (علیہ السلام) سے موجود زمانے تک، کھوسنوں نے (حسب توفیق) ایک ایک اینٹ سجائی تب کہیں جا کر اس معبد کی، جو باری تعالیٰ کے شایان شان اس کا گھر کہلانے کا سزاوار ہو سکتا ہے، تعمیر ممکن ہوئی، فری میسن نے کہا اور اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ ”مجھے آپ کو بتادینا چاہیے کہ میں خدا کو نہیں مانتا... خدا کو نہیں مانتا،“ پیئر نے کفِ فہوس ملنے اور ہاتھ پاؤں مارتے ہوئے کہا۔ وہ محسوس کر رہا تھا کہ کامل سچائی کا اظہار کیے بغیر کام نہیں چلے گا۔

فری میسن نے پیئر پر نگاہیں گاڑ دیں، اسے بغور دیکھا اور مسکراتے لگا۔ اس کا انداز بالکل اس شخص کا تھا جو کروڑوں میں کھیلا ہے اور کسی مفلس کو، جس پر نصیب کے پلے بقول اس کے اپنے، پانچ روپے بھی نہیں کہ ان سے اپنی خوشی کا سامان بہم پہنچ سکے، دیکھ کر مسکراتا ہے۔

”لیکن محترم، آپ کو اس ذات والا صفات کا ادراک نہیں،“ فری میسن نے کہا۔ ”آپ اس کا ادراک کرنے سے عاجز ہیں۔ آپ کو اس کا ادراک نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آپ ناشاد ہیں۔“

”ہاں، ہاں، میں ناشاد ہوں،“ پیئر نے ہل میں ہل ملاتے ہوئے کہا۔ ”لیکن میں کروں کیا؟“

”محترم، آپ کو اس کا ادراک نہیں، اس کا رن آپ اتنے ناشاد اور ناخوشند ہیں۔ لیکن وہ یہاں ہے، وہ مجھ میں ہے، وہ میرے الفاظ میں ہے، وہ تجھ میں ہے، بلکہ وہ تو ن بے ادبی کے الفاظ میں، جو ابھی ابھی آپ کے منہ سے ادا ہوئے ہیں، ابھی ہے،“ فری میسن نے درشت اور مرتعش لہجے سے کہا۔

اس نے توقف کیا اور اس کے سینے سے اک ٹوک نکلی۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنے جذبات پر قابو پانے کی سعی کر رہا ہے۔

”محترم، اگر وہ نہ ہوتا“ وہ نرمی سے گویا ہوا، ”تو میں اور آپ اس کا ذکر نہ کر رہے ہوتے۔ ہم کس کا ذکر کر رہے ہیں؟ آپ نے کس (کے وجود) کا انکار کیا ہے؟“ اس نے اچانک سوالات کی بو پھاڑ کر دی۔ اس کے لہجے میں پرمتر تندی اور تحکم تھا۔ ”مگر وہ موجود نہیں، تو پھر اسے کس نے گھڑا؟“ یہ بے بعید الفہم وجود کی موجودگی کا تصور کہاں سے آیا؟ تو نے اور کل عالم نے ایسے بعید الفہم وجود کا، ایسا وجود جو قادر مطلق ہے، نیا نہیں، جو اپنی

تمام صفات میں لا اقصیٰ ہے، مفروضہ کیسے بنایا؟“

وہ رک گیا اور دم بھر کے لیے خاموش ہو گیا۔

پھر اس مہر سکوت کو توڑ نہ سکا ورنہ وہ توڑنا چاہتا تھا

”وہ موجود ہے لیکن اب اس کا ادراک کارے دارد ہے،“ فری میسن نے اپنے سلسلہ کلام پھر سے جوڑتے ہوئے کہا۔ اب کے وہ پتھر کی جانب نہیں بلکہ سیدھا اپنے سامنے دیکھ رہا تھا جب کہ اس کے بوڑھے ہاتھ، جنہیں وہ اپنے داخلی بیچان کی وجہ سے ساکن رکھنے سے معذور تھا، کتاب کے صفحات الٹنے پلٹنے میں مصروف تھے۔ اگر آپ کو کسی انسان کے وجود کے بارے میں شک و شبہ ہوتا، میں اسے آپ کی خدمت میں حاضر کر سکتا تھا، میں اس کا ہاتھ پکڑ سکتا اور اسے آپ کو دکھا سکتا تھا۔ لیکن میں، حقیر، ناقص، فنا پذیر آدم زاد، اس کی قادر المطلقیت، اس کی لا اقصیت، اس کے کامل غفور کرم کو ایک، ایسے شخص کو، جرنایا ہے، جو نکلیں رکھتا ہے لیکن انہیں را نہیں کرتا کہ کہیں وہ اسے دیکھ نہ لے، اس کا ادراک نہ کر لے، کہیں اسے اپنی سفلگی اور ہوش کی کا علم نہ ہو جائے، کیسے دکھا سکتا ہوں؟“ اس نے ایک بار پھر توقف کیا۔ ”تو کون ہے؟ تو کیا ہے؟ تو سمجھتا ہے کہ تو عاقل و ناطق ہے کیونکہ تو وہ ہے ادبی کے کلمات کہہ سکتا ہے،“ اس نے گہیر اور پر تحیر طنز خفی سے کہا، ”جب کہ تو اس ننھے منے بچے سے بھی زیادہ گہرا گزر، احمق اور کودن ہے، جو اس گھڑی کے ساتھ، جس کی ساخت میں بڑی مہارت اور مشق سے کام لیا گیا تھا، چھیڑ خانی کرتا ہے اور چونکہ سے مطلق علم نہیں ہوتا کہ یہ گھڑی کس کام آتی ہے، اس لیے اس میں یہ کہنے کا حوصلہ ہوتا ہے کہ میں اس استاد کے، جس نے اس کو بنایا ہے، وجود کو نہیں مانتا۔ اس (خدا) کا ادراک کرنا بہت دشوار ہے۔ ہمارے اولین جد امجد (حضرت) آدم اور ہمارے اپنے زما نے کے مابین ہزاروں قرون کا فاصلہ حائل ہے۔ اس دوران میں ہم اس علم کے حصول میں ایڑی چوٹی کا زور لگاتے رہے ہیں لیکن ابھی تک ہم اپنے مقصد کے حصول میں ان گنت کوسوں دور ہیں۔ تنہیم کے اس فقدان میں میں ہمیں محض اپنا عجز اور اس کی کبریائی نظر آتی ہے۔“

فری میسن کی باتیں سن کر پتھر کی آنکھوں میں چمک آگئی اور اس کا دل اچھلنے لگا۔ اس نے اپنی نگاہیں اس کی نگاہوں میں ڈال دیں۔ اس نے نہ تو اسے ٹوکا اور نہ کوئی سوال اٹھایا، بلکہ جو کچھ اجنبی اس سے کہہ رہا تھا، وہ دل و جان سے اس پر آمنا و صدقہ تھا کہہ رہا تھا۔ فری میسن کی باتیں جن عقلی دلائل و براہین سے پر تھیں، آیا وہ ان سے قائل ہوا یا اس کے تھر تھراتے لہجے میں، جو شدت جذبات سے بعض اوقات اس کا ساتھ نہیں دے پاتا تھا، جو دبدبہ اور خلوص تھا، آیا بچوں کی طرح وہ اس سے متاثر ہو، یا اس کی موتی چوڑا آنکھوں نے، جنہیں اس عقیدے نے چلتے پھرتے دیا تھا، کام دکھایا یا پھر اس کے مقصد میں جو پرسکون محکمگی اور ایقان تھا جو اس کے سارے وجود سے پھوٹ رہا تھا (اور جس نے پتھر کو اپنے پاس اور نر اس کے مقابلے میں خاص طور پر متاثر کیا تھا)، اس نے اپنا اعجاز دکھایا اور اسے الجواب کر دیا۔ بہر حال وہ بہ صمیم قلب یقین کرنے کا آرزو مند تھا اور اسے یقین آ بھی گیا اور اسے یہ مسرت بخش احساس ہونے لگا کہ اسے تسکین حاصل ہو گئی ہے، اس کی توفیق ہو گئی ہے اور وہ دوبارہ زندگی کی طرف لوٹ آیا ہے۔

”اس کا ادراک بدریغہ عقل نہیں بلکہ بذریعہ حیات ہو سکتا ہے“ فری میسن نے کہا۔

”میں سمجھ نہیں پا رہا“ میئر نے کہا۔ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ شکوک و شبہات پھر سر اٹھانے لگے ہیں اور اس احساس سے اسے سخت دھچکا لگا۔ یہ سوچ کر اس کی روح فنا ہو رہی تھی کہ کہیں فری میسن کے استدلال میں کوئی جھوٹ یا الجھاؤ نہ ہو۔ اسے اس چیز سے بھی خوف آ رہا تھا کہ کہیں وہ اس (فری میسن) کی بات پر عدم یقین نہ کرنے لگے۔

”میں سمجھ نہیں پا رہا“ اس نے کہا، ”کہ جس چیز کا آپ ذکر کر رہے ہیں، اس کے علم تک عقل انسانی کی رسائی کیوں نہیں ہو سکتی؟“

فری میسن کے چہرے پر وہی نرم و گہرا زور اور پدرانہ مسکراہٹ تیرنے لگی۔ ”اعلیٰ ترین دانش اور صداقت خالص ترین انج یا حوہر کی، جسے ہم نوش کرنے کی خواہش کر سکتے ہیں، مانند ہوتی ہے“ اس نے کہا۔ ”کیا میں اس خالص مانع یا جوہر کو ناپاک برتن میں ڈال سکتا اور پھر اس کے خالص ہونے کا دعویٰ کر سکتا ہوں؟ میں صرف اپنی داخلی پاکیزگی کے ذریعے اس جوہر کی، جو میں اپنے اندر قبول کرتا ہوں، پاکیزگی کسی حد تک برقرار رکھ سکتا ہوں۔“

”ہاں، ہاں، یہ بات تو ٹھیک ہے“ میئر نے سرور سے جواب دیا۔

”اعلیٰ ترین دانش کی اساس محض استدلال یا بہ الفاظ دیگر فزکس، کیمسٹری اور ان جیسے دیگر دنیاوی علوم پر جن میں عقلی علم منتسم کیا جاتا ہے، نہیں ہوتی۔ اعلیٰ ترین دانش واحد اکائی ہے۔ اس کے علم کا صرف ایک ہی خانہ ہے۔ اور یہ بے گل کا علم، وہ علم جو ساری کائنات اور اس میں انسان کے مقام کی صراحت کرتا ہے۔ اس علم کو اپنے اندر جذب کرنے کے لیے یا انتہائی ضروری ہے کہ آدمی اپنے باطن کو پاکیزہ بنائے اور اسے حیات نور سے آشنا کرے۔ چنانچہ ادراک سے پہلے یہ لابدی ہے کہ آدمی پہلے اپنے اندر ایقان پیدا کرے اور اپنے آپ کو کامل بنائے۔ اور اس مقصد کے حصول کے لیے خداوند نے ہمارے اندر الوہی نور، جسے ضمیر کہا جاتا ہے، جاگزیں کر دیا ہے۔“

”جی ہاں، جی ہاں“ میئر نے موافقت کا ظہار کرتے ہوئے کہا۔

”اپنے باطن کے عیس ترین کونوں کو اپنی روحانی آنکھوں سے دیکھو اور اپنے آپ سے پوچھو: میں اپنے آپ سے مطمئن ہوں؟ کسی ہادی اور رہنما کا ہاتھ پکڑے بغیر میں نے محض عقل کے بل بوتے پر کیا پایا ہے؟ میں کیا ہوں؟“

محترم، آپ نوجوان ہیں، مال دار ہیں، اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں۔ آپ کو جو یہ ساری نعمتیں عطا ہوئی ہیں، آپ نے ان کا کیا بنایا؟ کیا آپ اپنے آپ سے اور اپنی زندگی سے مطمئن ہیں؟“

”نہیں، مجھے تو اپنی زندگی سے کھن آتی ہے“ میئر نے جیس بہ جیس ہو کر کہا۔

”تو اس سے کھن کھاتا ہے، پھر اسے تبدیل کر دے۔ اپنے آپ کو پاکیزہ بنا اور جب تو پاکیزہ ہو جائے گا، پھر تجھے عقل و دانش مل جائے گی۔ محترم، اپنی زندگی پر نظر دوڑائیں۔ اس کا جائزہ لیں۔ آپ نے اسے کیسے بسر کیا ہے؟ معاشرے سے لیا تو سب کچھ لیکن معوضے میں دیا کچھ نہیں۔ آپ کو دولت عطا کی گئی۔ آپ نے اسے کیسے استعمال کیا؟ آپ نے اپنے پڑوسی کے لیے کیا کیا ہے؟ آپ کے ہزاروں زرعی غلام ہیں، کیا آپ نے کبھی ان

کے بارے میں سوچا؟ کیا آپ نے کبھی اس کی داسے در سے ختنے مدد کی ہے؟ نہیں۔ محنت مشقت وہ کرتے ہیں، عیش آپ اڑاتے ہیں۔ انڈے سیوے ناخن اور کوڑے میوے کھائیں۔ یہی آپ نے کیا ہے۔ کیا آپ نے کوئی ایسا عہدہ جس میں آپ دوسروں کے کام آسکیں، منتخب کیا؟ نہیں۔ آپ ساری عمر نکھو بن کر بس ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہے۔ پھر، محترم، آپ نے شادی کی۔ ایک نوجوان خاتون کو زندگی میں سچائی کا راستہ دکھانے کا فریضہ پئے سر لیا۔ آپ نے یہ ذمے داری کیسے نبھائی؟ صداقت کا راستہ دریافت کرنے میں اس کا ہاتھ تو کیا بٹانا تھا، الٹا سے مکر و فریب اور ذلت و خواری کی دسل میں دھکیل دیا۔ ایک شخص نے آپ کی شان میں گستاخی کی اور آپ نے اس پر گولی چلا دی۔ پھر آپ کہتے ہیں کہ آپ خدا کو نہیں مانتے، اور اپنی زندگی سے گھن کھاتے ہیں۔ میرے محترم، اس میں تعجب کی کیا بات ہے؟“

ان الفاظ کے ساتھ فری میسن نے ایک مرتبہ پھر اپنا سر صوفے کی پشت پر ٹکا دیا اور اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ اس طویل گفتگو نے اسے ہلکان کر دیا ہے۔ پیٹر سمر آدھی کے درشت، جذبات سے عاری اور تقریباً بے جان چہرے کو بغور دیکھنے اور کسی قسم کی آذنی پیدا کیے بغیر اپنے لبوں کو حرکت دینے لگا۔ وہ کہنا چاہتا تھا ”جی ہاں، آپ نے بجا فرمایا ہے کہ میں رنگ رلیوں کا دلدادہ ہوں اور میں نے نہایت گھٹیا، شرم ناک، ورنکی زندگی بسر کی ہے۔“ لیکن اس میں مہر سکوت توڑنے کی ہمت نہیں تھی۔

فری میسن نے بوڑھوں کی طرح اپنا گلا کھنکار کر صاف کیا اور اپنے نوکر کو آواز دی۔
 ”گھوڑوں کے بارے میں کیا خبر ہے؟“ اس نے پیٹر کی جانب دیکھے بغیر پوچھا۔
 ”چند ابھی ابھی آئے ہیں،“ نوکر نے جواب دیا۔ ”آپ یہاں آرام نہیں فرمائیں گے؟“
 ”نہیں، انھیں جتو دو۔“

”کیا یہ مجھے سب کچھ بتائے اور مجھ سے مدد کا وعدہ کیے بغیر چلے جائیں گے اور مجھے یکہ تنہا چھوڑ جائیں گے؟“ پیٹر نے سوچا۔ وہ اٹھا، اپنا سر جھکایا اور کمرے میں چہل قدمی کرنے لگا۔ وہ کبھی کبھار فری میسن پر بھی سرسری نظر ڈال لیتا تھا۔ ”بالکل۔ میں نے پہلے یہ کبھی سوچا ہی نہیں تھا لیکن میں نے بڑی دلالت اور وابستگی کی زندگی گزاری ہے۔۔۔ حالانکہ یہ مجھے پسند نہیں تھی اور نہ میں نے کبھی اس کی آرزو کی تھی۔“ پیٹر سوچ بچار میں غطاس تھا۔ ”اور یہ شخص صداقت کے علم سے بہرہ ور ہے اور اگر یہ چاہے تو میرے سامنے اسے مشکف کر سکتا ہے۔“

پھر اس بارے میں فری میسن سے بات کرنا چاہتا تھا لیکن اسے حوصلہ نہیں ہو رہا تھا۔
 سہ فرنے بوڑھے مشق ہاتھوں سے اپنی اشیائیں میٹیں اور اپنے چری کوٹ کے بش بند کرنے لگا۔ جب وہ ناریغ ہوا، وہ بزدل خوف کی جانب متوجہ ہوا اور بے نیازی لیکن شائستگی سے بولا:

”محترم، آپ کہاں جانا چاہتے ہیں؟“

”میں؟ میں پیٹر زمرگ جا رہا ہوں،“ پیٹر نے بچوں کی طرح ڈھٹیل انداز سے جواب دیا۔ ”میں آپ؟“

بے حد مشکور ہوں۔ آپ نے جو کچھ فرمایا، میں اس سے متفق ہوں۔ لیکن مجھے بالکل ہی برائہ سمجھیں۔ میں بہ صمیم قلب وہ کچھ بننا چاہتا ہوں جو آپ چاہتے ہیں کہ میں بنوں۔ لیکن آج تک مجھے کہیں سے مدد نہیں ملی۔ اگرچہ ہر بات کے لیے مورد الزام میں ہی ٹھہرتا ہوں۔ آپ میری دست گیری کریں، میری مدد فرمائیں، میری رہبری کریں اور شاید میں۔“

ہیئر کے لیے اپنا سلسلہ کلام جاری رکھنا ناممکن ہو گیا، اس کا گلہ رندھ گیا اور اس نے سند دوسری طرف پھیر لیا۔ فری مین کانی دیر خاموش کھڑا رہا۔ بظاہر وہ کچھ سوچ رہا تھا۔

”مرد صرف خدا کرتا ہے،“ اس نے کہا۔ ”تاہم، محترم، جس قدر امداد ہماری جماعت کے بس میں ہوئی، وہ آپ کو سہا کر دی جائے گی۔ آپ ہیئر بزرگ جا رہے ہیں۔ آپ یہ کاؤنٹ ولارنگی کو پہنچا دیں۔“ (اس نے جیب سے نوٹ بک نکالی اور خاصے بڑے چوہرے کاغذ پر کچھ تحریر کیا۔) ”اگر آپ اجازت دیں، میں آپ کو ایک مشورہ دوں گا۔ جب آپ دارالصفنت پہنچ جائیں، کچھ عرصہ خلوت میں بسر کریں، اپنے نفس کا عی سہ کریں اور اپنے سابقہ طور طریقوں سے گریز کریں۔ اب میری یہ دعا ہے کہ آپ کا سفر بخیر و عافیت طے ہو۔“ اور اس نے اپنے نوٹ کو کمرے میں داخل ہوتے دیکھ کر مزید کہا: ”اور کامیابی آپ کے قدم چومے۔“

جیسا کہ ہیئر کوڈک چوکی کے مہتمم کے رجسٹر سے معلوم ہوا، مسافر کا نام آئی اوسف الیسی وچ باز دیف تھا۔ مادی کونف کے زمانے میں بھی باز دیف کا شمار جانے پہچانے فری میسنوں اور مارتی نیٹوں میں ہوتا تھا۔

اس کی روادگی کے خاصی دیر بعد بھی ہیئر نے نہ تو بستر کا رخ کیا اور نہ گھوڑے جوتے کا حکم دیا۔ وہ کمرے میں ادھر ادھر چکر لگاتا، اپنے ناپاک ماضی کا جائزہ لیتا اور آغا ز نو کے وجد و احساس کے ساتھ کیف آگئیں، بے داغ اور نکوکار مستقبل کی، جس کا حصول اسے بہت آسان نظر آ رہا تھا، تصویر کشی کرتا رہا۔ اسے محسوس ہوا کہ وہ راہ راست سے الپے بھٹک گیا تھا کیونکہ وہ کسی طور یہ فراموش کر بیٹھا تھا کہ صالح اور نکوکار ہونا کتنا احسن ہے۔ اس کی روح میں سابقہ شلوک دشہات کا شائبہ تک باقی نہ رہا۔ اسے یہ پختہ یقین ہو گیا کہ انسانوں کو اخوت کی کڑی میں پرویا جاسکتا ہے اور وہ مل جل کر صراط مستقیم پر چل سکتے ہیں۔ اسے اپنے تصورات میں فری مین تحریک اسی قسم کی برادری نظر آئی۔

3

ہیئر بزرگ پہنچنے کے بعد ہیئر نے نہ تو کسی کو اپنی آمد کی اطلاع دی اور نہ وہ کسی سے ملے گیا۔ وہ مسلسل کئی روز اس آگے پس کی کتاب، جو کسی اجنبی شخص نے اسے بھیجی تھی، پڑھتا رہا۔ جوں جوں وہ یہ کتاب پڑھتا گیا، اسے ایک چیز صرف ایک چیز، کا احساس ہوتا گیا اور وہ چیز یہ تھی کہ اگر وہ یقین کرنے لگے کہ بحیثیت انسان وہ اپنے آپ کو کامل بنا سکتا ہے، پھر اسے وہ سرور حاصل ہوگا، جس سے وہ اب تک آشنا نہیں تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ اسے یہ اندازہ بھی ہونے لگا کہ انسانوں کے مابین جس فعل اور بردار نہ محبت کا آئی اوسف الیسی وچ نے ذکر کیا تھا، اس کا

امکان بھی موجود ہے۔ میئر کی آمد کے ایک ہفتہ بعد نو جوان پولستانی کاؤنٹ ولارسکی، جس کے ساتھ میئر درج کے اعلیٰ طبقوں میں اس کی معمولی سی جان پہچان تھی، ایک شام بالکل اسی طرح رسوم و ضوابط کی پابندی کرنا، جس طرح ولوفوف کے سیکنڈ نے اس سے ملاقات کے وقت کی تھیں، اس کے کمرے میں داخل ہوا۔ اس نے گئے ہی دروازہ بند کر دیا اور جب اسے اطمینان ہو گیا کہ وہاں کوئی تیسرا شخص موجود نہیں، وہ میئر سے مخاطب ہوا:

”کاؤنٹ، میں آپ کے لیے ایک پیغام اور ایک تجویز لے کر آیا ہوں،“ اس نے بیٹھے بغیر کہا، ”ایک شخص نے، جسے ہماری جماعت میں اعلیٰ مقام حاصل ہے، آپ کی جانب سے درخواست پیش کی ہے کہ آپ کو معمول کی معیار سے قبل ہی جماعت کا رکن بنالیا جائے اور انھوں نے تجویز پیش کی ہے کہ آپ کی رکنیت کی سفارش میں کروں۔ اس شخص کی خواہشات کو عملی جامہ پہنانا میں عین سعادت تصور کرتا ہوں۔ آپ میری سفارش پر فری میسوں کی برادری میں شامل ہونا چاہتے ہیں؟“

اس شخص کے، جسے میئر نے تقریباً ہمیشہ اجتماعی رقص کی محفوں میں ہی دیکھا تھا، جو ہر دم خوشگو را انداز سے مسکراتا رہتا تھا اور جس کے ارد گرد خواتین کا، جن کا حسن چاند کو شرما تا اور نگاہوں کو خیرہ کرتا تھا، ہجوم رہتا تھا، مرد مہرآنہ اور روکھے سوکھے لہجے نے میئر کے دل پر گہرا اثر کیا۔

”جی، میری بالکل یہی خواہش ہے،“ میئر نے کہا۔

ولارسکی نے اپنے سر کو خم دیا۔ ”کاؤنٹ، ایک سوال اور،“ اس نے کہا، ”میری آپ سے درخواست ہے کہ آپ اس کا جواب پورے خلوص سے دیں۔ مستقبل کے فری میسن کی حیثیت سے نہیں بلکہ راست باز شخص کی طرح: کیا آپ اپنے سابقہ عقائد سے دست بردار ہو گئے ہیں۔ کیا آپ کو خدا پر یقین ہے؟“

میئر نے ایک لحظہ سوچا، ”بالکل... بالکل۔ میں خدا پر یقین رکھتا ہوں،“ اس نے کہا۔

”اگر یہ صورت ہے۔“ ولارسکی نے کہنا شروع کیا لیکن میئر نے اسے ٹوک دیا۔

”جی، مجھے خدا پر پورا یقین ہے،“ اس نے اپنی بات دہرائی۔

”اگر یہ صورت ہے، پھر ہم روانہ ہو سکتے ہیں،“ ولارسکی نے کہا۔ ”میری گاڑی حاضر ہے۔“

پورے رستے ولارسکی مہر پہ لب بیٹھا رہا۔ میئر نے جب اس سے پوچھنا چاہا کہ ”مجھے کیا کرنا ہوگا اور مجھے سوالات کے جوابات کس طرح دینا چاہئیں؟“ ولارسکی نے صرف اتنا کہا: ”مجھ سے بہتر ارکان آپ کا امتحان لیں گے اور آپ کو صرف سچ بولنا ہوگا۔“

وہ ایک وسیع و عریض عمارت کے، جس میں لانج کا صدر مقام تھا، صدر دروازے میں داخل ہوئے۔ ایک تاریک زینہ چڑھنے کے بعد وہ روشن استقبالیہ میں پہنچے۔ یہاں انھوں نے کسی ملازم کی اعانت کے بغیر اپنے اوپر کوٹ اتارے۔ وہ وہاں سے ایک دوسرے کمرے میں چلے گئے۔ دروازے پر ایک شخص، جو عجیب و غریب پوشاک میں ملیں تھا، نظر آیا۔ ولارسکی دسے پاؤں اس کے پاس گیا اور فرامیسی میں اس کے کان میں کچھ کہا۔ اس کے بعد وہ

ایک چھوٹی سی وارڈروب کی طرف بڑھا۔ وہاں میٹر کو کچھ اس قسم کے ملبوسات، جو اس نے اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھے تھے، دکھائی دیے۔ دلارسکی نے وارڈروب سے ایک رد مال نکالا اور اسے میٹر کی آنکھوں پر باندھ دیا۔ اس نے جب اس کی پشت پر گرہ لگائی، میٹر کے بال کچھ اس بری طرح اس میں پھنسے کہ اسے خاصی تکلیف ہونے لگی۔ پھر دلارسکی نے اس کا سر نیچے جھکایا، اس کے رخساروں پر بوسہ دیا، اس کا ہاتھ تھاما اور اسے وہاں سے لے چلا۔ میٹر کے بال جس بری طرح گرہ میں پھنسے ہوئے تھے، اس سے اسے اچھی خاصی اذیت ہو رہی تھی اور وہ ڈھٹائی سے سر کرنے لگا۔ وہ دلارسکی کے پیچھے چلنا رہا۔ اس کی چال میں بے یقینی اور جھینپ تھی۔ اس کے بازو بھاری بھر کم جسم کے اطراف جھول رہے تھے اور اس کے چہرے پر جسم کی شکنیں تھیں۔

کوئی دس قدم چلنے کے بعد دلارسکی رگ گیا۔

”اگر آپ ہماری جماعت میں بختہ رادے سے شامل ہونے آئے ہیں،“ اس نے کہا، ”پھر خواہ آپ کے ساتھ کچھ ہی کیوں نہ پیش آئے، آپ کو صبر و استقامت سے اسے برداشت کرنا ہوگا۔“ (میٹر نے ہاں میں سر ہلایا۔)

”جب آپ کو دروازے پر دستک سنائی دے، آپ اپنی آنکھوں سے پٹی اتار دیں گے،“ دلارسکی نے مزید کہا۔ ”میری دعا ہے کہ آپ حوصلے سے کام لیں اور کامیابی آپ کے قدم چومے،“ اس نے کہا، میٹر کا ہاتھ دیا اور باہر نکل گیا۔

جب میٹر اکیلا رہ گیا وہ پھر بھی اسی طرح مسکرتا رہا۔ ایک دو مرتبہ اس نے کندھے اچکاتے اور اپنا ہاتھ ہور اٹھا کر وہاں تک لے گیا جیسے وہ اسے اتارنا چاہتا ہو لیکن اس نے دوبارہ اسے نیچے گرا دیا۔ آنکھوں پر پٹی باندھے اس نے جو پانچ مٹ گز ارے، وہ اسے ایک گھنٹے کے سادھی معلوم ہوئے۔ اس کے بازو سن ہو گئے، اس کی ٹانگیں تقریباً جواب دیئے گئیں اور سے بے پناہ تھکن کا احساس ستانے اور مختلف انواع و اقسام کی چیزیں اس کا تجربہ ہونے لگا۔ یہ سوچ سوچ کر اس کی جاں ضیق میں آنے لگی کہ معصوم نہیں کہ اس پر کیا جیتے اور اس سے بھی زیادہ اندیشہ اسے اس بات کا تھا کہ کہیں اس کا خوف ظاہر نہ ہو جائے۔ اسے یہ کرید لگی ہوئی تھی کہ اب کیا وقوع پذیر ہونے والا ہے اور اس کے سامنے کن اسرار و رموز کے پردے اٹھائے جائیں گے۔ لیکن سب سے بڑا کہ اسے یہ خوشی ہو رہی تھی کہ اب وہ گھڑی آجی کی ہے جب وہ حیات نو پاسکے گا اور فعل طریقے سے نیکی در پارسائی کے، جن کا وہ آئی اےف ایف کی وجہ سے مدقات کے وقت سے خواب دیکھتا آ رہا تھا، راستے پر گامزن ہو سکے گا۔

دروازہ دھڑا دھڑ پٹا جانے لگا۔ میٹر نے پٹی اتار دی اور اپنے گرد و پیش نظریں دوڑائیں۔ کمرے میں گھپ اندھیرا تھا۔ صرف ایک کونے میں کسی سفید چیز کے اندر ایک چھوٹا مدم چراغ روشن تھا۔ میٹر نزدیک آیا اور اس نے دیکھا کہ چراغ ایک سیاہ میز پر، جس کے اوپر ایک کھلی کتاب پڑی تھی، دھرا تھا۔ کتاب اناجیل اربعہ پر مشتمل تھی۔ وہ سفید چیز، جس میں چراغ جل رہا تھا انسانی کھوپڑی تھی۔ اس کے تمام سوراخ اور دانت صحیح سالم تھے۔ میٹر نے اناجیل اربعہ کے ابتدائی الفاظ پڑھے۔ ”ابتدا میں کلام تھا اور کلام خدا کے ساتھ تھا۔“ میٹر نے میز کے گرد چکر لگایا۔ اس کی نظر خاصے بڑے بڑے پر پڑی۔ ڈبا کھلا تھا اور اس میں کوئی چیز بھنسی ہوئی تھی۔ یہ صندوق دراصل تابوت

تھا اور اس میں ہڈیاں رکھی ہوئی تھیں۔ جو کچھ اس نے دیکھا، اس میں اسے ذرا بھی تحیر نہ ہوا۔ اس امید میں کہ وہ ایک بالکل نئی زندگی میں داخل ہوا چاہتا ہے، جو اس کی پرانے زندگی سے قطعی مختلف ہوگی، وہ یہ توقع پائندہ بننے لگا کہ یہاں ہر شے غیر معمولی ہوگی، بلکہ جو کچھ وہ دیکھ رہا تھا، اس سے بھی زیادہ غیر معمولی ہوگی۔ کھوپڑی، تابوت، اناجیل اربہ۔ اسے محسوس ہوا کہ اسے سب اشیا بلکہ ان سے بھی زیادہ کی توقع ہے۔ اپنے جذبات کو بھارنے کی کوشش میں اس نے کنکلیوں سے اپنے ارد گرد دیکھا۔ ”خدا، موت، محبت اور انسانی اخوت۔“ وہ بار بار اس الفاظ کا ورد اور ان کے ساتھ کسی قسم کے دھندے لیکن پر مسرت تصورات بھی وابستہ کرتا رہا۔ دروازہ کھلا اور کوئی شخص اندر آیا۔ دھندلے روشنی میں، جس سے ویٹر کی آنکھیں پہلے ہی مانوس ہو چکی تھیں، اسے قدرے کوتاہ قامت شخص نظر آیا۔ بظاہر نووارد روشنی سے تاریکی میں آیا تھا، چنانچہ اس نے کچھ توقف کیا۔ پھر وہ محتاط قدموں سے چلا میر کے قریب پانچا اور اپنے تنھے سے ہاتھ، جن پر اس نے چرمی دستا نے اوڑھے ہوئے تھے، اس پر رکھ دیے۔

اس پست قامت شخص کے جسم پر سفید چرمی ایپرن، جس میں اس کا سینہ اور رانیں ڈھنسی ہوئی تھیں، لٹک رہا تھا۔ اس کی گردن میں ایک طرح کی کنکلی (نیمکلیس) حائل تھی۔ کنکلی کے مین و پر سفید اونچی جھلر تھی۔ اس جھلر میں اس کا کتابی چہرہ یوں نظر آ رہا تھا جیسے چوکنٹے کے اندر تصویر۔ نیچے جو روشنی تھی، اس میں اس کا چہرہ روشن ہو گیا تھا۔

”آپ یہاں کیوں آئے ہیں؟“ نووارد نے ویٹر کی جانب، جس نے ہلکی سی سرسراہٹ پیدا کی تھی، متوجہ ہو کر کہا۔ ”تم، جو نور کی صداقت سے منکر ہو، جس نے نور دیکھا ہی نہیں ہے، یہاں کیوں آئے ہو؟ تم ہم سے کیا لینے آئے ہو؟ دانائی، شکی، بردہن، نمیری؟“

جس لمحے دروازہ کھلا، اور نامعلوم شخص اندر آیا، ویٹر کو بعینہ اسی قسم کی ہیبت اور تعظیم و کرم کا، جس کا تجربہ اسے بچپن میں بھری محفل میں پادری کے سامنے اترایہ مذہب کے وقت ہوا تھا، احساس ہوا۔ اسے محسوس ہوا کہ وہ ایک ایسے شخص کے، جو نور مرہ کی زندگی میں، اس کے بے بالکل اجنبی تھا لیکن جو اخوت انسانی کے ناطے اس کا بھائی بند ہے، سامنے موجود ہے۔ دم سادھے اور دھک دھک کرتے دل کے ساتھ ہنر اتالیق (فری مین) یہ خطاب اپنے اس رفیق کو، جو تحریک میں شامل ہونے کے متمنی شخص کو باضابطہ شرکت کے لیے تیار کرنا ہے، دیتے ہیں کی جانب بڑھا۔ قریب پہنچنے کے بعد اسے معلوم ہوا کہ وہ اسے جانتا ہے۔ اس کا نام سالیامینوف تھا اور یہ سورج کر کہ نووارد اس کا واقف کار ہے، اسے سخت ذہنی اذیت پہنچی۔ وہ اس امر کو ترجیح دیتا کہ نووارد اس کا محض رفیق اور شکی کا پرچارک ہوتا۔ کافی دیر تک ویٹر کے منہ سے ایک لفظ بھی نہ نکل سکا۔ چنانچہ اتالیق کو مجبوراً اپنا سوال دہرانا پڑا۔

”جی ہاں، میں... میں... حیات نو کا متلاشی ہوں،“ ویٹر نے بے حد مشکل یہ الفاظ کہے۔

”بہت خوب،“ سالیامینوف نے کہا اور وہ فی الفور آگے بڑھا۔ ”تمہارے ذہن میں ان ذرائع کا جن کی وساطت سے ہماری مقدس جہت تمہارے مقصد کے حصول میں تمہیں کوئی امداد بہم پہنچا سکتی ہے، کوئی تصور ہے؟“

اتالیق نے سکون اور عجلت سے پوچھا۔

”مجھے امید ہے کہ حیات نو... کے سلسلے میں... مجھے... امداد... دستیاب ہوگی،“ پیئر نے کہا۔ اس کی آواز میں کچلپاہٹ تھی اور اسے بولنے میں دقت پیش آرہی تھی۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ اس کے جذبات میں ہل چل مچی ہوئی تھی دوسرے اسے رومی زبان میں مجرد افکار کے بارے میں گفتگو کرنے کی عادت نہیں تھی۔

”تمہارے ذہن میں فری میسنری کا تصور کیا ہے؟“

”میں سمجھتا ہوں کہ فری میسنری ان انسانوں کے، جن کے مقصد تک ہیں، مابین مواخات اور مساوات قائم کرتی ہے،“ پیئر نے کہا۔ وہ اس بات پر شرمسار ہو رہا تھا کہ اس کے الفاظ موقع کی متانت سے مناسبت نہیں رکھتے۔ ”میں سمجھتا ہوں۔“

”بہت خوب،“ اتالیق نے، جو بظاہر اس جواب سے مطمئن دکھائی دیتا تھا، عجلت سے کہا۔ ”اپنے مقصد کے حصول کے لیے تمہیں جو ذرائع درکار ہیں، کیا تم نے انہیں مذہب میں تلاش کیا؟“

”نہیں۔ میرا خیال تھا کہ یہ اغداط سے پر ہے، اس لیے میں نے یہ راستہ اختیار نہیں کیا،“ پیئر نے یہ الفاظ اتالیق دلی زبان سے کہے کہ اتالیق سن نہ سکا۔ چنانچہ اس نے پوچھا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔

”میں ناسمجھ تھا،“ پیئر نے جواب دیا۔

”تم سچی کے متلاشی ہو تا کہ تم اس کے اصولوں پر اپنی زندگی میں عمل کر سکو۔ چنانچہ تم دانائی اور نیکی کی تلاش میں ہو۔ ٹھیک ہے نا؟“ اتالیق نے کچھ دیر کی خاموشی کے بعد کہا۔

”جی ہاں،“ پیئر نے اس کی تائید کی۔

اتالیق نے کھکا کر اپنا گلہ صاف کیا۔ دستا نے پوش ہاتھوں سے اپنے سینے پر صلیب کا نشان بنایا اور بولنے لگا۔

”اب مجھے اپنی جماعت کے مقصدِ عظیم کا تمہارے سامنے انکشاف کر دینا چاہیے،“ اس نے کہا، ”اور اگر یہ مقصد تمہارے اپنے مقصد سے ملکا کھاتا ہو، پھر تم ہماری جماعت میں منفعت بخش انداز سے داخل ہو سکتے ہو۔ ہماری جماعت کا اولین اور عظیم مقصد، جس اساس پر یہ مصدقہ طور پر قائم ہے اور جسے دنیا کی کوئی طاقت زیر و زبر نہیں کر سکتی، وہ ایک خاص نوعیت کے وسیع راز کا تحفظ کرنا اور اسے در اثنا اختلاف تک پہنچانا ہے۔... یہ راز ہم تک زمانہ پر اچھیں بلکہ در حقیقت انسانِ اول سے پہنچا ہے اور یہ وہ راز ہے جس پر غالباً بنی نوع انسان کے مقدر کا انحصار ہے۔ لیکن چونکہ اس راز کی نوعیت کچھ ایسی ہے، کہ کوئی بھی شخص، تا وقتیکہ وہ طویل طویل اور جاں نسیں کے لیے تیار نہ ہو، اس سے آگاہ یا مستفید نہیں ہو سکتا اور نہ ہر کس و نا کس اسے آسانی سے دریافت کرنے کی امید کر سکتا ہے۔ چنانچہ ہمارا ایک مقصد دوم ہے اور وہ یہ ہے کہ ہم اپنے ارکان کی کچھ اس طرح تہذیب و تربیت کریں کہ وہ ان ذرائع سے، جو ہمیں روایا ان اشخاص سے ملے، جنہوں نے اس راز کے حصول کے لیے سرتوڑ کوششیں کیں، اپنے قلوب کی حتی الامکان زیادہ سے زیادہ تطہیر کر سکیں اور اپنے اذہان کو تمام آلائشوں سے پاک اور انہیں باخبر بنا سکیں، اور یوں ہم انہیں اس

قابل بنادیں کہ وہ اس راز کو حاصل کر سکیں۔

”سوم، ہم اپنے ارکان کا جس طرح تزکیہ کرتے اور انہیں حیات نو سے آشنا کرتے ہیں، اس کے ذریعے ہم ساری نسل، انسانی کی اصلاح کا کام سرانجام دیتے ہیں۔ وہ یوں کہ ہم اپنے ارکان کو پارسائی و ریشگی کے ٹھونے بنا کر پیش کرتے ہیں اور اس طرح دنیا میں جو بدی کا چلن ہے، اس کا پوری قوت سے ڈٹ کر مقابلہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جو کچھ میں نے عرض کیا ہے، اس پر غور کرو اور میں دوبارہ تمہارے پاس آؤں گا،“ اس نے یہ کہا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

”دنیا میں جو بدی کا چلن ہے، اس کا مقابلہ کرنے کے لیے..“ میٹر نے دہرایا اور اس سمت میں سے مستقبل میں جو کام سرانجام دینا تھا، اس کا خاکہ اس کے ذہن میں ابھرنے لگا۔ وہ جتنے قبل وہ خود جس قسم کا انسان تھا، وہ اس قسم کے انسانوں کا تصور اپنے دماغ میں باندھنے لگا اور جی ہی جی میں انہیں کا بر خیر کی تلقین کرے لگا۔ وہ ایسے اوباش، عیاش اور بد قسمت لوگوں کے، جن کی اس نے زبانی اور عملی امداد کرنا تھی، متعلق سوچنے لگا۔ پھر اس کے ذہن میں ان ظالموں کا، جن کے پنجے سے اس نے مظلوموں کو رہائی دلانا تھی، خیال آنے لگا۔ اتالیق نے جو تین صد گنوائے تھے، ان میں سے یہ آخری، جو بنی نوع انسان کی بھلائی کے متعلق تھا، اسے خاص طور پر پرکشش نظر آیا۔ اگرچہ اس واقعے راز نے، جس کا ذکر اتالیق نے کیا تھا، اس کے جذبہ رنجش کو ابھار دیا تھا، لیکن وہ سے اہم نظر نہ آیا۔ لیکن جہاں تک دوسرے مقصد، اصلاح قلب اور تزکیہ نفس۔ کا تعلق تھا، اس میں اس کی دلچسپی برائے نام تھی کیونکہ اس وقت وہ یہ سوچ سوچ کر نہال ہو رہا تھا کہ وہ سابقہ برائیوں سے پوری طرح صحت یاب ہو چکا ہے اور اب صرف نیک افعال کے لیے کمر بستہ ہے۔

آدھ گھنٹہ بعد اتالیق واپس آگیا تا کہ وہ طاسب کو ان حسنت ہفت سے، جو ہیکل سلیمانی کے سات تہ بچوں سے تھابت رکھتی تھیں اور جن کی ہر فری میسن کو اپنے اندر سمو کرنا چاہیے تھا، آگاہ کر سکے حسنت ہفت یہ تھیں 1- حرم و احتیاط (جماعت کے رازوں کی حفاظت کرنا) 2- جماعت کے اعلیٰ طبقوں کی اطاعت 3- اخلاقیات 4- بنی نوع انسان کی محبت 5- شجاعت 6- سخاوت 7- خُپ مرگ۔

”جہاں تک ان میں سے ساتویں کا تعلق ہے،“ اتالیق نے کہا، ”سوت کے بارے میں بار بار غور و فکر کرو اور اس کے متعلق یوں سوچو کہ یہ تمہاری دشمن نہیں، بلکہ دوست ہے۔ یہ اس زندگی سے جو رنج و غم سے سمور ہے، روح کو، جو ریشگی کی مشقتیں بھگت کر رہا حال ہو چکی ہے، رستگاری دہانی ہے اور اسے جزا اور امن و سکون کے راستے پر ڈال دیتی ہے۔“

”ہاں، ہونا بھی بالکل بھی چاہیے،“ میٹر نے سوچا۔ اتالیق اپنی گفتگو ختم کر چکا اور باہر جا چکا تھا تا کہ وہ تہائی میں غور و فکر کر سکے۔ ”لیکن میں ابھی تک اتنا کمزور ہوں کہ مجھے اپنی زندگی سے، جس کا مفہوم اب مجھ پر ہندو ج متکشف ہو رہا ہے، پیار ہے۔“ لیکن جہاں تک پانچ دوسری حسنتات۔ شجاعت، سخاوت، اخلاقیات، بنی نوع

انسان کی محبت اور سب سے بڑھ کر طاعت۔ کا، جنھیں بیئر نے اپنی انگلیوں پر گن کر یاد کیا، تعلق تھا، اسے اپنے قلب و روح میں پہلے ہی جاری و ساری محسوس ہوئیں۔ بہت سب سے آخری۔ الطاعت۔ اس کے نزدیک اتنی حسہ نہیں تھی جتنی کہ مسرت (اسے یہ محسوس کر کے قلبی مسرت ہو رہی تھی کہ اب وہ امن، فی نہیں کر پائے گا بلکہ وہ ان لوگوں کے، جو ہر قسم کے شکوک سے پاک صداقت کے امین تھے، سامنے تسلیم ختم کر دے گا)۔

راگنی حسہ، ہفتیم، وہ اسے بھول چکا تھا اور کوشش کے باوجود یاد نہ کر سکا۔

تیسری مرتبہ اتالیق جلدی واپس آگیا اور بیئر سے دریافت کرنے لگا ”کیا تم اب بھی اپنے عزم میں پختہ ہو اور وہ سب کچھ کرنے کے لیے تیار ہو جس کا تم سے مطالبہ کیا جائے گا؟“

”ہیں سب کچھ کرنے کے لیے تیار ہوں،“ بیئر نے کہا۔

”میں تمھیں مزید مطلع کر دوں،“ اتالیق نے کہا، ”کہ ہماری جماعت محض الفاظ ہی کے ذریعے اپنے نظریات کی تدریس نہیں کرتی بلکہ دوسرے ذرائع بھی استعمال کرتی ہے۔ محض لفظی تدریس کی نسبت یہ ذرائع حکمت اور نیکی کے قلعے حاسب پر عائد کیا زیادہ پرزور طریق سے اثر انداز ہوتے ہیں۔ اگر تمھارا قلب مصفاً قلعے ہے، تو اس کمرے و اس کمرے میں موجود تمام اشیائے، جو تمھیں نظر رہی ہیں، تم پر پہلے ہی اتنا کچھ واضح کر دیا ہوگا جس کا بلاغ الفاظ کے ذریعے ممکن نہیں، اور عین ممکن ہے کہ جماعت میں باضابطہ شرکت کی کارروائی کے دوران میں تمھیں ان سے ملتے جلتے آگہی کے طریقوں سے واسطہ پڑے۔ ہماری جماعت قدیم ترین معاشروں کے، جنھوں نے اپنی تعلیمات تصویر کی تحریروں کے ذریعے اجاگر کیں، نقش قدم پر چلتی ہے۔ تصویر کی تحریر“ اتالیق نے بیان کیا، ”ایک ایک حیر کا، جس کی حواس کے ذریعے پہچان ممکن نہیں لیکن جو ایسی خوبیوں سے جو صامت سے ملتی جلتی ہوتی ہیں بہرہ ور ہوتی ہے، نشان ہوتی ہے۔“

تصویری تحریر کی ہوتی ہے، بیئر اس سے بخوبی آگاہ تھا، تاہم اس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ خود کوئی بات کہہ سکے۔ وہ چپ چاپ اتالیق کی گفتگو مسترد نہ کیا۔ اتالیق جو کچھ کہہ رہا تھا، اس سے بیئر کو محسوس ہو رہا تھا کہ اس کی آزمائش کی گھڑی آ پہنچی ہے۔

”اگر تم تہیہ کر چکے ہو، پھر مجھے جماعت میں تمھاری باضابطہ شرکت کی کارروائی کا آغاز کر دینا چاہیے،“ اتالیق نے بیئر کے قریب آ کر کہا۔ ”سفاوت کی نشانی کے طور پر تم اپنی تمام قیمتی اشیائے میرے سپرد کر دو، یہ میرا مطالبہ ہے۔“

”لیکن یہاں تو میرے پاس کچھ بھی نہیں۔“ اس نے یہ فرض کر لیا تھا کہ اس کے پاس جو دھن دولت تھی، اسے اس سے دست بردار ہونے کے لیے کہا جا رہا ہے۔

”تمھارے پاس جو کچھ بھی ہے، گھڑی، ہر قم، مانگوٹھیاں۔“

بیئر نے ہلکتا اپنا ہوا اور جیسی گھڑی نکالی لیکن اس کی فریب انگلی پر جو مچکئی کی جھلکی تھی، اسے اتارنے کی کوشش میں اسے خاصا وقت صرف کرنا پڑا۔ جب یہ کام پایہ تکمیل تک پہنچ گیا، بیئر نے کہا۔

”اطاعت کی نشانی کے طور پر میں تم سے یہ کہوں گا کہ اپنے کپڑے اتار دو۔“

بیٹر نے اطاعت کی ہدایت کے مطابق اپنا کوٹ، واسکٹ اور بایاں بوٹ اتار دیا۔، تالیق نے اس کے سینے سے بائیں جانب سے اس کی قمیص سرکائی، نیچے جھکا اور اس کی پتلون کی بائیں ٹانگ گھٹنے سے اوپر تک کھینچ لی۔ بیٹر جلدی جلدی اپنا دایاں بوٹ بھی اتارنے لگا اور وہ اپنی پتلون کی دوسری ٹانگ بھی خود ہی اوپرٹانگنے کا ارادہ کر رہا تھا تاکہ اجنبی کو کسی قسم کا تردد نہ کرنا پڑے۔ لیکس میسن نے اسے بتادیا کہ اس کی ضرورت نہیں ہے اور اس نے بائیں پاؤں میں پہننے کے لیے ایک سلیپر اسے تھما دیا۔ پتی خواہش کے علی لرغم بیٹر کے چہرے پر کچھ اس قسم کے آثار ہونا ہو گئے جیسے وہ اندر ہی اندر شرمسار ہو رہا ہو، بددھما میں پڑا ہوا اور اپنی ذات کا خود ہی تسخراڑ رہا ہو۔ اس کے ہوں پر بچوں کی معصوم مسکراہٹ تھی اور وہ اپنے برادر تالیق کے سامنے یوں کھڑا تھا کہ اس کے بازو اس کے پیلوؤں کے ساتھ لٹک رہے تھے، اس کے پاؤں ایک دوسرے سے خاصے، لگ تھلگ فرش پر گڑے تھے اور وہ اس کے مزید احکام کا انتظار کر رہا تھا۔

”اور آخر الامر، میں یہ کہوں گا کہ اگر تم واقعی مخلص ہو، پھر اس کی نشانی کے طور پر مجھے یہ بتاؤ کہ تمہاری سب سے زیادہ کس چیز پر لپکتا ہے؟“ میسن نے کہا۔

”میرا جی سب سے زیادہ کس چیز پر لپکتا ہے؟، اسکی تو بے شمار چیزیں ہیں!“ بیٹر نے کہا۔

”صرف اس چیز کا نام نہ لوجو باقی تمام اشیاء کے مقابلے میں تمہیں کہیں زیادہ راہ راست سے بھٹکنے پر مجبور کرتی ہے؟“ میسن نے کہا۔

بیٹر نے توقف کیا۔ وہ جواب تلاش کر رہا تھا۔

”سے انگور؟ بسیار خوری؟ تن آسانی؟ آگ کسی؟ تنک مزاجی؟ غصیلہ پن؟ عورت؟“ وہ ایک ایک کر کے پٹی کزوریوں کا شمار کرنے اور انھیں ذہن میں تو سننے لگا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ ان میں سے کس کو دیت دے۔

”عورت؟“ اس نے زیر لب کہا۔ اس کی آواز بمشکل سنائی دے رہی تھی۔

اس جواب کے خاصی دیر بعد تک میسن نے نہ تو کوئی حرکت کی اور نہ وہ منہ سے کچھ گویا ہو۔ آخر کار وہ بیٹر کی جانب بڑھا، میز پر جو دو مال پڑا تھا، اس نے سے اٹھ دیا اور دوبارہ اس کی آنکھوں پر باندھ دیا۔

”میں آخری بار تم سے کہتا ہوں، اپنا پوری طرح محاسبہ کرو، اپنے حواس کو لگام دو، اپنی فرحت اپنی نفسانی خواہشات میں نہیں بلکہ، اپنے قلب میں تلاش کرو۔ ہماری فرحت کا منبع ہمارے خارج میں نہیں بلکہ ہمارے باطن میں ہے۔“

بیٹر فرحت کا یہ تاریکی بخش منبع مدتوں پہلے ہی اپنے اندر محسوس کر چکا تھا اور اب اس کا سرور پوری طرح اس کے حواس پر چھانے لگا۔

اس کے کچھ ہی دیر بعد تاریک کمرے میں اتالیق نہیں بلکہ اس کا سفارش کنندہ دلار کی داخل ہو۔ پیٹر نے اسے اس کی آواز سے پہچانا تھا اور وہ اسے سینے آیا تھا۔ دلار کی نے اس سے اس کے عزم کی پختگی کے بارے میں از سرنو پوچھ چکھی۔ جواب میں پیٹر نے کہا:

”جی ہاں، جی ہاں، میں رضا مند ہوں۔“

اور وہ آگے بڑھا۔ اس کے چہرے پر بچوں کی سی معصوم اور روشن دماغیہ مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ اس کے ایک ہڈ میں بوٹ اور دوسرے میں سیپر تھا اور یوں اس کی چال میں ایک قسم کی نامموری اور جھجک آگئی تھی۔ ادھر دلار کی نے اس کے گھرے بھرے اور غریاں سینے پر ہر ہند شمشیر نکالی ہوئی تھی۔ اسے کمرے سے باہر لایا گیا اور کبھی وہیں اور کبھی بائیں جانب مختلف غلام گردشوں میں گھمانے پھرانے کے بعد پلہ خول راج کے دروازوں پر پہنچا دیا گیا۔ دلار کی کھٹکتا رہا۔ اس کے جواب میں میسوں کے موگرے کھرائے گئے اور اس کے سامنے دروازے کھول دیے گئے۔ ایک کھٹک دار آواز نے (پیٹر کی آنکھوں پر ابھی تک پنی بدھی ہوئی تھی) اس سے پوچھا: ”تم کون ہو؟“ کہاں اور کب پیدا ہوئے؟“ وغیرہ وغیرہ۔ وہاں سے وہ اسے کسی اور طرف لے چلے۔ اس کی آنکھوں سے ابھی تک پنی نہیں اتاری گئی تھی اور جب وہ چل رہا تھا، وہ اس کی ”یا ترا“ کے دوران میں پیش آنے والی مشقتوں، مقدس روشنی، کائنات کے اردی سمرا، اور اس حوصے کا جس کے ساتھ اس نے اپنی تمام مشقتوں اور خطروں کو برداشت کرنا تھا، بیان تمثیلی حکایتوں کے ذریعے کرتے رہے۔ اس ”یا ترا“ کے دوران میں پیٹر کو احساس ہوا کہ کبھی اسے ”طالب“، کبھی ”بلا کش“ اور کبھی ”امیدوار“ کہا گیا اور ہر خطاب پر موگروں اور شمشیروں کے ساتھ مختلف قسم کی اصوات پیرا کی جاتی رہیں۔ جب اسے کسی شے کی جانب لے جا یا جا رہا تھا، اسے معلوم تھا کہ اس کے رہبروں پر ہنگامہ اور بوکھلاہٹ کی کیفیت طاری ہے۔ اس کے ارد گرد جن لوگوں کا ہجوم تھا، وہ اسے ایک دوسرے کے ساتھ سرگوشیوں میں بکھرا کرتے سنائی دیے اور ان میں سے ایک شخص اصرار کر رہا تھا کہ اسے ایک خاص قالین پر سے گزرا جائے۔ اس کے بعد انھوں نے اس کا دایاں ہاتھ پکڑا، اسے کسی چیز پر رکھا اور اس کے ساتھ ہی اسے حکم دیا کہ وہ اپنے دوسرے ہاتھ سے اپنے بائیں سینے پر کار رکھے اور جو شخص جماعت کے قوانین کے ساتھ وفاداری کے الفاظ کہہ رہا ہے، اس کی معیت میں انھیں دہراتا جائے۔ اس کے بعد موسیٰ شمعیں بجھا دی گئیں اور سپرٹ کا دیا روشن کر دیا گیا۔ پیٹر نے اسے اس کی بوت سے پہچانا۔ اسے بتایا گیا کہ اب وہ جو روشنی دیکھے گا، وہ کم تر ہوگی۔ اس کی آنکھوں سے پنی تاریکی گئی اور چلتی سپرٹ کی روشنی میں پیٹر کو اپنے سامنے متعدد اشخاص یوں کھڑے نظر آئے جیسے وہ خوب دیکھ رہا ہو۔ اتالیق کی طرح ان اشخاص کے اجسام پر ایپرن اور ہاتھوں میں تلواریں تھیں۔ ان تلواریں کا رخ اس کے سینے کی جانب تھا۔ اس لوگوں کے ہچ ایک شخص، جس کی سفید قمیص بھوسے داغ دار تھی، کھڑا تھا۔ یہ منظر دیکھ کر

ہیئر نے اپنا سینہ تلواروں کی جانب بڑھایا اور خود آگے چل پڑا۔ اس سے اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ چاہیں تو اس کی چھاتی چھلنی کر دیں۔ لیکن تلواریں واپس کھینچ لی گئیں اور پلک جھپکنے میں اس کی آنکھوں کی پٹی دو، رو یا بندھ دی گئی۔

”اب تم کم تر روشنی دیکھ چکے ہو،“ ایک آواز نے کہا۔

تب موی شمعیں دوبارہ روشن کر دی گئیں اور اسے بتایا گیا کہ اب وہ پوری روشنی دیکھ سکے گا۔ ایک بار پھر اس کی آنکھوں سے پٹی اتار دی گئی اور یک درجن سے زیادہ آوازوں نے بیک وقت کہا: 'Sic transit gloria mundi'۔

ہیئر بتدریج دوبارہ اپنے آپ میں آنے لگا۔ اس نے کمرے میں چاروں اطراف نگاہیں دوڑائیں اور اس میں موجود لوگوں کو دیکھا۔ ایک طویل کشادہ میز کے، جس پر سیاہ میز پوش بچھا تھا، ارد گرد تقریباً بارہ اشخاص بیٹھے تھے۔ دو وہی بابوسات، جو وہ پہلے ہی دیکھ چکا تھا، پہنے ہوئے تھے۔ ان میں سے بعض کے ساتھ اس کی ہیئر بزرگ کے اعلیٰ طبقوں کی محفوں میں ملاقات ہو چکی تھی۔ کرسی صدارت پر ایک نوجوان شخص متمکن تھا۔ اس کے گلے میں عجیب و غریب قسم کی، نخیل حائل تھی۔ ہیئر سے نہیں جانتا تھا۔ اس کی دائیں جانب اطالوی صدر راہب، جس سے دو سال قبل ہیئر کی آنتا پاؤ لوونا کے ہاں ملاقات ہوئی تھی، بیٹھا تھا۔ دوسرے لوگوں میں ایک اہم شخصیت تھی اور یک سوستانی ٹیونر بھی، جو کوراگنوں کے ہاں ہوتا تھا، موجود تھا۔ سبھی خاموش تھے اور ان کے چہروں پر بخمدگی اور محنت جھلک رہی تھی۔ وہ نہایت توجہ اور انشہاک کے ساتھ صدر کی، جس کے ہاتھ میں موگراتھا، گفتگو سن رہے تھے۔ دیوار کے طاق میں ستارہ نما شمع نصب تھی۔ میز کے ایک جانب ایک چھوٹا غالیچہ، جس میں رنگارنگ تصاویر باندھے تھیں، اور دوسری جانب مائدہ مقدسہ، جس پر اناجیل اربعہ اور ایک کھوپڑی رکھی ہوئی تھی، پڑی تھی۔ میز کے ارد گرد بالکل اسی قسم کے، جیسے کہ کلیساؤں میں استعمال ہوتے ہیں، سات بھاری بھر کم شمع دان ایستادہ تھے۔ دو برادران ہیئر کو مائدہ مقدسہ کے قریب بے گئے۔ انھوں نے اس کے پاؤں زاویہ قائمہ پر ٹکائے، اور اسے یہ بتاتے ہوئے کہ اسے بیکل کے صدر دروازوں کے سامنے سجدہ کرنا ہو جانا چاہیے، اسے نیچے بیٹھنے کا حکم دیا۔

”اسے سب سے پہلے کرنی ملنا چاہیے،“ ایک برادر نے سرکوشیوں میں کہا۔

”جناب، ذرا خاموش رہیں،“ دوسرے نے کہا۔

ہیئر بوکھلا گیا۔ اس نے حکم کی تعمیل کیے بغیر اپنی چندھی آنکھوں سے چاروں اطراف دیکھا اور ایک ایک اس کے دل میں شکوک و شبہات نے گھر کر لیا۔ ”میں کہاں ہوں؟ میں کیا کر رہا ہوں؟ کیا یہ میرا مذاق اڑا رہے ہیں؟ جب مجھے یہ باتیں یاد آیا کریں گی، مجھے شرمندگی تو محسوس نہیں ہوا کرے گی؟“ لیکن یہ شکوک و شبہات صرف

* دنیوی جاہ و حشمت پر نگی انجام پڑ رہی ہے۔

** معماروں کا دوزخ، جس سے گارا بچھاتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ فری مسوں کا ایک فرض بیکل سلیبی کی تعمیر ہے اور یہ دوزخ اس کی

علامت ہے۔

گھڑی کے گھڑی رہے۔ اپنے گرد پیش سنجیدہ شکلیں دیکھتے اور جن مراحل میں سے وہ اب تک گزرا تھا، انھیں یاد کرتے اسے احساس ہوا کہ اب وہ یہ کام ادھورا چھوڑ کر نہیں جاسکتا۔ وہ اپنی انچکی ہٹ پر ٹپٹا گیا اور اپنی لگن کے ساتھ جذبے کو بیدار کرنے کی کوشش میں نیکل کے صدر دروازوں کے سامنے سجدہ ریز ہو گیا اور واقعی عبودیت کے یہ جذبات دوبارہ اور پہلے کی نسبت کہیں زیادہ پر زور بن کر اُڑ آئے۔ وہ کچھ دیر یونہی سجدہ ریز رہا، پھر اسے اٹھنے کا حکم دیا گیا اور اسی قسم کا سفید چرمی ایپرن، جیسا کہ دوسروں نے پہنا ہوا تھا، اسے اوڑھادیا گیا۔ ایک کرنی اور دستانوں کے تین جوڑے اسے تھادے گئے اور گریڈڈ سٹراس سے نئی طب ہوا۔ ”اس ایپرن کی پیدہ کی کبھی داغ در نہ ہونے دینا، اس نے کہا، ”یہ پیدہی قوت اور پاکیزگی کی علامت ہے۔“ پھر اس نے پراسرار کرنی کی وضاحت کرتے ہوئے کہا: ”تمہیں اس کی مدد سے دل کی سیانی کھرچنا ہوگی اور ضبط و تحمل سے کام لے کر ہرادر انسانوں کے قلوب کی سونہیں دور کرنا ہوں گی۔ جہاں تک دستانوں کی پہلی جوڑی کا تعلق ہے، یہ مردانہ دستانے ہیں، تمہیں ان کی اہمیت کے بارے میں کچھ نہیں بتایا جائے گا لیکن تمہیں انہیں اپنے کپچے سے لگا کر رکھنا ہوگا۔ دوسری جوڑی بھی مردانہ ہے۔ انہیں تم راج کی مجالس میں پہنا کر دے۔“ دستوں کی تیسری جوڑی زنانہ تھی۔ ان کے متعلق اس نے کہا۔

”برادر عزیز، یہ زنانہ دستانے بھی تمہارے ہی لیے ہیں۔ انہیں اس خاتون کی، جس کی تم باقی خواتین سے زیادہ عزت کرو گے، خدمت میں پیش کرنا۔ اس تحفے کے ذریعے تم اسے، جسے تم میسنری کے کاموں میں اپنی رفیق بنانے کے مستحق سمجھو گے، یہ پیاں دے سکو گے کہ اس کے بارے میں تمہارا دل صاف ہے اور اس میں کوئی کھوٹ نہیں۔“ اس نے کچھ دیر توقف کیا اور پھر بولا: ”برادر، اس بات کا خیال رکھنا کہ یہ دستانے کبھی ناپاک ہاتھوں کی زینت نہ بنے پائیں۔“

میٹر کو محسوس ہوا کہ گریڈڈ ماسٹر جب یہ آخری کلمات کہہ رہا تھا، وہ کچھ گھبرا اور شرمارہا تھا۔ خود میٹر پر پہلے کی نسبت کہیں زیادہ گھبراہٹ اور شرم ساری طاری ہو گئی۔ وہ بچوں کی طرح شرمارہا تھا اور اس کی آنکھیں تریب قریب ڈبڈبائے لگیں۔ وہ بے قراری سے ادھر ادھر دیکھ رہا تھا اور محفل پر بے ڈھب سی خاموشی چھا گئی۔

بالآخر ایک برادر نے مہر سکوت توڑی۔ وہ میٹر کو غائبے کے تریب لے گیا۔ وہاں ایک مسودہ، جس کے اندر مختلف اقسام کی شیاں۔ سورج، چاند، تھوڑی، ساقول، کرنی، ایک بے ڈھنگے انداز سے تراشیدہ پتھر اور ایک مکھی پتھر، ستوں، اور تین در پتھوں وغیرہ۔ کی تصاویر منقوش تھی، پڑا تھا۔ وہ مسودے میں سے ان تمام اشیا کی تشریح و تعبیر کی خواندگی کرنے لگا۔ اس کے بعد میٹر کے لیے جگہ متعین کر دی گئی۔ اسے راج کی نشانیاں دکھائی گئیں، اسے پاس ورڈ (شناخت کا خفیہ نمونہ) بتایا گیا اور آخر کار اسے جیشنے کی اجازت دے دی گئی۔ گریڈڈ ماسٹر نے قوانین و ضوابط پڑھنا شروع کر دیے۔ یہ بہت طویل تھے۔ میٹر پر شادمانی، گھبراہٹ اور شرم ساری کے ملے جلے جذبات طاری تھے۔ اس لیے جو کچھ پڑھا جا رہا تھا، وہ اس کیفیت میں نہیں تھا کہ اسے پوری طرح سمجھ سکے، وہ قوانین کے صرف آخری الفاظ پر

مسعودوں کا آلہ، جس سے دیوار کی سیدھ معلوم کی جاتی ہے چنناں، فلک، سائل۔

صحیح معنوں میں توجہ دے سکا اور یہ اس کے حافظے پر نقش ہو گئے۔

”ہمارے ہیکلوں کا یہ دستور ہے،“ گرینڈ ماسٹر نے پڑھا، ”کہ ہم یہاں صرف نیکی اور بری کے مابین امتیاز برتتے ہیں، اس کے علاوہ ہم اور کسی قسم کے امتیاز کے قائل نہیں۔ اس قسم کے تمام امتیازات، جو مساوات کی حدود پھیلاؤنگ جائیں، برتنے سے احتراز کرو۔ جو برابر، خواہ وہ کوئی ہو، مصیبت میں گرفتار ہو، اس کی مدد کے لیے لپکو، جو راہ راست سے بھٹک جائے، اسے سمجھاؤ، جو تعزذلت میں گر پڑے، اس کا ہاتھ تھام لو، کسی برابر کے لیے دل میں کینہ، بغض یا عناد نہ پالو۔ شفقت اور شائستگی کو اپنا شعار بناؤ۔ سب دلوں میں نیکی کی جوت جلاؤ۔ پڑوسیوں کو بچی خوشیوں میں شریک کرو اور خدا کرے کہ اس نعمت کی پاکیزگی کبھی حسد کے گدے لے پانی سے داغ دار نہ ہو۔

”اپنے دشمن کو معاف کر دو۔ اس کے ساتھ بھلائی کرو، اس کے علاوہ اس سے اور کوئی انتقام نہ لو۔ اعلیٰ ترین قانون کی اس طریقے سے تعمیل کر کے تم اس قدیم عز و وقار کا، جس سے تم محروم ہو چکے ہو، کھوج لگا سکو گے۔ گرینڈ ماسٹر نے اپنا بیان ختم کیا۔ وہ اٹھا، میئر سے بغل گیر ہوا اور اس نے اس کا منہ چوم لیا۔

میئر نے اپنے گرد و پیش نظریں دوڑائیں۔ اس کی آنکھوں میں مسرت و شدائی کے آنسو تیر رہے تھے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس کے وقف کار، جنہوں نے اس کے ارد گرد جھگھٹا کر رکھا تھا، اسے جو تہنیں اور مبارک بادیاں پیش کر رہے تھے، وہ ان کا کیسے جواب دے۔ وہ انھیں واقف کار تسلیم نہیں کر رہا تھا! اس کے نزدیک وہ سب اس کے برابر تھے اور وہ ان کی محبت میں کام کرنے کے لیے بہت بے قرار تھا۔

گرینڈ ماسٹر نے اپنا موگرا میز پر مارا اور سب لوگ اپنی اپنی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ ان میں سے ایک افواہ عجز و انکسار کی ضرورت کے بارے میں اپدیش پڑھنے لگا۔

گرینڈ ماسٹر نے تجویز پیش کی کہ اب آخری فریضہ ادا ہو جانا چاہیے اور اہم شخصیت، جس کے پاس ’دان بنور‘ کا عہدہ تھا، باری باری سب برادران کے پاس گیا۔ میئر کے پاس جو کچھ تھا، اس کا جی چاہتا تھا، وہ سب چندے میں دے دے لیکن اسے اندیشہ تھا کہ کہیں اسے منکیر نہ سمجھ لیا جائے، چنانچہ اس نے بھی اتنی ہی رقم، جتنی کہ دوسروں نے لکھی تھی، لکھ دی۔

اجلاس ختم ہو گیا اور جب میئر گھر پہنچا، اسے محسوس ہوا کہ وہ ایک ایسے سفر سے، جس کا دورانیہ درجنوں برسوں پر محیط تھا واپس آیا ہے، اس کی بالکل گایا کھپ ہو چکی ہے اور وہ اپنی سابقہ عادات و طوار کو کہیں پہچنے چھوڑ آیا ہے۔

لاح میں داخلہ حاصل کرنے کے اگلے روز میئر گھر بیٹھا کتاب پڑھ رہا تھا اور وہ مربع (Square) کی، جس کا ایک کنارہ خدا، دوسرا عالم، خلق، تیسرا عالم خاکی اور چوتھا ان سب کے مجموعے کی علامت تھا، اہمیت سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وقتاً فوقتاً وہ کتاب نیچے رکھ دیتا اور اپنے تخیل میں زندگی کا نیا منصوبہ ترتیب دے لگتا۔ گزشتہ شام لاج

میں اسے بتایا گیا تھا کہ اس کی ڈویژن کی افواہ زار تک پہنچ چکی ہے اور اس کے لیے مناسب یہی رہے گا کہ وہ کچھ مدت کے لیے پیئر برگ سے کہیں باہر چلا جائے۔ میئر نے تجویز پیش کی کہ وہ جنوب میں واقع اپنی جاگیر پر چلا جائے گا اور وہاں اپنی زرعی غلامیوں کی بہبود کے لیے کام کرے گا۔ وہ اپنی نئی زندگی کو کچھ اسی منہج پر استوار کرنے کے منصوبے باندھ رہا اور جی جی میں بہت خوش ہو رہا تھا کہ غیر متوقع طور پر پرنس واسیلی کمرے میں داخل ہوا۔

”امی ڈیئر فیلو، یہ تم ماسکو میں کیا گل کھ کر آئے ہو؟“ *mon cher* یہ تم نے ایلینا سے جھگڑا کیوں کیا ہے؟ تم ضرور کسی غلط فہمی کا شکار ہو گئے ہو،“ پرنس واسیلی نے کمرے میں داخل ہوئے پر کہا۔ ”مجھے اس بارے میں سب کچھ معلوم ہے اور میں پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ ہیلین تمہارے حضور بالکل اسی طرح معصوم اور منزہ عن اخطا ہے جس طرح یہودیوں کے سامنے حضرت عیسیٰ تھے۔“

میئر نے جواب میں کچھ کہنا چاہا لیکن پرنس واسیلی بھانپ گیا کہ وہ کیا کہنا چاہتا ہے اور اس نے اسے بچ ہی میں لوگ دیا۔

”تم دوست کی طرح سیدھے میرے پاس کیوں نہ آئے؟“ مجھے اس بارے میں سب کچھ معلوم ہے، میں سب کچھ سمجھتا ہوں،“ اس نے کہا۔ ”تمہارا رویہ بالکل اس شخص کے، جسے اپنی عزت کا پاس ہو، شاید شان تھا۔ مابا تم نے ذرا عجلت پسندی کا مظاہرہ کیا لیکن ہم اس سلسلے میں مغز کھپائی نہیں کریں گے۔ تاہم تمہیں ایک بات پر توجہ دینا ہوگی اور وہ بات یہ ہے کہ ذرا سوچو کہ تم (بچے اس رویے سے) میری اور اس کی معاشرے بلکہ دربار کی نگاہوں میں کیا گت بنا رہے ہو،“ اس نے اپنی آواز مدھم کرتے ہوئے مزید کہا۔ ”وہ ماسکو میں دن گزار رہی ہے اور تم یہاں پڑے ہو۔ عزیزم، اب جانے دو، کافی ہو گئی ہے،“ اس نے میئر کو بازو سے گھسیٹ کر اپنے پاس بٹھاتے ہوئے کہا۔ ”(تم دونوں کے مابین جو کچھ ہوا ہے) وہ سراسر غلط فہمی کی پیداوار ہے۔ مجھے یقین ہے کہ تم خود بھی محسوس کرتے ہو گے۔ آؤ، ہم ابھی لجل کر اسے خد تحریر کیے دیتے ہیں، وہ یہاں آجائے گی۔ ہر بات آئینے کی طرح صاف روشن ہو جائے گی اور سب یہ وہ گویوں کا خاتمہ ہو جائے گا۔ ورنہ میرے عزیز، میں تمہیں بتائے دیتا ہوں کہ تمہیں اس کا خبیثہ بھگتنا پڑے گا۔“

پرنس واسیلی نے میئر کو معنی خیز نگاہوں سے دیکھا۔

”مجھے صدقہ ذرا فتح سے معلوم ہوا ہے کہ، دراپر اطور اس سارے معاملے میں گہری دلچسپی لے رہی ہیں۔ تم جانتے ہو کہ وہ ہیلین پر بہت مہربان ہیں۔“

میئر نے متعدد بار کچھ کہنے کی کوشش کی۔ لیکن ایک طرف تو پرنس واسیلی اسے کوئی موقع نہیں دے رہا تھا اور دوسرے خود میئر کو بھی یہ گوارا نہیں تھا کہ وہ کوئی ایسا لہجہ جس سے فیصلہ کن انکار اور اختلاف مترشح ہوتا ہو، اختیار کرے۔ حالانکہ وہ یہ سختہ تہیر کر چکا تھا کہ وہ اپنے سر کو اسی انداز سے جواب دے گا۔ مزید برآں فری میسن تحریک کا یہ فرمان

کہ ”شفقت اور شائستگی کو اپنا شعار بناؤ“ اس کے کانوں میں گونج رہا تھا۔ اس کی بھویں تن گئیں اور گال تھماتے لگے۔ وہ اپنی نشست سے اٹھ، در دو بارہ نیچے بیٹھ گیا۔ وہ وہ کام، جو اسے زندگی کا دشوار ترین کام۔ کسی شخص کے، خواہ وہ کوئی ہی کیوں نہ ہو، منہ پر کچھ کہنا، اسے کوئی ایسی بات سنانا جس کا اسے سان گمان بھی نہ ہو۔ معلوم ہوتا تھا، کرے کی سعی کر رہا تھا۔ پرنس واسیلی کا بات کرے اور حکم چلانے کا جو پر اعتماد، ور لا پرواہانہ انداز تھا، وہ اس سے آگے سرسبز کرنے کا اتنا عادی ہو چکا تھا کہ اسے یہ احساس ستانے لگا کہ اب بھی اس میں اتنی اہمیت نہیں کہ وہ اس کی عزت کر سکے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اسے یہ بھی محسوس ہو رہا تھا کہ جو کچھ وہ اب کہے گا اسی پر اس کے سامنے مستقبل کا دروازہ ہوگا۔ اس سے یہ طے پا جائے گا کہ آیا وہ اپنی گزشتہ روش پر گامزن رہے گا یا نیا راستہ، جس کی میسوں نے اس کے سامنے دلکش اور دل آویز تصویر کشی کی تھی اور جس کے متعلق اسے پکا یقین تھا کہ وہ اس پر چل کر حیات نو پالے گا، ترائے گا۔

”عزیزم، چلو، جانے دو“ پرنس واسیلی نے دس لگی کے انداز سے کہا۔ ”صرف ہاں“ کہہ دو۔ اسے میں خود خط لکھ دوں گا۔ پھر ہم سوٹا تازہ پچھڑاؤں کریں گے۔“

لیکن پھر اس کے کہ پرنس واسیلی اپنی مسخرگی کو انجام تک پہنچاتا، پیڑنے س کی جانب دیکھ بغیر اور اپنے چہرے پر شدید خفگی کے آثار پیدا کرتے، جنہوں نے اس کے باپ کی یاد تازہ کر دی، ایسی آواز سے جو گرگنی سے ملتی جلتی تھی، ہکلا کر کہا:

”پرنس، میں نے آپ کو یہاں نہیں بدیا تھا۔ آپ تشریف لے جائیں، برے مہربانی تشریف لے جائیں!“ اور اس نے اپنی نشست سے جست لگائی اور لپک کر دروازہ کھول دیا۔ ”تشریف لے جائیں!“ اس نے دہرایا۔ جو کچھ وہ کہہ رہا تھا، اس پر خود اسے بھی اچھنبا ہو رہا تھا لیکن پرنس واسیلی کے چہرے پر جو ہکلاہٹ اور دہشت نظر آرہی تھی، وہ اس پر محظوظ بھی ہو رہا تھا۔

”کیا بات ہے؟ تم بیمار تو نہیں؟“

”تشریف لے جائیں،“ تہدید آمیز آواز پھر دہاڑی۔

اور پرنس واسیلی کو جاتے ہی بنی۔ اسے اس سلوک کی کوئی توجیہ نہ ملی۔

اس کے ایک ہفتہ بعد پیڑنے اپنے تئیں دوستوں، میسوں، کو خیراتی مقاصد کے لیے خاصی بڑی رقم تھائی، ان سے اجازت چاہی اور اپنی جاکیر کی سمت عزم سفر ہو گیا۔ اس کے تازہ ہر اور ان نے اسے کیف اور اوڈی کے میسوں کے نام خطوط دیے اور اس سے وعدہ کیا کہ وہ اسے خطوط لکھتے اور زندگی کی نئی سرگرمیوں کے بارے میں اس کی رہنمائی کرتے رہیں گے۔

"Petersbourg" شریک ہوتی تھی۔ اس کے، ستقبالیوں میں جو لوگ آتے تھے، وہ ان کے مابین اس طرح کھرے کھوٹے کی تیز تو رور کھتی ہی تھی لیکن اس سے بڑھ کر وہ ایک کام اور کرتی تھی: وہ اپنی ہر دولت میں اپنے مہمانوں کو کسی نئی اور دلچسپ شخصیت سے لازماً متعارف کرتی تھی اور یوں پیٹرز برگ کے اسمبل و رہا کی طبقے کا جو درست اور صحیح سیاسی پیمانہ یہاں پڑھنے کو ملتا تھا، کسی اور جگہ دستیاب نہیں ہو سکتا تھا۔

نیپولین نے چین اور اورسٹٹ کے مقامات پر پرشیا کی افواج کو جو عبرت ناک شکست دی تھی اور پڑشیا کے بیشتر قلعے جس طرح اس کے قبضے میں چلے گئے تھے، اس کی دل خراش تفصیلات 1806 کے اختتام تک رہیں میں موصول ہو چکی تھیں۔ وریں اٹا ہری افواج پرشیا میں داخل ہو چکی تھیں ورنپولین کے خلاف ہمارے دوسری مہم کا آغاز ہو چکا تھا۔ اسی زمانے میں آٹا پاولوونا نے اپنی ایک محفل کا اہتمام کیا۔ یہ محفل La creme de la veritable bonne societe یعنی یرکشش لیکن بدست ہمیں، جس کا شوہر اس سے کنارہ کشی کر چکا تھا، سوخت باغ، خوش باش، پولیت، جو حال ہی میں ویانا سے واپس آیا تھا، دو سفارت کاروں، معمر آٹلی، ایک نوجوان، جسے اس ڈرائنگ روم میں محض "گوناگون خریوں کا مالک شخص" (un homme de beaucoup de merite) کی حیثیت سے متعارف کرایا گیا، ایک خاتون، جو پچھلے دنوں لیڈی ان ریٹنگ مقرر ہوئی تھی، اس کی والدہ اور متعدد نسبتاً کم اہم شخصیات پر مشتمل تھی۔

آٹا پاولوونا اس موقع پر جس نئی نویلی ہستی کو پیش کر رہی تھی، وہ بورس درویتسکوئے تھا۔ وہ انھیں دنوں پرشیا کی افواج کا خاص پیغام لے کر آیا تھا اور ایک نہایت ہی اہم شخصیت کا ایڈی کاٹنگ تھا۔

اس مخصوص شام حاضرین کو جو مخصوص سیاسی پیمانہ نظر آیا، وہ یہ تھا: "یورپ کے با اختیار حکمران مجھے اور غولی طور پر ہمیں بھیجھلا ہٹ میں جتلا کرنے اور ذہنی اذیت پہنچانے کی خاطر بوانا پارٹ کی خواہ کتنی ہی حوصلہ افزائی کیوں نہ کریں، بوانا پارٹ کے بارے میں ہماری رائے میں کوئی تبدیلی نہیں آسکتی۔ اس موضوع کے متعلق ہمارے جو خیالات ہیں، ہم انھیں چھپائیں گے نہیں، بلکہ ان کا کھلم کھلا اظہار کرتے رہیں گے۔ جہاں تک پرشیا کے بادشاہ اور دوسرے لوگوں کا تعلق ہے، ہم صرف اتنا ہی کہہ سکتے ہیں، خدا تمہارا اس سے بھی زیادہ خانہ خراب کرے۔ تم نے جو بویا، اب وہ کاٹو۔" اس ہم بھی کہہ سکتے ہیں۔ "اس شام آٹا پاولوونا کی محفل کا سیاسی پیمانہ بھی کچھ ہی خاص ہو کر رہا تھا۔ جب بورس، جسے اس شام کا بہترین لقمہ بنا کر پیش کیا جانا تھا، ڈرائنگ روم میں داخل ہوا، تقریباً تمام مدعوین آچکے تھے اور گفتگو، جس کے تناظر آٹا پاولوونا ہمارے ہی تھے، آسٹریا کے ساتھ ہمارے سفارتی تعلقات اور اس کے ساتھ معاہدے کی توقع کے بارے میں ہو رہی تھی۔

بورس ایڈی کاٹنگ کی خوش وضع اور خوش قطع وردی میں بیوس تھا۔ اس کا چہرہ سرخ و سپید اور تروتازہ تھا اور اس

پیٹرز برگ کے صحیح معنوں میں اعلیٰ طبقے کے بہترین، شماس اور دانش ور طبقے کے پسندیدہ اصحاب

کی شکل صورت پر مردانگی کی چھاپ تھی۔ وہ فطری خود اعتمادی سے قدم اٹھاتا اندر آیا اور اسے حسب دستور معمر آنٹی کی خدمت میں پیش کیا گیا تاکہ وہ اسے سلام عرض کر سکے۔ اس کے بعد اسے عمومی حلقے میں واپس لایا گیا۔

آنا پادوونا نے پتا سوکھ سڑا اور جھریوں زدہ ہاتھ اسے تھما دیا تاکہ وہ اس پر بوسہ ثبت کر سکے۔ پھر وہ مختلف ہستیوں سے، جن سے وہ واقف نہیں تھا، اس کا تعارف کرانے لگی۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ اس کے کان میں ہر شخص کا عہدہ اور اس کے اوصاف بتاتی گئی۔

’پرنس پولیت کورگن۔ سحر انگیز شخصیت کا مالک، نوجوان، موسیو کراؤنگ۔ عظیم دانشور اور کپن ہیگن (ڈنمارک) کے ناظم الامور، موسیو شینوف، گوناگون خوبیوں کے مالک۔‘

کچھ بھگ دوڑ آنا میٹھی نیلوونا نے کی تھی اور کچھ بورس کی اپنی محتاط پسند طبیعت کے میمانات اور خصوصیات نے رنگ دکھایا تھا۔ ان سب باتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ ملازمت میں نہایت منفعت بخش مقام پر پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔ وہ ایک ممتاز اور عالی مرتبت شخص کا ایڈی کا ٹنگ مقرر ہو چکا تھا، اسے نہایت اہم مشن پر پرشیا بھیجا گیا تھا اور وہاں سے وہ ابھی ابھی، بلٹی کی حیثیت سے واپس آیا تھا۔ ملازمت کے غیر تحریری قواعد و ضوابط، جنہوں نے اول موس کے مقام پر اس کی نس نس میں خوشی کی لہر دوڑا دی تھی، وہ پوری طرح جذب کر چکا تھا۔ ان قواعد کی رو سے لیفٹیننٹ کو جرنیل کے مقابلے میں کہیں اونچا مقام حاصل ہو سکتا تھا۔ ملازمت میں کامیابی کے لیے جن اوصاف کی ضرورت پیش آ سکتی تھی، وہ محنت، جدوجہد، شجاعت یا ثابت قدمی نہیں بلکہ محض آپ کی بہ صلاحیت تھی کہ آپ ان لوگوں کے، جو انعام و کرام عطا کر سکتے اور ترقی و درجات بلند کرنے کی حیثیت میں تھے، نباہ کر سکتے ہیں یا نہیں۔ اسے جس تیز رفتاری سے پے در پے ترقیاں ملیں اور دوسروں کو ان امور کے سمجھنے میں جو ناکامی ہوئی، اس پر وہ خود اکثر متحیر ہوا کرتا تھا۔ اس دریافت کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے طرز حیات، اپنے پرانے دوستوں اور واقف کاروں سے تعلقات اور اپنے مستقبل کے بارے میں اس کے منصوبوں کی نوعیت یکسر تبدیل ہو گئی۔ وہ سیم وزر میں نہیں کھیلتا تھا اور نہ رد پیہ اس کے ہاتھ کی سیل تھا لیکن وہ دوسروں سے بہتر لباس پہننے کے لیے اپنی آخری کوڑی بھی خرچ کر دیتا۔ وہ پیٹ پر پتھر باندھ لیتا اور مانے کی بے شمار تقریحات سے منہ موڑ بیٹا لیکن وہ یہ کبھی گوارا نہ کرتا کہ وہ پیئرز برگ کے گلی کوچوں میں کسی فشنے گاڑی یا پھٹی پرانی وردی میں نظر آئے۔ وہ صرف ایسے لوگوں سے، جو مرتبے میں اس سے بلند تر تھے اور یوں اس کے کام آ سکتے تھے، تعلقات استوار کرنے کی کوشش کرتا۔ وہ پیئرز برگ پر جان چھڑکتا اور ماسکو سے گھن کھاتا تھا۔ دستوفوں کے گھرانے اور ناسا کے ساتھ، اپنی بچکانہ محبت سے اس کا دل بھر چکا تھا اور ان کی یاد اس کے لیے سواہن روح تھی۔ وہ جس روز فوج میں شمولیت اختیار کرنے کی غرض سے ماسکو سے روانہ ہو تھا، اس کے بعد وہ ان کے ہاں ایک بار بھی نہیں گیا تھا۔ آنا پادوونا کی محفل میں باریابی کو وہ اپنی ترقی کے لیے اہم قدم تصور کرتا تھا۔ وہ چونک وہاں پہنچا، وہ فی الفور تاڑ گیا کہ اس سے کس کردار کی توقع کی جا رہی ہے۔ چنانچہ اس نے مکس مور پر اپنے آپ کو اپنی میزبان کی تحویل میں دے دیا تاکہ وہ اپنے مہمانوں کی دلچسپی کی خاطر اسے جس قسم کے مصروف میں لانا

چاہے، لاسکے۔ لیکن جہاں تک اس کا اپنا تعلق تھا، وہ ایک ایک چہرے کا بغور مشاہدہ کرنے اور اس بات کا جائزہ لیے لگا کہ جو اشخاص وہاں موجود ہیں، ان میں سے ہر ایک کے ساتھ تعلقات قائم کرنے کے فوائد و مراعات کیا ہیں۔ اسے جس نشست کی طرف اشارہ کیا گیا، وہ حسین و جمیل ہیلین کے قریب تھی، وہ اس پر بیٹھ گیا اور عمومی گفتگو بغور سننے لگا۔

”مجورہ معاہدہ⁹ جن اساسات پر طے ہونا پایا ہے، دیا نا انھیں اتنا قابل حصول سمجھتا ہے کہ بے درپے زبردست اور شاندار فتوحات بھی حاصل ہو جائیں، پھر بھی انھیں اسکانات کے دائرے میں نہیں، یا جانے کا اور اسے یہ بھی شبہ ہے کہ انھیں پانے کے لیے ہمارے پاس کوئی وسائل موجود نہیں۔ یہ دیا نا وزارت کے اصل الفاظ ہیں، ڈنمارک کے ناظم الامور نے کہا۔

”ان کا یہ شک و شبہ ہمیں یہ تاثر دیتا ہے کہ ہم بہت مضبوط ہیں لیکن حقیقتاً شاید ایسا نہیں،“ عظیم دانشور¹⁰ نے گھٹنے پن سے مسکرا کر کہا۔

”ہمیں دیا نا وزارت اور امپراطور آسٹریا کے مابین حد فاصل کھینچنا ہوگا،“ موخت، رخ نے کہا۔ ”ہر امر آسٹریا کے رخ میں ایسی بات کبھی نہیں آسکتی۔ صرف وزارت ہی نے اس قسم کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔“

"Ah, mon cher vicomte" آنا پادلوونانے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔¹¹ "L'Urope" (پا نہیں اس نے Europe کی بجائے Urope کیوں کہا۔ شاید اس کا یہ خیال ہو کہ یہ فرانسیسی کا نسبتاً شستہ تلفظ ہے اور وہ فرانسیسی شخص سے گفتگو کے دوران میں اسے استعمال کر سکتی ہے۔)

"L'Urope ne sera jamais notre alliee sincere"

اس نے یہ کہا اور گفتگو کا رخ شاہ پرشیا کی جرأت اور استقامت کی طرف پھیر دیا۔ اس کا مقصد بورس کو شریک گفتگو کرنا تھا۔

بورس نہایت توجہ سے ہر شخص کی گفتگو سنتا اور اپنی باری کا انتظار کرتا رہا تھا۔ اس دوران میں وہ کبھی بھی حسین و جمیل ہیلین پر، جو اس کے قریب بیٹھی تھی، نگاہ ڈالتا رہا۔ خود ہیلین نے خوب رُونو جوان ایڈی کا نگ کی نگاہوں کا جواب متعدد مرتبہ مسکرا کر دیا۔

آنا پادلوونانے پرشیا کی پوزیشن کا ذکر کرتے ہوئے بالکل فطری انداز سے بورس سے درخواست کی کہ اس نے اپنے سفر گلوگاؤ کے دوران میں جو کچھ دیکھا اور پرشیا کی افواج کو جس حال میں پایا، اس کے بارے میں انھیں بتائے۔ بورس نے آمادگی کا اظہار کر دیا تاہم کسی قسم کے غیر ضروری اشتیاق یا جلد بازی کا مظاہرہ بھی نہ کیا۔ اس نے نکسالی اور شستہ فرانسیسی میں انھیں افواج اور دربار کے متعلق بے شمار دلچسپ باتیں سنائیں۔ تاہم دو جو حقائق

• ائی ڈیر کاؤنٹ۔

• "بورس ہمارا کبھی بھی مخلص اتحادی نہیں ہو سکتا۔"

ہجان کر ہاتھ، ان کے بارے میں اپنی کسی رائے کا اظہار کرنے سے اس نے کمال رائٹ مندی سے احتراز کیا۔ کچھ دیر تو حاضریں اس کی باتیں بہت شوق سے سنتے رہے اور آٹنیا دلوونا کو یہ گمان ہونے لگا کہ اس نے اپنے مہمانوں کے سامنے جو انوکھی اور نئی نوٹی چیز پیش کی ہے، وہ اسے بظہر تحسین دیکھ رہے ہیں۔ تاہم بورس جو کچھ کہہ رہا تھا، اس پر سب سے زیادہ توجہ ہیلین دے رہی تھی۔ اس نے اس سفر کے بارے میں متعدد سوالات دریافت کیے اور معلوم ہو رہا تھا کہ اسے پرشیا کی انواج کی حالت کے بارے میں گہری دلچسپی ہے۔ جونہی وہ اپنا بیان ختم کر چکا، وہ حسب عادت مسکراتے اس کی جانب متوجہ ہوئی۔

”غریب خانے شریف، میں اور مجھ سے ملیں۔ تاکہ یہ ہے،“ اس نے یہ الفاظ کچھ اس لہجے سے کہے کہ بعض واقعات کی بنا پر، جن کا اسے (بورس کو) کوئی علم نہیں ہو سکتا تھا، یہ بالکل لازمی ہو گیا تھا کہ وہ آئے ور اس سے مذاقات کرے۔ ”بروز منگل۔ آٹھ اور نو بجے کے درمیان۔ مجھے بہت خوشی ہوگی۔“

بورس نے وعدہ کیا کہ وہ اس کا حکم سر آنکھوں پر بجالائے گا اور وہ اس کے ساتھ باتوں میں مشغول ہوا چاہتا تھا کہ آٹنیا دلوونا نے اسے اپنے پاس بلایا اور بہانہ یہ بنایا کہ آٹنیا اس کی داستان سننا چاہتی ہے۔

”تم اس کے شوہر کو تو جانتے ہی ہو،“ آٹنیا دلوونا نے آنکھیں بند کرتے اور غمزہ انداز سے ہیلین کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: ”اتنی چھیل چھیل، وہ طرح دار خاتون اور قسمت کی اتنی بیٹی! اتنی مہربانی کرنا کہ اس کے سامنے اس کے شوہر کا ذکر نہ کرنا، بلکہ اس کا نام بھی نہ لینا، اس سے اسے سخت اذیت ہوتی ہے!“

7

جب بورس اور آٹنیا دلوونا محفل میں واپس آئے، پرنس اپولیت گنگلو کی عمان اپنے ہاتھ میں لے چکا تھا۔ وہ بازوؤں والی کرسی پر بیٹھا تھا اور آگے کی طرف جھکا کہہ رہا تھا

”Le Roi de Prusse“ اس نے یہ الفاظ کہے اور کھٹکھٹا کر ہنس پڑا۔ ہر شخص اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔

”Le Roi de Prusse?“ اس نے سوالیہ لہجے سے دوبارہ کہا، ایک بار پھر ہنسنا اور اس کے بعد خاموشی

اور عجیبگی کا لہارہ اڑھ کر اپنی کرسی پر تک گیا۔

آٹنیا دلوونا نے، ایک آدھ منٹ، تنہا رکھا کہ وہ شاید کچھ اور کہنا چاہے لیکن جب اسے اندازہ ہو گیا کہ وہ مزید کچھ نہ کہنے کا تہیہ کیے ہوئے ہے، وہ بتانے لگی کہ پرنسڈم کے مقام پر بے دین بوانا پارت نے کس طرح فریڈرک اعظم کی مکرانہ لائی تھی۔

”فریڈرک اعظم کی بیوی تو اسی تھوڑے جس میں...“ اس نے کہنا شروع کیا لیکن اپولیت نے اسے ٹوک دیا۔

”Le Roi de Prusse...“ اس نے کہا اور جب ہر شخص کی توجہ اس کی طرف مبذول ہو گئی، اس نے

”فعلی ترجمہ پرشیا۔ لیکن فرانسیسی محاورے میں اس کا مطلب ”کھلی اور بے کار شے“ ہے۔ (ماڈ)

معذرت چاہی اور دوبارہ چپ سا دھلی۔

آٹنا پاؤڈر کے ماتھے پر شکلیں پڑ گئیں۔ پولیت کے دوست موخت، غ نے بڑے رعب اور حکم سے اسے مخاطب کیا اور پوچھا:

”تمہارے اس Roi de Prusse کو کیا ہوا؟“

اپولیت یوں ہنسا جیسے وہ اپنی ہنسی پر خود ہی شرمندہ ہو۔

”اچی، کچھ نہیں، کچھ نہیں۔ میرا مطلب صرف یہ تھا۔۔۔“ (وہ ساری شام ایک جگت، جو اس نے دیا میں سنی تھی اور جس میں فرانسیسی محاورہ Roi de Prusse، استعمال ہوا تھا، منانے کی کوشش کرتا رہا تھا لیکن کامیاب نہیں ہو رہا تھا۔) ”میں صرف یہ کہنا چاہتا تھا کہ Le Roi de Prusse کی خاطر جنگ کرنا بیکار ہے۔“

یورس تحت ط انداز سے مسکرایا۔ اس کی یہ مسکراہٹ طنزیہ بھی ہو سکتی تھی لیکن اس سے یہ مفہوم بھی اخذ کیا جا سکا تھا کہ وہ پسندیدگی کا اظہار کر رہا ہے۔ یہ تو ہر شخص کے اپنے ذوق کی بات تھی کہ اس نے، اس جگت کو کس انداز سے پر ہے۔ ہر شخص ہنسنے لگا۔

”تمہاری یہ جگت کوئی اچھا تاثر نہیں چھوڑتی۔ اس میں بذلہ سنجی تو ہے لیکن یہ ہے بے جا اور نامناسب،“

آٹنا پاؤڈر نے اپنی جھریوں زدہ انگلی اس کے سامنے لہراتے ہوئے کہا۔ ”ہم یہ جنگ Le Roi de Prusse کے لیے نہیں بلکہ صحیح اصولوں کے لیے لڑ رہے ہیں۔ اف، یہ پانچ پرنس اپولیت اس نے کہا۔

گفتگو زیادہ تر یہی خبروں کے متعلق ہوتی رہی اور اس میں کسی قسم کا جھول نہ آیا۔ محفل کے اختتام پر جب انعامات، جو زار نے مرحمت کیے تھے مدبر بحث آئے، اس میں اور بھی جوش و خروش آگیا۔

”آپ کو یاد ہو گا کہ گزشتہ برس این۔ این۔ کوئسوار کی ڈیبا، جس پر تصویر نقش تھی، ملی تھی؟“ ”عظیم دانشور نے کہا۔“ چنانچہ ایس۔ ایس۔ کوئسوار انعام کیوں نہ ملے؟“

”معافی چاہتا ہوں۔ جس کوئسوار کی ڈیبا پر اطور کی تصویر نقش ہو، وہ انعام تو کبلا سکتی ہے لیکن اسے انعام نہیں قرار دیا جاسکتا،“ ایک سفارت کار نے کہا۔ ”ہاں، آپ اسے عطیہ کہہ سکتے ہیں۔“

”نظر مروجہ ہیں۔ مثلاً شوارٹس بیرگ۔“

”ایسا ممکن ہے،“ ایک اور شخص نے اعتراض اٹھایا۔

”شرط لگاتے ہو؟ تمہارے کاربن۔ وہ مختلف قسم کا مسئلہ ہے۔“

جب ہر شخص روٹنگی کے لیے اٹھ کر کھڑا ہو گیا، بیسین، جس نے ساری شام شاد ہی زبان کھولی تھی، ایک بار پھر یورس کی جانب متوجہ ہوئی اور بڑے نار و غدار اور معنی خیز انداز سے گویا ہوئی۔ ”مشکل کا دن نہ بھولیں۔ میرا اصرار ہے۔“

”میرے لیے یہ بے حد اہم ہے،“ اس نے مسکراتے اور مڑ کر آٹنا پاؤڈر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

آپنا پاد پورٹا، جس طرح وہ اپنی حالی مرتبت شاہی مربیہ کا ذکر آنے پر مسکرایا کرتی تھی، اس انداز سے مسکراتے ہیلین کی خواہش پر صاد کر دیا۔

بظاہر یہ معلوم ہوتا تھا کہ بورس نے پریشانی فوج کے متعلق کوئی ایسی بات کہہ دی ہے کہ ہیلین کو چانک حواس ہو گیا ہے کہ اس کے لیے اس کے ساتھ ملاقات کرنا انتہائی ضروری ہو گیا ہے۔ اس کے رویے سے مترشح ہو رہا تھا کہ وہ یہ وعدہ کرتی ہے کہ جب وہ بروز منگل اس سے ملنے آئے گا وہ اسے بتائے گی کہ اس کے نزدیک یہ ملاقات کیوں ضروری ہے۔

تاہم منگل کی شام ہیلین کے آرامتہ و پیراستہ ڈرائنگ روم میں بورس کو اس قسم کی کوئی وضاحت نہ مل سکی کہ آج اس کا آنا اتنا ضروری کیوں تھا۔ وہاں درمہمان بھی موجود تھے۔ کاؤنٹس نے اس سے کوئی خاص بات نہ کی اور صرف اس وقت جب روانگی سے پیشتر وہ اس کے ہاتھ پر بوسہ دے رہا تھا، اس نے غیر متوقع طور پر (اس کا چہرہ ہر قسم کی مسکراہٹ سے عاری تھا اور اس کے سلسلے میں یہ بات بہت عجیب تھی) سرگوشیوں میں اس سے کہا ”کل شام کھانے پر آنا۔ بھولنا نہیں۔۔۔ ضرور آنا!“

پیئر بزرگ میں اپنے عارضی قیام کے دوران میں بورس بے تکلفانہ کاؤنٹس پر خود اس کے گھر آتا جاتا رہا۔

8

جنگ زور شور سے جاری تھی اور روز بروز روسی سرحد کے قریب سے قریب تر آرہی تھی۔ ہر جگہ یونا پارت پر پھنکار بڑھ رہی تھی اور اسے ”دشمن بنی نوع انسان“ قرار دیا جا رہا تھا۔ دیہاتوں میں باقاعدہ اور محفوظ افواج دونوں کے لیے رگروٹ بھرتی کیے جا رہے تھے۔ ادھر محاذ جنگ سے متضاد اور حسب معمول جھوٹی خبریں موصول ہو رہی تھیں، چنانچہ مختلف حلقوں میں ان کے مختلف مقاصد ہم اخذ کیے جا رہے تھے۔

1805 سے معمر پرنس بلیکونسکی پرنس آندرے اور پرنس ماریا کی زندگیوں کی خاصی حد تک تبدیل ہو چکی تھیں۔

1806 میں پورے روس میں ملیشیا کے جو آٹھ کمانڈر انچیف مقرر کیے گئے، معمر پرنس ان میں شامل تھا۔

ضعف بھری کے باوجود، جو اس زمانے میں، جب اسے یقین ہو گیا تھا کہ اس کا بیٹا ہلاک ہو چکا ہے، خاص طور پر نمایاں ہو گیا تھا، اسے یہ قطعاً خیال نہ آیا کہ اسے یہ حق حاصل ہے کہ وہ ایک ایسا فرض، جو اس پر اس طور نے بذات خود اسے تفویض کیا تھا، نبھانے سے انکار کر دے، اور عمل و مصروفیت کے اس تازہ موقع نے اس کے اندر نئی توانائی اور قوت بھری۔ جو تین سو بجات اس کی تحویل میں دیے گئے تھے، وہ مسلسل ان میں سفر کرتا رہا۔ جہاں تک فرائض کی ادائیگی کا تعلق ہے، وہ انھیں پوری تہادی سے ادا کرنے کا قائل اور اس معاملے میں سرمد رعایت برتنے کا روادار نہیں تھا۔ وہ اپنے ماتحتوں کے ساتھ نہایت سختی سے، جس کے ڈانڈے سنگ دلی کو چھونے لگتے تھے، پیش آتا تھا اور چھوٹی سے چھوٹی جزئیات کا بذات خود جائزہ لیتا تھا۔

پرنس ماریا نے اپنے باپ سے ریاضی کا درس لینا چھوڑ دیا تھا اور صرف ان ایام کے دوران میں جب وہ گھر ہوتا تھا، وہ ہر صبح (دودھ پلانے والی) لٹاؤر ننھے پرنس نکور کی (اس کا دادا اسے اسی نام سے پکارتا تھا) کی معیت میں اس کے سنڈی روم میں جاتی تھی۔ شیر خوار اپنی اناؤ اور نرس سادیشنا کے ساتھ مرحومہ پرنس کے لپارٹمنٹ میں رہتا تھا۔ پرنس ماریا اپنا بیشتر وقت نرسی میں گزارتی تھی اور پوری کوشش کرتی تھی کہ اس کا بھتیجا حتی الوسع اپنی ماں کی محسوس نہ کرے۔ بظاہر یہ نظر آتا تھا کہ مادمونیل بوغین بھی بچے پر جان چھڑکتی ہے اور پرنس، ماریا کثرت اوقات، ہا ایثار کرتی تھی کہ وہ اپنے بجائے اپنی سہیلی کو یہ موقع دیتی تھی کہ وہ ننھے ange (اپنے بھتیجے کو وہ ننھا سا فرشتہ کہا کرتی تھی) کے ساتھ لڈیو کرے، گکٹھوں پر اچھلے اور اسے جھولا جھلے۔

بالڈ ہلز کے گرجے کے مائدہ مقدمہ کے قریب کوچک پرنس کی ابدی آرام گاہ کے اوپر چیل 14 تعمیر کر دیا گیا تھا۔ اس چیل میں سنگ مرمر کی یادگاری سورت، جو اطالیہ سے منگوائی گئی تھی، نصب کر دی گئی تھی۔ اس سورت میں ایک فرشتہ، جو اپنے بازو پھیلے جانب آسمان پر دان کے لیے تیار تھا اور جس کا بالائی لب یوں اوپر کی طرف اٹھ ہوا تھا جیسے وہ ابھی ابھی مسکرا دے گا، دکھایا گیا تھا۔ ایک روز جب پرنس آندرے اور پرنس ماریا چیل سے باہر آ رہے تھے، انھوں نے ایک دوسرے کے سامنے عتراف کیا۔ ”عجیب بات ہے کہ فرشتے کو دیکھ کر کوچک پرنس یاد آ جاتی ہے۔“ لیکن اس سے بھی عجیب تر بات یہ تھی۔ اگرچہ اس بارے میں پرنس آندرے نے اپنی ہمشیرہ سے کبھی کچھ نہیں کہا تھا کہ مجسمہ ساز نے اتفاق سے فرشتے کے چہرے پر جو تاثر نمایاں کیا تھا، اس میں اسی نرم سرنش کا، جو پرنس آندرے نے اپنی مرحومہ بیوی کے چہرے پر پڑھی تھی، ”آہ! تم نے میرے ساتھ یہ کیوں کیا ہے؟“ احساس پایا جاتا تھا۔

جب پرنس آندرے واپس آیا، اس کے چند ہی روز بعد معمر پرنس نے اپنی جائیداد کا کچھ حصہ اس کے سپرد کر دیا۔ اس حصے میں باگوچا رافو کی وسیع دعریض جاگیر بھی، جو بالڈ ہلز سے تقریباً پچیس میل دور تھی، شامل تھی۔ پرنس آندرے نے اس سے یوں فائدہ اٹھایا کہ اس نے وہاں عمارتیں تعمیر کرائی اور اپنا بیشتر وقت ادھر صرف کرنا شروع کر دیا۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ اس کی بالڈ ہلز کے ساتھ بڑی تکلیف دہ یادیں وابستہ تھیں (اور وہ ان سے فرار حاصل کرنا چاہتا تھا)۔ دوسرے اسے اپنے باپ کی طبیعت کے ساتھ براہ کرنے میں بہت دشواری پیش آتی تھی اور پھر اسے خلوت کی ضرورت شدت سے محسوس ہو رہی تھی۔

ادمنٹنس کے سسر کے بعد پرنس آندرے نے پختہ عزم کر لیا تھا کہ اب وہ دوبارہ فوجی خدمات سر انجام نہیں دے گا اور جب جنگ دوبارہ چھڑ گئی اور ہر شخص کو فوج میں لازمی خدمات سر انجام دینا پڑیں، اس نے فعال ملازمت سے بچنے کی غرض سے اپنے والد کی ماتحتی میں رنگردت بھرتی کرنے کا کام سنبھال لیا۔ معلوم ہوتا تھا کہ 1805 کی مہم کے بعد معمر پرنس دوران کے صاحب زادے نے اپنے اپنے کرداروں کا باہمی تبادلہ کر لیا ہے۔

ہپ کو فعال ہونے کا جو موقع ملا، اس نے اس کے اندر دلولہ کا زہ پیدا کر دیا اور سے یہ توقع بندھنے لگی کہ نئی مہم سے بہترین نتائج برآمد ہوں گے۔ اس کے برعکس پرنس آندرے جنگ میں کوئی حصہ نہیں لے رہا تھا۔ وہ دل ہی دل میں اپنی بے عملی پر کڑھ رہا تھا اور معاملے کا صرف تاریک پہلو دیکھ رہا تھا۔

چھبیس فروری 1807 کو سمیر پرنس جب حسب معمول دورے پر روانہ ہوا، پرنس آندرے اس کی عدم موجودگی میں ہمیشہ کی طرح بالڈیز میں مقیم تھا۔ ننھے نکولائی کی طبیعت گزشتہ تین چار روز سے نامسا زخمی۔ جو کو چون سمیر پرنس کو شہر چھوڑنے گیا تھا، واپس آچکا تھا۔ وہ اپنے ساتھ پرنس آندرے کے لیے دستاویزات اور خطوط لایا تھا۔

وردی پوش ملازم کو جب نو جوان پرنس سٹڈی روم میں نظر نہ آیا، وہ خطوط لے کر پرنس ماریا کے اپارٹمنٹ میں چلا گیا لیکن وہ وہاں بھی نہ تھا۔ ملازم کو بتایا گیا کہ پرنس سٹڈی روم میں چلا گیا ہے۔

”یوٹرائیکس لینسی، اجارت ہو تو کچھ عرض کروں۔ پتروشکا چند کاغذات لایا ہے،“ ایک کھانا لے کر پرنس آندرے سے کہا۔ پرنس بچے کی کرسی پر بیٹھا تھا اس کے ابروؤں پر ٹل پڑے ہوئے تھے اور وہ کانپتے ہاتھوں دوا کی بوتل سے چند قطرے ساغرے میں، جو دھایانی سے بھرا ہوا تھا، انڈیل رہا تھا۔

”کیا ہے؟“ اس نے غصے سے پھنکارے ہوئے پوچھا اور اس کے کانپتے ہاتھوں سے اثاثہ قاصرورت سے کچھ زیادہ قطرے گلاس میں گر گئے۔

اس نے سیمزہ فرش پر اچھال دیا اور مزید پانی لانے کا حکم دیا۔ خادمہ پانی لے آئی۔

بچے کے پالنے اور ننھی منی کرسی کے علاوہ، جس پر پرنس آندرے بیٹھا تھا، کمرے میں دو بازوؤں والی کرسیاں، ایک بڑی میز اور ایک بچوں کی میز پڑی تھی۔ پردے گراتے جا چکے تھے۔ میز پر دھوم تھی جل رہی تھی۔ اس کے سامنے جلد کتاب دھری تھی تاکہ اس کی روشنی پالنے میں نہ جائے۔

”نائی ڈیئر،“ پرنس ماریا نے، جو پالنے کے قریب کھڑی تھی، وہاں سے ہٹتے اور اپنے بھائی کی جانب بڑھتے ہوئے کہا۔ ”بہتر یہی ہے کہ قدرے انتظار کر لیں۔ بعد ازاں۔“

”براٹھیر“ تمہیں معلوم ہی نہیں کہ تم کیا کہہ رہی ہو۔ تم ہمیشہ معاملات معرض التوا میں ڈالتی رہتی ہو۔ سب دیکھ لیا تاکہ اس کا انجام کیا ہوتا ہے؟“ پرنس آندرے نے قدرے جھنجھٹاتے لیکن دھیما ہوا اختیار کرتے ہوئے کہا۔ صاف نظر آ رہا تھا کہ وہ اپنی ہمشیرہ کے جذبات کو ٹھیس پہنچانا چاہتا ہے۔

”نائی ڈیئر، میں سچ عرض کر رہی ہوں۔ وہ سوچ چکا ہے اور اب اسے جگانا مناسب نہیں ہوگا،“ پرنس ماریا نے منت سماجت کے انداز سے کہا۔

پرنس آندرے اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور بیچوں کے مل چلا پالنے کے قریب آیا۔ ساغر اس کے ہاتھ میں تھا۔

”کیا تم واقعی یہ سمجھتی ہو کہ ہمیں اسے جگانا نہیں چاہیے؟“ اس نے جھجکتے، ہچکچاتے پوچھا۔

”جیسے آپ کا سن چاہیے۔ لیکن سچ پوچھیں۔ میرا یہی خیال ہے۔ ویسے آپ خود فیصلہ کر لیں،“ پرنس ماریا نے

کہ۔ صاف نظر آ رہا تھا کہ اپنی رائے کے منوائے جانے پر وہ سخت خوف زدہ ہو گئی تھی اور اس کے پسینے چھوٹنے لگے تھے۔ اس نے اپنے بھائی کی توجہ خادمہ کی، جو زیر لب اسے پکار رہی تھی، طرف دلائی۔

بچہ بخار سے پھنک رہا تھا۔ دونوں اس کی خبر گیری میں مصروف تھے۔ یہ دوسری رات تھی اور وہ پلک تک نہیں جھپک سکے تھے۔ انھیں اپنے گھریلو ڈکٹر پر اعتماد نہیں رہا تھا۔ انھوں نے شہر سے ڈاکٹر کو بلا بھیجا تھا اور اب اس کا انتظار کر رہے تھے۔ دریں اثنا وہ ان چند دنوں کے دوران میں کیے بعد دیگرے متعدد دوائیں اور ٹوٹکے استعمال کر چکے تھے۔ نیند کے فقدان اور خوف و ہراس نے ان کے اعصاب شل کر دیے تھے۔ وہ اپنے تفکرات اور پریشانیوں کا نشانہ ایک دوسرے کو بنا رہے تھے، ایک دوسرے میں خامیاں ڈھونڈ رہے تھے اور آپس میں تو تکار کر رہے تھے۔

”پتہ دسکا آپ کے والد محترم کے کچھ کاغذات لایا ہے“ خادمہ نے ہولے سے کہا۔

پرنس آندرے باہر چلا گیا۔

”اب کیا ہے؟“ وہ غصے میں بڑبڑایا۔ اس کے باپ نے اسے جو زبانی ہدایات بھیجی تھیں، وہ اس نے سنیں، اپنے باپ کا خط اور دوسرے مراسلے دھوئے کیے اور واپس زمری میں آ گیا۔

”ہونہ؟“ اس نے پوچھا۔

”ویسے ہی ہے۔ خدا کے لیے ذرا انتظار کریں کارل ایوانچ ہمیشہ یہی کہتے رہتے ہیں کہ کسی دوسری چیز کی نسبت نیند کہیں بہتر ہے،“ پرنس ماریانے آہ بھرتے ہوئے زیر لب کہا۔

پرنس آندرے بچے کی طرف گیا اور اس نے بچے کا جسم چھو کر دیکھا۔

”تم اور تمہارا کارل ایوانچ؟“

اس نے دوا کا گلاس اٹھایا اور دوبارہ پالنے کی طرف چل دیا۔

”آندرے، اسے مت چھیڑو،“ پرنس ماریانے کہا۔

اس نے اسے گھور کر دیکھا اور غرایا۔ اس کے چہرے پر عین دیکھوں میں کرب جھلک رہا تھا۔ گلاس انھوں میں تھا جسے وہ بچے کے اوپر جھکا۔

”لیکن میں یہ چاہتا ہوں،“ اس نے کہا۔ ”آؤ، میں تمہارے سامنے ہاتھ جوڑتا ہوں۔ یہ اسے پلاؤ۔“

پرنس ماریانے کندھے اچکائے۔ تاہم اس نے فرماں برداری سے گلاس پکڑ لیا، نرس کو بلایا اور بچے کو دوا پلانے لگی۔ بچے نے چیخ ماری درخراہٹ کے ساتھ سانس لینے لگا۔ پرنس آندرے سے یہ منظر دیکھ نہ گیا اور اسے حشر جھری آ گئی۔ اس نے اپنا سر پکڑا اور باہر نکل گیا۔ وہ ملحقہ کمرے میں چلا گیا اور صوفے پر بیٹھ گیا۔

خطوط ابھی تک اس کے ہاتھ میں تھے۔ اس نے مشینی انداز سے انھیں کھولا۔ معمر پرنس نے کہیں کہیں انتظار استعمال کیے تھے۔ اس کا خط نیلے کاغذ پر تھا اور خاصے موٹے اور لمبوترے حروف میں تحریر کیا گیا تھا۔ خط کی عبارت مندرجہ ذیل تھی:

بھی ابھی خصوصی ایٹمی کی وساطت سے نہایت خوش کن خبر۔ بشرطیکہ یہ دروغ گوئی پر مبنی نہ ہو۔ موصول ہوئی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ آئی۔ ڈی۔ کی جنگ میں بے گن سین کو بونا پارت کے خلاف کامل فتح حاصل ہوئی ہے۔ بیئرز برگ میں خوشی کے شادیاں بجاائے جا رہے ہیں۔ لاتعداد انعامات اور تمغہ جات فوج کو ارب سال کر دیے گئے ہیں۔ مگر چہ وہ جرمن تڑا ہے۔ میں اسے مبارکباد پیش کرتا ہوں ابھی میں نہیں آتا کہ وہ شخص۔ کوئی خاندان کوف ہے۔ جو کار چیوڈ میں کمانڈر کے فرائض سرانجام دے رہا ہے، کیا کرنا چاہتا ہے۔ بھی تک نہ تو مزید جواں پہنچے ہیں اور نہ سالن رسد۔ جنگی بجائے اس کے پاس پہنچو اور اسے بتا دو کہ اگر یہ سب کچھ بننے کے، اندر اندر نہ پہنچا، میں اس کا سر اتر دوں گا۔ پروئے کش۔ آئی۔ ڈی کے سر کے کے بارے میں پتہ کا خط بھی موصول ہوا ہے۔ وہ خود اس سر کے میں شریک تھا۔ جتنا خیر خبر درست ہے۔ اگر غیر متعلقہ اشخاص نقل اندازی سے گریز کریں، جرمن بھی بونا پارت کی ٹھکانی کر سکتا ہے۔ سنا ہے کہ وہ بڑی اراکفری کے عالم میں پسپا ہوا ہے۔ بلاتا خیر کار چیوڈ پہنچو اور کام کرو؟

پرنس آندرے نے ایسی سانس لی اور دوسرا لٹافہ کھولا۔ دو صفحے کا یہ مراسلہ ہمیں کا تھا اور بہت باریک حروف میں لکھا ہوا تھا۔ اس نے پڑھے بغیر اس کی تہہ لگائی، دو دو بارہ اپنے باپ کا خط، جس کے آخری الفاظ ”بلاتا خیر کار چیوڈ پہنچو اور کام کرو؟“ تھے، پڑھنے لگا۔

”نہیں آپ میری خط معاف فرمائیں۔ جب تک بچے کی حالت بہتر نہیں ہو جاتا، میں کہیں نہیں جاؤں گا۔“ اس نے اٹھ کر دروازے کی طرف جاتے اور دوسری میں جھانکتے ہوئے بچہ۔

پرنس ابھی تک پانے کے قریب کھڑی تھی اور دھیرے دھیرے بچے کو جھٹار ہی تھی۔

”اور یہ انھوں نے دوسری بد مزہ خبر کیا لکھی ہے؟“ پرنس آندرے اپنے باپ کا خط یاد کر کے سوچنے لگا۔

”اگر وہ ہاں ہمیں بونا پارت کے خد ف فتح حاصل ہوئی ہے۔ کم بخت فتح بھی بھیجی حاصل ہونا تھی جب میں فوج کے ساتھ نہیں تھا ہاں، جی ہاں وہ ہمیشہ میری مانگ گھسیٹے رہتے ہیں۔ اچھا، خیر، انھیں مزے لینے دو۔“

اور وہ ہمیں کا خط، جو فرنیسی میں تحریر کیا گیا تھا، پڑھنے لگا۔ وہ پڑھتا رہا، پڑھتا رہا اور نصف تک پہنچ گیا لیکن اس کے بچے خاک نہ پڑا۔ وہ شخص اس لیے پڑھے جا رہا تھا کیونکہ وہ ان خیالات سے، جو اتنے طویل عرصے سے اور اتنے تکلیف دہ انداز سے اس کی سوچوں پر غالب آچکے تھے کہ اسے کسی اور چیز کا ادھیان ہی نہیں رہا تھا، وقتی طور پر ہی سہی، فراموش کرنا چاہتا تھا۔

میں تحریر کیا تھا، فرانسیسی ہتھکڑ بازی سے کام لیا تھا اور اسلوب نگارش بھی فرانسیسیوں ہی کا بنایا تھا، لیکن اس نے ساری مہم کے بیانات میں جس بے دھڑک، انداز سے اپنے آپ کو ملامت کا نشانہ بنایا تھا اور اپنا تسخیر آپ اڑایا تھا، وہ خالصتاً روسی تھا۔ بلجیمن نے لکھا تھا کہ سنارتی حبیاط پسندی کے تھے جسے اس کے لیے سوہانِ رواج ہیں اور یہ کہ پرنس آندرے اس کا یہ مکتوب، لیہ ہے جس کے سامنے وہ اپنے اس تمام غم و غصے کا، جو فوج میں جو کچھ ہو رہا ہے اسے دیکھ کر اس کے نہاں خانہ قلب میں مجتمع ہو رہا ہے، (بلا خوف و خطر) اظہار کر سکتا ہے۔ اس خط پر پردے سٹش آئی لاء کے معرکے سے چند ایام قبل کی تاریخ مندرج تھی۔ ”جس روز ہمیں اوسٹریلش کے معرکے میں شاندار کامیابی نصیب ہوئی، بلجیمن نے لکھا تھا

وہ دن اور آج کا دن، مائی ڈیئر پرنس، تم اچھی طرح جاننے ہو کہ میں نے ہیڈ کوارٹر سے باہر قدم نہیں رکھا۔ مجھے صریحاً جنگ کا چمکا چمکا ہے اور مجھے خوشی ہے کہ مجھے یہ چمکا پڑ گیا ہے۔ گزشتہ تین ہفتوں کے دوران میں جو کچھ میں نے دیکھا اور سنا ہے، آنکھوں اور کانوں کو اس پر اعتبار نہیں آ رہا۔

میں یہ سراقہ بالکل شروع سے (ab ovo) بیان کرتا ہوں۔ جیسا کہ تمہیں معلوم ہے کہ ”دشمن بنی نوع انسان“ اہالیاں پرشیا کو اپنے حملوں کا نشانہ بنا رہا ہے۔ پرشیا والے ہمارے وفادار اتحادی ہیں۔ انہوں نے تین برسوں کے دوران میں صرف تین مرتبہ ہمارے ساتھ بے وفائی کی ہے۔ ہم اس کے نصب العین کو پنا نصیب العین بنالینے ہیں لیکن ہوتا یہ ہے کہ ”دشمن بنی نوع انسان“ ہماری سمجھ و مرصع تقریروں پر ذرا بھی کان نہیں دھرتا۔ وہ اپنے بدظن، بدتہذیب اور بدخصال انداز سے پرشیا کے باشندوں پر ہل پڑتا ہے اور انہیں تمام موقع بھی نہیں دیتا کہ جو پروردہ شروع کر چکے ہیں، اسے ہی ختم کر لیں۔ جنگی بجائے وہ ان کی دھمائی کر رہا ہے اور پولسڈم کے شاہی محل میں قدم رنجہ ہو جاتا ہے۔

”میری سب سے بڑی تمنا یہ ہے،“ پرشیا کے بادشاہ سلاست بونا پارت کو تحریر فرماتے ہیں ”کہ میں اپنے محل میں یومریمبشٹی کا ایسے انداز سے استقبال کروں اور خدمت بجا دوں جو یومریمبشٹی کے حراجِ اندس کے عین مطابق ہو۔ اس مقصد کے حصول کے لیے میں بہ عجلت و تمام اقدامات، جس کی حالات نے مجھے اجازت دی ہے، کر چکا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ میں اپنے اس مقصد میں کامیاب رہا ہوں؟“

پرشیا کے جرنیل اس بات پر بہت فخر کا اظہار کرتے ہیں کہ وہ فرانسیسیوں کے ساتھ بڑی شہنشاہی سے پیش آتے ہیں اور اولین مطالبے پر ہتھیار ڈال دیتے ہیں۔ گلوگاد میں متعین دس ہزار سپاہ کا کمانڈر پرشیا کے بادشاہ سے دریافت کرتا ہے ”اگر مجھے ہتھیار ڈالنے کے لیے کہا گیا، پھر مجھے یہ کرنا ہوگا۔“ اور یہ بات موافقت و درست ہے۔

قصہ مختصر ہمیں توقع تھی کہ اگر ہم نے محض جنگجو بادشاہ دیہاڑی، (حریف پر) بیت طاری ہو جائے گی۔

لیکن ہو کیا ہے؟ ہم فی نسب پوری طرح جنگ کی لپیٹ میں آچکے ہیں اور اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ جنگ کے شعلے ہماری سرحدوں تک پہنچ چکے ہیں۔ اب ہم اس جنگ میں پرشیا کے بادشاہ کے ملیف بن گئے ہیں اور اس کی خاطر اس میں کود پڑے ہیں۔ ہر شے تیار ہے۔ صرف ایک جھوٹے چیز۔ کمانڈر انچیف کی کمی ہے۔ چونکہ اب یہ محسوس کیا جا رہا ہے کہ اوٹوٹس کے معرکے میں ہمیں جو کامیابی حاصل ہوئی تھی، اگر وہ کمانڈر انچیف اتنا نو عمر نہ ہوتا، وہ فیصلہ کن ثابت ہو سکتی تھی، چنانچہ اسی اسی سالہ پیرن فرقت کو رازد کے بڑوں پر رکھا گیا ہے۔ مقابلہ پر رازد وٹسکی اور کامینسکی کے مابین تھا۔ قرعہ ڈال مؤخر اندز کے نام نکلا، اور اسے منتخب کر لیا گیا۔ جنرل صاحب سوریف کے انداز میں بند گاڑی میں تشریف لے جاتے ہیں اور "وہ وہ، سبحان اللہ، مرحبا اور زندہ باد" کے نعروں سے ان کا پر جوش استقبال کیا جاتا ہے۔

چوتھی تاریخ کو پیرز برگ سے پہلے ہر کارہ یہاں پہنچتا ہے۔ ڈاک کے تھیلے لیلڈ مارشل کے حضور اس کے کمرے میں پہنچا دیے جاتے ہیں کیونکہ وہ ہر کام بنفس نفیس سرانجام دینا پسند فرماتے ہیں۔ خطوط کی چھاننی میں ہاتھ بٹانے اور وہ جو ہمارے نام آئے ہوتے ہیں، انھیں لے جانے کے لیے مجھے طلب کیا جاتا ہے۔ حضور کمانڈر انچیف لگنگلی باندھے دیکھ رہے ہیں، در انتظار فرما رہے ہیں کہ ہم انھیں وہ خطوط، جو ان کے نام آئے ہیں، کب انھیں پیش کرتے ہیں ہم ڈھونڈتے ہیں، ڈھونڈتے ہیں۔ لیکن ان کے نام کا ایک خط بھی برآمد نہیں ہوتا۔ فینڈ مارشل میں صبر کا مزید یار نہیں رہتا، وہ آگے بڑھتے ہیں اور خود چھاننی کے کام میں جت جاتے ہیں۔ امپراطور نے کاؤنٹ، پرنس وڈ اور دیگر اشخاص کے نام جو کتابت اور مال فرمائے ہیں، وہ تو مل جاتے ہیں لیکن ان کا اپنا خانہ خالی رہتا ہے۔ چنانچہ وہ حسب معمول جلال میں آ جاتے ہیں، ان کے منہ سے جھاگ اڑنے لگتا ہے اور وہ ہر ایک کو بے نقطہ سنانے لگتے ہیں۔ امپراطور نے دوسروں کے نام جو خطوط تحریر کیے ہوتے ہیں، وہ انھیں کھولنا اور پڑھنا شروع کر دیتے ہیں۔ "ہونہہ! تو یہ ہے ان کا میرے ساتھ سلوک! مجھ پر اعتبار ہی نہیں رہا! آہا ہا حکم دیا جاتا ہے کہ مجھ پر نگاہ رکھی جائے! بہت خوب۔ دفع ہو جاؤ، تم سب یہاں سے!" اور وہ خود جبرل بے جگ سین کے نام اپنا مشہور و معروف "حکم ہر روز" لکھاتے بیٹھ جاتے ہیں۔

"میں زخمی ہوں اور گھوڑے پر سوار نہیں ہو سکا، چنانچہ میں فوج کی کمان منجی لے سے معذور ہوں تم اپنے شکست خوردہ دستوں کو پلٹک¹⁶ لے آئے ہو۔ یہاں وہ تقسیم کی زد میں ہیں۔ ان کے پاس نہ اندر ہن ہے اور نہ چارہ۔ چنانچہ کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی ہوگا۔ جیسا کہ کل تم نے خود کاؤنٹ بکس ہیڈن کو اطلاع دی تھی کہ تمہیں ہماری پٹی سرحدوں تک پسپائی اختیار کرنے کے متعلق سوچنا ہوگا۔ چنانچہ آج ہی سے یہ کام شروع کر دو۔"

امپراطور کے نام وہ تحریر کرتے ہیں۔ "میں نے تمام جنگوں میں گھوڑے پر سوار ہو کر حصہ لیا ہے

گھوڑے کی پیٹھ پر بیٹھے بیٹھے میری پشت پر لاگا لگ گیا ہے۔ یوں مجھے بار بار مرہم پٹی کرانا پڑتی ہے۔ ان حالات میں میرے لیے گھوڑے کی سواری کرنا اور اس فوج کی، جو در دراز مختلف علاقوں میں بکھری پڑی ہے، کمان کرنا ممکن نہیں رہا۔ چنانچہ میں نے متذکرہ کمان اپنے بعد سینئر ترین جرنیل کاؤنٹ بکس ہیولن کے سپرد کر دی ہے۔ میں نے اپنا سارا عملہ، در اپنے عہدے کے دیگر متعلقات انھیں بھیج دیے ہیں اور انھیں مشورہ دیا ہے کہ اگر انھیں روٹی کی کمی کا مسئلہ درپیش ہو، وہ پسپائی اختیار کر کے پرشیا کے اندرونی علاقوں میں جاسکتے ہیں۔ یہ مشورہ اس لیے ضروری ہو گیا کیونکہ ڈیڑھ کمانڈروں۔ اوسرمان اور سید مورنسکی کی اطلاعات کے مطابق ڈبل روٹی مقامی کسان چٹ کر گئے ہیں اور بعض رہنموں کے پاس صرف اتنی روٹی رہ گئی ہے کہ صرف ایک دن کی ضرورت پوری ہو سکتی ہے اور بعض کے پاس تو اتنی بھی نہیں۔ جہاں تک میرا تعلق ہے، میں جب تک صحت یاب نہیں ہو جاتا، میں آسٹریلیا کے ہسپتال میں مقیم رہوں گا۔ میں اپنی میر پورٹ بھد بھد واکسار خدمت عالیہ میں پیش کر رہا ہوں۔ اس کے ساتھ ہی میں یہ مزید عرض کرنے کی جسارت کروں گا کہ، اگر ہماری سپاہ یونہی کھلی فضا میں اپنے موجودہ پٹاؤوں میں پڑی رہی، پھر موسم بہار تک کوئی شخص بھی صحت مند نہیں رہے گا۔

مجھ جیسے ضعیف و ناتواں اور عمر رسیدہ شخص کے کندھوں پر جو عظیم اور رفیع الشان فریضہ ڈال گیا تھا، میں اس کو پایہ تکمیل تک پہنچانے میں ناکام رہا ہوں اور یوں میں ہر شخص کی نگاہوں میں ذلیل و خوار ہو گیا ہوں۔ اس لیے میں آپ سے یہ مؤدیانہ گزارش کروں گا کہ مجھے اپنی حیات مستعار کے بچے کچھ ایام دہاتی فضا میں گزارنے کی اجازت مرحمت فرمائی جائے۔ میں آپ کی عنایت خسروانہ کا یہیں ہسپتال میں انتظار کروں گا اور یہ کہ مجھے فوج کے سپہ سالار کی بجائے محرر کا کردار ادا کرنے پر مجبور نہیں ہونا پڑے گا۔ میری سوتیلی سے رتی برابر ترقی نہیں پڑے گا۔ یوں سمجھیں کہ کوئی نابینا شخص فوج سے رخصت ہو گیا ہے۔ روس میں مجھ جیسے ہزاروں لوگ موجود ہیں۔

فیلڈ مارشل صاحب کو گلہ اسپر اظہر کی ذات بابرکات سے ہے اور نزلہ بر عضو ضعیف می ریز و سزاہم سب کو دیتے ہیں۔ اسی کا نام مطلق ہے!

یوں ایکٹ اول ختام پذیر ہوتا ہے۔ اس کے بعد کے منظر پہلے کی نسبت کہیں زیادہ دلچسپ اور مضحکہ خیز ہیں۔ فیلڈ مارشل صاحب کی روانگی کے بعد یوں معلوم ہوتا ہے کہ دشمن ہمارے سر پر آچکا ہے اور ہمارا اس کے ساتھ ٹکراؤ مانا ہو کر رہے گا۔ سینارٹی کے اعتبار سے بکس ہیولن کمانڈر انچیف بن جاتا ہے لیکن جڑ بے تک سین کو اس سے اتفاق نہیں ہے، خاص طور پر اس لیے کیونکہ غنیم کی زد میں صرف وہ

لاگا (saddle-sore): لاگا پنجابی زبان کا لفظ ہے۔ مجھے اردو میں اس کا متبادل نہیں مل سکا۔ گھوڑے کی گچی پشت پر سزکے سے

کھال پر گر آ جاتی ہے اور وہ سرخ ہو جاتی ہے۔ تکلیف کا احساس بھی ہوتا ہے۔ (مترجم)

اور اس کے دستے ہیں۔ چنانچہ وہ اس موقع سے پورا پورا فائدہ اٹھانا چاہتا ہے اور جرموں کے بقول وہ جنگ جو اس کے ”سربراہ“ پہنچی ہے، وہ اسے لڑنا چاہتا ہے۔ وہ لڑتا ہے۔ یہ پلٹسک کی لڑائی ہے۔ اسے فتح عظیم گردانا جاتا ہے۔ لیکن میری رائے میں اسکی کوئی بات نہیں ہے۔ جیسا کہ تم جانتے ہو، کہ یہ فیصلہ کرنے کے لیے لڑائی جیتی گئی ہے یا اس میں ہار ہوئی ہے، ہم غیر فوجیوں نے بڑا ناگوار قسم کا معیار مقرر کر رکھا ہے۔ معرکے کے بعد جو فریق پسپائی اختیار کرتا ہے، ہماری نظروں میں وہ شکست خوردہ ہوتا ہے۔ اس اصول کی روشنی میں ہم نے پلٹسک کی لڑائی ہار دی تھی۔ قصہ مختصر لڑائی کے بعد ہم پسپائی اختیار کرتے ہیں لیکن پیٹرز برگ جو ہر کارہ بھیجتے ہیں، وہ فتح کی نوید لے کر جاتا ہے۔ چنانچہ جنرل بے نگ سین فوج کی کمان بکس ہیڈن کے سپرد نہیں کرتے بلکہ اس امید میں اس کے ساتھ چٹے رہتے ہیں کہ انھوں نے جو (نام نہاد) فتح حاصل کی ہے، اس کے صلے میں انھیں کاٹھراجیف کے مہدے پر سر فرما کر دیا جائے گا۔ اس وقت کے دوران میں ہم انتہائی دلچسپ اور انوکھی چالیں چلتے ہیں ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ ہم دشمن پر حملہ کرنے یا اس سے یہو بچانے کی تدابیر اختیار کرتے لیکن ہم اپنے اصل مقصد سے کنارہ کشی کر لیتے ہیں اور سارا زور اس بات پر لگا دیتے ہیں کہ ہم جنرل بکس ہیڈن کو جسے سینارٹی کے اعتبار سے ہمارا کمانڈر، چیف ہونا چاہیے تھا، کیسے غچہ دے سکتے ہیں۔ ہم اپنے مقصد کے حصول کے لیے اتنا زور لگاتے ہیں کہ ہم ایک ایسے دریا کو، جسے بل کے بغیر عبور نہیں کیا جاسکتا، عبور کر لیتے ہیں، پلوں کو نذر آتش کر دیتے ہیں تاکہ دشمن ادھر نہ آ سکے، ورنہ دشمن فی الحال یونا پارٹ نہیں بلکہ بکس ہیڈن ہے۔ جنرل بکس ہیڈن ہمارے تعاقب کرتا ہے۔ اور ہم مری تڑا کر بھاگ اٹھتے ہیں۔ جونہی وہ دریا عبور کر کے ہمارے کنارے پہنچتا ہے، ہم دوبارہ دریا عبور کرتے ہیں اور ایک بار پھر دوسرے کنارے پر پہنچ جاتے ہیں۔ بالآخر ہمارا دشمن بکس ہیڈن ہمارے سر پر پہنچ جاتا ہے اور ہم پر حملہ کر دیتا ہے۔ دونوں جرنیلوں کا پارہ چڑھ جاتا ہے۔ ایک موقع پر ہیڈن تو ڈوڈنل کا چیلنج بھی دے دیتا ہے اور دوسرے موقع پر بے نگ سین کو مرگی کا دورہ پڑ جاتا ہے۔ لیکن اس نازک موقع پر وہ ہر کارہ، جو پلٹسک کی فتح کی خبر لے کر پیٹرز برگ گیا تھا، بطور کمانڈر چیف ہماری تقرری کا فرمان لے کر پہنچ جاتا ہے اور یوں ہمارا دشمن نمبر ایک بکس ہیڈن ڈھیر ہو جاتا ہے اور اب ہم اپنی توجہ اپنے دشمن نمبر 2۔ یونا پارٹ۔ پر مبذول کر سکتے ہیں لیکن خدا کی مار، اس موقع پر ایک نیگل کھل جاتا ہے اور ہمارا دشمن نمبر 3 ہمارے بالتقابل تن کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ ہماری کیکر کی فقیر سپاہ روٹی، گوشت، بیکٹوں، چارے اور چٹائیں کن کن الم غلم اشیا کا مطالبہ شروع کر دیتی ہے اذخار ختم ہو چکے ہیں اور شاہر ہیں ناقابل عبور بن گئی ہیں۔ کیکر کی فقیر سپاہ لوٹ مار کرنے لگتی ہے اور وہ بھی ایسے اندازے جس کا ہماری گزشتہ ہم سے تم کوئی اندازہ نہیں لگا سکتے۔ آدھی راتیں جھٹوں میں بٹ جاتی ہیں اور وہ ریہات کی لہنت سے لہنت بجا دیتی ہیں۔ جو چیز بھی ان کے سامنے آتی ہے، اسے یا تو نذر آتش کر دیتی ہیں یا تلوار

کے گھاٹ اتار دیتی ہیں۔ مقامی باشندے بالکل تباہ و برباد ہو چکے ہیں۔ ہسپتال مریضوں اور زخمیوں سے لٹے پڑے ہیں اور قحط سہا کا دور دورہ ہے۔ قارتی و دمرتجہ ہمد کو اور فرز پر بھی حملہ کر چکے ہیں اور کمانڈر ایچیف کو انھیں بھگانے کے لیے بلالین بلانا پڑی۔ ایک حصے کے دوران میں وہ میرا خالی ٹریک اور ڈریسنگ گاؤں بھی لے آئے۔ امپراطور سوچ رہے ہیں کہ تمام ڈویژن کمانڈروں کو ان قارتوں کو گولیوں سے بھونسنے کی اجازت دے دی جائے لیکن مجھے اندیشہ ہے کہ اس قسم کے حکم کا نتیجہ یہ ہوگا کہ نصف فوج بقیہ نصف فوج ہلاک کرنے پر مجبور ہو جائے گی۔

شروع میں تو پرنس آندرے صرف نظریں ہی دوڑاتا رہا لیکن اپنی ذہنی کیفیت کے باوجود وہ کچھ ہی دیر بعد (اگرچہ وہ ابھی طرح جانتا تھا کہ اسے بلیمن کی باتوں کا کس حد تک اعتبار کرنا چاہیے) وہ جو کچھ پڑھ رہا تھا، اس میں اس کی دلچسپی بہ لحظہ بڑھتی گئی۔ جب وہ یہاں تک پڑھ چکا، اس نے خط مسلسل ڈالا اور اسے پرے پھینک دیا۔ اسے کہتے ہیں کہ وہ پڑھ رہا تھا، نہیں ہو رہی تھی بلکہ اس بات سے کہ وہاں کی زندگی، جس سے اس کا ناٹا ٹوٹ چکا تھا اب بھی اسے مضطرب کر سکتی تھی۔ اس نے اپنی آنکھیں میچ لیں اور اپنے ہاتھوں سے یوں اپنی پیشانی مسلنے لگا گویا جو کچھ اس نے پڑھا تھا، اس کی یادیں اپنے ذہن سے کھرچ دینا چاہتا ہو۔ پھر اس کی تمام تر توجہ ان آوازوں پر، جو سرری سے آ رہی تھیں، مبذول ہو گئی۔ اچانک اسے محسوس ہوا کہ اسے دروازے میں سے کوئی عجیب و غریب آواز سنائی دے رہی ہے۔ خوف و ہراس نے اسے اپنی گرفت میں لے لیا۔ اسے اندیشہ لاحق ہونے لگا کہ جب وہ خط پڑھنے میں کوفہ اس دوران میں بچے کو کچھ ہونہ گیا ہو۔ وہ اٹھا، دبے پاؤں چلتا سرری کے دروازے تک پہنچا اور اسے دیکھ کر دیا۔

جونی وہ اندر داخل ہوا، اس نے دیکھا کہ زس، جس کی خوف سے گھٹکی بندھی ہوئی تھی، اس سے کچھ چھپانے کی کوشش کر رہی ہے اور یہ کہ پرنس ماریا پالنے کے قریب نہیں ہے۔

”نائی ڈیرا“ اسے یہ الفاظ یوں سنائی دیے جیسے اس کی ہمشیرہ اس کے عقب میں کھڑی ہو اور مایوسی کے عالم میں اس سے سرگوشیاں کر رہی ہو۔

جیسا کہ عام طور پر ہوتا ہے کہ وہ بے خواب راتوں اور مطوّل تفکرات کے بعد غیر منطقی خوف و ہشت کی گرفت میں آچکا تھا۔ ایک ایسی کوندے کی طرح یہ خیال اس کے ذہن میں پکا کہ بچہ اللہ کو پیارا ہو چکا ہے۔ جو کچھ اسے دکھائی اور سنائی دیا، وہ اس کے دوسروں کی توثیق کرتا نظر آتا تھا۔

”قصہ تمام ہوا“ اس نے سوچا اور اس کی پیشانی پر ٹھنڈا پسینہ آ گیا۔ وہ اپنے آپ میں نہیں تھا اور جوں توں کر کے پالنے کے قریب پہنچا۔ اسے یقین تھا کہ پالنا خالی ہوگا اور یہ کہ زس مرحوم بچے کو چھپانے کی کوشش کر رہی ہے۔ اس نے پردے ایک طرف ہٹائے۔ کافی دیر تک اس کی نگاہیں، جو کسی ایک جگہ ٹھہر نہیں رہی تھیں اور جن میں اندیشہ جھلک رہے تھے، کچھ نہ دیکھ سکیں۔ آخر کار وہ اسے نظر آ ہی گیا۔ بچہ، جس کے گال تندرست تھے، ہلکے ہلکے

کراچی جگہ سے ہٹ چکا تھا اور اب وہ پائے کے آر پار لیٹا ہوا تھا۔ اس کا سر نیچے سے ڈھلک چکا تھا، اور اس کے لبوں سے کچھ اس قسم کی آواز آرہی تھی جیسے وہ کچھ چوس رہا ہو اور وہ ہموار انداز سے سانس لے رہا تھا۔

پرنس آندرے نے جب بچے کو اس کیفیت میں دیکھا، وہ دیر انداز وار مسرت سے جھوم گیا۔ اسے کچھ یوں محسوس ہوا جیسے بچہ اس سے چھٹن چکا تھا، اور اب وہ دوبارہ اس کی تحویل میں آگیا ہو۔ وہ اس کے اوپر جھک گیا اور بالکل اسی طرح جس طرح اس کی ہمشیرہ نے اسے سمجھایا تھا، اس نے اپنے ہونٹ اس کے جسم کے ساتھ لگا دیے اور یہ معلوم کرنے کی کوشش کرنے لگا کہ آیا اس کا جسم ابھی تک پہلے کی طرح گرم ہے۔ بچے کی نرم دھات پیشانی تر تھی۔ پرنس آندرے نے اپنا ہاتھ اس کے ننھے منے سر پر رکھ دیا۔ بچے کو اتنا زبردست پسینہ آیا تھا کہ اس کے بال بھی ہلکے چمکے تھے۔ نہ صرف یہ کہ بچے کا انتقال نہیں ہوا تھا، بلکہ اس کے برعکس ہر علامت سے یہ واضح ہو رہا تھا کہ نازک مرحلہ گزر چکا ہے، اور اب وہ رو بہ صحت ہے۔ پرنس آندرے کے دل میں یہ شدید خواہش پیدا ہوئی کہ وہ اس کمزور و ناتواں مخلوق کو جھپٹ کر اٹھالے اور اسے اپنے سینے سے لگا کر بھینچ لے لیکن اس میں اس کا حوصلہ نہیں تھا۔ وہ اس کے سر بالیں کھڑا رہا، اور اس کے سر، ننھے منے بازوؤں اور ٹانگوں کو، جو کبل کے نیچے نظر آرہی تھیں، بغور دیکھا۔ اسے اپنے قریب سرسراہٹ سنائی دی اور پالنے کے جھتر کے نیچے سایہ بہرایا۔ اس نے قطعاً ادھر ادھر نگاہ نہ کی بلکہ وہ، ابھی تک بچے کا چہرہ دیکھنے میں محو تھا اور اس کی سانس کے باقاعدہ زیر و بم پر نظرس جمائے ہوئے تھا۔ تاریک سایہ پرنس ماریا کا تھا، وہ بے آہٹ چلتی پالنے تک آئی تھی۔ اس نے پردے اٹھائے اور اپنے پیچھے گرا دیے۔ پرنس آندرے گرد و پیش نظرس دوڑائے بغیر اسے پہچان گیا اور اس نے اپنا ہاتھ اس کی جانب بڑھا دیا۔ وہ سے رہا نے لگی۔

”اسے پیسا آ رہا ہے،“ پرنس آندرے نے کہا۔

”میں یہی آپ کو بتانے آئی تھی۔“

بچے نے غیند میں خفیف سی حرکت کی، وہ مسکرایا اور اس کی پیشانی نیچے سے رگڑ کھا گئی۔

پرنس آندرے نے اپنی ہمشیرہ کی جانب دیکھا۔ چھتر کے مدھم سائے میں پرنس کی روشنی و تاباں آنکھیں معمول سے کہیں زیادہ چمک رہی تھیں کیونکہ وہ خوشی کے آنسوؤں سے بریز رہی تھیں۔ وہ اپنے بھائی پر جھکی اور اس نے اس کی پیشانی پر بوسہ ثبت کر دیا۔ اس عمل کے دوران میں پالنے کا پردہ ذرا سا کھسکا۔ دونوں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے کو سخت طریقے سے اشارہ کیا اور وہ چھتر کے مدھم سائے تلے پتھر کے بت بن کر کھڑے ہو گئے جیسے وہ اس گوشہ تنہائی کو، جہاں وہ تینوں باقی دنیا سے الگ تھلک اور اکیسے تھے، چھوڑنے کے لیے تیار نہ ہوں۔ پرنس آندرے نے جہل کی اور وہاں سے ہٹنے لگا۔ اس کے بال پردے سے ٹکرا رہے اور بے ترتیب ہو رہے تھے۔

”ہاں، میرے پاس بس یہی ایک چیز باقی رہ گئی ہے،“ اس نے ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے سوچا۔

میسوں کی برادری میں اپنی شمولیت کے چند روز بعد ہی میئر نے صوبہ کیف کا، جہاں اس کے زرعی غلاموں کی سب سے زیادہ تعداد آباد تھی، رخ کیا۔ اس نے اپنی جاگیروں میں کیا کرنا تھا، اس سلسلے میں اس کے پاس کھس ہدایات تھیں۔ یہ اس نے کاغذ پر تحریر کر لی تھیں۔

کیف پہنچنے کے بعد میئر نے اپنے تمام سٹیوارڈوں (منتظمین) کو اپنے دفتر بلایا اور ان کے سامنے اپنے عزائم و خواہشات کی وضاحت کی۔ اس نے انھیں بتایا کہ غلاموں کو آزاد کرنے کے لیے بلاتا خیر اقدامات کے جائیں گے اور جب تک یہ منصوبہ پایہ تکمیل تک نہیں پہنچ جاتا، ان سے ضرورت سے زیادہ محنت و مشقت نہیں لی جائے گی۔ جن عورتوں کے بچے ہیں، انھیں کام پر نہیں بھیجا جائے گا۔ کسانوں کو مدد و بہم پہنچی جائے گی۔ جسران سزاؤں سے کریم کیا جائے گا اور صرف زبانی سرزنش کی جائے گی۔ ساری جاگیروں میں شفا خانے، مدرسے اور محتاج گاہیں تعمیر کی جائیں گی۔ بعض منتظمین (ان میں نیم خواندہ نگران شامل تھے) نے یہ سمجھ کر نوجوان کاؤنٹ نے اپنی گفتگو میں ان کی بدانتظامیوں اور بدعنوانیوں پر اظہارِ ناپسندیدگی کیا ہے اور وہ اس کی باتیں سن کر رعبید ہوئے۔ بعض ابتدا میں تو کچھ پریشان ہوئے لیکن انھوں نے اپنی گھبراہٹ پر جلد قابو پالیا۔ میئر تقریر کے دوران ان میں جس طرح کفایت کھا رہا تھا اور جو نئے نئے الفاظ، جواںمہوں نے ازیں قبل کبھی نہیں سنے تھے، استعمال کر رہا تھا، وہ ان سے خاصے محفوظ ہو رہے تھے۔ بعض ایسے بھی تھے جنھیں محض اس چیز سے لطف آ رہا تھا کہ ان کا آقا کس قسم کی باتیں کر رہا ہے۔ تاہم جو تھا گروہ، جو نسبتاً ذہین منتظمین پر مشتمل تھا اور جن میں چیف سٹیوارڈ (منتظم اعلیٰ) بھی شامل تھا، اس گفتگو سے یہ اندازہ لگانے لگا کہ اپنا الو سیدھا کرنے کے لیے انھیں اپنے آقا سے کس طرح چننا ہوگا۔ چیف سٹیوارڈ نے میئر کے منصوبوں کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کیا، تاہم اس نے اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ یہ اختراعات اپنی جگہ بجا ہیں لیکن انھیں تمام معاملات کا ٹھوک بجا کر جائزہ لینا ہوگا کیونکہ حالات خاصے دیگر گروں ہو رہے ہیں۔

میئر کو کاؤنٹ پر و خوف کی بے پناہ دولت وراثت میں ملی تھی اور اس کی سالانہ آمدنی بھی، جس کے متعلق کہا جاتا تھا کہ وہ پانچ لاکھ روپے تک پہنچ جاتی تھی، کچھ کم نہ تھی، اس کے باوجود اسے یہ محسوس ہوتا تھا کہ جب سے اسے یہ سب کچھ ملا ہے، وہ اتنا امیر نہیں رہا جتنا کہ وہ اپنے آپ کو اس وقت محسوس کرتا تھا جب اسے اپنے باپ سے صرف دس ہزار روپے سالانہ سالانہ دس حاصل ہوتا تھا۔ اس کے ذہن میں اپنے بجٹ کا جو مبہم سا خاکہ تھا، وہ کچھ اس قسم کا تھا: مختلف جاگیروں کے لیے زرعی بنک سے جو قرضے لیے گئے تھے، اسی ہزار روپے سالانہ ان کی ادائیگی پر اٹھ جاتے تھے۔ ماسکو کے مصفاات میں جاگیر اور مکانات تھے اور شہر میں حویلی تھی۔ ان کے انتظام و انصرام، درختوں پر نرسوں کے الاؤنس پر تھیں ہزار روپے صرف ہو جاتے تھے۔ پندرہ ہزار روپے پنشنوں کی ادائیگی میں نکل جاتے

تھے، اور اتنی ہی رقم خیراتی اداروں میں بانٹ دی جاتی تھی۔ ڈیڑھ لاکھ روپے کا ڈنٹس کا ذاتی خرچہ تھا۔ دوسرے قرضوں پر جو سود بٹا پڑتا تھا، وہ ستر ہزار روپے تھا۔ دو سال قبل اس نے گرجے کی تعمیر کا بیڑا اٹھایا تھا، اس میں اسے دس ہزار روپے سالانہ خرچ کرنا پڑ رہے تھے۔ بے دے کر جو ایک لاکھ روپے باقی بچتے تھے، اسے کچھ معلوم نہیں تھا کہ وہ کیسے خرچ ہو رہے ہیں اور اسے تقریباً ہر سال قرضہ لینا پڑتا تھا۔ مزید برآں اس کا چیف سٹیوارڈ اسے اس قسم کی اطلاعات بہم پہنچاتا رہتا تھا کہ فداں جگہ آگ لگ گئی ہے، فصیلیں خراب ہوئی ہیں اور ٹیکسٹریوں اور ورکشاپوں کی تعمیر نو ہونا چاہیے۔ چنانچہ میئر کو جس ولین کام سے پشیمان پڑ رہا تھا وہ عملی کاروبار تھا اور یہی وہ کام تھا جس کے کرنے کی ذمہ داری اس میں مدد جیت تھی اور نہ اس کا طبعی میلان اس طرف تھا۔

میئر ہر روز اپنے چیف سٹیوارڈ کے ساتھ مختلف امور کا جائزہ لیتا لیکن اسے محسوس ہو رہا تھا کہ معاملات یک لکڑ بھی آگے نہیں بڑھ رہے۔ اسے احساس ہو رہا تھا کہ اس کے ان مشوروں کا حقیقی معاملات سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ ایک طرف اس کا چیف سٹیوارڈ تھا۔ وہ معاملات کو مسلسل بدترین صورت میں پیش کر رہا تھا اور جیم اصرار کر رہا تھا کہ تمام قرضوں کو ادا کرنا اور زرعی غلاموں کی مدد سے نئے منصوبوں کا، جس سے میئر متعلق نہیں ہو رہا تھا، آغاز کرنا ضروری ہے۔ دوسری طرف میئر مطالبہ کر رہا تھا کہ غلاموں کو آزاد کرنے کے سلسلے میں اقدامات کیے جائیں۔ چیف سٹیوارڈ اس کا توڑیوں کرتا تھا کہ وہ زرعی بنک کے قرضوں کی فوری ادائیگی کی ضرورت ثابت کرنے لگتا اور نتیجتاً غلاموں کی برصغیر آزادی کو ناممکن بنا دیتا۔

سٹیوارڈ نے یہ تو نہ کہا کہ یہ بالکل ہی ناممکن ہے تاہم، اس نے یہ تجویز پیش کی کہ اگر کاست روڈ¹⁸ صوبے کے جنگلات، زمینیں دریا کے کنارے واقع اراضی اور کریمیا کی جاگیر فروخت کر دی جائے، پھر اسے ممکن بنایا جاسکتا ہے۔ لیکن جنگلات اور اراضی کی فروخت اتنا آسان کام نہیں ہے۔ اس سلسلے میں بڑی پیچیدگیاں اور الجھنیں مائل ہیں۔ مختلف عدالتوں اور محکموں نے جو انتظامی احکام جاری کر رکھے ہیں، انھیں منسوخ کرنا پڑے گا، جگہ جگہ درخواستیں دیٹا پڑیں گی، اجازت نامے حاصل کرنا ہوں گے، وغیرہ وغیرہ تب کہیں ان کی فروخت کا مرحلہ آئے گا۔ یہ اس قسم کی بھول بھلیاں تھیں کہ میئر بالکل چکرا گیا اور وہ صرف اتنا کہہ سکا: ”ہاں، ہاں، یہی کرو۔“

میئر میں اس عملی مستقل مزاجی کا، جو اسے اپنا کاروبار خود سنبھالنے کے قابل بناسکتی تھی، فقدان تھا۔ چنانچہ اسے کاروبار سے گھٹن آتی تھی لیکن سٹیوارڈ کے سامنے وہ یوں بننے کی کوشش کر رہا تھا جیسے وہ سب کچھ سمجھتا ہو اور اس پر پوری توجہ دے رہا ہو۔ جہاں تک سٹیوارڈ کا تعلق ہے، وہ میئر کے سامنے کچھ اس قسم کی اداکاری کر رہا تھا کہ وہ جو آپس میں صلاح مشورے کر رہے ہیں، وہ اس کے خیال کے مطابق اس کے آقا کے لیے تو سودمند ہیں لیکن خود اس کے لیے خاصے تکلیف دہ اور بے آرائی کا باعث ہیں۔

کیف خاصا بڑا شہر تھا۔ وہاں اس کی مذاقات کچھ اپنی جان پہچان کے لوگوں سے ہو گئی۔ دوسروں نے اس دولت مند نووارد سے، جو صوبے کا سب سے بڑا جاگیردار تھا، متعارف ہونے اور اسے پر جوش انداز سے

خوش آمد یہ کہنے میں کوئی تاخیر نہ کی۔ وہ اخلاق کمزوری، جس سے جان چھڑنا اس کے لیے قریب قریب ناممکن تھا۔ اور جس کا فری میسنوں کی جماعت میں شمولیت کے دوران میں اس نے اعتراف بھی کیا تھا۔ اس کی تسکین کے لیے یہاں اتنی ترغیبات تھیں کہ وہ ان کی تاب مقاومت نہ دے سکا۔ ایک بار پھر پیئر برگ کی طرح یہاں بھی اس کے پورے پورے ایام، ہفتے اور مہینے پارٹیوں، عشائیوں، سہ پہر کے کھانوں اور اجتماعی رقص کی محفلوں کی نذر ہونے لگے۔ ان پیہم مصروفیات کا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ یہاں بھی اسے سوچ بچار کا ایک لمحہ تک میسر نہ آیا۔ اس نے جو باطنی حیات اختیار کرنے کی امیدیں باندھی تھیں، وہ نقشِ بر آب ثابت ہوئیں اور وہ ایک بار پھر پرانی ڈگر پر چل رہا تھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ ماحول تبدیل ہو گیا تھا۔

جہاں تک فری میسنوں کے تین اصولوں کا تعلق تھا، پیئر کو یہ اقرار کرتے بنی کہ وہ اس اصول کی، جو ہر مہم کو یہ تلقین کرتا تھا کہ اسے دوسروں کے سامنے راست بازی کا نمونہ بن کر پیش ہونا چاہیے، پاسداری نہیں کر رہا۔ وہ یہ بھی مان رہا تھا کہ وہ حسرتِ ہفت میں سے دو۔ اخلاقیات اور حُبِ مرگ۔ میں بالکل کورہا ہے۔ تاہم وہ یہ سوچ کر دل کو تسلی دے لیا کرتا تھا کہ وہ ایک اور اصول۔ بنی آدم کی اصلاح دہہو۔ پر تو عمل پیر تھا۔ پھر اس میں چند اور خوبیاں بھی تھیں۔ وہ پڑوسیوں سے محبت کرتا تھا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ فیاض تھا۔

1807 کے موسمِ بہار میں پیئر نے پیئر برگ واپس جانے کا فیصلہ کر لیا۔ اس کا ارادہ تھا کہ واپس کے سفر کے دوران میں وہ اپنی تمام جاگیروں کا معائنہ کرے گا اور اپنی آنکھوں سے دیکھے گا کہ اس کے احکام کی کس حد تک تعمیل ہوئی ہے۔ وہ یہ بھی معلوم کرے گا کہ زرعی غلام، جنہیں خداوند نے اس کی تحویل میں دیا تھا اور جنہیں شفقت پہنچانے کی وہ پوری کوشش کر رہا تھا، اب کن حالوں میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔

چیف سٹیوارڈ نے، جس کی نگاہوں میں کاؤنٹ کے منصوبے قریب قریب جنونی تھے، ان میں اس کی اہم مالک کی اور نہ کسانوں کی بھلائی تھی، زرعی غلاموں کو چند رعایات دے دی تھیں۔ وہ ان کی آزادی کو تو ناممکن، عمل بنا کر پیش کرتا رہا تاہم اس نے تمام جاگیروں میں مدارس، شفاخانے اور محتاج گاہیں قائم کرنے کی غرض سے بڑی بڑی عمارتیں تعمیر کرنے کے احکام دے دیے۔ ہر جگہ آقا کے استقبال کی تیاریاں کی گئیں۔ تاہم اس سلسلے میں بڑے صوبہ جیٹن اور رقص دہرو کی محفلیں برپا کرنے سے گریز کیا گیا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ پیئر انہیں پسند نہیں کرے گا۔ ان کی بجائے شکرانے کی مجالس منعقد کی گئیں۔ ان میں لوگوں کو ایقونات کی زیارت کرانی جاتی اور ان کی تواضع رونی اور ٹنک سے کی جاتی۔ جہاں تک وہ اپنے آقا کے کردار کو سمجھ سکا تھا، اس کا خیال تھا کہ وہ ان طور طریقوں سے، سے متاثر بھی کر سکے گا اور اسے خل بھی دے سکے گا۔

دکھتی بہار، ساختہ ویانا گاڑی میں آرام وہ اور تیز رفتور سفر اور سونی شاہراہ، ان تمام چیزوں نے دیکر کا دل خوش کر دیا۔ جن جاگیروں کا اس نے پہلے کبھی دورہ نہیں کیا تھا، ان میں سے ہر ایک پہلی سے بڑھ کر خوبصورت اور دل آویز دکھائی دے رہی تھی۔ وہ جہاں بھی گیا، کسان بظاہر خوشحال نظر آئے اور انہیں جن عنایات سے بہرہ ور کیا

کیا تھا، معلوم ہوتا تھا کہ انہوں نے ان کے قلوب پر گہرا اثر کیا ہے اور وہ بے حد ممنون و مشکور ہیں۔ ہر جگہ اس کا وابہ نہ انتقال کیا گیا۔ اس سے بیٹر کو شرمندگی کا احساس ضرور ہوتا تھا تاہم اپنی اس قدر افزائی پر وہ خوشی سے پھولا نہیں مانتا تھا۔ ایک مقام پر کسانوں نے اسے روٹی، نمک اور سینٹ پیٹر اور سینٹ پال کا ایقونہ پیش کیا اور اس کے ساتھ ہی انہوں نے گزارش کی۔ ”آپ نے جو کچھ ہمارے لیے کیا ہے، اس کے عوض بچے تشکر اور محبت کی نشانی کے طور پر ہمیں اپنے خرچ پر آپ اپنے سرب سینٹ پیٹر اور سینٹ پال کے اعزاز میں کلیسا سے ملحق نئی خانقاہ موقوفہ¹⁹ تعمیر کرنے کی اجازت مرحمت فرمائیں۔“ ایک اور مقام پر اس کی خدمت میں چند خواتین پیش ہوئیں۔ وہ بازوؤں میں دودھ پیتے بچے اٹھائے ہوئے تھیں۔ وہ اس کا شکریہ ادا کرنے آئی تھیں کہ اس نے انھیں محنت شاقہ سے نجات دلائی ہے۔ قیصری جاگیر پر اس کی ملاقات ایک پادری سے ہوئی۔ اس نے صلیب اٹھا رکھی تھی اور اس کے ارد گرد بچوں کا ہجوم تھا۔ وہ اسے یہ بتانے آیا تھا: ”صاحب، آپ کی دریا دلی کے طفیل میں ان بچوں کو بڑھنا لکھنا سکھایا جا رہا ہے اور انہیں دین کی تعلیم دے رہا ہوں۔“ اس نے اپنی تمام جاگیروں میں اپنی آنکھوں سے اینٹوں کی عمارتیں دیکھیں۔ یہ عمارتیں تو تعمیر ہو چکی تھیں یا تعمیر کے مراحل طے کر رہی تھیں۔ ان سب کا نقشہ یکساں تھا۔ ان میں تقریباً ہر س، شفا خانے اور محتاج گاہیں قائم کی جانا تھیں۔ اس نے ہر جگہ منتظمین کے حساب کتاب کا جائزہ لیا۔ جائزے کے دوران میں اس امر کا عندیہ ملتا تھا کہ جبری مشقت میں تخفیف کر دی گئی ہے۔ ہر مقام پر نیلے کوٹوں میں بیوی کسانوں کے نمائندے اس کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے اور تہہ دل سے اس کا شکریہ ادا کرتے تھے۔

جس بات کا بیٹر کو علم نہیں تھا، وہ یہ تھی کہ جس گاؤں میں اسے روٹی اور نمک پیش کیا گیا تھا اور جس باشندوں نے اس سے سینٹ پیٹر اور سینٹ پال کے اعزاز میں خانقاہ موقوفہ تعمیر کرنے کی اجازت مانگی تھی، وہ میلگاؤں (مارکیٹ پلیس) تھا۔ یہاں ہر سال سینٹ پیٹر کے یوم پر میلہ منعقد ہوتا تھا اور جو کسان وفد بنا کر اس کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے، وہ کھاتے پیتے لوگ تھے اور بدلتوں پہلے خانقاہ موقوفہ کی تعمیر شروع کر چکے تھے جب کہ گاؤں کے نوے فیصدی کسان انتہائی مفنوک الہی اور مفلسی کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ بسب سے اس نے یہ حکم دیا تھا کہ دودھ پلانے والی بواؤں کو اس کی زمینوں پر کام کرنے کے لیے نہ بھیجا جائے، انھیں اپنے قطعات اراضی پر پیسے سے بھی کہیں زیادہ جان توڑ محنت مشقت کرنا پڑتی تھی۔ وہ اس امر سے آگاہ نہیں تھا کہ جو پادری صلیب لٹکائے اس سے ملاقات کرنے آیا تھا، وہ کسانوں سے طرح طرح کے چندے وصول کرتا تھا اور یوں اس نے ان کا جینا دو بھر کر دیا تھا۔ وہ جن شاگردوں کو بچے ہمراہ لے کر گیا تھا، انھیں ”سکولوں“ اور ”سکیوں“ سے اس کے سپرد کیا گیا تھا اور پھر انھیں واگزار کرانے کے لیے ان کے والدین کو اسے بھاری رقم ادا کرنا پڑی تھی۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ منصوبے کے مطابق اینٹوں کی جو عمارتیں اٹھائی جا رہی تھیں ان کی تعمیر میں درمی کسٹروں کاخوں پسینہ شامل تھا، ان کی جبری مشقت میں محض کاغذی تخفیف ہوئی تھی جب کہ اصلاً وہ پیسے سے بھی زیادہ ہو گئی تھی۔ اسے پتا نہیں تھا کہ جب منتظمین نے حساب کے رجسٹروں میں اسے یہ دکھایا کہ زرعی غلاموں

کو جو لگان ادا کرنا پڑتا ہے، اس میں ایک تہائی کمی کر دی گئی ہے، اس وقت ان کی کھیتوں پر ماری مشقت ڈیڑھ گنا ہو چکی تھی۔ چنانچہ اپنی جاگیروں کے اس دورے کے بعد حیرت کا دل دھڑکتا ہوا سرسبز میدان سے میوے چھلنے لگا اور بیڑ برنگ سے روانہ ہونے سے قبل اس پر اسے لوگوں کے ساتھ فیاضانہ رویہ اختیار کرنے کی جو کیفیت طاری ہوئی تھی، وہ لوٹ آئی اور اس نے ”اصول ساز برادر“ (وہ گریڈ ماسٹر کو اسی نام سے پکارتا تھا) کو نہایت دلورہ انگیز خط مقرر کیا۔

”اتنی زیادہ بھلائی کرنے پر کتنی کم محنت کرنا پڑی ہے اور اس میں کھکھیڑیں بھی کتنی کم اٹھنا پڑی ہیں“ بیڑ نے سوچا۔ ”اس قسم کے کام کرنے کے لیے ہم کتنے کم ہاتھ پاؤں ہلاتے ہیں“

اس کے سامنے تشکر و احسان مندی کے جن جذبات کا ظہار کیا گیا، اس پر اسے خوشی تو ہوئی لیکن درپردہ اسے شرمندگی ہو رہی تھی کہ وہ ان کا اصول کسندہ ہے۔ اس تشکر سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ وہ ان سادہ دل اور نیک لوگوں کے لیے حریف کتنا کچھ کر سکتا ہے۔

چیف سٹیو، رڈ بالکل احمق لیکن اس کے ساتھ ہی بڑا، کائیاں شخص تھا۔ وہ ذہین و فطین لیکن سادہ لوح کاؤنٹ کو ٹھیک ٹھیک سمجھ گیا تھا اور اس کے ساتھ یوں کھیل رہا تھا جیسے بچہ کھلونے سے کھیلتا ہے۔ اس نے جب بیڑ پر ان، استقبالیوں کا، جنہیں پہلے سے سوچے سمجھے منصوبے کے تحت منظم کیا گیا تھا، یہ اثر دیکھا، وہ یہ ثابت کرنے کے لیے کہ زرعی غلاموں کو آزاد کرنا ناممکن ہی نہیں بلکہ لا حاصل بھی ہے کیونکہ وہ اپنے حال میں مست ہیں، پہلے سے بھی زیادہ قوی دلائل، جنہیں صحیح تسلیم کیے بغیر بن نہ پڑے، پیش کرنے لگا۔

اپنے یہاں خانہ دل میں بیڑ چیف سٹیو رڈ سے متفق تھا کہ ان سے زیادہ خوش و خرم لوگوں کا تصور محال ہے اور اگر انہیں آزاد کر دیا گیا، پھر خدا جانے ان کا کیا بے گناہ ہو گا۔ تاہم وہ جس چیز کو درست سمجھتا تھا، بدلہ ناخوشی سے ہی سہی، اس پر اصرار ضرور کرتا تھا۔ چیف سٹیو رڈ نے وعدہ کیا کہ جس قدر ممکن ہو، وہ کاؤنٹ کی خواہشات پورا کرنے کی کوشش کرے گا۔ وہ تاڑ گیا تھا کہ کاؤنٹ کے لیے یہ کبھی ممکن نہیں ہو گا کہ وہ یہ محسوس کر سکے کہ اراضی اور جنگلات کی فروخت اور بینک کے قرضے سے مرہن جاسیاد چھڑانے کے ضمن میں ہر اقدام کیا گیا ہے یا نہیں بلکہ غائبانہ اس سلسلے میں کوئی پوچھ بچھ بھی نہیں کرے گا۔ در اس چیز کا تو اسے کبھی علم نہیں ہو پائے گا کہ زنجیر عمارتیں خالی پڑی ہیں اور دوسرے لوگوں کے زرعی غلاموں کی طرح ان کے زرعی غلام بھی روپے پیسے اور محنت و مشقت کی صورت میں ہی کچھ ادا کرتے رہیں گے۔ یہ الفاظ دیکھ کر کچھ ان سے ہتھیار یا جاسکتا تھا، ہتھیار یا جا رہا تھا۔

بیڑ اپنے دکھنی دورے سے بالکل شاد و مطمئن تھا۔ واپسی میں اس نے اپنے دوست بلکولسکی کے، جس سے اس کی ملاقات دو سال سے نہیں ہوئی تھی، ہاں جانے کے ارادے کو، جو مدتوں سے اس کے دل میں چل رہا تھا، عملی جامہ پہنانے کا فیصلہ کر لیا۔

آخری ڈاک چوکی پر اسے معلوم ہوا کہ پرنس آندرے باندھن میں نہیں بلکہ اس جاگیر پر، جو سے حال ہی میں ملی تھی، قیام پذیر ہے۔ چنانچہ وہ اسے ہتھکڑیاں پہنچا کر چل پڑا۔

گوچرانو جس خطے میں واقع تھا، وہ چپٹا اور غیر دلکش تھا۔ یہ زرعی کھیتوں اور فر اور برج²⁰ کے جنگلات میں گمراہ ہوا تھا۔ کہیں کہیں یہ درخت کاٹ دیے گئے تھے۔ پرنس آندرے کا فارم ہاؤس گاؤں کے، جو بڑی سڑک کے ساتھ ساتھ پھیلا ہوا تھا، سرے پر بنا ہوا تھا۔ فارم ہاؤس کے ارد گرد چھڑیوں اور درختوں کا نسبتاً نیا ذخیرہ تھا۔ جھاڑیوں کے، جن کہیں کہیں صنوبر کے قد آور درخت کھڑے تھے۔ مکان کے سامنے پانی کا حوض تھا۔ اسے حال ہی میں زمین کھود کر بنایا گیا تھا۔ پانی اس کے کناروں سے اچھل رہا تھا لیکن ابھی تک ان پر گھاس نہیں اگی تھی۔

فارم ہاؤس غلے کے گوداموں، اصطبلوں، مویشیوں کے ماڑوں، اجتماعی غسل خانوں، مین گیٹ کے قریب چوکیداروں اور دوسرے ملازمین کے کوارٹروں اور اینٹ سے بنے وسیع دھڑیل مکان پر مشتمل تھا۔ اس کے نزدیک پختہ نرس، جس پر فصلیں کوٹ کر غلہ بھوسے سے انگ کیا جاتا تھا، بنا ہوا تھا۔ مکان کے سامنے کا حصہ نیم دائرے کی شکل کا تھا اور ابھی زیر تعمیر تھا۔ مکان کے گرد گرد حال ہی میں باغیچہ بچھایا گیا تھا۔ باڑیں اور دروازے ٹھوس، مضبوط اور نئے تھے۔ پچھلے کے نیچے دو واٹر پمپ اور ایک پانی کا ڈرم، جس پر سبز روغن پھرا ہوا تھا، پڑا تھا۔ سڑکیں سیدھی اور پلے، جس کے دونوں اطراف جنگل تھے، مضبوط تھے۔ ہر چیز پر اعلیٰ کارکردگی اور دیکھ بھل کی مہر لگی تھی۔ میٹر کورسے میں چند گھریلو ملازمین ملے۔ ان سے دریافت کرنے پر اسے معلوم ہوا کہ پرنس آندرے حوض کے کنارے نو تعمیر مکان میں رہتا ہے۔ بوڑھے خدمت گارائٹن نے، جس نے پرنس آندرے کے لڑکپن میں اس کی خدمت کی تھی، میٹر کو گاڑی سے نیچے اترنے میں مدد دی اور بتایا کہ پرنس گھر پر ہی ہے۔ وہ اسے صاف ستھرے چھوٹے استقبالیہ کمرے میں لے گیا۔

میٹر کی اپنے دوست سے آخری ملاقات پیٹر برگ کے پر شکوہ اور درختوں ماحول میں ہوئی تھی۔ اس نے جب اس کا یہ چھوٹا لیکن انتہائی صاف ستھرا مکان دیکھا، وہ بہت متاثر ہوا۔ وہ تیز تیز قدم اٹھاتا ننھے سے ڈرائنگ روم میں، جس کی چھت در دیواریں ابھی تک پستر سے محروم تھیں اور جس کی فضا میں بھی تک صنوبر کی لکڑی کی بوماس ریچی کی تھی، داخل ہوا۔ وہ شاید مزید آگے جاتا لیکن اسٹین بنجوں کے بل چلتا لپک کر آگے آیا اور اس نے ایک دروازے پر دستک دی۔

”بھئیہ، کیا بات ہے؟“ کرخت اور کرہا دار آئی۔
”مہمان۔“

”اسے کہو کہ ذرا انتظار کرے“ اور کرسی پیچھے دھکیلے جانے کی آواز سنائی دی۔

میٹر برق رفتاری سے چلتا دروازے کی طرف بڑھا اور اس نے ایک ایک اپنے آپ کو پرنس آندرے کے، جو جھل خوراک لایا جائے، جھکے جنگلات سے ذخیرہ کیا ہے۔

جو ناک بھوں چڑھاتا اور پہلے کی نسبت معر نظر آ رہا تھا، بالکل کھڑے پایا۔ بیڑ اس سے پس گیا، اس نے اپنا چشمہ اتارا، اپنے دوست کے گالوں پر بوسہ ثبت کیا اور نہایت اٹھا ک سے اسے دیکھنے لگا۔

”مجھے قطعاً توقع نہیں تھی کہ تم یہاں آؤ گے۔ ویسے مجھے خوشی ہوئی ہے، پر نس آندرے نے کہا۔

بیڑ نے کچھ نہ کہا۔ اپنے دوست کی شکل و شبہات میں اسے اتنی تبدیلی نظر آئی کہ حسرت سے اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں اور اس کے لیے وہاں سے نگاہیں ہٹانا ناممکن ہو گیا۔ اس کے الفاظ میں گرم جوشی اور اس کے چہرے پر مسکراہٹ ضرور تھی لیکن اس کی آنکھیں افسردہ اور بے روح تھیں حالانکہ اس نے اپنے طور پر ن میں مسرت و شادمانی کی جوت جگانے کی پوری کوشش کی تھی۔ بات صرف اتنی نہیں تھی کہ اس کا دوست پہلے کی نسبت زیادہ لاغر، زیادہ زرد و زور اور زیادہ بالغ نظر ہو گیا تھا، بلکہ جس چہرے سے بیڑ کو سخت دھچکا لگا اور وہ اپنے آپ کو اس کی موجودگی میں بیگانہ محسوس کرنے لگتا آ نکندہ وہ اس کا عادی ہو گیا، وہ یہ تھی کہ اس کی آنکھوں سے کچھ قسم کا تاثر جھلکتا تھا اور اس کی پیشانی پر کچھ اس طرح کی لکیریں نمودار ہو گئی تھیں کہ یوں محسوس ہونے لگا تھا کہ وہ خاصے عرصے سے کسی یک ہی سوچ میں مستغرق ہے۔

جیسا کہ عام طور پر ہوتا ہے کہ دو دوست جب طویل جدائی کے بعد آپس میں ملتے ہیں، انھیں گفتگو کی خاص موضوع پر مرکوز کرنے میں خاصا وقت درکار ہوتا ہے۔ یہاں بھی یہی کچھ ہوا۔ انھوں نے ایک دوسرے سے سوالات پوچھے اور ایسی باتوں کے متعلق، جن کے بارے میں انھیں معلوم تھا کہ انھیں ذرا تفصیل سے گفتگو کرنا چاہیے، مختصر جوابات دیے۔ بالآخر گفتگو بتدریج بعض ایسے موضوعات پر جن کا انھوں نے پہلے محض سرسری ذکر کیا تھا، پھیل گئی، درودہ دونوں بڑے واقعات، مستقبل کے عزائم، بیڑ کے سفر و راس کی حالیہ سرگرمیوں، جنگ اور اس قسم کی دوسری چیزوں کے متعلق کھل کر باتیں کرنے لگے۔ بیڑ کو پرس آندرے کی آنکھوں میں جس استغراق اور باں کی پر چھائیوں نظر آئی تھیں، اب اس کی مسکراہٹ میں، جو وہ اپنے چہرے پر بکھیرے اس کی باتیں سننے میں محو تھا اور بھی قریاں دکھائی دینے لگیں۔ جب بیڑ پر مسرت جوش و خروش کے ساتھ ماضی یا مستقبل کا ذکر کر رہا ہوتا، ان میں اس وقت خاص طور پر مزید اضافہ ہو جاتا۔ کچھ یوں معلوم ہوتا تھا کہ بیڑ جو کچھ کہہ رہا ہے، پرس آندرے اس میں دلچسپی لینا تو چاہتا ہے لیکن ایسا کرنے سے قاصر ہے۔ ادھر بیڑ کو یہ احساس ستانے لگا کہ پرس آندرے کی موجودگی میں اپنے اشتیاقات، خواہشوں، اور مسرت کی امیدوں کے بارے میں بات کرنا کچھ بچا نہیں۔ فری میسلوں سے اس نے جو خیالات اخذ کیے تھے اور جنہیں اس کے حالیہ دورے نے حیات نو بخش دی تھی اور انہیں مضبوط دوا بنا دیا تھا، اب ان کے متعلق گفتگو کرتے اسے شرمندگی محسوس ہونے لگی۔ اس نے اپنے آپ کو رد کا کیونکہ اسے یہ خوف آنے لگا تھا کہ کہیں وہ بالکل ہی سادہ لوح نظر نہ آئے۔ اس کے ساتھ ساتھ اس کی یہ خواہش، جس کی مزاحمت کرنا اس کے بس کی بات نہ تھی، ہر اٹھا رہی تھی کہ وہ اپنے دوست کو جلد از جلد یہ بتا دے کہ جس بیڑ کو پرس آندرے پیڑز برگ میں جانتا تھا، اب وہ اس سے بالکل مختلف اور بہتر انسان ہے۔

”میں تمہیں بتا نہیں سکتا کہ اس وقت سے مجھے کن کن حالات میں سے گزرنا پڑا ہے۔“

”ہاں، ہم اس ایام کے بعد بہت زیادہ بدل گئے ہیں،“ پرنس آندرے نے کہا۔

”خیر، تم اپنی سزاؤں، میئر نے کہا۔“ تمہارے کیا عزائم ہیں؟“

”عزائم؟“ پرنس آندرے نے طنز یہ انداز سے دہراتے ہوئے کہا ”میرے عزائم؟“ اس نے ایک بار پھر

کہا گویا اس لفظ نے اسے دریائے حیرت میں غوطہ زن کر دیا ہو۔ ”تم دیکھ رہے ہو کہ میں نگار میں تعمیر کر رہا ہوں۔ میرا ارادہ ہے کہ میں آئندہ سال یہاں مکمل طور پر منتقل ہو جاؤں۔“

میئر چپ ہو گیا اور پانچس نگاہوں سے پرنس آندرے کا چہرہ، جو پہلے کی نسبت کہیں زیادہ کہن سال ہو گیا تھا، دیکھنے لگا۔

”نہیں، میرا مطلب یہ معلوم کرنا تھا“ میئر نے کہنا شروع کیا لیکن پرنس آندرے نے اسے ٹوک دیا۔

”لیکن میرے متعلق باتیں کرنے کا فائدہ؟ تم مجھے بتاؤ، تم مجھے بتاؤ کہ تمہارا سفر کیسے رہا، تم اپنی جاگیروں پر کیا کرتے رہے ہو؟“

میئر اسے بتاتے لگا کہ اس نے اپنی جاگیروں پر کیا کچھ کیا ہے، تاہم وہاں حالات کار کو بہتر بنانے کے سلسلے میں جو کچھ کیا گیا تھا، وہ اس میں اپنے کردار پر حتیٰ الوسع پردہ ڈالنے کی کوشش کرتا رہا۔ کئی مواقع ایسے آئے جب پرنس آندرے نے کچھ یوں دخل اندازی کی جیسے اسے معلوم ہو کہ میئر کیا کہنا چاہتا ہے۔ گویا میئر نے جو کچھ کہا تھا، وہ کوئی پرانی اور جانی پہچانی کہانی تھی اور جو کچھ وہ سن رہا تھا، نہ صرف یہ کہ اس میں قطعاً کوئی دلچسپی نہیں تھی بلکہ اس کا انداز اس قسم کا تھا کہ میئر جو کچھ اس سے بتا رہا ہے، اس پر وہ عجوبہ ہو رہا ہے۔

اپنے دوست کی صحبت میں میئر نہ صرف بے چینی محسوس کر رہا تھا بلکہ اس پر افسردگی بھی طاری ہونے لگی۔ بالآخر وہ چپ ہو گیا۔

”مائی ڈیئر فیلو، میں تمہیں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ“ پرنس آندرے نے کہا، ”اپنے مہمان کی آمد پر وہ خود بھی کچھ گھنٹہ محسوس کر رہا تھا اور اس پر بھی افسردگی طاری ہونے لگی تھی،“ یہاں میرا قیام بالکل عارضی ہے۔ یہاں میں صرف مختلف امور کا جائزہ لینے آیا تھا۔ میں آج ہی واپس اپنی بہن کے پاس جا رہا ہوں۔ میں تمہیں اس سے ملوؤں گا۔ تاہم تم اسے جانتے تو ہو ہی،“ اس نے کہا۔ صاف نظر آ رہا تھا کہ وہ ایک ایسے مہمان سے، جس کے ساتھ اب اس کی کوئی قدر مشترک باقی نہیں رہ گئی تھی، کچھ کہنے کی کوشش کر رہا ہے۔ ”ہم لڑنے کے بعد پیل پڑیں گے۔ خیر، اب تم یہ بتاؤ کہ میرے اس غریب خانے کو دیکھنا پسند کرو گے؟“

وہ ہر نکل گئے اور ڈنر تک ادھر ادھر گھومتے پھرتے رہے اور ایسے اشخاص کی طرح، جن کی آپس میں کوئی بے تکلفی نہ ہو، سیاسی خبروں اور باہمی واقف کاروں کے متعلق باتیں کرتے رہے۔ جہاں تک پرنس آندرے کا تعلق تھا، اس نے گفتگو میں صحیح طور پر دلچسپی تبھی لی اور اس میں جوش و خروش کا مظاہرہ کیا جب وہ اپنے نئے فارم ہاؤس یا اس سے

متعلقہ تعمیرات کے متعلق باتیں کر رہا تھا۔ لیکن اس دوران میں بھی جب وہ معماروں کے میاں پر کھڑے تھے، وہ تعمیراتی منصوبے کا ذکر کرتے کرتے اچانک خاموش ہو گیا۔

”خیر، یہ کوئی دلچسپ موضوع نہیں ہے۔ چلو، چل کر کھانا کھاتے ہیں۔ اس کے بعد ہماری روانگی ہوگی۔“
کھانے کے دوران میں میز کی شاہی کا موضوع پر بحث آ گیا۔

”جب مجھے اس کی خبر ملی، مجھے سخت تعجب ہوا،“ پرنس آندرے نے کہا۔

میز کا چیرہ سرخ ہو گیا۔ جب کبھی یہ موضوع چھڑتا تھا، اس کی کیفیت یہی ہو جاتی تھی۔ اس نے فی الفور کہا،
”یہ سب کچھ کیسے ہوا، کسی وقت میں تمہیں اس کے متعلق بتاؤں گا۔ لیکن ہم جانتے ہو کہ اب یہ معاملہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا ہے۔“

”ہمیشہ کے لیے؟“ پرنس آندرے نے کہا۔ ”کوئی چیز ہمیشہ نہیں رہتی۔“

”تمہیں یہ تو معلوم ہو گا کہ یہ ختم کیسے ہوئی؟ نہیں؟ تم نے ڈوئل کے متعلق کچھ نہ؟“

”ہاں، تو تمہیں اس مصیبت میں سے بھی گزرنا پڑا!“

”میں خداوند کا شکر کرتا ہوں کہ وہ شخص میرے ہاتھوں ہلاک نہیں ہوا۔“

”کیوں؟“ پرنس آندرے نے پوچھا۔ ”غیبت کتے کو ہلاک کرنا تو بڑائی کی کام ہے۔ واقعی۔“

”نہیں، کسی انسان کو ہلاک کرنا اچھا کام نہیں، غلط ہے۔“

”غلط کیوں؟“ پرنس آندرے نے اصرار کیا۔ ”غلط کیا ہے، صحیح کیا ہے، اس کا فیصلہ کرنا انسان کے بس کی

بات نہیں۔ انسان ہمیشہ غلطیوں کا ارتکاب کرتے رہے ہیں اور ہمیشہ کرتے رہیں گے اور اس بات کا اطلاق کسی اور چیز پر اتنا نہیں ہوتا جتنا کہ اس پر جس کو وہ صحیح یا غلط تصور کرتے ہیں۔“

”ہر وہ چیز جو دوسروں کے لیے ضرور رساں ہو، غلط ہے،“ میئر نے کہا۔ اسے یہ دیکھ کر مسرت ہو رہی تھی، کہ

جب سے وہ آیا تھا، پرنس آندرے پہلی مرتبہ ذرا جوش میں آیا تھا اور صحیح معنوں میں گفتگو میں شرکت کرنے لگا تھا۔
اب اسے یہ آس بندھنے لگی کہ وہ چیز جس نے اس کی یہ حسرت ہٹا رکھی تھی، اس کا وہ ضرور ذکر کرے گا۔

”اور تمہیں یہ کس نے بتایا ہے کہ دوسروں کے لیے کیا ضرور رساں ہے؟“ اس نے سول کیا۔

”ضرور رساں؟ ضرور رساں؟“ میئر نے دہرایا۔ ”ہم سب جانتے ہیں کہ ہمارے لیے کیا ضرور رساں ہے۔“

”ہاں، اتنا ہم سب کو معلوم ہے لیکن جس چیز کو میں اپنے لیے ضرور رساں سمجھتا ہوں، وہ وہ ضرور نہیں ہے جس کا

نشاندہ میں دوسروں کو بنا سکتا ہوں،“ پرنس آندرے نے کہا۔ اس کے جوش و خروش میں لفظ بہ لفظ اضافہ ہوتا جا رہا تھا اور

صاف دکھائی دینے لگا تھا کہ اپنے نئے نقطہ نظر کو دیر کے سامنے بیان کرنے کے لیے اس کا اشتیاق دو چند ہو رہا ہے۔

اب وہ فراموشی میں پڑنے لگا۔ ”میرے نزدیک زندگی کی صرف دو آفات ہیں اور وہ ہیں، پشیمان اور عدالت۔ واحد

بھلائی، دن دونوں کی عدم موجودگی ہے۔ اپنے لیے زندہ رہو اور ان دونوں آفات سے بچو۔ میرا سہ را فلقد اب صرف

”کی ہے۔“

”کب ہمسایہ اور یثارذات کے بارے میں کیا خیال ہے؟“ میئر نے کہنا شروع کیا۔ ”نہیں، میں تمہاری بات سے اتفاق نہیں کر سکتا۔ محض اس لیے زندہ رہنا کہ انسان افعال شہنشاہ سے پہلو پچا رہے تاکہ سے بعد میں کسی قسم کی پشیمانی سے دوچار نہ ہونا پڑے، میرے خیال میں کافی نہیں ہے۔ میں اسی قسم کی زندگی بسر کرتا رہا، میں محض اپنے لیے جیتا رہا اور اس رویے نے میری زندگی میں زہر گھول دیا۔ اب جب کہ میں دوسروں کے لیے ریت کر رہا ہوں، کم از کم کرنے کی کدو کاوش کر رہا ہوں،“ (بجز دُفروتی نے میئر کو اپنی تہجج کرنے پر مجبور کر دیا)، ”تو مجھے احساس ہوا کہ زندگی اپنے دامن میں انسان کے لیے کتنی سرخیں سموئے ہوئے ہے۔ نہیں، میں تم سے اتفاق نہیں کر سکتا اور جو کچھ تم کہہ رہے ہو، حقیقتاً تمہیں خود بھی اس پر یقین نہیں ہے۔“

پرنس آندرے خاموش رہا۔ اس کے چہرے پر طنزیہ مسکراہٹ کھیل رہی تھی اور اس کی نگاہیں میئر پر گڑی ہوئی تھیں۔

”جب تمہاری ملاقات میری ہمشیرہ ماریا سے ہوگی، تمہاری اس سے خوب سمجھے گی،“ اس نے کہا۔ ”شاید بے بارے میں تم ٹھیک کہتے ہو،“ مختصر وقفے کے بعد وہ پھر کہنے لگا۔ ”لیکن ہر شخص اپنے انداز سے زندگی بسر کرتا ہے۔ تم اپنی ذات کے لیے زندگی بسر کرتے رہے اور تم کہتے ہو کہ اس طریقے سے تم نے اپنی زندگی میں زہر گھول لیا، اور تمہیں مسرت تب ملی جب تم دوسروں کی خاطر زندگی کرنے لگے۔ لیکن میرا تجربہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ میں نے کرواقار اور شان و شکوہ کے لیے زندگی بسر کی اور بہر حال یہ عز و وقار اور شان و شکوہ ہیں کیا؟ یہی ناکہ ہم دوسروں سے پیار کرتے ہیں، اس کی خاطر کچھ کرنے کی آرزو دل میں پالتے ہیں، ان کی پسندیدگی کی تمنا کرتے ہیں۔ چنانچہ میں نے ان کے لیے اپنی زندگی بتائی اور تقریباً ساری نہیں بلکہ کاملاً ساری حیات تباہ کر لی۔ اور جب سے میں نے صرف اپنی خاطر زندگی گزارنا شروع کیا ہے، مجھے سکون ملا ہے۔“

”لیکن جب تم یہ کہتے ہو کہ تم صرف اپنی خاطر زندگی کر رہے ہو، اس سے تمہاری کیا مراد ہے؟“ میئر نے یونانی عام میں دریافت کیا۔ ”اپنے بیٹے، اپنے والد اور پتی، ہمشیرہ کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟“

”وہ کوئی غیر تھوڑے ہیں۔ وہ میری اپنی ذات کا جزو ہیں،“ پرنس آندرے نے کہا۔ ”لیکن جہاں تک دوسراں۔ مثلاً اپنے ہمسایوں، ie prochain جیسا کہ پرنس، ریا اور تم انہیں کہتے ہو۔ کا تعلق ہے، وہ غلطی اور بدی کا سرچشمہ ہیں۔ ہمسایوں سے میری مراد تمہارے کیف کے کسانوں، جن کے ساتھ تم بھلائی کرنا چاہتے ہو، جیسے لوگ ہیں۔“

اس کے ساتھ ہی اس نے میئر کو کچھ اس انداز سے دیکھا جیسے وہ اس کا تسخراڑ رہا ہو، اسے لگا رہا ہو۔ صرف معلوم ہوتا تھا کہ وہ اسے مشتعل کرنا چاہتا ہے۔

”تم سنجیدہ نہیں ہو“ پیٹر نے کہا اس کا ہوجہ لختہ بہ لختہ جدلی ہوتا جا رہا تھا۔ اگر میں کسی کے ساتھ بھلائی کرنا چاہوں، اس میں غلطی یا برائی کیا ہے؟ میں مانتا ہوں کہ میں نے جو کچھ کیا، وہ بہت کم ہے اور پھر میں سے اسے احسن انداز سے بھی نہیں کیا۔ پھر بھی میں نیکی کرنا چاہتا تھا اور اس میں کچھ نہ کچھ کا سبب بھی رہا ہوں۔ یہ بد قسمت لوگ ہمارے زرعی غلام۔ وہ ہمارے جیسے ہی نشان ہیں۔ بے معنی دعاؤں اور رسوم کے علاوہ اور کچھ نہیں جانتے۔ انھیں نہ خدا کا علم ہے اور نہ سچی کا، بس پیدا ہوتے، بڑھتے اور بالآخر مر جاتے ہیں۔ اب جب کہ انھیں یہ سکھانے کا بندوبست کر دیا گیا ہے کہ، گروہ حیات اخروی، جزا اور سزا پر ایمان لے آئیں، تو ان کا یہاں بھی بھلا ہو گا اور آخرت میں بھی، تو اس میں حرج ہی کیا ہے؟ جب لوگ امراض کی وجہ سے موت کے منہ میں جا رہے تھے اور کوئی ان کا پرہیز حال نہیں تھا، نہ انھیں با آسانی مادی امداد فراہم کی جاسکتی تھی، ایسے میں اگر میں نے ان کے لیے کوئی ہسپتال بنوا دیا، ڈاکٹر فراہم کر دیا اور بوڑھوں اور ضعیفوں کے لیے کوئی محتاج گاہ تعمیر کرادی ہے، تو اس میں غلطی یا برائی کیا ہے؟ اگر کسی کسان یا شیر خوار بچے کی ماں کو، دن ہو یا رات، ایک لمحہ آرام سے بیٹھنا نصیب نہ ہوتا ہو اور میں اسے یہ آرام اور فرصت مہیا کر دوں، تو کیا یہ کار خیر۔ جو ہر ایک کو نظر آ سکتا ہے اور جسے کوئی جھٹلا نہیں سکتا۔ نہیں ہوگا؟“ پیٹر نے کہا۔ اگرچہ اس کی زبان بیچ بیچ میں لکنت کھا جاتی تھی، تاہم وہ خاص روان اور تیزی سے گفتگو کر رہا تھا۔ ”یہی کچھ تو میں نے کیا ہے، اگرچہ بد سلیقگی سے کیا ہے اور ضرورت سے بہت کم کیا ہے، تاہم میں نے غارتو کر دیا ہے۔ اور تم مجھ سے یہ نہیں منوا سکتے کہ یہ اچھا کام نہیں تھا۔ اور اس سے بڑھ کر یہ کہ تم مجھے کسی طور قائل نہیں کر سکتے کہ تم خود اسے اچھا کام نہیں سمجھتے ہو۔ اور بڑی بات یہ ہے،“ اس نے اپنا سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا، ”کہ مجھے معلوم ہے، یقینی طور پر معلوم ہے کہ اس قسم کی نیکی کر کے جو خوشی ملتی ہے، وہی زندگی کی واحد سچی خوشی ہے۔“

”افوہ، اگر تم مسئلے کو اس رنگ میں پیش کرو گے، تو یہ بالکل مختلف معاملہ بن جاتا ہے،“ پرنس آندرے نے کہا۔ ”میں مکان تعمیر کرتا ہوں اور باغ لگاتا ہوں۔ اور تم شفا خانے بناتے ہو۔ دونوں مصروفیات وقت گزاری کا ذریعہ بن سکتی ہیں۔ لیکن صحیح کیا ہے، نیک کیا ہے، اس کا فیصلہ اس پر، جو سب کچھ جانتا ہے، چھوڑ دینا چاہیے، مگر لگانا ہمارا کام نہیں ہے۔ خیر، اگر تم مناظرہ ہی کرنا چاہتے ہو،“ اس نے مزید کہا، ”پھر بندہ حاضر ہے۔“

وہ دسترخوان سے اٹھے اور آندرے کی راہداری میں، جو برآمدے کا کام دیتی تھی، بیٹھ گئے۔

”آؤ، اس مسئلے کے متعلق بحث کریں،“ پرنس آندرے نے کہا، ”تم مدد اس“ اس نے ایک انگلی کو نم دینے ہوئے اپنی بات جاری رکھی، ”اور درس و تدریس وغیرہ کی بات کرتے ہو۔ یہ الفاظ دیگر تم اسے“ (اس نے ایک کسان کی طرف، جو پنی ٹوپی اتارے اس کے قریب سے گزر رہا تھا، اشارہ کیا) ”اس کی حیوانی سطح سے اوپر اٹھا چاہتے ہو اور اسے اخلاقی ضروریات سے بہرہ ور کرنا چاہتے ہو۔ میرا نقطہ نظر یہ ہے کہ حیوانی صورت واحد صورت ہے جس کا حصول ممکن ہے اور تم اسے اس سے بھی محروم کرنے کے خواہش مند ہو۔ مجھے اس پر شک آتا ہے لیکن تم پر اسے وہ کچھ، جو کہ میں ہوں، اسے میری ذہانت، میرے احساسات اور میرے ذرائع فراہم کیے بغیر، بنانے کی

دھن سوار ہے۔ ایک اور بات۔ تم اس کی محنت و مشقت کا بار ہلکا کرنا چاہتے ہو لیکن میرے خیال کے مطابق جس طرح دانشور نہ سرگرمیوں میں اور تمھاری زندگی کا لازمی جز ہیں کہ ان کے بغیر ہمیں زندگی محال نظر آتی ہے، اسی طرح اس کے لیے جسمانی مشقت انتہائی ضروری ہے کیونکہ اس کے بغیر اس کی زندگی اس کے لیے دہال جان بن جائے گی۔ ہم غور و فکر کیے بنا رہے نہیں سکتے۔ جس رات دو بجے کے بعد بستر پر لیٹا ہوں۔ میرے ذہن پر خیالات بگڑا کر دیتے ہیں۔ نیند مجھ سے کوسوں دور رہتی ہے اور میں صبح صادق تک کروٹیں بدلنا رہتا ہوں کیونکہ میں سوچ بچار کرنا رہتا ہوں۔ جس طرح مل چلانا اور فصلیں کاٹنا اس کی زندگی ہے، وہ اس کے بغیر رہے ہی نہیں سکتا (اگر وہ یہ کام نہیں کرنے گا، پھر وہ کسی شراب خانے میں گھس جائے گا یا بستر سے لگ جائے گا)، بیچنہ سوچ بچار میری زندگی ہے اور میں اس کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ جس طرح میرے لیے اس کی جسمانی مشقت برداشت کرنا ممکن نہیں، اگر مجھے اس کی طرح محنت و مشقت کرنا پڑے، تو شدید ہنسنے و دس دن کے اندر اندر میں اگلے جہان چل بسوں گا، بیچنہ اگر وہ میری طرح ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جائے، وہ پھول کر کیا ہو جائے گا اور زندہ نہیں بچ سکے گا۔ اور تیسری بات، کیا کہا تھا تم نے؟ "پرنس آندرے نے اپنی تیسری انگلی سروڑتے ہوئے کہا۔" "اے ہاں، شفا خانے، ادویات۔ ہمارے کسان پراچانک بیماریاں حملہ کر دیتی ہے اور اس کی موت اس کے سر پر منڈمانے لگتی ہے۔ تم اس کی فصد کھلو اور دیتے ہو اور وہ فکا جاتا ہے لیکن زندگی بھر کے لیے معذور ہو جاتا ہے۔ وہ گھٹ گھٹا کر دس سال مزید گزار لیتا ہے لیکن دوسروں پر بوجھ بن جاتا ہے۔ گھر سے موت آ جاتی، اسے کتنی آسانی اور سہولت رہتی! اس کی جگہ لینے والوں کی کوئی کمی نہیں۔ آئے روز لاتعداد پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ اگر تمہیں اس لیے غصہ آتا ہے کہ تم ایک محنت کش۔ میں اسے یہی سمجھتا ہوں۔ سے محروم ہو گئے ہو، تو اور بات ہوتی لیکن تم تو اس لیے اس کی صحت کی بحالی کرنا چاہتے ہو کیونکہ تم اس سے محبت کرتے ہو اور یہ وہ چیز ہے جس کا وہ طلب گار نہیں۔ علاوہ انہیں یہ بھی تمھاری بھول ہے کہ ادویات انسان کو تندرست کر دیتی ہیں۔ بھلا وہ انے کبھی کسی انسان کو تندرست کیا ہے؟ ہاں، اس نے ہلاک ضرور کیا ہے؟" اس نے زہر شدہ انداز سے بھویں سکیڑتے اور میٹر سے منہ موڑتے ہوئے کہا۔

پرنس آندرے نے اپنے خیالات اتنے غیر مبہم اور صحیح انداز سے پیش کیے کہ صاف معلوم ہوتا تھا کہ اس نے اپنے موضوع پر ایک سے زیادہ مرتبہ سوچ بچار کیا ہے۔ اس کی گفتگو میں وہی روانی اور تیزی تھی، جو اس شخص کی، جسے دتول کسی سے ہم کلام ہونے کا موقع نہ ملا ہو، زبان میں ہوتی ہو۔ اس کے خیالات جتنے زیادہ مایوس کن تھے، وہ خود اتنا ہی زیادہ جوشیلا نظر آ رہا تھا۔

'اف، تمھاری باتیں کتنی ڈراؤنی ہیں؟' میٹر نے سرد آدھ بھرتے ہوئے کہا۔ "مجھ میں نہیں آ رہا کہ اس قسم کے خیالات کے ساتھ تم زندگی کیسے گزار سکتے ہو؟ اس قسم کے کھات میں سے مجھے بھی گزرنا پڑا ہے۔ زیادہ دنوں کی بات نہیں، وہ سکو میں اپنے قیوم دور پھر سفر کے دوران میں میری یہی کیفیت تھی۔ لیکن میں اتنی اچھا گہرائیوں میں گر جاتا ہوں کہ مجھے محسوس ہونے لگتا ہے کہ میں فی الحقیقت زندگی نہیں کر رہا۔ مجھے ہر چیز سے... بالخصوص اپنے آپ سے،

شدید نفرت ہونے لگتی ہے۔ پھر مجھ سے نہ کھانا کھایا جاتا ہے اور نہ نہایا دھویا... اپنے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟“

”نہاتے دھوتے نہیں ہو۔ کیوں؟“ اس سے جسم پلید ہو جاتا ہے، ”پرنس آندرے نے کہا۔“ اس کے عکس انسان کا یہ فرض بنتا ہے کہ وہ اپنی زندگی کو خوشگوار سے خوشگوار تر بنائے۔ میں زندہ ہوں اور اس میں میرا کوئی تصور نہیں۔ تاہم میرے فرض بنتا ہے کہ دوسروں کے معاملات میں خلل انداز ہوئے بغیر اپنی زندگی بہترین انداز سے گزارنے کی کوشش کروں۔“

”لیکن تمہارا مقصد حیات کیا ہے؟ اگر خیالات کا عالم یہ ہو، پھر آدمی ہاتھ پاؤں توڑ کر بیٹھ رہے اور تکلیف نہ توڑے، کبھی کسی کام کا آغاز نہ کرے۔“

”اس صورت میں بھی زندگی آدمی کو آرام چین سے نہیں بیٹھنے دے گی۔ اگر مجھے کچھ نہ کرنا پڑے، مجھے بڑی فرحت ہوگی۔ اس کے برعکس یہاں کے مقامی شرفاء نے میری یوں عزت افزائی کی کہ انھوں نے مجھے اپنا ارشل²² منتخب کر لیا۔ بڑی مشکل سے میں نے اپنی جان چھڑائی۔ وہ سمجھ نہیں پا رہے تھے کہ اس عہدے کے لیے جولاہی خصوصیات۔ اگر آدمی مارشل بننا چاہے اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ خوش خصال ہو، سٹچی ہو اور معمولی باتوں کو بہت اہمیت دیتا ہو۔ درکار ہیں، مجھ میں ان کا فقدان ہے۔ پھر یہ مکان ہے۔ اس کی تعمیر بہت ضروری تھی تاکہ کوئی ایسی جگہ ہو جسے میں اپنا گھر کہہ سکوں اور جہاں میں رہ سکوں۔ ورا بلیشیا کی ذمے داریاں ہیں۔“

”تم فوج میں خدمات کیوں سرانجام نہیں دے رہے؟“

”اوسٹرٹس کے بعد؟“ پرنس آندرے نے افسردگی سے کہا۔ ”نہیں، شکریہ۔ میں نے قسم کھائی تھی کہ اب میں کبھی دوبارہ ردی افواج میں فعال خدمات سرانجام نہیں دوں گا۔ نہیں، بالکل نہیں۔ بے شک بونا پارت یہاں سمونٹسک²³ پہنچ جائے اور بالڈلز خطرے کی زد میں آجائے۔ پھر بھی میں ردی افواج میں خدمات سرانجام نہیں دوں گا۔ خیر، جیسا کہ میں تمہیں بتا رہا تھا، اس نے اپنے آپ کو دوبارہ پرسکون بناتے ہوئے اپنی بات جاری رکھی، ”یہاں بلیشیا کی ذمے داریاں ہیں۔ واسد ضلع سوم کے کمانڈر انچیف ہیں اور میرے پاس فعال ملازمت سے بچنے کا صرف ایک ہی طریقہ ہے کہ میں ان کی ماتحتی میں کام کروں۔“

”بہر حال تم عازمت تو کر رہے ہو۔“

”ہاں، اس نے جواب دیا اور خاموش ہو گیا۔

”لیکن کیوں؟“

”میں اس کیوں؟“ کا جواب دیتا ہوں۔ والد محترم اپنے زمانے کی نادیر روزگار ہستیوں میں شمار ہوتے ہیں۔ وہ روز بروز بڑھتے جا رہے ہیں۔ اگرچہ صحیح معنوں میں انھیں ظالم تو نہیں کہا جاسکتا۔ لیکن انھوں نے عجیب سی باطنی طبیعت پائی ہے، وہ ایک گھڑی مچلا نہیں بیٹھ سکتے، کچھ نہ کچھ کرتے ہی رہیں گے۔ وہ غیر محدود اختیار

کراتے ہادی ہو چکے ہیں کہ ان کا مزاج بالکل جلائی ہو گیا ہے اور اب امپراطور نے انھیں ملیشیا کے مکڈرائیچیف کی حیثیت سے مزید اختیارات تفویض کر دیے ہیں۔ اگر دو ہفتے قبل مجھے صرف دو گھنٹے کی تاخیر ہو جاتی، وہ ہٹانوں کے رجسٹر فلرک کو پھانسی چڑھا چکے ہوتے،" پرنس آندرے نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "چنانچہ میں یہ خدمات سر انجام دے رہا ہوں کیونکہ میں واحد شخص ہوں جو میرے والد پر اثر انداز ہو سکتا ہے۔ در کبھی کبھار میں انھیں ایسا نقل و حرکت دے دوں گا کہ یہ شدید اذیت کا سبب بن سکتا ہے، ہر انجام دینے سے باز رکھ سکتا ہوں۔"

"یہ ہولی نہ بات!"

"ہاں، لیکن یہ وہ بات نہیں جو تم سمجھتے ہو،" پرنس آندرے نے اپنا سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "وہ رجسٹر فلرک واقعی بڑا بد معاش تھا۔ وہ رگروٹوں کے بوٹ و در دوسری اشیاء بیچ کھاتا تھا، مجھے اس سے ہمدردی تھی اور نہ ہے۔ مجھے، اپنے والد۔ جس کا ایک بار پھر مطلب 'میری اپنی ذات' ہے پرنس آگیا تھا۔"

پرنس آندرے کے جوش و خروش میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ جب وہ بیئر کے سامنے یہ ثابت کرنے پر تلا ہوا تھا کہ اس نے جو کچھ کیا، اس میں شبہ یا یہ کہ کوئی دخل نہیں تھا، اس کی آنکھوں میں غما جلا نہ چک آگئی۔

"دیکھو، تم اپنے غلاموں کو آزاد کرنا چاہتے ہو،" وہ بولے چلا گیا، "یہ بہت اچھی بات ہے لیکن تمہارے لیے نہیں۔ مجھے یقین ہے کہ تم نے نہ تو کبھی کسی کو کوڑوں سے پٹوایا ہے اور نہ کسی کو سائبیریا بھجوایا ہے اور تمہارے غلاموں کے لیے تو اس میں بھلائی کا بالکل ہی کوئی پہلو نہیں ہے۔ اگر انھیں مارا پیٹا جائے، کوڑے لگائے جائیں یا انھیں سائبیریا بھیج دیا جائے میرا خیال ہے کہ انھیں کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ اس قسم کی وحشیانہ زندگی وہ سائبیریا میں بھی بسر کر سکتے ہیں، جسم پر کوڑوں سے جو زخم آتے ہیں، وہ مندمل ہو جاتے ہیں اور وہ پہلے کی طرح خوش و خرم رہنا شروع کر دیتے ہیں۔ اس سے اگر کسی کو کوئی فائدہ پہنچ سکتا ہے تو زرعی غلاموں کے ان مالکوں کو جن کا خلائی طور پر دیوا سے پٹ چکا ہے، جنہیں اپنے کیے پریشانی تو ہوتی ہے لیکن وہ اپنی اس ہیشیانی کا گھنگھونٹ دیتے ہیں اور چونکہ انھیں جتنا ناجائز سزا نہیں دینے کا اختیار حاصل ہے، وہ سنگ دلی کو اپنا شعار بنا لیتے ہیں۔ یہ ہیں وہ لوگ جن پر مجھے ترس آتا ہے اور ان لوگوں کی (بھلائی کی) خاطر میں یہ چاہوں گا کہ غلاموں کو آزاد کر دیا جائے۔ لیکن یہ ہے کہ تمہیں موقع نہ ملا ہو لیکن میں متعدد ایسے شخصوں کو جو فطرتاً نیک اور بھلے تھے، جانتا ہوں۔ ان لوگوں نے غیر محدود اختیارات کی روایات میں تربیت پائی اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کے مزاج میں درشتی اور ہمتی آتی گئی اور ان کا رویہ ظالمانہ اور سنگ دل نہ ہوتا چلا گیا۔ وہ اپنی ان کمزوریوں سے آگاہ بھی ہیں لیکن وہ اپنے اوپر قابو پانے میں ناکام رہتے ہیں اور یوں ان کی زندگی تلخ سے تلخ تر ہوتی چلی جاتی ہے۔"

پرنس آندرے اتنے جوش و جذبے سے تقریر کر رہا تھا کہ بیئر یہ سوچے بنا شہرہ سکا کہ اس کے ذہن میں اس قسم کے خیالات اپنے والد کا رویہ دیکھ کر آئے ہوں گے۔ اس نے جواب میں کچھ نہ کہا۔

"تو تم نے دیکھ لیا کہ مجھے کس پر ترس آتا ہے اور کس چیز کا افسوس ہو رہا ہے۔ یہ چیزیں سراسر اور پستی نہیں ہیں

کہ آپ انھیں جتنی بار ماریں پٹیں، جو چاہیں، سزائیں دیں، جس طرح چاہیں ان کے بال موٹریں²⁵، سر سر ہاں اور پشتیں پشتیں ہی رہیں گی۔ اصل شیا انسانی تو قیر، ذہنی سکون اور پاکیزگی ہیں۔“

”نہیں، نہیں، ہزار مرتبہ نہیں، میں کبھی تم سے متفق نہیں ہوں گا،“ میٹرے نے کہا۔

12

شام کو پرنس آندرے اور میٹرے کا لاش میں سوار ہوئے اور ہالڈ ہلز کی طرف چل پڑے۔ پرنس آندرے کبھی کبھار دھڑکی جانب دیکھتا اور کچھ اس قسم کا فقرہ، جس سے معلوم ہوتا کہ اس کا مزاج شگفتہ ہو رہا ہے، کس کر ہر خاموشی توڑ دیتا۔ کھیتوں کی جانب اشارہ کرتے ہوئے، وہ اسے ان اقدامات کے، جن کی مدد سے وہ اپنی زرعت کو بہتر بنارہا تھا، بارے میں بتانے لگا۔

میٹرے نے رد کھی خاموشی اختیار کیے رکھی یا پھر وہ ایک لفظی جواب دے دیتا۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنی سوچوں میں مصروف ہے۔ اس کا خیال تھا کہ پرنس آندرے غلطی پر ہے اور راہ راست سے ہٹک گیا ہے۔ ایسے میں اس کا، یعنی میٹرے کا، یہ فرض بنتا ہے کہ وہ آگے بڑھے، اس کی مدد کرے، اسے صحیح راستہ دکھائے اور اسے اخلاقی اور روحانی اعتبار سے اوپر اٹھائے۔ لیکن جو انہی سوچ بچار کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ اسے کیا کہنا چاہیے اور کیسے کہنا چاہیے، وہ شگلی بھانپ گیا کہ پرنس آندرے محض ایک لفظ یا دلیل واحد سے اس کے تمام چند نصائح کے تار و پود کھیر دے گا۔ چنانچہ جو چیز اسے عزیز از جان تھی اس کے نزدیک تقدس کا درجہ رکھتی تھی، وہ اس کے متعلق بات کرنے کا پارانہ پاتا تھا کیونکہ اسے اندیشہ تھا کہ کہیں پرنس آندرے اسے ٹھنڈے ٹھول میں نہ اڑا دے۔

”آخر قصہ کیا ہے کہ تم اس طرح سوچتے لگے ہو؟“ میٹرے اچانک بولنے لگا۔ اس کی گردن اٹھی ہوئی تھی اور، یوں نظر آ رہا تھا جیسے وہ کوئی سناٹا ہو اور حملہ کیا جا رہا ہو۔ ”آخر تم اس انداز سے کیوں سوچتے ہو؟ تمہیں یوں نہیں سوچنا چاہیے۔“

”اس انداز سے کیا سوچ رہا ہوں؟“ پرنس آندرے نے متعجب ہو کر پوچھا۔

”زندگی کے بارے میں، انسان کے مقدر کے بارے میں۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔ میں بھی کچھ اسی انداز سے سوچا کرتا تھا اور تمہیں معلوم ہے کہ مجھے کس چیز نے بچایا؟ فری میسنری نے۔ نہیں، مسکراؤ مت۔ میں سمجھتا تھا کہ فری میسنری کوئی مذہبی یا رسوماتی فرقہ ہے جب کہ حقیقتاً ایسا نہیں ہے۔ یہ نئی نوع انسان کے ارفع ترین اور ابدی پہلوؤں کا فقید المثال اظہار ہے۔“

اور فری میسنری کو جس طرح وہ خود سمجھ پایا تھا، پرنس آندرے کے سامنے وہ اس کی وضاحت کرنے لگا۔ اس نے بتایا کہ فری میسنری کی تعلیمات وہی ہیں جو عیسائیت کی ہیں۔ عیسائیت کی طرح فری میسنری بھی اخوت، مساوات اور محبت کی تعلیم دیتی ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ اسے ان بیڑیوں سے، جو مملکت اور کلیسا نے عیسائیت

کے پاؤں میں ڈال رکھی ہیں، نجات دلا دی گئی ہے۔

”صرف ہماری تقدس آتب برادری کو زندگی کے صحیح مفہوم کا شعور ہے۔ باقی سب کچھ محض خواب و خیال ہے۔“
 بیڑے کہا۔ ”میرے دوست، بس یوں سمجھو کہ اس برادری سے جو کچھ باہر ہے، وہ دروغ اور زریب سے بڑا ہے۔ اور
 مجھے تم سے اتفاق ہے کہ ذہن اور نیک انسان کے لیے اس کے علاوہ اور کوئی چارہ ہی نہیں رہ جاتا کہ وہ تمہاری
 طرح یوں زندگی کی سعی کرے کہ اس سے دوسروں کو کوئی گزند نہ پہنچے۔ لیکن (میں چاہتا ہوں کہ) تم ہمارے
 بنیادی عقائد کو پناؤ، ہماری برادری میں شامل ہو جاؤ، قلب و روح کی گہرائیوں سے ہمارے ساتھ دو، ہمیں موقع دو
 کہ ہم تمہاری رہبری کر سکیں اور جس طرح میرے ساتھ ہوا، تم بھی چمکے میں یہ محسوس کرنے لگو گے کہ تم اس
 بے کراں، غیر مرئی زنجیر کے، جس کا ابتدائی سرالٹاک میں مستور ہے، جزو ہو۔“

پرنس آندرے سیدھا اپنے سامنے دیکھ رہا اور مہربان لب اس کی گفتگو سن رہا تھا۔ متعدد بار ایسا ہوا کہ گاڑی کے پیروں
 کی جڑ ہٹ میں کوئی لفظ اس کے پلے نہ پڑا اور اس نے بیڑے سے اسے دہرانے کے لیے کہا۔ پرنس آندرے نے
 جس طرح خاموشی اختیار کر رکھی تھی اور اس کی آنکھوں میں جو مخصوص روشنی جھلسا رہی تھی، اس سے بیڑے نے اندازہ لگایا
 کہ اس کی گفتگو اکارت نہیں گئی ہے، پرنس آندرے نہ تو اسے ٹوکے گا اور نہ جو کچھ وہ کہہ رہا ہے اس کا مذاق اڑائے گا۔
 وہ ایک دریا کے قریب پہنچے۔ اس کا پانی کن روں سے اچھل رہا تھا اور اسے انھوں نے کشتی سے پار کرنا تھا۔
 دونوں نوجوان کشتی پر سو رہے ہوئے تھے اور جب ان کی گاڑی اور گھوڑے اس پر لادے جا رہے تھے، پرنس آندرے اس
 کے جنگلے پر جھک گیا اور خاموشی سے سیلابی پانی کو، جو صوب میں چمک رہا تھا، بخوردیکھنے لگا۔

”خیر، اس بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟“ بیڑے نے دریافت کیا۔ ”تم بولتے کیوں نہیں؟“

”میرا کیا خیال ہے؟ میں نے تمہاری گفتگو سنی ہے۔ یہ ٹھیک ٹھاک تھی،“ پرنس آندرے نے کہا۔ ”تم کہتے
 ہو ہماری برادری میں شامل ہو جاؤ اور ہم تمہیں مقصدِ حیات، مقدرِ انسان اور ان قوانین کے، جو کائنات کا نظام
 چلا رہے ہیں، بارے میں بتائیں گے۔ لیکن ہم کون ہے؟۔ انسان۔ لیکن یہ کیسے ممکن ہے کہ تم سب کچھ جانتے ہو؟
 جو کچھ تمہیں نظر آ رہا ہے، صرف مجھے ہی کیوں نظر نہیں آ رہا؟ تم سمجھتے ہو کہ اس دھرتی پر صداقت و نیکوکاری کا چین
 ہونا لیکن مجھے اس سے اتفاق نہیں ہے۔“

بیڑے نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”کہا تمہیں حیاتِ اخروی پر یقین ہے؟“ اس نے پوچھا۔

”حیاتِ اخروی؟“ پرنس آندرے نے دہرایا لیکن بیڑے نے اسے جواب دینے کا موقع ہی نہ دیا۔ وہ سمجھا کہ
 پرنس آندرے نے اس کے الفاظ جوں کے توں دہرا کر اس کے وجود سے انکار کیا ہے۔ اسے اس پر یوں بھی بھٹ
 بہت یقین آ گیا کیونکہ وہ پرنس آندرے کے سابقہ ملحدانہ عقائد سے بخوبی آگاہ تھا۔

”تم کہتے ہو کہ تمہیں اس دھرتی پر صداقت اور نیکوکاری کے چلن کا امکان نظر نہیں آتا۔ میرا بھی یہی خیال تھا۔
 اگر ہم یہ تصور کر لیں کہ یہاں کی زندگی ہر چیز کا اختتام ہے، پھر امکان نظر آ بھی نہیں سکتا۔ دھرتی، پر۔ یہاں اس

دھرتی پر“ (میٹر نے کھیتوں کی طرف اشارہ کیا) ”کوئی صداقت نہیں ہے۔ صرف بدی، اور فریب کا راج ہے۔ لیکن کائنات میں کُلّی کائنات میں، صداقت کی قسم رد موجود ہے اور ہم، جو کہ اس دھرتی کے بالک ہیں، ابدی معانی میں کائنات کے بالک ہیں۔ کیا میں اپنی روح میں یہ محسوس نہیں کرتا کہ میں اس وسیع و عریض، ہم آہنگ اور مربوط کائنات کا جز رہوں؟ کیا میں یہ محسوس نہیں کرتا کہ میں لاکھوں ولایت مخلوقات کے جن میں الوہیت۔ تم چاہو تو اسے اعلیٰ ترین طاقت بھی کہہ سکتے ہو۔ کاظہور ہوتا ہے، اس ہم آہنگ اور مربوط ہجوم میں، ادنیٰ ترین سے اعلیٰ ترین مخلوقات کے مابین کڑی، واسطہ یا پیڑی ہوں؟ اگر میں اس میٹرٹی کو، جو پورے سے انسان تک پہنچتی ہے، دیکھ سکتا ہوں، واضح طور پر دیکھ سکتا ہوں، پھر میں یہ کیوں فرض کر لوں کہ یہ میٹرٹی، جس کا نقطہ آغاز میرے بہت نیچے کیس ہے اور میری نگاہوں سے اوجھل ہے، مجھ پر ہی آکر ختم ہو جاتی ہے اور وہ آگے، بہت ہی آگے، ان مخلوقات تک، جو مجھ سے کیس بلند تر ہیں، نہیں جاتی؟ میں نہ صرف یہ محسوس کرتا ہوں کہ میں ناپید نہیں ہو سکتا کیونکہ اس دنیا میں کچھ بھی ناپید نہیں ہوتا، بلکہ مجھے یہ احساس بھی ہوتا ہے کہ میں ہمیشہ موجود رہوں گا، ہمیشہ موجود رہا ہوں۔ مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میرے علاوہ مجھ سے بالا ارواح موجود ہیں اور اس دھرتی پر صداقت کا وجود بھی ہے۔“

”ہاں، یہ ہر ذرّہ کا نظریہ ہے،“ پرنس آندرے نے اظہار خیال کیا۔ ”لیکن، مائی ڈیئر فیو، اس قسم کی باتیں مجھے قائل نہیں کر سکیں گی۔ مجھے جو چیزیں قائل کرتی ہیں، وہ زندگی اور موت ہیں۔ آپ قائل اس وقت ہوتے ہیں جب آپ اس شخص کو دیکھتے ہیں جو آپ کو بہت عزیز ہوتا ہے، جس کا وجود آپ کے وجود سے منسلک ہوتا ہے، جس کے ساتھ آپ زیادتی کر بیٹھے ہیں لیکن آپ کو توقع ہے کہ آپ اس زیادتی کی خطائی کر سکیں گے۔“ (پرنس آندرے کی آواز کپکپانے لگی اور اس نے اپنا منہ دوسری طرف پھیر لیا۔) ”لیکن اچانک یہ شخص صاحبِ فراش ہو جاتا ہے، شدید کرب میں مبتلا ہو جاتا ہے، اس پر نزع کا عالم طاری ہو جاتا ہے اور اس کا وجود معدوم ہو جاتا ہے۔ کیوں؟ اس کا کوئی جواب ہونا چاہیے! اور مجھے یقین ہے کہ جواب ہے۔۔۔ یہ ہے وہ چیز جو قائل کرتی ہے اور یہی ہے وہ چیز جس نے مجھے قائل کیا ہے،“ پرنس آندرے نے کہا۔

”بالکل، بالکل،“ بجا کہا، ”میٹر نے کہا۔“ کیا میں یہی کچھ نہیں کہہ رہا؟“

”نہیں۔ جو کچھ میں کہہ رہا ہوں، وہ صرف یہ ہے کہ آپ محض دلائل کے بل بوتے پر کسی شخص کو بے جا خودی کی ضرورت کے بارے میں قائل نہیں کر سکتے بلکہ جو چیز اسے قائل کرتی ہے وہ یہ ہے۔ جب آپ کسی شخص کے ہاتھوں میں ہاتھ دیے زندگی کے سفر پر گامزن ہوں، پھر یکایکی وہ شخص ناپید ہو جاتا ہے، وہاں، جہاں عدم ہے، چلا جاتا ہے اور آپ کو خود اس اتھاہ گہرائی کا سامنا کیلئے کرنا پڑتا ہے، آپ اس میں اکیلے جھانکنے رہ جاتے ہیں۔۔۔ اور میں نے اس میں جھانک کر دیکھا ہے۔۔۔“

”اچھا، پھر بات بن گئی نا! تم جانتے ہو کہ ایک جہان آدھر ہے اور اس جہان میں کوئی ہے۔ یہ جہان (ب)

(الفاظ دیگر) حیاتِ اخروی ہے اور کوئی کا دوسرا نام خداوند ہے۔“

پرنس آندرے نے کوئی جواب نہ دیا۔ گاڑی اور گھوڑے مدتوں پہلے کشتی سے تارے جا چکے تھے اور گاڑی میں گھوڑے جوتے جا چکے تھے۔ سورج خاصا نیچے جا چکا تھا اور کشتی کے قریب جو ہڑوں کی سطح پر شام کا پالا ستاروں کی طرح جھللاتے لگا تھا لیکن ستر اور پرنس آندرے ابھی تک کشتی پر کھڑے تھے اور باتوں میں کھوتے، اس پر ملہ رسول، کو جوانوں اور کشتی رانوں کو سخت اچھٹیا ہورہا تھا۔

”مگر کوئی خدا اور خدوی حیات ہے، پھر صداقت اور نیکو کاری کا وجود بھی لازماً ہے۔ اور انسان کی اعلیٰ ترین سرت کا نھار اس بات پر ہے کہ وہ ان کے حصول کے لیے جدوجہد کرے۔ ہمیں لازماً زندگی کرتے رہنا چاہیے، لامتناہیت کا اظہار کرتے رہنا چاہیے اور لازماً اس بات پر یقین رکھنا چاہیے کہ ہم نہ صرف آج زمین کے اس ٹکڑے پر زندگی کر رہے ہیں بلکہ ہم وہاں کُل میں، زندگی کر چکے ہیں اور ابدی طور پر وہاں زندگی کرتے رہیں گے،“ میٹر نے آسمان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

پرنس آندرے کشتی کے جنگلے پر کھدوں لکائے کھڑا رہا اور میٹر کی گفتگو توجہ سے سنتا رہا۔ دریں اثنا اس کی نظریں قتب کے سرخ عکس پر، جو نیلگوں پانی میں دکھائی دے رہا تھا، مرکوز رہیں۔ میٹر خاموش ہو گیا۔ سب کچھ ساکت و صامت تھا۔ کشتی بہت دیر پہلے کنارے لگ چکی تھی اور جو واحد آواز سنائی دے رہی تھی، وہ پانی کی ان لہروں کی، جو ہولے ہولے کشتی کے زیریں حصے سے ٹکرا رہی تھیں، پیدا کردہ تھی۔ پرنس آندرے کو غسوس ہو، کہ پانی جس انداز سے ہولے ہولے کشتی سے ٹکرا کر آوار پیدا کر رہا ہے وہ ایسے ہے جیسے میٹر کی نظم کا شیپ کا مصرعہ ”یہ صداقت ہے، اسے مان لو“ دہرا رہا ہو۔

”ہاں، اگر ایسا ہوتا!“ پرنس آندرے نے کہا۔ ”خیر، چھوڑو، گاڑی میں بیٹھتے ہیں،“ اس نے مزید کہا۔ وہ کشتی سے نیچے تر آیا اور آسمان کی جانب، جس کی طرف میٹر نے اشارہ کیا تھا، دیکھنے لگا۔ اسٹرٹس کے معرکے کے بعد اسے یکساں مرتبہ بلند بار افلاک، جو اس نے میدان جنگ میں لیٹے لیٹے دیکھے تھے، نظر آئے اور کوئی چیز، جو مدتوں سے اس کے وجود کے اندر موجود تھی لیکن خوابیدہ تھی، کوئی چیز، جو اس کے اندر بہترین تھی، اچانک اس کی روح میں نوجونگی کی طرح خنداں و متہسم بیدار ہو گئی۔ جونہی وہ زندگی کے عام حالات میں واپس آیا، یہ غائب ہو گئی تاہم اسے یہ معلوم ہو گیا کہ اس احساس کو، جو اس کے وجود میں موجود تھا، کیسے نمودی جاسکتی ہے۔ میٹر کی آمد سے پرنس آندرے کی زندگی کے نئے دور کا آغاز ہوا۔ اگرچہ خارجی طور پر وہ اسی ڈگر پر چل رہا تھا لیکن داخلی طور پر اس کے لیے نئی زندگی کی ابتدا ہو گئی۔

جب پرنس آندرے اور میٹر کی گاڑی بالڈ ہز کے سامنے کے پھانک پر پہنچی، اندھیرا گہرا ہونے لگا تھا۔ جب وہ مکان میں داخل ہوئے گئے، پرنس آندرے مسکرایا اور اس نے میٹر کی توجہ اس شور و غل کی جانب دہائی جو عقی پورج میں پیا

تھا۔ ان کی گاڑی دیکھ کر ایک کمر خیمہ دست قامت بڑھیا، جس کی پشت پر جھولی لٹک رہی تھی اور ایک کوتاہ قامت نوجوان، جس کے گیسو دراز اور جس کے جسم پر سیاہ لباس تھا، واپس پھٹک کی طرف بھاگے آ رہے تھے۔ ان کے پیچھے دو عورتیں دوڑی آ رہی تھیں۔ جب ان چاروں کی نظریں گاڑی پر پڑیں، ان کے چہروں پر ہوائیاں اڑنے لگیں اور وہ بجٹ عقی پورج کی سیڑھیاں پھلنگنے لگی۔

”ان کا تعلق ان لوگوں سے ہے، جنہیں میری ہمشیرہ ’اللہ لوگ‘ کہتی ہے، پرس آندرے نے کہا۔“ انھوں نے غلطی سے ہمیں ابا جان تصور کر لیا۔ یہ واحد معاملہ ہے جس میں وہ ان کی نافرمانی کرتی ہے۔ ان کا حکم ہے کہ ان زائرین کو یہاں سے بھگا دیا جائے لیکن وہ انھیں ’جی آیاں نوں‘ کہتی ہے۔“

”لیکن یہ ’اللہ لوگ‘ ہیں کیا؟“ میئر نے پوچھا۔

پرس آندرے کو جواب دینے کا موقع نہ ملا۔ ان کا استقبال کرنے نوکر چاکر باہر آچکے تھے۔ اس نے ان سے دریافت کیا کہ بڑے میاں کہاں ہیں اور آ، ان کی آمد جلد متوقع ہے؟ ”بڑے پرس ابھی تک شہر میں مقیم ہیں لیکن وہ کسی وقت بھی واپس تشریف لا سکتے ہیں،“ اسے بتایا گیا۔

پرس آندرے میئر کو اپنے باپ کے مکان کے اس حصے میں، جہاں وہ خود رہ کر رہا تھا، لے گیا۔ اس کے کمرے اس کے لیے ہمیشہ صاف ستھرے اور تیار رکھے جاتے تھے۔ اس نے میئر کو یہیں چھوڑا اور خود زمری میں چلا گیا۔

”آؤ، ہمشیرہ کے پاس چلتے ہیں،“ اس نے واپس آ کر میئر سے کہا۔ ”میری ابھی اس سے ملاقات نہیں ہوئی۔ وہ کہیں چھپی ہوئی ہے اور اپنے ’اللہ لوگوں‘ کو لیے بیٹھی ہے۔ ہمیں دیکھ کر وہ خفت محسوس کرے گی، لیکن یہ اس کا بچا کیا دھرا ہے، اس کے ساتھ یہی ہونا چاہیے۔ تاہم تمہیں اس کے ’اللہ لوگوں‘ سے ملنے کا موقع مل جائے گا۔ میں اتنا بتا سکتا ہوں کہ یہ عجیب و غریب نظارہ ہے۔“

”لیکن یہ ’اللہ لوگ‘ ہیں کیا؟“

”تم خود دیکھ لو گے۔“

پرس، رہا انھیں دیکھ کر واقعی گھبرا گئی اور اس کے چہرے پر سرخ دھبے نمودار ہو گئے۔ اس کے آرام دہ کمرے میں، جہاں ایقونات کے سامنے شمعیں جل رہی تھیں، ایک نوجوان چھو کرا، جس کی ناک لمبی اور گیسو دراز تھی، راہوں کا چنڈ پہنے سہوار کے پیچھے صوفے پر اس کے قریب بیٹھا تھا۔ ان کے نزدیک آرام کری پر ایک بڑھیا بیٹھی تھی۔ اس کے جسم پر گوشت نام کو نہ تھا، اس کی جلد چرم پر اچکی تھی اور اس کے بچکانہ چہرے پر مسکینی ٹپک رہی تھی۔

”آندرے، آپ نے مجھے بتایا کیوں؟“ پرس ماریا نے ہلکی سی سرزنش کرتے ہوئے کہا اور وہ اپنے زائرین کے سامنے یوں کھڑی ہو گئی جیسے مرغی اپنے چوزوں کو اپنے پروں میں چھپا لیتی ہے۔

”آپ سے مل کر خوش ہوئی، بہت سرت ہوئی،“ اس نے میئر سے، جو اس کی دست بوسی کر رہا تھا، زرا جیسی میں کہا۔ وہ بچپن ہی سے اسے جانتی آئی تھی۔ چونکہ وہ آندرے کا دوست تھا، اس کی شادی لم ناک ثابت ہوئی تھی

اور سب سے بڑھ کر اس کے چہرے پر شفقت اور سادگی جھلک رہی تھی، وہ اس کے ساتھ ہمدردانہ انداز سے پیش آ رہی تھی۔ وہ اپنی چمکیلی اور حسین و جمیل آنکھوں سے یوں دیکھ رہی تھی جیسے وہ اس سے کہہ رہی ہو ”میں آپ کو بہت پسند کرتی ہوں پر اتنی مہربانی فرمائیں کہ میرے اس چھوٹے سے ریوڑ کا مذاق نہ اڑائیں۔“

بتدائی ملیک ملیک کے جادو لے کے بعد وہ بیٹھ گئے۔

”ارے، ایوانشکا بھی یہیں ہے؟“ پرنس آندرے نے نوجوان زائر کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔

”آندرے؟“ پرنس ماریا نے کہا۔ اس کے لہجے میں لجاجت تھی۔

”تھیں معلوم ہونا چاہیے کہ یہ لڑکی ہے؟“ پرنس آندرے نے فرانسیسی میں میئر سے کہا۔

”آندرے، خدا کے لیے!“ پرنس ماریا نے دوبارہ دہرایا کیا۔

صاف عیاں تھا کہ زائرین کے بارے میں پرنس آندرے کا رویہ طنزیہ تھا اور پرنس ماریا ان کا تحفظ کرنے کے لیے سعی حاصل کرتی رہتی تھی۔ اس سلسلے میں دونوں کی صحیح حق ان کی مادہ راستہ بن چکی تھی۔

”لیکن میری بہاری ہو؟“ پرنس آندرے نے کہا۔ وہ ابھی فرانسیسی میں باتیں کر رہا تھا۔ ”تھیں تو میرا مشکور ہونا چاہیے کہ میں اس نوجوان سے تمھاری پکی دوستی کے بارے میں میئر کے سامنے پہلے ہی وضاحت کر چکا ہوں۔“

”واقعی؟“ میئر نے گھڑی کی گھڑی اپنے چشمے میں سے ایوانشکا کے چہرے پر تجسس و رہنمائی نگاہیں ڈالتے ہوئے کہا۔ (پرنس ماریا اس کے اس رویے پر خاص طور پر مشکور تھی۔) اور ایوانشکا کو بھی اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ ان کی گفتگو کا موضوع ہے اور وہ ان سب کو عیاں نہ لگا ہوں سے دیکھ رہا تھا۔

اپنے ریوڑ کے بارے میں پرنس ماریا کا اضطراب بالکل غیر ضروری تھا۔ وہ رتی برابر بھی محبوب نہیں تھے۔ بڑھاپے اپنی نگاہیں ضرور نیچے جھکاٹی ہوئی تھیں لیکن وہ مسلسل نوواردوں کو دزدیدہ نظروں سے دیکھے جا رہی تھی۔ وہ انہی بیباک، ناپاک اور اسے گڑبگڑ کی ڈلی کے، جسے دانتوں سے تھوڑا سا کاٹا جا چکا تھا، قریب پرچ پر رکھ چکی تھی۔ وہ چپ چاپ بیٹھی تھی تاہم اسے امید تھی کہ اسے چائے کی ایک اور پیالی سے نوازا جائے گا۔ ایوانشکا پرچ میں سے چائے کی چمکیاں لے رہا تھا اور اپنی مکار ہنسوانی آنکھوں سے ان نوجوانوں کو دیکھ رہا تھا۔

”آپ کہاں گئی تھیں؟ کیف؟“ پرنس آندرے نے بڑھاپے سے پوچھا۔

”جی ہاں، آقا،“ باتونی بڑھاپے نے جواب دیا۔ ”کرسمس کے دوران میں مجھے اس قابل سمجھا گیا کہ میں اولیا کے عزرات مقدس پر عیشے ربانی کی پاکیزہ اور سادگی رسوم میں شرکت کر دوں۔ پر آقا اب میں کو لیا زن سے، جہاں برکچہ عظیم کا انکشاف ہوا ہے، آئی ہوں۔“

”ایوانشکا بھی آپ کے ساتھ تھا؟“

”نہیں، میں جدھر بھی جاتا ہوں، عام طور پر اکیلا ہی جاتا ہوں،“ ایوانشکا نے کہا۔ وہ اپنے لہجے میں گہرائی کے کسنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ”اتفاقاً مینا نوفو میں میری ملاقات پیرا جی شکا سے ہو گئی۔“

پیراجی اشکانے اپنے رفیق کی بات کاٹ دی۔ بظاہر وہ یہ بتانے کے لیے بہت بے قراری تھی کہ خوراس نے کیا دیکھا تھا۔

”آقا، کولیا زن میں برکت عظیم کا انکشاف ہوا ہے۔“

”کیا؟ کوئی نئے تحریکات ملے ہیں؟“

”آندرے، چھوڑو، جانے دو۔ کافی ہو گئی ہے،“ پرنس ماریا نے کہا۔ ”پیراجی، شکا، انھیں کچھ نہ بتانا۔“

”جانی، کیوں نہ بتاؤں؟ کوئی وجہ؟ میں انھیں پسند کرتی ہوں۔ یہ بہت بہریاں ہیں۔ یہ خداوند کے چہرہ بندوں میں شامل ہیں۔ میرے عمن ہیں۔ مجھے یاد ہے کہ ایک مرتبہ انھوں نے مجھے دس روپے دیے تھے۔ جب میں کیف میں تھی، اس پاگل کریوٹا۔ وہ خداوند کا اپنا بندہ ہے، گرمیاں ہوں یا سردیاں، ننگے پاؤں گھومتا پھرتا ہے۔ نے مجھ سے کہا تھا: ’تو صحیح جگہ کیوں نہیں جاتی؟ تو کولیا زن جا، اس نے مجھ سے کہا۔‘ وہاں مقدس مادر خداوند کا حجر نما بقولہ دریافت ہوا ہے۔ جوئی میں نے یہ الفاظ سنے، میں نے اپنے اللہ لوگ ساتھیوں سے اجازت لی اور ادھر چل پڑی۔“

سب چپ سادھے بیٹھے تھے۔ صرف زائرہ جے تلے لہجے کے ساتھ بولے جا رہی تھی۔ وہ جب سانس لیتی تھی، اس کی آواز صاف سنائی دیتی تھی۔

”چنانچہ، آقا، میں وہاں پہنچ گئی۔ وہاں لوگوں نے مجھے بتایا۔ یہاں برکت عظیم کا انکشاف ہوا ہے۔“

خداوند مقدس کنواری کے رخساروں سے پاکیزہ تیل قطرہ قطرہ بہہ رہا ہے۔“

”اچھا، اچھا، اس کے متعلق مجھے بعد میں بتا دینا،“ پرنس ماریا نے کہا۔ اس کے گال تھمارے تھے۔

”میں کچھ پوچھ سکتا ہوں؟“ پیر نے کہا۔ ”تم نے یہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا؟“ اس نے دریافت کیا۔

”بالکل، آقا۔ انھوں نے مجھے اس قابل سمجھا ان کا چہرہ اتنا روشن، اتنا چمکیلا تھا کہ بس یوں معلوم ہوتا تھا کہ سادوی نور کی بارش ہو رہی ہے، اور مادر مقدس کے رخساروں پر ایک کے بعد دوسرا قطرہ۔“

”یہ نری شعبہ بازی ہے،“ پیر نے زائرہ کی باتیں سننے کے بعد سادگی سے کہا۔

”آقا، یہ آپ کی فرما رہے ہیں؟“ پیراجی اشکانے کہا۔ اس بے ادبی پر اس کا منہ حیرت سے کھلے گا کھڑا

گیا اور وہ دھڑکے لیے پرنس ماریا کا منہ ٹکٹے لگی۔

”وہ اسی طرح لوگوں کو الو بتاتے ہیں،“ پیر نے اپنی بات دہراتے ہوئے کہا۔

”اف، خداوند یسوع مسیح!“ زائرہ اپنے سینے پر صلیب کا نشان بناتے چلائی۔ ”آقا، ایسی باتیں منہ سے نہ نکالیں۔ ایک جرنیل یہ باتیں نہیں مانا کرتے تھے اور کہا کرتے تھے: ”یہ راہبوں کے ڈھکوسلے ہیں۔ جوئی یہ الفاظ ان کے منہ سے نکلے، ان کی بینائی جاتی رہی۔ انھوں نے خوب دیکھا۔ ان کے خواب میں کیف کے زمین درز قبرستان کی مادر مقدس ان کے پاس آئیں اور فرمائے لگیں: ”مجھ پر ایمان لے آؤ۔ میں تمہیں دوبارہ دسام ہاروں

گی۔ چنانچہ مسلسل فریاد کرنے لگے 'مجھے ان کے پاس بے جلو مجھے ان کے پاس لے چلو۔' جو کچھ میں آپ لوگوں کو بتا رہی ہوں، وہ مجھے خداوند کی آیات کی طرح سچ ہے۔ یہ سب کچھ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ وہ پٹ نہ دھے تھے۔ چنانچہ وہ سیدھا اسے کنواریوں کے حضور لے گئے۔ جونہی وہ وہاں پہنچے، وہ گھٹنوں کے بل جھک گئے اور فریاد کرنے لگے 'مجھے سام کر دیں۔' جو کچھ مجھے زار نے عطا کیا ہے، وہ آپ کے چرنوں میں بھینٹ کر دوں گا، اور آقا، میں نے ان گنہگار آنکھوں سے دیکھا کہ ایک ستارہ لپکا اور مادر مقدس کے جسم میں داخل ہو گیا اور جرنیل کو دوبارہ آنکھوں کی روشنی مل گئی!... کسی باتیں منہ سے نکالنا گناہ ہے۔ تم خداوند کے عذاب سے بچ نہیں سکو گے۔' اس نے جیڑ کو جھاڑ پلاتے ہوئے کہا۔

"اور یہ ستارہ الیقونے میں کیسے داخل ہوا؟" جیڑ نے کہا۔

"اور مادر مقدس کی جرنیل کے عہدے پر ترقی ہو گئی؟" پرنس آندرے نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔
ایکا ایک پہلا جی اشکا کا رنگ فقی ہو گیا۔ کانو تو بدن میں خون نہیں در اس نے دونوں ہاتھوں کی منھیں بھیج دیں۔

"آقا، آقا، کیوں کھربولتے ہیں؟ یہ گناہ ہے اور آپ کا ایک بیٹا ہے؟" وہ چلا رہی تھی۔ اس کے چہرے پر بیل ہٹنا بود ہو چکی تھی اور اب وہ غصے سے لال بھوکا ہو رہی تھی۔ "آقا، آپ نے جو کچھ کہا ہے، خداوند آپ کو معاف فرمائے۔" اس نے اپنے سینے پر صیب کا نشان بنایا۔ "خداوند، انھیں معاف کر دو، جانی، ان کی بات کا مطلب کیا ہے؟" اس نے پرنس ماریا سے مخاطب ہو کر کہا۔

وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی، اس کی آنکھیں اشک آلود ہو رہی تھیں اور وہ اپنی جھولی درست کر رہی تھی۔ نظر آ رہا تھا کہ خوف سے اس کی جان نکلی جا رہی ہے اور اسے شرمندگی ہو رہی ہے کہ اس نے ایک ایسے گھر سے، جہاں اس قسم کی باتیں کہی جاتی ہیں، خیرات وصول کی ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اسے یہ فسوس بھی ہو رہا تھا کہ آئندہ اسے اس گھر کے عطیات سے دست کش ہونا پڑے گا۔

"آپ نے یہ کیوں کیا؟" پرنس ماریا نے کہا۔ "آپ میرے کمرے میں آئے ہی کیوں؟"

"پہلا جی اشکا، جاسنے بھی دیں۔ میں تو محض مذاق کر رہا تھا،" پرنس نے کہا۔ "پرنس، میں حلفا کہتا ہوں کہ میرا ہرگز یہ وہ نہیں تھا کہ میں انھیں ناراض کروں،" اس نے فرانسیزی میں پرنس ماریا سے کہا۔ "آپ اس بارے میں قلعہ دل سیلا کر رہیں، میں تو محض مذاق کر رہا تھا،" اس نے شرماتے مسکراتے اور اپنی زیادتی کی حدنی کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

پہلا جی اشکا رک تو گئی لیکن اس کا دل اب بھی دوسوں سے معمور تھا۔ تاہم جیڑ کے چہرے سے اس قدر پر غموں مذاست کا ظہار ہو رہا تھا اور پرنس آندرے، جو کبھی پیڑ اور کبھی پہلا جی اشکا کو دیکھنے لگتا تھا، اتنا سنجیدہ، متین اور شفیق نظر آ رہا تھا کہ آہستہ آہستہ اس کا غصہ فرو ہو گیا اور وہ بالکل مطمئن ہو گئی۔

زمرہ کا غصہ کا نور ہو گیا اور کچھ دوسروں نے اسے پھونک دی۔ چنانچہ وہ دوبارہ فر فر بولنے لگی اور انھیں نہایت تفصیل سے قادر آسمانی لوچس کے متعلق بتانے لگی۔ اس کے بقول قادر سہلی سوچس اسنے متقی اور پرہیزگار تھے کہ ان کے دست مبارک سے خوشبو کی لپٹیں نکلتی تھیں۔ ”میں جب پچھلی مرتبہ زیارت کے لیے کیف گئی تھی، میری جان پہچان کے چند راہوں نے نرین زمین قبرستان کی چابیوں میرے سپرد کر دیں، ”وہ کہہ رہی تھی۔ ”میں اپنے ساتھ کچھ خشک روٹی لے گئی تھی اور وہاں میں نے اولیاء کرام کی صحبت میں رودن اور دور تیں گزاریں۔

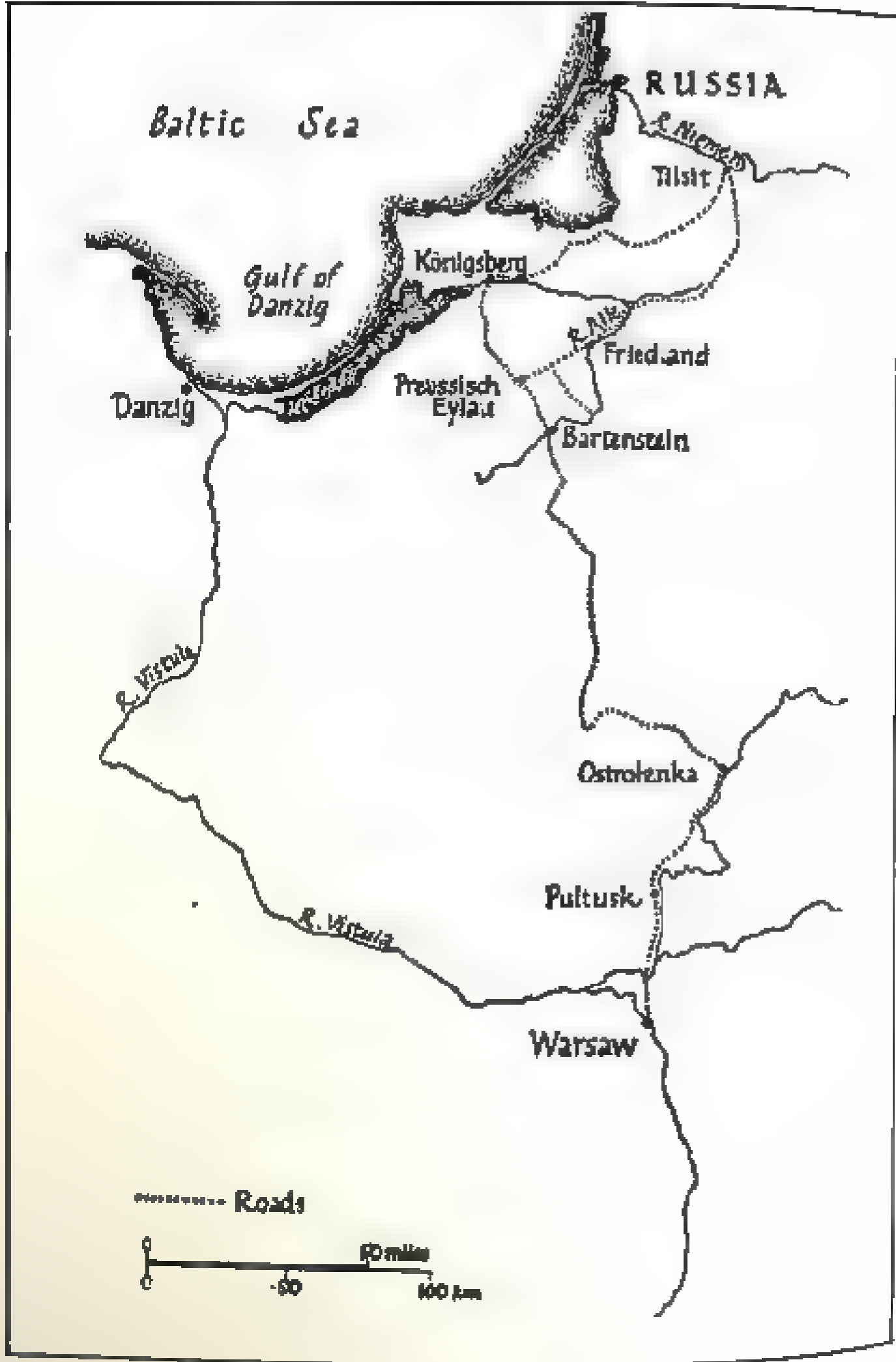
”میں ایک سینٹ کے مزار کے سرہانے چند دعائیں پڑھتی، انجیل مقدس کی چند آیات کی تلاوت کرتی اور دوسرے مقبرے پر پہنچ جاتی۔ کچھ دیر کے لیے سون، اٹھتی اور مقدس تبرکات کو بوسہ دیتی۔ جانی، وہاں کی نصیحتی پر سکون، اتنی بابرکت ہے کہ خداوند کی اس دنیا میں دوبارہ واپس آنے کو جی نہیں چاہتا۔“

ہیئر متانت اور توجہ سے اس کی باتیں سنتا رہا۔ پرنس آندرے کمرے سے باہر نکل گیا۔ پرنس مارہ نے ”اللہ لوگوں“ کو وہیں چھوڑا کہ وہ اپنی چاہے ختم کر لیں اور ہیئر کو ساتھ لے کر ڈرائنگ روم میں چلی گئی۔ ”آپ نے بہت شفقت فرمائی،“ وہ اس سے بولی۔

”اتوہ، میں قطعاً ان کے جذبات کو نہیں سمجھتا تھا۔ میں ان لوگوں کو خوب سمجھتا ہوں اور ان کی بہت قدر کرتا ہوں۔“

پرنس مارہ، جس کے چہرے پر نرم و گداز سکرابٹ کھیل رہی تھی، اسے خاموشی سے دیکھتی رہی۔ ”آپ کو معلوم ہے کہ میں آپ کو بہت عرصے سے جانتی ہوں اور آپ سے بھائی کی طرح پیار کرتی ہوں۔“ اس نے کہا۔ ”آندرے کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟“ اس نے یہ سوال اتنی عجلت سے پوچھا کہ ہیئر کو اس موقع ہی نہ مل سکا کہ وہ اس محبت کا، جو اس نے اس سے جتائی تھی، خاطر خواہ جواب دے سکتا۔ ”مجھے ان کے بارے میں شدید پریشانی ہے۔ سردیوں میں ان کی صحت بہتر تھی لیکن گزشتہ بہار کے دنوں میں ان کا زخم دوبارہ کھل گیا اور ڈاکٹر نے انھیں بتایا کہ انھیں یہاں سے چلے جانا اور اپنا سوزن طالع کرانا چاہیے۔ اور روحانی طور پر بھی میں ان کے بارے میں خوف زدہ ہوں۔ ان کی طبیعت ایسی ہے کہ ہم عورتوں کی طرح آنسو بہا کر اپنے دل کا بار ہلکا نہیں کر سکتے، بس اندر ہی اندر گھلتے رہتے ہیں۔“ سچ وہ خوب چپک رہے اور خوش خوش نظر آ رہے ہیں لیکن یہ آپ کی تشریف آوری کا اثر ہے۔ اکثر دیشترن کا یہ انداز نہیں ہوتا۔ کاش آپ انھیں بیرون ملک جانے پر آمادہ کر سکیں انھیں متحرک ہونے کی ضرورت ہے۔ یہ پرسکون، دھیمہ اور لگا بندہ طرز حیات ان کی جان لے بیٹھے گا۔ دوسروں کو یہ نظر نہیں آتا لیکن میری آنکھیں سب کچھ دیکھ رہی ہیں۔“

دس بجے کے قریب مہتمم پرنس کی گاڑی کی گھنٹیوں کی آواز سنائی دی۔ نوکر چاکر پھاٹک کی جانب بھاگے۔



1807

بیٹر اور آندرے بھی زینے کی طرف چل پڑے۔

”یہ کون ہیں؟“ معمر پرنس نے گاڑی سے اترتے اترتے پوچھا۔ اس کی نگاہیں بیٹر پر پڑ چکی تھیں۔

”ارے تم؟ تم سے مل کر بہت خوشی ہوئی مجھے جوسہ دو!“ اس نے نوجوان اجنبی کو پہچانتے ہوئے کہا۔

معمر پرنس ہشاش بشاش تھا۔ وہ بیٹر کے ساتھ گرم جوشی سے پیش آیا۔

جب سپرے قبل پرنس آندرے اپنے باپ کے سٹڈی روم میں داخل ہوا، اس نے دیکھا کہ وہ اپنے مہمان کے ساتھ گرم بحث کر رہا ہے۔ بیٹر کا اذعان تھا کہ ایک وقت ایسا آئے گا جب جنگیں نہیں ہوا کریں گی۔ معمر پرنس اس کے ساتھ نوک جھونک تو کر رہا تھا لیکن اس کا پارہ گرم نہیں ہو رہا تھا۔

”مردوں کی رگوں سے خون نچوڑ ڈالو اور ان میں پانی اندر دو، پھر جنگیں ونگس نہیں ہوں گی۔ نری نخیف و نزار بڑھیاں کی بہکی بہکی باتیں کر رہے ہو،“ اس نے کہا۔ تاہم اس نے پیار سے بیٹر کے شانے پر تھپکی دی اور اس میر کی طرف، جہاں پرنس آندرے کھڑا تھا، چل دیا۔ نظر بظاہر پرنس آندرے کو اس تکرار میں کوئی دلچسپی نہیں تھی اور نہ وہ اس میں شریک ہونے کا آرزو مند معلوم ہوتا تھا۔ وہ ان کاغذات کا، جو اس کا باپ شہر سے لایا تھا، مطالعہ کر رہے میں موجود تھا۔ معمر پرنس اس کے قریب آیا، اور اس سے سرکاری امور کے بارے میں گفتگو کرنے لگا۔

”ہارشل کوئی کاؤنٹ دستور ہے۔ اس کے ذمے جو پتہ تھی، اس نے اس میں سے ابھی آدمی بھی نہیں بھیجا۔ وہ شہر آیا تھا اور اس نے مجھے! خرپرہ یا تھا۔ اور میں نے اس کی خوب خبر لی... اور ہاں، ڈر اس پر نظر ڈالو۔ خیر، صاحب زد ہے۔“ اس نے بیٹر کے کندھے پر تھپکی دیتے ہوئے اپنے بیٹے سے کہا۔ ”تمہارا دوست اچھا آدمی ہے مجھے پسند ہے! مجھے خوب بھڑکا تا ہے! بعض لوگ بہت دانائی کی باتیں کرتے ہیں لیکن آپ ان میں کوئی دلچسپی نہیں لیتے۔ دھریہ شخص ہے۔ نادانی کی باتیں کرتا ہے لیکن مجھ جیسے بوڑھے آدمی کو بھڑکا دیتا ہے۔ خیر، اب جاؤ، جاؤ اور اپنا کام کرو،“ اس نے کہا۔ ”شاید میں بھی آ جاؤں اور سپر پر کچھ دیر تمہارے ساتھ بیٹھ جاؤں۔ ہم دوبارہ ایک دوسرے کے ساتھ جچ جچ کریں گے۔ میری بے وقوف بیٹی پرنس ماریا کے ساتھ دوستی کاٹھو،“ اس نے دروازے سے نکلتے چلاتے ہوئے بیٹر سے کہا۔

اب یہاں بالڈلز میں اپنی آمد کے بعد بیٹر کو پرنس آندرے کے ساتھ اپنی دوستی کی استوری اور دکاشی کی قدر معلوم ہوئی۔ اس دکاشی کا اظہار اتنا ان تعلقات سے، جو اس کے خود پرنس آندرے کے ساتھ تھے، نہیں ہوتا تھا، جتنا ان تعلقات سے جو اس کے خاندان اور گھرانے سے استوار ہو چکے تھے۔ اگرچہ وہ سخت گیر معمر پرنس اور سیم الجیج اور عد سے شرمیلی پرنس سے کوئی خاص واقف نہیں تھا لیکن ان دونوں کی موجودگی میں اسے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ ان کا پرانا دوست ہو۔ نہ صرف پرنس ماریا، جو اپنے زائرین کے ساتھ اس کے مشفقانہ سلوک کو دیکھ کر اس کی مداح بن گئی تھی، اور اپنی انتہائی روشن و تاباں آنکھوں سے اسے دیکھتی رہتی تھی بلکہ ایک سالہ ننھا پرنس نکولائی بھی، کہ اس کا دادا اسے اسی نام سے پکارتا تھا، اسے دیکھ کر کھل اٹھتا اور بخوشی اس کی بانہوں میں چلا جاتا۔ جب بیٹر معمر پرنس کے

ساتھ گفتگو کر رہا ہوتا، میخائیل ایونج اور مادموزیل بوغین کے دس باغ باغ ہو جاتے۔ وہ ان دونوں کو دیکھتے اور مسکرانے لگتے۔

یہ بالکل واضح تھا کہ معمر پرنس محض بیئر کی خاطر سپر میں شریک ہوتا رہا۔ بیئر نے جو دلدن باندھ دیں گزارے، ان کے دوران میں صاحب خانہ اس کے ساتھ انتہائی پرتپاک انداز سے پیش آتا رہا۔ اس نے اسے دوبارہ آئے اور اپنے ہاں قیام کرنے کی دعوت بھی دی۔

جب بیئر رخصت ہو گیا اور جیسا کہ کسی نئے دوست کی رو، نگلی پر ہمیشہ ہوتا ہے، تمام افراد خانہ اکٹھے ہوئے اور اس کے متعلق باتیں کرنے لگے۔ ہر شخص اس کی تعریف میں رطب الطین تھا اور ایسا شاذ و نادر ہی ہوتا تھا۔

15

رستوف جب چھٹی گزر کر واپس آیا، اسے پہلی مرتبہ احساس ہوا اور اسے اس کا بھرپور اندازہ بھی ہوا کہ جن رشتوں نے اسے دینی سوف اور رجنٹ کے باقی تمام افراد کے ساتھ وابستہ کر رکھا تھا، وہ کتنے مضبوط اور پائیدار ہیں۔

جوں جوں وہ رجنٹ کے پڑاؤ کے قریب پہنچتا گیا، اسے اپنے رگ و پے میں وہی سنسنی، جو اس نے جب جب وہ ماسکو میں اپنے گھر کے قریب پہنچ رہا تھا، محسوس کی تھی، دوڑتی نظر آئی۔ اور جب اس کی نگاہ اپنی رجنٹ کے پہلے ہوزار پر، جس کی اردی کے ہٹن کھلے تھے، پڑی، جب اس نے دیمیتیان کو، جس کے بار سرانے تھے، پہچانا، جب اس نے کمیت گھوڑوں کے کھونڑوں کے رے دیکھے، جب اس نے لاوردشکا کو اپنے آقا کو خوشی سے جلاتے بتاتے سنا: "کاؤنٹ آگئے!" جب دینی سوف، جو اپنے بستر پر کھو خواب تھا، اپنے الجھے بالوں اور پریشان لباس میں اپنے کچے یکے مکان سے بھگتا ہوا اور اس سے نکل گیا، اور جب افسران اس کا استقبال کرنے اس کے ارد گرد اکٹھے ہو گئے، اس کے احساسات بالکل دی تھے جن کا تجربہ اسے تب ہوا تھا جب وہ اپنی اماں، بہنوں اور باب کے ساتھ ہم آغوش ہو رہا تھا اور خوشی کے آنسوؤں سے اس کا گلہ اتار دھ گیا تھا کہ اس کے منہ سے، یک لفظ گئی۔ نکل سکا تھا۔ اس کے نزدیک رجنٹ بھی گھر کی، نند تھی اور یہ گھر غیر متبدل طور پر اتنا ہی پیارا اور انیسویں تھا جتنا کہ اس کا آبائی گھر تھا۔

جب وہ ڈیوٹی پر حاضر ہونے کی رپورٹ کرنا کی خدمت میں پیش کر چکا، اپنے سابقہ سکواڈرن میں دوبارہ اپنی تقرری کر چکا، اس روز یونٹ کے سکیورٹی آفیسر کی حیثیت سے اپنے فرائض سرانجام دے چکا، گھوڑے کے لیے چارے اور چھینے کا انتظام کر چکا، رجنٹ کی چھوٹی چھوٹی دھیسپیوں اور تعریحات میں حصہ لے چکا، اور یہ محسوس کر چکا کہ مادر پدر آزادی کے لحاظ ہوا ہو چکے اور اب اسے تنگ و رعبے کوچ نظم میں کام کرنا ہوگا، اسے بالکل اسی قسم کے سکون اور اخلاقی تائید کا تجربہ ہوا، بالکل وہی طرہ نیت محسوس ہوئی اور اس نے اپنے آپ کو عین اسی طرح اپنے مخصوص گوشے میں پایا، جیسے وہ اپنے ہی گھر میں ہو۔ یہاں دنیائے بیست کے، جہاں اسے اپنے صحیح مقام کا

بقی نہیں تھا اور جہاں فیصلے کرتے وقت وہ غلطیوں کا ارتکاب کر بیٹھتا تھا، ہنگامے اور افراتفری نہیں تھی۔ یہاں کوئی مویا نہیں تھی کہ اسے یہ سوچنا پڑتا کہ اس کی اس کے ساتھ مفہمت پر مبنی دوستی ہونا چاہیے یا نہیں۔ یہاں اس نوعیت کے شش و پنج میں بھی پڑنے کا کوئی امکان نہیں تھا کہ اسے نداں جگہ جانا چاہیے یا فلاں جگہ۔ یہاں اسے دن کے وہ جو میں گھنٹے، جنہیں، تنے مختلف النوع انداز سے گزارا جاسکتا تھا، میسر نہیں تھے۔ یہاں احباب کا، جن میں ایک بھی ایسا نہیں تھا جو اسے دوسروں سے زیادہ عزیز ہوتا، غیر ختم سلسلہ نہیں تھا۔ روپے کے معاملے میں اس کے اپنے باپ کے ساتھ جو مبہم اور غیروضوح تعلقات تھے، یہاں وہ بھی عنقا تھے اور دلوخوف کے ہاتھوں اسے جس ہولناک نقصان سے روچر ہونا پڑا تھا، یہاں کوئی ایسی چیز جو اسے اس کی یاد دلاتی، نہیں تھی! یہاں رجنٹ میں ہر چیز کھری، صاف اور سیدھی سادی تھی۔ عالم کل دو غیر مساوی اجز میں منقسم تھا۔ ایک جز دپاولوگرآت رجنٹ پر اور دوسرا باقی دنیا پر مشتمل تھا اور یہ باقی دنیا اس کا دوسرا نہیں تھی۔ رجنٹ میں ہر شے معین تھی۔ لیفٹیننٹ کون ہے اور کیپٹن کون ہے، کون شخص چھاپے اور کون نہیں ہے۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ آپ کا جگری یاد کون ہے۔ کینٹین کا، لک اشیا اور حار دیتا تھا۔ تنخواہ چار ماہ بعد ملتی تھی۔ یہاں نہ کچھ سوچنے کی ضرورت تھی اور نہ کوئی فیصلہ کرنے کی۔ یہاں صرف ایک ہی احتیاط کافی تھی کہ آپ کوئی ایسا کام، جو دپاولوگرآت رجنٹ میں ناپسندیدہ سمجھا جاتا ہو، نہ کریں اور جب کوئی حکم، جو بالکل صاف، بین اور غیر مبہم ہو، ملے، اس کی تعمیل کریں۔ پھر راوی چین ہی چین لکھتا ہے۔

جب رستوف رجنٹ کی زندگی کے ان آئینے کی طرح صاف حالات میں واپس آ گیا، اسے اسی قسم کی راحت اور مسرت کا، جو تھکے، مندے شخص کو بستر استراحت پر محسوس ہوتی ہے، احساس ہوا۔ اس مہم کے دوران میں رستوف کے لیے رجنٹ کی زندگی اور بھی تسکین بخش تھی کیونکہ دلوخوف کے ساتھ قمار بازی میں وہ جو بھاری رقم ہارا تھا (اس کے گھر والوں نے اسے تسلی دلا سادینے کی پوری کوشش کی تھی لیکن اس کے باوجود وہ اپنے آپ کو معاف کرنے کے لیے تیار نہیں تھا)، اس کی سلامتی کے طور پر اس نے یہ تہیہ کر لیا تھا کہ اب وہ پہلے کی طرح نہیں بلکہ حقیقتاً بہت اچھے انداز سے اپنے فرائض بجالائے گا اور اپنے آپ کو اول درجے کا ساتھی اور افسر ثابت کر دکھائے گا۔ بہ الفاظ دیگر وہ اپنے آپ کو نہایت اعلیٰ انسان کے روپ میں پیش کرے گا۔ باہر کی دنیا میں اسے یہ کام بہت دشوار معلوم ہوتا تھا لیکن یہاں رجنٹ میں قابل انکھوں نظر آتا تھا۔

وہ یہ عزم کر چکا تھا کہ اس نے قمار بازی میں جو رقم ہاری تھی، پانچ سال کے اندر اندر وہ اپنے والدین کو لوٹا لے گا۔ پہلے وہ اسے دس ہزار روبل سالانہ بھیج کر دے گا۔ اب اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ صرف دو ہزار روبل اپنے پاس رکھا کرے گا اور باقی رقم قرضے کی داغ بیل کے لیے اپنے ماں باپ کو واپس بھیج دیا کرے گا۔



معدہ ہسپتالوں، پیش قدمیوں اور پلٹسک اور پردے شش آئی لاؤ کی لڑائیوں کے بعد ہاری فوج بارٹن شائین کے نواح

میں مجتمع ہو چکی تھی۔ یہاں وہ زار کی آمد اور نئی مہم کے آغاز کا انتظار کر رہی تھی۔

پاولوگر، رجنٹ کا تعلق فوج کے اس حصے سے تھا جو 1805 کی مہم میں شریک ہوا تھا۔ اس کے تمام جوان ورافسر روس میں بھرتی کیے گئے تھے۔ چونکہ یہ قدرے تاخیر سے پہنچی تھی، اس لیے مہم کی ابتدائی جھڑپوں میں حصہ نہیں لے سکی تھی۔ پاولوگر، رجنٹ نہ پلٹسک میں موجود تھی اور نہ پردے سش آئی لاؤ میں۔ جب مہم کے دوسرے دور کے دوران میں یہ میدان جنگ میں بڑی فوج کے ساتھ ملی، اسے پلاتوف²⁸ کے ڈویژن کے ساتھ منسلک کر دیا گیا۔

پلاتوف کا ڈویژن بڑی فوج سے الگ آزادانہ حیثیت سے کارروائیاں کر رہا تھا۔ پاولوگر، رجنٹ کی یونٹیں متعدد مواقع پر دشمن کے خلاف جھڑپوں میں شریک ہو چکی تھیں، متعدد اشخاص کو جنگی قیدی بنا چکی تھیں اور ایک مرتبہ تو انھوں نے مارشل دیدی نو²⁹ کی گاڑیوں پر بھی قبضہ کر لیا تھا۔

اپریل میں پاولوگر، رجنٹ ہوزار ایک جرمن گاؤں کے، جس کی اینٹ سے اینٹ بج چکی تھی اور ب خالی اہتیار تھا، نزدیک تعینات کر دیے گئے۔ یہاں وہ کئی ہفتے مقیم رہے اور اس دوران میں انھوں نے قطعاً کوئی حرکت نہ کی۔ برف پگھلنا شروع ہو گئی تھی۔ موسم بچ بستہ تھا اور ہر طرف کچڑ ہی کچڑ تھی۔ دریا کی سطح پر برف ٹوٹنے لگی اور سڑکوں پر سفر کرنا ناممکن ہو گیا۔ کئی دنوں تک نہ ان لوگوں کو رسد فراہم کی گئی اور نہ گھوڑوں کے لیے چارہ اور چھینا مہیا کیا گیا۔³⁰ چونکہ گاڑیوں کی آمد و رفت ناممکن ہو گئی تھی، فوجی جوان خالی اور ویران گاؤں میں پھیل گئے تاکہ آلوداش کے بائیس لیکن اب یہ بھی جنس نایاب بن چکے تھے۔

ہر چیز کھائی جا چکی تھی اور تمام ساکنان وہ فرار ہو چکے تھے۔ اگر کوئی بھولے بھٹکے اشخاص رہ بھی گئے تھے، ان کی حالت بھکاریوں سے بدتر ہو چکی تھی۔ کسی کے پاس کوئی چیز ایسی نہیں تھی جسے قبضے میں لیا جاسکتا۔ عام طور پر فوجی جوان رحم نام کی کسی چیز سے آشنا نہیں ہوتے لیکن اب وہ بھی کوئی فائدہ اٹھانے کی بجائے انھیں رہنا بچا کھیا راشن دیتے گئے۔

جنگی کارروائیوں کے دوران میں پاولوگر، رجنٹ کے صرف درجہ ان زخمی ہوئے تھے لیکن فائدہ کشی اور بیماریوں نے ان کی تعداد میں نصف کے قریب تخفیف کر دی تھی۔ ہسپتالوں میں موت اتنی بے رحم تھی کہ وہ جوان، جو بخار میں مبتلا ہوتے تھے یا ناقص غذا کی وجہ سے جن کے معدے پھول جاتے تھے، ڈیوٹی پر رہنے کو ترجیح دیتے تھے۔ ان میں اتنی سکت بھی نہیں ہوتی تھی کہ وہ اپنے پاؤں ہی گھسیٹ سکیں۔ یوں وہ محاذ جنگ پر تو پہنچ جاتے لیکن ہسپتال میں داخل ہونا گوارا نہ کرتے۔ مہر کی آمد پر جوانوں نے ایک نیا پودا دریافت کیا۔ یہ تازہ تازہ زمین سے باہر نکلا تھا اور دیکھنے میں ایسا پارکس معلوم ہوتا تھا۔ بتائیں کیوں لیکن وہ اسے 'ماشکا کی بیٹی شیریں' کہنے لگے۔ وہ 'ماشکا کی بیٹی شیریں' (اس کا ذائقہ بہت ترش تھا) کی تلاش میں کھیتوں اور چراگاہوں میں مارے مارے پھرتے، اپنی کھواروں سے اسے کھودتے اور اس ٹھکم کے بارہو کو اس مضر صحت پودے کو ہاتھ نہ لگایا جائے، وہ اسے کھاتے رہتے۔ اس موسم

بہر میں فوجیوں میں نئی بیماری پھوٹ پڑی۔ ان کے بازو، ٹانگیں اور چہرے متورم ہونے لگے۔ ڈکٹروں کا خیال تھا کہ یہ عارضہ اس جز کے کھانے سے، حق ہوتا ہے۔ تاہم، کھانا نعت کے باوجود دینی سوف کے سکواڈرن کے جوان، بارہ تر "ماشکا کی بیخ شیریں" سے پیٹ کی آگ ٹھنڈی کرتے رہے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ کھانے پیے کا سامان تقریباً ختم ہو چکا تھا۔ گزشتہ دو ہفتوں سے صرف پاؤ بھڑسکٹ فی کس تقسیم ہو رہے تھے اور یہ بھی عدم دستیاب ہو چاہتے تھے۔ رہ گئے آلو اس کی آخری قسط برف کی طرح جم چکی تھی اور ان میں شگوفے پھوٹنے لگے تھے۔ گزشتہ دو ہفتوں سے گھوڑوں کا گزارہ بھی اس پرال پر، جو پھولس کی چھتوں سے نکالی جا رہی تھی، ہو رہا تھا۔ ان کے اجماع انتہائی ناغرا اور نحیف ہو چکے تھے، تاہم ان پر زمستانی بال بدستور لگ رہے تھے۔

اس وحشت ناک کمیابی کے باوجود جانوروں اور افسروں کے معمول میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ ان کے چہرے رد اور متورم اور دریاں تار تار رہی لیکن ہوزار حاضری کے لیے پیسے کی طرح صفیں ترتیب دیتے، نظم و ضبط کی پابندی کرتے، گھوڑوں کو خرا کرتے، ہتھیاروں کو چمکاتے، چارے کی بجائے چھتیں اڈھڑ کر پرال لاتے، کھانا کھانے کے لیے دیگوں کے گرد جمع ہوتے، وہاں سے بھوکے واپس آتے، داہیات کھانوں اور اپنی گرجگی کا مذاق اڑاتے۔ ہمیشہ کی طرح فالحو وقات میں بیکاراشیا سے بڑے بڑے، ماڈروٹن کرتے، ان کے سامنے پنہ کپڑے اتارتے اور اپنے ابدان کو حرارت پہنچاتے۔ تب کو نوشی کرتے، ادھر ادھر سے گلے سڑے آلو، جن پر شگوفے پھوٹ رہے ہوتے، لاتے اور انھیں آگ میں بھونٹے اور پوسکن اور سواروف کی مہمات کی داستا نہیں یا شعبہ باز آلو شایا پادری کے خدمت گار ملکوکا کے قصے سناتے۔

ایک ایک مکان میں حسب معمول دو دو تین تین افسران قیام پذیر تھے۔ ان مکانوں کی چھتیں ناہید اور عمومی حالت بہت خستہ تھی۔ عام فوجی جوانوں کو آؤ، بھوسا اور دیگر ضروریات زندگی بہم پہنچانے کے لیے سینئر افسران کے جو کچھ بس میں ہوتا، کیا جاتا۔ جو سینئر افسران ہمیشہ کی طرح اپنا وقت تاش باروسری کھیلیں کھیلنے (خوراک میسر ہو نہ ہو، لیکن روپے پیسے کی کوئی کمی نہیں تھی) میں صرف کر رہے تھے۔ بہم کیا رخ اختیار کر رہی تھی، اس کے بارے میں عام طور پر کم ہی گفتگو ہوتی تھی۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ اس کے متعلق یقین سے کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا اور دوسری بات یہ بہم سا احساس تھا کہ عمومی طور پر جنگ ان کے حق میں نہیں جا رہی۔

پہلے کی طرح رستوف اب بھی دینی سوف کے ساتھ مقیم تھا۔ جب سے وہ لمبی چھٹی سنا کر واپس آئے تھے، ان کے دائیں دوستی کے رشتے اور بھی مستحکم ہو گئے تھے۔ دینی سوف رستوفوں کے خاندان کا کبھی ذکر نہیں کرتا تھا لیکن کانڈر رستوف کے ساتھ جس قسم کی گرم جوشی کا مظاہرہ کرتا تھا، اس سے اسے یہ محسوس ہوتا تھا کہ سینئر فسر کو عاشق کی محبت میں جس ناکامی کا سامنا کرنا پڑا تھا، اس نے ان کے باہمی تعلقات کو مضبوط بنانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ اس میں قطعاً کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں کہ دینی سوف رستوف کا بہت خیال رکھتا تھا اور اس کی حتی الوسع یہی کوشش ہوتی تھی کہ اسے خطرات میں کم سے کم دھکیلا جائے اور جب ایک جھڑپ کے بعد وہ واپس آیا،

اس نے اس کا استقبال بے ریا مسرت سے کیا۔

ایک بار جب رستوف کو ایک اجڑے بچے اور مسماں شدہ گاؤں میں رسد تلاش کرنے کی غرض سے راز کی گیا، اس کی ملاقات ایک پولستانی بزرگ اور اس کی دختر سے ہوئی جس نے ایک شیرخوار بچہ، اپنی ہانہوں میں تھام رکھا تھا۔ ناقہ کشی اور نیم ستر پوشی نے ان کا کچھ مرنکاں دیا تھا اور ان میں اتنا کس بل نہ تھا کہ وہ پاپا را کہہ سکتے اور نہ ان میں اتنا دم تھا کہ کوئی کرائے کی گاڑی حاصل کر سکتے۔ رستوف واپسی پر انھیں اپنے ساتھ لے گیا اور مکان کے جس حصے میں وہ خود مقیم تھا، انھیں وہیں ٹھہر دیا۔ جب تک مرد بیر صحت یا پ نہ ہو گیا، وہ گئی بیٹھے وہیں ٹھہرے رہے۔ رستوف کے ایک رفیق کار نے عورتوں کا ذکر کرتے ہوئے اس پر پھبتی کہی کہ ”تم ہم سب کے گرد ہو۔ اب تمہارا بھلا اسی میں ہے کہ جس پولستانی بزرگ کو تم نے مصیبت سے بچایا ہے، اس کا تعارف ہم سب سے کرا دو۔“ رستوف نے اس مذاق کو اپنی توہین تصور کیا اور اس کا پارہ ساتویں آسمان پر پہنچ گیا۔ دینی سوف نے بڑی مشکل سے بچاؤ کرایا اور یوں ان دونوں کے مابین ڈوسٹیل ہوتے ہوتے رہ گئی۔ جب وہ افسردہاں سے چلا گیا، دینی سوف، جسے پولستانی دوشیزہ کے ساتھ رستوف کے تعلقات کے بارے میں کچھ معلوم نہیں تھا، اسے اس کی گرمی مزاج کے متعلق پچھر پلانے لگا۔ اس پر رستوف نے کہا:

”میں کیا کرتا؟۔ وہ میرے نزدیک بہن کے برابر ہے۔ میں تمہیں بتا نہیں سکتا کہ مجھے کس قدر غمہ یا تھا۔۔۔ کیونکہ خیر، کیونکہ۔۔“

دینی سوف نے رستوف کے کندھے پر تھکی دی اور جیسا کہ جذباتی کھلبلی کے عالم میں اس کا دستور تھا، وہ اس کی طرف دیکھے بغیر کمرے میں چہل قدمی کرنے لگا۔

”یہ تم رستوفوں کی نسل کتنی بڑی ہے!“ وہ بڑبڑایا اور رستوف نے دیکھا کہ اس کی آنکھوں میں آنسو چمک رہے ہیں۔

اپریل کے دوران میں زار کی آمد نے فوجیوں کو نیا حوصلہ بخشا۔ زار نے بارٹن ٹھکانے کے مقام پر فوجی دستوں کا معائنہ کیا۔ رستوف کو وہاں جانے کا کوئی موقع نہ مل سکا کیونکہ پولوگرات رجمنٹ بارٹن ٹھکانے سے کہیں دور بیرونی چوکی پر تعینات تھی۔

پولوگرات رجمنٹ کا پڑاؤ کھلی فضا میں تھا اور وہاں کسی قسم کی سہولت دستیاب نہیں تھی۔ دینی سوف اور رستوف کچے جھونپڑے میں ڈیرا ڈالے پڑے تھے۔ یہ جھونپڑا فوجی جوانوں نے ان کے لیے تعمیر کیا تھا اور اس پر انھوں نے گھاس پھوس اور درختوں کی شاخوں کی چھت بنا دی تھی۔ جھونپڑا تیار کرنے کے لیے جو طریقہ استعمال کیا گیا تھا، اس کا ان دنوں عام رواج تھا۔ جوتا یہ تھا کہ آٹھ فٹ لمبی، ساڑھے تین فٹ چوڑی اور ساڑھے چار فٹ گہری خندق

ساقی انٹرنیٹ

PDF BOOK COMPANY



Muhammad Hushain Syakir

0305-6406067

Sidrah Tahir

0334-0120123

Muhammad Saqib Riyaz

0344-7227224

کھڑی جاتی۔ خندق کے ایک کنارے کو کاٹ کر زینہ بنایا جاتا اور جھونپڑے کے اندر آمد و رفت اسی کے ذریعے ہوتی۔ یہ خندق کمرے کا کام دیتی اور جرنلوگ خوش نصیب ہوتے جیسا کہ سکواڈرن کمانڈر تھا، ان کی خندق میں زینے کے مقابل دوسرے کنارے پر چار پایوں پر چوبلی تختہ نصب کر دیا جاتا اور اس تختے سے میز کا کام لیا جاتا۔ خندق کے دونوں کناروں پر تقریباً اڑھائی ٹھکانے چوڑی زمین سے مٹی کھود کر باہر پھینک دی جاتی۔ اس طرح جو جگہ بنتی، وہ سونے اور بیٹھنے کے لیے استعمال ہوتی۔ چھت اس طرح تعمیر کی جاتی کہ اگر کوئی شخص خندق کے درمیان میں کھڑا ہونا چاہتا، اسے کوئی دقت پیش نہ آتی بلکہ اگر کوئی شخص بستر پر بیٹھنا چاہتا تو وہ بھی بیٹھ سکتا تھا، اسے صرف میز کی طرف قدرے جھٹکنا پڑتا تھا۔ دینی سرف بڑے مزے سے رہ رہا تھا کیونکہ وہ اپنے سکواڈرن کے جوانوں میں بہت مقبول تھا۔ خندق کے اندر داخل ہونے کا جو راستہ تھا، وہاں اس نے تختہ لگوا لیا تھا۔ اس تختے میں شکستہ لیکن مرستہ شدہ شیشہ نصب تھا اور یوں یہ کمزکی کا کام دینے لگا۔ جب موسم بہت سرد ہو جاتا، جوانوں کے الودوں سے میز بھی میزگی آہنی چادر پر دھکتے انگارے لائے جاتے اور زینے پر۔ جسے دینی سوف ”ستنبالیہ“ کہتا تھا۔ رکھ دیے جاتے۔ اس سے خندق اتنی گرم ہو جاتی کہ افسران جن کی اچھی خاصی تعداد ہر وقت دینی سوف اور رستوف کے پاس رہتی تھی، اپنے کوٹ اتار دیتے، اور محض قمیصوں میں خاصا آرام محسوس کرتے۔

اپریل کے مہینے میں رستوف ڈیوٹی افسر کے فرائض سرانجام دے رہا تھا۔ بے خواب شب گزارنے کے بعد وہ ایک صبح صحت اور آٹھ بجے کے درمیان واپس آیا۔ اس نے انگارے لانے کا حکم دیا، بارش سے شرابور اپنے زیر جاے تبدیل کیے، مناجات کی تلاوت کی، کچھ چائے پی اور اپنے جسم کو حرارت پہنچائی۔ پھر اس نے اپنے کونے میں اور میز پر مختلف اشیاء ترتیب اور سیٹے سے رکھیں۔ کھلی فضا میں گھومنے پھرنے کی وجہ سے اس کا چہرہ تھمارا تھا۔ وہ خالی قمیص پہنے اور دونوں ہاتھ سر کے نیچے رکھے پشت کے بل لیٹا ہوا تھا۔ اس کا حراج بہت خوشگوار تھا اور وہ اپنی ترقی کے، جس کی اسے غالباً ایک درود میں منے کی امید تھی (یہ ترقی اسے اس لیے ملنا تھی کیونکہ پچھلی بار تقسیم کی افواج کے بارے میں وہ لگانے کے سلسلے میں اس نے زبردست خدمات سرانجام دی تھیں)، بارے میں سوچ رہا تھا۔ وہ دینی سوف کا، جو کہیں باہر گیا ہوا تھا، انتظار کر رہا تھا۔ وہ اس کے ساتھ گفتگو کرنا چاہتا تھا۔

اچانک اسے جھونپڑے کے عقب میں دینی سوف کی آواز سنائی دی۔ صاف معلوم ہو رہا تھا کہ وہ غیظ و غضب سے اٹھ رہا ہے۔ یہ دیکھنے کے لیے کہ وہ کس پر اپنا غصہ جھاڑ رہا ہے، رستوف اٹھ اور کمزکی کی طرف چل پڑا۔ وہاں اسے کوارٹر ماسٹر توپ چونکو نظر آیا۔

”میں نے تمہیں حکم دیا تھا کہ انہیں وہ جڑ۔ کیا کہتے ہو اسے، ہاں ماشا کا مال۔ مت کھانے دو؟“ دینی سوف گلا پھڑ پھاڑ کر چلا رہا تھا، ”اور میں نے اپنی آنکھوں سے لازار چک کو اسے کہی توں سے لاتے دیکھا ہے۔“

”جناب علی، میں انہیں بار بار آپ کا حکم پہنچا چکا ہوں لیکن کوئی میری سننے بھی تو؟“ کوارٹر ماسٹر نے جواب دیا۔

رستوف دوبارہ اپنے بستر پر دراز ہو گیا اور مزے مزے سے سوچنے لگا۔ ”میں اپنی ڈیوٹی دے چکا ہوں،

اب وہ جانے اور اس کا کام۔ چلانا ہے تو چلاتا رہے، میں تو ب آرام کروں گا۔ واہ، واہ کیا لطف آ رہا ہے!“ دیر میں سے اسے دینی سوف کے چرب زبان اور ہر معاش ردی لا در و شکا کی آواز بھی سنائی دے رہی تھی۔ وہ لڑکی پھندی گاڑیوں، بسکٹوں اور بیلوں کے متعلق کچھ کہہ رہا تھا۔ اس نے یہ تمام چیزیں اس وقت دیکھی تھیں جب وہ رسد ڈھوڑنے گیا تھا۔

دینی سوف کی آواز پہلے سے کہیں زیادہ دور سے سنائی دے رہی تھی۔ وہ با آواز بلند چل رہا تھا:

”کاشیاں، کس لوا۔ دوسری پلٹن!“

”یہ کہاں جا رہے ہیں؟“ رستوف سوچ رہا تھا۔

کوئی پانچ منٹ بعد دینی سوف جھونپڑے میں آیا، کچھ آلود بوئوں سمیت بستر میں گھسا، چشم گین انداز سے پائپ جلایا، اپنی اشیاء اور ہر بکھیریں، چابک اور شمشیر اٹھائی اور دوبارہ باہر نکل گیا۔ جب رستوف نے پوچھا:

”کہاں جا رہے ہو؟“ اس نے مبہم اور غصیل جواب دیا: ”مجھے کچھ کام ہے۔“

”خداوند اور عظیم زار میر انصاف فرما، میں!“ دینی سوف نے باہر جاتے جاتے کہا۔

باہر متحد گھوڑے چھپ چھپ کیچڑ میں سے گزر رہے تھے۔ ان کے سموں کی دھپ دھپ رستوف کو سنائی دے رہی تھی۔ اس نے اتنا بھی معلوم کرنے کا تردد نہ کیا کہ دینی سوف کہاں گیا ہے۔ اپنے کونے میں اس کا جسم نرم گرم ہو گیا تھا اور اس کی آنکھ لگ گئی۔ وہ شام ڈھلے تک باہر نہ نکلا۔ دینی سوف ابھی تک راپس نہیں آیا تھا۔ مطلع نکھر چکا تھا۔ اگلے جھونپڑے کے قریب دو افسر اور ایک کیڈٹ سوالیٰ کا کھیں رہے تھے۔ جب جھلے نرم کیچڑ میں دھنس جاتے، وہ دھنس پڑتے۔ رستوف ان میں جا شامل ہوا۔ ابھی کھیں جاری تھا کہ افسروں کو متحد دھنکڑے ادھر تے دکھائی دیے۔ تقریباً پندرہ ہوزار مرل گھوڑوں پر سوار ان کے پیچھے پیچھے آ رہے تھے۔ چھٹکڑے، جو ہوزاروں کی نگرانی میں آ رہے تھے، پڑاؤ کے قریب پہنچ گئے۔ ہوزاروں کا جم غفیر ان کے گرد اکٹھ ہو گیا۔

”یہ بھی خوب رہی۔ دینی سوف نا حق پریشان ہوتا رہا اور رسد یہاں پہنچ بھی گئی،“ رستوف نے کہا۔ ”اور آئی بھی عین موقع پر! جوان کتنے خوش ہوں گے!“ افسروں نے لقمہ دیا۔

ہوزاروں سے چند قدم پیچھے گھوڑے پر سو رہی دینی سوف آ رہا تھا۔ اس کے ساتھ پیادہ فوج کے دو افسر تھے۔ وہ ان کے ساتھ کسی چیز کے بارے میں بحث کر رہا تھا۔ رستوف ان کا استقبال کرنے آگے بڑھا۔

”کیپٹن، میں آپ کو خبردار کیے دیتا ہوں،“ ایک نحیف و زار کوتاہ قامت شخص، جو بظاہر بہت برہم تھا، کہہ رہا تھا۔

”میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ میں انہیں واپس نہیں کروں گا!“ دینی سوف نے جواب دیا۔

”کیپٹن، آپ کو اس کے لیے جواب رہ ہونا پڑے گا۔ یہ بنا دت ہے۔ آپ نے اپنی ہی فوج کی گاڑیوں پر قبضہ کر لیا ہے! ہمارے جوانوں کے منہ میں دونوں سے کھیل بھی نہیں گئی۔“

”اور میرے جوان دوستوں سے فائدے کر رہے ہیں۔“

”یہ بڑی قزاقی ہے! جناب، آپ کو اس کے لیے جواب دہ ہونا پڑے گا!“ یہ وہ فوج کے فسر نے اپنی آواز بلند کرتے ہوئے کہا۔

”تم نے کیوں میرا ناک میں دم کر رکھا ہے؟“ دینی سوف نے چلا کر کہا۔ اس کا پارہ اک دم گرم ہو گیا تھا۔ ”جواب دہ مجھے ہونا پڑے گا، تمہیں نہیں۔ بہتر ہے کہ تم یہاں سے چلے جاؤ۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہاری ٹھکانی ہو جائے۔ چلو، بھاگو یہاں سے!“ اس نے دہارتے ہوئے افسروں سے کہا۔

”بہت اچھا پھرا!“ کوتاہ قامت فسر نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔ وہ ذرا بھی خوف زدہ نہیں ہوا تھا اور نہ اس نے اپنی جگہ سے کوئی جنبش کی۔ ”اگر آپ اس قزاقی پر تل ہی چکے ہیں، پھر میں...“

”جہنم میں جاؤ جان کی سلامتی چاہتے ہو، یہاں سے سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ جاؤ!“ دینی سوف نے اپنا گھوڑا موڑا اور افسر کی طرف لپکا۔

”بہت اچھا! بہت اچھا!“ افسر تہہ پدا میز انداز سے بڑبڑایا۔ وہ واپس مڑا اور گھوڑا بھگانے لگا۔ وہ زین پر بیٹھا اچھل رہا تھا۔

”کتے کا پلا باز پر پاؤں لٹکائے بیٹھا ہے! کتے کا پلا باز پر پاؤں لٹکائے بیٹھا ہے!“ دینی سوف اس کی طرف نہ کر کے چلائے جا رہا تھا۔ اس پر سوار فوج کا افسر یہ وہ فوج کے گھوڑے پر سوار افسر کی اس سے زیادہ توہین نہیں کر سکتا تھا۔ پھر وہ گھوڑے پر بیٹھا بیٹھا رستوف کی طرف آیا۔ ہستے ہستے اس کے پیٹ میں تل پڑ گئے۔

”یہ وہ فوج سے لایا ہوں۔“ چھین کر لایا ہوں!“ اس نے کہا۔ ”میں اپنے جوانوں کو بھوکے مرنے نہیں دیکھ سکتا۔ بالکل نہیں۔“

یہ چمکڑے، جواب ہونازاروں کے قبضے میں تھے، پیادہ رجمنٹ کے لیے مخصوص کیے گئے تھے۔ لیکن جب دینی سوف کو لاوردشکا کی زبانی معلوم ہوا کہ ان چمکڑوں کے ہمراہ فوجی گارڈ نہیں ہے، اس نے اور اس کے ہونازاروں نے ان پر بزور شمشیر قبضہ کر لیا۔ جوانوں کو اجازت دے دی گئی کہ وہ جتنے رس چاہیں، لے لیں۔ یہی نہیں بلکہ انھیں دوسرے سکواڈرنوں میں بھی تقسیم کر دیا گیا۔

اسکے روز رجمنٹل کمانڈر نے دینی سوف کو بلایا۔ اس نے اپنی انگلیاں اپنی نگاہوں کے سامنے پھیلائیں اور اس سے کہنے لگا

”اس معاملے میں میرا رویہ یہ ہوگا کہ مجھے اس کے متعلق کچھ علم نہیں اور میں کوئی کارروائی بھی نہیں کروں گا۔ لیکن تمہیں میں یہ مشورہ دوں گا کہ اپنا گھوڑا پکڑو اور جھٹ پٹ ہیڈ کوارٹر پہنچ جاؤ۔ وہاں شعبہ رسد کے حکام سے ملو اور اس معاملات کو سمجھا لو۔ اگر ہو سکے تو مختلف اشیاء کی وصولی کی رسید بھی دے دو۔ اگر ایسا نہ ہو سکا اور اشیائے خوردنی پیادہ فوج کے کھانے میں مندرج رہیں، پھر معاملہ گڑبڑ جائے گا۔“

کرنل سے ملنے کے بعد دینی سوف سیدھا ہیڈ کوارٹرز پہنچی۔ وہ اس کے مشورے پر پورے خلوص سے عمل کرنے کا خواہاں تھا۔ شام کو جب وہ واپس آیا، اس کی جو حالت ہو رہی تھی، رستوف نے اس میں اسے اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اس سے بات نہیں ہو رہی تھی اور اس کا دم پھول رہا تھا۔ جب رستوف نے استفسار کیا کہ گزرا کیا ہے، وہ ضحیف دنا تو اس اور ہٹھی ہوئی آواز میں صرف بے ربط رسمکیاں اور گالیاں ہی گل سکا۔

دینی سوف کی حاست دیکھ کر رستوف کو کھٹکنا حق ہو گیا۔ اس نے سے اپنا لباس تبدیل کرنے اور پانی پینے کا مشورہ دیا۔ اور خود اس نے ڈاکٹر کو بلا بھیجا۔

”مجھ پر قزاقی کا مقدمہ چلے گا۔ اف۔۔۔ مجھے۔۔۔ درپانی۔۔۔ دو۔۔۔ چلانے دو انھیں مقدمہ۔۔۔ مجھے کوئی پردا نہیں۔۔۔ میں بد معاشوں کی پٹائی کرتا رہوں گا۔ اور میں زر کے بھی گوش گزار کروں گا۔ کچھ دف ہے؟ مجھے دیتا۔۔۔“ وہ کہتا رہا۔

رجسٹریلر کمانڈر نے کہا کہ دینی سوف کی فصد کھولنا ضروری ہو گیا ہے۔ جب اس کے بالوں بھرے بازو سے سوپ کے پیالے کے برابر سیاہ خون نکالا جا چکا تب کہیں وہ اس قابل ہوا کہ اس کے ساتھ جو کچھ پیش آیا تھا، اس کی تفصیل بیان کر سکے۔

”میں وہاں پہنچی،“ دینی سوف بتانے لگا۔ ”میں نے ان سے دریافت کیا: آپ کے صاحب کہاں ہیں؟ انھوں نے اس کے مکان کی طرف اشارہ کیا اور مجھ سے کہا: مہربانی کریں اور ذرا انتظار فرمائیں۔ میں نے بس میل گھوڑے پر سفر کیا ہے۔ مجھے در بھی فرائض سر انجام دینا ہیں۔ میرے پاس فالتو وقت نہیں ہے، میری آمد کی اطلاع کر دو، بہت خوب، قزاق اعلیٰ باہر آ گیا۔ اس کے سر میں بھی مجھے لیکچر چلانے کا سودھا گیا۔ یہ تڑا ہے؟“ اس نے کہا۔ ”آپ اس شخص کو میں نے اسے بتایا، جو اپنے جوانوں کا پیٹ بھرنے کے لیے خوردنی اشیاء قبضہ کرتا ہے، قزاق نہیں کہہ سکتے۔ قزاق وہ شخص ہوتا ہے جو اپنی جیبیں بھرنے کے لیے دوسروں کا مال لوٹتا ہے، بہت خوب، رسد کشنر کے دفتر میں جاؤ اور رسید لکھ دو۔“ اس نے کہا۔ لیکن اس معاملے کے بارے میں ہیڈ کوارٹرز کو رپورٹ بھیج دی جائے گی۔ میں رسد کشنر کے دفتر پہنچی اور اندر چھا گیا۔ وہاں، تمھارے خیال میں۔ میز پر کون بیٹھا تھا؟ نہیں، دماغ پر زور دو۔ کون ہمیں بھوکوں مار رہا ہے؟“ دینی سوف نے دھاڑتے ہوئے کہا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے تختے پر اس بازو کے ساتھ، جس کی بھی ابھی فصد کھولی گئی تھی، اتنے زور سے منکا مارا کہ گلاس اچھلنے لگے اور حجتہ گرتے گرتے بچا۔ تکیا نہ!۔“ تو یہ تم ہو جو ہمیں فاتحہ کشی پر مجبور کر رہا ہے؟ کیا کہتے ہو؟ اور میں نے سے اس کا مزہ چکھا دیا۔ اسے جھانپ کر رسید کیا۔ وہ سیدھا اس کی تھوٹھنی پر لگا۔ ارے، بد ذات کے ختم، تم، تم، میں نے اس کی پٹائی شروع کر دی۔ سچ بڑ مزہ آیا،“ اس نے کینہ تو زسرت سے اپنی سیاہ سوپٹھوں تلے اپنے سفید داغوں کی نمائش کرتے ہوئے کہا۔ ”اگر وہ مجھے گھسیٹ کر پرے نہ لے جاتے، میں اس کی جان لے کر بیٹا۔“

”لیکن تم چلا کیوں رہے ہو؟“ رستوف نے کہا۔ ”چپ ہو جاؤ۔ تمھارے بازو سے پھر خون رسنے لگا ہے۔“

ٹھہر۔ پٹی دوبارہ باندھنا پڑے گی۔“

دینی سوف کی پٹی دوبارہ باندھ دی گئی اور اسے بستر پر لٹا دیا گیا۔ جب وہ اگلے روز بیدار ہوا، وہ پرسکون ہو چکا تھا اور اس کی طبیعت بارغ و بہار ہو رہی تھی۔

لیکن دوپہر کے وقت رجسٹر کا، بکسٹن ان کے زیر زمین جھونپڑے میں آیا۔ اس کے چہرے پر متانت اور سنجیدگی چھائی ہوئی تھی۔ اس نے ہمدانفوس میجر دینی سوف کو رجسٹر کا ٹکڑا کھایا جس میں اس سے گزشتہ روز کے واقعات کی وضاحت طلب کی گئی تھی۔ بکسٹن نے انھیں بتایا: ”معاذہ بہت نازک صورت اختیار کر چکا ہے۔ فوجی عدالت کی تقرری ہو چکی ہے۔ ان دنوں موٹ مارور حکم عدولی کے واقعات کے متعلق جو سختی روا رکھی جا رہی ہے، اس کے پیش نظر اگر آپ کی محض تنزیلی ہوگئی اور آپ کو عام سپاہی بنادیا گیا، آپ اپنے آپ کو بہت خوش نصیب تصور کریں۔“

شکایت کنندگان کا موقف یہ تھا کہ چھکڑوں پر قبضہ کرنے کے بعد میجر دینی سوف بحالت نشہ چیف کوارٹر ہاؤس کے دفتر پہنچا، بلا اشتعال اسے چور کہا اور اسے دھمکیاں دینے لگا کہ وہ اس کی پٹائی کر دے گا۔ جب اسے باہر نکالنے کی کوشش کی گئی، وہ زبردستی اندر گھس گیا، دو ملازمین کو بری طرح مارا پیٹا اور ان میں سے ایک کے بازو کا جوڑا لگ کر دیا۔

رستونف کے مزید سوالات کے جواب میں دینی سوف نے قہقہہ لگایا اور کہا: ”مجھے کچھ یاد پڑتا ہے کہ کسی دوسرے شخص نے اس پھٹنے میں ٹانگ اڑادی تھی۔ لیکن یہ سب وہ بات ہے، پریشانی کی قطعاً کوئی بات نہیں۔ رہا کورٹ مارشل، اس سے تو میں خواب میں بھی نہیں ڈرتا۔ اگر ان حرام زادوں نے مجھ سے الجھنے کی کوشش کی، میں انھیں وہ سبق سکھاؤں گا کہ وہ بدتمیز بھلا نہ سکیں گے۔“

دینی سوف اس سارے مسئلے کا تحقیر سے ذکر کرتا رہا، تاہم رستونف، جو اس کی رگ رگ سے واقف تھا، بہت پسند کیا کہ وہ اندر سے کورٹ مارشل سے خائف ہے (تاہم اس نے اپنے اس احساس کو دوسروں سے چھپانے کی پوری کوشش کی)۔ اس کے لیے یہ مسئلہ پریشانی کا باعث بن گیا کیونکہ یہ امر قطعی یقینی تھا کہ اس کے نتائج تباہ کن ہوں گے۔ سرکاری کاغذات روزانہ موصول ہونے لگے۔ کبھی مختلف اقسام کے فارم، جنھیں پرکرتا ہوتا تھا، آجاتے اور کبھی عدالتی حکم پہنچ جاتے۔ اور یکم مئی کو دینی سوف کو حکم ملا کہ وہ سکواڈرن کی کمان اگلے سینئر انسپکٹر کے حوالے کر دے اور خود ڈویژنل سٹاف کے سامنے حاضر ہو جائے تاکہ اس ہنگامے کی، جو اس نے دفتر رسد میں پہنچا تھا، تحقیقات کی جاسکیں۔

جس روز اسے یہ حکم ملا، اس سے ایک دن پہلے پلاٹوف نے دو قازق رجمنٹوں اور ہونڈروس کے دو سکواڈروں کے ساتھ دشمن کے زیر قبضہ علاقے کی ریکی کی تھی۔ اپنی عادت کے مطابق دینی سوف گھوڑے پر سوار سب سے آگے تھا اور اپنی جرات و لیری کی نمائش کر رہا تھا۔ اسے میں کسی ماہر فرانسیسی نشاچی کی گولی آئی اور اس کی ران کو چھوٹی نکل

گئی۔ اگر کوئی اور وقت ہوتا، دینی سوف اتنے معمولی زخم کی پروا بھی نہ کرتا اور نہ پنی رجنٹ چھوڑ کر کہیں جاتا۔ تاہم اب اس نے اس موقع کو غنیمت تصور کیا، اسے سٹاف کے سامنے پیش نہ ہونے کا بہانہ مل گیا اور وہ ہسپتال میں داخل ہو گیا۔

17

فریڈ لائنٹ کا معرکہ، جس میں پاؤ لو گرات رجنٹ شریک نہیں ہوئی تھی، جون میں پایا ہوا تھا۔ لڑائی کے بعد، رسمی صلح کا اعلان ہوا۔ رستوف کو اپنے دوست کی عدم موجودگی کھل رہی تھی۔ جب سے وہ گیا تھا، اسے اس کے بارے میں کوئی اطلاع موصول نہیں ہوئی تھی۔ اسے یہ فکر کھائے جا رہی تھی کہ معلوم نہیں کہ اس کے زخم کی کیا حالت ہو اور اس کے معاملات کس نہج پر جا رہے ہوں۔ چنانچہ اس نے اس، رضی صلح نامے سے فائدہ اٹھانے کی ٹھانی اور دینی سوف سے ہسپتال میں ملنے کی غرض سے چھٹی لے لی۔

ہسپتال پر شیا کے ایک چھوٹے سے قصبے میں واقع تھا اور دو مرتبہ روسی اور فرانسیسی افواج اس کی اینٹ سے اینٹ بجا چکی تھیں۔ چونکہ یہ گرمیوں کا موسم تھا جب کھیتوں اور چراگا ہوں میں ہر چیز اپنے جو بن پر ہوتی ہے، یہ نہایت منا قصبہ، جس کے مکانوں کی چھتیں اور باڑیں سسار ہو چکی تھیں، جس کے گلی کو بچے غلاظت سے اٹے ہوئے تھے، جس کے بایسوں کی حالت پتلی تھی اور جس میں پیار اور مدہوش فوجی آوارہ گردی کرتے پھرتے تھے، خاص طور پر براہ اس اور دیرین منظر پیش کر رہا تھا۔

ہسپتال خشکی و عورت میں قائم کیا گیا تھا۔ اس کے درجوں کے چوکھے، درخشے ٹوٹ پھوٹ چکے تھے۔ اس کے چاروں اطراف مہمن تھا۔ اس مہمن کے ارد گرد بچی کھچی باز کی نشانیاں کھڑی تھیں۔ متعدد فوجی، جن کے چہرے زار اور پھولے ہوئے تھے، بنیاں باندھے مہمن میں جھل قدمی کر رہے تھے یا بیٹھے دھوپ کے مزے لے رہے تھے۔ جو بچی رستوف دروازے کے اندر داخل ہوا، گلے سڑے احسام کی سڑاند اور ہسپتال کی معمول کی بدبوؤں نے اسے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ میڈیٹھیں پر اس کی مذاقات ایک روسی ڈاکٹر سے ہوئی جو سگارت نوشی میں مصروف تھا۔ ڈاکٹر کے پیچھے پیچھے اس کا روسی مددگار تھا۔

”میں بیک وقت ہر جگہ نہیں جاسکتا،“ ڈاکٹر کہہ رہا تھا۔ ”آج شام با کارالیکسی وچ کے ہاں آ جانا، میں وہاں ہوں گا۔“

طبی مددگار نے مزید ایک سوال دریافت کیا۔

”جو مناسب سمجھتے ہو، کروا کیا فرق پڑتا ہے؟“

ڈاکٹر کی نظر میڑھیاں چڑھتے رستوف پر پڑی۔

”محترم، آپ یہاں کیا کر رہے ہیں؟“ ڈاکٹر نے پوچھا۔ ”تم گولیوں سے اس لیے بچے ہو کہ یہاں تانس

بخار چنے گلے لگا لو۔ محترم، میں مع عرض کر رہا ہوں، یہ ہسپتال نہیں، دباؤں کا گھر ہے۔“

”کیا مطلب؟“ رستوف نے پوچھا۔

”ہائس، محترم۔ اس چار دیواری میں داخل ہونا موت کو دعوت دینے کے برابر ہے۔ صرف ہم دونوں، میں، ”ماکیف“ (اس نے اپنے مددگار کی طرف اشارہ کیا) ”ابھی تک صحیح سلامت ہیں۔ ہمارے نفع درجن رنقا خدا کو پرے ہو چکے ہیں۔ جوئی کوئی نیا آدمی آتا ہے۔ ایک ہفتے کے اندر اندر چلتا ہوتا ہے، ڈاکٹر نے بدبختی اطمینان سے کہا۔“ پرشیا کے ڈاکٹروں کو یہاں آنے کا حکم دیا گیا تھا لیکن معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے یہ اتحادی یہاں کی ملازمت کو جوتی کی لوگ پر بھی نہیں مارتے۔“

رستوف نے کہا: ”میں یہاں ہونے اردن کے مسجرونی سوف سے ملنے آیا ہوں۔ انھیں یہاں زخمی حالت میں دیا گیا تھا۔“

”محترم سرکار، مجھے کچھ علم نہیں۔ میں آپ کو کچھ بتانے سے قاصر ہوں۔ ذرا سرجیکس تین ہسپتالوں کا انتظام دالہرام میرے ذمے ہے۔ چار سو مریضوں کی نگہداشت کرنا ہوتی ہے۔ وہ تو بھلا ہو پرشیا کی چند مختیر خواتین کا کہ وہ ہر مہینے ہمیں دو پاؤنڈ کافی اور کچھ مرہم بیوں کا کپڑا بھیجتی ہیں ورنہ ہمارا تو خدا ہی حافظ تھا،“ اس نے قہقہہ لگایا۔ ”چار سو جوتی، دو ہر دور نئے مریضوں کا تانتا بندھا رہتا ہے۔ چار سو ہی ہیں؟“ اس نے اپنے مددگار کی جانب مڑتے ہوئے دیکھا۔

معلوم ہوتا تھا کہ تھکاوٹ اور بے آرامی نے مددگار کا پلٹتھن نکال دیا ہے۔ صاف نظر آ رہا تھا کہ وہ بہت جھنجھٹایا ہوا ہے اور چاہتا ہے کہ باقونی ڈاکٹر سے جلد از جلد چھپا چھوٹ جائے۔

”مسجرونی سوف،“ رستوف نے پھر کہا۔ ”وہ سویشین میں زخمی ہوا تھا۔“

”میرا خیال ہے کہ اس کی روح تنفس غصری سے پرواز کر چکی ہے۔ کیونکہ ماکیف؟“ ڈاکٹر نے بے نیازی سے پوچھا۔

تاہم مددگار نے ڈاکٹر کی تائید نہ کی۔

”بلند قامت؟ سرخ بال؟“ ڈاکٹر نے پوچھا۔

رستوف نے دینی سوف کا حلیہ بیان کیا۔

”ہاں اس قسم کا آدمی تھا تو سہی،“ ڈاکٹر نے یوں کہا جیسے خوشی سے اس کی ہاتھیں کھلی جاری ہوں۔ ”وہ یقیناً رائی ملک، عدم ہو چکا ہوگا۔ بہرحال میں دریافت کرنا ہوں۔ ہمارے پاس فہرستیں تھیں۔ ماکیف، تمہارے پاس تو نہیں۔“

”فہرستیں الکیسی دچ کے پاس ہیں،“ مددگار نے کہا۔ ”لیکن اگر آپ افسروں کے دارا میں تشریف لے جائیں، آپ کو خود ہی سب کچھ معلوم ہو جائے گا۔“

”محترم، آپ نہ ہی جائیں تو بہتر ہوگا،“ ڈاکٹر نے کہا۔ ”ورنہ شاید آپ کو بھی یہیں قیام کرنا پڑے!“

تاہم رستوف نے گردن کو خم دے کر اجازت چاہی اور مددگار سے راستہ دریافت کیا۔
 ”چھ، بعد میں مجھے اٹن، منڈوینا“ ڈاکٹر نے زبے پر اس کے پیچھے پاؤں بلند کہا۔

رستوف اور مددگار، ایک راہداری میں مڑ گئے۔ اس تاریک غدام گردش میں تعفن کی وہ بھر، تھی کہ رستوف نے ہاتھ ناک پر رکھ لیا اور مجبوراً پس رک گیا تا کہ آگے جانے کے لیے اپنا جی کڑا کر سکے۔ دائیں ہاتھ ایک دروازہ کھل اور ایک زرد رومر میں شخص نیچے پاؤں اور صرف جانگیا پہنے بیساکھیوں کے سہارے پھندکتا باہر آیا۔ اس سے دروازے کی چوکھٹ کا سہارا لیا اور انھیں چمکتی دیکتی اور پر رشک آنکھوں سے بخور دیکھنے لگا۔ رستوف نے کمرے کے اندر جھانکا۔ اسے زخمی اور بیمار فرش پر لیٹے نظر آئے۔ چند ایک کے نیچے گھاس پھوس اور بعضوں کے نیچے اور کوٹ نیچے ہوئے تھے۔

یہ کون ہیں؟“ رستوف نے پوچھا۔

”فوجی ہیں،“ مددگار نے جواب دیا۔ ”ہم بھلا کیا کر سکتے ہیں؟“ اس نے معذرت طلب انداز سے کہا۔
 ”میں اندر جا کر دیکھ سکتا ہوں؟“

”وہاں دیکھنے کو ہے ہی کیا؟“ مددگار نے جواب دیا۔

لیکن محض اس بنا پر کہ طبی مددگار وضع طور پر سے اندر جانے کی اجازت دینے پر متائل تھا، رستوف عام سپاہیوں کے وارڈ میں چلا گیا۔ جس تعفن کا وہ راہداری میں بتدریج عادی ہو رہا تھا، یہاں اس کے بھبھکوں میں اور بھی اضافہ ہو گیا۔ یہاں کی بدبو قدرے مختلف تھی، سختوں میں زیادہ تیزی سے گھسی جا رہی تھی اور محسوس ہو رہا تھا کہ سارے ہسپتال میں جو تعفن پھیلا ہوا ہے، اس کا منبع یہی کمرہ ہے۔

طویل و عریض کمرے میں، جسے دھوپ نے، جو بڑے بڑے دریچوں میں سے چھن چھن کر اندر آ رہی تھی، منور کر رکھا تھا، زخمی اور بیمار دیوار کی جانب منہ کیے دو قطاروں میں لیٹے ہوئے تھے۔ قطاروں کے درمیان میں گزرنے کا راستہ تھا۔ ان میں سے اکثر کو سر پیر کا کوئی ہوش نہیں تھا، کون کمرے میں آتا ہے اور کون باہر جاتا ہے، اس کا انھیں مطلق علم نہیں تھا۔ دوسروں میں قدرے اپنل پیدا ہوئی۔ بعض نے، بچے سراٹھائے اور بعض نے اپنے مہین رور چہرے گھمائے۔ وہ بھی نہایت انہماک سے رستوف کی جانب دیکھ رہے تھے۔ ان کے اندر سے معلوم ہو رہا تھا کہ وہ مدد کی توقع کر رہے ہیں، لعنت ملاست کر رہے ہیں یا دوسروں کی صحت مندی کے بارے میں حسد میں مبتلا ہیں۔ رستوف چلتا چلتا کمرے کے درمیان میں پہنچا، اس نے دو کھلے دروازوں میں سے بلحقتہ کمروں میں جھانک کر دیکھا اور وہاں بھی اسے وہی مناظر نظر آئے۔ وہ بالکل ساکت و صامت کھڑا تھا اور اپنے چاروں اطراف دیکھ رہا تھا۔ اس نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ اسے کبھی اس قسم کے منظر دیکھنا پڑیں گے۔ اس کے بالکل قریب راستے کے عین بیچ میں ایک بیمار شخص پڑا تھا۔ جس انداز سے اس نے اپنے بال ترشائے ہوئے تھے، اس سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ شاید کوئی قازق ہے۔

یہ شخص اپنی پشت کے بل لیٹا ہوا تھا۔ اس کے بھاری بھر کم بازو اور ٹانگیں باہر کو نکلی ہوئی تھیں۔ اس کے چہرے کا رنگ گہرا اور غوائی تھا۔ اس کی آنکھیں یوں اندر کو دھنسی ہوئی تھیں کہ ان کی صرف سفیدی نظر آرہی تھی اور اس کے برہنہ بازوؤں اور ٹانگوں کی، جو ابھی تک سرخ تھیں، رگیں رسیوں کی مانند ابھری ہوئی تھیں۔ وہ پنا مر فز کے ساتھ ٹکرا رہا تھا اور رندھی ہوئی آواز میں صرف ایک ہی لفظ ”پانی، پانی، پانی“ کی تکرار کیے جا رہا تھا۔ وہ یہ کہہ رہا تھا، رستوف بڑے غور سے سننے کے بعد ہی سمجھ سکا۔ رستوف نے اپنے گرد و پیش نگاہیں دوڑائیں۔

سے کسی ایسے شخص کی تلاش تھی جو اس بیمار آدمی کو اپنی جگہ لٹا سکا اور اسے پانی پلا سکا۔

”یہاں مریضوں کی دیکھ بھال کون کرتا ہے؟“ اس نے مددگار سے پوچھا۔

عین اسی وقت آری سروں کو رکھ کر ایک اردلی اگلے کمرے سے ندر آیا، وہ پھرتی سے رستوف کے پاس پہنچا اور میٹش کھڑا ہو گیا۔

”یوڑا کیسی لینس، خداوند آپ کی عمر دراز کرے“ اس فوجی جوان نے چلا کر کہا۔ جس وقت وہ رستوف سے بات کر رہا تھا، وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اسے دیکھے جا رہا تھا اور صاف نظر آرہا تھا کہ وہ اسے ہسپتال کا کوئی افسر سمجھ رہا ہے۔

”دیکھو جوان، اس شخص کو اپنی جگہ لٹا دو اور اسے پانی پلا دو“ رستوف نے قارق کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس سے کہا۔

”بہت اچھا، یوڑا کیسی لینس!“ فوجی جوان نے جواب دیا۔ اس نے اور بھی سیدھا ہونے کی کوشش کی اور اس کوشش کے دوران میں اس کی آنکھیں بالکل ہی باہر نکل آئیں لیکن وہ اپنی جگہ سے ایک انچ بھی نہ ہٹا۔

”نہیں میں یہاں کچھ نہیں کر سکتا“ رستوف نے سوچا اور اس کی نگاہیں جھٹک گئیں۔

وہ باہر نکلتا ہی چاہتا تھا کہ اسے احساس ہوا کہ دائیں جانب کوئی شخص اسے ٹکٹکی ہاندھے دیکھے جا رہا ہے۔ وہ اس کی جانب مڑا اور اس نے دیکھا کہ کمرے کے تقریباً کونے میں ایک ضعیف العمر فوجی، جس کے زرد چہرے پر خشونت برس رہی تھی اور ڈھکی بھڑکی ہو چکی تھی اور جسے خط بنائے مدتیں چکی تھیں، اور رکوٹ پر بیٹھا ہے، اور اسے مسلسل گھور گھور کر دیکھے جا رہا ہے۔ اس کا پڑوسی اس سے کانٹا پھوسی کر رہا تھا اور رستوف کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔ رستوف کو احساس ہوا کہ پیر مرد اس سے کچھ پوچھنا چاہتا ہے۔ وہ اس کے قریب چلا گیا۔ اس نے دیکھا کہ اس کی صرف ایک ٹانگ ہے اور اس نے یہ ٹانگ آلتی پالتی کے انداز میں رکھی ہوئی ہے۔ اس کی دوسری ٹانگ گھٹنے سے کٹی ہوئی تھی۔ دوسری طرف اس کا ہمسایہ سر نہوڑائے اس سے کچھ قافلے پرے جس حرکت پڑا تھا۔ وہ نہ جواں فوجی سپاہی تھا۔ اس کی ناک چبٹی تھی۔ اس کے زرد موی چہرے پر ابھی تک جھائیاں موجود تھیں اور اس کی آنکھیں پتھوؤں کے نیچے اندر کو دھنسی ہوئی تھیں۔ رستوف نے اس فوجی سپاہی کو دیکھا اور اسے شخصہ پسینہ آ گیا۔

”معلوم ہوتا ہے کہ یہ شخص...“ اس نے مددگار کی طرف متوجہ ہو کر کہنا شروع کیا۔

”محترم ہم اس کی منت سماجت کر چکے ہیں، اس سے جھٹ کر چکے ہیں...“ یوزھے سپائی نے کہا۔ اس کے ہونٹ کیکپا رہے تھے۔ ”آخر ہم انسان ہیں، کتے تو نہیں...“

”میں ابھی کسی کو بھیجتا ہوں۔ اسے اٹھالیا جائے گا۔ فی الفور اٹھالیا جائے گا،“ مددگار نے کہا۔ ”محترم، آئیں، شریف لے چلیں۔“

”ہاں، ہاں، آؤ چلیں!“ رستوف نے جھٹ کہا۔ اس کی نگاہیں جھک گئیں اور وہ آپ جس سیٹنے کی سعی کرنے لگا۔ اس کی پوری کوشش یہی تھی کہ راستے کے دونوں اطراف جو لمبے آئینے اور حاسدنگا ہیں اس پر گڑی ہوئی ہیں، وہ کسی طور ان سے بچ جائے، ورنہ کمرے سے باہر نکل گیا۔

18

راہداری میں سے گزرتے مددگار نے رستوف کو افسروں کے وارڈ میں پہنچا دیا۔ یہ وارڈ تین کمروں پر، جن کے دروازے ایک دوسرے کے اندر کھلتے تھے، مشتمل تھا۔ ان کمروں کے اندر بینگ بچھے ہوئے تھے۔ زخمی یا بیمار افسران ان کے اوپر بیٹے یا بیٹھے ہوئے تھے۔ بعض ہسپتال کے ڈریسنگ گاؤن پہنے کمرے میں ادھر ادھر گھوم پھر رہے تھے۔ المروں کے وارڈ میں جس اولین شخص سے رستوف کی مڈھ بھینٹ ہوئی، وہ ایک دیبا پتلہ کوتاہ قامت شخص تھا۔ اس کا صرف ایک ہی بازو تھا۔ وہ شبیز ٹوپ، وڑھے، ڈریسنگ گاؤن پہنے اور چھوٹا سا پائپ دانتوں سے دبائے پیسے کمرے میں چہل قدمی کر رہا تھا۔ رستوف نے اس پر نظر ڈالی اور یہ یاد کرنے کی کوشش کی کہ وہ اریں پشتر اس سے کہاں ملا تھا۔

”مقدیر نے ایک بار پھر ہمیں یک جا کر دیا ہے!“ کوتاہ قامت شخص نے کہا۔ ”توشن، توشن۔ کچھ یاد آیا؟ میں نے تمہیں شون گراہرن میں لفٹ دی تھی۔ یہ تو تمہیں نظر آ ہی گیا ہے کہ ان لوگوں نے میرے جسم کا ایک عضو کاٹ کر پھینک دیا ہے۔“ وہ اپنے ڈریسنگ گاؤن کی خاں آستین کی طرف اشارہ کرتے اور مسکراتے بولا چلا گیا۔ ”وایلی دی سترچ دینی سوف کی تلاش میں ہو؟ ٹھیک؟ وہ میرا روم میٹ ہے؟“ اس نے جب اسے معلوم ہوا کہ رستوف کس سے ملنا چاہتا ہے، کہا۔ ”ادھر، اس طرف۔“ اور توشن اسے اگلے کمرے میں، جہاں چند قہقہوں کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں، لے گیا۔

”قہقہے تو رہے ایک طرف، یہ لوگ یہاں زندہ کیسے ہیں؟“ رستوف نے سوچا۔ اس نے فوجی جوانوں کے کمرے میں جولاش دیکھی تھی، اس کی بواب تک اس کے تختوں میں گھسی ہوئی تھی، اور کمرے سے باہر نکلنے کے دوران میں جن حاسدنگا ہوں نے اس کا حائب کیا تھا، وہ اب تک اسے دکھائی دے رہی تھیں۔ وہ اس لوجوں فوجی کا، جس کی آنکھیں اندر کودھنسی ہوئی تھیں، چہرہ بھی فراموش نہیں کر سکا تھا۔

اگرچہ تقریباً دو پیر ہو چکی تھی، دینی سوف کبل میں سر چھپائے ابھی تک سو رہا تھا۔ ”ارے، رستوف! کیسے ہو! کیا حال میں؟“ اس کی پکار سنائی دی۔ اگرچہ اس کی آواز میں اب بھی دہلی

گلن گرج تھی، جس کا مظاہرہ وہ رجسٹری میں کیا کرتا تھا، لیکن رستوف کو یہ دیکھ کر بہت ملال ہوا کہ اس کی روایتی زندگی رلی اور فزنی کی تہہ میں ایک نیا، بدخواہانہ، ورنجی جذبہ، جس کا اظہار اس کے چہرے کے تاثرات اور اس کی آواز کے اتار چڑھاؤ سے ہوتا تھا، کارفرما ہے۔

اس کا زخم اگرچہ معمولی تھا لیکن ابھی مندمل نہیں ہو، تھا حالانکہ اسے یہ گھڑ آج سے چھ ہفتے قبل آیا تھا۔ ہسپتال میں مقیم باقی لوگوں کی طرح اس کے چہرے پر بھی زردی مائل سوچن نمایاں تھی لیکن رستوف کو جو چیز کھنگی، وہ یہ پتلی سوچن نہیں تھی بلکہ اس کا یہ احساس تھا کہ دینی سوف اسے دیکھ کر خوش نہیں ہوا اور یہ کہ اس کے چہرے پر جو تبسم تھا، وہ زبردستی کا تھا۔ اس نے نہ تو رجسٹری کے بارے میں کوئی سوال کیا اور نہ یہ پوچھا کہ حالات کا معمولی رخ کیا ہے اور جب رستوف ان امور کا ذکر کر رہا تھا، اس نے کوئی توجہ نہ دی۔

رستوف کو اندازہ ہوا کہ دینی سوف کو یہ بات پسند نہیں آ رہی کہ اسے رجسٹری کے بارے میں کوئی چیز یاد دلائی جائے یا ہسپتال سے ہر پابندیوں سے آزاد جو زندگی گزاری جا رہی تھی، اس کے سامنے معمولی طور پر اس کا کوئی ذکر کیا جائے۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنی اس سابقہ زندگی کو فراموش کرنے کی سعی کر رہا ہے اور اب جس واحد معاملے میں اسے دلچسپی رہ گئی تھی، وہ دفتر رسد کے افسروں کے ساتھ اس کا معاملہ تھا۔ جب رستوف نے اس سے پوچھا کہ اب معاملات کس نہج پر جا رہے ہیں، اس نے جھٹ پٹ اپنے بٹیکے کے نیچے سے ایک کانڈکال، جو کمیشن نے سے ارسال کیا تھا، اس نے اس کے جواب میں جو بتدائی مسودہ تیار کیا تھا، وہ بھی اسے دکھایا۔ جب وہ اپنے اس مسودے کی خواندگی کر رہا تھا، وہ اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکا اور لفظ بہ لفظ اس کے جوش و خروش میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ اس نے، جس ہلے کئے اور طنزیہ انداز سے اپنے حریفوں کے لئے لیے تھے، اس نے اس کی طرف رستوف کی توجہ خاص طور پر دلائی۔ جب دینی سوف نے یہ خط پڑھنا شروع کیا، اس کے ہسپتال کے ساتھی جو رستوف کو بیرونی دنیا سے تازہ دار دیکھ کر اس کے گرد اکٹھے ہو گئے تھے، ایک ایک کر کے چھٹنے لگے۔ ان کے چہروں سے رستوف نے اندازہ لگایا کہ وہ اس کہانی کو ایک سے زیادہ مرتبہ سن چکے ہیں اور اب اس سے قطعی عاجز آ چکے ہیں۔ صرف اگلا پڑوسی مریض، جو ہنا کٹا اعلان تھا، اپنے بستر پر بیٹھ رہا۔ وہ پامپ کے کش لے رہا تھا اور اس کے چہرے پر اداسی اور غمگینی جھلک رہی تھی۔ یا پھر کوتاہ قامت ٹوشن، جس کا صرف ایک ہی بازو تھا، یہ کتھ سنتار با اور وہ بھی ناپسندیدگی سے گردن ہلتا رہا۔ بھی خط کی خواندگی جاری تھی کہ نکاح میں اعلان نے دینی سوف کو ٹوک دیا۔

”لیکن میرا خیال یہ ہے،“ اس نے مداخلت کرتے ہوئے کہا ”کہ انھیں زار کو معافی کی درخواست بھیجنا چاہیے۔“
 ”سنا ہے کہ ان دونوں زہیروں انعامات و اکرامات منقسم ہونا ہیں۔ ان حالات میں انھیں معافی منے کا قوی امکان ہے۔“
 ”میں اور زار کو عرضی دوں!“ دینی سوف کچھ اس قسم کے لہجے سے پکارا کہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ اس میں اپنی سابقہ قوت اور شعلہ افشانی بھرنے کی کوشش کر رہا ہے لیکن اس کی آواز کچھ اس طرح سنائی دی جیسے اس کی ہمت جواب دے چکی ہو اور اب وہ نامردوں کی طرح محض اپنی تنگ مزاجی کا اظہار کر رہا ہو۔ ”کس لیے؟ اگر میں کوئی شیرا ہوتا ضرور

رحم کی درخواست پیش کرتا، لیکن میر کورٹ، رشل محض اس سے ہو رہا ہے کیونکہ میں لیبروں سے حسب کتاب کرنا چاہتا تھا۔ یہ چلا لیں مجھ پر مقدمہ، میں کسی سے ڈرتا اور تا نہیں۔ میں نے باعزت طریقے سے زار اور اپنے وطن کی خدمت کی ہے اور میں کوئی چور نہیں ہوں، ادو مجھے ذلیل کرنا اور عام سپاہی بنانا چاہتے ہیں اور۔ اور کان کھول کر سن لو۔ میں انہیں گلی لپٹی رکھے بغیر لکھ رہا ہوں۔ میں نے انہیں لکھا ہے: ”اگر میں نے خزانے پر ڈکا مارا ہوتا۔“

”آپ نے جو کچھ لکھا ہے، بالکل صحیح لکھا ہے، کون کافر اس کے متعلق شبہ کر سکتا ہے؟“ توشن نے کہا۔
 ”لیکن، وائیلی ڈمیترج، مسئلہ یہ نہیں۔“ اور وہ بھی رستوف کی طرف متوجہ ہوا۔ ”آدلی کو صبر شکر کرنا پڑتا ہے اور وائیلی ڈمیترج بھی کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ آڈیٹر نے خود آپ کو بتایا تھا کہ معاملہ گرگوں ہے۔“
 ”گرگوں ہے۔ پھر اسے گرگوں ہی رہنے دیں! دینی سوف پھٹ پڑا۔“

”آڈیٹر نے آپ کو عرضداشت لکھ کر دی تھی،“ توشن نے اپنی بات جاری رکھی۔ ”آپ کو اس پر دستخط کر دینا چاہیے اور اس بھلے مانس کے حوالے کر دینا چاہیے۔ لاریب ان کے (رستوف کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) شاف افسروں کے ساتھ روابط ہیں۔ آپ کو اس سے بہتر موقع میسر نہیں آئے گا۔“

”میں نے بتایا نہیں کہ میں کسی کے پاؤں نہیں پکڑوں گا؟“ دینی سوف نے اسے ٹوکتے ہوئے کہا اور دودھ اور اپنا جواب پڑھنے لگا۔

رستوف کو جیسی طور پر یہ محسوس ہو رہا تھا کہ توشن دوسرے افسروں نے دینی سوف کو جو طرز عمل اختیار کرنے کا مشورہ دیا تھا، وہ انتہائی دانش مندانہ تھا اور اگر وہ اس کے کسی کام آسکتا تو اسے قہری سرسٹ ہوتی، لیکن اس میں اتنا حوصلہ نہیں تھا کہ وہ اسے سمجھ بھجھا سکتا اور اس قسم کی راہ عمل اپنانے کی ترغیب دے سکتا۔ وہ خوب جانتا تھا کہ اس کے دوست کا عزم کڑی کمان کی طرح بے لوج ہے اور وہ دیانت داری کے معاملے میں بے حد جوشیل ہے۔

جب دینی سوف اپنا کھینٹا اور نہ ہرینا جواب، جس پر اس کا ایک گھنٹہ صرف ہوا، پڑھ چکا، رستوف نے اپنی زبان بند رکھی۔ اس نے بتایا دن نہایت افسردگی کے عالم میں دینی سوف کے سانچی مریضوں کی، جو ایک بار پھر اس کے گرد جمع ہو گئے تھے، صحبت میں گزارا۔ وہ ان کی کہانیاں سنتا اور جو کچھ اسے معلوم تھا، انہیں بتاتا رہا۔ دینی سوف ساری شام منہ پھلائے بیٹھا رہا اور اس نے زبان سے ایک لفظ تک نہ کہا۔

آخر کار جب شام کے سائے گہرے ہونے لگے، در رستوف نے روانگی کا ارادہ کیا، اس نے دینی سوف سے پوچھا: ”میرے راکٹ کوئی خدمت دے تو بتائیں۔“

”ہاں، ایک منٹ انتظار کرو،“ دینی سوف نے کہا۔ اس نے دوسرے افسروں پر اچھتی نظر ڈالی، اپنے بچے کے پیچھے سے کاغذات کا پندا نکال، کھڑکی کے، جہاں قلم دان دھرا تھا، قریب پہنچا اور لکھنے بیٹھ گیا۔
 ”معلوم ہوتا ہے کہ پتھر کی دیوار سے سر ٹکرانے کا کوئی فائدہ نہیں،“ اس نے واپس آتے اور رستوف کو غنیمت لٹافہ چھٹاتے ہوئے کہا۔

یہ وہ عرض داشت تھی جو آڈیٹر نے زار کے نام تحریر کی تھی۔ اس میں دینی سوف نے شعبہ رسد کے افسروں کے جرائم اور بدعنوانیوں کی کوئی نشان دہی نہیں کی تھی بلکہ اس نے سیدھے سادے الفاظ میں معافی کی درخواست کی تھی۔

”یہ پہچانو .. معلوم ہوتا ہے۔“

وہ اپنا جملہ مکمل نہ کر سکا۔ اس تکلیف دہ غیر فطری مسکراہٹ اپنے ہونٹوں پر لے آیا۔

19

رجنٹ میں واپس آنے اور دینی سوف کے معاملات کے بارے میں کمانڈر کو مطلع کرنے کے بعد رجنٹوں نے گھوڑا پکڑا اور زار کے نام درخواست لے کر ٹلرٹ³⁴ روانہ ہو گیا۔

فرانسیس درودی امپراطوروں کے مابین تیرہ جون کو ٹلرٹ میں ملاقات ہو چکی تھی۔ بورس جیسکو نے جن ہم شخصیات کی اردل میں تھا، ان سے اس نے درخواست کی تھی کہ اس موقع پر جن شاف افسروں کو ڈیوٹی پر متعین کیا جانا ہے، ان میں اسے بھی شامل کر لیا جائے۔

”میں اس عظیم آدمی کا دیدار کرنا چاہوں گا،“ اس نے فرانسیسی میں نیوین کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ہائی لوگوں کی طرح وہ بھی اسے بوانا پارت ہی کہتا تھا۔

”نہم بوانا پارت کی بات کر رہے ہو؟“ جرنیل نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

بورس نے مستفسرانہ انداز سے جرنیل کی طرف دیکھا اور آنا قانا اس کی سمجھ میں یہ بات آگئی کہ سوال کے بہانے اس کی معلومات کا امتحان لیا جا رہا ہے۔

”mon prince، میں امپراطور نیوین کا ذکر کر رہا ہوں،“ اس نے جواب دیا۔

جرنیل نے اس کے کندھے پر تھپکی دی اور مسکرا دیا۔

”تم بہت ترقی کر دے گے،“ اس نے کہا اور اسے اپنے ساتھ ٹلرٹ لے گیا۔

جس روز دریائے نیمین کے کنارے دونوں امپراطوروں کے مابین ملاقات ہوئی، اس موقع پر جو گئے چنے لوگ وہاں موجود تھے، بورس ان میں شامل تھا۔ اس نے وہ بھرے دیکھے جن پر شاہی مونو گرام کندہ تھا، اس نے دریا کے کافی کنارے پر نیوین کو فریج گاؤڈز کے قریب سے گزرتے دیکھا، اس نے امپراطور الیکساندر کا، جب وہ دریائے نیمین کے کنارے ہوٹل میں بیٹھا تھا اور خاموشی سے نیوین کی آمد کا انتظار کر رہا تھا، فکر میں غلغلاں و بیچاں چہرہ دیکھا۔ اس نے دونوں امپراطوروں کو بجرے میں سوار ہوتے دیکھا اس نے یہ بھی دیکھا کہ نیوین، جو بجرے کے پاس پہلے پہنچا تھا کس تیزی سے الیکساندر کا استقبال کرنے آگے بڑھا، اس کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دیا اور پھر کس طرح

ہائی پرنس۔ محترم پرنس

دونوں امپراطور پوئلہین کے اندر چلے گئے۔

جب سے بورس کو اعلیٰ ترین حلقوں میں رسائی حاصل ہوئی تھی، اس نے یہ تیرہ بنالیا تھا کہ اس کے گرد و پیش جو کچھ ظہور پذیر ہو رہا ہوتا، وہ اس کا بغور مشاہدہ کرتا اور اسے قلم بند کر لیتا۔ ٹلنٹ میں ملاقات کے دنوں میں وہ بینڈ لگاتا پھرا کہ پولین کے ہمراہ جو اشخاص آئے ہیں، ان کے نام کیا ہیں اور انہوں نے کس قسم کی در دیاں پیش ہوئی ہیں۔ صاحبان مرتبہ وحیثیت جو کچھ کہتے، وہ اسے نہایت توجہ سے سنتا رہا۔ جونہی دونوں امپراطور پوئلہین میں داخل ہوئے، اس نے اپنی گھڑی پر نظر ڈالی اور جب الیکساندر واپس آیا، وہ اسے دوبارہ دیکھنا نہ بھولا۔ یہ ملاقات ایک گھنٹہ اور تیرہ منٹ جاری رہی تھی۔ اس نے اسی شام دوسرے حقائق کے علاوہ، جو اس کے خیال کے مطابق تاریخی اہمیت کے حامل تھے، اس ملاقات کا دورانیہ بھی اپنی ڈائری میں درج کر لیا۔ چونکہ دونوں امپراطوروں کے مابین اس ملاقات کے موقع پرزار کے شتاب میں جو لوگ شامل تھے، ان کی تعداد بہت قلیل تھی، اس لیے ایک ایسے آدمی کے لیے، جو ملازمت میں ترقی کو ہر چیز پر ترجیح دیتا تھا، ان میں شامل ہونا نہایت اہم تھا اور چونکہ بورس وہاں جاے مک کامیاب رہا تھا، اسے محسوس ہونے لگا تھا کہ اب اس کی پوزیشن ہمیشہ کے لیے محفوظ و مستحکم ہو گئی ہے۔ وہ نہ صرف معروف ہو گیا تھا بلکہ لوگ اس کی موجودگی کے عادی ہو گئے تھے اور انہوں نے اس کی حیثیت تسلیم کر لی تھی۔ دوسرے وہ پیغام لے کر خود زار کی خدمت میں حاضر ہو چکا تھا چنانچہ دہلی سہفت اس کے چہرے سے آشنا ہو چکا تھا اور وہ لوگ، جو ہر وقت دربار میں موجود رہتے تھے، اگر ابتدا میں اسے نووارد سمجھ کر اس سے بے اعتنائی سے پیش آئے تھے، اب اگر وہ موجود نہ ہوتا، بہت متعجب ہوتے۔

بورس ایک اور ایجوٹ کاؤنٹ ڈی لنسکی کے ساتھ مقیم تھا۔ ڈی لنسکی پولستانی تھا۔ اس نے جرس میں تعلیم پائی تھی۔ وہ صاحب حیثیت آدمی تھا اور فرانسیسیوں پر جان چھڑکتا تھا۔ ان کا جتنی مدت ٹلنٹ میں قیام رہا، تقریباً ہر روز فرانسیسی گارڈز اور فرانسیسی جنرل سٹاف کے افسر اس کے اور بورس کے ساتھ بیٹھا کھانے آتے رہے۔ چوبیس جون کی شام کاؤنٹ ڈی لنسکی اپنی جان پہچان کے فرانسیسی افسروں کی سپر پر خاطر تواضع کر رہا تھا۔ پولین کا ایک ایڈمی کاٹنگ مہمان خصوصی تھا۔ دیگر مہمانوں میں پولین کا ایک خاص نوعمر خدمت گارڈ³⁵ جس کا تعلق فرانسیسی روسا کے ایک قدیم خاندان سے تھا، اور فرانسیسی گارڈز کے متعدد افسر شامل تھے۔ اسی روز رستوف تارکی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے، عام شہری لباس میں تاکہ وہ پہچانا نہ جاسکے، ٹلنٹ پہنچا اور سیدھ بورس اور ڈی لنسکی کے مکان پر وارد ہو گیا۔

پولین اور فرانسیسیوں۔ جن کی حیثیت ایک ایسی دشمن سے دوست میں تبدیل ہو گئی تھی۔ کے بارے میں ہیڈ کوارٹرز اور خود بورس کے ماتن میں جذبات کی جو کاپلیٹ ہوئی تھی، باقی ساری فوج اس کے متعلق قطعی لاعلم تھی۔ رستوف بھی اسی فوج سے آیا تھا، اس لیے اسے بھی اس تبدیلی جذبات کا کوئی تجربہ نہیں ہوا تھا۔ فوج میں ابھی تک ہونا پارت اور فرانسیسیوں کے خلاف مخصوص، تجارت اور خوف کے ملے جلے جذبات کا سکہ رواں تھا۔ کچھ زیادہ

دنوں کی بات نہیں، چوتوف کے ایک قازق افسر کے ساتھ گفتگو کے دوران میں رستوف نے یہ دعویٰ کیا تھا کہ اگر پولین قیدی بنالیا گیا، اس کے ساتھ اسپرطور کی نہیں بلکہ مجرم کی حیثیت سے برتاؤ کیا جائے گا۔ اور ابھی حال ہی میں رستوف کی راستے میں ایک زخمی فرانسیسی کرغل کے ساتھ اچانک ٹھہر بھٹڑ ہو گئی تھی اور اس نے نہایت تندی سے یہ دعویٰ کیا تھا کہ قانونی اسپرطور اور مجرم بونا یارت کے مابین کوئی صلح نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ جب رستوف نے بورس کی رہائش گاہ پر فرانسیسی افسر (اور وہ بھی ایسی دردیوں میں، جنہیں وہ میدان جنگ میں مختلف نظروں سے دیکھنے کا عادی ہو چکا تھا) کو دیکھا، وہ ہکا بکا رہ گیا۔ جونہی اس کی نگاہ ایک فرانسیسی افسر پر پڑی جس نے اپنی گردن درد زے کے باہر نکائی ہوئی تھی، اس پر وہی جنگ جو یانہ اور مخاصمانہ جذبہ، جو دشمن کو دیکھنے کے بعد اسے اپنی پیٹ میں لے لیا کرتا تھا، طاری ہو گیا۔ وہ دہلیز پر رک گیا اور روسی زبان میں دریافت کرنے لگا: ”درد تیسکوئے نہیں رہتے ہیں؟“ بورس کو جب استقبالیہ سے نا، نوں آواز آئی سنائی دی، وہ اسے ملنے باہر آ گیا۔ جب اس نے رستوف کو پہچان لیا، گھڑی کی گھڑی اس کے چہرے پر تکتا راور بھٹھلاہٹ کے آثار نمایاں ہو گئے۔

”ارے تم اتم سے مل کر بہت خوشی ہوئی، بہت خوشی ہوئی،“ تاہم اس نے آگے بڑھ کر مسکرتے ہوئے کہا۔ مگر رستوف اس کا اولین رد عمل دیکھ چکا تھا۔ ”معلوم ہوتا ہے کہ میں غلط وقت پر آ گیا ہوں۔ اگر مجھے کام نہ ہوتا، میں ہرگز نہ آتا،“ اس نے سر دھری سے کہا۔

”نہیں، مجھے تو حیرت اس بات پر ہوئی تھی کہ تمہیں اپنی رجسٹر سے غیر حاضر ہونے کا موقع کیسے مل گیا؟ میں ابھی حاضر ہوتا ہوں،“ اس نے فرانسیسی میں کسی شخص سے کہا جس نے اسے آواز دی تھی۔ ”نظر آتا ہے کہ میں غلط وقت پر آ گیا ہوں،“ رستوف نے اپنی بات دہرائی۔

بورس کے چہرے پر تکتا راور کے جو آثار نمایاں ہوئے تھے، وہ آنا فنا ناپید ہو گئے۔ بظاہر وہ سوچ سمجھ کر یہ فیصلہ کر چکا تھا کہ اسے کیا کرنا ہوگا۔ اس نے رستوف کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیے اور نہایت دل جمعی کے ساتھ اسے اگلے کمرے میں لے گیا۔ اس کی آنکھیں جو اطمینان سے سسل اسے دیکھے جا رہی تھیں، سات پردوں میں مستور تھیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ اس کی آنکھوں پر یہ پردہ اعلیٰ معاشرتی زندگی کے نیلے چٹے نے ڈال تھا، کم زور رستوف کو یہی محسوس ہوا۔

”پھوڑ دیا رہیے کیسے ہو سکتا ہے کہ تم غلط وقت پر آؤ!“ اس نے کہا اور اسے اس کمرے میں لے گیا، جوں پر اس کے لیے دسترخوان سجا تھا۔ اس نے اپنے مہمانوں سے اس کا تعارف کرایا اور انھیں بتایا کہ وہ عام شہری نہیں ہے، بلکہ ہزاروں کا۔ افسر اور پرانا دوست ہے۔

”کاؤنٹ ڈی لسنکی، Le Comte N.N.، Le Capitaine S.S.“ اس نے اپنے مہمانوں کے نام

کاؤنٹ این این
”کیپٹن ایس ایس“

کنواتے ہوئے کہا۔

رستوف نے جیس بہ جیس ہو کر فرانسیسیوں پر سرسری نگاہ ڈالی، اینٹھ کر گردن کو خم دیا اور منہ سے کچھ نہ کہا۔
صاف معلوم ہو رہا تھا کہ ڈی لنسکی کو اس غیر معروف روسی کو اپنے حلقے میں دیکھ کر قطعاً کوئی خوشی نہیں ہوئی تھی اور اس نے رستوف کو کوئی گھاس نہ ڈالی۔ ادھر یہ دکھائی دے رہا تھا کہ نووارد کی آمد پر محفل پر جو کھنچاؤ کی کیفیت طاری ہو گئی تھی، بورس اس سے قطعی لاعلم ہے۔ اس نے وہی خوشگوار اور پرسکون لہجہ اپنائے اور آنکھوں پر وہ نقاب اوڑھے، جس کے ساتھ اس نے رستوف کا خیر مقدم کیا تھا، محفل کو گرمانے کی کوشش کی۔ ایک مہمان اپنی تحریروں فرانسیسی شائستگی کے ساتھ رستوف سے، جو ہٹ دھرمی سے منہ میں گھنگھلیاں ڈالے بیٹھا تھا، مخاطب ہوا، درگوا ہوا:
”آپ شاید امپراطور سے ملنے ٹلزٹ آئے ہیں؟“

”نہیں، میں ایک کام کے سلسلے میں آیا ہوں۔“

رستوف کا مزاج تبھی برہم ہو گیا تھا جب اس نے بورس کے چہرے پر ٹکدر کے آثار دیکھے تھے اور جب کہ ہر شخص کے، جس کا مزاج برہم ہو، ساتھ ہوتا ہے، اسے بھی یہی محسوس ہو رہا تھا کہ ہر شخص اسے غیصہ نہ نگاہوں سے دیکھ رہا ہے اور اسے ناخواندہ مہمان تصور کر رہا ہے۔ اور درحقیقت وہ صحیح ٹھکانے پر تھا بھی نہیں۔ وہ واحد شخص تھا جو گفتگو میں، جو دوبارہ عام موضوعات پر ہونے لگی تھی، شریک نہیں تھا۔ دوسرے لوگ اسے جن نظروں سے دیکھ رہے تھے، وہ یہ کہتی محسوس ہو رہی تھیں۔ ”یہ شخص ابھی تک یہاں کیوں بیٹھا ہے؟ جا تا کیوں نہیں؟“ وہ اٹھ کر کڑا ہو گیا اور بورس کے قریب چلا گیا۔

”معلوم ہوتا ہے کہ میں یہاں رنگ میں بھنگ ڈال رہا ہوں،“ اس نے وحشی آواز میں کہا۔ ”آؤ، میں تمہیں بتائے دیتا ہوں کہ میں یہاں کیوں آیا ہوں، اس کے بعد میں یہاں سے چلتا ہوں گا۔“
”ارے نہیں، بالکل نہیں،“ بورس نے کہا۔ ”اگر تم تھک چکے ہو، میرے کمرے میں چلے چلو، وہاں لیٹ جاؤ اور آرام کرو۔“

”خیر، بات یہ ہے کہ...“

وہ اس کمرے میں، جہاں بورس سوتا تھا، چلے گئے۔ رستوف نے بیٹھنا گوارا نہ کیا اور کھڑے کھڑے بات شروع کر دی۔ اس کے سچے میں جھلاہٹ کا عنصر شامل تھا (گویا اس معاملے میں بورس کسی نہ کسی طرح تصور کرتا تھا)۔ وہ جھٹ پٹ دینی سوف کا معاملہ بیان کرنے اور اس سے پوچھنے لگا: ”کیا تم دینی سوف کا معافی نامہ اپنے جرنیل کی وساطت سے زار کے سامنے پیش کر سکتے ہو اور پیش کرو گے؟“ جب وہ دونوں اکیسے ملے، رستوف کو پہلی مرتبہ واضح طور پر احساس ہوا کہ بورس کی موجودگی میں اسے بے چینی ہو رہی ہے، ورنہ وہ اس سے آنکھ نہیں ملا سکتا۔ بورس نے اپنی ایک ٹانگ دوسری ٹانگ کے گرد پیٹ رکھی تھی اور وہ اپنے دائیں ہاتھ کی ریلی پتل انگلیوں سے ہاتھ مایاں ہاتھ سہلا رہا تھا۔ وہ رستوف کی باتیں یوں سن رہا تھا جیسے کوئی جرنیل اپنے ماتحت کی رپورٹ سنا رہا ہے۔

اور دیکھنے لگتا اور سمجھتا اور سمجھی اپنی نقاب پوش آنکھوں سے رستوف کی آنکھوں میں جھانکنے لگتا وہ جب بھی یہ حرکت کرتا رستوف کو بے کلمی ہونے لگتی اور اس کی نظریں جھٹک جاتیں۔

”میں اس قسم کے معاملات کے بارے میں سن چکا ہوں اور مجھے معلوم ہے کہ پیرا طور ان امور کے متعلق نہایت سخت رویہ اپناتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ بہترین طریقہ یہ ہے کہ اس مسئلے کو براہ راست ان کی بارگاہ میں پیش نہ کیا جائے بلکہ گورکھ کی طرف کی واسطت سے رجوع کیا جائے۔ لیکن اگر عمومی اعتبار سے بات کی جائے، مجھے یقین ہے کہ۔“

”اگر تم کچھ نہیں کرنا چاہتے، صاف صاف کہہ دو!“ رستوف نے بورس کی طرف دیکھے بغیر تقریباً پینتے ہوئے کہا۔

بورس سکرانے لگا۔ ”اس کے برعکس مجھ سے جو کچھ بن پڑا، میں کروں گا۔ میرا صرف یہ خیال تھا۔“ اس لمحہ ہی تسکی کی آواز سنائی دی۔ وہ بورس کو بلارہا تھا۔

”اچھا، چوڑا چلے جاؤ۔“ رستوف نے کہا۔ اس نے سپر میں شریک ہونے سے انکار کر دیا۔ وہ اس کے چھوٹے کمرے میں ہی مقیم رہا۔ وہ کافی دیر تک اس میں چکر کاٹتا رہا دراصلتہ کمرے سے ہلکی پھلکی کپ شپ کی بھنبھٹ سناتا رہا۔

20

رستوف جس روز ٹلزٹ پہنچا، وہی سوف کی طرف سے معافی نامہ پیش کرنے کے لیے اس سے زیادہ نامساعد دن شاید ہی کوئی اور ہو سکتا تھا۔ اس کے خود حاضر جرنیل کی خدمت میں پیش ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کیونکہ وہ اردی میں ملبوس نہیں تھا اور ٹلزٹ بھی اپنے کمان افسر کی اجازت کے بغیر آیا تھا۔ وہاں بورس، وہ اگر چاہتا بھی، تب بھی وہ یہ کام نہیں کر سکتا تھا کیونکہ اگلے روز یعنی ستائیس جون کو صلح نامے کے ابتدائی مسودے پر دستخط ہونا تھے۔ دونوں امپراطوروں نے آپس میں اعزازات کا تبادلہ کرنا، الکساندر کو لیجن آف آرڈر اور نیولین کو آرڈر آف سینٹ آنڈریس ملنا تھا۔ اسی روز فرانسیسی گارڈز کی ایک بٹالین نے پرنسے بزیو کی بٹالین کے اعزاز میں ڈنر کا اہتمام کیا۔ دونوں امپراطوروں نے اس ضیافت میں شریک ہونا تھا۔

رستوف کو بورس کی صحبت اتنی کھل رہی تھی کہ جب موخراند کرنے سپر کے بعد اندر جھانک کر دیکھا، وہ یوں ہن گیا جیسے وہ گہری نیند سو رہا ہو۔ اگلے روز وہ صبح سویرے ہی باہر نکل گیا تاکہ دوبارہ ملاقات کی نوبت ہی نہ آ سکے۔ وہ اپنا فرائیڈ کوٹ اور گول ہیٹ پہنے قبضے میں گھومتا پھر تازہ فرانسیسیوں اور ان کی وردیوں کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتا درجن سڑکوں اور مکانوں میں رسی اور فرانسیسی امپراطور مقیم تھے، ان کا جائزہ لیتا رہا۔ ضیافت کے انتظامات کے ضمن میں وسطی چوک میں جو میزیں بچھائی اور سجائی گئی تھیں اور جو دوسری تیاریاں ہو رہی تھیں، اس

نے وہ بھی دیکھیں۔ مختلف گلی کوچے ایک سرے سے دوسرے سرے تک، فرانسیسی اور روسی جھنڈوں سے، جن پر دونوں امپراطوروں کی رعایت سے ن اور الف کے حروف منتشر تھے، بڑی ساج دھج سے مزین کیے گئے تھے۔ مکانوں کے درجوں میں بھی بڑے بڑے علم لہرا رہے تھے۔ یہ سب بھی اس کے ملاحظے میں آئے۔

”بورس میری مدد کرنا نہیں چاہتا، نہ کرے، میں بھی اسے جوتی کی نوک پر نہیں دھرتا۔ یہ بات طے ہے کہ اب میں اس سے قطعاً کوئی گزارش نہیں کروں گا،“ نکولا کی نے سوچا۔ ”اب ہمارے مابین کوئی قدر مشترک باقی نہیں رہی، تاہم دینی سوف کی خاطر جو کچھ مجھ سے من پڑے گا، میں وہ کیے بنا یہاں سے نہیں ٹلوں گا۔ خاص طور پر جب تک میں زار تک اس کی درخواست نہیں پہنچا لیتا، میں ہٹلر نہیں ہوں گا۔ زار؟۔ لیکن وہ تو یہاں ہیں!“ اور وہ چلتا چلتا غیر شعور کی طور پر واپس اس مکان کے، جس میں زار کا قیام تھا، اسے منے جا پہنچا۔

دروازے کے رو برو گھوڑے کھڑے تھے۔ ان پر زینیں کسی جاچکی تھیں۔ خدام وحشم اکٹھے ہو رہے تھے۔ بظاہر یہی نظر آ رہا تھا کہ زار کی آمد کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔

”کسی بھی لمحے میری ان سے ملاقات ہو سکتی ہے،“ رستوف نے سوچا۔ ”کاش میں خود یہ درخواست ان کے حضور پیش کر سکتا اور انھیں تمام حالات سے آگاہ کر سکتا۔ کیا مجھے محض اس بنا پر تو گرفتار نہیں کر لیا جائے گا کہ میں عام شہری لباس میں ملبوس ہوں؟ نہیں، اتنا بھی اندھیر نہیں! وہ یقیناً سمجھ جائیں گے کہ انصاف کا پلڑا کس کے تن میں جھلکا ہے۔ وہ ہر بات سمجھتے ہیں۔ ان سے بڑھ کر منصف مزج اور دریا دل اور کون ہے؟ اور، گر نھوں نے مجھے حراست میں لے بھی لیا کہ میں یہاں کیوں آیا ہوں، کون سی قیامت نوٹ پڑے گی؟“ اس نے ایک انصر کہ جو اس مکان میں، جس میں زار مقیم تھا، داخل ہو رہا تھا، دیکھ کر سوچا۔ ”خبر لوگ اندر جا رہے ہیں۔ میری سوچ بالکل واہیات ہے! میں اندر جاؤں گا اور خود زار کی خدمت میں درخواست پیش کروں گا۔ لعنت ہو اس درد نیک کوئے پر جس کی وجہ سے میں یہ قدم اٹھانے پر مجبور ہوا ہوں۔“ اور اچانک ایسے عزم مصمم کے ساتھ، جس کا اسے کبھی شائبہ بھی نہیں ہوا تھا کہ وہ اس کے اندر موجود ہے۔ اس نے جیب میں درخواست کو ٹنڈلا اور سیدھا اس مکان میں، جس میں زار مقیم تھا، بگھس گیا۔

”نہیں، اس مرتبہ میں موقع ہاتھ سے جانے نہیں دوں گا جیسا کہ اسٹریٹس میں میرے ساتھ ہوا تھا،“ اس نے سوچا۔ ”اسے یہ توقع تھی کہ کسی بھی لمحے اس کی دائمی ملکیت سے ملاقات ہو سکتی ہے اور جو خفیہ اسے یہ بات سوجھی اسے اپنا سارا خون بجانب قلب دوز ناموس ہوا۔“ میں ان کے پاؤں پر جاؤں گا اور ان کی منت سماجت کروں گا۔“ مجھے اٹھا کر کھڑا کر دیں گے، میری عرض داشت سنیں گے بلکہ میرا شکریہ بھی ادا کریں گے۔ جب مجھ سے بھلائی کا کوئی کام سرزد ہو، مجھے خوشی ہوتی ہے لیکن مجھے عظیم ترین راحت تب حاصل ہوتی ہے جب میں کسی نا انصافی کا ازالہ کر سکوں،“ اس نے خیالوں ہی خیالوں میں زار کو کہتے سنا۔ مکان کے اندر باہر آنے جانے والوں کا تانا بندا جاتا تھا۔ جو بھی گزر رہا، اسے تجسس کی نگاہوں سے دیکھتا۔ وہ ان سب کے قریب سے گزرتا پورچ میں پہنچ گیا۔

پورچ سے خاصا کشادہ رینہ سیدھا اوپر جاتا تھا۔ اسے دائیں طرف بند دروازہ نظر آیا۔ زیریں رینہ ایک اور پورچ تھا۔ یہ نچلی منزل کے کمروں میں کھلتا تھا۔

”آپ کن سے ملنا چاہتے ہیں؟“ کسی نے دریافت کیا۔

”میں بزمِ سجشی کی خدمت میں درخواست پیش کرنا چاہتا ہوں،“ گھوٹائی نے کہا۔ اس کی آواز میں کپکپاہٹ تھی۔

”درخواست؟ ادھر تشریف لائیں۔ ڈیوٹی افسر ادھر بیٹھتے ہیں،“ اس نے زیریں دروازے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”بس اسے قبول نہیں کیا جائے گا۔“

اس بابلی آوز کو سن کر رستوف سٹی بھول گیا اور وہ سوچے لگا: ”میں یہاں کیا کر رہا ہوں؟“ کسی بھی لمحے اپنے آپ کو اپنی سلطنت کے روبرو پانے کا تصور اتنا دلکش اور خیتہا اتنا لرزہ خیز تھا کہ اس کے چھکے چھوٹ گئے اور اس کا جی چاہا کہ وہ فوراً وہاں سے سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ جائے لیکن اس ملازم نے، جس سے اس کی ملاقات ہوئی تھی، ڈیوٹی افسر کے کمرے کا دروازہ کھول دیا اور رستوف اندر چلا گیا۔

کمرے میں ایک کوتاہ قامت، ہٹا کٹا، تقریباً تیس سالہ شخص سفید بر جس، اونچے جوتے اور قمیص پاپلین کی قمیص (معلوم ہوتا تھا کہ وہ یہ ابھی ابھی زیب تن کر کے فارغ ہوا ہے) پہنے کھڑا تھا جب کہ اس کا اردلی اس کی بر جس کے عقبی جانب نئے اور دیدہ زیب کیسوں کے، جن پر ریشمی دھاگوں سے کشیدہ کاری کی گئی تھی، بٹن لگا رہا تھا۔ پائیس کیوں، بہر حال رستوف کی توجہ ان کیسوں کی طرف مبذول ہو گئی۔ ہٹا کٹا شخص ملحقہ کمرے میں موجود کسی آدمی سے باتیں کر رہا تھا۔

”سبحان تیری قدرت، کیا قیامت خیز و شیزہ ہے! نازک بدن، گھٹکتا رنگ، اوائلِ شباب،“ وہ فرانسیسی میں کہہ رہا تھا لیکن رستوف کو دیکھ کر ٹھٹھک گیا اور اس کے ابروؤں پر ہل پڑ گئے۔

”کیا چاہتے ہو؟ کوئی درخواست ہے؟“

”کیا بات ہے؟“ ملحقہ کمرے سے دوسرے شخص نے پوچھا۔

”ایک اور عرضی گزار،“ کیسوں والے آدمی نے جواب دیا۔

”اسے کہو کہ بعد میں کسی اور وقت آئے۔ وہ تشریف لایا ہی چاہتے ہوں گے۔ ہمیں چلنا چاہیے۔“

”کسی اور وقت، کسی اور وقت۔ کل آ جانا۔ اب بہت دیر ہو چکی ہے۔“

رستوف دایبک جانے کے لیے مڑا لیکن کیسوں والے شخص نے اسے روک دیا۔

”کس کی درخواست لائے ہو؟ تمہارا کیا نام ہے؟“

”میں میگردنی سوف کے پاس سے آیا ہوں،“ رستوف نے جواب دیا۔

”تم کون ہو؟ افسر؟“

”لیفٹیننٹ کا ڈنٹ رستوف۔“

”کیا دیدہ دلیری ہے! مجاز افسروں کی وساطت سے بھیجو۔ اب چلو۔ بھگو یہاں سے۔“ اور خود وہ وردی، جو اس کے اردن نے اسے تھمائی تھی، پہنے گا۔

رستوف واپس ہاں میں چلا گیا۔ وہاں متعدد افسر اور جرنیل اکٹھے ہو چکے تھے۔ وہ سبھی مکمل وردیوں میں ملبوس تھے اور اسے ان کے قریب سے گزرتا تھا۔

وہ اپنی بے باکی کو کوس رہا تھا اور اس تصور سے اس کا خون خشک ہوا چ رہا تھا کہ کسی بھی آن اس کا زارے آتنا سامنا ہو جائے گا، اسے سب کے سامنے ذلیل ہونا پڑے گا اور امپراطور کی موجودگی میں اس کی گرفتاری عمل میں لائی جائے گی۔ جو کچھ اس نے کیا تھا، خود اس کی اپنی نظروں میں وہ نامعقول اور ناشائستہ ٹھہرا تھا اور وہ کتبہ افسوس مل رہا تھا کہ اس نے یہ حرکت کی ہی کیوں۔ اس دھڑکنے والے مصروف رستوف نے اپنی نظریں جھکا دیں اور وہ زرق برق وردیوں میں ملبوس خدام و حشم کے بچوں سے بچ کر سے باہر نکلنے کی تگ و دو کرنے لگا کہ ایک جانی پہچانی آواز نے اسے پکارا اور ایک ہاتھ نے اسے روک لیا۔

”محترم، آپ یہاں کیا کر رہے ہیں اور وہ بھی نراک کوٹ پہنے؟“ ایک بھاری آواز نے دریافت کیا۔ یہ آواز اسپ سوار فوج کے ایک جرنیل کی تھی۔ وہ ایک حالیہ چھڑپ کے دوران میں زار کا منظور نظر بن گیا تھا اور جس ڈویژن میں رستوف خدمات سرانجام دے رہا تھا، پہلے اس کی کمان اسی کے پاس تھی۔

رستوف پر دہشت طاری ہو گئی اور وہ اپنے رویے کا جواز پیش کرنے کی کوشش کرنے لگا، لیکن جب اس نے جرنیل کے چہرے کی جانب دیکھا، اسے وہاں شفقت اور خوش طبعی نظر آئی۔ وہ اسے ایک طرف لے گیا اور اس نے پریشان و ساندہ لہجے میں اس کے سامنے سارا قصہ بیان کر دیا اور لجاجت سے درخواست کرنے لگا: ”آپ ریٹی سوف کو جانتے ہیں، خدا کے لیے کچھ کریں۔“ جرنیل نے رستوف کی پوری بات سنی اور گہمیرا انداز سے اپنے سر کو جنبش دی۔ ”بہت برا ہوا۔ اس دلیر آدمی کے بارے میں یہ سب کچھ سن کر مجھے بے حد افسوس ہوا ہے،“ اس نے کہا۔ ”مجھے اس کی درخواست دے دو۔“

رستوف دینی سوف کے معاملے کی ہشکل وضاحت کر اور اس کی درخواست تھما سکا تھا کہ زینے پر تیز تر قدموں کی چاپ اور ہیمزوں کی کھٹکھٹ ہٹ سنائی دینے لگی۔ جرنیل نے سے وہیں چھوڑا اور خود پورچ میں چلا گیا۔ زار کے خدام و حشم لپک جھپک میڑھیوں سے اترے، اور اپنے اپنے گھوڑوں کی طرف چل دیے۔ وہی سائیس، جس کا نام پہنے تھا اور جو اسٹریٹس میں موجود تھا، زار کا گھوڑا لے کر آگے بڑھا اور میڑھیوں سے قدموں کی ہلکی ہلکی چرچاہٹ، جسے رستوف فی الفور پہچان گیا، سنائی دی۔ رستوف نے اس اندیشے کو تو بے پشت ڈالا کہ وہ کہیں بچا نہ جائے اور بعض دیگر تجسس قماش بینوں کے ساتھ زینے کی طرف لپکا اور اس نے دو سال کے وقفے کے بعد اپنی آنکھیں ان خدو خالی کی، جن کی وہ پرستش کرتا تھا، زیارت سے سینکس۔ وہی چہرہ، وہی سیکھیں، وہی چال، وہی

شاہانہ وقار اور نرم خوئی کا امتزاج۔ اور رستوف کے دس میں زر کے لیے جو گرم جوش اور محبت موجود تھی، اپنی پوری سابقہ قوت کے ساتھ دوبارہ موج زن ہونے لگی۔

پرزے بزیو سکی رجسٹ کی وردی میں۔ نرم و گداز چرمی کپڑے کی بر جس اور اونچے بوٹ۔ ملبوس۔ ور سینے پر ستارے کی شکل کا تمغہ (رستوف اسے پہچاننے سے قاصر رہا، یہ لیجن آف آنر تھا) سجائے، والئی مملکت اپنا ہیٹ بیل میں دبائے وردستانہ پہنتے نیچے ترا۔ وہ رک گیا اور ایسی نظروں سے، جو چاروں اطراف روشنی بکھیر رہی تھیں، اپنے گرد و پیش دیکھنے لگا۔ اس نے ایک دو جرنیلوں سے مختصر بات کی اتنے میں اس کی نظر رستوف کے سابق کمانڈر پر پڑی، وہ اسے پہچان گیا اور اس نے ہاتھ کے اشارے سے اسے اپنی جانب بلایا۔

خدام و چشم پیچھے ہٹ گئے اور رستوف نے دیکھا کہ جرنیل کافی دیر تک والئی مملکت سے کچھ کہتا رہا۔ جواب میں زار نے اس سے مختصر کوئی بات کہی اور اپنے گھوڑے کی طرف چل پڑا۔ ایک بار پھر خدام و چشم اور تماش بین، جن میں رستوف بھی شامل تھا، امپراطور کی سمت بڑھنے لگے۔ امپراطور اپنے گھوڑے کے قریب رک گیا، اس نے اپنا ہاتھ زمین پر رکھا، اس پر سوار فوج کے جرنیل کی طرف رخ کیا اور خاصی بلند آواز میں، جو صاف ظاہر تھا کہ وہ سب کو سنانا چاہتا تھا، کہا۔

’جزل، میں یہ نہیں کر سکتا، بالکل نہیں کر سکتا کیونکہ قانون مجھ سے زیادہ طاقت ور ہے۔‘ اور اس نے اپنا پاؤں رکاب میں ڈال دیا۔

21

جس حوای چوک کی طرف گھوڑے پر سوار زار جا رہا تھا، وہاں دائیں طرف پرزے بزیو سکی رجسٹ کی ایک بیالین صفیں بنائے کھڑی تھی اور ان کے سامنے بائیں جانب فرانسیسی گارڈز کی بیالین تعینات تھی۔ فرانسیسیوں نے حسب معمول پیچھ کی کھال کی ٹوپیاں اوڑھ رکھی تھیں۔

گھوڑے پر سوار زار جب بیالینوں کے، جنہوں نے اسے سلامی دی، ایک پہلو کی جانب بڑھا، اس پر سواروں کا ردہ اگر وہ سرپٹ گھوڑے دوڑانا مخالف پہلو کی سمت آیا۔ رستوف نے اندازہ لگایا کہ ان سواروں کی قیادت پولین کر رہا ہے، پولین کے علاوہ کوئی دوسرا شخص ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ وہ چھوٹا ہیٹ اور نیلی وردی، جس کے ٹخن کھلے تھے اور جس کے نیچے سفید صدری تھی، پہنے ہوئے تھے اور اس کے کندھے پر آرڈر آف سینٹ آندرے کی بٹی چسپاں تھی۔ وہ اپنا خاکستری گھوڑا، جو خالصتاً عربی النسل اور نہایت شاندار تھا، سرپٹ دوڑاتا آیا تھا۔ گھوڑے کا تھول قرمزی رنگ کا تھا اور اس پر سنہری تاروں سے نکل بوٹے بنائے گئے تھے۔ جب وہ الیکساندر کے قریب پہنچا، اس نے اپنا ہیٹ اوپر اٹھایا۔ اس کے اس فعل کے دوران میں رستوف، جو اسے گھڑ سوار فوج کے انسٹرکٹر کے دیکھ رہا تھا، یہ مشاہدہ کیے بغیر رہ سکا کہ پولین کا گھوڑا پر بیٹھنے کا انداز نہ تو دل آویز تھا اور نہ اس سے کسی قسم کی خود اعتمادی

کا اظہار ہوتا تھا۔ دونوں بٹالینوں نے ”ہرا“ اور ”Vive l'Empereur“ کے نعرے بلند کیے۔ پولین نے الیکسا ندر سے کچھ کہا۔ امپراطور گھوڑوں سے نیچے اترے اور انھوں نے ایک دوسرے کے ہاتھ تھام لیے۔ پولیس کے چہرے پر ناگواری کی مصنوعی مسکراہٹ تھی۔ الیکسا ندر نے دلفریب انداز سے اس سے کچھ کہا۔

اس امر کے باوجود کہ فرانسیسیوں کے گھوڑے دلتیاں جھاڑ رہے تھے جس سے ہجوم کو آگے بڑھنے کا موقع نہیں مل رہا تھا، رستوف دونوں امپراطوروں کی ایک ایک حرکت کا بغور مشاہدہ کرتا رہا اور اس نے ایک نکلے لیے بھی اپنی نظریں ان سے نہ اٹھائیں۔ اسے یہ دیکھ کر چنچھ ہوا کہ یونانیات کے ساتھ الیکسا ندر کا سلوک کچھ اس قسم کا تھا جیسے وہ اس کا ہم پلہ ہو اور جہاں تک اول الذکر کا تعلق تھا، زار کی موجودگی میں اس پر کوئی گھبراہٹ طاری نہیں ہوئی تھی بلکہ وہ یوں ہمد تن پر سکون تھا جیسے شہنشاہوں کے ساتھ اس کا یہ قرب اس کے لیے بالکل فطری اور روزمرہ کا واقعہ ہو۔

الیکسا ندر اور پولین اپنے خدام و حشم کے لشکرِ جرار کی معیت میں پرزے بڑیوں کی بٹالین کے سینے کے قریب پہنچے۔ یوں وہ سیدھے اس ہجوم کی، جو وہاں کھڑا تھا، طرف آگئے تھے۔ وہ غیر متوقع طور پر ہجوم کے اتنا نزدیک پہنچ گئے کہ رستوف کو، جو پہلی قطار میں کھڑا تھا، یہ فکر دامن گیر ہو گئی کہ کہیں وہ پہچان ہی نہ لیا جائے۔

”عالی جاہ، میری درخواست ہے کہ مجھے یہ جازت مرحمت فرمائی جائے کہ میں آپ کے دلیر ترین سپاہی کو جن آف آزیٹیش کر سکوں،“ ایک شخص نے کرخت لیکن بالکل صحیح مخرج سے فرانسیسی میں کہا۔ وہ ایک ایک حرف اور لفظ بالکل درست اور واضح انداز سے ادا کر رہا تھا۔

یہ الفاظ جس شخص نے کہے تھے، وہ کوتاہ قامت پولین تھا۔ وہ بالکل سیدھا الیکسا ندر کی آنکھوں میں جھانک رہا تھا۔ جو کچھ الیکسا ندر سے کہا گیا، وہ اس نے نہایت توجہ سے سنا۔ اس نے پٹی گردن کو خم دیا اور خوشگوار انداز سے مسکرایا۔

”گزشتہ جنگ میں جس شخص نے سب سے بڑھ کر شجاعت اور دلیری کا مظاہرہ کیا تھا، یہ تمہاری کے لیے ہے،“ پولین نے مزید کہا۔ وہ ایک ایک لفظ پر اتنے سکون اور خود اعتمادی سے زور دے رہا تھا کہ رستوف کوتاہ آگیا۔ اپنی اس تقریر کے دوران میں پولین ان روی صفوں کا، جو اس کے سامنے مؤدب کھڑی تھیں، مشاہدہ کرتا چلا رہا تھا۔ سب روی سپاہی ہتھیار اٹھائے سلامی تو اسے دے رہے تھے لیکن ان کی نگاہیں اپنے امپراطور پر مرکوز تھیں۔

”یور میجسٹی، اجازت ہو تو میں اپنے کرنل سے مشورہ کر لوں؟“ الیکسا ندر نے کہا اور وہ تیز تیز قدم اٹھاتا بٹالین کے کمانڈر پرنس کزلوہسکی کی طرف بڑھا۔

دریں اثنا یونانیات نے اپنے ننھے منے سفید ہاتھ سے دستا نہ اتارا، اس کے چیتھڑے کپے اور انھیں بے پھینک دیا۔ اس کے عقب میں جوائنڈی کا رنگ کھڑا تھا، وہ تیزی سے آگے لپکا اور اس نے انھیں اٹھا لیا۔

”یہ کسے دلایا جائے؟“ امپراطور الیکسندر نے روسی میں کز لودسکی سے مدہم آواز میں پوچھا۔
 ”میرے پیچھے جیسے ہم فرمائیں۔“

زر کی خفگی سے بھریں تن گئیں اور اس نے پیچھے مڑ کر دیکھتے ہوئے کہا: ”ہمیں اسے کچھ نہ کچھ جواب تو دینا ہی ہوگا۔“

کز لودسکی نے پختہ ارادے کے انداز سے اپنے سپاہیوں کا جائزہ لیا۔ اس کی نگاہوں نے جن لوگوں کا احاطہ کیا، ان میں رستوف بھی شامل تھا۔

”کوئی ارکان ہے کہ یہ مجھے ہی مل جائے؟“ رستوف نے سوچا۔

”لازاریف!“ ترش مرا کرش کی آواز گونجی۔

لازاریف، جو پہلی صف کا پہلا آری تھا، پھرتی سے آگے بڑھا۔

”کہاں جا رہے ہو؟“ مستعد آوازوں نے دھمکے لگوں سے لازاریف کو، جس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس نے کہاں جانا ہے، خبردار کیا۔

لازاریف کے قدم جہاں تھے، وہیں رک گئے اور وہ ترچھی لیکن خوف زدہ نظروں سے اپنے کرش کو دیکھنے لگا۔ جسا کہ عام طور پر ان سپاہیوں کے، جنہیں صفوں سے باہر ہالیا جائے ساتھ ہوتا ہے، اس کے چہرے پر بھی تشویش کے آثار نمایاں ہو گئے۔

نیولین نے اپنے سر کو خفیف سی جنبش دی اور اپنا ننھا منا ہاتھ پیچھے بڑھ دیا جیسے وہ کوئی چیز وصول کرنا چاہتا ہو۔ اس کے خدام دھم دھم فی الفور تازہ گئے کہ وہ کیا چاہتا ہے۔ انھوں نے تھوڑی بہت ادھر ادھر بھاگ دوڑ کی، آپس میں کانا پھوسی کی اور کوئی چیز ہاتھوں ہاتھ ایک سے دوسرے شخص تک پہنچانے لگے۔ ایک اور ملازم خاص (page) — وہی جسے گزشتہ شب رستوف نے بورس کے ہاں دیکھا تھا — نے آگے، جست لگائی، وہ نہایت ادب سے آگے بڑھے ہوئے ہاتھ پر جھکا اور اس نے اسے ایک لمحہ بھی انتظار میں رکھے بغیر اس پر ایک سرخ تمغہ، جو سرخ پٹی پر بچست تھا، رکھ دیا۔ نیولین نے اتنا بھی نہ کیا کہ ایک نگاہ سے دیکھ ہی لیتا، اس نے بس دو انگلیاں دبائیں اور تمغہ ان کے پیچ میں گھس گیا۔ وہ لازاریف کے، جو مسلسل ایسی آنکھوں سے، جو معلوم ہوتا تھا کہ ابھی ابھی اچھل کر اس کے پیچھے سے باہر گر پڑیں گی، اپنے امپراطور کو شکلی باندھے دیکھے جا رہا تھا، قریب پہنچا۔ نیولین نے گردن جھکا کر یوں ہچکلی جانب الٹ کر نظر ڈالی جیسے وہ اسے بتا رہا ہو کہ جو کچھ وہ اب کر رہا تھا، محض اپنے اتحادی کی خاطر کر رہا ہے۔ جو ننھا منا سفید ہاتھ تمغہ تھا اسے ہوئے تھا، لازاریف کے بٹن کو چھونے لگا۔ نیولین کا اندازہ کچھ اس قسم کا تھا جیسے وہ جانتا ہو کہ اس کے ہکناں مہربانی سپاہی کے سینے کو چھونے کی دیر ہے، اس جوان کو احساس ہو جائے گا کہ اسے انعام مل گیا ہے، اب وہ باقی تمام دنیا سے ممتاز ہو گیا ہے اور یوں تا حیات خوش و خرم رہ سکے گا۔ نیولین نے محض اتنا کیا کہ صیبی نشان صرف لازاریف کے سینے پر رکھ دیا۔ پھر اس نے اپنا ہاتھ پیچھے کر دیا اور یوں الیکسندر

کی جانب مڑا جیسے اسے اس بات کا یقین ہو کہ اس نے صلیبی نشان جہاں رکھا تھا، وہاں رہے گا۔ صلیبی نشان واقعی وہیں پیوست رہا کیونکہ خدمت کے لیے ہمہ وقت تیار دونوں روسی اور فرانسیسی ہاتھ پک جھپکنے میں آگے بڑھے، انھوں نے نشان پکڑا اور وردی پر ٹانگ دیا۔ لازاریف بڑی پریشانی کے عالم میں سفید ہاتھوں والے کتاہ قامت شخص کو، جو اس کے ساتھ کچھ کر رہا تھا، دیکھتا رہا۔ تاہم وہ سیدھا اکڑ کر کھڑا رہا اور ہتھیار اٹھا کر سلامی دیتے ہوئے اس نے دوبارہ الیکسندر کی آنکھوں میں جھانک کر دیکھا جیسے وہ اس سے پوچھ رہا ہو: ”میں یہیں کڑا رہوں، ادھر ادھر ہٹ جاؤں یا کچھ اور کروں؟“ تاہم جب اسے کوئی اذن نہ مل، وہ مزید کچھ دیر اپنی جگہ بت کی طرح ساکت ایستا دو رہا۔

امپراطور دوبارہ اپنے گھوڑوں پر سوار ہوئے اور وہاں سے چل دیے۔ پرزے بریوکی ٹالین کے جوان منتشر ہو گئے اور فریج گارڈز کے ساتھ ان میزوں کے، جوان کے بے ترتیب دی گئی تھیں، سامنے بیٹھ گئے۔ لازاریف مہمان خصوصی کی کرسی پر بیٹھ گیا۔ فرانسیسی اور روسی افسروں نے اس کے ساتھ معاملہ کیا۔ مبارک باد دی اور اس سے ہاتھ ملائے۔ افسر اور غیر فوجی شہری گروہ درگروہ محض اس کا دیدار کرنے اس کے پاس آنے لگے۔ فرانسیسی اور روسی آوازوں کے شور و غل میں کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ دو افسر، جن کے چہرے تھما رہے تھے اور جو بے حد مسرور اور خوش باش نظر آ رہے تھے، دستوف کے قریب سے گزرے۔

”ہیٹ، اس خیاقت کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟ اتنے سارے چاندی کے ظروف،“ ایک نے کہا۔ ”لازاریف کو دیکھا؟“

”ہاں، میں نے دیکھا ہے۔“

”سننا ہے کہ کل پرزے بریوکی رجمنٹ اس کے اعزاز میں ڈنکا اہتمام کرے گی؟“

”یہ لازاریف بھی کیا قسمت کا دھتی ہے! تاحیات بارہ سو فرانک پنشن!“

”دوستو، اس ٹوپی کے بارے میں کیا خیال ہے؟“ پرزے بریوکی کے ایک جوان نے ایک پنٹ دار ٹوپی پر پورکھتے ہوئے کہا۔

”بہت اعلیٰ۔ تمہیں بالکل پوری آئی ہے!“

”آپ لوگوں نے پاس ورڈ (لفظ شناخت) سنا ہے؟“ دوسرے نے پوچھا۔ ”پرسوں یہ۔ Napoleon،

France, bravoure“ اور آج ”Aleksandr, Russie, grandeur“ ہے۔ ایک روز اس کا ٹیبلہ

ہمارے امپراطور کرتے ہیں اور اگلے روز پولین۔ کل ہمارے امپراطور تمغہ سینٹ جارج فرانسیسی گارڈز کے بہادر ترین

جوان کو پیش کریں گے۔ اس کے علاوہ اس کے پاس دو کوئی چارہ ہے بھی نہیں۔ خیر گالی کا جو سب دینا ہی ہو گا۔“

• نیپولین، فرانس، شجاعت

• الکساندر، روس، شان و شوکر۔

بورس اور اس کا دوست ڈی لٹسکی بھی ضیافت کا جائزہ لینے آئے تھے۔ واپسی پر بورس نے دیکھ رستوف مکان کے کونے میں کھڑا ہے۔

”رستوف کیسے ہو؟ ہمیں ایک دوسرے کی کمی بہت محسوس ہوتی ہے،“ اس نے کہا۔ وہ یہ پوچھے بغیر رہ سکا کہ اسے کیا ہوا ہے کیونکہ رستوف کے چہرے پر عجیب و غریب قسم کی پڑ مروگی اور پریشانی جھلک رہی تھی۔

”کچھ نہیں، کچھ نہیں،“ رستوف نے جواب دیا۔

”واپسی پر رکو گئے؟“

”ہاں، ذرا بعد میں۔“

رستوف کالی دیر تک کونے میں کھڑا اور سے ردِ برق میدہ دیکھتا رہا۔ اس کے دماغ میں اذیت ناک انتشار برپا تھا۔ وہ اسے سلجھانے اور کوئی نتیجہ اخذ کرنے سے قاصر تھا۔ اس کی روح میں ہوں ناک شکوک و شبہات سر اٹھ رہے تھے۔ اسے دینی سوچ، اس کا توکل اور اس کی قلبِ ماہیت یاد آئی۔ اس کے ذہن میں ہسپتال، بریدہ بازوؤں اور ٹانگوں، وہاں کی غلاظت اور امراض کی تصاویر دوڑنے لگیں۔ اسے سڑے بے گوشت کی سڑانداتے واضح انداز سے یاد آئی کہ اس نے ادھر ادھر نظریں دوڑا کر یہ یقین کرنے کی کوشش کی کہ یہ بدبو کہاں سے آرہی ہے۔ پھر اس نے بونا پارت کے، جو اپنے آپ سے کالنا مطمئن تھا، جس کا ننھ مناسفید ہاتھ تھا، جواب میرا طور تھا، جسے الیکساندر پسند کرتا اور جس کا وہ احترام کرتا تھا، متعلق سوچا۔ پھر وہ سب بازو اور ٹانگیں کیوں کئی تھیں؟ ان لوگوں کے اپنے آپ کو ہلاکت میں کیوں ڈالتا تھا؟ پھر اسے یہ خیال آیا کہ لازار یف کو انعام سے نوازا گیا ہے جبکہ دینی سوچ کو سزا مل رہی ہے اور اس کی تقصیر معاف نہیں ہوئی۔ اس نے اپنے آپ کو ان عجیب و غریب سوچوں میں یوں مستغرق پایا کہ اس کا روم روم کانپ اٹھا۔

ٹیگورک اور پرزے بزیو کی رجسٹر کے ڈنر کی اشتہا آور خوشبو نے اسے ان خیالات سے چونکا دیا۔ اسے روٹنگ سے پیشتر کچھ نہ کچھ ذہن مار کرنا تھا۔ وہ ایک ہوٹل میں، جس پر اس کی صبح نظر پڑی تھی، چلا گیا۔ وہاں خلقِ خدا کا، جن میں بعض انسر بھی، جو اسی کی طرح شہری لباس پہن کر آئے تھے، شامل تھے، وہ ہجوم تھا کہ اسے ڈنر کے حصوں میں خاصی دقت اٹھنا پڑی۔ اس کی اپنی ڈیرشن کے دو افسر اس کے پاس آ بیٹھے۔ فریڈ لائنٹ کے بعد جو اس کا بکھوٹہ طے پایا تھا، فسرنا گفتگو اسی کے متعلق ہونے لگی۔ ان کا خیال تھا کہ اگر ہم کچھ دیر اور نیولین کے خلاف ڈٹے رہتے اس کا خاتمہ یقینی تھا کیونکہ اس کی افواج کے پاس نہ ساءن رسد تھا اور نہ گولہ بارود۔ نکولائی مہر لمب کما تاجیتا (زیادہ تر مؤخر الذکر) رہا۔ وہ اکیلا ہی انگریز شراب کی دو بوتلیں چڑھا گیا۔ اس کے ذہن میں جس کشمکش نے گھر کر لیا تھا، اس کا اسے، بھی تک کوئی حل نہیں سوچا تھا۔ چنانچہ وہ بدستور اسے اذیت پہنچاتی رہی۔ اسے اپنے خیالات کا اظہار کرتے خوف آ رہا تھا لیکن ان سے پیچھا چھڑانا بھی اس کے لیے ناممکن تھا۔ جب ایک انسر نے یہ کہا کہ فرانسیزیوں کو دیکھ کر بڑی ذلت کا احساس ہوتا ہے، رستوف کا پچانہ صبر لبریز ہو گیا، وہ اچانک

اتنے بے جواز زور شور سے چلانے لگا کہ اس کے ساتھی افسر بھی بھونچکا رہ گئے۔

”آپ یہ کیسے محاکمہ کر سکتے ہیں کہ بہترین طریق کار کیا ہوتا؟“ وہ گل پھڑک کر چلایا۔ اس کا سارا خون بخور کر اس کے چہرے پر سمٹ آیا تھا۔ ”آپ زار کے افعال کے بارے میں کیسے فیصلہ صادر کر سکتے ہیں؟ ہمیں یہ حق کس نے دیا ہے کہ ہم ان کے بارے میں رائے زنی کریں؟ ہم زار کے مقاصد یا افعال نہیں سمجھ سکتے!“

”لیکن میں نے تو زار کے متعلق ایک لفظ بھی نہیں کہا تھا!“ ایک افسر نے اپنا جواز پیش کرتے ہوئے کہا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آخر رستوف اس قدر آگ بگوا کیوں ہو رہا ہے۔ اس کے ذہن میں صرف ایک ہی توجیہ آئی اور وہ یہ کہ وہ نشے سے مغلوب ہو گیا ہے۔

لیکن رستوف نے اس کی بات سنی ان سنی کر دی۔

”ہم سفارت کار نہیں ہیں، صرف سپاہی ہیں اور کچھ نہیں!“ وہ بولتا چلا گیا۔ ”اگر ہمیں موت کو گلے لگانے کا حکم دیا جائے، ہم موت کو گلے لگالیں گے۔ اگر ہمیں سزا کے عمل میں سے گزرا جاتا ہے، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم سے غلطی سرزد ہوئی ہے۔ محاکمہ کرنا ہمارا کام نہیں ہے۔ اگر ہر مجبشی امیر اطور بونا پارت کو امیر اطور تسلیم کرنا اور ان کے ساتھ اتحاد کرنا مناسب سمجھتے ہیں، وہ ضرور راستی پر ہوں گے۔ ایک مرتبہ ہم نے فیصلہ سنانے اور ہر چیز کے متعلق بحث کرنے کا عمل شروع کر دیا، پھر کچھ بھی مقدس نہیں رہے گا۔ اس طریقے سے ہم کل نکالیں یہ بھی کہنا شروع کر دیں گے کہ خدا ودا کچھ نہیں۔ کچھ نہیں!“ نکولائی نے زور سے میز پر منگھارتے ہوئے گلا پھاڑ کر کہا۔ اس کے ساتھیوں کو تو یہی محسوس ہوا کہ وہ غیر متعلق باتیں کر رہا ہے لیکن اس کے اپنے ذہن میں خیانات کی جو روچاں رہی تھی، یہ سب کچھ اس کے عین مطابق تھا۔

”ہمارا کام یہ ہے کہ ہم اپنا فرض ادا کریں، ہلوار چلائیں اور کچھ نہ سوچیں! بس یہی ہے حاصلِ کلام!“ اس نے اپنی بات کا اختتام کرتے ہوئے کہا۔

”اور خوب ڈٹ کر بیٹیں!“ ایک افسر نے جو جھگڑاموں نہیں لینا چاہتا تھا، کہا۔

”بالکل، اور خوب ڈٹ کر بیٹیں!“ نکولائی نے فی الفور اس کی بات پر صا د کیا۔ ”ارے، ادھر آؤ! ایک بوتل

اور لاؤ!“ اس نے دہاڑتے ہوئے کہا۔

1808 کے دوران میں امپراطور الیکساندر، امپراطور نپولین سے ایک اور مذاقات کرنے کی غرض سے اور فورٹ گیا اور رچ و نھرت کے اس موقع کی عظمت و جلالت کے بارے میں پیٹرز برگ کے اعلیٰ ترین حلقوں میں خوب باتیں ہوئیں۔

1809 کے دوران میں روسی زمین کے دو ٹالٹوں کے مابین، جیسے کہ نپولین اور الیکساندر کے بارے میں عام مشہور تھا، مؤذرت اور اخوت کا یہ عالم تھا کہ جب نپولین نے آسٹریا کے خلاف اعلان جنگ کیا، ایک روسی کورہارے سابق غنیم نپولین کی حمایت اور ہمارے سابق اتحادی امپراطور آسٹریا کے خلاف رزم آرا ہونے سرحد پار چل گئی اور شاہی حلقوں میں نپولین اور الیکساندر کی ایک ہمشیرہ کے مابین مناکحت کی باتیں ہونے لگیں۔ تاہم اس زمانے میں روسی معاشرے کی توجہ خارجہ پالیسی کے تقاضوں کے علاوہ ان داخلی تبدیلیوں کی، جو حکومت کے تمام محکموں میں لائی جا رہی تھیں، منعطف ہو چکی تھی اور ان تبدیلیوں میں خاص دلچسپی لی جا رہی تھی۔

دیں اشار زندگی۔ روزمرہ کی حقیقی اور جھتی جاگتی زندگی، جس میں تندستی، علالت، محنت مشقت اور آرام کے متعلق کچی تشویش، خیالات و افکار، سائنس، شعر و شاعری اور موسیقی کے شعبوں میں دانش و روانہ سرگرمیاں، محبت، دوستی، نفرت، تند و تیز جذبات، کبھی کبھ شامل ہیں۔ اپنے معمول کے ڈگر پر رواں رواں رہی۔ اس زندگی کا امکانی اصداحات سے کوئی تعلق واسطہ نہیں تھا، یہ ان سے بالکل الگ تھلگ تھی۔



پرنس آندرے دو سال سے گاؤں میں مقیم تھا اور اس دوران میں وہ ایک مرتبہ بھی دیہاتی علاقے سے کہیں باہر نہیں گیا تھا۔ وہ تمام منصوبے، جنہیں پیر نے اپنی جاکیروں میں آزمانے کی سعی کی تھی اور منہ کی کھائی تھی۔ وہ ناکام اس لیے رہا کیونکہ وہ کسی بھی منصوبے پر جم کر کام نہیں کرتا تھا۔ وہ ایک منصوبہ شروع کرتا لیکن کچھ عرصے کے بعد اسے چھوڑ دیتا اور دوسرا شروع کر دیتا۔ لیکن انہیں منصوبوں کو پرنس آندرے نے کسی قسم کے دھوم دھڑکے اور مری کوشش کے بغیر پایہ تکمیل تک پہنچا دیا اور انہیں شر آور بنادیا۔ پیر میں عملاً مستقل مزاجی نام کو بھی نہیں تھی لیکن پرنس آندرے

اس سے بدرجہ اتم بھرہ ورتھا۔ وہ نہ تو چھوٹی چھوٹی چیزوں کے بارے میں بے جا پریشانی کا اظہار کرتا تھا اور نہ ضرورت سے بڑھ کر سعی کرتا تھا۔ وہ جس کام میں بھی ہاتھ ڈالتا، اسے محرک دیتا اور اسے صحیح راستے پر ڈال دیتا۔ اس کی ایک جاگیر پر تین سوزرعی غلاموں کا درجہ تبدیل کر کے انھیں خود مختار زرعی کارکن بنا دیا گیا (روس میں یہ اقدام اپنی نوعیت کی اولین مشاوں میں شامل تھا)۔ باقی جاگیروں پر جبری مشقت کی جگہ چھٹکارا لگانا کا نظام رائج کیا گیا۔ ہنگو چارافو میں اس نے کساں عورتوں کو وضع حمل کے دوران میں مدد دینے کے لیے اپنے خرچ پر تربیت یافتہ رائی کا انتظام کیا۔ کسانوں کے بچوں کو تعلیم دینے اور گھریلو ملازمین کو پڑھنا لکھنا سکھانے کے لیے ہاتھوڑا پوری ملازم رکھا گیا۔

پرنس آندرے اپنا نصف وقت اپنے باپ اور بیٹے کے ساتھ، جو ابھی تک نرموں کی نگہداشت میں تھے۔ بلڈز میں اور بقیہ نصف ”گوشے ہنگو چارافو“ میں، کہ اس کا باپ اپنی اس جاگیر کو اسی نام سے پکارتا تھا، صرف کرتا تھا۔ دیوبی امور کے بارے میں اس نے بیٹر کے سامنے جس بے نیازی کا مظاہرہ کیا تھا، اس کے باوجود وہ واقعات و حادثات سے، جو ظہور پذیر ہوتے رہتے تھے، نہایت تنہا ہی سے اپنے آپ کو باخبر رکھتا، بے شمار نئی کتب کا مطالعہ کرتا اور یہ دیکھ کر بہت متعجب ہوتا کہ بیٹر بزرگ سے، جو فی نفسہ وہ منحور تھا کہ خود زندگی اس کے گرد گردش کرتی تھی، سے اس کے باپ سے ملنے جو مہمان آتے، ان کا ان واقعات کے بارے میں علم، جو اندروں یا بیرون ملک وقوع پذیر ہو رہے تھے، اس کے اپنے علم سے کہیں کم تر ہونا حالانکہ وہ دیہاتی علاقے سے کبھی باہر نہیں گیا تھا۔

پرنس آندرے اپنی جاگیر کے معاملات پر توجہ تو دیتا ہی تھا، طرح طرح کی کتابیں بھی اس کے زیر مطالعہ تھیں لیکن ان کے علاوہ وہ اس زمانے میں ہماری دو گزشتہ ناکام مہموں کا تنقیدی جائزہ لینے اور ہماری فوج کے قوانین و ضوابط کے متعلق منصوبہ مرتب کرنے میں بھی مصروف رہا۔

1809 کے موسم بہار میں پرنس آندرے ریڈان³ میں واقع جاگیروں کا معائنہ کرنے چلا گیا۔ یہ جاگیریں اس کے ذمہ بیٹے کو وراثت میں ملی تھیں اور وہ ان کا ستوتی تھا۔

موسم بہار کی دھوپ نے اس کے جسم کو گرم کیا تھا۔ وہ اپنی کالاش میں بیٹھانودمیدہ گھاس، برنج کے درختوں کے نوخیز پتوں اور سفید بہار یہ بادلوں کے اولین ٹکڑوں کو، جو صاف نیلگوں آکاش پر حیرتے بھرتے تھے، رکھتا جا رہا تھا۔ وہ کسی چیز کے بارے میں بھی سوچ نہیں رہا تھا بلکہ بے فکر اور خوش باش انداز سے اپنے گرد و پیش کی اشیاء پر نظریں دوڑا رہا تھا۔

جس مقام پر اس نے گزشتہ سال بیٹر کے ساتھ مکالمہ کیا تھا، وہیں سے انھوں نے بخشی کے ذریعے دریا عبور کیا۔ وہ کچھڑ میں مت پت دیہات میں سے گزرے، اس کے راستے میں زمستانی رائی کے کھیت بھی آئے اور گھائی کے پختہ میدان بھی۔ پل کے نزدیک دامن کوہ میں ابھی تک بھلی بھلی برف کا، جو ریلے کی صورت میں آئی تھی، ڈھیر پڑا تھا۔ پہاڑی کے اوپر جس کچی سڑک کے ساتھ ساتھ بارش نے آبی گزرگاہیں بنادی تھیں، انھوں نے اسے بھی مٹے کیا۔

سڑک کے دونوں اطراف کھیتوں میں فصلیں کٹ چکی تھیں، وہاں اب صرف ٹھنٹھ کھڑے تھے۔ جھاڑیوں کا ذخیرہ آیا جس میں کہیں کہیں سبزہ اپنی بہار دکھا رہا تھا۔ اس کے بعد برج کے درختوں کا جنگل تھا اور یہ سڑک کے دونوں کناروں کے ساتھ ساتھ پھیلا ہوا تھا۔ جنگل میں تقریباً جس تھا۔ ہوا بند تھی اور ایک پٹا بھی ہلتا دکھائی نہیں دیتا تھا۔ برج کے درختوں پر لیس دار بچوں کی بہار تھی لیکن یہ بچے بالکل ساکن تھے۔ ہنسی رنگ کے پھول اور سبز گھاس کی اولیں پتیاں راہ گزشتہ کے چوس میں سے اپنے سر یا ہر نکال رہی تھیں۔ برچوں کے مابین یہاں کہیں فر کے پست قد اور کمر درے سدا بہار درخت کھڑے تھے اور یوں وہ ناگوار انداز سے جڑے کے (نوں کی) دیں تارہ کر رہے تھے۔ جونہی گھوڑے جنگل میں داخل ہونے لگے، ان کے نتھنے پھڑ پھڑانے، دوران کے اجسام پر پسینے کے قطرے چکنے لگے۔

نٹ مین بیوترنے کو چوان سے کچھ کہا۔ کو چوان نے اس سے اتفاق کیا۔ بظاہر بیوترا اس سے مطمئن نہ ہوا۔

”پورے ٹیکسی لینسی، موسم کتنا معتدل ہے۔“ اس نے مودبانہ مسکراہٹ سے کہا۔

”معتدل، پورے ٹیکسی لینسی۔“

”جانتے ہیں کیا کہہ رہا ہے؟“ پرنس آندرے نے متعجب ہو کر سوچا ”اوہ، میرا خیال ہے کہ وہ موسم بہار کی بات کر رہا ہے،“ اس نے دونوں اطراف نظریں دوڑاتے ہوئے دل میں کہا۔ ”اور واقعی ہر چیز پسے ہی سرسبز ہو چکی ہے۔ بالکل جیش از وقت! برج، خورد و چیری، آندرے بھی نے پر پرزے نکالنا شروع کر دیے ہیں لیکن اوک کا بھی تک کوئی نشان نظر نہیں آ رہا۔ ارے نہیں، ایک ہے۔ ادھر ایک دک ہے۔“

سڑک کے کنارے ایک اوک کھڑا تھا۔ برج کے درختوں سے، جن پر جنگل مشتمل تھا، اس کی عمر غالباً دس گنا تھی اور کسی بھی برج سے یہ دگنا اونچا اور دس گنا موٹا تھا۔ یہ دیو قامت درخت تھا۔ اس کے تنے کا گھیر آدمی کے دونوں بازوؤں کی لمبائی سے دو چند تھا۔ بظاہر اس کے بعض ٹھن مدوں پہلے ٹوٹ کر گر چکے تھے اور یوں ان مقامات پر پھال جھڑنے سے جو گھڑا بھرے تھے، وہ اب مندمل ہو چکے تھے۔ اپنے بھاری بھر کم، عظیم الجثہ اور بے ہنگم، عرصہ جوڑے ترے اور گھسے پٹے بازوؤں اور انگلیوں کے مشابہ تھے، غیر مناسب انداز سے چاروں اطراف پھیلائے، یہ کسی ازمنہ قدیم عفریت کی مانند قہر آلود چہرے پر زہر خند سجائے ہنستے مسکراتے برج کے درختوں کے بچوں کی کھڑا تھا۔ یہ اوک واحد درخت تھا جس نے موسم کے طسم سے مرعوب ہونے سے انکار کر دیا تھا۔ اس نے بہار اور دھوپ دونوں کو پاسے استحقار سے ٹھکر دیا تھا۔

”بہار، محبت، مسرت!“ یہ اوک کہتا دکھائی دے رہا تھا۔ ”کیا ہیں یہ؟ بے معنی اور احمقانہ دھوکوں کی ٹٹیاں۔ تمہارا من سے جی نہیں بھرا؟ ان دھوکوں کا بار بار اعادہ کیا جاتا ہے لیکن ان میں کبھی کوئی تبدیلی نہیں آتی، یہ ہمیشہ وہی مسرت ہیں جو تھے، وہی دھوکوں کی ٹٹیاں! نہ کوئی بہار ہے، نہ دھوپ ہے، نہ مسرت۔ ان فر کے درختوں کو دیکھو،

بے روح، بے جان، جیسے کسی نے ان کا ٹینٹا دبا رکھا ہو، ہمیشہ ایک سے نظر آتے ہیں۔ اور ایک مجھے دیکھو، ٹکڑا اور کھال ادھڑے شاخوں سے، جو من مانے انداز سے دائیں بائیں، آگے پیچھے ہر جگہ میرے جسم پر اگے رہتے ہیں، پڑا ہوں جیسے وہ اگے ہوئے ہیں، ویسے میں کھڑا ہوں اور مجھے تمھاری امیدوں اور سراپوں میں کوئی اعتقاد نہیں ہے۔“

جنگل میں سے گزرتے گزرتے پرنس آندرے نے متعدد مرتبہ مڑ کر اس اوک کو دیکھا جیسے وہ اس سے کسی چیز کی توقع کر رہا ہو۔ دک کے نیچے بھی گھاس اور پھول اگے ہوئے تھے لیکن یہ ان کے درمیان ہمیشہ کی طرح ویسے کا ویسے کھڑا تھا، غیر متحرک، درشت رو، بد قطع اور گھبر۔

”ہاں، یہ اوک ٹھیک کہتا ہے، ہزار بار ٹھیک کہتا ہے،“ پرنس آندرے نے سوچا۔ ”تو جوان بھلے اس سراپ کے دوبارہ جال میں پھنس جائیں لیکن ہم جانتے ہیں کہ زندگی کیا ہے۔ ہماری زندگی میں اب کچھ نہیں رہ گیا۔“

اوک کے اس درخت کے تعلق سے پرنس آندرے کی روح نئے خیالات کے پورے سلسلے کی۔ جو اعلیٰ قنوطیت کی بیدار تھے لیکن حسرت ناک انداز سے تسلی بخش تھے۔ آماجگاہ بن گئی۔ اس کی زندگی جیسی کیسی تھی، اس سفر کے دوران میں اس کا اس نے از سر نو جائزہ لیا اور اسی پر اسے نتیجے پر پہنچا، جو یاس کن ہونے کے باوجود سکون بخش تھا، کہ اس کا کام یہ نہیں کہ وہ کسی چیز کو نئے سرے سے شروع کرے بلکہ وہ جیسے تیسے اپنی زندگی گزار دے، کسی کو گزند نہ پہنچائے، کسی شے سے خوف نہ کھائے اور کسی چیز کی آرزو نہ کرے۔

2

ریزان جاگیر کے موتی کی حیثیت سے پرنس آندرے پر جوڑے داریاں عاید ہوتی تھیں، ان کے سلسلے میں دو شرفا کے مقامی ضلعی مارشل سے ملنے پر مجبور ہو گیا۔ کاؤنٹ ایلیا آندرے رستوف مارشل تھا اور مئی کے وسط میں پرنس آندرے اس سے ملنے چل پڑا۔

گرمیوں کی آمد آمد تھی۔ درخت پہلے ہی چوں سے ڈھک چکے تھے۔ گرد اور گرمی اتنی زیادہ تھی کہ سفر کے دوران میں اگر کہیں پانی نظر آ جاتا، آدمی کا نہانے کو جی مچنے لگتا۔

پرنس آندرے اپنی گاڑی میں دو روہ درختوں کے بیچ اس شہراہ پر، جو اترا دیا میں رستوف کے گھر کی طرف جاتی تھی، سفر کر رہا تھا۔ اس کے چہرے پر پڑمردگی چھائی ہوئی تھی اور وہ جس کام کے سلسلے میں مارشل سے مشورہ کرنے جا رہا تھا، اس کے متعلق سوچوں میں مستغرق تھا۔ دائیں جانب چند درختوں کے عقب سے اسے چنگی اور زندہ دل دو شیرازوں کی آوازیں سنائی دیں، اور ایک انکی اسے، اس راستے پر، جس پر اس کی گاڑی جا رہی تھی، چند نوخیز لڑکیوں کا گروہ کد کڑے لگا تا اور اسے عبور کرتا نظر آیا۔ جو لڑکی سب سے آگے اور سیدھی اسی کی طرف بھاگی آ رہی تھی، وہ نازک بدن، حقیقتاً نمایاں انداز سے نازک بدن، اور سیاہ چشم تھی۔ اس کے بال کالی گھٹا تھے۔ اس کا ڈریس زرد پرنٹ کا تھا اور اس کے سر کے ارد گرد سفید پٹی رومال کچھ اس طرح لپیٹا ہوا تھا کہ اس کی ڈھیلی ڈھالی

زبیں بہرنگی پڑتی تھیں۔ وہ چلا چلا کر کچھ کہہ رہی تھی لیکن جب اسے احساس ہوا کہ وہ کوئی اجنبی ہے، وہ اس پر نظر ڈالے بغیر ہنسی مسکراتی واپس بھاگ گئی۔

پتا نہیں کیا وجہ ہوئی لیکن پرنس آندرے کو دل میں زبردست ٹیس محسوس ہوئی۔ دن اتنا سہانا، سورج اتنا روشن اور اس کے گرد و پیش ہر چیز پر اتنا نکھار تھا، پھر بھی وہ نازک بدن حیثیت نہ اس کے وجود سے باخبر تھی اور نہ اس کے وجود کے بارے میں کچھ جاننے کی خواہش مند تھی اور اپنی ذاتی۔ اور لاریب عقل و خرد سے عاری۔ بے فکر اور سرور زندگی سے مطمئن اور اسی میں ٹوٹ کر خرم تھی۔ ”آخر یہ اتنی شاداں و فرحاں کیوں ہے؟ یہ کیا سوچ رہی ہے؟ یہ جو کچھ بھی سوچ رہی ہے، اس کا تعلق نہ عسکری قواعد و ضوابط سے ہو سکتا ہے اور نہ ریازان کے زرعی غلاموں کے لیے چمکارا لگان کے انتظامات سے۔ یہ کیا سوچ رہی ہے؟ آخر یہ اتنی خرسند کیوں ہے؟“ پرنس آندرے نے اپنے آپ سے پوچھا۔

1809 میں کاؤنٹ ایلیہ آندرےج سابقہ برسوں کے دستور کے مطابق اتر اٹلی میں مقیم تھا درحسب عادت تقریباً پورے کے پورے صوبے کی شکار، ڈراموں، بحث یوں اور محافل موسیقی سے خاطر تواضع کر رہا تھا۔ جس طرح ہر مہمان کو دیکھ کر اس کی باجھیں کھل جاتی تھیں، پرنس آندرے کی آمد پر بھی اس نے قلبی مسرت کا اظہار کیا اور اس سے رات ٹھہرنے پر اصرار کیا۔

دن تھا کہ اکتاہٹ سے بھرپور تھا لیکن اس کے دوران میں بلکونسکی کے بزرگ میزبان، اس کی اہلسہ اور ان کے نہایت نامور مہمانوں (کاؤنٹ کے گھر میں بہت بھیڑ بھڑکا تھا کیونکہ عنقریب ایک نام دن کی تقریب منعقد ہونے لگی) نے اس کی متعدد مرتبہ خاطر مدارات کی اور ان مواقع کے دوران میں پرنس آندرے کو معلوم ہوا کہ اس کی نگاہیں بار بار شاہ کی، جو محفل کے نو عمر ارکان کے مابین تقسیم مگ رہی اور خطا اٹھا رہی تھی، جانب اٹھ رہی ہیں۔ جب بھی ایسا ہوتا، وہ اپنے آپ سے پوچھتا: ”یہ کیا سوچ رہی ہے؟ یہ اتنی سرور کیوں ہے؟“

اس شب نئے ماحول میں جب وہ تنہا رہ گیا، وہ کافی دیر تک اپنی پلک تک نہ جھپکاسکا وہ کچھ دیر مطالعہ کرتا رہا پھر اس نے شمع بجھا دی لیکن فوراً ہی اسے دوبارہ روشن کر دیا۔ کمرے کے اندر گرمی تھی کیونکہ اندرونی کواڑ بند تھے۔ اسے رہ رہ کر اس احمق بڑھے (اس کے خیال میں رستوف یہی کچھ تھا) پر غصہ آ رہا تھا کہ اس نے اسے رات بھر تیار کر کے پرآمادہ کر دیا تھا اور یہاں یہ بنایا تھا کہ شہر سے ابھی ضروری کاغذات نہیں آئے۔ اسے اپنے آپ پر بھی پیش آ رہا تھا کہ آخر وہ شہر ہی کیوں؟

پرنس آندرے اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور درہیچے کی جانب چل پڑا۔ جونہی اس نے کواڑ کھولے، چاندنی، جیسے وہ کال دیر سے اس کا انتظار کر رہی تھی، مصب سے اندر داخل ہو گئی اور سارا کمرہ منور ہو گیا۔ رات خشک، روشن اور ساکن تھی۔ باہر درہیچے کے بالکل قریب، ایسے درختوں کی، جن کی شاخیں کاٹ دی گئی تھیں تاکہ وہ چھتار اور تار بین کیمن، نظار تھی۔ ان درختوں کا ایک رخ تاریک اور دوسرا مانند نقرہ روشن تھا۔ درختوں کے نیچے کسی قسم کا سرسبز و

شاداب جھڑ جھکرا گا ہوا تھا۔ کہیں کہیں ان جھانڑیوں کی شاخیں اور پتے چاندنی میں نہائے ہوئے تھے اور چاندنی کی طرح چمک رہے تھے۔ ہار یک درختوں سے دور، خاصی دور، ایک چھت تھی۔ اس پر شبنم کے قطرے اپنی آب تاب دکھا رہے تھے۔ دائیں طرف پتوں میں لپٹا ایک تناور درخت کھڑا تھا۔ اس کا تنا اور شاخیں براق سفید تھیں۔ اس کے اوپر تقریباً مکمل چاند چمک رہا تھا۔ بہار یہ آسمان پیلا تھا اور اس پر ستارے خال خال دکھائی دے رہے تھے۔ پرنس آندرے نے اپنی کہنی درپے کی چوکھٹ پر ٹکا دی اور اس کی نگاہیں اس چراغ پر ٹھہر گئیں۔

اس کا کمرہ دوسری منزل پر تھا۔ اس سے اوپر کی منزل پر جو کمرے تھے، ان میں چند ایسے دگ تھے، جنہیں ابھی تک نیند نہیں آئی تھی۔ اسے اپنے اوپر نسوانی آوازیں سنائی دیں۔

”صرف ایک اور،“ اس کے سر کے اوپر ایک دو شیزہ نے کہا۔ پرنس آندرے نے یہ آواز فوراً پہچان لی۔
”تم سوؤ گی کب؟“ دوسری آواز نے جواب دیا۔

”میں سوؤں گی نہیں۔ مجھے نیند آ ہی نہیں رہی۔ پھر میں کیا کروں؟ آؤ نا، یہ آخری بار ہو گا۔“

دو دنوں لڑکیوں نے کوئی بول گنگنا یا۔ غائبانہ کسی گیت کا اختتام یہ تھا۔

”اف، کتنا خوبصورت تھا اس وقت، شب بخیر کہیں اور سو جائیں۔“

”تم سو جاؤ، میں نہیں سو سکتی۔“ پہلی آواز نے کھڑکی کے اوپر قریب آ کر کہا۔

معلوم ہوتا تھا کہ وہ کھڑکی کے باہر سر جھکائے ہوئے ہے کیونکہ اب وہ نہ صرف اس کے ذریعے کی سرسراہٹ بلکہ اس کی سانس کا ریویم بھی سن سکتا تھا۔ چاروں اطراف سناٹا چھایا ہوا تھا۔ ہر شے پتھر کی طرح ساکت اور خاموش تھی۔ بالکل چاند، اس کی روشنی اور سایوں کی مانند۔ پرنس آندرے میں، کتنا حوصلہ نہیں تھا کہ وہ اپنی جگہ حرکت کر سکے کیونکہ اسے یہ اندیشہ تھا کہ کہیں اس کی غیر ارادی موجودگی کا بھانڈا شہ پھوٹ جائے۔

”سونیا! سونیا!“ پہلی آواز دوبارہ سنائی دی، ”تمہیں نیند کیسے آگئی ہے؟ دیکھو، فضا کتنی حسین ہے، کتنی دیر آدین ہے! سونیا، جاگو تو سہی!“ اس نے تقریباً روتے ہوئے کہا۔ ”اتنی حسین رات پہلے کبھی نہیں آئی!“
سونیا نے بادشاہ کی درخواست کو کی جواب دیا۔

”آؤ نا، آؤ نا، دیکھو نا! چاند کتنا خوبصورت ہے! حسنِ کامل کا مرتب ہے۔۔۔ آ بھی جا، میری دلہا! ابھی جا
ادھر دیکھا؟ جی چاہتا ہے کہ آلتی پالتی مارے یہیں بیٹھی رہوں۔۔۔ کچھ اس طرح گھٹنوں کو بازوؤں کے گھبوں
میں کس لوں۔ پوری طرح کس لوں۔۔۔ یوں۔۔۔ اور فضا میں پرواز کرنے لگوں! ایسے۔۔۔“

”سنبھل کر، ورثہ نیچے گر پڑو گی!“

کھینچ تانی اور دھینکا مشتی کی آوازیں سنائی دیں۔ پھر سونیا کی آواز ابھری۔ وہ ناپسندیدگی کا اظہار کر رہی تھی۔
”تو، ایک بچ چکا ہے!“

”تم ہر وقت رنگ میں بھنگ ڈالتی رہتی ہو! سارا مزا کا رت کرو تکی ہو! اچھا، چؤ۔۔۔ اور جا کر سو جاؤ!“

ایک بار پھر سکوت طاری ہو گیا لیکن پرنس آندرے کو معلوم تھا کہ وہ ابھی تک وہیں بیٹھی ہے۔ کبھی کبھار ہلکی سرسراہٹ یا آواز بھرنے کی آواز سنائی دے جاتی۔

”خداوند! خداوند! یہ سب کچھ کیا ہے؟“ وہ چٹک پھٹ پڑی۔ ”اگر سونا اتنا ہی لازمی ہے، چلو، پھر میں سو جاتی ہوں!“ اور اس نے کھٹاک سے دروازہ بند کر دیا۔

”میرا کوئی وجود ہے یا نہیں، اس کی بل جانی!“ پرنس آندرے نے اس کی آواز پر کان لگائے سوچا۔ معلوم نہیں کیا وجہ تھی لیکن اسے امید تھی اور ساتھ ہی دھڑکا بھی کہ وہ شاید اس کے بارے میں کچھ کہے گی۔ ”لو، وہ پھر آگئی ہے! شاید جان بوجھ کر آئی ہے!“ اس نے سوچا۔

اور یگانگی اس کی روح پر بھرپور جونی کے تصورات اور میدانوں نے غیر متوقع انداز سے کچھ اس قسم کی یلغار کر دی جو اس کی ذہنت کی ساری روش کے بالکل برعکس تھی۔ اسے یہ محسوس ہونے لگا کہ وہ اپنی حالت اپنے آپ سے ہٹا کرنے سے عاثر ہے۔ اسی ادھیڑ بن میں اسے ایک دم نیند نے گھیر لیا۔

3

اگلے روز کاؤنٹ کے اسوا کسی اور شخص سے ملے اور خواتین کا استعارہ کیے بغیر پرنس آندرے نے اپنے گھر کی راہ لی۔ جوں کا پسے ہی آغا ہو چکا تھا۔ واپسی سفر کے دوران میں اس کا دوبارہ برج کے جنگل میں سے، جہاں اوک کے گائے دارکنہ درخت نے اس کے ذہن پر اتنے عجیب و غریب اور یادگار قسم کے تاثرات مرتب کیے تھے، گزر ہو۔ جنگل میں کالا لاش کی گھنٹی کی آواز پچھلے مہینے کی نسبت اور بھی مدہم سنائی دینے لگی تھی کیونکہ اب ہونا ہونا جنوں سے ڈھک چکا، گھنا ہو چکا اور سیاہ داربن چکا تھا۔ اور فر کے نوخیز درخت، جو جنگل میں یہاں وہاں لگیوں کی طرح جڑے ہوئے تھے، اب عام حسن میں بگاڑ پیدا کرنے کا سبب نہیں بن رہے تھے بلکہ گرد و پیش کی فضا سے متاثر ہو کرئی، درختم و نازک کوئیلیں نکال رہے تھے۔ ان کوئیلوں نے دل کش اور پر عطف، انداز سے انھیں سرسبز بنادیا تھا۔ سارا دن گرم رہا۔ کہیں طوفان کے آثار نمودار ہو رہے تھے۔ لیکن صرف ہلکا پھلکا برشکالی بادل آیا تھا اور اس سے سڑک اور وسیلے جنوں سے گرد و مودی تھی۔ چونکہ جنگل کا باپاں پہنوسائے میں تھا، اس لیے وہاں تاریکی تھی۔ راتیں پہلو مطلب اور دھوپ میں نہایا ہوا تھا اور خوب جگمگا رہا تھا۔ ہلکی ہلکی ہوا چل رہی تھی اور درختوں میں سرسراہٹ پیدا کرتی جا رہی تھی۔ ہر پودے پر جو بن چھایا ہوا تھا اور اس پر پتے اور شکوے نے پھوٹ رہے تھے۔ لیلیں چھپا اور گنگنا رہی تھیں۔ ان کی آوازیں کبھی دور سے اور کبھی نزدیک سے سنائی دینے لگتی تھیں۔

”ہاں، یہاں اس جنگل میں کہیں اوک کا درخت تھا جس سے میں پوری طرح متعلق تھا“ پرنس آندرے نے سوچا۔ ”لیکن وہ ہے کہاں؟“ اس نے سڑک کے بائیں جانب دیکھتے اور عین اسی اوک کی، جس کی اسے تلاش تھی، قسین کرتے ہوئے اپنے تعجب کا اظہار کیا۔

پرانے لوگ کی اب بالکل کاپاپلٹ چکی تھی۔ وہ گہرے سبز اور رسیلے پتوں کا لبادہ اوڑھے مست دبے خود کمزرا تھا اور شام کے آفتاب کی کرنوں میں ہوئے ہوئے لے جھول رہا تھا۔ گٹھیلی انگلیاں، زخموں کے نشانات، پرانا کرب اور بدگمانیاں، سبھی کچھ غائب ہو چکا تھا۔ صد سارہ قدیم کھر در کی چھایاں کے ان حصوں پر بھی، جہاں شخموں اور ٹہنیوں کا نام و نشان تک نہیں تھا، تازہ پتے پھوٹ آئے تھے۔ یہ پتے اتنی برق رفتاری سے نمودار ہوئے تھے کہ آدمی کو یقین نہیں آتا تھا کہ یہ اسی کہنہ اور سال خوردہ مخلوق کے جسم سے نکلے ہیں۔

”ہاں، یہ وہی لوگ ہے،“ پرنس آندرے نے سوچا اور پلک جھپکے میں سبے جواز مسرت اور زیست نو کے ہڈے نے اسے پوری طرح اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ ایک ایسی اس کی زندگی کے بہترین لمحات اس کی نگاہوں کے سامنے گھومنے لگے۔ اوٹریٹس اپنے بلند و بالا افدک سمیت، عالم نزع کے دوران میں اس کی بیوی کے چہرے پر ملت کا کھار، حیرت انگیز، حسن شب سے مسطور و مخمور الھڑدو شیرہ اور فی نصف رات اور، ہتاب۔ یہ تمام چیزیں اور مناظر یک دہی اس کے دماغ میں در آئے۔

”نہیں اکتیس سال کی عمر میں زندگی اختتام کو نہیں پہنچ جاتی!“ پرنس آندرے نے اضطرابی، قطعی اور اپنی فیصلہ کیا۔ ”میرے لیے محض اتنا ہی کافی نہیں کہ اسے جو میرے اندر ہے، صرف میں ہی جانوں، ہر شخص کو۔ ہنر، اس نوخیز دوشیرہ کو جو جانب آسمان پر داز کرنا چاہتی تھی۔ معلوم ہونا چاہیے کہ میں کیا ہوں تاکہ میں اپنی زندگی بھل اپنی ذات کی خاطر ہی نہ بتاؤں جب کہ دوسرے، جیسا کہ وہ لڑکی ہے، اس سے اتنا الگ تھلگ رہیں، مجھے اپنی زندگی کچھ اس طور بتانا چاہیے کہ وہ ان سب میں منعکس ہوتا کہ وہ میرے ساتھ میری زندگی میں جیسے درجہ ہو سکیں!“



گہرے پینے کے بعد پرنس آندرے نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ خزاں کے دوران میں پیٹرز برگ جائے گا اور اپنے اس فیصلے کے جواز میں اس نے ہر قسم کے عذر تراش لیے۔ اس کے ذہن میں معقول اور منطقی وجوہات کا پورا سلسلہ کھیلانے لگا کہ اس کا پیٹرز برگ جانا بلکہ فوج میں بھی دوبارہ شامل ہونا کیوں ضروری ہے۔ جس طرح ایک ماہر تیل وہ یہ فوج بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ دیہات سے کہیں اور جائے گا، اسی طرح اب یہ بات اس کے نہم وادراک میں نہیں آ رہی تھی کہ زندگی میں سرگرم انداز سے شرکت اختیار کرنے کی ضرورت کے بارے میں اس کے ذہن میں شکوک کیوں پیدا ہو گئے تھے۔ اب اسے یہ واضح انداز سے احساس ہونے لگا کہ اب تک اسے جو تجربات حاصل ہوئے ہیں، اگر اس نے انہیں کسی کام میں استعمال نہ کیا اور زندگی میں فعال انداز سے شرکت نہ کی، تو یہ سب رائیگاں جائیں گے اسے یہ تک یاد نہ آیا کہ ماضی میں اسی قسم کے بودے دلائل نے اسے یہ بھلایا تھا کہ زندگی نے اسے جو کچھ سکھایا ہے، اگر اس کے بعد بھی اس نے یہ یقین کر لیا کہ وہ کسی کے کام آ سکتا ہے اور محبت یا مسرت کا حصول ممکن ہے، اور

اس کی اپنی نگاہوں میں اس کا وقار جا رہا ہے گا۔ اب عقل و دانش اس کے علی الرغم رستہ دکھا رہی تھی۔ اپنے ریازان کے اس سفر کے بعد پرنس آندرے کے لیے رہنمائی ماحول اور نصائح کوئی دلکشی باقی نہ رہی اور وہ اس سے اکتانے لگا۔ اپنے سابقہ مشاغل میں اس کی دلچسپی جاتی رہی اور جب وہ اپنے سڈی روم میں تھا ہوتا، وہ اٹھتا اور آئینے کے سامنے کمرے ہو کر کالی دیر تک اپنا ہی چہرہ دیکھنے میں محو رہتا۔ پھر وہ اپنی مرحومہ بیوی لسا کی، جس نے اپنی زلفیں یونانی انداز سے بہن لگا کر نکالی ہوئی تھیں، تصویر کے سامنے جا کھڑا ہوتا۔ اسے محسوس ہوتا کہ وہ اپنے سنہری فریم میں سے اسے ہنگامہ لطف و الفت دیکھ رہی ہے۔ اب وہ اس کے سامنے ان مہیب الفاظ کا اعادہ نہیں کرتی تھی بلکہ فطری، پر مسرت اور رازدارانہ انداز سے اس کا جائزہ لے رہی ہوتی تھی۔ اور پرنس، آندرے اپنی پشت پر اپنے ہاتھ ایک دوسرے میں پھنسائے خاصی دیر تک کمرے کے، اندر چکر لگاتا رہتا۔ کبھی اس کی پیشانی پر بل پڑ جاتے اور کبھی اس کے لبوں پر تبسم آ جاتا اور اس دوران میں وہ ان خیالات کے، جو منطق سے خالی تھے، جن کا ظہار ممکن نہ تھا اور جنہیں کسی جرم کی طرح پردہ اخفا میں رکھنا لازمی تھا، بارے میں سوچتا رہتا۔ ان خیالات کا تعلق پیر سے تھا، شہرت سے تھا، درجے کی ویشیزہ سے تھا، دک کے بوڑھے درخت سے تھا، عورت کے حسن اور عشق سے تھا۔ انھوں نے اس کی ساری زندگی ہی پیٹ دی تھی۔ ان موقع پر اگر کوئی شخص کمرے میں آ جاتا، اس کے ساتھ اس کا رویہ خاص طور پر رد کھا، درشت اور سب سے بڑھ کر ناگوار انداز سے منطقی ہوتا۔

"Mon Cher"، ایسے ہی کسی موقع پر پرنس ماریا کی، جو بھولے بھٹکے ادھر آ نکلتی، آواز سنائی دیتی۔ "منھا گولائی آج باہر نہیں نکل سکتا، سخت سردی ہے۔"

"ٹھیک ہے، اگر سردی نہ ہوتی،" وہ خشک سہجے سے جواب دیتا، "وہ خالی قمیص میں بھی باہر جا سکتا تھا۔ چونکہ سرائی بڑھ گئی ہے، اس لیے اسے گرم کپڑے، جو خاص اسی مقصد کے لیے بنوائے گئے ہیں، پہنا دو۔ اگر موسم بخ ہو، تو یہی طریقہ اختیار کرنا پڑتا ہے، نہ کہ جس بچے کو تازہ ہوا کی ضرورت ہو، اسے چار دیواری کے اندر مقید کر دیا جائے۔" وہ لیسک شہر منطق سے کہتا کہ اس میں مین میکھ نکالنا ناممکن ہوتا۔ اس کے اس رویے سے یہ محسوس ہوتا کہ وہ ان ماتم عقلی اور غیر منطقی تو توں کی پاداش میں، اس کے اندر مصروف کاریں، دوسروں کو سزا دینے پر تلے ہوئے ہیں۔

پرنس آندرے اگست 1809 کے مہینے پیٹرز برگ پہنچا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب جواں سال پے رائسکی کی شہرت کا آفتاب نصف النہار پر تھا اور اس کی تجویز کردہ اصلاحات کو بڑے زور شور سے عملی جامہ پہنایا جا رہا تھا۔ اسی اگست سندھدان میں زارا اپنی گاڑی سے گر پڑا اور اپنی ٹانگ تڑوا بیٹھا۔ وہ تین ہفتے ہسپتال میں صاحب فراش رہا۔ اس علالت کے دوران میں وہ پے رائسکی سے تو روزانہ ملاقات کرتا رہا لیکن کسی دوسرے شخص کو اس نے اپنے قریب بھی

نہ پہنکنے دیا۔ ان دنوں نہ صرف دو بدنام زمانہ فرمین — دربار کی مدارج کا خاتمہ اور شعبہ محصرات کے ایسمران⁸ اور سٹیٹ کونسلروں کے عہدوں کے متمنی اشخاص کے لیے امتحانات کا اجراء — تشکیل و تدوین کے مراحل میں سے گزر رہے تھے بلکہ مکمل آئین مملکت، جس کے تحت کونسل آف سٹیٹ⁹ سے لے کر صلعی ٹریبونل تک اس زمانے کے قانونی، انتظامی اور مالیاتی ڈھانچے کو یک سر تبدیل کیا جانا تھا، زیر بحث تھا۔ اب وہ مبہم لبرل خواب، جو الیکساندر نے اپنی تخت نشینی کے وقت دیکھے تھے اور جنہیں اس نے اپنے مشیروں زار تورسکی، ناروولت سیف، اکرچون اور ستر اگانوف کی — یہ وہ دگ تھے جنہیں خود زار نے Comite de salut public کا نام دیا تھا — مدد سے عملی جامہ پہنانے کی سعی کی تھی، حقیقت کا روپ دھار رہے تھے۔ اب سوں ٹکڑوں میں ان کی جگہ ہے راسکی اور مگر دفاع میں آراک چیف¹⁰ کی تعیناتی ہو چکی تھی۔

اپنی آمد کے چند روز بعد ہی پرنس آندرے جنٹلیمن ان ویٹنگ کی حیثیت سے دربار میں حاضر ہو گیا۔ اگرچہ امپراطور کل ازیں دو مرتبہ سے مل چکا تھا، اس نے اس سے ایک لفظ تک نہ کہا۔ پرنس آندرے کو بیٹ، بلکہ اس سے پہلے بھی، یہی محسوس ہوتا رہا تھا کہ اس کے دل میں زار کے لیے کوئی نرم گوشہ نہیں ہے۔ خود زار کے نزدیک اس کا چہرہ اور ساری شخصیت ناپسندیدہ تھی۔ امپراطور نے اسے جس سردہرانہ انداز سے دیکھا اور اسے دیکھ کر جس طرح ناک بھوس چڑھائی، اس سے اسے اپنے مفروضے کی مزید تصدیق مل گئی۔ درباریوں نے پرنس آندرے کو بتایا ”زار نے آپ سے جو بے رخی برتی ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ نے 1805 کے بعد ان کی کوئی خدمات سرانجام نہیں دیں، لہذا وہ آپ سے نفرت ہیں۔“

”مجھے اپنے طور پر معلوم ہے کہ انساں کو اپنی پسند اور ناپسند پر اختیار نہیں ہوتا،“ پرنس آندرے نے سوجا۔ ”چنانچہ اگر میں نے فوجی قواعد و ضوابط میں ترمیمات کے متعلق ذاتی طور پر زار کو تجاویز پیش کیں، اس کا کوئی حاصل نہیں ہوگا، تاہم میرا منصوبہ خود ہی اپنے آپ کو منوائے گا۔“

اس نے اپنے محضرناسے کے متعلق ایک ضعیف اسر فیڈ مارشل کو، جو اس کے باپ کا دوست تھا، پیغام بھیجا۔ فیڈ مارشل نے اسے ملاقات کا وقت دے دیا۔ جب وہ اس کے ہاں پہنچا، اس نے شفقت سے اس کا استقبال کیا اور اس سے وعدہ کیا کہ وہ اس معاملے کو امپراطور کے سامنے پیش کر دے گا۔ چند روز بعد پرنس آندرے کو مطلع کیا گیا کہ وہ وزیر جنگ آراک چیف کی خدمت میں حاضر ہو جائے۔



مقررہ دن پرنس آندرے صبح نو بجے آراک چیف کے استقبال پر کمرے میں پہنچ گیا۔ وہ ذاتی طور پر کاؤنٹ آراک چیف سے واقف نہیں تھا اور نہ کبھی اس کی اس سے ملاقات ہوئی تھی۔ تاہم اس

نے اس کے متعلق جو کچھ سنا تھا، اس سے اس کے دل میں اس کے متعلق کوئی احترام کے جذبات پیدا نہ ہوئے۔
 ”اور درجہ جنگ ہے، اور زار اس پر اعتماد کرتا ہے۔ اس کے ذاتی وصف سے مجھے یا کسی کو کوئی سروکار نہیں
 ہونا چاہیے۔ اسے میرے منصوبے کے مسودے کا جائزہ لینے کا کام سونپا گیا ہے۔ چنانچہ صرف وہی اسے پروں
 چڑھا سکتا ہے۔“ پرنس آندرے نے سوچا۔ وہ کاؤنٹ آراک چیف کے استقبالیہ کمرے میں بیٹھا تھا۔ اس کے
 ارد گرد ہم، غیر اہم، اور بعض دیگر اشخاص بھی موجود تھے۔

اپنی ملازمت کے زمانے میں زیادہ تر ایجوکیشن کی حیثیت سے۔ پرنس آندرے نے متعدد اعلیٰ شخصیات
 کے متنبالیہ کمرے دیکھے تھے اور ان کمروں کی مختلف اقسام وہ باآسانی پہچان لیا کرتا تھا۔ کاؤنٹ آراک چیف کا
 کمرہ خصوصی دھن کا حامل تھا۔ جو غیر اہم اشخاص ملاقات کے لیے اپنی باری کا انتظار کر رہے تھے، ان کے چہروں
 بھراں سے گھبراہٹ، دراپنی تذلیل کا احساس ٹپک رہا تھا۔ جہاں تک وچے مراتب کے حامل لوگوں کا تعلق تھا،
 ان کے خدو خاں یہ غمازی کر رہے تھے کہ یہ وہ جگہ نہیں، جہاں انھیں آنا چاہیے تھا اور یوں وہ، ایک طرح کے
 اضطراب میں پھنسے ہوئے تھے لیکن انھوں نے اپنے اضطراب پر کچھ اس قسم کا پردہ ڈال رکھا تھا جیسے انھیں کسی چیز
 سے کوئی تعلق ہی نہ ہو اور جیسے وہ خود اپنے آپ کی، اپنے مراتب کی اور اس شخص کی، جس سے ملاقات کے لیے وہ
 انتظار کی زحمت گوارا کر رہے تھے، کسی اثر سے ہوں۔ ان میں سے بعض، بے خیالات میں مستغرق، کمرے میں
 ادھر ادھر چکر لگا رہے تھے، اور بعض آپس میں سرگوشیاں کر رہے تھے اور قہقہے لگا رہے تھے۔ پھر پرنس آندرے کے
 کالوں میں ایک شخص کا عرف ”سیا آندرے“ پڑا اور اسے یہ الفاظ سنائی دیے: ”بڑے میاں آج ہماری خوب خبر لیں
 گے۔“ ان کا اشارہ کاؤنٹ آراک چیف کی طرف تھا۔ کمرے میں ایک جرنل (وہ بڑا اہم شخص تھا) بھی تھا۔ صاف نظر آ
 رہا تھا کہ اس سے جس طرح انتظار کرایا جا رہا تھا، وہ اس کے لیے سوہاں روح بنا ہوا ہے۔ وہ بار بار اپنی ٹانگیں ایک
 دوسرے کے اوپر رکھ رہا اور پھر انھیں علیحدہ علیحدہ کر رہا تھا، اور آپ ہی آپ تحقیر آمیز انداز سے مکر رہا تھا۔

لیکن جوئی دروازہ کھلتا، سبھی کے چہروں پر ایک ہی قسم کا تاثر۔ خوف دائرہ۔ نمایاں ہو جاتا۔ پرنس آندرے
 نے دوسری مرتبہ ڈیوٹی ایجنٹ سے کہا کہ وہ اس کا نام اندر پہنچا دے۔ جواب میں اسے طنزیہ نگاہوں سے دیکھا گیا
 اور اسے بتایا گیا: ”مناسب وقت پر آپ کی باری آئے گی۔“ جب ایجنٹ متعدد اشخاص کو وزیر کے کمرے کے اندر
 اندر ہال سے باہر لے چکا، ایک ایسے افسر کو، جس کے چہرے کو دیکھ کر پرنس آندرے کو احساس ہو کہ یہ شخص نہایت گھٹیا
 بھی ہے اور دہشت زدہ بھی، مہیب دروازے میں سے اندر پہنچایا گیا۔ اس افسر کی ملاقات خاصی دیر تک جاری رہی۔
 اچانک دروازے کی دوسری جانب سے درشت اور چیختی چنگھاڑتی آواز سنائی دی اور وہ افسر ہر آگیا۔ اس کا چہرہ زرد
 اور عورت نماں تھے۔ وہ اپنا سر پکڑے تیز تیز قدم اٹھاتا استقبالیہ کمرے سے باہر نکل گیا۔

اس کے بعد معارف پرنس آندرے کو دروازے تک پہنچا دیا گیا اور ایجنٹ نے اس سے کہا: ”دائیں طرف،
 درستی کے کریب۔“

پرنس آندرے سادہ لیکن صاف ستھرے سنڈی روم میں داخل ہو گیا۔ اسے میز کے سامنے ایک چائیس برالہ شخص، جس کی کمر چوڑی، سر لیوڑا، بال خشکی، چہرہ جھریاں زدہ، ناک خمیدہ، آنکھیں جھکی جھکی اور سر ٹی بال، جن کے اوپر شکن آلود پیشانی تھی، بیٹھا نظر آیا۔ آراک چیف نے دیکھے بغیر اپنا رخ اس کی طرف کیا اور پوچھا:

”تمہاری درخواست کس چیز کے بارے میں ہے؟“

”یوٹراکیسی لینسی.. میں کوئی درخواست لے کر نہیں آیا ہوں،“ پرنس آندرے نے دھیرے سے جواب دیا۔ آراک چیف کی نظریں اس پر ٹھہر گئیں۔

”بیٹھو... پرنس بکلوئسکی؟“ آراک چیف نے کہا۔

”مجھے کوئی درخواست پیش نہیں کرنا ہے۔ میں نے ہنر سبجکٹی امپراطور کی خدمت میں ایک منصوبے کا مسودہ

پیش کیا تھا، انھوں نے بکمال لطف و کرم اسے آپ کے سپرد کر دیا۔“

”نائی ڈیئر سر، اگر اجازت ہو تو میں یہ عرض کروں گا کہ میں آپ کا محضر نامہ پڑھ چکا ہوں،“ آراک چیف نے اسے ٹوکتے ہوئے کہا۔ اس نے اپنی گفتگو کے محض چند ابتدائی کلمات خاص نوع کی شائستگی سے کہے لیکن پھر اس نے مزید دوسری طرف پھیر لیا اور اس کے لہجے میں بتدریج چڑچڑاپن اور حقارت آتی گئی۔ ”تم نئے عسکری قواعد و ضوابط تجویز کر رہے ہو؟ ہمارے پاس پہلے ہی قواعد و ضوابط کی بھرمار ہے۔ کوئی بھی ان پرانے قواعد و ضوابط پر عمل نہیں کرتا۔ آج کل ہر کس دن اس نئے سے نئے قوانین مرتب کرنے میں مشغول ہے۔ لکھنا سنا ہے، عمل کرنا ضرور ہے۔“

”میں ہنر سبجکٹی امپراطور کی خواہش کے مطابق یوٹراکیسی لینسی سے یہ دریافت کرنے حاضر ہوا تھا کہ میں نے جو محضر نامہ پیش کیا تھا، اس کے متعلق آپ کیا کرنا چاہتے ہیں؟“ پرنس آندرے نے شائستگی سے کہا۔

”میں نے تمہارے محضر نامے پر اپنا تبصرہ لکھ دیا ہے اور اسے کمیٹی کے پاس بھیج دیا ہے۔ مجھے یہ پسند نہیں

آیا،“ آراک چیف نے کہا۔ وہ اٹھا، میز پر سے کاغذ اٹھایا اور اسے پرنس آندرے کو تھماتے ہوئے بولا: ”یہ لو“

اس کاغذ پر گھسیٹ گھسات کر مندرجہ ذیل عبارت، جو جوں اور رسوزہ اوقاف، دونوں اقسام کی غلامی سے پر تھی، لکھی ہوئی تھی:

”باقی، فرانسیسی عسکری ضوابط کی بھونڈی نقل، ہمارے اپنے جنگی ضوابط سے خواہ مخواہ انحراف کیا گیا ہے۔“

”یہ محضر نامہ کس کمیٹی کو ارسال کیا گیا ہے؟“ پرنس آندرے نے دریافت کیا۔

”کمیٹی برائے عسکری ضوابط۔ اور ہاں، میں نے یہ سفارش بھی کر دی ہے کہ حضور کو اس کمیٹی کا رکن نامزد

دیا جائے۔ تاہم اس کام کی تنخواہ نہیں ملے گی۔“

”میں تنخواہ کے چھپے نہیں بھاگ رہا۔“

”بداختو ہر کن،“ آراک چیف نے اپنی بات دہرائی۔ ”اچھا، خدا حافظ۔ اسے اگلے شخص کو بھیج دو، ان کے علاوہ

اور کون ہے؟“ اس نے پرنس آندرے کو برائے نام سلام کرتے ہوئے چلا کر کہا۔

جب پرنس سمیرے کمپنی کے رکن کی حیثیت سے اپنی تقرری کے رکی علان کا اہتمام کر رہا تھا، اس نے سوچا کیوں نہ پرانے شامراؤں، خاص طور پر ان لوگوں سے، جن کے متعلق اسے معلوم تھا کہ وہ صاحبان اختیار ہیں اور اسے ان کی مدد کی ضرورت پیش آ سکتی ہے، ملاقاتیں کی جائیں۔ اب کے پیٹرز برگ میں اسے بعد اسی نوع کے احساسات کا تجربہ ہوا، جس میں سے وہ تب گزرا تھا جب جنگ شروع ہوا چاہتی تھی۔ ایک بے چین شخص اسے کسی کل آرام نہیں لینے دیتا تھا اور وہ دیوانہ دار ان حلقوں کی، جہاں مستقبل کے بارے میں نقشے، جن پر لاکھوں انسانوں کی زندگیوں کا راز مدار تھا، ترتیب دیے جا رہے تھے، جانب کھینچا چلا جاتا تھا۔ بڑے بوڑھوں کی جھلہٹ اور تنگ مزاجی، نوآسوروں کا تجسس، اور آزمودہ کاروں کی چُپ، ہر ایرے غیرے کی بھگ دوڑ اور مصروفیت کا ڈراما، کمپنیوں اور کمپنیوں کی بھرمار۔ وہ آئے روز نئی نئی کمپنیوں اور نئے نئے کمپنیوں کے قیام کے اعلانات سنتا رہتا تھا۔ ان سب چیزوں سے اسے اب 1809 میں یہ احساس ہو رہا تھا کہ پیٹرز برگ میں کوئی زبردست غیر فوجی معرکہ ہوا چاہتا ہے۔ جو لوگ اس معرکے کی تیاریوں میں جتے ہوئے تھے ان کا کانڈرانیچیف ایک پراسرار شخص تھا۔ اسے وہ خود تو نہیں جانتا تھا لیکن اس کے بارے میں عام خیال یہی تھا کہ وہ نابغہ روزگار راستی ہے۔ اس شخص کا نام سپے رائسکی تھا۔ اصل حیات کی جو تحریک، جس کے بارے میں پرنس آندرے کو محض مبہم ساعلم تھا، چل رہی تھی، اسے اس میں اور اس کی روح رواں شخصیت، سپے رائسکی، میں اتنی دلچسپی ہونے لگی کہ اس کے ذہن میں عسکری قواعد و ضوابط کا مسئلہ بہت جلد ثانوی حیثیت اختیار کر گیا۔

پرنس آندرے کو معلوم ہوا کہ وہ خود جس پوزیشن میں ہے، وہ بہت سودمند ہے اور وہ اپنے زمانے کے پیٹرز برگ کے اعلیٰ ترین دور انتہائی مختلف النوع حلقوں میں انتہائی آسانی اور سہولت سے رسائی حاصل کر سکتا ہے۔ وہ اسیب، جو مصیبت کے شیدائی تھے، اس کا گرم جوشی سے خیر مقدم کرتے اور اس کی تائید و حمایت حاصل کرنے کی مسامحہ کرتے۔ اس کی ایک وجہ تو اس کی یہ شہرت تھی کہ وہ بہت ہوشیار، سمجھ دار اور خوب پڑھا لکھا آدمی ہے۔ دوسری بات یہ تھی کہ اس نے اپنے رشتہ دار غلاموں کو جس طرح آزد کیا تھا، اس نے اسے لبرل کی حیثیت سے مشہور کر دیا تھا۔ بزرگ اور مخالفین اصدا حیات اس لیے اس کی طرف لپکتے تھے کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ انھیں اصلاحات سے جو کد ہے، اس میں وہ ان کا ساتھ دے گا کیونکہ آخر وہ اپنے باپ کا بیٹا ہے۔ حواتین، جو محافل کی جان ہوتی تھیں، اس لیے سے انھوں ہاتھ لیتی تھیں کیونکہ وہ حسب حیثیت تھا، نامور تھا اور رشتہ جوڑنے کے لیے موزوں بر تھا اور تقریباً نوادہ اس کی مشروفہ ہلاکت اور اس کی اہلیہ کے ام ناک انتقال نے اس کی ذات کے گرد رومانوی ہالہ تان دیا تھا۔ مزید برآں ان تمام لوگوں کی، جو پہلے ہی سے اسے جانتے تھے، عمومی رائے یہ تھی کہ وہ ان گزشتہ پانچ برسوں کے دوران میں خاص بدل چکا ہے اور پہلے کی نسبت کہیں بہتر انسان بن گیا ہے۔ اس کے اطوار میں ملائمت اور اس کی

عقل میں پچھگی آگئی ہے۔ تصنع اور بناوٹ، نخوت اور خود پسندی، تحقیر آمیز طنز، سبھی غنقا ہو گئے ہیں اور اس میں حسانت بھی آگئی ہے جو عمر اور تجربے سے نصیب ہوتی ہے۔ لوگ اس کا ذکر کرتے تھے، اس میں دلچسپی لیتے تھے اور اس سے ملاقات کرنے کا اشتیاق ظاہر کرتے تھے۔

جس روز پرنس آندرے کی ملاقات کاؤنٹ آراک چیف سے ہوئی، اس سے گلی شام اس نے کاؤنٹ کو چوبی کے ہاں گزاری۔ اس نے کاؤنٹ کو "سید آندرے" کے ساتھ اپنی ملاقات کا احوال سنایا۔ (کاؤنٹ کو چوبی کبھی آراک چیف کا نام نہیں لیتا تھا، وہ اس کا ذکر اسی قسم کے خندا، استہزا کے ساتھ، جس کا مظاہرہ پرنس آندرے نے ویرجنگ کے استقبالیہ کمرے میں دیکھا تھا، اس کے عرف سے کرتا تھا۔)

"Mon cher" کو چوبی نے کہا۔ "اس معاملے میں بھی تم میخائیل میخائیلوویچ (پے رانسکی) کے تعاون کے بغیر کچھ نہیں کر سکتے۔ اصلی حاکم وہی ہے۔ میں اس سے بات کروں گا۔ اس نے آج شام آنے کا وعدہ کیا تھا۔"

"لیکن پے رانسکی کا عسکری قواعد و ضوابط سے کیا تعلق ہے؟" پرنس آندرے نے پوچھا۔

کو چوبی کے لبوں پر تبسم آگیا اور اس نے اپنے سر کو یوں جھکا دیا جیسے اسے بلکونسکی کی سادہ لوحی پر سخت حیرت ہوئی ہو۔

"چند دن ہوئے میں اور وہ تمہارے اور تمہارے ان زرعی غلاموں کے بارے میں، جنہیں تم نے آزادی دی ہے باتیں کر رہے تھے۔" کو چوبی نے اپنا سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"پرنس، تو یہ آپ ہیں جنہوں نے اپنے زرعی غلاموں کو آزاد کیا ہے؟" امپراطورہ کیترین¹³ کے دوتوں کے ایک بزرگ نے بلکونسکی کو حقارت سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"یہ چھوٹی سی جاگیر تھی اور اس سے یافت بھی کوئی خاص نہیں ہوتی تھی؛ پرنس آندرے نے جواب دیا۔

اس نے جو کچھ کیا تھا، وہ اس کی اہمیت زیادہ سے زیادہ گھٹا کر پیش کرنے کی کوشش کر رہا تھا تا کہ پیر فرتوت خواہ مخواہ ناراض نہ ہو جائے۔

"مجھے ڈر ہے کہ کہیں تاخیر نہ ہو جائے..." پیر فرتوت نے کو چوبی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "یک بات میری سمجھ میں نہیں آتی؛ اس نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "اگر انہیں آزادی دے دی گئی، پھر زمین کون کاشت کرے گا؟ قوانین مرتب کرنا آسان کام ہے لیکن حکومت کرنا دشوار۔ اسی طرح، کاؤنٹ، میں آپ سے یہ دریافت کرنا چاہوں گا کہ اگر ہر شخص کو امتحان پاس کرنا پڑا پھر محکموں کے سربراہ کون لوگ مقرر ہوں گے؟"

"میرا خیال ہے کہ وہی لوگ، جو امتحانات میں کامیاب ہوں گے،" کو چوبی نے اپنی ایک ٹانگ دوسری ٹانگ پر رکھتے اور اپنے چاروں اطراف نظریں دوڑاتے ہوئے کہا۔

"میرے محلے میں ایک شخص پر یاچنیکوف ہے۔ وہ اتنا اچھا، درانمول کارکن ہے کہ اس جیسا ڈھونڈنے سے

نہیں ملے گا۔ لیکن اس کی عمر ساٹھ سال ہو چکی ہے۔ اسے بھی امتحان کی چکی میں سے گزرتا پڑے گا؟“
 ”ہاں، اس قسم کے معاملات میں ضرور دشواری پیش آئے گی کیونکہ تعلیم اتنی عام نہیں ہوئی۔“

کاؤنٹ کو چوبی نے اپنی بات ختم نہ کی۔ وہ اٹھا، پرنس آندرے کا بازو پکڑا اور ایک چہل سالہ شخص کا، جو کمرے میں داخل ہو رہا تھا، استقبال کرنے چل پڑا۔ نو وارد کا قد لمبا، سر کے بال تقریباً نادر، (لیکن جوتھے، ان کی رنگت سہری تھی)، پیشانی فراخ اور اونچی، چہرہ کتلی تھا، جس پر عجیب و غریب اور انوکھی نوعیت کی رنگت چھائی ہوئی تھی۔ اس کے جسم پر نیلے رنگ کا فراک کوٹ تھا، گلے میں صلیب لٹک رہی تھی اور بائیں سینے پر ستارہ نمائندہ آویزاں تھا۔ یہ ہے رانسکی تھا۔ پرنس آندرے سے ایک نظر میں ہی پہچان گیا۔ آدمی کی زندگی میں جب عظیم لمحات آتے ہیں، اس کے جسم میں تھر تھری سی دوڑ جاتی ہے۔ پرنس آندرے کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ اس تھر تھری کا سبب جذبہ احترام تھا، حسد تھا یا پیش بینی؟ اسے کچھ معلوم نہیں تھا۔ پرنس آندرے کا سار ڈیل ڈول کچھ عجیب و غریب قسم کا تھا اور یوں اسے پہچاننا آسان تھا۔ جس طبقے میں پرنس آندرے کے شب و روز بسر ہو رہے تھے، اس میں اسے اس نوع کی طمانیت اور خود اعتمادی سے، جیسی کہ اس شخص کی بے ہنگم اور دھیمی نقل و حرکت میں نظر آرہی تھی، کبھی واسطہ نہیں پڑا تھا۔ اس کی ہم ہند و تندرے مرطوب آنکھوں سے عزم ٹپکتا تھا لیکن اس کے باوجود وہ حلیم تھیں، اس نے اس طرح کی آنکھیں کبھی نہیں دیکھی تھیں۔ اسے کبھی اس قسم کا پراسیٹھال تبسم، جو بے شک بے معنی تھا، نظر نہیں آیا تھا اور اس نے کبھی اتنی نرم، ملائم، شیریں اور نستعلیق آواز نہ سنی تھی۔ لیکن ان سب سے بڑھ کر جس چیز نے اس کی توجہ اپنی جانب مبذول کرائی، وہ اس کے ہاتھوں اور خاص طور پر ہاتھوں کی۔ جو تندرے چوڑے چکے، غیر معمولی طور پر لمبے، نرم اور سفید تھے۔ کل پسیدی تھی۔ اس قسم کی پسیدی پرنس آندرے نے صرف ان فوجیوں کے، جو کافی کافی عرصہ ہسپتالوں میں صاحب فرمائش رہے تھے، چہروں پر دیکھی تھی۔ یہ تھا پرنس آندرے، وزیر داخلہ، زار کارازدان اور مخبر، رنورٹ مل، جہاں اس نے ایک سے زیادہ مرتبہ پیوین سے ملاقات اور گفتگو کی تھی، اس کا رفیق۔

عام طور پر جب لوگ کسی خاصی بڑی محفل میں داخل ہوتے ہیں، اس کی نگاہیں غیر ارادی طور پر ایک سے دوسرے اور دوسرے سے تیسرے چہرے کی طرف منتقل ہونے لگتی ہیں۔ پرنس آندرے نے اس قسم کی کوئی حرکت نہ کی اور شائے ایسی نگاہوں کوئی جلدی تھی۔ وہ باتیں دھیمے سروں میں کرتا تھا کیونکہ اسے یقین تھا کہ اس کی گفتگو توجہ سے نہ کی جائے گی اور اپنی گفتگو کے دوران میں وہ صرف اس شخص کی طرف دیکھتا تھا، جس سے وہ مخاطب ہوتا تھا۔

پرنس آندرے سے پرنس رانسکی کے ایک، ایک لفظ کو توجہ سے سنتا اور اس کے ایک ایک اشارے کو بخور دیکھتا رہا۔ جیسا کہ عام طور پر اس لوگوں کا، جو اپنے ساتھی انہوں نے کتنی محنت محکمہ کرتے ہیں، دستور ہوتا ہے، پرنس آندرے کو جب بھی کسی شخص سے۔ خاص طور پر پرنس رانسکی جیسے شخص سے، جسے وہ اس کی شہرت کی بنا پر جانتا تھا۔ ملاقات ہوئی، وہ ہمیشہ یہ توقع کرتا کہ یہ شخص انسانی خوبیوں کا کامل مرقع ہوگا۔

پرنس رانسکی نے کو چوبی سے اپنے تاخیر سے آنے پر معذرت کی کیونکہ اسے محل میں روک لیا گیا تھا۔ اس نے

یہ نہیں کہا کہ اسے روکنے والا شخص زار تھا۔ انک ر کایہ پر تشیع اظہار پر پرنس آندرے کی نظروں سے بچ نہ سکا۔ جب کوچوبی نے پرنس آندرے کا تعارف کرایا، پے رانسکی نے آہستہ آہستہ پٹی ٹکاہیں بلکونسکی کی جانب منتقل کیں اور چپ چاپ اسے دیکھنے لگا۔ اس کے چہرے پر وہی مسکراہٹ تھی جس میں کبھی کوئی تبدیلی نہیں آتی تھی۔

”مجھے آپ سے تعارف حاصل کر کے بہت خوشی ہوئی ہے۔ دوسروں کی طرح میں بھی آپ کے بارے میں کافی سن چکا ہوں،“ اس نے کہا۔

آراک چیف نے ملاقات کے دوران میں بلکونسکی کے ساتھ جو سلوک کیا تھا، کوچوبی نے اس کا مختصر اور سنایا۔ پے رانسکی کی مسکراہٹ اور پھیل گئی۔

”کمیٹی برائے عسکری قوت، عدو و صواب کا چیئر مین میرا عزیز دوست موسیو ماگ تشسکی ہے،“ اس نے ایک ایک لفظ کے ایک ایک جز کو واضح انداز سے ادا کرتے ہوئے کہا۔ ”اگر آپ چاہیں تو، میں اس سے آپ کی ملاقات کر سکتا ہوں۔“ (جسے کے اختتام پر اس نے کچھ توقف کیا۔) ”مجھے یقین ہے کہ وہ آپ کو ایک ایسا شخص نظر آئے گا جو ہر محقول بات میں دلچسپی لیتا ہے اور اسے پرواں چڑھانے کے لیے تیار رہتا ہے۔“

چشم زدن میں سوگوں نے پے رانسکی کے رد گرد حلقہ بنا لیا اور وہ بزرگ شخص جس نے اپنے ماتحت پر یا نچنیکوف کے متعلق باتیں کی تھیں، ان لوگوں میں، جنہوں نے اس کے سامنے کوئی نہ کوئی سواں اٹھایا، شامل تھا۔ پرنس آندرے نے گفتگو میں کوئی حصہ نہ لیا۔ وہ محض پے رانسکی کو دیکھتا رہا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ ابھی کل کی بات ہے کہ یہ شخص دینیات کا معمولی طالب علم تھا اور آج روس کی تقدیر اس کے ہاتھوں۔ لکھے سفید ہاتھوں۔ میں ہے۔ پے رانسکی نے جس غیر معمولی تحقیر آمیز طمانیت کے ساتھ پیر فرتوت کے سواں کا جواب دیا، اس پر پرنس آندرے کے کان کھڑے ہو گئے۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ خود ہالینائی بلند یوں پر جاگزیں ہے اور یہ اس کی کمال مہربانی ہے کہ وہ اس پیر فرتوت جیسے عام لوگوں سے جو کلام ہے۔ جب پیر فرتوت نے ضرورت سے زیادہ بلند بچے سے یوں شروع کر دیا، پے رانسکی کا چہرہ متبسم ہو گیا اور وہ کہنے لگا۔ ”اسیرا طور جس چیز کو منظور کرنا مناسب خیال کرتے ہیں، اس کی کیا مجال کہ اس کے ناقص یا سود مند ہونے کے بارے میں جھگمکے گاؤں۔“

پے رانسکی کچھ دیر اس عمومی جتنے میں گفتگو کرتا رہا، پھر وہ اٹھا، سیدھا پرنس آندرے کے پاس پہنچا اور اسے اپنے ساتھ کمرے کے دوسرے سرے پر لے گیا۔ صاف نظر آ رہا تھا کہ وہ بلکونسکی سے میل جوں بڑھانا زیادہ ضروری خیال کرتا ہے۔

”پرنس، اس قابل حرام بزرگ نے مجھے جس قسم کی پر جوش گفتگو میں گھسیٹ لیا، اس کے دوران میں مجھے آپ کے ساتھ ہم کلام ہونے کا کوئی موقع دستیاب نہ ہو سکا،“ اس نے ہلکی سی بر تحقیر مسکراہٹ سے کہا۔ اس کا بیرونی اس امر کی غی زئی کر رہا تھا کہ جن لوگوں کے ساتھ وہ ابھی محو کلام تھا، اس کا خیال تھا کہ اس کی طرح پرنس آندرے بھی انہیں حقیر کہنے کوڑے تصور کرتا ہے۔ اس کے اس رویے سے پرنس آندرے نہال ہو گیا اور اس کے جذبہ خود پسندی

کر دی تقویت ملی۔ ”میں آپ کو بہت عرصے سے جانتا ہوں۔ مجھے آپ کی ذات میں جو دلچسپی پیدا ہوئی، اس کی پہلی وجہ تو آپ کا وہ اتمام ہے جو آپ نے اپنے زرعی محاسنوں کے بارے میں کیا ہے۔ یہ نئی نوعیت کی اولین مثال ہے اور ضرورت اس بات کی ہے کہ دوسرے بھی اس کی تقلید کریں۔ دوسری بات یہ ہے کہ آپ کا شمار ان درباری مصاحبین میں ہوتا ہے جنہوں نے نئے فرمان پر، جس کے تحت درباریوں کی از سر نو درجہ بندی کی گئی ہے، جس کے بارے میں طرح طرح کی باتیں کی گئی ہیں اور جسے خواہ مخواہ اعتراضات کا نشانہ بنایا گیا ہے، کوئی ناک بھوں نہیں چڑھائی۔“

’جی نہیں، میرے والد قطعاً نہیں چاہتے‘، پرنس آندرے نے کہا، ”کہ مجھے جو استحقاق حاصل ہے، میں اس سے باز یا ناجائز کوئی فائدہ اٹھائوں۔ میں نے، اپنی ملازمت کا آغاز سب سے نچلے درجے سے کیا تھا۔“

’آپ کے والد، جد کا تعلق پرانی نسل کے لوگوں سے ہے لیکن یہ روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ وہ ہمارے اس معاصرین سے، جو اس اتمام میں کیزے نکال رہے ہیں، کہیں بلند تر ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ مخالفین کو اس فراہ سے کیا کہ ہے، حالانکہ اس کا مقصد محض فطری انصاف کے تقاضے پورے کرنا اور اس کا بول بال کرنا ہے۔“

”تاہم میرا خیال یہ ہے کہ جو کچھ چینی ہو رہی ہے، اس کی کچھ وجوہات ہیں،“ پرنس آندرے نے پے رانسکی کے طلسم کی مزاحمت کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ اسے یہ حساس ہونے لگا تھا کہ پے رانسکی کی سحر انگیز شخصیت اس پر بھی اثر انداز ہونے لگی ہے۔

اس کی ہر بات میں اس سے ہاں ملنا اسے پسند نہیں تھا اور اس نے اس کی تردید کرنا ضروری خیال کیا۔ عام طور پر وہ بوجھل اور با آسانی گھٹگو کر سکتا تھا لیکن پے رانسکی کے ساتھ مذاکرہ کرتے اسے اپنا مافی الضمیر ادا کرنے میں دست چیش آرہی تھی۔ اس نامور آدمی کی شخصیت کا مطالعہ کرنے میں وہ کچھ ضرورت سے زیادہ ہی محو ہو گیا تھا۔

”ان وجوہ کے پس پردہ شاید ذاتی امتگیس کار فرما ہوں؟“ پے رانسکی نے دھیمے انداز سے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔

”اور کسی حد تک مملکت کے مفادات بھی“ پرنس آندرے نے کہا۔

”کیا مطلب؟“ پے رانسکی نے اپنی نگاہیں جھکائے نرمی سے پوچھا۔

”میں سوچتا ہوں کہ اس کا یہ تصور کہ *le principe des monarchies est l'honneur* میرے نزدیک ناقابل تردید ہے۔ شرفاء کے بعض حقوق اور استحقاقات جس حد بے کو برقر رکھنے کا ایک درجہ ہیں۔“

پے رانسکی کے پید چہرے سے مسکراہٹ غائب ہو گئی لیکن اس تبدیلی سے اس کے خدو خال قدرے خوبصورت نظر آنے لگے۔ بظاہر یہی دکھائی دے رہا تھا کہ وہ پرنس آندرے کے خیالات میں بہت دلچسپی لے رہا ہے۔

”اگر آپ مسئلے کو اس نقطہ نظر سے دیکھتے ہیں... اس نے فرانسیسی میں کہنا شروع کیا۔ نظر بظاہر اسے اپنے

’بادشاہت کا اصول یہ ہے کہ دوسروں کا احترام کیا جائے۔‘

اخلاط کی ادائیگی میں مشکل پیش آرہی تھی۔ وہ جب ردی میں گفتگو کر رہا تھا، تب بھی اس کی رفتار دھیمی تھی لیکن اب تو یہ اور بھی دھیمی ہو گئی تاہم اس کی کامل طمانیت اپنی جگہ موجود تھی، اس میں سرخو فرق نہیں آیا تھا۔

وہ کہہ رہا تھا ”اس احترام (honneur) کو، جو ایسے استحقاقات کا، جو سرکاری ملازمت کے دوران میں عمر کا کردگی کی راہ میں مزاحم ہوں، مردہ بن مٹ ہو، برقرار نہیں رکھا جاسکتا۔ احترام یا تو منفی تصور ہے کہ اس کا جو کچھ قابلِ ملامت حرکات سے، جناب کرے گا، پھر یہ تقلید کا منبع بن سکتا ہے کہ ایسے کام کیے جائیں کہ آپ بھی دوسروں کی نگاہوں میں سرخ رو بن سکیں ورنہ ہم واکرام حاصل کر سکیں۔“ اس کے دلائل سیدھے سادے، جمل اور غیر مبہم تھے۔

”وہ ارارہ، جو اس قسم کے احترام کو، جو تقلید کا منبع ہو، برقرار رکھتا ہے، وہ عظیم اپر اطور پولیس کے legion d'honneur کے مشابہ ہے۔ پھر یہ ملازمت کے لیے ضروریات نہیں رہتا بلکہ اس کی کامیابی میں مدد و معاون ثابت ہوتا ہے۔ اس صورت میں یہ طبقاتی یا درباری استحقاق نہیں رہتا۔“

”جو کچھ آپ فرما رہے ہیں، بجا ہے، میں اس بارے میں آپ سے ٹکرا رہیں کر سکتا۔ تاہم اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ درباری استحقاقات کے ذریعے بھی یہی مقصد حاصل ہوتا ہے،“ پرنس آندرے نے جواب دیا۔ ”ہر درباری اپنے آپ کو اس بات کا پابند گردانتا ہے کہ اس نے اپنا منصب شایاں شاں طریقے سے سنبھالے رکھنا ہے۔“

”پرنس، اس کے باوجود آپ اپنے استحقاقات سے فائدہ اٹھانے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے،“ اے رائی نے کہا۔ اس کے چہرے پر سکراہٹ تھی۔ یہ اس بات کی علامت تھی کہ وہ ایک ایسی بحث کو، جو اس کے مخاطب کے لیے پریشان کن تھی، خوشگوار انداز سے ختم کرنے کا متنبی ہے۔ ”اگر آپ برون پدھ میرے غریب خانے پر تشریف لانے کی رحمت گوارا کر سکیں،“ اس نے مزید کہا، ”میں آپ کو شاید کوئی ایسی بات، جو آپ کے لیے دلچسپی کا باعث ہو، بتا سکوں گا کیونکہ اس وقت تک ماگ ٹسکی سے میری ملاقات ہو چکی ہوگی۔ مزید برآں، مجھے آپ کے ساتھ تصیلی تبادلہ خیالات کا موقع بھی میسر آ سکے گا۔“

اس نے اپنی ”تکھیں بند کیں، گردن کو خم دیا اور اس کوشش میں کہ کسی کو اس کی روانگی کی کانوں کان خبر نہ ہونے پائے، وہ خدا حافظ کہے بغیر چپکے سے باہر نکل گیا۔

6

پیئرز برگ میں اپنے قیام کے ابتدائی ہفتوں میں پرنس آندرے کو معلوم ہوا کہ یہی نف میں گوشہ نشینی کی زندگی گزارنے کے دوران میں اس نے سوچنے سمجھنے کی جو عادت اختیار کی تھی، وہ ان ادنیٰ مصروفیات کے باعث، جن میں وہ یہاں شہر میں الجھا رہا تھا، ختم ہوتی جا رہی ہے۔

شام کو جب وہ گھر لوٹا، وہ اپنی ڈائری میں ان چار پانچ ملاقاتوں کے، جو اس نے مقررہ اوقات پر مختلف اشخاص سے کرنا ہر میں اور جن سے وہ کسی صورت میں بھی پہلو نہیں پچ سکتا تھا، اوقات درج کر لیتا۔ اس کی زندگی کچھ اس ڈگر پر چل رہی تھی کہ اس کی اصل قوت کا بیشتر حصہ اسی ادھیڑ بن میں صرف ہو جاتا کہ وہ اپنے دن کی کس طرح تقسیم و ترتیب کرے کہ وہ ہر جگہ وقت معینہ پر پہنچ جائے۔ وہ کوئی کام نہیں کرتا تھا بلکہ سوچتا بھی نہیں تھا، ورنہ اسے سوچنے کا موقع میسر آتا تھا۔ وہ صرف ان امور کے بارے میں، جن کے متعلق اسے گاؤں میں سوچنے سمجھنے کا خاصا وقت ملتا تھا باتیں کرتا تھا اور وہ یہ باتیں بہت اچھے انداز سے کرتا تھا۔

بعض اوقات اسے محسوس ہوتا کہ وہ ایک ہی بات ایک ہی روز مختلف حلقوں میں کہہ چکا ہے۔ اس پر اسے بہت کوفت ہوتی۔ لیکن وہ مسلسل کئی کئی ایام ہمہ وقت اتنا مصروف رہتا کہ اسے یہ سوچنے کی فرصت ہی نہ ملتی کہ وہ کچھ نہیں کر رہا۔

جس طرح کو چوبلی کے ہاں پہلی ملاقات میں پے رانسکی نے بلکونسکی کو بے طرح متاثر کیا تھا، اب جب دونوں کی بدھ کو اس کے مکان پر بالمشانہ ملاقات ہوئی اور ان کے درمیان بہت طویل اور رازدارانہ گفتگو ہوئی، اس نے اس کو اور بھی زیادہ متاثر کیا۔

پرنس آندرے جن لوگوں کو حقیر و رے وقعت تصور کرتا تھا، ان کا شمار ممکن نہیں۔ اس کی یہ شدید آرزو تھی کہ اسے کوئی ایب آدمی مل جائے، جو کاملیت کا جیتا جاگتا نمونہ ہو۔ وہ خود بھی کامل بننے کی جگہ و دو کر رہا تھا۔ چنانچہ جب پے رانسکی سے اس کی ملاقات ہوئی، تو اس کے لیے یہ یقین کرنا آسان ہو گیا کہ اسے کامل منطقی اور پارسا انسان مل گیا ہے۔ مگر پے رانسکی کا تعلق بھی سماج کے، سی طبقے سے ہوتا، جس کی وہ خود پیداوار تھا، اگر اس نے بھی وہی تربیت پائی ہوئی اور سے بھی وہی اخلاقی روایات ورشے میں ملی ہوئیں، تو بلکونسکی بہت جلد اس کے کردار کے کمزور، بڑے، اور غیر اوجہ العزم پہلو تلاش کر لیتا۔ لیکن ہوا یوں کہ پے رانسکی کی عجیب و غریب اور منطقی ذاتی طاقت نے اس کے دس میں اس کے لیے احترام کا جذبہ اور بھی کوٹ کوٹ کر بھردیا کیونکہ وہ اس کی پوری تفہیم کرنے سے قاصر تھا۔ علاوہ ازیں پے رانسکی محض اس بنا پر کہ وہ پرنس آندرے کی خوبیوں کا واقعی معترف تھا اور ان کی تحسین کرتا رہتا تھا یا پھر وہ اسے اپنا حمایتی بنانا بہت ضروری سمجھتا تھا، بہر حال وجہ خواہ کچھ ہی ہو وہ اس کے سامنے کچھ اس قسم کا رویہ اختیار کر لیں جس سے احساس ہوتا کہ اس سے بڑھ کر اور کوئی معقول انسان ہے ہی نہیں۔ ایسے ملک شام پر جذبات غائب آتے اور نہ وہ عیش میں آتا۔ وہ اس کی چال چلی کرنے کے لیے خوشامد کی وہ لطیف قسم استعمال کرتا جس کا نخوت اور خود پسندی سے چوبلی دامن کا ساتھ ہوتا ہے اور اس اس کے مفرد بننے پر مشتمل ہوتی ہے کہ آپ کے علاوہ آپ کا ساتھ ہی وہ واحد انسان ہے جو باقی دنیا کی حماقتیں اور آپ کے خیارات کی گہرائی، کیرائی اور حکمت سمجھ سکتا ہے۔

بدھ کی شام دونوں کے مابین جو طویل مکالمہ ہوا، اس کے دوران میں پے رانسکی نے ایک سے زیادہ مرتبہ

یہ کہا: ”ہم ہر اس چیز کی، جو سم کہنے کے معیار سے اونچی ہوتی ہے، قدر کرتے ہیں...“ یا پھر ذریعہ جسم ”ہم اس خیال کے حامی ہیں کہ بھینریوں کو شکم سیر ہونے کا موقع دیا جائے اور بھینریوں کی رکھوالی کی جائے۔“ یا ”وہ یہ نہیں سمجھ سکتے...“ وہ یہ سب کچھ اس انداز سے کہتا کہ جس سے یہ مترشح ہوتا کہ وہ کہنا یہ چاہتا ہے کہ ”ہم۔ میں اور آپ۔ خوب سمجھتے ہیں کہ وہ کیا ہیں اور ہم کون ہیں۔“

پہلی ملاقات کے دوران میں پرنس آندرے کے ذہن پر پے رانسکی کے بارے میں جو تاثرات مرتب ہوئے تھے، اس اولین گفتگو نے ان پر مہر ثبت کر دی۔ وہ اسے ایک ایسا انسان نظر آیا جس کی دانش بے پایاں میں کوئی کلام نہیں تھا، وہ معاملہ فہم تھا، مدبر تھا، بخیدہ دشمن تھا۔ اس نے اپنے زور بازو اور استقلال سے قوت و اقتدار کی سند حاصل کی تھی اور اب اپنے اس اختیار و قوت کو محض روس کی فلاح و بہبود کے لیے استعمال کر رہا تھا۔ پرنس آندرے کی نگاہوں میں پے رانسکی نین میں وہی انسان تھا جو وہ خود بننا چاہتا تھا۔ یعنی وہ ایک ایسا شخص تھا جو زندگی کے تمام حقوق و منافع ہر کی عقلی توجیہ کرتا تھا، صرف اس بات کو، جو منطق کے اصولوں پر پورا اترتی تھی، صحیح تسلیم کرتا تھا اور ہر چیز پر منطق کے معیاروں کا اطلاق کرنے کی صلاحیت سے بہرہ ور تھا۔ ہر وہ چیز، جس کی پے رانسکی تشریح و تعبیر کرتا، اتنی سادہ اور عام فہم نظر آنے لگتی کہ پرنس آندرے بے اختیار ہر نکتے پر آمنا و صدقہا پکار اٹھتا، اگر وہ اس سے انکار کرتا یا اس کی کسی بات پر کوئی اعتراض اٹھاتا، اس کا مقصد یہ جتاننا ہوتا کہ اسے اپنی آزاد روی عزیمت اور وہ اسے برقرار رکھنا چاہتا ہے۔ وہ ہرگز ہرگز یہ تاثر نہیں دینا چاہتا تھا کہ جو کچھ پے رانسکی کہہ رہا ہے، اس کے ایک ایک حرف سے اتفاق ہے۔ تاہم ہر بات صحیح تھی، ہر چیز وہی تھی جیسے کہ وہ ہونا چاہیے تھی۔ صرف ایک بات پرنس آندرے کو مضطرب کر رہی تھی اور وہ پے رانسکی کی سرد مہر اور آئینہ نما آنکھیں تھیں۔ جس طرح آئینہ اس چیز کو تو، جو اس کے سامنے آتی ہیں، منعکس کر دیتا ہے لیکن یہ نہیں بتاتا کہ خود اس کے اپنے پیچھے کیا ہے۔ بعینہ پے رانسکی کی آنکھیں دیکھ کر یہ اندازہ نہیں لگایا جاسکتا تھا کہ ان کے پس پردہ کیا چیز ہے۔ ان سے صرف یہ عندیہ ملتا تھا کہ پرنس آندرے کو اس کی روح تک رسائی حاصل نہیں ہو سکتی۔ پھر پے رانسکی کے نرم و نازک اور پمید ہاتھ بھی اس کے لیے پریشانی کا سبب بنے ہوئے تھے۔ بلکہ اسکی انہیں یوں اضطرابی طور پر دیکھ رہا تھا جیسے عام طور پر ان ہاتھوں کو، جو طاقت و اختیار کے مالک ہوں، دیکھا جاتا ہے۔ پرنس آندرے کو پے رانسکی کی آئینہ نما آنکھوں اور نرم و نازک ہاتھوں پر خواہ مخواہ طیش رہا تھا۔ ادھر پے رانسکی کا انداز کچھ اس قسم کا تھا کہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ دوسروں کو ضرورت سے کچھ زیادہ ہی نگاہ تحقیر دیکھتا ہے اور اپنے مقابلے میں انھیں پرکاش کے برابر بھی نہیں سمجھتا اس کا یہ انداز بھی پرنس آندرے کو نہ بھابھ۔ پھر پے رانسکی اپنے خیالات و آراء کی تائید میں جس طرح گونا گوں دلائل و براہین پیش کر رہا تھا، وہ بھی اس کی طبیعت پر گراں گزرا۔ پرنس آندرے نے دیکھا کہ ان کی عقل اور ذہن جو چال ترکیب یا ہتکنڈ اچھا سکتا ہے، پے رانسکی ان سب کو بروئے کار لا رہا ہے لیکن وہ تمثیلی استدلال کو ہاتھ تک نہیں لگاتا۔ اور جب وہ ایک استدلال سے دوسرے استدلال کی طرف دست لگاتا، یوں محسوس ہوتا کہ یہ اس کے ہاتھ کا کھین ہے۔ ایک موقع پر وہ عملی آدمی

کا موقف اختیار کر لیتا اور خیالی منصوبے گھڑنے والوں (visionaries) کے لئے رہا ہوتا۔ اگلے سچے اس کا انداز طریقہ ہو جاتا اور وہ اپنے مخالفوں پر طنز و تشبیح کے تیر چلارہا ہوتا۔ پھر وہ پکا منطقی طریق اختیار کر لیتا یا ایک ایسی مابعد الطبیعیات کی قلمرو میں داخل ہو جاتا (اس آخری وسیلے کا وہ خاص طور پر شیدائی معلوم ہوتا تھا)۔ وہ مسئلے کی نوعیت تبدیل کر دیتا اور اسے مابعد الطبیعیاتی بلند یوں تک پہنچا دیتا، زمان و مکان اور تصور کی تعریف بتانے لگتا اور جب اس انداز سے بطل کر دیتا، وہ ایک بار پھر اصل بحث کی سطح پر نیچے اتر آتا۔

پرنس آندرے کوپے رانسکی کی ذہنیت میں جو سب سے بڑی خصوصیت نظر آئی، وہ اس کا عقل کی قوت اور اختیار پر مطلق اور غیر متزلزل یقین تھا۔ صاف نظر آ رہا تھا کہ ایک بات جسے پرنس آندرے فطرتاً نہایت آسانی سے سمجھ سکتا تھا، وہ اسے کبھی نہیں سمجھ سکے گا کہ آدمی لاکھ زور مارے، وہ جو کچھ سوچتا ہے، اس سب کو بہر حال الفاظ میں بیان کرنے پر قادر نہیں۔ پھر اس کے ذہن میں کبھی اس قسم کا شک و شبہ پیدا نہیں ہوا تھا کہ جو کچھ وہ سوچ رہا ہے! جس چیز کو وہ صحیح مان رہا ہے، عین ممکن ہے کہ وہ نری خرافات ہو۔ اور پے رانسکی کے ذہن کی یہی وہ انوکھی خصوصیت تھی جس نے پرنس آندرے کو اپنی طرف متوجہ کیا تھا۔

اپنے تعلقات کے ابتدائی ایام میں پرنس آندرے اس کا دیوانگی کی حد تک مداح تھا۔ اس کی یہ فریفتگی اس کی اس فریفتگی سے، جو وہ کسی زمانے میں ہونا پارت کے لیے محسوس کرتا تھا، کسی طور کم نہ تھی۔ اس حقیقت نے کہ پے رانسکی پادری کا بیٹا تھا اور اس خدشے نے کہ عقل سے گورے لوگ اسے راندہ درگاہ طبعی کا فرد سمجھتے ہوئے اس کے ساتھ کچھ اس قسم کی تعارضات سے، جو بازاری اور اونچے لوگوں کا خاصہ ہوتی ہے (اور حقیقتاً متعدد اشخاص اس کے ساتھ کچھ اس طرح کا برتاؤ کرتے تھے) پیش آنے لگیں، پرنس آندرے کو اس بات پر مائل کیا کہ اس کے دل میں اس کے لیے احترام کا جو جذبہ بید ہو تھا، اسے وہ سینے سے لگا کر رکھے اور غیر شعوری طور پر اس کی آبیاری کرتا رہے۔

اس اولین شام کو، جو بلکونسکی نے اس کی معیت میں گزاری، پے رانسکی نے قانونی ضوابط میں اصلاحات و ترامیم تجویز کرنے والے کمیشن کا ذکر کرنے کے بعد بڑے تمسخرانہ انداز سے کہا: ”یہ کمیشن گزشتہ اڑھ سو سال سے قائم ہے اس پر لاکھوں روپے صرف ہو چکے ہیں لیکن اس نے ابھی تک دھیلے کا کام نہیں کیا ہے۔ البتہ روزن کامپف نے مضامین و نعات پر چٹیں ضرور چسپاں کر دی ہیں۔“

”اور ملکیت نے جو لکھو لکھ ہار روپے صرف کیے ہیں، اس کا اسے بس یہی معاوضہ ملا ہے،“ اس نے کہا۔ ”ہم سمجھتے کوئے قانونی اختیارات تفویض کرنا چاہتے ہیں لیکن اس مقصد کے لیے ہمارے پاس کوئی قانون نہیں۔ چنانچہ پرنس، اگر آپ جیسے اسباب اس موقع پر آگے نہیں آئیں گے، تو یہ بہت بڑا گناہ ہوگا۔“

”اس قسم کے کام کے لیے ضروری ہے کہ آدمی نے قانون کی تعلیم حاصل کی ہو اور میں نے یہ تعلیم نہیں پائی،“ پرنس آندرے نے کہا۔

”لیکن اور بھی تو کسی نے نہیں پائی۔ پھر آپ کا کیا خیال ہے؟ اس کھن گھیری سے نکلنے کا کوئی تو راستہ ہوتا

چاہیے۔



ایک ہفتے کے اندر اندر پرنس آندرے کمیٹی برائے عسکری ضوابط کا رکن مقرر ہو گیا اور اس کے ساتھ ہی اسے ٹافل ضوابط میں اصلاحات و ترمیمات تجویز کرنے والے کمیشن کی ایک ریلی کمیٹی کا چیئرمین۔ اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ ایسا بھی ہو سکے گا۔ بنادیا گیا۔ اس نے پے رانسکی کی درخواست پر خط ریونی کا حصہ اوس، جو تکمیل کے مراحل میں سے گزر رہا تھا، اپنے ذمے لے لیا اور ان ضوابط کی مدد سے، جو پینلین اور جینیوین¹⁵ نے ترتیب دیے تھے، شخصی قوانین کے سیکشن کی اس سرنوتدوین کرنے لگا۔

7

اس سے تقریباً دو سال قبل، 1808 میں جب میئر اپنی جاگیروں کے دورے سے واپس لوٹا، اس نے اپنی کسی منصوبہ بندی کے بغیر اپنے آپ کو پیٹرز برگ کے فری میسنوں کی صف اول میں پایا۔ تاج میں جو دعوتیں اور تعزیتی اجلاس منعقد ہوتے، وہ ان کا انتظام داندھرام کرتا، نئے ارکان بھرتی کرتا، مختلف لاجوں کو اتحاد کی کڑی میں پروٹے اور ان کے لیے مصدقہ چارٹر حاصل کرنے کے کام میں زور شور سے حصہ لیتا۔ میسنی معبدوں کی تعمیر کے لیے روپیہ پیسہ فراہم کرتا اور خیراتی مقاصد کے لیے حاصل کردہ رقوم میں، جن کے بارے میں ارکان کی اکثریت بڑی زحمت دکھاتی اور بالکل بے قاعدگی سے چندہ دیتی تھی، اضافہ کرنے کے لیے جوہن پڑے کرتا۔ جماعت نے پیٹرز برگ میں جو محتاج گھر قائم کیا تھا، وہ تقریباً تنہا اس کے اخراجات برداشت کرتا تھا۔

دریں اثنا اس کی زندگی اسی سابقہ ڈگر پر چلتی رہی۔ اس کی فریٹنگیوں، عیاشیوں اور فرستچیوں میں کوئی کمی نہ آئی۔ اسے ڈٹ کر کھانا اور پینا پسند تھا۔ کنواروں کے حلقوں میں، جن میں وہ گھومتا پھرتا تھا، جو تفریحات میں تھیں۔ اگرچہ وہ انھیں غیر اخلاقی اور معیوب تصور کرتا تھا، تاہم وہ ان میں شریک ہوے بنا رہا بھی نہیں سکتا تھا۔ ابھی ایک سال بھی نہیں گزرا تھا کہ اپنی مصروفیت کے اس طوفان بدتمیزی کے، جن میں کچھ محسوس ہونے لگا کہ وہ جتنی زیادہ اشتیاق سے فری میسنری کی سرزمین پر، جس پر اس نے کھڑے ہونے کا فیصلہ کیا تھا، پاؤں نکالنے کی کوشش کرتا ہے، وہ اتنی ہی زیادہ اس کے پیروں تلے کھسک رہی ہے۔ اس کے ساتھ ہی اسے یہ بھی محسوس ہو رہا تھا کہ یہ زمیں جتنی زیادہ اس کے پیروں کے نیچے دھنستی جا رہی ہے وہ خود اتنا ہی زیادہ اس میں پھنستا جا رہا ہے اور باہر نکلنے کا راستہ سدود ہوتا جا رہا ہے۔ جب وہ نیا نیا برادری میں شامل ہوا تھا، اسے جس نوعیت کے احساسات کا تجربہ ہوا تھا، وہ اس شخص کے، جس نے بڑے پراعتماد انداز سے دلدل کی ہموار سطح پر پاؤں دھرا ہو، مشاہدہ تھے۔ جب اس نے ایک پاؤں رکھ دیا، دوسرے دھنسنے لگا۔ اپنے آپ کو یہ یقین دلانے کے لیے کہ نیچے زمین پختہ ہے، اس نے اپنا دوسرا پاؤں بھی دھردیا اور مزید

بچے بھنس گیا۔ جب وہ دلدل میں پوری طرح پھنس گیا، وہ اس میں گھٹنوں گھٹنوں چلنے پر مجبور ہو گیا۔
 آئی اوسپ الیکسی وچ پیٹرز برگ سے غیر حاضر تھا۔ (اس نے حال ہی میں پیٹرز برگ کی لاجوں کے امور سے اپنے آپ کو علیحدہ کر لیا تھا اور اب کبھی ماسکو سے باہر نہیں جاتا تھا۔) لاجوں کے بھی ارکان ان اشخاص پر مشتمل تھے، جن سے وچر کارڈز مرہ زندگی میں واسطہ پڑتا رہتا تھا۔ اس کے لیے انھیں محض فری میسن گردنا اور انھیں پرنس یا ایوان زاسلی وچ نہ سمجھنا دشوار تھا۔ وہ ان لوگوں کی رگ رگ سے واقف تھا اور انھیں معاشرے کے کمزور اور نکمٹوں اور تصور کرتا تھا۔ میسوں کی حیثیت سے وہ جوائیون پہنتے اور اپنے میسوں پر جوا تیزی نشانات چسپاں کرتے تھے، وہ خوب جانتا تھا کہ عام زندگی میں وہ ان کے نیچے کس قسم کی وردیاں پہنتے، عہدوں کے نشانات لگانے اور تمغے سجانے کی حسرتیں دلوں میں پالے ہوئے ہیں۔ خیراتی مقاصد کے لیے چندے، کٹھے کرنے، ورٹیس سے تیس روپے تک رقوم کا، جن کا بیشتر حصہ محض مواہید پر مشتمل ہوتا تھا (حالانکہ ان میں سے نصف ارکان اتنے ہی مرفہ الحال تھے جتنا کہ وہ خود تھا)، شمار کرنے کے بعد وہ میسوں کے اس حلقے کے، جس کے تحت ہر رکن نے یہ عہد کیا ہوتا تھا کہ وہ اپنا سارا سرمایہ اپنے پڑوسیوں کے لیے وقف کر دے گا، متعلق سوچنے لگتا اور اس کے دل میں غموں کو سر اٹھانے لگتے۔ اس کی کوشش یہی ہوتی کہ وہ اس بارے میں زیادہ نہ سوچے۔

وہ جن برادران کو جانتا تھا، اس نے انھیں چار زمروں میں تقسیم کر دیا۔ اس نے پہلے زمرے میں ان لوگوں کو رکھا جو نہ توں جوں کے اور نہ عام انسانوں کے امور میں کوئی فعال حصہ لیتے تھے۔ ان کی مصروفیات کا دائرہ جماعت کے محض علوم خفیہ تک محدود تھا۔ بہ الفاظ دیگر وہ صرف اس قسم کے مسائل، جن کا تعلق خدا کی سرچند صفات یا اس کی عناصر ثلاثہ۔ گندھک، پارہ اور نمک¹⁶۔ یا مربع کے مفہوم یا ایک سلیبائی کی مختلف اشکال کے مطالب سے تھا، لکھے رہتے تھے۔ نیز اپنے برادر میسوں کے اس طبقے کا، جو زیادہ تر بشمول خود آئی اوسپ الیکسی وچ اور دوسرے قدیم ارکان پر مشتمل تھا، حرام کرتا تھا لیکن وہ ان کی دلچسپیوں میں شریک نہیں ہوتا تھا۔ اس کے لیے فری میسنری کے باطنی پہلو میں کوئی کشش نہیں تھی۔

دوسرے زمرے میں وہ اپنا اور اپنے جیسے دیگر ارکان کا، جو جستجو اور تذبذب کے بیچ لٹکے ہوئے تھے، شمار کرتا تھا۔ انھیں ابھی تک فری میسنری میں سیدھا اور قابل فہم راستہ بھانپنے کی ضرورت نہیں رہی تھی کہ وہ عنقریب اس کا سراغ لگالیں گے۔

تیسرے زمرے میں اس نے ان برادران کو، جنھیں فری میسنری میں خارجی مظاہر اور رسوم کے علاوہ اور کچھ نظر نہیں آتا تھا (اور اکثریت انھی لوگوں کی تھی)، شامل کیا۔ انھیں بس ان رسوم کی کڑی ظاہری ادائیگی عزیز تھی، اس کی دوسرا معانی سے کوئی سروکار نہ تھا۔ دلارسکی بلکہ سپریم لاج کا گرینڈ، ستر بھی انھیں میں شامل تھا۔

آخری اور چوتھے زمرے میں ابھی اس نے برادران کی خاصی بڑی تعداد شمار کی۔ ان میں خاص طور پر وہ لوگ شامل تھے، جو حالیہ ایام میں جماعت کے ارکان بنے تھے۔ جہاں تک پیٹر مشاہدہ کر سکا تھا، یہ وہ اشخاص تھے جنھیں

نہ تو کسی چیز پر اعتقاد تھا اور نہ وہ کچھ کرنے کے آرزو مند تھے۔ یہ فری میسنوں میں محض اس لیے شامل ہوئے تھے تاکہ انھیں لاج کے دن کھاتے پیتے نو جوان ارکان کے، جو اپنے مراتب و تعلقات کی بنا پر اثر و رسوخ کے، لگ جے، ساتھ گھل مل جانے کے مواقع میسر آسکیں۔

جو کچھ میٹر کر رہا تھا، وہ اس سے غیر مطمئن ہونے لگا۔ بعض اوقات اسے محسوس ہونے لگتا کہ فری میسنری، بہر حال اس نے جو کچھ یہاں دیکھا تھا اس کے مطابق، محض فواہری پر مبنی ہے۔ یہ تو اس نے خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ وہ خود فری میسنری کو شکوک کی نگاہوں سے دیکھے گا تاہم اسے اتنا شبہ ضرور تھا کہ رومی فری میسنری غلط پٹری پر چڑھ گئی ہے اور اپنے اصل اصولوں سے انحراف کر چکی ہے۔ چنانچہ وہ سال کے اختتام پر ممالک غیر کے سفر پر روانہ ہو گیا تاکہ وہ جماعت کے، علی اسرار تک رسائی حاصل کر سکے



1809 کے تابستان میں میٹر پیئرز برگ لوٹ آیا۔ ہمارے اور غیر ملکی فری میسنوں کے، مین جو خط کتابت ہوئی، اس سے اندازہ ہوا کہ بڑا خوف متعد ایسے اشخاص کا، جو نہایت اعلیٰ درجات پر فائز تھے، اعتماد حاصل کرنے میں کامیاب رہا ہے۔ سے بہت سے اسرار و رموز سے آگاہ کر دیا گیا ہے، اعلیٰ درجے میں داخل کر دیا گیا ہے اور وہ اپنے ساتھ بہت کچھ، جو راس میں فری میسنری کے مقاصد کو آگے بڑھانے میں کافی مدد ثابت ہوگا، لا رہا ہے۔ پیئرز برگ کے مین اس سے ملنے آئے، انھوں نے اس کے دل میں گھر کرنے کی کوشش کی اور ان سب کا یہ خیال تھا کہ وہ ان کے سامنے کسی چیز کا انکشاف کرنے کے لیے پرتول رہا ہے۔

دوسرے درجے کی راج کے باضابطہ اجلاس کا اہتمام کیا گیا۔ میٹر نے وعدہ کیا کہ جماعت کے اعلیٰ ترین قائدین نے اسے جو بیغام تفویض کیا ہے، وہ اس کی تفصیلات اجلاس میں پیش کرے گا۔ اجلاس میں بھی ارکان شامل ہوئے۔ معمول کی رسوم کے بعد میٹر اٹھ کر کھڑا ہوا اور اس نے اپنا خطاب شروع کر دیا۔

”عزیز برادران،“ اس نے، اپنی تقریر کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔ وہ شرار رہا تھا اور اس کی زبان نکست کھارچا تھی۔ اس نے تقریر کا مسودہ ہاتھ میں تھام رکھا تھا۔ ”محض اتنا ہی کافی نہیں کہ ہم اپنی محض رسوم لاج کی ضرورتوں میں ادا کرتے رہیں۔ بلکہ ہمیں عملاً... عملاً کچھ کرنا چاہیے۔ ہمیں لوریوں شا کر سلا دیا گیا ہے جب کہ ہمیں عملاً کچھ کرنا چاہیے۔“ میٹر نے مسودے کے اور اتر کھولے اور انھیں پڑھنے لگا۔ ”خاص چائی کی تبلیغ اور نیکی کے لڑوغ کے لیے ہمیں انسانوں کو تعصبات سے چھٹکارا دلانا چاہیے، زمانے کے رجحانات سے ہم آہنگ اصولوں کی ترویج کرنا چاہیے، نو جوانوں کی تعلیم و تربیت کے انتظامات کرنا چاہئیں، انتہائی روشن خیال انسانوں کے ساتھ ناقابلِ تحلیل اور پائیدار رشتے استوار کرنا چاہئیں، بڑی دلیری لیکن ذہن کی کے ساتھ توہمت و زندہ والی دادر جانتوں کے خلاف صف آرا ہونا چاہیے اور وہ لوگ، جو ہمارے ہم خیال ہوں، ان کے ساتھ مل کر ایک ایسی جماعت، جسے مقصد وہ

نے ایک لڑی میں پرو دیا ہو اور جو اختیارات اور قوت سے بہرہ ور ہو، تشکیل دینا چاہیے۔

”اس مقصد کے حصول کے لیے ہمیں یہ کوشش کرنا ہوگی کہ بدی کے مقابلے میں نیکی کو تفوق حاصل ہو اور ہمیں اس سر کے لیے پورا زور لگانا ہوگا کہ دیانت دار آدمی کو ابدی اجر اسی دنیا میں مل سکے۔ لیکن ہماری ان کوششوں کی راہ میں موجود سیاسی ادارے سنگ ہائے گراں بنے ہوئے ہیں۔ پھر ان حالات میں کیا کرنا چاہیے؟ انقلابات کا خیر مقدم کریں، ہر چیز کو جس نہیں کر دیں، طاقت کا مقابلہ طاقت سے کریں؟ نہیں، بالکل نہیں۔ اس قسم کے اقدامات سے ہمیں دور کا بھی واسطہ نہیں۔ ہر پر تشدد و اصلاح زبرد تو بیخ کی سزاوار ہے کیونکہ جب تک انسان جوہیں، وہی رہتے ہیں، یہ طریق کار کسی انداز سے بھی بدی کا علاج نہیں بن سکتا۔ اس کی ضرورت اس لیے بھی نہیں ہے کہ کیونکہ حکمت تشدد کی محتاج نہیں ہے۔

”ہماری جماعت کے پورے منصوبے کی اساس یہ ہونا چاہیے کہ ہمیں باکردہ اور صالح اشخاص پیدا کرنا ہیں۔ ان تمام اشخاص کے اذہان میں یہ عقیدہ، جو انھیں ایک دوسرے کے ساتھ ایک لڑی میں منسلک کر دے گا، رائج کرنا ہوگا کہ انھیں ہر جگہ اور ہر ذریعے سے بدی و درجائت کو بیخ و بن سے اکھاڑنا ہے، لیاقت اور نیکی کی ترویج کرنا ہے، مستحق انسانوں کو خاک سے اٹھانا اور انھیں سچی بروری میں شامل کرنا ہے۔ جب یہ کام ہو جائے گا، تبھی ہماری جماعت کو اتنی قوت حاصل ہو سکے گی کہ ہم غیر محسوس طریقے سے بدی اور بد نظمی کے پرچار کوں کے ہاتھ باندھ سکیں گے اور ان پر یوں قبضہ پالیں گے کہ انھیں اس کا پتا بھی نہیں چل سکے گا۔ قصہ مختصر، جس چیز کی ضرورت ہے، وہ یہ ہے کہ ایک ایسی حکومت، جو عالمی اختیارات کی حامل ہو، تشکیل دی جائے۔ اس حکومت کا سکہ تو کل عالم پر چلے گا لیکن وہ مقامی شہری معاملات میں دخل نہیں ہوگی۔ اس کے تحت تمام مقامی حکومتیں اپنے روایتی انداز سے کام کرتی رہیں گی۔ تاہم انھیں اس امر کی قطعاً کوئی اجازت نہیں ہوگی کہ وہ ہماری جماعت کے عظیم مقصد۔ بدی پر نیکی کا غلبہ۔ کی راہ میں روڑے اٹھا سکیں۔ خود عیسائیت کا بھی یہی مقصد ہے۔ اس نے لوگوں کو داناتی اور نیکی کی تعلیم دی اور انھیں یہ سکھایا کہ ان کی بھلائی اسی میں ہے کہ وہ بہترین اور عظیم انسانوں کے نقش قدم پر چلیں اور ان کے اصولوں اور مثالوں پر عمل کریں۔

”ان زمانوں میں، جب ہر چیز ظلمت میں مستور تھی، محض چند و نصائح کافی ہوتے تھے کیونکہ چائی کی ندرت سے انوکھی قوت عطا کر دیتی تھی، لیکن موجودہ زمانے میں ہم کہیں زیادہ طاقت و ذرائع کا سہارا لینے پر مجبور ہیں۔ آج کے انسان کے اعصاب پر اس کے حواس سوار ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اسے نیکی میں ٹھوس کشش نظر آئے۔ جسمانی جذبات و خواہشات کا گلا نہیں گھونٹا جاسکتا۔ ہماری کوشش یہ ہونا چاہیے کہ ہم ان کا رخ نیک مقصد کی طرف موڑ دیں۔ چنانچہ ضرورت اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ ہر شخص کو یہ موقع ملنا چاہیے کہ وہ نیکی کی حدود کے اندر اپنے نفسانی جذبات و خواہشات کی تسکین کر سکے۔ اور ہماری جماعت کو اس مقصد کے حصول کے لیے رائج فراہم کرنا چاہیے۔

”جونہی ہمیں ہر خطے میں قبل قدم راشن ملے، جن میں ہر ایک اپنی باری پر دوسروں کی تربیت کرے گا۔ سبھی باہم یک دگر ہو کر اپنے فرائض سرانجام دیں گے، ایک خاص تعداد میں میسر آگئے، ہماری جدت کے لیے جو بنی نوع انسان کی بھلائی کی خاطر پہلے ہی خفیہ خفیہ اتنا کچھ پڑیہ تکمیل تک پہنچ چکی ہے، ہر کام ممکن ہو جائے گا۔“ اس تقریر کا نہ صرف یہ کہ حاضرین پر بردست اثر ہوا، بلکہ اس نے لاج میں ایک قسم کا ہنگامہ بھی پھا کر دیا۔ برادران کی اکثریت کو اس میں جرشی کے فرقہ عقلیہ و جمہوریہ کے خطرناک نظریات نظر آئے۔ چنانچہ ان کا رد عمل اتنا سرد و بھر نہ تھا کہ میٹر حیران و پریشان ہو گیا۔ گریڈ ماسٹر نے اعتراضات کی بوچھاڑ کر دی اور میٹر اور بھی جوش و خروش سے اپنے نظریات کی وضاحت کرنے لگا۔ اتنا ہنگامہ خیز اجلاس طویل مدت کے بعد ہوا تھا۔ لاج دونوں فرقوں میں تقسیم ہو گیا۔ ایک فریق اس پر عقیدہ و جمہوریہ فریق کا حامی ہونے کا الزام لگا رہا تھا اور دوسرا اس کی حمایت کر رہا تھا۔ میٹر کو پہلی مرتبہ اس اجلاس میں یہ شدید احساس ہو کر انہوں نے ان کے ذہان کچھ اتنی قسم میں بنے ہوئے ہیں کہ ان کا شمار ممکن نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کسی بھی دوا شخاص کو حقیقت ایک جیسی نظر نہیں آتی۔ ان ارکان نے بھی، جو بظاہر اس کے طرف دار نظر آتے تھے، اس کی باتوں کا مفہوم اپنے اپنے انداز سے لیا۔ ان کی اگر مگر کچھ اس نوعیت کی تھی کہ میٹر کے لیے ان سے متفق ہونا ممکن نہیں تھا کیونکہ اس کی سب سے بڑی خواہش یہ تھی کہ وہ اپنے خیالات کو دوسروں تک اس طرح پہنچائے جس طرح کہ وہ خود انھیں سمجھتا تھا۔

میٹر نے جس زبردست جوش و خروش سے اپنے خیالات کا اظہار کیا تھا، اس پر گریڈ ماسٹر نے اجلاس کے اختتام پر اسے سرزنش کی۔ اس نے طنز اور بغض کے تیر چلائے ہوئے کہا: ”اس نزاعی بحث میں جس جذبے نے میٹر کی رہنمائی کی ہے، وہ محض یہ نہیں کہ سے نیکی سے بڑا پیار ہے بلکہ یہ ہے کہ اسے فساد کرنے کا بہت شوق ہے۔“ میٹر نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس نے مختصر اصراف یہ دریافت کیا ”آپ حضرات کو میری نحوہ منظور ہے؟“ اسے بتایا گیا کہ ”نہیں۔“ وہ معمول کی رسی کا ردائی کا انتظار کیے بغیر لاج سے باہر نکل آیا اور اپنے گھر چلا گیا۔

8

میٹر پر پھر وہی افسردگی، جس سے وہ اتنا خائف تھا، طاری ہو گئی۔ لاج میں تقریر کرنے کے بعد وہ تین دن اپنے گھر صوفے پر لیٹا رہا۔ اس عرصے کے دوران میں اس نے نہ کسی شخص سے ملاقات کی اور نہ وہ کہیں باہر گیا۔ یہی وہ ایام تھے جب اسے اپنی بیوی کا خط ملا۔ اس نے بڑی حاجت سے اس سے یہ التجا کی تھی: ”آپ مجھے ملنے تشریف لائیں۔ میں اپنے کیے پر بہت پشیمان ہوں اور میری آرزو صرف یہ ہے کہ میں اپنی بقیہ زندگی آپ کے چہنوں میں گزار دوں۔“ خط کے اواخر میں اس نے یہ اطلاع دی تھی کہ وہ ایک دو روز میں دسارہ سے واپس پینز برگ پہنچ رہی ہے۔

اس خط کے پیچھے پیچھے ایک ایسا فری میسن، جس کا میٹر کے دل میں قطعاً کوئی احترام نہیں تھا، آدمکار

اس کی تنہائی میں نکل ہو۔ اس نے اپنی گفتگو کی تان اس کے ازدواجی معاملات پر توڑی۔ اس نے اسے پرادر نہ مشورہ دیتے ہوئے اپنی س رائے کا اظہار کیا کہ وہ نادم و پشیمان شخص کو سوائف نہ کر کے نرمی میسنری کے اولین اصولوں کی خلاف ورزی کا مرتکب ہو رہا ہے۔

اسی دوران میں اس کی خوش رامن، پرنس واسلی کی اہلیہ نے اسے ایک ملتجیانہ خط تحریر کیا۔ اس میں اس نے التماس کی تھی: ”خواہ چند منٹ کے لیے سنی آپ مجھے ملنے ضرور بالضرورت شریف ہائیں۔ مجھے آپ کے ساتھ نہایت اہم معاملے کے بارے میں بات کرنا ہے۔“ پیکر ہاڑ گیا کہ اس کے خلاف سازش ہو رہی ہے، ان لوگوں کا ارادہ اس کی بیوی کے ساتھ اس کی صلح کرانا ہے اور جس قسم کی ذہنی کیفیت میں وہ اس وقت گزر رہا تھا، اس میں یہ بات خرد اس کے اپنے لیے ناگوار نہیں تھی۔ اس کے لیے اب سب برابر تھا۔ زندگی میں کسی چیز کی کوئی خاص ہیئت نہیں رہ گئی تھی۔ جس قسم کی انسردگی نے اس پر غلبہ پالیا تھا، اس کے زیر اثر اس کے نزدیک نہ اپنی آزادی کی کوئی قدر قیمت باقی رہ گئی تھی اور نہ اپنی بیوی کو سزا دینے کی قصد۔

کوئی بھی سچا نہیں، کسی کو بھی سوز و انداز نہیں ٹھہرایا جاسکتا۔ چنانچہ اس پر کوئی الزام نہیں دھرا جاسکتا۔ اس نے سوچا۔

اگر وہ اپنی بیوی کے ساتھ فوری صبح پر آدہ نہ ہوا، تو اس کی وجہ محض یہ تھی کہ انسردگی کی جو کیفیت اس پر طاری ہو چکی تھی، اس کے دوران میں اسے یہ محسوس ہو رہا تھا کہ اس میں کسی کام کا بیڑا اٹھانے کا یا رہا نہیں۔ اگر ان ایام میں اس کی بیوی اس کے پاس آ جاتی، وہ اسے گھر سے باہر نہ نکالتا۔ وہ جس دھڑبن میں مصروف تھا، اس کے مقابلے میں کیا یہ بات توجہ کے قابل رہ جاتی ہے کہ وہ اپنی بیوی کے ساتھ رہتا ہے یا نہیں؟

اپنی بیوی یا خوش رامن کے خطوط کا جواب دیے بغیر وہ ایک روز، جب رات ڈھل چکی تھی، چپ چاپ ماسکورا نہ ہو گیا۔ اس کا مقصد آئی اوسپ الیکسی وچ سے ملاقات کرنا تھا۔ اس نے اپنے روزنامے میں جو کچھ تحریر کیا، درج ذیل ہے:

مکو ۱۲ نومبر

میں ابھی بھی اپنے محسوس سے مل کر آ رہا ہوں۔ میں نے جو کچھ وہاں محسوس کیا، اسے فی الفور سپرد قلم کر رہا ہوں۔ آئی اوسپ الیکسی وچ غربت و افلاس کی چکی میں پس رہا ہے اور گزشتہ تین برسوں سے مٹانے کے کسی معذی مرض میں مبتلا ہے۔ کسی شخص نے بھی نہ تو کبھی اسے کربتے اور نہ حرف شکایت زبان پر لانے دیکھا ہے۔ صبح سویرے سے رات گئے تک وہ مطالعے میں مستغرق رہتا ہے۔ اس دوران میں وہ سادہ غذا کھانے اور حوائج ضروریہ سے قاریغ ہونے کے عد وہ اور کچھ نہیں کرتا۔ اس نے کمال شفقت میرا خیر مقدم کیا، اور جس بستر پر دراز تھا، اس پر مجھے بٹھایا۔ میں نے اس کے سامنے مشرق اور روٹھم کے سرداروں کی علامات بنائیں اور

اس نے اسی انداز سے مجھے جواب دیا۔ اس کے چہرے پر خوشگوار تبسم تھا اور اس نے مجھ سے پوچھا کہ میں پرشیا اور سکاٹ لینڈ کی لہجوں سے کیا سمجھ کر آیا ہوں۔ اپنی بات کے مطابق مجھ سے جو کچھ من پڑا میں نے اسے بتایا اور اس کے سامنے ان اصوبوں کا بھی، جو میں نے پیئرز برگ کی لاج کے سامنے پیش کیے تھے، اعداد کیا۔ میری تجاویز کے بارے میں وہاں جو میٹنگ منعقد ہوئی وہاں تھا اور برادر اس کے ساتھ میری جو جھڑپ ہوئی تھی، میں نے اس کے متعلق بھی اسے گاہ کیا۔ آئی اوسپ کچھ دیر خاموش رہا اور سوچا ہی کرتا رہا۔ اس کے بعد اس نے ان امور کے بارے میں اپنا نقطہ نظر بیان کیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میرے چودہ طبق روشن ہو گئے۔ معاہدات مباحثی کھر کر میری نگاہوں کے سامنے آ گیا اور مجھے یہ اندازہ بھی ہو گیا کہ اب آئندہ مجھے کیا لائحہ عمل اپنانا ہوگا۔ میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب اس نے مجھ سے دریافت کیا کہ آیا مجھے جماعت کے سہ گونہ مقاصد یاد ہیں۔ 1۔ ہرز دور مزکا مطالعہ اور تحفظ۔ 2۔ اس کی پذیرائی کے لیے اپنے نفس کی اصلاح اور تزکیہ۔ 3۔ اس تزکیے کی خاطر جدوجہد کے ذریعے نئی آدم کی تہذیب و زندگی۔ پھر اس نے مجھ سے پوچھا کہ ان تینوں مقاصد میں سے اولین اور اہم ترین کون سا ہے؟ لا ریب اپنے نفس کی اصلاح اور تزکیہ۔ یہی وہ مقصد ہے جس کی خاطر ہم ہر قسم کے حالات سے، خواہ وہ کیسے ہی کیوں نہ ہوں، بے نیاز ہو کر جدوجہد کر سکتے ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی صرف یہی وہ مقصد ہے جو یہ تقاضا کرتا ہے کہ ہم اس کے حصول کے لیے پوری تہذیب سے کوشش کریں لیکن ہوتا کیا ہے یہی کہ ہمارا تکبر ہمیں صحیح راستے سے بھٹکا دیتا ہے، ہم اس مقصد کو فراموش کر دیتے ہیں اور یا تو ہرز دور مزکی، جس کی اپنی آلائشوں کے سبب، ہم پذیرائی کرنے کے اہل نہیں ہوتے، کھوج میں مصروف ہو جاتے ہیں یا پھر نئی آدم کی تہذیب و زندگی کا فریضہ اپنے ذمے لے لیتے ہیں اور یہ نہیں دیکھتے کہ ہم عملاً بدترین فسق و فجور اور خباثت کی مثالیں پیش کر رہے ہیں۔ عقلیت و جمہوریت صحیح معنوں میں خاص نظر یہ نہیں کیونکہ اس کا رجحان دنیوی معاملات کی طرف ہے اور اس کے غبارے میں تکبر کی ہوا بھری ہوئی ہے۔ میں نے جس قسم کی تقریر کی تھی اور جس طرح کی سرگرمیوں میں موثر رہا ہوں، آئی اوسپ اچھی طرح نے اسی بنیاد پر اس کی مذمت کی۔ میں نے جب اپنے نہاں خاتمہ دل میں جھانک کر دیکھا، اپنے آپ کو اس سے متفق پایا۔ میرے خانگی امور کا ذکر کرے ہوئے اس نے مجھ سے کہا ”جیسا کہ میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ مین کا سب سے بڑا فرض یہ ہے کہ وہ اپنی ذات کی تکمیل کے لیے جدوجہد کرے لیکن ہم کثرت یہ سمجھتے تھے ہیں کہ ہماری زندگی میں جو مشکلات وارد ہوتی ہیں، اگر ہم ان سب کا قلع قمع کر دیں، ہم بہت جلد اور آسانی اپنا مقصد حاصل کر لیں گے۔ اس کے برعکس، میرے محترم، اگر ہم دنیوی تفکرات کے بھنور میں گھرے رہیں، ہم اپنے تئیں بڑے مقاصد حاصل کر سکتے ہیں۔ 1۔ شعور و ذات۔ آدمی اپنا دوسروں سے مقابلہ کرنے کے بعد ہی اپنی ذات سے آگہی حاصل کر سکتا ہے۔ 2۔ تکمیل ذات: اس کا حصول صرف کشمکش اور جدوجہد سے ہی ممکن ہے۔ 3۔ حسن تعلیم۔ 4۔ موت۔ زندگی کے محض عیش و فراہ

ہے ہی ہمیں یہ سبق ملتا ہے کہ زندگی بچا ہے، موت سے ہمارا لگاؤ فطری اور خلقی ہے اور موت کے بعد ہم پھر سے جنم لیں گے اور نئی زندگی بسر کریں گے۔" یہ الفاظ اس لیے بھی غیر معمولی تھے کیونکہ اپنی تمام جسمانی تکالیف اور عوارض کے باوجود آئی اوسپ الیکسی وچ کبھی بھی زندگی سے بیزار نہیں ہوا حالانکہ وہ موت سے پیار کرتا ہے اور جس کے لیے۔ اپنی تمام تر روحانی بامیدگی اور پاکیزگی کے باوجود۔ وہ اپنے آپ کو کافی حد تک تیار نہیں پاتا۔ اس کے بعد میرے محسن نے تخلیق کے مربع عظیم کی پوری اہمیت اجاگر کی، اور مجھے بتایا کہ تین اور سات کے اعداد ہر چیز کی اساس ہیں۔ اس نے مجھے مشورہ دیا کہ میں پیٹرز برگ کے برادران سے قطع عداوت نہ کروں۔ "لاج کے درجہ دوم کے جو فراغتم پر عائد ہوتے ہیں،" اس نے کہا، "انھیں نبھاتے چلے جاؤ اور اس کے ساتھ ساتھ یہ کوشش کرتے رہو کہ برادران تکبر کی راہ اختیار نہ کرنے پائیں بلکہ انھیں تعمیل ذات اور شعور ذات کا صحیح راستہ دکھاتے رہو۔ علاوہ ازیں جہاں تک تمھاری اپنی ذات کا تعلق ہے، میرا مشورہ یہ ہے کہ تمھیں سب سے بڑھ کر اپنی ذات کی نگرانی کرنا چاہیے۔" اس نے مجھے ایک نوٹ بک دی۔ میں اسی پر یہ سب کچھ تحریر کر رہا ہوں اور آئندہ بھی اپنے تمام اعمال و افعال کا اندراج اس میں کرتا رہوں گا۔

پیٹرز برگ 23 نومبر

میں ایک بار پھر اپنی البیہ کے ساتھ رہ رہا ہوں۔ میری خوش دامن پہ چشم نم میرے پاس آئی اور کہنے لگی کہ ہمیں وپس آگئی ہے۔ اس نے مجھ سے التجا کی کہ "کم از کم اس کی بات تو سن لو۔ وہ بے قصور ہے اور اس بات پر بہت دکھی ہے کہ میں نے اس سے عیحدگی اختیار کر لی ہے۔" اس نے اس کے علاوہ اور بھی بہت کچھ کہا۔ میں جانتا تھا کہ اگر ایک مرتبہ میں نے اس سے ملاقات کرنے پر آمادگی کا اظہار کر دیا، پھر میرے پاس اس کی خواہشات پر عمل کرنے کے سوا اور کوئی چارہ کار نہیں رہ جائے گا۔ میں جس ننھے میں پھنس چکا تھا، کچھ میں نہیں آتا تھا کہ اس سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے کس کو آواز دوں، کس سے مشورہ کروں اور کس سے استمداد طلب کروں۔ اگر میرا محسن یہاں ہوتا، وہ مجھے بتاتا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ میں کمرے میں بدبو کر بیٹھ گیا، آئی اوسپ کے تمام خطوط کا از سر نو مطالعہ کیا، اس کے ساتھ میرے جتنے مکالمے ہوئے تھے، ان سب کو یاد کیا اور یہ سب کچھ کرنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ مجھے مستعدی کو ٹھکرانا نہیں چاہیے اور مجھے ہر شخص کی۔ خاص طور پر ایک ایسی ہستی کی، جس کی میرے ساتھ اتنی قربت تھی۔ دست گیری کرنا چاہیے اور اپنی صلیب آپ اٹھانا چاہیے۔ لیکن اگر میں اسے محض اس بنا پر معافی کر رہا ہوں کہ میں رات کی رات پر چل چاہتا ہوں، پھر اس کے ساتھ میرا سمبندھ محض روحانی ہونا چاہیے۔ یہی میرا فیصلہ تھا اور یہی کچھ میں نے آئی اوسپ الیکسی وچ کو تحریر کیا۔ میں نے اپنی بیوی سے کہا: "میں تم سے التماس کرتا ہوں کہ ماضی کو بھول جاؤ۔ اگر میں نے تمھارے ساتھ کوئی زیادتی کی ہے، تو مجھے معاف کر دو۔ جہاں تک میرا

تعلق ہے، کوئی ایسی بات نہیں ہے جس کے لیے میں تمہیں معاف کروں۔“ جب میں یہ سب کچھ اس سے کہہ چکا، مجھے بہت خوشی ہوئی۔ خدا کرے کہ اسے یہ کبھی معلوم نہ ہو کہ اس کی دوبارہ شکل دیکھنا میرے لیے کتنا اذیت ناک تھا۔ میں اس وسیع و عریض محل کی بالائی منزل پر متمکن ہو گیا ہوں اور اسی لئے لو کے خوشگوار تجربے سے لطف اندوز ہو رہا ہوں۔

9

جیسا کہ ہمیشہ سے ہوتا چلا آیا ہے، اس زمانے میں بھی معاشرے کا اعلیٰ ترین طبقہ، جو دربار اور اجتماعی رقص کی تقریبات میں، پس میں میل ملاقات کرتا رہتا تھا، مختلف حلقوں میں منقسم تھا اور ہر حلقے کا اپنا مخصوص ہیجہ تھا۔ ان میں سب سے بڑا۔ جس کے کاؤنٹ رومانت سیف¹⁹ اور مارکوئیس ڈکولین کو خروچ روں تھے۔ متصف بہ فرنیسی حلقہ تھا۔ یہ حلقہ نیولین کے ساتھ اتحاد کا حامی تھا۔ جوئی ہیلین نے پیئرز برگ میں اپنے خاندان کے محل میں دوبارہ پاؤں ج لیے، اسے اس حلقے میں نمایاں مقام حاصل ہو گیا۔ وہ لوگ جو سیاسی اعتبار سے اس حلقے کے نقطہ نظر کے حامی تھے اور اپنی دانش و فراست اور تہذیب و شائستگی کے سبب نمایاں حیثیت کے حامل تھے، جوق درجوق اور بکثرت اس کے ڈرائنگ روم میں آنے جانے لگے۔ فرانسیسی سفارت خانے کے ارکان بھی ان میں شامل تھے۔ جن ایام میں رفورٹ²¹ کے مقام پر دونوں پیراطوروں کی مشہور ملاقات ہوئی تھی، ہیلین وہیں موجود تھی۔ وہیں اس نے اس زمانے کی اہم ترین یورپی شخصیات سے، جو نیولین کی حامی تھیں، یہ روابط استوار کیے تھے۔ رفورٹ میں اسے ایک زبردست کامیابی نصیب ہوئی تھی۔ ایک دفعہ تھیسٹر میں خود نیولین کی نظر اس پر پڑ گئی۔ اس نے دریافت کیا کہ یہ خاتون کون ہے اور وہ اس کے حسن و جمال کے قہیدے پڑھنے لگا۔ حسین و جمیل اور مستحق شائستہ خاتون کی حیثیت سے وہ جس طرح محافل پر چھا جاتی رہی، پیئرز کو اس پر مطلق تعجب نہ ہوا، کیونکہ جوں جوں وقت آگے بڑھ رہا تھا توں توں اس کے حسن میں نکھار آتا جا رہا تھا۔ لیکن جس چیز نے اسے واقعی حیرت میں مبتلا کیا، وہ یہ تھی کہ ان گزشتہ دو برسوں کے دوران میں اس کی شریک حیات یہ شہرت کم کرنے میں کامیاب و کامران رہی تھی۔ ”یہ پرکشش خاتون جتنی خوبصورت ہے، اتنی ہی بدلتی رہی ہے۔“ نامور پرنس دینے²² اسے آٹھ آٹھ صفات کے خطوط لکھا کرتا تھا۔ ہیلین نے اپنے جو خطرناک جملے سینت سینت کر رکھے ہوئے تھے، اب وہ انہیں پہلی مرتبہ کاؤنٹس بردخو کی موجودگی میں استعمال کر رہا تھا۔ جس شخص کو کاؤنٹس بردخو کی محفل میں اذیت باریابی مل جاتا، اس کی دانش و فراست پر مہر ثبت ہو جاتی۔ نوجوان شخص ہیلین کی محافل میں شریک ہونے سے قبل کتب کاؤنٹس مطالعہ کرتے تاکہ وہ اس کے ڈرائنگ روم میں کچھ کہہ سکیں۔ سفارت خانوں کے سیکرٹری، بلکہ خود سفیران کرام بھی، اسے سفارتی رازوں میں اپنا محرم بناتے تھے۔ یوں ایک اعتبار سے ہیلین اچھی خاصی قوت بن گئی تھی۔

پیئرز بھی کبھی کبھار اس کی محفلوں اور عشائیوں میں، جہاں سیاست، شاعری اور فلسفے پر بحث و تمحیص ہوتی تھی شرکت

مگر کرتا تھا۔ یہ جانتے ہوئے کہ وہ نہایت احمق عورت ہے، وہ جب اس کی گفتگو سنتا، اسے عجیب و غریب احساسات کا تجربہ ہونے لگتا۔ ایک طرف اسے حیرت و استعجاب گھیر لیتا، دوسری طرف وہ پریشانی میں مبتلا ہو جاتا۔ اس کی حالت اس شہدہ بزرگی ہو جاتی جسے ہر لمحہ یہ اندیشہ دامن گیر رہتا ہے کہ کسی آن بھی اس کا بھٹا پھوٹ سکتا ہے۔ لیکن اس قسم کی محافل آراستہ کرنے کے لیے آیا اسی نوع کی صداقت کی ضرورت تھی، یا اس لوگوں کو، جو فریب کھاتے تھے، اس فریب کاری میں فی نفسہ مزہ آتا تھا، بہر حال یہ وہ راز تھا جو کبھی طشت از باہم نہیں ہوا اور ہمیں واسیج نابزد خوانے دلکش اور بڑے سچ خاتون کی حیثیت سے جو شہرت حاصل کی تھی، وہ اتنی مستحکم ہو گئی کہ اگر وہ غرور اور بے خوف ہو کر تنہائی پیش پا افتادہ، کھنسی پٹی اور احمقانہ بات بھی کہہ دیتی، تب بھی حاضرین اس کے ایک ایک لفظ پر اجد میں آنے لگتے، اس پر دو دو تھمسن کے ڈنگرے برسانا شروع کر دیتے اور اس کی گفتگو میں ایسے ایسے قہقہے اور در دریں مفاہیم جو خود بھی اس کے دہم و گمن میں بھی نہیں آ سکتے تھے، تلاش کرنے لگتے۔

ویٹرین میں اسی طرح کا شوہر تھا جس کی اس "شیخ محفل" کو ضرورت تھی۔ وہ غیر حاضری میں، جھپٹی اور بڑے نوب صاحب "قسم کا خاوند تھا جو کسی کے رنگ میں بھنگ نہیں ڈالتا تھا۔ ڈرائنگ روم کی لطیف و مطرغ لفظ کو مکدر کرنا تو درہیکہ، ات ہے۔ وہ الٹا اپنی موجودگی سے ایسا تضاد پیش کر دیتا کہ اس کی شریک حیات کی شائستگی اور موقع شناسی کی آب و تاب میں اور بھی اضافہ ہو جاتا۔ گزشتہ دو برسوں کے دوران میں ویٹر سلسل جس نوعیت کی مجرورہ لکچرپول میں مستغرق رہا تھا اور باقی تمام اشیاء کو وہ جس کچی حقارت سے دیکھتا رہا تھا، اس نے سے اپنی بیوی کے ملتے میں، جو اس کے لیے قطعاً کسی قسم کی دلچسپی کا باعث نہیں تھا، بے نیازی اور لائق کا وہ رویہ اپنانے اور سب لوگوں کے ساتھ یکساں مروت برتنے کا کچھ ایسا اسلوب اختیار کرنے میں مدد دی جس کا مصنوعی طریقوں سے حصول ممکن نہیں اور یوں وہ دوسروں کو مجبور کر دیتا ہے کہ وہ اس کے ساتھ احترام کے ساتھ پیش آئیں۔ وہ اپنی اہلیہ کے ڈرائنگ روم میں یوں داخل ہوتا جیسے وہ ڈرائنگ روم نہ ہو، کوئی تھیمٹر ہو۔ وہ ہر ایک سے تعارف حاصل کرتا تھا، ہر ایک کے ساتھ یکساں کشادہ پیشانی سے پیش آتا تھا، تاہم وہ ہر ایک سے یکساں بے نیازی برتا تھا۔ کبھی کبھی وہ اس کی گفتگو میں، جس میں اسے دلچسپی ہوتی، شریک بھی ہو جاتا اور اس بات سے قطع نظر کہ سفارت خانے کا کوئی "بڑا صاحب" آیا ہے یا نہیں، وہ چپا چپا کر اپنی رائے کا، جو کسی لحاظ سے بھی ہمیشہ مردہ خیالات سے لگا نہیں کھاتی تھی، اظہار کرتا لیکن ادنیٰ طبقہ "پیئرز برگ" کی ممتاز ترین خاتون کے جھپٹی شوہر سے ستا مانوس ہو چکا تھا کہ کوئی شخص بھی اس کی عجیب و غریب اور اذکی حرکات پر سمجیدگی سے توجہ نہیں دیتا تھا۔

ہیلین کی ان فورٹ سے واپسی کے بعد اس کے ڈرائنگ روم میں جو بے شمار نو جوان روز نہ آتے تھے، ان میں بزرگ اور غنیسکوئے، جو بے تک اپنی ملازمت میں زبردست کامیابیاں حاصل کر چکا تھا بزد خوف گھرانے کا بے تکلف زیر دست تھا۔ ہیلین اسے mon page (مائی پیج) کہہ کر پکارتی تھی اور اس کے ساتھ یوں برتاؤ کرتی تھی جیسے وہ کوئی بچہ ہو۔ وہ اس پر جس قسم کی مسکراہٹ بچھا دیتی تھی، وہ بالکل ویسی ہی ہوتی تھی جس سے وہ دوسروں

کو نوازتی تھی لیکن بعض اوقات میٹر جب یہ (مسکراہٹ) دیکھتا، اس کی طبیعت منتفض ہو جاتی۔ بورس میٹر کے ساتھ خاص طور پر متین ور پر وقار تعظیم و تکریم سے پیش آتا تھا۔ تعظیم و تکریم کا یہ رنگ بھی میٹر کے لیے پریشانی کا سبب بن جاتا تھا۔ تین سال قبل اس کی شریک حیات نے سے جو کچھ کے گائے تھے، اس نے ان کی کھکاتی شدت سے محسوس کی تھی، کہ اب بھی اس کی یہ ہر ممکن کوشش ہوتی تھی کہ اس کی کسی طرح بھی تذلیل نہ ہونے پائے۔ اس منحصر کے حصول کے لیے اس نے یہ طریقہ اختیار کیا: اول حقوق زنا شوی سے دست برداری اختیار کر لی۔ دوم: اپنے دل میں کسی قسم کا شک پیدا نہ ہونے دیا۔

”اب جب کہ وہ علم و ادب کا اڑعا کرنے لگی ہے، وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اپنی تمام سہولتیں سے دست بردار ہو گئی ہے۔“ اس نے اپنے آپ کو سمجھایا۔ ”ڈھونڈے سے ایک بھی ایسی مثال نہیں ملے گی کہ وہ عورت جسے علم و ادب میں درک کا دعویٰ ہو، وہ دل کے معاملات سے بھی متاثر ہوتی ہو۔“ اس نے یہ قول کہیں پڑھ دیا تھا اور وہ اس کی صداقت پر آنکھیں بند کر کے ایمان لائے ہوئے تھا اگرچہ اس نے رمان سے اس کا کبھی اظہار نہیں کیا تھا۔ لیکن یہ بات کتنی عجیب تھی کہ اپنی بیوی کے ڈرنک روم میں بورس کی موجودگی (اور وہ تقریباً ہر وقت وہاں موجود ہوتا تھا) میٹر پر جسمانی طور پر اثر انداز ہوتی تھی۔ اس کے اعضاء میں کھنچاؤ پیدا ہونے لگتا، وہ بے طرح جھینپنے لگتا اور اسے یوں محسوس ہونے لگتا جیسے اس سے اس کی حرکات و سکنات کی آزادی چھین گئی ہو۔

”اتنی نفرت، اتنی کراہت، عجیب بات ہے!“ میٹر نے سوچا، ”حالانکہ ایک وقت وہ بھی تھا جب یہ شخص مجھے حقیقتاً اچھا لگتا تھا۔“

دنیا کی نگاہوں میں میٹر بہت بڑا ثوب، ایک نامی گرامی خاتون کا قدرے کورچشم اور مشککہ خیز شوہر اور چالاک فطری شخص تھا جو کرتا اور تا کچھ نہیں تھا لیکن کسی کو اس کے ہاتھ کوئی گزند نہیں پہنچتا تھا۔ وہ بہت نفس اور خوش خلق انسان تھا۔ لیکن اس تمام عرصے کے دوران میں میٹر کی روح نشوونما کے پیچیدہ اور مشقت طلب عمل میں سے گزر رہی تھی۔ اس کے سامنے بے شمار چیزیں منکشف ہو رہی تھیں اور وہ ان گنت روحانی شکوک اور مسرتوں سے آشنا ہو رہا تھا۔

10

وہ مسلسل روزنامہ تحریر کرتا رہا۔ وہ جو کچھ سپرد قلم کر رہا تھا، اس کے چند اقتباسات درج ذیل ہیں:

24 نومبر:

صبح آٹھ بجے بیدار ہوا۔ انجیل مقدس کا مطالعہ کیا اور پھر دفتر چلا گیا (اپنے محسن کے مشورے پر میٹر نے ملازمت اختیار کر لی تھی اور اب وہ ایک سرکاری کمپنی کا ممبر تھا)، گھر واپس آیا اور اکیلے کھانا کھایا (کاؤنٹس کے اعداد و اہمال، جن کی مجھے قطعاً کوئی پردا نہیں آتے ہوئے ہیں)۔ خور و نوش دونوں میں اعتدال برتا۔

کھانے سے فرغت پانے کے بعد برادران کے لیے چند عبارت کی نقوش تیار کیں۔ سہ پہر ڈرائنگ روم میں بلا گیا اور سب کے بارے میں سٹھک قصہ سنایا۔ صرف اس وقت جب تمام اشخاص نکھلا کر بیٹھے گئے، مجھے احساس ہوا کہ مجھے یہ واقعہ نہیں سنانا چاہیے تھا۔

میں سرور و مطمئن ذہن کے ساتھ بستر پر دراز ہونے جا رہا ہوں۔ بزرگ و برتر خداوند، مجھے سرِ خط مستقیم پر چلنے کی توفیق عطا فرما۔ 1۔ مجھے سکون و اطمینان بخش تاکہ میں غصے پر قابو پا سکوں۔ 2۔ اعتراضاتِ نفس دے اور میرے قلب میں وہ کراہت بھرے کہ میں شہوانی خواہشات کو زیر کر سکوں۔ 3۔ مجھے اتنی ہمت دے کہ (الف) ملک کی خدمت (ب) خانگی امور (ج) دوستوں سے تعلقات اور (د) اپنے معاملات کے، نظام و احرام کے سلسلے میں میرے جو فرائض بنتے ہیں ان سے جی چرائے بغیر دنیا داری سے گریز کر سکوں۔

27 نومبر:

دیر سے جاگا کسل مندی کا، تنازعہ تھا کہ آنکھیں کھلنے کے بعد بھی خاصا وقت بستر پر لیٹا رہا۔ خداوند، میری دست گیری فرما، اور مجھے اتنی شگفتی عطا کر کہ میں تیرے متعین کردہ راستے پر چل سکوں۔ انجیل مقدس کا مطالعہ کیا لیکن دل پر وہ اثر، جو ہونا چاہیے تھا، نہ ہوا۔ برادرار و سوف آیا اور ہم دونوں دنیائے دلوں کی لغویات کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔ اس نے مجھے ذرا کے نئے منصوبوں سے آگاہ کیا۔ میں ان کو اپنی نکتہ چینی کا نشانہ بنانا چاہتا تھا کہ مجھے اپنے اصول اور اپنے محسن کے الفاظ یاد آجائے۔ کہ سچ فری مین کو، جب مملکت کو اس کی خدمات کی ضرورت پیش آئے، بڑھ چڑھ کر کام کرنا چاہیے اور جب اس کی خدمات طلب نہ کی جائیں، اسے حادِ ث کا مشاہدہ کرتے رہنا چاہیے لیکن اپنی زبان بند رکھنا چاہیے۔ میری زبان ہی میری دشمن ہے۔ برادران گاف، دوڈ اور الف مجھ سے ملنے آئے۔ ہم نے ایک نئے برادر کو جو عمت میں شامل کرنے کے بارے میں ابتدائی گفتگو کی۔ انھوں نے معلم کے فرائض مجھے سپرد کر دیے۔ مجھے محسوس ہوا کہ میں کمزور اور بودا آدمی ہوں اور جو ذمہ داری مجھے عہدہ نبض کی گئی ہے، اسے نبھانے کا اہل نہیں۔ پھر ہماری گفتگو پورکل کے سات ستونوں اور قدیموں کی تشریح و تعبیر کے بارے میں ہوئے گی۔ کیا ان سات ستونوں اور قدیموں کا مطلب سات علوم، سات نیکیاں، سات بدیاں اور روح مقدس کے سات عطیات ہیں؟ برادر الف نے فصاحت و بلاغت کے دریا بہا دیے۔ شام کو نئے رکن کے داخلے کی رسوم سرانجام پائیں۔ لالچ کی جو زسرو توئیں و راکش کی گئی ہے، اس نے کارروائی کو چار چاند لگانے میں اہم کردار ادا کیا۔ یاد کن بورس در دیش کوئے بنا تھا۔ اس کا نام میں نے تجویز کیا تھا اور معلم کے فرائض بھی میں نے ہی سرانجام دیے۔ میں جتنا عرصہ، اندھیرے کمرے میں تھا اس کے ساتھ رہا، عجیب و غریب احساس مجھے پریشان کرتا رہا۔ مجھے احساس ہوا کہ میرے دل میں اس کے خد ف نفرت کا جذبہ پل رہا ہے۔ میں نے اس جذبے کو زیر کرنے کی کوشش کی

لیکن بے سود۔ بالکل یہی وجہ تھی کہ میں پورے خصوص کے ساتھ اسے ہڈی سے پچانے، اور اسے صحیح راستے پر ڈالنے کا آررہ مند تھا لیکن میرے اپنے قلب و دماغ میں جو خیالات بد سراٹھ رہے تھے، میں ان سے چھٹکارا حاصل کرنے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ مجھے کچھ یوں محسوس ہوا تھا کہ اس کے مانج میں داخل ہونے کا مقصد صرف ارکان کے ساتھ گہرے تعلقات استوار کرنا اور ان کی خوشنودی حاصل کرنا ہے۔ اس نے بار بار مجھ سے دریافت کیا تھا کہ آیا میں اور اس کے ارکان ہیں؟ (یہ ایک ایسا سوال تھا جس کا میں جواب نہیں دے سکتا تھا)۔ دوسرے جہاں تک میرا مشاہدہ کام کرتا ہے، میں یہ سمجھتا ہوں کہ اس میں جتنی صلاحیت نہیں کہ وہ ہماری جماعت کا احترام کر سکے۔ وہ جس طرح اپنی اوجیز بن میں مصروف رہتا ہے اور جس طرح آدی کے محض ظواہر میں دلچسپی لیتا ہے اور ان سے جس طرح مطمئن ہو جاتا ہے، اس سے یہ عندیہ ملتا ہے کہ اسے روحانی، لیدرگی کی کوئی خواہش نہیں۔ یہ وہ باتیں ہیں جن کی وجہ سے مجھے اس کے بارے میں شک ہونے لگتا تھا تاہم ان کے ماسوا میرے پاس غصے کی کوئی نیا دوسو جو نہیں تھی۔ لیکن وہ مجھے رویہ کار نظر آیا۔ میں جتنا عرصہ تار بیک کرے میں تھا اس کے پاس کھڑا ہوا، ہر دم مجھے یہی محسوس ہوتا رہا کہ جو شمشیر میں نے تھام رکھی ہے، وہ اس کے سینے میں اتار دوں۔ میں نہ تو اپنا مدعا آسانی سے بیان کر سکا اور نہ گریڈ ماسٹر اور برادران کے سامنے لگی لپٹی رکھے بغیر اپنے شکوک کا اظہار کر سکا۔ میری دعا ہے کہ عظیم معمار فطرت مجھے اتنی توفیق دے کہ میں کذب و انفر کی بھول بھلیوں میں صحیح راستہ تلاش کر سکوں۔

روزنامے کے اگلے تین صفحات خالی چھوڑ دیے گئے تھے۔ ان کے بعد مندرجہ ذیل عبارت تحریر تھی:

برادر واؤ کے ساتھ طویل اور سبق آموز گفتگو ہوئی۔ اس نے مجھے مشورہ دیا کہ میں برادر الف کا ساتھ نہ چھوڑوں۔ اگرچہ میں اس قابل تو نہیں، مگر بھی میرے سامنے بہت کچھ سکشف کیا گیا۔ اس عالم کے خالق کا نام آرونائی اور سب کے، لک کا نام الویم²⁴ ہے۔ تیسرا نام ربان ادا کرنے سے قاصر ہے، تاہم اس کا مطلب ہمہ ہے۔ برادر واؤ کے ساتھ باتیں کر کے میری ہمت بڑھتی ہے، روح میں تازگی کا احساس ہونے لگتا ہے اور نیکی کے راستے پر چلنے کے لیے حمایت حاصل ہوتی ہے۔ مادی علوم کی ناقص اور تشویش تعلیمات اور ہمہ رے مقدس دور ہمہ گیر نظریے کے مابین جو فرق ہے، وہ مجھ پر روز روشن کی طرح عیاں ہو جاتا ہے۔ انسانی علوم ہر چیز کی چیرپا ذکر دیتے ہیں تاکہ اس کی تفہیم ہو سکے، ہر شے کو موت کے گھاٹ اتار دیتے ہیں تاکہ اسے جانچا اور پرکھا جاسکے۔ ہماری جماعت کی مقدس تعلیم میں سب کچھ واحد ہے، سب کچھ اس زندگی میں ہی اور لکی طور پر جانا جاتا ہے۔ تثلیث۔ مادے کے تین عناصر۔ گندھک، پارا اور نمک ہیں۔ گندھک میں تیل اور آگ کی خصوصیات ہیں۔ جب اس میں نمک کی آمیزش ہوتی ہے، اس کی

متکثر خصوصیت اس میں وہ تڑپ، جس کے ذریعے یہ پارے کو اپنی طرف راغب کر لیتی ہے، پیدا کر دیتی ہے۔ جب پارا غائب ہو جاتا ہے، یہ اسے دیوچ مکتی اور اپنی گرفت میں لے لیتی ہے۔ اور یوں جب دونوں کا آپس میں میل ہوتا ہے، تب دوسرے عناصر وجود میں آتے ہیں۔

3 دہر

دیر سے جاگ۔ نچل مقدس کا سطر کیا لیکن دل پر کوئی اثر نہ ہوا۔ اس کے بعد اٹھ اور بڑے کمرے میں چلا گیا۔ وہاں کچھ دیر چکر کا شمار۔ فکر و استغراق میں محو ہوئے کی سعی کی لیکن اس کے بجائے میرے تخیل میں ایک ایسا واقعہ، جو چار سو قبل پیش آیا تھا، گھومنے لگا۔ ہوا یوں کہ ہماری ڈرائیو کے بعد ایک روز ماسکو میں میری دونوں طرف سے بڑھ بھینز ہو گئی۔ اس نے کہا، ”مجھے امید ہے کہ اپنی بیوی کی عدم موجودگی کے باوجود تم کامل ذہنی سکون و اطمینان سے رہ رہے ہو گے۔“ اس وقت میں نے اسے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ لیکن اب مجھے اس ملاقات کی ایک ایک تفصیل یاد آگئی اور میں نے اس سے یوں انتقام لیا کہ دل ہی دل میں اسے خوب ملاحیاں سنائیں اور بڑھے چہیتے جواب دیے۔ تاہم میں نے اپنے آپ کو سنبھال اور صرف اسی وقت ان خیالات کو اپنے ذہن سے نکالنے میں کامیاب ہو جب مجھے یہ اندازہ ہوا کہ میں غصے سے پاگل ہو جا رہا ہوں۔ اس کے باوجود میں پوری طرح پشیمان نہ ہو۔ بعد ازاں یورپ در دہلیس کوئے آ گیا اور اپنے مختلف کارنامے بیان کرنے لگا۔ اس کی آمد مجھے ابتدا میں ہی بہت بری لگی تھی اور میں نے چند زبردستی کلمات کہہ دیے۔ اس نے ترکی یہ ترکی جواب دیا۔ میں آگ بگوما ہو گیا، اسے سخت مست کہا اور بہت سی ایسی باتیں کہہ دیں، جو ناگواری نہیں ناشائستہ بھی تھیں۔ وہ چپ ہو گیا اور میں بھی صرف تب جب معاملہ ہاتھ سے نکل چکا تھا اپنے آپ پر قابو پاسکا۔ خداوند! میں اس شخص کے ساتھ ہرگز ہرگز نباہ نہیں کر سکتا! یہ میری اٹائیت ہے جو مجھ سے اس قسم کی حرکات سرزد کرتی ہے اور میرے ذہن میں اس طرح کے خیانات ڈالتی ہے۔ میں اپنے آپ کو اس سے بہتر گردننے لگتا ہوں لیکن ہوتا یہ ہے کہ میں اس سے کہیں فروتر بن جاتا ہوں کیونکہ وہ ہر شے کے لیے سے درگزر کرتا ہے جب کہ اس کے برعکس میں اپنے دل میں اس کے خلاف نفرت کے جذبات پالتا رہتا ہوں۔ خداوند! مجھے اتنی توفیق دے کہ میں اس کی موجودگی میں اپنی خباثت دیکھ سکوں اور اس کے ساتھ ایسا برتاؤ کر سکوں جس سے اسے بھی کچھ نفع حاصل ہو سکے۔ دوپہر کے کھانے کے بعد میں نے ٹیبلٹس کا قصد کیا اور پھر اس وقت جب میری آنکھیں نیند سے بوجھل ہو رہی تھیں، مجھے واضح طور پر اپنے انیم کا نام میں آوار سنائی دی، ”یہ ان تیر ہے۔“

میں نے خواب میں دیکھا کہ میں اندھیرے میں چل رہا ہوں اور اچانک کتوں نے میرے گرد گھیرا ڈال لیا لیکن میں ڈر رہا کہ چلتا رہا۔ ناگاہ ایک قدرے پست قامت کتے نے میری پائیں لالچ اپنے دانتوں میں

دو بج لی۔ وہ اسے چھوڑ نہیں رہا تھا۔ میں نے کتے پر تھپا ڈالا اور اس کا گلہ گھونٹنے لگا۔ ابھی میں نے ہشکل اس سے پنڈ چھڑایا تھا کہ ایک دوسرا کتا، جو پیسے سے بڑا تھا، مجھے کاٹنے لگا۔ میں نے اسے اوپر اٹھانا چاہا، لیکن میں جتن اسے اوپر اٹھاتا تھا، یہ اتنا ہی وزن دار ہوتا جاتا تھا۔ چنانچہ برادر الف اور آگیا۔ اس نے مجھے بازو سے پکڑا اور ایک عمارت کی طرف بے چلا۔ اس عمارت میں داخل ہونے کے لیے ہمیں ایک تنگ شہنیر پر سے گزرنا تھا۔ میں لپک کر شہنیر پر چڑھ گیا لیکن میرے بوجھ تلے یہ خم کھ گیا اور میرے پیچے سے کھسک گیا۔ میں چوبی جنگلے پر، جس تک میرا ہاتھ بہت مشکلوں سے پہنچ سکا، چڑھنے کی کوشش کرنے لگا۔ بڑا زور لگانے کے بعد میں کسٹا گھسنا تا اس کے اوپر پہنچی لیکن ہوا یہ کہ میری ٹانگیں اس کے ایک جانب اور بقیہ جسم دوسری طرف جھو لئے لگا۔ میں نے مز کرنا بھیجی جانب دیکھا۔ مجھے برادر الف چوبی جنگلے پر کمر، نظر آیا۔ وہ ہاتھ سے ایک کشادہ سڑک، جس کے دونوں اطراف درخت تھے، اور ایک گلستان کی جانب اشارہ کر رہا تھا۔ اس گلستان کے بیچ ایک وسیع و عریض اور دیدہ زیب عمارت کھڑی تھی۔ میری آنکھ کھل گئی۔ اے خداوند اے عظیم سماء و فطرت امیری و شہسری فرما کہ میں ان کتوں۔ خواہشات ہوا ہوں۔ سے بیچ چڑھا سکوں اور میری مدد فرما کہ میں تنگی کے اس پہل میں، جس کی بشارت مجھے خواب میں ملی تھی، داخل ہو سکوں۔

7 نومبر:

میں نے خواب میں دیکھا کہ آئی، دسپ الہیسی وچ میرے گھر میں بیٹھا ہوا ہے۔ میں خوشی سے دیوانہ ہوا جا رہا تھا۔ میرا جی چاہ رہا تھا کہ میں اس کی خوب خاطر مدارت کروں لیکن مجھے محسوس ہو کہ میں تو نیم دوسروں کے ساتھ خوش گیسوں میں مصروف ہوں۔ ایسا ایک یہ خیال کوندے کی طرح میرے ذہن میں پکا کر اسے بہ بات پسند نہیں آئے گی۔ میں اس کے قریب جانا اور اس کے ساتھ معاہدہ کرنا چاہتا تھا لیکن جونہی میں اس کے قریب پہنچا، میں نے دیکھا کہ اس کا چہرہ منقلب ہو چکا ہے۔ یہ چہرہ تروتازہ اور نوجوان تھا۔ وہ مجھے ہماری جماعت کی تعینات کے بارے میں کچھ بتا رہا تھا لیکن اس کی آواز اتنی دھیمی تھی کہ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ پھر یوں لگا کہ ہم سب کمرے سے باہر نکل گئے ہیں اور کوئی انہونی بات تو ہاں پنڈ پر ہو گئی ہے۔ ہم سب فرش پر بیٹھے یا لیٹے ہوئے تھے۔ وہ مجھے کچھ بتا رہا تھا۔ میں اسے یہ جاننے کی فکر میں تھا کہ میں اس کی باتوں سے کتنا متاثر ہو ہوں لیکن میرا حال یہ تھا کہ میں اس کی گفتگو پر کوئی توجہ نہیں دے رہا تھا۔ میں اپنے تصورات میں اپنے اندر کے آدمی کی حالت کا نقشہ باندھنے اور یہ سوچنے لگا کہ خداوند کا فضل میرے شامل حال ہے اور وہ میرے گناہوں کی آرائشیں صاف کر دے گا۔ میری آنکھیں، شک آلود ہو گئیں اور مجھے خوشی اس بات پر ہوئی کہ اس نے یہ سب کچھ دیکھ لیا تھا۔ اس نے مجھ پر حازانہ نگاہ، جس میں جھٹا ہٹ تھی، ڈالی اور وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ مجھ سے جو گفتگو کر رہا تھا، اس نے اس کا سلسلہ

منقطع کر دیا۔ میں گھبرا گیا اور اس سے پوچھنے لگا ”پ جو کچھ فرما رہے تھے، اس کا میری ذات سے تو کوئی تعلق نہیں تھا؟“ اس نے کوئی جواب نہ دیا تاہم اس نے مجھے بہ نگاہ کرم دیکھا۔ پھر ایک ایک کی جانے کیا ہوا، ہم نے اپنے آپ کو میرے بیڈروم میں، جہاں ڈبل بیڈ ہے، موجود پایا۔ وہ اس کے ایک کنارے پر بیٹ گیا۔ مجھے اس خواہش نے آتش زیر پا کر رکھا تھا کہ میں اس کے ساتھ لائیو رکروں اور اس کے جسم کو سہلاؤں۔ چنانچہ میں بھی بیٹ گیا۔ اس نے مجھ سے پوچھا: ”صاف صاف بتاؤ کہ وہ کون سی شے ہے جو سب سے بڑھ کر تمہیں گناہ پر مائل کرتی ہے؟ تم نے معلوم کر لیا ہے؟ مجھے یقین ہے کہ تمہیں اب تک علم ہو چکا ہوگا۔“ اس کے سواں پر میں بہت عجوب ہوا تاہم میں نے اسے بتایا کہ ”کاپلی میرا سب سے بڑا عیب ہے۔ اس سے بچنا چھڑانا میرے لیے مشکل ہے۔“ اس نے اپنے سر کو یوں جنبش دی جیسے اسے میری بات کا یقین نہ آیا ہو۔ میں اور بھی عجوب ہوا اور میں نے اسے بتایا ”آپ کے مشورے کے مطابق میں اپنی شریک حیات کے ساتھ رہ ضرور رہا ہوں لیکن خاندان کی حیثیت سے ذاتا شوئی کے حقوق ادا نہیں کر رہا۔“ اس پر اس نے جواب دیا: ”کسی بھی بیوی کو اپنے شوہر کی ام آغوش سے محروم نہیں رکھا جانا چاہیے۔“ اور اس نے اپنی باتوں سے مجھے یہ اثر دیا کہ ایسا کرنا میرا فرض ہے۔ لیکن میں نے جواب دیا کہ ”اس سے تو مجھے سخت شرمندگی ہوگی۔“ اور ایک ایک سب کچھ میری نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ میری آنکھ کھل گئی اور میرے ذہن میں انجیل مقدس کی یہ آیت گھوم رہی تھی ”اور زندگی انسانوں کی روشنی تھی۔ روشنی ظلمت میں چمک رہی تھی اور ظلمت اس کی تنہیم نہیں کر پا رہی تھی۔“

آئی اوسپ کا چہرہ نو خیز، شاداب اور تاب دار دکھائی دے رہا تھا۔ آج ہی مجھے اپنے محسن کا خط ملا ہے۔ اس میں اس نے میرے اردو نامی فرائض یاد دلائے ہیں۔

9 دسمبر:

میں نے خوب دیکھا۔ جب میری آنکھ کھل تو میرا دل دھک دھک کر رہا تھا۔ میں نے خواب میں دیکھا کہ میں ہاسکوس اپنے مکان کے کشادہ نشستہ کمرے میں بیٹھا ہوں۔ اتنے میں آئی اوسپ الگسی وچ ڈرائنگ روم میں سے گزرتا اور داخل ہوا۔ مجھے فوراً معلوم ہو گیا کہ اس میں نشاۃ الثانیہ کا مل پہلے ہی پایہ تکمیل تک پہنچ چکا ہے۔ میں اس کا استقبال کرنے تیزی سے آگے بڑھا، اس سے بغل گیر ہوا اور تازہ توڑ اس کے ہاتھوں پر بوسے ثبت کرنے لگا۔ اس نے کہا ”تم نے دیکھ لیا کہ اب میرا چہرہ مختلف ہے؟“ میں ابھی تک اسے اپنے بازوؤں میں سیٹے ہوئے تھا۔ میں نے اس پر نظر ڈالی اور دیکھا کہ اس کا چہرہ جوان ہو چکا ہے لیکن اس کا سر بالکل سے محروم تھا اور اس کے خدو خال خاصے تہیل ہو چکے تھے۔ اور میں نے کہا: ”اگر ہماری ملاقات

تفاتیہ بھی ہوتی، تب بھی میں آپ کو پہچان جاتا۔“ اور اس کے ساتھ ہی میں نے سوچا، ”کیا میں بچ کہہ رہا ہوں؟“ اور اچانک میں نے دیکھا کہ وہ یوں لیٹا ہوا ہے جیسے وہ کوئی لاش ہو۔ پھر وہ بتدریج اپنے آپ میں آگیا اور میرے ساتھ کشادہ منڈی روم میں چل گیا۔ اس کے ہاتھ میں ڈرائنگ کے کاغذات پر مشتمل خاصی ضخیم کاپی تھی۔ میں نے کہا، ”یہ تصاویر میں نے بنائی ہیں۔“ اور اس نے جواب میں گروس کوٹ دیا۔ میں نے کاپی کھولی۔ تمام صفحات پر خوبصورت اور دل آویز تصاویر نقش تھیں۔ اسے خواب میں مجھے یہ معلوم تھا کہ ان تصاویر میں روح کی اپنے محبوب کے ساتھ عشقیہ ہم جوئوں کے خاکے پیش کیے گئے ہیں۔ اس کے صفحات پر مجھے ایک دوشیزہ کی، جس کا جسم شفاف تھا، جو شفاف لباس میں بیٹھ تھی اور جو با دلوں کی جانب محو پرواز تھی، خوبصورت تصویر نظر آئی۔ اور مجھے محسوس ہوا کہ یہ دوشیزہ اس کے علاوہ جس کی حکایتی نغمہ سلیانی میں کی گئی ہے، اور کوئی نہیں۔ خواب میں ان تصاویر کو دیکھتے ہوئے مجھے محسوس ہوا کہ میں فعل بد کا مرتکب ہو رہا ہوں لیکن میں اپنی نگاہیں ان سے ہٹا نہ سکا۔ خداوند! میری مدد فرما! اے خداوند، اگر تیرا مجھ سے منہ موڑنا تیرا اپنے فعل ہے، پھر تیری رضا پوری ہو لیکن اگر اس کا سبب خود میری ذات ہے، پھر مجھے سکھا کہ میں کیا کروں اگر تو نے کاملاً مجھ سے منہ موڑ لیا، پھر میری نفس پرستی مجھے کہیں کا نہ چھوڑے گی!

۱۱

رستوفوف نے جو گزشتہ دو سال دیہہ میں گزرے تھے، ان کے دوراں میں ان کے مالی امور میں بہتری کے کوئی آثار نمودار نہیں ہوئے تھے۔

اگرچہ نکولائی رستوفوف سختی سے اپنے ارادے پر ڈٹا ہوا تھا، ابھی تک ایک غیر محروف رجحان میں خدات سرا انجام دے رہا تھا اور نسبتاً کم خرچ کر رہا تھا، لیکن اترادنا یا میں زندگی کے رنگ ڈھنگ۔ اور خاص طور پر متکا کا انتظام والہ صرام۔ کچھ اس قسم کے تھے کہ قرضہ ناگزیر طور پر بڑھتا جا رہا تھا۔ ستمبر کا ڈنٹ کو اس مشکل کا صرف ایک ہی حل نظر آیا کہ کسی سرکاری عاومت کے لیے درخواست بھیج دی جائے۔ چنانچہ وہ اس کی تلاش میں پیٹرز برگ آگیا اور اس کے بقول اس کا یہاں آنے کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ بچیوں کو جی بھر کر لطف اندوز ہونے کا آخری موقع فراہم کیا جاسکے۔

انھیں پیٹرز برگ آئے زیادہ دن نہیں گزرے تھے کہ برگ نے ویرا کو شادی کی تجویز پیش کر دی۔ اس کی اس تجویز کو قبول کر لیا گیا۔

اس امر کے باوجود کہ، سگو میں رستوفوف کا تعلق معاشرے کے اعلیٰ ترین طبقے سے تھا (خود انھوں نے اس بارے میں کبھی سوچا بھی نہیں تھا)، پیٹرز برگ میں ان کے دائف کاروں کا حلقہ قدرے ملا جلا اور غیر واضح تھا۔ پیٹرز برگ میں وہ نسباً تھے اور وہی لوگ، جنہیں انھوں نے یہ پوچھے بغیر کہ ان کا تعلق کس زمرے سے ہے، دعوے

کل لٹھیں، یہاں انھیں بظہر حقارت دیکھتے تھے۔

ماسکو کی طرح پیٹرز برگ میں بھی رستونوں کی مہمان نوازی میں کوئی فرق نہیں آیا تھا اور بھانت بھانت کے لوگ۔ اترادایا میں ان کے دیہاتی ہمسائے، مفلوک اہل بزرگ تعلقہ در بعد دختران، درہاری مصاحبہ پیرانکا، پیٹرز برگ و خوف اور ان کے ضلعی پوسٹ ماسٹر کا بیٹا، جو پیٹرز برگ کے کسی دفتر میں ملازم تھا۔ ان کے ہاں ہر تاول کرنے آتے تھے۔ مردوں میں جن لوگوں کا بہت جلد پیٹرز برگ میں رستونوں کے گھر اکٹرا جانا ہو گیا، ان میں بورس، پیٹرز، جس سے سحر کاؤنٹ کی ملاقات سرراہ ہوئی تھی اور وہ اسے اپنے ساتھ اپنے ہاں گھسیٹ لے گیا تھا، اور برگ شامل تھے۔ برگ سارا سارا دن رستونوں کے ہاں گزارتا تھا اور وہ سب سے بڑی بیٹی، کاؤنٹس درہراپاس نو جوان کی طرح، جو شادی کا پیغام دینے کا ارادہ کیے ہوئے ہو، ہمہ تن توجہ دیتا تھا۔

اسٹریٹس کے میدان جنگ میں بنادایاں ہاتھ زخمی کرانے کے بعد برگ نے اس کی جس طرح نمائش کی تھی اور بیکار بائیں ہاتھ میں شمشیر تھامنے کا جو زراعت دریا تھا، وہ یونہی نہیں تھا۔ وہ اس واقعے کو اتنے تسلسل اور اتنے مظلومہ انداز سے سناتا رہتا تھا کہ ہر شخص کو یقین آ جاتا کہ اس کا یہ کارنامہ نہایت احسن در تقاضائے وقت کے عین مطابق تھا۔ اور برگ کو اس کارنامے کے طفیل دو تہنے ملے تھے۔

فن لینڈ کے خلاف جنگ میں بھی اس نے نمایاں کارکردگی کا مظاہرہ کیا تھا۔ اس نے گرینڈ کا ایک کلا، جس سے کمانڈر انچیف کے قریب کھڑے ایک ایجوٹ کو ہلاک کر دیا تھا، اٹھایا اور وہ سے اپنے کمانڈر کے پاس لے گیا۔ اسٹریٹس کے وقوعے کی طرح وہ اس واقعے کا بھی اتنی تفصیل اور اتنے ان تھک طریقے سے ذکر کرتا تھا کہ ہر شخص کو یقین ہو گیا کہ ایسا کرنا ضروری تھا۔ اور فن لینڈ کی جنگ نے اسے مزید دو تمغات عطا کیے۔ 1809 میں وہ گارڈز میں کپتان تھا، اپنے سینے پر تہنے سجایا کرتا تھا اور پیٹرز برگ میں بعض خاص اور منفعت آور مناصب پر فائز تھا۔

اگرچہ بعض مشکلیں ایسے بھی تھیں کہ جب ان کے سامنے برگ کے اوصاف بیان کیے جاتے، وہ ذریعہ سکر اسیتے، تاہم اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ وہ ضابطے کا پابند، جفاکش اور دلیرانہ تھا۔ اپنے افسران بالاسے اس کی خوب نہجی تھی۔ وہ محتاط، مچا اور کھرا نو جوان تھا۔ اس کا مستقبل بہت درخشاں تھا اور یہ بات قطعی یقینی تھی کہ وہ معشرے میں بہت اہم مقام حاصل کرے گا۔

چار سال قبل ماسکو کے ایک تحصیلدار ہل میں اس کی ملاقات اپنے ایک جرمن رفیق کار کے ساتھ ہوئی تھی۔ تب اس نے دیار ستورا کی طرف اس کی توجہ دلاتے ہوئے جرمن میں کہا تھا ”یہ لڑکی میری شریک حیات بنے گی۔“ اور اسی سے اس نے یہ ٹھان لیا تھا کہ وہ اس دوشیزہ کو اپنے حوالہ عقد میں لا کر ہی دم لے گا۔ اب پیٹرز برگ میں اپنی اور رستونوں کی پوزیشن کا جائزہ لینے کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ شادی کی تجویز پیش کرنے کا وقت آپہنچا ہے۔

برگ کی تجویز کچھ اس قسم کے جیسے جیسے ہے، جو کسی طرح بھی اس کی ناک کی تسکین کا باعث نہیں بن سکتی تھی، قبول کی گئی۔ ابتدا تو یہ بات ہی بہت عجیب نظر آئی کہ لیو دینا کے کسی غیر معروف چشم بین کا صاحب زادہ رستونوں

کی کسی صاحب زادی سے شادی کی خواہش کا اظہار کرے۔ تاہم اس کے کردار کا سب سے بڑا وصف۔ انیت۔ اتنی سادہ لوحی اور نیک طبعی پر مبنی تھی کہ رستوف غیر شعوری طور پر یہ سمجھنے لگے کہ یہ چھٹی ہی چیز ہوگی کیونکہ خود اسے یہ پختہ یقین تھا کہ یہ واقعی نہایت عمدہ چیز ہے۔ مزید برآں رستوفوں کے معاملات اتنے ڈرگوں ہو چکے تھے کہ رشتے کے خواستگاروں کی نظروں سے اوچھل نہیں رہ سکتے تھے۔ اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ دیر چوبیس برس کی ہو چکی تھی، اسے تقریباً ہر جگہ گھریا پھریا گیا تھا اور اس حقیقت کے باوصف کہ وہ ناقابل تردید حد تک خوبصورت اور سمجھدار تھی، کسی نے بھی اب تک اس سے شادی کی خواہش کا اظہار نہیں کیا تھا۔ چنانچہ انھوں نے اپنی رضا مندی دے دی۔

”دیکھو نا، برگ نے اپنے رفیق کار سے کہا۔ وہ اسے محض اس لیے اپنا دوست کہتا تھا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ ہر شخص کے دوست ہوتے ہیں۔“ دیکھو نا، میں نے ہر شے کا نہایت احتیاط سے جائزہ لیا ہے۔ اگر میں نے اس شادی کے بارے میں غور و فکر نہ کیا ہوتا یا یہ کسی اعتبار سے بھی مجھے غیر سوزوں دکھائی دیتی، تو میں اس کا نام بھی نہ دیتا۔ لیکن اب حالات یہ ہیں کہ میرے پاپا اور، ما کے نان نفقے کا معقول بندوبست ہو گیا ہے۔ مجھے بالک کے صوبوں میں بعض اراضی جات پر لگان²⁸ وصول کرنے کا جو اختیار ملے، وہ میں نے انھیں منتقل کر دیا ہے۔ اور جہاں تک ہمارا تعلق ہے، کچھ مجھے تنخواہ ملتی ہے، تھوڑی بہت جائیداد وہ بھی جہیز میں لائے گی۔ اللوں تللوں کا میں عادی نہیں۔ چنانچہ پیٹرز برگ میں احسن طریقے سے زندگی بسر کرنے میں کوئی دقت پیش نہیں آئے گی۔ میں روپے کی خاطر شادی نہیں کر رہا۔ میرے نزدیک اس قسم کی حرکت گھٹیا اور عزت نفس کے مٹانی ہے۔ تاہم میں سمجھتا ہوں کہ بیوی کو اپنا اور خاوند کو اپنا حصہ تو لانا ہی چاہیے۔ ملازمت میں میرا مقام ہے۔ اس کے خاندانی تعلقات ہیں اور وہ پھوٹی موٹی جائیداد کی مالکہ بھی ہے اور فی زمانہ یہ چیزیں بہت اہم ہیں۔ ٹھیک ہے نا؟ لیکن سب سے بڑی بات یہ ہے کہ وہ حسین اور قابل قدر و شیرازہ ہے اور مجھ پر جان چھڑکتی ہے۔“

برگ شرما گیا اور مسکراتے لگا۔

”اور میں بھی اس سے پیار کرتا ہوں کیونکہ وہ سمجھدار ہے اور۔۔۔ نیک سرشت ہے۔ جہاں تک اس کی دوسری ہمشیرہ کا تعلق ہے، اگرچہ دونوں ایک ہی خاندان کی افراد ہیں، وہ بالکل مختلف ہے۔ اس کا رویہ خوشگوار نہیں اور نہ وہ اتنی ذہین ہے۔ وہ اتنی۔۔۔ جمہیں معلوم ہے؟۔۔۔ خوش اظہار نہیں ہے۔ لیکن میری منگیتر۔۔۔ خیر تم ہمارے ساتھ۔“

وہ ”کھانا کھانے“ کہنا چاہتا تھا لیکن اس نے بروقت اپنا ارادہ بدل دیا اور کہا: ”تم ہمارے ساتھ چائے پینے تو آؤ گے ہی۔“ اس کے ساتھ ہی اس نے اپنی زبان کو ذرا ٹیڑھا کیا، اور منہ سے دھوکیں کا مرغولہ باہر نکال دیا۔ یہاں اس کا اظہار تھا کہ جس قسم کی مسرت کے وہ خواب دیکھتا رہا تھا، وہ اسے مل گئی ہے۔

برگ کے پیغام پر اگرچہ ویرا کے والدین کا اولین رد عمل شکوک و شبہات کا تھا، تاہم ایسے مواقع پر جو خوشیاں منائی جاتی ہیں اور جو جشن منعقد ہوتے ہیں، بعد ازاں وہ سب کچھ یہاں بھی ہوا۔ لیکن خوشیاں منانے کا عمل مٹی تھا، اس میں خلوص اور سچا جذبہ مقتود تھا۔ عزیز واقارب کے رویوں سے صاف جھٹک رہا تھا کہ وہ کھٹے کھٹے سے

میں اور جھینپ رہے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان کے ضمیر انہیں سچو کے لگا رہے ہیں کہ انہوں نے دیر سے کافی بہت نہیں کی اور اس سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے پابہ رکاب ہیں۔ سب سے زیادہ جس شخص کی جاں ضیق میں آئی ہوئی تھی، وہ معمر کاؤنٹ تھا۔ وہ غالباً یہ بتانے سے قاصر تھا کہ اس کی پریشانی کی وجہ کیا ہے تاہم اس کے شکرات کا بنیادی سبب اس کی مالی مشکلات تھیں۔ اسے قطعاً یہ معلوم نہیں تھا کہ اس کے پاس کیا کچھ ہے، وہ کتنے کا مقروض ہے اور یا دیر کو چیزیں کیا دے سکتا ہے۔ جب اس کے ہاں بیٹیاں تولد ہوئی تھیں، اس نے ہر ایک کو شادی پر دینے کے لیے ایک ایک جاگیر، جس پر تین تین سو زرعی غلام کام کرتے تھے، عائد کر دی تھی۔ لیکن ان میں سے ایک جاگیر پہلے ہی فروخت ہو چکی تھی، دوسری رہن پڑی تھی اور اس پر سود کے بقایا جات اتنے بڑھ چکے تھے کہ اسے بھی کسی نہ کسی دن فروخت ہونا تھا۔ چنانچہ دیر کو یہ جاگیر دینا بھی ممکن نہیں تھا۔ ادھر گھر میں روپیہ بھی نہیں تھا۔

برگ کی سگائی قرار پائے ایک مہینہ گزر چکا تھا، اور اب شادی کی تقریب کے انعقاد میں صرف ایک ہفتہ باقی رہ گیا تھا۔ لیکن کاؤنٹ یہ ابھی تک طے نہیں کر سکا تھا کہ اس نے چیزیں کیا کچھ دینا ہے اور اس موضوع کے بارے میں اس نے اپنی شریک حیات سے کوئی بات کی تھی۔ ایک موقع پر تو اس نے یہ سوچا تھا کہ ریا زان کی جاگیر دیر کو دے دی جائے۔ پھر اس کے دل میں یہ خیال آیا کہ کیوں نہ ایک جنگل فروخت کر دیا جائے یا پروٹوٹ کے ذریعے روپیہ حاصل کر لیا جائے۔

شادی سے چند روز قبل برگ ایک دن صبح سویرے کاؤنٹ کے سٹڈی روم میں داخل ہوا۔ وہ مسکرا رہا تھا اور اس نے نہایت احترام سے اپنے ہونے والے سر سے دریافت کیا کہ دیر کا چیز کیا ہوگا۔ کاؤنٹ کئی دنوں سے اس بات کا منتظر تھا کہ اس سے کب اس قسم کا ہوال پوچھا جائے گا۔ تاہم برگ کے سوال نے اسے اتنا ہلکا دیا کہ اس کے ذہن میں جو اومین بات آئی، وہ اس نے بے سوچے سمجھے کہہ دی۔

”تم نے جس سیدھے سادے انداز سے بات کہی ہے، کسی ہیر پھیر سے کام نہیں لیا، مجھے بہت پسند آیا۔ فکر نہ کرو تم بالکل مطمئن ہو جاؤ گے۔“

اس نے برگ کے کندھے پر تھپکی دی اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ سے توقع تھی کہ یوں بات ختم ہو جائے گی۔ لیکن برگ بھی ایک ہی کایاں شخص تھا، آسانی سے ہاتھ نہیں آ سکتا تھا۔ یوں اس کے چہرے پر بھولی بھالی مسکراہٹ چلی ہوئی تھی تاہم عملاً اس نے یہ کیا کہ بلا جھجک کہنے لگا: ”اگر مجھے یقینی طور پر یہ معلوم نہ ہو کہ دیر کو چیزیں ملے گی تو اس چیز کا کم از کم کچھ حصہ مجھے پیشگی نہ دیا گیا، تو مجھے مجبوراً شادی سے دست کش ہونا پڑے گا۔“

”کیونکہ، کاؤنٹ، ذرا سوچیں۔ اگر مجھے واضح طور پر یہ معلوم نہ ہو کہ اپنی شریک حیات کے اخراجات پورے کرے کے لیے مجھے کن ذرائع پر انحصار کرنا ہوگا اور میں نے شادی رچائی، تو میرا یہ رویہ بہت قابل غور نہیں ہوگا۔“ کاؤنٹ نے جو دیر دن کا مظاہرہ کرنا چاہتا تھا اور مزید چچ چچ چچ سے بھی جان چھڑانا چاہتا تھا، یہ کہہ کر کہ وہ انی ہزار روپے کا پروٹوٹ دے دے گا، گفتگو ختم کر دی۔ برگ شیریں انداز سے مسکرایا، اس نے معمر کاؤنٹ

کے شانے پر بوسہ دیا اور بولا ”میں آپ کا بے حد مشکور ہوں، تاہم جب تک مجھے تیس ہزار روپے نقد نہیں مل جاتے، میں نئی زندگی کا آغاز نہیں کر سکتا۔“

”یا پھر، کاؤنٹ“ اس نے حریف کہا، ”آپ مجھے تیس ہزار روپے نقد عطا کریں اور ساٹھ ہزار کا پرنٹ لکھ دیں۔“
 ”ہاں، ہاں، بالکل، بالکل“ کاؤنٹ نے غفلت سے کہا۔ ”مائی ڈیئر بوائے، میں تمہیں تیس ہزار نقد بھی دوں گا اور اسی ہزار کا پرنٹ بھی۔ ہاں، میں اتنا کچھ کر ہی دوں گا۔ اچھا، اب میرا بوسہ لو۔“

12

نٹاشا کان سوہ ہو چکا تھا اور یہ 1809 کی بات ہے۔ یہی وہ سال تھا جو اس نے چار برس قبل بورس کے ساتھ چوما چائی کے بعد انگلیوں پر شمار کیا تھا۔ اس کے بعد ان دونوں کی کبھی کوئی ملاقات نہیں ہوئی تھی اگر سواہیا، یعنی والدہ کے ساتھ گنگو کے دوران میں بورس کا کبھی ذکر آتا بھی، تو وہ اس بارے میں معاملے کو چٹکیوں میں اڑا دیتی اور کہتی ”مٹی ڈالو۔ یہ بچکانہ اور احمقانہ حرکتیں تھیں۔ سب ان کا ذکر کرنے کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں۔ مدتمس ہونے میں انہیں فراموش کر چکی ہوں۔“ لیکن اس کے قلب کی گہرائیوں میں یہ سوال اٹھتا رہتا اور سے اذیت دیتا رہتا تھا، ”میں نے اس کے ساتھ جو سگائی کی تھی، وہ محض مذاق تھا یا سنجیدہ عہد، جس کی پابندی لازمی ہے؟“

جب سے 1805 میں بورس نے فوج میں شمولیت اختیار کرنے کی غرض سے باسکو کو خیر باد کہا تھا، وہ ایک مرتبہ بھی رستوفوں سے ملے نہیں آیا تھا۔ وہ متعدد بار باسکو کے چکر کاٹ چکا تھا اور اتر ادنا یا کے قریب سے بھی گزرا تھا لیکن اس نے ان کے ہاں جانے کا تکلف کبھی گوارا نہ کیا۔

کبھی کبھی نٹاشا کو یہ بات کھٹکتی اور وہ سوچنے لگتی کہ وہ اس سے شادی کا روادار ہی نہیں۔ اس کی اس تہی سرنی کی تصدیق اس کے اپنے بزرگوں کے لہجے سے بھی ہو جاتی۔ جب بھی اس کا ذکر آتا، اس کے بڑے بوں بات کرتے جیسے وہ یہ سمجھتے ہوں کہ ان کے ساتھ بڑی زیادتی ہوئی ہے۔

”آج کل پرانے دوستوں کو فراموش کر دینا رواج بن گیا ہے“ بورس کا ذکر آنے پر کاؤٹس جھٹ کہتی۔
 گزشتہ کچھ عرصے سے آنا میخائیلوونا کا آنا جانا بھی خامسا کم ہو گیا تھا۔ ان کے بارے میں اس کے رویے میں نمایاں آن بان آگئی تھی۔ وہ اپنے لخت جگر کے اوصاف حمیدہ اور جس شاندار ملازمت کو اس نے اختیار کیا تھا، اس کا ذکر کرنے سے کبھی نہ چوکتی۔ وفور مسرت سے اس کا گھارندہ چاتا اور وہ اس عنایت سے پایاں کے لیے خداوند کا لکھ لکھ شکر ادا کرتی۔ جب رستوف پیٹر برگ پہنچے، بورس انہیں منے آیا۔

جب وہ گاڑی میں ان کے مسکن کی طرف جا رہا تھا، وہ جذبات سے بالکل ہی تہی دامن نہیں تھا۔ اس کے دل میں نٹاشا کی جو یادیں سمائی ہوئی تھیں، وہ اس کا زبردست شعری سرمایہ تھیں۔ تاہم جب اس نے ان کے ہاں جانے کا ارادہ کیا اس نے دل میں یہ ٹھان لیا تھا، ”میں نٹاشا اور اس کے والدین کو یہ واضح اشارہ دے دوں گا کہ میرے اور

ناتاشا کے مابین جو بیگانہ تعلقات استوار ہوئے تھے، ان کا سمجھنا ہم دونوں میں سے کسی کے لیے بھی لازمی نہیں رہا۔“
 کاؤتس بڑا خوش اسلوب تھا۔ وہ بے تکلفانہ دوستی کی وجہ سے اسے اعلیٰ طبقوں میں اہم مقام حاصل ہو چکا تھا۔ سرکاری ملازمت میں بھی اس کی پوزیشن بہت زبردست اور خیرہ کن تھی کیونکہ اسے ایک سرکردہ شخصیت کا، جو اس کی سرپرستی کرنے میں اس سے کام نہیں لیتی تھی، کُل اعتماد حاصل تھا۔ اب وہ پیئرز برگ کی ستمنزل ترین وراثت کی مالک دو شیرہ سے بیاہ رہانے کے منصوبے باندھ رہا تھا اور قرائن سے یہی نظر آتا تھا کہ اپنے اس منصوبے کو پروان چڑھانے کے لیے اسے کسی قسم کی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔ جب بورس رستوفوں کے ڈرائنگ روم میں داخل ہوا، ناتاشا اپنے کمرے میں تھی۔ جب اسے اس کی آمد کی اطلاع ملی، وہ تقریباً بگسٹ بھاگتی ڈرائنگ روم میں آدھمکی۔ اس کا چہرہ گلہنا، ہور ہاتھ اور اس پر جس نوع کا تبسم تھا، وہ اس امر کی علامت تھا کہ وہ مہمان کو دوست سے بڑھ کر کچھ اور سمجھتی ہے۔

بورس کے ذہن میں ناتاشا کا جو نقشہ تھا وہ ایک کم سن بچی کا تھا جو چھوٹا ڈریس پہنا کرتی تھی، جس کی رلفوں کے نیچے چمکتی دکتی سیاہ آنکھیں تھیں اور جو رنگ میں آکر بچوں کی طرح قہقہے لگایا کرتی تھی۔ لیکن اب جو ناتاشا اس کے سامنے کھڑی تھی، وہ بالکل اسی مختلف تھی۔ وہ شینا گیا اور اس کے چہرے پر جو حیرت و استعجاب اور تحسین و آفریں لگی، وہ دیدنی تھی۔ اس کے چہرے پر ان تاثرات کو دیکھ کر ناتاشا کھل اٹھی۔

”خیر، تم نے اپنی کھیل کی سمی منی شرارتی ساتھی کو پہچانا؟“ کاؤتس نے دریافت کیا۔

بورس نے ناتاشا کے ہاتھ پر ہوسہ دیا اور بولا: ”تم میں جو تبدیلیاں آئی ہیں، انھیں دیکھ کر میں درط حیرت میں گم ہو گیا ہوں۔“

”واہ واہ، کیا رنگ روپ نکالا ہے! کتنی حسین ہو گئی ہو!“

”میرا بھی کچھ یہی اندازہ ہے!“ ناتاشا کی چمکتی دکتی اور مسکراتی آنکھیں جواب میں کہہ رہی تھیں۔ ”پاپا، پہلے کی نسبت کچھ مسمر نہیں دکھائی دیتے؟“ وہ بولی۔

ناتاشا بیٹھ گئی۔ بورس اس کی ماں کے ساتھ جو گفتگو کر رہا تھا، اس نے اس میں کوئی دخل نہ دیا۔ وہ اس شخص کا، جو بچپن میں اس کے رشتے کا اسیدوار تھا، بس خاموشی اور باریک بینی سے جائزہ لیتی رہی۔ وہ خود بھی اس دلیرانہ اور بے ہمتی والی جانچ پر کھکا بو بھ محسوس کر رہا تھا اور کبھی کبھی آنکھ چرا کر اس پر طائرانہ نگاہ ڈال لیتا تھا۔

بورس کی وردی، اس کے مہیز، اس کی ٹائی، اس کا بال سنوارنے کا انداز۔ ایک ایک چیز میں تازہ ترین فیشن کی لہک مہک تھی اور تک سک سے بالکل درست تھی۔ ناتاشا نے یہ سب کچھ فوراً بھانپ لیا۔ وہ کاؤتس کے قریب بازوؤں والی کرسی پر ذرا ترچھا بیٹھا تھا۔ وہ اپنے دائیں ہاتھ سے اپنے بائیں ہاتھ کے انتہائی صاف ستھرے اور بے عیب دستارے کو، جو چمڑی کی طرح وہاں چپکا ہوا تھا، درست کر رہا تھا اور انوکھے شائستہ انداز سے ہونٹوں کو کھینچ کھینچ کر پیئرز برگ کے اعلیٰ ترین طبقوں کی رنگ رلیوں کے متعلق باتیں کر رہا تھا۔ بیچ بیچ میں وہ اسکو کے اصحاب اور ایام کی، جو اس نے وہاں گزارے تھے، ہلکے طنزیہ طریق سے یادیں تازہ کرنے لگیں۔ ناتاشا کو محسوس ہوا

کہ اعلیٰ ترین اشرافیہ طبقے کے ذکر کے دوران میں اس نے جب ایک سفیر کے اجتماعی رقص کی محفل کی، جس میں دو شریک ہو، تھا اور ان دعوت ناموں کی، جو اسے ن اور س کے اشارے سے، اشارہ کیا تھا، اس نے اس محفل پر سبیل بند کر دیا تھا۔

اس تمام عرصے کے دوران میں نناشا مہر بلب بیٹھی اسے سن اٹھیں سے دیکھتی رہی۔ اس کی تاک تھا کہ بورس کی بے چینی اور بوکھلاہٹ میں اضافہ کرتی رہی۔ وہ بار بار مڑ کر اسے دیکھتا اور اپنی بات ادھوری چھوڑتا رہا۔ وہ اس منٹ بھی نہیں بیٹھ ہوگا کہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور جانے کی اجازت طلب کرنے لگا۔ اس پر وہی تجسس، لٹکانے والی اور تدریسے تمسخر انگیز نگاہیں جمی ہوئی تھیں۔

اس پہلے پھرے کے بعد بورس نے اپنے آپ سے کہا: ”ہمیشہ کی طرح اب بھی نناشا مجھے کشش کرتی ہے لیکن مجھے اس جذبے کے سامنے تسلیم خم نہیں کر دینا چاہیے کیونکہ اس لڑکی۔ یہ جبر قتلانے کی نہیں۔ سے شادی کرے گا مطلب اپنے کیریئر پر لات مارنے کے مترادف ہوگا لیکن اس کے ساتھ نکاح کے بغیر سابقہ تعلقات کی تجدید کرنا کیسی حرکت ہوگی۔“ اس نے تہیہ کر لیا کہ وہ نناشا سے دور دور رہنے کی کوشش کرے گا لیکن اس عزم کے باوجود وہ چند روز بعد پھر آ موجود ہوا۔ اب وہ مسلسل رستوفوں کے ہاں آنے اور پورا پورا دن وہاں گزارنے لگا۔ اسے محسوس ہونے لگا کہ اس کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ نناشا کے ساتھ کوئی مداخلت کر لے اسے صاف صاف بتا دے کہ انھیں ماضی کو فراموش کرنا ہوگا اور ہر چیز کے باوجود وہ اسے اپنی شریک حیات نہیں بنا سکتا، وہ (بورس) بالکل قلاش اور تہی دست ہے اور یہی اس کی شادی کے راستے میں دیوار بن کر کھڑا ہو جائے گا۔ وہ اس قسم کے ارادے پاندھتا تو تھا لیکن انھیں عملی جامہ پہنانے میں ناکام رہتا۔ عین وقت پر اس کی ہمت جواب دے جاتی اور وہ اس موضوع کے بارے میں کوئی بات نہ کر سکتا۔ وہ روز بروز دلدل میں مزید اور مزید دھنستا رہا۔ ادھر معمر کاؤٹس اور سونیا کو محسوس ہو رہا تھا کہ نناشا پہلے کی طرح اس کی محبت میں گرفتار ہے۔ وہ جن نعروں کو پسند کرتا تھا، نناشا اس کی موجودگی میں وہی گاتی تھی، اسے اپنا، لیم دکھات تھی، اسے اس پر کچھ نہ کچھ لکھنے کے لیے اکساتی تھی اور اسے کبھی بھولے سے بھی ماضی کا تذکرہ نہیں کرنے دیتی تھی، اسے ہمیشہ ہی محسوس کراتی رہتی کہ حال کتنا سہانا اور پر لطف ہے اور یوں ہر روز وہ حیران و مشدد روایس لوٹ جاتا۔ وہ جو کچھ کہنا چاہتا تھا، نہ تو اسے کہہ پاتا اور نہ اس کی سمجھ میں کچھ آتا کہ وہ یہاں کیا کر رہا ہے، کیوں بار بار آ رہا ہے اور یہ سلسلہ کیسے ختم ہو گا اس نے ہیمن کے ہاں آنا جانا ترک کر دیا، اسے روزانہ اس کے ملامت انگیز خطوط ملتے تھے لیکن پھر بھی رستوفوں کے ہاں اس کا آنا جانا لگا رہا اور وہ پورا پورا دن وہاں صرف کرتا رہا۔

گئی۔ ناشا، جو پہلے ہی دوسری لڑھکیاں کھا چکی تھی، بے سنبھل کر لٹاف کے نیچے پتی دودھ کے قریب لیٹ گئی۔ اس نے اپنے ہاتھ باہر نکالے اور چہرے پر سنجیدگی طاری کر لی۔

رات کو کاؤنٹ کی کلب سے واپسی سے قبل ناشا اس قسم کے جو چکر اپنی ماں کے کمرے کے لگائی تھی، ان سے ماں جیٹی دونوں کو بے حد مسرت ہوتی تھی۔

”اچھا، آج کیا بات ہے؟... میں خود بھی تم سے بات کرنا چاہتی تھی۔“

ناشا نے اپنا ہاتھ اپنی ماں کے منہ پر رکھ دیا۔ ”بورس کے بارے میں۔ مجھے معلوم ہے،“ اس نے سنجیدگی سے کہا۔ ”میں بھی یہی بات کرنے آئی ہوں۔ آپ کچھ نہ کہیں۔ مجھے معلوم ہے، ضرور کہیں!“ اس نے اپنا ہاتھ پر سے ہٹا لیا۔ ”ما، یوں تو ادا بہت نفیس آدمی ہے، ہے نا؟“

”ناشا اب تم سولہ سال کی ہو گئی ہو۔ جب میں تمہاری عمر کی تھی، میں شادی شدہ زندگی بسر کر رہی تھی۔ تم کہتی ہو کہ بورس نفیس اور شستہ آدمی ہے اور میں اسے بیٹے کی طرح چاہتی ہوں۔ پھر تم اور کیا مانگتی ہو؟ تم کیا سوچ رہی ہو؟ تم نے اس کا دماغ گھما دیا ہے، مجھے صاف نظر آرہا ہے۔“

یہ کہتے کہتے کاؤنٹس نے گردن گھما کر اپنی بیٹی کی جانب دیکھا۔ ناشا ٹنگلی باندھے مہا گئی کے ابو اہول، بو پنگ کی پائنتی اور سرانے کے تختوں کے کناروں پر منتش تھے، دیکھ رہی تھی۔ چنانچہ کاؤنٹس اپنی بیٹی کا چہرہ صرف جزوی طور پر دیکھ سکی۔ اس کے خدو خال پر جو سنجیدگی اور عزم جھلک رہا تھا، اسے دیکھ کر وہ بہت متعجب ہوئی۔

ناشا سن رہی اور سوچ رہی تھی۔

”اچھا تو پھر کیا؟“ اس نے پوچھا۔

”تم نے اس کا دماغ، لکل ہی گھم دیا ہے۔ آخر کیوں؟ تم اس سے کیا چاہتی ہو؟ تم جانتی ہو کہ تم اس سے شادی نہیں کر سکتیں۔“

”کیوں نہیں؟“ ناشا نے اپنی جگہ سے ہلے جلے بغیر پوچھا۔

”کیونکہ وہ نو عمر ہے، قلاش ہے۔ ہمارا اقربا بت دار ہے۔۔۔ در کیونکہ تم اس سے حقیقتاً محبت نہیں کرتی ہو۔“

”آپ کو کیسے معلوم ہوا؟“

”مجھے معلوم ہے۔ منھی، یہ ٹھیک نہیں ہے۔“

”لیکن اگر میں چاہوں تو...“ ناشا نے کہا۔

”افصول باتیں مت کرو۔“ کاؤنٹس نے کہا۔

”لیکن اگر میں چاہوں تو...“

”ناشا، میں سنجیدگی سے...“

ناشا نے اسے بات ختم کرنے کا موقع نہ دیا۔ اس نے کاؤنٹس کا لب ٹانگا ہاتھ اپنی جانب کھینچا، پہلے اس کی

اپنی جانب اور پھر جھٹکی پر بوسہ ثبت کیا۔ تب اسے دوبارہ اٹھایا، پہلے ایک جوڑ کو³⁰ پھر پور کو، پھر دوسرے جوڑ کو چوم،
 درمیانہ ساتھ زیر لب کہتی جا رہی تھی: ”جنوری، فروری، مارچ، اپریل، مئی...“

”اما، کچھ تو کہیں۔ آپ کچھ کہتی کیوں نہیں؟ کچھ تو کہیں!“ اس نے اپنی ماں کی طرف، جو پیار سے سے ٹکلی
 باز دیکھ جا رہی تھی اور اپنی سوچوں میں گم مسم بظاہر یہ بھول چکی تھی کہ وہ کیا کہنا چاہتی تھی، دیکھتے ہوئے کہا۔
 ”انٹھی، یوں بات نہیں بنے گی۔ ہر شخص تو اس رفاقت کو، جس کا آغاز تب ہوا تھا جب تم دونوں ابھی بچے
 تھے، نہیں سمجھ سکتا۔ اور جو دوسرے نوجوان اس گھر میں آتے ہیں، جب وہ تمہیں اس کے ساتھ اس طرح کی بے تکلفی
 برتنے دیکھیں گے، ان کی نگاہوں میں تمہاری قدر دقیت جاتی رہے گی... لیکن اس سے بھی جو بات زیادہ اہم
 ہے، وہ یہ ہے کہ تم سے خواہ مخواہ اذیت پہنچی رہی ہو۔ سے شاید کسی صاحب حیثیت دشیزہ کا موزوں رشتہ مل چکا
 ہو، لیکن اس کے بجائے اس پر جنون غالب آنا جا رہا ہے۔“

”جنون غالب آنا جا رہا ہے؟“ ناشا نے دہرایا۔

”میں تمہیں ایک واقعہ بتاتی ہوں۔ یہ میرے ساتھ پیش آیا تھا۔ میرا ایک چچیرا بھائی تھا۔“

”مجھے معلوم ہے۔ رکرل مائو ج۔ لیکن وہ تو اتنے بوڑھے ہیں۔ نہیں؟“

”لیکن وہ سدا کا بوڑھا تو نہیں۔ لیکن سنو، ناشا، پتا ہے میں کیا کرنا چاہتی ہوں؟ میں بورس سے ڈوبڈو
 ات کر دوں گی۔ اسے بار بار یہاں نہیں آنا چاہیے۔“

”اگر وہ آنا چاہتا ہے تو پھر کیوں نہ آئے؟“

”کیونکہ میں جانتی ہوں کہ اس سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔“

”آپ کو کیسے پتا چلا؟ نہیں، اما، آپ اس سے مت کچھ کہیں۔ اس سے بات کرنے کا خطرہ مول نہ لیں۔
 بالکل دلہیت حرکت ہوگی!“ ناشا نے ایک ایسے شخص کے، جو یہ سمجھتا ہے کہ اسے اس کی ملکیت سے محروم کیا جا رہا
 ہے اس کے کہا۔ ”بہت اچھا، میں اس سے شادی نہیں کر دوں گی۔ لیکن اگر اسے یہاں آنے سے لطف ملتا ہے،
 پھر اسے آنے دیں۔ اور مجھے تو لطف آتا ہے۔“ ناشا نے مسکرا کر اپنی ماں پر طائر نہ نگاہ ڈالی۔ ”ہم شادی نہیں
 کریں گے... لیکن اتنا کرم تو کریں... ہم جیسے چل رہے ہیں، ہمیں ویسے چلتے رہنے دیں۔“

”میری لاڈلی، تمہارا مطلب کیا ہے؟“

”ہم جیسے چل رہے ہیں۔ مگر مجھے اس سے واقعی شادی نہیں کرنا چاہیے... پھر ہم جیسے چل رہے ہیں، ویسے
 چلتے جائیں گے۔“

”تم جیسے چل رہے ہو،“ کاؤنٹس نے دہراتے ہوئے کہا۔ اس کا سارا جسم لرزنے لگا۔ اس کے ساتھ ہی وہ
 غیر متوقع طور پر خوشگوار اور بزرگ مانند از سے چسنے لگی۔

”مت نہیں۔ رک جائیں!“ ناشا نے چلائے ہوئے کہا۔ ”آپ نے تو سارا بیڈلزادیا ہے۔ آپ تو بالکل

مجھ جیسی ہیں ہنسوڑ، دل لگی باز!.. رک جائیں!..“ اس نے کاؤنٹس کے دونوں ہاتھ پکڑ لیے، چٹنگلی کا ایک جوڑ چہا اور اس کے ساتھ بولی: ”جون۔“ پھر وہ دوسرا ہاتھ چومنے لگی، ”جولائی، گسٹ۔“ ماما کیا وہ واقعی محبت میں مجھوں ہو رہا ہے؟ آپ کا کیا خیال ہے؟ کیا آپ سے کبھی کسی نے اس قدر ٹوٹ کر محبت کی تھی؟ اور وہ تو بہت نفیس، بلکہ نفیس ترین آدمی ہے، صرف میرے ذوق پر پورا نہیں اترتا۔ اس کی دنیا بہت محدود ہے، ذرا تنگ روم کے کلاک کی طرح۔ آپ سمجھتی ہیں نا؟ محدود، آپ جانتی ہیں، سرکی۔ ہلکا سرکی،“

”یہ کیا احمقوں کی سی باتیں کر رہی ہوں؟“ کاؤنٹس نے کہا۔

”آپ کی سمجھ میں نہیں آیا؟“ ناشا بولتی چلی گئی۔ ”نکولائی سمجھ جائے گا۔ بڑا خوف کو لیں، وہ نیلگوں ہے۔ گہرا نیلگوں اور قمر مزی اور بالکل مربع۔“

”تم اس سے بھی محبت کی چٹنگلیں بڑھا رہی ہو!“ کاؤنٹس نے ہنستے ہوئے کہا۔

”نہیں۔ وہ فری میسن ہے۔ میں معلوم کر چکی ہوں۔ وہ بے انتہا نفیس ہے۔ گہرا نیلگوں اور سرخ۔ میں آپ کو کیسے سمجھاؤں؟“

”لٹل کاؤنٹس!“ دروازے کے باہر کاؤنٹ کی آواز سنائی دی۔

ناشا نے پلنگ سے نیچے چھانگ لگا دی، جھپٹ کر سیپرائٹھائے اور ننگے پاؤں کمرے سے باہر بھاگ گئی۔ اسے کافی اریٹک ٹینڈر آئی۔ وہ یہی سوچتی رہی کہ جو کچھ وہ سمجھتی ہے اور جو کچھ اس کے باطن میں ہے اسے کوئی دوسرا نہیں سمجھ سکتا۔

”سونیا؟“ اس نے اس بلوگنڈی کے، جو اپنی بھاری بھر کم چوٹی سمیت کئی سٹائی سوئی پڑی تھی، متعلق سوچا۔ ”نہیں، بعد اسے کیسے علم ہو سکتا ہے؟ یہ معصوم اور نیک فطرت ہے۔ اسے نکولائی سے محبت ہو گئی ہے اور اسے بس صرف اسی کی فکر ہے۔ ماما بھی نہیں سمجھتیں۔ حیرت کی بات ہے کہ میں کتنی تیز طرار ہوں اور کتنی۔ آف، یہ کتنی پرکشش ہے!“ اور وہ اپنا یونہی صیغہ غائب میں ذکر کرتی رہی اور تصور ہی تصور میں سوچتی رہی کہ اس کے متعلق یہ باتیں کرنے والا شخص کوئی ذہین و فطین، انتہائی ذہین و فطین اور بہترین مرد ہے۔ ”اس (ناشا) کے پاس سب کچھ ہے!“ یہ مرد کہتا چلا گیا۔ ”سب کچھ ہے، یہ ہے۔ اس (ناشا) کے پاس سب کچھ ہے،“ یہ مرد کہتا چلا گیا۔ ”سب کچھ ہے، یہ ہمہ صفت موصوف ہے۔ غیر معمولی طور پر ذہین ہے، پرکشش ہے۔ خوبصورت، انتہائی خوبصورت ہے، خوش وضع و خوش اندام ہے۔ غضب کی تیز رک اور گھڑ سوار ہے۔ اور اس کی آواز؟ کیا کہنے اس آواز کے، حیرت انگیز حد تک سریلی و دردلکش ہے!“

وہ کاروباری کے ادبیرا میں سے پتی دل پسند دھن گنگنا نے لگی اور جست لگا کر بستر میں ٹھس گئی۔ وہ اس خیال پر کہ وہ جنگی بچے تے نیند کی وادیوں میں کھو جائے گی، خوشی سے کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ اس نے دنیا شا کو آواز دی کہ وہ شمع بجھا دے اور خادما بھی کمرے سے باہر نہیں نکل پائی تھی کہ وہ خوابوں کی دوسری لیکن مسرتوں سے معمور

دنیا میں، جہاں ہر چیز حقیقی زندگی کی طرح ہلکی پھلکی اور حسین و جمیل تھی بلکہ حقیقی دنیا سے بھی کہیں بڑھ کر تھی کیونکہ یہ منفی تھی پہنچ گئی۔

اگلے روز کاؤنٹس نے بورس کو بلایا، اس سے گفتگو کی اور اسی دن سے اس نے رستوں کے ہاں آنا جانا ترک کر دیا۔

14

1810 کے نو روز سے ایک دن قبل 31 دسمبر کو امپراطورہ کیٹھرین کے ایک کہن ساں مصاحب نے اجتماعی رقص کی محفل اور نیم شب ضیافت کا اہتمام کیا۔ سفارتی نمائندوں اور وزراء نے اس تقریب میں شریک ہونا تھا۔

انگلش گھاٹ پر اس مصاحب کا مشہور و معروف محل ان گنت روشنیوں سے بے نور بنا ہوا تھا۔ صدر دروازے پر جو روشنیوں میں نہایت ہوا تھا اور جہاں سرخ پانات بچھی ہوئی تھیں، پولیس تعینات تھی۔ وہاں نہ صرف پیادہ اور سواری بلکہ پولیس کا سربراہ بنفس نفیس اور درجوں دیگر افسر بھی ایستادہ تھے۔ گاڑیوں کا تانا بندا تھا۔ یہی ٹھکی تھیں کہ ان کی جگہ نئی آجائیں۔ ان کے کوچوں نے پردار ہیٹ اور ان کی جلو میں آنے والے مائین نے سرخ دریاں پسلی ہوئی تھیں۔ ان گاڑیوں میں وردیوں میں ملبوس، سینوں پر تھنے اور ریشمی فیتے سجائے مرد، اور ساٹن اور سور کے ملبوسات میں مستور خواتین برآمد ہوتیں، حزم و احتیاط سے پائیدانوں پر، جوان کی خاطر کھٹکھٹاؤٹ سے پیچھے کیے جاتے، پاؤں نکالتیں اور پھر تیز تیز لیکن دبے قدموں صدر دروازے کے آ رہاں بچھائی سرخ پانات پر چلے گزر جاتیں۔

جوئی کوئی نئی گاڑی آئی، تقریباً ہر بار ہجوم میں کھسک پھسکے ہوئے لگتی، درٹوچیاں لہرائے جانے لگتیں۔
”امپراطور؟۔۔ ارے نہیں، وزیر پرل۔ سفیر۔ تمہیں کافیاں نظر نہیں آتیں؟“ ہجوم کی آوازیں سنائی دیتیں۔

ہجوم میں ایک شخص ایسا بھی تھا جس کا لباس دوسروں سے بہتر تھا اور معلوم ہوتا تھا کہ اسے ہر شخص کے بارے میں علم ہے کہ کون کیا ہے۔ وہ اس زمانے کی انتہائی نامور اور اہم شخصیتوں کے نام لے کر ان کی آمد سے دوسروں کو مطلع کر رہا تھا۔

ایک تہا کی مہمان پہلے ہی پہنچ چکے تھے لیکن رستوں، جنہیں بھی وہاں موجود ہونا چاہیے تھا، ابھی تک تیاریوں میں پھنسے ہوئے تھے۔

اس اجتماعی رقص کی تقریب میں شرکت کرنے کے سلسلے میں رستوں گمرانے میں خوب بحثیں ہوئی تھیں اور انہوں نے تیاریاں کرنے میں بھی کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ انہیں بار بار یہ اندیشے لاحق ہوئے کہ انہیں شاید دعوت نامہ ہی نہ ملے، شاید مہوسات وقت پر تیار نہ ہو سکیں، شاید باعتبار نفاسات ہر چیز تک سک سے پوری طرح

درست نہ ہو۔

رستوفوف نے کاؤتس کی دیرینہ سہیلی اور قرابت دار، لاغر اندام اور زرد رو مار یا اگنا تھو یا پیرا سکایا کی، جو مادہ میر طورہ کی مصاحبہ تھی اور اپنے دیہاتی رشتے داروں کو پیٹرز برگ کے اعلیٰ ترین طبقوں میں متعارف کراتی تھی، دعوت میں جانا تھا۔

انھیں دس بجے محلہ تاور کی چسکی گارڈنز میں اس کے گھر پہنچنا تھا، لیکن دس بجنے میں پانچ منٹ رہ گئے اور لڑکیوں نے ابھی تک اپنے بیوسات نہیں پہنے تھے۔

ناتاشا نے، اپنی زندگی میں پہلی مرتبہ کسی مہتمم بالشان اور پر شکوہ بال میں شریک ہونا تھا۔ وہ اس روز صبح سویرے اٹھ بے ہی اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ اس کا سر اداں بھ گتے دڑتے اور تھرتھنی مچاتے گزرا تھا۔ وہ جس سے بے پروا ہوئی، اس وقت سے اس کا سارا زور اس بات پر صرف ہو رہا تھا کہ وہ سب۔ وہ خود اماں اور سونیا۔ حتیٰ لامکان اپنے بہترین ملبوسات پہنیں۔ سونیا اور کاؤتس آنکھیں بند کر کے اس کی ہدایات پر عمل کرنے لگیں۔ کاؤتس نے ارغوانی رنگ کا مٹھیس گاؤن پہنا تھا اور دونوں لڑکیوں نے گلابی ریشمی سے بازو کرتیوں کے اوپر سفید مہین جالی دار ریشمی ڈریس زیب تن کرنا اور اپنے ڈریسوں کے بالائی حصے پر گلاب کے پھول نکانا تھے۔ انھوں نے اپنے بالوں کی آرائش یونانی انداز (a la greque) سے کرنا تھی۔

آرائش جمال کے دار، ت پہلے ہی پورے کیے جا چکے تھے۔ ہاتھ، پاؤں، گردنیں، ورکاں ابھی طرح دھوئے اور صاف کیے جا چکے تھے اور جیسا کہ اجتماعی رقص کا تقاضا ہے، ان پر پرفیوم چھڑکی اور پاؤں پر لگا دیا جا چکا تھا۔ جالی دار ریشمی لیس کی لمبی جراثیں ورسفید سائن کے سلیر، جن کے اوپر پھندے لگے تھے، پہنے جا چکے تھے۔ زلفوں کی آرائش بھی تقریباً مکمل ہو چکی تھی۔ سونیا ویر کاؤتس دونوں لباس پہن چکی تھیں، لیکن ناشا، جو ہر ایک کا ہاتھ بٹانے کے لیے تلی کی مانند ادھر ادھر بھاگی پھر رہی تھی، پیچھے رہ گئی تھی۔ وہ ابھی تک آئینے کے سامنے بیٹھی تھی، بناؤ سنگار کے دوران میں جو ڈریسنگ گاؤن اوڑھا جانا تھا، وہ ابھی تک اس کے مہین شانوں پر ٹک رہا تھا۔ سونیا جو پوری طرح ملبوس ہو چکی تھی، کمرے کے عین درمیان میں کھڑی تھی اور آخری پھندا، لگا رہی تھی۔ اس نے ہن کا سراستے زور سے دہا کہ وہ چرچا تا فیتے میں گھس گیا لیکن جاتے جاتے اس کی نرم دنازک انگلی رخی کر رہی۔

”سونیا، ایسے نہیں، ایسے نہیں!“ ناتاشا نے گردن گھمانے اور دونوں ہاتھوں سے اپنے بالوں کو سنبھالنے ہوئے چلا کر کہا۔ اس کے یہ بال ابھی تک خامدہ کے، جو اس کا بناؤ سنگار کر رہی تھی، ہاتھوں میں تھے۔ ناتاشا کی تیزی سے گھوٹی تھی کہ اسے انھیں چھوڑنے کا موقع ہی نہ ملے۔

”تمہارا یہ پھندا درست نہیں لگا ہے۔ ادھر آؤ۔“

سونیا نیچے بیٹھ گئی اور ناتاشا نے پھندا ذرا مختلف انداز سے چسپاں کر دیا

”مس، اس طرح تو میں اپنا کام نہیں پوسکوں گی،“ خامدہ نے، جو ابھی تک اس کے بال سنبھالے ہوئے

تھی، کہا۔

”اللہ کی بندی، پھر ذرا صبر کر۔ ہاں سو نیا، اب ٹھیک ہے۔“

”آپ نوک تیار ہو گئیں یا نہیں؟“ کاؤنٹس کی آواز سنائی دی۔ ”دس بجنے کو ہیں۔“

”ابھی آئیں، ابھی آئیں! اماں، آپ تیار ہو گئیں؟“

”مجھے بس اپنے سر کے پٹکے کی پٹیں لگانا ہیں۔“

”آپ کچھ نہ کریں، مجھے آئیے دیں!“ نانا شانے چد کر کہا۔ ”آپ سے ٹھیک طرح نہیں لگیں گی۔“

”لیکن دس تو بج بھی گئے!“

انھوں نے اجتماعی رقص کی تقریب میں سڑھے دس بجے پہنچنے کا فیصلہ کیا تھا لیکن نانا شانے نے ابھی اپنا ڈریس پہنا تھا اور انھیں تاوری چسکی گارڈنز بھی جانا تھا۔

جب نانا شا کی کنگھی چوٹی ختم ہو گئی، وہ اپنا چھوٹا بچل کوٹ، جس کے نیچے اس کے رقص کے سلیپر پتی جھٹک دکھا رہے تھے، اور اپنی دسدہ کا بنناؤ سنگار کا ڈریسنگ گاؤن اوڑھے، بھاگم بھاگم سو نیا کے پاس پہنچی، اس کا بنظر غور جائزہ لیا اور پھر ای کی طرف بھاگ پڑی۔ اس نے کاؤنٹس کے سر کو کبھی ادھر اور کبھی ادھر گھمایا، اس کے پٹکے پر ہنسی لگائیں، جلدی جلدی اس کے سفید بالوں پر بوسہ دیا اور بھاگتی دوڑتی دوبارہ خادماؤں کے، جو اس کے ڈریس کے نیچے لگا رہی تھیں، پاس آ گئی۔

نانا شا کے ڈریس نے تاخیر کر دی۔ ڈریس ذرا لمبا تھا۔ دو خادماں اس کی جھلردہ ہری کیے ٹانگے لگا رہی تھیں، تیسری منہ میں ہنسی دبائے سو نیا سے کاؤنٹس کی جانب بھاگی جا رہی تھی در چوٹی اپنے ہاتھوں میں مہین جالی دار ریشمی ڈریس اوپر اٹھائے کھڑی تھی۔

”مادو، شا، ڈریسنگ، ذرا جلدی ہاتھ چلاؤ۔“

”مس، انگشتانہ پکڑانا، ادھر پڑا ہے۔“

”کبھی تیار ہوگی بھی یا نہیں؟“ کاؤنٹس نے دروازے کی جانب آتے ہوئے پوچھا۔ ”یہ لو، پرنیوم لگا لو۔ مادام عکراں کا یا انتظار کرتے کرتے تنگ آ گئی ہوں گی۔“

”مس، یہ لیں، تیار ہو گیا،“ خادمہ نے دو انگلیوں سے ڈریس، جسے ذرا چھوٹا کر دیا گیا تھا، اوپر اٹھاتے ہوئے کہا۔ وہ اس کی بھاڑوھاڑ کر رہی تھی اور پھونکیں، ہار مار کر اس پر سے کوئی چیز ہٹانے کی کوشش کر رہی تھی۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ اپنی اس حرکت سے وہ یہ ظاہر کرنا چاہتی ہے کہ جو کچھ وہ اپنے ہاتھوں میں تھامے ہوئے ہے، وہ اس کی پاکیزگی اور لطافت سے پوری طرح آگاہ ہے۔

نانا شا ڈریس پہنتے لگی۔

”ایک منٹ، ایک منٹ۔ پایا، اندر نہ آئیں!“ اس نے اپنے باپ سے کہا جو دروازہ کھول رہا تھا۔ اس کا

سر ڈریس کے بادل میں مستور تھا۔

سونیا نے کھٹاک سے دروازہ بند کر دیا۔ تاہم ایک منٹ بعد انھوں نے کاؤنٹ کو اندر بلا لیا۔ وہ نیا ڈریس کوٹ، لمبی جرابیں اور بکسوں کے دار جو تے پہنے اور پرفیوم اور پو، دلگائے ہوئے تھا۔

”پاپا، آپ تو بہت شاندار لگ رہے ہیں! ایک دم شاندار درخو بصورت!“ ناسا نے کہا۔ وہ کمرے کے بیچ میں کھڑی تھی اور اپنے ہمین ڈریس کی شکلیں درست کر رہی تھی۔

”مس، ذرا اجازت دیں۔“ ایک خادمہ نے کہا۔ وہ گھٹنوں پر جھکی اس کا ڈریس سیدھا کر رہی تھی۔ اس کے منہ میں ہنسی تھی۔ وہ انھیں زبان سے ایک جانب سے دوسری جانب پھر رہی تھی۔

”تم جو جی چاہے، کہو!“ سونیا نے ناسا کے ڈریس کا ناقہ اندھ جائزہ لیتے ہوئے منہ لٹکا کر کہا۔ ”تم جو جی چاہے، کہو لیکن یہ ہے اب بھی لمبا!“

ناسا ٹاپک کر دیواری آئینے کے سامنے جا کھڑی ہوئی تاکہ وہ اپنا جائزہ خود لے سکے۔ ڈریس کچھ زیادہ ہی لمبا تھا۔

”نہیں، مادم، یہ لمبا دیر نہیں ہے، بالکل نہیں!“ مادموٹا نے کہا۔ وہ اپنی نو جوان مالکہ کے پیچھے گھٹنوں کے بل ریختی آرہی تھی۔

”اگر یہ لمبا ہے، اسے ہم اور چھوٹا کر دیتی ہیں، بس ایک منٹ لگے گا!“ دھن کی پکی ڈنیا شانے رومال سے، جو اس نے بصورت صلیب اپنے سینے پر ٹانگا ہوا تھا، سوئی نکالتے ہوئے کہا۔ وہ دوبارہ گھٹنوں کے بل جھک گئی اور اس نے اپنا کام شروع کر دیا۔

اسی لمحے کاؤنٹس اپنے جھلیں گاؤن ورسر کا پنکا پہنے شرما تے لجاتے دے پاؤں کمرے میں داخل ہوئی۔

”اوہو میری پری پیکر!“ کاؤنٹ نے اپنے حلق کا پورا زور لگاتے ہوئے کہا۔ ”یہ تم دونوں سے زیادہ خوبصورت نظر آرہی ہے!“

وہ اسے اپنے بازوؤں میں سمیٹ لیتا لیکن وہ پیچھے ہٹ گئی۔ اسے ڈر تھا کہ کہیں اس کے لباس میں سلوٹنگ نہ پڑ جائیں۔

”ماما، آپ کا پنکا ایک طرف کھسک گیا ہے!“ ناسا نے کہا۔ ”آئیں، میں اسے دوبارہ ٹھیک کیے دیتی ہوں۔“ وہ ہرنی کی طرح یوں آگے کو بھاگی کہ خادما نہیں، جو اس کا ڈریس سنبھالے ہوئے تھیں، اس کا ساتھ نہ دے سکیں اور اس کے ڈریس سے ایک دھجی پھٹ کر علیحدہ ہو گئی۔

”خداوند رحم! یہ کیا ہوا؟ پر یہ میرا قصور تو نہیں۔“

”نکرنہ کریں۔ میں، بھی رفو کیے دیتی ہوں۔ کسی کو پتا نہیں چلے گا!“ ناسا نے کہا۔

”میری بھو! میری ننھی شہزادی!“ بوڑھی نرس نے دروازے کی جانب آتے ہوئے کہا۔ ”مادر سو نہوٹکا بھی!“

پرستیاں کی پریاں ہیں، پریاں!“

آخر سو، دس بجے وہ گاڑی میں بیٹھ گئے اور چل پڑے۔ لیکن ابھی انھیں تادری چسکی گاڑی نہ جانا تھا۔

پیرانہ کایا تیار ہو چکی تھی اور ان کا منظر کر رہی تھی۔ پیرانہ سالی اور سپاٹ نقوش کے باد جو درستونوں کی طرح اس نے بھی ہناؤ سگار میں کوئی کسر ہاتی نہ چھوڑی تھی، تاہم اس نے کوئی شور شرابا نہیں کیا تھا کیونکہ اس کے لیے یہ معمول کی بات تھی۔ اس کا بھدا اور غیر دلکش بدن انھی کی طرح نہلا دھلا کر صاف کیا گیا تھا اور اس پر بھی ویسے ہی پرفیوم اور پاؤڈر لگایا گیا تھا۔ اس کے کانوں کی لوہی بھی بالکل انھیں کی طرح احتیاط سے دھو دھو کر صاف کی گئی تھیں اور جب وہ زرد گاون پہنے اور سینے پر اپنا اعزاز، جس پر مادہ امپراطورہ کا سونہ گرام نقش تھا، بجائے ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی، اس کی ادھیڑ عمر خادمہ نے بھی رستونوں کے ملازمین کی طرح ”واہ، واہ، اور سبحان اللہ“ کے ڈونگرے برمائے تھے۔

اس نے رستونوں کے اور انھوں نے اس کے ملبوسات کی تعریف کی اور وہ گیارہ بجے اپنے بالوں اور گاڑیوں کو سنبھالتے گاڑیوں میں بیٹھ گئے اور اپنی منزل کی طرف چل پڑے۔

15

نچ سویرے سے مناشہ کو ایک لمحہ بھی ایسا، جسے وہ اپنا کہہ سکتی، میسر نہیں آیا تھا اور نہ اسے یہ سوچنے کا کہ اسے کن حالات میں سے گزرنا پڑے گا، کوئی موقع میسر آیا تھا۔

وہ ٹھنڈی سرخوب ہوا، درجہ صحت، ڈنگماتی گاڑی کی نیم تاریکی میں مٹی سٹائی بیٹھی تھی اور اسے پہلی مرتبہ یہ موقع ملا تھا کہ وہ اپنے ذہن میں ان تمام اشیاء اور امور — موسیقی، پھول، رقص گرمی، زار، پیٹرز برگ کے تمام ہانکے سچلے نوجوانوں کا جن سے اس کا اجتماعی رقص اور جگمگاتی روشنیوں سے منور ہال کمروں میں واسطہ پڑنا تھا، واضح نقشہ بنا سکے۔ امکانات اتنے رفیع انشان اور سہانے تھے کہ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کچھ سچ ہو سکتا ہے کیونکہ اس وقت وہ جس گاڑی میں بیٹھی تھی، اس کے باہر اتنی ٹھنڈک اور اس کے اندر اتنی تاریکی اور تنگی تھی کہ دونوں کی ایک دوسرے سے کوئی مناسبت نظر نہیں آتی تھی۔ اسے کن چیزوں سے نپٹنا تھا اس کا اندازہ اسے بھی ہوا جب وہ صدر دروازے سے سرخ بانات پر چلتی پیش دِلان میں پہنچی، پنا پختا اتارا اور سونیا کی معیت میں اپنی امی کے آگے گئے پھولوں کے پتوں بیچ چلتی دینے، جو روشنیوں میں نہایا ہوا تھا، چڑھنے لگی۔ صرف اب اسے یاد آیا کہ اسے اجتماعی رقص پر کیا رویہ اختیار کرنا چاہیے اور اس نے وہ پر شکوہ انداز، جو اس کے خیال کے مطابق ایسے موقع پر نوجوان لڑکیوں کے لیے ضروری ہوتا ہے، اپنانے کی کوشش کی۔ لیکن اسے اس کی خوش قسمتی ہی کہیں کہ اس کی آنکھیں اتنی چند عیاں تھیں کہ اسے کوئی چیز صاف دکھائی نہیں دے رہی تھی، اس کی نبض کی رفتار فی منٹ سو تک پہنچ چکی تھی اور اس کا خون اس کے دل میں نہایت تیزی سے گردش کرنے لگا تھا۔ ان حالات میں اس کے لیے اس قسم کا پوز بنانا، جو

اسے دوسروں کی نگاہوں میں ٹکو بنانا تھا، ناممکن ہو گیا۔ وہ اپنے قدم آگے بڑھائے جارہی تھی۔ اس کے دل میں جو بل چل رہی تھی، اس سے اس کے ہوش و حواس تقریباً معطل ہوتے جا رہے تھے۔ ورنہ اپنی اس بل چل کو بچھانے کی پوری سعی کر رہی تھی۔ اس کی یہی وہ ادا تھی جو اس پر صبح معنوں میں پھیلتی تھی۔ ان کے آگے پیچھے دیگر مہمانوں نے بھی لمبے گاؤں پہنے ہوئے تھے اور وہ زیر لب باتیں کرتے جا رہے تھے۔ ذہین کے ساتھ ساتھ دیواروں پر جو آئینے نصب تھے، ان میں سفید، ہلکے نیلگوں اور گلابی گاؤں پہنے اور اپنے برہنہ بازوؤں اور سینوں پر میرے جو، ہرات سجائے خواتین کے عکس دکھائی دے رہے تھے۔

نشاٹا نے آئینوں میں جھانک کر دیکھا اور اسے اپنے اور دوسروں کے عکس میں کوئی فرق نظر نہ آیا۔ سبھی جھلملاتے، چمچھاتے حلوس میں گھل مل کر یک ہو گئے تھے۔ انسانی آوازوں، قدموں کی چاپوں اور علیک سلیک کے مسلسل شور و غل نے نشاٹا کے کان بہرے کر دیے۔ روشنیوں کی جگمگاہٹ اور چمک دمک نے اس کی آنکھیں چندھیا دیں۔ میزبان اور اس کی اہلیہ نے، جنھیں دروازے پر کھڑے کھڑے آدھ گھنٹے سے ادھر گزر چکا تھا اور جو ہر نئے مہمان کی آمد پر ایک ہی جملہ "Charme de vous voir" دہرائے جا رہے تھے، دستوفوں اور پیرانسا کا یاگا بھی اسی طرح استقبال کیا۔

دونوں لڑکیاں، جو سفید ڈریس پہنے اور اپنے سیاہ بالوں میں گلاب کا ایک ایک پھول ٹکائے ہوئے تھیں، بالکل یکساں انداز سے جھک کر آداب بجاوائیں لیکن میزبان کی اہلیہ کی نگاہیں غیر ارادی طور پر نشاٹا کے اکھرے جسم پر زیادہ دیر تک لگی رہیں۔ اس نے اس کا جس مسکراہٹ سے خیر مقدم کیا، وہ اس مسکراہٹ سے، جس سے وہ دوسرے مہمانوں کا استقبال کر رہی تھی، کچھ زیادہ بامعنی تھی، اسے دیکھ کر اسے شاید اپنے لڑکپن کا وہ سنہری زمانہ، جب وہ بھی اپنے او میں بال میں شریک ہوئی ہوگی، یاد آگیا ہو لیکن وہ زمانہ ہمیشہ ہمیش کے لیے ہاتھوں سے نکل چکا تھا اور اس کے دوبارہ گرفت میں آنے کا امکان قطعی ختم ہو چکا تھا۔ میزبان نے بھی اپنی نگاہوں سے نشاٹا کا تعاقب کیا اور اس نے کاؤٹ سے دریافت کیا "آپ کی صاحبزادی کون ہے؟"

"Charmantel" اس نے اپنی انگلیوں کی پھٹکیں چومتے ہوئے کہا۔

زار کے انتظار میں مہمان بال روم میں دروازے کے قریب جھوم کیے کھڑے تھے۔ گاؤٹنس نے اس گردہ کی پہلی قطار میں پوزیشن سنبھال لی۔ نشاٹا کو سنائی بھی دے رہا تھا اور محسوس بھی ہو رہا تھا کہ متعدد اشخاص اس کے بارے میں چہ میگوئیاں کر رہے اور اسے دیدے پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہے ہیں۔ اسے احساس ہوا کہ جن لوگوں کی نظریں اس پر پڑی ہیں، اس نے ان پر اچھا تاثر چھوڑا ہے۔ اس مشاہدے سے اس کے جذبات میں قدرے ٹھہراؤ آگیا۔

"ان میں سے بعض تو ہمارے ہی جیسے ہیں اور بعض بالکل ہی گئے گزرے ہیں،" اس نے سوچا۔

• آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔

• سحرانگیز پرکشش

ہال میں جو ممتاز شخصیات آئی تھیں، پیرنس کا یا ہاتھ کے اشارے سے کاؤنٹس کو ان کے بارے میں بتا رہی تھی۔
 ”وہ ولندیزی سفیر ہے۔ نظر آیا؟ وہ جس کے ہاں سفید ہیں،“ اس نے ایک بزرگ شخص کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ اس شخص کے سر پر چاندی کے بالوں کا زبردست جھمکا تھا۔ اس کے گرد پیش خواتین نے گھیرا زال رکھا تھا۔ وہ انھیں کچھ بتا رہا تھا اور وہ خوب تہمتیں لگا رہی تھیں۔

’اور یہ وہی پیئر بزرگ کی ملک کاؤنٹس بزدخود!‘ اس نے ہیلین کی طرف، جو ابھی ابھی اندر آئی تھی، انگلی ہراتے ہوئے کہا۔ ”کتنی خوبصورت ہے! یہ صحیح معنوں میں ماریا آنتونوونا³² سے نکلے سکتی ہے۔ اور دیکھو، بڑھے اور جوان ہر عمر کے مرد کس طرح اس کے آگے پیچھے پھر رہے ہیں۔ وہ حسین بھی ہے اور تیز طرار بھی۔ کہتے ہیں کہ پرس۔ اس کے عشق میں پاگل ہو جا رہا ہے۔ اور ان دونوں کو دیکھو، اگرچہ حسن نام کی کوئی چیز انھیں چھو کر بھی نہیں گزری، پھر بھی ان کی مانگ بے حد زیادہ ہے۔“

اس نے ایک خاتون کی طرف، جو اپنی بالکل معصومی شکل و صورت والی بیٹی کے ہمراہ کمرے میں سے گزر رہی تھی، اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”یہ لوٹیا لاکھوں کروڑوں کی دارت ہے،“ پیرنس کا یا نے کہا۔ ”اور یہ ہے اس کے چاہنے والے۔“

’دہ کاؤنٹس بزدخود کا بھائی انا طول کوراگن ہے،‘ اس نے ہارس گارڈز کے ایک خوب ردا فر کی طرف، جو سیڑھا تن کر ان کے قریب سے گزر رہا تھا اور خواتین کے سروں کے اوپر ہی دپر کوئی چیز دیکھ رہا تھا، انگلی ہراتے ہوئے کہا۔ ”وجہ انکلیل۔ ہے؟ مجھے معلوم ہوا ہے کہ وہ اس لاکھوں کروڑوں کی دارت سے شادی کرے گا۔ اور تمہارا کزن درویش کو بھی اس کے تلوے چاٹ رہا ہے۔ سنا ہے کہ لاکھوں کروڑوں... رہے ہاں، وہ فرانسیسی سفیر ہے،“ اس نے گوین کو رخ کے متعلق کاؤنٹس کے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا۔ ”دیکھو تو سہی۔ بالکل بادشاہ سلامت نظر آتا ہے! بہر حال یہ فرانسیسی ہوتے ہی بڑے من موہنے اور فسوں ساز۔ سوسائٹی میں ان سے بڑھ کر خوبصورت اور دل کش شکلیں کہیں نہیں ملیں گی۔ اور ہاں، یہ وہی وہ! ہاری ماریا آنتونوونا، اس جیسی ڈھونڈے سے بھی کہیں نہیں ملے گی! دیکھو تو، اس نے کتنا سادہ لباس پہنا ہوا ہے! لیکن کتنا خوبصورت اور دل آویز ہے! وہ ہٹا کٹنا شخص، جس نے نینک لگائی ہوئی ہے، بہت بڑا فری مین ہے،“ اس نے پیئر بزدخوف کا ذکر کرتے ہوئے کہا۔ ”اس کو اگر اس کی بیوی کے ساتھ کھڑا کر دیا جائے، بالکل مسخرہ نظر آئے گا۔“

پیئر ہیوم میں راستہ بناتے آگے جا رہا تھا۔ اس کا بھاری بھر کم جسم جھول رہا تھا اور وہ دیکھیں بائیں یوں لا تعلق اور خوش طبعی سے گردن گھما کر سلام کرتا جا رہا تھا جیسے وہ کسی سیلے میں پھر رہا ہو۔ وہ جس انداز سے دھکم پیل کرتا ہوا آگے جا رہا تھا، معلوم ہوتا تھا کہ اسے کسی شخص کی تلاش ہے۔

شاہ شامکر (اور بقول پیرنس کا یا ”مسخرہ“) کا جانا پہچانا چہرہ دیکھ کر باغ باغ ہو گئی۔ وہ جان گئی کہ وہ جن لوگوں کو دھونڈ رہا ہے، وہ اس کے گھر والے اور خاص طور پر وہ خود ہے۔ پیئر نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ وہ آئے گا اور اس

کے لیے رقص کے ساتھی تلاش کرے گا۔

لیکن چیستر اس کے کہ پیٹر ان تک پہنچ یا تا وہ ایک وجہہ ونگیل سانو نے نو جوان کے، جس کا تودر میاں اور جو سفید وردی میں ملبوس تھا، قریب رک گیا۔ یہ نو جوان ایک بندہ قامت شخص کے ساتھ، جس کے سینے پر تھنے اور نیچے آویزاں تھے، جو گفتگو تھا۔ ناشائے جھٹ پٹ اس سفید وردی میں ملبوس میاںہ قامت اور خوب روٹو جوان کو پہچان لیا۔ وہ اسے پہلے کی نسبت کہیں کم عمر، زیادہ خوش و خرم اور خوش شکل نظر آیا۔

”یہاں ایک اور آدمی، جسے ہم جانتے ہیں،۔۔۔ بلکونسکی۔۔۔ بھی ہے۔ ماما، دیکھ آپ نے؟“ ناشائے پرنس آندرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”آپ کو یاد ہوگا کہ یہ ایک رات ہمارے گھر اتر آدنا یا ٹھہرا تھا۔“

”ارے، تم اسے جانتی ہو؟“ پیٹر اسکا یا نے دریافت کیا۔ ”مجھ سے یہ شخص برداشت نہیں ہوتا۔ آج کل ہر کوئی اس کے پیچھے بھاگ رہا ہے۔ اس شخص کا داغ۔۔۔ اللہ تو ہے۔۔۔ بالکل آسمان تک پہنچا ہوا ہے۔ ہو ہوا اپنے باپ کی نقل ہے۔ آج کل یہ رانسکی سے اس کی گاڑھی چھنتی ہے۔ دونوں کسی منصوبے پر کام کر رہے ہیں۔ دیکھو، یہ خواتین کو جوتی کی نوک پر نہیں رکھتا۔ وہ خاتون اس سے بات کرنے کی متمنی ہے اور یہ ہے کہ اس کی طرف پیٹر کے کھڑا ہو گیا ہے،“ اس نے اس کی جانب انگلی لہراتے ہوئے کہا۔ ”یہ جس قسم کا سلوک ان خواتین کے ساتھ کر رہا ہے، میرے ساتھ کرے تو میں اسے وہ سناؤں کہ اسے چھٹی کا دودھ یاد آ جائے!“

16

چانک ہجوم میں بل چل چل گئی۔ لوگ کھسر پھسر کرنے لگے۔ وہ آگے بڑھے اور پھر پیچھے ہٹ گئے۔ یوں وہ قطاروں میں بٹ گئے۔ ان قطاروں کے بیچ جو راستہ بنا، اس پر آرکسٹرا کی، جو اس کی آمد پر بجنے لگا تھا، دھنوں کا ساتھ دیتے زار گزرنے لگا۔ اس کے پیچھے پیچھے میزبان اور اس کی اہلیہ آ رہے تھے۔ زار یوں تیز قدم اٹھاتے اور دائیں بائیں سر جھکاتے جا رہا تھا جیسے وہ ان ابتدائی رکی کارروائیوں سے جلد از جلد جان چھڑانے کی فکر میں ہو۔ آرکسٹرا پولستانی رقص کی، جس کا اس زمانے میں بہت رواج ہو چلا تھا، دھنیں بکھیر رہا تھا۔ مقبولیت کا سبب وہ بل تھے جو ان میں سوئے گئے تھے۔ نغمے کی بتدان، لفظ سے ہوتی تھی: ”ایلیسا اندر، ایلیزا اوتار، تم نے ہمارے دل کو لیے ہیں۔“ زار چلتے چلتے ڈرائنگ روم میں داخل ہو گیا۔ ہجوم دروازوں پر پل پڑا۔ دھکم پیل ہو رہی تھی۔ کسی نے اگلی جانب دھکا کھایا اور کسی نے پچھلی جانب۔ سب کے چہرے متقلب ہو چکے تھے۔ تاہم ڈرائنگ روم کے دروازوں پر بھیڑ چھٹ گئی۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہاں زار اپنے میزبان کی اہلیہ کے ساتھ مصروف گفتگو ہے۔ ایک نو جوان نے جو چہرے مہرے سے بدحواس نظر آ رہا تھا، خواتین پر یلغار کردی اور ان سے التجائیں کرنے لگا کہ وہ پیچھے ہٹ جائیں۔ متعدد عورتیں، جن کی صورتیں یہ غمازی کر رہی تھیں کہ وہ شائستگی کے تمام آداب بالائے طاق رکھ چکی ہیں آگے دھکم پیل کرنے لگیں اور انھیں اتنا خیال بھی نہ رہا کہ اس طرح ان کے قیمتی ملبوسات کا ستیا اس ہو رہا ہے۔ جہاں تک

مردوں کا تعلق ہے، وہ اپنی ساتھی خواتین منتخب کرنے اور پولستانی رقص کے لیے اپنی اپنی جگہیں سنبھالنے لگے۔ ہر شخص پیچھے ہٹ گیا، جگہ خالی ہو گئی اور متبسم زار اپنے میزبان کی اہلیہ کے ہاتھوں میں ہاتھ دے ڈرائنگ روم سے برآمد ہو، لیکن اس کی چال موسیقی کی لے کا ساتھ نہیں دے رہی تھی۔ اس کے پیچھے پیچھے اس کا میزبان زار کی چہیتی مار یا آتھو دنا نارش کیٹا کی معیت میں آ رہا تھا۔ اس کے عقب میں سفیر، وزیر اور مختلف جرنیل تھے۔ پیرانکا یا باری باری سب کے نام گنوا رہی تھی۔ نصف سے زیادہ خواتین کو ساتھی مل چکے تھے اور وہ رقص کے لیے اپنی جگہیں سنبھال چکی تھیں یا سنبھالنے میں مصروف تھیں۔

نشا کو محسوس ہوا کہ وہ، اس کی ماں اور سونیا اس اقلیت کے ساتھ، جو دیوار کے قریب ہجوم کیے تھی، کھڑی کی کھڑی رہ جائیں گی کیونکہ کسی نے بھی انھیں رقص کی دعوت نہیں دی تھی۔ وہ اپنے دبے پتلے بازو اپنے پہلوؤں کے ساتھ لٹکائے وہاں کھڑی تھی۔ اس کا سینہ، جس کا ابھارا بھی ٹھیک طرح واضح نہیں ہوا تھا، باقاعدہ رفتار سے اوپر نیچے اٹھ رہا تھا۔ وہ دم سادھے، پی جگہ گاتی خوف زدہ نگاہوں سے ٹکر ٹکر ناک کی سیدھ دیکھ رہی تھی۔ قرآن سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ بے پناہ مسرت یا بے پناہ گھٹت دونوں کے لیے تیار ہے۔ اسے نہ زار میں کوئی دلچسپی تھی اور نہ ان شخصیات میں، جن کی طرف پیرانکا یا اشارے کر رہی تھی۔ اس کے ذہن میں صرف ایک ہی خیال گردش کر رہا تھا۔ ”کیا یہ ممکن ہے کہ کوئی بھی مجھے بلائے نہ آئے؟ پہلے رقص میں جو خواتین شریک ہوں گی، کیا میں ان میں شامل نہیں ہوں گی؟ کیا یہ ممکن ہے کہ ان مردوں میں کوئی بھی مجھے التفات کے قابل نہ سمجھے؟ مجھے تو یوں دکھائی دیتا ہے کہ میں انھیں نظر ہی نہیں آ رہی اور اگر کسی کو نظر آ بھی رہی ہوں، کچھ یوں معلوم ہوتا ہے کہ جیسے وہ کہہ رہے ہوں، ”نہیں، یہ وہ نہیں جس کی مجھے تلاش ہے، پھر اس کی طرف دیکھنا لا حاصل ہے۔“ نہیں ایسا نہیں ہو سکتا، اس نے سوچا۔ ”انھیں معلوم ہونا چاہیے کہ میں رقص کے لیے کتنی بے تاب ہوں، میں کتنا شاعرانہ رقص کرتی ہوں اور میرے ساتھ رقص کرنے میں انھیں کتنا لطف آئے گا۔“

پولستانی نغمے کی دھنیں، جنہیں چھڑے کچھ وقت گزر چکا تھا، اب نشا کے کانوں میں کسی مغموم یا کی طرح افسردہ آوازیں بن کر گونجنے لگیں۔ اس کا رونے کو جی چاہتا تھا۔ پیرانکا یا انھیں چھوڑ کر جا چکی تھی۔ کاؤنٹ بال روم کے دوسرے کنارے پر تھا اور وہ، کاؤنٹس اور سونیا جنہیوں کے اس ہجوم میں اسی طرح یکدہ تھیں جس طرح وہی جنگل کے عین قلب میں ہوتا ہے۔ ان میں نہ کوئی دلچسپی لے رہا تھا اور نہ وہ کسی کے مطلب کی تھیں۔ پرنس آندرے ایک خاتون کی معیت میں آیا اور ان کے عین قریب سے گزر گیا۔ صاف ظاہر تھا کہ اس نے انھیں پہچاننا ہی نہیں تھا۔ خوب روانا طول مسکرا مسکرا کر اپنی ساتھی سے باتیں کر رہا تھا اور اس نے نشا کے چہرے کی جانب یوں دیکھا، جیسے وہ کوئی دیوار کو دیکھتا ہے۔ یورس دوم مرتبہ ان کے قریب سے گزرا تھا اور ہر مرتبہ اس نے وہاں نہ دوسری طرف پھیر لیا تھا۔ برگ اور اس کی جیون ساتھی رقص نہیں کر رہے تھے۔ وہ ان کے پاس آ گئے۔

یہاں بال روم میں خاندانی بے تکلفی نشا کے لیے سوہان روح تھی۔ گویا اس خاندان کو اجتماعی رقص کی

تقریب کے ماسوا باتیں کرنے کے لیے اور کوئی موقع در مقام میسر نہیں آسکا تھا اس نے ویرا کی طرف، جو انہیں اپنے سبز اریس کے بارے میں کچھ بتا رہی تھی، منہ آنکھ اٹھ کر دیکھا اور اس کی کوئی بات نہ کی۔

آخر کار زارا اپنی آخری ہم رقص کے قریب رک گیا (وہ تین خواتین کے ساتھ رقص کر چکا تھا) اور موسیقی ختم گئی۔ ایک ایڈی کا ٹنگ، جو ضرورت سے زیادہ مستعدی کا مظاہرہ کر رہا تھا، لپکتا، چپکلا رستوفوں کے پاس پہنچا اور اس سے کہنے لگا کہ وہ مزید پیچھے ہٹ کر کھڑے ہو جائیں حالانکہ وہ پہلے ہی دیوار سے لگ کر کھڑے تھے، دراصل گیلری سے والز کی بالکل صحیح، پر شکوہ اور دلکش دھنوں کی آواز سنائی دینے لگی۔ زارا نے مسکرا کر بال روم میں نگاہ دوڑائی۔ ایک منٹ گزر گیا۔ ابھی تک کسی نے بھی رقص کا آغاز نہیں کیا تھا۔ ایک ایڈی کا ٹنگ، جو میر شریفیت ³³ تھا، کاؤنٹس بزدخودا کے پاس پہنچا اور اس سے اپنے ساتھ رقص کی فرمائش کی۔ وہ مسکرائی، اس نے اپنا بازو بند کیا اور اس کی طرف دیکھے بغیر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ ایڈی کا ٹنگ نے، جو اپنے فن کا استاد تھا، اسی ہم رقص کی کمر پر ہاتھ ڈالا، مضبوطی سے اسے پتی گرفت میں لیا، اور پراعتاد لیکن دھیمے انداز سے تھرکنے لگا۔ اس کی حرکات میں ملائت تھی۔ اس نے یوں ہی دائرے کے گرد پہلا چکر لگایا۔ جب وہ کمرے کے کونے میں پہنچا، اس نے ہیلین کا بایاں ہاتھ پکڑا اور اسے گھمایا۔ موسیقی کی لے کے عدوہ، جو ہر دم تیز ہوتی جا رہی تھی، کمرے میں جو واحد آواز سنائی دے رہی تھی، وہ اس کے تیز اور پھرتیلے پاؤں پر مہیڑوں کی ہم آہنگ بھنگا رہی اور ہر تیسری تپاں پر اس کی ہم رقص کی پھلیں سکرٹ فضا میں یوں اچھلتی جیسے دریا میں پانی کی موج اٹھ رہی ہو جب کہ وہ خود گولے کی طرح گھوم رہی ہوتی۔ مناشا کی نگاہیں ان پر جمی ہوئی تھیں اور وہ آبدیدہ ہو رہی تھی کیونکہ دائرے کے پہلے دور میں جو خاتون رقص کر رہی تھی وہ، وہ خود نہیں تھی۔

پرنس آندرے، جس نے گھڑ سوار فوج کے کرنل کی سفید وردی، لمبی ریشمی جرابیں اور رقص کے جوتے پہن رکھے تھے، رستوفوں سے کچھ ہی دور کھڑا تھا۔ وہ جوش و خروش سے لبریز اور بے حد خوش و خرم نظر آ رہا تھا۔ اگلے روز کونسل آف سٹیٹ کا جوابدہائی اجلاس منعقد ہونا تھا، بیرن فرہوف اس سے اس کے بارے میں گفتگو کر رہا تھا۔ پرنس آندرے کو ایک توپے رانسکی کا قرب حاصل تھا، دوسرے وہ قانون ساز کش کے کام میں بھی ہاتھ بٹاتا تھا، اس لیے وہ اس حیثیت میں تھا کہ وہ اس اجلاس کے متعلق، جس کے بارے میں متضاد افواہیں پھیل رہی تھیں، مصدقہ معلومات فراہم کر سکے۔ تاہم اس کے کان لڑھوف کی باتوں پر نہیں تھے بلکہ اس کی نگاہیں کبھی زارا پر اور کبھی ان مردوں پر، جو رقص کرنے کے لیے پر تول رہے تھے لیکن ابھی تک اس میں شریک ہونے کی ہمت نہیں کر سکے تھے، مرکوز تھیں۔

جب پرنس آندرے ان مرد حضرات کو، جو امیر اطور کی موجودگی میں محبوب ہو رہے تھے اور ان خواتین کو، جو رقص کی دعوت حاصل کرنے کے لیے مری جا رہی تھیں، دیکھ رہا تھا، جیتر اس کے پاس آیا اور اس سے اسے بازو سے پکڑ لیا۔

”تم ہمیشہ رقص کرتے رہتے ہو۔ میں بھی ایک دو شیزہ کا مرتبی ہوں۔ وہ رستوفوں کی چھوٹی صاحب زادی

سے۔ اسے ضرور دعوت دو۔“

”کہیں ہے وہ؟“ بکلوئسکی نے پوچھا۔ ”معافی چاہتا ہوں،“ اس نے بیرن سے مخاطب ہو کر کہا۔ ”ہم یہ گفتگو کسی اور موقع کے لیے اٹھائے رکھتے ہیں۔ بال پر تو رقص ہی کرنا چاہیے۔“

بیرن نے بدھرا اشارہ کیا تھا اس نے ادھر قدم بڑھایا اور معا اس کی نظر نٹاشا کے او اس اور پڑ مردہ چہرے پر پڑی۔ وہ اسے پہچان گیا اور تاڑ گیا کہ یہ اس کا افتتاحی بال ہے۔ اس نے اس کے احساسات و جذبات کے متعلق قیاز لگالیا اور اسے وہ گفتگو، جو اس نے نادانستہ در پیچے کے او پر سنی تھی، یاد آگئی۔ وہ اپنے چہرے پر مسرت مسکراہٹ چائے کا ڈنٹس رستورہ کی طرف چل دیا۔

”اگر آپ برا نہ منائیں، تو میں اپنی بیٹی کا تعارف آپ سے کرادوں؟“ کا ڈنٹس نے کہا۔ اس کے چہرے کا رنگ سرخ ہو رہا تھا۔

”کا ڈنٹس، اگر آپ کو یاد ہو تو میں یہ عرض کر دوں گا کہ مجھے ان سے پہلے ہی تعارف حاصل ہے،“ پرنس آندرے نے ذرا جھک کر اور شائستہ انداز سے سلام کرتے ہوئے کہا۔ پیرنس کا یا نے اس کی بے سیلفگی اور ناتراشیدگی کا جو نقشہ کھینچا تھا، اس نے اپنے قول و فعل سے اسے جھٹکا دیا۔

پھر وہ نٹاشا کی طرف مڑا اور ابھی اسے ہم رقص بننے کی دعوت مکمل بھی نہیں کر پایا تھا کہ اپنا بازو اس کی کمر کے گرد حائل کر دیا۔ اس نے تجویز پیش کی انھیں والز کا چکر لگانا چاہیے۔ نٹاشا کے چہرے پر کچھ اس قسم کی برزیدگی طاری تھی کہ یوں لگ رہا تھا کہ اس نے یہ تو مسرت کی انتہائی بلند یوں کو چھو دیا ہے یا پھر وہ مایوسی کی اتھوہ گہرائیوں میں گر چکی ہے۔ آناٹا اس کا چہرہ کھل ٹھا اور وہاں پر مسرت، پر تشکر اور بچوں کی معصوم مسکراہٹ کھینے لگی۔

”میں تو روؤ ازل سے تمہارا انتظار کر رہی ہوں!“ جب خوف زدہ مسرور منظمی منی لڑکی نے اپنا ہاتھ اٹھا کر پرنس آندرے کے شانے پر رکھا، وہ کہتی محسوس ہو رہی تھی۔ اس کے چہرے پر وہ تبسم تھا جس نے آنسوؤں کے مابین، جو اس کی آنکھوں سے چھلکا ہی چاہتے تھے، اس کے خدو خاں کو جلا بخش دی تھی۔ رقص کے دائرے میں شامل ہونے والا یہ دوسرا جڑا تھا۔ پرنس آندرے کا شمار اپنے زمانے کے بہترین رقاصوں میں ہوتا تھا اور نٹاشا نہایت نفاست سے رقص کرتی تھی۔ اس کے ننھے سنے پاؤں، جو سائٹن کے بنے رقص کے سیپروں میں مستور تھے، اس نزاکت اور ہنسی رفتاری سے حرکت کر رہے تھے کہ معلوم ہوتا تھا کہ ان میں پر لگ گئے ہیں جب کہ مسرت و شانائی نے اس کے چہرے پر رونق پیدا کر دی تھی اور وجد طاری کر دیا تھا۔ اس کی دلیلی پتلی گردن اور برہنہ بارواختے خوبصورت نہیں تھے اور ہیلینا کے مقابلے میں اس کے شانے مہین اور اس کے سینے کا ابھار غیر واضح تھا۔ لیکن معلوم ہوتا تھا کہ مہین کے بدن پر، اس پالش کی، جو ان ہزاروں آنکھوں نے جو اس کے جسم کو کھنگالتی رہی تھیں، وہاں چھوڑا تھا، جہیں چھبکی ہیں۔ اس کے برعکس نٹاشا نو خیز و شیرازہ تھی۔ یوں نظر آتا تھا کہ اس نے زندگی میں پہلی مرتبہ کھلے گلے کا لباس (decollatee) پہنا ہے اور اگر اسے یہ یقین نہ دیا جاتا کہ اس نے جو کچھ زیب تن کیا ہے، وہ بالکل

مناسب ہے، وہ شرم سے پانی پانی ہو جاتی۔

پرنس آندرے رقص کر رہا تھا کیونکہ رقص کرنے میں اسے طوف آتا تھا۔ اس کے رقص کرنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اسے ہر شخص سیاسی وردانش و رانہ گفتگو میں گھسیٹنے کی فکر میں تھا، ورنہ اسے اس سے فرار حاصل کرنے کے لیے بہانہ درکار تھا۔ پھر ایک بات اور بھی تھی۔ زار کی موجودگی نے، حول میں جو گھٹن پیدا کر دی تھی اور ہر شخص کو مضبوطی برتنے پر مجبور کر دیا تھا، وہ اس قسم کے دباؤ، رہنمائیوں کو توڑ دینا چاہتا تھا۔ اس نے مناشا کو اس لیے ہم رقص کے طور پر منتخب کیا تھا کیونکہ اس کی توجہ دینے اس کی طرف دلائی تھی اور پھر وہ پہلی خوش اندام دشرہ تھی جس پر اس کی نظر پڑی تھی۔ تاہم اس نے جو بھی اپنے بازو اس کی دلی پک، کچک دار اور لرز کر کے گرد حاکم کیے، اس کے دل کو اپنے اتنا قریب دھڑکتے اور سے اپنے چہرے کے اتنا نزدیک سکراتے دیکھا، تو اس کی دس کشی اور رعنائی ہنت العصب کی طرح اس کے دماغ کو چڑھ گئی۔ اسے محسوس ہوا کہ وہ از سر نو جوان ہو گیا ہے اور اس کے جذبات کو نئی جلاں گئی ہے۔ اس نے گہری سانس لی، اسے اپنے سے الگ کیا اور محو رقص دوسرے جوڑوں کو دیکھنے لگا۔

17

پرنس آندرے کے بعد بورس مناشا کو رقص کی دعوت دینے آیا۔ پھر وہ یڈی کانگ، جس نے بال کا آغاز کیا تھا اور متعدد دوسرے نوجوان آئے۔ خوشی سے مناشا کا چہرہ ہنسنا رہا تھا۔ وہ اپنے خالتو، ہم رقصوں کو سونیا کے حوالے کر دیتی تھیں خود اقیہ سارا وقت رقص میں مصروف رہی۔ باقی لوگوں کو جن چیزوں میں دلچسپی تھی، اس نے نہ تو نگاہ اٹھا کر ان کی طرف دیکھا اور نہ ان پر کوئی توجہ دی۔ وہ نہ صرف یہ دیکھنے میں ناکام رہی کہ زار خاصا طویل عرصہ فرانسیسی سفیر سے باتیں کر رہا تھا، اور جب وہ ایک خاص خاتون سے محو کلام تھا اس کا رویہ بالخصوص مشفقانہ و کریم گستاخانہ تھا، یا فلاں فلاں صاحب اور فلاں فلاں پرنس نے یہ کیا یا وہ کہا تھا، یا ہیلین نے بھرا میلہ لوٹ لیا تھا اور فلاں فلاں حضرت نے اس پر خاص طور پر التماس کی یا رش کی تھی، بلکہ اس نے تو زار کو نگاہ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا تھا اور اسے اس کی روانگی کا علم بھی محض اس لیے ہوا تھا کیونکہ اس کے رخصت ہو جانے کے بعد رقص میں ایک ایک کی جان پڑ گئی تھی اور اس میں بڑی تیزی آگئی تھی۔

پرنس آندرے سے قبل فرانسیسی رقص کوتیلیوں (Cotillions) کے، جو خود بھی اور جس کی دھنیں بھی اہل ان شوق اور پھل ہوتی ہیں، دوران میں پرنس آندرے نے ایک بار پھر مناشا کو اپنی ساتھی بنایا۔ اترا دایا کے خیال میں ان کی جو اولین مدد بھیٹر ہوئی تھی، اس نے اسے وہ یاد دلائی اور اس نے اسے یہ بھی بتایا، ”اس چاند رات صبحیں بند نہیں رہی تھی اور میں نے مقصد تمھاری باتیں سن لی تھیں۔“ یادوں کے اس اعادے سے مناشا کا چہرہ شرم سے سرخ ہو گیا اور اس نے ان کے بارے میں معذرت خواہانہ رویہ اپنانے کی کوشش کی جیسے پرنس آندرے نے تھا تا جو کچھ مناشا تھا، اس کا اس پر محبوب ہونا ضروری تھا۔

ان تمام مردوں کی طرح، جن کا اوڑھنا بچھونا ہی معاشرے کا بند ترس طبقہ رہا ہو، پرنس آندرے بھی ہر اس شخص سے، جس پر اس طبقے کی روایتی چھاپ نہیں لگی ہوتی تھی، مل کر بہت خوش ہوتا تھا۔ نناشا جس طرح اپنی حیرت اور مسرت کا اظہار کر رہی تھی، بلکہ فرانسس میں گفتگو کے دوران میں بھی وہ جس قسم کی غلطیوں کا ارتکاب کر رہی تھی، اس سے یہ حیرت ہوتا تھا کہ وہ بھی ایسی ہی دوشیزا ہے۔ اس کے ساتھ پرنس آندرے کا رویہ خاص طور پر بے حد محتاط اور مشفقانہ تھا۔ جب وہ اس کے قریب بیٹھا، انتہائی سہل اور بالکل ہی غیر اہم امور کے بارے میں باتیں کر رہا تھا، اس پر اس کی ہنسیوں جس طرح چمکنے لگتی تھیں اور وہ جس طرح تبسم کرتی تھی، وہ اس کے من کو بہت بھایا کیونکہ اس کی ان اداؤں کا ان باتوں سے، جو وہ کر رہا تھا، کوئی تعلق نہیں تھا، بلکہ وہ اس طرح اپنے داخلی سرور کا اظہار کر رہی تھی۔ جب اس نے نناشا کو رقص کی دعوت دی، وہ جس طرح مسکراتی اٹھی اور کمرے میں تھلی کی طرح گھومی، اس کی اس جابا نہ عنائی نے اس کا دل خاص طور پر موہ لیا۔ کوتیلیاں ناچ کے دوران میں، جب رقص کا ایک ٹکڑا (figure) مکمل ہوا، وہ اپنی نشست کی طرف واپس آ رہی تھی کہ ایک اور شخص نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ وہ تھک چکی تھی اور اس کی سانس پھول رہی تھی۔ بظاہر بھی نظر آتا تھا کہ وہ معذرت کر لے گی لیکن اس نے جھٹ پٹ اپنا ہاتھ اپنے نئے ہم رقص کے کندھے پر رکھ دیا اور متبسم نگاہوں سے پرنس آندرے کو دیکھتی دوبارہ چل پڑی۔

”میں تھک چکی ہوں۔ جی چاہتا ہے کہ کچھ دیر آپ کے پاس بیٹھوں اور سستاؤں،“ اس کی مسکراہٹ کہہ رہی تھی۔ ”لیکن آپ دیکھ رہے ہیں کہ لوگ کس طرح بار بار مجھ سے تقاضا کر رہے ہیں۔ ان دعوتوں سے مجھے بھی خوشی ہوتی ہے۔ میں بہت سرور ہوں اور ہر شخص مجھے پیارا لگتا ہے۔ آپ اور میں یہ سب کچھ خوب سمجھتے ہیں۔“

جب نناشا کا ہم رقص رخصت ہوا، وہ بھگتی دوڑتی کمرے کے پار دوسری طرف گئی تاکہ رقص کے اگلے ٹکڑے کے لیے درخواستیں کا انتخاب کر سکے۔

”اگر وہ پہلے اپنی کزن اور پھر کسی دوسری خاتون کی طرف گئی، اس کا مجھ سے بیاہ ہو جائے گا۔“ پرنس آندرے نے اس پر نگاہیں جمائے اپنے آپ کو۔ اور اس پر اسے خاصا تعجب بھی ہوا۔ سوچتے پایا۔ وہ واقعی پہلے اپنی کزن تک کی طرف گئی۔

”بعض اوقات آدمی کے ذہن میں کیسی کیسی لغو باتیں در آتی ہیں!“ پرنس آندرے نے سوچا۔ ”لیکن ایک بات قطعی یقینی ہے۔ یہ لڑکی اتنی پیاری ہے، عام ذکر سے اتنی ہٹ کر ہے کہ اسے ہال روموں میں گھومتے پھرتے ایک مہینہ بھی نہ گزرنے پائے گا کہ کسی نہ کسی کے ساتھ اس کی شادی ہو جائے گی۔ یہاں اس قسم کی دوشیزاؤں کا قند ہے۔“ وہ اس طرح کی ادھیڑ بن میں مصروف تھا جب کہ نناشا اس کے قریب بیٹھی تھی اور اپنے سینے پر گلاب کے پھول کو، جو نیچے گرا چاہتا تھا، دوبارہ درست کر رہی تھی۔

کوتیلیاں کے اختتام پر، سحر کا ڈنٹ، حید کوٹ پہنچے، رقص کناں فوجوانوں کے پاس آیا۔ اس نے پرنس آندرے ناچ کی حالت بھرت جو خاص شکل یا صورت اختیار کر لیتی ہے۔

گو بنے گھر آنے اور ان سے ملنے ملانے کی دعوت دی۔ اس نے اپنی بیٹی سے پوچھا: ”کچھ مٹف آیا؟“ ناشا نے فوراً کوئی جواب نہ دیا بلکہ اس نے یوں مسکرا کر اس کی جانب دیکھا جیسے وہ اسے ملامت کر رہی ہو اور کہہ رہی ہو ”آپ نے یہ سوال پوچھا ہی کیوں؟“

”مجھے زندگی بھر اتنا لطف کبھی نہیں آیا“ اس نے جواب دیا اور پرنس آندرے نے رکھا کہ اس کے سین بازو کیسے بوجھلتا اور پڑا خٹھے جیسے وہ اپنے باپ سے بغل گیر ہونا چاہتی ہو لیکن پلک جھپکنے میں وہ دوبارہ نیچے گر پڑے۔ ناشا کو اتنی فرحت و مسرت کبھی حاصل نہیں ہوئی تھی۔ وہ سرورِ مطلق کی اس بلند منزل پر جہاں انسان کامل نیک اور شفیق ہو جاتا ہے اور اسے یہ یقین نہیں آتا کہ کہیں بدی، رنج و غم یا ناخوشی کا امکان ہو سکتا ہے، پہنچ چکی تھی



بیکر کی شریک حیات کو درباری حلقوں میں جو مقام حاصل تھا، اس پر زندگی میں پہلی مرتبہ اسے تذلیل محسوس ہوئی۔ اس کا منہ لٹک گیا اور وہ اپنے ہی خیالات میں مستغرق ہو گیا۔ اس کی پیشانی پر گہری لکیر نمودار ہو گئی۔ وہ ایک دہریے کے قریب کھڑا خالی خالی آنکھوں سے فضا میں گھور رہا تھا لیکن اس کی نظریں کسی خاص شخص یا چیز کو نہیں دیکھ رہی تھیں۔ پیر کے لیے جاتے وقت ناشا اس کے قریب سے گزری۔ اسے اس کی ہانسی، ناشا داوڑل کرتے صورت دیکھ کر بہت حیرت ہوئی۔ اس کے دل میں یہ خواہش امتداد آئی کہ وہ کسی طور اس کی مدد کر سکے اور جن سرتوں سے اس کا دل اچھل رہا ہے، وہ انھیں اس کی چھوٹی میں ڈال سکے۔

’کاوٹ، یہاں کتنا مزہ آرہا ہے!‘ اس نے کہا۔ ”آپ کا کیا خیال ہے؟“ صریحاً نظر آ رہا تھا کہ جیڑ سے جو کچھ کہا گیا تھا، وہ اس کے قطعاً پلے نہیں پڑا ہے۔ وہ بس بے دھیانی سے مسکرا دیا۔

”ہاں، میں بہت خوش ہوں،“ اس نے جواب دیا۔ ”کوئی شخص کسی چیز سے غیر مطمئن کیسے ہو سکتا ہے؟“ ناشا نے سوچا۔ ”خاص طور پر ایسا نہیں شخص جیسا کہ بزدل خوف ہے۔“ جو لوگ بال میں موجود تھے، ناشا کی نگاہوں میں وہ سب کے سب بھلے، مشفق اور شاندار اشخاص تھے، سب ایک دوسرے کے شیدائی تھے اور ایک دوسرے کو ناراض کرنے کی صلاحیت سے عاری۔ چنانچہ ان سب کو خوش و شادمان ہونا چاہیے تھا۔

اگلے روز پرنس آندرے بال کے متعلق اپنی یادیں تازہ کرتا رہا لیکن اس کا ذہن زیادہ دیر تک ان میں مصروف نہ رہ سکا۔ ”ہاں، یہ کمال کا بال تھا۔ اور پھر... ارے ہاں، وہ منہ می رستو بہت پرکشش ہے۔ اس کی شکل و صورت اور اطوار

میں کچھ ایسی نازگی اور نیا پن ہے جو عام طور پر پیٹرنز برگ میں نہیں پایا جاتا اور یہی چیز اسے دوسروں سے ممتاز کرتی ہے۔" گزشتہ رات کے بارے میں اس نے بس اتنا ہی سوچا اور صبح کی چائے پینے کے بعد اپنے کام میں جت گیا۔ لیکن یہ تھکاوٹ کا اثر تھا یا نیند کا فقدان؟ بہر حال اس کا کام میں جی نہ لگا اور وہ کچھ بھی نہ کر سکا۔ وہ اپنے ہی کام میں نقائص تلاش کرتا رہا۔ اور اس کے محلے میں یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ اور جب کسی ماقاتی کے قدموں کی آہٹ اس کے کانوں سے ٹکرائی، اس کا جی خوش ہو گیا۔

نوراد کا نام ہنسکی تھا۔ وہ مختلف کیٹیڈوں کا رکن تھا، پیٹرنز برگ کے ہر طبقے میں اس کا آنا جانا تھا، بے پرکی اڑانے میں اس کا کوئی ثانی نہیں تھا اور وہ یہ کام بڑی تندہی اور مستقل مزاجی سے کرتا تھا۔ وہ پیرانہ کی تصویر کا بدلہ جان مباح تھا۔ وہ ان لوگوں میں شامل تھا جو اپنے خیالات و افکار کا انتخاب بھی نئے ملبوسات کی طرح نت نئے فیشن کے مطابق کرتے ہیں، اور محض اسی بنا پر تازہ ترین رجحانات کے پر جوش حمایتی نظر آتے ہیں۔ اپنا ہیٹ تارتے ہی وہ پرس آئندے کے کمرے میں جا دھمکا اور اس نے وہاں پہنچتے ہی آؤر دیکھا نہ تاؤ، جھٹ اپنی باتوں کا آغاز کر دیا۔ اسے ابھی ابھی کونسل آف سٹیٹ کے صبح کے اجلاس کی، جس کا افتتاح زار نے کیا تھا، تفصیلات معلوم ہوئی تھیں، اور اب وہ انھیں نہایت جوش و خروش سے بیان کر رہا تھا۔ امپراطور کی تقریر غیر معمولی تھی۔ یہ بالکل اسی قسم کی تقریر تھی جیسی صرف آئینی قریاں رواہی کرتے ہیں۔

"امپراطور نے صاف صاف کہہ دیا ہے کہ کونسل اور سینیٹ مملکت کے ایسے ادارے ہیں جن کے اپنے واضح سیاسی حقوق ہیں۔ انھوں نے فرمایا کہ حکومت کا انحصار من مانے اور مستبدانہ اختیارات پر نہیں بلکہ مستحکم اصولوں پر ہونا چاہیے۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ ماریاتی نظام کی لازماً تنظیم تو ہونا چاہیے اور میزبانے کی تفصیلات عوام کے سامنے پیش کی جانا چاہئیں۔" ہنسکی نے بعض الفاظ پر زور دیتے اور اپنی آنکھیں معنی خیز انداز سے جھپکاتے ہوئے کہا: "واقعہ یہ ہے کہ سچ جو کچھ پیش آیا ہے، اس سے ہماری تاریخ کے نئے اور عظیم ترین دور کا آغاز ہو گیا ہے،" اس نے نئی بات ختم کرتے ہوئے کہا۔

پرس آئندے سٹیٹ کونسل کے اختتامی اجلاس کی تفصیلات توجہ سے سنتا رہا۔ یہ واقعہ تھا جس کا وہ نہایت بے چینی سے انتظار کرتا رہا تھا، اور جس کو وہ اتنی زیادہ اہمیت دیتا رہا تھا۔ لیکن اسے تعجب اس بات پر تھا کہ جب کہ اس نے سسر حقیقت کا روپ دھار لیا تھا، وہ نہ صرف اس سے قطعاً متاثر نہ ہوا بلکہ اسے وہ ایچ پوچ چیز سے بھی کم تر محسوس ہوا۔ وہ ہنسکی کے پر جوش بیان کو چہرے پر ہنسکوں طرز بجائے سنتا رہا۔ اس کے ذہن میں نہایت سیدھا سادہ خیال اٹھ رہا: "امپراطور نے کونسل کے اجلاس میں جن باتوں کا یہ سرت اعلان کیا ہے، ان سے مجھے یا ہنسکی کا کیا واسطہ؟ ہمارے لیے ان کی کیا اہمیت ہے؟ کیا ان سے میری خوشی میں کوئی اضافہ ہو سکتا ہے یا میں بہتر انسان بن سکتا ہوں؟"

جن اصلاحات کو عملی جامہ پہنایا جا رہا تھا، ان میں پرس آئندے جو دلچسپی لیا کرتا تھا، اس سیدھے سادے خیال

سے وہ پار ہوا ہو گئی۔ اس روز اس نے پے رانسکی کے ہاں کھانا کھانا تھا۔ جیسا کہ اس کے میزبان نے اسے مدعو کرتے وقت اسے مطلع کیا تھا کھانے پر "مجلس چند گئے چنے احباب" نے آنا تھا۔ اس شخص کے، جس کا دراجا زبردست مداح تھا، بے تکلف گھریلو حلقے میں ذر کا تصور پرنس آندرے کو بہت دلچسپ معلوم ہوا تھا، خاص طور پر اس لیے بھی کہ اس نے ابھی تک پے رانسکی کو اس کے خانگی ماحول میں نہیں دیکھا تھا لیکن اب اسے وہاں جانے کی کوئی خواہش باقی نہیں رہ گئی تھی۔

تاہم وہ وقت مقررہ پر تادری چسکی گارڈنز میں واقع پے رانسکی کے عام سے گھر پہنچ گیا۔ اس چھوٹے سے مکان کا نمایاں ترین وصف یہ تھا کہ یہ اتنا صاف ستھرا تھا کہ ڈھونڈنے سے بھی اس میں کوئی نقص نظر نہیں آ سکتا تھا (اسے دیکھ کر خائفانہ کی یاد تازہ ہو جاتی تھی)۔ ڈائننگ روم میں، جس کا فرش چوبی تختوں کا تھا، پرنس آندرے کو جو قدرے تاخیر سے آیا تھا، پے رانسکی کے حلقے کے یارین بے تکلف نظر آئے۔ یہ لوگ پہلے ہی پانچ بجے پہنچ چکے تھے۔ پے رانسکی کی نو عمر دختر (جس کا چہرہ اپنے باپ کے چہرے کی طرح کتابی تھا) اور اس کی گورنرس کے علاوہ اور کوئی خاتون موجود نہیں تھی۔ دوسرے مہمان گرولیس،³⁴ ماگ ٹسکی اور ستالی پن تھے۔ پرنس آندرے کو پیش راندن میں ہی پر شور و آوازیں سنائی دینے لگیں۔ کسی شخص کی تراشیدہ اور کھٹکھٹاتی ہنسی کی۔ بالکل اسی نوع کی ہنسی جو راسے کی سٹیج پر سنائی دیتی ہے۔ گونج بھی اس کے کانوں سے ٹکرائی۔ کوئی شخص۔ وہ آواز سے پے رانسکی معلوم ہوا تھا، بڑے واضح انداز سے 'بابا بابا' کی آوازیں نکال رہا تھا۔ پرنس آندرے نے اس سے پہلے پے رانسکی کو کبھی ہنسنے نہیں سنا تھا۔ ایک عظیم سیاسی مدبر کی اس ٹیکھی اور کھٹکھٹاتی ہنسی نے اس پر عجیب تاثر قائم کیا۔

وہ ڈائننگ روم میں چلا گیا۔ وہ درپچوں کے مابین ایک چھوٹی میز پر بٹھالے دار گوشت اور سبزیوں پر مشتمل مختلف اقسام کے کھانے (hors d'oeuvres)، جو اصل طعام سے پہلے کھائے جاتے ہیں، پڑے تھے اور سب حاضرین ان کے ارد گرد جمع تھے۔ پے رانسکی نے خاکستری نراک کوٹ، جس پر ستارہ آریزاں تھا، اور بٹا ہر وہی سفید واسکٹ اور وہی سفید جری گلوبند، جو اس سے کونسل آف میٹ کے شہرہ آفاق اجلاس میں پہنے تھے، زیب تن کر رکھے تھے۔ وہ اپنے مہمانوں میں گھرا کھڑا تھا اور اس کے انگ انگ سے خوشی پھونتی محسوس ہو رہی تھی۔ ماگ ٹسکی اپنے میزبان سے مخاطب ہو کر کوئی قصہ بیان کر رہا تھا۔ ماگ ٹسکی نے جو کچھ کہا تھا، پے رانسکی نے اس پر ہنسی کی ہنسا شروع کر دیا تھا۔ جونہی پرنس آندرے کمرے میں داخل ہوا، ماگ ٹسکی کے الفاظ دوبارہ تہہ پہلوں میں دب گئے۔ ستالی پن نے ذہل روٹی اور خیر کا لقمہ چباتے چباتے نیچی آواز سے تہہ پہلو لگایا، گرولیس نے منہانے پر اکٹافیا اور پے رانسکی اپنی ٹیکھی اور تراشیدہ ہنسی ہنس رہا تھا۔

اس نے ہنستے ہنستے اپنا نرم و معانم اور سفید ہاتھ پرنس آندرے کی طرف بڑھا دیا۔ "پرنس، آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی،" اس نے کہا۔ "ایک منٹ..." وہ ماگ ٹسکی کی طرف مڑا اور اس کے قصے میں مداخلت کرتے ہوئے اپنی ہی کہنا چلا گیا۔ "ہم نے یہ طے کر لیا ہے کہ یہ ذر مجلس تفریح طبع کے ہے

ہوگا، یہاں سرکاری امور کے بارے میں ایک لفظ بھی نہیں کہا جائے گا۔“ وہ دوبارہ قصہ گو کی طرف متوجہ ہوا اور ایک بار پھر ہنسنے لگا۔

پرنس آندرے نے سرور و خوش صبح سے رانسکی کو حیرت کی نگاہوں سے دیکھا۔ اس کے بارے میں اس کی ساری خوش فہمیاں کا فوراً ہو گئیں اور اس کا منہ لٹک گیا۔ اسے کچھ یوں محسوس ہوا کہ یہ ہے رانسکی نہیں بلکہ کوئی اور شخص ہے۔ وہ ہے رانسکی سے پہلے بے حد متاثر ہوا تھا کیونکہ اسے اس کی ذات میں بعض پر سرور اور دل کش پہلو نظر آئے تھے لیکن اب بھانڈ، پھوٹ چکا تھا اور سب کچھ اپنی دل کشی کھو چکا تھا۔

ڈن پر گنگو میں ایک ٹائیپے کا بھی دفتر نہ آیا اور یہ کسی لٹینوں کی کتاب کے مندرجات پر مشتمل معلوم ہوتی تھی۔ ماگ شسکی نے ابھی بمشکل اپنا قصہ ختم کیا ہوگا کہ کسی دوسرے نے اس سے بھی لذیذ تر حکایت سنانے کی ہامی بھر لی۔ اکثر دیشتر قہے اگر سرکاری ملازمت کے بارے میں نہیں تھے، تو کم از کم ان افراد کے، جن کا تعلق سرکار سے بنتا تھا، متعلق ضرور تھے۔ معلوم ہوتا تھا کہ اس جتنے میں، ان اشخاص کی بے وقعتی کو اتنے فیصلہ کن انداز سے تسلیم کر لیا گیا ہے کہ ان کے متعلق جو حد تک رو یہ اختیار کیا جاسکتا ہے، وہ یہی ہو سکتا ہے کہ ان کا خوش مزاجانہ انداز سے مسخرہ اڑایا جائے۔

پے رانسکی نے بتایا کہ اس روز جب کونسل کے اجلاس میں ایک بہرے مدبر سپہ سالار سے اس کی رائے دریافت کی گئی، اس نے جواب میں کہا: ”ہاں، میرا بھی یہی خیال ہے۔“ ایک واقعہ، جس کا تعلق مردم شناسی سے تھا، گردیس نے اس کا تفصیل سے ذکر کیا۔ اس واقعے کا خاص پہلو یہ تھا کہ اس سے ہر مختلف شخص کی ضعیف العقلی عیاں ہوتی تھی۔ سولی پن نے ہکلاتے ہکلاتے اس کی بات کاٹ دی اور اتنے جوش و خروش سے سابقہ نظام کی خرمیاں گوانے لگا کہ گنگو کے سنجیدہ رخ اختیار کرنے کا اندیشہ لاحق ہو گیا۔ ماگ شسکی نے اس کے جوشیے پن کا مذاق اڑانا شروع کر دیا۔ گردیس نے لطیفہ گوئی کے ذریعے ان دونوں کو خاموش کر دیا اور یوں گنگو دوبارہ ہرزہ سرائی کی طرف لوٹ آئی۔

بظاہر تو یہی نظر آتا تھا کہ محنت مشقت کے بعد پے رانسکی کو استراحت کرنا اور اپنے دوستوں کے حلقے میں دل بہلانا بہت مرغوب ہے۔ اس کے دوست اس کی خواہشات سمجھ چکے تھے۔ چنانچہ وہ خود بھی لطف اندوز ہوا ہے تھے اور اسے بھی مظلوم کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ لیکن پرنس آندرے کو ان کی یہ مختلف مزاحیہ بھرتی کی اور بے کیف دکھائی دی۔ پے رانسکی کا بلند آہنگ لہجہ اس کی طبیعت پر بار بن رہا تھا اور اسے اس کے مسلسل قہقہوں کی بھٹکتی ہٹ، جواں کے کانوں پر گراں گزر رہی تھی، مصنوعی معلوم ہوئی۔ پرنس آندرے نے ہنسنے اور قہقہے لگانے سے گریز کیا اور نتیجتاً اسے محسوس ہونے لگا کہ کہیں اس پر رنگ میں بھنگ ڈالنے کا الزام نہ دھر دیا جائے۔ لیکن کسی شخص کو بھی یہ خیال نہ آیا کہ وہ محفل کے عمومی مزاحیہ سے ہم آہنگ نہیں ہے۔ قرائن بتا رہے تھے کہ وہ جی بھر کر لطف اندوز ہو رہے ہیں۔ اس نے گنگو میں شریک ہونے کے لیے بہترے ہاتھ پاؤں مارے لیکن اس کی ہر بات یوں ازادی جاتی

جیسے پانی کارک کو اٹھ کر پرے پھینک دیتا ہے۔ چنانچہ وہ ان کے ساتھ بھٹکڑ پن اور لطیفہ گوئی کے کھیل میں شریک ہونے سے قاصر رہا۔

جو کچھ وہ کہہ رہے تھے، وہ غلط یا بے موقع نہیں تھے۔ ان کی باتوں میں طرافت تھی اور عین ممکن ہے کہ وہ پر لطف بھی بن جاتیں لیکن ان میں اس چیز کا، جسے نشاط و نبساط کی چاشنی کہا جاسکتا ہے، فقدان تھا۔ یہ ایک ایسی شے تھی جس کے بارے میں انھیں معلوم ہی نہیں تھا کہ یہ بھی وجود رکھ سکتی ہے۔

ڈز کے ختم پر پے رانسکی کی دختر اور اس کی گورنس دسترخوان سے اٹھ کر کھڑی ہوئیں۔ پے رانسکی نے اپنی ننھی منی بیٹی کے رخساروں پر بوسے دیے اور اپنے سفید ہاتھوں سے اس کے بال سہلے۔ اس کا یہ انداز بھی پرنس آندرے کو غیر فطری محسوس ہوا۔

مرد حضرات دسترخوان پر ڈٹے رہے۔ وہ انگریزوں کی طرح پورٹ سے شغل کرنا چاہتے تھے۔ باتوں ہی باتوں میں جب ہسپانیہ میں نیپولین کے اقدامات کا ذکر چھڑا اور انھوں نے بیک زبان ان کی تائید کی، پرنس آندرے نے ان کی آراء کے برعکس خیالات کا اظہار کیا۔ پے رانسکی کے لبوں پر تبسم آگیا۔ روزِ رڈن کی طرح عیاں تھا کہ وہ یہ قطعاً نہیں چاہتا تھا کہ گفتگو میں کوئی تلخی آنے پائے۔ چنانچہ وہ ایک ایسی حکایت، جس کا موضوع زیر بحث سے قطعاً کوئی تعلق نہیں تھا، بیان کرنے لگا۔ چند لمحوں کے لیے سب کی زبانیں گنگ ہو گئیں۔

پے رانسکی چند لمحے دسترخوان پر بیٹھا رہا، پھر اس نے انگوری شرب کی بوتل کا کاگ بند کیا اور یہ کہتے ہوئے کہ ”آج کل اچھی شرب حاصل کرنا جوئے شیر ڈھونڈنے کے برابر ہے،“ اسے ملازم کے ہاتھ میں تمہادیا اور اس کے ساتھ ہی وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

دوسروں نے اس کی پیروی کی اور وہ بھی اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ وہ ابھی تک اونچے لمبوں میں باتیں کر رہے تھے۔ باتیں کرتے کرتے وہ ڈرائنگ روم میں چلے گئے۔ دو دفعے، جو ہر کارہ لے کر آیا تھا، پے رانسکی کے حوالے کر دیے گئے۔ وہ انھیں اپنے سنڈی روم میں لے گیا۔ جونہی وہ کمرے سے باہر نکلا، قہقہے چپچپے ختم ہو گئے اور مہمان آپس میں دھیسے لمبوں میں سنجیدہ گفتگو کرنے لگے۔

”اچھا، اب یہ کچھ شعر خوانی ہو جائے“ پے رانسکی نے سنڈی روم سے واپس آ کر کہا۔ ”شعر گوئی اور شعر خوانی میں اس شخص کا جواب نہیں،“ اس نے پرنس آندرے سے کہا۔

ماگ ٹسکی نے جھٹ پٹ پوز بنالیا اور فرانسیسی زبان میں مزاحیہ اشعار، جو اس نے پیٹرز برگ کی چندای گرامی ہستیوں کے بارے میں لکھے تھے، پڑھنے لگا۔ اس پر بار بار داد و تحسین کے ڈونگرے برسائے گئے۔ جب شعر خوانی اختتام پذیر ہوئی، پرنس آندرے پے رانسکی کے پاس گیا، اور اس سے اجازت کا طلب گار ہوا۔

”اتنی جلدی کہاں جانا ہے؟“ پے رانسکی نے دریافت کیا۔

”میں نے ایک محفلِ شام میں شرکت کی ہمی پھرتی تھی۔“

پرنس آندرے نے گزشتہ چاروں برسوں کے دوران میں پیٹرز برگ میں جو کچھ کیا تھا، گھر پہنچنے کے بعد اس نے اس کا نئے انداز سے جائزہ لیا۔ اس نے عسکری قواعد و ضوابط میں اصلاح و ترمیم کی غرض سے جو منصوبہ وضع کیا تھا، اس کے سلسلے میں جو بھگ دوڑ کی تھی اور جن جن لوگوں سے ملنے کے لیے ہاتھ پاؤں مارے تھے، اس نے ان سب کے بارے میں سوچا۔ اگرچہ اس کا یہ منصوبہ غور و فکر کے لیے منظور ہو چکا تھا لیکن عملاً اسے ایک دوسرے منصوبے کی خاطر، جو انتہائی بے مغز تھا، اٹھا کر طاق نسیان پر رکھ دیا گیا تھا کیونکہ وہ منصوبہ پہلے ہی تیار کیا جا چکا تھا اور راز کی خدمت میں پیش کیا جا چکا تھا۔ اس نے اس کمیٹی کے، جس کا برگ رکن تھا، اجلاسوں کے بارے میں سوچا۔ اسے یاد آیا کہ قواعد کی ظاہری شکل و صورت اور طریق کار کے ایک ایک نکتے کے بارے میں دیانت دارانہ و رطویل مباحث ہو رہے تھے لیکن جہاں تک معاملے کی روح کا تعلق ہے، اس سے بڑی جانفشانی اور عجلت سے پہلو پھالیا گیا۔ اس نے ضابطہ قانون کے بارے میں جو کام کیا تھا، اسے وہ بھی یاد آیا۔ اس نے ردی اور فرانسیسی ضوابط کا ردی زبان میں ترجمہ کرنے کے لیے بڑی کٹھنوں میں اٹھائیں لیکن سب رائیگاں گئیں اور اسے خود ہی شرم محسوس ہونے لگی۔ پھر یاگو چار فو، دیہات میں اپنے مشاغل اور ریاران کے سفر کے واضح خاکے اس کے ذہن میں آنے لگے۔ اس نے اپنے کسانوں اور دیہاتی کھیا دران کے بارے میں سوچا اور جب اس نے شخصی حقوق سے متعلق رفعت کا، جن کی اس نے مختلف سیکشنوں میں درجہ بندی کی تھی، اطلاق دینا ان پر کیا، تو اسے سخت اچنبھا ہوا کہ اس نے اس قسم کے لائسنس کام پر اتنا وقت کیسے صرف کر دیا۔

19

اگلے روز پرنس آندرے نے ملاقات کی غرض سے ان متعدد اشخاص کے، جن سے وہ پہلے ملنے نہیں گیا تھا، دروازوں پر دستک دی۔ ان لوگوں میں رستوف بھی، جن کے ساتھ اس نے بال پر تعلقات کی تجدید کی تھی، شامل تھے۔ شائستگی کے تقاضوں کے علاوہ، جنہوں نے اس ملاقات کو ناگزیر بنا دیا تھا، اس کے دل میں یہ شدید خواہش موجزن تھی کہ وہ اس چنچل، شگفتہ مزاج اور اپنی مثال آپ دو شیرہ سے، جو اس کے ذہن پر اتنے خوشگوار تاثرات چھوڑ گئی تھی، اس کے اپنے گھر میں مل سکے۔

جن لوگوں نے سب سے پہلے اس کا خیر مقدم کیا، ان میں ننا شامل تھی۔ وہ مرد مرہ کا گہرے نیلے رنگ کا ڈریس پہنے ہوئے تھی۔ پرنس آندرے کو محسوس ہوا کہ وہ اس لباس میں بال گاؤن سے بھی زیادہ حسین نظر آ رہی ہے۔ اس نے اور اس کے گھر والوں نے اس کا سادہ لیکن پرتپاک استقبال کیا، بالکل اسی طرح جس طرح ایک دیرینہ دوست کا کیا جاتا ہے۔ پورے کا پورا خاندان، جس کا اس نے پہلے اتنا سخت بھا کہہ کیا تھا، اب اسے شہتہ، سلیم الطبع اور سیدھے سادے اشخاص پر مشتمل نظر آیا۔ کاڈنٹ کی مہمان نوازی اور خوشی نہ دی، جو پیٹرز برگ میں خاص طور پر وضع داری کا پہلو سوسے نظر آ رہی تھی، کچھ اس نوعیت کی تھی کہ جب پرنس آندرے سے ڈرنک ٹھہرنے کی

درخواست کی گئی، وہ نکار نہ کر سکا۔ ”ہاں، یہ نفیس اور شستہ لوگ ہیں،“ اس نے سوچا۔ ”لیکن انھیں قطعاً معلوم نہیں کہ نشا کی شکل میں وہ کتنے بڑے خزانے کے مالک ہیں۔ تاہم یہ لوگ ٹیک فطرت، رحم دل اور رقیق القلب ہیں۔ وہ اس دوشیزہ کے لیے جو حسن و رعنائی اور دلکشی کا مرقع ہے اور جس کے انگ انگ سے زندگی پھوٹی پڑ رہی ہے، امکانی حد تک بہترین پس منظر مشکل کرتے ہیں۔“

نشا میں پرنس آندرے کو ایک غیر معمولی دنیا کا، جو نامعلوم سرتوں سے پٹی پڑی تھی، درجوں کے لیے قطعی اجنبی تھی، شعور ہوا۔ ایسی عجیب و غریب دنیا جس نے اسے اترا دنیا کے خیابان میں اور اس چاند شب کے درستیچے میں بھی، ترسنا ترسایا تھا۔ اب یہ دنیا تو اس کی انا کو ٹھیک پہنچا رہی تھی اور نشا کے لیے اجنبی رہی تھی۔ جب کہ وہ خود اس میں بار پا چکا تھا، اسے اس میں نئی نئی دلچسپیاں اور راحتیں حاصل ہو رہی تھیں۔

ذکر کے بعد پرنس آندرے کی درخواست پر نشا کلاوی کارڈ کے سامنے بیٹھ گئی اور نذر سرائی کرنے لگی۔ پرنس آندرے درستچے کے قریب کھڑا خواتین سے باتیں کر رہا اور اس کا گانا سن رہا تھا۔ اچانک وہ بولتے بولتے فقرے کے عین بیچ میں خاموش ہو گیا۔ اسے محسوس ہوا کہ اس کے آنسو اب نکلنے لگے اور اس کا گارنڈھے لگا۔ یہ ایک ایسی کیفیت تھی جس کے بارے میں اسے کبھی یقین ہی نہیں آ سکتا تھا کہ یہ اس کے ساتھ بھی پیش آ سکتی ہے۔ جب نشا گار ہی تھی، اس کی نگاہیں اس پر مرکوز رہیں اور اسے یوں لگا کہ اس کی روح میں کوئی نئی اور سرد رک چیز انگڑائیاں لے رہی ہے۔ وہ خوش بھی تھا اور اس کے ساتھ غم گیس بھی۔ قطعاً کوئی ایسی بات نہیں ہوئی تھی کہ اسے رونا آتا، اس کے باوجود وہ اسٹک بہانے کے لیے تیار تھا۔ کس لیے؟ اپنی سابقہ محبت کے لیے؟ کوئیک پرنس کے لیے؟ اپنی گم شدہ خود فریبوں کے لیے؟ اپنی مستقبل کی امیدوں کے لیے؟۔۔۔ ہاں وہ نہیں۔ سب سے بڑی بات، جس نے اسے آنسو بہانے کے قریب پہنچا دیا تھا، وہ اس بھیا تک تضاد کا فوری اور شدید احساس تھا۔ یہ تھا کہ کیا تھا؟ ایک طرف کوئی لامحدود طور پر عظیم اور غیر تعریف پذیر چیز تھی جو اس کے باطن میں موجود تھی اور دوسری طرف گوشت پوست کا محدود وجود تھا جس سے نہ صرف وہ خود بلکہ وہ (نشا) بھی عبارت تھی۔ جب وہ گانا گار رہی تھی، یہ تضاد اس کی روح کو کچھ کے لگا رہا اور اسے مسرت و بہت بہم پہنچا رہا تھا۔

جونہی نشا کا گانا ختم ہوا، وہ فی الفور اس کے پاس پہنچی اور اس سے پوچھنے لگی، ”آپ کو میری آواز کیسی لگی؟“ پوچھنے کو تو اس نے یہ سوال پوچھ لیا لیکن اس کے ساتھ ہی وہ محبوب بھی ہو گئی۔ اسے احساس ہوا کہ یہ ایک ایسی بات تھی جو اسے پوچھنا نہیں چاہیے تھی۔ وہ اس کی طرف دیکھ کر مسکرایا اور بولا، ”جس طرح مجھے تمہاری ہر بات پسند ہے، اسی طرح مجھے تمہارا گانا بھی پسند ہے۔“

جب پرنس آندرے رستوفوں سے رخصت ہوا رات خاصی گزر چکی تھی۔ عادت کے موافق وہ بستر میں کھس گیا لیکن بہت جلد اسے احساس ہو گیا کہ نیند اس سے کوسوں دور ہے۔ اس نے شمع روشن کی اور اٹھ کر بستر پر بیٹھ گیا۔ پھر وہ دوبارہ بستر پر دراز ہو گیا۔ اپنی اس بے خوابی سے وہ مطلق پریشان نہ ہوا۔ اس کی روح نئے اور پر مسرت احساسات

اس قدر سرشار تھی کہ اسے محسوس ہونے لگا کہ وہ کسی ایسے کمرے سے، جہاں جس کی وجہ سے دم گھٹتا تھا، کھلی فضا میں آ گیا ہے۔ اسے یہ بالکل خیال نہ آیا کہ وہ مناشا کی محبت میں گرفتار ہو چکا ہے۔ وہ اس کے متعلق سوچ نہیں رہا تھا بلکہ ذہن میں اس کا خاکہ بنا رہا تھا اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اسے اپنی ساری زندگی روشنی میں نظر آنے لگی۔ ”میں اس تک اور محدود ماحول میں کیوں جدوجہد کر رہا ہوں، خون پسینہ ایک کر رہا ہوں جب کہ زندگی، ساری زندگی اور اس کی تمام سرشتیں اور رہنمائیاں اپنے دامن پھیلائے میرے سامنے کھڑی ہیں؟“ اس نے اپنے آپ سے پوچھا۔ اور وہ طویل عرصے کے بعد پہلی مرتبہ مستقبل کے بارے میں خوشگوار منصوبے بنانے لگا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ اپنے بیٹے کی تعلیم و تدریس پر یوں ذاتی طور پر توجہ دے گا کہ وہ اس کے لیے اتالیق کا بندوبست کرے گا اور اسے اس کی تحویل میں دے دے گا۔ وہ مذمت سے ریٹائر ہو جائے گا اور غیر مماثلک کی سیر پر روانہ ہو جائے گا، وہ انگلستان، سوئٹزرلینڈ اور اٹالیہ گھومے پھرے گا۔ ”جب تک میرے اندر طاقت اور توانائی کا احساس موجود ہے، مجھے اپنی آزادی سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانا چاہیے۔“ اس نے اپنے آپ سے کہا۔ ”میر نے جب یہ کہا تھا کہ اگر آدمی خوش رہنا چاہتا ہے، اسے یہ یقین کر لینا چاہیے کہ خوشی کا امکان موجود ہے تو ٹھیک ہی کہا تھا اور میرا بھی اس پر پختہ یقین ہو گیا ہے۔ گڑے مردوں کو گڑے ہی رہنے دینا چاہیے۔ جب تک سانس کی ڈوری باقی ہے، آدمی کو زندہ رہنا چاہیے اور خوش رہنا چاہیے!“ اس نے سوچا۔

20

ایک صبح کرنل ادلف برگ، جسے میئر جانتا تھا، جس طرح وہ ماسکوا اور پیٹرز برگ کے ہر شخص کو جانتا تھا، نئی گور وری پینے والوں میں پوچھ لگائے اور امپیرا طور الیکساندر پادلووچ کے اندر میں زلفوں سے کنپٹیاں ڈھانپے، اسے ملے آیا۔

”کاونٹ، میں ابھی ابھی کاؤنٹس، آپ کی شریک حیات، سے مل کر آ رہا ہوں۔ بد قسمتی سے انھوں نے میری درخواست کو شرف قبولیت نہیں سمجھا۔ مجھے امید ہے کہ یہاں قسمت کی دیوی مجھ پر مہربان ہوگی،“ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”کرنل، آپ کا کیا حکم ہے؟ میں آپ کی خدمت کے لیے حاضر ہوں۔“

”کاونٹ، میں اپنے نئے اپارٹمنٹ میں ٹھیک ٹھاک طرح ٹک گیا ہوں،“ برگ نے اعلان کیا۔ اس کے انداز سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ اسے اس بات کا پختہ یقین ہے کہ اس کی یہ اطلاع میئر کاچی خوش کرنے میں ہرگز ناکام نہیں رہے گی۔ ”چنانچہ مجھے یہ امید ہو گئی ہے کہ اب میں اپنے اور اپنی شریک حیات کے، حبیب کے لیے ایک مہربانی محفل کا انعقاد کر سکوں گا۔“ (اب وہ اور بھی خوش خلقی سے مسکراتے لگا۔) ”میں آپ سے اور کاؤنٹس سے محفل یہ درخواست کرنے آیا تھا کہ آپ اور وہ مجھ پر کرم فرمائی کریں ورنہ میرے ہاں چائے کی پیالی نوش کرنے .. بہر تاول فرماتے .. تشریف لائیں۔“

صرف کاؤنٹس ہیلینا داسیلو نا جو برگ جیسے لوگوں کو اپنے سے کم تر سمجھتی تھی، تا ظلم کر سکتی تھی کہ وہ اس قسم کی دعوت کو پائے استحقاق سے ٹھکرا دے۔ برگ کو اپنے نئے پارٹمنٹ میں چند گئے چنے اشخاص پر مشتمل محفل سجانے کی ضرورت کیوں پیش آئی، اس سے سے کیا خوشی حاصل ہوگی اور وہ اچھی محفل کی خاطر کیوں اچھی خاصی رقم خرچ کرنے کے لیے تیار ہو جائے گا تاکہ ناش بازی اور اس قسم کے دوسرے گھٹیا مشاغل پر روپیہ لٹانا اس کی فطرت کے خلاف تھا، اس نے یہ سب کچھ پیئر کو اتنی صراحت اور تفصیل سے بتایا کہ وہ انکار نہ کر سکا اور اس نے آنے کا وعدہ کر لیا۔

”کاؤنٹ، اگر آپ اسے گستاخی محسوس نہ کریں تو میں یہ عرض کرنے کی جسارت کروں گا کہ برے مہربانی اپنی تشریف آوری میں زیادہ تاخیر نہ کریں۔ میرے خیال میں سات پچاس کا وقت موزوں رہے گا۔ ہم ایک دربار کا اہتمام کریں گے۔ ہمارے جرنیل تشریف لارہے ہیں۔ وہ مجھ پر بہت مہربان ہیں۔ کاؤنٹ، چھوٹے سونے پر کا انتظام بھی ہوگا۔ مجھے امید ہے کہ آپ مجھے مایوس نہیں کریں گے۔“

مینرک کچھ یہ عادت سی بن گئی تھی کہ وہ اس قسم کی محافل میں عام طور پر تاخیر سے پہنچا کرتا تھا لیکن اس شام وہ معمول کے برعکس سات پچاس کے بجائے پونے آٹھ بجے ہی برگ کے گھر پہنچ گیا۔

برگ اور اس کی اہلیہ اپنی محفل کے لیے ہر چیز کا بندوبست کر چکے تھے اور اب وہ اپنے مہبنوں کا غیر مقدم کرنے کے لیے بالکل تیار تھے۔ وہ اپنے نئے، روشن اور صاف ستھرے سٹڈی روم میں، جس میں یہ فریج بچا گیا تھا اور جس کی نیم بچتموں اور تصویروں سے آرائش کی گئی تھی، بیٹھے تھے۔ برگ نے نئی وردی، جوٹن بند کرنے سے تنگ تنگ سی لگتی تھی، پہن رکھی تھی۔ وہ اپنی بیوی کے قریب بیٹھا تھا اور اسے سمجھا رہا تھا کہ ”دی ان لوگوں کے، جو مراتب کے اعتبار سے اس سے اونچے ہوں، راہ ورسم بڑھا سکتا ہے اور سے بڑھانا بھی چاہیے، کیونکہ صرف اسی طرح وہ صحیح معنوں میں دوستوں اور راقف کاروں سے فیض یاب ہو سکتا ہے۔“

”اس طرح آپ کو کوئی نہ کوئی بات معلوم ہو سکتی ہے، آپ کسی چیز کے لیے درخواست کر سکتے ہیں۔ یہ تو آپ نے دیکھ ہی لیا ہوگا کہ جب سے مجھے ولین ترقی ملی ہے، میرے حالات نے کیا کیا پلٹا کھایا ہے۔“ (برگ اپنی زندگی کا حساب سالوں سے نہیں بلکہ ترقیوں سے کرتا تھا۔) ”میرے سابق ساتھی بھی تک کوئی مقام حاصل نہیں کر سکے جب کہ میں صرف اس بات کا منتظر ہوں کہ کب کوئی رخصت ملے گا۔“ (وہ اٹھا، اس نے دیو کے ہاتھ پر تعینات کر دیا جائے گا اور مجھے خوشی اس بات کی ہے کہ میں آپ کا شوہر ہوں۔) (وہ اٹھا، اس نے دیو کے ہاتھ پر بوسہ دیا اور وہ چلتے چلتے ڈور کا تا کہ قالین کے کنارے کو، جو ڈراما گیا تھا، سیدھا کر سکے۔) ”اور میں نے یہ سب کچھ کیسے حاصل کیا؟ زیادہ تر اس لیے کہ میں نے یہ ڈھنگ سیکھ لیا ہے کہ کن لوگوں سے تعلقات بڑھانا چاہئیں اور ہاں یہ کہنے کی ضرورت ہی نہیں کہ آدمی کو باضمیر اور با اصول ہونا چاہیے۔“

برگ اس احساس پر مسکرا دیا کہ اسے ایک کمزور عورت پر تفوق حاصل ہے۔ وہ رک گیا اور سوچنے لگا۔ ”میری اس پیری شریک حیات کا تعلق بہر حال ہے تو صنف نازک ہی ہے۔ یہ ان چیزوں کو جو مرد کی وجہ سے

اور آن بان مشکل کرتی ہے، انھیں کبھی سمجھ نہیں پائے گی۔“

ویر بھی مسکرا رہی تھی۔ اسے بھی یہ احساس تھا کہ اسے اپنے خوش خصال اور قابل قدر شوہر پر تفرق حاصل ہے کیونکہ اس کے خیال کے مطابق زندگی کے متعلق تمام مردوں کی طرح اس کے شوہر کا انداز فکر بھی غلط نہیں پر جتنی تھا۔ اپنی بیوی کو دیکھنے اور پرکھنے کے بعد برگ نے یہ نتیجہ اخذ کیا تھا کہ تمام خواتین کمزور اور احمق ہوتی ہیں۔ دھر ویرا کا دوسرے صرف اپنے شوہر سے بڑا اور اس نے صرف اسی کو دیکھا اور بھالا اور اسے دیکھ کر جو کچھ اس کے مشاہدے میں آیا، اس سے اس نے یہ عمومی نتیجہ نکالا کہ تمام مرد یہ سمجھتے ہیں کہ اس کے علاوہ باقی تمام مخلوق سوجھ بوجھ سے عاری ہے حالانکہ ان کا اپنا یہ حال ہے کہ وہ خود خود غرض، انا پسند اور ہر قسم کی معاملہ فہمی سے قبی دامن ہوتے ہیں۔

برگ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے نہایت حزم و احتیاط سے اپنی بیوی کو اپنی آغوش میں لے لیا تاکہ وہ کہیں بے رحمی میں اس کی بے آستین نیم تبا، جس پر اس نے چھٹی خاصی رقم خرچ کی تھی، چرمر نہ کر دے اور پھر پورا انداز سے اس کے لبوں پر بوسہ شیت کر دیا۔

”ہمیں صرف ایک بات کا خیال رکھنا ہو گا کہ ابھی بچے پیدا نہ ہونے دیں“ اس نے ملازم خیالات کی، جس سے وہ خود بھی آگاہ نہ تھا، برو میں بہتے ہوئے کہا۔

”نہیں“ ویرا نے جواب دیا۔ ”میں خود یہ نہیں چاہتی۔ ہمیں ابھی سو سائلی میں گھومنا پھرنا ہے۔“

”پرس یو سو پورا نے بالکل اس سے ملتی جلتی پوشاک پہن رکھی تھی“ برگ نے مطمئن و مسرور انداز سے مسکراتے ہوئے ویرا کی بے آستین نیم تبا کی طرف اشارہ کیا۔

عین اسی لمحے ملازم نے کاؤنٹ برو خوف کی آمد کی اطلاع دی۔ میاں بیوی نے آسودہ مسکراہٹوں کا تبادلہ کیا۔ دونوں میں سے ہر ایک اس مہمان کی آمد کو اپنے کھاتے میں ڈال رہا تھا۔

”رکھا، آدی کو درست بنانے کا ڈھنگ آتا ہو، تو اس کا یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے!“ برگ نے سوچا۔ ”آدی کو صحیح روایہ اختیار کرنے کا سیکھتا ہوں، تو اس کا کافی مدد یہ ہوتا ہے!“

”میری گزارش یہ ہے“ ویرا نے کہا، ”کہ جب میں مہمانوں کی خاطر مدارات میں مصروف ہوں گی، آپ اس میں کوئی دخل نہیں دیں گے کیونکہ میں سمجھتی ہوں کہ کس شخص کو کس چیز میں دلچسپی ہے، و کس شخص سے کیا کہنا ہے۔“

برگ دوبارہ مسکرا پڑا۔ ”لیکن اس سے منفر بھی تو کوئی نہیں۔ مرد بعض اوقات مردانہ گھنگو کرنا پسند کرتے ہیں“ اس نے کہا۔

ویٹر کو ڈرائنگ روم میں پہنچا دیا گیا۔ وہاں اشیا کچھ اس طرح رکھی گئی تھیں کہ ان کے حسبِ تناسب، صفائی ستھرائی اور ترتیب میں درختہ ڈالے بغیر وہاں بیٹھنا ناممکن تھا، چنانچہ یہ بات بالکل قابلِ فہم تھی اور اس پر کسی قسم کی حیرت نہیں ہونا چاہیے کہ برگ عالی ظرف کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے معزز مہمان کی خاطر کسی بازوؤں والی کرسی یا صوفے کے حسن ترتیب کی قربانی دینے کی چٹیکش کرتا، لیکن پھر اسے محسوس ہوا کہ وہ خود کوئی فیصد نہیں کر سکتا۔ اس سے اسے ذہنی

اذیت تو ضرور ہوئی، تاہم مہمان کو کہاں بیٹھنا چاہیے، اس کا فیصلہ اس نے اسی پر چھوڑ دیا۔ پیٹر نے ایک کرسی گھسیٹ لی اور یوں اسے حسن ترتیب میں بگاڑ پیدا کر دیا۔ ادھر برگ اور ویرا نے جو محفل رچائی تھی، اس کا افتتاح انھوں نے اس طرح کیا کہ اپنے مہمان کی خاطر تواضع کرنے کی کوشش میں فوراً ایک دوسرے کی بات کاٹنے لگے۔

ویرا اپنے ذہن میں طے کر چکی تھی کہ پیٹر کو فرانسیسی سفارت خانے کے بارے میں گفتگو کر کے غفلت کیا جائے چاہیے۔ چنانچہ اس نے آؤ دیکھانہ تاؤ، جھٹ پٹ یہی موضوع پھینڈ دیا۔ برگ اپنے دل میں ٹھان چکا تھا کہ موقع مردانہ گفتگو کا تقاضا کرتا ہے۔ چنانچہ اس نے اپنی بیوی کی بات کاٹ دی اور جنگ آسٹریا کے بارے میں اپنے تاثرات کا اظہار کرنے لگا۔ اس نے گفتگو عمومی انداز سے شروع کی تھی لیکن اس نے غیر شعوری طور پر اس کا رخ پیٹ دیا اور اس میں اپنی ذات کو گھسیٹ لیا۔ آسٹروی مہم میں شرکت کرنے کے لیے اسے جو تھوڑی بڑبڑ کی گئی تھی، اس نے ان کا ذکر کیا اور پھر اس نے ان رجوع پر، جن کی بنا پر اس نے یہ تجاویز مسترد کر دی تھیں، روشنی ڈالی۔ اگرچہ گفتگو انتہائی بے ربط اور بے جوڑ تھی اور ویرا اس بات پر طیش کھا رہی تھی کہ مردانہ پہلو خواہ مخواہ کیوں بیچ میں گھسیٹ لیا گیا ہے، میاں بیوی دونوں کو اس امر کے باوجود کہ گویا بھی تک صرف ایک ہی مہمان آیا تھا، بہت اطمینان محسوس ہو رہا تھا کہ ان کی محفل کا آغاز بہت احسن طریقے سے ہوا ہے اور وہ سمجھ رہے تھے کہ جس طرح بھلی میں مڑ کے دو دانے بالکل ایک جیسے ہوتے ہیں، ان کی محفل بھی اسی قسم کی دوسری محافل جیسی ہے۔ آخر یہاں کس چیز کی کمی تھی؟ دہائی چائے وہی گفتگو اور وہی روشن شمعیں، سبھی کچھ تو موجود تھا۔

کچھ زیادہ وقت نہیں گزرا تھا کہ برگ کا سابق رفیق کار بورس آگیا۔ وہ برگ اور ویرا کے ساتھ جس انداز سے پیش آرہا تھا، اس سے یہ مترشح ہو رہا تھا کہ وہ اپنے آپ کو ان سے قدرے برتر محسوس کر رہا ہے اور اس نے یہاں آکر ان پر بڑا احسان کیا ہے۔ بورس کے بعد کرنل اور اس کی اہلیہ، پھر بنس نفیس جرنیل اور اس کے بعد رستوف پھنچ گئے۔ اب اس بارے میں شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہیں رہ گئی تھی کہ یہ محفل دوسری محافل کا رنگ پکڑ گئی تھی۔ ان کے ذرائع روم میں جس قسم کی ہل چل مچی ہوئی تھی، جس طرح جھک جھک کر ایک دوسرے کو سلام و درآداب کہا جا رہا تھا، جس طرح سکرٹوں میں سرسراہٹ ہو رہی تھی اور بے ربط گفتگو جاری تھی، اس پر ویرا اور برگ اتنے مطمئن تھے کہ ان کے لیے اپنی مسکراہٹوں کو دوبارہ مشکل ہو گیا۔ (ان کے خیال کے مطابق) سب کچھ عین مین دیس ہی ہو رہا تھا جیسا کہ باقی جگہوں پر ہوتا ہے۔ جرنیل پر یہ بات خاص طور پر صدق آتی تھی۔ اس نے اپارٹمنٹ کی دل کھول کر تعریف کی، برگ کے کندھے پر پھکی دی اور پھر ان اختیار استعمال کرتے ہوئے تاش کے کھیل بوسٹن³⁹ کے لیے میز لگانے پر اصرار کیا۔ جرنیل کاؤنٹ ایلیکسندر جی کے قریب بیٹھ گیا کیونکہ مرچے کے اعتبار سے خود اس کے بعد اسی کا نمبر آتا تھا۔ بزرگوں نے بزرگوں کے پاس اور نوجوانوں نے نوجوانوں کے پاس نشستیں سنبھال لیں۔ چائے کی میز، جس پر بالکل اسی قسم کے کیک، جو پائٹن گمرالنے نے اپنی ضیافت کے لیے منگوائے تھے، چاندی کی ٹرے میں پڑے تھے، میزبان کی اہلیہ نے اپنی ٹھوکیں میں لے لی۔ درحقیقت ہر چیز بالکل

رہی ہی تھی جیسی کہ دوسری جنگوں پر ہوتی ہے۔

21

میئر انتہائی معزز مہمانوں میں شامل تھا، اس لیے بوشن کے کھیل کے دوران میں اسے مجبوراً کاؤنٹ ایلیا آندرچ، جنرل اور کرنل کے ساتھ بیٹھنا پڑا۔ جس میز پر یہ کھیل ہو رہا تھا، اس کے بالکل سامنے ناشائستگی تھی۔ اجتماعی رقص کی شب سے اس میں جو حیرت انگیز تبدیلی آئی تھی، اس نے اس کی توجہ اپنی طرف مبذول کرائی۔ وہ شاید وہاں ہی کوئی بات منہ سے نکال رہی تھی۔ بال پر اس کا حسن جس طرح نکھرا تھا، اس کے مقابلے میں اب نہ صرف اس کی خوبصورتی اند پڑ چکی تھی بلکہ اگر اس کے چہرے پر اپنے گروڈیش کی ہر چیز کے بارے میں خفیف بے نیازی نہ جھلک رہی ہوتی تو یہ بالکل ہی سپاٹ نظر آتا۔

”اسے کیا ہوا ہے؟“ میئر نے اس پر چھپتی نگاہ ڈالتے ہوئے سوچا۔

وہ اپنی ہمیشہ کے پاس چائے کی میز کے سامنے بیٹھی اور بے دلی سے بورس کی، جو اس کے قریب بیٹھا تھا، کسی بات کا اس کی طرف دیکھے بغیر ہی، جواب دے رہی تھی۔ میئر نے تاش کی پوری بازی، جس کے دوران میں اس نے پانچ ٹرک بھی کھیلے جس پر اس کے ساتھی کو بہت اطمینان ہوا، کھیل لی۔ اتنے میں اس کے کانوں میں کچھ اس قسم کی آوازیں نکرائیں جیسے کسی شخص کو خیر مقدمی کلمات کہے جا رہے ہوں اور اس کے ساتھ ہی اسے کسی شخص کے اندر آنے کی آہٹ سنائی دی۔ میئر اپنے پتے اٹھا رہا تھا کہ ایک بار پھر اس کی نگاہیں ناشائستگی پر پڑ گئیں۔

”اسے کیا ہوا ہے؟“ اس نے اور بھی حیرت زدہ ہو کر سوچا۔

اس کے سامنے پرنس آندرے کھڑا تھا۔ اس کی نگاہوں میں محتاط ملاحظہ تھی اور وہ اس سے کچھ کہہ رہا تھا۔ وہ اپنا سر اٹھائے اس کی جانب دیکھ رہی اور شرمارہی تھی۔ نظر آتا تھا کہ وہ اپنی تیز سانسوں پر قابو پانے کی کوشش کر رہی ہے۔ کسی اندرونی آتش کی چمک، جو پہلے بچھ چکی تھی، اب پھر سے اس کے چہرے پر پیدا ہونے لگی تھی۔ اس کی تو کایا ہی پلٹ گئی۔ اب اس کا چہرہ سپاٹ نہیں رہا تھا بلکہ ایک بار پھر وہاں وہی حسن و جمال تھا جو اس نے اجتماعی رقص کی رات دیکھا تھا۔

پرنس آندرے میئر کے پاس آیا اور میئر کو اپنے دوست کے چہرے پر نئی نازکی اور شباب جھلکتا نظر آیا۔ کھیل کے دوران میں میئر نے متعدد بار اپنی جگہ تبدیل کی۔ کبھی وہ ناشائستگی کی جانب پشت کر لیتا اور کبھی اس کے گرد بڑھ جاتا۔ اس نے چہرہ برکھیلے اور ان کے دوران میں وہ مسلسل اسے اور اپنے دوست کو دیکھتا رہا۔

”ان دونوں کے مابین کوئی انتہائی اہم اور سنجیدہ چیز وقوع پذیر ہو رہی ہے،“ میئر نے سوچا۔ اور اس کے سہم اور کٹنگی کے طے جملے جذبات نے اس کے قلب میں وہ بیل چل پیدا کر دی کہ کھیل پر اس کی توجہ مرکوز نہ رہ سکی۔ جب چہرہ برکھل ہو گئے، جنرل یہ کہتے ہوئے کہ اس طرح کھیلا لا حاصل ہے، اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور میئر کی

جان چھوٹ گئی۔ نناشا ایک طرف ہٹ گئی تھی اور سونیا اور بورس کے ساتھ باتیں کر رہی تھی۔ ویرا شوخ اور نہ بکھٹ انداز سے مسکرا رہی تھی اور پرنس آندرے سے کچھ کہہ رہی تھی۔ پیٹر اپنے دوست کے پاس پہنچا اور پرچنے لگا۔ ”کوئی راز دارانہ گفتگو ہو رہی ہے؟“ وہ ان کے قریب ہی بیٹھ گیا۔

پرنس آندرے نناشا کے ساتھ جس التفات سے پیش آیا تھا، وہ ویرا کی نظروں سے اوجھل نہ رہ سکا۔ وہ اس نتیجے پر پہنچی کہ اس قسم کی محفل، اصلی محفل، کا تقاضا یہ ہے کہ نرم و ملائم جذبات کی طرف محتاط انداز سے اشارہ کیا جائے اور ایک موقع کا فائدہ اٹھاتے ہوئے، جب پرنس آندرے تنہا تھا، اس نے جذبات کے بارے میں مولیٰ گفتگو شروع کر دی اور سچ سچ میں اپنی ہمیشہ کا ذکر بھی کرنے لگی۔ اسے محسوس ہوا کہ اس طرح کے دانش ور مہمان کے ساتھ، جیسا کہ پرنس آندرے اس کی دانست میں تھا، بیٹھنے کے لیے اسے نین سفارت کی مہارت کو بروئے کار لانا ہوگا۔

جب پیٹر ان کی محفل میں جا شامل ہوا، اس نے دیکھا کہ ویرا جس روانی سے گفتگو کر رہی ہے، اس پر وہ خود ہی نازاں ہو رہی ہے، جب کہ پرنس آندرے شرما ور گھبرا رہا ہے۔ اور یہ ایک ایسی کیفیت تھی جو نناشا ہی کبھی اس کے ساتھ پیش آئی ہوگی۔

”آپ کی کیا رائے ہے؟“ ویرا نے گھٹنے انداز سے مسکرا کر پوچھا۔ ”پرنس، آپ اتنے دقیقہ شناس ہیں کہ پلک جھپکنے میں کسی شخص کے اندر جھانک کر دیکھ سکتے ہیں اور اندازہ لگا سکتے ہیں کہ وہ کس قسم کا انسان ہے۔ نناشا کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟“ کیا وہ اپنی وابستگیوں کے بارے میں، ستقامت کا مظاہرہ کر سکتی ہے؟ کیا وہ دوسری خواتین۔ ویرا کی مراد اپنی ذات تھی۔ ”کی طرح ہمیشہ ایک ہی مرد سے پیار کر سکتی ہے اور دائمی طور پر اس سے وفاداری نبھا سکتی ہے؟“ میرے خیال میں سچی محبت اسی چیز کا نام ہے۔ پرنس، آپ کی کیا رائے ہے؟“

”میں آپ کی ہمیشہ کو کچھ زیادہ نہیں جانتا،“ پرنس آندرے نے بناوٹی تبسم سے، جس کی اوٹ میں وہ اپنی گھبراہٹ اور احساس شرمندگی کو چھپانے کی کوشش کر رہا تھا، کہا۔ ”اس لیے میں اس نازک مسئلے کے بارے میں کوئی قصی رائے دینے سے قاصر ہوں۔ اور پھر میں نے یہ بھی دیکھ ہے کہ“ اس نے پیٹر کی جانب، جو ان کے نزدیک پہنچ چکا تھا، دیکھتے ہوئے کہا، ”عورت میں جتنی کم دلکشی ہوتی ہے، اس کے ثابت قدم رہنے کا اتنا ہی زیادہ امکان ہوتا ہے۔“

”جی ہاں، پرنس، آپ نے بجا فرمایا۔ ہمارے زمانے میں،“ ویرا نے پنا سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔ (وہ ”ہمارے زمانے“ کا ذکر بیحد اسی انداز سے کر رہی تھی جس طرح محمد دودھانت کے حامل اشخاص عام طور پر کرتے ہیں۔ وہ یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ وہ ”ہمارے زمانے“ کی خصوصیات دریافت کر چکے اور اس کا عکا کہہ کر چکے ہیں، اور انھیں یہ بھی معلوم ہو چکا ہے کہ وقت کے ساتھ ساتھ انسانی فطرت تبدیل ہوتی رہتی ہے۔)

”ہمارے زمانے میں لڑکی کو اتنی آزادی مل چکی ہے کہ مرد اس کا دل بھرنے اور اسے بچھانے پر چاہنے کی جو کوشش

کرتا ہے، اس سے وہ اتنا مسرور ہو جاتی ہے کہ اکثر اوقات اس کے سچے جذبات کا گلا گھٹ جاتا ہے، اور یہاں یہ اعتراف کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ دنیا لیا اس سلسلے میں کچھ زیادہ ہی اثر پذیر ہے۔“

نشا کے موضوع کی اس تکرار نے پرنس آندرے کو براہ فرہستہ کر دیا اور اس کی بھویں تن گئیں۔ وہ اٹھنے ہی والا تھا کہ میر نے اور بھی گھٹنے انداز سے مسکراتے ہوئے اپنی بات جاری رکھی۔

’میں نہیں سمجھتی کہ کسی دوشیزہ کا دل جیتنے کی اتنی کوششیں کی گئیں ہوں گی جتنی کہ اس کی‘، اس نے کہا۔
 ”لیکن پچھلے دنوں تک کوئی بھی اسے صحیح معنوں میں متاثر نہیں کر سکا تھا، ورنہ اس نے سنجیدگی سے کسی کے بارے میں سوچا تھا۔ اور کاؤنٹ“ اس نے بیئر سے مخاطب ہو کر کہا: ”آپ تو جانتے ہیں کہ ہمارا پیارا کزن بورس، دریہ بات میں محض آپ سے کہہ رہی ہوں، محبت (la tendresse) کی مملکت میں بہت دور تک سفر کر چکا تھا۔“ (وہ محبت کے اس نقشے کی طرف، جو اس زمانے میں بہت رواج پا چکا تھا، اشارہ کر رہی تھی۔)

پرنس آندرے کی تیوریاں چڑھ گئیں لیکن اس نے لب کشائی سے احتراز کیا۔

”آپ اور بورس دوست ہیں۔ میں نے درست کہا؟“ میرا نے پوچھا۔

”ہاں، میں اسے جانتا ہوں۔۔۔“

”میرا خیال ہے کہ اس نے نشا سے اپنی بچکانہ محبت کے متعلق آپ کو کچھ نہ کچھ بتایا ہوگا؟“

”ان میں بچکانہ محبت تھی؟“ پرنس آندرے نے ایک دم پوچھا۔ غیر متوقع طور پر شرم سے اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔

”ہاں، آپ کو معلوم ہے کہ کزنوں کے مابین بے تکلفی ہوتی ہے اور یہ بے تکلفی اکثر اوقات محبت پر منتج ہوتی ہے۔ Le Cousinage est un dangereux voisinage۔ آپ کا کیا خیال ہے؟“

”اوسے ہاں، بے شک، بے شک،“ پرنس آندرے نے کہا۔ پھر وہ دفعتاً اور غیر فطری بے شاشت سے بیئر سے دل لگی کرنے اور اسے متنبہ کرنے لگا کہ ماسکو میں اس کی جو پچاس پچاس سالہ کزن ہیں، اسے ان کے ساتھ اپنے تعلقات کے بارے میں حدود درجہ تجاوز ہونا چاہیے اور اس قسم کی پر نفیض باتیں کرتے کرتے وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے بیئر کو بازو سے پکڑا اور اسے ایک طرف لے گیا۔

”بھونہا کیا بات ہے؟“ بیئر نے پوچھا۔ اپنے دوست کی خلاف عادت کلفت مزاجی نے اسے حیران و سرگرداں کر دیا تھا۔ اس نے اٹھتے اٹھتے جس انداز سے نشا کو دیکھا تھا، وہ اسے دیکھ چکا تھا اور وہ بھی اس کے لیے اچھے کا باعث بنا تھا۔

”مجھے۔۔۔ مجھے تمھارے ساتھ بات کرنا ہے،“ پرنس آندرے نے کہا۔ ”تمھیں خواتین کے داستانوں کی اس جوڑی کے بارے میں تو پتا ہی ہے۔“ (اس کا اشارہ میسوں کے ان کے داستانوں کی طرف تھا جو اس شخص کو جو فری

قریبی قرابت وادوں کا، اختلاط خطرناک نتائج کو جنم دیتا ہے۔

میسز کی تحریک کا نیا نیا رکن بنا ہوا، دیے جاتے ہیں۔ اس نے یہ دستاویز اس خاتون کو، جس سے اسے محبت ہو رہی ہو، دیا اور اس کے قریب بیٹھ گیا۔ اس کی آنکھوں میں عجیب و غریب قسم کی جگمگاہٹ، اور اس کی حرکات و سکنات میں بے قراری تھی۔

بیئر نے دیکھا کہ پرنس آندرے نے نٹاشا سے کچھ پوچھا اور جب وہ جواب دے رہی تھی، شرم و حجاب سے اس کے گال سرخ ہو رہے تھے۔

اتنے میں برگ بیئر کے پاس آیا اور اس سے اصرار کرنے لگا کہ جرنیل اور کرنیل کے مابین ہمسائیگی صورت حال کے بارے میں جو بحث چھڑی ہوئی ہے، اس میں وہ بھی شرکت کرے۔

برگ مطمئن اور ہشاش بشاش تھا۔ اس کا چہرہ مستقر مسکرا رہا تھا۔ اس کی پارٹی بہت کامیاب رہی تھی اور سولہ آنے ن محافل کی مماثل تھی جن میں اسے کبھی شریک ہونے کا موقع ملا تھا۔ ان محافل میں جو کچھ۔ خواتین کی تعلق گفتگو، ناش کا کھیل، کھیل کے بارے میں جرنیل کا با آواز بلند تبصرہ، سادار، اور چائے کے ایک، سکن۔ ہوتا ہے، یہاں بھی ہو بہو وہی کچھ موجود تھا۔ صرف ایک چیز کی، جو اس نے ہمیشہ دوسری محافل میں دیکھی تھی اور جس کی وہ نقل کرنا چاہتا تھا، کمی رہ گئی تھی۔ کسی اہم دانش ورانہ مسئلے کے متعلق مردوں میں نہ تو تندہ تیز گفتگو ہوتی اور نہ وہ آپس میں الجھے۔ اب جرنیل نے اس قسم کی بحث پھیر دی تھی اور برگ بیئر کو اس میں گھسیٹہ ہاتھا۔

22

اگلے روز پرنس آندرے کاؤنٹ کی دعوت پر ستونوں کے ہاں گیا اور اس نے بقیہ دن وہیں گزارا۔ تمام افراد خانہ کو یہ اندازہ ہو گیا کہ اس نے کس کی خاطر ان کے گھر آنے کی زحمت گوارا کی ہے۔ پرنس آندرے نے بھی کسی قسم کی رازداری برتنے کی کوشش نہ کی اور وہ ہمہ وقت نٹاشا کے ساتھ تھی رہنے کے جتن کرتا رہا۔ نہ صرف نٹاشا اپنے تہاں خانہ دل میں ڈری سہی ہوئی تھی اور ساتھ ساتھ مسرت و انبساط کے فلک ہنم پر بھی پہنچی ہوئی تھی بلکہ گھر کے دیگر افراد پر کچھ اس نوع کی ہیبت طاری تھی جیسے وہ کسی عظیم اور گہیر وافتے کے ظہور پزیر ہونے کے منتظر ہوں۔ جب بھی پرنس آندرے نٹاشا کے ساتھ کوئی بات کرتا، کاؤنٹس اداس اور انتہائی سنجیدہ لگا ہوں سے اس کا تعاقب کرنے لگتی اور جو غمی وہ مڑ کر خود اس کی جانب دیکھتا، وہ ڈرے ڈرے انداز سے مصنوعی اور بے ربط گفتگو شروع کر دیتی۔ سونیا نٹاشا کے پاس سے اٹھ کر جانے سے بھی خائف تھی لیکن وہاں بیٹھے رہنے پر بھی اس کے دل پر ہول طاری ہو رہا تھا کہ کہیں وہ دونوں کے مابین سبز راہ تو نہیں بن رہی۔ خود نٹاشا کی یہ حالت تھی کہ اگر وہ ایک آدمے کے لیے بھی اس کے ساتھ تہہ رہ جاتی، اس اندیشے سے کہ اب کچھ ہوا، اب کچھ ہوا، اس کی رگت پیلی پڑ جاتی۔ پرنس آندرے کی بے حوصلگی اور جھجک نے سے ششدر کر دیا تھا۔ وہ محسوس کر رہی تھی کہ پرنس آندرے

اس سے کچھ کہنا چاہتا ہے لیکن اپنا مافی الضمیر ادا کرنے کا حوصلہ نہیں پاتا۔
شام کو جب پرنس آندرے چل گیا، کاؤنٹس نتاشا کے پاس گئی اور اس کے کان میں کہنے لگی۔
”ہونہ؟“

”اما، خدا کے لیے مجھ سے فی الحال کچھ نہ پوچھیں۔ اس بارے میں بات کرنا ناممکن ہے!“ نتاشا نے کہا۔
تاہم اس رات وہ خاصی دیر تک اپنی ماں کے بستر میں لیٹی رہی۔ وہ غلطی باندھے سیدھ میں دیکھ رہی تھی،
کبھی وہ خوشی سے جھوم اٹھتی اور کبھی اندیشوں اور دوسوں میں گھرجاتی۔ اس نے اپنی ماں کو بتایا کہ وہ کس طرح اس
کی تعریفوں کے پل باندھتا رہا تھا، اس نے کیسے اسے بتایا کہ وہ دس ور چارہ ہے، کیسے اس سے پوچھا کہ وہ گرمیاں
کہیں گزریں گے اور پھر کس طرح بورس کے بارے میں کرید کی۔

”لیکن ایسی... ایسی چیز اس سے پہلے میرے ساتھ کبھی پیش نہیں آئی تھی!“ اس نے کہا۔ ”بات صرف یہ
ہے کہ ان کی موجودگی میں مجھ پر خوف طاری ہو جاتا ہے۔ جب بھی میں ان کے پاس ہوں ہوں، میں خوف
میں مبتلا ہو جاتی ہوں۔ اس کا کیا مطلب ہے؟ کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ حقیقی چیز ہے؟ یہی مطلب ہے؟ اما،
آپ سو رہی ہیں؟“

”نہیں، ڈارلنگ، میں خود خوف زدہ ہوں۔“ اس کی ماں نے کہا۔ ”اب تم چاؤ۔“
”لیکن مجھے نیند نہیں آئے گی۔ اگر میں سو گئی، تو یہ بڑی احتمالہ حرکت ہوگی! اف، اما، ڈیر اما، اس سے پہلے
کبھی مجھ پر اس قسم کی واردات نہیں گزری تھی!“ وہ پکاری۔ باطن میں اسے جس احساس کا وقف تھا، اس نے اسے
درط حیرت میں گم کر دیا تھا اور اس پر ہیبت طاری کر دی تھی۔ ”اور ہم نے کبھی خواب میں بھی یہ نہیں سوچا ہوگا...“
نتاشا کو احساس ہوا کہ اس نے جب پہلی مرتبہ پرنس آندرے کو اتر ادنایا میں دیکھا تھا، وہ اسی وقت اس کی
محبت میں گرفتار ہو گئی تھی۔ جس شخص کو اس نے تب اپنا جیون ساتھی منتخب کیا تھا (اسے پختہ یقین تھا کہ اس نے ایسا
ی کیا تھا)، اب یوں لگ رہا تھا کہ بالکل اسی آدمی سے دوبارہ مل کر، بالخصوص ان حالات میں جب کہ وہ بظاہر اس
سے سب امتنا نظر نہیں آتا تھا، اسے جو انوکھی اور غیر متوقع خوشی حاصل ہوئی تھی، اس سے اس کے دل میں خوف بیٹھ
گیا ہے۔

”یہ کہ وہ بالکل انھی ایام میں پیئرز برگ آئے جب کہ ہم یہاں موجود تھے! پھر بال میں ہماری ملاقات
ہوئی! اکی کا نام مقدور ہے! صریحاً یہ مقدور ہی تو ہے کہ سب کچھ اس انجام کو پہنچا۔ جب میں نے انہیں پہلی مرتبہ
دیکھا تھا، تبھی میں نے کوئی خاص بات محسوس کی تھی۔“

”اس نے تم سے کیا کہا تھا؟ اور یہ کیا اشعار ہیں؟ مجھے پڑھ کر سناؤ!“ اس کی ماں نے ان چند اشعار کی طرف،
جو پرنس آندرے نے نتاشا کی اہم میں تحریر کیے تھے، اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ اس طریقے سے وہ اس کی دل جوئی
کو اچا ہتی تھی۔

”اما، وہ رنڈا ہے، اس میں شرم کی تو کوئی بات نہیں؟“

”نناشا، چپ کر۔ خداوند سے خیر مانگو۔ رشتے، فداک پر طے ہوتے ہیں۔“

”اما ڈارلنگ، میں آپ کو کتنا چاہتی ہوں! میں کتنا خوش ہوں!“ نناشالے با آواز بلند کہا۔ وہ اپنی ماں سے پیٹ گئی، در سرت و بیجان کے عالم میں اس کی آنکھوں کے پیمانے پھٹنے لگے۔

ادھر عین اسی وقت پرنس آندرے پیٹر کے پاس بیٹھا تھا اور اسے اپنی داستان محبت سنارہا تھا۔ وہ اپنے اس عزم مصمم کا اظہار کر رہا تھا کہ وہ اسے اپنی دلہن بنا کر ہی دم لے گا۔



اسی شام کاؤنٹس ہیلینا واسیلیو نابز و خود اسے استقبال کے لیے کا اہتمام کیا۔ دعوت میں فرانسیسی سفیر، ایک نجیب، افسر فین غیر کی شہزادہ، جو گزشتہ کچھ عرصے سے باقاعدگی سے کاؤنٹس کے گھر کا طواف کر رہا تھا، اور ذہین و فطین خواتین و حضرات کی اچھی خاصی تعداد شریک تھی۔ پیٹر نیچے تر آیا تھا اور مختلف کمروں میں گھوم پھر رہا تھا۔ وہ کھویا کھویا سا تھا، اپنے خیالات میں مستغرق تھا اور اس کے چہرے پر وحشت برس رہی تھی۔ اس کی یہ کیفیت دیکھ کر سب مہمان بہت متعجب ہوئے۔

جس رات بال منعقد ہوا تھا، تبھی سے اسے محسوس ہونے لگا تھا کہ اس پر اعصابی اضمحلال کا دورہ پڑنے والا ہے اور وہ اس سے نبرد آزما ہونے کی سر توڑ کوشش کر رہا تھا۔ جب سے اس کی اہلیہ نے شاہی شہزادے کے ساتھ راہ و رسم بڑھائی تھی، اسے غیر متوقع طور پر مصاحب (جنٹلمین۔ ان۔ ویٹنگ) مقرر کر دیا گیا تھا۔ اب اسے درباری طبقے کے مابین کچھ یوں محسوس ہونے لگا جیسے اس کا دم گھٹ رہا ہو۔ اس پر شرمندگی کا احساس اس قدر غالب تھا کہ اپنی دانست میں وہ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہا تھا۔ ماضی میں وہ یہ سمجھتا رہا تھا کہ ہر وہ چیز، جس کا تعلق حضرت انسان سے ہے، بچا ہے، بے بنیاد ہے، بے ایک بار پھر اسی طرح کے بھیانک خیالات، بالخصوص اس کے ذہن پر یورش کرنے لگے۔ اس کے ساتھ ہی اس نے نناشا، جسے وہ اپنی متوسل سمجھتا تھا، اور اپنے دوست پرنس آندرے کے مابین جس قسم کے جذبے کا مشہدہ کیا تھا، اس نے جتنی پرتیل کا کام کیا۔ وہ جب اپنے دوست کی اور خود اپنی صورت حال کا موازنہ کرتا، اس کی افسردگی نروں تر ہو جاتی۔ وہ برابر اس کوشش میں لگا رہتا تھا کہ وہ اپنی بیوی اور نناشا و پرنس آندرے کے بارے میں کچھ نہ سوچے۔ ابدیت کے مقابلے میں اسے ہر چیز دوبارہ بے وقعت نظر آنے لگی اور ایک بار پھر اس کے ذہن میں یہ سول گردش کرنے لگا ”یہ سب کس لیے ہے؟“ عین کی حیثیت سے وہ جس نوعیت کے کاموں میں مشغول تھا، انہیں سراپجام دینے کے لیے اب وہ اپنی جان پر جبر کرنے لگا اور دن رات محنت کرنے لگا۔ اسے امید تھی کہ اس طرح وہ اس بدروح سے، جو ہر وقت خطرہ بن کر اس کے سر پر منڈلان رہتی تھی، پیچھا چھڑا سکے گا۔

بوقت نیم شب وہ کاؤتس کے پارٹمنٹ سے بالائی منزل پر پنے کمرے میں، جس کی چھت نیچی تھی اور جو دیوڑھی سے بھرا ہوا تھا، پہنچ گیا۔ اس نے بوسیدہ ڈریسنگ گاؤن پہنا اور میز کے سامنے بیٹھ گیا۔ دس کاؤٹس فری میس کے دو بین مسودوں کی نقول تیار کر رہا تھا کہ کوئی شخص اندر آ گیا۔ یہ پرنس آندرے تھا۔

”اگر تم“ میئر نے کہا۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنے ہی خیالات میں کھویا ہوا ہے اور نامطعن دنا آسودہ ہے۔ ”دیکھ رہے ہو میں اپنے کام میں مصروف ہوں،“ اس نے اپنے مسودے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ اس کا انداز بنیاداً دنا مراداً اشخاص کا تھا جو پنے کام کو زندگی کی تلخیوں اور دشواریوں سے نجات حاصل کرنے کا واحد ذریعہ تصور کرتے ہیں۔

پرنس آندرے اس کے سامنے کھڑا تھا۔ اس کے چہرے پر وہ چمک دمک اور فرحت و راحت تھی جیسے اسے نئی زندگی مل گئی ہو۔ اس کے دوست کی شکل و صورت سے جو وزن و مبالغہ چمک رہا تھا، اس نے اس پر کوئی توجہ نہ دی۔ وہ اس کے سامنے سرسرت کی انا کے ساتھ کھٹلا جا رہا تھا۔

”دیکھو یار!“ اس نے کہا، ”میں کل تمہارے ساتھ بات کرنا چاہتا تھا اور اب میں تمہیں اسی کے متعلق بتانے آیا ہوں۔ اس سے قبل مجھے اس قسم کا کبھی کوئی تجربہ نہیں ہوا تھا۔ دوست، مجھے محبت ہو گئی ہے!“

اپنا ٹک میئر نے زور سے آدھ بھری اور وہ دھڑام سے پرنس آندرے کے قریب صوفے پر پاؤں پسا کر بیٹھ گیا۔ ”میرا خیال ہے کہ تمنا سوار ستودا سے،“ اس نے کہا۔

”ہاں، بالکل۔ اور کس سے؟ مجھے کبھی یقین نہ آتا کہ ایسا ممکن ہے لیکن جذبہ مجھ سے قوی تر ہے۔ کل میں نگاروں پر لوٹ رہا تھا، میں کرب و ذیت میں مبتلا تھا لیکن میں اس کرب و اذیت کا بھی دنیا کی کسی چیز سے تبادلہ نہیں کروں گا۔ اس سے پہلے میں جیا ہی نہیں، زندگی تو مجھے اب ملی ہے لیکن اس کے بغیر میں زندہ نہیں رہ سکوں گا۔ لیکن کیا وہ مجھ سے محبت کر سکے گی؟ ہم دونوں کی عمریں میں بہت فرق ہے۔ تم کچھ کہتے کیوں نہیں؟“

”میں؟... میں؟ میں کیا کہوں؟“ میئر نے کہا۔ وہ دفعتاً اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور کمرے میں چکر لگانے لگا۔ ”میں نے ہمیشہ یہی سمجھا ہے۔ وہ لڑکی ایسا عجیب ہے، ایسا۔ وہ نایاب لڑکی ہے۔ میرے عزیز دوست، میں تم سے ہاتھ جوڑ کر التجا کرتا ہوں، تیل و قال نہ کرو، اگر مگر کے چکر میں نہ پڑو، شک و شبہ کے جال میں نہ پھنسو، شادی کرلو، شادی کرلو۔ اور میں یہ بات دھڑے سے کہہ سکتا ہوں کہ تم سے زیادہ سرور و مطمئن شخص دنیا کے تحتے پر نہیں ملے گا۔“

”لیکن اس کی مرضی؟“

”وہ تم سے محبت کرتی ہے۔“

”فصل باتیں مت کرو۔۔۔“ پرنس آندرے نے سکراتے اور میئر کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

”وہ تم سے محبت کرتی ہے، مجھے معلوم ہے!“ میئر نے پرتو در انداز سے کہا۔

”نہیں، سنو!“ پرنس آندرے نے اس کا بازو تھامتے اور اسے روکتے ہوئے کہا۔ ”تمہیں معلوم ہے کہ میں

کس کیفیت میں سے گزر رہا ہوں؟ مجھے اس کے بارے میں کسی نہ کسی سے لازماً بات کرنا ہوگی۔“

”اچھا، پھر شروع ہو جاؤ۔“ کرو بات۔ میں بہت خوش ہوں، پیئر نے کہا دروآتی اس کا چہرہ متقلب ہو چکا تھا۔ اس کی پیشانی پر جو سلوٹیں تھیں، وہ کا نور ہو چکی تھیں۔ وہ خوش تھا اور ہم تن گوش۔

پرنس آندرے مکمل طور پر مختلف، درنیا شخص نظر آ رہا تھا اور حقیقتاً وہ تھا بھی۔ وہ جو ہر وقت بیزار رہتا تھا، زندگی کے متعلق حقارت کا اظہار کرتا تھا، کہتا تھا کہ مجھے اس نے مایوس کیا ہے۔ پھر اس کی یہ بیزاری کہاں گئی؟ اس کی حقارت کا کیا بنا؟ اور اس کی، یوسی کہاں غائب ہو گئی؟ پیئر واحد شخص تھا جس سے وہ کھل کر بات کر سکتا تھا اور جو کچھ اس کے دل میں تھا، وہ اس نے اس کے سامنے بلا کم و کاست بیان کر دیا۔ اس نے بد تامل اور پراعتقاد انداز سے اپنے ان منصوبوں پر، جن کا تعلق دور مستقبل سے تھا، روشنی ڈالی۔ اس نے اعلان کیا کہ وہ اپنی خوشیوں کو اپنے باپ کی تلون مزاجی کی بھیٹ نہیں چڑھا سکتا۔ وہ یا تو اسے مجبور کر دے گا کہ وہ اس شادی کے بارے میں اپنی رضامندی کا اظہار کر دے اور اس کی دلہن سے انکسار برتے، اور یا وہ اس کی رضامندی کا خیال ہی چھوڑ دے گا۔ اس کے بعد اس نے ان جذبات کے بارے میں، جو اسے اپنی گرفت میں لے چکے تھے، اپنی حیرت کا اظہار کیا۔ اس کا خیال تھا کہ اس کے یہ جذبات نرالے اور ناقابل فہم ہیں اور از خود اس کے دس میں در آئے ہیں، اس میں اس کی اپنی مرضی کا کوئی دخل نہیں تھا۔

”اگر کوئی دوسرا شخص مجھے یہ بتاتا کہ میں اس طرح ٹوٹ کر محبت کر سکتا ہوں، مجھے کبھی یقین نہ آتا، اس نے کہا۔“ میں نے اس قسم کا جذبہ اس سے پہلے کبھی محسوس نہیں کیا۔ میرے لیے، سب کل عالم دو نصف نصف اڑا میں تقسیم ہو چکا ہے۔ ایک نصف وہ ہے، جہاں وہ ہے۔ دہیں ساری امیدیں، مسرتیں اور روشنی ہیں اور دوسرا نصف وہ ہے، جہاں وہ نہیں ہے۔ وہاں مکمل تاریکی ہے، اداسی ہے، ناامیدی ہے۔“

”تاریکی، اداسی، ناامیدی،“ پیئر نے دہرایا۔ ”ہاں، ہاں، میں سمجھ گیا ہوں۔“

”میں روشنی سے محبت کیے بنا رہا ہی نہیں سکتا۔ یہ میرا قصور نہیں۔ اور میں بے حد مسرور ہوں! کیا تم میری بات سمجھتے ہو؟ مجھے معلوم ہے کہ تم میری خاطر خوش ہو۔“

”ہاں، ہاں،“ پیئر نے اس سے اتفاق کا اظہار کیا۔ وہ اداس اور ہمدردانہ لگا ہوں سے اپنے دوست کو دیکھ رہا

تھا۔

پرنس آندرے کا مقدر اسے جتنا زیادہ روشن دکھائی دیا، اپنی قسمت اسے اتنی ہی زیادہ تاریک نظر آئی۔

اپنا بیابان رچانے کے لیے پرنس آندرے کو اپنے باپ کی جائزت درکار تھی اور اس مقصد کے حصول کے لیے وہ اگلے ہی روز گاؤں روانہ ہو گیا۔

باپ نے بیٹے کی خبر بظاہر صبر و تحمل سے سنی لیکن اندر ہی اندر وہ غصے سے کھول رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اب جب کہ وہ خود چراغ سحری تھا اور اپنی زندگی کے آخری ایام بتا رہا تھا، کسی شخص کو اپنی زندگی کا ڈھانچہ تبدیل کرنے اور اس میں کسی نئی چیز کو متعارف کرانے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ ”اگر یہ لوگ مجھے اپنی زندگی اس ڈھب سے جس ڈھب سے میں اسے گزارنا چاہتا ہوں، گزارنے دیں، بڑے میاں نے اپنے آپ سے کہا، پھر میرے بعد ان کے جوہی میں آئے، کرتے رہیں۔“ تاہم اپنے بیٹے کے ساتھ اس نے اسی حکمت عملی سے، جو وہ نہایت اہم مواقع پر استعمال میں لاتا تھا، کام لیا۔ اس نے پرسکون لہجہ اختیار کیا اور سارے مسئلے کو زیر بحث لے آیا۔

اول حسب نسب، روپے پیسے، حفظ مراتب، کسی اعتبار سے بھی یہ رشتہ ان کے شایان شان نہیں ہے۔ دوم پرس آندرے شایب کی دہن پر دستک نہیں دے رہا اور اس کی صحت بھی چنداں قابل رشک نہیں (بڑے میاں نے اس نکتے پر خاص طور پر زور دیا)، جب کہ وہ بالکل نو خیز ہے۔ سوم: وہ ایک بیٹے کا باپ ہے اور اسے محض بیٹی کی تحویل میں دینا ظلم ہوگا۔ ”چوتھی اور آخری بات یہ ہے،“ باپ نے بیٹے کو ہنسی سے دیکھتے ہوئے کہا: ”میری التجا ہے کہ تم اپنی اس شادی کو ایک سال کے لیے مؤخر کر دو۔ دس اور چار، اپنا علاج کراؤ اور جیسا کہ تمہاری خواہش ہے، اپنے صاحب زادے کے لیے کوئی جرمن ٹیوٹر تلاش کرو اور اس کے بعد بھی، اگر تمہارا عشق، نفسانی جذبہ، ہٹ دھرمی۔ جو چاہے، اسے نام دے لو۔ اتنا ہی تو اتنا رہے، پھر بے شک شادی کر لو۔ اور اس موضوع پر یہ میرا حرف آخر ہے، کسی بھول میں نہ رہنا، حرف آخر ہے!۔“ پرس نے اپنی بات کا اختتام کچھ اس لہجے سے کیا جس سے یہ مترشح ہوتا تھا کہ دنیا کی کوئی طاقت اسے اپنا فیصلہ بدلنے پر مجبور نہیں کر سکتی۔

پرس آندرے پر یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہو گئی کہ بڑے میاں کو امید ہے کہ نہ اس کے اپنے اور نہ اس کی متوقع دہن کے جذبات ایک سال کی آزمائش پر پورا اتریں گے یا پھر اس عرصے کے دوران میں معمر پرس، رانی ملک عدم ہو جائے گا۔ چنانچہ اس نے اپنے باپ کی خواہشات کا احترام کرنے اور اپنی شادی ایک سال کے لیے مؤخر کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

رستونوں کے ساتھ اپنی آخری ملاقات کے تین ہفتے بعد پرس آندرے ہیٹرز برگ واپس آ گیا۔



جس مرد متاثر کی اپنی والدہ سے گفتگو ہوئی تھی، اس سے اگلے دن وہ ہمہ وقت بلکوسکی کی آمد کی منتظر رہی لیکن وہ نہ آیا۔ اس سے، گلہ اور اس سے بھی اگلا دن اسی کیفیت میں گزرا۔ جیتر نے بھی اپنی شکل نہ دکھائی۔ متاشا کو یہ معلوم نہیں تھا کہ پرس آندرے اپنے باپ سے ملنے چلا گیا ہے، اس لیے اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس غیر ماضی سے کیا مفہوم اخذ کرے۔

یوں تمنا بنتے بیت گئے۔ متاشا کو کہیں بھی آنے جانے کی خواہش نہیں رہی تھی۔ وہ بھوت کی مانند بلا مقصد

ایک کمرے سے دوسرے اور دوسرے سے تیسرے کے چکر کاٹتی رہی۔ اس کا چہرہ لٹک گیا اور دل بچھ گیا تھا۔ وہ راتوں کو چھپ چھپ کر روتی اور ماں کے کمرے میں جانے سے گریز کرتی رہی۔ غصہ اس کی ناک پر دھرا رہتا تھا اور شرمندگی کا احساس اس کے چہرے پر برستار ہوتا تھا۔ اسے یوں نظر آ رہا تھا کہ اس کی امیدوں کے غنچے، جو بن کھلے مر جھگئے تھے، ہر کسی کی نگاہوں میں ہیں اور وہ دل ہی دل میں اس کا ٹھٹھا اڑا رہے ہیں اور اس کی حالت زار پر زس کھا رہے ہیں۔ اس کے دل پر تو چر کے نگہ ہی رہے تھے لیکن اس کی اماں کو جو شیس بچتی تھی، اس نے اس کے آلام میں کئی گنا اضافہ کر دیا تھا۔

ایک روز وہ اپنی ماں کی خدمت میں حاضر ہوئی۔ وہ کچھ کہا ہی چاہتی تھی کہ بے اختیار اس کے آنسو پھونپ مگر نہ لگے۔ اس کے آنسو اس بچے کے تھے جس کی سمجھ میں نہ آ رہا ہو کہ آخر اسے کس بات کی سزا مل رہی ہے۔ کاؤنٹس نے اسے دم دیا مادیے کی کوشش کی۔ ابتدا میں تو نناشا اپنی ماں کی تسلیاں سنتی رہی پھر وہ چانک پھٹ پڑی اور اس نے اس کی بات کاٹ دی۔

”چپ کرو، ماما میں اس بارے میں سوچ بھی نہیں رہی اور نہ سوچنا چاہتی ہوں۔ وہ بس آئے اور پھر چلے گئے۔ چلے گئے...“

اس کی آواز میں کیکپاہٹ تھی اور اس کی آنکھیں دوبارہ اشک آلود ہو گئیں۔ تاہم وہ سنبھل گئی اور بولی: ”میں بالکل شادی نہیں کرانا چاہتی۔ مجھے ان سے خوف آتا ہے۔ اور بہر حال، میں اب سنبھل چکی ہوں۔“ اس گفتگو کے اگلے روز نناشا نے اپنا پرانا ڈریس، جس کے متعلق اسے معلوم تھا کہ اس میں یہ عجیب خصوصیت ہے کہ جب وہ صبح کے دوران میں اسے پہنتی ہے، اس کی طبیعت ہشاش بشاش ہو جاتی ہے، پہن لیا۔ اور اس روز بھی جب وہ اس میں ملبوس ہوئی، اس نے پرانے طور طریق، جو اس نے بال کے انعقاد کے فوراً بعد ترک کر دیے تھے، دوبارہ اختیار کر لیے۔ صبح کی چائے پینے کے بعد وہ بال روم میں، جو اسے خاص طور پر پسند تھا کیونکہ اس میں آواز خوب گونجتی تھی، چلی گئی اور گلوکاری کی مشق کرنے لگی۔ وہ کمرے کے وسط میں کھڑی ہو گئی اور ایک بول، جو اسے خاص طور پر پسند تھا، بار بار گنگٹانے لگی۔ اس کے گلے سے سٹوں کی جو آواز نکل رہی تھی، اسے سن کر وہ جی ای جی میں مغلوط ہو رہی تھی جیسے یہ کوئی غیر متوقع چیز ہو۔ خالی کمرے میں اس کی آواز گونجتی اور پھر دم توڑ دیتی۔ ایک بار اس کے دل سے غم و اندوہ کے بادل چھٹ جاتے اور وہ اپنے آپ کو ہلکا پھلکا محسوس کرنے لگتی۔ ”اس بارے میں خرد کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ عادات جیسے بھی ہیں، ٹھیک ہیں، اس نے اپنے آپ سے کہا اور کمرے میں گھومنے پھرنے لگی۔ وہ چوبلی فرش پر، جس پر پاؤں دھرنے سے صدائے بازگشت پیدا ہو رہی تھی، فطری انداز سے چل پھر نہیں رہی تھی بلکہ وہ سنبھل سنبھل کر پہلے اپنی، بڑی اور پھر انگلیاں نیچے رکھتی (وہ اپنے پسندیدہ جوتے پہنے ہوئے تھیں)۔ ہنسی خوشی اسے اپنی گنگناہٹ سن کر ہوئی تھی، اتنی ہی اسے اپنی ایڑی کی غنکی دھمک اور انگلیوں کی چرچاہٹ سے مل رہی تھی۔ آئینے کے سامنے گزرتے گزرتے اس نے اپنے سر اپنے پر نظر ڈالی۔ ”وہ، میں ہوں!“ اس کا چہرہ

کہنا نظر آ رہا تھا، ”اور بہت خوب صورت بھی! مجھے کسی کی ضرورت نہیں ہے!“

ایک فٹ مین اندر آنا چاہتا تھا۔ اسے کمرے میں سے کوئی چیز اٹھانا تھی لیکن اس نے اسے اندر آنے سے منع کر دیا اور دروازہ بھینٹ دیا۔ وہ دوبارہ چہل قدمی کرنے لگی۔ اس رور اس پر اپنے آپ کو پسند کرنے اور اپنی ذات پر شراں و فرحان ہونے کی پسندیدہ کیفیت ایک بار پھر طاری ہو گئی۔ ”یہ ناشائستگی پرکشش مخلوق ہے!“ وہ اپنے آپ سے یوں باتیں کر رہی تھی جیسے کوئی تیسرا شخص، از روئے جنس، سر، اس سے مخاطب ہو۔ ”خوش رو، خوش اندام، خوش خواب، خوش آواز۔ کسی کو شکایت کا موقع نہیں دیتی بشرطیکہ اس کے اپنے سکون میں خلل اندازی نہ کی جائے۔“ لیکن دوسرے اس کے سکون میں خلل ہونے سے کتنا ہی گریز کیوں نہ کرتے، اس کا سکون اب بحال نہیں ہو سکا تھا، درود یہ چیز پلک جھپکنے میں سمجھ گئی۔

پیش دالت میں بڑے کمرے کا دروازہ کھل اور کسی نے دریافت کیا، ”آپ لوگ گھر پر ہی ہیں؟“ پھر قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ ناشائستگی نے آئینے کے ردِ پردے پر نظر ڈالی لیکن وہ اپنے آپ کو نہیں دیکھ رہی تھی، اس کے کان ان آوازوں پر، جو بڑے کمرے سے آرہی تھیں، لگے ہوئے تھے۔ جب اس نے اپنے آپ کو دیکھا، اسے معلوم ہوا کہ اس کا رنگ فق ہو چکا ہے۔ نو دروازہ تھا۔ اسے اس بارے میں پختہ یقین تھا حالانکہ بند دروازے میں سے جو آواز آرہی تھی، وہ سے بمشکل سن پا رہی تھی۔

ناشائستگی کا چہرہ زرد اور حال ناگفتہ بہ تھا۔ وہ ڈرائنگ روم میں بھاگ گئی۔

”اما، بلکونسکی آگئے ہیں!“ اس نے کہا۔ ”ماں، یہ تو بڑی بری بات ہوئی۔ مجھ میں برداشت کی سکت نہیں رہی۔ میں نہیں چاہتی۔۔۔ کہ مجھے اذیت پہنچے! کیا کروں؟“

پیشتر اس کے کادونٹس کچھ جواب دے پاتی، پرنس آندرے کمرے میں داخل ہو چکا تھا۔ اس کے چہرے پر تنہیدگی اور تشویش چمک رہی تھی۔ جونہی اس کی نظر ناشائستگی پر پڑی، اس کا چہرہ کھل اٹھا۔ اس نے کادونٹس اور ناشائستگی کی دست بوسی کی اور صوفے کے قریب بیٹھ گیا۔

”کپ سے ملاقات کی سعادت حاصل ہوئے عرصہ۔۔۔“ کادونٹس نے کہا شروع کیا لیکن پرنس آندرے نے اس کی بات بچ میں کاٹ دی اور اس کے بین السطور جو سوال پوشیدہ تھا، اس کا جواب دینے لگا۔ یہ اظہر من الشمس تھا کہ اسے کچھ کہا تھا اور وہ اسے جلد از جلد کہہ دینا چاہتا تھا۔

”میں اس عرصے میں آپ کی خدمت میں حاضر نہ ہو سکا کیونکہ میں والد سے لئے گاؤں چلا گیا تھا۔ مجھے ان کے ساتھ چند انتہائی اہم امور پر تبادلہ خیالات کرنا تھا۔ میں بس کل رات ہی واپس آیا ہوں،“ اس نے ناشائستگی کو انکھیں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”کادونٹس، میں آپ سے کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں،“ اس نے ایک لچلے کے توقف کے بعد مزید کہا۔

کادونٹس نے اپنی نگاہیں جھکا لیں اور ٹھنڈی سانس بھری۔ ”ارشاد، میں حاضر ہوں،“ اس نے زیر لب کہا۔

نشا جانتی تھی کہ اسے اٹھ جانا چاہیے لیکن وہ اٹھ نہ سکی۔ اس کے حلق کی رگیں تن گئیں۔ وہ آداب بھری گئی۔ اس کی آنکھوں کی پتلیاں پھیل گئیں اور وہ ٹکر ٹکر پرس آندرے کو دیکھنے لگی۔

”ابھی؟ اسی وقت؟... نہیں، ایسا نہیں ہو سکتا!“ وہ سوچ رہی تھی۔

پرس آندرے نے دوبارہ اس پر چھبھتی نگاہ ڈالی اور اس نظر سے اسے یقین آ گیا کہ وہ غلطی پر نہیں تھی۔ ہاں، ابھی، اسی لمحے، اس کے مقدر کا فیصلہ ہو جائے گا۔

”نشا، تم چلو۔ میں تمہیں بلاؤں گی،“ کاؤنٹس نے سرگوشیوں میں کہا۔

نشا نے ڈری سہی، منت سماجت سے بھرپور نگاہوں سے پرس آندرے اور اپنی ماں کو دیکھا اور کمرے سے باہر چلی گئی۔

”کاؤنٹس، میں آپ کی دختر نیک اختر سے رشتے کی درخواست لے کر حاضر ہو ہوں،“ پرس آندرے نے کہا۔

کاؤنٹس کا چہرہ لال ہوا لیکن اس نے منہ سے کچھ نہ کہا۔

”آپ کی پیشکش...“ اس نے منانت سے کہنا شروع کیا۔

وہ خاموش بیٹھا رہا اور اس کی نگاہوں میں جھانکتا رہا۔

”آپ کی پیشکش...“ وہ پھر رک گئی۔ وہ ذہنی انتشار کا شکار تھی اور اپنے خیالات مجتمع نہیں کر رہی تھی۔

”ہمیں پسند ہے اور میں آپ کی پیشکش قبول کرتی ہوں۔ میں خوش ہوں اور میرے شوہر... مجھے امید ہے،

لیکن آخری فیصلہ وہ خود کرے گی۔“

”جونہی مجھے آپ کی رضامندی حاصل ہوگئی، میں اس سے بات کروں گا۔ آپ رضامند ہیں؟“ پرس آندرے

نے پوچھا۔

”ہاں“ کاؤنٹس نے اپنا ہاتھ اس کی جانب بڑھاتے ہوئے جواب دیا۔ پھر جب وہ اس کے ہاتھوں پر

بوسہ دینے کے لیے نیچے جھکا، اس نے پیارا اور بیگانگی کے سببے جذبہ بات سے اپنے لب اس کی پیشانی پر چپا

کر دیے۔

وہ اسے بیٹے کی طرح یہ رکنا چاہتی تھی لیکن اسے محسوس ہوا کہ یہ کوئی اجنبی شخص ہے جسے دیکھ کر اس کا دل

دھک دھک کرنے لگتا ہے۔

”مجھے یقین ہے کہ میرے شوہر رضامند ہو جائیں گے،“ کاؤنٹس نے کہا۔ ”لیکن آپ کے والد گرامی...“

”والد کو میں پہلے ہی اپنے منصوبوں کے متعلق مطلع کر چکا ہوں لیکن انہوں نے واضح قدغن لگادی ہے کہ

شادی ایک ماہ سے قبل نہیں ہوگی۔ میں اس سلسلے میں آپ سے گفتگو کرنا چاہتا تھا،“ پرس آندرے نے کہا۔

”یہ ٹھیک ہے کہ نشا ابھی کم سن ہے لیکن... تا طویل عرصہ!“

”اس کا کوئی علاج نہیں،“ پرنس آندرے نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔

”میں اسے آپ کے پاس بھیجتی ہوں،“ کاؤٹس نے کہا اور کمرے سے باہر نکل گئی۔

”خداوند ہم پر رحم فرمائے،“ وہ بار بار زبردست کہتی اپنی بیٹی کو تلاش کرنے چل پڑی۔

سونیا نے بتایا کہ ناسا اپنی خواب گاہ میں ہے۔ وہ اپنے بستر پر بیٹھی تھی، اس کا رنگ فق اور آنکھیں خشک تھیں۔ وہ کسی دینی برگ کے ایتھونے پر نظریں جمائے، اپنے سینے پر تیز چیز صیب کی علامات ہارے ورنہ ہی منہ میں کچھ بڑا رہی تھی۔ جب اس کی نظر اپنی ماں پر پڑی، اس نے جست لگائی اور اس کی طرف بھاگی۔

”ہوشیہ، ماما؟.. ہوشیہ؟“

”جاؤ، اس کے پاس چلی جاؤ۔ اس نے تمہارا رشتہ، لگا ہے،“ کاؤٹس نے کہا۔ ناسا کو لگا کہ اس کے لہجے میں سرد مہری ہے۔ ”جاؤ.. جاؤ“ ماں سلامت آمیز انداز سے بڑبڑائی۔ وہ زور زور سے ٹھنڈی سانس بھر رہی تھی اور اسے اس کی بیٹی وہاں سے رفق چکر ہو چکی تھی۔

ناسا کبھی یہ نہ بتا سکی کہ وہ ڈرائنگ روم میں کیسے پہنچی تھی۔ جب وہ کمرے میں داخل ہوئی اور اس کی نظر اس پر پڑی، وہ جھجک گئی۔ ”کیا یہ اجنبی میرے لیے سب کچھ بن گیا ہے؟“ اس نے اپنے آپ سے پوچھا اور فوراً ہی جواب دیا: ”ہاں، اب صرف یہی میرے لیے دنیا کی عزیز ترین متاع ہیں۔“

پرنس آندرے نگاہیں جھکائے اس کی طرف بڑھنے لگا۔

”میں نے جس لمحے تمہیں دیکھا تھا، اسی وقت سے تم سے محبت کرنے لگا تھا۔ کیا میری امید برآ سکتی ہے؟“ اس نے اپنی نظریں اوپر اٹھائیں اور جب اس نے اس کے سنجیدہ اور جذباتیت سے معمور چہرے کو دیکھا جو یہ کہتا دکھائی دے رہا تھا، ”بھلا یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے؟ جو بات آپ کو معلوم ہوئی جانا ہے، اس کے متعلق شک کرنے کی کیا تک ہے؟ آدمی جو کچھ محسوس کرتا ہے، جب اسے الفاظ میں ادا کرنا ناممکن ہو جائے، پھر بات کیوں کی جائے؟“ تو وہ بہت متاثر ہوا۔

وہ اس کے قریب پہنچی اور رک گئی۔ اس نے اس کا ہاتھ تھاما اور اسے چومنے لگا۔

”تم مجھ سے محبت کرتی ہو؟“

”جی ہاں، جی ہاں!“ ناسا یوں بڑبڑائی جیسے اس پر جھٹکا ہٹ سوار ہو۔ پھر اس نے گہری سانس لی، مزید گہری سانس کھینچی۔ یوں اس کی سانسیں دھونکنی کی طرح چلنے لگیں اور وہ سبکیاں بھرنے لگی۔

”کیا ہوا؟ کیا بات ہے؟“

”اف، میں کتنی خوش ہوں!“ اس نے نپا شکوں کے بیچ مسکراتے ہوئے کہا۔ وہ جھک کر اس کے اور قریب ہو گئی، ایک لمحے کے لیے جھجکی گویا اپنے آپ سے پوچھ رہی ہو کہ ”مجھے کیا کرنا چاہیے؟“ اور پھر اس نے اس کا بوسہ لے لیا۔ پرنس آندرے نے اس کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام لیے اور اس کی آنکھوں میں جھانکنے لگا، لیکن اسے

اس کے ساتھ پہلے جو محبت تھی، اب اس کی رمتی بھی اس کے دس میں موجود نہ تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ اس کے اندر کسی تبدیلی نے جنم لے لیا ہے۔ آرزو کی سابقہ شعری اور پراسرار دلکشی مفقود ہو چکی تھی۔ اب اسے اس کے بجائے اس کی نسوانی اور بچکانہ کمزوری پر ترس آنے اور اس کے اندھے پیار اور راست گوئی سے خوف محسوس ہونے لگا۔ اسے اس فرض کے احساس نے گھیر لیا تھا کہ وہ اب ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس کے ساتھ بندھ گیا ہے۔ فرض کے اس احساس سے اس کا گلابی گھٹ رہا تھا اور اسے اس سے لطف بھی آ رہا تھا۔ موجودہ جذبہ اگرچہ سابقہ تجرب کی طرح درخشاں اور شعریت سے بھرپور نہیں تھا تاہم یہ کہیں زیادہ سنجیدہ اور توانا تھا۔

”آپ کی امی جان نے آپ کو بتا دیا ہے کہ ابھی ایک سال انتظار کرنا ہوگا؟“ پرنس آندرے نے پوچھا۔ وہ ابھی تک اس کی نگاہوں میں نگاہیں ڈالے کھڑا تھا۔

”کیا یہ واقعی میں ہوں، کل کی چھو کری جیسا کہ ہر کوئی مجھے سمجھتا اور کہتا ہے؟“ نائشا سوچ رہی تھی۔ ”کیا یہ ممکن ہے کہ اسی لمحے مجھے اس اجنبی، پیارے اور تیز طرار شخص کی، جس کا میرا پاپا بھی احترام کرتا اور اسے بڑا گاہ تمسین دیکھتا ہے، شریک حیات اور ہمسر بننا ہے؟ کیا یہ سچ ہو سکتا ہے؟ کیا یہ سچ ہو سکتا ہے کہ اب زندگی سے اٹھیلیاں کرنے کے دن گئے، کہ اب میں بالغ ہو گئی ہوں، کہ اب ایک ایک لفظ اور ایک ایک فعل کی ذمہ داری میرے کندھوں پر آن پڑی ہے؟... لیکن انھوں نے مجھ سے پوچھا کیا تھا؟“

”نہیں،“ اس نے جواب دیا، ”تاہم وہ اس کا سوال سمجھ نہیں پائی تھی۔“

”میں معذرت خواہ ہوں،“ پرنس آندرے نے کہا۔ ”لیکن تم حتیٰ تو عمر ہو اور میں زندگی میں پہلے ہی اتنا کچھ دیکھ چکا اور بھگت چکا ہوں کہ مجھے تمہارے متعلق اندیشے لاحق ہونے لگتے ہیں۔ تم ابھی اپنا برا بھلا نہیں سمجھتی ہو۔“

نائشا پوری توجہ اور انتہاک سے سنتی رہی۔ اس نے بڑی کوشش کی کہ اس کے الفاظ کا مفہوم اس کے پلے پڑ جائے لیکن اس کی سمجھ میں خاک نہ آیا۔

”اپنی خوشی موخر کرنے سے یہ سال مجھ پر گراں ضرور گزرے گا،“ پرنس آندرے نے پنا سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا، ”لیکن اس سے تمہیں اتنا موقع ضرور مل جائے گا کہ تم اپنے بارے میں پر یقین بن سکو۔ میری تم سے التجا ہے کہ سال کے اختتام تک میری جھولی خوشیوں سے بھر دو، تاہم تمہیں کھلی چھوٹ ہے۔ ہماری یہ سگائی رہو رہے گی اور گر تمہیں یہ احساس ہو کہ تمہیں مجھ سے محبت نہیں یا پھر تمہیں مجھ سے محبت ہو جائے...“ اس نے غیر فطری انداز سے مسکراتے ہوئے کہا۔

”آپ ایسی باتیں کیوں کر رہے ہیں؟“ نائشا نے اس کی بات میں دخل دیتے ہوئے کہا۔ ”آپ جانتے ہیں کہ آپ جس روز اتر ادنا یا تشریف لائے تھے، میں اسی وقت آپ سے پیار کرنے لگی تھی۔“ اس نے اس یقین کے ساتھ کہ وہ جو کچھ کہہ رہی ہے، سچ کہہ رہی ہے، کہا۔

”ایک سال میں تم اپنے آپ کو اچھی طرح جانتے سمجھنے لگو گی۔“

”پورا سال! نتاشا نے با آواز بلند کہا۔ حیرت سے اس کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا تھا۔ اسے صرف اب حساس ہوا کہ شادی ایک برس کے لیے معرض تعلق میں ڈالنا ہوگی۔“ لیکن ایک سال کیوں؟ ایک سال کیوں؟۔۔۔“

پرنس آندرے اسے تاخیر کی وجوہات بتانے لگا۔ نتاشا نے اس کی بات سنی ان سنی کر دی۔

”اس کے علاوہ، اور کوئی چارہ کار نہیں؟“ اس نے پوچھا۔

پرنس آندرے نے کوئی جواب نہ دیا لیکن اس کے چہرے بشرے سے عیاں ہو رہا تھا کہ اس فیصلے میں تبدیلی ناممکن ہے۔

”اف، یہ تو بڑی بھی تک بات ہوئی! اف، بھی تک، قطعی بھی تک!“ نتاشا اچانک پھٹ پڑی اور وہ ایک بار پھر سسکیں بھرنے لگی۔ ”اگر مجھے ایک سال انتظار کرنا پڑا، پھر میرا خدا حافظ، میں جان بر نہیں ہو سکوں گی! اف، یہ ناممکن ہے! بھی تک ہے!“

اس نے پرنس آندرے کے چہرے کی طرف دیکھا۔ وہ ترس اور تشویش سے مملو تھا۔

”نہیں، نہیں، میں سب کچھ بھگت لوں گی،“ اس نے اچانک اپنے آنسو روکتے ہوئے کہا۔ ”میں کتنی خوش ہوں!“

اس کے والدین کمرے میں آگئے۔ انہوں نے منگیتروں کو دعائیں دیں۔

اس دن سے پرنس آندرے دستوفوں کے ہاں نتاشا کے منگیتر کی حیثیت سے آنے جانے لگا۔

24

سائی کی کوئی رسم اور شکی گئی اور نہ اس کے بارے میں کوئی اعلان کیا گیا۔ پرنس آندرے کا بھی، صراحتاً۔ اس کا کہنا تھا کہ چونکہ تاخیر کی ذمہ داری اس پر عائد ہوتی ہے، لہذا اس کا سر راہار بھی اسے خود اٹھانا چاہیے، وہ زندگی بھر کے لیے اپنے آپ کو اپنے عہد کا پابند تصور کرتا ہے لیکن وہ نتاشا کو جکڑ بند یوں میں نہیں کسنا چاہتا اور وہ اس کے لیے عمل کی راہیں کیٹا کھلی رکھنا چاہتا ہے۔ اگر چہ ماہ بعد وہ یہ محسوس کرے کہ اسے اس سے محبت نہیں، تو اسے اسے ٹھکرانے کا مکمل حق حاصل ہے۔ یہ درست کہ نہ نتاشا اور نہ اس کے والدین اس قسم کی کوئی بات سننے کے رد وادار تھے لیکن وہ اپنی ضد پر اڑ رہا تھا۔

اگرچہ پرنس آندرے بدنامہ دستوفوں کے ہاں آتا رہتا تھا لیکن وہ نتاشا کے ساتھ منگیتروں کی طرح پیش نہیں آتا تھا۔ وہ جب بھی اس کے ساتھ بات کرتا، کبھی بے تکلفانہ تو استعمال نہیں کرتا تھا بلکہ ہمیشہ تم کہہ کر اس سے بات کرتا تھا اور صرف اس کے ہاتھ پر بوسہ دیتا تھا۔ منگنی کے دن ہی سے ان کے مابین بالکل مختلف، سیدھے سادے اور دوستانہ مراسم قائم ہو گئے تھے اور یہ کچھ اس نوعیت کے تھے گویا کہ اس سے پہلے وہ ایک دوسرے کو جانتے تک نہیں تھے۔ جب ان کا آپس میں کوئی سبب نہ نہیں تھا، تب ان کی ایک دوسرے کے بارے میں کیا بات تھی، دونوں کو اس کا یاد کرنا بہت مرغوب تھا۔ اب انھیں محسوس ہو رہا تھا کہ وہ بالکل مختلف قسم کی ہستیاں ہیں۔

تب وہ ایک دوسرے کے ساتھ تصنع اور بناوٹ برتتے تھے اور اب ان کا رویہ فطری اور مخلصانہ تھا۔ ابتدا میں گھر والوں کو پرنس آندرے کے ساتھ مکالمہ کرنے اور اس سے راہ و رسم بڑھانے میں قدرے الجھن ہوتی تھی، وہ بالکل کسی دوسری دنیا کی مخلوق دکھائی دیتا تھا اور سناشا کو انھیں اس کا خوگر بنانے کے لیے خاصا وقت صرف کرنا پڑا۔ وہ پرنس آندرے انھیں یقین دلاتی رہتی تھی کہ وہ دیکھنے میں مختلف نظر آتا ہے، ورنہ حقیقتاً وہ باقی لوگوں جیسا ہی ہے، وہ نہ تو خود اس سے خوف زدہ ہے اور نہ دوسروں کو اس سے خوف زدہ ہونے کی ضرورت ہے۔ چند دنوں کے بعد وہ اس سے مانوس ہو گئے اور اب وہ اس کی موجودگی میں گھٹے گھٹے محسوس نہیں کرتے تھے۔ اب وہ بلا جھجک اپنے روزمرہ کے معمولات پر عمل کرنے لگے، وہ بھی ان میں شرکت کرنے لگا۔ اسے یہ فن خوب آتا تھا کہ کاؤنٹ سے اس کی جاگیروں کے انتظام و انصرام، کاؤنٹس اور سناشا سے تازہ ترین فیشنوں، اور سویا سے الیموں اور کشیدہ کاری کے بارے میں کس قسم کی گفتگو کی جانا چاہیے۔ یہ سب کچھ کیسے وقوع پذیر ہوا اور خود واقعے کے ظہور سے قبل جو علامات نمودار ہو رہی تھیں، ان کے بارے میں رستوف بعض اوقات آپس کی گفتگو میں اور بعض اوقات پرنس آندرے کی موجودگی میں بھی اپنے استعجاب و تحیر کا اظہار کرتے رہتے تھے۔ پرنس آندرے کی اتر اٹایا آمد، ان کی پیٹرز برگ نقل مکانی، سناشا اور پرنس آندرے کے، بین مش بہت، جو ستمبر میں نے اس کی اولین آمد پر ہی بھانپ لی تھی، 1805 میں نکولائی اور آندرے کی اتفاقاً مدھ بھیڑ اور اس نوع کے لاتعداد دیگر واقعات، جو آنے والے دو ہجرتی نشان رہی کرتے تھے، خاندان کی باہمی گفتگو کے موضوعات بنتے رہتے تھے۔

دو منگیتروں کی موجودگی میں گھر کی فضا جس قسم کی شعری اکٹاہٹ اور سکوت سے بوجھل ہونے لگتی ہے، وہ یہاں بھی پوری طرح سایہ فگن تھی۔ بارہا ایسا ہوا کہ وہ سبھی ایک کمرے میں بیٹھے ہوتے لیکن کسی کے منہ سے ایک لفظ بھی نہ نکلتا۔ بعض اوقات دوسرے لوگ اٹھ جاتے اور منگیتر تہارہ جاتے لیکن مہر سکوت پھر بھی نہ ٹوٹی۔ وہ اپنی آئندہ زندگی کے بارے میں شاذ ہی کوئی بات کرنے۔ پرنس آندرے کو اس سلسلے میں ضمیر کی کک محسوس ہونے لگتی تھی۔ سناشا اس جذبے میں، سی طرح اس کی ساجھی تھی جس طرح وہ اس کے تمام جذباتوں میں، جنھیں وہ علی التواتر اپنی خداداد اصل جیتوں سے بھانپتی رہتی تھی، شریک رہتی تھی۔ ایک مرتبہ وہ اس سے اس کے بیٹے کے بارے میں سوالات پوچھنے لگی۔ پرنس آندرے کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ وہ اب اکثر شرمانے لگا تھا اور سناشا کو اس کا یہ انداز خاص طور پر پسند تھا۔ اور بولا: ”میرا بیٹا ہمارے ساتھ نہیں رہا کرے گا۔“

”آخر کیوں؟“ سناشانے دل گیر ہو کر پوچھا۔

”میں اسے اس کے دادا جان سے عیحدہ نہیں کر سکتا۔ اور اس کے علاوہ۔“

”میں اس سے کتنی محبت کرتی!“ سناشانے کہا۔ اس نے جھٹ پٹ قیافہ لگا لیا تھا کہ پرنس آندرے کے ذہن میں کیا بات ہے۔

”خیر میں جانتی ہوں کہ آپ کسی کو یہ موقع فراہم نہیں کرنا چاہتے کہ وہ ہم پر انگلی اٹھ سکے۔“

”کبھی کبھار مہر کاؤنٹ پرنس آندرے کے پاس آ جاتا، اسے بوسہ دیتا اور اس سے پتیا کی تعلیم یا ملازمت

میں گولائی کے مقام کے بارے میں مشورہ کرتا۔ مہر کاؤنٹس جب ان دو چاہنے والوں کو دیکھتی، اس کی آہ نکل جاتی۔ سونیا کو سدایہ اندیشہ دامن گیر رہتا کہ کہیں وہ ان کی تنہائی میں غل تو نہیں ہو رہی، چنانچہ وہ مسلسل اس وقت بھی، جب انہیں خلوت کی قطعاً کوئی خواہش نہ ہوتی، ان کے پاس سے اٹھ جانے کے عذر تلاش کرتی رہتی۔ جب پرنس آندرے بات کر رہا ہوتا (سے تھے کہ نیاں سنانے کا فن خوب آتا تھا)، مناشا بڑے فخر سے سنتی اور جب وہ خود بات کرتی، اسے یہ دیکھ کر کہ وہ اپنی منہک اور تجسس نگاہیں اس پر گاڑے ہوئے ہے، خوش بھی ہوتی اور خوف بھی لاحق ہونے لگتا۔ انہیں مجھ میں کیا چیز پانے کی امید ہے؟“ وہ سراسیمگی کے عالم میں اپنے آپ سے پوچھتی ”وہ اپنی ان نظروں سے کیا تلاش کر رہے ہیں؟ فرض کر دو کہ وہ مجھ میں جو کچھ ڈھونڈ رہے ہیں، وہ مجھ میں نہیں ہے، پھر؟“ بعض اوقات اس کی طبیعت جنونی اور رنگیلی ہو جاتی (یہ اس کے مزاج کا خاصہ تھا)، ایسے میں اسے پرنس آندرے کو دیکھنے اور اسے جتنے ہوئے سننے میں خاصا لطف آتا تھا۔ وہ شاید ہی ہنستا تھا لیکن جب ہنستا تھا، وہ اپنی خوش طبعی کے سامنے سر ہٹا پا مظلوم ہو جاتا تھا اور اس قسم کی ہنس کے بعد وہ اپنے آپ کو اس کے قریب تر محسوس کرتی تھی۔ اگر ان کی متوقع علیحدگی کا سنگین خطرہ، جوان کے سروں پر منڈلار ہاتھ، مناشا کے دل میں جاگزیں نہ ہوتا، اس کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہتا۔

پیٹرز برگ سے اپنی روانگی سے ایک روز قبل پرنس آندرے ہیٹر کو، جو بال کے انعقاد کے بعد ایک مرتبہ بھی رستوفوں کے ہاں نہیں آیا تھا، اپنے ہمراہ لایا۔ ہیٹر اکھڑا اکھڑا اور شرمندہ شرمندہ سا نظر آ رہا تھا اور وہ زیادہ تر کاؤنٹس کے ساتھ گفتگو کرتا رہا۔ مناشا سونیا کے ساتھ شطرنج کی چھوٹی میز کے سامنے بیٹھی تھی اور وہیں سے پرنس آندرے کو بلارہی تھی۔ وہ ان کے پاس چلا گیا۔

”تم بزدل و خوف کو خاصے عرصے سے جانتی ہو، ٹھیک ہے نا؟“ پرنس آندرے نے مناشا سے پوچھا۔ ”تمہیں وہ پسند ہے؟“

”ہاں، وہ بہت بھلا آدمی ہے، لیکن ہے مٹھکے خیز؟“

اور جیسا کہ دوسرے لوگ ہمیشہ کرتے تھے، ہیٹر کا ذکر آنے پر وہ بھی اس کی غیر حاضر دماغی کے بارے میں قصص دلفانگ، جن میں سے اکثر وہ بیشتر ایجاؤ بندہ تھے، سنانے لگی۔

”تمہیں معلوم ہے کہ میں نے اسے اپنے راز میں شریک کر لیا ہے؟“ پرنس آندرے نے کہا۔ ”میں اسے بچپن سے جانتا ہوں۔ اس کا دل خالص سونے کا ہے۔ مناشا، میری تم سے یہ درخواست ہے،“ پرنس آندرے نے اچانک سنجیدگی اختیار کرتے ہوئے کہا۔ ”میں یہاں سے جا رہا ہوں۔ خدا معلوم اس عرصے کے دوران میں پردہ غیب سے کیا کچھ ظہور میں آجائے۔ ممکن ہے کہ تمہارا ارادہ بدل جائے۔ ارے ہاں، مجھے معلوم ہے کہ مجھے اس طرح کی بات نہیں کہنا چاہیے۔ میری تم سے صرف ایک ہی درخواست ہے۔ میری عدم موجودگی میں تمہارے ساتھ خراہ کچھ ہی کیوں نہ پیش آجائے۔“

”مجھے کیا پیش آ سکتا ہے؟“

”کسی قسم کی کوئی بھی مشکل پیش آئے۔“ پرنس آندرے نے اپنا سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا، ”مادموزیل سوئی، خواہ یہ کیسی ہی کیوں نہ ہو، مشورے اور مدد کے لیے کسی بھی شخص کے در پر دستک نہ دینا، سیدگی اس کے پاس چلے جانا۔ اس جیسا غیر حاضر دماغ اور مضحک آدمی روئے زمین پر ڈھونڈے سے نہیں ملے گا لیکن اس کاں خالص ہونے کا ہے۔“

مفارقت کا جواثر متاثرانے قبول کیا، اس کا اندازہ نہ اس کے والدین، نہ سونیا اور نہ پرنس کر سکا۔ وہ تھمتے گالوں اور آشفتہ حالوں سارا دن گھر میں بے مقصد گھومتی پھرتی رہی۔ اس کی آنکھیں خشک تھیں اور وہ نہجائی معص چیزوں میں مصروفیت کے بہانے ڈھونڈ رہی تھی جیسے اسے یہ قطعاً احساس ہی نہ ہو کہ اسے کس صورت حال سے واسطہ پڑتا ہے۔ جب وہ آخری مرتبہ اس کا ہاتھ چومنے لگا، وہ اس وقت بھی نہ روئی۔ ”مت جائیں“ وہ صرف اتنا ہی کہہ سکی لیکن اس کا لہجہ کچھ اس قسم کا تھا کہ وہ سوچنے لگا کہ اسے واقعی نہیں ٹھہرنا چاہیے اور یہ بات اسے مدتوں یاد رہی۔ جب وہ جدا گیا، وہ پھر بھی نہ روئی بلکہ کئی دن گم صم اپنے کمرے میں بیٹھی رہی۔ اس کی آنکھیں خشک تھیں لیکن اسے کسی چیز میں دلچسپی نہیں رہی تھی اور وہ وقتاً فوقتاً صرف یہی سوال دہراتی رہتی تھی ”آف، وہ کیوں چلے گئے؟“ لیکن اس کی روانگی کے دو ہفتے بعد اس کے اعزہ واقارب یہ دیکھ کر ششدر رہ گئے کہ اس نے اپنے راجائی اور ذہنی انتشار پر قابو پایا ہے اور وہ دوبارہ وہی بن گئی ہے، جو وہ پہلے تھی۔ تاہم اتنا فرق ضرور نمودار ہوا تھا کہ جس طرح طویل عارضے کے بعد بچے کا چہرہ متغلب ہو جاتا ہے، اس کے اخلاقی خدوخال بھی وہ نہیں رہے تھے جو پہلے تھے۔

25

بچے بننے کی دس اور روانگی کے بعد گزشتہ برس کے دوران میں پرنس نکولائی آندر یوچ بلکوسکی کی محبت اور مزاج دونوں ہی خاصے ابتر ہو چکے تھے۔ اس کا غصہ پہلے سے کہیں زیادہ ناک پر دھر رہنے لگا اور اسے بات بے بات جو بھی ہوتی، اس کے داری کی زد میں عام طور پر پرنس مار یا آتی۔ کچھ یوں معلوم ہوتا تھا کہ وہ ہر دم اس لڑکے میں لگا رہتا ہے کہ اس کی بیٹی کی فطرت میں وہ کون کون سی خامیاں ہیں جنہیں وہ با آسانی اپنے حلوں کا نشانہ بنا سکتا ہے اور یوں وہ اسے شدید ترین ذہنی اذیت پہنچانے کے لیے انتہائی سنگ دلائندہ رویہ اختیار کرنے سے گریز نہیں کرتا تھا۔ پرنس، ادا کو صرف دو چیزوں۔ اپنے برادر زادے نکولشکا اور مذہب۔ میں دیوانگی کی حد تک دلچسپی تھی۔ نتیجتاً اسے صرف انہیں دو شیا سے راحت نصیب ہوتی تھی اور یہی دو چیزیں پرنس کے دھاووں اور پھبتیوں کے پسندیدہ موضوعات بنتی تھیں۔ گفتگو کا موضوع خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہوتا، وہ گھما پھرا کر بات کی تان بڑی بوڑھیوں کے توہم پرستیوں میں جتل ہونے یا بچوں کی ناز برداریاں اٹھانے اور بے جالا ڈپیار کر کے ان کی عادات بگاڑنے پر توڑتا۔ ”تم اسے (نکولشکا کو) بھی اپنی طرح کی بڑھیا کھوسٹ، جو کام کی نہ کاج کی، دشمن اناج کی، بنا نا چاہتی ہو در میں ایسا نہیں ہونے دوں گا۔ پرنس آندرے کو بیٹا چاہیے، بڑھی کھوسٹ زنانی نہیں،“ وہ کہتا رہتا۔ یا پھر مادموزیل بوٹین کی

صرف متوجہ ہوتا اور پرنس ماریا کی موجودگی میں اس سے پوچھتا ”تمہارا ہمارے گاؤں کے پادریوں اور ایقوالوں کے بارے میں کیا خیال ہے؟“ دوران کے متعلق لطیفے سنانے لگتا۔

وہ بہیم پرنس ماریا کے جذبات کند چھری سے ذبح کرتا رہتا لیکن اسے اپنے باپ کو معاف کرنے میں دشواری پیش نہ آتی۔ کیا وہ کسی چیز کے بارے میں بھی، جس کا اس کی اپنی ذات سے تعلق تھا، اپنے باپ کو موردِ اہم ٹھہرا سکتی ہے اور کیا وہ، جس کے متعلق اسے علم ہے کہ ان سب باتوں کے باوجود وہ اس سے پیار کرتا ہے، اس کے ساتھ انصافی برت سکتا ہے؟ پھر انصاف ہے کیا؟ پرنس نے اس مشکبہ لفظ ”انصاف“ کے بارے میں مطلق کسی بھی نہیں سوچا تھا۔ بنی آدم نے جتنے بھی پیچیدہ قوانین مرتب کیے ہیں، ان سب کا لب لباب محبت اور پیار کے اس واحد غیر پیچیدہ اور سیدھے سادے قانون میں موجود ہے جو اس (کج) نے، جس نے تمام انسانوں سے اپنی محبت کی خاطر مصائب کو خدہ پیش فی سے جھیلنا تھا حالانکہ وہ خود خداوند تھا، وضع کیا تھا۔ ”مجھے دوسرے لوگوں کی انصاف پسندی یا غیر منصف مزاجی سے کیا واسطہ؟ میرا کام جھیلنا اور محبت کرنا ہے۔“ اور یہ کام وہ کیے جا رہی تھی۔

جاڑوں کے دوران میں پرنس آندرے بالڈلز آئی تھا۔ جتنا وہ اب سلیم الطبع، سرور اور شفیق تھا، پرنس ماریا نے اس سے قبل اسے اتنا خاصی مدت سے نہیں دیکھا تھا۔ وہ محسوس کر رہی تھی کہ اس کے ساتھ کوئی خاص واردات گزری ہے لیکن اس نے اپنی محبت کے بارے میں اس سے ایک لفظ تک نہ کہا۔ روانگی سے چند روز اس کی اپنے باپ کے ساتھ کسی موضوع پر طویل گفتگو ہوئی تھی اور پرنس ماریا نے نہ بھانپ لیا تھا کہ رخصت کے وقت دونوں ایک دوسرے سے ناخوش ہیں۔

پرنس آندرے کی روانگی کے چند روز بعد پرنس ماریا نے اپنی سہیلی جولی کاراگینا کے ہم پیئرز برگ خط لکھا اور اس کا جواب اس نے لکھا تھا۔ جیسا کہ لڑکیاں عام طور پر دیکھائی کرتی ہیں۔ کہ اس کی اس کے اپنے بھائی سے شادی ہو رہی ہے لیکن اس وقت وہ اپنے بھائی کی، جو ترکی میں ⁴⁰ ہلاک ہو گیا تھا، موت کا سوگ من رہی تھی۔

میری عزیز اور پیاری سہیلی، معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہم سب کا مشترکہ مقدر ہے۔

تمہارے یہ نقصان اتنا گہرا اور، غددہ ناک ہے کہ میں اپنے آپ سے اس کی توجیہ صرف بدیں الفاظ کر سکتی ہوں کہ یہ خداوند کی، جو تمہارے ساتھ اپنی محبت کی خاطر تمہیں اور تمہاری قابلِ توفیر والدہ کو آزمائش کی بھٹی میں سے گزرتا چاہتا ہے، رحمت کی خاص نشانی ہے۔ اودہ، مائی ڈیئر، مذہب اور صرف مذہب ہی۔ میں یہ نہیں کہتی کہ یہ ہمیں تسکین بہم پہنچاتا ہے۔ ہمیں، یوسی کی اتحاد کبراہیوں میں گرنے سے بچا سکتا ہے۔ صرف مذہب ہی ہمیں وہ کچھ، جس کی ہم اس کی مدد کے بغیر تنہا نہیں کر سکتے، سمجھ سکتا ہے۔ آخر تک طہیست اور بھلے مانس انسان، جو زندگی میں مسرت پاسکتے ہیں، جنہوں نے نہ صرف کبھی کسی کو دکھ نہیں دیا

ہوتا بلکہ واقعتاً دوسروں کی خوشی کے لیے جن کا وجود لایہدی ہے، کیوں، کس لیے، دربار خداوندی میں بلا لیے جاتے ہیں جب کہ بد باطن، بدکار اور بے مصرف اشخاص کو یا ان لوگوں کو، جو حشرتی پر خود اپنے اورد دوسروں کے لیے بوجھ ہیں، زندہ رہنے دیا جاتا ہے؟ پہلی موت نے، جسے میں نے دیکھا اور جسے میں کبھی فراموش نہیں کر سکوں گی۔ میری پیاری بھانج کی موت۔ مجھ پر ہی قسم کا تاثر چھوڑا۔ جس طرح تم مشیت سے یہ سوال کرتی ہو کہ آخر تمہارے ہی قابلِ تعریف اور لائقِ فائق بھائی کی موت کیوں ضروری تھی، اسی طرح میں بھی یہ پوچھتی پھرتی تھی کہ فرشتہ خصلت لسا کا، جس نے کبھی کسی کے ساتھ زیادتی نہیں کی تھی، جس کے دل میں کبھی کسی کے بارے میں کوئی ایسا خیال، جس کا مقصد دوسروں کو دکھ دینا ہو، نہیں آیا تھا، سرنا کیوں ناگزیر تھا؟ اور، مائی ڈیئر، تمہارا کیا خیال ہے؟ اس سانحہ پر پانچ برس کا عرصہ محیط ہو چکا ہے اور اب تو میں بھی، جس کی عقل ناقص ہے، واضح طور پر یہ سمجھنے لگی ہوں کہ اس کا رحلت کرنا کیوں ضروری تھا، کسی لحاظ سے اس کی موت خالق کائنات کی، جس کا ہر فعل، جو اگرچہ زیادہ تر ہماری فہم و فراست سے بعید ہے، اس کے محض اپنی مخلوق کے لیے لامحدود فضل و کرم کا اظہار ہے، بے پایاں رحمت کا مظہر تھی۔ میں اکثر سوچتی ہوں کہ وہ فرشتوں کی مانند اتنی معصوم تھی کہ ماں ہونے کے ناتے اس پر جو فرائض عائد ہوتے تھے، وہ ان سب کو پورا کرنے کی سکت سے شاید بہرہ ور نہیں تھی۔ نوجواں بیوی کی حیثیت سے اس کا کردار شفاف اور بے داغ تھا، لیکن عین ممکن ہے کہ بطور ماں وہ ایسی نہ ہوتی۔ اب صورت حال جیسی بھی ہے، یہ ہے کہ وہ خود تو چلی گئی لیکن بچے پیچھے نہ صرف ہمارے لیے اپنی پاکیزہ ترین یادیں اور تانقعات چھوڑ گئی ہے بلکہ اس بات کا بھی پورا امکان ہے کہ اسے عالمِ بالا میں وہ مقام، جس کے متعلق میں کبھی یہ سوچ بھی نہیں سکتی کہ یہ مجھے حاصل ہو سکے گا، مل جائے گا۔ لیکن صرف اسی کا ذکر کیوں کیا جائے؟ اس کی ہولناک اور قہرناک موت نے، اس صدمے کے باوجود جو ہمیں اٹھانا پڑا، مجھ پر اور میرے بھائی پر انتہائی بابرکت اور فیض رساں اثر چھوڑا ہے۔ جب ہمیں یہ دکھ جھیان پڑا، تب میں یہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ اس قسم کے خیالات میرے ذہن میں رسائی حاصل کر سکتے ہیں، اگر آتے بھی تو میں انھیں گھناؤنی چیز سمجھ کر جھٹک دیتی۔ لیکن اب ان کے بارے میں میرا ذہن بالکل صاف ہے اور وہ ہر قسم کے شکوک و شبہات سے ماوراء ہے۔ میرے فرزند، میں تمہیں یہ سب کچھ اس لیے لکھ رہی ہوں تاکہ میں تمہیں اس الہامی سچائی کا، جو میرے لیے اصولِ حیات بن چکی ہے، یقین دلا سکوں۔ اس کی رضا کے بغیر ہمارے سروں کا ایک بال بھی نہیں گر سکا۔ اور اس کی رضا کا ایک رضا اصول اس کی ہمارے ساتھ بے پایاں محبت ہے، چنانچہ جو کچھ ہمیں پیش آتا ہے، اس میں ہماری ہی بھلائی منظر ہوتی ہے۔

تم پوچھتی ہو کہ آیا ہم اگلے جائزے، اسکو میں گزاریں گے؟ تم سے ملاقات کی شدید آرزو کے باوجود مجھے نہ تو اس کی توقع ہے اور نہ خواہش۔ اور تم یہ سن کر شدید رورہ جاؤ گی کہ اس کا سبب بوائے پارٹ ہے۔

کیوں؟ اس کا جواب میں دیتی ہوں۔ میرے پاپا کی صحت روز بروز خاصی گرتی جا رہی ہے۔ ان سے اب اپنی بات کی تردید برداشت نہیں ہوتی، ورنہ بہت جلد جلال میں آجاتے ہیں۔ جیسا کہ تم جانتی ہو کہ بنیادی طور پر ان کی تشتم آلودگی کا رخ سیاسی امور کی طرف ہوتا ہے۔ ان کے لیے یہ بات قطعاً ناقابل برداشت ہے کہ یونان پارتیورپ کے تمام حکمرانوں، بالخصوص کیتھرین اعظم کے نمبرے کے ساتھ برابر کی سطح پر مذاکرات کرتا پھرے جیسا کہ تمہیں معلوم ہے کہ مجھے سیاست دیاست میں بالکل کوئی دلچسپی نہیں لیکن پاپا جو کچھ فرماتے رہتے ہیں اور مائیکل ایوانوویچ کے ساتھ جس طرح کی گفتگو کرتے رہتے ہیں، اس سے مجھے اندازہ ہوتا رہتا ہے کہ دنیا کے حالات کس نہج پر جا رہے ہیں اور یونان پارتی کو جن اعزازات سے سرفراز کیا گیا ہے، ان کے متعلق تو مجھے خاص طور پر آگاہی حاصل ہو چکی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ بالڈینز روئے زمین کا واحد گوشہ ہے جہاں اسے فرانس کا امپراطور تو کجا، عظیم آدمی بھی تسلیم نہیں کیا جاتا۔ والد ماجد یہ سننا بھی گوارا نہیں کرتے کہ کوئی اسے امپراطور فرانس کے لقب سے پکارے۔ میرا خیال ہے کہ انہیں ماسکو جانے میں جو تامل ہے، اس کے پس پردہ زیادہ تر ان کے سیاسی خیالات کا رفرہ ہیں۔ انہیں یہ اندیشہ لگتا رہتا ہے کہ کہیں وہ وہاں کسی سے لڑائی جھگڑا نہ کر بیٹھیں کیونکہ ان کی یہ عادت ہے کہ اس امر سے قطع نظر کہ ان کے سامنے کون بیٹھا ہے وہ اپنی رائے کا اظہار کیے بغیر نہیں رہتے۔ طبی علاج کے ذریعے انہیں جو بھی افتادہ ہوگا، وہ لازماً یونان پارتی کے متعلق تو تو میں میں کی وجہ سے اکارت ہو جائے گا۔ بہر حال یہ معاملہ عنقریب سلجھا لیا جائے گا۔

ہماری مانگی زندگی اسی ذکر پر، جس کے ہم خوک رہیں، رواں دواں ہے۔ فرق صرف یہ آیا ہے کہ میرا بھائی یہاں موجود نہیں۔ جیسا کہ میں پہلے ہی تحریر کر چکی ہوں، حال ہی میں ان میں انقلابی تبدیلیاں آئی ہیں۔ صرف گزشتہ سال کے دوران میں وہ صدے سے سنبھل سکے ہیں۔ وہ ایک بار پھر دیسے ہی بن گئے ہیں جیسا کہ میں انہیں بچپن میں دیکھا کرتی تھی۔ مشتاق، مہربان، اور قلب سونے کا، جو مجھے کسی اور میں نظر نہیں آیا۔ مجھے شہسوی ہوتا ہے کہ انہیں یہ اندازہ ہو گیا ہے کہ فن کے لیے زندگی ابھی قسم نہیں ہوئی۔ اگرچہ اپنی طو پر وہ خاصے تبدیل ہو چکے ہیں، تاہم ان کی جسمانی صحت خاصی ڈانواں ڈول ہو گئی ہے۔ وہ پہلے کی نسبت لاغر بھی ہیں اور ان کے اعصاب بھی وہ نہیں رہے جو کبھی ہوا کرتے تھے۔ مجھے ہر دم ان کے متعلق دھڑکا لگتا رہتا ہے تاہم مجھے خوشی اس بات کی ہے کہ ڈاکٹروں نے مدتوں پہلے انہیں ممالک غیر میں گھومنے پھرنے کا جو مشورہ دیا تھا، وہ اس پر عمل کرتے ہوئے عارم سفر ہو چکے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ اس دورے سے ان کی صحت بحال ہو جائے گی۔ تم نے لکھا ہے کہ پیئرز برگ میں ان کا شمار انتہائی مستعد، مہذب اور ذہین نوجوانوں میں ہوتا ہے۔ میں کو بھائی پر جو فخر ہوتا ہے، اسے بھول جاؤ لیکن مجھے ان کی ان خوبیوں کے بارے میں کبھی کوئی شبہ نہیں تھا۔ انہوں نے اپنے کسانوں سے لے کر مقامی شرفاء تک کے لیے بھلائی کے جو کام کیے ہیں، وہ حدود صواب سے باہر ہیں۔ ان کا جراتمیزان بننا ہے، پیئرز برگ میں انہیں اس سے زیادہ کچھ نہیں ملا۔

پنیر ڈیرگ سے ماسکو جو انوا ہیں پہنچتی رہتی ہیں، وہ مجھے ہمیشہ اچھنبے میں ڈالتی رہی ہیں۔ خاص طور پر اس قسم کی بے بنیاد افواہیں کہ میرے بھائی کی کم سن رستو دل سے منگنی قرار پائی ہے اور جس کے متعلق تم نے مجھے لکھا ہے، میرے چھکے چھڑا دیتی ہیں۔ مجھے یقین نہیں آتا کہ آندرے کبھی دوبارہ شادی کریں گے اور اس کے ساتھ تو وہ ہرگز ہرگز بیاہ نہیں کریں گے۔ میں بتاتی ہوں کہ کیوں 'اول'، اگر چہ وہ اپنی مرحوم شریک حیات کے بارے میں شاذ ہی کوئی کلمہ زبان پر نہ لے سکتے ہیں تاہم مجھے معلوم ہے کہ انھیں اس کی موت کا اتنا شدید صدمہ ہے کہ وہ کبھی کسی دوسری کو اس کی جگہ لانے کے لیے آمادہ نہیں ہو سکتے اور نہ وہ ہمارے فرشتہ صفت ننھے نئے پرنس کے سر پر سوتلی ماں سوار کرانے کا تصور کر سکتے ہیں۔ دوم، جو کچھ میرے علم میں ہے، اس سے قطعاً یہ عندیہ نہیں ملتا کہ یہ صاحب زادی اس قسم کی دوشیزہ ہے کہ میرے بھائی کا دل موہ سکے۔ میں نہیں سمجھتی کہ پرنس آندرے اسے اپنی دامن کے طور پر منتخب کریں گے اور یہی بات یہ ہے کہ میں خود بھی یہ نہیں چاہتی۔ لیکن اس، یہ کیا؟ یہ خط تو شیطان کی آنت کی طرح لپا ہوتا جا رہا ہے۔ اب تو دوسرا ورق بھی ختم ہونے کو آ رہا ہے۔ مائی ڈیئر فرینڈ، خدا حافظ۔ میری دعا ہے کہ وہ تمہیں ہمیشہ اپنے حفظ و امان میں رکھے۔ میری عزیز رفیقہ مادموزیل بوٹین تمہیں محبت بھر اسلام بھیجتی ہے۔

ماری

26

گر میوں کے وسط میں پرنس ماریا کو پرنس آندرے کا خلاف توقع خط ملا۔ اس میں عجیب و غریب اور غیر انگیزہ خیز تھی۔ اس نے اسے نسا شارستووا کے ساتھ اپنی منگنی کی اطلاع دی تھی۔ اسے اپنی منگیتر کے ساتھ جو جد آفریں محبت تھی، سارا خط اس کی خوشبو سے مہک رہا تھا یا پھر اس میں اس نرم، ملائم اور رازدارانہ پیار کا، جو اسے اپنی ہمشیرہ سے تھا، ذکر تھا۔ اس نے تحریر کیا کہ جس طرح کی محبت میں وہ اب گرفتار ہوا ہے، اس کا ذائقہ اس نے قبل ازیں کبھی نہیں چکھاتھا اور یہ کہ زندگی کیا ہے، اس کی تفہیم اور اندازہ صرف اب سے ہوا ہے۔ اس نے گڑ گڑا کر اپنی بہن سے اپنی اس خط کی معافی مانگی تھی کہ جب وہ بچھلی مرتبہ بالڈلز آیا تھا، وہ اسے اپنے منصوبوں کے بارے میں آگاہ نہیں کر سکتا تھا حالانکہ اس نے اپنے والد سے اس سلسلے میں بات کی تھی۔ اس نے اس لیے کچھ بتانے سے گریز کیا تھا کیونکہ اسے اندیشہ تھا کہ وہ اپنے والد سے یہ اصرار کرنا شروع کر دے گی کہ وہ اجازت دے دیں۔ وہ اپنا مقصد تو حاصل کر سکتی لیکن اس کی ناراضگی خواہ مخواہ مول لے لیتی۔ یوں نزلہ بر عضو ضعیف می ریزو، اس کی شامت آجاتی۔

”علاوہ ازیں“ اس نے لکھا۔

اس وقت یہ معاملہ اتنے واضح انداز سے طے نہیں ہوا تھا جتنے کہ اب ہوا ہے۔ تب والد ماجد نے اصرار کیا

تھ کہ یہ مسئلہ ایک سال کے لیے اٹھا رکھا جائے۔ اب اس کی نصف مدت یعنی چھ ماہ گزر چکے ہیں اور میرا رسم پیسے سے بھی پختہ تر ہو گیا ہے۔ اگر ڈاکٹر مجھے یہاں معدنی پانیوں کے چشموں کے پاس ٹھہرنے کے لیے اتنے پرزور انداز سے آمادہ نہ کرتے، میں واپس روس پہنچ چکا ہوتا۔ لیکن ان حالات کے پیش نظر مجھے اپنی وہیسی مزید سن ماہ کے لیے ملتوی کرنا پڑے گی۔ تم مجھے جانتی ہو اور والد کے ساتھ میرے جس قسم کے تعلقات ہیں، وہ بھی تم سے ڈھکے چھپے نہیں۔ مجھے ان سے کچھ نہیں چاہیے، میں اپنے افعال و اعمال میں ہمیشہ آزاد رہا ہوں اور ہمیشہ آزاد رہنا چاہتا ہوں۔ تاہم میں ان کے منشا کے خلاف کوئی قدم نہیں اٹھانا چاہتا اور یوں اس کی ناراضگی مول لینا نہیں چاہتا کیونکہ اس طرح میری آدمی خوشیاں میا میٹ ہو جائیں گی۔ اب میں اسی مسئلے کے متعلق انھیں خط لکھ رہا ہوں۔ میری تم سے التجا ہے کہ کوئی اچھا سا موقع دیکھ کر یہ خط انھیں پہنچا دو۔ وہ جس قسم کے رد عمل کا اظہار کریں، اس کے بارے میں مجھے مطلع کر دینا اور یہ بھی لکھنا کہ آیا اس مدت میں تین ماہ کی تخفیف کرنے کے لیے ان کی رضا مندی کی امید کی جاسکتی ہے؟

پرنس ماریا کافی دیر جیسے جیسے میں جتلا رہی، وہ مختلف شکوک و شبہات کے زمرے میں آئی رہی، وہ وہ دعاؤں پر عائیں مانگتی رہی تا آنکہ اس نے خط اپنے باپ کے حوالے کر دیا۔ اگلے روز ممبر پرنس نے اسے بلایا اور اس سے ہنسے سکون سے کہا:

”اپنے بھائی کو لکھ دو کہ وہ میری موت کا انتظار کرے۔ اب اس میں کوئی زیادہ دیر نہیں لگے گی۔ میں بہت جلد اسے تمام بندھنوں سے آزاد کر دوں گا۔“

پرنس نے اعتراض اٹھانا چاہا لیکن اس کے باپ نے اسے کچھ کہنے کا موقع ہی نہ دیا۔ اس کی آواز بلند سے بلند ہوئی جا رہی تھی اور وہ بولے جا رہا تھا:

”بیادہ رچاؤ، خوشیاں مناؤ، پتھر، بیادہ رچاؤ! کیا شادمانہ رشتہ ڈھونڈا ہے! چالاک لوگ، ہونہر؟! میرے کبیر، ہونہر؟! کلونکا کو کیسی اعلیٰ سوتیلی ماں ملے گی! سے لکھ دو اور بتا دو کہ اس کا جی چاہے تو وہ کل ہی دو بیویاں پڑھوا سکتا ہے! کلونکا کو سوتیلی ماں مل جائے گی اور میں تمھیں منی بوشین سے بیادہ رچالوں گا!... ہا، ہا، ہا! اس کی بھی تو یک عدد سوتیلی ماں ہونا چاہیے۔ صرف ایک بات اور ہے۔ میں اپنے گھر میں مزید عورتوں کو نہیں گھسنے دوں گا۔ وہ شادی کر لے اور جہاں اس کا جی چاہے، رہے۔ شاید تم بھی یہاں سے جانا اور اس کے ساتھ رہنا پسند کر دو گی؟“ اس نے پرنس ماریا کی طرف رخ کر کے مزید کہا: ”تمھیں کھلی چھٹی ہے، جب جی چاہے، چلی جانا! خس کم جہاں پاک! خس کم جہاں پاک!... خس کم جہاں پاک!“

غیظ و غضب کے اس طوفانی مظاہرے کے بعد پرنس نے دوبارہ اس موضوع کا اشارہ نہ کیا لیکن اپنے بیٹے کی نڈوں ہمتی اور کم حوصلگی پر وہ جس طرح اندر ہی اندر کھول رہا تھا، اس کا اظہار وہ اس سلوک سے، جو وہ

اپنی بیٹی سے روارکھتا تھا، کرتا تھا۔ اس کا مذاق اڑانے کے لیے وہ ازیں چہرے تراش کرتا تھا، ان مہربان دونی چیزوں کا۔ سوتلی ماؤں کی طرف اشاروں اور ماموزیوں بغیر کے ساتھ کچھ اس نوع کی خوش خلقی کا برتاؤ جیسے وہ اس کے ساتھ عشق کی پیٹنگیں بڑھا رہا ہو۔ اضافہ ہو گیا تھا۔

”میں اس سے شادی کیوں نہ کروں؟“ وہ اپنی بیٹی سے کہا کرتا۔ ”وہ بڑے ٹھنڈے کی بیگم بنے گی۔“

اور پرنس ماریا یہ دیکھ کر ہچکچا رہ گئی کہ اس کا باپ حقیقتاً فرانسیسی خاتون کا روز بروز دلدادہ سے دلدادہ ہو رہا تھا۔ اس نے اپنے بھائی کے نام خط لکھا اور اس میں اسے بتایا کہ اس کے عریضے کا اس کے باپ پر کیا اثر ہوا ہے۔ تاہم اس نے اسے تسلی دی کہ وہ اپنے باپ کو منالے گی اور اسے اس کی خواہش پورا کرنے کے لیے آمادہ کرے گی۔

پرنس ماریا کو جن اشیا میں مسرت اور تسکین حاصل تھی، وہ نکولشکا اور اس کی تعلیم، آئندہ رے اور مذہب تھا۔ ان کے علاوہ، جیسا کہ ہر شخص کی ذاتی انگلیں اور امیدیں ہوتی ہیں، اس نے بھی اپنے نہاں خانہ دس کی عین گہرائیوں میں پوشیدہ آرزو یا خواب، جو اسے زندگی میں سب سے بڑا دلاسا فراہم کرتا تھا، پال رکھا تھا۔ یہ تسکین بخش آمد دار خواب اسے اپنے ”اللہ لوگ“ ساتھیوں کی وساطت سے ملا تھا۔ یہ ”اللہ لوگ“ ان زمین اور پراگندہ خیال راگبیروں پر، جو اس کے باپ کے علم کے بغیر اس کے پاس آتے جاتے رہتے تھے، مشتمل تھے۔ جوں جوں اس کی عمر بڑھتی جا رہی تھی، توں توں زندگی کے بارے میں اس کے تجربے اور مشاہدے میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا اور اسی حساب سے ان انسانوں کی، جو اس دھرتی پر طیف و مسرت کے تلاشی رہتے ہیں، کو تاہم جی کے متعلق اس کی حیرت فزوں تر ہوتی جا رہی تھی۔ یہ انسان، بے چارے، قسمت کے مارے، کوٹھو کے نیل کی طرح دن رات کام میں جتے رہتے ہیں، مصائب جھیلتے ہیں، ایڑی چوٹی کا زور لگاتے ہیں، ایک دوسرے کے ساتھ دھکم پیل کرتے ہیں، اور ایک دوسرے کے درپے آزار رہتے ہیں۔ کس لیے؟ کہ ناممکن الحصول، سوہوم اور گناہ آلود مسرت تک ان کی رسائی ہو جائے لیکن مسرت ہے کہ ہاتھ آتی ہے پر نہیں آتی۔

”پرنس آئندہ رے اپنی بیوی سے محبت کرتے تھے۔ وہ خدا کو پیاری ہو گئی لیکن بات بنی نہیں،“ وہ سوچ رہی تھی۔ ”اب وہ اپنی خوشیاں ایک اور عورت کے ساتھ وابستہ کرنا چاہتے ہیں۔ پاپا اس پر معترض ہیں کیونکہ وہ آئندہ رے کے رشتے کے لیے کہیں زیادہ مال دار، ذی حیثیت اور ذی رجا سامانی کے خواہش مند ہیں۔ ادھر یہ لوگ خون پسینہ ایک کر رہے ہیں، مصائب کی بجلی میں پس رہے ہیں، ایک دوسرے کے گلے کاٹ رہے ہیں، اپنی روحوں، غیر فانی روحوں، کو پلید کر رہے ہیں تاکہ کسی بھی نعمت کا، جس کی عمر خواہ ایک لمحہ ہو، حصول ان کے لیے ممکن ہو سکے۔ نہ صرف ہم سب خود جانتے ہیں بلکہ فرزند خداوند، یسوع مسیح، اس دھرتی پر تشریف لائے اور انھوں نے ہمیں بتایا کہ یہ حیات چند روزہ ہے، یہ دور آزمائش ہے، پھر بھی اس کے ساتھ چٹے رہتے ہیں اور سمجھنے لگتے ہیں کہ ہم یہیں مسرت ڈھونڈ لیں گے۔ کسی کو یہ شعور ہی نہیں کہ ایسا کیسے ممکن ہے؟“ وہ سوچے جا رہی تھی۔ ”مگر کسی کو یہ

شعر ہے تو ان راندہ درگاہ اللہ لوگوں کو، جو اپنی گدڑیاں کندھوں پر ڈالے عقیقہ زینہ چڑھ کر میرے پاس آتے ہیں لیکن انھیں ہر وقت یہ خوف دامن گیر رہتا ہے کہ کہیں پرنس کی نظر ان پر نہ پڑ جائے۔ انھیں ذرا اس بات کا نہیں ہوتا کہ پرنس انھیں پٹو ادے گا بلکہ انھیں اندیشہ یہ ہوتا ہے کہ کہیں وہ پرنس سے گناہ کا ارتکاب نہ کر دیں۔ کمر بار اور گڑستی سے کنارہ کشی اختیار کرنا، تمام مادی خواہشات سے منہ موڑ لینا اور دنیوی اشیاء سے کوئی علاقہ نہ رکھنا، ان کے بوسیدہ چیتھڑوں میں اور فرضی ناموں کے ساتھ در بدر کی خاک چھانٹا، کسی کو ضرر نہ پہنچانا بلکہ سب کے لیے دستِ دعا اٹھانا۔ ان کے لیے بھی جو انھیں دھتکار تے ہیں اور ان کے لیے بھی جو انھیں پناہ مہیا کرتے ہیں، اس نوع کی راست باری اور زندگی سے بلند تر کوئی راست بازی اور کوئی زندگی نہیں ہو سکتی۔“

ان لوگوں میں ایک زائرہ فیدوسیو شکا تھی۔ وہ خاموش طبع، چمچک رو، کوتاہ قامت پچاس سالہ عورت تھی۔ وہ گزشتہ تیس برس سے بیڑیاں پہنے ننگے پاؤں جہاں جہاں گھوم رہی تھی۔ پرنس مار یا اس کی خاص طور پر گردیدہ تھی۔ ایک روز وہ تاریک کمرے میں اکٹھی بیٹھی تھیں۔ وہاں ایک مدھم لیسپ کے، جو کسی ایقونے کے سامنے روشن تھا، سوا اور کوئی روشنی نہیں تھی۔ فیدوسیو شکا اپنی زندگی کے متعلق باتیں کر رہی تھی۔ دفعتاً پرنس مار یا کے کے ذہن میں یہ خیال کندے کی طرح پکا کہ صرف اس عورت کو صراطِ مستقیم پر چلنے کی توفیق نصیب ہوئی ہے۔ یہ خیال اس بری طرح اس کے ذہن پر حاوی ہوا کہ اس نے تہیہ کر لیا کہ وہ خود بھی زائرہ بن جائے گی۔ جب فیدوسیو شکا سو گئی، پرنس مار یا خاصی دیر تک اسی بارے میں سوچتی رہی اور بالآخر وہ اس نتیجے پر پہنچی کہ بظاہر یہ بات خواہ کتنی ہی عجیب نظر آئے، اسے زیارتوں پر بہر صورت نکل جانا چاہیے۔ فادرا آکٹھی کے علاوہ اس نے اپنے اس ارادے کی بھٹک کسی اور کے کانوں میں نہ پڑنے دی۔ فادرا آکٹھی راہب تھا اور وہ اپنی لغزشوں اور گناہوں کے اعترافات اسی کے سامنے کیا کرتی تھی۔ اس نے اس کے اس منصوبے کی منظوری دے دی۔ پرنس مار یا نے ظاہر تو یہ کیا کہ وہ زائرہ عورتوں کو تحائف دینا چاہتی ہے لیکن ان کے پردے میں اس نے خود اپنے لیے زائرہ کا پورا سامان۔ موٹے جھوٹے کپڑے کی قمیص، زیز فون درخت کی چھال کے جوتے، کمر درے کپڑے کا کوٹ اور سیاہ رومال۔ تیار کر لیا۔ وہ اکثر اس الماری کے، جس میں یہ قیمتی اشیاء دھری تھیں، سامنے جا کھڑی ہوتی اور سوچنے لگتی۔ ”کیا اس منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کی گھڑی آگئی ہے؟“

بعض اوقات، جب وہ ان زائرین کے قصے کہانیاں سن رہی ہوتی، وہ ان کی سیدھی سادی باتوں سے، جو ان کے لیے تو عین فطری ہوتیں لیکن وہ اسے معنویت سے بھرپور نظر آتیں، اتنا متاثر ہوتی اور اس کی طبیعت میں اتنا جوش و خروش بھر جاتا کہ وہ جیسے بٹھائے یہ فیصلہ کر لیتی کہ اسے سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر گھر سے بھاگ جانا چاہیے۔ وہ تصور ہی تصور میں موٹے جھوٹے کپڑوں میں ملبوس ہو جاتی، اپنا ڈنڈا اور گدڑی ہاتھوں میں تمام لیتی اور کسی گرد آلود سڑک پر سفر کر رہی ہوتی۔ فیدوسیو شکا اس کے ہمراہ ہوتی۔ وہ اسے ایک درگاہ سے دوسری درگاہ تک لے جا رہی ہوتی، وہ حسد و رشک، دنیاوی خواہشات اور محبتوں سے ماورا ہو چکی ہوتی اور آخر کار اس منزل مقصود کو

پلٹی جہاں نہ غم و اندوہ ہے اور نہ سسکیاں اور آہیں۔ بس دائمی مسرت اور برکت کا دور دورہ ہے۔
 ”میں کسی جگہ رک جایا کروں گی اور وہاں عبادت کیا کروں گی لیکن پیشتر اس کے کہ میں وہاں کے ماحول سے عادی ہو جاؤں اور اس کی محبت میری رگ و پے میں سمائے لگے، میں وہاں سے آگے چل دیا کروں گی۔ آگے ہی آگے، اور آگے، جہاں تک میری ٹانگیں جواب دے جائیں، میں وہیں کہیں لیٹ جاؤں گی اور اپنی جان جانِ سحرین کے سپرد کروں گی۔ آخر کار میں کسی پرسکون مامن میں پہنچ جاؤں گی، وہاں نہ غم و اندوہ ہوگا اور نہ آہیں اور سسکیاں۔“ پرنس ماریا سوچتی۔

لیکن جب اس کی نظر اپنے باپ پر اور اس سے بھی بڑھ کر کوکا (نکوشکا) پر پڑتی، اس کی ہمت جواب دے جاتی، اس کے عزائم متزلزل ہونے لگتے، وہ چھپ چھپ کر روتی اور محسوس کرتی کہ وہ گنہگار ہے کیونکہ وہ خداوند سے زیادہ اپنے باپ اور بھتیجے سے پیار کرتی ہے۔

انجیل کی ایک حکایت میں بیان ہوا ہے کہ ہبوطِ آدم سے قبل انسان کو جو سرورِ کامل حاصل تھا، اس کا سبب مشقت کا فقدان، عدم مصروفیت یا فراغت تھا۔ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہنا اب بھی حضرت انسان کو پستی میں گرنے کے باوجود بہت مرغوب ہے۔ نئی نوع انسان ابھی تک قہرِ خداوندی کے بوجھ تلے دبے ہوئے ہیں، نہ صرف اس لیے کہ ہمیں اپنی روری خون پسینہ ایک کر کے کمانا پڑتی ہے بلکہ ہماری خلاقی فطرت کچھ اس قسم کی بن گئی ہے کہ نہ ہم سے بیکار بیٹھا جاتا ہے اور نہ ہم امن چین سے رہ سکتے ہیں۔ مخفی آواز ہمیں بتاتی رہتی ہے کہ بیکار بیٹھے رہنا گناہ ہے۔ مگر انسان کوئی ایسا طرزِ حیات دریافت کر لیتا کہ وہ کرتا بھی کچھ نہ اور محسوس بھی یہ کرتا کہ اس کا وجود بیکار محض نہیں بلکہ وہ دوسروں کے کام آ رہا ہے اور اپنا فرض سرانجام دے رہا ہے، وہ صہدِ عشق کے سرورِ کامل کا کوئی عنصر ڈھونڈ چکا ہوتا۔ اس ذمیت کی واجب التعمیل اور خالی از ملامت عدم مصروفیت سے ایک پورا طبقہ۔ فوج۔ لطف اندوز ہوتا ہے۔ عسکری ملازمت کی سب سے بڑی کشش بھی واجب التعمیل، درخانِ ملازمت عدم مصروفیت ہے۔

1807 کے بعد جب سکورٹی رستوف ہنوز پادلوگرات رجمنٹ میں خدمات سرانجام دے رہا تھا اور جب سے اس کو اڈرن کی کمان، جو پہلے دینی سوف کے پاس تھی، اسے غفل ہوئی تھی، اسے اسی قسم کے بابرکت سرور کی کیفیت کا پوری طرح تجربہ ہو رہا تھا۔

اپنی فوجی ملازمت کے دوران میں رستوف میں ایک طرح کی نائراشیدگی اور اکھڑین آگیا تھا لیکن فطرتاً اور خوش خصال شخص تھا اور خوش خصل ہی رہا۔ اس میں یوں جو تبدیلیاں آئی تھیں، اگرچہ اس کے ماسکو کے شناسا نظروں میں انھیں زمیں ٹھہرایا جاتا اور ان پر ناک بھوں چڑھائی جاتی، لیکن اپنے رفقاءے کار، ماتحتوں اور اعلیٰ افسروں میں اسے نظر پسندیدگی دیکھ جاتا اور اس کا احترام کیا جاتا تھا اور وہ اپنی زندگی سے خاصا مطمئن تھا۔ 1809 کے دوران میں اسے کچھ عرصے سے گھر سے جو خطوط ملنا شروع ہوئے تھے، ان میں اس کی ماں اکثر شکایت کرتی رہتی تھی کہ ان کے حالات بد سے بدتر ہوتے جا رہے ہیں اور وہ ہر دم اسے صحت کرتی رہتی تھی کہ اسے اب گھر واپس آ جانا چاہیے اور اپنے ماں باپ کے کلوب کو ٹھنڈک پہنچانا اور انھیں راحت فراہم کرنا چاہیے۔

نگولائی جس ماحول میں رہ رہا تھا، اس نے اسے زندگی کے جھیلوں اور الجھنوں سے ہٹا دیا۔ گاہ بگاہ اس کی تکی اور یوں اس کے ایم سکون و اطمینان سے گزر رہے تھے۔ تاہم جب وہ یہ خطوط پڑھتا، اس پر ہول طاری ہو جاتا اور اس کے دل کو ٹیس چبچتی کیونکہ اسے یہ محسوس ہونے لگتا کہ وہ اسے یہاں سے نکالے جانا چاہتے ہیں۔ وہ جانتا تھا کہ اسے جلد یا بدیر زندگی کے بھنور میں کودنا ہوگا اور اس کی چیخ در چیخ گتھیوں اور معاملات۔ سٹیوارڈ کے حسابات، دیوی تنازعات اور سازشیں، معاشرہ اور معاشرتی بندھن، سونیا کی محبت اور اس کے ساتھ اس کے قول و قرار۔ کے ساتھ بٹھنا اور انھیں سلجھانا ہوگا۔ یہ سب کچھ انتہائی مشکل اور پیچیدگیوں سے معمور تھا، اور وہ جواب میں اپنی ماں کو فرانسیسی میں سرد مہر اور رکھی خطوط، جن کا آغاز "Ma Chere maman" سے اور انجام "Votre obeissant fils" پر ہوتا تھا، لکھتا رہتا۔ وہ ان خطوط میں کبھی یہ نہ بتاتا کہ اس کی ویسی کب ہوگی۔ 1810 میں اسے اپنے والدین کے جو خطوط ملے، ان میں انھوں نے اسے بلکونسکی کے ساتھ تاشا کی نسبت کی اطلاع دی تھی اور یہ بھی بتایا تھا کہ شادی ایک سال کے لیے معترض، لہذا میں ڈالتا پڑی ہے تاکہ معمر پرنس کی رضامندی حاصل کی جاسکے۔ ان خطوط کو پڑھ کر نگولائی رنجیدہ و مغموم ہو گیا اور وہ سخت سخت محسوس کرنے لگا۔ اول: اسے اس بات کا افسوس تھا کہ تاشا، جسے وہ گھر کے کسی دوسرے فرد کی نسبت کہیں زیادہ پیار کرتا تھا، گھر والوں سے پھڑ جائے گی۔ دوم: ہزار ہوں نے کہے تھے اسے اس بات کا افسوس تھا کہ وہ موقع پر موجود نہیں تھا اور نہ وہ اس ذات شریف بلکونسکی کو بتا دیتا کہ اس کے ساتھ قربت قائم ہونا کسی لحاظ سے بھی ان کے لیے کوئی خاص عزت افزائی نہیں ہے اور اگر اسے تاشا سے قرار واقعی محبت ہے، تو پھر وہ اپنے محبوبہ الحواس بذمے باپ کی رضامندی کو، آسانی حلق پر رکھ سکتا ہے۔ کچھ دیر وہ اس ادھیڑ بین میں مصروف رہا کہ آیا اسے چھٹی کی درخواست دے دینا چاہیے تاکہ وہ شادی سے پہلے ایک مرتبہ تاشا سے مل سکے لیکن اتنے میں فوجی مشقیں شروع ہو گئیں، سونیا کا تصور اور گھر کی مشکلات بھی اس کے ذہن میں گردش کرنے لگیں اور نگولائی نے ایک مرتبہ پھر اپنا ارادہ ملتوی کر دیا۔ لیکن اسی سال کے موسم بہار میں اسے اپنی والدہ کا خط، جو اس کے والد کے علم کے بغیر لکھا گیا تھا، ملا۔ یہ خط پڑھنے کے بعد وہ قائل ہو گیا کہ اسے واپس جانا چاہیے۔ اس کی والدہ نے لکھا تھا کہ اگر وہ واپس نہ آیا اور اس نے معاملات اپنے ہاتھ میں نہ لیے، ان کی ساری جائیداد نیلام ہو جائے گی اور وہ سب تلاش ہو جائیں گے۔ کاؤنٹ اتھاکزورڈ بے بس ہے، مٹکا پر اس طرح آنکھیں بند کر کے اعتبار کرتا ہے اور اتنا بھلا مالس ہے کہ ہر کوئی اپنا الو سیدھا کر لیتا ہے۔ اور حالات یہاں کہ بد سے بدتر ہوتے جا رہے ہیں۔ "مگر تم مجھے اور سارے خاندان کو مفلوک الحال نہیں دیکھا چاہتے، پھر میری کیا درخواست ہے کہ خدا کے لیے فی الفور واپس آ جاؤ،" کاؤنٹس نے تحریر کیا۔

نگولائی نے اس خط کا اثر قبول کیا۔ وہ اوسط درجے کی ذہانت کے مالک شخص کی عام سوجھ بوجھ سے بہرہ ور تھا

اور اس سوجھ بوجھ نے اسے رہ گئی بھادی۔

اب اس کے لیے درست راستہ یہی تھا کہ اگر ملازمت سے ریٹائرمنٹ نہ بھی لی جائے، اسے رخصت پر گھر ضرور جانا چاہیے۔ اس کا جانا کیوں ضروری تھا، یہ تو وہ شاید نہ بتا سکتا، تاہم قیولے کے بعد اس نے حکم دیا کہ اس کے گھوڑے مریخ (Mars) پر زین کس دی جائے۔ اس کا یہ سرنگی گھوڑا آخستہ نہیں تھا اور انتہا درجے کا ٹھیکیت اور درخصل تھا۔ عامیے عرصے سے اس پر سواری نہیں کی گئی تھی۔ جب وہ اس کی نگام تھا اسے واپس آیا، اس نے لارڈشکا (دینی سوئ کا ملازم جو اس کے ساتھ رہ گیا تھا) اور اپنے دوستوں کو، جو اس شام اٹھتا تھا اسے ملنے چلے آئے تھے، بتایا کہ وہ چھٹی کی درخواست دے رہا اور گھر جا رہا ہے۔ اگرچہ اس کے لیے یہ سوچنا بڑا محال اور عجیب تھا کہ وہ کمانڈر انچیف کے دفتر سے اس قسم کی کوئی اطلاع۔ حالانکہ اس میں سے انتہائی دلچسپی تھی۔ کہ آیا اسے ترقی دے کر کمیشن بنا دیا گیا ہے یا نہیں یا گزشتہ مشقوں کے دوران میں اس نے جو کارکردگی دکھائی تھی، اس کی بنا پر اسے آرڈر آف سینٹ این عطا ہو گیا یا نہیں، وصول کیے بغیر جا رہا ہے، اگرچہ اسے یہ سوچتے بھی بہت عجیب معلوم ہو رہا تھا کہ وہ پولستانی کاؤنٹ گائوڈوئسکی کے ہاتھ اپنے تین کمیت گھوڑے، جن کے سلسلے میں کاؤنٹ اس سے سو دے انڈی کی کوشش کر رہا تھا جب کہ رستوف اس سے شرط بد چکا تھا کہ وہ ان کے دو ہزار روپے لے کر ہی رہے گا، بچے بغیر جا رہا ہے، اگرچہ اس کے لیے یہ امر بھی ناقابل تصور تھا کہ وہ خود تو جا رہا ہو اور ادھر ہوزار پولستانی رقاہہ ادموزیل پنا پر لارڈشکا کے اعزاز میں بال کا، جس میں وہ شریک نہیں ہو سکے گا، اہتمام کر رہے ہوں (وہ یہ تقریب اولان گز سواروں کو، جنہوں نے اپنی پولستانی رقاہہ ادموزیل پنا پر لارڈشکا کے اعزاز میں بال منعقد کیا تھا، جڑانے کے لیے برپا کر رہے تھے)۔ تاہم وہ خوب جانتا تھا کہ اسے اس چھیلے اور خوشگوار عالم کو خیر ہا کہنا اور ایک ایسی دنیا میں، جہاں ہر چیز اذندھی اور بے سروپا تھی، جانا ہی ہوگا۔ ایک ہفتے بعد اس کی چھٹی کی منظوری آگئی۔ اس کے رفقاءے کار۔ نہ صرف اس کی اپنی رجمنٹ بلکہ سارے بریگیڈ کے ہوزاروں۔ نے اس کے اعزاز میں زنگا، جس کا چندہ فی کس پندرہ روپے تھا، اہتمام کیا۔ شرکا کو محفوظ کرنے کے لیے رو فوجی بینڈ اور دو موسیقاروں کے طائفے بلائے گئے۔ رستوف نے میجر بازوف کے ساتھ Trepak رقص کیا۔ نشے میں مغمور افسر اسے فضا میں اچھالتے، اس سے بغل گیر ہوتے اور اسے نیچے شیخ دیتے۔ سکواڈرن کے سپاہیوں نے بھی اسے ایک بار اپنے کندھیا پر اٹھایا اور ”ہڑا“ کے نعرے بلند کیے۔ پھر انہوں نے اسے سلیج (برف گاڑی) میں لٹایا اور اپنی حفاظت میں اسے پکلی ڈاک چوکی پہنچا دیا۔

کریسچک سے کیف تک، اپنے سفر کے پہلے نصف کے دوران میں، جیسا کہ عام طور پر مسافروں کا طریقہ ہوتا ہے، رستوف بھی ان چیزوں کے، جنہیں وہ سکواڈرن کے ساتھ پیچھے چھوڑ آیا تھا، متعلق سوچتا رہا۔ جب اس کا آرہا پینڈا کٹ گیا، وہ اپنے تینوں کمیت گھوڑوں، اپنے کوارٹر ماسٹر اور ادموزیل پر لارڈشکا کو فراموش کرنے لگا اور یہ سوچ سوچ کر اس کا کلیجہ منہ کو آنے لگا کہ جانتا تھا کہ مراد آیا میں جانات کیسے ہوں گے اور وہاں اسے کس چیز

کا سامنا کرنا پڑے گا۔ جوں جوں وہ گھر کے نزدیک سے نزدیک تر ہوتا گیا، توں توں اس کے خیالات میں شدت۔ کہیں زیادہ شدت۔ آتی گئی (جیسے اخلاقی جذبہ کلیہ مربع معکوس کا یا بند ہو)۔ اتر، دایا سے پہلے اس نے آخری بڑا اک چوکی پر کو جوان کو تین روہل خشیش میں دیے اور گھر پہنچنے پر بچوں کی طرح بھاگتا دوڑتا میڑھیوں پھلانگنے لگا۔ اس کوشش میں اس کی سانس پھوں گئی۔

گھر پہنچنے کے بعد جب نکولائی کا جوش و خروش قدرے دھیمّا ہوا (ویسے اسے ایک طرح کی مایوسی ہوئی تھی، ہر چیزوں کی توں تھی کچھ بھی تو نہ بدلاتھا، پھر اس نے جلد بازی کیوں کی؟)، ایک مرتبہ پھر زندگی جاے پہچانے خانگی دھڑے پر رواں دواں ہو گئی۔ اس کی اماں اور ابا بالکل ویسے کے ویسے تھے، صرف پہلے کی نسبت کمرن ضرور گئے تھے۔ ان میں جوئی چیز دیکھنے میں آئی، وہ ان کے، مین خاص قسم کی کشیدگی تھی۔ گاہے گاہے ان میں اختلاف بھی، جو پہلے کبھی دیکھنے میں نہیں آیا تھا، رونما ہو جاتا اور جیسا کہ نکولائی کو بہت جلد معلوم ہو گیا اس کا سبب ان کے وہ حالات تھے جو روز بروز دیگر گروں ہوتے جا رہے تھے۔ سونیا اب تقریباً بیس برس کی ہو چکی تھی۔ اب اس کے صحن میں مزید نکھار آنے کے امکانات معدوم ہو چکے تھے۔ اس کے سراپے میں اس نوعیت کے قطعاً کوئی آثار دکھائی نہیں دے رہے تھے، پھر بھی وہ جیسی بھی تھی خاصی قبول صورت تھی۔ جونہی رستوف واپس آیا، وہ مسرت اور محبت کی کرنیں نکھیرنے لگی تھی اور اس لڑکی کی پرستندگی اور وفا شعار محبت نے اس کا دل ہار ہار کر دیا۔ سب سے زیادہ اسے چٹا اور نساٹا نے متعجب کیا۔ چٹا حیرہ سالہ جسم اور خوش شکل بڑکا تھا۔ وہ تیز فہم اور فسوف تھا اور اس کی آواز میں مردانہ پن آنے لگا تھا۔ جہاں تک نساٹا کا تعلق ہے، نکولائی کے لیے اپنے استعجاب پر قابو پانا محال تھا، وہ جب بھی اسے دیکھتا، اس کی ہنسی چھوٹ جاتی۔

”تم بالکل بدل گئی ہو؟“ اس نے اسے چھیڑا۔

”کب سے؟ پہلے سے بد صورت ہو گئی ہوں؟“

”نہیں، یہاں معاملہ الٹ گیا ہے۔ کتنا وقار آ گیا ہے اپر نس، بن رہی ہو؟“ اس نے سرکشی کی۔

”بالکل، بالکل، بالکل!“ نساٹا نے با آواز بلند کہا۔ اس کی باچھیں کھلی جا رہی تھیں۔

اس نے اسے پرنس آندرے کے ساتھ اپنے معاشقے اور اس کی اترادایا آمد کے بارے میں سب کچھ بتایا

اور اسے اس کا تازہ ترین غلط بھی دکھایا۔

”خیر، تم خوش ہو؟“ نساٹا نے پوچھا۔ ”میں اب بالکل سرور و مطمئن ہوں۔“

”بہت خوش؟“ نکولائی نے کہا۔ ”وہ بہت جاوہر والی آدمی ہے۔ کیا تمہیں اس سے بہت محبت ہے؟“

”میں کیسے بیان کروں؟“ نساٹا نے جواب دیا۔ ”مجھے بورس سے محبت ہوئی، اپنے استاد سے ہوئی، ادنیٰ سون

سے ہوئی لیکن یہ بالکل مختلف قسم کی ہے۔ مجھے یقیناً قرار محسوس ہوتا ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ اس سے بہتر شخص کرہ ارض پر موجود نہیں، اور اب مجھے کتنا سکون، کتنی دل جیسی ہے اس طرح کی کیفیت پہلے کبھی محسوس نہیں ہوئی تھی۔“

شادی کے ایک ماں تک ملتوی کیے جانے پر نکولائی نے عدم اطمینان کا اظہار کیا لیکن ناشا نے اس کی بات کا بہت برا مانا اور وہ اسے مارنے دوڑی۔ اس کا استدلال یہ تھا کہ اس کے خدا وہ اور کوئی صورت ممکن ہی نہیں تھی، یہ کہ ماں کی مرضی کے بغیر کسی خاندان کا رکن بننا غلط تھا اور یہ کہ وہ خود بھی یہی چاہتی تھی۔

”تم بالکل سمجھتے نہیں، بالکل سمجھتے نہیں،“ وہ بار بار کہے جا رہی تھی۔

نکولائی نے ہار مان لی اور اس نے مزید کچھ نہ کہا۔

اس کا بھائی جب بھی اسے دیکھتا، کٹر دبدبے میں پڑ جاتا۔ اس امر کا قطعاً کوئی عندیہ نہیں ملتا تھا کہ یہ لڑکی کسی کے عشق میں گرفتار ہے اور اپنے منگیتر کی جدائی کا دکھ جھیل رہی ہے۔ وہ ہمیشہ کی طرح معتدل مزاج اور مسرور و مطمئن تھی۔ اس کے اس رویے نے نکولائی کو متحیر کر دیا تھا اور وہ بلکونسکی کے محاشقے کے بارے میں بھی شکوک و شبہات میں مبتلا ہو گیا۔ اسے یہ یقین ہی نہیں آتا تھا کہ اس کی ہمشیرہ کی تقدیر مہربند ہو چکی ہے، خاص طور پر اس لیے بھی نہیں کیونکہ اس نے اسے پرنس آندرے کی معیت میں نہیں دیکھا تھا۔ اس مجوزہ شادی کے بارے میں ہمیشہ یہی خیال اس کے ذہن میں گردش کرتا رہا کہ کہیں نہ کہیں کچھ گڑبگڑ ضرور ہے۔

”تاخیر کیوں؟ سنگنی کی رسم کیوں شادا کی گئی؟“ وہ سوچتا۔

ایک مرتبہ جب وہ اپنی ہمشیرہ کے متعلق اپنی ماں سے گفتگو کر رہا تھا تو اسے یہ معلوم کر کے حیرت بھی ہوئی اور اطمینان بھی کہ اس شادی کے بارے میں اس کے نہیں خانہ دل میں بھی شکوک پرورش پا رہے ہیں۔

”یہ دیکھو“ اس نے اپنے بیٹے کو پرنس آندرے کا خط دکھاتے ہوئے کہا۔ اس کے لہجے میں تلخی تھی۔ اس نے اس تلخی کا کھلے ہندوں اظہار تو نہیں کیا تھا لیکن یہ محسوس کی جاسکتی تھی۔ اپنی بیٹیوں کی آئندہ کی شادی شدہ زندگی کی مسرتوں کے سلسلے میں ماؤں میں اسی طرح کی تلخی ہوتی ہے۔ ”اس نے لکھا ہے کہ وہ دسمبر سے پہلے نہیں سسکا۔ سے کس چیز نے روک رکھا ہے؟ ماسرزی طبع؟ بے شک یہی بات ہوگی۔ اس کی صحت خاصی خراب ہے۔“

ناشا کو نہ بتانا۔ وہ جو اتنا چھپھاتی پھر رہی ہے، اس پر حیران ہونے کی ضرورت نہیں۔ وہ اپنے لڑکپن کے آخری ایام میں سے گزر رہی ہے لیکن مجھے معلوم ہے کہ جب اسے اس کا کوئی خط ملتا ہے، تو اس کا کیا حال ہوتا ہے۔ تاہم،

”شاء اللہ، اب بھی ساری نردیں صحیح پڑ سکتی ہیں۔“ اس نے کہا اور حسب معمول اپنی بات کا اختتام بدیں الفاظ کیا۔

”وہ قابل ستائش آدمی ہے۔“

گھبراہٹ کے بعد نکولائی شروع شروع میں اپنے ہی خیالات میں غطال و پیچاں رہا، بلکہ اس پر ادا کی اور آکٹاہٹ کا غلبہ بھی رہا۔ اسے پریشانی اس بات کی تھی کہ جن فضول کاروباری امور کو پنپانے کے لیے اس کی ماں نے اسے طلب کیا تھا، ان سے جہدہ برا آجوتے کی سماعت سر پر منڈلا رہی تھی۔ اس بوجھ سے جلد از جلد نجات پانے کی غرض

سے اپنی آمد کے تیسرے دن وہ غصے سے پھنکا رہا، ناک بھوں چڑھاتا اور نسا شا کے اس سوال کو کہ وہ کہاں جا رہا ہے، نظر انداز کرتا، تیز تیز چلتا متزکا کے مسکن کی طرف بڑھتا کہ وہ اس سے ایک ایک چیز کا حساب طلب کر سکے۔ ایک ایک چیز کے حساب کا مطلب کیا تھا، اس کے بارے میں ٹکول ٹی نہشت اور یو کھلا ہٹ کے شکار متزکا سے بھی کم آگاہ تھا۔ گھنگو اور حساب کتاب کی جانچ پڑتال زیادہ دیر نہ جاری رہی۔ گاؤں کا کھیا، کسانوں کا، ایک نمائندہ اور دیہی ٹکر، جو راہداری میں عاقبات کا انتظار کر رہے تھے، ہیبت اور مسرت کے ملے جلے جذبات سے نوجوان کاؤنٹ کی گونجی، دھاڑتی اور مسلسل بلند ہوتی آواز سن رہے تھے۔ اور اس کے ساتھ گائیوں کا طوفان برپا ہو گیا، الفاظ تھے کہ ایک دوسرے کے اوپر ڈھسے پڑ رہے تھے۔

”ڈاکو، لٹیرے، اناشکرے، بے حیا، بے شرم!... میں کتے کی ٹکا بوٹی کر دوں گا... اب تمہارا واسطہ پاپا سے نہیں ہے... تم ہمارا سب کچھ ہڑپ کر گئے ہو... لٹنگے...“

اس کے بعد انھوں نے جب نوجوان کاؤنٹ کو، آتش غضب سے جس کا چہرہ لال بھوکا اور آنکھیں خون آلود ہو رہی تھیں، متزکا کو گدی سے پکڑ کر گھسیٹتے اور الفاظ کے مابین مناسب مناسب دفتلوں سے بڑی پھرتی اور مشتاقی سے اس کی پیٹھ پر پاؤں سے ٹھوکریں اور گھٹنوں سے ٹھوکے لگاتے دیکھا، ان کی ہیبت اور مسرت میں کوئی تخفیف نہ ہوئی۔ نوجوان کاؤنٹ چلا چلا کر کہہ رہا تھا:

”رفع ہو جاؤ! بد معاش، مجھے دوبارہ کبھی اپنی شکل نہ دکھانا!“

متزکا سیڑھیوں کے چھ قندھے سر کے بل لڑھکتا پیچھے آیا اور سر پر پاؤں رکھ کر درختوں کے ذخیرے کی طرف بھاگ کھڑا ہوا۔ (تراوٹا میں ذخیرہ بھرموں اور خطا کاروں کی جانی پہچانی پناہ گاہ تھی۔ خود متزکا جب لٹے سے جو شہر سے واپس آتا، وہیں چھپا کرتا تھا اور تراوٹا کے بے شمار باسی، جو متزکا کی نظروں سے بچنے کے لیے بے قرار ہوتے تھے، اس ذخیرے کی حفاظتی صلاحیتوں سے بخوبی آگاہ تھے۔)

متزکا کی بیوی اور سالی، جن کے چہروں پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں، اپنے کمرے سے باہر بھاگ رہی تھیں۔ ان کے کمرے میں چمکتا دستا سادارا بل رہا تھا اور ایک طرف سٹیوارڈ کا اونچا پلنگ، جس پر بوسیدہ لٹا رکھا ہوا تھا، پڑا تھا۔

نوجوان کاؤنٹ نے ان عورتوں کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ وہ زور زور سے سانس لیتا اور آہستہ آہستہ کے ساتھ لیے لیے ڈگ بھرتا ان کے برابر سے گزر گیا اور اپنے مکان میں چلا گیا۔

سٹیوارڈ کے مسکن میں جو کچھ ہوا تھا، پلک جھپکنے میں اس کی اطلاع نوکرائیوں کی وسالت سے کاؤنٹس کو مل چکی تھی۔ اسے اس سوچ سے تسلی ہو رہی تھی کہ اب ان کے معاملات لازماً سدھ جائیں گے لیکن اس کے ساتھ ہی اسے یہ دھڑکا بھی لگا ہوا تھا کہ اس سارے دلقے کا اس کے بیٹے پر کیا اثر ہوگا۔ وہ متعدد مرتبہ بیچوں کے بل پلٹی اس کے دروازے تک گئی اور اس نے کان لگا کر کچھ سننے کی کوشش کی۔ اس کا بیٹا پانچپ پانچپ لٹکائے جا رہا تھا۔

گلے روز معمر کا ڈنٹ اپنے بیٹے کو ایک طرف لے گیا اور ڈری بھی سکر اہٹ کے ساتھ بولا:

”عزیزم، تم جانتے ہو کہ تم خواہ مخواہ مشتعل ہو گئے! متزکا نے خود اس بارے میں مجھے سب کچھ بتا دیا ہے۔“

”مجھے پسے ہی معلوم تھا کہ اس جنون دنیا کی کوئی بات میرے بچے نہیں پڑے گی،“ ٹکولائی نے سوچا۔

”تمہیں غصہ اس لیے آیا کہ اس نے سات سو روپے کا اندراج نہیں کیا تھا لیکن تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ وہاں بچایا اگلے صفحے پر تحریر تھا اور تم نے اگلا صفحہ دیکھا ہی نہیں۔“

”پاپا، وہ پکا بد معاش اور چور ہے اور مجھے یہ معلوم ہے۔ مجھے جو کچھ کرنا تھا، میں کر چکا ہوں۔ لیکن اگر آپ کی بی خواہش ہے، میں اس سے مزید کچھ نہیں کہوں گا۔“

”نہیں، میرے بیٹے،“ کا ڈنٹ جھینپ رہا تھا۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ اس نے اپنی زوجہ کی جائیداد کی مناسب دیکھ بھال نہیں کی ہے اور یوں وہ اپنے بچوں کے ساتھ زیادتی کا مرتکب ہوا ہے۔ لیکن اس کی کوتاہی کا مداوا کیا تھا، اس کے متعلق وہ کچھ نہیں جانتا تھا۔ ”نہیں، میری تم سے یہی التجا ہے کہ معاملات کو سنبھالو۔ میں ضعیف العمر ہو چکا ہوں، میں۔“

”نہیں، پاپا، اگر میری وجہ سے آپ کو کوئی تکلیف پہنچی ہے، میں معافی کا خواست گار ہوں۔ رہا حساب کتاب اس کے متعلق میرا علم آپ کے علم سے بھی کم ہے۔“

”لخت ہوان سب پر۔ کسانوں پر، روپے پیسے کے معاملوں پر اور بچایا“ گلے صفحے پر پڑا۔“ اس نے سوچا۔

”ناش کا سکور میں خوب اچھی طرح سمجھ لیا کرتا تھا لیکن یہ بچایا اگلے صفحے پر کا معاملہ میری سمجھ سے بالا ہے!“ اس نے اپنے آپ سے کہا اور وہ وقت اور بیدقت، اس نے خانگی امور کے پھٹے میں دوبارہ کبھی ٹانگ نہ ڈالی۔

لیکن ایک روز کا ڈنٹس نے اپنے بیٹے کو پھر کمرے میں بلایا اور اسے بتانے لگی۔ ”میرے پاس آنا، مٹھا نیلونا کا پروٹوٹ ہے۔ تمہارے خیال میں میں اس کا کیا کرنا چاہیے۔“

”بس یہ،“ ٹکولائی نے جواب دیا۔ ”آپ فرماتی ہیں کہ فیصلہ میرے اختیار میں ہے۔ پھر نہیں۔ مجھے یہ آنکھیں مٹھا نیلونا قطعاً پسند نہیں ہے اور نہ میں بورس کو پسند کرتا ہوں۔ تاہم ہمارے ان کے ساتھ تصورات تھے اور وہ مفلوک اہل تھے۔ پھر میرا خیال یہ ہے!“ اور اس نے پروٹوٹ پر زے پر زے کر دیا۔ اس کے اس طرز عمل نے معمر کا ڈنٹس کو خوشی کے آنسو چھلکانے پر مجبور کر دیا۔

اس کے بعد نو عمر کا ڈنٹ کسی قسم کے بھی کاروباری معاملات میں کبھی دخل نہ ہوا بلکہ وہ پورے جوش و خروش اور توجہ سے نئے مشغلے۔ شکار۔ میں، جو کا ڈنٹ کی جاکیر پر بڑے پیمانے پر کھیلا جاتا تھا مصروف ہو گیا۔

جائزوں کی آمد آمد تھی اور صبح کے پالوں نے دھرتی کو، جو خزانہ بارشوں میں خوب بھیگ چکی تھی، خشک کر دیا۔ قبل ازیں

گھس گھس کی شکل میں اگ چکی تھی اور سرمائی شتری رائی⁴، جسے مویشیوں نے اپنے گھروں اور سموسے تلے روند دیا تھا، بہاریہ فصل کے زردی مائل ٹھٹھکوں⁵ و ربک دیٹ کے نازوں⁶ کے مقابلے میں خوب سرسبز شاداب نظر آرہی تھی۔ پہاڑی ٹیلے اور درختوں کے جھنڈ، جواگست کے اواخر تک سیاہ کھیتوں اور ٹھٹھکوں کے مابین سرسبز شاداب جڑیے تھے، اب سرسرمائی رائی کے مابین سنہری اور ارغوانی جزیرے بن چکے تھے۔ خرگوش پہلے ہی اپنے نصف تابستانی لبادے جھاڑ چکے تھے۔ لومڑوں کے بچے ادھر ادھر منتشر ہونا شروع ہو گئے تھے اور بھیڑیوں کے پلے پل کرکتوں سے زیادہ جسم ہو چکے تھے۔ اس جو شیلے شکاری رستوف کے سگ تازی نہ صرف شکاری قارم میں آچکے تھے بلکہ وہ اس قدر مشتعل ہو رہے تھے کہ کتوں کے رکھوالوں کی مشترکہ کونسل میں انھیں تین دن آرام دینے اور سولہ ستمبر کو ہم پر روانہ ہونے کا فیصلہ کر لیا گیا۔ اس مہم کا آغاز اوک کے درختوں کے جھنڈ سے، جوا بھی تک غیر پامال تھا اور جہاں نو عمر بھیڑیوں کا جھوں رہتا تھا، ہونا تھا۔

یہ صورت حال چودہ ستمبر کی تھی۔

اس تاریخ کو سگ تازی سارا دن گھروں میں بند رکھے گئے۔ اس روز خوب پالا پڑا تھا اور جسم کے آپر ہو جانے والی بخ بستہ ہوا چل رہی تھی۔ تاہم سرشام آسمان پر بادل چھا گئے اور برف پگھلنے لگی۔ چندر کو مچ سورے جب ڈریسنگ گاون میں ملیں نو جون رستوف نے کھڑکی میں سے باہر جھانک کر دیکھا، اسے خیال گزرا کہ گار کے لیے اس سے بہتر اور کوئی سحر نہیں ہو سکتی⁸۔ معلوم ہوتا تھا کہ آسمان پگھل رہا ہے اور ہوا کے ہلکے سے ہلکے جھوکے کے بغیر میں بوس ہو رہا ہے، فضا میں ہو واحد چیز حرکت پذیر تھی وہ دھند یا کہر کے خوردبینی قطرات کا بطرف زمین بہاؤ تھا۔ باغ میں تنگی بوچی شاخوں پر موتیوں کی طرح شفاف قطرے لٹک رہے تھے اور رس رس کر نیچے ان پتوں پر، جوتارہ تازہ درختوں سے جھڑے تھے، گر رہے تھے۔ سبزیوں کے باغیچے کی مرطوب اور سیاہ زمین گل لالہ کے قلب کی طرح جھلک رہی تھی اور چند ہی قدم آگے دھند کی گیلی اور تاریک چادر میں تحلیل ہو رہی تھی۔ نکولائی باہر آیا اور گیلے اور کیچڑ آلود پورچ میں چلا گیا۔ وہاں گلے سڑے پتوں اور ایک کتیا کی بو پھیلی ہوئی تھی۔ سیاہ پتوں، لٹراں پشت اور بڑی بڑی آنکھوں والی کتیا بلکا اپنے مالک کو دیکھ کر اٹھ کر کھڑی ہوئی، اس نے اپنی مقبلی ٹانگیں پھیلائیں اور خرگوش کی طرح نیچے بیٹ گئی۔ پھر اس نے ایک ایک جھست لگائی اور عین اس کی ناک اور مونچھیں چاٹنے لگی۔ ایک بار زدتی کتے نے جب باغیچے کی پگنڈی سے اپنے آقا کو دیکھا، اس نے اپنی کمر کو کمان کی طرح خمیدہ کیا، سر کے بل پکتا پورچ کی طرف آیا اور اپنی دہاٹھا کر نکولائی کی ٹانگوں پر اپنی تھو تھنی رگڑنے لگا۔

اسی لمحے ہانکے کی مخصوص آواز "o-hoy" فضا میں گونجی۔ شکاری کتوں کے رکھوالوں کی یہ وہ ہانک پکار ہے جس میں انتہائی نیچا سراخجائی اونچے سر کے ساتھ یک جان ہو جاتا ہے اور مکان کے کونے سے کتوں کا رکھوالا دانلو اور اس کا نائب نمودار ہوئے۔ دانیلو کے چہرے پر جھریاں تھیں اور اس کے سفید بال پوکرینی انداز سے پیشانی کے آر پار سیدھے کئے ہوئے تھے۔ اس کے ہاتھ میں خاصا لمبا خیدہ چابک تھا۔ اس کے چہرے بشرے کو دیکھ کر

ہاڑ ملتا تھا کہ یہ شخص اپنی مرضی کا مالک ہے اور دنیا کی ہر چیز کو بھڑکھڑات دیکھتا ہے۔ اس قسم کی باتیں صرف شکاری کتوں کے رکھوالوں میں نظر آتی ہیں۔ اس نے اپنی سرکیشی کی ٹوپی اتار کر اپنے آقا کو سلام کیا اور اسے حقارت آمیز نظروں سے دیکھنے لگا۔ آقا کے نزدیک اس حقارت میں گستاخی کا کوئی پہلو نہیں تھا۔ گلوہ کی جانتا تھا کہ دیکھنے میں دانیلو کا رویہ بے شک حقارت آمیز اور برتر معلوم ہوتا ہے، پھر بھی وہ اس کا وفا شعار ملازم اور اس کے کتوں کا رکھوالا ہے۔

”دانیلو“ کتوں کی نے ذرا ڈھیٹ میں کر کہا۔ وہ اس سر سے بخوبی آگاہ تھا کہ شکار کے اعتبار سے انتہائی سازگار موسم، شکاری کتوں اور رکھوالوں کو دیکھ کر اس کے دل میں شکار کا وہ زبردست جذبہ پیدا ہو گیا ہے، جس کی مزاحمت نہیں کی جاسکتی اور جس کی موجودگی میں آدمی بعینہ اسی طرح اپنے تمام سابقہ ارادے حاق نسیاں پر رکھنے کے لیے مجبور ہو جاتا ہے جس طرح عاشق اپنی محبوبہ کی موجودگی میں باقی سب کچھ فراموش کر دیتا ہے۔

”سرکار، کیا حکم ہے؟“ ایک دھیمی آواز نے پوچھا۔ اس آواز میں آرج ڈیکن کی گہرائی تھی لیکن یہ ہانکے لگا لگا کر بیٹھ چکی تھی۔ دراصل فلن آنکھیں، استغیا میہ انداز سے اپنے آقا کو، جس نے چپ سا دھڑکی تھی، دیکھ رہی تھیں۔ ”یقیناً تم مزاحمت نہیں کر پاؤ گے؟“ وہ آنکھیں یہ کہتی دکھائی دے رہی تھیں۔

”سازگار دن ہے، شکار کے لیے، سر بٹ دوڑنے دوڑانے کے لیے، کیا خیال ہے؟“ گلوہ کی نے ہلکا کو کانوں کی پھولی جانب کھجاتے ہوئے کہا۔

دانیلو نے آنکھیں جھپکائیں اور خاموش کھڑا رہا۔

”میں نے سن گن لینے کے لیے پو پھٹے یوار کا کوچھج دیا تھا، اس نے کچھ توقف کے بعد کہا۔ ”وہ کہتا ہے کہ وہ ابھی اتر ادا نیا کے بن میں لے گئی ہے۔ وہ وہاں چیخ چلا رہے تھے۔“ (اس کا مطلب یہ تھا کہ بھیڑنی، جس کے متعلق ان دونوں کو علم تھا، بچوں کو اتر ادا نیا کے جنگل میں لے گئی ہے۔ یہ نجی شکار گاہ تھی اور گھر سے ڈیڑھ میل دور تھی۔)

”ہمیں جانا نہیں چاہیے؟“ کتوں کی نے کہا۔ ”یوار کا کے ساتھ میرے پاس آ جانا۔“

”بہت اچھا، حضور۔“

”پھر انھیں دانہ ڈنگا دینا بند کر دو۔“

”جی سرکار۔“

پانچ منٹ بعد دانیلو اور یوار کا گلوہ کی کے کشادہ سٹڈی روم میں کھڑے تھے۔ اگرچہ دانیلو بلند قامت شخص نہیں تھا لیکن کمرے میں اسے دیکھ کر یہی احساس ہوتا تھا جیسے گھریلو ماحول اور فرنیچر کے درمیان فرش پر کوئی کھوڑا یا رینگہ کھڑا ہو۔ دانیلو خود بھی یہی محسوس کر رہا تھا اور وہ حسب معمول دروازے کے ذرا اندر کھڑا تھا۔ وہ نرم ملائم لہجے سے گفتگو کرنے کی سعی کر رہا تھا اور اپنی جگہ سے بالکل ہل چل نہیں رہا تھا۔ اسے اندیشہ تھا کہ اپنے آقا کے کمرے

میں اس سے کہیں کوئی چیز ٹوٹ نہ جائے۔ اسے جو کہنا تھا، وہ اسے حتی الامکان جلد از جلد کہہ رہا تھا تاکہ وہ ایک مرتبہ پھر چھت سے دور آسان تے کھلی فضا میں جا سکے۔

چھان بین کرنے اور دانیلو سے تقریباً جبراً یہ منوالینے کے بعد، کہ شکاری کتے بالکل چاقو چوہند ہیں (خود دانیلو بھی جانے کے لیے بے قرار تھا)، نکولائی نے گھوڑوں پر زینیں کسنے کا حکم دے دیا۔ لیکن عین اس وقت جب دانیلو جانے ہی والا تھا، نناشا پیک جھپک کمرے میں داخل ہوئی۔ وہ بوڑھی نرس کا بڑا دوشادہ اور بڑے ہوئے تھی کیونکہ ابھی تک اس نے نہ بال بنائے تھے اور نہ ڈھنگ سے کپڑے پہنے تھے۔

”تم جارہے ہو؟“ نناشا نے پوچھا۔ ”مجھے معلوم تھا کہ تم رکو گے نہیں! سوچا کہ جی تو تم نہیں جاؤ گے لیکن میں جانتی تھی کہ جب دن اس قسم کا ہو، تم جائے بنا رہے نہیں سکو گے۔“

”ہاں، ہم جارہے ہیں!“ نکولائی نے بادل ناخواستہ جواب دیا کیونکہ وہ اس روز سنجیدگی سے شکار کھیلا چاہتا تھا اور نناشا اور پیتا کو اپنے ساتھ نہیں لے جانا چاہتا تھا۔ ”ہم جارہے ہیں۔ آج صرف بھیڑیوں کا شکار ہوگا، تمہیں کوئی لطف نہیں آئے گا۔“

”تمہیں معلوم ہے کہ یہ میری سب سے بڑی تفریح ہے!“ نناشا نے کہا۔ ”بڑا کمینہ ہے۔ کیلا ہی جارہا ہے۔ گھوڑے تیار کرنے کا حکم بھی دے دیا اور تمہیں کانوں کان خبر تک نہ ہونے دی۔“

”کوئی رکاوٹ روسیوں کے راہ کاروڑ انہیں بن سکتی! چلو، ہم بھی چلتے ہیں!“ پیتا نے باواز بلند کہا۔ ”لیکن تم نہیں جا سکتیں۔ ماما نے کہا تھا کہ تمہیں بالکل نہیں جانا چاہیے!“ نکولائی نے نناشا کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔

”کیوں نہیں؟ میں جاؤں گی اور ضرور جاؤں گی!“ نناشا نے مٹھیاں بھیج کر کہا۔ ”دانیلو، ہمارے گھوڑوں پر بھی زینیں ڈلو اور دانیلو سے کہو کہ وہ میرے شکاری کتے لے آئے!“ اس نے رکھوالے سے کہا۔ دانیلو کو تو کمرے میں ہی کھڑا ہونا گراں اور ناز بیا معلوم ہو رہا تھا چہ جائیکہ نوجوان دوشیزہ سے بھی واسطہ پڑ جائے اور یہ بات اس کے لیے بالکل ہی ناقابل برداشت ہو گئی۔ اس نے اپنی آنکھیں جھکا میں اور وہاں سے بہ عجلت کھسکنے میں ہی عافیت جانی گویا یہ اس کا معاملہ نہیں تھا۔ تاہم جاتے جاتے اس نے اتنی احتیاط ضرور برنی کہ اس کے کسی قول و فعل سے اتفاق نہ بھی نوجوان خاتون کے جذبات کو کوئی ٹھیس نہ پہنچے۔

معمر کاؤنٹ شکار کا کھٹ راگ ہمیشہ ہی وسیع و عریض پیمانے پر پالتا رہا تھا لیکن حال ہی میں اس نے یہ سب کچھ اپنے بیٹے کی تحویل میں دے دیا تھا۔ تاہم اس روز، بتاریخ پندرہ ستمبر، اس کی طبیعت بہت گھٹتہ تھی اور اس سے دوسروں کے ہمراہ چلنے کی تیاریاں شروع کر دیں۔

ایک گھنٹے کے اندر شکار کے تمام شوقین پورج میں آسودہ ہوئے۔ گول کی درشت اور بنجیدہ انداز سے، جس سے وہ یہ ظاہر کرنا چاہتا تھا کہ اب اس کے پاس فضاویات پر ضائع کرنے کے لیے کوئی وقت نہیں ہے، متاثر اور چپا کے، جو اسے کچھ بتانے کی کوشش کر رہے تھے، قریب سے گزر گیا۔ اس نے شکار کے لوازمات کی ایک ایک چیز کا خود جائزہ لیا، شکار کو راستے میں روکنے کی غرض سے رکھوالوں کو شکاری کتوں کی ایک ٹولی کے ساتھ آگے بھیجا، وہ اپنے کیت گھوڑے ”دون“ پر سوار ہوا اور سیٹیاں بجا بجا کر اپنے کتوں کو بلاتا اور ان کی رہنمائی کرتا تھا، پڑے سے کھیت کی، جہاں سے اتر ادنا یا شکار گاہ کو رستہ جاتا تھا، جانب چل پڑا۔ معمر کاؤنٹ کا گھوڑا آختہ، اس کا رنگ سرخی مائل بادی اور اس کا نام دی نلائی آ نکا تھا۔ اس گھوڑے کو سائیس نے تمام لیا جب کہ خود کاؤنٹ ہلکی پھلکی غم غم میں جنگل کے اس حصے کی، جسے درخت کاٹ کر صاف کر دیا گیا تھا اور جو اسی کے لیے مخصوص تھا، چل دیا۔

چونکہ شکاری کتے چھ رکھوالوں اور نائب رکھوالوں کی نگرانی میں جا رہے تھے۔ خاندان کے ارکان اور ان کے بچے اپنے کتوں کے علاوہ چالیس سے زیادہ بارزوں کے اور ان کے نگران بھی ساتھ تھے۔ چنانچہ مل کر کل قافلہ ایک سو تیس کتوں اور بیس گھڑ سواروں پر مشتمل تھا۔

ہر کتا اپنے آقا کو اور جس نام سے اسے پکارا جاتا تھا، ان کو خوب پہچانتا تھا۔ شکاری قافلے کے ہر شخص کو بخوبی معلوم تھا کہ اس کا کام اور مقام کیا ہے اور کہاں اس نے کیا کرنا ہے۔ جو نئی انھوں نے باز عبور کی، وہ سب خاموشی اور درست انداز سے اس کھیت اور سڑک پر، جو اتر ادنا یا شکار گاہ کی طرف جاتی تھی، پھیل گئے۔ کسی نے نہ تو کوئی بات کی اور نہ کسی طرح کا شور و غوغا کیا۔

گھوڑے کھیت پر یوں قدم دھرتے تھے جیسے وہ کسی دبیز قلعہ میں پر چل رہے ہوں۔ کبھی کبھار سڑک پار کرتے وقت ان کے پاؤں پانی کے چھوٹے موٹے گڑھوں پر پڑ جاتے اور یوں وہ چھینٹے اڑانے لگتے۔ دھند میں پٹنا آکاش اب بھی دھیرے دھیرے اور غیر محسوس انداز سے دھرتی کی جانب اترتا محسوس ہوتا تھا۔ ہوا بند اور فضا نیم گرم تھی۔ کہیں کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی، ماسوا اس کے کہ کبھی کبھار کوئی رکھوالا سیٹی بجا دیتا، کوئی گھوڑا نہہانے لگتا، کوئی چابک شوں شاں کر دیتا یا کوئی کتا، جو اپنے ساتھیوں سے پھنچ چکا ہوتا، رونے کی صدا بلند کر دیتا۔ جب وہ تقریباً پون میل کا فاصلہ طے کر چکے، پانچ مزید گھڑ سوار اپنے کتوں کے ہمراہ دھند سے نمودار ہوئے۔ اور دستوں کی طرف آ رہے تھے۔ سب سے اگلے گھوڑے پر ایک خوش اندام بوڑھا شخص سوار تھا۔ اس کا چہرہ سرخ و سپید اور موٹھیں گھنی، بڑی اور سفید تھیں۔

”چچا جان، آداب عرض!“ گول کی نے بوڑھے کے قریب آنے پر کہا۔

”سہانا کھیت اور صاف راستہ! مجھے یقین تھا، بوڑھے شخص نے، جسے ”چچا جان“ کے لقب سے مخاطب کیا گیا تھا، کہا۔ (وہ دستوں کا در پرکار رشتہ دار تھا اور ان کے پڑوس میں اس کی تھوڑی بہت جائیداد تھی۔) ”مجھے معلوم تھا کہ تم اپنی خواہش پر قابو نہیں پاسکو گے۔ چلو اچھا ہوا کہ تم لوگ آ گئے! سہانا کھیت اور صاف راستہ!“ (یہ

اس کا پسندیدہ نکیہ کلام تھا۔ ”نی الفور شکار گاہ پہنچ جاؤ کیونکہ میرے ملازم گرچک نے مجھے بتایا ہے کہ لاگن اپنے کتوں کے ہمراہ کارنگی پہنچ چکے ہیں۔ سہانا کھیت اور صاف راستہ۔ وہ تمہاری آنکھوں کے عین سامنے بھیڑیوں کا مہول اڑا لے جائیں گے۔“

”میں ادھر ہی جا رہا ہوں۔ کیوں نہ ہم سب ایک ہی جگہ بیٹھیں؟“ نکولائی نے پوچھا۔
کتوں کو ایک ہی ٹولی میں کٹھا کر دیا گیا اور ”چیچا“ اور نکولائی برابر برابر چھنے لگے۔ ناشا جو درشاہوں میں لپٹی ہوئی تھی لیکن اس کا پر اشتیاق چہرہ اور چمکتی دکتی آنکھیں ان میں پوشیدہ نہیں تھیں، چچا، نائب رکھوالے میخانہ اور گھڑسوار کی کے استاد کی، جسے اس کی خبر گیری کے لیے ماسور کیا گیا تھا، معیت میں سر پٹ گھوڑا دوڑاتی ان کے ساتھ آئی۔ چچا کی بات پر قہقہے لگا رہا تھا اور اپنے گھوڑے کو چابک سے پیٹ رہا اور اس کی باگیں کھینچ رہا تھا۔ ناشا اپنے مشکل اسپ تازی پر بڑے ٹھسے اور اعتماد سے بیٹھی تھی۔ لگام پر اس کی گرفت خاصی مضبوط تھی اور وہ حسب ضرورت بڑے آرام اور سہولت سے سے کھینچ لیتی یا ڈھیلی چھوڑ دیتی۔

”چیچا“ نے چچا اور ناشا کو نا پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا۔ وہ شکار جیسے سنجیدہ معاملے میں کسی قسم کی ایڈی بیڑی اور بے ہودگی کا پیوند لگانا پسند نہیں کرتا تھا۔

”چیچا جان، آداب عرض! ہم بھی آرہے ہیں،“ چچا نے نعرہ مستانہ بلند کیا۔
”آداب عرض آداب عرض! بچو، خیال رکھو، کہیں کتوں پر گھوڑے نہ بڑھا دیتا،“ اس نے دھکی سے

جواب دیا۔

”نکولائی کا، سبحان اللہ، یہ تر دینا کیا پھب دار کتاب ہے! وہ مجھے پہچانتا تھا!“ ناشا نے اپنے پسندیدہ کتے کے

متعلق کہا۔

”جیسا بات تو یہ ہے کہ تر دینا کتا نہیں، شکاری کتا ہے،“ نکولائی نے سوچا اور اس نے چچا ہشیر کو گور کر دیکھا۔ وہ اسے یہ محسوس کرانے کی کوشش کر رہا تھا کہ دونوں کے مابین جو فاصلہ ہونا چاہیے، سے اس کا اندازہ ہو جانا چاہیے۔

ناشا اس کا مدعا سمجھ گئی۔

”چیچا جان آپ کے دس میں مطلق یہ خیال نہیں آنا چاہیے کہ ہم آپ کی راہ میں رکاوٹ بنیں گے،“ وہ بولا۔
”ہم اپنی جگہ ڈنٹے رہیں گے اور ایک انچ بھی ادھر ادھر نہیں بنیں گے۔“

”چھوٹی کاؤٹنس، یہ تو بہت اچھی بات ہوگی!“ ”چیچا“ نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ ”صرف اتنا خیال رکھنا کہ کہیں اپنے گھوڑے سے نہ گر جانا،“ اس نے مزید کرہ لگائی۔ ”ورنہ۔ سہانا کھیت، صاف راستہ۔ تم کچھ بھی نہیں پکڑ سکو گی۔“

کوئی دوسو گز آگے اتر اونا یا شکار گاہ صاف نظر آنے لگی اور نائب رکھوالے اپنے گھوڑے ادھر بڑھانے لگے۔

رستوف نے جب بالآخر ”چچا“ کے ساتھ یہ طے کر لیا کہ انھوں نے اپنے شکاری کتے کہاں سے چھوڑنے میں اور دانا کو یہ سمجھا چکا کہ اس نے کہاں کھڑے رہنا ہے۔ یہ وہ مقام تھا، جہاں اس بات کا قطعی کوئی امکان نہیں تھا کہ وہاں بھگتی دوڑتی کوئی چیز پہنچ جائے گی۔ وہ پہاڑی نالے سے گھیرا ڈالنے آگے چلا گیا۔

”جھجے، تم خاصے بڑے شکار پر ہاتھ ڈال رہے ہو“ ”چچا“ نے کہا۔ ”اس بات کا خیال رکھنا کہ کہیں وہ تمہاری آنکھوں میں دھول پھونک کر نکل نہ جائے۔“

”اس کا انحصار حالت پر ہے،“ رستوف نے جواب دیا۔ ”کارائی، ادھر۔“ اس نے اپنے ایک کتے کا نام لے کر اسے یوں پکارا جیسے وہ ”چچا“ کو جتنا چاہتا ہو کہ وہ بالکل بخیر رہے۔

کارائی جھبرا، بد صورت، بوڑھا اور پرانا شکاری کتا تھا۔ اس کی وجہ شہرت یہ تھی کہ اس نے تنہا ایک جسم درخوب لپے ہوئے بھیڑیے کی ہڈی پسلی یک کر دی تھی۔

بچے کو شکار کا جو جنون تھا، معمر کاؤنٹ اس سے بخوبی آگاہ تھا۔ وہاں تعمیل آگے بڑھتا کہ وہ کہیں پیچھے نہ رہ جائے۔ رکھوالوں نے بمشکل اپنی اپنی جگہیں سنبھالی تھیں کہ الیا آندرینچ سرسبز کھیت میں اپنے آہنی گھوڑے روڑا بنا اس مقام پر، جو پگڈنڈی پر اس کے لیے مخصوص تھا، پہنچ گیا۔ وہ ہشاش بشاش تھا، اس کا چہرہ تسمنا رہا اور اس کے گال بھڑک رہے تھے۔ اس نے اپنے سموری کوٹ کی شکنیں درست کیں، شکاری سامان سے اپنے آپ کو لیس کیا اور اپنے فیس، خوش اندام، تندرست و توانا، اور مسکین طبع گھوڑے دی فلانی آکا کی، جس کے بال اس کے اپنے بالوں کی طرح سفید ہو رہے تھے، پشت پر سوار ہو گیا۔ گھوڑے اور خم خم واپس بھیج دی گئی۔ اگر چہ کاؤنٹ الیا آندرینچ کو شکار کا خاص شوق نہیں تھا لیکن وہ شکاریات کے اصدوں سے بخوبی آگاہ تھا۔ وہ گھوڑے پر سوار درختوں کے جھنڈ کی طرف چل دیا۔ اسے اسی کے کنارے ٹھہرنا تھا۔ چنانچہ اس نے وہاں پہنچ کر گھوڑے کی نگام کھینچ لی، آرام سے زین پر بیٹھ گیا اور یہ محسوس کرتے ہوئے کہ اب وہ بالکل تیار ہے، جہم ادھر دھرنظر میں دوڑانے لگا۔

اس کے قریب اس کا وردی پوش ملازم سکی آکن چیک، رہتا۔ چیک مار جہان دیدہ اور تجربے کار گھڑ سوار تھا لیکن اس وقت وہ کانٹھی پر جسم، کڑائے بیٹھا تھا۔ اس نے تین خونخوار بھیڑیا نما شکاری کتوں کی زنجیریں تمام رکھی تھیں حالانکہ وہ بھی اپنے مالک اور اس کے گھوڑے کی طرح فریبہ ہو چکے تھے۔ دو سیانے اور ادھیڑ عمر کتے، رسیوں سے آراہنہ زمین پر لیٹے ہوئے تھے۔ جنگل کے کنارے کے ساتھ ساتھ کوئی سو قدم آگے کاؤنٹ کا دوسرا سامان محکا کھڑا تھا۔ وہ بے دھڑک خطروں میں کود جانے والا جیوٹ گھڑ سوار اور بہت جوشیلا شکاری تھا۔

کاؤنٹ نے شکار پر روانہ ہونے سے قبل قدیم اور مقدس روایت پر عمل کرتے ہوئے براڈی کا ایک نفرتی جام، جس میں شکر، گرم مصالحے اور انڈے کی زردی کی آمیزش تھی، نوش کیا، چند بسکٹ کھائے اور ان سب کے اوپر اپنے پسندیدہ مشروب بارڈا کی نصف بوتل حلق میں اندیل لی تھی۔ شراب اور سفر نے اس کے گال قدرے تھما دیا تھا۔ اس کی آنکھیں، جن میں پانی آیا چاہتا تھا، خاص طور پر روشن داتاں تھیں۔ وہ فرکوٹ میں پٹنا زین پر

بیٹھا تھا اور بالکل اس ننھے ننھے بچے کی، جسے گھوڑے پر سو رکرا کر سیر اتفریح کے لیے کھلی فضا میں لے آئے ہوں، مانند نظر آ رہا تھا۔

اپنے فرائض کی ادائیگی کے بعد چیک مارنے، جس کا جسم اکہرا اور آنکھیں اندر کودھنسی ہوئی تھیں، ایک نظر اپنے کاپر ڈالی۔ وہ اس کے ساتھ گزشتہ تیس سالوں سے وابستہ تھا اور دونوں کے باہمی تعلقات نہایت خوش گزار تھے۔ خدمتکار نے جب اپنے آقا کو ہشاش بشاش پایا، اسے پر لطف گپ شپ کی امید بندھ گئی۔ ایک تیسرا شخص (جسے بظاہر تربیت دی گئی تھی) کان کھڑے کیے گھوڑے پر سوار جنگل سے باہر نکلا اور کاؤنٹ کے عقب میں رک گیا۔ یہ ذات شریف کہن سال تھا، اس کی ڈارھی سفید تھی، اس کے جسم پر زنا نہ چنخہ اور سر پر بھی تہجے دار ٹوپی تھی۔ یہ مسخرہ¹² تھا اور اسے ناستاسیا ایو، نووونا کے نام سے جانا جاتا تھا۔

”ناستاسیا ایو نووونا،“ کاؤنٹ نے اسے آنکھ مارتے ہوئے سرگوشی کی۔ ”اگر تم نے درندے کو مار دیا، پھر دیکھنا، دانیلو کے ہاتھوں تمہیں کیا بے بھاد کی پڑتی ہیں۔“

”میں اتنا بھی نادان نہیں!“ ناستاسیا ایو نووونا نے جواب دیا۔

”دشمنی؟“ کاؤنٹ پھٹکارا اور کسی آن کی طرف متوجہ ہو گیا۔ تمہیں حنا لیا لپٹنا کہیں نظر آئی ہے؟“ اس نے پوچھا۔ ”کہاں ہے وہ؟“

”پیوٹر الچ کے ساتھ۔ زحاروف چراگاہ کے عقب میں،“ متبسم چیک مارنے جواب دیا۔ ”بے شک ان کا تعلق صنف نازک سے ہے لیکن شکار کی بہت دلدادہ ہیں۔“

”سیسی ون، جس انداز سے وہ سواری کرتی ہے، تمہیں تعجب تو ہونا ہوگا؟“ کاؤنٹ نے کہا۔ ”بالکل مرد معلوم ہوتی ہے!“

”کون حیران نہیں ہوگا؟ اتنی دلیر، اتنی ہوشیار!“

”اور نکولا شا، وہ کہاں ہے؟ لیادوف ٹیلے کے پاس؟“ کاؤنٹ نے اب بھی سرگوشیوں میں پوچھا۔

”بالکل درست، سرکار۔ انھیں معلوم ہے کہ انھیں کہاں کھڑا ہونا ہے۔ وہ شکار کی ہارکیاں اتنی اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ بعض اوقات میں در دانیلو ششدر رہ جاتے ہیں،“ چیک مارنے کہا۔ وہ خوب جانتا تھا کہ آقا کو کیسے

خوش کیا جاتا ہے۔

”سواری بھی خوب کرتا ہے۔ ٹھیک ہے؟ گھوڑے پر چٹا بھی خوب ہے۔ ٹھیک ہے؟“

”بالکل سورت معلوم ہوتے ہیں۔ واہ واہ، سبحان اللہ! ابھی پچھلے دنوں انھوں نے زوارز نسکی چراگاہ کی

اونچی اونچی گھاس میں لومڑ کا زبردست تعاقب کیا تھا! وہ بالکل طوفان کی مانند گھوڑا سر پٹ دوڑاتے آئے گھوڑا

ہزار رو بل کا اور سوار؟ بالکل انمول! چراغ لے کر بھی ڈھونڈیں، ان جیسا اور کوئی نہیں ملے گا!“

”ان جیسا اور کوئی نہیں ملے گا۔“ کاؤنٹ نے دہرایا۔ اسے بظاہر بڑی مایوسی ہوئی تھی کہ چیک مار کی

تقریباً اتنی جلدی ختم ہو گئیں۔ ”اور کہیں نہیں ملے گا،“ اس نے پھر کہا اور سواری کی ذیبا تک پہنچنے کے لیے اپنا کوٹ الٹ پلٹ کرنے لگا۔

”چند روز ہوئے جب وہ اپنی خوبصورت وردی پہنے گرجے سے باہر آئے اور منجی ٹیل سیدورج...“ چیک مار کہتے کہتے رک گیا۔ ٹیبھر سناٹے میں اس نے وضع طور پر دو تین شکاری کتوں کے بھونکنے کی آوازیں سن لی تھیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ شکار کا آغاز ہو گیا ہے۔ اس نے اپنا سر جھکایا، کان لگا کر غور سے سنا اور انگلی لہرا کر اپنے آقا کو متنبہ کیا۔ ”وہ بھیڑنی کے بچوں کا تعاقب کر رہے ہیں،“ اس نے زیر لب کہا۔ ”وہ سیدھے لیاؤف ٹیپے کی طرف جا رہے ہیں۔“

کاؤنٹ نے اپنی پناہ گاہ سے دور جھانک کر دیکھا۔ اس کے چہرے پر اب بھی مسکراہٹ تھی اور اس کے ہاتھ میں جو ڈیریا تھی، وہ اس میں سے چٹکی بھر سواری نکال بھول گیا تھا۔ کتوں کے بھونکنے کی آواز کے بعد دانیلو کے ذہن پر بھیڑیے کا شکار کرنے کی ہلکی لٹکار سنائی دی۔ (کتوں کا) غول پہلے تین شکاری کتوں کے ساتھ آ ملا۔ وہ پچھڑوں کا پورا زور لگا کر وہ مخصوص چیخ، جو اس امر کی علامت ہوتی ہے کہ وہ کسی بھیڑیے کو ڈھونڈ رہا ہے، بلند کر رہے تھے۔ نائب رکھوالے اب شکاری کتوں کو محض شکار نہیں رہے تھے بلکہ ہوجھ، ہوجھ کی آوازیں نکالتے انھیں شکار جھپٹنے کے لیے لشکار رہے تھے، اور دانیلو کی آواز، جو کبھی مدھم انداز سے اس کے حلق سے برآمد ہوتی اور کبھی اتنی بلند ہو جاتی کہ کانوں کے پردے پھاڑنے لگتی، پائی تمام آوازوں سے اونچی تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ اس کی یہ آواز تمام جنگل اور اس کے در گرد کے سارے علاقے پر محیط ہو چکی ہے۔ دریاں کی بازگشت دور کھلی فضاؤں میں بھی سنائی دے رہی تھی۔

چند سینکڑ چپ چاپ سننے کے بعد کاؤنٹ اور اس کے ساتھیوں کو یقین ہو گیا کہ شکاری کتے دو ٹولیوں میں تقسیم ہو گئے ہیں۔ بڑی ٹولی بڑے زور شور سے کہیں دور بھاگی جا رہی تھی، جب کہ دوسری جنگل کے کنارے کے ساتھ ساتھ بھگتی کاؤنٹ سے آگے نکل گئی اور یہی وہ ٹولی تھی جسے دانیلو لش لاش کرنا سنائی دے رہا تھا۔ دونوں ٹولیوں کی آوازیں آپس میں گونجنے لگیں اور ایک بار پھر علیحدہ علیحدہ ہو گئیں لیکن دونوں ہی دور سے دور تر ہوتی جا رہی تھیں۔

چیک مار نے ٹھنڈی آہ بھری اور نیچے جھک کر زنجیر، جس میں ایک نو عمر شکاری کتے نے اپنی ٹانگ پھنسی تھی، سیدھی کرنے لگا۔ کاؤنٹ کی بھی سسکی نکل گئی اور جب اس کی نظر اپنے ہاتھ میں ڈیرا پر پڑی، اس نے اسے کھولا اور چٹکی برابر سواری نکال لی۔

”واپس!“ چیک مار نے ایک شکاری کتے سے، جو بے پاؤں جنگل سے باہر نکل رہا تھا، چلا کر کہا۔ کاؤنٹ گھبرا کر اچھل پڑا اور سواری کی ڈیرا اس کے ہاتھ سے نیچے گر پڑی۔ ناستا سیا ایوانو ونا سے اٹھانے کھوڑے سے نیچے تر آیا۔ کاؤنٹ اور چیک مار کی نظریں اس پر جمی ہوئی تھیں۔ پھر، جیسا کہ اکثر ہوتا ہے، پلک

جھپکنے میں شکار کی آواز قریب آنے لگی اور یوں معلوم ہونے لگا کہ کتوں کی چیخ پکار اور دانیلو کی شلش لشن ان کے عین سامنے آگئی ہے۔

کاؤنٹ نے اپنے ارد گرد نظریں دوڑائیں اور اسے دائیں ہاتھ متناک دکھائی دیا، جو اسے یوں گھور گھور کر دیکھ رہا تھا کہ معلوم ہوتا تھا کہ اس کی آنکھیں اس کے پیچھے سے باہر نکل آئیں گی۔ اس نے اپنی ٹوپی، ٹھکڑا کر سامنے اور دوسری جانب اشارہ کیا۔

”خبردار، ہوشیار!“ اس نے کچھ اس قسم کی آواز سے کہا کہ معلوم ہوتا تھا کہ پیچھے یہ الفاظ خاصی دیر سے اس کی زبان پر اٹکے ہوئے تھے اور باہر نکلنے کے لیے محض اشارے کے منتظر تھے۔ اس نے بارز دلی کتوں کو آگے نکل جانے دیا اور خود بگسٹ گھوڑا دوڑاتے کاؤنٹ کی طرف بڑھنے لگا۔

کاؤنٹ اور چیک مار سر پٹ گھوڑے دوڑاتے جھڑیوں سے باہر نکل آئے۔ انھیں بائیں ہاتھ آرام آرام سے ڈگ بھرتی اور پھلنگیں لگاتی، بھیڑنی بالکل ادھر، جہاں وہ کھڑے تھے، آتے نظر آئی۔ خوشخوار کتے دوڑا پا کر رہے تھے۔ انھوں نے زنجیریں چھڑائیں اور برقی رفتار سے بھیڑنی کا تعاقب کر لے لگے۔ گھوڑے پیچھے رہ گئے۔ بھیڑنی بھاگتے بھاگتے رک گئی۔ اس نے اس آدمی کی طرح، جو خنق میں مبتلا ہو، بے ہنگم انداز سے اپنی بھاری بھر کم اور کشادہ پیشانی کا سرخ کتوں کی طرف کیا اور ابھی تک اپنی وہی نرم اور چھوٹی چال چلتے دوہنتیں بھریں، چابک کی طرح فضا میں لہرائی اور سڑا کے کی آواز پیدا کرتی جنگل میں غائب ہو گئی۔ اسی لمحے تار و شبیوں سے ملتی جلتی آواز نکالتے مخافت جھنڈ سے پہلے ایک، پھر دوسرا، پھر تیسرا اور اس کے بعد شکاری کتوں کا پورے گا پورا غول برآمد ہو اور کھلے کھیت کو عبور کر تار برقی رفتار سے عین اس مقام کی، جہاں بھیڑنی غائب ہوں تھی، جانب بڑھا۔ کتوں کے گزرنے سے بادامی سرخی ہاتل جھاز یوں میں فاصلہ بن رہا تھا اور اس میں سے دانیلو کا گھوڑا، جس کا پسینے نے حلیہ بگاڑ دیا تھا، نظر آنے لگا۔ گھوڑے کی پشت پر دانیلو گردن آگے جھکائے بیٹھا تھا۔ اس کی ٹوپی بکرا دار بال پریشان تھی۔ اس کے یہ سفید بال اس کے تھمتھاتے اور پسینہ بہاتے چہرے پر ٹپک رہے تھے۔

”ہو چھ، ہو چھ!...“ وہ چلا رہا تھا۔

جب اس کی نظر کاؤنٹ پر پڑی، اس کی آنکھوں سے شعلے نکلنے لگے۔

”آپ! وہ اپنا چابک کاؤنٹ کے سامنے لہراتا دھاڑا۔“ آپ نے بھیڑنی کو کھٹک جانے دیا۔... ہونہ

آئے بڑے شکاری۔“

اور گویا کہ اسے متوجش اور شرمسار کاؤنٹ پر مزید الفاظ ضائع کرنے سے چڑھ، اس نے اپنے پسینے سے شرابور کیت آختہ گھوڑے کے، جس کی سانس پھول رہی تھی، چابک رسید کیے اور یوں اس نے اپنے سارے غصے کی، جو کاؤنٹ نے اسے دلایا تھا، بھڑاس اس پر نکالی اور کتوں کے پیچھے ہوا ہو گیا۔

کاؤنٹ کی حالت سکول کے اس طالب علم کی تھی، جس کی زبردست گوشالی ہوئی ہو۔ اس نے مسکراتے

ہوئے اپنے گرد و پیش یوں نظر دوڑائی جیسے وہ اپنے اس حال زار میں چیک مار سے ہمدردی کی بھیک مانگ رہا ہو۔ لیکن چیک مار وہاں کہاں تھا، وہ تو پٹا گھوڑا سر پٹ بھگالے گیا تھا تا کہ وہ بھیڑنی کو جنگل میں پناہ دینے سے روک سکے۔ دونوں اطراف کھیت بھی آرہے تھے لیکن بھیڑنی جنگل میں داخل ہو چکی تھی اور ایک بھی شکاری اس کے راستے کی دیو نہیں بن سکا تھا۔

5

دربن اٹا کولٹی رستوف بھیڑنی کے انتقال میں اپنی جگہ ڈٹا رہا۔ جس طریقے سے شکار آیا اور واپس چلا گیا، جس انداز سے کتے، جن کی آوازیں اس کی چانی پہچانی تھیں، داویلا کر رہے تھے اور جس ڈھنگ سے چابکوں کی اصوات، کبھی نزدیک اور کبھی دور بلند ہو رہی تھیں، ان سے ہی اس نے اندازہ لگایا کہ جنگل میں کیا ہو رہا ہے۔ اسے معلوم تھا کہ جنگل میں نو عمر اور کہن سال بھیڑیے موجود ہیں، وہ جانتا تھا کہ کتنے دو گرد ہوں میں تقسیم ہو چکے ہیں، کہیں شکار کے پیچھے بھگ رہے ہیں اور کہیں نہ کہیں گڑبڑ ضرور ہو گئی ہے۔ اسے ہر آن یہی امید تھی کہ بھیڑنی ابھی ادھر جدھر وہ کھڑا تھا، ضرور آئے گی۔ اس نے مختلف انواع کی ایک ہزار ایک قیاس آریاں کیں کہ درندہ کیسے اور کدھر سے بھاگتا آئے گا اور وہ کس طرح اسے اپنے حملے کی زد میں لے گا۔ کبھی اس کے دل میں امید کی کرن بگمگانے لگتی اور کبھی، یوپی کا گھٹا ٹوپ اندھیرا چھایا جاتا۔ وہ بار بار خداوند سے دعائیں مانگ رہا تھا کہ بھیڑنی ادھر، جدھر وہ کھڑا تھا، آئے۔ وہ گڑگڑا، گڑگڑا کر اور شرمساری کے اسی احساس کے ساتھ، جس کے ساتھ لوگ شدید مذہبی کیفیت میں، جس کے پس پردہ معمولی وجوہات کا فرما ہوتی ہیں، اپنے رب کے حضور حاضر ہوتے ہیں، دعاؤں پر دعائیں مانگے جا رہا تھا۔ ”اگر میرا یہ کام ہو جائے،“ وہ خداوند سے کہہ رہا تھا، ”خیر میں کیا کی آ جائے گی؟ میں جانتا ہوں کہ تو عظیم ہے اور اس طرح کی دعائیں مانگنا گناہ ہے لیکن برائے کرم بھیڑنی کو میری طرف بھیج دے اور میرے کتے کا رٹی کو اس پر جھپٹنے اور چچا کے سامنے، جو وہاں کھڑا سب کچھ دیکھ رہا ہے، اس کو ختم کرنے کا موقع عطا کر دے۔“ اس نصف گھنٹے کے دوران میں اس نے ایک ہزار ایک مرتبہ پر عزم، بوجھل اور متحرک نظروں سے جنگل کے کنارے جھاڑیوں کے جھنڈ کی طرف دیکھا جہاں پہاڑی ٹالوں کے کنارے، جسے پانی سے کاٹ دیا تھا، درمرد گرم چشیدہ، سوکھے مڑے اوک کے درختوں کے نیچے سفیدے کے چھوٹے چھوٹے درخت کھڑے تھے اور جہاں ایک جھاڑی کے عقب میں ”چچا“ کی ٹوپی کی ہلکی سی جھلک نظر آرہی تھی۔

”نہیں، میری ایسی قسمت کہاں!“ رستوف نے سوچا۔ ”اس کی خاطر سب کچھ قربان کیا جاسکتا ہے! لیکن وہ کسے کی نہیں۔ تاش کا کہیں ہو، جنگ کا میدان ہو یا کچھ اور۔ بد قسمتی میرا چچا نہیں چھوڑتی!“ آسٹریٹس اور ولوف کی یادیں میرز بہم انداز سے سرعت یکے بعد دیگرے اس کے ذہن میں کھوٹنے لگیں۔ ”کاش زندگی میں تو مند بھیڑنی کو ہلاک کرنے کا ایک موقع تو میسر آ جائے!“ پھر مجھے کسی اور چیز کی تمنا نہیں رہے گی!“ اس نے آنکھوں اور

کانوں پر زور ڈالتے، دائیں بائیں جھانکتے اور کتوں کی آوازوں میں معمولی ترین فرق کی نشان دہی کرنے کی خاطر غور سے سنتے سوچا۔

اس نے ایک بار پھر اپنی دائیں جانب دیکھا اور اسے کھلے کھیت میں کوئی چیز اپنی طرف بھاگتی نظر آئی۔
 ”نہیں، ایسا نہیں ہو سکتا!“ رستوف نے سوچا اور اس شخص کی طرح، جو اس شے کے، جس کی آرزو دلوں سے اس کے دل میں پلتی رہی ہو، حصول پر گہری سانس لیتا ہے، اسے بھی اطمینان کی سانس ملی۔ اس کی عظیم ترین سہرت کا لہجہ پہنچا تھا۔ وہ وہ بھی اتنے سادے انداز سے، شور شرابے، دھوم دھڑکے اور شان و شوکت کے بغیر کہ اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا اور ایک سیکنڈ کے لیے وہ شک و شبہ میں مبتلا رہا۔ بھیڑنی آگے بھاگی اور پوری قوت سے ایک تنگ پہاڑی نالے کو، جو اس کے راستے پر پڑتا تھا، جست لگا کر پھانگ گئی، یہ بوڑھی اور سل غور رہی تھی۔ اس کی پشت خاکستری اور پیٹ بھرا بھرا درمیان مائل تھا۔ وہ بھاگ ضرور رہی تھی لیکن جلد بازی نہیں کر رہی تھی۔ بظاہر اسے یقین تھا کہ کوئی اسے دیکھ نہیں پائے گا۔ رستوف کی اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی نیچے رہ گئی۔ اس نے کتوں کی جانب دیکھا۔ وہ کھڑے تھے یا لیٹے ہوئے تھے، انھوں نے بھیڑنی کو نہیں دیکھا تھا اور وہ اس کے وجود سے قطعاً بے خبر تھے۔ بوڑھا کارائی سر پہوڑا سے اپنے جسم پر پنڈو ڈھونڈ رہا تھا۔ اس کے پیلے ہونٹ برہنہ تھے اور اپنی پشت پر جھپٹے مار رہا تھا۔

”ہوچھ، ہوچھ!“ رستوف ہونٹ لٹکا کر کھسر پکھسر کے اندر میں پکارا۔

کتے جست لگا کر ایستادہ ہو گئے، انھوں نے زنجیروں کی آہنی کڑیوں کو جھٹکایا اور ان کے کان کھڑکے ہو گئے۔ کارائی نے اپنی پچھلی ٹانگ کھرچنا رک کر دیا اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے کان چوکنے تھے اور وہ اپنی ام، جس کے ڈولیدہ بال نیچے لٹک رہے تھے، آہستہ آہستہ ہلا رہا تھا۔

”ان کی زنجیریں کھول دوں یا نہیں؟“ نکولائی نے تب، جب بھیڑنی درختوں کے جھنڈے نکل کر اس کی طرف رہی تھی، اپنے آپ سے پوچھا۔ اچانک درندے کی سری شکل و صورت خیر ہو گئی۔ اس کا جسم تھر تھریا۔ اس نے وہ کچھ۔ انسانی نگاہیں، جو اس پر مرکوز تھیں۔ جو اس نے غالباً پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا، دیکھ لیا تھا۔ اس نے اپنے سر کو تدریس رستوف کی جانب گھمایا اور رک گئی، وہ فیصلہ نہیں کر پا رہی تھی کہ اسے آگے چلنا یا پیچھے لوٹ جانا چاہیے۔ ”اُدھیہ، کچھ پروا نہیں۔ آگے۔“ وہ اپنے آپ سے کہتی محسوس ہو رہی تھی اور عقب میں دیکھے بغیر اطمینان سے سکون سے لابی لیکن فیصلہ کن زقند میں بھرتی آگے بڑھتی رہی۔

”ہوچھ، ہوچھ!“ نکولائی نے کچھ ایسی آواز سے، جو اس کی اپنی نہیں تھی، چیخ ماری اور اس کا گھوڑا اور خود اسے خوف ناک رفتار سے لے اڑا اور ٹیلے سے نیچے اترنے لگا۔ بھیڑنی سے دور ہونے کے لیے اس نے چھوٹے سونے نالوں کی بھی پروا نہ کی اور جھلٹکیں لگا کر انھیں پار کرتا رہا۔ کتوں کی رفتار ان سے بھی زیادہ تیز تھی اور وہ ان سے آگے نکل گئے۔

نکولائی کو نہ تو اپنی چیخ سنائی دی اور نہ اسے یہ اندازہ ہوا کہ وہ سرپٹ بھاگا جا رہا ہے۔ اسے نہ کئے نظر آئے، درودہ زمین پر اس کا گھوڑا بگشت رواں دواں تھا۔ اس کی نگاہیں محض بھیڑنی پر، جو درختوں کے پتوں بیچ قلائع نہیں بھرتی، اور ہر آن اپنی رفتار تیز کرتی اسی سمت میں بھاگی آرہی تھی، جمی ہوئی تھیں، اس کے علاوہ اسے اور کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ ہر چیز سب سے پہلے درندے کی جانب بڑھتی نظر آئی، وہ سیاہ چٹنوں اور کشادہ پشت دلی (کتیا) ملا تھی۔ قریب قریب تر اور قریب تر۔ اب وہ اس کے بربر پٹ پٹتی جا رہی تھی۔ لیکن بھیڑنی نے اچانک اپنا رخ تبدیل کر لیا اور کتیا پر درودہ نگاہ ڈالی۔ ہلکا بجائے اس کے جیسا کہ اس کی ہمیشہ عادت رہی تھی، آگے بڑھنے کی سرگزشت کرتی، اس نے اچانک اپنی دم اٹھائی اور اپنی اگلی ٹانگیں اکڑا لیں۔

”ہوچھ ہوچھ ہوچھ!“ نکولائی چلایا۔

سرخ سگ تازی، لیویم، ملا کی پشت پھلانگتا ہوا آگے پکاء وحشیانہ انداز سے بھیڑنی پر کودا، اسے پھیلی ناچک سے پکڑا لیکن نانا ناس پر ایسا خوف و ہشت طاری ہوا کہ چھلانگ لگا کر ایک طرف ہٹ گیا۔ بھیڑنی دبک گئی، اس نے دانت پیسے، وہ دوبارہ اٹھی اور زقندیں لگاتی آگے بھاگنے لگی۔ کتوں کے پورے غول نے اس کا تعاقب کیا۔ وہ اس سے صرف دو قدم پیچھے تھے لیکن وہ اس تک پہنچنے میں ناکام رہا۔

”یہ تو چیخ نکلتے ہیں کامیاب ہو جائے گی! نہیں، یہ ناممکن ہے!“ رستوف نے سوچا اور وہ اپنی پھٹی پھٹی آواز میں بھرچلانے لگا۔ ”کارائی! ہوچھ۔۔“ وہ لکارا اور اپنے ارد گرد بوزھے کتے کو، جو اس کی واحد امید رہ گیا تھا، تلاش کرنے لگا۔

کارائی بھیڑنی پر نظریں جمائے اور اپنی زواں پذیر قوت کا آخری قطرہ نچوڑنے کی کوشش کرتے ہی ہتھم انداز سے درندے کے ایک جانب دوڑنے لگا تا کہ وہ اس کا راستہ روک سکے لیکن بھیڑنی تھی کہ برقی رفتار سے پھلانگیں لگاتی بھاگی جا رہی تھی جب کہ کتے کی رفتار لحظہ بہ لحظہ کم ہوتی جا رہی تھی۔ صاف پتا چل رہا تھا کہ کارائی کے انداز سے غلط ثابت ہوئے ہیں۔ سامنے قلیل فاصلے پر نکولائی کو جنگل دکھائی دے رہا تھا اور اگر بھیڑنی وہاں تک پہنچے میں کامیاب ہو گئی، پھر وہ یقیناً اس میں غائب ہو جائے گی۔ اس کے سامنے ایک رکھوالا اور کتے نمودر ہوئے۔ وہ بھیڑنی کی سمت میں سرپٹ بھگے آرہے تھے۔ ابھی امید کی رمت باقی تھی۔ ایک نوجوان لمبا ٹانگا اور زبردستی کتا، جسے نکولائی پہچان نہ سکا، درجو کسی دوسرے شخص کی زنجیر میں بندھا ہوا تھا، اندھا دھند بھیڑنی سے جا ٹکرایا اور اس نے اسے قریب قریب نیچے گرا دیا۔ بھیڑنی نے توقع سے بڑھ کر پھرتی دکھائی، اپنا توازن درست کیا اور مات لنگھاتی، درد سگ تازی پر پل پڑی۔ کتے کے منہ سے دل دوز چیخ نکلی وروہ سر کے بل زمین پر گر پڑا۔ اس کے ایک پہلو پر گہرا زخم آیا اور وہاں سے خون کا فوارہ بہہ نکلا۔

”کارائی، بڑے سیان۔۔“ نکولائی نے نالہ و شہیون پیا کرتے ہوئے کہا۔

بھیڑنی کے فرار میں جو یہ رکاوٹ آئی، یہ اسی کا کرشمہ تھا کہ درودہ دم والے ادھیڑ عمر کتے اور بھیڑنی کے

امین اب صرف پانچ قدم کا فاصلہ رہ گیا تھا۔ بھیڑنی نے کارائی کو کچھ اس انداز سے آنکھ ماری جیسے دو درہنوں خطرے سے بے خبر ہو، اس نے اپنی دم مزید چلی ٹانگوں میں گھسیڑی اور اپنی رفتار بڑھا دی۔ لیکن صحن اسی کے نکولائی نے دیکھا کہ کارائی پر کوئی تیز جذبہ غالب آ گیا ہے۔ چٹکی بجاتے کتے نے بھیڑنی کو دیوچ یا اور دو درہنوں سر کے بل پہاڑی نالے میں، جو چانک ان کے آگے آ گیا تھا، جا گرے۔

جس وقت نکولائی نے نالے میں بھیڑنی کو کتوں کے ساتھ گھم گھا ہوتے دیکھا، وہ اس کی زندگی کا سرور تری لمحہ تھا۔ اس کا خاکستری جسم اور اس کی باہر کوٹلی ہوئی عقی ٹانگیں ان کے نیچے تھیں۔ اس کا دم پھوس چکا تھا، چہرے پر دہشت سوار تھی اور اس کے کان پیچھے کو جھکے ہوئے تھے۔ (کارائی نے اس کا زخراہ بار کھا تھا)۔ اس نے ہٹا ہتھ دین کے ہرنے پر رکھا۔ اب وہ گھوڑے سے اترنے اور بھیڑنی کے جسم میں خنجر بھونکنے کے لیے تیار تھا لیکن ایک ایسی درد سے نے کتوں کے ہجوم میں سے اپنے سر اٹھایا اور اگلے لمحے اس کی اگلی ٹانگیں نالے کے کنارے پر پہنچ گئیں، اس کے دانت کڑکڑائے (وہ کارائی سے اپنا حلقوم چھڑا چکا تھا)۔ اس نے اپنی پچھلی ٹانگوں پر وزن ڈالا، پورا زور لگایا اور نالے سے باہر کود گیا۔ یوں کتوں سے اپنا پنڈ چھڑا کر بھیڑنی دم دبائے تیزی سے آگے بڑھنے لگی۔ کارائی، جس کے رگڑے کھڑے تھے، بظاہر یا تو خراشیں یا زخم کھا چکا تھا اور وہ بڑی اذیت کے ساتھ رینگ رینگ کر نالے سے باہر آ رہا تھا۔

”اف، میرے خدایا کیوں“۔ نکولائی مایوسی کے عالم میں چیخ و پکار کرنے لگا۔

دوسری طرف سے ”چچا“ کے کتوں کے رکھوالے سر پٹ گھوڑے دوڑاتے بھیڑنی کے راستے کی دیوار بن گئے اور ان کے سگان تازی نے ایک مرتبہ پھر اسے روک لیا۔ یوں وہ دوبارہ زرخے میں آ گئی۔ نکولائی، اس کا سائیس، ”چچا“ اور اس کے کتوں کے رکھوالے دوبارہ درندے کے گرد گھیرا جگ کرنے لگے۔ وہ ”ہوچھ، ہوچھ“ کے ہنکارے لگا رہے اور شور و غل مچا کر رہے تھے۔ جونہی وہ دیک کر بیٹھا، وہ اترنے کے لیے تیار ہو جاتے لیکن جونہی وہ سب کچھ جھاڑ جھوڑ دوبارہ اٹھتا اور جنگل کی طرف، جہاں اسے پناہ مل سکتی تھی، آگے بڑھتا، وہ بھی آگے چل پڑتے۔

اس یورش کے بالکل آغاز میں دانیلو رکھوالوں کی ”ہوچھ، ہوچھ“ کی آوازیں سن کر گھوڑا بھاگنا جنگل کے کنارے پہنچ چکا تھا۔ اس نے کارائی کو بھیڑنی کے ساتھ گھم گھا ہوتے دیکھ لیا تھا۔ اس نے اپنا گھوڑا روک کر دیکھا کہ اس کا خیال تھا کہ معاملہ ختم ہوا ہو چکا ہے۔ لیکن جب اس نے دیکھا کہ رکھوالے گھوڑوں سے نہیں اترے بلکہ بھیڑنی اپنے آپ کو چھڑانے اور راہ فرار اختیار کرنے میں کامیاب رہی ہے، اس نے اپنا گھوڑا جھٹ دوڑا دیا لیکن اس کا رخ درندے کی طرف نہیں تھا بلکہ، جیسا کہ کارائی نے کیا تھا، سیدھا پناہ گاہ کی طرف تھا تا کہ وہ بھیڑنی کو راستے میں روک سکے۔ نتیجتاً وہ اس کے قریب صحن اس وقت پہنچا جب ”چچا“ کے کتے اسے دوسری مرتبہ روک چکے تھے۔

دانیلو اپنا گھوڑا خاموشی سے سر پٹ دوڑاتا آیا۔ اس نے بائیں ہاتھ میں خنجر تان رکھا تھا اور وہ اپنے کپت گھوڑے کے، جس کی سانس پھول چکی تھی، دونوں پہلوؤں پر چابک پر چابک مار رہا تھا۔

کھولائی کو دانیلو آواز نہ دکھائی دیا اور نہ سنائی تا آنکہ اس کا ہاتھ گھوڑا ہانپتا کانپتا اس کے برابر سے آگے نہ گزر سکا اور کسی شخص کے نیچے گرنے کی آواز اس کے کانوں تک نہ آئی۔ اب اس نے دیکھ کر دانیلو کتوں کے مابین بھیرنی کی پشت پر گرا پڑا ہے اور اسے کانوں سے پکڑنے کی کوشش کر رہا ہے۔ رکھالوں، کتوں اور خود بھیرنی پر یہ بہت روز روشن کی طرح عیاں ہو چکی تھی کہ اب قصہ تمام ہو چکا ہے۔ درندے نے، جس کے دہشت کی وجہ سے کان پیچھے کو کھینچے ہوئے تھے، ٹھننے کی سعی کی لیکن کتے اس کے ساتھ چپکے رہے۔ دانیلو اٹھا، پھسلا، کچھ یوں لگا جیسے وہ کان اتارنے کے لیے نیچے بیٹھنا چاہتا ہے، بھیرنی پر گرا، اپنا پورا وزن اس پر ڈالا اور اسے کانوں سے پکڑ لیا۔ کھولائی اپنا خنجر درندے کے پیٹ میں اتارنا چاہتا تھا کہ دانیلو نے سرگوشی کی: ”صاحب، جانے دیں، ہم اس کی کھال اتاریں گے۔“ پھر اس نے اپنی پوزیشن تبدیل کی اور اپنا پاؤں بھیرنی کی گردن پر رکھ دیا۔ انھوں نے اس کے جبرؤں کے مابین چھری گھسیڑ دی اور اس کے ساتھ اس طرح زنجیر باندھ دی جیسے وہ اس کے منہ میں لگام ڈال رہے ہوں۔ پھر انھوں نے اس کی ٹانگیں باندھ لیں اور دانیلو نے اسے دائیں بائیں ایک دو ٹوٹکتیاں دیں۔

اگرچہ تھکاوٹ سے ان کے اجسام چور ہو چکے تھے، پھر بھی وہ ہشاش بشاش تھے۔ انھوں نے ادھیڑ عمر زندہ بھیرنی کو ایک گھوڑے کی، جو ڈر کے مارے بدک رہا اور نتھنے پھڑکار رہا تھا، پشت پر ڈال دیا اور چیختے چلاتے کتوں کی معیت میں ادھر، جہاں ان سب نے اکٹھے ہونا تھا، چل پڑے۔ شکاری کتے بھیرنی کے دو اور بارزوں کی کتے تین بچے ہلاک کر چکے تھے، کھولے اپنے اپنے مال غنیمت اور قصوں سمیت ایک جگہ مجتمع ہو گئے۔ سبھی عظیم الجثہ بھیرنی کو، جو اپنی کشادہ پیشانی والے سر سمیت گھوڑے پر جمول رہی تھی، دیکھنے چلے آ رہے تھے۔ بھیرنی کے دونوں جبرؤں کے مابین چھری، جسے اس نے کترنے کی کوشش کی تھی، پھنسی ہوئی تھی اور وہ اپنی پھرائی ہوئی آنکھوں سے کتوں اور انسانوں کے ہجوم، جو اس کے ارد گرد حصار بنائے کھڑے تھے، دیکھ رہی تھی۔ جب وہ اسے چھوتے، وہ اپنی بندھی ہوئی ٹانگوں کو جھکا دیتی اور ان سب کو وحشت سے دیکھنے لگتی، وہ محض دیکھتی تھی اور کرتی کچھ نہیں تھی۔

کارنٹ الیو آندر بیچ بھی گھوڑا دوڑاتا آیا اور اس نے بھیرنی کو چھو کر دیکھا۔

”اف، کتنی بڑی ہے!“ اس نے کہا۔ ”بہت بڑی! کیا خیال ہے؟“ اس نے دانیلو سے، جو قریب کھڑا تھا، کہا۔

”بالکل، بڑی، یکسی نیسی!“ دانیلو نے باا تعجیل ٹوپی اتارتے ہوئے جواب دیا۔

کارنٹ کو بھیرنی، جسے اس نے کھسک جانے دیا، اور دانیلو کا خفیہ و غضب یاد آ گیا۔

”خیر، بر خود دار تم ہو بڑے غصیلے۔ ناک پر کھسی نہیں بیٹھنے دیتے،“ کارنٹ نے کہا۔

دانیلو چپ رہا۔ وہ اسے شرمیلی، خوشگوار اور بچوں کی معصوم سکراہٹ سے دیکھتا رہا۔

سکر کاؤنٹ گھر چلا گیا۔ نناشا اور چیتا نے وعدہ کیا کہ وہ اس کے پیچھے آ رہے ہیں۔ لیکن چونکہ ابھی سویرا تھا،

شکاری مزید آگے چلے گئے۔ دوپہر کے وقت انہوں نے شکاری کتے ایک ٹنگ گھٹی میں، جس میں ندی بہتی تھی اور تھنی بھاڑیں کھڑی تھیں، ڈال دیے۔ نکولائی اوپر بلندی پر کھیت میں، جس کی فصل کٹ چکی تھی اور اب وہاں صرف ناڑے باقی رہ گئے تھے، کھڑا تھا۔ وہاں سے اسے اپنی ساری پارٹی نظر آرہی تھی۔

نکولائی کے سامنے گھٹی کی دوسری جانب سر، رائی کے کھیت تھے اور اس کے اپنے کتوں کے رکھوالے نیچے گھاتی میں سرخی مائل بادامی بھاڑیوں کے عقب میں اکیسے کھڑے تھے۔ ابھی وہ بمشکل شکاری کتوں کو گھیر گیار کر لائے تھے کہ نکولائی کے کانوں سے ایک کتے، والتوردن کی، جسے وہ جانتا تھا، آواز نکرائی۔ دو تھے وقتے سے بھونک رہا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ اس نے شکاری بو پالی ہے۔ دوسرے کتے بھی اس کا ساتھ دینے لگے۔ کچھ وہ بھونکنے لگتے اور کبھی خاموش ہو جاتے۔ چند ثانیے کے بعد اس گھاتی سے شور و غل سنائی دیا کہ انھیں لومڑ کا سرا مل گیا ہے۔ سارا غول ندی کے ساتھ ساتھ دوڑنے لگا۔ ان کا رخ رائی کے کھیت کی طرف تھا اور وہ نکولائی سے دور ہوتے جا رہے تھے۔

اسے ندی کے کنارے کے ساتھ ساتھ گھوڑے دوڑتے اور سرخ ٹوپوں کے، بین چابک ہراتے نظر آنے لگے۔ سگان تازی بھی دکھائی دینے لگے۔ اسے ہر آن یہ توقع تھی کہ گھاتی کی دوسری جانب رائی کے کھیت میں لومڑا ب منظر عام پر آیا، اب آیا۔

جور کھولا دادی میں کھڑا تھا، وہ بھی چل پڑا۔ اس نے، بے کتوں کی زنجیریں ڈھیلی کر دی تھیں۔ اسے میں نکولائی کو لومڑ دکھائی دینے لگا۔ یہ عجیب الخلق جانور تھا۔ اس کی ہانگیں چھوٹی چھوٹی، رنگت سرخ اور دم پر گھنے بال تھے۔ وہ کھیت کے پتوں نیچے بھاگا جا رہا تھا۔ کتے کچھ یوں اس کا تعاقب کر رہے تھے کہ اس کی خیر معلوم نہیں ہوتی تھی۔ اب وہ اس کے قریب سے قریب تر ہوتے جا رہے تھے۔ لومڑ بھی ایک ہی کایاں تھا۔ وہ بڑی صفائی اور پھرتی سے نیم دائرہ بناتا اور انھیں بجل دے جاتا۔ اس کی دم اس کے پیچھے تھسٹی آرہی تھی۔ اچانک ایک نامعلوم سفید کتا تیر کی طرح آگے بڑھا، ایک کانا کتا اس کے پیچھے ہولیا اور پھر وہ سب آپس میں گڈمڈ ہو گئے۔ یوں انھوں نے تارے کی شکل بنائی۔ ان کے اجسام بمشکل کوئی حرکت کر رہے تھے۔ ان کے سر مرکز کی طرف تھے اور ان کی دیم باہر نکلی ہوئی تھیں۔ دو رکھوالے گھوڑے دوڑاتے کتوں تک پہنچے۔ ان میں سے ایک کے سر پر سرخ ٹوپی تھی۔ دوسرا کوئی اجنبی تھا۔ وہ ہنز کوٹ میں ملیں تھا۔

”اس کا مطلب کیا ہے؟“ نکولائی متحجب تھا۔ ”یہ دوسرا کھولا کہاں سے آچکا؟“ ”چچا کا آدمی تو یہ ہے نہیں۔“ رکھوالوں نے لومڑ کو ٹھکانے لگا دیا اور پھر اسے کانٹھی سے باندھے بغیر وہ کافی دیر تک وہیں کھڑے رہے۔ ان کے اکہری لگام والے گھوڑے، جن کی اونچی اونچی کانٹھیاں دور سے نظر آرہی تھیں، ان کے قریب ایسا دانتے اور کتے زمین پر لیٹے ہوئے تھے۔ رکھوالے اپنے بازو دفنا میں لہرا رہے تھے اور وہ لومڑ کے ساتھ کچھ کر رہے تھے۔ اسی مکان سے ہارن کی آواز سنائی دی۔ یہ وہ سنگل تھا جو کسی جھگڑے کے موقع پر دیا جاتا تھا۔

”وہ الگن کے کتوں کا رکھوالا ہے اور ہمارے ایوان کے ساتھ الجھ رہا ہے،“ گولائی کے سرخس نے کہا۔
گولائی نے سائیکس کو حکم دیا کہ وہ جائے اور اس کی ہمشیرہ اور پیتا کو اس کے پاس بلا لائے۔ پھر وہ دھیمے دھیمے چلتا اس جگہ جہاں نائب رکھوالے کتے اکٹھے کر رہے تھے، پہنچا۔ متحدہ درکھوالے گھوڑوں پر ادھر، جہاں جھگڑا ہو رہا تھا، چل پڑے۔

گولائی گھوڑے سے نیچے اتر آیا۔ شا اور پیتا بھی گھوڑوں پر دیں پہنچ گئے تھے۔ وہ سب شکاری کتوں کے قریب کھڑے تھے اور اس چیز کے منتظر تھے کہ دیکھیں جھگڑے کا انجام کیا ہوتا ہے۔ جو رکھوالا جھگڑا کر رہا تھا، وہ جہازوں سے برآمد ہوا۔ وہ گھوڑے پر سوار اپنے نوجوان آقا کے پاس پہنچا۔ اس نے لومڑ کاٹھی کے ساتھ ہاتھ رکھا تھا۔ ابھی وہ کچھ دور تھا کہ اس نے اپنی ٹوپی اتار لی اور قریب پہنچ کر احترام سے بات کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ لیکن اس کا رنگ فق اور سانس پھولی ہوئی تھی۔ غصے سے اس کے چہرے کی شکل مسخ ہو چکی تھی۔ چوٹ سے اس کی آنکھ نکل رہی تھی لیکن اسے غالباً اس کا علم بھی نہیں تھا۔

”وہاں کیا ہوا تھا؟“ گولائی نے دریافت کیا۔

”وہ ہمارے کتوں کی آنکھوں کے عین سامنے ہمارا شکار اڑانے کی نگر میں تھا۔ اس لومڑ کو میری کتیا۔ وہی جو بچہ بیمار لگت ہے۔۔۔ نے دیو چا تھا۔۔۔ کہتا ہے عدالت میں ٹالش کر دوں گا، ہونہہ! اس نے مجھ سے لومڑ پھینکا جا ہا اور میں نے اسے دمڑ ہی دے مارا۔ میں یہ لومڑ لے آیا ہوں، یہ میری کاٹھی کے ساتھ بندھا ہوا ہے۔ اس کا مزہ بکھٹا چاہو گے؟“ رکھوالے نے اپنے شکاری چاقو کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ ابھی تک یہی تصور کر رہا تھا کہ وہ اپنے دشمن سے ہم کلام ہے۔

گولائی نے اس شخص پر اغاظ ضائع کرنا مناسب نہ سمجھا۔ اس نے اپنی ہمشیرہ اور چیتا سے کہا: ”تم یہیں انتظار کرو۔“ وہ خود گھوڑے پر سوار ہوا اور ادھر، جدھر الگن کے رکھوالے اکٹھے ہو رہے تھے، چل دیا۔

فلاح رکھوالا گھوڑے پر سوار اپنے ساتھیوں سے جا ملا۔ وہاں وہ ہمدرد اور تجسس ہجوم کی توجہ کا مرکز بن گیا اور بچے کا رنایے کی تفصیلات بیان کرنے لگا۔

اصل صورت حال یہ تھی کہ الگن، جس کے ساتھ رستوفوں کا کچھ جھگڑا تھا اور مقدمے بازی بھی چل رہی تھی، ان ملاقاتوں میں، جو راجا رستوفوں کی ملکیت میں تھے، شکار کھیل رہا تھا اور اب معلوم ہوتا تھا کہ اس نے عدالت اپنے آدمی، اس علاقے میں، جہاں رستوف شکار کھیل رہے تھے، بھیج دیے تھے اور جس لومڑ کو ان کے کتوں نے دیو چا تھا اس نے اپنے آدمیوں کو کھلی چھٹی دے دی تھی کہ وہ اسے ہتھیالیں۔

گولائی کی الگن سے کبھی ملاقات نہیں ہوئی تھی لیکن چونکہ وہ خیالات، درجذبات کے اعتبار سے اعتدال آئے شخص نہیں تھا، اس لیے اس تک اس کے متکبرانہ اور استبدادی رویے اور زبان و راہی کے متعلق جو افواہیں پہنچیں، اس نے انہیں صحیح مان لیا تھا، انہی کی بنیاد پر وہ اس سے رلی نفرت کرنے اور اسے اپنا بدترین دشمن تصور

کرنے لگا تھا۔ چنانچہ اس کا جوش اور غصہ دیدنی تھا۔ وہ غیظ و غضب سے پھنکار رہا تھا اور اس نے اپنا چابک اپنی منگی میں بچھڑکھا تھا۔ وہ اپنے میری سے پنپنے کے لیے فیصلہ کن اقدام کرنے اور مرنے مارنے پر تل گیا تھا۔

ابھی اس نے جنگل کا ایک ہی موڑ کاٹا تھا کہ اس نے ایک بڑے کئے شخص کو اپنی طرف آتے دیکھا۔ نواد نے اود بلاؤ کی سموری ٹوپی اوڑھ رکھی تھی اور وہ دیدہ زیب منگی گھوڑے پر سوار تھا۔ اس کی معیت میں دوسرے تھے۔ دشمن کی بجائے نکولائی کو الگن شائستہ اور مہذب جنٹل مین نظر آیا۔ اس کی شکل و صورت سے دعب فک رہا تھا اور وہ نو عمر کاؤنٹ کی طرف دوستی اور اخوت کا ہاتھ بڑھانے کے لیے خاص طور پر بے قرار نظر آ رہا تھا۔ جونکی ۱۱ رستوف کے قریب پہنچا، اس نے اسے اپنی سموری ٹوپی اٹھا کر سلام کیا اور کہا کہ جو کچھ ہوا ہے، اسے اس پر دل افروز ہوا ہے، وہ اس شخص کو، جس نے لومڑ کو، جسے دوسروں کے کتوں نے رگیدا تھا، ہتھیانے کی کوشش کی تھی، سخت سرا دے گا۔ اس نے اس امید کا اظہار کیا کہ اب ان کی ایک دوسرے کے ساتھ بہتر جان پہچان ہو جائے گی اور اس نے اسے اپنا جنگل کھنگالنے کی دعوت دی۔

اس اندیشے کے پیش نظر کہ کہیں اس کے بھائی سے کوئی مہیب حرکت نہ سرور ہو جائے، پریشان و مضطرب ساٹا بھی اس کے پیچھے چل پڑی۔ دونوں کے مابین محض چند قدموں کا فاصلہ تھا۔ جب اس نے حریفوں کو دوستانہ انداز سے علیک سلک کرتے دیکھا، وہ خود بھی ان کے قریب پہنچ گئی۔ الگن نے اپنی ٹوپی اور بھی اونچی کر کے نشا کر سلام کیا۔ وہ خوشگوار انداز سے مسکرایا اور بولا کہ نوجوان کاؤنٹس، اپنی خوبصورتی و رشوق شکاری، جس کے متعلق ۱۱ بہت کچھ سن چکا تھا، بنا پر حسن اور شکاری کنواری دیوی ڈیانا سے مشابہت رکھتی ہے۔

اپنے رکھوالے کے جرم کی تلانی کے طور پر الگن نے رستوف سے پراصرار انداز سے کہا کہ وہ اس کے نیلے پر، جو وہاں سے پون سیل دور تھا، چلا چلے۔ عام طور پر وہ یہ ٹیلا، جس پر اس کے قول کے مطابق خرگوشوں کی بہتات تھی، اپنے لیے مخصوص رکھتا تھا۔ نکولائی نے ہائی بھری اور شکاریوں کا ٹولا، جو پہلے سے دوچند ہو گیا تھا، آگے چل پڑا۔ الگن کے نیلے کا راستہ کھیتوں کے پتوں سے جاتا تھا۔ رکھوالے قطار میں چل رہے تھے اور ان کے قاتاک دوسرے کے ساتھ گھوڑے بڑھائے جا رہے تھے۔ "چچا" رستوف اور الگن ایک دوسرے کے شکاری کتوں کو دیدہ نگاہوں سے دیکھتے رہے۔ ان کی کوشش یہ تھی کہ ان کے ہمراہی ان کی یہ حرکات نہ دیکھ سکیں تاہم وہ بڑی بے قراری سے اپنے کتوں کے ممکن رقیب ڈھونڈ رہے تھے۔

رستوف الگن کی ایک دہلی پتلی، کوتاہ قاست، ابلق اصل کتیا سے خاص طور پر متاثر ہوا۔ اس کتیا کے عضلات فولادی تھو تھتی مہین اور آنکھیں سیاہ اور غزالی تھیں۔ اس نے سنا تھا کہ الگن کے پاس چند بڑے بلی دار تازی کتے ہیں اس خوبصورت کتیا میں اسے اپنے ملاک کی رقیب نظر آئی۔

سال گزشتہ کی فصل کے بارے میں بے کیف گفتگو کے، جس کا آغاز الگن نے کیا تھا، دوران میں مکرتی نے ابلق کتیا کی طرف اشارہ کیا۔

”آپ کی کتابت بہت خوبصورت ہے،“ اس نے لاابالی انداز سے کہا۔ ”بہت تیز طرار ہے؟“

”وہ والی؟ ہاں، اچھی کتابت ہے۔ جس چیز کے پیچھے پڑتی ہے، اسے حاصل کر کے ہی دم لیتی ہے،“ الاگن نے بڑے لا پرواہانہ انداز سے اپنی چستکبری کتابت ”ریزا“ کا، جس کی خاطر اس نے گزشتہ سال اپنے گھریلو غلاموں کے تین کنبے اپنے ہمسائے کو دے دیے تھے، ذکر کرتے ہوئے کہا۔ ”چنانچہ، کاؤنٹ، آپ کے علاقے میں فمیلی اتنی چھی نہیں ہوئیں کہ ان پر فخر کا اظہار کیا جاسکے!“ اس نے جس گفتگو کا آغاز کیا تھا، اس کا سلسلہ دوبارہ بحال کرتے ہوئے کہا۔ تاہم شائستگی کا تقاضا یہ تھا کہ کاؤنٹ نے اس کی کتابت کی جو تعریف کی تھی، اس کے جواب میں وہ بھی کوئی توصلیٰ کلمہ کہے۔ چنانچہ الاگن نے اس کے کتوں کا تنقیدی نظر سے جائزہ لیا اور اس نے ملکا کو، جس کی کٹ وہ پشت اس کی نگاہوں میں چھپ چکی تھی، منتخب کر لیا۔ ”آپ کی یہ چستکبری کتابت بہت بڑھیا ہے۔ اس کا جسم موزوں اور سڈل ہے!“ اس نے کہا۔

”جی ہاں، اچھی ہے، دوڑ لیتی ہے،“ نکولائی نے جواب دیا۔ ”کاش کوئی سوٹا تازہ خرگوش یہاں کھیت میں نظر آ جاتا، پھر میں تمہیں بتا تا کہ وہ کیا کر سکتی ہے۔“ اس نے سوچا۔ اور اس نے اپنے ساتھیوں کی طرف متوجہ ہو کر کہا: ”جو کوئی خرگوش کی نشان دہی کرے گا، میں اسے ایک روئل دوں گا۔“

”سمجھ میں نہیں آتا،“ الاگن نے اپنا سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا: ”کہ بعض شکاریوں کو دوسروں کے شکار یا کتوں کے بارے میں حسد کیوں ہو جاتا ہے۔ اور کاؤنٹ، جہاں تک میرا تعلق ہے، میں یہ عرض کر رہا ہوں کہ اگر مجھے گھڑسواری کے لیے ایسے ساتھیوں کی، جیسے آج ملے ہیں، صحبت میسر آجائے، تو میں بہت لطف اندوز ہوتا ہوں۔ بھلا، اس سے بڑھ کر اور کوئی اچھی بات کیا ہو سکتی ہے؟“ (اس نے دوبارہ ٹوپی اٹھا کر تاش کو سلام کیا۔) ”لیکن جہاں تک کھالیں گنتے اور انھیں اپنے ساتھ لے جانے کا تعلق ہے، مجھے اس میں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔“

”جی، بالکل نہیں!“

”اور مجھے اس بات پر بھی جھنجھٹا ہٹ نہیں ہوتی کہ فلاں شخص کے کتے نے شکار کیوں دبوچ لیا اور میرے کتے نے کیوں نہیں پکڑا۔ مجھے تو بس تعاقب میں مزہ آتا ہے۔ کاؤنٹ، آپ کو مجھ سے اتفاق ہے نا؟ اس کے علاوہ میرا خیال ہے۔“

ایک ناعب رکھو اسے کی لٹکار ”اوہو“ کی آواز سنائی دی۔ وہ ناڑوں کے مابین جھوٹے سے نیلے پر کھڑا تھا۔ اس نے اپنا چابک اوپر اٹھ رکھا تھا اور وہ اپنی لٹکار دہرا رہا تھا۔ (اس کی اس لٹکار اور اوپر اٹھے ہوئے چابک کا مطلب یہ تھا کہ اس نے کسی خرگوش کو کہیں پیٹھے دیکھ لیا ہے۔)

”مظلوم ہوتا ہے کہ اسے خرگوش کا سراغ مل گیا،“ الاگن نے لا پرواہی سے کہا۔ ”کاؤنٹ، آئیں، اس کا پیچھا کرتے ہیں۔“

”جی ہاں، ہمیں ضرور چلنا چاہیے۔ اسے تعاقب کریں؟“ نکولائی نے یزرا اور ”چچا“ کے سرخ کتے رگائی

کو نہایت انہماک سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ یہ دونوں کتیا اور کتاوہ رقیب تھے۔ جن کے حلال اسے اپنے کتوں کو ابھی تک آزمانے کا موقع نہیں ملتا تھا۔ ”اگر انہوں نے ابتدا ہی میں میری ملکا کو پچھاڑ دیا، پھر کیا ہوگا؟“ اس نے ”چچا“ اور الاگن کے ساتھ خرگوش کے پیچھے جاتے ہوئے سوچا۔

”مونا تازہ ہے؟“ الاگن نے رکھوالے کے، جس نے خرگوش کو دکھا تھا، قریب پہنچ کر پوچھا۔ اس نے جوشیہ انداز سے اپنے چاروں اطراف نظریں دوڑائیں اور سیٹی بجا کر یز کو خبردار کیا۔ ”اور آپ سیٹائل کا لورچ؟“ اس نے ”چچا“ سے مخاطب ہو کر پوچھا۔

مونا لڈ کر پنا گھوڑ بھگائے جا رہا تھا۔ اس کے چہرے پر خفگی کے آثار تھے۔

”میں کیوں بیچ میں ٹانگ اڑاؤں؟“ اف، تمہارے یہ کتے تم نے ایک ایک کے عوض پورا پورا گاؤں دیا ہے۔ ہزاروں روپے کے ہیں۔ تم ایک دوسرے کے خلاف زور گاؤ، میرا کیا ہے، میں صرف تاشاد بکھیں گا۔ ایں، برگائی، ایں!“ اس نے چہا کر کہا۔ ”رگائی شکا!“ اس نے مزید کہا اور یوں اس نے اپنے سرخ کتے کے لیے اپنی محبت کا اور اس کے ساتھ ساتھ اس نے جو امیدیں وابستہ کر رکھی تھیں، ان کا غیر رادری طور پر اظہار کر دیا۔ یہ دونوں بزرگ اور اس کا اپنا بھائی، اپنے جس جوش و جذبے کو چھپانے کی کوشش کر رہے تھے، ناٹا کو دور نظر بھی آ رہا تھا اور وہ اسے محسوس بھی کر رہی تھی۔ وہ خود بھی اسی رو میں بہہ چلی تھی۔

رکھوالا اپنا چابک اوپر اٹھائے ٹیلے پر کھڑا تھا، در شرفا خراماں خراماں اس کے پاس پہنچے۔ کتوں کا وہ غول، جو افق کی پٹی کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا، خرگوش سے پرے ہٹ گیا۔ شرف تو نہیں ابستہ رکھوالے بھی ایک طرف ہو گئے۔ ہر کام سچ سچ اور سوچ سمجھ کر کیا جا رہا تھا۔

”یہ کدھر اتر رہے کر رہا ہے؟“ نکولائی نے اس رکھوالے کی طرف، جس نے خرگوش کا سراغ لگا دیا تھا، گھوڑے پر کوئی سو قدم بڑھانے کے بعد پوچھا۔

لیکن بیشتر اس کے کہ رکھوالا کوئی جواب دیتا، خرگوش کے لیے اس پالے کو، جو اگلی صبح پڑنا تھا، بھانپتے ہوئے ساکن بیٹھے رہنا ناممکن ہو گیا اور وہ چھانگیں لگاتا بھاگنے لگا۔ شکاری کتے، جو زنجیروں میں بندھے ہوئے تھے، پورا زور لگاتے خرگوش کا تعاقب کرنے اور پہاڑی سے نیچے اترنے لگے۔ چاروں، اطراف سے باز دلی کتے، جو زنجیروں میں بندھے ہوئے نہیں تھے، شکاری کتوں اور خرگوش کے پیچھے بھاگ اٹھے اور ہلکے جھپکنے میں ہوا سے باتیں کرنے لگے۔ تمام نائب رکھوالے، جو اب تک کسی قسم کی عجلت یا تیزی کا مظاہرہ کیے بغیر آہستہ آہستہ آگے جا رہے تھے، اپنے گھوڑے سر پٹ دوڑانے لگے۔ وہ شکاری کتوں کو ”رکو، رکو!“ کی صداؤں سے اور بار بار دلی کتوں کو ”ارہو“ کی آوازوں سے اکٹھا کر رہے اور انہیں خرگوش پر چڑھا رہے تھے۔ سنجیدہ دو متین الاگن، نکولائی، ریشا، اور ”چچا“ کے ساتھ برق رفتاری سے ادھر ادھر بھاگا پھر رہا تھا۔ انہیں اس بات کی قطعاً کوئی پروا نہیں تھی کہ وہ کہاں اور کیسے جا رہے ہیں۔ انہیں کتوں اور خرگوش کے علاوہ اور کچھ نظر نہیں آ رہا تھا اور ان پر صرف ایک ہی چیز کا خوف سوار

تھ کہ کہیں ایک لمحہ کے لیے بھی شکارانہ کی نظروں سے اوجھل نہ ہو جائے۔ جس خرگوش کو انہوں نے بھگایا تھا، خاصا نومد اور نیز رفتار نکلا۔ جب وہ چھلانگ لگا کر ٹھٹھا تھا، اس نے بھاگنے کی جلدی نہیں کی تھی، بلکہ اس نے اپنے کان کھڑے کیے، شور و غل کی آوازیں اور گھوڑوں کی ٹاپیں، جو چاروں اطراف سے آرہی تھیں، غور سے سیں اور وزن بھر قدیں بھریں، لیکن اتنی تیزی سے نہیں بلکہ اس نے ہارزوں کی کتوں کو اپنے قریب آ جانے دیا۔ آخر کار جب اسے اپنے خطرے کا صحیح اندازہ ہو گیا اور اس نے جس سمت بھاگنا تھا، وہ بھی منتخب کر لی، تب اس نے اپنے کان پھیل جانا بھگائے دوسرے پاؤں رکھ کر بھاگ کھڑا ہوا۔ وہ ٹانگوں کے مابین لیٹا رہا تھا لیکن اس کے سامنے خریف کی نسل کھڑی تھی وروہاں زمین دلدلی تھی۔ جس رکھوالے نے اس کا سراغ لگایا تھا، اس کے دو تازی کتے چونکہ قریب ترین تھے اس لیے سب سے پہلے انہیں نے اسے دیکھا اور اس کا پیچھا کیا تھا۔ لیکن وہ ابھی زیادہ دور نہیں گئے تھے کہ الاگن کی اہلی کتیا میرزا آئی اور ان سے آگے نکل گئی۔ اب اس کے اور خرگوش کے مابین صرف ایک قدم کا فاصلہ رہ گیا۔ اس نے خرگوش کی دم کا نشانہ لیا، برق آسا رفتار سے اس پر چھلانگ لگائی اور لوٹیاں کھانے لگی۔ اس کا خیال تھا کہ اس نے خرگوش کو اپنے قابو میں کر لیا ہے، تاہم خرگوش بھی کچی گولیاں نہیں کھیلا تھا، اس نے اپنی پشت کو کمان کی طرح خم دیا اور پہلے سے بھی تیز رفتار سے دوڑنے لگا۔ ریز کے عقب سے سیاہ دھبوں اور کشادہ پشت والی ہلکا سمودار ہوئی اور نہایت سرعت کے ساتھ اپنے اور خرگوش کے مابین فاصلہ کم کرنے لگی۔

”سیلو شکا، شا باش، شا باش!“ نکولائی کی فاتحانہ لہکار بلند ہوئی۔

بظاہر یہی نظر آتا تھا کہ ہلکا خرگوش کو اپنے جھپٹے میں لے لے گی لیکن اس کی قوت رفتار نے اسے ضرورت سے زیادہ آگے دھکیل دیا اور وہ خرگوش سے، جو اپنی جگہ رک گیا تھا، آگے نکل گئی۔ بائیں بھلی ریزا پھر آگے بڑھی اور خرگوش کی دم پر یوں منڈلاتی دکھائی دی جیسے وہ فاصلے کا تعین کر رہی ہو تا کہ وہ اس مرتبہ نہ صرف اپنی سابقہ فطرتی دہرانے سے کم تر زور سکے بلکہ اسے پچھلی ٹانگ سے پکڑ سکے۔

”ریز نکا، میری گڑیا!“ الاگن کچھ ایسے لہجے سے، جو اس کا اپنا معلوم نہیں ہوتا تھا، گڑ گیا۔

ریزانے اس کی منت، سہجت کا کوئی اثر قبول نہ کیا۔ عین اس لمحے جب معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنے شکار کو دبوچے گی، خرگوش نے جھوک کھائی اور سر سبز کھیت اور ٹانگوں کے، بین مینڈھ پر نراٹے بھرنے لگا۔ ایک بار پھر ریزا اور ہلکا، جو چمکڑے کے بیلوں کی طرح پہلو پہ پہلو بھاگی جا رہی تھیں، اپنے اور خرگوش کے، بین مسافت کم کرنے لگیں لیکن خرگوش کے لیے مینڈھ پر دوڑنا نسبت آسان تھا اور کتوں کے لیے اسے تیزی سے پکڑنا نسبتاً دشوار۔

”رگائی، رگائی یوشکا! ہموار کھیت، صاف راستہ!“ عین اس وقت تیسری آواز کا غلغلہ بلند ہوا اور مچھ کے سرخ شکاری کتے رگائی نے اپنی ٹانگیں پھیلائیں، پنی کمر کو کمان کی طرح نیم خیدہ کیا اور اپنے سے آگے دونوں کتوں کو جا لیا پھر وہ ان سے آگے نکل گیا اور جب وہ خرگوش کے قریب پہنچ گیا، اس نے ہرچہ بادا بادی رفتار میں خوف ناک مدد تک اضافہ کر دیا، خرگوش کو کمر ماری اور اسے مینڈھ سے نیچے رائی کے کھیت میں گرادیا۔ اس نے بھیا تک رفتار

سے کچھ آلود کھیت میں چھٹانگ لگائی اور کندھوں تک زمین میں ڈھنس گیا۔ اب جو کچھ نظر آ رہا تھا وہ صرف پر تھاکر کتا خرگوش کے ساتھ بار بار لڑھکتیاں کھا رہا ہے اور اس کی پشت پر کچھ چپک گئی ہے۔

کتوں نے اس کے گرد ستارہ نما حصار بنا لیا۔ ایک ٹائیے بعد تمام لوگ کتوں کے جھرمٹ کے گرد اکٹھے ہو گئے۔ صرف ”پچھا“ جس کی خوشی سے باجھیں کھلی جا رہی تھیں، گھوڑے سے نیچے اتر، اس نے زور سے خرگوش کو جھنڈا تاکہ اس کا خون ٹپڑ جائے، اس کا ایک پنجہ کاٹا اور بے قرار ہو کر چاروں اطراف دیکھا۔ اس کے ہاتھوں اور پاؤں پر ریشہ طاری تھا اور اس کے لیے انھیں سنبھالنا مشکل ہو رہا تھا۔ اس کی زبان پیچھی کی طرح چل رہی تھی لیکن اسے کچھ معلوم نہیں تھا کہ وہ کس سے مخاطب ہے اور کیا کہہ رہا ہے۔

”یہ ہولی نہ بات... کتا تو یہ ہے.. سب کو ہت دے گیا، خواہ اس کی قیمت ایک روپل تھی یا ایک ہزار ہمارا کھیت، صاف راستہ!“ وہ بولے جا رہا تھا۔ اس کا دم پھول چکا تھا اور وہ اپنے چاروں اطراف یوں خشم ناک نگاہوں سے دیکھ رہا تھا جیسے وہ کسی کو مٹھون کر رہا ہو، جیسے وہ سب اس کے حریف ہوں، اس کی توہین کے مرتکب ہوئے ہوں اور ان کے ساتھ اگلا پھپھلا حساب چکانے کا سے اب موقع ملے ہو۔ ”تمہارے ہزار ہزار روپل کے کتوں کے بے بس اتنا ہی کافی ہے۔ سہانا کھیت۔ رگائی، یہ دیکھو تمہارے لیے پنجرہ“ اس نے کچھڑے لٹھڑا ہوا پنچ، جو اس نے ابھی ابھی کاٹا تھا، بھینکتے ہوئے کہا۔ ”تم اس کے مستحق ہو، تم نے اسے زور بازو سے کہا ہے سہانا کھیت، ہمارا راستہ“

”اس بے چاری نے اپنی جان ہلکان کر دی... تین مرتبہ اکیلی اس پر حملہ آور ہوئی اور یوں اس کا کچھ مر نکال دیا،“ نکولائی کہہ رہا تھا۔ اس امر سے قطع نظر کہ کوئی اس کی بات سن بھی رہا ہے یا نہیں، وہ اپنی ہی بات کے جا رہا تھا وہ خود بھی تو کسی کی نہیں سن رہا تھا۔

”اس قسم کی بے نیکی باتیں کرنے کا فائدہ؟“ الگن کے سائیں نے کہا۔

”میری کتیا اس سے آگے نکل گئی لیکن وہ اسے اس طرح دھکا دے گئی کہ کوئی پلا بھی با آسانی اسے دوڑا سکتا تھا،“ الگن کہہ رہا تھا۔ سرپٹ گھوڑا دوڑتے اور جوش و خروش کا مظاہرہ کرتے اس کا چہرہ تہمتانے لگا تھا۔

عین اسی لمحے مناشا نے سانس روک کر اپنی خوشی کا اظہار وجد آفریں کوک سے کیا۔ کوک اتنی بدلیک اور چمکی تھی کہ سبھی کے کانوں میں گھنٹیاں بجنے لگیں۔ اس کے ذریعے اس نے وہ سب کچھ کہہ دیا جو باقی ایک وقت بول کر ادا کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ یہ تھی نا، نوس تھی کہ اس شور یدہ چیخ پر خود اسے بھی شرمندگی کا احساس ہوا، وہ گالور اگر کوئی اور سماں ہوتا، دوسرے بھی بھونچکا رہ جاتے۔ ”پچھا“ نے بہ نفس نفیس خرگوش کی کھل ادھیڑی، اسے بڑی مشاقتی اور پھرتی سے اپنے گھوڑے کی پشت پر پھینکا گویا کہ اپنی اس اد سے وہ باقیوں کی سرزنش کرنا چاہتا ہو اور کسی سے کلام کرنے کا روادار نہ ہو۔ وہ اپنے کیت گھوڑے پر سوار ہوا، اسے ایڑ لگائی اور وہاں سے چل پڑا۔ دوسروں نے اس کی پیروی کی۔ ان کے منہ لٹکے ہوئے اور دل بجھے ہوئے تھے۔ صرف خاما دقت گزر جانے کے بعد ہی وہ بے نیازی کا سابق ملحق ایک بار پھر چڑھانے میں کامیاب ہوئے۔ وہ کافی دیر تک سرخ شکاری کتے کو، جو کچھڑے میں

تھڑا اور اپنی زنجیر کھٹکھٹاتا چہرے پر سکون و اطمینان سجائے خراں خراں ”چچا“ کے گھوڑے کے پیچھے پیچھے جا رہا تھا، گھوڑے گھوڑے کر دیکھتے رہے۔

گولائی کو کچھ یوں محسوس ہوا جیسے وہ اس سے یہ کہہ رہا ہو: ”میں باقی کتوں سے کوئی خاص مختلف نہیں۔ فرق صرف تب پڑتا ہے جب معاملہ خرگوش کے تعاقب کا ہو۔ جب ایسی صورت درپیش ہو۔ پھر ہوشیار رہیں!“

کچھ دیر بعد ”چچا“ گھوڑا دروازے تک لائی کے پاس آیا اور اس نے اس سے مخاطب ہو کر کچھ کہا۔ اس کی باتیں کھل گئیں کیونکہ جو کچھ وقوع پذیر ہوا تھا، اس کے باوجود ”چچا“ عرش سے فرش پر آگیا تھا اور اس سے باتیں کر رہا تھا۔

7

تمام ڈھلے جب لاگن نے ان سے رخصت لی، گولائی نے یہ دیکھ کر کہ وہ ابھی تک گھر سے خاصا دور ہیں، ”چچا“ کی دعوت، کہ شکار پارٹی اس کے ننھے ننھے گاؤں میں گاؤں کا میں شب بسر کرے، منظور کر لی۔

”اور اگر تم میرے غریب خانے پر قیام کرو۔ سہانا کھیت، ہموار راستہ۔ چشم ارشن، دل ماشاں“ اس نے کہا۔ ”تم دیکھ رہے ہو کہ موسم مرطوب ہے، تم آرام کر سکتے ہو۔ ری چھوٹی کاڈنٹس، اسے تم ٹم میں واپس پہنچایا جاسکتا ہے۔“

پیشکش منظور کر لی گئی اور تم ٹم لانے ایک رکھوالا اتر ادنا یارو نہ کر دیا گیا جب کہ گولائی، نناشا اور چچا گھوڑوں پر ”چچا“ کے گھر کی طرف چل دیے۔

گولائی آدمی درجن چھوٹے بڑے مرد گھریلو نظام اپنے آقا کا استقبال کرنے، بیردنی پورج کی طرف بھاگتے آئے۔ ہر عمر اور قد کی تقریباً ایک کوڑی باندیوں نے عقبی دروازے سے سر باہر نکالے اور شکاریوں کو، جو واپس آ رہے تھے، دیکھنے لگیں۔ نناشا۔ عورت ذات، گھڑ سوار خانم۔ کی آمد نے ان کے تجسس کو اس انتہا تک بیدار کر دیا کہ ان میں سے کئی اس کے بالکل قریب پہنچ گئیں، آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اس کے چہرے کو دیکھنے اور اس کی موجودگی میں شرمائے لجائے بغیر اس کے متعلق ایسی باتیں بنانے لگیں جیسے وہ کوئی انسان نہ ہو جو وہ سب کچھ جو اس کے متعلق کہا جا رہا تھا، سن سکتا اور سمجھ سکتا ہو بلکہ وہ کوئی عجیب ہو جس کی کھلے عام نمائش کی جا رہی تھی۔

”اری آر نکا، وہ دیکھو، وہ ایک جانب مانگیں لٹکائے بیٹھی ہے! اس کی سرٹ جھول رہی ہے... وہ وہ چھوٹا ہارن بھی نظر آ رہا ہے!“

”ہائے اللہ اور چاقو بھی!“

”بالکل تارن ہے!“

”کپ سر کے بل کرنے سے کیسے بچ سکیں؟“ ان میں سے دلیر ترین ملازمہ نے براہ راست نناشا سے پوچھ لیا۔

”چچا“ اپنے تنگ چوبی مکان کی دلیں پر گھوڑے سے نیچے اتر آیا۔ مکان کے چاروں طرف باغچہ تھا اور وہ ضرورت سے زیادہ ہی روئیدگی میں گھرا ہوا تھا۔ جب ”چچا“ کی نظر اپنے ملازمین پر پڑی، اس نے تنگمانہ انداز سے با آواز بلند حکم دیا کہ فالتو لوگ فوراً وہاں سے چلے جائیں اور جو باقی رہ گئے، انھیں بتایا کہ وہ مہمانوں اور لونو اور رکھوالوں کے آرام اور خاطر تو واضح کے لیے خاطر خواہ انتظامات کریں۔

تمام باندیاں اور غلام تتر بتر ہو گئے۔ ”چچا“ نے اپنے ہاتھوں سے مناشا کو گھوڑے سے نیچے اتارا، اس کا ہاتھ تھاما اور اس کے ساتھ پورچ کی بوسیدہ سیڑھیوں چڑھنے لگا۔

اندرون خانہ صفائی ستھرائی کا خاص خیال نہیں رکھا گیا تھا۔ چوبی شہتیروں پر پلستر نہیں تھا۔ آثار بتا رہے تھے کہ مکینوں کا منشا اسے بے عیب طریقے سے صاف ستھرا رکھنا نہیں ہے، تاہم ایسی بھی کوئی بات نہیں تھی جس سے معلوم ہوتا کہ اسے بالکل ہی اپنے حال پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ غلام گردش میں تارہ سیبوں کی خوشبو مرتجی لمبی تھی اور اس کی ریواروں پر بھینریوں اور لومڑیوں کی کھالیں لٹک رہی تھیں۔

”چچا“ غلام گردش میں سے اپنے مہمانوں کو چھوٹے ہال کمرے میں لے گیا۔ وہاں یک میز، جسے تھپکا جا سکتا تھا، اور سرخ رنگ کی کرسیاں دھری تھیں۔ وہاں سے وہ ڈرائنگ روم میں، جس میں ایک صوفہ اور برچ کی کول میز پڑی تھی، داخل ہوئے۔ اس سے آگے سنڈی روم تھا۔ اس میں ایک شکستہ صوفہ، بوسیدہ قالین، جزل سواروف، میزبان کے والد والدہ اور خود اس کی اپنی فوجی ردی میں تصاویر تھیں۔ کمرے میں تنباکواور کتوں کی بو، جو تھنوں میں گھسی جا رہی تھی، پھیل ہوئی تھی۔

مہمانوں کو بٹھانے اور انھیں آرام کا مشورہ دینے کے بعد ”چچا“ سنڈی روم سے باہر نکل گیا۔ رگلی، جس کی پشت ابھی تک کچھڑ میں لتھڑی ہوئی تھی، آیا اور صوفے پر بیٹ گیا۔ چٹا اپنی کہنی پر جھکا اور آناٹا باسو گیا۔ مناشا اور نکولائی آپس میں باتیں کیے بغیر بیٹھے رہے۔ ان کے چہرے تسمتا رہے تھے۔ وہ ہشاش بشاش تھے لیکن ان کے بیٹوں میں جو ہے دوڑ رہے تھے۔ انھوں نے ایک دوسرے کی جانب دیکھا (اب جب کہ شکار کا دھندا ختم ہو چکا تھا اور وہ گھر کے اندر بیٹھے ہوئے تھے، نکولائی کو اپنی ہمشیرہ کے سامنے اپنے مردانہ تفوق کا اظہار کرنا غیر ضروری معلوم ہوا)۔ مناشا نے اپنے بھائی کو آنکھ ماری اور دونوں میں سے کوئی بھی زیادہ دیر تک اپنی منی پر قابو نہ رکھ سکا۔ ابھی وہ جواز بھی تلاش نہ کر پائے تھے کہ کھٹکھٹا کر ہنسنے لگے۔

چند ثانیے بعد ”چچا“ واپس آ گیا۔ اس نے قازق کوٹ، نیلی پتلون اور اونچے بوٹ پہن لیے تھے۔ مناشا کو محسوس ہوا کہ یہ پہناؤ۔ جب ”چچا“ اسے پہن کر اتر ادا کیا، اسے دیکھ کر مناشا کو حیرت بھی ہوئی تھی اور اس میں اسے دل لگی کا سامان بھی نظر آیا تھا۔ بالکل بے عیب ہے اور کسی اعتبار سے بھی سوالوئیل³ یا نراک کوٹ سے کمز نہیں ہے۔ ”چچا“ بھی ترنگ میں تھے۔ پہن بھائی کی منی پر ناک بھوس چڑھانا تو دور کی بات تھی (وہ بھی یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ عین ممکن ہے کہ وہ اس کے رہن بہن کا ہی مذاق اڑا رہے ہوں)۔ وہ خود بھی ان کے بے ساختہ قہقہوں

میں شریک ہو گیا۔

”حیر، یہ نوجوان کاؤنٹس۔ سہانا کھیت، ہموار راستہ۔ اس جیسی خاتون سے کبھی واسطہ نہیں پڑا تھا“ اس نے ایک پائپ، جس کی نال لمبی تھی، نکول لی کو تھمتے اور دوسرے میں مشاق انداز سے تین انگلیوں سے تمباکو بھرتے ہوئے کہا۔ (اس نے اپنا پائپ چھوٹا کر الیا تھا۔) ”یہ سارا دن زین پر ٹپٹپی رہی۔ یوں بیٹھے بیٹھے تو مرد بھی جگ جگاتا۔ لیکن یوں نظر رہا ہے جیسے اس کے لیے کوئی بات ہی نہیں تھی۔“

”چچا“ کی دوبارہ آمد کے کچھ ہی دیر بعد دروازہ کھلا۔ آہٹ سے معلوم ہوتا تھا کہ یہ کسی نئے پاؤں ملازم و دیشیزہ نے کھولا ہوگا۔ اور ایک بھاری بھر کم، گل عذار اور خوش رو عورت، جو چالیس کے پیٹے میں ہوگی اور جس کی ٹھوڑی دوہری اور ہونٹ کا ماسرغ تھے، اندر داخل ہوئی۔ اس کے ہاتھ میں خاصی بڑی اور مدی پھندی ترے تھی۔ اس نے مہمانوں پر نظر ڈالی۔ اس کی آنکھوں اور ایک ایک حرکت سے یہ مترشح ہو رہا تھا کہ وہ انھیں پروقار اور پرتپاک انداز سے خوش آمدید کہہ رہی ہے۔ وہ خوش ترکیبی سے مسکرائی اور اس نے انھیں جھک کر سلام کیا۔ اپنے غیر معمولی جتنے کے باوجود، جو اسے اپنا سر پیچھے جھکانے پر مجبور کر رہا تھا جب کہ اس کا سیدہ اور پیٹ آگے کو نکلا ہوا تھا، یہ عورت (وہ چچا کی منظر خانہ تھی) غیر معمولی پھرتی سے قدم آگے بڑھا رہی تھی۔ وہ میز کے قریب پہنچی، ٹرے نیچے رکھی اور اس کے نرم دگداز سفید ہاتھ بوتلوں، پھیلوں، گوشت، ترکاریوں اور زیتون کے انواع و اقسام کے طعام اور دیگر لذیذ اشیا نہایت مشقی اور مہارت سے ترتیب دینے لگے۔ جب وہ اپنا کام ختم کر چکی، وہ واپس دروازے کے پاس چلی گئی اور چہرے پر تبسم سجائے وہاں کھڑی ہو گئی۔ ”یہ میں ہوں۔ میں! بتم سمجھ گئے ہو کہ چچا کیا چیز ہے؟“ رستوف کو اس کا انداز کہتا محسوس ہو رہا تھا۔ اسے سمجھے بنا بھلا کوئی بات بنتی تھی؟ ”چچا“ جس کی پیشانی پر شکنیں اور ہونٹوں پر سلوٹیں تھیں، ایسی فیورڈونا کی اندر آمد پر جس خوش باش اور مطمئن انداز سے مسکرانے لگا، اس کا مفہوم نہ صرف نگوار کی بلکہ نتاشا کی سمجھ میں بھی آ گیا۔ ٹرے پر مختلف اقسام کی تیز اور خوشبودار شرمیں، مٹا تاتی برانڈی، کھنیاں، لسی میں بنے ہوئے رائی سیک، چھتے میں رکھا ہوا شہد، جھاگ دار اور بے جھاگ دونوں انواع کی مے، جو شہد سے کشید کی گئی تھی، کچے اور بھنے ہوئے گری دار میوے، سیب، شہد اور گری دار میووں سے بنی ہوئی منھایاں اور بیہ شریاں تھیں۔ بعد میں ایسی فیورڈونا تازہ بھنے ہوئے مرغ اور گوشت کے قتلے، جام اور مر بے لائی۔

یہ تمام اشیا اس نے اپنے ہاتھوں سے بنائی تھیں۔ اس نے خود ہی ان کے اجزاء منتخب کیے اور خود ہی انھیں تیار کیا تھا۔ انھیں دیکھ کر ایسی فیورڈونا کی شکل نگاہوں کے سامنے گھومنے لگتی تھی، وہی رسیلا پن، وہی صفائی ستھرائی، وہی دودھیا ملکجا پن، وہی فرحت بخش تبسم، کہ بس آدمی انگلیاں چاٹتا رہ جائے۔

”چھوٹی لیڈی، کاؤنٹس، ذرا یہ آرماء کر دیکھیں،“ وہ بار بار کہتی اور نتاشا کو کبھی ایک اور کبھی دوسری چیز پیش کر دیتی۔

نتاشا نے ہر چیز سے اپنے کام و درہن کی تواضع کی۔ وہ سوچ رہی تھی، ”میں نے زعدگی میں لسی کے ایسے

مڑے در یک، ایسے لذیذ جام اور مربے، ایسے خوش ذائقہ شہد اور گری دار میوؤں کی مٹھائیاں یا اس طرح کے بنے ہوئے مرغ نہ کہیں دیکھے اور نہ چکھے تھے۔ واہ واہ سبحان اللہ!“
ایسیا فیور دروتا داپس چلی گئی۔

پھر کے بعد چیری کی برائڈی کا در چلا اور رستوف اور ”چچا“ ماضی اور مستقبل کے شکاروں، رنگائی اور لالگوں کے کتوں کے متعلق باتیں کرنے لگے۔ متاثر تن کر صوفے پر بیٹھی ہوئی تھی، اس کی آنکھیں جھنگاری تھیں اور وہ ان کی گفتگو سنہاں سے سن رہی تھی۔ اس نے متعدد بابیتا کو جگانے اور اسے کچھ کھانے پلانے کی کوشش کی لیکن وہ کچھ ایسے گھوڑے بیچ کر سویا تھا کہ آنکھ کھولے بغیر بے ربط انداز سے کچھ ہڑبڑا کر رہ جاتا۔ اس بیگانے ماحول میں رشتہ اتنی شاداں و فرحان تھی کہ اسے جس واحد چیز کا خوف تھا، وہ یہ تھی کہ کہیں غم غم جلدی نہ آجائے۔ باتوں کے دوران میں ایسے وقفے بھی آتے جب ناگہانی طور پر گفتگو کا سلسلہ منقطع ہو جاتا اور محفل پر خاموشی چھا جاتی۔ جب آدمی پہلی مرتبہ اپنے گھر پر اپنے دوستوں کی خاطر تواضع کرتا ہے، تو خاموشی کے ایسے وقفے آتی جاتے ہیں۔ ایسے ہی ایک وقفے کے بعد ”چچا“ نے بریکسل تذکرہ وہ بات، جو مہمانوں کے اذہان میں بھی گردش کر رہی تھی، پھیر دی۔

”چنانچہ یہ تو تم نے دیکھ ہی لیا،“ اس نے کہا، ”کہ میں اپنی زندگی کے آخری ایام کیسے گزار رہا ہوں۔ موت اٹل ہے، اسے ایک نہ ایک دن آنا ہی ہے۔ سہانا کھیت، ہموار راستہ۔ اور کچھ باقی نہیں بچے گا۔ پھر گناہوں کا ارتکاب کیوں کیا جائے؟“

”چچا“ کے خدو خال سے نہ صرف اس کے جذبات و عزائم کا اظہار ہو رہا تھا بلکہ وہ خوبصورت بھی نظر آ رہا تھا۔ رستوف کو یاد آیا کہ اس کا باپ اور تمام پڑوسی ”چچا“ کا ذکر ہمیشہ اچھے الفاظ میں کرتے تھے۔ سارے علاقے میں اس کی شہرت یہ تھی کہ وہ بھلے اچھے شخص سے لیکن وہ تھا انتہائی شریف النفس اور بے غرض انسان۔ دیا کاری اسے چھو کر نہیں گئی تھی۔ خاندانی تنازعات میں اسے ثالثی کا فریضہ سونپا جاتا، وصیت ناموں کی تعمیل کے لیے اسے منتخب کیا جاتا اور لوگ اپنے رازوں کا امین اسے بناتے۔ اسے سچ بھی چنا گیا، ہر بار سرکاری مناصب پیش کیے گئے لیکن وہ اپنی ضد پر اڑا رہا اور اس نے کبھی کوئی عہدہ قبول نہ کیا۔ وہ خریف اور بیچ کے پیام اپنے کیت آختہ گھوڑے کی کر پر اپنے کھیتوں میں گزارتا، سردیوں میں گھر کے اندر بیٹھا رہتا اور گرمیوں میں اپنے باغیچے میں، جہاں ہنرے اور دھندگی کی بہتات تھی، چہل قدمی کرتا رہتا۔

”چچا، آپ نے ملازمت کیوں نہ اختیار کی؟“

”میں نے ملازمت کی تھی لیکن چھوڑ دی تھی، میں اس کے لیے سوزوں نہیں تھا۔ مجھے اس کا سرچہ کچھ بھی میں نہیں آتا تھا۔ یہ تم جیسے لوگوں کے لیے ہے۔ جس کا کام، اسی کو سنا جھے۔ میرا اس میں ذہن کام نہیں کرتا۔ ہا شکار۔ یہ بالکل مختلف قسم کا شغل ہے۔ سہانا کھیت، ہموار راستہ۔ وادروازہ کھول دوا“ اس نے چلا کر کہا۔ ”تم نے اسے بند کیوں کر دیا ہے؟“

غلام گردش کے، جسے ”چچا“ ”گلام گردش“ کہتا تھا، اختتام پر ایک دروازہ تھا۔ یہ شکاریوں کے کمرے میں کھلتا تھا۔ اسلانیہ کمران ملازموں کے، جو شکار میں ساتھ جاتے تھے، لیے تھا۔ وہاں تیز تیز ٹنگے پاؤں کی آہٹ سنائی دی اور کسی نادیدہ ہاتھ نے رکھوالوں کے کمرے کا دروازہ کھول دیا۔ غلام گردش سے ردی رباب (balalaika) کی سازیں سنائی دے رہی تھیں۔ اسے کوئی ایسا شخص، جو لاریب اپنے فن کا استاد تھا، بجا رہا تھا۔ ناشا کچھ دیر سے موسیقی کی دھنیں سن رہی تھی۔ اب وہ غلام گردش میں چلی گئی تاکہ وہ انھیں بہتر طور سے سن سکے۔

”وہ میر کوچوان متکا ہے... میں نے اسے بہت عمدہ رباب خرید دیا تھا۔ مجھے یہ پسند ہے“ ”چچا“ نے کہا۔ متکا کا یہ دستور تھا کہ جب ”چچا“ شکار سے واپس لوٹتا، وہ شکاریوں کے کمرے میں رباب بجاتا۔ ”چچا“ یہ موسیقی سنتا اور اس پر سر دھناتا۔

”کتنا اچھا بجا رہا ہے! واقعی بہت اچھا ہے“ نکودائی نے کہا۔ اس کے لہجے میں خاص نوع کی غیر شعوری نغوت تھی جیسے اسے یہ تسلیم کرتے عار آ رہا ہو کہ اسے موسیقی میں بہت لطف آ رہا ہے۔

”بہت اچھا؟“ اپنے بھائی کے لہجے کے جواب میں ناشا نے سرزنش کرتے ہوئے کہا۔ ”اچھا، یہاں صحیح لفظ نہیں ہے۔ یہ سرتاپا مسخو رکھ رہا ہے!“

جس طرح ”چچا“ کی کھنیاں، شہد اور شراہیں ناشا کو دنیا میں لذتیں معلوم ہوئی تھیں، اسی طرح اس وقت یہ موسیقی بھی اسے غنائی لطف کی معراج معلوم ہوئی۔

”مکر، مکر“ جو بھی موسیقی ختم ہوئی، ناشا نے، جو دروازے کے قریب کھڑی تھی، کہا۔ متکا نے سر ٹھیک کیے اور وہ دوبارہ ”محبوبہ من“ کی تانیں اپنے لگا۔ وہ تار کبھی دیا تا، کبھی کھینچتا اور کبھی ان پر پھرتی سے انگلی چلاتا اور یوں وہ اپنی تان میں کھنک اور تنوع پیدا کر رہا تھا۔ ”چچا“ اپنا سر ایک طرف جھکائے اسے بغور سن رہا تھا اور اس کے ہونٹوں پر ہلکی پھلکی مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔ ”محبوبہ من“ کی لے کوئی سو مرتبہ ہرانی لگی۔ رباب کے سر ایک سے زیادہ بار درست کیے گئے اور اس کے بعد وہی تانیں دوبارہ الائی گئیں لیکن سامعین کی طبیعتیں سیر نہ ہوئیں، اور انھیں بار بار سننے کی خواہش ان کے قلوب میں امنڈتی رہی۔ ایسی فیورونا ندر آئی اور اپنا کیم شیم جسم دروازے کے بازو پر ٹکا کر کھڑی ہو گئی۔

”چھوٹی کاؤٹس، اسے ذرا اب سینیں“ اس نے ایسی مسکراہٹ سے، جو غیر معمولی طور پر ”چچا“ سے مشابہ تھی، کہا۔ ”ہمارا متکا حقیقتاً ساز بجا سکتا ہے۔“

”وہ یہ سرتی ٹھیک سے نہیں بجا رہا“ ”چچا“ نے، یکا کی پوری قوت سے بازو دھرا کر کہا۔ ”یہاں سرتی ہر دار ہونا چاہیے۔ سہانا کیفیت، ہموار راستہ۔ لہر دار!“

”آپ کو ساز بجانا آتا ہے؟“ ناشا نے دریافت کیا۔

”چچا“ بس مسکرا دیا لیکن اس نے جواب کوئی نہ دیا۔

”انیسی اشکا، ذرا دیکھو کہ میرے گٹار کے تار درست ہیں یا نہیں۔ مدتیں ہو گئیں، میں نے انہیں چھوایں نہیں۔ سہانا کھیت، ہموار راستہ۔ میں یہ کام چھوڑ چکا ہوں۔“

انیسیا فیورر ونا اپنے آقا کے حکم کی تعمیل میں بلاتال چل پڑی اور گٹار اٹھالائی۔

”چچا“ نے کسی جانب دیکھے بغیر تکی پکی پھونکوں سے گٹار کی گرد جھاڑی، سو ڈنگ بورڈ پر اپنی استخوانی انگلیاں کھٹکھٹائیں، سر نہیک کیے اور اپنی بازوؤں والی کرسی پر آرام سے ٹک گیا۔ اس نے قدرے تھپکڑا انداز سے اپنا بیاں بازو کمان کی طرح نیڑھا کیا، فکر بورڈ سے ذرا اوپر گٹار کو کچڑا، انیسیا فیورر ونا کو ”تکھ“ ماری اور اس کے ساتھ ہی واحد سر، پاکیزہ اور پر شوکت، اٹھایا، پھر وہ دھیرے دھیرے ”محبوبہ من“ کی نہیں بلکہ مشہور زمانہ گیت ”گل میں دیشیزہ چلی آئی“ کی تانیں لاپنے لگا۔ اس کا انداز پرسکون، شائستہ اور پراعتماد تھا۔ نکوما کی اور تاشا کے قلوب میں نغمے کی پرتلی شگفتگی سے۔ وہی شگفتگی جو انیسیا فیورر ونا کے انگ انگ سے پھوٹ رہی تھی۔ جوش دسرت کی لہر پر موجزن ہونے لگیں۔ انیسیا فیورر ونا کا چہرہ مالوں لال ہو رہا تھا، اس نے اسے رومال میں چھپایا اور ہنستے مسکرتے کمرے سے باہر نکل گئی۔ ”چچا“ اپنے بے عیب، مشقت طلب اور پرزور انداز سے ساز پر گیت الا پتا رہا۔ تاشا اس کی نگاہیں نمٹنگی باندھے مسلسل اس جگہ کو، جہاں انیسیا فیورر ونا کھڑی تھی، دیکھتی رہیں۔ اس کی ریت مقلب ہو چکی تھی اور یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے اسے القا ہو رہا ہو۔ اس کی سفید مونچھوں تلے ہلکی پھلکی مسکراہٹ اس کے دہانے کے ایک جانب نمایاں ہونے لگی اور جوں جوں گیت آگے بڑھتا گیا، تانیں تیز سے تیز تر ہوتی چلی گئیں اور اس کی مسکراہٹ پھیلی چلی گئی۔ اور جہاں کہیں پر شکوہ توڑ آتا، تازہ جھنجھٹا اٹھتے۔

”خوبصورت، روح پرور، چچا! مکرر! مکرر!“ جونہی گیت ختم ہوا، تاشا نے چلا کر کہا۔ پھر وہ قہقہے بھرتی آگے آئی، چچا کو اپنی بانهوں میں بھینچا اور اس کے گال چوم لیے۔ ”کولینکا، کولینکا!“ اس نے اپنے بھائی کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔ اپنی حیرت کا اظہار کرنے کے لیے اسے موزوں الفاظ نہیں مل رہے تھے۔

چچا کی کارکردگی پر نکولائی بھی خوشی سے دیوانہ ہوا جا رہا تھا اور گیت کی دھن ایک بار پھر بھائی گئی۔ انیسیا فیورر ونا کا مسکراتا چہرہ دروازے میں نمودار ہوا۔ اس کے پیچھے پیچھے دوسرے چہرے تھے۔

جسے سے پانی نکالتے وہ چلایا

جانب من، ذرا ٹھہر جا، یہ میری التجا ہے

”چچا“ نے یہ ٹکڑا ایک بار پھر ہرایا، پر شکوہ انداز سے سر اٹھایا، کندھے جھٹکائے اور گیت ختم کر دیا۔

”انگل ڈارنگ، ابھی بجائیں، اور بجائیں،“ تاشا نے ملتجیانہ انداز سے دادیلا کیا جیسے اس کی زندگی کا دار و مدار

اسی پر ہو۔

”چچا“ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ معلوم ہوتا تھا کہ اس وقت اس کی ذہن میں دو اشخاص سوچے ہوئے ہیں۔ ایک شجیدہ اور

گہیر انداز سے دوسرے کی طرف، جو رنگین حراج اور خوش طبع تھا، مسکرا رہا تھا، جب کہ رنگین مزاج اور خوش طبع شخص
 ۷۰ وہ مصوبانہ اور رسمی انداز، جو رقص کی تمہید ہوتا ہے۔ اپنا لیا۔

”اری ننھی منی بہتجی!“ اس نے اپنا ہاتھ، جس سے اس نے ابھی ابھی سر نکالے تھے، نٹاشا کی طرف لہراتے
 ہوئے پاؤں بلند کیا۔

نٹاشا نے اپنی مثال اتار بھینکی، لپک بھپک آگے آئی اور چچا کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ اس نے دونوں ہاتھ
 گولہوں پر رکھے۔ ”پنے شانوں کو جنبش دی اور رقص کا پوز بنایا۔

اس فوئیز کاؤنٹس نے، جس کی تعلیم و تربیت ایک فرانسیسی گورنس کے، جو انقلاب فرانس کے بعد ترک وطن
 کر کے روس آئی تھی، ہاتھوں ہوئی تھی، کب، کہاں اور کیسے اس روسی فضا سے، جس میں وہ سانس لیتی تھی، اس
 رقص کی روح اپنی ذات میں سمولی تھی؟ اس نے وہ انداز، جو خیال کیا جاسکتا ہے کہ فرانسیسی رقص pas de
 chale (شارل ڈانس) نے کبھی کا نیست و نابود کر دیا ہوگا، کہاں سے اپنا لیا؟ لیکن اس کی چال ڈھال اور حرکات
 میں اصرار ہی روح مٹی ہوئی تھی۔ یہ چیزیں نہ سکھائی جاسکتی ہیں اور شاہ کی نقل اتاری جاسکتی ہے۔ لیکن ”چچا“
 اس سے جو توقع کر سکتا تھا، یہ اس کے عین مطابق تھیں۔ جس آن اس نے رقص کا پوز بنایا اور وہ اپنی نقا خزانہ،
 نقا خانہ اور دانستگاتہ نہی ہنسی، تو ابتدا میں گولائی اور دوسروں پر جو یہ خوف سوار ہوا کہ شاید وہ رقص کا صحیح پوز اختیار نہ
 کر سکے، از خود زائل ہو گیا اور وہ بلا توقف اس کی تعریفوں کے پل باندھنے لگے۔

اس کی کارکردگی اتنی بے عیب، اتنی کاملاً بے عیب تھی، کہ ایسی فیورڈ ناکی، جس نے جھٹ پٹ اپنا رومال،
 جس کی سے رقص میں ضرورت تھی، اس کے حوالے کر دیا تھا، آنکھیں نم ناک ہو گئیں حالانکہ وہ تب بغلیں بجا رہی تھی
 جب وہ اس چھری، بانگی بجلی اور طرح دار کاؤنٹس کو دیکھ رہی تھی، جو وہ سب کچھ جو ایسیا، ایسا کے ماں باپ اور
 خاندان اور ہر روسی مرد و زن کے رگ و پے میں سمایا ہوا تھا سمجھنے میں کامیاب رہی تھی حالانکہ اس کی پردریش ریشم و
 کغوب میں ہوئی تھی اور اس کا تعلق جس دنیا سے تھا، وہ اس کی دنیا سے قطعی مختلف تھی۔

”خوب، بہت خوب! ننھی کاؤنٹس۔ سہانا کھیت، ہموار راستہ“ ”چچا“ چلا کر کہہ رہا تھا اور خوشی کے
 عالم میں قہقہے لگا رہا تھا۔ ”بہت اعلیٰ، بہتجی! اب ہمارے کرنے کا ایک ہی کام ہے کہ تمہارے لیے کوئی خوب صورت
 نوجوان برڈھونڈیں۔“

”ایک تو پہلے ہی ڈھونڈا جا چکا ہے،“ گولائی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”اچھا!“ ”چچا“ نے متحیر ہو کر کہا اور وہ استفہامیہ انداز سے نٹاشا کو دیکھنے لگا۔ نٹاشا نے خوشی سے سرشار ہو کر
 اور لبوں پر تبسم پھیرا کر تائید کر دی۔

”اور وہ اتنے اچھے ہیں!“ وہ بول پڑی۔

جونہی اس کے منہ سے یہ الفاظ نکلے، اس کے دماغ میں خیالات و جذبات کا نیا سلسلہ چل نکلا۔ ”جب گولائی

یہ کہہ کر کہ وہ تو پہلے ہی ڈھونڈا جا چکا ہے، مسکرایا تھا، اس کی مسکراہٹ کا کیا مفہوم تھا؟ کیا وہ خوش ہے یا رنجیدہ ہے؟ نظر آتا ہے کہ اس کے خیال میں ہلکوسکی اس قسم کے رونق میلے کی غایت نہیں سمجھ سکیں گے اور نہ اسے پسند کریں گے۔ لیکن وہ سب کچھ سمجھ جائیں گے۔ پروہ اس وقت ہیں کہاں؟“ وہ متعجب تھی اور اس کا چہرہ ایک دم سنجیدہ ہو گیا۔ تاہم یہ کیفیت صرف ایک سیکنڈ رہی۔ ”اس بارے میں مت سوچ، یہ خیال بھی ال میں نہ لاد،“ اس نے اپنے آپ کو بتایا اور وہ خندہ ران، خندہ خمیں ”چچا“ کے قریب بیٹھ گئی اور اس سے التجا کرنے لگی کہ وہ مزید کچھ دیر ساڑ بچائے۔

چچا نے ساڑ پر ایک اور گیت کی دھن اور الزرقص کی گیت بجاتی۔ کچھ توقف کے بعد اس نے اپنا گلا صاف کیا اور اپنا پسندیدہ شکاری گیت گانے لگا۔

جب شام ڈھلے

زمستاں کی اولیں اور دلکش برف باری ہوئی...

”چچا“ کے گانے کا انداز بالکل دیہاتی کسانوں کا تھا۔ کتنے سادہ دل ہیں یہ لوگ! انہیں پورا یقین ہوتا ہے کہ گیت کے پورے معانی الفاظ میں مضمر ہوتے ہیں، یہ کہ دھن بے ساختہ آتی ہے اور شعر کو جس کے بغیر یہ کچھ بھی نہیں رہتی، محض اچا کر کرنے اور اس کا وزن متعین کرنے کے لیے وجود میں آتی ہے۔ چنانچہ اس دھن میں، جس میں آواز کا شائبہ تک نہیں تھا، وہی غیر معمولی دلکشی تھی جو پرندے کے گیت میں ہوتی ہے۔ چچا کی گلوکاری نے نشا پرجد کی کیفیت طاری کر دی۔ اس نے جی میں ٹھان لیا کہ وہ بربط کے اسباق نہیں لے گی اور اپنی ساری توجہ صرف گیت پر لگا دے گی۔ اس نے چچی سے گیتار مانگی اور آٹا فانا گیت کے سراٹھا لیے۔

نشا اور چیتا کو واپس لے جانے کے لیے تقریباً دس بجے چھوٹی دنگن¹⁸ اور دروٹکی¹⁷ پہنچ گئیں۔ ان کی حفاظت کے لیے تین ملازم بھی ہمراہ تھے۔ ایک ملازم نے بتایا: ”کاؤنٹ اور کاؤنٹس کو قطعاً معلوم نہیں کہ آپ لوگ کہاں ہیں۔ وہ آپ کے بارے میں بہت فکر مند ہیں۔“

چیتا کولاش کی طرح اٹھا کر لایا گیا اور اسے چھوٹی دنگن میں لٹا دیا گیا۔ نکولائی اور نیشا دروٹکی میں بیٹھ گئے۔ ”چچا“ نے نیشا کو دروٹا لہ اڈھا دیا اور سے نئی طرح کی شفقت اور ملائمت سے خدا حافظ کہا۔ وہ پل تک پیدل ان کے ساتھ آیا۔ پل پر سے گاڑیاں نہیں گزر سکتی تھیں، چنانچہ انہیں اپنی گاڑیاں ندی میں ڈالنا پڑیں اور یوں اسے عبور کیا۔ ”چچا“ نے اپنے چند نوکر چاکر، جن کے پاس لائینیں تھیں، ساتھ کر دیے، وہ گاڑیوں کے آگے آگے چلے گئے۔ ”پیری سنٹی بھتیجی، خدا حافظ“ تاریکی میں اس کی آواز سنائی دی لیکن یہ وہ آواز نہیں تھی جس سے نیشا پہلے شناسا تھی، بلکہ یہ وہ آواز تھی جس نے ”جب شام ڈھلے“ گایا تھا۔

گاڑیوں میں، جس کے بچوں نے وہ گزرے ہر رخ روشنیاں چمک رہی اور دھوئیں کی خوشگوار دھند بھلی بھلی تھی۔

”یہ چچا“ کتنے پیارے ہیں!“ بڑی سڑک پر پہنچنے کے بعد نیشا نے کہا۔

”ہاں،“ نگولائی نے جواب دیا۔ ”تمہیں سردی تو نہیں لگ رہی؟“

”نہیں، میں بالکل، بالکل ٹھیک ہوں۔ میں بے حد خوش ہوں!“ نناٹا نے کہا۔ اس کے دل میں جو جذبات موج زن تھے، انھوں نے اسے صریحاً الجھن میں ڈال دیا تھا۔

وہ کافی دیر خاموش رہے۔

رات اندھیری اور مرطوب تھی۔ انھیں کھوڑے نظر نہیں آرہے تھے، صرف نادیدہ کچڑ میں ان کے چپکے اڑانے کی آوازیں ان کے کانوں سے ٹکر رہی تھیں۔

اس معصوم صفت اور اتر پندیر روح میں، جو زندگی کے گونا گوں اور متنوع تاثرات کو قبول کر رہی اور انھیں اپنے اندر جذب کر رہی تھی، کیا کیا خیالات اور احساسات سر اٹھا رہے تھے؟ وہ سب اس کے دل و دماغ میں کس طرح سمجھنے؟ لیکن وہ مسرت سے بے حال ہو رہی تھی۔ جب وہ گھر کے نزدیک پہنچنے لگے، وہ اچانک ”جب شام ڈھلے“ کی دھن گنگنا نے لگی۔ وہ سارا راستہ اسے یاد کرنے کی سعی کرتی رہی تھی اور سخرکار اسے اپنی گرفت میں لینے میں کامیاب ہو گئی۔

”یا آگئی؟“ نگولائی نے پوچھا۔

”نگولائی کا ہم ابھی ابھی کیا سوچ رہے تھے؟“

انھیں ایک دوسرے سے یہ سواں پوچھنے کا بہت شوق تھا۔

”میں؟“ نگولائی نے تراخ سے جواب دیا۔ وہ یاد کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ”خیر، تمہیں معلوم ہونا ہی چاہیے۔ پہلی بات، جو میں سوچ رہا تھا، یہ ہے کہ رگائی، وہی سرج کتا چچا سے مشابہ ہے اور یہ کہ اگر وہ انسان ہوتا، وہ اگر شکار کے لیے نہیں تو کم از کم ہم آگئی کے لیے چچا کو ضرور ہمیشہ اپنے ساتھ رکھتا۔ چچا واقعی سولس و دم ساز آدمی ہے! تمہارا کیا خیال ہے؟... خیر، چھوڑو، ہم کیا سوچ رہی تھیں؟“

”میں؟ ایک منٹ ٹھہرو۔ بس ایک منٹ۔ پہلے تو میں یہ سوچ رہی تھی کہ یہاں ہماری گاڑیاں چل رہی ہیں اور ہم سمجھتے ہیں کہ ہم گھر جا رہے ہیں لیکن صرف خداوند جانتا ہے کہ اس گھنا ٹوپ اندھیرے میں ہم کہاں جا رہے ہیں۔ ہر سکا ہے کہ ہم ایک ایک کی ایسے مقام پر، جس کے بارے میں ہمیں معلوم ہو کہ یہ اتر ادنایا تو نہیں، پہنچ جائیں اور ہم پر سوچے لگیں کہ عین ممکن ہے کہ یہی پرستان ہو۔ اور پھر میں نے سوچا۔ نہیں، بس یہی کچھ تھا۔“

”مجھے معلوم ہے۔ تم غالباً اس کے بارے میں سوچ رہی تھیں،“ نگولائی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ نناٹا اس کی آوازیں کرتا سکتی تھی کہ وہ مسکرا رہا ہے۔

”نہیں۔“ نناٹا نے کہا حالانکہ وہ واقعتاً اس وقت پرنس آندرے کے بارے میں ہی سوچ رہی تھی اور اس کے ساتھ ہی اس کے دل میں یہ خیال بھی آیا تھا کہ ”چچا“ کے بارے میں اس کا رویہ کیا ہوتا۔ ”پھر سارا راستہ میں اپنے آپ سے یہ کہتی رہی کہ ایسا نے اپنے فرائض کتنی خوبصورتی سے نبھائے اور کس خوبصورتی سے...“

اور ٹکولائی کو اس کی ہے ساختہ، گونج دار اور مسرت سے بھرپور ہنسی کی آواز سنائی دی۔

”اور تم جانتے ہو؟“ وہ اچانک گویا ہوئی۔ ”مجھے یقین ہے کہ مجھے اس رات جو راحت اور سکون میسر ہے، دوبارہ کبھی نہیں مل سکے گا۔“

”واہیات۔ لغو باتیں مت کرو!“ نکوئی نے کہا، اور وہ سوچنے لگا: ”میری یہ نسا شاکتھی پیاری ہے اس جیسا دوست نہ مجھے ملے اور نہ ملے گا۔ آخر اسے پیادہ چلانے کی ضرورت کیوں پیش آگئی ہے؟ میں اس کی معیت میں اس طرح کا سفر ہمیشہ کر سکتا ہوں!“

”میرا یہ نکلوالی کتنا پیارا ہے!“ مٹاشا سوچ رہی تھی۔

”ارے، ڈرائنگ روم میں ابھی تک بقیں جل رہی ہیں، اس نے گھر کے درپہلوں کی طرف، جو رات کی مرطوب اور خمیلیس تاریکی میں جھنسل رہے تھے، دوران کے لیے چشم برہ تھے، اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

8

کاؤنٹ الیا آندرچ شرفا کے مارشل کے منصب سے مستعفی ہو گیا تھا کیونکہ اس کی وجہ سے اسے ضرورت سے زیادہ اخراجات اٹھانا پڑتے تھے، تاہم اس کے مالی امور میں پھر بھی اصلاح کے کوئی آثار نمودار نہ ہوئے۔ کولان اور نانا نے اکثر اپنے والدین کو پریشانی کے عالم میں اور چھپ چھپ کر آپس میں صلاح مشورے کرنے دیکھا اور انھیں ماسکو میں رستونوں کے عالی شان اور بیش قیمت آبائی مکاں اور ماسکو کے مضافات میں اپنی جاگیر فروخت کرنے کے متعلق باتیں کرتے سنا۔ اب جب کہ کاؤنٹ مارشل آف دی نو بیلیٹی، نہیں رہا تھا، ان کے لیے رسعا پائے پر تکلف دعوتیں منعقد کرنے کی ضرورت بھی نہیں رہی تھی، چنانچہ سابقہ برسوں کے مقابلے میں، ترو دنیا میں ان کے ایام نسبتاً سکون اور خاموشی سے گزر رہے تھے، تاہم ان کے وسیع و عریض مکان اور اس سے ملحق عمارتوں میں اب بھی لوگوں کا تانتا بندھا رہتا تھا اور ہر روز دسترخوان پر بیٹھنے سے زیادہ حالی موالی اکٹھے ہو جاتے تھے۔ ان میں سے بیشتر ان کے اپنے احباب تھے، وہ ان کے گھر میں آباد ہو چکے تھے اور تقریباً خاندان کے ارکان بن چکے تھے۔ چند ایک اصحاب ایسے بھی تھے جن کے لیے کاؤنٹ کے گھر میں بسیرا کرنا بظاہر امر مجبوری بن چکا تھا۔ ان میں موسیقار ڈیٹر اور اس کی اہلیہ، استاد قص فوگل اور اس کا خاندان، ایک غیر شادی شدہ بزرگ خاتون پالووا، جس نے ہمیں اپنا گھر بنالیا تھا اور بہت سے دوسرے لوگ شامل تھے۔ ان دوسرے لوگوں میں چیتا کے ٹیوٹر، لڑکیوں کی سابقہ گورنر اور مختلف دیگر اشخاص شمار کیے جاسکتے تھے۔ یہ بھی اپنے گھروں میں رہنے کے بجائے کاؤنٹ کے مکاں کو اپنا گھر بنانے کو ترجیح دیتے تھے یا اس میں انھیں زیادہ منفعت نظر آتی تھی۔ اگرچہ باہر سے مہمان اب پہلے کی نسبت کم آتے تھے لیکن ان کے اپنے رہن رہن میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی کیونکہ کاؤنٹ اور کاؤنٹس کسی دوسرے اسلوب سے زندگی بسر کرنے کے متعلق سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔ شکاریات کالاؤلنکر جوں کا توں تھا۔ بلکہ کولائی نے اس میں

مزید اضافہ کر دیا تھا۔ کہ اصطبلوں میں بچاں گھوڑے اور چند رہ سائیکس تھے۔ نام دن کے مواقع پر حسب سابق تہتی تحائف دینے اور اس کے ساتھ ساتھ پر شکوہ ضیافتیں، جن میں سارے ضلع کے لوگوں کو مدعو کیا جاتا منعقد کرنے کا سلسلہ جاری تھا۔ کاؤنٹ اب بھی ناش کے کھیل دست (Whist) اور بوٹن کھیل کے دوران میں وہ اپنے کچھ اس انداز سے پکڑتا کہ ہر شخص انھیں دیکھ سکتا اور یوں اس کے پڑوسی روزانہ اس کے سینکڑوں روبلوں پر ہاتھ صاف کر جاتے۔ اس ہمسایوں کے نزدیک کاؤنٹ کے ساتھ باڑی لگانا آمدنی کا منفعت بخش ذریعہ بن گیا تھا۔

کاؤنٹ نے اپنے معاملات کے بارے میں جو طرز عمل اپنا رکھا تھا، وہ ایسے ہی تھا جیسے وہ کسی عظیم الجثہ جال کے اندر چل پھر رہا ہو۔ اس کی ہمیشہ یہی کوشش رہی کہ کہیں اسے یہ یقین نہ آ جائے کہ وہ پھندے میں گرفتار ہو چکا ہے، لیکن ہر قدم جو وہ اٹھاتا تھا، وہ اسے اس میں مزید ابھارتا تھا اور اسے یہ محسوس ہونے لگا تھا کہ اب اس میں نہ اتنی سکت باقی رہی ہے کہ جس پھندے نے اسے پھانس لیا ہے، وہ اسے توڑ سکے اور نہ اتنا صبر و ضبط کہ وہ اس کی گرہیں کھول سکے۔ کاؤنٹس کا پیار بھرا دل اسے بتا رہا تھا کہ اس کے بچے تباہی کے غار میں دھکیلے جا رہے ہیں لیکن اسے محسوس ہوتا تھا کہ اس میں کاؤنٹ کا کوئی دوڑ نہیں کیونکہ وہ جو کچھ تھا، اس کے علاوہ وہ اور کچھ بن ہی نہیں سکتا تھا، اور یہ کہ خود سے اپنی اور اپنے بچوں کی بربادی کا پورا پورا شعور تھا اور یہ شعور اسے کسی پل چلیں نہیں مینے دیتا تھا (حالانکہ وہ اپنی اس بے چینی کو پردہ افشا میں رکھنے کی پوری کوشش کرتا تھا)۔ کاؤنٹس اس صورت حال کا مداوہ کرنے کے لیے مغز ماری کرتی رہتی تھی لیکن اس کا نسوانی نقطہ نظر اسے اس مسئلے کا صرف ایک ہی حل بھاتا تھا۔ کہ نکولائی کسی متحمل اور صاحب جائیداد و شیرازہ کے ساتھ شادی کر لے۔ وہ محسوس کرتی تھی کہ یہ ان کی امید کی آخری کرن ہے اور اگر نکولائی نے اس رشتے کو بھی، جو اس نے اس کے لیے تلاش کیا تھا، قبول کرنے سے انکار کر دیا، پھر ان کے سارے سہانے خواب چکنا چور ہو جائیں گے اور وہ اپنی شان و شوکت کبھی بحال نہیں کر سکیں گے۔ یہ رشتہ ٹوٹی کاراگنا کا تھا۔ وہ معزز اور رست باز والدین کی بیٹی تھی۔ رستوں اسے بچپن سے جانتے تھے اور اب جب کہ اس کا آخری بھائی موت سے ہم کنار ہو چکا تھا، وہ وسیع و عریض جائیداد کی واحد وراثت تھی۔

کاؤنٹس نے براہ راست جولی کی والدہ کو ماسکو خط تحریر کیا تھا۔ اس میں اس نے آپس کے بچوں کے مابین رشتے کی تجویز پیش کی تھی اور اسے خاطر خواہ جواب موصول ہوا تھا۔ جولی کی والدہ نے اپنے جواب میں لکھا تھا: 'جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے، مجھے اس رشتے میں کوئی عذر نہیں، تاہم ہر بات کا دار و مدار میری بیٹی کے میلانات و خواہشات پر ہوگا۔' اس نے نکولائی کو ماسکو آنے کی دعوت دی۔

کاؤنٹس غم ناک آنکھوں سے متعدد مواقع پر اپنے بیٹے کو جتا چکی تھی کہ اب جب کہ اس کی دونوں بیٹیوں کی تقدیر طے ہو چکی ہے، اس کی واحد خواہش صرف یہ رہ گئی ہے کہ اس کا بیٹا دلہن لے آئے۔ وہ کہتی کہ اگر یہ معاملہ پایہ تکمیل تک پہنچ گیا، پھر وہ سکون و اطمینان سے اپنی لحد میں جاسوئے گی۔ پھر وہ اسے بتاتی کہ اس کے ذہن میں ایک خوش شکل اور خوش اطوار دو شیرازہ ہے اور اس سے پوچھتی کہ شادی کے بارے میں اس کے اپنے نظریات کیا ہیں۔

بعض دوسرے مواقع پر وہ اس کے سامنے جولی کی تعریفوں کے پلے باندھ دیتی اور نکولائی کو مشورہ دیتی کہ وہ سیر و تفریح کے لیے ماسکو چلا جائے اور وہاں کی زندگی سے لطف اٹھائے۔ نکولائی بھانپ گیا کہ اس کی والدہ کی باتوں کا رخ کس طرف ہے۔ اور اس قسم کے ایک مکالمے کے دوران میں اس نے اصرار کیا کہ وہ کل کر بات کرے۔ اس پر اس نے اسے صاف الفاظ میں بتادیا: ”ہمارے معاملات میں اتنا بگاڑ آچکا ہے کہ انہیں درست کرنے کا صرف ایک ہی راستہ باقی رہ گیا ہے کہ تم جولی سے شادی کر لو۔“

”لیکن ماما، فرض کریں، مجھے ایک ایسی لڑکی سے، جو بالکل تہی دست ہے، یہ رہے، کیا آپ بھر بھی مجھ سے یہ توقع کریں گی کہ میں دولت کی خاطر اپنے جذبات کا گلہ گھونٹ دوں اور اپنی عزت داؤں پر لگا دوں؟“ اس نے اپنی والدہ سے پوچھا۔ اس کے سوال میں کتنی سفاکی تھی، اس کا اسے اندازہ ہی نہیں تھا۔ وہ تو کھن سے یہ ثابت کرنے پر تیار ہوا تھا کہ وہ دیانت دار اور با اصول شخص ہے۔

”نہیں، تم میری بات ٹھیک طرح نہیں سمجھ پائے،“ اس کی ماں نے کہا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اپنے موقف کو صحیح کیسے ثابت کرے۔ ”نکولینکا، تم مجھے غلط سمجھ رہے۔ میں تو صرف تمہاری خوشی چاہتی ہوں،“ اس نے مزید کہا۔ وہ محسوس کر رہی تھی کہ وہ راست گوئی سے کام نہیں لے رہی اور پراگندہ ذہن ہو رہی ہے۔ وہ رونے لگی۔

”ماما، ڈیر ماما، آپ رونی کیوں ہیں؟ آپ صرف اتنا فرمادیں کہ آپ چاہتی کیا ہیں اور آپ جانتی ہیں کہ میں آپ کے ذہنی سکون کی خاطر سر دھڑکی بازی لگا دوں گا،“ نکولائی نے کہا۔ ”میں آپ کی خاطر اپنا سب کچھ حتیٰ کہ اپنے جذبات بھی قربان کر دوں گا۔“

لیکن کاؤنٹس اس طرح دست سواں در نہیں کرنا چاہتی تھی۔ وہ اپنے بیٹے سے کسی قربانی کا تقاضا کرنے کی خواہش مند نہیں تھی، اس کی قربانی سے پہلے وہ اس کی خاطر اپنی ذات کی قربانی دے سکتی تھی۔

”نہیں، تم میری بات سمجھ ہی نہیں۔ اچھا، چھوڑو اس قصے کو،“ اس نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

”شاید میں واقعی کسی نادار لڑکی سے محبت کرتا ہوں،“ نکولائی نے اپنے آپ سے کہا۔ ”کیا مجھے روپے کی خاطر واقعی اپنے جذبات کا گلہ گھونٹنا ہوگا؟ اپنی عزت کو داؤں پر لگانا ہوگا؟ سمجھ میں نہیں آتا کہ ماما نے اس طرح کی تجویز میرے سامنے رکھی ہی کیوں؟ چونکہ سونیا مفلس ہے، مجھے اس سے محبت نہیں کرنا چاہیے، اس کی دنا شعار اور پکی محبت سے آنکھیں چرا لینا چاہیے؟ اور پکی بات یہ ہے کہ جولی جیسی کسی گڑیا کی نسبت میں اس کے ساتھ کہیں زیادہ خوش رہوں گا۔ میں اپنے جذبات پر حکم نہیں چلا سکتا،“ اس نے اپنے آپ سے کہا۔ ”اگر مجھے سونیا سے پیار ہے، پھر میرے نزدیک یہ جذبہ کسی دوسری چیز کی نسبت کہیں زیادہ قوی اور ارفع و اعلیٰ ہے۔“

نہ نکولائی ماسکو گیا اور نہ کاؤنٹس نے شادی کے متعلق اس سے دوبارہ بات کی، لیکن وہ یہ دیکھ کر اس کے بیٹے اور بے چیز سونیا کے مابین محبت کی بیٹنگیں روز بروز بڑھتی ہی جا رہی ہیں، جی ہی جی میں کڑھتی رہی، تملاتی

رہی، در غصے سے بل کھاتی رہی۔ اور اگرچہ وہ اپنے سب کو کوستی رہتی تھی کہ وہ اس قسم کی حرکت کیوں کرتی ہے، پھر بھی اس سے رہانہ جاتا، وہ سونیا کو دیکھ کر بڑبڑانے لگتی، اس میں میں سیکھ نکالتی رہتی اور جب اس سے بات کرتی، بڑی اکڑوں سے اسے ”مائی ڈیئر“ کہہ کر مخاطب کرتی اور بے تکلفانہ ”تم“ کی جگہ ”تھی“ کہتی۔ کہتی۔ مشفق و مہربان کاؤنٹس کو جس چیز سے سخت کوفت ہوتی، وہ یہ تھی کہ اس کی یہ مفلس و تلاش سیاہ چشم بھانجی بالکل اللہ میاں کی گائے ہے، اتنی منکسر المزاج، اتنی نیک طبیعت، اپنے محسنوں کی اتنی جی جان سے احسان مند اور گولائی کے ساتھ اتنی وفا شعار، یہ بات اور بے غرض محبت میں گرفتار، کہ اس میں عیوب تلاش کرنے کی کوئی وجہ جو رہ نہیں تھی۔

گولائی نے اپنی بقیہ چھٹی اپنے دامدین کے ہاں ہی گزاری۔ روم سے پرنس آندرے کا محلہ موصوں ہوا۔ اس میں اس نے لکھا تھا کہ اگر گرم آب دہوا میں اس کا زخم غیر متوقع طور پر دوبارہ نہ کھل جاتا، وہ کبھی کا عازم رہا ہو چکا ہوتا لیکن موجودہ صورت حال میں وہ اپنی وطن روٹنگی سہل نو کے آغاز تک معرض التوا میں ڈالنے پر مجبور ہو گیا ہے۔ ناشا کی اپنے سنگیتر کے ساتھ محبت میں کوئی فرق نہیں آیا تھا، اسے ابھی تک محبت میں وہی سکون مل رہا تھا اور وہ زندگی کی مسرتوں میں اب بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہی تھی، تاہم مفارقت کے چوتھے مہینے کے اختتام پر اس پر افسردگی کے دورے پڑنا شروع ہو گئے۔ ان کا توڑ کرنا اس کے بس کی بات نہیں تھی۔ اسے اپنے آپ پر ترس آنے اور بس بات کا افسوس رہنے لگا کہ اس عرصے کے دوران میں اس کی جسمانی و روحانی صلاحیتیں خواہ مخواہ ضائع ہوتی رہی ہیں اور وہ کسی کے کام بھی نہیں آسکی ہے جب کہ اس کی سوچ یہ تھی کہ اس میں محبت کرنے اور کرانے کی بے پناہ صلاحیت ہے۔

رستوں کے گھر میں زندگی کی لہر بہر اور چمک مہک عطا تھی۔

9

کرسمس آگئی۔ گرجے میں رسمی عبادت کی گئی، ہسپوٹ اور خانگی غلاموں کو سنجیدہ اور ڈوبھرا انداز سے مبارک بادیاں دی گئیں اور تمام افراد خانہ نے نئے لمبوسات زیب تن کیے۔ یہ سب کچھ تو تھا لیکن ان کے علاوہ اور کوئی بات ایسی نہ ہوئی جس سے یہ غم نہ مٹتا کہ ان چھٹیوں کو شایان شان طریق سے منانے کا کوئی خاص اہتمام کیا گیا ہے، ہر آں حالیکہ موسم بے عیب انداز سے ٹھہرا ہوا تھا۔ درجہ حرارت بے شک نقطہ انجماد سے تیرہ درجے ذریں ہائیٹ¹⁹ نیچے تھا لیکن دن کو آنکھیں چکا چوندہ کر دینے والی دھوپ پڑتی تھی اور رات کو آسمان ستاروں سے جگمگاٹھٹھا تھا۔ اس قسم کے موسم کا تقاضا تھا کہ کرسمس ڈرا دھوم دھڑکے سے منائی جاتی۔

ہفتہ کرسمس کے تیسرے روز ڈنر کے بعد افراد خانہ مختلف کمروں میں منتشر ہو گئے۔ دن کا یہ وقت انتخابی بیزار کن تھا۔ گولائی، جس نے چاشت پڑوسیوں کے ہاں حاضری دیتے گزار لی تھی، سنگ روم میں بخواب تھا۔ معمر کاؤنٹ

روٹی جیسا ”تم“ اور ”تو“ ہوگا۔

اپنے سٹڈی روم میں استراحت کر رہا تھا۔ سونیا ڈرائنگ روم میں گول میز کے سامنے بیٹھی تھی اور کشیدہ کاری کا کوئی نمونہ اتار رہی تھی۔ کاؤتس اکیسی ہی تاش کے کھیل "پیشنس" میں مصروف تھی۔ سخر دنا ستاسیا ایوانووا، جس کے چہرے پر افسردگی فلک رہی تھی، دو بڑی بوڑھیوں کے ساتھ کھڑکی کے قریب بیٹھا تھا۔ نناٹا کمرے میں آئی، سیدھی سونیا کے پاس گئی، جو کچھ وہ کر رہی تھی، اس پر ایک نظر ڈالی، پھر کمرے کی دوسری جانب اپنی ماں کے پاس پہنچی اور چپ سا دھمکھڑی ہو گئی۔

"یہ تم دھوبی کے کتے کی طرح کیا آؤ، رہ گردی کر رہی ہو؟" اس کی ماں نے پوچھا۔ "کیا چاہیے؟" "مجھے وہ چاہئیں۔ ابھی اور اسی دلت! مجھے وہ چاہئیں!" اس کی آنکھیں جگمگا رہی تھیں لیکن اس کے چہرے پر تبسم نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔

کاؤتس نے اپنا سر اوپر اٹھایا اور متلاشی نگاہوں سے اس کے چہرے کو دیکھنے لگی۔

"مجھے مت دیکھیں، ماما، مجھے مت دیکھیں، نہیں تو میں روئے بیٹھ جاؤں گی۔"

"بیٹھو۔ یہاں آؤ اور میرے پاس بیٹھ جاؤ۔"

"ماما، مجھے وہ چاہئیں۔ آخر مجھے یونہی ضائع ہونے کے لیے کیوں چھوڑ دیا گیا ہے؟"

اس کی آواز ٹوٹ گئی اور اس کی آنکھوں سے اشکوں کا سیل رواں ہو گیا۔ انھیں چپانے کے لیے اس نے فی الفور اپنا منہ دوسری طرف پھیر لیا اور کمرے سے باہر نکل گئی۔ وہ سٹنگ روم میں پہنچی، کچھ دیر اپنے خیالوں میں گم سم وہیں کھڑی رہی اور پھر باندیوں کے کمرے کی طرف چل دی۔ وہاں ایک ادھیڑ عمر خادما ایک نوجوان لڑکی کو، جو اس کے سامنے کھڑی تھی، ڈانٹ ڈپٹ کر رہی تھی لڑکی ابھی ابھی غلاموں کے سر دکرے سے بھاگ کر آئی تھی اور ہانپ رہی تھی۔

"کافی ہو چکی، اب کھیلنا ویلٹا بند! ہر کام کا وقت ہوتا ہے۔"

"کوئڈر اٹیوٹا، اسے جانے دو،" نناٹا نے کہا۔ "ماوروشا جاؤ۔"

ماوروشا کی گلو خلاصی کرانے کے بعد نناٹا ہال روم میں سے گزرتی پیش دالین میں چلی گئی۔ وہاں ایک سمر وردی پوش ملازم اور اس کے دونو جوان چہچہے تاش کھیل رہے تھے۔ اس کی آمد پر انھوں نے سچے ایک طرف پیٹک دیے اور کھڑے ہو گئے۔

"ان سے کیا کراؤں؟" نناٹا نے تعجب سے سوچا۔

"نکلیجا، ڈرا جانا۔۔۔ (اسے کہاں بھیجوں؟)۔ ہاں، ڈرا باڈے تک جاؤ اور میرے لیے ایک مرنالے آؤ۔"

20

ہاں بوشا، تم جی کے چند دانے اٹھا لاؤ۔"

"مٹھی بھر جی؟" مٹا پہلے ہی کمریاندھے کھڑا تھا اور خوش بھی۔

"جاؤ، بھاگ کر جاؤ،" سمر آوی نے زور دے کر اس سے کہا۔

”اور فیروز، تم ذرا چاک لے آؤ۔“

وہیسی پر جب وہ اشیائے خورونوش کے کمرے کے قریب سے گزری، اس نے حکم دیا کہ سوار چولھے پر چڑھا دیا جائے حالانکہ ابھی چائے کا وقت نہیں ہوا تھا۔ فو کا بٹر گھر کا انتہائی بد مزاج شخص تھا اور نشا کو ہمیشہ یہ بات آنے میں بہت مطف آتا تھا کہ ”دیکھو تو کسی کہ اس پر میرا کتنا اختیار چلتا ہے؟“ اسے اس کے حکم پر یقین نہ آیا اور وہ یہ دریافت کرنے چلا گیا کہ آیا سوار کی واقعی ضرورت ہے۔

”اف، یہ چھوٹی بی بی بھی خوب ہیں!“ فو کا نے نشا پر جھوٹ موٹ کا غصہ جھڑتے ہوئے کہا۔ گھر کا کوئی فرد بھی نوکروں اور نوکرہ کو نہ اتنا بھگاتا توڑا تھا اور نہ انھیں تناسباتا تھا جتنا کہ نشا کرتی تھی۔ جرنہی اس میں سے کسی پر اس کی نظر پڑتی، اس سے کچھ نہ کچھ کرانے کو اس کا جی مچلنے لگتا۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ یہ پرکھنا چاہتی ہے کہ کوئی اس کے حکم پر ناک بھوں چڑھاتا ہے ورنہ اس پر غصہ کھاتا ہے یا نہیں۔ لیکن کسی کے احکام کی تنی خوش ولی سے تعمیل نہیں ہوتی تھی جتنی کہ اس کے۔

”کیا کروں؟ کہاں جاؤں؟“ وہ غلام گردش میں دھیرے دھیرے چلتی سوچ رہی تھی۔
”ناسا سیالیا ایوا کو دنا، میرے بچے کس قسم کے ہوں گے؟“ اس نے مسخرے سے، جوڑنا نہ کوٹ پہنے اس کی جانب آ رہا تھا، پوچھا۔

”پتو، گالی کھیاں، بڑے،“ مسخرے نے جواب دیا۔

”ہائے اللہ، ہائے اللہ! ہمیشہ ہی جواب ملتا ہے۔ اف! کیا کروں؟ کہاں جاؤں؟“
اور وہ دھپ دھپ پاؤں اٹھاتی، گرتی بھاگتی، زینہ چڑھنے لگتی۔ اس کا ارادہ فو گل اور اس کی بیوی سے، جو سب سے آخری منزل پر رہتے تھے، ملنے کا تھا۔ دو کورسوں لوگوں کے ساتھ میز کے، جس پر کشمش، اخروٹ اور بادام کی پیٹش دھری تھیں، سامنے بیٹھی تھیں اور اس بات پر بحث کر رہی تھیں کہ باسکو سنا ہے یا اودیہ۔²¹ ناسا بیٹھ گئی، بنجیدہ اور پر فکر انداز سے ان کی گفتگو سنتی رہی اور دبا دبا ہوا اٹھ کھڑی ہوئی۔

”جزیرہ ٹڈ غاسکر،“ اس نے کہا۔ ”ٹڈ۔ غاس۔ کر۔“ اس نے ایک ایک جوڑ واضح اور غیر مبہم انداز سے ادا کرتے ہوئے کہا۔ اور جب بادام شوس نے اس سے پوچھا کہ وہ کیا کہہ رہی ہے، وہ اس کی بات کا جواب دے بغیر کمرے سے باہر نکل گئی۔

اس کا بھائی پتا بھی باپا کی منزل پر تھا۔ وہ اپنے ٹیوٹر کے ساتھ پھلجھڑیاں، جو رات کو چھوڑی جانا تھیں، تیار کر رہا تھا۔

”پتا! پتا!“ اس نے اسے آواز دی۔ ”مجھے نیچے لے چلو!“

پتا بھانگتا بھاگتا آیا ورنہ اس کے سامنے پشت جھکا کر کھڑا ہو گیا۔ وہ جست لگا کر اس پر سوار ہو گئی اور اپنے بازو اس کی گردن میں جھانک کر دیے۔ وہ اسے اٹھائے ادھر ادھر کہ کڑے لگا تا پھرا۔

”بس اتنا کافی ہے... جرمہ ڈغا سکر...“ اس نے کہا، اس کی پشت سے چھلانگ لگائی اور پھر وہ نیچے میٹریاں اترنے لگی۔

کچھ ایسے تھ جیسے وہ پتی شاہی مملکت کا معائنہ کر چکی ہو، اپنے اختیارات کی آزمائش کر چکی ہو اور اپنے سب کو یقین دلا چکی ہو کہ اگرچہ ہر کوئی اس کا مطیع و فرمانبردار ہے، بہر حال یہ سب کچھ بے کیف و بے لطف تھا۔ ناشا بال روم میں چلی گئی۔ اس نے اپنا گٹار اٹھایا، اس کے ساتھ کتابوں کی ایک الماری کے پیچھے تار یک کوٹنے میں جا بیٹھی اور اس کے تاروں پر انگلیاں پھیرنے لگی۔ اس نے اس اوپیرا کی، جو اس نے پیئرز برگ میں پرنس آندرے کی معیت میں دیکھا تھا، موسیقی کی ایک دھن یاد کی اور اسے دھیسے دھیسے دہرانے لگی۔ اس کے گٹار سے جو آوازیں برآمد ہو رہی تھیں، دوسرے سامعین کو بے شک ان میں کوئی معنی نظر نہ آتے، لیکن خود اس کے اپنے ذہن میں یادوں کا پورا سلسلہ تازہ ہو رہا تھا۔ وہ کتابوں کی الماری کی ادٹ میں بیٹھی تھی، اس کی نگاہیں روشنی کی ایک لکیر پر جو اشیائے خور و نوش کے کمرے سے برآمد ہو رہی تھی، مرکوز تھیں، وہ خود ہی بیجا رہی، خود ہی سن رہی اور یادیں تازہ کر رہی تھیں۔ اس کی ذہنی کیفیت کچھ ایسی تھی کہ وہ رہ کر اس کا دھیان ماضی کی طرف جا رہا تھا۔

سونیا اشیائے خور و نوش کے کمرے کے قریب سے گزری۔ اس کے ہاتھ میں پانی کا گلاس تھا۔ ناشا کی نظر اس پر اور دروازے کی درز پر پڑی اور اسے یوں محسوس ہوا کہ اسے یاد آ گیا ہے کہ اس نے اس سے پہلے بھی اس دروازے کی درز میں سے روشنی کی کرن کو چھن چھن کر باہر آتے اور سونیا کو ہاتھ میں گلاس پکڑے ادھر سے گزرتے دیکھا تھا۔

”ہاں، بالکل اسی طرح ہوا تھا،“ ناشا نے سوچا۔

”سونیا، یہ کیا ہے؟“ اس نے ایک تار جھنجھٹاتے پوچھا۔

”اوہ، تم وہاں ہو!“ سونیا نے گھبرا کر کہا اور اس کی بات سننے اس کے پاس چلی آئی۔ ”جائیں... طوفان؟“ اس نے ڈرتے ڈرتے مسکراتے کہا۔ اسے یہ فکر کھائے جا رہی تھی کہ کہیں وہ غلط بات نہ کہہ بیٹھی ہو۔

”وہ مارا! یہ اس وقت بھی اسی طرح گھبرائی تھی اور اسی طرح ڈرتے ڈرتے مسکراتے آئی تھی!“ ناشا کے ذہن میں خیال آیا۔ ”یعنی اس سے بھی مجھے یہی محسوس ہوا تھا کہ اس میں کسی چیز کی کمی ہے۔“

”نہیں، یہ دُؤ²³ کے کورس کا ٹکڑا ہے۔ سنو!“ اور ناشا کورس کی دھن گنگنا نے لگی تاکہ سونیا اسے سمجھ سکے۔

”کہاں جا رہی ہو؟“ اس نے پوچھا۔

”اس گلاس کا پانی تبدیل کرنے۔ میرا ڈیزائن ختم ہوا چاہتا ہے۔“

”تم کرنے کے لیے ہمیشہ کچھ نہ کچھ ڈھونڈتی لیتی ہو، مجھے کچھ نہیں ملتا!“ ناشا نے کہا۔ ”اور ہاں، ٹکڑی کا

کہاں ہے؟“

”میرا خیال ہے، سو رہے ہیں۔“

”سونیا، جاؤ اور اسے جگادو!“ ناشا نے کہا۔ ”اسے کہو کہ میں چاہتی ہوں کہ وہ یہاں آئے اور گانا گائے۔“

وہ کچھ دیر مزید یونہی بیٹھی رہی۔ وہ یہ سوچ سوچ کر کہ یہ واقعہ پہلے بھی پیش آیا تھا، پھر اس کا مطلب کیا ہوا، حیران دہر گرداں ہوتی رہی۔ تاہم اس مسئلے کو حل کیے بغیر اور اپنی ناکامی پر کسی قسم کے تردد کا ذرا بھی اظہار کیے بنا وہ اپنے تصورات میں ان وقتوں کو جب وہ اس کے ساتھ ہوتا تھا اور اسے پیار بھری نظروں سے دیکھ رہا ہوتا تھا یاد کرنے لگی۔

”کاش وہ جلدی آجائیں! میرے دل میں ہول اٹھ رہا ہے کہ یہ کبھی نہیں ہوگا اور بدترین بات یہ ہے کہ میری عمر ڈھل رہی ہے، اصل مصیبت یہی ہے کہ وہ دن دیر نہیں جب میں وہ نہیں ہوں گی جواب ہوں۔ پر شاید وہ آج آجائیں گے شاید وہ ابھی پہنچ جائیں گے شاید وہ آچکے ہیں اور ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہیں۔ شاید وہ کل گئے تھے اور میں ہی بھول گئی ہوں۔“

وہ اٹھ کھڑی ہوئی، کٹار نیچے رکھا اور ڈرائنگ روم کی طرف چل پڑی۔ سارا خانگی حلقہ۔ ٹیٹر، گورنسیس اور مہمان۔ میر کی جائے کے ارد گرد بیٹھا تھا۔ ان کے پیچھے نوکر چاکر کھڑے تھے۔ لیکن پرنس آندرے وہاں نہیں تھا اور زندگی حسب معمول رواں دواں تھی۔

”اٹھا، وہ آگئی ہے!“ کاؤنٹ ایسا آندرینچ نے نشا کو آتے دیکھ کر کہا۔ ”آؤ اور میرے پاس بیٹھ جاؤ۔“ لیکن نشا اپنی اس کے پاس بیٹھ گئی۔ وہ ادھر ادھر یوں نگاہیں گھما پھرا رہی تھی جیسے اسے کسی چیز کی تلاش ہو۔ ”اٹھا، وہ بڑبڑائی،“ انھیں مجھے دے دو، انھیں مجھے دے دو، ہاما، فوراً ابھی!“ اور ایک بار پھر اسے اپنی سکیوں پر قابو پانے میں مشکل پیش آئی۔

وہ میز پر بیٹھ گئی اور اپنے بزرگوں اور نکولا کی کے، جو میز پر پہنچ چکا تھا، مین مکالمہ سننے لگی۔ ”اٹھا، میرے خدایا، میرے خدایا! وہی چہرے، وہی باتیں۔ پاپا بالکل ویسے ہی ہاتھ میں کپ پکڑے ہوئے ہیں اور بالکل ویسے ہی اس پر پھونگیں مار رہے ہیں!“ نشا نے سوچا۔ وہ یہ محسوس کر کے دہشت زدہ ہو گئی کہ اسے اپنے سارے کنبے سے کراہت، جس میں ہر آن اضافہ ہوتا جا رہا تھا، ہونے لگی ہے کیونکہ ان کے رویے اور اطوار ہمیشہ یکساں رہتے ہیں۔

چائے کے بعد نکولا کی، سونیا اور نشا سنگ روم میں چلے گئے اور اپنے پسندیدہ کونے میں، جہاں ہمیشہ بے تکلف گفتگو ہوتی تھی، بیٹھ گئے۔

”کیا تمہارے ساتھ کبھی ایسا ہوا ہے؟“ نشا نے اپنے بھائی سے، جب وہ سنگ روم میں بیٹھ گئے، پوچھا، ”کیا تمہیں کبھی محسوس ہوا ہے کہ کبھی کچھ وقوع پذیر نہیں ہوگا۔ کچھ نہیں اور یہ کہ ہر اچھی شے ماضی کا حصہ بن چکی ہے؟ اور کیا کبھی تمہیں یہ احساس ہوا ہے کہ تم اتنا بوجھ نہیں ہو رہے جتنا اداس نے تم پر غلبہ پالیا ہے؟“

”ہاں، میرا خیال ہے کہ ایسا ہوتا ہے؟“ اس نے جواب دیا۔ ”کبھی کبھی میرے ساتھ ایسا ہوا ہے۔ بظاہر ہر شے اچھی بھلی ہے، ہر شخص مسرور و مطمئن ہے لیکن اچانک مجھے محسوس ہونے لگتا ہے کہ میں ان سب سے الگ آ گیا ہوں اور یہ کہ ہم سب فنا ہو جائیں گے۔ ایک روز جب رجنٹ کے لوگ کوئی جشن منا رہے تھے اور میں اس میں شریک نہیں ہو سکا تھا، موسیقی کی دھنیں بج رہی تھیں۔ ریکا کی مجھ پر اتنی افسردگی طاری ہو گئی۔“

”ارے ہاں، میں اس کیفیت سے آگاہ ہوں۔ آگاہ ہوں، آگاہ ہوں،“ مناشا بچ میں بول پڑی۔ ”جب میں ابھی ننھی منی بچی تھی، تب بھی میرے ساتھ ایسا ہو جایا کرتا تھا۔ تمہیں وہ دن یاد ہیں جب مجھے لوچوں کی وجہ سے سزا ملی تھی؟ تم سب لوگ ناچ کود رہے تھے اور میں کلاس روم میں بیٹھی سسکیں بھر رہی تھی۔ میں اتارو کی، اتارو کی کہ زندگی بھر بھلا نہیں پاؤں گی۔ مجھے ہر شخص پر۔ اپنے آپ پر اور دنیا کے ہر شخص پر۔ ترس آنے لگا، جہنم نے لگا۔ اور دکھ کی بات یہ ہے کہ میں نے کیا بھی کچھ نہیں تھا،“ مناشا نے کہا۔ ”تمہیں یاد ہے؟“

”مجھے یاد ہے،“ نکورائی نے کہا۔ ”مجھے، دادا کہ میں بعد ازاں تمہارے پاس آیا تھا۔ میں تمہیں تسلی دینا چاہتا تھا لیکن تمہیں معلوم ہے کہ میں بہت شرمندہ تھا۔ ہم سب نے خوب ہلا گلا کیا تھا۔ میرے پاس ننھی سی چوٹی گڑبانجی اور یہ میں تمہیں دینا چاہتا تھا۔“

”اور تمہیں یاد ہے،“ مناشا نے اداس مسکراہٹ سے کہا، ”کہ بہت مدت پہلے جب ہم ابھی بالکل بچے تھے انکل نے ہمیں شادی روم میں بلایا تھا؟۔ یہ پرانے گھر کی بات ہے۔ وہاں اندھیرا تھا۔ ہم اندر چلے گئے اچانک وہاں ہمیں اپنے سامنے ایک شخص کھڑا نظر آیا۔“

”جیشی!“ نکورائی نے بغلیں بجاتے ہوئے اس کا فقرہ مکمل کر دیا۔ ”مجھے بالکل یاد ہے! مجھے آج تک معلوم نہیں ہو سکا کہ وہاں واقعی کوئی جیشی تھا یا یہ شخص ہمارا وہم تھا اور یا یہ بات ہمارے ذہنوں میں ڈال دی گئی تھی۔“

”یاد ہے کہ اس کے بال تلکھے اور چٹے سفید تھے اور وہ کھڑا ہمیں گھور گھور کر دیکھ رہا تھا؟“

”سوئیلا، تمہیں یاد ہے؟“ نکورائی نے پوچھا۔

”ہاں، مجھے اس بارے میں کچھ کچھ یاد ہے،“ سوئیلا نے شرماتے لچتے کہا۔

”تمہیں معلوم ہے کہ میں پاپا اور، ما سے اس جیشی کے بارے میں پوچھتی رہی ہوں،“ مناشا نے کہا۔ ”وہ کہتے ہیں کہ جیشی وحشی کوئی نہیں تھا۔ پردیکھا کہ تمہیں وہ یاد ہے!“

”بالکل، مجھے یاد ہے۔ مجھے اس کے دانت اتنی اچھی طرح یاد ہیں جیسے میں نے انہیں ابھی ابھی دیکھا ہو۔“

”یہ کتنی عجیب بات ہے!۔ یوں معلوم ہوتا ہے جیسے یہ کوئی خواب ہو اور یہی بات مجھے پسند ہے۔“

”اور تمہیں یاد ہے کہ ہم بال روم میں انڈے لڑھکار رہے تھے کہ اچانک دو بڑھی کھوٹ عورتیں کہیں سے

عمورار ہوئیں اور وہ قالین کے ارد گرد لٹو کی مانند گھومنے لگیں؟ حقیقت میں ایسے ہوا تھا یا نہیں؟ تمہیں یاد ہے کہ ہمیں

کتنا مزہ آیا تھا؟“

”اور ہاں، تمہیں یاد ہے کہ پاپ نے، جو نیسے اور کوٹ میں ملیوں تھے، کس طرح پورج میں بندوق داغ دی تھی؟“
یوں دہسرت و شادمانی سے سکراتے اپنی یادداشتوں کو کریدتے رہے۔ لیکن یہ کیرسنی کی دل گیر اور افسردہ کن یادداشتیں نہیں تھیں بلکہ یہ اٹھتی جوانی کے شاعرانہ قصبے تھے، ان کے بید ترین ماضی کے وہ تاثرات، جن میں خواب اور حقائق آپس میں گتھم گتھا ہو جاتے ہیں۔ وہ پرسکون انداز سے لطف اندوز ہو رہے تھے اور قہقہے پر قہقہے لگا رہے تھے۔

ہمیشہ کی طرح یہاں بھی سونیا دوسرے دونوں کے مقابلے میں پھسندی رد گئی حار نکہ ان سب کی یادداشتیں مشترک تھیں۔ جو کچھ انھیں یاد آ رہا تھا وہ اسے زیادہ تر بھول چکی تھی اور جو کچھ اسے یاد آیا بھی، وہ اس کے اندر اس قسم کے شاعرانہ جذبات، جن کا انھیں تجربہ ہو رہا تھا، بھار نہ سکا۔ وہ محض ان کی مسرت سے لطف اندوز ہو رہی تھی اور صھوٹ صھوٹ سے اپنے اوپر طاری کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ وہ ان کی گفتگو میں پوری طرح صرف تب شریک ہوئی جب انھوں نے اپنے گھر میں اس کی آمد کے بارے میں باتیں شروع کر دیں۔ سونیا نے انھیں بتایا کہ وہ بکولائی سے کس طرح خوف زدہ ہوئی تھی کیونکہ جو کوٹ وہ پہنچے ہوئے تھا، اس میں موٹی موٹی ڈوریوں پر دوئی ہوئی تھیں اور نرس نے اسے بتایا تھا کہ اسے بھی رسیوں کے ساتھ سی دیا جائے گا۔

”اور مجھے یاد ہے کہ مجھے یہ بتایا گیا تھا کہ تم گو بھی کے پودے کے نیچے پیدا ہوئی تھیں،“ نساٹا نے کہا۔ ”اور مجھے یاد ہے کہ مجھ میں ان کی اس بات پر یقین نہ کرنے کی جرأت نہیں تھی حار نکہ مجھے معلوم تھا کہ یہ درست نہیں ہے اور اس نے مجھے خاصا بے چین کیا تھا۔“

جب وہ آپس میں باتیں کر رہے تھے، سننگ روم کے عقبی دروازے سے ایک نوکرانی نے جھانک کر اندر دیکھا۔

”بلی بی، سرغا، گیا ہے،“ اس نے کانپھوسی کرتے ہوئے کہا۔

”پوہیا، اب اس کی ضرورت نہیں رہی۔ ان سے کہو کہ وہ اسے واپس لے جائیں،“ نساٹا نے کہا۔

ان کی گفتگو کے دوران میں ڈراما اندر آ گیا تھا۔ وہ بریل کے، جو کونے میں کھڑا تھا، قریب چلا گیا۔ اس نے اس کا خلاف اتار اور بریل چھیننا اٹھا۔

”ایڈورڈ کارلج، میرا وہ پسندیدہ نغمہ، جس کی موسیقی فیلڈ نے²⁴ ترحیب دی تھی، بجائیں۔ میں آپ کی بے حد ممنون ہوں گی،“ زرائنگ روم سے کاؤتس کی آواز سنائی دی۔

ڈرامے نے تار چھیڑا اور نساٹا، بکولائی اور سونیا کی طرف متوجہ ہو کر بولا:

”آپ تو جوان لوگ قطعاً کوئی شور و غل نہیں کر رہے!“

”ہاں، ہم ذرا فلسفیانہ گفتگو کر رہے ہیں،“ نساٹا نے ذرا کی ذرا نظریں اٹھا کر کہا اور دوبارہ باتوں میں جست گئی۔

وہ خوابوں کے متعلق بحث کر رہے تھے۔

ڈولر ساز بجانے لگا۔ نٹاشا دبے پاؤں بچوں کے بل میز کے قریب پہنچی، اس نے موسم جی اٹھائی، اسے باہر لے گئی اور خاموشی سے دوبارہ اپنی جگہ آ بیٹھی۔ کمرے میں، خاص طور پر اس جگہ جہاں وہ صوفے پر بیٹھے تھے، اندھیرا تھا لیکن چودھویں کے چاند کی روپوشی روتنی بلند وبالا درپچوں میں سے چھن چھن کر اندر آ رہی تھی اور فرش کو منور کر رہی تھی۔

”تمہیں معلوم ہے؟“ نٹاشا نے ٹکڑی اور سونیا کے قریب کھسکتے ہوئے سرگوشی کی، جب کہ ڈولر، جو نذر ختم کر چکا تھا، ابھی تک دھیرے دھیرے تاروں پر انگلیاں پھیر رہا تھا۔ بظاہر وہ طے نہیں کر پا رہا تھا کہ اسے اب بس کر دینا چاہیے یا کوئی اور نغمہ شروع کر دینا چاہیے۔ ”تمہیں معلوم ہے کہ میرے خیال کے مطابق جب کوئی شخص پرانی یادیں کریدنا چلا جاتا ہے، تو آخر میں ایک وقت، یہاں بھی آ جاتا ہے جب اسے وہ باتیں بھی، جو اس وقت دماغ پذیر ہوئی تھیں جب وہ ابھی اس دنیا میں آیا بھی نہیں تھا، یاد آنے لگتی ہیں۔“

”یہ تنازعہ روح کا مسئلہ ہے؟“ سونیا نے، جو ابھی طالبہ تھی اور جو پڑھتی تھی، ہمیشہ یاد رکھتی تھی، کہا۔ ”مصریوں کا عقیدہ تھا کہ کسی زمانے میں ہماری روہیں جانوروں کے، جسم میں متمکن تھیں اور دوبارہ وہیں لوٹ جائیں گی۔“

”نہیں، میں نہیں مانتی کہ ہم کبھی جانوروں کے اندر رہتے تھے؟“ نٹاشا نے کہا۔ وہ ابھی تک سرگوشیوں میں باتیں کر رہی تھی حالانکہ موسیقی کبھی کی بند ہو چکی تھی۔ ”لیکن میں اتنا یقیناً جانتی ہوں کہ کبھی ہم کسی دوسری دنیا میں فرشتگان ضرور تھے۔ اور سب ہم یہاں ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ہمیں سب کچھ یاد ہے۔۔۔“

”میں بھی شریک ہو جاؤں؟“ ڈولر نے پوچھا۔ وہ خاموشی سے آیا اور ان کے قریب بیٹھ گیا تھا۔

”اگر ہم فرشتے ہوتے، پھر اتنی پستی میں کیوں گرتے؟“ ٹکڑا لائی نے کہا۔ ”نہیں، میں یہ نہیں مان سکتا۔“

”پستی میں نہیں تمہیں کس نے بتایا کہ ہم پستی میں ہیں؟۔ میں پہلے کیا تھی، مجھے اس کا علم کیسے ہوا؟“

نٹاشا نے بڑے یقین سے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ ”تم جانتے ہو کہ روح فیرقانی ہے۔۔ چنانچہ اگر مجھے ابد تک رہنا ہے، اس کا مطلب یہ ہوا کہ ماضی میں میری کوئی زندگی رہی ہوگی، میں ازل سے موجود رہی ہوں گی۔“

”ہاں، لیکن ہمارے یہ ازل سے ابد کا تصور ذہن میں لانا مشکل ہے؟“ ڈولر نے کہا۔ وہ کچھ یوں مسکراتا نوجوانوں کی گفتگو میں شریک ہو گیا تھا جیسے اس پر کسی حد تک احسان کر رہا ہو لیکن اس کا لہجہ انہیں کی طرح دھیما اور سنجیدہ تھا۔

”ازل سے ابد کا تصور ذہن میں لانا کیوں مشکل ہے؟“ نٹاشا نے کہا۔ ”آج کے بعد کل آنے گا اور کل کے بعد پرسوں۔ یونہی یہ سلسلہ ہمیشہ چلتا رہے گا اور اسی طرح آج سے قبل کل تھا اور کل سے قبل پرسوں۔۔۔“

”نٹاشا، اب تمہاری باری ہے۔ مجھے کوئی گیت سناؤ؟“ انہیں کاؤنٹس کی آواز سنائی دی۔ ”یہ تم لوگ اس طرح کیوں بیٹھے ہو؟ کوئی سازش ہو رہی ہے؟“

”ماما، میرا نکل جی نہیں چاہتا؟“ نٹاشا نے کہا، تاہم وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

”ان میں سے کوئی بھی، یہاں تک کہ ادھیڑ عمر ڈال رہی، گنگو کو ختم کرنا اور سنگ روم کے اس کوٹے سے اٹھنا نہیں چاہتا تھا، لیکن ناشا اٹھ کر کھڑی ہو گئی اور گولائی کلاوی کارڈ کے سامنے جا بیٹھا۔ ناشا سب معمولی بس روم کے عین درمیان میں چلی گئی اور اس نے وہ جگہ، جہاں سے آواز بہترین انداز سے سنوائی جاسکتی تھی، منتخب کر لیا۔ اب وہ اپنی والدہ کا پسندیدہ گیت گانے لگی۔

اس نے کہا تھا کہ اس کا گانا گانے کو جی نہیں چاہتا، لیکن جس انداز سے وہ اس شام گائی، اس طرح اسے گائے میں بیت چکی تھیں اور بدلتی بیت جاتا تھیں کہ اس نے پھر اس طرح گانا گانا تھا۔ کاؤنٹ الیا آندر بیچ کو سٹڈی روم میں، جہاں وہ متکا کے ساتھ باتیں کر رہا تھا اس کی آواز سنائی دی۔ سکول کے کسی طالب علم کی طرح جسے اپنا آموختہ یاد کرنے کی جلدی ہوتی ہے کہ اس نے کھینچے جانا ہوتا ہے، کاؤنٹ بھی ان احکام میں وجود اپنے شیوارڈ کو دے رہا تھا، گڑبڑا گیا اور آخر کار بالکل خاموش ہو گیا۔ متکا، جو اس کے رو برو کھڑا تھا، وہ بھی غور سے سننے اور مسکرانے لگا۔ گولائی، اپنی نظرس اپنی بہن کے چہرے سے نہ ہٹا سکا۔ وہ اس کی گائیکی کے دوران میں دم سادھ لیتا اور تب سانس بیتا جب وہ رکتی۔ سوئی سماعت کے دوران میں سوچ رہی تھی کہ اس کے اور اس کی بہن کے مابین کتنا عظیم فرق ہے اور یہ کہ اس کے لیے اپنی کزن کی طرح مسکور کن بننا کتنا ناممکن ہے۔ متکا ڈنٹس کے چہرے پر سرور آگئیں لیکن اس مسکراہٹ تھی اور اس کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔ کبھی کبھار وہ اپنا سر ہلادیتی۔ اسے ناشا کی اور اپنی دونوں کی جوانی یاد آ رہی تھی اور یہ کہ پرنس آندرے کے ساتھ متوقع شادی میں کوئی نہ کوئی ایسی بات ضرور تھی جو ہوں ناک اور غیر فطری تھی۔

ڈالر، جو کاؤنٹس کے قریب جا بیٹھا تھا، آنکھیں موندے میں رہا تھا۔

”آہ، کاؤنٹس،“ اس نے آخر کار کہا، ”اس کا یہ ہنر یورپی ہے۔ اسے کچھ سیکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ کیا ملاحت، کیا مٹھاس، کیا توانائی ہے۔“

”اف، میں اس کے بارے میں کتنی خوف زدہ ہوں، کتنی خوف زدہ ہوں!“ کاؤنٹس نے کہا۔ اسے یہ حساس ہی نہیں تھا کہ وہ کس کے ساتھ باتیں کر رہی ہے۔

اس کی مادرانہ جبلت اسے بتا رہی تھی کہ ناشا میں کوئی چیز ضرورت سے کہیں زیادہ ہے اور محض اس کی وجہ سے وہ خوش و خرم نہیں رہ سکے گی۔

چوتھو اس کے کہ ناشا گانا ختم کرتی، چودہ سالہ چپا، جس پر بیچنی کیفیت طاری تھی، ابھ گیا دوڑتا کمرے میں داخل ہوا اور اس نے بتایا کہ سوانگی آگئے ہیں۔

ناشا نے اپنا گانا سچ میں ختم کر دیا۔

”Idiot“ اس نے چل کر اپنے بھائی سے کہا۔ پھر وہ ایک کرسی کی طرف ہلکی اور اس پر گر پڑی۔ وہ اتنا زار و تظار رہی تھی کہ اسے اپنی سسکیوں پر قابو پانے میں خاص وقت صرف کرنا پڑا۔

”اما، کوئی بات نہیں، بالکل کوئی بات نہیں، بس چپا نے مجھے ڈرا دیا تھا۔“ وہ بولی۔ اس نے سکر نے کی کوشش کی لیکن اس کے آنسو تھے کہ تھمتے کا نام ہی نہ لیتے تھے اور سسکیوں سے اس کا گلہ بندھ گیا تھا۔

سوانگی (اصل میں یہ خانگی ملازمین تھے، انھوں نے ریچھوں، ترکوں، کلا لوں اور ناست پسند خواتین کے سوانگ بھر رکھے تھے۔ ان کی شکلیں مضحک بھی تھیں اور مرعوب کن بھی۔ وہ ابتداً جھپٹتے جھپٹتے پیش دلائل میں سٹ سٹا کر کھڑے ہو گئے اگر چہ ان کے انگ انگ سے شگفتگی لپک رہی تھی، لیکن جس انداز سے وہ اندر آئے اور کھڑے ہوئے اس سے احساس ہوتا تھا کہ باہر بہت سردی ہے)۔ پھر وہ ایک دوسرے کے پیچھے چھپتے چھپاتے دھکم پیل کرتے بال روم میں آ موجود ہوئے۔ وہاں شروع شروع میں وہ ذرا لیے دیے رہے، تاہم ان کی خوشی میں اور زندہ دلی میں بتدریج اضافہ ہونے لگا اور وہ گانے بجانے، ناچنے کودنے اور کرسی سے متعلق کھیلیں کھیلنے لگے۔ کاؤنٹس انھیں پہچاننے اور ان کی وضع قطع پر ہنسنے کے بعد واپس ڈرائنگ روم میں چلی گئی۔ کاؤنٹ بال روم میں ہی بیٹھ گیا۔ اس کے چہرے پر چمکتی دیکتی مسکراہٹ تھی اور وہ سوانگیوں کی تعریفیں کر رہا تھا۔ نوجوان رفو چکر ہو چکے تھے۔ کوئی نصف گھنٹہ بعد بال روم میں سوانگیوں کے مابین ایک ضعیفہ نظر آئی۔ اس کی سکرٹ کے اندر لپک دار تار کا چکر لگا ہوا تھا تا کہ وہ اٹھی اور پھیلی رہے۔ یہ نکولا کی تھا۔ چپا ترک رو شیزہ، ڈاکٹر سخرے ہنسا تھا ہونا اور سوانگی جس نے اپنی بھویں اور مونچھیں سوختہ کارک سے بنائی تھیں، سرکیشیائی باشندے کے بھیس میں تھی۔

جب وہ شخص خاص، جو اس سوانگ سازی میں شریک نہیں ہوئے تھے، نوجوانوں کو دیکھ کر اپنی جھوٹ موٹ کی حیرت کا اظہار کر چکے اور انھیں بتا چکے کہ اگر چہ انھوں نے انھیں خوب بے وقوف بنایا ہے، تاہم وہ انھیں ان بہرہ پوں میں دیکھ کر بہت خوش ہوئے ہیں، نوجوانوں نے فیصلہ کیا کہ ان کے پہناوے اتنے عمدہ ہیں کہ انھیں ان کی کسی اور جگہ نمائش کرنا چاہیے۔

چونکہ سکرٹوں کی حالت بہت اچھی تھی، نکولا کی نے جو اپنی ٹرویگا میں گھومنا پھرنا چاہتا تھا، تجویز پیش کی کہ انھیں اپنے ساتھ دس بارہ غلام، جنھوں نے سوانگ بھرا ہوا تھا، ساتھ لے لینا اور ”چپا“ کے ہاں چلنا چاہیے۔

”نہیں، بڑے میاں کو پریشان کرنے کی کوئی ضرورت نہیں!“ کاؤنٹس نے کہا۔ ”اگر جانا ہی ہے، پھر میلو

کوفوں کے ہاں چلے جاؤ۔“

مادام میلو کو دایہ تھی۔ وہ ہر عمر کے بچوں، ان کے ٹیوٹروں اور گورنروں کے ساتھ رستوں سے تقریباً تین میل دور رہتی تھی۔

”ہاں، ma chere یہ بہت اچھی تجویز ہے۔“ ماسٹر کاؤنٹس نے پھرتی سے عگرہ لگائی۔ ”میں جنگی بھلنے کیڑے تبدیل کر لوں گا اور ان کے ساتھ جاؤں گا۔ اگر مجھے دیکھ کر پاشیت کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی نہ رہیں، تو میرا ذمہ“ لیکن کاؤنٹس اس کے جانے پر رضا مند نہ ہوئی کیونکہ گزشتہ کئی دن سے اس کی ٹانگ لٹیک نہیں تھی۔ چنانچہ یہ فیصلہ کیا گیا کہ کاؤنٹس تو ان کے ساتھ نہیں جائے گا، لڑکیاں البتہ جاسکتی ہیں بشرطیکہ لویسیا ایوانووا (مادام شوں)

اس کا ساتھ دینے کی ہامی بھر لے۔ سو نیا، جو عام طور پر شرمائی گھبرائی رہتی تھی اور کم ہی بات کرتی تھی، مادام شوس سے اصرار کرنے میں سب سے پیش پیش تھی۔

سب سے بہترین پہناوا سو نیا کا تھا۔ اس کی بھوئیں اور مونچھیں غیر معمولی طور پر اس پر بھبھ رہی تھیں۔ ہر شخص اسے بتا رہا تھا کہ وہ بہت خوبصورت دکھائی دے رہی ہے اور وہ خود بھی خلاف معمول بہت چاق چوبند اور تیز طرار نظر آ رہی تھی۔ کوئی باطنی آواز اسے سمجھ رہی تھی کہ اس کا معاملہ ”اب یا پھر کبھی نہیں“ کا ہے، آج اس کی ہتھیر کا فیصلہ ہو کر رہے گا اور اپنے مردانہ بھیس میں وہ بالکل مختلف دکھائی دے رہی تھی۔ لویسا ایوانوونانے ساتھ جانے پر آمادگی کا اظہار کر دیا۔ آدھ گھنٹے بعد چارٹرویگا نکلیں، جن کی گھنٹیاں ٹھنکنار ہی تھیں، اور جن کے چوہی تختے،²⁸ جن پر برف گاڑی پھسلتی ہے، چرچا رہے اور زمانے کی آوازیں پیدا کر رہے تھے، پورج میں آکھڑی ہوئیں۔

کرسمس کی چھٹیوں کی چھلوں، ہنسی مذاق اور دل لگیوں کی بتدا نشانہ سے ہوئی، بتدریج ایک سے دوسرا اور دوسرے سے تیسرا ان کی لپیٹ میں آنے لگا، ہر لمحے ان کی بے لگامی اور شوریدہ سری میں اضافہ ہوتا رہا۔ جب وہ تباہستہ ہو، میں آئے اور برف گاڑیوں میں سوار ہوئے، ان کا شور و غل نقہ عروج پر پہنچ گیا۔ وہ زور زور سے باتیں کر رہے تھے، ایک دوسرے کو پکار رہے تھے قہقہے لگا رہے تھے اور اپنے غل غپاڑے سے آسمان سر پر اٹھا رہے تھے۔ دوئریگا نکلیں وہ برف گاڑیاں تھیں جو گھریلو کاموں کے لیے استعمال ہوتی تھیں۔ تیسری کاؤنٹ کی تھی۔ اس کا درمیان کا گھوڑا گاڑیوں کی دوڑوں میں حصہ لیا کرتا تھا اور آریلوں کے گھوڑی پال فارم سے خریدا گیا تھا۔ چوتھی گاڑی ٹکروائی کی اپنی تھی۔ اس کا درمیانہ گھوڑا نیٹا کوتاہ قامت تھا اور اس کے جسم پر موٹے موٹے بال تھے۔ ٹکروائی نے ضیف کی سکرٹ پر اپنا ہوزاروں کا اور کوٹ پہن لیا تھا۔ وہ ہاتھوں میں لگا میں تھا۔ گاڑی کے مین درمیان میں کھڑا تھا۔

روشنی اتنی زیادہ تھی کہ اسے گھوڑوں کے، جو پورج کی چھت کے سائے میں غل غپاڑا بچاتے اشخاص کو دیکھ کر بدک رہے تھے، دھاتی ساروسامان اور اس کی آنکھوں میں منعکس ہوتی نظر آ رہی تھی۔

نشاہ، سو نیا، مادام شوس اور دونو کرانیاں ٹکروائی کی برف گاڑی میں سوار ہو گئیں۔ ڈیڑھ اس کی اہلیہ اور پٹیا کاؤنٹ کی گاڑی میں بیٹھ گئے۔ باقی سوانگیوں نے دوسری دو گاڑیوں میں نشستیں سنبھال لیں۔

”واخار، آگے آگے تم چلو،“ ٹکروائی نے اپنے باپ کے کوچوان کو چلا کر حکم دیا تا کہ سڑک پر پہنچنے کے بعد اسے اپنی گاڑی دوڑانے اور اس کی گاڑی سے آگے نکل جانے کا موقع مل سکے۔

کاؤنٹ کی سوانگی گاڑی، جس میں ڈیڑھ اس کی پارٹی کے دیگر افراد سوار تھے، چل پڑی۔ اس کے چوہی تختے یوں چرچا رہے تھے جیسے وہ بھی جم کر برف بن گئے ہوں۔ اس کی تھن، جس کی آواز بھاری تھی، ٹھنکنار ہی تھی۔ اس کا اس گھوڑا زور لگا کر ہم کے قریب ہو گیا۔ اس کے پاؤں برف میں، جو چھنی کی طرح سخت اور منور تھی، دھنسے جا رہے تھے ورنہ اسے ٹھوکریں مار مار کر اڑا رہا تھا۔

نکولائی پہلی سہاپسی گاڑی کے پیچھے چل پڑا۔ دوسری دونوں، جن کے چوبی تختے سٹوں کی طرح جھم پکار کر رہے تھے، اس کا تعاقب کرنے لگیں۔ شروع شروع میں سڑک تنگ تھی اور ان کی رفتار بھی معتدل تھی۔ جب وہ باغ کے برابر سے گزر رہے تھے، تنگے نیچے درختوں کے سائے سڑک پر پڑنے لگے اور یوں وہ مہتاب کی تیز روشنی کو دھندلانے لگے، لیکن جونہی انھوں نے باز عبور کی، انھیں اپنے سامنے ساکن بر فیلا میدان، جو روشن دتاباں چاندنی میں ہیروں کی مانند جگمگا رہا اور نیلگوں آب دتاب دکھارہا تھا، دور دور تک پھیلا نظر آیا۔

دھم، دھم۔ پہلی گاڑی برف کے اندر گڑھے میں دھنس گئی۔ دوسری اور تیسری نے بھی اسی طرح بچکولے کھائے۔ اس کے بعد وہ یکے بعد دیگرے بھونڈے انداز سے گلیبھر خاموشی کو توڑتی سڑک پر پھیلنے لگیں۔
 ”خرگوش کے پاؤں کے نشانات... بے شمار نشانات!“ بخ بستہ ہوا میں مٹا شاک آواز گونجی۔
 ”نکولس، رات کتنی روشن ہے!“ سونیا کی آواز آئی۔

نکولائی نے اچھتی سی نظر سونیا پر ڈالی اور وہ نیچے جھک گیا تاکہ اس کے چہرے کو قریب سے دیکھ سکے۔ یہ بالکل نیا اور دل پذیر چہرہ تھا۔ اس پر سیاہ بھوئیں اور سوچھیں تھیں۔ سونیا نے جو سیاہ سموری کوٹ پہن رکھا تھا یہ اس میں سے اس کی طرف جھانک رہا تھا۔ روپیلی روشنی میں یہ اتنا قریب، بھر بھی اتنا دور تھا۔
 ”یہ سونیا ہوا کرتی تھی؟“ نکولائی نے سوچا۔ اس نے اسے اور قریب سے دیکھا اور مسکرا دیا۔
 ”نکولس، کیا بات ہے؟“

”کچھ نہیں،“ اس نے جواب دیا اور گھوڑوں کی طرف متوجہ ہو گیا۔

جب وہ بڑی سڑک پر، جسے برف گاڑیوں نے رگڑ رگڑ کر چکا دیا تھا اور جسے گھوڑوں کے کھردرے نعلوں نے، جن کے روپیلی روشنی میں جگہ جگہ نشانات نظر آ رہے تھے، جگہ جگہ سے کاٹ دیا تھا، پہنچے گھوڑے باگیں بڑانے اور اپنی مرضی سے اپنی رفتار تیز کرنے لگے۔ دائیں طرف کے گھوڑے نے اپنی گردن کو کمان کی طرح خم دیا اور پوہ چلنے لگا۔ یوں اس کی راسوں پر زور پڑنے لگا، اور وہ قریب قریب ٹوٹنے لگیں۔ درمیان کا گھوڑا دائیں بائیں جھول رہا تھا۔ اس نے اپنے کان یوں کھڑے کر لیے تھے جیسے وہ یہ پوچھ رہا ہوں ”کیا ہم ہواسے باتیں کرنے لگیں یا ابھی بہت وقت ہے؟“ سب سے اگلی گاڑی، جسے ذخار ہانک رہا تھا، پہلے ہی کافی آگے نکل چکی تھی اور اب اس کے اور باقی گاڑیوں کے مابین فاصلہ مزید بڑھتا جا رہا تھا، اس کی گھنٹی کی آواز دور سے دور تر ہوتی جا رہی تھی اور سفید برف کے بالقابل اس کے سیاہ گھوڑے صاف دکھائی دے رہے تھے۔ ذخار کے ساتھ جو سواکچے بیٹھے تھے ان کے پیچھے چلانے اور ہنسنے ہسانے کی آوازیں صاف سنائی دے رہی تھیں۔

”میرے جانیر!“ نکولائی نے لگائیں ایک طرف کھینچتے اور اپنا چابک ہوا میں لہراتے ہوئے اپنے گھوڑوں سے چلا کر کہا۔

جس شدت سے ہوا ان کے چہروں سے ٹکرا رہی تھی اور اپنی رفتار میں اضافہ کرنے کی غرض سے گھوڑے

جس انداز سے اپنی باگوں پر زور دے رہے تھے، ان دونوں چیزوں سے انھیں یہ اندازہ ہو رہا تھا کہ برف گاڑی کتنی سرعت سے بھاگی جا رہی ہے۔ نکولائی نے مڑ کر پیچھے نگاہ ڈالی۔ عجبی گاڑیاں چیخ پکار کرتی، چرچاتی اور چابک، جو درمیانے گھوڑوں کو اپنی رفتار بڑھانے پر مجبور کر رہے تھے، ہو میں لہرائی، سرپٹ اس کے پیچھے بھاگی آرہی تھیں۔ اس کا اپنا درمیان گھوڑا مسلسل آگے پاؤں بڑھا رہا تھا اور اس بات کا قطعاً کوئی عندیہ نہیں دے رہا تھا کہ وہ اپنی رفتار کم کرنا چاہتا ہے بلکہ یوں نظر رہا تھا کہ اگر ضرورت پیش آئی تو وہ اپنی رفتار مزید تیز کر دے گا۔

نکولائی پہلی گاڑی کے قریب ہونے لگا۔ وہ ایک ڈھلوان سے نیچے اترے اور خاصی کشادہ لیکن پاماس مزگ پر، جو دریا کے قریب چراگاہ کے پتھروں سے گزرتی تھی، چڑھ گئے۔

”ہم کہاں جا رہے ہیں؟“ نکولائی کی سمجھ میں نہیں رہا تھا۔ ”یہ کہیں کوسائی چراگاہ تو نہیں؟ پر نہیں۔ یہ جگہ تو میں نے پہلے کبھی دیکھی ہی نہیں۔ یہ کوسائی چراگاہ نہیں درندہ یہ دیا مکن پہاڑی ہے۔ خدا معلوم یہ کون سی جگہ ہے ایہ کوئی نیا اور سحر زدہ مقام ہے۔ خیر، کوئی بات نہیں۔“ اور وہ با آواز بلند اپنے گھوڑوں کو ہنکارنے اور اپنی اور پہلی گاڑی کے مابین فاصلہ کم کرنے لگا۔

زاخار نے اپنے گھوڑے روک لیے اور پیچھے مڑ کر دیکھنے لگا۔ پالے سے اس کا چہرہ بھوڑوں تک سفید ہو چکا تھا۔ نکولائی نے اپنے گھوڑوں کی باگیں ڈھیلی چھوڑ دیں۔ زاخار نے بازو آگے بڑھائے اور اس نے بھی اپنے گھوڑوں کی لگامیں ڈھیلی چھوڑ دیں۔ وہ انھیں کسانے اور اپنی رفتار بڑھانے کے لیے چٹاخ چٹاخ کی آوازیں نکال رہا تھا۔

”آقا، ذرا سنبھل کر!“ اس نے چلا کر نکولائی سے کہا۔

نکولائی نے اپنے گھوڑے پوری رفتار سے سرپٹ دوڑا دیے اور زاخار سے آگے نکل گیا۔ گھوڑوں کی ٹھوکروں سے باریک اور خشک برف رُتی اور سوار یوں کے چہروں پر جا پڑتی۔ ان کے قریب گھنٹیاں بھنپنا رہی تھیں اور جس سے ایسی گاڑی کے برابر سے وہ گزر رہے تھے، اس کا سایہ اور گھوڑوں کی صاف رفتار ٹانگیں انھیں گھنٹہ سے انداز سے نظر آرہی تھیں۔ مختلف اطراف سے گاڑیوں کے تختوں کے برف سے لکرانے اور جھنجھٹانے اور لڑکیوں کی چیخ پکار کی آوازیں ان کے کانوں سے ٹکرارہی تھیں۔

نکولائی نے ایک بار پھر اپنے گھوڑوں کی رفتار دھیمی کی اور اپنے گرد و پیش نظریں دوڑائیں۔ چاروں اطراف ظلم زدہ میدان، جو مہتابی روشنی میں نہایا ہوا تھا اور جس پر ستارے بکھرے ہوئے تھے، بھیلایا ہوا تھا۔

”زاخار مجھے آوازیں دے رہا ہے کہ مجھے بائیں طرف مڑنا ہے لیکن بائیں طرف کیوں؟“ نکولائی کو تعجب ہو رہا تھا۔ ”کیا ہم واقعی سیلیو کوفوں کی طرف جا رہے ہیں؟ کیا یہ واقعی سیلیو کوکا ہے؟ خدا جانے ہم کہاں جا رہے ہیں۔ اور خدا جانے ہمارے ساتھ کیا اداوات بیت رہی ہے لیکن یہ جو کچھ بھی ہے، ہے بہت عجیب اور شاندار۔“ اور وہ اپنی برف گاڑی میں چاروں اطراف نظریں دوڑانے لگا۔

”دیکھو۔ اس کی سوچیں اور بھوئیں بالکل سفید ہیں،“ نرالی، حسین اور نامانوس صورتوں میں سے، جو اس

کے قریب بیٹھی تھیں، ایک نے۔ وہی جس کے نفیس ابرو اور مونچھیں تھیں۔ کہا۔

”میرا خیال ہے کہ وہ ناشا تھی؟“ نکولائی نے سوچا۔ ”اور وہ مادام شوس ہے، پر شاید نہیں۔ اور وہ جو مونچھوں والی سرکیشیائی ہے، میں اسے پہچان نہیں سکا لیکن میں اس سے محبت کرتا ہوں۔“

”تمہیں سردی تو نہیں لگ رہی؟“

انہوں نے کوئی جواب نہ دیا لیکن وہ ہنسنے لگیں۔ پچھلی گاڑی سے ڈمر نے چلا کر کچھ کہا۔ اس نے جو کچھ کہا تھا غالباً کوئی دلچسپ بات تھی لیکن اس کے پے کچھ نہ پڑا۔

”ہاں، ہاں،“ متعدد ہنستی کھٹکھٹاتی آوازوں نے جواب دیا۔

لیکن اب وہ کسی سحر زدہ جنگل میں داخل ہو چکے تھے۔ وہاں تاریک سائے آنکھ بھولی کھیل رہے تھے، کبھی ادھر نظر آتے اور کبھی ادھر۔ ہیروں کی خیرہ کن جگمگاہٹ تھی، سنگ مرمر کی سیڑھیاں تھیں، پرستان کی عمارتوں پر روہیلی چھتیں تھیں، در کسی قسم کے رندوں کی ٹیکھی آوازیں۔

”اگر یہ واقعات یلو کو فوں کا مسکن ہے، پھر تو یہ اور بھی عجیب و غریب بات ہے۔ خدا جانے ہم کہاں پھرتے پھرتے رہے اور آخر یہاں یلو کوڈ کا پہنچ گئے،“ نکولائی نے سوچا۔

یہ واقعی یلو کوڈ کا تھا۔ نوکر نوکر نیاں موسم بتیاں اٹھائے پورج کی طرف بھاگے آرہے تھے، ان کے چہرے خوشی سے تھمارہے تھے۔

”کون ہے؟“ صدر دروازے میں سے کسی نے پوچھا۔

”کاؤنٹ کے ہاں سے سونگے آئے ہیں۔ میں ان کے گھوڑے دیکھ کر بوجھ سکتا ہوں،“ متعدد آوازوں نے جوابا کہا۔

11

پہلا گیا دانیل وٹا میلیر کوڈا چوڑی چٹکی اور مستعد و پر جوش عورت تھی۔ وہ چشمہ لگائے درمھیلا ڈھالا ڈرہیں پہے ڈرائنگ روم میں بیٹھی تھی۔ اس کے ارد گرد اس کی بیٹیوں نے ہجوم کر رکھا تھا اور وہ انھیں خوش کرنے کی بھرپور کوشش کر رہی تھی۔ وہ پیپ چاپ پگھلی ہوئی موسم کے قطرات پانی میں انڈیلنے اور موسمی اشیاء کے عکس دیکھنے میں خود تھیں کہ انھیں ہال میں مہمانوں کے قدموں کی آہٹ اور ان کی باتوں کی آوازیں سنائی دیں۔

ہوزاروں، طرح دار خوش، تین، چادوگر نیوں، مسخروں اور ریتھپوں نے کھٹاکر اپنے گلے صاف کیے، اپنے چہروں سے بخ بستہ شبنم جھڑی اور بال روم میں، جہاں بھگم بھاگ موسم بتیاں روشن کر دی تھیں، داخل ہو گئے۔ مسخروں۔ ڈطرا اور خاتون۔ نکولائی نے رقص شروع کر دیا۔ سوانگی، جو چیختے چلاتے بچوں کے مابین کھڑے ہوئے تھے، اپنے چہروں پر نقائیں اوڑھے اور اپنی آوازیں چھپائے پٹی میزبان کے سامنے جھک کر آداب بجالائے

اور کمرے میں بکھر گئے۔

”ارے، انہیں پہچاننا ناممکن ہو رہا ہے! اتنا، سا شاہ کس سے مشابہ ہے؟ اسے دیکھ کر مجھے واقعی کوئی یاد آ گیا ہے! اور یٹرورڈ کارٹیج (ڈور) اپنے بھیس میں کتنے ایسے لگ رہے ہیں! مجھ سے تو وہ پہچانے ہی نہ گئے۔ ارے واہ، کیا دلفریب رقص ہے! ان کا ’انف‘ میرے غدا یا! اس سرکیشیا کی کودیکھو! سونیو شکا پر اس کا بھیس کیسا اچھا ہے! اور یہ کون ہے؟ خیر، تم لوگوں نے ہمارے دل خوش کر دیے ہیں۔ نکلتا، وانیا، یہ بیزس یہاں سے اٹھالو۔ اور ایک ہم ہیں کہ یہاں چپ گھڑپ بیٹھے تھے۔“

”ہا ہا ہا، وہ ہوزار، ادھر، وہ ہوزار! بالکل چھوکر معلوم ہوتا ہے۔ اور ٹانگیں... مجھ سے وہ دیکھا ہی نہیں جاتا!“
 مختلف آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔

ناتشا، جو کہ سیلج کو دا کے بچوں میں بہت مقبول تھی، ان کے ساتھ عقبنی کروں میں غائب ہو گئی۔ وہاں سوختہ کارک، طرح طرح کے ڈریسنگ گاؤں اور مردانہ ملبوسات منگوائے گئے اور دروازے کی وٹ میں کھڑی کم سن، محصوم اور بھولی بھالی بڑکیوں نے بازو پھیلا پھیل کر انہیں دردی پوش ملازمین سے دسوں کر لیا۔ دس منٹ بعد سیلج کو دا کی بیٹیاں سوانگیوں میں جا شامل ہوئیں۔

پیلا گیا دانیل و دانا اپنے مہمانوں کے لیے جگہ خالی کرانے اور شرقا اور ملازمین دونوں کی خاطر تواضع کا سامان فراہم کرنے کے بعد سوانگیوں کے مابین گھومنے پھرنے لگی۔ وہ بھی بیک چشمہ لگائے ہوئے تھی اور دبی دبی سکرابٹ سے بغور، ن کے چہرے دیکھ رہی تھی لیکن کسی کو بھی پہچان نہیں پا رہی تھی۔ وہ نہ صرف رستوں اور ڈنر کی شناخت میں ناکام رہی، بلکہ وہ اپنی بیٹیوں کو بھی نہ پہچان سکی اور نہ اسے اپنے مرحوم خاوند کے ڈریسنگ گاؤں اور حدودوں کا جو وہ پہنے ہوئے تھیں، کچھ پتا چل سکا۔

”اور یہ کون ہو سکتا ہے؟“ اس نے گورنس سے مخاطب ہو کر اور اپنی ہی بیٹی کے، جس نے قازنی تاتار کا بھیس مار کھا تھا، چہرے پر نگاہیں گاڑ کر کہا۔ ”یہ لڑکا کوئی رستوف ہوگا! ہونہ، ہسٹر ہوزار، تمہارا کس رجسٹ سے تعلق ہے؟“ اس نے ناتشا سے پوچھا۔ ”ارے بھئی، اس ترک کوڑکی مٹھائی کھلاؤ نا۔“ اس نے اپنے بٹلر کو، جو شروبات و ماکولات لیے لیے پھر رہا تھا، حکم دیا۔ ”ان کی شرع میں یہ چیز یقیناً حرام نہیں ہے۔“

بعض اوقات جب پیلا گیا دانیل و دانا قاصوں کو، جو یکبارگی یہ تہیہ کر چکے تھے کہ وہ اپنے فینسی ڈریسوں میں کسی شخص کو بھی اپنی حقیقت کے بارے میں علم نہیں ہونے دیں گے، در تمام شرم و حجاب کو ہلائے طاق رکھ چکے تھے، عجیب و غریب اور مضحکہ خیز اچھل کود کرتے دیکھتی، وہ پناچہ ردماں میں چھپا لیتی اور اس کا سارا فرہ جسم، سر سے پاؤں تک، ایسی ہنسی سے، جو بزرگانہ اور ہر شرم کے کینے اور بغض سے پاک تھی اور جس پر قابو پانا اس کے لیے ناممکن تھا، کا پنے لگتا۔

”میری ننھی سرشا! میری ننھی ساشا! میری ننھی ساشا کو دیکھو۔“ اس نے با آواز بلند کہا۔

جب روم کے دیہاتی اور لوک رقص ختم ہو گئے، پیلا گیا دانیو دنانے تمام شرفا اور ملازمین کو خاصے بڑے دائرے کی شکل میں کھڑا کر دیا۔ ایک انگٹھی، ایک رسی اور ایک چاندی کا روٹل منگو یا گیا اور دس سب مل جل کر مختلف اقسام کے کھیل کھیلنے لگے۔

کوئی یک کھینے کی بھگ دوڑ اور چھل کود کے بعد ملبوسات تراش گئے اور وہ بے ترتیب ہونے لگے۔ پیچے سے شرابور، تھمتھاتے اور ہستے مسکراتے چہروں پر، بھوئیں اور مونچھیں، جو سوختہ کارکوں سے بنائی گئی تھیں، دھبوں کی صورت اختیار کر گئیں۔ پیلا گیا دانیو دنا بہرہ پیوں کو پیچھے جتنے لگی۔ انھوں نے جس مہارت اور چابک دستی سے ہمیں بدے تھے، ان کی تعریف میں اس نے کسی نجل سے کام نہ لیا۔ وہ انھیں بنارہی تھی کہ وہ ان سب پر، خاص طور پر نوجوان لڑکیوں پر، خوب سچ رہے ہیں۔ اس نے ان سب کا جی کھول کر شکر یہ ادا کیا کہ انھوں نے اتنے اچھے تربیت سے اس کے لیے تفریح کا سامان بہم پہنچایا تھا۔ مہمانوں کو ڈرائنگ روم میں پرکھانے کی دعوت دی گئی اور غلاموں کو بال روم میں کھلایا یا بلایا گیا۔

”اگر کسی شخص کو اس کی قسمت کا حال سونے غسل خانے میں بتایا جائے۔ اس سے زیادہ ڈراؤنی بات اور کوئی ہو ہی نہیں سکتی،“ ایک بوڑھی خادمہ نے، جو میسز کو فوں کے ہاں رہتی تھی، سپر کے دوران میں کہا۔

”کیوں؟“ میسز کو فوں کی سب سے بڑی بیٹی نے دریافت کیا۔

”افوہ، آپ نہیں جانتیں گی۔ اس کے لیے بڑے حوصلے کی ضرورت ہے۔“

”میں جاؤں گی،“ سونیانے کہا۔

”آپ بتائیں کہ اس لڑکی کے ساتھ کیا ہوا تھا،“ میسز کو فوں کی دوسری بیٹی نے کہا۔

”خیر، وہ قصہ کچھ یوں تھا،“ بوڑھی خادمہ نے کہا۔ ”نوجوان لڑکی باہر گئی، ایک مرغالائی، اس نے وہ آدمیوں کے لیے دسترخوان بچھایا۔ سب کچھ اسی طرح، جیسے کہ ہونا چاہیے تھا، ہوا۔ اور پھر وہ بیٹھ گئی۔ وہ کچھ دیر یونہی بیٹھی رہی، اچانک اس کے کانوں کو یوں محسوس ہوا کہ کوئی آ رہا ہے۔ گھنٹیاں کھٹکھٹاتی برف گاڑی اس کے دروازے پر آرکی... اسے اس کے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ وہ اندر آ گیا... اس کا پیکر اندنی تھا، بالکل افسر معلوم ہوتا تھا، وہ آیا اور اس کے ساتھ میز کے سامنے بیٹھ گیا!“

”ارخ، ارخ!“ ننا شاد ہشت سے آنکھیں گھماتے چلائی۔

”اور اس نے کیا کیا۔ کیا وہ منہ سے کچھ بولا؟“

”ہاں، بالکل کسی مرد کی طرح۔ سب کچھ بعینہ ایسے ہی، جیسے کہ ہونا چاہیے تھا، ہوا۔ وہ بار بار اس کا دل پیٹنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اسے چاہیے تھا کہ وہ مرغ کی یا بگ تک اسے باتوں میں لگائے رکھتی، لیکن اس کی ہمت جواب دے گئی، بس وہ حوصلہ ہار چکی اور اس نے، پتہ چہرہ اپنے ہاتھوں میں چھپا لیا۔ لیکن پھر... وہ اٹھا اور اس نے اسے دبوچ لیا خوش قسمتی یہ ہوئی کہ میں اسی لمحے خادائیں بھاگتی دوڑتی اندر آ گئیں...“

”چھوڑو، جانے دو، کیوں انہیں ڈرا رہی ہو؟“ پیدا گیا دانیلو دنا نے کہا۔

”پر ماما، آپ خود بھی تو اسی طرح اپنی قسمت کا حال معلوم کرنے کی کوشش کی کرتی تھیں،“ اس کی بیٹی نے کہا۔
”اور آدمی اناج گودام میں اپنی قسمت کا حال کیسے معلوم کرتا ہے؟“ سونیا نے پوچھا۔

”اچھا، فرض کرو کہ تم ابھی اناج گودام میں چلی گئی ہو اور غور سے سن رہی ہو۔ سرادار دنا، راس بات پر ہے کہ تمہیں سنائی کیا دیتا ہے۔ اگر دروازے پر دستک ہو جائے یا کھٹ کھٹ کی آواز آجائے۔ تو یہ براشگون ہو گا۔ ہاں، اگر دنوں کو بھوسے سے الگ کرنے کی آواز کانوں میں آئے۔ تو یہ نیک شگون ہو گا۔ یا بعض اوقات یوں ہوتا ہے۔“

”اما، آپ بتائیں کہ اناج گودام میں آپ کے ساتھ کیا ہوا تھا؟“

پیدا گیا دانیلو دنا مسکرائی۔ ”اوہو، میں بھول گئی ہوں،“ اس نے کہا۔ ”اور مجھے یقین ہے کہ تم میں سے کوئی بھی وہاں نہیں جائے گا۔“

”پیدا گیا دانیلو دنا، میں چاؤں گی، آپ بس مجھے اجازت دے دیں! میں جاؤں گی!“ سونیا نے کہا۔

”بہت اچھا۔ اگر تمہیں ڈر نہیں آتا تو ضرور جاؤ۔“

”لو کیسا ایوانو دنا، مجھے اجازت ہے؟“ سونیا نے پوچھا۔

خود وہ رسی پر انگلی ٹکانے کے کھیل میں مصروف تھی، خواہ روہل گیم میں یا باتوں میں، جیسے کہ وہ اب تھے، نکولائی سونیا کے چوسے بندھا اور اسے بالکل نئی نظروں سے نگاہ کر دیکھتا رہا۔ اسے محسوس ہوا کہ سوختہ کارک کی موچھوں کے طفیل آج وہ یہی مرجہ اسے اس کی اس حیثیت سے، جس کی وہ درحقیقت مالک تھی، پوری طرح شناخت کر سکا ہے۔ اور سچی بات یہ ہے کہ وہ جتنی مسرور، حسین اور طنائز اب دکھائی دے رہی تھی، اتنی کبھی معلوم نہیں ہوئی تھی۔

”تو یہ ہے وہ جو وہ فی الحقیقت ہے! میں بھی کیسی کیسی حقائق کرتا رہا ہوں!“ اس نے سوچا۔ وہ اس کی حکمت گائی آنکھیں اور اس کے چہرے پر برسرت اور وجد آفریں قسم جو اس کی موچھوں تلے اس کے رخسار پر چاہ زخموں کا بار تھا، دیکھ رہا تھا۔ یہ مسکراہٹ اس نے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔

”میں کسی چیز سے نہیں ڈرتی،“ ”میں ابھی جا سکتی ہوں؟“ اس نے اٹھتے اٹھتے پوچھا۔ انھوں نے اسے بتایا کہ اناج گودام کہا ہے، سونیا نے کہا۔ اسے وہاں کیسے خاموش کھڑے ہونا اور کان لگا کر سننا ہے۔ انھوں نے سمور کلبادہ اس کے حوالے کر دیا۔ اس نے وہ اپنے سر اور کندھوں پر ڈال لیا اور اپنی نگاہوں سے نکولائی کی طرف دیکھا۔
”یہ لڑکی کتنی سن بھوؤنی ہے!“ اس نے سوچا۔ ”اور اس سارے عرصے کے دوران میں میں کن خیالوں کے ہائوں بالوں میں مصروف رہا ہوں؟“

سونیا اناج گودام جانے کے لیے غلام گردش کی طرف چل دی۔ نکولائی یہ بتا کر کہ اسے بہت گرمی محسوس ہو

رہی ہے، بہ عجلت سامنے کے پورچ کی طرف روانہ ہو گیا۔ لوگوں کے ہجوم کی وجہ سے مکان میں واقعی دم گھٹنے لگا تھا۔ باہر ابھی تک وہی ٹھنڈک تھی اور وہی چاند تھا لیکن چاندنی پہلے سے زیادہ چھٹک رہی تھی۔ روشنی اتنی تیز تھی اور اتنے کثیر تعداد ستاروں کی وجہ سے برف اتنی جگمگ رہی تھی کہ نگاہ نہ پر نہیں اٹھتی تھی اور آسمان پر جو جتنی ستارے جھلک رہے تھے، آدمی انھیں دیکھ نہیں پا رہا تھا۔ آسمان تاریک اور بے کیف تھا جب کہ دھرتی نور کی کرنوں سے جگمگ جگمگ کر رہی تھی۔

”میں بے وقوف ہوں، حتمی ہوں! آخر میں اتنا عرصہ کس چیز کا انتظار کرتا رہا ہوں؟“ نکولائی نے سہا۔ اور پورچ سے بھاگتے دوڑتے اس نے مکان کے کونے سے سوڑ کاٹا اور اس راستے پر ہولی جو عقی پورچ کی طرف جاتا تھا، وہ جانتا تھا کہ سونیا یہی راستہ اختیار کرے گی۔ اماں گودم کے راستے کے درمیان میں سوختی لکڑی کے برف پوش ڈھیر، جن کا سایہ یہاں وہاں پھیل ہوا تھا، پڑے تھے۔ ان کے پار راستے کے ایک جانب بے برگ درختوں کے درختوں کے سایوں کا جال بنا ہوا تھا۔ چوبی دیواریں اور اماں گودام کی برف پوش چھت ہمیں روشنی میں یوں جگمگ رہی تھی جیسے انھیں قیمتی پتھروں سے تراش کر بنایا گیا ہو۔ باغ میں کبر سے یک درخت چٹا اور دوبارہ چاروں اطراف سناٹا چھا گیا۔ اسے محسوس ہو کہ اس کے پیچھے مڑے اندر ہوا نہیں، بلکہ بدی شباب اور سردی حیات پرورد قوت کھینچ رہے ہیں۔

عقی پورچ سے کسی کے زینے سے نیچے اترنے کی آواز سنائی دی۔ زینے کے آخری قدم پر سے، جس پر برف کا ڈھیر لگا ہوا تھا، چرچراہٹ کی گونج بلند ہوئی اور اس کے بعد ایک بوڑھی خادمہ کی آواز کانوں سے ٹکرائی۔

”مس، بالکل سیدھے آگے، راستے کے ساتھ ساتھ، بس پیچھے مڑ کر نہ دیکھیں!“ وہ کہہ رہی تھی۔

”میں ڈرتی ورتی نہیں،“ سونیا کی آواز سنائی دی اور راستے کے ساتھ ساتھ نکولائی کی جانب سویا کے ننھے نئے

یاؤس کی، جس پر اس نے پتلے پتلے لیپر پہنے ہوئے تھے، چرماتی، چھیں چھیں کرتی چاب سنائی دے رہی تھی۔

لبڈے میں لپٹی لپٹائی سونیا نمودار ہوئی۔ جب وہ اسے دیکھ پائی، وہ اس سے صرف دو قدم دور تھی اور وہ بھی

اب جس نکولائی کو دیکھ رہی تھی، وہ نکولائی وہ نہیں تھا جس سے وہ اب تک آشنا تھی۔ جس سے وہ کچھ کچھ خوف زدہ

رہی تھی۔ وہ سونیا پارچاٹ میں ملبوں تھا، اس کے بازو لیدہ اور پریشان تھے اور اس کے چہرے پر کچھ اس طرح

کی پرمسرت مسکراہٹ تھی جو سونیا کے لیے بالکل نئی تھی۔ وہ اس کی طرف دوڑی۔

”کامل مختلف اور پھر بھی بالکل ویسی کی ویسی،“ نکولائی نے اس کے چہرے کی، جو چاندنی میں چمک رہی

رہا تھا، طرف دیکھ کر سوچا۔ اس نے اپنے بازو اس کے پوشتنی لبادے کے، جس سے وہ اپنا سر ڈھانپے ہوئے تھی،

اندھ گھسیڑ دیے اور اس سے ہم آغوش ہو گیا۔ اس نے سے اپنی جانب بھینچا اور اس کے ہوں پر، جن پر مونچھیں

بیوست تھیں اور جن سے سوختہ کارک کی بو آ رہی تھی، بوسہ ثبت کر دیا۔ سونیا نے اس کے ہونٹوں کا بھرپور بوسہ لیا اور

اپنے ننھے سنے ہاتھوں کو چھڑا کر اس کے رنسا روں کو اپنی گرفت میں لے لیا۔

”سونیا“۔ ”نکولس!“ وہ بس اتنا ہی کہہ سکے۔

وہ بھاگتے دوڑتے اناج گودام پہنچے اور پھر واپس چل دیے۔ وہ مکان میں دوبارہ انہیں راستوں سے، جن سے باہر آئے تھے، داخل ہوئے نکولائی فرنٹ پورج سے اور سونیا بھی پورج سے نکل آئی۔

12

”جب وہ پیلا گیا دانیل وڈنا کے گھر سے روانہ ہوئے، ننا شانے، جس کی نظریں سب کچھ بھانپ لیتی تھیں اور جو ہر بات سے آگاہ رہتی تھی، کچھ یوں انتظام کیا کہ وہ خود اور لونیسا ایوانوونا ڈمر کے ساتھ برف گاڑی میں بیٹھ گئیں جب کہ سونیا نکولائی اور خاندانوں کے ہمراہ چل پڑی۔

وہ پس کے سفر کے دوران میں نکولائی نے گاڑی دوڑانے کے بجائے مہمانہ روی اختیار کی اور وہ پراسرار مہتابی روشنی میں، جو ہر چیز میں تغیر کلی برپا کر رہی تھی، مسلسل کن اکھیوں سے سونیا کو دیکھتا رہا۔ وہ اس چہرے میں ابروؤں اور مونچھوں کے نیچے اپنی سابقہ اور موجودہ دونوں طرح کی سونیا کو، جس سے اس نے کبھی جدا نہ ہونے کا تہیہ کر لیا تھا، تلاش کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

اسے دیکھتے دیکھتے، پرانی، درختی دونوں طرح کی سونیا کو پہچانتے اور سوختہ کارک کی بو کو، جس میں اس کے بوسے کا تبس شامل تھا، یاد کرتے کرتے اس نے غارتہ ہوا میں گہری سانس لی اور اس نے دھرتی، جو ان کے نیچے کھسکتی جا رہی تھی اور آکاش کی، جو ان کے سروں کے اوپر جھنگ رہا تھا، طرف دیکھتے ہوئے محسوس کیا کہ وہ ایک بار پھر طلسم زدہ مملکت میں داخل ہو گیا۔

”سونیا، تیری طبیعت ٹھیک ہے؟“ وہ اس سے گاہے بگاہے پوچھ لیتا۔

”ہاں،“ وہ جواب دیتی۔ ”اور تیرا کیا حال ہے؟“

گھر کا نصف راستہ طے کرنے کے بعد نکولائی نے باگیں کو چوان کے سپرد کر دیں اور خود پیچھے نناشا کی برف گاڑی کی طرف بھاگ پڑا۔ وہ کچھ دیر گاڑی کے بازو پر کھڑا رہا۔

”نناشا،“ وہ فریبیسی میں سرگوشی کرنے لگا۔ ”میں سونیا کے بارے میں قطعی فیصلے تک پہنچ گیا ہوں۔“

”اسے بتا دیا ہے؟“ نناشانے پوچھا۔ اچانک خوشی سے اس کا چہرہ تہمتانے لگا۔

”اُف، ان ابروؤں اور ان مونچھوں کے ساتھ تم کتنی عجیب نظر آ رہی ہو۔ نناشا، تم خوش ہو؟“

”میں؟ اتنی خوش ہوں کہ تمہیں بتا نہیں سکتی! مجھے تو تم پر طیش آنا شروع ہو گیا تھا۔ میں نے تم سے کچھ کہا تو

نہیں تھا لیکن اس کے ساتھ تمہارا رویہ ٹھیک نہیں رہا تھا۔ نکولس، اس نے کیا دل پایا ہے! میں بے حد خوش ہوں!

کبھی کبھی میرا رویہ نہایت بھیانک ہو جاتا ہے لیکن سچی بات یہ ہے کہ جب وہ خوشی سے محروم تھی، مجھے اپنی خوشی پر بڑی

شرم آئے گی تھی،“ نناشانے اپنی بات جاری رکھی۔ ”میں کتنی خوش ہوں! اب بھاگو اور واپس اس کے پاس چلے جاؤ۔“

”نہیں، ایک منٹ ٹھہرو۔ تم کتنی مضحک نظر آرہی ہو!“ نکولائی نے کہا۔ وہ ابھی تک ٹنگلی باندھے اس کا چہرہ دیکھے جا رہا تھا۔ اسے اپنی ہنسی میں بھی کوئی ایسی چیز، جو بالکل نئی تھی، غیر معمولی تھی اور من بھانے کی حد تک پر حلف تھی اور جو اس نے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی، نظر آرہی تھی۔ ”نشا، یہ بالکل طلسمی ہے، ٹھیک ہے؟“

”ہاں،“ اس نے جواب دیا۔ ”تم نے قابل تعریف کام کیا ہے!“

”جن نگاہوں سے سب میں اسے دیکھ رہا ہوں، اگر پہلے دیکھ لیتا،“ نکولائی نے سوچا، ”تو میں مدتوں پہلے اسے بتا چکا ہوتا کہ ہمیں کیا کرنا ہے اور جو کچھ وہ کہتی، میں اسے کر چکا ہوتا۔ یوں سب معاملہ ٹھیک ڈھنگ سے طے ہو چکا ہوتا۔“

”تو تم خوش ہو اور جو کچھ میں نے کیا ہے، ٹھیک کیا ہے؟“

”اوہ، بالکل ٹھیک! کوئی زیادہ دن نہیں ہوئے کہ اس بارے میں ماما سے میری تکرار بھی ہو گئی تھی۔ ماما کہہ رہی تھیں کہ وہ تمہارے لیے پچھلی پھانسی کی کوشش کر رہی ہیں۔ انھیں یہ بات ذہب نہیں دیتی تھی۔ میں نے ماما کے سامنے قریب قریب ہنگامہ بپا کر دیا۔ میں کبھی کسی کو یہ اجازت نہیں دے سکتی کہ وہ سونیا کے بارے میں کوئی بے ہودہ بات کہے یا سوچے کیونکہ وہ مجسم اچھائی ہے، اس کے عداوہ اور کچھ نہیں۔“

”پھر یہ بالکل ٹھیک ہے؟“ نکولائی نے پوچھا اور اس نے یہ جاننے کے لیے کہ جو کچھ وہ کہہ رہی ہے، درست کہہ رہی ہے، ایک بار پھر اس کے چہرے پر تجسسناہ نگاہ ڈالی، تب گاڑی سے نیچے چلا ننگ لگائی اور اپنی گاڑی کی طرف بھاگ اٹھا۔ اس کے قدموں تلے برف چر رہی تھی۔

وہی شاداں و فرحان اور متبسم سرکیشیائی، جس کی مونچھیں اور تاب دار آنکھیں تھیں، وہاں بیٹھا تھا۔ سیاہ کلاہ کے نیچے سے اس کی نگاہیں اسے تکیے جا رہی تھیں۔ وہ سرکیشیائی سونیا تھی اور لا رہی اس مسرورہ خوش مزاج اور الفت کرنے والی دوشیزہ نے مستقبل میں اس کی رہیں بننا تھا۔

جب وہ گھر پہنچ گئے اور اپنی ماں کو بتا چکے کہ میلو کوٹوں کے ہاں انھوں نے اپنا وقت کیسے گزارا تھا، لڑکیوں اپنے کمرے میں چلی گئیں۔ جب وہ اپنے کپڑے تبدیل کر چکیں۔ تاہم انھوں نے سوختہ کارک کی مونچھیں صاف نہ کیں۔ وہ اپنی فرخندگی کے متعلق کافی دیریشی باتیں کرتی رہیں۔ جب ان کی شادیاں ہو جائیں گی، وہ کس قسم کی زندگی گزاریں گی، کس طرح ان کے شوہران کے دوست ہوں گے اور وہ کتنی خوش و شادماں ہوں گی، یہ اور اس قسم کے موضوعات ان کی گفتگو کا محور بنے رہے۔ نشا کی میز پر دو آئینے، جنھیں قسمت کا حال معلوم کرنے کے لیے دنیا شا نے سرشام وہاں ترتیب دیا تھا، ایستادہ تھے۔

”لیکن یہ سب کچھ کب ہوگا؟ مجھے اندیشہ ہے کہ کبھی نہیں۔ یہ بات کچھ زیادہ ہی خوش آئند ہے!“ نشا نے اٹھتے اور آئینوں کی جانب جاتے ہوئے کہا۔

”نشا، بیٹھ جاؤ، شاید تمہیں نظر آجائیں،“ سونیا نے کہا۔

نشاٹا نے سونیا کو بیاں روشن کر دیں اور بیٹھ گئی۔

”مجھے تو کوئی مونچھوں والا نظر آ رہا ہے،“ نشاٹا نے (”میں نے“) اپنے چہرے کو دیکھتے ہوئے کہا۔
”مس، آپ کو یوں مذاق نہیں اڑانا چاہیے،“ دنیاٹا نے کہا۔

نشاٹا نے سونیا اور خادمہ کی مدد سے آئیے ایک دوسرے کے بالمقابل صحیح طور پر نصب کر دیے۔ اس کے چہرے پر سنجیدگی طاری ہو گئی اور وہ بالکل خاموش ہو گئی۔ آئیے میں یکے بعد دیگرے سونیا کیوں کے عکس نظر آنے لگے۔ وہ کافی دیر تک انھیں ٹکٹکی باندھ کر دیکھتی رہی اور (ان کہ نیوں کے مطابق جو اس نے سن رکھی تھیں) اس امر کی توقع کرنے لگی کہ کوئی دم میں اسے دور ترین دھند سے اور غیر واضح چوک میں کوئی تابوت یا وہ، یعنی پرس آندرے، نظر آ جائے گا۔ مگر چہ وہ معمولی سے معمولی دھبے کو بھی انسانی ہوتی یا تابوت سمجھنے کے لیے تیار تھی، اسے کچھ بھی دکھائی نہ دیا۔ اس نے بار بار اپنی آنکھیں جھپکائیں اور پھر آئینوں سے پرے ہٹ گئی۔

”خیرے دوسرے لوگوں کو چیزیں کیوں نظر آ جاتی ہیں اور مجھے کیوں نہیں آتیں؟“ اس نے کہا۔ ”سونیا، اب تم آؤ اور یہاں بیٹھ جاؤ۔ آج رات تمہیں لازماً بیٹھنا ہوگا۔ میری خاطر بیٹھ جاؤ۔ آج رات خوف مجھ پر آسیب بن کر سوار ہو گیا ہے۔“

سونیا آئینوں کے سامنے بیٹھ گئی۔ اس نے اپنا آسن درست کیا اور ان میں جھانکنے لگی۔
”سونیا الیکس ندر ونا کو ضرور یا ضرور کچھ نہ کچھ نظر آ جائے گا۔“ دنیاٹا نے سرگوشی کی، ”لیکن آپ ہمیشہ مذاق اڑاتی رہتی ہیں۔“

سونیا نے یہ بات سن لی اور اس نے نشاٹا کو بھی کھسر پھسر کرتے سنا۔
”مجھے معلوم ہے کہ اسے کچھ نہ کچھ لازماً نظر آ جائے گا اس نے گزشتہ برس بھی کچھ دیکھا تھا۔“
دونوں منٹ وہ سب خاموش رہیں۔

”وہ یقیناً کچھ نہ کچھ دیکھ لے گی!“ نشاٹا نے زیر لب کہا۔ لیکن یہ الفاظ بمشکل اس کے منہ سے نکلے تھے کہ اچانک سونیا نے وہ سہمتہ، جو وہ تھا اسے ہوئے تھی، ایک طرف دھکیل دیا اور اپنے ہاتھ سے اپنی آنکھیں ڈھانپ لیں۔
”اف، نشاٹا!“ وہ چلائی۔

”تم نے کچھ دیکھا؟ کچھ دیکھا؟ کیا تھا یہ؟“ نشاٹا نے چیختے ہوئے پوچھا۔
سونیا نے کچھ نہیں دیکھا تھا۔ وہ صرف اپنی آنکھیں جھپکاتا اور اٹھا چاہتی تھی کہ اس نے نشاٹا کو یہ کہتے سنا: ”وہ یقیناً کچھ نہ کچھ دیکھ لے گی!“ وہ دنیاٹا یا نشاٹا کو، یوں نہیں کرنا چاہتی تھی لیکن وہاں بیٹھنا بھی بار خاطر تھا۔ اسے خود معلوم نہیں تھا کہ جب اس نے اپنی آنکھیں ڈھانپ لیں، اس کے منہ سے کیوں اور کیسے چیخ نکل گئی تھی۔
”تم نے انھیں دیکھا؟“ نشاٹا نے اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے پوچھا۔
”ہاں۔ ٹھہرو... میں... میں نے، انھیں دیکھا،“ سونیا نے بے آپ کو کہتے ہوئے پایا۔ اسے ابھی تک یہ معلوم

نہیں ہو سکتا تھا کہ انھیں سے نسا شا کی مراد نکول کی تھایا پرس آندرے۔

”میں کیوں نہ یہ کہہ دوں کہ میں نے کچھ دیکھا ہے؟ آخر دوسرے لوگوں کو چیزیں نظر آتی ہی ہیں۔ علاوہ ازیں کون کہہ سکتا ہے کہ میں نے کچھ دیکھا ہے یا نہیں؟“ اچانک سونیا کے ذہن میں یہ خیال کوندے کی طرح چکا۔

”ہاں، میں نے انھیں دیکھا،“ اس نے کہا۔

”لیکن کیسے۔ کھڑے تھے یا لیٹے ہوئے؟“

”خیر، میں نے دیکھا۔۔۔ پہلے پہل تو کچھ دکھائی نہ دیا، پھر میں نے انھیں لیٹے دیکھا۔“

”آندرے لیٹے ہوئے تھے، وہ بیمار ہیں؟“ نسا شا نے کہا۔ اس کی خوف زدہ نگاہیں اپنی سہیلی پر مرکوز تھیں۔

”نہیں، اس کے برعکس، اس کے برعکس۔ وہ ہشاش بشاش نظر آ رہے تھے اور انھوں نے مڑ کر میری طرف

دیکھا۔۔“ اور جب وہ یہ الفاظ کہہ رہی تھی، اسے محسوس ہونے لگا کہ جو کچھ وہ بیان کر رہی ہے، اسے وہ فی الواقع دیکھ چکی ہے۔

”اس کے بعد میری سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ یہ کیا ہے۔ کوئی نیلی اور سرخ چیز۔۔“

”سونیا! وہ کب واپس آئیں گے؟ میں انھیں کب دیکھ سکوں گی؟ ف، خدا یا! مجھے ان کے اور اپنے بارے

میں کتنی تشویش ہے۔ میں ہر چیز کے بارے میں ڈر رہی ہوں۔۔۔“ نسا شا بولتی چلی گئی۔ سونیا نے اسے ہار بار تکی

دینے کی کوشش کی لیکن اس نے اس کی کسی بات پر کوئی توجہ نہ دی۔ وہ اپنے بستر میں گھس گئی اور اپنی موسم بٹی کے

بچھنے کے بعد بھی کافی دیر تک آنکھیں کھولے بے حس و حرکت لیٹی رہی اور بے ہوش درپچوں میں سے جونا خوشگور

مہتابی روشنی چھن چھن کر اندر آرہی تھی، اسے گھور گھور کر دیکھتی رہی۔

13

کرسمس کی چھٹیوں کے اختتام کے چند دن بعد ہی نکول کی نے اپنی ماں کو سونیا سے اپنی محبت کے بارے میں بتایا اور

کہا کہ وہ اس کے ساتھ شادی کرنے کا پختہ ارادہ کر چکا ہے۔ ان دونوں کے مابین جو پختہ دیر ہو رہی تھی، کاؤٹنس

کافی عرصے سے اس سے آگاہ تھی اور اس، اعلان کی توقع کر رہی تھی۔ وہ چپ چاپ سب کچھ سنتی رہی۔ پھر اس نے

اپنے بیٹے کو بتایا کہ وہ جس سے اس کا جی چاہے، شادی رچالے لیکن اس طرح کی شادی میں نہ اس کی اپنی اور نہ

اس کے باپ کی دعائیں ان کے شامل حاس ہوں گی۔ زندگی میں پہلی مرتبہ نکولائی کو احساس ہوا کہ اس کی ماں اس

سے ناخوش ہے اور یہ کہ اس کے ساتھ اپنی تمام تر محبت کے باوجود کبھی اپنی رضا مندی کا اظہار نہیں کرے گی۔

کاؤٹنس نے اپنے بیٹے کی طرف نگاہ اٹھا کر دیکھنا تک گوارا نہ کیا اور سرد مہری سے اپنے خاوند کو بلا بھیجا۔ جب وہ آ

گیا، اس نے نکولائی کی موجودگی میں سخت روکھے لہجے سے اسے مختصر صورت حال سے آگاہ کیا، تاہم وہ اپنی

شدت جذبات پر قابو نہ رکھ سکی اور جھل جھل میں زار و قطار روتی کرے سے ہر نکل گئی۔ سن رسیدہ کاؤٹنس نے

سہارنشی (عورت و لڑکی)۔

intrigante کا لفظ سن کر نکولائی کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ اس کی آواز بلند ہو گئی۔ وہ اس نے پٹیاں کو بتایا کہ وہ کبھی یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ سے یوں اپنے جذبات کا سودا کرنے پر مجبور کرے گی اور اگر حالات یہی رہے، پھر اسے جو آخری بات کہنا ہے، وہ، لیکن پیشتر اس کے کہ اس کے منہ سے انٹ اور فیصد کن الفاظ، جن کا، اس کے چہرے کے تاثرات بھانپتے ہوئے اس کی ماں خوف و دہشت کے عالم میں انتظار کر رہی تھی، اور جو غالباً اس دونوں کے اذہان پر اذیت ناک یادیں مرتسم کر دیتے، ادا ہوتے، ناشائے جو دروازے کے قریب کھڑی سب کچھ سن رہی تھی، بھاگتی اندر آئی۔ اس کا رنگ فق اور چہرہ گھبرہ گھبر تھا۔

”نکولینکا، تمہیں پتا نہیں کہ تم کیبہ رہے ہو! چپ ہو جاؤ، چپ ہو جاؤ، میں کہتی ہوں، چپ ہو جاؤ!“ اس کی آواز دبانے کی کوشش میں وہ تقریباً چیخ رہی تھی۔

”اماڈارنگ، اس کا یہ مطلب بالکل نہیں تھا۔ میری پیاری، بے چاری ماں!“ اس نے اپنی ماں سے کہا جو اس بات سے بخوبی آگاہ ہو چکی تھی کہ وہ ناچاتی کی حدود تک پہنچ چکے ہیں اور جو خوف و دہشت کے عالم میں ٹنگی باندھے دیکھے جا رہی تھی لیکن اس کی اپنی ہٹ دھرمی اور جھگڑے کی شدت اسے ہتھیار ڈالنے نہیں دیتی تھی اور نہ دے سکتی تھی۔

”نکولینکا، میں تمہیں بعد میں سمجھ دوں گی۔ اس اب تم جاؤ اماڈارنگ، سنیں۔“ ناشائے کہا۔ اس کے الفاظ بے ربط تھے لیکن وہ پنا مقصد پورا کر گئے۔

کاؤنٹس نے زور سے سسکی بھری اور اپنا چہرہ اپنی بیٹی کے سینے میں چھپا لیا۔ وہیں اٹا نکولائی اٹھ اور سر پکڑے کمرے سے باہر نکل گیا۔

ناشائے صلیح کرانے میں جت گئی اور وہ اس حد تک کامیاب رہی کہ نکولائی کو اس کی ماں کی طرف سے یقین دلا دیا گیا کہ سونیہ کے ساتھ بدسلوکی نہیں کی جائے گی اور جہاں تک اس کا اپنا تعلق تھا، اس نے یہ وعدہ کر لیا کہ وہ اپنے ماں باپ کو بتائے بغیر کوئی قدم نہیں اٹھائے گا۔

نکولائی نے یہ تہیہ کر لیا تھا کہ جونہی وہ اپنی فوجی ملازمت سے متعلق معاملات پٹا سکے، وہ اپنے عہدے سے مستعفی ہو جائے گا، واپس آئے گا اور سونیہ کے ساتھ شادی کر لے گا۔ اس کے چہرے پر ہر وقتنجیدگی اور حزن و اطلال برسنے لگا، والدین سے اس کی راہیں مختلف ہو گئی تھیں لیکن اپنے خیال کے مطابق وہ سرنا پ شدت سے محبت میں گرفتار ہو چکا تھا۔ جنوری کے آغاز میں وہ اپنی رہنمائی میں دوبارہ شامل ہونے کی غرض سے گھر سے روانہ ہو گیا۔ نکولائی کی روانگی کے بعد رستوفوف کے گھر کا ماحول پہلے سے بھی زیادہ افسردہ ہو گیا۔ اپنی پریشانیوں نے کاؤنٹس کو بستر علالت پر مالدیا۔

نکولائی کی فرقت نے سونیہ کو رنجیدہ کر دیا، لیکن اس سے بھی زیادہ دکھا سے کاؤنٹس کے معاندانہ رویے سے، جو وہ اختیار کیے بغیر نہیں سکتی تھی، ہوتا تھا۔ معاملات کی، جو کسی فیصلہ کن اقدام کے متقاضی تھے، انہوں نے

کاؤنٹ کو پہلے کی نسبت کہیں زیادہ پریشان کر دیا تھا شہری مکان اور ماسکو کے مصفاقات میں واقع جاگیر فروخت کیے بنا چارہ نہیں رہا تھا۔ اس کے لیے ماسکو جانا ضروری تھا لیکن کاؤنٹس کی ماسازی طبع انھیں آئے دن اپنی روالگی ملتی کرنے پر مجبور کر دیتی تھی۔

ناشائے اپنے منگیترا سے فراق کا ابتدائی عرصہ کسی قسم کا خاص تردد کیے بغیر، بلکہ ہنسی خوشی گزار دیا تھا، لیکن اب اس کی بے چینی میں روز بروز اضافہ ہونے لگا درمہر کا دامن ہاتھ سے چھوٹنے لگا تھا۔ یہ خیال کہ اس کی زندگی کا بہتر دور، جو اس سے محبت کرنے میں گزارا جاسکتا تھا بیکار جا رہا ہے اور کسی کو اس سے کچھ حاصل نہیں ہو رہا، اس کے لیے متوترس وہاں رہ رہا تھا۔ اس کے خطوط زیادہ تر اسے غصہ دلانے کا موجب بنتے تھے۔ یہ سوچ سوچ کر اسے بہت دکھ ہوتا تھا کہ وہ محض اس کو اپنے خیالوں میں بسائے زندگی گزار رہی ہے جب کہ وہ خود حقیقی زندگی سے لطف اندوز ہو رہا ہے کہ نئے نئے مقامات کی سیر کرتا ہے اور نئے نئے لوگوں سے، حواسے دلچسپ معلوم ہوتے، ملاقاتیں کرتا پھرتا ہے۔ اس کے خطوط جتنے زیادہ پر لطف ہوتے اسے وہ اتنا ہی زیادہ مشتعل کرتے۔ جو خطوط وہ اسے لکھتی، بجائے اس کے کہ وہ اس کی تسکین کا باعث بنتے، انھیں لکھتا اسے ناگوار اور معنوی قریضہ معلوم ہونے لگا۔ وہ صحیح معنوں میں لکھ نہیں سکتی تھی کیونکہ یہ بات اس کے ذہن میں آتی ہی نہیں تھی کہ وہ بات جسے وہ اپنے سبک کے اتار چڑھاؤ، مسکراہٹ یا نظروں سے ادا کرنے کی عادی تھی، اس کا ہزارواں حصہ بھی پر خلوص انداز سے غلط میں بیان کرنا ممکن ہے۔ وہ اسے خشک، روایتی، یک لکھی اور غیر متنوع خطوط، جنہیں وہ خود اسی بھی اہمیت نہیں دیتی تھی اور جن کے ابتدائی مسودوں میں کاؤنٹس اس کی ادا کی غلطیاں درست کرتی تھی، تحریر کرتی رہی۔

کاؤنٹس کو ابھی کوئی افق نہیں ہوا تھا لیکن ماسکو کا سفر مزید ملتی نہیں کیا جاسکتا تھا۔ ناشا کا عروسی جوڑا تیار کرنا اور مکان فروخت کرنا تھا۔ مزید برآں ماسکو میں پرنس آندرے کی آمد متوقع تھی کیونکہ اس کا باپ سردیاں وہیں گزارا کرتا تھا اور ناشا کو یہ یقین ہو چلا تھا کہ وہ پہلے ہی وہاں پہنچ چکا ہے۔

کاؤنٹس دیہاتی جاگیر پر ہی مقیم رہی اور جنوری کے اختتام پر کاؤنٹ ناشا اور سونیا کی معیت میں عازم ماسکو ہو گیا۔

نشا کی پرنس آندرے کے ساتھ نسبت طے پا جانے کے بعد پیئر کو بظاہر کسی وجہ کے بغیر اچانک محسوس ہونے لگا کہ پہلے کی طرح زندگی گزارنا ناممکن ہے۔ اس کے محسن نے اس کے سامنے جن حقائق کی نقاب کشائی کی تھی، اگرچہ اسے ان کی صحت کے بارے میں پختہ یقین تھا اور تکمیل ذات کے روحانی کام میں، جس کے لیے اس نے اپنا تن من و جان وقف کر رکھا تھا، وہ جس طرح جوش و خروش کا اظہار کرتا تھا، مگر چہ اس کے ابتدائی دور میں وہ بے حد مسرور و شادماں تھا، لیکن نشا اور پرنس آندرے کی مٹتی اور آئی اوسف ایسی ہیج کے انتقال کے بعد، جس کی اطلاع اسے تقریباً اسی زمانے میں ملی تھی، اس قسم کی زندگی اس کے لیے ساری دل کشی کھو بیٹھی۔ صرف زندگی کا خول۔ اس کا گھر، درخشندہ شریک حیات، جواب ایک انتہائی اہم شخصیت کی منظور نظر بن چکی تھی، سارے پیئرز برگ سے شناسائی، اپنی اکتا دینے والی رسوم و قواعد کے ساتھ اس کی درباری ملازمت۔ باقی رہ گیا تھا۔ اور ایک ایسی چیز کو غیر متوقع طور پر اس زندگی سے گھٹن آنے لگی۔ اس نے روزنامہ لکھنا بند کر دیا، برادران کی صحبت سے کئی کترانے لگا دیے ایک بار پھر کلب جانے اور جی بھر کر شراب نوشی کرنے لگا۔ اس نے کنواروں کے حلقوں کے ساتھ اپنے تعلقات کی اس طرف تجدید کی اور اس طرح کی زندگی بسر کرنا شروع کر دیا کہ کاؤنٹس ہیلینا واسیلیو نا کے لیے اسے آڑے ہاتھوں لیانا گزربو گیا۔ پیئر کو محسوس ہوا کہ وہ ٹھیک کہتی ہے، چنانچہ اس بات سے بچنے کی غرض سے کہ کہیں اس کی اہلیہ کو محض اس کی جہ سے کسی ناگوار صورت حال کا سامنا نہ کرنا پڑے، وہ ماسکورا تہ ہو گیا۔

جونہی اس نے ماسکو میں اپنے وسیع و عریض محل نما مکان میں، جس میں خدام کی فوج ظفر سوچ تعینات تھی اور جس میں ابھی تک پرنسپس، جو مرچھ چکی تھیں اور مزید مرجھاتی جا رہی تھیں، مقیم تھیں، قدم رکھا، جونہی اپنی گاڑی میں سو ر شہر کے بچوں بیچ گزرتے اسے آبیروائی چیل، جس کے طلائی ڈبوں میں رکھے الیونوں کے سامنے لاتعداد بار یک محرومی موسم بیاں، جل رہی تھیں دکھائی دیا، جونہی اس نے کریملن سکوائر، جس کی برف ابھی گاڑیوں کے تلے ردی نہیں گئی تھی، برف گاڑیوں کے کوچوانوں اور سیوسیف ورڈوک (محلہ غربا) کے ٹک دھاریک مکانوں کو دیکھا، جونہی اس کی، سکو کے قدیم باسیوں پر، جو پرسکون انداز سے اپنی زندگیوں کے ایام پورے کر

رہے تھے، جہیں کسی چیز کی تنہا نہیں تھی، کہیں جانے کی جلدی نہیں تھی، پڑیں، جونہی، سکو کی سن رسیدہ خواتین اور نوجوان دو شیرائیں، ماسکو کا انگش کلب اور اجتماعی رقص گاہیں اس کی نگاہوں میں آئیں، اسے محسوس ہوا کہ وہ اپنے گھر۔ پرسکون جنت۔ میں پہنچ گیا ہے۔ ماسکو میں اسے اسی راحت و آرام اور حرارت کا احساس ہوتا جو آدمی کو پرانے اور بوسیدہ ذریعہ تنگ گاؤں میں ملتی ہے۔

بڑی بوزھیوں سے لے کر بچوں تک، ماسکو کی سوسائٹی نے بیئر کا استقبال ایک ایسے مہمان کی، جس کا مدتوں سے انتظار ہو، جس کی جگہ ہمیشہ تیار ہو اور اس کی آمد منتظر، حیثیت سے کیا۔ اہالیان، سکو کی نظروں میں وہ eccentric ضرورت تھی لیکن ایسا eccentric، جو انتہائی شستہ، شفیق، ذہین، طنسار اور فیاض تھا اور وہ سے شرفا کے پرنے دبستان کا غیر حاضر دماغ اور نمکسار روی گرا نئے تھے۔ اس کا ہوا، ہمیشہ خالی رہتا تھا کیونکہ یہ ہر کس و نا کس کے لیے ہر دم کھلا رہتا تھا۔

امدادی شو، معمولی تصویریں اور مجسمے، چیمپیوں کے موسیقی کے جشن، درس گاہیں، چندے کے ڈنر، رفاہی انجمنیں، ناؤ و نوش کی محفلیں، فری میسن، گرے، کتابیں۔ جس نام سے اور جس غرض سے بھی سوالی آیا، کبھی اس کے در سے خالی نہ گیا۔ اور اگر دو دوست، جنھوں نے اس سے بڑی بڑی قوم فرض لے رکھی تھیں اور اب اسے اپنی بڑاہ میں لے چکے تھے، بیچ میں نہ پڑتے، وہ اپنا سب کچھ بانٹ چکا ہوتا۔ (انگلش) کلب میں کوئی دعوت یا محفل اس کے بغیر منعقد نہیں ہوتی تھی۔ مارگو کی دو بوتلیں چڑھانے کے بعد جونہی وہ صوفے پر اپنی معمول کی نشست پر ٹھہر جاتا، پھر پڑتا، جہاب اس کے ارد گرد حلقہ بنا لیتے، پھر باتوں، بحثوں، لطیفوں اور ایک دوسرے کی ٹانگ تھپتھپانے کا لڑائی سلسلہ شروع ہو جاتا۔ جب کبھی معاملہ تو بھارتیک پہنچتا، اس کی پراشفتت سکراہٹ اور باہل فقرے بازی مخالفین کے مابین دوبارہ صبح کرانے کا موجب بنتی۔ اس کی عدم موجودگی میں میسوں کی دعوتیں بھیجی اور بے کیف ہوتیں۔ جب کبھی وہ کنوروں کے سپر کے اختتام پر اٹھ کھڑا ہوتا، لیکن اپنی دل کش اور مشفقانہ سکراہٹ سے رنگ رلیاں منانے والوں کی التجاؤں اور مثبت سماعتوں کے سامنے ہتھیار ڈال دیتا اور گاڑی میں سواران کے ساتھ کہیں چل پڑتا، اس کے نوجوان ساتھی خوشی اور مسرت سے خمرہ ہائے جھین بلند کرنے لگتے۔ اگر اجتماعی رقص کے دوران میں کسی کو ساتھی کی ضرورت پیش آتی، وہ اپنی خدمات پیش کر دیتا اور ناچ میں شریک ہو جاتا۔ لڑکیاں اور نوجوان شادی شدہ خواتین اسے بہ نظر پسندیدگی دیکھتی تھیں کیونکہ وہ کسی کے ساتھ بھی معاشرہ لڑانے کی کوشش نہیں کرتا تھا بلکہ اس کا سب کے ساتھ، خاص طور پر سپر کے بعد، سلوک یکساں طور پر ملتفتانہ ہوتا تھا۔ "I est charmant, il n'a pas de sexe" اور اس کے متعلق کہا کرتے۔

وہ شخص جرمادات، احوار، خیالات یا اپنے مایوسات کی بنا پر دوسروں سے الگ تھلک اور یوں عجیب و غریب اور زلال دکھائی دے۔
بھل لوگ ایسے شخص کو خبیث بھی تصور کرتے ہیں۔
وہ پرکشش ہے۔ اس کی کوئی جنس نہیں۔

بیکران ریٹائرڈ درباری مص حیوں میں، جو سینکڑوں کی تعداد میں، سکو میں خوش و خرم اپنی زندگیوں کے ایام بتا رہے تھے، شامل تھا۔

سات سال قبل، جب وہ اولین بار پریس سے دیس لوٹا تھا، اگر کوئی اس سے یہ کہتا کہ اسے کسی چیز کی جست کرنے یا منصوبہ بندی کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے کیونکہ اس کا راستہ بدلتا پہلے مشکل ہو چکا ہے، ہمیشہ پیش کے لیے متعین کیا جا چکا ہے، وہ خواہ کتنا ہی ترپے، بل کھائے، وہ رہے گا وہی جو اس کے مقام کے دوسرے اشخاص کا مقدر ہے، تو اسے کتنا دھچکا پہنچتا! اسے اس پر یقین ہی نہ آتا۔ کیا کسی زمانے میں اس کی یہ زبردست آرزو نہیں تھی کہ روس کو جمہوری ملک بنایا جائے؟ کیا اس کے بعد وہ نیولین، پھر فلسفی، پھر فن حرب و ضرب کا ماہر اور پھر خور نیولین کا فاتح نہیں بننا چاہتا تھا؟ کیا اس نے بد خصال و بد اعمال بنی نوع انسان کی نشت و الثانیہ کے خواب نہیں بنے تھے اور اپنی ذات کو اکسلیت کے بلند ترین درجے تک پہنچانا نہیں چاہا تھا؟ کیا اس نے مدارس اور شفا خانے قائم نہیں کیے تھے اور زرعی غلاموں کو آزاد نہیں کیا تھا؟

لیکن ان تمام باتوں کے بجائے وہ اب کیا تھا؟ بے وقوفی کا دولت مند شوہر اور ریٹائرڈ صاحب شاہ جس کا شوق کھانا پینا اور ڈنر کے بعد واسکٹ کے ٹین کھول کر حکومت کو ملاحیاں سنانا تھا۔ وہ انگلش کلب کا رکن تھا اور اسکو کے سارے اونچے طبقے کی آنکھوں کا تارا۔ کافی عرصے تک اس سے یہ بات ہضم نہ ہو سکی کہ وہ اب اسی طرح کا ریٹائرڈ صاحب شاہ ہے جسے وہ قبل ازیں سات سال تک بھرپور حقارت کی نظر سے دیکھتا رہا تھا۔

بعض اوقات وہ اس تصور سے اپنا دل بہلا لیتا تھا کہ جس نوعیت کی زندگی وہ بسر کر رہا ہے، وہ محض عارضی ہے لیکن بہت جدا سے ایک خیال سے سخت دھچکا پہنچا۔ اس کی طرح کتنے ہی آدمیوں نے، جب ابھی ان کے پیٹ میں آنت، منہ میں دانت اور سر پر ڈھیروں، لٹھے یہ سمجھ کر اس قسم کی زندگی کی شروعات کی اور اس کلب کی رکنیت اختیار کی کہ اس کی نوعیت محض عارضی ہے، لیکن جب وہ یہاں سے نکلے، ان کے دانت، آنت اور بال سب صاف ہو چکے تھے!

جب وہ تعلیٰ اور فخر و مباہات کے لمحات میں اپنے مقام کا جائزہ لے رہا ہوتا، اسے کچھ یوں دکھائی دیتا کہ وہ ان ریٹائرڈ مصاحبین شاہ سے، جن سے اسے دور سائیں میں گھن آتی تھی، بالکل مختلف اور متنازع ہے۔ وہ سطحی، کم ظرف اور گاوری ہیں اور اپنے مقام و مرتبے پر مطمئن ہیں، ”جب کہ میں ابھی تک نامطمئن ہوں، میں اب بھی بنی نوع انسان کی بھلائی کے لیے کچھ کرنے کا شدت سے آرزو مند ہوں۔“ ایسے مواقع پر وہ اپنے آپ سے کہا کرتا۔ لیکن شاید میرے ان تمام رفتا نے میری ہی طرح جدوجہد کی تھی، زندگی میں تنی اور اچھوتی راہیں تراشنے کی کوشش کی تھی اور شاید میری ہی طرح حانات، معاشرے اور نسب وہ فطری قوت جس کے گئے انسان ہے بس ہے۔ نے انھیں بھی اسی مقام پر، جس پر میں اپنے آپ کو پارہا ہوں، لکھڑا کیا، ”وہ عاجزی کے لمحات میں اپنے آپ سے کہتا۔ اور اسکو میں چندے قیام کے بعد اسے اب اپنے ہم تقدیر ساتھیوں سے نفرت نہ رہی بلکہ وہ ان کا گردیدہ

ہونے، ان کا احترام کرنے اور ان پر رحم کھانے لگا۔

میکر پر اب مایوسی، مایخولیا اور زندگی سے بیزاری کے لمحات کبھی وارد نہیں ہوتے تھے، لیکن وہ عارضہ جو دور سابق میں شدید دروں کی شکل میں بننا اظہار کرتا تھا، اب باطن کی جانب دھکیل دیا گیا اور ایک لختے کے لیے بھی اس کا چچھانہ نہیں چھوڑتا تھا۔ ”کس لیے؟ کیا فائدہ؟ دنیا میں کیا ہو رہا ہے؟“ وہ دن کے دوران میں بار بار اپنے آپ سے پوچھتا اور تجھ سے گرفتار ہو جاتا، اور یوں غیر ارادی طور پر مظاہر حیات کے مذہم کی از سر نو جستجو کرنے لگتا۔ پھر چونکہ تجربے سے اسے معلوم تھا کہ ان سوالات کے کوئی جوابات نہیں ہیں، وہ بالتحیل انھیں اپنے دماغ سے نکال باہر کرنے کی سعی کرنے لگتا۔ وہ کوئی کتاب اٹھا لیتا یا بل تاخیر کلب یا اپالون کولائی دج کے ریستوران کا رخ کرتا تا کہ شہر کی تازہ ترین گپ شپ کے بارے میں تبادلہ خیالات کر سکے۔

”بہلینا واسیلو نا کو پنے جسم کے عداوہ کبھی کسی دوسری چیز کے متعلق فکر لاحق نہیں ہوئی۔ اس کا شہر وئے زمین کی احمق ترین عورتوں میں کیا جاسکتا ہے؟“ میکر سوچتا۔ ”لیکن اسے مذہانت اور نستعلیقیت کی معراج تصور کیا جاتا ہے اور لوگ ہیں کہ اس کے آگے بچھے جاتے ہیں اور اس کی تعریفوں کے پل باعہتے رہتے ہیں۔ پولین جب تک عظمت کے سنگھاسن پر براجمان رہا، ہر کوئی سے بظہر حقارت دیکھتا رہا لیکن اب جب کہ وہ قابل رحم سخرہ بن چکا ہے، اسے اس طرح فراموش اپنی دختر نیک اختر کو اس کے غیر شرعی حبابہ عقد میں دینا چاہتا ہے۔ ہسپانوی چودہ جون کو اپنے کیتھولک پادریوں کی وساطت سے خداوند کا شکر بجاتے ہیں کہ اس نے انھیں فرانسیسیوں پر فتح دلائی تھی اور فرانسیسی بھی اپنے کیتھولک پادریوں کی وساطت سے اس کا شکر بجالاتے ہیں کہ اس نے اسی روز انھیں ہسپانیوں کے خلاف کامیاب کر لیا تھا۔ میرے مین بر در ان اپنے خون میں انگلی ڈبو کر حلف اٹھاتے ہیں کہ وہ اپنے پڑوسی کے لیے تن من دھن قربان کر دیں گے لیکن غریبا و مساکین کے لیے چندہ جمع کرنے کی نوبت آئے، تو ایک روئل بنک نہیں دیتے۔ آسٹریا لاج متراشیان من دسوی کے خد ف سازش کرتی ہے اور یہ سب اصلی سکائش غالیچے، یا مشور کے، جس کا مطلب خود اس شخص کی، جس نے اسے تحریر کیا تھا، سمجھ میں بھی نہیں آیا تھا اور جس کی نہ کسی کو ضرورت ہے، متعلق خوب غل غباڑا بچاتے ہیں۔ ہم سب مسخی قانون۔ اگر کوئی شخص تمہارے ساتھ زیادتی کرے، تو غصہ اور درگزر سے کام لو اور اپنے پڑوسی سے پیار کرو۔ کاخص زبانی کلامی کلمہ پڑھتے ہیں۔ یہ وہ قانون ہے جس کے احترام میں ہم نے ماسکو میں لا تعداد گرے تعمیر کر دیے ہیں لیکن کل ایک مرتہ کو کوڑے مار کر ہلاک کر دیا گیا اور غنود محبت کے اسی قانون پر عمل درآمد کرنے والے ایک پادری نے کارروائی سے پہلے جلا د کو صلیب تھمائی تا کہ وہ اسے چوم سکے۔“ میکر کافی دیر تک اسی طرح سوچ بچار کرتا رہا اور یہ کالما عالم گیر منافقت، جس کا ہر کوئی کلمہ پڑھتا ہے، باوجود اس امر کے کہ میکر کو آئے روز اس سے واسطہ پڑتا تھا اور وہ اس کا عادی ہو چکا تھا، کبھی بھی اسے حیرت و استعجاب میں ڈالنے میں ناکام نہ رہی جیسے یہ کوئی نئی چیز ہو۔ ”بددیانتی اور پریشاں خیالی میری سمجھ میں آتی ہے لیکن جو کچھ میں دیکھتا ہوں، انھیں کیسے بتاؤں؟ میں نے کوشش کی اور مجھے ہمیشہ یہی احساس ہوا کہ جس

طرح میں جانتا ہوں، قلوب کی گہرائیوں میں وہ بھی اسی طرح جانتے ہیں۔ لیکن وہ جان بوجھ کر اپنی آنکھیں بند کرے ہوئے ہیں اور پوری کوشش کرتے ہیں کہ وہ اسے دیکھ نہ پائیں۔ میرا خیال ہے کہ ہمت کچھ ایسی ہی ہے۔ لیکن میں۔ میرا کیا بنے گا؟" پیکر نے سوچا۔

متعدد انسانوں، یا مخصوص روپیوں میں ایک مصدحیت عام ہوتی ہے کہ وہ نیکی اور صداقت کے امکانات تو بھانپ لیتے ہیں اور ان پر یقین بھی کرنے لگتے ہیں لیکن زندگی میں جو بدی اور عدم صداقت پائی جاتی ہے، وہ ان پر رنج واضح انداز سے آشکار ہوتی ہے کہ وہ سنجیدگی سے کچھ بھی کرنے سے قاصر رہتے ہیں۔ بد قسمتی سے بیٹر کا بھی کچھ بھی حال تھا۔ اس کی نگاہوں میں زندگی کا ہر رُہ کار بدی اور ریا کاری سے منسلک تھا۔ وہ جو کچھ بھی بننے کی کوشش کرنا جس کام میں بھی ہاتھ ڈالتا، وہ ہمیشہ بدی اور فریب کے ہاتھوں مار کھا جاتا اور اسے محسوس ہوتا کہ یہ دونوں چیزیں اس کے راستے میں دیوار بن کر حائل ہو گئی ہیں۔ لیکن اس نے زندہ رہنا تھا، کوئی مصروفیت ڈھونڈنا تھی۔ اس کا ٹھل مسئلہ کے بوجھ تلے دبے رہنا۔ بے حد خوف ناک صورت تھی۔ چنانچہ انھیں فراموش کرنے کے لیے جو اولین چیز، جو اس کی توجہ دوسری طرف موڑ سکتی تھی، اس کے سامنے آتی، وہ بے اختیار اس کی طرف لپکتا اور اسی کا ہر کر رہ جاتا۔ وہ ہر قسم کی مجلسوں میں بکثرت آتا جاتا، خوب ڈٹ کر مے نوشی کرتا، تصویریں خریدتا، عمارتیں تعمیر کراتا، اور سب سے بڑھ کر۔ مطالعہ کرتا۔

وہ پڑھتا اور خوب پڑھتا، جو چیز بھی اس کے ہاتھ آتی، وہ اسے پڑھ کر ہی دم لیتا۔ چنانچہ جب وہ رات کو گھر واپس آتا، ابھی نوکر چا کر اس کے کپڑے تبدیل کر رہے ہوتے کہ وہ کتاب اٹھا لیتا، پڑھتے پڑھتے سو جاتا، سو کر اٹھتا تو ڈرائنگ روموں یا کلب میں گپ شپ لگانے چلا جاتا، وہاں سے اٹھتا تو مے خانوں اور بالا خانوں کا رخ کرتا، ان کے بعد پھر گپ شپ، مطالعے اور مے نوشی کا سلسلہ شروع ہو جاتا۔ مے نوشی اس کے لیے روز بروز جسمانی ہی نہیں، اخلاقی ضرورت بھی بنتی گئی۔ اگر چہ ڈاکٹروں نے اسے متنبہ کر دیا تھا کہ اس کی فریبی کے پیش نظر مے نوشی اس کے لیے خطرناک ثابت ہو سکتی ہے، وہ مقدار کثیر پیتا چلا گیا۔ اسے آسودگی کا احساس صرف اسی وقت ہوتا جب مشینیں انداز سے اپنے فراخ خلقی میں انگوری شراب کے متعدد جام انڈیلنے کے بعد اسے اپنے جسم میں خوشگوار حرارت محسوس ہوتی۔ اس وقت وہ ساتھی انسانوں کے ساتھ تعلق سے پیش آتا اور گہرائی میں جائے بغیر ہر آدرش کو سطحی طور پر قبول کرنے کے لیے آمادہ ہو جاتا۔ صرف ایک دو باتیں خالی کرنے کے بعد اسے یہ دھندلا دھندلا احساس ہونے لگتا کہ زندگی کی، نہجائی ڈولیدہ گنتھی، جو ماضی میں اس کے اتنے چمکے چھڑاتی رہی تھی، بہر حال اتنی سہیب نہیں جتنی کہ وہ سمجھتا رہا ہے۔ اس گنتھی کے کسی نہ کسی پہلو کا اسے ہمیشہ احساس رہتا تھا، جیسا کہ ذرا پہلے کے بعد جب وہ گپ شپ کر رہا، گفتگو میں رہا یا کتاب پڑھ رہا ہوتا، اسے یوں محسوس ہوتا جیسے اس کے دماغ میں گھنٹیں ہی بج رہی ہیں۔ لیکن صرف اسی وقت، جب وہ انگوری شراب کے نشے سے پوری طرح دھت ہو چکا ہوتا، وہ اپنے آپ سے یہ کہہ سکتا تھا: "کوئی بات نہیں، میں اسے سلجھا لوں گا۔" میرے پاس اس کا بنا بنا یا حل موجود ہے، لیکن فی الحال

میرے پاس کوئی وقت نہیں۔ میں اس کے متعلق بعد میں سوچوں گا۔“ لیکن یہ بعد کبھی نہ آتا۔

صبح دم جب اس کا پیٹ خالی ہوتا، دیرینہ سوالات ہمیشہ کی طرح لہلہ نظر آتے اور پھر یہ غلت کوئی کتاب اٹھ بیٹا اور اگر کوئی ملا دیتی آجاتا، اس کی باچھیس کھل جاتیں۔

بعض اوقات اسے یاد آتا کہ اس نے کسی سے سنا ہے کہ جب پناہ گاہوں میں فوجیوں پر دشمن کی گولہ باری ہو رہی ہو اور ان کے پاس کرنے کو کچھ نہ ہو، تو وہ اپنے آپ کو کسی نہ کسی کام میں مصروف رکھنے کی سر توڑ کوشش کرتے ہیں تاکہ خطرے کو نسبتاً زیادہ آسانی سے برداشت کیا جاسکے۔ اور پھر کو یہ محسوس ہونے لگتا کہ سب، نہ ان فوجیوں کی، نہ مددگاروں کی زندگی سے پناہ ڈھونڈنے کی فکر میں لگے رہتے ہیں، بعض اسے جاہ طبعی میں، بعض تلاش کے کھیل میں، بعض عورتوں، شرب، لعبتوں، گھوڑوں یا کھیلوں میں اور بعض سیاست رانی یا امور مملکت میں تلاش کرتے ہیں۔ ”نہ کچھ ہے وقعت ہے اور نہ کچھ با وقعت۔ انجام کار یہ سب کچھ یکساں ہے۔ کرنے کا کام یہ ہے کہ آدمی اس سے حتی المقدور بچنے کی پوری کوشش کرے،“ پیئر سوچتا۔ ”یہ سب کچھ دہشت ناک ہے کاش آدمی نے اسے نہ دیکھا ہوتا۔“

2

ہانڈل کے آغاز کے ساتھ ہی پرنس نکولا کی آندر یوچ بلکونسکی اور اس کی بیٹی ماسکونھل ہو گئے۔ بالخصوص ایک ایسے دور میں جب امپراطور الیکساندر کی حکومت کے لیے عوام کی گرم جوشی مدھم پڑنے لگی تھی اور ماسکو میں قوم پرستانہ اور فرانس مخالف رجحانات کو فروغ حاصل ہو رہا تھا، پرنس نکولا کی آندر یوچ کے ماضی، دانش و فراست اور انج کی شہرت نے اسے بیک وقت اہالیین ماسکو کی آنکھوں کا تار ابھی بنادیا اور شہر میں حکومت کے جو مخالفین تھے، ان کا مرکز بھی۔

اس برس کے دوران میں پیرا نہ سالی نے پرنس کو کچھ زیادہ ہی ضعیف بنادیا تھا۔ مضبوط کمر بنی نے بلا مقابلہ اپنا رنگ کچھ یوں دکھایا تھا کہ پیٹھے بٹھائے اس پر اچانک غنودگی طاری ہو جاتی، حالیہ وقعت اس کے ذہن سے نکل جاتے جب کہ بھولے بسرے ماضی کی داستانیں اسے اچھی طرح یاد ہوتیں، اور پھر جس بچکانہ انداز سے اس نے ماسکو کے حکومت مخالف طبقے کی سربراہی قبول کی تھی، وہ بھی اسی علامت کی طرف اشارہ کرتا تھا۔ ان سب باتوں کے باوجود مرد کبریاں جب شام کو، اپنا پرانی وضع کا کوٹ وریاؤڈر چھڑکی وگ پہنے ڈرائنگ روم میں شام کی چائے پینے آتا اور اگر کسی ہاشما کے اشتعال دلانے پر بیجے دنوں کے بارے میں مختصر لیکن جامع آرا کا اظہار کرتا یا اس سے بھی بڑھ کر موجودہ زمانے پر نئی تلی اور بے رحمانہ تنقید کرتا، وہ بلا امتیاز اپنے تمام ملاقاتیوں کو غماصاثر کرتا کہ وہ بھی اس کا مؤدبانہ انداز سے احترام کرنے پر مجبور ہو جاتے۔ یہ دقیقہ نویسی مکان جس کی کھڑکیوں اور دروازوں کے مابین دیواروں پر بڑے بڑے آرائشی آئینے لگے ہوئے تھے، جہاں قتل از انقلاب (فرانس) کے نمائندے کافر نیچر تھا، جہاں سر پر پاؤڈر چھڑکے وردی پوش ملازمین تھے اور جس میں یہ سخت مزاج اور زیرک مرد صبر

سال۔ جو خود ماضی کی نشانی تھا۔ اپنی منکسر المزاج دختر اور خوش شکل فرانسیسی خاتون کے ساتھ، جو دونوں اس کی تنظیم میں کوئی کسر اٹھ نہیں رکھتی تھیں، رہتا تھا، ان کے سامنے مرعوب کن اور خوشگوار منظر پیش کرتا تھا۔ لیکن ان ملاقاتیوں نے کبھی اس بات پر دھیان نہیں دیا تھا کہ انھوں نے اپنے میزبانوں کی معیت میں جو دو گھنٹے گزارے ہیں، ان کے علاوہ دن رات کے بائیس گھنٹے اور بھی ہوتے ہیں اور ان کے دوران میں اس گھر کی نجی اور مالوس زندگی اپنی ڈگر پرواں دواں رہتی ہے۔

حالیہ ایام میں پرنس ماریا کے لیے یہ زندگی خاصی دکھی اور اذیت ناک بن چکی تھی۔ جس چیز۔ زریں کے ساتھ گفتگو اور خلوت نشینی، جو بالڈلز میں سے نازہ دم کر دیتی تھی۔ اسے زندگی کی عظیم ترین مسرت حاصل ہوتی تھی، ماسکو میں وہ اس سے محروم ہی نہیں ہوئی تھی بلکہ شہری زندگی میں جو فوائد اور تفریحات میسر آتی ہیں، وہ بھی اس کے حصے میں نہیں آتی تھیں۔ اس کا لوگوں کے گھروں اور محفلوں میں آنا جانا نہیں تھا۔ کبھی جانتے تھے کہ جب تک اس کا باپ خود اس کے ساتھ نہ جائے، وہ اسے کہیں جانے نہیں دے گا اور چونکہ اس کی صحت، جو وزیر برزگرتی جا رہی تھی، اسے باہر نہیں نکلنے دیتی تھی، چنانچہ احباب اس کی بیٹی کو دعوتوں اور شینہ محفلوں میں مدعو نہیں کرتے تھے۔ وہ یہ امید کہ اس کی کہیں شادی ہو سکے گی، کھو چکی تھی۔ وہ نوجوان، جو کبھی بکھار اس کے گھر آ جاتے اور جو، مکانی طور پر اس کے رشتے کے امیدوار ہو سکتے تھے، منمر پرنس ان کا جس سرد مہری اور خصوصیت سے استقبال کرتا، اور پھر ان کی چھٹی کرتا تھا، وہ اس کی نظروں کے سامنے تھا۔ پرنس ماریا کا کوئی ساتھی تھا نہ سگی۔ جب سے ماسکو آئی تھی، وہ اپنی ان دو سہیلیوں سے، جو اس کے قریب ترین تھیں، بایوس ہو چکی تھی۔ مادوزیل بوغین، جس کے سامنے وہ اپنا حال دل کبھی صحیح معنوں میں کھول کر بیان نہیں کر سکی تھی، اب سے زہر لگنے لگی تھی اور مختلف وجوہات کی بنا پر وہ اس سے کتنی کاٹنے لگی تھی۔ جولی، جس کے ساتھ وہ گزشتہ پانچ سال سے خط کتابت کرتی رہی تھی، ماسکو میں ہی تھی، لیکن جب ان دونوں کی ملاقات ہوئی، وہ اسے بالکل اجنبی دکھائی دی۔ اپنے بھائیوں کے انتقال کی وجہ سے جلا کا شمار ماسکو کی امیر ترین وارثوں میں ہونے لگا تھا اور وہ عیش و طرب کی محافل میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے لگی تھی۔ وہ ہر وقت نوجوانوں کے، جن کے متعلق اسے یقین تھا کہ انھوں نے اس کی قدر و قیمت کی تحسین کرنا ایک ایسی سیکھا ہے، نرٹھے میں گھری رہتی۔ دولت مند، اونچے اور فیشن ایبل طبقے کی اس خاتون کی طرح، جس کا شباب ڈھلتا جا رہا ہے، جولی زندگی کے اس مرحلے پر پہنچ چکی تھی جب عورت کو یہ محسوس ہونے لگتا ہے کہ اس کے لیے شوہر تلاش کرنے کا آخری موقع آن پہنچا ہے اور یہ کہ اس کے مقدر کا فیصلہ ب ہو ہی جانا چاہیے ورنہ وہ ہمیشہ کب افسوس ہلتی رہے گی۔ ہر جمعرات پرنس ماریا چہرے پر اداس مسکراہٹ سجائے سوچا کرتی کہ اب کوئی شخص ایسا نہیں رہا جسے وہ خط لکھ سکے کیونکہ جولی۔ جس کی موجودگی سے اسے کوئی راحت نہیں ہوتی تھی۔ یہیں موجود تھی اور ہر ہفتے ان کی ملاقات ہوتی رہتی تھی۔ اس بوڑھے تارک وطن کی طرح، جس نے اس خاتون کے ساتھ، جس کے ہاں وہ برسوں اپنی شامیں گزارتا رہا تھا، شادی کرنے کی دعوت محض اس لیے ٹھکرا دی تھی کہ اگر اس نے اس کے ساتھ بیوہ چاہا، پھر شام گزارنے

کے لیے اس کے پاس کوئی جگہ نہیں رہ جائے گی، پرنس ماریا کو بھی اس بات کا افسوس تھا کہ جوں جوں یہاں موجود ہے، اس لیے اس نے اسے مکتوب ایسے سے محروم کر دیا ہے۔ ادھر ماسکو میں کوئی ایسا شخص نہیں تھا جسے وہ اپنا حال دل سناسکتی یا جسے وہ اپنے غموں، درد کھوں کا راز دلاں سنا سکتی اور دریں اثنا اسے نت نئے آرام و مصائب گھیرتے رہے۔ پرنس آندرے کی واپسی اور شادی کا وقت قریب تر ہاتھ لیکن اس نے اس کے ذمے جو فرض لگایا تھا کہ وہ اس کے باپ کو اس واقعے کے لیے تیار کرے، مرحلہ تکمیل سے اتنا دور تھا کہ معلوم ہوتا تھا کہ سارا معاملہ گڑبڑا جائے گا۔ نوجوان کاؤنٹس رستووا کا ذکر آیا نہیں کہ معمر پرنس (جو بہر حال ویسے ہی بد مزاج تھا) کا پارہ آسمان پر چڑھا نہیں۔ ایک اور مصیبت، جو حال ہی میں پرنس ماریا کے ذہن پر اچھا خاصا بوجھ بن گئی تھی، وہ ان اسباق کی، جو وہ اپنے بھتیجے کو دیا کرتی تھی، پیدا کر رہی تھی۔ اسے یہ دیکھ کر بہت دکھ ہوتا کہ وہ کوشکا کے ساتھ جس قسم کا برتاؤ کرنے لگی تھی، اس میں اس کے باپ کی بد مزاجی کی علامات نمودار ہونا شروع ہو گئی تھیں۔ وہ اپنے آپ کو خواہ کتنا ہی کیوں نہ سمجھتی کہ جب وہ بچے کو پڑھانے بیٹھتی ہے، اسے غصے کو اپنے قریب بھی نہیں بٹھکنے دینا چاہیے لیکن تقریباً ہر بار یہی ہوتا کہ جب بھی فرانسیسی حروف تہجی کی طرف اشارہ کرنے کے لیے وہ اپنے ہاتھ میں چھڑی پکڑ کر درس کا آغاز کرتی اسے کام نبھانے کی اتنی جلدی ہوتی اور اپنا علم بچے۔ جسے پہلے ہی یہ خوف اپنے شکبے میں جکڑنے لگتا کہ آنٹی کسی لمحے اس سے ناراض ہو سکتی ہے۔ کے ذہن میں اٹھ پلنے کے لیے اتنا آسان بنانے کی فکر ہوتی، کہ اگر وہ ذرا بھی بے توجہی کا مظاہرہ کرنا، وہ سر سے پاؤں تک کا پیسے لگتی اور ہڑبڑا جاتی، اس کی کیفیت بیجانی ہو جاتی، اس کی آواز بلند ہو جاتی اور بعض اوقات وہ اس کا بازو پکڑ کر جھنجھوڑ دیتی اور اسے کونے میں کھڑا کر دیتی۔ اسے کونے میں کھڑا کر چکنے کے بعد وہ اپنی سفاک اور نابکار فطرت پرورد نے بیٹھ جاتی اور کوشکا اس کی مثال پر عمل کرتے ہوئے زائد تھوڑے روئے لگتا، بغیر اجازت کونے سے نکلتا، اس کے پاس پہنچتا اور اس کے چہرے سے اس کے لیے ہاتھ اٹھا کر اسے تسلی دینے کی کوشش کرتا۔

لیکن پرنس ماریا کو جس سب سے بڑی چٹا کا سامنا کرنا پڑتا، وہ اس کے باپ کی تنگ مزاجی تھی۔ وہ اس کا مستقل نشانہ بنی رہتی۔ حال ہی میں یہ شقاوت کی سرحدوں کو چھونے لگی تھی۔ اگر اسے ساری ساری رات رکوں و بھوک کی حالت میں گزارنے پر مجبور کیا جاتا یا اسے لکڑیاں کاٹ کر لانے یا پانی ڈھونڈنے کا حکم دیا جاتا، تو یہ بات کبھی اس کے نہاں خائبہ دماغ میں نہ آتی کہ اس کی قسمت ہی حراب ہے، لیکن یہ محبت و مشفق ڈیکٹر۔ چونکہ وہ اس سے محبت کرتا تھا، اس لیے وہ اور بھی سفاک ہو گیا تھا اور یہی وجہ تھی کہ وہ اپنے آپ کو بھی اور اسے بھی اذیت میں مبتلا رکھتا تھا۔ نہ صرف اس لیے وہ دانستہ اس کے جذبات کو ٹھیس پہنچانے اور اس کو دلیل و خواہ کرنے کا اہتمام کرتا رہتا تھا بلکہ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ اسے یہ کیسے جنانا ہے کہ ہر معاملے میں قصور وار وہی ٹھہرتی ہے۔ حال ہی میں اس نے ایک نیا گل کھلانا شروع کر دیا تھا اور یہ بات کسی دوسری چیز کی نسبت زیادہ سواہن روح بن گئی تھی۔ یہ نیا گل جو وہ کھل رہا تھا، یہ تھا کہ اس کے اور مادہ سوزیل یونین کے مابین ہے تکلفی میں روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ اسے یہ سن کر جب

اسے اپنے بیٹے کے عزائم کے بارے میں خبر ملی۔ بظاہر اس کی سوچ یہ تھی کہ اگر آئندہ سے شادی کرانا ہے، پھر اس کے مادموزیل بوغین کے ساتھ نکاح کرنے میں کیا مضائقہ ہے؟ گزشتہ کچھ عرصے سے اس کا مسلسل یہ دتیرہ بن گیا تھا کہ مادموزیل کے ساتھ کچھ اس طرح پیش آتا جیسے وہ اس سے جی جان سے پیار کرتا ہو (پرنس ماریا کا خیال تھا کہ وہ یہ سب کچھ محض اس کی تذلیل کرنے کے لیے کرتا ہے)۔ درحقیقت فرانسیسی خاتون سے پیار و محبت جتنا کردہ اپنی بیٹی سے اپنی بے اطمینانی کا اظہار کر رہا تھا۔

ایک روز ماسکو میں معمر پرنس نے پرنس ماریا کی موجودگی میں (وہ یہ سمجھتی تھی کہ اس کے باپ سے جب وہ وہاں بیٹھی تھی، عہد ایہ حرکت کی ہے) مادموزیل بوغین کے ہاتھ پر بوسہ دیا، اسے اپنی جانب کھینچا، اپنی آغوش میں بھینچا اور پیار سے اس کا جسم سہانے لگا۔ پرنس شرم سے پیر بہوٹی بن گئی اور کمرے سے باہر بھاگ گئی۔ چند من بعد مادموزیل بوغین پرنس ماریا کے کمرے میں آئی۔ وہ مسکرا رہی تھی اور اپنی شیریں آواز میں چہچہا چہچہا کر باتیں کر رہی تھی۔ پرنس ماریا نے پھرتی سے اپنے آنسو پونچھے، بڑے عزم و حوصلے کے ساتھ مادموزیل بوغین کے پاس پہنچی اور بظاہر اس بات سے بے خبر کہ وہ کیا کر رہی ہے، بڑی تسلی اور تیز مزاجی سے بھرائی ہوئی آواز میں فرانسیسی عورت پر پھٹ پڑی:

”کسی شخص کی کمزوری سے یوں فائدہ اٹھانا قابل نفرت، شرم ناک، وحشیانہ۔“ اس میں اپنی بات ختم کرنے کا یار نہیں تھا۔ ”کل جاؤ میرے کمرے سے!“ اس نے چلا کر کہا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

اگلے روز پرنس نے اپنی بیٹی سے ایک لفظ تک نہ کہا تاہم ذرا پر اس نے دیکھا کہ وہ حکم دے رہا ہے کہ سب سے پہلے مادموزیل بوغین کو کھانا پیش کیا جائے۔ کھانے کے اختتام پر جب بلر کافی لایا اور اس نے عادتاً سے سب سے پہلے پرنس ماریا کے سامنے رکھا، معمر پرنس آگ بگول ہو گیا، اس نے اپنی چھری بلر فلپ کو دے مارا، درآؤ دیکھا نہ تاؤ، جھٹ حکم صادر کر دیا کہ اسے فوج میں بھرتی کرادیا جائے۔

”یہ حکم ماننا ہی نہیں۔ میں نے دو دفعہ دہرایا۔ یہ پھر بھی نہیں مانا اب اس گھر کی خاتون اول ہے، یہ میری بہترین دوست ہے!“ پرنس نے چلا کر کہا۔ ”اور اگر تم نے“ اس نے آپ سے باہر ہو کر پہلی مرتبہ پرنس ماریا سے مخاطب ہو کر کہا، ”اگر تم نے اس کی موجودگی میں دوبارہ اپنا مقام بھلانے کی کوشش کی تو مجھے تمہیں یہ بتانا پڑے گا کہ اس گھر کا، لک کون ہے۔ دفع ہو جاؤ! میری آنکھوں سے دور ہو جاؤ! اس سے معافی، لگو!“

پرنس ماریا نے مادموزیل بوغین سے معذرت کی اور اپنے باپ سے بھی درخواست کی کہ وہ اسے اور بلر قلب، جس نے اس سے گزر کر التجا کی تھی کہ اس کی شفاعت کر دے، دونوں کو معاف کر دے۔

ایسے مواقع پر ایک ایسا جذبہ جو قربانی کے فخر سے مرثل ہوتا، اس کی روح کو گرما دیتا اور ایک پکے وہ باپ جیسے وہ دل ہی دل میں کوس رہی ہوتی تھی، اس کی موجودگی میں اپنا چشمہ ڈھونڈنے لگتا۔ وہ اس کے قریب ہی پڑا ہوتا لیکن وہ اسے دیکھ نہ رہا ہوتا، بلکہ بے ڈھنگے انداز سے اسے ٹوٹ رہا ہوتا، یادہ کوئی ایسی بات، جو ابھی ابھی وقوع

پذیر ہوئی ہوتی، بھول جاتا، یا اپنی ٹانگوں پر، جو جواب دہی جا رہی تھیں لڑکھڑاتا چل پڑتا اور مڑ کر پیچھے دیکھتا جاتا کہ کہیں کسی نے اس کی کمزوری بھانپ تو نہیں لی اور سب سے بدتر بات یہ ہوتی کہ اگر لڑ پر اسے انگشت کرنے کے لیے کوئی مہمان نہ ہوتا، وہ ایک دم اونگھنے لگتا، اس کا ٹپکین نیچے گر پڑتا اور اس کا کانپنا لڑتا ہاتھ پیٹ میں جا پڑتا۔ وہ بوڑھے اور ضعیف ہیں اور میں ان کا ہکا کہہ کرنے چلی ہوں!“ وہ سوچتی اور اسے اپنے آپ سے نفرت ہونے لگتی

3

1811 میں ماسکو میں ایک فرانسیسی طبیب ڈاکٹر مینی ویئے، جس نے دیکھتے ہی دیکھتے نوبلٹ عامہ حاصل کر لی تھی، رہتا تھا۔ وہ بے حد لب و لہجہ، خوش شکل اور کچھ اس طور اشتیاق و شائستگی تھا، جو صرف کوئی فرانسیسی ہی ہو سکتا ہے۔ ہر شخص کی اس کے متعلق ایک ہی رائے تھی کہ وہ غیر معمولی طور پر ہوشیار اور باکمال طبیب ہے۔ بہترین گھروں میں اسے محض معالج کے طور پر ہی نہیں بلکہ برابر کے آدمی کی حیثیت سے ’جی آیاں نوں‘ کہا جاتا تھا۔

پرنس نکولا کی آندر یوچ نے ہمیشہ طب کا مذاق اڑایا تھا، تاہم حال ہی میں مادموزیل بوغین کے مشورے پر اس نے اس ڈاکٹر کو اپنے گھر آنے اور اپنا معائنہ کرنے کی اجازت مرحمت کر دی تھی۔ رفتہ رفتہ وہ اس کا خوگر ہو گیا۔ جتنی دیر ہفتے میں کوئی دو مرتبہ پرنس کو دیکھنے آیا کرتا تھا۔

جس روز سینٹ نکولا کی یاد تازہ کی جاتی تھی، وہی دن پرنس آندرے کا نام دن تھا۔ اس روز سارا، سکواں کے دروازے پر پہنچ گیا لیکن اس نے حکم دے دیا تھا کہ کسی کو گھر کے اندر گھسنے نہ دیا جائے۔ صرف چند گئے چنے مہمانوں کو، جن کی فہرست اس نے پرنس، ریا کے سپرد کر دی تھی، کھانے پر مدعو کیا جاتا تھا۔

جتنی دیر، جو ذرا دن چڑھے ہدیہ تبریک پیش کرنے چلا آیا تھا، ڈاکٹر کی حیثیت سے اپنا یہ حق سمجھتا تھا کہ ضرورت پڑے تو وہ، جیسا کہ اس نے پرنس ماریا کو بتایا، حکم کی خلاف ورزی کر کے (forcer la consigne) بھی اندر آ سکتا ہے۔ چنانچہ وہ آیا اور پرنس کو دیکھنے اندر چلا گیا۔ ہوا یہ کہ اپنے نام دن کی صبح پرنس پر بد مزاجی کا شدید ترین دورہ پڑ گیا۔ اس نے چاشت کا سارا وقت گھر میں بے مقصد گھومنے پھرنے میں گزارا تھا، وہ ان تھک انداز سے ہر شخص میں خاموش تلاش کر رہا تھا اور یوں بن رہا تھا کہ جو کچھ اس سے کہا جا رہا ہے، وہ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا اور نہ کوئی دوسرا اس کی بات صحیح طور پر سمجھ رہا ہے۔ اس کے مزاج کی اس چڑچڑی کیفیت سے، جس میں وہ بظاہر پرسکون اور اپنے ہی خیالات میں کھویا ہوا معلوم ہوتا تھا، لیکن جس کا عام طور پر انجیم یہ ہوتا تھا کہ وہ غیظ و غضب سے بارود کے دھماکے کی طرح پھٹ جاتا تھا، پرنس ماریا بخوبی آگاہ تھی اور وہ ساری صبح کچھ یوں پریشان رہی تھی جیسے اسے کسی ایسی بندوبست کا، جس میں گولیاں بھری جا چکی ہوں اور جس کا گھوڑا چڑھایا جا چکا ہو، سامنا ہو، اب وہ محض دھماکے کی، جیسے ٹالائیں جاسکتا تھا، منتظر تھی۔

ڈاکٹر کی آمد تک خیریت رہی تھی اور کوئی خاص سانحہ پیش نہیں آیا تھا۔ جتنی دیر کا استقبال کرنے کے بعد

پرنس ماریا کتاب لے کر ڈرائنگ روم میں دروازے کے قریب بیٹھ گئی۔ سٹڈی روم میں جو کچھ بچہ رہا تھا، وہاں سے وہ با آسانی سن سکتی تھی۔

شروع شروع میں اسے صرف جی دے کی آواز سنائی دی، پھر اپنے باپ کی آواز اس کے کانوں میں پڑی اور اس کے بعد دونوں کے بیک وقت بولنے کی آوازیں آنے لگیں۔ طوفانی انداز سے دروازہ کھلا اور دلیر پر اپنے ژولیدہ باؤں سمیت جی دے کی، جس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں، وجہ یہ شکل نمودار ہوئی۔ اس کے پیچھے پیچھے پرنس تھا۔ وہ شینے ٹوپی اور ڈریسنگ گاؤن میں ملبوس تھا، غیظ و غضب سے اس کے چہرے کی صورت مسخ ہو گئی تھی اور اس کی آنکھوں کی پتلیاں باہر ابل آئی تھیں۔

”تم سمجھے یا نہیں؟“ پرنس نے چلا کر کہا۔ ”لیکن میں سمجھ گیا ہوں! نرائسی جاسوس! بولنا پارت کا بٹھو۔ جاسوس امیرے گھر سے نکل جاؤ۔ میں کہتا ہوں، نکل جاؤ!“ اور اس نے دھم کے سے دروازہ بند کر دیا۔ جی دے نے کندھے اچکائے اور ماداموزیل بوغین کے، جو شور و غل کی آواز سن کر ملاحظہ کمرے سے بھاگن آئی تھی، پاس چلا گیا۔

”پرنس کی طبیعت اچھی نہیں ہے۔ ان کا مزاج صفا دی ہے، بہت جلد خون کھولنے لگتا ہے۔ فکر نہ کرو، میں کل پھر آ جاؤں گا،“ جی دے نے کہا۔ اس نے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھی اور بھاگ بھاگ باہر نکل گیا۔ سٹڈی روم کے دروازے میں سے سلیر پہنچے پاؤں کی چاپ سنائی دے رہی تھی، در کوئی شخص چلا چلا کر کہہ رہا تھا۔ ”جاسوس، غدار۔ ہر طرف غدار ہی غدار! مجھے اپنے ہی گھر میں لمحہ بھر سکون نہیں ملتا۔“ جی دے کی رونا گئی کے بعد پرنس نے اپنی بیٹی کو بلا بھیجا اور اس کے سارے قہر کا وبال اسے جھیلنا پڑا۔ ”یہ سارا قصور تمہارا ہے کہ ایک جاسوس میرے سر پر آ سوار ہوا۔ میں نے تمہیں بتایا نہیں تھا کہ فہرست بالور، جس آدمی کا نام فہرست میں شامل نہ ہو، اسے مت اندر آنے دو؟ پھر تم نے اس بد معاش کو کیوں اندر آنے دیا؟ یہ سب تمہاری وجہ سے ہوا۔ تم مجھے ایک گھڑی آرام سے رہنے نہیں دیتیں، تم تو مجھے سکون کی موت بھی نہیں مرنے دو گی!“ اس نے گلہ پھر ڈکر کہا۔

”نہیں، مادام، ہمیں ایک دوسرے سے لگ ہونا ہی پڑے گا، لڑنا لگ ہونا پڑے گا۔ یہ میں بھی جانتا ہوں اور تم بھی جانتی ہو۔ میں مزید برداشت نہیں کر سکتا!“ اس نے کہا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔ پھر اسے شاید یہ اندیشہ لاحق ہو گیا کہ وہ کہیں تسکین و تشفی کے کوئی اسباب ہی نہ ڈھونڈ لے، وہ واپس آیا اور یوں ٹھہر ٹھہر کر بولنے لگا جیسے وہ یہ تاثر دینا چاہتا ہو کہ وہ یہ باتیں غصے کے عالم میں نہیں، بلکہ ٹھنڈے مزاج سے کہہ رہا ہے۔ ”یہ مت سوچو کہ میں غصے سے پاگل ہو گیا ہوں۔ میں بالکل ٹھیک ٹھاک اور پرسکون ہوں۔ میں نے جو کچھ کہا ہے، خوب سوچ سمجھ کر کہا ہے اور میری ان باتوں پر عمل ہو کر رہے گا۔ ہمیں مادام ایک دوسرے سے علیحدہ ہونا پڑے گا، چنانچہ اپنے لیے کوئی ٹھکانہ نکالنا ضروری ہے۔“

لیکن پھر وہ اپنے اوپر قابو نہ رکھ سکا اور ایسی مسموم تلخی سے، جس کا ظہار صرف اسی شخص سے، جو صحیح معنوں میں محبت کرتا ہو ممکن ہوتا ہے، پھٹ پڑا۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ شدید رہنمی اذیت میں مبتلا ہے۔ وہ اس کی جانب کے ہرانے اور طلق پھاڑ پھاڑ کر کہنے لگا

”کاش کوئی الو کا پٹھانم سے شادی کر چکا ہوتا!“ پھر اس نے دھماکے سے دروازہ بند کیا، ماداموزیل بوغین کو بلایا اور ٹھنڈا ہو کر اپنے شہزی روم میں بیٹھ گیا۔

دو بجے اس کے چھ منتخب مہمان ڈنر پر اکٹھے ہوئے۔ یہ مہمان — مشہور و معروف کاؤنٹ رستوپ چین، پرنس پوخن اور اس کا برادر زادہ، جنرل چاترول، جو فوج میں معمر پرنس کا سابق رفیق تھا اور نئی نسل میں پیئر اور یورس دو ویشسکوئے۔ ڈرائنگ روم میں اپنے میزبان کا انتظار کر رہے تھے۔

یورس کی جو چند روزہ جیٹر چھٹی پر ماسکو آیا تھا، یہ خوش ہٹل تھی کہ اسے پرنس نکولائی آندر یوچ کی خدمت میں حاضر ہونے کا کوئی موقع مل جائے۔ نہ صرف یہ کہ اس کی دلی آرزو پوری ہوئی تھی بلکہ وہ اس حد تک اس کے دل میں گھر کرنے میں کامیاب رہا تھا کہ پرنس، جس نے جو یہ اصول بنارکھا تھا کہ وہ کسی کنوارے کو اپنے گھر میں پاؤں نہیں رکھنے دے گا، اس کے معاملے میں استثناء برتنے پر مجبور ہو گیا۔

پرنس کامکات، ان مکانوں میں شامل نہیں تھا جن کے متعلق یہ کہہ جاسکتا ہے کہ وہاں شہر کے حصوں، اونچے اور فیشن پرست طبقے کے لوگ دعوتوں، محفلوں، درودری تفریحات کے لیے اکٹھے ہوتے ہیں۔ لیکن اس کا چھوٹا سا حلقہ، جس کا اگرچہ شہر میں کوئی خاص ذکر نہیں ہوتا تھا، ایسا تھا کہ کسی بھی دوسری جگہ کی نسبت اس میں باریابی پانا کہیں زیادہ فخر و مباہات کی بات سمجھا جاتا تھا۔ یورس نے اس کا اندازہ گزشتہ ہفتے کر لیا تھا جب اس کی موجودگی میں کمانڈر انچیف نے کاؤنٹ رستوپ چین کو سینٹ نکولائی کے یوم کی تقریبات کے سلسلے میں دعوت دی اور رستوپ چین نے جواب میں کہا:

”اس روز میں ہمیشہ پرنس نکولائی آندر یوچ کے تبرکات کو سلام کرنے جاتا ہوں۔“

”ارے ہاں بالکل بالکل۔“ کمانڈر انچیف نے کہا۔ ”ان کی طبیعت کیسی ہے؟“

مختصر گردپ، جو بلند دبلا اور قدیم الوضع ڈرائنگ روم میں ڈنر سے پہلے اکٹھا ہوا تھا، عدالت انصاف کے شہید و حاضرین سے مشابہ تھا۔ سب لوگ یا تو خاموش تھے، یا اگر لب کشائی کرتے بھی تھے تو اتنا آہستہ بولتے تھے کہ ان کی آواز بمشکل سنی دیتی تھی۔ پرنس نکولائی آندر یوچ اندر آیا۔ اس نے سنجیدگی کا لہجہ اور رکھ رکھاؤ اور معلوم ہوا تھا کہ اس نے کچھ نہ کہنے کی قسم کھا رکھی ہے۔ پرنس، رہا معمول سے کہیں زیادہ مسکین اور ڈری بھی نظر آ رہی تھی۔ مہمان اس سے ہم کلام ہونے میں متامل تھے کیونکہ انھیں یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ اس کی ذہنی کیفیت کچھ ایسی ہے کہ وہ ان سے بات کرنے کے لیے آمادہ نہیں ہے۔ کاؤنٹ رستوپ چین واحد شخص تھا جو گفتگو کا سرا تھا۔ وہ بے تھا، کبھی وہ شہر کی تازہ ترین خبریں سنانے لگتا اور کبھی کوئی حالیہ سیاسی گپ شپ۔

کبھی کبھار پوخن اور بوڑھا جرنیل بھی کوئی لقمہ دے دیتے۔ پرنس نکولائی آندر یوچ کچھ اس انداز سے جس

طرح عدالت انصاف کا صدر کوئی ایسی رپورٹ جو سے پیش کی جا رہی ہو، منسا ہے سن رہا تھا۔ وہ رپورٹ منسا رہتا ہے، بس کہیں بیچ بیچ میں غرض کر دیتا ہے یا روکے پھیکے سچے سے کوئی لفظ کہہ دیتا ہے۔ اس کا یہ رویہ اس امر کی علامت ہوتا ہے کہ وہ رپورٹ کو نظر انداز نہیں کر رہا، بلکہ اس پر پوری توجہ دے رہا ہے۔ معر پرئس کا بھی کچھ ایسی حال تھا جہاں تک گفتگو کا تعلق ہے، وہ جس لہجے میں ہو رہی تھی، اس سے یہ مترشح ہوتا تھا کہ دنیائے سیاست میں جو کچھ ہو رہا ہے، کوئی بھی اسے پسندیدگی کی نگاہوں سے نہیں دیکھتا۔ جو واقعات بیان کیے جا رہے ہیں، وہ اس رائے کی تصدیق کرتے تھے کہ حالات بد سے بدتر ہوتے جا رہے ہیں، لیکن بیان خواہ کسی واقعے کا ہوتا یا اظہار کسی بھی رائے کا، قابل غور بات یہ تھی کہ ایک خاص مقام پر پہنچ کر متکلم یا تو خود ہی خاموشی اختیار کر لیتا یا پھر اسے ٹوک دیا جاتا کیونکہ اس سے آگے اس بات کا احتمال ہو جاتا تھا کہ کہیں اس کی نکتہ چینی کی زد میں خود اپنی طور کی ذات و ذمہ داری نہ آجائے۔

ڈیوٹن گولڈنبرگ کا وہ تیسری سیاسی خبر کے۔ ڈیوٹن آف اولڈن برگ کے محرمہ عدالت پر نیولین کے قبضے، اور اس کے بارے میں راسی مراسلہ کے، جس میں نیولین کے اقدام کی مخالفت کی گئی تھی اور جو یورپ کے تمام شاہی درباروں کو ارسال کیا گیا تھا۔ متعلق ہونے لگی۔

”بونا پارٹ یورپ کے ساتھ جو سلوک روا رکھتا ہے، وہ بالکل وہی ہے جو بحری قزاق مقبوضہ جہاز کے بارے میں اختیار کرتا ہے،“ کاؤنٹ نے اپنا ایک فقرہ، جو وہ بار بار استعمال کر چکا تھا، دہراتے ہوئے کہا۔ ”ڈیوٹن گولڈنبرگ والیان تحت وناج، جو عرصے سے مصائب کی پگھلی میں پس رہے ہیں یا اپنی آنکھیں بند کیے بیٹھے ہیں، ہوتا ہے۔ اب یورپ کی باری آگئی ہے، نیولین رومن کی تھوٹک مسلک کے سربراہ کو معزول کرنے میں ضمیر کی ذرا سی بھی کلک محسوس نہیں کرتا اور ابھی منہ میں گھٹنگھٹیاں ڈالے ٹک ٹک دیکھ دیکھ نہ کشیدہ کی تصویر بنے بیٹھے ہیں۔ صرف ہمارے اہل طور نے ڈیوٹن آف اولڈن برگ کے عدالت پر قبضے کے خلاف احتجاج کیا ہے اور وہ بھی۔“ کاؤنٹ رستوب جن نے توقف کیا۔ اسے یہ احساس ہونے لگا تھا کہ وہ اس حد کو جس سے آگے نکتہ چینی ناممکن الامر تھی، چھوٹنے لگا ہے۔

”ڈیوٹن آف اولڈن برگ کے عوض دوسرے علاقوں کی پیشکش کی گئی ہے،“ پرئس گولڈن آندر یونج نے کہا۔ ”وہ ڈیوٹن کی اکھاڑ پچھاڑ ایسے ہی کرتا رہتا ہے جیسے میں اپنے زرعی غلاموں کو بالذہر سے اپنی باگوچارانویار باران کی جاگیروں میں بھیجتا رہتا ہوں۔“

”ڈیوٹن آف اولڈن برگ، اپنے مصائب کو جس صبر و تحمل سے جھیل رہے ہیں اور انہوں نے انہیں جس طرح شہیت ایزدی سمجھ کر قبول کیا ہے، وہ قابل تعریف ہے،“ بورس نے نہایت ادب و احترام سے لقمہ دیا۔

اس سے یہ بات کیوں کہی، اس کی وجہ یہ تھی کہ پیئر زبرگ سے اپنے سفر کے دوران میں اسے ڈیوٹن کی خدمت میں حاضر ہونے کا اعزاز ملا تھا۔ پرئس گولڈن آندر یونج نے آنکھ اٹھ کر نو جوان کو کچھ اس انداز سے دیکھا جیسے وہ جواب میں کچھ کہنا چاہتا ہو، تاہم اس نے اپنا ارادہ بدل دیا۔ بظاہر اس کا خیال تھا کہ وہ اتنا نو عمر ہے کہ اس کی توجہ کا مستحق نہیں۔

”اولڈن برگ کے معاملے میں ہم نے جو احتجاج کیا ہے، مجھے وہ پڑھنے کا موقع ملا ہے۔ اس کو جس برے طریقے سے تحریر کیا گیا ہے، اسے دیکھ کر میں ہکا بکا رہ گیا،“ کاؤنٹ رستوپ چین نے ایک ایسے شخص کے، جو کسی ایسی بات کا، جس سے وہ پوری طرح آگاہ ہو، یا کہہ کر رہا ہو، لا پرواہانہ انداز سے کہا۔

میسٹر نے رستوپ چین کو معصومانہ حیرت سے دیکھا۔ اس کی سمجھ میں یہ بات نہیں آرہی تھی کہ اگر مراسلے میں بلیغ زبان استعمال نہیں ہوئی تھی، تو اس پر اسے پریشان ہونے کی کیا ضرورت تھی۔

”کاؤنٹ، اگر مراسلے کا متن زوردار ہو، پھر اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ اس میں کس قسم کی زبان استعمال کی گئی ہے؟“ اس نے پوچھا۔

”مائی ڈیئر فیلو، اگر آپ کے پاس پانچ لاکھ افراد پر مشتمل سپاہ ہو، پھر بلیغ اسلوب بنانا آسان ہو جاتا ہے۔“ کاؤنٹ رستوپ چین نے کھٹ فرانسیزی میں جواب دیا۔

مراسلے کے اسلوب نگارش پر کاؤنٹ رستوپ چین نے عدم اطمینان کا جو اظہار کیا تھا، وہ میسر کی سمجھ میں آ گیا۔ ”ہمارا تو یہی خیال تھا کہ وہاں قلم کاروں کی کوئی کمی نہیں،“ میسر پرس نے کہا۔ ”پیشتر برگ میں انھیں لکھنے کے علاوہ اور کوئی کام نہیں اور وہ صرف مراسلے ہی نہیں لکھتے۔ تو انہیں بھی تحریر کرتے رہتے ہیں۔ میرا اندازہ وہیں ہے۔ اس نے روس کے لیے تو انہیں کی پوری کتاب لکھ دی ہے۔ آج کل ہر کس و نا کس لکھ رہا ہے۔“ اس نے غیر فحری انداز سے ہنستے ہوئے کہا۔

گنگو میں عارضی توقف آگیا۔ میسر جرنیل نے دوسروں کی توجہ اپنی جانب مبذول کرانے کے لیے کھکار کر گلا صاف کیا۔

”پیشتر برگ میں مارچ پاسٹ کے موقع پر جو تازہ ترین واقعہ پیش آیا ہے، آپ میں سے کسی نے اس کے بارے میں کچھ سنا ہے؟ اس واقعے کا تعلق نئے فرانسیسی سفیر کے دتیرے سے ہے۔“

”کیا؟ میں نے کچھ سنا تو تھا۔ میرا خیال ہے کہ اس نے امپراطور کی موجودگی میں کوئی کٹھن بات کہہ دی تھی۔“ ”امپراطور نے اس کی توجہ گرینڈ ڈریشن اور مارچ پاسٹ کی جانب دلائی تھی،“ جرنیل نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”معلوم ہوتا ہے کہ سفیر موصوف نے اس پر مطلق توجہ نہ دی اور بڑی بدتمیزی سے بولا: ”فرانس میں ہم اس قسم کی معصوم چیزوں پر وقت ضائع نہیں کرتے!“ امپراطور نے اس کا جواب دینا اپنی شان سے بعید تصور کیا۔ کہتے ہیں اگلے مارچ پاسٹ پر انھوں (امپراطور) نے اسے بالکل نظر انداز کر دیا۔“

تمام لوگ خاموش بیٹھ رہے۔ کسی ایسے معاملے کے، جس کا براہ راست تعلق امپراطور کی ذات سے ہو، بارے میں رائے زنی کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

”گستاخ لفظ!“ پرس نے کہا۔ ”آپ صاحبان جتنی دیرے کو جانتے ہیں؟ آج میں نے اسے اپنے گھر سے نکال دیا۔ وہ یہاں آدھکا تھا۔ انھوں نے اسے مجھ سے ملنے اندر آنے دیا حالانکہ میں نے اس سے عرض بھی کیا تھا

کہ کسی کو اندر نہ آنے دیا جائے، وہ بولتا چلا گیا اور غصیلی نظروں سے اپنی بیٹی کو دیکھتا رہا۔

فرانسیسی ڈاکٹر کے ساتھ اس کی جو گفتگو ہوئی تھی، وہ اسے الف سے کی تک دہرنے اور انھیں یہ بتانے لگا کہ وہ جتنی دیر کو کیوں جاسوس سمجھتا ہے، اگرچہ جو بات ناکافی اور مبہم تھیں، کسی نے جو بڑا مناسب نہ سمجھا۔ دوست کے بعد شیمپس پیش کی گئی۔ معمر پرنس کو تہنیت پیش کرنے کے لیے مہمان اپنی نشستوں سے اٹھ کر کھڑے ہو گئے پرنس ماریا بھی اس کے پاس چلی گئی۔

اس نے سرد مہر اور غضب ناک نگاہوں سے اس کی جانب دیکھا اور اپنا جھریاں زدہ اور صفا چٹ گال آگے بڑھا دیا تاکہ وہ اس پر بوسہ دے سکے۔ اس کے انگ انگ سے یہ ظاہر ہو رہا تھا کہ ان دونوں کے مابین صبح جو گفتگو ہوئی تھی، وہ اسے بھولا نہیں تھا اور نہ اس کے فیصلے میں کوئی تبدیلی آئی تھی، یہ تو صرف مہمانوں کی موجودگی تھی جو اس کے اسے یہ سب کچھ بتانے میں رکاوٹ ڈال رہی تھی۔

جب وہ کافی نوش کرنے کے لیے ڈرائنگ روم میں چپے گئے، بڑھے ٹھڈے ایک دوسرے کے پاس بیٹھ گئے۔ پرنس نکولائی آندر یوچ کے جوش و خروش میں اضافہ ہوئے لگا اور وہ متوقع جنگ کے بارے میں اپنے خیالات بیان کرنے لگا۔ اس نے کہا جب تک ہم جرمنوں کے ساتھ معاہدہ کرنے کے لیے ہاتھ پاؤں مارتے رہیں گے اور یورپی معاملات کے، جن میں ہمیں عہد نامہ ٹلزٹ نے گھسیٹ لیا ہے، پھٹے میں ٹانگ اڑاتے رہیں گے، یوٹانا پارت کے ساتھ ہماری جنگیں تباہ کن ثابت ہوتی رہیں گی۔

”ہمیں نہ تو آسٹریا کی خاطر جنگ کرنا چاہیے اور نہ اس کے خلاف“ اس نے کہا۔ ”ہمارے تمام سیاسی مفادات، مشرق میں ہیں اور جہاں تک یوٹانا پارت کا تعلق ہے، واحد کام جو ہمارے کرے کا ہے، یہ ہے کہ ہم سرحدوں پر مسلح افواج تعینات کر دیں اور مضبوط پالیسی اختیار کریں، پھر جس طرح 1807 میں اس نے روسی سرحد عبور کی تھی، وہ دوبارہ اس قسم کی حرکت کرنے کی جرأت نہیں کرے گا۔“

”لیکن پرنس، ہم فرانسیسیوں کے خلاف ممکنہ طور پر کیسے جنگ کر سکتے ہیں؟“ کاؤنٹ رستوپچن نے کہا۔ ”کیا ہم اپنے اساتذہ کے، جو ہمارے نزدیک دیوتاؤں کی مانند ہیں، خلاف اتھیا راٹھا سکتے ہیں؟ اپنے نوجوانوں کو دیکھیں، اپنی خواتین پر نظر ڈالیں! ان سب کے نزدیک فرانسیسی ہمارے دیوتا ہیں اور پھر جنت الفردوس!“

اس کی آواز بلند ہو گئی۔ بظاہر اس کی خواہش یہی معلوم ہوتی تھی کہ ہر شخص تک اس کی آواز پہنچے۔ ”ہمارے میشن فرانسیسی ہیں، ہمارے خیانت فرانسیسی ہیں، ہمارے جذبات واحد سات فرانسیسی ہیں! آپ نے مٹی ویئے کو چلا کیا کیونکہ وہ فرانسیسی ہے ورنہ لٹکا ہے۔ لیکن ہماری خواتین گھٹنوں کے بل چل کر اس کے پاس جانا عار نہیں سمجھتیں۔ کل رات میں ایک دعوت میں شریک ہوا۔ وہاں پانچ خواتین میں سے تین روسی بھولک تھیں۔ انھیں پوپ نے خصوصی اجازت مرحمت فرمائی ہے کہ وہ اتوار (روزِ سبت) کو سلائی کر چھائی کر سکتی ہیں۔ وہاں وہ تقریباً عریاں بیٹھی تھیں اور اگر آپ براہِ منائیں تو میں یہ عرض کروں گا کہ وہ خواتین معلوم ہی نہیں ہوتی

تھیں بلکہ عوامی حاسوں کے سائن بورڈ نظر آتی تھیں۔ جب ان لوگوں پر نظر پڑتی ہے، میرا جی چاہتا ہے کہ
جانب گھر سے پیٹرا عظیم کا عصا اٹھاؤں اور قابل تہہ رقدیم رومی انداز سے چند ایک پسلیاں توڑ دوں۔ یوں ان
چھو کر دس چھو کر یوں کے دماغوں سے خرافات نکل جائیں گی۔“

کسی نے کچھ نہ کہا۔ معمر پرنس نے رستوپ چن کی جانب دیکھا اور پسندیدگی سے اپنی گردن ہلا دی۔
”اچھا، پوڑا ٹیکسی لینسی، خدا حافظ۔ اپنی صحت کا خیال رکھیں!“ رستوپ چن نے اپنی مخصوص پھرتی کے
ساتھ، ٹھٹھے اور پرنس کی جانب اپنا ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔

”مائی ڈیئر فیو، خدا حافظ، اس کے الفاظ کانوں میں رس گھولتے ہیں۔ میں اس کی باتوں سے کبھی سیر نہیں
ہوتا۔“ معمر پرنس نے رستوپ چن کا ہاتھ تھامتے اور بوسے کے لیے اپنا گال اس کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔
رستوپ چن کی مثال پر عمل کرتے ہوئے دوسرے بھی اٹھ کھڑے ہوئے۔

4

پرنس ماریا ڈرائنگ روم میں بیٹھی اور بڑے بوڑھوں کی چلی کٹی باتیں سنتی رہی، لیکن اس کی سمجھ میں خاک نہ آیا۔ وہ
صرف اسی ادھیڑ بن میں مصروف رہی کہ اس کے باپ نے اس کے بارے میں جو مخاصمانہ رد یہ اختیار کر رکھا ہے، وہ
مہانوں کے مشہدے میں آیا ہے یا نہیں۔ پورس درو تیسکوئے، جو اس روز تیسری مرتبہ ان کے گھر آیا تھا، ڈنر کے
سارے عرصے کے دوران میں اس پر جس نمایاں انداز سے توجہ دیتا رہا اور اسے جس التفات کی نظروں سے دیکھتا رہا
تھا، پرنس ماریا کا وہ بیان اس طرف بھی نہ گیا۔

اس نے کھوئی کھوئی لیکن دریافت طلب نگاہوں سے حیر کی، جو ہاتھوں میں ہیٹ پکڑے اور چہرے پر
مسکراہٹ سجائے اس کے پاس آنے والا آخری مہمان تھا، جانب دیکھا۔ معمر پرنس اندر جا چکا تھا اور اب وہ
ڈرائنگ روم میں اکیلے رہ گئے تھے۔

”کیا میں کچھ دیر مزید ٹھہر سکتا ہوں؟“ اس نے پوچھا اور اس کا بھاری بھر کم جسم دھم سے بازوؤں والی کرسی
پر، جو پرنس ماریا کی نشست کے قریب پڑی تھی، گر پڑا۔

”ارے، بالکل بالکل،“ اس نے جواب دیا۔ ”آپ نے کچھ نہیں دیکھا؟“ اس کی نگاہیں پوچھ رہی تھیں۔
ڈنر کے بعد میز کا مزاج بہت خوشگوار تھا۔ وہ بالکل سامنے رکھ رہا تھا اور اس کے چہرے پر نرم دگداز
مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔

”پرنس، کیا آپ اس نوجوان کو کافی عرصے سے جانتی ہیں؟“ اس نے پوچھا۔

”کون نوجوان؟“

”درو تیسکوئے۔“

”نہیں، زیادہ عرصے سے تو نہیں...“

”کیا آپ اسے پسند کرتی ہیں؟“

”ہاں، وہ پسند خاطر نو جوان ہے... آپ کیوں پوچھ رہے ہیں؟“ پرنسس ماریانے کہا۔ اس کا ذہن ابھی تک اس گفتگو پر، جو صبح اس کی اپنے باپ سے ہوئی تھی، مرکوز تھا۔

”کیونکہ میرا مشاہدہ یہ ہے کہ جب کوئی نو جوان پیئرز برگ سے چھٹی پر ماسکواتا ہے، تو عام طور پر اس کی نیت کسی ایسی دو چیز سے، جو خاصی بڑی جائیداد کی وارث ہو، شادی کرنا ہوتی ہے۔“

”آپ کو اس کے بارے میں مشاہدہ ہوا ہے؟“

”ہاں،“ پیئرز نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”اور یہ نو جوان کچھ ایسا اہتمام کرتا ہے کہ جو نہیں۔ سے کسی ایسی دو چیز کی، جو بھاری جائیداد کی وارث ہو، بن گئی ہوتی ہے، یہ جھٹ وہاں پہنچ جاتا ہے۔ میں اسے بالکل اسی طرح پڑھ سکتا ہوں جس طرح آدمی کتاب پڑھتا ہے۔ فی الحال وہ یہ فیصلہ نہیں کر پارہ کہ وہ کس کے۔ آپ کے یا جولی کارگنا کے۔ گرد و دام ہم رنگ زمیں میں پھے۔ وہ آج کل اسے خاص توجہ دے رہا ہے۔“

”کیا وہ ان کے ہاں آتا جاتا ہے؟“

”ہاں، اکثر۔ نو جوان لڑکیوں کو رہانے کے لیے جوئے نئے اسالیب اختیار کیے جا رہے ہیں، آپ کو ان کے بارے میں کچھ علم ہے؟“ پیئرز نے یوں مسکراتے ہوئے پوچھا جیسے وہ بہت ملاحظہ ہو رہا ہو۔ معلوم ہوتا تھا کہ اس پر ہلکے پھلکے انداز سے اسی قسم کی دل لگی کرنے، جس کے ذریعے وہ اپنے روزنامے میں اکثر اپنی سرزنش آپ کرتا رہتا تھا، ذہن سوار ہے۔

”نہیں؟“ پرنسس ماریانے جواب دیا۔

”آج کل ماسکو کی لڑکیوں کو خوش کرنے کے لیے اپنے اوپر انفرادی طاری کرنا پڑتی ہے۔ وہ جب بھی مادموزیل کاراگنا سے ملتا ہے، وہ اپنی شکل انفرادہ بنالیتا ہے،“ پیئرز نے کہا۔

”واقعی؟“ پرنسس ماریانے پیئرز کے شفقت سے معمور چہرے کو دیکھتے اور اپنے رنج و الم کے متعلق تاحال سوچتے ہوئے کہا۔ ”اگر میں کسی شخص کو پناہ دار دان بنانے کے سلسلے میں فیصلہ کر سکوں، مجھے ذہنی طور پر سکون مل جائے گا،“ وہ سوچ رہی تھی۔ ”اور پیئرز بالکل اسی قسم کے آدمی ہیں جنہیں میں وہ سب کچھ، جو میں محسوس کر رہی ہوں، بتانا چاہوں گی۔ وہ بہت شفیق اور کشادہ دل ہیں۔ میرے دل کا بوجھ ہلکا ہو جائے گا۔ وہ مجھے مشورہ دے سکیں گے۔“

”آپ اس سے شادی کرنا چاہیں گی؟“

”اف، میرے خدایا کاؤنٹ، بعض اوقات ایسے لمحے آ جاتے ہیں جب میں ہر ایک کے غیرے کے ساتھ شادی کرنے کے لیے تیار ہو جاتی ہوں!“ پرنسس ماریانے اچانک با آواز بلند کہا۔ اپنے اس لب و لہجہ پر وہ خود بھی حیران رہ گئی اور اس کی آواز بھر گئی۔ ”آہ، یہ بات کتنی ذیت ناک ہے کہ آپ ایک شخص کے ساتھ، جو آپ کے اتنا قریب

ہے، محبت کرتے ہیں اور آپ کو یہ محسوس ہوتا ہے کہ: ”وہ لرزتی ہوئی آواز میں بولتی چلی گئی، ”آپ اس شخص کو دکھ پہنچانے کے علاوہ اور کچھ نہیں کر سکتے اور پھر آپ کو جب یہ معلوم ہوتا ہے کہ جو کچھ ہو رہا ہے، آپ اس میں کوئی تبدیلی نہیں لے سکتے تو آپ کی اس اذیت میں اور بھی اضافہ ہو جاتا ہے۔ اس صورت میں صرف ایک ہی رہ عمل باقی رہ جاتی ہے۔ کہ آپ کہیں چلے جائیں، لیکن میں جا بھی کہاں سکتی ہوں؟“

”پرنس، کیا ہوا؟ گزر بڑ کیا ہے؟“

لیکن پرنس کسی قسم کی مزید وضاحت کیے بغیر ٹپ ٹپ آنسو بہانے لگی۔

”پتا نہیں آج مجھے کیا ہو گیا ہے؟ آپ کوئی ٹکرنہ کریں۔ بھول جائیں کہ میں نے کیا کہا ہے؟“

ہیئر کی شگفتگی کاٹا ہوا ہو گئی۔ وہ مضطرب تھا اور پرنس پر سوالات کی بوچھاڑ کر رہا تھا، اس سے التجائیں کر رہا تھا کہ وہ منہ سے کچھ بولے، اپنے غموں میں اسے رازوں بنا لے، لیکن ان سب کے جواب میں وہ اس سے صرف یہی استدعا کر رہی تھی کہ جو کچھ وہ کہہ چکی ہے، وہ اسے بھول جائے اور بار بار تکرار کر رہی تھی کہ جو کچھ اس نے کہا ہے، وہ خود اسے بھی یاد نہیں رہا، اسے کوئی دکھ نہیں، کوئی ملال نہیں ہے۔ ہاں، اسے جو دکھ ہے، وہ اس کے متعلق پہلے ہی جانتا ہے۔ اسے دکھ صرف یہ ہے کہ پرنس آندرے کی متوقع شادی باپ بیٹے کے مابین خلیج حائل کر دے گی۔

”آپ کے پاس رستوفوں کی کوئی خبر ہے؟“ اس نے موضوع تبدیل کرنے کی خاطر پوچھا۔ ”مجھے معلوم ہوا ہے کہ وہ چند دنوں میں یہاں پہنچنے والے ہیں اور میرا خیال ہے کہ آندرے بھی غنقریب یہاں آجائیں گے۔ میں چاہتی ہوں کہ وہ (رستوف) یہاں آکر مل جائیں۔“

”اس بارے میں اب ان کا رویہ کیسا ہے؟“ ہیئر نے پوچھا۔ ان سے مراد عمر پرنس تھا۔

پرنس ماریا نے نفی میں سر ہلادیا۔

”لیکن کیا بھی کیا جاسکتا ہے؟ چند مہینوں میں سال پورا ہو جائے گا۔ معاملہ ہاتھ سے نکل چکا ہے۔ کاش میں اپنے بھائی کو ابتدائی لمحات کی ٹکر سے بچا سکتی! کاش رستوف ہی ذرا جلدی آجائیں! مجھے امید ہے کہ میں اس (نشانا) کے ساتھ دوستی کر سکوں گی... آپ تو انہیں کافی عرصے سے جانتے ہیں، ”پرنس ماریا نے کہا۔“ مجھے لگی لپٹی اسکے بغیر اس کے متعلق سب کچھ بتادیں، اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر صحیح صحیح بتائیں کہ وہ کس قسم کی لڑکی ہے، در آپ کی اس کے بارے میں کیا رائے ہے۔ مجھے سچ، پورا سچ، چاہیے کیونکہ آپ جانتے ہیں کہ آندرے یہ سب کچھ اپنے باپ کی مرضی کے خلاف کر کے بہت بڑا خطرہ مول لے رہے ہیں اور میں یہ جانتا چاہوں گی۔“

کوئی بہیم جست ہیئر کو بتا رہی تھی کہ دغا حیس اور مکمل سچائی معلوم کرنے کے لیے یہ بہ تکرار التجائیں اس امر کی غمازی کر رہی ہیں کہ ہونے والی بھابی کے بارے میں اس کے نہیں خانہ دس میں کہیں بغض پوشیدہ ہے، اور کوئی خواہش تقاضا کر رہی ہے کہ وہ پرنس آندرے کے انتخاب پر اظہار ناپسندیدگی کر دے لیکن جواب میں اس نے جو کچھ کہا وہ وہ نہیں تھا جو وہ سوچ رہا تھا بلکہ وہ تھا جو وہ محسوس کر رہا تھا۔

”مجھے میں نہیں آتا کہ تمہارے اس سوال کا جواب کیسے دوں،“ اس نے لالوں لال ہو کر کہا لیکن وہ لالوں لال کیوں ہو رہا تھا، اس کا علم سے خود بھی نہیں تھا۔ ”سچی بات یہ ہے کہ مجھے بالکل معلوم نہیں کہ وہ کس قسم کی لڑکی ہے۔ میں ہرگز ہرگز اس کی ذات کا تجزیہ نہیں کر سکتا۔ وہ پرکشش ہے اور آدمی کو اپنا گردیدہ بنا سکتی ہے، لیکن اسے پرکشش کون سی چیز بناتا ہے، مجھے اس کے متعلق کچھ معلوم نہیں۔ اس کے بارے میں بس یہی کچھ کہا جاسکتا ہے۔“

پرنس ماریا نے ٹھنڈی سانس بھری اور اس کے چہرے پر جو تاثر ابھرا، وہ یہ کہہ رہا تھا۔ ”ہاں، مجھے یہی توقع تھی، یہی اندیشہ تھا۔“

”وہ چالاک ہے؟“ اس نے پوچھا۔

میئر نے کچھ دیر سوچا۔ ”میرا خیال ہے، نہیں،“ اس نے کہا۔ ”اور تاہم۔ ہاں۔ وہ سمجھتی ہے کہ چالاک بننے کا کوئی خاص فائدہ نہیں... وہ بس پرکشش ہے اور آدمی کو اپنا گردیدہ بنا لیتی ہے، اس کے علاوہ اور کچھ نہیں۔“

پرنس ماریا نے ایک بار پھر اپنا سر ناپسندیدگی سے ہلایا۔

”آہ، میری کتنی خواہش ہے کہ میں اس سے محبت کر سکوں! اگر مجھ سے پہلے آپ کی اس سے ملاقات ہو جائے، میری طرف سے یہ بات اسے بتادیں۔“

”سننا ہے کہ وہ چند دنوں میں یہاں پہنچنے والے ہیں،“ میئر نے کہا۔

پرنس ماریا نے اسے اپنے منصوبے کے بارے میں بتایا۔ اس کا ارادہ ہے کہ جو کچھ رستوف پہنچے، وہ اپنی ہونے والی بھابی سے ملے گی، اور معمر پرنس کو بھی اس سے متعارف کرانے کی کوشش کرے گی۔

5

یورس پیٹرز برگ میں کسی رئیس زادی کو شیشے میں اتارنے میں ناکام رہا تھا اور اب وہ یہی مقصد لے کر ماسکو آیا تھا۔ یہاں اس کے لیے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو گیا کہ وہ دو متمول ترین دوشیزگان۔ جولی اور پرنس ماریا۔ میں سے کسے منتخب کرے۔ اگرچہ اسے پرنس ماریا اپنی واجبی شکل و صورت کے باوجود جولی سے زیادہ پرکشش معلوم ہوتی تھی تاہم اس سے محبت جتنا اسے ٹیڑھا کام محسوس ہوتا تھا، کیوں؟ اس کا جواب اسے خود بھی معلوم نہیں تھا۔ معمر پرنس کے نام دن پر جب ان کی آخری ملاقات ہوئی تھی، اس نے جتنی مرتبہ بھی جذبات میں ڈوب کر اس سے بات کرنے کی کوشش کی، اسے جواب میں غیر متعلقہ باتیں ہی سننے کو ملیں۔ صاف ظاہر تھا کہ جو کچھ وہ کہہ رہا تھا، وہ اسے مطمئن نہیں رہی تھی۔ اس کے برعکس اس نے جوں کو جب بھی بنظر التفات دیکھا یا اس سے بات کی، وہ کچھ ایسے غدار سے اپنے شوق کا دامن پھیلادیتی جو شخص اسی سے مخصوص تھا۔

جولی کی عمر ستائیس برس ہو چکی تھی۔ اپنے بھائیوں کی اسوات کے بعد وہ بے حد امیر کبیر ہوئی تھی۔ اس میں کوئی کلام نہیں کہ اب اس کے خدو خال میں دلکشی باقی نہیں رہی تھی لیکن وہ اپنے آپ کو بالکل اسی طرح روشن

جمال سمجھتی تھی جس طرح وہ اوائل شباب کے زمانے میں تھی بلکہ اس کی اپنی دانست میں اس کی دل کشی میں پہلی نسبت کئی گنا اضافہ ہو گیا تھا۔ اس کی اس فریب خیزی پر اس حقیقت نے بھی کہ وہ وسیع وعریض جائیداد کی، لکھ بھٹی تھی، ہر تصدیق ثبت کر دی تھی۔ پھر ستم یہ ہوا کہ جوں جوں اس کی عمر ڈھلتی جا رہی تھی، وہ مردوں کے لیے کم خطرناک ہوتی جا رہی تھی اور وہ کہیں کھلے ڈھلے انداز سے اس سے برا اور سم بڑھا سکتے تھے، بلا جھجک اس کی محفلوں اور طعام کی دعوتوں میں شریک ہو سکتے تھے اور جو زعفرانہ دل اور بذلہ شیخ اشخاص بکثرت اس کے گھر کر دیتی بختے لگے تھے، کسی قسم کی احسان مندی کے بغیر اس کے ہاں آ جاسکتے تھے۔ اس نے اس کثیر آمدورفت کو اپنی مقبوضت محمول کیا حالانکہ بات کچھ اور تھی۔ وہ مرد، جو دس سال قبل ایک ایسے گھر میں، جہاں سترہ سالہ دوشیزہ رہتی تھی، اس اندیشے کے پیش نظر کہ کہیں وہ اس کی شہرت کو داغ دار نہ بنا دیں یا کہیں وہ خود ہی اس کے دام الفت میں گرفتار نہ ہو جائیں، قدم رکھنے سے پہلے دو مرتبہ سوچا کرتے تھے، اب بے دھڑک اس کے ہاں آنے جانے لگے اور اس کے ساتھ کچھ اس طرح پیش آنے لگے جیسے وہ کوئی ایسی دوشیزہ نہیں جو شادی کی عمر میں داخل ہو چکی ہے، بلکہ وہ ایک ایسی شناسا مخلوق ہے جس کی سرے سے کوئی جنس ہی نہ ہو۔

ان جائزوں میں کاراگنوں کا مسکن ماسکو کا خوشگوار ترین اور اچھائی مہمان نواز گھر تھا۔ وہاں سرشام رسی محفلیں تو سجا ہی کرتی تھیں اور طعام کی دعوتیں بھی منعقد ہوتی رہتی تھیں۔ ان کے علاوہ ہر روز خاصا بڑا اجھوم، جو زیادہ تر مردوں پر مشتمل ہوتا تھا، وہاں جمع ہو جاتا، آدمی رات کو یہ لوگ پرکھاتے اور صبح کے ٹن بجے تک وہیں بے رستے۔ پھر کہیں بال، ہو، نغمہ و سرود کی ایستادہ محفل ہو یا ڈرامہ ہو، جولی ضرور وہاں پہنچ جاتی تھی۔ اس کے بلبوسات ہمیشہ تارہ ترین فیشن کے مطابق ہوتے۔ لیکن ان چیزوں کے باوجود کچھ یوں نظر آتا جیسے جولی کا ہر شے سے اعتبار اٹھ چکا ہو، ورنہ ہر شخص کو یہی بتاتی کہ وہ دوستی، محبت اور زندگی کی مسرتوں پر یقین نہیں رکھتی اور اسے صرف حیات اخروی میں ہی تسکین پانے کی توقع ہے۔ وہ ایک ایسی دوشیزہ کا روپ دھار لیتی جسے بے پناہ مایوسیوں کا سامنا کرنا پڑا ہو، جس کا محبوب اس سے چھن گیا ہو یا جس کے محبوب نے سے سنگ دلانہ انداز سے دھوکا دیا ہو۔ اگرچہ اس کے ساتھ اس قسم کی کوئی واردات نہیں ہوئی تھی، عام طور پر سمجھا یہی جانے لگا کہ اس کے ساتھ اس نوع کی بات ہوئی ضرور ہے اور خود سے بھی یقین ہونے لگا کہ اسے زندگی میں بڑے گھڑاؤ پر داشت کرنا پڑے ہیں۔ اس افسردگی نے نہ تو اسے ای جی بھر کر حلف نذر ہونے سے روکا اور نہ یہ ان نوجوانوں کے، جو بکثرت اس کے گھر کے پچھلے لگاتے رہتے تھے، اپنا وقت خوشگوار انداز سے گزارنے میں رکاوٹ بنی۔ ہر مہمان اپنی میزبان کی افسردہ مزاجی کو خراج تحسین پیش کرتا اور پھر اونچے اور فیشن ایبل طبقے کے بارے میں گپ شپ، رقص، رائل ورائٹ کھیلوں یا فی البدیہہ اشعار گوئی کے مقبول¹⁰ سے، جس کا کاراگنوں کے ہاں بڑا رواج تھا، جی بہلانے لگتا۔ صرف چند نوجوان، جن میں بورک شامل تھا، ایسے تھے جو جولی کی افسردگی کے سمندر میں گہری ڈبکی لگاتے تھے اور وہ ان کے ساتھ نیاے دلوں کی بچ، بچگیوں کے بارے میں طویل اور راز دارانہ گفتگوئیں کرتی، جی بھر کر اپنے دلوں کی بھڑاس نکالتی اور انھیں

اپنے اہم، جو افسردہ تصویروں، کہاوتوں اور شعارے بھرے ہوتے دکھاتی۔

جولی بورس پر بالخصوص نظر کرم کرتی تھی۔ اسے اوائل حیات میں ہی جن مایوسیوں کا سامنا کرنا پڑا، وہ ان کے بارے میں اس سے اظہار ہمدردی کرتی، ورا یک ایسی خاتون کی طرح، جسے خود بھی بے شمار مصائب کا سامنا کرنا پڑا ہو، جو کچھ اس سے بن پڑتا، دوست بن کر اس کی ڈھارس بندھاتی اور اسے اپنے اہم دکھاتی۔ بورس نے اہم میں درد رشتوں کی تصویر بنائی اور ان کے نیچے لکھا۔

تا تراشیدہ و درشتو، تمھاری سیاہی مائل شاخیں
مجھ پر اداسی اور افسردگی کے تاریک سائے ڈال رہی ہیں
ایک دوسرے صفحے پر اس نے تربت بنائی اور لکھا۔

La mort est secourable et la mort est tranquille.

Ah! contre les douleurs il n'y a pas d'autre asile.

جولی نے کہا: ”بہت خوبصورت شعر ہے۔“

”افسردگی کی سکراہٹ میں کوئی ایسی چیز ہے کہ انسان پر وجد کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔“ اس نے ایک عبارت ”یہ تاریکی میں روشنی کی کرن ہے، مدلل اور مایوسی کے مابین باریک اور نازک حد فاصل ہے اور تسکین کے امکان کا انکشاف کرتی ہے۔“ لفظ بہ لفظ دہراتے ہوئے بورس سے کہا۔
اس پر بورس نے یہ سطور تحریر کر دیں۔

Aliment de poison d'une ame trop sensible,

Toi, sans qui le bonheur me serait impossible

Tendre melancolie, ah, viens me consoler,

Viens calmer les tourments de ma sombre retrade

Et mele une douceur secrete

A ces pleurs, que je sens couler.

• موت ہماری مددگار ہے اور یہ ہمیں سکون بخشتی ہے۔

اس کے بعد ہمارے تمام دکھ درختم ہو جاتے ہیں۔

• بے حد حساس روح کے لیے مسموم غذا

تیرے بغیر مسرت کا تصور محال ہے

نرم و لطیف افسردگی، تسکین شیریں

آؤ، اور جو دکھ میں عزت میں پھیل رہے ہوں، ان سے مجھے چھٹکارا دلا دو۔

اپنا غم اُٹھائی اور تسکین بخش مرہم

میرے غمگوں میں، جو سدا رواں رہتے ہیں، بھول دو

جولی اپنے انتہائی غم آشام رومانی نغمے بورس کو مطرب پر سناتی اور بورس اسے نظم Poor Liza ("بیچاری لڑا") یا آواز بلند پڑھ کر سنا تا۔ نظم کی خواندگی کے دوران میں اس کا گلا بار بار شدت جذبات سے رندھ جاتا اور خواندگی میں توقف آ جاتا۔ بڑی بڑی محافل میں وہ یوں یک دوسرے کی طرف دیکھتے جیسے وہ روکے پھکے اور غیر دلچسپ لوگوں کے مابین یک جان دو قالب ہوں۔

آشنا میخانیدونا کاراگنوں کے گھر کا بار بار طواف کرتی رہتی تھی اور اس کی ماں کے ساتھ تاش کی بازی کے دوران میں کھلم کھلا جولی کے جہیز کے۔ اسے جہیز¹¹ میں دو جاگیریں اور نیز بنی اور نووگورڈ¹² میں جنگلات ملتا تھے۔ بارے میں معلومات دریافت کرتی رہتی تھی۔ جس شائستہ افسردگی نے اس کے بیٹے کو صاحب ثروت جولی کے ساتھ منسلک کر دیا تھا، اس پر اس کے دل میں نرم و نازک جذبات کر دئیں لینے لگتے اور وہ مشیت ایزدی کے حضور سر تسلیم خم کر دیتی۔

"Toujours charmante et melancholique, cette chere jule",

وہ بیٹی سے کہا کرتی، اور اس کی ماں کو بتاتی: "بورس کہتا ہے کہ اس کی روح کو تمہارے گھر میں سکون ملتا ہے۔ اس نے بہت دکھ جھیسے ہیں اور وہ بہت حساس ہے۔" اور پھر ایک روز اس نے اپنے بیٹے سے کہا: "اسخ، مائی ڈیئر، میں بیان نہیں کر سکتی کہ میں حال ہی میں جولی کی کتنی گرویدہ ہو گئی ہوں! لیکن کون ہے جو اس سے محبت کیے بنا رہ سکتا ہے؟ وہ ملوٹی روح ہے! آہ، بورس، بورس!" اس نے ایک لمحہ توقف کیا۔ "اور مجھے اس کی ماں پر کتنا ترس آتا ہے!" اس نے دوبارہ اپنا سلسلہ کلام جوڑتے ہوئے کہا۔ "جہیز اسے۔ ان کی وہاں دو وسیع و عریض جاگیریں ہیں۔ جو حسابات اور خطوط موصول ہوئے ہیں، وہ اس نے آج مجھے دکھائے۔ اور وہ بے چاری، قسمت کی ماری، کوئی بھی تو نہیں جو اس کا ہاتھ بٹا سکے اور لوگ ہیں کہ اسے دونوں ہاتھ سے لوٹ رہے ہیں!"

بورس اپنی ماں کی باتیں توجہ سے سن رہا تھا۔ وہ مسکرا رہا تھا لیکن اس کی یہ مسکراہٹ اتنی مہین تھی کہ بمشکل نظر آ رہی تھی۔ وہ اپنی ماں کی بھولی بھالی ڈپلومیسی پر اندر ہی اندر محظوظ ہو رہا تھا لیکن بہرحال وہ کچھ کہہ رہی تھی، اس کے کان اسی پر لگے ہوئے تھے اور وہ وقتاً فوقتاً جہیز اور میر جی نووگورڈ جاگیروں کے بارے میں محتاط انداز سے سوال پوچھ لیتا تھا۔ جولی کافی دنوں سے اس بات کی غلط فہمی کہ اس کا افسردہ پرستار کب اسے شادی کی پیش کش کرتا ہے اور وہ اسے شرف قبولیت بخشنے کے لیے بالکل تیار تھی، تاہم بورس کو ابھی تک جو چیز روکے ہوئے تھی، وہ یہ تھی کہ وہ باطنی طور پر اس سے مخالفت محسوس کرتا تھا، وہ جو اس شدید خواہش میں مبتلا تھی کہ اس کی جلد از جلد شادی ہو جائے، وہ اس کی بے لگام خواہش اور اس کے منصوبی طور طریقوں سے گھٹن کھاتا تھا اور پھر اس پر یہ دہشت بھی سوار ہو گئی تھی کہ یہاں وہ سچی محبت کے امکانات سے کنارہ کش ہو جائے گا۔ اس کی چھٹی تھریبا ختم ہو چکی تھی۔ وہ ہر دن اور سارا سارا دن کاراگنوں کے ہاں گزارتا، ہر شب اس معاملے پر غور فکر کرتا اور اپنے آپ سے یہ کہتا رہتا تھا کہ وہ اگلے روز شادی

"مائی ڈیئر جولی، تم اب بھی ہمیشہ کی طرح پرکشش اور اداس ہو۔"

کی تجویز پیش کر دے گا، لیکن جولی کی موجودگی میں جب وہ اس کے سرخ چہرے اور ٹھوڑی (جن پر تقریباً ہمیشہ پاؤں کی تہہ جمی رہتی)، اور اس کی مرطوب آنکھوں کو دیکھتا اور اس کے چہرے کے تاثرات کو پڑھتا جن سے یہ علم یہ کہ وہ تو ازل سے پایہ رکاب ہے اور اس بات کی منتظر ہے کہ اسے پیغام ملے۔ پیغام ملتے ہی اس کی افسردگی چشم زدن میں کانور ہو جائے گی اور وہ بڑے طعراق سے اس وجد کی، جو شادی کی بابرکت تقریب منعقد ہونے پر طاری ہوتا ہے، کیفیت میں ڈوب جائے گی۔ بورس فیصلہ کن الفاظ ادا کرنے کا اپنے آپ میں حوصلہ پاتا حالانکہ اپنے تخیل میں وہ کبھی کامیونز اور نیز ہنی نوڈگورد جاگیروں کا مالک بن چکا تھا بلکہ یہ بھی فیصلہ کر چکا تھا کہ ان کی آمدنی کن کن مدت پر خرچ کی جائے گی۔

بورس کا تذبذب جولی کی نظروں میں تھا اور بعض اوقات یہ بات اس کے دماغ میں اتنی کہ وہ اسے پریشان کرتی ہے، لیکن اس کی نسوانی خودنر ہی نور اسے دلاسا دیتی اور وہ اپنے آپ سے کہتی کہ وہ بے چارہ اس قدر محنت کا، راہ ہے کہ حال دل بھی بیان نہیں کر سکتا، خواہ مخواہ جھیشپ جاتا ہے۔ تاہم اب اس کی افسردگی زور و زنجی میں تبدیل ہونے لگی تھی اور بورس کی رو، نگلی سے صرف چند ایام قبل اس نے واضح طرز عمل اختیار کرنے کا منصوبہ سوچ لیا۔ بین اس وقت جب بورس کی تعطیل اختتام پذیر ہو رہی تھی، انا طول کو راگن ماسکو میں آوارہ ہوا اور یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ وہ آتے ہی کاراگنوں کے ڈرائنگ روم کے پھیرے لگانے لگا، اس پر جولی نے افسردگی کو حد افاقہ کیا، جھلڑوں سے یاراندہ لگایا اور دیوانہ وار کوراگن پر تار ہونے لگی۔

"Mon Cher" آتنا میخائیلوڈنا نے اپنے بیٹے سے کہا۔ "مجھے معتبر ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ پرس داسکی نے اپنے صاحب زادے کو ماسکو بھیجا ہی اس مقصد کے لیے ہے کہ وہ جولی سے پیہ کر لے۔ میں جوں کی اتنی گرویدہ ہوں کہ (اگر یہ شادی ہوگئی) مجھے اس پر بڑا ترس آئے گا۔ مائی ڈیئر تمہارا اس بارے میں کیا خیال ہے؟" اس خیال سے کہ کہیں اسے بے وقوف نہ بتادیا جائے، اس نے مہینہ بھر جولی کی جو مشقت طلب اور افسردگی سے بھرپور خدمت کی تھی، وہ رائیگاں نہ چلی جائے اور ان جاگیروں کی تمام آمدنی، جسے وہ ذہنی طور پر مختلف مدت کے اخراجات کے لیے تقسیم کر چکا تھا، کسی دوسرے شخص کے ہاتھوں میں۔ بالخصوص اس کا ودی انا طول کے ہاتھوں میں۔ نہ چلی جائے، بورس کے تن بدن میں آگ لگا دی اور اس نے یہ تہیہ کر لیا کہ وہ آج وہ کاراگنوں کے ہاں جائے گا اور شادی کا پیغام دے کر ہی دم لے گا۔ جب وہ وہاں پہنچا، جولی نے چپکتے ہوئے بڑی بے نیازی سے اس کا استقبال کیا، اور بریٹیل تذکرہ اسے بتایا کہ وہ گزشتہ رات جس ہال میں شریک ہوئی تھی، اس سے خوب مظلوظ ہوئی تھی۔ پھر وہ اس سے پوچھنے لگی کہ وہ کب واپس جا رہا ہے۔ اگرچہ بورس یہ عزم مصمم لے کر آیا تھا کہ وہ اپنی محبت کا ذکر کرے گا اور وہ بیار بھرا ہجہ اختیار کرنا چاہتا ارادہ بھی کر چکا تھا، وہ (جولی کی باتیں سن کر جھنجھلا گیا اور) عورتوں کی تلون مزاجی کا تذکرہ کرنے لگا کہ ان کی ذہنی کیفیت کا کچھ بتا ہی نہیں چلا، گھڑی میں تولیہ، گھڑی میں ماشہ، بھی افسردہ ہیں، ابھی مسرت کے شادیاں نے بجائے لگی ہیں۔ ان کی مزاج کی کیفیت کا دار و مدار سراسر اس چیز پر ہے کہ

ان کے ساتھ محبت کون جتا رہا ہے۔ جولی نے اس کی باتوں کا برا منایا اور یوں: ”تم بالکل ٹھیک کہتے ہو۔ عورت کی ضرورت نوع ہے، یکساںیت سے تو ہر کوئی اکتا جاتا ہے۔“

”پھر میں تمہیں مشورہ دوں گا۔“ بورس ترکی بہ ترکی جواب دینا چاہتا تھا۔ وہ کوئی جگر نگر جملہ کسنا چاہتا تھا، لیکن اس لمحے یہ ذہن ناک خیال اس کے دماغ میں کوندے کی طرح پکا کہ کہیں اسے اپنا مقصد حاصل کیے بغیر ماسکو سے لوٹنا نہ پڑے اور اگر ایسا ہوا، پھر اس کی تمام کاوشیں اکارت جائیں گی (اور یہ ایک ایسی چیز تھی جو اس نے کبھی گوارہ نہ کی تھی)۔ وہ جملے کے درمیان میں ہی رک گیا، اس نے اپنی نگاہیں جھکا لیں تاکہ جولی کے چہرے پر محکوم اور بے یقینی کے جواثرات پیدا ہو رہے تھے، ان سے چشم پوشی کر سکے اور یوں:

”لیکن میں یہاں تم سے ٹھکرا کرنے تو نہیں آیا تھا۔ اس کے برعکس۔“

اس نے در دیدہ نگاہوں سے جولی کی جانب دیکھا تاکہ وہ اپنا اطمینان کر سکے کہ وہ بات کو آگے بڑھا سکتا ہے یا نہیں اس (جولی) کی ساری خفگی ناکا ناپا رہا ہو چکی تھی اور اس کی ستھک، ملتی جلتی نگاہیں اس کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں اور حریصانہ انداز سے انتظار کر رہی تھیں کہ وہ کب اپنا جملہ مکمل کرتا ہے۔

”میں ہمیشہ اس بات کا اہتمام کر سکتا ہوں کہ مجھے اس کی صحبت میں کم سے کم وقت گزارنا پڑے،“ بورس نے سوچا۔ ”اور اب جب کہ یہ قضیہ شروع ہو ہی گیا ہے، اسے اس کے انجام تک پہنچا دینا چاہیے!“ اس کے رخسار تھمتھانے لگے اور ان کی رنگت سرخ ہو گئی۔ اس نے اپنی نظریں اس کی جانب اٹھائیں اور بولا:

”تمہیں اپنے بارے میں میرے جذبات کا علم ہے!“

مزید کچھ کہنے سننے کی ضرورت نہیں تھی۔ جولی کا چہرہ کامرانی اور آسودہ خاطر کی طرح سے جھگڑنے لگا، تاہم اس نے بورس کو وہ سب کچھ کہنے پر مجبور کر دیا جو ایسے موقع پر عموماً کہا جاتا ہے کہ وہ اس سے محبت کرتا ہے اور اس نے کبھی کسی عورت سے اتنی محبت نہیں کی جتنی کہ وہ اس سے کرتا ہے۔ وہ خوب جانتی تھی کہ وہ عینز کی جاگیروں اور نیزنی نووگورد کے جنگلات کے عوض وہ اس کا مطالبہ کر سکتی ہے اور اس نے جو کچھ طلب کیا، وہ اسے مل گیا۔

منگنی ملے پا جانے کے بعد انھیں ان درختوں کی طرف، جن سے اداسی اور غم گینی چلتی رہتی تھی، مزید اشارے کرنے کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ اب وہ پیئرز برگ میں ٹھٹ دارڈویرا بنانے کے منصوبے سوچنے، لوگوں سے ان کے گھروں پر جا کر ملنے ملانے اور شادی کی تقریبات منعقد کرنے کی تیاریاں کرنے میں مصروف ہو گئے۔

6

جنوری کے اختتام پر کاؤنٹ الیا آندرچک نتاشا اور سونیا کی معیت میں ماسکو پہنچا۔ کاؤنٹس کی طبیعت ابھی تک نامساں تھی اور وہ سفر کا جو کھم اٹھانے کے قابل نہیں تھی تاہم اس کے رویہ صحت ہونے کا انتظار عبث تھا۔ پرنس آندرے کسی روز بھی پہنچ سکتا تھا، عروسی جوڑے کا آرڈر دینا تھا اور ماسکو کے قریب دجوار میں جو جاگیر تھی، اسے فروخت کرنا تھا۔

علاوہ انہیں ماسکو میں معمر پرنس بکنو سکی کی موجودگی سے فائدہ اٹھا کر اس کی ہونے والی بہو کو اس کی خدمت میں پیش کرنا تھا۔ ستوفوں کا ماسکو میں جو مکان تھا، ان ساری سردیوں کے دوران میں اسے گرم نہیں کیا گیا تھا اور چونکہ وہ مختصر مدت کے لیے آئے تھے، پھر کاؤنش بھی ان کی ہم رکاب نہیں تھی، اس لیے کاؤنش نے بار بار دہرایا آخر وہ سودا کے، جو مدتوں سے ان کی مہمان نوازی کرنے پر اصرار کر رہی تھی، ہاں قیام کرنے کا فیصلہ کر دیا۔

ایک روز جب شام خاصی بیت چکی تھی، رستوفوں کی چار گاڑیاں اولڈ کوئی یوشیا سٹریٹ میں اس کے محل کے سامنے آکر کھیں۔ ماریا دمتریو نا تن تنہا رہتی تھی۔ وہ اپنی بیٹی کی پہلے ہی شادی کر چکی تھی اور اس کے تمام بیٹے سرکاری ملازمت کر رہے تھے۔

ہمیشہ کی طرح وہ اب بھی سیدھا تن کر چھتی تھی، ہمیشہ کی طرح ہر شخص کے سامنے اپنی رائے کا اظہار لپی لپی رکھے بغیر، منہ پھٹ طریق اور بند آواز سے کرتی تھی۔ اس کے اٹھنے بیٹھنے، چمنے پھرنے، دروگوں سے منے مانے کا جو انداز تھا، وہ اس اسر کا غماز تھا کہ وہ دوسروں کی سرزنش کر رہی ہے کہ ان میں کمزوریاں ہیں اور وہ نفسانی جذبے، ترغیب و تحریص کا شکار ہو جاتے ہیں کیونکہ اس کی لغت میں ان چیزوں کا کوئی وجود نہیں تھا۔ وہ ہمیشہ صبح سویرے اٹھتی، ڈھیل ڈھاما اون دار فرغل پہنتی اور اپنے خانگی امور کے انتظامات کی نگرانی میں جت جاتی۔ اس کے بعد وہ گاڑی پکڑتی اور باہر چلی جاتی۔ کسی سینٹ کا دن ہوتا تو گرجے کا رخ کرتی اور جب دعا ختم ہوتی تو جیلوں اور قید خانوں میں، جن کے معاملات کے بارے میں وہ کبھی کسی کو کچھ نہیں بتاتی تھی، پہنچ جاتی۔¹³ عام دنوں میں وہ لبرس تبدیل کرنے کے بعد مختلف طبقتوں کے درخواست گزاروں سے، جو روزانہ اس کی امداد حاصل کرنے آتے تھے، ملاقاتیں کرتی۔ پھر وہ ڈنر کھاتی۔ ڈنر مختلف انواع اور اشتہا آور کھانوں کی خاصی تعداد پر مشتمل ہوتا اور دس خوان پر ہر روز تین چار مہمان ضرور موجود ہوتے۔ ڈنر کے بعد وہ بوسٹن کھیلتی۔ رات کو وہ خود تو کشیدہ کاری سنبھال لیتی۔ وہ کوئی دوسرا شخص اسے اخبارات یا نئی کتابیں پڑھ کر سناتا۔ وہ کسی دوسرے شخص سے ملاقات کرنے کی غرض سے اپنے معمول سے شاذ و نادر ہی ہٹ کر اس کے گھر جاتی اور جب کسی کے ہاں جاتی بھی، تو وہ، سکو کی اہم ترین شخصیات میں سے کوئی ہوتا۔

جب رستوف پہنچے، اس نے ابھی سونے کا قصد نہیں کیا تھا۔ مہمانوں اور ان کے ملازموں کو سردی سے اندر لانے کے لیے جب پیش دالان کا دروازہ کھلا، وہ اپنی چربیوں پر چڑھا دیا۔ تاک کے بالے پر چشمہ دھرے، جس نے اسے اپنا سر بھکی جانب جھکانے پر مجبور کر دیا تھا، ماریا دمتریو نا پیش دالان کے دروازے کے کچا جا کھڑی ہوئی اور درشتی اور ترش مزاجی سے نوواردوں کا جائزہ لینے لگی۔ اگر وہ عین اسی وقت مہمانوں کو ٹھہرانے اور ان کے سامان کو سنبھالنے کے سلسلے میں اپنے نوکروں چاکروں کو پر از احتیاط ہدایات نہ دے رہی ہوتی، دیکھے والے یہی سمجھتا کہ وہ اس سے سخت ناراض ہے اور انھیں گھر سے باہر پھینکوانے کی تیاریاں کر رہی ہے۔

”کاؤنش کا سامان؟ اسے یہاں لے آؤ، اس بے کسی سے بھی غنیک سلیک کے بغیر چڑے کے سوت کیسوں

کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حکم دیا۔ ”چھو کر یاں؟“ انھیں ادھر لے جاؤ؟ بائیں طرف۔ ہونہ، یہ تم گھسن گھریاں کیوں ڈال رہی ہو؟“ اس نے ایک خادمہ سے چہ کر کہا۔ ”جاؤ، سہارا تیار کرو! اس چھو کر کی کا جسم بھر گیا ہے اور یہ پہلے سے زیادہ خوش اندام ہو گئی ہے۔“ اس نے مناش (جس کے رخسار بریلی ہوا میں تھمتانے لگے تھے) کو اس کی گاہ سے پکڑ کے، چنی طرف گھسیٹتے ہوئے اس کے متعلق رائے زنی کرتے ہوئے کہا۔ ”ارے غضب، تمہارا جسم تو بہت ٹھنڈا ہے۔ ہونہ، یہ اپنے فالٹو کپڑے جلدی جلدی اتار دو۔“ اس نے کاؤنٹ سے، جو اس کے ہاتھ پر بوسہ دینا چاہتا تھا، چہ کر کہا۔ ”تمہاری تو قلفی جم گئی ہوگی۔ چائے کے ساتھ کچھ ¹⁴ لے آؤ۔“ سوئیٹشکا، bon jour۔ اس نے سوئیٹ سے کہا۔ اپنی اس فرانسیسی علیک سلیک سے وہ یہ ظاہر کر رہی تھی کہ اگرچہ سوئیٹا کے ساتھ اس کا رویہ شفقتانہ ہے لیکن وہ اپنے آپ کو اس سے تدرے برتر بھی تصور کرتی ہے۔

جب وہ سفر کے بعد شالیں، کمبل وغیرہ اتار کر اور اپنے کپڑے جھاڑ پونچھ کر چائے پینے اندر آئے، دیر یا دیر یونانے باری باری ان سب کے گال چوسے۔

”مجھے قلبی مسرت ہو رہی ہے کہ تم لوگ یہاں آئے اور میرے ہاں قیام پذیر ہوئے۔ اب مناسب وقت آ گیا ہے،“ اس نے مناش کی طرف معنی خیز انداز سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”بڑھا جائیں ہے اور اس کا صاحب زادہ کسی روز بھی پہنچ سکتا ہے۔ تمہیں یقیناً اس سے متعارف ہونا پڑے گا۔ خیر چھوڑو، اس بارے میں ہم بعد میں بات کریں گے۔“ اس نے سوئیٹا کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ اس سے یہ عندیہ ملتا تھا کہ وہ اس کی موجودگی میں اس موضوع کو زیر بحث لانا نہیں چاہتی۔

’اب بتاؤ،“ وہ کاؤنٹ کی طرف متوجہ ہوئی، ”کل کے بارے میں تمہارے کیا منصوبے ہیں؟“ تم کسے کسے بلادے؟ شن شن؟“ اس نے اپنی ایک انگلی میز پر کی۔ ”آئنا میٹا نیلو دنا، وہ جوٹسوے بہاتی ہے؟ چلو، دو ہوئے۔ اس کے ساتھ اس کا بیٹا بھی ہے۔ یہ صاحب زادہ بیاہ رہا ہے! پھر بزد خوف، کیا خیال ہے؟ وہ اور اس کی بیوی دونوں یہاں ہیں۔ وہ اس سے پنڈ چھڑا کر بھاگا تھا لیکن وہ ہوا کے گھوڑے پر سوار ہو کر اس کے پیچھے آدھمکی۔ وہ بدھ کے روز میرے ہاں کھانا کھانے آیا تھا۔ جہاں تک ان کا تعلق ہے۔“ اس نے لڑکیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”میں کل انھیں پہلے مادر خداوند کی اکھیر پائی خانقاہ لے جاؤں گی اور وہاں سے ہم عروسی بیوسات کا آؤر دینے، مہیا لنگی ¹⁵ (مارا م شامے) کے ہاں چلے جائیں گے۔ میرا خیال ہے کہ تم سب کچھ نیا سوانا چاہو گی۔ میری طرف، کچھ کر اندازے مت لگاؤ۔ آج کل آستینیں اسی قسم کی ہیں! چند دنوں کی بات ہے کہ نو عمر ٹرس آئی ریٹا واسلیوٹا مجھے ملنے آئی تھی۔ وہ کچھ یوں ڈری سبھی نظر آتی تھی جیسے اس نے ہزاروں میں بندوق کی دونائیاں پہن رکھی ہوں۔ تم جانتے ہو کہ کوئی دن ایسا نہیں جاتا جب کوئی نہ کوئی نیا فیشن معرض وجود میں نہ آتا ہو۔ ورتم اپنے بارے میں کیا کہتے ہو۔ تم یہاں کیا لینے آئے ہو؟“ اس نے کاؤنٹ کو ڈانٹتے ہوئے پوچھا۔

گڈڈے (دن بخیر)۔

”معلوم ہوتا ہے کہ سب مسائل یک دم اٹھ کھڑے ہوئے ہیں۔“ گاڈنٹ نے جواب دیا۔ ”اس لڑکی کے کپڑے لے کر خریدنا ہیں۔ ادھر ہاسکو کی جاگیر اور مکان کا ایک خریدار نمودار ہو گیا ہے۔ اگر آپ اتنی مہربانی فرمائیں دوران لڑکیوں کو سنبھال لیں، میں وقت طے کر لوں گا اور ایک دس کے لیے جاگیر پر چلا جاؤں گا۔“

”خوب، بہت خوب۔ یہ میرے پاس رہیں گی اور انھیں کوئی گزند نہیں پہنچے گا۔ جہاں ان کا جانا ضروری ہو، میں انھیں اپنے ساتھ لے جاؤں گی۔ کچھ ڈانٹ ڈپٹ کروں گی، کچھ چونچے برداشت کروں گی، ماریا دستریونانے اپنی دینی بیٹی اور چیتتی دوشیزہ کے رخسار اپنے لاپٹے ہاتھ سے چھوتے ہوئے کہا۔

اگلی صبح ماریا دستریونانو جو اس خواتین کو پہنے آنکھریاں خانقاہ اور پھر دام شامے کے ہاں لے گئی۔ مادام شامے اس سے اتنا خائف رہتی تھی کہ وہ اس سے جلد از جلد خلاصی پانے کے لیے اپنے ملبوسات ہمیشہ اونے پونے دامن فر دخت کر دیتی تھی۔ ماریا دستریونانے تقریباً بھی عروسی ملبوسات کا آرڈر دے دیا۔ جب وہ گھر پہنچے، اس نے نناشا کے علاوہ تمام لوگوں کو کمرے سے باہر نکال دیا۔ پھر اس نے اپنی چیتتی دوشیزہ کو بلایا اور سے اپنے پاس بٹھالیا۔

”خیر، اب ہماری گفتگو ہو سکتی ہے۔ میں تمہیں تمہاری سگائی پر مبارک باد دیتی ہوں۔ تم نے اچھا آدمی پھانسا ہے! میں تمہاری خاطر خوش ہوں۔ میں اسے تب سے جانتی ہوں جب وہ اتنا سا تھا۔“ (اس نے فرش سے روٹ کی

دو ٹپائی پر اپنا ہاتھ روک لیا)۔ نناشا کا چہرہ خوشی سے تھماتے لگا۔ ”میں اسے اور اس کے سارے خاندان کو پسند کرتی

ہوں۔ اب سنو، تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ پرنس نکولائی اس شادی کے سخت خلاف ہے۔ مانا کہ پرنس آندرے اب

بچہ نہیں رہا اور وہ اس کے خیر بھی اپنا کام چلا سکتا ہے، لیکن باپ کی مرضی کے خلاف کسی خاندان میں داخل ہونا اچھی

بات نہیں ہے۔ حالات ایسے ہونا چاہئیں کہ گھر اس چین اور محبت کا گہوارہ بن جائے۔ تم ہوشیار لڑکی ہو اور تم حالات

سنبھالنے کا گر جانتی ہو۔ صرف اپنی عقل استعمال کرو اور اخلاص و محبت کا رویہ اپناؤ۔ پھر سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔“

نناشا خاموش رہی۔ اس لیے نہیں، جیسے کہ ماریا دستریونانے فرض کر لیا تھا کہ وہ شرمیلی تھی، بلکہ اس لیے

کہ اسے پرنس آندرے کے ساتھ جو محبت تھی، اس میں وہ کسی قسم کی مداخلت پسند نہیں کرتی تھی۔ اسے اپنی یہ محبت

تمام انسانی معاملات سے اتنی جدا گانہ معلوم ہوتی تھی کہ اس کی دانست میں یہ ہر شخص کے فہم و ارادے سے ماورا

تھی۔ وہ صرف پرنس آندرے سے محبت کرتی تھی اور صرف اسی کا خیال اس کے قلب و دماغ میں جاگزیں تھا۔ وہ

اس سے محبت کرتا تھا، وہ ایک دو دن میں آجائے گا اور وہ اسے بھگا لے جائے گا۔ وہ اس سے زیادہ اور کچھ نہیں

چاہتی تھی۔

تمہیں معلوم ہے کہ میں اسے ایک عرصے سے جانتی ہوں اور میں اس کی ہمشیرہ، تمہاری ہونے والی نند،

ماترا کی بہت گردیدہ ہوں۔ کہتے ہیں کہ نندیں بڑی فساد دی ہوتی ہیں لیکن ماترا تو کبھی بھی نہیں ہو سکتی۔ اس نے مجھ

سے درخواست کی ہے کہ میں تم دونوں کی ملاقات کرادوں۔ کل تم اپنے باپ کے ساتھ اسے ملنے جاؤ گی۔ اس کے

ساتھ خوش اخلاقی سے پیش آؤ۔ تم اس سے چھوٹی ہو اور جب وہ نوجوان، تمہارا سنگیتر، آئے گا، سے معلوم ہو جائے

گا کہ تم اس کی ہمشیرہ اور باپ کو پیسے سے جانتی ہو اور وہ تمہیں پسند کرتے ہیں۔ میں نے ٹھیک کہا نا؟ یہ بہترین بات نہیں ہوگی؟“

”جی ہاں، میرا بھی کچھ یہی خیال ہے،“ نتاشا نے ہادول ناخواستہ جواب دیا

7

گلے روز مار یا دستریو نا کے مشورے پر کاڈنٹ، ستوف نتاشا کے ہمراہ پرنس نکولا کی سمندری جہاز سے ملنے چل دیا۔ رودنگی کے وقت کاڈنٹ کی حالت دیدنی تھی۔ وہ قطعاً خوش نہیں تھا اور اس کا دل دھک دھک کر رہا تھا۔ فوجی بھرتی کے دوران میں اس کی سمندر پر نرس کے ساتھ جو ملاقات ہوئی تھی، وہ اسے فراموش نہیں کر سکا تھا۔ اس نے سمندر پر نرس کو ڈنر کی دعوت دینا چاہا تھا لیکن اس کے جواب میں اسے سخت سست سننا پڑا کہ اسے فوج میں جتنے آدمی بھرتی کرانے کے لیے کہا گیا تھا، اس نے ان کی تعداد کیوں پوری نہیں کی تھی۔

اس کے برعکس نتاشا، جس نے اپنا بہترین ڈریس زیب تن کیا تھا، بے حد ہشاش بشاش تھی۔ ”وہ بھلا مجھے کیوں پسند نہیں کریں گے؟ ضرور کریں گے،“ وہ سوچ رہی تھی۔ ”ہمیشہ ہر شخص نے مجھے پسند کیا ہے۔ میں ان کی ہر خواہش پر عمل کرنے کے لیے تیار ہوں۔ وہ ان کے والد ہیں اور وہ ان کی ہمشیرہ، اس لیے میں ان سے محبت کرنے کے لیے آمادہ ہوں۔ کوئی وجہ نہیں کہ وہ مجھے پسند نہ کریں۔“

دو دو دو بڑے ہنکا سٹریٹ میں اداس اور تاریک مکان پر پہنچے اور پیش دالان میں داخل ہو گئے۔

”اچھا، خداوند ہم پر رحم فرمائے!“ کاڈنٹ نے نیم دل لگی اور نیم سنجیدگی سے کہا۔

”جب وہ پیش دالان کے اندر گئے، نتاشا نے دیکھا کہ اس کا باپ خاصا بدحواس ہے اور وہ ڈرتے ڈرتے، جھنجکے جھنجکے پوچھتے پھر رہا ہے کہ آیا پرنس اور پرنس گمر پر موجود ہیں۔“

جب وہ اپنا نام بتا چکے، نوکرانے چا کران میں کچھ افراتفری دیکھنے میں آئی۔ ایک دردی پوش ملازم ان کی آمد کی اطلاع دینے اندر بھاگا۔ جب وہ بڑے ہال میں پہنچا، دوسرے دردی پوش ملازم نے اسے روک لیا۔ دونوں کمرے ہو گئے، در آپس میں کھسر پھسر کرنے لگے۔ پھر ایک خادمہ گرنی پڑتی ہال میں آئی اور پرنس کا نام لے کر جلدی جلدی کچھ کہنے لگی۔ آخر کار ایک ادھیڑ عمر دردی پوش ملازم، جس کے چہرے پر خشونت لپک رہی تھی، آیا اور اس سے رستونوں کو بتایا کہ پرنس ان سے ملاقات نہیں کریں گے، البتہ پرنس ان سے مل کر خوش ہوگی۔ جو ہستی سب سے پہلے ان سے ملنے آئی، وہ، دسوزیل یونین تھی۔ اس نے ہاپ بیٹی کے استقبال میں نمایاں انداز سے شاہنگی کا مظاہرہ کیا اور وہ انھیں پرنس کے کمرے میں لے گئی۔ پرنس مضطرب و متفکر تھی اور اس کے چہرے پر سرخا دھبے نمایاں ہو گئے تھے۔ وہ بو جھل قدم اٹھاتی یہ غلت آگے بڑھی۔ وہ پوری کوشش کر رہی تھی کہ اس کا رویہ پر تپاک اور پراطمینان نظر آئے لیکن اپنی اس سعی میں اسے ناکامی کا منہ دیکھنا پڑ رہا تھا۔ وہ پہلی نظر میں ہی نتاشا کو

نا پسند کرنے لگی۔ اس کا خیال تھا کہ اس نے حد درجہ فیشن ایبل لباس پہن رکھا ہے چنار کا صنم کدو ہسائے ہوئے ہے اور بے ہودہ طور پر ہشاش بشاش ہے۔ پرنس ماریا کو اس امر کا قطعاً کوئی اندازہ نہیں تھا کہ اپنی بھائی کو ایک نظر دیکھنے سے پہلے ہی اس کے دل میں اس کے خلاف تعصب بیٹھ چکا تھا کیونکہ وہ غیر شعوری طور پر اس کی خوبصورتی، جوانی اور ہشاش بشاشت سے حسد کرنے لگی تھی۔ پھر اسے اس بات کی جلن بھی تھی کہ اس کا بھائی اس سے محبت کرتا تھا۔ منافرت کے اس ناقابل مفتوح جذبے کے علاوہ پرنس کو اس چیز سے بھی گھبراہٹ ہو رہی تھی کہ میں اس وقت، جب رستوفوں کی آمد کی اطلاع پہنچائی جا رہی تھی، محرم پرنس نے با آواز بلند چلا کر کہا تھا: ”وہ لوگ جائیں بھاڑ میں، میں ان سے نہیں ملوں گا۔ پرنس ماریا کا جو جی چاہے، کرے لیکن میرے پاس، انھیں ہرگز ہرگز نہ لایا جائے۔“ وہ ان سے ملنے کا فیصلہ کر چکی تھی لیکن اسے اس چیز کا بھی اندیشہ تھا کہ کہیں پرنس پر کوئی بھرت سوار نہ ہو جائے اور وہ کوئی ایسی ویسی حرکت نہ کر بیٹھے کیونکہ رستوفوں کی آمد نے اس کے دوسان خطا کر دیے تھے۔

”مائی ڈیئر پرنس، دیکھیں، میں نے اپنی منگھی مٹی بلبل آپ کی خدمت میں پیش کر دی ہے،“ کاؤنٹ نے گردن جھکاتے اور پاؤں سے فرش کھرچتے ہوئے کہا۔ وہ وحشت کے عالم میں ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔ اس پر یہ خوف سو رہا تھا کہ کہیں محرم پرنس ادھر نہ آ نکلے۔ ”میں بہت خوش ہوں کہ آپ لوگوں کو ایک دوسرے سے متعارف ہونے کا موقع میسر آ گیا ہے۔ مجھے افسوس ہے، بے حد افسوس ہے کہ پرنس کی طبیعت ابھی تک ہنساز ہے“ اس قسم کی چند مزید پیش پا افتادہ باتیں کرنے کے بعد وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ”پرنس، اگر آپ مجھے اجازت دیں، تو میں چندرہ منٹ کے لیے نتاشا کو آپ کے پاس چھوڑے دیتا ہوں۔ اتنے میں میں ذرا آتنا سیمہ لورا سے مل آتا ہوں۔ وہ یہاں سے چند قدم کے فاصلے پر سو باچی سکوائر میں رہتی ہیں۔ پھر میں اسے لینے واپس آ جاؤں گا۔“

ایسا آندرٹیج نے یہ سفارتی چال اس لیے چلی تھی کیونکہ وہ (جیسا کہ اس نے بعد میں پتی بیٹی کو بتایا) مستقل کی خواہران نسبتی کو آپس میں کھل کر بات چیت کرنے کا موقع دینا چاہتا تھا، لیکن اس کے ساتھ ہی وہ محرم پرنس سے، جس سے اس کی جان جاتی تھی، ملاقات کے امکان سے جان چھڑانا چاہتا تھا۔ اس بات کا کہ اس نے اپنی بیٹی سے تو نہ کیا لیکن نتاشا اپنے باپ کی بے چینی اور خدشات کو بھانپ گئی اور اس پر اسے سخت شرمندگی ہوئی۔ گھبراہٹ رہا تھا، شرمسار وہ ہو رہی تھی۔ اسے جو شرمساری محسوس ہوئی تھی اس پر اسے اپنے آپ پر سخت غصہ آیا اور اس غصے میں ہر آن اضا نہ ہونے لگا۔ اس نے بے باک اور سرکش نگاہوں سے پرنس کو دیکھا۔ اس کی یہ نگاہیں کہہ رہی تھیں کہ وہ کسی شخص سے خوف زدہ نہیں۔ جب پرنس نے کاؤنٹ کو یقین دل دیا کہ وہ اس کی غیر موجودگی کا برا نہیں منائے گی، بلکہ وہ تو یہ چاہے گی کہ وہ آتنا سیمہ نوو کے ہاں زیادہ دیر ٹھہرے، وہ رخصت ہوگی۔

پرنس ماریا نتاشا کے ساتھ خلوت میں باتیں کرتا چاہتی تھی۔ اس کی پریشان اور مضطرب نظریں بار بار ماسوزیل بونین کی جانب اٹھیں لیکن وہ اللہ کی بندی ٹس سے مس نہ ہوئی اور اپنی جگہ بت لٹا بیٹھی رہی، اور مسلسل ماسکو کی تقریحات اور تھیکروں کے بارے میں گفتگو کرتی رہی۔ نتاشا نے پیش دالان میں جو تذبذب کی کیفیت

دیکھی تھی، اسے اس پر، اپنے باپ کی گھبراہٹ پر اور پرنس کے، جو قرآن سے معلوم ہوتا تھا کہ اس کا استقبال کر کے اس پر احسان کر رہی ہے، غیر فطری رویے پر، بڑی اہانت محسوس ہونے لگی تھی اور نتیجتاً اسے ہر بات بری لگنے لگی تھی۔ اسے پرنس ماریا پسند نہیں آئی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ وہ بد صورت، طمع کار و رکھور ہے۔ وہ آٹافانا اپنے آپ میں سکر جھٹی، اور اس نے غیر ارادی طور پر لہو و لہجہ انداز اختیار کر لیا۔ اس کے اس رویے نے پرنس کو اور بھی برگشتہ کر دیا۔ پانچ منٹ کی پراور اور مصنوعی گفتگو کے بعد انھیں کسی شخص کے، جس نے پاؤں میں سلیپر پہنے ہوئے تھے، درجوبہ سرعت انھیں کی طرف آ رہا تھا، قدموں کی چاپ سنائی دی۔ پرنس ماریا کے چہرے پر ہول طاری ہو گیا۔ دروازہ کھلا اور پرنس اندر داخل ہو گیا۔ اس کے سر پر شبیہ ٹوپی اور جسم پر ڈریسنگ گاؤن تھا۔

”اھا، میڈم“ اس نے اپنی بات کا آغاز کیا۔ ”میڈم، کاڈنٹس، گر میں غلطی نہیں کر رہا، کاڈنٹس رستودا معافی چاہتا ہوں، خدا را مجھے معاف کر دیں۔ میڈم، مجھے معلوم نہیں تھا۔ خدا گواہ ہے کہ مجھے بالکل علم نہیں تھا کہ آپ اپنی تشریف آوری سے ہماری عزت افزائی فرما رہی ہیں۔ میں تو محض اپنی بیٹی کو دیکھنے آیا تھا، اسی لیے میں نے اس قسم کے کپڑے پہنے ہوئے میں۔ آپ مجھے معاف فرمادیں۔ خدا گواہ ہے کہ مجھے مطلق علم نہیں تھا۔“ اس نے اپنی بات دہرائی اور لفظ ”خدا“ پر اتنے غیر فطری اور ناخوشگوار انداز سے درود یا کہ پرنس ماریا نظر میں جھکائے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ اس میں اتنا حوصلہ نہیں تھا کہ اپنے باپ یا نانا کی طرف دیکھ سکے۔

نانا شا بھی اٹھ کر کھڑی ہو چکی اور جھک کر آداب عرض کر چکی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اسے کیا کرنا چاہیے۔ صرف ماد سوزیل بوغین خدا پیشانی سے مسکرا رہی تھی۔

”میں آپ سے ہاتھ جوڑ کر التجا کرتا ہوں کہ آپ مجھے معاف فرمادیں، میری آپ سے گزارش ہے کہ آپ مجھے معاف فرمادیں۔ خدا گواہ ہے کہ مجھے کوئی علم نہیں تھا،“ بوڑھا بڑبڑایا اور نانا شا کو سر سے پاؤں تک دیکھنے کے بعد باہر نکل گیا۔

اس بھوت کی روانگی کے بعد سب سے پہلے ماد سوزیل بوغین آپے میں آئی اور وہ پرنس کی ناسازی طبع کے بارے میں باتیں کرنے لگی۔ نانا شا اور پرنس ماریا ہر بلب ایک دوسرے کو دیکھتی رہیں۔ وہ جتنا زیادہ عرصہ اپنے منہوں میں گھنگھنیاں ڈالے اور جو کچھ وہ کہنا چاہتی تھیں، اسے کہے بغیر، بیٹھی ایک دوسری کو کچھ کہیں، ان کا باہمی تنازعہ اتنا ہی زیادہ مصدقہ ہوتا چلا گیا۔

جب کاؤنٹ واپس آیا، نانا شا نے بڑے نانا شاہتہ انداز سے اطمینان کی سانسوں اور دہاں سے بھاگنے میں ذرا برا تاخیر نہ کی۔ اس لئے اسے پرنس سے، جو اسے بوڑھی دوشیزہ نظر آتی تھی، جو اسے ان پریشان کن حالات میں دھکیل سکتی تھی اور جو پرنس آندرے کا ایک مرتبہ بھی نام لیے بغیر آدھ گھنٹہ گزار سکتی تھی، قریب قریب نفرت ہو گئی۔ ”میں اس فرانسیسی زنانی کی موجودگی میں ان (پرنس آندرے) کے بارے میں گفتگو کی ابتدا نہیں کر سکتی تھی“ نانا شا نے سوچا۔ دریں اثنا یہی خیال پرنس ماریا کو اذیت پہنچا رہا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ اسے نانا شا سے کیا کہنا چاہیے۔

تھا لیکن اسے یہ سب کچھ کہنے میں ناکامی ہوئی تھی۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ، دوسری بونین کی موجودگی اس کے لیے رکاوٹ بن گئی تھی۔ دوسرے۔ اگرچہ اسے معلوم نہیں تھا کہ کیوں۔ شادی کے بارے میں اسے گفتگو کرنا دشوار معلوم ہوا۔ کاؤنٹ کمرے سے تقریباً نکل ہی چکا تھا کہ پرنس، ریا لپک جھپک ستاشا کے پاس آئی، اس نے اس کا ہاتھ تھاما اور گہری سانس لے کر بولی۔

”نٹھیریں، مجھے۔“

ستاشا نے اس کی جانب یوں دیکھا جیسے وہ اس کا منہ چڑا رہی ہو۔ اس نے ایسا کیوں کیا، اس کی وجہ وہ خود بھی نہیں جانتی تھی۔

”ڈیڑ ستالی، میں تمہیں بتانا چاہتی ہوں کہ مجھے خوشی ہے کہ میرے بھائی کو دل کی مراد مل گئی ہے۔“

”پرنس، میرا خیال ہے کہ یہ اس قسم کی باتیں کرنے کا وقت نہیں ہے،“ ستاشا نے خاہرا سردمراچی اور آن بان سے کہا لیکن اسے محسوس ہوا ہاتھ کہ اس کے آنسو اب نکلے، کہ اب نکلے اور اس کا گلہ بندھنے لگا۔

”یہ میں نے کیا کہہ دیا؟ یہ میں نے کیا کر دیا؟“ جونہی وہ کمرے سے باہر نکلی اس نے سوچا۔



اس روز انھیں ڈنر پر ستاشا کا خاص دیر تک انتظار کرنا پڑا۔ وہ اپنے کمرے میں بیٹھی کسی بچی کی طرح رو رہی تھی۔ وہ بار بار سسکیاں لیتی اور اپنی ناک چھنکتی جاتی۔ سو نیا اس کے قریب کھڑی تھی اور اس کے بالوں کو چوم رہی تھی۔

”ستاشا، تم رو کیوں رہی ہو؟“ وہ پوچھ رہی تھی۔ ”تم ن لوگوں کا برا کیوں سناتی ہو؟ ستاشا، بات آئی گی ہر جائے گی۔“

”کاش تمہیں معلوم ہوتا کہ یہ کتنا چمک آمیز تھا۔۔۔ جیسے میں۔۔۔“

”ستاشا، اس کا مت ذکر کرو۔ یہ تمہارا قصور نہیں تھا۔ پھر تم کیوں برا سناتی ہو؟ اچھا، میرا بوسہ لو۔“ سونیا نے کہا۔

ستاشا نے اپنا سر اوپر اٹھایا اور اپنی سیکلی کے لبوں کو چومتے ہوئے اپنا آنسوؤں سے تر چہرہ اس کے چہرے کے ساتھ چمٹا دیا۔

”میں تمہیں جانتی نہیں سکتی، مجھے معلوم نہیں۔ قصور وار کوئی نہیں،“ ستاشا نے کہا۔ ”غلطی میری ہے۔ لیکن یہ

ہے بہت تکلیف دہ۔ وہ آتے کیوں نہیں؟“

وہ سرخ آنکھوں کے ساتھ ڈنر پر آئی۔ ماریا دترویانے، جسے معلوم تھا کہ پرنس نے رستوفوف کا کیا خیر مقدم کیا ہے، یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی کہ اسے ستاشا کا کلفت زدہ چہرہ دیکھا ہی نہیں اور وہ دسترخوان پر با آواز بلند اور ر کے بغیر کاؤنٹ اور دوسرے مہمانوں کے ساتھ طیفہ گونی کرتی رہی۔

اس شرم رستوف ادبیر، مگئے۔ اس کے لیے ماریا دستریوڈا نے باکس ریزرو کر لیا تھا۔

متاشا جانا نہیں چاہتی تھی لیکن وہ ماریا دستریوڈا کی، جب کہ یہ سارا انتظام خاص طور پر اسی کے لیے کیا گیا تھا، شفقت ٹھکرا بھی نہیں سکتی تھی۔ اس نے اپنا لباس تبدیل کیا اور بڑے ہال میں اپنے باپ کا انتظار کرتے کرتے اس نے قد آدم سینے کے سامنے اپنے سر اپنے کا جائزہ لیا۔ جب اس نے دیکھا کہ وہ کتنی خوبصورت ہے، وہ پہلے سے بھی زیادہ اداس ہو گئی لیکن اس کی اس اداسی میں ہٹھاس اور ملامت تھی۔

”ف، ضد وند، کاش کہ وہ یہاں ہوتے! اگر وہ یہاں ہوتے، میں نے تب جس قسم کے احقانہ شرمیے پن کا مظاہرہ کیا تھا، وہ اب نہ کیا ہوتا، بلکہ میرا رویہ مختلف ہوتا۔ میں، اپنے بازوان کے گلے میں جھانک کر دیتی، ان سے چٹ جاتی اور انھیں مجبور کر دیتی کہ وہ مجھے نہ متجسس اور مستفسرانہ نگاہوں سے، جن سے وہ مجھے اکثر دیکھا کرتے تھے، دیکھیں۔ اور پھر میں انھیں اسی طرح ہنس دیتی جس طرح کہ وہ اس وقت ہنسا کرتے تھے۔ اور ان کی آنکھیں۔ اس وقت بھی مجھے ان کی آنکھیں بالکل صاف نظر آ رہی ہیں!“ متاشا نے سوچا۔ ”مجھے ان کے باپ اور بہن سے کیا لینا؟ میں صرف ان سے، ان سے، ان سے، اس چہرے سے، ان آنکھوں سے، اور ان کی مسکراہٹ سے۔ مردانہ اہم بچوں کی طرح معصومانہ۔ پیار کرتی ہوں، نہیں، بہتر یہی ہے کہ ان کے متعلق سوچا ہی نہ جائے، بالکل سوچا ہی نہ جائے، بلکہ فی الحال میں انھیں بھول جاؤں، بالکل بھول جاؤں۔ رفتار کی یہ کیفیت مجھ سے برداشت نہیں ہو سکتی۔ میں ابھی، ایک منٹ میں، رو پڑوں گی!“ اور وہ آہٹ سے پرے ہٹ گئی۔ وہ پوری کوشش کر رہی تھی کہ وہ رونے نہ بیٹھ جائے۔ ”اور سونیا نکولا کی سے اتنے سکون، اور استقلال کے ساتھ کیسے محبت کر لیتی ہے اور سبردخل سے اتنا طویل انتظار کس طرح برداشت کر لیتی ہے؟“ اور وہ سونیا کو، جو ادبیرا کے لیے اپنا لباس تبدیل کر کے ہاتھ میں پٹکیا پکڑے اندر آئی تھی، دیکھ کر درخت حیرت میں گم ہو گئی۔ ”نہیں، وہ مجھ سے بالکل مختلف ہے۔ میں یہیں کر سکتی۔“

اس وقت متاشا اپنا دل ملامت اور جذبے سے اس قدر معمور محسوس کر رہی تھی کہ اس کے لیے محض اتنا کافی نہیں تھا کہ وہ محبت کرتی ہے اور جانتی ہے کہ اس کے ساتھ محبت کی جارہی ہے۔ اب تو وہ یہ چاہتی تھی کہ چشم زدن میں اپنے محبوب سے بغل گیر ہو جائے، اس سے راز و نیاز کی باتیں، جن سے اس کا اپنا دل لبریر تھا، کرے، کچھ اپنی کہے اور کچھ اس کی سنے۔ جب وہ گاڑی میں اپنے باپ کے برابر بیٹھی جا رہی تھی اور غم گینی کے عالم میں، سڑک کی روشنیاں، جو بریلے درپچوں پر بھللا رہی تھیں، دیکھ رہی تھی، وہ اور بھی اداس اور اپنے آپ کو پہلے سے بھی کہیں زیادہ گرتا محبت محسوس کرنے لگی۔ اسے اتنا بھی یاد نہ رہا کہ وہ کہاں اور کس کے ساتھ جارہی ہے۔ رستونوں کی گاڑی اس گاڑیوں کی، جو تھینکر کے اچھے طے کے اندر جارہی تھیں، صف میں شامل ہو گئی۔ اس کے پیچے آہستہ آہستہ

برف سے رگڑیں کھا رہے اور چہ مرا رہے تھے۔ نناشا اور سونیا نے اپنے اپنے ڈریس سنبھالے اور جھٹ بٹ نیچے گئیں۔ کاؤنٹ وردی پوش طار مسوں کی مدد سے نیچے اترا اور وہ تینوں پروگرام نیچے والوں اور ان خواتین و حضرات کے، جو تھیٹر میں داخل ہو رہے تھے، درمیان میں سے راستہ بناتے اور غلام گردش میں سے گزرتے، باکسوں کی پہلی قطار میں پہنچ گئے۔

بند دروازوں میں سے موسیقی کی دھنیں ازیں پھرتی رہی نہ کی دینے لگی تھیں۔
 ”نناشا، تمہارے ہال...“ سونیا نے سرگوشی کی۔

تھیٹر کا ایک خدمت گار تیزی سے آگے آیا اور ان کے باکس کا دروازہ کھولنے کے لیے تعظیم سے خواتین کے برابر سے گزر گیا۔ موسیقی کی آواز اور بلند ہو گئی اور انھیں دروازے میں سے روشنیوں میں نہائے اور تدریجاً بلند ہوتے باکسوں کی، جن میں برہنہ بازوؤں اور شانوں والی خواتین رونق افروز تھیں، قطریں نظر آئیں۔ نیچے سال تھے۔ وہاں خوب شور و غل ہو رہا تھا اور طر زمین کی بھڑکیں و دریاں چمک رہی تھیں۔ ایک خاتون نے، جو اگلے باکس میں داخل ہو رہی تھی، ذرا کی ذرا احساسِ شگفتگی سے نناشا کو دیکھا۔ پردہ ابھی اٹھا نہیں تھا اور اسے کسٹرا اوپیرا کی افتتاحی دھن بجا رہی تھی۔ نناشا اپنے گاؤں کی شکلیں درست کرتی سونیا کے ساتھ آگے بڑھی اور اپنی نشست پر بیٹھ گئی۔ اس کی نگاہیں اپنے بائیں چمکتے دسکتے باکسوں پر مرکوز تھیں۔ وہ تحس جس کا اسے مدتوں سے تجربہ نہیں ہوا تھا۔ جب آپ کے عریاں بازوؤں اور گردن پر سینکڑوں نگاہیں لگی ہوئی ہوں۔ اچانک اس کے رگ و پے میں سما گیا۔ واضح بھی تھی اور بے چین و مضطرب بھی۔ اس احساس کے ساتھ یادوں، امنگوں اور جذبوں کا جو جم غفیر وابستہ تھا، وہ ایک بارگی اس کے ذہن میں رہا۔

دو غیر معمولی طور پر خوبصورت دوشیزاؤں، سونیا اور نناشا نے، جو کاؤنٹ رستوف کے ساتھ آئی تھیں اور جنھیں کچھ مدت سے ماسکو میں دیکھا نہیں گیا تھا، تمام حاضریں کی توجہ اپنی طرف مبذول کراں۔ مزید برآں ہر شخص کو یہ دھندلادھندلا سا احساس تھا کہ نناشا کی پرئیں آندے سے نسبت طے پا چکی ہے۔ انھیں یہ بھی معلوم تھا کہ اس وقت سے رستوف گاؤں میں قیام پذیر ہیں اور وہ اس لڑکی کو، جس کے مقدور میں روس کا ایک بہترین رشتہ لکھا تھا، تحس کی نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔

جیسا کہ ہر شخص نے اسے بتایا تھا، دیہاتی فضا میں نناشا کا رنگ روپ نکھر آیا تھا اور اس شام اس پر جو بیانی کیفیت طاری تھی، اس کے طفیل وہ خاص طور پر حس و جمال کا مرقع دکھائی دے رہی تھی۔ اس کی نگاہت مزاحیہ اور حسن نے اپنے گرد و پیش کی ہر چیز کے بارے میں اس کی بے نیازی سے مجتمع ہو کر ہر شخص پر زبردست تاثر قائم کر دیا تھا۔ اس کی غزالی آنکھیں، جو کسی شخص کی متلاشی نہیں تھیں، ہجوم کے اوپر تیرتی پھر رہی تھیں۔ اس کے مہین بازو، جو کہنوں سے اوپر تک برہنہ تھے، باکس کے مخلیں کنارے پر پڑے تھے جب کہ وہ بالکل غیر شعوری طور پر موسیقی کی دھن کے ساتھ ساتھ اپنی مٹھی کبھی کھولتی اور کبھی بند کرتی جا رہی تھی۔ یوں اس کے ہاتھوں میں پروگرام کا کتابچہ چم رہا تھا جابجا رہا تھا۔

”وہ دیکھو، آدھرا ٹلینینا ہے“، سونیا نے کہا۔ ”میرا خیال ہے کہ اس کی ماں بھی ساتھ ہے۔“

”غضب خدا کا، میخائل کرینچ پہلے کی نسبت کہیں زیادہ موٹا ہو گیا ہے!“ کاؤنٹ نے حیرت کا اظہار کیا۔

”اپنی سنائیٹا کیلونا کو دیکھو! یہ اس نے سر پر کیا اوڑھ رکھا ہے!“

”وہ رہے کاراگنز۔ بورس جولی کے ساتھ ہے۔ یہ سمجھا دشوار نہیں کہ اس کی نسبت ملے پا چکی ہے۔“

”دروغیسکو نے پیغام دے دیا ہے، یقیناً مانیں یہ مجھے آج ہی معلوم ہو ہے،“ شن شن نے رستوفو

کے بائیں آتے ہوئے کہا۔

اپنے باپ کی نگاہوں کا تعاقب کرتے ہوئے نتاشا نے جولی کو اپنی ماں کے برابر بیٹھے دیکھا۔ اس کے چہرے پر طمانیت جھلک رہی تھی اور اس کی موٹی سرخ گردن (نتاشا کو معلوم تھا کہ اس پر پاؤڈر کی تہہ جمی ہوگی) میں موتیوں کی مالا لٹک رہی تھی۔ ان کے عقب میں بورس کا خوبصورت سر نظر آ رہا تھا۔ اس نے اپنے بال بہت دلکش انداز سے سنوارے ہوئے تھے۔ وہ مسکرا رہا تھا۔ وہ آگے کو جھکا ہوا تھا اور اس کا کان جون کے منہ کے قریب تھا۔ اس نے کن آنکھوں سے رستوفو کی جانب دیکھ کر تبسم روا اپنی انگلیتر سے کچھ کہا۔

”وہ ہمارے، میرے اور ان کے بارے میں، باتیں کر رہے ہیں!“ نتاشا نے سوچا۔ ”وہ مجھ سے حسد کرتی ہے اور وہ غالباً اسے ٹھنڈ کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ انھیں تردد کرنے کی ضرورت نہیں! کاش انھیں معلوم ہوتا کہ اب میرے نزدیک ان کی کوئی اہمیت نہیں رہی، ان میں سے کسی کی بھی نہیں۔“

اس کے پیچھے آنتائیٹا کیلونا بیٹھی تھی۔ اس کے سر پر سبز پہناوا تھا۔ بیک وقت اس کی باجھیں بھی کھلی جا رہی تھیں اور وہ پارسایانہ انداز سے راضی پر رضا بھی نظر آ رہی تھی۔ بائیں اس فضا سے، جو انگلیتروں سے مخصوص ہوتی ہے، جس سے نتاشا خوب آگاہ تھی، درجے وہ اتنا پسند کرتی تھی، چاہتا تھا۔ اس نے اپنا منہ دوسری طرف پھیر لیا اور اچانک وہ تذلیل، جس کا اسے صبح کے چکر کے دوران میں سامنا کرنا پڑا تھا، اس کی نگاہوں کے سامنے گھومنے لگی۔

”کسے کیا حق ہے کہ وہ مجھے اپنے خاندان میں شامل نہ ہونے دے؟“ الف! بہتر ہے کہ اس بارے میں سوچا ہی نہ جائے۔ اس وقت تک نہ، جب تک وہ واپس نہ آجائیں!“ اس نے اپنے آپ سے کہا اور وہ ان لوگوں کے، جو نیچے ٹال میں بیٹھے تھے، چہروں کا جائزہ لینے لگی۔ ان میں کچھ چہرے شہنا سا تھے اور کچھ، جنہی۔

پہلی قطار کے عین درمیان میں آرکسٹرا کے جنگلے سے پشت ٹکائے ایرانی لباس میں بیوس دو خوف کھڑا تھا۔ اس نے اپنے گھونگر یا لے بالوں کو کچھ یوں سنوارا تھا کہ وہ بہت اونچے اور گھٹنے نظر آ رہے تھے۔ وہ حاضرین کے نمونہ سامنے کھڑا تھا اور اس بات سے بخوبی آگاہ تھا کہ وہ سارے تھیکر کا مرکز نگاہ ہے، لیکن وہ کھڑا ہوا تھا جیسے وہ تھیکر میں نہیں، اپنے کسی کمرے میں موجود ہو۔ اسکو کے پائے نیچے نو جوتوں کا گروہ، جس کا وہ بظاہر لیڈر تھا، اس کے گرد ہجوم کیے ہوئے تھا۔

کاؤنٹ ایسا اندر بچنے ہنستے ہوئے سونیا کو، جس کے رخسار لال ہو رہے تھے، ٹھوکا دیا اور اس کی توجہ اس

کے سابقہ پرستار کی طرف دلائی۔

”تم نے اسے پہچانا؟“ اس نے پوچھا۔ ”یہ اچانک کہاں سے آچکا ہے۔ میرا تو خیال تھا کہ یہ کہیں دراپوش ہو گیا ہے۔“

”ہاں، دراپوش تو ہو گیا تھا،“ شن شن نے جواب دیا۔ ”یہ کاکیشیا چلا گیا تھا لیکن وہاں سے فرار ہو گیا۔ سنا ہے کہ یہ ایران میں، جہاں اس نے شاہ کے بھائی کو قتل کر دیا تھا، کسی حکمران بادشاہ کے وزیر کی حیثیت سے کام کر رہا ہے۔ اب ماسکو کی تمام خواتین اس پر جانیں چھڑکنے لگی ہیں۔ ”دلوخوف ایرانی“۔ ان الفاظ نے یہ کرشمہ کر دیا ہے۔ وہ اس کا نام بے کرمیوں کھاتی ہیں۔ محفلیں منعقد کرنے والی خواتین اسے یوں پیش کرتی ہیں جیسے ”دلوخوف نہ ہو، سٹریٹ مچھلی کی بہترین ڈش ہو،“ شن شن نے کہا۔ ”دلوخوف اور انا طول کوراگن نے تمام خواتین کے سر گھما دیے ہیں۔“

ملحقہ باکس میں ایک دراز قد حسین و جمیل خاتون اپنا بھاری بھر کم ریشمی گاؤن لہرائی، سرسائی داخل ہوئی۔ اس کے ہل بہت بڑی سینڈھی کی صورت میں گندھے ہوئے تھے۔ اس کے کھلے گلے کے ڈریس میں اس کی گردن اور سفید گداز بازوؤں کی سرعام نمائش ہو رہی تھی۔ اس کے گلے میں بڑے بڑے موتیوں کی دوہری لٹاچی۔ اس نے اپنی نشست سنبھالنے میں خاصا وقت صرف کیا۔

ناتشا اس گردن، ان بازوؤں، موتیوں اور کنگھی چوٹی کی خوبصورتی کو بغور دیکھے اور اس کی تعریف میں رطب اللسان ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔ عین اس وقت جب وہ دوسری مرتبہ اس کا جائزہ لینے اس کی طرف متوجہ ہوئی اس خاتون نے مڑ کر دیکھا اور جب اس کی نگاہیں کاؤنٹ کی نگاہوں سے ٹکرائیں، اس نے گردن کو جھیش دی اور مسکرائے لگی۔ یہ جھیر کی اہلیہ کاؤنٹس بزدل خود اٹھی۔ کاؤنٹ الیا آندرچ، جو اونچے طبقے کے ہر فرد کو جانتا تھا، آگے جھکا اور اس سے مخاطب ہوا۔

”کاؤنٹس، آپ یہاں کب سے ہیں؟“ اس نے دریافت کیا۔ ”میں حاضر ہوں گا، دست بوسی کے لیے حاضر ہوں گا۔ میں یہاں کام کے سلسلے میں آیا ہوں اور اپنی بچیاں ساتھ لایا ہوں۔ سنا ہے کہ سمبولووا کی اراکاری بے نظیر ہے،“ کاؤنٹ اپنی ہانکتا چلا گیا۔ ”کاؤنٹ پیوتر کرلودچ نے کبھی ہمیں فراموش نہیں کیا تھا۔ کیا وہ نہیں ہیں؟“

”جی ہاں، ان کا ارادہ یہاں آنے کا تھا،“ ہیلین نے ناتشا کو بغور دیکھتے ہوئے کہا۔

کاؤنٹ رستوف دوبارہ اپنی نشست پر بیٹھ گیا۔

”خوبصورت، وجہ یہ ہے نا؟“ کاؤنٹ نے ناتشا کے کان میں کہا۔

”بہت متاثر کن!“ ناتشا نے اتفاق کیا۔ ”مرد اس کی محبت میں آسانی سے گرفتار ہو جاتا ہوگا۔“

عین اسی لمحے اکتھامی نغے کے آخری سرسائی رہے اور کنڈکٹر نے اپنی چھتری کھٹکائی۔ بنفٹ ناتشائی، جو

تاخیر سے آئے تھے، نیچے سال میں اپنی نشستوں پر بیٹھ گئے اور پردہ اٹھ گیا۔

جونہی پردہ اٹھا، شال اور باکسوں پر گہرا سکوت طاری ہو گیا اور تمام مردوں، بوڑھے تھے یا لوجواں، جو دردیوں اور ڈریس کوٹوں میں بیٹھے تھے، اور خواتین نے، جو اپنے اجسام کے برہنہ حصوں پر قیمتی جواہرات پہنے ہوئے تھیں، یہ جوش توقعات کے ساتھ اپنی توجہ شیخ کی طرف مبذول کر دی۔
 مناشا کی نگاہیں بھی شیخ پر مرکوز ہو گئیں۔

9

درمیان میں شیخ اہوار تختوں پر مشتمل تھ۔ پہلوؤں پر گئے کی دھتیاں، جن پر درختوں کی تصاویر بنی ہوئی تھیں، پڑی تھیں۔ عقب میں دھتیاں کے دو پرکینوس کھنچا ہوا تھا۔ شیخ کے درمیان میں سرخ چولیوں اور سفید بٹنی کوٹوں میں ملبوس چند دوشیزائیں بیٹھی تھیں۔ ایک انتہائی فریب اندام لڑکی، جس نے سفید ریشمی ڈریس پہن رکھی تھی، دوسروں سے لگ تھلگ کوتاہ قامت شیخ پر متمسک تھی۔ اس شیخ کے عقب میں سبز گئے کی تختی گوند سے جوڑ دی گئی تھی۔ وہ سب نغمہ سرائی کر رہی تھیں۔ جب ان کا گیت اختتام پذیر ہوا، وہ لڑکی جو سفید ڈریس میں ملبوس تھی، پرامپٹر کے باکس کی طرف آئی اور ایک شخص، جس کی ٹائیس سفید، چست ریشمی چٹلون میں ملفوف تھیں، جس کے سر پر کلائی اور ہاتھ میں ٹختر تھا، گانا گانے اور نغمہ میں ہاتھ لہرانے لگا۔

پہلے تو ٹھک چٹلون والا شخص اکیلے گاتا رہا، پھر وہ گانے لگی، پھر وہ دونوں رک گئے اور اس شخص نے سفید ڈریس والی دوشیزہ کا ہاتھ اپنی انگلی سے چھوا۔ وہ بظاہر اس تال کا، جس پر اس نے اس کے ساتھ مل کر گانا گانا تھا، انتظار کر رہا تھا۔ جب ان کا دو گانا ختم ہو گیا، سارے تھیسٹر میں داد و تحسین کے وہ ڈوگرے بلند ہوئے اور اتنا شور مچا کہ کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی، جب کہ شیخ پر وہ شخص اور لڑکی، جو عشق و معشوق کے کردار ادا کر رہے تھے، مسکراتے اور اپنے ہاتھ آگے پھیرا پھیلا کر اور اپنے سر جھکا جھکا کر سلام کرتے رہے۔

دیہاتی فضا میں زندگی گزرنے کے بعد وہ اپنی موجودہ پیچیدہ کیفیت میں مناشا کو یہ سب کچھ حیرت انگیز اور طرز تماشا نظر آیا۔ وہ دیر پر پوری توجہ مرکوز نہ کر سکی، بلکہ وہ نغمہ بھی صحیح طور پر نہ سن سکی۔ اسے صرف باتصویر دھتیاں، یا عجیب و غریب ملبوسات پہنے مرد اور لڑکیاں، جو اس چکا چوند روشنی میں اسے عجیب انداز سے حرکتیں یا ہاتھیں کر رہے، درگاہانے گارہے تھے، نظر آ رہے تھے۔ اسے معلوم تھا کہ ان سب کا مدعا کیا پیش کرنا تھا لیکن یہ سب کچھ تنا ڈھنکی سے باطل، بناوٹی اور غیر فطری تھا کہ کبھی اسے اداکاروں پر شرم آنے لگتی اور کبھی وہ ان کی حرکتوں سے محظوظ ہونے لگتی۔ اس نے اپنے گرد پیش ناظرین کے چہروں پر نظر ڈالی۔ وہ دیکھنا چاہتی تھی کہ آیا وہ بھی اسی طرح بوکھلا رہے ہیں یا نہیں اور جس مضحکہ خیزی کو وہ محسوس کر رہی ہے، انھیں بھی اس کا احساس ہے یا نہیں۔ لیکن نظر بظاہر یہی دکھائی دیا کہ جو کچھ شیخ پر ہو رہا تھا، وہ اس میں پوری طرح محو تھے اور ایک ایسی سرخوشی کا اظہار کر رہے تھے، جو مناشا کو براسر جھوٹی اور مصنوعی معلوم ہو رہی تھی۔ ”میرا خیال ہے کہ یہاں جو کچھ ہو رہا ہے، اتنا قانع نہیں ہو رہا، منتظرین

شاید چاہتے ہی یہ تھے کہ ایسا ہو، اس نے سوچا۔ وہ کبھی نیچے شال میں پو ماں لگائے سردی کی قطروں کو اور کبھی کھلے گلے کے گاؤں پہنے باکسوں میں بیٹھی خواتین اور بالخصوص ہیلین کو دیکھنے لگتی۔ یہ ہیلین صریحی طور پر سب لباس دکھائی دے رہی تھیں۔ اس کے چہرے پر آسودہ اور پراطمینان مسکراہٹ تھی۔ اس کی نگاہیں سٹیج پر مرکوز تھیں اور وہ اس خیرہ کن روشنی سے، جس میں سٹیج نہایا ہوا تھا اور پر کیف اندر دنی فضا سے، جسے ہجوم کی موجودگی نے قدرے گرم کر دیا تھا، لطف اندوز ہو رہی تھی۔ مناشا بتدریج کیف و مستی کی ایک ایسی کیفیت کی، جس کا اسے مدتوں تجربہ نہیں ہوا تھا، لپیٹ میں آتی چلی گئی۔ اسے یہ مطلق احساس نہ رہا کہ وہ کون ہے، کہاں ہے اور جو کچھ اس کی نگاہوں کے سامنے ہو رہا ہے، وہ کیا ہے۔ جب وہ اپنے ارد گرد کی باندھے دیکھ رہی تھی، غیر متوقع طور پر اور بے ربط انداز سے انتہائی عجیب و غریب تصورات برق رفتاری سے اس کے ذہن میں گردش کرنے لگے۔ ایک لمحے تو اسے خیال آیا کہ وہ سٹیج کے سامنے کی روشنیوں (فٹ لائٹس) کے اوپر سے چھٹا ٹنگ لگا دے اور دبیر کا نفر، جو اداکارہ تھیں، تہاگا رہی تھی، خود گانے لگے۔ پھر ایک ایک کی اس کے من میں یہ ترنگ آئی کہ اس کے قرب میں جو سن رسیدہ شخص بیٹھا ہے اسے پٹھیا کی نوک سے ٹھوکا دے دے یا زر جھک کر ہیلین کے گدگدی کر دے۔

ایک موقع پر جب واحد اداکار نے اپنا نغمہ شروع کرنا تھا، سٹیج پر مکمل سکوت طاری تھا، ایک روزانہ جو رستوفوں کے قریب تریں تھا اور جو نیچے شال میں کھلتا تھا، چرچا یا اور ایک نووارد کے، جو تاخیر سے آیا تھا، مراٹہ قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ ”کوراگن آیا ہے!“ شن شن نے سرگوشی کی۔ کاؤٹنس بزد خود انے اپنی گردن گھمائی اور نووارد کو دیکھ کر مسکرائے لگی۔ مناشا نے کاؤٹنس کی نگاہوں کا تعاقب کیا در اسے ایک غیر معمولی طور پر وجہ و ثقیل ایجوکیشن نظر آیا۔ وہ انھیں کے باکس کی طرف آ رہا تھا۔ اس کی چال ڈھال اور طور طریق میں بدی خود اعتمادی لیکن مناشا تھی۔ یہاں طول کوراگن تھا۔ اسے اس نے مدتوں پہلے پیٹرز برگ کے ایک بال میں دیکھا تھا اور اسے قابل توجہ سمجھا تھا۔ اب وہ ایجوکیشن کی وردی میں ملبوس تھا۔ اس کے کندھے پر ایک پھول اور ایک فیتے کی گرہ تھی۔ اس کی چوٹی میں محتاط اکڑ پن تھا۔ اگر وہ اتنا خوب روتہ ہوتا اور اگر اس کے خدو خال سے اتنی نیک درندہ آسودگی اور مالی خوشحالی نہ چمک رہی ہوتی، تو اس کی یہ چال مضحکہ خیز معلوم ہوتی۔ اگرچہ اوہیرا جاری تھا، وہ نشستوں کے درمیانی راستے پر، جس پر قالین بچھا ہوا تھا، شہزادوں کی طرح چہل قدمی کرتا چلا آ رہا تھا، اس کی شمشیر اور مہینہ قدرے کھٹکنا رہے تھے اور اس کا خوش وضع سر، جس پر خوشبو لگی ہوئی تھی، سیدھا ہاتھ ہوا تھا۔ مناشا پر اچلتی نظر ڈالنے کے بعد وہ نئی ہمشیرا کے پاس پہنچا، اپنا ہاتھ، جس پر دستانہ پوری طرح فٹ تھا، اس کے باکس کے کنارے پر رکھا، اسے گردن ہد کر سلام کیا، آگے جھک کر اور مناشا کی جانب اشارہ کر کے کوئی سوال پوچھا۔

”Mais charmantel“ اس نے کہا۔ وہ لاریب مناشا کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔ مناشا کو اس کے الفاظ

استنے واضح طور پر تو سنائی نہ دیے، تاہم اس نے اس کے لبوں کی حرکت سے اندازہ لگا لیا۔

اس کے بعد وہ نیچے سٹال میں چھا گیا دروہاں پہلی تھ رہی دلخوف کے برابر بیٹھ گیا۔ اس نے اس شخص کو جس کے ساتھ دوسروں کا رویہ چاہو سنا تھا، ڈا ابالی دروستانہ انداز سے اپنی کہنی سے ٹھوکا دیا، شگفتہ روی سے اسے آنکھ ماری اور مسکرایا۔ اس کے بعد اس نے پٹاپاؤں آرکسٹرا کے پردے پر نکا دیا۔

”بہن بھائی میں کتنی مشابہت ہے!“ کاؤنٹ نے رائے زنی کی۔ ”اور دونوں کتنے وجیہ و تکیل ہیں!“
 شن زن ریلب کاؤنٹ کو کوراگن کے ماسکو میں کسی خفیہ معاشرے کے متعلق بتانے لگا۔ چونکہ اس نے نیشا کو ”من سوہنی“ کہا تھا، اس نے، جو کچھ کہا جا رہا تھا، کان لگا کر سننے کی کوشش کی۔

پہلا ایکٹ ختم ہو گیا۔ سٹال میں تمام لوگ اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ کوئی آرہا تھا، کوئی جا رہا تھا، یوں ایک قسم کی کھلبلی مچ گئی۔

یورس رستونوں کے باکس میں آیا، سے ان سے انداز سے ان کی مبارک بادوں کی، اپنے اورو اوپر اٹھائے، غیر ضروری سے مسکرایا، انھیں اپنی مگنیز کی طرف سے شادی میں شرکت کی دعوت دی اور واپس چل دیا۔ نیشا ہشاش بشاش انداز سے، ترا ترا کر اس سے باتیں کرتی رہی اور بار بار مسکرتی رہی۔ اس نے اسے شادی کی، جو عنقریب ہونا تھی، مبارک باد پیش کی۔ حالانکہ یہ وہی یورس تھا جس کی محبت میں وہ خود کبھی گرفتار رہی تھی۔ اپنی کیف و مستی کی موجودہ کیفیت میں اسے ہر چیز پہل اور فطری معلوم ہو رہی تھی۔

نیم کریا میلین، جو اس کے قرب میں بیٹھی تھی، ہر کس دنا کس کو یکساں تبسم سے نواز رہی تھی اور بالکل اسی قسم کی مسکراہٹ نیشا نے یورس پر چھا دی۔

انتہائی روشن طبع اور نامی گرامی اشخاص نے میلین کے باکس پر بیٹھ کر دی تھی۔ نہ صرف اندر تل دھرنے کی گنجائش نہیں رہی تھی بلکہ سٹال کی جانب باہر بھی لوگ اسے گھیرے کھڑے تھے۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ دوسروں کو یہ جتانے کے لیے کہ ن کی اس کے ساتھ راہ و رسم ہے، ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کے لیے سردھڑکی بازی لگائے ہوئے ہیں۔

وقت کے دوران میں کوراگن سارا عرصہ دلخوف کے ساتھ سٹیج کی اگلی روشنیوں کے سامنے کھڑا اور ہلکی باندھ کر رستونوں کے باکس کی طرف دیکھتا رہا۔ نیشا جانتی تھی کہ وہ اسی کے متعلق باتیں کر رہا ہے اور اس نے اس کی ہاتھیں کھل دیں۔ وہ اپنی جگہ سے کچھ ہلی تاکہ وہ اس کا چہرہ اس زاویے سے، جو اس کے خیال میں بہترین تھا، دیکھ سکے۔

دوسرے ایکٹ کے آغاز سے قبل میئر سٹال میں نمودار ہوا۔ جب سے رستونوں کا سکودار دھوے شے، اس سے ان کی ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ اس کے چہرے پر حزن و ملال برس رہا تھا اور جب نیشا نے اسے آخری مرتبہ دیکھا تھا، اس کے مقابلے میں اس کے تن و توش میں مزید اضافہ ہو گیا تھا۔ کسی شخص پر بھی توجہ دے بغیر وہ اگلی نشستوں کی جانب بڑھا۔ اناطول اس کے پاس آیا اور اس نے رستونوں کی طرف آنکھ اٹھا کر اور ہاتھ کا اشارہ کر

کے اس سے کچھ کہا۔ جب بیئر کی نظر نٹاشا پر پڑی، وہ کھل اٹھا اور ان کے باکس کی طرف تیز قدم اٹھانے لگا۔ یہاں پہنچ کر وہ اپنی کہنیوں پر جھک کر کھڑا ہو گیا اور کافی دیر تک اس سے مسکرا مسکرا کر باتیں کرتا رہا۔ بیئر کے ساتھ گفتگو کے دوران میں نٹاشا کو کاؤنٹس بزدخودا کے باکس میں کسی مرد کی آواز سنائی دی اور کئی چیز نے اس کے کان میں پھونک ماری کہ یہ لازمہ کوراگن ہوگا۔ وہ مڑی اور ان کی نگاہیں ٹکرائیں۔ انا طول نے تقریباً سکتے ہوئے کچھ ایسی متوالی اور بیار بھری نگاہوں سے سیدھا اس کی آنکھوں میں جھٹک کر دیکھا کہ نٹاشا کو اس کے اسنے قریب ہونا، اس کا اس کی طرف اس انداز سے دیکھنا اور اس بات کا یقین ہونا کہ وہ اس کی تحسین کر رہا ہے، اور ان سب باتوں کے باوجود اس سے کوئی شناسائی نہ ہونا، عجیب لگا۔

دوسرے ایکٹ کے دوران میں سٹیج پر جو دھتیاں رکھی گئیں، وہ قبرستان کا منظر پیش کر رہی تھیں۔ عقب میں جو پردہ لٹک رہا تھا، اس میں سوراخ تھا۔ یہ سوراخ کچھ اس انداز سے بنایا گیا تھا کہ معلوم ہوتا تھا کہ چاند چمک رہا ہے۔ سٹیج کے سامنے کی روشنیاں ڈھانپ دی گئیں۔ ہارنوں²⁰ ورنکٹرا بیسوں²¹ کے دھیمے سرسائی دینے لگے۔ اس کے ساتھ ہی دونوں اطراف سے سیاہ بادلوں میں ملبوس متعدد شخصیات کوئی ہتھیار، جو بظاہر مخبر معلوم ہوتے تھے، فضا میں لہراتے سٹیج پر نمودار ہوئے۔ پھر چند اور اشخاص بھاگتے آئے اور اس دو شیزہ کو، جو پہلے سفید اور اب ہلکے نیلے لباس میں ملبوس تھی، گھسیٹنے لگے۔ وہ جھٹ پٹ اسے گھسیٹ کر نہیں لے گئے، بلکہ پہلے دو خاصی دیر تک اس کے ساتھ گانا گاتے رہے اور پھر سے گھسیٹتے گھسیٹتے سٹیج سے باہر نکل گئے۔ سٹیج کے عقب میں کوئی دھاتی چیز تین بار کھٹکھٹائی گئی، ہر شخص دوزانو ہو گیا اور مناجات کا ورد کرنے لگا۔ ناظرین کے پروردنہ ہائے تحسین سے ان تمام افعال میں بار بار خلل پڑا۔

اس ایکٹ کے دوران میں جب بھی نٹاشا کی نظر شمال کی طرف اٹھی، اسے اپنا بازو کرسی کے عقب پر لٹکائے انا طول کوراگن ٹنگلی باندھ کر مسلسل اپنی طرف دیکھتا دکھائی دیا۔ وہ یہ دیکھ کر باغ باغ ہو گئی کہ وہ اسے اپنا اتنا فریقتہ بنا چکی ہے اور اسے یہ خیال چھو کر بھی نہ گزرا کہ اس میں کوئی خرابی کا پہلو بھی پوشیدہ ہو سکتا ہے۔ جب دوسرا ایکٹ ختم ہوا، کاؤنٹس بزدخودا، اٹھی، رستوفوں کے باکس کی طرف مڑی (عملی طور پر اس کا سارے کا سارا سینہ عریاں تھا)، اپنی پھنگلی کے اشارے سے کاؤنٹ کو اپنی طرف بلایا اور ان دونوں کی طرف، جو اس کے باکس میں داخل ہو گئے تھے، مطلق دھین دیے بغیر دلکش مسکراہٹ کے ساتھ اس سے باتیں کرنے لگی۔

”اپنی خوبصورت بیٹیوں کے ساتھ میرا تعارف کرائیں نا،“ اس نے کہا۔ ”سارا شہران کے گن گار ہا ہے اور ایک میں ہوں کہ انھیں جانتی تک نہیں۔“

نٹاشا اٹھی اور دوزانو ہو کر پرشکوہ کاؤنٹس کو آداب بجالائی۔ وہ اس سینہ کی، جس کا حسن جہاں سوز تھا، تعریف سے اتنا خوش ہوئی کہ اس کے گال تھمتانے لگے۔

”اب تو میں ماسکوی بننے کا تہیہ کر چکی ہوں۔ آپ کو شرم نہیں آتی کہ آپ نے ایسے جواہر پارے گاؤں میں

دفتر کے ہیں؟“

کاؤنٹس بڑبڑوانے مسکور کن خاتون کی جو شہرت کمائی تھی، وہ اس کی کامل مستحق تھی۔ وہ ایسی باتیں بھی۔ خاص طور پر اگر ان کا تعلق خوشامد سے ہوتا۔ جو کبھی اس نے سوچی بھی نہیں ہوتی تھیں، بے عیب سادگی اور بے ساختگی سے کہہ دیتی تھی۔

”ہائی ڈیز کاؤنٹ، اب آپ اپنے ان جگر گوشوں کو میری تحویل میں دے دیں۔ میں کوئی زیادہ دن یہاں قیام نہیں کروں گی۔ اور خود آپ کا بھی تو یہی پروگرام ہے۔ پھر بھی میں انہیں محفوظ کرنے کی کوشش کروں گی۔ جب میں پیٹرنز برگ میں تھی، میں نے تمہارے بارے میں بہت کچھ سنا تھا اور میں تمہارے ساتھ واقفیت کرنا چاہتی تھی،“ اس نے اپنی خوبصورت اور غیر متبدل مسکراہٹ سے نناشا کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”میں نے اپنے مصاحب خاص²² درویش کوئے۔ تمہیں معلوم ہے کہ اس کی شادی ہو رہی ہے۔ اور اپنے شوہر کے دوست، بلکونسکی، پرنس آندرے بلکونسکی۔ سے بھی، تمہارے بارے میں بہت کچھ سنا ہے۔“ وہ چپا چپا کر اور خاص زور دے کر بات کر رہی تھی۔ اپنے اس لہجے سے وہ یہ جتان چاہتی تھی کہ اسے پرنس آندرے کے نناشا کے ساتھ رشتے کا علم ہے۔

پھر اس نے کہا کہ ایک لڑکی اوپیرا کے بقیہ دورانیے کے لیے اس کے باکس میں آجائے تاکہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ بہتر انداز سے واقفیت پیدا کر سکیں۔ چنانچہ نناشا اٹھی اور اس کے باکس میں اس کے قریب بیٹھ گئی۔

تیسرے ایکٹ میں محل کا منظر پیش کیا گیا۔ بے شمار قمیص روشن تھیں اور دیواروں پر باریش ناستوں کی تصاویر لٹک رہی تھیں۔ سٹیج کے درمیان میں ایک مرد اور ایک خاتون کھڑی تھی۔ بظاہر وہ بادشاہ درملکہ تھے۔ بادشاہ اپنے دائیں ہاتھ سے اشارے کر رہا تھا اور بہت مضطرب نظر آ رہا تھا۔ اس نے بھونڈے انداز سے کوئی گانا گایا اور عنابی تخت پر بیٹھ گیا۔ وہ دوشیزہ، جو پہلے سفید اور پھر ہلکے نیلے رنگ کے ڈریس میں سٹیج پر آئی تھی، اب ایک قسم کے صرف ڈھیٹے ڈھالے بلاؤز میں بیوس تھی اور بال شکائے تخت کے قریب کھڑی تھی۔ وہ حزن سے انداز سے غمہ سرائی کر رہی تھی اور ملکہ سے خطاب کر رہی تھی۔ بادشاہ نے تحکمانہ انداز سے اپنے بازو کو جنبش دی اور سٹیج کے دونوں بازوؤں سے چند مرد اور خواتین، جن کی ٹانگیں برہنہ تھیں، برآمد ہوئیں۔ ان مردوں اور عورتوں نے آنکھ مل کر رقص کا مظاہرہ کیا۔ اس کے بعد جنکھی اور پرسرت نے میں دامنوں کی دھنیں سنوائی گئیں۔ اور ایک لڑکی، جس کی برہنہ ٹانگیں فریہ اور بازو پتلے تھے، دوسروں سے علیحدہ ہوئی، سٹیج کے بازو میں گئی، وہاں اس نے اپنی چوٹی درست کی، سٹیج کے وسط میں آئی، درنظر میں چھلانگیں لگانے، در تیزی سے ایک پاؤں کو دوسرے پاؤں سے ٹکرانے لگی۔ سٹال میں موجود تمام اشخاص تاریاں پیٹنے اور داد و تحسین کے ڈنگرے برسانے لگے۔ پھر ایک شخص سٹیج کے ایک کونے میں گیا۔ آرکسٹرا میں مجھے²³ اور ہارس جھنجھانے لگے اور یہ شخص، جس کی ٹانگیں نکلی تھیں، کد کڑے لگانے لگا۔ وہ اتنی تیزی سے بلندی پر اچھلتا تھا کہ اس کی ٹانگوں کی بس جھلک نظر آتی تھی۔ (اس شخص کا نام ڈو پورخ تھا اور محض اس اچھل کود کے عوض ساٹھ ہزار روبل سالانہ پاتا تھا۔) سٹالوں، باکسوں اور جھیلری میں موجود تمام خواتین و حضرات پر زور

اندہ ز سے نعرہ ہائے تحسین بلند کرنے اور پوری قوت سے تالیاں بجانے لگے۔ یہ شخص رکا، مسکراتے درجک جھک کر چاروں طرف سلام کرنے لگا۔ اس کے بعد دوسرے مرد اور خواتین اپنی سنگی ٹانگوں کے ساتھ ناچنے لگیں۔ ان کے بعد بادشاہ اور ملک میں سے کسی نے گا کر کچھ کہا اور وہ سب کے سب نعرہ سرا ہو گئے۔ لیکن ایک ایک ایک موقن برپا ہو گیا اور آکر کسٹرا پر بارہ نیم سر تیوں پر مشتمل سگم ²⁴ اور نعرہ ²⁵ ہفتم کے دھیمے سر سنائی دینے لگے۔ اور وہ اپنے ایک اور سانچی کو دوبارہ گھسیٹتے ہوئے وہاں سے بھاگ گئے اور پردہ گر پڑا۔ اس بار شور و غل سے کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ نعرہ ہائے تحسین بلند ہو رہے تھے اور تالیاں پٹ رہی تھیں۔ ہر چیز سے پر مسرت و انبساط ٹپک رہی تھی اور حاضرین چلا چلا کر پکار رہے تھے۔

”دوپوخ / دوپوخ / دوپوخ!“

نشا شا کو اب یہ سب کچھ اجنبی نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس نے بہت دشا دانی سے مسکراتے پر اطمینان اندازے گرد و پیش نظریں دوڑائیں۔

”دوپوخ نے سماں نہیں باندھ دیا؟ کتنا لطف آیا!“ ہیلین نے اس کی جانب متوجہ ہو کر کہا۔
”جی، بالکل!“ نشا شا نے جواب دیا۔

10

وقت کے دوران میں ہیلین کے باکس میں سرد ہو کا جھوٹا محسوس کیا گیا۔ دروازہ کھل گیا اور انا طول اندر داخل ہوا۔ اس نے کمر جھکا رکھی تھی اور وہ کوشش کر رہا تھا کہ کسی کے ساتھ ٹکرا نہ جائے۔
”اجازت ہو تو میں اپنے بھائی سے تعارف کرا دوں؟“ ہیلین نے اپنی مضطرب نگاہیں نشا شا سے انا طول کی جانب منتقل کرتے ہوئے کہا۔

نشا شا نے اپنا خوبصورت ننھا منہ سر و جہرہ تشکیل ایجوٹ کی جانب گھمایا، اور اپنے عریاں بازو کے اوپر سے اسے دیکھ کر مسکرائی۔ انا طول، جو قریب سے بھی اتنا ہی خوش شکل تھا جتنا کہ وہ دور سے نظر آیا تھا، اس کے نزدیک بیٹھ گیا اور اسے بتاتے لگا کہ وہ مدتوں سے اس کا دیدار حاصل کرنے کا منتہی تھا بلکہ سچ پوچھیں تو جب اس اوپن مرتبہ اسے ناری شکن کے بال میں دیکھ تھا، اسے اتنی مسرت ہوئی تھی کہ وہ اسے کبھی فراموش نہ کر سکا اور اسی دن سے اس کے دل میں اس سے ملاقات کرے کی تمنا چل رہی ہے۔ کوراگن مردوں کی نسبت عورتوں کی صحبت میں کہیں زیادہ سمجھدار اور بے بناوٹ تھا۔ وہ لگی لپٹی رکھے بغیر درنظری انداز سے گفتگو کرتا تھا اور نشا شا کو یہ دیکھ کر عجیب و غریب اور خوشگوار حیرت ہوئی کہ اس شخص میں، جس کے متعلق اس نے اتنا کچھ سنا تھا، قلعہ کوئی ایسی بات، جسے ہیپس ڈراؤنی کہا جاسکے، نہیں ہے، بلکہ اس کے برعکس اس کی مسکراہٹ جتنی بے تصنع، یک نہار اور خوشگوار نظر آتی تھی، اس سے بڑھ کر ہو ہی نہیں سکتی تھی۔

انا طول نے فنکاروں کی کارکردگی کے بارے میں اس کی رائے دریافت کی اور اسے بتایا کہ کس طرح سمونود اپنے سابقہ مظاہرے کے دوران میں سٹیج سے نیچے گر گئی تھی۔

”اور کاؤنٹس، تمہیں معلوم ہے؟“ اس نے اس سے یوں نجی طب ہو کر پوچھ جیسے وہ اس کی کوئی دیرینہ دوست ہو، ”کہ ہم ایک کاسٹیوم ٹورنامنٹ کا اہتمام کر رہے ہیں؟“ تمہیں اس میں لارڈ شریک ہونا چاہیے۔ بڑا مزہ آئے گا۔ ہم سب رخساروں کے ہاں اکٹھے ہو رہے ہیں۔ ضرور آؤ، تاکید ہے۔ آؤ گی نا؟“

جب وہ یہ باتیں کہہ رہا تھا، اس نے ایک ٹائیے کے لیے بھی اپنی منہم نگاہیں اس کے چہرے، اس کی گردن اور اس کے عریاں بازوؤں سے نہ ہٹائیں۔ تناش کو اس بارے میں مطلق شبہ نہیں تھا کہ وہ اس سے مسحور ہو چکا ہے، اس سے اسے خوشی تو ہوئی لیکن کوئی بات ایسی ضرور تھی جس نے اس کی موجودگی کو اس کے لیے پریشان کن بنا دیا تھا۔ سے محسوس ہونے لگا کہ وہ کڈھب صورت حال میں پھنس گئی ہے اور اس احساس نے اسے بے چین اور بے سکون بنا دیا۔ جب وہ اس کی جانب نہیں دیکھ رہی ہوتی تھی، اسے یہ احساس ستانے لگا کہ وہ اس کے شانوں کا عمیق نظروں سے جائزہ لے رہا ہے اور جلی طور پر اپنی نگاہیں اس کی نگاہوں میں گاڑ دیتی تاکہ وہ اس کی توجہ اپنے چہرے کی طرف متعطف کرا سکے۔ جب وہ اس کی آنکھوں میں جھانکتی، اس پر خوف سوار ہو جاتا اور اسے یہ اندازہ ہونے لگتا کہ اس نے شعوری طور پر اپنے اور دوسرے مردوں کے مابین ادب و شائستگی کی جود یوار کھڑی کر رکھی تھی، وہ ان رذلوں کے مابین عدم موجود ہے۔ یہ بات اس کے فہم و ادراک میں نہیں آ رہی تھی کہ وہ پانچ منٹ کے اندر تندر اس شخص کے بے پناہ طور پر، تا قریب کیوں محسوس کر رہی ہے۔ جب وہ اپنی نظریں دوسری طرف پھرتی، اسے یہ اندیشہ لاحق ہو جاتا کہ وہ عقب سے، سے عریاں بازو سے پکڑ لے گا اور اس کی گردن پر بوسہ ثبت کر دے گا۔ وہ بالکل عام قسم کی باتیں کرتے رہے لیکن اسے لگ رہا تھا کہ اسے کبھی کسی مرد کے ساتھ اتنی بے تکلفی کا احساس نہیں ہوا تھا جتنا کہ اس کے ساتھ ہو رہا ہے۔ تناشا اپنی نگاہوں سے ہیلین اور اپنے باپ کو دیکھتی رہی جیسے وہ پوچھ رہی ہو کہ یہ سب کیا ہے اور اس کا مطلب کیا ہے۔ لیکن ہیلین کسی جرنیل کے ساتھ باتوں میں محو تھی اور اس نے اس کی نظروں کا کوئی جواب نہ دیا۔ رہا اس کا باپ، اس کی نگاہوں میں ہمیشہ کی طرح صرف ایک ہی پیغام تھا، اور کچھ نہیں، ”محفوظ ہو رہی ہو؟ بہت خوب، مزے کرو۔ میں خوش ہوں!“

وقت تو تادوئوں کے مابین خاموشی کے کڈھب لمحات آ جانے۔ ایسے ہی ایک لمحے کے دوران میں جب انا طول کی موٹی موٹی آنکھیں، جن میں سکون اور ٹھہراؤ تھا، ٹٹکنکی باندھے مسلسل اسے دیکھے جا رہی تھیں، تناشا نے ہر سکوت توڑنے کی غرض سے اس سے پوچھا: ”آپ کا ماسکو کے بارے میں کیا خیال ہے؟ پسند آیا؟“ پوچھنے کو تو اس نے یہ سوال پوچھ ہی نہیں سہم دیا لیکن شرم و حیا سے اس کا چہرہ گلنار ہو گیا۔ اسے ہر دم یہ خیال ستاتا رہا کہ اس شخص سے محو کلام ہو کر وہ کسی نارہر حرکت کا ارتکاب کر رہی ہے۔ انا طول یوں مسکرا جیسے وہ اس کی ہمت افزائی کرنا چاہتا ہو۔

”شروع شروع میں تو مجھے اس شہر میں کوئی جازبیت نظر نہ آئی۔ آخر وہ کون سی چیز ہے جو کسی شہر کی دل کشی کا

سبب بنتی ہے؟ پری چہرہ اور پری جمال خواتین۔ ٹھیک کہا نا میں نے؟ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اب مجھے یہ شہر بہت پسند ہے، اس نے سعی خیر نظروں سے اس کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ ”کاؤنٹس، تم کا سیونم ٹورنامنٹ میں آؤ گی نا؟ ضرور آنا!“ اور نتاشا کے ہاتھوں میں جو گلدستہ تھا، کوراگن نے اپنا ہاتھ اس پر رکھا، اپنی آواز دھکی کی اور زانیسی میں بولا ”وہاں تم ملکہ حسن ہو گی، ضرور آنا، ڈیئر کاؤنٹس، اور یہ پھول مجھے بطور نہایت دے دو۔“

وہ کیا کہہ رہا تھا، نتاشا کچھ نہیں سمجھ رہی تھی اور نہ وہ خود سمجھ رہا تھا۔ تاہم وہ یہ محسوس کر رہی تھی کہ اس کے ناقابل تفہیم الفاظ میں کوئی ناشائستہ غرض و غایت پوشیدہ ہے۔ اسے کچھ معلوم نہیں تھا کہ اسے کیا کہنا چاہیے اور اس نے اپنا منہ دوسری طرف پھیر لیا جیسے اس نے کچھ سنا ہی نہ ہو۔ لیکن جونہی اس نے اپنا رخ دوسری طرف کیا، اس کے ذہن میں یہ خیال آیا کہ وہ تو اس کے پیچھے ہے اور اس کے اتنا قریب ہے۔

”اب وہ کیا محسوس کر رہا ہے؟ بدحواس ہے؟ ناراض ہے؟ کیا مجھے اصلاح احوال کرنے چاہیے؟“ وہ اپنے آپ سے پوچھ رہی تھی۔ وہ اپنے گرد پیش نظریں دوڑائے، ناشرہ سکی۔ اس نے سیدھا اس کی نگاہوں میں بھاٹک کر دیکھا اور وہ اس کی قربت، اس کی خود اعتمادی اور اس کے تبسم کی پر شفقت ممانعت کے سامنے ڈھیر ہو گئی اور اس کے تبسم کے جوب میں متبسم ہو گئی۔ اسے یہ سوچ کر دوبارہ تشویش لاحق ہوئی کہ دونوں کے باہم کوئی دیوار نہیں رہی۔ پردہ اٹھا اور اتنا طول یا کس سے باہر نکلی گیا۔ وہ سرور و مطمئن تھا۔ نتاشا دوسرے باکس میں اپنے باپ کے پاس چلی گئی۔ وہ اس عالم کے، جس میں وہ اپنے آپ کو پا رہی تھی، مکمل طور پر حلسم میں گرفتار ہو چکی تھی۔ اب جو کچھ اس کے سامنے وقوع پذیر ہو رہا تھا، بالکل فطری نظر آ رہا تھا۔ اس کے برعکس اپنے سنگیتر، پرنس ماریا یا دیگی زندگی کے بارے میں اس کے ذہن میں جو سابقہ خیالات تھے، وہ ایک مرتبہ بھی اس کے دماغ میں نہ آئے جیسے ان سب کا تعلق کسی ماضی بعید سے ہو۔

جو تھے ایکٹ میں ایک قسم کا ابلیس شیخ پر نمودار ہوا۔ وہ گاتا جاتا اور بازو اور ہاتھ ہراتا جاتا تھا تا آنکہ ایک ایک اس کے پاؤں تلے کے تختے کھینچ لیے گئے اور وہ نظروں سے و جھل ہو گیا۔ نتاشا نے جو تھے ایکٹ میں بس یہی کچھ دیکھا۔ وہ پریشان و مضطرب تھی اور اس کے اس اضطراب کا باعث کوراگن تھا جسے وہ بغور دیکھے، ناشرہ سکی۔ جب وہ تھیں گھر سے روانہ ہو رہے تھے اتنا طول ان کے پاس آیا، اس نے ان کی گاڑی منگوائی اور اس میں انھیں سوار ہونے میں مدد دی۔ جب وہ نتاشا کو گاڑی میں بٹھ رہا تھا، اس نے اس کا بازو دبایا۔ نتاشا کے جذبات میں مل جل چُ گئی، اس کا چہرہ تھمتھانے لگا اور اس کے رگ و پے میں مسرت کی ہر دوڑ گئی۔ اس نے مڑ کر پیچھے نگاہ ڈالی، وہ چمکتی دیکتی آنکھوں اور مجسم ملائمت سے اسے دیکھ رہا تھا۔



نتاشا کے ساتھ کیا دردت ہوئی تھی، اس کا صحیح اندازہ اسے گھر پہنچ کر ہی ہو سکا۔ اور جب اچانک پرنس آندرس کا

خیال اس کے ذہن میں آیا، وہ دہشت زدہ ہو گئی۔ چائے پر، جو وہ تھینکر سے واپسی کے بعد پینے بیٹھے تھے، اس کے طاق سے با آواز بلند کراہ نکل گئی، اس کا چہرہ قرمز ہو گیا اور وہ کمرے سے باہر بھاگ گئی۔

”اف، خداوند، میں لٹ گئی، برباد ہو گئی!“ اس نے اپنے آپ سے کہا۔ ”میں نے اس معاملے کو یہاں تک جانے ہی کیوں دیا؟“ اسے حیرت ہو رہی تھی۔

وہ کافی دیر تک اپنا دھکتا سلگتا چہرہ اپنے ہاتھوں میں بھپائے چٹھی اور یہ سمجھنے کی کوشش کرتی رہی کہ اس پر کیا واقعہ گزرا ہے۔ لیکن وہ نہ تو یہ سمجھ سکی کہ اس کے ساتھ ہوا کیا ہے اور نہ اسے یہ معلوم ہو سکا کہ وہ محسوس کیا کر رہی ہے۔ ہر چیز دھندل دھندلی، گجھلک اور ہیبت ناک دکھائی دے رہی تھی۔ اس وسیع و عریض اور درختوں آؤ بیوریم میں، جہاں نوخیز لڑکوں، ادھیز عمر مرد اور طرح دار اور مطمئن انداز سے مسکراتی نیم عریاں بیہین، جوش انبساط میں داد و تحسین کے نعرے لگا رہے تھے، اس ہیلین کے زیر سایہ یہ سب کچھ سیدھا سادا اور فطری معلوم ہو رہا تھا، لیکن اب جب کہ وہ تنہا تھی، یہ سب کچھ ناقابل تقسیم ہو گیا تھا۔ ”یہ کیا ہے؟“ مجھ پر اس کا ہول کیوں طاری ہوا تھا؟ ضمیر کے ن کیوکوں کا، جو میں اب محسوس کر رہی ہوں، مفہوم کیا ہے؟“ اس نے اپنے آپ سے پوچھا۔

نشا جو کچھ محسوس کر رہی تھی، وہ اس کا ذکر، ستر میں صرف معرکاؤنٹس سے کر سکتی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ سونیا، جس کا نقطہ نظر پاکیرہ اور بے لوج ہے، اس اعتراف کو یا تو بالکل سمجھ نہیں پائے گی یا اس پر ہیبت زدہ رہ جائے گی۔ چنانچہ جو چیز نشا کو اذیت پہنچا رہی تھی، وہ خود ہی اس کا حل ڈھونڈنے کی کوشش کرنے لگی۔

”کیا میں تنی پیدا ہو گئی ہوں کہ پرنس آندرے کی محبت کی مستحق نہیں رہی؟“ اس نے اپنے آپ سے سوال کیا اور پراعتقاد استہزا سے جواب دیا: ”میں بھی کیا حق ہوں کہ اس قسم کے سوالات اٹھا رہی ہوں! میرے ساتھ حقیقتاً ہوا کیا ہے؟ کچھ بھی تو نہیں! میں نے کیا کیا ہے؟ کچھ بھی تو نہیں! میں نے ہرگز ہرگز اسے کوئی تحریک نہیں دی۔ کسی کو کچھ بتا نہیں چلے گا ورنہ اسے دوبارہ کبھی نہیں ملوں گی،“ اس نے اپنے آپ سے کہا۔ ”چونکہ یہ بات بالکل عیاں ہے کہ کچھ بھی نہیں ہوا، پھر کچھ بتاؤ کس بات کا؟“ اور پرنس آندرے اب بھی مجھ سے محبت کر سکتے ہیں۔

”لیکن یہ اب بھی کیوں؟“ اف، میرے خداوند، وہ یہاں کیوں نہیں ہیں؟“

کچھ دیر کے لیے تو اسے سکون محسوس ہوا، لیکن کسی چلت نے اسے دوبارہ بتایا کہ اگرچہ یہ سب کچھ درست ہے اور اگرچہ کچھ بھی نہیں ہوا ہے، لیکن پرنس آندرے کے لیے اس کی محبت میں ازیں پیشتر جو پاکیزگی تھی، وہ اب غارت ہو گئی ہے۔ کوراگن کے ساتھ اس کی جو گفتگو ہوئی تھی، اس نے اسے اپنے تخیل میں ایک مرتبہ پھر دہرایا اور اس دورن میں اس بے باک دروچہ شخص کا چہرہ، اس کے ہاتھوں اور بازوؤں کی حرکات اور اشارے اور اس کی ملائم مسکراہٹ، جو اس کا بازو دبانے وقت اس کے ہونٹوں پر نمودار ہوئی تھی، اس کی نگاہوں کے سامنے گھومتی رہی۔

اناطول کو راگن ماسکو میں اس لیے مقیم تھا کیونکہ اس کے باپ نے اسے پیٹرز برگ سے، جہاں وہ سالہا سال سے رہا، روٹل سے زیادہ خرچ کر رہا تھا، باہر بھیج دیا تھا۔ مزید برآں وہ اس سے کہیں زیادہ رقم کا مقروض تھا اور اس کے قرض خواہوں نے اس کے باپ کا ناطقہ بند کر رکھا تھا۔

پرنس واسیلی نے اپنے بیٹے کو متنبہ کر دیا تھا کہ وہ اس کے نصف قرضے ادا کرے گا، لیکن اس شرط پر کہ کنڈراچیف کے ایجوٹس۔ اس کے لیے یہ عہد اس کے باپ نے حاصل کیا تھا۔ کی حیثیت سے ماسکو چلا جائے اور قطعی طور پر یہ عہد کرے کہ وہاں وہ کوئی اچھا رشتہ ڈھونڈ لے گا۔ اس نے اسے پرنس ماریا اور جون کارگن کے نام بھجائے۔

ناطول نے ہائی بھری اور ماسکو چلا آیا۔ یہاں اس نے میٹر کے مکان میں ڈیراجیا۔ شروع شروع میں میٹر اسے اپنے گھر میں رکھنے میں متاثر تھا، تاہم کچھ دنوں کے بعد وہ اس کا والدی ہو گیا اور وقتاً فوقتاً اس کے ساتھ رنگ رلیاں سنانے بھی جانے لگا۔ وہ قرض کے پردے میں اسے رقم بھی دینے لگا۔

جب شن شن نے یہ کہہ دیا تھا کہ اناطول نے ماسکو کی تمام خواتین کے سرگھما دیے ہیں، تو ٹھیک ہی کہا تھا۔ بھاری طور پر اس کا طریق کار یہ تھا کہ وہ ان کے ساتھ تغافل شعاری کاروبار اختیار کرتا اور بظاہر چھپیڑکیوں اور رانسیسی اداکاراؤں کو ترجیح دیتا تھا۔ ان فرانسیسی اداکاراؤں میں نمایاں ترین نام یوٹسی کا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اس کے ساتھ اس کے تعلقات بے تکلفانہ تھے۔ دل و خوف بابا سکو کے عیاش ٹولے کے کسی بھی سرد کے ہاں ناؤ نوٹش کی جو محفیں منعقد ہوتی تھیں، وہ ان میں شرکت کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتا تھا۔ وہ ساری ساری رات سے نوٹش کرتا، اور اس محلے میں بڑے بڑے حریفوں کو چت کر دیتا۔ شیر کے انتہائی اونچے طبقے کے کسی بھی گھر میں محفل یا مال منعقد ہوتا، وہاں وہ لازماً پہنچ جاتا۔ ماسکو کی خواتین کے ساتھ اس کے چھپے ڈھکے معاشقوں کی افواہیں پھیل رہی تھیں اور وہ اجتماعی رقصوں میں ان کے ساتھ وقتی محبت کی پینٹلیں بڑھاتا نظر آتا تھا۔ لیکن وہ نو جوان و شیرازوں، خاص طور پر مال دار و شیرازوں سے۔ جن میں سے اکثر کی شکل و صورت بس واجبی ہی تھی۔ دور دور رہتا تھا۔ اس کی ایک وجہ تھی۔ وہ برس قبل۔ اس حقیقت سے اس کے صرف قریب ترین دوست ہی آگاہ تھے۔ اناطول نے شادی کر لی تھی۔ اس زمانے میں اس کی رجمنٹ پولینڈ میں مقیم تھی اور ایک پولش بی بی زسیلارے، جو تھوڑی سی زمین کا مالک تھا، اسے اپنی بیٹی کے ساتھ عقد کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اس نے اپنی بیوی کو چھوڑنے میں لحد بھری تانہین کی اور خاصی معقول رقم کے، جس کا اس نے اپنے خسر کو بھیجنے کا اقرار کیا تھا، معوضے میں گلو خلاسی کر لی اور اب وہ کنوارے کی حیثیت سے وندنا تا پھر رہا تھا۔

اناطول اپنے مقام، اپنے آپ اور باقی دنیا سے ہمیشہ مطمئن رہتا تھا۔ اسے جبلیا اور کاملاً یقین تھا کہ جس

طرح کی زندگی وہ سر کر رہا ہے، اس سے مختلف انداز اختیار کرنا اس کے بس کی بات نہیں اور یہ کہ اس نے اپنی پوری زندگی میں کبھی کوئی گھٹیا حرکت نہیں کی ہے، لیکن اس میں اتنی صلاحیت نہیں تھی کہ وہ یہ سوچ سکتا کہ اس کے اہل و انہاں سے دوسرے کیسے متاثر ہوتے ہیں یا یہ کہ اس کے اس یا اس فعل کے کیا نتائج برآمد ہوں گے۔ اس کا ایقان تھا کہ جس طرح بظن پانی میں رہنے کے لیے تخلیق ہوئی ہے، اسی طرح خدا نے اسے تیس ہزار سالہ نڈاڑا نے اور معشرے میں ہمیشہ نمایاں مقام پر نہ رکھنے کے لیے بنایا ہے۔ اسے اس بات کا اتنا پختہ یقین تھا کہ جب دوسروں کی نگاہیں اس پر پڑتی تھیں، تو وہ بھی اس کے قائل ہو جاتے تھے اور وہ اسے نہ معاشرے میں اعلیٰ مقام عطا کرنے اور نہ اسے روپیہ، خورد و دائیں بائیں ہر طرف سے اوجھار لینا رہتا تھا اور بظاہر کبھی یہ نہیں سوچتا تھا کہ یہ اس نے واپس بھی کرنا ہے، فراہم کرنے سے انکار کرتے تھے۔

وہ جواری نہیں تھا۔ کم زکم اس نے جیتنے کے بارے میں کبھی نہیں سوچا تھا اور اگر وہ ہار جاتا، تو قطعی دل میلا نہیں کرتا تھا۔ وہ نخوت پسند بھی نہیں تھا۔ اسے اس امر کی قطعاً کوئی پروا نہیں تھی کہ لوگ اس کے بارے میں کیا سوچتے ہیں اور اس پر یہ تہمت تو بالکل نہیں لگائی جاسکتی تھی کہ وہ جاہ پسند ہے۔ اس نے ایک سے زیادہ مرتبہ محض اس لیے اپنے ہپ کو ناراض کیا تھا کہ ملازمت کے دوران میں، سے ترقی کے جو مواقع ملے تھے، وہ اس نے گنوا دیے تھے، اور سے ہر قسم کے امتیازات سے چڑھتی۔ وہ سونم نہیں تھا اور جس نے اس سے جو بھی مانگا وہ اس نے دینے سے کبھی نکار نہ کیا۔ اگر اسے کسی چیز کا لپکا تھا، وہ عیش و عشرت اور خوشی تھیں۔ اس کا یہ قول تھا کہ بن چسکوں میں کوئی رذالت نہیں۔ چونکہ وہ یہ سوچنے سمجھنے کی، کہ اس کی اپنی شمس پروری کے دوسروں کو کیا نتائج جھگٹنا پڑیں گے، اہلیت سے بے بہرہ تھا، وہ بڑے خلوص سے اپنے بارے میں یہ رائے رکھتا تھا کہ اس کے کردار پر کوئی انگلی نہیں اٹھائی جا سکتی، غلط کاروں اور لچوں انگلوں سے کچی نفرت کرتا تھا اور صاف ستھرے ضمیر کے مالک کی حیثیت سے اپنی گردن بلند رکھتا تھا۔

ہوں کاروں، مرد مگدینوں، کو زمانہ مگدینوں کی طرح اپنی معصومیت کا باطنی یقین ہوتا ہے اور انہیں کی طرح انہیں بھی بخشش کی امید ہوتی ہے۔²⁷ وہ تو اس لیے بخشش کی مستحق ٹھہری کیونکہ اس نے محبت بہت کی تھی اور یہ اس سے بخش دیا جائے گا کیونکہ اس نے جی بھر کر مرے اڑائے ہیں۔“

دلخوف، جوانی جلد وطنی اور ایرانی مہم جونیوں کے بعد اسی سال دوبارہ ماسکودارو ہوا تھا، ایک بار پھر تدار بازی کی لت میں گرفتار ہو چکا تھا۔ وہ خوب سے نوشی کرتا اور جی بھر کر رنگ ریاں مانتا۔ اس نے ہنر برک کے اپنے برسنے یاد کو راگن کے ساتھ دوستی کی تجدید کر لی تھی اور اپنی مطلب برآری کے لیے اسے استعمال کر رہا تھا۔

انا طول دو خوف سے اس کی ذہانت، فطانت اور جسارت کی بنا پر سچے دل سے پیار کرتا تھا۔ دلخوف کو انا طول کو رگن کے نام، سماجی حیثیت اور تعلقات کی ضرورت تھی تاکہ وہ ان کی کڑ میں کھاتے پیتے نوجوانوں کو بھلا پسلا کر اپنے تدار بازی کے حلقے میں شامل کر سکے۔ وہ سے اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرتا تھا اور اس کے

پیسے پر داد بخش دیتا تھا لیکن اسے شبہ بھی نہیں ہونے دیتا تھا۔ انا طول سے مفادات حاصل کرنے کے علاوہ دوسرے آدمی کے عزم و ارادے پر تھلب پانے کا عمل دلوخوف کے لیے فی نفسہ باعث مسرت تھا، یہ اس کی حالت اور ضرورت تھا۔

نشاٹانے کو راگن کے دل و دماغ پر گہرے نقوش چھوڑے تھے اور اس نے، دبیرا کے بعد پھر کے دوران میں دلوخوف سے ایک باذوق قدر دان کی طرح اس کے بازوؤں، شانوں، پاؤں اور بالوں کی پرکشش جوہیل بیان کیں اور اپنے اس عزم کا اظہار کیا کہ وہ اس کے ساتھ عاشقانہ تعلقات، ستوار کرے گا۔ اس کے اس جذباتی ابال اور دکھاوے کی محبت کا ممکنہ انجام کیا ہوتا، اس کے متعلق سوچنا اس کے سی طرح بس کی بات نہیں تھا، جس طرح اس نے اس امر پر کبھی غور نہیں کیا تھا کہ جو حرکات وہ کر رہا ہے، درجہ افعال اس سے سرزد ہو رہے ہیں، ان کا نتیجہ کیا برآمد ہوگا۔

”میرے دوست، وہ واقعی بہت خوبصورت ہے لیکن وہ ہمارے لیے نہیں ہے،“ دلوخوف نے اس سے کہا۔

”میں اسے اپنی ہمشیرہ کی وساطت سے ڈر پر بلواؤں گا،“ انا طول نے کہا۔ ”کیا خیال ہے؟“

”تمہارا بھلا اسی میں ہے کہ جب تک اس کی شادی نہیں ہو جاتی، انتظار کرو...“

”تمہیں معلوم ہے کہ میں منہی منی لڑکیوں کا جاں سپار ہوں،“ انا طول نے اپنے خیالات کی روشنی بنے

ہوئے کہا۔ ”وہ اپنے ہوش دحواس کھونے میں دیر نہیں لگاتیں۔“

”ایک منہی منی لڑکی تمہیں پہلے ہی پھانس چکی ہے،“ دلوخوف نے، جسے اس کی شادی کے بارے میں علم

تھا، کہا۔ ”احتیاط سے کام لو!“

”ہونہر، آری کا دوسری مرتبہ ڈسا جانا دشوار ہے،“ انا طول نے خوش مزاجی سے تہقیر لگاتے ہوئے کہا۔

12

ادبیرا سے اگلے روز رستوف گھریز ہی ٹھہرے رہے اور کوئی شخص انھیں ملنے بھی نہ آیا۔ ماریا دسریا کی کاؤنٹ کے ساتھ کسی ایسے معاملے پر، جس کے بارے میں انھوں نے نساٹا کو ندھیرے میں رکھا، گفتگو ہوئی۔ نساٹانے قیاس آرائی کی وہ مہر پر نس کے متعلق باتیں کر رہے ہیں اور کوئی منصوبہ بنا رہے ہیں۔ اس پر اسے پریشانی بھی ہوئی اور غصہ بھی آیا۔ اسے تو قہقہے کہ پرس آندرے کسی بھی گھڑی پہنچ سکتا ہے اور اس روز اس نے دو مرتبہ ایک ملازم یہ دریافت کرنے کہ وہ آگیا ہے یا نہیں، وزوویز ہنکا سٹریٹ بھیجی۔ وہ نہیں آیا تھا۔ ماسکو کے قیام کے ابتدائی ایام میں اسے اتنی مشکل صورت حال کا سامن نہیں کرنا پڑا تھا جتنا کہ اب کرنا پڑ رہا تھا۔ ایک طرف تو اس کے ہاتھ سے مہر کا دامن چھوٹا جا رہا تھا اور وہ اس کی فرقت میں گھلی جا رہی تھی اور دوسری طرف پرس ماریا اور مہر پر نس کے ساتھ جو ملاقات ہوئی تھی، اس کی تلخ یادیں اس کے ذہن پر آسیب بن کر سوار ہو گئی تھیں۔ اور اس پر طرہ یہ کہ اسے ایک دم کی

تشویش اور خوف نے گھیر لیا تھا۔ اس کا سبب اسے خود بھی معلوم نہیں تھا، لیکن اس کے ذہن میں مسلسل یہ خیال وارد ہوتا رہتا تھا کہ وہ کبھی نہیں آئے گا۔ پھر اس کی آمد سے قبل خود اس کے ساتھ کوئی واردات ہو جائے گی۔ پہلے وہ ایک سوئی سے گھنٹوں اس کے بارے میں خوابوں کے تانے بانے بنتی رہتی تھی لیکن اب وہ اس صلاحیت سے عاری ہو چکی تھی۔ جونکی اس کا تصور اس کے ذہن میں آتا، معمر پرنس، پرنس ماریا، جھینگر اور کوراگن کی یادیں اس کے خیالات میں درآئیں۔ ایک بار پھر اس نے اپنے آپ سے سول کیا: ”کیا مجھ سے کوئی غلطی سرور ہو گئی ہے؟ میں نے پرنس آندرے کے ساتھ جو پیمانہ دنا باندھا تھا، میں اسے توڑ تو نہیں چکی ہوں؟“ اور اسے ایک بار پھر معلوم ہوا کہ جس شخص نے اس کے قلب میں اتنے ناقابل تفہیم درد و ہشت ناک جذبات موجزن کر دیے تھے، وہ اس کے ایک ایک لفظ، ایک ایک شارے اور اس کے چہرے کے ایک ایک تاثر کا جزئیات سے جائزہ لے رہا ہے۔ جو لوگ ساشا کے رد گرد تھے، انھیں وہ معمول سے زیادہ شگفتہ مزاج اور خوش طبع نظر رہی تھی، لیکن حقیقت اس کے برعکس تھی۔ وہ پہلے کی نسبت ذہنی طور پر کم آسودہ اور سرور تھی۔

اتوار کی صبح ماریا دمیتریو نا لے اپنے مہمانوں کو اپنے حلقے کے گرجے۔ جرج آف ازپیشن²⁸۔ میں نماز عشاءے ربانی میں شرکت کی دعوت دی۔

’مجھے یہ فیشن اہل گرجے پسند نہیں ہیں‘ اس نے کہا۔ وہ بظاہر اپنی آزادی رائے پر بہت ازاں معلوم ہوتی تھی۔ ”خدا ہر جگہ ایک ہے۔ ہمارے پاوری صاحب بہت نفیس آدمی ہیں۔ وہ مذہبی رسوم پورے وقار اور رکھ رکھاؤ سے سرانجام دیتے ہیں۔ اور یہی حال ان کے نائب کا ہے۔ گانے والوں کے طائفے بنا کر حمدیں اور سنا جاتیں گانے میں کیا تقدس ہے؟ مجھے یہ پسند نہیں ہے۔ یہ بس جذبات کی تسکین کا ذریعہ ہیں، اور کچھ نہیں!“

ماریا دمیتریو نا کو اتوار کے ایام پسند تھے، ورنہ انھیں منانا خوب جانتی تھی۔ بروز ہفتہ اس کا سار گھر رگڑ رگڑ کر صاف کیا جاتا اور چمکا یا جاتا۔ اتوار کو نہ وہ خود کوئی کام کرتی اور نہ اس کے نوکر چاکر کسی کام کو ہاتھ لگاتے۔ دُزیر معمول سے زیادہ کھڑے ہوتے۔ سائزین کی خاطر تواضع و دُڈکا اور بھنے گوشت سے کی جاتی تھی لیکن سارے گھر میں کسی شخص کے چہرے پر تعطیل کا احساس اچھے واضح اور بین انداز سے ہویدا نہ ہوتا جتنا کہ ماریا دمیتریو نا کے چوڑے چمکے اور سخت گیر چہرے پر نظر آتا تھا۔ اس روز وہاں غیر متبادل مسرت آمیز مسامت جھلکتی رہتی۔

عشاءے ربانی کی تقریب کے بعد جب وہ طعام گاہ میں، جہاں میزوں اور کرسیوں سے مختلف ہٹالیے گئے تھے، کالی ختم کر چکے، ایک ملازم نے اسے اطلاع دی کہ گازی تیار ہے اور ماریا دمیتریو نا نے خوشنمت انداز سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ اس نے اپنی بہترین شال، جس میں وہ دوسرے لوگوں سے ملنے چاہتی تھی، اوڑھ رکھی تھی۔ اس نے اعلان کیا کہ وہ پرنس کورائی آندر یوچ بلکوسکی سے ملاقات کرنے اور ساشا کے بارے میں اس سے گفتگو کرنے جا رہی ہے۔

جب وہ جا چکی، مادام شائے کی ایک ڈریس میکر پہنچ گئی۔ ساشا کو اپنی توجہ دوسرے امور کی طرف منعطف کرنے کا بہانہ مل گیا اور اس کی باجھیں کھل گئیں۔ وہ ڈرائنگ روم سے ملحق کمرے میں بند ہو گئی اور نئے ملبوسات

آزمائے لگی۔ اس نے ابھی چولی، جس میں کچے دھماگے تو لگا دیے گئے تھے لیکن ابھی وہ استمنوں سے محروم تھی۔ یہی تھی اور وہ آئینے کے سامنے اپنی گردن گھما کر یہ جہازہ رہے رہی تھی کہ یہ اس کے جسم پر پھب رہی ہے یا نہیں۔ کہ اس نے اپنے باپ اور ایک خاتون کو ڈرائنگ روم میں جوشیلے انداز سے باتیں کرتے سنا اور اس کا چہرہ تھمتھنے لگا۔ ناشا کو اتنا موقع بھی نہ مل سکا کہ وہ اپنی کرتی ہی اتار سکتی کہ دروازہ کھلا اور کاڈنٹس بزدخود اندر داخل ہو گئی۔ اس کے جسم پر گہرے نمنی رنگ کا مخملیسا گاؤن، جس کے کار معمول سے اونچے تھے، اور چہرے پر دو ستارہ جسم تھا۔

اٹھا، "Imadeticieuse!" اس نے شرماتی لجاتی ناشا سے با آواز بلند کہا۔ "Charmantel" پھر وہ کاڈنٹ کی، جو اس کے پیچھے پیچھے کمرے میں چلا آیا تھا، طرف متوجہ ہوئی اور بولی، "نہیں، مائی ڈیر کاڈنٹ، یہ سخت زیادتی ہے! یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ آپ رہیں بھی ماسکو میں اور کہیں آئیں جائیں بھی نہ؟ نہیں، میں آپ کو ہرگز نہیں بخش گی! سچ شام مادموزیل یو عیسی میرے غریب خانے پر اپنے فن کا مظاہرہ کر رہی ہیں۔ صرف چند گئے چنے لوگ اُنیں گے اور اگر آپ اپنی صاحب زادیوں کو جو اپنے حسن سے، مادموزیل یو عیسی کو بھی شرماتی ہیں۔ اپنے ساتھ لے کر نہ آئے، تو میری آپ سے کئی ہو جائے گی۔ میرے شوہر یہاں نہیں ہیں، وہ تو رگھتے ہوئے ہیں، در نہ میں ابھی بچا دیتی اور وہ آپ لوگوں کو اپنے ساتھ لے جاتے۔ آپ کو آنا ہوگا، لازماً آنا ہوگا۔ وقت آٹھ اور تو کے درمیان۔"

اس نے ڈریس میکر کی طرف اپنی گردن کو جنبش دی۔ وہ اسے جانتی تھی اور دور انو ہو کر آداب بجالائی۔ ہیلین آئینے کے قریب کرسی پر بیٹھ گئی اور دل کش انداز سے اپنے مخملیسا گاؤن کی تھیں سنوارنے لگی۔ وہ خوش گوار اور ہلکے پھلکے انداز سے چہچہاتی اور ناشا کے حسن و جمال کی تعریفوں کے بل باندھتی رہی۔ جب وہ نئے لمبوسات کا جائزہ لے اور ان کی تحسین کر چکی، اس نے اپنے ڈریس کا، جو کہ باریک جالی سے بٹاتھا اور ابھی ابھی اسے بڑے سے موصول ہوا تھا، ذکر چھیڑ دیا۔ ناشا کو مشورہ دیا کہ وہ بھی ایک ایسا ہی ڈریس بنوائے۔

"لیکن، میری جادوگرنی، تم پر تو ہر چیز چھبتی ہے،" اس نے کہا۔

ناشا کے چہرے پر پرست تبسم مسلسل نظر آتا رہا۔ وہ کچھ یوں خوش ہو رہی تھی جیسے وہ اس مسکور کی کاڈنٹس کی، جو ماضی میں اتنی پر شکوہ اور ناقابل رسائی معلوم ہوتی تھی اور اب وہ اتنی گرم گسٹری کا مظاہرہ کر رہی تھی، تعریف و تحسین تلے پردان چڑھ رہی ہو۔ ناشا کے حوصلے بلند ہو گئے اور وہ اس عورت سے، جو اتنی حسین و جمیل اور گرم انٹنس تھی، قریب قریب محبت کرے لگی۔ اور جہاں تک ہیلین کا تعلق ہے، اس نے ناشا کی تعریفوں کے جو پل ہاندھے تھے، ان میں اس نے کسی ریاکاری سے کام نہیں لیا تھا۔ اس نے پورے خلوص سے اپنی اس خواہش کا اظہار کیا تھا کہ ناشا خوب مزے اڑائے اور لمبی تان کر سوئے۔ انا طول نے اس سے گڑگڑا کر درخواست کی تھی کہ وہ ان دونوں کو ایک دوسرے کے قریب لائے اور سی مشہد کے پیش نظر وہ رستوفوں سے ملنے جی آئی تھی۔ وہ ناشا اور اپنے بھائی کو

ایک دوسرے کے قریب لانے کے تصور سے خوب مفلوظ ہو رہی تھی۔

اگرچہ پیٹرنز برگ میں ایک وقت یہ بھی آیا تھا جب اسے سناٹا پر سخت غصہ آیا تھا کہ وہ بورس کو اس سے دور کیے جا رہی ہے، لیکن اب اس کے دل میں کوئی ملاں نہیں تھا اور اپنے انداز سے اس کا بھلا چاہنے لگی تھی۔ جب وہ رستوں سے رخصت چاہ رہی تھی، وہ اپنی متوسل کو ایک طرف لے گئی۔

”میرے بھائی نے کل میرے ہاں کھانا کھایا۔ ہنستے ہنستے ہمارا برا حال ہو گیا۔ میری جادوگرنی، اس سے کچھ کھایا نہیں جا رہا تھا۔ بس تمہارا نام لے کر آہیں بھرے جا رہا تھا۔ کئی ڈیڑھ گھنٹے اس پر تمہارے عشق کا جنون سوار ہو گیا ہے، پاگل ہوا جا رہا ہے۔“

”دیکھو تو، ma delicieuse، کیسے شرمناک ہے، لجا رہی ہے۔“ ہیلین بولتی چلی گئی۔ ”تمہیں لازماً آنا ہے۔ ma delicieuse، ٹھیک ہے کہ تم کسی سے پیار کرتی ہو لیکن اس کا یہ مطلب تھوڑے ہی ہے کہ تم کسی راہبہ کی طرح بند ہو کر بیٹھ رہو۔ اگر تمہاری نسبت طے پا چکی ہے، تو بھی مجھے یقین ہے کہ تمہارا سنگیتریہ قطعاً نہیں چاہے گا کہ تم اس کی عدم موجودگی میں بوریت سے گھٹ گھٹ کر مر جاؤ، بلکہ وہ یہی چاہے گا کہ تم سوسائٹی میں گھومو پھرو۔“

”اسے معلوم ہے کہ میری سنگتی ہو چکی ہے،“ نساٹا نے سوچا۔ ”وہ وہ اور اس کا فائدہ۔ نیک دل پیٹر۔ اس بارے میں باتیں کرتے رہے اور خوب ہنستے رہے ہوں گے۔ چنانچہ وہاں جانے میں کوئی ہرج نہیں۔“ اور ایک بار پھر وہ بات، جو اسے تنی گھناؤنی اور دہشت ناک نظر آتی تھی، ہیلین کے زیر اثر بالکل سادہ اور فطری معلوم ہونے لگی۔ ”اور وہ اتنی grande dame ہیں، ان کی شخصیت میں اتنی دل کشی ہے اور ترانے سے نظر آتا ہے کہ وہ مجھے پسند کرتی ہیں۔ پھر میں لطف کیوں نہ اٹھاؤں؟“ نساٹا نے ہیلین کو حیرت سے دیکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتے ہوئے سوچا۔

ماریا دستریونا بوقت ذرا واپس پہنچ گئی۔ اس کے منہ پر قفل لگا ہوا تھا اور اس کے چہرے پر سنجیدگی طاری تھی۔ صاف نظر آ رہا تھا کہ وہ پرنس سے پٹ کر آئی ہے۔ وہ مذاقات کے بعد ابھی تک اپنے حواس مجتمع نہیں کر سکی تھی اور اس معاملے کے بارے میں دس جہتی سے بات کرنے کے قابل نہیں تھی۔ کاؤنٹ کے سونات کے جواب میں وہ صرف اتنا کہہ سکی: ”سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہے، میں اس بارے میں کل تم سے بات کروں گی۔“ اس نے جب کاؤنٹس بزدخوا کی آمد اور شام کی دعوت کے بارے میں سنا، تو گویا ہوئی:

”میں کاؤنٹس بزدخوا سے مسئلہ جوں بڑھانا پسند نہیں کرتی اور میں تمہیں بھی یہی مشورہ دوں گی۔ تاہم، اگر تم وعدہ کر چکے ہو، پھر بے شک چلے جاؤ۔ تمہاری ذرا تفریح ہو جائے گی،“ اس نے نساٹا سے مخاطب ہو کر کہا۔

تقریباً سارے کے سارے تاشا کے لیے اجنبی تھے۔ کاؤنٹ رستوف کی طبیعت یہ دیکھ کر سخت مکدر ہوئی کہ محفل سراسر ایسے مردوں اور عورتوں پر، جو اپنی آزاد روی کے لیے بدنام تھے، مشتمل ہے۔ مادموزیل یوغمی، نوجوان مردوں کے حلقے میں گھری، ڈرائنگ روم کے ایک کونے میں کھڑی تھی۔ وہاں متعدد فرنیچر سیسی موجود تھے۔ ان میں ڈاکٹر میتی ویے بھی شامل تھا، اور جب سے کاؤنٹس بزدل خود اپنے ماسکوں میں ڈیر ڈالا تھا، وہ باقاعدگی سے اس کے ہاں آنے لگا تھا۔ کاؤنٹ الیا آندرچک نے دل میں ٹھان لیا کہ وہ نہ تو تاشا کی بھیسے گا اور نہ اپنی بیٹیوں کو نظروں سے اڑھل ہونے دے گا، بلکہ جو بھی مادموزیل یوغمی کے فن کا مظاہرہ ختم ہوا، وہ اٹھ کر چلا جائے گا۔

انا طول دروازے پر کھڑا تھا۔ صاف عیاں تھا کہ وہ رستوفوں کی آمد کا انتظار کر رہا ہے۔ کاؤنٹ سے علیک ہلیک کرنے کے بعد وہ تاشا کے ساتھ تھی ہو گیا اور اس کے پیچھے پیچھے ڈرائنگ روم میں چلا گیا۔ جو بھی تاشا کی نظر اس پر پڑی، اسے انہیں جذبات نے، جن کا تجربہ اسے ادھیرا کے دوران میں ہوا تھا، اپنی گرفت میں لے لیا۔ ایک طرف تو اس کی ستائش سے اس کی انا کی تسکین ہو رہی تھی اور دوسری طرف اسے یہ خوف کھائے جا رہا تھا کہ ان کے مابین اخلاقی دیوار موجود نہیں رہی ہے۔

ہیلیمن اس پروری صدقے ہونے اور اس کے حسن اور لباس کی بڑھ چڑھ کر تعریفیں کرنے لگی۔ اس کی آمد کے ذرا دیر بعد مادموزیل یوغمی اپنا کاسٹیوم تبدیل کرنے کمرے سے باہر چلی گئی۔ دریں اثنا ڈرائنگ روم میں کرسیاں ترتیب دے دی گئیں اور لوگ اپنی اپنی نشستوں پر بیٹھنے لگے۔ انا طول تاشا کے لیے ایک کرسی اٹھالیا وہ خود اس کے بربر بیٹھنا چاہتا تھا، لیکن کاؤنٹ نے، جس نے اپنی نظریں اپنی بیٹی سے ہٹائی نہیں تھیں، خود اس کے پاس نشست سنبھال لی۔ انا طول تاشا کے پیچھے بیٹھ گیا۔

مادموزیل یوغمی، جس کے عریاں، فریہ اور گداز بازوؤں پر چھوٹے چھوٹے گڑھے بن اور مٹ رہے تھے۔ ایک کندھے پر شمال لیٹے، کرسیوں کے درمیان جگہ پر، جو خالی چھوڑ دی گئی تھی، چلتی اندر آئی اور غیر فطری انداز سے کھڑی ہو گئی۔ واہ واہ کی دہی دہی آوازیں سنائی دیں۔

مادموزیل یوغمی نے افسردہ اور گھبراہٹ سے ناظرین کا جائزہ لیا اور فرانسسی زبان میں یک کرداری ڈرامے کی، جس کا موضوع ایک ماں کے اپنے بیٹے کے بارے میں سفلی جذبات تھے، عبارت بولنے لگی۔ کہیں اس کی آواز بند ہو جاتی اور کہیں اتنی دھیمی کہ سرگوشیوں میں تبدیل ہو جاتی۔ وقتاً فوقتاً وہ توقف کرتی، اپنی آنکھیں گھماتی اور ایک بار پھر اپنی بھاری اور کھردری آواز میں بولنے لگتی۔

"Adorable! Divin! Delicieux!" چاروں اطراف سے آوازیں سنائی دیں۔

تاشا کی نگاہیں نرہ اندام اداکارہ پر گڑی رہیں، لیکن اس کے سامنے جو کچھ ہو رہا تھا، وہ اسے نہ نظر پالو رہ سمجھ۔ مگر اسے کسی چیز کا شعور تھا، تو وہ یہ تھا کہ ایک بار پھر اسے اٹھا کر اس عجیب و غریب اور لا-یعنی دنیا میں، جہاں سے وہ

بوٹ کر بھی واپس نہیں جاسکتی، پہنچا دیا گیا ہے۔ یہ دنیا اس کی اپنی پرانی دنیا سے دور، بہت دور تھی اور اس میں یہ جانا ناممکن تھا کہ اچھ کیا ہے یا برا کیا ہے، معقول کیا ہے یا غیر معقول کیا ہے۔ اس کے پیچھے انا طول جیٹھا تھا۔ وہ اس کے قریب سے آگاہ تھی اور یہ سوچ سوچ کر کہ کچھ نہ کچھ ہونے والا ہے، اس پر ہول طاری ہو رہا تھا۔

پہلے یک کرداری ڈرامے کے اختتام پر ناظرین اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ انھوں نے مادموزیل یوغبی کے گرد گھیرا ڈال لیا اور اس کی تعریف میں زمین آسمان کے فاصلے ملائے لگے۔

”وہ کتنی حسین ہے!“ مناشا نے اپنے باپ سے کہا جو دوسروں کے ساتھ اٹھ کر کھڑا ہو گیا تھا اور اداکاروں تک بچپن کے لیے ہجوم میں سے راستہ بنارہا تھا۔

”جب میں تمہیں دیکھتا ہوں تو مجھے تمہاری اس رائے سے اتفاق نہیں رہتا!“ انا طول نے مناشا کے پیچھے پیچھے آکر ایک ایسے لمحے کا، جب اس کی بات صرف وہی سن سکتی تھی، انتخاب کر کے کہا۔ ”تم میں بلا کی کشش ہے جب سے میں نے تمہیں دیکھا ہے، تبھی سے میں تمہارے۔“

”مناشا، آگے، جاؤ، آگے جاؤ!“ کاؤنٹ نے مڑ کر اپنی بیٹی سے کہا۔ ”وہ کتنی خوش شکل ہے!“ مناشا کچھ کہے بغیر اپنے باپ کے پاس چلی گئی اور اسے مبہوت، سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔ اپنے فن کا متعدد بار مظاہرہ کرنے کے بعد مادموزیل یوغبی رخصت ہو گئی اور کاؤنٹس نے مہمانوں کو بال روم میں آنے کی دعوت دی۔

کاؤنٹ گرجانا چاہتا تھا لیکن ہیلین اس کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کھڑی ہو گئی اور بولی کہ وہ رنگ میں بھنگ نڈ سے اور اسے جو بے ساختہ اجتماعی رقص منعقد کرنے کا خیال آیا ہے، اسے ہونے دے۔ چنانچہ رستوف رک گئے۔ انا طول نے مناشا سے دائر کی فرمائش کی۔ رقص کے دوران میں وہ اس کی کمر اور ہاتھ دباتا رہا، اسے بتاتا رہا کہ اس کا حسن خیرہ کن ہے اور یہ کہ وہ اس کی زلف گرہ گیر کا اسیر ہو چکا ہے۔ ³⁰ecossalse کے دوران میں بھی وہ دونوں ہم رقص تھے۔ اس کے دوران میں جب بھی انھیں تنہائی میسر آتی، انا طول منہ سے تو کچھ نہ کہتا، بس اسے نکلتا رہتا۔ مناشا کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ دائر کے دوران میں وہ جو کچھ اس سے کہتا رہا تھا، کہیں وہ خواب کی باتیں تو نہیں تھیں۔ جب رقص کا پہلا دور ختم ہوا، انا طول نے دوبارہ اس کا ہاتھ دیا۔ مناشا نے خوف زدہ نگاہیں اوپر اٹھا کر اسے دیکھا لیکن اس کی پیار بھری نظروں اور مسکراہٹ میں اتنی پراعتماد ملامت تھی کہ جو کچھ وہ اس سے کہنا چاہتی تھی اسے وہ کہنا ناممکن معلوم ہونے لگا۔ اس نے اپنی نگاہیں جھکا لیں۔

”مجھ سے ایسی باتیں نہ کریں۔ میری سگنی ہو چکی ہے اور میں کسی اور سے پیار کرتی ہوں!“ وہ برق رفتاری سے بڑی چلی گئی۔

پھر اس نے نظر اٹھا کر اس کی جانب دیکھا، لیکن جو کچھ اس نے کہا تھا، انا طول نے نہ تو اس کا برا منایا تھا اور نہ اس کے چہرے سے کسی قسم کی پریشانی کا ظہار ہو رہا تھا۔

”مجھے یہ باتیں مت بتاؤ۔ میں کیا کر سکتا ہوں؟“ اس نے کہا۔ ”میں تو تمہیں یہ بتا رہا ہوں کہ میں تمہارے عشق میں پاگل ہو رہا ہوں۔ کیا یہ میرا قصور ہے کہ تم اتنی پرکشش ہو؟... سب (رقص میں) رہنمائی کرنے کی ہماری باری ہے۔“

ستاسا کے دل و دماغ میں ہل چل پاتھی اور اس پر بیجانی کیفیت طاری تھی۔ اس نے سنکھیں پھاڑ پھاڑ کر متوحش نظروں سے چاروں اطراف دیکھا۔ وہ معمول سے زیادہ سرور دکھائی دے رہی تھی۔ اس شام جو کچھ ہو، بعد میں کوشش کرنے کے باوجود اسے کچھ خاص یاد نہ آیا۔ انھوں نے ecossaise اور grossvater³¹ رقص کیے۔ اس کے باپ نے اسے گھر چلے کو کہہ لیکن وہ التجائیں کرنے لگی کہ ابھی وہ کچھ دیر اور ٹھہریں۔ وہ جہاں کہیں بھی ہوتی، جس کسی سے بھی بات کر رہی ہوتی، اسے یہی محسوس ہوتا کہ اس کی نگاہیں اسی پر مرکوز ہیں۔ بعد میں اسے یاد آیا کہ اس نے اپنے باپ سے کہا تھا کہ وہ ڈرائنگ روم میں جانے کی اجازت دے کیونکہ اس نے اپنا لباس ٹھیک کرنا تھا، یہ کہ ہیلین اس کے پیچھے پیچھے آئی تھی اور ہنستے مسکراتے اس سے اپنے بھائی کی بے پناہ محبت کی باتیں کرتی رہی تھی۔ وہ یہ کہ چھوٹے نشستے کمرے میں اس کی انا طول سے ملاقات ہوئی تھی۔ ہیلین خود تو کہیں چمپت ہو گئی اور انھیں تنہا چھوڑ گئی تھی۔ انا طول نے اس کا ہاتھ تھم لیا تھا اور اس سے کہا تھا:

”میں تمہیں ملنے تو نہیں آ سکتا لیکن کیا ممکن ہے کہ میری دوبارہ تم سے کبھی ملاقات نہ ہو؟ میں تمہاری محبت میں ہوش و حواس کھو بیٹھا ہوں کیا میں کبھی بھی...“ اور اس کا راستہ روک کر وہ اپنا چہرہ اس کے چہرے کے قریب لے گیا۔

اس کی موٹی موٹی روشن روشن، مردانہ آنکھیں اس کی اپنی آنکھوں کے اتنا قریب تھیں کہ اسے ان کے علاوہ اور کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔

”تماری؟“ اس نے استغہامیہ انداز سے سرگوشی کی اور وہ محسوس کرنے لگی کہ اس کے ہاتھ اتنے زبرد سے دبائے جا رہے ہیں کہ ان میں درد ہونے لگا ہے۔ ”ستاسا؟“

”میں کچھ نہیں سمجھ رہی۔ مجھے کچھ نہیں کہنا،“ اس کی آنکھوں نے جواب دیا۔
آنکھیں ہونٹ اس کے ہونٹوں سے پیوست ہو گئے اور تقریباً عین اسی لمحے اسے محسوس ہوا کہ اس کی رہائی ہو گئی ہے کیونکہ کمرے میں ہیلین کے قدموں کی چاپ اور اس کے گاہن کی سرسراہٹ سنائی دینے لگی تھی۔ ستاسا نے اپنے گرد و پیش نظر ڈالی۔ وہ بیر بہوٹی کی طرح سرخ ہو رہی تھی اور اس کا جسم کپکپا رہا تھا۔ اس نے خوف زدہ، استغہامیہ نظروں سے انا طول کو دیکھا اور دروازے کی طرف چل پڑی۔

”ایک لفظ، صرف ایک، خدا کے لیے!“ انا طول نے چلا کر کہا۔
وہ رک گئی۔ وہ اس سے کچھ کہنا چاہتی تھی، اس سے معلوم کرنا چاہتی تھی کہ یہ کیا واقعہ پیش آیا ہے اور اس کے جواب میں کچھ کہنا چاہتی تھی۔

’نبی، ایک لفظ، صرف ایک لفظ‘ وہ اپنی بات دہراتے ہوئے بڑا جیسے اسے کچھ علوم ہی نہ ہو کر اسے کہہ رہا ہے۔ وہ یہی گردن کرتا رہا تا آنکہ ہیلین ان کے پاس پہنچ گئی۔

نبی ہیلین کے ساتھ واپس ڈرائنگ روم میں آگئی۔ رستوں پر کا انتظار کیے بغیر واپس آ گئے۔

جب وہ گھر پہنچے، نبی ساری رات جاگتی اور کروٹیں بدلتی رہی۔ اسے یہ ناقابل حل مسئلہ کہ وہ اناطول سے پیار کرتی ہے یا پرنس آندرے سے، اذیت پہنچاتا رہا۔ اسے پرنس آندرے سے پیار تھا۔ اسے واضح طور پر یاد تھا کہ وہ اس سے قلب کی گہرائیوں سے پیار کرتی تھی لیکن وہ اناطول سے بھی پیار کرتی تھی اور اس سلسلے میں بھی شک و شبہ کی قطعاً کوئی گنجائش نہیں تھی۔ ”وہ نہ یہ سب کچھ کیسے ہو جاتا؟“ اس نے سوچا۔ ”مگر میں اس کے بعد بھی بوقت رخصتی، جب ایک دوسرے کو خدا حافظ کہہ جا رہا تھا، اس کی مسکراہٹ کا جواب مسکراہٹ سے دے سکتی تھی، اگر میں حالت کو یہاں تک پہنچنے کی اجازت دے سکتی تھی، تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ مجھے ابتداء میں ہی اس سے محبت ہو گئی تھی۔ چنانچہ وہ لازماً حوش خصال، شریف النفس، عالی منش اور با مردت ہو گا اور میرے لیے اس سے محبت کیے بنا کوئی چارہ ہی نہ رہا۔ اگر مجھے دونوں سے پیار ہے، پھر مجھے کیا کرنا ہو گا؟“ اس نے اپنے آپ سے پوچھا لیکن وہ ان خوف ناک سوالوں کے جواب تلاش کرنے سے قاصر تھی۔

14

دن چڑھ گیا اور اپنے ساتھ روزمرہ کے تفکرات اور بکھیرے لایا۔ سب کی آنکھ کھل گئی۔ ہر کوئی ادھر ادھر بھاگنے دوڑنے اور باتیں کرنے لگا۔ ڈریس میکر دوبارہ آگئی۔ ماریا دمیتریوونا نمودار ہوئی اور ان سب کی ناشتے پر مہمانی ہوئی۔ نبی آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر بے چینی سے ہر کسی کو دیکھتی رہی جیسے وہ یہ چاہتی ہو کہ ہر وہ نگاہ، جو اس کی طرف اٹھے، راستے میں ہی روک لے اور اس کی کوشش یہ تھی کہ وہ معمول کے مطابق ہی نظر آئے۔

ناشتے کے بعد، جو اس کا بہترین وقت ہوتا تھا، ماریا دمیتریوونا اپنی کرسی پر ٹک کر بیٹھ گئی اور اس نے نبی اور کاؤنٹ کو اپنے پاس بلایا۔

”ہاں، تو میرے دوستو، میں نے سارے مسئلے پر خوب سوچ بچار کیا ہے اور تمہارے لیے میرا مشورہ یہ ہے۔“ اس نے اپنی بات کا آغاز کیا۔ ”جیسا کہ تمہیں معلوم ہے، میں کل پرنس نکولائی سے ملنے گئی تھی۔ خیر، بری ان سے گفتگو ہوئی... چنانچہ ان کے جی میں کیا آیا کہ وہ مجھ پر گرجنے برسے گئے، لیکن میں ان لوگوں میں سے نہیں جو جیتنے پلٹنے سے سب جاتے ہیں۔ جو کچھ میں نے کہا تھا، کہہ دیا۔“

”لیکن انہوں نے کیا کہا؟“ کاؤنٹ نے کہا۔

”وہ؟ وہ سترے بہترے ہو گئے ہیں... اس بارے میں کچھ سنتے ہی نہیں۔ لیکن باتیں بنانے کا حاصل یہ ہے کہ اس بے چاری لڑکی کو پہلے ہی کافی پریشان کر چکے ہیں،“ ماریا دمیتریوونا نے کہا۔ ”تمہارے لیے میرا مشورہ یہ ہے کہ

اپنا کام پٹاؤ اور واپس اتر دینا چلے جاؤ۔۔ اور وہیں انتظار کرو۔“
”اوہ، نہیں!“ نسا شا چلائی۔

”ہاں، واپس چلے جاؤ،“ ماریا دمتریوٹا نے کہا۔ ”اور وہیں انتظار کرو۔ اگر تمہارا منگیترا اب یہاں آگیا۔ لازماً جھگڑا ہوگا۔ لیکن اگر وہ اکیلا ہوا، تو وہ خود ہی بڑھے سے معاملہ پٹا لے گا اور پھر تمہارے پاس چلا آئے گا۔“

کاؤنٹ رستوف کو مشورہ معقول نظر آیا اور وہ اس سے متفق ہو گیا۔ ”اگر بڑے میاں ٹھٹھے پڑ گئے، پھر ان سے بعد از اس ماسکویا بالڈ ہلز، کہیں بھی ملاقات ہو سکتی ہے اور اگر وہ اپنی ’میں نہ مانوں‘ پر قائم رہے، تب شادی ان کی خواہشات کے برعکس اتر دینا یا میں ہی ہو سکے گی۔“

”آپ بالکل صحیح فرماتی ہیں،“ کاؤنٹ نے کہا۔ ”مجھے افسوس ہے کہ میں انہیں خواہ مخواہ ملنے چل دیا اور اپنے ساتھ اسے بھی تھپیٹ لے گیا۔“

”نہیں، افسوس کس بات کا؟ جب تم یہاں تھے، پھر تمہیں علیک سلیک کے لیے جانا ہی چاہیے تھا۔ اگر انہیں یہ بات پسند نہیں آئی، تو یہ ان کا اپنا معاملہ ہے۔“ ماریا دمتریوٹا نے اپنے پرس میں کچھ تلاش کرتے ہوئے کہا۔ ”علاوہ ازیں، عروسی بیوسات تیار ہو گئے ہیں، چنانچہ تمہارے یہاں ٹھہرنے کی کوئی ضرورت نہیں رہ گئی۔ اگر کوئی چیز ابھی تیار نہیں ہو سکی، تو وہ میں تمہیں بھیج دوں گی۔ اگر چہ تمہارے جانے پر مجھے قلق ہوگا، لیکن تمہارے لیے یہی بہتر رہے گا۔“

وہ اپنے پرس میں جو چیز ڈھونڈ رہی تھی، وہ اسے مل گئی اور یہ اس نے نسا شا کو تمہادی۔ یہ پرس ماریا کا نقد تھا۔ ”یہ اس نے تمہیں لکھا ہے۔ دیکھو، بے چاری کتنا پریشان ہے! اسے یہ خوف کھائے جا رہا ہے کہ کہیں تم یہ نہ سمجھ بیٹھو کہ وہ تمہیں پسند نہیں کرتی۔“

”لیکن وہ مجھے پسند نہیں کرتی!“ نسا شا نے کہا۔

”فضول باتیں مت کرو!“ ماریا دمتریوٹا دہاڑی۔

”کوئی بھی مجھے قائل نہیں کر سکتا۔ مجھے معلوم ہے کہ وہ مجھے پسند نہیں کرتی،“ نسا شا نے خط پکڑتے ہوئے بڑی دلیری سے ترکی بہ ترکی جواب دیا، اور اس کے چہرے پر کچھ ایسا سرد مہراندہ اور غصیلہ عزم نمودار ہوا کہ ماریا دمتریوٹا نے بڑے انہماک سے اس کی طرف دیکھا اور اس کے ابروؤں پر بل پڑ گئے۔

”مجھے جمعہ آٹھ دن کی چھوٹ مری، میری بات کو اس طرح مت جھٹلاؤ!“ اس نے کہا۔ ”میں جو کچھ کہہ رہی ہوں، سچ کہہ رہی ہوں، تمہیں اس خط کا جواب دینا ہوگا۔“

نسا شا چپ رہی اور پرس ماریا کا خط پڑھنے اپنے کمرے میں چلی گئی۔ پرس ماریا نے لکھا تھا کہ ان دنوں کے مابین جو غلط فہمی پیدا ہو گئی ہے، اس کا اسے بہت دکھ ہے۔ ”میرے باپ کے جذبات خواہ کیسے ہی کیوں نہ ہوں، جہاں تک میرا تعلق ہے، میری اس بات کا یقین کرو،“ اس

نے نناشا سے پرزور احتجاج کی تھی، ”کہ جس لڑکی کو میرے بھائی نے، جن کی خوشی کی خاطر میں بڑی سے بڑی قربانی دینے کو تیار ہوں، اپنی شریک حیات منتخب کیا ہے، میں اس سے پیار کیے بنا نہیں رہ سکتی۔“

”تاہم یہ مت سوچو کہ میرے باپ کو تم سے کوئی عناد ہے،“ اس نے مزید لکھا تھا۔ ”وہ بیمار، ضعیف، بوڑھے آدمی ہیں اور ہمیں غصے سے کام لینا چاہیے۔ تاہم وہ دل کے کھرے، نیک نفس و در عالی ظرف انسان ہیں، اور جو عورت ان کے بیٹے کا دامن خوشیوں سے بھر دے گی، انہیں اس سے پیار ہو جائے گا۔“

خند پڑھنے کے بعد نناشا اس کا جواب لکھنے بیٹھ گئی۔

”Chere princesse“ اس نے بہ چلت اور مشینی انداز سے لکھا اور پھر رک گئی۔

گزشتہ رات جو کچھ ہوا تھا، اس کے بعد اس کے پاس لکھنے کو رہا ہی کیا گیا تھا؟ ”ہاں، ہاں ایہ سب کچھ ہوا اور ب ہر چیز مختلف ہو گئی۔“ وہ خط، جو اس نے لکھنا شروع کیا تھا، سامنے رکھے اس نے سوچا۔ ”کیا مجھے ان (پرنس آندرے) سے قطع تعلق کرنا ہوگا؟ واقعی مجھے؟ یہ تو بڑی خوف ناک صورت ہوگی۔“

اور اس قسم کے ڈر، ڈر نے خیالات سے فرار حاصل کرنے کی غرض سے وہ سونیا کے پاس چلی گئی اور اس کے ماتھ کشیدہ کاری کے نمونوں کو الٹ پلٹ کر دیکھنے لگی۔

ڈر کے بعد نناشا اپنے کمرے میں چلی گئی اور ایک بار پھر پرنس ماریہ کا خط پڑھنے بیٹھ گئی۔ ”کیا واقعی یہ سب کچھ ختم ہو گیا ہے؟“ اس نے سوچا۔ ”کیا یہ سب کچھ اتنی جلدی ہو سکتا ہے اور جو کچھ اس سے پہلے تھا، اسے نسبت دنا بود کر سکتا ہے؟“ اسے پرنس آندرے کے ساتھ جو محبت تھی، اس نے اسے اپنی تمام تر سابقہ قوت کے ساتھ دوبارہ یاد کیا اور اس کے ساتھ ہی اسے یہ احساس بھی ہوا کہ وہ اناطول سے محبت کرتی ہے۔ اس نے بین انداز سے پرنس آندرے کی بیوی کی حیثیت سے اپنے ذہن میں اپنی تصویر بنائی، اس کے ساتھ مسرت کے وہ مناظر، جن کے خواب اس نے اکثر اپنے تخیل میں دیکھے تھے، یاد کیے اور اسی وقت وہ گزشتہ شام، اناطول کے ساتھ جذبات کی حرارت سے دہکتی متمنائی ملاقات کی ایک ایک تفصیل کا جائزہ لینے لگی۔

”آخر میں دونوں کے ساتھ بیک وقت محبت کیوں نہیں کر سکتی؟“ ضعیفے میں گرفتار دوبار بار اپنے سے پوچھ رہی تھی۔ ”صرف تبھی مجھے کامل مسرت مل سکتی ہے۔ لیکن اب مجھے انتخاب کرنا ہے اور اگر میں ان دونوں میں سے کسی ایک سے بھی دست بردار ہوتی، میں خوش نہیں رہ سکوں گی۔ ایک بات یقینی ہے،“ اس نے سوچا، ”کہ جو کچھ ہوا، اس کے بارے میں پرنس آندرے کو بتانا مشکل ہوگا یا اسے ان سے چھپانا بھی اتنا ہی ناممکن ہوگا۔ لیکن جہاں تک دوسرے کا تعلق ہے، یہ کچھ بھی نہیں بگڑا۔۔۔ پرنس آندرے سے مجھے جو اتنے طویل عرصے سے محبت ہے اور اس محبت سے مجھے جو مسرت ملتی ہے، کیا مجھے اس سے ہمیشہ ہمیش کے لیے دست بردار ہونا پڑے گا؟“

”میں صاحبہ،“ ایک خادمہ نے پراسرار انداز سے اندر داخل ہوتے ہوئے زیر لب کہا۔ ”ایک آدمی نے

مجھ سے کہا تھا کہ یہ میں آپ تک پہنچا دوں۔ اور اس نے ایک خط نٹاشا کو تھما دیا۔ ”صرف خدا کے لیے۔“ رُک کر بولے جاری تھی جب کہ نٹاشا سوچے سمجھے بغیر مشینی انداز سے خط کھول رہی تھی۔ خط کھلا اور نٹاشا، ناطول کا محبت نامہ پڑھنے لگی۔ اس کے پلے کچھ نہ پڑا۔ وہ صرف ستا جان سکی کہ یہ اس کا خط ہے، اس شخص کا، جس سے وہ محبت کرتی ہے، خط ہے۔ ہاں، وہ اس سے محبت کرتی ہے، ورنہ جو کچھ ہوا، وہ کیسے ہو سکتا تھا؟ اس کا محبت نامہ اس کے ہاتھوں میں کیسے پہنچ سکتا تھا؟

نٹاشا لرزتے کانپتے ہاتھوں میں ناطول کا شدت جذبات سے معمور محبت نامہ، جو اسے دل و خوف نے لکھ کر دیا تھا، پکڑے رہی اور جوں جوں وہ اسے پڑھتی گئی، اسے محسوس ہونے لگا کہ اس میں جو کچھ ہے، ”میں نے پر جانا، گویا یہ بھی میرے دل میں ہے۔“

”کل شام سے میرے مقدر پر مہر ثبت ہو چکا ہے، یا تو مجھے تمہاری محبت حاصل رہے یا پھر مجھے موت آ جائے۔ اس کے علاوہ میرے لیے تیسری صورت کوئی نہیں،“ خط کی ابتدا ان لفظ سے ہوئی تھی اس کے بعد اس نے تحریر کیا تھا: ”مجھے معلوم ہے کہ تمہارے دل میں تمہارا عقد مجھ سے کرنے پر کبھی رضا مند نہیں ہوں گے۔ اس کی وجوہ خفیہ ہیں اور ان کا انکشاف میں صرف تمہارے سامنے کر دوں گا۔ لیکن اگر تم مجھ سے محبت کرتی ہو، پھر صرف ’ہاں‘ کہہ دو اور دنیا کی کوئی طاقت ہماری خوشی کے راستے میں حائل نہیں ہو سکتی۔ محبت فاتح عالم ہے، اس کے سامنے سب مخالفتیں خس و خاشاک کی طرح بہہ جائیں گی۔ میں تمہیں اٹھالے جاؤں گا اور دنیا کے سبھی کناروں تک لے جاؤں گا۔“

”ہاں، میں اس سے محبت کرتی ہوں،“ نٹاشا نے بیسویں مرتبہ خط پڑھتے ہوئے، در اس کے ایک ایک لفظ میں کوئی خاص معنی معانی تلاش کرتے ہوئے سوچا۔ اس شام مار یا دمتریو نا آرخاروفوں کے ہاں جاری تھی۔ وہ ٹریوں کو بھی اپنے ساتھ لے جانا چاہتی تھی۔ نٹاشا نے سردرد کا بہانہ کر دیا اور گھر پر ہی رہی۔

15

سونیا شام کو ذرا تاخیر سے گھر آئی اور سیدھی نٹاشا کے کمرے میں چلی گئی۔ اسے یہ دیکھ کر، چنچا ہوا کہ وہ، بچی تک اپنا پورا لباس پہنے ہوئے ہے اور صوفے پر سوئی پڑی ہے۔ اس کے قریب میز پر ناطول کا کھلا خط پڑھا۔ سونیا نے اسے اٹھایا اور پڑھنے لگی۔

جب وہ یہ خط پڑھ رہی تھی، اس نے نظر اٹھا کر جو خواب نٹاشا کی طرف دیکھا اور جو کچھ وہ پڑھ رہی تھی، اس کی کلید اس کے چہرے پر ڈھونڈنا چاہی لیکن وہاں سے اسے کچھ نہ ملا۔ اس کے چہرے پر طمانیت، ملاحت اور مسرت نیک رہی تھی۔ خوف و اضطراب سے سونیا کا رنگ فق ہو گیا اور اس کا جسم لرزنے لگا۔ اس نے اپنے ہاتھ اپنے سینے

پر لگا ہے کہ کہیں اس کا گلہ نہ گھٹ جائے۔ وہ کرسی پر بیٹھ گئی اور اس کی آنکھوں سے اشک رواں ہو گئے۔

”یہ کیسے ہو کہ مجھے کچھ نظر نہ آیا؟ نوبت یہاں تک پہنچی کیسے؟ کیا پرنس آندرے سے اس کی محبت ختم ہو گئی ہے؟ اس نے کوراگن کو یہاں تک پہنچنے کا موقع ہی کیوں دیا؟ یہ بات سنے ہے کہ وہ عورتوں کا شکاری ہے، لپی، اور بھنگا ہے۔ نکولس، جان سے عزیز اور شریف النفس نکولس، جب اسے یہ معلوم ہوگا، اس کا رد عمل کیا ہوگا؟ توکل، گزشتہ رات اور آج، اس کے چہرے پر جو بھائی، پر عزم اور غیر فطری تاثر نظر آتا تھا، تو اس کا مفہوم یہ تھا، ”سونیا نے سوچا۔“ یہ ”اور اس سے محبت کرے، نہیں، یہ ناممکن ہے! ہو سکتا ہے کہ اسے یہ معلوم ہی نہ ہو کہ خط کس کا ہے اور اس نے خط کھول لیا ہو۔ غالب گمان یہ ہے کہ اسے یہ خط پڑھ کر تو ہین محسوس ہوئی ہو۔ یہ اس قسم کی حرکت نہیں کر سکتی!“

سونیا نے اپنے آنسو پونچھ ڈالے اور تاشا کے قریب جا کر ایک بار پھر اس کے چہرے کا بخور جائزہ لینے لگی۔

”تاشا“ اس نے زیر لب، ورتتی دھیمی آواز سے، جو بمشکل سنائی دے سکتی تھی، کہا۔

تاشا کی آنکھ کھل گئی اور اسے سونیا دکھائی دی۔

”ارے تم داپس آ گئی ہو؟“

اور جب کہ آنکھ کھلنے پر اکثر ہوتا ہے، وہ بے ساختہ اپنی دوست سے لپٹ گئی اس کے انگ انگ میں پیار افسردہ تھا، لیکن جب اس نے دیکھا کہ سونیا بوکھلا رہی ہے، اس کے چہرے پر پریشانی، اضطراب اور شک و شبہ کے سائے ہر آنے لگے۔

”سونیا، تم نے وہ خط پڑھ لیا؟“

”ہاں!“ سونیا نے نرمی سے جواب دیا۔

تاشا ذرا مسرت سے کھل اٹھی۔ ”یہ مسئلہ اس طرح آگے نہیں چل سکتا، اس نے کہا۔“ میں تم سے مزید نہیں چھپا سکتی۔ تم نے دیکھ لیا ہے کہ ہم ایک دوسرے سے پیار کرتے ہیں!... سونیا ڈارنگ! انھوں نے لکھا ہے۔ سونیا!“

سونیا دیدے پھڑپھڑے گھور گھور کر تاشا کو دیکھ رہی تھی۔ اسے اپنے کانوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔

”اور بلکونسکی؟“ اس نے پوچھا۔

”اوہ، سونیا، کاش تمہیں معلوم ہوتا کہ میں کتنی خوش ہوں!“ تاشا نے با آواز بلند کہا۔ ”تمہیں معلوم ہی نہیں کہ محبت ہوتی کیا ہے۔“

”لیکن تاشا، تمہارا مطلب ہے کہ دوسری ختم ہو گئی ہے؟“

تاشا نے اپنی بڑی بڑی متحیر آنکھوں سے سونیا کی طرف یوں دیکھا جیسے اس کا سوال اس کی سمجھ میں نہ آیا ہو۔

”پھر تم پرنس آندرے سے قطع تعلق کر لو گی؟“

”اے، تم سمجھتی ہی نہیں! انھوں باتیں مت کرو۔ بس سنو!“ تاشا نے گھڑی کی گھڑی ناراض ہو کر کہا۔

”نہیں مجھے یقین نہیں آتا،“ سونیا نے زور دے کر کہا۔ ”مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ تم پورا

ساں یک شخص سے محبت کرتی رہیں اور پھر آنا قانا ہونہ، تمہاری تو اس سے صرف تین ملاقاتیں ہوئی ہیں! ناشا، مجھے تم پر یقین نہیں آ رہا، تم ضرور مذاق کر رہی ہو۔ تم تین دن ہی میں سب کچھ بھول گئیں اور نوبت بیاں جا۔

”تین دن؟“ ناشا نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔ ”مجھے تو معلوم ہوتا ہے کہ میں ان سے سو سال سے محبت کرتی چلی آ رہی ہوں۔ مجھے لگتا ہے کہ میں نے اس سے پہلے محبت کبھی کی ہی نہیں تھی۔ سونیا، یہ باتیں تمہاری سمجھ میں نہیں آئیں گی۔ سونیا، ذرا ٹھہرو، یہاں بیٹھ جاؤ۔“ اور ناشا نے اپنے بازو اس کی کمر میں ڈال دیے اور اسے چومنے لگی۔ ”میں نے سنا تو تھا کہ ایسی چیزیں ہوتی ہیں اور تم نے بھی یقیناً سنا ہوگا، لیکن صرف اب مجھے اس قسم کی محبت ہوئی ہے۔ ایسی محبت کا پہلے مجھے کبھی احساس بھی نہیں ہوا تھا۔ جونہی میری نگاہیں ان پر پڑیں، مجھے محسوس ہوا کہ وہ میرے آقا ہیں۔ وہ میں ان کی باندی، اور یہ کہ میں ان سے محبت کیے بنا نہیں رہ سکتی۔ ہاں، ان کی باندی! وہ جو حکم بھی دیں گے، میں بسر و چشم اسے بجالاؤں گی۔ تم یہ باتیں نہیں سمجھتیں۔ میں کیا کروں؟ سونیا، میں کیا کروں؟“ ناشا نے با آواز بلند کہا۔ اس کے انگ انگ سے خوشی پھوٹی پڑ رہی تھی، پھر بھی اس کے چہرے پر خوف کے آثار ہو رہے تھے۔

”لیکن سوچو کہ تم کر کیا رہی ہو؟“ سونیا نے کہا ”میں اس معاملے کو یوں نہیں چھوڑ سکتی۔ یہ در پردہ خدا کا بت۔ تم نے اسے اتنی ڈھیل دی ہی کیوں کہ نوبت یہاں تک آ پہنچی؟“ وہ بولتی چلی گئی۔ اس کی آواز میں دہشت بھی تھی اور حقارت بھی، اور اسے چھپانا اس کے بس میں نہ رہا۔

”میں بتا چکی ہوں کہ یہ میرے بس کی بات نہیں ہے!“ ناشا نے کہا۔ ”تم سمجھتی کیوں نہیں؟ میں ان سے پیار کرتی ہوں!“

”پھر میں یہ سلسلہ نہیں چلنے دوں گی۔ میں سب کو بتا دوں گی!“ سونیا پھٹ پڑی اور اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔

”کیا مطلب؟ خدا کے لیے... اگر تم نے کسی کو بتایا تو میں تمہیں اپنا دشمن سمجھوں گی!“ ناشا نے اعلان کیا۔ ”تم مجھے دکھ دینا چاہتی ہو، تم مجھ سے کئی کرنا چاہتی ہو۔“

جب سونیا نے ناشا کی گھبراہٹ اور خوف دیکھا، اسے اپنی دوست پر ترس بھی آیا اور اس سے شرم بھی۔ اور ایک بار پھر اس کی آنکھوں سے، شک رواں ہو گئے۔

”لیکن یہ تم دونوں کا چکر کیا ہے؟“ اس نے پوچھا۔ ”اس نے تم سے کہا کیا ہے؟ وہ یہاں گھر کیوں نہیں آتا؟“ ناشا نے اس کے سوالوں کا کوئی جواب نہ دیا۔

”خدا کے لیے، سونیا، کسی کو مت کچھ بتانا۔ مجھے انگاروں پر نہ لٹاؤ،“ ناشا نے منت مانت کرتے ہوئے کہا۔ ”یاد رکھو کہ ان معاملوں میں کوئی ٹانگ نہ اڑائے، کوئی دخل نہ دے۔ میں نے تمہیں اپنا راز دان بنایا ہے۔“

”لیکن یہ راز داری کیوں؟ وہ گھر کیوں نہیں آتا؟“ سونیا نے پھر رٹ لگائی۔ ”وہ کھلے عام تمہارا رشتہ کیوں

نہیں مانگتا؟ تم جانتی ہو کہ پرنس آندرے نے تمہیں مکمل آزادی دے دی تھی۔ اگر واقعی اس قسم کی کوئی بات ہے۔ لیکن مجھے اس کا یقین نہیں آتا۔ مناشا تم نے سوچا ہے کہ یہ خفیہ وجوہات کیا ہو سکتی ہیں؟“

مناشا ہکا بکا رہ گئی اور سونیا کا منہ کھلنے لگی۔ بظاہر یہ سواں اسے پہلے نہیں سوجھا تھا اور اسے کچھ علم نہیں تھا کہ وہ اس کا کیا جواب دے۔

’مجھے نہیں معلوم کہ ان کے پاس کیا وجوہات ہیں، لیکن کوئی نہ کوئی وجوہات ہوں گی!“

سونیا نے لمبی سانس لی اور بے اعتباری سے اپنا سر ہلانے لگی۔

’اگر وجوہات تھیں۔“ اس نے کہنا شروع کیا۔

لیکن مناشا اس کے شکوک بھانپ گئی اور اس نے دہشت زدگی کے عالم میں قطع کلائی کی۔

’سونیا، ان پر شک نہیں کیا جاسکتا! نہیں، بالکل نہیں! تم سمجھتی کیوں نہیں؟“ وہ پھٹ پڑی۔

’کہاؤ تمہارے ساتھ محبت کرتا ہے؟“

’کیا وہ مجھ سے محبت کرتے ہیں؟“ مناشا نے اپنی دوست میں تفہیم کے فقدان پر ترس کھا کر مسکراتے ہوئے کہا۔

’تم ان کا خط پڑھ چکی ہو۔ پڑھا ہے یا نہیں؟ اور تم ان سے مل چکی ہو!“

’لیکن اگر اس کی نیت صاف نہ ہوئی؟“

’ان کی؟۔ نیت صاف نہ ہوئی؟ کاش کہ تمہیں معلوم ہوتا!“ مناشا نے کہا۔

’اگر اس کی نیت صاف ہے، پھر وہ اپنے ارادوں کا صاف صاف اظہار کرے، ورنہ تم سے ملنا ترک کر دے۔ مگر تم اسے یہ نہیں بتاؤ گی، تو میں بتا دوں گی۔ میں اسے خط لکھ دوں گی۔ میں پاپا کو بتا دوں گی!“ سونیا نے پکے ارادے سے کہا۔

’لیکن میں ان کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی!“ مناشا چلائی۔

’مناشا، تم میری سمجھ سے باہر ہو۔ تم کیا کہہ رہی ہو؟ اپنے آپ کا سوچو، کنوئس کا خیال کرو۔“

’مجھے کسی کی ضرورت نہیں ہے، مجھے ان کے علاوہ کسی سے پیار نہیں۔ تمہیں یہ کہنے کا حوصلہ کیسے ہوا کہ ان کی نیت صاف نہیں ہے؟ تمہیں پتا نہیں کہ میں ان سے محبت کرتی ہوں؟“ مناشا چیخنے چلانے لگی۔

’جاؤ، سونیا، جاؤ۔ میں تم سے جھگڑنا نہیں چاہتی۔ جاؤ، خدا کے لیے جاؤ۔ تمہیں پتا ہے کہ میں کس عذاب میں سے گزر رہی ہوں؟“ مناشا نے ایک ایسے لہجے میں، جس کی کاٹ میں اس نے اپنی مایوسی اور جھلٹ کو دبانے کی کوشش کی تھی، غصے سے چلا کر کہا۔

سونیا روتی چنتی کمرے سے باہر بھاگ گئی۔

مناشا نے میز کا رخ کیا اور ایک لمحہ سوچے بغیر پرنس ماریا کے خط کا جواب، جس میں اس کے لیے لکھا تھا محال ہو گیا تھا، تحریر کر دیا۔ اس نے اپنے خط میں مختصر پرنس ماریا کو مطلع کیا کہ ان کے، بین تمام غلط فہمیاں دور ہو

گئی ہیں، یہ کہ یرنس آندرے نے غیر مماثلک کا سفر اختیار کرنے سے قبل اسے مکمل آزادی دے کر جس عین طرزی کا مظاہرہ کیا تھا، وہ اس سے فائدہ اٹھا رہی ہے، یہ کہ وہ ہر چیز بھول جائے اور گروہ اس کے ساتھ کوئی زیادتی کر بیٹھی ہے تو وہ اسے معاف کر دے لیکن وہ اس کے بھائی کی شریک حیات بننے سے معذور ہے۔ اس وقت ناتاشا کو یہ سب کچھ نہایت اہل، سادہ اور واضح معلوم ہوا۔



رستوفون نے بروز جمعہ گاؤں واپس چلے جانا تھا، لیکن بدھ کو کاؤنٹ متوقع خرید ر کے ساتھ، سکو کے اڑوں پر اس میں اپنی جاگیر پر چلا گیا۔

جس روز کاؤنٹ باہر گیا، اسی روز سوینا، ورنٹاشا کو کارگنوں کے ہاں عظیم الشان ڈنر پارٹی میں شریک دعوت ملی اور مار یا دستریو نا انھیں وہاں لے گئی۔ اس پارٹی پر ناتاشا کی ایک بار پھر اناطول سے ملاقات ہوئی اور سوینا نے دیکھا کہ وہ اس سے کچھ کہہ رہی ہے اور کوشش کر رہی ہے کہ جو کچھ وہ کہہ رہی ہے، کسی کے کانوں میں اس کی بھٹک نہ پڑے اور یہ کہ ڈنر کے پورے عرصے کے دوران میں وہ پہلے سے کہیں زیادہ یحسانی کیفیت میں نظر رہی ہے۔ جب وہ گھر پہنچے، ناتاشا نے خود ہی وہ بات، جس کا سوینا کو انتظار تھا، پٹھیر دی۔

”دیکھو سوینا، تم ان کے بارے میں ہر قسم کی دہی باتیں کہتی رہتی ہو،“ ناتاشا نے ایسے مسکین بھے سے، جو بچے اس وقت اختیار کرتے ہیں، جب وہ اپنی تعریف کرانا چاہتے ہوں، کہنا شروع کیا۔ ”انھوں نے مجھے سب کچھ بتا دیا ہے۔“

”اچھا، کیا کہا اس نے؟ کیا کہا؟ ناتاشا، میں بہت خوش ہوں کہ تم مجھ سے ناراض نہیں ہو۔ مجھے سب کچھ بتاؤ۔ ایک، ایک بات، کچھ نہ چھپاؤ۔ اس نے کیا کہا تھا؟“

ناتاشا سوچ بچار کرنے لگی۔

”اوہ، سوینا، کاش تم بھی انھیں اسی طرح جانتی ہو تیں جس طرح کہ میں جانتی ہوں انھوں نے کہا۔ انھوں نے مجھ سے پوچھا کہ میں نے بکنوئسکی کے ساتھ کیا عہد و پیمان کیا تھا۔ جب انھیں یہ معلوم ہوا کہ میں جب چاہوں، اسے جواب دے سکتی ہوں، ان کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا۔“

سوینا نے دکھ کی گہری سانس لی۔ ”لیکن تم نے بکنوئسکی کو جواب تو نہیں دیا، یاد ہے؟“ اس نے پوچھا۔ ”شاید میں دے چکی ہوں، ممکن ہے کہ میرے اور بکنوئسکی کے مابین اب کوئی تعلق واسطہ نہ رہا ہو۔ لیکن تم میرے بارے میں اتنی اتنی بری بری باتیں کیوں سوچتی ہو؟“

”میں کچھ نہیں سوچتی۔ میں بس یہ سمجھنے سے قاصر ہوں۔“

”سوینا، بس کچھ دیر انتظار کرو اور تم سب کچھ سمجھ جاؤ گی۔ تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ وہ کس کیڈے کے

انسان ہیں۔ میرے یا ان کے متعلق بری بری باتیں مت سوچو۔“
 ”میں کسی کا برا نہیں سوچتی۔ میں ہر شخص سے پیار کرتی ہوں اور مجھے ہر شخص سے ہمدردی ہے۔ لیکن مجھے کیا کرنا ہوگا؟“

ناتاشا نے اسے پیار اور محبت سے جیتنا چاہا لیکن وہ کسی طرح بھی اس کے قابو میں نہ آئی۔ ناتاشا کا چہرہ جتنا نرم اور ملائم ہوتا گیا، سونیا کا اتنا ہی سنجیدہ اور درشت ہونے لگا۔
 ”ناتاشا، تم نے مجھ سے کہا تھا کہ میں اس بارے میں تم سے کوئی بات نہ کروں اور میں نے کی بھی نہیں۔ لیکن اب جب کہ تم نے خود ہی یہ مسئلہ چھیڑ دیا ہے، میں یہ کہوں گی کہ مجھے اس پر اکتفا نہیں۔ یہ رازداری کیوں؟“
 ”تم پھر شروع ہو گئی ہو!“ ناتاشا نے اسے ٹوکا۔
 ”ناتاشا، میں تمہارے بارے میں فکر مند ہوں!“
 ”فکر مندی کس بات کی؟“

”مجھے اندیشہ ہے کہ تم کہیں برباد نہ ہو جاؤ!“ سونیا نے جی کڑا کر کے کہا اور جو کچھ اس نے کہا تھا، اس پر وہ خود بھی ہیبت زدہ رہ گئی۔

ناتاشا کے چہرے پر پھر غمگنی کے آثار نمودار ہو گئے۔

”پھر میں اس بربادی کو گلے لگا لوں گی، بالکل لگا لوں گی اور یہ بربادی جتنی جلدی ہو، اتنا ہی بہتر ہوگا! تمہیں اس بھٹنے میں ٹانگ اڑانے کی ضرورت نہیں ہے۔ برباد تم نہیں، میں ہوں گی! مجھے تہ چھوڑ دو، مجھے تہا چھوڑ دو! مجھے تم سے نفرت ہے!“

”ناتاشا!“ سونیا کی اوپر کی سانس اوپر اڑنے کی بجائے نیچے رہ گئی۔

”مجھے تم سے نفرت ہے، نفرت ہے! تم میری سدا کی دشمن ہو!“ اور ناتاشا کمرے سے بھاگ گئی۔

ناتاشا نے دوبارہ سونیا سے کلام نہ کیا اور وہ اس کے سامنے سے بھی بچتی رہی۔ وہ سارے گھر میں بے مقصد ادھر ادھر گھومتی پھرتی رہی۔ اس کے چہرے پر وہی پر از اضطراب، تھرا اور احساسِ نقصان پورا تھا۔ کبھی وہ ایک کام تک ہاتھ ڈالتی اور کبھی دوسرے میں، پھر پلک جھپکنے میں اسے چھوڑ چھاڑ کچھ اور شروع کر دیتی۔

سونیا کے لیے یہ کام دشوار ضرور تھا، تاہم وہ مستعدی سے اپنی سہیلی کی نگرانی کرتی رہی اور اس نے ایک لمحے کے لیے بھی اسے اپنی نگاہوں سے اونچل نہ ہونے دیا۔

کاؤنٹ کی واپسی سے ایک روز قبل سونیا نے دیکھا کہ ناتاشا نے ساری چاشت ڈرائنگ روم کے درتچے کے قریب بیٹھے بیٹھے گزار دی ہے، گویا اسے کسی کا انتظار ہو، اور یہ کہ اس نے ایک انفر کوہ جو گاڑی میں سوار ادھر سے گزرا تھا اور جسے اس نے ناپوں محسوس کیا، کوئی اثر نہ کیا تھا۔

سونیا اپنی درست کی اور بھی چوکی سے نگرانی کرنے لگی اور اس کے ملاحظے میں آیا کہ اس روز ڈنر کے

دوران میں اور ساری شام ناشا کی ذہنی کیفیت عجیب و غریب اور غیر فطری رہی ہے۔ اس سے پوچھا کچھ بات اور جواب کچھ ملتا، وہ فقرہ شروع کرتی اور اسے ادھورا چھوڑ دیتی، اور بات سب بات نئے جاری تھی۔

چائے کے بعد سونیا نے ایک نوکرانی کو ناشا کے دروازے پر کھڑے سے دیکھا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں اور وہ اس کے گزرنے کا نظارہ کر رہی تھی۔ سونیا نے اس سے کوئی تعرض نہ کیا، اسے اندر جانے دیا اور خود کنسوئیاں لینے دروازے کے ساتھ چٹ کر کھڑی ہو گئی۔ اسے معلوم ہوا کہ ایک اور خط پہنچا گیا ہے۔

اچانک سونیا کے چوہہ طبع روشن ہو گئے۔ وہ سمجھ گئی کہ ناشا اس شام کسی خوف ناک منصوبے پر عمل پیرا ہونا چاہتی ہے۔ اس نے دروازے پر دستک دی۔ ناشا نے اسے دھتکار دیا اور اندر نہ آئے دیا۔

”وہ اس کے ساتھ فرار ہونا چاہتی ہے!“ سونیا نے سوچا۔ ”اس سے کوئی چیز بعید نہیں۔ خاص طور پر آج اس کے چہرے پر جو تاثرات تھے، وہ قابلِ رحم بھی تھے اور عزم کے آئینہ دار بھی۔ اور جب اس نے پاپا کو خدہ جانتا کہا تھا، اس کے آنسو نکل آئے تھے۔“ سونیا کو یاد آیا۔ ”ہاں، بالکل یہی بات ہے، وہ اس کے ساتھ اُدھل جانا چاہتی ہے۔ لیکن مجھے کیا کرنا چاہیے؟“ وہ سوچ میں پڑ گئی۔ اسے ساری عداوت، جو واضح طور پر یہ نشان دہی کر رہی تھیں کہ ناشا کسی ہیبت ناک منصوبے پر عمل کرنا چاہتی ہے، یاد آنے لگیں۔ ”کاؤنٹ یہاں نہیں ہیں۔ مجھے کیا کرنا چاہیے؟ کوراگن کو خط لکھ کر پوچھوں کہ یہ سب کیا ہے؟ لیکن اس سے میرے خط کا جواب نکھوئے گا کون؟“ میٹر کو لکھوں جیسا کہ پرنس آندرے نے کہا تھا کہ مصیبت کے وقت ان سے رجوع کروں؟... لیکن وہ شاید بالکل سکی کوٹھکرا چکی ہے۔ اس نے کل پرنس ماریا کو خط بھیجا تھا۔ اور انکل یہاں نہیں ہیں!“

اور ماریا دمریوٹا کو، جو ناشا پر اندھا اعتماد کرتی تھی، وہ کچھ بتانا نہیں چاہتی تھی، اس کے نزدیک یہ اقدام بہت خوف ناک تھا۔

”لیکن کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی پڑے گا،“ سونیا نے اندھیری غلام گردش میں کھڑے کھڑے سوچا۔ اب مجھے یہ ثابت کرنا ہوگا کہ اس خاندان نے مجھ پر جو عنایات کی ہیں، میں انہیں بھولی نہیں ہوں اور یہ کہ میں نکوس سے بیار کرتی ہوں۔ دوبارہ اس قسم کا موقع کبھی ہاتھ نہیں آئے گا۔ ہاں، اگر مجھے بغیر سونے یہاں مسلسل تین راتیں بھی کھڑے ہونا پڑا، میں اس غلام گردش سے نہیں ہوں گی اور اسے زبردستی روک لوں گی۔ میں خاندان کے ماننے پر کبھی کلنک کا ٹیکا نہیں لگنے دوں گی!“ اس نے سوچا۔

اناطوس اصل ہی میں دلو خوف کے ہاں منتقل ہو گیا تھا۔ ناشا کو خواہ کرنے کا منصوبہ دلو خوف نے چند روز قبل وضع کیا تھا اور اسی نے اس پر عمل کرنے کے انتظامات مکمل کیے تھے۔ اس پر اس روز عمل ہونا تھا، جس روز سونیا نے ناشا کے دروازے پر سن گن لینے کے بعد اسے بچانے کا تہیہ کیا تھا۔ ناشا نے وعدہ کیا تھا کہ وہ اس بجے شب عقی دروازے

پر کوراگن کے پاس پہنچ جائے گی، کوراگن نے سے سہا پس گازی میں، جس میں اس نے انتظار کرنا تھا، سوار کرانا اور اسے چالیس میل دور کا مینکا گاؤں لے جانا تھا۔ وہاں ان کا نکاح پرچہ نے کے لیے ایک معزول پادری نے منتظر ہونا تھا۔ کامینکا میں انھوں نے چند گھوڑوں کا بندوبست بھی کر لیا تھا۔ انھیں اگلے بدلتے انھوں نے دور، بہت دور وارسا روڈ تک پہنچنا تھا۔ وارسا روڈ پر کام آسان تھا۔ وہاں مختلف مقامات پر ڈاک چوکیاں تھیں۔ ان چوکیوں پر گھوڑے تبدیل کرتے انھیں کسی غیر ملک میں چھ جانا تھا۔

اناطول کے پاس ایک پاسپورٹ، ڈاک گھوڑوں کی فراہمی کا اجازت نامہ اور بیس ہزار روپے تھے۔ وہ ہزار روپے اس نے اپنی بہن سے ادھار لیے تھے اور دس ہزار روپے کی مدد سے اکٹھے کیے تھے۔ نفلی شادی کے دو گواہ دلوخوف کے سامنے کے کمرے میں بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ ان میں سے ایک کا نام خوشی کوف تھا۔ وہ ریٹائرڈ اوئی افسر تھا اور دلوخوف اسے اپنے قمار بازی کے دھندے میں استعمال کرتا تھا۔ دوسرا ماکارن تھا۔ کسی زمانے میں وہ ہوزاردستے میں خدمات سرانجام دیتا تھا۔ وہ ٹیکسٹ اور بودا انسان تھا۔ وہ کوراگن پر جان چھڑکتا تھا۔

دلوخوف اپنے کشادہ سنڈی روم میں، جس کی دیواروں پر چھت سے فرش تک ایرانی غایب، ربکچوں کی کھالیں اور مختلف قسم کے ہتھیار لٹک رہے تھے، سٹری چھ اور بوٹ پہنے میز کے سامنے بیٹھا تھا۔ میز کی درازیں کھلی تھیں۔ اس پر گنتارا اور نوٹوں کی گدیاں پڑی تھیں۔

اناطول، جس کی وردی کے بٹن کھلے تھے، اس کمرے، جہاں گواہن بیٹھے تھے، سنڈی روم اور عقبی کمرے کے، جس میں اس کا فرانسیسی اردن اور دوسرے مائٹمین اس کا بچا کھچا سامان سمیٹ رہے تھے، مین چکر کاٹ رہا تھا۔ دلوخوف رقوم گن رہا اور کاغذ پر ان کا اندراج کر رہا تھا۔

”ہو بہ،“ اس نے کہا ”خوشی کوف کو لاؤ، زیادہ ہزار روپے دینا ہوں گے۔“

”پھر دس روپے،“ اناطول نے جواب دیا۔

”ماکار کا“ (وہ ماکارن کو اسی نام سے پکارتے تھے) ”خود اسے دھیلا بھی نہ دو، تمہاری خاطر آگ میں کودنے اور کنوئیں میں چھلنگ لگانے سے گریز نہیں کرے گا۔ چنانچہ ہمارے تمام حسابات طے پا گئے ہیں،“ دلوخوف نے اسے کھانا دکھاتے ہوئے کہا۔ ”ٹھیک ہے؟“

”ہاں، ٹھیک ہے۔“ مساف معلوم ہوتا تھا کہ اس نے دلوخوف کی بات سنی ان سنی کر دی ہے۔ وہ سیدھا سامنے دیکھ رہا تھا اور مستحلاً مسکرائے جا رہا تھا۔

دلوخوف نے دھماکے سے دراز کا ڈھکنا بند کر دیا اور طنز یہ انداز سے مسکراتا کوراگن کی طرف متوجہ ہوا۔

”دیکھو، اب بھی وقت ہے۔ تمہارے حق میں بہتر یہی ہے کہ اس سارے دھندے سے ہاتھ اٹھا لو!“

دلوخوف نے کہا۔

”اجت؟“ انا طول نے پٹ جواب دیا ”بکواس مت کرو! کاش تمہیں معلوم ہوتا۔ صرف میں جا رہا ہوں۔ شیطان کہ میرے لیے یہ معاملہ کتنا اہم ہے!“

”نہیں۔ واقعی، چھوڑو، جانے دو!“ دلو خوف نے کہا۔ ”میں سنجیدگی سے بات کر رہا ہوں۔ یہ تم نے جو سازش تیار کی ہے، مذاق کی بات نہیں ہے۔“

”تم کہنا کیا چاہتے ہو؟ مجھے اشتعال دلانا؟ جہنم میں جاؤ!“ انا طول نے منہ ہٹا کر کہا۔ ”سچ پوچھو تو مجھ میں تمہارے یہ بھونڈے مذاق برداشت کرنے کا یارا نہیں،“ اس نے مزید کہا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

دلو خوف نے پرازنخوت اور حقارت آمیز انداز سے مسکراتے ہوئے اس کی جانب دیکھا۔

”ذر ٹھہرو،“ اس نے آد زدی۔ ”میں مذاق نہیں کر رہا، بالکل سنجیدگی سے بات کر رہا ہوں، ادھر آؤ۔ اب آ بھی جاؤ۔“

انا طول واپس آ گیا اور دلو خوف کا منہ ٹکٹے لگا۔ وہ اس پر اپنی توجہ مرکوز کرنے کی کوشش کر رہا تھا، لیکن بظاہر اپنے ارادے کے علی الرغم اس کے سامنے ہار مان رہا تھا۔

”اب میری بات ذرا غور سے سنو۔ یہ میں آخری مرتبہ تم سے کہہ رہا ہوں۔ آخر مجھے مذاق کرے کی کیا ضرورت ہے؟ کیا میں نے کبھی تمہیں رک پہنچانے کی کوشش کی ہے؟ تمہارے لیے یہ سارے، نظامت کسے

کیے ہیں؟ پادری کس نے ڈھونڈا؟ پاسپورٹ کس نے بنوایا؟ رقم کس نے اکٹھی کی؟ یہ سب کچھ میں نے کیا!“

”اس تکلیف کے لیے میں تمہارا شکر گزار ہوں۔ تمہارا خیال ہے کہ میں ناشکرا ہوں؟“ انا طول نے گہری

سانس لی اور دلو خوف سے لپٹ گیا۔

”میں نے تمہاری مدد تو کر دی ہے، پھر بھی میں تمہیں سچائی سے آگاہ کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں۔ جس راتے پر تم چل پڑے ہو، بڑا خطرناک ہے، اور اگر نرم غور کرو تو حماقت سے بھی بھر پور۔ تم سے اٹھائے جاتے ہو۔ بہت

خوب، سبحان اللہ۔ لیکن تمہارے خیال میں وہ معاملے کو ہمیں ختم کر دیں گے؟ یہ راز کھل جائے گا کہ تم پہلے ہی شادی شدہ ہو۔ وہ تمہیں بھراؤ کا رردائی کے زام میں گرفتار کرادیں گے۔“

”بکواس، نری بکواس!“ انا طول کے منہ سے نکلا اور اس کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔ ”میں نے ہر چیز کھول کر تمہیں بتائی نہیں؟ ہو نہ؟“

کودوں اور کوتاہ اندیش اشخاص کی یہ عجیب افتاد ہوتی ہے کہ اپنے استدلال کے ذریعے وہ جس نتیجے پر پہنچے ہیں، اس کی بار بار وضاحت کرنے کا انہیں بہت شوق ہوتا ہے۔ انا طول بھی اس سے مستثنیٰ نہیں تھا۔ وہ من دماغی کو

سو مرتبہ ہر اچکا تھا، ایک بار پھر ان کا عادہ کرنے لگا۔

”میں پہلے ہی تمہارے سامنے وضاحت کر چکا ہوں کہ میری نظروں میں معاملہ کچھ یوں ہے۔ اگر یہ شادی غیر قانونی ٹھہرائی گئی،“ اس نے اپنی ایک انگلی میز پر کرتے ہوئے کہا، ”اس کا مطلب کیا ہوگا کہ مجھے کسی بات کے

لیے جواب دہ نہیں ہونا پڑے گا لیکن اگر یہ شادی قانونی متصور ہوئی، پھر اللہ اللہ خیر سلا۔ غیر ملک میں کسی کو اس معاملے کی کاٹوں کا خبر نہیں ہوگی۔ ٹھیک ہے یا نہیں؟ پھر مجھ سے بحث مت کر دامت کریم!

”میں پھر سنجیدگی سے مشورہ دے رہا ہوں۔ بھڑوس کے چھتے میں ہاتھ نہ ڈالو، خواہ مخواہ مصیبت سولے لو گے!“

’جہنم میں جاؤ!‘ اناطوں نے کہا۔ اس نے اپنا سر دونوں ہاتھوں میں پکڑا اور کمرے سے باہر نکل گیا لیکن رات واپس آگیا اور کرسی پر پاؤں لٹکا کر دلخوف کے سامنے بیٹھ گیا۔ ”بڑی بھانک صورت ہے“ ہونہ؟ دیکھو، کیسے دھک دھک کر رہا ہے۔“ اس نے دلخوف کا ہاتھ پکڑا اور اپنے دل پر رکھ دیا۔ ”ارخ، مائی ڈیئر فیو، وہ نہا مٹا پاؤں! وہ نظر اریوئی ہے وہ، دیوئی! ہونہ؟“

دلخوف سر دھری سے مسکرایا۔ اس کی خوبصورت اور گستاخ آنکھوں میں چمک آگئی۔ اس نے اناطول کی جانب یوں دیکھا کہ معصوم ہوتا تھا کہ بھی اس کا جی نہیں بھرا، وہ اپنی تفرق کے لیے اسے مزید تجسس مشق بنا چاہتا ہے۔

”اچھا، جب روپیہ ختم ہو جائے گا، پھر؟“

”پھر؟ ہونہ؟“ اناطوں نے دہرایا۔ مستقبل کے خیال نے اسے واقعی اچھے میں ڈال دیا تھا۔ ”پھر؟ مجھے کیا معلوم لیکن فضول باتیں کرنے کا فائدہ؟“ اس نے اپنی گھڑی پر نظر ڈالی۔ ”وقت ہو گیا!“

اناطول عقبی کمرے میں چلا گیا۔

”تیرری مکمل نہیں ہوئی؟ جلدی کرو۔ کیوں دقت ضائع کر رہے ہو؟“ وہ نوکروں پر برس پڑا۔

دلخوف نے رقم ایک طرف رکھی، ایک وردی پوش خدمت گار کو بلایا اور اسے حکم دیا کہ وہ کچھ کھانے پینے کا سامان لے آئے تاکہ وہ سفر سے پہلے پیٹ پوجا کر سکیں۔ وہ خود اس کمرے کی، جس میں خوشی کوف اور ماکارن بیٹھے تھے، طرف چل دیا۔

اناطول شذی روم میں صوفے پر لیٹ گیا۔ وہ کہنی پر جھکا اور خواب گین کیفیت میں مسکراتا زربلب آپے آپ سے کچھ کہہ رہا تھا۔

”ادھر آ جاؤ اور کچھ کھا لو۔ ایک گھونٹ ہی لگا لو،“ دلخوف نے ملحقہ کمرے سے چلا کر کہا۔

”مجھے کچھ نہیں چاہیے،“ اناطول نے کہا۔ وہ بھی تک مسکرا رہا تھا۔

”آ جاؤ۔ بالا کا پہنچ گیا ہے۔“

اناطوں اٹھا ور ڈانٹنگ روم میں چلا گیا۔ بالا گاسا بی کاڑیوں کا زبردست اور مشہور کوچوان تھا۔ وہ دلخوف اور اناطوں کو گزشتہ چھ برسوں سے جانتا تھا اور ان کے خوب کام آتا رہتا تھا۔ جب اناطول کی رہنمائی ٹوڑ میں مقیم تھی، وہ متعدد بار شام کو اناطول کے ساتھ نور سے روانہ ہوا، علی الصبح اسے ماسکولایا اور اگلی رات دوبارہ اسے واپس پہنچا دیا۔ اس نے ایک سے زیادہ مرتبہ دلخوف کو اس کے حقائق میں سے بچنے میں مدد دی تھی۔ اس نے متعدد مرتبہ

انھیں جیسویں اور اس کے اپنے بقول ”ننھی منی بیویوں“ کی معیت میں اپنی گاڑی میں شہر کے مختلف علاقوں میں گھمایا پھرایا تھا۔ ان کی ملازمت کے دوران میں اس نے، سکو کے گلی کوچوں میں متعدد بار اپنی گاڑی یا یہ وہ لوگوں پر چڑھائی تھی اور دوسروں کی گاڑیاں ان کی تھیں۔ اس کی ان حرکتوں کے نتائج دعوتِ بے سے، اس کے ”جنٹل مینوں“ نے، جیسا کہ وہ انھیں کہا کرتا تھا، ہمیشہ اسے بچایا تھا۔ اس نے ان کی ملازمت کے دوران میں متعدد گھوڑوں کو ناکارہ بنا دیا تھا۔ انھوں نے متعدد مرتبہ اس کی پٹائی کی تھی اور متعدد بار اسے شیمین اور مدبر، جس پر اس کی جاں جاتی تھی، پلا کر نشے میں چور کیا تھا۔ خود اسے ان دونوں کے بارے میں ایک ایک دو دو باتیں ایسی معلوم تھیں جن کی پاداش میں ایک عام آدمی کو کبھی کا سا بھرپا بھیجا جا چکا ہوتا۔ وہ اکثر اسے اپنی خرمستیوں میں شریک کر لیتے، جی بھر کر اسے شراب پلاتے اور جیسویں کے ہاں اس سے قص کراتے، اور ان کے ہزاروں روپے ہی کے ذریعے ترپا ہو جاتے۔ ان کی ملازمت کے دوران میں وہ سال میں کوئی بیس مرتبہ ان کی خاطر اپنا سراو کھلی میں دیتا اور اپنی جان ہتھیلی پر لیے لیے پھرتا رہتا۔ جتنی رقم وہ اسے ادا کرتے تھے، اس سے کہیں زیادہ قیمت کے گھوڑے وہ ان کی خاطر تھکا تھکا کر مار دیتا۔ لیکن وہ انھیں پسند کرتا تھا، اسے کو جوانی سے عشق تھا اور بارہ میل فی گھنٹہ کی بجائے رات سے گاڑی چلانے کا شوق رکھتا تھا۔ دوسرے کوچوں کی جیس بلادینے یا یہ وہ لوگوں پر گاڑی چڑھا دینے اور، سکو کے گلی کوچوں میں سرپٹ گھوڑے دوڑانے میں اسے لطف آتا تھا۔ ادھر نشے میں ڈوبے ہوئے اور ہوش و حواس سے عاری ترش بین جب ”ہیز، اور ہیز“ کے نعرے بلند کرتے، اسے یوں اتر آتا، حالانکہ رتی رتی مزید اضافہ ممکن ہوتا تھا۔ اسے کسی کسان کی، جو مردہ زیادہ اور زندہ کم نظر آتا تھا اور جو پہلے ہی بھگم بھاگ اس کے راستے سے ہٹنے کی کوشش کر رہا ہوتا، گردن پر چابک سے تکلیف دہ ضرب لگانا اچھا لگتا تھا۔ وہ انھیں ”اصلی اور کھرے جنٹل مین“ سمجھا کرتا تھا۔

ناطول اور دلوفی بھی باماگا کو اس کی، ہر آنہ کو جوانی کی وجہ سے پسند کرتے تھے اور پھر وہ اس وجہ سے بھی ان کی نگاہوں میں نمایا ہوا تھا کیونکہ جو چیزیں انھیں مرغوب تھیں، وہ انھیں پسند کرتا تھا۔ دوسروں کے ساتھ ہانکا سول تول کرتا تھا، دو گھنٹوں کی کو جوانی کے عوض پچیس روپے وصول کرتا تھا، خود کم جاتا تھا اور اپنے کسی ”ہانکے“ کو زیادہ بھیجتا تھا۔ لیکن اپنے ”جنٹل مینوں“ کی کو جوانی وہ ہمیشہ خود کرتا تھا اور کبھی اپنی خدمات کا معاوضہ طلب نہیں کرتا تھا۔ سال میں صرف دو تین مرتبہ جب اسے ان کے اردلیوں کی زبانی معلوم ہوتا کہ ان کی جیسویں میں رہیں ہیں، وہ صبح سویرے آسجود ہوتا، اس وقت وہ پوری طرح ہوش حواس میں ہوتا، وہ انھیں خاصا جھک کر سلام کرتا اور عرض کرتا کہ اس کی مدد کی جائے۔ ”جنٹل مین“ ہمیشہ اسے ہٹھ لیتے۔

”فیور ایوانچ جناب عالی، یا“ ”یوڑا کیسی لیتسی، میری دستگیری فرمائیں،“ وہ التجا کرتا۔ ”میرے پاس گھوڑے نہیں رہے، میری دستگیری فرمائیں۔ جو کچھ ہو سکے، مجھے عطا فرمائیں تاکہ میں سیلے جا سکوں۔“

اور ناٹوں اور دلوفی، جب ان کے پاس رقم ہوتی، اسے ہر دو ہزار روپے دے دیتے۔

باراگھا اصد کسان تھا۔ وہ ستائیس سے ذرا اوپر تھا۔ اس کا قد ناچ، جسم گٹھا ہوا، ناک چھوٹی اور قدرے بھروس، بال بھورے، چہرہ سرخ، گردن موٹی اور نمایاں طور پر لالی تھی۔ اس کی مہین آنکھیں ہر دم چمکتی رہتی تھیں۔ اس کی چھوٹی چھوٹی داڑھی بھی تھی۔ وہ بھیڑ کی پوستین کے چنے کے ورنیس نیلا کوٹ، جس کا استر ریشمی کپڑے کا تھا، پہنے ہوئے تھا۔

کمرے میں داخل ہونے کے بعد وہ پہلے کونے میں گیا۔ وہاں اس نے اپنے سینے پر صلیب کا نشان بنایا۔ پھر وہ دلخوف کے حضور حاضر ہوا اور اس نے اپنا میل کچیل ہاتھ آگے بڑھا دیا۔

”فیورڈ ایوانچ!“ اس نے دوزانو ہو کر کہا۔

”سلام، دوست، سلام! ایسے صاحب، وہ آگیا ہے؟“

”یوئر یکسی لینس، آداب!“ اس نے اناطول کی، جو ابھی ابھی کمرے میں آیا تھا، طرف اپنا ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔

”بالاگا، میں کہتا ہوں،“ اناطوں نے اس کے کندھے پر تھکی دیتے ہوئے کہا۔ ”اگر تمہیں مجھ سے ذرا سی محبت ہے، پھر اس کے اظہار کا وقت آگیا ہے۔ کیسے گھوڑے لائے ہو؟ ہونہر؟“

”جیسا کہ آپ کے ایلچی نے کہا تھا، آپ کے پسندیدہ گھوڑے لایا ہوں،“ بالاگانے کہا۔

”باباگا، غور سے سنو۔ تمہارے تینوں گھوڑے جان سے جاتے ہیں، تو جائیں، لیکن مجھے وہاں تین گھنٹوں میں پہنچا دو۔ سنا؟“

”اگر ہم نے انہیں بھاگ بھاگ کر مار دیا، پھر وہاں کیسے پہنچیں گے؟“ بالاگانے آنکھ مار کر پوچھا۔

”یہ مذاق مذاق رہنے دو، ورنہ وہ جھ پیردوں گا کہ چھٹل کا دودھ یا آ جائے گا!“ اناطوں نے قہر آلود نظروں سے اسے گھورتے ہوئے چلا کر کہا۔

”مذاق کون کر رہا ہے؟“ کوچوان ہنسا۔ ”گویا میں اپنے جنٹل مین کو کوئی چیز دینے سے بخل کروں گا۔ اپنی تو جان بھی حاضر ہے، ہم اتنا تیز، اتنا تیز جائیں گے کہ کوئی کاہے کو تار دوزا ہوگا۔“

”دادا!“ اناطوں کے منہ سے نکلا۔ ”خیر بیٹھو۔“

”ہاں، بیٹھ جاؤ،“ دلخوف نے کہا۔

”فیورڈ ایوانچ، میں کمر ہی اچھا ہوں۔“

”واہیات، بیٹھ جاؤ۔ کچھ پی لو،“ اناطوں نے کہا اور اس کے لیے میرا شراب کا بڑا گلاس بلال بھر دیا۔

سے انگور دیکھ کر کوچوان کی آنکھیں چمپانے لگیں۔ تقاضائے آداب کے پیش نظر پہلے تو اس نے ذرا اندھکی،

پھر گلاس اٹھایا اور غنا غٹ چڑھا گیا، ٹوپی سے ریشمی رومال نکالا اور اس سے اپنا منہ پونچھ لیا۔

”یوئر یکسی لینس، ہماری روائی کب ہے؟“

”ہونہہ...“ انا طول نے اپنی گھڑی پر نظر ڈالی۔ ”ہمیں ابھی روانہ ہونا ہے۔ دیکھو، باراگا، تمہیں ہمیں دقت پر وہاں پہنچانا ہوگا۔ ہونہہ؟“

”یہ تقدیر کا کھیل ہے۔ اگر شروع میں ہی قسمت نے ہماری یاوری کی اور ہماری روانگی میں تاخیر نہ ہوئی پھر کوئی وجہ نہیں کہ ہم وہاں دقت پر نہ پہنچ سکیں“ باراگا نے جواب میں کہا۔ ”کیا میں نے آپ کو تو رست گئے میں نہیں پہنچایا تھا؟ یورائیکسی سیسی، آپ کو یقیناً یاد ہوگا؟“

”تمہیں معلوم ہے کہ ایک مرتبہ کرسس کے موقع پر ہم تو رستے روانہ ہوئے“ انا طول نے یادوں پر مسکراتے اور ماکارن کی، جس کی پرشوتی اور پرلگن نگاہیں اسی پر جمی ہوئی تھیں، طرف متوجہ ہو کر کہا۔ ”اور ماکار کا کیا تم یقین کرو گے کہ ہماری رفتار اتنی تیز تھی کہ ہماری اوپر کی سانس اوپر در نیچے کی نیچے رہ گئی؟ راستے میں برف گاڑیوں کا، جولدہ ہوئی تھیں، قافلہ آگیا اور ہم ان میں سے دو کے اوپر سے کود گئے۔ سنا؟“

”وہ اکیلے گھوڑے تھے۔“ باراگا نے داستان کا سر اٹھایا۔ ”اس وقت“ اس نے دلاخوف کی طرف مخاطب ہو کر اپنی بات آگے بڑھائی، ”میں نے دونوں خیز گھوڑے دائیں بائیں جوتے اور مشکلی گھوڑے بیچ میں ڈالا۔ فیور ایوانچ، یقیناً مانیں، یہ جانور چالیس میل تک ہوا سے باتیں کرتے رہے۔ انھیں سنبھالنا محسوس ہو رہا تھا پالے میں میرے ہاتھ سن ہو گئے، چنانچہ میں نے بائیں ڈھیلی چھوڑ دیں۔ یورائیکسی سیسی، ذرا سنبھل کر بیٹھیں، میں نے کہا۔ درہرا یہ جاں کہ میں لڑھکتا لڑھکتا گاڑی کے عقب میں پہنچ گیا اور وہیں پڑا رہا۔ انھیں تیز چھنے کے لیے اکسانے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ اور جب تک وہ ٹھکانے پر نہ پہنچ گئے، انھیں روکا ہی نہ جاسکا۔ ان ابلیس کے بچوں نے ہمیں قتل گھنٹوں میں وہاں پہنچ دیا! صرف دائیں ہاتھ کا خدا کو پیارا ہو گیا۔“

17

انا طول کمرے سے باہر نکل گیا اور چند منٹ بعد واپس آ گیا۔ اس نے سمور کا کوٹ پہن لیا تھا۔ اس کی کمر کے گرد نقری پٹی بندھی ہوئی تھی۔ اس نے سیاہ رنگ کی ٹوپی ترچھے انداز سے اپنے سر پر ٹکارتھی تھی اور یہ اس کے چہرہ چہرے پر خوب پھب رہی تھی۔ اس نے سینے کے رد پردے پر اپنے سر پر نظر ڈالی اور پھر جس انداز سے آگے کے سامنے کھڑا تھا، اسی انداز سے وہ دلاخوف کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ اس نے انگوری شراب کا گلاس اٹھایا۔

”اچھا، فدیہ، خدا حافظ اور میری خاطر تم نے جو جو تکلیف اٹھائی، اس کے لیے شکریہ... خدا حافظ“ انا طول نے کہا۔ ”اور ہاں، دوستو، ساتھیو، اب...“ اس نے ایک لحظہ سوچا۔ ”میرے عہد شباب کے دوستو، ساتھیو، خدا حافظ۔“ اس نے ماکارن اور دوسروں کی جانب متوجہ ہو کر کہا۔

اگرچہ وہ ابھی اس کے ہمراہ جارہے تھے، وہ اپنے ساتھیوں سے جس انداز سے خطاب کر رہا تھا، اس سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنی اس گفتگو کو کسی نہ کسی طور سنجیدہ اور متاثر کن بنانے کے درپے ہے۔ وہ اپنا سینہ پھلاتے اور

ایک ٹانگ کو قدرے آگے پیچھے جھٹاتے سوچے سمجھے اور بلند آہنگ لہجے سے بولے جارہا تھا۔

”سب گلاس تھام ہو۔ بالاکا تم بھی۔ ہاں تو میرے عہد شباب کے دوستو اور ساتھیو، ہم سب نے مل جل کر خوب رنگ رلیاں منائیں، مل جل کر صحیح معنوں میں زندگی گزاری، مزے کیے، لطف اٹھایا۔ ہر نہر؟ پھر اب ہماری دوبارہ ملاقات کب ہوگی؟ میں وطن سے باہر جا رہا ہوں۔ ہم سب مل کر دھومیں مچاتے اور میٹھ کرتے رہے ہیں اور اب جوانو، خدا حافظ، اور یہ ہاتھ مارا جام صحت ابر!“ اس نے چلا کر کہا، چنا گلاس خالی کیا اور اسے فرش پر دے مارا۔

”اور یہ رہا آپ کا جام صحت“ بالاکا نے کہا۔ اس نے بھی اپنا گلاس خالی کر دیا اور رومال سے منہ صاف کرنے لگا۔

ماکارنا انا طول سے بغل گیر ہو گیا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔

آہ، پرنس، آپ سے جدا ہوتے میرا کلیجا پھٹ رہا ہے،“ اس نے کہا۔

آؤ چلیں، چلیں!“ انا طول چلایا۔

بالاکا چل پڑا۔

”نہیں، بھڑھو!“ انا طول نے کہا۔ ”دردانہ بند کر دو۔ ہمیں رسم پوری کرنا چاہیے۔ آؤ، ذرا بیٹھ جائیں، پھر

چلیں گے صحیح طریقہ یہی ہے۔“

انھوں نے دردانہ بند کر دیا اور سب بیٹھ گئے۔

”جوانو، اب چلو، ذرا تیز قدم بڑھاؤ!“ انا طول نے اٹھتے ہوئے کہا۔

اس کے اردلی جوزف نے اسے چمپی کیس اور شمشیر تھادی وروہ سب پیش دالان میں چلے گئے۔

”اور سمور کا کوٹ کہاں ہے؟“ دلوخوف نے پوچھا۔ ”نہے۔ باگن شکا، ووڈ کر جائیو اور ماتر دیا ناما تریونا سے

سیاہ کوٹ کے بارے میں دریافت کر۔ عورتیں جب اپنے آشناؤں کے ساتھ بھاگتی ہیں، تب کیا ہوتا ہے، میں

نے اس کے متعلق کچھ سن رکھا ہے،“ دلوخوف نے آنکھ مار کر کہا۔ ”جب وہ بھاگم بھاگ باہر آئے گی، اس میں زندگی

کی رتیں کم اور اس کے چہرے پر مردنی زیادہ ہوگی۔ مگر میں اس نے جو کچھ پہن رکھا ہوگا، جلد بازی میں بس اسی

میں چل پڑے گی۔ ذرا سی بھی تاخیر ہوئی، بس ٹپ ٹپ آنسو بہنا شروع ہو جائیں گے اور ڈیرہ، ما اور پاپا کی گردان

شروع ہو جائے گی۔ اور پھر اس کے کہ آپ کو اندازہ ہو کہ کیا ہوا، اس کی قلفی جم چکی ہوگی اور وہ واپس جانا چاہے

گی۔ بس فوراً اسے چٹا اڑھا دو اور گاڑی میں بٹھا دو۔“

ایک خدمت گار زمانہ کوٹ لے آیا۔ اس کے اندر لومڑی کے سمور کا استر تھا۔

”اجن، گاؤ دی! میں نے تمہیں سیاہ چٹا لانے کو کہا تھا اے، ماتر دیا نا، کالے والا!“ اس نے اتنے زور

سے چلا کر کہا اس کی آواز کی گونج تمام کمروں میں سنائی دی۔

ایک خوبصورت، دہلی پتلی، نازک اندام چھٹی درشیزو، جس کے بال بلیو بلیک اور گھونگر یا لے، آنکھیں روشن

اور سیاہ، اور چہرہ پیل تھا، اپنے بازو پر سیاہ چغڑا لے بھگتی تھی۔

”یہ رہا، لے لیں، میں برا نہیں سناتی،“ اس نے کہا۔ بظاہر اپنے آقا کے سامنے خوف سے اس کی جان بھی نکلی جا رہی تھی اور چغڑے کا ہاتھ سے جاتے رہنا بھی اسے پسند نہیں آ رہا تھا۔

دلو خوف نے جواب دیے بغیر چٹا پکڑیا ور آگے بڑھ کر اسے ماتر دیا نا کے جسم کے گرد لپیٹ دیا۔
”اس طرح،“ دلو خوف نے کہا۔ ”اور اس طرح۔“ اس نے کوٹ کا کار کچھ اس طرح اس کے سر کے گرد لپیٹ دیا کہ چہرے کے لیے باریک سی جھری باقی رہ گئی۔ ”اور پھر اس طرح، دیکھ رہے ہو؟“ اور اس نے انا طول کا سر آگے دھکیل دیا تا کہ وہ کالر کی جھری، جس میں ماتر دیا نا کی چمکتی دکتی مسکراہٹ دکھائی دے رہی تھی، دیکھ سکے۔

”اچھا، ماتر دیا نا، خدا حافظ،“ انا طول نے اس کے گال پر بوسہ ثبت کرتے ہوئے کہا۔ ”آہ، یہاں میرے عیش و نشاط کے دن پورے ہوئے! ستیوشکا کو میرا سلام کہنا۔ خدا حافظ، ماتر دیا نا، خدا حافظ! میرے لیے دعا کرنا!“
”پرنس، خداوند آپ کا دامن خوشیوں سے بھر دیں!“ ماتر دیا نا نے جھپٹی لہجے سے کہا۔

پورچ میں دوسرا ایسی گاڑیاں کھڑی تھیں اور دہشتے کئے نو جوان کو چوں گھوڑوں کی بانگیں تھامے ہوئے تھے۔ بالا گاٹلی برف گاڑی میں بیٹھ گیا۔ اس نے پٹی کہنی اوپر اٹھائی اور اس میں درست کرنے لگا۔ انا طول اور دلو خوف اس کی گاڑی میں سوار ہو گئے۔ ماکارن، خوشی کوف، اور خدمت گار دوسری گاڑی میں بیٹھ گئے۔
”سب تیار ہو گئے؟“ بالا گاٹلی نے پوچھا۔ ”چلو!“ اس نے بانگیں اپنے ہاتھ کے ارد گرد پیٹنے ہوئے چلا کر کہا اور سہ ایسی گاڑی ٹکٹسکی خیابان پر فرار لے بھرنے لگی۔

”باہ باہ!۔ ارے، دھیان سے!۔ تاہ تاہ!“ بالا گاٹلی اور نو جوان کو چوں کی، جو اس کے قریب بیٹھ تھا، بس یہی چیخ پکار سنائی دے رہی تھی۔

آر باط سکوائر میں سہ ایسی گاڑی کسی دوسری گاڑی سے ٹکرائی، کوئی چیز توخی، چیخنے جلانے کی آوازیں سنائی دیں اور سہ ایسی گاڑی آر باط سٹریٹ پر سرپٹ بھگتی رہی۔ جب وہ پرنسکی خیابان پوری کی پوری طے کر چکی، بالا گاٹلی پیچھے مڑا اور پرانی کوئی یوشینا یا سٹریٹ کے چوک پر رک گیا۔

گھوڑوں کو تھامنے نو جوان کو چوں نیچے کود آیا اور انا طول و دلو خوف نٹ پاتھ پر چپنے لگے۔ جب وہ کین کے پاس پہنچے، دلو خوف نے سیٹی بجائی۔ سیٹی کے جواب میں سیٹی آئی اور ایک نوکرانی بھگتی باہر آئی۔

”یہاں صحن میں تشریف لے آئیں، نہیں تو کوئی آپ کو دیکھ لے گا، وہ ابھی آئیں کہ آئیں،“ اس نے کہا۔
دلو خوف گیٹ پر ٹھہرا رہا۔ انا طول نوکرانی کے پیچھے پیچھے صحن میں چلا آیا، سوڑ مڑا اور دوڑتا بھاگتا پورچ میں پہنچ گیا۔

اس کے سامنے ماریا دمترونا کارلو قاست وردی پوش ملازم گاڈریلو کھڑا تھا۔
”جناب، ادھر سے، ماکسن کے پاس،“ ملازم نے اس کی واپسی کا راستہ روکتے محفل سے آواز نکال کر کہا۔

”کون سی مالکین؟ کون ہو تم؟“ انا طول نے زیرب پوچھا۔ اس کی سانس پھول رہی تھی۔

”تشریف لائیں، جناب۔ مجھے حکم ملا ہے کہ آپ کو اندر پہنچا دوں۔“

”گورامن، واپس آ جاؤ!“ دلوفوف چلایا۔ ”تمہارے ساتھ دھوکا ہوا ہے۔ واپس آ جاؤ!“

دلوفوف، جو گیٹ کے پاس کھڑا تھا، اب وہیں ہاؤس پورٹر کے، جو تالا لگانے کی کوشش کر رہا تھا کہ تاحول بچ کر جانے نہ پائے، ساتھ تختہ گتھا ہو رہا تھا۔ دلوفوف نے عالم بے چارگی میں آخری مرتبہ در لگایا اور اس نے پورٹر کو ایک طرف دھکیل دیا۔ اس نے انا طول کا، جو سر پر پاؤں رکھے بھاگا آ رہا تھا، ہزد پکڑا، اسے دروازے سے ہر گھسیٹا، اور اس کے ساتھ سداہی گاڑی کی طرف دوڑنے لگا۔

18

ماریا متر یونا نے سونیا کو غلام گردش میں روتے دیکھ لیا اور اس سے سب کچھ اگلوالی تھا۔ ناسا کے نام جو خط لکھا گیا تھا، وہ اس نے راستے ہی میں دبوج لیا، اس نے اسے پڑھا اور وہ اسے بکڑے ناسا کے کمرے میں گھس گئی۔

”بے شرم، بے حیا چھو کر!“ وہ گرجی۔ ”میں ایک لفظ بھی نہیں سنوں گی!“

اس نے ناسا کو، جو حیران و ششدر لگا ہوں سے اسے دیکھ رہی تھی لیکن جس کی آنکھیں بالکل خشک تھیں، پیچھے دھکیل، اسے کمرے میں بند کیا، اور باہر سے تالا لگا دیا۔ اس نے پورٹر کو حکم دیا کہ جو لوگ شام کو آئیں، انہیں اندر تو آنے دینا لیکن انہیں باہر نہ نکلنے دینا۔ پھر اس نے دردی پوش ملازم کو حکم دیا۔ ”انہیں میرے پاس لے آنا۔“ اس کے بعد وہ ڈرائنگ روم میں جا بیٹھی اور اغوا کاروں کا انتظار کرنے لگی۔

جب گاوریلو نے اسے اطلاع پہنچائی کہ وہ اشخاص آئے ضرور تھے لیکن فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے ہیں، وہ تیوریاں چڑھاتے کرسی سے اٹھی، اپنے ہاتھ ایک دوسرے میں بھسائے، انہیں اپنی کمر پر لٹکایا اور خاصی دیر تک کمرے میں چکر لگاتی رہی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ اب اسے کیا کرنا چاہیے۔ آدمی رات کے لگ بھگ وہ جیب میں چابی ٹٹوتے ناسا کے کمرے کی طرف چل پڑی۔ سونیا غلام گردش میں بیٹھی سسکیاں لے رہی تھی۔

”ماریا متر یونا، خدا کا واسطہ، مجھے اس کے پاس جانے دیں!“ اس نے ملتجیانہ لہجے سے کہا۔

لیکن ماریا متر یونا نے تالا کھولا اور اسے جواب دیے بغیر اندر چلی گئی۔

”کریہ! قہق! مذموم! میرے گھر میں۔ بے حیا پھمال! مجھے تو بس اس کے باپ پر ترس آ رہا ہے۔“

ماریا متر یونا نے اپنے غیظ و غضب پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے سوچا۔ ”کام مشکل ضرور ہے، تاہم میں کوشش کر دوں گی کہ وہ اپنی زبانیں بند رکھیں اور کاؤنٹ کو کچھ بتائیں چنے دوں گی۔“

وہ ثابت قدم چلتی کمرے میں داخل ہو گئی اور اسے ناسا منہ سر ہاتھوں میں چھپے صوفے پر لیٹی نظر آئی۔

وہ اپنی جگہ سے قطعاً نہیں ہلی تھی، بلکہ وہ بالکل اسی حالت میں بیٹی پڑی تھی جس حالت میں ماریا متر یونا اسے چھوڑ

کر گئی تھی۔

”بہت خوب! بہت اچھی! کیا کہنے!“ ماریا دمیتریوونا بولی۔ ”کیا سمجھ ہے تم نے میرے گھر کو کہ آگے بھاگے یاروں سے ملاقاتیں کرتی پھر رہی ہو! کوئی مکر نہیں چھے گا اب۔ جب میں بات کروں، تو تمہارا فرض ہے کہ اسے غور سے سنو!“ اور ماریا دمیتریوونا نے نسا شا کو ذرا بارود سے جھنجھوڑا۔ ”جب میں کچھ کہوں، تو تمہارا فرض ہے کہ اسے توجہ سے سنو! تم نے عام گری پڑی قطار کی طرح اپنے ماتھے پر کلنگ کاٹیکا لگا لیا ہے۔ اگر مجھے تمہارے باپ کا خیال نہ ہوتا، پتا نہیں میں تمہارے ساتھ کیا سلوک کرتی! تاہم میں یہ ٹھان چکی ہوں کہ اسے اس معاملے کی ہوا بھی نہیں لگنے دوں گی۔“

نسا شا جوں کی توں پڑی رہی، تاہم اس کا سارا جسم بے آواز اور لرزہ فگن سسکیوں سے کھنچا جا رہا تھا اور اسے پتہ نہ تھا کہ محسوس ہو رہا تھا۔ ماریا دمیتریوونا نے نظراٹھا کر سونیا کی طرف دیکھا اور نسا شا کے قریب صوفے پر بیٹھ گئی۔ ”اس کی قسمت اچھی تھی کہ میرے ہاتھوں سے بچ گیا۔ خیر، چھوڑ دوں گی میں بھی نہیں اسے، ڈھونڈ نکالوں گی!“ اس نے اپنے سخت گیر لہجے سے کہا۔ ”میں جو کچھ کہہ رہی ہوں، سن رہی ہو یا نہیں؟“

اس نے پتہ لہا چوڑا ہاتھ نسا شا کی ٹھوڑی کے نیچے رکھا اور اس کا چہرہ اپنی طرف گھمایا۔ لیکن جب اسے دمیتریوونا اور سونیا کی نظریں نسا شا کے چہرے پر پڑیں، انہیں سخت جھٹکا لگا، اس کی آنکھیں خشک اور درخشاں تھیں، اس کے ہونٹ بچھے ہوئے اور نگاں اندر دھنسے ہوئے تھے۔

”مجھے چھوڑ دیں... مجھے کیا... میں سر... مرجاؤں گی!“ وہ بڑبڑائی۔ اس نے جھٹکا مارا، ماریا دمیتریوونا کی گرفت سے اپنے آپ کو چھڑایا اور دوبارہ پہلے کی طرح لیٹ گئی۔

”نسا لیا!“ ماریا دمیتریوونا نے کہا۔ ”میں صرف تمہارا بھلا چاہتی ہوں اور کچھ نہیں۔ بے شک یونہی لپٹی رہو، بالکل نہ ہلو جلو، میں تمہیں چھوڑوں گی بھی نہیں۔ لیکن ایک بات کان کھول کر سن لو۔ یہ میں نہیں کہتی کہ تم سے کتنا بڑا قصور سرزد ہوا ہے، یہ تم خود اچھی طرح جانتی ہو۔ لیکن کل جب تمہارا باپ واپس آئے گا، میں اسے کیا بتاؤں گی؟“

بولو، جواب دو۔“

نسا شا کا جسم دوبارہ سسکیوں سے کاٹپٹنے لگا۔

”اگر اسے اسے تمہارے بھائی یا تمہارے منگیتر کو معلوم ہو گیا، پھر کیا ہو گا؟“

”میرا کوئی منگیتر نہیں، میں اسے جواب دے چکی ہوں!“ نسا شا نے چیخ کر کہا۔

”اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا،“ ماریا دمیتریوونا نے اپنی بات جاری رکھی۔ ”اگر انہیں معلوم ہو گیا، تمہارا خیال ہے وہ چپ سا دھ لیں گے؟ فرض کر دو تمہارا باپ۔ میں اسے جانتی ہوں۔ فرض کرو، وہ اسے ڈاکٹر کے لیے لٹکاتا ہے۔ کیا یہ اچھی بات ہوگی؟ ہونہ؟“

”اف، مجھے اکیلی چھوڑ دیں! آخر آپ لوگوں کو رنگ میں بھٹک ڈالنے کی ضرورت کیا تھی؟“ نسا شا چپ رہی۔

پراغائے ہوئے تھی۔ وہ اٹھ کر صوفے پر بیٹھ گئی اور قہر آلود نگاہوں سے ماریا دستریونا کو گھور گھور کر دیکھنے لگی۔
 ”لیکن تم چاہتی کیا تھیں؟“ ماریا نے کرحست لہجے سے پوچھا۔ ایک بار پھر اس کا مزاج برہم ہونے لگا تھا۔
 ”تمہیں کسی نے تارے کے اندر بند کر کے تو نہیں رکھا تھا؟ یا کہو کہ رکھا تھا؟ اسے گھر آنے سے کس نے روکا تھا؟ وہ
 تمہیں بھگا کر کیوں لے جانا چاہتا تھا؟ تم کوئی جیسیوں کی بیٹی ہو؟۔ اگر وہ کامیاب ہو جاتا، تمہارے خیال میں وہ
 اسے تلاش نہ کر سکتے؟ تمہارا باپ، تمہارا بھائی یا تمہارا سنگیتر؟ وہ لچا ہے، لنگا ہے، کام کا نہ کاج کا، یہ ہے اس کی
 اصل حقیقت!“

”وہ تم سب سے بہتر ہے“ ماریا نے جینھتے ہوئے گلا پھاڑ کر کہا۔ ”کاش آپ نے اس پھٹے میں ہانگ نہ
 لڑائی ہوتی۔ اف، میرے خداوند! یہ کیا ہے، یہ کیا ہے! سو نیا، تم نے کیوں۔ میری نظروں سے دور ہو جاؤ!“
 اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے اور سسکیاں بھرنے لگی۔ اس کی آواز ماری میں مایوسی کی وہ شدت تھی جس کا اظہار
 ان لوگوں کے جویہ محسوس کرتے ہیں کہ اپنے مصائب کے ذمے دار وہ خود ہیں، دار لے میں ہوتا ہے۔ ماریا دستریونا
 پھر کچھ کہنا چاہتی تھی کہ ماریا پھٹ پڑی۔

”چلے جاؤ، چلے جاؤ! تم سب مجھ سے نفرت کرتے ہو، مجھے ذلیل سمجھتے ہو!“ اس نے چل کر کہا اور دوبارہ
 صوفے پر گر پڑی۔

ماریا دستریونا اسے مزید کچھ دیر فہمائش کرتی اور سمجھاتی رہی کہ اس کی اس حرکت کا علم اس کے باپ کو قطعاً
 نہیں ہونا چاہیے۔ وہ اسے یقین دلاتی رہی کہ اگر ماریا نے خود اسے بھلانے کی سعی کی اور کسی کو یہ معلوم نہ ہونے
 دیا کہ یہ ہو چکا ہے، تو وہ کسی کو اس کی کانوں کان خبر نہ ہونے دے گی۔ ماریا نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس کی سسکیاں
 بند ہو چکی تھیں، لیکن سردی سے اس کا بدن کاپٹنے لگا تھا۔ ماریا دستریونا نے اس کے سر کے نیچے تکیہ رکھ دیا اور اس کا
 جسم دلی فوں میں ڈھانک دیا۔ وہ اس کے لیے لیموں کا رس لینے چل دی۔ لیکن ان تمام باتوں کا ماریا پر کوئی اثر نہ
 ہوا۔ اس خاصگی تھی سب کے جواب میں۔

”خیر، اسے سونے دے، ماریا دستریونا نے کمرے سے باہر جاتے ہوئے کہا۔ اس کا خیال تھا کہ ماریا سو رہی ہے۔
 لیکن نیند ماریا کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ وہ دیدے پھاڑے، نکا ہیں سیدھے سارے گارے دیکھے جا
 رہی تھی۔ اس نے ساری رات نہ آنکھ جھپکائی، نہ کوئی آنکھ بہایا ورنہ اس نے سو نیا سے، جو بار بار اٹھتی اور اس کے
 بچک کے قرب آ کر کھڑی ہو جاتی تھی، کوئی کلام کیا۔

اسکے روز کاؤنٹ رستون، ماسکو کے قریب وجوار میں واقع اپنی جاگیر سے حسب وعدہ عین لنچ کے قریب پہنچ
 گیا۔ خوشی سے اس کے پاؤں زمین پر نہ ٹپک رہے تھے۔ خریدار سے اس کی بات چکی ہو گئی تھی اور اب کوئی ایسا کام
 نہیں تھا جو اسے کاؤنٹس سے، جو اسے بہت یاد آ رہی تھی، دور ماسکو میں روکے رکھتا۔ ماریا دستریونا اسے ملی اور اس
 سنہ اسے بتایا کہ گزشتہ روز سے ماریا کی طبیعت سخت ناساز ہے، اس نے ڈاکٹر کو بلایا تھا لیکن اب اس کی حالت

بہے کی نسبت کافی بہتر ہے۔ ناشا اس صبح اپنے کمرے سے باہر نہ نکلی۔ اس کے ہونٹ بچنے ہوئے تھے اور ان پر پڑیاں جم چکی تھیں۔ اس کی آنکھیں خشک تھیں اور وہ خد میں گھور رہی تھیں۔ وہ درستی کے قریب بیٹھی تھی اور حیران و مضطرب ان لوگوں کو جو گلی میں سے گزر رہے تھے، دیکھ رہی تھی۔ اگر کوئی شخص اس کے کمرے میں داخل ہوتا، وہ بدلتا مڑ کر اس پر سرسری نظر ڈالتی۔ بظاہر یہی معلوم ہوتا تھا کہ وہ اس کے بارے میں کسی خبر کی منتظر ہے۔ سے توقع تھی کہ وہ یا تو خود آئے گا یا پھر اسے خط لکھے گا۔

جب کاؤنٹ اس سے ملنے اس کے کمرے میں آیا، مردانہ قدموں کی آہٹ سن کر وہ متردد مشوش ہو گئی کے لیے مڑی کہ کون آیا ہے، اور اس کے چہرے پر وہی سرد مہراندہ اور مشفقانہ تاثر نمودار آیا۔ وہ اس سے ملنے کے کرنے بھی نہ اٹھی۔

”میری جان، کیا بات ہے؟ انہیں دشمنان طبیعت ناساز ہو گئی ہے؟“ کاؤنٹ نے پوچھا۔
 ناشا کچھ دیر خاموش رہی۔

”ہاں، ناساز،“ اس نے جواب دیا۔

کاؤنٹ کے متفکر سوالات کے، کہ وہ اتنی پر مردہ خاطر کیوں ہے اور کیا کوئی ایسا واقعہ جس کا تعلق اس کے منگیتر سے ہو، تو پیش نہیں کیا۔ جواب میں اس نے یقین دہایا کہ نہیں، ایسی کوئی بات نہیں ہے، اور اس سے اتفاق کرنے لگی کہ وہ قطعاً پریشان نہ ہو۔ ماریا دمیتریوونا نے بھی ناشا کی یقین دہانیوں کی تائید کی کہ کچھ نہیں ہوا ہے۔ لیکن اپنی بیٹی کی ردنی صورت، رکھ دے کی بیماری، اور ماریا دمیتریوونا اور سونیا کے سراسیمہ چہروں سے کاؤنٹ کو یہ اندازہ لگانے میں کوئی دشواری پیش نہ آئی کہ اس کی عدم موجودگی میں کچھ ہوا ضرور ہے، تاہم وہ یہ سوچنا بھی نہیں چاہتا تھا کہ اس کی عزیز از جان بیٹی کے ساتھ کوئی شرم ناک واردات بھی ہو سکتی ہے کیونکہ اس کے لیے یہ صدمہ اٹھنا محال ہو جاتا اور اسے اپنا مسرت بخش سکون و اطمینان اتنا عزیز تھا کہ وہ اسے قطعاً کھونا نہیں چاہتا تھا۔ چنانچہ اس نے کسی قسم کی چھان بین کرنے سے احتراز کیا اور اپنے آپ کو یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ کوئی خاص خلاف معمول بات نہیں ہوئی ہے۔ اب اسے صرف یہ ملا تھا کہ اس کی ناسازی طبع کی وجہ سے اسے اپنی ردائی چند دنوں کے لیے ملتوی کرنا پڑے گی۔

بیٹر کی بیوی نے جس روز ماسکو میں قدم رکھا تھا، اس نے اسی دن یہ تہیہ کر لیا تھا کہ وہ کہیں چلا جائے گا تا کہ وہ اس کی صحبت سے بچا رہے۔ رستوفون کو ماسکو آئے زیادہ دن نہیں گزرے تھے، لیکن ناشا نے اسے کچھ اس طور متاثر کیا تھا کہ اسے اپنے ارادے کو عملی جامہ پہنانے میں تھیں کرنا پڑی۔ وہ آئیوسف الگسی وچ کی بیوہ سے، جس نے اسے اپنے مرحوم شوہر کے کاغذات دینے کا وعدہ کیا تھا، ملے تو چلا گیا۔

جب بیٹر، سکو پہنچا، اسے ماریا دستریونا کا خند ملے۔ ماریا دستریونا نے اسے اپنے ہاں آنے اور اس کے ساتھ ایک نہایت اہم معاملے کے، جس کا تحقق آندرے بکنو سکی اور اس کی منگیتر سے تھا، بارے میں گفتگو کرنے کے لیے بدایا تھا۔ بیٹر مناشا سے کئی کتراتا پھر رہا تھا کیونکہ اسے یہ نظر آ رہا تھا کہ اس کے متعلق اس کے جذبات وہ نہیں جو شادی شدہ شخص کے اپنے دوست کی منگیتر کے بارے میں ہونا چاہئیں، بلکہ وہ حدود سے بہت آگے نکل چکے ہیں۔ لیکن مندرجہ کہ وہ انہیں مسلسل ایک دوسرے کی جلو میں لانے کے انتظامات کرتا رہتا تھا۔

”کیا واقعہ پیش آ سکتا ہے؟ اور وہ مجھ سے کیا چاہتے ہیں؟“ ماریا دستریونا کے جانے سے چند منٹ بعد ہی بیٹر نے ہاں تبدیل کرتے ہوئے غور کیا۔ ”کاش پرنس آندرے جلد آجائے اور اس سے شادی کر لے!“ اس نے اس کے گھر کی طرف جاتے ہوئے سوچا۔

تو رسکوئے خیابان پر اسے کوئی جانی پہچانی آواز سنائی دی۔

”بیٹر اکب آئے؟“ کسی نے چلا کر پوچھا۔

بیٹر نے گردن اوپر اٹھائی۔ اس کے قریب سے ایک برف گاڑی، جس میں دو تیز رفتار گاڑی کھڑے، جن کے سموں سے برف ٹھوکر کھا کر ٹٹی اور گاڑی کے کچھڑ روک تھو سے ٹکراتی چارہائی تھی، جتے ہوئے تھے، زانے سے گزر گئی۔ گاڑی میں اناطول اور اس کا مستقل رفیق ماکارن سوار تھے۔ اناطول ہائیکے فوجی افسر کے مستند انداز سے تن کر سیدھا بیٹھ ہوا تھا، اس کے چہرے کا ٹھنڈا حصہ سنبائی کالر کی اوٹ میں تھا اور اس کی گردن قدرے ہلکی ہوئی تھی۔ اس کی شکل و صورت سے تازگی اور سرخی جھلک رہی تھی۔ اس کا سفید بیٹ، جس میں کلنی بھی ہوئی تھی، بائیکے انداز سے ترچھا تھا اور اس کے نیچے اس کے گھونگریا لے ور پامید سے چڑے بال، جن پر کہیں کہیں باریک برف نظر آرہی تھی، دکھائی دے رہے تھے۔

”یہ شخص آنکھوں کا ٹھکیت ہے،“ بیٹر نے اپنے آپ سے کہا۔ ”اس کا رویہ ہمیشہ وقتی تفریح پر مرکوز رہتا ہے، آگے پیچھے کچھ نہیں سوچتا، اسے کسی چیز کی فکر نہیں، ترو نہیں، پریشانی اسے کبھی چھو کر نہیں گزری، چنانچہ اسے کپ ہیئت من موئی، سرور اور مطمئن پائیں گے۔ مجھ سے جو چاہے لو، بس مجھے اس جیسا بنادو!“ اس نے رشک سے سوچا۔

ماریا دستریونا کے پیش دالان میں، جس وردی پوش ملازم نے اسے اپنا سموری کوٹ اتارنے میں مدد دی، اسے بتایا: ”مالک کہتی ہیں کہ آپ پیلر دم میں تشریف لے آئیں۔“

جب بیٹر نے بال روم کا دروازہ کھولا، اس کی نظر مناشا پر پڑی۔ وہ کھڑکی کے قریب بیٹھی تھی اور زرد دروازہ، کمزور اور جلی بھنی دکھائی دے رہی تھی۔ اس نے نگاہ اٹھا کر اسے دیکھا، تیزی سے چڑھائی اور سر دھرائے آن بان کے ساتھ کمرے سے باہر نکل گئی۔

”کیا ہوا؟“ بیٹر نے ماریا دستریونا کے کمرے میں داخل ہو کر پوچھا۔

”کیسی کیسی زبردست حرکتیں ہو رہی ہیں، واہ واہ، سبحان اللہ!“ ماریا دمتریوونا نے جواب دیا۔ ”میں نے اس دھرتی پر ٹھہرون سال بتائے ہیں۔ لیکن اس سے بڑھ کر شرمناک حرکت دیکھی نہ سنی۔“

اور جب اس کے اصرار پر بیئر اپنی عزت کی قسم کھا کر یہ وعدہ کر چکا کہ جو کچھ وہ اسے بتائے گی، وہ اس کے ایک لفظ کی بھی دھمک کسی کے کانوں میں نہیں پڑنے دے گا، ماریا دمتریوونا نے اسے مطلع کیا کہ ساشا نے اپنے والدین کو بتائے بغیر پرنس آندرے سے اپنی منگنی توڑ دی ہے اور یہ کہ اس کی اس حرکت کا موجب انا طول ہے جس کی صحبت میں بیئر کی بیوی نے ساشا کو دھکیلا تھا اور جس کے ساتھ اس نے اپنے باپ کی عدم موجودگی میں فرار ہونے کی کوشش کی تھی۔ وہ آپس میں خفیہ شادی کرنا چاہتے تھے۔

ماریا دمتریوونا جو کچھ اسے بتا رہی تھی، بیئر کندھے ذرا آگے جھکائے اور منہ کھولے سنتا رہا۔ اس کے بے اپنے کالوں پر اعتبار کرنا محال ہو رہا تھا۔ اسے یہ بات ناقابل تفہیم اور ناقابل تصور معلوم ہو رہی تھی کہ پرنس آندرے کی منگیترنا شارستود۔ جو سب کی آنکھوں کا تار تھی اور جواب تک بے حد پرکشش نظر آتی رہی تھی۔ اس احمق، باطل کی، جس کے متعلق بیئر کو معلوم تھا کہ وہ پہلے ہی شادی شدہ ہے، خاطر بالکنوسکی کو چھوڑ دے گی بلکہ وہ اس کے ساتھ اتنی شدید صحبت کرنے لگے گی کہ اس کے ساتھ فرار ہونے کے لیے بھی تیار ہو جائے گی۔

وہ ساشا کو اس وقت سے جانتا تھا جب وہ ابھی بچی تھی۔ ایک طرف اس نے اس کے دل و دماغ پر کچھ اس قسم کا سحر انگیز تاثر قائم کیا تھا کہ اللہ اللہ۔ دوسری طرف اس کی رذالت، حماقت اور بربریت کا یہ بے نقشہ سامنے آیا تھا۔ دونوں باتوں میں اتنا تضاد تھا کہ اسے ان میں توافق پیدا کرنا ناممکن نظر آ رہا تھا۔ اس کے ذہن میں اپنی بیوی کا خیال آیا۔ ”یہ سب ایک ہی تھیلی کے چنے بٹے ہیں،“ اس نے اپنے آپ سے کہا اور سوچنے لگا کہ وہ واحد شخص نہیں ہے جسے بد نصیبی نے ایک بدکار عورت کے پلو سے باندھ دیا ہے۔ لیکن اس پر بھی اسے پرنس آندرے اور اس کی زخمی انا پر اتنا ترس آیا کہ اس کا رونے کو جی چاہا۔ بچے دوست کی حالت زار پر اسے اس کے ساتھ جتنی زیادہ ہمدردی ہو رہی تھی، ساشا کے، جو ابھی ابھی ہال روم میں اتنی سرد مہراں آن بات چہرے پر سجائے اس کے قریب سے گزری تھی، خلاف اس کے دل میں اتنی ہی زیادہ نفرت بلکہ حقارت پیدا ہو رہی تھی۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ ساشا کی روح یاس، نجاست اور خفت کے طوفان میں گھر چکی ہے اور گر اس کے چہرے پر پر سکون دجاہت اور بے ہرلی کے آثار ہو پیدا ہو گئے تھے تو یہ اس کا قصور نہیں تھا۔

”شادی کرنا چاہتے تھے؟“ بیئر نے ماریا دمتریوونا کے آخری الفاظ پر چونک کر کہا۔ ”وہ اس سے شادی کیسے

رچا سکتا تھا؟۔ وہ تو پہلے ہی شادی شدہ ہے!“

”نگوڑی صورت حال بد سے بدتر ہوتی جا رہی ہے“ ماریا دمتریوونا چلائی۔ ”کی بڑھیا آدمی ہے“ اول درجے کا لٹنٹ! اور وہ یہاں بیٹھی اس کا انتظار کر رہی ہے۔ دودن سے اس کی نظر میں دروازے پر بھی ہوتی ہیں کہ وہ اب آیا، کہ اب آیا۔ ہمیں اسے بتانا ہوگا، کم از کم یہ انتظار کی کیفیت تو ختم ہوا“

جب، ریڈمٹریوٹا انا طول کے نکاح کی تفصیلات سن چکی، جی بھر کر اسے کوس اور اپنے دل کی بھڑاس نکال چکی، اس نے میٹر کو بتایا کہ اس نے اسے کیوں بلایا ہے۔ اگرچہ اس کا ارادہ یہی ہے کہ کاؤنٹ یا بلکونسکی کو، جو کسی بھی وقت یہاں پہنچ سکتا ہے، اس معاملے کی ہوا بھی نہ لگنے پائے، پھر بھی سے یہ اندیشہ لاحق ہو رہا ہے کہ کسی نہ کسی ذریعے یہ خبر ان کے کانوں تک پہنچ سکتی ہے اور وہ انا طول کو ڈویل کے لیے لٹکار سکتے ہیں۔ چنانچہ اس نے میٹر سے پر زور التجا کی کہ وہ اس کا نام لے کر اپنے سامنے کو سمجھائے کہ وہ فی الفور پاسکو سے کہیں اور چلا جائے اور تاشا کو کبھی اتنا موقع نہ دے کہ وہ دوبارہ اس کی شکل دیکھ سکے۔ میٹر کا ڈنٹ، بلکولائی اور پرنس آندرے کے سردار پر جو خطرہ منڈلا رہا تھا، میٹر کو صرف اب اس کا ادراک ہوا۔ چنانچہ اس نے یہ وعدہ کر لیا کہ وہ جو کچھ کہتی ہے، وہ اس کے مطابق عمل کرے گا۔ جو کچھ وہ چاہتی تھی، اس نے اسے مختصراً لیکن غیر مبہم انداز سے بیان کیا اور پھر اسے ڈرائنگ روم میں جانے کی اجازت دے دی۔

”یاد رکھو، کاؤنٹ کو اس بارے میں مطلق کچھ پتا نہیں۔ چنانچہ اس کے ساتھ کچھ اس طور پیش آؤ جیسے تمہیں خود بھی کچھ معلوم نہیں ہے،“ اس نے کہا۔ ”اب میں جاتی ہوں اور اسے بتاتی ہوں کہ اس کا انتظار عبث ہے، ہاں، اگرچی چاہے تو ڈرتک ٹھہر جانا!“

میٹر سمر کاؤنٹ سے ملا۔ وہ بوکھل یا اور گھبرایا دکھائی دے رہا تھا۔ اس صبح تاشا نے اسے بتا دیا تھا کہ وہ بلکونسکی کے ساتھ اپنی نسبت ختم کر چکی ہے۔

”مصیبت، مصیبت، مائی ڈیر فیلوا!“ اس نے میٹر سے کہا۔ ”ان لڑکیوں کی ماں یہاں نہیں ہے اور میں کس عذاب میں پھنس گیا ہوں! مجھے اسوں اس بات کا ہے کہ میں آیا ہی کیوں؟ میں تم سے کچھ نہیں چھپاؤں گا۔ سنا تم نے کہ اس نے کسی سے مشورہ کیے بغیر اپنی منگنی توڑ دی ہے؟ یہ ٹھیک ہے کہ یہ رشتہ مجھے کوئی خاص پسند نہیں تھا۔ ماں، وہ بہت نفیس آدمی ہے، لیکن جب اس کا باپ مخالفت پر اصرار رکھائے بیٹھا ہو، وہ خوش نہیں رہ سکتے تھے اور تاشا کے لیے رشتوں کی کمی نہیں ہے۔ پھر بھی، یہ معاملہ اتنی دیر سے چل رہا تھا، اور اس نے نہ ماں سے پوچھا اور نہ باپ سے، اور تناؤ اقدام اٹھالیا! اور اب اس کی طبیعت ناساز ہے۔ خدا جانے، یہ گورکھ دھندا کیا ہے۔ کاؤنٹ، میں تو صرف ایک بات جانتا ہوں کہ لڑکیوں کا اپنی ماں سے دور رہنا اچھی بات نہیں ہے۔“

میٹر سمجھ گیا کہ کاؤنٹ بے حد پریشان ہے۔ اس نے گنگوکار خ کے کسی اور موضوع کی جانب موڑنے کی کوشش کی، لیکن کاؤنٹ بار بار اپنے مصائب کا تذکرہ کرتا رہا۔

سو نیا کمرے میں آئی۔ اس کی صورت پر خوف یز رہا تھا۔

”تاشا کی طبیعت خراب ہو گئی ہے۔ وہ اپنے کمرے میں ہے اور آپ سے ملنا چاہتی ہے۔ ماریا دمتریوٹا اس

کے پاس ہیں اور وہ بھی چاہتی ہیں کہ آپ تشریف لے آئیں۔“

”اوسے ہاں!“ کاؤنٹ نے کہا۔ ”تم تو بلکونسکی کے دوست ہو۔ وہ شاید تمہاری رسلطت سے اسے کوئی

پیغام بھیجنا چاہتی ہے۔ اے خداوند، خداوند! چند ہی روز پہلے ہم لوگ کتنے خوش تھے!“

اور کاؤنٹ نے اپنی کینٹی پر سے اپنے چند بچے کھچے ہاں پکڑے اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

ماریا دمیتر یونانے نتاشا کو بتا دیا تھا کہ انا طول شادی شدہ ہے، لیکن نتاشا نے اس کی بات ماننے سے انکار کر دیا تھا اور مطالبہ کیا تھا کہ میٹر خود اس کی تصدیق کرے۔ سو نیا نے غلام گردش میں میٹر کی نتاشا کے کمرے کی طرف رہنمائی کرتے ہوئے اسے بتایا تھا۔

زورور و نتاشا جسم اکڑائے ماریا دمیتر یونا کے پاس بیٹھی تھی۔ جونہی میٹر اندر داخل ہوا، اس کی چمکتی دکتی اور نگار سے پھٹکتی آنکھیں استغہامیہ انداز سے اس پر مرکوز ہو گئیں۔ وہ نہ مسکرائی اور نہ اس نے گردن ہلائی، بس تک تک اسے دیکھتی رہی۔ اس کی آنکھیں صرف ایک سوال پوچھ رہی تھیں: ”تم انا طول کے دوست ہو یا؟“ قیوں کی طرح اس کی جان کے دشمن؟“ بظہر اس کے لیے خود میٹر کا کوئی وجود نہیں تھا۔

”یہ اس بارے میں سب کچھ جانتے ہیں،“ ماریا دمیتر یونا نے میٹر کی طرف اشارہ کرتے اور نتاشا سے مخاطب ہو کر کہا۔ ”یہ خود ہی سب کچھ سمجھیں بتائیں گے کہ میں نے جھوٹ کہا تھا یا سچ؟“

نتاشا نے ایک سے دوسرے کی جانب یوں دیکھا جیسے زخمی صیدان کتوں اور شکاریوں کی، جو اس کے قریب سے قریب تر آتے جا رہے ہوں، طرف دیکھتا ہے۔

”تم لیا لینچہ،“ میٹر نے نئی بات کا آغاز کیا۔ جو کچھ اس نے کہنا تھا، اس سے اسے اتنی گھن آ رہی تھی اور نتاشا پر تنازع محسوس ہو رہا تھا کہ اس کی نگاہیں خود بخود جھک گئیں۔ ”یہ بات سچ ہے یا نہیں، تمہارے لیے کوئی فرق نہیں پڑتا کیونکہ۔“

”پھر یہ سچ نہیں ہے کہ وہ شادی شدہ ہیں؟“

”ہاں، سچ ہے۔“

”انہیں شادی کیسے لیا عرصہ ہو گیا؟“ اس نے پوچھا۔ ”اپنی عزت کی قسم کھا کر بتائیں۔“

میٹر نے اپنی عزت کی قسم کھائی۔

”کیا وہ ہمیں ہیں؟“ اس نے تجلت سے پوچھا۔

”ہاں، میں نے اسے ابھی دیکھا تھا۔“

بظہر اس میں، اب مزید بولنے کی ہمت نہیں رہی تھی اور اس نے اپنے دونوں ہاتھوں سے کچھ اس قسم کا

نشان بنایا۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ وہ اسے تنہا چھوڑ دیں۔

جس کا ذہن میں خیال آتے ہی اس کا خون کھولنے لگتا اور اس کا دل اتنے زور زور سے دھڑکنے لگتا کہ اسے سانس لینے میں دشواری ہونے لگتی، تلاش میں سارے شہر کا چکر لگانے لگا۔ وہ نہ برنائی پہاڑوں پر نہ چھپیوں کے ڈیرے میں اور نہ کوئی نینو کے رستوراں میں مل۔ میئر کلب پہنچا۔ وہاں سب کچھ معمول کے مطابق ہو رہا تھا۔ جو ارکان کھانا کھانے اکٹھے ہوئے تھے، ٹولیاں بنائے بیٹھے تھے اور وہ شہر کی خبروں کے بارے میں اس سے باتیں کرنے لگے۔ ایک وردی پوش ملازم نے، جو اس کے دوستوں کو جانتا اور اس کی عاداتوں سے آگاہ تھا، سلام کرنے کے بعد سے بتایا کہ چھوٹے ڈائننگ روم میں اس کے لیے جگہ موجود ہے، پرنس میخائیل ذخارج لہیری میں ہے لیکن پاول سمونچا ابھی نہیں آیا ہے۔ میئر کے ایک واقف کار نے موسم کے بارے میں اپنی گفتگو بیچ میں چھوڑی اور اس سے کہا: ”سنا ہے کہ گورگن نے بھی رستو کو اغوا کر لیا ہے۔ سارے شہر میں اس خبر کی دھوم مچی ہوئی ہے۔ ایسے یہ سچ ہے؟“ میئر ہنس پڑا اور اس نے جواب دیا: ”یہ نری بکواس ہے۔ میں ابھی ابھی رستوفوں کے ہاں سے آ رہا ہوں۔“ وہ ہر شخص سے اناطول کے بارے میں پوچھنے لگا۔ ایک شخص نے اسے بتایا کہ وہ ابھی نہیں آیا ہے اور دوسرے نے سے اطلاع دی کہ وہ ڈنر نہیں کھائے گا۔ لوگوں کے اس پرسکون اور بے نیاز جھوم کو، جسے اس امر کا تعلق کوئی اندازہ نہیں تھا کہ اس کے دل و دماغ پر کیا بیت رہی ہے، دیکھ کر میئر کو عجیب قسم کا احساس ہونے لگا۔ وہ بال روم میں چکر گاتا رہا اور جب تک ہر شخص آ نہ گیا، انتظار کرتا رہا، اور چونکہ، ماحول نہیں آیا تھا، اس لیے وہ ڈنر کھانے کے لیے نہ ٹھہرا بلکہ گھر چلا گیا۔

اناطول نے، جس کی تلاش میں میئر مار مارا پھر رہا تھا، اس روز دلوخوف کے ساتھ کھانا کھایا اور اس سے صلاح مشورہ کرتا رہا کہ وہ اس معاملے کو، جو نائیں نائیں فٹ ہو گیا تھا، کس طرح اپنے حق میں سلجھائے۔ وہ سمجھتا تھا کہ نائشا سے ملنا ضروری ہے۔ شام کو وہ اپنی بہن کے ہاں چلا گیا تاکہ اس کے ساتھ مل کر نائشا سے ملاقات کی کوئی سبیل نکالی جائے۔ جب سارے ماسکو کی خاک چھاننے کے بعد میئر واپس گھر پہنچا، اس کے ذاتی خدمت گار نے اسے بتایا کہ پرنس اناطول کاؤٹش کے پاس بیٹھا ہے۔ کاؤٹش کا ڈرائنگ روم مہمانوں سے چھپا ہوا تھا۔

اپنی بیوی سے، جس سے وہ ماسکو واپس آنے کے بعد نہیں ملا تھا۔ اس وقت وہ اسے پہلے کی نسبت کہیں زیادہ گھناؤنی نظر آئی۔ علیک سلیک کے بغیر وہ ڈرائنگ روم میں چلا گیا۔ وہاں اسے اناطول کی شکل دکھائی دی اور وہ سیدھا اس کے پاس پہنچ گیا۔

”اتھا، میئر،“ کاؤٹش نے اپنے شوہر کے پاس جا کر کہا۔ ”آپ کو معلوم ہی نہیں کہ ہمارا اناطول کس تکلیف و صورت حال سے دوچار ہے۔“

وہ بات کرتے کرتے چپ ہو گئی۔ اسے اپنے خاوند کے آگے جھکے ہوئے سر، شعلہ بارنگا ہوس اور پر عزم چال میں اس غیظ و غضب اور تشدد کی بھیانک علامتیں، جن سے وہ بخوبی آگاہ تھی اور جن کا دلوخوف کے ساتھ اس کی ڈونگل کے بعد اسے فی نفسہ تجربہ ہو چکا تھا، نظر آ گئی تھیں۔

”تم جہاں بھی جاؤ گی، بدی اور فتنہ و فحش رہنمائی جو میں ہوں گے،“ میئر نے اپنی بیوی سے کہا۔ ”اناطول،“

آؤ، مجھے تمہارے ساتھ ضروری بات کرنا ہے، اس نے فرانسیسی میں مزید کہا۔

انا طول نے ایک نظر اپنی ہمشیرہ پر ڈالی، موزر باندھ کر کھڑا ہوا اور بیئر کے ساتھ چلنے کے لیے تیار ہو گیا۔

بیئر نے اسے بازو سے پکڑا، اپنی طرف کھینچا اور کمرے سے باہر لے جانے لگا۔

”میرے ڈرائنگ روم میں تمہاری یہ جرات“ ہیلین نے زیر لب کہا، لیکن وہ اس کی بات سن کر ان کی کمرے سے باہر نکل گیا۔

انا طول حسب معمول اکڑا کر اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگا لیکن اس کے چہرے پر ہوسیاں، ڈر ہی تھیں۔

سٹڈی روم میں داخل ہونے اور دروازہ بند کرنے کے بعد بیئر انا طول کی طرف دیکھے بغیر اس سے مخاطب ہوا:

”تم نے کاؤتس رستو وا سے شادی کا وعدہ کیا تھا؟ تم اسے بھگالے جانا چاہتے تھے؟ ٹھیک ہے؟“

”Mon cher“ انا طول نے جواب دیا۔ (ان کی ساری گفتگو فرانسیسی میں ہو رہی تھی)۔ ”میں سمجھتا ہوں کہ

اس لہجے سے مجھ سے جو سوالات پوچھے جا رہے ہیں، مجھ پر ان کے جوابات دینے کی ذمہ داری عاید نہیں ہوتی۔“

بیئر کا چہرہ، جو پہلے زرد تھا، اب غیظ و غضب سے مسخ ہو گیا۔ اس نے اپنے کیم و شیم ہاتھوں سے اس کی وردی

کا کالر پکڑا اور اسے اتنے زور سے جھٹکے دیے کہ اس کی سٹی گم ہو گئی اور وہ خوف سے خاصا لرزہ بر اندام ہو گیا۔

”جب میں کہتا ہوں کہ مجھے تم سے ضروری بات کرنا ہے۔“ بیئر نے دہرتے ہوئے کہا۔

”چھوڑو، یار، بالکل احمقانہ حرکتیں کر رہے ہو۔ ہائیں!“ انا طول نے اپنے کالر کے ایک ٹن کو، جو ڈھیلا ہو

گیا تھا، انگلی سے چھوتے ہوئے کہا۔

”تم لٹنگے، پاجی، بد قماش ہو۔ جی چاہتا ہے کہ مار مار کر تمہارا بھیجا نکال دوں، اس سے میرے کلیجے میں

ٹھنڈک پڑ جائے گی، پر پتا نہیں کہ میرے ہاتھ کو کیا چیز روکے ہوئے ہے۔“ اس کا انداز بالکل معنوی تھا کیونکہ وہ

فرانسیسی بول رہا تھا۔ اس نے اچھے خاصے بھاری پیپر دیٹ پر ہاتھ ڈالا اور دھمکی آمیز طریقے سے اسے اوپر اٹھایا،

تاہم اس نے فوراً ہی اسے نیچے رکھ دیا۔

”تم نے اس سے شادی کا وعدہ کیا تھا؟“

”ہیں۔ ہیں۔ میں نے اس بارے میں سوچا نہیں تھا... درحقیقت میں نے کوئی وعدہ نہیں کیا تھا کیونکہ

”تمہارے پاس اس کے کوئی خطوط ہیں؟ کوئی خطوط؟“ بیئر نے انا طول کی جانب بڑھتے ہوئے مطالبہ کیا۔

انا طول نے اسے سرسری نگاہوں سے دیکھا، پلک جھپکنے میں اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا اور اپنی پاکٹ بک باہر

نکالی۔

انا طول نے ایک خط اسے تمہارا دیا۔ بیئر نے خط پکڑا اور ایک میزگرہ، جو اس کے رستے میں رکاوٹ بنی ہوئی

تھی، ایک جانب دھکیلتے ہوئے صوفے پر ڈھیر ہو گیا۔

”ذرا مت، میں تمہیں کوئی غم نہیں پہنچاؤں گا۔“ انا طول نے اپنی حرکات و سکنات سے جس خوف کا اظہار کر رہا تھا، بیٹر نے اس کے جواب میں کہا۔ ”نمبر ایک۔ خطوط،“ اس نے یوں کہا جیسے آموختہ دہرا رہا ہو۔ ”نمبر 2۔“ ایک لفظ کے توقف کے بعد وہ پھر بولا، اٹھ کر کھڑ ہوا اور کمرے میں گھومنے لگا۔ ”کل تم ہاسکو سے رخصت ہو چاؤ گے۔“

”لیکن میں کیسے۔“

”نمبر 3،“ بیٹر اس کی بات سننے بغیر اپنی ہی کہتا چلا گیا۔ ”تمہارے اور کاؤنٹس رستودا کے مابین جو کچھ بھی ہوا ہے، تم اس کے بارے میں کسی سے ایک لفظ بھی نہیں کہو گے۔ مجھے معلوم ہے کہ میں تمہیں ایسا کرنے سے روک نہیں سکتا، لیکن اگر تمہارے اندر ضمیر کی ذرا سی بھی رتی ہے۔“

بیٹر خاموشی سے کمرے میں ٹہکتا رہا۔ انا طول میز کے سامنے بیٹھ گیا۔ وہ ناک بھونچتا ہوا اور اپنے ہونٹ کاٹ رہا تھا۔

”تمہیں لازماً معلوم ہونا چاہیے کہ تمہارے پیش و عشرت کے علاوہ ایک چیز اور بھی ہے، اسے دوسروں کی خوشی، دوسروں کا ذہنی سکون کہتے ہیں اور تم محض اپنے تفلذ کی خاطر ایک پوری زندگی کو تباہی کے غار میں دھکیں رہے ہو۔ میری بیوی جیسی عورتوں کے ساتھ عیش کرتے ہو۔ اس قسم کی عورتوں کی محبت میں تم اپنے حقوق سے متجاوز نہیں ہوتے کیونکہ انہیں معلوم ہوتا ہے کہ تم ان سے کیا چاہتے ہو۔ جس قسم کے فسق و فجور کے تم عادی ہو، انہیں بھی اس کا تجربہ ہوتا ہے، اس لیے تم ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ لیکن کسی معصوم لڑکی کے ساتھ شادی کا وعدہ کرنا، اسے قریب دینا، اسے اغوا کرنا۔ تم سمجھتے نہیں کہ یہ اتنی ہی گھٹیا حرکت ہے جتنا کہ کسی مرد ضعیف یا بچے پر ہاتھ اٹھانا؟“

بیٹر نے توقف کیا اور وہ انا طول کو قہر آلود لگا ہوں سے نہیں بلکہ استہزامیہ انداز سے دیکھنے لگا۔

”مجھے ان باتوں کا کچھ علم نہیں، راج؟“ انا طول نے کہا۔ اب جب کہ بیٹر نے اپنے غیظ و غضب کو تسخیر کر لیا تھا، اس کا حوصلہ بڑھنے لگا تھا۔ ”میں اس بارے میں نہ کچھ جانتا ہوں اور نہ جانتا چاہتا ہوں،“ اس نے بیٹر کی جانب دیکھے بغیر اور اپنے نچلے جڑے کو قدرے ہلاتے ہوئے کہا۔ ”لیکن تم نے میرے بارے میں ایسے ایسے الفاظ۔ گھٹیا، وغیرہ وغیرہ۔ استعمال کیے ہیں، جو میں باعزت شخص ہونے کے ناتے کسی اور کو اپنے بارے میں کہنے کی اجازت نہیں دیتا۔“

بیٹر سکتے کے عالم میں اس کا منہ ٹکٹنے لگا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ محض کہنا کیا چاہتا ہے۔

”اگرچہ یہ ہماری آپس کی گفتگو تھی،“ انا طول نے اپنی بات جاری رکھی، ”پھر بھی میں۔“

”کیا تم حلفی کرنا چاہتے ہو؟“ بیٹر نے طنزیہ انداز سے پوچھا۔

”جو کچھ تم نے کہا ہے، کم از کم اتنا تو کر سکتے ہو کہ اسے واپس لے لو۔ ہونہ؟ اگر تم چاہتے ہو کہ میں تمہاری

خواہش پر عمل کروں، ہونہ؟“

”ہاں، ہاں، میں اپنے الفاظ واپس لیتا ہوں، واپس لیتا ہوں۔ درمیان میں تم سے معافی بھی مانگتا ہوں،“ بیٹر

سنے بغیر ار دی طور پر ڈھیلے جٹن کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ”اور اگر تمہیں سر کے لیے رقم درکار ہو۔“

انا طول مسکرا دیا۔ یہ ابھی گھٹیا اور عاجزت آئیز مسکراہٹ تھی جس کا میٹر اپنی بیوی میں خوب مشاہدہ کر چکا تھا۔ اسے محسوس ہوا کہ اسے انکالی آجائے گی۔

”اف، روزیل، سفاک، چنگل پر لے!“ وہ پکارا۔

اگلے روز انا طول پیٹرز برگ روانہ ہو گیا۔

21

میٹر نے ماریا دستریو نا کے گھر کا رخ کیا تا کہ وہ اسے بتا سکے کہ اس کی جو یہ خواہش تھی کہ کوراگن کو ماسکو سے نکال دیا جائے، پوری ہو گئی ہے۔ سارے گھر میں کھبلی اور فر تفری مچی ہوئی تھی۔ نناشا کی طبیعت سخت خراب ہو گئی تھی۔ دراصل، جیسا کہ ماریا دستریو نا نے رازداری سے میٹر کو بتایا، نناشا نے اس رات، جب اسے معلوم ہوا کہ انا طول تبادلی شدہ ہے، چوری چھپے کہیں سے شکلیہ حاصل کیا اور کھالیا۔ ابھی اس نے اس کی خفیف سی مقدار علق میں ڈالی تھی کہ اس کے ہاتھ پاؤں پھول گئے اور اس پر اتنا خوف طاری ہوا کہ اس نے سونیا کو جگا دیا اور اسے بتا دیا کہ اس نے کیا کر دیا ہے۔ وقت پر مناسب تریاق فراہم ہو گئے اور اسے کھل دیے گئے۔ اب اس کی حالت خطرے سے باہر ہے لیکن وہ اتنی کمزور ہو گئی ہے کہ ابھی اس کا گاؤں سے چار ماہ خارج از امکان ہے، چنانچہ کاؤنٹس کو بلا بھیجا گیا ہے۔ میٹر آشفستہ حال کاؤنٹ اور سونیا سے، جس کی آنکھیں رو رو کر سرخ ہو گئی تھیں، ملا، لیکن اسے نناشا سے ملاقات کی اجازت شددی گئی۔

اس روز اس نے کلب میں ذکر کھایا۔ وہاں چاروں اطراف سے اس کے کانوں میں یہ افواہ، کہ کاؤنٹس رستورا کو اغو کرنے کی کوشش کی گئی ہے، پڑ رہی تھی۔ اس نے جائنٹشانی سے ان افواہوں کی تردید کی اور ہر شخص کو یہ یقین دلایا کہ بات صرف اتنی ہے کہ اس کے برادر نسبتی نے اس کا رشتہ مانگا تھا لیکن اس کی درخواست کو شرف قبولیت نہ حاصل ہو سکا۔ اس سے زیادہ اور کچھ نہیں ہوا۔ میٹر کا یہ خیال تھا کہ اس سارے معاملے کو پردہ اخفا میں رکھنا اور نناشا کی نیک نامی بحال کرنا اس کا فرض ہے۔

اس کی یہ سوچ سوچ کر خوف سے جان نکل جا رہی تھی کہ پرنس آندرے ب پہنچا کہ اب پہنچا وہ اس کے متعلق خبر حاصل کرنے ہر روز پرنس کے گھر کے پھیرے لگانے لگا۔

شہر میں جو افواہیں گردش کر رہی تھیں، وہ مادموزیل بوغین کی دسراطت سے پرنس نکولا کی آندر بوج تک پہنچ چکی تھیں۔ اس نے وہ خط بھی، جس میں نناشا نے اپنی سنگنی کی تنبیخ کے بارے میں پرنس ماریا کو اطلاع دی تھی، پڑھا تھا۔ وہ معمول سے زیادہ ہشاش بشاش نظر آ رہا تھا اور بڑی بے قراری سے اپنے بیٹے کی واپسی کا انتظار کر رہا تھا۔ انا طول کی روانگی کے چند روز بعد میٹر کو پرنس آندرے کا خط ملا۔ اس میں اس نے اپنی آمد کی اطلاع دی تھی اور اس سے کہا تھا کہ وہ کسی روز اس سے ملنے اس کے گھر آئے۔

جونی پرس آندرے ماسکو پہنچا، اس کے باپ نے اسے وہ خط، جو ماسٹا نے پرس ماریا کے نام تحریر کیا تھا اور جس میں اس نے اپنی سگائی ختم کرنے کے متعلق اطلاع دی تھی، تھما دیا۔ (مادسوزیل بوغین نے یہ خط پرس ماریا کے کمرے سے چرایا اور مسٹر پرس کے حوالے کیا تھا۔) اس نے اپنے باپ سے ماسٹا کے اڈھل جانے کی کہانی بھی سنی۔ اس کے باپ نے یہ کہانی خوب مریج مصالحہ لگا کر اور بڑھا چڑھا کر پیش کی۔

پرس آندرے کی آمد شام کو ہوئی تھی اور اگلی صبح دیر اسے ملے آگیا۔ جیٹر کو توقع تھی کہ پرس آندرے کی بھی ری حالت ہوگی جو ماسٹا کی تھی۔ لیکن جب وہ ڈرائنگ روم میں داخل ہوا اور سے سٹڈی روم سے پیئرز برگ کی کسی سازش کے متعلق اس کے جوش و خروش دور بلند لہجے سے باتیں کرنے کی سازش آتی سنائی دی، اس کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ کبھی کبھی مسٹر پرس، وہ کوئی دوسرا شخص اسے ٹوک دیتا اور خود بولنے لگتا۔ پرس ماریا پیئر سے ملنے آئی۔ جس کمرے میں اس کا بھائی تھا، اس کی نگاہیں اس طرف پلٹ گئیں۔ اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔ بظاہر وہ یہ عندیہ دینا چاہتی تھی کہ اس کے بھائی کو جس الم ناک صورت حال کا سامنا کرنا پڑا ہے، وہ اس میں اس کی برابر کی شریک ہے لیکن جب پیئر نے اس کے چہرے پر نگاہ ڈالی، اسے صاف نظر آگیا کہ جو کچھ ہوا اور ماسٹا کی بے وفائی پر اس کے بھائی نے جس رد عمل کا ظہار کیا ہے، ان دونوں باتوں پر وہ جی اسی جی میں بہت خوش ہے۔

”وہ کہتے ہیں کہ انھیں یہی توقع تھی“ وہ بولی۔ ”میں جانتی ہوں کہ ان کا چندارا انھیں اپنے جذبات کے اظہار کی اجازت نہیں دے گا، پھر بھی انھوں نے اس صدمے پر میری توقع سے کہیں بڑھ کر صبر و تحمل کا مظاہرہ کیا ہے۔ بظاہر یہی ہوتا تھا۔“

”کیا ان دونوں کے تعلقات واقعی بالکل ختم ہو گئے ہیں؟“ جیٹر نے پوچھا۔

پرس ماریا کا منہ حیرت سے کھلے کا کھلا رہ گیا اور وہ ٹک ٹک اسے دیکھنے لگی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کوئی شخص اس قسم کا سوال کیسے پوچھ سکتا ہے۔ جیٹر سٹڈی روم میں چلا گیا۔ پرس آندرے عام شہری لباس میں ملبوس تھا۔ اس میں خاصی تبدیلیاں رونما ہو چکی تھیں اور بظاہر اس کی صحت بحال ہو گئی تھی۔ تاہم اس کے ابروؤں کے مابین نئی اور نمایاں لکیر ابھر آئی تھی۔ وہ اپنے باپ اور پرس مشٹر سکی کی جانب رخ کیے کھڑا تھا، اور جوش و خروش سے استدلال کر رہا اور در شور سے ہاتھوں اور بازوؤں سے اشارے کر رہا تھا۔

گفتگو پہے رائسکی³⁶ کے، جس کی اچانک جہاد وطنی اور مبینہ غداری کی خبر ابھی ابھی، سکو پہنچی تھی، بارے میں ہو رہی تھی۔

”وہی لوگ، جو ایک ماہ قبل اس کے تلوے چاٹ رہے تھے اور اسے آسمان پر چڑھا رہے تھے، آج اس کی مذمت کرنے اور اس پر الزامات کی بوچھاڑ کرنے میں پیش پیش ہیں،“ پرس آندرے کہہ رہا تھا۔ ”اور اس معاملے میں وہ لوگ بھی، جو اس کے مقاصد کو سمجھنے میں ناکام رہے، کسی سے پیچھے نہیں ہیں۔ جب کسی شخص کے سرے عزت کا تاج اتر جاتا ہے، اس پر الزام تراشی کرنا، اسے سولی پر لٹکانا اور دوسروں کی غلطیاں اس کے کھاتے میں ڈالنا نہایت

آسان کام ہے۔ لیکن میری رائے یہ ہے کہ اس عہد میں اگر کسی نے کوئی اچھا کارنامہ سرانجام دیا ہے، تو اسی نے، صرف اسی نے، سرانجام دیا ہے۔“

اس کی نظر میٹر پر پڑی اور وہ خاموش ہو گیا۔ گھڑی کی گھڑی اس کا چہرہ کپکپایا لیکن دیکھتے ہی دیکھتے وہاں معاندانہ تاثر نمودار ہو گیا۔

”آنے والی نسلیں اس سے انصاف کریں گی،“ اس نے اپنی بات ختم کی اور معاً میٹر کی طرف متوجہ ہو گیا۔
 ”ہونہ، کیا حال ہیں تمہارے؟ ابھی تک چربی کی تھیں چنھائے جا رہے ہو؟“ اس کا لہجہ جوشیلا تھا لیکن اس کی پیشانی پر جو کیکری نئی نمودار ہوئی تھی، وہ اور گہری ہو گئی۔ ”ہاں، میں ٹھیک ہوں،“ اس نے میٹر کے سوال کے جواب میں کہا اور مسکراتے لگا۔

میٹر پر یہ بالکل واضح تھا کہ اس کی مسکراہٹ کا مفہوم یہ ہے: ”ہاں، میں ٹھیک ہوں، لیکن اب میری صحت کسی کے کام نہیں آئے گی۔“

پولستانی سرحدوں سے اسے جن خستہ سڑکوں پر سفر کرنا پڑا تھا، سوئٹزرلینڈ میں وہ جن لوگوں سے، جو میٹر کو جانتے تھے، ملے تھے اور وہ اپنے بیٹے کے لیے جو نیا ٹویٹر سویڈیل لایا تھا، اس نے ان سب کے بارے میں میٹر کو مختصر بتایا اور وہ دوبارہ جوش و خروش سے اپنے رائسکی کے متعلق گفتگو میں، جہاں بھی تک دونوں بزرگوں کے مابین ہو رہی تھی، شریک ہو گیا۔

”اگر کہیں غداری ہوتی یا پھولین کے ساتھ خفیہ ساز باز کا کوئی ثبوت ہوتا، تو وہ اسے ماننا منظر عام پر لے لے“ اس نے بڑی گرم جوشی اور تیزی سے بولتے ہوئے کہا۔ ”مجھے ذاتی طور پر پسے رائسکی نہ تو پسند ہے اور نہ میں نے اسے کبھی پسند کیا ہے، لیکن انصاف مجھے پسند ہے۔“

میٹر کو اپنے دوست کے رویے میں اسی ضرورت کا، جس سے وہ خود بخوبی آگاہ تھا، احساس ہوا۔ اس ضرورت کے تحت آدمی کسی ایسے معاملے کے، جس کا اس کی ذات سے براہ راست کوئی تعلق نہیں ہوتا، بارے میں اس لیے کامنا جوش و خروش کا مظاہرہ کرنے اور منطق چھانٹنے لگتا ہے کیونکہ وہ ان ذاتی خیالات کا، جو اس کے لیے بے حد اہمیت ناک ہوتے ہیں، نگاہ گھونٹ دینا چاہتا ہے۔

جب پرنس مشرک کی رخصت ہو گیا، پرنس آندرے نے میٹر کا بازو دھما اور اسے اس کمرے میں، جو اس کے لیے تیار کیا گیا تھا، چلنے کو کہا۔ وہاں بستر لگا ہوا تھا اور ادھر ادھر متحدہ سوٹ کیس اور ٹریک، جو کھلے ہوئے تھے، پڑے تھے۔ پرنس آندرے ایک سوٹ کیس کے پاس گیا اس نے ایک ڈبٹا اٹھا اور اس میں سے ایک پیکٹ، جو کاغذ میں لپیٹا ہوا تھا، نکالا۔ یہ سب کچھ بہ تجیل اور خاموشی سے ہوا۔ وہ دوبارہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور اپنا گل کھنکارنے لگا۔ اس کے ماتھے پر ٹکلیں ابھر آئی تھیں اور اس کے ہونٹ بچنے ہوئے تھے۔

”میں معافی چاہتا ہوں کہ تمہیں زحمت دے رہا ہوں۔۔۔“

بیز کو اندازہ ہو گیا کہ پرنس آندرے شاہ کے متعلق بات کرنا چاہتا ہے اور اس کے چوڑے چکے چہرے پر ہمدردی اور رحم کے آثار نمایاں ہو گئے۔ اس کے چہرے پر ان تاثرات کو دیکھ کر پرنس آندرے جھلا گیا اور وہ پر عزم بھٹکتا ہے اور ناخوشگوار لہجے سے بولتا چلا گیا۔

”مجھے کاؤنٹس رستو، کا انکار موصول ہوا ہے اور میں نے کچھ اس قسم کی خبریں بھی سنی ہیں کہ تمہارے بردار لسی نے اس سے شادی وغیرہ کرنے کی خواہش کی ہے۔ کیا یہ ٹھیک ہے؟“

”صحیح بھی ہے اور نہیں بھی،“ بیز نے اپنی بات شروع کی لیکن پرنس آندرے نے اسے ٹوک دیا۔

”یہ رہے اس کے خطوط و تصویر۔“ اس نے میز سے پیکٹ اٹھایا اور بیز کو دیکڑا دیا۔

”یہ کاؤنٹس کو دے دیجئے۔ اگر تمہاری اس سے ملاقات ہو۔“

”وہ سخت پیار ہے،“ بیز نے کہا۔

”پھر وہ ابھی تک یہیں ہے؟“ پرنس آندرے نے دریافت کیا۔ ”اور پرنس کوراگن؟“ اس نے بلاتا خیر پوچھا۔

”وہ چند روز قبل یہاں سے چلا گیا تھا اور وہ موت کے دروازے پر دستک دے رہی ہے۔“

”مجھے اس کی عزالت کے متعلق سن کر بہت افسوس ہوا ہے،“ پرنس آندرے نے اپنے باپ کی طرح ناخوشگوار،

مردمہرات اور معاندانہ انداز سے مسکراتے ہوئے کہا۔

”چنانچہ موسیو کوراگن نے کاؤنٹس رستو کو حوالہ عقد میں لینے کا شرف نہیں بخشا؟“ اس نے بار بار تھنے

پھٹا کر جملہ کہا۔

”وہ اس سے شادی نہیں کر سکتا تھا، وہ پہلے ہی شادی شدہ ہے،“ بیز نے کہا۔

پرنس آندرے ایک بار پھر بالکل اپنے باپ کی طرح ناگوار انداز سے ہنس پڑا۔

”اگر اجازت ہو تو کیا میں یہ پوچھنے کی جسارت کر سکتا ہوں کہ آپ کے سالے شریف کہاں ہیں؟“ اس

نے کہا۔

”وہ چلا گیا ہے، شاید پیئرز۔ لیکن حقیقتاً مجھے معلوم نہیں،“ بیز نے کہا۔

”خیر، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا،“ پرنس آندرے نے کہا۔ ”کاؤنٹس رستو کو بتادیں کہ اس پر نہ پہلے

کوئی پابندی تھی اور نہ اب ہے، اور میں ہر دم اس کی خوشی کے لیے دعا گو ہوں۔“

بیز نے پیکٹ اٹھا لیا۔ پرنس آندرے نگاہیں گاڑے اسے دیکھتا رہا۔ وہ شاید یاد کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ

اسے مزید کچھ تو نہیں کہنا پھر وہ اس بات کا منتظر تھا کہ شاید بیز کچھ کہے۔

”سنو۔۔۔ پیئرز برگ میں ہم دونوں کے، بین جو مکالمہ ہوا تھا، تمہیں وایا دے؟“ بیز نے پوچھا۔ ”اس کا

موضوع۔“

”مجھے یاد ہے،“ پرنس آندرے نے فی الفور جواب دیا۔ ”میں نے کہا تھا کہ جو عورت راہ راست سے بھٹک

جائے، ہمیں اسے معاف کر دینا چاہیے۔ لیکن میں نے یہ نہیں کہا تھا کہ میں اسے معاف کر سکتا ہوں۔ میں نہیں کر سکتا۔“

”لیکس کیا اس کا اس سے موازنہ ہو سکتا ہے۔؟“ پیٹر نے کہا۔

پرنس آندرے نے اس کی بات کاٹ دی اور درشت سچے سے چلا کر بولا:

”ہاں، دوبارہ اس سے شادی کی استدعا کروں، عالی ظرفی کا مظاہرہ کروں، وغیرہ وغیرہ؟۔۔ بات تو بہت بندہ پایہ ہے لیکن میں ان صاحب کے نقش قدم پر چلنے سے معذور ہوں۔ اگر تم چاہتے ہو کہ ہماری دوستی برقرار رہے، پھر اس... اس سارے معاملے کا کچھ ذکر نہ کرنا۔ اچھا، خدا حافظ۔ اسے پیکٹ پہنچا دو گے؟“

پیٹر اس سے رخصت ہوا اور معمر پرنس اور پرنس ماریا کے پاس چلا گیا۔

بڑے میاں معمر سے کہیں زیادہ شگفتہ نظر آ رہے تھے۔ پرنس ماریا بالکل ایسی کی ایسی تھی جیسی وہ ہمیشہ ہوتی تھی۔ بظاہر اسے اپنے بھائی سے ہمدردی تھی لیکن پیٹر بھانپ گیا کہ اس ہمدردی کے نیچے خوشی پنہاں تھی کہ ملنی ٹوٹ گئی ہے۔ انھیں بغور دیکھنے کے بعد پیٹر کو اندازہ ہو گیا کہ ان کے قلوب میں رستوفوں کے خلاف کتنی حقارت اور عناد بھرا ہوا ہے، اور یہ کہ ان کی موجودگی میں اس لڑکی کا، جو دنیا کے کسی دوسرے شخص کی خاطر پرنس آندرے کو ٹھکرا سکتی تھی، نام لینا بھی ناممکن ہے۔

ڈنر کے دوران میں گفتگو کا رخ جنگ کی، جس کے آثار درود بروز واضح ہوتے جا رہے تھے، طرف منتقل ہو گیا۔ پرنس آندرے کی زبان قینچی کی طرح چل رہی تھی اور وہ مسلسل بولے جا رہا تھا، کبھی وہ اپنے باپ سے اور کبھی سوس ٹیوٹر دیال سے بحث کرنے لگتا۔ وہ غیر فطری بشاشت کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ اس کی وجہ پیٹر کو اچھی طرح معلوم تھی۔

22

اسی شام پیٹر اس ڈے داری کی، جو اس کے کندھوں پر ڈالی گئی تھی، تکمیل کے لیے رستوفوں کے ہاں چلا گیا۔ شاخا پیٹر پر دراز تھی اور کاؤنٹ کلب گیا ہوا تھا۔ پیٹر نے خطوط سونیا کے سپرد کر دیے اور خود ماریا دسٹر یونا کے، جسے یہ جاننے میں دلچسپی تھی کہ پرنس آندرے نے خبر پر کیا رد عمل ظاہر کیا ہے، پاس چلا گیا۔ دس منٹ بعد سونیا ماریا دسٹر یونا کے کمرے میں آئی۔

”شاخا پیٹر کر لودوچ سے ملے پر مصر ہے؟“ اس نے کہا۔

”ہم انھیں وہاں کیسے لے جاسکتے ہیں؟ تمہارے کمرے کی جھڑپو ٹپھ تو ہوئی نہیں۔“

”نہیں، وہ لباس تبدیل کر چکی ہے اور نیچے ڈراٹنگ روم میں آ گئی ہے،“ سونیا نے کہا۔

ماریا دسٹر یونا اپنے کندھے اچکا کر رہ گئی۔

”کاش کہ اس کی ماں آجاتی اس لڑکی نے تو مجھے اتنا پریشان کیا ہے کہ میرا کچھ سر نکل گیا ہے اہاں“ ذرا سمجھ

سے کام پینا اور اسے سب کچھ نہ بتا دینا، اس نے میٹر سے کہا۔ ”اس کی حالت اتنی قابلِ رحم ہے کہ مجھ میں اتنا جگرا نہیں رہا کہ اسے ڈانٹ ڈپٹ کر سکوں!“

دنا شاؤرنگ روم کے درمیان میں کھڑی تھی۔ اس کا چہرہ زرد اور پر عزم تھا (لیکن اس پر خجالت کے آثار قطعاً نہیں تھے، حالانکہ میٹر کو امید تھی کہ وہ مجھوب ہو رہی ہوگی)۔ جب وہ دروازے کے قریب پہنچی، وہ کچھ ہڑبائی اور ہچکچائی۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ یہ فیصلہ نہیں کر پا رہی کہ آیا اسے آگے بڑھ کر میٹر کا استقبال کرنا چاہیے یا وہیں کھڑے کھڑے اس کا استخار کرنا چاہیے۔

میٹر تیزی سے آگے بڑھا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ حسبِ معمول اپنا ہاتھ آگے بڑھائے گی لیکن وہ اس کی طرف آتے آتے رک گئی۔ اس کی سانس دھونکی کی طرح چل رہی تھی اور اس کے بازو بالکل اسی بے جان انداز سے اس کے پیروں پر ٹپک رہے تھے جس طرح وہ اس وقت دھکا کرتے تھے جب وہ نغمہ سرائی کرے کے لیے ہال روم کے درمیان میں کھڑی ہوا کرتی تھی، لیکن اب اس کے چہرے پر بالکل ہی مختلف قسم کا تاثر نمایاں ہو رہا تھا۔

”میٹر کر لووج!“ وہ تیز تیز بولنے لگی، ”پرنس بلکونسکی آپ کے دوست تھے۔ دوست ہیں!“ اس نے اپنی اصلاح کی۔ (وہ سمجھ رہی تھی کہ ہر چیز باضی سے متعلق ہو چکی ہے، چنانچہ اب ہر چیز کی شکل صورت لازماً مختلف ہو گئی ہوگی)۔ ”ایک مرتبہ انھوں نے مجھ سے کہا تھا کہ میں آپ سے رجوع کروں۔“

میٹر کی نظر جب اس پر پڑی، اس نے ناک کے راستے زور کی سانس کھینچی اور اسے بولنے میں دشواری محسوس ہونے لگی۔ اب تک وہ دل ہی دل میں اسے برا بھلا کہتا رہا، اور اس سے نفرت کرنے کی کوشش کرتا رہا تھا، لیکن اب اسے اتنا ترس آنے لگا کہ لعنت طاعت کی مزید گنجائش ہی نہیں رہ گئی تھی۔

”وہ اب یہاں تشریف لے چکے ہیں... ان سے عرض کریں کہ وہ مجھے معاف فرمادیں“
 دو رنگ گئی اور اس کی سانس اب اور بھی تیز چلنے لگی، لیکن اس کی آنکھ سے آنسو ایک بھی نہ ٹپکا۔
 ”ہاں... میں اسے بتا دوں گا،“ میٹر ذریعہ بڑبڑایا۔ ”لیکن۔“

اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کہے۔

نظر آ رہا تھا کہ دنا شا کو یہ سوچ ہلکا نہ کر رہی تھی کہ معلوم نہیں میٹر کیا سمجھ رہا ہوگا۔

”میں جانتی ہوں کہ اب ہمارے مابین تمام رشتے ناتے منقطع ہو چکے ہیں،“ اس نے غجالت سے کہا۔ ”نہیں، اب انھیں دوبارہ بحال نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن میں نے ان کے ساتھ جو زیادتی کی ہے، اس کی وجہ سے میں سخت اذیت میں مبتلا ہوں۔ ان سے صرف اتنا عرض کر دیں کہ میں ان سے معافی کی التجا کرتی ہوں، معافی کی بھیک مانگتی ہوں۔ مجھے سب کچھ معاف فرمادیں...“

اس کا سارے جسم کا ہپ رہا تھا اور وہ کرسی پر بیٹھ گئی۔

دیا کا ایسا جذبہ، جس سے ان میں جیستہ میٹر قطعاً نا آشنا تھا، اس کے رگ و پے میں دوڑنے لگا۔

”میں اسے سب کچھ بتا دوں گا ایک بار پھر ایک ایک بات اس تک پہنچا دوں گا،“ پیٹر نے کہا۔ ”لیکن میں ایک بات جانتا چاہوں گا۔“

”کیا جانتا چاہتے ہیں؟“

”میں یہ جانتا چاہوں گا: کیا تمہیں اس سے محبت ہوگئی تھی؟“ پیٹر کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اناطول کا نام کیسے لے اور اس کے تصور سے ہی اس کا چہرہ لال سرخ ہو گیا۔ ”کیا تمہیں اس بذات سے محبت ہوگئی تھی؟“

”انہیں بذات نہ کہیں،“ نناشا نے کہا۔ ”لیکن مجھے پتا نہیں۔ قطعاً کچھ پتا نہیں۔“

وہ رونے لگی۔ حیرت کے دل میں پہلے سے بھی کہیں زیادہ رحم، شفقت اور محبت کے جذبات امنڈنے لگے۔ اسے محسوس ہوا کہ اس کی عینک کے نیچے آنسو قطرہ قطرہ بہہ رہے ہیں اور وہ جی جی میں دعائیں مانگنے لگا کہ نناشا کی نظر ان پر نہ پڑے۔

”نائی ڈیئر، اب ہم اس بارے میں مزید کوئی بات نہیں کریں گے۔“ اور اچانک نناشا کو اس کی پر خلوص، دہمکی اور نرم دلائل آوارس کر بہت عجیب لگا۔ ”نائی ڈیئر، اب ہم اس بارے میں بات نہیں کریں گے۔ میں اسے خود ہی سب کچھ بتا دوں گا۔ لیکن میری ایک التجا ہے۔ مجھے اپنا دوست سمجھو۔ اگر تمہیں مدد درکار ہو، مشورے کی ضرورت ہو یا محض کسی کے سامنے اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنا ہو۔ ابھی نہیں، بلکہ اس وقت جب تمہارا داغ صحیح طور پر سوچنے سمجھنے لگے۔ مجھے بلا لیتا۔“ اس نے اس کا ہاتھ تھاما اور اسے چوم دیا۔ ”مجھے بے حد خوشی ہوگی اگر میں تمہارے کسی۔“

پیٹر ڈرلیدگی کا شکار ہو گیا۔

”مجھ سے اس طرح کی باتیں نہ کریں، میں ان کی مستحق نہیں ہوں!“ نناشا چیخ پڑی اور وہ کمرے سے نکل چکی ہوتی لیکن پیٹر نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

وہ جانتا تھا کہ ابھی اس نے مزید کچھ کہنا ہے لیکن جب وہ گویا ہوا، اپنے الفاظ پر خود ہی ہکا بکا رہ گیا۔

”ش، ش، ش! ابھی تو تمہاری ساری زندگی تمہارے سامنے ہے!“ اس نے کہا۔

”میرے سامنے؟ نہیں۔ میرے لیے سب کچھ ختم ہو چکا ہے!“ اس نے نفقت اور خواری محسوس کرتے ہوئے کہا۔

”سب کچھ ختم ہو گیا؟“ پیٹر نے دہرایا۔ ”اگر میں میں نہ ہوتا بلکہ میں روئے زمین کا درجہ ترین، عقل مند ترین اور ہر لحاظ سے بہترین مرد ہوتا، اور شادی کے بندھنوں سے آزاد ہوتا، میں اسی وقت، فی الفور، تمہارے سامنے دروازہ نہ ہوتا اور گزرتے کرتے سے محبت کی بھیک مانگ رہا ہوتا، تم سے شادی کی التجا کر رہا ہوتا۔“

کئی دنوں کے بعد پہلی مرتبہ نناشا کی آنکھوں سے شکر اور نرم دلائل جذبات کے آنسو ٹپک پڑے۔ اس نے پیٹر کو ایک نظر دیکھا اور باہر نکل گئی۔

جب وہ جا چکی، پیٹر بھی پیش دلائل کی طرف بھاگ اٹھا۔ وہاں آنسوؤں کو، جو مسرت اور محبت کے مظہر

تھے، روکنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس نے اپنا سموری کوٹ کندھوں پر ڈالا، اسے یہ خیال ہی نہ رہا کہ اسے مارو
آسمانوں میں ڈال لینا چاہئیں، اور وہ اپنی ہرٹ گاڑی میں جا بیٹھا۔
”ہوٹا کیسی لینسی، کدھر چلیں؟“ کوچوان نے دریافت کیا۔

”کدھر؟“ پیٹر نے اپنے آپ سے پوچھا۔ ”میں کہاں جا سکتا ہوں؟ گلب تو یقیناً نہیں جا سکیں گے ورنہ
لوگ اسے ملے اس کے گھر۔“ محبت اور شفقت کے جن حضرات کا اسے تجربہ ہوا تھا، متاثرانے اپنے اشکوں کے بیچ
میں سے، جن ملائم اور تشکر نگا ہوں سے آخری مرتبہ دیکھا تھا، ان چیزوں کے مقابلے میں اسے تمام انسان
قابلِ رحم اور پر نصیب دکھائی دے رہے تھے۔

”گھر!“ پیٹر نے کہا اور اس بات کے باوجود کہ درج حرارت نقطہ انجماد سے دس درجے نیچے گر چکا تھا، اس
نے اپنے جوڑے چمکے سینے پر ریچھ کی پوسٹن کے کوٹ کے ٹخن کھول دیے اور مسرت کے احساس سے سرشار تازہ
ہو، پچھروں میں کھینچے لگا۔

مطیع صاف تھا اور پانا یز رہا تھا۔ گندی غلیظ سڑکوں، جن پر روشنی ناکالی تھی، اور سیاہ چھتوں کے اوپر تاریک
اور ستاروں بھرا آسمان پھیلا ہوا تھا۔ پیٹر نے جب فلکی باندھ کر آسمان کی طرف دیکھا، صرف تبھی اسے یہ احساس
ہوا کہ اب جس بلند یوں تک اس کی روح پہنچ چکی ہے، ان کے مقابلے میں تمام ارضی اشیائیں حقیر، کتنی گھٹیا ہیں۔
جب وہ آرمیڈڈ سکوائر میں داخل ہوا، اس کی نگاہوں کے سامنے ستاروں سے معمور فلک کی لامحدود وسعتیں سامنے آئیں۔
اس آکاش کے تقریباً مرکز میں پری جینسکی خیابان کے اوپر 1812 کا جسم تاباں و درخشاں دُم دار ستارہ جھنگارہ
تھا۔ یہ چاروں اطراف سے دوسرے ستاروں میں، جو آسمان پر چمک رہے تھے، محصور تھا، لیکن یہ باقی ستاروں
سے اس لحاظ سے مختلف تھا کہ یہ ان کی نسبت زمین سے کہیں زیادہ قریب تھا، اس کی روشنی سفید براق تھی اور اس کی
بے حد عظیم دم اوپر کوٹھی ہوئی تھی۔ لوگ کہتے تھے کہ یہ دُم دار ستارہ اپنی جلو میں ہر قسم کے مصائب و آفات لے کر آیا
ہے اور قریب تیار مت کا پیش خیمہ ہے۔ لیکن اس درخشاں و تاباں دُم دار ستارے نے، جس کی لمبی اور خمیرہ کن دم
تھی، پھر کے ریل میں کسی نہج کے خوف کا جذبہ نہ بھارا، اس کے برعکس وہ مسرت و شادمانی سے سرشار اور اشکوں
سے لھر پور آنکھوں سے اسے بخور دیکھ رہا تھا۔ اسے یہ سیارہ لامحدود فضا میں ناقابلِ تصور تیز رفتاری سے اپنے محور
کے گرد سفر کرنے کے بعد سیاہ آسمان میں اپنی منتخب جگہ اسی طرح گڑا نظر آ رہا تھا جیسے کوئی تیر، جو زمین میں کبھی کبھار
ہو، رکھتی رہتا ہے۔ وہ بڑی جاں فشانی سے اپنی دم سیدھی اوپر اٹھائے ہوئے تھا اور لاتعداد دیگر چمکتے ستاروں کے
مابین جھنگارہ اور اپنی سفید براق روشنی کی نمائش کر رہا تھا۔ پیٹر کو یوں لگا کہ یہ سیارہ اس کی اپنی ردا سے، جو زم و گداز
ہو چکی تھی اور بلند یوں کی جانب اٹھ چکی تھی، پوری طرح ہم آہنگ ہے۔

تیسری کتاب

1811ء کے اواخر میں مغربی یورپ کے ممالک اپنی افواج کو سر تاپا مسلح اور انہیں مختلف مقامات پر جمع کرنے میں مصروف ہو گئے۔ 1812ء میں لکھو کھا افراد پر مشتمل یہ افواج ان لوگوں میں وہ لوگ بھی، جن کے ذمے فوج کی قتل و حمل کے انتظامات کرنا اور انہیں سامان خورد و نوش فراہم کرنا تھا، شامل تھے۔ مشرق کا رخ کرنے اور روس کی سرحدوں کی جانب بڑھنے لگیں۔ روسی بھی غافل نہیں تھے، انہوں نے بھی اسی سال کے دوران میں اپنی فوجیں وہاں پہنچانا شروع کر دیں۔ بارہ جون کو مغربی یورپ کی افواج روسی سرحد پار کر گئیں اور پہلے جنگ بچ گیا۔ یہ اللہ کا دیگر ایک ایسا واقعہ جو عقل انسانی اور فطرت انسانی سے قطعاً میل نہیں کھاتا تھا، ظہور پذیر ہو گیا۔ لاکھوں انسانوں نے ایک دوسرے کے خلاف جن جرائم دسیسہ کاریوں، فریب دہیوں، بے وقافیوں، دغا بازیوں، قراچیوں، جعل سازیوں، نقلی سکے اور نوٹ بنانے کی وارداتوں، غارتگریوں، آتش زنیوں اور قتلوں کا ارتکاب کیا، وہ باعتبار تعدد ادا تے زیادہ تھے کہ روئے زمین کی تمام عدالت ہائے انصاف میں اب تک جتنے مقدمات کا اندراج ہوا ہے، گنتی کے لحاظ سے وہ بھی ان کے مقابلے میں بچ ہیں۔ لیکن جو لوگ ان جرائم کے مرتکب ہوئے، وہ انہیں جرائم سمجھتے ہی نہیں تھے۔ یہ غیر معمولی واقعہ کیوں پیش آیا؟ اس کے پس پردہ کیا اسباب کار فرما تھے؟ سوچیں بڑے بھولے بادشاہ ہیں کہ ہمیں پورے حقیقت سے یہ بتاتے ہیں کہ یہ واقعہ اس لیے رونما ہوا کیونکہ ڈیوک آف ولڈن برگ کے ساتھ زیارتوں کی گئی تھیں، براعظمی نظام پر عمل نہ کیا گیا، پولین کی خواہشات بے لگام ہو گئی تھیں، الیکساندر کے رویے میں پلک نہیں رہی تھی، سفارت کاروں سے حماقتیں سرزد ہوتی رہی تھیں، وغیرہ وغیرہ۔

اگر بات صرف اتنی تھی، پھر میٹرنش³، برومانشیف⁴ یا تالیفاں⁵ کو یہ چاہیے تھا کہ وہ اس دفتروں کے، جو دربار کے اقتدار اور شام کی ضیافتوں کے مابین آتے تھے، دوران میں تھوڑی سی تظلیف کر لیا کرتے اور سچے سچے مرا سے تحریر کر دیا کرتے، یا پھر پولین یہ کرتا کہ قلم اٹھاتا اور الیکساندر کے نام لکھتا:

"Monsieur mon frere" میں ڈیوک آف ولڈن برگ کی سحالی کی منظوری دیتا ہوں۔ "بات رفت

گزشت ہو جاتی اور نوبت جنگ تک نہ پہنچتی۔

اگر اس زمانے کے لوگ اس انداز سے سوچتے تھے، بات ہماری سمجھ میں آتی ہے۔ نیولین سمجھتا تھا کہ جنگ کا باعث انگلستان کی ریشہ دوانیاں بنی ہیں (جیسا کہ اس نے سینٹ ہیلینا کے جزیرے میں، جہاں اسے مقید کیا گیا تھا، کہا بھی تھا)، برطانوی پارلیمنٹ کے ارکان کا خیال تھا کہ نیولین کی بے لگام خواہشات جنگ کا سبب بنیں، ڈیوک آف اولڈن برگ کا خیال تھا کہ جنگ اس لیے چھڑی کیونکہ اس کے ساتھ زیادتی رد رکھی گئی تھی، تاجروں کی سوچ یہ تھی کہ جنگ کی نوبت اس لیے آئی کیونکہ براعظمی نظام یورپ کو تباہ ویراں کر رہا تھا، جرمنیوں اور آرمیہ کار بوزے فوجیوں کی رائے یہ تھی کہ جنگ اس لیے برپا ہوئی کیونکہ ان کے یہ روزگار فرہم کیا جاتا تھا، وہ لوگ، جو بادشاہت کے سرورٹی و رٹن، بالخصوص فرانس پر یوگ یوں خاندان کی حکومت کے حامی تھے، وہ ان "اعلیٰ اصولوں" کی تردید کی ضرورت کو اس کا باعث قرار دیتے تھے، اور اس عہد کے سفارت کاروں کا خیال یہ تھا کہ جنگ اس لیے ہوئی کیونکہ 1809 میں روس و آسٹریا کے مابین جو معاہدہ طے پایا تھا،⁷ سے نیولین سے ٹھیک طرح پوشیدہ نہ دیکھ جا سکا اور یہ کہ میمورنڈم نمبر 178 کی عبارت ڈھنگ سے تحریر نہیں کی جاسکی تھی۔ یہ اور ان کی طرح کی، تعداد اور بے شمار وجوہات⁸۔ تعداد کا انحصار نقطہ ہائے نظر کی فراوانی پر ہے۔ اس دور کے لوگوں کے اذہان میں آتی تھیں۔ ان کا اس انداز سے سوچنا بالکل فطری بات تھا اور ہماری سمجھ میں بھی یہ چیز آتی ہے کہ وہ اس طرح کیوں سوچتے تھے۔ لیکن جہاں تک ہم لوگوں، ان کے "اخلاف" کا تعلق ہے، ہم ایک ایسی حقیقت کا جواب دینے کو پہنچ چکی ہیں، اس کی تمام تر وسعتوں سمیت، جائزہ لے رہے ہیں اور اس کے واضح اور بھیا تک مفہوم کی شہ تک پہنچنے کی کوشش کر رہے ہیں، ہمیں یہ وجوہ نا کافی نظر آتی ہیں۔ ہمیں یہ بات قابل فہم محسوس نہیں ہوتی کہ لکھو کھا عیسائیوں نے اس لیے ایک دوسرے کو موت کے گھاٹ اتار دیا یا ایذا نہیں پہنچائیں کیونکہ نیولین کی خواہشات بے لگام تھیں، الیکساندر کا رویہ بے لوج تھا، انگلستان کی پالیسی حیدری پر مبنی تھی یا ڈیوک آف اولڈن برگ کے ساتھ زیادتی ہوئی تھی۔ ان حالات اور عام کشت و خون و تشدد کی اصل حقیقت کے مابین جو رشتہ ہونا چاہیے، ہمیں اس کا کوئی سراہا نہیں آتا۔ اگر ڈیوک کے ساتھ زیادتی ہوئی تھی، یورپ کے دوسرے کنارے کے ہزاروں لوگوں کو کیا مجبوری تھی کہ انہوں نے سمونسک اور ماسکو کو تاخت و تاراج کر دیا اور وہاں کے باشندوں کے کشتوں کے پشتے لگا دیے، اور ان کے ہاتھوں خود بھی ہزاروں کی تعداد میں مارے گئے۔

ہم لوگ، ان کے وہ اخلاف، جو سورج ہونے کا دعویٰ نہیں رکھتے اور جو تحقیق کی رو میں بہہ کر عاجلانہ یا احمقانہ نتائج خد نہیں کرتے، اس واقعے کا عام سوجھ بوجھ ہے، جو کسی ابھرنے کا شکار نہیں ہوئی، جائزہ لے سکتے ہیں اور یوں ان اسباب کو، جن کی تعداد حد و حساب سے باہر ہے، دریافت کر سکتے ہیں۔ ہم ان اسباب کی تلاش میں جتنا زیادہ گہرائی میں جائیں گے، اتنی ہی زیادہ تعداد میں ہم انہیں ڈھونڈ نکالیں گے، اور ہر سبب علیحدہ علیحدہ اسباب کا پور سلسلہ ہمیں جس طرح بالکل صحیح نظر آتا ہے، اسی طرح اگر اسے واقعے کی وسعتوں کے تناظر میں رکھ

کر لکھا جائے، تو اپنی بے ہمتی کی بنا پر اتنا ہی باطل رکھائی دینے لگتا ہے اور (اگر اسے مماثل اسباب سے نہ تھی
 یہ کیا جائے) اپنی نا طاقتی کے کارن کسی واقعے کو ظہور میں لانے سے، اتنا ہی قاصر نظر آنے لگتا ہے۔ ہمارے نزدیک
 اس سے فراموشی کا رپورل کا دوسری میقات کے لیے خدمات سرانجام دینے کے لیے رضا مندی یا نارضا مندی کا
 اظہار اس واقعے کے منظر عام پر آنے کے لیے اتنا ہی اہم تھا جتنا کہ نیولین کا دریائے دستولا سے فوجوں کو واپس
 بلانے اور اولڈن برگ کی ڈیچی بھاگ کرنے سے انکار تھا کیونکہ اگر ایک دو تین یا ہزار کارپورس اور عام سپاہی فوجی
 خدمات سرانجام دینے سے انکار کر دیتے، نیولین کی فوج میں اتنی تخفیف ہرجاتی کہ جنگ کے شعلوں کے بھڑکنے کا
 امکان ہی ختم ہو جاتا۔

مگر نیولین اس مطالبے پر کہ وہ اپنی فوجیں دریائے دستولا کے پار لے جائے، ناراضگی کا اظہار نہ کرنا اور
 اس نے اپنی افواج کو پیش قدمی کا حکم نہ دیا ہوتا، جنگ نہ ہوتی۔ لیکن اگر اس کے تمام سارجنوں نے دوسری
 میقات کے لیے فوجی خدمات سرانجام دینے سے انکار کیا ہوتا، جنگ نہیں ہو سکتی تھی۔ جنگ پھر بھی نہ ہوتی اگر
 انگریز ریشہ دوانیاں نہ کرتے، ڈیوک آف اولڈن برگ کا کوئی وجود نہ ہوتا، الیکس اند کو یہ محسوس نہ ہوتا کہ اس کی
 توہین ہوئی ہے، روس میں غیر جمہوری استبدادی حکومت نہ ہوتی، انقلاب فرانس برپا نہ ہوتا اور اپنی جگہ میں آمریت
 اور اسپاٹر نہ لایا ہوتا یا وہ تمام امور، جو انقلاب فرانس کا موجب بنے، نہ ہوتے، وغیرہ وغیرہ۔ اگر ان میں سے ایک
 سبب بھی عدم موجود ہوتا، کچھ بھی نہ ہوتا۔ چنانچہ وہ سب کے سب۔ اسباب کا جم غفیر۔ ایک ہی وقت میں ظہور پذیر
 ہوئے اور جو کچھ ہوا اس کا باعث بنے۔ چنانچہ کسی ایک امر کو جنگ کا واحد سبب قرار نہیں دیا جاسکتا بلکہ یہ اس لیے
 برپا ہوئی کیونکہ اسے برپا ہونا ہی تھا۔ راکھوں انسانوں نے اپنے انسانی جذبات اور عقل و فہم کو بالائے طاق رکھ کر
 بالکل اسی طرح اپنے برادر انسانوں کا قتل عام کرنے مغرب سے مشرق آنا ہی تھا جس طرح چند صدیاں پیشتر اپنے
 برادر انسانوں کو نوک شمشیر پر پردنے کے لیے تاتاریوں کے جتھوں نے مشرق سے مغرب کی طرف کوچ کیا تھا۔

جس طرح عام فوجی جوان کو، جسے قریباً اندازی یا جبری بھرتی کے ذریعے جنگ میں دھکیل دیا گیا تھا، اپنے
 اعمال پر کوئی اختیار نہ تھا، بیچنہ نیولین اور الیکساندر کے، بظاہر جن کے فرمان پر جنگ کے ہونے یا نہ ہونے کا انحصار
 تھا، ان میں بھی ان کی مرضی کو کوئی دخل نہیں تھا۔ حالات اس سے مختلف ہو بھی نہیں سکتے تھے کیونکہ نیولین اور
 الیکساندر (بظاہر واقعے کے ظہور پذیر ہونے کا انحصار انہیں دونوں پر تھا) کے منشا کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لیے
 سب سے زیادہ دوسرے حالات کا اسی وقت رونما ہونا ضروری تھا۔ ان میں سے اگر ایک بھی کتم وجود میں نہ آتا، یہ واقعہ
 منصفہ شہود پر نمودار نہ ہوتا۔ یہ ضروری تھا کہ لکھو کھا نشان۔ فوجی جوان، جو تو پیچ چلاتے تھے اور رسد و عسکری
 ساز و سامان ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچاتے تھے۔ جن کے ہاتھوں میں اصلی طاقت تھی، ان کے زور و ناتواں
 افراد کے منشا کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لیے رضا مند ہو جاتے اور لامحدود گونا گوں اور پیچیدہ وجوہات کی بنا پر
 اس کام کے لیے راغب کر لیے جاتے۔

تاریخ کے غیر عقلی واقعات (یعنی وہ واقعات جن کی عقلی طور پر توجیہ کرنا ہمیں ممکن معلوم نہیں ہوتا) کی تشریح و توضیح کرنے کے لیے ہمیں چار دنا چر جبریت کی طرف رجوع کرنا پڑے گا۔ ہم ان واقعات کی عقلی توضیح کرنے کی جتنی زیادہ کوشش کرتے ہیں، یہ ہمیں اتنے ہی زیادہ غیر عقلی اور ناقابل فہم معلوم ہونے لگتے ہیں۔

ہر شخص اپنی ذات کی خاطر زندگی بسر کرتا ہے، وہ اپنی آزادی کو اپنے ذاتی مقاصد کے لیے، مستعد کرتا ہے اور اسے اپنے سارے وجود میں یہ محسوس ہونے لگتا ہے کہ وہ فلاں وقت فلاں کام کر سکتا ہے یا نہیں، لیکن جو بھی وہ کسی کام کو پایہ تکمیل تک پہنچا دیتا ہے، اس پر اس کا اختیار ختم ہو جاتا ہے وہ اس پر خطہ تسلیم نہیں پھیر سکتا، بلکہ اس کا یہ کام تاریخ کا جزو بن جاتا ہے اور تاریخ میں اس کی حیثیت آرا نہیں، بلکہ پہلے سے طے شدہ ہوتی ہے۔

ہر شخص کی زندگی کے دو پہلو ہوتے ہیں۔ ایک تو اس کی نجی یا خلوتی زندگی۔ اس زندگی کے مشاغل دوسروں کی شراکت سے جتنے زیادہ بے نیاز ہوں گے، بہ اتنی ہی زیادہ آزاد ہوگی۔ دوسرے اس کی مشترک یا خلوتی زندگی۔ اس زندگی میں وہ انسانی گروہ میں ایک اکائی بن کر جیتا ہے اور جو قوانین اس کے لیے وضع کیے جا چکے ہوں، ان سے وہ سرنور و گردانی نہیں کر سکتا۔

شعوری طور پر اسان، اپنی ذات کی خاطر زندگی بسر کرتا ہے، لیکن غیر شعوری طور پر وہ بنی آدم کے تاریخی اور معاشرتی مقاصد کی تکمیل کے لیے آلہ کار کے طور پر کام کرتا ہے۔ جو فعل پایہ تکمیل تک پہنچ جاتا ہے، ناقابل تخیل ہو جاتا ہے ورنہ فعل جو نہیں اس وقت، جب لکھو کھا دیگر انسانوں کے (اسی قسم کے) افعال برپا ہوتے ہیں، منصفہ شہود پر آتا ہے، تاریخی اہمیت اختیار کر جاتا ہے۔ سماجی پیمانے میں ایک انسان جتنی زیادہ بلندی پر پہنچ جاتا ہے، انسانوں کے ساتھ اس کے تعلقات جتنے زیادہ وسیع ہو جاتے ہیں، اسے ان پر جتنا زیادہ اختیار حاصل ہو جاتا ہے، ہر فعل جو وہ سر انجام دیتا ہے، اس کا پہلے سے طے شدہ ہونا اور ناگزیر طور پر وجود میں آنا اتنا ہی زیادہ اظہار من الشئس ہو جاتا ہے۔

”بادشاہوں کے قلوب خدا کی مٹھی میں ہیں۔“

بادشاہ تاریخ کا غلام ہوتا ہے۔

تاریخ، یعنی بنی آدم کی غیر شعوری، عالم گیر اجتماعی زندگی، بادشاہوں کی زندگی کے ایک ایک پل کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرتی ہے۔



اگرچہ کسی بھی دوسرے وقت کے مقابلے میں 1812 کے ان ایام میں یورپین کو کہیں زیادہ یہ یقین ہو چکا تھا کہ اپنے مختلف ممالک کے باشندوں کے خوں بہائے جانے یا نہ بہائے جانے کا انحصار۔ جیسے کہ الیسا ندر نے اس کے نام اپنے آخری مکتوب میں تحریر کیا تھا۔ اس کی اپنی مرضی پر ہے، وہ قدرت کے اٹل قوانین کے اتنا تابع کبھی نہیں رہا تھا جتنا کہ وہ جب تھا۔ یہ قوانین اسے مجبور کر رہے تھے (جب کہ وہ خود بھی سمجھ رہا تھا کہ وہ جو کچھ کر رہا ہے اپنی

مرضی سے کر رہا ہے) کدو دنیا کے لیے، تاریخ کے لیے، عمومی طور پر دہی کچھ کرے جس کا بروئے کار لیا جانا پہلے سے معین کیا جا چکا تھا۔

اپنے برادر انسانوں کا قتل کرنے مغرب کے لوگ مشرق کی جانب بڑھے گئے۔ بعض اوقات یوں ہوتا ہے کہ مختلف واقعات اتفاق سے ایک وقت ظہور پذیر ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ اس اصول کے مطابق ہزاروں ہی چھوٹی بڑی وجوہات — براعظمی نظام کی عدم پابندی پر لعنت ملست، ڈیوک آف اوٹمن برگ کے ساتھ زیادتیاں، ہرشیا کے اندر فوجوں کی نقل حرکت (نیپولیس کے خیال کے مطابق یہ کام بزور شمشیر امن حاصل کرنے کے لیے کیا جا رہا تھا) ہرنیمسی امپراطور کی جنگ سے محبت اور اس کی معرکہ آرائی کرنے کی عادت، جو اتفاق سے اس کی قوم کے رجحانات سے مطابقت رکھتی تھی، پر شکوہ تیار یاں کرتے رہنے کا شدید جذبہ، ان تیرہ یوں پر اٹھنے والے اخراجات اور ان کی تلافی کے لیے نوائد حاصل کرنے کی ضرورت، ڈریسڈن میں اسے جن اعزازات والہ بات سے نوازا گیا، ان کے شرآدراثرات، سفارتی مذاکرات، جو معاصرین کی رائے کے مطابق حصول امن کی پر خلوص خواہش کے تحت منعقد کیے گئے تھے لیکن جنہوں نے دونوں فریقوں کی خودداری کو صرف ٹھیس پہنچائی، اور اس قسم کے ہتھیار دیگر واقعات — منظر عام پر آنے، ایک دوسرے پر منطبق ہونے اور ایک دوسرے کے ساتھ مربوط ہونے لگیں۔ یہ تمام کی تمام اس واقعے کے، جس کا پیش آنا مقدر ہو چکا تھا، ساتھ ہم آہنگ ہونے اور عین اسی زمانے میں، جب یہ واقعہ ظہور پذیر ہوا چاہتا تھا، نمودار ہونے لگیں۔

جب سیب پک جاتا اور نیچے گر پڑتا ہے۔ یہ نیچے کیوں گرتا ہے؟ کیا اس کی وجہ کشش ثقل کی قوت ہے؟ یا اس کا سبب یہ ہے کہ یہ جس تے پر لگا ہوا ہے، وہ مرجھا جاتا ہے، یا یہ دھوپ سے سوکھ جاتا ہے، یا اس کا وزن حد سے بڑھ جاتا ہے، یا ہوا سے زور زور سے ہلانے لگتی ہے یا وہ لڑکا جو اس کے نیچے کھڑا ہے، اسے کھانا چاہتا ہے؟ ان میں سے کون بھی اصل وجہ نہیں ہے۔ یہ سب مل جل کر ان حالات کا ارتکاز، جس کے تحت نامیاتی فطرت کا ہر حیاتی عمل اپنی تکمیل کرتا ہے، وجود میں لاتے ہیں۔ اور وہ ماہر نباتات، جو یہ معلوم کرتا ہے کہ سیب اس لیے گرا ہے کیونکہ صیہ دار بافتیں گل سرنگی ہیں، وغیرہ وغیرہ، اتنا ہی صحیح یا غلط ہے جتنا کہ وہ لڑکا، جو درخت کے نیچے کھڑا ہے اور کہتا ہے کہ سیب اس لیے گرا کیونکہ وہ اسے کھانا چاہتا تھا اور اس نے اس کے نیچے گرنے کی دعا مانگی تھی۔ اسی طریقے سے دوسرا، جو یہ کہتا ہے کہ نیپولین ماسکو اس لیے گیا کیونکہ وہ وہاں چاہتا تھا اور تباہ و برباد اس لیے ہوا کیونکہ الیسا اندر اس کی تباہی و بربادی چاہتا تھا، اتنا ہی صحیح یا غلط ہے جتنا کہ وہ شخص، جو یہ کہتا ہے کہ ہزاروں ٹن وزنی پہاڑی، جس کی بنیادیں کھوکھلی ہو چکی تھیں، درجولہ انواں ڈول ہو رہی تھی، محض اس لیے گری کہ اس پر ہتھوڑے سے جو آخری ضرب لگائی گئی، وہ کارگر ثابت ہوئی۔ تاریخی اہمیت کے واقعات میں نام نہاد مردانِ عظیم محض جنس (لیبل) ہوتے ہیں۔ ان کا کام واقعے کو محض نام دینا ہوتا ہے اور چٹ کی طرح نی نقب ان کا واقعے سے تعلق صرف سطحی ہوتا ہے۔ ان کا ہر فعل، جو انھیں اپنی آراء و قوت ارادی کا فعل معلوم ہوتا ہے، تاریخی مفہوم میں بالکل آزاد نہیں ہوتا بلکہ

وہ تاریخ کے پورے دھارے کے ساتھ منسلک ہوتا ہے اور ازل سے اس کا وجود میں آنا طے پا چکا ہوتا ہے۔

2

نومبر 29 مئی کو ڈریسڈن سے روانہ ہوا۔ یہاں اس نے تین ہفتے درباریوں کے، جن میں پرنس، ڈیوک، بادشاہ بلکہ ایک امپراطور بھی شامل تھا، مابین گزارے تھے۔ اپنی روانگی سے قبل اس نے امپراطور اور ان بادشاہوں اور پرنسوں کو جو اس کی دانست میں اس کی عنایات خسروانہ کے مستحق تھے، دل کھول کر اپنی نوازشات سے نوازا، تاہم جن بادشاہوں اور پرنسوں سے وہ پوری طرح مطمئن نہیں تھا، اس نے ان کے کان اٹھنے سے دریغ نہ کیا۔ اس نے آسٹریا کی امپراطور کو اپنے میرے خواہرات۔ یعنی وہ، جو اس نے دوسرے بادشاہوں سے حاصل کیے تھے۔ پیش کیے۔ وہ بڑے پیار اور شفقت سے امپراطورہ ماری لوئی سے۔ جو اس حقیقت کے باوجود کہ اس کی ایک بیوی بیٹوں میں موجود تھی، اپنے آپ کو اس کی شریک حیات سمجھتی تھی۔ بغل گیر ہو اور اسے روتے کلبلاتے (اس کے مورخین ہمیں بتاتے ہیں کہ امپراطورہ کے لیے اس کی یہ جدائی برداشت کرنا محال ہو رہا تھا) چھوڑ کر عازم سفر ہو گیا۔

اگرچہ سفارت کاروں کو امن کے امکان پر پختہ یقین تھا اور وہ اس مقصد کے حصول کے لیے بڑے جوش و خروش سے بھگ دوڑ کر رہے تھے، اور اگرچہ امپراطور نومبر نے بذات خود الیکساندر کے نام خط، جس میں اس نے اسے "Monsieur mon frere" کے لقب سے خطاب کیا تھا، تحریر کیا تھا اور اس میں اسے یقین دلایا تھا کہ وہ جنگ نہیں چاہتا اور ہمیشہ اس سے محبت کرتا اور اس کے ساتھ احترام سے پیش کرتا رہے گا۔ اس کے باوجود اس نے رخت سبز بندھا اور اپنی فوج کے ساتھ جانے کے لیے کوچ کر گیا۔ وہ ہر پڑاؤ پر تازہ احکام صادر کرتا رہا کہ اس کی فوجوں کو مغرب سے مشرق پہنچانے کے کام کی رفتار تیز سے تیز تر کر دی جائے۔ وہ اس سڑک پر، جو پوزین¹⁰ نورن¹¹، ڈس¹²، ورکنش برگ¹³ جاتی تھی، اپنے عالی مرتبت خدمت گاروں، ایڈی کاٹکوں اور ایک حفاظتی دستے کی جلو میں ایک بند بگھی میں، جسے چھ گھوڑے کھینچ رہے تھے، سفر کرتا رہا۔ ان تمام قصبوں اور شہروں کے ہزاروں لوگوں نے ڈرتے کانپتے اس کا پر تپاک خیر مقدم کیا۔

فوج مغرب سے مشرق کی جانب رواں دواں تھی اور وہ خود بھی اسی جانب جا رہا تھا۔ وہ مختلف چوکیوں پر اپنی بگھی کے چھوڑے تبدیل کرتا رہا۔ دس جون کو وہ فوج سے آلا۔ اس کے قیام کے لیے واکوہسکی جنگل میں ایک پولستانی کا ڈنٹ کی جاکیر پر بندوبست کیا گیا تھا۔ اس نے رات وہیں بسر کی۔

اگلے روز پنجولین فوج سے آگے نکل گیا اور دریائے نیمن¹⁴ کے قریب پہنچ گیا۔ اس نے دریا عبور کرنے کے لیے کوئی مناسب جگہ منتخب کرنے سے پہلے اپنی دردی اتار دی اور پولستانی دردی پہن لی۔

جب اس نے دوسرے کنارے پر قازقوں کو تعینات رکھا اور اس کی نظر گھاس کے وسیع و عریض میدانوں پر

ہری جن کے درمیان میں ماسکو کا مقدس شہر — "Moscouville sainte" — واقع ہے اور جو اسی قسم کی مملکت کا، جس قسم کی مملکت توران تھی، اور جس پر سکندر اعظم نے چڑھائی کی تھی دارا سستنت تھا، نیولین نے غیر متوقع طور پر اور فن حرب و ضرب کی حکمت عملیوں اور سفارتی تقاضوں کے علی الرغم پیش قدمی کرنے کا حکم دے دیا اور اگلے روز اس کی افواج دریائے نیمن عبور کرنے لگیں۔

بارہ جون کی صبح کو وہ تڑکے تڑکے اپنے جیسے سے، جو اس روز دریائے نیمن کے بائیں کنارے سیدھی ڈھلوان پر نصب تھا، باہر آیا اور دور بین سے، اپنی افواج کو دیکھ کر جنگل سے نکلتے اور تین پلوں پر سے، جو عارضی طور پر بنائے گئے تھے، دریا عبور کرتے دیکھنے لگا۔ فوجیوں کو امپراطور کی موجودگی کا علم تھا۔ ان کی کوشش تھی کہ وہ ایک نظر سے دیکھ سکیں۔ انھوں نے جب پہاڑی پر اپنے خیمے کے سامنے اپنے ایڈی کانگوں اور شاف کے دیگر ارکان سے الگ تھلگ اور کوٹ اور ہیٹ پہنے ایک شخص کو کھڑے دیکھا، انھوں نے اپنی ٹوبیاں نضا میں اچھال دیں اور "امپراطور رہا باد" ("Vive l'Empereur") کے نعرے بلند کرنے لگے۔ وہ صفیں باندھے موج کی طرح مسلسل یکے بعد دیگرے جنگل سے، جس نے انھیں چھپا رکھا تھا، باہر آتے گئے۔ ان کی صفوں میں صرف اسی رقت شکاف مسودار ہوتے جب وہ دریا عبور کرنے کے لیے تینوں پلوں کے قریب پہنچے۔

"اب کامیابی ہرے قدم چومے گی! جب وہ خود کسی کام میں ہاتھ ڈالتے ہیں، پھر کچھ نہ کچھ ہو کر ہی رہتا ہے۔ خدا کی قسم! وہ رہے وہ! Vive l'Empereur! تو یہ ہیں ایشیا کے گھاس کے میدان ابہر حال بڑا غلیظ ملک ہے۔ خدا حافظ، خدا تمہارا بعد کرے!... میں تمہارے لیے ماسکو کا بہترین کل محفوظ رکھوں گا! خدا حافظ! خدا تمہارا بھلا کرے!... تم نے امپراطور کو دیکھا؟ Vive l'Empereur! اگر انھوں نے مجھے ہندوستان کا گورنر مقرر کر دیا، پھر پیٹاخ، میں تمہیں در پر کشمیر بنادوں گا۔ یہ میرا تمہارے ساتھ وعدہ ہے۔ زندہ باد امپراطور! ہڑا، ہڑا۔ (ان بدعاش قاتلوں کو دیکھو کیسے دوڑے چلے جا رہے ہیں! Vive l'Empereur! دور ہے، ادھر! نظر آئے؟) میں نے واضح طور پر دوسرے جہان میں دیکھا ہے، بالکل ایسے جیسے میں تمہیں دیکھ رہا ہوں "de petit Corpore" میں نے انھیں ہمارے ایک پرانے ساتھی کو صلیب پیش کرتے دیکھا ہے۔ زندہ باد امپراطور!" کردار اور سماجی حیثیت کے اعتبار سے ایک دوسرے سے مختلف بوڑھے اور جوان بھی فوجیوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ کسی مہم کا بد تو اسے انتظار ہو رہا تھا، اس کے آغاز پر تمام چہروں پر یکساں مسرت کا اظہار ہو رہا تھا، اور وہ شخص، جو سرنگی کوٹ پہنے پہاڑی پر کھڑا تھا، اس کے متعلق گرم جوشی اور الفت دکھائی جا رہی تھی۔

تیرہ جون کو ایک قدرے کوتاہ قامت اسیل عربی گھوڑا نیولین کے پاس لایا گیا۔ وہ اس پر سوار ہوا اور اسے جینٹ روڈ اتار دیا۔ نیمن پر ایک تعمیر شدہ پل کی جانب چل پڑا۔ اس سارے عرصے کے دوران میں کانوں کے

ماسکوویوں کا شہر

"نصحا کار ہول۔ بہت نامتی کی وجہ سے بریو لین کا عرف میں گیا تھا۔

پردے پھاڑ دینے والے دجہ آفریں نعرے لگتے رہے۔ بظاہر وہ انھیں اس لیے برداشت کر رہا تھا کیونکہ اس کے جوان جس طرح گلے پھاڑ پھاڑ کر اس سے اپنی محبت کا اظہار کر رہے تھے، انھیں اس سے روکنا ناممکن تھا۔ تاہم یہ شور و غل، جو اس کا، وہ جدھر بھی جاتا، پیچھا کر رہا تھا، اسے تھکانے اور اس کی توجہ عسکری مسائل سے ہٹانے لگا تھا۔ وہ ان مسائل میں تبھی سے، جب وہ نیو نیافوج میں بھرتی ہوا تھا، گھرا اور ان پر سوچ بچار کرتا چلا آ رہا تھا۔ وہ تھوکتے جھالتے کشتیوں کے پل کے پار پہنچا، تیزی سے بائیں جانب مڑا اور اپنا گھوڑا کاٹو گاؤں کی سمت میں سرپٹ دوڑانے لگا۔ اس کے آگے آگے ہارس گارڈز کے پر جوش اور برق رفتار جوان تھے۔ ان کی مسرت کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا اور وہ اس کے آگے آگے سر بکف بھاگے جا رہے تھے اور فوجوں کے عین درمیان میں سے اس کے لیے راستہ بنا رہے تھے۔ جب وہ بہت چوڑے پاٹ کے دریا دلائیہ کے قریب پہنچا، اس نے پوستانی نیزہ بردار سواروں (unlans) کی رجمنٹ کے پاس، جو دریا کے کنارے پر متعین تھی، اپنے گھوڑے کی لٹا میں کھینچ میں

”اوپر، طور زندہ باد!“ پولستانیوں کے نعرے کی گھن گرج کسی سے کم نہ تھی۔ ان کی صفیں اسٹ گئیں اور وہ اس کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے ایک دوسرے سے دھکم پیل کرنے لگے۔

پولینے دریا کا جائزہ لیا، گھوڑے سے نیچے اترا اور ایک شہتیر پر، جو دریا کے کنارے پڑا تھا، بیٹھ گیا۔ اس کے خاموش اشارے پر اسے ایک دور بین تھما دی گئی۔ اس نے اسے دُور مسرت سے سرشار خدمت گار کی، جو بھگتا دوڑتا اس کے پاس پہنچا تھا، پشت پر نکا دیا۔ اس نے دریا کے دوسرے کنارے کو اچھی طرح دیکھا بھالا اور پھر ایک نقشے کے، جسے چند شہتیروں پر پھیل دیا گیا تھا، مطالعے میں محو ہو گیا۔ اس نے سر اٹھائے بغیر کچھ کہا اور اس کے دو ایڈی کاٹنگ سرپٹ گھوڑا دوڑاتے پوستانی نیزہ بردار سواروں کی طرف چل دیے۔

حکم یہ تھا کہ وہ دریا میں پیاب گزر گاہ تلاش کریں اور دریا پار کر جائیں۔ پوستانی سواروں کے کرنل نے جو، وجیہ و تحلیل معرخص تھا، جس کا چہرہ تھم رہا تھا، درجس کی کیفیت یبانی ہو رہی تھی، ایڈی کاٹنگ سے دریافت کیا کہ آیا اسے پیاب گزر گاہ تلاش کرنے کے بجائے اپنے جوانوں کے ساتھ تیر کر دریا پار کرنے کی اجازت مل سکتی ہے۔ صاف نظر آ رہا تھا کہ اسے یہ خوف کھائے جا رہا ہے کہ کہیں اسے انکار ہی نہ ہو جائے۔ چنانچہ اس نے ایک ایسے لڑکے کی طرح، جو گھوڑے پر سوار ہونے کی اجازت مانگ رہا ہو، گڑ گڑا کر درخواست کی کہ اسے امیر اطور کی نگاہوں کے سامنے تیر کر دریا عبور کرنے کی اجازت مرحمت کی جائے۔ ایڈی کاٹنگ نے جواب دیا، ”غالب امکان یہی ہے کہ، امیر اطور اس قسم کے بے پناہ جوش و خروش پر اپنی ناپسندیدگی کا اظہار نہیں فرمائیں گے۔“

جونہی ایڈی کاٹنگ کے منہ سے یہ الفاظ نکلے، موگھیل بوڑھے افسر نے چمکتی آنکھوں اور تھمتاتے چہرے کے ساتھ اپنا نیزہ قضا میں لہرایا، ”زندہ باد“ کا نعرہ لگایا، اپنے جوانوں کو اپنے پیچھے آنے کا حکم دیا، اپنے گھوڑے کو اپنے لگائی اور رجمنٹ دریا کی جانب بھگنے لگا۔ اس نے بے دردی سے اپنے گھوڑے کو، جو اس کے نیچے اڑیل ہو چلا تھا، ٹھوکا دیا اور دریا میں کود پڑا۔ وہ سیدھا اس طرف جا رہا تھا جہاں پانی کی گہرائی سب سے زیادہ تھی اور جہاں انتہائی

تیز موہیں جو گردش تھیں۔ سینکڑوں نیزہ بردار سوار اس کے پیچھے سر پٹ گھوڑے دوڑانے لگے۔ تیز موجوں کے بیچ میں پانی ٹٹنڈا تھا اور وہاں جانا پر خطر تھا۔ سوار گھوڑوں سے نیچے گرنے اور ایک دوسرے کے ہاتھ تھامنے لگے۔ چند گھوڑے اور چند انسان بھی ڈوب گئے۔ باقی دریا کے دوسرے کنارے پر پہنچنے کے لیے ہاتھ پاؤں مارنے لگے۔ کوئی تیر رہا تھا، کوئی کانٹھی کے ساتھ چرٹا ہوا تھا اور کسی نے گھوڑے کی ایال پکڑ رکھی تھی۔ اس حقیقت کے باوجود کہ دریا کا پایاب پاٹ صرف چوٹائی میل دور تھا، انھیں اس بات پر فخر تھا کہ وہ اس شخص کی، جو شہتیر پر بیٹھا تھا اور جو کچھ وہ کر رہے ہیں، وہ اسے دیکھ بھی نہیں رہا، نگاہوں کے سامنے تیر کر دریا عبور کر رہے اور ڈوب رہے ہیں۔ جب ایڈی کا جنگ واپس آیا، اس نے مناسب موقع منتخب کر کے اسپر طور کی توجہ پوستانوں کے اس کی ذات کے ساتھ لگاؤ کی طرف سزدوں کرائی۔ سرمئی کوٹ میں ملبوس پست قامت شخص اٹھ کر کھڑا ہو گیا، اس نے بیخ نیئے¹⁵ کو بلایا اور اس کے ساتھ دریا کے کنارے چہل قدمی کرنے لگا۔ وہ اسے احکامات سناتے لگا اور کبھی کبھار ڈوبتے سواروں پر ناپسندیدگی کی نگاہ ڈال لیتا کیونکہ وہ اس کی توجہ میں مغل ہو رہے تھے۔

یہ کوئی ایسی چیز نہیں تھی جس کا اسے پہلی بار تجربہ ہوا ہو۔ وہ جانتا تھا کہ افریقہ سے لے کر مسکوی کے گھاس کے میدانوں تک دنیا کے کسی بھی حصے میں اس کی موجودگی انسانوں کے سرگھمانے اور انھیں ایثار و قربانی کے لایعنی کارنامے سرانجام دینے پر ابھارنے کے لیے کافی ہے۔ اسے اس سلسلے میں کسی ثبوت کی ضرورت نہیں تھی۔ اس نے اپنا گھوڑا سگولایا اور اپنے پڑاؤ کی جانب چل پڑا۔

مردی کشتیاں بھیجے جانے کے باوجود چالیس سوار لہروں کی بھیٹ چڑھ گئے۔ اکثریت کسی نہ کسی طرح اس کنارے، جہاں سے وہ چلے تھے، واپس پہنچ گئی۔ کرنل اور اس کے متعدد جوان دریا پار کر گئے لیکن وہ بڑی مشکلوں سے باہر نکل سکے۔ اگر چہ ان کے ملبوسات پانی میں تر ہو چکے تھے اور ان کے اجسام کے ساتھ چپکے ہوئے تھے، وہ خونگی پانی سے باہر آئے، انھوں نے گلوں کی پوری قوت سے ”زندہ باد“ کا نعرہ لگایا اور فوراً مسرت سے اس مقام کی، جہاں فیوین موجود تھا، طرف دیکھنے لگے۔ اگرچہ پولین جا چکا تھا، پھر بھی ان کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔

شام کو دریا کا حکام جاری ہوئے۔ ایک حکم کے مطابق ان جعلی نوٹوں کو، جو دریا میں پھیلانے کے لیے تیار کیے گئے تھے، جلد از جلد پہنچایا جانا تھا۔ دوسرے حکم کے تحت ایک سیکس¹⁷ باشندے کی مزائے موت پر عمل کیا جانا تھا۔ اس شخص کو اس لیے مزائے موت دی گئی تھی کیونکہ اس کے قبضے سے ایک خط، جس میں فریبسی افواج کی تقسیم و ترتیب کے متعلق معلومات مندرج تھیں، برآمد ہوا تھا۔ ان دونوں احکام کے درمیان میں پولین نے ایک تیسرا حکم دیا کہ جو پولستانی کرنل غیر ضروری طور پر دریا میں کود گیا تھا، اسے لچن ڈائر¹⁸ میں جس کا پولین خود سراہا تھا، شامل کر لیا جائے۔

Quos vult perdere — dementat

پورا ترجمہ یہ ہے Quos (Juppitar) vult perdere dementat (prius) جسے خدا نے جاہ کرنا ہے، وہ اس کی موت مارا جاتا ہے۔

دو برس اشادس کا امپراطور فوجوں کے معائنے اور جنگی مشقوں کے انعقاد کے سلسلے میں ایک ماہ سے کچھ اوپر دلنا میں¹⁹ مقیم تھا۔ جس جنگ کی توقع ہر شخص کر رہا تھا اور جس کی تیاریوں کی خاطر امپراطور پیٹرز برگ سے آیا تھا، اس کا سامنا کرنے کے لیے، بھی کچھ بھی پاپہ تکمیل تک نہیں پہنچا تھا۔ جنگ کس طریقے سے لڑی جائے گی، اس کا ابھی تک کوئی عمومی خاکہ مرتب نہیں ہوا تھا۔ مختلف خاکے تجویز کیے گئے لیکن عمل کس پر ہوگا، زار کو ہیڈ کوارٹر پہنچے ایک ماہ سے اوپر ہو چکا تھا، لیکن کوئی فیصلہ نہیں ہو پا رہا تھا۔ تینوں افواج کے اپنے اپنے کمانڈر انچیف تھے، لیکن تمام سپاہ کا سپریم کمانڈر کون ہوگا، اس کی تقرری ابھی ہونا تھی اور امپراطور نے اس ذمہ داری کو خود سنبھالنا مناسب خیال نہ کیا۔

دن میں امپراطور کا قیام جوں جوں طویل ہوتا جا رہا تھا، جنگی تیاریوں کے لیے ہر شخص کے۔ انتظار کرتے کرتے سب لوگ تنگ آ چکے تھے۔ جوش و خروش اور دلولے میں توں توں کی آتی جا رہی تھی۔ جن لوگوں نے امپراطور کو اپنے زرخے میں لے رکھا تھا، معلوم ہوتا تھا کہ ان کی کوششوں کا محور محض یہ ہے کہ اس کے لیے عیش و عشرت کا زیادہ سے زیادہ سماں فراہم کیا جائے اور ایسے حالات پیدا کیے جائیں کہ وہ جنگ، جس کا خطرہ سردیوں پر منڈلا رہا تھا، اس کے ذہن سے نکل جائے۔

جون میں جب مائتعداد اجتماعی رقص کی محفلیں اور ضیافتیں، جن کا اہتمام پولستانی غلامدین، درباریوں اور خود زار نے کیا تھا، منعقد ہو چکیں، ایک پولستانی جرنیل کو، جو زار کے عملے میں شامل تھا، خیال آیا کہ امپراطور کے ایڈی کانگوں کو زار کے اعزاز میں ضیافت اور محفل رقص رچانا چاہیے۔ اس کی تجویز کو اس کے تمام رفقاء نے سراہا اور رائے بھی سے شرف قبولیت بخش دیا۔ ایڈی کانگوں نے چندہ کر کے رقم، اکٹھا کر لی۔ جس خاتون کے متعلق خیال تھا کہ وہ امپراطور کی منظور نظر ہے، اسے میزبانی کے فرائض ادا کرنے کے لیے منتخب کر لیا گیا۔ کاؤنٹ بے نگ سین نے، جو دلنا صوبے کا جاگیردار تھا، دعوت کے انعقاد کے لیے اپنا قصر پیش کر دیا اور بے نگ سین کے وہی مسکن نازک رجو میں ضیافت، محفل رقص، کشتیوں کی دوڑ اور آتش بازی کے لیے جون کی تیرہ تاریخ مقرر ہو گئی۔

یعنی اس روز، جب پولین نے اپنی افواج کو دریائے نیمن عبور کرنے کا حکم دیا، اور اس کے ہراول دستے نے قازقوں کو پیچھے دھکیل کر روسی سرحد عبور کی، الیکسندر اپنی شام اجتماعی رقص کی محفل میں، جس کا اہتمام اس کے ایڈی کانگوں نے بے نگ سین کے وہی قصر میں کیا تھا، گزار رہا تھا۔

یہ بڑی ذرق برق، پر شکوہ و رنجہ کن ضیافت تھی۔ صاحبان ذوق سلیم و تیز اور قدردان حضرات نے ڈنکے کی جوت کھا کر پری تمثال، روشن جمال اور خوش اندام خواتین اتنی بڑی تعداد میں شاید ہی کبھی ایک مقام پر جمع ہوئی ہوں گی۔ کاؤٹس بڑے خود ارجو دوسری روسی خواتین کے ساتھ امپراطور کے تعاقب میں پیٹرز برگ سے دلنا آئی تھی، دعوت میں موجود تھی۔ اس کا نام نہاد جیم روسی حسن پولستانی خواتین کی، جو اس کے مقابلے میں کہیں نازک اور ماغرا اندام

تھیں، آب دتاب کو گہنا رہا تھا۔ ذرا اس کی طرف ملحقیت ہوا اور اس نے سے اپنے ساتھ رقص کرنے کا اعزاز بخشا۔
 بورس دروچیسکو نے بھی، جو اپنی دلہن کو ماسکو چھوڑ آیا تھا اور خود اپنے بقول فی الحال en garçon تھا،
 وہیں موجود تھا۔ اگرچہ وہ، امپراطور کا ایڈی کاٹنگ نہیں تھا، اس نے آخر جات کے ضمن میں خاصی بڑی رقم دی تھی۔
 بورس اب مالدار آدمی تھا اور خاصے بلند مقام پر فائز ہو چکا تھا۔ سب وہ دوسروں کی سرپرستی کا جو یا نہیں تھا بلکہ اپنی
 نسل کے انتہائی ممتاز اور نمائندہ اشخاص کے ہم پلہ تھا۔

رات بھیگ چکی تھی لیکن رقص جاری تھا۔ ہیلین کو اپنی پسند کا کوئی ساتھی میسر نہیں آ رہا تھا۔ اس نے بورس کو
 پیشکش کی کہ وہ اس کے ساتھ مازور کار رقص کرنے کے لیے تیار ہے۔ ان کا جوڑا تیسرا تھا۔ ہیلین کے برہنہ شائوں
 کی آب دتاب نگاہوں کو خیرہ کر رہی تھی اور وہ سیاہ باریک جالی کے گاؤن سے، جس پر تلے سے کشیدہ کاری کی ہوئی
 تھی، باہر جھانک رہے تھے۔ بورس نے انھیں سرد مہراندہ بے نیازی سے دیکھا اور اس کے ساتھ پرانے واقف کاروں
 کے متعلق باتیں کرنے لگا۔ اس کے ساتھ ہی، اگرچہ خود اسے اس کا شعور نہیں تھا اور نہ دوسروں نے اس پر کوئی
 دھیان دیا تھا، اس نے ایک بھٹے کے لیے بھی اپنی نگاہیں زار سے، جو اسی کمرے میں موجود تھا، نہ ہٹائیں۔
 امپراطور رقص نہیں کر رہا تھا۔ وہ دروازے میں کھڑا تھا اور شفقت آمیز لہجے سے، جسے صرف وہی اچانا جانتا تھا، کبھی
 ایک اور کبھی دوسرے جوڑے کو روک لیتا تھا۔

جب مازور کار رقص کا آغاز ہوا، بورس نے دیکھا کہ ایجوٹ جنرل بالاشیف، جو ان لوگوں میں شامل تھا جنھیں صبح
 معنوں میں زار کا قرب حاصل تھا، اس کے پاس گیا اور درباری آداب کو پس پشت ڈال کر اس کے قریب جا کھڑا ہوا
 حالانکہ وہ اس وقت ایک پرستانی خاتون سے مصروف کلام تھا۔ زار نے اس خاتون سے ایک درجے کے اہل در یافت
 طلب نگاہوں سے بالاشیف کی طرف دیکھا۔ بظاہر وہ سمجھ گیا تھا کہ بالاشیف نے یہ حرکت بوجہ نہیں کی بلکہ اس
 کے پیچھے اہم وجوہ ہوں گی۔ اس نے خاتون کی جانب گردن کو ذرا سا خم دیا اور اپنے ایجوٹ جنرل کی طرف متوجہ ہو
 گیا۔ بالاشیف نے بمشکل اپنی زبان کھولی ہوئی کہ زار کے چہرے پر تحیر کے آثار نمودار ہو گئے۔ اس نے بالاشیف کا
 بازو پکڑا اور اس کے ساتھ کمر اغبور کرنے لگا۔ وہ غیر ارادی طور پر تین گز چڑا راستہ بنانا چاہتا تھا کیونکہ دونوں اطراف
 کے لوگ پیچھے ہٹتے جا رہے تھے۔ جب زار بالاشیف کے ساتھ باہر نکل رہا تھا، بورس نے دیکھا کہ آراک چیف کے²¹
 چہرے پر اضطراب کا سایہ نمودار ہو گیا ہے۔ آراک چیف نے ترجیحی نگاہوں سے امپراطور کی طرف دیکھا، اپنی
 سرخ ناک سے ذراٹوں ٹوں کی اور ہجوم میں سے نکل کر آگے بڑھا جیسے اسے امید ہو کہ امپراطور اس سے مخاطب
 ہوگا۔ (بورس پر، نکل واضح ہو گیا کہ آراک چیف بالاشیف سے حسد کرتا ہے اور اس بات پر جل، بھن رہا ہے کہ وہ
 خبر جو بظاہر بہت اہم تھی، اس کی وساطت سے نہیں، بلکہ کسی دوسرے ذریعے سے امپراطور تک پہنچی ہے۔)

لیکن زار اور بالاشیف آراک چیف کی طرف توجہ دے بغیر باہر نکل گئے۔ مرتا کیونہ کرتا، آراک چیف اپنی

شمشیر سنبھالتا اور ہر کس و نا کس کو تہر کھونڈ لگا ہوں سے دیکھنا ان کے پیچھے پیچھے چل پڑ۔ اس کے دوران دونوں کے مابین نہیں قدم کا فاصلہ تھا۔

دریں اثنا بورس نے بازو رکاز قفس تو جاری رکھا لیکن اس کا دماغ اس ادھیڑ میں میں مصروف تھا کہ بار شیف کیا خبر لایا ہے اور وہ سب سے پہلے کس طرح اس کی ٹوہ لگا سکتا ہے۔

قفس کے اس جزو کے دوران میں، جب اسے دو خواتین کا انتخاب کرنا تھا، بورس نے ہیلین کے کان میں کہا کہ وہ کاؤنٹس پاتو کا کوہ جس کے متعلق سے یقین تھا کہ وہ ہر برآمدے میں چلی گئی ہے، اپنے ساتھ ملانا چاہتا ہے۔ وہ چوبلی تختوں کے فرش پر دبے پاؤں چلتا اس دروازے میں سے، جو باغیچے میں کھلتا تھا، باہر کھسک گیا۔ وہاں جب اس نے دیکھا کہ امپراطور اور بالاشیف واپس برآمدے کی طرف آرہے ہیں، وہ وہیں کھڑا ہو گیا۔ وہ دروازے کی جانب آرہے تھے۔ بورس نے پھرتی دکھائی اور یوں ظاہر کیا جیسے اسے راستے سے ہٹنے کا موقع نہ ملا ہو، وہ چوکھٹ کے ساتھ چٹ گیا اور اس نے نہایت عزت و احترام سے اپنی گردن جھکا دی۔

امپراطور، ایک ایسے شخص کی طرح، جس کی کسی نے توہین کر دی ہو، مضطرب لہجے سے کہہ رہا تھا۔
 ”اعلان جنگ کیے بغیر روس میں داخل ہونا جب تک دشمن کا ایک بھی مسلح سپاہی میرے ملک میں موجود ہے، میں صلح نہیں کروں گا۔“

بورس کو کچھ یوں لگا کہ زار کو یہ الفاظ ادا کرتے وقت خوشی محسوس ہو رہی ہے۔ اس نے جس انداز سے یہ الفاظ کہے تھے، اس پر وہ مطمئن تھا لیکن اسے خفگی اس چیز پر تھی کہ بورس نے نادانستہ اس کی بات سن لی تھی۔
 ”خبردار، یہ بات کسی کے کانوں تک نہ پہنچنے پائے!“ زار نے چپیں بہ جبین ہو کر مزید کہا۔
 بورس سمجھ گیا کہ یہ جملہ اس کے لیے ہے۔ اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور اپنے سر کو ذرا سا جھکا دیا۔ زار دوبارہ بال روم میں چلا گیا اور بورس کوئی آدھ گھنٹہ وہیں ٹھہرا رہا۔

چنانچہ بورس وہ پہلا شخص تھا جسے یہ معلوم ہوا کہ فرانسیسی افواج دریائے نیمین عبور کر چکی ہیں۔ اس کا فائدہ یہ ہوا کہ اسے بعض اہم شخصیات کو یہ جتانے کا موقع مل گیا کہ وہ باتیں، جنہیں دوسروں سے چھپ کر رکھا جاتا ہے، اسے عام طور پر معلوم ہو جاتی ہیں اور یوں وہ ان کی نگاہوں میں اپنی قدر و قیمت مزید بڑھانے میں کامیاب ہو گیا۔



ایکایکی یہ جو خبر آئی کہ فرانسیسی دریائے نیمین عبور کر چکے ہیں، اس نے سب کو ششدر کر دیا۔ ان کے یوں ششدر ہونے کی خاص وجہ یہ تھی کہ پورا مہینہ اس قسم کی خبر کا انتظار ہوتا رہا لیکن کچھ بھی نہ ہوا، لیکن جب یہ موصول ہوئی تو اس وقت جب اجتماعی قفس کی تقریب اپنے زردوں پر تھی، خبر کی وصولی کے چند ثانیوں کے اندر اندر امپراطور کو طیش اور خفگی کے زیر اثر ایک ایسا جملہ سوچا گیا جس پر وہ بہت خوش ہوا، جو اس کے جذبات کا پوری طرح احاطہ کرتا تھا اور جو

ساقی انٹرنیٹ

PDF BOOK COMPANY



Muhammad Hushain Syakir

0305-6406067

Sidrah Tahir

0334-0120123

Muhammad Saqib Riyaz

0344-7227224

اس وقت سے رہبان خود خاص دعاء ہو گیا تھا۔ جب وہ رات کے دو بجے تقریب سے واپس لوٹا، اس نے اپنے سیکرٹری شش کوف کو بلایا اور سے حکم دیا کہ وہ افواج کے نام فرمان اور فیلڈ مارشل سالتی کوف²² کے نام ہدایت شاہی تحریر کرے۔ اس نے اصرار کیا کہ ہدایت شاہی میں مندرجہ ذیل الفاظ لازماً درج کیے جائیں

جب تک روس کی سرزمین پر ایک بھی فرانسیسی مسیح فوجی موجود ہے، میں ہرگز ہرگز صلح کا ڈوس نہیں ڈالوں گا۔

اگلے روز نیولین کے نام مندرجہ ذیل مراسلہ تحریر کیا گیا۔

محترم برادر من

کل مجھے معلوم ہوا کہ جان جاہ کے ساتھ اپنے وعدوں کی میں نے جو سختی سے پابندی کی ہے، اس کے باوجود آپ کی افواج سے روسی سرحد پار کر لی ہے۔ مجھے اس وقت پشیم برگ سے مراسلہ موصول ہوا ہے۔ اس میں کاؤنٹ بوگسٹول²³ نے مجھے یہ اطلاع دی کہ عالی جاہ اسی وقت سے، جب پرنس کوراکس²⁴ نے اپنے پاسپورٹوں کے لیے درخواست کی تھی، اپنے آپ کو میرے خلاف حالت جنگ میں تصور کرتے ہیں۔

ایک آف باسانو²⁵ نے جن وجوہات کو یہ پاسپورٹ اس کی تحویل میں دینے سے انکار کے لیے بنیاد بنایا تھا، ان کے پیش نظر میں یہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ یہ واقعہ جارحانہ کارروائی کا بہانہ بن جائے گا۔ درحقیقت میرے سفیر کو جیسا کہ اس نے خود کہا ہے، اس قسم کی درخواست کرنے کا کبھی اختیار نہیں دیا گیا تھا۔ جونہی مجھے اطلاع موصول ہوئی، میں نے اپنی ناپسندیدگی کا اظہار یوں کیا کہ اسے حکم دیا کہ وہ اپنی تعیناتی کا مقام چھوڑ کر نہ آئے۔ اگر عالی جاہ اس قسم کی غلط فہمی کی بنا پر دونوں اقوام کے افراد کا خون بہانے پر مائل نہ ہوں اور روسی سرزمین سے اپنی افواج واپس بلانے پر رضامند ہوں، تو جو کچھ ہو چکا ہے، میں اسے نظر انداز کر دوں گا اور ہمارے مابین میثاق طے پا سکے گا۔ اگر معاملہ اس کے برعکس ہوا، پھر میں اس مسئلے کا جس کا میں کسی صورت میں بھی ذمے دار نہیں ہوں، خاطر خواہ جواب دینے پر مجبور ہو جاؤں گا۔ بنی نوع انسان کو ایک جنگ کی تباہ کاریوں سے بچانا ابھی تک عالی جاہ کے ہتھار میں ہے۔

میں ہوں، وغیرہ وغیرہ

(دستخط) الیکساندر

4

چوہہ جون کی صبح دوبجے زار نے باراشیف کو بلانے اور اس کے سامنے نیولین کے نام اپنا یہ خط پڑھنے کے بعد اسے حکم دیا کہ وہ ذاتی طور پر اسے فرانسیسی امپراطور کو پہنچائے۔ جب وہ باراشیف کو رخصت ہونے کی اجازت دے

رہا تھا، اس نے ایک بار پھر اپنے اس عزم کا اعادہ کیا کہ جب تک ایک بھی مسلح دشمن روس کی سرزمین پر موجود ہے، وہ ہرگز ہرگز صبح کا ڈول نہیں ڈالے گا۔ اس نے اسے تاکید کی کہ اس نے پولین کے سامنے اس کے یہ الفاظ لڑا دہرائیں۔ ایکس اندر نے پولین کے نام اپنے خط میں ان الفاظ کا اندراج نہیں کیا تھا کیونکہ جیسا کہ اس کی طبیعت کا خاصہ تھا، وہ ہر معاملے میں خاصی احتیاط کا سناہرہ کرتا تھا۔ یہاں بھی اسے یہی احساس ہوا کہ ایک ایسے موقع پر، جب صلح جوئی کی آخری کوشش کی جارہی ہے، اس قسم کے الفاظ کا استعمال غیر دانش مندانہ ہوگا، تاہم اس نے بالاشیف کو یہ ہدایت دینے میں کوئی کسر اٹھانہ رکھی کہ وہ پولین تک اس کا یہ پیغام زبانی ضرور بالضرور پہنچا دے۔

بالاشیف ایک ہنگامی اور دوکانوں کی معیت میں چودہ جن کو صبح کا رعب سے بھی خاصا پہلے روانہ ہوا اور پورے پچھنے پر رائی کوئی پہنچ گیا۔ یہ گاؤں دریائے نیمن کے ادھر روسی سرحدوں کے اندر واقع تھا، اور یہاں فرانسیسی ایٹا ہیردنی چوکیاں قائم کر چکے تھے۔

ایک نان کمشنڈ فرانسیسی ہوا، جو تھری وردی اور روٹیں دار ٹوپی میں بیوس تھا، سفیر سے، جو قریب آتا جا رہا تھا، چل کر رکنے کو کہا۔ فوراً رکنے کے بجائے بالاشیف پیدل آرمی کی رفتار سے سڑک پر چلا رہا۔

نان کمشنڈ افسر نے تیوریاں چڑھاتے اور منہ ہی منہ میں گالیوں کی گردان کرتے اپنا گھوڑا بالاشیف کے گھوڑے کے آگے کر دیا اور یوں اس کے راستے میں رکاوٹ بن گیا۔ اس نے اپنا ہاتھ شمشیر پر ڈالا اور بدتمیزی سے چلاتے روی جرنیل سے پوچھنے لگا کہ آیا وہ بہرا ہے کہ اس سے جو کچھ کہا گیا ہے، وہ اس نے سنا نہیں۔ بالاشیف نے پنا نام بتایا۔ نان کمشنڈ افسر نے اپنے ایک جواں کو اپنے افسر اعلیٰ کی خدمت میں بھیج دیا۔ اس نے بالاشیف کی طرف حریف کوئی توجہ نہ دی اور رجسٹ کے معاملات کے بارے میں اپنے ساتھی افسروں سے باتیں کرنے لگا۔

بالاشیف کو ان لوگوں کا، جو مملکت میں اعلیٰ ترین اختیارات اور اقتدار کے مالک ہوتے ہیں، بقرب حاصل تھا۔ ابھی صرف تین گھنٹے قبل وہ زار سے گفتگو کر رہا تھا۔ طارست میں اپنے عہدے کی بنا پر اس کی جو توقیر و تکریم کی جاتی تھی، وہ اس کا عادی ہو چکا تھا۔ اسے جب اپنے ہی وطن کی سرزمین پر بہیمانہ قوت کے خصمانہ، بلکہ اس سے بھی بڑھ کر گستاخانہ اظہار سے واسطہ پڑا، تو اسے سخت دھچکا لگا۔ اسے یہ تجربہ بالکل عجیب و غریب اور انوکھا محسوس ہوا۔

بادلوں کی اوٹ سے، آفتاب نے ابھی ابھی اپنا جلوہ دکھانا شروع کیا تھا۔ ہوا تازہ اور شبنم سلو تھی۔ سڑک پر گاؤں سے مویشیوں کا ریڑ پانا جا رہا تھا۔ کھیتوں پر یکے بعد دیگرے گنگنائے مارک یوں بلندی کی طرف اٹھ رہے تھے جیسے پانی کی سطح پر جلیے نمود رہتے ہیں۔

بالاشیف اپنے گرد و پیش کا جائزہ لے رہا تھا۔ وہ گاؤں سے کسی افسر کی آمد کا منتظر تھا۔ کبھی کبھار روسی ہنگامی اور قازق سوار اور فرانسیسی ہوزار ایک دوسرے کی جانب دیکھتے دیکھتے لیکن منہ سے کچھ نہ کہتے۔

فرانسیسی ہوزاروں کا کرل اپنے دو جوانوں کی معیت میں خوبصورت اور چاق چوبند گھوڑے پر سوار چلا آ رہا

تھا۔ افسر، جوان اور ان کے گھوڑے سبھی چھیلے اور مشتیں دسرور نظر آ رہے تھے۔

یہ جنگ کا وہ ابتدائی مرحلہ تھا جب فوجی جوان تقریباً اسی طرح صاف ستھرے اور بنے سنورے نظر آتے ہیں جس طرح کہ وہ زمانہ امن کی مشقوں کے دوران میں دکھائی دیتے ہیں۔ جیسا کہ معرکے کے آغاز میں ہمیشہ ہوتا ہے ان کے ہیوسات سے ایک قسم کی عسکری دھونس چکنے لگتی ہے اور ان کی روح ہم جوتی کے جذبے سے سرشار ہونے لگتی ہے۔

فرانسیسی کرنل کو جمائی آگئی اور وہ اسے بڑی مشکل سے روک رکھا۔ تاہم اس کے اطوار شائستہ تھے، اور بظاہر اسے بالاشیف کی اہمیت کا اعتراف تھا۔ وہ اسے اپنی بیرونی جوکھوں کے پیچھے لے گیا، اور اسے بتانے لگا کہ امیر اطوار کی خدمت میں باریابی کے لیے اس کی خواہش غالباً فوراً پوری ہو جائے گی کیونکہ شاہی پڑاؤ زیادہ دور نہیں ہے۔ وہ دہلی کوئی گاؤں میں سے گزرتے فرانسیسی ہوزاردوں کے گھوڑوں، جو بندھے ہوئے تھے، ستر یوں اور جوانوں سے، جو اپنے کرنل کو سلام کرتے اور روئی وردی کو متحسب نگاہوں سے دیکھتے جاتے تھے، آگے نکل گئے۔ جب وہ گاؤں کے دوسرے سرے پر پہنچے، کرنل نے بالاشیف کو بتایا کہ ڈیوڈنٹل کمانڈر کا، جو اس کا استقبال کرے گا اور اسے منزل مقصود تک پہنچائے گا، پڑاؤ صرف سو میل آگے ہے۔

اب آفتاب پوری طرح طلوع ہو چکا تھا اور بہتر و شاداب گھاس پر پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا۔ ابھی انھوں نے شراب خانے سے آگے بمشکل پہاڑی پر چڑھائی شروع کی ہوگی کہ انھیں اپنے سامنے گھڑسواروں کا ایک دستہ، جو پہاڑی سے نیچے اتر رہا تھا، آتا دکھائی دیا۔ اس دستے کی قیادت ایک بلند قامت شخص کر رہا تھا۔ اس شخص نے تیز سرخ رنگ کا چٹا اور کٹنی دار ٹوپی پہن رکھی تھی۔ اس کے سیاہ گھونگھریا لے بال اس کے شانوں پر لٹک رہے تھے۔ وہ مشکلی گھوڑے پر، جس کا ساز و سامان دھوپ میں جگمگا رہا تھا، سوار تھا اور اس کی لائبریا ٹانگیں فرانسیسی انداز سے آگے کی طرف نکلی ہوئی تھیں۔ یہ ذی وقار شخص اپنا گھوڑا سر پٹ دوڑائے بالاشیف کی طرف آ رہا تھا۔ اس کی ٹوپی کا پھندا لہلہا رہا تھا اور جون کی تیز دھوپ میں اس کے ہیرے جو اہرات اور سنہری پٹیاں جگمگ جگمگ کر رہی تھیں۔

یہ سوار، جس نے نیکلیس، بازو بند، کلنیاں اور طلائی پٹیوں پہن رکھی تھیں اور جو تھیں انہ انداز سے اپنے جہرے، شرے پر سنجیدگی ظاہر کیے بجٹ بالاشیف کی طرف بھاگا آ رہا تھا، ابھی اس سے دس گز دور ہوگا کہ فرانسیسی کرنل نے (Laner) نے سودا بانہ انداز سے سرکوشی کی: ”شاہ نیمپز!“ یہ درحقیقت سوچا تھا جسے اب ”شاہ نیمپز“ کہا جاتا تھا۔ اگرچہ یہ بات بالکل ناقابل فہم تھی کہ آخر وہ ”شاہ نیمپز“ کیوں تھا، پھر بھی اسے اسی نام سے پکارا جاتا تھا اور اس کا نتیجہ یہ ہوا تھا کہ خود اسے بھی یقین ہو گیا تھا کہ وہ ”شاہ نیمپز“ ہی ہے اور یوں اس کے رویے میں پہلے کی نسبت کہیں زیادہ متانت اور وقار آ گیا تھا۔ اس کا اس بات پر کہ وہ حقیقتاً ”شاہ نیمپز“ ہی ہے، ایقان اتنا پختہ ہو چکا تھا کہ جب نیمپز سے اپنی روانگی سے ایک روز قبل وہ اپنی بیوی کے ساتھ اس شہر کے کلی کوچوں میں منگشت کر رہا تھا کہ چند

اطاہوی باشندوں نے اسے دیکھ کر "Vivail re!" کا نعرہ لگا دیا، وہ حسرت آنکھوں میں سے اپنی شریک حیات کی طرف متوجہ ہوا اور بولا "بے چارے، قسمت کے ارے، انھیں پتا ہی نہیں کہ میں کل انھیں دغ مفارقت دے رہا ہوں!" مگر چہ اسے اس بارے میں قطعاً کوئی شبہ نہیں تھا کہ وہ "شاہ ٹیپلز" ہے اور اس کی شہر سے روانگی پر (اس کے خیال کے مطابق) اس کی رعایا نے جس غم و اندوہ کا اظہار کیا تھا، اس پر اس نے دل ہی دل میں اس سے ہمدردی جتائی تھی، تاہم جب اسے دوبارہ فوجی خدمات سرانجام دینے کے لیے واپس بلا لیا گیا اور خاص طور پر جب ڈان سگ کے مقام پر اس کی بیوی سے آخری ملاقات ہوئی، جس میں اس کے چیل القدر برادر نسبتی نے اس سے یہ کہا: "میں نے تمہیں بادشاہ اس لیے بنایا تھا کہ تم میرے طریقے سے حکومت کرو گے، مگر کہ اپنے طریقے سے!" اس کی باپچیں کھل گئی تھیں اور اس نے خوشی خوشی اپنے فرائض سنبھال لیے تھے۔ اس گھوڑے کی مانند جسے خوب اچھی طرح پال پوسا گیا ہو لیکن جسے ضرورت سے زیادہ غریب نہ کیا گیا ہو، جو ہر وقت جتا ہوا محسوس کرنا ہو اور گاڑی کے بسوں کے، بے فرائض بھرتا ہو، وہ بھی اتنے قیمتی اور بھڑکیے ملبوسات کہ ان پر نظر نہ ٹھہر سکے، زیب تن کر کے بڑے اطمینان و سرت سے پولیٹنڈ کی سڑکوں پر یوں بگٹ بگٹ گا پھرتا تھا کہ خود اسے بھی معلوم نہیں ہوتا تھا کہ وہ کہاں جا رہا ہے اور کیوں جا رہا ہے۔

روسی جرنیل کو دیکھ کر اس نے در زگھنگریا لے گیسوؤں سمیت اپنے سر کو پیچھے کی جانب جھٹکا دیا اور شاہانہ اور پروتار انداز سے فرانسیسی کرنل پر مستفسرانہ نگاہ ڈالی۔ کرنل نے بڑے ادب کے ساتھ ہنر سمجھتی کو بلاشیف کے، جس کا وہ نام بھی صحیح انداز سے نہ لے سکا، مشن کے بارے میں بتایا۔

"ڈبیل۔ اچیف۔" بادشاہ نے (اس مشکل پر، جو کرنل کو پیش آئی تھی، اپنی خود، عنادی سے غالب آتے ہوئے) کہا۔ "جنرل، آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی!" اس نے شاہانہ کرم فرمائی کا مظاہرہ کرتے ہوئے مزید کہا۔ جونہی بادشاہ نے با آواز بلند اور تیز تیز بولن شروع کیا، اس کا سارا شاہی طعنے دھڑکے کا دھرا رہ گیا اور وہ غیر شعوری طور پر اپنے فطری لہجے میں، جس میں نیک دمانہ بے تکلفی جھلک رہی تھی، باتیں کرنے لگا۔ اس نے بلاشیف کے گھوڑے کے شانے پر ہاتھ رکھا اور کہا:

"خیر، جنرل، معلوم ہوتا ہے کہ ہم جنگ کی طرف بڑھ رہے ہیں۔" گویا اسے ایک ایسی صورت حال پر، جس کے متعلق وہ خود کوئی رائے دینے سے قاصر تھا، ملال ہو رہا ہو۔

"جناب عالی!" بلاشیف نے جواب دیا۔ "میرے آقا، اس پر اطور، جنگ کے خواہاں نہیں اور جب کہ پورے محنتی خود دیکھ سکتے ہیں... وہ "یور سمجھتی" کی تکرار کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دے رہا تھا لیکن اس کے لہجے میں بناوٹ تھی لیکن جب کسی خطاب کو بار بار دہرایا جائے اور کسی ایسے شخص کو، جس کے لیے یہ خطاب ابھی نئی اور انوکھی چیز ہو، مخاطب کیا جائے، اس قسم کی بناوٹ ناگزیر ہو جاتی ہے۔

جب موغا ”سوسیو ذبال اچیف“ کی باتیں سن رہا تھا، اس کا چہرہ احمقانہ اطمینان سے دھک رہا تھا۔ لیکن بادشاہت کی اپنی ذمے داری ہوتی ہیں، اس نے بادشاہ اور اتحادی کی حیثیت سے اپنا فرض منصبی گردانا کہ وہ اہم امور کے بارے میں الیکسندر کے سفیر سے گفت و شنید کرے۔ وہ گھوڑے سے اترا، اس نے بالاشیف کو بازو سے پکڑ کر اسے اپنے ماتحت عملے سے، جو احتراماً اس کے انتظار میں اپنی جگہ کھڑا رہا، دور لے گیا۔ وہاں وہ اس کی معیت میں آگے پیچھے پھر کاٹے لگا۔ وہ پوری کوشش کر رہا تھا کہ وہ جو کچھ کہہ رہا ہے، اہم نظر آئے۔ اس نے اسے یہ مردانہ بتایا کہ نیولین سے یہ جو مطالبہ کیا گیا ہے کہ وہ اپنی فوجیں پرشیا سے واپس بلا لے، اس پر وہ سخت ناراض ہے، خاص طور پر اس لیے کہ اس سے یہ مطالبہ اب برسر عام کیا جا رہا ہے اور یوں فرانس کے دقار کو ٹھیس پہنچاتی جارہی ہے۔

بالاشیف نے جواب دیا کہ یہ مطالبہ کسی طرح بھی تو بین آئیز نہیں کیونکہ... لیکن موغانے اسے ٹوک دیا۔
 ”تو تمہارے خیال میں امپراطور الیکسندر جارح نہیں؟“ اس نے، حتمی طور پر ٹیک دل نہ شمس سے پوچھا۔
 بالاشیف نے اسے بتایا کہ اس کے خیال میں جنگ بھڑکانے کی ذمے داری نیولین پر عاید ہوتی ہے اور اس نے اس سلسلے میں اپنے دلائل بھی دیے۔

”اٹا، مائی ڈیر جنرل!“ موغانے ایک بار پھر اسے ٹوکا۔ ”میں خلوص دل سے یہ چاہتا ہوں کہ امپراطور ان کرامت معاملہ آپس میں طے کر لیں اور یہ جنگ، جس کے شروع ہونے میں میری خواہشات کا قطعاً کوئی دخل نہیں، حتی الامکان جلد از جلد ختم ہو جائے!“ اس نے ایک ایسے ملازم کے، جو اپنے آقاؤں کے جھگڑوں کے باوجود دوسرے شخص کے ملازم سے دوستانہ تعلقات برقرار رکھنے کے لیے بے چین ہو، لہجے سے کہا۔

پھر اس نے گفتگو کا رخ گرینڈ ڈوک کی طرف موڑ دیا اور وہ اس کی صحت کے بارے میں دریافت کرنے لگا۔ اس نے میز میں اس کی صحبت میں جو پرسرت اور خوشگوار کام گزارے تھے، وہ ان کی یاد تازہ کرنے لگا۔ اچانک اسے اپنے شاہی دبے اور دقار کا خیال آگیا۔ وہ ستانت سے سیدھا تن کر کھڑا ہو گیا، اس نے وہ پوز، جو اس نے اپنی تاج پوشی کے موقع پر اختیار کیا تھا، بنالیا اور اپنا دایاں ہاتھ لہرا کر بول۔

”جنرل، میں تمہیں زیادہ دیر نہیں روکوں گا۔ خدا کرے کہ تم اپنے مشن میں کامیاب و کامران ہو!“ اور وہ اپنے کامدار سرخ چہرے اور کلنی کو کھڑا کھڑا اور اپنے جواہرات کی چمکیلی جھلک دکھاتا اپنے ماتحت عملے سے، جو اس کا مؤدبانہ انتظار کر رہا تھا، جا ملے۔

بالاشیف آگے چل پڑا۔ موغا کے الفاظ سے اس نے یہ فرض کر لیا تھا کہ اسے بہت جلد نیولین کے سامنے پیش کر دیا جائے گا، لیکن بجائے اس کے کہ اس کی بلاناخیر نیولین سے ملاقات ہوتی، جس طرح اسے بیرونی چوکیوں میں روکا گیا تھا، اسی طرح اگلے گاؤں میں مارشل داؤڈ²⁷ کی پیدہ کور کے ستر یوں نے روک لیا اور اسے مارشل داؤڈ کی خدمت میں پیش کرنے کے لیے کور کا نڈر کے ایک ایجوٹ کو بل بھیجا گیا۔

امپراطور نیپولین کی نگاہوں میں داؤ کی وہی حیثیت تھی جو الیسا ندر کے نزدیک آراک چیف کی تھی۔ اگرچہ آراک چیف کی طرح بزدل تو نہیں تھا، لیکن سخت گیر و سفاک اسی کی مانند تھا، اور اپنے حکمران سے اپنی اطاعت شعاری جتانے کا اس کی طرح اسے بھی صرف ایک ہی طریقہ آتا تھا کہ وہ دوسروں کے ساتھ خالمانہ برتاؤ کرے۔ مملکتوں کے نظام کو بروئے کار لانے کے لیے اس قسم کے لوگوں کا وجود اتنی ضروری ہے جتنی کہ فطرت کے نظام مشیت کے لیے بھیڑیوں کا۔ ان کی موجودگی اور مربراہ مملکت سے ان کا قرب کتنا ہی اٹل اور بے نکا کیوں نہ نظر آئے ایسے لوگ ہمیشہ موجود رہتے ہیں، ہمیشہ منظر عام پر نمودار ہوتے رہتے ہیں اور کبھی پسپا نہیں ہوتے۔ صرف یہی امر کہ ان کا وجود ناگزیر ضرورت بن گیا ہے، اس بات کی وضاحت کرتا ہے کہ آراک چیف جیسا سنگدل شخص، جو اپنے ہاتھوں سے لیے تڑگے فوجی جوانوں کی مونچھیں کھاڑ سکتا تھا، لیکن جس کے کمزور اعصاب، سے خطرے کا سامنا کرنے کے نااہل بنا دیتے تھے، اور جو نہ تعلیم یافتہ تھا اور نہ درباری آداب سے واقف، کس طرح الیسا ندر، جو بذات خود شریف الطبع، نیک فطرت اور زیر دستوں کا زبردست حامی تھا، جیسے حکمران کے دور میں اتنا اثر و رسوخ برقرار رکھ سکتا تھا۔

بالاشیف نے دیکھا کہ مارشل داؤ کسی کسان کے بھونپڑے میں لکڑی کے مدور پیپے پر بیٹھا ہے اور کچھ لکھنے میں مصروف ہے۔ (وہ حسابات کی جانچ پڑتال کر رہا تھا۔) ایک ایجوٹنٹ اس کے قریب کھڑا تھا۔ گاؤں میں اس کے لیے بہتر رہائش تلاش کی جاسکتی تھی لیکن مارشل داؤ وہاں لوگوں میں شامل تھا، جو ارادہ اپنی زندگی حتی الوسع کٹھن بنا دیتے ہیں تاکہ وہ اپنے کل کھرے پن کا جواز پیش کر سکیں۔ اور محض اسی وجہ سے وہ ہر وقت اتنی محنت مشقت کرتے اور یہی تاثر دیتے رہتے ہیں کہ وہ اپنا کام جلد از جلد ختم کرنا چاہتے ہیں۔ ”تم دیکھتے نہیں کہ میں گندے مندرے بھونپڑے میں پیپے پر بیٹھا کام کر رہا ہوں، ان حالات میں مجھے زندگی کے روشن پہلو کیسے سوجھ سکتے ہیں؟“ اس کے چہرے کے تاثرات کہتے دکھائی دے رہے تھے۔ اگر ن لوگوں کی طرح بھونپڑے کی طرح ہی شخص سے، جو زندگی سے لطف اندوز ہو رہا ہو، ہو جائے، تو انھیں اطمینان قلب صرف اسی صورت میں حاصل ہو سکتا ہے کہ وہ اپنی افسردہ اور غیر ختم مشغولیت کی نمائش کرتے رہیں اور ان کی ضرورت بس یہی ہوتی ہے۔ جب بالاشیف کو اندر لایا گیا، داؤ نے بھی اسی انداز سے تسکین حاصل کرنا چاہی۔ جونہی روسی جرنیل نے اندر پاؤں دھرنا، وہ در بھی اپنے کام میں منہمک ہو گیا۔ اس نے اپنے جیشے کے اوپر سے بالاشیف کے چہرے پر، جسے صبح کے حسن اور موعا کے ساتھ گفتگو نے گرمادیا تھا، نظر ضرور ڈالی لیکن وہ نہ اٹھ کر کھڑا ہوا ورنہ اپنی جگہ سے سرکا، اس نے بس ناگوار انداز سے تیوریں چڑھائیں اور تحقیر آمیز انداز سے طرح طرح کی شکلیں بنانے لگا۔

داؤ نے جب دیکھا کہ اس طریقے سے بالاشیف کا جواب مقبول ہوا ہے، اس کا اس نے برا منایا ہے، اس نے

پہنسا اور اٹھا اور سرد مہری سے اس سے پوچھا کہ وہ کیا چاہتا ہے۔

بالاشیف نے یہ سوچتے ہوئے کہ اس کا اس انداز سے استقبال محض اس لیے ہوا کیونکہ داؤد کو بہ معلوم نہیں کہ وہ اس پر اسی انداز کا ایکسٹنٹ جنرل ہے اور اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ وہ پولیس کی خدمت میں بطور سفارت کار حاضر ہوا ہے، اس نے یہ غلط اسے اپنے عہدے اور مشن سے آگاہ کیا۔ داؤد نے جب یہ سنا، بالاشیف کی توقع کے برعکس اس کی بد مزاجی اور بد تمیزی میں اور بھی اضافہ ہو گیا۔

”کہاں ہے تمہارا سرا سدا؟“ اس نے پوچھا۔ ”داؤد، یہ مجھے دے دو، میں اسے اس پر اطور کی خدمت میں بھجودوں گا۔“

بالاشیف نے جواب دیا، ”مجھے حکم ہے کہ میں اسے خود اس پر اطور تک پہنچاؤں۔“
”تمہارے پر اطور کے احکام کی تعمیل تمہاری فوج میں ہوتی ہوگی،“ داؤد نے کہا، ”لیکن یہاں تمہیں وہی کرنا پڑے گا جو تمہیں کہا جاتا ہے۔“

داؤد نے اپنے ایکسٹنٹ کو حکم دیا کہ وہ ڈیوٹی افسر کو بلا لائے۔ اس کا انداز کچھ اس قسم کا تھا جیسے وہ روسی جرنل کو مزید باور کرانا چاہتا ہو کہ وہ بیہادہ قوت کے رحم و کرم پر ہے۔

بالاشیف نے وہ پیکٹ، جس میں زر کا خط تھا، نکالا اور اسے میز پر رکھ دیا۔ (دروازے کا ایک تختہ، جس کے قلابے ابھی ساتھ لٹک رہے تھے، دو پہیوں کے اوپر رکھ دیا گیا تھا اور میز کا کام دے رہا تھا۔) داؤد نے پیکٹ اٹھا لیا اور اس پر تحریر پڑھنے لگا۔

”آپ میری عزت کریں، نہ کریں، آپ کو پوری آزادی ہے، لیکن اگر آپ اجازت دیں تو میں یہ عرض کروں گا کہ مجھے یہ فخر حاصل ہے کہ میں اس پر اطور کا ایکسٹنٹ جرنل ہوں۔“

داؤد نے خاموشی سے بالاشیف پر اچھٹی نظر ڈالی۔ صاف معلوم ہو رہا تھا کہ روسی چٹھی کے چہرے پر جو تکبر اور پریشانی کے آثار ہو رہے تھے، وہ ان سے خوب عطف اندوز ہو رہا ہے۔

”تمہارے ساتھ تمہارے مرتبے کے مطابق سلوک کیا جائے گا،“ داؤد نے کہا، پیکٹ اپنی جیب میں ڈالا اور پھر سے ہارنگل گیا۔

ایک منٹ بعد مارشل کا ایکسٹنٹ دکاسٹ (De Castes) آیا اور وہ اسے اس مکان میں، جو اس کے لیے مخصوص کیا گیا تھا، لے گیا۔

بالاشیف نے اس روز مارشل کے ساتھ اسی سائبان تلے اور دو پہیوں کے اوپر رکھے ہوئے تختے پر کھانا کھایا۔ اگلے روز داؤد صبح سویرے گھوڑے پر سوار ہوا لیکن روانگی سے چند منٹ پہلے بالاشیف کو بلا بھیجا اور واجب التعمیل انداز سے اسے بتایا کہ وہ جہاں سے، وہیں ٹھہرا رہے، ہاں اگر سامان ڈھونے والے قافلے کو کوچ کا حکم ملے، وہ بھی اس کے ساتھ چل پڑے۔ اور موسیو دکاسٹ کے علاوہ کسی دوسرے شخص کے ساتھ ہم کام ہونے کی کوشش

نہ کرے۔

چار روز گزر گئے۔ اس عرصے کے دوران میں کوئی بھی شخص اس کے قریب نہ پہنکا اور وہ بوریٹ کا شکار ہوتا رہا۔ وہ درہ کراچی ہے، بس اور بے وقعتی پر کڑھتا رہا۔ موجودہ صورت حال میں اسے اس کی شدت خاص طور پر اس لیے بھی محسوس ہوئی، کیونکہ وہ حال ہی میں جس علاقے سے آیا تھا، وہاں وہ یہاں کے مقابلے میں اختیار اور دبے کا مالک تھا۔ اور اسے ان ایام کے دوران میں مارشل کے ساز و سامان اور فرانسیسی فوج کے ساتھ جواب سارے ضلع پر قابض ہو چکی تھی، ہارپار کوچ کرنا پڑا آخر کار اسے دلنا جواب فرانسیسیوں کے قبضے میں تھا۔ پہنچا دیا گیا۔ وہ شہر میں دوبارہ اسی دروازے سے، جس میں سے گزر کر دو چار روز قبل روانہ ہوا تھا، داخل ہوا۔

اگلے روز امپراطور کا ایک مصاحب، کاؤنٹ ڈوئیغے (Turenne)، بالاشیف کو یہ اطلاع دینے آیا کہ امپراطور نیولین اسے شرف ملاقات بخشنا چاہتے ہیں۔

چار دن قبل اس مکان کے سامنے، جس میں بالاشیف کو پہنچایا گیا تھا، پری ابراؤینسکی رجمنٹ کے سنٹری پہرے پر تعینات تھے، اب وہاں دو لمبے تڑنگے فرانسیسی سپاہی ایستادہ تھے۔ ان کے سروں پر روئیں دار ٹوپیاں اور احسام پر نیلی وردیاں، جن کے سامنے کے ٹن کھلے ہوئے تھے، تھیں، جب کہ ہونر روں اور پولستانی نیزہ بردار سواروں کا ایک حفاظتی دستہ، اور ایڈری کاٹکوں، ادائی خادموں اور جرنیلوں پر، جو زرق برق وردیوں میں ملبوس تھے، مشتمل ایک جتھا، جو نیولین کے باہر آنے کا منتظر تھا، اس کے سواری کے گھوڑے اور اس کے مملوک رستن کے ²⁸ گرد گھیر ڈالے کھڑا تھا۔ نیولین نے بالاشیف کو اسی مکان میں، جہاں سے الیکساندر نے اسے اپنے مشن کے لیے بھیجا تھا، ملاقات کے لیے بلایا۔

6

اگرچہ بالاشیف شاہی شان و شوکت کا عادی تھا، لیکن جو کز و فراز ٹھاٹھاٹ باٹ اسے نیولین کے دربار میں نظر آئے، انھیں دیکھ کر اس کی غلی ہو گئی۔

کاؤنٹ ڈوئیغے سے بڑے استقبالیہ کمرے میں لے گیا۔ وہاں جرنیلوں، مصاحبوں اور پولستانی عمائدین۔ ان میں اکثر کو بالاشیف روسی امپراطور کے دربار میں دیکھ چکا تھا۔ کاظم غفر نیولین کا انتظار کر رہا تھا۔ ڈوئوک (Duroc) نے اسے بتایا کہ نیولین کھڑ سواری پر جانے سے قبل روسی جرنیل سے ملاقات کرے گا۔

چند منٹ بعد ڈیوٹی پر موجود مصاحب استقبالیہ کمرے میں آیا۔ اس نے شائستگی سے اپنی گردن کو خم دیا اور بالاشیف سے اپنے پیچھے آنے کو کہا۔

بالاشیف چھوٹے استقبالیہ کمرے میں داخل ہوا۔ اس کا ایک دروازہ اس سٹڈی روم میں، جہاں سے وہ روسی امپراطور سے رخصت ہوا تھا، کھلتا تھا۔ وہ ایک دو منٹ کھڑ انتظار کرتا رہا۔ دروازے کی دوسری جانب کسی کے

تیز چلنے کی آواز سنائی دی۔ مصاحب نے بہ عجلت دروازے کے دونوں پٹ کھول دیے اور خود مودب کھڑا ہو گیا۔ کمرے میں مکمل سکوت طاری تھا۔ پھر سنڈی روم میں کسی اور شخص — یہ نبولین تھا — کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ اس چال میں غزم اور استقلال تھا۔ نبولین ابھی ابھی گھڑ سواری کا لباس پہنتے سے فارغ ہوا تھا۔ وہ نلی وردی میں لمبوس تھا۔ اس کے سینے کے بٹن کھلے ہوئے کی وجہ سے وردی کے نیچے سفید واسکٹ، جواتنی لمبی تھی کہ اس کی ساری گون توند اس میں چھپ گئی تھی، نظر آنے لگی تھی۔ اس کی برجس ہرن کی کھل کی تھی اور وہ اس کی چھوٹی چھوٹی ناگوں کی فرہ رانوں سے چمکی ہوئی تھی۔ اس کے ہنسی بوٹ پنڈلیوں تک پہنچتے تھے۔ بظاہر اس کے چھوٹے چھوٹے باؤں پر ابھی ابھی کنگھی پھیری گئی تھی لیکن لنوں کا ایک گچھا اب بھی اس کی کٹھ وہ پیشانی کے درمیانی حصے پر حصول رہا تھا۔ اس کی فرہ سفید گردن اس کی وردی کے سیاہ کالر کے اوپر سیدھی کھڑی تھی اور اس کے جسم سے بوڑی کون کی ہلک آ رہی تھی۔ اس کے بھرے بھرے چہرے پر، جس پر اب بھی قدرے شباب جھلک رہا تھا، نمایاں ٹھوڑی سمیت، جو تاثر جھلک رہا تھا، وہ اس امر کی ٹیڑھی کر رہا تھا کہ وہ بکمال تملطف و مہربانی، جوش ہی شان و شکوہ کے عین مطابق تھا، خوش آمدید کہہ رہا ہے۔

وہ تیز تیز قدم اٹھاتے، ہر قدم پر پاؤں کو زرا سا جھٹکا دیتے اور اپنا سر قدرے پچھلی جانب ڈھلکاتے اندر داخل ہوا۔ اس نے اپنے چوڑے چمکے اور دبیز شانے، چھان اور توند غیر شعوری طور پر آگے کو جھکائے ہوئے تھے۔ وہ کوتاہ قامت، فرہ بند، م اور گول منول ضرور تھا لیکن اس کے پورے سراپے پر وہ رعب اور شادانہ وقار جھلک رہا تھا جو ایسے اشخاص میں، جو چالیس کے پینے میں ہوتے ہیں، درآسودگی کی زندگی گزار رہے ہوتے ہیں، عام نظر آتا ہے۔ یہ بھی حیاں تھا کہ وہ اس روز خاص طور پر ہشاش بشاش تھا۔

ہارشیف مودب نہ انداز سے دوزانو ہو گیا اس کے جواب میں اس نے پنی گردن کو خم دیا، ایک لمحے کی تاخیر کے بغیر اس کے پاس گیا اور ایک ایسے شخص کی طرح، جو اپنے وقت کا ایک ایک لمحہ بہت قیمتی سمجھتا ہے لیکن جو کچھ اس نے کہا ہوتا ہے، اسے تیار کرنا اپنی شان کے خلاف تصور کرتا ہے کیونکہ اسے یقین ہوتا ہے کہ جو کچھ وہ کہہ رہا ہے، ٹھیک کہہ رہا ہے اور اچھے انداز سے کہہ رہا ہے، باتیں کرنے لگا۔³⁰

”جنز، bon jour“ اس نے کہا۔ ”آپ اپرا طور ایسا اندر کا جو خط لائے ہیں، وہ مجھے مل گیا ہے اور آپ سے مل کر مجھے بہت خوشی ہوئی ہے۔“

اس نے اپنی غنائی آنکھوں سے بالاشیف کے چہرے کا سرسری جائزہ لیا اور فی الفور اس سے آگے دیکھنے لگا۔ صاف نظر آ رہا تھا کہ اسے جرنیل کی شخصیت میں قطعاً کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ اسے دلچسپی صرف اس بات سے تھی جو اس کے اپنے دل میں گردش کر رہی تھی۔ اس کی ذلت سے باہر جو چیزیں تھیں، وہ اس کے لیے کسی اہمیت کی حامل نہیں تھیں کیونکہ وہ یہ سمجھتا تھا کہ دنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے، اس کا انحصار صرف اس کے منشا پر ہے۔

”مجھے جنگ کی خواہش ہے اور نہ میں نے کبھی اس کی خواہش کی تھی،“ اس نے کہا۔ ”لیکن یہ مجھ پر ٹھوکی گئی ہے۔ اب“ (اس نے لفظ پروردہ) ”بھی میں ہر وہ وضاحت، جو آپ پیش کرنا چاہیں، سننے کے لیے تیار ہوں۔“ اور وہ غیر مبہم اور بیشع انداز سے ان وجوہات کو، جو اس کی روسی حکومت سے ناخوشی کا باعث بنی تھیں، بیان کرنے لگا۔ فرانسیسی امپراطور کے معادل، پرسکون اور دوستانہ لہجے سے اندازہ لگاتے ہوئے بالاشیف کو پکا یقین ہو گیا کہ وہ امن کے لیے بے قہر رہے اور مذاکرات کا ڈوں ڈالنا چاہتا ہے۔

”عالی جاہ، امپراطور، میرے آقا۔“ جب نیولین اپنی بات ختم کر چکا اور روسی سفیر کی طرف مستفسر انداز سے دیکھنے لگا، بالاشیف نے کہنا شروع کیا۔ تاہم امپراطور نے جس انداز سے اس کے چہرے پر نظریں گاڑ رکھی تھیں، اس سے وہ گزر بڑا گیا اور بہت دن پہلے اس نے جس تقریر کا نقشہ اپنے ذہن میں جمایا تھا، وہ اس کے دماغ سے نکل گئی ”میں بوکھلائے ہوئے ہوں۔ اپنے آپ کو سنبھالو۔“ نیولین کی ٹکٹکی کہتی دکھائی دے رہی تھی جب کہ وہ ایک ایسی مسکراہٹ، جو بمشکل نظر آرہی تھی، اپنے چہرے پر سجائے بالاشیف کی شمشیر اور روسی کو دیکھ رہا تھا۔

بالاشیف نے اپنی بوکھلاہٹ پر قابو پالیا اور بولنے لگا۔ اس نے بتایا کہ کوراکن نے اپنے پاسپورٹوں کا جو مطالبہ کیا تھا، امپراطور ایکساندر کی نظروں میں وہ جنگ کا مناسب سبب نہیں بن سکتا، یہ کہ کوراکن نے یہ قدم اپنی مرضی سے اٹھایا تھا اور اس بارے میں امپراطور نے اسے کوئی اختیار نہیں دیا تھا، یہ کہ امپراطور ایکساندر جنگ نہیں چاہتا اور اس کے انگلستان کے ساتھ کوئی ردابط نہیں ہیں۔

”ابھی۔ تو نہیں ہیں!“ نیولین نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔ پھر سے غالباً یہ اندیشہ لاحق ہو گیا کہ کہیں اس کے دلی جذبات آشکار نہ ہو جائیں، اس نے تیوری چڑھائی اور گردن کو ذرا سی جنبش دی جو اس بات کی علامت تھی کہ بالاشیف اپنی بات جاری رکھ سکتا ہے۔

بالاشیف جب وہ سب کچھ، جو اسے کہنے کی ہدایت کی گئی تھی، کہہ چکا، اس نے مزید یہ کہا کہ امپراطور ایکساندر امن کے خواہش مند ضرور ہیں لیکن وہ کسی قیمت پر مذاکرات کے لیے تیار نہیں ہوں گے جب تک ان کی ایک شرط پوری نہ کر دی جائے اور وہ شرط یہ ہے۔۔۔ ”یہاں بالاشیف ڈگر لگا گیا۔۔۔“ وہ الفاظ، جو امپراطور نے (نیولین کے نام) اپنے خط میں تحریر نہیں کیے تھے لیکن سالتی کوف کے نام اپنے فرمان میں باادھر درج کرائے تھے، یاد آ گئے۔ اس نے بالاشیف کو حکم دیا تھا کہ وہ الفاظ کو زبانی اس تک پہنچا دے۔ الفاظ ”جب تک ایک بھی مسلح دشمن روس کی سرزمین پر موجود ہے۔۔۔“ بلاشبہ بالاشیف کے ذہن میں گردش کر رہے تھے، لیکن کسی جھجک جذبے نے اس کی زبان پر آ کی ہوئی بات کاٹ دی۔ چاہنے کے باوجود وہ ان الفاظ کو ادا نہ کر سکا اس نے تال کیا اور پھر بولا: ”اور وہ شرط یہ ہے کہ فرانسیسی فوج دریائے نیلین کے پار چلی جائے۔“

بالاشیف نے یہ آخری الفاظ جھینپتے جھینپتے کہے تھے اور نیولین سے اس کی یہ جھینپ پوشیدہ نہ رہ سکی۔ اس کا چہرہ پھڑکنے اور اس کی بائیں ٹانگ کی پٹلی باقاعدہ آہنگ کے ساتھ لرزنے لگی۔ جہاں وہ کھڑا تھا وہاں سے بیک

قدم اٹھائے بغیر وہ پہلے سے بند تر اور تیز تر لہجے سے بولنے لگا۔ اس کے بعد اس نے جو تقریر کی، اس کے دوران میں بلاشیف، جس نے ایک سے زیادہ مرتبہ اپنی نظریں جھکائیں، یہ دیکھے بغیر نہ رہ سکا کہ نیولین کی باتیں پنڈن رزروئی سے اور جوں جوں اس کی آواز بلند تر ہوتی جا رہی ہے، توں توں اس لرزش میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔

”میں امپراطور الیکسندر سے کم امن کا متمنی نہیں،“ اس نے کہنا شروع کیا۔ ”اس مقصد کے حصول کے لیے وہ کون سا دقیقہ ہے جو میں نے گزشتہ اٹھارہ مہینوں کے دوران میں فردگزاشت کیا ہے؟ میں ٹھہرہ ماہ سے وضاحت کا انتظار کر رہا ہوں۔ لیکن مذاکرات کا آغاز کرنے کے لیے مجھ سے کس چیز کا تقاضا کیا جا رہا ہے؟“ اس نے بھویں ٹیکڑتے اور ننھے منے فریبہ ہاتھ سے استفسار اندازہ اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”غالی جاہ، یہی کہ آپ اپنی افواج دریائے نیمن کے پار لے جائیں،“ بلاشیف نے کہا۔

”نیمن کے پار؟“ نیولین نے دہراتے ہوئے کہا۔ ”تو تم چاہتے ہو کہ میں نیمن کے پار چلا جاؤں۔“

”صرف نیمن کے پار؟“ نیولین نے سیدھے بلاشیف کی طرف دیکھتے ہوئے ایک بار پھر دہرایا۔

بلاشیف نے مؤدبانہ انداز سے سر جھکا دیا۔

چار ماہ قبل اس سے مطالبہ کیا گیا تھا کہ وہ اپنی فوجیں پومیرنیا سے نکال لے اور اب اس سے صرف یہ کہا جا رہا تھا کہ وہ نیمن کے پار چلا جائے۔ نیولین بہ عجلت پیچھے ہٹا اور کمرے میں چکر کاٹنے لگا۔

”تم کہتے ہو کہ مذاکرات شروع ہونے سے پہلے میں اپنی فوجیں نیمن کے پار لے جاؤں لیکن دو ماہ پیشتر

مجھ سے مطالبہ کیا گیا تھا کہ میں ³²اور ³³دوستولا کے پار چلا جاؤں اور پھر بھی تم مذاکرات کے لیے رضامند ہو؟“

وہ چپ چاپ لمبے لمبے ڈگ بھرتا کمرے کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک پہنچ گیا اور دوبارہ بالا

شیف کے سامنے آکھڑا ہوا۔ بلاشیف نے دیکھا کہ اس کی باتیں پنڈلی پہلے کی نسبت کہیں زیادہ پھڑک رہی ہے

اور اس کے چہرے پر جو درشتی جھلک رہی تھی، اس سے یوں معلوم ہوتا تھا جیسے وہ پتھر کا بنا ہوا ہو۔ اس کی یہ حویاں

پنڈلی لر رہی تھی، خود اسے اس کا شعور تھا۔ ”میری باتیں ٹانگ کا لرزنا میرے نزدیک بہت بڑی علامت ہے،“

اس نے ایک مرتبہ کہا تھا۔

”اور اور دوستولا کے پار سپاہی اختیار کرنے کے مطالبات کسی پرنس آف باڈن سے تو کیے جاسکتے ہیں، مجھ

سے نہیں،“ نیولین نے تقریباً یوں چیخ کر کہا کہ خود اسے بھی حیرانی ہوئی۔ ”اگر تم پیٹرز برگ اور ماسکو طشتری میں

رکھ کر مجھے پیش کر دو میں اس قسم کی شرائط تسلیم نہیں کر دوں گا۔ تم کہتے ہو کہ یہ جنگ میں نے شروع کی ہے؟ لیکن ہم

مسا سے سب سے پہلے کون فوج کے ساتھ آکر ما؟ امپراطور الیکسندر، نہ کہ میں جب میں کروڑوں کا خرچہ کر چکا

ہوں، جب تم انگلستان کے ساتھ اتحاد کر چکے ہو، جب تمہاری پوزیشن کمزور ہے، تم مجھے مذاکرات کی پیشکش کرنے

لگے۔ تم مجھے مذاکرات کی پیشکش کرنے لگے! لیکن تمہارا انگلستان کے ساتھ اتحاد کرنے کا مقصد کیا ہے؟ اس نے

تسکین دیا کیا ہے؟“ وہ بیہم بولت چلا گیا۔ امن میں کیا فائدہ مضرتھے، صاف نظر آ رہا تھا کہ وہ نہ تو اس بارے میں

تفصیل سے کوئی بات کرنا چاہتا تھا ورنہ اس کے امکانات اس کی گفتگو کا حصہ تھے، بلکہ وہ اپنے پرزور اور جلالی بیان سے صرف یہ ثابت کرنے پر علا ہوا تھا کہ اس کا موقف سو فیصد درست ہے، وہ بہت طاقتور ہے، یہ کہ الیسا ندر غلطیوں کا ارتکاب کر رہا ہے اور منافقت برت رہا ہے۔

اس نے اس گفتگو کا آغاز اس واضح ارادے سے کیا تھا کہ وہ یہ بتائے گا کہ اس کی پوزیشن بہت مضبوط اور ذائقہ ہے لیکن اس کے باوجود وہ یہ عندیہ دے گا کہ وہ مذاکرات کے لیے آمادہ ہے۔ لیکن جب اس نے یوں شروع کیا، جوں جوں اس کی گفتگو آگے بڑھتی گئی، اس کے مفہوم پر اس کا کنٹرول کم سے کم تر ہوتا چلا گیا۔ ماریٹ اب اس کی باتوں کا سارا مقصد صرف اپنی رات کو آسمان پر چڑھنا اور الیسا ندر کی تذلیل کرنا رہ گیا تھا۔ حالانکہ یہ وہ چیزیں تھیں جن کا مذاکرات کے آخر میں وہ ہرگز تاثر دینا نہیں چاہتا تھا۔

”میں نے سنا ہے کہ تم نے ترکوں سے بھی صلح کر لی ہے۔“

بالاشیف نے اثبات میں سر جھکا دیا۔

”صلح نامہ طے پا چکا ہے۔۔۔“ اس نے کہنا شروع کیا۔

لیکن نیولین نے اسے بولنے کا موقع نہ دیا۔ وہ بظاہر تمام گفتگو خود کرنا چاہتا تھا اور وہ اسی طاقتور لبّی اور بے قید جھجھاہٹ کے ساتھ، جوان لوگوں کا، جن کا ظفر مندی کی وجہ سے دماغ لٹھکانے پر نہیں رہتا، و تیرہ بن جاتا ہے، بولتا چلا گیا۔

”ہاں میں جانتا ہوں کہ تم نے مولداویا اور لاکیا³⁶ حاصل کیے بغیر ترکوں سے صلح کر لی ہے۔ جس طرح میں نے تمہارے امپراطور کو فن لینڈ دیا تھا، اسی طرح میں یہ سو بجات بھی ان کی تحویل میں دے سکتا تھا۔ ہاں، بالکل۔“ اس نے اپنا سلسلہ کلام جاری رکھا۔ ”میں نے امپراطور الیسا ندر سے مولداویا اور لاکیا کا وعدہ کیا تھا اور میں وہ انہیں دے بھی دیتا، لیکن اب انہیں ان خوبصورت سو بجات سے محروم رہنا پڑے گا۔ وہ انہیں اپنی مملکت میں شامل کر سکتے تھے اور ایک ہی عہد حکومت میں روس کی سرحدوں کی خلیج³⁷ بو تھنبا³⁸ سے دریائے ڈینیوب کے منابع تک توسیع کر سکتے تھے۔ کیترین اعظم بھی اس سے زیادہ کچھ نہیں کر سکتی تھی۔“ نیولین نے کہا۔ وہ کمرے میں چکر کاٹ رہا تھا اور اس کی بیجانی کیفیت میں لفظ بہ لفظ اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ وہ بالاشیف کے سامنے بالکل وہی الفاظ، جو اس نے ٹلٹ میں خود الیسا ندر سے کہے تھے، دہرا رہا تھا۔ ”یہ سب کچھ نہیں میری دوستی کے طفیل حاصل ہو جاتا۔ اے، کیا مہتمم بالشان عہد حکومت ہوتا، کیا مہتمم بالشان عہد حکومت ہوتا؟“ اس نے یہ الفاظ بار بار دہرائے، پھر وہ رکا، جیب سے نسوار کی سنہری ڈیانا نکالی، اسے اپنی ناک کے نیچے لے گیا، حریصانہ سے سو گھٹا اور زور سے چھینک ماری۔ ”امپراطور الیسا ندر کا عہد حکومت کتنا مہتمم بالشان ہوتا؟“

اس نے بالاشیف کی طرف یوں دیکھا جیسے اسے اس پر برا ترس آرہا ہو اور جب موخر الذکر نے کچھ جواب دیے کی کوشش کی، اس نے آنا فانا دوبارہ اسے ٹوک دیا۔

”آخر انہیں کس چیز کی خواہش یا جستجو ہے جو انہیں میری دوستی کے مفیل نہیں مل سکتی تھی؟“ پولین نے یوں کدھے چکاتے ہوئے مطالبہ کیا جیسے یہ جیستان ان کی سمجھ سے بالا ہو۔ ”لیکن نہیں، انہوں نے میرے دشمنوں کو اپنے ارد گرد اکٹھا کرنے کو ترجیح دی اور کن لوگوں کو؟“ شٹائینوں کو،⁴⁰ آرم فیلتوں کو،⁴¹ بے ہنگ سینوں کو،⁴² ونٹ ٹسکے روڈیوں کو⁴³ اٹھائیں۔ وہ غدار، جسے اپنے ملک سے جلا وطن کیا گیا، آرم فیلت۔ عیاش اور سازشی، ونٹ ٹسکے روڈے غدار راہسی شہری، بے ہنگ سین۔ باقیوں سے ذرا بہتر فوجی لیکن بہر حال نا اہل، جس سے 1807 میں کچھ نہ ہو سکا اور جسے دیکھ کر امپراطور الیکساندر کے ذہن میں مہیب یادیں تازہ ہونا چاہئیں۔۔۔ چھیں، اگر یہ اشخاص لائق فائق ہوتے، مجھے کوئی اعتراض نہ ہوتا، کیونکہ پھر ان کی صلاحیتوں سے فائدہ اٹھایا جاسکتا تھا،“ پولین نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ اس کے ذہن میں خیالات و دلائل کی، جو اس کی نظروں میں اس کا حق یا قوت (اس کے نزدیک یہ دونوں یک ہی چیز کے دو رخ تھے) ثابت کر رہے تھے، اتنی تیزی سے یلغار ہو رہی تھی کہ اس کے الفاظ اس (خیالات و دلائل) کا ساتھ نہیں دے پا رہے تھے۔ ”لیکن وہ تو یہ بھی نہیں ہیں۔ وہ نہ جنگ میں کام آسکتے ہیں اور نہ زمانہ امن کے دوران میں کوئی مدد کر سکتے ہیں! سنا ہے کہ اس ٹولے میں بار کٹے قابل ترین شخص ہے لیکن اس کی ہتھائی چالوں کو دیکھ کر مجھے اس سے اتفاق نہیں ہونا چاہیے۔۔۔ اور یہ کہ کیا رہے ہیں؟ یہ سب درباری کیا کر رہے ہیں؟“ پٹوئل منسوبے بناتا ہے، آرم فیلت رد و قدح کرتا ہے، بے ہنگ سین غور کرتا ہے، اور بار کٹے، جسے عمل کرنے کے لیے کہا جاتا ہے، فیصلہ نہیں کر پاتا اور وقت گزر جاتا ہے۔ صرف باگ راتیاں گچھ معنوں میں فوجی آدمی ہے۔ وہ احمق ضرور ہے، لیکن اس کے پاس تجربہ، تیز نگاہ اور عزمِ محکم ہے۔ اور شائستگی سے عاری اس جھوم میں آپ کے نوجوان امیر، طور کیا کردار ادا کر رہے ہیں؟۔۔۔ لوگ ان کی پوزیشن کو مشتبہ بنا رہے ہیں اور جو کچھ ہوتا ہے، اس کی ذمہ داری ان پر ڈال دیتے ہیں۔ جب تک کوئی حکمران خود جرنیل نہ ہو، اس کا فوج میں کیا کام؟“ پولین نے کہا۔ صاف حیاں تھا کہ ان آخری الفاظ کے ذریعے اس کا ارادہ براہ راست ردی امپراطور کو لکارتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ الیکساندر فوجی کا غور کھلانے کا شدید آرزو مند ہے۔

”بہم شروع ہوئے، ایک ہفتہ گزر چکا ہے اور تم لوگ ولنا کا بھی دفاع نہیں کر سکے۔ تمہاری فوج دو حصوں میں تقسیم کی جا چکی ہے اور تمہیں پولینڈ کے صوبوں سے باہر دھکیلا جا چکا ہے۔ تمہاری فوج میں بے اطمینانی پھیل رہی ہے۔“

”اس کے برعکس، عالی جاہ،“ پالاشیف نے کہا۔ اس سے جو کچھ کہا گیا تھا، اس کے لیے اسے یاد کرنا مشکل اور اس لفظی آتش بازی کو سمجھنا دشوار ہو رہا تھا، ”ہماری افواج کے جوش و خروش میں روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔“ ”مجھے یہ سب کچھ معلوم ہے،“ پولین نے سے ٹوک دیا۔ ”مجھے یہ سب کچھ معلوم ہے۔ جس طرح مجھے یہ صحیح صحیح معلوم ہے کہ میری فوج میں کتنی بے اطمینانی ہے، اسی طرح میں تمہاری فوج کی بیانیوں سے بھی بلا کم و کاست آگاہ ہوں۔ تمہارے پاس دو لاکھ سے زیادہ جوان نہیں اور میرے پاس اس سے تین گنے ہیں۔ یہ میں تمہیں اپنی عزت کی

قسم کھا کر بتا رہا ہوں۔“ وہ یہ بھوں گیا تھا کہ اس کی عزت کی قسم کی کوئی وقعت نہیں رہ گئی تھی۔ ”میں عزت کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ دریائے وستوما کے اس پار میرے پاس پانچ لاکھ تیس ہزار جوان ہیں۔ ترک تمہارے کسی کام نہیں آئیں گے۔ وہ بالکل ناکارہ لوگ ہیں اور تمہارے ساتھ صبح کر کے انھوں نے یہ ثابت کر دکھایا ہے۔ رہے سوئیڈی۔ ان کا مقدر یہی ہے کہ ان پر پاگل بادشاہ حکومت کرتے رہیں ان کا بادشاہ مجبوظ الجھوس تھا۔ انھوں نے اسے تخت سے اٹھایا اور دوسرے کو بٹھا دیا۔ لیکن یہ دوسرا۔ برناڈوٹ⁴⁵۔ دیکھتے ہی دیکھتے اپنے ہوش دھواں گنوا بیٹھا کیونکہ کوئی سوئیڈی، جب تک وہ پاگل نہ ہو، روس کے ساتھ اتحاد نہیں کر سکتا۔“

نیولین حذر و معاندت سے مسکرایا اور دوبارہ تسوار کی ڈیبا اپنی ناک تے لے گیا

بالاشیف نیولین کی ہر بات کا ترکی بہ ترکی جواب دے سکتا تھا اور وہ بار بار بات کرنے کی کوشش بھی کرتا رہا۔ اس نے بار بار اپنے ہاتھ اور بازوؤں ہلائے جیسے وہ یہ اشارہ دینا چاہتا ہو کہ وہ کچھ کہنا چاہتا ہے لیکن نیولین سے کوئی موقع ہی نہیں دے رہا تھا اور ہر مرتبہ اسے ٹوک دیتا تھا۔ مثلاً جب اس نے یہ دعویٰ کیا کہ سوئیڈیوں کا کیا ہے، وہ تو پاگل ہیں، بالاشیف یہ کہنا چاہتا تھا کہ گر روس سوئیڈن کا ساتھ دے، تو وہ عملاً جزیرہ بن جاتا ہے، لیکن نیولین آپے سے باہر ہو گیا اور غضب ناک انداز سے چیخنے چلانے لگا یوں بالاشیف کی آواز دب گئی۔

نیولین پر کچھ اس قسم کی جھلک ہٹ سورتھی جس میں ایک آدمی کو اپنے آپ کے سامنے یہ ثابت کرنے کے لیے کہ وہ صحیح ہے، باتوں کا سہارا لینا پڑتا ہے اور وہ بس بولتا ہی بولتا چلا جاتا ہے۔ بالاشیف کو بے چینی ہونے لگی۔ سفیر کی حیثیت سے اسے اپنا وقار برقرار رکھنے کی فکر تھی اور وہ جواب دینے کی ضرورت محسوس کر رہا تھا، لیکن انسان کی حیثیت سے وہ اس بلا سبب غیظ و غضب کے، جس کی لپیٹ میں نیولین آچکا تھا، سامنے سکر گیا۔ وہ جانتا تھا کہ نیولین اب خواہ کچھ ہی کیوں نہ کہے، اس کی کوئی اہمیت نہیں اور نیولین خود بھی، جب وہ اپنے آپے میں آئے گا، اپنے الفاظ پر شرمندگی محسوس کرے گا۔ بالاشیف نظریں جھکائے کھڑا، نیولین کی فرہنگوں کو، جو تیزی سے آگے پیچھے حرکت کر رہی تھیں، دیکھتا اور اس کی نگاہوں سے بچنے کی کوشش کرتا رہا۔

”لیکن تمہارے ان اتحادیوں کی مجھے کیا پروا ہے؟“ نیولین نے کہا۔ ”میرے بھی اتحادی ہیں۔ پولستانی۔

ان کی تعداد اسی ہزار ہے اور وہ شیروں کی طرح لڑتے ہیں۔ چند دلوں میں ان کی تعداد دیکھ ہو جائے گی۔“

نیولین جانتا تھا کہ وہ صریحاً کذب بیانی سے کام لے رہا ہے۔ ادھر بالاشیف اس کے سامنے اسی طرح کھڑا تھا، گم مسم، راضی برضا۔ غالباً ان دونوں باتوں نے نیولین کو در بھی جھلکا دیا۔ چنانچہ وہ تیزی سے پیچھے ہٹا، اپنا چہرہ بالاشیف کے چہرے کے قریب لا دیا اور اپنے ننھے منے سفید ہاتھوں کو پوری قوت اور تیزی سے فضا میں لہراتا تقریباً چلا کر بولا:

”اور میں تمہیں بتائے دیتا ہوں کہ اگر تم نے پرشیا کو میرے خلاف بھڑکانے کی کوشش کی، تو میں یورپ کے نقشے سے اس کا نام نشان مٹا دوں گا!“ اس نے اعلان کیا۔ غیظ و غضب سے اس کا چہرہ زرد اور مسخ ہو گیا، اور اس

نے بڑے زور سے اپنا ایک ننھا منا ہاتھ دوسرے پر مارا ہاں، میں تمہیں دوینا۔⁴⁶ ونچر کے پار ڈھکیل دوں گا، اور میں وہ سرحدیں، جن کو یورپ نے تمہیں پامال کرنے کی اجازت دے کر پہلے جرم کیا اور پھر چشم پوشی برتی، دوبارہ بجاں کر دوں گا۔⁴⁸ ہاں، تمہارے ساتھ اب یہی کچھ ہوگا، مجھے بیگانہ بنا کر تم یہی کچھ کاٹو گے!“ اس نے کہا اور وہ چپ چاپ کمرے کے پتھر کاٹنے لگا۔ اس کے قریب کندھے پھڑک رہے تھے۔

اس نے اپنی نساہ کی ڈیڈ اسکٹ کی جیب میں زالی، پھر نکالی، متعدد بار اسے اپنی ناک کے نیچے رکھا اور بالاشیف کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ اس نے کچھ دیر توقف کیا، تسخرات انداز سے سیدھا بالاشیف کی آنکھوں میں جھانکا اور دھیمے انداز سے کہا:

”اور اس کے باوجود تمہارے آقا کا دور حکومت کتنا پر شکوہ ہو سکتا تھا!“

بالاشیف کو محسوس ہوا کہ اب جواب دینا بالکل لازمی ہو گیا ہے اور اس نے کہا کہ روسیوں کا اس بارے میں نقطہ نظر ناقض نہیں ہے۔ نیولین چپ سر دھم رہا۔ وہ اب بھی اسے بنظرِ تحقیر دیکھ رہا تھا اور بظاہر اس کی بات سن نہیں رہا تھا۔ بالاشیف نے کہا کہ روسیوں کو توقع ہے کہ جنگ سے بہترین نتائج حاصل ہوں گے۔ نیولین ازراہ کرم فرمائی مسکرایہ گویا وہ یہ کہنا چاہتا ہو ”مجھے معلوم ہے کہ اس قسم کی بات کرنا تمہارا فرض بنتا ہے لیکن خود تمہیں اس بات کا کوئی یقین نہیں۔ میں نے تمہیں قائل کر دیا ہے۔“

جب بالاشیف اپنی بات ختم کر چکا، نیولین نے ایک بار پھر اپنی نساہ کی ڈیڈ نکالی، اسے سو جگھا اور سگنل کے طور پر اپنا پاؤں زور سے دوسرے فرش پر مارا۔ دروازہ کھلا اور ایک مصاحب نے مؤدبانہ انداز سے جھٹک کر امپراطور کو اس کا بیٹ اور دستا نے پیش کیے۔ دوسرا مصاحب جیسی رومال لایا۔ ان کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھے بغیر نیولین بالاشیف کی جانب متوجہ ہوا۔

”امپراطور ایکساندر کو یقین دلا دو!“ اس نے اپنا بیٹ پکڑتے ہوئے کہا، ”کہ ہمیشہ کی طرح میں اب بھی ان کا خادم ہوں۔ میں انہیں اچھی طرح جانتا ہوں اور وہ جن ہندوبالا و صاف کے مالک ہیں، ان کے پیش نظر میں ان کا بدل و جان احترام کرتا ہوں۔ جنرل، اب میں تمہیں مزید نہیں روکوں گا، تمہیں امپراطور کے نام میرا حطل جائے گا۔“

اور پولین چیز تیز قدم، ٹھٹھا اور دوازے کی جانب چل دیا۔ استقبال کمرے میں جتنے بھی لوگ موجود تھے، جھٹ پٹ آگے بھاگے اور رینا ترنے لگے۔

نیولین نے جو کچھ اس سے کہا تھا جس طرح غیظ و غضب سے لالہ پیلا ہوا تھا اور اس نے جس خشک بچے سے اس سے بآخری الفاظ کہے تھے، ”جنرل، اب میں تمہیں مزید نہیں روکوں گا، تمہیں میرا حطل جائے گا۔“ اس سے بالاشیف

کو یہ یقین ہو گیا کہ یوین اس سے دوبارہ ملاقات کرنا نہیں چاہے گا۔ واقعتاً وہ ایک ایسے مفیر کے، جس کے ساتھ وہ اتنی بے ہودگی سے پیش آیا تھا اور جس کے سامنے اس نے اتنی ناشائستہ تندی و تیزی کا مظاہرہ کیا تھا، دوبارہ قریب بھی نہیں پھٹکے گا۔ لیکن جب دو غموک کی وساطت سے اسے امپراطور کے ساتھ کھانا کھانے کی دعوت ملی، اس کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔

ڈنر میں جیسی ایچ، کوئین کوخ ⁵⁰ درخ تھے موجود تھے۔

یوین بالاشیف سے بہت کشادہ دلی اور خندہ پیشانی سے ملا۔ اس صبح اس پر غصے کا جو دورہ پڑا تھا، اس کے رویے سے ظاہر ہو رہا تھا کہ اس کے بارے میں نہ تو اس کے جذبات میں کوئی تاؤ ہے اور نہ اسے اس کا ضمیر کوئی معذرت دامت کر رہا ہے، بلکہ اس کے برعکس اس کی پوری کوشش یہ تھی کہ بالاشیف کسی قسم کی گھبراہٹ یا بے چینی محسوس نہ کرے۔ صاف دکھائی دے رہا تھا کہ اسے مدتوں سے یقین ہو چکا ہے کہ اس سے کسی نوع کی غلطی کا ارتکاب ہو ہی نہیں سکتا اور اس کے خیال کے مطابق وہ جو کچھ بھی کرتا ہے، وہ بالکل صحیح ہوتا ہے۔ وہ ایسا کیوں سمجھتا تھا، اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ اس کے افعال صحیح یا غلط کے پیمانے پر پورے اترتے تھے بلکہ وہ اس کے لیے صحیح ہونے تھے کیونکہ یہ اس سے سرزد ہوئے ہوتے تھے۔

ولنٹائن، جہاں کے باشندوں نے اس کا واسپانہ انداز سے استقبال کیا تھا اور جوش و خروش سے اس کے گھوڑے کے پیچھے بھاگے تھے، سواری کرنے کے بعد اس کا مزاج بہت خوشگوار تھا۔ وہ جن سڑکوں اور گلیوں میں سے گزرا، وہاں ہر درتپے میں غالیچے، جھنڈے اور پردے، جن پر اس کے سونوگرام نقش تھے، منک رہے تھے اور پولستانی حواتین نے رومال ہلا ہلا کر سے اہل دہلا کہا تھا۔

ڈنر پر بالاشیف کو اپنے برابر بٹھانے کے بعد یوین نے صرف اس کے ساتھ ملنساری سے پیش آیا، بلکہ وہ اس کے ساتھ کچھ اس قسم کا برتاؤ کرنے لگا جیسے وہ اسی کا درباری ہو، اور ان لوگوں میں، جنہیں اس کے منصوبوں سے ہمدردی تھی اور جنہیں مارنا اس کی کامرانیوں پر خوشیاں منانا چاہیے تھا، شامل ہو۔ گفتگو کے دوران میں اس نے ماسکو کا ذکر چھیڑ دیا اور بالاشیف سے روسی دارالسلطنت کے بارے میں سوالات پوچھنے لگا۔ تاہم اس کا انداز اس مسافر کا نہیں تھا جو کسی نئے شہر کے، جس کی وہ سیر کرنا چاہتا ہے، متعلق دریافت کرتا ہے، بلکہ وہ یوں استفسار کر رہا تھا جیسے یقین ہو کہ اس کے تجسس کو دیکھ کر بالاشیف، جو روسی شہری تھا، پھولنے نہ سمائے گا۔

”ماسکو کی آبادی کتنی ہے؟ مکانات کتنے ہیں؟ کیا یہ صحیح ہے کہ ماسکو کو Moscou la sainte کہا جاتا ہے؟“ اسکو میں گرجے کتنے ہیں؟“ وہ پوچھ رہا تھا۔

اور جب اسے بتایا گیا کہ ماسکو میں گرجوں کی تعداد دو سو سے اوپر ہے اس نے کہا۔

”اتنے گرجوں کا فائدہ؟“

”روسی بہت دین دار ہیں“ بالاشیف نے جواب دیا۔

”ہاں ہم خانقاہوں اور گرجوں کی کثیر تعداد ہمیشہ کسی قوم کی پس مندی کی علامت ہوتی ہے،“ پولین نے رائے زنی کی اور اپنے اس جملے پر داد و صوص کرنے کے لیے اچھلتی نگاہوں سے پولین کو رخ کی طرف دیکھا۔

بالاشیف نے فرانسیسی امپراطور سے مؤثر بانہ اختلاف کرنے کا حوصلہ دکھایا۔

”ملک کے اپنے رسوم و رواج ہوتے ہیں،“ اس نے کہا۔

”لیکن یورپ کے کسی بھی دوسرے ملک میں اس قسم کی کوئی نظیر نہیں ملتی،“ پولین نے کہا۔

”پورے جی، جان کی اماں باؤں تو عرض کرو،“ بالاشیف نے کہا۔ ”روس کے علاوہ ہسپانیہ ہے۔ وہاں

بھی بے شمار گرجے اور خانقاہیں ہیں۔“

بالاشیف کے اس ترکی بہ ترکی جواب پر جس میں ہسپانیہ میں فرانسیسیوں کی حالیہ ہزیموں کے بارے⁵¹ میں ڈھکا چھپا اشارہ کیا گیا تھا، بعد ازاں الیکساندر کے دربار میں، جب اسے وہاں دہرایا گیا، اداؤ تحسین کے ڈنگرے برمائے گئے، لیکن پولین کے دسترخوان پر اسے کوئی خاص پسند نہ کیا گیا اور کسی نے اس پر توجہ نہ دی۔

مارشوں کے چروں پر جو بے نیازی اور الجھاؤ جھلک رہا تھا، اس سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ اس دبدبے میں پڑے ہوئے ہیں کہ بالاشیف کے لہجے کا مفہوم کیا ہے۔ ”اگر اس میں کوئی نکتہ ہے تو ہم اسے سمجھنے سے قاصر ہیں“ یا ”اس فقرے میں قطعاً کسی قسم کی بذلہ سخی نہیں ہے،“ ان کے تاثرات کہتے نظر آ رہے تھے۔ اس کے ترکی بہ ترکی جواب کی اتنی کم تفہیم ہوئی کہ پولین نے اس پر مطلق توجہ نہ دی اور بڑی سادگی سے پوچھنے لگا کہ وہاں (ولنا) سے ماسکو کا سیدھا راستہ کن کن شہروں میں سے گزرتا ہے۔ بالاشیف نے جوڈنر کے سارے عرصے کے دوران میں بڑا چوکس رہا تھا، جواب دیا کہ جس طرح ”تمام شاہراہیں روم پہنچتی ہیں، اسی طرح یہاں تمام شاہراہیں ماسکو پہنچتی ہیں۔ پھر یہاں متعدد شاہراہیں ہیں اور ان میں وہ شاہراہ جو براستہ پولٹاوا جاتی ہے اور جسے چارلس دوازدہم⁵² نے منتخب کیا تھا، بھی شامل ہے۔“ بالاشیف کا یہ جواب اتنا برکل تھا کہ غیر ارادی طور پر اس کا چہرہ خوشی سے دھندلنے لگا، لیکن اس کا جملہ بھی پورا نہیں ہوا تھا کہ پولین کو رخ پیٹرز برگ تا ماسکو شاہراہ کی خست حالی کا ذکر کرنے اور پیٹرز برگ میں اپنے قیام کی یادیں تازہ کرنے لگا۔

ڈنر کے بعد وہ کافی پیئے نیولین کے سٹڈی روم میں چلے گئے۔ چار روز پیشتر یہ ہر طور الیکسندر کا سٹڈی روم تھا۔ نیولین بیٹھ گیا اور کافی کی پیالیوں سے، جو سیونے⁵³ میں بنائی گئی تھیں، کھینے لگا۔ اس نے بالاشیف کو ہاتھ کے اشارے سے بلا یا اور اپنے قریب کی کرسی پر بٹھالیا۔

یہ بات کسی سے ڈھکی چھپی نہیں کہ کھانا کھانے کے بعد آدمی پر کچھ اس قسم کی کیفیت، جو کسی سوچے سمجھے سبب کی نسبت کہیں زیادہ اسے اپنے آپ سے مطمئن و مسرور بنا دیتی ہے، طاری ہو جاتی ہے۔ اس کیفیت میں وہ ہر شخص کو ہنسا و دست بکھینے لگتا ہے۔ پولین بھی اسی کیفیت میں گرفتار تھا۔ وہ یہ سمجھ رہا تھا کہ وہ ایسے اشخاص کے، جو اس کی پرسش

کرتے ہیں، حلقے میں ہے اور اپنی اس بعد از طعام کی کیفیت میں وہ یہ باور کرنے لگا کہ بالاشیف بھی اس کا دوست اور مداح ہے۔ وہ خوشگوار لیکن قدرے طنزیہ انداز سے مسکراتا ہوا اس کی جانب متوجہ ہوا۔

”مجھے بتایا گیا ہے کہ یہی کرا پہلے امپراطور الیکساندر کے ریراستہ تھے۔ کتنی عجیب بات ہے اکیوں جہز؟“ اس نے کہا۔ سے اس بارے میں ذرا برابر شبہ نہیں تھا کہ اس کا یہ جملہ کسی روسی کو قطعاً پسند نہیں آ سکتا کیونکہ اس سے اس کی، یعنی پولین کی، الیکساندر پر برتری ثابت ہوتی تھی۔

بالاشیف کوئی جواب نہ دے سکا اور اس نے خاموشی سے اپنا سر جھکا لیا۔

”ہاں، اسی کمرے میں چار روز قبل ونٹ ٹسکے روڈے اور ٹنائین مشورتی اجلاس منعقد کر رہے تھے،“ پولین نے اپنی اسی خود اعتماد، طنزیہ مسکراہٹ سے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”جو بات میری سمجھ میں نہیں آرہی، وہ یہ ہے کہ امپراطور الیکساندر نے میرے تمام ذہنی دشمن اپنے ارد گرد مجتمع کر لیے ہیں۔ یہ... میں بالکل... سمجھ نہیں پایا۔ کیا انھیں کبھی یہ خیال نہیں آیا کہ یہ کام میں بھی کر سکتا ہوں؟“ اس نے بالاشیف کی طرف متوجہ ہو کر پوچھا اور بظاہر اس سوال نے اسے دوبارہ اسی پٹری پر، جس پر وہ صبح رواں دواں تھا، ڈال دیا اور اس کا غصہ جو ابھی فرو نہیں ہوا تھا پھر تازہ ہو گیا

”اور انھیں بتا دو کہ میں بھی یہی کچھ کروں گا!“ پولین نے اپنی پیالی ایک طرف دھکیلتے اور اٹھتے ہوئے کہا۔ ”میں ان کے تمام عزیزوں اور قربت داروں۔ ورٹم برگوں،⁵⁴ ہڈنوں،⁵⁵ دائیروں۔ کو جرمنی سے نکال باہر کروں گا۔ ہاں، جن جن کو سب کو نکال باہر کروں گا۔ انھیں چاہیے کہ وہ ان کے لیے روس میں عافیت گاہیں تعمیر کرائیں۔“

بالاشیف نے جس انداز سے اپنا سر جھکایا، وہ اس بات کی علامت تھا کہ وہ رخصت ہونا چاہے گا اور جو کچھ اس سے کہا جا رہا ہے، وہ اسے اس لیے سن رہا ہے کیونکہ وہ اسے سننے پر مجبور ہے۔ اس کے چہرے پر جو تاثرات تھے، پولین نے ان پر کوئی توجہ نہ دی۔ وہ بالاشیف سے کچھ اس طرح پیش آ رہا تھا جیسے وہ اس کے حریف کا شیر نہ ہو، بلکہ بہ دل و جان اس کا شیدائی ہو اور بلاشبہ اپنے سابقہ آقا کی تذلیل پر خوش ہو رہا ہوگا۔

”اور امپراطور الیکساندر نے فوجوں کی کمان اپنے ہاتھوں میں کیوں لے لی ہے؟ اس کا لائدہ؟ جنگ میرا پیشہ ہے۔ اس کا کام فرمانروائی کرنا ہے فوجوں کی کمان سنبھالنا نہیں۔ انھوں نے یہ ذمہ داری اپنے سر کیوں لے لی ہے؟“

اور اس نے دوبارہ سواری کی زین نکالی خاموشی سے کمرے کے متعدد چکر کاٹے، پھر وہ اچانک اور غیر متوقع طور پر بالاشیف کے پاس پہنچا، صرف ہونٹوں سے قدرے مسکراتے ہوئے اس نے چالیس سالہ جرنیل کے چہرے تک اپنا ہاتھ اٹھایا اور ہلکے سے جھٹکے سے اس کا کان مروڑ دیا۔ اس نے یہ حرکت اتنے اعتماد، اتنی عجلت اور اتنی بے تکلفی سے کی گویا کہ وہ کوئی نہایت اہم کام سرانجام دے رہا ہو، بلکہ ایسا کام جس میں گویا خود بالاشیف کو بھی بڑا اعزاء آئے ہوگا۔ فریسی دربار میں امپراطور سے اپنے کان اٹھوانا عظیم ترین عزت اور شاہی مطلق و کرم کی علامت سمجھا جاتا

تھا۔

”Eh bien، امپراطور الیکساندر کے درباردار اور مداح، تم کچھ کہتے کیوں نہیں؟“ اس نے یوں پوچھا جیسے اس کی موجودگی میں اس، ”پولیٹین“ کے علاوہ کسی اور کا درباری اور مداح ہونا بڑی مضحکہ خیز بات ہو۔ ”میں نہیں میرے گھوڑے مدے دو۔ انھیں بہت لمبا سفر کرنا ہے۔“

یہ شیف کے ذریعے جو خط ارسال کیا گیا، الیکساندر کے نام وہ اس کا آخری مراسلہ تھا۔ اس ملاقات کی ایک تفصیل روس کے امپراطور کو پہنچا دی گئی اور جنگ کا آغاز ہو گیا۔

8

اسکوش بیئر سے ملاقات کے بعد پرنس آندرے پیٹرز برگ روانہ ہو گیا۔ گھردلوں کو تو اس نے یہی بتایا تھا کہ سے کچھ کام ہے لیکن حقیقتاً اسے اناطول کوراکن کی، جس سے مناسبت بہت ضروری محسوس ہو رہا تھا، تلاش تھی۔ جونہی وہ پیٹرز برگ پہنچا، اس نے کوراکن کا پتہ کرایا لیکن وہ اب وہاں نہیں تھا۔ بیئر اپنے برادر نسبتی کو بتا چکا تھا کہ پرنس آندرے اس کے تعاقب میں ہے، چنانچہ اناطول کوراکن نے پیٹرز برگ پہنچتے ہی دزیر جنگ سے ملاقات کی اور فوج میں شامل ہونے کے لیے سولہادیا چلا گیا۔

پیٹرز برگ میں اپنے اس قیام کے دوران میں پرنس آندرے نے اپنے سابق کمانڈر کو تو زوف سے، جس کے دل میں پرنس آندرے کے لیے ہمیشہ نرم گوشہ موجود رہا تھا، ملاقات کی۔ بوڑھے جرنیل نے سے تجویز پیش کی کہ وہ اس کے ساتھ سولہادیا، جہاں کی فوج کا وہ کمانڈر پیچیدہ مقرر ہو چکا تھا، چلا چلے۔ چنانچہ پرنس آندرے نے ہیڈ کوارٹر شاف میں اپنی تعیناتی کے احکام حاصل کیے اور ترکی روانہ ہو گیا۔

پرنس آندرے نے کوراکن کو خط لکھا اور اسے ڈوئیل کے لیے ملکارنا مناسب نہ سمجھا۔ اس نے سوچا کہ اگر سے کوئی نیا بہانہ ہاتھ نہ آیا اور اس نے یونہی کوراکن کو لٹکار دیا، اس سے نوجوان کاؤنٹس کی شہرت پر حرف آ جائے گا۔ چنانچہ اس نے یہ ارادہ کر لیا کہ وہ خود کوراکن سے ملاقات کرے گا اور اس کے ساتھ ڈوئیل لڑنے کا کوئی جواز دھونڈ لے گا لیکن کوراکن ترکی میں بھی اس کے ہتھے نہ چڑھا، وہ پرنس آندرے کی آمد کے چند ہی روز بعد روس روانہ ہو گیا تھا۔

نئے ملک اور نئے ماحول میں پرنس آندرے کو زندگی کا بوجھ اٹھانا آسان محسوس ہوا۔ اپنی مگیتیر کی بے وفائی۔ اس کے اس پر جوا اثرات ہوئے تھے، وہ انھیں جتنا زیادہ چھپانے کی کوشش کرتا تھا، وہ اس کے لیے اتنے ہی زیادہ لذیت ناک ثابت ہو رہے تھے۔ کے بعد وہ، حوصلہ، جس میں وہ شہسوار و مطمئن رہتا تھا، اب اسے کاٹ کھاتے لگا، اور وہ آکر اور وی اور خود بخاری، جسے کسی زمانے میں وہ حریز جاں بنا کر رکھتا تھا، اب اسے وبال جان محسوس ہونے

گئی۔ وہ خیالات، جو دسترلش کے میدان جنگ میں لینے آسمان کی جانب ٹنگی باندھ کر دیکھنے کے دوران میں اس کے ذہن میں وارد ہوئے تھے اور جنہیں بعد ازاں پیئر کے ساتھ اپنے مکالموں کے دوران میں شرح و سطر سے بیان کرنا اسے بہت مرغوب تھا۔ وہ خیالات، جنہوں نے ہگو چارافو اور بعد ازاں سوئٹزر لینڈ اور روم میں اس کی تجاہیوں کو پر کیا تھا۔ اب نہ صرف اس کے دماغ میں آتے ہی نہیں تھے، بلکہ انھیں دوران درخشاں اور بے کنار آفاق کوہ جنہیں انھوں نے آشکار کیا تھا، یا کرنے میں اسے خوف محسوس ہونے لگتا تھا۔ اب اس کی فکروں کا محور صرف وہ امور تھے جنہیں فوری طور پر پختا یا جانا ضروری تھا اور جن کا اس کے پرانے آدرشوں سے کوئی تعلق نہیں بننا تھا۔ سوئٹزرلڈ کر جتنا زیادہ اس کی رسائی سے دور ہو رہے تھے، ان نئی دلچسپیوں میں اس کا شوق اتنا ہی زیادہ بڑھتا جا رہا تھا۔ یہ ایسے ہی تھا جیسے برج نیلی فام کی وہ بلند و بالا غیر محدود چھتری، جو کبھی اس کے سر پر سایہ فگن تھی، اچانک پست ٹھوس گنبد نما چھت میں تبدیل ہو گئی ہو اور اس پر رزنی بوجھ بن گئی ہو۔ اس گنبد نما چھت کے نیچے ہر شکل واضح ضرورت تھی لیکن پر اسراریت اور ابدریت سے تھی و ماں ہو چکی تھی۔

اس کے ذہن میں جتنے بھی مشاغل آئے، ان سب میں فوجی ملازمت ایک ایسا پیشہ تھا جو ہر قسم کی گھجکلوں سے پاک اور سب سے زیادہ جانا پہچانا تھا۔ اس نے کوٹوزوف کے شاف میں ڈیوٹی جرنیل کی ذمہ داریاں قبول کر لیں اور اپنے فرائض اتنی تن دی اور استقلال سے سر انجام دینے لگا کہ خود کو کوٹوزوف اس کی مستعدی اور راست بازی پر ششدر رہ گیا۔ جب ترکی میں کوراکن پرنس آندرے کے ہاتھ نہ آیا، تو اس نے اس کے تعاقب میں واپس روس جانا لا حاصل کر دانا، تاہم وہ دل میں خوب سمجھتا تھا کہ خواہ کتنی طویل عرصہ بیت جائے، ایک نہ ایک دن اس کا اس سے آمن سامن لازماً ہوگا۔ اس حقارت کے باوجود، جو وہ اس کے لیے محسوس کر رہا تھا اور ان تمام دلائل کے باوجود، جن سے وہ اپنے آپ کو یہ یقین دلانا رہتا تھا کہ وہ "اس قابل نہیں کہ میں اپنے آپ کو اتنا نیچا گرا لوں کہ اس کے ساتھ ہاتھ پائی کرے لگوں"۔ وہ خوب جانتا تھا کہ جب کبھی ان کی ملاقات ہوئی، وہ اسے بالکل اسی طرح، جس طرح کہ وہ شخص جس کی بھوک سے جان ٹنگی جا رہی ہو، کھانے پر ٹوٹے بنا نہیں رہ سکتا، اسے لاکارے بنا نہیں رہ سکے گا۔ اور اس کا یہ شعور کہ ابھی تک تذلیل کا انتقام نہیں لیا گیا، اور اس کے دل میں عداوت کی جو آگ بھڑک رہی ہے، ابھی تک بجھائی نہیں جاسکی، اس کے ذہن پر بوجھ بنا ہوا تھا اور اس مصنوعی اطمینان و سکون میں، جو اس نے ترکی میں پیام جھانکنا، قدرے نخوت پسند نہ ور جا، طلبانہ مصروفیت کے ذریعے حاصل کیا تھا، بس گھول رہا تھا۔

1812 میں جب پولین کے ساتھ جنگ کی خبر بخارست۔ جہاں کوٹوزوف دو ماہ سے مقیم تھا اور اپنے روز و شب ایک دما کیائی عورت کی صحبت میں گزار رہا تھا۔ پہنچی، پرنس آندرے نے درخواست کی کہ اس کا چادرہ مغربی فوج میں کر دیا جائے۔ کوٹوزوف نے، جس کا پیسے ہی اس کی جان توڑ سرگرمیوں سے ناک میں دم آچکا تھا کیونکہ اسے یہ محسوس ہو رہا تھا کہ یہ اس کی اپنی آرام طلبی پر مستقل طمانچہ ہیں، اسے جھٹ پٹ اجازت دے دی اور اسے اہم مشن پر بارے کھلے ذقوی کے پاس روانہ کر دیا۔

برادر راست مغربی فوج میں شامل ہونے سے قبل جو اس وقت، مئی میں، وریسا میں خیمہ زن تھی، پرنس آندر نے بالڈ ہلز کا، جو اس کے راستے میں آتا تھا کیونکہ یہ سولسک شاہراہ سے صرف دو میل ہٹ کر واقع تھا، چکر لگایا۔ گزشتہ تین برسوں کے دوران میں اس کی زندگی میں اتنی زیادہ تبدیلیاں رونما ہو چکی تھیں، اس نے اتنا کچھ سوچا، محسوس کیا اور دیکھا تھا (کیونکہ وہ مشرق اور مغرب دونوں میں سفر کر چکا تھا) کہ جب وہ بالڈ ہلز پہنچا، تو اسے یہ دیکھ کر حیرت بھی ہوئی اور عجیب بھی محسوس ہوا کہ وہاں زندگی کے اطوار میں سو برابر فرق نہیں آیا تھا۔ اس کی گاڑی سنگی پھٹک کے بند داخل ہوئی اور اس حیوان پر، جو مکان کو جاتی تھی، چلنے لگی۔ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ وہ کسی عظیم زدہ قلعے میں، جہاں ہر چیز گہری سینہ میں کھوتی ہوئی ہے، پہنچ گیا ہے۔ مکان پر وہی سنجیدہ اور متین ماحول، وہی بے داغ صفائی ستھرائی اور وہی سکوت حاوی تھا۔ اندرون مکان وہی فرنیچر اور دیواریں، وہی آوازیں اور وہی خوشبوئیں اور بوئیں، اور وہی درپوک چہرے، جو پہلے کی بہت ذر کہوت زدہ ہو گئے تھے، نظر آ رہے تھے۔ پرنس ماریا وہی ڈری بھی، کم رودا شیرہ تھی۔ اس کے شباب کا اولین دور ختم ہو چکا تھا اور وہ اپنی زندگی کے بہترین سال اندیشوں و وسوسوں اور اخلاقی کرب میں ضائع کر چکی تھی۔ مادموزیل بوغین بھی ویسی کی ویسی تھی۔ جون، اپنے آپ سے مطمئن، عشوہ گر۔ وہ زندگی کے ایک ایک لمحے سے لطف اندوز ہو رہی تھی اور مستقبل کے بارے میں سہانی امیدیں پل رہی تھی۔ فرن صرف یہ آیا تھا کہ وہ اپنی ذات کے بارے میں کہیں زیادہ پر اعتماد ہو چکی تھی (پرنس آندر سے نے سوچا)۔ ٹیوٹر دیال، جسے وہ سوتلر لینڈ سے لایا تھا، بروی طرز کا کوٹ پہنے ہوئے تھا اور ٹوٹی پھوٹی روئی میں نوکروں چاکروں سے باتیں کر رہا تھا لیکن وہ اب بھی وہی مہذب، باخمسیر، ایماندار اور کتاب پسند تالیق تھا لیکن خراچی ذہن سے محروم تھا۔ سمر پرنس میں جو واحد جسمانی تبدیلی نظر آ رہی تھی وہ اس کے ذہن میں ایک طرف اچھا خاصہ رخنہ تھا جو ایک دانت کے نکلانے جانے کے بعد وہاں بس گیا تھا۔ جہاں تک اس کے مزاج کا تعلق تھا، وہ جوں کا توں تھا، بلکہ اس کی خشونت میں کچھ اضافہ ہو گیا تھا اور دنیا میں جو واقعات ظہور پذیر ہو رہے تھے، ان کے بارے میں اس کا رویہ مزید تشکیک پسند نہ ہو گیا تھا۔ صرف نکوشکا میں تبدیلیاں رونما ہوئی تھیں، وہ بڑا ہو گیا تھا، اس کے گال پہلے کی نسبت زیادہ گلابی، اور اس کے بال سیاہ اور گھونگر بالے تھے۔ اور جب وہ ہنستا اور خوش ہوتا تھا، وہ غیر شعوری طور پر اپنی ماں، کوچک پرنس، کی طرح اپنا ہانڈی ہونٹ اوپر اٹھا لیتا تھا۔ اس سحر زدہ اور خفہ قلعے میں وہ وہ حدی روح تھا جس نے عدم تغیر کے اصول پر عمل نہیں کیا تھا۔ تاہم اگرچہ ہر چیز خارجی طور پر جوں کی توں تھی، لیکن اب ان تمام لوگوں کے باہمی باطنی تعلقات وہ نہیں تھے جن کا مشاہدہ پرنس آندر نے کواچی سابقہ آمد پر ہوا تھا، اب ان میں تبدیلیاں درآئی تھیں۔ افراد خانہ دو جنبی اور منقسم گروہوں میں منقسم ہو چکے تھے۔ وہ آپس میں اس لیے ملتے تھے کیونکہ وہ وہاں تھا، اس کی خاطر انھوں نے اپنی زندگی کے معمول کے ڈھانچے کو تبدیل کر لیا تھا۔ ایک گروہ سمر پرنس، مادموزیل بوغین اور میر تعمیرات پر مشتمل تھا، جب کہ دوسرے گروہ میں پرنس ماریا، نکوشکا اور تمام ادیبز عمر کھلایاں اور انا میں شامل تھیں۔

بالڈ ہلز میں اس کے قیام کے دوران میں سارا خاندان یک جا کھانا کھاتا تھا، لیکن وہ بھی کے بھی عدم اطمینان کا

شکار رہتے تھے۔ پرنس آندرے کو محسوس ہوتا تھا کہ وہ ایک ایسا مہمان ہے جس کی خاطر استقبالیہ جارا رہا ہے اور یہ کہ اس کی موجودگی ان سب کے اعصاب پر بوجھ بنی ہوئی ہے۔ اسے اس کا جلی طور پر شعور ہو گیا۔ چنانچہ وہ پہلے روز ڈنر کے دوران میں گرم صم بیٹھا رہا۔ اس کا یہ غیر فطری رویہ معمر پرنس کی نظروں سے اوجھل نہ رہ سکا، وہ بھی منہ بھار سر پہ نہ بیٹھا رہا اور جو ٹہنی کھانا ختم ہوا، سیدھا اپنے اپرٹمنٹ میں چلا گیا۔ شام کو جب پرنس آندرے اس کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس نے نو جون کا میسکی کی مہم کے بارے میں باتیں کر کے اس کی دلچسپی ابھارنے کی کوشش کی، معمر پرنس نے اچانک پرنس ماریا کا ذکر چھیڑ دیا۔ اسے اس پر اعتراض تھا کہ وہ ضعیف الیما تھا اور تو ہم پرست ہے، اور مادموزیل بوٹین سے خار کھاتی ہے حالانکہ مادموزیل واحد اداستی ہے جو اس (معمر پرنس) پر جان پھڑکتی ہے۔

معمر پرنس نے دھوکا کیا کہ مگر اس کی طبیعت خراب رہتی ہے، تو اس کی ذمہ داری سر پر پرنس ماریا پر عاید ہوتی ہے، وہ عہد اسے ستاتی، زنج کرتی اور اشتعال دلالتی رہتی ہے اور یہ کہ وہ اپنے بے جالا ڈیپار اور احمقہ مند باتوں سے ننھے پرنس کو، ٹی کا بیڑا غرق کر رہی ہے۔ معمر پرنس خوب اچھی طرح جانتا تھا کہ وہ اپنی بیٹی کو کرب میں سے گزار رہا ہے اور اس نے اس کی زندگی جہنم بنا رکھی ہے، لیکن وہ یہ بھی جانتا تھا کہ وہ اسے ایذا پہنچائے بغیر نہیں رہ سکتا اور یہ کہ وہ اسی کی مستحق ہے۔ ”پرنس آندرے سب کچھ دیکھتا ہے لیکن وہ اپنی بہن کے بارے میں مجھ سے کچھ کہتا کیوں نہیں؟“ معمر پرنس کو اچنبھا ہوا ہوا تھا۔ ”کیا وہ یہ سمجھتا ہے کہ میں فاسق ہوں، بدکار ہوں یا فاسق العقل بڑھا ہوں جس نے بلا وجہ اپنی بیٹی سے تعلقات کشیدہ کر لیے ہیں ورنہ انیسویں عورت سے اپنا نا طرہ جوڑ لیا ہے۔ وہ کچھ نہیں سمجھتا، مجھے اسے سمجھانا اور سب کچھ بتانا ہوگا۔ اسے میری بات سننا ہوگی۔“ معمر پرنس نے سوچا اور وہ اسے بالتفصیل بتانے لگا کہ وہ اپنی بیٹی کا احمقانہ رویہ کیوں برداشت نہیں کر سکتا۔

”جی بات یہ ہے،“ پرنس آندرے نے نظر اٹھا کر اپنے باپ کی طرف دیکھے بغیر کہا (اپنی زندگی میں وہ اولیں مرتبہ اپنے باپ پر کتہ چٹنی کر رہا تھا، ”کہ میں اس بارے میں بات نہیں کرنا چاہتا تھا لیکن چونکہ آپ کا امر رہا ہے، میں صاف گوئی سے کام لوں گا اور لگی پٹی رکھے بغیر اپنی رائے کا اظہار کروں گا۔ اگر آپ کے اور ماری کے مابین کوئی غلط فہمی یا نزاع ہے، میں اس کے لیے کسی طرح بھی اسے مورد الزام نہیں ٹھہرا سکتا۔ میں چاہتا ہوں کہ وہ آپ سے کتنی محبت کرتی ہے اور آپ کا کتنا احترام کرتی ہے۔ چونکہ آپ نے مجھ سے پوچھا ہے،“ پرنس آندرے نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ جیسا کہ بچھے کچھ عرصے سے اس کے ساتھ ہو رہا تھا، اس کا پارہ بتدریج چڑھتا جا رہا تھا، ”میں صرف اتنا عرض کر سکتا ہوں کہ اگر کوئی غلط فہمی پیدا ہوئی ہیں تو وہ اس فضول عورت کے، جو کسی طرح بھی میری ہمشیرہ کی ہم نشین بننے کی، اہل نہیں، سبب ہوئی ہیں۔

ایک لمحہ تو پرنس ٹک ٹک دیکھ دیم دم نہ کشیدم بنا رہا، پھر وہ زبردستی مسکرایا۔ جب وہ یوں مسکرایا، اس کے منہ میں جو تازہ تازہ شگاف رونما ہوا تھا، وہ منکشف ہو گیا۔ پرنس آندرے ابھی اس کا عادی نہیں ہوا تھا۔

”میرے عزیز بیٹے، کون ہم نشین؟ تو تم دونوں اس سلسلے میں پہلے ہی گفتگو کر چکے ہو۔ ٹھیک ہے؟“

”با جان، میں قطعاً کوئی محاکمہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔“ پرنس آندرے نے درشت اور تلخ لہجے میں جواب دیا، ”لیکن آپ نے اصرار کیا۔ میں کہہ چکا ہوں، درمیش کہتا رہوں گا کہ ماری بالکل بے قصور ہے۔ قصور دار وہ لوگ ہیں۔ قصور دار وہ فرانسیسی عورت ہے۔“

”ارغ، اس نے فیصلہ سنا دیا ہے... اس نے فیصلہ سنا دیا ہے!“ معتمر پرنس نے زور پر کہا، ”اور جیسا کہ پرنس آندرے کو محسوس ہوا، وہ یہ بات کہتے ہوئے قدرے بھینپ رہا اور شرم سار ہو رہا تھا۔ لیکن اگلے ہی لمحے وہ تھیل کر کھڑا ہو گیا اور چلانے لگا۔“ نکل جاؤ۔ میری نظروں سے دور ہو جاؤ! سمجھو، کبھی مجھے اپنی شکل نہ دکھانا!“



پرنس آندرے اسی روز روانہ ہو جانا چاہتا تھا لیکن پرنس ماری نے اسے مزید ایک دن قیام کرنے کے لیے مہلک اس روز وہ اپنے باپ کے سامنے نہ گیا۔ معتمر پرنس اپنے کمرے میں مقید رہا اور اس نے مادموزیل، بوفین اور تھون کے علاوہ کسی تیسرے شخص کو اندر نہ آنے دیا۔ وہ بار بار پوچھ رہا تھا کہ اس کا بیٹا چلا گیا ہے یا نہیں۔

اگلے روز روانگی سے قبل پرنس آندرے اپنے بیٹے کے پارلمنٹ میں گیا۔ قوی الجسم ٹھنڈا لڑکا، جس کے بال اپنی ماں کی طرح گھونگر یا لے تھے، اس کی گود میں بیٹھ گیا۔ پرنس آندرے سے نیگلوں پرندے کی کہانی سنانے لگا لیکن اسے ابجا تک پہنچنے سے پہلے ہی اپنے خیالات میں کھو گیا۔ وہ اپنے خوبصورت بیٹے کے، جسے اس نے اپنی گود میں بٹھا رکھا تھا، متعلق سوچ نہیں رہا تھا، بلکہ اس کی سوچوں کا محور خود اس کی اپنی ذات تھی۔ اس نے جستجو ضرور کی لیکن اسے اپنے نہیں خاندان میں ندامت کا کوئی سراغ نہ ملا کہ اس نے اپنے باپ کی ناراضگی سول لے لی ہے اور نہ اسے اس بات پر کوئی افسوس تھا کہ وہ زندگی میں پہلی مرتبہ ان حالات میں اپنے گھر سے رخصت ہو رہا ہے کہ اس کی اپنے باپ سے اس بن ہو گئی ہے۔ اس کی سب سے بڑی پریشانی یہ تھی کہ اس کے دل میں اپنے بیٹے کے لیے جو پورا اور شفقت تھی، اب ڈھونڈنے سے اس کا نشان تک نہیں مل رہا تھا حالانکہ جب اس نے اسے اپنی گود میں بٹھا یا اور چمکا رہا تھا، اسے امید تھی کہ اس کے سابقہ پیرور محبت کا سیل پھر رواں ہو جائے گا۔

”اچھا، آگے چلیں؟“ اس کے بیٹے نے کہا۔

پرنس آندرے نے جواب دیے بغیر اسے گود سے اتارا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

جونہی پرنس آندرے نے اپنی روزمرہ کی مصروفیات معروض التوا میں ڈالیں اور خاص طور پر اس وقت، جب دوپہر کے ماحول میں، جس میں اس نے ہشاش بشاش ایام گزارے تھے، واپس آیا، زندگی کا کرب اپنی تمام تر سابق شدت کے ساتھ دوبارہ اس پر حملہ آور ہو گیا۔ وہ اس یادوں سے پیچھا چھڑانے اور جاتا خیر کوئی مصروفیت محفوظ کرنے کی کوشش کرنے لگا۔

”آندرے، آپ واقعی جا رہے ہیں؟“

”خدا کا شکر ہے کہ میں جاسکتا ہوں!“ اس نے کہا۔ ”مجھے بے حد افسوس ہے کہ تم کہیں نہیں جاسکتی ہو۔“
 ”آپ ایسا کیوں کہتے ہیں؟“ پرنس ماریا نے پوچھا۔ ”آپ اس قسم کی باتیں کیوں کرتے ہیں جب کہ آپ
 اس ہولناک جنگ میں جا رہے ہیں اور وہ اتنے ضعیف ہو چکے ہیں؟“ مادموزیل بوغین کہتی ہیں کہ وہ بار بار آپ
 کے متعلق پوچھ رہے ہیں۔“

جونہی وہ اس موضوع کے متعلق بات کرنے لگی، اس کے ہونٹ کاپٹنے اور اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو
 گرنے لگے۔ پرنس آندرے نے منہ دوسری طرف پھیر لیا اور کمرے میں چکر لگانے لگا۔

”آف، میرے خداوند، میرے خداوند! کون اور کیا۔ کیسی کیسی بے وقعت اشیا اور کیسے کیسے بے حیثیت لوگ
 آدمی کے مصائب کا سبب بن جاتے ہیں!“ اس نے کہا۔ اس کے لہجے میں کچھ اس قسم کی مخلصیت تھی کہ پرنس ماریا
 لرزہ بر اندام ہو گئی۔

اسے اندازہ ہوا کہ جب اس نے ”بے حیثیت“ لوگوں کا ذکر کیا تھا، اس کا اشارہ محض، مادموزیل بوغین کی،
 جو اس (ماریا) کے لیے مصیبت کا باعث بنی تھی، طرف ہی نہیں تھا بلکہ اس شخص کی، جس نے اس کی اپنی زندگی میں
 زہر گھول دیا تھا اور اس سے اس کی تمام خوشیاں چھین لی تھیں، طرف بھی تھا۔

”آندرے، میں آپ سے ایک چیز کی بھیک مانگتی ہوں، التجا کرتی ہوں،“ اس نے اس کی کہنی کو پھوٹے اور
 اسے ایسی آنکھوں سے، جو اس کے آنسوؤں میں چمک رہی تھیں، دیکھتے ہوئے کہا۔ ”میں آپ کا کچھ سمجھتی ہوں۔“ (اس
 نے اپنی نگاہیں نیچے جھکا لیں۔) ”یہ مت سمجھیں کہ غم انسان دیتے ہیں۔ انسان اس (خدا) کے آلہ کار ہیں۔“ اس نے
 اپنی نگاہیں اوپر اٹھائیں، پرنس آندرے کے سر سے ذرا اوپر۔ یہ پراعتماد اور خوش نظر میں تھیں جن سے انسان کسی ایسی
 جگہ کو، جہاں جانی پہچانی تصویر لٹک رہی ہوتی ہے، دیکھتا ہے۔ غم وہ دیتا ہے نہ کہ انسان۔ انسان اس کے آلہ کار
 ہیں۔ اس لیے انھیں لڑم نہیں دیا جاسکتا اگر آپ کو محسوس ہوتا ہو کہ کسی نے آپ کے ساتھ زیادتی کی ہے، اسے
 بھول جائیں اور معاف کر دیں۔ ہمیں یہ حق حاصل نہیں ہے کہ ہم سزائیں دیتے پھریں۔ پھر آپ کو معلوم ہو جائے گا
 کہ معاف کرنے میں کیا راحت ہے۔“

”ماری، اگر میں عورت ہوتا، میں یہی کرتا۔ یہ نسائی وصف ہے۔ لیکن مرد کو بھولنا چاہیے نہ معاف کرنا، اور وہ
 بھول سکتا ہے نہ معاف کر سکتا ہے۔“ اور اگر چہ اس لمحے تک سے کوراگن کا کوئی خیال نہیں آیا تھا، اس کا تمام غصہ،
 جسے لڑو کرنے کا اسے موقع میسر نہیں آیا تھا، اچانک اس کے دل میں جاگ اٹھا۔

”مگر پرنس ماریا کو یہ امید ہے کہ وہ مجھے درگزر سے کام لینے پر آمادہ کر لے گی،“ اس نے سوچا، ”تو اس کا
 مطلب یہ ہو کہ مجھے اسے بہت عرصہ پہلے سزا دے دینا چاہیے تھی۔“ چنانچہ اس کی بات کا مزید کوئی جواب دے
 بغیر وہ اس خروش کن انتقامی لمحے کے، جب اس کی ملاقات کوراگن سے ہوگی، متعلق سوچنے لگا۔ اسے معلوم تھا کہ
 کوراگن اب فوج میں ملازمت کر رہا ہے۔

پرنس ہارڈ نے اپنے بھائی سے التجا کی کہ وہ ایک دن مزید ٹھہر جائے۔ اس کی دلیل یہ تھی کہ اگر وہ اپنے باپ سے صبح کیے بغیر جدا گیا، وہ جانتی ہے کہ اسے کتنا دکھ ہوگا، لیکن پرنس آندرے نے جواب دیا کہ کوئی زیادہ عرصہ گزرنے سے پہلے ہی وہ غالباً فوج سے واپس جائے گا اور اپنے باپ کو وہ خط تو یقیناً لکھے گا ہی، لیکن اس کا تیاہ جتنا طویل ہوتا چلا گیا، اس کے اختلافات کی تلخی اتنی ہی بڑھتی چلی جائے گی۔

”خدا حافظ، آندرے! اتنا یا اور کھیں کہ مصائب خداوند کے فرستادہ ہوتے ہیں، ان کے لیے بندوں کو تصور وار نہیں ٹھہرایا جاسکتا۔“ یہ آخری الفاظ تھے جو اس نے، پتی بہن سے رخصت ہوتے وقت سنے۔

”مقدر میں یہ لکھا تھا۔“ بالذات کے خیال ان پر سے گزرتے وقت پرنس آندرے نے سوچا۔ ”بے چاری، ثامت کی ماری، بے گناہ ہے، بے تصور ہے، پھر بھی بڑے میاں کے، جو زندہ تو ہیں لیکن ہوش دحواس سے بیگانہ ہو چکے ہیں، ہاتھوں مزا بھگتے کے لیے پیچھے رو گئی ہے۔ بڑے میاں جانتے ہیں کہ تصور وار وہ خود ہیں لیکن وہ بدل نہیں سکتے۔ میرا بیٹا ہورہا ہے اور زندگی سے لطف اندوز ہورہا ہے۔ اور یہ زندگی؟ باقی لوگوں کی طرح وہ اسے لرید دے گا یا خود اس سے فریب کھا جائے گا۔ اور میں فوج میں جا رہا ہوں۔ کیوں؟ مجھے خود معلوم نہیں۔ اور میں اس آدمی سے، جس کے لیے میرے دس میں نفرت ہی نفرت ہے ملنا چاہتا ہوں تاکہ میں اسے یہ موقع دے سکوں کہ وہ مجھے ہلاک کر سکے اور مجھے تسخیر کا نشانہ بنا سکے۔“

زندگی کے یہ حالات پہلے بھی ایسے ہی تھے، تاہم تب یہ حالات ایک ہی زنجیر کی مختلف کڑیاں تھے، متحد و مربوط، اب یہ زنجیر ٹوٹ چکی تھی اور کڑیاں کھڑکی تھیں۔ اس کا دماغ بے ترتیب انداز سے ایک شے سے دوسری شے کی طرف زنجیریں لگا رہا تھا، سب کچھ ہوش و خرد اور مفہوم سے عاری تھا۔

9

پرنس آندرے جون کے اواخر میں فوج کے ہیڈ کوارٹرز میں پہنچا۔ سپاہ اول، جس کے ساتھ امپریا طور ہم رکاب تھا، دریائے کے قلعہ بند کمپ پر قابض تھی۔ سپاہ دوم⁵⁸ سپاہ ہورہی تھی اور کوشش کر رہی تھی کہ وہ کسی نہ کسی طرح سپاہ اول کے ساتھ آئے۔ شہید یہ تھی کہ فرانسیسیوں کے خاصے بڑے لشکر نے ان دونوں فوجوں کے مابین رابطہ منقطع کر دیا ہے۔ روسی افواج میں عسکری حالات جس نہج پر جا رہے تھے، ان سے کوئی بھی مطمئن نہیں تھا لیکن کسی کے کبھی یہ خواب و خیال نہیں آیا تھا کہ روسی صوبجات کو حملے کا خطرہ لاحق ہو جائیگا ورنہ کبھی کسی کے یہ دھم دگمان میں آیا تھا کہ جنگ مغربی محاذ، باغیظ دیگر، پولستان صوبوں تک محدود نہیں رہے گی۔

پرنس آندرے کو بارہ کھلے ڈتولی، جس کے سپرد اس کی خدمات کی گئی تھیں، دریائے دریائے کے کنارے پر ملا۔ چونکہ کمپ کے قریب وجوہ میں ایک بھی تھیں۔ یا بڑا گاؤں نہیں تھا، چنانچہ فوج کے ساتھ جرنیلوں اور درباریوں کا جو لاڈلہ لنگر تھا، اس نے چھ میل کے دائرے کے اندر دریا کی دونوں اطراف جتنے بھی چھوٹے چھوٹے دیہات تھے، ان

سب کے بہترین مکانوں پر قبضہ کر لیا تھا۔ بار کئے زار سے کوئی تین میل دور قیام پذیر تھا۔ اس سے بلکوسکی کا خشک اور سرد مہراندہ انداز سے خیر مقدم کہا، اور اپنے جرمن لہجے میں اسے مطلع کیا کہ وہ اس کی اصل تعیناتی کا مسئلہ فرماں بردارے مملکت کے سامنے پیش کر دے گا، تاہم اس نے اسے پیشکش کی کہ وہ فی الحال اس کے شاپ پر کام کرے۔

اباطول کوراگن، جس کے بارے میں پرنس آندرے کو، میدتھی کہ فوج میں مل جائے گا، وہاں نہیں تھے۔ وہ پیٹرز برگ میں تھا۔ یہ خبریں کر بلکوسکی کو خوشی ہوئی۔ اس کی دلچسپیوں کا محور اس عظیم جنگ کی کارروائیاں تھیں جس کا ابھی ابھی آغاز ہوا تھا اور جن کے بیچ میں وہ خود کو پڑھا تھا اسے سرت اس بات کی تھی کہ کوراگن کے متعلق سوچ سوچ کر اسے جو جھل ہٹ ہو رہی تھی، اس سے وقتی طور پر اس کا پنڈ چھوٹ جائے گا۔ چونکہ اسے فوری طور پر کوئی فرائض سرانجام نہیں دینا تھے، اس نے اپنے پہلے چار دن گھوڑے پر سارے قلعہ بند کیمپ کا چکر لگانے میں صرف کیے۔ اپنے تجربے اور ان گفتگوؤں کی، جو اس نے ماہرین سے کیں، مدد سے اس نے اس کے متعلق واضح رائے قائم کرنے کی کوشش کی، لیکن یہ سوال کہ آیا اس کیمپ کا کوئی فائدہ بھی ہے، اس کے لیے لائیکل ہی رہا۔ اپنے عسکری تجربے کی بنا پر وہ پہلے ہی اس نتیجے پر پہنچ چکا تھا کہ جنگ میں ایسے منصوبے بھی، جن پر خوب غور و فکر کیا جا چکا ہوتا ہے (جیسا کہ اوسٹریس کے میدان میں ہوا تھا)، دھڑے کے دھڑے رہ جاتے ہیں۔ اور ہر چیز کا انحصار اس پر ہوتا ہے کہ آپ ٹیم کی غیر متوقع کارروائیوں۔ جن کی پیش بینی کرنا ممکن نہیں ہوتا۔ کس طرح سامنا کرتے ہیں، اور یہ کہ یہ سارا عمل کس طرح اور کس کے ہاتھوں سرانجام پاتا ہے۔ اپنے ذہن میں اس آخری نقطے کو سلجھانے کے لیے پرنس آندرے نے اپنے مقام اور وقفہ کاروں سے پورا پورا فائدہ اٹھایا اور یوں اس نے فوجی کمان اور ن لوگوں اور فریقوں کے، جن پر یہ مشتمل تھی، کردار کا دقیقہ نظر سے مطالعہ کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہ دیا۔ حالات کا نقشہ کیا تھا، اس کے متعلق اس نے اپنے ذہن میں مندرجہ ذیل نتیجہ مستند کیا۔

جب زار بھی تک ولنا میں قیام پذیر تھا، پورے لشکر کو تین افواج میں تقسیم کر دیا گیا تھا۔ فوج اول بار کئے زول، فوج دوم باگ راتیاں اور فوج سوم ترما سوف کی کمان میں تھی۔ فرماں بردارے مملکت فوج اول کے ساتھ تھا لیکن اس مرتبہ کمانڈر انچیف نہیں تھا۔ اس ضمن میں جو فرمان جاری ہو تھا، اس میں یہ تو کہا گیا تھا کہ امپراطور فوج کے ہم رکاب ہوں گے، لیکن یہ نہیں کہ وہ اس کی کمان کریں گے۔ علاوہ ازیں اس کے ساتھ کمانڈر انچیف کا شاف نہیں تھا، صرف امپیریل ہیڈ کوارٹرز شاف تھا۔ جو لوگ اس کے ساتھ آئے تھے، ان میں امپیریل شاف کا کوارٹر ماسٹر جنرل پرنس ولکوسکی، متعدد دیگر جرنیل، امپیریل ایڈمی کمانگ، سفارتی افسران اور اچھی خاصی تعداد میں غیر ملکی شامل تھے، لیکن یہ فوجی شاف نہیں تھا۔ چند اور لوگ۔ آراک چیف (سابق وزیر جنگ)، کاؤنٹ بے نگ سین (عہدے کے اعتبار سے سینئر ترین جرنیل)، گریڈ ڈیوک کونستانٹین پادوویچ (زار یوچ)⁶⁰، کاؤنٹ روبانسیف (چانسلر/وزیراعظم) شائین (پرشیا کا سابق وزیر)، آرام فیلٹ (سوئیڈی جرنیل)، ریخولی (جنگی منصوبے کا اصل خالق وہی تھا)، جنرل انکوونٹ پاؤلووکی (ساروینیا کا تارک وطن)⁶¹، دول ٹسگن اور متعدد دیگر حضرات۔ بھی اس کی

اورل میں تھے۔ اگرچہ یہ واضح نہیں تھا کہ یہ اشخاص کس حیثیت سے آئے ہیں ورنہ فوج میں ان کے ذمے کوئی سرکاری فرائض تھے، تاہم ان کے مقام و مرتبہ نے انھیں اثر و رسوخ سے بہرہ ور کر رکھا تھا۔ یہ لوگ فوجی حکام کو مشورے دیتے رہتے تھے، لیکن گورنر کمانڈروں کو اکثر وقایع اور کمانڈر فیلڈوں کو بھی بعض اوقات یہ معلوم نہیں ہو پاتا تھا کہ بے شک ہیں، گریڈ ڈیوٹ، آراک چیف یا پرنس و لکونسکی انھیں کس حیثیت سے مشورہ دے رہا یا اس سے استفادہ کر رہا ہے اور نہ وہ یہ بتا سکتے تھے کہ کوئی خاص حکم، جو انھیں مشورے کے قالب میں وصول ہوا تھا، زار کا حکم ہے یا اس شخص کا، جس نے یہ اس تک پہنچایا تھا، اور آیا اسے عملی جامہ پہنانا ہے یا نہیں۔ یہ صورت حال کا محض درمیانی پہلو تھا، لیکن ایک درباری (درجہ فرماں روا کے مملکت موجود ہو، وہاں کبھی درباری ہوتے ہیں) کے نقطہ نظر سے امپراطور اور اس کے حاشیہ نشینوں کی موجودگی کا مفہوم کسی سے ڈھکا چھپ نہیں تھا۔ انھوں نے اپنی موجودگی سے وضع کر دیا تھا کہ اگرچہ زار نے کمانڈر انچیف کا عہدہ نہیں سنبھالا ہے، لیکن انوارج کا کنٹرول اسی کے ہاتھوں میں ہے اور وہ اشخاص، جنھوں نے اسے اپنے نرغے میں سے رکھا ہے، اس کے تابعین ہیں۔ آراک چیف نظم و نسق کا دفتر دارنگران اور فرماں روا کا باڈی گارڈ تھا۔ بے شک سین صوبہ ولنا کا جاگیردار تھا۔ بظاہر وہ اپنے علاقے کی جانب سے میزبانی کے فرائض سرانجام دے رہا تھا، لیکن وہ حقیقتاً بہت اچھا جرنیل تھا، مشیر کی حیثیت سے کارآمد تھا اور ضرورت پڑے تو، بارسکے کی جگہ سنبھالنے کے لیے تیار تھا۔ گریڈ ڈیوٹ اس لیے وہاں موجود تھا کیونکہ وہاں موجود ہونا اسے اس آراک تھا۔ پرشیا کا سابق وزیر مٹاکین اس لیے وہاں حاضر تھا کیونکہ اس کے مشورے سودمند ہوتے تھے اور امپراطور ایکساندر اس کی ذاتی خوبیوں کا بردست مددگار تھا۔ آرم فیلٹ پولین کا جانی دشمن تھا اور ایک ایسا جرنیل تھا جسے اپنی صلاحیتوں پر زبردست اعتماد تھا۔ اور یہ خصوصیت زار پر کبھی اثر انداز ہوئے بنا نہیں رہتی تھی۔ ہڈلوپچی کی موجودگی کی وجہ یہ تھی کہ کیونکہ اس کا بات کرنے کا انداز جرأت مندانہ اور فیصلہ کن ہوتا تھا۔ ایجنٹس جنرلوں کی آمد اس لیے ہوئی تھی کیونکہ وہ ہمیشہ وہیں ہوتے ہیں جہاں امپراطور ہوتا ہے اور آخر میں بغول کا نام آتا ہے اور وہ ان سب سے ہوتا تھا۔ وہ اس لیے وہاں آیا تھا کیونکہ پولین کے خد ف جنگ کا منصوبہ اسی نے تیار کیا تھا۔ وہ اپنے منصوبے کی موثریت کے بارے میں زار کو شک میں اتار چکا تھا اور اب تمام کارروائیوں کے بارے میں ہدایت جاری کر رہا تھا۔ دول شوگن بغول کا ساتھ دے رہا تھا۔ اس نے بغول کے خیالات کو خود بدول سے زیادہ قابل فہم صورت میں پیش کیا تھا۔ خود بغول سے یہ کام نہیں ہو سکتا تھا کیونکہ وہ کابینہ کا بے شک فکریہ ممبر نہ تھا اور اس حد تک خود اعتماد کہ کسی دوسرے کو خاطر میں لانا اپنی شان کے منافی سمجھتا تھا۔

مناروسیوں و غیر ملکیوں (ان غیر ملکیوں کو باقیوں پر حقوق حاصل تھا کیونکہ یہ آئے روز نئی سے نئی چونکا دینے والی تجاویز پیش کرتے رہتے تھے اور اس ضمن میں ایسی بے باکی کا مظاہرہ کرتے تھے جو ان لوگوں کا خاصہ ہوتی ہے جو ایسی سرورنیاں کو، جو ان کے دائرہ کار سے باہر ہوتی ہیں، گلے لگا لیتے ہیں۔) کے علاوہ وہاں لاتعداد ایسے اشخاص موجود تھے جن کی حیثیت محض قانونی تھی لیکن وہ اس لیے فوج کے ہم رکاب تھے کیونکہ ان

کے بڑے اہاں تشریف فرما تھے۔

اس وسیع عرض، بے چین و مضطرب، ہم چومادنگرے نیست اور روشن تاب دیا میں متضاد و متضاد خیالات اور آوازوں کے مابین پرنس آندرے نے فریقین اور رجحانات کی مندرجہ ذیل ضمنی درجہ بندیاں، جو ایک دوسرے سے واضح طور پر مختلف تھیں، نوٹ کیں:

فریق اول پغول اور اس کے پیروکاروں پر مشتمل تھا۔ یہ لوگ عسکری نظریہ ساز تھے۔ ان کا بیان تھا کہ جنگ ایک سائنس ہے اور اس سائنس کے غیر متغیر قوانین ہیں۔ غنیم کے میسے یا میسرے کو کیسے گھیرے میں لینا ہے تاکہ عسکری توازن آپ کے حق میں ہو جائے فوج کی تقسیم و ترتیب میں ترجمہ رخ سے کیسے تغیر و تبدل کیا جائے، ان سے اور اس قسم کی دیگر چیزوں سے عہدہ برآ ہونے کے لیے باقاعدہ ورو واضح قوانین ہیں۔ پغول اور اس کے حواریوں کا مطالبہ یہ تھا کہ فوج کو اندرون ملک پیچھے ہٹایا جائے اور یہ واپسی بالکل ان شین قاف سے درست اصولوں کے مطابق، جن کی جنگ کے نام نہاد نظریے میں حد بندی کی گئی ہے، ہونا چاہیے۔ انھیں اس نظریے سے ہر انحراف میں بربریت، جہالت یا کوئی مکر، مقصد نظر نہ آتا تھا۔ اس فریق میں جرمن پرنس، دول ٹوگن، ونٹ ٹینگے رڈڈے اور دوسرے لوگ زیادہ تر جرمن، شامل تھے۔

فریق دوم فریق اول کے بالکل معکوس تھا۔ جیسا کہ ہمیشہ ہوتا آیا ہے، ایک انتہا کے مقابلے میں دوسری انتہا کے نمائندے تھے۔ اس فریق کے ارکان ان لوگوں پر مشتمل تھے جن کا مطالبہ یہ تھا کہ دن سے پولینڈ میں پیش قدمی کی جائے اور جتنے منصوبے پہلے ہی بنائے جا چکے ہیں، ان سب کو طاق نسیاں پر رکھ دیا جائے۔ یہ فریق محض جرأت مندانہ کارروائی ہی کے حق میں نہیں تھا بلکہ اس کے ارکان قوم پرستی کی بھی نمائندگی کرتے تھے اور اس چیز نے انھیں اس نزاع میں، اور بھی یک رخ بنا دیا تھا۔ یہ فریق ردیوں کا تھا۔ باگ راتیاں، بیرمالوف (جس نے حال ہی میں اپنے آپ کو منوانا شروع کیا تھا) اور بعض دوسرے اشخاص اس میں شامل تھے۔ یہی وہ زمانہ تھا جب بیرمالوف کا مشہور زمانہ لطیفہ۔ اس نے زار سے درخواست کی تھی کہ اسے ترقی دے کر "جرمن" بنا دیا جائے۔ زبان زد خاص و عام ہونے لگا تھا۔ اس فریق کے لوگ ہمہ وقت سواروف کے حوالے دیتے رہتے تھے اور یہ صراحت کرتے تھے کہ تیار نے لگائے اور نقوش پر نہیں لگانے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ اصل چیز یہ ہے کہ غنیم کے خلاف جنگ کی جائے، اس کا بھرکس نکال جائے، اسے روس سے دور رکھا جائے اور فوج کو اس قسم کا کوئی موقع فراہم نہیں کرنا چاہیے کہ وہ حوصلہ ہار بیٹھے۔

فریق سوم۔ جس پر زار سب سے زیادہ اعتماد کرنے پرائل تھا۔ وہ پاروں پر مشتمل تھا۔ یہ فریق ہمیشہ دوسرے دو فریقوں کے مابین مصالحت کرانے کی سعی کرتا رہتا تھا۔ اس فریق کے ارکان، جن میں زیادہ تر غیر فوجی، بشمول آراک چیف، تھے۔ ان لوگوں کی طرح، جن کی اپنی کوئی جچی تلی رائے نہیں ہوتی لیکن ظاہر یہ کرنا چاہتے ہیں کہ نہیں، ان کی رائے ہے، وہ سوچتے اور بات کرتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ جنگ، خاص طور پر جب کہ سامنا ہونا پارت (انھوں نے اب اسے پھر ہونا پارت کہنا شروع کر دیا تھا) جیسے نابینہ کروڑگار سے ہو، لاریب ایسے منصوبوں کا، جن

پھر اسوج بچا کر کیا گیا ہو اور زبردست سائنسی علم کا تقاضا کرتی ہے، اور اس معاملے میں بغول کا جواب نہیں کیونکہ وہ غیر معمولی طور پر ذہین فطین ہے۔ اس کے ساتھ اس بات کا بھی اقرار کرنا پڑے گا کہ نظریہ سازوں کی سوچ اکثر دیشتر یک رخی ہوتی ہے، اس لیے ان پر اندھا دھند اعتماد نہیں کیا جاسکتا، بلکہ بغول کے مخالفین جو کچھ کہتے ہیں، اس پر اور ان لوگوں کے جنہیں رزم آرائی کا عملی تجربہ حاصل ہے، نقطہ نظر پر بھی دھیان دیا جانا چاہیے، اور یوں دونوں کے بیچ بیچ کوئی راہ عمل اختیار کی جانا چاہیے۔ اس فریق کے ارکان کا اصرار تھا کہ بغول کے منصوبے کے مطابق دریا کا (قلعہ بند) یکسپ برقرار رکھا جانا چاہیے، لیکن جہاں تک دوسری دونوں افواج کا تعلق تھا، وہ ان کی تقسیم و ترتیب میں تبدیلیاں لانے کی حمایت کرتے تھے۔ اگرچہ اس قسم کے طریقہ عمل کو اپنانے سے نہ تو فریق اول اور نہ فریق دوم کا مقصد پورا ہوتا تھا لیکن مصالحتی فریق سوم کے نزدیک یہی بہترین راہ عمل تھی۔

فریق چہارم کا نمایاں ترین نمائندہ گرینڈ ڈیوک اور ولی عہد تھا۔ اسٹریٹس میں اس کا زعم باطل جس طرح پاش پاش ہوا تھا، وہ اسے فراموش نہیں کر سکا تھا۔ وہاں اس نے سر پر خود سجائے اور جسم پر گھڑ سواروں کی وردی پہنے گاؤں کی زیارت کی تھی۔ اسے توقع تھی کہ اپنی دلیری اور شجاعت کے بل بوتے پر وہ فرانسیسیوں کے پاؤں اکھاڑ دے گا اور ان میں بھگدڑ مچا دے گا لیکن اس کی کوئی امید بر نہ آئی اور ساری سوچیں دھری کی دھری رہ گئیں۔ ہوا یہ کہ وہ بالکل اگلی صف میں پہنچ گیا اور عام بھگدڑ میں بڑی مشکل سے اپنی جان بچانے میں کامیاب ہو سکا۔ اس فریق کے ارکان کی بیک وقت خوبی اور خامی یہ تھی کہ یہ لوگ صاف باطن تھے، اور جس بات کو صحیح سمجھتے تھے، اس کا برملا اظہار کر دیتے تھے۔ وہ نہ تو بہت سے خوف کھاتے تھے، اس کی قوت اور اپنی کمزوری کا اعتراف کرتے تھے، اور لگی لپٹی رکھے بغیر اپنے ان خیالات کو لوگ زبان پر لے آتے تھے۔ ”جو کچھ ہو رہا ہے، اس سب کا نتیجہ صعوبت، مضیقت اور شکست کے علاوہ اور کچھ نہیں ہو سکتا۔“ وہ کہتے تھے ”ہم دل کو اس کے حال پر چھوڑ چکے ہیں، وہی تمسک خالی کر چکے ہیں اور اسی طرح ہم دریا سے بھی نکل جائیں گے۔ بیشتر اس کے کہ ہمیں پیئرز برگ سے بھی بھگا دیا جائے، معقولیت کا تقاضا یہ ہے کہ ہم اس سے پہلے ہی جس قدر جلد ممکن ہو صلح کریں۔“

فوج کے اعلیٰ حلقوں میں اس نقطہ نظر کو زبردست حمایت حاصل تھی۔ پیئرز برگ (کے حکام) اور چانسلر رومانیف بھی اس کی تائید کرتے تھے۔ رومانیف بعض دیگر مسلکتی وجوہات کی بنا پر صلح کے حق میں تھا۔ فریق پنجم جن لوگوں پر مشتمل تھا وہ بار کھے و تولی کی حمایت کرتے تھے۔ یہ لوگ اس لیے اس کی حمایت نہیں کرتے تھے کہ وہ انسان تھا، بلکہ اس لیے کیونکہ وہ دزیر جنگ اور کمزور و نحیف تھا۔ ”وہ اور جو کچھ بھی ہوں،“ وہ اپنی بات کا آغاز ہمیشہ اسی جملے سے کرتے تھے، ”وہ دیانت دار اور عمل پسند آدمی ہیں اور ان سے بہتر کوئی دوسرا شخص ہمارے پاس نہیں ہے۔ انہیں حقیقی اختیارات تفویض کریں کیونکہ منقسم کماں کے تحت جنگ کامیابی سے نہیں لڑی جا سکتی، اور جیسا کہ انھوں نے فن ینڈ میں کیا تھا، وہ آپ کو دکھ دیں گے کہ وہ کیا کچھ کر سکتے ہیں۔ اگر ہاری فوج ٹھیک طرح منقسم اور مضبوط ہے، اور ایک بھی شکست کھائے بغیر دریا تک پہنچا ہوگی ہے، اس کا سہرا سراسر انھیں

کے سر بندھتا ہے اور ہم سب کو ان کا مشکور ہونا چاہیے۔ اگر اس موقع پر بار کچلے کی جگہ بے نگ سین کی تعیناتی عمل میں لائی گئی، تو سب کیے کراہے پر پانی پھر جائے گا کیونکہ بے نگ سین بہت عرصہ قبل 1807 میں اپنی نا اہلی ثابت کر چکا ہے۔“

فریق ششم۔ بے نگ سین۔ اس کے برعکس یہ دلیل دیتا تھا کہ ”بہر حال اب کوئی شخص، جو بے نگ سین سے زیادہ قابل اور زیادہ تجربہ کار ہو، موجود نہیں ہے“ اور یہ کہ ”آپ لوگ خواہ کتنی ہی مین میکھ جائیں، کتنی ہی ٹرین طرازی کریں، انجام کار تب کو بے نگ سین کی طرف ہی رجوع کرنا پڑے گا۔“ ان کا استدلال یہ تھا کہ دریا تک پسپائی اختیار کرنا شرمناک شکست ہے اور حمایتوں اور فاش غلیبوں کا غیر منقطع سلسلہ۔ غلطیاں جتنی زیادہ ہوں گی، اتنا ہی بہتر ہوگا۔ اس سے اور کچھ نہیں، تو انھیں کم از کم اتنا سبق ضرور مل جائے گا کہ حالات جوں کے توں جاری نہیں رکھے جاسکتے۔ ہمیں تمہارے بار کچلے جیسا نہیں، بلکہ بے نگ سین جیسا آدی چاہیے۔ اس نے 1807 میں بتا دیا تھا کہ وہ کس مٹی سے بنا ہے اور یہی وہ شخص ہے جس کی صلاحیتوں کا خود پیرلین بھی اعتراف کرنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ ہمیں، ایک ایسا آدی درکار ہے جس کی سیادت سب برضا اور رغبت تسلیم کر لیں اور بے نگ سین اس کینڈے کا واحد آدی ہے۔“

فریق ہفتم جن لوگوں پر مشتمل تھا، اس قسم کے لوگ درباروں، خاص طور پر نوجوان فرماں رواؤں کے درباروں، میں ریل سے موجود رہے ہیں، اور الیکساندر کے حاشیہ نشینوں میں یہ افراد خاص طور پر بہت کثیر تعداد میں شامل تھے۔ ان میں جرنیل بھی تھے اور امپیرل ایڈمی کاٹنگ بھی۔ یہ لوگ اپنے فرماں روا پر دیونہ وارفندہ تھے۔ وہ اس کی عزت و محض امپراطور کی حیثیت ہی سے نہیں، بلکہ بطور انسان بھی کرتے تھے۔ انھوں نے، جیسا کہ 1805 میں رستوف نے کیا تھا، اسے پورے خلوص اور بے غرضی سے دیوتا کے سنگھاسن پر ہتھارکھا تھا۔ ان کی نظروں میں وہ محض اوصاف حمیدہ سے ہی، لامال نہیں تھا بلکہ تمام انسانی صلاحیتوں سے بھی بہرہ ور تھا۔ گرچہ زار کی یہ اداں کے دلوں کو بھاگی تھی کہ اس نے فوج کی کمان اپنے ہاتھ میں لینے سے انکار کر دیا تھا لیکن وہ اس ضرورت سے زیادہ انکسار پر تاسف کا اظہار بھی کرتے تھے۔ وہ پر زور طریقے سے، صرار کرتے تھے کہ ان کے محبوب فرماں روا کو اس خواہ مخوہ کی جھجک کو ترک کر دینا، علانیہ اپنے آپ کو فوج کا سربراہ قرار دے دینا، کمانڈر انچیف کی حیثیت سے اپنا عملہ مقرر کرنا، جب اور جہاں ضرورت پڑے، نظریہ سازوں اور عملی افراد کا مشورہ لینا اور اپنی افواج کی بغض نفیس قیادت کرنا چاہیے۔ اس طریقے سے، درحرف اسی طریقے سے وہ ان کے جوش و خروش کو بلند یوں تک پہنچا سکے گا۔

فریق ہشتم سب سے بڑا تھا۔ باقی تمام فریقوں کے ایک شخص کے مقابلے میں اس میں ننانوے افراد شامل تھے۔ یہ ان لوگوں پر مشتمل تھا جو نہ اس چاہتے تھے اور نہ جنگ۔ وہ نہ کسی جارحانہ کارروائی کے حق میں تھے اور نہ دریا کسی بھی دوسرے مقام پر دفاعی کیمپ کے۔ انھیں نہ بار کچلے سے کوئی سروکار تھا اور نہ زار سے، نہ پھول سے اور نہ بے نگ سین سے۔ انھیں کسی چیز سے غرض تھی تو بس اپنے حلوے مانڈے سے۔ وہ زیادہ سے زیادہ فوائد

سینا اور تفریح کرنا چاہتے تھے۔ زار کے ہیڈ کوارٹرز کے مسلاطم یا نیوں میں سازشوں اور ریشہ وانیوں کی جن مصلحتوں اور دھوکوں کے بھنور بن رہے تھے، ان میں کئی طریقوں سے، جن کا کسی دوسرے زمانے میں سوچا بھی نہیں جاسکتا تھا، کامیابی کے جھنڈے گاڑے جاسکتے تھے۔ ایک شخص، جس کی واحد دلچسپی کسی مصلحت بخش عہدے سے چٹنے رہنے تک ہوتی، ایک دن وہ بخوبی کی ہاں میں ہاں مل رہا ہوتا اور اس سے اگلے روز اس کے مخالف کا دم بھر رہا ہوتا، اور بعض بڑے داری سے بچنے یا زار کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے تیسرے دن یہ اعلان کر رہا ہوتا کہ اس معاملے میں اس کی اپنی کوئی رائے نہیں ہے۔ ایک دوسرے شخص جو کوئی لمبا ہاتھ مارنے یا زار کی نظروں میں آنے کے چکر میں ہوتا، اپر اٹھ کر اپنی طرف متوجہ کرنے کے لیے گلا پھاڑ پھاڑ کر کسی ایسی بات کی حمایت کرنے لگتا جس کا اشارنا ذکر خود فرماں رو نے ایک روز پہلے کیا ہوتا تھا۔ وہ کونسل میں دوسروں سے الجھتا، پورے زور سے چٹخا چلاتا، سینے پر دو ہتھ مارتا، جیرونگ اس سے متفق نہ ہوتے انھیں ڈسٹیل کے لیے لٹکارتا دریوں ثابت کر دیتا کہ وہ مشترکہ بھلائی کے لیے اپنی جان بھی قربان کر دے گا۔ ایک تیسرا، کونسل کے دو اجلاسوں کے مابین، اپنے حریفوں کی عدم موجودگی میں اپنی دوا دارانہ خدمات کے عوض کسی خاص بخشش کا طلب گار ہوتا۔ وہ اس بات سے بخوبی آگاہ ہوتا تھا کہ ایسے موقع پر انکار کم ہوگا، شرب قبولیت زیادہ ہوگا۔ چوتھا ہمیشہ اس قسم کی تدابیر کرنا رہتا کہ جب بھی زار کی نظر اس پر پڑے، وہ کام کے بوجھ تلے لدا دکھائی دے۔ پانچواں، جس کے دل میں بدقوتوں سے زار کے ساتھ کھانا کھانے کی خواہش اگرائیاں لے رہی ہوتی، اپنی اس آرزو کی تکمیل کے لیے کسی ایسی جھوٹ کی، جو حال ہی منظر عام پر آئی ہوتی، صحت یا عدم صحت کے بارے میں بڑے زور شور سے دلائل کے انبار لگانا شروع کر دیتا اور اس سلسلے میں بڑے قوی اور قابل قبول ثبوت فراہم کرتا۔

اس فریق کی تمام کوششوں کا محور و محول، اعزازات اور ترقیوں کا حصول تھا اور اپنی اس جستجو میں ان کی نظریں ہمیشہ شاہی عنایات کے بادشاہ پر مرکوز رہتی تھیں۔ جو بھی وہ اس کا رخ ایک طرف دیکھتے، فوج کے یہ ٹھکانے زنگر و پھر پرواز کرنے لگتے اور زار کے لیے اس کا رخ کسی اور طرف گھمانا تقریباً ناممکن بنا دیتے۔ ایک طرف صورت حال کی بے چینی تھی، کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا کہ کب کیا ہو جائے، اوپر سردوں پر فطری کی تلوار لٹک رہی تھی جس نے ہر شخص کو سب بچھنی میں مبتلا کر رکھا تھا، دوسری طرف سرشوں، خود غرضانہ خواہشات، متضاد نظریات و جذبات اور مختلف نوعیتوں کا بھنور تھا، ان سب کے بیچ میں انسانوں کے اس آٹھویں اور سب سے بڑے فریق نے، جو ذاتی مفادات کی روڑ میں مصروف و مستغرق تھا، مشترکہ کام میں اچھا خاصا انتشار اور ابہام پیدا کر دیا تھا۔ جو مسئلہ بھی اٹھتا، ان زنگوں کا ہجوم کا ہجوم اپنی بھیمناہٹ ختم کرنے سے پہلے ان لوگوں کی، جو دیانت داری سے اس کے متعلق بحث و مباحثہ کر رہے ہوتے، آوازوں کا گلا گھونٹ دیتا اور ہر چیز خلط ملط کر دیتا۔

بالکل انھیں، یام میں، جب پرنس آندرے فوج کے ساتھ آکر ملا، ان سب میں سے ایک اور یعنی فریق خیم کی تشکیل عمل میں لائی جا رہی تھی اور اب اس کی آواز بھی سنائی دی جانے لگی تھی۔ یہ فریق بزرگوں پر مشتمل تھا۔ یہ لوگ

کچھ دار، معاملہ فہم و باصلاحیت تھے۔ انھیں سرکاری امور کا تجربہ تھا۔ وہ متضاد و متضادم نظریات میں سے کسی کی بھی حمایت نہیں کرتے تھے۔ سٹاف ہیڈ کوارٹرز میں جو کچھ ہو رہا تھا، وہ اس کا بے تعصبی اور غیر جانبداری سے جائزہ لے سکتے تھے اور اس پر اگندہ خیالی، غیر یقینیت، تردید کی اور ضعف سے بچنے کے ذرائع سوچ سکتے تھے۔

اس فریق کے لوگوں کا یہ خیال تھا کہ اور وہ کہتے بھی یہی تھے کہ یہ ساری خرابی اس لیے پیدا ہوئی ہے کیونکہ زار اپنے فوجی درباریوں کی معیت میں یہاں مقیم ہے۔ درباریوں کے آپس کے تعلقات کبھی ایک جیسے نہیں رہتے، ان میں اتار چڑھاؤ آتے رہتے ہیں، ان کی نوعیت غیر واضح اور اتفاقات کی مرہون بنت ہوتی ہے۔ دربار میں عموماً اس سے کوئی خلل نہیں پڑتا لیکن فوج کے لیے یہ چیز سم قتل کی حیثیت رکھتی ہے۔ ان کی سوچ اور قول کے مطابق فرماں ردائے مملکت کو حکمرانی تو کرنا چاہیے لیکن فوج کی کمان اپنے ہاتھ میں نہیں لینا چاہیے۔ زر کی محض موجودگی نے سچاس ہزار فوجیوں کو مفلوج کر دیا ہے کیونکہ وہ اس کی ذاتی حفاظت کے لیے درکار ہیں۔ بدترین کمانڈر چیف اگر اپنے فیصلوں میں آزد ہے، بہترین سے بہترین کمانڈر انچیف سے، جس کے کام میں فرماں روا کی موجودگی اور منصب رکاوٹ بن جاتے ہیں، بہتر ہے۔

ان دنوں، جب پرنس آندرے کو بھی تک کوئی ذمہ داری نہیں سونپی گئی تھی، سیکرٹری آف سٹیٹ (وزیر خارجہ) اور اپنے گروپ کے ایک اعلیٰ نمائندے شش کوف نے زار کے نام ایک خط تحریر کیا۔ باراشیف اور آراک چیف نے اس پر دستخط کرنے کی ہامی بھری۔ فرماں ردائے مملکت نے حالت کی عمومی منہج کے بارے میں بحث مباحثہ کرنے کی اجازت دے رکھی تھی، شش کوف نے اس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس خط میں مؤدبانہ تجویز پیش کی کہ زار کو فوج سے رخصت ہو جانا چاہیے۔ اس نے عذر یہ پیش کیا کہ لوگوں میں جنگ کا جوش و جذبہ ابھارنے کے لیے اس کا دار الحکومت میں موجود ہونا ضروری ہے۔

فرماں ردائے مملکت نے اس شیطانی جوہرادی اور اپنی رعایا سے مادر وطن کا دفاع کرنے کی جواہیل کی، وہ بالآخر روس کی کامیابی کا سبب بنی۔ اگر چہ زار کی ماسکو میں ذاتی موجودگی لوگوں میں جوش و خروش پیدا کرنے کا سبب بنی، تاہم اسے وہاں جانے کی ترغیب اس لیے دی گئی تھی تاکہ وہ فوج سے کنارہ کشی اختیار کر سکے۔ خود زار نے بھی اس ترغیب پر کوئی اعتراض نہ کیا کیونکہ وہ سمجھ گیا تھا کہ اس سے فوج سے دور جانے کا تقاضا کیوں کیا جا رہا ہے۔

یہ خط ابھی، پیرا طور کی خدمت میں پیش نہیں کیا گیا تھا کہ ایک روز ڈنر کے دوران میں بارکلی نے بلکونسکی کو مطلع کیا کہ ترکی کے متعلق استفسار کرنے کے لیے فرماں روا اس سے ملاقات کرنا چاہتا ہے اور پرنس آندرے کو اسی شام چوبیس بجے تک سین کی قیام گاہ پر پہنچنا ہے۔

اسی شام زار کے عملے کو اطلاع ملی کہ ہولین نے اپنی فوجوں کو از سر نو آگے پیچھے کیا ہے اور اس کی سپاہ کا یہ

نقل و حرکت روسی فوج کے لیے خطرناک ثابت ہو سکتی ہے۔ تاہم بعد ازاں یہ اطلاع غلط ثابت ہوئی۔ سی صحیح کرنل میشو (Michaud) زار کے ساتھ دریا کی قلعہ بندیوں کے معاملے پر گیا تھا اور اس نے امپراطور کو بتایا تھا کہ یہ قلعہ بند کمپ جسے پھول کی ہدایات پر تعمیر کرایا گیا تھا اور جسے اس وقت تک عسکری سائنس کا chef d'oeuvre خیال کیا جا رہا تھا، نری حقیقت ہے اور روسی افواج کی تباہی و بربادی کا سامان ہے۔

جس پرنس آندرے بے نگ سین کے ہیڈ کوارٹرز۔ یہ دریا کے کنارے مقامی علاقہ دار کا اوسط درجے کا مکان تھا۔ پہنچا وہاں بے نگ سین تھا شہ زار کے ایڈی کا نگ چرن شیف نے اس کا استقبال کیا اور اسے بتایا کہ زار مارکوئس پاؤلووچکی اور جنرل بے نگ سین کی مسیحت میں دوسری سرحد دریا کمپ کی قلعہ بندیوں کے معاملے پر لگا ہوا ہے کیونکہ ان کی افادیت کے بارے میں شکوک و شبہات ابھرنا شروع ہو گئے ہیں۔

چرنی شیف بیرونی کمرے کے درجے کے قریب بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ میں کوئی فرانسیسی ہول تھا، اور یہ کرنا لبا باں روم تھا۔ وہاں ابھی تک ارگن باجہ، جس پر غالیچوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا، پڑا تھا۔ ایک کونے میں بے نگ سین کے بچوٹ کا پلنگ، جسے تہہ کیا جاسکتا تھا، رکھا ہوا تھا۔ یہ بچوٹ بھی اچھا تھا اور لپٹے ہوئے بستر پر بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ بظاہر اسے رنگ رلیوں یا کام کی زیادتی نے تھکا کر چور کر دیا تھا۔ اس کمرے سے دروازے نکلتے تھے۔ ایک تو سیدھا اس کمرے میں، جو کبھی ڈرائنگ روم تھا، اور دوسرا دائیں جانب مٹھی روم میں کھلتا تھا۔ پہلے دروازے میں سے بعض آدمیوں کی آؤز میں ستائی دے رہی تھیں۔ گفتگو جرمن زبان میں ہو رہی تھی لیکن کبھی کبھار فرانسیسی بھی کانوں میں پڑ جاتی تھی۔ زار کی خواہش کے مطابق سابق ڈرائنگ روم میں فوجی کونسل تو نہیں (امپراطور معاملات گول بول رکھے کو ترجیح دیتا تھا)، البتہ چند ایسے اشخاص موجود تھے جن کی رائے وہ ان مشکلات کے، جو قریب چن آتا تھیں، بارے میں سننے کا خواہش مند تھا۔ یہ جنگی کونسل نہیں تھی لیکن بہر حال تھی ایک قسم کی کونسل ہی۔ اسے خود زار کے لیے بعض مسائل کی تشریح و توضیح کرنا تھی۔ اس نیم کونسل میں سویڈی جنرل آرم فیلٹ، بچوٹ جنرل وول ٹوکس، وٹ ٹسگے روڈے (جسے پولین نے فرانسیسی رعایا کا بدعہد و غدار قرار دیا تھا) میشو، کاؤنٹ پلاٹین (حقوقاً فوجی نہیں تھا) ہول اور پھول کو، جس کے متعلق پرنس آندرے نے سنا تھا کہ وہ اس سرے سے معاملے میں اصل کرتا رہتا ہے، بلایا گیا تھا۔ پرنس آندرے کو اسے (پھول کو) اچھی طرح دیکھنے کا موقع مل گیا کیونکہ وہ اس کی اپنی آمد کے چند منٹ بعد ہی آگیا تھا اور ڈرائنگ روم میں جانے سے پہلے اس نے چرنی شیف سے مختصر بات کی تھی۔

پھول نے روسی جرنیل کی بد وضع و روی اپنی ہوئی تھی اور فینسی ڈریس کی طرح یہ اس کے جسم پر قطعاً نہیں لگتی تھی۔ پہلی نظر میں وہ پرنس آندرے کو جانا پہچانا معلوم ہوا حالانکہ اس نے ازیں پہنچتا ہی نہیں دیکھا تھا۔ اس میں بعض ایسی باتوں کی، جو اس نے دے روٹر، میک، شٹ اور بعض دوسرے نظریہ ساز جرمن جرنیلوں میں، جن سے اس کی 1805 میں مدھ بھیڑ ہوئی تھی، دیکھی تھیں، جھٹک دکھائی دی، لیکن وہ ان میں سے کسی کی بھی نسبت

زیادہ مثالی جرمن تھا۔ پرنس آندرے نے اپنی زندگی میں کبھی کوئی ایسا جرمن نظریہ ساز، جس کی ذات میں دوسرے تمام جرمنوں کی خصوصیات یوں مجتمع ہو گئی ہوں، نہیں دیکھا تھا۔

پغوبل پست قامت اور بے حد ماغر تھا، تاہم اس کی بڑی چوڑی تھپی۔ ساخت کے اعتبار سے اس کا جسم بھرا اور گنزا تھا۔ اس کے کولھے چوڑے چکے در کندھوں کی ہڈیاں ابھر رہی تھیں۔ اس کے چہرے پر جھریاں ہی جھریاں تھیں اور اس کی آنکھیں اندر کودھنسی ہوئی تھیں۔ بظاہر اس کے بالوں میں جلد باری سے گنگھنی کی گئی تھی اور انھیں کنپٹیوں کے قریب آگے کی جانب ہموار بنانے کی کوشش کی گئی تھی لیکن وہ عجیب بے ہنگم انداز سے چھوٹے چھوٹے پگھلوں کی صورت میں اوپر کواٹھے ہوئے تھے۔ وہ اپنے گرد و پیش یوں مضطرب اور غصیلی لگا ہوں سے دیکھتا اندر آیا جیسے وہ اس کشادہ کمرے کی، جس میں سے اسے گزرنا تھا، ہر چیز سے مرعوب ہو۔ اس نے اپنی شمشیر بڑے بے ڈھب انداز سے تھامتے ہوئے چرنی شیف سے جرمن زبان میں خطاب کیا اور اس سے پوچھنے لگا کہ ہر طور کہاں ہے۔ صاف نظر آ رہا تھا کہ وہ کمرے میں سے جلد از جلد گزرنا، تسلیات اور علیک سلیک سے بچنا اور نقشے کے سامنے بیٹھ کر اپنے کام کا آغاز کر دینا چاہتا ہے کیونکہ اسی میں اسے صحیح معنوں میں سکون ملتا تھا۔ اس نے چرنی شیف کے سلام کے جواب میں بے اعتنائی سے سر کو جنبش دی اور یہ سن کر کہ زار ان قلعہ بندیوں کا، جو اس کے نظریات کے مطابق تعمیر کی گئی تھیں، معائنہ کرنے گیا ہوا ہے، طنزیہ انداز سے مسکرا دیا۔ اس نے اپنی گہری آواز میں بڑبڑاتے ہوئے اپنے آپ سے کچھ کہا۔ وہ جو کچھ کہہ رہا تھا، ان جرمنوں کے، جو اپنی آراء کو ہمیشہ صحیح اور دوسروں کو غلط قرار دیتے ہیں، مخصوص منہ پھٹ انداز سے کہہ رہا تھا اور کچھ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ کہہ رہا ہو ”اقت، گاؤ دی؟“ ”لعنت ہو اس سارے معاملے پر!“ یا ”سارا منہ لگڑ بڑا جائے گا“ جو کچھ وہ کہہ رہا تھا، پرنس آندرے کو سنائی نہیں دیا اور وہ اس کی بھی پروا نہ کرتا، لیکن چرنی شیف نے اس کا تعارف پغوبل سے کر دیا اور ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ پرنس آندرے ابھی ابھی ترکی سے، جہاں جنگ اتنی کامیابی سے اختتام پذیر ہوئی ہے، آیا ہے۔ پغوبل نے اس پر کچھ یوں اپشتی نظر ڈالی جیسے وہ اسے نہیں، بلکہ اس کے آہ پار دیکھ رہا ہو اور ہنستے ہوئے بول: ”یہ جنگ عسکری تدابیر کا زبردست نمونہ بنی ہوگی!“ اور ہنستے ہنستے اس کمرے میں، جہاں سے باتوں کی آوازیں آرہی تھیں، چلا گیا۔

یہ بات روز روشن کی طرح عیاں تھی کہ پغوبل، غصہ جس کی ہمیشہ ناک پر دھرا رہتا تھا اور جو ہر دم جلی کٹی منانے کی طرف مائل رہتا تھا، اس روز خاص طور پر جلال میں آیا ہوا تھا کیونکہ چند لوگوں نے اس کی عدم موجودگی میں اس کے کمپ کا معائنہ کرنے اور اس میں میں میکہ نکالنے کی جسارت کی تھی۔ پرنس آندرے کو دسترلش میں جو تجربات ہوئے تھے، ان کی بددست اسے اس مختصر ملاقات کے بعد اس شخص کے کردار کے متعلق واضح تصور قائم کرنے میں کوئی دشواری پیش نہ آئی۔ پغوبل کا شمار ان لوگوں میں کیا جاسکتا تھا جو حد سے زیادہ اور غیر متوازن طور پر خود اعتماد ہوتے ہیں۔ اس حد تک خود اعتماد کہ وہ اپنی گردن کٹ دیں گے لیکن اپنی رائے سے پیچھے ہٹا گوارا نہیں کریں گے۔ یہ وصف صرف جرمنوں میں پایا جاتا ہے کیونکہ جرمن اپنی خود اعتمادی کی اساس بھر تصور پر۔ سائنس

یعنی مطلق صداقت کے مفروضہ علم پر۔ رکھتے ہیں۔ فرانسیسی کی خود اعتمادی کا سرچشمہ اس کا یہ عقیدہ ہوتا ہے کہ ذہنی اور جسمانی اعتبار سے اس میں اتنی دلکشی ہے کہ مرد اور خواتین دونوں دیوانہ وار اس کی طرف کھینچے چلے آتے ہیں۔ اگر بڑی خود اعتمادی اس کے اس ايقان سے پھوٹتی ہے کہ وہ دنیا کی بہترین منظم مملکت کا شہری ہے، اور اس کے ساتھ وہ سے بھی حقیقت تصور کرتا ہے کہ انگریز ہونے کے ناطے اسے ہمیشہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ اسے کیا کرنا ہوگا، اور انگریز ہونے کے ناطے وہ جو کچھ کرے گا، لاریب درست ہوگا۔ اطالوی اس لیے خود اعتماد ہوتا ہے کیونکہ آؤں کھا نہتا، فرما مشتعل ہو جاتا ہے اور آسانی سے اپنے آپ کو اور دوسروں کو بھول جاتا ہے۔ رومی شخص اس لیے خود اعتماد ہوتا ہے کیونکہ وہ نہ کچھ جانتا ہے اور نہ جانتا چاہتا ہے کیونکہ وہ یہ مانتا ہی نہیں کہ کسی چیز کو مکمل طور پر جانتا ممکن ہے۔ تاہم جرمن کی بد اعتمادی بدترین چیز ہے۔ وہ کسی بھی دوسری قوم کے فرد کی نسبت زیادہ بے لگ اور نامعلوم ہوتا ہے کیونکہ وہ یہ سمجھتا ہے کہ اسے صداقت یعنی سائنس۔ جو شخص اس کی اپنی اختراع ہوتی ہے لیکن جو اس کے نزدیک مطلق صداقت ہے۔ کا علم ہے۔

ہنگری صربیا ایسا ہی آدمی تھا۔ اس کے پاس اپنی سائنس۔ ترجمانی نقل و حرکت کا نظریہ، جس کا اس نے فریڈرک اعظم کی جنگوں سے استنباط کیا تھا۔ تھی اور وہ ہر بات، جو اسے نسبتاً حالیہ جنگوں کی تاریخ میں نظر آئی، اسے دو بے ہودہ، لہجہ اور خلاف فطرت معلوم ہوئی۔ اس کے نزدیک یہ حربی معرکے بھونڈے اور بے ذہنگ تھے۔ ان میں طرحین نے ایسی ایسی فاش غلطیوں کا ارتکاب کیا تھا کہ ان مجاہدوں کو جنگ کا نام دینا لفظ ”جنگ“ کی توہین تھا۔ وہ نظریے کی کسوٹی پر پورے نہیں اترتے تھے، اس لیے سائنس کی دلچسپی کا ان میں کوئی سادہ نہیں تھا۔

جولگ 1806 میں اس مہم کی، جو جینا اور اورشٹٹ⁶⁴ میں انجیم پذیر ہوئی تھی، منصوبے بندی کے ذمے دار تھے، ہنگری ان میں شامل تھا۔ لیکن اس جنگ کا جو نتیجہ برآمد ہوا، اس سے اسے اس امر کی بال برابر شہادت ملی کہ اس کا نظریہ خطا پذیر ہو سکتا ہے، اس کے برعکس اس کی سوچ یہ تھی کہ اس ساری تباہی و بربادی کی واحد وجہ یہ تھی کہ اس کے نظریے سے انحراف کیا گیا تھا، اور وہ اپنے مخصوص سرور و مطمئن انداز سے کہا کرتا تھا ”میں نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ سارا معاملہ گڑبڑا جائے گا۔“ وہ ان نظریہ سازوں میں سے تھا جنہیں اپنے نظریے سے اتنا لگاؤ ہوتا ہے کہ نظریے کا مقصد۔ اس کا عملی اطلاق۔ ان کی نگاہوں سے اور جھل ہو جاتا ہے۔ اس کے نظریے سے دیوانگی کی حد تک لگاؤ نے اسے تمام عملی پہلوؤں سے متنفر کر دیا اور وہ ان کا ذکر تک سننا بھی گوارا نہیں کرتا تھا۔ ناکامیوں پر اس کی سرست دیدنی ہوتی تھی کیونکہ ناکامیاں جو عمل میں نظریے سے انحراف کا نتیجہ ہوں، اسے صرف اپنے نظریے کی صحت کا ثبوت فراہم کرتی تھیں۔

اس نے پرنس آندرے اور چرنی شیف سے موجودہ جنگ کے بارے میں ایک ایسے شخص کے، جسے پہلے ہی یہ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی کل سیدھی نہیں بیٹھے گی اور جسے قطعاً اس بات کا طال نہیں ہوتا کہ ایسا ہوا ہے، انداز سے چند الفاظ کہے۔ اس کے بالوں کے وہ چمچے جو کنگھی کی زد میں نہیں آئے تھے اور جو پیچھے کو کھڑے تھے، اور اس کے کنپٹیوں کے قریب

کے وہ ہاں، جنہیں اس نے بہ غلت گنگھی پھیر کر ٹھیک ٹھاک کر لیا تھا، یہ سب کچھ بزہن حال پکار پکار کر خوش اسلوبی سے بیان کر رہے تھے۔

وہ اگلے کمرے میں چل گیا اور اگلے ہی لمحے اس کی پرزور جھگڑاؤ گفتگو سنائی دینے لگی۔

11

پرنس آندرے ابھی اپنی نگاہوں سے بغلوں کا تعاقب کر رہا تھا کہ کاؤنٹ بے نگ سین لپک جھپک کمرے میں داخل ہوا، اس نے رکے بغیر سہام کے انداز میں اپنی گردن کو ذرا سا خم دیا اور مٹڈی روم کی طرف جاتے کمرے میں سے گزرتے گزرتے اپنے بکوتھ کو ہدایات دیں۔ امپراطور اس کے پیچھے پیچھے آ رہا تھا اور بے نگ سین اس سے بھاگ بھاگ پہلے پہنچ گیا تھا کیونکہ وہ بعض تیاریاں کرنا چاہتا اور اس کے استقبال کے لیے خود وہاں موجود ہونا چاہتا تھا۔

چرنی شیف اور پرنس آندرے پورچ میں چلے گئے۔ وہاں امپراطور، جو تھکا وٹ سے نڈھال معلوم ہوتا تھا، گھوڑے سے نیچے اتر رہا تھا۔ مارکوئیس پاؤلو کی اس سے باتیں کر رہا تھا اور فر، نروائے مملکت اپنا سر بائیں طرف جھکائے اس کی گفتگو سن رہا تھا۔ اس کے چہرے پر خفگی کے آثار تھے، لیکن پاؤلو کی جوش و خروش سے اپنی کہتا چلا گیا۔ امپراطور آگے بڑھا۔ صاف معلوم ہوتا تھا کہ وہ اس گفتگو کو ختم کرنا چاہتا ہے مگر اطالوی، جس کا چہرہ ہنستا رہا تھا اور جس پر بیچانی کیفیت طاری تھی، آداب کو پس پشت ڈالے اس کے پیچھے پیچھے چلا اور اپنی باتیں گوش گزار کر رہا۔ ”جہاں تک اس شخص کا، جس نے اس کمپ، اس درمیکپ کو قائم کرنے کا نظریہ پیش کیا تھا، تعلق ہے“

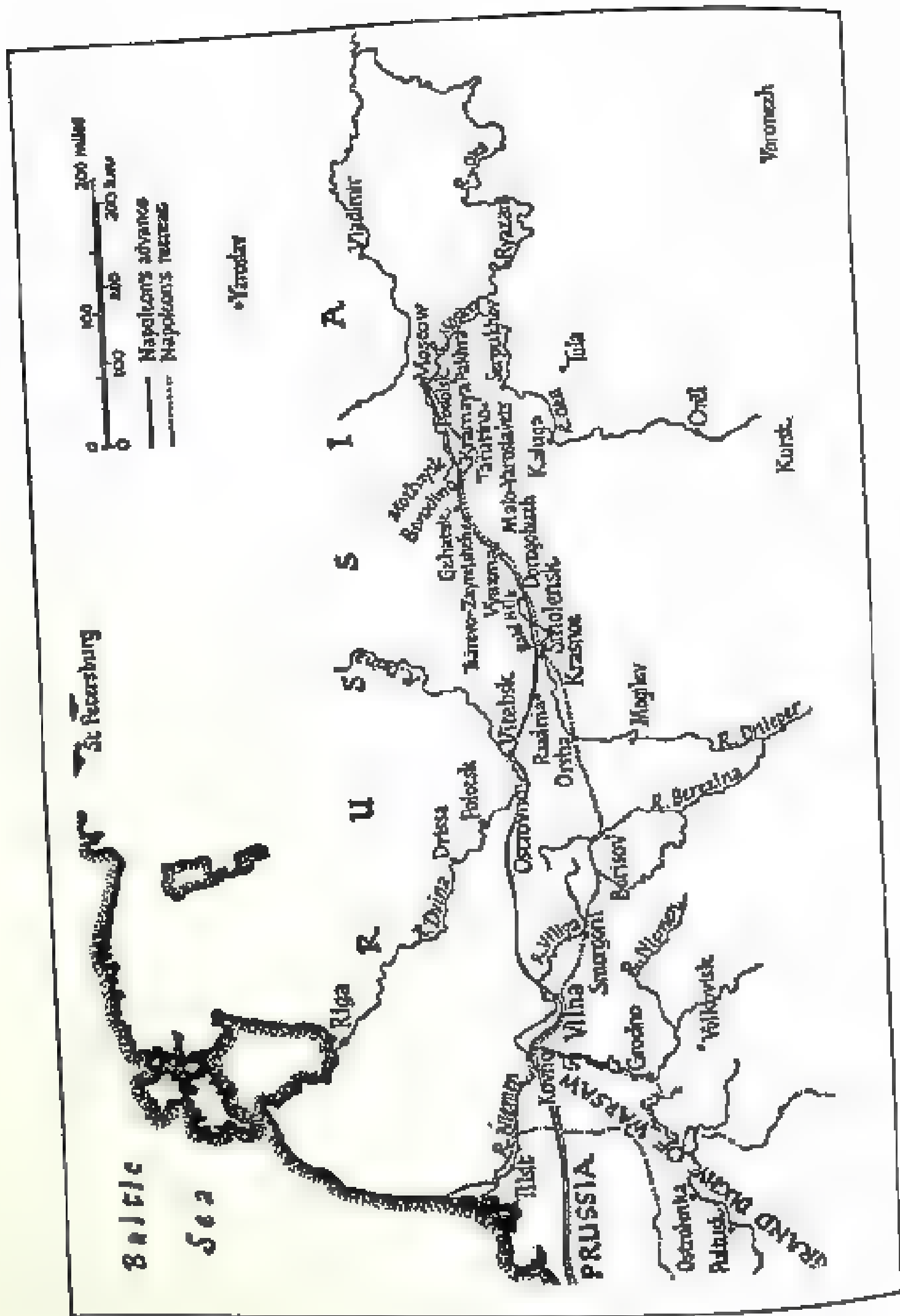
وہ فرانسسیسی میں کہہ رہا تھا جب کہ امپراطور زینہ چڑھ رہا اور پرنس آندرے کو دیکھ کر اس کے ناشائسا چہرے کا بغور جائزہ لے رہا تھا۔ ”عاجز جاہ، جہاں تک اس شخص کا...“ پاؤلو کی بے جگری سے بولے جا رہا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ اس کے لیے ضبط کرنا ناممکن ہے۔ ”جہاں تک اس شخص کا جس نے درمیکپ قائم کرنے کا مشورہ دیا تھا، تعلق ہے۔“ مجھے اس کے علاوہ اور کوئی صورت دکھائی نہیں دیتی کہ اسے یا تو پاگل خانے میں بھیج دیا جائے یا پھانسی کے تختے پر لٹکا دیا جائے۔“

اطالوی کی بات کے ختم ہونے کا انتظار کیے بغیر اور ایسے جیسے اس نے کچھ سنا ہی نہ ہو، امپراطور بلکونسکی کو پہچانتے ہوئے بہ کمال لطف و عنایت اس کی جانب متوجہ ہو گیا۔

”تمہیں دیکھ کر مجھے بہت خوشی ہوئی ہے۔ باقی لوگ جہاں بیٹھے ہیں، تم بھی وہیں چلو اور میرا انتظار کرو۔“



امپراطور مٹڈی روم میں چلا گیا۔ اس کے پیچھے پیچھے پرنس پیوٹر میخائیلوویچ وکونسکی اور بیرن ٹوئین تھے۔ ان کے اندر داخل ہونے کے بعد دروازہ بند ہو گیا۔ پرنس آندرے زار کی اجازت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے پاؤلو کی



ہے، جس سے اس کی ترکی میں ملاقات ہوئی تھی، ساتھ چل پڑا اور ڈرائنگ روم میں، جہاں کونسل کے رکان اکٹھے ہو چکے تھے، پہنچ گیا۔

پرنس پیوٹر مینا کیلوریج ویکٹوریسکی جس قسم کے فرائض سرانجام دے رہا تھا، ان سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ امپراطور کے عیسے کا سربراہ ہے۔ وہ سنڈی روم سے ڈرائنگ روم میں آیا۔ اس کے پاس چند نقشے تھے۔ اس نے انھیں میز پر پھیلا یا اور ان نکات کا، جن کے بارے میں وہ معزز حاضر اصحاب کی رائے دریافت کرنا چاہتا تھا، اعلان کیا۔ ہوا یہ تھا کہ دوران شب یہ خبر (بعد میں لحاظ ثابت ہوئی) کہ فرانسیسیوں نے دریہا کیپ کو زرخے میں بننے کے لیے نقل و حرکت کی تھی، ملی تھی۔

سب سے پہلے جنرل آرم فیلیٹ نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ اس نے اس مشکل کا سامنا کرنے کے لیے غیر متوقع طور پر تجویز پیش کی کہ ماسکوا اور پیٹرز برگ کو جانے والی شاہراہوں سے پرے ہٹ کر بالکل نئی پوزیشن سنبھالی جائے، دیں سب فرجیس انھیں ہو جائیں اور مل کر دشمن کا انتظار کریں۔ یہ تجویز کیوں پیش کی گئی، کسی کو اس کی تک سمجھ نہ آئی۔ یہ الگ بات ہے کہ اس نے یہ تجویز محض اس لیے پیش کی ہوتا کہ دوسروں کو یہ معلوم ہو جائے کہ اس کی بھی کوئی رائے ہے۔ بظاہر بھی دکھائی دیتا تھا کہ آرم فیلیٹ یہ منصوبہ بہت عرصہ قبل مرتب کر چکا تھا اور اس نے اب اسے اس مقصد کے پیش نظر آگے نہیں بڑھایا تھا کہ اس سے موجود مسئلے کا کوئی حل نکلتا تھا۔ اس سلسلے میں یہ قطعاً سودمند نہیں تھا بلکہ اس نے اسے اس لیے پیش کیا تھا کیونکہ وہ اسے پیش کرنے کا موقع گنوا نہیں چاہتا تھا۔ یہ ان لاکھوں مفروضوں میں سے ایک مفروضہ تھا جن میں سے ہر ایک بظاہر دل کو اتانی لہجاتا ہے جتنا کہ دوسرا اور اگر کوئی کہ یہ معلوم نہ ہو کہ جنگ کیا شکل اختیار کرے گی، انھیں با آسانی مرتب کیا جاسکتا ہے۔ بعض حاضرین نے اس کے دلائل کی مخالفت کی اور بعض نے حمایت۔ سب سے زیادہ نوجوان جنرل ٹول نے سویڈی جنرل کے نظریات کی بھڑا ڈالی۔ اس کا انداز بالکل جلدی تھا۔ تو تکار کے دوران میں اس نے جیب سے نوٹ بک، جس کے صفحے کے تحریروں سے پٹے پڑے تھے، نکالی اور اسے پڑھنے کی اجازت طلب کی۔ اپنی اس ضخیم یادداشت کی خواہش کے دوران میں اس نے ایک نیا منصوبہ، جو آرم فیلیٹ یا پنویل کے منصوبوں سے قطعی مختلف تھا، پیش کر دیا۔ یاد دہانی کے ٹول کے منصوبے پر اعتراضات اٹھاتے ہوئے پیش قدمی اور حمہ کرنے کی تجویز پیش کی۔ اس کا دعویٰ تھا کہ جس بے یقینی اور پھندے (وہ دریہا کیپ کو پھندا کہتا تھا) میں وہ اب گرفتار ہیں اس سے نکلنے کا یہی واحد راستہ ہے۔ اس تمام مباحثے کے دوران میں پنویل اور اس کا ترجمان دول ٹوگن (وہ درباری معاملات میں بھی پنویل کا رابطہ تھا) منہ باندھے بیٹھے رہے۔ پنویل حقارت سے محض نتھنے پھناتارہا اور اس نے یہ ظاہر کرنے کے لیے، کہ جس قسم کی خرافات وہ من رہا ہے، اس کا جواب دیا اس کی شان سے فردتر ہے، اپنی پشت دوسری طرف گھمائی۔ اور جب پرنس ویکٹوریسکی نے، جو اس مباحثے میں صدر مجلس کے فرائض سرانجام دے رہا تھا، اس سے اس کی رائے طلب کی، اس نے محض یہ کہنے پر اکتفا کیا:

”مجھ سے کیا پوچھتے ہیں؟ جنرل آرم فیٹ نے زبردست پوزیشن سمجھائی ہے، بس دشمن کو ہمارے مقب میں بلا روک ٹوک آنے کی کھلی چھٹی مل جائے گی۔ یا پھر ان اٹالوی بزرگوار کی۔ حملے کی تجویز کیوں نہیں قبول کر لیتے؟ اتنی عمدہ تجویز کسی کو کاہے کو سوجھی ہوگی! پھر پسپائی؟ یہ بھی بہت اعلیٰ خیال ہے! مجھ سے کیا پوچھتے ہیں؟“ اس نے پھر دہرایا۔ ”مجھے معلوم ہوتا ہے کہ آپ سب مجھ سے بہتر جانتے ہیں۔“

لیکن جب دلوں کی تیوری چڑھا کر یہ کہا کہ وہ اس کی رائے امپراطور کے نام پر دریافت کر رہا ہے، تو پھول اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ سے اچانک جوش، گیا اور وہ کہنے لگا

”آپ لوگوں نے سب کچھ جس نہیں کر دیا ہے۔ سب کچھ گڈمڈ ہو گیا ہے۔ ہر شخص یہی سمجھتا ہے کہ وہ مجھ سے بہتر جانتا ہے۔ اب آپ لوگ میرے پاس چلے آئے ہیں اور جانتا چاہتے ہیں کہ حالات کیسے ٹھیک کیے جاسکتے ہیں۔ ٹھیک کیا کرنا ہے؟ سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہے۔ میں نے جو اصول وضع کیے ہیں، ان پر حرف بہ حرف عمل ہونا چاہیے۔“ اس نے اپنی استخوانی انگلیوں سے میز کو پٹتے ہوئے کہا ”مشکل کیا ہے؟ دہیات اسیر تو بچوں کا کھیل ہے!“

دو میز کے قریب گیا، اس نے اپنی انگلی نقشے پر رکھی اور بڑی سرعت سے عملی مظاہرہ کرتے ہوئے یہ ثابت کرنے لگا کہ دریائے کمپ کے جو فوائد ہیں، کوئی اتفاقی واقعہ ان پر اثر انداز نہیں ہو سکتا۔ ہر چیز کی پیش بندی کر لی گئی ہے اور اگر غنیمت نے اسے گھیرے میں لینے کی کوشش کی، وہ دل رمانیٹ ہو جائے گا۔

پاولو کی، جسے جرمن نہیں آتی تھی، فرانسیسی میں اس سے استفسارات کرنے لگا۔ رول ٹسگن اپنے چیف کی، جو خراب فرانسیسی بولتا تھا، مدد کرنے آگے بڑھا اور جو کچھ وہ کہہ رہا تھا، اس کا ترجمہ کرنے لگا۔ لیکن اس کے لیے پھول کا ساتھ دینا مشکل ہو رہا تھا کیونکہ پھول کی زبان قینچی کی طرح چل رہی تھی اور وہ یہ ثابت کر رہا تھا کہ اس کے منصوبے میں نہ صرف ان باتوں کا، جو ماضی میں پیش آچکی ہیں، خیال رکھا گیا ہے بلکہ ان باتوں کو بھی، جو مستقبل میں پیش آسکتی ہیں، سمولیا گیا ہے، اور اب اگر کوئی مشکلات پیش آ رہی ہیں تو غلطی صرف یہ ہوئی ہے کہ اس کے منصوبے کو ایمانداری سے نہیں اپنایا گیا اور اسے سن و سن عملی جامہ نہیں پہنایا گیا۔ وہ دلائل لڑھکتا جا رہا تھا اور ساتھ ساتھ طزیہ نشی ہنستا جا رہا تھا اور آخر کار ایک ایسے ریاضی دان کی طرح جو کسی مسئلے کو، جس کا حل پہلے ہی ملے پا چکا ہو، حل کرنے کے لیے مختلف طریقوں کی مثالیں دینا بند کر دیتا ہے، اسی طرح اس نے بڑی حقارت سے پنا عملی مظاہرہ بند کر دیا۔ اس کی جگہ اب رول ٹسگن نے لے لی اور وہ اس کے نظریات کی فرانسیسی میں تشریح کرنے لگا۔ کبھی کبھی وہ مڑ کر پھول کی طرف دیکھتا اور اس سے پوچھتا، ”یہ فرانسیسی لینیسی، میں نے ٹھیک کہا تھا!“ لیکن پھول ایک ایسے شخص کی طرح، جو بجاوے کی گرما گرمی میں اپنے ہی لوگوں کو نشانے کی زد میں لے لینا ہے، غیظ و غضب سے رول ٹسگن پر برس پڑا اور چلا کر کہنے لگا۔

”ہونہ، اب تشریح کے لیے رہ کیا گیا ہے؟ سب کچھ روز روشن کی طرح عیاں ہے!“

پاولو کی اور میٹھو نے بیک وقت فرانسیسی میں دونوں ٹسگن کو آڑے ہاتھوں لین شروع کر دی۔ آرم فیٹ

جرمن زبان میں پنوال سے مخاطب ہوا۔ ٹول نے پرنس ویکٹورسکی کے سامنے ردی زبان میں وضاحتی بیان دیا۔ پرنس آندرے نے دیکھنے اور سننے پر اکتفا کیا، اس نے زبان سے کچھ نہ کہا۔

ان تمام اشخاص میں پرنس آندرے کو سب سے زیادہ ہمدردی مند خواہاں اور نامتویت کی حد تک خود غماز پنوال سے تھی۔ جتنے لوگ وہاں موجود تھے، ان سب میں دو واحد شخص تھا جو بین طور پر اپنے لیے کچھ نہیں چاہتا تھا، اسے کسی کے خدف کوئی ذاتی عناد نہیں تھا اور اسے صرف ایک ہی آرزو تھی کہ اس کا منصوبہ، جس کی اساس ایک ایسے نظریے پر تھی جسے اس نے برسوں کی ریاضت کے بعد اپنایا تھا، اختیار کر لیا جائے۔ اس کا رویہ نامتو تھا، اور اس کی طنزنا خوشگوار، لیکن اسے ایک تصور سے جو غیر محدود لگاؤ تھا، وہ آدمی کو غیر ارادی طور پر اس کا احترام کرنے پر مجبور کرتا تھا۔ مزید برآں اس نشست میں ہر شخص نے جو کچھ کہا، اس میں ایک خصوصیت مشترک تھی (اور یہ چیز 1805 کی جنگی کونسل میں مفقود تھی)۔ وہ مشترک خصوصیت یہ تھی کہ ان سب پر پولین کی غیر معمولی ذہانت و ذہانت کی ہیبت طاری تھی۔ اگرچہ ان تمام اشخاص کی سرتوڑ کوشش یہ تھی کہ اس ہیبت کو سات پردوں میں چھپا کر رکھا جائے لیکن اس کی ایک ایک ریل پکار پکار کر یہ کہہ رہی تھی کہ پولین ان کے ذہنوں پر کا بوس بن کر سوار ہو چکا ہے۔ صرف پنوال وہ واحد شخص تھا جو اس سے مشتکی تھا۔ جہاں تک باقیوں کا تعلق ہے، سبھی نے یہ مفروضہ قائم کر لیا تھا کہ پولین کے لیے ہر چیز ممکن ہے، انھیں ہر نکتہ سے اس کا سایہ لہراتا نظر آتا تھا اور ایک دوسرے کی تجاویز کی دھجیاں اڑانے کے لیے وہ اسے ہوا بنا کر پیش کرتے تھے۔ معلوم ہوتا تھا کہ صرف پنوال واحد شخص ہے جو پولین کو اسی طرح وحشی اور اجدب سمجھتا ہے جس طرح وہ ہر اس شخص کو، جو اس کے نظریے کی مخالفت کرتا تھا، سمجھتا تھا۔ لیکن احترام کے علاوہ پنوال نے پرنس آندرے کے دل میں اپنے لیے رحم کا جذبہ بھی ابھارا۔ جس لہجے سے درباری اس سے مخاطب ہوتے تھے اور جس انداز سے پاؤ لوہیگی نے امپراطور سے اس کے بارے میں بات کرنے کی جسارت کی تھی، لیکن ان سب سے بڑھ کر پنوال کی اپنی گفتار میں جو مرنے مارنے کا انداز جھلک رہا تھا، اس سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ دوسروں کو غم ہے اور پنوال کو محسوس ہو رہا ہے کہ اس کا زوال چند دنوں کی بات ہے۔ اپنی تمام تر خود اعتمادی اور جھگڑا لوجھن طرز و تعریض کے باوجود اس شخص کی، جس کے کنپٹیوں کے بالوں کو اچھی طرح کٹھنسی کر کے ہموار کر دیا گیا تھا لیکن جس کے پچھلے بال سیدھے کھڑے تھے، حالت قابل رحم تھی۔ اگرچہ اس نے اپنی اس حالت کو جڑ جڑ سے پن اور حقارت کا اظہار کر کے چھپانے کی کوشش کی تھی، صاف نظر آ رہا تھا کہ وہ باؤسیوں میں گھر چکا ہے اور وہ سمجھنے لگا ہے کہ اپنے نظریے کی وسیع پیمانے پر آزمائش کرنے اور کل عالم کے سامنے اس کی صحت ثابت کرنے کا بچا کچھ موقع اس کے ہاتھ سے لٹکا جا رہا ہے۔

بحث و نتیجہ خاص و یرتک جاری رہی اور جوں جوں یہ طوں پکڑتی گئی، توں توں تکرار میں شدت اور گرمی آتی گئی۔ منجم کار وہ ایک دوسرے پر چیخنے چلانے اور آپس میں الجھنے لگے، اور جو کچھ کہا گیا تھا، اس کی مدد سے کسی عمومی نتیجے پر پہنچنا اتنا ہی کم ممکن نظر آنے لگا۔ پرنس آندرے کو اس ہفت زبان گفتگو، مفروضوں، پیش فرضیوں، منصوبوں،

تریدوں اور غل غیاڑے کو سننے کے بعد اچنبھا ہی ہو سکتا تھا۔ اپنی عسکری مصروفیت کے دوران میں ایک خیال جو بہت پہلے اور بار بار اس کے ذہن میں آیا تھا، یہ تھا کہ علم حرب و ضرب (سائنس آف وار) نام کی نہ کوئی چیز ہے، نہ ہو سکتی ہے، نتیجتاً عسکری جینٹس نام کی مخلوق یا چیز بھی ممکن نہیں، اب یہ بات اسے بدیہی حقیقت دکھائی دی۔

جہاں فعاں طاقتوں کے حالات و واقعات معلوم نہ ہوں، خاص طور پر جب ان کی قوت کے بارے میں یقین سے کچھ نہ کہا جاسکتا ہو، وہاں سائنس یا نظریہ کیسے ممکن ہے؟ کسی شخص کو پیشگی کبھی یہ معلوم نہیں ہو سکا ہے کہ کسی دس کے اختتام پر ہاری یا غنیم کی سپاہ کی پوزیشن کیا ہوگی اور نہ کوئی آدمی اس یا اس دستے کی اسکانی قوت کی کبھی پیکائش کر سکا ہے۔ بعض اوقات — جب کوئی بزدل چلاچر کر نہیں کہہ رہا ہوتا، ”ہمارا رابطہ منقطع ہو گیا ہے!“ اور بھاگنا شروع نہیں کر دیتا، بلکہ کوئی جری اور پر جوش شخص نعرہ تحسین و مسرت بلند کرتا ہے: ”وہ واہ، شاہ ش!“ — تو پانچ ہزار کا دستہ جیسا کہ شون گراہرن میں ہوتا تھا، تیس ہزار کے برابر ہو جاتا ہے جب کہ دوسرے اوقات میں پچاس ہزار کا دستہ جیسا کہ اوٹنٹس میں ہوا، آٹھ ہزار کے آگے دم دبا کر بھگ کھڑا ہوتا ہے۔ ”ایک ایسے معاملے میں (جیسا کہ قلم عملی معاملات میں ہوتا ہے)، جس میں ہر چیز بہم اور غیر واضح ہو اور جس میں ہر چیز کا انحصار حالات کی ن گت افواج پر ہو، جن کی اہمیت حاصل موقع پر ہی آشکار ہو اور کوئی بھی یہ نہ بتا سکتا ہو کہ وہ موقع کب آئے گا، سائنس کیا ہو گی؟ آرم نیٹ کہتا ہے کہ ہاری افواج کا آپس میں رابطہ منقطع ہو چکا ہے جب کہ پاؤ لوہگی یہ سمجھتا ہے کہ ہم نے فراہمی سپاہ کو دونوں اطراف سے اپنے حملے کی زد میں لے لیا ہے۔ میٹو کے خیال میں دریا کمپ کو جس چیز نے بے مصرف اور ناکارہ بنا دیا ہے، وہ یہ ہے کہ اس کے عقب میں دریا ہے جب کہ پتوہل کا دعویٰ ہے کہ یہی چیز قوت فراہم کرتی ہے۔ ٹول ایک منصوبہ پیش کرتا ہے اور آرم فیٹ دوسرا۔ کبھی میں خوبیاں ہیں اور کبھی میں خرابیاں کسی منصوبے کی سودمندی تھی ثابت ہو سکتی ہے جب اسے آزمائش کی بھٹی میں سے گزارا جائے۔ پھر ان تمام لوگوں نے ”عسکری ٹائپ“ کی رٹ کیوں لگا رکھی ہے؟ کیا ہم کسی شخص کو اس سے نابذ کہہ سکتے ہیں کیونکہ اسے معلوم ہوتا ہے کہ فوج کے لیے بسکٹ اور روٹی فراہم کرنے کا آرڈر کب دیا جانا چاہیے؟ کب اپنی افواج کو دہلیز طرف در کب بائیں طرف حرکت دینا چاہیے؟ اسے نابذ کہیں اس ٹھاٹ باٹ اور قوت کی بنا پر، جس سے فوجی بہرہ ور کر دیے جاتے ہیں، کہا جاتا ہے اور چونکہ چچوں اور جی حضور یوں کے ٹولے طاقت کی خواہش بوسی کرنے کے لیے ہر دم تیار رہتے ہیں، وہ اس کے ساتھ جینٹس کے اوصاف، جن سے وہ تہی داماں ہوتا ہے، منسوب کر دیتے ہیں۔ بہترین جرنیل، جنہیں میں جانتا ہوں، وہ حقیقت وہ اشخاص تھے جو یا تو اتنی تھے یا غیر حاضر، غ، بہترین باگ راتیاں تھیں۔

خود نیولین نے اس کا اعتراف کیا تھا۔ یا پھر خود نیولین! میں نے وٹلٹس کے میدان میں اس کے چہرے پر خود اطمینانی اور سہ و نظری کی جو جھلکیاں دیکھی تھیں، وہ مجھے اب تک یاد ہیں۔ ایک ایسے کمانڈر کو نہ صرف یہ کہ کسی خاص اوصاف کی ضرورت نہیں رہتی، بلکہ اس کے برعکس اگر وہ انہوں میں بلند ترین درجے میں صفات — محبت، شجری، حساسیت، ملائمت اور فلسفیانہ و مستفسرانہ تشکیک پسندی — سے بالکل ہی کورا ہو، تو اور بھی بہتر ہوگا۔

اس کی سوچ محدود ہونا چاہیے اور اسے اس، مگر کا یقین محکم ہونا چاہیے کہ جو کچھ وہ کر رہا ہے، زبردست اہمیت کا حامل ہے (ورنہ وہ مناسب مستقل مزاجی سے کام نہیں کر سکے گا)، تبھی وہ ٹھہرنا مکمل کر سکے گا۔ خدا نہ کرے کہ اس کے دل میں رحم کی کوئی رشتی بھی ہو، اس کے قلب میں محبت یا ترس کے جذبات امٹنا آئیں اور وہ یہ سوچنے لگے کہ صحیح کیا ہے اور غلط کیا ہے۔ ان کے 'ناہنہ' ہونے کا نظریہ جو زمانہ قدیم میں ہی گھڑ لیا گیا تھا، اس کی وجہ سمجھ میں آتی ہے۔ وہ 'ناہنہ' اس لیے ہیں کیونکہ وہ قوت کے مالک ہیں۔ فوجی کارروائی کا انحصار ان پر نہیں ہوتا بلکہ اس عام سپاہی پر ہوتا ہے جو چلا چلا کر کہتا ہے 'ہم مارے گئے؟' یا اس پر جو 'واہ واہ' 'شاہ شاہ' کے نعرے بلند کرتا ہے۔ اور صرف یہ سپاہی کی حیثیت سے آدمی اس یقین کے ساتھ کہ وہ کارآمد ہے، خدمات سرانجام دے سکتا ہے۔

پرنس آندرے کے گرد پیش جو مباحثہ ہو رہا تھا، اس کے دوران میں پرنس آندرے کچھ انھیں خطوط پر سوچ رہا تھا اور وہ صرف تب بیدار ہوا جب پاؤں لپکی نے اسے آواز دی۔ وہ ہر شخص باہر جا رہا تھا۔

اگلے روز سحائے کے دوران میں امپراطور نے پرنس آندرے سے دریافت کیا کہ وہ کہاں خدمات سرانجام دینا چاہتا ہے اور جب پرنس آندرے نے فرماں روئے مملکت کے خدام و حشم میں شامل کیے جانے کی درخواست کرنے کے بجائے فوج کے ساتھ فرائض ادا کرنے کی اجازت مانگی، تو وہ درباری حلقوں میں اپنا مقام ہمیشہ ہمیشہ کے لیے کھو بیٹھا۔

12

جنگ، بھی شروع نہیں ہوئی تھی کہ رستوف کو اپنے والدین کا محبت نامہ موصول ہوا۔ اس میں انھوں نے اسے مختصراً مناشا کی علالت اور پرنس آندرے سے اس کی سگائی کے اخطار (ان کے خیال میں یہ اس لیے ہوا کیونکہ مناشا نے اسے مسترد کر دیا تھا) کے بارے میں اطلاع دی تھی اور ایک بار پھر اس سے پرزور التجا کی تھی کہ وہ فوج سے ریٹائر ہو جائے ورنہ واپس گھر آ جائے۔ اس خط کے موصول ہونے کے بعد رستوف نے نہ صرف یہ کہ فوج سے ریٹائرمنٹ لینے کی کوئی ٹنگ و دو تہ کی بلکہ اس نے چھٹی کی درخواست بھی نہ دی۔ تاہم اس نے اپنے والدین کے خط کے جواب میں مناشا کی علالت اور اس کی اپنے معیتر کے ساتھ ناچاقی کے بارے میں اظہار افسوس کیا اور انھیں اطمینان دلایا کہ وہ اس کی خواہشات کی تعمیل کرنے کی پوری کوشش کرے گا۔ سو نیا کے نام اس نے ملکہ و خد تحریر کیا۔

"میرے دل کی ملکہ،" اس نے لکھا "مسئلہ محض ناک کا ہے، ورنہ مجھے کوئی چیز وطن واپس آنے سے نہ روک سکتی، لیکن اب جب کہ جنگ شروع ہو چکا ہے، اگر میں نے مادر وطن کی محبت اور اپنے فرض پر اپنی ذاتی خوشی کو ترجیح دی، میں نہ صرف اپنے رہنا، بلکہ خود اپنی نظروں میں ذلیل و خوار ہو جاؤں گا، لیکن یقین مانو کہ یہ ہماری آخری مفارقت ہوگی۔ جوئی جنگ اختتام پذیر ہوئی اور میں زندہ سلامت بچ گیا، اور مجھے تمہارا پیارا حاصل رہا، میں سب کچھ چھوڑ چکا ہوں گا، پرگنا کر تمہارے پاس پہنچوں گا اور تمہیں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اپنے سینہ سوزاں سے چٹائوں گا۔"

درحقیقت جو چیز رستوف کے جیسا کہ اس نے وعدہ کیا تھا، گھر لوٹنے اور سونیا کے ساتھ شادی کرنے کی راہ میں مزاحم ہوئی، وہ معرکہ آرائی کا آغاز ہی تھا، درنتہا ترادنا یا کی خزاں، جس کے دوران میں شکار کھیل جاتا ہے، وہاں کا موسم، جس میں کرکس کا پر سرست تہو رہنا یا جاتا ہے، اور سونیا کی محبت، کبھی اسے اشارے کر رہے اور اپنی طرف بلا رہے تھے۔ اسے تو قہقہے کہ ان چیزوں کی موجودگی میں اس کے سامنے پر سکون دیہی مسرتوں اور دل جمعیوں کا، جن سے وہ اب تک نا آشنا رہا تھا، نیا باب کھل جائے گا۔ ”پرکشش اہلیہ، بچے، شکاری کتوں کا لشکر، تین تین ہیز رفتاری روٹی کتوں کی ایک درجن ٹولیاں، دیکھ بھال کے لیے جاگیر، خاطر تواضع کے لیے پڑوسی اور شاید مقامی شرف کے دونوں سے انکیشن میں کامیابی!“ رستوف خیالات کے گھوڑے دوڑا رہا تھا، لیکن ادھر معرکہ آرائی کی ابتدا ہو چکی تھی اور اسے اپنی رجنٹ کے ساتھ رہنا تھا۔ اور چونکہ ایسا ہونا ہی تھا، نکولائی رستوف، جیسا کہ اس کی عادت تھی، رجنٹ میں جس قسم کی زندگی گزار رہا تھا، اس سے وہ مطمئن تھا اور اس زندگی کو خوشگوار بنانے میں کامیاب رہا تھا۔

جب وہ چھٹی گز رکروا پس آیا اور اس کی آمد پر اس کے ساتھی اپنی مسرت کا اظہار کر چکے، اسے رجنٹ کے بے گھوڑے اکٹھے کرنے کے کام پر روانہ کر دیا گیا اور وہ یوکرین سے چند نہایت عمدہ گھوڑے لے آیا۔ اس کام کی کامیابی پر وہ خود بھی بہت مسرور تھا اور رجنٹ کے اعلیٰ افسروں نے بھی اس کی دل کھول کی تعریف کی۔ اس کی عدم موجودگی کے دوران میں اس کی ترقی کر دی گئی تھی اور اسے لیفٹیننٹ سے کپتان بنادیا گیا تھا اور جب رجنٹ کو، جس کی نفی میں پہلے کی نسبت خاصا اضافہ ہو چکا تھا، جنگ کی تیاریاں کرنے کا حکم ملا، اسے دوبارہ اپنے پرانے سکوڈرن میں بھیج دیا گیا۔

معرکہ آرائی شروع ہو گئی۔ رجنٹ کو دینی تنخواہ پر پولینڈ روانہ کر دیا گیا۔ نئے افسر نئے جوان اور نئے گھوڑے اس میں شامل ہوتے گئے، اور سب سے بڑھ کر، جیسا کہ آغاز جنگ پر ہوتا ہے، ہر شخص میں نیا جوش و خروش اور دلولہ پیدا ہو گیا۔ رستوف، جو رجنٹ میں، اپنے منفعت بخش مقام سے پوری طرح آگاہ تھا، بدول وجان فوجی ملازمت کی دلکشیوں اور مسرتوں میں کھو گیا۔ ویسے اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ جلد یا بدیر اسے ان سے دست کش ہونا پڑے گا۔ مختلف و پیچیدہ سیاسی، مسلکتی اور عسکری وجوہ کی بنا پر فوج دلنا سے پیچھے ہٹ آئی تھی۔ پسپائی کے ضمن میں جو قدم بھی اٹھایا جاتا، اس پر ہیڈ کوارٹرز میں مفادات، دراصل اور بیجانی جذبات کے بیچ در پیچ ٹکراؤ کا سلسلہ شروع ہو جاتا۔ تاہم جہاں تک پولوگرات ہورادوں کا تعلق ہے، موسم گرما کے بہترین ایام کے دوراں میں، جب کہ رسد افراداں مقدار میں میسر تھی، پسپائی کا یہ سارا عمل ہر قسم کی پیچیدگیوں سے معرا اور دل پذیر تھا۔ ہیڈ کوارٹرز میں بھلے مردی، افسردگی، بے چینی اور سازش کی نص چھائی ہوئی ہو، لیکن جہاں تک عام فوجیوں کا تعلق تھا، کسی نے بھی یہ سوال نہ اٹھایا کہ وہ کہاں جا رہے ہیں اور کیوں جا رہے ہیں۔ اگر انھیں پسپائی اختیار کرنے پر کوئی قلق ہو رہا تھا، تو وہ صرف اس بات کا تھا کہ انھیں وہ قیام گاہیں، جن کے وہ عادی ہو چکے تھے، چھوڑنا پڑ رہی تھیں یا کسی پرستانی مہ جیسے سے جدائی اختیار کرنا پڑ رہی تھی۔ اگر کسی شخص کے دل میں یہ خیال آیا بھی کہ آثار اچھے نہیں دکھائی دیتے، تو وہ جیسا کہ

اچھے سپاہی کا شیوہ ہوتا ہے، ہشاش بشاش رہنے اور واقعات کے عمومی رجحان کے بجائے اس کام پر، جو قی طور پر اس کے سپرد کیا جاتا، توجہ دینے کی کوشش کرتا۔ ابتدا میں انھوں نے دلنا کے قریب پڑاؤ ڈالا۔ وہ بہت خوش تھے۔ ان کا کام پولستانی رسیداروں کے ساتھ راہ و رسم بڑھانا، معائنے کی تیاریاں کرنا اور زارا اور دوسرے اعلیٰ فوجی حکام کے سامنے پرٹے کرنا ہوتا تھا۔ پھر حکم موصول ہوا کہ سو سیانی تک پسپا ہو جائیں اور جو رسد ساتھ نہ لے جاسکے، اسے صانع کر دیا جائے۔ ہزاروں کو سو سیانی محض ”بد ہوشی کا پڑاؤ“ کے طور پر یاد رہا۔ سردی فوج نے وہاں اپنے قیام کے دوران میں، سے یہی نام دیا تھا۔ یہ جگہ انھیں اس لیے بھی یاد رہی کیونکہ یہاں فوجیوں کے خلاف شکایات کا طیارہ بندھ گیا تھا۔ ہوائیوں کہ یہاں فوجیوں کو رسد کا سامان اکٹھا کرنے کا حکم ملا تھا۔ انھوں نے اس حکم کا پورا پورا فائدہ اٹھایا اور رسد کے عداوہ پولستانی شرقا کے گھوڑے، گاڑیاں، غالیچے، الغرض جو چیز بھی ہاتھ لگی، سامان رسد کے نام پر ہتھیالی۔ رستوف کو یہ ننھا منا قصبہ اس لیے یاد رہا کیونکہ وہ جس روز یہاں پہنچا تھا، اس نے اسی روز اپنا کورڈر ماسٹر مار جنٹ تبدیل کر لیا تھا اور وہ اپنے سکواڈرن کے جوانوں پر، جو اس کے علم کے بغیر پرانی پیر کے پانچ پیرا لے اڑے تھے اور بے ہوشی کے بعد اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھے تھے، قابو پانے میں ناکام رہا تھا۔ وہ سو سیانی سے بھی پیچھے، مزید پیچھے ہٹے گئے جہاں تک وہ پیچھے ہٹتے دیرینا پہنچ گئے۔ پھر انھوں نے دریا سے بھی پسپائی اختیار کی اور وہ خود روس کی سرحدوں کے قریب پہنچ گئے۔

تیرہ جون کو پادلو گرات، رجنٹ نے پہلی سنجیدہ جھڑپ میں حصہ لیا۔

اس جھڑپ سے ایک روز قبل بارہ جون کو بارش اور اولوں کا بردست طوفان آیا۔ عمومی طور پر 1812 کا سال اپنے طوفانوں کی وجہ سے امتیازی حیثیت کا مالک ہے۔

پادلو گرات، رجنٹ کے دونوں سکواڈرن رائی کے، جس کی بالیاں پھوٹنا شروع ہو گئی تھیں، لیکن جسے موسیوں اور گھوڑوں نے بری طرح روند ڈالا تھا، کھیت میں پڑاؤ ڈالے پڑے تھے۔ چھا جوں بند برس رہا تھا اور رستوف الی بن نامی لو جو ان اسر کے، جو اس کی کفالت میں تھے، ساتھ جھوپڑا نما پناہ گاہ میں، جسے لٹم پشتم بہ ثلث کٹر کر دیا گیا تھا، بیٹھا تھا۔ ان کی رجنٹ کا ایک، اسر، جس کی لمبی لمبی موچیں اس کے رخساروں سے نیچے ڈھلک رہی تھیں، شاف بیڈ کو از رز سے واپسی پر بارش میں پھنس گیا اور ان کے جھوپڑے میں آگیا۔

”کاؤنٹ میں سیدھا شاف سے آ رہا ہوں۔ تم نے رلیف سکی کے کارنامے کے بارے میں کچھ سنا؟“ اور افسران کے سامنے سالٹانوف کی لڑائی کے بارے میں تفصیلات، جو اس نے شاف میں سنی تھیں، بیان کرنے لگا۔

رستوف سر نہوڑائے، کندھے چکائے اور جسم آگے جھکائے، کہ پانی قطرہ قطرہ اس کی گردن پر بہہ رہا تھا، اپنا پائپ پی رہا اور بے توجہی سے سن رہا تھا۔ وہ کبھی کبھار نو جوان الی بن پر، جو اس کے قریب بیٹھا تھا، اپنی منہ نظر ڈال لیتا۔ یہ افسر محض سولہ سال کا چھوٹا تھا اور حال ہی میں رجنٹ میں شامل ہوا تھا۔ اس کا کولائی سے وہی تعلق

تھا جو سات برس قبل نکولائی کا دینی سوف سے تھا۔ الیٰین ہر بات میں رستوف کی نکالی کرتا تھا اور وہ اس کی بالکل اسی طرح پرستش کرتا تھا جس طرح کہ کوئی ریشہ کرتی۔

موکھیل السرنے، جس کا نام زورڈنسکی تھا، طمطراق سے اعلان کیا کہ سالٹانوف بندر کی تھر موپلی⁶⁹ ہے اور اس بندر پر جنرل رابیف سکی نے جو کارنامہ سرانجام دیا ہے، وہ محترمین کے شایاں شاں ہوتا۔ اس نے بتایا کہ کس طرح جنرل رابیف سکی گولیوں کی زبردست بوچھاڑ میں، اپنے دو بیٹوں کو ہند تک لے گیا اور کس طرح اس نے ان کے ساتھ اپنے پہلو سے نصیم پر حملہ کیا۔ رستوف نے کہانی سنی ضرور لیکن اس نے نہ صرف کہ زورڈنسکی کا حوصلہ بڑھانے کے لیے منہ سے کچھ نہ کہا بلکہ اس کے برعکس اس کی شکل اس آدمی کی سی دکھائی دے رہی تھی جسے جو کچھ بتایا جا رہا ہو، اس پر اگر چہ اسے خفت محسوس ہو رہی ہوئی ہے لیکن وہ اسے جھٹلانے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا۔ اوسٹریس اور 1807 کی مہموں کے بعد اسے اپنے تجربے سے معلوم تھا کہ جب فوجی عسکری کارناموں کی تفصیل بیان کرتے ہیں، ہمیشہ دروغ بیانی کرتے ہیں جیسا کہ خود اس نے کیا تھا۔ اس کے علاوہ اسے یہ جاننے سمجھنے کا بھی کافی تجربہ ہو چکا تھا کہ جنگ میں جو کچھ ہوتا ہے، اس کے بارے میں ہم جو تخیل باندھتے ہیں اور اسے جس طرح بیان کرتے ہیں، وہ اس سے جو پیش آیا ہوتا ہے، بالکل مختلف ہوتا ہے۔ چنانچہ اسے زورڈنسکی کی کہانی پسند نہ آئی اور نہ اسے یہ آدمی، جس نے، اپنی سوچ نہیں، اتنی بڑھار کھی تھیں کہ اس کے رخساروں سے نیچے دھلک رہی تھیں اور جس کی یہ بد عادت تھی کہ وہ اپنے مخاطب کے چہرے کے عین اوپر جھک جاتا تھا، اچھا لگا۔ رستوف کے اسے پسند نہ کرنے کی ایک وجہ اور بھی تھی اور وہ یہ تھی کہ اس نے جنگ جھونپڑے میں ضرورت سے زیادہ جگہ گھیر رکھی تھی۔ دویوں وہ دوسروں کے لیے زحمت کا سبب بن گیا تھا۔ رستوف اسے خاموشی سے نکٹارہا۔ "پہلی بات تو یہ ہے کہ وہاں بندر، جو حملے کی زد میں تھا، اتنی ٹھکڑی ہوئی، اتنی انفراتفری برپا ہوئی ہوگی کہ گرو رابیف سکی نے اپنے بیٹوں کے ساتھ حملہ کیا بھی ہوگا، اس کا، سوائے ان دس بارہ آدمیوں کے، جو اس کے قریب ترین ہوں گے، کسی دوسرے پر کوئی خاص اثر نہ ہوا ہوگا،" رستوف نے سوچا۔ "رہے دوسرے، وہ یہ کچھ ہی نہیں کہتے تھے کہ رابیف سکی کیسے اور کس کے ساتھ بندر پر آیا ہے، اور وہ، جنھوں نے اسے دیکھا ہوگا، اسے دیکھ کر ان کے دلوں میں بھی کوئی ولولہ پیدا نہیں ہوا ہوگا، انھیں تو اپنی جانوں کے لائے پڑے ہوئے ہوں گے، ایسے میں ان کے لیے رابیف سکی کے نرم و ملائم پدرانہ جذبات کیا معانی رکھتے ہوں گے؟ مزید برآں،، دروٹس کے مقدور کا انحصار، جیسا کہ ہمیں بتایا جاتا ہے کہ تھر موپلی کے سلسلے میں ہوا تھا، اس بات پر نہیں تھا کہ سالٹانوف بندر پر قبضہ ہوتا ہے یا نہیں۔ پھر اس قربانی کا فائدہ؟ پھر اپنے ہی بچوں کو لڑائی میں جھونکنے کی کیا ضرورت تھی؟ میں پتیا کو، بلکہ ایس کو بھی، جو سوائے اس کے کہ اچھا لڑکا ہے، میرا کچھ نہیں لگتا، کبھی اپنے ساتھ نہ لے جاتا، میں انھیں خطرے سے دور رکھنے کی کوشش کرتا۔" نکولائی زورڈنسکی کی گفتگو سننا اور ان خطوط پر سوچنا تا تھا، لیکن اس نے اپنے خیالات کو الفاظ کا جامہ پہنانے سے گریز کیا۔ یہ چیز بھی اس نے تجربے سے سیکھی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ یہ داستان ہماری سپاہ کی شان و شوکت کو چار چاند لگاتی ہے چنانچہ آدمی کو جھوٹ موٹ ہی

سہی لیکن ظاہر یہی کرنا پڑتا تھا کہ وہ اسے صحیح تسلیم کرتا ہے اور اس نے اسی کے مطابق عمل کیا۔

”مجھ سے اب مزید برداشت نہیں ہوتا“ الی میں نے کہا۔ ”وہ ابھانپ چکا تھا کہ رستوف کو زور و زور سے کھینچ رہا ہے۔“

الی بن باہر نکل گیا اور زور و زور سے گھوڑے پر اپنی راہ لی۔

”ہزار رستوف! جلدی کریں! جلدی کریں! مجھے مل گیا ہے یہاں سے کوئی دوسرا زور و زور سے خاندہ ہے۔ ہمارے کئی ساتھی پہلے ہی وہاں موجود ہیں۔ ہم کم از کم اپنے کپڑے تو خشک کر سکیں گے اور ماریا پیندری خود ناویں ہے۔“

ماریا پیندری خود ناہر جمنٹ کے ڈاکٹر کی شریک حیات تھی۔ وہ نازک اندام، قبول صورت، نوجوان جرمن خاتون تھی۔ ڈاکٹر نے پوینڈ میں اس کے ساتھ شادی کی تھی۔ ڈاکٹر کے پاس یا تو اتنے ذرائع نہیں تھے کہ وہ اپنی اہلیہ کے لیے کوئی گھر خرید سکتا یا پھر اس کے لیے شادی کے ابتدائی زمانے میں اپنی بیوی سے جدائی کا تصور سہاں روح تھا، وجہ بہر حال کچھ ہی کیوں نہ ہو، وہ رجنٹ کے ساتھ جہاں بھی جاتا، اپنی دہن کو اپنے ساتھ لے جاتا اور ہورہوں میں اس کا حاسدانہ رویہ مذاق کا مستقل موضوع بن گیا تھا۔

رستوف نے اپنا اوور کوٹ اپنے کندھوں پر ڈالا اور چلا کر ماوروشکا کو حکم دیا کہ وہ ان کی اشیاء کران کے پیچھے پیچھے آجائے۔ وہ خود الی بن کے ساتھ چل پڑا۔ راہ گزر پر کبھی وہ کچھڑ میں پھسل جاتا اور کبھی اس میں چپکے اڑے لگتا لیکن رستوف سے ادھر ادھر نہ ہوتا۔ بارش تھمتی جا رہی تھی لیکن اندھیرا بڑھتا جا رہا تھا۔ کبھی کبھی وہ بجلی چمک جاتی اور ذرا کی ذرا تاریکی چھٹ جاتی۔

”رستوف، آپ کہاں ہیں؟“

”یہاں، ادھر۔ بجلی کی کیا چمک ہے!“ وہ ایک دوسرے سے کہہ رہے تھے۔

13

اڑے بجڑے خانے میں، جس کے سامنے ڈاکٹر کی بند گاڑی کھڑی تھی، کوئی نصف درجے انسر پہنے ہی موجود تھے، نرم و گداز جسم اور خوب صورت بالوں والی پست قامت جرمن خاتون، ماریا پیندری خود نا، ڈرینگ جیکٹ اور شیعہ نوپا پہنے، باہری دروازے کے قریب کھلے ڈھلے پنج پر بیٹھی تھی۔ اس کا خاندان کے قریب کو استراحت تھا۔ جب رستوف اور الی بن اندر داخل ہوئے، حاضرین نے خوشی سے چلاتے اور ہنستے انھیں ”ئی آیاں نوں“ کہا۔

”کاش معلوم ہوتا ہے کہ خوب مزے ہو رہے ہیں!“ رستوف نے ہنستے ہوئے کہا۔

”اور یہ تم منہ پھاڑ پھاڑ کر کیا دیکھ رہے ہو؟“

”چھ نمونے ہیں! ان کے جسموں سے پانی یوں گر رہا ہے جیسے ندی بہہ رہی ہو! خبردار، کہیں ہمارے ڈرائنگ روم کو نہ بھگودینا!“

رستوف اور الی سین پک، چھپک ایک کونے کی طرف بڑھے۔ وہاں وہ گلیے کپڑے اتار کر خشک لباس پہن بھی سکتے تھے اور ماریا ہندری خودنا کو شرم سار ہونے سے بھی بچا سکتے تھے۔ وہ چوبی تختوں کے پیچھے بالکل ہی خشک سٹوروم میں گھسنا چاہتے تھے۔ لیکن وہاں اکلوتی موسمِ ہتی کی روشنی میں خالی صندوق پر بیٹھے تین افسر تاش کھیلنے میں مصروف تھے۔ جگہ اتنی تنگ تھی کہ تل دھرنے کی گنجائش نہیں تھی۔ انھوں نے پورا زور لگا یا مگر وہ افسر اس سے مس نہ ہوئے اور انھوں نے اپنی جگہ چھوڑنے سے صاف انکار کر دیا۔ ماریا ہندری خودنا نے تکی نوازش کی کہ اپنی چینی کوٹ انھیں دے دیا تاکہ وہ اسے بطور پردہ استعمال کر سکیں اور اس پردے کے عقب میں رستوف اور الی سین نے لا در و شکا کی مدد سے، جوان کی وردیاں اور دوسرا سامان لایا تھا، خشک ملبوسات پہن لیے۔

انھوں نے ٹوٹے پھوٹے خوشی سٹور میں، گ جوائی۔ ایک چوبی تختہ بن کے ہاتھ آ گیا۔ انھوں نے اسے دو کانٹھوں کے، ترپار رکھا اور اسے جھول سے زھانک دیا۔ انھیں کہیں سے چھوٹا سا اور بوتلوں کا ڈبا، جس میں رم کی آدمی بوتل تھی مل گیا۔ انھوں نے ماریا ہندری خودنا سے تمام تنظیلات اپنے ہاتھ میں سینے کی درخوست کی اور خود اس کے ارد گرد جمع ہو گئے۔ ایک شخص نے اسے اجداد رومل پیش کیا تاکہ وہ اس سے اپنے خوبصورت ہاتھ پونچھ سکے، دوسرے نے اس کے قدموں تلے اپنا اور کوٹ بچھا دیا تاکہ اس کے ننھے منے پاؤں گلیے نہ ہو جائیں، تیسرے نے اپنا لبارہ کھڑکی پر ڈل دیا تاکہ اسے ہوا کے جھوکوں سے آڑ میرا سکے اور چوتھا اس کے خاوند کے چہرے سے کھیاں اڑنے لگا کہیں وہ جگ نہ جائے۔

”انھیں رہنے دیں“ ماریا ہندری خودنا نے جھینپتے شرماتے اور خوشی سے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”یوں بھی یہ ساری رات جاگتے رہے ہیں، گھوڑے بیچ کر سوئے ہیں، بالکل نہیں ملیں گے۔“

”واہ، نہیں،“ ماریا ہندری خودنا، ”ایک افسر نے جواب دیا۔“ ہمیں ڈاکٹر صاحب کا خیال رکھنا ہی ہوگا۔ کون جانے کیا ہو جائے۔ اگر کسی روز میرا زہانک کا ٹٹنے کی نوبت آگئی، مجھے امید ہے کہ یہ مجھ پر ترس کھائیں گے۔“ وہاں صرف تین گھاس تھے اور پانی تا گدلا تھا کہ یہ معلوم کرنا کہ چائے پتلی یا ٹھیک ہے، ناممکن تھا۔ ابھر سوار میں صرف چھ آدمیوں کے لیے پانی کی گنجائش تھی لیکن ان سب باتوں کے باوصف چائے نوشی کا لطف دو بالا ہو گیا تھا کہ سب لوگ سینیرٹی کے اعتبار سے باری باری ماریا ہندری خودنا کے نرم دگرداز ننھے منے ہاتھوں سے، جن پر چھوٹے چھوٹے، اور تقریباً صاف ناخن تھے، گھاس پکڑتے تھے۔ اس شام یوں معلوم ہونے لگا تھا کہ سب افسر بچے دل سے اس سے پیار کرنے لگے ہیں، بلکہ ان لوگوں نے بھی، جو چوبی پارٹیشن کے پیچھے تاش کھیلنے میں مصروف تھے، اپنا کھیل ترک کیا اور تعجیل سے سوار کے پاس آ گئے۔ افسروں پر ماریا ہندری خودنا کا دل جیتنے کا بھوت سوار تھا، انھوں نے اس کے سامنے ہتھیار ڈال دیے۔ ماریا ہندری خودنا نے بھی جب دیکھا کہ اسے حیران

”تھکیل بمشکل شروع ہوا، ہوگا کہ دفعتاً ڈاکٹر کا سر، جس کے بال پریشان تھے، چانک اپنی بیوی کے عقب سے نمودار ہوا۔ وہ کچھ دیر سے جاگ رہا تھا اور جو کچھ کہا جا رہا تھا، سب سن رہا تھا، اور جو کچھ ہو رہا تھا، بٹھا ہوا اس میں نہ تو مزاح کا کوئی پہلو نظر آیا اور نہ اس میں اسے کوئی دلچسپی اور لطف معلوم ہوا۔ اس کے چہرے پر خفگی اور افسردگی

کے آثار تھے۔ اس نے افسروں سے سیک ملیک کرنا گوارا نہ کیا بلکہ اپنے جسم کو کھرچتے ہوئے بولا کہ وہ ایک طرف ہٹ جائیں کیونکہ انھوں نے اس کا راستہ روک رکھا ہے۔ جونہی وہ ہر نکلا، تمام افسر کھلکھلا کر ہنسنے لگے جب کہ ماریا بیندری خود نا کا چہرہ شرم سے سرخ سے سرخ تر ہوتا چلا گیا تا آنکہ اس کی آنکھوں سے آنسو تھلکنے لگے اور اس سے وہ افسروں کی نگاہوں میں اور بھی دلکش معلوم ہونے لگی۔ جب ڈاکٹر مچن سے واپس اندر آیا اس نے اپنی بیوی (جواب خوشی سے مسکرا نہیں رہی تھی بلکہ خوف زدہ ہو کر اپنے خاوند کو دیکھ رہی اور اپنی سزا کا انتظار کر رہی تھی) کو بتایا کہ بارش ختم گئی ہے، اب چلنا اور رات، اپنی بندگاری میں بسر کرنا چاہیے ورنہ سب کچھ چوری ہو جائے گا۔

”میں اپنا رول بلکہ دوارولی بھیج دیتا ہوں!“ رستوف نے کہا۔ ”کیا عہدہ تجویز ہے، کیوں ڈاکٹر صاحب؟“

”میں خود پہرہ دینے کے لیے تیار ہوں!“ الی سین نے کہا۔

”نہیں، حضرات، بالکل نہیں۔ آپ لوگ جی بھر کر سوچئے ہیں لیکن میں درماتیں نہیں سوسکا،“ ڈاکٹر نے کہا۔ وہ منہ بچہ کر اپنی بیوی کے پاس بیٹھ گیا اور باری کے ختم ہونے کا انتظار کرنے لگا۔

افسروں نے جب اسے افسر وہ دول گیر بیوی کی طرف منہ لٹکائے دیکھا، وہ اور بھی ترنگ میں آگئے اور ان کے لیے اپنی ہنسی رہا ناممکن ہو گیا۔ لیکن وہ ہنس کیوں رہے تھے، ان میں سے چند ایک اگلے ہی لمحے اس کا قابل قبول جوڑ گھڑنے کی کوشش کرنے لگے۔ جب ڈاکٹر اپنی بیوی کے ساتھ رخصت ہو گیا اور وہ دونوں اپنی بندگاری میں لیٹ گئے، افسران سے خانے ہی میں دراز ہو گئے۔ انھوں نے اپنے گیسے اور کوٹ اپنے اوپر ڈال لیے لیکن خند ان کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی اور وہ خاصی دیر تک سونہ سکے۔ وہ آپس میں باتیں کرنے لگے۔ کبھی وہ ڈاکٹر کے اضطراب اور اس کی بیوی کی مسرت کا ذکر کرتے اور کبھی ان میں سے کوئی بھگ کر پورچ میں جاتا اور واپس آ کر بتاتا کہ بندگاری میں کیا ہو رہا ہے۔ رستوف نے متعدد مرتبہ اپنا چہرہ اٹھانپا اور سونے کی کوشش کی کہ کوئی نہ کوئی افسر ایسی بات کہہ دیتا کہ اس کی آنکھ کھل جاتی، باتوں کا سلسلہ دوبارہ شروع ہو جاتا اور وہ ایک بار پھر احمقانہ، ہچکچانہ اور پر شور انداز سے قہقہے لگانے لگتے۔

تین نچ چکے تھے لیکن ابھی تک کوئی بھی نہیں سویا تھا۔ اتنے میں کواریٹر ماسٹر حکم لے کر آگیا کہ انھیں استرونا کے چھوٹے قصبے میں پہنچنا ہے۔

افسران ابھی تک باتیں کیے جا رہے ہیں اور قہقہے لگاتے جا رہے تھے اور ساتھ ساتھ روانگی کی تیاریاں بھی کرتے جا رہے تھے۔ انھوں نے ایک بار پھر سادار میں گدلا پانی ابال لیکن رستوف چائے کا انتظار کیے بغیر اپنے سکوادران کے ساتھ روانہ ہو گیا۔ اندھیرا چھٹ چکا تھا، بارش ختم چکی تھی اور آسمان پر بادل تتر بتر ہونے لگے تھے۔ موسم سرد اور مرطوب تھا۔ جب رستوف اور الی سین صبح کے دھندلکے میں سے خانے سے باہر نکلے، دونوں نے ڈاکٹر کی گیلی اور

بارش میں چمکتی پوشش کی طرف دیکھا۔ ڈاکٹر کے پاؤں اسپرن سے باہر نکلے ہوئے تھے۔ گاڑی کے اندر بچے کے اوپر، انہیں اس کی بیوی کی شبیہ ڈی کی جھلک دکھائی دی اور نیند میں اس کی سانسوں کے چلنے کی آواز سنائی دی۔
 ”وہ واقعی بہت نفیس عورت ہے،“ رستوف نے الین سے، جو اس کے پیچھے پیچھے آرہا تھا، کہا۔
 ”پرکشش خاتون!“ الین نے سولہ سالہ لڑکے کی پوری سنجیدگی سے کہا۔

آدھ گھنٹہ بعد سکواڈرن سڑک پر صف بندی کر چکا تھا۔ حکم ”سوار ہو جاؤ!“ سنائی دیا، جوانوں نے سینوں پر صلیب کے نشانات بنائے اور گھوڑوں پر سوار ہو گئے۔ رستوف نے جو سب سے آگے جا رہا تھا، حکم دیا ”آگے بڑھو!“ اور ہزاروں نے اپنے اپنے گھوڑوں کو ایڑ لگائی اور چل پڑے۔ ان کی تلواریں کھنکھار رہی تھیں اور وہ مدھم مدھم سردیوں میں ہاتھیں کر رہے تھے۔ ان کے گھوڑے کچھڑ میں پھینٹے اڑ رہے تھے۔ سڑک خاصی کھلی تھی اور اس کے دونوں کناروں پر برج کے درخت لہہ رہے تھے۔ چار چار سوار ایک دوسرے کے برابر برابر جا رہے تھے۔ ان کے آگے آگے توپ خانہ اور پیادہ فوج کے دستے تھے۔ وہ ان سے پہلے روانہ ہوئے تھے۔

شکستہ سرئی، دل، جو شرق میں طلوع آفتاب کی وجہ سے سرخ ہونے لگے تھے، ہوا کے آگے آگے بھاگے جا رہے تھے۔ روشنی میں ہر لحظہ اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ لہراتی تل کھاتی کھاس، جو ہمیشہ وہی سڑکوں کے کناروں پر اگی رہتی ہے دکھائی دیے گئی تھی۔ رات کی، رش کی وجہ سے وہ، ابھی تک گیلی تھی۔ برج کے درختوں کی چلی جانب جھکی ہوئی شاخیں بھی ابھی تک بھنگی ہوئی تھیں۔ وہ ہوا میں جھول رہی تھیں اور سڑک پر پانی کے درخشاں قطرے کر رہی تھیں۔ ہرگزرتے منٹ کے ساتھ جوانوں کے چہرے واضح سے واضح تر ہوتے چلے گئے۔ رستوف، الین کی، جو کبھی اس کا ساتھ نہیں چھوڑتا تھا، معیت میں برج کے درختوں کی دونوں قطاروں کے بیچوں بیچ سڑک پر جا رہا تھا۔
 رستوف جب جنگی خدمات سرانجام دے رہا ہوتا، وہ اتنی عیاشی ضرور کر بیٹا کہ وہ رجمٹ کے گھوڑے کی بجائے قازق گھوڑے پر سوار ہو جاتا۔ وہ شکاری تھا اور گھوڑوں کو خوب پہچانتا تھا۔ اس نے حا ہی میں ایک بہت عمر والا دار گھوڑا اور یائے ڈان کے گھاس کے میدانوں سے خریدا تھا۔ اس گھوڑے کا جسم مشکل لیکن اس کی دم اور ابال سفید تھیں۔ وہ اس پر سوار ہو کر ہر کسی کو پچھاڑ سکتا تھا۔ وہ جب بھی اس پر سواری کرتا، اسے بہت لطف آتا۔ وہ گھوڑے پر بیٹھا تھا اور گھوڑے کے بارے میں صبح کے بارے میں، ڈاکٹر کی بیوی کے بارے میں سوچتا جا رہا تھا، لیکن اس کے سر پر جو خطرہ منڈا رہا تھا، اس کی طرف اس کا دھیان ایک مرتبہ بھی نہ گیا۔

ابتدائی ایام میں اسے جب کبھی محاذ جنگ پر جانا ہوتا، اس کے پسینے چھوٹ جاتے تھے لیکن اب اسے خوف کا ذریعہ ہر حساس نہیں تھا۔ وہ اس لیے ڈر نہیں تھا کہ کیونکہ اسے گودہ باری میں جانے کی عادت ہو چکی تھی (انسان خطرات کا کبھی عادی نہیں ہو سکتا)، بلکہ اس سے یہ کیوں کہ وہ سیکھ چکا تھا کہ خطرے کے سامنے اپنے خیالات کو کس طرح قابو میں رکھا جاسکتا ہے۔ اس نے اپنی تربیت کچھ اس طرح کر لی تھی کہ جب بھی اسے محاذ کی جانب جانا ہوتا، وہ ہر چیز کے متعلق سوچتا، لیکن وہ چیز۔ خطرہ، جس کا اسے سامنا کرنا ہوتا تھا۔ بظاہر اسے جس میں سب سے زیادہ

لیجی بیٹا چاہیے ہوتی، وہ اس کے بارے میں کچھ نہ سوچتا۔ اپنی ملازمت کے ابتدائی دور میں وہ خواہ کتنی ہی کوشش کرتا، اپنے آپ کو بریلی کے کتنے ہی تلمیذ بناتا، وہ یہ کیفیت کبھی اپنے اوپر طاری نہ کر سکتا۔ وقت کے ساتھ ساتھ یہ خود بخود پیدا ہو گئی تھی۔ اب وہ الین کی معیت میں برج کے درختوں کے نیچے نیچے جا رہا تھا۔ کبھی کوئی شاخ اس کے ہاتھ میں آ جاتی اور وہ اس کا ایک آدھ پتا توڑ لیتا، کبھی وہ اپنے پاؤں سے گھوڑے کے پہلو کو چھوٹا یا اپنی گردن گھمائے بغیر اپنا پائپ، جو وہ ختم کر چکا ہوتا، اپنے عقب میں ہونڈر کے سپرد کر دیتا، اور وہ یہ سب کچھ استے پر سکون اور لا پرواہی سے کر رہا تھا جیسے وہ کھنڈ تفریح گاہ پر گھڑ سواری کر رہا ہو۔ جب کبھی اس کی نظریں الین کے، جو گھبراہٹ سے بھاگتا اور بڑھ بڑھ کر باتیں بھی بنا رہا تھا، پہچانی چہرے پر پڑتی، وہ تجربے سے خوف اور موت کی اس تکلیف دہ توقع کو، جس میں نوخیز لیغٹینٹ مبتلا تھا، بھانپ جاتا اور سمجھ جاتا کہ صرف وقت ہی اس کی مدد کر سکے گا۔

جونہی بادلوں کے عقب میں آسمان کے صاف شفاف حصے پر سورج غلوغ ہوا، ہوائیوں بند ہو گئی جیسے اس میں طوفان کے بعد اس تابستانی صبح کے حسن میں رخنہ انداز ہونے کا باراندہ رہا ہو۔ درختوں سے پانی کے قطرے اب بھی گر رہے تھے لیکن اب یہ عمود اپنے نیچے آ رہے تھے اور ہر چیز ساکن تھی۔ سورج پوری آب و تاب کے ساتھ افق پر نمودار ہوا اور بادل کے ایک لمبے اور پتے ٹکڑے کے، جو اس کے اوپر لٹک رہا تھا، پیچھے غائب ہو گیا۔ چند منٹ بعد یہ پھر، پنا جلوه دکھانے لگا لیکن اب اس کی آب و تاب پہلے سے کہیں بڑھ کر تھی اور جب یہ بلند ہوا، اس نے بادل کا اوپری کنارہ کاٹ دیا۔ ہر چیز دند غانے اور چمچانے لگی، اور اس روشنی کے ساتھ ہی، جیسے اس کے جواب میں، آگے توپوں کی گھن گرج سنائی دینے لگی۔

بیشتر اس کے کہ رستوف کو کچھ سوچنے اور گولہ باری کے مقام کا، کہ وہ کتنی دور رہے، اندازہ لگانے کا موقع ملا، کاؤنٹ اسٹریان ٹالسٹائی کا بھونٹ دھمک سے سر پٹ گھوڑا دوڑاتا یہ حکم لایا کہ سڑک کے ساتھ ساتھ درمیانی رفتار سے آگے بڑھا جائے۔

سکوادرن نے پیادہ دستوں اور توپ خانے کو، جنہوں نے اپنی رفتار تیز کر دی تھی، اجایا اور پھر ان سے آگے نکل گیا۔ وہ پہاڑی سے نیچے اترا، دیران اور اجڑے گاؤں میں سے گزرتا اور ایک اور پہاڑی پر چڑھ گیا۔ گھوڑوں کو جھانگ دار پسینا آنے لگا تھا اور سواروں کے چہرے تھمارے تھے۔

”ہائٹ! صفیں درست کر لو!“ گھڑ سوار جمنٹ کے کمانڈر کا حکم گونجا۔

”ہائٹ! سڑ اور آگے بڑھو!“ آگے سے حکم سنائی دیا۔

اور ہونڈر ہماری پوزیشن کی بائیں جانب چل دیے اور نیزہ بردار پولستانی سواروں کے، جو اگلی صفوں میں تھے، پیچھے رک گئے۔ دائیں طرف ہمارے پیادہ دستے گھجوں کا لم بنائے کھڑے تھے۔ یہ محفوظ دستے تھے۔ مزید اوپر، پہاڑی پر، بالکل افق کے ساتھ، بلور کی طرح شفاف فضا میں اپنی توپیں دیکھی جاسکتی تھیں۔ وہ صبح کی ترچھی کرنوں میں جھنگ رہی تھیں۔ سامنے، گھائی کے پار غنیم کے کالم اور توپیں نظر آرہی تھیں۔ گھائی میں، جہاں ہماری ہرا دل

یونٹیں پہلے ہی نسیم سے برسرِ پیکار تھیں، گولیوں کے بہ سرعت تبادلے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔

ان آوازوں پر، جو اس نے مدت سے نہیں سنی تھیں، رستوف بالکل اسی طرح نشاط و انبساط سے جھوم اٹھا جیسے آدمی نہائی تیز موسیقی کی دھنیں سن کر جھوم جاتا ہے۔ دھڑڑ، دھڑڑ، دھڑڑ، گولیوں کی آوازیں گونج رہی تھیں، کبھی یک وقت، اور کبھی بہ سرعت کیے بعد دیگرے۔ ایک بار پھر چہار سو خاصوشی چھاگئی اور ایک بار پھر کچھ اس قسم کی آواز سنائی دی جیسے کوئی شخص چھوٹے دروں پر چل رہا ہو۔

ہو اور تقریباً ایک گھنٹہ اسی جگہ انتظار کرتے رہے۔ توپیں داغی جانے لگیں۔ کاؤنٹ اوسترمان طالبائی گھوڑے پر سوار اپنے محلے کے ساتھ سکواڈرن کے عقب میں آیا، رکا، اس نے رجمنٹ کے کمانڈر سے چند الفاظ کہے اور توپوں کی جانب پہاڑی پر چڑھنے لگا۔

اوسترمان طالبائی کی روانگی کے بعد نیزہ بردار سواروں کے دستے میں حکم گونجنے لگا
”حملے کے لیے صفیں درست کر لی جائیں۔“

پیادہ دستے، جو آگے تھے، پلاٹونوں میں تقسیم ہو گئے تاکہ گھڑ سواروں کو آگے بڑھنے کے لیے رستہ مل سکے۔ نیزہ بردار پولستانی سوار آگے بڑھنے لگے۔ ان کے نیزوں پر عم پھڑ پھڑا رہے تھے۔ وہ دنگی چلتے پہاڑی سے نیچے اتر رہے تھے، اور فرانسیسی سواروں کی، جو اب نیچے بائیں جانب نظر آنے لگے تھے، سمت پیش قدمی کر رہے تھے۔ جونکی نیزہ بردار سوار پہاڑی سے نیچے اترے، ہوز روں کو پہاڑی کے اوپر چڑھنے کا حکم ملانا کہ توپ خانے کو تحفظ فراہم کیا جاسکے۔ جونکی وہ اس جگہ، جو نیزہ بردار سواروں نے خالی کی تھی، پہنچے، سنسنائی، دھماکا دھماکا کرتی گولیوں کی بوجھاؤ شروع ہو گئی مگر وہ نشانے سے دور گر رہی تھیں۔

ان آوازوں نے، جو اس نے کافی عرصے سے نہیں سنی تھیں، رستوف پر نرنگ کی سابقہ آوازوں سے بھی کہیں زیادہ پر لطف اور فرحت بخش اثر چھوڑا۔ وہ زمین پر سیدھا تن کر بیٹھ گیا، اور پہاڑی سے میدان جنگ کا، جو اس کے سامنے کھل پڑا تھا جائزہ لینے اور جی جان سے نیزہ بردار سواروں کی حرکات کا مشاہدہ کرنے لگا۔ وہ نیچے فرانسیسی سواروں کے بالکل قریب پہنچ کر ان پر جھپٹے۔ دھومیں میں افراتفری کے آثار دکھائی دیے۔ پانچ منٹ بعد نیزہ بردار سوار ایک بھاگے آ رہے تھے، لیکن ان کا رخ اس مقام کی، جہاں سے وہ گئے تھے، طرف نہیں تھا بلکہ وہ نسبتاً زیادہ بائیں جانب جا رہے تھے۔ تاریخی وردیوں میں ملبوس نیزہ بردار پولستانی سواروں کے بیچ میں اور ان کے عقب میں فرانسیسی سواروں کے، جو نیلی وردیوں میں ملبوس اور خاکستری گھوڑوں پر سوار تھے، جھمکت نظر آ رہے تھے۔

رستوف کی نظر شکاری کی نظر کی طرح تیز تھی۔ جن محدودے چند لوگوں نے فرانسیسی سواروں کو مارے نیزہ بردار سواروں کا تعاقب کرتے دیکھا، وہ ان میں شامل تھا۔ نیزہ بردار سواروں کے بے ترتیب جھوم، جن کا فرانسیسی سوار

چپچا کر رہے تھے، قریب سے قریب تر آتے جا رہے تھے۔ اگرچہ پہاڑی کی تیلیٹی میں ان کی شکلیں بہت چھوٹی چھوٹی دکھائی دے رہی تھیں، وہ جس طرح ایک دوسرے کو دھکیل رہے، ایک دوسرے سے لگے نکلنے کی کوشش کر رہے اور اپنی بندوقیں یا نیزے فضا میں لہرا رہے تھے، وہ سب کچھ اسے صاف نظر آ رہا تھا۔

رستوں کی نظروں کے سامنے جو کچھ ہو رہا تھا، وہ اسے نگاہیں گاڑے یوں دیکھ رہا تھا جیسے کسی شکار کو دیکھ رہا ہو۔ اسے جلی طور پر محسوس ہوا کہ اگر اس کے ہوز، روں نے اب فرانسیسیوں پر دھاوا بول دیا، تو موثر الذکر اس کی تاب نہیں لاسکیں گے مگر یہ کام فی الفور، اسی وقت، کرنا ہوگا ورنہ بہت تاخیر ہو جائے گی۔ اس نے اپنے گرو ویش نظریں دوڑائیں۔ اس کے قریب ایک کمپین، جس کی نگاہیں بھی نیچے سواروں پر جمی ہوئی تھیں، کھڑا تھا۔

آندریے سیواستیانچ، رستوف نے کہا۔ ”آپ جانتے ہیں کہ ہم انھیں گھیرے میں لے سکتے ہیں...“

”اس سے ہمارا مقصد حاصل ہو جائے گا“ کمپین نے جواب دیا۔ ”درحقیقت۔“

اس کی بات ختم ہونے کا انتظار کیے بغیر رستوف نے اپنے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور سکواڈرن کے آگے سرپٹ بھاگنے لگا۔ پشتر اس کے کہ اسے حکم دینے کا موقع ملا، اس کا سارا سکواڈرن، جس کے اس معاملے میں جذبات اس سے متاثر تھے، اس کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔ رستوف کو کچھ معلوم نہیں تھا کہ اس نے یہ کیسے اور کیوں کیا۔ جیسا کہ وہ شکار کے دوران میں کرتا تھا، یہاں بھی اس نے سوچے سمجھے بغیر یا غور و فکر کیے بغیر عمل کیا۔ اس نے دیکھا کہ فرانسیسی سوار قریب ہیں، وہ سرپٹ بھاگے آ رہے ہیں اور ان کی صفیں درست نہیں ہیں۔ وہ جانتا تھا کہ اگر ان پر حملہ کر دیا جائے تو وہ اس کی مقاومت نہیں کر سکیں گے۔ وہ جانتا تھا کہ یہ واحد موقع ہے جب وہ کچھ کر سکتا ہے، لیکن اگر اس نے اسے گنوا دیا، پھر یہ کبھی ہاتھ نہیں آئے گا۔ اس کے قریب جو سنسنائی اور دھاوا دھار کر لی گولیاں گزری تھیں، انھوں نے اسے آہ عمل کیا تھا اور اس کا گھوڑا وہاں سے ہٹنے کے لیے اتنا بے قرار تھا کہ وہ اس کی مزاحمت نہ کر سکا۔ اس نے گھوڑے کو ایڑ لگائی، چلا کر حکم دیا اور عین اس وقت اپنے سکواڈرن کے، جو اس کے پیچھے تعینات تھا، گھوڑوں کی ٹاہیں سن کر وہ خاصی رفتار سے پہاڑی سے نیچے اترنے اور فرانسیسی سواروں کی جانب بڑھنے لگا۔ وہ پہاڑی سے بمشکل نیچے اترے ہوں گے کہ ان کی رفتار خود بخود چیز سے تیز تر ہونے لگی، اور جوں جوں وہ آہے نیزہ بردار سواروں اور فرانسیسی سواروں کے، جو ان کا تعاقب کر رہے تھے، قریب سے قریب تر ہوتے جا رہے تھے، توں توں اس رفتار میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ اب فرانسیسی سوار ان کے بالکل نزدیک تھے۔ ان میں سے جو لوگ سب سے آگے تھے، انھوں نے جب ہوزاروں کو اپنی طرف آتے دیکھا، وہ پیچھے مڑنے لگے اور جوانان کے پیچھے تھے، وہ اپنی اپنی جگہ رک گئے۔ بالکل اسی احساس کے ساتھ، جس کے ساتھ اس نے اپنا گھوڑا اس راستے پر، جس پر بھیڑنی گزر رہی تھی، سرپٹ دوڑایا تھا، رستوف نے اپنے ڈان گھوڑے کی نگاہیں ڈھیلی چھوڑ دیں اور وہ فرانسیسی سواروں کی شکستہ صفوں کو رد کرنے کے لیے مبارفتماری سے آگے بڑھا۔ ایک نیزہ بردار سوار رک گیا، دوسرا، جو پیس تھا تیر کی سے زمین پر گر پڑا کہ کہیں وہ گھوڑے کے پاؤں سے پھلانگ جائے۔ ایک بے سوار گھوڑا

ہوزاروں کے ہاتھ آگیا اور وہ اسے اپنے ساتھ ہانکنے لگے۔ تقریباً سبھی فرانسیسی سوار سر پٹ پیچھے بھاگ گئے۔ رستون نے ایک خستری گھوڑے کو نظر میں لیا اور اس کے پیچھے چل پڑا۔ رستے میں ایک جھاڑی آگئی اور اس کا دلیر گھوڑا جست لگا کر اسے صاف عبور کر گیا۔ ابھی وہ اپنی کانٹھی پر دوبارہ ٹھیک طرح بیٹھا بھی نہیں تھا کہ اس نے دیکھ کر جس دشمن کو اس نے اپنے نشانے کے لیے منتخب کیا تھا، وہ اس سے صرف چند سینکڑوں کے فاصلے پر آگے ہے۔ یہ فرانسیسی، جو دردی سے افسر معلوم ہوتا تھا، اپنے گھوڑے پر دبکا بیٹھا تھا اور اپنے نیزے کی اٹی سے اسے جزی اختیار کرنے پر مجبور کر رہا تھا۔ پلک جھپکنے میں رستون کے گھوڑے نے اپنا سیدھا فرانسیسی افسر کے گھوڑے کی پچھاڑی سے ٹکرا دیا اور اسی لمحے رستون نے، یہ جانے بغیر کہ کیوں، اپنا نیزہ اپنے حریف پر دے مارا۔

جونہی رستون سے یہ فعل سرزد ہوا، اس کا سارا جوش و خروش تحلیل ہو گیا۔ افسر نیچے گر پڑا۔ اس کی وجہ سے یہ نہیں تھی کہ اسے نیزے سے کوئی گہرا گھاؤ آیا تھا۔ اس نے تو اس کے بازو کو گہنی سے ڈارا اور معمولی سا زخمی کیا تھا۔ اس کے گرنے کا سبب یہ تھا کہ ایک تو اس کے گھوڑے کو ٹکر لگی تھی اور دوسرے وہ ڈر گیا تھا۔ رستون نے اپنا گھوڑا روک لیا اور اس کی نگاہیں یہ دیکھنے کے لیے کہ اس نے کس قسم کے آدمی کو چیت کیا ہے، اپنے دشمن کو ڈھونڈنے لگیں۔ فرانسیسی فریوں پھیل کود رہا تھا کہ اس کا ایک پاؤں زمین پر تھا اور دوسرا رکاب میں پھنسا ہوا تھا۔ اس نے رستون کی جانب دیکھ اور خوف سے اس کی آنکھیں سکڑ گئیں۔ وہ کچھ یوں دبکا ہوا تھا جیسے اسے اندیشہ ہو کہ کسی بھی آن اسے ایک اور ضرب لگائی جاسکتی ہے۔ اس کا کچھڑ سے اٹا ہوا زرد چہرہ — یہ خوبصورت اور بالکل نوخیز لڑکے کا چہرہ تھا، آنکھیں بلی کی نیلی اور ٹھوڑی میں گڑھا تھا۔ قطعی معاند نہیں تھا ورنہ یہ جنگ کے لیے موزوں تھا، بلکہ یہ تو انتہائی بھولہ بھالہ اور جانی پھپھانی قسم کا چہرہ تھا۔ پیشتر اس کے کہ رستون یہ فیصلہ کر پاتا کہ اس کے ساتھ کیا سلوک کیا جانا چاہیے، وہ افسر جیٹ کر بولا: ”میں تمھارا ڈالتا ہوں!“ اس نے رکاب سے اپنا پاؤں چھڑانے کے لیے دیوانہ وار زور لگایا لیکن کامیاب نہ ہو سکا۔ دریں اثنا اس کی سبھی سبھی نیلی آنکھیں رستون کے چہرے پر گڑی رہیں۔ چند ہوزار گھوڑے دڑاتے آئے، انھوں نے اس کا پاؤں آزاد کر لیا اور اسے کانٹھی پر بیٹھنے میں مدد دی۔ چاروں اطراف رستون کے ہوزار فرانسیسی سواروں سے تپنے میں مصروف تھے۔ ایک فرانسیسی سوار زخمی ہو گیا اور اگرچہ اس کے چہرے سے خون بہہ رہا تھا، وہ پنا گھوڑا چھوڑنے پر آمادہ نہیں تھا۔ ایک دوسرا ایک ہوزار کے گھوڑے کی کانٹھی پر چڑھ گیا اور اس نے اپنے بازو سوار کے گرد حائل کر دیے۔ دھڑا فرانسیسی سوار بھاگ رہے تھے اور ادھر سامنے فرانسیسی پیادے دھڑا دھڑا گولیاں چھا رہے تھے۔ ہوزار تین تیدیوں سمیت بہ عجلت پیچھے جانب بھاگ پڑے۔ دوسروں کے ساتھ رستون بھی جا رہا تھا۔ اسے یہ احساس کھائے جا رہا تھا کہ اس کے دل پر کوئی بوجھ ہے، کوئی مبہم اور یا گدہ چیز جس کی وہ توجہ بہ کرنے سے قاصر تھا، اس وقت اس پر غائب آگئی تھی جب اس نے تیدی کو پکڑا اور اسے ضرب رسید کی تھی۔

کاؤنٹ اوسترمان۔ طاہر لٹائی ہوزاروں سے، جو واپس لوٹ رہے تھے، ملا۔ اس نے رستون کو بلایا، اس کا

شکریہ داکر اور اسے بتایا کہ وہ اس کے دیراندہ کارنامے کے بارے میں فرماں بردارے مملکت کو رپورٹ ارسال کرے گا اور سفارش کرے گا کہ اسے تھنڈ سینٹ جارج کراں عطا کیا جائے۔ جب رستوف کو کاؤنٹ اسٹریمان طاسطائی کا پیغام ملا تھا، اسے یاد آیا کہ اس نے حکم کے بغیر حملہ کیا تھا۔ اسے یقین تھا کہ اس کے کمانڈنگ افسر نے اسے ڈائنٹ ڈپٹ پلانے کے لیے بلایا ہے کیونکہ اس نے ڈسپلن کی خلاف ورزی کی تھی۔ چنانچہ اسٹریمان طاسطائی کے تعریفی الفاظ اور اس کا انعام کا وعدہ اسے اور بھی خوشگوار محسوس ہونے چاہئیں تھے لیکن اخلاقی مسئلے کا بہم اور ناخوشگوار احساس بیک اسے ستارہ ہاتھ۔ ”خارج مجھے پریشانی کس بات کی ہے؟“ اس نے جنرل سے ملاقات کے بعد واپسی پر اپنے آپ سے پوچھا۔ ”الی بن؟ نہیں۔ وہ صحیح سلامت ہے۔ کیا مجھ سے کوئی موجب خجالت حرکت سرزد ہوئی ہے؟ نہیں، ایسا بھی نہیں ہے۔“ پشیمانی سے ملتی جلتی کوئی اور چیز اسے غصہ دلاری تھی۔ ”ارے ہاں، وہ فرانسیسی افسر، وہی، جس کا چہرہ ذقن ہے۔ اور مجھے خوب اچھی طرح یاد ہے کہ جب میں نے بازو اٹھایا تھا، میں نے کچھ تذبذب دکھایا تھا۔“

رستوف کی نظرقیدیوں پر، جنہیں کہیں لے جایا جا رہا تھا، پڑی۔ وہ گھوڑا بھگاتا اس فرانسیسی افسر کی، جس کی ٹھوڑی پر گڑھا تھا، جھلک دیکھنے ان کے پیچھے بھگا۔ وہ اپنی عجیب و غریب ردی میں ہونے والوں کے لڑکھوڑے پر بیٹھا تھا اور بے قراری سے ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔ نیزے نے اس کے دائیں بازو پر جس طرح خراش ڈالی تھی، اسے زخم بمشکل ہی کہہ جاسکتا تھا۔ اس نے رستوف کو بناوٹی مسکراہٹ سے دیکھا اور علیک سلیک کے لیے اپنا بازو دلہرایا۔ رستوف کو ابھی تک بے چینی محسوس ہو رہی تھی جیسے کوئی چیز اس کے ضمیر پر بو جھدن ہوئی ہو۔

اس روز بھی اور اس سے اگلے روز بھی اس کے دوستوں اور ساتھیوں کے مشاہدے میں یہی آیا کہ رستوف صحیح معنوں میں، فسر دیا چڑچڑاتو نہیں لیکن وہ کھل کر باتیں بھی نہیں کر رہا، اپنے ہی خیالوں میں کھویا ہوا ہے اور مسلسل کچھ سوچے جا رہا ہے۔ اس نے بے نوشی میں بھی کوئی خاص دلچسپی نہ لی، بس تنہا رہنے کی کوشش کرتا رہا اور اپنی ادھڑپن میں مصروف رہا۔

رستوف اپنے اس درخشاں کارنامے کے، جس نے اسے سینٹ جارج کراں ہی نہیں دیا تھا حالانکہ اسے اس پر، اچنبھا بھی ہوا تھا، بلکہ شجاعت کی شہرت بھی عطا کی تھی، متعلق سوچتا رہا۔ اس میں کوئی ایسی بات تھی جیسے وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ ”تو وہ ہم سے بھی زیادہ خائف ہیں؟“ اس نے سوچا۔ ”پھر ہیرو وازم کا مفہوم کیا ہے؟ کیا میں نے یہ واقعی اپنے وطن کے لیے کیا تھا؟ وہ جس کی آنکھیں نیلی اور جس کی ٹھوڑی پر گڑھا تھا، اس کا کیا قصور تھا؟ وہ کتنا سا ہوا تھا؟ اس کا خیال تھا کہ میں اسے موت کے گھاٹ اتار دوں گا۔ آخر میں اسے کیوں ہلاک کرتا؟ میرا تو ہاتھ کاٹنے لگا تھا۔ اور یہ مجھے سینٹ جارج کراں دے رہے ہیں۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ بالکل سمجھ میں نہیں آتا۔“

لیکن جب کولائی ان سوالات پر ملنے کھپائی کر رہا تھا اور جو چیز اسے پریشان کر رہی تھی، اس کا کوئی سراں اس کے ہاتھ نہیں آ رہا تھا، ملازمت میں قسمت کا چکر، جیسا کہ اکثر ہوتا ہے، اس کے حق میں گھوم رہا تھا۔ دسترونا کے واقعے کے بعد اس کی قدر شناسی ہوئی، اسے ہوزاروں کی ایک پائلین کا کمانڈر بنا دیا گیا اور جہاں کسی دیر افسر کی

ضرورت محسوس ہوتی تھی، قرعہ قائل اسی کے نام نکلتا تھا۔

16

جونی کا ڈنٹس کوننا شا کی علالت کی اطلاع ملی۔ حالانکہ وہ خود ابھی تک پوری طرح صحت ماب نہیں ہوئی تھی، اور اس کے جسم میں طاقت نہیں آئی تھی، وہ چپا اور باقی افراد خانہ کے ساتھ عازم، سکر ہو گئی۔ رستوں کا سراخانہ ان، ماریا متر یونا کے گھر سے اپنے گھر منتقل ہو گیا اور وہ شہر میں قیام پذیر ہو گئے۔

ننا شا کی علالت اتنی سنگین تھی کہ اسے اس کی وراثت کے والدین کی خوش نصیبی سمجھا چاہیے کہ وہ تمام باتیں۔ اس کا رویہ وراثت کا اپنی نسبت کو منسوخ کرنا۔ جو اس کا موجب بنی تھیں، پس منظر میں تحلیل ہو گئیں۔ ان کے لیے یہ سوچنا ممکن نہیں رہا تھا کہ جو کچھ ہوا تھا، اس کے لیے وہ کتنی قصور وار تھی جب کہ اس کی حالت اتنی خراب تھی کہ وہ نہ کھا سکتی تھی اور نہ سو سکتی تھی۔ بظاہر وہ روز بروز خف سے خف تر ہوتی جا رہی تھی، کھانسی رہتی تھی اور ڈاکٹروں نے استاروں کنایوں سے انھیں سمجھ دیا تھا کہ اس کی زندگی خطرے میں ہے۔ اب انھیں صرف ایک ہی فکر ستائے جا رہی تھی کہ اسے کسی نہ کسی طرح صحت یاب کیا جائے۔ اس کے علاوہ انھیں اور کوئی بات سمجھتی ہی نہیں تھی۔ ڈاکٹروں کا ہاتھ لگا رہتا تھا۔ کبھی وہ اکیلے اکیلے آتے اور کبھی ایک دوسرے کے ساتھ۔ وہ آپس میں مشورے کرتے، جرمن، فرانسیسی اور لاطینی زبانوں میں طویل گفتگوئیں کرتے اور ایک دوسرے کو تنقید کا نشانہ بناتے۔ وہ انتہائی مختلف اقسام کے نسخے، جن کا اطلاق ان تمام امراض پر جن سے وہ آگاہ تھے، ہو سکتا تھا، تجویز کرتے۔ لیکن ان میں سے کسی کے بھی ذہن میں یہ سیدھا سادہ خیال نہ آیا کہ ننا شا جس مرض میں مبتلا تھی، ممکن ہے کہ انھیں اس کا علم ہی نہ ہو کیونکہ کوئی بھی ذی روح جس مرض میں مبتلا ہوتا ہے، اسے مکمل طور پر کبھی نہیں جانا جاسکتا کیونکہ ہر ذی روح کے اپنے انفرادی خصائص ہوتے ہیں اور اس کا مرض حوالہ کیے ہی ہو، ہمیشہ اسی کے لیے مخصوص ہوتا ہے، نیا، پیچیدہ مرض، جس سے طب کا نہیں ہوئی۔ مرض محض پیچیدہ دوا، جگر، جلد، قلب، اعصاب، علی ہذا القیاس، کا جیسا کہ طبی کتابوں میں مندرج ہوتا ہے، نہیں ہوتا، بلکہ ان اعضا کی بے قاعدگیوں کی جولا تعداد صورتیں اختیار کرتی ہیں، ان میں سے ایک صورت ہوتا ہے۔ ڈاکٹروں کے اذہان میں یہ سیدھا سادہ خیال کبھی بار نہیں پاسکتا تھا (بالکل اسی طرح، جس طرح کسی جادوگر کے دماغ میں کبھی یہ خیال نہیں پاسکتا کہ اس کا جادو کا کام رہا ہے) کیونکہ طب کی پرنکٹس ان کی زندگی بھر کا مشغلہ تھا، انھیں اس کا معاوضہ ملتا تھا اور انھوں نے اپنی زندگی کے بہترین سال اس میں کھپائے تھے۔ لیکن یہ خیال ان کے اذہان میں کیوں بار نہیں پاسکتا تھا، اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ وہ یہ سمجھ گئے تھے کہ لاریب وہ بہت کام کے لوگ ہیں اور ان کا وجود بہت راحت ساں ہے۔ اور حقیقتاً وہ رستوں خانہ ان کے لیے بہت سودمند بنے ہوئے تھے۔ وہ محض اس لیے سودمند ثابت نہیں ہو رہے تھے کہ وہ مریضہ کو ایسی ایسی اشیاء جو زیادہ تر مردہاں ہوتی تھیں (ان سے جو ضرر پہنچتا تھا، اس کا اندازہ لگانا اتنا آسان نہیں تھا کیونکہ ان کی مقدار بہت خفیف

ہوتی تھی) بکھلا پلا دیتے تھے بلکہ ان کا وجود اس لیے فائدے مند، ضروری اور ناگزیر تھا کیونکہ وہ مریض دوشیزہ اور اس کے لواحقین کی جو اس سے محبت کرتے تھے، اخلاقی ضرورت پوری کر رہے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا میں نیم حکیم، سین عورتیں، ہومیو پیتھ ور، یلو پیتھ ہمیشہ موجود رہے ہیں اور موجود رہیں گے۔ انسان پر جب بھی افتاد پڑتی ہے، وہ ہمیشہ تسکین کی ضرورت محسوس کرتا ہے، ہمدردی ڈھونڈتا ہے، عمل چاہتا ہے اور یہ ڈاکٹر یہی ابدی انسانی ضرورت پوری کر رہے تھے۔ وہ اس ابدی انسانی ضرورت کی، جو انتہائی ابتدائی صورت میں بچوں میں نظر آتی ہے، تسکین فراہم کر رہے تھے۔ بچوں کو اگر معصوم سی بھی چوٹ آجائے، تو وہ چاہتے ہیں کہ کوئی ان پر دست شفقت پھیرے، انہیں سہلائے اور ان کی اذیت کو کم کرے۔ چنانچہ جب بچہ زخمی ہوتا ہے، وہ فوراً ماں یا آبا کی طرف بھاگتا ہے کہ وہ اسے اپنے بازوؤں میں، شہلے اور زخمی جگہ کو چومے یا سہلائے۔ وہ یہ ماں ہی نہیں سکتا کہ ان اشخاص کے، جو اس سے کہیں زیادہ غلغلہ اور قوی ہیں، پاس اس کی تکلیف کا کوئی علاج نہیں ہے۔ اسے محض اس امید سے کہ اس کی تسکین کا سامان فراہم کر دیا جائے گا، اور اس کی ماں کے چہرے پر، جب وہ اس کی چوٹ سہلا رہی ہوتی ہے، ہمدردی کا جوتاثر ہوتا ہے، اس سے اس کی تشفی ہو جاتی ہے۔ ناشا کے لیے ڈاکٹر اس لیے مفید تھے کیونکہ وہ اس کے ”مقام تکلیف“ کو چومتے تھے، سہلاتے تھے اور اسے یقین دلاتے تھے کہ اس کی ساری تکلیف رفع ہو جائے گی بشرطیکہ کوچران لپک کر آریا سکواٹر میں کیسٹ کے ہاں سے ایک روہل ستر کو پک کی خوبصورت ڈبیوں میں بند چند سلوف اور گولیاں لے آئے اور وہ ان سفوفوں کو کم نہ زیادہ اس ہر دو گھنٹے بعد ابلے ہوئے پانی میں حل کر کے پی جائے۔ اگر سونیا، کاؤنٹ اور کاؤنٹس کے پاس کرنے کو کچھ نہ ہوتا، اگر انہیں ڈاکٹروں کے تجویز کردہ نسخوں کے مطابق ناشا کو گھڑی کے حساب سے گولیاں نہ کھلانا ہوتیں، اسے دوائیں نہ پلانا ہوتیں، چکن کٹ لٹ (Cutlet) اور اس قسم کی دیگر اشیاء تیار نہ کرنا ہوتیں، پھر ان کا کیا بنتا؟ ان کے پاس ناشا کو، جو روز بروز کمزور و رونا توں ہوتی جا رہی تھی، دیکھنے کے علاوہ اور کوئی کام نہ ہوتا، تو وہ بڑی مصیبت میں پھنس جاتے۔ یہ چھوٹے چھوٹے کام انہیں مصروف رکھتے اور ان کی تسکین کا سامان فراہم کرتے۔ ڈاکٹروں کے احکام جتنے زیادہ پیچیدہ ہوتے گئے اور جتنی زیادہ احتیاط کا تقاضا کرنے لگے، خاندان کے ارکان کی اتنی ہی تشفی ہوتی رہی۔

اگر کاؤنٹ کو یہ معلوم نہ ہوتا کہ اس کی چھٹی بیٹی کی بیماری پر اس کے ہزاروں روہل اٹھ رہے ہیں اور اگر اس کی صحت بحال کرانے کے لیے اسے مزید ہزاروں روہل خرچ کرنا پڑے، تو وہ دریغ نہیں کرے گا، تو وہ اسے (بیماری) کو کیسے جھیل سکتا تھا؟ اور یا اگر اسے یہ معلوم نہ ہوتا کہ اتنا کچھ خرچ کرنے کے بعد بھی وہ ٹھیک نہ ہوئی اور اسے اس کے ساتھ مشورے کے لیے ممالک غیر کا سفر اختیار کرنا پڑا اور اس سفر پر مزید ہزاروں روہل کا خرچہ برداشت کرنا پڑا، تو بھی وہ ناک بھوس نہیں چڑھائے گا، باوہ وگوں کو بالتفصیل یہ بتا سکتا کہ کس طرح بیٹی دیے اور فیلر جیسے لوگ علامات مرض پہنچانے میں ناکام رہے ہیں لیکن فریس انہیں سمجھ گیا ہے اور مدد و ف اس سے بھی زیادہ کامیاب رہا ہے، اس کے روز و شب کیسے گزر سکتے تھے؟ اور اگر کاؤنٹس کو کبھی کبھار مریضہ کو ڈانٹ پلانے کا موقع نہ

ماتہ اس نے ڈاکٹر کی ہدایت پر لفظ اور معنا عمل نہیں کیا، پھر وہ کیا کرتی؟

”اگر تم نے ڈاکٹر کی ہدایات پر عمل نہ کیا اور مقررہ اوقات پر ادویات کھائیں نہ بیٹیں، پھر تم کبھی ٹھیک نہیں ہو سکو گی!“ وہ کہتی اور یوں اسے جھلاہٹ کے پردے میں اپنا دکھ چھپانے کا موقع مل جاتا۔ ”تم جانتی ہو کہ تم ان چیزوں کے بارے میں غیر سنجیدہ رویہ نہیں اختیار کر سکتیں، ورنہ تمہیں نمونیا بھی ہو سکتا ہے۔“ وہ کہتی رہتی اور اس لفظ کو، جو دوسروں کے لیے اور اس کے اپنے لیے بھی غیر فہم تھا، ادا کر کے بہت خوش ہوتی۔

اور نمونیا کا کیا بنتا اگر اسے یہ سرت بخش آگئی نہ ہوتی کہ اسے پہلی تین راتیں علی التواتر اتنا موقع بھی نہ مل سکا کہ وہ اپنا لباس ہی تبدیل کر لیتی کیونکہ اسے ڈاکٹر کے احکام کی فوری تعمیل کے لیے ہر دم تیار رہنا ہوتا تھا اور یہ کہ وہ اب بھی رات رات بھر جاگتی رہتی ہے کہ کہیں اس سے ناشا کو عین وقت پر وہ گولیاں، جو مریض ڈبے میں رکھی تھیں، اور اتنی ضرورتیں نہ تھیں، دینے میں چوک نہ ہو جائے؟

اور خود ناشا بھی، اگرچہ وہ کہتی یہی تھی کہ اسے کوئی دوائی نہیں پہنچا سکے گی اور یہ سب بکواس ہے، یہ دیکھ کر بہت خوش ہوتی تھی کہ اس کے لیے اتنی قربانیاں دی جا رہی ہیں۔ اس کے لیے یہ اسر بھی باعث سرت تھا کہ اسے مقررہ اوقات پر ادویات کھانا پینا ہیں، یہی نہیں بلکہ یہ بات بھی خوشگوار تھی کہ ہدایات کے بارے میں لا پرواہی برت کر وہ یہ قضا سکتی ہے کہ وہ طبی علاج کو نہیں مانتی اور اپنی زندگی کو کوئی اہمیت نہیں دیتی۔

ڈاکٹر ہر روز آتا، اس کی نبض دیکھتا، اس کی زبان کا معائنہ کرتا اور اس کے السرود چہرے کو نظر انداز کر کے اس سے ہنسی مذاق کرتا۔ لیکن اس کے بعد جب وہ ملحقہ کمرے میں چلا جاتا اور کاڈنٹس لپک جھپک اس کے پیچھے پیچھے آ جاتی، وہ اپنے چہرے پر سنجیدگی اور متانت طاری کر لیتا، فکر مند انداز سے اپنے سر کو جنبش دیتا اور کہتا: ”اگرچہ مریض کی حالت خاصی نازک ہے، تاہم مجھے امید ہے کہ اب کے میں نے جو دوا تجویز کی ہے، وہ اپنا اثر ضرور دکھائے گی۔ اب ہمیں انتظار کرنا اور دیکھنا ہوگا۔ دراصل مریض کی بیماری نفسیاتی زیادہ ہے اور...“ اور کاڈنٹس ایک طوائف کے ہاتھ میں کھسکا دیتی لیکن اس کی کوشش یہی ہوتی کہ اس کے اس فعل کا احساس نہ ڈاکٹر کو ہونے پائے اور نہ خود اسے۔ اس کے بعد وہ ہلکے پھلکے دل کے ساتھ مریض کے کمرے میں واپس لوٹ جاتی۔

ناشا کے مرض کی علامات یہ تھیں: اس کی بھوک ختم ہو گئی تھی، اسے راتوں کو نیند نہیں آتی تھی، وہ ہر وقت کھانسی رہتی تھی اور اس پر افسردگی طاری رہتی تھی۔ ڈاکٹر کہتے تھے کہ طبی علاج کے بغیر اس کا بچنا مشکل ہے۔ چنانچہ انھوں نے اسے شہر کی فضا میں، جہاں آدمی کا ویسے ہی دم گھٹنے لگتا ہے، روکے رکھا۔ یوں رستوف 1812 کی گرمیاں گاؤں نہ گئے۔

ناشانے بے حساب گولیاں کھائیں۔ شیشیوں اور ڈبیوں میں سے، جنہیں مادام شوٹس کو جمع کرنے کا جنون تھا، مسلسل سفوف کھائے اور ادویات کے قطرات حلق میں اترنے لگے۔ اسے دیہات کی تازہ فضا میں، جس کی وہ عادی تھی، سانس لینے سے بھی محروم رکھ گیا۔ لیکن ان تمام امور کے باوجود شباب غالب آیا۔ ناشا کا غم روزمرہ کے

وقت اور تاثرات میں ڈوب گیا اور اس کے دل پر مزید بوجھ نہ بنا۔ اس کی تکلیف آہستہ آہستہ ماضی میں قسمل ہونے لگی اور جسمانی طور پر اس کی صحت بحال ہوتی چلی گئی۔

17

مناشا پہلے کی نسبت پر سکون ضرور تھی لیکن اس کی طبیعت کی مردنی دور نہیں ہو سکی تھی۔ وہ نہ صرف مسرت و بہجت کے خارجی مظاہر۔ اجتماعی رقص، سیرپانا، محافل موسیقی، تھیٹر۔۔۔ سے اجتناب برتی تھی بلکہ جب کبھی رہ ہنستی بھی تھی، اس میں آنسوؤں کی آمیزش ضرور ہوتی تھی۔ وہ غم سرائی نہیں کر سکتی تھی۔ جب کبھی اس نے ہنسنا یا تہنائی میں گانا گانا چاہا، شکوں سے اس کا گلا بندھ جاتا۔ یہ آنسوئد امت کے تھے، محسوسیت کے ان ایام کی، جنہیں واپس نہیں لایا جاسکتا تھا۔ یاروں پر تاسف کے تھے۔ وہ جھلانی در کڑھتی کہ اس نے اپنے شباب کی زندگی، جس میں مسرتوں کے رنگ بھرے جاسکتے تھے، لاابانی انداز سے پامال کر دی تھی اور اس کی آنکھیں اشک آلود ہو جاتیں۔ خندہ زنی اور نغمہ آرائی اسے خاص طور پر چاہتے۔ وہ جب کبھی ہنستی یا گانا گانے کی ہمت کرتی، اسے یوں محسوس ہوتا کہ وہ اپنی ان حرکات سے اپنے غم کو بخش کر رہی ہے۔ جہاں تک غمزہ و عشوہ گری کا تعلق ہے، اس معاملے میں ضبط کرنے کی ضرورت باقی نہیں رہی تھی۔ اس طرح کا کوئی خیال کہ کوئی اس کی تعریف کرے، بھولے بھٹکے بھی اس کے ذہن میں نہیں آتا تھا۔ اس زمانے میں وہ کہتی بھی یہی تھی اور محسوس بھی یہی کرتی تھی کہ مسخرے نسا یا ابوالوہا کی طرح مردوں کی اس کے نزدیک بھی کوئی اہمیت نہیں۔ کوئی داخلی چوکیدار پھرے پر تعینات تھا اور اسے سرور کی مسرت سے لطف اندوز ہونے سے روک رہا تھا۔ اور واقعہ یہ ہے کہ اپنے تفکرات سے آزاد لڑکپن میں، جو امیدوں سے اتنا بھرپور تھا، اسے جن چیزوں میں دلچسپی تھی، اب اس کے لیے غما ہو گئی تھیں۔ وہ یادیں، جو بار بار اس کے ذہن میں آتیں اور اس کے لیے سخت اذیت کا باعث بنتیں، خزاں کے ان مہینوں کی تھیں، جب وہ اتر ادنا یا میں نکولائی کے ساتھ شکار پر گئی تھی، ”پچھا“ سے ٹپ تھی اور کرس کی چھٹیاں اس کے ساتھ گزری تھیں۔ اس زمانے کا اگر ایک دن بھی اسے لوٹا دیا جاتا، تو وہ کیا کچھ دینے کو تیار نہ ہو جاتی! لیکن اب یہ زمانہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بیت چکا تھا۔ آئندہ کے مصائب کے بارے میں اس کا جو ماتھا ٹھنکا تھا، ان کے متعلق اسے کوئی دھوکا نہیں ہوا تھا، اسے محسوس ہو گیا تھا کہ آزادی کی کیفیت اور ہر مسرت سے طف اندوز ہونے کی صداقت کبھی واپس نہیں آئے گی۔ لیکن انسان، انسان ہے، اسے کبھی ڈھب زندہ تو رہتا ہے۔

اسے یہ سوچ کر تسلی ہوتی تھی کہ اس کی حالت، جیسا کہ اسے ایک مرتبہ خیال آیا تھا، بہتر نہیں ہوئی ہے، بلکہ دنیا کے کسی بھی انسان سے بدتر، کہیں بدتر ہے۔ لیکن، تنا کا کافی نہیں تھا۔ اسے معلوم تھا اور وہ، اپنے آپ سے پوچھتی رہتی تھی ”اس کے بعد کیا ہوگا؟“ لیکن ب رکھا ہی کیا تھا۔ زندگی مسرتوں سے خالی تھی اور زندگی گزرتی جا رہی تھی۔ مناشا کی صریح سوچ یہ تھی کہ وہ کسی پر بوجھ نہ بنے، کسی کے راستے میں دیوار نہ بنے، لیکن وہ اپنے لیے کچھ نہیں

چاہتی تھی۔ وہ گھر کے کسی فرد سے گھسی ملتی نہیں تھی۔ اس کا بھائی، پتیاء، واحد شخص تھا جس کی موجودگی میں اسے اطمینان محسوس ہوتا تھا۔ وہ کسی بھی دوسرے شخص کی نسبت اس کی صحبت کو ترجیح دیتی اور جب اس کے ساتھ نہ ہوتی، کبھی کبھار اس بھی پڑتی، وہ گھر سے شاذ ہی باہر جاتی تھی اور جو لوگ اس سے ملنے آتے تھے، ان میں پیئر واحد شخص تھا جس کو دیکھ کر اسے واقعی خوشی ہوتی تھی۔

نشا کے ساتھ اپنے برتاؤ میں جس نوعیت کی ملائمت، احتیاط اور اس کے ساتھ ہی بنجیدگی کا ڈنٹ برو خوف روا رکھتا تھا، کسی اور کے لیے اس سے زیادہ کا مظاہرہ کرنا ممکن نہیں تھا۔ وہ غیر شعوری طور پر اس شفقت آمیز ملائمت کے بحر میں آتی گئی۔ نتیجتاً اسے اس کی صحبت میں بڑی راحت ملنے لگی۔ لیکن وہ اس بات کے لیے اس کی احسان مند بھی نہیں تھی۔ وہ یہ محسوس کرتی تھی کہ پیئر کو دوسروں کے ساتھ نیک سلوک کرنے میں کوئی کوشش نہیں کرنا پڑتی۔ اس کا یہ رویہ اتنا فطری ہوتا تھا کہ اس کے حسن خلق میں کوئی خاص خوبی نظر نہیں آتی تھی۔ بعض اوقات نشا کو، جب وہ اس کے پاس ہوتا، اس کے رویے میں خاص قسم کا حجاب اور کٹھن پن دکھائی دیتا، خاص طور پر جب وہ اسے خوش کرنے کے لیے کچھ کرنا چاہ رہا ہوتا یا وہ یہ اندیشہ محسوس کرنے لگتا کہ اس کے منہ سے کوئی ایسی بات، جو ان چیزوں کی یاد میں تازہ کر دے، جو اس کے لیے تکلیف دہ تھیں، نہ نکل جائے۔ وہ یہ سب کچھ دیکھتی تھی اور اسے اس کی معمولی رحم دلی اور شرمیلے پن پر محمول کرتی تھی۔ ان چیزوں کے بارے میں اس نے یہ مفروضہ گھڑا تھا کہ باقی لوگوں کے ساتھ بھی اس کا رویہ ایسا ہی ہوگا۔ اپنے اس غیر ارادی اعلان کے اگر وہ آزاد ہوتا، تو وہ گھٹنوں کے بل جھک کر اس سے شادی اور محبت کی بھیک مانگتا۔ کے بعد، جس کا اظہار اس نے ایک ایسے موقع پر کیا تھا، جب وہ بے حد بیجانی کیفیت میں مبتلا تھی، پیئر نے کبھی دوبارہ اپنے جذبات کا اظہار نشا کے سامنے نہیں کیا تھا اور وہ یہ سمجھنے لگی تھی کہ اس کے یہ الفاظ، جنہوں نے اس وقت اسے اتنی تسکین فراہم کی تھی، اسی طرح دیکھے گئے تھے جیسے آدمی روتے بچے کو تشفی دینے کے لیے ہر قسم کی بے شمار لالچیں اور فضول باتیں کہتا ہے۔ اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ پیئر شادی شدہ آدمی تھا، بلکہ یہ تھی کہ نشا کو اپنے اور کوراگن کے مابین جو اخلاقی رکاوٹ عدم موجود معلوم ہوئی تھی، اپنے اور پیئر کے مابین پوری مضبوطی و رتوت سے کھڑی نظر رہی تھی۔ چنانچہ یہ بات کبھی بھولے سے بھی اس کے ذہن میں نہ آئی کہ ان کے مابین جو تعلقات ہیں، وہ جہاں تک اس کا پنا تعلق ہے، کبھی محبت میں تبدیل ہو سکیں گے اور جہاں تک پیئر کا تعلق تھا، تو اسے اس کا اس کے ساتھ محبت کرنے کا سوال ہی خارج از بحث نظر آتا، اور نہ اسے اپنے دونوں کے بیچ اس طرح کی ملائمت، خود شعوری، رومانوی دوستی، جو کسی مرد اور عورت کے مابین استوار ہو سکتی ہے اور جس کی متعدد مثالیں اس کے علم میں تھیں، ممکن دکھائی دیتی تھی۔

مینٹ پیئر کے ایام صیام⁷³ کے اختتام کے قریب رستوفوں کی ایک دیہاتی پڑوسن، گرافیا ایوانوونا بیلووا بزرگانہ دین کے مقبروں کی زیارت اور سلام کے لیے ماسکوائی۔ اس نے تجویز پیش کی کہ نشا روزے رکھے اور اس کے ساتھ عثمانیہ زبان میں شرکت کی تیاری کرے۔ نشا نے زور شور سے اس تجویز کی پذیرائی کی۔ گرچہ

ڈاکٹروں نے اس کے صبح سویرے باہر نکلنے پر پابندی لگا رکھی تھی، اس نے روزے رکھنے اور عشاءے ربانی میں شرکت کے لیے تیار ہونے پر اصرار کیا۔ یہ عشاءے ربانی اس قسم کی نہیں تھی جس کا رستوفوں کے گھر نے میں رواج تھا کہ وہ اپنے ہی گھر پر تین مذہبی تقریبات منعقد کر لیتے تھے، بلکہ اس میں اس طرح شریک ہونا تھا جس طرح اگر افینا ایوانوونا شریک ہوتی تھی۔ انھیں پورے ہفتے ہر روز گرجے جانا اور صبح، عبادت شام اور عشاءے ربانی بھی میں حاضری دینا اور ان میں سے کسی ایک میں بھی ناغہ نہیں کرنا تھا۔

کاؤتس کو ناسا کا جوش اور دلولہ بہت پسند آیا۔ طبی علاج کے غیر موثر ہونے کے بعد وہ یہ امید کرنے لگی تھی کہ جو کام دواؤں سے نہ ہو سکا، وہ دعا کیے کر دکھائیں گی۔ اگرچہ اس کا دل اندیشوں و دوسوسوں سے معمور رہتا تھا لیکن اس نے ڈاکٹروں کے سامنے کبھی ان کا اظہار نہیں کیا تھا۔ اب اس نے ناسا کی خواہشات سے اتفاق کیا اور اسے بیالودا کے سپرد کر دیا۔

جب گرافینا ایوانوونا صبح ⁷⁴تین بجے اسے جگانے آئی، عام طور پر وہ بھی دیکھتی کہ ناسا پہلے ہی بیدار ہو چکی ہے۔ ناسا کو یہ اندیشہ دامن گیر رہتا کہ کہیں وہ سوتی ہی نہ رہ جائے اور تسبیح صبح کا ناغہ ہو جائے۔ وہ جلدی جلدی ہاتھ منہ دھوتی اور بڑے انکسار و عاجزی کے ساتھ پتہ سادہ تریں ڈریس اور بے آستین کی تبا پہنتی اور پنج بستہ ہوا میں لرزتی کانپتی دیران گلیوں میں، جو صبح صادق کے پہلے اجالے میں روشن روشن ہوتیں، چلنے لگتی۔ گرافینا ایوانوونا کے مشورے پر ناسا اپنے ٹیکسائی حلقے کے گرجے کی عبادت میں شریک ہونے کے بجائے ایک ایسے گرجے میں، جس کا پادری دیں وریالودا کے بقول سادہ اور پروکار زندگی بسر کرتا تھا، چلی جاتی۔ گرجے میں عبادت گزاروں کی تعداد کوئی زیادہ نہیں ہوتی تھی۔ ناسا مریم مقدس، کے ایقونے کے سامنے، جہاں مناجات خوانوں کے دو بروگز رکر پروے کے پیچھے جانا ہوتا تھا، بیالودا کے قریب ہمیشہ اپنی مقررہ جگہ پر کھڑی ہوتی۔ اور جب وہ پادری مقدس کے سانولے چہرے کو، جو اس کے قریب موسیٰ ٹھموس کی روشنی اور دستے میں سے چھن چھن کر آنے والے صبح کے اجالے میں جگمگا اٹھتا تھا، بغور دیکھ رہی اور عبادت کے الفاظ کو، جنہیں وہ سمجھنے کی کوشش کرتی، سن رہی ہوتی، تو ایک ایسی چیز کے سامنے جو رفیع المرتبت اور ناقابل فہم تھی، اس پر عاجزی و انکساری کا یا جذبہ غالب آ جاتا۔ جب عبادت کے الفاظ کا مفہوم اس کی سمجھ میں آ جاتا، اس کے ذاتی جذبات کی تمام رنگینیاں اس کی دعاؤں میں گھل مل جاتیں۔ جب معانی اس کے لیے نہ پڑتے تو اسے یہ سوچ کر اور بھی لطف محسوس ہوتا کہ سب سمجھنے کی آرزو محض تکبر ہے، یہ کہ ہر چیز کی تفہیم ناممکن ہے، یہ کہ اس کا کام محض یقین کرنا اور اپنے آپ کو خداوند کی، جو اس قسم کے لمحات میں اسے اپنی روح کی رہنمائی کرتا لگتا، تجویز میں دینا ہے۔ وہ اپنے سینے پر صلیب کے نشانات بناتی، تقریباً فرش تک دوڑا نو ہو جاتی اور جب اسے تفہیم نہ ہوتی، وہ اپنی رذالت پر خوف زدہ ہو جاتی اور خداوند سے صرف یہ التجا کرتی کہ وہ اس کا ہر گناہ، ہر گناہ معاف کر دے اور اس پر رحم فرمائے۔ جن مناجات کے دوران میں اس پر کھس خشوع و خضوع کی کیفیت طاری ہو جاتی، وہ توبہ کے بارے میں ہوتیں۔ صبح سویرے گھر واپسی کے وقت جب لوگ

ابھی سو رہے ہوتے، اسے سوائے راج مزدوروں کے جو اپنے کام پر جا رہے ہوتے یا جا رہے کشوں کے، جو سرکوں پر جھاڑو پھیر رہے ہوتے، کسی ذی روح کی شکل نہ دکھائی دیتی، اسے ایک ایسے جذبے کا، جس سے وہ پہلے آشنا نہیں تھی، تجربہ ہوتا اور اسے محسوس ہوتا کہ اس بات کا امکان موجود ہے کہ انسان اپنی مدعا علیوں کی اصلاح کر لے اور از سر نو پاکیزہ اور پر مسرت زندگی کے قابل ہو جائے۔

اس پورے ہفتے کے دوران میں، جو اس نے اس طرح گزارا، یہ جذبہ روز بروز قوی سے قوی تر ہوتا گیا۔ عشاءے ربانی میں، جسے بیان لودا "حصولِ قربِ خداوند کی تقریب" کہتی تھی شرکت سے ناشا کو جو مسرت حاصل ہو رہی تھی، وہ اتنی زیادہ تھی کہ اسے محسوس ہونے لگا کہ وہ اس بابرکت اتوار تک مدد نہیں رہ سکے گی۔

لیکن وہ پر مسرت دن آگئی اور اس یادگار اتوار کو جب ناشا، ملل کا سفید لباس پہنے، عشاءے ربانی کی مقدس تقریب میں شرکت کے بعد گھر پہنچی، کئی مہینوں میں پہلی مرتبہ اسے محسوس ہوا کہ اس کی روح کو قرار آ گیا ہے اور جو زندگی ابھی اس نے گزارنا تھی، اس کا تصور اب اس کے لیے سوہان روح نہیں رہا تھا۔

جب اس روز ڈاکٹر اسے دیکھنے آیا، اس نے حکم دیا کہ اس نے دو ہفتے قبل جو سونف تجویز کیے تھے، وہ انھیں کھاتی رہے۔

"اسے انھیں لازماً صبح و شام کھاتے رہنا چاہیے" اس نے کہا۔ اپنی کامیابی پر اسے جو اطمینان ہوا، وہ بے ریا بھی تھا۔ وہ اس کے چھپے چھپتے بھی نہیں تھا۔ "صرف اتنی احتیاط کریں کہ مقدار میں کوئی کمی بیشی نہ آنے دیں۔ کاؤنٹس، اب آپ خاطر جمع رکھیں۔" اس نے بڑی چابک دستی سے طلّائی سکہ اپنی مٹھی میں ٹھاتے ہوئے کہا۔ "وہ عنقریب گانے گانا در کھڑے لگانا شروع کر دے گی۔ اس آخری درالے معجزہ کر دکھایا ہے۔ اب اس کی حالت بہت بہتر ہے۔"

کاؤنٹس نے، جب وہ خوش خوش ڈرائنگ روم سے واپس آ رہی تھی، اپنے ناخنوں کا بغور جائزہ لیا اور ٹیک ٹھونک کے لیے کچھ تھوک اگل دیا۔

جون کے اوائل میں جنگ کے بارے میں پریشان کن سے پریشان کن خبریں، سکو میں پھیلنا شروع ہو گئی تھیں۔ یہ کہا جانے لگا کہ اپر اطور عوام سے اپیل کرنے والے ہیں اور جنس ٹیس فوج سے ماسکو تشریف لارہے ہیں۔ چونکہ گیارہ جولائی تک نہ کوئی اعلان اور نہ کوئی اپیل موصول ہوئی، فرماں روائے مملکت اور روس کی پوزیشن کے متعلق انتہائی مبالغہ آمیز افواہیں گردش کرنے لگیں۔ کہنے والے کہتے تھے کہ اپر اطور اس لیے فوج سے رخصت ہو رہے ہیں کیونکہ وہ خطرے کی زد میں آ چکی ہے، یہ کہ سولنسک نے ہتھیار ڈال دیے ہیں، یہ کہ پولین کے پاس دس لاکھ سپاہ ہے، اور یہ کہ کوئی معجزہ ہی روس کو بچا سکتا ہے۔

گیارہ جولائی بروز ہفتہ اعلان موصول ہو گیا لیکن ابھی تک اس کی نقول طبع نہیں ہوئی تھیں۔ جیٹر نے، جو اتفاق سے رستونوں کے ہاں موجود تھا، وعدہ کیا کہ وہ اعلان اور پیل کی نقول رستوپ چن سے حاصل کرے گا، اگلے روز، اتوار، کوڈر پرائے گا اور انھیں اپنے ساتھ لیتا آئے گا۔

اس اتوار رستون حسب معمول رازد مودسکیوں کے نجی گرجے میں دعائے عشاءے ربانی میں شرکت کے لیے گئے۔ یہ جولائی کا گرم دن تھا۔ دس بجے بھی، جب رستون گرجے کے سامنے اپنی گاڑی سے نیچے ترے گھس، خوانچہ فروشوں کی چیخ دیکار، جھوم کے ہلکے پھلکے اور رنگارنگ گرمائی بیوسات، خیابان کے دونوں اطراف درختوں کے گرد آلود چٹوں، پریڈ کے لیے گزری ہوئی بیلین کی عسکری موسیقی اور سفید براق چھوٹوں، پانی سے تراشیدہ پتھروں پر پیوں کی کھڑکھڑاہٹ اور چکا چوندھ دھوپ، سبھی میں وہ تابستانی آنکس اور حال کے ساتھ وہ اطمینان ور بے اطمینانی، جسے کسی گرم اور چمکیلے دن آدمی خاص شدت سے محسوس کرتا ہے، کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ ماسکو کے سبھی کابرین، رستونوں کے سبھی واقف کاران، رازد مودسکیوں کے گرجے میں موجود تھے۔ (اس سال بے شمار متوں گھرنے، جو عام طور پر اپنی گرمیاں اپنی دیہاتی جاگیروں پر گزارتے تھے، یوں شہر میں قیام پذیر رہے جیسے انھیں زبردست واقعات کے ظہور پذیر ہونے کی توقع ہو۔)

جب خاشا اپنی ماں کے پہلو بہ پہلو اپنے دردی پوش ملازم کے، جو جھوم میں ان کے لیے راستہ بنارہا تھا، پیچھے پیچھے جا رہی تھی، اس نے اپنے بارے میں ایک نوجوان کو حاصے بلند بچے میں سرگوشی کرتے ہوئے سنا

”وہ رستو واسے، وہی جو۔“

”دکشی لاغر ہو گئی ہے! لیکن اس کی دلکشی میں کوئی کمی نہیں آئی!“

اسے کوراگن اور بکنو سکی کے نام سنائی دیے یا اسے خیال گزر کہ اسے سنائی دیے ہیں۔ لیکن اب تو ہمیشہ ہی ہوتا رہتا تھا۔ جب بھی کوئی شخص اس کی طرف دیکھتا، اسے مدام یہی محسوس ہوتا کہ ”جو کچھ مجھ پر جیتا ہے، یہ لازماً اسی کے بارے میں سوچ رہا ہوگا۔“ خاشا جب بھی اپنے آپ کو جھوم میں پاتی، اس کا دل ڈوبنے لگتا اور وہ اذیت میں مبتلا ہو جاتی۔ اب بھی اس پر، جب وہ ہنسنی ریشمی ڈریس، جسے سیاہ بنجاف سے سنوارا گیا تھا، پہنے ہوئی تھی، اس پر یہی کیفیت طاری تھی۔ جیسا کہ خواتین کا شعار ہوتا ہے، وہ سکون اور وقار کی تصویر بنے گزر رہی تھی۔ اس کی روح میں جو ندامت اور کرب تھا، اس نے اس سکون اور وقار کو اور بھی عظمت بخش دی تھی۔ وہ بھینا جانتی تھی کہ وہ دلکش ہے لیکن اسے اپنی اس آنگہی سے وہ خوشی نہیں ہوں تھی جو کبھی ہو کرتی تھی، اس کے برعکس حال میں، خاص طور پر شہر کے روشن اور گرم تابستانی دن، جیسا کہ آج کا تھا، کسی دوسری چیز کی نسبت یہ اس کے لیے زیادہ اذیت ناک بن گئی تھی۔ ”ایک اور ہفتہ گزر گیا، ایک اور اتوار آ گیا۔“ اس نے یہ یاد کرتے ہوئے کہ وہ گزشتہ اتوار بھی یہاں آئی تھی، سوچا۔ ”اور زندگی، جو کوئی زندگی نہیں ہے، ہمیشہ کی طرح کی زندگی ہے اور حالات بھی، جن میں زندگی گزارنا اتنا آسان معلوم ہوتا تھا، وہی ہیں۔ میں خوبصورت ہوں، نوجوان ہوں اور میں جانتی ہوں کہ میں اب نیک اطوار ہوں۔ قبل ازیں

میں بد اطوار ہوا کرتی تھی لیکن اب میں جانتی ہوں کہ میں نیک اطوار ہوں، اس نے سوچا۔ ”پھر بھی میری زندگی کے بہترین سال کھسکتے جا رہے ہیں اور کسی کو ان سے کچھ حاصل نہیں ہو رہا۔“ وہ اپنی ماں کے پہلو میں کھڑی تھی اور اپنے بچے ملنے والوں سے، جو اس کے قریب کھڑے تھے، سر کے اشارے سے علیک سلیک کا تبادلہ کر رہی تھی۔ وہ عادتاً خواتین کے ملبوسات کا تنقیدی نگاہوں سے جائزہ لینے لگی اور اس نے ایک خاتون کے، جو اس کے قریب ایستادہ تھی، ڈریس میں اور جس بے ڈھنگ، درگجلیک انداز سے وہ اپنے سینے پر صلیب کے نشانات بنا رہی تھی، اس میں ٹیوب ڈھونڈ نکالے۔ پھر اسے یہ سوچ کر بڑی کوفت ہوئی کہ جس طرح وہ دوسروں کا محاکہ کر رہی ہے، اسی طرح خود اس کا اپنا محاکہ ہو رہا ہوگا اور جب اچانک عبادت کے الفاظ اس کے کانوں سے گھرائے، وہ اپنی کیلنگی پردہشت زدہ رہ گئی۔ اس پردہشت اس لیے سوار ہوئی تھی کیونکہ وہ اس پاکیزگی سے، جو حال ہی میں اس کے دل میں رہی تھی، محروم ہو گئی تھی۔

ایک تسکین طبع، معزز، بن رسیدہ شخص عبادت میں رہنمائی کا فریضہ سرانجام دے رہا تھا۔ اس کے انداز میں وہ پرسکوت متانت اور سنجیدگی تھی جو مقتدیوں کی رگوں کو بالیدگی عطا کرتی اور ان پر تسکین بخش اثرات چھوڑ جاتی ہے۔ مانند مقدسہ کے پاک دروازے بند تھے۔ پردہ آہستہ آہستہ بلند ہو اور اس کے عقب میں کسی عالم اور پراسرار آواز نے چند لفظ کہے۔ ناشا کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ کیوں؟ اس کی وجہ شاید خود بھی نہ بیان کر سکتی لیکن ان کا اثر یہ ہوا کہ اس کا سینہ دھک دھک کرنے لگا اور سر ت آگیاں اضطراب اسے اپنی لپیٹ میں لینے لگا۔

”مجھے سکھائیں کہ مجھے کیا کرنا چاہیے، اپنی زندگی کیسے بسر کرنا چاہیے اور کیسے ہمیشہ صحیح کام کرنا چاہیے؟“ وہ ہالانگ رہی تھی۔

چھوٹا پادری ڈاکس پر آیا۔ اس نے اپنا انگوٹھا آگے بڑھا کر پکڑ رکھا تھا۔ اس نے اپنی مہیا میں سے اپنے لیے بال ہار نکالے اور وہ اپنے سینے پر صلیب کا نشان بناتے بلند اور گھبریلے سے مناجات کے الفاظ پڑھنے لگا۔

”آئیں، ہم امن و سکون سے خداوند سے دعا کریں۔“

”آئیں، ہم امن و سکون سے، کسی طبقاتی امتیاز کے بغیر، کسی عناد کے بغیر، اخوت کے رشتے میں بندھ کر۔“

”آئیں، ہم دعا کریں؟“ ناشا نے سوچا۔

”امن کے لیے، جو اوپر سے نازل ہوتا ہے، اپنی رگوں کی بخشش کے لیے؟“

عالم ٹانگ کے لیے اور ان تمام غیر جسمانی ہستیوں کی رگوں کے لیے، جو ہمارے دہر، عالم بالا میں ٹپک رہی ہیں، ناشا نے دعا کی۔

جب وہ فوج کے لیے دعا مانگ رہے تھے، ناشا اپنے بھائی اور دینی سوف کے متعلق سوچ رہی تھی۔ جب وہ ان لوگوں کے لیے، جو بحر ویر کا سفر اختیار کرتے ہیں، دعا مانگ رہے تھے، اسے پرنس آندرے یاد آ گیا۔ اس

نے اس کے لیے دعائے خیر کی اور خداوند سے التجا کی کہ وہ اس کے ساتھ جن زیادتیوں کی مرتکب ہوئی ہے، وہ اسے ان کی معافی دے دے۔ جب انھوں نے ان تمام لوگوں کے لیے، جو ہمارے ساتھ محبت کرتے ہیں، دعا کی، اس نے اپنے ہی خاندان کے افراد، اپنی ماں، اپنے ابا اور سونیا کے لیے دعا مانگی اور اسے اولین بار یہ احساس ہوا کہ وہ ان کے ساتھ کتنی زیادتی کرتی رہی ہے اور خود ان سے کتنی شدید محبت کرتی ہے۔ جب انھوں نے ان لوگوں کے لیے جو ہمارے ساتھ نفرت کرتے ہیں، دعا کی، اس نے اپنے دشمنوں اور ان اشخاص کا، جو اس سے نفرت کرتے تھے، نقشہ ذہن میں قائم کرنے کی کوشش کی تاکہ وہ ان کے لیے دعا کر سکے۔ اپنے دشمنوں میں اس نے اپنے باپ کے قرض خواہوں اور ان اشخاص کو، جن سے وہ لین دین کرتا تھا، شمار کیا۔ اسے جب بھی اپنے دشمنوں اور ان لوگوں کا، جو اس سے نفرت کرتے تھے، خیال آتا، اسے ہمیشہ انا طول، جس نے اسے اتنا ضرر پہنچایا تھا، یاد آ جاتا اور اگرچہ وہ اس سے نفرت نہیں کرتی تھی، وہ اسے دشمن سمجھ کر بڑی خوشی سے اس کے لیے دعا کرتی تھی۔ صرف دعا کے موقع پر وہ پرس آندرے یا انا طول کے بارے میں واضح اور پرسکون لائنڈاز سے سوچ سکتی تھی۔ اس وقت سے یہ احساس ہوتا تھا کہ اس پر خداوند کی جو ہیبت طاری ہوتی ہے اور وہ اس کا جواب دے کر رہی ہے، اس کے مقابلے میں ان دونوں کے متعلق اس کے جذبات قطعی بے وقعت ہیں۔ جب انھوں نے شاہی خاندان اور مجلس کلیس⁷⁵ کے لیے دعا مانگی، اس نے اپنے سینے پر صلیب کا نشان بنایا اور وہ خاص طور پر اور بھی نیچے جھک گئی۔ وہ اپنے آپ سے کہہ رہی تھی کہ خواہ وہ کچھ بھی نہ کہی ہو، وہ تشکیک میں گرفتار نہیں ہو سکتی، اور وہ بہر حال برسرِ قدار مجلس کلیس سے محبت کرتی تھی اور اس کے لیے دعا کرتی رہتی تھی۔

جب مناجات اختتام پذیر ہوئی، چھوٹے یادری نے اپنے منہ کی رومال سے اپنے سینے پر صلیب کا نشان بنایا اور اعلان کیا:

”آئیں، ہم اپنے آپ کو اور اپنی ساری زندگیوں کو یسوع مسیح کے لیے وقف کر دیں۔“

”اپنے آپ کو خداوند کا مطیع و منقاد بنادیں!“ نسا شائے اپنے دل میں دہرایا۔ ”اف، خداوند، میں اپنے آپ کو تیری مرضی کا مطیع بناتی ہوں!“ اس نے سوچا۔ ”میں کچھ نہیں چاہتی، کسی چیز کی آرزو نہیں کرتی، مجھے بس اتنا سکھا دو کہ میں اپنے ارادے کو کیسے عملی جامہ پہناؤں! مجھے اپنا بنالو، مجھے اپنی قبول میں لے لو!“ وہ دعا مانگ رہی تھی اور اس کا قلب آرزوئے بہ قرار سے لبریز تھا۔ وہ اپنے سینے پر صلیب کا نشان نہیں بن رہی تھی بلکہ اپنے بہمن بازوؤں کو اپنے پہلوؤں پر لٹکائے کھڑی تھی جیسے اسے توقع ہو کہ کسی لمحے کوئی نادیدہ قوت اسے اپنی سپردگی میں لے لے گی اور اسے خود اپنے آپ سے، اپنے تاسفات اور خواہشات، اپنی پشیمانیوں، اپنی امیدوں اور گناہوں سے چھٹکارا دلا دے گی۔

عبادت کے دوران میں کاؤنٹس نے متعدد سر جہ اپنی بیٹی کے منہ پر دستخیز چہرے اور چہچہاتی آنکھوں پر اچشتی نظر ڈان اور خداوند سے دعا کی کہ وہ اس کی مدد کرے۔

غیر متوقع طور پر عبادت کے عین درمیان میں اور عام قاعدے سے ہٹ کر چھوٹے پادری نے بولی فٹ سنول، جس پر وہ اتوار ٹیلیٹ کو عبادت کے دوران میں دوڑا ہوا تھا، باہر لگایا اور ان مقدس دروازوں کے، جو زیارت گاہ میں کھلتے تھے، سامنے رکھ دیا۔ پادری اپنی ارغوانی قلمی ٹوپی پہنے باہر آیا، اس نے اپنے ہاں درست کپے اور ہڈت گھٹنوں پر جھک گیا۔ عبادت گزاروں کا پورے کا پورا مجمع، حیرت و تحیر کی تصویر بنا، اس کے ساتھ دوڑاٹو ہو گیا۔ پھر وہ دعا، جو ابھی ابھی مجلس کلیسا سے موصول ہوئی تھی اور جو تقسیم کے حملے سے روس کی رستگاری کے بارے میں تھی شروع ہو گئی۔

”خداوند جبروت و عظمت، خداوند نجات ما،“ پادری نے اپنے اس واضح نرم اور بے زور لہجے سے، جو سلائی پادریوں کا خاصہ ہے اور جو روسی قلوب کو اس طرح گرماتا ہے کہ وہ اس سے متاثر ہوئے بنا نہیں رہ سکتے، دعا کا آغاز کیا۔

خداوند جبروت و عظمت خداوند نجات ما، آج اپنے عجز و مسکین بندوں کو اپنی رحمتوں اور برکتوں سے بہرہ ور فرما، اپنا فضل و کرم نازل کر اور ہماری التجائیں سماعت فرما۔ ہمیں اپنی پناہ میں لے لے اور ہمارے اوپر رحم فرما۔ یہ دشمن، جو تمھاری اس دھرتی کو تمھیں نہیں کر رہا ہے جو کل عالم کو میا میٹ کر دینا چاہتا ہے، ہمارے خلاف اٹھ کھڑا ہوا ہے۔ یہ نافرمان لوگ تیری مملکت کو تہ و بالا کرنے، مقدس یہ و ظلم کو زیر و بر کرنے، تیرے معبدوں کو پلید کرنے، تیرے کلیساؤں کی اینٹ سے اینٹ بجانے اور ہماری زیارت گاہوں کی بے حرمتی کرنے کے لیے اکٹھے ہو گئے ہیں۔ خداوند، ہد کردار کب تک غائب آتے رہیں گے؟ یہ منحرف کب تک ناجائز جھکنڈوں سے اٹھائے ہوئے اختیار استعمال کرتا رہے گا؟

رہنما و لہجہ، جب ہم دعا کریں، ہماری دعائیں سن۔ ہمارے انتہائی قابل، حرام اور کریم انفس فرماں روا امپراطور الیکساندر پاولوویچ کو قوت و طاقت عطا فرما، ان کی راست بازی اور فروتنی سے سرفرو نظر نہ کر، انھیں ان کی پارسائی کا جردے اور انھیں، اپنے چشیدہ اسرئیل کو، ہمیں محفوظ کر لینے دے! ان کی مشاورتوں، ان کے عزم و استقلال اور ان کے افعال و اعمال کو بابرکت بنا، اپنے قادر مطلق ہاتھوں سے ان کی سلطنت کو محفوظ و مستحکم بنا اور انھیں دشمن کے خلاف اسی طرح کامیاب و کامران فرما جس طرح تو نے عیسیٰ کے خلاف موسیٰ کو مدد یا نبیوں کے خلاف جدعون⁸¹ کو اور جبریل کے خلاف داؤد کو کامیاب و کامران کیا تھا۔ ان کی التواج کو، جنھوں نے تیرے نام پر ہتھیار اٹھائے ہیں، محفوظ و مامون رکھ، ان کے ہاتھوں میں اعلیٰ ترین اقسام کے اسلحہ جات تھما اور انھیں معرکہ آرائی کے لیے کمر بستہ کر۔ اپنی شمشیر اور سپر اٹھا اور ہماری مدد کے لیے آجا۔ وہ لوگ، جو ہمارے خلاف ہدایتناہ منصوبے بناتے ہیں، انھیں قہر و شدت میں گرا اور انھیں زمین میں بوس کر، اور اپنے با ایمان جنگجوؤں کے سامنے ان کا وہی حال کر جو ہو، کے سامنے دھوکا ہوتا ہے۔ اپنے قوی ملانگہ کو حکم دے کہ وہ ان کی کوشائی کریں اور انھیں شکست کا مزہ چکھائیں۔ خداوند، ۱۱

ایسے جال میں، جس کا خدا انھیں علم نہ ہو، پھنس جائیں اور جو گڑھے انھوں نے خفیہ خفیہ تیار کیے ہیں، ان میں وہ خود ہی گر جائیں۔ انھیں اپنے غلاموں کے قدموں پر گرادے اور ہمارے فوجیوں کو یہ توفیق دے کہ وہ انھیں زیر کر لیں! خداوند، تمھارے لیے چھوٹوں اور بڑوں، دونوں کو بچانا کوئی مشکل کام نہیں۔ تو خداوند ہے اور بندے کا تیرے خلاف بس نہیں چل سکتا۔

ہمارے آباؤ جہاد کے خداوند! اپنے بے پایاں رحم و کرم کو، جو تو ازل سے نازل کرتا چلا آیا ہے، یاد کرا ہم سے منہ نہ موڑ اور نہ ہماری خطاؤں پر اپنا جلال دکھا، بلکہ اپنے رحم کی عظمت اور اپنے کرم کی لامتناہیت کے ذریعے ہماری ہدایت یوں اور سید کاریوں سے صرف نظر فرما۔ ہمارے قلوب کو مصفا کر، ہمارے اندر ایک نیا جذبہ بھر، اپنی ذات پر ہم سب کا ایمان پختہ کر، ہماری امید کو توانا بنا، ہمارے قلوب میں ایک دوسرے کے لیے محبت پیدا کر اور وہ ورثہ، جو تو نے ہمیں اور ہمارے آباؤ جہاد کو عطا فرمایا تھا، اس کے دیانت دارانہ دفاع کے لیے ہمیں جذبے کی یگانگت سے اٹھ کر بند کر۔ درجہ کاروں کے ڈنڈے کو ان لوگوں کے جنھیں تو نے پاکیزہ کر دیا ہے، مقدر پر حاوی نہ ہونے دے۔

ربّ ذو الجلال، خداوند کریم، تجھ پر ہم ایمان رکھتے ہیں اور تجھ پر ہم اعتماد کرتے ہیں، ہم تجھ سے رحم و کرم کی خواہش کرتے ہیں، تو اسے خائب و خاسر نہ کر، اور ہمیں اپنی برکتوں کی کوئی نشانی عطا کر تا کہ وہ، جو ہم سے اور ہمارے مقدس آرتھوڈوکس مذہب سے خارج کھاتے ہیں، اسے دیکھ سکیں اور دیکھ کر شرم سے پانی پانی ہوں اور تباہ و برباد ہوں، اور تمام قوم عالم جان سکیں کہ تو خداوند ہے اور ہم تیرے بندے۔ اے خداوند، آج کے روز ہم پر اپنا رحم و کرم فرما، اور ہمیں اپنی مکتی سے بہرہ ور کر۔ بے بندوں کے قلوب کو اپنے فضل و کرم کے کمرشے سے شاد دل ہونے کا موقع ہم پہنچا۔ ہمارے دشمنوں کا قلع قمع فرما اور انھیں بے عجلت ان لوگوں کے، جو تجھ پر ایمان رکھتے ہیں، قدموں تلے روندادے! جو لوگ تجھ پر ایمان رکھتے ہیں تو ہی ان کا بچا، تو ہی ان کا مادی، تو ہی ان کا حامی و ناصر ہے اور تیرے ہی ذریعے وہ فتح و نصرت سے ہم کنار ہوتے ہیں۔ ساری کبریائی تجھی کو، باپ، بیٹے، روح القدس کو، زیب دیتی ہے، ایسا ہمیشہ سے ہے، آج بھی ہے اور ابد تک رہے گا۔ آمین۔

نشان: جس کیفیت میں سے گز رہی تھی، اس میں اس کا متاثر ہونا ناگزیر تھا۔ چنانچہ اس دعا نے اس پر شدید اثر کیا۔ مائیک کے اوپر موٹی، مدینہ کیوں کے اوپر جدعون اور جویس کے اوپر داؤد کی فتح اور یرید خلم کی تباہی و بربادی کے بارے میں اس نے ایک ایک لفظ غور سے سنا۔ اس نے پوری رقیق القلس اور شوق و شغف سے، جس سے وہ سر تا پا لبریز تھی، خداوند سے دعا مانگی، لیکن دعا میں وہ کیا مانگ رہی تھی، اسے وہ پوری طرح سمجھ نہ پائی، وہ بہیم قلب دعا مانگی کہ خداوند اس کے دل میں راستی کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھر دے، ایمان و اعتماد سے اس کا دل

مضبوط بنادے اور اس میں محبت کی جوت جگا دے۔ لیکن وہ یہ دعا نہ مانگ سکی کہ اس کے دشمن پاؤں تلے چلے جائیں جب کہ چند ہی منٹ پہلے وہ یہ خواہش کر رہی تھی کہ ان کی تعداد بڑھ جائے تاکہ وہ زیادہ سے زیادہ لوگوں سے محبت کر سکے اور ان کے لیے دعا مانگ سکے۔ تاہم وہ اس دعا کی، جو دوزخوں کو کرکے چارہاں تھی، موزونیت اور معقولیت پر کسی قسم کا شک و شبہ بھی نہ کر سکی۔ انسانوں کو اپنے گناہوں کی پاداش میں (خاص طور پر جب اسے اپنے گناہ یاد آئے) جو سزا بھگتنا پڑتی ہے، اس کے تصور نے اس کے دل میں پاکیزہ اور تحریر ادینے والی ہیبت طاری کر دی اور اس نے خداوند سے دعا مانگی کہ وہ سب کو، اور خود اسے بھی، معاف کر دے اور سب کو سکون اور مسرت عطا کر دے۔ اور اسے یوں لگا جیسے خداوند نے اس کی دعا سن لی ہو۔

19

جس روز جبر نے رستوفوں کے ہاں سے رخصت ہونے کے بعد، جب کہ ناشا کی شکر گزار نگاہوں کا تصور ابھی تک اس کے ذہن میں تازہ تھا، راستے میں دم دار ستارہ، جو فلک میں آویزاں نظر آ رہا تھا، دیکھا تھا اور اسے محسوس ہوا تھا کہ اس کے لیے کسی نئی چیز کا آغاز ہو رہا ہے۔ وہ دن اور آج کا دن، یہ گمبیر مسئلہ کہ تمام دنیوی اشیائے درغلو ہیں، جو ہر وقت اس کے ذہن پر سو رہتا تھا، اب اسے ذہنی اذیت نہیں پہنچتا تھا۔ اس ہیبت ناک سوال ”کیوں؟ کس لیے؟“ جو اس روز تک اس کو اپنی ہر مصروفیت کے دوران میں غلطے میں ڈالے رکھتا تھا، کی جگہ کسی دوسرے سوال یا پہلے سوال کے جواب نے نہیں، بلکہ ناشا کی شبیہ نے لے لی تھی۔ انسانی خیانتوں اور محبتوں کے بارے میں خواہ وہ خود کچھ پڑھتا یا دوسروں سے ان کے متعلق سنتا۔ اب اسے ان سے اس طرح وحشت نہیں ہوتی تھی جیسے پہلے ہوتی تھی اور نہ وہ اپنے آپ سے یہ سوال کرتا کہ اگر یہ سب کچھ چند روزہ اور غیر یقینی ہے، پھر انسان اتنی بھاگ دوڑ کیوں کرتے ہیں، بلکہ اب وہ اسے اپنی اس صورت میں، جس میں اس نے اسے آخری مرتبہ دیکھا تھا، دکھائی دینے لگتی اور اس کے تمام شکوک پاؤں ہوا ہو جاتے۔ اس لیے نہیں کہ اسے جن سوالات کا سامنا تھا، اس کی صورت ان کے جوابات مہیا کر دیتی تھی بلکہ اس لیے کیونکہ اس کی شبیہ اسے ایک ایسی روحانی مشغولیت کی دوسری ”دروشن تر مملکت میں پہنچا رہی۔ اس مملکت میں نیکی تھی نہ بدی۔ یہ حسن اور محبت کی مملکت تھی اور اس قابل تھی کہ آدمی اس کی خاطر زندہ رہے۔ جس قسم کی بھی دنیوی کمینگی اس کے علم میں آتی، وہ اپنے آپ سے کہتا:

”وہ کل مجھے دیکھ کر مسکرائی تھی، اس نے مجھ سے دو بارہ آنے کو کہا تھا، اور میں اس سے محبت کرتا ہوں، اور کسی کو اس کا علم نہیں ہو پائے گا۔ ایسے میں فرض کیا کہ فلاں فلاں نے مملکت اور زار کو لوٹ لیا ہے جب کہ مملکت اور زار اسے اعزازات سے نوازا رہے ہیں، اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟“

بہتر سب بھی محفلوں میں گھومتا پھرتا تھا، پہلے کی طرح ڈٹ کر پیتا تھا اور پہلے ہی کی طرح ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا رہتا یا لہو و لعب میں مشغول ہو جاتا تھا۔ کیونکہ جو عرصہ وہ رستوفوں کے ہاں گزارتا تھا، اس کے علاوہ بھی اس

کے پاس وقت بچ رہتا اور اس نے اسے کسی نہ کسی طور گزارنا ہوتا تھا۔ ماسکو میں اس نے جو عادتیں اختیار کر لی تھیں اور جن لوگوں کے ساتھ اس نے تعلقات استوار کر لیے تھے، وہ ان کی مزاحمت نہ کر سکتا اور بے دریغ اس قسم کی زندگی کی طرف کھینچ چلا جاتا تھا۔ لیکن حال ہی میں میدان جنگ سے جو خبریں موصول ہونا شروع ہوئی تھیں، چونکہ وہ حوصلہ افزا نہیں ہوتی تھیں اور چونکہ نیشا کی صحت میں بہتری کے آثار نمودار ہونے لگے تھے اور اسے دیکھ کر اس کے دل میں رحم کے وہ جذبات پیدا نہیں ہوتے تھے کہ اس کا جی چاہنے لگتا کہ وہ اسے اپنی پنہ میں لے لے، ایک نوع کی بے چینی، جس کی وہ تو ختم نہیں کر سکتا تھا اور جس کی شدت میں روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا تھا، اس کے دل و دماغ کو اپنی گرفت میں لینے لگی۔ اسے محسوس ہونے لگا کہ وہ اپنے آپ کو جس صورت حال میں پارہا ہے، وہ زیادہ دیر یاتی نہیں رہے گی، یہ کہ کوئی عظیم آفت، جو لازماً اس کی ساری زندگی کا رخ تبدیل کر دے گی، سر پر منڈ مار رہی ہے اور وہ بے صبری سے ہر جگہ اس مصیبت کی، جو کسی وقت بھی نازل ہو سکتی تھی، علامات تلاش کرنے لگتا۔ ایک مہسن بردار نے پولین کے بارے میں مندرجہ پیشین گوئی کا، جو یوحنا عارف کے مکاشفہ سے اخذ کی گئی تھی، انکشاف کیا۔

مکاشفہ کے باب نمبر 13 آیت نمبر 18 میں کہا گیا ہے:

”حکمت کا یہ موقع ہے۔ جو سمجھ رکھتا ہے اور وہ اس حیوان کا عدد گن لے کیونکہ وہ آدمی کا عدد ہے اور اس کا عدد چھ سو چھیاسٹھ ہے۔“

اور اسی باب کی پانچویں آیت:

”اور بڑے بول بولنے اور کفر بکنے کے لیے اسے ایک منہ دیا گیا اور اسے بیایس مہینے تک کام کرنے کا اختیار دیا گیا۔“

اگر فرانسیسی حروف تہجی کو ضبط تحریر میں لایا جائے اور ان کی وہی عددی قیمت مقرر کی جائے جو عبرانی حروف تہجی (جن میں پہلے نو حروف اکائیاں اور باقی دہائیاں ہیں) کی ہے، پھر صورت حال مدہجذیل ہوگی:

a	b	c	d	e	f	g	h	i
1	2	3	4	5	6	7	8	9
k	l	m	n	o	p	q	r	s
10	20	30	40	50	60	70	80	90
t	u	v	w	x	y	z		
100	110	120	130	140	150	160		

اس لکھ کے تحت اگر Napoleon I کے انداز کو اعداد میں منتقل کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ان کا مجموعہ 666 بنتا ہے۔ اصولاً ا کے بعد e آنا چاہیے لیکن قواعد کے تحت اسے حذف کر دیا جاتا ہے تاہم 666

کے مجموعے میں اس e کے اعداد 5 شامل ہیں۔ چنانچہ پولین وہ حیوان ٹھہرا جس کا ذکر ”مکاشفہ“ میں ہوا ہے۔ مزید برآں اگر اس نظم کا اطلاق الفاظ quarante-deux (بیالیس) پر کیا جائے یعنی وہ اصطلاح جو اس جانور کے لیے، جس نے ”بڑے بول بولے اور کفر کا“ استعمال کی گئی ہے، وہی عدد یعنی 666 حاصل ہوگا۔ اس سے یہ مستطاب ہوا کہ پولین کی قوت (اور اختیارات) کے لیے جو حدود مقرر کی گئی تھیں، اس کا اختتام 1812 میں، جب فرانسیسی امپراطور ہالیس سال کا تھا، ہونا تھا۔

اس پیشین گوئی نے میٹر کے ذہن پر گہرا اثر مرتب کیا اور وہ اکثر اپنے آپ سے پر ہمتار ہتا کہ وہ کون سی چیز ہے جو جانور یعنی پولین کو ختم کر کے رکھ دے گی اور جس سوال میں وہ اتنا منہمک ہو گیا تھا، اس کا جواب ڈھونڈنے کے لیے وہ حروف کو اعداد کا قالب پہنانے اور ان کا مجموعہ بنانے کے لیے وہ اسی نظم کا سہارا لیتا۔ اس نے الفاظ Empereur Alexandre La nation russe، لکھے اور ان کے اعداد کو جمع کیا لیکن حاصل جمع 666 سے یا تو بہت زیادہ ہو گیا یا بہت نیچے رہ گیا۔

ایک مرتبہ جب وہ جمع تفریق کے اس چکر میں مصروف تھا، اسے اپنا نام فرانسیسی میں Comte Pierre Besouhoff لکھا، لیکن اعداد کا مجموعہ ٹھیک نہ بیٹھا۔ اس نے الما میں تبدیلی کر دی s کی جگہ z لکھا، اور de اور حرف تعریف le کے اضافے کیے لیکن مطلوبہ نتیجہ پھر بھی برآمد نہ ہوا۔ پھر اسے خیال آیا کہ جس جواب کا وہ متلاشی ہے، اگر وہ اس کے نام میں موجود ہے، پھر اس میں یقیناً اس کی قومیت بھی شامل ہوگی، چنانچہ اس نے الفاظ Le russe Besuhof آزمائے۔ اس نے اعداد کو جمع کیا اور اسے 671 کا عدد مل گیا۔ مطلوبہ عدد اس میں صرف پانچ کی بیشی تھی اور یہ حرف e سے مطابقت رکھتا تھا۔ e وہی حرف تھا جو empereur کے حرف تعریف le سے خارج کر دیا جاتا ہے۔ یوں حرف e نکال کر (حالانکہ طریق کار کے مطابق ایسا کرنا درست نہیں تھا) میٹر کو وہ جواب، جس کی اسے تلاش تھی، مل گیا۔ russe Besuhof کے اعداد بالکل 666 بنتے تھے۔⁸³ اس انکشاف نے اس پر بیچانی کیفیت طاری کر دی۔ وہ عظیم واقعہ، جس کی ”مکاشفہ“ میں پیشین گوئی کی گئی تھی، وہ خود اس سے کیسے اور کس ذریعے سے منسلک تھا، وہ اس کے متعلق کچھ نہیں جانتا تھا، لیکن یہ کہ اس کا اس سے تعلق بنتا ہے، اس بارے میں اس کے دل میں مطلق کوئی شبہ نہیں تھا۔ ناشائے اس کی محبت، دشمن مسیح و جال، پولین کی چڑھائی، دم رابر ستارہ، 666، Empereur Napoleon، اور russe Besuhof، ان تمام چیزوں نے رسیدگی کی منزل تک پہنچنا اور اپنا ٹھہر کرنا تھا، ماسکو کے جن سمرزدہ اور گھنیا حلقوں میں جانے کی اسے عادت پڑ گئی تھی اور جن کا وہ اپنے آپ کو اسیر سمجھتا تھا، انھوں نے اسے ان کے چنگل سے چھڑانا اور اسے کسی عظیم کارنامے اور

”ایکسا ندر امپراطور روسی قوم“

”کاڈٹ میٹر بدخوف“

”روسی بدخوف“

عظیم مسرت کی راہ پر گامزن کرنا تھا۔



جس اتوار، خصوصی دعا کی گئی، اس سے ایک روز قبل میئر نے رستوفوں سے وعدہ کیا تھا کہ وہ ان کے لیے رستوپ چن سے، جسے وہ اچھی طرح جانتا تھا، قوم کے نام اپیل کی نقل اور فوج سے وصول شدہ تازہ ترین خبریں لے کر آئے گا۔ صبح کو جب وہ رستوپ چن کے ہاں گیا، اس کی ملاقات ایک ایلچی سے، جو ابھی ابھی فوج سے آیا تھا، ہو گئی۔ یہ ایلچی ماسکو کے اجتماعی رقصوں میں باقاعدگی کے ساتھ شریک ہوا کرتا تھا اور میئر کا شناسا تھا۔

”خدا کے لیے یہ بوجھ اٹھانے میں میری کچھ مدد کرو“ ایلچی نے کہا۔ ”والدین کے نام خطوط کی پوری پوری لیا ہوں۔“

خطوط میں نکولائی رستوپ کا اپنے باپ کے نام مکتوب تھا۔ میئر نے یہ اٹھا لیا۔ ہالیان ماسکو کے نام اپر طور نے جو اپیل جاری کی تھی، رستوپ چن نے بھی اس کی ایک نقل، جو بھی ابھی طبع ہوئی تھی، تازہ ترین عسکری احکام اور اپنے تازہ ترین خبر نامے کا ایک پرچہ میئر کو دے دیا۔ میئر نے عسکری احکام و اعلانات پر سرسری نظر ڈالی۔ ایک اعلان نامے میں، ان لوگوں کے، جو زخمی یا ہلاک ہو چکے تھے یا جنہیں اعزازات سے نوازا گیا تھا، نام مندرج تھے ان میں ایک نام نکولائی رستوف کا تھا۔ اسے استردونا کے معرکے میں جرأت کا مظاہرہ کرنے پر سینٹ جارج کر اس (درجہ چہرم) کا تمغہ دیا گیا تھا۔ اس اعلان نامے میں یہ بھی درج تھا کہ پرنس آندرے بیلکونسکی شامروں کی ایک رجمنٹ کا کمانڈر مقرر ہوا ہے۔ اگرچہ میئر رستوفوں کو بیلکونسکی کی یاد نہیں دلانا چاہتا تھا لیکن وہ جانتا تھا کہ جب انہیں یہ خبر ملے گی کہ ان کے بیٹے کو اعزاز عطا ہوا ہے، تو وہ بہت خوش ہوں گے۔ وہ خوشی کی یہ خبر پہنچانے کی خواہش پر قابو نہ پاسکا۔ چنانچہ اس نے زار کی اپیل، خبر نامہ، و دیگر اعلانات اپنے پاس رکھ لیے کہ وہ انہیں، جب وہ ان کے ہاں ڈنر کھانے جائے گا، اپنے ساتھ لے جائے گا۔ تاہم اس نے نکولائی کا خط اور مطبوعہ اعلان نامہ پہلے ہی بھجوا دیا۔

کاؤنٹ رستوپ چن کے ساتھ اس کی گفتگو، مؤخر انداز کا قہقہی اور کھوپ کھوپا انداز، قاصد سے، جس نے اسے باتوں میں فوج کے تباہ کن حالات کے متعلق اشارہ دیا تھا، اس کی ملاقات، ماسکو میں چار سوسوں کا کھوج لگائے جانے کے بارے میں افواہیں، شہر میں دتی، اشتہار کی تقسیم، جس میں یہ کہا گیا تھا کہ نیپولین نے قسم کھائی ہے کہ وہ موسم خزاں تک دونوں دارالسلطنتوں میں داخل ہو جائے گا، اور اگلے روز زار کی متوقع آمد کے بارے میں باتیں۔ ان تمام چیزوں نے مل جل کر میئر کے دل میں نئی شدت کے ساتھ اضطراب اور امید و بیم کی وہ کیفیت، جس کے متعلق وہ دم دار ستارے کے ظہور اور خاص طور پر آغاز جنگ کے وقت سے آگاہ تھا، ابھر رہی۔

فوج میں شامل ہونے کا خیال مدتوں پہلے اس کے دماغ میں آیا تھا اور اگر وہ باتیں اس کے راستے میں رکاوٹ نہ بنتیں، تو وہ یہ کام کبھی کا کر چکا ہوتا۔ ان میں سے ایک رکاوٹ تو اس کی فری سیسوں کی سوسائٹی کی رکیت تھی۔ وہ حلف

اٹھا کر اس سوسائٹی کا حلقہ بگوش ہو چکا تھا اور سوسائٹی اندی امن اور انسداد جنگ کی تعلیم دیتی تھی۔ دوسری بات یہ تھی کہ اس نے جب ماسکو کے لے تعداد بشندوں کو رد دیاں پہنے حب الوطنی کے گیت گاتے دیکھے، اسے پتا نہیں کیوں لیکن بہر حال خود یہ قدم اٹھاتے شرم محسوس ہوئی۔ لیکن وہ اس ارادے کو کیوں عملی جامہ پہناند سکا، اس کی بڑی وجہ اس کا یہ دھندلا دھندلا تصور کہ وہ russe Basuhof، اسے تھا۔ اس russe Besuhof کی انوکھی اہمیت اس بات میں مضمر تھی کہ اس کا عدد 666 بھی وہی تھا جو کہ حیوان کا تھا۔ وہ ہم انداز سے یہ سمجھتا تھا کہ ازل سے اس کے مقدر میں یہ لکھ دیا گیا ہے کہ اسے حیوان کی، جسے ”بڑے بول بولنے اور کفر بکنے“ کی عادت ہے، قوت کو حدود کے اندر لانے کے عظیم معرکے میں کچھ نہ کچھ کردار ادا کرنا ہے۔ چنانچہ اس کی سوچ یہ تھی کہ اسے از خود کوئی قدم اٹھانے سے گریز کرنا چاہیے اور جس چیز کا وقوع پذیر ہونا ازل سے مقدر ہو چکا ہے، اس کا انتظار کرنا چاہیے۔

20

جیسا کہ عام طور پر ہر انوار کو ہوتا تھا، چند بے تکلف احباب رستوفوں کے ہاں کھانے پر آرہے تھے۔ بیئر تہائی میں ان کے ساتھ باتیں کرنا چاہتا تھا، چنانچہ وہ باقی مہمانوں سے پہلے پہنچ گیا۔

اس سال اس کے تن و توش میں اتنا اضافہ ہو گیا تھا کہ اگر وہ اتنا دراز قامت نہ ہوتا اور اس کے اعضا اتنے توانا و توی نہ ہوتے، تو اس کی شکل و صورت بالکل مضحکہ خیز نظر نہ لگتی۔ تاہم اس کی کاٹھی اتنی مضبوط تھی کہ اپنے بھاری بھر کم جتنے سمیت وہ ہا آسانی یہاں وہاں بلکہ ہر جگہ آ جا سکتا تھا۔

وہ زور زور سے سانس بیٹا اور منہ ہی منہ میں، کچھ بڑبڑاتا سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ اس کے کوچران نے اس سے یہ بھی نہیں پوچھا تھا کہ اسے انتظار کرنا ہے یا نہیں۔ وہ جانتا تھا کہ کاؤنٹ جب بھی رستوفوں کے ہاں آتا ہے، آدمی رات سے پہلے جانے کا نام نہیں لیتا۔ رستوفوں کا وردی پرش خدمت گار بھاگا بھاگا آیا تا کہ وہ کوٹ اتارنے میں اس کی مدد کر سکے اور اس کی چھڑی اور ہیٹ سنبھال سکے۔ کلب کی رکنیت کی وجہ سے بیئر کی یہ عادت بن گئی تھی کہ وہ اپنی چھڑی اور ہیٹ پیش دالان میں چھوڑ جاتا تھا۔

گھر کے جس اولین فرد سے اس کی ملاقات ہوئی، وہ نسا تھا۔ سے دیکھنے سے پہلے ہی پتا دور کوٹ اتارنے کے دوران میں وہ اس کی آواز سن چکا تھا۔ وہ بال روم میں ریاض کر رہی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ جب سے وہ غلیل ہوئی تھی، اس نے گانا نہیں گایا تھا۔ چنانچہ اس کی آواز سن کر اسے حیرت بھی ہوئی۔ درخوشی بھی۔ اس نے آہستہ سے دروازہ کھولا اور اسے اسی ارغوانی لباس میں، جو وہ پہن کر گرے گئی تھی، دیکھا۔ وہ گارہی اور کمرے میں چکر لگا رہی تھی، جب اس نے دروازہ کھولا، اس کی پشت اس کی جانب تھی لیکن جب وہ اچانک مڑی اور اس کی نظر اس کے حیرت زدہ چہرے پر پڑی، وہ شرم سے لال ہو گئی اور تیزی سے اس کی طرف ہلکی۔

”میں دوبارہ گانا گانے کی کوشش کرنا چاہتی ہوں،“ اس نے کہا۔ ”اس سے کم از کم اتنا تو ہوتا ہے کہ مصروفیت مل جاتی ہے،“ اس نے یوں کہا جیسے وہ عذر تراش رہی ہو۔

”یہ تو بہت چھٹی بات ہے!“

”میں بہت خوش ہوں کہ آپ تشریف لے آئے ہیں میں آج بے حد خوش ہوں۔“ اس نے پرانے انداز سے، جو میٹر نے بہت عرصے سے اس میں نہیں دیکھا تھا، چمکتے ہوئے کہا۔ ”آپ جانتے ہیں کہ ٹکس کو سینٹ چارج کر اس ملا ہے۔ مجھے اس پر کتنا فخر ہے!“

”ہاں، وہ اعلان نامہ میں نے ہی آپ لوگوں کو بھیجا تھا۔ لیکن میں تمہارے گانے میں مغل نہیں ہونا چاہتا!“ اس نے مزید کہا اور وہ ڈرائنگ روم کی طرف قدم بڑھانے ہی دلا تھا کہ متاثرانے اسے روک لیا۔

”کائنات، کیا میں گانا گانے کو کوئی غلطی کر رہی ہوں؟“ اس نے شرماتے جتے پوچھا، لیکن اس کی نگاہیں ابھی تک مستفسرانہ انداز سے میٹر کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔

”نہیں... اس میں غلطی کی کیا بات ہے؟ اس کے برعکس... تم مجھ سے کیوں پوچھ رہی ہو؟“

”مجھے خود معلوم نہیں،“ متاثرانے غلٹ سے جواب دیا۔ ”لیکن میں کوئی ایسا کام، جو آپ کو پسند نہ آئے، نہیں کرنا چاہوں گی۔ میں ہر بات میں آپ پر اعتبار کرتی ہوں۔ آپ کو معلوم نہیں کہ آپ میرے لیے کتنے اہم ہیں اور آپ نے میرے لیے کیا کچھ کیا ہے۔“ وہ تیز تیز بول رہی تھی اور اس نے یہ بھی نہ دیکھا کہ اس کے الفاظ پر میٹر کا چہرہ کتنا سرخ ہو رہا ہے۔ ”میں نے اس اعلان نامے میں یہ بھی نہ دیکھا کہ وہ، بلکونسکی“ (اس نے یہ نام بہت تیزی سے لیکن زریب لیا)، ”روس آچکے ہیں اور دوبارہ فوج میں شامل ہو گئے ہیں۔ آپ کے خیال میں“ اس کے بولنے کی رفتار بہت تیز تھی جیسے اسے اندیشہ ہو کہ کہیں اس کی ہمت جواب نہ دے جائے، ”کیا وہ مجھے معاف کر دیں گے؟ کیا انھیں میرے بارے میں ہمیشہ تلخی محسوس نہیں ہوتی رہے گی؟ آپ کا کیا خیال ہے؟ آپ کا کیا خیال ہے؟“

”میرا خیال ہے... میٹر نے کہا۔ ”وہ کیا معاف کرے گا، اس کے پاس معاف کرنے کے لیے کچھ ہے ہی نہیں... اگر میں اس کی جگہ ہوتا...“

غلام خیانت نے آٹافاٹلی میٹر کو دوبارہ ماضی کے ان لمحات میں پہنچا دیا جب اسے (متاثرانہ کو) تسلی دینے کی کوشش میں اس کے منہ سے یہ نکل گیا تھا کہ اگر وہ نہ ہوتا جو وہ تھا، بلکہ وہ دنیا کا بہترین انسان ہوتا اور شادی کے بندھنوں سے آزاد وہ دوزخوں ہو کر اس سے شادی کی درخواست کر رہا ہوتا، اور اسے رحم، ملامت اور محبت کے انھیں جذبات نے اپنی گرفت میں لے لیا اور اس کے لبوں پر وہی الفاظ پھلنے لگے لیکن متاثرانے اسے انھیں ادا کرنے کا موقع ہی نہ دیا۔

”لیکن آپ۔ آپ۔“ اس نے غلط انبساط سے سرشار ہو کر لفظ ”آپ“ ادا کرتے ہوئے کہا۔ ”یہ دوسرا معاملہ ہے۔ مجھے کبھی کسی ایسے شخص سے، جو آپ سے زیادہ با محبت، مہربان، کریم النفس، حالی ظرف و بہتر انسان ہو،

واسطہ نہیں پڑا۔ کوئی شخص ایسا ہو ہی نہیں سکتا! اگر اس وقت، بلکہ اب بھی، آپ نہ ہوتے، خدا معلوم میرا کیا حشر ہوتا کیونکہ۔۔۔“

اچانک اس کی آنکھیں آبدیدہ ہو گئیں اور اس نے اپنا منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ اس نے موسیقی کا کتابچہ اٹھایا، سے، اپنی نگاہوں کے سامنے کیا، ورگنا گانے اور کمرے میں چکر کاٹنے لگی۔

عین اسی لمحے پیتا ڈرائنگ روم سے بھاگتا باہر نکلا۔ اب وہ پندرہ سال کا وجیہ و شکیل نوجوان تھا۔ اس کی رنگت شہابی اور اس کے ہونٹ متا شا کے ہونٹوں کی طرح بالکل سرخ تھے۔ وہ یونیورسٹی میں داخلہ لینے کی تیاری کر رہا تھا لیکن حال ہی میں اس نے اور اس کے دوست ابولسکی نے خفیہ خفیہ پر طے کر لیا تھا کہ وہ ہزاروں میں بھرتی ہو جائیں گے۔

پیتا بھانگم بھاگ آیا تھا کیونکہ وہ اس معاملے کے بارے میں اپنے ہم نام کے ساتھ گفتگو کرنا چاہتا تھا۔ اس نے میئر سے دریافت کیا کہ کیا سے ہزاروں میں شامل ہونے کی اجازت مل جائے گی۔ میئر کمرے میں چکر لگا رہا تھا۔ پیتا جو کچھ کہہ رہا تھا، اس نے اس پر کوئی توجہ نہ دی۔ پیتا نے اس کا دھیان اپنی طرف مبذول کرانے کے لیے اس کا بازو کھینچ لیا۔

”پیوٹر کرلو، جی، میرے منصوبے کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟ خدا کے لیے کچھ تو بتائیں۔ آپ میری واحد امید ہیں!“ پیتا نے کہا۔

”ارے ہاں، تمھارا منصوبہ تم ہزاروں میں بھرتی ہونا چاہتے ہو؟ میں اس کی بات بات کروں گا، آج ہی بات کروں گا۔“

”خیر، mon cher، آپ کو اعلان نامہ مل گیا؟“ بوڑھے کاؤنٹ نے پوچھا۔ ”میری ننھی کاؤنٹس رازد مودسیوں کے نجی گرجے میں عشاءے ربانی میں شریک ہونے گئی تھی۔ وہاں اس نے نئی دعا سنائی تھی۔ کہتی ہے، بہت اچھی ہے۔“

”ہاں، میرے پاس ہے،“ میئر نے کہا۔ ”زارکل یہاں تشریف لائیں گے۔ اشراف کا غیر معمولی اجلاس منعقد ہو رہا ہے۔ درشنید ہے کہ ہر ہزار میں سے دس افراد فوج میں بھرتی کرانا ہوں گے۔ ارے ہاں، میں آپ کو مبارکباد پیش کرنے کی اجازت چاہتا ہوں۔“

”بالکل، بالکل۔ خداوند کا شکر ہے۔ خیر، فوج کی کیا خبر ہے؟“

”ہم پھر پیچھے ہٹ آئے ہیں۔ سنا ہے کہ ہم پہلے ہی سولسک پہنچ چکے ہیں۔“

”رحم، خداوند رحم!“ کاؤنٹ نے کہا۔ ”اعلان نامہ کہاں ہے؟“

”اسپر امور کی اصل؟ ہاں، میرے پاس ہے!“

میٹر کاغذات کے لیے اپنی جیبیں ٹٹولنے لگا لیکن وہ اسے نہ مل سکے اتنے میں کاؤٹنس اندر آ گئی۔ میٹر نے جیبیں تھپکتے اس کے ہاتھ پر بوسہ دیا اور پھر بے قراری سے نگاہیں ادھر ادھر دوڑانے لگا۔ بظاہر اسے ناشا کا، جو گانا تو ختم کر چکی تھی لیکن ابھی تک ڈرائنگ روم میں نہیں آئی تھی، انتظار تھا

”سمجھ میں نہیں آتا کہ میں نے انھیں کہاں رکھ دیا ہے؟“ اس نے کہا۔

”تمہارا حال وہی رہا۔ ہمیشہ اپنی چیزیں بھولتے رہتے ہو،“ کاؤٹنس نے کہا۔

ناشا اندر آ گئی۔ اس کے چہرے پر درشتی نہیں بلکہ ملائمت تھی لیکن اس پر گھبراہٹ بھی ہو پیدا تھی۔ وہ کرسی پر بیٹھ گئی اور ٹکلی باندھ کر چپ چاپ میٹر کو دیکھنے لگی۔ حونہی وہ اندر آئی، میٹر کا چہرہ جس پر پہلے افسردگی تھی، اچانک کھل اٹھا اور کاغذات تلاش کرتے کرتے اس نے متعدد بار اسے اچھتی نظروں سے دیکھا۔

”کہیں نہیں مل رہے۔ مجھے گھر جانا ہوگا۔ دیں رہ گئے ہوں گے۔ میں یقیناً...“

لیکن تم ڈنر کے لیے وقت پر نہیں پہنچ سکو گے۔“

”اف، میرا کوچوان بھی جا چکا ہے۔“

لیکن سو نیا کو، جو پیش دالاں میں کاغذات تلاش کرنے چلی گئی تھی، وہ میٹر کے ہیٹ میں مل گئے۔ وہاں وہ خود ہی انھیں نہایت احتیاط سے اسٹر کے نیچے گھسیر آیا تھا۔

میٹر انھیں پڑھ کر شانا چاہتا تھا۔

”نہیں، ڈنر کے بعد،“ میٹر کاؤٹنس نے کہا۔ معلوم ہوتا تھا کہ اسے امید تھی کہ ان کے پڑھنے میں بہت لطف آئے گا۔

ڈنر کے دوران میں انھوں نے شمعوں کی شکل میں سینٹ جارج کے ⁸⁴ نئے محافظ کا جام صحت پیا اور شن شن نے انھیں معمر جارجیا کی پرنس کی علالت اور ماسکو سے جی دیے کی کم شدگی کی خبریں سنائیں۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ کس طرح کوئی جرمن باشندہ رستوپ چین کے سامنے پیش کیا گیا۔ اس پر الزام لگایا گیا تھا کہ وہ ⁸⁵ Cham — pignon فرانسس جاسوس ہے (رستوپ چین نے یہ کہانی اسی طرح سنائی تھی) اور یہ کہ رستوپ چین نے اسے کس طرح جانے دیا۔ اس نے عوام کو یقین دلادیا تھا کہ وہ Cham pignon لکل نہیں ہے بلکہ بوڑھا جرمن نوڈسٹول ⁸⁶ ہے۔

”یہ خراہ تو اہ لوگوں کو گرد کرتے رہتے ہیں،“ کاؤٹنس نے کہا۔ ”میں کاؤٹنس سے کہتا رہتا ہوں کہ وہ اتنی زیادہ فرانسس کی نہ بولا کریں۔ اس کے لیے وقت سزاگار نہیں رہا۔“

”اور آپ لوگوں نے سنا ہے کہ پرنس گالت سن نے ٹیوٹر رکھ لیا ہے؟“ شن سن نے پوچھا۔ ”وہ اسے روی سکھایا کرے گا۔ کھلی کوچوں میں فرانسس بولنا خطرناک ہوتا جا رہا ہے۔“ ⁸⁷

”کاؤٹنس پیوٹر کر لووچ، تمہارا اپنے بارے میں کیا خیال ہے؟ اگر عام بھرتی کا حکم صادر ہو گیا، تمہیں بھی

گھوڑے پر سوار ہونا پڑے گا،" معمر کاؤنٹ نے بیٹر سے مخاطب ہو کر کہا۔

بیٹر ڈنر کے دوران میں سارا عرصہ خاموش رہا تھا۔ وہ اپنی سوچ بچار میں مصروف تھا۔ اس نے کاؤنٹ کی طرف یوں دیکھا جیسے اس کی سمجھ میں نہ آیا ہو کہ اس نے کیا کہا ہے۔

"ہاں، ہاں، جنگ..." وہ بولنے لگا۔ "نہیں! میں بھی کیسا اچھا سپاہی ثابت ہوں گا! لیکن یہ سب کچھ اتنا عجیب، اتنا غیر معمولی ہے! لیکن میری سمجھ میں نہیں آ رہا، مجھے کچھ معلوم نہیں ہے۔ مجھ میں کسی صورت عسکری ذوق پیدا نہیں ہو سکتا۔ لیکن موجودہ زمانے میں کوئی بھی اپنے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔"

ڈنر کے بعد کاؤنٹ ٹانگیں پیار کر آرام کرسی پر بیٹھ گیا اور چہرے پر سنجیدگی طاری کر کے سونیا (جس کی شہرت یہ تھی کہ وہ بہت اچھی خواندگی کرتی ہے) سے بولا کہ وہ انھیں اپیل پڑھ کر سنائے۔

ہمارے لیے ایک صدر مقام، ماسکو کے نام

"دشمن لشکر ہزار کے ساتھ روسی سرحدیں عبور کر چکا ہے۔ وہ ہمارے محبوب وطن کی حرمت خاک میں ملانا چاہتا ہے۔"

سونیا نہایت مستعدی سے اپنے بلند آہنگ لہجے میں اپیل پڑھ کر سنارہی تھی۔ کاؤنٹ آنکھیں بند کیے سن رہا تھا۔ بعض عبارتوں پر وہ ناگہاں آہیں بھرنے لگا۔ ناشائستگی تن کرتی تھی۔ وہ تجسس نگاہوں سے کبھی اپنے باپ کو اور کبھی چچا کو دیکھنے لگی۔

بیٹر کو تجسس ہو رہا تھا کہ اس کی نگاہیں اس پر لگی ہوئی ہیں اور وہ کوشش کر رہا تھا کہ وہ ادھر ادھر نہ دیکھے۔ بیل کے ہر سنجیدہ اور گنہگار جملے پر کاؤنٹس غصے اور ناپسندیدگی سے اپنا سر ہلانے لگتی۔ ان تمام الفاظ میں اسے صرف ایک ہی چیز نظر آرہی تھی اور وہ چیز یہ تھی کہ جن خطرات میں اس کا بیٹا گھرا ہوا ہے وہ حلدی ناپید نہیں ہوں گے۔ ٹن ٹن کے لہلوں پر جنھیں اس نے بھیج رکھا تھا، طنزیہ مسکراہٹ تیر رہی تھی۔ صاف عین تھا کہ جرات بھی پہلے اس کے ہتھے چڑھی ہو وہ اس کا مذاق اڑائے بنا نہیں رہے گا۔ سونیا کی خواندگی، کاؤنٹ کا کوئی تبصرہ، بلکہ اپیل خود بھی، ان سے بڑھ کر اور بہتر عذر کیا ہو سکتا تھا۔

روسی کو جو خطرات درپیش تھے، اور امپراطور نے اہالیان ماسکو، بالخصوص اس کے نامور اشراف سے جو توقعات وابستہ کی تھیں، ان کی خواندگی کے بعد سونیا نے، جس کی آواز میں کپکپاہٹ تھی، جو زیادہ تر اس توجہ کی، جس سے وہ اسے کن رہے تھے، بنا کر تھی، آخری الفاظ پڑھے:

ہم اپنی افواج کی، جو پہلے ہی دشمن کے روستے میں سد سکندری بن چکی ہیں، اور وہ جہاں بھی جائے اس کو میا لٹ کرنے کے لیے جوئی افواج تشکیل دی گئی ہیں، ان کی قیادت کرنے اور اپنی رعایا سے منظورہ کرنے

اس دار الحکومت اور اپنی مملکت کے دوسرے علاقوں کا دورہ کرنے میں ذرا بھی تاخیر دلائیں رکھیں گے۔ دشمن جو جیسا ہمارے سردار پر ناز کرنے کی سوچ رہا ہے، خدا کرے کہ وہ خود اس کا شکار ہو جائے اور خدا کرے کہ یورپ غلامی کے بندھنوں سے آزاد ہو جائے اور روس کے نام کو چار چاند لگا دے۔

”یہ ہولناکیاں!“ کاؤنٹ نے اپنی بھیگی آنکھیں کھولتے اور بار بار چھٹکیں مارتے ہوئے، جیسے اس کی ناک کے نیچے کا فوری سر کے کی شیشی رکھ دی گئی ہو، با آواز بلند کہا۔ ”ہمارے قربان روائے مملکت اپنی زبان مبارک سے صرف ایک لفظ کہہ دیں اور ہم تن من دھن سب کچھ قربان کر دیں گے، قطعاً دریغ نہیں کریں گے۔“

پوچھتا رہا کہ کون کون سا کچھ، جس کے ذریعے وہ کاؤنٹ کی حب الوطنی کی بھڑاڑ اٹا چاہتا تھا، کس سکھ، نمائندے اپنی نشست سے جست لگائی اور اپنے باپ کی طرف بھاگی۔

”ہمارے باپ کتنے اچھے ہیں!“ وہ اس کا بوسہ لیتے ہوئے با آواز بلند بولی اور اس نے ایک بار پھر غیر شعوری غمزے سے، جو اس کی طبیعت کی شگفتگی کی بحال کے ساتھ اس میں نمود کر آیا تھا، پیئر پر نگاہ غلط انداز ڈالی۔

”واہ واہ، بڑی محب وطن ہوا!“ کونٹن نے کہا۔

”اس میں حب الوطنی کی کوئی بات نہیں۔ یہ تو محض..“ نمائندہ برافردختہ ہو کر بولی۔ ”آپ کو ہر بات میں مذاق کا پہلو نظر آتا ہے لیکن یہ کسی عنوان دل لگی کی بات نہیں ہے۔“

”دل لگی کی بات؟ قطعاً نہیں!“ کاؤنٹ نے کہا۔ ”وہ اپنے راجن مبارک سے ایک لفظ ارشاد فرمائیں اور ہم سب چل پڑیں گے۔“

”لیکن آپ نے غور نہیں کیا کہ اس میں مشورے کی بات کی گئی ہے؟“ پیئر نے کہا۔

”خیر جس کا ہے کے لیے بھی ہو۔“

اس سے بچتا، جس پر کوئی توجہ نہیں دے رہا تھا، اپنے باپ کے پاس گیا۔ اس کا چہرہ تہمتار ہا تھا اور وہ ایک ایسی آواز میں، جو کبھی پھٹکتی اور کبھی اس میں باری باری خراہٹ یا ٹیکھاپن آ جاتا، بات کرنے لگا۔

”پاپا، میں آپ کو بھی۔ اور ماما کو بھی۔ صاف صاف بتا دینا چاہتا ہوں، آپ کا جوجی چاہے کرتے رہیں، لیکن میں آپ کو صاف صاف بتا دینا چاہتا ہوں کہ میں فوج میں شامل ہونے کا خواہش مند ہوں اور آپ مجھے اس کی اجازت دے دیں کیونکہ میں یہ نہیں... بس مجھے یہی کہنا تھا۔“

کاؤنٹس نے عالم بے چارگی میں اپنی نگاہیں آسمان کی جانب اٹھا دیں، اس نے اپنی مٹھیں بھینچیں اور خشم ناک ہو کر اپنے خاندان کی طرف متوجہ ہوئی۔

”آپ جو کچھ کہہ رہے ہیں، دیکھ میں، اس کا نتیجہ یہ برآمد ہوا ہے!“ اس نے کہا۔

لیکن کاؤنٹ اپنے جوش و خروش پر پہلے ہی قابو پا چکا تھا۔

”چھوڑو بھی!“ اس نے کہا۔ ”بڑے عمدہ نوجی ثابت ہو گئے، ہونہر! نہیں، فضول بات مت کرو۔ ابھی تو تمہیں اپنی تعلیم مکمل کرنا ہے۔“

”پاپا، یہ فضول بات نہیں ہے۔ ندیا ہولینسکی مجھ سے چھوٹا ہے اور وہ جارہا ہے۔ اس کے علاوہ اب میں پڑھنا دڑھائی نہیں کر سکتا کیونکہ...“ پیتارک گیا۔ اس کا چہرہ شتمنا نے لگا یہاں تک کہ اس پر پسینہ چھوٹ آیا۔ تاہم رول کڑا کر کے بولتا چلا گیا، ”کیونکہ اس وقت مادر وطن خطرات میں گھر چکی ہے۔“

”اتنا کافی ہے، اتنا کافی ہے۔ ایسی فضول باتیں نہیں کرتے۔“

”لیکن آپ نے خود فرمایا تھا کہ آپ سب کچھ قربان کر دیں گے۔“

”پیتا! خاموش ہو جاؤ، میں بتائے دیتا ہوں!“ کاؤنٹ نے چلا کر کہا اور مڑ کر اپنی بیوی کی طرف دیکھا جس کا رنگ فق ہو چکا تھا اور جو ٹنگی باندھے، پٹے بیٹے کو دیکھ رہی تھی۔

”لیکن میں آپ سے عرض کر رہا ہوں۔ اور پیوتر کرلووچ بھی آپ کو کچھ بتائیں گے۔“

”اور میں کہتا ہوں کہ یہ نری فضول حرکت ہے۔ ابھی اس کے ہونٹوں پر دودھ بھی خشک نہیں ہو اور یہ فوج میں جانا چاہتا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ ان باتوں کو چھوڑو۔“ کاؤنٹ نے کاغذات، جنہیں وہ غالباً قبولے سے قبل ایک بار پھر اپنے سٹڈی روم میں پڑھنا چاہتا تھا، سمیٹے اور کمرے سے باہر نکلنے لگا۔

”پیوتر کرلووچ، آؤ چلیں، ذرا پاپا کا کش لگاتے ہیں۔“

پیوتر بوکھلا گیا اور حیرت سے لگا۔ نشا کی غیر معمولی طور پر تاباں و رنگافتہ آنکھیں بار بار اس کی جانب دیکھ رہی تھیں۔ ان میں گرم جوشی سے بڑھ کر کچھ اور تھا اور اسی نے اس کی یہ حالت بنا دی تھی۔

”نہیں، میرا خیال ہے کہ مجھے گھر چلنا چاہیے۔“

”گھر؟ کیوں؟ تم تو شام ہمارے ساتھ گزارنا چاہتے تھے،“ کاؤنٹ نے خوش مزاجی سے کہا۔ ”ویسے بھی تم آج کل کبھی بھاری آتے ہو اور میری یہ بیٹی اس نے نشا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا،“ صرف تبھی چہکتی ہے جب تم یہاں ہوتے ہو۔“

”لیکن میں بھول گیا تھا۔ مجھے واقعی گھر جانا ہے۔ کچھ کام ہے۔“ پیوتر نے نشا سے کہا۔

”اچھا پھر خدا حافظ،“ کاؤنٹ نے کہا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

”آپ کیوں جارہے ہیں؟ آپ اتنا پریشان کیوں ہیں؟ کیوں؟“ نشا نے پوچھا اور یوں اس کی آنکھوں میں جھانکنے لگی جیسے وہ اسے لٹکا رہی ہو کہ ہے ہمت۔

وہ کہنا چاہتا تھا ”کیونکہ میں تم سے محبت کرتا ہوں،“ لیکن اس نے یہ کہا نہیں۔ اس کا چہرہ لالوں لال ہونے لگا یہاں تک کہ اس کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے اور اس نے اپنی نگاہیں نیچے جھکا لیں۔

”کیونکہ میرے لیے بہتر یہی ہے کہ میں یہاں اتنا نہ آیا کروں... کیونکہ... نہیں، بات صرف اتنی ہے کہ مجھے

کچھ کام ہے۔۔

دوڑوں نے سبے چارگی اور بوکھا ہٹ سے ایک دوسرے کی جانب دیکھا۔ اس نے مسکرانے کی کوشش کی لیکن وہ مسکرانہ سکا۔ اس کی مسکراہٹ دکھ کا اظہار کر رہی تھی۔ اس نے اس کا ہاتھ چومنا اور ایک لفظ کہے بغیر ہا ہر نکل گیا۔ بیڑے تہیہ کر لیا تھا کہ اب وہ رستوؤں کے باں نہیں جایا کرے گا۔

21

دوڑوں کو جواب ملنے کے بعد جتا پنے کمرے میں چلا گیا۔ اس نے اندر سے چٹختی لگائی اور جی بھر کر رو دیا۔ جب وہ ہر بلب، آشفستہ حال اور چہرے پر آنسوؤں کے نشانات سجائے چائے پر آیا، ہر شخص جھوٹ موٹ یہی غہہ کرنے لگا کہ اس نے کچھ نہیں دیکھا ہے۔

اگلے روز امپراطور کی آمد ہوئی۔ رستوؤں کے متعدد ملازموں نے ہا ہر جانے اور زار کو دیکھنے کی اجازت مانگی۔ اس روز جیتانے اپنا لباس پہنے، بال سنوارنے اور کارٹھیک کرنے میں خاصا وقت صرف کیا تا کہ وہ چہرے مہرے سے بالغ شخص نظر آئے۔ اس نے آئینے کے ردبرو اور دوں پر بل ڈالے، ہاتھوں اور بازوؤں سے اشارے کیے، کندھے اچکائے اور آخر کار کسی سے ایک لفظ کہے بغیر اس نے اپنی ٹوپی پہنی اور عقی دروازے سے ہا ہر نکل گیا۔ اس کی کوشش تھی کہ کوئی اسے دیکھنے نہ پائے۔

جیتانے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ سیدھا وہاں، جہاں زار مقیم تھا، جائے گا اور کسی مصاحب خاص (جیتانے اپنے ذہن میں امپراطور کی جو تصویر بنائی تھی، اس میں وہ ہر وقت مصاحبان خاص میں گھرا نظر آتا تھا) سے صاف صاف عرض کرے گا کہ کاؤنٹ رستوف اپنی نو عمری کے باوجود اپنے وطن کی خدمت کرنا چاہتا ہے، یہ کہ نو عمری وفاداری میں رکاوٹ نہیں بن سکتی اور یہ کہ وہ بالکل کمر بستہ ہے۔۔۔ لباس تبدیل کرنے کے دوران میں اس نے خاصی تعداد میں نفیس جملے، جو وہ مصاحب خاص سے کہنا چاہتا تھا، سوچ لیے تھے۔

امپراطور تک رسائی حاصل کرنے کے لیے جیتا شخص اسی حقیقت پر کہ وہ اتنا نو عمر ہے، انھیں رکر رہا تھا (اس کا تو یہ بھی خیال تھا کہ اس کی نو عمری دیکھ کر ہر شخص کا منہ حیرت سے کھلے گا کھلا رہ جائے گا)، تاہم اس نے جس اسلوب سے اپنے بال بنائے اور کار سنوارے تھے، اور جس پر وقار اور محتاط انداز سے اس کا چلنے کا ارادہ تھا، اس سے وہ یہ تاثر دینا چاہتا تھا کہ وہ بالغ شخص ہے۔ لیکن جوں جوں وہ آگے بڑھتا گیا اور جوں جوں لوگوں کے ازدحام سے، جس میں کریمسن کے آس پاس ہر آن اضافہ ہوتا جا رہا تھا، اس کی توجہ منتشر ہوتی چلی گئی، توں توں اس کے لیے یہ یاد رکھنا کہ سے بالغ آدمی کی شجیدگی اور وجاہت برقرار رکھنا ہے، مشکل سے مشکل تر ہوتا چلا گیا۔ جب وہ کریمسن کے نزدیک پہنچا، اسے دھکوں سے بچنے کے لیے خاصا چوکس ہونا پڑا، اور اس نے پر عزم اور تہدید انداز سے اپنی کہیاں آگے بڑھا دیں۔ لیکن سٹیلٹ دروازے پر اس کے عزم مہیم کے باوجود، لوگوں نے، جولاریب اس کے محبت الوہنا نہ

جذبات سے، جو اسے کشاں کشاں کریمین تک لے گئے تھے، نا آشنا تھے، اسے دیوار کے ساتھ اتنا دبایا کہ اسے مجبوراً انہیں راستہ دینا اور خود رکتا پڑا جب کہ گاڑیاں مخراب دروازے کے نیچے بلا روک گزرتی رہیں۔ اس کے نزدیک ایک کسان عورت، ایک وردی پوش گھریلو ملازم، ایک فوجی، جسے فوج سے فارغ کر دیا گیا تھا اور دو تاجر کھڑے تھے۔ دروازے کے قریب کچھ دیر کھڑا رہنے کے بعد تمام گاڑیوں کے گزرنے کا انتظار کیے بغیر پچانے دھکم پیل کر کے دوسروں سے آگے نکلنے کی کوشش کی اور اس نے عزم مصمم کے ساتھ کہنیاں چاٹنا شروع کر دیں لیکن کسان عورت نے، جو اس کے نزدیک کھڑی تھی اور جسے اس نے اپنی اولین کوشش کا نشانہ بنایا تھا، غصے سے چلا کر بولی۔

”تو جوان صاحبزادے، ذرا دیکھو، یہ تم دھکے کیوں دے رہے ہو؟ تمہیں نظر نہیں آتا کہ ہم سب یہاں چپ چاپ کھڑے ہیں؟ پھر تم دھکم پیل کیوں کرنا چاہتے ہو؟“

”دھکوں کا کیا ہے، وہ تو ہر کوئی دے سکتا ہے،“ وردی پوش گھریلو ملازم نے کہا۔ وہ بھی اپنی کہنیاں چاٹنے لگا اور اس نے چٹا کو دروازے کے ایک ایسے کونے میں، جہاں سے بدبو کے بھکے اٹھ رہے تھے، دھکیل دیا۔

چٹانے ہاتھوں سے اپنا چہرہ، جس پر پسینہ پھوٹ رہا تھا، پونچھا اور اپنا گیلیا کالر، جسے اس نے بالغ نظر آنے کے لیے گھر پر اتنی احتیاط سے ٹھیک کیا تھا، اوپر اٹھ دیا۔

اسے محسوس ہوا کہ اس کی وضع قطع اس قابل نہیں رہی کہ اسے دوسروں کے سامنے پیش کیا جاسکے اور اسے اندیشہ لاحق ہو گیا کہ اگر وہ اس جیسے میں مصاحب خاص کے سامنے گیا، اسے امپراطور کی خدمت میں پیش ہونے کا موقع نہیں دیا جائے گا، لیکن لوگوں کی بھیڑ میں یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ اپنی جھاڑ پونچھ کر سکا، کسی دوسری جگہ چلا جاتا۔ ایک جرنیل، جو گاڑی میں جا رہا تھا، رستونوں کا واقف تھا۔ چٹا کے دل میں خیال آیا کہ کیوں نہ اس سے مدد کی درخواست کی جائے لیکن اسے محسوس ہوا کہ ایسا کرنا شیوہ مراد انگلی نہیں ہوگا۔ جب تمام گاڑیاں گزر گئیں، ہجوم کا ریل مثل موج سیلاب بہتا اور چٹا کو اپنے ساتھ بہاتا چوک میں، جو پہلے ہی خلق خدا سے پر تھا، پہنچ گیا۔ خلعت کے ٹھٹھ صرف چوک میں ہی نہیں تھے، بلکہ ڈھانچے، چھتیاں اور ہروا جک، جو انہیں سیر آئی، ان سے پٹی پڑی تھی۔ جرنلی چٹا چوک میں پہنچا، اسے گھنٹیوں کے بجنے اور ہجوم کے، جن سے سارا چوک اٹا ہوا تھا، بھنبنانے کی آوازیں صاف سنائی دینے لگیں۔

کچھ دیر کے لیے چوک میں لوگوں کا ہجوم اتنا گنجان نہیں تھا، لیکن ایک کی تمام سر بہ ہونے لگی اور لوگوں کا ایک دور ریل بننے لگا۔ چٹا کچھ اس طرح بچک گیا کہ اس کے لیے سانس لینا دشوار ہو گیا۔ وہاں مسلسل ”ہڑا، ہڑا، ہڑا“ کے نعرے بلند ہو رہے تھے۔ وہ بچوں کے بل کھڑا ہوا، اس نے دھکم پیل کی، جنگلیاں کانٹیں، لیکن اسے اپنے گرد و پیش کے سوا کچھ نظر نہ آیا۔

ہر چہرے پر بیجان اور جوش و خروش کی یکساں کیفیت نمایاں تھی۔ چٹا کے قریب کسی تاجر کی بیوی کھڑی تھی۔ وہ مسکیاں بھر رہی تھی اور اس کے رخساروں پر آنسو بہہ رہے تھے۔

”باپ! فرشتہ! ہمارا آقا!“ وہ بار بار یہی رٹ لگائے جا رہی تھی اور اپنی انگلیوں سے آنسو پونچھتی جاتی تھی۔
 ”ہر آ!“ چاروں اطراف سے یہ نعرہ سنائی دے رہا تھا۔

ایک لمحے کے لیے ہجوم ساکت و صامت کھڑا رہا۔ پھر بھینٹر کا ریل، ایک بار در آگے پہنچے۔
 پیتا ب آپے میں نہیں رہا تھا۔ وہ سختی سے دانت کچکچاتا اور تندہی سے آنکھیں مٹکاتا در آگے دھکم پیل کرنے لگا۔
 وہ یوں دائیں بائیں کہنیاں چلا اور ”ہر آ“ کا نعرہ بند کر رہا تھا جیسے مرنے مارنے پر تل چکا ہو لیکن اس کے چاروں اطراف جو لوگ تھے، ان کے چروں پر بھی خشونت برس رہی تھی، وہ بھی دھکم پیل کر رہے اور ”ہر آ“ کا فلک شکاف نعرہ بند کر رہے تھے۔

”تم معاملے کی نوعیت یہ ہے!“ پیتا نے سوچا۔ ”میں زار کے سامنے خود کبھی درخوست پیش نہیں کر سکتا تھا۔
 یہ ضرورت سے کچھ زیادہ ہی بے باکی کا مظاہرہ ہوتا!“ تاہم وہ آگے ہی آگے بڑھتا رہا۔ اسے یہ فکر کھائے جا رہی تھی کہ کہیں وہ پیچھے نہ رو جائے۔ سے اپنے سامنے دو گوں کی بیٹھوں کے بیچ میں کھلی جگہ دکھائی دی۔ وہاں سرخ ہفتات کی پٹی بچھی ہوئی تھی تاہم عین اسی وقت ہجوم ڈگمگانے اور پیچھے ہٹنے لگا (ہوا یہ کہ پولیس نے ان لوگوں کو جو جلوس۔
 زار محل سے کلیسائے سریم جا رہا تھا۔⁹⁰ کے بہت قریب پہنچ گئے تھے، پیچھے دھکیل دیا تھا۔)، اور پیتا کی پسلیوں پر غیر متوقع طور پر اتنے زور کا گھونٹ پڑا اور وہ اس طرح کچل گیا کہ اچانک اس کی ٹکا ہوں کے سامنے اندھیرا چھ گیا۔ درودہ غش کھ گیا۔ جب اسے دوبارہ ہوش آیا، ایک شخص نے، جو شکل و صورت سے کوئی پادری وغیرہ معلوم ہوتا تھا، جس کی لائے سفید زلفیں اس کی پشت پر لٹک رہی تھیں، اور جس نے پادریوں کا بوسیدہ سیاہ کپڑا پہنا ہوا تھا، اسے ایک بازو سے تھام رکھا تھا جب کہ وہ دوسرے ہاتھ سے ہجوم کے دباؤ کا توازن کر رہا تھا۔

”تم نے اس نوجوان کو کچل دیا ہے!“ پادری کہہ رہا تھا۔ ”وہ بیان سے... آرام سے... تم لوگ اسے کچل دے رہے ہو!“

زار کلیسائے سریم میں داخل ہو چکا تھا۔ ہجوم ایک بار پھر پھیل چکا تھا اور پادری پیتا کو، جس کا چہرہ زرد پڑ گیا تھا اور سانس اکھڑ رہی تھی، توپ زار کی طرف لے چلا۔ بے شمار آدمیوں کو پیتا پر ترس آ گیا اور دیکھتے ہی دیکھتے اس کے گرد گردلوگوں کی بھینٹ جمع ہو گئی۔ جو اشخاص اس کے قریب کھڑے تھے، وہ اس کی خبر گیری کرنے لگے، انھوں نے اس کے کوٹ کے بٹن کھول دیے اور اسے توپ کے بلند چھوڑے پر بٹھادیا۔ دریں اثنا دوسروں کو، جنھوں نے غالباً اسے کچلا تھا، ملاحیاں مٹاتے رہے۔

”کوئی آدمی بھی اس طرح پاؤں تلے کچلا جاسکتا اور ہڈیاں ہو سکتا ہے اس کے بعد؟ لوگوں کی ہلاکت اور کھو تو، بیچارے کا رنگ بالکل سپید پڑ گیا ہے!“ لوگ کہتے سنائی دے رہے تھے۔

پیتا کی حالت بہت جد سنہیں گئی، اس کے رخساروں کی سرخی عود کر آئی، ورد تھم گیا اور اس عارضی تکلیف سے اسے فائدہ یہ ہوا کہ اسے توپ پر جگہ مل گئی اور وہ یہاں سے امپر ا طور کو دیکھنے کی امید کر سکتا تھا۔ زار سے درخواست

کرنے کا خیال پیتا کے ذہن سے نکل چکا تھا۔ اگر وہ اپنی آنکھوں سے زار کی زیارت کرنے میں کامیاب ہو گیا، اس کے سارے ارمان پورے ہو جائیں گے۔

کلیب نے مریم میں اجتماعی مشترکہ عبادت کی تقریب۔ یہ مشترکہ تقریب اس لیے تھی کہ اس میں ایک طرف تو زار کی آمد پر عبادت کرنا اور دوسری طرف ترکوں کے ساتھ معاہدہ اسن طے پا جانے پر شکر خداوندی ادا کرنا مقصود تھا۔ کے دوران میں ہجوم ادھر ادھر چوک میں بکھر گیا اور خواتین فردش نظر آنے لگے۔ وہ کواش⁹² ایک بسکٹ، جن میں اورک کی آمیرش تھی اور مٹھائیاں، جن میں خشکاش کے دانے ملائے گئے تھے (اور جن کا پیتا خاص طور پر شوقین تھا) فروخت کر رہے تھے۔ اب روزانہ کی عام گفتگو دوبارہ سنائی دینے لگی تھی۔ ایک یو پارٹی کی بیوی اپنی دریدہ شامل دکھ رہی تھی اور بتا رہی تھی کہ اس نے یہ کتنے میں خریدی تھی۔ دوسری کہہ رہی تھی کہ آج کل رہنشی شی کے نرخ بہت چھ گئے ہیں۔ وہ پادری، جس نے پیتا کو بچایا تھا، ایک سرکاری کارندے سے ان خدا دین دین کے، جو اس روز مذہبی فرائض کی ادائیگی میں ہشپ کا ہاتھ بٹانے پر مامور تھے، ہارے میں گفتگو کر رہا تھا۔ وہ لفظ ”کانو ویکشن“ بار بار استعمال کر رہا تھا۔ یہ غلط پیتا کی سمجھ میں نہ آیا۔ دونوں جوان مزدور چند نو خیز خادماؤں کے ساتھ، جو خروٹ توڑنے میں مصروف تھیں، ہنسی مذاق کر رہے تھے۔ پیتا کو ان تمام گفتگوؤں، بالخصوص لڑکیوں کے ساتھ چھیڑ چھاڑ میں، جو کسی دوسرے وقت اس کا دل بھالیتیں، کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ توپ پر اپنی بلند اور محفوظ نشست پر بیٹھا تھا، اور جب بھی اسے اپنا اطلہ اور اس کے ساتھ اپنی محبت کا خیال آتا، وہ پیسے کی طرح بے گل ہو جاتا۔ لوگوں کے پاؤں تلے کچلے جانے کے دوران میں اسے جس درد اور خوف کا تجربہ ہوا تھا، اس میں نشاط و انبساط کا جذبہ بھی شامل ہو گیا تھا، اور ان سب چیزوں نے مل کر اس کے دل میں موقع کی سنجیدگی کا جو احساس ابھارا تھا، اس کی شدت میں مزید اضافہ کر دیا تھا۔

اچانک دریا کے پتے پر توپ کے دانے جانے کی آواز سنائی دی (توپ ترکوں کے ساتھ معاہدہ اسن پر دستخط ہو جانے کی خوشی میں واغی جاری تھی) اور بھیڑیہ منظر دیکھنے کے لیے پتے پر چل پڑی۔ پیتا بھی بھاگ اٹھا، لیکن جس پادری نے، اسے اپنے سایہ عافیت میں لے لیا تھا، اس نے اسے اپنی جگہ سے ہلے نہ دیا۔ گولے چلتے رہے جب کہ افسر، جرنیل و درمہ حساب خاص بھاگ بھاگ کلیب سے باہر آتے رہے۔ اس کے پیچھے پیچھے دوسرے لوگ آ رہے تھے لیکن انہیں کوئی خاص جلدی نہیں تھی۔ ایک بار پھر ٹوپیاں فضا میں بلند کی گئیں اور وہ لوگ، جو توپوں کی جانب بھاگے تھے، واپس آنے لگے۔ آخر کار وردیاں پہنے اور اپنے سینوں پر تھمے سجائے چار اشخاص گرے سے برآمد ہوئے۔ ”ہڑ، ہڑ!“ ایک بار پھر ہجوم غرے بلند کرنے لگا۔

”ان میں سے وہ کون ہے؟ وہ کون ہے؟“ چیتا نے روہاٹی آواز سے پوچھا لیکن کسی نے اسے جواب نہ دیا۔ ہر شخص پر بیجانی کیفیت طاری تھی۔

پیتا نے ان چار میں سے ایک پر اپنی نگاہیں گاڑ دیں مگر چونکہ اس کی آنکھیں مسرت کے آنسوؤں سے مہرین

تھیں، اسے وہ واضح طور پر دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ تاہم اس نے اپنا سار شوق و دہولہ اسی پر مرکوز کر دیا۔ اگرچہ اتفاق سے وہ امپراطور نہیں تھا۔ اور دیوانہ وار ”ہرا“ کا نعرہ بند کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے جی میں ٹھن لیا کہ خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہو جائے، وہ لازماً کل فوج میں بھرتی ہو جائے گا۔

ہجوم نے امپراطور کا تعاقب کیا، محل تک اس کے پیچھے پیچھے گیا اور پھر منتشر ہونے لگا۔ پہلے ہی دن خاصا گزر چکا تھا۔ پیتا کے پاس کھانے کو کچھ بھی نہیں تھا اور وہ پیٹے میں شرابور ہو رہا تھا، تاہم وہ گھرنہ گیا بلکہ ہجوم کے ساتھ، جو گرچہ چھٹ رہا تھا، پھر بھی خاصا بڑا تھا، محل کے سامنے کھڑا رہا جب کہ امپراطور ڈنکھارہا تھا۔ محل کے درپچوں کو ٹھنکی باندھے رکھ رہا تھا، اسے انتظار تھا لیکن کس کا، یہ اسے خود بھی معلوم نہیں تھا۔ اسے ان معزز اشخاص پر، جنہیں وہ امپراطور کے ساتھ ڈنکھانے کے لیے دروازے کے اندر جاتے دیکھ رہا تھا، اور ان درباری وردی پوش ملازمین پر، جو دسترخون پر خدمات سرانجام دے رہے تھے، درجن کی جھلک اسے درپچوں میں سے دکھائی دے رہی تھی، یکساں رشک آ رہا تھا۔

جب امپراطور ڈنکھارہا تھا، البتہ وہ نے درتپے میں سے باہر جھانکتے ہوئے کہا۔

”یوز بھئی، لوگ اب بھی آپ کا دوبارہ دیدار کرنے کی امید لگائے ہوئے ہیں۔“

ڈنر تقریباً ختم ہو چکا تھا۔ امپراطور بسکٹ چباتا اپنی نشست سے اٹھا اور باہر بالکنی میں چل گیا۔ ہجوم، جس کے بیچ میں جتا بھی تھا، بالکنی کی طرف بھاگا۔

”فرشتہ لباب! آقا!“ ہجوم پورے زور شور سے نعرے لگا رہا تھا اور ایک بار پھر خواتین اور بعض رقیق القلب مرد، بشمول پیتا، خوشی کے آنسو بہانے لگے۔

زار کے ہاتھ میں جو بسکٹ تھا، اس کا خاصا بڑا ٹکڑا ٹوٹا اور بالکنی کے چنگلے پر گرتا نیچے زمین پر آ رہا۔ ایک کوجون، جس نے پوتیس کا کوٹ پہنا ہوا تھا، بسکٹ کے ٹکڑے پر جھپٹا، اور اس نے اسے دبوچ لیا۔ ہجوم میں بے شمار لوگ کوجون کی طرف بھاگے۔ جب زار نے یہ منظر دیکھا، اس نے بسکٹوں سے بھری ہوئی پیٹ منگوائی اور انہیں بالکنی سے نیچے پھینکنے لگا۔ پیتا، جس کی آنکھیں اب سرخ ہو رہی تھیں اور جسے کپلے جانے کے خوف نے اور بھی ہچکچاہٹ کر دیا تھا، بسکٹوں پر ٹوٹ پڑا۔ وہ یہ تو نہیں جانتا تھا کہ کیوں لیکن اسے زار کے ہاتھ سے بسکٹ لینا تھا اور اسے محسوس ہوا کہ وہ یہ کوشش ترک نہیں کر سکا۔ اس نے آگے زائد گائی اور ایک بوڑھی عورت کو، جو ایک بسکٹ پکڑا چاہتی تھی، حذر کر دیا۔ بڑھیا نے، حال نہ کہ وہ زمین پر گری پڑی تھی، یہ تسلیم کرنے سے انکار کر دیا کہ وہ پٹ چکی ہے۔ اس نے چند بسکٹ جھپٹنے کی کوشش کی لیکن اس کا ہاتھ ان تک نہ پہنچ سکا۔ پیتا نے اس کے ہاتھ پر گھٹنا مارا اور اسے پرے دھکیل دیا، خود ایک بسکٹ پکڑا اور اس اندیشے کے پیش نظر کہ کہیں اس سے تاخیر نہ ہو جائے ایسی آواز میں، جواب بیٹھ چکی تھی، اس لیے ہی ”ہرا“ کا نعرہ لگا دیا۔

امپراطور اندر چل گیا اور اس کے بعد ہجوم کا خاصا بڑا حصہ تتر بتر ہونے لگا۔

”دیکھ، میں نے کہا نہیں تھا کہ کچھ دیر اور انتظار کرنا چاہیے۔ اور میں نے ٹھیک ہی کہا تھا،“ چاروں اطراف ہی پر مسرت تبصرہ سنا کی دے رہا تھا۔

مانا کہ چٹا خوش تھا لیکن یہ سوچ کر کہ اب اسے واپس گھر جانا ہوگا، اس کا منہ لنگ گیا۔ وہ جانتا تھا کہ اس روز کا مزہ ختم ہو گیا ہے۔ وہ کریمین سے سیدھا گھر نہ گیا بلکہ اپنے دوست ابولینسکی سے، جس کی عمر چندہ سال تھی اور جو خود بھی فوج میں شامل ہو رہا تھا، منے اس کے مکان پر چل گیا۔

جب پیتا گھر پہنچا، اس نے بڑے باعزم اور فیصلہ کن انداز سے اعلان کر دیا کہ اگر انھوں نے اجازت نہ دی، تو وہ گھر سے بھاگ جائے گا۔ اگرچہ کاؤنٹ لیا آندرچے نے پوری طرح اپنی رضامندی کا اظہار نہیں کیا تھا، پھر بھی وہ اگلے روز یہ دریافت کرنے چل دیا کہ پیتا کو کسی ایسے مقام پر جہاں کم سے کم خطرہ درپیش ہو، تعینات کرانے کا بندوبست کس طرح ہو سکتا ہے۔

22

دو روز بعد چندہ جولائی کی صبح لہ تعداد گاڑیاں سلا بورا محل کے سامنے کھڑی تھیں۔

اسیج و عریض ہال کمرے کچھا کچھ بھرے ہوئے تھے۔ پہلے میں وردیوں میں ملبوس شرفا تھے۔ دوسرے میں نیچے ختان پہنے اور سینوں پر تھنے بجائے بارلش تجارت تھے۔ جس کمرے میں شرفا جمع تھے، وہاں سے بدلت بھانت کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں اور لوگ ادھر ادھر گھوم پھر رہے تھے۔ انتہائی ممتاز اکابرین، امپراطور کی تصویر کے نیچے بہت بڑی میز کے سامنے اونچی پشتوں والی کرسیوں پر براجمان تھے، تاہم حاضرین کی بیشتر تعداد کمرے میں سڑکت کر رہی تھی۔

یہ تمام اشراف، جن سے بیئر کی روزانہ کلب میں یا ان کے گھروں میں ملاقاتیں ہوتی رہتی تھیں، وردیوں میں ملبوس تھے۔ ان میں سے بعض کی وردیاں امپراطورہ کی تھریں کے زمانے کی، بعض کی امپراطور پادل کے دنوں کی، اور بعض کی امپراطور الیکساندر کے نئے عہد کی تھیں۔ ان میں بعض ایسے بھی تھے جنھوں نے شرفا کی عام وردیاں پہنے پر اکتفا کر لیا تھا۔ ان کے ملبوسات کی اس عمومی خصوصیت نے ان متنوع ور جانی پیچنی ہستوں کی، جن میں بوڑھے اور جوان دونوں شامل تھے، ہیئت کچھ ایسی بنا دی تھی جو دیکھنے میں عجیب اور انوکھی معلوم ہوتی تھی۔ چندھی آنکھوں، بے دانت دہانوں، گنبجے سروں، پیچ اور پھولے ہوئے یا سوکھے سڑے اور جھریوں زدہ چہروں والے بوڑھے خاص طور پر دیکھنے والوں کی توجہ اپنی طرف مبذول کرا لیتے تھے۔ وہ زیادہ تر اپنی نشستوں پر گم سم بیٹھے تھے اور ان میں سے اگر کوئی کمرے میں گھومتا پھرتا اور باتیں کرتا بھی، تو وہ اپنے آپ کو کسی نو جوان کے ساتھ نتھی کر لیتا۔ ہوم میں شامل لوگوں کے جنھیں پیتا نے کریمین چوک میں دیکھا تھا، چہروں کی طرف ان اشخاص کے چہروں پر بھی نمایاں طور پر متضاد تاثرات ہو رہے تھے۔ ایک طرف تو ان کے چہروں پر کسی گھبرائے کے ظہور پذیر ہونے کی

توقع جھٹک رہی تھی اور دوسری طرف انھیں بوشن کے کھیل، باورچی پترو شکا، زینید ادمیریونا کی صحت وغیرہ کے رور مرہ کے، مور میں جود لچکی تھی، اس کا عندیہ مل رہا تھا۔

بیسر بھی دیں تھا۔ وہ صبح سے شرفا کی وردی میں، جس کے بٹن بند تھے، ملبوس تھا۔ اب اسے اس میں خاصی بے آرامی محسوس ہو رہی تھی کیونکہ یہ جنگ تھی اور اس میں اس کا جسم جکڑا ہوا تھا۔ یہ غیر معمولی مجلس، جس میں نہ صرف شرفا بلکہ تاجر بھی شامل تھے، ایک قسم کی مجلس عوام⁹⁵ (Les Etats-generaux) تھی اور اس نے اس کے ذہن میں خیالات کے پورے سلسلے کا، جسے وہ مدتیں ہوئیں بھوں چکا تھا لیکن جو اس کی روح پر پوری طرح نقش تھا، احیا ہو گیا اور یہ خیالات ”عمرانی معاہدے“⁹⁶ اور فرانسیسی انقلاب کے بارے میں تھے۔ امپراطور کے فرمان کے ان الفاظ۔ ”لرماں رواے مملکت اپنی رعایا سے مشورے کی غرض سے در السلطنت آرہے ہیں۔“ نے اس کی توجہ خاص طور پر اپنی طرف مبذول کرائی تھی اور اس کے ان خیالات کی توثیق بھی کر دی تھی۔ اور یہ فرض کر کے کہ اس سمت، جس کا اسے مدتوں سے انتظار تھا، کوئی ہم پیش رفت ہونے والی ہے، وہ ادھر ادھر چکر لگاتا، دوسروں کو دیکھتا اور ان کی باتیں بغور سنتا رہا لیکن جن خیالات میں وہ مستغرق تھا، اس کی ذرا سی بھی صدائے بازگشت سے کہیں سنائی نہ دی۔

امپراطور کا فرمان پڑھ کر سنایا گیا۔ اسے سن کر حاضرین میں بڑا جوش و خروش پیدا ہوا اور وہ اس پر بحث و تحقیق کرنے کے لیے مختلف ٹولیوں میں بٹ گئے۔ گفتگو کے روایتی موضوعات پر باتیں کرنے کے علاوہ بیٹرنے لوگوں کو اس قسم کی بحثیں کرتے بھی سنا کہ امپراطور کی آمد پر اشراف کے نمائندوں نے، جو مارشل کہلاتے تھے، کہاں کھڑے ہونا ہے، اس کے اعزاز میں اجتماعی رقص کب منعقد کیا جانا چاہیے، آیا انھیں اپنی جماعت کی تشکیل ضلع یا پورے صوبے کی بنیاد پر کرنا چاہیے۔ علیٰ ہذا القیاس۔ لیکن جونہی جنگ اور شرفا کو طلب کرنے کا مقصد زیر بحث آیا، گفتگو میں ہچکچاہٹ اور بے نتیجی پیدا ہو گئی۔ معلوم ہوتا تھا کہ اب ہر شخص بولنے پر سننے کو ترجیح دے رہا ہے۔

ایک خوب رو اور تندہ ست و توانا ادھیڑ عمر شخص، جس نے ریٹائرڈ بحری افسر کی وردی پہنی ہوئی تھی، ایک کمرے میں باتیں کر رہا تھا اور اس کے ارد گرد لوگوں کا حلقہ بن گیا تھا۔ بیٹر اس حلقے میں چلا گیا اور کان لگا کر سننے لگا۔ کاؤنٹ الیادستوف امپراطور کی تہرین کے عہد کی وردی میں ملبوس تھا۔ اس کے چہرے پر خوشگوار مسکراہٹ تھی۔ وہ ہجوم میں شامل تمام لوگوں سے واقف تھا اور ان کے مابین ادھر ادھر گھوم پھر رہا تھا۔ پھرتے پھرتے وہ بھی اس حلقے کے قریب پہنچ گیا اور سننے کے لیے رک گیا۔ ہمیشہ کی طرح اب بھی وہ مشفقانہ انداز سے متبسم تھا اور جو کچھ مشکلم کہہ رہا تھا، اس پر سر ہلا کر صاد کر رہا تھا۔ ریٹائرڈ بحری افسر بڑی بے باکی کے ساتھ گفتگو کر رہا تھا۔ (اس کا اندازہ سامعین کے چہروں کے تاثرات اور اس حقیقت سے لگایا جاسکتا تھا کہ ان لوگوں کی، جن کے بارے میں بیٹر کو معلوم تھا کہ ان کا شمار مسکین ترین اور بزدل ترین انسانوں میں ہوتا ہے، بیشتر تعداد واپسندیدگی کا اظہار کرنے کے لیے یا تو وہاں سے پرے کھسک گئی یا پھر وہ اس سے اختلاف رائے کرنے لگی۔) دیر و حکم چل کر حلقے کے عین درمیان میں پہنچ گیا۔ اس نے مشکلم کی باتیں غور سے سنیں اور اسے یقین ہو گیا کہ یہ شخص واقعی لبرل ہے لیکن اس کے خیالات

اس کے اپنے خیالات سے قطعی مختلف تھے۔ بحری افسر روی اشراف کے مخصوص حدوت آمیز، سریلے اور بلند آہنگ لہجے میں گفتگو کر رہا تھا۔ وہ ”ر“ غتر بود کر دیتا اور اپنے حروف صحیح کو عام طور پر بچ بچ میں کھا جاتا تھا۔ اس کے لہجے سے مترشح ہوتا تھا کہ وہ عیش و عشرت کا لہذا دہ اور حکم چلانے کا عادی ہے۔

”گر سولنسک کے باشندوں نے امپراطور کے لیے فوج میں بھرتی دینے کی پیشکش کی ہے، تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟ کیا ہمارے لیے قانون سولنسک وضع کرے گا؟ اگر صوبہ ہاسکو کے مراد شرفا مناسب سمجھیں، تو وہ امپراطور کے ساتھ اپنی وفاداری کا اظہار دوسرے طریقوں سے کر سکتے ہیں؟ اس سات میں ہم نے جولیٹیا بھرتی کرائی تھی، کیا ہم اسے بھول گئے ہیں؟ اس کا نتیجہ کیا نکلتا تھا؟ یہی ناکہ پادریوں کے بیٹوں اور چوروں اچکوں نے خوب ہاتھ دنگے۔“

کاؤنٹ رستوف خوش اخلاقی سے مسکرایا اور اس نے پسندیدگی سے اپنا سر ہلادیا۔

”اور ہم نے جولیٹیا بھرتی کرائی تھی، کیا وہ امپراطور کے کسی کام آئی؟ ذرا بھی نہیں البتہ اس سے ہماری کیتی باڑی ضرور تباہ ہوئی۔ بہتر ہے کہ ایک بار پھر جبری لام بندی کر لی جائے۔ بصورت دیگر جب ہمارے آدمی واپس ہمارے پاس آئیں گے، وہ نہ صحیح معنوں میں فوجی ہوں گے اور نہ کسان۔ اس ان کی حالتیں بگڑ چکی ہوں گی، داعی شہ اور شراب خوری کے عادی ہو چکے ہوں گے، وہ بالکل نکلے بن چکے ہوں گے۔ شرفا کسی چیز سے دریغ نہیں کریں گے۔ ہم میں جو بھی مرد کا بچہ ہے، جائے گا اور اپنے ساتھ رنگروٹ لے کر آئے گا۔ امپراطور اپنی زبان مبارک سے ایک لفظ ارشاد فرما دیں اور ہم سب ان پر اپنی جانیں نثار کر دیں گے،“ خلیب نے اپنے لہجے میں جوش پیدا کرتے ہوئے کہا۔

ایہ اندر بچ اس کی باتیں سن کر اتنا خوش ہوا کہ اس کی راہیں بے گلی اور اس نے میٹر کو ٹھوکا دیا، لیکن جبر خود تقریر کرنا چاہتا تھا۔ وہ آگے بڑھا۔ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ اس کے جذبات مشتعل ہو چکے ہیں مگر کیوں؟ اس کے بارے میں وہ یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا تھا اور نہ اسے معلوم تھا کہ وہ کہے گا کیا۔ اس نے بمشکل اپنا منہ کھولا ہوگا کہ ایک پوپے منہ والے بوڑھے سینئر نے، جس کے چہرے پر زیر کی اور خفگی ٹپک رہی تھی اور جو پہلے مقرر کے قریب کھڑا تھا، اسے ٹوک دیا۔ بظاہر معلوم ہوتا تھا کہ وہ بھٹوں کو پٹری پر ڈالنے اور استدلالی انداز کو ہاتھ سے نہ جانے لیتے کا عادی ہے۔ اس نے مدھم مدھم لیکن صاف لہجے میں بولنا شروع کیا:

”میرا خیال ہے کہ ہمیں یہاں یہ بحث کرنے کے لیے نہیں بلایا گیا،“ اس نے پوپے منہ سے اپنی گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے کہا، ”کہ موجودہ حالات میں ملک کے لیے کیا موزوں رہے گا۔ جبری بھرتی یا ملیشیا۔ ہمیں یہاں اس اوپل کا، جس سے ہمارے امپراطور نے ہمیں نواز کر ہماری عزت افزائی کی ہے، جواب دینے کے لیے اکٹھا کیا گیا ہے۔ لیکن بہترین طریق کار کیا رہے گا۔ جبری بھرتی یا ملیشیا۔ اس کا فیصلہ ہمیں حاکم اعلیٰ پر چھوڑ دینا چاہیے۔“

ملیشیا (نام نہاد) رصاصہ کار فوج۔ حقیقتاً جاگیردار اپنے زرعی غلام جبرا بھرتی کرتے تھے۔

بیئر کو اپنے جوش و خروش کے اظہار کے لیے اچانک رست مل گیا۔ اسے سینئر پر، جو شرفا کی بحث و تمحیص میں اپنا محدود، روایتی نقطہ نظر گھسیٹ رہا تھا، طیش آ گیا۔ ویئر آگے بڑھا اور اس نے اس کی بات ٹوک دی۔ اسے خود معلوم نہیں تھا کہ وہ کیا کہنے والا ہے، تاہم اس نے اپنی گفتگو کی ابتدا بڑے ولولے سے کی۔ وہ کتابی رویہ پل رہا تھا لیکن وقتاً فوقتاً فرامیسی کا سہارا لے لیتا تھا۔

”یوٹا کیسی لینیسی، معافی چاہتا ہوں“ (بیئر سینئر سے چھی طرح واقف تھا لیکن اس موقع پر اس نے اسے رسمی انداز سے مخاطب کرنا مناسب سمجھا۔) ”اگرچہ میں ان صاحب سے، جنہوں نے ابھی ابھی اپنے خیالات کا اظہار ہے، اتفاق نہیں کر سکتا۔“ (وہ قدرے ہچکچایا، وہ اسے *mon tres honorable preopinant* کہتا چاہتا تھا) ”اگرچہ میں ان صاحب سے۔۔ جن سے مجھے تعارف کا شرف حاصل نہیں، اتفاق نہیں کر سکتا، میرا اندازہ ہے کہ شرفا کو یہاں محض اس لیے نہیں بلایا گیا کہ وہ ہمدردی جن میں یا محض اپنے جوش و خروش کا اظہار کریں بلکہ ہمیں اس وسائل و ذرائع کے، جن سے ہم اپنی مادر و جن کا دفاع کر سکتے ہیں، بارے میں بھی غور و فکر کرنا ہوگا۔ میں سمجھتا ہوں“ اس نے اپنے موضوع کے سلسلے میں اور بھی گرم جوش کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنی بات جاری رکھی، ”کہ امپراطور کو جب یہ معلوم ہوگا کہ ہم انھیں کوئی مش۔ مش۔ مشورہ دینے کی بجائے محض یہ بتانے پر اکتفا کر رہے ہیں کہ ہم اپنے ساتھ ساتھ اپنے زرعی غلاموں کو، جن کے ہم مالک ہیں *Chaur a Cannon* توپوں کا بندھن۔ بنانے پر راضی ہیں، تو وہ کوئی خاص خوش نہیں ہوں گے۔“

گفتگو سننے کے لیے جو لوگ حلقہ بنائے کھڑے تھے، ان کی اچھی خاصی تعداد نے، جب بیئر کے چہرے پر مسخرانہ مسکراہٹ دیکھی اور بیئر کو بے لگام بولتے سنا، وہاں سے کھسکے میں ہی عافیت سمجھی، کاؤنٹ رستوف واحد شخص تھا جس نے بیئر کی باتوں پر تحسین کی۔ ویسے بھی اس کی یہ عادت تھی کہ جو شخص جو بھی کہتا تھا، وہ جھٹ اس کے ساتھ متفق ہو جاتا تھا۔ اسی لیے اس نے ازیں قبل بحری افسر اور سینئر کی باتوں پر بھی پسندیدگی کا اظہار کیا تھا۔

”ان سوالات پر بحث کرنے سے قبل“ بیئر نے اپنا سلسلہ، کلام جاری رکھا، ”ہمیں امپراطور سے، نہایت ادب و احترام کے ساتھ ہر پیشگی سے یہ دریافت کرنا چاہیے کہ وہ ازراہ کرم ہمیں یہ بتائیں کہ ہماری افواج کی تعداد کتنی ہے، ان کی اس رفت پر زبیشن کیا ہے اور اس کے بعد۔“

لیکن ویئر کے منہ سے یہ الفاظ بمشکل نکلے ہی ہوں گے کہ اس پر سہ طرفہ تنقید ہونے لگی۔ متعدد ترین دھواں اس کے پرانے شناسا اور بوٹن کھیل میں اس کے حلیف سٹیپن سٹیپانوفچ ابراکنس نے، جو اس کے متعلق اچھی رائے رکھتا تھا، بولا۔ سٹیپن سٹیپانوفچ وردی میں تھا اور یہ وردی کا اعجاز تھا یا اس کا سبب کچھ اور تھا، بیئر کو اپنے سامنے ایک بالکل مختلف شخص نظر آیا۔ پیرائہ سال کے غیظ و غضب سے اس کا چہرہ لال انگرا رہا اور وہ گل پھاڑ پھاڑ کر بیئر سے کہنے لگا ”میں تمہیں بتائے دیتا ہوں کہ نمبر ۱ ہمیں امپراطور سے اس قسم کے سوالات پر چھنے کا کوئی حق حاصل نہیں۔“

نمبر 2 اگر رہی شرمناک اس قسم کا کوئی حق حاصل ہے بھی، تو بھی یہ امپراطور کی مرضی ہے کہ وہ اس کا جواب میں یا نہ دیں۔ فوج کی نقل و حرکت کا انحصار دشمن کی نقل و حرکت پر ہوتا ہے۔ تعداد کا اس سے کوئی تعلق نہیں، وہ بڑھتی یا گھٹتی رہتی ہے۔“

ستے میں ایک اور آواز نکل ہو گئی۔ یہ آواز ایک خاندانی خطاب یافتہ شخص کی تھی۔ اس کا قد درمیانہ اور اس کی عمر چالیس سال کے لگ بھگ تھی۔ میئر اسے بھٹے دنوں میں چھپیوں کے سیلوں ٹھیلوں میں دیکھا کرتا تھا اور اسے یہ بھی معلوم تھا کہ وہ تاش کا بڑا زئیل کھلاڑی ہے۔ وروی نے اس کی کایا بھی پٹ دی تھی۔ وہ میئر کی جانب بڑھا اور بولا: ”ہاں، ہاں، بجا کہا۔ یہ وقت غور و فکر کا نہیں بلکہ عمل کا تقاضا کرتا ہے۔ جنگ روس میں پہنچی ہے۔ دشمن روس کو جس نہیں کرنے، ہمارے آباؤ اجداد کی قبروں کی بے حرستی کرنے اور ہمارے بیوی بچوں کو اٹھالے جانے کے لیے پیش قدمی کر رہا ہے!“ اس نے اپنے سینے پر دو ہتھ مارا۔ ”ہم اٹھیں گے، ہم سب چلیں گے اور اپنے باپ زاری جیروی کریں گے!“ اس نے اپنی خون بار آنکھوں کو گھماتے ہوئے چلا کر کہا۔

ہجوم میں سے چند آوازیں، جو اپنی پسندیدگی کا اظہار کر رہی تھیں، سنائی دیں۔

”ہم روسی ہیں اور اپنی مادر وطن کے دفاع کے لیے اپنا خون بہانے سے دریغ نہیں کریں گے! اگر ہم مادر وطن کے سپردت ہیں، تو ہمیں لا-عینی خواب دیکھنے کی عادت ترک کرنا ہوگی۔ ہم یورپ کو رکھ دیں گے کہ روسی کس طرح اس کا دفاع کرنے کے لیے اٹھ کھڑا ہوتا ہے!“ اس نے دہانے ہوئے کہا۔

میئر نے جواب دینے کی کوشش کی لیکن وہ ایک لفظ بھی دوسروں کے کانوں تک نہ پہنچا سکا۔ اسے حساس تھا کہ اس کے الفاظ کا مطلب کیا ہے، اسے پہچانا تو دور کی بات ہے، مخالفین کی ہرجوش چیخ دیکار میں اس کی آواز بھی سنائی نہیں دے سکتی تھی۔

کاؤنٹ رستوف اس مختصر ہجوم کے عقب میں کھڑا تھا اور پسندیدگی سے اپنا سر ہار رہا تھا۔ جسے کے اختتام پر متعدد حاضرین تیزی سے مقرر کی جانب بڑھے اور چلانے لگے۔

”ہیر، ہیر!“

ہیر کہنا یہ چاہتا تھا کہ وہ کسی اعتبار سے بھی اپنی دولت، اپنی زرعی غنموں اور خود اپنی رات کی قربانی دینے کا مخالف نہیں ہے۔ بات صرف اتنی ہے کہ آدمی کو یہ معصوم ہونا چاہیے کہ حالات کس نہج پر جا رہے ہیں تاکہ ان میں اصلاح کی صورت نکالی جاسکے لیکن وہ کچھ بھی نہ کہہ سکا۔

ایک وقت بولنے اور چلانے کی اتنی زیادہ آوازیں سنائی دے رہی تھیں کہ الیا آندرجک کو ان سب کے ساتھ اپنے اتفاق کے اظہار کا موقع نہ مل سکا۔ ہجوم میں اضافہ ہونے لگا، وہ ٹوٹا اور پھر بھا، اور چلاتے، باتیں کرتے بڑے بال میں بڑی میز کے پاس پہنچ گیا۔

ویٹر کو نہ صرف بات کرنے سے روکا گیا، بلکہ بڑی بدتمیزی سے ٹوکا گیا، دھکے دیے گئے اور لوگوں نے اس کی طرف یوں پٹھیں پھیر لیں جیسے وہ مشترک دشمن ہو۔ اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ انھیں اس کی گفتگو کا رنگ ڈھنگ پسند نہیں آیا تھا۔ وہ اسے اسی وقت بھول گئے تھے جب بعد ازاں دوسرے لوگوں نے اپنی تقریریں شروع کر دی تھیں۔ اس کا سبب صرف یہ تھا کہ ہجوم کو گرانے کے لیے کوئی ایسی ٹھوس چیز، جس سے وہ اپنی محبت کا اظہار کر سکتا، درکار تھی۔ ایسی ہی کوئی چیز، جو ان کی نفرت کا نشانہ بن سکتی، چاہیے تھی۔ ویٹر مؤخر الذکر بن گیا۔

بیجان روہ۔ بحری افسر اور نواب کے بعد متعدد مزید مقرروں نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ ان میں سے بعض نے فصاحت و بلاغت کے دریا بہائے اور بعض نے اپنے نقطہ نظر کے اظہار میں بڑی ایج کا مظاہرہ کیا۔ ہم ان سب کا بولچہ یکساں تھا۔ جریدہ ”پامبروس“ کے ایڈیٹر گلنکا نے، جسے بیجان لیا گیا تھا (ہجوم میں ”مصنف!“ مصنف!“ کے نعرے بلند ہوئے تھے) کہا: ”جہنم کا توڑ جہنم ہی ہونا چاہیے۔ میں نے ایک بچے کو بجلی کی چمک اور بادل کی کڑک پر مسکراتے دیکھا ہے لیکن ہمارا رویہ اس بچے کو روپیے سے مختلف ہوگا۔“

”بیر، ہیرا، دل کی کڑک پر مسکراتا!“ ہجوم کی عظیمی قہاروں سے پسندیدگی کی گونج سنائی دی۔

ہجوم دھکم پیل کرتا بڑی میز کی، جس پر ستر ستر بہتر سال کے مگنہ سروں اور سفید بالوں والے بزرگ زعماء دریاں پہنے اور تھمے سجائے بیٹھے تھے، جانب بڑھنے لگے۔ ان بزرگ زعماء میں سے تقریباً سبھی سے ویٹر ان کے نجی مستخدموں کی معیت میں ان کے گھروں میں یا کلبوں میں بوسٹن کھیلنے مل چکا تھا۔ ہجوم مسلسل جھنجھٹے جا رہا تھا اور میز کے قریب پہنچنے پر بھی اس کی جھنجھٹا ہٹ میں کوئی کمی نہ آئی۔ وہ لوگ، جزر در شور سے باتیں کر رہے تھے، انھیں ہجوم نے، جس میں ہر آن اضافہ ہوتا جا رہا تھا اونچی پشتوں والی کرسیوں کی طرف دھکیل دیا تھا لیکن ان کی باتیں پھر بھی بند نہ ہوئیں۔ وہ یکے بعد دیگرے بولے جا رہے تھے بلکہ بعض اوقات تو دور وادشاخص بیک وقت لب کشائی کرنے لگتے۔ وہ لوگ، جو مزید پیچھے کھڑے تھے، جب یہ دیکھتے کہ بولنے والے سے کوئی بات پھوٹ گئی ہے، وہ اسے لقمہ دینے میں عجلت کرتے۔ اس ہنگامے اور بھیڑ بھڑکے میں دوسروں کی کوشش یہ تھی کہ انھیں کوئی بات سوجھ جائے اور وہ جھٹ پٹ اسے کہہ سکیں۔ بزرگ زعماء جنھیں ویٹر جاتا تھا اپنی نشستوں پر بیٹھے کبھی ایک شخص اور کبھی دوسرے کو پکارتے لگتے لیکن ان کے چہروں سے کسی رد عمل کا عندیہ نہیں مل رہا تھا، سوائے اس کے کہ انھیں کمرے میں گرمی محسوس ہو رہی تھی۔ ہجوم پر جو یہ عمومی کیفیت طاری تھی کہ وہ سب کچھ کرنے کے لیے تیار رہے۔ جس کا اظہار وہ اپنے الفاظ کے رنگ ڈھنگ سے کم، لیکن لہجے اور نظروں سے زیادہ کر رہا تھا۔ ویٹر بھی اس کی لپیٹ میں آ گیا اور اس کی حالت بیجانی ہو گئی۔ وہ اپنے خیالات سے تو دست بردار نہ ہوا مگر کسی نہ کسی طرح اسے محسوس ہوا کہ وہ غلطی پر ہے اور وہ اپنے آپ کو صحیح ثابت کرنے کے لیے بے قرار تھا۔

”میں نے صرف یہ کہا تھا کہ اگر ہمیں یہ معلوم ہو جائے کہ ضرورت کس چیز کی ہے، پھر ہم جو قربانیاں دیں گے، ان سے بہتر مقدار حاصل ہو سکیں گے“ اس نے حلق کا پورا زور لگا کر کہا۔ اس کی کوشش تھی کہ اس کی آواز

دوسری کی آواز پر چھا جائے تاکہ وہ حاضرین کے کانوں تک پہنچ سکے۔

اس کے قریب ایک سحر شخص نے اپنے گرد و پیش نگاہ دوڑائی لیکن اس کی توجہ سراسر چیخ پکار کی، جو میز کی دوسری سمت سے سنائی دینے لگی تھی، طرف متعطف ہو گئی۔

”بالکل، ہاسکو کو دشمن کے حوالے کر دیا جائے گا! وہ ہمارا کفارہ ادا کرے گا!“ کوئی چلا چلا کر کہہ رہا تھا۔
 ”یہ انسانیت کا دشمن ہے۔“ دوسرا ہاڑا۔
 ”مجھے بولنے تو دیں۔“

”حضرات، آپ میرا کچھ مر نکال رہے ہیں!“

23

اس لیے اپنی لمبی ٹھوڑی اور چوکس آنکھوں سمیت رستوپ چن بڑے بڑے ڈگ بھرتا کمرے میں داخل ہوا۔ وہ جوشیل کی درزی میں ملبوس تھا اور اس کے شانے پر پٹکا لٹک رہا تھا۔ اس کے سامنے جو ہجوم تھا، ادھر ادھر بکھر گیا۔

”ہمارے امپراطور ایک آدھ منٹ میں تشریف لے آئیں گے،“ رستوپ چن نے اعلان کیا۔ ”میں ابھی ابھی ان کی بارگاہ سے آرہا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ اس وقت ہماری جو پوزیشن ہے، اس کے پیش نظر بحث و تمحیص کی کوئی خاص ضرورت نہیں ہے۔ امپراطور نے ہمارا اور تاجروں کا اجلاس بلانا مناسب سمجھا ہے۔ وہ اپنی تھیلیوں کے منہ کھول دیں گے اور دل کھولی کر لاکھوں روپے دیں گے۔“ (اس نے تاجروں کے کمرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا) ”جب کہ ہمارے یہ فرض بنتا ہے کہ نفری فرہم کریں اور کسی چیز سے دریغ نہ کریں۔ یہ کم سے کم ہے جو ہم کر سکتے ہیں۔“
 صلاح مشورے شروع ہو گئے لیکن یہ صرف ان بزرگ ذہن تک، جو میز کے ارد گرد بیٹھے تھے، محدود تھے۔ مشورے ضرورت سے زیادہ دھیمی آوازوں میں ہو رہے تھے اور یوزھی آوازیں یکے بعد دیگرے ایک دوسرے سے ”مجھے آپ سے اتفاق ہے۔“ ”پائتوے کی خاطر“ ”میر بھی یہی خیال ہے،“ کہہ رہی تھیں۔ قبل ازیں جو شور و غلبہ ہاتھ اس کے مقابلے میں یہ آوازیں اندوہ گیس معلوم ہو رہی تھیں۔

ہاسکو کے اعیان و عمائدین نے یہ قرارداد منظور کی۔ ”سمولنسک کے شرقا کی طرح ہم بھی اپنے ہزار درزی غلاموں سے دیں، جو ہر اعتبار سے اسلحہ اور دوسرے ساز و سامان سے ہمیں ہوں گے، فوج میں بھرتی کرادیں گے۔“ اور میکرزی کو حکم ملا کہ وہ اس قرارداد کو قلم بند کر لے۔ عمائدین نے اطمینان کی سانس لی اور جب وہ اپنی نشستوں سے اٹھے، کرسیوں کے چرچرانے کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ وہ اپنی ٹانگیں سیدھی کرنے کے لیے اپنے اپنے دوستوں کے بازو تھامے اور ان سے گپ شپ کرتے کرتے کمرے میں ادھر ادھر چہل قدمی کرنے لگے۔

”امپراطور! امپراطور!“ اچانک تمام کمروں سے گونج سنائی دینے لگی اور سارے کاسارا ہجوم دروازے کی طرف لپک پڑا۔

امپراطور شرقا کی دودیاؤں کے مابین خاصی عریض گلی میں سے گزرتا ہال کمرے میں داخل ہوا۔ ہر چہرے پر تجسس تھا لیکن یہ تجسس ان لوگوں کا تھا جن کا رویہ بے حد مؤدبانہ تھا اور جو رعیب شہنشاہیت سے سرگوش تھے۔ بیئر ذرافہ صلی پر کھڑا تھا اور امپراطور جو کچھ کہہ رہا تھا، وہ اسے پوری طرح سن نہیں پا رہا تھا، تاہم جو کچھ وہ سن سکا، اس سے وہ بھی سمجھ کہ امپراطور ان خطرات کا جو امپراطور یہ کو لاحق تھے اور ان امیدوں کا، جو اس نے ماسکو کے شرقا سے وابستہ کر رکھی تھیں، ذکر کر رہا ہے۔ امپراطور کی گفتگو کے جواب میں ایک شخص نے اسے اس قدر رد کے، جو حاضرین نے منظور کی تھی، متعلق بتایا۔

”حضرات!“ زرنے کی کپکپاتی آواز سے کہا۔

اجرم میں ہل چل چکی گئی اور جب دوبارہ خاموشی چھائی، بیئر کو زار کی تین طور پر خوشگوار بشری آواز سنائی دی۔ وہ بڑے جوش و جذبے سے کہہ رہا تھا۔

”مجھے روسی شرقا کے خلوص اور وفا شعار پر کبھی شبہ نہیں ہوا۔ لیکن آج یہ میری توقعات سے کہیں زیادہ بڑھ گئی ہے۔ میں مادر وطن کے نام پر آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ حضرت، آئیں، اب ہم عمل کر کے دکھائیں!۔ وقت اصول ترین شے ہے۔“

امپراطور خاموش ہو گیا، جرم و حکم پیل کرتا اس کے ارد گرد اکٹھا ہونے لگا اور چاروں اطراف وجد آفریں نعرہ ہائے تحسین گونجنے لگے۔

”بہا فرمایا، اصول ترین۔۔۔ بالکل شاہانہ انداز سے ارشاد فرمایا!“ کاؤنٹ رستوف نے سسکی بھرتے ہوئے کہا۔

وہ پیچھے کھڑا تھا۔ اسے سنائی تو کوئی خاص نہیں آیا تھا لیکن وہ اپنے انداز سے سب کچھ سمجھ گیا تھا۔

شرقا کے کمرے سے امپراطور تیار کے کمرے میں چلا گیا۔ وہاں وہ تقریباً دس منٹ رہا۔ جن لوگوں نے اسے وہاں سے پچھتم نم آتے دیکھا، ان میں بیئر بھی شامل تھا۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا، زار نے تیار کو بمشکل خطاب کرنا شروع کیا تھا، کہ اس کی آنکھوں سے اشک رواں ہو گئے اور اس نے لرزتی آواز سے اپنی تقریر ختم کی۔ جب بیئر کی نظر اس پر پڑی، وہ ردِ اشخاص کی معیت میں باہر آ رہا تھا۔ ان میں سے ایک بھاری بھر کم شراب کا ٹھیکے دار تھا اور بیئر کا واقف کار تھا۔ دوسرا بیئر تھا۔ وہ زرد اور دبلا پتلا تھا۔ دونوں کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ دبلے پتلے شخص کی آنکھیں اشکوں سے لبریز تھیں لیکن ٹیم ٹھیم ٹھیکے دار بچوں کی طرح ہلک رہا تھا اور کہہ رہا تھا۔

”یوکر سبشٹی، جان بھی حاضر ہے اور مال بھی!“

اس وقت بیئر کے دل میں صرف ایک ہی خواہش اسٹڈری تھی۔ وہ یہ دکھانا چاہتا تھا کہ وہ کسی چیز سے دریغ نہیں کرے گا اور اپنا سب کچھ بچھاؤ کرنے کے لیے تیار ہے۔ اس کی تقریر میں جو آئینی آہنگ تھا، وہ اس کے ضمیر پر بوجھ بن گیا تھا اور وہ اس کی تلخی کرنے کے لیے موقع کی تلاش میں تھا۔ جب اس نے یہ سن کہ کاؤنٹ مائوف

ایک رجسٹ فراہم کر رہا ہے، اس نے جھٹ پٹ کا ڈنٹ دستوپ چن کو مطلع کیا کہ وہ ایک ہزار جوان فراہم کرے گا اور ان کے تمام اخراجات برداشت کرے گا۔

جب معمر دستوف نے یہ تفصیل اپنی بیوی کو سنائی، وہ اپنے آنسوؤں کو روک نہ سکا۔ اس نے وہیں اور اسی وقت چٹا کی درخت قبوں کر لی اور بذات خود اس کا نام درج کرانے چاہا۔

اگلے روز امیر اطور ماسکو سے روانہ ہو گیا۔ تمام شرف نے اپنی وردیاں اتاریں اور مطمئن ہو کر دوبارہ اپنے گھروں اور کھنوں میں بیٹھ گئے۔ انھوں نے کہنے کو تو اپنے سٹیو ارڈوں کو حکم دے دیا کہ ان کے ذمے جتنے جتنے رگڑت بھرتی کرانے کی پابندی لگائی گئی ہے، وہ انھیں بہم پہنچادیں لیکن اس کے ساتھ ہی وہ کف افسوس بھی مل رہے تھے کہ وہ کیا کر بیٹھے ہیں۔

نپولین روس کے خلاف اس لیے رزم آرا ہوا کیونکہ وہ ڈریسڈن جانے کی خواہش پر قابو نہیں پاسکا تھا، وہاں اسے جو خراج تحسین پیش کیا گیا، وہ اس سے اتنا متاثر ہوا کہ اپنے دماغ کو چوتھے آسمان پر پہنچنے سے روک نہیں سکا تھا، پولستانی وردی زیب تن کرنے سے احتراز نہیں کر سکا تھا، جون کی خوبصورت صبح کے دلولہ انگیز اثرات کے سامنے سر تسلیم خم کیے بنا رہ نہیں سکا تھا اور کورکن اور بعد ازاں بال شیف کی موجودگی میں اپنا غصہ پی نہیں سکا تھا۔

ایکسا غر نے گفت و شنید کے تمام دروازے بند کر دیے تھے کیونکہ وہ سمجھتا تھا کہ اس کی ذاتی طور پر توہین ہوئی ہے۔ بارکلی ڈتولی فوج کی کمین بہترین انداز سے کرنے کے لیے ایڑی چوڑی کا زور لگا رہا تھا کیونکہ وہ اپنا فرض نبھانا اور عظیم جرنیل کی شہرت کمانا چاہتا تھا۔ رستوف نے فرانسیسیوں پر اس لیے ہلہ بول دیا تھا کیونکہ چراگاہ کے آ رہے سر پٹ گھوڑا دوڑانے کی جو ترغیب اس کے دل میں پرورش پا رہی تھی، وہ اس سے چھٹکارا حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔ اور اسی انداز سے تمام اتحادی افراد نے، جو جنگ میں شریک تھے، اپنے ذاتی خصائص، عادات، حالات اور مقاصد کے تحت عمل کیا۔ وہ جو کچھ کرتے تھے، اس کے پیچھے ان کے اندیشے، غوریں، لطف اندوزیاں یا خفکیاں کارفرما تھیں، اور جب وہ استدلال کرتے تھے، وہ یہ فرض کر لیتے تھے کہ انھیں معلوم ہے کہ وہ کیا کر رہے ہیں اور جو کچھ وہ کر رہے ہیں، اپنی مرضی سے کر رہے ہیں۔ حالیکہ وہ سب کے سب غیر ارادی طور پر تاریخ کے آلا ستی کار تھے۔ وہ ایک ایسا فریضہ سرانجام دے رہے تھے جو خود ان کی نگاہوں سے تو دو جھل تھا لیکن وہ ہمارے لیے قابل فہم ہے۔ با عمل اشخاص کا یہی مقدر ہوتا ہے، وہ اسے نال نہیں سکتے۔ سماجی درجے بندی میں ان کا مقام جتنے بلند ہوتا ہے، اپنے افعال میں وہ اتنے ہی کم آزاد ہوتے ہیں۔

جن لوگوں نے 1812 کے واقعات میں حصہ لیا تھا، انھیں منظر عام سے اوجھل ہوئے مدتیں بیت چکی ہیں۔ ان کے ذاتی مفادات اور دلچسپیاں قصہ پارینہ بن چکی ہیں اور ان کا نام و نشان تک بھی باقی نہیں رہا۔ تاریخی نتائج کے ماسوائے اس زمانے کا کچھ بھی موجود نہیں رہا۔

لیکن آئیں، ہم یہ فرض کر لیتے ہیں کہ یورپ کے لوگوں کو نپولین کی قیادت میں روس کے قلب تک آنا اور وہاں

تھا ہونا ہی تھا، پھر اس لوگوں کے۔ خاص طور ان لوگوں کے جو جنگ میں شریک ہوئے۔ باہمی طور پر متعلق، خارج ز عقل، ظلمانہ افعال ہمارے لیے قابل فہم بن جاتے ہیں۔

مشیتِ ایزدی نے ان تمام لوگوں کو، جو اپنے اپنے ذاتی مقاصد کے حصول کے لیے کوتاہاں و سرگرداں تھے، عظیم الشان نتیجے کی، جس کا ان میں سے کسی کو (نہ نیولین کو، نہ ایکساندر کو اور ان لوگوں کو تو، جو واقعتاً جنگ میں شریک ہوئے، بالکل ہی نہیں) خفیہ سامع بھی نہیں تھا، تکمیل کے لیے ایک جگہ اکٹھے ہونے پر مجبور کر دیا تھا۔

اب ہمیں یہ بات، کہ 1812 میں فرانسیسی فوج کیوں تباہی سے دوچار ہوئی، واضح طور پر معلوم ہے۔ کوئی شخص بھی یہ بات جھٹلا نہیں سکتا کہ اس کا ایک سبب تو یہ تھا کہ نیولین کی فوج نے موسم (گرما) کے اواخر میں مڈی ملک کے قلب میں پیش قدمی تو کر لی لیکن موسم سرما سے پہلے کے لیے کسی قسم کی کوئی تیاری نہ کی۔ دوسری وجہ یہ ہوئی کہ روسی شہروں کے نذرِ آتش کیے جانے پر روسی عوام کے دلوں میں دشمن کے خلاف جو نفرت پیدا ہوئی، اس سے جنگ نے بالکل مختلف شکل اختیار کر لی۔ لیکن اس وقت کوئی شخص بھی پیش از حالات یہ بھانپ نہ سکا (جو اب روز روشن کی طرح عین نظر آتا ہے) کہ آٹھ لاکھ افراد پر مشتمل سپاہ۔ روئے زمین کی بہترین فوج، جس کی قیادت بہترین جرنیل کر رہا تھا۔ کو جنگ میں نا پخت فوج، جس کی نفری اس سے نصف تھی اور جس کی قیادت نا تجربہ کار جرنیل کر رہے تھے (جیسا کہ روسی فوج فی الحقیقت تھی)، صرف اسی صورت میں شکست دے سکتی تھی کہ حالات و واقعات بالکل بھی رخ اختیار کرتے۔ نہ صرف یہ کہ کوئی شخص اس کا اندازہ نہ کر سکا بلکہ جہاں تک روسیوں کا تعلق ہے، وہ مسلسل اس واحد چیز کی، جو انھیں بچا سکتی تھی، راہ میں رکاوٹیں کھڑی کرنے کی کوششیں کرتے رہے۔ جہاں تک فرانسیسیوں کا تعلق ہے، نیولین کے تجربے اور اس کی نام نہاد غیر معمولی عسکری فطانت کے باوجود انھوں نے گرمیوں کے ختم پر، سکوت پنپنے کے لیے پورا زور لگا دیا۔ بالفاظِ دیگر وہ بالکل وہی کام، جس نے انھیں لازماً تباہی کے کنارے پہنچانا تھا، کرنے کی جگہ و رو کرتے رہے۔

1812 کے واقعات سے متعلق فرانسیسی مورخین نے جو تصانیف تحریر کی ہیں، ان میں انھیں اس قسم کے دعاوی کرے گا بڑا شوق ہے کہ اپنی جنگی حد بندی میں توسیع کرنے میں جو خطرات پہنچا تھے، نیولین ان سے آگاہ تھا، یہ کہ اس نے (مولسک پہنچنے سے پہلے روسیوں کے ساتھ) جنگ کرنے کی کوشش کی اور یہ کہ اس کے مارشلوں سے اسے مولسک میں رکنے کا مشورہ دیا تھا۔ یہ مصنفین اس قسم کے اور ان سے ملتے جلتے دلائل یہ ثابت کرنے کے لیے دیتے ہیں کہ ہم میں جو خطرات پوشیدہ تھے، اس زمانے میں بھی لوگ ان سے آگاہ تھے۔ اس معاملے میں روسی مصنفین فرانسیسی مصنفین سے بھی دوچار ہا تھا آگے نکل گئے ہیں۔ وہ دعویٰ کرتے ہیں کہ روسیوں نے ہم کے بالکل آواز میں یہ منصوبہ بنا لیا تھا کہ وہ تو رائیوں کے انداز میں نیولین کو سبز باغ دکھ کر روس کے قلب میں بے آئیں گے۔ بعض گھاری اس منصوبے کا سہرا بھرا بل، بعض کسی فرانسیسی، بعض ٹول اور بعض خود امیر اطوار ایکسندر کے سر باندھتے ہیں۔ اس قسم میں وہ مختلف ترکوں، آپ بیتیوں، منصوبوں اور خطوط کے، جن میں واقعی اس قسم کے طریق کار کے

متعلق اشارے موجود ہیں، حوالے دیتے ہیں۔ لیکن امر حقیقت یہ ہے کہ فرانسیسیوں اور روسیوں دونوں کی پیش اندیشی کے متعلق جو معلومات پیش کی جاتی ہیں، وہ محض اس لیے کی جاتی ہیں کیونکہ واسطے نے انھیں صحیح ثابت کر دیا ہے۔ اگر واقعہ پیش نہ آتا، تو ان باتوں کو اسی طرح طاق نسیاں پر رکھ دیا جاتا جس طرح ان سے مختلف دستاویز ان ہزاروں اشاروں، کنایوں اور قیافوں کو، جن کا اس زمانے میں بڑا چرچہ تھا، محض اس لیے فراموش کر دیا گیا ہے کیونکہ واسطے نے انھیں غلط قرار دے دیا ہے۔ کوئی واقعی کس کروٹ بیٹھے گا، اس کے متعلق قیاس آرائیوں کی تعداد اتنی زیادہ ہوتی ہے کہ نتیجہ خواہ کچھ ہی نکلے، چند لوگ آپ کو ہمیشہ ایسے مل جائیں گے جو یہ دعویٰ کرنے سے قطعاً نہیں ہچکچائیں گے۔ ”میں نے اسی وقت کہہ دیا تھا کہ یہی ہوگا۔“ وہ یہ قطعاً بھول جاتے ہیں کہ انھوں نے جو بے شمار مفرد مضامین تراشے تھے، ان میں سے بیشتر (اصل واسطے کے) بالکل برعکس تھے۔

اس قسم کے قیاسات، کہ جنگی حد بندی کو توسیع دینے میں جو خطرات مضمر تھے، یوں کہ ان سے آگاہ تھا، یا یہ کہ روسیوں نے دشمن کو ہتھیار باغ دکھا کر ملک کے قلب میں لے آنے کا ارادہ کر لیا تھا، لاریب اسی زمرے میں آتے ہیں، اور مورخین محض کھینچ ٹان کر کے ہی (اور وہ بھی خاصی زیادہ) اس قسم کے تصورات کو پھیلین اور اس کے مارشلوں سے یا اس نوعیت کے منصوبوں کو روسی جرنیلوں سے منسوب کر سکتے ہیں۔ تمام حقائق ایسے مفرد وضوں کی جھلک دیکھ کر آتے ہیں۔ ہم کی ساری مدت کے دوران میں نہ صرف یہ کہ روسیوں نے قطعاً کبھی اس رغبت کا اظہار نہیں کیا تھا کہ وہ فرانسیسیوں کو بہلا پھسا کر ملک کے قلب میں لے آئیں، بلکہ اس کے علی الرغم انھوں نے جو نئی سرحد عبور کی، انھوں نے انھیں روکنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ اور جہاں تک یورپین کا تعلق ہے، اپنی جنگی حد بندی کی توسیع سے خطرہ محسوس کرنا تو بہت دور کی بات ہے، وہ تو ہر قدم، جو وہ آگے بڑھاتا تھا، اسے اپنی کامیابی تصور کرتا اور اس پر خوشیاں مناتا تھا۔ اپنی سابقہ مہموں کے دوران میں وہ جس طرح بڑھ چڑھ کر اور ذوق و شوق سے غنیمت پر حملہ آور ہوتا تھا، یہاں اس کا طرز عمل اس کے بالکل برعکس تھا، روسیوں کے ساتھ پھوڑانے میں وہ تاخیری حربے استعمال کر رہا تھا۔

مہم کے بالکل آغاز میں ہماری افواج منقسم تھیں (اور مختلف مقامات پر مقیم تھیں) اور ہمارا واحد ہدف انھیں یکجا کرنا تھا۔ اگر ہمارا مقصد پیچھے ہٹنا اور دشمن کو ملک کے قلب میں گھسیٹنا ہوتا، پھر فوج کو یکجا کرنے سے کوئی فائدہ حاصل نہ ہوتا۔ ہمارا امپراطور فوج کے ساتھ اس لیے نہیں گیا تھا کہ وہ انھیں پسپائی کی ترغیب دینا چاہتا تھا بلکہ اپنی موجودگی سے وہ ان میں یہ روح پھونکنا چاہتا تھا کہ وہ روس کی ایک ایک انچ زمین کا تحفظ کرنے کے لیے سرحد کی بازی لگا دیں۔ دریا کی طول طویل قلعہ بندیوں پھوٹل کے منصوبے کے تحت تعمیر کی گئی تھیں اور وہاں سے مزید پیچھے ہٹنے کا قطعاً کوئی ارادہ نہیں تھا۔ کمانڈر انچیف جو ذرا سی بھی پسپائی اختیار کرتے تھے، اس پر امپراطور انھیں زبردستی توجہ کرتا تھا۔ ماسکو کو نذر آتش کرنا تو دور کی بات ہے، امپراطور تو کبھی خواب میں بھی یہ سوچ نہیں سکتا تھا کہ وہ دشمن کو سولنسک تک ہی ملک کے اندر گھسنے دے گا۔ اور جب ہماری افواج بالآخر یک جا ہو گئیں تو وہ یہ من کر آگ بگولا ہو گیا کہ سولنسک کی دیواروں تلے کوئی خولی معرکہ لڑے بغیر ہی شہر کو دشمن کے قبضے میں جانے اور سے نذر آتش

کے جانے دیا گیا ہے۔

یہ تو، میرا طور کارویہ تھا۔ جہاں تک روسی کم نڈروں اور عوام کا تعلق ہے، ان کا تو یہ تصور کر کے ہی کہ ہماری افواج ملک کے اندر اتنی دور تک پہنچا ہوتی جا رہی ہیں، خون کھولنے لگتا تھا۔

پولین ہماری افواج کو منقسم کرنے کے بعد اندرون ملک دور تک پیش قدمی کر گیا۔ وہ بدو جنگ کے متعدد مواقع آئے لیکن وہ ان سب سے کئی کتر ا گیا۔ اگست کے دوران میں وہ سمونسک پہنچ گیا۔ اب وہ صرف یہ سوچ رہا تھا کہ مزید آگے کیسے بڑھا جا سکتا ہے، حالانکہ جیسا کہ اب ہمیں معلوم ہے، یہ پیش قدمی اس کے لیے واضح طور پر تباہ کن تھی۔

حقائق چیخ چیخ کر بتا رہے ہیں کہ پولین کو ماسکو کی جانب اپنی پیش قدمی میں پیشگی کسی قسم کے خطرات نظر نہیں آئے تھے اور یہ کہ الیک نڈر اور روسی جرنیلوں کے اذہان میں قطعاً کبھی یہ بات نہیں آئی تھی کہ انھیں پولین کو بھلا بھلا کر آگے لے آنا چاہیے بلکہ اس کے برعکس وہ بہر صورت اس کی پیش قدمی روکنا چاہتے تھے۔ پولین کو روس میں جو گھسیٹا گیا وہ کسی سوچے سمجھے منصوبے کی بدولت نہیں ہوا (کوئی بھی شخص یہ یقین ہی نہیں کرتا تھا کہ ایسا ہو سکتا ہے) بلکہ وہ ان لوگوں کی، جو جنگ میں شریک ہوئے، سازشوں، آرزوؤں اور امنگوں کے پیچیدہ تعامل کا نتیجہ تھا۔ خود ان لوگوں کو بالکل یہ ادراک نہیں تھا کہ کیا وقوع پذیر ہونے والا ہے یا روس کو بچانے کا واحد ذریعہ کیا ہو سکتا ہے۔ جو کچھ بھی ظہور پذیر ہوا، اٹھاتا ہوا۔ ہماری افواج ہم کے بالکل آغا میں ہی منقسم ہو گئی تھیں۔ ہم نے انھیں بچانے کی کوشش کی۔ بظاہر مقصد یہی تھا کہ ہم جنگ کریں گے اور حملہ روکنے کی سعی کریں گے۔ ہمارا ارادہ تھا کہ یک جا یہ عمل جلد از جلد پایہ تکمیل تک پہنچ جائے اور اس اثنا میں اپنے سے کہیں زیادہ قوتور دشمن کے ساتھ ٹکرینے کی نوبت نہ آئے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے ہم زاویہ حادثہ بناتے مجبوراً پیچھے ہٹتے گئے اور یوں فرانسیسیوں کو سمونسک تک کھینچ لائے۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہم زور دینے والے اس لیے پیچھے ہٹ رہے تھے کیونکہ فرانسیسی ہماری دونوں افواج کے بیچ میں سے پیش قدمی کر رہے تھے۔ زور دینے والے مزید حادثہ ہوتا چلا گیا اور ہم اس لیے مزید پسپائی اختیار کرتے چلے گئے کیونکہ بار کلمے ڈتولی جرمن تھا اور غیر مقبول تھا اور باگ راتیاں (جسے اس کے زیرِ کمان آنا تھا) اس سے نفرت کرتا تھا۔ باگ راتیاں فوج روم کا سپہ سالار تھا، (حالانکہ ہیڈ کوارٹرز میں تمام لوگ چاہتے تھے کہ فوجوں کی سیکائی کا عمل جلد از جلد پایہ تکمیل تک پہنچ جائے) اس نے اپنی فوج کو ڈتولی کی فوج میں ضم کرنے اور اس کے زیرِ کمان آنے میں حتی المقدور زیادہ سے زیادہ تاخیر کی۔ اس کا انداز یہ تھا کہ اگر وہ اپنی فوج کو لے کر چل پڑا تو سفر کے دوران میں وہ خطرات کی زد میں آجائے گی اور اس کے لیے بہترین طریق کار یہی ہوگا کہ وہ مزید بائیں اور جنوب کی طرف ہٹ جائے، دشمن کے پہلو اور عقب کو مسلسل حملوں سے زچ کرے، اور یوکرین سے اپنی فوج کی کمک کے لیے مزید تگ و دو حاصل کرے۔ قرآن سے یہی نظر آتا ہے کہ اس نے یہ منصوبہ اس لیے بنایا تھا کیونکہ اسے جرمن بار کلمے کے، جس سے ہر کوئی نفرت کرتا تھا، اور جو مزید برآں ملازمت میں اس سے جو نیئر

تھا، ماتحت کام کرنا گوارا نہ تھا۔

امپراطور فوج کے ساتھ اس لیے گیا تھا کیونکہ وہ اس کا حوصلہ بڑھانا چاہتا تھا لیکن ہوا یہ کہ اس کی موجودگی، کیا اقدامات کیے جانا چاہئیں، ان کے بارے میں اس کی علمی، مشیروں کی کثرت اور منصوبوں کی بھرمار نے فوج، دل کی قوت سلب کر لی اور وہ پیچھے ہٹ گئی۔

ارادہ تو درپہ کا ڈٹ کر دفاع کرنے کا تھا لیکن پڈ لومبکی نے، جو خود کمانڈر انچیف بننے کا آرزو مند تھا، اپنا سارا زور ایک ندر کو متاثر کرنے کے لیے لگا دیا اور پنویل کا سہارا منصوبہ ترک کر دیا گیا اور کمان بار کلمے کے سپرد کر دی گئی، لیکن بار کلمے پر کلی اعتماد نہیں کیا جاسکتا تھا اور اس کے اختیارات محدود کر دیے گئے۔

افواج منقسم تھیں، کمان میں وحدت نہیں تھی اور بار کلمے غیر مقبول تھا۔ اس انتشار، عدم وحدت و جرمن کمانڈر انچیف کی غیر مقبولیت کا نتیجہ ایک طرف تو عدم فیصلے اور جنگ (اگر فوجیں یک جا ہوتیں اور بار کلمے کی جگہ کوئی دوسرا شخص کمانڈر انچیف ہوتا، تو یہ لازماً ہو کر رہتی) سے گریز کی صورت میں برآمد ہوا اور دوسری طرف کیفیت یہ ہوئی کہ جرمنوں سے نفرت میں روز بروز اضافہ ہونے لگا اور حب الوطنی کا جوش و خروش بڑھنے لگا۔

آخر کار امپراطور اس عذر کے ساتھ — یہ نہایت سوزوں عذر تھا اور امکانی طور پر واحد عذر تھا جو اس کی روانگی کا جو ز فراہم کر سکتا تھا۔ فوج سے رخصت ہو گیا کہ اس کے لیے دار الحکومت جانا اور وہاں کے باشندوں میں قومی جنگ کے لیے جوش و جذبہ ابھارنا ضروری ہو گیا ہے۔ یوں فرماں روائے مملکت نے ماسکو کا جو دورہ کیا، اس سے روسی افواج کی قوت میں تین گنا اضافہ ہو گیا۔

وہ فوج سے اس لیے رخصت ہوا تھا تا کہ کمانڈر انچیف کے غیر منقسم اختیارات میں کوئی رکاوٹ نہ پڑے۔ اسے امید تھی کہ (اس کی عدم موجودگی میں) زیادہ فیصلہ کن اقدامات کیے جائیں گے، لیکن عسکری کمان پہلے سے بھی زیادہ پراگندہ خیال اور غیر موثر ہو گئی۔ بے جنگ سیں، زار یوج (ولی عہد) اور ایجوٹنٹ جنرلوں کا جم غفیر اس لیے فوج کے ساتھ وابستہ رہا تا کہ کمانڈر انچیف پر نظر رکھی جاسکے اور اسے ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھنے نہ دیا جائے بلکہ اسے کچھ نہ کچھ کرنے پر اکسایا جاتا رہا۔ ”امپراطور کی ان تمام آنکھوں“ کی زیر نگرانی بار کلمے اپنے آپ کو پہلے سے زیادہ کم آواز محسوس کرنے لگا۔ یوں وہ مزید محتاط ہو گیا اور جنگ سے اجتناب کرنے لگا۔

بار کلمے مستقل مزاجی سے محتاط رویہ اختیار کیے رہا۔ زار یوج اشاروں کنایوں سے غداری کے الزامات لگاتا اور عمومی مردم آرائی کا مطالبہ کرتا رہا۔ لیو با مر سکی، بروٹسکی، ولوچکی اور ان کے ہم خیال دوسرے لوگوں نے وہ دوا دیا کیا کہ بار کلمے نے امپراطور کو کاغذات پہنچانے کے بہانے ان پولستانی ایجنٹوں کو پیٹریز برگ بھیج دیا اور خود بے جنگ سین اور زار یوج کے ساتھ علانیہ چیقلش میں مصروف ہو گیا۔

باگراتیاں کی خواہشات کے علی الرغم افواج یا آخر سولسک میں یک جا ہو گئیں۔

باگراتیاں نے کبھی پکڑی اور اس مکان پر، جس میں بار کلمے مقیم تھا، پہنچ گیا۔ بار کلمے نے اپنا سرکاری پنکا

پہنا اور اپنے سینٹر افسر کا استقبال کرنے اور اسے رپورٹ پیش کرنے کے لیے باہر نکل آیا۔ عالی ظرفی کے اس مقابلے میں باگ راتیں پیچھے نہیں رہنا چاہتا تھا چنانچہ ملازمت میں سینیاروں کے باوجود اس نے اپنے آپ کو بار کھلے کی کمان میں دے دیا کہنے کو تو اس نے اس کی ماتحتی قبول کر لی لیکن عملاً وہ پہلے کی نسبت کہیں کم اس سے اتفاق کرنے لگا۔

پھر طور کے خصوصی احکام پر باگ راتیاں اپنی رپورٹیں براہ راست اسے ارسال کرنے لگا اور اس نے آراک چیف کو تحریر کیا:

فرماں روائے مملکت کا منتا میرے لیے بجز لہ حکم ہے لیکن میں منسز (مراد بار کھلے) کے ساتھ کام نہیں کر سکتا۔ لہذا، مجھے کہیں، اور بھجوادیں، خواہ رجسٹر کی کمان پر ہی لگا دیں کیونکہ یہاں رہنا میری برداشت سے باہر ہے۔ تمام کا تمام ہیڈ کوارٹر جرموں سے تباہ و برباد ہے کہ کسی روی کے لیے سانس لینا محال ہے اور کسی معاملے کا سراپا تمھ نہیں آتا۔ میرا خیال تھا کہ میں فرماں روائے مملکت اور مادر وطن کی خدمت کرتا رہوں لیکن عقدہ یہ کھلے کہ میں بار کھلے کی خدمت پر ماسور ہوں۔ مجھے اعتراف ہے کہ مجھے اس کا بار نہیں۔

برڈنسکیوں اور ونٹ ٹنگے روڈوں اور ان کی قبیل کے دوسرے لوگوں کے جم غفیر نے کانڈرائیجیوں کے مابین تعلقات میں مزید بس گھول دیا اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک جہتی پہلے سے بھی کم ہو گئی۔ سولنسک سے دھڑی فرانسیسیوں پر حملہ کرنے کی تیاریاں کی گئیں۔ پوزیشن کا جائزہ بننے کے لیے ایک جرنیل بھیجا گیا۔ اس جرنیل کو بار کھلے سے نفرت تھی۔ وہ اپنے ایک دوست سے، جو کور کمانڈر تھا، ملنے چلا گیا۔ اس کے ساتھ ایک دن گزارنے کے بعد وہ واپس بار کھلے کے پاس پہنچ گیا اور مجوزہ میدان کو، جسے اس نے دیکھا تک نہیں تھا، ہر لحاظ سے ناموزوں قرار دینے لگا۔

جب مستقبل کے میدان جنگ کے بارے میں مناقشے اور سازشیں جاری تھیں اور جب ہم فرانسیسیوں کو تلاش کر رہے تھے۔ ان کے ساتھ ہمارا رابطہ منقطع ہو چکا تھا۔ ہلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا، ناگاہ فرانسیسیوں کی نے وی روسکی کی ڈویژن سے ٹکڑے بھینٹ ہو گئی اور وہ سولنسک کی دیواروں تک پہنچ گئے۔

پتی رسد اور مواصلات کے راستوں کا دفاع کرنے کے لیے ہمیں ناگہانی جنگ کا سامنا کرنا پڑا۔ جنگ ہوئی اور طرفین کے ہزاروں آدمی کھیت رہے۔

فرماں روائے مملکت اور ساری قوم کی خواہشات کے برعکس سولنسک خالی کر دیا گیا لیکن شہر کو اس کے باسیوں نے، جنھیں ان کے اپنے گورنر نے گمراہ کیا تھا، اپنے ہاتھوں نذر آتش کر دیا اور یہ خانماں برباد باشندے، دوسرے روسیوں کے سامنے مثل پیش کرتے ماسکو کی طرف راہ قرار اختیار کرنے لگے۔ انھیں صرف اپنے نقصانات کا غم تھا اور وہ جہاں سے بھی گزرتے، دشمن کے خلاف نفرت کی چنگاریوں کو ہوا دیتے جاتے۔ پولین

طرز آگے آگیا، ہم پیچھے ہٹ گئے اور یوں ہم نے وہ چیز، جو پولین کی شکست کا سبب بنی، حاصل کر لی۔

اپنے بیٹے کی روانگی کے اگلے روز پرنس نکولائی آندر یوچ بکنوئسکی نے پرنس ماریا کو بلا بھیجا۔

”ہاں؟“ سب تم مطمئن ہو؟“ اس نے اس سے کہا۔ ”تم نے میرے بیٹے سے میری دانتا ٹککل کراوی؟ تم مطمئن ہو؟ تم بس یہی چاہتی تھیں تم مطمئن ہو؟... میرے لیے یہ بہت تکلیف دہ، بے حد تکلیف دہ ہے۔ میں بوڑھا اور ضعیف ہوں اور تم یہی چاہتی تھیں۔ خیر، اب تم قہقہے لگاؤ، بخشیں بجاؤ!“

اس کے بعد پرنس ماریا کی اپنے باپ سے پورا ہفتہ ملاقات نہ ہوئی۔ وہ صاحب فرانس تھا اور اپنے سنڈی روم سے باہر نہیں نکلتا تھا۔

پرنس ماریا کو یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ اپنی عدالت کے دوران میں معمر پرنس نے خود اسے ہی نہیں بلکہ مادموزیل یونین کو بھی اپنے قریب پھٹکنے نہیں دیا تھا۔ بخون تن تھا اس کی تیمارداری کر رہا تھا۔

بشتے کے اختتام پر پرنس نے اپنی شکل دکھائی اور وہ ایک بار پھر اپنی سابقہ روش پر چل پڑا۔ وہ پوری تن دی سے ماغات کی تزئین و آرائش، درمکان کے قریب زرعی عمارتوں کی تعمیر میں جت گیا۔ اس نے مادموزیل یونین سے تمام علاقے منقطع کر دیے۔ اب وہ اپنی بیٹی کے ساتھ جو سرد مہراندہ لہجہ اور برتاؤ اختیار کیے ہوئے تھا، اس سے وہ یہ تاثر دینا نظر آتا تھا ”دیکھ تم نے؟ تم نے میرے خلاف سازش کی، اس فرانسیزی عورت کے ساتھ میرے تعلقات کے بارے میں پرنس آندرے سے جھوٹ بولا اور میری اس سے صحیح کرادی، لیکن تم دیکھ رہی ہو کہ مجھے نہ تمھاری ضرورت ہے اور نہ اس فرانسیزی عورت کی!“

پرنس ماریا اپنا نصف دن نکولشکا کی معیت میں گزارتی تھی۔ وہ اس کے اسباق کی نگرانی کرتی، اسے روسی اور موسیقی کی خود تعلیم دیتی اور دیال کے ساتھ باتیں کرتی۔ وہ اپنا بھایا وقت اپنے اپارٹمنٹ میں اپنی کتابوں، اپنی بوڑھی آایا ”اللہ لوگوں“ کے ساتھ، جو اس سے کبھی کبھار ملنے ملائے عقی دروازے سے اندر آتے تھے، بتاتی۔

جنگ کے متعلق اس کی سوچ بالکل وہی تھی جو ہمیشہ سے خوتین کی چلی آرہی ہے۔ اسے اپنے بھائی کے، جو اس میں شریک تھا، بارے میں خوف دامن گیر رہتا تھا۔ وہ سفاکی اور درندگی، جو مردوں کو ایک دوسرے کا قتل عام کرنے پر اکساتی رہتی ہے، اسے سداہشت زدہ اور مبہوت کرتی رہتی۔ لیکن جنگ کی معنویت کیا تھی، اس بارے میں اس کا ذہن کوری سلیٹ کی طرح معرئی تھا۔ اسے یہ بھی گزشتہ جنگوں کی طرح کی کوئی جنگ معلوم ہوتی تھی۔ اگر چہ دیال جس کے ساتھ وہ ہر روز تبادلہ خیالت کرتی رہتی تھی، جنگ کی صورت حال میں بڑے جوش و خروش سے دلچسپی لیتا تھا اور اس کے سامنے اس کے متعلق وضاحت سے اپنے خیالات بیان کرنے کی کوشش کرتا تھا، اگرچہ جو ”اللہ لوگ“ اس سے ملنے آتے تھے، خوف و ہشت کے عالم میں اپنے انداز سے ان الفاظوں کے بارے میں، جو ”دشمن مسیح“ کے متعلق پھیل رہی تھیں، بتاتے رہتے تھے اور اگرچہ جولی (جو اب پرنس دروچیسکا یا تھی)، جس نے

خط کتابت کا سلسلہ دوبارہ شروع کر دیا تھا، ماسکو سے اسے حب الوطنی سے بھرپور خطوط۔ جو عجیب و غریب فرانسیسی زدہ روی² میں تحریر ہوتے تھے۔ بھیجتی رہتی تھی، وہ (پرنس ماریا) جنگ کی اہمیت سمجھنے میں ناکام رہی۔

میری عزیز سہیلی میں تمہیں روسی میں خط تحریر کر رہی ہوں (جولی نے لکھا تھا) کیونکہ مجھے ہر اس چیز سے، جس کا تعلق فرانس سے ہے، بلکہ فرانسیسی زبان سے بھی، نفرت ہے۔ اگر کوئی شخص میری موجودگی میں فرانسیسی میں گفتگو کرتا ہے تو مجھ سے قطعاً برداشت نہیں ہوتا۔۔۔

یہاں ماسکو میں ہمارے محبوب، پمپراٹور کے بارے میں تناجوش و خروش پایا جاتا ہے کہ سب لوگ خوشی سے دیوانے ہوئے جا رہے ہیں۔ میرے شوہر مائدار اس وقت قسمت کے پھیر میں ہیں۔ وہ یہودیوں کے ذیل شراب خانوں میں دھکے کھا رہے ہیں اور بھوک و مصائب برداشت کر رہے ہیں، تاہم جو طلاعات مجھے موصول ہو رہی ہیں، وہ مجھے مزید آمادہ عمل کر رہی ہیں۔ رولیف سکی نے جو دلیرانہ کارنامہ سرانجام دیا ہے، ہم نے مارسیا اس کے بارے میں سن لیا ہوگا۔ وہ اپنے بیٹوں سے بغل گیر ہوا اور بولا: ”ہم مر جائیں گے لیکن پیچھے نہیں رکھائیں گے!“ اور سچی بات یہ ہے کہ ہم نے پیچھے نہیں دکھائی۔

ہم یہاں مقدور بھر بہترین انداز سے وقت گزارنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن یہ جنگ کا زمانہ ہے! پرنس ایلین اور سونی سارا سارا دن میرے ساتھ گزارتی ہیں اور ہم زندہ شوہروں کی دل گرفتہ بنیں (مزمع) بیٹوں کا کپڑا بنی، درجہ بصورت پائیں کرتی ہیں۔ مائی ڈیٹر صرف تمہاری عدم موجودگی کی کھلتی ہے۔۔

اور غیرہ وغیرہ

پرنس ماریا جنگ کی معنویت کیوں نہ سمجھ سکی، اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ معمر پرنس ابھی اس کا ذکر نہیں کرتا تھا۔ وہ تیری بھی تسلیم نہیں کرتا تھا کہ اس (جنگ) کا کوئی وجود ہے اور جب کبھی دیساں ڈنر پر اس کے متعلق کوئی بات کرتا تھا، اس کا مذاق اڑاتا تھا۔ پرنس کا لہجہ اتنا پرسکون اور پراعتماد ہوتا تھا کہ ماریا آنکھیں بند کر کے اس پر یقین کر لیتی۔ جولائی کے سارے مہینے کے دوران میں معمر پرنس معمول سے کہیں زیادہ مصروف اور فعال رہا، بلکہ وہ شگفتگی اور زندہ دلی کا مظاہرہ بھی کرتا رہا۔ اس نے یہ ہانچہ لگوا دیا اور خانگی غلاموں کے لیے نئی عمارت کی تعمیر بھی شروع کرا دی۔ پرنس ماریا کو جو واحد چیز اس کے متعلق مشوش کرتی تھی، یہ تھی کہ وہ موتا بہت کم تھا۔ اس نے سٹڈی روم میں سونے کی عادت ترک کر دی تھی اور ہر شب مختلف کمرے میں گزارنے لگا تھا۔ ایک روز وہ حکم دیتا کہ اس کا بستر گیلری میں لگا دیا جائے، اگلے روز وہ ڈرائنگ روم میں صوفے یا دالیر کرسی پر دراز ہو جاتا۔ وہاں وہ کپڑے تبدیل کیے بغیر اٹھتا رہتا جب کہ مادموزیل بوٹس کی جگہ ایک چھوٹا پتروشکا اسے اونچی آواز میں کوئی کتاب یا رسالہ پڑھ کر سنا رہتا۔ پھر کسی رات وہ ڈرائنگ روم میں ہی ڈیرا ڈال لیتا۔

کیم اگست کو پرنس آندرے کا دوسرا خط موصول ہوا۔ اپنے پہلے خط میں، جو پرنس آندرے کی روانگی کے فوراً بعد موصول ہوا تھا، اس نے نہایت عاجزی اور فردوسی سے اپنے باپ سے درخواست کی تھی کہ اس نے اس کے سامنے جو گستاخانہ کلمات استعمال کیے تھے، ان کی اسے معافی دے دی جائے اور اس نے گڑگڑا کر التجا کی تھی کہ وہ اسے حسب سابق نگاہ التفات سے نوازتا رہے۔ معمر پرنس نے اس خط کا جواب بہت محبت اور شفقت سے دیا تھا اور تب سے اب تک اس نے فرانسیسی عورت کو بے قریب پھٹکنے نہیں دیا تھا۔ پرنس آندرے نے اپنا دوسرا خط وچسک پر فرانسیسیوں کا قبضہ ہو جانے کے بعد اس شہر کے کہیں قریب وجوار سے تحریر کیا تھا۔ اس میں اس نے ساری مہم کا مختصر حال بیان کیا تھا۔ مزید صراحت کے لیے اس نے علاقے کا نقشہ بھی کر دیا تھا اور مستقبل میں جنگ نے کیا رخ اختیار کرنا تھا، اس کے بارے میں اس نے اپنے خیالات کا اظہار بھی کیا تھا۔ چونکہ بالڈلز میداں جنگ کے بالکل قریب اور دشمن کی پیش قدمی کے عین رستے میں آتا تھا، اس لیے یہاں ٹھہرنے میں جو خطرات لاحق تھے، پرنس آندرے نے اپنے باپ کی توجہ ان کی طرف دلائی تھی اور اسے مشورہ دیا تھا کہ وہ ماسکو نقل مکانی کر جائے۔

اس روز ڈزیر دیال نے جب یہ کہا، ”سننے میں آیا ہے کہ فرانسیسی کبھی کے وچسک میں داخل ہو چکے ہیں۔“ معمر پرنس کو یاد آیا کہ اسے اپنے بیٹے کا خط موصول ہوا ہے۔

”آج پرنس آندرے کا خط آیا تھا،“ اس نے پرنس ماریا سے کہا۔ ”تم نے پڑھا؟“

”non, mon pere“ پرنس ماریا نے ڈرتے جھجکتے جواب دیا

اس کے خط پڑھنے کا کوئی امکان نہیں تھا کیونکہ اس نے اس کی وصولی کے بارے میں سن تک نہیں تھا۔

”اس نے اس جنگ کے بارے میں لکھا ہے،“ پرنس نے تسخراگیز انداز سے مسکراتے ہوئے کہا۔ اس کی یہ عادت بن گئی تھی کہ جب بھی وہ اس جنگ کے متعلق کوئی بات کرتا تھا، وہ اسی انداز سے مسکراتے لگتا تھا۔

”خاص دلچسپ خط ہوگا،“ دیال نے کہا۔ ”پرنس آندرے اس پوزیشن میں ہیں کہ صحیح حال معلوم کر سکیں۔“

”اے، بہت دلچسپ!“ مادموزیل بوغین نے اظہار خیال کیا۔

”جاؤ اور لے آؤ،“ معمر پرنس نے مادموزیل بوغین سے کہا۔ ”تمہیں معلوم ہی ہے۔ یہ چھوٹی میز پر پیپر ویٹ کے نیچے پڑا ہے۔“

مادموزیل بوغین نے پھرتی سے زقند لگائی۔

”نہیں، تم مت جاؤ،“ وہ تیوریاں چڑھا کر چلایا۔ ”میخائیل ایوانوچ، تم جاؤ۔“

میخائیل ایوانوچ اٹھا اور سٹڈی روم کی طرف چل دیا۔ لیکن وہ کمرے سے نکلا ہی تھا کہ معمر پرنس نے، جو پریشانی کے عالم میں ادھر ادھر دیکھ رہا تھا، اپنا نیپکن نیچے پھینکا اور خود چل پڑا۔

”ان سے کبھی کوئی کام نہیں ہوتا ہمیشہ کہیں نہ کہیں گڑبڑ کر دیتے ہیں۔“

اس کی عدم موجودگی میں پرنس ماریا، دیال، مادموئیل بوئین، یہاں تک کہ ننھا گلوٹکا بھی چپ چاپ ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہے۔ معمر پرنس تیز تیز قدم اٹھاتا میٹھا مکمل ایوانچ کی معیت میں واپس آیا۔ وہ خط اور نقشہ دونوں لے آیا تھا۔ اس نے انھیں اپنے قریب رکھ لیا اور ڈنر کے دوران میں کسی کو ان پر نظر نہ ڈالنے دی۔ جب وہ ڈرائنگ روم میں منتقل ہو گئے، اس نے پرنس ماریا کو خط چھار دیا۔ اس نے نئی عمارت کا نقشہ اپنے سامنے پھیلا دیا اور اس پر نگاہیں گاڑتے ہوئے اپنی بیٹی کو حکم دیا کہ وہ با آواز بلند خط پڑھ کر سنے۔

خط پڑھنے کے بعد پرنس ماریا مستفسر انداز سے اپنے باپ کی جانب دیکھنے لگی۔ وہ نقشے کا مطالعہ کر رہا تھا اور بظاہر اپنے خیالات میں مستغرق تھا۔

”پرنس، آپ کی اس بارے میں کیا رائے ہے؟“ دیال نے ہمت کر کے پوچھ لیا۔

”میری؟.. میری؟..“ پرنس نے نقشے سے نگاہیں اٹھائے بغیر کہا۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ اس کی مرضی کے خلاف جگایا گیا ہے۔

”عین ممکن ہے کہ محاذ جنگ اتنا قریب پہنچ جائے کہ..“

”ہا۔ ہا۔ ہا“ محاذ جنگ“ پرنس نے کہا۔ ”میں نے ہمیشہ یہی کہا ہے اور اب بھی یہی کہتا ہوں کہ جنگ کا محاذ پوینڈ بنے گا اور دشمن کبھی دریائے نیمن عبور نہیں کر سکے گا۔“

دیال نے اچھٹے سے پرنس کی جانب دیکھا۔ وہ نیمن کا راگ الاپ رہا تھا جب کہ غنیمت کبھی کا دیپر کے کنارے پہنچ چکا تھا، لیکن پرنس ماریا نے دریائے نیمن کی جغرافیائی پوزیشن بھول کر اپنے باپ کے فرمودات پر کوئی اعتراض نہ اٹھایا۔

”جب برف پگھلے گی، وہ پولستانی دلدلوں میں غرقاب ہو جائیں گے۔ صرف انھیں یہ نظر نہیں آئیگی۔“ معمر پرنس نے اپنی بات بڑھاتے ہوئے کہا۔ صاف معلوم ہوتا تھا کہ وہ 1807 کی مہم کے بارے میں سوچ رہا ہے۔ اسے وہ بالکل حال کی بات معلوم ہوتی تھی۔ ”بے شک سین کو بہت پہلے پریشا میں داخل ہو جانا چاہیے تھا۔ پھر حالات قطعی مختلف صورت اختیار کر لیتے۔“

”لیکن پرنس،“ دیال نے ڈرتے جھجکتے کہا، ”خط میں تو وہ جیسک کا ذکر ہے۔“

”ہونہر، خط“ اسے ہاں..“ پرنس نے جھلا کر کہا۔ ”ہاں.. ہاں..“ اس کے چہرے پر اچانک آزدگی چھا گئی اور اس کا مزاج برہم ہو گیا۔ اس نے چندے وقف کیا۔ ”اس نے لکھا ہے کہ فرانسیسیوں کو شکست ہوگی ہے۔ بھلا کیا نام ہے دریا کا جہاں انھیں شکست ہوئی ہے۔“

دیال نے نظریں جھکا لیں

”پرنس نے اس بارے میں کچھ نہیں لکھا،“ اس نے نرمی سے کہا۔

”اس نے نہیں لکھا؟ پھر یقیناً یہ بات میں نے نہیں گھڑی۔“

میں نے یہ فیصلہ کر لیا تھا۔

”پچھلے چار سالوں میں یہ فیصلہ کرنے پر مجبور ہوا تھا۔ اس نے پچھلے چار سالوں میں اس کے متعلق کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: ”مجھے یہ بتاؤ کہ تم یہ فیصلہ کیسے کر رہے ہو؟“

میں نے اس پر فیصلہ کر لیا تھا۔ اس نے اس کے بارے میں اس سے باتیں کرتا رہا۔ پھر اس نے پرنس مارک اور دیال پر فیصلہ کی خبر ان کے پاس پہنچانے کی جانب چل دیا۔

پرنس مارک نے دیکھا کہ دیال کی حیران پریشانی اور سراسیمہ لگاؤ اس کے باپ پر گہری ہوئی ہیں۔ اس سے یہ بھی نوٹ کیا کہ وہ بالکل خاموش ہے اور اس حیران پریشانی کی شے ہی گم کردی کہ اس کا باپ اپنے بیٹے کا خط بھول گیا ہے اور اسے ڈرائنگ روم کی میز پر چھوڑ گیا ہے۔ وہ نہ صرف اس کے متعلق بات کرنے اور دیال سے یہ پوچھنے سے ہی کہ وہ اتنا حیران پریشان اور خاموش کیوں ہے، خوف کھا رہی تھی، بلکہ وہ تو ان کے بارے میں سوچتے بھی لرز و بر اندام ہو رہی تھی۔

شام کو پرنس نے میٹاکیل ایوانچ کو فراہم شدہ خط لے کر پرنس مارک کے پاس بھیجا۔ پرنس مارک نے یہ اس کے حوالے کر دیا اور اگرچہ اسے یہ بات قطعاً پسند نہیں تھی۔ پھر بھی اس نے حوصلہ کر کے اس سے پوچھ ہی لیا کہ اس کا باپ کیا کر رہا ہے۔

”مسب معمول مصروف“ اس نے مؤدبانہ طنز یہ مسکراہٹ سے جواب دیا۔ اس پر پرنس مارک کا رنگ فق ہو گیا۔ ”وہ نئی عمارت کے بارے میں بہت فکر مند رہتے ہیں۔ وہ کچھ پڑھتے بھی رہے ہیں لیکن اب۔۔۔ میٹاکیل ایوانچ نے اپنی آواز دھیمی کر لی۔ ”وہ اس وقت میز کے سامنے بیٹھے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ وہ اپنا وصیت نامہ تیار کرنے میں مصروف ہیں۔ (حالیہ ایام کے دوران میں پرنس کا دل بسند مشغلہ یہ تھا کہ وہ کچھ استاد و ریاضات تیار کرتا رہتا۔ انھیں وہ اپنا ”وصیت نامہ“ کہتا تھا اور انھیں وہ اپنی موت پر چھوڑنا چاہتا تھا۔)

”اور کیا آل پاچ کو سمولنسک بھیجا جا رہا ہے؟“ پرنس مارک نے دریافت کیا۔

”ارے ہاں، یقیناً۔ وہ کچھ دیر سے روانگی کا منتظر ہے۔“

3

جب میٹاکیل ایوانچ خط لے کر واپس سٹڈی روم میں آیا، معمر پرنس آنکھوں پر چشمہ اور چشمے پر شیڈ لگائے میز کے، جس کی دراریں کھلی تھیں، سامنے بیٹھا تھا۔ میز پر شمع، جسے شیڈ نے ڈھانپ رکھا تھا، پڑی تھی۔ پرنس نے پتا ہاتھ، جس میں وہ کوئی کاغذ تھا، ہوتے تھا، آگے بڑھا رکھا تھا اور وہ قدرے ڈرامائی انداز سے اپنے مسودے کا، جسے وہ ”مشاہدات“ کہتا تھا، مطالعہ کر رہا تھا۔ اس کے انتقال کے بعد اس کا یہ مسودہ راز کی خدمت میں ارسال کیا جاتا تھا۔ جب میٹاکیل ایوانچ اندر داخل ہوا، پرنس کی آنکھوں میں آنسو چھلک رہے تھے۔ یہ آنسو ان وقتوں کی، جب

یہ کاندھ، جن کا وہ مطاب کر رہا تھا، تحریر کیے گئے تھے، یاد دہانے چھلکائے تھے۔ اس نے میخائیل ایوانچ سے خط پکڑا۔ جب میں ڈال اور اپنے کاغذات تہہ کرتے ہوئے آل پاچ کو، جو کمرے کے باہر منتظر کر رہا تھا، اندر بلایا۔

پرنس سمولنسک میں جو جو کام کرانا چاہتا تھا، اس نے ان کی فہرست بنالی تھی، درودہ آل پاچ کو، جو دروازے کے قریب کھڑا تھا، ہدایات دینے کے دوران میں چکر لگاتا رہا۔

’نمبر ۱، لکھنے کا کاغذ۔ سن رہے ہو؟ آٹھ دسے، اس لمبے کا، سنہری حاشیے والا... یہ اس نمونے کے عین مطابق ہو۔ وارنش، مہرے لگانے کی لاکھ۔ میخائیل ایوانچ کی فہرست کے مطابق۔‘

’وہ کچھ دیر آگے پیچھے چکر لگاتا رہا اور پھر اس نے اپنی فہرست پر سرسری نظر ڈالی۔

’نمبر ۲، دھتے کے متعلق خط اپنے ہاتھوں کو زکو پہنچانا۔‘

اس کے بعد نئی عمارت کے دروازوں کے لیے چٹخیں خریدنا تھیں۔ یہ خاص انداز کی تھیں اور ان کا ڈیزائن پرنس نے خود بنایا تھا۔ پھر ایک بکس کا، جس کے گرد آہنی پٹیاں چڑھی تھیں، آرڈر دیا جانا تھا۔ اس بکس میں اس نے اپنا ’’وصیت نامہ‘‘ رکھنا تھا۔

آل پاچ کو ہدایات دینے میں دو گھنٹے سے زیادہ صرف ہوئے۔ پھر بھی پرنس نے اس کی جان نہ چھوڑی۔ لاپچھے بیٹھ گیا، کچھ دیر سوچتا رہا، اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور اسے ادگھ آگئی۔ آل پاچ تھوڑا تھوڑا کھسنے لگا۔

’اچھا، اب تم جاؤ، جاؤ! اگر مجھے کسی اور شے کی ضرورت ہوئی، میں تمہارے پیچھے دئی بھیج دوں گا۔‘

آل پاچ باہر نکل گیا۔ پرنس دوبارہ میز کی طرف آیا، اس نے دروازوں کے اندر جھانک کر دیکھا، انگلیوں سے کاغذات کو چھوا، دراز میں بند کیس اور گورنر کے نام خط لکھنے بیٹھ گیا۔

جب اس نے خط بند کیا، شام خاصی ڈھل چکی تھی۔ وہ تھک چکا تھا اور سونا چاہتا تھا، لیکن وہ جانتا تھا کہ وہ سو نہیں سکے گا۔ وہ جب بھی بستر پر دراز ہوتا تھا، انتہائی افسردہ خیالات اس کے ذہن میں گھومنے لگتے تھے۔ اس نے گجوں کو بلایا اور اس کے ساتھ مختلف کمروں میں گھومنے لگا تا کہ وہ اسے بتا سکے کہ اس نے اس رات اس کا بستر کہاں لگایا ہے۔ وہ ادھر ادھر پھرتا اور ایک ایک کونہ کھنگالتا رہا۔

اسے کوئی جگہ تسلی بخش نظر نہ آئی۔ سب سے بدترین وہ کاؤچ تھا جو ٹنڈی روم میں پڑا تھا اور جس پر لیٹنا اس کا معمول تھا۔ یہ کاؤچ اب اس کے لیے ڈراؤنی شے بن چکا تھا۔ اس کی وجہ بتائی تھی کیونکہ جب وہ اس پر لیٹتا تھا، اس کے ذہن میں بڑے موذی اور اذیت ناک خیالات گھومنے لگتے تھے۔ کوئی جگہ بھی صحیح نہیں تھی لیکن سنگ روم اس کے لیے بیاد کا غشی گوشہ تھی سب سے بہتر تھا۔ وہ ابھی تک وہاں نہیں سویا تھا۔

گجوں ایک وردی پوش ملازم کی مدد سے پلنگ اندر لے آیا اور اسے وہاں رکھنے لگا۔

’اس طرح نہیں، اس طرح نہیں!‘ پرنس نے چلا کر کہا۔ پھر اس نے اپنے ہاتھوں پلنگ کو نے سے چنداچ لگے دھکیل دیا اور اس کے بعد دوبارہ اسے اس کے قریب لے گیا۔

”خیر، آخر کار میں نے یہ کام مکمل کر ہی لیا! اب میں آرام کر سکتا ہوں،“ پرنس نے سوچا اور اس کی اجازت سے تختوں اس کے کپڑے تبدیل کرنے لگا۔

کوٹ چٹلون اتارنے کے لیے پرنس کو جو ضروری تنگ دودھ کرنا پڑی، وہ اس پر بہت تنگ ہوا اور اس کی بھوئیں تن گئیں۔ بہر حال اس نے جیسے تیسے کپڑے اتارے، دھم سے پلنگ پر گر پڑا اور اپنی سوکھی سرخی زرد رنگوں کو یہ نظر قنارت گھور گھور کر کچھ اس طرح دیکھنے لگا کہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنے خیالات میں کھو گیا ہے۔ درحقیقت وہ سوچ نہیں رہا تھا بلکہ وہ محض اس لمحے کو، جب اسے زور لگا کر ان ٹانگوں کو اوپر اٹھانا اور بستر پر چڑھنا تھا، ٹال رہا تھا۔

”توبہ توبہ! کیا مصیبت ہے! کاش اس روز روز کی مشقت سے میری جان چھوٹ جائے! کاش تو میری خلاصی کر دے!“ اس نے سوچا۔ اس نے اپنے دانت بھینچے، بیس ہزارویں مرتبہ زور لگایا اور بستر پر دراز ہو گیا۔ لیکن جونہی اس نے پاؤں پیارے، اسے محسوس ہوا جیسے پلنگ اس کے نیچے آگے پیچھے جھول رہا ہو، زور زور سے سانس لے رہا اور ہچکولے کھارہا ہو۔ ہر روز اس کے ساتھ یہی واردات ہوتی تھی۔ اس کی آنکھیں بند ہو رہی تھیں کہ پھر کھل گئیں۔

”کہیں سکون نہیں، لعنت ہواں پر!“ وہ غیظ و غضب سے بڑبڑایا۔ اسے غصہ کس پر آ رہا تھا، یہ سے خود بھی معلوم نہیں تھا۔ ”ارے ہاں، کوئی اور اہم چیز بھی تھی۔ اتنی اہم کہ میں نے ارادہ کر لیا تھا کہ بستر میں اس کے بارے میں سوچوں گا۔ ڈرائنگ روم میں کوئی چیز تھی۔ پرنس ماریا کوئی فضول بات کہہ رہی تھی اس احمق دیوال نے کچھ کہا تھا۔۔۔ میری جیب میں کچھ تھا۔۔۔ کچھ یاد نہیں آ رہا۔“

”تجھون، ہم نے ڈنر پر کیا باتیں کی تھیں؟“

”پرنس آندرے کے بارے میں“

”بکرا اس بند کر د!“ پرنس نے زور سے میز پر چیت بھائی۔ ”ہاں۔ مجھے معلوم ہے، پرنس آندرے کا خطا یہ

پرنس مارمانے پڑھ کر ٹالیا تھا۔ دیوال نے وہیں کے بارے میں کچھ کہا تھا۔ اب میں اسے پڑھوں گا۔“

اس نے تجھون کو حکم دیا کہ وہ اس کی جیب سے خط نکال لے اور چھوٹی میز پر، جس پر اس کا لیوئیڈ اور خردلی موسم جی پڑی تھی، پلنگ کے قریب کر دے۔ اس نے عینک پہنی اور خط پڑھنے لگا۔ جب وہ رست کے سکوت میں ہنر شید کے نیچے مدھم روشنی میں خط پڑھ رہا تھا، اسے یہی مرتبہ وقتی طور پر اس کا مفہوم سمجھ میں آیا۔

”نرا نہیں وہیں وہیں! اگر انھوں نے مزید چار روز اپنی پیش قدمی جاری رکھی، وہ سمونسک میں داخل ہو سکیں گے۔ غائبانہ پہلے ہی وہاں پہنچ چکے ہیں! ہشکا!“ تجھون ہڑبڑا کر اٹھ کھڑا ہوا۔ ”نہیں، چھوڑو، جانے دو“ اس نے چلا کر کہا۔

اس نے خط شمع دان کے نیچے رکھ دیا اور اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ اس کی آنکھوں کے سامنے ڈینیوب کا نقشہ گھومنے لگا۔ درختاں و تاباں دو پہر، سرکندے، روسی پڑاؤ اور وہ خودنو جوان جرنیل، اس کا سرخ و سپید، جھریوں سے پاک صاف چہرہ، صحت مند اور پھر تیل جسم، خوش مزاج و خوش طبع، وہ پوٹیمکن کے بھڑکیلے اور رنگین خیمے میں داخل

ہو رہا تھا۔ ”چیتے“ سے حسد کے آتشیں جذبے نے جس طرح اس وقت اس کے رگ و پے میں بھان پیدا کر دیا تھا، اب دوبارہ اس پر وہی کیفیت طاری ہو گئی۔ پوئیمکن کے ساتھ پہلی ملاقات کے دوران میں جو گفتگو ہوئی تھی، اب سے اس کا ایک ایک لفظ یاد آ گیا۔ پھر اسے ایک کوتاہ قامت، کیم شیم عورت، جس کا چہرہ بلیا اور زرد تھا، نظر آئی۔ یہ اور اچھا طورہ تھی۔ مادر اچھا طورہ نے ازراہ عنایت اسے جب پہلی مرتبہ شرف باریابی بخشا تھا، اس وقت وہ جس انداز سے مسکرائی تھی اور اس نے گفتگو کے دوران میں جو لفظ استعمال کیے تھے، وہ اسے من و عنان یاد آ گئے۔ پھر سے وہی چہرہ تابوت گاڑی میں دکھائی دیا اور اس کے بعد اسے زہوف کے ساتھ وہ ہلکی سی جھڑپ، جو اس کا ہاتھ چومنے پر تابوت گاڑی کے قریب دونوں میں ہوئی تھی، یاد آ گئی۔

”کاش وہ زمانہ جلد از جلد، پر لگا کر، دوبارہ واپس آ جائے اور اس زمانہ حال سے چھٹکارا مل جائے۔ کاش یہ مجھے امن چھین سے رہنے دیں۔“

4

پرنس نکورائی بلکونسکی کی جاگیر ”بالڈ ہلز“ سمولنسک سے چالیس میل دور مشرق میں واقع تھی۔ ماسکو جانے والی برنسکی سڑک جاگیر سے دو میل ہٹ کر گزرتی تھی۔

اسی شام جب پرنس آل پاچ کو ہدایات دے رہا تھا، دیساں نے پرنس ماریا سے ملاقات کی خواہش کا اظہار کیا۔ اس نے، سے بتایا: ”چونکہ نصیب دشمنوں پرنس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے، وہ اپنی حفاظت کے لیے کوئی اقدام نہیں کرے گا۔ حالانکہ پرنس آندرے کے خط سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ بالڈ ہلز میں ٹھہرنا خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔ اس لیے میرا مشورہ یہی ہے کہ آپ آل پاچ کی وساطت سے صوبائی گورنر کے نام سمولنسک خط بھیج دیں اور ان سے دریافت کریں کہ حالات کس ڈھب پر جا رہے ہیں اور یہ بھی پوچھیں کہ بالڈ ہلز کس حد تک خطرے کی زد میں ہے۔“ دیساں نے گورنر کے نام خط لکھ دیا اور اسے پرنس ماریا کے حوالے کر دیا۔ اس نے اس پر دستخط کر دیے اور آل پاچ کو تھماتے اسے ہدایت کی کہ وہ یہ خط خود گورنر تک پہنچائے اور اگر کوئی خطرہ نظر آئے، جلد از جلد واپس چلا آئے۔

سب سے تمام احکام وصول کرنے کے بعد آل پاچ نے سجائی ٹوپی۔ یہ اسے پرنس نے تحفہ دیا تھا۔ پہنی اور پرنس کی طرح ہاتھ میں چھتری پکڑے باہر نکل گیا۔ اس نے چری چھت والی گاڑی میں، جسے تینا چتکبرے گھوڑے، جو خوب پلے ہوئے تھے، کھینچتے تھے، سوار ہونا تھا۔ ال کے اہل خانہ اسے رخصت کرنے ساتھ ہوئے۔ بڑی گھنٹی کے اوپر کپڑا منڈھ دیا گیا تھا تا کہ وہ زیادہ شور نہ کرے۔ گھوڑوں کے گلوں میں جو گھنٹیاں تھیں، انہیں کاغذات ٹھونس دیے گئے تھے۔ پرنس بالڈ ہلز میں کسی شخص کو ایسی گاڑی، جس میں کھلمناتی گھنٹیاں نصب ہوں، چلنے کی اجازت نہیں دیتا تھا۔ لیکن آل پاچ جب کہیں بے سفر پر روانہ ہونا تھا، اسے یہ کھلمناتی گھنٹیاں لگانا بہت پسند تھا۔ اس کے حواری۔ ہیڈ کلرک، حساب دار، باورجن اور برتن مانجھنے والی حادہ، دو بوڑھی عورتیں،

ایک وردی پوش ملازم لڑکا، جو قارتوں کا لباس پہنے ہوئے تھا، کو چوان اور مختلف گھریلو خدمات سرانجام دینے والے نوکر چاکر۔ اسے خدا حافظ کہتے آئے۔

اس کی بیٹی نے جینٹ کے کپڑے میں ملغوف گدیاں اس کی نشست اور پشت پر رکھ دیں۔ اس کی بڑی سالی نے ایک چھوٹی سی پوٹلی گاڑی میں دھکیل دی اور ایک کوچران نے اسے گاڑی میں سوار ہونے میں مدد دی۔

”یہ زنانیاں بھی مست ماردیتی ہیں! ذرا زرا سی بات پر پریشان ہو جاتی ہیں! زنانیاں، زنانیاں!“ آل پاچ نے گاڑی میں سوار ہوتے ہوئے عین مین پرنس کی طرح پھونکیں، رستے اور تیز تیز بولتے ہوئے کہا۔

کسی کام کو نہ جانے کے سلسلے میں ہینڈ کلرک کو الوداعی ہدایت دینے کے بعد آل پاچ نے، جواب پرنس کی نکالی کرنے کی کوئی کوشش نہیں کر رہا تھا، اپنے کنبے سر سے ٹوپی اتار دی اور اپنے سینے پر تین مرتبہ صلیب کا نشان بٹایا۔

”باکوف آل پاچ، اگر کوئی ایسی ویسی بات ہوئی فوراً واپس چلے آنا۔ مسخ کا واسطہ ہے۔ ہمارا کچھ خیال کرنا!“ اس کی بیوی نے جنگ اور دشمن کے بارے میں افواہوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”یہ زنانیاں، وراں کی خواہ مخواہ کی پریشانیاں!“ آل پاچ نے اپنے آپ سے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔ اس کی گاڑی چل پڑی۔ وہ اپنے گرد و پیش نظریں دوڑانے لگا۔ کھیتوں میں راکھ زرد ہونے لگی تھی۔ جٹی کے پودے بہت گھنے تھے اور ابھی تک ان کا رنگ سبز تھا۔ دوسرے کھیت ابھی تک بالکل سیاہ تھے۔ ان میں کسانوں نے ابھی ابھی دوسری مرتبہ بھل چھانا شروع کیا تھا۔

آل پاچ کا سفر جاری تھا۔ وہ دل ہی دل میں اناج کی فصلوں کی، جو اس سال خاص طور پر بہت عمدہ تھیں، تمسین کر رہا تھا۔ وہ رائے کے کھیتوں کا بغور جائزہ لیتا جا رہا تھا (ان کی کہیں کہیں کٹائی شروع ہو گئی تھی) اور سچے کسان کی طرح برائی اور کٹائی کا حساب کرتا جا رہا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ اپنے آپ سے یہ بھی پوچھتا جا رہا تھا کہ کہیں وہ پرنس کی کوئی ہدایت بھول تو نہیں گیا۔

اپنے گھوڑوں کو دائرہ اور چارہ کھلانے کے لیے وہ راستے میں دو مرتبہ رکا اور بتارتخ چار اگست شام کے وقت شہر پہنچ گیا۔

راستے میں آل پاچ فوجیوں اور سامان کے چھکڑوں کو دیکھتا اور ان سے آگے گزرتا رہا۔ جب وہ سولنسک پہنچا، اسے دور سے فائرنگ کی آوازیں سنائی دینے لگیں لیکن وہ ان سے کوئی خاص متاثر نہ ہوا۔ تاہم جب وہ شہر کے نزدیک پہنچا، جس چیز نے اس کی توجہ معاً اپنی طرف مبذول کرائی وہ جٹی کا شاندار کھیت تھا۔ اس میں پڑاؤ قائم ہو چکا تھا اور اسے چند فوجی جوان کاٹ رہے تھے۔ ظاہر تھا کہ وہ چارہ حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ انھیں دیکھ کر آل پاچ متاثر ضرور ہوا لیکن اپنے معاملات کے بارے میں سوچتے سوچتے وہ یہ سب کچھ بھول گیا۔

آل پاچ کی زندگی کی تمام دلچسپیاں پرنس کی مرضی میں محصور ہو کر رہ گئی تھیں اور اس نے کبھی اس حد کو عبور کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ جس چیز کا پرنس کے احکام کی تعمیل کرنے سے کوئی تعلق نہیں تھا، اسے اس میں کوئی

دلچسپی نہیں تھی، بلکہ حقیقتاً اس کے نزدیک اس کا کوئی وجود ہی نہیں تھا۔

4 اگست کی شام سمولنسک پہنچنے کے بعد آل پاچ نے دریائے دنیپر کے پار مضائقہ بہتی گا جن میں فیراپونتوف کے ہوٹل میں زیرِ ڈال دیا۔ گزشتہ تیس برسوں کے دوران میں اس کا یہ تیرہ بن گیا تھا کہ وہ یہیں قیام کرتا تھا۔ بارہ سال قبل فیراپونتوف نے آل پاچ کے توسط سے پرنس سے (درختوں کا) ذخیرہ خریدا تھا اور تجارت کرنے لگا تھا۔ اب اس کا اپنا مکان تھا، اپنا ہوٹل تھا اور اسی علاقے میں غصے کی دکان تھی۔ فیراپونتوف پولیس کے پیٹے میں تھا۔ اس کا جسم ہٹا کن رنگ سانرما، چہرہ سرخ و سپید اور ہونٹ موٹے تھے۔ ناک کے نام پر چوڑا سا گومڑ تھا۔ اس قسم کے گومڑ اس کی سیاہ اور چمکی جانب چمکی ہوئی بھوؤں کے اوپر تھے۔ اس کی توند خاصی بڑی تھی۔

وہ جھینٹ کی قمیص پرواسکٹ پہنے اپنی دکان کے سامنے، جھکی میں کھلتی تھی، کھڑا تھا۔ اس نے آل پاچ کو دیکھ لیا اور اس کی جانب چل پڑا۔

”خوش آمدید، یا کوف آل پاچ، خوش آمدید۔ لوگ شہر چھوڑ کر جا رہے ہیں اور تم آرہے ہو،“ اس نے کہا۔

”شہر چھوڑ کر جا رہے ہیں؟۔ کیوں؟“ آل پاچ نے پوچھا۔

”یہی تو میں پوچھتا ہوں۔ لوگوں کی تو مت، ری گئی ہے، ان پر فرانسیسیوں کا ہوا مینہ گیا ہے۔“

”بے بنیاد فواہیں ہیں! بے بنیاد فواہیں!“ آل پاچ نے کہا۔

”یا کوف آل پاچ، میرا بھی بالکل یہی خیال ہے۔ میں کہتا ہوں، حکم جاری ہو چکا ہے کہ انھیں اندر نہ مکنے دیا جائے، پھر فکر کی کیا بات ہے؟ سب ٹھیک ہو جائے گا اور کسان ہیں کہ چمکڑے گھوڑے کا کرایہ تین روٹل طلب کر رہے ہیں۔ اتنا زیادہ!“ ان کے دیدوں کا پانی ڈھل گیا ہے۔“

یا کوف آل پاچ بظاہر سن رہا تھا لیکن اس کا دھیان کہیں اور تھا۔ اس نے سوار اور گھوڑوں کے لیے خشک گھاس طلب کی۔ جب وہ چائے پی چکا، بستر پر لیٹ گیا۔

ساری رات فوجی ہوٹل کے برابر سے گزرتے رہے۔ اگلے روز آل پاچ نے کوٹ زیب تن کیا (اسے وہ شہر میں بسنے کے لیے سنبھال کر رکھتا تھا) اور اس کے ذمے جو کام لگائے گئے تھے، وہ انھیں پور کرنے چل پڑا۔ اس روز صبح چمک رہی تھی اور اچھی خاصی گرمی ہو گئی تھی۔ ”فصل کاٹنے کے لیے بہت اچھا دن ہے،“ آل پاچ نے سوچا۔

تڑکے تڑکے شہر کے باہر فزنگ شروع ہو گئی تھی اور اس کی آوازیں سنائی دینے لگی تھیں۔ آٹھ بجے دس ہندوؤں کی چٹاخ پٹاخ میں توپوں کی گھن گرج بھی شامل ہو گئی۔ سڑکوں اور گلیوں میں لوگوں کا وہ ازدحام تھا کہ سڑوں پر تھیل بھرے اور نیچے نہ گرے۔ ہجوم میں کثیر تعداد فوجیوں کی تھی۔ جس کا جدھر سینگ سمایا، ادھر بھاگ رہا تھا تاہم سڑکوں اور بازاروں میں کرائے کے ٹانگے ریڑھے ابھی تک رداں رداں تھے۔ دکاندار اپنی دکانوں کے سامنے کھڑے تھے اور کیسوں میں حسبِ معمول صبح کی مناجات جاری تھیں۔ آل پاچ نے دکانوں اور سرکاری دفاتروں کے پھیرے لگائے۔ وہ ذراک خانے بھی گیا اور گورنر کی رہائش گاہ پر بھی۔ وہ جہاں بھی گیا، لوگ فوج اور غنیم کے بارے میں، جو

زین پشتر شہر پر حملہ آور ہو چکا تھا، باتیں کر رہے تھے۔ کبھی ایک دوسرے سے پوچھ رہے تھے کہ اب کیا کرنا چاہیے۔ کبھی ایک دوسرے کو دم دلا سادے رہے اور میدیں بندھا رہے تھے۔

گورنر ہاؤس کے سامنے آل پانچ کولوگوں کا جم غفیر نظر آیا۔ ان میں قازق اور گورنر کی سفری گاڑی شامل تھے۔ میٹھیوں پر اس کی ٹیڈہ بھینڑ دو جاگیرداروں سے ہو گئی۔ ان میں سے ایک اس کا شناسا تھا۔ یہ شخص کبھی ضلعی پولیس کا کپتان تھا۔ وہ زور شور سے تقریر کر رہا تھا۔

”آپ جانتے ہیں کہ یہ براق کی بات نہیں۔ اگر آپ تن تنہا ہوں تو کوئی بات نہیں۔ کہاوت ہے، اکیلے آدمی مار جائے، وہ اکیلا ہی رہتا ہے۔ لیکن تیرہ افراد کا گھرانہ اور ساتھ اتنا کاٹھ کہاڑ، عادات ایسے ہو گئے ہیں کہ ہم سب کا کہاڑا ہو جائے گا۔ اگر ہمارا یہی حشر ہوتا ہے، پھر ان افراد کا فائدہ؟ انہیں پھانسی پر لٹکا دینا چاہیے۔ شیرے، ڈاکو!“

”صبر، بھائی، صبر! اب خاموش ہو جاؤ!“ دوسرے نے کہا۔

”وہ سنتا ہے تو سنتا ہے، میں اسے جوتی کی ٹوک پر نہیں مارتا، ہم کتے تھوڑے ہی ہیں!“ سابق پولیس کپتان نے کہا۔ اس نے، پنے گرد و پیش دیکھا اور اس کی نظر آل پانچ پر پڑ گئی۔

”ارے، یا کوف آل پانچ، تم یہاں کیسے آ گئے؟“

”میں ہز ایکسی لینسی کے حکم پر گورنر سے ملنے آیا ہوں،“ آل پانچ نے بڑے فخر سے پتی گردن اکڑاتے اور بند کوٹ کی اندرونی جیب میں ہاتھ ڈالتے ہوئے کہا۔ وہ جب بھی پرنس کا نام لیتا تھا، یہی انداز اختیار کر لیتا تھا۔

”ہز ایکسی لینسی نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں یہ معلوم کروں کہ حالات کس نہج پر جا رہے ہیں،“ اس نے حریف کہا۔

”اچھا، تو پھر سن لو،“ جاگیردار نے چھا کر کہا۔ ”انہوں نے ہم سب کو تباہی کے کنارے پہنچا دیا ہے۔ ڈاکو، شیرے!“ اس نے اپنی بات دہرتے ہوئے کہا اور شیریںوں کے نیچے اتر آیا۔

آل پانچ نے گردن کو جھٹکا دیا اور زینہ چڑھنے لگا۔ انتظار گاہ تاجروں، عورتوں اور سرکاری کارندوں سے کھینچ بھری ہوئی تھی۔ سب کے چہروں پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں اور وہ بک بک دیدم، دم نہ کشیدم کی تصویر بنے ہوئے تھے۔ گورنر کے کمرے کا دروازہ کھلا۔ سب حاضرین اٹھ کر کھڑے ہو گئے اور آگے سرکنے لگے۔ ایک کلرک بھاگ بھاگ باہر آیا۔ اس نے کسی تاجر سے کچھ کہا، ایک بٹے کئے سرکاری ملازم کو، جس کے گلے میں صلیب ٹک رہی تھی، ہاتھ سے اشارہ کیا اور دوبارہ غائب ہو گیا۔ صاف ظاہر تھا کہ حاضرین جس طرح مستفسر اندہ نگاہوں سے اسے دیکھ رہے تھے اور تاہن تو اس سے جو سوالات پوچھ رہے تھے، وہ ان سے بچنا چاہتا تھا۔ آل پانچ آگے بڑھا اور جب اگلی مرتبہ کلرک باہر آیا، اس نے ایک ہاتھ کوٹ کی اندرونی جیب میں ڈال اور اسے دو خطوط تھماتے ہوئے اس سے مخاطب ہوا۔

”ہنزل انچیف پرنس بلکونسکی کی طرف سے ہز آئر بیرن آج کے لیے۔“ اس نے اتنے گہرے اور بارعب انداز سے کہا کہ کلرک کو اس کی جانب متوجہ ہوتے ہی بن پڑی اور اس نے خطوط پکڑ لیے۔

چند منٹ بعد گورنر نے آل پاچ کو طلب کیا اور عجالت سے کہنے لگا۔

”پرنس اور پرنس کو بتا دو کہ مجھے کچھ معلوم نہیں تھا، میں نے حکام بالا کی ہدایات پر عمل کیا تھا۔ ادھر...“ اس نے آل پاچ کو کاغذات تھماتے ہوئے کہا۔ ”پھر بھی، چونکہ پرنس کی طبیعت نامناسب ہے، میرا انھیں یہی مشورہ ہے کہ وہ اسکو شریف لے جائیں۔ میں خود بھی وہیں جا رہا ہوں۔ انھیں بتانا...“

لیکن گورنر اپنی بات ختم نہ کر سکا۔ دھول سے ست پت اور پسینے میں شرابور ایک افسر بھگم بھاگ کمرے میں داخل ہوا اور اس نے فریسی میں اس سے کچھ کہا۔ گورنر حواس باختہ ہو گیا۔

”اب جاؤ“ اس نے سر کو جنبش دے کر آل پاچ سے کہا اور افسر سے سوال جواب کرنے لگا۔

جب آل پاچ گورنر کے کمرے سے باہر آیا، بے قرار خوف زدہ، مستفسرانہ نگاہوں نے اس کا استقبال کیا۔ وہ رمار ہوٹل کی جانب چل پڑا اور نہ چاہتے ہوئے فائرنگ کی آوازیں سنتا رہا۔ گورنر نے اسے جو کاغذات دیے تھے، ان پر مندرجہ ذیل عبارت تحریر تھی:

میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ سمولنسک شہر کو بھی رتی برابر خطرہ نہیں اور اس بات کا بھی امکان نہیں کہ سے کوئی خطرہ لاحق ہوگا۔ ایک طرف سے میں دوسری طرف سے پرنس ہگ رتیاں اپنی اپنی افواج لے کر آگے بڑھ رہے ہیں تاکہ سمولنسک سے پرے ہی ہم ایک دوسرے سے مل سکیں۔ کچھ کی کارپل اس مہینے کی پائیس تاریخ تک مکمل ہو جائے گا۔ دونوں فوجیں اپنے مشترکہ مسائل سے صوبے کے باشندوں کا، جن کی خبر گیری کی ذمہ داری آپ کے کندھوں پر ڈالی گئی تھی، تحفظ کریں گی۔ ہماری یہ کوششیں اس وقت تک جاری رہیں گی جب تک ہم اپنے دشمنوں کو اپنے وطن عزیز کی مقدس سرزمین سے باہر نہیں نکال دیتے یا بصورت دیگر ہماری دلیر اور شجاع افواج کا آخری سپاہی اپنی جان نثار نہیں کر دیتا۔ اس سے آپ یہ اندازہ لگا سکیں گے کہ آپ کو یہ پورا حق حاصل ہے کہ آپ سمولنسک کے باشندوں کو یہ یقین دلا سکیں کہ جب ان کی حفاظت کا ہیڈ، ان دونوں اور جری فوجوں نے سنبھال لیا ہے، انھیں کامل اطمینان ہونا چاہیے کہ رائے ان کی ہوگی۔ (فرمان سرور ز بار کھلے ذقوی برائے بیرن آج، سول گورنر سمولنسک، 1812)

لوگ بے مقصد شہر میں ادھر ادھر گھوم پھر رہے تھے۔ انھیں کسی پہلو قرار نہیں تھا۔ خانگی برتنوں، کرسیوں اور لماریوں سے بھرے چھوٹے مسلسل کھروں سے نکل رہے تھے اور شہر کے گلی کوچوں میں دوں دوں تھے۔ فیر اپوٹوف کے مکان سے اگلے مکان کے دروازے پر لدی پھندی گاڑیاں کھڑی تھیں۔ عورتیں سب دشتہم کر رہی تھیں ورا آسمان پر اٹھائے ہوئے تھیں۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ آپس میں گلے مل رہی اور ایک دوسرے کو خدا حافظ کہہ رہی تھیں۔ ایک پست قامت گھریلو کتا گاڑیوں میں جتے گھوڑوں کے سامنے نکلیں بھرتا پھر رہا اور بھونک رہا تھا۔

جب آل پانچ ہوٹل کے صحن میں داخل ہوا، وہ معمول سے تیز قدم اٹھا رہا تھا۔ وہ اس سہبت میں، جہاں اس کی گاڑی اور گھوڑے کھڑے تھے، پہنچا۔ کوچران سویا پڑا تھا۔ اس نے اسے جگایا، اسے گھوڑے جوتے کا حکم دیا اور ہوٹل کے اندر چلا گیا۔ ہوٹل والے کے نجی کمرے سے کسی بچے کے رونے کی آوازیں، کسی عورت کی دل خراش چیخیں اور فیرا پوتوف کی کھر دہری اور غصیلی چیخ دھاڑ سنائی دے رہی تھی۔ جب آل پانچ ہوٹل میں داخل ہوا، بار جن خوف زدہ مہربانی کی طرح غلام گردش میں ادھر ادھر بھاگی پھر رہی تھی۔

”وہ مالکن کی جان لے رہا ہے۔ مار مار کر اس کا بھر کس نکال دیا ہے، ٹھنڈے مار کر کبھی ادھر پھینک دیتا ہے اور کبھی ادھر۔ اتنی پٹائی آخر کوئی حد ہوتی ہے؟“

”کیوں؟ کس لیے؟“ آل پانچ نے پوچھا۔

”وہ بار بار یہاں سے جانے کی التجائیں کر رہی تھی۔ آخر عورت ذات ہے، مجھے یہاں سے بے چارہ، وہ کہہ رہی تھی۔ مجھے، درمیرے بچوں کو یہاں مرنے نہ دو۔ سب دنیا جا رہی ہے۔ وہ بار بار کہہ رہی تھی۔ پھر ہم کیوں نہیں جاتے؟ اس پر وہ اسے اس قدر پٹنے اور گاسیاں دینے لگا۔“

یہ الفاظ اس کر آل پانچ نے یوں سر ہلے یا جیسے پسندیدگی کا اظہار کر رہا ہو اور ایک لفظ مزید سے بغیر سیدھا اس کمرے میں چل گیا جو ہوٹل والے کے کمرے کے ہاں مقابل تھا اور جس میں اس نے اپنا سودا سلف رکھا ہوا تھا۔

”دو جی، بخونی“ ایک دہلی پتلی زرد عورت نے چلا کر کہا اور اسی لمحے وہ اپنے بازوؤں میں شیر خر رچہ اٹھائے بھاگتی زرد رازے سے باہر آئی۔ اس کے سر کا رومال تار تار ہو رہا تھا۔

وہ شیر حیاں اتر کر نیچے صحن میں چلی گئی۔ فیرا پوتوف اس کے پیچھے پیچھے ہاں آتا لیکن آل پانچ کو دیکھ کر اس نے اپنی دسٹ ٹھیک ٹھاک کی، بال درست کیے، جھانکی لی اور آل پانچ کے پیچھے پیچھے سامنے کے کمرے میں چلا گیا۔

”جار ہے ہو؟ ابھی سے؟“ اس نے پوچھا۔

ہوٹل والے کے سول کا جواب دیے یا اس کی طرف دیکھے بغیر آل پانچ اپنے پارسل چھانٹتا رہا اور اس سے پوچھنے لگا کہ اس کے ذمے کتنی رقم بنتی ہے۔

”حساب کر لیں گے؟“ تم گورنر کے ہاں گئے تھے؟ کیا فیصلہ ہوا ہے؟“

آل پانچ نے جواب دیا کہ گورنر نے اسے کوئی واضح بات نہیں بتائی۔

”جس قسم کا ہمارا کاروبار ہے، اس میں ہم کیسے سامان باندھ سکتے اور کیسے کہیں جا سکتے ہیں،“ فیرا پوتوف نے کہا۔ صرف وارد گو بڑا ہی جانا ہو، تو فی چھکڑا سات روپے ادا کرنا پڑیں گے اور میں کہتا ہوں کہ اتنا کرایہ مانگنا کسی عیسائی گورنر نہیں دیتا۔ ادھر سیلو انوف کی چاندی ہو گئی ہے۔ اس نے جسمرات کو فوج کے ہاتھ لور روپے فی بوری آٹا بیچا۔ کیا خیال ہے، کچھ چائے والے ہو جائے؟“ اس نے مزید کہا۔

جب گھوڑے جوتے جارہے تھے، آل پانچ اور فیرا پوتوف غلے اور دوسری فصلوں کی قیمتوں کے متعلق

باتیں کرتے رہے۔ ان کا خیال تھا کہ فصلیں کاٹنے کے لیے موسم سازگار ہے۔

”خیر، معلوم ہوتا ہے کہ حالت کچھ سنبھل گئی ہیں،“ فیراپونوف نے چائے کی تیسری پیالی ختم کرتے اور اٹھتے ہوئے اظہار خیال کیا۔ ”میدان لازماً ہمارے جوانوں کے ہاتھ رہا ہوگا۔ وہ کہتے تھے کہ وہ انھیں شہر کے اندر سمجھنے نہیں دیں گے۔ میرا خیال ہے کہ پلہ ہمارا بھاری ہے۔ سنا ہے کہ ماتوائی ایوانچ پلاتوف نے ان کی گاڑیاں دریائی بندرگاہ میں دھکیل دی تھیں اور اس طرح ایک ہی دن میں ان کے اٹھارہ ہزار آدمی زبورہے۔“

آل پانچ نے سودا سلف اکٹھا کیا، اسے کوچوان کے، جو اندر آ گیا تھا، سپرد کیا اور ہوٹل والے کے ساتھ اپنا حساب چکانے لگا۔ پہیوں کی چرچراہٹ، گھوڑوں کی گردنوں میں پڑی گھنٹیوں کی جھنجھناہٹ اور ان کے سسوں کی دھمدچاہٹ کانوں سے نکرانے لگی اور ایک دو پہیوں والی ہلکی پھلکی گاڑی، جو چاروں اطراف سے بند تھی، دروازے سے باہر نکل گئی۔

دن کبھی کا ڈھل چکا تھا۔ سائے سڑک کے درمیان تک آچکے تھے جب کہ بقیہ حصے میں تیز دھوپ چمک رہی تھی۔ آل پانچ نے کھڑکی میں سے جھانک کر باہر دیکھا اور دروازے کی طرف چل پڑا۔ اچانک کہیں دور سے سناہٹ سنائی دی۔ اس کے بعد ایک اور آواز کانوں سے نکرائی۔ معلوم ہوتا تھا کہ کوئی چیز دم سے گر پڑی ہے۔ پھر توپوں کی گھن گرج کانوں کے پردے پھاڑنے لگی۔ مختلف آوازیں آپس میں مل کر شور و غل مچا کر نکل گئیں اور کھڑکیوں کے ہٹ کھڑانے لگے۔

آل پانچ باہر سڑک پر چلا گیا۔ دو آدمی پل کی جانب بھاگے جا رہے تھے۔ مختلف اطراف سے میلوں کے بچے، توپوں کے گرجے اور گویوں کے، جو شہر پر گر رہے تھے، پھٹنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ لیکن شہر کے باشندے ان اصوات کو بمشکل سن پا رہے تھے اور وہ ان پر کوئی خاص توجہ بھی نہیں دے رہے تھے۔ ان کے مقابلے میں وہ توپوں کی، جو شہر سے باہر دھاڑ رہی تھیں، آوازوں پر زیادہ دھیان دے رہے تھے۔ ایک سوئیں توپیں گولہ باری کر رہی تھیں۔ اس کا حکم پولین نے چار بجے کے ذرا بعد دیا تھا۔

شروع شروع میں تو لوگ سمجھ ہی نہ پائے کہ گولہ باری کیوں ہو رہی ہے۔ دقتی بہوں اور توپوں کے گولوں کے گرنے سے جو آواز پیدا ہوتی، وہ محض ان کے تجسس کو ہوا دیتی۔ فیراپونوف کی بیوی، جو اس وقت تک سامان تلے کھڑی سسل چیچ پکار رہا کیے ہوئے تھی، خاموش ہو گئی اور بچہ بازوؤں میں اٹھائے باہر صدر دروازے کی جانب چل دی۔ وہاں وہ کچھ دیر شور و غل سنتی اور صدمہ بگم ٹھنکی باندھے لوگوں کو دیکھتی رہی۔

باورچن، در ایک دکا دار صدر دروازے کے پاس آگئے۔ ان کے سروں کے اوپر ہی اوپر جو اشیاء اڑی جا رہی تھیں، وہ بڑی دلچسپی سے اس کی ایک جھلک دیکھنے کی کوشش کرنے لگے۔ متعدد اشخاص کھڑے ہو گئے اور شور سے باتیں کرنے لگے۔

”کیا قوت ہے!“ ایک شخص نے تبصرہ کیا۔ ”چھتوں کی اینٹ سے اینٹ بجا دی اور انھیں کڑے کڑے کر دیا!“

”سوتروں کی طرح زمین ادھیڑ ڈہلی!“ دوسرے نے لقمہ دیا۔

”واہ واہ، کیا بات ہے! آدمی کو خواہ تھوڑا جوش آنے لگتا ہے!“ ایک اور نے کہا۔

”شکر کرو کہ تم پھلانگ لگا کر ایک طرف ہٹ گئے، ورنہ ڈھونڈے سے تمہارے نشان تک نہ ملتا!“

انھیں ہجوم نے چپ کرادیا اور بتایا کہ کس طرح توپ کا گولہ ایک مکان پر، جو وہاں سے زیادہ دور نہیں تھا، گرا تھا۔ دریں اثنا چند اور متحرک اشیاء۔ کبھی تیزی سے بھاگتا اور بھیا تک سنسناء ہٹ پیدا کرتا توپ کا گولہ اور کبھی دتی بم دقت بے وقت سیٹی کی خوشگوار آواز نکالتا۔ متواتر توگوں کے سروں کے اوپر سے گزرتی رہیں لیکن ان میں سے ایک بھی ان کے قریب نہ گری۔ سبھی ان کے سروں کے اوپر ہی اوپر اڑتی آگے نکل گئیں۔

آل پانچ اپنی گاڑی میں سوار ہو گیا۔ ہوٹل والا صدر دروازے پر کھڑا تھا۔

”یہ تم منہ پھاڑ کر ادھر ادھر دیکھنا بند کرو گی یا نہیں؟“ اس نے جھاکر باورجن سے کہا۔ وہ اپنا سرخ چٹنی کوٹ پہنے، آستینیں چھائے اور اپنی برہنہ کہلیوں کو چھاتے نکڑ میں جا کھڑی ہوئی تھی تاکہ وہ ان باتوں کو، جو وہاں ہو رہی تھیں، سن سکے۔

”آپ توگوں کے لیے یہ بالکل انوکھی چیز ہے!“ وہ کہہ رہی تھی لیکن جب اس نے اپنے آقا کی آواز سنی، وہ پیچھے ہٹ گئی اور اس نے اپنی سکرٹ، جو اس نے اوپر ٹانگ رکھی تھی، نیچے گرا دی۔

ایک بار پھر، لیکن اب کی مرتبہ بہت قریب، سیٹی کی سی آواز سنائی دی اور کسی ننھے منے پرندے کی طرح کوئی چیز نیچے جھپٹی۔ گلی کے درمیان میں آتشیں چمک دکھائی دی، دھماکہ ہوا اور گلی دھوئیں سے بھر گئی۔

”بد ذات، الو کی دم! یہ تم نے کیا کیا؟“ ہوٹل والا باورجن کی جانب بھاگتا چلا یا۔

عین اسی لمحے چاروں اطراف سے عورتوں کے رونے پینے کی جگر خراش آوازیں بلند ہونے لگیں۔ ایک دہشت زدہ بچہ چیخنے چلانے لگا۔ لوگوں کے چہرے فق ہو گئے اور وہ چپ چاپ باورجن کے ارد گرد اکٹھا ہونے لگے۔ سچ چھاڑے میں سب سے بلند باورجن کی آہیں اور کراہیں تھیں۔

”ہائے... ہائے، واہ! بھلے لوگو! خدا کے نیک بندو! مہربان دوستو! مجھے مرنے سے بچالو! خدا کے نیک بندو!“

پانچ منٹ بعد گلی میں کوئی تنفس باقی نہ رہا۔ دتی بم کے ٹکڑے نے باورجن کی ٹانگ توڑی دی تھی اور وہ اسے اٹھا کر باورجنی خانے میں لے گئے۔ آل پانچ، اس کا کو جوان، فیروپوتوف کی اہلیہ، بچے اور خاگی نوکر چاکر سمی تہ خانے میں بیٹھے اور کان لگائے سن رہے تھے۔ توپوں کی گھن گرج، گولوں کی سنسناء ہٹ، اور باورجن کی دل شکن آہیں، جو شور و غل سے زیادہ بلند تھیں، ایک لمحے کے لیے بھی بند نہ ہوئیں۔ ہوٹل والے کی بیوی اپنے بچے کو کبھی جھلانے اور کبھی چپ کرنے لگتی، اور جب کوئی شخص تہہ خانے میں داخل ہوتا، اس سے درد انگیز سرگوشی میں پوچھنے لگتی کہ اس کے خاوند پر، جو سڑک پر ہی ٹھہر گیا تھا، کیا ہوا ہے۔ ایک دکاندار نے سے بتایا کہ وہ سمولنسک کے اس

ایڈو نے کو، جو مجھے دکھاتا ہے، لانے هجوم کے ساتھ کیسا چلا گیا ہے۔

جھٹ پٹے کے قریب گولہ باری تھمنے لگی۔ آل پاچ تہہ خانے سے باہر نکلا و دروازے پر جا کھڑا ہوا۔ شام کا سہن، جو اتنا صاف ہوتا تھا، دھوئیں کی چادر میں لپٹا ہوا تھا اور اس دھوئیں میں درائی نما چاند آسمان میں بہت بلند یوں پر عیب و غریب انداز سے نمودار تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ توپوں کی گھن گرج کے بعد شہر پر سکوت چھا گیا ہے۔ اس سکوت کی مہر صرف تب ٹوٹی جب کسی کے قدموں کی چاپ، آہوں اور کراہوں کی آواز، دور کے شور و غل کی ہنہماہٹ یا آگ میں، جو چاروں اطراف پھیل رہی تھی، لکڑیوں کے پٹختے کی صدا سنائی دیتی۔ باورجن کا کراہنا اب ٹھم گیا تھا۔ دو طرف دھوئیں کے بادل آگے سے، ٹھہرے اور فضا میں تحلیل ہو رہے تھے۔ قسم قسم کی اردیوں میں بلوں فوجی جوان ادھر ادھر چل پھر رہے تھے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کدھر جائیں اور کدھر نہ جائیں۔ ان کی حالت بالکل ان چیونٹیوں کی، جن کا ڈکورا تھیں نہیں ہو چکا ہو، مانند تھیں۔ ان میں سے متعدد بھگتے دوڑتے، آں پاچ کی نظروں کے سامنے فیر پونٹوف کے گھن میں آدھکے۔ آل پاچ صدر دروازے کی طرف چلا گیا۔ یکدم جھٹ نے، جس کے جوان جسد بازی میں ایک دوسرے سے دھکم پیل ہو رہے تھے، سڑک روک رکھی تھی۔ ”شہر منسوب ہو گیا ہے۔ یہاں سے نکل جاؤ، نکل جاؤ“ ایک افسر نے، جس نے سے دیکھ لیا تھا، اس سے کہا۔ پھر وہ جوانوں کی طرف متوجہ ہو گیا۔ ”تمہیں وہ سبق سکھاؤں گا کہ چھٹی کا دودھ یاد آ جائے گا لوگوں کے منوں میں بھاگے جا رہے ہیں، ہونہہ!“

آل پاچ واپس ہوٹل میں آ گیا۔ اس نے کوچوان کو بلایا اور اسے روانگی کا حکم سنا دیا۔ فیر پونٹوف کا پورا کمرانہ ان کے پیچھے پیچھے گھن میں چلا آیا۔ جب انھوں نے دھواں، بلکہ آگ کے شعلے بھی، جو جھٹ پٹے میں نظر آنے لگے تھے، اوپر اٹھتے دیکھے، غور تیں، جو اس وقت تک دم سادھے خاموش رہی تھیں، اپنے دادیلے سے آسمان سربراٹھانے لگیں۔ اسی قسم کی آوازیں سڑک کے دوسرے حصوں سے بھی آنے لگی گویا وہ ان کا جواب دے رہی ہوں۔ ساتھ ان کے اندر آل پاچ اور کوچوان اپنے گھوڑوں کی باگیں اور راسیں، جو آپس میں الجھ گئی تھیں، کا پتہ انھوں سے درست کرنے لگے۔

جب آں پاچ اپنی گاڑی میں صدر دروازے سے باہر نکلا، اسے فیر پونٹوف کی کھلی رکان میں لگ بھگ ایک اور فوجی جوان نظر آئے۔ وہ اونچی اونچی آوازوں میں باتیں کر رہے تھے اور گندم کے آنے اور سورج کیکھی کے بھول سے اپنے تھیلے اور بچے بھرتے جا رہے تھے۔ اتنے میں فیر پونٹوف واپس آ گیا اور سیدھا دکان میں چلا گیا۔ فوجی جوانوں کو دیکھ کر وہ جینٹے چلانے والا تھا کہ وہ اچانک رک گیا، اس نے اپنا سر پکڑا اور روٹکھی لکھی ہنسنے لگا۔ ”بچو، سب کچھ ہے جاؤ، ان شیطان کے تھموں کے لیے کچھ نہ چھوڑنا!“ وہ گلا پھاڑ پھاڑ کر کہہ رہا تھا۔ اس نے جھٹ کر خود کچھ بوریاں گھسیٹیں اور انھیں ہر سڑک پر پھینک دی۔

(انٹ-ہیل) چیونٹیوں کے گھروں کے اوپر مٹی کا مخروطی شکل کا ڈھیر۔ (مولوی مہدی الحق)

چند جوان ڈر گئے اور باہر بھاگ گئے، تاہم باقی اپنے تھیلے بھرتے رہے۔ آل پاچ کو دیکھ کر فیراپوتوف اس کی جانب متوجہ ہوا۔

”روس جاہ ہو گیا ہے!“ اس نے چلا کر کہا۔ ”آل پاچ، ہا، را بیڑا غرق ہو گیا ہے! میں اپنے ہاتھوں اس عورت کو آگ لگا دوں گا۔ ہم اجڑ گئے، جاہ ہو گئے ہیں۔“ اور فیراپوتوف باہر گھن میں بھاگ گیا۔

فوجی جوانوں کا ریلوے کھڑے کرنے کا نام ہی نہ لیتا تھا۔ انھوں نے پوری سڑک روک لی تھی۔ چنانچہ آل پاچ باہر نہ نکل سکا اور اسے اٹھ کر لے کر اپنا پڑا۔ فیراپوتوف کی بیوی اور بچے بھی ایک چھکڑے میں بیٹھے تھے اور سوچ رہے تھے کہ باہر نکلنا کب ممکن ہوگا۔

رات آگئی تھی درآسمان پر ستارے نمودار ہونے لگے تھے۔ فلک پر دھوئیں کی جو چادر لپٹی ہوئی تھی، کبھی کبھار اس میں نیا چاند چمکنے لگتا تھا۔ دریائے دیمپر کی جانب جوڑھلوان جالی ہے، اس پر آل پاچ کی گاڑی اور ہوٹل والے کی بیوی کے چھکڑے، جو فوجی جوانوں کی قطاروں اور دوسری گاڑیوں کے بچوں بیچ محو حرکت تھے، رکنا پڑتا۔ چوک سے کچھ دور، جہاں ٹریفک بالکل جام ہو گیا تھا، ایک بغلی گلی میں ایک مکان اور چند دکانیں جل رہی تھیں۔ آگ اب بجھنے کے قریب تھی۔ ایک موقع پر شعلے بالکل ناپید ہو گئے اور سیاہ دھوئیں کے مرغولے سر اٹھانے لگے لیکن شعلے دوبارہ بھڑک اٹھے اور انھوں نے ان لوگوں کے، جو چوک میں ہجوم کیے ہوئے تھے، چہرے عجیب و غریب واضح انداز سے روشن کر دیے۔ آگ کے سرے سیاہ شکلیں تیزی سے آگے پیچھے حرکت کر رہی تھیں اور شعلوں کی دیم چمچ چمچ سے مادرِ باتوں اور چیخوں کی آواز میں سنائی دے رہی تھیں۔ آل پاچ نے جب دیکھا کہ اس کی ٹیم کو آگے چلنے میں ابھی کچھ وقت لگے گا، وہ نیچے اتر آیا اور آگ کا منظر دیکھنے واپس بغلی گلی میں چلا گیا۔ جو عورتیں جل رہی تھیں، ان کے پڑوس میں فوجی جوان مسلسل آگے پیچھے بھاگے بھڑکے پھر رہے تھے۔ اس نے دیکھا کہ دو فوجی اور ایک دوسرا شخص، جس نے موٹا اور کھردرا ہوا کوٹ پہن رکھا تھا، جلتے ہوئے شہتر گھسیٹ کر گلی کے پار دوسرے صحن میں لے جا رہے ہیں جب کہ دوسرے خشک گھاس کے گٹھے اٹھائے چل رہے ہیں۔

آل پاچ ان لوگوں کی، جو خامے اونچے سودی خانے کے سامنے ایستہ وہ تھے، بے پناہ بھیڑ میں گھس گیا۔ گودام دھڑا دھڑا جل رہا تھا۔ تمام دیواریں شعلوں کی لپیٹ میں آچکی تھیں۔ عینی دیوار زمین بوس ہو چکی تھی۔ شہتروں کی چھت نیچے گر رہی تھی اور کڑیوں کو آگ لگ چکی تھی۔ نظر آ رہا تھا کہ ہجوم اس لمبے کا، جب چھت نیچے گر پڑے گی، انتظار کر رہا ہے۔ آل پاچ کی نظریں بھی وہیں جمی ہوئی تھیں۔

”آل پاچ! اچانک ایک جانی پہچانی آواز نے بوڑھے کو پکارا۔

”یوڑا کیسی لینسی، مائی زیبر سر، آپ!“ آل پاچ نے فوراً اپنے نوجوان آقا کی آواز پہچانتے ہوئے جواب دیا۔ پرنس آندرے اور کوٹ پہنے سیاہ گھوڑے پر سوار تھا اور ہجوم کے عقب سے ٹنگی باندھے آل پاچ کو دیکھ

رہا تھا۔

”تم یہاں کیا کر رہے ہو؟“ اس نے پوچھا۔

”یور... پورائیکسی لیشی؟“ آل پانچ نے ہلکے سے ہلکے کہا اور سسکیاں بھرنے لگا۔ ”یور... یور... واقعی فتم ہو گیا ہے؟... آپ کے دامد محترم...“

”تم یہاں کیا کر رہے ہو؟“ پرنس آندرے نے دوبارہ پوچھا۔

اسی لمحے شعلے دوبارہ بھڑک اٹھے اور آل پانچ کو تیز روشنی میں اپنے نو جوان آقا کا زرد لور ٹھہال چہرہ نظر آیا۔ اس نے اسے بتایا کہ اسے شہر بھیجا گیا تھا لیکن اب اسے وہاں سے نکلنے میں رقت پیش آ رہی ہے۔

”پورائیکسی لیشی، واقعی ہمارے لیے سب کچھ فتم ختم ہو گیا ہے؟“ اس نے دوبارہ پوچھا۔

پرنس آندرے نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس نے جیب سے نوٹ بک نکالی، ورق پھاڑا، اپنا گھٹنا اوپر اٹھایا اور ہل سے لکھنے لگا۔ اس نے اپنی ہمشیرہ کو لکھا:

”سولنسک مغلوب ہو گیا ہے۔ ایک ہفتے کے اندر اندر بالڈ ہلز پر دشمن کا قبضہ ہو جائے گا۔ فوراً اسکو چلے جاؤ۔ جونہی روانگی ہو، مجھے اطلاع بھیج دینا۔ خصوصی پیغام رساں اسوایا ڈروانہ کر دیں۔“

جب وہ یہ قلم لکھ کر اسے آل پانچ کے حوالے کر چکا، اس نے اسے بتایا کہ پرنس، پرنس، اس کے بیٹے اور اس کے بیوڑ کی روانگی کے کیا انتظامات کرنا ہیں اور خود اسے کیسے اور کہاں فوراً اطلاع پہنچانا ہے۔ خوشتر اس کے کہ اسے اپنی بات ختم کرنے کا موقع ملتا، یک شاف افسر، ایک ایجوٹ کی معیت میں سرپٹ گھوڑا دوڑتا اس کے پاس پہنچا۔

”تم کرل ہو؟“ شاف افسر نے جرمن لہجے اور ایک ایسی آواز میں، جسے پرنس آندرے پہچانتا تھا، چل کر کہا: ”تمہاری موجودگی میں مکالوں کو آگ لگائی جا رہی ہے ورنہ آرام سے کھڑے ہو! کیا مطلب ہے تمہارا؟ تمہاری جواب ملے گی!“ برگ نے، جواب سپاہ اول کے پیادہ دستوں کے پیچھے کے کمانڈر کے چیف آف شاف کا نائب تھا، چل کر کہا۔ (برگ کا خیال تھا کہ جس عہدے پر وہ اب فائز ہے، وہ خاصا اونچا اور نہجائی قابل اطمینان ہے۔) پرنس آندرے نے اس پر سرسری نگاہ ڈالی اور اسے جواب دیے بغیر آل پانچ کو ہدایت دیتا رہا۔

”انہیں بتانا کہ میں دس تاریخ تک جواب کا انتظار کروں گا اور اگر اس تاریخ تک مجھے اطلاع نہ ملی کہ وہ سب لوگ جا چکے ہیں، تو مجھے مجبوراً سب کچھ چھوڑنا اور خود بالڈ ہلز آنا پڑے گا۔“

”پرنس، میں نے جو کچھ کہا، اس کی واحد وجہ یہ تھی،“ برگ نے پرنس آندرے کو پیچھے ہٹے ہوئے کہا، ”کہ مجھے احکام کی تعمیل کرنا ہوتی ہے۔ اور جہاں تک احکام کی تعمیل کا تعلق ہے، میں کسی قسم کی کوتاہی قطعاً روا نہیں رکھتا۔ میں آپ سے معافی کا خوشگوار ہوں،“ اس نے گڑ گڑاتے ہوئے کہا۔

جو غمناک چل رہی تھی، اس میں دھماکہ ہوا۔ ایک لچکے کے لیے آگ ماند پڑ گئی اور چھت کے ذریعے سے سیاہ دھواں کے مرغولے اوپر اٹھنے لگے۔ ایک اور زبردست دھماکہ ہوا کیونکہ کوئی خاصی بھاری بھر کم چیز نیچے گر

پڑی تھی۔

”اوہی یی!“ سودی خانے کی چھت گرنے سے جوڑ بردست دھماکہ ہوا تھا، اس کے جواب میں ہجوم نے چیخ بلند کی۔ چھت گرنے سے اناج آگ کی لپیٹ میں آگیا اور چاروں اطراف ایسی خوشبو، جو کیک پکانے کے دوران میں محسوس کی جاتی ہے، پھیل گئی۔ شعلے ایک ہار پھر بھڑکنے لگے اور ان کے ارد گرد جو لوگ کھڑے تھے، ان کے پر جوش، پر حسرت اور آشفستہ چہرے روشن ہو گئے۔

مولے کھردرے، ونی کوٹ میں ملبوس شخص نے اپنے بازو ہرائے اور چلانے لگا۔

”واہ واہ! سر حبا! دوستو، مزہ آگیا! اب صحیح معنوں میں بھڑکی ہے!“

”وہ خود مالک ہے،“ متعدد آوازیں کہہ رہی تھیں۔

”چنانچہ جو کچھ میں نے سمجھیں بتایا ہے وہ ان تک پہنچا دینا،“ پریس آئندے نے آل پاچ سے کہا اور برگ سے، جو گرم صم اس کے قریب کھڑا تھا، ایک لفظ کہے بغیر اس نے گھوڑے کو ہمیز لگایا اور بخشی گلی پار کرنے لگا۔

5

سولنسک سے افواج پسپا ہوتی رہیں۔ دشمن ان کا تعاقب کر رہا تھا۔ دس اگست کو وہ رہجسٹ۔ جس کی کماں پریس آئندے کے ہاتھ میں تھی، جرنیل سڑک پر گزرتے گزرتے اس خیابان سے، جو بالذات کو جاتی تھی، آگے نکل گئی۔ تین ہفتوں سے اوپر گزر گئے لیکن پانی کی ایک بوند تک نہیں برسی تھی اور گرمی کا یہ حال کہ ہر تنفس الا مان الا مان پکارا تھا۔ ہر روز آسمان پر روئی کی طرح سفید بادلوں کے گالے تیرتے دکھائی دیتے، وہ کبھی کبھار سورج کو پتی اوٹ میں لے لیتے لیکن دن ڈھلے مطلع دوبارہ صاف ہو جاتا۔ اور آفتاب سرخی مائل بادامی دھند میں غروب ہو جاتا۔ صرف رات کو خوب اوس پڑتی اور یوں دھرتی کوئی تازگی مل جاتی۔ کھیتوں میں گندم کی جو بچی کھچی فصل کھڑی تھی۔ وہ دھوپ میں چر مرا گئی تھی اور اس کی بالیاں نیچے گر پڑی تھیں۔ دلہلیس خشک ہو گئیں۔ بھوک نے مویشیوں کا برا حال کر دیا اور وہ ہر وقت بھیس بھیس کرتے رہتے، کیونکہ تمازت نے چراگا ہوں کا ستیاناس کر دیا تھا اور ان کے چرنے کے لیے کچھ نہیں بچا تھا۔ صرف رات کو درجنگلوں میں (اور ان میں بھی صرف اس وقت تک جب تک شبیم سک نہیں ہوتی تھی) خشک ہوتی تھی، لیکن سڑکوں اور جرنیلی شہرہ پر، جس پر فوجی جوان سفر کر رہے تھے، رات کو بھی ٹھنڈ نہیں پڑتی تھی۔ یہی نہیں ان کا جو حصہ جنگل میں سے گزرتا تھا، وہ بھی گرم رہتا تھا۔ راستوں پر چھ چھانچ گہری دھوپ تھی، اور اس پر اس کا قطعاً کوئی اثر نہیں ہوتا تھا۔ جونہی اجالا ہوتا، فوجی جوان اپنی راہ چل پڑتے۔ توپ خانے اور بار برداری کے چمکڑوں کے پیچھے دھوپ آدھ کر دھوپ دھنسنے ہوتے اور وہ کسی قسم کی آواز پیدا کیے بغیر آگے بڑھتے رہتے۔ پیادہ فوج کے جوان نرم، گرم دھول میں، جو کبھی رات کو بھی خشک نہ ہوتی، ٹخنوں ٹخنوں دھنسنے لگتے، ان کے حلق خشک ہونا شروع ہو جاتے اور انھیں اپنا دم گھٹنا محسوس ہونے لگتا۔ پیرتلی دھول، جسے گاڑیوں کے پہیوں اور جانوروں اور انسانوں

کے پاؤں نے رگڑ رگڑ کر میدہ کر دیا تھا، ہادلوں کی شکل میں فوجیوں کے سروں کے اوپر اڑنے لگتی اور انسانوں اور جانوروں کی، جب وہ سڑکوں پر رواں دواں ہوتے، آنکھوں، کانوں، بالوں، نتھوں اور سب سے زیادہ تکلیف دہ انداز سے ان کے گلوں اور سینوں میں گھسنے لگتی۔ جوں جوں سورج بلند ہوتا جاتا، توں توں گرد کا بادل اوپر اٹھتا جاتا اور انسان ان باریک اور گرم ذرات کی چادر میں تنگی آنکھ سے آفتاب کا، جو بے ایر آسمان پر بھاری بھر کم نہجائی سرخ گوشت کی، بند نظر آتا، مشاہدہ کر سکتا تھا۔ ہو بند، فضا ساکن اور غیر متحرک۔ ایسے میں سانس لینا بھی دشوار ہو جاتا۔ انسان اپنے مونہوں اور ناکوں پر دھل لپیٹ لیتے لیکن ان کا سفر جاری رہتا۔ جب وہ کسی گاؤں میں داخل ہوتے، کنوؤں پر بھیڑ لگ جاتی، پانی پر جھگڑے ہوتے اور وہ گاد تک پی جاتے۔

پرنس آندرے رجسٹ کا کمانڈر تھا۔ اسے اس کی تنظیم، جوانوں کی فلاح و بہبود اور احکام وصول کرنے اور ان پر عمل کرنے کی ضرورت کا شدت سے احساس رہتا تھا۔ سمونسک کی آتش زدگی اور وہاں سے شہریوں کا انخلاء اس کی زندگی کا عصر آخری واقعہ بن گیا۔ دشمن کے خلاف شدید برہمی کے نئے جذبے نے اسے اس کا ذاتی غم بھل دیا۔ اسے اپنی رجسٹ کے امور سے دلی لگاؤ ہو گیا تھا اور وہ اپنے جوانوں اور افسروں کا بڑا خیال رکھنے لگا تھا۔ رجسٹ میں وہ اسے ”ہمارا پرنس“ کہتے تھے، اس پر فخر اور اس سے محبت کرتے تھے، لیکن وہ اپنی رجسٹ کے صرف ان لوگوں سے، جو اس کے لیے بالکل نئے تھے، جو مختلف دنیا سے تعلق رکھتے تھے اور جنہیں اس کے ماضی کے بارے میں کچھ معلوم نہیں تھا۔ تمoux اور اس جیسے۔ شرافت اور شفقت کا برتاؤ کرتا تھا۔ جو نہیں اس کی لمحہ بھیڑ کسی پرانے شناسایا شاف افسر سے ہوتی، اسے آنا فٹائش آ جاتا اور اس کا انداز مستحمانہ، تسخرانہ اور پر، زخارت ہو جاتا۔ وہ ہر اس چیز سے، جو اسے ماضی کی یاد دلاتی تھی، خار کھاتا تھا۔ چنانچہ جہاں تک اس کا سابقہ دنیا سے اس کے تعلقات کا ذکر ہے، وہ محض پناہ فرم بھانے تک محدود رہتا تھا اور کوشش کرتا تھا کہ کسی کے ساتھ نا انصافی نہ ہونے پائے۔

تجربہ بات یہ ہے کہ پرنس آندرے قوی ہو گیا تھا اور اب وہ ہر چیز کا صرف افسردہ اور تاریک پہلو دیکھنے کا عادی ہوتا جا رہا تھا۔ خصوصاً جب چھ اگست کو سمونسک سے دستبرداری اختیار کی گئی (اس کا خیال تھا کہ شہر کا دفاع کیا جاسکتا تھا اور کیا جانا چاہیے تھا) اور جب اس کے باپ کو، جیسا کہ اس نے فرض کر لیا تھا، اپنے محبوب بالڈلز، جسے اس نے تعمیر اور آباد کیا تھا اور جسے اب تاحسہ دھاراج ہونا تھا، چھوڑ کر ماسکو فرار ہونا پڑا، اس کی قنوطیت میں اور بھی اضافہ ہو گیا۔ تاہم پرنس آندرے کے پاس اپنے مرتبے کے طفیل سوچنے اور توجہ دینے کے لیے عمومی نوعیت کے مسائل سے بالکل جدا ایک اور چیز تھی اور یہ چیز اس کی رجسٹ تھی۔ دس اگست کو وہ کالم، جس کا اس کی رجسٹ جزو تھی، بالڈلز کے برابر پہنچ گیا۔ دور دراز قبل اسے اطلاع ملی تھی کہ اس کا باپ، بیٹا اور ہمیشہ ماسکو روانہ ہو چکے ہیں۔ اگرچہ پرنس آندرے کو بالڈلز میں کوئی کام نہیں تھا لیکن، اپنے ذاتی مصائب و آلام کو مزید سنگین بنانے کی جو مخصوص خواہش اس کے دل میں مچلتی رہتی تھی، اس کے ذریعہ اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ وہاں ضرور جائے گا۔ اس نے حکم دیا کہ اس کے گھوڑے پر زین ڈال دی جائے۔ اس کی رجسٹ آگے چلتی رہی اور وہ اپنے باپ کی جاگیر کی، جہاں وہ پیدا ہوا

تھا اور جہاں اس نے اپنا بچپن گزارا تھا، طرف چل پڑا۔ جو ہڑ کے نزدیک، جہاں ماضی قریب میں درجنوں رہباتی عورتیں سوگریوں سے کپڑوں کے تھان پیٹ پیٹ کر دھوئے یا انھیں نچوڑتے آپس میں گپ شپ کر رہی ہوتی تھیں، گزرتے اسے فرد واحد بھی نظر نہ آیا۔ دھوپ، پڑاٹوٹ چکا تھا اور جو ہڑ کے درمیان میں تیر رہا تھا، اس کا نصب حصہ پانی میں ڈوب چکا تھا۔ وہ گیٹ کیسر کی کوٹھری کے قریب پہنچا۔ سنگی پھلک اور کوٹھری، جس کا دروازہ کھل تھا، دونوں بے آباد تھے۔ باغات کی ردشوں پر گھاس اگنے لگی تھی اور انگش پارک میں گھوڑے اور بچھیرے آواہ پھر رہے تھے۔ گھوڑے پر بیٹھے بیٹھے وہ گرین ہاؤس پہنچے۔ دیواروں کے شیشے جگہ جگہ سے ٹوٹ چکے تھے۔ بعض گلوں کے پودے اونڈھے پڑے تھے اور پانی سوکھ چکے تھے۔ اس نے مالی کو، جس کا نام تارس تھا، آواز دی، لیکن اسے کوئی جواب نہ ملا۔ گرین ہاؤس کا چکر کاٹ کر وہ باغ میں داخل ہوا۔ اس کی منتقش چوٹی دیوار شکستہ ہو چکی تھی اور آلوچوں کی ٹہنیاں پھلوں سمیت توڑی جا چکی تھیں۔ ایک بوڑھا کسان، جسے پرنس آندرے بچپن سے جانتا تھا، باغ کی سبز نشست پر بیٹھا تھا اور کسی درخت کی چھال سے جوتا بنارہا تھا۔

وہ بہرہ تھا اور اسے پرنس آندرے کی آمد کی کانوں کان خبر نہ ہوئی۔ وہ معمر پرنس کے پسندیدہ بیج پر بیٹھا تھا اور اس کے قریب مکولیا (Magnolia) کی مرجھائی ہوئی شاخوں سے چھال کے لچھے لٹک رہے تھے۔

پرنس آندرے مکان کی جانب چل پڑا۔ پرانے باغ میں یمنوں کے متعدد درخت کٹے پڑے تھے اور مکان کے قریب گلاب کی جھاڑیوں میں ایک چتکبری گھوڑی اور اس کا بچھیرا آواہ پھر رہے تھے۔ درپوں کے پت بند تھے۔ نخلی منزل کی صرف ایک کھڑکی کھلی تھی۔ ایک نو عمر غلام لڑکا پرنس آندرے کو دیکھ کر مکان کے اندر بھاگ گیا۔ آل پانچ اپنے گھر والوں کو وہاں سے رخصت کر چکا تھا اور اب وہ اکیلا بالڈ ہلز میں تھا۔ وہ اندر بیٹھا "سیرالولیا" پڑھ رہا تھا۔ جب اس نے سنا کہ پرنس آندرے آیا ہے، اس نے ناک پر چشمہ چڑھایا اور وہ کوٹ کے بن بن کرتے باہر آیا۔ وہ پرنس آندرے کی طرف لپکا اور ایک لفظ کہے بغیر رونے اور اپنے نو جوان آقا کا گھٹنا چومنے لگا۔

پھر وہ اپنی کمزوری پر غمگینا ایک طرف ہٹ گیا اور اسے صورت حاس بتانے لگا۔ تمام قیمتی اور قابل قدر اشیاء باگوچارافو پیپی دی گئی ہیں۔ آٹھ سوشل غلہ بھی چھکڑوں میں وہاں بھیج دیا گیا ہے۔ سویٹیوں کے چارے اور غلے کی بہاریہ فصل، جو آل پانچ کے مطابق اس سال بے حد شاندار تھی، فوجیوں کے قبضے میں چلی گئی تھی، ورائیوں نے اسے پکنے سے پہلے ہی کاٹ دیا تھا۔ کسانوں کا بر حال ہے۔ کچھ باگوچارافو چلے گئے ہیں۔ صرف چند ایک ابھی تک وہیں مقیم ہیں۔

اس کی بات کے مکمل ہونے کا انتظار کیے بغیر پرنس آندرے نے پوچھا کہ اس کا باپ اور ہمشیرہ کب روانہ ہوئے تھے۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ ماسکو کب گئے تھے۔

آل پانچ نے فرض کر لیا کہ سوال کا اشارہ ان کی یا گوچار فورڈنگ کی طرف ہے۔ اس نے جواب دیا کہ وہ سات کوروندہ ہوئے تھے اور وہ ایک بار پھر جاگیر کے معاملات بالتفصیل بیان کرنے اور ہدایت مانگنے لگا۔

”جنی جانے دوں اور فسروں سے رسید حاصل کر لوں؟“ اس نے پوچھا۔ ”اب بھی ہمارے پاس تقریباً چوبیس کوارٹر بچے پڑے ہیں۔“

”میں اس سے کیا کہوں؟“ پرنس آندرے شش و پنج میں پڑ گیا۔ اس کی نگاہیں بوڑھے آدمی کے منجھسے سر پر، جو دھوپ میں چمک رہا تھا، جمی ہوئی تھیں۔ آل پانچ کے چہرے پر جو تاثرات تھے، ان سے اسے یہ اندازہ ہوا کہ بوڑھے میاں خود بھی سمجھتے ہیں کہ ان کا سوال بے محل ہے اور انھوں نے یہ محض اپنے دکھ کی شدت کم کرنے کے لیے پوچھا ہے۔

”ہاں، جانے دو“ اس نے جواب دیا۔

”یور، یکسی لینس، آپ کو باغ میں شاید کچھ گڑ بڑ نظر آتی ہو،“ آل پانچ نے کہا۔ ”حالات ہی ایسے تھے کہ اسے روکا نہیں جاسکتا تھا۔ یہاں تین رجمنٹیں آچکی اور رات قیام کر چکی ہیں۔ زیادہ تر ڈریگون¹¹ تھے۔ میں نے شکایت درج کرانے کے لیے ان کے کمانڈنگ افسر کا نام اور عہدہ لکھ لیا تھا۔“

”خیر، اب تمھارا کیا ارادہ ہے؟ اگر دشمن نے اس جگہ پر قبضہ کر لیا، پھر بھی تم یہیں رہو گے؟“ پرنس آندرے نے اس سے پوچھا۔

آل پانچ نے پتارخ پرنس آندرے کی طرف کیا، اس کے چہرے پر نظر ڈالا اور پھر اچانک اس نے اپنا بازو ہند کیا اور شجیدگی سے اوپر کی جانب اشارہ کرنے لگا۔

”وہ میرا کھولا ہے۔ وہی ہوگا جو وہ چاہے گا، اس نے با آواز بلند کہا۔

کسانوں اور خانگی غلاموں کا ایک گروہ چراگاہ میں سے گزرتا ادھر آ نکلا۔ وہ جب پرنس آندرے کے قریب آئے، انھوں نے (احتراماً) اپنی ٹوپیاں اتار دیں۔

”اچھا، خدا حافظ!“ پرنس آندرے نے آل پانچ کے اوپر جھکتے ہوئے کہا۔ ”تم بھی یہاں سے چلے جاؤ، جو کچھ لے جاسکتے ہو، لے جاؤ اور کسانوں کو بتا دو کہ وہ ریازان کی یا اسکو کے قریب کی جاگیر پر چلے جائیں۔“

آل پانچ پرنس آندرے کی ٹانگ سے چٹ گیا اور اس کی سسکیں نکلتے لگیں۔ پرنس آندرے نے نہایت نرمی سے اپنی ٹانگ چھڑائی، گھوڑے کو مہینز لگایا اور اسے سرپٹ دوڑانے لگا۔

وہ ایک بار پھر بوڑھے آدمی کے قریب سے گزرا۔ بوڑھے کا چہرہ ہر قسم کے جذبات سے عاری تھا اور اس کی حالت اس تکھی کی تھی جو کسی عزیز کے، جس کا انتقال ہو چکا ہو، چہرے پر بیٹھی ہو۔ وہ ابھی تک وہیں بیٹھا تھا اور جس قالب پر اپنے جہال کے جوتے کی بنائی کر رہا تھا، اس پر کھٹ کھٹ کیے جا رہا تھا۔ دس مٹی پچیاں گرین ہاؤس سے بھاگی آرہی تھیں۔ ان کی سرکٹیں آکھچوں سے، جو انھوں نے وہاں سے توڑے تھے، بھری ہوئی تھیں۔ وہ بھانسی

دوڑتا تقریباً پرنس آندرے سے ٹکرائیں۔ دونوں میں سے بڑی نے جب چھوٹے آقا کو دیکھا، اس کا رنگ فق ہو گیا۔ اس نے چھوٹی کا ہاتھ پکڑا اور اس کے ساتھ برج کے درخت کے پیچھے چھپ گئی۔ انھوں نے اتنا بھی نہ کیا کہ ان کے جواکو چے گر گئے تھے، انھیں اٹھانے رک جاتیں۔

پرنس آندرے سٹپٹا گیا۔ وہ برقی رفتار سے دوسری طرف گھوم گیا۔ وہ بچیوں پر قطعاً یہ ظاہر نہیں ہونے دینا چاہتا تھا کہ انھیں دیکھ لیا گیا ہے۔ اسے ننھی منی ڈری سہی پیاری پیاری لڑکی پر ترس آ گیا۔ وہ اسے دیکھنے سے گھبرا رہا تھا لیکن اس کے ساتھ ہی اسے محسوس ہو رہا تھا کہ وہ اپنی اس خواہش پر قابو نہیں پاسکتا۔ یوں جب سے دوسری انسانی رچسپیوں کے، جس کا اس کی اپنی رچسپیوں سے دور کا بھی واسطہ نہیں تھا، درجن کے جائز ہونے میں کوئی کام نہیں تھا، وجود سے آگاہی ہوئی، سکون و اطمینان کا ایک نیا جذبہ اسے سرشار کر گیا۔ صریحاً ان ننھی منی بچیوں کو ایک چیز کی شدید آرزو تھی۔ وہ ان مہتر آلوچوں کو بے جانا اور انھیں کھانا چاہتی تھیں لیکن اس کے ساتھ ان کی یہ خواہش بھی تھی کہ کوئی انھیں دیکھ اور پکڑ نہ لے۔ اور ان کی طرح پرنس آندرے بھی اس بات کا متنی تھا کہ وہ بھی اپنی ہم میں سرخرو ہو۔ وہ ایک بار پھر اس کی طرف دیکھے بغیر نہ رہ سکا۔ ادھر وہ تھیں کہ یہ سمجھتے ہوئے کہ اب خطرہ ٹل گیا ہے، اپنی سکرٹیں اوپر اٹھائے، پٹی مہین جیکھی آواروں میں ایک دوسرے سے کچھ کہتے اور کد کڑے لگاتے اپنی پناہ گاہ سے باہر نکل آئیں اور ان کے پتلے پتلے برہنہ اور دھوپ میں جھمکے پاؤں جتنا تیز دوڑ سکتے تھے، وہ شادوں و فرحان چراگاہ کی گھاس پر بھاگنے لگیں۔

گرد آلود جرنیلی سڑک سے، جس پر فوجی جوان سفر کر رہے تھے، ہٹ کر سواری کرنے سے پرنس آندرے قدرے تازہ دم ہو گیا لیکن ہالڈیز سے کچھ ہی دور رہا، جرنیلی سڑک پر پہنچ گیا۔ اس کی رجمنٹ نے ڈیم (بند) کے قریب عارضی پڑاؤ ڈال لیا تھا۔ وہ وہاں اس سے آگے نہ بڑھا۔ وہ پہرہ کا ایک بچ چکا تھا۔ گرد و غبار میں سورج سرخ گولے کی مانند نظر آ رہا تھا۔ وہ سیاہ کوٹ میں ملبوس تھا اور آفتاب کی تمارت اس کے جسم کو ناقابل برداشت انداز سے جلا اور بھون رہی تھی۔ فوجی آرام کر رہے تھے اور گرد و غبار کا باد ہمیشہ کی طرح ان کے سروں کے اوپر بے حس و حرکت معلق تھا۔ ہوا بند تھی۔ چنانچہ نہیں ٹل رہا تھا۔ جب پرنس آندرے بند کے برابر گزر رہا تھا، جھیل کی تازہ، سوندھی خوشبو اس کے نختوں میں گھسنے لگی۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ وہ پانی میں، خواہ یہ کتنی ہی گدلا ہو، گھس جائے۔ اس نے پانی کے ذخیرے پر نظر ڈالی۔ وہاں سے چپختے چلانے اور ہنسنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ ننھی منی جھیل کی سطح، جس پر ہنر کیچڑ کی تہہ جمی ہوئی تھی، واضح طور پر ایک فٹ بلند ہو چکی تھی اور اس کا پانی بند کے اوپر بہہ رہا تھا کیونکہ یہ برہنہ گورے انسانی جسام سے، جن کے ہاتھ، چہرے اور گردنیں انٹوں کی طرح سرخ تھے، اور جو پانی کو ادھر ادھر اچھال رہے تھے، بھری پڑی تھی۔ یہ تمام جینتے چلاتے، ہنستے کھانستے انسانی اجسام اس گدلے جو ہنر میں اس کا رپ (بھیلی) کی طرح، جسے کسی تنگ آبِ برتن میں بند کر دیا گیا ہو، ادھر ادھر ٹکراتے اور ٹھوکریں کھاتے پھر رہے تھے۔ دھپ دھپ کرتے اور کیچڑ کے چھینٹے اڑاتے اس ہجوم میں قہقہے اور چپچپے گونج رہے تھے اور یہی چیز ان کی حالت

حیرت انگیز بنادی تھی۔

تیسری کمپنی کے ایک فوجیوں سپاہی نے، جس کے بال سرخ تھے، وہ جس نے، پتی پنڈلی کے گرد سرخ پٹی باندھ رکھی تھی (پرنس آندرے اسے چماتا تھا)، اپنے سینے پر صلیب کا نشان بنایا، دوڑ کی اچھی ابتدا کرنے کے لیے وہ پیچھے ہٹا اور اس نے پانی میں چھلانگ لگا دی۔ ایک نان کمیشنڈ انفر، جس کا بدن دھوپ میں جھلسا ہوا تھا اور جس کے بال اور کپڑے ہمیشہ بے ترتیب نظر آتے تھے، پانی میں، جو اس کی کمر تک پہنچتا تھا، کھڑا ہو گیا اور اپنے ہاتھوں سے، جو سیاہ ہو رہے تھے، اپنے سر پر پانی ڈالے گا۔ وہ مطمئن تھا۔ اس کا کمرتی جسم بھول رہا اور خوشی سے اس کے نتھنے پھول رہے تھے۔ انسانوں کے ایک دوسرے کو دھپ دھپ تھکیاں لگانے، چیخنے اور باپنے کی آوازیں آرہی تھیں۔

کن رے پر، بند پر اور جو ہڑ کے اندر، ہر جگہ گورے، صحت مند، گھنے ہوئے انسانی اجسام تھے۔ کمیشنڈ انفر تھوخن، جس کی ننھی سی سرخ ناک تھی، بند پر کھڑا اپنے جسم پر تولیہ رکھ رہا تھا۔ وہ پرنس کو دیکھ کر عجوبہ ہو گیا تاہم اس نے اس سے بات کرنے کا حسیہ کر لیا۔

”ہیئر ٹیکسی لیکسی، خاصا مزہ آرہا ہے!“ اس نے کہا۔ ”آپ نہانا پسند فرمائیں گے؟“

”بہت گدلا ہے!“ پرنس نے برا سا منہ بنا کر جواب دیا۔

”ہم پلک جھپکنے میں اسے خالی کر دیں گے“ تھوخن نے کہا اور کپڑے پہنے بغیر جوانوں کو پانی سے باہر

لکائے بھاگا۔

”پرنس نہانا چاہتے ہیں۔“

”کون پرنس؟ ہمارے؟“ مختلف آوازیں سنائی دیں اور جوانوں نے اس کے لیے جو ہڑ خالی کرنے میں اتنی تیزی دکھائی کہ پرنس آندرے کو انھیں منع کرنے میں بڑی مشکل پیش آئی۔

اس نے سوچا کہ اس کے لیے بہترین یہی رہے گا کہ وہ سببان کے نیچے اپنے بدن پر پانی انڈیل لے۔

”گوشت، اجسام، توپوں کا ایندھن!“ اس نے اپنے برہنہ جسم کو دیکھتے سوچا اور اسے جھرجھری آگئی۔ اس پر کپکپاہٹ سردی سے نہیں بلکہ تقاخر کے اس حساس سے، جو گد لے پانی میں چھینٹے اڑاتے ننگے اجسام کو دیکھ کر اس کے دل میں پیدا ہوا تھا اور جو خود اس کی اپنی سمجھ سے ماورا تھا، طاری ہوئی تھی۔



سات اگست کی شام کو پرنس ہاگ راتیاں نے سولنسک شاہراہ پر واقع گاؤں میخانیلووکا میں اپنے پڑاؤ سے مندرجہ ذیل خط تحریر کیا۔

ڈیئر کاؤنٹ الیکسی آندریوچ (وہ خط آراک چیف کے نام لکھ رہا تھا لیکن اسے معلوم تھا کہ اسے اپنا نام بھی

پڑھئے گا، چنانچہ اس نے ایک ایک لفظ خوب جانچا پرکھا اور پھر تحریر کیا۔

میرا خیال ہے کہ فکٹر۔ (جیسا کہ وہ بار کئے و توتلی کو کہا کرتا تھا)۔ آپ کو مطلع کر چکا ہے کہ سمولنسک دشمن کے حوالے کر دیا گیا ہے۔ یہ تکلیف دہ ہے، افسوس ناک ہے اور ساری فوج کو مایوسی ہوئی ہے کہ اس انتہائی اہم مقام سے یوں من مائے طریقے سے دستبرداری اختیار کرنی گئی ہے۔ میں نے زبانی بھی اور بعد میں تحریری طور پر بھی، پرزور التجائیں کیں لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوا۔ میں اپنی عزت کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ بیوی میں زندگی بھر اس قسم کے تحفے میں گرفتار نہیں ہوا ہوگا۔ وہ اپنی نصف فوج بھی کٹوا دیتا، تب بھی سمولنسک پر قبضہ نہ کر سکتا۔ ہماری افواج جس طرح ٹری ہیں اور لڑ رہی ہیں، پہلے کبھی نہیں لڑی ہوں گی۔ میرے پاس پندرہ ہزار کی نفری تھی اور میں نے 35 گھنٹے تک دشمن کو اپنے قریب نہ پھٹکنے دیا اور اسے مار بھگا یا۔ لیکن خود وہ چودہ گھنٹے کے لیے بھی ڈٹے رہنے کے لیے تیار نہ ہوا۔ یہ ہماری سپاہ کی تذلیل ہے اور اس کے ماتھے پر کلک کا ٹیکا۔ اور جہاں تک اس کا تعلق ہے، میرا خیال ہے کہ اسے اب زندہ نہیں رہتا چاہیے (اس کے لیے یہ شرم سے ڈوب مرنے کا مقام ہے)۔ اگر وہ اخلاص بھیجے کہ ہمیں ہماری جانی نقصان اٹھانا پڑا تو یہ بات درست نہیں ہوگی۔ شاید چار ہزار کے لگ بھگ (جو ان کام آئے)، ان سے زیادہ بالکل نہیں، بلکہ اتنے بھی نہیں۔ لیکن اگر تعداد دس ہزار بھی ہوتی، پھر کیا، یہ جنگ ہے۔ اس کے برعکس دشمن کی جو نفری کھیت رہی، اسے شمار نہیں کیا جاسکتا۔۔۔

اگر ہم مزید دو دن بھی ڈٹے رہتے، اسے کتنا نقصان اٹھانا پڑتا؟ بہر حال فرانسیسیوں کو اپنی مرضی سے پیچھے ہٹنا پڑتا کیونکہ ان کے پاس اپنے جوانوں اور گھوڑوں کے لیے پانی کی بوند تک نہیں تھی۔ اس نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ وہ اپنی اختیار نہیں کرے گا لیکن اس نے اچانک مجھے پیغام بھیجا کہ وہ اسی رات پیچھے ہٹ رہا ہے۔ اس طریقے سے جنگ لڑنا ناممکن ہے، اس طرح تو ہم بہت جلد دشمن کو ماسکو پہنچ جانے دیں گے۔۔۔

افواہ گردش کر رہی ہے کہ آپ صلح کے بارے میں سوچ رہے ہیں۔ خدا نہ کرے کہ آپ صلح کے بارے میں سوچنا پڑے۔ اتنی قربانیاں دینے اور اس قسم کی بھڑکانہ پسائیاں اختیار کرنے کے بعد صلح کا ذول ڈالنا اس طرح تو آپ سارے روس کو اپنا مخالف بنالیں گے اور ہم سب کو روسی وردی پہنتے غار آئے گی۔ اگر نوبت یہاں تک پہنچ ہی گئی ہے، پھر بھی جب تک روس میں دم ختم ہے اور جب تک ایسے افراد، جو کمزور ہونے کی سکت رکھتے ہیں، موجود ہیں، ہمیں لڑتے رہنا چاہیے۔۔۔

کمان ایک آدی کے ہاتھ میں ہونا چاہیے، دو کے نہیں۔ آپ کا مشترکہ وزارت کا کام تو چلا سکتا ہے لیکن جرنیل کی حیثیت سے وہ ہر جی نہیں، بدترین ہے، اس کے باوجود ساری مادر وطن کا مقدر اس کے ہاتھوں میں دے دیا گیا ہے!۔۔۔ میں نے اپنی تحریر میں جس بے ہاکی کا مظاہرہ کیا ہے، اس کے لیے معذرت خواہ

ہوں، لیکن غصے اور جھلاہٹ سے میرا دماغ ماؤف ہو چلا ہے۔ یہ بات بالکل واضح ہے کہ جو شخص صلح نامہ طے کرنے اور فوج کی کمان فئسٹر کے سپرد کرنے کا مشورہ دیتا ہے، اسے لڑیں اور اسے ملکیت سے کوئی لگاؤ نہیں، درودہ ہم سب کی بھائی ویر بادی کے درپے ہے۔ چنانچہ میں صاف گوئی سے کام لے رہا ہوں اور آپ سے غریب گزارش کرتا ہوں کہ ملیشیا کو محاذ پر پہنچنے کا حکم دے دیا جائے کیونکہ فئسٹر ہمارے ان مہمانوں کو انہماکی ماہر انداز سے ماسکولے جا رہا ہے۔ ساری فوج شاہی ایڈری کاٹنگ وول فئسٹنگ کو زبردست شک و شبہ کی نظر سے دیکھتی ہے۔ اس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ ہم سے زیادہ نیوکلن کا وفادار ہے اور وہی فئسٹر کو اپنے میدانے مشورے دیتا رہتا ہے۔ میں اس کے ساتھ شخص شائستگی اور خوش خلقی سے ہی پیش نہیں آتا بلکہ ادنیٰ سپاہی کی طرح اس کی اعانت بھی کرتا ہوں حالانکہ میں اس سے سنٹر ہوں۔ بات تکلیف دہ ضرور ہے لیکن مجھے چونکہ اپنے امپراطور اور محسن سے محبت ہے، میں نے سر تسلیم خم کر دیا ہے۔ مجھے دکھ صرف اس بات کا ہے کہ ہمارے فرماں روا نے ہماری ویر ویر شجاع سپاہ اس قسم کے شخص کی تحویل میں دے دی ہے۔ فور فرمائیں کہ سپاہی کے دوروں میں ہمیں شخص تحکات کی بنا پر چند ہزار سے اوپر جوانوں سے محروم ہونا اور انہیں ہسپتالوں میں چھوڑنا پڑا ہے۔ اگر ہم نے (غصیم پر) حملہ کیا ہوتا تو یہ صورت پیش نہ آتی۔ خدا ارادے بتائیں اس بزدلی کے بارے میں روس۔ ہمارا پیار روس۔ کیا کہے گا۔ ہم اپنے خوبصورت اور بہادر وطن کو اس قسم کے رذیلوں کے حوالے کیوں کر رہے ہیں اور ریت کے ہر فرد کے دل میں غرت اور شرم کے جذبات کیوں ابھار رہے ہیں؟ آخر ذر کس بات کا؟ ہم کس سے خوف زدہ ہیں؟ اگر فئسٹر ارادے کا کچھ بے حوصلہ، مفر اور تاخیر پسند ہے، وہ بدترین خصائص کا مالک ہے، تو اس میں میرا کیا قصور؟ ساری فوج اس سے نالاں ہے اور اس پر ہر نوع کے تہرے بھیجتی رہتی ہے۔

6

مظاہر حیات کو جن لاتعداد خانوں میں تقسیم کیا جاتا ہے ان کو مجتمع کر کے دو زمرے بنائے جاسکتے ہیں: ایک وہ جس میں سوار کو تغلب حاصل ہو جاتا ہے، دوسرا وہ جس میں ہیت کو بالادستی مل جاتی ہے۔ پیٹرز برگ کی زندگی۔ جو رہن، قصباتی، صوبجاتی بلکہ ماسکو کی زندگی سے بھی جدا گانہ چیز ہے۔ اور خاص طور پر اس کے سیلونوں کے رنگ و رنگ اور چلن موخر الذکر زمرے میں شمار کیے جاسکتے ہیں۔ یہ وہ زندگی ہے جس میں کبھی کوئی تغیر رونما نہیں ہوتا۔ 1805 سے صورت حال کی نوعیت یہ تھی کہ نیوکلین سے کبھی ہماری صلح ہو جاتی اور کبھی نا جاتی۔ ہم آئیں بناتے اور ٹوڑتے رہے لیکن آنا پالو وونا اور ہیلین کے سیلون جیسے تھے دیسے ہی رہے۔ ایک کا عرصہ حیات سات سال پر جب کہ دوسرے کا پانچ سال پر محیط تھا۔ آنا پالو وونا کے سیلون میں جن لوگوں کا اجتماع ہوتا تھا، ہونا پارت کی

کامیابیاں انھیں ہمیشہ الجھن میں ڈالے رکھتیں، انھیں ن میں اور ان ناز برداریوں میں، جو یورپ کے حکمران اس سے روار کھتے تھے، کیلئے توڑ سڑش کی بو آتی رہتی تھی جس کا واحد مقصد درباری حلقوں کے لیے، جن کی آئنا پاولوونا نمائندگی کرتی تھی، ناگوار اور پریشان کن صورت حال پیدا کرنا ہوتا تھا۔ ہیلین کے گھر میں، جسے رومائشیف بنفسیہ اپنے قدم بیمنت لڑم سے نوازتا رہتا تھا کیونکہ وہ اسے غیر معمولی طور پر ذہین عورت تصور کرتا تھا، جو اصحاب اکٹھے ہوتے تھے، وہ 1812 میں بھی ”عظیم قوم“ اور ”عظیم آدمی“ کے بارے میں اس داہنا دانیسا سے باتیں کرتے تھے، جس طرح وہ 1808 میں کیا کرتے تھے اور فرانس کے ساتھ ہمارے جو ردابط منقطع ہوئے تھے، اس پر وہ افسوس کا اظہار کرتے رہتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ انجام کار دونوں اقوام میں صلح ہو جائے گی

حال ہی میں، جب سے زار نے فوج سے مرجعت اختیار کی تھی، ان حریف سیلونوں میں ایک قسم کی کھلبلی مچنے لگی تھی۔ اس کا نتیجہ بالہی خاصیت کے اظہار کی صورت میں نمودار ہوا تھا تاہم دونوں حلقوں کی مصیبت میں کسی فوج کی تبدیلی رونما نہیں ہوئی تھی۔ آئنا پاولوونا کے حلقے میں صرف وہی فرانسیسی، جو لانس میں بادشاہت کا سرورٹی نظام بحال کرنے کے حق میں بے پلک روئے کے حامل تھے، بار پاسکتے تھے اور وہاں حب الوطنی کا مظاہرہ کچھ اس قسم کی آر سے کیا جاتا تھا کہ کسی کو فرانسیسی تھیٹر میں نہیں جانا چاہیے اور یہ کہ فرانسیسی حائے کی دیکھ بھال پر حکومت کو جو اخراجات برداشت کرنا پڑتے ہیں، وہ ان اخراجات کے، جو فوج کی پوری کور پراٹھتے ہیں، برابر ہیں۔ جنگ کے متعلق خبریں بڑے ذوق و شوق سے اکٹھا کی جاتی اور پوری توجہ سے سنا جاتی تھی۔ اپنی فوج کے بارے میں صرف وہی خبریں، جن میں ان کی تعریف و تحسین کا پہلو نکلتا تھا، پھیلائی جاتی تھیں۔

ہیلین اور رومائشیف کے فرانس نواز حلقے میں دشمن کی بربریت اور جنگی مظالم کے متعلق خبروں کی تردید کی جاتی تھی، در صلح جوئی کے بارے میں نپولین کی مساعی پر بحثیں کی جاتی تھیں۔ وہاں ان لوگوں کے، جو اس نوعیت کے مشورے دیتے تھے کہ مادر امیرا طورہ کی سرپرستی میں چلنے والی زنانہ تعلیمی درسگاہیں اور دربار جلد از جلد قازان منتقل کرنے کے انتظامات کیے جانا چاہئیں، لئے لیے جاتے تھے۔ ہیلین کے حلقے میں جنگ کو عام طور پر فوجی قوت کے رکی اظہار کا وسیلہ سمجھا جاتا تھا اور یہ خیال ٹک رہا جاتا تھا کہ جنگ کا یہ سلسلہ بہت جلد صلح پر منہج ہو جائے گا۔ وہاں اس نقطہ نظر کو کہ معاملے کا فیصلہ گوہر و دھنیں بلکہ وہ لوگ، جن کے ذہن رسا کی یہ پیداوار تھی، کریں گے، بڑی قبولیت حاصل تھی۔ (اس نقطہ نظر کا راہی ہیلین تھا۔ وہ اب پیئر برگ آچکا تھا اور ہیلین کے سیلون میں، جہاں ہرزبرگ اور طباع نو جوان جانا اپنے شایان شان تصور کرتا تھا، باقاعدگی سے آتا جاتا تھا۔) اہالیان ماسکو کی پر جوش حب الوطنی کی، جس کی خبرز رکی واپسی کے ساتھ پیئر برگ پہنچ چکی تھی، ہیلین کے سیلون میں طنزیہ اور انتہائی ظریفانہ انداز سے بھداڑائی جاتی تھی۔ ایسے اس ضمن میں خاصا خاص انداز اختیار کیا جاتا تھا۔

اس کے برعکس آئنا پاولوونا کے حلقے کے لوگ اہالیان ماسکو کے جوش و خروش پر داہانہ مسرت کا اظہار کرتے تھے، وروہ اس کا ذکر یوں کرتے تھے جیسے پلونا رگ¹³ قدام کے کارناموں کا کرتا ہے۔ پرنس واسیلی، جو ابھی تک اپنے

شاہد عہد پر قابض تھے، ان دونوں کے مابین درمیانی کڑی تھی۔ وہ "ma bonne amie" آتنا پاولوونا کے ہاں بھی جاتا اور اپنی بیٹی کے "Salon diplomatique" میں بھی۔ دونوں جگہوں پر جانے کا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ وہ پراگندہ خیالی کا شکار ہو جاتا۔ اسے جو باتیں آتنا پاولوونا کے ہاں کہنا چاہیے تھیں، وہ انھیں ہیلین کے ہاں کہہ دیتا اور جو باتیں اسے ہیلین کے ہاں کرنا چاہیے تھیں، وہ انھیں آتنا پاولوونا کے ہاں اگل دیتا۔

زور کی آمد کے کچھ ہی عرصہ بعد پرنس واسلی نے آتنا پاولوونا کے ہاں گفتگو کے دوران میں بارے کلمے دتولی کو زبردست تنقید کا نشانہ بنایا۔ تاہم کمانڈر انچیف کے مقرر کیا جانا چاہیے، اس بارے میں وہ کوئی واضح رائے قائم نہ کر سکا۔ ایک مہمان نے، جسے عام طور پر ¹⁴ "Un homme de beaucoup de mérite" کہا جاتا، بتایا کہ اس کی اس روز کس طرح کو تو زوف سے، جو پشیرز برگ لیشیا کا نیا سربراہ منتخب ہوا تھا اور جسے اس نے اس روز وزارت خزانہ میں رٹروڈوں کی بھرتی کے سلسلے میں (ٹریبونل کے) اجلاس کی صدارت کرتے دیکھا تھا، ملاقات ہوئی تھی۔ اس نے محتاط انداز سے رائے دی کہ کو تو زوف ایک ایسا شخص ہے جو تمام شر نظر پر پورا اترتا ہے۔ آتنا پاولوونا نے اس مسکراہٹ سے تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ کو تو زوف نے زار کو آزرده کرنے کے علاوہ اور کچھ نہیں کیا۔

"اُمرا کی اسمبلی میں میں یہی بات متعدد مرتبہ ان کے گوش گزار کر چکا ہوں،" پرنس واسلی نے مداخلت کرتے ہوئے کہا، "لیکن کیا کیا جائے کوئی سنتا ہی نہیں۔ میں نے ان سے کہا تھا کہ اگر انھوں نے اسے لیشیا کا سربراہ منتخب کیا، اوپر طور خوش نہیں ہوں گے، لیکن انھوں نے سنی ان سنی ایک کر دی۔ اصل میں ان سب پر حزب اختلاف کا کردار ادا کرنے کا خط سوار ہے،" اس نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "درود یہ سب کچھ کس کے لیے کر رہے ہیں؟ محض اس لیے کیونکہ وہ اہالیان ماسکو کے احقانہ جوش و خروش کی نقای کرنا چاہتے ہیں،" پرنس واسلی نے کہا۔ وہ ایک نکلے کے لیے یہ بھول گیا تھا کہ صرف ہیلین کے حلقے میں اس جوش و خروش کا خاکہ اڑایا جاسکتا ہے لیکن آتنا پاولوونا کے حلقے میں یہ ایک ایسی چیز تھی جسے بنظر تعین دیکھا جانا چاہیے۔ لیکن وہ فوراً سنبھل گیا۔ "کیا کو تو زوف کو جو روس کا معمر ترین جرنیل ہے، یہ بات چھٹی ہے کہ وہ اس ٹریبونل کی صدارت کرنا پھرے؟ اسے اس قسم کی مشقت سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ انھوں نے ایک ایسے شخص کو، جو گھوڑے پر چڑھ نہیں سکتا، کونسل کے اجلاس میں سو جاتا ہے، اخلاقی اعتبار سے جس کا کردار شرم ناک ہے، کمانڈر انچیف کیسے بنا دیا؟ بخارست میں اس نے کیا ٹیک نائی کائی؟ میں جرنیل کی حیثیت سے اس کے اوصاف کا ذکر نہیں کر رہا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا ہم اس جیسے زمانے میں کسی نجیف و نزار، اندھے۔ ہاں، بالکل اندھے۔ بڑے پھوس کا تقرر عمل میں لاسکتے ہیں؟ اندھے جرنیل کی تقرری، کیا لا جواب انتخاب ہے! اسے تو کچھ بھی نظر نہیں آتا! اس سے شاید آنکھ پھولی

"my good friend"۔ "میری عزیز دوست"

"ڈیپریک (سفارتی) سیلون۔"

"معدود خویوں کا مالک آدمی۔"

کھانا ہے؟ اسے قطعاً کچھ نظر نہیں آتا!“

کسی نے اس کی باتوں کی تردید نہ کی۔

24 جون کو یہ نقطہ نظر بالکل صحیح تھا لیکن 29 جون کو کو تو زوف کو پرنس کا خطاب مرحمت ہوا۔ یہ عنایت بے غایت

اس خواہش کی تھی کہ شاید اس سے چھٹکارا حاصل کرنے کی سبیل کی گئی ہے۔ اس صورت میں

پرنس واسیلی کی رائے پھر بھی صحیح قرار پاتی تاہم وہ اس کا اظہار کرنے کی طرف استنامائل نہیں تھا۔ تاہم آٹھ اگست کو

ایک کمیٹی کا، جرنیلڈ مارشل (پرنس) سالتی کوف، آراک چیف، دیاز میتیوف، پوجن اور کوچوبی پر مشتمل تھی، جنگی

کارروائیوں کا جائزہ لینے کے لیے اجلاس منعقد ہوا۔ کمیٹی اس نتیجے پر پہنچی کہ ہماری ناکامیوں کا سبب منقسم کمان ہے

اور اگرچہ کمیٹی کے ارکان کو بخوبی علم تھا کہ دالنی سلطنت کو تو زوف کو ناپسند کرتا ہے، انھوں نے مختصر سوچ بچار کے بعد

اتفاق رائے سے یہ مشورہ دینے کا فیصلہ کیا کہ اسے کمانڈر انچیف مقرر کر دیا جائے۔ اسی روز کو تو زوف کو کمانڈر انچیف

کے عہدے پر تعینات کر دیا گیا اور اسے فوجوں، دوران کے زیر قبضہ علاقوں پر مکمل اختیارات تفویض کر دیے گئے۔

نواگست کو آٹنا پاولوونا کے ہاں ایک بار پھر پرنس واسیلی کی ”متعدد خوبیوں کے مالک“ شخص سے ملاقات

ہوئی۔ (اس شخص کو توقع تھی کہ مادر امپراطورہ کی زیر نگرانی جو تعلیمی اور رے کام کر رہے تھے، اسے ان میں سے کسی کا

ٹرشی مقرر کر دیا جائے گا، چنانچہ وہ آٹنا پاولوونا کے اشاروں پر چلنے کے لیے تیار تھا۔) پرنس واسیلی فاتح کی طرح

کمرے میں داخل ہوا۔ اس کی یوں باچھیں کھلی جا رہی تھیں جیسے اس کے دل کی مراد پوری ہو گئی ہو۔

”خوب! آپ لوگوں نے زبردست خبر سن لی؟ پرنس کو تو زوف کمانڈر انچیف مقرر ہو گئے ہیں! تمام

اختلافات بالائے طاق رکھ دیے گئے ہیں۔ میں بہت خوش ہوں، بس کچھ نہ پوچھیں کہ کتنا خوش!“ پرنس واسیلی

نے کہا۔ ”آخر کار ہمیں مرد بچہ دستیاب ہوئی گیا!“ اس نے تمام (حاضرین) محفل کو درشت اور معنی خیز نظروں

سے دیکھتے ہوئے کہا۔

اپنے من پسند عہدے کو حاصل کرنے کی خواہش کے باوجود ”متعدد خوبیوں کا مالک“ شخص پرنس واسیلی کو

اس کی سابق رائے یاد دلانے سے گریز نہ کر سکا۔ (آٹنا پاولوونا کے ڈرائنگ روم میں اس قسم کا انداز گفتگو پرنس واسیلی

اور خود آٹنا پاولوونا کی، جس نے اس خبر کا خیر مقدم اتنے ہی جوش و خروش سے کیا تھا، وائسٹ میں آداب کے منافی تھا

لیکن اس سے رہانہ گیا۔)

”لیکن، پرنس، وہ تو ناہنایاں!“ اس نے پرنس واسیلی کو اس کے اپنے الفاظ یاد دلاتے ہوئے کہا۔

”فصول، واهیات انھیں اچھا بھلا دکھائی دیتا ہے!“ پرنس واسیلی نے کھٹکھٹاتے کھٹکتے آواز میں تیز تیز

بولتے ہوئے کہا۔ اپنی اس کھٹک اور کھٹکار کے ذریعے وہ تمام مشکلات سے پیچھا چھڑا لیتا تھا۔ ”انھیں اچھا بھلا

دکھائی دیتا ہے!“ اس نے اپنی بات دہرائی۔ ”اور جس بات پر مجھے خاص طور پر خوش ہوئی ہے، وہ یہ ہے کہ امپراطور

نے انھیں تمام افواج اور علاقوں پر پورے اختیارات سونپ دیے ہیں۔ یہ اختیارات کسی کمانڈر انچیف کو اس سے

نہیں مے تھے۔ وہ دوسرا autocrat¹⁷ ہے، اس نے فاتحانہ انداز سے مسکراتے ہوئے کہا۔
”خدا کرے، خدا کرے!“ آٹنا پاولوونا نے گروہ لگائی۔

”متعدد خوبیوں کا مالک“ شخص، جو درباری حلقوں میں ابھی مبتدی تھا، آٹنا پاولوونا کی سادہ رائے کو صحیح ثابت کر کے اس کی خایہ بوسی کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ وہ گویا ہوا:

”سنا ہے کہ امپری طور کو تو زوف کو یہ اختیارات دینے میں متامل تھے۔ شنید ہے کہ جب انھوں نے کو تو زوف سے یہ فرمایا کہ تمہارا فرماں روا اور تمھاری، وروطن تمھیں یہ اعزاز دے رہے ہیں، وہ اس نوخیز روشیرہ کی طرح، جسے جو کوئٹے¹⁸ پر تھ کر سنا کی جارہی ہو، شرماتے گئے۔“

”شاید وہ دل سے یہ نہ چاہتے ہوں،“ آٹنا پاولوونا نے اظہار خیال کیا۔

”ارے نہیں، بالکل نہیں،“ پرنس واسیلی نے مال پیلے ہو کر احتجاج کیا۔ اس کے لیے ب کسی دوسرے شخص کو تو زوف پر ترجیح دینا ممکن نہیں رہا تھا۔ اس کی رائے میں کو تو زوف نہ صرف بد بات خود قابل تحسین تھا بلکہ ہر شخص اس کی پرستش کرتا تھا۔ ”نہیں، یہ ناممکن ہے،“ اس نے کہا۔ ”امپری طور نے اس کی ہمیشہ بڑی تہر کی ہے۔“

”خدا کرے کہ کو تو زوف صحیح معنوں میں اختیارات سنبھال لیں اور کسی کو اپنے پھٹے میں ٹانگ نہ اڑانے دیں۔“ des batons dans les roues۔“ آٹنا پاولوونا نے کہا۔

پرنس واسیلی نوراً سمجھ گیا کہ ”کسی“ سے کون مراد ہے اور اس نے زیر لب کہا

”مجھے معلوم ہے اور یہ بات بالکل صحیح ہے کہ کو تو زوف نے واضح طور پر یہ شرط لگائی تھی کہ زار یوج فوج میں نہیں رہیں گے۔ تمھیں معلوم ہے کہ انھوں نے امپری طور سے کیا کہا تھا؟“

اور پرنس نے وہ الفاظ، جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ کو تو زوف نے زار سے کہے تھے، دہرائے۔

”اگر ان سے غلطی کا ارتکاب ہوا، میں انھیں سزا نہیں دے سکتا اور اگر انھوں نے اچھی کارکردگی کا مظاہرہ

کیا، میں انھیں جزا نہیں دے سکتا۔ دیکھا، کتنا اثر فنگاہ شخص ہے میں انھیں بد توں سے جانتا ہوں۔“

”یہ بھی سنا گیا ہے،“ ”متعدد خوبیوں والے شخص“ نے، جو درباریوں کی موقع شناسی سے محروم تھا، کہا، ”کہ

ہزار کیسی لیلیٰ نے واضح انداز سے یہ شرط بھی لگائی تھی کہ خود امپری طور بھی فوج میں شامل نہیں ہوں گے۔“

اس کے اس الفاظ پر پرنس واسیلی اور آٹنا پاولوونا دونوں نے بیک وقت اس سے نگاہیں پھیر لیں، جن

دماغ سے ایک دوسرے کی جانب دیکھا اور اس کی سادہ لوحی پران کی آہ نکل گئی۔

دب پٹیرز برگ میں یہ واقعات رونما ہو رہے تھے، فرانسیسی سمولنک میں سے گزرنے کے بعد ماسکو کے قریب

سے قریب تر پہنچتے جا رہے تھے۔ نیولین کا سوانح نگار، تنج، اس کے دیگر سوانح نگاروں کی طرح، اپنے ہیرو کو حق بجانب قرار دینے کی کوشش کرتا ہے اور کہتا ہے ”نیولین کی اپنی مرضی کے برعکس حالات اسے ماسکو کے درود یوار کی جانب دھکیل کرے گئے۔“ اپنے اس دعویٰ میں وہ اتنا ہی صحیح ہے جتنے کہ اس کی قبیل کے دوسرے مورخین جو تارنجی واقعات کی توجیہ فرد واحد کے منشا میں تلاش کرتے ہیں۔ وہ اتنا ہی صحیح ہے جتنے کہ اس کے ہم پیشہ روسی بھائی بند جو یہ دعویٰ کرتے نہیں تھکتے کہ روسی جرنیلوں کا حسن تدبیر اسے ماسکو کھینچ لایا تھا۔ یہاں ”قانون استقامت“ کے، جو ماضی کو اس طور پیش کرتا ہے کہ وہ ان واقعات کی، جو بعد میں پیش آتے ہیں، محض تیاری معلوم ہوتا ہے، عداوہ ”قانون سکانیت“ بھی دخل ہو جاتا ہے اور یوں سارا معاملہ گڈ ہو جاتا ہے۔ خطرناک کے، چھٹے کھلاڑی کو کسی بازی میں پٹے کے بعد یہ دانش یقین ہو جاتا ہے کہ اس کی ناکامی کا سبب یہ ہے کہ وہ کوئی غلط چال چل بیٹھا ہے اور وہ اپنی اس غلطی کو، جو کھیل کے ابتدائی مراحل میں اس سے سرزد ہوئی تھی، ڈھونڈنے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ یہ بھول جاتا ہے کہ کھیل کے ہر مرحلے میں ایسی ہی فاش غلطیوں کا ارتکاب ہوتا رہا ہے اور یہ کہ کوئی چال بھی بے عیب نہیں قرار دی جاسکتی۔ جس غلطی پر وہ اپنی توجہ مرکوز کرتا ہے، اس لیے اس کی نظر میں آ جاتی ہے کیونکہ اس کے حریف نے اس سے بھرپور فائدہ اٹھایا ہوتا ہے۔ جنگ کا کھیل اس سے کہیں زیادہ پیچیدہ ہوتا ہے۔ اسے وقت کی بعض مخصوص حدود کے اندر کھیلنا پڑتا ہے۔ یہاں مسئلہ فرد واحد کے منشا کا نہیں کہ (خطرناک کے کھلاڑی کی طرح) اس کا جس طرح جی چاہے، بے جان اشیاء کو دھرا دھر کرتا رہے، یہاں اس کا سامنا مختلف انسانوں کے منشاؤں سے ہوتا ہے۔ یہ منشا ایک دوسرے سے تصادم ہوتے ہیں جب کہیں کوئی نتیجہ برآمد ہوتا ہے۔

سولسک کے بعد نیولین نے دارا گو بڑے آگے دیا اور پھر نہ ریوڈز انش چے کے مقامات پر جنگ پنا کرنے کی کوشش کی لیکن ہوا یہ کہ لاتعداد مرتبہ مختلف حالات نے مل جل کر کچھ ایسی صورت اختیار کی کہ روسی ماسکو سے ستر میل ادھر، درود یو پہنچنے سے قبل مقابے کے لیے تیار نہ ہو سکے۔ نیولین نے دیاڑ، سے براہ راست، ماسکو پر چڑھائی کا حکم دے دیا۔

Moscou, la capitale de ce grand empire, a ville sacrée
des peuples d, Alexandre Moscou avec ses innombrables
eglises en forme de pagodes Chinoises!

نیولین کے (ذہن میں رہے بے) اس ماسکو نے اس کے تخیل کو دم نہ لینے دیا۔ دیاڑ ما سے تار یوڈز انش چے تک سفر کے دوران میں وہ نیلیا سرنگ گھوڑے پر، جو مزے مزے دہکی چلتا تھا، سوار رہا۔ اس کے ہمراہ شاہی دستے کے جوان، اس کا باڈی گارڈ، اس کے خدمت گار اور ایڈی کا ٹنگ تھے۔ اس کا چیف آف سٹاف، بیخ تھے، ایک

• قانون استقامت (the law of retrospective ness)

• سکانیت: (reciprocity)

• اس عظیم الشان سلطنت کا صدر مقام، ماسکو، ایکسٹنڈ کی اقوام کا شہر مقدس، یعنی پکوزوں سے مشابہ لاتعداد کلیوں کا شہر، ماسکو۔

روسی فیدی کو جسے گھڑسوار فوج نے پکڑا تھا، تفتیش کی بھٹی میں گزارنے کے لیے پیچھے رہ گیا تھا۔ اپنے ترجمان للوخی وائیچے سے مل کی، جو اس کے پیچھے پیچھے آ رہا تھا، مصیبت میں سرپٹ گھوڑا دوڑاتے وہ نیولین کے ساتھ آگیا اور اس نے مسکراتے ہوئے اپنا گھوڑا روک لیا۔

”ہونہ؟“ نیولین نے پوچھا۔

”پلا توف کا قازق۔ کہتا ہے کہ پلا توف کی کور بڑی فوج میں شامل ہو رہی ہے اور یہ کہ کو تو زوف کو کاٹڈرا چیف مقرر کر دیا گیا ہے۔ بڑا تیز طرار اور باتونی شخص ہے۔“

نیولین مسکرا پڑا۔ اس نے حکم دیا کہ قازق کو گھوڑا دیا جائے اور اسے اس کی خدمت میں پیش کیا جائے۔ وہ خود اس سے بات کرنا چاہتا تھا۔ متعدد ایجوٹنٹ گھوڑے دوڑاتے واپس چلے گئے اور ایک گھنٹے بعد زرعی غلام لا اور دشکا کو، جسے زرعی سو ف نے دستوف کی تحویل میں دے دیا تھا، گھوڑے پر بٹھا کر نیولین کے حضور پیش کر دیا گیا۔ اس کے نیچے زائیسو رسالے کی زمین تھی۔ اس نے اردلی کا کوٹ پہن رکھا تھا اور چہرے مہرے سے معلوم ہوتا تھا کہ آرمی میار ہے کن ہوئی ہے اور پیسے ہوئے ہے۔ نیولین نے اسے اپنے برابر چلنے کا حکم دیا اور اس پر جرح کرنے لگا:

”تم قازق ہو؟“

”جی، حضور، قازق۔“

”قازق کو“ یہ واقعہ قلم بند کرتے ہوئے تیغ لکھتا ہے: ”یہ معلوم ہی نہیں تھا کہ وہ کس شخص کی مصیبت میں ہے کیونکہ نیولین کے سیدھے سادے لباس میں کوئی ایسی چیز نہیں تھی جس سے کسی پورے کے ذہن میں یہ شائبہ بھی ہوتا کہ وہ کسی امپراطور کی خدمت میں حاضر ہے، چنانچہ وہ جنگی واقعات کے بارے میں کھل کر اور انتہائی بے تکلفی سے باتیں کرتا رہا۔“

قصہ دراصل یہ تھا کہ ایک روز پہلے لا اور دشکا نے اتنی پی اتنی پی کہ وہ اپنے آپے میں نہ رہا اور اس نے اپنے آقا کے لیے ڈنڈ بھی تیار نہ کیا۔ اس پر اس کی زبردست ٹھکانی ہوئی اور اسے سرخیوں کی تلاش میں گاؤں بھیج دیا گیا۔ وہاں دولٹ مار میں جت گیا تا آنکہ وہ فرانسیسیوں کے ہتھے چڑھ گیا۔ انھوں نے اسے گرفتار کر لیا اور فیدی بنالیا۔ لا اور دشکا ان کندکنا تراش، ڈھیٹ اور بد لحاظ کا سہ لیسوں میں شامل تھا جو گھٹ گھاٹ کا پانی پی چکے ہوتے ہیں اور اب ہر کام میں، جو وہ کرتے ہیں، عیاری اور مکر و فریب استعمال کرتا رہی تصور کرتے ہیں، اپنے آقاؤں کی ہر خدمت بجالانے کے لیے کمر بستہ رہتے ہیں اور ان کے سفل جذبات، خاص طور پر وہ جو نخوت پسندی اور کم عمری کی پیداوار ہوتے ہیں، معلوم کرنے کے لیے بے تاب رہتے ہیں۔

جب لا اور دشکا نے اپنے آپ کو نیولین کی، جس کی شناخت متعین کرنے میں اسے ذرا بھی دقت پیش نہ آئی، محبت میں پایا، اسے ذرا بھی حجاب نہ آیا بلکہ وہ شخص نے اپنے آقا کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے پوری کوشش کرنے لگا۔

وہ خوب جانتا تھا کہ یہ نیولین ہے لیکن جس طرح رستوف یا سارجنٹ میجر کی اسے ڈنڈوں سمیت موجودگی میں پرکونی لرنز و طاری نہیں کر سکتی تھی، نیولین کی موجودگی بھی اسے خائف نہ کر سکی کیونکہ اس کے پاس تھا ہی کیا جس سے سارجنٹ میجر یا نیولین اسے محروم کر سکا۔

چنانچہ اس کی زبان کینچی کی طرح چلتی رہی اور وہ تمام گپ شپ، جو اس نے ارد لیوس سے کی تھی، دہراتا رہا۔ ان میں سے بیشتر باتیں صحیح تھیں لیکن جب نیولین نے اس سے پوچھا کہ کیا روسیوں کے خیال میں وہ نیولین کو شکست دے سکیں گے یا نہیں، لاورڈشکا نے اپنی آنکھیں سکیڑیں اور سوچنے لگا۔

جیسا کہ اس قسم کے آدمیوں کو ہر چیز میں عیاری نظر آتی ہے، اسے بھی اس سوال میں ایک طرح کی ڈھکی چھپی عیاری دکھائی دی۔ چنانچہ اس کی بھوسیں تن گئیں اور اس نے کوئی فوری جواب دینے سے جتناب کیا۔

”بات یہ ہے،“ اس نے سوچتے ہوئے جواب دیا، ”اگر لڑائی ابھی اور اسی وقت چھڑ جائے، میدان آپ کے ہاتھ رہے گا لیکن، اگر تین دن کی تاخیر ہوگئی، پھر معاملہ طوں پکڑ جائے گا۔“

لوشی ڈآئیدے ویں نے مسکراتے ہوئے نیولین کے سامنے اس کی تعبیریوں کی۔ ”اگر لڑائی اگلے تین روز کے اندر اندر ہوگئی، جیت فرانسیسیوں کی ہوگی لیکن اگر یہ بعد میں چھڑی پھر خدا جانے کہ نتیجہ کیا نکلے۔“

اگرچہ بظاہر نیولین کا موڈ خوشگوار تھا، لیکن وہ مسکریا نہیں اور اس نے فقرہ دوبارہ سنوایا۔

لاورڈشکا اس کی یہ کیفیت بھانپ گیا اور اس نے اسے مزید خوش کرنے کے لیے (وہ جھوٹ موٹ ہی ظاہر کر رہا تھا کہ اسے معلوم ہی نہیں کہ وہ کون ہے) بات بڑھاتے ہوئے کہا:

”ہمیں معلوم ہے کہ آپ کے پاس ہونا پارت ہیں اور یہ کہ انھوں نے روئے زمین کے ہر شخص کو شکست دی ہے لیکن ہم ڈراما مختلف قسم کے لوگ ہیں۔“ اسے یہ قطعاً معلوم نہیں تھا کہ اس نے جب، لوشی کے بارے میں یہ شنی کیسے اور کیوں بھاردی تھی۔

ترجمان نے اس جملے کا ترجمہ اعتدائی الفاظ کے بغیر کیا اور ہونا پارت مسکرانے لگا۔

”نویان تازق اپنے عظیم اور جلیل القدر شریک گفتگو کے ہونٹوں پر مسکراہٹ لانے کا سبب بنا،“ تیخ لکھتا ہے۔

چند قدم خاموشی سے چلنے کے بعد نیولین تیخ نیے کی جانب متوجہ ہوا اور بولا: ”میں یہ دیکھنا چاہوں گا کہ (دریائے) ڈان کے اس طفل کو جب یہ معلوم ہوگا کہ جس شخص سے وہ مخاطب ہے، وہ بذات خود اس پر اظہار ہے، وہی اس پر اظہار جس نے اپنا غیر فانی اور فاتح نام ابراہیم مصر پر کندہ کر دیا ہے، تو اس پر کیا اثر ہوتا ہے۔“

لاورڈشکا کو اس حقیقت سے آگاہ کر دیا گیا۔

لاورڈشکا کو احساس ہوا کہ اسے یہ اس لیے بتایا گیا ہے تاکہ اس کے پاؤں تلے کی مٹی نکالی جاسکے اور نیولین یہ توقع کر رہا ہے کہ وہ اتنا بھونچکا ہو جائے کہ اس کا منہ کھلے کا کھلا رہ جائے۔ لاورڈشکا بھی ایک کایاں تھا۔ اپنے نئے اکاؤں کی خواہش پوری کرنے کے لیے وہ جھٹ پٹ اداکاری کرنے لگا اور یوں ظہر کرنے لگا جیسے (رعب شاہی

ہے) اس کی واقعی سٹی گم ہو گئی ہو، ہوش و حواس جاتے رہے ہوں، اور اس نے اپنا منہ یوں ہٹا لیا جیسے اس پر دشت برسنے لگی ہو۔ اس کی یہ کیفیت تب ہوتی تھی جب اسے کوڑوں سے پٹائی کے لیے باہر لے جایا جاتا تھا۔ ”ہوئی پولین کے تر جہان نے اپنا فقرہ ہمیں کیا“ ”تبیغ لکھتا ہے“ ”قازق کا منہ حیرت سے کھلے کا کھلا رہ گیا۔ اس نے اپنی زبان سے مزید ایک لفظ بھی نہ کہا بلکہ گھوڑے پر سوار چپ چاپ آگے چلا رہا۔ اس کی نگاہیں مسلسل اس قازق پر، جس کی شہرت مشرق میں گھاس کے میدانوں (steppes) کے پار اس کے کانوں تک پہنچ چکی تھی، جمی رہیں۔ اس کی چب زبانی پلک جھپکنے میں پادر ہوا ہو گئی اور اس کے معصوم اور گم صم چہرے پر بیت طاری ہو گئی۔ پولین نے اسے خد مخواهہ انعم دیا اور اسے اس طرح رہا کرنے کا حکم دے دیا جس طرح کسی پرندے کو اس کے آبائی وطن میں کھلا چھوڑ دیا جائے۔“

پولین آگے چلا رہا۔ وہ ماسکو کے بارے میں، جو اس کے خیال میں سہایا ہوا تھا، خواب دیکھتا جا رہا تھا۔ جب کہ وہ ”پرندہ، جسے اس کے آبائی وطن میں کھلا چھوڑ دیا“ گیا تھا، راستے میں وہ کہتی، جو اس نے اپنے ساتھیوں کو سنا نا نمی، گھڑتا گھڑاتا واپس ہماری بیرونی چوکیوں میں پہنچ گیا۔ جو کچھ حقیقتاً ظہور پذیر ہوا تھا، اس کا اسے بتانے کا قطعاً کوئی ارادہ نہیں تھا کیونکہ اس کا خیال تھا کہ یہ بتانے کے قابل نہیں۔ اس نے قازق تلاش کیے، ان سے اپنی رجنٹ کے جواب چاتوف کے لشکر میں شامل تھی، بارے میں دریافت کیا اور شام ہوتے ہوتے اپنے آقا کولائی رستوف کا، جواب یا نکادو میں منقسم تھا، اتنا چتا معلوم کر لیا۔ رستوف الین کی معیت میں بالحدہ دیہات کا چکر لگانے کے لیے گھوڑے پر سوار ہو رہا تھا۔ اس نے لا اور دیشکا کو دوسرے گھوڑے پر بٹھایا اور اسے اپنے ساتھ لے گیا۔

8

جیسا کہ پرنس آنڈرے نے فرض کر لیا تھا، پرنس ماریا ماسکو نہیں گئی تھی اور نہ خطرے کی زد سے باہر تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ آل پاچ کی سولنسک سے واپسی کے بعد معمر پرنس اچانک خواب سے بیدار ہو گیا ہے۔ اس نے حکم دیا کہ گاؤں کے وہ جوان، جو طیشیا میں شامل ہیں، فوجی خدمات سرانجام دینے کے لیے طلب کرے جائیں اور انھیں مسلح کر دیا جائے۔ اس نے کمانڈر انچیف کے نام خط لکھا کہ اس کا ارادہ بالڈلز میں ہی ٹھہرے رہنے اور آخر دم تک اپنے دفاع کرنے کا ہے۔ تاہم اس نے یہ بات کمانڈر انچیف کی صوابدید پر چھوڑ دی کہ وہ چاہے تو بالڈلز کا، جہاں روس کا ایک معمر ترین جرنیل گرفتار ہونے یا موت کو گلے لگانے کی تیاریاں کر رہا ہے، دفاع کرنے کے لیے کوئی، قدام کرے، چاہے نہ کرے۔ اس کے ساتھ ہی اس نے اپنے گھروالوں کے سامنے اعلان کر دیا کہ وہ کہیں نہیں جائے گا بلکہ بالڈلز میں ہی قیام کرے گا۔

اگرچہ وہ خود تو نہیں جانا چاہتا تھا، تاہم اس نے دیال اور چھوٹے پرنس کی معیت میں پرنس ماریا کو باگو چارافو اور وہاں سے انھیں ماسکو پہنچانے کے انتظامات مکمل کر لیے۔ کہاں تو پرنس ماریا کا باپ اتنا سرد مہر اور بے حس تھا

اور کہاں اب (اس کی خاطر) اسے، تنی مصروفیت کہ نہ دن کو چین اور نہ رات کو آرام، اس پر بس ہر وقت کچھ نہ کچھ کرنے کی دھن سوار رہتی تھی۔ اس کی ان سرگرمیوں نے پرنس ماریا کے حواس باختہ کر دیے۔ وہ اسے یوں تنہا چھوڑ دینے کا حوصلہ نہ کر سکی اور اس نے اپنی زندگی میں پہلی مرتبہ اس کے حکم کی خلاف ورزی کرنے کی جرأت کی۔ اس نے جانے سے انکار کر دیا اور اس کے باپ کا غصہ اس پر قہر بن کر نازل ہونے لگا۔ پرنس نے ہر اس نا انصافی اور زیادتی کا، جو اس نے کبھی اپنی بیٹی سے روا رکھی تھی، اعادہ کیا اور اسے مورد الزام ٹھہرانے کے لیے اسے بتانے لگا کہ اس نے اسے ہلکان کر دیا ہے، اس کی پٹے سے چیخ چیخ کرادی ہے، اس کے بارے میں وہ اپنے دل میں بدترین قسم کے شکوک و شبہات پالے ہوئے ہے، اور اس نے اس کی زندگی میں بس گھولنا اپنا مقصد حیات بنالیا ہے۔ پھر اس نے یہ کہہ کر اسے اپنے سنڈی روم سے باہر نکال دیا، ”اگر تم بالڈ ہلز سے نہیں جاتیں، نہ جاؤ، میری بلا سے، لیکن مجھے کبھی یہ مت جنانا کہ تم ابھی زندہ ہو اور نہ کبھی مجھے اپنی شکل دکھانا، ورنہ مجھ سے کوئی برا نہیں ہوگا۔“ پرنس ماریا کی جان سٹھی میں آچکی تھی۔ اسے اندیشہ تھا کہ وہ اسے ربرڈسٹی بالڈ ہلز سے باہر نکال دے گا لیکن جب اس نے اسے محض یہ کہنے پر اکتفا کیا کہ وہ اسے اپنی شکل نہ دکھائے، اس کی کچھڑ حارس بندھی۔ وہ جانتی تھی کہ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ اپنے نہاں خانہ دل میں خوش ہے کہ وہ جانے کے بجائے گھر پر ہی ٹھہری رہی ہے۔

جس روز نکولشکا کی روائٹی عمل میں آئی، اسی دن بعد میں صبح پرنس نے وردی پہنٹی اور کٹڈ رائیچیف سے ملنے کی تیاری کرنے لگا۔ اس کی گاڑی دروازے پر کھڑی تھی۔ پرنس، ماریا نے اسے وردی زریب تن کیے اور سینے پر اپنے تمام تحفے، دراعرازا ت سجاے مسلح کسانوں اور گھریلو غلاموں کا معائنہ کرنے کے لیے باغ کی روش کی طرف جاتے دکھا۔ وہ درختے کے قریب بیٹھی اس کی آواز، جو باغیچے سے اس تک پہنچ رہی تھی، سن رہی تھی، اچانک متعدد اشخاص خیابان پر بھاگتے نظر آئے۔ ان کے چہروں پر خوف و ہراس ہوتا تھا۔

پرنس، ماریا پورچ کی طرف بھاگی۔ وہاں سے وہ اس ریش پر، جس کے دونوں کناروں پر پھول لہلہا رہے تھے، ہوتی خیابان پر پہنچ گئی۔ وہاں اس کی ٹڈھ بھڑیلیش کے جوانوں، دونوں کروں چاکروں کے جھوم سے ہوئی۔ وہ اسی کی طرف آ رہے تھے۔ وہ اپنے درمیان میں وردی پہنٹی اور تحفے سجائے بڑے میاں کو کچھ اٹھائے اور کچھ گھسیٹے آ رہے تھے۔ وہ ان کی طرف بھاگی۔ سورج کی جھلکاتی کرنوں کی روشنی لمبوں کے درختوں کے سایوں کے پتوں بیچ جس طرح دائرے بنادی تھی، ان میں وہ پوری طرح اس تہذیبوں کا، جو اس کے خدو خال پر نمودار ہو چکی تھیں، اوراک نہ کر سکی۔ وہ صرف یہی دیکھ سکی کہ اس کے چہرے پر پہلے جو درشتی اور عزم صمیم جھلکتا رہتا تھا، وہ اب ناپید ہو چکا تھا اور اس کی جگہ فردوسی ورکم حوصلگی نمایاں ہونے لگی تھی۔ جب اس کی نظر اپنی بیٹی پر پڑی، اس نے بے بسی سے اپنے ہونٹوں کو حرکت دینے کی کوشش کی، اور اس کے لبوں سے گلو گرفتہ آواز نکلی۔ یہ سمجھنا ناممکن تھا کہ وہ کہنا کیا چاہتا ہے۔ لوگوں نے اسے اٹھایا اور اٹھا کر سنڈی روم میں لے گئے۔ انھوں نے اسے اسی کاؤچ پر، جس پر لیٹنے سے وہ حالیہ دنوں میں خوف کھانے لگا تھا، بٹا دیا۔

ڈاکٹر نے، جسے اسی رات بدیا گیا تھا، اس کی نصرت کھولی اور بتایا کہ پرنس پر فوج کا حملہ ہوا ہے اور اس کا دایاں پہلو مفلوج ہو گیا ہے۔

بالذکر میں قیام خطرناک سے خطرناک تر ہوتا جا رہا تھا اور وہ اگلے روز پرنس کو باگوچار خانے لے گئے۔ ڈاکٹر ان کے ساتھ تھا۔

جب وہ باگوچار خانے پہنچے، دیوال اور چھوٹا پرنس ماسکوروانہ ہو چکے تھے۔

مفلوج پرنس تین ہفتے باگوچار خانے میں رہے، جسے پرنس آندرے نے تعمیر کرایا تھا صاحب فراش رہا۔ اس کی حالت نہ بہتر ہو رہی تھی اور نہ بدتر۔ وہ ہوش و حواس سے عاری تھا اور مڑی مڑی لاش کی طرح پڑا تھا۔ وہ متواتر بڑبڑاتا رہتا، اس کے ہونٹ اور چوٹے پھڑکتے رہتے لیکن یہ بتانا ناممکن تھا کہ اس کے گرد و پیش جو کچھ رونما ہو رہا تھا، وہ اس سے آگاہ ہے یا نہیں۔ ایک بات یقینی تھی۔ وہ اذیت میں مبتلا تھا اور کچھ کہنا چاہتا تھا، لیکن کیا، اس کا اندازہ لگانا کسی شخص کے بس کی بات نہیں تھی۔ ہو سکتا ہے کہ یہ کسی علیل اور نیم ہذیانی شخص کے من کی موج ہو یا یہ بھی ممکن ہے کہ اس کا تعلق کسی سرکاری مسئلے یا خانگی امور سے ہو۔

ڈاکٹر کا خیال تھا کہ اس کی یہ بے چینی بے معنی ہے اور محض جسمانی اسباب کی پیدا کردہ ہے، تاہم پرنس ماریا کو یقین تھا کہ وہ اس سے کچھ کہنا چاہتا ہے اور یہ حقیقت کہ اس کی موجودگی میں اس کی حالت مزید دگرگوں ہو جاتی، اس کے شبہات کی تائید کرتی نظر آتی تھی۔

صاف نظر آرہا تھا کہ وہ جسمانی ورچنس دونوں اقسام کی اذیت میں مبتلا ہے۔ بھائی صحت کی کوئی امید باقی نہیں رہی تھی۔ اسے وہاں سے کہیں، ورنہ لے جانا ناممکن تھا۔ 'اگر ان کا راستے میں ہی انتقال ہو گیا، پھر کیا ہوگا؟ اگر قصہ ختم ہی ہو چکا ہے تو پھر کیا یہ بہتر نہیں ہوگا کہ آخری گھڑی آہی جائے؟' پرنس ماریا بعض اوقات سوچتی۔ وہ تقریباً سوئے بغیر دن رات کی اس خبر گیری کرتی اور اگر چہ کہنے کو یہ بات بہت بڑاؤنی ہے لیکن حقیقت یہی ہے کہ جب وہ اسے بغور دیکھتی تھی، اس خیال سے نہیں دیکھتی تھی کہ اسے اس کی حالت میں اصلاح کے کوئی آثار نظر آجائیں گے بلکہ وہ اس قسم کی علامات، جن سے یہ عندیہ مل جاتا کہ اس کا انجام کب ہو رہا ہے، ڈھونڈنے میں مصروف ہو جاتی۔

اگر چہ اپنے باطن میں اس احساس کو تسلیم کرنا اسے عجیب لگتا تھا لیکن یہ موجود تھا، لیکن پرنس ماریا کو اس سے بھی زیادہ وحشت، جس چیز سے ہو رہی تھی وہ یہ تھی کہ جب سے اس کا باپ بستر سے لگا تھا (شاید اس سے بھی پہلے جب اس نے کسی چیز کے ظہور پذیر ہونے کی توقع میں اس کے ساتھ مقیم رہنے کا تہیہ کیا تھا)، وہ تمام ذاتی امیدیں اور آرزوئیں، جنہیں فراموش کر دیا گیا تھا یا جو اس کے نہاں خندہ دل کے کسی گوشے میں خوابیدہ تھیں، اٹھائیاں لینے لگی تھیں۔ وہ خیالات۔ اپنے باپ کے مسلسل خوف سے آزاد زندگی، پر محبت اور پر مسرت شادی شدہ زندگی کے امکانات، جو برسوں سے اس کے دماغ میں نہیں آئے تھے، شیطانی ترغیبات کی طرح پیہم اس کے تخیل پر یلغار کرنے

لگے۔ اب جب کہ یہ معاملہ اختتام پذیر ہوا چاہتا تھا، اس قسم کے سوالات کہ وہ اپنی زندگی کس انداز سے ترتیب دے گی، وہ ان سے بچنے کی خواہ کتنی ہی سرتوڑ کوشش کیوں نہ کرتی، ہر دم اس کے ذہن پر سوار رہنے لگے۔ یہ شیطانی ترغیبات تھیں اور پرنس ماریا کو اس کا علم تھا۔ وہ جانتی تھی کہ اس (شیطان) کے حلاف واحد (کارگر) ہتھیار عبادت ہے اور وہ عبادت کرنے کی کوشش کرتی۔ وہ عبادت کا انداز اختیار کرتی، ایقونوں کے سامنے بیٹھ جاتی اور انھیں ٹھنکلی باندھ کر دیکھنے لگتی۔ وہ دعا کے الفاظ دہراتی لیکن اس سے دعا مانگی نہ جاتی۔ اسے محسوس ہونے لگتا کہ ایک مختلف قسم کی دنیا اس پر قابض ہو گئی ہے۔ ارضی، پر مشقت، سزاوارتہ عمل کی دنیا، جو اس روحانی دنیا سے، جس میں وہ اب تک محدود رہی تھی اور جس میں اسے عظیم تر تسکین دعا اور عبادت سے ملتی تھی، بالکل جداگانہ ہے۔ اب اس سے منہ عامانگی جانی اور منہ رویا جاتا تھا، اور دیوی تفکرات اس کے دل و دماغ پر حاوی ہو چکے تھے۔

باگو چارافو میں مزید قیام خطرناک ہوتا جا رہا تھا۔ تمام اطراف سے فرانسیسیوں کی آمد کی خبریں مل رہی تھیں اور باگو چارافو سے دس بارہ میل دور ایک گاؤں میں فرانسیسی قزاقوں نے ایک گھرانے کو تاخت و تاراج کر دیا تھا۔ ڈاکٹر کا اصرار تھا کہ پرنس کو یہاں سے منتقل کرنا ضروری ہے۔ امراء کے صوبائی مارشل نے پرنس ماریا کے پاس اہلکار بھیجے تاکہ وہ اسے حتیٰ لا مکان جلد از جلد رخصت ہونے کے لیے آمادہ کر سکے۔ صلیبی پولیس کا سربراہ خود باگو چارافو آیا اور اس نے بھی اسی بات پر زور دیا۔ اس نے بتایا کہ فرانسیسی صرف پندرہ میل دور ہیں، اور ان کے اعلانات دیہاتوں میں پہنچائے جا رہے ہیں۔ ان حالات میں اگر پرنس نے اپنے باپ کے ساتھ پندرہ تاریخ سے پہلے پہلے وہاں سے کوچ نہ کیا، سانحہ کار سے داروہ نہیں ہوگا۔

پرنس نے پندرہ کو درانگی کا فیصلہ کیا۔ چودہ تاریخ کو اس نے سارا دن تیاریاں کرنے اور ضروری ہدایات، جن کے لیے اب ہر کوئی اس کے پاس آتا تھا، دینے میں گزارا۔ معمول کے مطابق اس نے چودہ کی رات اس کمرے میں، جو پرنس کے کمرے سے ملحق تھا، گزارا۔ اس کی متعدد مرتبہ آنکھ کھلی، اس کے کراہنے اور بڑبڑانے کی آوازیں اس کے کانوں سے ٹکراتیں۔ اسے اس کے بٹنگ کی چرچاہٹ اور ڈاکٹر ورتیخون کے قدموں کی چاپ، جوان کے اس کا پہلو بدلوانے کے دوران میں پیدا ہوتی، سنائی دیتی۔ وہ بار بار دروازے کے پاس جاتی، کان لگا کر سنتی اور اسے محسوس ہوتا کہ وہ جس طرح بڑبڑا رہا ہے، اس کی آواز معمول سے کہیں زیادہ ہے۔ اس نے یہ بھی دیکھا کہ وہ اس کا پہلو بار بار بدلو رہا ہے۔ نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ وہ گھڑی گھڑی اٹھتی اور سن گن لینے کے لیے دروازے کے قریب پہنچ جاتی۔ ایک سے زیادہ مرتبہ اس کے دل میں خیال آیا کہ وہ اندر چلی جائے لیکن حوصلہ نہ کر سکی۔ اگرچہ وہ بول نہیں سکتا تھا لیکن وہ دیکھتی بھی تھی اور اسے یہ معلوم بھی تھا کہ وہ یہ بات سخت ناپسند کرتا ہے کہ کوئی شخص اپنے چہرے کے تاثرات سے یہ ظاہر کرے کہ اسے اس کے بارے میں تشویش ہے۔ وہ یہ بات بھانپ چکی تھی کہ جو بھی اس کی مشوش نگاہیں غیر ارادی طور پر بھی اس کے چہرے کی طرف اٹھتی ہیں، وہ خفا ہو جاتا ہے اور اپنا منہ دوسری طرف پھیر لیتا ہے۔ وہ جانتی تھی کہ اگر وہ رات کو کسی ایسے وقت، جو مہموں سے ہٹ کر ہو، اس کے کمرے

میں گئی، وہ برا فروختہ ہو جائے گا۔

لیکن اس کی حالت پر اب اسے جو ترس آ رہا تھا، اس سے پہلے کبھی نہیں آیا تھا اور نہ اسے اس احساس سے کہ وہ اس کے سایہ عاطفت سے محروم ہو جائے گی، کبھی اتنا دکھ پہنچا تھا جتنا کہ اب پہنچ رہا تھا۔ اس نے اس کے ساتھ جو زندگی گزاری تھی، اس کا ایک ایک لمحہ اس کی نگاہوں کے سامنے گھومنے لگا، اور اسے اس کا ایک ایک لفظ اپنے لیے محبت سے بھرپور دکھائی دینے لگا۔ وقتاً فوقتاً ان یادوں میں رخسہ آ جاتا، اسے شیطان درغلانے لگتا اور اسے اس قسم کے خیالات ستانے لگتے کہ اس کی موت کے بعد کیا ہوگا اور اسے آزادی کی جوئی زندگی ملے گی، وہ اسے کیسے زنجیر دے گی۔ لیکن اسے ان خیالات سے گھن آنے لگتی اور وہ انھیں اپنے دماغ سے باہر نکال پھینکتی۔ پوچھنے کے قریب وہ نسبتاً پرسکون ہو گیا اور وہ سو گئی۔

وہ دیر سے جاگی۔ آنکھ کھلنے پر جس طرح دماغ اکثر تازہ دم ہو جاتا ہے اور ہر چیز واضح انداز سے سمجھنے لگتا ہے، اسے بھی یوں اور غیر مبہم طور پر معلوم ہو گیا کہ اپنے باپ کی علالت کے دوران میں اسے کس چیز کی سب سے زیادہ فکر تھی۔ اس نے اپنی آنکھیں کھولیں، جو کچھ دروازے کے پیچھے ہو رہا تھا، اس کی بھٹک لی اور جب اس نے اسے کراہتے سنا، اس کی آنکھیں کھلی، اور وہ اپنے آپ سے کہنے لگی کہ ”حالات جوں کے توں ہیں، ان میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔“

”لیکن ہونا کیا چاہیے تھا؟ میں چاہتی کیا ہوں؟ میں چاہتی ہوں کہ وہ مر جائیں!“ اس نے چیختے ہوئے کہا اور اسے اپنے آپ سے نفرت ہونے لگی۔

اس نے ہاتھ منہ دھویا، کپڑے تبدیل کیے، مناجات کی تلاوت کی اور پورچ میں چلی گئی۔ دروازے پر چکڑے کمرے تھے۔ ان پر سامان لا دیا جا چکا تھا لیکن ابھی ان میں گھوڑے نہیں جوتے گئے تھے۔ یہ نیالی اور نیم گرم صبح تھی۔ پرنس ماریا پورچ میں گھسی رہی۔ اپنی روحانی فصاحت پر وہ ابھی تک لرزہ بر اندام تھی اور اپنے باپ کی خدمت میں حاضر ہونے سے پہلے اپنے خیالات مجتمع کرنے کی تنگ درو کر رہی تھی۔

ڈاکٹر سیڑھیاں اترتا نیچے آیا اور سیدھا اس کے پاس چلا آیا۔

”آج ان کی حالت قدرے بہتر ہے،“ اس نے کہا۔ ”میں آپ کو ڈھونڈتا پھرا ہوں۔ وہ جو کچھ فرما رہے ہیں، اس کا کچھ کچھ مفہوم سمجھنے میں آنے لگا ہے۔ ان کا ذہن صاف ہو چکا ہے اور وہ آپ کو بلارہے ہیں۔“

یہ خبر سن کر پرنس ماریا کا دل اتنے زور سے دھڑکا کہ اس کا رنگ پیلا پڑ گیا۔ وہ دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑی ہو گئی کہ کہیں وہ نیچے نہ گر پڑے۔ اب جب کہ اس کی روح ان خوفناک اور فاسد خیالات سے اثاث بھری ہوئی تھی، اسے دیکھنا، اس سے باتیں کرنا، اس کی نگاہوں کو اپنے جسم پر محسوس کرنا۔ یہ سب کچھ اس کے لیے اذیت ناک سرگرمی اور دہشت بن گیا تھا۔

”آئیں، تشریف لے چلیں،“ ڈاکٹر نے کہا۔

پرنس ماریا اپنے باپ کے کمرے میں داخل ہوئی اور اس کے پلنگ کی طرف قدم بڑھانے لگی۔ وہ پشت کے

بل لیٹا ہوا تھا۔ ٹکیوں کے سہارے اس کا دھڑکنے والا دل پڑا ہوا تھا۔ اس کے مہین استخوانی ہاتھ کاٹھن دار، رگوں رگوں سمیت، لٹاف پر پڑے تھے۔ اس کی بائیں آنکھ ٹنگی بانڈھے سیدھا سامنے دیکھ رہی تھی۔ اس کی دائیں آنکھ قدرے ترچھی تھی اور اس کے ہونٹ اور ابرو بالکل سکت تھے۔ وہ اتنا مفر، اتنا کوتاہ اور اتنا قابل رحم نظر آ رہا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ اس کا چہرہ چرم اچکا ہے یا پگھل گیا ہے، یوں اس کے خدو خال سکڑ گئے تھے۔ پرنس ماریا آگے آئی اور اس نے اس کے ہاتھ پر بوسہ دیا۔ اس کے بائیں ہاتھ نے اس کے ہاتھ کو کچھ اس طرح دبایا کہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ اسی کا انتظار کر رہا تھا۔ اس نے اس کے ہاتھ کو جھٹکا دیا اور غصے سے اس کے ابرو اور ہونٹ پھڑکنے لگے۔

وہ غم زدہ ہو گئی، اور اس کی جانب دیکھنے لگی۔ وہ یہ سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی کہ وہ اس سے چاہتا کیا ہے۔ جب وہ اپنی پوزیشن میں تدریجی تبدیلی دیکھ کر اس کی بائیں آنکھ اسے دیکھ سکے، وہ پہلے کی نسبت پرسکون ہو گیا اور کئی سیکنڈ اپنی نگاہ اس پر گاڑے رہا۔ پھر اس کے لب اور زبان حرکت کرنے لگے، اصوات برآمد ہونے لگیں اور وہ بولنے لگا۔ وہ گھبرائے اور منجانبہ انداز سے اسے دیکھ رہا تھا۔ صاف عیاں تھا کہ وہ اس چیز سے خوف زدہ تھا کہ وہ اس کی بات سمجھ نہیں پائے گی۔

پرنس ماریا نے اپنی تمام صلاحیتوں پر دھاؤ ڈال، اور اسے بغور دیکھنے لگی۔ اپنی زبان کو حرکت دینے کے لیے وہ جس قسم کی مضحک کوششیں کر رہا تھا، انہوں نے اسے اپنی نگاہیں جھکانے پر مجبور کر دیا۔ وہ رونا چاہتی تھی اور وہ بڑی مشکلوں سے اپنی چیخوں پر قابو پاسکی۔ وہ جو کچھ کہہ رہا تھا، اسے بار بار دہرا رہا تھا۔ اگرچہ اس کے الفاظ کا مفہوم اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا لیکن وہ اپنے طور پر یہ قیادہ لگانے کی بھرپور کوشش کر رہی تھی کہ وہ کہہ کیا رہا ہے۔ اس کے منہ سے جو ٹوٹے پھوٹے الفاظ نکل رہے تھے، اس نے انہیں سوالیہ انداز سے دہرایا۔

”رو... رو... مصی... مصی...“ وہ بار بار کہہ رہا تھا۔

سمجھنا ناممکن تھا۔ ڈاکٹر کو زعم تھا کہ وہ مطلب سمجھ گیا ہے اور اس نے پرنس سے کہا: ”میرا خیال ہے کہ وہ آپ سے کہہ رہے ہیں: تم ڈرتی ہو؟“ لیکن جب اس نے یہ الفاظ دہرائے، پرنس نے منہ انداز سے اپنے سر کو جنبش دی اور ایک بار پھر اپنی آوازوں کا اعادہ کرنے لگا۔

”روح... روح... مصیبت میں ہے“ پرنس ماریا نے کہا۔

وہ تائید میں پوپلے منہ سے بڑبڑایا، اس نے اپنی بیٹی کا ہاتھ پکڑا، اور اس سے اپنے سینے کے مختلف حصے دبائے گا جیسے وہ اس کے لیے صحیح جگہ تلاش کر رہا ہو۔

”ہے... ہمیشہ تمہارے بارے... میں سوچ... سوچتا رہا ہوں۔“ اب جب کہ اسے یہ یقین ہو گیا تھا کہ وہ اس کی بات سمجھ رہے ہیں، اس کی زبان پہلے کی نسبت کہیں زیادہ واضح انداز سے چل پڑی تھی۔ پرنس ماریا اپنی سکیوں اور آنسوؤں کو روکنے کے لیے اپنا سر اس کے ہاتھ پر مسلنے لگی۔ وہ اپنا ہاتھ اس کے بالوں پر پھیرنے لگا۔

”میں ساری رات... تھکیں... آوازیں دیتا رہا،“ اس نے بدقت کہا۔

”کاش مجھے معلوم ہوتا،“ اس نے آنسوؤں اور سسکیوں کے مابین کہا۔ ”میں آتے ڈرتی تھی۔“

وہ اس کا ہاتھ دبائے لگا۔

”تم سوئیں نہیں؟“

”نہیں، مجھے نیند نہیں آرہی تھی،“ پرنس ماریا نے فنی انداز سے اپنے سر کو جنبش دے کر کہا۔

غیر شعوری طور پر اپنے باپ کی نقالی کرتے وہ اسی کے انداز سے اپنا مفہوم ان کرنے کی کوشش کرنے لگی۔

وہ زیادہ تر اشاروں کنایوں سے کام لے رہی تھی جیسے اسے بھی اپنی زبان سنبھالتے میں وقت پیش آرہی ہو۔

”جان من...“ یا یہ ”عزیز از جان من“ تھا؟۔ پرنس ماریا سمجھ نہ سکی کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ تاہم اس کی

چاہوں میں جو شفقت جھلک رہی تھی، اس سے اس بارے میں قطعاً کوئی شبہ نہ رہا کہ اس نے کوئی ملائم،

محبت بھرا لفظ جو اس سے پہلے اس نے کبھی اس کے لیے استعمال نہیں کیا تھا، کہا ہے۔ ”تم آئیں کیوں نہ؟“

’اور میں... میں ان کی موت کی تمنا کر رہی تھی!‘ پرنس ماریا نے سوچا۔

وہ کچھ دیر خاموش رہا۔

”شکریہ... پیاری بیٹی... مجھے سب کچھ... سب کچھ... معاف کر دو... شکریہ... معاف کر دو“ اور اس کی

آنکھوں سے اشک رواں ہو گئے۔

”آندر یوشکا کو بلاؤ،“ اس نے اچانک کہا اور اس کے چہرے پر بے یقینی کی ڈر سی بھی، بچکانہ کیفیت طاری

ہو گئی۔

اس کی یہ کیفیت کچھ اس قسم کی تھی جیسے اسے معلوم ہو کہ اس کی یہ درخواست قدرے غیر معقول ہے یا پھر

پرنس ماریا کو یہی محسوس ہوا۔

”مجھے ان کا خط موصول ہوا تھا،“ وہ جواب میں بولی۔

وہ جھپکتے جھپکتے حیرانی سے اس کا منہ تکتے لگا۔

”وہ کہاں ہے؟“

”mon pere“ وہ فوج کے ساتھ سمولنسک میں ہے۔“

وہ کافی دیر خاموش رہا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ پھر ایسے جیسے اس کے ترم شکوک کا ازالہ ہو گیا ہو اور جیسے

وہ اس امر کا دعا کر رہا ہو کہ وہ سب کچھ سمجھ گیا ہے، اور اسے ہر چیز یاد آگئی ہے، اس نے مثبت انداز سے ہنسا ہلایا

اور دوبارہ اپنی آنکھیں کھول دیں۔

”ہاں،“ اس نے ملائم اور واضح انداز سے کہا۔ ”روس ختم ہو گیا ہے۔ انھوں نے اس کا بیڑا اثر کر دیا ہے!“

وہ ایک بار پھر مسکایا لینے لگا اور اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے۔

پرنس ماریا کے لیے اب مزید ضبط کرنا ناممکن ہو گیا اور وہ اس کے چہرے پر نظریں جمائے کھل کر رونے لگی۔ اس نے دوبارہ اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ اس کی مسکایاں ختم گئی تھیں۔ اس نے اپنی آنکھوں کی طرف اشارہ کیا۔ تجوین سمجھ گیا کہ وہ کیا چاہتا ہے اور اس نے اس کے آنسو پونچھ ڈالے۔

اس نے دوبارہ اپنی آنکھیں کھولیں اور کچھ کہا لیکن کسی کی سمجھ میں نہ آیا کہ اس نے کیا کہا ہے تا آنکہ تجوین نے اندازہ لگا لیا کہ اس نے کیا کہا ہے اور اس نے اسے دہرایا۔ پرنس ماریا اس کے الفاظ کے مفہوم کا سلسلہ ان اشیا سے، جن کے متعلق وہ ابھی بھی باتیں کر رہا تھا، جوڑنے کی کوشش کر رہی تھی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ وہ لازماً روس، پرنس آندرے، خود اس (پرنس ماریا) کے، اپنے پوتے اور اپنی موت کے متعلق اشارہ کر رہا ہوگا، چنانچہ وہ یہ نہ بھانپ سکی کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔

”اپنا سفید ڈریس چمکنے لگا، اس نے کہا تھا۔“

اور جب پرنس ماریا کی سمجھ میں آیا کہ اس نے کیا کہا ہے، وہ پہلے سے زیادہ بند آواز میں رونے لگی۔ ڈاکٹر نے اسے بازو سے پکڑا اور باہر برآمدے میں لے گیا۔ وہ اس پر زور دے رہا تھا کہ وہ صبر تحمل سے کام لے اور سفر کے لیے تیاریاں جاری رکھے۔

جب وہ کمرے سے باہر چلی گئی، پرنس دوبارہ اپنے بیٹے، جنگ اور اسپر اطور کے متعلق باتیں کرنے لگا۔ وہ غیظ و غضب سے اپنے ابرو جھٹکا رہا اور اپنی گلو گرفتہ آواز بلند کر رہا تھا۔ پھر دوسرا اور آخری حملہ ہوا۔

پرنس ماریا ابھی تک برآمدے میں تھی۔ آسمان نکھر چکا تھا، دھوپ چمک رہی تھی اور موسم گرم تھا۔ وہ نہ کچھ سمجھ پارہی تھی، نہ اس سے کچھ سوچا جاتا تھا اور نہ اسے کچھ محسوس ہوتا تھا۔ اس پر صرف ایک ہی جذبہ شدت سے غالب تھا اور وہ تھا اپنے باپ سے محبت کا۔ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ اب تک وہ اس جذبے سے نا آشنا رہی تھی۔ وہ روتی کلبلائی دوڑ کر باغ میں چلی گئی اور ان روشوں پر، جن کے کنارے کنارے پرنس آندرے نے لیموں کے پودے لگوائے تھے، چھٹی تالاب کی طرف بڑھنے لگی۔

”ہاں... میں... میں... میں نے ان کی موت کی تمنا کی تھی! ہاں... میں چاہتی تھی کہ یہ جلد ار جلد آجائے۔ تاکہ مجھے سکون مل جائے۔ لیکن میرا کیا بے گا؟ اگر وہ منہ موڑ گئے، پھر یہ سکون میرے کس کام آئے گا؟“ پرنس ماریا بڑبڑا رہی تھی۔ وہ تیز تیز قدم اٹھاتی باغ میں گھوم پھر رہی تھی۔ وہ اپنے ہاتھوں سے اپنی چھاتی، جو اس کے تشنچ آلود آہیں بھرنے سے اوپر نیچے اٹھ رہی تھی، دوبارہ دیکھتی تھی۔

جب وہ باغ کا چکر مکمل کر چکی، وہ دوبارہ مکان کے قریب پہنچ گئی۔ اسے، دوسری مل بوغین (جو باگوارانو میں ہی مقیم رہی تھی اور وہاں سے جانے سے انکار کر چکی تھی) نظر آئی۔ وہ کسی اجنبی کے ساتھ اس کی طرف آ رہی تھی۔ نوادہ شرفا کا نسلی مارشل تھا۔ وہ بذات خود پرنس ماریا کو سمجھنے آیا تھا کہ اس کا فوری طور پر روانہ ہونا ضروری

ہے۔ پرنس ماریاس کی باہمی دوستی رہی لیکن اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ وہ اسے گھر کے اندر لے گئی، اس نے اسے لٹچ پیٹن کیا اور اس کے ساتھ بیٹھ گئی۔ پھر اس نے معذرت چاہی اور معمر پرنس کے کمرے کے دروازے کی طرف چل پڑی۔ ڈاکٹر آشفتمند حال اس کی جانب آیا اور اسے بتانے لگا کہ وہ اندر نہیں جاسکتی۔

”پرنس، جائیں یہاں سے چلی جائیں!“

وہ واپس باغ میں چلی گئی اور ڈھلوان کے دامن میں تالاب کے کنارے گھاس پر بیٹھ گئی۔ وہاں سے کوئی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اسے کچھ معلوم نہ ہوا کہ وہاں وہ کتنی دیر بیٹھ رہی۔ کوئی شخص روش پر بھاگا آ رہا تھا۔ اس کے قدموں کی چاپ سن کر اس کے حواس بیدار ہو گئے۔ وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی اور اسے اپنی ملازمہ دنیا شا، جو بظاہر اسے تلاش کرتی پھر رہی تھی، نظر آئی۔ اس نے جب اپنی مالکہ کو دیکھا، اس کے قدم رک گئے۔

”پرنس، پرنس۔۔۔ پرنس۔“ دنیا شا نے پھٹی پھٹی آواز میں کہا۔

”آئی، بھی آئی!“ پرنس نے چلا کر بہت تیزی سے کہا۔ اس نے دنیا شا کو اپنی بات ختم کرنے کا موقع ہی نہ دیا۔ اس کی کوشش تھی کہ خادمہ پر اس کی نظر نہ پڑے اور وہ مکان کی جانب دوڑنے لگی۔

”پرنس، یہ خداوند کا غشا ہے۔ آپ کو بری سے بری خبر سننے کے لیے تیار رہنا چاہیے،“ مارشل نے مکان کے دروازے پر اس کا سامنا کرتے ہوئے کہا۔

”مجھے تنہا چھوڑ دیں! یہ جھوٹ ہے!“ پرنس نے جھل کر کہا۔

ڈاکٹر نے اسے روکنے کی کوشش کی۔ اس نے اسے ایک طرف دھکیل دیا اور خود اپنے باپ کے کمرے کی جانب بھاگنے لگی۔ ”یہ سب اتنے خوف زدہ کیوں نظر آ رہے ہیں اور مجھے روک کیوں رہے ہیں؟ مجھے ان کی ضرورت نہیں ہے اور یہ یہاں کیا کر رہے ہیں؟“ اس نے دروازہ کھولا اور اس کمرے میں، جہاں قبل ازیں تاریکی تھی، دن کی تیز روشنی نے اس کے حواس باختہ کر دیے۔ اس کی ادھیر عمر نرس اور محض دیگر خواتین کمرے میں تھیں۔ اسے رستہ دینے کے لیے وہ سب پلنگ سے پرے ہٹ گئیں۔ پرنس پہلے کی طرح پلنگ پر لیٹا ہوا تھا لیکن اس کے پر سکون چہرے کی درشتی نے پرنس ماریاس کے پاؤں دبلیز پر ہی روک دیے۔

”نہیں، ان کا انتقال نہیں ہوا۔ ایسا ہو ہی نہیں سکتا!“ پرنس، ماریاس نے اپنے آپ سے کہا۔ وہ پلنگ کے قریب پہنچی اور جس خوف و دہشت نے اسے اپنی گرفت میں سے لیا تھا، اس کے خلاف جدوجہد کرتے اس نے اپنے ہونٹ اس کے رخساروں پر ثبت کر دیے لیکن پلنگ جھپکنے میں وہ بدک کر چپچپے ہٹ گئی۔ اس کے سامنے پلنگ پر جو کچھ بڑا تھا، وہ اتنا دہشت ناک اور مہیب تھا کہ اس کے سامنے محبت، اور شفقت کے جذبات، جو وہ اس کے لیے اپنے دل میں محسوس کر رہی تھی، آنا قانا کا فور ہو گئے۔ ”نہیں، اب وہ نہیں رہے! وہ اب نہیں رہے بلکہ اس جگہ جہاں وہ دراز تھے کوئی اجنبی، دہشت ناک، لرزدہ انگیز، ذراؤنی، مہیب، پر سرار چیز پڑی ہے!“ پرنس ماریاس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ ڈھانپ لیا اور ڈاکٹر کے، جس نے اسے سہارا دے کر کھڑے رکھا تھا، بازوؤں

میں گر پڑی۔



تھون اور ڈاکٹر کی نظروں کے سامنے عورتوں نے اسے، جو کبھی پرنس تھا، غسل دیا۔ انھوں نے اس کے سر کے گرد رمال باندھ دیا تاکہ منہ کھلا رہنے کی وجہ سے اس کا جڑ اکڑ نہ جائے اور ایک دوسرے رومال سے اس کی دونوں ٹانگیں آپس میں باندھ دیں۔ اس کے بعد انھوں نے اسے اس کی وردی پہنائی، اس کے تھنے اور اعزازیات اس کے سینے پر چسپاں کیے اور اس کے مختصر جسم کو، جو چرم کا تھا، میز پر لٹا دیا۔ صرف خدا جانتا ہے کہ یہ سب کچھ کس نے اور کس وقت کیا، لیکن یہ سب کچھ ایسے ہوا جیسے اپنے آپ ہو گیا ہو۔ سر شام اس کے تابوت کے ارد گرد موم بتیاں جلتے لگیں، اس کی میت پر ماتمی چادر ڈال دی گئی اور فرش پر جونی پر²² (Juni per) کا تیل چھڑک دیا گیا۔ اس کے جھریاں زدہ سر کے نیچے طغریٰ، جس پر مناجات چھپی ہوئی تھیں، ٹانگ دیا گیا اور کمرے کے کونے میں بیٹھا نائب پادری مناجات کی تلاوت کرنے لگا۔

جس طرح مردہ گھوڑے کے گرد دوسرے گھوڑے بدکنے لگتے ہیں، زور زور سے نتھن پھلاتے ہیں اور ایک دوسرے سے دھکم پیل کرتے ہیں، بعد میں مکان کے یکین اور باہر کے لوگ — مارشل، گاؤں کا سرخیج اور کسان عورتیں — کبھی اپنی نگاہیں، جن میں خوف تیر رہا تھا، گاڑے، سینوں پر صلیب کے نشان بناتے نیچے جھکتے اور مرحوم پرنس کے ٹھنڈے اور اکڑے ہوئے ہاتھ کو بوسہ دینے لگتے۔

9

جب تک پرنس آندرے نے باگوچار فو میں رہائش اختیار نہیں کی، اس جاگیر پر غیر حاضر زمینداروں کا قبضہ رہا تھا۔ چنانچہ باگوچار فو کے کسان، لڈ ہلز کے کسانوں کے مقابلے میں مختلف کردار کے مالک تھے۔ وہ گنگلو، لباس، مزاج، ہر اعتبار سے ان سے جدا تھے۔ وہ سٹیپ (گھاس کے میدانوں کے) کسان تھے۔ جب وہ فصلوں کی کٹائی میں مدد دینے یا تالاب اور ٹنڈ قیل کھودنے بالڈ ہلز آتے، معمر پرنس ان کی قوت برداشت کی تعریف ضرور کرتا لیکن وہ ان کے ازمنہ قدیم کے طور طریقے ناپسند کرتا تھا۔

باگوچار فو میں اپنے گزشتہ قیام کے دوران میں پرنس آندرے نے جو اختراعات — شفا خانوں اور درمگا ہوں کی تعمیر اور اپنی آزادی حاصل کرنے کے خواہش مند کسانوں کے لگان میں تخفیف — کی تھیں، وہ نہ صرف ان کے اطوار میں ملاست پیدا کرنے میں ناکام رہیں بلکہ اس کے برعکس ان کے رنگ ڈھنگ کی وہ خصوصیات، جنہیں معمر پرنس بھونڈا اور قدیم قرار دیتا تھا، اور شدید ہو گئیں۔

ان میں مبہم اور گول مول افواہیں ہمیشہ گردش کرتی رہتی تھیں۔ ایک وقت آیا جب انھیں یقین ہو گیا کہ ان

سب کو قارت کی حیثیت سے (نوج یا ملیشیا میں) بھرتی کر لیا جائے گا۔ پھر دوسرا وقت آیا اور وہ سمجھنے لگے کہ انھیں نیا مذہب اختیار کرنے پر مجبور کیا جائے گا۔ پھر زار کے کسی فرضی اعلان کی باتیں ہونے لگیں۔ اس کے بعد زار پاول پتروویچ کے ²³ 1897 کے حلف کا ذکر ہونے لگا۔ (یہ کہا جانے لگا کہ اس حلف میں زار نے انھیں آزادی دے دی تھی لیکن جاگیرداروں نے انھیں اس سے محروم رکھا ہے۔) پھر انھیں توقع بندھنے لگی کہ پتروویچ درجہ ²⁴ سرت سال کے اندر دوبارہ تخت نشین ہو جائے گا، ان سب کو آزادی مل جائے گی اور ہر چیز اتنی آسان ہو جائے گی کہ کسی قانون کی ضرورت باقی نہیں رہ جائے گی۔ جس طرح دجال دنیا کے خاتمے اور آزادی مطلق کے متعلق مبہم اور غمراہ تصورات ان کے دماغوں میں رہ چکے تھے، ایسے ہی جنگ، یونا پارٹ اور اس کے حملے کے بارے میں کچی پکی افواہیں ان کے ذہنوں میں بار بار پائے لگیں۔

باکو چارافو کے نوع میں بڑے بڑے دیہات کی اچھی خاصی تعداد تھی۔ ان کی ملکیت یا حکومت کے پاس تھی یا ان مالکوں کے، جن کے کسان اپنی آزادی حاصل کرنے کے لیے لگان ادا کرتے تھے اور جہاں ان کا جی چاہتا وہاں کام کر سکتے تھے۔ قرب و جوار میں بہت کم رہائشی مالکان زمین تھے۔ نتیجتاً گھریلو یا خواندہ غلاموں کی تعداد بھی آٹے میں نمک کے برابر تھی۔ اس زمانے میں روسیوں کی زندگی میں جو پراسرر زیر سطح لہریں ²⁵ رواں دواں تھیں، کسی بھی دوسرے علاقے کی نسبت یہاں کے کسانوں کی زندگیاں ان سے کہیں زیادہ پروردگار واضح انداز سے متاثر تھیں۔ اس کی وجہ یہ تھیں یا ان کی اہمیت کیا تھی، یہ عقدہ معاصرین سے حل نہ ہو سکا اور وہ اکثر اوقات چکر اکر رہ جاتے۔ اس قسم کا ایک محیر العقول واقعہ کوئی بیس سال قبل رونما ہوا تھا جب کسانوں کے اذہان میں بعض مظلوم "نیم گرم دریاؤں" کی طرف ترک وطن کرنے کا سودا سما گیا۔ ہزاروں کسان، جن میں باکو چارافو کے کسان بھی شامل تھے، اچانک اپنے مویشی فروخت کرنے اور اپنے خاندانوں سمیت جنوب مشرقی سمت کوچ کرنے لگے۔ ان پرندوں کی طرح، جو پرواز کر کے سمندر پار کہیں جا رہے ہوتے ہیں، یہ لوگ بھی اپنے بیوی بچوں سمیت جوق در جوق مشرق میں ان علاقوں کی جانب، جہاں ان میں سے قبل ازیں کوئی بھی نہیں گیا تھا، عازم سفر ہوئے۔ لگے۔ وہ کارواں بناتے، ایک ایک کر کے اپنی آزادی خریدتے اور پیدل یا چھکڑوں پر نیم گرم دریاؤں کی جانب چل پڑتے۔ بعض ایسے ہی بھاگ نکلتے۔ کئیوں کو سزائیں دی گئیں اور سائبیریا بھیج دیا گیا۔ بہت سے بھوک پیاس پروردگی سے راستے میں مر گئے۔ متعدد اپنی مرضی سے واپس آ گئے اور یہ تحریک جس طرح کسی ظاہری وجہ کے بغیر شروع ہوئی تھی، اسی طرح دم توڑ گئی۔ لیکن یہ زیریں سطح رویں اب بھی چل رہی اور لوگوں کو متاثر کر رہی تھیں اور اپنے اظہار کے لیے کسی نئے محرک کی منتظر تھیں۔ یہ جب منظر عام پر آئیں، تو بالکل فطری، سادہ اور پر تشدد معلوم ہوئیں لیکن یہ کہ ایسا ہوگا، کسی کو بھی اس کی توقع نہ ہوتی اور نہ اس کی وجہ کسی کی سمجھ میں آتی۔ اب 1812 میں ہر اس شخص پر، جو ان کسانوں کے قریب رہتا تھا، یہ بات بالکل عیاں تھی کہ یہ زیریں سطح لہریں غیر معمولی قوت سے رواں دواں ہیں اور کسی نہ کسی قسم کا جوا لاکھیں پھٹ پڑنے کو بے تاب ہے۔

آل پاچ، جو معمر پرنس کے انتقال سے صرف چند دن قبل باگو چارافو پہنچا تھا، بھانپ گیا کہ کسانوں میں ہلچل پائی جالی ہے۔ وہ سمجھ گیا کہ بالڈ ہلز میں جو کچھ ہو رہا ہے، یہاں اس کے بالکل برعکس ہو رہا ہے۔ بالڈ ہلز کا حال یہ تھا کہ وہاں چالیس میل سے بھی زیادہ دائرے کے اندر جتنے کسان تھے، وہ اپنے گھریاں چھوڑ کر فرار ہو رہے تھے اور جن دیہاتوں کو وہ خالی کرتے تھے، قارق انھیں تاخت و تاراج کر دیتے تھے۔ اس کے برعکس باگو چارافو اس کے گرد و نوچ گھاس کے میدانوں کے کسانوں کے متعلق یہ کہہ جاتا تھا کہ ان کے فرانسیسیوں کے ساتھ رد و بپا ہیں، وہ ان سے دو یا چار درتی کتابچے وصول کر رہے ہیں اور ہاتھوں ہاتھ ایک سے دوسرے شخص تک پہنچا رہے ہیں، اور یہ کہ ان کا اپنے گھروں کو چھوڑنے کا قطعاً کوئی ارادہ نہیں ہے۔ اسے گھریلو غلاموں کی، جو اس کے وفادار تھے، وساطت سے معلوم ہوا کہ ایک کسان، جس کا نام کارپ ہے، جسے یہی کیون میں زبردست اثر و رسوخ حاصل ہے اور جو حالیہ دنوں میں ہر کاری گاڑی ہانکنے کا کام سرانجام دیتا رہا ہے، یہ خبر لے کر واپس آیا ہے کہ قارق دیہات کی اینٹ سے اینٹ بجا رہے ہیں لیکن فرانسیسی ان سے کوئی تعرض نہیں کرتے۔ آل پاچ کو یہ بھی معلوم تھا کہ گزشتہ روز ایک اور کسان و سلو خاؤد گاؤں سے، جس پر فرانسیسیوں کا قبضہ تھا، کسی فرانسیسی جرنیل کے فرمان کی نقل بھی لے آیا ہے۔ اس فرمان میں یہ کہہ گیا تھا کہ مقامی باشندوں کو، بشرطیکہ وہ جہاں ہیں، وہیں مقیم رہیں، کوئی گزند نہیں پہنچایا جائے گا اور ان سے جو چیز بھی لی جائے گی، اس کی انھیں قیمت ادا کی جائے گی۔ ثبوت کے طور پر وہ کسان و سلو خاؤد سے ٹوٹوں کی شکل میں سو روپے لایا تھا۔ (سے یہ معلوم نہیں تھا کہ یہ نوٹ جعلی ہیں۔) یہ رقم اسے خشک گھاس کے عوض پیشگی ادا کی گئی تھی۔ اور آخر میں، اور یہ اہم ترین بات تھی، آل پاچ کو معلوم ہوا کہ جس روز اس نے باگو چارافو سے پرنس ماریا کا سامان منتقل کرنے دیہی سرچ کو چھوڑے اسٹھٹے کرنے کا حکم دیا تھا، اسی روز گاؤں میں (کسانوں کا) اجلاس منعقد ہوا تھا اور اس میں انھوں نے فیصلہ کیا تھا کہ وہ وہاں سے کہیں نہیں جائیں گے بلکہ انتظار کریں گے۔ لیکن وقت اتنا کم تھا کہ سے مزید ضائع نہیں کیا جاسکتا تھا۔ پندرہ اگست کو، جس روز معمر پرنس کا انتقال ہوا، مارشل نے امرار کیا تھا کہ پرنس کو بل تاخیر روانہ ہو جانا چاہیے کیونکہ وہاں ٹھہرنا خطرناک سے خطرناک تر ہوتا جا رہا تھا۔ وہ اسے بتا چکا تھا کہ سولہ تاریخ کے بعد جو کچھ وقوع پذیر ہو، وہ اس کے لیے جواب دہ نہیں ہوگا۔ وہ اسی شام واپس چلا گیا تھا لیکن چلتے چلتے وعدہ کر گیا تھا کہ وہ اگلے روز تجھیز و تکفین کی رسوم میں شریک ہونے واپس آئے گا۔ لیکن وہ واپس نہ آ سکا کیونکہ اسے اطلاع ملی تھی کہ فرانسیسی غیر متوقع طور پر آگے بڑھ آئے ہیں اور اسے بڑی مشکل سے صرف اتنا وقت مل سکا کہ وہ اپنی جاگیر سے اپنا خاندان اور قیمتی اشیاء کہیں اور منتقل کر سکے۔

کوئی تیس سال سے باگو چارافو کا نظم و نسق دیہاتی سرچ زردن کے ہاتھوں میں چھا آ رہا تھا۔ معمر پرنس اسے ہمیشہ درویش کا کہتا تھا۔ وہ ان کسانوں۔ جسائی اور ذہنی اعتبار سے چاق و بند۔ میں شامل تھا جو بلوغت کی عمر کو پہنچتے ہی لمبی لمبی داڑھیاں رکھ لیتے ہیں اور جن میں سرٹھ ستر کے پٹے میں داخل ہونے سے پہلے کوئی تبدیلی نہیں آتی۔ نہ ان کا کوئی لباس سفید ہوتا ہے اور نہ ان کا کوئی دانت گرنا ہے۔ وہ ساٹھ کے تو ہو جاتے ہیں لیکن ان کے

اجسام اسی طرح توانا اور سیدھے ہوتے ہیں جیسے وہ تیس سال کی عمر میں تھے۔

’نیم گرم دریاؤں‘ کی طرف کوچ کے، جس میں دوسروں کے ساتھ وہ بھی شریک تھا، کچھ ہی عرصہ بعد درون کو چارانو کا سرچ اور اور سیر مقرر کر دیا گیا۔ درودہ تیس سال سے ان عہدوں کے فرائض اتنی خوبی سے سرانجام دے رہا تھا کہ کسی کو میں مکھ نکالنے کا موقع نہ دیا۔ کسان اپنے مالک سے اتنے خائف نہیں تھے جتنے کہ اس سے۔ معمر اور جوان، دونوں پرنس، اور سٹیوارڈ اس کی عزت کرنے اور درہ مذاق اسے ”نفسر“ کہا کرتے تھے۔ اپنی ساری ملازمت کے دوران میں درون نہ تو کبھی نشے سے مدہوش ہوا اور نہ کبھی بیمار پڑا۔ انتہائی جان لیوا مشقت کرنے یا بے خواب راتیں گزارنے کے بعد بھی اس میں تھکن کے کبھی معمولی آثار بھی دکھائی نہیں دیے تھے اور اگرچہ اسے پڑھنا آتا تھا نہ لکھنا، وہ حساب کتاب کے معاملے میں اتنا تیز تھا کہ پائی پائی کا خیال رکھتا اور ایک پیسہ بھی ادھر ادھر نہیں ہونے دیتا تھا۔ وہ پرنس کا ل تعداد چھکڑے، تا فردخت کرنا لیکن بحال ہے کہ ایک آدھ سیر کا بھی پیر پھیر ہو جانا درودہ باگو چارانو کے کھیتوں کے ایک ایک ایکڑ سے گندم کا ایک ایک گٹھ وصول کیے بغیر م نہ لیتا۔

بالذہن کی لٹی پٹی جاگیر سے اپنی آمد کے بعد آل پانچ نے اسی درون کو پرنس کی جھینڈ ٹکٹین کے روز بدایا۔ اس نے اسے بتایا کہ پرنس کی بگیوں اور دوسری گاڑیوں کے لیے ایک درجن گھوڑے اور باگو چارانو سے اس کا سامان منتقل کرنے کے لیے اٹھارہ چھکڑے تیار کیے جائیں۔ اگرچہ کسان اپنی آزادی حاصل کرنے کے لیے لگان ادا کرتے تھے، آل پانچ کے کبھی ذہن دکان میں بھی یہ بات نہیں آئی تھی کہ اس کے اس حکم کی تعمیل میں کوئی دقت پیش آئے گی کیونکہ باگو چارانو میں جو گھرانے لگان ادا کرتے تھے ان کی تعداد اڑھائی سو تھی اور کسان خوشحال تھے۔ لیکن حکم سن کر درون نے نظریں جھکا لیں اور خاموش رہا۔ آل پانچ نے بعض کسانوں کا، جنہیں وہ جانتا تھا، نام لیا اور اس سے کہا کہ ان سے چھکڑے لے لیے جائیں۔

درون نے جواب دیا کہ ان لوگوں کے گھوڑے کرائے پر گئے ہوئے ہیں۔ آل پانچ نے دوسروں کے نام لیے لیکن درون کے بقول ان کے گھوڑے بھی دستیاب نہیں تھے۔ بعض گھوڑے سرکاری گاڑیوں میں جتے ہوئے تھے، بعض بالکل کمزور تھے اور بعض چارہ نہ ملنے کے سبب مر چکے تھے۔ بگیوں وغیرہ کے لیے بھی کافی گھوڑے میسر آنے کی کوئی امید نہیں تھی۔

آل پانچ نے گھوڑے درون کی جانب دیکھا اور اس کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ جس طرح درون مثالی دیہی سرچ تھا، اسی طرح آل پانچ مثالی سٹیوارڈ تھا۔ وہ گزشتہ بیس سالوں سے پرنس کی جاگیروں کا یونہی نظم نہیں چلا آ رہا تھا۔ جن لوگوں سے اسے پٹنا پڑتا تھا، اسے ان کی جبتوں اور ضرورتوں کو بھانپنے کا غیر معمولی ملکہ حاصل تھا اور اسی بنا پر وہ اتنا اعلیٰ پائے کا سٹیوارڈ تھا۔ اس کے لیے یہ اندازہ لگانے کے لیے درون پر ایک نظر ہی ڈالنا کافی تھا کہ جس قسم کے جوابات وہ دے رہا ہے، وہ اس کے ذاتی خیالات کا اظہار نہیں بلکہ باگو چارانو کی عمومی ذہنی کیفیت کی، جس کی رو میں سرخ بہہ گیا تھا، عکاسی کر رہے ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اسے یہ بھی معلوم تھا کہ

درون، جو اچھی خاصی رقم پس انداز کر چکا تھا اور جسے کیوں میں بنظر تھرت دیکھ جاتا تھا، دوفریقوں۔ ایک طرف مالک اور دوسری طرف کسان۔ کے مابین ڈنگار ہا ہوگا۔ اس کا یہ تذبذب اسے اس کی آنکھوں میں نظر آ گیا۔ چنانچہ اس نے تیوریاں چڑھائیں اور درون کے قریب ہو گیا۔

”دروں کا سنو“ اس نے کہا۔ ”مجھ سے فضول باتیں مت کرو۔ ہر ایک سی لینسی پر نس آندرے نکولائی ورج نے بنس نفیس مجھے حکم دیا تھا کہ تمام لوگوں کو یہاں سے نکال دیا جائے اور انھیں دشمن کے رحم و کرم پر نہ چھوڑا جائے اور نہ رکا بھی جائے۔ جو شخص یہاں مقیم رہے گا ہزار سے غدار کی کا سر تک متصور ہوگا۔ سناتم نے؟“

”سن رہا ہوں،“ درون نے اپنی نگاہیں اٹھائے بغیر کہا۔

آل پانچ اس جواب سے مطمئن نہ ہوا۔

”ہاں، درون، مصیبت کھڑی ہو جائے گی،“ اس نے اپنا سر ہلاتے ہوئے کہا۔

”حکم دینا آپ کا کام ہے،“ درون نے انسردگی سے کہا۔

”درون، چھوڑ دو،“ آل پانچ نے کوٹ کی اندرونی جیب سے ہاتھ نکالتے اور درون کے پاؤں تلے فرش کی طرف سنجیدگی سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”میں تمہارے سارے پارہ دیکھ سکتا ہوں۔ یہی نہیں بلکہ تمہارے قدموں کے تین گز نیچے زمین میں بھی دیکھ سکتا ہوں،“ اس نے درون کے پاؤں تلے فرش کو ٹنگی پاندھ کر دیکھتے ہوئے کہا۔ درون گھبرا گیا۔ اس نے دیر دیدہ نگاہوں سے آل پانچ کی جانب دیکھا اور ایک بار پھر اپنی نظریں جھکا لیں۔ ”یہ بکواس ختم کرو اور لوگوں سے کہو کہ وہ اپنا بور یا بستر سیمیش اور، سکو چلے جائیں۔ انھیں بتاؤ کہ وہ پرس کے سامان کے لیے کل چھڑے تیار رکھیں اور ہاں، ان کے جلسوں سے دور رہو، سناتم نے؟“

درون اچانک دوڑا تو ہو گیا۔

”یا کون آل پانچ، مجھے ذرا غلطی دے دو اسٹیج کا واسطہ، مجھ سے چاہیاں لے لو اور مجھے فارغ خطی دے دو“ ”بند کر دیا،“ آل پانچ نے درستی سے کہا۔ ”میں تمہارے قدموں کے تین گز نیچے زمین میں دیکھ سکتا ہوں!“ اس نے ایک بار پھر کہا۔ وہ جانتا تھا کہ اسے شہد کی کھیاں پانے اور جینی کی صحیح وقت پر کاشت کرنے میں جو مہارت حاصل ہے، اور اس پر مستزاد یہ کہ اسے بیس ساں سے مٹر پر نس کو مطمئن کرنے میں جو کامیابی ملتی رہی ہے، اس نے مدتوں سے اسے جادوگر کی حیثیت سے مشہور کر رکھا ہے اور یہ کہ کسی شخص کے پاؤں کے تین گز نیچے زمین میں دیکھا جادو گروں کا ہی دھنک گروانا جاتا ہے۔

درون سیدھا کھڑا ہو گیا۔ وہ کچھ کہنا چاہتا تھا کہ آل پانچ نے اسے ٹوک دیا۔

”یہ تم لوگوں کے بھیجوں میں کیا سما گیا ہے؟ ہونہہ... تم سوچ کیا رہے ہو؟ ہونہہ؟“

”میں لوگوں کو کیا سمجھاؤں؟“ درون نے کہا۔ ”ن سب میں جیوان پھیلا ہوا ہے۔ میں انھیں بتا چکا ہوں...“

”تم انھیں بتا چکے ہو!“ آل پانچ نے دہرایا۔ ”کیا ان سب کو نشہ چڑھ گیا ہے؟“ اس نے پوچھا۔

’یا کوف آں پانچ ان سب میں پہچان پھیلنا ہوا ہے۔ انھیں نیا مشغلہ ہاتھ آ گیا ہے۔‘
 ’پھر میری بات دھیاں سے سنو۔ میں پولیس کیتان کے پاس جا رہا ہوں۔ تم، انھیں یہ بتادینا اور ان سے
 کہنا کہ وہ احمدیہ حرکتیں چھوڑ دیں اور چھکڑے تیار رکھیں۔‘
 ’بہت اچھا‘ درون نے جواب دیا۔

آل پانچ نے مزید اصرار نہ کیا۔ اسے کسانوں سے نیپٹے اتنی مدت ہو چکی تھی کہ وہ یہ بات اچھی طرح سمجھ گیا
 تھا کہ ان سے حکم منوانے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ انھیں مطلق شبہ نہ ہونے دیا جائے کہ وہ حکم عدولی کر سکتے
 ہیں۔ اس نے درون سے جوا طاعت شعارانہ ’’بہت اچھا‘‘ اگھوایا تھا، وہ اس کی مطمئن ہو گیا حالانکہ وہ جانتا تھا کہ
 فوجی حکام کی مداخلت کے بغیر چھکڑے نہیں نکلیں گے۔

چنانچہ یہی ہوا۔ شام ڈھل گئی، رات سریر آگئی لیکن چھکڑوں کا نام و نشان تک نہیں تھا۔ گاڑوں میں شراب خانے
 کے باہر ایک اور جلسہ ہوا۔ اس میں یہ بڑے پیا کہ گھوڑے جنگل میں ہانک دیے جائیں اور چھکڑے فراہم نہیں کیے
 جائیں گے۔ آل پانچ نے پرنس سے ایک لفظ کہے بغیر چھکڑوں سے اپنا وہ سامان، جو بالڈلز سے اس کے ساتھ آیا
 تھا، واپس لیا۔ اس نے ان کے گھوڑے پرنس کی گاڑیوں میں جتوا دیے اور خود حکام سے ملنے چلا گیا۔

10

اپنے باپ کے کفن دفن کے بعد پرنس ماریا اپنے کمرے میں بند ہو گئی اور اس نے کسی شخص سے بھی ملنے سے انکار کر
 دیا۔ دروازے پر ایک خادمہ یہ بتانے آئی کہ آل پانچ روانگی کے متعلق ہدایات مانگ رہا ہے۔ (یہ اس کی درون
 سے گفتگو سے قبل کی بات ہے۔) پرنس ماریا جس صوفے پر لیٹی ہوئی تھی، وہ اٹھ کر اس پر بیٹھ گئی اور بند دروازے
 میں سے جواب دینے لگی: ’’میرا یہاں سے کہیں جانے کا قطعاً کوئی ارادہ نہیں۔ میں ہاتھ جوڑ کر کہتی ہوں کہ میرے
 سکون میں خلل نہ ڈالیں۔‘‘

وہ جس کمرے میں لیٹی ہوئی تھی، اس کی کھڑکیاں مغرب کی جانب کھلتی تھیں۔ وہ صوفے پر رہا کرتی تھی اور اس
 کا در دیوار کی طرف تھا۔ وہ چرمی کشن کے بنوں پر انگلیاں پھیر رہی تھی۔ اسے کشن کے علاوہ اور کچھ نظر نہیں آ رہا تھا
 جب کہ اس کے پرانگندہ خیالات صرف ایک موضوع پر۔ موت اٹل ہے اور وہ خود روحانی مصلحت میں گرفتار ہے۔
 مرکز تھے۔ جہاں تک اس کی روحانی مصلحت کا تعلق ہے، اسے اس کے بارے میں خفیہ سا بھی علم نہیں تھا
 تا آنکہ اپنے باپ کی عدالت کے دوران میں یہ خود ہی اس پر آشکار ہو گئی۔ اس کا روم روم دعا مانگنے کے لیے تڑپ
 رہا تھا لیکن جس ذہنی کیفیت میں وہ اپنے آپ کو پارہی تھی، اس میں اسے اتنا حوصلہ نہیں ہو رہا تھا کہ وہ خدا سے
 غائب ہو سکے۔ وہ کافی دیر تک اسی طرح لیٹی رہی۔

سونا مکان کی دوسری جانب پہنچ چکا تھا اور اس کی ترجمانی کر نہیں سکے درپے میں سے اندر آ رہی تھیں۔ وہ

کمرے اور مراکشی چڑے کے کشن کے اس حصے کو، جسے پرنس ماریا گھور گھور دیکھ رہی تھی، منور کر رہی تھیں۔ اس کے خیالات کی رواج چایک تھم گئی اور وہ غیر شعوری طور پر اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس نے اپنے بال درست کیے، صوفے سے نیچے اتری اور چلتے چلتے کھڑکی کے پاس پہنچ گئی۔ سطح صاف تھا لیکن ہوا چل رہی تھی۔ وہ جیسی طور پر ہوا اپنے ہیمپٹروں میں کھینچنے لگی۔

”ہاں، اب تم جی بھر کر شام سے لطف اندوز ہو سکتی ہو اور وہ جھپکے ہیں، اب ڈرکس چیز کا؟ کون ہے جو تمہیں ٹوک سکے؟“ اس نے اپنے آپ سے کہا۔ وہ بے اختیار کرسی میں ڈھنسنے لگی لیکن اس نے اپنا سر کھڑکی کی دہلیز پر پڑا رہنے دیا۔

کسی نے باغ میں سے بڑے نرم اور ملائم لہجے سے اس کا نام پکارا اور اس کے سر پر بوسہ دیا۔ اس نے نگاہیں اوپر اٹھا کر دیکھا۔ وہ مادموزیل بوغین تھی۔ وہ سیاہ ڈریس اور سکارف میں ملبوس تھی۔ وہ وہی پرنس ماریا کے قریب آئی، اسے چوما، وہ بھری اور جھٹ پٹ پھوٹ پھوٹ کر آنسو بہانے لگی۔ پرنس ماریا نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا۔ دونوں کے مین ریمش تھیں اور پرنس ماریا فرانسیسی خاتون سے حسد کرتی رہی تھی۔ اب یہ ساری باتیں اس کے ذہن میں گردش کرنے لگیں، لیکن اسے یہ بھی یاد آیا کہ بعد ازاں مادموزیل بوغین کے بارے میں اس کے رویے میں تبدیلی آگئی تھی اور وہ یہ ظاہر کرنے لگا تھا کہ اسے اس کا وجود ایک آنکھ نہیں بھاتا۔ یوں اس نے یہ دکھا دیا تھا کہ پرنس ماریا اسے دل ہی دل میں جس طرح کستی رہی تھی، اس میں حق بجانب نہیں تھی اور وہ محض نا انصافی برتی رہی تھی۔ ”اس کے علاوہ کیا یہ میرا، میرا کام ہے کہ میں، جو اس کی موت کی تمنا کرتی رہی، دوسروں کا مواخذہ کر دوں؟“ اس نے سوچا۔

پرنس ماریا نے واضح انداز سے مادموزیل بوغین کی پوزیشن کا تصور اپنے ذہن میں قائم کیا۔ دونوں کے مابین خلیج حائل ہو چکی تھی لیکن وہ اپنی ضروریات کے لیے اس کی محتاج تھی اور اس کے مکان میں رہ رہی تھی۔ اسے اس پر ترس آنے لگا۔ اس نے دائم مستفسر انداز سے اس کی جانب دیکھا اور اپنا ہاتھ بڑھا دیا۔ مادموزیل بوغین ایک بار پھر رونے اور اس کا ہاتھ چومنے لگی۔ پرنس ماریا پر غم کا جو پہاڑ ٹوٹ پڑا تھا، وہ اس کے متعلق باتیں کرنے اور اپنے آپ کو اس میں برابری کا شریک بنانے لگی۔ ”مجھے ذاتی طور پر جو صدمہ پہنچا ہے وہ تو اپنی جگہ ہے ہی،“ اس نے کہا، ”لیکن میرے لیے تسلی کا پہلو یہ ہے کہ آپ نے مجھے، پناغم بنانے کی اجازت دے دی ہے۔ ہمیں جو یہ عظیم صدمہ برداشت کرنا پڑا ہے، اس کے پیش نظر ہمیں اپنی تمام سابقہ غلط فہمیاں فراموش کر دینا چاہئیں۔ میں محسوس کرتی ہوں کہ ہر شخص کے بارے میں میرا ضمیر پاک و صاف ہے۔ وہ عالم بالا میں پہنچ چکے ہیں لیکن انہیں معلوم ہے کہ مجھے (اس خاندان سے) کتنی محبت ہے اور میں اس کی کتنی شکر گزار ہوں۔“ پرنس ماریا کے کان اس کی باتوں پر ضرور تھے لیکن وہ سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ وہ کیا کہہ رہی ہے۔ ہاں، کبھی کبھار وہ آنکھ اٹھا کر اس کی جانب دیکھ لیتی اور اس کی باتوں کی آواز سننے لگتی۔

”ڈیزیز پرنس، مجھے معلوم ہے کہ آپ کی پوزیشن رگنٹا نشوونما ناک ہے۔“ مادوزیل بوغین نے توقف کے بعد کہا۔ ”میں جانتی ہوں کہ آپ اپنے بارے میں نہ سوچ سکتی تھیں اور نہ سوچ سکتی ہیں، لیکن مجھے آپ سے جو محبت ہے، اس کے پیش نظر میں سوچنے پر مجبور ہوں۔ آل پانچ آپ سے ملنے آیا تھا؟ اس نے یہاں سے روانہ ہونے کے بارے میں کوئی بات کی تھی؟“ اس نے پوچھا۔

پرنس ماریا نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس کی کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ کس نے جانا ہے اور کہاں جانا ہے۔ ”کیا کسی چیز کے بارے میں اب سوچنا یا منصوبہ بنانا ممکن ہے؟“ اس نے سوچا اور کوئی جواب نہ دیا۔

”Chere Marie“ آپ جانتی ہیں، ”مادوزیل بوغین نے کہا، ”کہ ہم خطرے میں ہیں۔ ہم فرانسیسیوں کے زخموں میں آچکے ہیں۔ اب یہاں سے جانا خطرے سے خالی نہیں ہوگا۔ گرہم چل پڑے، ہمیں یقیناً قیدی پالیا جائے گا اور خدا جانتا ہے۔۔۔“

پرنس ماریا اپنی مصاحبہ کی طرف دیکھنے لگی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کہہ رہی ہے۔ ”کاش کسی کو معلوم ہوتا کہ اب میرے لیے ہر چیز کتنی بے معنی ہو گئی ہے؟“ اس نے کہا۔ ”البتہ ایک بات یقینی ہے کہ میں کسی صورت میں بھی ان سے دور نہیں جانا چاہوں گی۔۔۔ آل پانچ سے جانے کے متعلق کچھ کہا ضرور تھا، آپ ان سے بات کر لیں۔ میں کچھ نہیں کر سکتی اور نہ کچھ کرنا چاہتی ہوں۔۔۔“

”میں اس سے بات کر چکی ہوں۔ اسے امید ہے کہ ہم کل یہاں سے روانہ ہو سکیں گے۔ لیکن میرا خیال ہے کہ ہمارے لیے بہتر یہی ہے کہ ہم یہیں رہیں، ”مادوزیل بوغین نے کہا۔ ”کیونکہ Chere Marie، آپ مجھ سے اتفاق کریں گی کہ گرہم راستے میں فوجیوں یا فساد کی کسٹوں کے ہتھے پڑھ گئے، پھر بڑا برا حال ہوگا۔“

مادوزیل بوغین نے اپنے (قدیم الوضع) ہینڈ بیک سے اعلان نامے کی نقل نکالی (یہ عام روٹی کاغذ پر طبع نہیں ہوئی تھی)۔ یہ اعلان نامہ فرانسیسی جرنیل عامونے جاری کیا تھا اور اس میں لوگوں سے کہا گیا تھا کہ وہ اپنے گھر پر چھوڑ کر نہ جائیں، بلکہ فرانسیسی ان کا تحفظ کریں گے۔ اس نے نقل پرنس کو تھمادی۔

”میرا خیال ہے کہ اس جرنیل سے اپیل کرنا زیادہ بہتر رہے گا،“ اس نے مزید کہا۔ ”اور مجھے یقین ہے کہ آپ کا شاہانہ شان انداز سے احترام کیا جائے گا۔“

پرنس ماریا نے کاغذ کا مطالعہ کیا اور گھٹی گھٹی، ہوں سے اس کا چہرہ کچکپانے لگا۔

”آپ کو یہ کہاں سے ملا ہے؟“ اس نے پوچھا

”انھیں غالباً میرے نام سے اندازہ ہو گیا ہوگا کہ میں فرانسیسی ہوں،“ مادوزیل بوغین نے کہا اور اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

پرنس ماریا کا رنگ پیلا ہو گیا۔ اعلان نامہ ابھی تک اس کے ہاتھ میں تھا۔ وہ درجے کے قریب اپنی

نشست سے اٹھی اور پرنس آندرے کے سابق سٹڈی روم میں چلی گئی۔

”دنیا شاہ! اس نے کہا۔“ آل پاچ، درویشکایہ کسی دوسرے شخص کو میرے پاس بھیج دو! اور ہاں، دام بوفین کو بتا دو کہ میں خلوت چاہتی ہوں!“ اس نے اپنی مصاحبہ کی آواز سن کر مزید کہا۔ ”ہمیں فوراً روانہ ہو جانا چاہیے! فی الفور ابھی!“ اس پر فرانسیسیوں کے ہتھے چڑھ جانے کے خیال سے ہی ہول طاری ہو گیا تھا۔

”اگر پرنس آندرے کو معلوم ہو گیا کہ میں فرانسیسیوں کے قبضے میں ہوں، وہ کیا سوچیں گے! یہی نامہ پرنس نکولائی کی مٹی جنرل غامو سے تحفظ کی طلب گار ہوئی اور اس کی نوازش سے فیض یاب ہوئی! ہے نا ڈوب مرنے کا مقام!“ اس تصور نے ہی اس پر دہشت طاری کر دی اس کا بدن کچکپانے لگا اور (شرم) سے اس کا چہرہ رال بھبھوکا ہو گیا۔ اب اسے جو غصہ آیا اور جس آن بان کا احساس ہوا، اس کا تجربہ اسے زریں جیستر کبھی نہیں ہوا تھا۔

اس کی موجودہ حالت اس کے لیے جس طرح تکلیف اور اس سے بھی زیادہ ذلت کا باعث بن گئی تھی، اس کا سے شدت سے احساس ہو گیا۔ ”وہ، یعنی فرانسیسی، اس گھر میں زیرے ڈال دیں گے، Monsieur le genera

غامو پرنس آندرے کے سٹڈی روم پر قابض ہو جائے گا اور اس کے کاغذات و خطوط کی پھان پھٹک اور مطالعے سے اپنا دل بہلائے گا۔ دموزیل بوشین باگو چارافو کی میزبان بن جائے گی اور مجھے از رو عنایت کوئی چھوٹا موٹا کمرہ دے دیا جائے گا۔ سپاہی میرے باپ کے تیغے اور اعزازات چرانے کے لیے اس کی تازہ قبر کی بے حرمتی کریں گے۔ وہ مجھے روسیوں پر اپنی فتوحات کے قصے سنائیں گے اور میرے غم و اندوہ میں مجھ سے جھوٹ سوٹ کی ہمدردی جتائیں گے۔“ پرنس ہاریانے سوچا۔ وہ اپنے فطری انداز سے نہیں سوچ رہی تھی بلکہ اس موقع پر جس طرح اس کا باپ اور بھائی سوچتے، وہ اسی طرح سوچنا اپنا فرض سمجھ رہی تھی۔ جہاں تک اس کی اپنی ذات کا تعلق تھا، اسے اس امر کی مطلق پروا نہیں تھی کہ وہ کہاں قیام کرتی ہے یا اس پر کیا واردات گزرتی ہے، لیکن اسے محسوس ہوا تھا کہ وہ اپنے مرحوم باپ اور پرنس آندرے کی نمائندگی کر رہی ہے۔ وہ غیر شعوری طور پر ان کے خیالات سوچ رہی اور ان کے احساسات و جذبات محسوس کر رہی تھی۔ وہ کیا کہتے، وہ کیا کرتے، اب اس کا یہ فرض بنتا ہے کہ وہ وہی کچھ کرے۔ وہ پرنس آندرے کے سٹڈی روم میں چلی گئی اور اس کے خیالات کی روشنی میں اپنی پوزیشن کا جائزہ لینے کی کوشش کرنے لگی۔

اسے محسوس ہوا تھا کہ باپ کی موت کے ساتھ زندگی کی مقتضیات بھی دم توڑ گئی ہیں لیکن وہ نئی اور ایسی قوت سے، جس سے وہ اب تک نا آشنا ہی تھی، سر اٹھانے اور اسے اپنی گرفت میں لینے لگیں۔

اس کا چہرہ تہمتار ہوا تھا اور اس کے دل و دماغ میں ہل چل مچی ہوئی تھی، اور اسی کیفیت میں وہ کمرے میں گھومتی رہی۔ وہ کبھی میخائیل ایوانچ، کبھی جیون اور کبھی درون کوئی الفور پہنچنے کا پیغام بھیجتی۔ دنیا شاہ، ادیٹر عمرزں اور دیگر خاندانوں میں سے کوئی بھی اسے یہ نہ جاسکی کہ دموزیل بوفین کا بیان کہاں تک صحیح ہے۔ آل پاچ گھر پر

نہیں تھا، وہ پولیس کے حکام سے ملنے گیا ہوا تھا۔ ماہر تفسیرات میخائیل ایوانچ بھی، جس کی آنکھیں خیر سے جوصل ہو رہی تھیں، پرنس ماریا کو کچھ بتاتے ہیں ناکام رہا۔ گزشتہ چند رہبروں کے دوران میں اس کی یہ عادت بن گئی تھی کہ سمر پرنس جو کچھ کہتا، وہ اس پر مسکرا کر ”ہونہ، ہاں“ کرتا رہتا اور اپنے منہ سے کوئی ایسی بات، جسے پورا کرنا اس کا فرض بن جاتا، نہ نکالتا۔ اس نے اب پرنس کے سوالات کے جوابات بھی ”ہونہ، ہاں“ میں ہی دیے اور کوئی بھی ایسی بات جس کی ذمہ داری اس پر ڈالی جاسکتی، نہ کہی۔ چنانچہ اس کے منہ سے کوئی واضح بات نکلا، تاہم ممکن ہو گیا۔ دیرینہ وردی پوش ملازم تیخون، جس کا پڑ سردہ اور اندر کو دھنسا ہوا چہرہ اس امر کی غمازی کر رہا تھا کہ اس کے غم دائودہ کا کوئی بدوا نہیں ڈھونڈا جاسکتا، پرنس ماریا کے تمام سوالات کا صرف ایک ہی جواب دے رہا تھا: ”جی، پرنس۔“ اور وہ جب بھی نظر اٹھ کر اس کی طرف دیکھتا، بے اختیار ہکیاں بھرنے لگتا۔

سفر شہر دیچی سرشچ وودن اندر آیا۔ اس نے جھک کر پرنس کو سلام کیا اور دروازے کے قریب کھڑا ہو گیا۔ پرنس ماریا نے کمرے کا چکر کاٹا اور اس کے سامنے آکھڑی ہوئی۔

”دروشکا“ اس نے کہا۔ وہ اسے انتہائی وفادار دوست سمجھ رہی تھی۔ اس کے خیال میں یہ وہی دروشکا تھا جو ہر سال دیازما کے میلے سے خاص قسم کی خنجر بریڈ لایا کرتا اور مسکرا کر اسے پیش کیا کرتا تھا۔ ”دروشکا، جب سے مجھے ناقابل برداشت صدمے“ اس نے کہنا شروع کیا لیکن وہ بچ میں ہی رک گئی، اس کے لیے اس سے آگے کچھ کہنا ناممکن ہو گیا۔

”ہم سب خداوند کے دست قدرت میں ہیں،“ وہ کہہ بھر کر بولا۔

وہ ایک لمحہ خاموش رہے۔

”دروشکا، آل پاچ کہیں گئے ہوئے ہیں۔ کوئی نہیں جس سے میں کوئی مشورہ لے سکوں۔ جیسا کہ میں نے

سنا ہے، کیا یہ درست ہے کہ میں یہاں سے جا بھی نہیں سکتی؟“

”یوئر، یکسی لینسی، آپ کیوں نہیں جاسکتیں۔ آپ جاسکتی ہیں،“ درون نے کہا۔

”مجھے بتایا گیا ہے کہ دشمن کی وجہ سے اس میں خطرہ ہے۔ ڈیر فرینڈ، میں بے بس ہوں۔ مجھے کچھ سمجھ میں

نہیں آ رہا۔ کوئی میرا ساتھی نہیں، غم خواہ نہیں۔ میں آج رات یا کل صبح سویرے یہاں سے لازماً روانہ ہو جانا چاہتی ہوں۔“

درون نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ پرنس ماریا کو آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔

”گھوڑے دستیاب نہیں ہیں،“ اس نے کہا۔ ”میں نے یا کوف آل پاچ کو بتا دیا تھا۔“

”کیوں؟“ پرنس نے پوچھا۔

”یہ عذاب الہی ہے،“ درون نے کہا۔ ”ہمارے پاس جو گھوڑے تھے، انھیں یا فوج لے گئی ہے یا وہ مر کھپ

گئے ہیں۔ اس سارا حالات ہی سمجھا ایسے ہیں۔ گھوڑوں کو کہاں سے کھلائیں؟ میں یہ فکر لگی ہوئی ہے کہ ہمیں ہم خود بھوکوں نہ مر جائیں۔ حالت یہ ہے کہ بعض لوگوں کو تین دن تک لقمہ توڑنے کو نہیں ملتا۔ ہمارے پاس تنکا بھی

نہیں ہے۔ ہم تباہ ہو گئے ہیں، برباد ہو گئے ہیں۔“

وہ جو کچھ کہہ رہا تھا، پرنس ماریا اسے توجہ سے سن رہی تھی۔

”کس دن تباہ ہو گئے؟ ان کے پاس روٹی نہیں؟“ اس نے پوچھا۔

”وہ قوتوں میں“ درون نے کہا۔ ”گھوڑوں اور چمکڑوں کا ذکر کرنا بیکار ہے۔“

”لیکن دردِ خشک، تم نے مجھے بتایا کیوں نہیں؟ کیا ان کی مدد کرنے کی کوئی صورت نہیں؟ مجھ سے جو بن پڑا،

میں ضرور کروں گی۔“

پرنس ماریا کو یہ بات بہت عجیب نظر آئی کہ اب جب کہ اس کا دل غم و الم سے سیریز تھا لوگوں کے، میرا اور غریب طبقے ہو سکتے ہیں اور یہ کہ امیر لوگ غریبوں کی مدد کرنے سے کتنی کترا سکتے ہیں۔ اسے دھندلا دھندلا سا غم تھا کہ ایک چیز جسے ”جائیداد کا اناج“ کہا جاتا ہے، موجود ہوتی ہے اور یہ کہ اسے بعض اوقات کسانوں میں تقسیم کر دیا جاتا ہے۔ وہ یہ بھی جانتی تھی کہ ضرورت کے وقت نہ اس کا باپ اور نہ اس کا بھائی کسانوں کی مدد کرنے سے گریز کرتا۔ اسے ڈر صرف ایک بات کا تھا کہ وہ اناج کی تقسیم کے سلسلے میں جو ہدایات دینے کا ارادہ کر رہی تھی، انھیں اغاظ کا جامہ پہنانے میں کہیں اس سے کوئی غلطی سرزد نہ ہو جائے۔ وہ اس بات پر خوش تھی کہ اس کے پاس کچھ کرنے کا عذر ہے۔ وہ یہ کام ضمیر کی خلش محسوس کیے بغیر کر سکتی تھی اور اس کے کرنے میں اپنا غم بھلا سکتی تھی۔ وہ درون سے کسانوں کی ضروریات کے بارے میں سوالات کرنے لگی۔ اس نے اس سے یہ بھی دریافت کیا کہ آیا باگچا رافو میں اناج کا کوئی محفوظ ذخیرہ موجود ہے۔

”سیرا خیال ہے کہ ہمارے پاس میرے بھائی کا اناج موجود ہے؟“ پرنس ماریا نے پوچھا۔

”آکا کے اناج کو کسی نے ہاتھ بھی نہیں لگایا،“ درون نے فخریہ کہا۔ ”پرنس نے اس کی فروخت کے بارے

میں کوئی حکم نہیں دیا تھا۔“

”یہ کسانوں میں تقسیم کر دو۔ جسے جتنے کی ضرورت ہو، اسے اتنا دے دو۔ میں اپنے بھائی کے نام پر تمہیں

اس کا اختیار دیتی ہوں،“ پرنس ماریا نے کہا۔

درون نے جواب میں صرف گہری سانس لی۔

”ان میں یہ اناج تقسیم کر دو بشرطیکہ یہ کافی ہو۔ سب بانٹ دو۔ میں اپنے بھائی کے نام پر یہ حکم دے رہی

ہوں۔ انھیں بتا دو کہ جو کچھ ہمارا ہے، ان کا ہے۔ ہم انھیں کچھ بھی دینے سے دریغ نہیں کریں گے۔ جاؤ، انھیں

بتا دو۔“

جب وہ بول رہی تھی، درون ٹھٹکی باندھے اسے دیکھ رہا تھا۔

”میم، خدا کا واسطہ میری چھٹی کر دیں! مجھ سے چابیاں لے لیں!“ اس نے کہا۔ ”میں نے تیس سال

خدمت کی ہے اور کبھی غلطی نہیں کی۔ خدا کا واسطہ، میری چھٹی کر دیں!“

پرس مار یا بانگل سمجھ نہ سکی کہ وہ اس سے کیا چاہتا ہے یا وہ کیوں اس سے کہہ رہا ہے کہ اس کی چھٹی کردی جائے۔ اس نے جواب دیا، ”میں نے تمھاری خدمت کو کبھی شک کی نظروں سے نہیں دیکھا۔ میں تمھارے اور کسانوں کے لیے سب کچھ کرنے کو تیار ہوں۔“

11

ایک گھنٹہ بعد دیا شاپرس کو بتانے آئی کہ درون واپس آ گیا ہے اور پرس کے حکم پر تمام کسان سودی خانے کے قریب جمع ہو گئے ہیں، وہ اپنی مالکہ سے ہات کرنا چاہتے ہیں۔

”لیکن میں نے تو انھیں نہیں بلایا تھا،“ پرس، ریا نے کہا۔ ”میں نے درونشکا سے صرف یہ کہا تھا کہ انھیں ناناچے پہن دو۔“

”پرس، خدا کے لیے انھیں یہاں سے چلنا کریں اور ہرگز ہرگز اس کے قریب نہ جائیں۔ یہ محض جال ہے،“ دیا شاپر نے کہا۔ ”جوئی یا کوف آں پانچ آئیں گے، ہم روانہ ہو جائیں گے لیکن خدا کے لیے۔“

”جال؟ تم کہنا کیا چاہتی ہو؟“ پرس ماریا نے، پیچھے سے پوچھا۔

”مجھے اس کا پورا یقین ہے۔ خدا کے لیے میری بات سنیں آپ پرس سے پوچھ سکتی ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ وہ آپ کے حکم پر باگ چارانو چھوڑ کر نہیں جائیں گے۔“

”تم غلطی کر رہی ہو۔ میں نے انھیں کبھی یہ حکم نہیں دیا تھا کہ وہ یہاں سے چلے جائیں،“ پرس نے کہا۔

”درونشکا کو بلو۔“

درون اندر آ گیا اور دیا شاپر نے جو کچھ کہا تھا، اس نے اس کی تصدیق کر دی۔ ”کساں آپ کے حکم پر آئے ہیں!“ اس نے کہا۔

”لیکن میں نے تو انھیں کبھی نہیں بلایا تھا،“ پرس نے زور دے کر کہا۔ ”تم سے ان تک میرا پیغام پہنچانے میں غلطی سرزد ہوئی ہوگی۔ میں نے تو صرف یہ کہا تھا کہ ان میں غنہ تقسیم کر دو۔“

درون نے جواب میں لمبی سانس لی۔

”اگر آپ انھیں حکم دیں گی تو وہ چلے جائیں گے۔“

”نہیں، نہیں، میں ان کے پاس خود جاؤں گی،“ پرس ماریا نے کہا۔

دیا شاپر اور ادھیز عمرزس نے ہر چند اسے روکنے کی کوشش کی لیکن اس کے باوجود وہ پورچ میں چلی گئی۔

درون اور دیا شاپر اور ادھیز عمرزس اور میٹاں یوانج اس کے پیچھے پیچھے چل پڑے۔

”میں بہت خوش ہوں کہ آپ لوگ آ گئے ہیں،“ وہ بولنے لگی۔ اس کی نگاہیں جھکی ہوئی تھیں اور اسے محسوس ہو رہا تھا کہ اس کا دس زور زور سے دھڑک رہا ہے۔ ”درونشکا نے مجھے بتایا ہے کہ جنگ نے آپ لوگوں کو تباہ کر دیا

ہے۔ یہ ہم سب کی مشترکہ پتا ہے اور میں آپ کی مدد کرنے میں کسی قسم کے بخل سے کام نہیں لوں گی۔ میں خود یہاں سے جارہی ہوں کیونکہ یہاں ٹھہرنا خطرے سے خالی نہیں... دشمن قریب ہے.. کیونکہ دوستوں میں سب کچھ آپ کو دے رہی ہوں۔ درمیری آپ سے درخواست ہے کہ آپ سب کچھ، ہمارا سارا اناج، لے لیں تاکہ آپ لوگوں کو کوئی تنگی نہ ہو۔ لیکن اگر کسی نے آپ کو یہ بتایا ہے کہ میں آپ لوگوں کو غلہ اس لیے دے رہی ہوں تاکہ آپ لوگوں کو یہیں ٹھہرا سکوں۔ تو یہ بات درست نہیں ہے۔ اس کے برعکس میری آپ سے درخواست ہے کہ آپ اپنا اپنا سامان اٹھائیں اور میرے ساتھ ماسکو کی جاگیر پر چلے چلیں۔ میں آپ سے وعدہ کرتی ہوں کہ وہاں میں اس بات کا خیال رکھوں گی کہ آپ کو کسی چیز کی قلت محسوس نہ ہو۔ آپ لوگوں کو گھر بھی دیے جائیں گے اور خوراک بھی مہیا کی جائے گی۔“

پرنس نے توقف کیا۔ ہجوم میں صرف آپ سنا دیں۔

”میں یہ سب کچھ اپنی مرضی سے نہیں کر رہی،“ اس نے اپنی تقریر جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”بلکہ میں یہ سب کچھ اپنے مرحوم باپ کے، جو آپ لوگوں کے اچھے آقا تھے، نام پر اور اپنے بھائی اور اس کے بیٹے کے لیے کر رہی ہوں۔“ وہ پھر رک گئی۔ کسی نے ہر سکوت نہ توڑی۔

”یہ ہم سب کی مشترکہ پتا ہے اور ہم سب اس میں برابر کے شریک ہیں۔ جو کچھ میرا ہے، وہ سب آپ کا ہے،“ اس نے اپنے سامنے چہروں کا بخور جائزہ دیتے ہوئے اپنی بات ختم کر دی۔

تمام نگاہیں ٹٹکلی باندھے اسے دیکھ رہی تھیں۔ سب چہروں پر ایک ہی قسم کا تاثر، جس کا مفہوم وہ سمجھنے سے قاصر تھی، جھلک رہا تھا: یہ تجسس تھا، وفاداری تھی، تشکر تھا، خوف تھا یا بدگنی؟ بہر حال جو کچھ بھی تھا، تمام چہروں کا تاثر بالکل یکساں تھا۔

”آپ کی اس کرم فرمائی کا شکریہ لیکن ہم اپنے آقا کا اناج نہیں لے سکتے،“ ہجوم کے عقب سے ایک آواز سنائی دی۔

”لیکن کیوں؟“ پرنس نے پوچھا۔

کسی نے جواب نہ دیا اور پرنس ماریا نے ہجوم میں شامل لوگوں کے چہروں کا جائزہ لیتے ہوئے ایک بات محسوس کی کہ جوئی کوئی آنکھ اس کی آنکھ سے ٹکراتی، فوراً نیچے جھک جاتی۔

”آپ لوگ کیوں نہیں لینا چاہتے؟“ اس نے دوبارہ پوچھا۔

کسی نے جواب نہ دیا۔

خاموشی اس کی طبیعت پر بار بننے لگی۔ وہ کوشش کرنے لگی کہ کسی شخص کی نگاہوں سے تو وہ اپنی نگاہیں مل سکے۔ ”آپ بولتے کیوں نہیں؟“ اس نے ایک بوڑھے شخص سے، جو لاٹھی سے ٹیک لگائے اس کے عین سامنے کھڑا تھا، مخاطب ہو کر کہا۔ ”اگر آپ سمجھتے ہیں کہ کچھ اور بھی درکار ہے، مجھے بتائیں! میں سب کچھ کر دوں گی۔“ اس

نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

لیکن اس شخص نے اپنا سر جھکا لیا جیسے اسے اس کی بات سن کر غصہ آ گیا ہو اور وہ بڑبڑانے لگا:

”ہم آپ کی بات کیوں مانیں؟ ہمیں آپ کا تاج نہیں چاہیے!“

”ہم سب کچھ کیوں چھوڑ دیں؟ ہمیں آپ سے اتفاق نہیں!۔۔۔ ہمیں اتفاق نہیں... ہم نہیں مان سکتے ہمیں

آپ سے ہمدردی ضرور ہے لیکن ہم راضی نہیں ہیں... خوردی چلی جاؤ، خود ہی اپنا بندوبست کر لو،“ ہجوم کے مختلف حصوں سے آوازیں آرہی تھیں۔

ایک بار پھر ہجوم میں شامل تمام اشخاص کے چہروں پر یکساں نوعیت کا تاثر نمایاں ہو گیا لیکن اب کے یہ تاثر شمس یا لشکر کا ہرگز نہیں تھا بلکہ وہ غصہ آلود عزم مصمم کا مظہر تھا۔

”لیکن آپ لوگ شاید میری بات سمجھ نہیں سکے،“ پرنس ماریا نے اداس مسکراہٹ سے کہا۔ ”آپ لوگ کیوں جانا نہیں چاہتے؟ میں آپ سے وعدہ کرتی ہوں کہ میں آپ کو سچے گھروں کی، آپ کو خوراک مہیا کروں گی اور آپ کی دوسری ضروریات پوری کروں گی، جب کہ دشمن یہاں آپ کا سب کچھ تاخت و تاراج کر دے گا۔“ مگر اس کی آواز ہجوم کے شور و غل میں ڈوب گئی۔

”ہم جانے کے لیے تیار نہیں ہیں!۔۔۔ وہ بے شک ہمیں تاخت و تاراج کر دے، کوئی پروا نہیں! ہم آپ کا غلہ نہیں لیں گے... ہم کبھی نہیں مانیں گے!۔۔۔“

پرنس ماریا نے ایک بار پھر ہجوم میں کسی شخص کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالنا چاہیں لیکن کسی نے بھی آنکھ اٹھا کر اس کی طرف نہ دیکھا۔ وہ بظاہر اس کی نگاہوں سے بچنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اسے یہ سب کچھ بہت عجیب لگا اور اسے بے کلی ہونے لگی۔

”اگرے نہیں، وہ اس قسم کی باتوں سے ہمارے گلوں میں طوق نہیں ڈال سکتی... اس کے پیچھے پیچھے جائیں اور اس کے غلام بن جائیں!۔۔۔ اپنے مکان مسمار کر دیں اور گلوں میں بچے ڈال لیں چہ خوب!۔۔۔ کہتی ہے، میں تمہیں تاج دوں گی!“ ہجوم میں سے بھانت بھانت کی آوازیں آرہی تھیں۔

پرنس ماریا نے اپنا سر جھکا لیا اور وہاں سے واپس مکان کی طرف چل پڑی۔ اس نے ایک بار پھر درون کو حکم دیا کہ وہ ان کی اگلی صبح روانگی کے لیے گھوڑے تیار کرے اور وہ اپنے کمرے میں چلی گئی۔ وہاں وہ تنہا اپنے خیالات میں مصروف رہی۔

پرنس ماریا اس رات خاصی دیر تک اپنے کمرے کی کھلی کھڑکی کے قریب بیٹھی رہی۔ گاڑوں سے دیہاتیوں کی آوازیں آرہی اور اس کے کانوں سے مکرار ہی تھیں۔ لیکن اب وہ ان کے متعلق نہیں سوچ رہی تھی۔ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ

وہ ان کے بارے میں خواہ کتنا ہی غور و فکر کیوں نہ کرے، وہ انھیں سمجھ نہیں سکے گی۔ وہ صرف ایک ہی چیز کے متعلق سوچ رہی تھی اور یہ اس کا غم و اندوہ تھا۔ نوری تفکرات کے سبب جو وقفہ آیا تھا، اس کے بعد یوں معلوم ہونے لگا جیسے یہ پہلے ہی قصہ پارینہ بن چکا ہو لیکن اب وہ اس سلسلے میں اپنی یادیں تازہ کر سکتی تھی، آنسو بہا سکتی تھی اور دعائیں مانگ سکتی تھیں۔

غروب آفتاب کے ساتھ ہوا تھم گئی۔ رات ساکت اور خشک تھی۔ نیم شب کے قریب آوازیں آہستہ آہستہ خاموش ہو گئیں، مرغ نے بانگ دی، میوں کے درختوں کے عقب سے ماہ کامل جلوہ افروز ہوا اور تازہ، سفید، شبنم آلود دھند کی چادر پھیلنے لگی۔ مکان و رگاؤں پر خاموشی کا راج مسلط ہو گیا۔

یکے بعد دیگرے حالیہ ماضی کی تصاویر۔ اس کے باپ کی عدالت اور آخری لمحات۔ اس کے ذہن میں دارہ ہونے لگیں۔ وہ تادیر ان شبیہوں کے بارے میں اس سرست سے سوچتی رہی۔ اس نے صرف آخری، یعنی اپنے باپ کے انتقال کی۔ شبیہ کو خوف و دہشت سے اپنے ذہن سے جھٹک دیا۔ اس کے متعلق اسے محسوس ہو رہا تھا کہ رات کے اس ساکت اور پراسرار لمحے میں وہ اپنے تخیل میں بھی اس کے بارے میں کچھ سوچنے کی ہمت نہیں کر سکتی۔ یہ تصاویر اس کے ذہن میں اتنے واضح، غیر مبہم اور مفصل انداز سے آ رہی تھیں کہ اسے یہ خیال گزرنے لگا کہ ان کا تعلق حقیقی حال سے ہے مگر کبھی وہ اسے ماضی اور کبھی مستقبل سے متعلق چیزیں دکھائی دینے لگتیں۔

اسے وہ لمحہ، جب اس پر پہلی مرتبہ فالج کا حملہ ہوا تھا، واضح طور پر یاد آ رہا تھا۔ اسے بغلوں کے نیچے مہارادے کر باغ میں سے گھسیٹ گھساٹ کر اندر لایا گیا تھا۔ اس کی زبان لنگ ہو چکی تھی اور وہ بے بسی کے عالم میں مٹھ ای مٹھ میں کچھ بڑا رہا تھا۔ اس کی سفید بھوئیں پھڑک رہی تھیں اور وہ سہنگیں اور پریشان نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔
”جو کچھ انھوں نے اپنے انتقال کے دن مجھے بتایا، وہ اس روز بھی مجھے وہی کچھ بتانا چاہتے تھے،“ وہ سوچ رہی تھی۔ ”تب انھوں نے جو کچھ فرمایا، وہ ہمہ وقت ان کے ذہن میں موجود رہا۔“

اور پھر اسے بالڈ ہلز میں فالج کے حملے سے قبل کی رات، جب اسے بدشگونی کا احساس ہو گیا تھا اور وہ اس کی مرضی کے برعکس گھر میں مقیم رہی تھی، پوری تفصیل سے یاد آ گئی۔ اسے نیند نہیں آ رہی تھی اور وہ دبے پاؤں نیچے لگاں ہاؤس میں، جہاں اس رات اس کا بستر لگایا گیا تھا، چلی گئی تھی۔ وہ دروازے کے ساتھ کان لگا کر کھڑی ہو گئی تھی۔ وہ تھکی تھکی، مضمحل آواز میں تجن سے کچھ کہہ رہا تھا۔ صاف نظر آ رہا تھا کہ وہ باتیں کرنا چاہتا ہے۔ ”اور انھوں نے مجھے کیوں نہ بلایا؟ تجن کی بجائے مجھے دہس کیوں نہ بٹھایا؟“ پرنس ماریا کو اس وقت بھی تعجب ہوا تھا اور اب بھی ہو رہا تھا۔ ”ان کے دس میں کیا کچھ تھا، اب وہ کسی کو نہیں بتائیں گے۔ اب وہ وقت نہ ان کے لیے، ورنہ میرے لیے دوبارہ کبھی آئے گا۔ یہی وہ وقت تھا جب وہ مجھے وہ سب کچھ، جس کے بتانے کی ان کے دل میں حسرت تھی، بتا سکتے تھے۔ تب تجن کی بجائے شاید میں ان کی باتیں سن سکتی اور ان کا مدعا سمجھ سکتی۔ میں اس رات، اندر کیوں نہ گئی؟“
اس نے سوچا۔ ”انھوں نے جو کچھ اپنے انتقال کے روز مجھ سے کہا، شاید وہ اس روز کہہ دیتے۔ تجن کے ساتھ

انہیں کرنے کرتے انھوں نے دو مرتبہ میرے متعلق دریافت کیا تھا۔ وہ مجھے دیکھنا چاہتے تھے اور میں دروازے کے ساتھ لگی کھڑی تھی۔ وہ غمگین تھے۔ اور ان کے لیے تھون کے ساتھ باتیں کرنا آسان نہیں تھا کیونکہ وہ ان کا مفہوم سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ وہ کس طرح اچانک اس سے بس کے متعلق یوں باتیں کرنے لگے جیسے وہ بھی زندہ ہو۔ وہ بھول چکے تھے کہ وہ خداوند کو پیاری ہو چکی ہے۔ اور جب تھون نے انھیں یاد دلایا کہ وہ اس دنیا میں نہیں رہی، انھوں نے چلا کر کہا دگا ڈوی، ان کی حالت دیکھی نہیں جاتی تھی۔ جب میں دروازے کے ساتھ آڑ لگائے کھڑی تھی، میں نے انھیں کراہتے، بستر پر لیٹے اور دھیمی آواز سے میرے خدا یا! کہتے سنا تھا۔ پھر میں اندر کیوں نہ گئی؟ وہ میرا کیا باگڑ سکتے تھے؟ میرا کیا بگڑ جاتا؟ شاید انھیں رحمت پہنچ جاتی اور شاید مجھے وہ ان الفاظ سے مخاطب کرتے۔ "اور پرنس ماریا نے پیار کے وہ الفاظ، جو وہ اپنی موت کے روز اپنی زبان پر لایا تھا، باواز بلند دہرائے: "عزیز۔ از جان کن!" اور بلک بلک کر رونے لگی۔ آنسوؤں کی اس جھڑکی نے اس کے دل کا غبار دھو دیا۔ اب وہ اس کا چہرہ اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتی تھی اور یہ چہرہ وہ چہرہ نہیں تھا جسے وہ اس وقت سے دیکھتی چلی آئی تھی جب چیزیں اس کے حافظے میں محفوظ ہونا شروع ہوئی تھیں اور جسے اس نے ہمیشہ فاصلے سے دیکھا تھا۔ لیکن جو چہرہ اب دیکھ رہی تھی، وہ نحیف و زار، ڈراسا چہرہ تھا اور اسے اس نے اس کی زندگی کے آخری روز، جب وہ بچہ جھک گئی تھی تاکہ جو کچھ وہ کہہ رہا تھا، اسے غور سے سن سکے، دیکھا تھا۔ وہ زندگی میں پہلی بار اس کے اتنا قریب آئی تھی کہ اس کے چہرے کی باریک سے باریک لکیر اور مہین سے مہین جھری نظر آ گئی تھی۔

"عزیز۔ از جان کن!" اس نے ایک بار پھر یہ الفاظ دہرائے۔

"جب انھوں نے یہ الفاظ کہے تھے، وہ کیا سوچ رہے تھے؟ وہ اب کیا سوچ رہے ہیں؟" یہ سوال اچانک اس کے ذہن میں ابھر اور جواب میں اسے اس کی شکل اپنے سامنے دکھائی دی۔ اس کے چہرے پر وہی تاثر، جو انتقال کے روز اس کے روال سے بندھے ہوئے چہرے پر ہویدا تھا، جھٹک رہا تھا۔ اور اس نے اس روز جب اسے جھوکر دیکھا تھا اور اسے یقین ہو گیا تھا کہ یہ وہ نہیں بلکہ، کوئی اور ہی گھناؤنی اور پراسرار چیز ہے تو جس خوف و ہشت نے اس روز اس پر غلبہ پایا تھا، اس نے اب دوبارہ اسے اپنے شکچے میں کس لیا۔

اس نے کچھ اور سوچنے کی کوشش کی، دعا، ننگن چاہی لیکن وہ دونوں میں سے کچھ بھی نہ کر سکی۔ اس کی آنکھوں کی پتلیاں پھیل گئیں اور وہ ٹھٹھکی بانہہ کر چاندنی اور سائے دیکھنے لگی۔ سے ہر لمحہ یہ گمان ہو رہا تھا کہ اب بھی اس کا کردہ چہرہ دکھائی دیا، اب بھی دکھائی دیا، اور اسے یوں محسوس ہونے لگا کہ مکان کے اندر اور باہر جس سکوت کا راج ہے، اس نے اس پر طلسم طاری کر دیا ہے۔

"رنیا شا!" اس نے زیر لب کہا۔ "دنیا شا!" اس نے وحشت زدگی سے چلا کر کہا، اپنے آپ کو اس طلسم سے آزاد کرایا اور سر پر پاؤں رکھ کر نوکرانیوں کے کمرے کی طرف بھاگنے لگی۔ رستے میں وہ ادھیڑ عمر زن اور خاندان سے، جو بھاگ بھاگ اسی کی طرف آرہی تھیں، ٹکرائی۔

سترہ اگست کو رستوف اور لی یو صرف لاوردشکا، جو ابھی بھی اپنی اسیری سے واپس آیا تھا، اور ایک ہوزار کی، جو اردلی کے فرائض سرانجام دے رہا تھا، معیت میں باگوچارانو سے لگ بھگ دس میل پرے یان کاود میں اپنی جائے رہائش سے روانہ ہوئے۔ لی یو نے نیا گھوڑا خریدا تھا، وہ اس کی آزمائش کرنا چاہتے تھے اور معلوم کرنا چاہتے تھے کہ دیہاتوں میں خشک گھاس میسر آ سکتی ہے یا نہیں۔

گزشتہ تین دنوں سے باگوچارانو کی کیفیت یہ تھی کہ دونوں متحکم فوج کے پڑاؤ وہاں سے برابر برابر قاصد پر قائم تھے۔ چنانچہ روس کی عسکری سپاہ اور فرانسیسیوں کی ہراول فوج، دونوں کے لیے وہاں پہنچنا خاصا آسان تھا۔ رستوف حاضر دماغ سکواڈرن کا نڈر تھا، اس لیے وہاں جو رسد دستیاب ہو سکتی تھی، وہ فرانسیسیوں کی آمد سے پہلے ہی اس پر قابض ہو جانا چاہتا تھا۔

رستوف درالی میں دونوں بے حد ہشاش بشاش تھے۔ انھیں معلوم تھا کہ باگوچارانو کسی پرنس کی جاگیر میں شامل ہے، وہاں جاگیردار کا مکان²⁹ اور زرعی رقبہ ہے اور انھیں امید تھی کہ وہاں انھیں گھریلو غلاموں کی فوج ظفر موج اور چند یک حسین و جمیل خادیاں بھی مل جائیں گی۔ دھر کے سفر کے دوران میں وہ لاوردشکا سے پولین کے متعلق سوالات پوچھتے، اس کے قصوں پر دل کھول کر قہقہے لگاتے اور لی یو کے نئے گھوڑے کو آزمائے کے لیے ایک دوسرے سے دوڑ لگاتے آرہے تھے۔

رستوف کو یہ بالکل معلوم نہیں تھا کہ وہ جس گاؤں جا رہے ہیں، وہ اسی بلکونسکی کی، جو کبھی اس کی ہشیرہ کا منگیتر تھا، ملکیت ہے۔

باگوچارانو پہنچنے سے قبل رستوف اور لی یو نے آخری دوڑ کے لیے اپنے اپنے گھوڑوں کی باگیں کھلی چھوڑ دیں۔ رستوف لی یو سے آگے نکل گیا اور سر پٹ گھوڑا بھگاتا سب سے پہلے گاؤں میں داخل ہوا۔

”آپ جیتے،“ لی یو نے کہا۔ اس کا چہرہ ہنس رہا تھا۔

”ہاں، ہمیشہ میں ہی جیتتا ہوں، یہاں بھی اور چراگاہ میں بھی،“ رستوف نے اپنے زان گھوڑے کو، جس کے منہ سے جھاگ نکل رہا تھا، چپچہاتے کہا۔

”یوٹراپکسی لینسی، میں نے اپنے لہرنچی پر میدان، رلیا تھا،“ عقب سے لاوردشکا نے اپنے کھدشوں کی طرف، جو چھکڑوں میں جوتنے کے کام آتا تھا، اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”وہ تو میں آپ کی لہج رکھنا چاہتا تھا، اس لیے پیچھے رہ گیا۔“

وہ آہستہ ردسودی خانے کی طرف، جہاں کسانوں کا خامسا بڑا ہجوم کھڑا تھا، آنے لگے۔ بعض لوگوں نے اپنے سروں سے ٹوبیاں اتار دیں اور دوسرے ٹوبیاں، تارے بغیر انھیں گھور گھور کر دیکھنے لگے۔

دوسو کھے سڑے بوڑھے کسان، جن کے چہروں پر جھریاں اور کھروری داڑھیاں تھیں، لڑکھڑاتے شراب خانے سے باہر نکلے۔ وہ مسکراتے اور بے سرے انداز سے گانا گاتے افسروں کی طرف بڑھے۔

”خوب لوگ ہیں؟“ رستوف نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”یہ بتاؤ، یہاں کہیں خشک گھاس ہے؟“

”موران کی شکلیں دیکھیں، بالکل ایک جیسے ہیں۔“ الی یں نے کہا۔

”خوش سے مت۔ مت۔ مت۔ دے لو۔ لو۔ گ۔۔۔“ ایک کسان جوش مسرت سے مسکرانے اور

لہک لہک کر گانے لگا۔

جوم میں سے صرف ایک شخص نکلا اور رستوف کے قریب آیا۔

”آپ کا تعلق کس فریق سے ہے؟“ اس نے پوچھا۔

”ہم فرانسیسی ہیں،“ الی یں نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”اور یہ خود پنولین ہے،“ اس نے لادروشکا کی طرف اشارہ

کرتے ہوئے کہا۔

”میرا خیال ہے کہ پھر آپ روسی ہیں؟“ کسان نے دریافت کیا۔

”کیا آپ کے ساتھ خاصا بڑا لشکر ہے؟“ ایک ٹھگنے شخص نے ان کی طرف آتے ہوئے کہا۔

”بہت بڑا،“ رستوف نے جواب دیا۔ ”لیکن آپ سب لوگ یہاں کیوں اکٹھے ہوئے ہیں؟“ اس نے

پوچھا۔ ”کوئی میلا ٹھیلہ ہے؟“

”گاؤں کے مشترکہ مسائل کے بارے میں بزرگوں کا اجلاس ہو رہا ہے۔“

یعنی اسی وقت اس سڑک پر، جو بڑے مکان کی طرف جاتی تھی، سفید ہیٹ پہنے ایک مرد اور دو عورتیں

نمودار ہوئیں۔ وہ ان افسروں کی طرف آرہے تھے۔

”گلابی کپڑوں والی میری ہے، اسے تو ہاتھ بھی نہ لگائیں!“ الی یں نے دنیا شا کو، جو پختہ عزم کے ساتھ ان

کی طرف بھاگی آرہی تھی، دیکھتے ہوئے کہا۔

”یہ بوڑھا ہمارے شایان شاں ہے!“ لادروشکا نے آنکھ مار کر الی یں سے کہا۔

”میری حسیت، کیا چاہیے؟“ الی یں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”پرنس نے مجھے یہ دریافت کرنے کے لیے بھیجا ہے کہ آپ کا تعلق کس رجسٹر سے ہے اور آپ کا اسم

شریف کیا ہے؟“

”یہ سکواڈرن کمانڈر رستوف ہیں اور میں آپ کا ادنیٰ خادم ہوں۔“

”م۔ مت۔ مت۔ مت۔ دے لو۔۔۔“ نشے سے چور کسان گانے لگا۔ وہ الی یں کو لڑکی سے باتیں کرتے دیکھ کر

خوش سے مسکرا رہا تھا۔

دنیا شا کے پیچھے پیچھے آل پاچ رستوف کی طرف آرہا تھا۔ وہ ابھی دور ہی تھا کہ اس نے اپنے سر سے ہیٹ

اتار دیا۔

”حضور، جان کی اماں پاؤں، تو کچھ عرض کروں؟“ اس نے مؤدبانہ کہا لیکن رستوف کی نوعمری دیکھ کر اس کے لمبے میں قدرے حقارت آگئی اور اس نے اپنا ہاتھ کوٹ کے اندر اپنے سینے کی طرف دھکیل دیا۔ ”میری مالکہ، جنرل انچیف پریس نکولائی آندر یوچ بلکونسکی کی، جو ماہ رواں کی پندرہ تاریخ کو مالک حقیقی سے جا ملے، دختر نیک اختر، جو ان لوگوں کے گتوار اور اجڈ رویے کی وجہ سے“ اس نے کسانوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا، ”مصائب میں گھر چکی ہیں، آپ کو اپنے دولت کدے پر قدم رنجہ فرمانے کی دعوت دیتی ہیں... حضور، اگر آپ ذرا آگے تشریف لے آئیں،“ آل پاچ نے اداس مسکراہٹ سے کہا، ”کیونکہ ان کی موجودگی میں کچھ کہنا مناسب ہوگا۔“ اس نے ان دو کسانوں کی طرف، جو بڑی بکھیوں کی طرف ان کے ارد گرد منڈلارہے تھے، انگلی لہراتے ہوئے کہا۔

”اے! آل پاچ۔ یا کوف آل پاچ... اہم، اہم، ہم ہیں یا نہیں؟... سٹیج کا واسطہ، ہمیں معاف کر دو!... بہت اہم، ہونہر؟“ دونوں کسانوں نے کھیسیں نکالتے ہوئے کہا۔

رستوف نے نشے میں چور کسانوں کی طرف دیکھا اور مسکرا دیا۔

”یا شاید، حضور، یہ آپ کو محفوظ کر رہے ہیں؟“ آل پاچ نے اپنے خالی ہاتھ سے بوڑھوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے متانت سے کہا۔

”نہیں، یہیں محفوظ کرنے والی کوئی شے نہیں ہے،“ رستوف نے کہا اور اس نے اپنا گھوڑا آگے کر لیا۔ ”کیا بات ہے؟“ اس نے پوچھا۔

”حضور، جان کی اماں پاؤں تو عرض کروں کہ یہ اجڈ اور نا کندہ تراش لوگ نہیں چاہتے کہ مالکہ جاگیر چھوڑ کر جائیں اور وہ دھکیاں دے رہے ہیں کہ وہ گھوڑے نہیں جو تم گے۔ صبح سے ہر چیز بندھی پڑی ہے لیکن ہر ایک سی لینسی یہاں سے روانہ نہیں ہو سکتیں۔“

”نا ممکن!“ رستوف نے تعجب سے کہا۔

”حضور، میں نہایت ادب سے اصل حقیقت آپ کے گوش گزار کر رہا ہوں،“ آل پاچ نے کہا۔

رستوف نیچے اترا، اس نے اپنا گھوڑا ردلی کے حوالے کیا اور خود آل پاچ کے ساتھ مکان کی طرف چل پڑا۔ راستے میں وہ صورت حال کے بارے میں اس سے مزید سوالات پوچھتا رہا۔ معلوم ہوتا تھا کہ پریس نے گزشتہ روز کسانوں کو اناج کی جو پیشکش کی تھی اور جلسے میں اس کی دردن اور کسانوں کے ساتھ جو گفتگو ہوئی تھی، اس سے معاملات اتنے دگرگوں ہو گئے کہ دردن نے آخر کار چابیاں لوٹا دیں اور کسانوں میں جا شامل ہوا۔ جب آل پاچ نے اسے بلایا، اس نے آنے سے انکار کر دیا، اور جب اس صبح پریس نے حکم دیا کہ اس کے سفر کے لیے بے جوت دیے جائیں، کسان بہت بڑی تعداد میں سودی خانے کے قریب جمع ہو گئے اور انھوں نے پیغام بھیجا کہ وہ پریس کو گاؤں سے نکلنے نہیں دیں گے، یہ کہ حکم موصول ہو چکا ہے کہ لوگ اپنے گھر بار چھوڑ کر نہ جائیں اور یہ کہ وہ

بچے گھوڑے کھول دیں گے۔ آل پاچ انھیں سمجھانے گیا تو سے بتایا گیا (زیادہ تر گھنگو کارپ نے کی تھی، ورون جھوم کے مقب میں کھڑا رہا) کہ پرس کو جانے کی اجازت نہیں دی جائے گی کیونکہ یہ احکام کی خلاف ورزی ہوگی، لیکن اگر وہ نہیں ٹھہری رہی، وہ حسب سابق اس کی خدمات کرتے اور اس کے احکام کی تعمیل کرتے رہیں گے۔

عین اس وقت جب رستوف اور الی بن سڑک پر سرپٹ گھوڑے دوڑتے آرہے تھے، پرس ماریا نے آل پاچ، دھیرنز، اور خادماؤں کی منت سماجت کے باوجود گھوڑے جوتے کا حکم دے دیا اور روانگی کے لیے تیار ہو گئی۔ اتنے میں کوچہ انوں نے سواروں کو گھوڑے بھگاتے اور ادھر آتے دیکھا۔ وہ سمجھے کہ فرانسینی آگئے ہیں اور وہ فرار ہو گئے۔ ادھر گھر کی عورتوں نے روننا پینا شروع کر دیا۔

”ہمارے مشفق! ہمارے مہربان! حضورِ دال! ہمارے محافظ! آپ کو خداوند نے ادھر بھیجا ہے؟“ رستوف کو، جب وہ پیش دالان میں سے گزر رہا تھا، مختلف آوازیں سنائی دیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ اسے دیکھ کر عورتیں بہت متاثر ہوئی ہیں۔

جب رستوف کو اندر پہنچایا گیا، پرس ماریا بے چارگی اور آشفتہ حالی کی تصویر بنی ہال میں بیٹھی تھی۔ اسے کچھ معلوم نہیں تھا کہ وہ کون ہے، کیوں آیا ہے یا یہ کہ خود اس کا اپنا کیا بنے گا۔ جب اس نے اس کا ردی چہرہ دیکھا، اس کی چال ڈھال، لب و لہجے اور اویس الفاظ سے، جو اس کے منہ سے نکلے تھے، سچی نا کہ وہ اس کے اپنے طبقے کا آدمی ہے، اس نے اپنی گہری اور درخشاں آنکھیں اس پر مرکوز کر دیں اور جذبے کی شدت سے لڑکھرائی کا نچنی آواز میں اس سے گھنگو کرنے لگی۔

آنا لانا رستوف کو محسوس ہوا کہ اس ملاقات میں کچھ رومانیت کی چاشنی شامل ہے۔ ”بے یار و مددگار دشمن“ دھوکوں کی ماری اور تنہا اجڑا، ناکندہ تراش اور باغی کسانوں کے رحم و کرم پر! کیسا عجیب مقدر مجھے یہاں کھینچ لایا ہے؟“ وہ اس کی طرف، جب وہ ہر اسماں و ترساں اپنی داستان سنارہی تھی، دیکھتے ہوئے سوچ رہا تھا۔ ”اس کے خدا و خال اور چہرے مہرے میں کتنی لطافت اور نجات ہے!“

اور جب وہ اسے یہ بتانے لگی کہ یہ سب کچھ اس کے باپ کی جھنجھرائیں کے اگلے روز ہی وقوع پذیر ہو گیا، اس کا گلہ بندھ گیا۔ اس نے اپنا منہ دوسری طرف پھیر لیا اور پھر اس اندیشے کے پیش نظر کہ کہیں رستوف یہ نہ سمجھ لے کہ وہ یہ سب کچھ اس کا جذبہ ترخم ابھارنے کے لیے کر رہی ہے، اس نے مستفسرانہ اور خوف زدہ نگاہیں اس کے چہرے پر گاڑ دیں۔ رستوف کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔ پرس، ماریا نے انھیں دیکھ لیا اور اپنی درخشاں آنکھوں سے، جو اتنی خوبصورت تھیں کہ دیکھنے والا یہ تعلق محول جانتا تھا کہ اس کی شکل و صورت بالکل معمول ہے، غفلت کرنا سے دیکھنے لگی۔

”پرس، میں آپ کو بتا نہیں سکتا کہ میں کتنا خوش ہوں کہ میں اتفاق سے ادھر آ نکلا۔ اب مجھے یہ موقع مل گیا ہے کہ میں آپ کی کچھ خدمت کر سکوں،“ رستوف نے کہا۔ ”آپ جب چاہیں، یہاں سے تشریف لے جاسکتی ہیں“

اور میں آپ سے حلفا وعدہ کرتا ہوں کہ اگر آپ مجھے اپنا محافظ بنا کر اپنے ساتھ چلنے کی اجازت مرحمت فرمائیں، پھر کسی مائی کے لال میں اتنی جرأت نہیں ہوگی کہ وہ آپ کے لیے در اسی بھی تکلیف کا باعث بن سکے۔“ پھر اس نے اسے یوں جھک کر مؤدبانہ سلام کیا جیسے وہ شاہی خاندان کی کوئی خاتون ہو اور دروازے کی طرف چل پڑا۔

رستوف کے مؤدبانہ لہجے سے یہ مترشح ہو رہا تھا کہ اگرچہ وہ اس کے ساتھ متعارف ہونا اپنی خوش نصیبی تصور کرے گا لیکن اس کی بد نصیبی سے فائدہ اٹھا کر اپنے آپ کو اس کے مرہٹہ ہٹا پسند نہیں کرے گا۔

پریس ماریاسا لے کی اس نزاکت کو سمجھ گئی اور دل ہی دل میں اس کی تحسین کرنے لگی۔

”میں آپ کی بہت جہت محنت ہوں،“ اس نے فرانسیسی میں کہا۔ ”تاہم مجھے امید ہے کہ یہ سب کچھ کسی غلط فہمی کی بنا پر ہوا اور کسی کو مورد الزام نہیں ٹھہرایا جاسکتا۔“ وہ رد نے لگی۔ ”میں معافی چاہتی ہوں،“ اس نے کہا۔

رستوف کی بھویں تن گئیں۔ اس نے ایک بار پھر جھک کر سلام کیا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

14

”واہ، وہ خوبصورت ہے؟ دوست، میری گلابی دوشیزہ مہراجنگیز ہے! اس کا نام دنیاشا ہے۔“

لیکن جب الی یں نے رستوف کے چہرے پر چشتی نظر ڈالی، وہ خاموش ہو گیا۔ اس نے بھانپ لیا کہ اس کا افسر اعلیٰ اور ہیر و بالکل مختلف ذہنی کیفیت میں آیا ہے۔

رستوف نے الی یں کو خشم گین نگاہوں سے گھورا اور جواب دیے بغیر لمبے لمبے ڈگ بھرتا گاؤں کی طرف چل پڑا۔

”میں ان بد معاشوں کو ایسا سبق دوں گا، ان کی ایسی تپسی کر دوں گا!“ اس نے اپنے آپ سے کہا۔

آل پاچ دوڑا تو نہیں، البتہ تیز تیز قدم اٹھاتا رستوف کے پیچھے ہولیا۔ وہ بڑی مشکل سے تک پہنچ پایا۔

”حضور، آپ نے کیا فیصلہ فرمایا ہے؟“ اس نے پوچھا۔

رستوف رک گیا، اس نے اپنی منھیاں پھینچیں اور غیظ و غضب سے کھولتا اس کی طرف متوجہ ہوا۔

”فیصلہ؟ کیا فیصلہ؟ بڑھے مفت خورے!“ اس نے چہرہ کر کہا۔ ”تم کیا کچھڑی پکاتے رہے ہو؟ ہونہ؟

کسان باغی ہو رہے ہیں اور تمہیں اتنی سمجھ نہیں کہ انہیں قابو کیسے کیا جاسکتا ہے۔ تم خود غدار ہو! میں تمہیں خوب جانتا ہوں۔ میں تم سب کی ہڈی پہلی ایک کر دوں گا!“

پھر گویا اسے یہ اندیشہ لاحق ہو گیا کہ وہ اپنے غصے کا ذخیرہ بیکار ضائع کر رہا ہے، اس نے آل پاچ کو چھوڑا اور

تیزی سے آگے نکل گیا۔ آل پاچ نے اپنی ذات پر پردہ ڈال اور رستوف کے پیچھے چھوٹ لگادی۔ دریں اثنا وہ سارا رقت اپنا نقطہ نظر بیاں کرتا رہا۔ اس نے کہا کہ کسان اتنے سرکش اور متیز ہو چکے ہیں کہ مسلح فوج کی مدد کے بغیر ان کی مخالفت کرنا عقل مندی نہیں ہوگا۔ ”کیا یہ بہتر نہیں ہوگا کہ چند فوجی دستے بدلے جائیں؟“ اس نے کہا۔

”میں ان کے لیے مسلح فوج لگاؤں گا۔ ان کی مخالفت کروں گا۔“ ٹکولائی بے معنی انداز سے بڑبڑاتا رہا۔
 غیر عقلی حیوانی غصہ اس پر غالب آچکا تھا۔ اس غصے اور اس غصے کے اخراج کی ضرورت سے اس کا دم گھٹنے لگا تھا۔
 یہ سوچے سمجھے بغیر کہ اس کا اقدام کیوں ہوگا، وہ لمبے لمبے قدم اٹھاتا اندھا دھند ہجوم کی جانب بڑھا۔ وہ جوں
 جوں ہجوم کے قریب بڑھتا گیا، توں توں آل پاچ کو یہ احساس ہوتا گیا کہ رستوف کے اس عقل سے عاری طرز عمل
 سے اچھے نتائج برآمد نہیں ہوں گے۔ کسانوں نے جب رستوف کو بچے تلے اور تیز رفتار قدم اٹھاتے اور اپنے
 چہرے پر غم و استقلال اور غیظ و غضب دتے دیکھا، وہ بھی اسی طرح متاثر ہوئے۔

گھوڑوں پر سوار ہوناروں کے گاؤں میں داخل ہونے اور رستوف کے پرس سے ملاقات کرنے کے لیے
 جانے کے بعد ہجوم کسی قدر ہلچلی ہٹ، دراختلاف رائے کا شکار ہو گیا تھا۔ بعض کسانوں کا کہنا تھا کہ چونکہ یہ لوگ روسی
 ہیں، اس لیے ہو سکتا ہے کہ وہ اس بات کا برا منائیں کہ مالک کو یہاں (خواہ مخواہ) روک لیا گیا ہے۔ دروں اسی رائے
 کا حامی تھا لیکن جو بھی اس نے اپنے نقطہ نظر کا اظہار کیا، کارپ اور چند دوسرے شخص اس کے پیچھے پڑ گئے۔

”تمہیں گاؤں کا مال کھاتے اور اپنی توہم بڑھاتے کتنا عرصہ ہو گیا ہے؟“ کارپ نے چلا کر کہا۔ ”تمہیں
 کیا لرق پڑتا ہے! تم نے مرجان کے مرتبان، ل و منال سے بھر کر زمین میں دبا رکھے ہیں، تم انہیں نکالو گے اور
 جل پڑو گے۔ ہمارے گھرا جڑتے ہیں تو اجڑ جائیں، تمہیں کیا پروا؟“

”ہمیں حکم ملا ہے کہ ہم یہاں امن چین برقرار رکھیں کوئی شخص اپنا گھریا چھوڑ کر نہ جائے اور اناج کا ایک
 دانہ بھی، ہر نکلے نہ پائے۔ اور ایک وہ ہے کہ جو کچھ اس کے پاس ہے، سب کچھ اٹھائے یہ جاری ہے!“ دوسرے
 نے با آواز بلند کہا۔

”فوج میں (جبری) بھرتی کے لیے تمہارے بیٹے کی باری تھی لیکن تم نے ایسا چکر چلایا کہ تمہارا موٹو ٹکھنوصاف
 چل گیا!“ ایک ٹھگنے بوڑھے نے اچانک دروں پر جھپٹتے ہوئے کہا۔ ”چنانچہ وہ میرے دان کا کولے گئے تاکہ اس کی
 راہمی موٹو نہ کرا سے فوجی بنا سکیں! لیکن سرت سے کون بچا ہے؟ ہم سب کو یک نہ ایک دن مرنا ہی ہے!“
 ”یقیناً ہم سب کو مرنا ہے!“

”میں کیوں کے خلاف نہیں ہوں؟“ دروں نے کہا۔

”تم کیوں ہو گے! تم نے تو مجھ کو بھرتی ہے!“

دو ماہ اندام کسانوں کو اپنی کہنے کا موقع مل گیا۔

جو بھی رستوف الی یں، ماوروشکا اور آل پاچ کی معیت میں ہجوم کے قریب پہنچا، کارپ اپنے انگوٹھے اپنی
 ٹانگی میں گھسولے اور چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ پھیلانے آگے آیا۔ اس کے برعکس دروں عقب کی جانب کھسک
 گیا اور ہجوم میں شامل لوگ ایک دوسرے کے قریب ہو گئے۔

”ایں! تمہارا سر بیچ کون ہے؟“ رستوف نے ہجوم کی طرف تیز قدم اٹھاتے ہوئے چلا کر پوچھا۔

”سرنچ؟“ آپ نے اس سے کیا لینا ہے؟“ کارپ نے پوچھا۔

لیکن ابھی الفاظ اس کے منہ سے نکلے بھی نہیں تھے کہ اس کی ٹوپی اڑ کر دور جا گری اور زبردست گھولے نے اس کا سر ایک طرف مہوڑا دیا۔

”ٹوپیاں اتار دو، غدارو!“ رستوف دہاڑا۔ ”سرنچ کہاں ہے؟“ وہ غضب ناک ہو کر چلایا۔

”سرنچ... وہ سرنچ کا پوچھ رہے ہیں... درون زا خارج، وہ تمہارا پوچھ رہے ہیں!“ عاجلانہ، تابعدا جوابات سنائی دیے اور لوگ دھڑا دھڑا اپنی ٹوپیاں اتارنے لگے۔

”بغاوت و غارت کوئی نہیں کر رہا، ہم احکام کی تعمیل کر رہے ہیں،“ کارپ نے پرزور انداز سے کہا اور دیکھتے ہی دیکھتے ہجوم کے عقب سے متعدد آوازیں سنائی دینے لگیں۔

”ہمارے بڑاں نے فیصلہ کیا تھا۔ آپ میں حکم دینے والے بہت ہیں۔“

”بحث کرتے ہو، کرو گے؟ بغاوت... لیسرو، بد معاشرہ... غدارو!“ رستوف ایک ایسی آواز میں، جو اس کی اپنی نہیں تھی، بلا سوچے سمجھے اور نسانج و عواقب کی پروا کیے بغیر دباڑے چرہ تھا۔ اس نے کارپ کا کالر پکڑا۔ ”اسے باندھ دو، باندھ دو!“ اس نے چہا کر کہا حالانکہ وہاں لا دروشکا اور آل پاچ کے عداوہ ایسا کوئی اور شخص، جو اسے باندھ سکتا، موجود نہیں تھا۔

تاہم لا دروشکا کارپ کی جانب بھاگا اور اس نے پیچھے سے اس کے بازو پکڑ لیے۔

”حضور، پہاڑی کے نیچے ہمارے جون کھڑے ہیں، انھیں بدالوں؟“ اس نے با آواز بلند کہا۔

آل پاچ کسٹوں کی طرف متوجہ ہوا۔ اس نے نام لے کر دو اشخاص کو بلایا اور انھیں حکم دیا کہ وہ کارپ کو باندھ دیں۔ کسان مودبانہ آگے بڑھے اور اپنی بیٹیوں کھولنے لگے۔

”سرنچ کہاں؟“ رستوف نے اصرار کیا۔

درون آگے آیا۔ اس کا رنگ فق اور چہرہ افسردہ تھا۔

”تم سرنچ ہو؟ لا دروشکا، اس کے ہاتھ پاؤں باندھ دو،“ رستوف نے یوں چلا کر کہا جیسے اس کے حکم کی خلاف ورزی ممکن ہی نہ ہو۔

اور حقیقتاً درمزیہ کسانوں نے درون کو پکڑ لیا اور اس کے ہاتھ پاؤں باندھنے لگے۔ درون نے، جیسے وہ ان کی مدد کرنا چاہتا ہو، خود ہی اپنی بیٹی اتاری اور انھیں پکڑا دی۔

”اب تم سب لوگ کان کھول کر سن لو!“ رستوف نے کسانوں سے مخاطب ہو کر کہا۔ ”ابھی، اسی وقت اپنے گھروں کو لوٹ جاؤ اور تمہاری باتوں کا ایک لفظ بھی میرے کانوں تک پہنچنے نہ پائے!“

”کیوں؟ ہم نے کیا بگاڑا ہے؟۔ بس ذرا سی حماقت ہوگی۔ ذرا بے وقوفی کر بیٹھے، بس میں نے کہا نہیں تھا کہ یہ ٹھیک نہیں ہے۔“ بیک وقت مختلف آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ لوگ ایک دوسرے کو الزام دے رہے

تھے اور آپس میں ٹھٹھکیں مچا کر رہے تھے۔

”ہونہ، میں نے کیا کہا تھا؟“ آل پاچ نے دوبارہ اپنا رنگ جماتے ہوئے کہا۔ ”بچے، تم غلطی کر رہے ہو؟“
 ”یا کونف آں پاچ، ہم سے بس بے وقوفی ہو گئی،“ لوگوں نے جواب دیا اور ہجوم چٹختے، درخلف گیوں میں
 منتشر ہونے لگا۔

دونوں اشخاص کو بندھے ہوئے بازوؤں سمیت باگو چارافو اؤس کے احاطے میں لایا گیا۔ نشے سے ہرست
 دونوں کسان ان کے پیچھے ہو لیے۔

”خوب، اپنا کھڑا تو دیکھو!“ ان میں سے ایک نے کارپ سے کہا۔

”تمہارا کیا خیال تھا کہ تم شرقا سے یوں پیش آ سکتے ہو؟ تم نے سوچا کیا تھا؟“

”الوکی دم!“ ایک نے کہا۔ ”اصلی الوکی دم؟“ دوسرے نے دھوئی کیا۔

دو گھنٹے بھی گزرنے نہ پائے تھے کہ باگو چارافو کے احاطے میں چھٹڑے پھینچ گئے۔ کسان بڑی پھرتی سے
 بگڑنکیوں کا سامان اٹھانے اور اسے چھٹڑوں پر لادنے لگے۔ اور دونوں، جسے پرس مار یا کی خواہش پر کاٹھ کباڑ
 کے کرے سے، جہاں اسے منتقل کر دیا گیا تھا، رہا کر دیا گیا تھا۔ انھیں ہدایات دے رہا تھا۔

”اسے یونہی بے احتیاطی سے نہ رکھ دینا!“ ایک کسان نے، جس کا چہرہ گول مثل اور متبسم تھا، خانگی ملازمہ
 کے ہاتھوں سے جھوٹا صندوق پکڑتے ہوئے کہا۔ ”یقیناً، نو، اس پر بڑا ایسہ حرج ہوا تھا! گرمی نے، اسے یونہی اٹھا
 کر بھینک دیا۔ رسیوں کے نیچے دھکیل دیا، اس پر خراشیں پڑ جائیں گی اکام کا یہ انداز مجھے پسند نہیں ہے۔ ہر کام
 احتیاط اور ٹھیک طریقے سے ہونا چاہیے۔ دیکھو، یہ پکڑو۔ اسے ٹاٹ کے نیچے رکھ دو اور اوپر خشک گھاس ڈال دو۔
 بالکل، یہی صحیح طریقہ ہے! بہت اعلیٰ!“

”ارے یہ کتنا میں، یہ کتنا میں!“ ایک اور کسان نے، جو پرس آندرے کے بک کیس اٹھائے لارہا تھا، کہا۔

”خیل رہے، کہیں ٹھوکر کھا کر گر نہ پڑنا۔ بیڑ، بہت بھاری ہیں۔ کتابوں کا بڑا وزنی ڈھیر ہے!“

”ہاں، وہ اپنی لکھائی میں لگے رہتے تھے، ادھر ادھر وقت ضائع نہیں کرتے تھے!“ ایک بلند قامت کسان
 نے، جس کا چہرہ بیضوی تھا، سنجیدگی سے لغت کی بھاری بھر کم کتابوں کی طرف، جو سب سے اوپر پڑی تھیں، آنکھ مار
 کر کہا۔



دستور پر نس کو قطعاً یہ تاثر نہیں دینا چاہتا تھا کہ مان نہ مان میں تیرا مہمان ہوں۔ چنانچہ وہ واپس مکان میں نہ
 گیا بلکہ گاؤں میں ہی ٹھہرا رہا اور اس کی روانگی کا انتظار کرتا رہا۔ جب گاڑیاں اور چھترے روانہ ہوئے، حفاظت
 کے خیال سے وہ بھی ان کے ساتھ ہو لیا۔ باگو چارافو سے سات آٹھ میل دور، وہ اس شاہراہ پر، جو ہماری سپاؤ کے

قبضے میں تھی، پہنچ گئے۔ یا نکاو گادوں کے ہوٹل میں اس نے موڈ بانہ اس سے اجازت چاہی اور پہلی بار اس کے ہاتھ پر بوسہ دیا۔

”اس کی بھلا کیا ضرورت ہے؟“ اپنی نجات (جیب کہ پرس، ماریا نے اپنے متعلق کہا تھا) کے لیے اس نے شکرے کے جو لفظ استعمال کیے تھے، ان کے جواب میں اس نے جھپٹے اور شرماتے ہوئے کہا۔ ”ہر پولیس افسر، کتا کچھ تو کرتا ہی۔ اگر ہمارے پاس لڑائی میں حصہ لینے کے لیے صرف کسان ہوتے، ہم نے دشمن کو اتنی دور تک اندر نہ آنے دیا ہوتا،“ اس نے کہا۔ وہ ایک طرح سے جھجکتا، شرماتا موضوع تبدیل کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ”مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ آپ سے متعارف ہونے کا موقع مل گیا۔ چچا، پرس، خدا حافظ، میری نیک تمناؤں آپ کے ساتھ ہیں اور دعا کرتا ہوں کہ آپ کا یہ سفر اطمینان سے کٹ جائے۔ مجھے امید ہے کہ ہماری آئندہ ملاقات ان سے بہتر حالات میں ہوگی۔ اگر آپ مجھے شرم سار نہیں کرنا چاہئیں، تو میں یہ عرض کروں گا کہ آپ میرا شکریہ ادا نہ کریں؟“ اگرچہ پرس نے الفاظ میں اس کا دوبارہ شکریہ ادا نہ کیا، تاہم اس کا چہرہ، جو محبت اور شکر کے جذبات سے تاباں تھا، پکار پکار کر اس کا شکریہ ادا کر رہا تھا۔ وہ یہ مان ہی نہیں سکتی تھی کہ اس کے پاس اس کا شکریہ داکر نے کی کوئی وجہ نہیں۔ اس کے برعکس اسے یقین تھا کہ اگر وہ نہ آتا تو وہ لازماً باغی کسانوں اور فرانسیسیوں کے ہاتھوں ماری جاتی۔ اسے بچانے کے لیے وہ صرخی اور ہولناک خطرے میں کود گیا تھا۔ اس سے بھی یقینی بات یہ امر واقعہ تھا کہ وہ بلند کردار، نیک سیرت اور شریف النفس انسان تھا اور جس خطرے میں وہ گھری ہوئی تھی اور جو غم اسے لاحق تھا، وہ اسے سمجھنے کے قابل تھا۔ اس کی پر شفقت اور بادیانت آنکھیں، جو اس وقت، جب وہ اپنے صدے کا ذکر کرتے کرتے خود رو پڑی تھی، ”نسوؤں سے لبریز ہو گئی تھیں، اس کے تن میں سچکی تھیں۔

جب پرس ماریا سے خدا حافظ کہ چکی ورا کیل رہ گئی، اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ پھر یہ عجیب و غریب سوال ”کیا مجھے اس سے محبت ہو گئی ہے؟“ اس کے ذہن میں، اگرچہ پہلی بار نہیں، گردش کرنے لگا۔ اگرچہ ماسکو کے بقیہ سفر کے دوران میں پرس ماریا کی ذہنی کیفیت خوشگوار نہیں تھی، تاہم دنیا شانے، جو اس کی گاڑی میں سوار تھی، ایک سے زیادہ مرتبہ اپنی ماکہ کو کمز کی میں سے باہر جھانکتے اور اسے کسی بات پر حسرت ناک اور پر حسرت انداز سے مسکراتے دیکھا۔

”باالغرض مجھے واقعی اس سے محبت ہو گئی ہو؟“ پرس ماریا (بار بار) سوچتی تھی۔

اگرچہ اسے اپنے آپ سے یہ اقرار کرتے شرم آ رہی تھی کہ وہ ایک ایسے شخص کی، جو غالباً کبھی اس کے بارے میں فکر مند نہیں ہوگا، محبت ہو گئی ہے، وہ اس تصور سے اپنے دل کو تسلی دے لیتی کہ کسی کو کبھی اس کے متعلق مطلق کوئی علم نہیں ہو سکے گا اور اگر وہ اس کا کسی سے ذکر کیے بغیر زندگی بھر ایک ایسے شخص سے، جس سے اس نے اپنی حیات میں پہلی اور آخری محبت کی تھی، محبت کرتی رہی، تو اسے کسی قسم کا الزام نہیں دیا جاسکے گا۔

جس انداز سے اس (رستوف) نے اسے دیکھا تھا، اس سے جو ہمدردی جٹائی تھی، اس سے جو باتیں کی

تھیں، بعض اوقات جب وہ یہ سب کچھ یاد کرتی، خوشی اسے ناممکن نظر نہ آتی۔ یہی وہ لمحات تھے جب دنیا شا اسے گاڑی کی کھڑکی میں سے باہر جھانکتے اور مسکراتے دیکھتی تھی۔

”اور سوچنے کی بات یہ ہے کہ وہ باگوچو رافو آیا۔۔۔ اور وہ بھی اس موقع پر!“ پرس مار یا سوچ رہی تھی۔ ”عین اس وقت جب اس کی ہمشیرہ آندرے سے شادی کرنے سے انکار کر چکی ہے“³⁰

اور اس تمام چیزوں میں پرس مار یا کو مشیت ایزدی کا رفرمانظر آتی۔

رستوف پر پرس مار یا نے جو نقش چھوڑا تھا، وہ خوشگوار تھا۔ اس کے متعلق سوچنے سے اس کی روح خوشی سے سرشار ہو جاتی۔ اور جب اس کے ساتھیوں نے اس کی باگوچو رافو ہم کے بارے میں سن کر اس کی ٹانگ گھسیٹنا چاہی کہ وہ گیا تو نہ گھس لینے لیکن لے آیا روس کی تمسور ترین وارثہ (جائداد)، تو وہ غصے سے مال پیلا ہو گیا۔ اسے غصہ محض اس لیے آیا تھا کیونکہ شریف انیس پرس سے، جس میں اسے دلکشی نظر آتی تھی اور جو بے پناہ دولت کی مالک تھی، شادی کرنے کا خیال اس کی مرضی کے خلاف ایک سے زیادہ مرتبہ اس کے اپنے دل میں بھی آچکا تھا۔ جہاں تک نکولائی کی اپنی ذات کا تعلق تھا، وہ اس سے بہتر بیوی کی خواہش نہیں کر سکتا تھا۔ اگر اس سے اس کی شادی ہو جاتی ہے تو کاؤنٹس، اس کی ماں، کی خوشی کا ٹھکانا نہیں رہے گا اور اس کے باپ کی بگڑی قسمت سنور جائے گی اور بلکہ۔۔۔ اسے محسوس ہو رہا تھا۔ خود پرس مار یا کی خوشی کی ضمانت فراہم ہو جائے گی۔

لیکن سوچنا کا کیا بے گاہ؟ اور اس کا وہ وعدہ جو اس نے کیا تھا، کہاں جائے گا؟ اور یہی وجہ ہے کہ جب وہ پرس مار یا کے سلسلے میں اس کی ٹانگ گھسیٹ رہے تھے، اسے اتنا شدید غصہ آ گیا تھا۔

15

فوجوں کی کمان سنبھالنے کے بعد کوٹوزوف کو پرس آندرے یاد آیا اور اس نے سے پیغام بھیجا کہ وہ ہیڈ کوارٹرز رپورٹ کرے۔

پرس آندرے عین اس روز اور اس وقت تیار ہوئے۔ زائٹس چے پہنچے جب کوٹوزوف پہلی مرتبہ فوجوں کا معائنہ کر رہا اور ان سے سلامی لے رہا تھا۔ وہ گاؤں میں پادری کے مکان کے سامنے رک گیا۔ اسی مکان کے سامنے کوٹوزوف کی گاڑی کھڑی تھی۔ پرس آندرے دروازے کے قریب ایک رچ پر بیٹھ گیا اور ہنریرین الی پرس کا، جیسا کہ اب ہر شخص کوٹوزوف کا نام ان احترامی الفاظ سے لیتا تھا، انتظار کرنے لگا۔ گاؤں کے پارکیت سے ہر منٹل سوتیلی کی ٹانگوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ بیچ بیچ میں بہت بڑا ہجوم ”ہڑا“ کے نعرے بلند کرنے لگا۔ پرس آندرے سے کوئی دس قدم کے فاصلے پر گیٹ کے قریب دواردلی، ایک پیغام رساں اور ایک چیف سٹیوارڈ کھڑے تھے اور اپنے آقا کی عدم موجودگی سے فائدہ اٹھا کر سہانے موسم سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ ہوزاروں کا ایک سانوا کھانا قامت لینٹینٹ کرنل، جس کی ہیبت ناک موچھیں رخساروں تک پھیلی ہوئی تھیں، گھوڑے پر گیٹ تک آیا۔ اس نے

سرسری نگاہوں سے پرنس آندرے کو دیکھا اور اس سے پوچھنے لگا کہ آیا ہزیرین ہائی نس بھییں قیام پذیر ہیں اور آیا وہ محقریب تشریف لے آئیں گے۔

پرنس آندرے نے جواب دیا کہ وہ ہزیرین ہائی نس کے سٹاف میں شامل نہیں ہے اور یہ کہ وہ خود بھی ابھی آیا ہے۔ لیفٹیننٹ کرنل ایک تیز طرار اردلی کی طرف متوجہ ہوا۔ اردلی نے اس مخصوص تحقیر آمیز انداز سے، جو کسی افسر سے مخاطب ہوتے وقت کہ نڈرا چیف کے اردلیوں کا شعور بن جاتا ہے، جواب دیا:

”کیا فرمایا؟ ہزیرین ہائی نس؟ میرا خیال ہے کہ انھیں اب یہاں تشریف لانے میں کوئی زیادہ دیر نہیں لگے گی۔ آپ کو کیا چاہیے؟“

اردلی کے اس انداز گفتگو کے جواب میں لیفٹیننٹ کرنل نے اپنی مونچھوں کے نیچے کھیسیں نکالیں، گھوڑے سے اترا، اسے ایک مراسلہ رساں کے حوالے کیا اور گردن کو ذرا خم دیتا بلکونسکی کی طرف آیا۔ بلکونسکی نے اسے بچ پر جگہ دے دی اور وہ اس کے قریب بیٹھ گیا۔

”آپ بھی کہ نڈرا چیف کا انتظار فرما رہے ہیں؟“ اس نے گفتگو کی ابتدا کی۔ ”سنا ہے کہ وہ ہر شخص کو شرف ملاقات بخش دیتے ہیں۔ خدا کا شکر ہے۔ ان ساتج خوروں کا طریقہ بالکل مختلف تھا! ایر، لوف نے جب یہ کہا تھا کہ اسے ترقی دے کر جرمن بنادیا جائے، تو کوئی غلط نہیں کہا تھا۔ اب شدید رویوں کو بھی بات کرنے کا موقع مل جائے گا۔ خدا ہی جانتا ہے کہ ان کے عزائم کیا تھے! بس پسپائی ورمزید پسپائی، اس کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ آپ بھی مجھ میں شامل تھے؟“ اس نے پوچھا۔

”ہاں، مجھے یہ شرف حاصل ہے،“ پرنس آندرے نے کہا، ”کہ میں نہ صرف پسپائی میں شامل تھا، بلکہ جاگیریں اور آبائی گھر تو ایک طرف رہے، میں نے اپنا وہ سب کچھ گنوا دیا جو مجھے بے حد عزیز تھا، میرے والد محترم، وہ صدے کی تاب نہ لا کر خداوند کو پیارے ہو گئے۔ میرا حلق صوبہ ہولنسک سے ہے۔“

”اٹھا آپ پرنس بلکونسکی ہیں؟ آپ سے مل کر بے حد خوشی ہوئی۔ میں لیفٹیننٹ کرنل دینی سوف ہوں۔ لوگ مجھے زیادہ تر واسکا کے نام سے جانتے ہیں،“ دینی سوف نے پرنس آندرے سے ہاتھ ملاتے اور اس کے چہرے کو خاص طور پر دلچسپی سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”ہاں، میں نے اس بارے میں سنا تھا، اس نے ہمدردی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ اور کچھ توقف کے بعد اس نے مزید کہا۔ ”یہ تو رانی طریقہ جنگ یقیناً بہت اچھا ہے۔ ماسوا ان لوگوں کے جنھیں اس کا خیر زہ بھگتنا پڑتا ہے، اور جانوں کی قربانیاں دینا پڑتی ہیں... تو آپ پرنس آندرے بلکونسکی ہیں!“ اس نے اپنے سر کو جنبش دی۔ ”پرنس، آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی،“ اس نے ایک بار پھر اس مسکراہٹ سے اپنی بات دہرائی اور پرنس آندرے سے دوبارہ ہاتھ ملایا۔

دینی سوف تاشا کا اولین امیدوار تھا اور تاشا نے اس کے بارے میں پرنس آندرے کو جو قصے سنائے تھے، ان کی بنا پر وہ اسے جاننے لگا تھا۔ ان یادوں نے، جو بیک وقت شیریں اور روح فرساتھیں، اس کے دل میں از سر نو

تحتات چکا دیے جن کے متعلق اس نے کچھ عرصے سے سوچا تک نہیں تھا لیکن جواب بھی اس کے نہیں خانہ قلب میں موجود تھے۔ حالیہ ایام کے دوران میں اسے اتنے زیادہ انوکھے اور سنگین تجربات۔ سولنسک سے پسپائی، اس کا بلڈ بلز کا دورہ، باپ کے انتقال کی خبر۔ میں سے گز رہا پڑا تھا اور سے اتنے نوع بہ نوع جذبات سے واسطہ پڑا تھا کہ کافی عرصے تک یہ یادیں اس کے ذہن میں بار نہ پاسکی تھیں اور اب جب وہ آئیں بھی، تو ان کا اثر اتنا زور دار نہ ہو، (جتنا کسی اور وقت ہوتا)۔

اور جہاں تک دینی سوف کا تعلق ہے، بلکونسکی کے نام سے اس کے ذہن میں جو یادیں ابھریں، ان کا تعلق کہیں دور رومانی ماضی سے تھا، جب ایک شام پیر اور مناشا کی نغمہ سرائی کے بعد اس نے یہ سوچ سمجھے بغیر کہ وہ کیا کہہ رہا ہے، پندرہ سال کی ننھی منی دوشیزہ کو شادی کی تجویز پیش کر دی تھی۔ اسے جب یہ زمانہ اور مناشا سے اپنی محبت یاد آئی، تو وہ مسکرا دیا لیکن وہ اتنا فانا اس چیز کی طرف، جس میں اب اسے اتنی انتہائی شدید دلچسپی تھی کہ وہ اس کے علاوہ کسی اور بات کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا، لوٹ آیا۔ یہ جنگی منصوبہ تھا اور سے اس نے پسپائی کے دوران میں ہیر دنی چونکوں پر خدمات سر انجام دیتے وضع کیا تھا۔ اس نے اسے بار کھلے دتولی کو پیش کیا تھا اور اب اس کا ارادہ اسے کو تو زوف کے سامنے رکھنے کا تھا۔ منصوبے کی اساس اس حقیقت پر رکھی گئی تھی کہ فرانسیسیوں نے ضرورت سے زیادہ لمبائی بنالیا تھا اور اس کا خیال تھا کہ بجائے اس کے کہ ان کی پیش قدمی روکنے کے لیے ان پر سامنے سے حملہ کیا جائے، ان کے مزید آگے بڑھنے پر ان کے مواصلاتی رابطوں کو نشانہ بنایا جانا چاہیے۔ وہ پرنس آندرے کے سامنے اپنے منصوبے کی وضاحت کرنے لگا۔

”وہ اپنے تمام کے تمام مواصلاتی رابطوں کا دفاع نہیں کر سکتے، یہ ناممکن ہے میں ان میں شکاف ڈالنے کی کوشش کروں گا۔ آپ مجھے پانچ سو جوان دے دیں اور میں ان کے (مواصلاتی) رابطے منقطع کر دوں گا۔ ایسا یقیناً ہو سکتا ہے! ہمارے پاس صرف ایک ہی طریق کار ہے۔ اور وہ ہے گوریلہ جنگ!“

دینی سوف بلکونسکی کے سامنے اپنے منصوبے کی وضاحت کرتے کرتے اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور ہاتھوں سے اشارہ کر کے سمجھانے لگا۔ اس وضاحت کے دوران میں انھیں فوجی جوانوں کے نعرہ ہائے تحسین کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ یہ آوازیں پر پیڈ گراؤنڈ سے آرہی تھیں۔ چونکہ یہ عسکری نغموں اور موسیقی کی اصوات میں خلط ملط ہو رہی تھیں، اس لیے وہ غیر مربوط ہو رہی تھیں اور کچھ پتا نہیں چل رہا تھا کہ کیا کہا جا رہا ہے۔ اب آوازوں کا شور و غل اور گھونڈوں کے ناپوں کی تڑائی پڑائی گاؤں میں سنائی دینے لگی تھی۔

”وہ تشریف لارہے ہیں، وہ تشریف لارہے ہیں!“ ایک قازق نے جو گیٹ کے قریب کھڑا تھا، چلا کر کہا۔ بلکونسکی اور دینی سوف گیٹ کی طرف چل دیے۔ وہاں جوانوں کا ایک گروہ (گارڈ آف آنر) اکٹھا ہو گیا تھا۔ انھیں کو تو زوف، جو قدرے کوتاہ قامت کیٹ گھوڑے پر سوار تھا، آٹا دکھائی دیا۔ جرنیلوں کا خاص بڑا ٹولا اس کے پیچھے پیچھے آ رہا تھا۔ بار کھلے گا گھوڑا تو تقریباً اس کے برابر برابر تھا۔ افسروں کا ایک جھوم تھا۔ کوئی اس کے عقب میں تھا اور کوئی

برابر اور وہ سب ”ہڑا، ہڑا“ چلا رہے تھے۔

اس کے ابجوتھ سر پٹ گھوڑے دوڑاتے اس سے پہلے احاطے میں داخل ہو گئے۔ کوٹوزوف کا دامن مہر ہاتھ سے چھوٹ گیا اور اس نے اپنے گھوڑے کو، جو اس کے بوجھ تلے خرابیاں خرابیاں چل رہا تھا، آگے بڑھنے کی کوشش کی۔ کوٹوزوف مسلسل اپنے سر کو جنبش دے رہا اور اپنا ہاتھ اپنی ہارس گارڈ کی سفید ٹوپی تک، جس کے ارد گرد سرخ پٹی تو تھی لیکن چھپی نہیں تھا، سے جارہا تھا۔ گیٹ کے قریب جو گارڈ آف، نرکا دستہ کھڑا تھا، اس کے سارے جوان ٹومند تھے اور ان کا تعلق گریڈ پر گارڈز سے تھا۔ ان میں سے اکثر نے اپنے سینوں پر تیشے اور دوسرے عزازات بجا رکھے تھے۔ جب کوٹوزوف ان کے قریب پہنچا، وہ اسے سدھی دینے لگے۔ اس نے ان پر کم نڈر کی حرم و استقامت سے بھرپور نگاہ ڈالی اور انھیں ایک آدھ منٹ خاموشی سے دیکھتا رہا۔ پھر وہ اپنے رد گرد جرنیلوں اور افسروں کے جم غفیر کی طرف متوجہ ہو گیا۔ اچانک اس کے چہرے پر کایاں پن جھلکنے لگا اور وہ اپنے کندھے یوں اچکائے لگا جیسے کسی الجھن میں پڑ گیا ہو۔

”دیکھیں، ہمارے پاس ایک سے ایک نفیس جوان موجود ہے، پھر بھی ہم پسپائی پر پستی اختیار کرتے رہے!“ اس نے کہا۔ ”اچھا، جرنیل، خدا حافظ!“ اس نے مزید کہا اور پرنس آندرے اور دینی سوف کے برابر گزرتا احاطے کے اندر چل گیا۔

”ہڑا، ہڑا!“ اس کے پیچھے آوازیں گونج رہی تھیں۔

جب سے پرنس آندرے کی کوٹوزوف سے آخری ملاقات ہوئی تھی، اس کا جسم کہیں زیادہ فریب، بلکہ پھول کر کپ اور پلپلا ہو چکا تھا۔ لیکن اس کے جانے پہچانے زخم کے نشان، سفید کرۂ چشم اور تھکے تھکے چہرے مہرے میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ اس نے فوجی اور رکوت اور ہارس گارڈز کی سفید ٹوپی پہنی ہوئی تھی اور اس کے کندھے پر پتلی مچی سے تازیانہ لٹک رہا تھا۔ ٹومند کوتاہ قامت گھوڑے پر اس کا بھاری بھر کم بے ڈول جسم آگے پیچھے اور دائیں بائیں جھول رہا تھا۔

”سی۔ سی۔ سی۔“ جب وہ احاطے میں داخل ہوا، اس کے منہ سے سیٹی جیسی آواز، جو بمشکل سنائی دے رہی تھی، نکل رہی تھی۔ اس کے چہرے پر ایک ایسے شخص کی، جسے کارکردگی دکھانے کے بعد توقع ہوتی ہے کہ اب اسے آرام کا موقع میسر آ جائے گا، مسرت اور تسکین جھلک رہی تھی۔ اس نے اپنا پایا پاؤں رکاب سے باہر نکالا اور اپنے سارے جسم کو بے قیود انداز سے جھلاتے اور ماتھے پر شکنیں ڈالتے پورا زور لگا دیا۔ یوں اس نے اپنا جسم زمین تک پہنچا دیا۔ پھر وہ گھٹنے پر جھکا اور کراہتا ہوا قازقوں اور ابجوتھوں کے، جو اسے سہرا دینے کے لیے تیار کھڑے تھے، بازوؤں میں جا گرا۔

اس نے جوتوں کر کے اپنے آپ کو سنبھالا اور آنکھیں بھیج کر اپنے گرد و پیش نظر ڈالی۔ اس کی نگاہ پرنس آندرے پر پڑی لیکن معلوم ہوتا تھا کہ وہ اسے پہچان نہیں سکا اور وہ اتنا و خیزاں برآمدے کی طرف چل دیا۔

”ہی۔ ہی۔ ہی۔“ اس نے پھر سیٹی بجائی اور دوبارہ پرنس آندرے کی طرف دیکھا۔

جب کہ بوڑھے اشخاص کے ساتھ اکثر ہوتا ہے، اسے پرنس آندرے کے چہرے کا اس شخص کے ساتھ، جو اس کے حافطے میں محفوظ تھا، تعلق قائم کرنے میں چند سیکنڈ لگ گئے۔

”پرنس، تم کیسے؟ مائی ڈیئر بوائے، کیا حال ہے تمہارا، ادھر آؤ۔“ اس نے تھکے تھکے لہجے سے کہا اور بھاری ذہنوں سے زینہ، جو اس کے بوجھ تلے چرچارہا تھا، چڑھنے لگا۔

اس نے کوٹ کے بٹن کھولے اور برآمدے میں بیچ پر بیٹھ گیا۔

”خیر تمہارے والد محترم کیسے ہیں؟“

”مجھے کل ان کے انتقال کی خبر ملی تھی،“ پرنس آندرے نے یک بیک کہا۔

کوٹوزوف کو سخت دھچکا لگا اور وہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے اسے دیکھنے لگا۔ پھر اس نے اپنی ٹوپی اتاری اور سینے پر صلیب کا نشان بتایا۔

”خداوند! تمہیں جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائیں! ہم سب خداوند کی مرضی کے تابع ہیں!“ اس نے آہ بھری، گہری سانس لی اور توقف کیا۔ ”میں ان سے محبت کرتا اور ان کا احترام کرتا تھا اور میں سچے دل سے تمہارے ساتھ ہمدردی کرتا ہوں۔“

اس نے پرنس آندرے کو اپنی آغوش میں لے لیا، اسے اپنے غریب سینے سے بھینچا اور اسے یونگی تھاے دیں کھڑا رہا۔ جب اس نے اسے چھوڑا، پرنس آندرے نے دیکھا کہ اس کے پلپے ہونٹ کپکپا رہے ہیں اور اس کی آنکھیں اشکوں سے لبریز ہیں۔

”چلو۔ میرے کمرے میں چلو۔ ہم ذرا باتیں کریں گے،“ اس نے کہا۔

لیکن میں اسی دم دینی سوف جواب دشمن کی طرح اپنے اعلیٰ افسروں سے بھی بالکل خائف نہیں تھا، انہیں ان کی، جنہوں نے اسے روکنے کی کوشش کی تھی، غصیلی کاٹنا پھوسیدوں کے باوجود اپنے ہمیز کھنکھاتے بے خوف و خطر زینہ چڑھ آیا۔ کوٹوزوف نے، جس نے سہارے کے لیے اپنے ہاتھ بچا کر رکھے ہوئے تھے، اس پر ناپسندیدگی کی نگاہ ڈالی۔ دینی سوف نے اپنا تعارف کرایا اور زوردار سچے سے کہا کہ وہ وطن کی بہبود کے سلسلے میں ہر سرین ہائی نس کو ایک اہم معاملے کی اطلاع دینا چاہتا ہے۔ کوٹوزوف نے دینی سوف کو تھکی تھکی نظروں سے دیکھا، خفگی کا ظہار کرنے کے لیے اپنے ہاتھ اوپر اٹھائے، انھیں ایک دوسرے کے اوپر اپنے پیٹ پر رکھا اور اس کی بات دہرانے لگا۔

”وطن کی بہبود کے لیے؟ ہوتہ، کیا ہے؟ بولو!“

دینی سوف لڑکیوں کی طرح شرما گیا (اس کے مونچھوں سے بھرپور، سرد گرم چشیدہ اور سے کشانہ چہرے پر رنگ کا آنا کچھ عجیب معلوم ہو رہا تھا۔) اور وہ بڑی جرأت و دلیری سے سولسک اور دیا زما کے، بین دشمن کے مواصلاتی رابطوں کے انقطاع کے بارے میں اپنے منصوبے پر روشنی ڈالنے لگا۔ دینی سوف کا وطن بالوف بھی خطہ

تھا اور وہ اس کے چپے چپے سے خوب آگاہ تھا۔ منصوبہ لاریب دلکش معلوم ہو رہا تھا اور خاص طور پر اس لیے بھی کیونکہ وہ اسے یقین کی پیشگی سے بیان کر رہا تھا۔ کوٹوزوف بیٹھا اپنے اسی پاؤں کو گھورتا رہا۔ کبھی کبھی وہ درختوں سے گھرے تر ہی جنگل کے احاطے پر نظر ڈال لیتا جیسے اسے امید ہو کہ وہاں سے کوئی ناخوشگوار چیز نکل آئے گی اور وہ واقعی، جب دینی سوف کا بیان جاری تھا، ایک جرنیل، جس کے ہاتھ میں چرمی تھیل تھا، اس جنگل سے برآمد ہو گیا۔

”کیا!“ کوٹوزوف نے دینی سوف کے بیان کے بیچ میں حیرت سے کہا۔ ”اتنی جلدی تیر ہو گئے؟“

”تیار یوز ہائی نس،“ جرنیل نے کہا۔

کوٹوزوف نے یوں سر کو جنبش دی جیسے وہ یہ کہنا چاہتا ہو۔ ”بھلا ایک آدمی یہ سب کچھ کیسے کامیابی سے بھگتا سکتا ہے؟“ اور وہ دوبارہ دینی سوف کا بیان سننے لگا۔

”روسی افسر کی حیثیت سے میں اپنی عزت کی قسم کھا کر آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ میں نیولین کا مواصلاتی رابطہ منقطع کر سکتا ہوں۔“

”تمہارا کوآرڈر ماسٹر جنرل کرل آندر یوچ سے کیا رشتہ ہے؟“ کوٹوزوف نے اسے ٹوکتے ہوئے پوچھا۔

”یوز ہائی نس، وہ میرے چچا ہیں۔“

”اوہ! ہماری آپس میں دوستی ہے،“ کوٹوزوف نے خوشگوار لہجے سے کہا۔ ”ٹھیک، ٹھیک، مائی ڈیر بوائے۔“

تم یہیں ہیڈ کوارٹرز میں ہی ٹھہرو۔ ہم کل بات کریں گے۔“

اس نے دینی سوف کی طرف اپنے سر کو جنبش دی اور دوسری جانب متوجہ ہو گیا۔ اس نے کاغذات پکڑنے کے لیے، جو ڈیوٹی جنرل کو نائنٹھن اس کے لیے دیا تھا، اپنا ہاتھ آگے بڑھا دیا۔

”یوز ہائی نس، آپ اندر تشریف نہیں لانا چاہیں گے؟“ ڈیوٹی جرنیل نے آہستہ لہجے سے دریافت کیا۔

”وہاں آپ نے منصوبوں کا جائزہ لینا اور متعدد کاغذات پر دستخط فرمانا ہیں۔“

دروازے پر ایک ایجوٹ آہ اور اس نے اطلاع دی کہ اندر ہر چیز تیار ہے، لیکن صریحاً نظر آ رہا تھا کہ کوٹوزوف اندر جانے سے قبل تمام امور سے فراغت حاصل کر لینا چاہتا ہے۔ اس نے ناک بھوں چڑھائی۔

”نہیں!“ اس نے کہا۔ ”مائی ڈیر بوائے، میز یہیں اٹھوا لاؤ۔ میں یہیں ان پر نظر ڈال لوں گا۔ ابھی چاہا نہیں،“ اس نے پرس آندر سے کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔

پرس آندر سے برآمدے میں ٹھہرا رہا اور ڈیوٹی جرنیل کی رپورٹ سن رہا۔ جب اس کی خواندگی ہو رہی تھی، پرس آندر سے کوئیم وادروازے کے پیچھے ریشمی لباس کی سرسراہٹ اور کسی خاتون کی سرگوشیوں کی آواز سنائی دی۔ اس طرف متعدد مرتبہ جھانکنے کے بعد اسے ایک خوش وضع خاتون کی، جس کا جسم بھرا بھرا اور چہرہ سرخ و سپید تھا، جھٹک دکھائی دی۔ وہ گلابی ڈریس میں لمبوں تھی اور اس کے سر پر نقش رنگ کارومال تھا۔ اس کے ہاتھ میں پلیٹ تھی۔ صاف نظر آ رہا تھا کہ وہ کمانڈر انچیف کی اندر آمد کی منتظر ہے۔ کوٹوزوف کے ایجوٹ نے پرس آندر سے کہ

ذریعہ بتایا کہ جس پادری کا یہ مکان ہے، یہ اس کی رفیعہ حیات ہے اور بحیثیت میزبان نرہائی نس کی روٹی اور نمک سے تواضع کرنا چاہتی ہے۔

”اس کے شوہر نے صلیب تھامے گرے میں ہیرسین ہائی نس کا استقبال کیا تھا اور اب وہ گھر میں ان کا استقبال کرے گی۔ اچھی خاصی قبول صورت چیز ہے“ ایجوٹنٹ نے مسکراتے ہوئے اضافہ کیا۔

ان الفاظ پر کوٹوزوف نے نگاہیں اٹھا کر اوپر دیکھا۔ وہ جرنیل کی رپورٹ (جو زیادہ تر تیار ہوا۔ زائٹس چے کے مقام پر) (نوجی دستوں کی) پوزیشنوں کی نکتہ چینی پر مشتمل تھی [یعنی اسی طرح سن رہا تھا جس طرح اس نے ریٹ سوٹ کا بیان یا سات سال پہلے اوٹسٹنس کے معرکے سے قبل جنگی کونسل کی بحث سنی تھی۔ وہ بین طور پر محض اس بے منت تھا کیونکہ اس کے کان تھے۔ اگرچہ اس کے ایک کان میں سن کی پتی ٹھنسی ہوئی تھی، پھر بھی اس کے کانوں میں راز پڑی جاتی۔ تاہم نہ صرف یہ بات اظہر من الشمس تھی کہ جرنیل خواہ کچھ ہی کیوں نہ کہتا، اسے کوئی چیز نہ حیران کر سکتی تھی اور نہ اسے کسی قسم کی دلچسپی مینے پر آمادہ کر سکتی تھی، اور یہ امر بالکل واضح تھا کہ جو کچھ اسے بتایا جا رہا تھا، اسے وہ پہلے ہی معلوم تھا اور وہ سن محض اس لیے رہا تھا کیونکہ وہ اسی طرح سننے پر مجبور تھا جس طرح وہ گرے میں عبادت کے دوران میں سننے پر مجبور ہوتا تھا۔ دینی سوٹ نے جو کچھ کہا تھا، اس سے دانش مندی کا اظہار ہوتا تھا اور اس کی باتیں بر محل تھیں۔ جو کچھ جرنیل کہہ رہا تھا، وہ اس سے بھی زیادہ دانش مند تھا اور بر محل تھا لیکن یہ واضح تھا کہ کوٹوزوف دانش اور علم دونوں کو بنظر حقارت دیکھتا تھا۔ پرنس آندرے نے کٹڈ رائیجیف کے چہرے کا بغور مطالعہ کیا اور اسے وہاں جو واحد تاثر نظر آیا، وہ بوریٹ، دردانے کے پیچھے نسوانی کھسک بھسک کا ملبوم جانے کا تجسس اور مجلسی ادب کے مطابق رویہ اختیار کرنے کی خواہش کا ملبوم تھا۔ یہ بالکل ظاہر تھا کہ کوٹوزوف کو نہ صرف علم اور عقل سے نفرت ہے بلکہ دینی سوٹ نے جس حب الوطنی کے جذبے کا اظہار کیا تھا، وہ اس سے بھی بدکوتا تھا۔ تاہم وہ ان چیزوں سے اپنی کسی دانش مندی، جذبے یا علم کی بنا پر تشغیر نہیں تھا (کیونکہ اس نے ان میں سے کسی کا بھی اظہار کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی تھی)، بلکہ اس کی وجہ کچھ اور تھی۔ اسے ان چیزوں سے محض اس لیے نفرت تھی کیونکہ وہ عمر رسیدہ ہو چکا تھا اور زندگی میں بہت کچھ دیکھ چکا تھا۔

رپورٹ میں کوٹوزوف نے اپنی طرف سے جس بات کا اضافہ کرنے کی ہدایت کی، اس کا تعلق اس لوٹ کھسوٹ سے تھا جو روسی افواج نے کی تھی۔ رپورٹ کے ختام پر جرنیل نے دستخطوں کے لیے اس کے سامنے ایک دستاویز رکھی۔ ایک جاگیر دار نے ایک نوجوانی کا ٹڈر کو درخوست دی تھی کہ فوجیوں نے اس کی جٹی کی نھل کاٹ لیا ہے، اس کی ادائیگی ہونا چاہیے اور یہ دستاویز اس ادائیگی کے بارے میں تھی۔ جب کوٹوزوف کو اس کے متعلق بتایا گیا، اس نے اپنے ہونٹ چاٹے اور نفی میں سر ہلا دیا۔

’جو مہم میں پھینک دوا ہے۔ آگ لگا دو! مائی ڈیئر نیلو، میں تمہیں قطعی طور پر بتائے دیتا ہوں،“ اس نے کہا۔ ”ایسی تمام چیزیں کو ٹڈر آتش کر دیا کرو۔ انہیں جی بھر کر نھلیں کاٹنے اور نکڑی جلانے دو! یہ میرا حکم نہیں ہے

اور نہ میں اس کی اجازت دیتا ہوں، لیکن میں ان کی حرکات پر کوئی سزا بھی نافذ نہیں کر سکتا۔ اس کا کوئی علاج نہیں۔ جب آدمی درخت کاٹتا ہے، پھیلنے لگتا ہے، ادھر ادھر اڑیں گی۔“ اس نے ایک بار پھر دستاویز پر نظر ڈالا۔ ”ف، ان جرموں کو چھوٹی سے چھوٹی بات قاعدے قانون کے مطابق کرنے کا ضبط ہے!“ وہ نفی میں سر ہلا تا بڑبڑایا۔

16

”اچھا، کام ختم ہو گیا!“ کوٹوزوف نے آخری کاغذ پر دستخط کرتے ہوئے کہا۔ وہ بے ڈھنگے انداز سے اٹھا، اپنی سرٹئی گردن کی شکلیں درست کیں اور پہلے کی نسبت بشاش طریق سے دروازے کی طرف بڑھا۔ پادری کی اہلیہ نے، جس کا چہرہ شرم و حیا سے گلزار ہو رہا تھا، جھپٹ کر پلیٹ اٹھائی لیکن اتنی دیر تیاری کرنے کے باوجود وہ اسے مناسب وقت پر پیش کرتے میں نا کام رہی۔ وہ خاصا جھک کر آداب بجالائی اور اس نے پلیٹ اسے تھما دی۔

اس نے اپنی آنکھیں پھینکیں، مسکرایا، پیار سے اس کی ٹھوڑی پر ٹھوکا دیا اور کہنے لگا

”واہ، کیا حسن ہے! تھینک یو، مائی ڈیر!“

اس نے اپنی جیب سے چند طلائی سکے نکالے اور سے دینے کے لیے پلیٹ پر رکھ دیے۔

”اچھا، یہاں تمھاری کیسے گزر رہی ہے؟“ اس نے اس کو کمرے کے، جو اس کے لیے سجایا گیا تھا، دروازے کی جانب جاتے ہوئے کہا۔

پادری کی اہلیہ، جس کے سرخ و سپید چہرے پر گڑھے پڑے تھے اور سکراہٹ دوڑ رہی تھی، اس کے پیچھے پیچھے کمرے میں چلی گئی۔ ایجوکیشن برآمدے میں پرنس آندرے کے پاس آیا اور اس نے اسے دوپہر کے کھانے کی دعوت دی۔ آدھ گھنٹہ بعد کوٹوزوف کے بلائے پر جب پرنس آندرے اندر گیا، اس نے اسے آرام کرسی پر پاؤں پیارے لیٹے رکھا۔ اس نے اب بھی وہی کوٹ پہنا ہوا تھا اگرچہ اب اس کے بنن کھلے تھے۔ اس کے ہاتھ میں فرانسیسی ناول تھا۔ جب پرنس آندرے اندر آیا، اس نے اسے ایک طرف رکھ دیا۔ جو صفحہ وہ پڑھ رہا تھا، وہاں نشان کے طور پر اس نے کاغذ تراش رکھ دیا۔ پرنس آندرے نے سر درق سے دیکھا کہ یہ ہارام ڈگائی کا⁴ لے شوالے⁴ دوہنے ہے۔

”اچھا، بیٹھو، بیٹھو، ادھر آ جاؤ۔ چلو، کچھ باتیں ہو جائیں،“ کوٹوزوف نے کہا۔ ”مجھے بہت افسوس ہوا، بہت زیادہ افسوس ہوا۔ مگر مائی ڈیر فیلو، اب تم مجھے ہی اپنا باپ سمجھو، پدیرٹائی...“

پرنس آندرے کو اپنے باپ کے انتقال کے متعلق جو کچھ معلوم ہو سکا اور اس نے بالڈلن میں، جب وہ گھوڑے پر وہاں گیا تھا، جو کچھ دیکھا تھا، وہ اس نے کوٹوزوف کو بتایا۔

”ان لوگوں نے ہمیں کن حالوں میں پہنچا دیا ہے!“ کوٹوزوف اچانک مضطرب سہجے میں چیخ پڑا۔ نظر آ رہا تھا کہ پرنس آندرے نے اسے جو باتیں بتائی تھیں، ان سے اس پر یہ واضح ہو گیا تھا کہ روس کن حالات میں سے

عزیز رہا ہے۔ ”لیکن مجھے کچھ مہمت دو، کچھ مہلت دو!“ اس نے گیمبرلج میں کہا۔ اس کے چہرے پر دشت برس رہی تھی۔ بظاہر وہ ایک ایسے موضوع پر، جس نے اس کے جذبات میں زبردست کھلبلی مچا دی تھی، تفصیل سے گفتگو کرنے سے گریز کر رہا تھا۔ ”میں نے تمہیں اس سے بلایا تھا کیونکہ میں تمہیں اپنے ساتھ رکھنا چاہتا ہوں۔“

”پوز ہائی ٹس، میں آپ کا ممنون ہوں۔ لیکن مجھے اندیشہ ہے کہ میں اب سٹاف ورک کے لیے سورتوں نہیں رہا، پرنس آندرے نے کچھ اس انداز سے مسکرتے ہوئے کہا کہ کوئزوف نور آناڑ گیا کہ دال میں کچھ کالا ضرور ہے۔ کمانڈر انچیف نے اسے استفہامیہ نگاہوں سے دیکھا۔

”لیکن سب سے بڑی بات یہ ہے،“ پرنس آندرے نے مزید کہا، ”کہ میں پٹی رجنٹ سے مانوس ہو گیا ہوں۔ مجھے اپنے انسروں سے انس ہے اور میرا خیال ہے کہ میرے جوان مجھے پسند کرنے لگے ہیں۔ مجھے رجنٹ چھوڑتے افسوس ہو گا۔ آپ نے مجھے اپنے پاس رکھنے کی پیشکش کر کے میری جو عزت افزائی فرمائی ہے، اس کے لیے میں آپ کا تہہ دل سے مشکور ہوں اور اگر میں آپ کی پیشکش قبول نہیں کر رہا تو یقین مانیے۔“

کوئزوف کے پھولے پھولے چہرے پر ایک ایسا تاثر نمودار ہو گیا جو فراست اور شفقت سے معمور تھا لیکن اس کے ساتھ ہی اس میں نہایت لطیف طنز کی آمیزش بھی تھی۔ اس نے ہلکوسکی کو ٹوک دیا۔

”مجھے افسوس ہے۔ میرا خیال تھا تم میرے بڑے کام آتے۔ مگر تم ٹھیک کہتے ہو، بالکل ٹھیک کہتے ہو! (صحیح) آدمیوں کی یہاں اتنی ضرورت نہیں ہے۔ مشیر ہمیشہ بکثرت دستیاب ہو جاتے ہیں لیکن (صحیح) آدمیوں کا بڑا توڑا ہے۔ جس طرح تم رجنٹ میں کام کر رہے ہو، اگر یہ تمام مشورے والے بھی وہاں اس طرح خدمات سرانجام دیں تو رجنٹوں کی کاپی اپلیٹ جائے۔ وائٹس میں تم نے جو کارنامہ سرانجام دیا تھا، وہ مجھے یاد ہے۔ بالکل یاد ہے۔ مجھے یاد ہے کہ تم نے وائٹس میں علم تمام رکھا تھا!“ کوئزوف نے کہا اور اس یاد پر پرنس آندرے کا سارا چہرہ خوشی سے تھماتے لگا۔

کوئزوف نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا اور اسے اپنے قریب گھسیٹ لیا۔ اس نے اپنے گال اس کے سامنے کر دیا تاکہ وہ اس پر بوسہ دے سکے اور ایک بار پھر پرنس آندرے کو بوڑھے شخص کی آنکھوں میں آنسو تیرنے نظر آئے۔ اگرچہ وہ جانتا تھا کہ کوئزوف کے آنسو بات بے بات نکل آتے ہیں اور وہ اس سے اس لیے خاص طور پر بچا اور شفقت سے پیش آرہا ہے کہ کیونکہ اسے جو صدمہ برداشت کرنا پڑا تھا، اس پر وہ اس سے ہمدردی کا اظہار کرنا چاہتا ہے، پھر بھی وائٹس کے واقعے کے یاد کیے جانے پر اسے خوشی بھی ہوئی اور اس کی ”ٹانگی بھی تسکین ہو گئی۔“

”جاؤ اپنی صوابدید کے مطابق عمل کرو، خدا تمہارا حامی و ناصر ہو۔ میں جانتا ہوں کہ تم نے جو رستہ منتخب کیا ہے، وہ غرور و قار کا رستہ ہے۔“ اس نے توقف کیا۔ ”بخارست³⁵ میں تم مجھے بہت یاد آئے۔ مجھے ایسے شخص کی ضرورت تھی جسے میں بھیج...“ اور کوئزوف موضوع تبدیل کر کے ترکوں کے ساتھ جنگ اور معاہدہ امن کے، جو طے پا چکا تھا، متعلق بات کرنے لگا۔ ”ہاں، مجھے بڑی ملذخیاں سنائی گئی ہیں!“ اس نے کہا۔ ”اس وقت بھی جب جنگ شروع

ہوئی اور اس وقت بھی جب معاہدہ امن طے پایا... لیکن انت بھلا، سو بھلا۔ ہر کام صحیح وقت پر انجام پا گیا۔ Tout vient a point a celui qui sait attendre ہے۔ وہ ایک بار پھر اس موضوع پر، بظاہر جس کے بارے میں وہ بہت سوچتا رہا تھا، گفتگو کرنے لگا۔ ”اے یہ مشیر، یہ مشیر!“ اس نے کہا۔ ”اگر ہم نے ان سب کی باتوں پر توجہ دی ہوتی تو ہم ابھی تک ترکی میں ہی ہوتے۔ ہم نہ امن کا معاہدہ طے کر پاتے اور نہ، بھی تک جنگ ختم ہوئی ہوتی۔ ہمیشہ جلد بازی، اور جلد بازی، جلد بازی جتنی زیادہ، رفتار اتنی ہی کم! اگر کانسکی کا پہلے ہی انتقال نہ ہو چکا ہوتا، وہ لازماً کسی مصیبت میں پھنس جاتا۔ اس نے تیس ہزار آدمیوں کے ساتھ قلعوں اور قلعہ بند شہروں پر طوفانی چڑھائی کر دی تھی۔ قلعوں پر قبضہ کرنا آسان ہے لیکن ہم کو کامیابی سے منزلی مراد تک پہنچنا مشکل ہے، اور اس مقصد کے لیے طوفانی چڑھائیوں و رائدہا دھند حلوسے کام نہیں بنتا۔ اس کے لیے صبر و تحمل اور وقت کی ضرورت ہے۔ کانسکی نے رست چمک پر قبضہ کرنے کے لیے جون بھیجے لیکن میں نے صرف ان دو۔ صبر و تحمل اور وقت۔ سے کام لیا اور اس کی نسبت کہیں زیادہ قلعہ بند شہروں کو فتح کیا۔ اور ان ترکوں کو گھوڑے کھانے پر مجبور کر دیا!“ اس نے اپنے سر کو جنبش دیتے ہوئے کہا۔ ”اور میری بات یاد رکھو، فرانسیسیوں کا بھی یہی حشر ہوگا!“ وہ کہتا چلا گیا۔ اس کا لہجہ تند سے تند تر ہوتا چلا گیا اور وہ اپنی چھاتی پیٹنے لگا۔ ”میں انھیں گھوڑے کھانے پر مجبور کر دوں گا!“ اور ایک بار پھر اس کی آنکھوں میں آنسو ٹھہلانے لگے۔

”لیکن ہمیں لڑنا تو پڑے گا ہی ایسا نہیں؟“ پرنس آندرے نے پوچھا۔

”غالباً۔ اگر یہ شخص یہی، صراحتاً نام، پھر اس سے منکر ممکن نہیں ہوگا۔ لیکن، مائی ڈیئر بوائے، یقیناً تو، ان دو۔ صبر و تحمل اور وقت۔ سے زیادہ طاقتور حلیف اور کوئی نہیں۔ وہ سب کچھ سرانجام دیں گے۔ مصیبت یہ ہے... کہ ہمارے مشیر اس انداز سے نہیں سوچتے۔ بعض کہتے ہیں کہ یہ کرو اور بعض کہتے ہیں وہ کر دو... آدمی کرے کیا؟“ اس نے یوں پوچھ جیسے وہ اس سے جواب کی توقع کر رہا ہو۔ ”خیر تم کیا کروانا چاہو گے؟“ اس نے ایک بار پھر پوچھا اور اس کی آنکھوں میں کچھ اس قسم کی چمک پیدا ہو گئی جیسے اسے معلوم ہو۔ ”کیا کرنا چاہیے اور میں کیا کر رہا ہوں، یہ میں تمہیں بتائے دیتا ہوں۔“ Dons le doute, moncher! اس نے کچھ توقف کیا اور کہا: ”abstiens-toi“ اس نے یہ الفاظ عہد اچھا کر کے۔

”اچھا، مائی ڈیئر بوائے، خدا حافظ۔ میں تمہارے غم میں برابر کا شریک ہوں۔ میں تمہارے لیے ہائی نرس پرنس یا کمانڈر انچیف نہیں ہوں بلکہ بمنزلہ باپ ہوں۔ اگر کبھی تمہیں کسی چیز کی ضرورت پیش آئے، سیدھے میرے پاس چلے آنا۔ مائی ڈیئر بوائے، خدا حافظ“

• جسے انتظار کرنا آ گیا، سے سب کچھ مل گیا۔

• مائی ڈیئر بوائے، تم تک میں پہنچاؤں

• پھر کچھ نہ کرو

وہ ایک بار پھر پرنس آندرے سے لپٹ گیا اور اس نے اس کا بوسہ لیا۔ اور پھر پرنس آندرے اپنے پیچھے دروازہ بند کرتا، کوثر زوف نے اطمینان کی گہری سانس لی اور مادام ڈگالٹی کا نادل ”لے شوالیے دو سیے“ جو وہ قبل ازیں پڑھ رہا تھا، دوبارہ اٹھ لیا۔

پرنس آندرے کے لیے یہ تو فیح کرنا کہ ایسا کیسے اور کیوں ہے، ممکن نہیں تھا لیکن حالات عموماً جس ڈھب پر جارہے تھے اور انھیں جس شخص کی تحویل میں دیا گیا تھا، کوثر زوف کے ساتھ اس ملاقات کے بعد وہ ان کے بارے میں مطمئن اپنی رجنٹ میں واپس چلا گیا۔ اس بوڑھے شخص میں۔ جس کی نفسانی خواہشات کی آگ لب سرد پڑ چکی تھی اور، گروہ ایسی دہکی کوئی حرکت کرتا بھی تھا، محض عارٹا یا کرنا تھا اور جس میں دانش (جو واقعات کو باہم مربوط کرتی اور نتائج مستنبط کرتی ہے) کی جگہ صرف واقعات کے بہاؤ کا پرسکون انداز سے غور و فکر کرنے کی صلاحیت تھی۔ اسے ذاتی مطلب برآری کا فقدان جتنا واضح نظر آنے لگا، تنہا ہی اسے یقین ہونے لگا کہ انجام کار سب کچھ ویسے ہی ہوگا جیسے کہ ہونا چاہیے۔ ”وہ اپنی طرف سے کوئی چیز متعارف نہیں کرائے گا۔ وہ منصوبے بنائے گا اور نہ کسی چیز کی ابتدا کرے گا“ پرنس آندرے نے سوچا۔ ”لیکن وہ ہر بات سے گاہ سب کچھ یاد رکھے گا اور ہر چیز کو اپنے مقام پر رکھے گا۔ وہ کسی سودمند چیز کے راستے میں رکاوٹ نہیں بنے گا اور کسی ضرر دہ چیز کو قبول نہیں کرے گا۔ وہ جانتا ہے کہ کوئی چیز، جو اس کی اپنی مرضی سے کہیں زیادہ طاقتور اور کہیں زیادہ اہم ہے، موجود ہے۔ اور یہ چیز واقعات کا ناگزیر بہاؤ ہے۔ وہ انھیں دیکھ سکتا ہے، ان کی اہمیت سمجھ سکتا ہے اور ان کی اہمیت سمجھنے کے بعد وہ ان میں ٹانگ اڑانے، ذاتی خواہشات کی پیروی کرنے یا کسی دوسری چیز کو ہدف بنانے سے گریز کر سکتا ہے۔ سب سے بڑھ کر“ پرنس آندرے نے سوچا، ”آدمی کو اس لیے اس پر اعتماد ہونے لگتا ہے کیونکہ مادام ڈگالٹی کے نادلوں اور اپنی فرانسسی کہاوتوں کے باوجود وہ روسی ہے اور کیونکہ جب اس نے یہ کہا تھا، ”انھوں نے ہمیں کن حالوں میں پہنچا دیا ہے۔“ تو اس کی آواز کانپنے لگی تھی اور جب اس نے یہ کہا تھا کہ ”میں انھیں گھوڑے کھانے پر مجبور کر دوں گا۔ اس کی چیخ کل گئی تھی۔“

ان جذبات کا وہند لے وہند لے اندر سے کم و بیش بھی کوثر بہہ رہا تھا۔ چنانچہ درباری سارشل کے باوجود جب کوثر زوف کا بحیثیت کمانڈر انچیف تقرر عمل میں آیا تو اسے اتفاق رائے اور عمومی پسندیدگی کی سند مل گئی۔

زارکی ماسکو سے ردا گئی کے بعد اس شہر کی زندگی اپنی سابقہ جانی پہچانی ڈگر پر رواں دواں ہو گئی۔ اس نے اپنا معمول کا انداز اس حد تک دوبارہ اختیار کر لیا کہ ان حالیہ ایام کو، جن کے دوران میں جب انوفی کے ولولے اور جوش و خروش کا اظہار کیا گیا تھا، یاد رکھنا مشکل ہو گیا۔ اب یہ یقین کرنا محال تھا کہ روس کو واقعی کوئی خطرہ درپیش ہے اور یہ کہ انگلش کلب کے ارکان مادر وطن کے فرزند ہیں اور وہ ہر قسم کی قربانی دینے کے لیے کمر بستہ ہیں۔ اہم طور کے قیام کے

دوران میں جب الوطنی کے جس والہ نہ جوش و خروش کا مظاہرہ کیا گیا تھا، اس کی یاد صرف ایک چیز سے تازہ ہوتی تھی اور وہ یہ مطالبہ تھا کہ لوگ جوانوں کی بھرتی اور نقدِ قوم کی ادائیگی کی صورت میں بنانا پنا حصہ او کریں۔ جوئی اس سلسلے میں وعدہ ہو جاتا، وہ قانونی اور سرکاری حیثیت اختیار کر جاتا اور اس کا پورا کرنا ناگزیر ہو جاتا۔

اگرچہ نسیم ماسکو کے قریب سے قریب تر آتا جا رہا تھا، ابا بیان شہر کی صورت یہ تسلیم کرنے کے لیے آمادہ نہیں تھے کہ ان کے لیے صورت حال نازک سے نازک تر ہوتی جا رہی ہے، اس کے برعکس ان کا رویہ پہلے کی نسبت روز بروز غیر سنجیدہ سے غیر سنجیدہ تر ہوتا جا رہا تھا جیسا کہ ہمیشہ ان لوگوں کے، جنہیں اپنے سردوں پر تباہی و بربادی کا خطرہ منڈلاتا نظر آتا ہو، ساتھ ہوتا ہے۔ جب خطرے کی گھنٹی بجنے لگتی ہے اور اس کی آواز قریب سے سنائی دینے لگتی ہے، انسانی روح میں مدام دو آوازیں برابر کی قوت سے بولنا شروع کر دیتی ہیں۔ ایک آواز اسے بڑے معقول انداز سے سمجھاتی ہے کہ وہ خطرے کی نوعیت پر غور کرے اور اس سے بچنے کے ذرائع تلاش کرے۔ دوسری اس سے بھی زیادہ معقول انداز اختیار کرتی ہے اور اسے بتاتی ہے کہ خطرے کے متعلق سوچ بچ کر کرنا تکلیف دہ اور افسردہ کن ہے کیونکہ ہر بات کا پیشگی اندازہ لگانا اور واقعات کی عمومی پیش قدمی کے آگے بند باندھنا کسی انسان کے بس میں نہیں ہے، چنانچہ بہتر یہی ہے کہ وہ، جو ناخوشگوار ہے، جب تک بالکل ہی سر پر آ موجود نہ ہو، آدمی کو اسے نظر انداز کرتے رہنا چاہیے اور اس کے بجائے اسے صرف اس پر، جو خوشگوار ہے، دھیان دیتے رہنا چاہیے۔ اگر آدمی تھا ہو تو وہ عام طور پر پہلی آواز پر کان دھرتا ہے لیکن اپنے ساتھی انسانوں کی صحبت میں وہ دوسری آواز کی پیروی کرنے لگتا ہے۔ چنانچہ اب، اسکو کے باسیوں کا بھی کچھ یہی حال تھا۔ جس قسم کا رونق میلا اور عیش و عشرت کا سماں اس سماں ماسکو میں دیکھنے میں آیا، مدتوں سے دیکھنے میں نہیں آیا تھا۔

رستوپ چین کے جہزی سائز کے اشتہار نما یک درتی خبر نامے منظر عام پر آتے رہتے تھے۔ ان کے اوپر ایک سے خانے، ایک کلال اور ماسکو کے ایک شہری موسوم بہ کارینشکا تھی گی رین³⁷۔ ایک ریزرو فوجی سپاہی، جو پب میں کچھ زیادہ ہی پی پیتا ہے لیکن جب اسے معلوم ہوتا ہے کہ یونا پارٹ کا ارادہ ماسکو پر چڑھائی کرنے کا ہے، وہ بڑے جلد میں آ جاتا ہے اور لڑائی میں کو مصدق و مسجع زبان میں گالیاں سننے لگتا ہے۔ وہ سے خانے کے باہر آتا ہے، درجہ دوم کے، جو دروازے کے باہر عقاب کی تصویر (شاہی نشان) کے نیچے جمع ہو چکا ہوتا ہے، جذبات کو برا بیچنے کرنے کے لیے زوردار تقریر کرنے لگتا ہے۔ کی چوب کاری کی تصاویر چھپی ہوئی تھیں۔ ان خبر ناموں کو اتنے ہی ذوق و شوق سے پڑھا جاتا تھا اور ان کے متعلق اسی طرح بحثیں ہوتی تھیں جس طرح کہ وائلی لووچ پوٹکن³⁸ کی نظمیں پڑھی جاتی اور بحث کا موضوع بنتی تھیں۔

ان خبر ناموں کو پڑھنے کے لیے کلب کے ارکان کا سن روم میں اکٹھا ہوا کرتے تھے۔ کارینشکا تھی گی رین کی زبان سے جس طرح لڑائی میں لوگوں کو وہ پسند آتا تھا۔ وہ کہتے: "وہ ہماری راسی کو بھی کبھی کبھار دس کی طرح پھوس جائیں گے، روپی پورج کھا کھا کر ان کے پیٹ پھٹ جائیں گے اور

ہماری گوبھی کا سوپ اس کا کام تمام کر دے گا۔ وہ سب کے سب بونے میں۔ ہماری ایک کساں عورت ان میں سے تین میں کو بیک وقت اپنی تنگی پر اٹھائے گی اور انھیں دور پھینک دے گی۔" دوسروں کو یہ انداز گفتگو پسند نہ آیا۔ ان کے خیال کے مطابق یہ حاسیانہ اور احمقانہ تھا۔ لوگ کہتے تھے کہ رستوب چن نے چن جن کر تمام فرانسیسیوں، بلکہ دیگر تمام غیر ملکیوں کو بھی، شہر سے نکال دیا ہے اور یہ کہ ان میں سے بعض یوین کے جاسوس اور ایٹ تھے لیکن یہ باتیں اس لیے سنائی جاتی تھیں تاکہ ان کے بہانے موقع کی مناسبت سے رستوب چن کے شخصوں کو دہرایا جاسکے۔ جب غیر ملکیوں کو اس جہز میں، جو زنی جارم تھا، سوار کرا دیا گیا، رستوب چن نے فرانسیسی میں ان سے کہا تھا

"Rentrez en vousmeme, entrez dans la barque et n'en faites pas une

barque de Charon,"³⁹

اس قسم کی باتیں بھی ہو رہی تھیں کہ تمام سرکاری دفاتر ماسکو سے باہر منتقل کرا دیے گئے ہیں اور اس کے ساتھ شہر کے فی البدیہہ طنزیہ جملے کا اضافہ کر دیا جاتا تھا۔ "کم از کم اس بات کے لیے ہمیں یولین کا شکر گزار ہونا چاہیے۔" کہا جاتا تھا کہ ماسٹوف نے جو رجسٹ فراہم کرنا ہے، اس پر اس کے آٹھ ہزار روپل انھیں ملے لیکن بد خوف اپنی رجسٹ پر اس سے زیادہ خرچ کر رہا ہے لیکن بد خوف جو کچھ کر رہا ہے، اس میں بہترین بات یہ ہے کہ وہ خود وردی پہنے گا اور اپنی رجسٹ کی قیادت کرے گا۔ اس طرح لوگوں کو جو کہیں قاشادیکھنے کو ملے گا، اس پر انھیں پھولی کوڑی بھی ادا نہیں کرنا پڑے گی۔

"تمہیں کسی پر ذرا ترس نہیں آتا؟" بولی درد جیسکا یا نے اپنی نرم و نازک انگلیوں سے، جن میں اس نے انگوٹھیاں پہنی ہوئی تھیں، چند الجھے ہوئے دھاگوں کو سیٹھے۔ دران کا گولہ بناتے ہوئے کہا۔

بولی نے الورا کی محفل سے رکھی تھی۔ وہ اگلے روز ماسکو سے روانہ ہونے کی تیاریاں کر رہی تھی۔

Bezukhovestridiculie، لیکن وہ بہت شفیق اور نیک فطرت انسان ہے۔ آخر اس قدر "Caustique"

ہونے میں کیا لطف آتا ہے؟"

"جرمانہ" ایک نوجوان شخص نے، جو ملیشیا کی وردی میں لمبوس تھا، با آواز بلند کہا، بولی اسے

mon Chevalier کہتی تھی۔ وہ اس کے ساتھ زنی جا رہا تھا۔

ماسکو کے بہت سے دوسرے حلقوں کی طرح بولی کے ٹولے نے بھی متفقہ طور پر یہ طے کر لیا تھا کہ وہ وردی

اپنے کام سے کام رکھیں۔ جہاز میں سوار ہو جائیں لیکن دھیان سے، کہیں کیرن (38) کی کشتی میں سوار نہ ہو جائے۔

"بد خوف سہمک ہے۔"

"مزا میز (طر کے فشر چلانے میں کیا لطف آتا ہے؟)

my knight۔ فردا وسطی میں صنف نازک کے پر زور صافی کو نامٹ کہتے تھے۔

کے علاوہ کوئی دوسری زبان نہیں بولیں گے اور وہ لوگ جو غلطی کر بیٹھتے اور فرانسیسی بول جاتے، انہیں ”مجلس برے“ رضا کارانہ چندہ جات“ کو جرمانہ ادا کرنا پڑتا تھا۔

Gallicism⁴⁰ کا دگنا جرمانہ۔ ایک مصنف نے جو وہاں موجود تھا، کہا، ”کیا لطف آتا ہے“ رومی ترکیب نہیں ہے۔“

”تمہیں کسی پر ذرا ترس نہیں آتا؟“ جولی نے مصنف کے الفاظ کو نظر انداز کرتے ہوئے نوجوان سے کہا۔ ”Castique“ کی غلطی میں مانتی ہوں اور تمہیں سچی بات بتانے کے ”لطف“ کی خاطر بھی میں جرمانہ ادا کرنے کو تیار ہوں، لیکن جہاں تک فرانسیسی سخت کے جملے اور ترکیبیں استعمال کرنے کا تعلق ہے، ان کی ذمہ داری مجھ پر عاید نہیں ہوتی،“ اس نے مصنف کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔ ”میرے پاس نہ اسناد وقت ہے اور نہ اتنا پیسہ کہ پرنس کا تفسیر کی طرح رومی سیکھنے کے لیے کوئی اتالیق رکھ لوں۔ سو، وہ آگئے!“ اس نے مزید کہا۔ ”Quandon.. نہیں نہیں،“ اس نے بلیشیا کے نوجوان سے احتجاج کرتے ہوئے کہا۔ ”اب کے میں تمہارے جال میں نہیں آؤں گی۔ آفتاب کا ذکر آیا اور اس کی کرنیں روشنی بکھیرنے لگیں!“ اس نے بیئر کی جانب ملنساری سے مسکرا کر کہا۔ ”ہم ابھی آپ کا ذکر کر رہے تھے اور کہہ رہے تھے کہ آپ کی رجسٹ مامونوف کی رجسٹ سے یقیناً بہتر ہوگی۔“ اس نے جرب زبانی سے صریحاً کذب بیانی کرتے ہوئے، جو امداد، مراعات یا فائدہ اور بخشش۔ بیل طبقے کی خواتین کے بایں ہاتھ کا کھیل ہے، مزید کہا۔

”انہو، مجھ سے میری رجسٹ کے بارے میں بات نہ کریں،“ بیئر نے اپنی میزبان کی دست بوسی کرتے ہوئے اور اس کے قریب نشست پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ”میں اس سے بالکل بیزار ہو چکا ہوں۔“

”اس کی کمان یقیناً آپ کے اپنے ہاتھوں میں ہوگی؟“ جولی نے بلیشیا کے افسر کی طرف دزدیدہ، طنزیہ انداز سے دیکھتے ہوئے کہا۔

موجودہ کریمیر کی موجودگی میں طنزیہ رویہ اپنانے کی طرف قطعاً مائل نہیں تھا اور اس کے چہرے سے صاف نظر آ رہا تھا کہ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا کہ آخر جولی کی مسکراہٹ کا مطلب کیا ہے۔ اپنی غیر حاضر دماغی اور نیک فطرت کے باوجود بیئر کی شخصیت میں کچھ ایسی بات تھی کہ جو شخص بھی اس کے منہ پر اس کا مذاق اڑانے کی کوشش کرتا، اسے ناکامی کے سوا کچھ ہاتھ نہ آتا۔

”بہیں،“ بیئر نے اپنے بھاری بھر کم، کیم شحم جتنے پرہنتے ہوئے نظر ڈال کر کہا۔ ”میں فرانسیسیوں کا بہت آسان نشانہ ثابت ہوں گا اور اس کے علاوہ مجھے یقین نہیں، کہ میں گھوڑے پر سوار ہو بھی سکوں گا یا نہیں۔“

جولی کے مہمان گپ شپ کے موضوع کے طور پر جن لوگوں کو منتخب کرتے تھے، ان میں رستوف بھی شامل تھے۔ ”سنا ہے کہ ان کے حالات بہت ابتر ہو گئے ہیں،“ جولی نے کہا۔ ”اور ان کا۔۔۔ میرا مطلب ہے کہ کاؤنٹ

کا۔ رویہ بالکل غیر معقول ہے۔ ”رزومووسکی، اسکو کے قریب مکان اور جاگیر خریدنا چاہتے تھے لیکن بل منڈھے چڑھ ہی نہیں رہی۔ وہ حد سے زیادہ قیمت مانگ رہے ہیں۔“

”ہمیں، میرا خیال ہے کہ سودا چند دنوں میں طے پا جائے گا۔“ ایک مہرمان نے کہا، ”حالانکہ اب اسکو کے قریب رجوار میں کچھ خریدنا نرا پاگل پن ہے۔“

”کیوں؟“ جولی نے پوچھا۔ ”اسکو کو یقیناً کوئی خطرہ درپیش نہیں۔ کیا خیال ہے آپ کا؟“

”پھر آپ کیوں جا رہی ہیں؟“

”میں؟ کیا عجیب و غریب سوال ہے۔ میں جا رہی ہوں کیونکہ خیر، کیونکہ ہر کوئی جا رہا ہے۔ اور اس کے علاوہ میں کوئی جون آف آرک⁴¹ یا امیزن⁴² تو ہوں نہیں۔“

”رے ہاں، بالکل بالکل۔ مجھے (کپڑے کی) چند اور پٹیاں دے دو۔“

”مگر انھوں نے اس سودے میں سوجھ بوجھ کا ثبوت دیا، وہ اپنے تمام تر حصے با سنی ادا کر سکیں گے،“ یلیٹیا کے افسر نے مستوف کا ذکر کرتے ہوئے کہا۔

”بڑے میاں آدمی تو اچھے ہیں لیکن بہت pauvresire ہیں۔ لیکن دوائے عرصے سے شہر میں کیوں مقیم ہیں؟ وہ مدتوں پہلے گاؤں جانے کے لیے پرتول رہے تھے۔ شہر کی طبیعت بھی دوبارہ بحال ہو گئی ہے۔ نہیں؟“

جول نے شوخی سے سکراتے پوچھا۔

”وہ اپنے چھوٹے بیٹے کا انتظار کر رہے ہیں،“ میئر نے جواب دیا۔ ”وہ ابوسکی کے قازق دستوں میں شامل ہو گیا تھا اور بل یا سرکوف⁴³ بھیج دیا گیا تھا۔ وہاں رجمنٹ کی تشکیل ہو رہی ہے۔ لیکن اب اس کا تباہ مری رجمنٹ میں ہو گیا ہے اور وہ اس غریب یہاں بچنے والا ہے۔ کاؤنٹ تو بہت عرصہ پہلے روانہ ہو چکے ہوتے، تاہم جب تک ان کا بیٹا نہیں آ جاتا، دنیا کی کوئی طاقت کاؤنٹس کو جانے پر آمادہ نہیں کر سکتی۔“

”میری ایک روز قبل ارخاروفوں کے ہاں ان سے ملاقات ہوئی تھی۔ شہر کی کارنگ روپ پھر سے نکھر آیا ہے اور اس کی رعدہ دلی خود کرا آئی ہے۔ اس نے ہمیں محفوظ کرنے کے لیے گانا بھی گایا تھا۔ بعض لوگ کتنی آسانی سے ہر مشکل پر قابو پا لیتے ہیں؟“

”کس مشکل پر قابو؟“ میئر نے خفگی سے پوچھا۔

جولی مسکرا دی۔ ”کاؤنٹ، آپ جانتے ہیں کہ آپ جیسے بااخلاق اور خواتین کی آن پر جان بھار کرنے والے سورما صرف، دامد سوزا کے نادلوں میں ہی پائے جاتے ہیں!“

”سورما! کیا مطلب ہے تمہارا؟“ میئر نے شرارتے ہوئے پوچھا۔

”اف، مائی ڈیئر کاؤنٹ، اب چھوڑیں نا“

"C'est la fable de tout Moscou. Je vous admire maparole d'honneur"

"جرمانہ جرمانہ" ملیشیا کے افسر نے چلاتے ہوئے کہا۔

"اف، بہت اچھا۔ آج کل تو آدمی اپنی زبان بھی نہیں کھول سکتا۔ کیا بورژوازی ہے؟"

"سارا ماسکو کس کے بارے میں گفتگو کر رہا ہے؟" میئر نے غصے سے پھٹکارتے ہوئے پوچھا اور اٹھ کر کھڑا

ہو گیا۔

"چھوڑیں گاؤنٹ، آپ جانتے ہی ہیں؟"

"نہیں، میں نہیں جانتا، میئر نے کہا

"مجھے معلوم ہے کہ آپ کی نقالی کے ساتھ ہمیشہ سے کتنی اچھی دوستی چلی آ رہی ہے اور چنانچہ... لیکن میری

دیر سے زیادہ دوستی رہی ہے۔ وہی ڈیرویرا"

"نہیں، مارام۔" میئر نے جھنجھلاہٹ اور تکذّر کے لہجے میں بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "میں نے گاؤنٹس

رستووا کے نائٹ کا کردار ہرگز نہیں سنبھالا۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ایک ماہ ہونے کو آیا ہے، میں ان کے گھر ہی نہیں

گیا۔ لیکن مجھے سمجھ نہیں آتا کہ یہ ظلم۔"

"Oui s' excuse—s' accuse" جوبلی نے مسکراتے اور کپڑے کی پٹی نضا میں ہراتے ہوئے کہا۔

اور یہ یقین کرنے کے لیے کہ وہ حرف آخر کہہ رہی ہے، اس نے جھٹ پٹ موضوع تبدیل کر دیا۔ "ہاں چلتے چلتے

یہ عرض کر دیتی ہے کہ مجھے معلوم ہوا ہے کہ بے چاری ماریا بلکونسکا یا کل ماسکو پہنچی تھی۔ آپ کو معلوم ہے کہ ان کے

والد خدا کو پیارے ہو گئے ہیں؟"

"واقعی؟ کہاں ہے وہ؟ میں اس سے ملنا چاہوں گا،" میئر نے کہا۔

"میں نے گزشتہ شام اس کے ساتھ گزاری تھی۔ وہ آج یا کل صبح ماسکو کے قریب اپنی جاگیر پر چلی جائے

گی۔ اپنا بھتیجا بھی اپنے ساتھ لے جا رہی ہے۔"

"بتاؤ کیس ہے وہ؟" میئر نے پوچھا۔

"بالکل ٹھیک ٹھاک۔ بس ذرا غمگین ہے۔ لیکن آپ کو معلوم ہے کہ اسے بچا یا کس نے؟ بالکل روہنی داستان

ہے۔ نگوانی رستوف نے۔ وہ محصور ہو چکی تھی۔ وہ اسے ہلاک کرنا چاہتے تھے اور اس کے چند ماہ زمین زخمی ہو گئے۔

وہ سر پٹ بھاگتا اندھا آیا اور اس نے اسے بچا لیا!"

"ایک اور رومان؟" ملیشیا کے افسر نے کہا۔ "سچی بات یہ ہے کہ یہ عام خروج ہوا ہی اس لیے کہ ہماری تمام

ادھیڑ عمر کنواری خواتین کی شادیاں ہو سکیں۔ ایک کا تشر ہے اور دوسری یہ پرنس بلکونسکا یا ہے۔"

* سارا ماسکو جانتا ہے۔ مجھے واقعی آپ پر حیرت ہو رہی ہے۔

معافی کی خواہشگار رہوں، اپنا قصور مانتی ہوں۔

”آپ کو معلوم ہے کہ مجھے واقعی یہ پختہ یقین ہے کہ وہ Jeune un petit peu amoureuse du

homme“

”جرمانہ! جرمانہ! جرمانہ!“

”لیکن آرمی یہ بات روسی میں کیسے بیان کر سکتا ہے؟“

18

جب میز گھر واپس آیا، اسے دو خبرنا سے، جو اسی روز موصول ہوئے تھے، تمنا دی گئے۔

پہلے میں یہ بتایا گیا تھا کہ یہ انوار کہ کاؤنٹ دستوپ جن نے لوگوں کو ماسکو چھوڑنے سے منع کر دیا ہے، غلط ہے، اس کے برعکس وہ اس بات پر خوش ہے کہ خواتین اور تجارت کی بیویاں شہر کو خیر باد کہہ رہی ہیں۔ ”اس سے خوف و ہراس میں کمی ہوگی اور ادھر ادھر کی گپ شپ میں تخفیف ہوگی۔“ ”خبرنامہ میں کہا گیا تھا۔“ ”تاہم میں یہ بات دعویٰ سے کہہ سکتا ہوں کہ یہ لفنگا شہر میں قدم نہیں رکھ سکے گا اور اگر وہ یہاں آگیا تو بے شک میری گردن اڑا دی جائے۔“ ان الفاظ سے میز پر پہلی مرتبہ بالکل واضح انداز سے منکشف ہوا کہ فرانسیسی ماسکو میں آیا ہی چاہتے ہیں۔ دوسرے خبرنا سے میں اعلان کیا گیا تھا کہ ہمارا فریج ہیڈ کوارٹر دیا زما میں ہے، کاؤنٹ وٹ لینگے روڈے⁴⁶ نے فرانسیسیوں کو شکست فاش سے دو چار کر دیا ہے لیکن چونکہ ماسکو کے اکثر شہری اپنے آپ کو ہتھیار بند کرنا چاہتے ہیں، اسلحہ خانے میں ان کے لیے ہتھیار موجود ہیں، شمشیریں، پستول اور بندوقیں سستے داموں حاصل کی جاسکتی ہیں۔ ”ان خبرناموں کا بچہ مضحکہ خیز حد تک محسوس ہوتا ہے، تنہا بھر پور نہیں تھا جتنا کہ ان خبرناموں کا ہوتا تھا جن میں نیچی گی رن کے اقوال و آراء منقول کیے جاتے تھے۔ میز ان پر ہر پہلو سے غور و فکر کرتا رہا۔ وہ بھیا نک طوفانی بادل، جن کی اس کی روح نے پوری قوت سے تمنا کی تھی لیکن جو غیر ارادی طور پر اسے دہشت زدہ کیے دے رہے تھے، صریحاً قریب آرہے تھے۔“ ”کیا میں ملزمت اختیار کر لوں اور فوج میں شامل ہو جاؤں یا مجھے انتظار کرنا چاہیے؟“ اس نے سوچا۔

مرتبہ اپنے آپ سے پوچھا۔

اس نے میز سے تاش کی گڈی اٹھائی اور پیشکش کیلئے کے لیے پتے بچھ دیے۔

”اگر اس بازی میں صحیح پتے نکل آئے،“ اس نے پتے پھینکنے کے بعد انھیں دریا کی ذرا تھ میں تھامنے اور

”وہ آج کل کچھ کچھ کسی ہاتھ چھوڑے سے اٹل ہوئی ہے۔“

اصل فرانسیسی جملے میں جو لفظ اور کاٹ ہے، کسی دوسری زبان میں اس کا انہماک نہیں۔ Jeune femme (نوجوان عورت) کا وہ محب ہوتا ہے جو عمر میں اس سے خاصا چھوٹا ہو۔ جوں کی بھائی چاچی ہے کہ پرنس ماریا تو خاصی بڑی عمر کی ہو چکی ہے لیکن وہ ایک ایسے نوجوان (گولائی دستوف) کی محبت میں گرفتار ہو گئی ہے جو بلحاظ عمر اس سے کافی چھوٹا ہے۔ جول کے لہجے میں طنزیہ لہجہ، سنجی بھی ہے کیونکہ کسی زمانے میں وہ خود بھی گولائی دستوف پر ڈور سے لٹا رہی تھی۔ (پہلی کتاب، حصہ اول، باب نمبر 22، 9)۔ (مستمر)

سراٹھا کر اوپر دیکھنے کے بعد اپنے آپ سے کہا۔ ”اگر اس بازی میں جیت ہوگئی تو اس کا مطلب یہ ہوگا۔ کیا مطلب ہوگا؟“

پیشتر اس کے کہ وہ مطلب، کا فیصلہ کر پاتا، اسے اپنے سنڈی روم کے دروازے پر بڑی پرنس کی آواز سنائی دی۔ وہ اس سے پوچھ رہی تھی کہ آیا وہ اندر آ سکتی ہے۔

”اس کا مطلب یہ ہوگا کہ مجھے لازماً فوج میں چنا جانا چاہیے،“ اس نے سچا خد کیا۔ ”آئیں، اندر آ جائیں،“ اس نے پرنس سے کہا۔

صرف سب سے بڑی پرنس، جس کی کمر لپی اور چہرہ پتھر پر تھا، ابھی تک پیر کے گھر میں رہ رہی تھی۔ اس کی دونوں چھوٹی بہنوں کی شادیاں ہو چکی تھیں۔

”mon cousin“ میں نکل ہونے کی معافی چاہتی ہوں۔ اس کے لہجے میں سرزنش بھی تھی اور اس سے پریشانی کا اظہار بھی ہو رہا تھا۔ ”تم جانتے ہو کہ اب دلت آ گیا ہے کہ تم کسی لیٹلے پر پہنچ جاؤ۔ کیا ہونے والا ہے؟ ہر شخص ماسکو کو خیر یاد رکھ چکا ہے اور لوگ ہنگامے کر رہے ہیں۔ ہم ابھی تک یہاں کیوں ٹھہرے ہوئے ہیں؟“

”ma cousine“ اس کے برعکس مجھے تو ہر شے تسلی بخش دکھائی دے رہی ہے،“ پیر نے دل لگی کے لہجے میں کہا۔ پرنس کے محسن کے کردار میں اسے جو شرمندگی اور الجھن ہوتی تھی، اس پر پردہ ڈالنے کے لیے اسے اس قسم کا لہجہ اختیار کرنے کی عادت ہو گئی تھی۔

”ہاں، بہت تسلی بخش،“ سچائی تسلی بخش، واقعی! آج صبح ہی مجھے واردار ایوانو دنا بتا رہی تھی کہ ہاری فوج کیسے کیسے کارنامے سرانجام دے رہی ہے! اس کی نیک نامی میں اضافہ ہو رہا ہے۔ ہر ہے عام لوگ، وہ حتیٰ طور پر باغی ہو رہے ہیں اور کسی کی بات نہیں سن رہے۔ میری اپنی خادمہ مجھ سے گستاخی سے پیش آنے لگی ہے۔ اگر حالات اسی طرح رہے، پھر وہ دن دور نہیں جب وہ ہر رات عام شروع کر دیں گے۔ اب تو گلی کو چوں میں چلنا پھرنا بھی محفوظ نہیں رہا۔ لیکن بدترین بات یہ ہے کہ فرانسیسی کوئی دن یہاں پہنچ چاہتے ہیں۔ چنانچہ ہم یہاں کس چیز کا انتظار کر رہے ہیں؟ mon کزن، میں تم سے صرف ایک چیز کی التجا کر رہی ہوں،“ پرنس نے کہا۔ ”مجھے پیئرز برگ پہنچانے کا انتظام کرو۔ میں خواہ کسی ہی کیوں نہ ہوں، مجھے بونا پارٹ کی حکومت کے زیر سایہ زندگی گزارنا منظور نہیں۔“

”ارے چھوڑیں، ma cousine، آپ کو اس قسم کی معلومات کہاں سے مل جاتی ہیں؟ اس کے برعکس۔“

”میں تمہارے نیولین کے سامنے گردن خم نہیں کروں گی! دوسرے چاہیں تو بے شک کرتے پھریں لیکن... اگر تم میرا یہ کام نہیں کرو گے۔“

• میرے اسوں راد بھائی

• میری چھوٹی راد، فرانسیسی میں، اگر مرد سے بات کی جائے تو mon استعمال ہوگا لیکن عورت کے لیے ma۔ اور اسی طرح Cousin

ذکر ہے اور Cousine مؤنث۔

”دکروں گا، ضرور کروں گا۔ میں ابھی حکم دیے دیتا ہوں۔“

صریح پریس کو یہ پریشانی ہو رہی تھی کہ کوئی نہیں جس پر وہ اپنا غصہ جھڑکے۔ وہ منہ ان منہ میں کچھ بڑبڑائی اور کرسی کے بالکل کنارے پر بیٹھ گئی۔

”لیکن آپ کو کسی نے غلط اطلاع دی ہے،“ میئر نے کہا۔ ”شہر میں بالکل امن و سکون ہے اور خطرے کی ہلکی سی ملامت بھی نہیں۔ میں ابھی ابھی یہ پڑھ رہا تھا۔۔۔“ اس نے اسے خبرناے دکھائے۔ ”کاؤنٹ رستوپ جن لکھتا ہے کہ فرانسیسی شہر میں داخل نہیں ہو سکیں گے اور اگر وہ داخل ہو گئے تو بے شک اس کی گردن مار دی جائے۔“

”اف تمہارا یہ کاؤنٹ!“ پریس نے کیسہ پرور سلجھ میں بات کرتے ہوئے کہا۔ ”وہ منافق ہے، لہذا ہے، اور اس نے خود لوگوں کو اکسایا ہے کہ وہ فساد برپا کریں۔ کیا اس نے اپنے ان احمقانہ خبرناموں میں یہ نہیں لکھا کہ وہ جس شخص کو، خواہ وہ کوئی بھی ہو، چاہیں، سر کے بالوں سے پکڑیں اور تھیلے ہوئے حوالات پہنچادیں؟ (کیا اتنا نہ بات ہے!) جو شخص یہ کام کرے گا، وہ کہتا ہے، عزت و احترام اور شان و شوکت سے سر لراز ہوگا! اب تم خود کچھ لو کہ اس قسم کی ترغیبات نے ہمیں کہاں پہنچا دیا ہے۔ داردار ایوانہ دنانے مجھے بتایا ہے کہ وہ ہجوم کے ہاتھوں ہلاک ہونے سے ہاں بال بنگی کیونکہ اس کے منہ سے فرانسیسی کے چند الفاظ نکل گئے تھے۔“

”خیر، پھر بھی۔ آپ ہر بات دل کو لگاتی ہیں۔۔۔“ میئر نے پریس کی بازی کے لیے پتے پھیلاتے ہوئے کہا۔

اگرچہ اس بازی میں صحیح پتے نکل آئے لیکن میئر فوج میں شامل نہ ہوا۔ وہ سنسان شہر میں مقیم رہا۔ شہر پر گھبراہٹ، بے یقینی اور دہشت کی فضا چھائی ہوئی تھی اور وہ کسی سہیب شے کے وقوع پذیر ہونے کا منتظر تھا۔ اگلے روز شام کے قریب پریس روانہ ہو گئی اور میئر کا سٹیوارڈ اسے اطلاع دینے آیا کہ رجنٹ کے لیے ہتھیار اور دوسرا ساز و سامان خریدنے کے لیے جو رقم درکار ہے، وہ ایک آدھ جاگیر بیچے بغیر حاصل کرنا ناممکن ہے۔ سٹیوارڈ کی یہ عادت بن گئی تھی کہ وہ موقع بے موقع میئر کو یہ جتنا تاثر تھا کہ رجنٹ کو سلخ کرنے، اور اس کے لیے ساز و سامان فراہم کرنے اور اس قسم کے جو دیگر من موچی منصوبے اس کے ذہن میں آتے رہتے ہیں، وہ ایک روز اس کی بربادی کا موجب بنیں گے۔ میئر نے اس کی بات سنی اور وہ بڑی مشکل سے اپنی مسکراہٹ پر قابو پاسکا۔

”اچھا پھر بچ دو،“ اس نے کہا۔ ”اب کیا ہو سکتا ہے۔ میں اپنے قوس سے نہیں پھر سکتا۔“

صورت حال جتنی زیادہ خراب ہوتی، خاص طور پر اس کے اپنے معاملات کی، میئر کو اتنی ہی زیادہ خوشی محسوس ہوتی، اور اتنا ہی زیادہ اس پر یہ واضح ہو جاتا کہ جس آفت کا اسے انتظار تھا، اس کی کٹری آہٹنی ہے۔ جن لوگوں کو وہ جانتا تھا، ان میں سے اب شاید ہی کوئی شہر میں باقی رہ گیا ہوگا۔ جوں جی چکی تھی، پریس مارا جا چکی تھی۔ اس کے قریبی دوستوں میں صرف رستوف ابھی تک وہیں قیام پذیر تھے، لیکن وہ انھیں ملنے نہیں جاتا تھا۔ اپنا دھیان بٹانے کے لیے میئر اس روز درنت ساود گاؤں چلا گیا۔ وہ اس عظیم غبارے کو، جو دشمن کو تباہ

کرنے کے لیے لے جی تیسرے رہا تھا، دیکھنا چاہتا تھا۔ آزمائشی غبرو لگے دوڑ چھوڑا جاتا تھا۔ غبار، ابھی تیار نہیں ہوا تھا لیکن جیڑ کو معلوم تھا کہ اسے زار کی خواہش پر تیسرے کیا جا رہا ہے۔
زار نے گاؤنٹ رستوب چن کو دکھایا تھا۔

جونی نے جی کی تیاری کس ہو جائے، اس کے چمکڑے کے لیے قابل اعتماد اور سمجھدار شخص کا عندیہ اکٹھا کر لیا اور کوئزڈ کو اطلاع دینے کے لیے ایجنسی روانہ کر دیا۔ اسے میں اس سلسلے میں مطلع کر چکا ہوں۔
ہاں، اتنی مہربانی کرو اور لے جی کو اچھی طرح سمجھا دو کہ اس نے اوہیں بار اپنا غبارہ کہاں اتارنا ہے۔ اس ضمن میں اسے پوری احتیاط برتنا ہوگی مباد اس سے کوئی غلطی سرزد ہو جائے اور وہ دشمن کے ہاتھ چڑھ جائے۔ یہ بہت ضروری ہے کہ وہ اپنی نقل و حرکت کا اندازہ صحیف کی نقل و حرکت کے ساتھ مربوط کرے۔

ورنٹ سا دوسرے واپسی پر جب ویز اپنی گاڑی میں یلوٹایا سکوار میں سے گزر رہا تھا، اسے بہت بڑا ہجوم، جو لائبرے ٹیس میں اکٹھا ہو چکا تھا، نظر آیا۔ وہ رک گیا اور اپنی درویشی سے باہر نکل آیا۔ ایک فرانسیسی خاندان، جس پر جاسوسی کا الزام لگایا گیا تھا، کوڑے کھا رہا تھا۔ کوڑوں کی سزا ابھی ختم ہوئی تھی اور جلا داس بیچ سے، جس پر بیٹھا کر کوڑے لگائے جاتے تھے، ایک عظیم شخص کو کھول رہا تھا۔ اس کی موٹھیں سرخ، جراثیم خلی اور لانی، اور کوٹ سبز تھا۔ وہ اس طرح آہ دہکا کر رہا تھا کہ اس کی حالت دیکھ کر نرس آتا تھا۔ ایک اور ہجوم قریب کھڑا تھا۔ وہ ذبلا پتلا اور زرد رنگ کا شخص تھا۔ چہروں سے اندازہ ہوتا تھا کہ دونوں فرانسیسی ہیں۔ جیڑ کا چہرہ بھی اتنا ہی پتلا ہو گیا جتنا کہ وہ بے پتے شخص کا تھا۔ وہ کہنیاں چلانا ہجوم میں آگے بڑھنے لگا۔

”یہ کیا ہے؟ یہ کون ہیں؟ انھوں نے کیا کیا ہے؟“ وہ بار بار پوچھ رہا تھا۔

لیکن ہجوم۔ کلرکوں، دستکاروں، دکانداروں، کسانوں اور غورقوں، جو پھلوں اور اور کوٹوں میں ملیں تھے۔ کے سامنے جو کچھ ہو رہا تھا، وہ اسے اتنے استہاک سے دیکھنے میں مصروف تھے کہ کسی نے اس کی بات کا جواب نہ دیا۔ عظیم شخص آدمی ناک بھوں چڑھاتا اور کندھے اچکا تا اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ یہ ظاہر کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ وہ مصیبت اور تکلیف میں صبر و تحمل سے کام لینا جانتا ہے۔ وہ ادھر ادھر دیکھے بغیر اپنا کوٹ پہنے لگا پھر وہ اچانک رونے لگا۔ وہ اس پر شرمندہ ضرور تھا لیکن وہ رد ایسے رہا تھا جیسے کوئی تو منہ بالغ شخص رد سکتا ہے۔ ہجوم میں شامل لوگ اونچے سروں پر باتیں کرنے لگے۔ بیڑ کو یوں محسوس ہو جیسے وہ اس طرح رحم و ہمدردی کے جذبات کا گلہ گھونٹ دینا چاہتے ہوں۔

”وہ کسی پرنس کا خاندان ہے۔۔۔“

”یہ، موسیو، روسی پٹنی فرانسیسیوں کے لیے قدرے ترش ہے۔۔۔ رات کھٹے ہو جاتے ہیں!“ ایک کلرک

نے جس کے چہرے پر جھریاں ہی جھریاں تھیں اور جو بیئر کے قریب کھڑا تھا، فرانسیسی کو روکتے ہوئے دیکھ کر کہا۔
کلرک نے تیزی سے، دھڑا دھڑکاہٹ گھمائی۔ بظاہر اسے توقع تھی کہ اس کے مذاق کو پسند کیا جائے گا۔ بعض
لوگ ہنس پڑے لیکن اکثر منہ بنائے جلاوکی، جو دوسرے آدمی کا لباس اتار رہا تھا، طرف دیکھتے رہے۔

بیئر کا دل بھرا آیا اور اس کا گلا بندھنے لگا۔ اس کا ماتھا شکن آلود ہو گیا۔ جب وہ واپس اپنی درویشی کی طرف
جا رہا تھا اور وہاں پہنچنے کے بعد اس میں میٹھ رہا تھا، وہ منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑاتا جا رہا تھا۔ گاڑی چلتی رہی اور اس
کا بدن کپکپاتا رہا۔ متحدہ مرتبہ وہ اتنی اونچی آواز سے چلایا کہ کوچوان کو مڑ کر پوچھنا پڑا کہ وہ کہاں جانا چاہتا ہے۔
”کہاں جا رہے ہو؟“ بیئر نے، جب کوچوان لمبی نکاسٹریٹ کی طرف مڑا، چلا کر پوچھا۔
”آپ کے حکم کے مطابق گورنر جنرل کے ہاں؟“ کوچوان نے جواب دیا۔

”حق! گدھا!“ بیئر نے کوچوان کو ڈانٹ پلاتے ہوئے (ویسے وہ یہ حرکت کم ہی کیا کرتا تھا) یا آواز بلند
کہا۔ ”میں نے کہا تھا، گھر۔“ کوڑھ مغز، ذرا تیز چلا۔ ”پھر وہ آپ سے آپ سے زیر لب کہنے لگا: ”مجھے آج ہی یہاں
سے نکل جانا چاہیے۔“

اس جگہ کو، جہاں لوگوں کو سزائیں دی جا رہی تھیں، ان فرانسیسیوں کو، جنہیں سزائیں دی گئی تھیں، اور اس
جہوم کو، جو وہاں کٹھا ہو گیا تھا، دیکھ کر بیئر نے پختہ تہیہ کر لیا تھا کہ وہ ماسکو میں ہرگز مزید قیام نہیں کر سکا، بلکہ اسے
اکی روز رزائنہ ہو جانا اور جا کر فوج میں شامل ہو جانا چاہیے۔ وہ، اپنے ان خیالوں میں، تھاکھویا ہوا تھا کہ اسے غصوں
ہوا کہ وہ (اپنی منزل مقصود کے بارے میں) کوچوان کو بتا چکا تھا اور اگر اس نے نہیں بتایا تھا پھر اسے خود معلوم ہو
جانا چاہیے تھا۔

گھر پہنچ کر بیئر نے اپنے ہیڈ کوچوان سے ستافوج۔ یہ شخص سب کچھ جانتا تھا، ہر کام کر سکتا تھا اور ماسکو کا
بچہ بچا اس سے واقف تھا۔ کو بتایا کہ وہ فوج میں شامل ہونے کے لیے اسی روز موڈریک رزائنہ ہو جائے گا، چنانچہ
اس کے سواری کے گھوڑے آگے بھیج دیے جائیں۔ یہ سارے انتظامات ایک دن میں مکمل نہیں کیے جاسکتے تھے،
چنانچہ ستافوج کی درخواست پر اس نے، اپنی روانگی ایک دن کے لیے ملتوی کر دی تاکہ وہ گھوڑے، جو راستے
میں تبدیل کرنا چاہتے، پیشگی بھیجے جاسکیں۔

خراب موسم کے بعد چوبیس تاریخ کو مطلع صاف ہو گیا اور ڈنر کے بعد بیئر ماسکو سے رزائنہ ہو گیا۔ پر خوش کو
”گادوں میں، جہاں وہ رات کو گھوڑے تبدیل کرنے کے لیے رک گیا تھا، اسے معلوم ہوا کہ اس شام زبردست
مسرکہ پھا ہوا تھا۔ (یہ شیواروینو کی لڑائی تھی)۔ اسے معلوم ہوا کہ فزنگ اتنی دھواں دار تھی کہ پر خوش کو دو میں دھرتی
کا پھل لگی تھی۔ لیکن جیت کس کی ہوئی، اس کے متعلق کوئی اسے کچھ نہ بتا سکا۔ اگلی صبح طلوع آفتاب کے سے بیئر
موڈریک کے قریب پہنچ گیا۔

موڈریک میں کوئی مکان ایسا نہیں تھا جس میں فوجی مقیم نہ ہوں۔ ہوٹل میں بیئر کی ملاقات اپنے ساتھیوں اور

کو چوان سے ہوئی۔ وہاں بھی کوئی کمر خالی نہیں تھا۔ ہوٹل بھی فوجیوں سے کھنچا کھنچ بھرا ہوا تھا۔

قصبے اور اس کے مضافات میں یا تو فوجی ستیم تھے یا دھرا دھرا رواں دواں تھے۔ جدھر نگاہ جاتی تھی قازق، پیراہ اور گھڑ سوار فوجی، چھکڑے، توپ گاڑیاں اور گولے بارود کے ریڈے نظر آ رہے تھے۔ ویزر جتنا تیز چل سکتا تھا، آگے ہی آگے چلا گیا۔ وہ ماسکو سے جتن زیادہ دور ہوتا جا رہا تھا اور فوجیوں کے اس سمندر کے جتنا زیادہ درمیان میں گھستا جا رہا تھا، اتنی ہی زیادہ اس کی تشویش بڑھتی جا رہی تھی اور وہ اتنا ہی زیادہ ایک نئے اور خوشگوار جذبے سے، جس کا ازیں پیشتر اسے کبھی تجربہ نہیں ہوا تھا، مغلوب ہوتا جا رہا تھا۔ یہ جذبہ اس جذبے سے، جو اسے زار کی آمد کے موقع پر سلا بودا محل میں محسوس ہوا تھا، ملتا جلتا تھا۔ اس کے دل میں یہ سوچ آ رہی تھی کہ کچھ کرنے اور قربانی دینے کی اشد ضرورت ہے۔ اب وہ اس خوش کن یقین سے آگاہ تھا کہ وہ ہر چیز، سہولیات، دولت، بلکہ زندگی بذات خود بھی۔ جو انسانی مسرت کی تشکیل کرتی ہے، لایعنی ہے، اور انسان اسے بڑی خوشی سے ٹھکرا سکتا ہے، خاص طور پر جب وہ ان خطوط پر سوچتا ہو کہ، کن خطوط پر، ویزر اس بارے میں کچھ کہنے سے قاصر تھا اور اس نے یہ متعین کرنے کی کوئی کوشش نہ کی کہ اسے کس شخص یا کس چیز کی خاطر ہر چیز قربان کر دینے میں یہ بالکل مسرت محسوس ہو رہی ہے۔ قربانی کس کے لیے تھی، اس سے اسے کوئی سروکار نہیں تھا، یہ فی نفسہ قربانی تھی جو اسے یہ نیا اور پرست جذبہ فراہم کر رہی تھی۔

19

شیواردینو مورچے کی لڑائی چوبیس اگست کو لڑی گئی، پچیس کو زبقتین میں سے کسی نے بھی ایک گولی تک نہ چلائی اور پچیس کو بارودینو کا معرکہ برپا ہوا۔⁴⁹
⁵⁰

شیواردینو اور بارودینو کی لڑائیاں کیسے لڑی گئیں، کیوں لڑی گئیں، ان کے لڑنے کے لیے فریق مخالف کو کیوں لٹکارا گیا اور مخالف فریق نے لڑائی کی دعوت کیوں قبول کی؟ بارودینو کی لڑائی کا مقصد کیا تھا؟ اس میں نہ روسیوں کے لیے اور نہ فرانسیسیوں کے لیے مطلق کوئی معافی تھی جہاں تک روسیوں کا تعلق ہے، اس کا فوری نتیجہ یہ برآمد ہوا اور برآمد بھی لازماً ہی ہونا تھا کہ ہمیں ماسکو کی تباہی کے قریب تر پہنچا دیا گیا (اور یہ وہ چیز تھی جس سے ہم دنیا کی کسی بھی دوسری شے کے مقابلے میں زیادہ خائف تھے)۔ اور جہاں تک فرانسیسیوں کا تعلق ہے، ان کی ساری فوج تباہی کے قریب تر پہنچ گئی (اور وہ بھی دنیا کی کسی بھی دیگر شے کے مقابلے میں اس سے زیادہ خائف تھے)۔ انجام بالکل واضح نظر آ رہا تھا، پھر بھی نیوین نے لڑائی کا طبل بجا دیا اور کوتوزوف نے اس کا جواب دینے کی ہائی بھری۔

اگر فوجی کمانڈروں نے عقل سے کام لیا ہوگا تو معلوم یہی ہوگا کہ نیوین پر یہ بات بالکل واضح ہو گئی ہوگی کہ تیرہ سو میل پیش قدمی کرنے اور ایک ایسی لڑائی کی، جس میں اس کی ایک چوتھائی فوج کے ہاک ہونے کا

داخل تھا، دعوت دینے کے بعد وہ یقینی شکست کی طرف بڑھ رہا ہے۔ اور کو تو زوف پر بھی یہ بات بالکل اسی طرح واضح ہو گئی ہوگی کہ لڑائی کی دعوت قبول کرنے اور اپنی چوتھائی فوج کی جانیں خطرے میں ڈالنے کے بعد اسے یقینی طور پر اسکو سے ہاتھ دھونا پڑیں گے۔ حسابی طور پر بات کو تو زوف کے لیے بالکل اسی طرح واضح ہوگی جس طرح مجھ پر یہ بات واضح ہے کہ ڈرافٹ کی بازی میں، اگر میرا ایک مہرہ بھی کم پڑ جائے اور میں اپنے ایک ایک ہرے کی قربانی دے کر دشمن کا ایک ایک مہرہ ہتھیاتا رہوں، نتیجہ لازماً میری شکست کی صورت میں برآمد ہوگا۔ چنانچہ مجھے اپنے مہرے کی قربانی پر دشمن کا مہرہ ہتھیانے سے گریز کرنا چاہیے۔ جب میرے حریف کے پاس سولہ مہرے ہوں اور میرے پاس چودہ، تو میں اس کی نسبت صرف 8/1 کمزور ہوں لیکن اگر میں تیرہ مہرے کنوادیوں، پھر وہ مجھ سے ٹین گنا مضبوط ہو جائے گا۔

بارودینو کی لڑائی تک ہماری اور فرانسیسی افواج کے مابین تقریباً پانچ اور چھ کا توازن تھا لیکن اس لڑائی کے بعد یہ توازن یک اور دو کا ہو گیا۔ دوسرے الفاظ میں لڑائی سے پہلے ان کے ایک لاکھ بیس ہزار فوجیوں کے مقابلے میں ہماری فوج ایک لاکھ تھی۔ لیکن لڑائی کے بعد ان کے ایک لاکھ کے مقابلے میں ہمارے پاس پچاس ہزار رہ گئے۔ پھر بھی زیرک اور تجربے کا کو تو زوف نے لڑائی کی دعوت قبول کر لی جب کہ نیولین نے جسے عسکری نابغہ کہا جاتا ہے، لڑائی کی دعوت دے دی، یوں اس نے اپنی چوتھائی فوج کنوادی اور اپنا محاذ پہلے سے کہیں زیادہ بڑے علاقے پر پھیلا دیا۔ اگرچہ ہمیں یہ بتایا جاتا ہے کہ اسے توقع تھی کہ اس کے، سکو پر قبضہ کرنے کے بعد جنگ ختم ہو جائے گی، تو ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ شواہد کافی حد تک اس کے برعکس تھے۔ نیولین کے مورخین خود ہمیں بتاتے ہیں کہ وہ سولٹسک کے آگے رک جانا چاہتا تھا، محاذ کی وسعت پذیری میں جو خطرات پنہاں تھے، وہ ان سے بخوبی آگاہ تھا اور وہ جانتا تھا کہ ماسکو پر قبضہ ہو جانے کے بعد جنگ ختم نہیں ہوگی کیونکہ اس نے سولٹسک میں دیکھ لیا تھا کہ روسی شہر کی حالت میں اس کے لیے چھوڑے جا رہے ہیں اور اس نے مذاکرات کا ڈول ڈالنے کے لیے جو متعدد اطلاعات کیے تھے، ان میں سے اسے ایک کا بھی جواب نہیں ملا تھا۔

بارودینو کے مقام پر لڑائی کی دعوت دے کر اور اسے قبول کر کے نیولین اور کو تو زوف نے غیر منطقی اور اپنے ارادوں کے برعکس طرز عمل اختیار کیا۔ بعد میں مورخین نے کمانڈروں کی پیش بندی اور مقربیت کے ایسے ایسے ثبوت، جنہیں نہایت عیاری اور پرکاری سے گھڑا گیا تھا تا کہ وہ ان حقائق پر، جو پہلے ہی پایہ تکمیل کو پہنچ چکے تھے، منطبق ہو سکیں، الزام کر دیے، جبکہ حقیقت یہ ہے کہ تاریخ نے عالمی واقعات کو ظہور میں لانے کے لیے جن لوگوں کو اپنے آئینہ کار کے طور پر (بے شک یہ لوگ غیر ارادی طور پر آلہ کار بنے) استعمال کیا، ان میں یہ جرنیل سب سے زیادہ سبب خیر تھے اور ان کا طرز عمل سب سے زیادہ غلامانہ اور حلقہ بگوشانہ تھا۔

محققین نے ہمارے لیے ایک نظموں کی جو مثالیں چھوڑی ہیں، ان میں کہانی کی ساری دلچسپی ہیرو کے کردار کو متنی ہے اور ہم آج تک اپنے اذہان کو اس تصور کے عادی بنانے میں ناکام رہے ہیں کہ ہمارے عہد کے

لیے اس قسم کی تاریخ بے معنی ہے۔

جہاں تک دوسرے سوال کا تعلق ہے کہ بارودینو اور اس سے قبل شیواروینو کی لڑائی کیوں لڑی گئی تو اس کے بارے میں بالکل قطعی اور جانی پہچانی لیکن کا ملا غلط وضاحت موجود ہے۔ کبھی مورخین اس معاملے کو یوں پیش کرتے ہیں:

روسی فوج نے (وہ کہتے ہیں) سمولنسک سے پسپائی اختیار کرنے کے بعد عمومی لڑائی بننے کے لیے ایسا مقام، جو ان کے لیے انتہائی سازگار ہوتا، منتخب کرنے کی کوشش کی اور انھیں یہ میدان بارودینو میں ملا۔

روسیوں نے (وہ کہتے ہیں) سمولنسک سے ماسکو جانے والی شاہراہ کے بائیں جانب اور اس کے تقریباً زاویہ قائمہ پر بارودینو سے پونے گاڑی تک اس میدان میں اونچی زمین پر پیشگی مضبوط سورجے تعمیر کر لیے۔

دشمن کی نقل و حرکت کا مشاہدہ کرنے کے لیے (وہ کہتے ہیں) اس میدان کے سامنے شیواروینو کے سورجے کے اوپر مضبوط بیرونی چوکی تعمیر کی گئی۔ چوبیس تاریخ کو (ہمیں بتایا جاتا ہے) پولین نے اس بیرونی چوکی پر قبضہ کر لیا اور چھبیس تاریخ کو اس نے تمام روسی فوج پر، جو بارودینو کے میدان میں اپنی پوزیشنیں سنبھال چکی تھی، بلند ہول دیا۔

مورخین یہی کہتے ہیں اور جیسا کہ ہر وہ شخص، جو حقائق کی چھان بچک کرنے کی تکلیف گوارا کرتا ہے، سمجھ سکتا ہے، یہ سب کچھ بالکل غلط ہے۔

روسیوں نے انتہائی سازگار میدان تلاش کرنے کی جستجو نہیں کی تھی۔ اس کے برعکس سمولنسک سے پسپائی کے دوران میں ان کا گزرتا تھا، ایسے مقامات سے، جو بارودینو سے کہیں بہتر تھے، ہوا تھا۔ وہ ان میں سے کسی مقام پر بھی نہ ٹھہرے کیونکہ کو تو زوف کسی ایسے مقام پر، جو اس کا اپنا منتخب کردہ نہیں تھا، قابض نہیں ہونا چاہتا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ لڑائی کے عمومی مطالبے نے ابھی اتنی شدت اختیار نہیں کی تھی، میلورادو وچ ابھی تک اپنی مدد کے ساتھ نہیں پہنچا تھا اور ان کے علاوہ متعدد دیگر اسباب بھی کارفرما تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ جس سڑک کے ساتھ ساتھ روسی فوج پہنچا ہو رہی تھی، اس پر بے شمار مقامات تھے جو سورجوں کی تعمیر کے لیے انتہائی سوزوں تھے اور بارودینو کا وہ مقام، جہاں معرکہ ہوا، سورجوں کی تعمیر کے لیے انتہائی سوزوں تو کیا ہوتا، وسیع دھڑیل روسی مملکت کے کسی بھی دوسرے مقام سے، جسے آپ نقشے پر بالکل بچھوڑیں لگا کر منتخب کر سکتے ہیں، کسی صورت بہتر نہیں تھا۔

روسیوں نے نہ صرف جنرل سڑک کے بائیں طرف اور اس کے زاویہ قائمہ پر بارودینو کے میدان (یعنی وہ مقام جہاں لڑائی لڑی گئی) میں نہ صرف مضبوط سورجے تعمیر کرنے سے گریز کیا بلکہ 25 اگست 1812 تک انھوں نے یہ کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ یہاں لڑائی لڑے جانے کا کوئی امکان ہے۔ اس کا اظہار ایک تو اس حقیقت سے ہوتا ہے کہ 25 اگست سے قبل وہاں سورجوں کی تعمیر نہیں ہوئی تھی اور جن کی بچھیں اور چھبیس اگست کو تعمیر شروع ہوئی تھی، وہ بھی پانچویں تک مکمل نہ پہنچ سکے۔ دوسری بات شیواروینو کے سورجے کا مقام ہے۔ چونکہ یہ اس میدان کے، جہاں لڑائی

ڑنے کی ہامی بھری گئی، عین سامنے واقع تھا، اس کے کوئی معافی نہیں تھی۔ کسی دوسری چوکی کی نسبت اس مورچے کو کیوں اتنا زیادہ مضبوط بنایا گیا؟ چونکہ تاریخ کی شام تک اسے بچانے کے لیے تمام ممکن کوششیں کیوں بروئے کار لائی گئیں اور چھ ہزار افراد کی قربانی کیوں دی گئی؟ دشمن کی نقل و حرکت کا مشہدہ کرنے کے لیے قاذوؤں کی صرف ایک گشتی پارٹی کافی ہوتی۔ یہ بات کہ جس مقام پر لڑائی لڑی گئی، اس کے متعلق پیشگی سوچ بچار نہیں کیا گیا تھا اور یہ کہ شیوارڈینو کا مورچہ اس مقام کی بیرونی چوکی نہیں تھا، اس کا تیسرا ثبوت ہمارے پاس یہ حقیقت ہے کہ پچیس تاریخ پارکے دتلی اور یاگرتیاں کو بھی یقین تھا کہ شیوارڈینو کا مورچہ میدان کا رزدار کا پایاں پہلو ہے اور خود کو تورون اس رپورٹ میں، جو لڑائی کے فوراً بعد تحریر کی گئی، شیوارڈینو کے مورچے کو پایاں پہلو قرار دیتا ہے۔ یہ تو بہت بعد میں، جب جنگ کے بارے میں تفصیلی رودادیں اطمینان اور فراغت سے تحریر کی گئیں کہ یہ غیر صحیح اور عیب و غریب دعادی گھڑے گئے (ان کا مقصد غالباً کمانڈر انچیف کی فاش غلطیوں کی پردہ پوشی کرنا تھا کیونکہ اسے ایک ایسے شخص کے، جس سے کوئی غلطی سرزد نہیں ہو سکتی، ررپ میں پیش کیا جانا مقصود تھا) کہ شیوارڈینو کا مورچہ بیرونی چوکی تھا (جبکہ درحقیقت یہ بائیں بازو میں محض ایک مضبوط مورچہ تھا) اور یہ کہ بارودینو کی لڑائی اس میدان میں، جسے ہم نے پہلے ہی منتخب کر لیا تھا اور وہاں اپنی پوزیشنیں مستحکم بنائی تھیں، لڑی گئی، حالانکہ جس میدان میں گھمسان کارن پڑا، اس کے متعلق نہ تو پیشگی قطعاً کچھ سوچا گیا اور نہ وہاں کوئی خاص مضبوط مورچہ تعمیر کیے گئے۔

صریحاً معاملہ کچھ اس طرح وقوع پذیر ہوا۔ دریائے کالوچاکے۔ جو جزیرے کے مرکز کو زادیہ قائمہ پر نہیں بلکہ حدہ زاویہ بنا کر قطع کرتا ہے۔ کنارے ایک میدان منتخب کر لیا گیا، چنانچہ پایاں پہلو شیوارڈینو، دایاں نو دایاں گاؤں کے قریب اور قلب بارودینو میں کالوچا اور دائی نادریاؤں کے سنگم پر بنا۔ جو شخص بھی سوچے بغیر کہ لڑائی حقیقتاً کس طرح لڑی گئی تھی، جب بارودینو کے میدان پر نظر دوڑائے گا، اسے یہ مقام، جسے دریائے کالوچا نے محفوظ بنا دیا تھا، ایک ایسی فوج کے لیے، جس کا مقصد اس دشمن کو، جو سولنسک شاہراہ پر باسکو کی طرف پیش قدمی کر رہا تھا، روکنا تھا، واضح انتخاب دکھائی دے گا۔

چونکہ تاریخ کو پوئین گھوڑے پر دایوئے دو گاؤں کی جانب روانہ ہوا۔ تاریخ کی کتابوں کے صلی الرغم اسے یوتسا گاؤں سے بارودینو تک کوئی روسی پوزیشن نظر نہ آئی (اسے کوئی روسی پوزیشن نظر آئی نہیں سکتی تھی کیونکہ اس کا کوئی وجود ہی نہیں تھا) اور نہ اسے روسی فوج کی کوئی بیرونی چوکی دکھائی دی۔ وہ تو محض اس وقت، جب وہ اوک سپاہ کے عقبی دستوں کا تعاقب کر رہا تھا، اچانک روسی پوزیشن کے بائیں پہلو کے۔ شیوارڈینو کا مورچہ۔ قریب آچھنچ اور روسیوں کو یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ وہ اپنی فوجیں دریائے کالوچا کے پار لے گیا ہے۔ روسیوں کے پاس چونکہ تناوٹ نہیں رہ گیا تھا کہ وہ عمومی لڑائی چھیڑ دیتے، انھوں نے اس مقام سے جس پر انھوں نے قبضہ کرنے کا ارادہ کیا تھا، اپنا پایاں بازو پیچھے ہٹا لیا اور ایک ایسی پوزیشن پر جس کا انھوں نے نہ تو پیشگی سوچا تھا اور نہ جس کی توجہ بندی کی تھی، چھپے گئے۔ جب پوئین اپنی سپاہ شاہراہ کی بائیں جانب دریائے کالوچا کے پار لے گیا،

اس نے ہونے والی ساری لڑائی دائیں سے بائیں (روسیوں کی جانب سے) پہنچادی اور اس نے اسے اس میدان میں، جو یوتھ، سیمو نووسک اور بارودینو کے مابین واقع ہے، منتقل کر دیا۔ پوزیشن کے اعتبار سے اس میدان کو روس کے کسی دوسرے مقام پر کوئی فوجیت حاصل نہیں ہے۔ درجہ پچیس اگست کو جو معرکہ بپا ہوا، وہ سارے کا سارا بائیں ہوں جس لڑائی کا ارادہ کیا گیا تھا اور جرمنی الواقع لڑی گئی، اس کا تھینی خاکہ کتاب کے آخر میں شامل کر دیا گیا ہے۔

اگر نیولین چوبیس تاریخ کی شام گھوڑے پر کالو چاند گیا ہوتا، ورنہ اس نے اس وقت شیوار دینو کے مورچے پر فوری حملے کا حکم دیا ہوتا، بلکہ اسے اگلی صبح تک اٹھا دیا ہوتا، تو کسی کو اس بارے میں یہ مطلق شبہ نہ ہوتا کہ یہ مورچہ ہمارا بایاں پہلو تھا اور لڑائی وہیں لڑی جاتی، جہاں ہمیں اس کے لڑے جانے کی توقع تھی۔ اس صورت میں ہم نے شاید شیوار دینو کے مورچے کا دفاع اور بھی زیادہ ڈٹ کر کیا ہوتا، ہم نے نیولین کے قلب یا سینے کو اپنے حملے کی زد میں لے لیا ہوتا اور عام لڑائی پچیس تاریخ کو اس مقام پر، جس کے بارے میں ہم نے پیشگی سوچ لیا تھا اور جس میں ہم نے مددے اور مورچے تعمیر کر لیے تھے، ہوئی ہوتی۔ لیکن ہمارے میسرے پر حملہ ہمارے عقبنی دستوں کی پسپائی یعنی گردنوا گاؤں کی جھڑپ کے فوراً بعد شام کو ہوا اور چونکہ روسی کمانڈروں نے تب یعنی 24 کی شام کو عام لڑائی شروع کرنا نہ چاہی یا وہ کر نہیں سکتے تھے، چنانچہ بارودینو کی لڑائی کا اولین وراہم تریں معرکہ چوبیس کو پہلے ہی ہمارا جاکا تھا اور چوبیس تاریخ کو جو شکست ہوئی، یہ شکست واضح طور پر اس کا پیش خیمہ بنی۔

شیوار دینو کے مورچے کے ہاتھ سے نکل جانے کے بعد ہمیں 25 تاریخ کو معلوم ہوا کہ ہمارے میسرے کے لیے کوئی پوزیشن ہی نہیں رہی۔ چنانچہ ہمیں مجبوراً اپنے میسرے کو واپس بلانا اور اسے بہ غلٹ اس جگہ، جہاں وہ پہنچ سکا، مورچے اور مددے تعمیر کرنے کے لیے کہنا پڑا۔

لیکن روسی فوج کے دفاع کے لیے جو مددے اور مورچے تعمیر کیے گئے، 26 اگست کو وہ نہ صرف ادھورے اور کمزور تھے، بلکہ اس صورت حال میں جو خطرات اور دشواریاں پہاں تھیں، ان کی شدت میں اس حقیقت سے حیرانمانہ ہو گیا کہ روسی جرنیلوں نے، جنہیں پوری طرح اندازہ ہی نہیں ہو پایا تھا کہ آخر ہوا کیا ہے (یعنی بائیں پہلو پر ہماری پوزیشن کا ہاتھ سے نکل جانا اور ہونے والی لڑائی کا میدان دائیں سے بائیں منتقل ہو جانا)، نورایا گاؤں سے یوتھ تک اپنا توسیع شدہ محاذ برقرار رکھا اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انہیں عین لڑائی کے دوران میں اپنی فوجوں کو دائیں سے بائیں جانب منتقل کرنا پڑا اور یوں لڑائی کا پورا عرصہ روسیوں کو ساری فرنیسی فوج کا، جو ہمارے میسرے کے خلاف بھونک دی گئی تھی، سے مٹا کر نا پڑا جبکہ ان کی نفری حریف کی نفری سے آدھی تھی۔ (یوتھ کے سامنے پونہا تو سکی اور دائیں بازو پر یوٹھ کی کارروائیاں اصل لڑائی سے بالکل مختلف چیزیں تھیں۔)

چنانچہ بارودینو کی لڑائی ہرگز اس طور نہیں لڑی گئی جس طرح مورچین نے اسے پیش کیا ہے (مورچین نے جو رویہ اختیار کیا، اس کا مقصد کم ٹھروں کی غلطیوں کی پردہ پوشی کرنا تھا حالانکہ ان کے اس رویے سے اس شہرت اور ناموری میں، جو روسی افواج اور عوام کے حصے میں آنا چاہیے تھی، کئی واقع ہو گئی ہے)۔ بارودینو کی لڑائی، اس میدان

میں، جسے احتیاط سے منتخب کیا گیا تھا اور جس میں مضبوط سورجے بنائے گئے تھے، نہیں لڑی گئی اور اس میں جو سپاہ لڑی، نہ وہ دشمن کے مقابلے میں بس ذرا ہی کمزور تھی۔ بلکہ شیوار دینو مورچے کے ہاتھ سے جاتے رہنے کی وجہ سے روسیوں کو ایک ایسے میدان میں، جو کھڑا تھا اور جس میں سورجے نہ ہونے کے برابر تھے، برسرِ پیکار ہونا پڑا۔ پھر ان کی سپاہ کی تعداد بھی فرانسیسیوں کے مقابلے میں صرف نصف رہ گئی تھی۔ یہ الفاظ دیگر انھیں جن حالات میں لڑنا پڑا، ان میں دس گھنٹے تک لڑتے رہنے اور معائنے کو کسی فیصلہ کن انجام تک پہنچنے سے روکنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا، بلکہ فوج کو تین گھنٹے بھی مکمل تباہی، اور بھگدڑ سے بچائے رکھنے کا تصور محال تھا۔

20

بچیس تاریخ کی صبح میئر سوڈبیک سے روانہ ہوا۔ شہر سے سڑک بل کھاتی کلیسا کے قریب سے گزرتی بہت اونچی عمودی پہاڑی کی ڈھلوان پر پہنچتی تھی۔ یہ کلیسا ڈھلوان کے دائیں جانب پہاڑی کی چوٹی پر واقع تھا۔ اس وقت اس میں عبادت ہو رہی تھی اور گھنٹیاں بجائی جا رہی تھیں۔ میئر کی گاڑی جب ڈھلوان پر پہنچی، وہ نیچے تر آیا اور پیرل چلنے لگا۔ ایک گھڑسوار رجمنٹ، جس کے آگے آگے سردو خوں تھے، پہاڑی سے نیچے اتر رہی تھی۔ چھکڑوں کا ایک قافلہ پہاڑی پر اس کی جانب آرہا تھا۔ ان چھکڑوں میں وہ فوجی، جو گزشتہ روز کی جھڑپ میں زخمی ہو گئے تھے، سوار تھے۔ شور و غل مچاتے اور گھوڑوں کو چابکوں سے پٹختے کسان کو جوان مسلسل سڑک کے کبھی دائیں اور کبھی بائیں کنارے ڈھلکتے رہے۔ چھکڑے، جن میں تین تین چار چار زخمی سپاہی لیٹے یا بیٹھے ہوئے تھے، پتھروں پر، جنھیں عمودی ڈھلوان پر کچھ اس طرح پھینک دیا گیا تھا کہ سڑک نما چیز بن گئی تھی، ہچکولے کھارے تھے۔ مروجین کو، جن کے زخموں پر چھتھروں کی پٹیاں بندھی ہوئی تھیں اور جن کے چہرے مردہ، ہونٹ بیچھے ہوئے اور بھوس سگری ہوئی تھیں، جب دھچکے لگتے، وہ ایک دوسرے سے ٹکرا جاتے اور مضبوطی سے چھکڑوں کے کنارے پکڑ لیتے۔ وہ تقریباً ابھی کے بجلی میئر کے سفید ہیٹ اور سیاہ نیل کوٹ کو معصومانہ اور بھولے بھالے پنجیس سے ٹکاہیں گاڑ کر دیکھتے جا رہے تھے۔

میئر کا کو جوان غصے سے چلا چلا کر چھکڑوں کے ڈرائیوروں سے کہہ رہا تھا کہ وہ سڑک کے ایک طرف رہیں۔ گھڑسوار رجمنٹ نے، جو اپنے سردو خوانوں سمیت پہاڑی سے نیچے اتر رہی تھی، میئر کی گاڑی کو آلیا اور اس کے راستے میں رکاوٹ بن گئی۔ میئر نے دیکھا کہ وہ سڑک کے اس کنارے پر، جو پہاڑی کو کاٹ کر بنایا گیا تھا، بھنس گیا ہے، چنانچہ وہ رکنے پر مجبور ہو گیا۔ سورج کی کرنیں، اس جگہ، جہاں سے سڑک کے لیے پہاڑی کاٹی گئی تھی، پہنچنے سے معذور تھیں۔ چنانچہ یہ سرد اور مرطوب تھی لیکن اوپر، گست کی روشنی دھوپ چمک رہی تھی اور گھنٹیاں نشاط انگیز آوازیں بلند کر رہی تھیں۔ زخموں سے لدا ایک چھکڑا سڑک کے کنارے میئر کے قریب رک گیا اور کو جوان رخت کی چھال کے کمرہ سے جوتے پہنے ہانپتا کا پٹا اپنے چھکڑے کے عقب کی جانب بھاگا، اس نے ایک پیسے کے نیچے پتھر رکھا (ان پیسوں میں مار نہیں تھی) اور بے کوتاہ قامت گھوڑے کے سارے کے لیے درست کرنے لگا۔

ایک معمر زخمی سپاہی نے، جس کا یک ہزدنگے کی پٹی میں لٹک رہا تھا اور جو چھکڑے کے پیچھے پیچھے پیدل آ رہا تھا، تندرست ہاتھ سے زخمی ہاتھ پکڑا اور مڑ کر پیتر کی جانب دیکھنے لگا۔

”بھائی جاں، ہمیں یہیں اتار دیا جائے گا یا ماسکو پہنچا جائے گا؟“ اس نے پوچھا۔

پیتر اپنے خیالات میں اس قدر مستغرق تھا کہ اسے سوال سنائی نہ دیا۔ کبھی وہ اس گھڑسوار رجمنٹ کی طرف، جو سڑک پر زخمیوں کے قافلے کی سمت تدم ہڑھائے آرہی تھی اور کبھی اس چھکڑے کی طرف، جس کے قریب وہ کھڑا تھا اور جس میں دو اشخاص بیٹھے اور ایک لیٹا ہوا تھا، دیکھنے لگتا۔ اسے یوں لگا جیسے اس سوال کا حل، جس میں وہ مستغرق تھا، اسی میں موجود ہے۔ چھکڑے میں جو دو اشخاص بیٹھے تھے، معصوم ہوتا تھا کہ ان میں سے ایک کے گال پر زخم آیا ہے۔ اس کا سارا سر بیٹوں میں مستور تھا اور اس کا ایک رخسار پھول کر شیرخوار بچے کے سر جتنا ہو گیا تھا۔ اس کی ناک اور منہ مڑ کر لیٹھے ہو گئے تھے۔ یہی فوجی جوان کلیسا پر لگا ہیں بجائے اپنے سینے پر صیب کا نشان بنا رہا تھا۔ دوسرا مگر دٹ نو خیز لڑکا تھا۔ اس کے ہال سرخ تھے اور اس کا رنگ اتنا سفید تھا جیسے اس کے مہین چہرے پر خون کی رمتی تک نہ ہو۔ وہ پیتر پر نظریں گاڑے نیک دلی سے مسکرا رہا تھا۔ تیسرا اوندھے منہ پڑا تھا، اس کا چہرہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ اب گھڑسوار رجمنٹ کے سرورڈ خزان چھکڑے کے برابر پہنچ چکے تھے۔

ف، علاقہ غیر میں رہتے رہتے

میں کور کھدھندے میں پھنس گیا ہوں۔۔۔

وہ عسکری رقص کی دھن میں الاپ رہے تھے۔

گویا کہ ان کے جواب میں لیکن مختلف قسم کی شگفتہ مزاجی کے لحن میں گھٹیوں کی فلزاتی دھنوں کی صدائے بارگشت اوپر بند یوں پر سنائی دے رہی تھی۔ سورج کی گرم کرنوں نے سامنے کی ڈھلوان کو ایک اور طرح کی شگفتگی میں نہا دیا تھا، لیکن پہاڑی کے نیچے جہاں پیتر چھکڑے، جس میں زخمی جوان تھے، اور ہانپتے کاپتے کوتاہ قامت گھوڑے کے قریب کھڑا تھا، سہیل، تارکی اور افسردگی کا راج تھا۔

پھولے گال والے فوجی جوان نے غصیلی نگاہوں سے گھڑسواروں سرورڈ خزانوں کی طرف دیکھا۔

”آہ، یہ بات کئے!“ اس نے عقارت سے کہا۔

”میں نے آج پچھلے فوجی ہی نہیں، کساں بھی دیکھے ہیں! کسان۔۔۔ جی ہاں، انھیں بھی جانا پڑ رہا ہے،“ فوجی جوان نے، جو چھکڑے کے پیچھے کھڑا تھا، پیتر سے ادا اس مسکراہٹ سے کہا۔ ”آج کل وہ مختلف لوگوں کے مابین تمیز نہیں کر رہے، ان کا ارادہ ساری قوم کو ان کے خلاف لاکھڑے کرنے کا ہے۔ ایک لفظ میں اس کا نام ماسکو ہے!۔۔۔ وہ اسے ختم کر دینا چاہتے ہیں۔“

اگرچہ فوجی سپاہی کی گفتگو سب سے زیادہ تھی لیکن پیئر سمجھ گیا کہ وہ کہنا کیا چاہتا ہے اور اس سے اتفاق کا اظہار کرنے کے لیے اس نے پتہ سر ہلا دیا۔

سڑک دوبارہ صاف ہو گئی۔ پیئر پہاڑی سے نیچے اتر آیا اور اپنی گاڑی میں بیٹھ گیا۔ گاڑی چل پڑی اور وہ سڑک کے دونوں اطراف دیکھتا رہا کہ شاید کوئی جان پہچان کا آدمی مل جائے لیکن اسے صرف عسکریوں کے غیر شناسا چہرے نظر آ رہے تھے۔ ان عسکریوں کا تعلق فوج کے مختلف شعبوں سے تھا اور وہ سب کے سب حیرت اور اچنبھے سے اس کے سفید ہیٹ اور ٹیل کوٹ کو گھور گھور کر دیکھ رہے تھے۔

اڑھائی تین میل طے کرنے کے بعد بالآخر اسے ایک واقف کار مل ہی گیا۔ اس نے بڑے تپاک سے اس سے ملک سلیک کی۔ یہ شخص ڈاکٹر تھا اور فوج کے ایک طبی یونٹ کا سربراہ۔ وہ بند گھسی میں دھڑکیاں دے رہا تھا۔ گاڑی میں اس کے ساتھ ایک نوجوان ڈاکٹر بیٹھا تھا۔ اس نے پیئر کو پہچان لیا اور اپنے قازق کوچران کو گاڑی روکنے کا حکم دیا۔

”کاونٹ، یوز ایکسی لینسی۔ آپ یہاں کیسے آ گئے؟“ ڈاکٹر نے دریافت کیا۔

”میں ڈرا دیکھنا چاہتا تھا۔“

”جی ہاں، دیکھنے کے لیے تو بہت کچھ ہو گا۔“

پیئر نیچے اتر آیا اور ڈاکٹر سے باتیں کرنے لگا۔ اس نے بتایا کہ اس کا ارادہ جنگ میں شریک ہونے کا ہے۔ ڈاکٹر نے بڑے خوف کو مشورہ دیا کہ وہ کوتاہی سے براہ راست بات کرے۔

’خدا معلوم آپ جنگ کے دوران میں کس کس غیر معروف جگہ پھرتے رہیں، پر ایسا کیوں ہوا؟‘ اس نے اپنے نوجوان ساتھی کے ساتھ نگاہوں کا تبادلہ کرتے ہوئے کہا۔ ”ہر سیرین ہائی ٹس آپ کو جانتے ہیں اور انھیں آپ کا غیر مقدم کر کے خوشی ہوگی۔ میرے دوست، آپ کو بس یہی کرنا چاہیے۔“

معلوم ہوتا تھا کہ ڈاکٹر تھکاوٹ سے غرہ حال ہو رہا ہے اور جلدی میں ہے۔

”تو آپ کا یہ خیال ہے۔۔۔ لیکن میں آپ سے ایک مزید بات پوچھنا چاہتا ہوں۔ ہماری پوزیشن صحیح طور پر کہاں ہے؟“ پیئر نے کہا۔

”ہماری پوزیشن، ڈاکٹر نے کہا۔ ”یہ میرے دائرہ کار میں نہیں ہے۔ آپ براستہ تاریخ نوادے چلے جائیں۔ وہاں خوب کھدائی ہو رہی ہے۔ ٹیلے پر چڑھ جائیں، وہاں سے آپ کو سب کچھ نظر آ جائے گا۔“

”وہاں سے سب کچھ نظر آ سکتا ہے؟۔۔۔ اگر آپ بہرانی کر سکیں۔“

لیکن ڈاکٹر نے اس کا سلسلہ کلام منقطع کر دیا اور اپنی بھیج کی طرف چل پڑا۔

”میں آپ کے ساتھ چلتا اور مجھے اس میں خوشی بھی بہت ہوتی۔ لیکن کیا کروں، خداوند میرا بھرا کرے، میں یہاں تک پھنسا ہوا ہوں؟“ اس نے اپنے گلے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”میں سر پر پاؤں رکھے گا اور کھڑکی

طرف بھاگا جا رہا ہوں۔ آپ کو معلوم ہے کہ صورت حال کیا بن گئی ہے؟ کاؤنٹ، آپ جانتے ہیں کہ کل لڑائی ہو گی۔ ایک لکھ کی سپاہ میں ہمیں کم از کم بیس ہزار افراد کے زخمی یا ہلاک ہونے کی توقع ہے اور ہمارے پاس چھ ہزار کے لیے بھی ستر پچر، چار پائیاں، خدمت گار اور ڈاکٹر نہیں ہیں۔ ہمارے پاس یقیناً دس ہزار چھکڑے ہیں، لیکن ہمیں دوسری اشیاء کی بھی ضرورت ہے۔ لیکن ہم سے جو کچھ بن پڑا، ہم ضرور کریں گے۔“

ہیئر نے جب یہ سوچا کہ ان ہزاروں جیتے جاگتے ہندوستان دتوانا، نو جوان، اور بوڑھے اشخاص کا، جو اس کے ہیٹ کو دیکھ کر محظوظ بھی ہو رہے تھے اور حیران بھی، یہ مقتدر بن چکا ہے کہ ان میں سے بیس ہزار مارا مارا ہلاک یا زخمی ہو جائیں گے (اور شاید یہ بالکل وہی ہوں جنہیں وہ دیکھ چکا ہے)، تو اسے یہ بات بہت عجیب لگی اور اس کے دل پر گہرا اثر ہوا۔

”ہو سکتا ہے کہ کل ان کی موت واقع ہو جائے۔ پھر ان کے لیے موت کے عداوہ کسی اور چیز کے بارے میں سوچنا کیسے ممکن ہے؟“ تب اس کے رہن میں آپ ہی آپ خیالات کا سلسلہ جڑنے لگا اور اسے موٹر بیک پہاڑی کی ڈھوان، زخمیوں سے لدے پھندے چھکڑے، سورج کی ترپھی کرنیں، کھنکھانی گھنٹیاں اور گیت الپتے گھڑسوار۔ بالکل واضح شکل میں یاد آنے لگی۔

”گھڑسوار میدان جنگ کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ رستے میں ان کی ٹڈھ بھیر زخمیوں سے ہو جاتی ہے۔ چلتے چلتے وہ انہیں آنکھ مارتے ہیں اور بیک لٹلے کے لیے بھی یہ نہیں سوچتے کہ ان کے ساتھ کیا ہتھیار رکھے۔ ان میں سے تقریباً بیس ہزار کے مقدر میں مرنا لکھا ہے، پھر بھی وہ میرے ہیٹ کو متحیر نگاہوں سے دیکھتے ہیں! کتنی عجیب بات ہے!“ ہیئر نے تاتارینووا کی سمت جاتے ہوئے سوچا۔

سڑک کے بائیں طرف کسی زمیندار کے گھر کے سامنے گاڑیوں، دیکھوں، اردلیوں اور سنتریوں کا ہجوم کھڑا تھا۔ یہی وہ جگہ تھی جہاں کمانڈر، چیف مقیم تھا، لیکن جب ہیئر وہاں پہنچا تو وہ وہاں موجود نہیں تھا اور اس کا شاف بھی تقریباً سارے کا سار غائب تھا۔ بھی گرے میں عبادت میں شریک ہونے گئے ہوئے تھے۔ ہیئر آگے گور کی⁵⁴ کی طرف چل دیا۔

پہاڑی کے اوپر سے گزرتے جب وہ گاؤں کی ننھی منی سڑک پر پہنچا، اسے پہلی مرتبہ ملیشیا کے کسان نظر آئے۔ وہ سفید قمیصوں میں ملبوس تھے اور ان کی ٹوپوں پر صلیب نمائندگی کے ہوئے تھے۔ وہ زور زور سے چہ اور ہنس رہے تھے، ان کے پسینے بہہ رہے تھے مگر وہ بڑے ادق شوق سے سڑک کے دائیں طرف پہاڑی ٹیپے پر، جو گھاس سے ڈھکا ہوا تھا اپنے کام میں مصروف تھے۔ بعض کھدائی کر رہے تھے، بعض چوبی تختوں پر مٹی سے لدے ریزے ڈھکیل رہے تھے اور بعض بیکار کھڑے تھے۔

ٹیلے کے اوپر دو افسر کھڑے تھے اور وہ جوانوں کو ہدایات دے رہے تھے۔ ہیئر نے جب ان کسانوں کو، جو بظاہر ابھی تک فوجیوں کی حیثیت سے اپنی انوکھی پوزیشن سے محظوظ ہو رہے تھے، دیکھا، اسے وہ زخمی، جنہیں اس

نے موڑ دیک پہاڑی پر دیکھا تھا، یاد آگئے اور تب ایک زخمی سپاہی نے جو یہ کہا تھا، ”ان کا ارادہ ساری قوم کو ان کے خلاف رکھنے کا ہے،“ اب اسے اس کا مطلب سمجھ میں آیا۔ میئر کو بارش کسٹوں کے، جو عجیب و غریب اور بھدے بوٹ پہنے ہوئے تھے، جن کی گردنوں سے پسینہ بہہ رہا تھا، جن کے سینوں پر یہاں وہاں میڑھے انداز سے کھلے بٹنوں کی قمیصیں تنک رہی اور یوں ان کی دھوپ میں جھلسی ہوئی ہسلیاں لگی ہو رہی تھیں، اس عجیب و غریب منظر نے جس پر ذرا انداز سے اس پر موقع کی نزاکت اور اہمیت واضح کی، کسی اور چیز نے، جو اس نے دیکھی یا سنی تھی، نہیں کی تھی۔

21

میئر گاڑی سے اتر اور محنت مشقت کرتے ملیشیا کے جوانوں کے قریب سے گزرتا نیچے پر، جس کے تعلق ڈاکٹر نے اسے بتایا تھا کہ وہ وہاں سے میدان جنگ کا مشاہدہ کر سکتا ہے، چڑھ گیا۔

صبح کے تقریباً گیارہ بج چکے تھے۔ سورج اس کے ذرا بائیں جانب اور عقب میں تھا۔ صاف خفاف اور لطیف فضا میں اسے چاروں اطراف وہ تاحہ نظر وسیع و عریض منظر، جو کسی بیضوی تھیمز کی طرح اس کے سامنے تھا اور دھوپ میں چمک رہا تھا، دکھائی دے رہا تھا۔

ماسکو سولنسک شاہراہ اس بیضوی تھیمز کو اوپر اور بائیں جانب کاٹتے گزر رہی تھی اور سامنے کی طرف ایک گاؤں میں، جس کے گرجے (یہ گرجا ٹیلے کے سامنے تقریباً پانچ سو گز دور نشیب میں واقع تھا) کی عمارت سفید تھی، داخل ہو جاتی تھی۔ اس گاؤں کا نام باروینو تھا۔ یہاں سے شاہراہ نزدیک پل پر سے دریا کو عبور کرتی، پہاڑیوں میں اوپر نیچے بل کھاتی، بلند سے بلند تر ہوتی جاتی، اور تقریباً چار میل آگے ایک بستی میں، جس کا نام ویوے دو تھا اور جس میں اس وقت پولین معیم تھا، پہنچ جاتی تھی۔ رالیوے دو سے آگے سڑک فراور بریج کے درختوں کے، جس کے پتے نرم اور سہلے تھے، جنگل میں غائب ہو گئی تھی۔ اس جنگل میں شاہراہ کے دائیں جانب خاصے خاصے پرکالوچا کی خانقاہ کی صیب، درمیانہ جرس دھوپ میں چمک رہے تھے۔ اس ساری ٹیلگوں وسعت میں جنگل، در سڑک کے دونوں اطراف یہاں وہاں پڑاؤوں کے لڑوے سے اٹھتا دھواں اور فوجیوں کے۔ ہمارے اور دشمن کے۔ خبر واضح جنگی نظر آ رہے تھے۔ دائیں سمت کالوچا اور مسکو اور یاؤں کی گزرگاہوں کے ساتھ ساتھ جوزمین تھی، وہ کئی کچھ اور پہاڑی تھی۔ پہاڑیوں کے مابین تنگ گھاٹیوں میں سے بڑو باو اور زافارینو کے دیہات نظر آ رہے تھے۔ بائیں طرف کا ملانہ نسبتاً زیادہ ہموار تھا۔ وہاں اناج کی فصلوں اور سیو نووسک قبضے کے، جسے نذر آتش کر دیا گیا تھا، دھواں اگلنے کھنڈرات دیکھے جاسکتے تھے۔

میئر نے اپنے دائیں بائیں جو کچھ دیکھا، وہ اتنا غیر واضح تھا کہ اس کی نگاہوں کے سامنے جو منظر تھا، اس کا کوئی حصہ اس کی توقعات پر پورا نہ اتر سکا۔ اس نے، بچے ذہن میں جس قسم کے میدان جنگ کی تصویر بنائی تھی، وہ

اسے کہیں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ وہاں صرف چراگاہیں، جنگلات، پہاڑیوں کے مابین گھاٹیاں، پڑاؤں میں جتنے والے الاؤں کا دھواں، دیہات، ٹیلے اور ندی نالے تھے۔ کوشش کے باوجود، اسے اس منظر میں، جس میں زندگی پورے زور شور سے رواں دواں تھی، کوئی عسکری ”پوزیشن“ نظر نہ آئی۔ وہ تو اپنے اور غنیم کے فوجیوں کے مابین بھی کوئی فرق نہ کر سکا۔

”مجھے کسی شخص سے، جو ان چیزوں کو جانتا ہے، دریافت کرنا چاہیے،“ اس نے سوچا اور وہ ایک افسر سے، جو اس کے بھاری بھر کم، غیر فوجی جتنے کو، تجسس کی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا، مخاطب ہوا۔

”کیا آپ مجھے یہ بتا سکیں گے کہ اس سامنے گاؤں کا کیا نام ہے؟“ میئر نے کہا۔ ”توازش ہوگی۔“
 ”بردینو، کیا اس کا بھی نام نہیں؟“ افسر نے اپنے ساتھی سے پوچھا۔
 ”باردینو، دوسرے نے صحیح کی۔“

افسر صریحاً خوش تھا کہ سے بات کرنے کا موقع مل گیا ہے۔ چنانچہ وہ میئر کے قریب ہو گیا۔
 ”وہ ہمارے جوان ہیں؟“ میئر نے سامنے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”ہاں، اور ان سے کچھ آگے فراٹسی ہیں،“ افسر نے کہا۔ ”وہ رہے ادھر، آپ انہیں دیکھ سکتے ہیں۔“
 ”کہاں؟ کہاں؟“ میئر نے پوچھا۔

”آپ انہیں نگلی آنکھ سے دیکھ سکتے ہیں۔ ادھر دیکھیں!“

افسر نے دھوئیں کی جانب، جو دریا کے پار بائیں طرف اٹھ رہا تھا، اشارہ کیا اور اس کے چہرے پر وہی گہیر اور درشت تاثر، جو میئر ان بے شمار جوانوں کے، جن سے اس کی منہ بھیر ہوئی تھی، چہروں پر دیکھ چکا تھا، نمایاں ہو گیا۔
 ”ہونہ، تو وہ فراٹسی ہیں! اور ادھر؟“ میئر نے بائیں جانب ایک ٹیلے کی طرف، جس کے قریب کچھ فوجی نظر آ رہے تھے، اشارہ کیا۔
 ”وہ ہمارے ہیں۔“

”واقعی؟ اور وہ دھر؟“ میئر نے دور فاصلے پر، ایک اور نیسے کی طرف، جس پر خاص بڑا درخت تھا، اشارہ کیا۔ اس ٹیلے سے کچھ ہی دور گھٹی میں ایک گاؤں تھا۔ وہاں پڑاؤ میں مزید الاؤ دھواں اگل رہے تھے اور کوئی سیاہ چیز نظر آرہی تھی۔

”وہ بھی اسی کا ہے،“ افسر نے کہا۔ (یہ شیواردینو کا مورچہ تھا۔) ”کل یہ ہمارا تھا لیکن اب اس کا ہے۔“
 ”پھر ہماری پوزیشن کا کیا بنا؟“

”ہماری پوزیشن؟“ افسر نے دل جمعی سے مسکراتے ہوئے دہرایا۔ ”میں اس کے متعلق آپ کو واضح طور پر بتا سکتا ہوں کیونکہ اپنے تقریباً تمام مورچے اور مددے میں نے ہی تعمیر کرائے ہیں۔ ادھر، آپ دیکھ رہے ہیں نا؟ وہ ہمارا قلب ہے، باردینو میں، ادھر بالکل سامنے“ اس نے بالکل سامنے کے گاؤں کی، جس میں سفید گر جاتا تھا، جانب

اشارہ کیا۔ ”یہ ہے وہ مقام، جہاں سے ہم دریائے کالوچا عبور کرتے ہیں۔ آپ ادھر دیکھیں، کھائی میں، جہاں گئے ہوئے شک گھاس کے گٹھے قطاروں میں پڑے ہیں۔ وہاں پل ہے۔ وہ ہمارا قلعہ ہے۔ ہمارا میزادھر ہے۔“ اس نے انتہائی رانیں ست و در ایک نالے کی طرف اشارہ کیا۔ ”وہاں دریائے مسکوا ہے۔ وہاں ہم نے تین مورچے تعمیر کرائے ہیں۔ بہت مضبوط ہیں۔ ہمارا میسرہ۔“ یہاں افسر نے توقف کیا۔ ”خیر، آپ کو معلوم ہوگا کہ سمجھنا مشکل ہے۔۔۔ کل ہمارا میسرہ شیواور دینو میں تھا۔ وہ دیکھیں، جہاں اوک کا درخت ہے۔ لیکن اب ہم نے اپنا میسرہ واپس بلایا ہے۔ اب یہ وہاں ہے۔ آپ کو وہ گاؤں دروہواں نظر آ رہا ہے؟ وہ سمیٹو نو سک ہے۔ ہاں، بالکل وہیں،“ اس نے رانیف سکی ٹیلے کی طرف اشارہ کیا۔ ”لیکن اس بات کا کوئی خاص امکان نہیں کہ لڑائی وہیں ہوگی۔ وہ اپنے دستوں کو، جو وہاں لے گیا ہے، وہ گھنٹن اس کی چال ہے۔ وہ غالباً مسکوا کے دائیں جانب چلا جائے گا لیکن یہ (معرکہ) خواہ کہیں بھی پیا ہو، کل بے شمار آدمی نابود ہو جائیں گے؟“ افسر نے کہا۔

جب افسر یہ توضیحات پیش کر رہا تھا، ایک سن رسیدہ سارجنٹ وہاں آگیا اور اس کی گفتگو کے ختم ہونے کا انتظار کرنے لگا۔ تاہم معلوم ہوتا تھا کہ اس موقع پر اسے اس کا آخری جسم پسند نہیں آیا اور اس نے اس کی بات کاٹ دی۔

”مٹی، ٹھانے کی ٹوکریاں منگوا لیں،“ اس نے کڑنگی سے کہا۔

افسر نے اپنا کلیجہ م لیا۔ معلوم ہوا تھا کہ اس کی سمجھ میں یہ بات آگئی ہے کہ آدمی دل میں تو بے شک یہ سوچتا رہے کہ کتنے جوان موت کی بھیٹ چڑھ جائیں گے لیکن اسے اس ضمن میں کوئی کلمہ زبان پر نہیں لانا چاہیے۔ ”اچھا، کمپنی نمبر 3 کو دوبارہ بھیج دو،“ اس نے غفلت سے جواب دیا۔ ”اور آپ کون ہیں؟ ڈاکٹر؟“ ”نہیں، میں کچھ بھی نہیں ہوں،“ پیئر نے جواب دیا درودہ ایک بار پھر ملیشیا کے جوانوں کے برابر سے گزرتا پہاڑی سے نیچے اتر گیا۔

”اف، یہ لعلی لوگ!“ افسر نے بڑبڑاتے ہوئے کہا اور وہ ناک پکڑے جلدی جلدی کام میں مصروف لوگوں کے پاس سے گزرتا اس کے پیچھے چلا گیا۔

”وہ جگے!۔۔۔ وہ اسے لا رہے ہیں... وہ رہی وہ!۔۔۔ وہ ایک منٹ میں یہاں پہنچ جائیں گے۔“ اچانک آوازیں کتنی سنائی دینے لگیں اور اس کے ساتھ افسر فوجی ور ملیشیا کے جوان سڑک پر آگے کی طرف بھاگنے لگے۔ بارودینو سے کلیسا کا جلوس پہاڑی پر چڑھتا آ رہا تھا۔ گرد آلود سڑک پر سب سے آگے آگے پیدل فوج کی ٹالین آ رہی تھی۔ جوانوں کے سر نیچے تھے، درودہ ترتیب سے قطاریں بناتے بازو دھراتے چلے آ رہے تھے۔ اس کے عقب میں لٹن سے مناجات پڑھنے کی صدائیں بلند ہو رہی تھیں۔

باقاعدہ فوج اور ملیشیا کے جوان نیچے سر پیئر کے برابر سے جلوس کا استقبال کرنے دوڑ پڑے۔

”وہ اسے مار رہے ہیں، ہماری محافظ، ہماری آئینہ یائی مادر خداوند!“ کسی نے با آواز بلند کہا۔

”سولنسک کی مادر خداوند“ دوسرے نے تصحیح کی۔

ملیشیا کے جوان، وہ بھی جو گاؤں میں تھے اور وہ بھی جو توپ خانے پر کام کر رہے تھے، اپنے بچے پھینک پھانک جوس کا استقبال کرنے کے لیے لپکے۔ بالین کے عتب میں، جو گرد آلود سڑک پر مرج کرتی آرہی تھی، پادری چنے چنے چھے آرہے تھے۔ ان میں سے ایک کو تاہ قامت شخص راہوں کے جے میں ملبوس تھا اور اس کی جلو میں خادین کلیسا اور سردخوایں تھے۔ ان کے پیچھے سپاہی اور افسر بہت بڑا ایقوند، جس کا چہرہ سائول تھا اور جس کے اوپر مشت دھات کا غلاف تھا، اٹھائے چلے آرہے تھے۔ یہ ایقوند سولنسک سے بایا گیا تھا اور تب سے فوج کی تحویل میں تھا۔ ایقوند کے آگے پیچھے اور دائیں بائیں فوجی سپاہی گروہ درگروہ ننگے سر بھاگے آتے اور اس کے قریب اتنا جھک جاتے کہ ان کی پیشانیوں زمین کو چھوئے لگتیں۔

جب وہ پہاڑی کی چوٹی پر پہنچ گئے، وہ رک گئے۔ ان اشخاص کی جگہ جنھوں نے ایقوند کے کنس کی بیٹیوں سے، جو اس کے ارد گرد لیٹ دی گئی تھیں، تمام رکھا تھا، دوسروں نے سنے لی، سردخو، نوں نے عودان دوبارہ جلا دیے اور عبادت شروع ہو گئی۔ سونج کی جھلسا دینے والی کرنیں نمودار ہوئی تھیں۔ تازہ، نرم رو، باد نسیم ننگے سروں پر بالوں کے ساتھ اٹھکیلیاں کر رہی تھی اور وہ رہن، جن سے ایقوند نے کو آراستہ کیا گیا تھا، بجز پھڑا رہے تھے۔ کھلے آسمان تلے سردخوانی دلی دلی معلوم ہو رہی تھی۔ ننگے سرافسروں، فوجیوں اور ملیشیا کے جوانوں پر مشتمل بہت بڑے ہجوم نے ایقوند کے ارد گرد گھیرا ڈال رکھا تھا۔ پادری اور سردخو، نوں کے پیچھے اعلیٰ شخصیات کھڑی تھیں۔ ان کے لیے الگ جگہ بنا دی گئی تھی۔ ایک جنرل، جس کی گردن میں سینٹ چارج کا تمغہ لٹک رہا تھا، بڑے پادری کے بالکل عقب میں کھڑا تھا۔ وہ اپنے سینے پر صلیب کا نشان بن رہا تھا (وہ صریحاً جرمن تھا) اور صبر تحمل سے عبادت کے اختتام پذیر ہونے کا انتظار کر رہا تھا۔ غالباً اس کی دانست میں روسی عوام کے جذبہ حب الوطنی کو بیدار کرنے کے لیے اس عبادت کا انعقاد ناگزیر تھا۔ ایک اور جنرل، عسکری پوز بنائے کھڑ تھا۔ وہ اپنے گرد و پیش نظریں دوڑ رہا اور اپنے سینے کے سامنے بہ عجلت صلیب کے نشانات بنا رہا تھا۔ دیگر کسانوں کے بیچ میں کھڑا تھا۔ اس نے افسروں میں سے متعدد شناسہ اشخاص کو پہچان لیا لیکن اس نے ان کی طرف دیکھنے سے احتراز کیا۔ اس کی ساری توجہ جوانوں کے، جو سب کے سب پورے اٹھاک سے ایقوند کی زیارت کرنے میں مشغول تھے، چہروں کی شجیدگی دیکھنے پر مرکوز تھی۔ جونہی تھکے ماندے سردخو، نوں نے، جو اس روز بیسویں مرتبہ مناجات الاپ رہے تھے، نیم رلی اور مٹھی انداز سے بول اٹھائے۔ ”اے مادر خداوند اپنے غلاموں کو مصیبت سے بچا“ اور پادری اور اس کے نائب نے بیچ میں اپنی طرف سے غمزدیا: ”کیونکہ خداوند کے زیر سایہ اسی طرح تیری طرف ہی گئے آتے ہیں جیسے ناقابلِ تخیل نصیل اور پشت پناہ کی طرف۔“ تو ہر چہرے سے یہ ہویدا ہونے لگا کہ آنے والا لمحہ اپنا اندر جو گھبرنا سوائے ہوئے ہے، وہ اس سے بخوبی آگاہ ہے۔ بیٹرنے یا آگئی ان جوانوں کے، جن سے اس کا آمنا مناموڑ یک کے نزدیک پہاڑی کے دامن میں ہوا تھا، چہروں پر دیکھی تھی اور یہی، سے چلتے چلتے بار بار ان لوگوں کے، جن سے اس کی اس روز

ملاقات ہوئی تھی، خدو حاس سے ہنستی نظر آئی تھی۔ (سردخوالوں کو سننے کے بعد) سردوں کو کثرت سے جھکایا جانے اور ہاوس کو جھٹکے دے دے کر چہرہ دل سے پرے ہٹایا جانے لگا۔ اور جب لوگ اپنے سینوں پر صلیب کے نشانات بنا رہے تھے ان کے آجیں بھرنے اور اپنے سینوں کو تپتھپانے کی آوازیں سنائی دیے لگیں۔

ایقونے کے ارد گرد لوگوں کا جو ہجوم تھا، وہ اچانک چھٹنے اور بیڑ پر دباؤ ڈالنے لگا۔ کوئی شخص ایقونے کی جانب آ رہا تھا۔ جس عجلت اور پھرتی سے لوگ اس کے لیے راستہ بنا رہے تھے، اس سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ کوئی اہم شخصیت ہے۔

یہ کو تو زوف تھا۔ وہ میدان جنگ کا جائزہ سینے نکالتا تھا اور واپس تاتاریوں و اچار ہا تھا لیکن عبادت میں شرکت کے لیے رک گیا۔ بیڑ نے اس کی نرالی شکل سے، جو اسے دوسروں سے ممتاز کر رہی تھی، فوراً پہچان لیا۔

اپنے حد سے زیادہ بھاری بھر کم جسم، جس پر اس نے اوور کوٹ پہن رکھا تھا، سفید برہنہ سر، فرہ اور مسکھے چہرے اور زخمی آنکھ کے ساتھ کو تو زوف جھولتا اور تیز تیز قدم اٹھاتا دائرے میں آگے بڑھا اور پارہ کی کے پیچھے آکھڑا ہوا۔ اسے جس انداز سے سینے پر صلیب کا نشان بنانے کی عادت ہو چکی تھی، اس نے اس سے یہ نشان بنایا، وہ اتنا نیچے جھکا کہ اس کا ہاتھ زمین کو پھونکنے لگا، تب اس نے گہری سانس لے اور اپنا سر خم کر دیا۔ کو تو زوف کے عقب میں بے نگ سین اور اس کے شاف کے ارکان تھے۔ کمانڈر انچیف کی موجودگی کے، جس نے تمام اعلیٰ افسروں کی توجہ اپنی طرف مبذول کرائی تھی، ہا وجود فوج، ورلیشیا کے جوان اس کی طرف دیکھے بغیر دعائیں مانگتے میں مصروف رہے۔ جب عبادت ختم ہو گئی، کو تو زوف ایقونے کے قریب پہنچا، بھاری بھر کم اور بے ڈال انداز سے اپنے گھٹنوں پر جھکا اور زمین پر سجدہ ریز ہو گیا۔ وہ کافی دیر تک اٹھنے کی کوشش کرتا رہا لیکن اس کے ضعف اور وزن نے رکاوٹ ڈال دی۔ زور لگانے سے اس کا سفید سر پھڑکنے لگا۔ آخر کار وہ اٹھنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس نے مصوٰنہ در پچکات انداز سے اپنے ہونٹ باہر نکالے اور ایقونے کو بوسہ دیا۔ وہ ایک بار پھر نیچے جھکا اور اس نے اپنے ہاتھ سے زمین کو چھوا۔ دوسرے جرنیوں نے اس کی مثال کی پیروی کی۔ ان کے بعد افسر اور فوجی جوان آگے بڑھے، ایک دوسرے کو دھکیلتے اور آپس میں گتھم گتھم ہونے لگے۔ یہ جانی کیفیت میں ان سب کی سانسیں پھولنے لگیں۔

سٹیز بھڑ میں پھنس گیا اور لڑکھڑاتا، ڈمکاتا اس کے ساتھ ساتھ آگے بڑھنے لگا۔ اس نے نگاہ اٹھا کر اپنے گروڈیشل نکالا۔ 'کاؤنٹ! پوٹر کر لودج! آپ یہاں کیسے پہنچ گئے؟' کسی نے چلا کر کہا۔

بیڑ نے اپنے چاروں اطراف دیکھا۔ بورس تیسکوئے ہاتھوں سے گھٹنے پونچھتا (غالبا وہ بھی ایقونے کے سامنے سجدہ ریز ہو تھا) اور سکراتا بیڑ کی جانب آیا۔ بورس کا لباس اتنا نفیس اور شستہ تھا کہ اگر وہ ذرا سا گھٹ ہوتا تو کسی کو گمان بھی نہ گزرتا کہ وہ بھی جنگ میں شریک ہے۔ اس نے اوور کوٹ پہنا ہوا تھا اور کو تو زوف کی طرح

اس کا چابک اس کے شانے پر لٹک رہا تھا۔

دوڑیں اٹھا کو تو زوف گاؤں پہنچ چکا تھا۔ وہاں وہ قریب ترین مکان کے سائے میں بیچ پر بیٹھ گیا تھا۔ یہ بیچ ایک قازق بھانم بھاگ اٹھا لیکن وہاں دوسرے نے عجلت سے اس پر غالیچہ بچھا دیا تھا۔ اجلی اور سر صبح وردیوں میں ملوے بہت بڑے محلے کے ارکان نے کہ نڈرا نجیف کے گرد گھیراؤاں لیا تھا۔

ایٹوش، بھوم کی معیت میں، آگے جا چکا تھا۔

بیٹر کو تو زوف سے کوئی تیس قدم دور رک گیا اور بورس سے باتیں کرنے لگا۔ وہ اسے بتا رہا تھا کہ اس کا ارادہ جنگ کے دوران میں وہیں موجود رہنے اور میدان جنگ کا جائزہ لینے کا ہے۔

”میں آپ کو بتاتا ہوں کہ آپ کو کیا کرنا چاہیے،“ بورس نے کہا۔ ”پڑاؤ میں قیام کے دوران میں آپ کی میزبانی کا شرف مجھے حاصل ہوگا۔ جس مقام پر کاؤنٹ بے جنگ میں تعینات ہوں گے، وہاں سے آپ ہر چیز کا بہترین انداز سے جائزہ لے سکیں گے۔ آپ جانتے ہیں کہ میں ان کے سٹاف پر ہوں۔ میں اس بارے میں ان سے ذکر کر دوں گا۔ اگر آپ میدان جنگ کا چکر لگانا چاہتے ہیں، بسم اللہ، آپ ہمارے ساتھ چلے چلیں۔ ہم میسرے کی طرف جانے والے ہیں۔ اور پھر جب ہم واپس آئیں گے، مجھے امید ہے کہ آپ رات ہمارے ساتھ بسر کریں گے اور ہم تاش کی بازی کا انتظام کر دیں گے۔ بہر حال آپ دستری سرجی وچ کو تو جانتے ہی ہوں گے۔ وہ وہاں مقیم ہیں۔“ اور اس نے گور کی کے تیسرے مکان کی طرف اشارہ کیا۔

”لیکن میں میسرے دیکھتا چاہوں گا۔ مجھے بتایا گیا ہے کہ یہ بہت مضبوط ہے،“ بیٹر نے کہا۔ ”میں دریائے مسکوا سے دورے کا آغاز کرنا چاہتا ہوں اور سارے میدان جنگ کا چکر لگانے کا خواہش مند ہوں۔“

”خیر، آپ یہ کام بعد میں کر سکتے ہیں لیکن اصل چیز میسرہ ہے۔“

’ٹھیک، ٹھیک۔ اور پرنس بلکوسکی کی رجنٹ کہاں ہے؟ مجھے بتا سکتے ہیں؟“ بیٹر نے پوچھا۔

”آندرے نکولائی وچ کی؟ ہم ان کے قریب سے گزریں گے اور میں خود آپ کو ان کے پاس لے چلوں گا۔“

”تم میسرے کے متعلق کیا کہہ رہے تھے؟“

”جی بات یہ ہے (اور یہ بات میرے اور آپ کے درمیان ہی رہنا چاہیے) کہ میسرے کے حالات کیسے ہیں، انھیں معلوم کرنے کی کوئی صورت نہیں ہے،“ بورس نے اپنی آواز دھیمی کرتے اور رازدارانہ انداز سے کلام کرتے ہوئے کہا۔ ”کاؤنٹ بے جنگ سین کا جو کچھ کرنے کا ارادہ تھا، یہ اس سے کوئی مطابقت نہیں رکھتا۔ وہاں جو پہاڑی ہے وہ اس پر مختلف انداز سے مورچے اور مددے تعمیر کرنا چاہتے تھے۔ لیکن،“ بورس نے اپنے کندھے جھٹکائے۔ ”لیکن ہر سیریں ہائی لسن نے ان کی تجویز ماننے سے انکار کر دیا یا پھر کسی نے انھیں کوئی پٹی پر معافی۔ بہر حال، آپ سمجھ گئے ہوں گے...“ بورس اپنی بات ختم نہ کر سکا کیونکہ اسی وقت کو تو زوف کا ایجوٹٹ کیسا رونجیٹر کے پاس آ گیا۔ ”اٹھ، پانسی سرجی وچ،“ بورس نے فی البدیہہ مسکرتے ہوئے اس کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔ ”میں

ابھی ابھی کاؤنٹ کو میدان جنگ کی تفصیل بتا رہا تھا۔ یہ دیکھ کر آدمی کی عقل دنگ رہ جاتی ہے کہ ہر سیرین ہائی نس نے فرانسیسیوں کے عزائم کے بارے میں پیشگی استاد درست اندازہ کیسے لگا لیا؟

”تمہارا مطلب میرے سے ہے؟“ کیساروف نے پوچھا۔

”جی، بالکل، بالکل۔ اب ہمارا میسرہ انتہائی مضبوط ہو گیا ہے۔“

اگرچہ کوٹوروف نے اپنے عملے کے تمام فالتو رکاب کی چھٹی کرادی تھی لیکن بورس نے کچھ ایسا چکر چلایا کہ تہذیبوں کے بعد بھی وہ ہیڈ کوارٹرز میں ہی ٹکا رہا۔ وہ کاؤنٹ بے نگ سین کے ساتھ تھیں ہو گیا۔ ہائی لوگوں کی طرح، جن کے تحت اس نے خدمات سرانجام دی تھیں، بے نگ سین بھی اسے اصول شخص سمجھتا تھا۔

اگلی کمان دو فریقوں میں منقسم تھی اور انھیں با آسانی ایک دوسرے سے میز کیا جاسکتا تھا۔ ایک نرین کوٹوروف کا اور دوسرا چیف آف سٹاف بے نگ سین کا تھا۔ بورس کا تعلق مؤخر الذکر دھڑے سے تھا اور اس سے بہتر کوئی شخص یہ نہیں جانتا تھا کہ کوٹوروف کا تعلق احترام کیسے کیا جاسکتا ہے اور اس کے ساتھ ہی یہ تاثر کیسے دیا جاسکتا ہے کہ بڑھا بے کار محض ہے اور سب کچھ بے نگ سین کے ہاتھ میں ہے۔ اب جب کہ جنگ کی فیصلہ کن گھڑی سر پر آ پہنچی تھی، اس کا نتیجہ یا تو کوٹوروف کے زوال اور اختیارات کی بے نگ سین کو منتقلی کی صورت میں نکلتا تھا اور یا اگر کوٹوروف لڑائی میں فاتح بھی قرار پا گیا، پھر بھی عام اذہان پر یہ تاثر قائم کیا جاسکتا تھا کہ یہ سب کچھ بے نگ سین کی وجہ سے ہوا۔ بہر حال کل کے معرکے کے بعد متعدد اہم اعزازات تقسیم ہوں گے اور نئے لوگ اگلی صف میں آجائیں گے۔ چنانچہ اس روز بورس پر اعصابی شکستگی کا نشہ طاری رہا۔

کیساروف کے بعد کئی اور وقف کاروبار سے ملنے آئے اور اسے اتنا موقع ہی نہ ملا کہ وہ اسکو کے بارے میں ان تمام سوالات کے، جو اس سے پوچھے جاتے، جوابات دے سکتا اور یا وہ ان کہانیوں کو، جو وہ اس کے گوش گزار کرنا چاہتے تھے، سن سکتا۔ ہر چہرے پر ہیجان اور خوف کی کیفیت نمایاں تھی۔ تاہم ہیئر کو یہ محسوس ہوا کہ جن چہروں پر ہیجانی کیفیت جھلک رہی ہے، ان میں سے بعض چہرے ان لوگوں کے ہیں جو زیادہ تر ذاتی کامیابی کے مسئلوں کے بوجھ تلے دبے ہوئے ہیں، تاہم وہ اپنے ذہن سے ان دیگر اشخاص کے چہروں کو، جن کی ہیجانی کیفیت ان کے ذاتی مفادات کی آئینہ دار نہیں تھی بلکہ اس کا سبب موت و حیات کے عالم گیر مسائل تھے، جو نہیں کر سکتا تھا۔ کوٹوروف کے گرد و پیش جو لوگ جمع تھے، سے ان کے بیچ میں ہیئر کی شکل نظر آ گئی۔

”اسے میرے پاس لاؤ“ کوٹوروف نے کہا۔

جب ایک ایجوٹنٹ نے ہیئر کو ہر سیرین ہائی نس کی خواہش سے مطلع کیا، وہ اس کے بیچ کی طرف چل پڑا۔ لیکن لیڈیا کا ایک جوان اس سے پہلے ہی وہاں پہنچ گیا۔ یہ دلو خوف تھا۔

”یہ شخص یہاں کیسے پہنچ گیا؟“ ہیئر نے دریافت کیا۔

”یہ تاہم سب عیار ہے کہ سینڈھ لگا کر ہر جگہ پہنچ جاتا ہے“ ہیئر کو جواب ملا۔ ”آپ کو معلوم ہے کہ اس کی

”تو تم بارود کی بوسو گھنا چاہتے ہو!“ اس نے بیڑ سے کہا۔ ”ہاں۔ خوشگوار مہک ہے۔ مجھے تمہاری بیگم کا مدح ہونے کا شرف حاصل ہے۔ ان کی طبیعت ٹھیک ہے؟ میرا ٹھکانا تمہارے لیے حاضر ہے۔“

جیسا کہ بڑھے کھنکر لوگوں کے ساتھ اکثر ہوتا ہے، کو تو زوف بے دھیانی کے عالم میں ادھر ادھر دیکھنے لگا جسے وہ یہ بھول گیا ہو کہ وہ کیا کہنا یا کرنا چاہتا ہے۔

پھر بظاہر جیسے اسے یاد آگیا ہو کہ وہ کیا چاہتا ہے، اس نے اپنے، بچہ نٹ کے بھائی آندرے سر جی دوج کیساروف کو ہاتھ کے اشارے سے بلایا۔

”وہ اشعار۔ مارین⁵⁷ کے وہ اشعار۔ ہونہر، کیا ہیں وہ؟ وہی، جو اس نے گیراکوف کے متعلق لکھے تھے؟“ تم کو کو پکچر چاہتے رہتے ہو۔ ”ہاں، ہاں، اس ڈونا!“ اس نے کہا۔ صاف معلوم ہوتا تھا کہ وہ قہقہے لگانے کی تیاریاں کر رہا ہے۔

کیساروف نے، شعارت نے۔ کو تو زوف مسکراتا اور اشعار کی لے کے ساتھ اپنا سر دھتارہا۔

جب بیڑ نے کو تو زوف سے اجازت لی، دلو خوف اس کے پاس آیا اور اس نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں پکڑ لیا۔

”کاؤنٹ، تم سے یہاں مل کر بہت خوشی ہوئی،“ اس نے اجنبیوں کی موجودگی کو نظر انداز کرتے ہوئے نمایاں عزم و محکم اور سنجیدگی سے با آواز بلند کہا۔ ”ایک ایسے وقت، جب صرف خدا ہی جانتا ہے کہ کل ہم میں سے کس کس کے مقدر میں زندہ بچ رہنا لکھا ہے، مجھے خوشی ہے کہ مجھے تمہیں یہ بتانے کا موقع دستیاب ہو گیا ہے کہ ہم دلوں کے، چین جو غلط فہمی ہو گئی تھی، اس کے متعلق مجھے کتنا افسوس ہے اور یہ کہ مجھے امید ہے کہ میرے بارے میں تمہارے دل میں کوئی بدگمانی نہیں ہوگی۔ میری تم سے یہی التجا ہے کہ تم مجھے معاف کر دو۔“

بیڑ نے مسکرا کر دلو خوف کی جانب دیکھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس سے کیا کہے۔ دلو خوف کی آنکھوں میں آنسو چھلکنے لگے۔ وہ بیڑ سے بغل گیر ہو گیا اور اس کے بوسے لینے لگا۔

یورس اپنے جرنیل کو کچھ بتا چکا تھا اور کاؤنٹ بے گنگ سین بیڑ کی طرف متوجہ ہو گیا۔ اس نے اسے تجویز پیش کی کہ وہی ذکا جائزہ لینے وہ ان کے ساتھ چلے۔

”آپ کے لیے یہ بہت دلچسپ رہے گا،“ اس نے کہا۔

”جی، واقعی۔“ بیڑ نے جواب دیا۔

آدھے گھنٹے بعد کو تو زوف و پس تاتارینووا کی طرف چل دیا اور بے گنگ سین اور اس کا عملہ، جس میں بیڑ بھی شامل تھا، محاذ کے معائنے پر نکل گئے۔

مگر اس سے انکر بے گنگ سین اس شاہراہ پر ہولیا جو اس پل کی طرف، جو اس انسر کے بقول، جس نے ٹیلے پر بیڑ کو

بتایا تھا کہ وہ ہماری پوزیشن کے عین قلب میں واقع ہے، اور جہاں دریا کے کنارے تازہ تازہ کٹی ہوئی گھاس کے گٹھے قطاروں میں پڑے تھے، جاتی تھی۔ انھوں نے پل عبور کیا اور بارود بیخاکوں میں داخل ہو گئے۔ وہاں سے وہ بائیں طرف مڑ گئے، اور جوانوں اور توپوں کی بے پناہ تعداد کے قریب سے گزرتے ایک اونچے ٹیلے پر پہنچ گئے۔ وہاں ملیشیا کے جواں کھدائی کر رہے تھے۔ اس مورچے کو ابھی تک کوئی نام نہیں دیا گیا تھا لیکن بعد ازاں اس نے ریفٹ سکی مورچے یا توپ خانے کے نیسے کے لقب سے شہرت پائی۔

ہیئر نے اس ٹیلے کی طرف کوئی خاص توجہ نہ دی۔ سے معلوم نہیں تھا کہ بارود بیخاکوں کے سرے میدان میں اس نے اس کے لیے انتہائی یادگار مقام بننا ہے۔ انھوں نے نارعبور کیا اور سمجھو نووسک میں داخل ہو گئے۔ وہاں فوجی جوان مکانوں ورمودی خانوں کے شہیر گھیت گھیت کر کہیں لے جا رہے تھے۔ اس کے بعد وہ پہاڑی کے اوپر چڑھے، نیچے اترے، رائی کے کھیت میں سے گزرے (کھیت میں رائی کے پودے یوں کچلے پڑے تھے جیسے وہاں ژالہ باری ہوئی ہو) اور نو سائتہ راستے پر، جسے اہل پھرے کھیت کے شیاژوں پر توپ خانے سے بنایا تھا، چلتے بلند و بالا دھم دھم کے، جنھیں ”تیر“ کہا جاتا تھا، قریب پہنچ گئے۔ ان دھم دھم کی تعمیر ابھی جاری تھی۔

بے نگ سین دھم دھم کے قریب رک گیا اور اس کے بالمقابل شیدار دینو مورچے کو، جو کل تک ہمارا تھا، دیکھنے لگا۔ وہاں متعدد گھڑسوار نظر آ رہے تھے۔ افسروں نے بتایا کہ وہاں پولین ہے یا سوغا۔ چنانچہ سب لوگ بڑے شوق سے گھڑسواروں کے چھونے سے ہجوم کو دیکھنے لگے۔ ہیئر نے اوھرنگا ہیں گاڑ دیں۔ وہ یہ اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا تھا کہ ان لوگوں میں، جن کی شکلیں بمشکل دکھائی دے رہی تھیں، پولین کون ہے۔ آخر کار گھڑسوار پہاڑی سے نیچے اتر گئے اور نظروں سے اوجھل ہو گئے۔

بے نگ سین ایک جرنیل کی طرف، جو اس کے قریب آ گیا تھا، متوجہ ہوا اور اس کے سامنے اپنی افواج کی مکمل پوزیشن کی توضیح کرنے لگا۔ ہیئر بھی سن رہا تھا۔ اس نے اپنی پوری صدا جیتیں صرف کر دیں کہ لڑائی کے، جو سر پر کھڑی تھی، اہم نکات اس کے پلے پڑ جائیں، لیکن اسے یہ معلوم کر کے سخت جھنجھلا ہٹ ہوئی کہ یہ کام اس کی ذاتی صدا جیتوں سے ماورا ہے۔ اس ابھی ڈور کا کوئی سرا اس کے ہاتھ نہ آیا۔ بے نگ سین بولتا بولتا چپ ہو گیا۔ اس نے جب دیکھا کہ ہیئر سن رہا ہے، اس نے اچانک اس سے مخاطب ہو کر کہا

”میرا خیال ہے کہ آپ کو اس میں دلچسپی کی کوئی بات نظر نہیں آئی ہوگی۔“

”اور، اس کے برعکس یہ انتہائی دلچسپ ہے،“ ہیئر نے کہا۔ اس کے جواب میں کوئی خاص صداقت نہیں تھی۔ وہ تیرنہ بیرونی دھم دھم سے بائیں طرف مزید آگے نکل گئے۔ وہ جس سڑک پر جا رہے تھے، وہ برج کے کوتاہ قامت درختوں کے گھٹے جنگل میں سے مل کھاتی گزر رہی تھی۔ جنگل کے بیچ میں سے ایک بھورا خرگوش، جس کے پاؤں سفید تھے، جست لگا کر باہر آیا لیکن گھوڑوں کے ناپوں کی آوازوں سے اتار لڑہ بر اندام ہوا کہ ہوش دھواں کھو بیٹھا اور وہ کچھ دیر تک سڑک پر ان کے آگے آگے کودتا پھاندا چلا رہا۔ سب لوگوں کی توجہ اس کی طرف مبذول

ہو گئی اور وہ فیصلہ لگانے لگے۔ صرف اس وقت جب متعدد آوازیں چلا چلا کر اسے خبردار کرنے لگیں، وہ بھاگ کر ایک طرف ہو گیا، اور جنگل میں غائب ہو گیا۔ جنگل میں کوئی ڈیڑھ میل چلنے کے بعد وہ کھلے میدان میں پہنچے۔ وہاں بائیں بازو کا دفاع کرنے کے لیے تھک کوف کی کور کے دستے مقیم تھے۔

یہاں دوسرے کے بالکل اختتام تک پہنچنے کے بعد جنرل بے ٹنگ سین نے بڑے جوش و خروش سے خاصی طویل تقریر کی اور جیسا کہ جیئر کو محسوس ہوا، اس نے زبردست عسکری اہمیت کے احکام دیے۔ تھک کوف کی سپاہ کے سامنے بلند زمین تھی۔ وہاں فوج کا کوئی سپاہی تعینات نہیں تھا۔ بے ٹنگ سین نے خاصی اونچی آواز میں اس فرد گزاشت پر نکتہ چینی کی۔ اس کا کہنا تھا کہ اتنے بلند مقام کو، جہاں سے گرد و پیش کے علاقے پر نظر رکھی جاسکتی ہے، یونہی چھوڑ دینا اور سپاہ کو اس کے دامن میں متعین کر کے مطمئن ہو جانا نرا پاگل پن ہے۔ متعدد جرنیلوں نے بھی اسی قسم کے خیالات کا اظہار کیا۔ ان میں سے ایک خاص طور پر بہت گرم تھا اور اس نے عسکری جدل سے کہا کہ اگر دستے وہیں تعینات رہے، جہاں کہ وہ ہیں، ان کے کشتوں کے پستے لگ جائیں گے۔ بے ٹنگ سین نے اپنی ذمہ داری پر کور کو حکم دیا کہ وہ بلندی پر چل جائے۔

بائیں بازو پر فوج کی اس تقسیم و ترتیب نے جیئر کو پہلے کی نسبت کہیں زیادہ اس شک و شبہ میں مبتلا کر دیا کہ فوجی امور اس کی دسترس سے باہر ہیں۔ جب اس نے بے ٹنگ سین اور دوسرے جرنیلوں کو پھاڑی کے دامن میں دستوں کی پوزیشن پر نکتہ چینی کرتے سنا، وہ ان کا استدلال سمجھتا بھی تھا اور ان سے اتفاق بھی کرتا تھا لیکن محض اسی وجہ کی بنا پر یہ بات اس کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی کہ جس شخص نے انہیں متعین کیا تھا، اس سے اتنی بڑی اور صریح غلطی کیوں کر سرزد ہوئی۔

جیئر کو یہ معلوم نہیں ہو سکتا تھا کہ ان دستوں کو وہاں اس لیے تعینات کیا گیا تھا کیونکہ یہ وہاں سے کسی کو نظر نہیں آ سکتے تھے، اس لیے وہ دشمن پر، جب وہ آگے آئے، اچانک حملہ کر سکتے تھے۔ بے ٹنگ سین کو اس کا علم نہیں تھا اس نے اپنے تصورات کے مطابق دستوں کو آگے پہنچا دیا اور اس بارے میں کہ ٹڈا چیف کو کچھ نہ بتایا۔

25 اگست کی اس چکیلی شام کو پرنس آندرے اپنی رجسٹر کے پڑاؤ کے انتہائی آخری سرے پر کنیاز کو دو گاؤں کے ایک بوسیدہ چھپرے تلے اپنی کہنی کے بل لیٹا ہوا تھا۔ شکست دیوار کے ایک شکاف میں سے اسے چوٹی ہاڑ کے ساتھ تیس تیس سالہ برج درختوں کی قطار نظر آ رہی تھی۔ ان درختوں کی پٹلی شاخیں کاٹ دی گئی تھیں۔ ان سے آگے ایک کھیت تھا۔ اس میں جئی کے پالوں کے ڈھیر لگے ہوئے تھے۔ پاس ہی جھاڑیاں تھیں۔ ان کے نزدیک کھپ فارے۔ جوانوں کے عارضی مطبخ۔ سے دھواں اٹھ رہا تھا۔

اس امر کے باوجود کہ پرنس آندرے کو اب اپنی زندگی محدود، بیکار و بوجھل محسوس ہو رہی تھی، پھر بھی لڑائی

سے ایک روز بیشتر اسے اسی قسم کی پریشانی لاحق ہو رہی تھی اور اس کا مزاج بیحد اسی طرح برہم ہو رہا تھا جیسے کہ سات سال قبل اوٹسٹریٹس میں اس کے ساتھ ہوا تھا۔

اگلے روز کی لڑائی کے بارے میں اسے حکام وصول ہو چکے تھے اور وہ اپنی رجسٹر کو ہدایات دے چکا تھا۔ اب اس کے پاس کچھ مزید کرنے کو نہیں تھا۔ لیکن اس کے خیالات، جو سادہ ترین، واضح ترین اور بلند خطرناک ترین قسم کے تھے، اسے کسی پہلو میں نہیں لینے دے رہے تھے۔ وہ جانتا تھا کہ وہ اب تک جن لڑائیوں میں شریک ہو چکا ہے، ان میں کل کا معرکہ مہیب ترین ہو گا اور زندگی میں اولین بار موت کا امکان اس کے رویہ کو گھرا ہوا ہے۔ یہ امکان جس طرح اس کے ذہن میں نمودار ہوا، اس کا نہ تو اس کی دنیوی زندگی سے کوئی تعلق تھا اور نہ اس بات سے کہ اس کی موت کا دوسروں پر کیا اثر ہو گا بلکہ اس کا تعلق محض اس کی اپنی ذات اور اپنی روح سے تھا۔ اور یہ امکان اتنے واضح، صریح اور ہیبت ناک انداز سے ابھرا کہ یہ تقریباً ٹھوس حقیقت معلوم ہونے لگا۔ اور وہ تمام چیزیں، جو اس سے قبل اس کے لیے سوہان روح بنی رہی تھیں اور جنہوں نے اس کی توجہ کو پوری طرح اپنی طرف مبذول کیے رکھا تھا، وہ دراک کی اس بلندی پر اچانک سرد، سفید روشنی میں منور ہو گئیں۔ ان (چیزوں) کا نہ کوئی سایہ تھا، نہ تاثر اور نہ خطوط کہ انہیں ایک دوسرے سے میز کیا جاسکتا۔ اسے اپنی تمام زندگی طلسمی لائین (مبجک لینٹرن) کی تصاویر کے ایک سلسلے کی مانند دکھائی دی۔ طلسمی لائین کی تصاویر کی طرح وہ اپنی زندگی (کی تصاویر) کو بھی مصنوعی روشنی میں شیشے میں سے دیکھتا رہا تھا۔ اب شیشے کے بغیر اور دن کی صاف روشنی میں اسے یہ تصاویر یوں دکھائی دیں جیسے وہ بھدے انداز سے پپ پوت دی گئی ہوں۔ "ہاں، ہاں، وہ رہیں وہ، وہ جھوٹی شیشیں، جو میرے اندر پھیل چاتی رہیں، مجھے اپنا گردیدہ بناتی رہیں اور مجھے ستاتی رہیں۔" اس نے زندگی کی طلسمی لائین کی بڑی بڑی تصاویر پر نظر ثانی کرتے اور اسے موت کا جو واضح اور اک ہوا، اس کی دن جیسی سرد، سفید روشنی میں انہیں دیکھتے ہوئے اپنے آپ سے کہا: "وہ رہیں وہ، بھدے رنگوں سے بنائی گئی بھدے تصویریں، جو کبھی پر شکوہ اور پراسرار معلوم ہوتی تھیں۔ عزت و احترام، عظمت و جلال، فلاح عامہ، عشق، زن، خور وادار، وطن۔ مجھے یہ تصاویر مہتمم بالشان دکھائی دیتی تھیں اور کتنے غمگین مفاہیم سے بھرپور معلوم ہوتی تھیں! اور صبح کی، جو مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ میرے لیے طلوع ہو رہی ہے، سرد، سفید روشنی میں یہ سب کچھ کتنا سیدھا سادا، بے رنگ اور بھونڈا نظر آ رہا ہے۔" اپنی زندگی کی تمنّیں عظیم ندوہ ناک یوں۔ ایک عورت سے اس کا عشق، اپنے باپ کا انتقال اور فرانسسیدوں کی درس پر چڑھائی، جس کی ہاپر انہوں نے اس کے آدھے ملک کو روند ڈالا تھا۔ نے خاص طور پر اس کی توجہ اپنی طرف مبذول کرائی۔ "محبت، وہ لو خیزدو شیزہ، جو مجھے باطنی قوتوں سے لبریز دکھائی دیتی تھی! مجھے اس سے کتنا عشق تھا! میں اس کے ساتھ مسرت اور محبت کے رومانی منصوبے بناتا رہا۔ وہ! میں بھی کیا طفل نادان تھا!" اس نے بڑی تلخی سے آہ بھرتے ہوئے با آواز بلند کہا۔ "جی بات یہ ہے کہ مجھے کسی قسم کی مثالی محبت کا یقین ہو گیا تھا اور میں یہ سمجھنے لگا تھا کہ یہ محبت میری عدم موجودگی کے پورے بارہ مہینوں کے دوران میں اسے میری وفادار بنائے رکھے گی! (مجھے خیال گزرا کہ) کہانیوں کی لختہ کی طرح وہ

میری جدائی میں گھس گھس کر کمزور و ناتواں ہو رہی ہوگی۔ لیکن یہ سب تصورات کتنی زیادہ بے سمجھی پر مبنی تھے۔۔۔ باقی زیادہ نا سمجھی اور نادانی پر کہ آدمی کا جی متلانے لگے!

”میرے باپ نے بھی بانڈلز کی تعمیر کرائی اور سمجھنے لگا کہ یہ جگہ اس کی ہے۔ یہ زمین، یہ ہو، یہ کسان اس کے ہیں۔ لیکن پولین آیا اور اس کے وجود سے بے خبر اسے سب سمجھا اٹھا کر یوں ایک طرف پھینک دیا جیسے کوئی شخص لکڑی کا کوئی ٹکڑا، ٹھہ کر ایک جانب پھینک دیتا ہے۔ اور میرے باپ کا بانڈلز اور اس کی ساری زندگی چکنا چور ہو گئی۔ پرنس مار یا کہتی ہے کہ ہم پر آزمائش کی جو گھڑی آئی ہے، وہ عالم بالا سے آئی ہے۔ لیکن آزمائش کیسی؟ میرا باپ تو یہاں (اب) رہا نہیں اور نہ وہ کبھی دوبارہ آئے گا۔ کبھی نہیں! اس کا وجود مٹ چکا ہے، پھر یہ آزمائش کس کی ہے؟ مادر وطن، ماسکو کی تباہی! اور کل میں ہلک ہو جاؤں گا۔ شاید فرانسیسیوں کے ہاتھوں بھی نہیں، بلکہ اپنے ہی کسی شخص کے ہاتھوں، بالکل اس فوجی جوان جیسے، جس نے کل جب بتدق چلائی تھی، گولی میرے کان کے قریب سے سنسنائی گزر گئی تھی، کسی شخص کے ہاتھوں کہ وہ بتدق چلائے اور میں اتفاقاً گولی کی زد میں آ جاؤں!۔ پھر فرانسیسی آئیں گے، مجھے سر اور ایڑیوں سے پکڑیں گے اور کسی گڑھے میں پھینک دیں گے، اس لیے کہ کہیں ان کی ناکوں کے عین سامنے میرے جسم سے سڑاندہ نہ اٹھنے لگے۔ اور زندگی یوں ہی روں رہے گی، حالات بے شک تھے ہوں گے لیکن دوسروں کو ان حالات میں ویسے ہی کوئی نوکھاپن دکھائی نہیں دے گا جیسے ہمیں آج کے حالات میں دکھائی نہیں دیتا لیکن مجھے ان (نئے حالات) کے متعلق کچھ معلوم نہیں ہوگا کیونکہ میرا وجود عدم وجود ہو چکا ہوگا۔“

وہ ٹھنکی ہانڈھ کر قطار میں برتج کے درخت دیکھنے لگا۔ ان کے سبز اور زرد پتے ساکن تھے اور ان کی سفید چھانیں دھوپ میں چمک رہی تھیں۔ ”کل موت واقع ہو جائے گی، ہلاکت اپنا کام دکھا جائے گی۔۔۔ میرا وجود عدم وجود بن جائے گا۔۔۔ لا و چلے گا۔ بنجارہ۔۔۔ اور یہ سارا ٹھٹ، یوں کاتوں موجود رہے گا۔۔۔ اور میں؟ میں نہیں ہوں گا۔“

اس نے اپنے بغیر زندگی کا تصور کیا۔ برتج کے درخت، جن میں سے کہیں روشنی چھن چھن کر گز رہی تھی اور کہیں ان کے سائے پڑ رہے تھے، اون کی طرح کے سفید بادل، پڑاؤ کے لاؤ۔ ایک ایسی اس کے گرد و پیش ہر چیز کی کیا پٹ گئی۔۔۔ سے یوں محسوس ہونے لگا کہ ہر چیز نے اپنا چولا تبدیل کر لیا ہے، وہ اس کی طرف ناپاک ارادوں سے، یکدم ہی ہے، در خطر ہے کی تلوار بن کر اس کے سر پر لٹک رہی ہے۔ اس کا جسم کچا پانے اور ٹھنڈے لگا۔ وہ جلدی سے اٹھا، باہر نکلا اور ادھر ادھر چکر کاٹنے لگا۔

جب وہ دوبارہ سائبان میں داخل ہوا، اسے آواز سنائی دی۔ آواز کہیں باہر سے آئی تھی۔ سرخ ناک دارا کیپٹن، تھوخن، جوازیں، شتر و خوف کا کہنی کمانڈر تھے لیکن اب انہوں کی تعداد میں کمی آ جانے کے سبب بنا لین کمانڈر بن چکا تھا، شرماتا لجانا سائبان میں داخل ہوا۔ اس کے پیچھے ایک ایجوٹ اور رجسٹ کا بجٹی تھا۔

پرنس آندرے جھٹ پٹ اٹھ کر کھڑا ہو گیا، وہ جس کام کے سلسلے میں آئے تھے، اس نے اس کے بارے

میں ان کی بات توجہ سے سنی، انھیں چند مزید ہدایات دیں اور انھیں رخصت کیا چاہتا تھا کہ سے ساتباں کے ماہر جانی پہچانی تعلقانی آواز سنائی دیتی۔

”بیڑا غرق!“ کسی شخص نے کسی چیز سے ٹھوکر کھاتے ہوئے کہا۔

پرنس آندرے نے ساتباں کے باہر دیکھا اور اسے حیرت دکھائی دیا۔ وہ ایک کھجے سے جوزمین پر پڑا تھا، لکڑا گیا تھا اور گرنے سے بال بال بچا تھا۔ پرنس آندرے عام طور پر ایسے لوگوں سے جس کا تعلق اس کے اپنے طبقے سے تھا، منا پسند نہیں کرتا تھا اور حیرت تو اسے خاص طور پر ایک ”نکٹہ نہیں بھاتا تھا کیونکہ اسے دیکھ کر سے وہ تمام روح فرسا واقعات، جن میں وہ اپنے ماسکو کے گزشتہ قیام کے دوران میں گزرا تھا، یاد آ جاتے تھے۔

”تم؟ تم نے تو مجھے چکرا ہی دیا!“ اس نے کہا۔ ”یہاں کیسے آنا ہوا؟ میں نے تو کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ تم سے کبھی یہاں ملاقات ہوگی!“

جب وہ یہ سب کچھ کہہ رہا تھا اس کا چہرہ اور آنکھیں چغلی کھار ہی تھیں کہ اس میں مروت نام کی کوئی شے نہیں رہی۔ اس کا رویہ سرد مہراندہ، بلکہ جیب کہ بیٹرنے آنا فنا بھنپ لیا، قطعی غماصمانہ تھا۔ وہ بڑے شوق اور دلو سے ساتباں میں آیا تھا لیکن جب اس نے پرنس آندرے کی شکل دیکھی، اس کا جی بجھ گیا اور اس پر بے کلی سو رہ گئی۔

”میں آیا تھا۔ خیر، تمہیں معلوم ہے۔ میں آیا تھا۔... مجھے اس میں دلچسپی پیدا ہو گئی،“ بیٹرنے کہا۔ اس نے اس روز لفظ دلچسپی سوچے سمجھے بغیر بار بار استعمال کیا تھا۔ ”میں لڑائی دیکھنا چاہتا تھا۔“

”افاہ! ارے ہاں، تمہارے فری۔ مسن برادران کا جنگ کے متعلق کیا خیال ہے؟ وہ اس کے آگے بند کیے باندھیں گے؟“ پرنس آندرے نے طنز یہ انداز سے پوچھا۔ ”خیر، ماسکو میں کیا ہو رہا ہے؟ میرے گھر والوں کا کیا حال ہے؟ آخرش وہاں کو پہنچ گئے ہیں؟“ اس نے سنجیدگی سے دریافت کیا۔

”ہاں پہنچ گئے ہیں۔ مجھے اس بارے میں جولی روڈتیسکو نے بتایا تھا۔ میں گیا بھی لیکن ملاقات نہ ہو سکی۔ وہ تمہاری ماسکو کے قریب جاگیر پر چلے گئے تھے۔“

25

افسر رخصت ہونا چاہتے تھے لیکن پرنس آندرے نے، جسے بظاہر اپنے دوست کے ساتھ تہا رہنے میں تامل تھا، انھیں ٹھہرنے اور چائے پینے کی دعوت دے دی۔ بیچ بچھا دیے گئے اور چائے منگوائی گئی۔ انسران کچھ کچھ حیرت و استعجاب سے بیڑ کے بھاری بھر کم اور کوہ پیکر جئے کو دیکھتے اور ماسکو اور اپنی فوج کی ترتیب کے، جس کا اس نے گھوڑے پر مشاہدہ کیا تھا، بارے میں اس کی باتیں سنتے رہے۔ پرنس آندرے منہ میں گھٹکیاں ڈالے بیٹھا رہا۔ اس کا چہرہ اتنا گھبراہٹ اور ذراؤنا تھا کہ بیڑ نے بلکوسکی کے بجائے زیادہ تر خوش خصل کمانڈر حموخن سے مخاطب ہونے میں ہی خیریت سمجھی۔

”تو تم ہماری افواج کی ساری تقسیم و ترتیب سمجھ گئے ہو؟“ پرس آندرے نے اسے ٹوکتے ہوئے کہا۔
 ”ہاں یعنی کہ۔ کیا مطلب ہے تمہارا؟“ میئر نے کہا۔ ”میں چونکہ فوجی کہ اندر تو ہوں نہیں، اس لیے میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ میں سب کچھ سمجھ گیا ہوں۔ پھر بھی عمومی نقشہ میری سمجھ میں آ گیا ہے۔“
 ”اچھا پھر کسی بھی دوسرے شخص کی نسبت تم زیادہ جانتے ہو؟“ پرس آندرے نے فریسی میں کہا۔
 ”اے!“ میئر نے کنکھیوں سے پرس آندرے کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ”اے بڑی الجھن ہو رہی تھی۔“ میئر کو تو زورف کی تقرری کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟“
 ”میں نے اس تقرری کو خوش آئند قرار دیا تھا۔ اس سے زیادہ میں کچھ نہیں کہہ سکتا؛ پرس آندرے نے جواب دیا۔

”اور یہ بتاؤ کہ بارکے دتولی کے متعلق تمہاری کیا رائے ہے؟ خدا جانے ماسکو میں لوگ اس کے بارے میں کیا کیا باتیں بنا رہے ہیں۔ تمہارے خیال میں وہ کیسا شخص ہے؟“
 ”اس لوگوں سے پوچھ لو،“ پرس آندرے نے افسروں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔
 میئر نے کچھ ایسی کریمانہ مسکراہٹ سے تموخن کی طرف دیکھا جیسے پوچھ رہا ہو کہ یہ کیا شے ہے؟ (دیے تموخن سے جو شخص بھی مخاطب ہوتا تھا، وہ غیر ارادی طور پر ایسے ہی مسکراتا تھا۔)
 ”یورائیکسی لیس، جب ہریرین ہائی نس نے عہدہ سنبھالا، یہ اندھیرے میں روشنی کی کرن تھی۔“⁵⁸ تموخن نے اپنے کرل کی طرف مسلسل شرمیلی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔
 ”ایسا کیوں!“ میئر نے پوچھا۔

”میں عرض کرتا ہوں۔ صرف ہیزم سوختنی اور چارہ لیس۔ جب ہم سویڈیائی سے پپا ہو رہے تھے، ہم میں اتنا حوصلہ نہیں تھا کہ ہم کہیں سے کوئی شہنی، گھاس کا تنکا یا ایسی ہی کوئی چیز اٹھالیں۔ آپ سمجھ رہے ہیں کہ ہم تو وہاں سے بھاگ رہے تھے، اور یہ سب کچھ اسے مل جاتا تھا۔ یورائیکسی لیس، میں نے ٹھیک کہا یا نہیں؟“ اس نے دوبارہ اپنے پرس کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔ ”ہم میں اتنا حوصلہ ہی نہیں تھا۔ اس قسم کی حرکت پر ہمارے دو افسروں کا کورٹ مارشل ہو گیا۔ خیر، جب سے ہریرین ہائی نس نے کمان سنبھالی ہے، کسی طرح کا الجھن و باقی نہیں رہا، ہر چیز واضح اور صاف ہو گئی ہے۔ اب ہمیں روشنی نظر آ گئی ہے۔“
 ”پھر اس کی ممانعت کیوں کی گئی تھی؟“

تموخن بوکھلا گیا اور ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس سوال کا کیسے جواب دے۔ میئر نے یہی سوال پرس آندرے سے پوچھ لیا۔

”تاکہ وہ علاقہ، جو ہم خالی کر رہے تھے، کہیں خرابے کا منظر پیش نہ کرنے لگے؛ پرس آندرے نے جملے کے لچکے سے کہا۔ ”بے عیب اصول یہ ہے۔ تاخت و تاراج کرنے سے احتراز کرو اور اپنی سپاہ کو کبھی لوٹ مار کا عادی نہ

بناؤ۔ سولنسک میں بھی (اس بار کلمے ذوقی) نے بالکل صحیح اندازہ لگایا تھا کہ فرانسیسی ہمیں نرغے میں لے سکتے ہیں یا ہمارے مہینے اور میسرے پر شدید دباؤ ڈال سکتے ہیں کیونکہ اس کے پاس ہم سے کہیں بڑی فوج تھی لیکن وہ یہ نہ سمجھ سکا "پرنس آندرے نے جیکھی آواز میں یوں چلاتے ہوئے کہا جیسے اس کے ضبط کے سبب بندھن ٹوٹ گئے ہوں۔" لیکن وہ یہ نہ سمجھ سکا کہ ہم روسی سرزمین کے تحفظ کے لیے پہلی مرتبہ لڑ رہے تھے، یہ کہ ہمارے جوان ایک ایسے جذبے سے سرشار تھے جو اس سے پہلے میں نے نہ دیکھا تھا، یہ کہ ہم متواتر دو دنوں سے فرانسیسیوں کے حملے پسپا کرتے آرہے تھے اور یہ کہ اس کامیابی نے ہماری قوت میں دس گنا اضافہ کر دیا تھا۔ مگر اس نے کیا کیا؟ اس نے ہمیں پیچھے ہٹنے کا حکم دے دیا اور ہم نے جو تک و دو کی تھی اور جو نقصانات برداشت کیے تھے، وہ سب کے سب بیکار گئے۔ یہ ٹھیک ہے کہ اس نے کبھی یہ سوچا بھی نہیں ہوگا کہ وہ ہمیں کبھی دغا دے گا۔ اس نے حتی الامکان پوری کوشش کی کہ ہر کام بہترین انداز سے سرانجام پائے اور اس نے سب کچھ پیسے ہی سوچ لیا تھا، لیکن بالکل ہی وجہ ہے کہ وہ اس عہدے کے لیے موزوں نہیں۔ وہ اس لیے موزوں نہیں کہ اس نے جو کام کرنا ہوتا ہے، اس کا وہ خوب سوچ سمجھ کر پیشگی منصوبہ بنالیتا ہے، اتنی باریکیوں میں چلا جاتا ہے کہ چھوٹی سے چھوٹی تفصیل بھی نظروں سے اوجھل نہیں ہونے دیتا، جرموں کا یہی شعار ہے میں کیسے سمجھاؤں۔ فرض کرو کہ تمہارے والد کے پاس جرمن (روسی پوش) ملازم ہے۔ ملازم وہ بہت اچھا ہے۔ تم اپنے والد کی ضروریات کا انتہائی خیال نہیں رکھ سکتے جتنا کہ وہ رکھتا ہے۔ یہاں تک تو بات ٹھیک ہے۔ لیکن اگر تمہارے والد کسی مہلک بیماری میں مبتلا ہو جاتے ہیں، تو ملازم کی چھٹی کر دو گے اور اپنے اناڑی اور بے ڈھنگے ہاتھوں سے خود ان کی تیمارداری کر دو گے۔ کسی ماہر اور چابک دست شخص کی نسبت، جو ان کے لیے جہنمی ہے، تم ان کے لیے زیادہ تقویت و رسہوت کا باعث بنو گے۔ یہی حال بارکلی ذوقی کا ہے، جب تک روس پر براہوت نہیں پڑا تھا، غیر ملکی اس کی خدمت کر سکتا تھا ورنہ اعلیٰ پایے کا وزیر ثابت ہو سکتا تھا، لیکن جوئی اس (روسی) پر براہوت آ پڑا، اسے اس شخص کی جس نے اس کی کوکھ سے جنم لیا ہو، ضرورت لاحق ہو گئی۔ مگر تمہارے کلب میں اس پر تمہاری کی چھاپ لگا دی جاتی ہے لیکن اسے بدنام کرنے کا صرف ایک ہی نتیجہ برآمد ہوگا کہ جو لوگ یہ عطل الزام تراشی کر رہے ہیں، بعد ازاں اتنا شرمندہ ہوں گے کہ وہ ایک ایک اسے یا تو ہیر و بنا دیں گے یا نابینا روزگار ثابت کر دیں گے، اور یہ بھی اس کے ساتھ ایک طرح کی نا انصافی ہوگی۔ وہ دیانت دار اور قاعدے قانون کی سختی سے پابندی کرنے والا جرمن ہے۔"

"یہ تو بھی مانتے ہیں کہ وہ قابل جرنیل ہے۔"

"مجھے نہیں معلوم کہ قابل جرنیل کسے کہتے ہیں؟" پرنس آندرے نے طنز یہ لہجے سے جواب دیا۔

"قابل جرنیل؟" میئر کہنے لگا۔ "خیر، قابل جرنیل وہ ہوتا ہے جو ہر قسم کے اضمحلات کا پیشگی اندازہ لگا لیتا ہے

اور... خیر، دشمن کے عزائم بھانپ جاتا ہے۔"

"لیکن یہ تو ناممکن ہے،" پرنس آندرے نے یوں کہا جیسے یہ نکتہ بد توں پہلے طے ہو چکا ہو۔

بڑا بڑا نگاہ حیرت اسے دیکھنے لگا۔

”پھر بھی کیا یہ نہیں کہا جاتا کہ جنگ شطرنج کے کھیل کی مانند ہے؟“

”ہاں، ہے،“ پرنس آندرے نے جواب دیا۔ ”مگر دونوں میں تھوڑا سا فرق ہے۔ شطرنج میں ہر چال کے بارے میں تم جتنا عرصہ چاہو، سوچ سکتے ہو، وقت کی کوئی قید نہیں۔ ایک مزید فرق یہ ہے کہ شطرنج میں گھوڑے پیادے سے ہمیشہ طاقت ور ہوتے ہیں اور دو پیادے ایک پیادے پر بھاری ہوتے ہیں، جب کہ جنگ میں پائین بعض اوقات ڈریشن پر بھاری ہوتی ہے اور بعض اوقات کپنی سے مار کھا جاتی ہے۔ فوجوں کی باہمی قوت کے بارے میں یقین سے کبھی کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ میں تمہیں یقین دلانا ہوں، اس نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا: ”اگر حالات کا انحصار ان انتظامات پر، جو سٹاف طے کرتا ہے، ہوتا تو بجائے اس کے کہ میں یہاں رجنٹ میں خدمات سرانجام دیتا (اور مجھے ان حضرات کے ساتھ کام کرنے پر فخر ہے)، میں بھی وہیں ہوتا اور ان انتظامات میں ہاتھ بٹا رہا ہوتا، اور میں سمجھتا ہوں کہ کل کی لڑائی کا انحصار ہم پر ہوگا، نہ کہ ان پر۔۔۔ کامیابی کا انحصار انوائج کی تقسیم وترتیب، ہتھیاروں، بلکہ تعداد پر بھی، نہ کبھی رہا ہے، ورنہ کبھی ہوگا۔ پوزیشن پر تو شاید ہی کبھی رہا ہے۔“

”پھر اس کا انحصار کس چیز پر ہے؟“

”مجھے میں، ان میں اس نے تموخن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا، ”اور ہر جوان میں جو جذبہ ہے، اس پر۔“

ہیئر نے سرسری نگاہوں سے تموخن کی، جو بوکھلاہٹ اور دہشت زدگی کے عالم میں ٹنگی باندھے اپنے کمانڈر پر نظریں جمائے بیٹھا تھا، جانب دیکھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ پرنس آندرے اپنی سابقہ کم خشی اور چپ کے مقابلے میں اب جوش میں آچکا ہے۔ وہ خیالات، جنہوں نے اچانک اس کے ذہن پر یلغار کر دی تھی، ظاہر تھا کہ اب وہ ان کا نگاہ کیے بنارہے نہیں سکتا تھا۔

”لڑائی وہی فریق جیتتا ہے جس نے جیتنے کا تہیہ کر لیا ہو۔ ہمیں او سٹریٹس کی لڑائی میں کیوں شکست ہوئی؟ رائیسیوں کے زخمیوں اور ہلاک شدگان کی تعداد تقریباً اتنا ہی تھی جتنا کہ ہماری۔ لیکن دن ابھی آدھا بھی نہیں گزرا تھا کہ ہم نے اپنے آپ سے یہ کہنا شروع کر دیا کہ ہم ہار رہے ہیں۔ چنانچہ ہم ہار گئے۔ اور ہم یہ اس لیے کہہ رہے تھے کیونکہ ہمارے سامنے لڑائی کا کوئی مقصد نہیں تھا اور ہم حتیٰ، بلکہ مکان جہاز جہاز میدان جنگ سے چھٹکار حاصل کرنا چاہتے تھے۔ ہم ہار گئے ہیں۔ چلو، بھاگ چلیں؟ اور ہم بھاگ پڑے۔ اگر ہم نے شام تک زبانیں بند رکھی ہوتیں، پھر خدا معلوم اس لڑائی کا کیا انجام ہوتا۔ لیکن کل ہم یہ نہیں کہیں گے۔ تم ہماری تقسیم وترتیب کے متعلق باتیں کر رہے ہو۔ تمہارا خیال ہے کہ ہمارا میسرہ کمزور ہے اور ہمارا میسرہ ضرورت سے زیادہ دور تک پھیلا ہوا ہے، یہ سب نرکی کمواس ہے، اس کے کوئی معافی ہی نہیں نکلتے۔ لیکن کل ہمیں کس چیز کا سامنا ہے؟ دس کروڑ مختلف امکانات: جن کا فیصلہ موقع پر ہی ہو جائے گا کہ ہم دوڑتے ہیں یا دوڑتے ہیں، یہ شخص مار جاتا ہے یا وہ۔ لیکن اس وقت جو کچھ ہو رہا ہے، وہ نری تفریح ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جن لوگوں کی معیت میں تم نے آج نماز کا چکر لگا یا اور انوائج کی

تقسیم و ترتیب کا معائنہ کیا ہے، وہ نہ صرف یہ کہ معاملات میں مددگار ثابت نہیں ہو رہے بلکہ انارڈڈے اگلار ہے ہیں۔ انھیں بس، اپنے حلوے مانڈے سے غرض ہے۔“

”اس موقع پر ہیئر نے ناپسندیدگی کے لہجے سے کہا۔

”بالکل اس موقع پر،“ پرنس آندرے نے اس کے الفاظ دہراتے ہوئے کہا۔ ان کے خیال کے مطابق یہی تو موقع ہے جب حریف کے پاؤں تلے سے زمین کھسکا کی جاسکتی ہے یا انعام میں کوئی مزید تمغہ یا پٹی حاصل کی جاسکتی ہے۔ میرے نزدیک کل کا مطلب یہ ہے کہ یک ما کھ فرانسیزی اور ایک لا کھ روسی سپاہی جنگ کرنے کے لیے اکٹھے ہوئے ہیں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ ان دو لاکھ انسانوں کی جنگ ہوگی اور کامیابی اس فریق کے قدم چومے گی جو دوسرے کی نسبت زیادہ شدت سے لڑے گا اور اپنے آپ کو بچانے کی کم سے کم فکر کرے گا۔ اور اگر تم جانتا چاہو تو میں تمہیں بتا سکتا ہوں کہ خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہو اور وہ لوگ، جو چوٹی پر بیٹھے ہیں، خواہ کتنی ہی گز بڑ کیوں نہ کریں، کل کی لڑائی میں ہم ہی جیتیں گے، دنیا ادھر سے ادھر ہو جائے، کل کی لڑائی میں میدان ہمارے ہی ہاتھ رہے گا۔“

”یو برا کیسی لہجی، آپ صحیح فرماتے ہیں، سولہ آنے صحیح!“ تموخن نے زور دے کر کہا۔ ”اب اپنے آپ کو بچانے کی فکر کس کو ہے؟ یقیناً نہیں، میری بٹالین کے جوان دوڑ کا کو ہاتھ بھی لگانے کے لیے تیار نہیں! اب اس کا وقت نہیں رہا، وہ کہتے ہیں۔“

سب خاموش ہو گئے۔

افسران اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ پرنس آندرے ایجوٹ کو آخری احکام دیتا ان کے ساتھ ساتھ ان سے ہر چلا گیا۔ جب افسران چلے گئے، ہیئر کھسک کر پرنس آندرے کے قریب ہو گیا۔ وہ اس کے ساتھ گفتگو شروع کیا ہی چاہتا تھا کہ انھیں سائبون سے کچھ ہی دور سڑک پر تین گھوڑوں کے دوڑنے کی آواز سنائی دی۔ پرنس آندرے نے مڑ کر ادھر دیکھا اور اس نے دس ٹسگوں اور کلاؤس ٹس کو پہچان لیا۔ ان کے ساتھ ایک قازق تھا۔ وہ آپس میں باتیں کرتے جا رہے تھے۔ جب وہ پرنس آندرے اور ہیئر کے برابر سے گزرے جب بھی ان کی گفتگو جاری رہی۔ گفتگو کے کچھ حصے ان کے کانوں تک بھی پہنچ گئے۔

”جنگ خالص وسیع و عریض علاقے میں پھیلا دینا چاہیے۔ یہ سیران نقطہ نظر ہے درمیں اس کا پرچار کرتے کبھی نہیں چھوڑا گا،“ ان میں سے ایک جرمن میں کہہ رہا تھا۔

”چونکہ مقصد دشمن کو کمزور کرنا ہے، اس لیے (محاذ پھیلانے سے) عام شہری باشندوں کا جو نقصان ہوگا، اسے ملحوظ خاطر نہیں رکھا جاسکتا۔“

”بالکل نہیں!“

”جنگ خالص وسیع و عریض علاقے پر پھیلا دینا چاہیے،“ جب وہ گزر گئے پرنس آندرے نے غیظ و غضب سے نتھنے پھلا کر کہا۔ ان کے اس وسیع و عریض علاقے، میں میرا ایک باپ تھا، ایک بیٹا تھا، ایک بہن تھی، لیکن انھیں کیا،

ان کے لیے سب برابر ہے۔ یہی بات ابھی ابھی میں تم سے کہہ رہا تھا۔ یہ جرمن حضرت کل کی جنگ تو کیا جیتیں گے جہاں تک ان کے بس میں ہوا، الٹا گند ضرور مچا دیں گے، کیونکہ ان کے جرمن دماغوں میں صرف نظری باتیں بھری ہوئی ہیں، اور کچھ نہیں۔ اور یہ نظری باتیں بیکار محض ہیں اور کل جس چیز کی ضرورت ہے، ان کے قلوب اس سے خالی ہیں۔ لیکن وہ تم کو خن کے دل میں موجود ہے۔ انھوں نے سارا یورپ ہتھیلی پر رکھ کر اسے پیش کر دیا ہے اور اب ہمیں سبق پڑھانے چلے آئے ہیں۔ کیسے پائے کے اس تذہ ہیں 'واہ' اور ایک بار پھر اس کی آواز بجی ہوئی۔

"تو تمہارے خیال میں کل کی ٹرینی ہم جیتیں گے؟" پیئر نے دریافت کیا۔

"بالکل، بالکل؛" پرس آندرے نے بے دھیانی سے جواب دیا۔ "اگر میرے پاس اختیار ہوتا تو ایک کام ضرور کرتا،" اس نے پھر بولنا شروع کر دیا۔ "میں قیدی بنانے کا جھنجھٹ نہ پالتا۔ آخر قیدی بنانے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ یہ دو درختوں کے قصے ہیں۔ فرانسیسیوں نے میرے گھر کی اینٹ سے اینٹ بجا دی ہے اور اب وہ اسکو کو تخت و تاراج کرنے جا رہے ہیں۔ انھوں نے میرے ساتھ دست درازی کی ہے اور ہر لمحے میرے ساتھ دست درازی کیے جا رہے ہیں۔ وہ میرے دشمن ہیں۔ میرے خیال کے مطابق وہ سب خطا کار ہیں اور بالکل یہی سوچ تم کو خن اور باقی ساری فوج کی ہے۔ انھیں کیفر کردار تک پہنچانا ہی چاہیے ٹلرٹ میں خواہ کچھ ہی کیوں نہ کہا گیا ہو، چونکہ وہ میرے دشمن ہیں، وہ میرے دوست ہو ہی نہیں سکتے۔"

"اے ہاں، بالکل؛" پیئر نے چسکی آنکھوں سے پرس آندرے کو نگلی باندھ کر دیکھتے ہوئے کہا۔ "میں تم سے پوری طرح متفق ہوں!"

پیئر کو محسوس ہوا کہ وہ سوال جس نے اسے موڈ ایک پہاڑی پر اور بقیہ سارے دن پریشان کیے رکھا تھا، اب واضح طور پر اور پوری طرح حل ہو گیا ہے، اب اس جنگ اور پیش آئندہ معرکے کا مکمل مفہوم اور اہمیت اس کی سمجھ میں آ گئی ہے۔ اس نے اس روز جو کچھ دیکھا تھا اور گزرے گزرتے اس نے چہروں پر جن معنی خیز اور درشت تاثرات کا مشاہدہ کیا تھا، وہ سب اسے نئی روشنی میں نظر آ رہے تھے۔ ان تمام جوانوں میں جنہیں اس نے اس روز دیکھا تھا، اسے حب الوطنی کی جو دلی دلی حرارت (فرس کے علاقے کے بقول حرارت خفی) نظر آئی تھی، اب اس کے معانی اس پر روشن ہو گئے اور اسے معلوم ہو گیا کہ جس دل جمعی اور بظاہر خشکی کے ساتھ وہ موت کا سامنا کرنے کی تیاریاں کر رہے ہیں، اصل میں ہے کیا۔

"گر قیدی بنانے کا سلسلہ ترک کر دیا جائے،" پرس آندرے نے اپنا سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا، "تو صرف اسی سے جنگ کی ساری ہیئت تبدیل ہو جائے گی اور یہ اتنی سفاک نظر نہیں آئے گی جتنی کہ اب آتی ہے۔ موجودہ صورت میں ہم جنگ کے ساتھ محض آنکھیلیاں کر رہے ہیں۔ اور خباثت بس یہی ہے۔ دوسروں کو بس بتا رہے ہیں کہ ہم بڑے نور ہیر ہیں، فوج ہیں، کمزوروں پر ہاتھ نہیں اٹھاتے، بس زور آوروں سے لکر لیتے ہیں۔ اس قسم کی عالی ظرفی اور حساسیت اس خاتون کی، جس پر نہ بوج بھڑے کو دیکھ کر غشی طاری ہو جاتی ہے، عالی ظرفی اور

حسابیت سے مشابہ ہے۔ وہ اتنی شفیق اور نرم دل ہے کہ اس سے خون دیکھا نہیں جاتا، لیکن پھڑے کے گوشت کے قتلے، بھنے ہوئے ہوں یا تلے ہوئے، حرلے لے لے کر کھاتی ہے۔ یہ لوگ ہمیشہ جنگ کے قواعد و ضوابط، شجاعانہ رویے، امن کے جھنڈوں، زخموں پر رحم و کرم، وغیرہ وغیرہ کے ڈھول پیٹتے رہتے ہیں۔ یہ سب زبانی جمع خرچ ہے اور نری بکواس۔ میں نے 1805 میں شجاعانہ رویے اور امن کے جھنڈے دیکھے تھے۔ وہ ہمیں، درہم انھیں چکر دیتے رہے۔ وہ لوگوں کے گھروں میں لوٹ مار مچاتے ہیں، جعلی کرنسی چلاتے ہیں اور سب سے بدترین حرکت یہ کرتے ہیں کہ ہمارے بچوں اور باپوں کو شگینوں پر پروتے ہیں اور ڈھٹائی کا یہ عالم ہے کہ اس کے بعد جنگ کے قواعد و ضوابط پر عمل کرنے اور دشمن کے ساتھ عالی ظرفی برتنے کی باتیں کرتے ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ قیدی بنانے کا ڈھونگ ختم کر دیا جائے، مارا اور مہر جاؤ! جس قسم کے مصائب جھینے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں، گر کوئی دوسرا شخص... ”

پرنس آندرے، جس کا یہ خیال تھا کہ جس طرح انھوں نے سولنسک پر قبضہ کیا ہے، اگر وہ اسی طرح ماسکو پر قابض ہو جائیں، اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ اب ایک ایک کی اسے محسوس ہوا جیسے اس کے گلے کی رگیں سکڑ گئی ہوں اور اس نے اپنا استدلالی بیان ادھورا چھوڑ دیا، خاموشی سے ادھر ادھر متعدد چکر لگائے لیکن جب اس نے اپنی گفتگو کا دوبارہ آغاز کیا، اس کی آنکھیں بے تابی سے جگمگا رہی تھیں اور اس کے ہونٹ لرز رہے تھے۔

”اگر جنگ میں اس قسم کے شجاعانہ رویے، عالی ظرفی کی روایت نہ پڑتی، تو جس طرح ہم اب جنگ کرتے ہیں، کبھی نہ کرتے۔ ہم جنگ کا صرف اس وقت نام لیتے جب ہمیں یہ یقین ہوتا کہ یہی موت کے منہ میں جانا کچھ معنی رکھتا ہے۔ پھر جنگیں محض اس لیے نہ لڑی جاتیں کیونکہ پاؤں یوانچ نے میخائیل ایوانچ کی توہین کر دی تھی۔ پھر اگر موجودہ جنگ کی طرح کوئی جنگ لڑی جاتی، تو وہ سچ سنوں میں جنگ ہوتی اور سپاہیوں کا جوش و خروش بھی مختلف قسم کا ہوتا۔ پھر ویسٹ فالتی اور ہسے کے باشندے، جن کی پوین ہمارے خلاف قیادت کر رہا ہے، کبھی اس کے پیچھے پیچھے نہیں آتے اور نہ ہم، جب تک ہمیں یہ معلوم نہ ہو جاتا کہ کیوں، آسٹریا اور پرشیا جاتے۔ جنگ کسی شاندار نفرت کا نام نہیں، بلکہ یہ زندگی کی خبیث ترین چیز ہے ہمیں اس کی تفہیم کرنا چاہیے اور اسے بچوں کا کھیل نہیں بنانا چاہیے۔ ہمیں اس ہول ناک حقیقت کو فرزانگی اور بنجیدگی سے دیکھنا چاہیے۔ ان سب باتوں کا حاصل یہ ہے: ابد فریبی سے دامن چھڑائیں، جنگ کو جنگ رہنے دیں، اسے پھیڑ خوباں نہ بنائیں، جیسا کہ ہم اب کر رہے ہیں کہ یہ بیکاروں اور کم ظرفوں کی تفریح بن گئی ہے۔۔۔“

”جتنی قدر منزلت فوجی طبقے کی ہوتی ہے، کسی اور کی نہیں ہوتی۔ اور جنگ کیا ہے؟ جہل میں فتح و نصرت کے لیے کیا اور کار ہے؟ اور عسکری دنیا کے اخلاقی معیار کیا ہیں؟ جنگ کا مقصد و منشا قتل ہے⁶¹ اور اس میں جو ہتھیار استعمال ہوتے ہیں، وہ ہیں: جاسوسی، غداری، غداری کی ترکیب، فوج کی ضروریات پوری کرنے کے لیے لوٹ مار، غارت گری کے ذریعے ملک کے باشندوں کی تباہی و بربادی، چالبازی اور دھوکا دہی، جنھیں عسکری چالیں کہا جاتا ہے۔ عسکری دنیا کی، تباہی خصوصیات فقدان آزادی یا دوسرے غفلتوں میں لقمہ و ضبط کا ٹکچہ، بے شغلی جو زبردستی

ہادی جاتی ہے، جہالت، سفاکی اور بربریت، عیاشی اور بے خوری ہیں۔ لیکن ان سب امور کے باوجود یہ بلذریعہ طبقہ ہے اور سب اس کی عزت و توقیر کرتے ہیں۔ چینیوں کو چھوڑ کر باقی دنیا کے تمام امپراطور خود بھی فوجی وردی زیب تن کرتے ہیں اور اعلیٰ ترین اعزازات ان لوگوں کی، جنہوں نے زیادہ سے زیادہ انسانوں کو موت کے گھاٹ اتارا ہوتا ہے، جھولی میں ڈال دیتے ہیں۔

”وہ ایک دوسرے کو ہلاک کرنے کے لیے ایک دوسرے کے آمنے سامنے آتے ہیں۔ ہم بھی کل اسی طرح ایک دوسرے کے روبرو آئیں گے۔ وہ ہزاروں، ماکھوں انسانوں کو اجل کے حوالے کرتے ہیں۔ انہیں زندگی بھر کے لیے محذور بنا دیتے ہیں۔ کشتوں کے پستے (وہ تعداد بھی بڑھا چڑھا کر پیش کرتے ہیں) لگانے کے بعد دعائے شکر ادا کرتے ہیں اور فتح کے ڈنکے بجاتے ہیں۔ ان کا خیال یہ ہوتا ہے کہ وہ جتنے زیادہ لوگوں کو ہلاک کریں گے، اتنے ہی زیادہ نیک نام ہوں گے۔ سوچو، خداوند انہیں کیسے دیکھ اور سن سکتا ہے؟“ پرنس آندرے نے ٹیکھی اور کانوں کے پردے پھڑپھڑانے والی آواز میں چیختے ہوئے کہا۔ ”آہ، میرے دوست، حالیہ کچھ عرصے سے زندگی میرے لیے دال بن گئی ہے۔ مجھے نظر آرہا ہے کہ میں ضرورت سے کچھ زیادہ ہی سمجھنے بوجھنے لگا ہوں۔ نیکی اور ہدی کے درخت کا پھل کھانے سے آدمی کا کچھ بھلا نہیں ہوتا... آہ، خیر، یہ صورت حال زیادہ دیر رہنے کی نہیں!“ اس نے مزید کہا۔ ”تاہم تمہیں تو نیند آ رہی ہے۔ رات اتنی گزر چکی ہے کہ مجھے بھی جا کر سو جانا چاہیے۔ تم واپس گور کی چلے جاؤ!“ پرنس آندرے نے اچانک کہا۔

”ارے نہیں؟“ پیئر نے جواب دیا۔ اس کی آنکھوں میں رحم اور خوف و ہراس دونوں جھلک رہے تھے۔ ”تمہیں لازماً چلے جانا چاہیے۔ ٹرائی سے پہلے آدمی کو جی بھر کر سونے کی ضرورت ہوتی ہے، پرنس آندرے نے کہا۔ وہ تیزی سے پیئر کی جانب آیا، اس نے اسے سینے سے لگایا اور اس کا بوسہ دیا۔ ”خدا حافظ، اب جاؤ!“ اس نے چلا کر کہا۔ ”ہماری آئندہ ملاقات ہوگی یا نہیں...“ وہ جھٹ بٹ پیچھے ہٹا اور سائبان کے اندر چلا گیا۔

تاریکی چھا چکی تھی اور پیئر کو یہ اندازہ نہ ہوسکا کہ پرنس آندرے کے چہرے پر غصہ جھلک رہا ہے یا شفقت۔ وہ کچھ دیر چپ چاپ کھڑا رہا۔ وہ یہ فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا کہ اسے اس کے پیچھے پیچھے اندر چلے جانا یا وہاں سے واپس لوٹ آنا چاہیے۔ ”نہیں، وہ یہ نہیں چاہتا۔“ پیئر اس نتیجے پر پہنچا: ”لیکن میں جانتا ہوں کہ یہ ہماری آخری ملاقات ہے!“ اس نے گہری آہ بھری اور گھوڑے پر سوار واپس گور کی طرف چل دیا۔

سائبان کے نیچے پرنس آندرے دوری پر لیٹا ہوا تھا لیکن نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ اس کے تخیل میں ایک کے بعد دوسری تصویر آنے لگی۔ ایک تصویر کے بارے میں وہ بہت دیر تک سوچتا اور خوش ہوتا رہا۔ اسے پیئر بزرگ کی ایک شام بہت واضح انداز سے یاد آئی۔ شا شاید سے جوش و خروش اور شگفتگی سے اسے بتا رہی تھی کہ گزشتہ گریسوں کے دوران میں وہ کھنیاں

تلاش کرنے لگی تھی لیکن وسیع و عریض جنگل میں راستہ بھول گئی۔ وہ اسے گھنے جنگل، اپنے احساسات اور شہر کی کھیلوں کے رکھوالے سے، جس سے اس کی سرراہے ملاقات ہو گئی تھی، اپنی گفتگو کے بارے میں بے ربط انداز سے باتیں کر رہی تھی لیکن وہ گھڑی گھڑی یہ کہنے کے لیے کہ ”نہیں، میں نہیں بتا سکتی، میں ٹھیک طرح سے یہ قصہ بیان نہیں کر سکتی“ کہیں، آپ سمجھ نہیں رہے، ”خود ہی اپنا سلسلہ کلام منقطع کر دیتی حالانکہ پرنس آندرے اسے بار بار یقین دہا رہا تھا کہ وہ اس کی بات سمجھ رہا ہے اور اسے معلوم ہو چکا ہے کہ وہ اسے کیا بتانے کی کوشش کر رہی ہے۔ لیکن ساشا اپنے الفاظ سے مطمئن نہیں تھی۔ وہ یہ محسوس کر رہی تھی کہ اسے اس روز جس قسم کے شدید شاعرانہ جذبہ بات کا تجربہ ہوا تھا، وہ ان کی ارسر تو خلیق کرنا چاہتی ہے، لیکن الفاظ ہیں کہ اس کے قابو میں نہیں آ رہے اور جو کچھ وہ کہنا چاہتی ہے، اس کا مناسب طور پر بلاغ نہیں کر پار رہی۔ ”بڑے میاں جتنے پرکشش اور دل آویز تھے اور جنگل میں اتنی تاریکی تھی۔ اور بن کے چہرے پر اتنی کھلاوت تھی“ نہیں، میں صحیح طور پر بیان نہیں کر سکتی، ”اس نے کہا تھا اور اس کے ساتھ اس کا چہرہ دل لوں مال ہو گیا تھا۔ پرنس اب پھر اسی پر سرت انداز میں مسکرانے لگا جس طرح وہ تب مسکرایا تھا جب اس نے ساشا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا تھا۔ ”میں اس کی بات سمجھ گیا تھا،“ اس نے سوچا۔ ”میں نہ صرف اس کی بات سمجھ گیا تھا، بلکہ یہ اس کی باطنی اور روحانی قوت، اس کا خصوص، اس کا بھولپن اور معصومیت ہی تو تھی جس سے مجھے تپا پیر تھا اور میں اس پر جی جان سے قد ہو گیا تھا۔ کچھ یوں معلوم ہوتا تھا کہ اس کی یہ باطنی خوبیوں اس کے جسم کا ناگزیر جز ہیں چکی ہیں اور انہیں اس سے علیحدہ کرنا ناممکن ہے۔ اسی لیے میں اس سے محبت کرتا اور خوش ہوتا تھا۔“ اور یک لخت اسے یاد آیا کہ وہ کیا چیز تھی جس نے اس کی محبت کا گلا گھونٹ دیا تھا۔ ”اے ان چیزوں کی قطعاً کوئی پروا نہیں تھی، اسے اس طرح کی نہ کوئی چیز نظر آئی اور نہ وہ انہیں سمجھ سکا۔ اسے تو جو کچھ نظر آیا، وہ خوبصورت، صحت مند، تازہ رو، نوخیز و شیرازہ تھی،... جس کے ساتھ اس نے اپنے مقدر کو دبست کرنا اپنے شایان شاہ نہ سمجھ... اور میں؟... اور وہ ابھی تک زندہ ہے، درزندگی سے حظ ٹھارہا ہے!“

اور پرنس آندرے یوں بدک کر اٹھ کھڑا ہوا جیسے کھوتے پانی سے اس کا جسم جھلس گیا ہو اور وہ ایک بار پھر اپنے سابقان کے سامنے ادھر ادھر چکر کاٹنے لگا۔

باردورینو کی لڑائی سے ایک روز قبل 25 اگست کو فرانسیسی امپراطور کے محل کا منتظم موسیو ڈیوے (de Beausset) اور کرنل فابیر (Fabvier) میڈرڈ سے ویوے دو میں پولیس کے ہیڈ کو رٹرز پہنچے۔

درباری وردی پہنچنے کے بعد موسیو ڈیوے نے حکم دیا کہ وہ امپراطور کے لیے جو بکس لایا ہے، وہ اس کے پاس لایا جائے، ”اور وہ پولیس کے خیمے کے بیرونی کمرے میں چھا گیا۔ وہاں وہ بکس کھولنے میں مصروف ہو گیا اور اس

• یعنی لاطول کوراگن

کے ساتھ ساتھ نیوین کے بیڈی کانگوں سے، جنہوں نے اس کے ارد گرد گھیرا ڈال دیا تھا، باتیں کرنے لگا۔
فیوئر خیمے سے باہر ہی رہا اور اپنی جان بچان کے چند جرنیوں کے ساتھ گپ شپ لڑاتا رہا۔

اس پر اطور نیولین ابھی تک اپنی خواب گاہ سے باہر نہیں آیا تھا۔ وہ نہلائی دھلائی سے فارغ ہو رہا تھا۔ ہلکے پھلکے انداز سے کھنکھرتے اور ناک بھیج کر دوازیں نکالتے اس نے پہلے پنی کمر اور بعد میں اپنے زبرد گرد زاروں سے بھرا ہوئے برش کے، جس سے اس کا ذاتی خدمت گار اس کے جسم کی رگڑائی کر رہا تھا، آگے کر دیا۔ ایک اور خدمت گار بوتل کے دبائے پر انگلی رکھے امپر طور کے بدن پر، جس کے اتنے ناز اٹھائے جاتے تھے، یوڈی کلون چھڑک رہا تھا۔ اس کے چہرے کے تاثرات سے یہ سترج ہو رہا تھا کہ صرف وہی جانتا ہے کہ یوڈی کلون کہاں اور کتنا استعمال کرنا ہے۔ نیولین کے چہرے نے اور پانی سے تر و لمیدہ بل اس کی پیشانی اٹھائے ہوئے تھے، تاہم اس کے چہرے سے، جو اگرچہ پیلا اور پھولا پھالا تھا، یہ عیاں ہو رہا تھا کہ وہ جسمانی طور پر بالکل شانت ہے۔

”کرتے رہو، ذرا اور زور سے، کرتے رہو!“ اس نے اپنے خدمت گار سے، جو اس کے جسم پر برش پھیر رہا تھا، غرا کر کہا، اور اس کے جسم کی رگیں تن گئیں۔

ایک ایڈی کانگ، جو اسے یہ بتانے آیا تھا کہ گزشتہ روز کے معرکے میں کتنے، شخصوں کو قیدی بنایا گیا تھا، اپنا پیغام پہنچانے کے بعد دروازے کے قریب کھڑ واپس جانے کی اجازت کے ملنے کا انتظار کر رہا تھا۔ نیولین نے برا سر مٹھ دیا اور تھرا آلودنگاہوں سے اس کی جانب دیکھا۔

”کوئی قیدی دیدی نہیں!“ اس نے بیڈی کانگ کے الفاظ دہراتے ہوئے کہا۔ ”وہ ہمیں مجبور کر رہے ہیں کہ ہم انہیں صفحہ ہستی سے مٹا دیں۔ ہمیں کیا، بیڑا تو روسی فوج کا ہی غرق ہوگا... کرتے جاؤ، ذرا اور زور لگاؤ۔ اور زور لگاؤ!“ اس نے اپنی کمر جھکاتے اور اپنے فریب کندھے خدمت گار کے سامنے کرتے ہوئے کہا۔ ”بہت چھا۔“
سیویڈیوس اور فیوئر کو یہیں بلا لو،“ اس نے اپنی گردن کو خم دیتے ایڈی کانگ سے کہا۔

”بہت اچھا، عالی جاہ!“ ایڈی کانگ نے جواب دیا اور خیمے کے دروازے میں غائب ہو گیا۔
دونوں خدمت گاروں نے پھرتی سے ہر سیمپٹی کو گارڈز کی نیلی وردی پہنائی اور نیولین مضبوط اور تیز قدم اٹھانا مستحالیہ میں چلا گیا۔

دو دریں اثنا ڈیوس دروازے کے بالکل سامنے دو کرسیوں پر وہ تحائف، جو امپر اطورہ نے بھیجے تھے، بھجوا رہا تھا لیکن نیولین نے لباس تبدیل کرنے اور باہر جانے میں اتنی تیزی دکھائی کہ ڈیوس کو اتنا وقت ہی نہ ملا کہ وہ تحائف کی ٹھیک طرح آرائش کر سکتا اور یوں اسے حیران کر سکتا۔

نیولین آناٹا بھانپ گیا کہ ان تحائف کا مقصد کیا ہے اور اسے یہ بھی اندازہ ہو گیا کہ انہیں ابھی تک ترتیب نہیں دیا جاسکا۔ انہیں اسے حیران کر کے جو خوشی ہوتی، وہ انہیں اس سے محروم نہیں کرنا چاہتا تھا، چنانچہ اس نے جھوٹ موٹ یہ خطا ہر کیا کہ اس نے ڈیوس کو دیکھا ہی نہیں اور اس نے اشارے سے فیوئر کو اپنے پاس بلا لیا۔

یورپ کے دوسرے کنارے سٹامباٹا میں اس کی فوجیں جس دلیری اور جاہ شہری سے جنگ کر رہی تھیں، فوئیر اس کے بارے میں اسے رپورٹ پیش کر رہا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا کہ اس کے سپاہیوں پر ایک ہی دھن سوار ہے کہ وہ اپنے امیرا طور کا دل موہ سکیں لیکن ان کے قلوب میں یہ خوف سما یا ہوا ہے کہ وہ کہیں اسے خوش کرنے میں ناکام نہ ہو جائیں۔ وہاں جو جنگ ہوئی تھی، اس کا نتیجہ حوصلہ افزا نہ تھا۔ فوئیر کے بیان کے دوران میں نیولین طنزیہ جملے کستار ہا جیسے وہ اسے یہ جتنا چاہتا ہو کہ اسے یہ قطعاً توقع نہیں تھی کہ اس کی عدم موجودگی میں حالات یوں دگرگوں ہو جائیں گے۔

”مجھے اس کی تلافی ماسکو میں کرنا ہوگی،“ نیولین نے کہا۔ ”میں بعد میں تم سے ملاقات کروں گا۔“ اور اس نے ڈیوسے کو اپنے پاس بلایا۔ ڈیوسے جس چیر سے نیولین کو حیراں کرنا چاہتا تھا، وہ اس دوران میں اس کی تیاری مکمل کر چکا تھا۔ وہ دونوں کرسیوں پر یکسر رکھ اور ڈھانپ چکا تھا۔

ڈیوسے جس طرح کورٹش بجالایا وہ صرف سابقہ شاہی خاندان یوگ یوں کے مصاحبین ہی بجا لانا جانتے تھے۔ پھر وہ آگے بڑھا اور اس نے نیولین کی خدمت میں ملقوف خط پیش کر دیا۔

نیولین اس کی طرف متوجہ ہوا اور اس نے دل لگی سے اس کا کان ایٹھ دیا۔

”تم بہت جلد پہنچے ہو، تم سے مل کر بہت خوشی ہوئی ہے۔ خیر، پیرس میں کیا ہو رہا ہے؟“ اس نے پوچھا اور ایکایکی اس کے چہرے سے سابقہ خشونت کا نور ہو گئی اور اس کی جگہ گرم جوشی کا اظہار ہونے لگا۔

”عالی جاہ، سارا پیرس آپ کی عدم موجودگی پر ملول اور اداس ہے،“ ڈیوسے نے جواب دیا اور یہی سوز وں جواب تھا۔

اگرچہ نیولین جانتا تھا کہ ڈیوسے نے یہی یا اس سے ملتی جلتی بات ہی کہنا تھی، اور اگرچہ ان اہل لمحات کے دوران میں، جب اس پر عقل و دانش کا غلبہ ہوتا تھا، اسے معلوم ہوتا تھا کہ ڈیوسے نے جو کچھ کہا ہے، وہ درست نہیں ہے، لیکن اس وقت وہ اس کی بات سن کر خوشی سے پھولے نہ سمایا۔ اس نے ایک بار پھر ڈیوسے کے کان مردڑ کر اس کی عزت افزائی کی۔

”مجھے افسوس ہے کہ میں نے تم سے اتنا لمبا سفر کرایا۔“

”عالی جاہ، مجھے تو قطعاً تھی کہ ماسکو سے ادھر آپ کہیں نہیں ملیں گے،“ ڈیوسے نے جواب دیا۔

نیولین مسکرایا۔ اس نے بے دھیانی سے اپنا سر اٹھا یا اور دائیں طرف دیکھا۔ ایک ایڈی کا تنگ نسوار کی طوائی ڈبیا اٹھائے دے پاؤں تیزی سے آگے بڑھا اور اس نے اسے اس کی خدمت میں پیش کر دیا۔ نیولین نے ڈبیا پکڑ لی۔

”ہاں، تم بڑے خوش قسمت ہو کہ تمہارا کہا پورا ہو گیا ہے،“ اس نے نسوار کی کھلی ڈبیا ناک کے آگے لائے ہوئے کہا۔ ”تمہیں سفر کا شوق ہے اور تم نین دنوں میں ماسکو دیکھ لو گے۔ تمہیں غائبانی دارالحکومت دیکھنے کی

واقع نہیں تھی۔ تمہارے لیے یہ خوشگوار تقریبی دور ہوگا۔“

(بوسے کے سفر کے شوق) جس کا اسے اس وقت تک خود کوئی اندازہ نہیں تھا) پر جو یوں توجہ فرمائی گئی، اس پر وہ بطور شکر یہ دوبارہ کورنش بجا لایا۔

”افادہ، یہ ہمارے لیے کیا مائے ہوتا؟“ نیولین نے دریافت کیا۔ وہ یہ دیکھ چکا تھا کہ اس کے درباریوں کی نظروں کی ڈھکی ہوئی چیز پر مرکوز ہیں۔

اپنی پشت، سپر طور کی جانب کیے بغیر دوسرے درباری پھرتی کے ساتھ دو قدم پیچھے ہٹا، تھوڑا سا مڑا اور اس نے ہلکے جھپکنے میں سرپوش پرے ہٹا دیا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے با آواز بلند کہا:

”یورینجی کے لیے امپراطور کا تحفہ۔“⁶³

یہ ایک بچے کی تصویر تھی۔ یہ بچہ نیولین اور اس کی دوسری بیوی کے، جو آسٹریا کے امپراطور کی دختر تھی، ہیں تو لڑ ہوا تھا۔ اسے ہر شخص بلا سبب ”شاہِ روم“ کہتا تھا۔ اس کی تصویر (فرانسیسی مصور) بیچارے نے بنائی تھی اور اس کے رنگ بہت شوخ تھے۔ تنہا بچہ بے حد خوبصورت تھا، اس کے ہاں گھونگھریالے تھے اور اس کی آنکھیں حضرت مریم کی اس تصویر کے، جو پوپ سکسٹس چہارم نے بنوائی تھی، شیرخوار مسیح کی آنکھوں سے مشابہ تھیں۔ اسے تصویر میں گیند اور چھتری سے کھیلنے دکھایا گیا تھا۔ گیند کرۂ ارض اور چھتری عصا کی علامت تھی۔

تصویر میں مصور نے نام نہاد شاہِ روم کو جس طرح کرۂ ارض پر چمید کر کے اسے چھتری پر اٹھاتے دکھایا تھا، اگرچہ یہ پوری طرح واضح نہیں تھا کہ اس کا مقصد کیا ہے، لیکن ہر اس شخص کی طرح، جس نے یہ تصویر چہرے میں دیکھی تھی، نیولین کو بھی یہ بالکل قابل فہم اور انتہائی دلچسپ نظر آرہی تھی۔

”شاہِ روم“ وہ تصویر کی طرف باوقار اور پر تمکین انداز سے اشارہ کر کے پکارا تھا۔ ”واہ واہ! سبحان اللہ! کیا بات ہے۔“

ہر اطالوی کی طرح نیولین میں بھی یہ خدا واد ملکہ موجود تھا کہ وہ جب جی چاہتا نہایت آسان سے اپنے چہرے کے تاثرات تبدیل کر لیتا۔ چنانچہ وہ تصویر کی طرف بڑھا اور اس کے چہرے پر متکبرانہ لماعت چھا گئی۔ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ وہ اس موقع پر جو کچھ بھی کہے گا اور کرے گا، اسے تاریخی اہمیت حاصل ہو جائے گی اور اس کے دل میں خیال آیا کہ بہترین کام جو وہ کر سکتا ہے یہ ہے کہ وہ اس سے بالکل عام قسم کی پدری شفقت کا اظہار کرے (حالانکہ اس کے رعب و جفا کا یہ عالم تھا کہ اس کا شیرخوار بچہ بھی کرۂ ارض کے ساتھ گیند اور چھتری کا کھیل سکتا تھا)۔ شدت جذبات سے اس کی آنکھیں نم ہاںک ہو گئیں۔ وہ آگے بڑھا، اس نے کرسی کی تلاش میں ادھر ادھر دیکھا (کہیں سے ایک کرسی، جیسے خود بخود، اس کے نیچے آگئی) اور وہ تصویر کے سامنے بیٹھ گیا۔ اس کے واحد اشارے پر تمام افسرانِ پنوں کے بل چلتے کمرے سے باہر نکل گئے اور عظیم آدمی کو اپنے جذبات سے بچنے کے لیے تنہا چھوڑ گئے۔ وہ کچھ دیر یونہی بیٹھا رہا۔ پھر اس نے کیوس کے کھردرے روشن حصوں پر انگلی پھیری۔ کیوں؟ یہ وہ خود بھی

نہیں جانتا تھا اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے ڈیو سے اور ڈیوٹی افسر کو آؤ زدی۔ اس نے حکم دیا کہ وہ تصویر باہر سے جائیں اور اس کے خیمے کے سامنے رکھ دیں تاکہ وہاں متعین گارڈ ”شاہِ روم“ اور اپنے محبوب امپراطور کے فرزند بلند اور جانشین کا دیدار کرنے کی سعادت سے محروم نہ رہیں۔

Vive l'Empereur! Vive le roi de Rome! Empereur

کے پر جوش نعروں سے گونج اٹھی۔

ناشتے کے بعد نیپولین نے ڈیو سے کی موجودگی میں فوج کے نام فرمانِ یوم لکھو دیا۔ ”مختصر لیکن بلند!“ اس نے اس اعلان کو، جو اس نے فی البدیہہ لکھوایا تھا اور جس میں اس نے کسی قسم کی ترمیم و تصحیح نہیں کی تھی، پڑھتے ہوئے کہا۔ اس کا متن درج ذیل ہے۔

”جوانو، اس لڑائی کی رز دھمیں بہت دنوں سے تھی۔ فتح کا انحصار تم پر ہے۔ ہمارے لیے یہ از بس ضروری ہے۔ اس سے ہمیں وہ سب کچھ۔ آرام و رہائش گاہیں اور اپنے وطن جلد واپسی۔“ جس کی ہمیں ضرورت ہے، مل جائے گا۔ اپنے فرائض بالکل اسی طرح جس طرح تم نے اسٹریٹس، فریڈلٹ ⁶⁵، ویتسک اور سولنسک میں ادا کیے تھے، بجاؤ۔ ایسے ایسے کارنامے سرانجام دو کہ آنے والی نسلیں بڑے فخر سے ان کا ذکر کیا کریں۔ خدا کرے کہ تم میں سے ہر ایک کے متعلق یہ کہا جاسکے۔ اس شخص نے ماسکو کے دروازوں پر عظیم لڑائی میں حصہ لیا تھا۔“

”ماسکو!“ نیپولین نے دہرایا۔ اس نے موسیو ڈیو سے کو، جو سفر کا اتنا شوقین تھا، اپنے ساتھ چلنے کی دعوت دی۔ وہ خود اٹھا اور ادھر ادھر گھوڑے کھڑے تھے اور جن پرزہیں کسی جا چکی تھیں، قدم بڑھانے لگا۔

”یوٹر بچشی، آپ بے حد شفیق اور کریم ہیں!“ امپراطور نے ڈیو سے کو اپنے ساتھ چلنے کی جو دعوت دی تھی، اس نے اس کے جواب میں کہا۔ یہ الگ بات ہے کہ نیند سے اس کی آنکھیں بو جھل ہو رہی تھیں اور وہ سونا چاہتا تھا۔ اسے ڈھنگ سے سواری کرنا بھی نہیں آتا تھا ورنہ ایسے گھوڑوں سے اس کی جان جاتی تھی۔

لیکن نیپولین مسافر کو سر سے اشارہ کر چکا تھا اور ڈیو سے کو مجبوراً گھوڑے پر سوار ہونا پڑا۔ جب نیپولین خیمے سے باہر آیا، اس کے بیٹے کی تصویر کے سامنے گارڈ کے نعرے اور بھی بلند ہو گئے۔

”اسے اٹھا کرے جاؤ!“ اس نے شاہانہ وقار سے تصویر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”ابھی اس کی عمر اتنی چھوٹی ہے کہ اسے میدانِ جنگ کی ہوا نہیں لگنا چاہیے۔“

ڈیو سے نے گہری سانس لی، آنکھیں بند کیں اور اپنا سر جھکا دیا۔ یہ اس امر کی علامت تھی کہ وہ امپراطور

سے الفاظ سمجھتا ہے اور ان کا احترام کرتا ہے۔

27

نپولین کے مورخین کے مطابق اس نے 25 اگست کا سارا دن گھوڑے کی پشت پر گزارا۔ وہ علاقے کا معائنہ اور اس کے ارشلوں نے اسے جو منصوبے پیش کیے تھے، ان کا مطالعہ کرتا رہا اور ذاتی طور پر جرنیلوں کو حکام دیا رہا۔ روسیوں نے دریائے کالوچا کے ساتھ ساتھ اپنی فوجوں کو جس انداز سے ترتیب دیا تھا، جو جس تاریخ کو شیوارڈینو کا مورچہ ہاتھ سے نکل جانے کے بعد اس میں رخسہ پیدا ہو گیا تھا اور فوج کا کچھ حصہ۔ میسرہ۔ پیچھے ہٹا لیا گیا تھا۔ کچھ علاقے میں مورچے اور دہرے تعمیر نہیں کیے جاسکے تھے اور نہ وہاں دریا کی آزمیہ تھی۔ دوسرے علاقوں کی نسبت وہاں زمین زیادہ کھلی اور ہموار تھی۔ فوجی اور غیر فوجی، ہر شخص پر یہ بات بالکل واضح تھی کہ فرانسیسی حملے کا زور اسی علاقے میں ہونا چاہیے۔ آرمی کے دل میں یہی خیال آتا ہے کہ اس نتیجے پر پہنچنے کے لیے اپر اطور اور اس کے ارشلوں کو نہ کوئی خاص سوچ بچار کرنے اور نہ کوئی خاص کوشش یا تردد کرنے کی ضرورت تھی۔ اور وہی وہ مخصوص اور بلند ذہنی صلاحیت، جسے جینیئس (genius) کہا جاتا ہے اور جسے لوگ نپولین سے منسوب کرنے کی طرف مائل رہتے ہیں، اس کی توقع ضرورت نہیں تھی۔ اس کے باوجود ان مورخین نے، جنہوں نے اس واقعے کو بیان کیا، ان لوگوں نے، جنہوں نے اس وقت اس کے ارد گرد گھیراؤ ال رکھا تھا اور اس نے خود بھی قطعی مختلف انداز سے سوچا۔ نپولین نے گھوڑے پر پھر میدان کا چکر لگایا، عیسیت سوچ بچار کے ساتھ علاقے کا جائزہ لیا۔ کبھی دو ٹنگ اور کبھی پسندیدگی کا اظہار کرنے کے لیے اپنے سر کو جنبش دیتا۔ اپنے فیصلوں پر پہنچنے کے لیے اس نے دل ہی دل میں جو استدلال کے زبردست انبار لگائے تھے، اس نے اپنے جرنیلوں کو، جو اس کے ہم رکاب تھے، ان کے متعلق کچھ نہ بتایا۔ اس نے بس احکام کی صورت میں انہیں اپنے فیصلوں سے آگاہ کر دیا۔ جب داؤد نے، جسے اب پرنس آف ایک موئل کہا جاتا تھا، تجویز پیش کی کہ روسیوں کے میسرے کو الٹ پلٹ دیا جائے، نپولین نے جواب دیا: ”نہیں، ایسا کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔“ لیکن اس نے یہ نہ بتایا کہ ایسا کیوں نہ کیا جائے۔ اس کے برعکس جب جنرل کومپان (Compans) نے، جسے ”تیرنا“ دہمسوں پر حملہ کرنا تھا، بتایا کہ وہ اپنا ڈویژن جنگل میں سے گزارا کر لے جائے گا، حالانکہ ڈیوک آف ایلیچی ٹگاں⁶⁶ نے دہی دہی زبان سے کہا بھی کہ اس طرح جنگل میں سے گزرنا خواہ تو وہ خطرات سول لینے کے مترادف ہے اور اس سے فوجوں کی ترتیب میں رخسہ پڑ سکتا ہے، نپولین نے اس کے منصوبے کو منظور کر لیا۔

شیوارڈینو کے مورچے کے سامنے علاقے کا معائنہ کرنے کے بعد نپولین کچھ دیر ساکت و صامت غور فکر کرتا رہا۔ پھر اس نے دو مقامات کی طرف ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ اگلے روز روسی مورچوں پر بم باری کرنے کے لیے وہاں دو بیٹریاں تعینات کر دی جائیں اور اس نے ان کی سیدھ میں ان جگہوں کی بھی، جہاں فیلڈ آرٹلری

نصب کیا جانا تھا، نشان دہی کر دی۔

یہ اور دوسرے احکام صادر کرنے کے بعد وہ اپنے خیمے میں واپس آ گیا اور لڑائی میں فوج کو جس طرح ترتیب دیا جانا تھا، اسے اسی طرح تحریر کیا گیا جس طرح کہ اس نے لکھوایا۔

یہ ترتیب، جس کا ذکر فرانسیسی مورخین فریڈرک سے جھوم جھوم کر اور دوسرے انتہائی حرام سے کرتے ہیں، مندرجہ ذیل تھی:

پو پھٹنے پر دو نئے توپ خانے (آرٹری)، جو رات کے دوران میں پرنس آف ڈیک مول کے زیرِ قبضہ میدان میں نصب کیے جائیں گے، مخالف سمت میں غنیم کے دو توپ خانوں پر گولہ باری کریں گے۔

اسی وقت پہلی کور کے توپ خانے کا کمانڈر جنرل پھیٹی، جنرل کوپاں کی ڈویژن کی تیس بجنا لوں، جنرل دیے (Desaix) اور جنرل فغیاں (Fiant) کی ڈویژنوں کی تمام ہودنروں (nowitzers) کو لے کر آگے بڑھے گا، فائرنگ کھوے گا اور غنیم کے توپ خانے (بیٹری) پر گولے برسائے گئے گا۔ یوں دشمن کی اس بیٹری کے خلاف حملے میں مندرجہ ذیل مصروف کار ہوں گی۔

گارڈز کی آرٹری کی چوبیس توپیں

کوپاں کی ڈویژن کی تیس توپیں

فغیاں اور دیے کی ڈویژنوں کی آٹھ توپیں

کل تعداد: باسٹھ توپیں

تیسری کور کی آرٹری کا کمانڈر جنرل فوشے (Fouche) تیسری اور آٹھویں کور کی ہودنریں، جن کی تعداد سولہ تھی، اس بیٹری کے، جس نے بائیں بازو کے سورچوں اور دھمکوں پر گولہ باری کرتا ہے، پہلوؤں پر نصب کرے گا۔ یوں اس بیٹری میں چالیس توپیں اور ہودنریں شامل ہو جائیں گی۔

جنرل سوٹیے (Sorblie) پوری طرح تیار ہو گا اور جو تھپی حکم نامہ کا پہلا لفظ اس کے کانوں تک پہنچا، وہ گارڈز کی آرٹری کی تمام ہودنروں کے ساتھ غنیم کے سورچوں اور دھمکوں کی کسی ایک قطار پر چڑھائی کر دے گا۔

گولہ باری کے دوران میں پرنس پونیا تو سکی⁶⁷ جنگل میں سے گزرتا گاؤں کی طرف پیش قدمی کرے گا اور غنیم کی پوزیشن کو تھس تھس کر دے گا۔

جنرل کوپس جنگل میں سے آئے گا اور مورچے نمبر 1 پر قبضہ کر لے گا۔
کارروائی کا آغاز مندرجہ بالا خطوط پر ہوگا، بعد ازاں تقسیم کی حرکات و سکنات کے مطابق مزید احکام جاری کیے جائیں گے۔

جونہی مچنے کی توپوں کی آواز سنائی دے گی، میسرے کی توپیں گولے برسانا شروع کر دیں گے۔ موغان (Morand) کی ڈویژن اور وائسرے کی ڈویژن کے ماہر نشانچی جونہی یہ دیکھیں گے کہ میسرے کا حملہ شروع ہو گیا ہے، وہ زبردست فائرنگ کرنے لگیں گے۔

وائسرے گاوڑوں پر قبضہ کرے گا، اس کے تین پلوں پر اپنی سپاہ گزارے گا اور جس پہاڑی پر موغان اور بیخاغ (Gerard) کے ڈویژن تعینات ہیں، وہاں تک پیش قدمی کرے گا اور پھر یہ سب اس کی کمان میں مورچے کی طرف بڑھیں گے اور فوج کے باقی دستوں کے برصطف بندی کر لیں گے۔

اور یہ سب کچھ نظم و ضبط سے کیا جائے اور جہاں تک ممکن ہو، دستوں کو خواہ مخواہ لڑائی میں نہ جھونکا جائے بلکہ انھیں بطور محفوظ روکے رکھا جائے۔

شاہی کمپنیز میوزیک
1812⁷⁰ چھ تبھر

اگر آدمی پولیس کی عبقریت سے مرعوب نہ ہو تو فوجوں کی یہ تقسیم و ترتیب انتہائی ڈولیدہ اور گجھلک نظر آئے گی۔ یہ ترتیب چار نکات یا چار احکام پر مشتمل تھی۔ ان میں سے کسی ایک پر بھی نہ تو عمل ہوا اور نہ ہو سکتا تھا۔ اس تقسیم و ترتیب میں یہ کہا گیا کہ

نمبر 1: پولیس کے منتخب کردہ مقامات پر جو بیٹریاں نصب کی جانا تھیں، ان کے برابر ہائل سیدھ میں پھنسی اور فوٹے نے اپنی توپیں گاڑنا تھیں۔ ان تمام توپوں کی کل تعداد ایک سو دو بنتی تھی۔ ان سب نے روسیوں کے 'تیر نما' دم سوں پر گولی باری کرنا تھا۔ ایسا نہیں ہو سکتا تھا کیونکہ پولیس نے جو مقامات منتخب کیے تھے، وہاں سے گولے روسیوں کے دم سوں تک پہنچ ہی نہیں سکتے تھے اور یوں ایک سو دو توپوں سے جو گولہ باری کی گئی وہ بیکار ثابت ہوئی۔ وہ سوڑ بھی نہیں جب نزدیک تریں کمانڈر نے انھیں پولیس کے احکام کے علی الرغم آگے بڑھا دیا۔

حکم نمبر 2: یہ تھا کہ پوینا تو سکی جنگل میں سے گزرتا گاؤں کی جانب پیش قدمی کرے گا اور روسیوں کے میسرے کو تھس نہیں کر دے گا۔ ایسا نہ ہو سکتا تھا اور نہ ہوا کیونکہ جب پوینا تو سکی جنگل میں سے گزرتا گاؤں کی جانب پیش قدمی کرنے لگا، اس کا سامنا خچ کوف سے ہو گیا۔ روسی جنرل نے اس کا راستہ روک لیا۔ یوں وہ روسی پوزیشن کو تھس نہیں کر سکتا تھا اور نہ وہ اس سے ہرتی۔

حکم نمبر 3 کے مطابق جنرل کوہپاں نے جنگل میں سے گزر کر نمبر ایک مورچے پر قبضہ کرنا تھا۔ جنرل کوہپاں اس مورچے پر قابض نہ ہو سکا بلکہ اسے پیچھے دھکیل دیا گیا کیونکہ جب وہ جنگل سے باہر آیا، اسے گریپ شٹ فائرنگ کا سامنا کرنا پڑا اور اسے از سر نو اپنی صفیں ترتیب دینا پڑیں۔ نیولین کو اس بارے میں کچھ علم نہیں تھا۔

حکم نمبر 4 میں یہ کہا گیا تھا کہ وائسرائے گاؤں پر قبضہ کرے گا، اس کے تینوں پلوں پر سے اپنی سپاہ گزارے گا اور اس حد تک پہاڑی پر پیش قدمی کرے گا کہ وہ موغاں اور بیخاغ (جن کی حرکات و سکنات کے بارے میں کوئی ہدایات نہیں دی گئی تھیں) کے ڈویژنوں کی سیدھ میں آجائے۔ پھر یہ تمام ڈویژن اس کی زیر قیادت ریلیف سکی مورچے پر حملہ کریں گے اور باقی لشکر کی سیدھ میں آجائیں گے۔

جہاں تک آدمی کا دماغ کام کرتا ہے، جو بات سمجھ میں آتی ہے۔ یہ بات گجنگ عبارت سے اتنی واضح نہیں ہوتی جتنی ان کوششوں سے ہوتی ہے جو وائسرائے نے ان احکام کی، جو اسے ملے تھے، تعمیل میں کی تھیں۔ وہ یہ ہے کہ وائسرائے کو بائیں طرف سے گاؤں میں سے گزر کر (شیو روڈینو کے) مورچے تک پہنچنا تھا جبکہ موغاں اور بیخاغ کو بیک وقت محاذ سے پیش قدمی کرنا تھی۔

تقسیم و ترتیب کے دوسرے نکات کی طرح اس پر بھی نہ عمل ہو سکتا تھا اور نہ ہوا۔ وائسرائے بارودینو میں سے تو گزر گیا، لیکن وہاں سے اسے دریائے کاوچا تک پیچھے دھکیل دیا گیا اور وہ پیش قدمی نہ کر سکا۔ موغاں اور بیخاغ کے ڈویژن بھی مورچے پر قبضہ نہ کر سکے بلکہ انھیں سپا کر دیا گیا۔ رائیف سکی مورچے پر صرف لڑائی کے بالکل آخر میں قبضہ نہ ہو سکا اور وہ بھی گھڑ سو روستے نے کیا۔ (اس حملے کے بارے میں نیولین نے غالباً نہ تو کچھ سوچا تھا اور نہ اس کے متعلق اسے کوئی اطلاع ملی۔) چنانچہ تقسیم و ترتیب کے کسی بھی حکم پر نہ تو عمل ہوا اور نہ ہو سکتا تھا۔ تقسیم و ترتیب کے اعلان میں یہ بھی کہا گیا تھا کہ کارروائی کا آغاز مندرجہ بالا خطوط پر ہوگا، بعد ازاں ٹیم کی حرکات و سکنات کے مطابق مزید احکام جاری کیے جائیں گے۔ اس سے شاید یہ نتیجہ اخذ کر لیا جائے کہ لڑائی کے دوران میں تمام اقدامات نیولین ہی نے کرنا تھے لیکن ایسا نہیں ہوا اور نہ ہو سکتا تھا کیونکہ لڑائی کے سارے عرصے کے دوران میں نیولین اتنا دور تھا کہ (جیسا کہ بعد ازاں معلوم ہوا) اسے یہ علم ہو ہی نہیں سکتا تھا کہ لڑائی کیا رخ اختیار کرے گی اور معرکے کے دوران میں اس کے ایک حکم کی بھی تعمیل نہ ہو سکی۔

متعدد مورخین دعویٰ کرتے ہیں کہ فرانسیسی بارودینو کی لڑائی جیتنے میں اس لیے ناکام رہے کیونکہ نیولین کو زکام ہو گیا تھا اور اگر اسے زکام نہ ہوا ہوتا، اس نے لڑائی سے قبل اور لڑائی کے دوران میں جو احکام دیے، ان سے اس کی

• بعد میں یہ مورچہ (redoubt) رائیف سکی مورچے کے نام سے مشہور ہوا۔ اسی جگہ کے باب نمبر 23 کا پہلا پیرا اور باب نمبر 21 کا درمیانی حصہ دیکھیں۔ فرانسیسیوں نے بعد میں اس کا نام la fatale redoute (خونی مورچہ) رکھا۔ (مترجم)

مہقریت کا مزید ثبوت فراہم ہوتا، روس کی اینٹ سے اینٹ بچ جاتی اور دنیا کا نقشہ روز بروز ہوجاتا۔ وہ مورخین، جو اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ روس نے جو شکل و صورت اختیار کی ہے، وہ فرد واحد۔ پیٹر اعظم⁷¹۔ کے منشاء مرضی کے مرہون منت ہے اور وہ، جن کا ایمان یہ ہے کہ فرانس کی یہ جو کایا کلپ ہوئی کہ وہ ری پبلک (جمہوریہ) سے اس پر طور بن گیا اور فرانسیسی افواج (اردحاڑ کرتی) روس میں داخل ہو گئیں، اس کا سبب بھی فرد واحد۔ نپولین۔ ہی تھا، انھیں یہ دلیل کہ روس اس لیے نیست و نابود نہیں ہوا بلکہ طاقت کے طور پر موجود رہا کیونکہ نپولین کو 26 اگست کو زکام ہو گیا تھا، منطقی اور قابل یقین نظر آئے گی۔

اگر بارودینو میں لڑائی کے ہونے یا نہ ہونے کا انحصار نپولین کی مرضی پر ہوتا اور اگر اس بات کا انحصار کہ وہ یہ حکم دے یا وہ، اس کے منشا پر ہوتا، پھر یہ مربیانکل واضح ہو جائے گا کہ وہ زکام، جو اس کے منشا کے اظہار پر اثر انداز ہوا، غالباً روس کی نجات کا سبب بن جاتا ہے اور نتیجتاً اس کا وہ خدمت گار، جو چھپ میں تاریخ کو اس کے دائرہ پر دف بوٹ لانا بھول گیا تھا، روس کا نجات دہندہ قرار پاتا ہے۔ اس طرز استدلال کے مطابق اس قسم کا استنباط اسی طرح فیروزخانہ فیہ ٹھہرتا ہے جس طرح واسیر کا یہ استخراج، جو اس نے مذاق میں وضع کیا تھا (یہ جانے بغیر کہ وہ مذاق کر رہا ہے)، کہ سینٹ پارتھولومیو⁷² کے یوم پر جو قتل عام⁷³ ہوا تھا، اس لیے ہوا تھا کہ کیونکہ اس روز چارلس نهم کو بد بھمی ہو گئی تھی۔ لیکن وہ لوگ، جو یہ نہیں مانتے کہ روس کی تشکیل ایک شخص۔ پیٹر اعظم۔ کی مرضی سے عمل میں آئی تھی یا یہ کہ فرانسیسی امپراطوریہ کی تخلیق و بروز روس کے ساتھ جنگ کا آغاز یک شخص۔ نپولین۔ کے ہاتھوں ہوا تھا، انھیں یہ استدلال نہ صرف بوجہ انسانی نظرت کے سراسر خلاف معلوم ہوتا ہے۔ اس سوال کا کہ تاریخی واقعات کا کون موجب بنتا ہے، یک اور جواب ہمارے سامنے آتا ہے۔ دشمنی واقعات کیا رخ اختیار کریں گے، اس جواب کے مطابق اس کا تعین علم بالا میں ہو چکا ہے اور اس کا انحصار ان لوگوں کے، جو ان واقعات کی تشکیل میں حصہ لیتے ہیں، مشترکہ منشا پر ہوتا ہے۔ نپولین جیسے لوگ ان واقعات کا رخ متعین کرنے میں جو کردار ادا کرتے ہیں، وہ بالکلنا سطحی اور خیالی ہوتا ہے۔

پہلی نظر میں یہ مفروضہ خواہ کتنا ہی عجیب کیوں نظر نہ آئے کہ سینٹ پارتھولومیو کے یوم پر جو قتل عام ہوا، اس میں چارلس نهم کی مرضی کا کوئی دخل نہیں تھا، حالانکہ اس کا حکم اسی نے دیا تھا اور اس کا خود بھی یہی خیال تھا، کہ یہ محض اس کے حکم پر ہوا، اور یہ مفروضہ بھی کہ بارودینو کے میدان میں اسی ہزار انسانوں کا جو قتل ہوا، وہ نپولین کے منشا پر نہیں ہوا حالانکہ لڑائی کا حکم بھی اسی نے دیا تھا اور یہ کس طرح لڑی جانا تھی، اس کا منصوبہ بھی اسی نے بنایا تھا، خواہ کتنا ہی عجیب کیوں نظر نہ آئے، انسانی عز و شرف، جو مجھے بتاتا ہے کہ ہم میں سے ہر شخص اگر عظیم نپولین سے بڑے درجے کا نہیں تو کم از کم اس سے کم تر درجے کا انسان بھی نہیں ہے، یہ تقاضا کرتا ہے کہ مسئلے کا یہ حل حسیم کرنا جائے اور تاریخی تحقیق اس کی وافر مقدار میں تصدیق کرتی ہے۔

بارودینو کی لڑائی میں نپولین نے نہ تو کسی شخص پر گولی چلائی اور نہ کسی کو ہلاک کیا۔ یہ سب کچھ عسکریوں نے

کیا۔ چنانچہ قتل و غارت اس کے ہاتھوں نہیں ہوئی۔

بارودینو میں فرانسسی فوجی اس لیے روسی فوجیوں کو ہلاک کرنے اور ان کے ہاتھوں ہلاک ہونے نہیں گئے تھے کیونکہ انھیں اس کا حکم نیولین نے دیا تھا بلکہ اس میں ان کی اپنی مرضی کا دخل تھا۔ ان کی نظریں جب اس فوج پر، جو ان کے ماسکو کے راستے میں دیوار بن گئی تھی، پڑیں، وہ۔ فرانسسی سپاہی، جن میں فرانسیسی ہی نہیں، اطالوی، جرمن اور پولستانی بھی شامل تھے۔، جو بھوک سے بڑھ چکے تھے، جن کے لباس تار تار ہو رہے تھے اور جن کا جنگوں نے بھر کس نکال دیا تھا، محسوس کرنے لگے کہ شرب کی بوتل کھل چکی ہے اور اب اسے لازماً پیا جانا چاہیے۔ گر اس وقت نیولین انھیں روسیوں سے لڑنے سے منع کرتا، تو وہ اسے ہلاک کر دیتے اور خود روسیوں کے خلاف ٹہر آتا ہو جاتے کیونکہ اس کے علاوہ اور کوئی چارہ کار تھا ہی نہیں۔

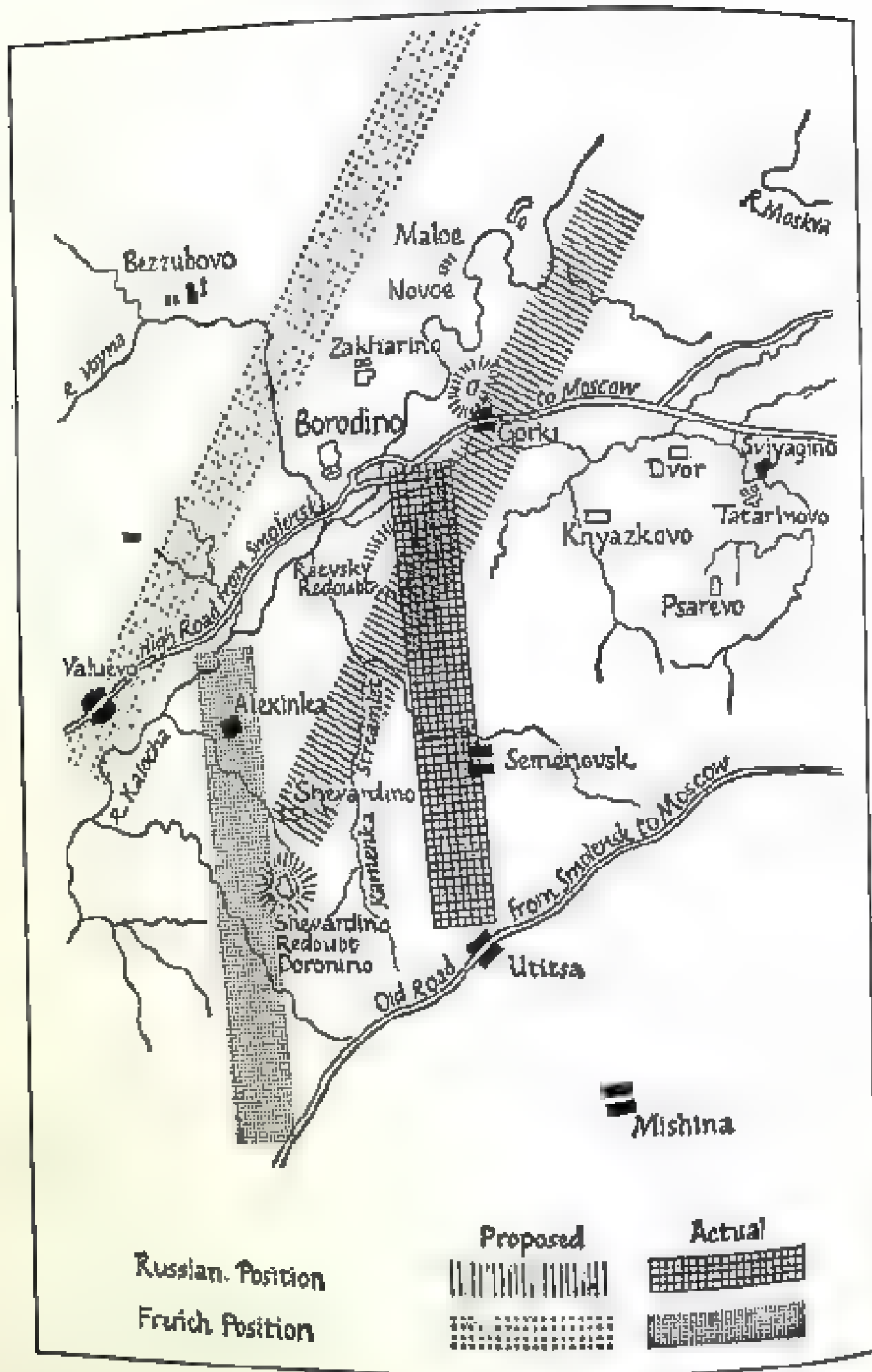
اور جب انھوں نے نیولین کا اعلان سنا جس میں اس نے انھیں یہ اطمینان دیا تھا کہ وہ میدان جنگ میں جو قتل و غارت کریں گے، اس کا معاوضہ انھیں یوں ملے گا کہ آئندہ نسلیں انھیں یہ خراج تحسین پیش کریں گی کہ یہ شخص جنگ ماسکو میں شریک تھا، وہ اسی طرح "Vive l'Empereur" کے نعرے بلند کرنے لگے۔ جس طرح انھوں نے اس کے بیٹے کی تصویر، جس میں اسے کرۂ ارض پر چھید کر کے اسے کھلونا بنا چھڑی پر چڑھاتے ہوئے دکھایا گیا تھا، دیکھ کر لگائے تھے اور جس طرح وہ ہر اس بے سرو پا اور بے ٹکی بات پر، جو انھیں بتائی جاتی، اس قسم کے نعروں سے اپنے گلے پھاڑ لیتے۔ اب ان کے پاس رہ بھی کیا گی تھ سوائے اس کے کہ وہ چیخ چیخ کر "Vive l'Empereur" کے نعرے گائیں، میدان جنگ میں کودیں اور لڑیں تاکہ انھیں ماسکو میں خوراک مل سکے اور وہ فاقہ میں کی طرح وہاں آرام کر سکیں۔ چنانچہ انھوں نے اپنے ساتھی انسانوں کو جو قتل کیا، وہ نیولین کے احکام پر نہیں کیا۔

اور جس نے جنگ کا رخ متعین کیا، وہ نیولین نہیں تھا کیونکہ اس کے تو کسی حکم کی تعمیل ہی نہیں ہوئی تھی اور لڑائی کے دوران میں اسے یہ بالکل معلوم نہیں تھا کہ اس کی نظروں کے سامنے کیا ہو رہا ہے۔ چنانچہ جس طریقے سے ان لوگوں نے ایک دوسرے کو موت کے گھاٹ اتارا، اس کا فیصلہ نیولین کے منشا مطابق نہیں ہوا تھا بلکہ اس کی مرضی سے مادرا، ان ہزاروں اشخاص کی، جو اس مشترکہ کارروائی میں شریک تھے، مرضیوں کے مطابق متعین ہوا۔ نیولین کو صرف محسوس یہ ہو رہا تھا کہ جو کچھ ہو رہا ہے، اس کی مرضی سے ہو رہا ہے۔ چنانچہ اس سوال کی کہ اسے زکام ہوا تھا یا نہیں، تاریخی اعتبار سے اسی طرح کوئی اہمیت نہیں جس طرح بار برداری کے دستوں کے کسی ادنیٰ ترین سپاہی کے زکام کی نہیں۔

نیولین کو 26 اگست کو جو زکام ہوا تھا، اس کی اہمیت یوں بھی اس لیے کم ہو جاتی ہے کہ جن مختلف مسئلوں نے جو یہ دعاوی کیے ہیں کہ اس نے بحالت زکام جس طرح اپنی فوجوں کو ترتیب دیا اور لڑائی کے دوران میں اس نے جو احکام دیے، وہ اس کے اس سے پہلے کے طریق کار سے لگا نہیں کھاتے، بالکل غلط ہیں۔

یہ تقسیم و ترتیب، جس کا اوپر حوالہ دیا گیا ہے، اس کی سابقہ صفت بندیوں سے، جنہوں نے اسے لتوحات

عالمی کاسپین ہاتھ کا بنایا ہوا نقشہ



دلائل نہیں، کسی لحاظ سے بھی فروتر نہیں ہے بلکہ حقیقتاً ان سے برتر ہے۔ لڑائی کے دوران میں اس نے جو معروضہ احکام دیے وہ اس کے سابقہ مواقع کے احکام سے بدتر نہیں تھے بلکہ مخصوص اہتمام سے اس کی شخصیت کے سینہ دار تھے۔ وہ بدتر اس لیے نظر آتے ہیں کیونکہ بارودینو کی لڑائی پہلی لڑائی ہے جس میں پولیس فتح سے ہم کنار ہونے میں ناکام رہا۔ اسی تمام صف بندیاں اور احکام، جو چاہے کتنے ہی بہترین ہوں اور جن پر چاہے کتنا ہی غور و فکر کیا گیا ہو، اگر فتح پر منتج نہ ہوں، گھٹیا معلوم ہونے لگتے ہیں اور ہر فوجی ماہر پر خود غلام انداز سے ان پر تنقید کر سکتا ہے۔ ایسے ہی اگر بدترین صف بندیاں اور حکام فتح کا سبب بنیں، وہ نہایت عمدہ معلوم ہونے لگتے ہیں اور ان کی خوبیوں ثابت کرنے کے لیے سنجیدہ اور پڑھے لکھے اشخاص کتابوں پر کتابیں لکھ رہے ہیں۔

اوسٹریس کی لڑائی کے لیے دے روٹر نے افواج کی تقسیم و ترتیب کا جو منصوبہ وضع کیا تھا، وہ اپنی نوعیت کا کامل نمونہ تھا لیکن پھر بھی اس پر نکتہ چینی ہوئی۔ اس پر نکتہ چینی اس لیے ہوئی کیونکہ یہ ہر لحاظ سے کامل تھا، اس میں معمولی سے معمولی جزئیات کا ضرورت سے زیادہ خیال رکھا گیا تھا۔

بارودینو میں اختیار و اقتدار کے نمائندے کی حیثیت سے پولین نے اپنا کردار اسی خوش اسلوبی سے نبھایا جس طرح وہ دوسری لڑائیوں میں نبھاتا رہا تھا بلکہ یہاں اس کی کارکردگی پہلے کی نسبت کچھ بہتر ہی تھی اس نے جنگ کی پیش رفت میں کسی قسم کا رخ نہیں ڈالا، وہ نہایت مقبول استدلال کرنے پر راضی تھا۔ وہ کسی قسم کے الجھاؤ میں گرفتار نہیں ہوا، اس نے کوئی متضاد طرز عمل اختیار نہیں کیا، وہ گھبراہٹ یا گڑبڑا نہیں اور نہ اس نے میدان جنگ سے فرار حاصل کرنا چاہا بلکہ اس نے اپنی بے عیب قوت فیصلہ اور عظیم عسکری تجربے کو بروئے کار لا کر کامل سکون اور پوری اہلیت سے اپنا کردار ادا کیا کہ بظاہر یہی تاثر دیا کہ اصل کمان اسی کے ہاتھ میں ہے۔

29

صلوں کا دوسری مرتبہ نہایت احتیاط سے جائزہ لینے کے بعد پولین نے کہا

”خطرے کے مہرے سج گئے ہیں، کل کھیل شروع ہو جائے گا۔“

اس نے بیچ پیش کرنے کا حکم دیا اور ڈبوسے کو بلا بھیجا۔ وہ اس کے ساتھ بیس کے متعلق گفتگو کرنے اور اسے ان بعض تبدیلیوں کے، جو وہ اسی طرح کے محل میں کرنا چاہتا تھا، بارے میں آگاہ کرنے لگا اس نے دوبارہ کی باریک سے باریک تفصیلات یاد رکھنے کی جس صلاحیت کا مظاہرہ کیا، اس پر منتظم قصر بھی مستحضر رہ گیا۔

اس نے معمولی معمولی باتوں میں دلچسپی کا اظہار کیا، ڈبوسے کے شوقی سفر کا مذاق اڑایا اور وہ یوں گپ شپنگا رہا تھا جیسے کوئی مشہور و معروف، پر اعتماد اور تجربہ کار سرجن اپنی آستینیں چڑھاتے اور اپنے پر پہننے لگتا ہے جبکہ مریض آپریشن ٹیبل پر جکڑا جا رہا ہوتا ہے۔ ”ہر چیز میری دسترس میں ہے، میرا ذہن بالکل صاف ہے، اس میں کسی قسم کا الجھاؤ نہیں اور جب کام کا مرحلہ آئے گا، میں اسے یوں سرانجام دوں گا کہ کوئی دوسرا کا ہے کوڑے سکے گا، لیکن فی الحال

میں پھٹک بازی کر سکتا ہوں۔ میں جتنی زیادہ کھل کر پھٹک بازی کروں گا، اتنا ہی زیادہ پرسکون محسوس کروں گا۔ میں جتنا زیادہ پرسکون ہوں گا، تمہیں اتنا ہی زیادہ اطمینان اور اعتماد ہوگا اور اتنا ہی زیادہ تمہیں میری عبقریت پر حیرت ہوگی۔“ نیولین نے بیچ کا دوسرا گلاس ختم کیا اور کارہنجیدہ سے، جو اس کے خیال کے مطابق اسے اگلے روز درپیش ہوگا، نشے سے قبل آرام کرنے چلا گیا۔

جو کام اس کا منتظر تھا، وہ اس کے متعلق سوچ بچار میں، تناسف ترقی تھا کہ وہ سونہ سکا، اور زکام کے باوجود جو شام کی رطوبت کی وجہ سے مزید بگڑ گیا تھا، صبح تین بجے اٹھ کھڑا ہوا اور زور زور سے ناک سڑکتا اپنے خیمے کے بڑے کپڑے میں چلا گیا۔ وہاں اس نے دریافت کیا کہ کہیں ردی فوج پیچھے تو نہیں ہٹ گئی۔ اسے بتایا گیا کہ غنیم کی صف بندی یوں کی توں موجود ہے۔ اس نے پسندیدگی سے اپنے سر کو جنبش دی۔

ڈیوٹی پر ماسورا بھوتت خیمے کے اندر آیا۔

”اچھا، غاب، کیا خیال ہے آج ہمیں کامیابی ہوگی؟“ نیولین نے اس سے پوچھا۔

”عالی جاہ، اس میں شک کی کوئی گنجائش ہی نہیں۔“

نیولین نے نگاہیں اٹھا کر اس کی جانب دیکھا۔

”عالی جاہ، آپ کا اپنا وہ جملہ، جو آپ نے سولسک میں میرے سامنے کہا تھا، یاد ہے؟“ غاب نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔

”بوتل سے تاب کھل چکی ہے، اب اسے لڑنا توڑ کیا جانا چاہیے۔“

نیولین کی جنہیں شکن آلود ہو گئی۔ وہ ہاتھ پر سر جھکائے کچھ دیر خاموش بیٹھا رہا۔

”یہ بے چاری سپاہ،“ اس نے اچانک کہا۔ ”سولسک کی نسبت اس کی تعداد میں خاصی تخفیف ہو گئی ہے۔“

غاب، تقدیر چٹھی ہوئی فاحشہ ہے۔ میں نے ہمیشہ یہی کہا ہے اور اب مجھے اس کا تجربہ ہونے لگا ہے۔ لیکن گارڈز،

غاب، گارڈز تو ٹھیک ٹھاک ہیں؟“ اس نے ٹٹول کر دریافت کیا۔

”عالی جاہ، بالکل۔“

نیولین نے کھانسی کی گولی نکالی، اسے منہ میں رکھا اور گھڑی پر نظر ڈالی۔ نیند اس سے کوسوں دور تھی اور صبح کا

ابھی دور در تک نشان نہیں تھا۔ مزید احکام بھی نہیں تھے کہ انہیں سمجھانے اور دیے میں ہی وقت کٹ جاتا کیونکہ وہ

سب کے سب جاری کیے جا چکے تھے اور بے ان پر عمل ہو رہا تھا۔

”گارڈز کی رجمنٹوں میں بسکٹ اور چارل تقسیم کر دیے گئے ہیں؟“ اس نے درشتی سے پوچھا۔

”جی، عالی جاہ!“

”چاؤں بھی؟“

غاب نے جواب دیا کہ وہ چاؤلوں کے متعلق امپراطور کا حکم پہنچا چکا ہے لیکن نیولین نے ہنسائیوں غیر قلمی

بخش انداز سے دیا جیسا اسے شک ہو کہ اس کی ہدایات پر عمل ہوا بھی یا نہیں۔ ایک خدمت گار بیچ لے کر اندر حاضر ہوا۔ پولیس نے حکم دیا کہ ایک گلاس غاب کے لیے بھی لایا جائے۔ خود اس نے خاموشی سے اپنے گلاس میں سے چند چسکیاں لیں۔

”مجھے نہ ذائقے کا احساس ہو رہا ہے اور نہ خوشبو کا،“ اس نے اپنے گلاس کو سونگھتے ہوئے کہا۔ ”میں اس نزلے سے تنگ آچکا ہوں۔ وہ دوا کی باتیں کرتے ہیں لیکن ان کی دواؤں کا فائدہ؟ ان سے زکام کا علاج تو ہوتا نہیں۔ کوخ دیساغ نے مجھے کھانسی کی یہ گولیاں دی تھیں لیکن ان سے رتی برابر فائدہ نہیں ہوا۔ یہ ڈاکٹر کس مرض کی دوا ہیں؟ ان سے کسی چیز کا علاج نہیں ہوتا۔ ہمارا جسم زندہ رہنے کی مشین ہے۔ یہ اسی مقصد کے لیے بنا ہے اور یہی اس کی فطرت ہے۔ اس میں زندگی بلا روک ٹوک جاری رہنے دیں، یہ اپنا دفاع خود کر لے گا۔ اگر اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا جائے، تو یہ اپنی لڑائیاں کھیں بہتر انداز سے لڑ سکے گا، بہ نسبت اس صورت کے کہ آپ اس میں اور بات ٹھونس ٹھونس کر بھرتے رہیں اور یوں اسے مفلوج کرتے رہیں۔ ہمارا جسم کسی بے عیب گھڑی کی، جو خام مدت کے لیے بنائی جاتی ہے، مانند ہے۔ اگر گھڑی سازی کی آنکھوں پر پٹی بندھی ہو، وہ اسے کھوں نہیں سکتا۔ ٹائم ٹوئیاں ہار کر اسے کھن آگے پیچھے کر سکتا ہے۔ میں نے کہا ہمارا جسم زندہ رہنے کی مشین ہے، بس باقی اللہ خیر سلا۔“

پولیس کو اشیا کی تعریف متعین کرنے کا بڑا چمکا تھا۔ وہ ایک دفعہ یہ کام شروع کر دیتا، پھر اسے نئی باتیں سوچنے لگتیں۔ اب بھی یہی ہوا۔ غیر متوقع طور پر اس کے ذہن میں نیا خیال آ گیا۔

”غاب، تمہیں معلوم ہے کہ عسکری فن کیا ہے؟“ اس نے پوچھا۔ ”یہ کسی مخصوص وقت میں غیم سے مضبوط ہونے کا فن ہے۔ Vaola tout۔“

غاب نے کوئی جواب نہ دیا۔

”کل ہمیں کو تو زوف سے پھٹا ہوگا۔“ پولیس نے کہا۔ ”دیکھ میں گے اتمیں یاد ہے کہ براؤناؤ میں فوج کی کمان اس کے ہاتھ میں تھی لیکن وہ مورچوں کا معائنہ کرنے کے لیے ایک مرتبہ بھی گھوڑے پر سوار نہیں ہوا تھا۔ اچھا، دیکھ لیں گے۔“

اس نے گھڑی پر نظر ڈالی۔ چار بج چکے تھے لیکن اسے ابھی تک نیند کی خواہش محسوس نہیں ہوئی تھی۔ بیچ ختم ہو چکا تھا اور کرنے کو کچھ تھا نہیں۔ وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور اس نے ادھر ادھر چند چکر لگائے، گرم اور کوٹ پہنا، سر پر ہیٹ رکھا اور باہر نکل گیا۔ رات تاریک اور مرطوب تھی۔ بوند باندی ہو رہی تھی لیکن اتنی ہلکی کہ بمشکل احساس ہو پاتا تھا۔ قریب ہی فرانسیسی گارڈز کے الاؤ خوب روشنی دے رہے تھے لیکن دور فاصلے پر دیسیوں کے الاؤ دھوئیں میں محض ٹھمارے تھے۔ ہر طرف سکوت طاری تھا اور فرانسیسی سپاہیوں کے، جو پہلے ہی اپنے اپنے مقام کی طرف رواں دواں تھے، قدموں کی چاپ اور ان کی وردیوں کی سرسراہٹ صاف سنائی دے رہی تھی۔

اس کے علاوہ اور کچھ نہیں۔

نیولین اپنے خیمے کے سامنے ادھر ادھر گھومتا رہا۔ وہ روشن الاؤں کو دیکھ رہا اور قدموں کی چاپ سن رہا تھا، اور جب وہ ایک سنتری کے، جو شیم دار ٹوپی پہنے اس کے خیمے کے سامنے پہرہ دے رہا تھا، اور جو نیولین کو دیکھ کر تن کر سیاہینا کی طرح سیدھا کھڑا ہو گیا تھا، قریب آیا، وہ اس کے رو بہ درک گیا۔

”تم کس ساں بھرتی ہوئے تھے؟“ اس کے اندازِ تکلم میں مصنوعی طور پر فوجیوں کا مخصوص اکڑہین بھی تھا اور گھلڑت بھی۔ وہ عام سپاہیوں سے ہمیشہ اسی لہجے میں بات کرتا تھا۔ اس شخص نے مناسب جواب دیا۔

”واہ، پرانے کھڑکی ہو! تمھاری رجمنٹ کو چاؤں مل گئے تھے؟“

”جی ہاں، عالی جاہ!“

نیولین نے پسندیدگی کا اظہار کرنے کے لیے اپنے سر کو جنبش دی اور آگے چل پڑا۔



سائرسے پانچ بجے نیولین گھوڑے پر شیوار دینو گاؤں کی طرف روانہ ہو گیا۔

پچھٹ رہی تھی اور اجالا پھیلنے لگا تھا۔ مشرق کی طرف آسمان پر واحد بادل ٹپک رہا تھا۔ صبح کی دھندلی روشنی میں کہیوں کے الاؤ، گرچہ جل رہے تھے لیکن وہ بجھنے کے قریب تھے۔ وہاں کوئی تنفس نہیں تھا۔

دائیں جانب واحد توپ کے گولہ دانے جانے کی آواز سنائی دی اور چاروں اطراف محیط خاموشی میں ڈوب گئی۔ کئی منٹ گزر گئے۔ دوسرے اور تیسرے دھماکے سے فضا لرز گئی۔ دائیں سمت کہیں قریب ہی سے چوٹکی اور پانچویں توپ کی دھماکہ خیز صدائے بازگشت سنائی دی۔

ابتدائی گولوں کی گونج ابھی ختم نہیں ہوئی تھی کہ دوسری توپوں کے گولے اگلنے کی صدائیں بلند ہونے لگیں۔ ان کی شدت میں ہر آن اضافہ ہوتا جا رہا تھا اور وہ ایک دوسرے میں مدغم ہو رہی تھیں۔

نیولین اور اس کا عملہ گھوڑوں پر سوار شیوار دینو کے مورچے کے پاس پہنچ گیا وہاں وہ نیچے اتر آیا۔ کھیل کا آثار ہو چکا تھا۔

پرنس آندرے سے ملاقات کرنے کے بعد جب میئر گور کی واپس آیا، اس نے اپنے سائیس کو حکم دیا کہ وہ گھوڑے تیار رکھے اور اسے علی الصبح جگا دے۔ پھر وہ فوراً ہی ایک کونے میں سکرین کے، جو بورس نے اسے دی تھی، پیچھے سو گیا۔ جب وہ اگلی صبح بیدار ہوا، ہر شخص جاچکا تھا اور جھوپڑا نما مکان خالی ڈھنڈا رہا تھا۔ چھوٹی چھوٹی کھڑکیوں کے پٹ کھڑکھڑا رہے تھے اور اس کا سائیس اس کے قریب اسے زور زور سے ہمارہا تھا۔

”یوز ایکسی لینسی، یوز ایکسی لینسی، یوز ایکسی لینسی!“ سائیس مسلسل تکرار کیے اور بیڑ کی طرف دیکھے بغیر زور زور سے اس کا کاندھا ہلاتے جا رہا تھا جیسے اسے بالکل امید نہ رہی ہو کہ وہ اسے کبھی جگا سکے گا۔
”کیا؟ شروع ہو گئی؟ وقت آگیا؟“ بیڑ غنیمت میں بڑبڑایا۔

”جناب، دیکھیں تو سہی، فائرنگ شروع ہو چکی ہے۔ آداریں سنائی دے رہی ہیں،“ سائیس نے کہا۔ وہ نوح میں رہ چکا تھا۔ ”تمام حضرات پہلے ہی جا چکے ہیں۔ اور ہزیرین ہائی لنس کو تشریف لے جائے تو بدلتی گزر چکی ہیں۔ وہ گھوڑے پر سوار تھے۔“

بیڑ نے بھٹ بھٹ بیٹ کپڑے تبدیل کیے اور بھاگ کر پورچ میں چلا گیا۔ باہر نقانہ نقاری گھری، تازہ اور شبنم آلود تھی۔ مطلع صاف اور روشن تھا۔ سورج ایک بادل کی نقاب، جس نے اسے ڈھانک رکھا تھا، پھاڑ کر ابھی ابھی برآمد ہوا تھا۔ اس کی کرنیں بادلوں میں شگاف بناتی، سامنے کے مکانوں کی چھتوں اور دیواروں، سڑک کی شبنم کو دکھ، چربی بازوں اور بیڑ کے گھوڑوں پر، جو مکان کے سامنے کھڑے تھے، منعکس ہو رہی، اور انھیں منور کر رہی تھیں۔ باہر کھلے آسمان تلے توپوں کی گھن گرج زیادہ واضح انداز سے سنائی دے رہی تھی۔ گھوڑے پر سوار ایک، بیکورٹ اپنے قارق کی معیت میں فرارے بھرتا قریب سے گزر گیا، لیکن جاتے جاتے بیڑ سے کہہ گیا، ”کاؤنٹ، وقت ہو گیا ہے اوقت ہو گیا ہے!“
بیڑ نے اپنے سائیس کو حکم دیا کہ وہ گھوڑا لے کر اس کے پیچھے پیچھے چلا آئے اور خود گلی میں پھیل چلا اس ٹیلے کی طرف، جہاں سے اس نے گزشتہ روز میدان جنگ کا جائزہ لیا تھا، چل پڑا۔ وہاں فوجی افراد کا ہجوم اکٹھا ہو چکا تھا اور بیڑ نے سٹاف کے ارکان کو رائیسی میں باتیں کرتے سنا۔ اسے وہاں کو تو زرف بھی نظر آیا۔ اس نے اپنے سفید سر پر سفید ٹوپی، جس کے ارد گرد سرخ فیتہ لگا ہوا تھا، پہنی ہوئی تھی اور اس کی مگزی، جس پر سفید بال تھے، اس کے شانوں کے مابین جھکی ہوئی تھی۔ کوئزوف دور بین میں سے سامنے شاہراہ پر نظریں جمائے ہوئے تھا۔

جب بیڑ ٹیلے کی چوٹی پر پہنچنے کے لیے قدم چڑھ رہا تھا، اس نے نگاہیں اٹھا کر سامنے دیکھا۔ منظر اتنا حسین اور خوبصورت تھا کہ وہ مبہوت رہ گیا۔ یہ وہی وسیع و عریض منظر تھا جس کی اس نے گزشتہ روز تحسین کی تھی لیکن اب سب تاحد نظر سارے کا سارا علاقہ فوجیوں سے پٹا پڑا تھا، اور توپوں سے جو دھواں نکل رہا تھا، اس نے اس پر چادر تان دی تھی۔ درخشندہ سورج کی، جو بیڑ کے عقب میں قدرے بائیں جانب اوپر اٹھ رہا تھا، ترچھی کرنوں نے صاف شفاف صبح کو اپنی گلابی سنہری روشنی سے، جس میں کہیں کہیں سیاہ سایوں کی دھاریاں نظر آرہی تھیں ڈھانپ دیا تھا۔ دور کے جنگلات، جو اس لمبے چوڑے منظر کی حد بندی کر رہے تھے، یوں دکھائی دے رہے تھے جیسے وہ زردی مائل ہنز رنگ کے قیمتی پتھروں کو تراش کر وجود میں لائے گئے ہوں۔ اس کے لہراتے بال کھاتے بیرونی خطوط میں، جن کی ایک رخنی شکل افق کے قریب نمودار ہو رہی تھی، والیوائے دو سے آگے سولسک شاہراہ نے، جہاں اس وقت فوجی ہی فوجی نظر آرہے تھے، شگاف ڈال رکھا تھا۔ سامنے کی سرزمین میں اناج کی فصلوں کے سنہری کھیت اور درختوں کے جھنڈ جھنگ رہے تھے۔ سامنے، دائیں، بائیں، جدھر نگاہ اٹختی، فوجی ہی فوجی رکھائی دیتے۔ سارا منظر

زندگی سے بھرپور تھا اور عظمت و جلال کا مرقع تھا۔ یہ کہہ سکتے تھے کہ یہ ایک ایسا منظر دیکھنے کو ملے گا، اس کی توقع ہی نہیں کی جاسکتی تھی۔ لیکن میٹر کو جس چیز نے سب سے زیادہ متاثر کیا، وہ مذاحت خود میدان جنگ، بارودینو اور دریائے کالوچا کے دونوں اطراف جنگ گھائیوں اور وادیوں کا، جن میں ہند کی نالے بہہ رہے تھے، منظر تھا۔

دریائے کالوچا، بارودینو اور اس کے دونوں اطراف کے اوپر۔ خاص طور پر بائیں ہاتھ جہاں وہاں ہندی دلدلی زمین میں سے گزرتی دریائے کالوچا میں شامل ہوتی ہے۔ بالکی دھند چھائی ہوئی تھی۔ جنگ گاتی دھوپ میں یہ دھند پھیلتی، بکھرتی، پکھلتی اور روشن ہوتی جا رہی تھی۔ ہر وہ چیز، جو اس میں سے نظر آ رہی تھی، معلوم ہوتا تھا کہ جادو کے زور سے رنگین ہو گئی ہے اور اس کے خدخال واضح ہو گئے ہیں۔ توپوں کا دھواں اس دھند میں مدغم ہو رہا تھا۔ سارے زمینی منظر پر صبح کے سورج کی جگمگاتی کرنیں دھند اور دھوئیں میں سے گزرتی پانی، شبنم اور پیادہ فوج کی، جس کے دریا کے کناروں اور بارودینو میں ٹھٹ کے ٹھٹ لگے ہوئے تھے سنگینوں کو تابدار بنا رہی تھیں۔ اس شفاف دھند میں ایک سفید کلیسا، گاؤں کا مکانوں کی چھتیں، عسکریوں کے زبردست جھگڑے، گولہ بارود کی سہریلیاں اور توپیں صاف دکھائی دے رہی تھیں۔ دھند اور دھواں مسلسل حرکت کر رہے تھے لیکن معلوم ہوتا تھا کہ ان کی کوئی منزل نہیں ہے۔ ان کے ساتھ ساتھ ہر چیز بھی یا تو حرکت کر رہی تھی یا حرکت کرتی نظر آ رہی تھی۔ جس طرح دھند نے بارودینو کے آس پاس گھائیوں اور وادیوں پر چادر تان رکھی تھی، بعینہ اس سے اوپر اور اس سے آگے، خاص طور پر بائیں طرف دور ہٹ کر، پورے محاذ کے ساتھ ساتھ جنگلوں، کھیتوں، وادیوں، بلند سطحوں اور پہاڑیوں کی چوٹیوں پر توپوں کے دھوئیں کے بادل یوں اوپر اٹھ رہے تھے کہ پتا نہیں چل رہا تھا کہ وہ کہاں سے آرہے ہیں یا کس چیز سے نکل رہے ہیں۔ یہ بادل اکیلے اکیلے، کبھی ان کے پرے کے پرے، کبھی پتلے اور کبھی گھٹے، دور دور تک پھیل رہے تھے، لکڑے کھا رہے تھے، آپس میں گھل مل رہے تھے پھنور بنا رہے تھے اور نظروں سے اوجھل ہو رہے تھے۔

اگر یہ کہا جائے کہ منظر کی خوبصورتی و زیبائی دھوئیں کے ان اٹھتے مرغولوں اور توپوں کی گھن گرج کی، جو ان کے ساتھ بلند ہو رہی تھی، اور ہین منت تھی، تو یہ بات بہت عجیب معلوم ہوگی لیکن حقیقت یہی تھی۔

”پھو!“ اچانک دھوئیں کا گولہ فضا میں بلند ہوا۔ اس کا رنگ بخشنی سے سرخی اور سرخی سے دودھیا سفید ہو گیا۔ ایک سیکنڈ بعد دھماکے کی دنا دنا سنائی دی۔

”پھو، پھو!“ دھوئیں کے دوا در بادل اوپر اٹھے، وہ ایک دوسرے کے ساتھ ٹکرائے اور آپس میں مدغم ہو گئے۔ ساتھ ہی دنا دنا کی آوازیں سنائی دیں۔ یوں آنکھ نے جو کچھ دیکھا تھا، کانوں نے اس کی تصدیق کر دی۔

میٹر نے مڑ کر دھوئیں کے پہلے مرغولے کی جانب دیکھا۔ ایک ثانیہ قبل اس مرغولے کا دھواں گہرا اور ٹھوس گیند کی مانند تھا۔ اب اس کی جگہ دھوئیں کے غباروں نے لے لی تھی اور وہ ایک طرف ادھر ادھر آوارہ گھوم رہے تھے۔ ”پھو...!“ (وقفہ) ”پھو، پھو“ پہلے تین اور ان کے بعد چار مزید فضا میں بلند ہوئے۔ جب کوئی مرغولہ اوپر اٹھا، اس کے جواب میں اسے ہی وقفے کے بعد دنا دنا کی وہی ٹھوس، بالکل صحیح، پر شکوہ آواز سنائی دیتی کبھی معلوم ہوتا

کہ دھوئیں کے یہ بادل سطحِ فلک پر صیقلِ بھاک رہے ہیں اور کبھی یوں نظر آتا کہ وہ وہیں نقش ہو گئے ہیں جبکہ جنگ، کھیت اور جنگلاتی سنگینیں تیز رفتاری سے دوڑتی ان سے آگے نکل گئی ہیں۔ بائیں جانب کے کھیتوں اور جہاز یوں پر دھوئیں کے یہ عظیم بادل مسلسل نمودار ہو رہے تھے اور ان کی جلو میں گھڑ، گھڑڑ، گھڑ، گھڑڑ کی ہیست ناک آوازیں ابھر رہی تھیں جبکہ ان کے کہیں قریب ہی پہاڑیوں اور گھاٹیوں پر دتی بندو قوں کا حقیر دھواں اپنی بہار دکھانے کی کوشش ضرور کر رہا تھا، لیکن وہ گول گیند کا پیکر اختیار نہیں کر پا رہا تھا۔ تاہم ان بندو قوں کی نجیف دہاتوں و نادان ضرور سنائی دے جاتی تھی۔ ”تراق، تراق، تراق، تراق، تراق!“ دتی بندو قیں دھڑا دھڑا چل رہی تھیں لیکن توپوں کی مستم گونج کے مقابلے میں ان کی آواز خاصی مدہم بھی تھی اور آہنگ سے محروم بھی۔

پیئر کا جی چاہتا تھا کہ وہ اس جگہ پہنچ جائے جہاں جنگلاتی سنگینیں اور توپیں تھیں، دھواں اٹھ رہا تھا، شور و غل ہو رہا تھا اور نقل و حرکت جاری تھی۔ اس نے کوئٹورف اور اس کے عملے کی جانب دیکھا۔ وہ اپنے تاثرات کا دھروں کے تاثرات سے موازنہ کرنا چاہتا تھا۔ ان سب کا دھیان بھی میدانِ جنگ کی طرف تھا اور اسے خیال گزرا کہ ان کے جذبات و احساسات بھی بالکل وہی ہیں جو اس کے اپنے ہیں۔ ہر چہرہ جوش و خروش کی اس ثقلی حرارت سے، جو اس نے گزشتہ روز دیکھی تھی اور جس کا مفہوم وہ پرس آندرے کے ساتھ اپنی گفتگو کے دوران میں پوری طرح سمجھ چکا تھا، دیکھ رہا تھا۔

”ہائی ڈیر نیو، جائیں، آپ جائیں، مسیح آپ کا حامی و ناصر ہوا۔“ کوئٹورف ایک جرنیل سے، جو اس کے قریب کھڑا تھا، کہہ رہا تھا لیکن اس کی نگاہیں میدانِ جنگ پر مرکوز تھیں۔
 حکم ملنے کے بعد جرنیل پیئر کے برابر سے گزرتا نیو سے نیچے اترنے لگا۔
 ”چور ہے کی طرف!“ جرنیل نے درشتی اور سرد مہری سے اس سٹاف افسر کو، جس نے اس سے دریافت کیا تھا کہ وہ کہاں جا رہا ہے، جواب دیا۔

”میں بھی، میں بھی ادھر ہی جاؤں گا!“ پیئر نے سوچا اور اسی سمت چل پڑا۔
 جرنیل اپنے گھوڑے پر، جو اس کا قازق اس کے پاس لایا تھا، سوار ہو گیا۔ پیئر اپنے سائیکس کی، جو اس کے گھوڑے تھا، کھڑا تھا، طرف بڑھا اور یہ دریافت کرنے کے بعد کہ ان میں سب سے نرم خو کون سا ہے، وہ اس پر چڑھ گیا۔ اس نے گھوڑی کی ایال مضبوطی سے پکڑی اور اپنی ایڑیوں سے اس کے پیٹ کو دبایا۔ اسے محسوس ہوا کہ اس کا چشمہ ڈھلک رہا ہے لیکن وہ نہ ایال چھوڑ سکتا تھا اور نہ لگام، اور وہ جرنیل کے پیچھے سرپٹ بھاگنے لگا۔ اسے دیکھ کر سٹاف افسر مسکرانے لگے۔

پیادہ ہٹالین کی، جو اس کے آگے آگے جا رہی تھی، صفوں میں جا گھسا۔ اس نے ان سے آگے نکلنے اور دائیں یا بائیں ہونے کی کوشش کی لیکن ہر جگہ فوجی ہی فوجی تھے۔ ان سب کے چہروں، بشرط سے مترشح ہو رہا تھا کہ وہ گہری سوچ بچار میں مستغرق ہیں اور کوئی پر سرار لیکن بظاہر کوئی اہم کام سرانجام دینے کا تہیہ کیے ہوئے ہیں۔ وہ سب کے سب اس عجیب شحیم آدمی کو، جس نے سفید ہیٹ پہنا ہوا تھا اور جو کسی نامعلوم وجہ سے انھیں، اپنی گھوڑی کے قدموں تلے پکڑنے کے درپے دکھائی دیتا تھا، غصیلی اور قہر آلود نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

”تم ہٹالین کے عین درمیان میں کیوں گھوڑی دوڑائے پھر رہے ہو؟“ ایک شخص نے چلا کر اس سے پوچھا۔ دوسرے نے اپنی دقتی بندوق کی سنگین کے سرے سے اس کی گھوڑی کو کچوکا دیا، میٹر، جونہی اس کی انگلی موٹھر پر سر جھکائے ہوئے تھا اور جسے اپنی گھوڑی کو روکنے میں سخت دقت پیش آ رہی تھی، ہوا سے باتیں کرتا سپاہیوں سے آگے سیدھا اس جگہ، جو خالی تھی، پہنچ گیا۔

اس کے آگے چل گیا۔ وہاں چند فوجی کھڑے تھے اور فائرنگ کر رہے تھے۔ حیران کے قریب پہنچ گیا۔ اگرچہ اسے معلوم نہیں تھا لیکن وہ دریائے کالو پچا کے اس پل پر، جو گور کی اور بارودینو کے، عین واقع تھا، پہنچ گیا تھا۔ لڑائی کے پہلے مرحلے میں فرانسیسی بارودینو پر قبضہ کرنے کے بعد اس (پل) پر حملہ کر رہے تھے۔ میٹر نے دیکھا کہ اس کے سامنے پل ہے اور وہاں چند سپاہی پل کے دونوں اطراف اور چراگاہ میں، تازہ تازہ کٹی ہوئی گھاس کے گنہوں کی تظاروں کے مابین، جو اس نے گزشتہ روز دیکھی تھیں، دھوئیں میں کچھ کر رہے ہیں۔ حالانکہ وہاں مسلسل فائرنگ ہو رہی تھی، اسے قطعاً یہ خیال نہ آیا کہ وہ لڑائی کے عین مرکز میں پہنچ گیا ہے۔ اسے نہ ان گولیوں کی، جو چاروں اطراف سے سنسناتی گزر رہی تھیں اور نہ ان گولیوں کی، جو اس کے سر کے اوپر ہی اوپر گزرتے جا رہے تھے، آوازیں سنائی دیں اور نہ اسے وہ یا کی دوسری جانب دشمن دکھائی دیا۔ کافی دیر بعد اسے چند زخمی اور ہلاک شدگان نظر آئے حالانکہ ان میں سے کئی ایک اس سے زیادہ دور نہیں گئے تھے۔ اس نے مسکرا کر اپنے گرد و پیش دیکھا۔ اس کی یہ مسکراہٹ وہاں ہر دم اس کے چہرے پر رہی۔

”یہ شخص صفوں کے آگے کیا کر رہا ہے؟“ کسی نے چلا کر پوچھا۔

”بائیں طرف!... دائیں طرف ہٹ جاؤ!“ کوئی اسے با آواز بلند کچھ کہہ رہا تھا اور کوئی کچھ۔

حیران نہیں طرف ہو گیا اور غیر متوقع طور پر اس کی بلکہ بھیڑ جنرل رلیف سکی کے ایک ایجوٹ سے ہو گئی۔ ایجوٹ نے اس کی جانب یوں دیکھا جیسے وہ اسے کچا ہی چبا جائے گا۔ وہ اس پر برسے ہی وال تھا کہ وہ اسے پھینا گیا اور اس نے گردن کو خم دے کر اسے سلام کیا۔

”آپ یہاں کیسے آگئے؟“ اس نے پوچھا اور وہ سر ہیٹ گھوڑا دوڑاتے آگے بڑھ گیا۔

حیران کا احساس ہوا کہ وہ غصہ جگایا گیا ہے اور یہاں وہ کسی کام بھی نہیں آسکتا۔ اسے یہ خوف ستانے لگا کہ وہ خواہ مخواہ دوسروں کی راہ کار روڑا بن گیا ہے۔ چنانچہ اس نے گھوڑی کو ایڑ لگائی اور پھر عرت ایجوٹ کے پیچھے بھاگنے لگا۔

”یہاں کیا ہو رہا ہے؟ میں آپ کے ساتھ آ سکتا ہوں؟“ اس نے پوچھا۔

”ایک منٹ، صرف ایک منٹ،“ ایجوٹ نے جواب میں کہا۔ وہ گھوڑا دوڑاتے ایک بٹے کے کرل کے، جو چراگاہ میں کھڑا تھا، پاس پہنچا۔ اس نے سے کوئی پیغام دیا اور واپس میئر کی طرف پلٹ آیا۔

”کاؤنٹ، آپ یہاں کیسے پہنچ گئے؟“ اس نے خندہ روئی سے پوچھا۔ ”بھی تک لوہ لگاتے پھر رہے ہیں؟“

”بالکل، بالکل،“ میئر نے جواب دیا۔

لیکن ایجوٹ نے اپنا گھوڑا گھمایا اور آگے چلے لگا۔

”یہاں صورت حال اتنی خراب نہیں،“ ایجوٹ نے خیال ظاہر کیا۔ ”لیکن بائیں طرف، جہاں باگ راتیاں ہیں، گھسان کارن پڑ رہا ہے!“

”واقعی؟“ میئر نے کہا۔ ”کہاں؟“

”تو آئیں میرے ساتھ، ہمارے ٹیلے پر چلتے ہیں۔ وہاں سے ہمیں سارا منظر نظر آ سکتا ہے۔ ہماری میٹری کی حالت ابھی اتنی خندہ روئی نہیں ہوئی،“ ایجوٹ نے کہا۔ ”چلیں گے؟“

”بالکل، میں آپ کا ضرور ساتھ دوں گا،“ میئر نے اپنے سرخس کی تلاش میں ادھر ادھر نگاہیں گھماتے ہوئے کہا۔

صرف اب، پہلی مرتبہ، میئر کی نظر صحیح معنوں میں زخمی اشخاص پر پڑی۔ وہ یا تو بری طرح نڈکھڑاتے، لگنگاتے، خرد جا رہے تھے یا انھیں ستر پچر دس پر لے جایا جا رہا تھا۔ اسی چراگاہ میں، جس میں سے وہ ایک دن پہلے گھوڑے پر گزرا تھا، معطر گھاس کی قطاروں کے مابین ایک سپاہی پڑا تھا۔ اس کی ٹانگیں میزھی ہو رہی تھیں، اس کا سر بے ہنگم انداز سے پیچھے کوڑھلکا ہوا تھا اور اس کی جھجے دار مخروطی فوجی ٹوپی اس کے قریب پڑی تھی۔

”وہ اسے اٹھاتے کیوں نہیں؟“ میئر پوچھنا چاہتا تھا لیکن جب اس نے ایجوٹ کے درشت چہرے کو اسی طرف مڑتے دیکھا، اس نے اپنی زبان پر قابو رکھا اور کچھ کہنے سے احتراز کیا۔

میئر کو اپنا سامخیں کہیں نظر نہ آیا اور وہ ایجوٹ کی معیت میں گھٹی میں سے گزرتا رلیف سکی مورچے کی طرف چل پڑا۔ اس کی گھوڑی ایجوٹ کے گھوڑے کا ساتھ نہ دے سکی اور وہ کچھ پیچھے رہ گئی۔ وہ سے قدم قدم پر اچھاال بھی رہی تھی۔

”کاؤنٹ، معلوم ہوتا ہے کہ پ گھوڑے پر سواری کے عادی نہیں ہیں،“ ایجوٹ نے گلا پھاڑ کر کہا۔

”نہیں یہ بات نہیں ہے، لیکن اس کی چال کچھ ایسی ہے کہ خواہ مخواہ جھٹکتے لگتے ہیں۔“ اس کے لہجے سے

ظاہر ہوتا تھا کہ وہ انھیں خاصی الجھن میں پھنسا ہوا ہے۔

”ارے، یہ تو زخمی ہو چکی ہے!“ ایجوٹ نے چلا کر کہا۔ ”اگلی بائیں ٹانگ، گھٹنے کے اوپر۔ بلاشبہ اسے

گولی لگی ہے۔ کاؤنٹ، میں آپ کو مبارکباد پیش کرتا ہوں کہ آپ کی فائرنگ میں بسم اللہ ہو گئی ہے!“

چھٹی کور سے آگے دھومیں میں سے گزرتے وہ آرٹلری کے، جسے آگے کر دیا گیا تھا اور جواتنی زبردست گولہ باری کر رہی تھی کہ کانوں کے پردے پھٹے جا رہے تھے، عقب میں چھوٹے سے جنگل میں پہنچ گئے۔ وہاں خنکی بھی تھی اور خاموشی بھی۔ چاروں اطراف موسم خزاں کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔

”جنرل یہیں ہیں؟“ ایجوٹنٹ نے مورچے کے قریب پہنچ کر کہا۔

”ایک منٹ پہلے تو یہیں تھے۔ وہ ادھر چلے گئے ہیں،“ کسی نے دائیں جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

ایجوٹنٹ نے بیئر کی طرف یوں دیکھا جیسے وہ سمجھ نہ پا رہا ہو کہ اس کا کیا کیا جائے۔

”میری فکر نہ کریں۔ اجازت ہو تو میں نیلے کے اوپر چلا جاتا ہوں۔“

”ہاں، بالکل، بالکل،“ آپ کو وہاں سے ہر چیز بخوبی نظر آ جائے گی۔ پھر وہاں خطرہ بھی کم ہے۔ میں آپ

کی خیریت دریافت کرنے آؤں گا۔“

بیئر بیئر کے قریب چلا گیا اور ایجوٹنٹ گھوڑے پر آگے نکل گیا۔ ان کی دوبارہ ملاقات نہ ہوئی۔ کہیں بہت

بعد میں بیئر کو معلوم ہوا کہ ایجوٹنٹ اس دور ایک بازو سے محروم ہو گیا تھا۔

بیئر جس نیلے پر چڑھا وہ بہت مشہور ہوا۔ (بعد ازاں ردی اسے بیئر کا نیلا یا ریف سکی مورچہ کے نام سے

پکارنے لگے اور فرانسیسیوں کے نزدیک یہ la grande redoute, la fatale redoute, la doute du centre بن گیا۔)

اس کے آس پاس ہزاروں اشخاص یا تو اپنی جانوں سے ہاتھ دھو بیٹھے یا عمر بھر کے لیے معذور

ہو گئے۔ فرانسیسی اسے کلیدی پوزیشن قرار دیتے تھے۔

یہ مورچہ ایک نیلے پر مشتمل تھا۔ اس کے تین اطراف خندقیں کھدی ہوئی تھیں۔ خندقوں میں دس تو ہیں نصب

تھیں۔ مٹی کی دیواروں میں جو شگانہ رکھے گئے تھے، یہ انھیں میں سے گولہ باری کر رہی تھیں۔

نیسے کی سیدھ میں دونوں اطراف مزید گنجائیں نصب تھیں۔ وہ بھی فائرنگ کر رہی تھیں۔ توپوں کے عقب

میں زر پیچھے امدادی پیادہ سپاہ کھڑی تھی۔ جب بیئر اس نیسے پر چڑھا، اسے یہ مطلق خیال نہیں تھا کہ یہ جگہ جہاں

کوئی خاص بڑی بڑی خندقیں نہیں کھودی گئی تھیں اور جہاں سے گنتی کی صرف چند توپیں فائرنگ کر رہی تھیں، لڑائی

کا اہم ترین مقام ہے۔ اس کے برعکس اس کی دانست میں اسے لڑائی میں کوئی خاص وقعت حاصل نہیں تھی کیونکہ

اتفاق سے وہ خود وہاں موجود تھا۔

جب بیئر نیلے کے اوپر پہنچ گیا، وہ اس خندق کے، جس کے اندر توپیں نصب تھیں، آخری کنارے پر بیٹھ گیا

اور جو کچھ اس کے گرد پیش ہو رہا تھا، غیر شعوری طور پر خوشی سے مسکراتا اسے دیکھنے لگا۔ کبھی کبھار وہ اٹھ کر کھڑا ہو

جاتا اور بیئر کے آس پاس چکر کاٹنے لگتا۔ اس کے چہرے پر اس وقت بھی وہی مسکراہٹ کھیل رہی ہوتی۔ اس کی

کوشش یہ ہوتی کہ اس کی وجہ سے ان سپاہیوں کے کام میں، جو مسلسل اس کے قریب سے بھاگ بھاگ کر گولے بارود

پر ہلکے مورچہ، بخوبی مورچہ، مرکزی مورچہ

کی تھیلیاں لار ہے، انھیں توپوں میں بھر رہے اور توپیں واپس اپنے صحیح مقام پر نصب کر رہے تھے، کسی قسم کی رکاوٹ پیدا نہ ہو۔ بیڑی کی توپیں بلا توقف کیے بعد دیگرے داغی جا رہی تھیں۔ ان کے چنے پر وہ شور و غل بپا ہوتا کہ کانوں کے پردے پھٹنے لگتے اور اڑوس پڑوس کا سارا علاقہ دھوئیں کی لپیٹ میں آ جاتا۔

اندادی فوج کے پیادہ سپاہیوں کے برعکس جو پیچھے کھڑے تھے اور جن کی خوف سے جان نکلی جا رہی تھی، یہاں بیڑی میں، جہاں چند گتے چنے جوان، جنھیں خندق نے دوسروں سے لگ تھلگ کر دیا تھا، تنہا ہی سے اپنے اپنے کام میں مصروف تھے، یا ان کے چہروں پر شوق اور الہامانہ جوش و جذبہ کی کیفیت نمایاں تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ ایک ہی خاندان کے افراد ہیں اور بھائی چارے کی فضا میں مصروف کار ہیں۔

جب میئر سفید ہیٹ پہنے بن بلائے مہمان کی طرح وہاں پہنچا، تو ابتدا میں اس کی غیر فوجی شکل و صورت جوانوں کو، ایک آنکھ نہ بھائی۔ وہ دوڑتے دوڑتے جب اس کے قریب سے گزرتے، نکلکیوں سے اسے دیکھتے اور تعجب کرنے لگتے، اور بعض اوقات ان کے کانوں میں خطرے کی گھنٹیاں بھی بجنے لگتیں۔ آرٹلری کا دراز قد سینئر انسٹر، جس کی ٹانگیں لمبی اور چہرے پر بیچک کے داغ تھے، آخری توپ کی کارکردگی کا جائزہ لینے کے بہانے چلا چلا میئر کے پاس پہنچا، اور اسے تجسس کی نگاہوں سے دیکھنے لگا۔

ایک نو عمر کوتاہ قامت انسٹر، جس کا چہرہ بیضوی تھا، جس کی ابھی مسیں تک بھیگی نہیں تھیں اور جو بظاہر، بھی ابھی کینڈٹ کو رہا تھا، بڑی تنہا سی سے دونوں توپوں کو، جو اس کی تحویل میں دی گئی تھیں، چلو رہا تھا۔ وہ بڑی درشتی سے میئر سے مخاطب ہوا اور بولا:

”حضرت، اگر آپ اجازت دیں تو میں آپ سے عرض کروں گا کہ آپ ایک طرف ہٹ کر کھڑے ہوں۔ آپ یہاں نہیں ٹھہر سکتے۔“

جب جوانوں سے میئر کی طرف دیکھا، انھوں نے سر ہل کر اپنی ناپسندیدگی کا، ظہار کیا لیکن جب انھیں احساس ہوا کہ سفید ہیٹ پہنے یہ شخص تو کچھ بھی نہیں کر رہا، وہ یا تو چپ چاپ خندق کی ڈھلوان پر بیٹھ جاتا ہے، شریکے اور خوش خلق انداز سے مسکراتا جوانوں کے گزرنے کے لیے راستہ ہٹا دیتا ہے اور یا پھر فائرنگ کے نیچے بیڑی کے ارد گردیوں سکون سے ادھر ادھر چکر گانے لگتے ہیں جیسے وہ کسی خیابان میں چہل قدمی کر رہا ہو، تو انھیں یقین ہو گیا کہ اس سے انھیں کسی قسم کا گزند نہیں پہنچے گا اور ان کی محاصرانہ حیرت دھیرے دھیرے اس نوع کی دوستانہ اور شرف تعلق داری میں تبدیل ہو گئی جو فوجی سپاہی کتوں، مرغوں، بکریوں اور ان کی طرح کے دوسرے جانوروں کے لیے، جوان کے ساتھ رجسٹر کی کامیابیوں اور ناکامیوں دونوں میں برابر کے شریک ہوتے ہیں، محسوس کرتے ہیں۔ جوانوں نے میئر کو کسی قسم کا دھوم دھڑکا کیے بغیر چپ چاپ اپنے خاندان کا رکن تسلیم کر لیا، اسے اپنا بھائی بنا لیا، پیار سے اسے ”ہمراہ جنٹلمین“ کا لقب دے دیا اور اس کے متعلق آپس میں ہنسی مذاق کرنے لگے۔

میئر سے کوئی دو قدم کے فاصلے پر گوسے نے زمین کا سینہ چیر دیا۔ اس کے کپڑوں پر جو گرد و غبار آ پڑا، اسے

جھڑتے پونچھتے اس نے مسکرا کر اپنے گرد پیش دیکھا۔

”جناب، آپ کو ذرا کیوں نہیں لگا؟ واقعی، یہ تو حیرت کی بات ہے!“ ایک سپاہی نے جس کا چہرہ سرخ اور شہ نے چوڑے چکلے تھے، مسکراتے ہوئے بیٹھ کر پوچھا۔ مسکراتے سے اس کے سفید اور مضبوط دانت نمایاں ہو گئے۔

”اچھا، تمہیں ڈر لگا تھا؟“ بیٹھنے پوچھا۔

”بالکل۔ آپ کو کیا امید تھی؟“ سپاہی نے جواب دیا۔ ”آپ کو معلوم ہے کہ وہ رحم کرنا نہیں جانتا۔ وہ آپ کے جسم سے ٹکراتا ہے اور آٹا فانا آپ کی آنتیں اڑ کر باہر آ جاتی ہیں۔ ایسے میں آدمی ڈرے نہ، تو اور کیا کرے؟“ اس نے ہنستے ہوئے کہا۔

متعدد جوان بیٹھ کر قریب آ کر کھڑے ہو گئے۔ ان کے چہروں سے دوستی کا ظہار بھی ہو رہا تھا۔ اور وہ مظلوم بھی ہو رہے تھے۔ پتا نہیں کیوں لیکن بہر حال انھیں یہ امید نہیں تھی کہ اسے بھی دوسروں کی طرح باتیں کرنا آتا ہوگا۔ اور جب انھیں یہ معلوم ہوا کہ وہ باتیں کر لیتا ہے، وہ بہت خوش ہوئے۔

”ہمارا تو کام ہی یہی ہے۔ ہم فوجی ہیں۔ لیکن کسی جنگلی زمین میں۔ اور آپ تو ویسے بھی سچے اور کھرنے جنگلی ہیں۔ اس وصف کا ہونا قابل تعریف بات ہے!“

”اپنی اپنی جگہوں پر!“ نو عمر افسر نے، ان جوانوں سے جنھوں نے بیٹھ کر گدگھیرا ڈاں لیا تھا، چلاتے ہوئے کہا۔

صاف نظر رہا تھا کہ یہ نو عمر افسر پہلی یا دوسری مرتبہ اس قسم کی ڈیوٹی سرانجام دے رہا ہے۔ چنانچہ افسروں اور ماتحتوں، دونوں کے ساتھ، اس کا رویہ قواعد و ضوابط کے عین مطابق اور انتہائی رسم پرستانہ تھا۔

سارے میدان جنگ میں، خاص طور پر انہیں جانب اس علاقے میں جہاں باگ راتیاں کے تیرنہ دمے تھے، توپوں کی گھن گرج اور ہندوؤں کی تڑتڑاہٹ شدید سے شدید تر ہوتی جا رہی تھی، لیکن جہاں بیٹھ کھڑا تھا، وہاں سے دھوئیں کی بنا پر بمشکل ہی کوئی چیز نظر آ سکتی تھی۔ ویسے بھی اس کی ساری توجہ بیٹری کے جوانوں کے اس مختصر حلقے پر، جو باتوں سے الگ تھلگ ہو چکا تھا، مرکوز تھی۔ میدان جنگ کے مناظر دیکھ کر درآؤ زیں سن کر اسے ابتدا جو غیر شعوری مسرت ہوئی تھی، اب اس کی جگہ ایک اور جذبے نے لے لی تھی۔ یہ کیفیت اس پر بالخصوص اس وقت سے طاری تھی جب اس نے ایک فوجی کو جراگاہ میں پڑے دیکھا تھا۔ اب خندق کی ڈھلوان پر بیٹھے وہ آنکھ اٹھ کر ان جوانوں کے، جو اس کے آس پاس موجود تھے، چہروں کا مشاہدہ کرنے لگا۔

دس بجے تک بیس آدمی، ٹھہا کر لے جاتے چکے تھے، وہ توپیں ناکارہ ہو چکی تھیں، بیٹری پر گرنے والے گولوں کی تعداد اور رفتار میں اضافہ ہو چکا تھا اور گولیاں فضا میں سنسنائی اور گنگنائی گزر رہی تھیں۔ لیکن بیٹری پر جو جوان متعین تھے، معلوم ہوتا تھا کہ انھیں ان چیزوں کی قطعاً کوئی پروا نہیں، وہ مسکراتے اور پس میں چھلپیں کرتے چاروں اطراف بھاگے پھر رہے تھے۔

”واہ واہ، لکل اتنا س ہے!“ ایک سپاہی نے گریینڈ کو، جو فضا میں سنسناتا ان کی طرف آ رہا تھا، دیکھ کر کہا۔
”دھڑ نہیں، میری جان!۔ ادرھر کوشش کرو جہاں پیادہ فوج ہے۔“ دوسرے نے گولے کو اڑ کر آگے جاتے اور عقب کی سپاہ کے مابین گرتے دیکھ کر کہا، اور کھٹکھٹا کر ٹپس پڑا۔

”نصہ ارادہ مست معلوم ہوتا ہے!“ تیسرے نے ایک کسان کو توپ کے گولے سے، جو برق رفتاری سے اڑ رہی اور چار ہاتھ اپنے کے لیے نیچے جھکتے دیکھ کر کہا اور اس کی ہنسی چھوٹ گئی۔

چند جوان خندق کی دیوار سے لگ کر کھڑے ہو گئے۔ وہ یہ دیکھنے کی کوشش کر رہے تھے کہ سنا کیا ہو رہا ہے۔
”نہوں نے اگلی صفیں پیچھے ہٹ لی ہیں۔ دیکھ لو، وہ پیچھے ہٹ گئی ہیں!“ وہ دیوار کے اوپر اشارے کرتے کہہ رہے تھے۔

”اپنے کام سے کام رکھو!“ ایک بوڑھے سارجنٹ نے چٹا کر انھیں کہا۔ ”اگر وہ پیچھے ہٹ گئے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ لڑائی اب پیچھے ہو رہی ہے۔“

اور اس نے ایک جوان کو شانے سے پکڑا اور گھٹنا مار کر اسے آگے دھکیل دیا۔ وہ سب کھٹکھٹا کر ٹپس پڑے۔
”توپ نمبر ۵۔ پوزیشن سنبھال لو!“ ایک طرف سے حکم کی آواز سنائی دی۔

”خبردار، ہوشیار، سب مل کر زور لگاؤ!“ چند جوان توپ دھکیل رہے تھے اور غلغلے سے چٹا چٹا کر ایک دوسرے کی ہمت بندھا رہے تھے۔

”ارے، اس گولے سے تو ہمارے جنٹلمین کا بیٹھیڑ چلا تھا!“ سرخ چہرے والے دل لگی باز نے کہیں نکالتے اور بیئر سے پھیٹر چھاڑ کرتے ہوئے کہا۔ ”آف تم سے کوئی کام ڈھنگ سے نہ ہوا!“

اس نے ایک گولے کو، جو توپ کے پیسے سے ٹکرا گیا اور ایک آدمی کی ٹانگ اڑا لے گیا تھا، دیکھا جہاں سننے ہوئے کہا۔

”ارے لومڑو!“ ایک اور جوان نے ہنستے ہوئے بیٹی کے آدمیوں سے کہا جو توپوں کے مابین جھک کر ٹپس شخص کو اٹھانے آئے تھے۔ ”تو یہ دال دلیا تمہیں پسند نہیں آیا؟ یا آیا؟ ارے کوؤ! ڈر رہے ہو؟“ انھوں نے گلے پھاڑ کر بیٹیا کے جوانوں سے کہا جو اس سپاہی کے، جس کی ٹانگ اڑ گئی تھی، سنے کھڑے پس پیش کر رہے تھے۔

”اب چلو، بھاگیو!“ انھوں نے کس نوں کا مذاق اڑاتے ہوئے کہا۔ ”نہیں، مانہیں یہ پسند نہیں آیا۔“

بیئر نے دیکھا کہ جب بھی توپ کا کوئی گولہ مورچے سے آکر ٹکراتا یا کوئی شخص زخمی یا ہلاک ہو کر گر جاتا، جوانوں میں پہلے کی نسبت زیادہ مسرت کی ہر دوز جاتی۔ جس طرح جب بادل کر جتے ہیں اور بجلی چمکتی ہے، تو ان کے اندر

چمپنی ہوئی آگ کا شعبدہ روشن سے روشن تر اور اس کی رفتار تیز سے تیز تر ہوتی جاتی ہے، اسی طرح ان جوانوں کے اندر جو آگ بھڑک رہی تھی، اس کے شعلے تیز سے تیز تر ہوتے جا رہے تھے اور ان کی شدت ان کے چہروں پر منعکس

ہو رہی تھی۔ یہ گویا اس امر کی عدم متقی کہ وہاں جو کچھ ہو رہا تھا، انھیں اس کی قطعاً کوئی پروا نہیں۔ بیئر نے میدان

جنگ کی طرف، نکلا اٹھ کر بھی نہ دیکھا اور نہ اسے یہ جاننے کی کوئی فکر تھی کہ وہاں کیا ہو رہا ہے۔ وہ تو سراسر اس آگ کے متعلق جس کی شدت میں ہر لمحہ اضافہ ہو رہا تھا اور جو اسے اپنی روح میں بھی بھڑکتی محسوس ہو رہی تھی، سوچ بچار کرنے میں مجھو تھا۔

جنگل میں اور کاسینکا ندی کے کنارے کے ساتھ ساتھ جو پیادہ دستے متعین تھے، دس بجے وہ پیچھے ہٹ گئے۔ وہ رخیوں کو اپنی دستی بندو قوں پر اٹھائے بیٹری کے قریب سے بھاگتے نظر آ رہے تھے ایک جرنیل اپنے عملے کی معیت میں ٹیلے کے اوپر آیا، اس نے کرنل سے کچھ بات کی، خشم آلود نگاہوں سے بیٹری کو دیکھا، بیٹری کے پیچھے جو امدادی پیادہ فوج کھڑی تھی، اسے نیچے لیٹ جانے کا حکم دیا تا کہ وہ فائرنگ کی زد میں آنے سے بچ جائے اور دوبارہ واپس چلا گیا۔ اس کے بعد بیٹری کے دائیں جانب پیادہ فوج کی صفوں سے صبل کے پٹے اور چلا چلا کر حکم دینے کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ بیٹری پر متعین جو نوں کو پیادہ سپاہی آگے بڑھتے نظر آئے۔

بیٹری نے خندق کی دیوار کے پار دیکھا۔ ایک جہرے پر اس کی نظر بھور خاص ٹھہر گئی۔ یہ ایک زورور نو جوان فر تھا۔ اس کی ششیر بھلی جانب لٹک رہی تھی اور وہ بے چینی سے اپنے گرد و پیش نگاہیں دوڑاتا پیچھے کی جانب جا رہا تھا۔ پیادہ فوج کی صفیں دھوکس میں غائب ہو گئیں لیکن ان کی طویل نعرے بازی اور دستی بندو قوں کی صبارتار فائرنگ کی آوازیں ابھی تک سنائی دے رہی تھیں۔ چند منٹ بعد ادھر سے زخمی اشخاص اور سڑ پکڑاٹھانے والوں کا اچھا خاصا ہجوم واپس آتا دکھائی دیا۔ بیٹری پر جو بم گر رہے تھے، ان کی تعداد میں ایک بیک اضافہ ہو گیا۔ یہاں وہاں بے شمار زخمی اور ہلاک شدگان پڑے تھے لیکن ان کا کوئی پرسان حال نہیں تھا۔ توپوں کے ارد گرد جو جوان تھے، وہ پہلے سے بھی زیادہ پھرتی کا مظاہرہ کرنے لگے تھے۔ اب وہ بیٹری کی طرف قطعاً کوئی توجہ نہیں دے رہے تھے۔ ایک دو مرتبہ کسی شخص نے بڑے غصے سے گلا پھاڑ کر اس سے کہا کہ وہ خواہ مخواہ بیچ میں رکاوٹ بنا ہوا ہے۔ سینئر افسر کا چہرہ خشم کین ہو چکا تھا اور وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا کبھی ایک توپ کے پاس چلا جاتا اور کبھی دوسری کے۔ نو عمر افسر کے گال اور زیادہ تھمتانے لگے تھے اور وہ پہلے کے مقابلے میں اور زیادہ حزم و احتیاط سے احکام دینے لگا تھا۔ وہ سپاہی، جو توپوں پر خدمات سرانجام دے رہے تھے، تیری سے مڑتے، گولے بھرتے اور یوں چھانگئیں لگاتے ادھر ادھر بھاگے پھر رہے تھے جیسے ان کے پاؤں کے نیچے پیرنگ لگے ہوں۔ وہ اپنے فرائض مستعدی سے ضرور ادا کر رہے تھے لیکن ذہنی طور پر کشیدگی محسوس کرنے لگے تھے۔

طوفانی بادل ان کے سروں کے اوپر پہنچ چکا تھا اور وہ آگ، جو بیٹری نے روشن ہوتے دیکھی تھی، اب ہر چہرے پر منعکس ہو رہی تھی۔ وہ کرنل کے قریب کھڑا تھا کہ اسے میں نو عمر افسر، سموری ٹوپی ہاتھ پر رکھے، اپنے اعلیٰ افسر کی طرف دوڑتا ہوا آیا۔

”ہناب غاں! میں نہایت ادب سے گزارش کروں گا کہ صرف آٹھ راؤنڈ باقی رہ گئے ہیں۔ کیا ہم فائرنگ جاری رکھیں؟“ اس نے پوچھا۔

”گریپ شاٹ؟“ کرنل چلایا۔ وہ خندق کی دیوار کے اوپر دیکھ رہا تھا اور اس نے سوال نظر انداز کر دیا۔

اچانک کچھ ہوا، نو جوان افسر نے ہچک لی، اس کا جسم دو ہرا ہو گیا اور وہ یوں زمین پر ڈھیر ہو گیا جیسے کوئی پرندہ، جس کے بازو پر گولی لگی ہو، کرتا ہے۔ بیٹر کی نگاہوں کے سامنے ہر چیز دھندلا گئی، تاریک ہو گئی، پراسرار اور بھانک شکل اختیار کر گئی۔

گولے کے بعد گولہ سنسناتا گزر رہا تھا، کوئی دیوار سے ٹکرا جاتا، کوئی کسی فوجی سے اور کوئی کسی توپ سے۔ بیٹر نے یہ دازیں زیں پیشتر شاید ہی سمجھی سنی ہوں گی لیکن اب اسے ان کے علاوہ اور کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔ بیٹر کے دائیں طرف فوجی جوان ”ہڑا ہڑا“ کے نعرے لگاتے بھاگ رہے تھے، بیٹر کو احساس ہوا کہ وہ اگلی نہیں بلکہ پچھلی جانب جا رہے ہیں۔

”سب گریپ شاٹ فائر کریں!“ افسر نے چلا کر کہا۔

مارجنٹ پک جھپک اس کے پاس پہنچا اور دہشت زدہ سرگوشی میں (بالکل اسی طرح، جس طرح کوئی بٹر ڈر پارٹی پر اپنے آقا کو بتائے کہ جس انگوری شراب کا اسے حکم دیا تھا، وہ ختم ہو چکی ہے) بتانے لگا کہ کارٹوس ختم ہو چکے ہیں۔

”لفنگے امد معاش! یہ چاہتے کیا ہیں؟“ افسر نے منہ سے جھاگ اڑاتے اور بیٹر کی جانب مڑتے ہوئے کہا۔ انس کا چہرہ مال بھوکا ہو رہا تھا اور اس کا پسینہ چھوٹ رہا تھا۔ اس کے، تھے پر شکلیں پڑ رہی تھیں اور اس کی آنکھوں میں غضب کی چمک آگئی تھی۔

”بھگ کر محفوظ دستوں کے پاس جاؤ اور وہاں سے گولوں اور بارود کے بکس اٹھاؤ۔“ اس نے بیٹر کے اوپر نکی اور ایک نو جوان کو خصلی نگاہوں سے دیکھتے اور دھاڑتے ہوئے کہا۔

”میں جاتا ہوں!“ بیٹر نے کہا۔

کوئی جواب دیے بغیر کرنل لمبے لمبے ڈگ بھرتا دوسری طرف چلا گیا۔

”فائرنگ بند کر دو... بٹھرو!“ اس نے گلا بھاڑ کر کہا۔

وہ جوان، جسے گولہ بارود لانے کا حکم دیا گیا تھا، بیٹر سے ٹکرایا۔

”آہ، جناب عالی، یہ جگہ آپ کے لیے سوزوں نہیں،“ اس نے کہا اور بھگتا بھگتا ڈھلوان سے بچنے اترنے لگا۔

بیٹر اس کے پیچھے بھاگا۔ وہ اس جگہ سے، جہاں نو عمر افسر گر پڑا تھا اور اسے رہیں پڑا رہنے دیا گیا تھا، پہلو بچا کر آگے نکل گیا۔

ایک، دو، تین، یکے بعد دیگرے گولے اس کے سر کے اوپر سے گزر گئے۔ ایک اس کے سامنے، دوسرا برابر اور تیسرا پیچھے گر، اور زمین سے ٹکرا گیا۔ بیٹر ڈھلوان پر بھگتا رہا۔ ”میں کہاں جا رہا ہوں؟“ گولہ بارود کے ہنر

چھکڑوں کے قریب پہنچنے پر اس نے یک دم اپنے سب سے پوچھا اور وہیں رک گیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ واپس جائے یا آگے۔ اچانک اسے زبردست دھکا لگا اور وہ پچھلی جانب زمین پر گر پڑا۔ عین اسی لمحے نہایت زبردست شعلہ چمکا اور اس کی آنکھیں خیرہ ہو گئیں۔ دھماکہ ہوا اور وہ شورا اٹھا کہ اسے محسوس ہو کہ اس کے کانوں کے پردے پھٹ گئے ہیں۔

جب اسے ہوش آیا، وہ اپنے ہاتھوں پر جھکا زمین پر بیٹھا تھا۔ گولے بارود کا چھکڑا، جو اس کے پاس کھڑا تھا، غائب ہو چکا تھا۔ سوختہ گھاس پر محض چند جھلے ہوئے سبز تختے اور چیتھڑے ادھر ادھر بکھرے پڑے تھے۔ ایک گھوڑا چھکڑے کے نیچے کچے کلڑے گھسینا سر پٹ بھاگا جا رہا تھا جبکہ دوسرا بیڑی کی طرح زمین پر لیٹا ہوا تھا اور ایسی فلک شگاف اور لمبی چیخیں بلند کر رہا تھا کہ برداشت نہیں ہوتی تھیں۔

32

بیڑی پر اتنی دہشت طاری ہوئی کہ اس کے لیے وہاں ٹھہرنا ناممکن ہو گیا۔ وہ جست لگا کر اٹھ اور یوں واپس بیڑی کی طرف بھاگا کہ گویا کہ جن مہیب چیزوں میں وہ محصور ہو چکا تھا، ان سے بچنے کی وہی واحد پناہ گاہ تھی۔

جب وہ خندق میں داخل ہوا، اس نے دیکھا کہ فائرنگ بند ہو چکی ہے اور بیڑی خاموش ہے لیکن وہاں فوجی جوان کسی اور کام میں مصروف ہیں۔ اس کے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ وہ یہ معلوم کر سکتا کہ یہ کون لوگ ہیں۔ اسے کرنل اپنی طرف پشت کیے لیٹا نظر آیا جیسے وہ کسی چیز کا جائزہ لے رہا ہو۔ اس کی نظر ایک فوجی جوان پر پڑی۔ جسے وہ ازیں پیشتر بھی دیکھ چکا تھا۔ وہ چلا چلا کر ”دوستو، بھائیو، دوستو“ پکارے جا رہا تھا اور اپنے سب کو چند آدمیوں سے، جنہوں نے اسے اپنے شکنجے میں لے رکھا تھا، چھڑانے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔ اسے کچھ دور بھی نظر آیا، اور وہ عجیب تھا۔

اس کے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ وہ یہ سمجھ سکتا کہ کرنل ہلاک ہو چکا ہے، یہ کہ جو شخص ”دوستو، بھائیو“ کی رٹ لگا رہا ہے، قیدی بنایا جا چکا ہے اور یہ کہ ایک اور آدمی کی کمر میں گھنٹن گھونپی جا چکی ہے، کیونکہ جو نبی وہ بھگتا دوڑتا نیلے کے اوپر پہنچا، نلی وردی میں لبوس ایک لاغر اندام اور زرد و شخص، جس کا پسینہ بہہ رہا تھا، ہاتھ میں تلوار تھا۔ اور منہ سے کچھ چلائے تیزی سے اس کی طرف برہما۔ جب وہ دونوں ادھر ادھر دیکھے بغیر ایک دوسرے کی طرف سر پٹ بھاگے آ رہے تھے، بیڑی نے تصادم سے بچنے کے لیے جسی طور پر اپنے ہاتھ آگے بڑھا دیے اور اس شخص (وہ فرانسیسی افسر تھا) کے کندھے اور حلق کس کر پکڑ لیے۔ اس نے تلوار نیچے پھینک دی اور اس نے بیڑی کو کالہ سے پکڑ لیا۔ سراسیمگی کے عالم میں وہ دونوں کئی سیکنڈ ایک دوسرے کے اجنبی چہروں کی طرف دیکھتے رہے۔ دونوں کو یہ سمجھنے میں وقفہ پیش آرہی تھی کہ انہوں نے کیا کیا ہے یا انھیں اس کے بعد کیا کرنا ہے۔ ”کیا میں نے اسے یا اس نے مجھے قیدی بنالیا ہے؟“ دونوں یہی سوچ رہے تھے لیکن بظاہر فرانسیسی یہ یقین کرنے کے لیے زیادہ مائل تھا کہ

خود ہی قیدی بن چکا ہے کیونکہ دہشت کے جنلی رد عمل کے طور پر بیٹر کا ہاتھ اس کے حلق پر اپنی گرفت سخت سے سخت کرتا جا رہا تھا۔ فرانسیسی کچھ کہنے کی کوشش کر رہا تھا کہ توپ کا گولہ ہول ناک مدینک ان کے قریب سے سننا گزرا۔ فرانسیسی تیزی سے نیچے جھکا کہ بیٹر کو محسوس ہوا کہ اس کا سر اڑ گیا ہے۔

بیٹر بھی نیچے جھک گیا، اور اس نے اپنے ہاتھ ڈھیلے چھوڑ دیے۔ مزید سوچے بغیر کہ کس نے کسے قیدی بنایا ہے، فرانسیسی دیس بیٹری کی طرف بھاگا اور بیٹر سر پر پاؤں رکھے ڈھلوان سے نیچے اترنے لگا۔ وہ بار بار زخمیوں اور ہلاک شدگان کے ساتھ ٹکرایا اور ہر مرتبہ اسے یہی محسوس ہوا کہ وہ اس کی ٹانگیں پکڑنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ تاہم ابھی وہ پہاڑی کے دامن میں نہیں پہنچا تھا کہ اس کا سامنا ردی فوجیوں کے گھنے جھوم سے ہو گیا۔ وہ لڑکھڑاتے، ٹھوکریں کھاتے اور پاگلوں کی طرح خوشی کے نعرے لگاتے بیٹری کی جانب بھاگے جا رہے تھے۔ (یہ وہ حملہ تھا جس کا سہرا (ردی جرنیل) یہ مالوف نے اپنے سر باندھ لیا تھا۔ اس نے یہ ٹکڑی دہلی یہ اعلان کیا کہ یہ شخص اس کی دلیری اور خوش قسمتی تھی کہ اس قسم کا کارنامہ سرانجام دینا ممکن ہوا۔ کہا جاتا ہے کہ اس کی جیب میں چند سینٹ جارج کراس (تینے) تھے۔ اس نے وہ ٹیلے پر پھینک دیے اور یوں فوجیوں میں اشتعال پھیل دیا۔)

فرانسیسی، جو بیٹری پر قابض ہو چکے تھے، فرار ہو گئے۔ ہمارے جوانوں نے ”ہرا“ کا نعرہ لگاتے اتنی دور تک ان کا تعاقب کیا کہ انھیں روکنا مشکل ہو گیا۔

بیٹری سے قیدی نیچے لائے گئے۔ ان میں ایک رخمی فرانسیسی جرنیل بھی تھا۔ اس کے گرد فردوں نے گھیرا ڈال رکھا تھا۔ دونوں ردی اور فرانسیسی (بیٹر نے چند روسیوں کو پہچان لیا) گردہ در گردہ چلتے یا رنگتے آرہے تھے۔ ان میں سے بعض کو ستر پجروں پر لایا جا رہا تھا۔ کرب اور اذیت سے ان کے چہروں کی شکلیں بگڑ گئی تھیں۔ بیٹر نیچے پر، جہاں اس نے ایک گھنٹے سے زیادہ دقت گزارا تھا، دوبارہ چڑھ گیا۔ اس مختصر خاندانی حلقے میں سے، جس نے اسے، پابنا لیا تھا، ایک فرد بھی باقی نہیں بچا تھا۔ ہلاک شدگان میں متعدد ایسے اشخاص تھے جنہیں وہ جانتا تھا لیکن بعض کو اس نے پہچان لیا۔ خندق کے آخری سرے پر نوجوان فرخون کے تالاب میں ابھی تک جوں کا توں سنا سکر اڑا تھا۔ سرخ روسیوں کے عضلات، ابھی تک پھڑک رہے تھے لیکن وہ اسے دہیں چھوڑ گئے تھے۔

بیٹر ڈھلوان پر نیچے کی جانب بھاگنے لگا۔

”اب انھیں یہ سب کچھ لڑنا بند کر دینا چاہیے۔ انھوں نے جو کچھ کیا ہے، اس پر یقیناً ان کے دل دہل گئے ہوں گے۔“ اس نے سوچا اور وہ بے مقصد ستر پجراٹھانے والوں کے جلوس کے، جو میدان جنگ سے پرے جا رہے تھے، پیچھے پیچھے چلتے لگا۔

لیکن دھومیں کی چادر کے پیچھے پیچھے سورج، ابھی تک ہندی پر موجود تھا اور سامنے، خاص طور پر بائیں

اٹل زمانے میں تینے اور دوسرے اعزازات تقسیم کرنے کے لیے تقریبات کا اہتمام نہیں کیا جاتا تھا۔ قصہ میں ہر زمین، وہیں میدان جنگ میں دیے جاتے تھے۔ اس لیے، گر جرنیل کی جیب میں چند تینے تھے تو تعجب نہیں ہونا چاہیے۔ (سرم)

جانب، سمیونو و سک کے ارد گرد، ہنوز دھوئیں میں ہنگامہ خیز ہلچل ہو رہی تھی اور توپوں اور ہندو قوں کی گھن گرج اور ٹڈا ہٹ سست تو کیا پڑتی، اور بھی شدید تر ہوتی جا رہی تھی، بالکل اس آرمی کی طرح جو آخری چیخ مارتے وقت اپنی بچی بچی قوت ساری کی ساری استعمال کر دیتا ہے۔

33

بارودینو لڑائی کا بڑا معرکہ بارودینو گاؤں اور ہگ راتوں کے تیرنما دم موں کے مابین سات ہزار فٹ وسیع علاقے پر لڑا گیا۔ (اس نیم قطر سے ماہر ایک جانب روسیوں کی فرانسیسیوں سے ایک مختصر جھڑپ دو پہر کے وقت یو ارب کے گھڑ سوار دستے کے ذریعے ہوئی تھی اور دوسری جانب ایک معرکہ پونیو تو سکی اور نیچ کوف کے دستوں کے مابین یوتنا سے آگے برپا ہوا تھا، لیکن میدان جنگ کے مرکزی حصے میں جو کچھ ہوا، اس کے مقابلے میں یہ دونوں جھڑپیں خاصی ہلکی پھینکی تھیں اور ان کا اصل لڑائی پر کوئی خاص اثر بھی نہ ہوا۔) بارودینو اور تیرنما دم موں کے مابین جنگل کے پڑوس میں یہی وہ کھلا قطعہ زمین تھا جو دونوں اطراف سے بخوبی نظر آتا تھا اور جہاں اس روز کا اصل معرکہ انتہائی سادہ اور بے حد اناندری طریقے سے لڑا گیا۔

لڑائی کا آغاز دونوں اطراف سے سینکڑوں توپوں کی گولہ باری سے ہوا۔

پھر جب سارا میدان دھوئیں کی چادر میں لپٹ چکا تھا، کو مپاں اور دیسے کے دو ڈوڈیٹن فرانسیسی مہینے سے تیرنما دم موں کی طرف بڑھے جبکہ وائسراے (سوغا) کا لشکر مائیں جانب بارودینو پر بلے بولے چل پڑا۔

شیوارو نو کے مورچے سے، جہاں نیولین کھڑا تھا، تیرنما دم مے کوئی دو تہائی میل اور بارودینو سے ناک کی سیدھ میں تقریباً ڈیڑھ میل دور تھے۔ چنانچہ جو کچھ وہاں ہوا تھا، نیولین کو نظر نہیں آ سکتا تھا، خاص طور پر اس لیے بھی کہ دھوئیں نے دھند میں غلط منط ہو کر سارے علاقے کو لگا ہوں سے اوپر جھل کر دیا تھا۔ دیسے کے جوان، جو تیرنما دم موں کی طرف بڑھ چکے تھے، صرف اس وقت تک دکھائی دیتے رہے جب تک وہ اس گھائی میں، جوان کے اور تیرنما دم موں کے مابین واقع تھی، داخل نہ ہو گئے۔ جونہی وہ گھائی میں داخل ہوئے، تیرنما دم موں پر توپوں اور ہندو قوں کا دھواں اتنا دیر ہو گیا کہ آگے کی جانب اس نے ساری ڈھلوان پر چاروں سی زائل دی۔ کبھی کبھار دھوئیں میں کوئی سیاہ چیز، غالباً انسانوں کی جھلک یا سنگیوں کی چمک، دکھنا ممکن ہو جاتا تھا لیکن شیوارو نو کے مورچے سے یہ اندازہ لگانا ممکن نہیں تھا کہ وہ متحرک ہیں یا ساکن کھڑے ہیں اور نہ یہ معلوم ہو سکتا تھا کہ وہ فرانسیسی ہیں یا روسی۔

سورج بلند ہو رہا تھا اور خوب چمک رہا تھا۔ اس کی ترچھی کرنوں نے نیولین کا چہرہ پوری طرح روشن کر دیا تھا۔ اس نے ہاتھوں سے اپنے چہرے پر سایہ کیا اور تیرنما دم موں کی طرف دیکھنے لگا۔ ان دم موں کے سامنے دھوئیں کی چادر خاصی نیچی تھی۔ بعض اوقات یوں نظر آتا تھا کہ دھواں حرکت کر رہا ہے اور بعض اوقات یوں دکھائی دیتا کہ فوجی دستے آگے پیچھے جا رہے ہیں۔ کبھی کبھار فائرنگ میں ایک آدھ چیخ سنائی دے جاتی لیکن یہ بتانا

ناممکن تھا کہ وہاں ہو کیا مرد ہے۔

ٹیلے پر کھڑے کھڑے نیولین روچشی دور بین میں سے دیکھنے لگا۔ دور بین کے نیچے سے دائرے میں سے اسے دھواں اور فوجی، کبھی اپنے اور کبھی روسی، دکھائی دینے لگے لیکن جب اس نے دوبارہ نگاہ کی دیکھنے کی کوشش کی، وہ یہ نہ بتا سکا کہ اس نے انھیں کہاں دیکھا تھا۔

وہ ٹیلے سے نیچے اتر آیا اور اس کے سامنے آگے پیچھے چکر لگانے لگا۔ گاہے بگاہے وہ رک جاتا، فائرنگ کی آوازیں سنتا اور میدان جنگ کے بارے میں سوچ بچار کرنے لگتا۔

جہاں وہ کھڑا تھا، وہ وہاں سے اور نہ ٹیلے سے، جس پر چند جرنیل چڑھ گئے تھے، یہ معلوم کرنا ممکن تھا کہ نیچے کیا ہو رہا ہے بلکہ تیرنہ دہرموں پر جو کچھ ہو رہا تھا، اس کی اصلیت کا بھی کچھ پتا نہیں چل رہا تھا۔ بس یہی نظر آتا کہ وہاں فرانسیسی دور روسی۔ ان میں کوئی زخمی تھا، کوئی ہدک ہو چکا تھا، کوئی زندہ تھا اور کوئی ہوش و حواس سے عاری ہو چکا تھا۔ کبھی باری باری اور کبھی اکٹھے قابض ہو جاتے تھے۔ دور کوئی توپوں اور بندوٹوں کی سات گھنٹے کی مسلسل فائرنگ کے مابین وہاں کبھی روسی، کبھی صرف فرانسیسی، کبھی گھڑسوار اور کبھی پیادہ دستے دکھائی دیتے۔ وہ میدان میں نمودار ہوتے، فائرنگ کرتے، نیچے گرتے، ایک دوسرے سے ٹکرتے، ہتھیار گتھ ہوتے، ان کی سمجھ میں نہ آتا کہ وہ ایک دوسرے کا کیا کریں، شور و غل مچاتے اور دوبارہ پیچھے بھاگ جاتے۔

اس کے فرستادہ ایجوٹ اور مارشوں کے ردی مسلسل میدان جنگ سے سرپٹ گھوڑے دوڑاتے ان کے آس پاس آ رہے اور معرکے کی پل کی پل اطلاعات بہم پہنچا رہے تھے۔ تاہم یہ سب اطلاعات پر فریب تھیں، اس لیے بھی کہ ٹرائی کی گرما گرمی میں یہ بتانا ناممکن تھا کہ کسی خاص لمحے میں وہاں کیا ہو رہا تھا، بلکہ اس لیے بھی کہ متعدد ایجوٹ میدان کارزار میں جاتے ہی نہیں تھے، وہ محض وہی کچھ، جو انھوں نے دوسروں سے سنا ہوتا تھا، دہرا دیتے تھے جب کوئی ایجوٹ ڈیڑھ دو میل کا فاصلہ طے کر کے پہنچتا، حالات تبدیل ہو چکے ہوتے اور جو خبر وہ لایا ہوتا اس میں سے حقیقت کا عنصر غائب ہو چکا ہوتا۔ مثلاً ایک ایجوٹ سرپٹ گھوڑا دوڑاتے نیولین کی خدمت میں حاضر ہوا اور اسے بتانے لگا کہ بارودینو فتح ہو گیا ہے اور دریائے کالوچا کا پل فرانسیسیوں کے قبضے میں آ گیا ہے اپنی خبر سنانے کے بعد اس نے نیولین سے دریافت کیا "یورکیشی، کیا ہاری فوج پل عبور کر کے اس طرف چلی گئی؟" نیولین نے جواب دیا، "نہیں، وہ دوسری سمت عسکری صف بندی کر لیں اور اگلے حکم کا انتظار کریں۔" لیکن اس حکم کے دیے جانے سے پیشتر ہی بلک ایجوٹ کی بارودینو سے روانگی کے تقریباً فوراً ہی بعد روسی دوبارہ پل پر قابض ہو چکے تھے اور اسے نذر آتش کر چکے تھے۔ اور یہ بالکل اسی جھڑپ کے دوران میں ہوا، جب ٹرائی کے آغاز پر پھر وہاں موجود تھا۔

تیرنہ دہرموں سے ایک اور ایجوٹ برقی رفتار سے گھوڑا دوڑاتا آیا۔ اس کا مدفق تھا اور شکل سے بدحواسی ٹپک رہی تھی۔ وہ نیولین کے پاس یہ اطلاع لے کر آیا تھا کہ فرانسیسیوں نے جو حملہ کیا تھا، وہ ناکام ہو چکا ہے، کوہاں

زخمی اور داؤد ہدک ہو چکا ہے، لیکن عین اس وقت جب ایجوٹنٹ کو یہ بتایا گیا کہ حملہ نا کام ہو گیا ہے، اور ایک فرانسیسی یونٹ دھرمسوں پر دوبارہ قابض ہو چکا تھا، اور داؤد زندہ تھا، اسے محض معمولی زخم آئے تھے۔ اس قسم کی غلط سلاطہ اطلاعات کی ساس پر تپو لیس احکام دیتا رہا۔ ان حکام پر یا تو ان کے جاری ہونے سے پہلے ہی عمل ہو چکا ہوتا، یا پھر ان کی تعمیل ہو ہی نہیں سکتی تھی اور ہوتی بھی نہیں۔

دو مارشل اور جرنیل، جو میدان جنگ کے تو قریب تھے لیکن پولیس کی طرح اصل لڑائی میں شریک نہیں تھے اور صرف کبھی کبھار ان مقامات تک، جو فائرنگ کی زد میں آتے تھے، چلے جاتے تھے، پوینٹن سے مشورہ کیے بغیر خود ہی فوجوں کی اکھاڑ پھھاڑ کرتے اور اس بارے میں کہ فائرنگ کہاں سے کی جائے، کس پر کی جائے، گھڑ سوار دستوں نے کب حملہ کرنا ہے اور پیادہ دستوں نے کب تیزی دکھانا ہے، احکام دیتے رہے۔ ان کے احکام پر بھی شاذ ہی عمل ہوا اور ہوا بھی تو صرف جزوی طور پر۔

لیکن جو کچھ ہو، وہ اس سے، جس کا حکم دیا گیا تھا، قطعی مختلف تھا۔ جن سپاہیوں کو آگے بڑھنے کا حکم ملا، ان پر جب گریپ شاٹ فائرنگ ہوئی، وہ پیچھے ہٹ آئے۔ جن سپاہیوں کو یہ حکم دیا گیا تھا کہ وہ پٹی جگہوں پر ڈنے رہیں، انھوں نے جب روسیوں کو نمودار ہوتے دیکھا جس کی انھیں توقع نہیں تھی، وہ بعض اوقات پیچھے بھاگ آتے اور بعض اوقات آگے دوڑ پڑتے۔ اور رہے گھڑ سوار، وہ کسی کے حکم کے بغیر ہی بھاگتے روسیوں کا سر پٹ تعاقب کرنے لگے۔ اس طرح دو گھڑ سوار جنھیں برقی رفتاری سے سمیو نو سک گھائی میں سے گزرتی جو ٹکی پہاڑی کی چوٹی پر پہنچیں، مڑیں اور جس رفتار سے گئی تھیں، اسی رفتار سے واپس آگئیں۔ اسی طرح پیادہ دستوں کو جن جن مقامات کی سمت جانے کا حکم دیا گیا، وہ ان کی بجائے دوسری جگہوں کا رخ کرتے رہے۔

تو میں کب اور کہاں لے جانا ہیں؟ پیادہ سپاہ نے کب فائرنگ کا آواز کرنا ہے؟ گھڑ سوار دستوں نے کب روسی پیادہ فوج کو روندنا ہے؟ اس قسم کے حکام وہ انسٹر، جو متعلقہ یونٹوں کے قریب ترین تھے، دیتے رہے، پوینٹن چھوڑ، انھوں نے ان کے بارے میں نے (Ney) داؤد یا سوغا سے بھی کوئی مشورہ نہ کیا۔ انھیں یہ قطعاً اندیشہ نہیں تھا کہ احکام کی تعمیل نہ کرنے یا اپنی سن مانی کرنے پر انھیں کوئی سزا ملے گی کیونکہ لڑائی میں جو چیز داؤں پر لگی ہوتی ہے وہ انسان کی عزیز ترین متاع۔ اس کی اپنی زندگی۔ ہوتی ہے اور چونکہ بچہ بعض اوقات پیچھے ہٹنے میں اور بعض اوقات آگے بھاگنے میں نظر آتا ہے، اس لیے وہ اشخاص، جو اس جگہ، جہاں گھسان کارن پڑ رہا تھا، موجود تھے، وقتی لہر کے تحت صورت حال سے عہدہ برآ ہوتے رہے۔

تاہم حقیقت یہ ہے کہ اس طرح کبھی آگے بڑھنے اور کبھی پیچھے ہٹنے سے سپاہ کی مجموعی صورت حال نہ بہتر ہوئی اور نہ بہتر۔ انھوں نے ایک دوسرے کے خلاف جو حمے کیے یا دھمکے دیے، اس سے کوئی خاص نقصان نہ ہوا۔ جو بھی نقصان ہوا، اسوات وقوع پذیر ہوئیں یا لوگوں کو چوٹیں در زخم آئے، وہ سب توپوں کے گولوں اور دستی بند توپوں کی گولیوں کا کیا دھر تھا، جن کی کھلے میدان میں چاروں طرف بوجھاؤ ہو رہی تھی۔ جو نئی سپاہی اس

میدان میں پہنچتے، وہ فائرنگ کی زد میں آ جاتے، وہ بھٹکتے، ایک دوسرے سے ٹکراتے، ٹھوکریں کھاتے نیچے گرتے اور گر کر آگے بڑھتے یا پیچھے ہٹتے۔ لیکن ان کے پیچھے ہٹتے ہی ان کے سینئر افسر، جو عقب میں کھڑے ہوتے، جھٹ پٹ نظم و ضبط بحال کرتے اور انھیں دوبارہ فائرنگ کے علاقے میں بھیج دیتے۔ وہاں اندیشہ موت کے غلبے تلے سارا نظم و ضبط دھڑے کا دھڑا رہ جاتا اور وہ بھیڑ بکریوں کے ریوڑ کی طرح اندھا دھند ادھر ادھر بھاگنا شروع کر دیتے۔

34

نیولین کے جرنیل — راؤڈ، نے (Ney) اور سوغا، جو فائرنگ کے علاقے کے قریب تھے اور بعض اوقات اس کے اندر بھی چلے جاتے تھے۔ ایک سے زیادہ مرتبہ اپنے ضبط و نظم کے انتہائی پابند فوجی جوانوں کے زبردست لشکروں کو ادھر لے گئے لیکن ان کے سابقہ معرکوں میں جو کچھ ہوتا رہا تھا، یہاں اس کے بالکل برعکس ہو۔ بجائے اس کے کہ انھیں غنیم کی فوجوں میں بھگدڑ مچنے اور ان کی بے ترتیب پسپائی کی خبریں ملتیں، نظم و ضبط کے خوگر یہ لشکر خود بے ترتیب اور ہراساں زدہ ہجوموں کی صورت میں واپس آ جاتے تھے۔ جرنیل ان کی دوبارہ صف بندی کرتے لیکن ان کی تعداد بتدریج کم ہو رہی تھی۔ دوپہر کے قریب سوغا نے اپنا ایجوٹنٹ نیولین کے پاس بھیجا۔ اس نے کمک لرام کرنے کا مطالبہ کیا تھا۔

جب سوغا کا ایجوٹنٹ سر پٹ گھوڑا دوڑاتا تو نیولین کو یہ یقین دلانے، کہ اگر فریجیٹی انھیں ایک اور ڈویژن مہیا کر دیں، وہ روسیوں کو مار بھگائیں گے، اس کے پاس پہنچا، وہ پیڑی کے دامن میں میٹھاچ سے شغل کر رہا تھا۔ ”کمک!“ نیولین نے گمبیر تعجب کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ اس کی نگاہیں ایجوٹنٹ پر مرکوز تھیں۔ ایجوٹنٹ خوش شکل اور خوش اندام نوجوان تھا اور اس کے سیاہ گھونگریاے بال سوغا کی طرح اس کے شانوں پر پر لٹک رہے تھے۔ ”کمک!“ نیولین نے دل میں سوچا۔ ”انھیں کمک کی ضرورت کیوں پیش آگئی حالانکہ نصف فوج پہلے ہی کمزور دی سپاہ کے، جو مورچے بھی نہیں بنا سکی تھی، ہنر دڑ رہا ہے؟“

”جاؤ، شاہنشاہ کو بتا دو،“ نیولین نے درشتی سے کہا، ”کہ ابھی دوپہر بھی نہیں ہوئی، دیر مجھے، بھی اپنی بساط بھی ٹھیک طرح سے نظر نہیں آ رہی۔ جاؤ۔“

بے بالوں والے خوبڑا ایجوٹنٹ نے پنے ہیٹ سے ہاتھ ہٹائے بغیر زور سے آہ بھری اور سر پٹ گھوڑا دوڑاتے ادھر، جہاں انسانوں کا قتل عام ہو رہا تھا، چل پڑا۔

نیولین، ٹھہر کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے کو لین کوخ (Caulaincourt) اور بیٹیے (Berthier) کو بلا یا اور ان کے ساتھ ایسے موضوعات کے متعلق، جن کا جنگ سے کوئی تعلق نہیں تھا، گفتگو کرنے لگا۔ گفتگو کے دوران میں، جس میں نیولین کو دلچسپی کا سامان نظر آنے لگا تھا، بیٹیے کی نظر ایک جرنیل پر

پڑی، جو اپنے محلے کے ہمراہ ادھر آ رہا تھا۔ جریل کے صبارتہ گھوڑے کے منہ سے جھاگ بہہ رہا تھا اور وہ سینے سے شراہور تھا۔ اس جریل کا نام بیلارخ (Beard) تھا۔ وہ گھوڑے سے اتر، تیز قدم اٹھاتا اپرا طور کی طرف بڑھا اور بڑی جرات سے مکک فراہم کرنے کی ضرورت بیان کرنے لگا۔ اس نے اپنی عزت کی قسم کھ کر کہا کہ اگر انھیں ایک مرید ڈویژن مل جائے، روسی تیس نہیں ہو جائیں گے۔

نیولین نے کندھے جھٹکائے اور وہ جواب دے بغیر چہل قدمی کرتا رہا۔ بیلارخ بڑے زور شور اور بلند آہنگ لہجے سے عملے کے جرنیلوں سے، جو اس کے ارد گرد کٹھا ہو گئے تھے، خطاب کرنے لگا۔

”بیلارخ، تم بہت جلد باز ہو،“ نیولین نے دوبارہ اس کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔ ”جب گھمسان کا رن پڑ رہا ہو، غلطی نہایت آسانی سے ہو جاتی ہے۔ جاؤ، ایک بار پھر حالات کا جائزہ لو اور اس کے بعد میرے پاس آنا۔“

پیشتر اس کے کہ بیلارخ نظروں سے اوجھل ہوتا، میدان جنگ کے ایک اور علاقے سے پیغام رساں ہوا سے باتیں کرتا پہنچ گیا۔

”ہونہ اب کیا ہوا؟“ نیولین نے ایک ایسے شخص کی طرح، جسے مسلسل پریشان کیا جا رہا ہو اور وہ اب تک آچکا ہو، جھلا کر کہا۔

”sire, le prince۔“ ایکوئنٹ نے کہنا شروع کیا۔

”مکک مانگ رہا ہے؟“ نیولین نے محسوس سے بازو ہلاتے ہوئے کہا۔

ایکوئنٹ نے ہاں میں سر ہلا دیا اور پورٹ پیش کرنے لگا، اپرا طور نے منہ دوسری طرف پھیر لیا، دو قدم اٹھائے، رکھا، واپس آیا اور اشارے سے بچے تینے کو بلایا۔

”ہمیں انھیں مکک فراہم کرنا ہی پڑے گی؟“ وہ سمجھ گیا کہ اب اس کے بغیر اور کوئی چارہ ہی نہیں۔ ”تمہارے خیال میں مکک بھیجا جائے؟“ اس نے بچے تینے سے پوچھا۔ (اس کے متعلق اس نے بعد میں کہا تھا: ”اس مولے کو شہباز میں نے ہی بنایا تھا۔“)

عالی جاہ، کلا غاپید (Clapede) کا ڈویژن بھیج دیں۔ بچے تینے نے جواب دیا۔ اسے تمام ڈویژنوں، رجمنٹوں اور بٹالینوں کی تعداد زبانی معلوم تھی۔

نیولین نے سر ہلا کر اپنی رضا مندی کا اظہار کر دیا۔

ایکوئنٹ گھوڑا دوڑاتا ہوا کلا غاپید کے ڈویژن کی طرف چل پڑا، اور چند منٹ بعد نو جون گارڈ جو ٹیلے کے عقب میں متعین تھے، آگے بڑھنے لگے۔ نیولین انھیں چپ چاپ دیکھتا رہا۔

”نہیں“ اس نے ایکایکی بچے تینے سے چہا کر کہا، ”میں کلا غاپید نہیں بھیج سکتا۔ فغیاں (Friant) کا ڈویژن بھیج دو۔“

اگرچہ کلانا پید کی بجائے فغیاں کا ڈویشن بھیجنے سے کسی قسم کا کوئی فائدہ نہیں ہو سکتا تھا کیونکہ یہ صاف ظاہر تھا کہ ایک کو واپس بلائے اور دوسرے کو روکنے سے تاخیر بھی ہوتی اور وقت بھی پیش آتی، اس کے حکم کی فی الفور تعمیل ہوئی۔ نیولین یہ سمجھنے میں ناکام رہا کہ اپنی فوج کے سلسلے میں اس کا کردار اس ڈاکٹر کا تھا جو اپنے نسخوں سے نصرت کے عمل میں مزاحم ہوتا ہے۔ وہ اس کردار کو سمجھتا بھی تھا اور اس کی مذمت بھی کرتا تھا۔

دوسروں کی طرح فغیاں کا ڈویشن بھی میدان جنگ کے دھوکے میں غائب ہو گیا۔ ہر طرف سے مسلسل ایجنٹ آرہے، وردہ سب، جیسے انھوں نے مل کر سازش کر رکھی ہو، ایک ہی بات کہے جا رہے تھے۔ جو کوئی آنا، ملک کا مطالبہ لے کر آنا اور یہی دعویٰ کرتا کہ روسی اپنی جگہ ڈٹے ہوئے ہیں اور اسکی ہولناک فائرنگ کر رہے ہیں کہ میدان کا رزارہ جہنم کا نقشہ پیش کر رہا ہے اور قرآنمیں سیاہ اس میں کھسکتی ورنہ پید ہوتی جا رہی ہے۔

نیولین کمپ سنول پر بیٹھا تھا وراپنی سوچوں میں مستغرق تھا۔

موسیو ڈبوسے، جو سفر کا شوقین تھا اور جس کے منہ میں صبح سے کھیل تک اڑ کر نہیں گئی تھی، اپرا طور کے پاس آیا اور اس نے نہایت احترام سے لہجے کرنے کی تجویز پیش کی۔

”مجھے یقین ہے کہ میں اس موقع پر یورمجسٹی کو فتح کی مبارک باد پیش کر سکتا ہوں، اس نے کہا۔

نیولین نے منفی انداز سے سر کو جنبش دی۔ موسیو ڈبوسے نے فرض کر لیا کہ نیولین کی نفی کا تعلق فتح سے ہے، فتح سے نہیں، چنانچہ اس نے کچھ بے تکلفی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بڑے اطمینان اور نیم طریقہ انداز سے کہا ”اگر فتح دستیاب ہو، پھر وہی النظر میں ایسی کوئی معقول وجہ دکھائی نہیں دیتی کہ یہ فتح کھایا کیوں نہ جائے۔“

”دفع ہو جاؤ...“ نیولین نے اکھڑپن سے کہا اور اپنی پیٹھ پھیر لی۔

ڈبوسے کے چہرے پر ہر ممکن مسکراہٹ، جس میں وجد آفریں سرت، تاسف اور مال بھی کچھ شامل تھا،

بھیل گئی اور وہ دبے پاؤں دوسرے جرنیلوں کی طرف چل پڑا۔

نیولین پر جس قسم کا اضمحلال طاری تھا اس کی گرفت میں وہ جوری آتا ہے جو طویل عرصے تک اتنا خوش قسمت رہا ہو کہ نتائج و عواقب کی پردا کیے بغیر اپنی پونجی داؤں پر لگاتا اور ہر بار جیتتا رہا ہو کہ اچانک ایک روز، عین اس وقت جب وہ اپنی کامیابی کے تمام امکانات کا جائزہ لے چکا اور ان پر مطمئن ہو چکا ہوتا ہے، اسے پتا چلتا اور تدمقدم پر محسوس ہونے لگتا ہے کہ وہ جتنا زیادہ اپنے کھیل کے بارے میں سوچتا ہے، اتنا ہی زیادہ ہارتا جاتا ہے۔

اس کی سپاہ وہی تھی، اس کے جرنیل وہی تھے، تیاریاں وہی تھیں، فوجوں کی تقسیم و ترتیب اسی طرح کی گئی تھی، وہی مختصر اور زوردار اعلان ”کیا گیا تھا، وہ خود بھی وہی تھا۔ وہ یہ سب کچھ جانتا تھا اور اسے یہ بھی معلوم تھا کہ وہ اپنے کام میں پہلے کی نسبت کہیں زیادہ تجربے کا اور ماہر ہے۔ پھر دشمن بھی وہی تھا۔ اس کی اس سے اوٹس اور فریڈلانٹ میں ٹھہرے بھیڑ ہو چکی تھی۔ پھر اس کا ہیبت ناک جھانڈ پر اسرار انداز سے نا طاقی اور ضعف کا شکار کیوں ہو گیا ہے؟

اس کے تمام سابقہ داؤ چھج اور چاہیں، جو ہمیشہ کامیابی سے ہم کنار ہوئی تھیں، پہلے ہی استعمال کی جا چکی تھیں۔ اس نے حسب معمول آج بھی اپنی بیٹریاں ایک مقام پر مجتمع کر دی تھیں، غنیم کی صفوں میں شکاف ڈالنے کے لیے اپنے محفوظ دستے جھونک دیے تھے اور اپنے ”فولادی جوانوں“ کو گھوڑوں پر سوار ہو کر حمے کا حکم دے دیا تھا لیکن ان تمام باتوں کے باوجود نہ صرف یہ کہ فتح کی نوید نہیں ملی تھی بلکہ چاروں اطراف سے ایک ہی قسم کی اطلاعات موصول ہو رہی تھیں کہ جرنیل ہلاک ہو رہے ہیں یا زخمی، کمک کی اشد ضرورت ہے، روسیوں کو مار بھگانا ناممکن ہے اور یہ کہ اس کی اپنی سپاہ بد نظمی اور انتشار کا شکار ہو رہی ہے۔

پہلے تو یہ ہوتا تھا کہ وہ دو تین احکام جاری کرتا تھا، ایک دو جیسے کہتا تھا اور اس کے، رشل اور ایجوٹس مبارک باز پیش کرنے بھاگے آتے تھے۔ ان کے چہرے سرت سے کھلے جاتے تھے اور وہ سرے لے لے کر مال غنیمت کی تفصیل سنایا کرتے تھے، دشمن کی پوری کی پوری کور قیدی بنائی گئی ہے، غنیم کے لاتعداد علم، تحفے، توپیں اور دیگر سامان حرب ہاتھ لگا ہے اور موغا تو ہاتھ جوڑ کر درخواست کیا کرتا تھا کہ گھڑسوار دستوں کو کھلی چھٹی دے دی جائے تاکہ وہ ساز و سامان کے چھکڑے ہانک کر لے آئیں۔ لودکی، رہنگو، آرکورا، جینا، اوسٹرس، واگرام، کون کون سا مقام تھا جہاں یہ نہیں ہوا مگر اب؟ اب اس کی فوج پر کچھ عجیب واردات بیت رہی تھی۔

تیر نما دھسوں پر قبضے کی خبر منے کے باوجود پولین یہ دیکھ رہا تھا کہ حالات اس طرح کے نہیں ہیں۔ بالکل نہیں ہیں۔ جیسے کہ گزشتہ لڑائیوں میں ہوتے تھے۔ اس نے یہ بھی دیکھا کہ جو کچھ وہ محسوس کر رہا ہے، دوسرے بھی، جو اس کے گرد و پیش جمع تھے اور جنہیں مختلف جنگوں کا تجربہ تھا، وہی کچھ محسوس کر رہے ہیں۔ ان سب کے حوصلے پست ہو چکے تھے اور وہ ایک دوسرے سے نظریں چرا رہے تھے۔ جو کچھ ہو رہا تھا، صرف دہو سے اس کی اہمیت کا اندازہ لگانے میں ناکام رہا تھا۔ لیکن پولین، جس کی لڑتے لڑتے عمر گزر گئی تھی، خوب اچھی طرح سمجھتا تھا کہ اگر پورا زور لگانے اور آٹھ گھنٹے میدان جنگ میں گزارنے کے بعد بھی حمہ آور توت لڑائی میں فتح یاب نہیں ہوتی، تو اس کا مطلب کیا ہوتا ہے۔ وہ جانتا تھا کہ یہ عمل شکست کے مترادف ہے، اور یہ کہ لڑائی کے اس نازک مرحلے میں معمرولی، حادثہ سے اور اس کی فوج کو تباہی سے دوچار کر سکتا ہے۔

اس نے جب اپنے ذہن میں اس ساری عجیب و غریب روسی مہم کے بارے میں غور کیا، جس میں وہ، کی مدت کے دوران میں ایک بھی لڑائی جیتی نہیں گئی تھی، ایک بھی پرچم یا توپ پر قبضہ ہوا نہ کوئی فوجی کورڈر پر حراست آئی، اس نے جب اپنے گرد و پیش کے اشخاص کے چہروں پر ڈھکی چھپی آزر و گی دیکھی اور اسے یہ خبریں موصول ہوئیں کہ روسی ابھی تک میدان جنگ میں ڈٹے ہوئے ہیں۔ اس پر ایسا مہیب اور ہول ناک جذبہ غالب آ گیا جیسے اس نے کوئی ڈراؤنا خواب دیکھا ہو اور وہ ان تمام ناموافق اور نامساعد احتمالات کے بارے میں سوچنے لگا جو امکانی حد تک اس کی بربادی کا سبب بن سکتے تھے۔ ہو سکتا ہے کہ روسی اس کے میسرے پر دھاوا بول دیں، اس کے قلب میں شکاف ڈال دیں اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ لوپ کا کوئی آوارہ گولہ خود اسے ہلاک کر دے۔ یہ سب کچھ ممکن

تھ۔ گزشتہ ٹرائیوں میں وہ صرف فتح کے امکانات کے بارے میں سوچا کرتا تھا لیکن اب لہ تعداد امریکی مائنات آپ ہی آپ اس کو سوجھ رہے تھے اور ان سب کے وقوع پذیر ہونے کے خدشات اس کے دل میں سر اٹھ رہے تھے۔ جی ہاں، یہ بالکل ایسے خواب کی مانند تھا جس میں آدمی یہ دیکھتا ہے کہ کوئی قاتل اس پر حملہ کر رہا ہے، وہ اپنے حملہ آور سے پٹنے کے لیے اسے زبردست گھونسا رسید کرنا چاہتا ہے جس کے متعلق وہ جانتا ہے کہ وہ اسے چت کر دے گا لیکن جب وہ بازو اوپر اٹھاتا ہے، اسے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں تو اتنی سکت ہی نہیں اور اس کا بازو یوں نیچے گرنا ہے، جیسے وہ بازو نہ ہو، جیسے ہڈیاں نہ ہوں۔ اپنی اس بے بسی کی حالت میں اس پر یقینی موت کی دہشت سوار ہونے لگتی ہے۔

نیولین پر جو دہشت طاری ہوئی، اس کا باعث یہ خبر بنی تھی کہ روسیوں نے فرانسیسی بیسرے پر حملہ کر دیا تھا۔ وہ نیلے کے دامن میں سر نہوڑائے اور کہنیاں گھٹنوں پر نکائے چپ چاپ کیمپ سنول پر بیٹھا تھا۔ بیخ تھے اس کے پاس آیا۔ اس نے مشورہ دیا کہ حالات معلوم کرنے کے لیے انھیں خود گھوڑوں پر عاز جنگ کے قریب گھومنا پھرنا چاہیے۔

”کیا؟ کیا کہا تم نے؟“ نیولین نے پوچھا۔ ”لھیک ہے۔ انھیں کہو میرا گھوڑا لے آئیں۔“

وہ گھوڑے پر سوار ہو گیا اور سمیونووسک کی طرف چل پڑا۔

اس سے پہلے نہ نیولین نے اور نہ اس کے جرنیلوں نے کسی انتخابیایک منظر دیکھا تھا اور نہ اتنے چھوٹے میدان میں انھیں کبھی اتنی دلشیں نظر آئی تھیں۔ توپوں کی گھن گرج، جو دس گھنٹے گزرنے کے بعد بھی ختم نہیں ہوئی تھی، کانوں کو عاجز کر رہی تھی اور منظر کو بالکل اسی طرح مخصوص سنویرت دے رہی تھی جیسے tableaux vivants کی سنگت میں موسیقی دیتی ہے۔ نیولین گھوڑے پر سمیونووسک کی پہاڑی کی چوٹی پر پہنچا اور دھوئیں کے دلوں میں اسے ناشائسا رنگوں کی وردیوں میں ملبوس سپاہیوں کی صفیں نظر آئیں۔ وہ روکی تھے۔

پہاڑی اور سمیونووسک گاؤں کے درمیان مربوط صفیں بنائے کھڑے تھے۔ سارے محاذ پر ان کی توپیں مسلسل دھاڑ رہی تھیں اور نصف کو دھواں دار بنارہی تھیں۔ یہ اب لڑائی نہیں رہی تھی بلکہ قتل عام تھا جس کا سلسلہ دراز سے دراز تر ہوتا جا رہا تھا۔ اس میں نہ فرانسیسیوں کا کوئی بھلا تھا اور نہ روسیوں کا۔

نیولین نے لگام کھینچ کر گھوڑا روک لیا اور ایک بار پھر اپنی ادھیڑ بن میں کھو گیا جس سے بیخ تھے نے اسے جگایا۔ اس کے روبر واد اور دائیں بائیں جو کچھ ہو رہا تھا، وہ اسے ردک نہیں سکتا تھا حالانکہ بظاہر یہ سب کچھ اسی کا کیا دھرا تھا اور اس کے جاری رہنے کا انحصار بھی اسی پر تھا۔ کامیابی کے فقدان کے پیش نظر اسے پہلی مرتبہ یہ سب غیر ضروری اور بے ناک نظر آیا۔

ایک جرنیل گھوڑا دوڑاتے نیولین کے پاس آیا۔ اس نے بڑی جرأت سے اپنی قیادت میں اولڈ گارڈز کو معرکے میں لڑانے کی پیشکش کی۔ نے (Ney) اور بیخ تھے نے، جو نیولین کے قریب کھڑے تھے، آپس میں لگا ہوں کا عادلہ کیا اور اس قسم کی لہجہ اور بے ہودہ تجویز پر مسکرا دیے۔

نیولین کا سر جھک گیا اور وہ تادیر خاموش کھڑا رہا۔

”میرا اپنے گارڈز کو فرانس سے، ٹھہ سو لیگ، دو تیس تیس نہس کرانے کا کوئی ارادہ نہیں،“ اس نے کہا۔
اس نے اپنا گھوڑا سوڑا اور شیوار دینو کی سمت واپس چل پڑا۔

35

کوٹوزوف سر جھکائے اور اپنے بھاری بھر کم جسم کو ڈھیلا چھوڑے غالیچے میں لیپے اسی بیچ پر بیٹھا تھا، جہاں پھر نے صبح اسے دیکھا تھا۔ وہ کوئی احکام جاری نہیں کر رہا تھا بلکہ جب بھی اسے کوئی تجویز پیش کی جاتی، وہ اس پر محض اپنی رضا مندی یا نارضا مندی کا اظہار کرنے پر اکتفا کرتا۔

”ہاں، ہاں، یہی کرو۔“ وہ مختلف تجویز کے بارے میں جواب دیتا۔ ”ہاں، ہاں، پر حوردار، ذرا جاؤ اور اپنی آنکھوں سے دیکھ آؤ۔“ وہ اپنے مصاحبین میں سے کبھی ایک سے اور کبھی دوسرے سے کہتا۔ یا ”نہیں، بالکل نہیں، بہتر ہے کہ ہم انتظار کریں۔“ جو اخلاعات اس کے پاس لائی جاتیں، وہ انہیں سنتا اور اگر کوئی ماتحت ہدایات کا طالب ہوتا، وہ اسے مناسب ہدایات دیتا۔ لیکن جب وہ رپورٹیں سن رہا ہوتا، بظاہر یہی نظر آتا کہ اسے ان میں اتنی دلچسپی نہیں جتنی ان کی ادائیگی یا رپورٹ منانے والے کے بچے سے ہے۔

طویل طویل فوجی تجربے نے اسے یہ ذہن نشین کرادیا تھا اور پیرانہ سالی کی دانش مندی نے اسے یہ یاد کرادیا تھا کہ جب لاکھوں انسان موت و حیات کے معرکے میں برسریکا رہوں، کسی فرد واحد کے لیے ان سب کو ہدایات دینا ناممکن ہے، اور وہ جانتا تھا کہ لڑائی کے نتیجے کا انحصار نہ اس بات پر ہوتا ہے کہ کمانڈر انچیف فوجوں کی تقسیم کس طرح کرتا ہے اور مختلف دستے کہاں کہاں تعینات کرتا ہے اور نہ اس بات پر کہ توپیں کتنی استعمال ہوئی ہیں یا اشخاص کتنے ہلاک ہوئے ہیں، بلکہ اس کا انحصار اس غیر مرئی قوت پر ہوتا ہے۔ جسے فوج کا جذبہ کہا جاتا ہے، وہ اسی قوت پر وحیان دیتا تھا، حتیٰ المقدور اس کی رہنمائی کرتا اور اسے صحیح راستے پر ڈالتا تھا۔

کوٹوزوف کے چہرے بشرے سے عام طور پر یہی ظاہر ہوتا کہ وہ نہایت شہاک اور سکون سے توجہ دے رہا ہے اور اگر اس کے بوڑھے اور ناتواں جسم کے لیے تھکن پر قابو پانا مشکل ہو جاتا، تو اس کا اظہار یوں ہوتا کہ اس کے چہرے کی رگیں تن جاتیں۔

گیارہ بجے اسے یہ خبر پہنچی گئی کہ جن تیر ہزار آدمیوں پر فرانسیسیوں نے قبضہ کر لیا تھا، انہیں دوبارہ چھڑا لیا گیا ہے لیکن پرنس باگ راتیاں زخمی ہو گیا ہے۔ کوٹوزوف کی سسکی نکل گئی اور اس نے افسوس کا اظہار کرنے کے لیے اپنے سر کو جنبش دی۔

”گھوڑا بھاؤ، پرنس پیوتر ایوانوویچ کے پاس جاؤ اور تفصیلات معلوم کرو،“ اس نے اپنے ایک ایجوٹ سے کہا۔ پھر وہ ڈیوک آف درٹم برگ کی طرف، جو اس کے پیچھے کھڑا تھا، متوجہ ہوا اور بولا:
”پیوتر ہائی لنس، آپ پہلی فوج کی کن سنہال لیں گے؟“

ڈیوک کی روانگی کے کچھ ہی دیر بعد۔ درحقیقت اتنی جلدی کہ وہ سمیٹو نو سک پہنچ بھی نہیں پایا ہوگا۔ اس کا ایجنٹ واپس آگیا اور بتانے لگا کہ ڈیوک کو مزید فوج درکار ہے۔

کوٹوروف کے ہاتھ پر بل پڑ گئے۔ اس نے دختروف کو پیغام بھجوادیا کہ فوج کی کمان دہسنبال لے اور ڈیوک کو۔ جس کے متعلق اس نے یہ کہا کہ اس نازک موقع پر اسے اس کی اشد ضرورت ہے۔ واپس بھیج دے۔ جب کوٹوروف کو یہ اطلاع ملی کہ سمیٹو نو کو قیدی بنالیا گیا ہے، وہ مسکرایا۔⁷⁹

”حضرات، ذرا انتظار کر لیں،“ اس نے کہا۔ ”جنگ کا پانسہ ہمارے حق میں پٹ چکا ہے۔ موٹا کی گرفتاری سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ تاہم خوشیاں منانے سے پہلے کچھ دیر انتظار کرنا بہتر ہے۔“ پھر بھی اس نے عام فوجیوں تک یہ خبر پہنچانے کے لیے اپنا ایک ایجنٹ بھیج دیا۔

جب ہائیک بازو سے شربین (Shcherbinin) گھوڑا دوڑاتے یہ خبر لایا کہ فرانسیسیوں نے تیرہ ہزار آدمیوں اور سمیٹو نو سک پر قبضہ کر لیا ہے، کوٹوروف نے لڑائی کی آوازوں اور شربین کے چہرے کے تاثرات سے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ خبر بری ہے ورنہ وہ یوں اٹھ کر کھڑا ہو گیا جیسے اپنی ٹانگیں سیدھی کرنا چاہتا ہو۔ اس نے شربین کو ہانڈ سے پکڑا اور اسے ایک طرف لے گیا۔

”ٹائی ڈیر نیو،“ اس نے یہ موقوف سے کہا ”دیکھیں کہ کچھ ہو سکتا ہے یا نہیں۔“ کوٹوروف گورکی میں تھا اور یہ گاؤں روسی پوزیشنوں کے وسط میں تھا۔ پولین نے ہمارے میسرے پر حملہ کر لیا تھا اسے کئی بار پسپا کیا جا چکا تھا۔ جہاں تک قلب کا تعلق ہے، فرانسیسی بارڈوینو سے آگے نہیں بڑھ سکتے تھے اور ان کے اپنے میسرے کو یواروف کے سواروں نے مار بھگا تھا۔

لگ بھگ تین بجے فرانسیسی حملے رک گئے۔ جو لوگ میدان جنگ سے آئے تھے اور جو کوٹوروف کے ارد گرد حلقہ بنائے کھڑے تھے، ان سب کے چہروں پر شدید تناؤ کے آثار نظر آرہے تھے۔ اس روز جو کامیابی حاصل ہوئی تھی، وہ اس کی توقعات سے بڑھ کر تھی اور وہ اس پر مطمئن تھا۔ تاہم بڑے میاں کی ہمت جواب دے رہی تھی۔ کئی بار اس کا سریوں بھولا جیسے وہ ابھی نیچے گر پڑے گا اور اسے غنودگی آگئی۔ اس کے سامنے اس کا زور کھ دیا گیا۔

جب کوٹوروف ڈنر کھا رہا تھا، ایجنٹ دول سٹوگن، جسے پرنس آندرے نے اٹھانا یہ کہتے سنا تھا، ”لڑائی وسیع علاقے پر پھیلادینا چاہیے۔“ اور جس سے باگ راتیاں اتنی شدید نفرت کرتا تھا، گھوڑا دوڑاتے آیا۔ دول سٹوگن کو بار کھلے ڈتولی نے بھیجا تھا اور وہ بائیں بازو پر لڑائی کی صورت حال کے بارے میں اطلاع دینے آیا تھا۔ ذریعہ اور تیز بہم ڈتولی نے زخموں کی ٹولیوں کو پیچھے بھاگتے اور فوج کے عقب کو تیزتر ہوتے دیکھ کر تمام حالات کا جائزہ لیا اور وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ لڑائی ہاری جا چکی ہے۔ چنانچہ اس نے اپنے چہیتے افسر کو اس خبر کے ساتھ کوٹوروف کے پاس بھیج دیا۔

کوٹوروف نے، جسے مرغ کی ٹانگ چبانے میں دقت پیش آرہی تھی، ایسی نگاہوں سے، جو دل لگی کے

احساس ہے سڑ گئی تھیں، دودل ٹسوگن کو دیکھا۔

دول ٹسوگن نے لاابالی طریق سے اپنی ٹانگیں تان کر سیدھی کہیں اور نیم تمسخرانہ انداز سے سکرانا کو تو زوف کے قریب پہنچا۔ اس نے سلام کے لیے ہاتھ اٹھایا لیکن وہ بمشکل ٹوپی کو چھو رہا تھا۔ وہ ہنر سیرین ہائی نس سے کسی حد تک مصنوعی بے نیازی کا برتاؤ کر رہا تھا جس کا مقصد یہ دکھانا تھا کہ اعلیٰ تربیت یافتہ فوجی کی حیثیت سے اس نے یہ فریضہ دسیوں کے سپرد کر دیا ہے کہ وہ اس کام کے نہ کاج کے پیر فرقت کو دیتا بیٹا کر اس کی پرستش کرتے رہیں لیکن وہ خود خوب سمجھتا ہے کہ وہ کس قسم کے شخص سے بہت رہا ہے۔ "Der alte Herr"، (جرمن جب بھی اس کا آپس میں ذکر کرتے، اسی لقب سے کرتے)، "خوب مزے کر رہا ہے، اسے کسی چیز کی فکر ہی نہیں۔" دول ٹسوگن نے سوچا اور کو تو زوف کے سامنے جو ڈشیں پڑی تھیں، انھیں درشت نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بائیں بازو کی صورت حال کے بارے میں، جیسا کہ بار کے ذقوی نے اسے بتایا تھا اور جیسا کہ اس نے خود دیکھا تھا، "بڑھے صاحب" کو رپورٹ پیش کرنے لگا۔

"ہماری پوزیشن کے تمام مقامات دشمن کے ہاتھوں میں چلے گئے ہیں اور اسے پیچھے نہیں دھکیلا جاسکتا کیونکہ اسے پیچھے دھکیلنے کے لیے سپاہ درکار ہے اور سپاہ ہمارے پاس ہے نہیں۔ جوان فرار ہو رہے ہیں اور انھیں روکنا ناممکن ہو گیا ہے۔"

کو تو زوف ہڈی چباتے چباتے رک گیا اور اسے یوں تعجب سے دیکھنے لگا جیسے اس کی سمجھ میں نہ آیا ہو کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ دول ٹسوگن نے جب "بڑھے صاحب" کی گھبراہٹ دیکھی، وہ مسکرایا اور گویا ہوا۔
"میں سمجھتا ہوں کہ جو کچھ میں نے دیکھا ہے، اگر میں نے اسے پوچھا ہائی نس سے چھپانے کی کوشش کی تو یہ صحیح کام نہیں ہوگا۔۔۔ فوج کے پاؤں اکھڑ چکے ہیں اور وہ افراتفری میں مگر بڑھ رہی ہے۔"

"کیا دیکھا ہے۔ کیا دیکھا ہے تم نے؟" کو تو زوف نے چٹا کر پوچھا۔ اس نے شعلہ بارنگاہوں سے دول ٹسوگن کو دیکھا، غلٹ سے اپنی جگہ سے اٹھا اور اس کی طرف بڑھا۔ "تمہیں۔ تمہیں یہ جرات کیسے ہوئی؟" اس نے گلوگیر لہجے سے کہا اور اپنے کانپتے ہوئے بازو تھپتھپا کر انداز سے اوپر اٹھائے۔ "حضور، تمہیں میرے سامنے اس قسم کی بات کرنے کی جرات کیسے ہوئی؟ تمہیں اس بارے میں کچھ پتا نہیں۔ جاؤ اور جا کر بار کالے کو میری طرف سے بتا دو کہ ان کی طلاعات صحیح نہیں ہیں۔ لڑائی حقیقتاً کیا رخ اختیار کر رہی ہے، اس کے متعلق مجھے، کم نڈرا چیف کو، ان سے بہتر علم ہے۔"

دول ٹسوگن ترکی بہ ترکی جواب دینا چاہتا تھا لیکن کو تو زوف نے اسے ٹوک دیا۔

"دشمن بائیں جانب سے پیچھے دھکیل دیا گیا ہے اور دائیں جانب اسے شکست دی جا چکی ہے۔ حضور، اگر تمہیں ڈھنگ سے کچھ نظر نہیں آتا، پھر جو کچھ تمہیں معلوم ہے، اس کا ذکر کرنے کی زحمت نہ کرو۔ چنانچہ مہربانی

نہاؤ، واپس جنرل بارکلی کے پاس جاؤ اور انھیں بتاؤ کہ میرا ارادہ کل دشمن پر حملہ کرنے کا ہے،" کوٹوزوف نے کہا۔ سب کی زبانیں گنگ ہو گئیں۔ جو واحد آواز سنائی دے رہی تھی، وہ بوڑھے جرنیل کے ہانپنے کی تھی۔

"انھیں تمام مقامات سے پسپا کیا جا چکا ہے۔ اس کے لیے میں خداوند کا شکر بجا لاتا ہوں اور اپنی بہادر افواج کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ دشمن پٹ چکا ہے اور کل ہم اسے روس کی مقدس سرزمین سے باہر نکال دیں گے،" کوٹوزوف نے کہا اور اپنے سینے پر صلیب کا نشان بنایا۔ اچانک اس کی آنکھوں میں آنسو چھلکنے لگے اور اس کی آنکھیں نکل گئیں۔

دول ٹسوگن نے کندھے اچکائے، ہونٹ سکڑے اور چپ چاپ وہاں سے چل دیا۔ اسے "بڑھے صاحب" کے خطاب پر تعجب ہو رہا تھا۔

"آہا، میرا ہیرا آگیا! بہت اچھا!" کوٹوزوف نے ایک لمبی شہم، درخورد جرنیل کو، جس کے بال سیاہ تھے اور جو اس لمحے پہاڑی پر پہنچا تھا، دیکھ کر کہا۔

یہ رابیف سکی تھا۔ وہ سارا دن بارودینو میدان کے انتہائی خطرناک مقام پر موجود رہا تھا۔ رابیف سکی نے اطلاع دی کہ سپاہ مضبوطی سے قدم جمائے اپنی جگہ کھڑی ہے اور فرانسیسی مزید حملے کرنے کا خطرہ مول نہیں لے رہے۔

اس کی بات سن کر کوٹوزوف نے فرانسیسی میں کہا۔
"تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ بعض دوسرے لوگوں کے خیالات کے برعکس تمہاری رائے میں ہم پیچھے ہٹنے پر مجبور نہیں ہوں گے۔"

"بالکل نہیں، یوزر ہائی نس، اس کے برعکس میں یہ سمجھتا ہوں کہ جس لڑائی کا ابھی فیصلہ ہوا ہے اس میں کامیابی اس فریق کے حصے میں آتی ہے، جو اپنی جگہ پر ڈٹا رہتا ہے،" رابیف سکی نے جواب دیا۔ "اور میرے خیال میں۔"

"کیسا روف؟" کوٹوزوف نے اپنے ایجوٹنٹ کو آواز دی۔ "میٹھو اور کل کے لیے فوج کے نام فرمان لکھو۔ اور تم" اس نے دوسرے ایجوٹنٹ کی طرف مخاطب ہو کر کہا، "تم گھوڑے پر جنگ کے محاذ پر جاؤ اور اعلان کر دو کہ کل ہم حملہ کریں گے۔"

جب کوٹوزوف رابیف سکی سے باتیں کر رہا اور فرمان پوم لکھوا رہا تھا، دول ٹسوگن واپس آگیا اور اس نے کہا کہ فیئڈارشل نے جو حکم جاری کیا ہے، جنرل بارکلی ذوقی اس کی توثیق چاہتے ہیں۔

کوٹوزوف نے دول ٹسوگن کی جانب دیکھے بغیر ہدایت کی کہ حکم تحریر کر دیا جائے۔ سابق کمانڈر انچیف کو اس کی یوں ضرورت تھی کیونکہ وہ ہر قسم کی ذمہ داری سے پہلو بچانا چاہتا تھا۔

اور اس پر اسرار یک جہتی کے ذریعے، جس کی تعریف متعین کرنا ناممکن ہے مگر جو پوری فوج میں یکساں

مزاجی کیفیت، جسے فوج کا جذبہ یا دلولہ کہا جاتا ہے، برقرار رکھتی ہے اور جو جنگ کا سب سے بڑا وسیلہ فراہم کرتی ہے، کو تو زونف کا فرمان آنا فوج کے تمام حصوں تک پہنچا دیا گیا۔

الفاظ۔ فرمان کی صحیح شکل۔ جب زنجیر کی آخری کڑی تک پہنچے ہرگز وہ نہیں تھے جو ابتدا میں استعمال ہوئے تھے۔ مختلف یونٹوں میں مندرجہ بانی جو فرمان گردش کر رہا تھا، وہ قطعاً اس صورت میں نہیں تھا جس صورت میں کو تو زونف نے اسے جاری کیا تھا لیکن اس کے الفاظ کا مفہوم فوج کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک پہنچ ضرور گیا کیونکہ جو کچھ اس نے کہا تھا وہ کسی ذریعہ سوچ بچار کا نتیجہ نہیں تھا بلکہ ایک ایسے احساس کا اظہار تھا، جو کم نڈرا پیچیدہ اور ہر روسی کے دل کی آواز تھا۔

اور جب انہیں معلوم ہوا کہ کل انہیں حملہ کرنا ہے اور جس چیز پر وہ یقین کرنا چاہتے تھے، اس کی فوج کے اعلیٰ ترین حلقوں سے تصدیق ہوئی ہے، تھکے ماندہ اور گھبراہٹ کے شکار جوانوں کو یہ حوصلہ و راہنمائی حاصل ہو گیا۔

36

پرنس آندرے کی رجنٹ ریزرو دستوں میں شامل تھی۔ اگر چہ ان دستوں پر آرٹلری کی زبردست فزنگ ہوتی رہی، تاہم ایک بجے تک ان سے کوئی کام نہ لیا گیا اور یہ سمیونو دسک کے عقب میں بیکار کھڑے رہے۔ ایک بجے کے قریب پرنس آندرے کی رجنٹ کو، جو اس وقت تک دوسو سے زائد جوانوں سے محروم ہو چکی تھی، رائی کے روندے ہوئے کھیت میں آگے بڑھایا گیا۔ یہ کھیت سمیونو دسک اور بیٹری کی پہاڑی کے مابین دترے میں تھا۔ یہی وہ مقام تھا جہاں اس روز ہزاروں انسان خاک و خون میں غلطاں ہو گئے اور جہاں ایک اور دو بجے کے درمیان غنیم کی سینکڑوں توپیں شدید گولہ باری کر رہی تھیں۔

سبکی رجنٹ اپنی جگہ سے، ایک انچ بھی ہلے اور ایک بھی گولی چلائے بغیر اپنی مزید تہائی نفری سے محروم ہو گئی۔ سامنے، خالص طور پر دائیں جانب، توپوں کی دناؤں مسلسل گونج رہی تھی اور اس پر اسرار خطہ زمین پر، جو مستقلاً دھوئیں کی چادر میں لپٹا ہوا تھا، سنسناتے توپوں کے تیز رفتار گولے اور سیٹیاں، بجاتے نسبتاً کم رفتار گرینیڈ متواتر اڑتے چلے آ رہے تھے۔ کبھی کبھی پندرہ منٹ تک گولے اور گرینیڈ (کوئی گزند پہنچائے بغیر) جوانوں کے سروں کے اوپر ہی اوپر گزرتے رہتے جیسے وہ انہیں وقتی طور پر مہلت دینا چاہتے ہوں لیکن دوسرے لحاظ کے دوران میں ایک منٹ کے اندر اندر رجنٹ کے متعدد جوان ڈھیر ہو جاتے اور ان کے اجسام کے پرچے اڑ جاتے۔ لاشیں مسلسل تھپیٹ تھپیٹ کر ہٹائی جاتی رہیں اور مجروحین کو اٹھا اٹھا کر پیچھے پہنچایا جاتا رہا۔

ہر نئے دھماکے کے ساتھ باقیوں کے زندہ بچ رہنے کے امکانات کم تر ہو جاتے۔ رجنٹ کی بٹالینوں کے حساب سے صف بندی کی گئی تھی۔ بٹالین اور بٹالین کے مابین تین سو قدم کا فاصلہ تھا۔ پھر بھی ساری رجنٹ کی ذہنی کیفیت ایک سی تھی۔ سبکی کو ایک ہی نوعیت کی چپ لگی ہوئی تھی اور سبکی پر یکساں قسم کی افسردگی طاری تھی۔ صفوں

میں شاید ہی کوئی شخص بات کرتا تھا اور وہ بھی اس وقت، جب کوئی گولہ یا گریزنڈ براہ راست ان پر گرتا اور ”سٹرچر“ کی آوازیں بلند ہونے لگتیں، فی الفور خاموش ہو جاتا۔

اپنے السروں کے حکم پر جوانوں نے زیادہ تر وقت زمین پر بیٹھ کر گزارا۔ ایک نے چنی سموری ٹوپی اتاری، نہایت احتیاط سے اس کی لائننگ ڈھیلی کی اور اس کے دھاگے دوبارہ کس دیے۔ دوسرے نے کچھ مٹی اپنی ہتھیلی پر مٹی اور اپنی انگلیں چمکانے لگا۔ تیسرے نے اپنی کارتوسوں کی پٹی لگے پیچھے بکھینچی اور اس کے بکسوں کس دیے۔ چوتھے نے اپنی ٹانگوں کی پٹیاں کھویں، ان کی شکنیں درست کیں، انھیں ایک بار پھر ٹانگوں پر باندھا اور اپنے بوٹ دوبارہ اوپر چڑھ لیے۔ بعض مل پھرے کھیت کے ڈھیلوں یا فصل کے بچے کھچے اور مڑے مڑے ڈنٹھلوں سے گردنہ سے تعمیر کرتے رہے۔ سبھی اس قسم کی یا ان سے ملتی جلتی سرگرمیوں میں مصروف و منہمک نظر آ رہے تھے۔ جب جوان ہلاک یا زخمی ہو جاتے، سٹرچر اٹھا کر صفوں سے باہر لے جائے جاتے۔ ہمارے بعض جوان مجھ جنگ سے پیچھے ہٹ کر آتے یا دھوکے میں دشمن کے نوچیوں کے پرے کے پرے دکھائی دیتے، ان پر کوئی شخص ذرا بھی دھیان نہ دیتا۔ لیکن جب ہماری آرٹلری یا گھڑ سوار فوج آگے بڑھتی، یا یہ وہ فوج اوپر جاتی دکھائی دیتی، چاروں اطراف سے تحسین و فرین کے کلمات سنائی دینے لگتے۔ تاہم سب سے زیادہ پر جوش توجہ ان خارجی واقعات کو دی جاتی، جن کا لڑائی سے نام کو بھی تعلق نہیں ہوتا تھا، گویا کہ ان جوانوں کو، جن کے حوصلے خاصے پست ہو چکے تھے، روزمرہ کی زندگی کی غیر اہم معمولات میں ہی تسکین مل رہی تھی۔

رجنٹ کے سامنے سے آرٹلری کی بیڑی گزری۔ ایک گھوڑی کی، جو بارود کے پھکڑے میں جتی ہوئی تھی، ٹانگہ اس میں پھنس گئی۔

”اے، دیکھتے نہیں، گھوڑی کی ٹانگہ اس میں پھنس گئی ہے... اس کی ٹانگہ چھڑاتے کیوں نہیں؟... اے، گر پڑے گی... تمہارے دیدے نہیں؟“ محاذ جنگ کے ساتھ ساتھ اس قسم کا ہنر، سارا دن جاری رہا۔

ایک اور وقت سب کی توجہ چھوٹے سے شریکتے کی جانب مبذول ہو گئی۔ خدا جانے وہ کہاں سے آچکا تھا۔ وہ اپنی دم اکڑائے رجنٹ کے سامنے خاصا تیز بھاگا جا رہا تھا۔ اچانک اس کے قریب توپ کا گولہ گرا۔ اس نے زور سے چیخ ماری، ٹانگوں میں مہرہ پائی اور تکی تیز رفتار سے بھاگنے لگا کہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ سے ہاتھ کر رہا ہے۔ ہماری رجمنٹ کا ہنس ہنس کر برا حال ہو گیا اور تمام جوان زور زور سے چیخنے اور نعرے لگانے لگے۔ لیکن اس قسم کے تفریحی مشاغل صرف چند منٹ جاری رہتے اور ان انسانوں کے، جو کھائے پیے بغیر آٹھ گھنٹوں سے بیکار بیٹھے تھے اور جن پر پیہم موت کا خوف سوار تھا، زرد اور پڑمرہ چہرے مزید زرد اور پڑمرہ ہو جاتے۔

رجمنٹ کے دوسرے لوگوں کی طرح پرس آندرے کا چہرہ بھی زرد اور پڑمرہ تھا۔ وہ جی کے کھیت کے آگے چڑھا گیا، سر تھکائے اور ہاتھ پشت پر باندھے، ایک سرے سے دوسرے سرے تک چکر لگا رہا تھا۔ اس کے پاس جاری کرنے کے لیے کوئی حکم نہیں تھا اور نہ اسے کوئی کام تھا۔ ہر چیز خود بخود ہو رہی تھی۔ محاذ سے لاشیں چھین کر اور

مجر دھن اٹھا کر لائے جاتے۔ جب یہ سب کچھ ہو جاتا، صفیں اپنے آپ درست ہو جاتیں۔ اگر کوئی فوجی جوان بھاگ کر پیچھے جاتا، فوراً ہی واپس پلٹ آتا۔ پہلے پہل پرنس آندرے نے اپنا یہ فرض گردانا کہ وہ اپنے جوانوں کا حوصلہ بلند رکھے اور ان کے سامنے مثال پیش کرے۔ چنانچہ وہ بار بار صفوں کے مابین چکر لگاتا رہا، لیکن اسے بہت جلد یقین ہو گیا کہ اس سے کچھ حاصل نہیں ہوتا اور انھیں اس سے کچھ بھی سیکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ وہاں دیگر فوجی جوانوں کی طرح اس کی روح کی تمام قوتیں غیر شعوری طور پر اپنے ذہن کو صورتِ حاس کی ہولناکیوں سے دور رکھنے میں صرف ہو رہی تھیں۔ وہ پاؤں گھسیٹتا، گھاس میں سرسراہٹ پیدا کرتا اور اس گرد و غبار کے بارے میں، جو اس کے بوٹوں پر جم گیا تھا، سوچتا چراگاہ میں ادھر ادھر گھوم پھر رہا تھا۔ پھر وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا ان پگڈنڈیوں پر، جو گھسیاروں کے قدموں نے وہاں بنادی تھی، چنے لگتا۔ تب وہ اپنے قدم گھٹنے اور دل میں یہ حساب لگاتا کہ سے ایک میل کا فاصلہ طے کرنے کے لیے چراگاہ کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک کتنے چکر لگانا ہوں گے۔ کبھی وہ نفسیہ کے، جن کے پودے کھیت کی باڑ کے ساتھ ساتھ گے ہوئے تھے، پھول توڑتا، انھیں اپنی ہتھیلیوں کے مابین سستا اور ان کی تند و تیز، تلخ ترش اور شیریں خوشبو سونگھتا۔ گزشتہ روز اس نے عرق ریزی سے خیالات کا جو کل کھڑا کیا تھا، اب اس کا کچھ بھی باقی نہیں بچا تھا۔ وہ کسی چیز کے بھی بارے میں قطعاً کچھ نہیں سوچ رہا تھا۔ وہ ایسے کانوں سے، جو ایک ہی قسم کی آوازیں سن سن کر پک چکے تھے، سنتا اور گونا گوں اقسام کے بموں، گولوں و درگولیوں کے، جو سنسناتی اور سیٹیاں بھاتی اڑی جا رہی ہو تھیں، مابین امتیاز کرنے کی کوشش کرنے لگتا۔ در پہلی بنا لین کے جوانوں کے اکٹھا دینے والی حد تک شناسا چہروں کو پہچاننے لگتا۔ ”وہ آئی۔ یہ ہم پر گرے گی!“ اس نے دھوئیں سے لبریز علاقے میں کسی اڑتی چیز کی سنسناہٹ سن کر سوچا۔ ”ایک ایک اور اسی ایک... وہ گری۔“ وہ رک گیا اور صفوں پر نظریں دوڑانے لگا۔ ”نہیں، یہ آگے نکل گئی ہے۔ لیکن وہ، وہ کسی سے ٹکرائی ہے!“ اور وہ ایک بار پھر چکر کاٹنے لگا۔ اس کی کوشش تھی کہ وہ سولہ قدموں میں دوسرے سرے پر پہنچ جائے۔

سرسراہٹ سنائی دی اور دھماکے سے کچھ گرا اس سے پانچ قدم دور توپ کے گولے نے زمین کا سینڈش کر دیا۔ اس پر کپکپاہٹ طاری ہو گئی اور خوف نے اس پر غلبہ پالیا۔ اس نے سرسری نگاہوں سے صفوں کی جانب دیکھا۔ شاید کچھ لوگ اس کا نشانہ بن گئے تھے۔ دوسری بنا لین کے قریب خاصا بڑا جھوم اٹھا ہو گیا تھا۔

”ایجوٹس!“ اس نے چلا کر آواز دی۔ ”ان لوگوں سے کہو کہ ایک جگہ اتنا جھگھانا نہ کریں۔“

ایجوٹس نے حکم کی تعمیل کی اور پرنس آندرے کی جانب چل پڑا۔ دوسری طرف سے بنا لین کا اثر آ گیا۔ وہ گھوڑے پر سوار تھا۔

”بچ کر!“ ایک سپاہی نے چلا کر کہا۔ اس کی آواز میں دہشت تھی۔ اور کسی پرندے کی طرح جو پھڑپھڑاتا زمین کی طرف لپکتا ہے، ایک شیل قریب قریب کوئی شور کیے بغیر پرنس آندرے سے صرف دو قدم پرے جا کر، سب سے پہلے گھوڑے نے، جسے اس بات کی کوئی پروا نہیں تھی کہ خوف کا اظہار کرنا صحیح ہے یا غلط، اپنا رد عمل ظاہر

کیا۔ اس کے ہتھنے پھڑ پھڑائے، اس نے اپنی انگلی ٹانگیں اوپر اٹھائیں اور اپنے سوار، میجر، کو تقریباً گراتا بھاگ کھڑا ہوا۔ گھوڑے کی دہشت جانوروں میں بھی سرایت کر گئی۔

”نیچے لیٹ جاؤ!“ ایجوٹسٹ نے چلا کر کہا اور خود بھی زمین پر ڈھیر ہو گیا۔

پرنس آندرے نے تامل کیا۔ دھواں اٹھنا شیل، جو ابل پھرے کھیت اور چراگاہ کے درمیان افسٹین کے پودوں کے جھنڈ پر گرا تھا، اس کے اندر منہ کے بل لیٹے ایجوٹسٹ کے مابین لڑائی کی طرح گھومنے لگا۔

”کیا یہ موت بن سکتا ہے؟“ پرنس آندرے نے کچھ ایسی حسرت سے، جس کا وہ عادی نہیں تھا، گھاس، افسٹین اور پھر دھوکس کی اس پتلی لکیر کی طرف دیکھا، جو گھومتے، پھر کاٹتے، یہ دگولے سے مرغولے کی شکل میں اوپر اٹھ رہی تھی۔ ”میں مر نہیں سکتا، میں مرنا نہیں چاہتا، میں زندگی سے پیار کرتا ہوں۔۔۔ مجھے اس گھاس، اس زمین، اس ہوا سے پیار ہے۔۔۔“

عین اس وقت، جب یہ خیالات اس کے ذہن میں آرہے تھے، اسے یاد آیا کہ لوگ اس کی جانب دیکھ رہے ہیں۔

”محترم، یہ بڑی شرم کی بات ہے!“ اس نے ایجوٹسٹ سے کہا۔ ”یہ کس قسم کی۔۔۔“

اس نے اپنی بات مکمل نہ کی۔ زبردست دھماکہ ہوا اور ایسی آوازیں سنائی دیں جیسے درہچے کے چوکھے کو پاش پاش کیا جا رہا ہو۔ اس کے ساتھ بارود کی جگ گھونٹ دینے والی بو پھیل گئی۔ پرنس آندرے کو جھٹکا لگا، وہ ایک طرف اچھلا اور اپنا بازو نقصان میں اٹھا تاہم منہ کے بل نیچے آگرا۔

متعدد فرس اس کی طرف بھاگے۔ اس کے پیٹ کی داغی جانب سے خون کا فوارہ اٹھ پڑا اور گھاس رنگین ہونے لگی۔

میشیا کے جوان، جنہیں طلب کیا گیا تھا، سڑ پچر اٹھائے، انہروں کے پیچھے کھڑے ہو گئے۔ پرنس آندرے شادندھا کیے چھاتی کے بل گھاس پر لیٹا ہوا تھا اور سے سانس لینے میں دشواری پیش آرہی تھی۔

”اے انتظار کس بات کا؟ آگے آؤ!“

کسان آگے بڑھے۔ انہوں نے پرنس آندرے کے کندھوں اور ٹانگوں پر ہاتھ ڈالے لیکن وہ بری طرح کراہا تھا۔ میشیا کے جوانوں نے آپس میں نگاہوں کا تبادلہ کیا اور اسے پھر نیچے لٹا دیا۔

”انہیں اٹھاؤ، اٹھاؤ، اٹھاؤ، اٹھاؤ، اٹھاؤ، اٹھاؤ!“ کسی نے چلا کر کہا۔

انہوں نے دوبارہ اسے کندھوں سے پکڑا، اوپر اٹھایا اور سڑ پچر پر لٹا دیا۔

”اف، میرے خدایا، میرے خدایا!۔۔۔ کہاں؟ پیٹ میں؟“

”بس، یہ اب گھے!۔۔۔ اف، خدایا!“ انہر چیخ پکار کرتے سنائی دیے۔

”بیزن زن کرتا میرے کان کے بالکل قریب سے گزر گیا۔ بس ذرا سی خراش آئی!“ ایجوٹسٹ نے کہا۔

کس نوں نے سٹرچر پنے کندھوں پر درست کیا اور اس پگڈنڈی پر چلنے لگے، جو ڈرینگ ٹیشن کے چکر کاٹنے کاٹنے ان کے پاؤں نے بنا دی تھی۔

”قدم سے قدم ملا کر چلو! یہ کسن!“ ایک افسر نے گلا پھر کر کہا۔ اس نے ان میں سے ایک کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا تاکہ وہ بے ربط قدموں میں، جن سے سٹرچر ہچکولے کھا رہا تھا، کسی طور بال میل پیدا کر سکے۔

”فیورر، قدم ملا کر چلو! فیورر!“ سب سے اگلے کسن نے کہا۔

”سن لیوٹا لیے ہیں!“ پچھلے نے کہا۔ وہ خوش تھا کہ اس کے قدم باقیوں سے مل گئے ہیں۔

”یوہرائکسی لینسی! آف! پرنس!“ تسوخن نے کپکپاتی آواز میں کہا۔ وہ بھگم بھگ آیا تھا اور اب سٹرچر پر نگاہیں جمائے ہوئے تھا۔

”پرنس آندرے نے آنکھیں کھولیں اور سٹرچر کی، جس پر اس کا سر جھکی جانب ڈھلک گیا تھا، گہرائیوں میں سے حکم کی جانب دیکھا اور اس کے پوٹے دربارہ بند ہو گئے۔

طیش کے جوان پرنس آندرے کو جنگل کے قریب مرہم پٹی کے مرکز میں لے گئے۔ ڈرینگ ٹیشن تین خیموں پر مشتمل تھا، جنہیں برج کے درختوں کے جھنڈ کے قریب گاڑا گیا تھا۔ خیموں کے پردے اٹھا کر پیچھے بانٹ دیے گئے تھے۔ ایسبوسنس گاڑیاں اور گھوڑے درختوں کے بیچ میں کھڑے تھے۔ گھوڑے راندہ کھ رہے تھے اور ان کی گتھلیوں سے جو دانے باہر گر پڑتے تھے، انہیں اٹھانے کے لیے چڑیاں نیچے جھپٹ پڑتی تھیں۔ کوئے، جنہیں خون کی بو آ رہی تھی، درختوں کے آس پاس منڈلا رہے تھے اور انہوں نے اپنی کانیں کانیں سے آسمان سربراٹھا رکھا تھا۔ خیموں کے چاروں اطراف پانچ ایکڑ سے زیادہ رتبے پر مختلف لباس پہنے لوگ کھڑے، بیٹھے یا لیٹے ہوئے تھے۔ ان کے ابدان خون آلود تھے۔ سٹرچر بردار ہجوم درہجوم کھڑے انہیں مغموں نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ جن افسروں کا کام نظم و ضبط کی پابندی کرنا تھا، وہ انہیں منتشر کرنے کی بہتری کوشش کرتے لیکن ناکام رہتے۔ یہ لوگ اپنے سٹرچروں سے ٹیک لگائے، بڑی توجہ اور انہماک سے یوں سامنے نظر میں جمائے ہوئے تھے جیسے وہ اس منظر کی، جس کا وہ مشاہدہ کر رہے تھے، پیچیدہ اہمیت سمجھنے کی کوشش کر رہے ہوں۔ خیموں سے بلند اور غصیلی چیخوں کی آوازیں آ رہی تھیں اور ان میں پر ملاں سسکیوں اور آہوں کی آمیزش ہو رہی تھی۔ وقفے وقفے کے بعد ڈاکٹر کا اسٹنٹ پانی لینے یا یہ بتانے کہ اب کسے اندر لایا جائے، بھاگم بھاگ باہر آتا۔ جو بحر و مین خیموں کے باہر اپنی باری کا انتظار کر رہے تھے، بھڑائی ہوئی آوازیں میں آہیں بھر رہے تھے، رورہے تھے، چلا رہے تھے، کفر بک رہے تھے اور دوا کا کی بھیک مانگ رہے تھے۔ بعضوں کی کیفیت ہڈیانی ہو رہی تھی۔

پرنس آندرے کے حوال، بحر و مین کو، جن کے زخموں کی ابھی تک مرہم پٹی نہیں ہوئی تھی، پاؤں تلے روندتے رجسٹ کے کمانڈر کی حیثیت سے اسے ایک خیمے کے قریب لے آئے، یہاں وہ رک گئے اور ہدایات کا انتظار کرنے لگے۔ پرنس آندرے نے اپنی آنکھیں کھول دیں لیکن کافی عرصے تک وہ بالکل سمجھ نہ پایا کہ اس کے گرد و پیش کیا ہو

رہا ہے۔ اسے چراگاہ، انسٹین کا جھنڈ، بل پھر اٹھیت، لٹو کی طرح گھومتا سیاہ گوندہ یاد آئے اور اسے یہ بھی یاد آیا کہ اس کے دل میں زندہ رہنے کی پرجوش، منگ اچانک بیدار ہو گئی تھی۔

اس سے کوئی دو قدم کے فاصلے پر ایک دراز قد اور خوب روئان کشنڈا فسر، جس کے بال سیاہ تھے، سر پر پٹی باندھے درخت کے تنے سے ٹیک لگائے کھڑا تھا۔ اس کے سر اور ایک ٹانگ میں گولیوں کے زخم تھے۔ وہ بہت اونچی آواز میں باتیں کر رہا تھا اور سب کی توجہ اپنی طرف مبذول کر رہا تھا۔ زخمیوں اور شریچہ برداروں کا خاصا بڑا ہجوم اس کے ارد گرد جمع ہو گیا تھا اور وہ جو کچھ کہہ رہا تھا، اسے نہایت شوق سے سن رہا تھا۔

”ہم نے اسے مار مار کر اس کا وہ بھر کس نکالا کہ وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر بھاگ اٹھا۔ بلکہ ہم نے خود بادشاہ کو بھی پکڑ لیا۔“ اس نے اپنے گرد و پیش دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ بہت جوش میں آچکا تھا اور اس کی آنکھیں جھمکے لگی تھیں۔ ”یقین مانیں اگر اس وقت یہ زرد ستے آجائے، توڑھوٹے اس کا نام دنتاں تک نہ ملے۔“

مشکلم کے قریب جو لوگ تھے، ان سب کی طرح پرنس آندرے کی آنکھوں میں بھی چمک اُٹھ گئی تھی۔ وہ اسے بنور دیکھ رہا تھا اور اسے قدرے اطمینان کا احساس ہو رہا تھا۔

”لیکن اب یہ سب کچھ بے معنی نہیں ہو گیا؟“ اس نے سوچا۔ ”رہاں حالات کس قسم کے ہوں گے۔ اور یہاں صورت حال کیا ہے؟ مجھے زندگی کو خیر باد کہنے میں اتنا تامل کیوں تھا؟ اس زندگی میں کوئی چیز ایسی ہے جسے میں سمجھ نہیں پایا اور نہ اب مجھے اس کی سمجھ آرہی ہے۔“

37

ایک ڈاکٹر خیمے سے باہر آیا۔ اس کا سپرن اور ہاتھ خون سے تر ہوتے تھے۔ وہ انگوٹھے اور چھٹکی سے سگار پکڑے ہوئے تھا تاکہ اس پر خون کے دھبے نہ پڑ سکیں۔ اس نے اپنا سر اوپر اٹھایا اور زخمیوں کے اوپر ہی اوپر چاروں اطراف نکاہیں گھمائیں۔ بظاہر وہ تھوڑی دیر کے لیے کام سے چھٹکارا چاہتا تھا۔ جب وہ اپنی گردن دھڑا دھڑا چکا، اس نے آہ بھری اور نیچے دیکھنے لگا۔

”بہت اچھا، آ جاؤ۔“ اس نے اپنے اسٹنٹ کو، جس نے اس کی توجہ پرنس آندرے کی طرف دلائی تھی، جواب دیا اور اس سے کہا: ”ہاں، انھیں اندر لے آؤ۔“

جو مجرا تھیں، اپنی باری کے منتظر تھے، بڑبڑانے لگے۔

”معلوم ہوتا ہے کہ اگلی دنیا میں بھی انھیں بڑے لوگوں کا راج ہوگا۔“

پرنس آندرے کو اندر پہنچانے کے بعد میز پر لٹا دیا گیا۔ یہ میز ابھی ابھی خالی ہوئی تھی اور ڈیسک سے دھوم مچ رہی تھی۔ کیمپ میں کیا کچھ تھا، وہ اسے پوری طرح سمجھ نہ سکا۔ چاروں اطراف جو دل خراش آوازیں بلند ہو رہی تھیں اور خود اس کے اپنے پیٹ اور ٹانگ میں جو درد ہو رہا تھا، اس سے اس کی توجہ بٹ جاتی تھی۔ اپنے گرد و پیش اسے جو

جیز بھی نظر آتی، معلوم ہوتا کہ وہ ایک ہی عمومی تاثر میں گھل مل گئی ہے کہ خیمہ اسی طرح برہنہ اور خوں چکاں اجسام سے بھرا نظر آتا ہے جس طرح چند ہفتے قبل انگست کی اس گرم شام اسے سمولٹسک روڈ کے قریب غلیظ ناماب میں اجسام سے پردھائی دیا تھا۔ ہاں، یہ بھی اسی قسم کا گوشت پوست تھا، وہی Chair a canon، جسے دیکھ کر اس کے دل پر دہشت سوار ہو گئی تھی۔ کچھ یوں نظر آتا تھا کہ جو کچھ وہ اب دیکھ رہا تھا، اسے اس کی پیشگی خبر ہو گئی تھی۔

خیمے میں تین میزیں تھیں۔ دو فارغ نہیں تھیں۔ تیسری پر انھوں نے پرنس آندرے کو لٹا دیا۔ کچھ دیر کے لیے جب اسے تنہا چھوڑ دیا گیا، وہ غیر ارادی طور پر یہ دیکھنے لگا کہ دوسری میزوں پر کیا ہو رہا ہے۔ جو میز اس کے قریب تریں تھی، اس پر ایک تاتار بیٹھ تھا۔ اس کے قریب جو دردی پڑی تھی، اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ غالباً قازق ہے۔ اسے چار سپاہیوں نے تھام رکھا تھا جب کہ ڈکٹر چشمہ چڑھائے اس کی گٹھلی گندی کمر میں چیر دے رہا تھا۔

”ہائے، ہائے! ارے مار دیا!“ تاتار داویل کر رہا تھا۔ اچانک اس نے اپنا گندمی چہرہ اوپر اٹھایا، جس پر چھوٹی اور چھٹی ناک تھی اور جس کے رخساروں کی ہڈیاں ابھری ہوئی تھیں۔ اپنے سفید دانت ننگے کیے۔ اس کا جسم مل کھانے اور پھڑکنے لگا، اور اس نے کانوں کے پردے پھڑدینے والی بڑی لمبی چیخ ماری۔

دوسری میز کے ارد گرد لوگوں کا جھگڑا تھا۔ اس پر ایک بھاری بھر کم کچم شحم شخص سر نہوڑائے پڑا تھا۔ پرنس آندرے کو اس کے سر کی ساخت، شکل اور اس کے بالوں کی رنگت اور تھنگریا لے پن میں عجیب قسم کی شناسائی نظر آئی۔ اسے نیچے دبائے رکھنے کے لیے متعدد ڈریسر اس کے سینے پر جھکے ہوئے تھے۔ اسے جب دور پڑا، اس کی ایک لمبی، سفید اور نرہ ٹانگ پر تشنج کی کیفیت طاری ہو جاتی اور وہ پھڑکنے لگتی۔ وہ آدھی سبکیاں لے رہا تھا اور اس پر لرزہ طاری تھا۔ دوسرے جن۔ ان میں ایک درد روتھا اور اس کا جسم کانپ رہا تھا۔ اس کی دوسری ٹانگ کے ساتھ، جو لبوہان تھی، چپ چاپ کچھ کر رہے تھے۔

جب معنگ ڈاکٹر تاتار سے، جس پر اور کوٹ ڈال دیا گیا تھا، فراغت پا چکا، وہ ہاتھ پونچھتا پرنس آندرے کی طرف آیا۔ اس نے پرنس آندرے پر اپنی نظر ڈالی اور غلٹ سے چیخے ہٹ گیا۔

”ان کے کپڑے اتار دو۔ جلدی کرو۔ میرا منہ کیا تک رہے ہو؟“ اس نے غصے سے اسٹنٹ سے چلا کر کہا۔ جب اسٹنٹ آستینیں چڑھائے پھرتی سے پرنس آندرے کے ہٹن کھولنے اور اس کے کپڑے اتارنے لگا، اسے اپنی بالکل ابتدائی طفولیت کا زمانہ، جو اب قصہ پارینہ بن چکا تھا اور ماضی کے دھند لکوں میں کھوپکا تھا یاد آ گیا۔ ڈاکٹر زخم کے اوپر جھکا، اس نے آہ چھو کر اس کی گہرائی معلوم کی اور لمبی سانس لی۔ پھر اس نے کسی کی طرف ہاتھ سے اشارہ کیا۔ پرنس آندرے کے پیٹ میں جونا قافلے برداشت درد ہو رہا تھا، اس نے اس پر بے ہوشی طاری کر دی۔ جب اسے ہوش آیا، اس کی ٹانگ سے ٹوٹی پھوٹی ہڈیوں کی کرچیاں نکالی جا چکی تھیں، کٹا پھٹا گوشت قطع کیا جا چکا تھا اور زخم پر پٹی باندھی جا چکی تھی۔ اس کے چہرے پر پانی چھڑکا جا رہا تھا۔ جو بھی اس نے آنکھیں کھولیں،

ذاکر اس کے اوپر جھکا، اس کے ہونٹوں پر بوسہ دیا اور ایک لفظ کہے بغیر بائیں دہان سے کھسک گیا۔

پرنس آندرے جس قسم کے کرب میں سے گزرا تھا، اس کے بعد اسے جو سکون نصیب ہوا، اس کا اسے مدتوں تجربہ نہیں ہوا تھا۔ اس کی زندگی کے بہترین اور انتہائی مسرت بخش لمحات۔ خاص طور پر ابتدائی طفولیت کا عہد، جب اس کے کپڑے تبدیل کرنے کے بعد اسے بستر پر لٹا دیا جاتا تھا، نرس گاگا اسے لوریاں سناتی، وہ اپنا سر نیچے میں چھپا لیتا اور محض یہ احساس کہ وہ زندہ ہے، اس کی رگ رگ میں خوشی کی لہر دوڑا دیتا۔ اس کے ذہن میں گردش کرنے لگے جیسے وہ ماضی کی چیزیں نہ ہوں، بلکہ عصر حاضر کی حقیقت ہوں۔

ذاکر کسی زخمی پر پوری توجہ اور انتہا ک سے کام کر رہے تھے۔ اس زخمی کا سر آندرے کو جانا پہچانا معلوم ہوا۔ وہ اسے اوپر اٹھا رہے اور اسے چپ کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

”مجھے دکھاؤ، مجھے دکھاؤ۔ ہائے، ہائے... ہائے“ اس کی آنکھوں اور کراہوں سے دہشت زدگی کا اظہار ہو رہا تھا اور جس انداز سے وہ نالہ و شیون بپا کر رہا تھا، اس سے مترشح ہو رہا تھا کہ وہ بنیادی طور پر گھٹیا اور اچھا آدمی ہے۔ اس شخص کی ہائے دائیں سن کر پرنس آندرے کا جی چاہنے لگا کہ وہ پھوٹ پھوٹ کر دنا شروع کر دے۔ چونکہ وہ کوئی کارنامہ سرانجام دیے بغیر اس جہان فانی سے رخصت ہو رہا تھا، یا اسے یہ زندگی قبیح و بے عزت تھی کہ وہ اس سے ہاتھ دھونا نہیں چاہتا تھا، یا اسے بچپن کا وہ زمانہ، جو لوٹ کر کبھی واپس نہیں آسکتا تھا، یا آ رہا تھا، یا یہ کہ وہ اذیت میں مبتلا تھا، دوسرے لوگ اذیت میں مبتلا تھے، یا یہ شخص جسے رقت انگیز انداز سے ہائے دائیں کر رہا تھا، وجہ خواہ کچھ بھی ہو، وہ بہر حال بچوں کی طرح رونا، معصوم، تقریباً مسرت سے بھرپور، آنسو بہانا چاہتا تھا۔

مجرد شخص کو اس کی قطع شدہ ٹانگ دکھا دی گئی۔ اس پر خون جما ہوا تھا اور پاؤں میں بوٹ تھا۔

”میرے خدا! یہ کیا ہے؟ یہ یہاں کیوں ہے؟“ پرنس آندرے نے اپنے آپ سے پوچھا۔

اس مصیبت کے بارے، مسکیاں بھرتے، بے حوصلہ شخص میں، جس کی ٹانگ ابھی ابھی قطع کی گئی تھی، پرنس آندرے نے اناطول کورامن کو پہچان لیا۔ یہ بالکل اناطول تھا جسے انھوں نے بازوؤں میں تھام رکھا تھا اور جسے وہ پانی کا گلاس پیش کر رہے تھے لیکن جس کے کپکپاتے سوجے ہوئے ہونٹ اس کا کنارہ پکڑنے سے جڑ گئے۔ اناطول کی آہ نکل گئی اور اس کا جسم بید مجنوں کی طرح کانپنے لگا۔ ”ہاں، یہ وہی ہے، ہاں، اس شخص کا کسی نہ کسی طور مجھ سے گہرا اور تکلیف دہ تعلق ہے،“ پرنس آندرے نے سوچا۔ تاہم وہ ابھی تک صحیح طور پر یہ اندازہ نہیں کر سکا تھا کہ اس نے اپنے سامنے جس شخص کو رکھا ہے، وہ فی الحقیقت ہے کون۔ ”اس شخص کا میرے بچپن سے، میری زندگی سے کیا تعلق ہے؟“ اس نے اپنے آپ سے پوچھا لیکن اسے جواب نہ مل سکا۔ اچانک بچپن، پاکیزگی اور محبت کی اس ملکیت میں بالکل نئی اور غیر متوقع یاد اور آئی اور پرنس آندرے کے ذہن میں گھومنے لگی۔ اسے وہ نانا یاد آئی، جس سے وہ اوہین بار 1810 میں بال پر ملا تھا۔ مہین گردن، دبلے پٹے بازو، سہا سہا شاش بٹاش چہرہ، جو جوش مسرت سے بے خود ہونے کے لیے تیار تھا۔ اور اس کے دل میں اس کے لیے محبت اور شفقت کا جذبہ بیدار ہو گیا، جو پہلے

کی نسبت کہیں زیادہ توانا اور جاندار تھا۔ اب اسے وہ تعلق یاد آیا جو اس کے اور اس شخص کے مابین تھا، جو آنسوؤں میں سے، جن سے اس کی سوجی ہوئی آنکھیں لبریز تھیں، اسے دیکھ رہا تھا اور اس شخصے میں پھنسا ہوا تھا کہ یہ کون ہے۔ پرنس آندرے کو سب کچھ یاد آ گیا اور اس کے مسرت سے معمور دل میں اس شخص کے لیے ربردست محبت اور رحم کا چشمہ پھوٹ پڑا۔

پرنس آندرے کو اب مزید ضبط کا یا راندہ رہا۔ سارے بندھن ٹوٹ گئے۔ وہ بے اختیار اپنے ساتھی انسانوں کے لیے، اپنے لیے، ان کی اور اپنی غلطیوں پر، محبت اور شفقت کے آنسو بہانے لگا۔

”عفو، رحم اور محبت، اپنے بھائیوں کے لیے، ان کے لیے جو ہم سے محبت کرتے ہیں اور ان کے لیے جو ہم سے نفرت کرتے ہیں، محبت ہمارے دشمنوں کے لیے۔ ہاں، وہی محبت، جس کی خداوند نے رے زمین پر تبلیغ کی، جو پرنس ماریا نے مجھے سکھانے کی کوشش کی اور جسے میں سمجھ نہ سکا۔ زندگی سے دست کشی اختیار کرنا مجھے جو اچھا نہ لگا، وہ محض اسی کی وجہ سے تھا، اگر میں مزید زندہ رہا تو میرے لیے یہی کچھ باقی رہ جائے گا مگر اب بہت تاخیر ہو چکی ہے، مجھے معلوم ہے۔“

38

ایک طرف میدان جنگ، جو ماشوں اور زخمیوں سے بٹا پڑا تھا، بھی ایک منظر پیش کر رہا تھا۔ ادھر پولین کو سر میں گرانی محسوس ہو رہی تھی، اوپر سے اسے خبر ملی کہ تقریباً بیس جرنیل جنھیں وہ ذاتی طور پر جانتا تھا، ہلاک شدگان یا مجروحین میں شامل ہیں۔ پھر اسے یہ احساس بھی کھائے جا رہا تھا کہ اس کی فوج، جس کی کبھی دھاک بیٹھی ہوئی تھی، اب بے دست و پا ہو چکی ہے۔ یہ سب باتیں مل ملا کر پولین پر، جسے عام طور پر اپنی ذہنی قوت کا امتحان لینے کے لیے (جیسا کہ وہ سمجھتا تھا) زخموں اور ہلاک شدگان کے بارے میں دیر تک سوچ بچار کرنا پسند تھا، غیر متوقع انداز سے اثر انداز ہوئیں۔ پولین بڑی سے بڑی مصیبت میں کبھی گھبرایا نہیں تھا۔ اس کے خیال میں اس کے اسی وصف سے اس کی عظمت اور وقعت تشکیل پاتی تھی، لیکن اس روز میدان جنگ کا مہیب اور لرزہ خیز منظر وہ بھی برداشت نہ کر سکا۔ اس نے میدان کا رزار سے یہ جھلکتا روانہ ہونے میں ہی عافیت جانی اور وہ شیواروینو کے ٹیلے کی جانب چل پڑا۔ وہاں وہ کمپ سٹول پر بیٹھ گیا اور نگاہیں جھکا کر غیر ارادی طور پر قارئنگ کی آواز سننے لگا۔ اس کا چہرہ پیلا، پھولا ہوا اور بھری تھا۔ آنکھوں کی چمک کا نور ہو چکی تھی، ناک سرخ ہو رہی تھی اور جب وہ بات کرتا، اس کی آواز بھڑا جاتی۔

وہ تکلیف دہ آزر وگی کے ساتھ اس کا رزار کے، جس کی ابتدا تو اس کے ہاتھوں ہوئی تھی لیکن جسے ختم کرنا اس کے بس کی بات نہ رہا تھا، اہتمام پذیر ہونے کا انتظار کر رہا تھا۔ زندگی کے اس جعلی سراب پر، جس کا وہ اتنے عرصے سے پانی بھرتا چلا آیا تھا، وقتی طور پر سہی، تدرقی انسانی جذبہ حاوی ہو گیا۔ اس نے میدان جنگ میں جن اسوات اور مصائب کا مشاہدہ کیا تھا، وہ انھیں اپنی ذات میں محسوس کرنے لگا۔ اسے اپنے سر اور سینے میں جس گرنی کا احساس ہو

رہا تھا، اس سے اسے یہ اندازہ ہوا کہ یہ موت اور مصیبت خود اسے بھی اپنے شکنجے میں جکڑ سکتی ہے۔ اس لیے اسے اسکو نصرت یا نام و نمود کی کوئی تمنا باقی نہیں رہ گئی تھی۔ (اسے مزید نام و نمود کی ضرورت ہی کیا تھی؟) واحد چیز جس کی اب اسے خواہش تھی، وہ آرام، سکون اور فراغت تھے لیکن جب وہ سمیو نووسک کی پہاڑی پر تھا، آرٹری کے کاغذ نے اسے تجویز پیش کی تھی کہ اس بلند مقام پر متعدد بیٹریاں نصب کر دی جائیں تاکہ روسیوں پر، جو کنیاز کا دو کے سامنے اکٹھے ہو گئے تھے، شدید فائرنگ کی جاسکے، تو اس نے رضامندی کا اظہار کر دیا تھا اور اس نے حکم دیا تھا کہ اس فائرنگ کے نتائج سے اسے آگاہ کیا جاتا رہے۔

ایک ایجوٹ گھوڑ بھگا تانپولین کے پاس پہنچا اور اس نے بتایا کہ ہر میچنی کے حکم پر دو سو تین روسیوں پر فائرنگ کر رہی ہیں لیکن وہ ٹس سے مس نہیں ہو رہے، اپنی جگہ ڈلے کھڑے ہیں۔

”ہاری فائرنگ سے ان کی صفوں کی صفیں نیست و نابود ہو رہی ہیں لیکن وہ ہیں کہ وہاں سے ہل ہی نہیں رہے۔“
”اور چاہئیں؟“ تانپولین نے میٹھی ہوئی آواز سے پوچھا۔

”کیا نہ، یا، ہاں جاہ؟“ ایجوٹ نے کہا، جو تانپولین کے الفاظ صحیح طور پر نہیں سن سکا تھا۔

”انہیں اور چاہئیں؟“ تانپولین نے میٹھی ہوئی آواز میں اپنے اللہ ظارٹش روئی سے دہرائے۔ ”وے رو!“

اس کے حکم کے بغیر ہی (اس نے یہ حکم محض اس لیے دیا تھا کہ کیونکہ اس کا خیال تھا کہ اس سے اسی کی توقع کی جا رہی ہے) پہلے ہی اس کی خواہش کی تکمیل ہو رہی تھی اور وہ ایک بار پھر عظمت کے خوابوں کی مصنوعی دنیا میں کھو گیا اور اس نے (کو لھو کے تیل کی طرح، جو یہ بھٹتا ہے کہ وہ جو کچھ کر رہا ہے، اپنی مرضی سے کر رہا ہے) بلا جھجکا اس سفاک، ضرر رساں، طال انگیز اور نہایت کش کردار کو، جس کی انجام دہی اس کا مقدر تھا، دوبارہ سنبھال لیا۔ اس شخص کا، جس پر کسی دوسرے شخص کی نسبت، اس سب کچھ کا جو ہو رہا تھا، کہیں زیادہ بھاری بوجھ لدا ہوا تھا ذہن اور ضمیر محض اس روز اور اس لمحے ہی اندھیرے میں ٹامک ٹوپیاں نہیں مار رہے تھے بلکہ اپنی زندگی کے آخری لمحات تک وہ اچھائی، خوبصورتی، سچائی یا اپنے افعال کی، جو اچھائی اور سچائی کے بالکل سٹانی تھے، اہمیت سمجھنے میں ناکام رہا۔ وہ ہر اس چیز سے جو انسان میں نہایت پیدا کرتی ہے، اعتادور رہا کہ اس کی معنویت اس کے لیے ہی نہ ہو سکی۔ بھلے آدمی دنیا اس کے افعال کی تعریف میں رطب اطلس رہے، وہ یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ اس کا ان سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ چنانچہ وہ سچائی، اچھائی، خوبصورتی اور ہر قسم کی انسانیت سے قطع تعلق کرنے پر مجبور رہا۔

اس روز جب وہ میدان جنگ کا، جو مقتولوں اور زخمیوں سے پاپڑا تھا (اس کا خیال تھا کہ یہ سب کچھ اس کی مرضی کے مطابق ہوا ہے)، چکر لگا رہا تھا اور یہ مظلوم کر رہا تھا کہ ایک فرانسیسی کے مقابلے میں کتنے ردی گھائل باہاک ہوسے ہیں اور جب اسے یہ اندازہ ہوا کہ روسیوں کا اعلانِ جسم و جان فرانسیسیوں سے پانچ گنا زیادہ ہے، تو اس کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا اور وہ فریبِ نفس میں مبتلا ہو گیا، میں اور اس نے سرخوشی کے عالم میں یہ لکھ کر پیریں بھیجا: ”میدان جنگ نہایت زبردست منظر پیش کر رہا تھا“ کیونکہ وہاں ہزار لاشیں پڑی تھیں۔ اس کی یہ ذہنی کیفیت اس پر اسی روز

وارد نہیں ہوئی تھی، بلکہ سینٹ ہیلینا کے جزیرے کی پرسکون تنہائی میں، جہاں اس نے یہ کہا تھا کہ اس کا ارادہ فرمت کے اوقات اپنے عظیم کارناموں کی تفصیل قلم بند کرنے میں صرف کرنے کا ہے، اس نے تحریر کیا۔

”روسی جنگ کو عصر جدید کی مقبول ترین جنگ ہونا چاہیے تھا۔ یہ جنگ عقل سلیم اور حقیقی مفادات کی جنگ تھی۔ اس کے ذریعے سب کے لیے شامی، اور تحفظ فراہم کرنا، امن قائم کرنا اور پرانی قدروں کو محفوظ کرنا مقصود تھا۔“

اس جنگ کے پس پردہ عظیم مقصد کا فرما تھا کہ بے یقینیاں ختم کی جائیں اور تحفظ کی ابتدا کی جائے۔ اس سے نیا افق طلوع ہو جاتا، نئی کوششوں کا، جو سب کی بھلائی اور خوشحالی کے لیے ہوئیں، آغاز ہو جاتا۔ یورپی نظام پہلے ہی قائم ہو چکا تھا، اب اسے صرف منظم کرنے کا کام باقی رہ گیا تھا۔

اگر ان نکات کی تکمیل ہو جاتی اور ہر جگہ امن قائم ہو جاتا، میں بھی اپنی کانگریس منعقد کرتا اور اپنا بیٹاق مقدس⁸³ سفر میں لے آتا۔ یہ صورت میرے تھے، چرا دو سرور نے لیے۔ خود مختار حکمرانوں کے اس عظیم اجتماع میں ہم اپنے مفادات پر خاندان کی طرح بحث و مباحثہ کرتے اور اپنی اپنی اقوام کے سامنے اسی طرح جواب دہ ہوتے جس طرح منشی اپنے آقا کے سامنے ہوتا ہے۔

اس طرح یورپ صحیح معنوں میں ایک حقیقت بن جاتا اور وہ قوم واحد کے سانچے میں ڈھل جاتا جو شخص جہاں بھی سفر کرتا، ایسے آپ کو مشترکہ وطن میں پاتا۔ میں اصرار کرتا کہ ان تمام دریاؤں میں، جن میں جہاز رانی ہو سکتی ہے، سب کو جہاز چلانے کی آزادی ہو، سمندروں پر سب کی مشترکہ حکمرانی ہو اور موجودہ عظیم اقوام میں اس حد تک تخفیف کر دی جائے کہ وہ حکمرانوں کی محض باڈی گارڈ بن کر رہ جائیں۔

عظیم، طاقتور، پر امن، پر شکوہ، جلیل القدر وطن، فرانس کی کود میں داجیں پہنچ کر میں یہ اعلان کر دیتا کہ اس کی سرحدیں اٹل اور ناقابل تبدیلی ہیں، مستقبل کی جنگیں خالصتاً دفاعی ہوں گی، تمام نئی توسیحات وطن دشمن گردانی جائیں گی۔ میں اپنے بیٹے کو اپر اطور یہ کے امور میں اپنا ساجھی بیٹا لیتا۔ میری آمریت ختم ہو جاتی اور اس کی آنکھیں حکمرانی کا دور شروع ہو جاتا...

پیرس دنیا کا صدر مقام بن جاتا، اور فرانسیسی اقوام عالم کے لیے باعث رشک بن جاتے۔ پھر میری فرصت کے اوقات، بڑھاپے کے ایام اور وہ زمانہ، جب میرا بیٹا حکمرانی کے آداب سیکھ رہا ہوتا، امپراطورہ کی معیت میں امپراطور یہ کے کونے کونے کا دورہ کرنے میں صرف کرتا۔ سچے رہائی باشندوں کی طرح ہمیں کوئی جلد بازی نہ ہوتی، ہمارے پاس اپنے گھوڑے ہوتے اور ہم آرام آرام سے سفر کرتے۔ لوگوں کی شکایات سنتے، زیادتیوں کا مداوا کرتے، جہاں کہیں جاتے، عوام کی بھود کے لیے کام کرتے اور جگہ جگہ سرکاری عمارات تعمیر کراتے۔

اس شخص نے، جسے مشیتِ ایزدی نے اقوام کے جلا دکا انیسویں ناک اور ناگزیر کردار ادا کرنے کے لیے پیشگی جن لیا تھا، اپنے آپ کو قائل کر لیا کہ اس کے افعال کا محرک اقوام کی فلاح و بہبود ہے، وہ لاکھوں کروڑوں انسانوں کے مقدر کو کنٹرول کر سکتا اور اپنے اختیارات کو بروئے کار لا کر انھیں فوائد سے بہرہ ور کر سکتا ہے۔

”ان چار لاکھ اشخاص میں سے، جنھوں نے دستِ بالا عبور کیا (اس نے جنگ روس کے متعلق مزید لکھا)، نصف آسٹریائی، پریشائی، سیکسن، پولستانی، بوار یاہائی،⁸⁴ ورم برگی، میکلن برگ، ہسپانوی، اطالوی اور بحالی تھے۔ اصل شاہی فوج کا تیسرا حصہ ولندیزیوں، بلجیوں، رائن لینڈ کے ہسپوں، پرمونیوں، سوستانیوں، جینیویں، اسکائیوں، روسیوں، اور بریمن اور ہسبرگیوں وغیرہ کے بیسیوں فوجی ڈویژن پر مشتمل تھا۔ اس میں وہ لوگ، جو فرانسیسی بولتے تھے، ان کی تعداد مشکل ایک لاکھ چالیس ہزار ہوگی۔ روسی ہم میں فرانس کے پچاس ہزار سے کم افراد تھے۔ اہل بنے جب کہ ولنا سے پسپائی اختیار کرنے کی تاریخ متعین، ماسکو تک روسیوں کا جانی نقصان فرانس سے چار گنا زیادہ تھا۔ ماسکو کی آتش زدگی کا نتیجہ یہ ہوا کہ روسیوں کو ایک لاکھ انسانوں کی قربانی دینا پڑی۔ یہ لوگ جنگوں میں سردی، درجہ حرارت سے ہلاک ہوئے۔ اور آخر میں روسیوں کو ماسکو سے دریائے اور نیل کوچ کے دوران میں موسم کی سختیاں بھی تھیلیا بڑیں۔ جب وہ ولنا پہنچے، ان کی تعداد گھٹتے گھٹتے پچاس ہزار رہ گئی اور کالینس⁸⁵ میں تو صرف اٹھارہ ہزار بچے باقی رہے۔

اس کا خیال تھا کہ روس کے ساتھ جو جنگ ہوئی، وہ اس کے منشا کا نتیجہ تھی۔ جنگ میں جو ہول ناکیاں روا رکھی گئیں، وہ اس کی روح کا کچھ بھی نہ بگاڑ سکیں۔

جو کچھ وقوع پذیر ہوا، اس نے بڑی جرأت سے اس کی کمال ذمہ داری قبول کی اور اس کے پراگندہ دہن نے اس کا جواز اس یقین میں ڈھونڈ لیا کہ جو لاکھوں اشخاص موت سے ہم کنار ہوئے، ان میں فرانسیسیوں کی تعداد بوار یاہائیوں یا ہسپوں کی نسبت کم تھی۔

مختلف وردیوں میں بیس ہزاروں افراد مختلف صورتوں میں کھیتوں اور چراگااہوں۔ یہ کھیت اور چراگااہیں دادی دلف خاندان اور بعض شاہی غلاموں کی ملکیت تھیں اور ان میں صدیوں سے بارودینو، گورکی، شیوارو، بنو اور سمیو نووسک کے دیہات کے باشندے فعلیں بولتے اور مویشی چراتے آرہے تھے۔ میں مرے پڑے تھے۔ ڈرینگ شیشیوں کے ارد گرد تقریباً تین تین ایکڑ زمین اور گھاس خون سے تر ہو چکی تھی۔ بحرواح اور غیر بحرواح اشخاص کے، جن کا تعلق مختلف یونٹوں سے تھا اور جن کے چہروں پر وحشت ٹپک رہی تھی، ہجوم کھینٹے کھٹاتے پیچھے ہٹ رہے تھے۔

ایک نوج کے جوان موڑ سیک کی جانب اور دوسری کے والیوائے دو کی طرف پلٹ رہے تھے۔ بعض جھوموں کو ان کے انسر آگے لے جا رہے تھے جب کہ کچھ اپنی اپنی جگہوں پر ڈٹے ہوئے تھے اور متواتر فائرنگ کر رہے تھے۔

سارے میدان میں، جہاں قبل ازیں صبح کی دھوپ میں گلیٹیں چمک رہی تھیں، دھوئیں کے ہلکے پھلکے مرغولے اوپر فضا میں اٹھ رہے تھے، اور پہلے جو اتنا حسین اور درخشاں تھا، اب وہاں کھرے، نمی اور دھوئیں کی چادر تھی ہوئی اور شور سے اور خون کی عجیب و غریب سرائندرجی بسی ہوئی تھی۔ آسمان پر گہرے بادل چھایے تھے اور زخمی، ہلاک شدہ، خوف زدہ، تھکے ماندے اور ضعیف الاراادہ، انسانوں پر پانی کی بوندیں برسنے لگی تھیں، جیسے وہ ان سے کہہ رہی ہوں: ”لوگو، کافی ہوگئی ہے، کافی ہوگئی ہے!... اپنی فکر کرو! یہ تم کیا کر رہے ہو؟“

بھوک اور آرام کے فقدان سے نڈھال دونوں اطراف کے انسانوں کے ذہنوں میں شکوک سرٹھانے لگے تھے کہ آیا انھیں ایک دوسرے کو موت کے گھاٹ اتارنے اور کشتوں کے پستے لگانے کا عمل جاری رکھنا چاہیے یا نہیں۔ ہر چہرے پر تذبذب کی علامات پڑھی جاسکتی تھیں اور ہر دل میں ایک ہی سوال اٹھ رہا تھا: ”میں کیوں، کس کے لیے، (دوسروں کو) ہلاک کر رہا ہوں اور ہلاک ہو رہا ہوں؟... تم جو جی چاہے کرو، جسے چاہو، مارو، میرا دل بھر چکا ہے!“

شام ہوتے ہوتے یہ خیال ہر دل میں پختہ ہو چکا تھا۔ یہ لوگ جو کچھ کر رہے تھے، کسی بھی لمحے اس کی دہشت ان پر اس حد تک سوار ہو سکتی تھی کہ وہ اچانک ہر چیز چھوڑ چھاڑ سکتے اور بدھرمناٹھتے، ادھر بھاگ سکتے تھے۔ ان لوگوں نے جو کچھ کیا تھا، اگرچہ لڑائی کے اختتام پر اس کی ہولناکی ان پر پوری طرح واضح ہو چکی تھی اور اگر وہ یہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر راہ فرار اختیار کر لیتے، انھیں بڑی راحت ہوتی، لیکن کوئی پراسرار، ناقابل اوراک قوت انھیں اپنے قابو میں رکھے ہوئے تھی اور بچے کھچے تو بچی۔ ہر تین میں صرف ایک زندہ بچا تھا۔ جن کے ابدان پسینے میں شرابور اور خون و بارود میں لتھڑے ہوئے تھے، اب بھی گولے لارہے، انھیں توپوں میں بھر رہے، نشانے باندھ رہے اور فلیٹوں کو آگ لگا رہے تھے، حالانکہ حال ان کا یہ تھا کہ قدم قدم پر ٹھوکریں کھا رہے اور حلق سے ہانپ رہے تھے۔ دونوں اطراف سے توپوں کے گولے ابھی تک اسی تیز رفتاری سے اڑ رہے تھے اور اسی سفاکانہ انداز سے انسانی اجسام کے چیتھڑے اڑ رہے تھے، اور وہ لرزہ خیز شغل، جو افراد کی نہیں ذات خداوندی کی، جو انسانوں اور عالموں پر حکومت کرتی ہے، مرضی سے پایہ تکمیل تک پہنچتا ہے، جاری تھا۔

جو شخص بھی روسی فوج کے عقب میں بد نظمی دیکھتا، یہی کہتا کہ فرانسیسی اگر ذرا سی اور کوشش کریں، روسی سپاہ چشم زدن میں نگا ہوں سے اوچھل ہو جائے گی۔ اور جو شخص فرانسیسی فوج کا عقب دیکھتا، وہ یہ خیال ظاہر کرتا کہ روسی تھوڑی سی اور کوشش کریں، تو فرانسیسیوں کا دھڑن تھمتہ ہو جائے گا۔ تاہم نہ فرانسیسیوں اور نہ روسیوں نے یہ کوشش کی۔ جنگ کا شعہ آہستہ آہستہ جل کر ہسم ہو گیا۔

روسیوں نے یہ کوشش اس لیے نہ کی کہ کیونکہ وہ فرانسیسیوں پر دھاوا نہیں بول رہے تھے۔ لڑائی کے شروع میں وہ محض ماسکو جانے والی شاہراہ پر کھڑے تھے اور یوں غنیم کے راستے میں دیوار بن گئے تھے۔ اور معرکے کے اختتام

پر بھی وہ وہیں بالکل اسی طرح کھڑے تھے جس طرح کہ وہ ابتدا میں کھڑے تھے۔ لیکن اگر روسیوں کا مقصد فرانسیسیوں کو اپنی پوزیشنوں سے نکال باہر کرنا بھی تھا تو ان میں اتنی اہمیت نہیں رہ گئی تھی کہ وہ یہ آخری کوشش کر گزرتے کیونکہ تمام روسی سپاہ کی زبردست دھنات کی ہو چکی تھی اور ایک بھی فوجی یونٹ ایسا نہیں تھا جسے لڑائی کے دوران میں نقصان نہ اٹھانا پڑا ہو اور روسیوں کو محض اپنی پوزیشنوں پر ڈٹے رہنے کے لیے اپنی آدھی فوج کو مارا جائیگا۔

فرانسیسی، جنہیں اپنی پندرہ سالہ فوجات یاد تھیں، جن کا ایمان تھا کہ پولین ناقابلِ تسخیر ہے اور جنہیں علم تھا کہ وہ میدان جنگ کے کچھ حصے پر قابض ہو چکے ہیں، اپنی صرف چوتھائی نفری سے محروم ہوئے تھے۔ ان کے گارڈز۔ جن کی تعداد بیس ہزار تھی۔ ابھی تک جنگ میں شریک نہیں کیے گئے تھے۔ وہ آسانی سے یہ کوشش کر سکتے تھے۔ چونکہ انہوں نے حملہ کیا ہی اس مقصد کے پیش نظر تھا کہ انہوں نے روسیوں کو اپنی پوزیشنوں سے نکال باہر کرنا ہے، انہیں یہ کوشش کرنا چاہیے تھی کیونکہ جب تک روسی، سکو جانے والی سرنگ پر سدراہ بنے کھڑے تھے، فرانسیسیوں کا مقصد حاصل نہیں ہو سکتا تھا اور انہوں نے جو کوششیں کی تھیں اور جو نقصانات اٹھائے تھے، وہ سب بیکار جا رہے تھے۔ لیکن فرانسیسیوں نے یہ کوشش نہ کی۔ بعض مورخین کہتے ہیں کہ اگر پولین گارڈز کو، جنہیں کوئی نقصان برداشت نہیں کرنا پڑا تھا، استعمال میں لے آتا، وہ لڑائی جیت جاتا۔ اگر پولین نے گارڈز کو میدان جنگ میں دھکیل دیا ہوتا، پھر کیا ہوتا، اس طرح کی باتیں کرنا ایسے ہی ہے جیسے کوئی یہ پوچھے کہ اگر بہار خزاں میں آ جائے، پھر کیا ہوگا۔ ایسا نہیں ہو سکتا تھا۔ پولین نے اپنے گارڈز کو اس لیے نہیں روکے رکھا کیونکہ وہ انہیں استعمال نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس نے انہیں اس لیے روکا کیونکہ وہ انہیں استعمال کر ہی نہیں سکتا تھا۔ فرانسیسی فوج کے تمام جرنیل، افسر اور جوان جانتے تھے کہ عسکریوں کا جذبہ ہر آن سست پڑنا جا رہا ہے اور ان حالات میں گارڈز کو لڑائی میں دھکیلا بیکار تھا۔

یہ صرف اکیلا پولین ہی نہیں تھا جسے اس بھیاں تک حقیقت کا احساس ہو رہا تھا کہ اس کی طاقتور فوج بے بسی کا شکار ہو گئی ہے بلکہ اس کی سپاہ کے تمام جرنیلوں اور جوانوں کو، خواہ وہ لڑائی میں شریک ہوئے تھے یا نہیں اور جنہیں گزشتہ معرکوں (جن میں اس لڑائی کی نسبت صرف دسویں حصہ زور لگانے سے وہ دشمن کو مار بھگاتے تھے) کا تجربہ تھا، اسی وحشت ناک احساس سے دوچار ہونا پڑ رہا تھا۔ اب ان کا واسطہ ایک ایسے حریف سے پڑا تھا جو اپنی نصف نفری کو مارنے کے بعد بھی اپنی جگہ بت بنا کھڑا تھا اور وہ لڑائی کے اختتام پر بھی اتنی ناقابلِ تسخیر تھا جتنا کہ اس سے پہلے تھا۔ حملہ آور فرانسیسی فوج کی اخلاقی قوت ختم ہو چکی تھی۔ روسیوں کو بارودینو میں جو کامرائی نصیب ہوئی، وہ اس قسم کی کامرائی نہیں تھی جس کا تعین چند ڈنڈوں کے، جن کے سروں پر پکڑے کی دھجیاں لٹی ہوئی ہیں اور جنہیں عرف عام میں پرچم کہا جاتا ہے، ہاتھ میں آ جانے سے ہوتا ہے یا زمین کے پکڑے پر، جہاں فوجیوں کی جماعت کھڑی رہی تھی یا کھڑی تھی، قبضہ ہونے سے ہوتا ہے۔ یہ فتح اخلاقی فتح تھی۔ اس قسم کی فتح، جو دشمن کو یہ یقین دلا دیتی ہے کہ اس کے حریف کو اس پر اخلاقی برتری حاصل ہے اور وہ خود اخلاقی طور پر نامردی کا شکار ہو چکا ہے۔

فرانسیسی فوج کو ایک ایسے جنوبی درندے کی طرح، جسے اپنے حملے کے دوران میں مہلک زخم آ جاتا ہے، محسوس ہونے لگا کہ اس کا آخری وقت قریب آ پہنچا ہے لیکن جس طرح روسی فوج، جو تعداد میں فرانسیسی فوج کا نصف تھی، ڈنگ گانے پر مجبور تھی، وہ (فرانسیسی فوج) نہ رکنے پر مجبور تھی۔ اسے شروع میں جو مہینز مل چکا تھا، اس کی بدولت وہ ماسکو کی طرف چل سکتی تھی اور چلی لیکن وہاں پہنچنے کے بعد اسے اس زخم کی وجہ سے، جو اسے بارودینو میں لگا تھا، روسیوں کی کسی قسم کی کوشش کے بغیر ہی لازماً نیست و نابود ہونا تھا اور اس کا اتنا خون نکلتا تھا کہ اس کے بچ نکلنے کی کوئی صورت رہ ہی نہیں جاتا تھی۔ بارودینو کی لڑائی کا براہ راست نتیجہ یہ تھا کہ پولین کو بلا سبب، ماسکو سے بھاگنا اور اسے اسی شاہرہ سولنسک کے ساتھ ساتھ، جس پر چل کر وہ ماسکو پہنچا تھا، واپسی کا سفر اختیار کرنا تھا۔ یوں پانچ لاکھ افراد پر مشتمل فوج کو تباہ و برباد ہونا اور پولیائی فرانس کو، جسے پہلی مرحلہ جذبہ اور جی داری کے اعتبار سے اپنے سے برتر حریف سے پیچہ آزمانے کی کرنا پڑی تھی، زخموں پر ہونا تھا۔

انسانی ذہن کے لیے حرکت کے مطلق تسلسل کا ادراک کرنا ناممکن ہے۔ کسی بھی قسم کی حرکت کے قوانین صرف تبھی انسان کی سمجھ میں آتے ہیں جب وہ اس حرکت کو من مانے طریقے سے توڑ لیتا ہے، اسے اکائیوں میں تقسیم کر دیتا ہے اور پھر ان کا بغور مطالعہ کرتا ہے۔ لیکن جب وہ حرکت مسلسل کو من مانے انداز سے غیر مسلسل اکائیوں میں منقسم کرتا ہے، اس کا یہی فعل خاصی بڑی انسانی غلطی کا سبب بن جاتا ہے۔

متقدمین کے اس گمراہ کن مغالطے سے ایک دنیا آگاہ ہے کہ انجیوس² اس کچھوے کو، جو اس سے پہلے روانہ ہو تھا، کبھی نہ پکڑ سکا، حالانکہ اس کی رفتار کچھوے کی رفتار سے دس گنا زیادہ تھی۔ جس مدت کے دوران میں انجیوس اس فاصلے کو، جو اس کے اور کچھوے کے درمیان ہوتا ہے، طے کرتا ہے، کچھوہ اس فاصلے کے دسویں حصے کے برابر اور آگے نکل چکا ہوتا ہے۔ جب انجیوس اس دسویں حصے کا سفر ختم کرتا ہے، کچھوے کو دسویں حصے کی برتری حاصل ہو جاتی ہے اور یوں یہ سلسلہ لامتناہی ہو جاتا ہے۔ متقدمین کو یہ مسئلہ لا-نخل معلوم ہوتا تھا۔ اس استخراج کی کہ انجیوس کبھی کچھوے کو پکڑ نہیں سکتا، مہمیت کی وجہ محض یہ ہے کہ حرکت کو من مانے انداز سے مختلف اکائیوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے جب کہ انجیوس اور کچھوہ مسلسل حرکت کر رہے ہیں۔

حرکت کو مختصر سے مختصر تر و مزید مختصر تر اکائیوں میں تقسیم کر کے ہم سسٹے کے حل کی طرف محض قدم برعائے ہیں، اس تک رسائی حاصل نہیں کر پاتے۔ اگر ہم یہ فرض کر لیں کہ خرد ترین مقدار موجود ہے، اس مقدار کو دس دس کی ضرب یا تقسیم سے بڑھایا یا گھٹایا جاسکتا ہے، اور ضرب اور تقسیم کا یہ سلسلہ لامحدود طور پر پھیلا جاسکتا ہے۔ پھر جب ہم ضرب و تقسیم کے اس عمل سے حاصل کردہ نتیجے پر پہنچیں گے، ہمیں مسئلے کا حل مل جائے گا۔ ریاضی کی ایک نئی شاخ معرض وجود میں آئی ہے۔ اس شاخ نے خرد ترین مقداروں سے نپٹنے کا فن پالیا ہے، چنانچہ یہ حرکت کے دیگر کہیں زیادہ پیچیدہ مسائل کے، جواز میں پیشتر لا-نخل معلوم ہوتے تھے، حل پیش کرنے لگی ہے۔

ریاضی کی یہ نئی شاخ، جس سے متقدمین لاعلم تھے، حرکت کے مسائل سے عہدہ برآ ہونے وقت یہ تسلیم کرتی ہے کہ خرد ترین مقداریں موجود ہو سکتی ہیں اور یوں وہ حرکت کی شرط عظیم (مطلق تسلسل) پورا کر دیتی ہے۔ اس

سے اس ناگزیر غلطی کی تصحیح ہو جاتی ہے جس کا انسانی ذہن، اگر وہ حرکت مسلسل کی بجائے حرکت کو مختلف اکائیوں میں بانٹ کر اس کا جائزہ لیتا ہے، ارتکاب کیے بنا رہ ہی نہیں سکتا۔

تاریخی حرکت کے قوانین دریافت کرنے کے سلسلے میں عین میں یہی اصول کام آتا ہے۔

بنی نوع انسان کی پیش رفت (یا حرکت)، جیسا کہ اس کا طریقہ ہے، ان گنت انسانی عزائم کی رہنمائی کرتی رہتی ہے، مسلسل جاری رہتی ہے۔

تاریخ کا مقصد اس پیش رفت (یا حرکت) کے قوانین کی تفہیم ہے لیکن حرکت مسلسل کے ان قوانین کی جو انسانی عزائم کا حاصل گل ہوتے ہیں، تفہیم کے لیے انسانی ذہن حرکت (یا پیش رفت) کو حرکت مسلسل تصور نہیں کرتا بلکہ وہ من مانے انداز سے اسے جدا جدا اکائیوں میں تقسیم کر دیتا ہے۔

واقعات کو مسلسل پیش آتے رہتے ہیں اور ان کا سلسلہ کہیں رکنا نہیں۔ مورخ کا پہلا طریقہ کاریہ ہے کہ وہ ان مسلسل واقعات میں سے چند ایک کو من مانے انداز سے جن لیتا ہے، انہیں دوسروں سے الگ تھلک کر دیتا ہے اور پھر ان پر غور و فکر کرتا ہے حالانکہ کسی واقعے کی نہ ابتدا ہوتی ہے اور نہ ہو سکتی ہے کیونکہ ہر واقعہ کسی قسم کے انتقال کے بغیر دوسرے واقعے کی کوکھ سے جنم لیتا ہے۔ دوسرا طریقہ کاریہ ہے کہ کسی فرد واحد یا شاہ یا سپہ سالار کے افعال کا جائزہ لیا جاتا ہے جیسے اس کے افعال بے شمار افراد کے عزائم کے حاصل گل کے مساوی ہوں حالانکہ تعداد افراد کے ارادوں کا حاصل گل کسی واحد تاریخی شخصیت کے افعال سے اظہار ہو ہی نہیں سکتا۔

علم تاریخ جوں جوں آگے بڑھ رہا ہے، وہ متواتر تخریر سے تخریر اکائیوں کا جائزہ لینے لگا ہے اور وہ اس طریقے سے سچائی تک رسائی حاصل کرنے کے لیے سر توڑ کوشش کر رہا ہے۔ لیکن یہ اکائی خواہ کتنی ہی خورد کیوں نہ ہو، ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ یہ مفروضہ کہ کوئی اکائی دوسری سے الگ تھلک ہے، یہ مفروضہ کہ کسی واقعے کی کوئی ابتدا ہے، یہ مفروضہ کہ انسانی عزائم کسی واحد تاریخی کردار کے افعال کے ذریعے اظہار پاتے ہیں، انی نقشہ غلط ہے۔

تاریخ سے جو نتائج مستحب ہوتے ہیں، انہیں توڑ پھوڑ کر خاک میں اس طرح ملا دینے کے لیے، کہ ان کا نام و نشان بھی باقی نہ رہے، نقاد کو کوئی خاص تردد نہیں کرنا پڑتا۔ اس کے لیے بس اتنا ہی کافی ہے کہ وہ مشاہدے کے موضوع کے لیے بس کوئی بڑی یا چھوٹی اکائی منتخب کر لے۔ اور اس انتخاب کا اسے پورا پورا حق حاصل ہے کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ تاریخ اپنے مشاہدے کے لیے جو بھی اکائی منتخب کرتی ہے، من مانے طریقے سے کرتی ہے۔

مشاہدے کے لیے تاریخ کی تخریریں اکائی (تاریخ کی جزئیات یعنی انہوں کے متجانس رجحانات) لے کر اور انہیں باہمی طور پر مربوط کرنے کا فن حاصل کر کے (یعنی ان تخریریں اکائیوں کا حاصل گل معلوم کر کے) ہم تاریخ کے قوانین دریافت کرنے کی امید کر سکتے ہیں۔

یورپ میں انیسویں صدی کے پہلے پچاس سال لاکھوں انسانوں کی غیر معمولی نقل و حرکت کا منظر پیش کرتے ہیں۔ لوگ اپنے روایتی اشغال کو خیر باد کہہ دیتے ہیں۔ بھاگم بھاگ یورپ کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک پہنچتے ہیں۔ ایک دوسرے کو لوٹتے اور خون میں نہلاتے ہیں۔ کامیابیوں سے ہم کنار اور مایوسیوں سے دوچار ہوتے ہیں۔ اور چند سالوں کے لیے زندگی کا سارا چلن منسوب ہو جاتا ہے اور قومی تحریک کا روپ دھار لیتا ہے۔ یہ تحریک پہلے زور پکڑتی ہے اور پھر مدھم پڑنے لگتی ہے۔ آدمی کے ذہن میں سوال ابھرتا ہے: اس تحریک کے پس پردہ کیا عوامل کار فرما تھے اور یہ کن قوانین کے تابع تھی؟

اس سوال کے جواب میں مورخین ہمیں چند درجن انسانوں کے، جو پیرس کی ایک عمارت میں رہائش پذیر تھے، اقوال و افعال کا مرقع پیش کر دیتے ہیں۔ وہ ان اقوال و اعمال کو ”انقلاب“ کے نام سے پکارتے ہیں۔ اس کے بعد وہ ہمیں نیولین اور متعدد دیگر اشخاص کی، جو اس کے حامی یا مخالف تھے، زندگیوں کی تفصیلی داستان سنانے لگتے ہیں۔ ان میں بعض آدمیوں نے دوسروں کو جس طرح متاثر کیا تھا، وہ اس کا بھی تذکرہ کرتے ہیں اور ہمیں یہ نوید سنا تے ہیں: ”یہ تھیں وہ باتیں جو اس تحریک کا باعث بنیں اور یہ اس کے قوانین ہیں۔“

لیکن انسانی ذہن نہ صرف اس قسم کی وضاحت پر یقین کرنے سے انکار کرتا ہے بلکہ دونوک اعلان کرتا ہے کہ تعبیر و تشریح کا یہ طریقہ درست نہیں کیونکہ اس میں کمزور شے کو عظیم تر شے کا سبب قرار دیا گیا ہے۔ یہ انسانوں کے انفرادی عزائم کا حاصل کل تھا جو انقلاب اور نیولین کو منصفہ شہود پر مانے کا موجب بنا اور انہی عزائم کے حاصل کل نے پہلے انھیں برداشت کیا اور بعد میں انھیں تباہی کے غار میں دھکیل دیا۔

”لیکن جب کبھی اور جہاں کہیں فتوحات ہوتی ہیں، وہاں فاتح بھی ہوتے ہیں اور جب کبھی وہ جہاں کہیں انقلاب برپا ہوتے ہیں، عظیم انسان منظر عام پر نمودار ہو جاتے ہیں۔“ تاریخ فتویٰ سناتی ہے۔ ”جی ہاں۔“ عقل انسانی جواب دیتی ہے۔ ”جب کبھی فاتح نمودار ہوا، اپنی جلو میں جنگیں لے کر آیا لیکن اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ فاتحین جنگوں کا باعث بنے تھے یا کسی فرد واحد کے ذاتی اشغال میں جنگ کے قوانین دریافت کرنا ممکن ہے۔“ جب کبھی میں اپنی گھڑی پر نظر ڈالتا ہوں اور سوئی دس کے ہندسے کی طرف اشارہ کرتی دکھائی دیتی ہے، میرے کانوں میں قریبی گرجے کی گھنٹیوں کے بجنے کی آوازیں آنے لگتی ہیں لیکن محض اس لیے کہ گھنٹیاں اس وقت بجنا شروع ہوئیں جب میری گھڑی سوئی دس کے ہندسے پر پہنچتی ہے، مجھے یہ نتیجہ اخذ کرنے کا کوئی حق حاصل نہیں کہ گھنٹیاں اس لیے حرکت میں آتی ہیں کیونکہ میری گھڑی کی سوئیاں خاص نقطے پر پہنچ چکی ہوتی ہیں۔

میں جب کبھی سلیم انجن کو متحرک ہوتے دیکھتا ہوں، مجھے سیٹی کی آواز سنائی دیتی ہے، والو (Valve) کھلتے اور پوسہ کھوستے دکھائی دیتے ہیں لیکن مجھے یہ نتیجہ اخذ کرنے کا کوئی حق حاصل نہیں کہ سلیم انجن اس لیے متحرک ہوتا ہے کہ سیٹی بجنے لگی ہے یا پوسہ کھودنے لگے ہیں۔

کسان کہتے ہیں کہ بہار کے آخری ایام میں ٹھنڈی ہوا اس لیے چلتی ہے کیونکہ موسم کے اس حصے میں آدک

کے درختوں میں کوئلیں پھوٹنا شروع ہو جاتی ہیں۔ یہ سچ ہے کہ ہر موسم بہار میں جب اوک کے درختوں میں کوئلیں پھوٹنے لگتی ہیں، ٹھنڈی ہوا ضرور چلتی ہے اور اگرچہ مجھے یہ معلوم نہیں کہ اوک کے درختوں کی کوئلیوں کے پھوٹنے پر ٹھنڈی ہوا کیوں چلنے لگتی ہے، میں کسانوں کی اس رائے سے اتفاق نہیں کر سکتا کہ کوئلیوں کا پھوٹنا ٹھنڈی ہوا کے چلنے کا سبب ہے کیونکہ ہوا کی قوت کوئلیوں کے اثر در سوخ سے بالاتر ہے۔ مظاہر حیات کے ساتھ اس قسم کے جو واقعات پیش آتے ہیں، میں سمجھتا ہوں کہ ان کے پیچھے محض اتفاقات کا دخل ہوتا ہے اور میری سمجھ میں یہ بات آنے ہے کہ میں اپنی گھڑی کی سوئیوں، سٹیم انجن کے والوؤں اور پیپوں، اور اوک کی کوئلیوں کا خواہ کتنی ہی دیر تک اور کتنے ہی غور سے مطالعہ کروں، میں یہ معلوم نہیں کر سکتا کہ ٹھنڈیوں کے بجنے، سٹیم انجنوں کے متحرک ہونے اور موسم بہار میں ٹھنڈی ہواؤں کے چلنے کے اسباب کیا ہیں۔ مجھے یہ معلوم کرنے کے لیے اپنا نقطہ نظر پوری طرح تبدیل کرنا ہوگا اور ان قوانین کا، جو ٹھنڈیوں کے بجنے، سٹیم انجنوں کے متحرک ہونے اور ہواؤں کے چلنے کے عمل کو منضبط کرتے ہیں، مطالعہ کرنا ہوگا۔ تاریخ کو بھی یہی کرنا چاہیے اور اس سمت میں پہلے ہی کوششیں کی جا چکی ہیں۔

تاریخ کے قوانین کا مطالعہ کرنے کے لیے ہمیں اپنے مشاہدے کا موضوع یکسر تبدیل کرنا ہوگا۔ ہمیں بادشاہوں، وزیروں اور جرنیلوں کو ایک طرف رکھ دینا چاہیے اور ان متجانس اور خرد ترین عناصر کا، جو عام لوگوں پر اثر انداز ہوتے ہیں، مطالعہ کرنا چاہیے۔ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ تاریخ کے قوانین کی تنہیم کے لیے اس طرف پیش رفت کرنا انسان کے لیے کہاں تک ممکن ہے لیکن یہ بالکل عیاں ہے کہ صرف اسی ذریعے سے تاریخ کے قوانین کی دریافت ممکن ہے۔ سورنسن نے مختلف بادشاہوں، وزیروں اور جرنیلوں کے اعمال و افعال کو بیان کرنے اور ان اعمال و افعال کے متعلق اپنے نظریات وضع کرنے کے لیے جو سعی کی ہیں، ان کے مقابلے میں انھوں نے اس سمت میں اپنی کوششوں کا صرف دس لاکھواں حصہ صرف کیا ہے۔

2

ایک درجن یورپی ممالک کی افواج روس پر یلغار کر رہی ہیں۔ روسی سپاہ اور علاقے کے بادشاہ پیچھے ہٹتے جاتے ہیں اور تصادم سے گریز کرتے رہتے ہیں تاکہ وہ سولسک پہنچ جائے ہیں۔ وہاں بھی وہ یہی رویہ اختیار کرتے ہیں اور سولسک سے پار رو دینا آ جاتے ہیں۔ فرانسیسی ماسکو کی جانب بڑھنے لگتے ہیں اور ان کی رفتار تیزی پکڑنے لگتی ہے۔ وہ جوں جوں اپنی منزل مقصود کے قریب سے قریب تر آتے جا رہے ہیں، توں توں ان کی رفتار تیز سے تیز تر ہوتی جا رہی ہے، بالکل اسی طرح جس طرح وہ چیز، جو اوپر سے نیچے گر رہی ہو، جوں جوں زمین کے قریب تر آتی جاتی ہے توں توں اس کی رفتار بھی تیز تر ہوتی جاتی ہے۔ ان کے پیچھے فائدہ زدہ، معاند ملک کے سینکڑوں میل ہیں اور ان کے آگے محض چند میل، جو ان کے اور ان کی منزل مقصود کے مابین حائل ہیں۔ پولین کی فوج کے ایک ایک سپاہی کو اس کا شعور ہے اور یلغار محض اپنی ہی رفتار کے بل پر جاری ہے۔

روسی فوج جتنا زیادہ پیچھے ہٹی ہے، دشمن کے خلاف اس کے عناد میں اتنی ہی زیادہ شدت آنے لگتی ہے۔ پیچھے ہٹنے سے اس کی قوت ٹھٹھکتی نہیں بلکہ بڑھتی ہے اور وہ پہلے کی نسبت مضبوط تر ہو جاتی ہے۔ بارودینو میں تصادم ہوتا ہے۔ دونوں میں سے کوئی فوج بھی تباہ و برباد نہیں ہوتی، لیکن تصادم کے فوراً بعد روسی فوج ناگزیر طور پر بالکل اسی طرح پسپائی اختیار کرتی ہے جس طرح وہ گیند، جو کسی ایسے گیند سے، جو اس سے بھی زیادہ تیز رفتار سے اس کی طرف فضا میں اڑتی آرہی ہو، ٹکرا جاتی ہے اور اپنی پچھلی جانب لڑھکے لگتی ہے۔ اور بالکل اسی ناگزیر انداز سے یلغاری گیند، جو اتنی تیز رفتاری سے آگے بڑھتی آئی تھی، خاصے فاصلے تک از خود (اگرچہ تصادم نے اسے اس کی قوت سے محروم کر دیا ہوتا ہے) آگے لڑھکتی جاتی ہے۔

روسی پسپا ہو جاتے ہیں اور اسی میل دور ماسکو کی دوسری سمت چلے جاتے ہیں۔ فرانسیسی ماسکو پہنچ جاتے ہیں اور وہاں پڑاؤ ڈال لیتے ہیں۔ اس کے بعد پانچ ہفتے تک ایک بھی لڑائی نہیں ہوتی۔ فرانسیسی ماسکو سے ہٹے کا نام بھی نہیں دیتے۔ کسی درندے کی طرح، جسے کاری زخم آئے ہوں اور وہ اپنے زخموں کو چاٹ رہا ہو، وہ ہاتھ پاؤں توڑے وہیں قیام پزیر رہتے ہیں اور پھر آٹافٹا کسی ظاہری وجہ کے بغیر راہِ افرار اختیار کر لیتے ہیں۔ وہ بھگم بھگ کانوگا روڈ کا رخ اختیار کرتے ہیں اور (فتح حاصل کرنے کے باوجود، کیونکہ بیچ میں مالایا روسلوانس میں جو سحر کہہ چکا ہوا تھا، اس میں میدان انھیں کے ہاتھ میں رہا تھا) کوئی سنجیدہ لڑائی لڑے بغیر انتہائی تیز رفتاری سے واپس، سمولنسک، سمولنسک سے آگے دلنا اور دلنا سے آگے بیریزینا تک چلے جاتے ہیں۔ وہ بیریزینا کے قریب بھی نہیں رکتے، بلکہ وہاں سے بھی مزید پیچھے ہٹ جاتے ہیں۔

چھبیس اگست کی شام کو کوٹوروف اور ساری روسی فوج کو یقین ہو گیا تھا کہ بارودینو کی لڑائی جیتی جا چکی ہے۔ کوٹوروف نے زار کے نام اپنے مراسلے میں یہی تاثر دیا تھا۔ اس کے بعد اس نے حکم دیا کہ دشمن کا قلع قمع کرنے کے لیے تازہ لڑائی کی تیاری کی جائے۔ یہ اس نے اس لیے نہیں کیا کیونکہ وہ کسی کو دھوکا دینا چاہتا تھا، بلکہ اس لیے کیونکہ وہ، ہر اس شخص کی طرح جس نے لڑائی میں حصہ لیا تھا، جانتا تھا کہ دشمن شکست کھا چکا ہے۔

لیکن اس تمام شام اور اگلے روز لگاتار اطلاعات موصول ہوتی رہیں کہ فوج کو جو نقصانات برداشت کرنا پڑے ہیں، ان کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ آدھی فوج کٹ چکی تھی اور ثابت ہو گیا تھا کہ ایک اور لڑائی قلعی ناممکن ہے۔ لڑائی اس وقت تک لڑنا ناممکن تھا جب تک تمام محاذوں سے اطلاعات موصول نہ ہو جائیں، زخمی اٹھانے لیے جاتے، جو گولہ بارود صرف ہو گیا تھا، اس کی کمی پوری کرنے کے لیے نیاز خیر نہ پہنچ جاتا، ہلاک شدگان کا شمار نہ ہو جاتا، مقتول افسروں کی جگہ نئے فسرود کا تقرر نہ ہو جاتا اور جوانوں کو خوراک اور آرام نہ مل جاتا۔

دریں اثنا، گلی ہی صبح فرانسیسی فوج اپنے آپ روسیوں کی جانب پیش قدمی کرنے لگی (سے کوئی تحریک دینے کی ضرورت نہیں تھی، وہ اپنے ہی زور پر آگے بڑھ رہی تھی اور اس کی رفتار اس فاصلے کے، جو اس کے اور اس کی منزل مقصود کے، بین رہ گیا تھا، مربع کے تناسب معکوس سے بڑھ رہی تھی)۔ کوٹوروف اگلی صبح حملہ کرنا چاہتا تھا

اور ساری فوج اس کی ہم خیال تھی لیکن حملے کی خواہش ہی کافی نہیں ہوتی، جسے کا امکان بھی موجود ہونا چاہیے اور یہ امکان موجود نہیں تھا۔ وہ ایک دن کی پسپائی کے دوران میں جتنا فاصلہ طے کر سکتے تھے، اس سے کم تر طے کرے میں خطرات پوشیدہ تھے۔ یہی حال دوسرے اور تیسرے دن ہوا، ان دو ایام کے دوران میں وہ جتنا پیچھے ہٹ سکتے تھے، انھیں ہٹنا پڑا اور یوں پیچھے ہٹتے ہٹتے وہ بالآخر کیم تمبر کو ماسکو پہنچ گئے اور جب وہ ماسکو پہنچ گئے، جذبہ کی شدت کے باوجود، جو تمام یونٹیں محسوس کر رہی تھیں، حالات کی قوت نے انھیں ماسکو سے بھی آگے پسپائی اختیار کرنے پر مجبور کر دیا اور یوں وہ ایک اور یوم کے فاصلے تک پیچھے ہٹ گئی اور ماسکو کو غنیم کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا گیا۔

وہ لوگ، جنھیں یہ فرض کرنے کی عادت پڑ چکی ہے کہ جرنیل معرکوں اور لڑائیوں کے منصوبے بالکل اسی طرح بناتے ہیں جس طرح ہم میں سے کوئی بھی اپنے سٹڈی روم میں نقشے کے سامنے بیٹھ کر یہ قیاس آرائی کرنے لگتا ہے کہ اس یا اس لڑائی میں ہم صورت حال سے کس طرح عہدہ برآ ہوتے، ہمارے اذہان میں یہ سوالات خود بخود درآتے ہیں کہ تو زوف نے پسپائی کے دوران میں یہ یا وہ کیوں نہ کیا؟ فلی⁴ پیچھے سے قبل وہ دشمن کے مقابلے میں کہیں ڈٹا کیوں نہیں؟ ماسکو کو تقدیر کے حوالے کرنے سے پہلے اس نے فوراً ہی کالوگا روڈ پر قبضہ کیوں نہ کیا؟ وغیرہ وغیرہ۔ وہ لوگ، جو اس انداز سے سوچنے کے عادی ہیں، وہ ان حالات کو، جن سے دامن نہیں چھڑایا جاسکا اور جو کسی بھی کمانڈر انچیف کے دائرہ عمل کو محدود کر دیتے ہیں، بھول جاتے ہیں یا انھیں ان کا کوئی علم نہیں ہوتا۔ کمانڈر انچیف کی مصروفیت کی اس مصروفیت سے، جس کا تصور ہم اپنے ڈرائنگ روم میں ٹانگیں پیر کر کرتے ہیں، قطعاً کوئی مشابہت نہیں ہوتی۔ ہم اپنے سامنے نقشہ پھیلا کر بیٹھ جاتے ہیں اور اپنے ذہن میں کسی لڑائی کا، جو کسی خاص مقام پر کسی خاص وقت کے دوران میں فریقین کی فوجوں کی خاص تعداد کے ساتھ لڑی گئی تھی، خاکہ بناتے ہیں اور سوچنے لگتے ہیں کہ کمانڈر انچیف نے یہ کیا ہوگا یا وہ کیا ہوگا۔ کمانڈر انچیف ہمیشہ ہر آن بدلتے واقعات میں گھرا ہوتا ہے ورنہ جتنا وہ کسی لمحے بھی اس پوزیشن میں نہیں ہوتا کہ وہ واقعہ جو ظہور پذیر ہو رہا ہے، اس کی پوری اہمیت پر غور کر سکے۔ واقعہ غیر محسوس طور پر لحظہ بہ لحظہ متشکل ہوتا رہتا ہے اور واقعات کی اس تدریجی، بلا روک ٹوک شکل پذیری کے دوران میں کمانڈر انچیف ریشہ دوانیوں، پریشانیوں، احتمالات، احکام، منصوبوں، مشوروں، دھمکیوں اور دعا بازیوں کے انتہائی پیچیدہ کھیل کا مرکزی نقطہ ہوتا ہے اور وہ لگاتار لاتعداد متنوع سوالات کے جوابات فراہم کرنے پر مجبور ہوتا ہے۔

وہ لوگ، جنھیں عسکری امور میں درک حاصل ہے، بڑی سنجیدگی سے ہمیں بتاتے ہیں کہ کو تو زوف کو اپنی فوج فلی پیچھے سے بہت پہلے کا نوگورڈ پر لے جانا چاہیے تھی۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ کسی شخص نے اس کے سامنے اس قسم کی تجویز پیش کی تھی۔ لیکن کمانڈر انچیف کو عام طور پر، بالخصوص نازک صورت حال کے دوران میں، ایک نہیں، درجنوں منصوبے ملتے رہتے ہیں۔ یہ سبھی منصوبے کیدیت (strategy) اور مصروفیت (tactics) کے اصولوں پر مبنی ہوتے ہیں اور سبھی ایک دوسرے کے متضاد ہوتے ہیں۔

بظہریٰ معلوم ہوتا ہے کہ کمانڈر انچیف کا کام محض یہ ہے کہ وہ ان میں سے کسی ایک منصوبے کو منتخب کر لے۔ لیکن وہ یہ بھی نہیں کر سکتا۔ وقت اور واقعات انتظار نہیں کرتے۔ آئیں، ہم یہ فرض کر لیتے ہیں کہ 28 تاریخ کو سے کالوگاردو کی جانب کوچ کرنے کی تجویز ملتی ہے لیکن عین اسی لمحے میلورادو وچ کا ایک ایجوئنٹ سرپنٹ گھوڑا روڑائے آتا ہے اور اس سے دریافت کرتا ہے کہ آیا وہ فرانسیسیوں سے بچہ لڑانا چاہتا ہے یا پیچھے ہٹنا چاہتا ہے۔ اس کا مطالبہ ہے کہ اسے فوراً، اسی وقت حکم دیا جائے۔ اور پسپائی کا جو حکم دیا جاتا ہے، وہ ہمیں اس مقام سے، جہاں شاہراہ کالوگاردو کی طرف مڑتی ہے، آگے لے جاتا ہے۔ ایجوئنٹ کی روانگی کے بعد حکم رسد کا افسر پہنچ جاتا ہے۔ وہ پوچھتا ہے کہ سامان رسد کہاں پہنچایا جاتا ہے۔ ادھر چیف میڈیکل افسر یہ معلوم کرنا چاہتا ہے کہ زمینوں کو کہاں لے جاتا ہے۔ پیئر برگ سے اپنی ملک معظم کا مراسلہ لے کر آتا ہے۔ اس میں اس امکان کو سرے سے مسترد کر دیا جاتا ہے کہ ماسکو کو اس کے حال پر چھوڑا جاسکتا ہے۔ دوسری طرف کمانڈر انچیف کا حریف اپنے جوتوز میں مصروف ہے اور غیر محسوس طریقے سے اس کے پاؤں تلے کی زمین کھکانے کی کوشش کر رہا ہے (اور اس قسم کے اشخاص ایک سے زیادہ ہوتے ہیں)۔ وہ ایک نیا منصوبہ پیش کر دیتا ہے اور اس کا یہ منصوبہ اس منصوبے کے، جس میں کالوگاردو کے ساتھ ساتھ پسپائی اختیار کرنے کا مشورہ دیا گیا تھا، بالکل متضاد ہوتا ہے۔ اور ستم بالائے ستم یہ کہ کمانڈر انچیف کی آنکھیں نیند سے بوجھل ہوتی جارہی ہیں اور اسے تازہ دم ہونے کے لیے آرام کی شدید ضرورت ہے۔ اتنے میں ایک قابل جرنیل، جسے اعزازات کی تقسیم کے دوران میں نظر انداز کر دیا گیا تھا، اپنی شکایت لے کر پہنچ جاتا ہے۔ پھر عدالت کے باشندے التجائیں کر رہے ہیں کہ ان کی حفاظت کا بندوبست کیا جائے۔ جس افسر کو عدالت کے خدو خال کا جائزہ لینے کے لیے بھیجا گیا تھا، وہ ایک ایسا رپورٹ لے کر حاضر ہو جاتا ہے جو اس رپورٹ کے، جو اس سے پہلے بھیجے گئے افسر نے پیش کی تھی، بالکل برعکس ہوتی ہے۔ ایک جاسوس، ایک تیدی اور ایک جرنیل، جو ریکی کر کے آئے ہیں، غنیمت کی انواع کی پوزیشن ایک دوسرے سے مختلف انداز میں بیان کرتے ہیں۔ کمانڈر انچیف کو اس نوع کے جن ناگزیر حالات میں کام کرنا پڑتا ہے، جو لوگ انہیں فراموش کر دیتے ہیں یا انہیں سمجھنے میں ناکام رہتے ہیں، وہ مثلاً فلی میں، فوج کی پوزیشن بیان کرتے ہیں اور فرض کر لیتے ہیں کہ کمانڈر انچیف یکم ستمبر کو نہایت آسانی سے یہ فیصلہ کر سکتا تھا کہ اسے ماسکو کو اپنے حال پر چھوڑ دینا چاہیے یا اس کا دفاع کرنا چاہیے، جب کہ روسی فوج کے پاس، جو کہ ماسکو سے چار میل سے بھی کم فاصلے پر مقیم تھی، اس قسم کا انتخاب سرے سے موجود ہی نہیں تھا۔ پھر اس سوال کا کب فیصلہ ہوا؟ اس کا فیصلہ دریا میں، سمولنسک میں یا اغبنا چو میں تاریخ کو شیواریو میں، چچیس کو بارودینو میں اور بارودینو سے فلی تک پسپائی کے دوران میں ہر یوم، ہر گھنٹی اور ہر منٹ ہوتا رہا۔

بارودینو سے پسپائی اختیار کرنے کے بعد روسی فوج نے فلی میں پڑاؤ ڈال دیا۔ برالف، جسے ریکی کرنے بھیجا گیا

تھا، گھوڑے پر کمانڈر انچیف کے پاس آیا۔

”اس پوزیشن پر لڑنے کا کوئی امکان نہیں۔“ اس نے کہا۔

کوئٹہ زون ہکا ہکا ہو کر اسے دیکھنے لگا اور اس سے پوچھا کہ اس نے جو کچھ کہا ہے، اسے ایک بار پھر دہرائے۔
جب وہ اپنے الفاظ دہرا چکا، کوئٹہ زون نے پناہ تھ آگے بڑھایا۔

”مجھے اپنا ہاتھ پکڑاؤ!“ اس نے کہا۔ پھر اس نے اس کا ہاتھ پکڑا، اسے اٹھایا تاکہ وہ اس کی بغل محسوس کر سکے اور بولا: ”مائی ڈیئر فیو، معصوم ہوتا ہے کہ تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ ذرا سوچو کہ تم کیا کہہ رہے ہو؟“

دور کو میلوں گیٹ سے چار میل دور کوئٹہ زون پکھلوتا گیا پہاڑی پر اپنی گاڑی سے نیچے اترا اور سڑک کے کنارے بیچ پر بیٹھ گیا۔ اس کے ارد گرد جرنیلوں کی اچھی خاصی بھیڑ جمع ہو گئی۔ کاؤنٹ رستونپ جن، جو ماسکو سے آیا تھا، اس میں شامل ہو گیا۔ داناؤں کی یہ جماعت مختلف گروہوں میں بٹ گئی اور آپس میں پوزیشن کے حسن و قبح، فوج کی کیفیت، مختلف تجویز کردہ منصوبوں، ماسکو کی صورت حال اور عسکری امور کے بارے میں عمومی بحث کرنے لگی۔ اگرچہ نہ تو انہیں اس مقصد کے لیے بلایا گیا تھا ورنہ اسے یہ نام دیا گیا تھا، ہر شخص یہ محسوس کر رہا تھا کہ یہ جنگی کونسل ہی ہے۔ گفتگو میں عوامی مفاد کے مسائل تک محدود رہیں۔ اگر کسی شخص نے ذاتی نوعیت کی کوئی بات پوچھی بھی، بتائی بھی، تو اس نے بدسرگوشیوں میں کیا اور گفتگو کا رخ فوراً ہی عمومی تشویش کے موضوعات کی طرف مڑ گیا۔ ان تمام اشخاص میں سے نہ تو کسی نے کوئی ایسی مذاق کی بات کی اور نہ کوئی ہنس، بلکہ کسی چہرے پر مسکراہٹ تک دکھائی نہ دی۔ ان سب کی سرخا کوشش یہی تھی کہ وہ موقع کی نزاکت کے مطابق ہمت اور دلیری کا مظاہرہ کریں۔ ان تمام گروہوں کے اشخاص آپس میں باتیں بھی کرتے جا رہے تھے لیکن ساتھ ساتھ وہ یہ کوشش بھی کر رہے تھے کہ وہ کمانڈر انچیف (جس کا بیچ سارے ہجوم کا نقطہ ماسک تھا) کے قریب رہیں اور اس طرح بات کریں کہ ان کی آواز اس تک پہنچ جائے۔

کمانڈر انچیف منتار ہا۔ اس کے گرد و پیش جو کچھ ہو رہا تھا، وہ کبھی کبھار اس کے متعلق پوچھ لیتا لیکن وہ نہ تو کسی گفتگو میں شریک ہوا اور نہ اس نے کسی رائے کا اظہار کیا۔ زیادہ تر وہ کسی ایک یا دوسرے گروپ کی باتیں سننے کے بعد، بڑی کے انداز سے اپنا منہ دوسری طرف پھیر لیتا گویا جو کچھ وہ سنتا چاہتا تھا، وہ وہی نہیں کہہ رہے تھے۔

بعض اس پوزیشن کے متعلق جو منتخب کی گئی تھی، رائے زنی کر رہے تھے۔ وہ فی نفسہ پوزیشن کی اتنی تنقید نہیں کر رہے تھے جتنا ان اشخاص کی، جنہوں نے اس کا انتخاب کیا تھا، دانشورانہ صلاحیتوں کو اپنی تنقید کا نشانہ بنا رہے تھے۔ دوسروں کا استدلال یہ تھا کہ قبل ازیں خاصی بڑی غلطی کا ارتکاب کیا جا چکا ہے اور لڑائی تین یوم پہلے لڑی جانا چاہیے تھی۔ بعضوں کی گفتگو کا موضوع سلاوا کا کیڑائی تھی۔ اس کے بارے میں ایک فرانسیسی جرنیل، کروسارٹ (Crosart)، جو ہسپانوی دردی میں ملیں تھا، انہیں معلومات فراہم کر رہا تھا۔ (یہ فرانسیسی اور ایک جرمنی پرنس، جو بعض دیگر جرمن پرنسوں کی طرح ردی فوج میں خدمات سرانجام دے رہا تھا، ہسپانویوں کے خاصہ کے بارے میں بحث کر رہے تھے اور اس امکان پر غور کر رہے تھے کہ کیا ماسکو کا اسی طریقے سے دفاع کیا جاسکتا

ہے یا نہیں۔) کاؤٹ رستوپ چن چوتھے گروپ کو بتا رہا تھا کہ وہ شہری پیشیا کے شانہ بہ شانہ لڑنے اور ماسکو کے دروازوں کے سامنے اپنی جان قربان کرنے کے لیے تیار ہے، تاہم وہ یہ افسوس کیے بنا نہیں رہ سکتا کہ جو کچھ ہو رہا ہے، اسے اس کے بارے میں لاعلم رکھا گیا ہے کیونکہ اگر اسے اس بارے میں ذرا جلدی کچھ معلوم ہو جاتا تو حالات مختلف ہوتے۔ پانچویں گروپ کے لوگ اپنی کلیدی بصیرت کی نمائش کر رہے تھے۔ ان کی بحث کا نکتہ یہ تھا کہ فوج کو اب کون سی سمت اختیار کرنا ہوگی۔ رہ چھٹا گروپ، اس کی گفتگو سراسر فضولیات پر مبنی تھی۔

کوٹوزوف کے چہرے کے تاثرات سے یہ مترشح ہو رہا تھا کہ وہ اپنے ہی خیالات میں مستغرق ہے اور بہت افسردہ ہے۔ اس کے نزدیک اس ساری گفتگو کا حاصل صرف یہ تھا کہ وہ لاکھ سرچیکس، صحیح معنوں میں ماسکو کا دفاع قطعی ناممکن ہے۔ یہ دفاع اس اعتبار سے قطعی ناممکن تھا کیونکہ اگر کوئی جنونی کمانڈر لڑائی کا حکم دے بھی دیتا تو بھی اس کا نتیجہ صرف یہ نکلتا کہ انتشار کی کیفیت تو ضرور رونما ہو جاتی لیکن لڑائی کسی صورت نہ ہوتی۔ لڑائی اس لیے نہ ہوتی کیونکہ اعلیٰ کمان کے تمام افسروں نے نہ صرف یہ تسلیم کر لیا تھا کہ اپنی پوزیشن کا وڈغ نہیں کیا جاسکتا بلکہ ان کی گفتگو کا آخری نقطہ اس کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا کہ پوزیشن کا ترک کرنا تو ناگزیر ہوا ہی چکا ہے، البتہ مسئلہ یہ ہے کہ اس پوزیشن کو ترک کرنے کے بعد انھیں کیا کرنا ہوگا۔ جس لڑائی میں کمانڈروں کو امید کی کوئی روش نظر نہیں آتی تھی، وہ اس میں اپنے دستوں کی قیادت کیسے کر سکتے تھے؟ ماتحت افسران ہی نہیں بلکہ عام سپاہی بھی (وہ بھی اپنے نتائج اخذ کرتے ہیں) یہ سمجھتے تھے کہ اپنی پوزیشن پر ڈٹے رہنا ناممکن ہے۔ چنانچہ جب انھیں یہ یقین ہو چکا ہو کہ شکست ان کا حقد ہے، ایسے میں ان سے لڑنے کی توقع کرنا خام خیالی کے علاوہ اور کچھ نہ ہوتا۔ "ناکہ بے لگ سین اصرار کرتا رہا کہ پوزیشن کا دفاع کیا جانا چاہیے اور دوسرے اس کے متعلق بحث مباحثے میں الجھ رہے لیکن ان باتوں کی فی نفسہ کوئی اہمیت نہیں رہ گئی تھی۔ ان چیزوں کی اگر کوئی اہمیت تھی، تو فقط یہ تھی کہ یہ سازشوں اور مناقشوں کے لیے عذر فراہم کرتی تھیں اور یہ کوٹوزوف جانتا تھا۔

سپے لگ سین، جس نے پوزیشن کا انتخاب کیا تھا، اپنی روسی حب الوطنی کی بڑے زور شور سے نمائش کر رہا تھا (کوٹوزوف کے کان میں جب بھی اس کا کوئی فرمودہ پڑتا تھا، اسے جھرجھری آ جاتی تھی)۔ اس کا اصرار تھا کہ ماسکو کا دفاع نازما کیا جانا چاہیے۔ وہ کیا چاہتا تھا، وہ کوٹوزوف پر زور و دشمنی کی طرح عیاں تھا۔ گرد دفاع ناکا م رہا تو سارا الزام کوٹوزوف کے سر جو دشمن سے مقابلہ کیے بغیر سپاہ کو کھینک پہاڑیوں تک لے آیا تھا، دھڑکا سکے گا۔ اگر یہ کامیاب نہ ہوتا تو اس کا سہرا وہ اپنے سر باندھ لے گا۔ اگر مقابلہ نہ کیا گیا، وہ ماسکو اس کے حال پر چھوڑنے کے جرم سے اپنا دامن چھڑا لے گا۔

لیکن بڑے میاں کے ذہن میں اس وقت اس سازش کا مسئلہ نہیں تھا۔ اس کی توجہ یکسر ایک خونا ک سوال پر مرکوز تھی اور یہی وہ سوال تھا جس کا جواب اسے کسی سے نہیں مل رہا تھا۔ اس کے سامنے اب واحد سوال صرف یہ تھا: ”کیا میں نے واقعی پولین کو ماسکو پر چڑھ دوڑنے دیا ہے اور یہ میں نے کب کیا؟ اس کا فیصلہ کب ہوا کیا یہ کل کی

بات ہو سکتی ہے جب میں نے پل توف کو پپائی کا حکم دیا تھا یہ پرسوں شام کی، جب مجھے اونگھ آگئی تھی، اور میں نے بے نگ سین کو کہہ دیا تھا کہ وہ احکام جاری کر دے؟ یا یہ اس سے بھی پہلے کی بات ہے؟ یہ ہولناک معاملہ کب طے ہوا تھا؟ کب؟ کب؟ کب؟ اس کے حال پر چھوڑ دیا جائے فوج پیچھے ہٹ آئے اور اس سلسلے میں حکم لاندہ جاری کر دیا جائے۔“ کوٹوزوف کے نزدیک اس قسم کا ہولناک حکم جاری کرنا فوج کی کمان سے دست برداری اختیار کرنے کے مترادف تھا۔ اس بات سے قطع نظر کہ وہ طاقت اور اختیارات کا دلدادہ تھا اور انھیں استعمال کرنا اس کی کھلی میں داخل ہو چکا تھا (پرنس پرازورودسکی (Prozorovsky) کو، جس کے تحت اس نے ترکی میں خدمات سر انجام دی تھیں، جو اعزازات عطا کیے گئے تھے، ان پر اسے اپنی تذلیل محسوس ہوئی تھی)، اسے یہ یقین ہو چکا تھا کہ روس کا تحفظ کرنا اس کا مقصد بن چکا ہے اور یہی وجہ تھی کہ امپراطور کی خواہش کے علی الرغم اور عوام الناس کی خواہش کے پیش نظر اسے کمانڈر انچیف مقرر کیا گیا تھا۔ اس کا یہ ایمان تھا کہ ان مشکل حالات میں صرف وہی ایک شخص ہے جو فوج کی تیادت کر سکتا ہے اور پوری دنیا میں وہ اکیلا شخص ہے جو بلا خوف و خطر قابل مفتوح نبولین کا مقابلہ کرنے کا اہل ہے۔ اور جو حکم اس نے جاری کرنا تھا، اس کا تصور ہی اسے لرزہ بر اندام کیے ہوئے تھے۔ تاہم کسی فیصلے پر پہنچنا ناگزیر تھا۔ ضرورت اس بات کی تھی کہ اس کے ارد گرد جو گفتگوئیں ہو رہی تھیں اور جن میں ضرورت سے زیادہ سزاوردی کا مظاہرہ کیا جانے لگا تھا، ان کا سلسلہ منقطع کر دیا جائے۔

اس نے سینئر جرنیلوں کو ہاتھ کے اشارے سے اپنے پاس بلایا۔

”میرا فیصلہ اچھا ہے یا برا، مجھے اسی پر انحصار کرنا ہو گا۔“ اس نے فرانسیسی میں ان سے کہا۔ اس کے ساتھ ہی وہ بیچ سے اٹھا، گھوڑے پر سوار ہو اور فلی کی طرف چل پڑا، جہاں اس کی گاڑیاں اس کی منتظر تھیں۔

4

سیدہ کے دو بچے آندرے سادوستیانوف نامی کسان کے عام سے مکان کے بہترین اور کشادہ ترین کمرے میں جنگی کونسل کے ارکان اکٹھے ہوئے۔ اس کسان کا خاندان خاصا بڑا تھا اور اس کے ارکان — مردوں، عورتوں اور بچوں — کی عقی کمروں میں بھینٹ لگ گئی۔ آندرے کی چھ سالہ پوتی، مارشا، جسے ہزیرین ہائی نس پیار سے چکارتے، پچکارتے رہے تھے اور جسے اس نے چائے نوشی کے دوران میں شکر کی ڈلی دی تھی، سامنے کے کمرے میں بیچھے، گئی اور آتش دان پر چڑھی بیٹھی تھی۔ مالا شاشریسلی سرت سے، جرنیلوں کے، جب وہ یکے بعد دیگرے کمرے میں داخل ہو رہے اور ایقونوں کے نیچے فراخ پنجوں پر بیٹھ رہے تھے، چہرہ دوں، وردیوں اور اعزازات کو دیکھ رہی تھی۔ خود ”داوالبا“ جیسا کہ مالا شادل ہی دل میں کوٹوزوف کو کہہ رہی تھی، ان سے الگ تھلگ آتش دان کے نیچے ہارک کوٹنے میں بیٹھا تھا۔ نوڈنگ آرم چیئر پر اس کا بھاری بھر کم جسم بے شکم انداز سے پڑا تھا۔ وہ بار بار اپنا گلا کھنکھار رہا اور کوٹ کا کالر درست کر رہا تھا۔ اگرچہ اس کا کالر کھل تھا، پھر بھی یوں لگ رہا تھا کہ وہ اس کی گردن میں چھ رہا

ہے۔ کمرے میں داخل ہونے کے بعد افسر ایک ایک کر کے اس کے پاس پہنچتے۔ وہ بعضوں کے ساتھ ہاتھ ملاتا اور بعضوں کے سامنے محض گردن کو خم دے دیتا۔ اس کا ایجوٹ، کیساروف، کوتوزوف کے، لقمہ بل کھڑکی کا پردہ ہٹایا چاہتا تھا کہ اس نے جھنجھل کر ہاتھ سے، اشارہ کیا اور کیساروف کو اندازہ ہو گیا کہ ہر سرین ہائی نس یہ نہیں چاہتے کہ کوئی ان کا چہرہ دیکھے۔

کسان کی چیز کی میز کے جس پر نقشے منصوبے، کاغذات اور ہنسلیں پڑی تھیں، ارد گرد اتنا جھوم ہو گیا تھا کہ اردلی ایک اور بیچ اٹھا لائے اور انھوں نے اسے میز کے قریب رکھ دیا۔ یہ مالوف، کیساروف اور ٹول، جو ابھی ابھی پہنچا تھا، اس بیچ پر بیٹھ گئے۔ یوتوفوں کے عین نیچے سب سے آگے بار کلمے دتولی بر جھان تھا۔ اس کے گلے میں سیٹ جارج کراس (تمغہ) تنک رہا تھا۔ اس کی پیشانی اس کی گتھی کھوپڑی کا حصہ بن چکی تھی اور وہ زرد رداور ہمار نظر آ رہا تھا۔ وہ دو بیٹے کسی قسم کے بخار میں پھٹکا رہا تھا اب بھی کانپ رہا تھا۔ اس کے قریب یاروف بیٹھا تھا۔ یاروف دلی دلی زبان میں (کبھی سرگوشیوں میں باتیں کر رہے تھے) اسے کوئی معلومات فراہم کر رہا تھا اور تیزی سے اپنے ہاتھ کو جنبش دے رہا تھا۔ کوتاہ قامت، گول مٹوں دختر دوف بھویں اٹھائے اور پیٹ پر ہاتھ بائیں نہایت توجہ سے سن رہا تھا۔ دوسری طرف اوسترمان طاسطائی اپنے چوڑے چمکے سر کو ہاتھوں پر رکھے بیٹھا تھا۔ وہ بظاہر اپنے ہی خیالات میں کھویا ہوا تھا۔ اس کے چہرے کے خدو خاں نمایاں اور آنکھوں میں ہلاکی چمک تھی۔ رلیف کی، جیسا کہ اس کی عادت تھی، اپنے بالوں کو آگے کی طرف مردڑ تر وڑ کر اپنی کپٹیوں پر ان کے کنڈل بنا رہا تھا اور اس کے ساتھ ساتھ بے تابی سے کبھی دروازے کی جانب اور کبھی کوتوزوف کی طرف دیکھنے لگتا تھا۔ کوتاؤٹسن کے خوبصورت، پر عزم اور شفیق چہرے کو کایاں اور نرم دماغ تبسم نے منور کر رکھا تھا۔ اس کی نگاہیں مالاٹش کی نگاہوں سے ٹکرائیں اور اس نے کچھ اس انداز سے اسے آنکھ ماری کہ ننھی منی بچی مسکرائے گی۔

وہ بے تنگ سین کا، جو پوزیشن کا تازہ جائزہ لینے کے بہانے آرام آرام سے لذتہ ذر سے حلقہ اندوز ہو رہا تھا، نظر کر رہے تھے۔ وہ چارے چھ بجے تک اس کے منتظر رہے۔ اس تمام عرصے کے دوران میں انھوں نے بحث مباحثے اور غور و خوض سے اجتناب کیا اور آپس میں غیر متعلقہ امور کے بارے میں زیر لب سرگوشیاں کرتے رہے۔ صرف اس وقت جب بے تنگ سین کمرے میں داخل ہوا، کوتوزوف کو نے سے اٹھا اور میز کے قریب آ گیا لیکن وہ اتنا قریب بھی نہ آیا کہ موم بتیوں کی روشنی اس کے چہرے پر پڑنے لگتی۔

بے تنگ سین نے کارروائی کا آغاز اس سوال سے کیا ”کیا ہمیں روس کے قدیم، مقدس دارالسلطنت سے مقابلہ کیے بغیر دست بردار ہو جانا ہے یا ہمیں اس کا دفاع کرنا ہے؟“ اس کے بعد خاصی دیر تک خاموشی چھائی رہی۔ ہر پیشانی شمن آلود تھی۔ صرف کبھی کبھار کوتوزوف کی کھانسی یا غصیلی کھار اس سکوت کو توڑ دیتی۔ تمام نگاہیں اس پر مرکوز تھیں۔ مالاٹش ابھی ”دارالابا“ کو بخور دیکھ رہی تھی۔ وہ کسی دوسرے شخص کی نسبت اس کے زیادہ قریب تھی اور اسے صاف نظر آ رہا تھا کہ اس کے ماتھے پر کس طرح تل پڑ رہے ہیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ بھی ابھی رودے کا لیکن

یہ کیفیت زیادہ عرصہ برقرار نہ رہی۔

”روس کا قدیم، مقدس دارالسلطنت!“ اس نے طیش کے عالم میں بے نگ سین کے لحاظ دہر کر کہا۔ اس کے اندر سے یہ مترشح ہو رہا تھا کہ ان الفاظ کے پیچھے جو منافقت کا رفرہ تھی، وہ اسے سے نقاب کر رہا ہے۔ ”یوکر ایکی لینسی، مجھے یہ عرض کرنے کی اجازت مرحمت فرمائیں کہ کسی روسی کے لیے اس سوال کے کوئی معافی نہیں ہے۔“ (اس کا بھاری بھر کم جسم آگے کی جانب ڈھلک گیا۔) ”اس قسم کا سوال پیش نہیں کیا جاسکتا، یہ بے معنی ہے۔ میں نے ان حضرات کو یہاں آنے کی جو زحمت دی ہے، اس کا مقصد عسکری نوعیت کا سوال اٹھانا اور اس پر بحث کرنا ہے۔ وہ سوال یہ ہے: روس کے تحفظ کا انحصار اس کی فوج پر ہے۔ کیا یہ بہتر ہے کہ مقابلے کی دعوت قبول کر کے فوج اور، سکو دونوں کو خطرے کی بھینٹ چڑھا دیا جائے یا یہ کہ مقابلہ کیے بغیر ماسکو سے دست برداری اختیار کر لی جائے؟ میں آپ صاحبان کی رائے اس سوال کے بارے میں دریافت کرنا چاہتا ہوں۔“، درود دوبارہ ہے اختیار اپنی کرسی میں جنس گیا۔

بحث شروع ہو گئی۔ بے نگ سین سمجھ رہا تھا کہ وہ ابھی تک بازی ہار نہیں۔ اس نے بار کھلے اور دیگر شاہی کی اس رائے سے تو اتفاق کیا کھلی کے مقام پر دفعتی لڑائی لڑنا ناممکن ہے، تاہم اس نے اپنی روسی حسب الوطنی اور ماسکو سے اپنی محبت کا اظہار یہ تجویز پیش کر کے کیا کہ رات کو ان فوج کو دائیں سے بائیں جانب منتقل کر دیا جائے اور گلی بیج فرانسیسیوں کے دائیں پہلو پر ہلہ بول دیا جائے۔ اس کی تجویز کے بارے میں حاضرین کی رائے بٹ گئی، کچھ لوگ اس کے حق میں اور کچھ خلاف دلائل دیتے گئے۔ یہ مائوف، دستوروف اور رلوف سکی بے نگ سین سے متعلق تھے۔ آیا ان کے اعصاب پر یہ خواہش بھوت بن کر سوار ہو چکی تھی کہ دارالسلطنت سے ہاتھ اٹھانے سے پہلے کچھ نہ کچھ قربانی ضرور دینا چاہیے یا ان کے اس موقف کے پس پردہ ان کی ذاتی انگلیں کام کر رہی تھیں، وجہ خواہ کوئی بھی ہو لیکن نظریہ آتا تھا کہ ان جرنیلوں کو یہ اندازہ ہی نہیں ہے کہ حالات ناگزیر طور پر جو رخ اختیار کر رہے ہیں، اسے ان کی موجودہ بحث و تمحیص تبدیل نہیں کر سکتی اور یہ کہ، سکو عملاً پہلے ہی ترک کیا جا چکا ہے۔ دوسرے جرنیل یہ بات سمجھ رہے تھے۔ وہ صرف اس سمت کے متعلق، جو نوج کو پسپائی کے دوران میں، اختیار کرنا تھی، بات کر رہے تھے۔

مال شانے، جس کی نظریں اس پر، جو اس کے سامنے ہو رہا تھا، مرکوز تھیں، کونسل کی کارروائی کو مختلف طریقے سے جانچا۔ اسے لگا کہ یہ ”دادا ابا“ اور لمبے کوٹ (اس نے اپنے دل میں بے نگ سین کو یہی نام دیا تھا) کے مابین ذاتی نزاع کا مسئلہ ہے۔ وہ دیکھ رہی تھی کہ وہ جب بھی ایک دوسرے سے بات کرتے ہیں، غصے سے لال چلے ہو جاتے ہیں اور وہ دل ہی دل میں ”دادا ابا“ کی طرف داری کر رہی تھی۔ گفتگو کے عین درمیان میں ”دادا ابا“ نے جس عجلت اور عیاری سے بے نگ سین کی طرف دیکھا تھا، وہ اس سے چھپا پندہ سکا اور اس کے معا بعد اسے یہ دیکھ کر بہت خوش ہوئی کہ ”دادا ابا“ نے بے نگ سین سے کوئی ایسی بات کہہ دی کہ اسے اپنی حیثیت کا اندازہ ہو گیا۔ اس کا چہرہ ایک ایکی لالوں لال ہو گیا اور وہ انتہائی طیش کے عالم میں کمرے میں ادھر ادھر پھرکے لگانے لگا۔ وہ چیز جو تیر بن کر اس

کے دل پر لگی تھی، وہ اس کی اس تجویز کے بارے میں، کہ فرانسیسیوں کے دائیں پہلو پر حملہ کرنے کے لیے فوج کو راتوں رات دائیں سے بائیں جانب منتقل کر دیا جائے، کو تو زوف کا دھیمہ اور پرسکون تبصرہ تھا:

”حضرات، میں کاؤنٹ کی تجویز پر صاف نہیں کر سکتا۔ غنیم کے قرب میں فوج کو ادھر سے ادھر منتقل کرنا خطرے سے خالی نہیں اور عسکری تاریخ اس نقطہ نظر کی تائید کرتی ہے۔ مثلاً..“ کو تو زوف رک گیا۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ کچھ سوچ رہا ہے جیسے وہ کوئی نظریہ ڈھونڈ رہا ہو۔ پھر اس نے ٹھکانا بن کر چمکتی آنکھوں سے بے جنگ سین کی جانب دیکھا اور کہنے لگا ”مثلاً فریڈلانٹ کا معرکہ لیں۔ مجھے یقین ہے کہ یہ کاؤنٹ کو اچھی طرح یاد ہوگا۔.. اس میں ہمیں محض اس بے پوری کامیابی حاصل نہ ہو سکی کیونکہ ہم نے افواج کی نئے سرے سے تقسیم و ترتیب دشمن کے بالکل قریب کی تھی۔..“

اس کے بعد خاموشی چھا گئی۔ اگرچہ اس کا دورانیہ صرف ایک لمحہ تھا لیکن ان سب کو لامحدود طور پر طویل نظر آ رہا تھا۔

بحث پھر شروع ہو گئی، لیکن اس میں بار بار وقفے آنے لگے اور ہر شخص کو محسوس ہونے لگا کہ اب کہنے کے لیے حریہ کچھ نہیں رہ گیا۔

ایک وقفے کے دوران میں کو تو زوف نے گہری آہ بھری جیسے وہ کچھ کہنا چاہتا ہو۔ سب کی نگاہیں اس پر مرکوز ہو گئیں۔

”Enbien messieurs!“ اس نے کہا۔ ”مجھے نظر آ رہا ہے کہ نیصے کا بار مجھے ہی اٹھانا ہوگا۔“ پھر وہ آہستہ آہستہ اپنی کرسی سے اٹھا اور میز کے قریب آ گیا۔ ”حضرات، میں آپ کی آرا سن چکا ہوں۔ آپ میں سے چند ایک مجھ سے اتفاق نہیں کریں گے لیکن میں..“ وہ رک گیا، ”میرے اوپر اظہارِ وطن نے مجھے جو اختیارات سونپے ہیں، انھیں بروئے کار لاتے ہوئے میں... پسپائی کا حکم دیتا ہوں۔“

اس کے بعد جرنیل چپ چاپ اسی گہیر متانت کے ساتھ، جو تجویز و تکفین کی رسوم کی ادائیگی کے بعد بوت رداگی لوگوں پر طاری ہو جاتی ہے، منتشر ہونے لگے۔

بعض جرنیل اپنے کمانڈر انچیف سے کچھ کہنے کے لیے رک گئے۔ کونسل کے اجلاس میں وہ جس بجے سے ہٹ کر رہے تھے، اس کے برعکس اب وہ بالکل مختلف اور وجہیہ انداز سے بول رہے تھے۔

الاش، جس کا بہت دیر سے سپر پر انتظار ہو رہا تھا، اپنے ننھے ننھے پاؤں حزم و قبط سے تہجے پر کھتی آتش دھن سے، جس پر اس کے لیے سونے کی جگہ ہی ہوئی تھی، نیچے اتاری اور جرنیلوں کی ٹانگوں کے نیچے سے کھسکتی باہر بھاگ گئی۔

جرنیلوں کو فارغ کرنے کے بعد کو تو زوف خامی و یرنگ میز پر ٹھہریاں لگائے بیٹھا رہا اور مسلسل اس بولناک

سوال پر غور کرتا رہا۔ ”ماسکو کو اپنے حال پر چھوڑنا کب ناگزیر ہو، تھا؟ کب؟ اور اس کا الزام کس پر آتا ہے؟“
 ”مجھے۔ مجھے اس کی توقع نہیں تھی!“ اس نے اپنے ایجوٹڈ شنیدر سے، جب وہ خامی رات گزرنے کے بعد اس کے کمرے میں آیا، کہا۔ ”مجھے اس کی توقع نہیں تھی! میں نے کبھی یہ سوچا بھی نہیں تھا کہ ایسا ہوگا۔“
 ”یونٹ ہائی نس! آپ کو کچھ دیر آرام کر لینا چاہیے۔“ شنیدر نے کہا۔
 ”لیکن ابھی قصہ ختم نہیں ہوا، ترکوں کی طرح وہ بھی گھوڑوں کا گوشت کھانے پر مجبور ہوں گے!“ کپٹن زوف نے اس کی بات کا جواب دیے بغیر کہا، اور اس نے اپنے نر بہ ہاتھ سے زور سے میز پر مکا مارا۔ ”وہ بھی... اگر صرف...“

5

دوہیں اٹنا ایک ایسے واقعے میں، جواہریت کے اعتبار سے فوج کی مقابلے کے بغیر پسائی سے بھی زیادہ بڑا تھا۔ یعنی ماسکو کا انخلا اور آتش زدگی۔ رستوپ چن نے، جسے عام طور پر اس طرح پیش کیا جاتا ہے کہ یہ سب کچھ اس کی ہدایات کے مطابق ہوا تھا، کو تو زوف سے بالکل مختلف رویہ اختیار کر رکھا تھا۔
 بارودینو کی لڑائی کے بعد یہ واقعہ۔ ماسکو کا انخلا اور آتش زدگی۔ بالکل اسی طرح اٹل تھا جس طرح مقابلے کے بعد فوج کی پسپائی ناگزیر ہو گئی تھی۔

ہر روسی اس کی پیش گوئی کر سکتا تھا، کسی عقلی استدلال کی بنا پر نہیں بلکہ اس جذبے کی اساس پر، جو ہم سب کو اور ہمارے آباء و اجداد کو خلقی طور پر ودیعت ہوا ہے۔

جو کچھ ماسکو میں ہوا، وہ سمولنسک سے لے کر آگے تک روسی سرزمین کے ہر قصبے، قریے اور گاؤں میں ہوا۔ اس میں رستوپ چن اور اس کے خبرناموں کا کوئی دخل نہیں تھا۔ قوم خاص نوعیت کی بے تعلقی سے دشمن کی منتظر تھی۔ نہ کہیں فساد ہوا اور نہ ہنگامہ آرائی۔ کسی کی تکسیر تک نہ بھوٹی۔ تمام لوگ تحمل اور سکون سے اپنے مقدر کا نظارہ کرتے رہے۔ انھیں احساس تھا کہ ان کے اندر ایسی قوت موجود ہے کہ جب یہ مہیب وقت آئے گا، وہ انھیں بتا دے گی کہ انھیں کیا کرنا ہے۔ اور جو دشمن قریب پہنچتا، معاشرے کا خوش حال اور مالدار طبقہ اپنی املاک اور جائیدادیں چھوڑ چھاڑ راہ فرار اختیار کر لیتا جب کہ مفلس اور نادار لوگ وہیں ٹکے رہتے اور جو کچھ باقی بچ رہتا، اسے نذر آتش اور جہاں کرتے رہتے۔

یہ شعور کہ یہی ہوگا اور ہمیشہ یہی ہوتا رہے گا، ہر روسی کے دل پر نقش تھا اور نقش ہے۔ 1812 کے دوران میں ماسکو کے اعلیٰ طبقے کے ہر فرد کو یہ شعور نہیں، بلکہ اس سے بھی بڑھ کر یہ پیشگی اندازہ تھا کہ شہر پر (دشمن کا) قبضہ ہو جائے گا۔ ان لوگوں نے، جو اتنا پہلے کہ جولائی یا شروع اگست میں ہی رخت و سفر باندھ کر ماسکو سے روانہ ہوا شروع ہو گئے تھے، یہ دیکھ دیا تھا کہ انھیں اسی چیز کی توقع تھی۔ یہ لوگ، جتنا کچھ اٹھ سکتے تھے، اٹھا کر اور اپنے مکانات اور

آدھوں آدھ احساں منقولہ اہیں چھوڑ کر، فرار ہو گئے۔ انہوں نے یہ سب کچھ حب الوطنی کے اس غفی جذبے کے تحت کیا جن کا اظہار نہ الفاظ، نہ مادر وطن کے لیے اپنے بچوں کی قربانی اور نہ اس نوع کے دیگر غیر فطری افعال سے ممکن ہے بلکہ یہ کچھ اس طرح سیدھے سادے اور خلقی انداز سے منظر عام پر آتا ہے کہ دوسروں کو اس کا پتا بھی نہیں چلا اور اس کے نتائج بھی نہایت مستحکم و رتوی ثابت ہوتے ہیں۔

”خطرے سے راہ فرار اختیار کرنا شرمناک حرکت ہے۔ صرف بزدل ماسکو سے بھاگ رہے ہیں۔“ انہیں بتایا جاتا تھا۔ خبرناموں میں رستوپ چین ان پر زور دیتا رہتا تھا کہ وہ ماسکو سے نکل کر اپنے ہاتھوں پر کلک کا ٹیکہ لگوا رہے ہیں۔ انہیں اس بات پر شرمندگی ضرور ہوتی تھی کہ ان پر بردلی کا ٹھپا لگایا جا رہا ہے، انہیں اپنی اس روانگی پر ہفت بھی محسوس ہوتی تھی مگر وہ پھر بھی جا رہے تھے کیونکہ وہ جانتے تھے کہ اس کے علاوہ اور کوئی صورت ہی نہیں۔ وہ کیوں جا رہے تھے؟ یہ مفروضہ تو بالکل ہی قائم نہیں کیا جاسکتا کہ وہ اس لیے جا رہے تھے کیونکہ رستوپ چین نے، ان مظالم کی، جو اس کے خیال میں پولین نے مفتوحہ ممالک کے باشندوں پر روا رکھے تھے، داستانیں سنا کر انہیں خوف زدہ کر دیا تھا۔ سب سے پہلے جن لوگوں نے رستوپ سفر باندھا، وہ متوس اور تعلیم یافتہ تھے اور وہ خراب اچھی طرح جانتے تھے کہ پولین کے قبضے کے دوران میں ویانا اور برلن کو ذرا آگ نہیں آئی تھی اور ان شہروں کے باسی، سحرانگیر اور پرکشش فرانسیسیوں کی صحبت میں جنہیں اس زمانے میں روسی، خاص طور پر خواتین، اتنی پسندیدگی کی نگاہوں سے دیکھتی رہی تھیں، خوشگوار وقت گزرتے رہے ہیں۔

روسی ماسکو سے اس لیے نکل گئے تھے کیونکہ ان کے سامنے مسئلہ یہ نہیں تھا کہ فرانسیسی راج کے دوران میں ان کا وقت اچھا گزرے گا یا برا۔ ان کے نزدیک فرانسیسیوں کے زیر تسلط زندگی گزارنے کا تصور بھی محال تھا، اس سے بدترین بات، اور کوئی ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ وہ بارودینو کی لڑکی سے پہلے ہی ٹکنا شروع ہو گئے اور اس اثر ال کے بعد ان کے ٹکنے کی رفتار میں اور بھی تیزی آگئی۔ اگرچہ رستوپ چین ان سے شہر کے دفاع کی اپیلیں کرتا رہا اور ماسکو کے گورنر جنرل کی حیثیت سے اپنے اس عزم کا اظہار کرتا رہا کہ وہ مادرِ خداوند کا ”بھیریائی ایقونہ میدان جنگ میں لے جائے گا، فرانسیسیوں پر ایسے غبارے چھوڑے گا کہ ان کا نام و نشان باقی نہ رہے گا اور اس قسم کی دوسری امتحانہ باتوں سے اپنے خبرناموں کے صفحات پر کرتا رہا لیکن ان پر کوئی اثر نہ ہوا۔ انہیں معلوم تھا کہ جنگ کرنا فوج کا کام ہے اور اگر وہ یہ نہیں کر سکتی، پھر ان پر یہ لازم نہیں آتا کہ وہ نوخیز لڑکیوں اور قلاموں کو لے کر تین پرست پر پہنچ جائیں اور پھینکن کے خلاف صف آرا ہو جائیں۔ اگرچہ انہیں اپنی احساں کو تباہ و برباد ہونے کے لیے یوں چھوڑنے پر بڑا اہمال ہوتا تھا لیکن وہ جانتے تھے کہ انہیں شہر سے ٹکنا ہی ہوگا۔ اور وہ نکل گئے لیکن انہوں نے ایک لمحے کے لیے بھی یہ نہ سوچا کہ ان کا اس وسیع و عریض اور مالی و دولت سے بھرپور شہر کو یوں چھوڑنا کتنی زبردست مسئولیت کا حامل ہوگا۔ بس وہ چلے گئے لیکن شہر کو شعلوں کے حوالے کر گئے (چوبی عمارتوں پر مشتمل کسی عظیم شہر کے باشندے اگر اسے چھوڑ کر بھاگ جائیں، اسے لازماً شعلوں کی نذر ہونا پڑے گا)۔ ان میں سے ہر ایک اپنی مرضی سے گیا لیکن ان کے اس

طور جانے کا ہی یہ نتیجہ تھا کہ وہ عظیم الشان واقعہ ظہور پذیر ہو، جو سہاروی قوم کے ماتھے کا جھومر بنارہے گا۔ وہ خاتون، جو اس مبہم احساس کے تحت، کہ وہ اپنے اوپر یونانی پارت کا حکم نہیں چلنے دے گی اور جسے یہ خوف دامن گیر تھا کہ کہیں کاؤنٹ رستوپ چن کے حکم پر اسے روک ہی نہ دیا جائے، اپنے جیشی خدمت گاروں اور سخریوں کے ہمراہ دوسروں سے بہت پہلے جون میں ہی پٹی جاگیر واقع سہارا توف روانہ ہو گئی تھی، بالکل سیدھے سادے اور فطری انداز سے کار عظیم میں، جس نے روس کو تحفظ فراہم کیا، ہاتھ بٹا رہی تھی۔

تاہم رستوپ چن، جو پہلے ان لوگوں کو، جو شہر چھوڑ کر جا رہے تھے، ملاحیاں سناتا رہتا تھا اور پھر جس نے سرکاری دفاتر شہر سے باہر منتقل کر دیے تھے، اب اس نے خود شرابی لٹو نجوں میں ناکارہ تھپہر تقسیم کر دیے۔ ایک روز اس نے حکم دیا کہ ایٹورنوس کے ساتھ جلوس نکال جائے، لیکن اگلے روز جب پادری اوستیس نے ایٹورنوس اور مقدس نشانوں کے ساتھ، ہر آنا چاہا، تو اس نے اسے اجازت دینے سے انکار کر دیا۔ اس کے بعد اس نے ماسکو کے تمام لٹی چٹکڑے اپنے قبضے میں لے لیے اور ان میں سے ایک سو چھتیس پر وہ اس غبارے کو، جو لے بیچ نے تعمیر کیا تھا، لٹا کر لے گیا۔ پھر اس نے اشاروں کنیوں میں بتایا کہ وہ ماسکو کو نذر آتش کر دے گا اور اعلان کیا کہ وہ اپنا گھر اپنے ہاتھوں جدا کر رکھ کر چکا ہے۔ اس کے بعد اس نے فرانسیسیوں کے نام ایک مراسلہ تحریر کیا اور انھیں براہ بلا کہا کہ انھوں نے اس کے بچپن کے گھر کو مسمار کر دیا ہے۔ کبھی وہ، سکو کو نذر آتش کرنے کا پردہ گرام بیانا اور کبھی کانوں کو ہاتھ لگاتا اور کہتا، ”تو بہ تو بہ، میں بھلا یہ حرکت کیسے کر سکتا ہوں؟“ کبھی وہ لوگوں کو حکم دیتا ہے کہ وہ تمام ماسکوں کو ہٹا لیں، ورنہ اس کے سامنے پیش کر دیں۔ جب لوگ اس کے حکم کی تعمیل کرتے، وہ انھیں لعنت ملامت کرنے لگتا کہ انھوں نے یہ حرکت کیوں کی ہے۔ پہلے اس نے تمام فرانسیسی باشندوں کو شہر سے باہر نکال دیا اور پھر مادم اریخ شائے (ماسکو میں تمام فرانسیسیوں کی مرکزی شخصیت) کو ٹھہرنے کی اجازت دے دی۔ اس کے ساتھ فریڈریم ہاؤس کے بغیر معمر پوسٹ مارشردا جب استعظیم کلیو چاریف کی گرفتاری اور جلا وطنی کا حکم دے دیا۔ ایک مرتبہ اس نے فرانسیسیوں کے خلاف لڑنے کے لیے لوگوں کو تین پر بت پر اکٹھا کر لیا، پھر ان سے پچھا چھڑانے کے لیے اس نے ایک آدمی ان کے حوالے کر دیا تاکہ وہ، سے قتل کر سکیں اور خود گھوڑے پر سوار ہو کر عقبی دروازے سے باہر نکل گیا۔ کبھی وہ اعلان کرتا کہ وہ سقوطی، سکو کا صدمہ برداشت نہیں کر سکے گا اور دماغی اجل کو لبیک کہہ دے گا۔ پھر وہ اپنی بیاضوں میں، جن میں وہ اس معاملے میں اپنے کردار کے متعلق یا دداشتیں رقم کرتا رہتا تھا، فرانسیسی میں اشعار لکھنے لگتا۔ جو کچھ وقوع پذیر ہو رہا تھا، یہ شخص اس کی معنویت سمجھنے میں قطعاً ناکام رہا۔ اس کے دل میں صرف ایک ہی دھن سمائی ہوئی تھی کہ وہ کوئی ایسا کام کرے جو لوگوں کو متحیر کر دے اور اس کی دلیرانہ حب الوطنی کی دھاک ٹھارسے ماسکو کے انحلال اور آتش زدگی کے تاریخ ساز اور ناگزیر واقعے میں اس کا کردار بالکل بچکانہ تھا۔ وہ اپنے حقیر داناواں ہاتھوں سے اس عظیم الشان عوامی میل کے آگے، جو اسے اپنے ساتھ بہائے لیے جا رہا تھا، کبھی بند باندھنے لگتا اور کبھی اس کی رفتار میں اضافہ کرنے کی سعی کرتا۔

ہیلین، جو دربار کے ساتھ دلنہ سے واپس پیٹرز برگ لوٹ آئی تھی، مجھے میں گرفتار تھی۔

پیٹرز برگ میں اسے ایک عظیم المرتبت شاہی مصاحب کی، جو امپراطوریہ میں کسی بلند ترین منصب پر بھی نائز تھا، سرپرستی حاصل تھی۔ تاہم دلنہ میں اپنے قیام کے دوران میں اس نے ایک غیر ملکی شہزادے کے ساتھ جسمانی تعلقات استوار کر لیے تھے۔ جب وہ پیٹرز برگ واپس آئی، شاہی مصاحب اور شہزادہ دونوں وہاں موجود تھے۔ دونوں اپنے اپنے حقوق جتار رہے تھے اور ہیلین کو اپنی معاشرتی زندگی میں ایک نئی، الجھن کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ اس کے تعلقات دونوں کے ساتھ برقرار رہیں اور کسی کے ساتھ بگاڑ کی نوبت نہ آئے۔

وہ چیز، جو کسی دوسری عورت کے لیے اگر ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہوتی، کاؤنٹس بزدلانہ اسے کبھی پرکاش کے برابر بھی اہمیت نہ دی۔ اس کی شہرت ہوشیار ترین عورت کی تھی اور یہ بے سبب نہیں تھی۔ کدھب صورت حال سے پیچھا چھڑانے کے لیے اگر وہ رازداری، سخن طرازی یا حیلہ جوئی سے کام لیتی، بے مقصدے کو خود ہی خراب کر لیتی کیونکہ یہ اعتراف جرم ہوتا، لیکن ہیلین نے، صحیح معنوں میں عظیم انسان کی طرح، کہ وہ جو جی چاہے کر سکتا ہے، فوراً یہ رویہ اختیار کر لیا کہ وہ راستی پر ہے۔ اور وہ صدق دل سے اس پر یقین رکھتی تھی۔ وہ باقی تمام لوگ خطا کار ہیں۔ جب نوجوان غیر ملکی شہزادے نے پہلی مرتبہ اسے طعنہ دینے کا حوصلہ کیا، اس نے، پناخو بصورت سر اٹھا دیا اور اس کی طرف نیم متوجہ ہو کر پرسکون لہجے سے بولی:

”آپ کا رویہ بالکل مردوں کا ہے۔ خود غرض اور سفاک! مجھے یہی توقع رکھنا چاہیے تھی۔ عورت آپ کے لیے سب کچھ قربان کر دیتی ہے، مصائب جھیلیں ہے، دکھ اٹھاتی ہے اور اسے انعام یہ ملتا ہے! یوز ہائی نس، آپ کو یہ حق کہاں سے مل گیا کہ آپ مجھ سے میری دوستیوں اور تعلقات کا حساب مانگیں؟ یہ وہ شخص ہے جو میرے لیے میرے باپ سے بڑھ کر ہے۔“

شہزادہ کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن ہیلین نے اس کی بات کاٹ دی۔

Eh bien oui۔ اس نے کہا، ”میرے متعلق اس کے جو جذبات ہیں، شاید بکسر پرانہ نہیں لیکن اس سے میرے لیے یہ وجہ جواز نہیں بنتی کہ میں اپنے دروازے اس پر بند کر دوں۔ میں کوئی مرادھورے ہی ہوں کہ مہربانوں کا جواب ناشکرے پن سے دوں۔ اور یوز ہائی نس، آپ یہ بات اچھی طرح پلے باندھیں کہ ان تمام باتوں کے لیے، جس کا تعلق میرے ذاتی جذبات سے ہے، میں صرف خداوند اور اپنے ضمیر کے سامنے جواب دہ ہوں۔“ اس نے اپنی بات ختم کرتے ہوئے کہا۔ اس نے اپنا ہاتھ اپنی خوش قطع اور خوشنا چھاتیوں پر رکھا، جواب پوری طرح بھرپور تھیں، اور آسمان کی طرف دیکھنے لگی۔

”لیکن خدا کے لیے میری بات تو سنو۔“

”مجھ سے شادی کر لیں اور میں آپ کی باندی بن جاؤں گی“

”مگر یہ ناممکن ہے!“

”مجھ سے شادی کر کے آپ کی شان میں بٹالکتا ہے۔ آپ کے لیے یہ پاتال میں گرنے کے مترادف ہے۔ آپ۔“ اور ہیلین زارو قطار رونے لگی۔

شہزادے نے اسے تسلی دینے کی کوشش کی لیکن ہیلین نے، جیسے وہ دکھ سے نڈھال ہو رہی ہو، روتے اور ہچکیاں لیتے پر زور انداز سے کہا: ”دنیا کی کوئی طاقت مجھے شادی کرنے سے روک نہیں سکتی، ایسی مثالیں موجود ہیں۔“ (اس زمانے تک ایسی مثال خال خال ہی ملتی تھیں۔ اس نے البتہ نیولین اور بعض دیگر شخصیات کے حوالے دیے۔) ”میں نے اپنے خاندان کے ساتھ کبھی میاں بیوی کے تعلقات قائم نہیں کیے۔ مجھے تو محض قربانی کا بکرا بننا پڑا تھا۔“ اس نے مزید کہا۔

”لیکن ادھر تو انجمن ہیں۔ مذہب۔“ شہزادے نے تیم دلی سے کہا۔ لیکن وہ اسے جو تجویزیں دے رہی تھی، وہ اس کے سامنے پہلے ہی ہتھیار ڈال چکا تھا۔

”تو، نہیں، مذہب۔۔۔ مگر یہ اس قسم کی صورت حال کا عداو نہیں کر سکتے، پھر ان کے گھرے جانے کا فائدہ؟“ شہزادے کی اندر کی سانس اندر اور باہر کی باہر رہ گئی۔ اسے تعجب اس بات پر تھا کہ خود اسے اس قسم کا آسان حل کیوں نہ سوچھا۔ اس نے سوسائٹی آف جیوز¹⁰ کے صالح ارکان سے، جن کے ساتھ اس کے قریبی تعلقات تھے، مشورہ طلب کیا۔

چند دنوں کے بعد ایک پر شکوہ دعوت (ہیلین کو کاہنی جزیرے پر اپنے گسائی بنگلے میں اس قسم کی دعوتیں منعقد کرنے کا چسکا پڑ چکا تھا) میں اس کی خدمت میں کسی موسیو یوانخ (Jobert) کو پیش کیا گیا۔ موسیو یوانخ کا دور شباب گزر چکا تھا۔ اس کے بال برف کی مانند سفید تھے اور اس کی سیاہ آنکھوں میں ہلا کی جھک تھی۔ وہ¹¹ un Jesuite a robe courtہ تھا۔ چکا چند روشنیوں میں موسیقی کی دھنوں کے مابین وہ باغیچے میں خاصی دیر تک اس سے خداوند، یسوع، اور قلب متقدس¹² سے محبت کے بارے میں گفتگو کرتا رہا۔ (اس کا دعویٰ تھا کہ برومن کیتھولک مذہب واحد سچا مذہب ہے۔ یہ مذہب اس دنیا اور آخرت میں جو تسکین فراہم کرتا ہے، اس نے اس پر بھی میر حاصل تبصرہ کیا۔) ہیلین بہت متاثر ہوئی۔ ایک سے زیادہ مرتبہ اس کی اور موسیو یوانخ کی آنکھیں دھنکبار ہو گئیں اور ان کی آواز میں کپکپانے لگیں۔ درس اشاڈانس کا آغاز ہوا چاہتا تھا، اور ہیلین کا ہم رقص اسے بلانے آگیا اور یوں اس کی اپنے مستقبل کے ”directeur de conscience“ سے گفتگو منقطع ہو گئی۔ لیکن اگلی شام موسیو یوانخ آگیا

* a Jesuit in walking dress: م لوگوں کے لباس میں یسوعی۔ (ماہیہ نمبر ۶۶ دیکھیں۔)

ہی اسے ملنے آگیا اور اس کے بعد وہ اس کے گھر اکثر آنے لگا۔

ایک روز وہ کاؤتس کو رومن کیتھولک چرچ میں لے گیا۔ وہاں وہ عشاءے ربانی کی میز کے سامنے، جہاں اسے پہنچایا گیا تھا، دوڑاؤ ہو گئی۔ پرکشش فرانسیسی نے اپنے دونوں ہاتھ اس کے سر پر رکھے اور جیسا کہ ہیلین نے خود بعد میں بتایا، اسے محسوس ہوا جیسے ہو۔ کاٹارہ جھونکا اس کی روح میں داخل ہو گیا ہو۔ اس کے سامنے اس کی توجہ یوں کی گئی کہ یہ *la grace* ہے۔

پھر اس کے پاس ایک ¹³ *abbé* — *un abbé à robe longue* — لایا گیا۔ وہ اس سے اس کے گناہوں کے اعترافات سنتا رہا اور اس نے اسے اس کے تمام گناہوں کی سحانی دے دی۔ اگلے روز اسے ایک چھوٹا سا ڈیپا موصول ہوا۔ اس میں عشاءے ربانی کی روٹی تھی۔ یہ اس نے کھانا تھی۔ چند روز بعد ہیلین کو یہ سن کر بہت تسلی ہوئی کہ اسے سچے رومن کیتھولک مذہب میں داخل کر لیا گیا ہے اور یہ کہ خود پوپ اس کے مقدسے کی سماعت کرے گا اور اسے خاص دستاویز بھیجے گا۔

ان ایام کے دوران میں ہیلین کے گرد و پیش جو کچھ ہوتا تھا اور اس کے ساتھ جس قسم کا برتاؤ کیا جا رہا تھا، ذہن اور سمجھ دار اشخاص اتنی زیادہ تعداد میں اس پر جو توجہ دے رہے تھے اور اس توجہ کا اظہار جن خوشگوار اور شائستہ صورتوں میں ہو رہا تھا، اور اب وہ اپنے آپ کو جس مصوئیت اور پاکدامنی کی حالت میں پارہی تھی (اس مدت کے دوران میں وہ صرف سفید ڈریس، جس پر سفید جھالریں ٹانگی ہوئی تھیں، پہنتی رہی)، ان تمام امور سے اسے بہت مسرت ہو رہی تھی۔ تاہم اس مسرت نے اسے اپنے مذہب سے ایک لمحے کے لیے بھی غافل نہ ہونے دیا۔ جیسا کہ عیاری کے مقابلوں میں ہمیشہ ہوتا چلا آیا ہے کہ احمق شخص نسبتاً تیز طرز آدنی کو بچھاڑ دیتا ہے، ہیلین یہ محاب گئی کہ اس کے کیتھولک مذہب میں داخل کیے جانے کے بعد اس کے ساتھ جس قسم کا سلوک روا رکھا جا رہا ہے اور اسے جس طرح چکنی چٹری باتوں سے بہلایا جا رہا ہے، اس کا بڑا مقصد اس سے بیوگی اداواروں کے لیے رقوم بٹورنا ہے (جس کے متعلق اسے متعدد مرتبہ اشاروں کنایوں میں بتایا جا چکا تھا)۔ چنانچہ اس نے کسی قسم کی رقم ادا کرنے سے پہلے ان تمام مختلف رسوم کی ادائیگی کا مطالبہ کیا جو اس کی اپنے شوہر سے خلاصی حاصل کرنے کے لیے ضروری تھی۔ اس کی عقل کے مطابق کسی بھی مذہب کی غرض و غایت محض اتنی تھی کہ وہ ایسے آداب اور دیدہ زیب رسوم کی محافظت کرتا ہے جن کی آڑ میں انسان اپنی خواہشات کی بجا روک ٹوک تسکین کر سکے۔ اور اس مقصد کے پیش نظر اس نے اس پادری سے اصرار کیا تھا جو اس کے گناہوں کے اعترافات سننے آتا تھا کہ وہ اسے اس سوال کا جواب دے کہ وہ کس حد تک شادی کے بندھنوں میں بندھی ہے۔

وہ ڈرامنگ روم میں ایک درتے کے سامنے بیٹھتے تھے۔ شام کا دھندلا پھل چکا تھا۔ درتے میں سے

خدا کی دین

لے چنے میں بلوں پادری

پھولوں کی مہک آ رہی تھی ہیلین سفید ڈریس میں ملبوس تھی۔ شانوں اور سینے پر یہ ڈریس اتنا حسین اور شگفتہ تھا کہ وہ اس میں سے صاف نظر آ رہے تھے۔ سرخ و سپید اور خوب چمے ہوئے پادری کی دائرہ کی منحنی صفا چٹ، ٹھوڑی فریاد گداز اور پیشانی خندہ تھی وہ اپنے سفید ہاتھ یا جزی سے ایک دوسرے کے اوپر گھٹنوں پر لگائے ہیلین کے بالکل قریب بیٹھا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر لطیف مسکراہٹ تیر رہی تھی درودہ گاہے گاہے محنت نظر کریں، جن میں اس کے حسن و جمال کے لیے نرم و حلیم تحسین سمائی ہوئی تھی، اس کے چہرے پر ڈاس لیتا، در اس کے ساتھ ساتھ زیر بحث موضوع کے بارے میں اپنے خیالات کی تشریح کرتا جاتا۔

ہیلین کی جب اس کے گھونگریاے ہاتھوں، فریب، صفا چٹ چہرے، نرم گداز اور قدرے سانولے رخساروں پر نظر پڑتی، وہ پراضطراب انداز سے مسکرا دیتی۔ اسے ہر آن یہی فکر دامن گیر رہتی کہ گفتگو نے اب بھی پلٹا کھایا، اب بھی پلٹا کھایا۔ لیکن پادری اگر چہ قریب اپنے ہم نشین کے حسن و جمال اور قرب سے محفوظ ہو رہا تھا، لیکن وہ اس معاملے کو جس خوش اسلوبی سے پنہاں رہا تھا، اس سے خود ہی مسحور ہو رہا تھا۔

اس کا استدلال کچھ ان مخطوط پر چل رہا تھا۔

”تم جس کام کا بیڑا اٹھا رہی تھیں، تمہیں اس کی ہمت کا کوئی علم نہیں تھا۔ چنانچہ تم نے ایک ایسے شخص کے ساتھ ازواجی و فاداری کا عہد و پیمان باندھا جس نے شادی کی مذہبی معنویت میں کسی قسم کا اعتقاد رکھے بغیر رشتہ مناکحت استوار کر لیا اور یوں اس نے مقدس اشیاء کی بے حرمتی کے جرم کا ارتکاب کیا۔ اس شادی کی دہری معنویت ہونا چاہیے تھی، اس میں اس کا فقدان تھا۔ تاہم اس کے باوجود تم نے جو ایجاب و قبول کیا، اس کی پابندی کرنا تم پر لازم ٹھہرتا تھا۔ تم نے اس سے انحراف کیا ہے۔ اب کر کے تم کس چیز کی مرتکب ہوئی ہو: peche veniel ou peche mortel گناہ صغیرہ یا گناہ کبیرہ؟ اگر تمہارے اس فعل میں ارادہ کا بد شامل نہیں تھا، پھر یہ گناہ صغیرہ ہے۔ اب اگر تم بچوں کو جہنم دینے کے ارادے سے، زمر نو شادی کر لو، تمہارا گناہ معاف ہو سکتا ہے۔ لیکن سوال پھر وہی نوعیت کا ہے۔“

لیکن ہیلین نے، جو پورے پورے تھی، اچانک مسحور کن انداز سے مسکراتے ہوئے کہا:

”مگر میرا خیال ہے کہ اب جب کہ میں نے سچا دین قبول کر لیا ہے، جھوٹے مذہب نے مجھ پر جو فرائض عائد کیے تھے، ان کی پابندی مجھ پر لازم نہیں رہی۔“

ہیلین کا روحانی مشیر یہ دیکھ کر ہلکا سا رہ گیا کہ مسئلہ اس کے سامنے اتنا ہی سادگی سے پیش کیا گیا ہے جتنی سادگی سے کولمبس نے انڈے کو (ایک طرف سے پچکا کر) کھڑا کرنے کا مظاہرہ کیا تھا۔ اس کی شاگرد نے جس غیر متوقع تیزی سے ترقی کی منازل طے کی تھیں، اسے دیکھ کر وہ خوش ضرور ہوا لیکن اس نے اتنی دانشورانہ مسامحہ کے بعد استدلال کی جو عمارت تعمیر کی تھی، وہ اسے ترک کرنے کے لیے اپنے آپ کو آمادہ نہ کر سکا۔

”کاؤنٹس، آئیں، ہم ایک دوسرے کو سمجھ لیں۔“ اس نے مسکراتے ہوئے کہا اور وہ اپنی روحانی دختر کے

رواں کا ابطال کرنے لگا۔

7

ہیلین سمجھ گئی کہ کلیسائی نقطہ نظر سے معاملہ بالکل سادہ اور آسان ہے اور یہ کہ اس کے روحانی مشیر محض اس لیے روزے انکار ہے ہیں کیونکہ انھیں یہ اندیشہ لاحق ہے کہ پتا نہیں سیکر حکام اس مسئلے کے بارے میں کیا رویہ اختیار کریں۔

چنانچہ وہ اس نتیجے پر پہنچی کہ اس معاملے میں اونچے طبقے کی رائے امور کیے بنا چارہ نہیں۔ اس نے منصرعالی مرتبہ حب کے دل میں رقابت کا جذبہ پیدا کیا اور اس سے وہی کچھ کہا جو وہ اپنے دوسرے امیدوار سے کہہ چکی تھی۔ یعنی اس نے اس کے ذہن میں یہ بات بٹھادی کہ اگر وہ بلا شرکت غیرے اس کی الفت پر حق حنا چاہتا ہے تو اس کا ایک ہی طریقہ ہے کہ وہ اس سے شادی کر لے۔

ایک ایسی عورت کے ساتھ جس کا خاوند بھی بقیہ حیات تھا، شادی کی تجویز سن کر سن رسیدہ شاہی مصاحب بھی ابھڑا تنہا سر اسیر ہو جتنا کہ نوجوان شہزادہ ہوا تھا۔ لیکن جب ہیلین نے اپنے ہنس غیر حزرزل یقین کا اظہار کیا کہ معاملہ اتنا ہی سادہ اور مطابق فطرت ہے جتنا ناکندہ و شیرہ سے نکاح کرنا، تو وہ بھی متاثر ہو گیا۔ اگر وہ را بھی اچکچاہٹ، مکرو فن یا خجالت کا مظاہرہ کرتی تو اس میں کوئی کلام نہیں کہ اسے اپنے مقصد کے حصول میں ناکامی کا سامنا کرنا پڑتا تاہم اس نے نہ صرف یہ کہ رازداری یا شرم کی کوئی علامت ظاہر نہ ہونے دی بلکہ اس کے برعکس اس نے بڑی سادگی اور بے ریائی سے پورا معاملہ اپنے بے تکلف دوستوں (اس کا مطلب تمام پیئرز برگ ہے) کے سامنے بیان کر دیا اور انھیں بتا دیا کہ پرنس اور عالی مرتبت مصاحب دونوں نے اس کے ساتھ شادی کی درخواست کی ہے، وہ دونوں سے پیار کرتی ہے اور کسی ایک کو بھی دکھ پہنچانے سے خوف کھاتی ہے۔

ایکا کی سارے پیئرز برگ میں افواہ پھیل گئی، یہ نہیں کہ ہیلین اپنے خاوند سے طلاق لینا چاہتی ہے (اگر خبر کی نوعیت یہ ہوتی تو بے شمار اشخاص اس کے اس غیر قانونی رادے کے خلاف پر زور احتجاج کرتے)، بلکہ یہ کہ ہٹادور پر کشش ہمیں اس شخصے میں گرفتار ہے کہ اپنے دو امیدواروں میں سے کس کو شادی کے لیے ترجیح دے۔ اب مسئلہ یہ نہیں تھا کہ آیا اس قسم کی شادی ہو بھی سکتی ہے یا نہیں، بلکہ محض یہ تھا کہ بہتر رشتہ کون سا ہے اور شاہی دربار میں اس معاملے کے متعلق کیا رویہ اختیار کیا جائے گا۔ بلاشبہ ایسے بے لوج درخت گیر افراد بھی موجود تھے جو اس مشکل مسئلے کی تہہ تک پہنچنے اور اس سے عہدہ برآ ہونے کی صلاحیت سے عاری تھے، اور انھیں اس قفسے میں شادی کی مقدس رسم کی بے حرستی نظر آتی تھی، لیکن وہ قلبیت میں تھے اور انھوں نے اپنی زبانیں بند رکھیں۔ تاہم جہاں تک اکثریت کا تعلق ہے، وہ ہیلین کی خوش بخشی میں دلچسپی لیتی رہی اور آپس میں یہ بحث کرتی رہی کہ دونوں میں سے شادی کا بہتر امیدوار کون ہو سکتا ہے۔ جہاں تک اس معاملے کا تعلق ہے کہ اس عورت کے لیے، جس کا شوہر

ابھی تک زندہ ہو، شادی رچانا صحیح ہے یا غلط، اس کے بارے میں کچھ نہ کہا گیا۔ وہ کہتے تھے کہ اس مسئلے کا فیصلہ ان لوگوں نے، جو ”مجھ سے یا تم سے زیادہ عقل مند“ ہیں، کر دیا ہے اور اس فیصلے کی صحت کے متعلق شک و شبہ کا اظہار کرنا اپنی حماقت اور معاملہ فہمی (savoir faire) کے فقدان کا ڈھنڈورا پیٹنے کے مترادف ہے۔

صرف ماریا دمتریونا آخر دوسروں نے، جو ان گریبوں میں اپنے ایک بیٹے سے ملنے چلی آئی تھی، یہی رائے، جو مقبول نقطہ نظر کے قطعی منہ فی منہ تھی، ظاہر کرنے کا حوصلہ کیا۔ کسی بال پر اس کی جب ہیلین سے ملاقات ہوئی، اس نے اسے کمرے کے عین درمیان میں ہی روک لیا اور عام خاموشی کے بیچ اپنے اکٹرا لہجے میں گویا ہوئی:

”ہونہ، تو ان بیبیوں نے، جن کے خاندان ابھی زندہ ہیں، دوبارہ شادیاں رچانا شروع کر دیا ہیں تم شاید سمجھتی ہو کہ تم نے کوئی نئی اختراع کی ہے مگر بی بی، سنو، اس معاملے میں تم کچھ زنگنی ہو۔ اس کام کو شروع ہوے مدد ملے ہیٹھی ہیں۔ تمام قبیلہ خاتونوں میں یہی کچھ ہوتا ہے۔“ ان الفاظ کی اداسگی کے ساتھ ہی ماریا دمتریونا نے اپنے مخصوص جہدیدی انداز سے اپنی پوری آستینیں اوپر چڑھالیں اور اپنے ارد گرد خشم ناک نگاہوں سے دیکھتی اور لمبے لمبے ڈگ بھرتی کمرے کے پار دوسری طرف چلی گئی۔

اگرچہ لوگ ماریا دمتریونا سے خوف کھاتے تھے، پیٹرز برگ میں اسے ایک قسم کی مسخری خاتون سمجھا جاتا تھا۔ چنانچہ اس نے جو کچھ کہا، کسی نے اس پر مطلق توجہ نہ دی۔ البتہ اس بھونڈے اور عامیانہ لفظ پر، جو اس نے آخر میں استعمال کیا تھا، سب چونکے اور وہ اسے سرگوشیوں میں یوں دہرانے لگے جیسے اس خاتون کی گفتگو کا اصل نکتہ اسی لفظ میں بند ہو۔

پرنس ویکسی، جو حال ہی میں یہ بھولنے لگا تھا کہ وہ کیا کہہ چکا ہے اور ایک ہی بات کو سو مرتبہ ہر اتار جاتا تھا، جب بھی اس کی اپنی بیٹی سے ملاقات ہوتی، وہ اس سے کہتا:

”ہیلین، مجھے تم سے کچھ کہنا ہے۔“ اور وہ اس کا ہاتھ نیچے تھپیٹ لیتا اور اسے ایک طرف لے جاتا۔ ”میرے کانوں میں بعض منصوبوں کے بارے میں۔ تمہیں معلوم ہی ہے کہ یہ کیا ہیں۔ انہو میں بیٹی ہیں۔۔۔ خیر جان من، تمہیں معلوم ہی ہے کہ میرا پدری دل یہ جان کر باغ باغ ہو جاتا ہے کہ تم۔ تمہیں اپنے دکھوں میں سے گزرنا پڑا ہے۔۔۔ Chere enfant لیکن صرف اپنے دل سے مشورہ کرنا چاہیے۔ مجھے بس یہی کہنا تھا۔“ اور ایک ایسے جذبے کو، جو ان مواقع پر بالکل یکساں ہوتا تھا، اپنے نہاں خانہ دل میں پھپھا کر وہ اپنا گال اپنی بیٹی کے گالوں سے لگا دیتا اور وہاں سے چل دیتا۔

ہیلین، جس کی یہ شہرت، کہ وہ بے حد چالاک اور ہوشیار شخص ہے، ابھی تک برقرار تھی اور جو ہیلین کا دوست تھا۔ اس قسم کا بے لوث دوست، جنہیں روشن دماغ خواتین ہمیشہ کسی نہ کسی طرح اپنے پلو سے باندھنے کا اہتمام کر لیتی ہیں، ایسا مرد دوست، جو صرف دوست ہی رہتا ہے، اسے خلوتی کبھی نہیں بنایا جاتا۔ اس نے ایک روز غیرتی

ایضاح میں اس سارے معاملے کے بارے میں اسے اپنی رائے سے آگاہ کیا۔

”ہیلین، سنو۔“ (وہ اس قسم کے دوستوں کو ہمیشہ ان کے خاندانی نام سے پکارتی تھی) اور اس نے اپنی سفید انگلیوں سے، جن میں اس نے انگوٹھیاں پہن رکھی تھیں، اس کے کوٹ کی آستین کو چھوا۔ ”مجھے بالکل اسی طرح، جس طرح تم اپنی ہمشیرہ کو بتاؤ گے، بتاؤ کہ مجھے کیا کرنا چاہیے؟ دونوں میں سے کون؟“

ہیلین کی پیشانی پر شکنیں پڑ گئیں۔ وہ مسکرایا اور سوچنے لگا۔

”تمہیں معلوم ہے کہ تمہاری بات سن کر مجھے کوئی چنبھا نہیں ہوا۔“ اس نے کہا۔ ”بچے دوست کی طرح میں نے اس معاملے کے بارے میں بار بار غور و فکر کیا ہے۔ تم جانتی ہو کہ اگر تم نے شہزادے“ (حمر کے اعتبار سے چھوٹا) ”سے نکاح پڑھو الیا“ اور اس نے اپنی انگلی ٹیڑھی کی، ”تو تم دوسرے سے شادی کرنے کا موقع ہمیشہ کے لیے گنوا دو گی۔ مزید برآں، دربار کی ناراضگی مفت میں مول لے لو گی۔ تمہیں معلوم ہے کہ یہاں ایک قسم کا تعلق بہرہاں موجود ہے۔ لیکن اگر تم معمر کاؤنٹ سے عقد کر لو، تم اس کی زندگی کے آخری ایام مسرتوں سے عمر دو گی اور اس کے بعد ایک بہت بڑے خواب کی بیوہ کی حیثیت سے... اگر شہزادہ تم سے شادی کر لے، پھر کوئی نہیں کہہ سکے گا کہ اس نے اہل اور بے جوڑ رشتہ جوڑا ہے۔“ ہیلین نے کہا اور اس کے چہرے کی شکنیں معدوم ہو گئیں۔

”تم بالکل سچے دوست ہو۔“ ہیلین نے کہا اور اس کے چہرے پر رونق آ گئی۔ اس نے ایک بار پھر اس کی آستین کو چھوا اور بولی: ”لیکن تم جانتے ہو کہ مجھے ان دونوں سے پیار ہے اور میں ان دونوں میں سے کسی کے جذبات کو بھی ٹھیس نہیں پہنچانا چاہتی۔ میں ان دونوں کی راحت کے لیے اپنی جان کی بھینٹ بھی دے سکتی ہوں!“

ہیلین نے یوں اپنے کندھے اچکائے جیسے وہ کہتا چاہتا ہو کہ اس الجھن میں تو وہ بھی اس کی کوئی مدد نہیں کر سکا۔

”کیا استاد عورت ہے؟“ اس نے سوچا۔ ”یہ ہوئی نہ بات اسے کہتے ہیں معاملے کو سیدھے طریق سے پیش کرنا۔ وہ بیک وقت تینوں کے ساتھ عروسی تعلقات قائم کرنا چاہتی ہے۔“

”لیکن یہ تو بتاؤ کہ تمہارے شہر کا اس معاملے میں کیا خیال ہے؟“ اس کی ساکھ اتنی مضبوط اور چمکی تھی کہ اس قسم کے بھولے بھولے سوالات پوچھنے سے اس کی شہرت پر کوئی حرف نہ آتا۔ ”کیا وہ مان جائیں گے؟“

”ادہ، وہ؟ اچی وہ تو مجھ سے اتنی محبت کرتے ہیں۔ وہ میرے لیے سب کچھ کرنے کو تیار ہو جائیں گے۔“

ہیلین نے کہا۔ وجہ تو معلوم نہیں کیا تھی لیکن وہ سمجھتی یہی تھی کہ دیر بھی اس کی پرستش کرتا ہے۔

ہیلین کی پیشانی شکن آلود ہو گئی۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ کوئی پھر نہ تھا ہوا جملہ سوچ رہا ہے۔

”تمہیں طلاق دینے پر بھی آمادہ ہو جائیں گے؟“ اس نے کہا۔

ہیلین کی ہنسی چھوٹ گئی۔

وہ لوگ، جنہیں ہیلین کی مجوزہ شادی کے قانونی اعتبار سے درست ہونے کے بارے میں شبہ تھا، ان میں ہیلین کی ماں پرنس کوراکنا بھی شامل تھی۔ وہ متواتر اپنی بیٹی سے حسد کی آگ میں جلتی بھنٹی رہی تھی اور اب جب

کہ اس کے حسد کا باعث وہ شخص تھا جو اس کے اپنے دل کے اتنا قریب تھا، وہ اس تصور سے سمجھوتا نہ کر پائی۔ اس نے ایک روسی پادری سے پوچھا ”کیا طلاق کا کوئی امکان ہے؟ خاوند کی زندگی میں دوسری شادی ہو سکتی ہے؟“ اور جب اس نے جواب دیا کہ یہ ناممکن ہے تو وہ بہت خوش ہوئی۔ پادری نے اس ضمن میں انجیل مقدس کی آیات کا حوالہ دیا جن میں (پادری کے خیال کے مطابق) اس قسم کی شادی کو واضح طور پر باطل ٹھہرایا گیا تھا۔

ان دنوں سے، جو پرس کے مطابق ناقابل تردید تھے، مسیح ہو کر وہ ایک روز علی الصبح اپنی بیٹی کے گھر کی جانب چل پڑی کیونکہ یہی وہ وقت تھا جب وہ گھر میں آگئی ہوگی۔

ہیلین نے اپنی ماں کے اعتراضات سنے اور ان کے جواب میں خوش اخلاقی لیکن طنزیہ انداز سے مکرادی۔
”لیکن یہاں یہ صاف لکھا ہوا ہے: ”جو اس (عورت) سے جسے طلاق مل چکی ہو، شادی کرے گا۔““ دھڑیر عمر پرس نے کہا۔

”ہائے، mamañ، فضول باتیں مت کرو۔ تم کچھ نہیں سمجھتیں۔ میرا جو مقام ہے، اس میں مجھ پر کچھ فرائض عائد ہوتے ہیں۔“ ہیلین نے اپنی ماں سے فرانسیسی میں کہا۔ اس کے خیال کے مطابق فرانسیسی موقع سے زیادہ مناسبت رکھتی تھی۔ کیونکہ اگر وہ روسی استعمال کرتی تو یہی محسوس ہوتا کہ وہ اپنی بات واضح نہیں کر سکی۔
”لیکن جان من...“

”ہائے، mamañ، سب سمجھتی کیوں نہیں؟“

”مقدس باپ 14 جنہیں عام لوگوں کو ان کے وعدوں، قسموں، و فرائض کی پابندیوں سے آزاد کرنے کا اختیار حاصل ہے۔“

اس مرحلے پر وہ خاتون، جو ہیلین کی مصاحبہ کی حیثیت سے اس کے گھر میں رہتی تھی، یہ بتانے آئی کہ ”ہزہائی نہیں ڈرائنگ روم میں تشریف فرما ہیں اور آپ سے ملاقات کرنا چاہتے ہیں۔“
”نہیں، میں نہیں آؤں گی۔ جاؤ، انہیں جا کر بتا دو کہ میں ان سے بے حد خفا ہوں کیونکہ انہوں نے مجھ سے جو وعدہ کیا تھا، انہوں نے وہ پورا نہیں کیا۔“

”Comtesse، ہر گناہ کی بخشش ہوتی ہے۔“ ایک نوجوان شخص نے، جس کے بال ہلکے بھورے، چہرہ کتابی اور ناک لمبی تھی، کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

ادھیز عمر پرس احتراماً اٹھ کر کھڑی ہوئی اور ”داب بھالائی“ نوجوان شخص نے اس پر قطعاً کوئی توجہ نہ دی اور وہ چپکے سے باہر نکل گئی۔

”ہاں، وہ رات ہی پر ہے۔“ ادھیز عمر پرس نے سوچا ہزہائی نہیں کی آء سے اس کے تمام پتے یقیناً پور ہوا

ہو گئے تھے۔ وہ راستی پر ہے۔ لیکن ہمیں اپنی جوتی میں۔ جو کبھی لوٹ کر واپس نہیں آ سکتی۔ اس طرح کیوں نہ سوچھا؟ حالانکہ یہ بالکل سیدھی سی بات ہے۔ اس نے سوچا اور وہ اپنی گاڑی پر سوار ہو گئی۔



اول اگست میں ہیلین کے معاملات طے ہو گئے اور اس نے اپنے خاندان (جس کے بارے میں اس کا خیال تھا کہ وہ اس پر بری طرح فریفتہ ہے) کے نام خط تحریر کیا۔ اس میں اس نے اسے مطلع کیا کہ اس کا ارادہ این این سے رشتہ ازدواج میں غسلک ہونے کا ہے اور اس نے واحد سچا مذہب اختیار کر لیا ہے۔ اس نے اس سے درخواست کی کہ طلاق کے لیے جو رسمی کارروائیاں ضروری ہیں، وہ انہیں پایہ تکمیل تک پہنچا دے۔ یہ کارروائیاں کیا تھیں، ان کی تشریح اس کے خط کے مطابق اس شخص نے کرنا تھی، جو اس کا مکتوب لے کر جا رہا تھا۔ ”اور، ہائی ڈیئر، میری خداداد سے یہ دعویٰ ہے کہ وہ آپ کو اپنے مقدس اور طقور حفظ داماں میں رکھے۔ آپ کی دوست، ہیلین۔“

یہ خط ڈیئر کے گھر اس وقت پہنچایا گیا، جب وہ بارودینو کے میدان جنگ میں پہنچ چکا تھا۔

8

جب بارودینو کی لڑائی اہتمام کو پہنچ رہی تھی، سوئزر دوسری مرتبہ رلیف سکی بیٹری سے بھاگ اٹھا اور سپاہیوں کے ہجوم کی معیت میں گھائی کے ساتھ ساتھ کنیز کا دور کی سمت میں چلنے لگا۔ جب وہ ڈرننگ سٹیشن پر پہنچا اور اسے وہاں ہر طرف خون ہی خون دکھائی دیا اور زخمیوں کے کراہنے اور چیخنے چلانے کی آوازیں سنائی دیں، اس کے لیے وہاں ٹھہرنا محال ہو گیا۔ چنانچہ وہ لپک جھپک آگے چلنے لگا لیکن وہ اب بھی سپاہیوں کے زرنے میں گھرا ہوا تھا۔

اب سوئزر کی صرف ایک ہی تمت تھی اور وہ اسے بھیم قلب پورا کرنا چاہتا تھا۔ وہ ان تمام ہیبت ناک مناظر سے، جن سے دن بھر اس کا واسطہ پڑا رہا تھا، انرا حاصل کرنے کی فکر میں تھا۔ وہ زندگی کے روزمرہ کے معمولات کی جانب لوٹا، اور اپنے کمرے میں اپنے بستر پر پرسکون گہری نیند سونا چاہتا تھا۔ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ وہ زندگی کے عام معمولات میں ہی اپنے آپ کو اور ان تمام باتوں کو، جو اس نے دیکھی تھیں اور جن کا اسے تجربہ ہوا تھا، سمجھ سکے گا۔ لیکن زندگی کے یہ عام معمولات کہیں بھی نظر نہیں آ رہے تھے۔

جس سڑک پر وہ گاڑن تھا، اگر چہ اب وہاں گولے اور گولیاں اس کے سر کے اوپر سے نہیں گزر رہے تھے تاہم اپنے چاروں اطراف اسے اب بھی وہی مناظر، جو اس نے میدان جنگ میں دیکھے تھے، نظر آ رہے تھے۔ وہاں دای مصائب زدہ، تھکے ماندے اور بعض اوقات عجیب انداز سے تکلیف کے احساس سے عاری سپاہ چہرے دکھائی دے رہے تھے۔ ہر طرف وہی خون، وہی فوجی اور ویکوٹ، وہی فائرنگ کی آوازیں تھیں۔ اور یہ آوازیں اگرچہ فاصلے فاصلے سے، مگر یہی تھیں لیکن وہ اب بھی دلوں پر دہشت، بھار ہی تھیں یہی نہیں، بلکہ ان پر مشتزاں، وہاں جاں لیو

گرمی اور گرد تھی۔

سوڈیک شاہراہ پر تقریباً دو میل پیدل چلنے کے بعد میٹر سڑک کے کنارے بیٹھ گیا۔

جھٹ پٹے کا وقت ہو چکا تھا اور توپوں کی گھن گرج قصہ پارینہ بن چکی تھی۔ میٹر نیچے لیٹ گیا اور کہنی پر مکائے کافی دیر تک تاریکی میں اپنے قریب غیر واضح شکلیں آگے بڑھتے دیکھتا رہا۔ اس کے ذہن میں بار بار یہ خیال آتا کہ توپ کا گولہ مہیب انداز سے سسنا تا برق رنائری سے اس کی جانب بڑھتی چلا آرہا ہے۔ اسے جھرجھری آجاتی اور وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھتا۔ سے کچھ اندازہ نہیں تھا کہ وہاں کتنی دیر سے پڑا ہے۔

نصف شب کے قریب تین سپاہی نمودار ہوئے۔ وہ اپنے پیچھے چند جھاڑیاں گھسیٹے لارہے تھے۔ وہ اس کے قریب بیٹھ گئے اور آگے جلائے لگے۔ پھر انھوں نے آگ پر کیتلی رکھی اور اس میں چند ٹوٹے پھوٹے دس درہم جلی ڈالی۔ روغنی خوراک کی اشتہا آور مہک دھوئیں کی بو میں گھل مل گئی۔ میٹر اٹھ کر بیٹھ گیا اور اس نے بھی سانس لی۔ تینوں سپاہی اس سے بے نیاز کھانے اور آپس میں باتیں کرنے میں مشغول ہو گئے۔

”تم کون ہو؟“ اچانک ایک سپاہی نے میٹر سے پوچھا۔ جس انداز سے اس نے یہ سوال پوچھا، اس کا بظاہر مطلب یہ تھا اور میٹر کے ذہن میں بھی یہی مفہوم آیا: ”اگر تم بھوکے ہو، ہم تمہیں کچھ کھانے کو دے دیں گے۔ صرف اتنا بتا دو کہ تم آدمی ایسے انداز ہو یا نہیں۔“

”میں۔ میں۔“ میٹر نے کہنا شروع کیا۔ اسے احساس ہو رہا تھا کہ اسے اپنے سماجی سرچہ حتی الامکان کم تر کر کے پیش کرنا ہوگا تاکہ وہ ان سپاہیوں کا قرب حاصل کر سکے اور وہ اس کی باتیں سمجھ سکیں۔ ”میں۔ درحقیقت لیٹیا کا افسر ہوں لیکن میرے آدمی یہاں نہیں ہیں۔ میں گھوڑے پر لڑائی میں شریک ہوا تھا لیکن اپنے آدمیوں سے بچ کر رہا۔“

”واقعی؟“ ایک سپاہی نے پوچھا۔

دوسرے نے اپنے سرکویوں، جنبش دی جیسے اسے اس کے بیان پر شک ہو۔

”اچھا! اگر تم چاہو تو بھرتا حاضر ہے، کچھ کھا لو۔“ پہلے سپاہی نے کہا۔ اس نے چوبی چھپ چاٹ کر صاف کیا

اور میٹر کو تھما دیا۔

میٹر آگ کے قریب بیٹھ گیا اور کیتلی میں سے آمیزہ کھانے لگا۔ اس نے اب تک جتنے کھانے کھائے تھے، ان سب میں سے اسے یہ لذیذ ترین محسوس ہوا۔ جب وہ کیتلی پر جھکا بڑے بڑے جج بھر کر نادیوں کی طرح کھا رہا تھا، آگ کی روشنی اس کے چہرے پر منعکس ہونے لگی اور سپاہی اسے چپ چاپ بغور دیکھنے لگے۔

”اب بتاؤ کہ تمہیں کہاں جانا ہے؟“ ایک نے پوچھا۔

”سوڈیک۔“

”کوئی رئیس ہو؟ ہے؟“

”ہاں۔“

”تمہارا نام کیا ہے؟“

”پیٹر کرلووچ۔“

”خیر، پیٹر کرلووچ، ہمارے ساتھ آؤ، تم تمہیں وہاں پہنچا دیں گے۔“

ویٹر اور سپاہی سوڑیک کی جانب چل پڑے۔ اندھیرا، تازہ وادہ تھا کہ ہاتھ کو ہاتھ سمجھتی نہیں دیتا تھا۔ جب وہ وہاں پہنچے اور شہر میں داخل ہونے کے لیے عمودی پہاڑی پر چڑھنے لگے، مرغلوں کی بانٹیں شروع ہو گئیں۔ ویٹر کے ذہن میں ہی نہ رہا کہ اس کا ہوٹل پہاڑی کے دامن میں ہے۔ چنانچہ وہ سپاہیوں کے ساتھ ساتھ چلا رہا اور اپنے ہوٹل سے آگے نکل گیا۔ وہ اس قدر بوکھل یا ہوا تھا کہ اگر پہاڑی کے صحن درمیان میں اچانک اس کی لٹھ بھینٹ اپنے سائیکس سے نہ ہو جاتی تو وہ اسے یہ بھی نہ آتا۔ سائیکس اس کی تلاش میں سارے شہر میں مدامارا پھر رہا تھا اور اب واپس ہوٹل آ رہا تھا۔ اس نے ویٹر کو اس کے ہیٹ سے، جوائنڈھیرے میں دھندلا دھندلا دکھائی دے رہا تھا، پہچان لیا۔

”ویٹر ایسی لینس!“ اس نے چلا کر کہا۔ ”ہم تو امید کھو بیٹھے تھے! یہ آپ پیدل کیوں چل رہے ہیں؟ اب آپ کہاں تشریف لے جا رہے ہیں؟“

”ارے ہاں...“ پیٹر بڑبڑایا۔

سپاہی رک گئے۔

”تو تمہیں اپنے آدمی مل گئے؟“ ایک نے کہا۔ ”اچھا، خدا حافظ!.. پیٹر کرلووچ۔ یہی نام تھا؟“

”خدا حافظ، پیٹر کرلووچ“ دوسروں نے ہاں میں ہاں ملائی۔

”خدا حافظ!“ پیٹر نے جواب دیا اور اپنے سائیکس کے ساتھ ہوٹل کی طرف چل پڑا۔

”مجھے انھیں کچھ دینا چاہیے۔“ اس نے اپنی جیسیں ٹٹولتے ہوئے سوچا۔ ”نہیں، نہ دینا ہی بہتر ہے۔“ باطنی آواز نے اس کے کان میں سرگوشی کی۔

ہوٹل میں کوئی کمر خالی نہیں تھا۔ سب مہمانوں سے پُر تھے۔ ویٹر محن میں چلا گیا۔ اس نے سر سے پاؤں تک اپنا جسم ڈھانپا اور اپنی گاڑی میں لیٹ گیا۔

عکس نے بے شکل سیکے پر سر نکال دیا ہو گا کہ اسے محسوس ہوا کہ خیندا اس پر غلبہ پا رہی ہے۔ پھر اچانک اتنے واضح اعداد سے کہ اس پر حقیقت کا گمان ہوتا تھا، اسے توپوں کی تھن گرج اور گرتے گولوں کی تراتراتی پڑاقت سنائی دینے اور بارود اور خون کی بو اس کے تھنوں میں گھسنے لگی۔ اس پر ہیبت طاری ہو گئی اور موت کے خوف نے اسے اپنی گرفت میں لے لیا۔ دہشت نے اس پر ہی طرح اسے جکڑ لیا کہ اس کی آنکھ کھل گئی اور اس نے اپنا سر چنے سے باہر نکال لیا۔ محن پر

گنیمت سکوت کا رنج تھا۔ صرف کوئی اردلی کیچڑ میں چھپ چھپ کر رہا اور صدر دروازے پر دریاں کے ساتھ ہاتس کر رہا تھا۔ میٹر کے سر کے اوپر ہوٹل کی بالائی منزل کے کمروں کے چیمبوں میں چند کبوتر، جنہیں میٹر نے اپنی حرکات و سکنات سے گزربڑا دیا تھا، اپنے پر پھڑپھڑانے لگے۔ سارے صحن میں خشک گھاس، گوبر اور تارکول کی تیز اور پرسکون بوسبجی بسی تھی۔ دو چیمبوں کے مابین اسے تاروں بھر اصف شفاف آسمان نظر آ رہا تھا۔

”خدا کا شکر ہے کہ یہ مصیبت تو ختم ہوئی!“ میٹر نے دوبارہ اپنا سر ڈھانپتے ہوئے سوچا۔ ”اف، یہ خوف بھی کتنی بھیاںک چیز ہے اور میں نے کتنی ڈھٹائی سے اس کے سامنے سرنگوں کر دیا! اور وہ... وہ آخر دم تک مستقل مزاجی اور سکون سے اپنا کام کرتے رہے...“ اس نے سوچا۔

میٹر کے ذہن میں وہ سے مراد وہ فوجی تھے جنہوں نے میٹری پر خدات سرانجام دی تھیں، وہ جنہوں نے اسے کھانا کھلایا تھا، اور وہ جنہوں نے یقونے کے سامنے دعائیں مانگی تھیں۔ وہ، وہ عجیب اور انوکھے لوگ تھے جن کے متعلق اسے اب تک کچھ معلوم نہیں تھا۔ اب وہ اس کے ذہن میں باقی تمام مخلوقات سے واضح اور غیر ہم انداز سے الگ تھلگ تھے، نمایاں تھے۔

”فوجی سپاہی بننا!“ میٹر نے نیند کی آغوش میں جاتے ہوئے سوچا۔ ”اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ اپنے پورے وجود کے ساتھ اجتماعی زندگی میں شامل ہو گئے ہیں اور اس میں ٹھہل مل گئے ہیں، جس چیز نے آپ کو وہ کچھ بنایا ہے، جو کہ آپ ہیں، اس کو آپ نے کاملاً اپنے رگ و پے میں سمو لیا ہے۔ لیکن اس باہر کے انسان پر جنہوں نے بے ضرورت، مسفاک بوجھ لدا ہوتا ہے، اسے کیسے اتار کر پھینکا جائے؟ کوئی رقت تھا جب میں یہ کام کر سکتا تھا۔ جب کہ میری خواہش تھی میں اپنے باپ سے قطع تعلق کر سکتا تھا۔ دلوفوف سے جب میں نے ڈوئل لڑی، تب بھی مجھے سپاہی کی حیثیت سے فوج میں خدمات سرانجام دینے کے لیے بھیجا جاسکتا تھا۔“

اور ان سوتے جاگتے کے خوابوں کے دوران میں، یکا ایک انگش کلب کی ضیافت، جس میں اس نے دلوفوف کو لاکارا تھا، کوندے کی طرح اس کے ذہن میں لپکی۔ پھر اسے ترڑھوک میں اپنے محسن کے ساتھ اچانک مدھ بھڑ یاد آئی۔ یہاں تک پہنچنے کے بعد اس کے دماغ میں لاج کے باضابطہ در بنجیدہ اجلاس کی، جو انگش کلب میں منعقد ہوا تھا، تصویر ابھری۔ کوئی ہستی، جو اس کے دل و دماغ میں بسی ہوئی تھی، میز کے آخری سرے پر بیٹھی تھی۔ ”ہاں، یہ وہی ہیں‘ وہ میرے محسن ہیں! لیکن ان کا تو یقیناً انتقال ہو گیا تھا!“ میٹر نے سوچا۔ ”ہاں ان کا انتقال ہو گیا تھا اور مجھے معلوم نہیں تھا کہ وہ زندہ ہیں۔ مجھے کتنا افسوس ہے کہ ان کا انتقال ہو گیا اور مجھے کتنی خوشی ہے کہ وہ دوبارہ زندہ ہو گئے ہیں!“ میز کی ایک جانب انا طول، دلوفوف، نیس و تسکی، دینی سوف اور ان جیسے دوسرے لوگ بیٹھے تھے۔ (جس طبقے سے ان لوگوں کا تعلق تھا، خواب کی حالت میں اس کے ذہن میں اس کے خدو خال اتنے ہی واضح تھے جتنے کہ اس طبقے کے، جن میں وہ لوگ شامل تھے جنہیں وہ اپنے ذہن میں وہ کہتا تھا۔) اور اس نے ان لوگوں، انا طول، دلوفوف، وغیرہم، کو با آواز بلند بلاتا تھا چاتے اور گانا گاتے سنا۔ تاہم اس غل غپارے میں بھی اسے اپنے

محسن کے مسلسل ہاتھ کرنے کی آواز سنائی دیتی رہی اور اس کے الفاظ کی گونج بھی اتنی ہی موثر رہی اور غیر منقطع تھی جتنا کہ میدان جنگ کا شور شرابا۔ مگر یہ کانوں کو بھلی لگتی اور دل کو تسکین دیتی معلوم ہوتی تھی۔ اس کا محسن کیا کہہ سکتا تھا۔ پیر کو اس کی سمجھ نہیں آ رہی تھی لیکن وہ خوب جانتا تھا (اس کے خوب میں خیالات کی انواع بھی بالکل واضح تھیں) کہ وہ نیکی اور آن (وہی فوجی) جیسا ہونے کے امکان کے بارے میں گفتگو کر رہا ہے اور وہ آپے بھرے بھالے، بے ریا، شفیق، پر عزم چہروں کے ساتھ، اس کے محسن کے چاروں اطراف حلقہ بنائے کھڑے ہیں۔ اگرچہ وہ شفیق تھے، مگر انہوں نے پیر کی جانب آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا، اسے پہچانا تک نہیں۔ پیر ان کی توجہ اپنی طرف مبذول کرانا اور ان کے ساتھ باتیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا لیکن اسی لمحے اسے محسوس ہوا کہ اس کی ٹانگیں ٹکی ہیں اور انھیں سرری لگ رہی ہے۔

پیر شرمندہ ہو گیا اور وہ ایک ہاتھ سے ٹانگیں، جن سے دراصل چعا کھسک گیا تھا، ڈھانچنے کی کوشش کرنے لگا۔ چنے کو دوبارہ ٹھیک ٹھاک کرنے کے دوران میں اس نے اپنی آنکھیں ایک لچلے کے لیے کھولیں۔ اسے وہی ہول کی بالائی منزل کے کمرے، وہی کھجے وروہی محسن دکھائی دیا لیکن اب ہر شے نیلگوں روشنی میں لپٹی ہوئی تھی اور اس یا پالے میں جنگ گارہی تھی۔

”پو پھٹ گئی ہے۔“ پیر نے سوچا۔ ”لیکن جو کچھ میں چاہتا ہوں، وہ یہ تو نہیں۔۔۔ میں اپنے محسن کی باتیں سننا اور سمجھنا چاہتا ہوں۔“ اس نے ایک بار پھر اپنے جسم کے گرد چغا پیٹ لیا لیکن اب اسے نہ اپنے محسن اور نہ لاج کا کوئی نام و نشان نظر آیا۔ جو کچھ باقی رہ گیا تھا، وہ خیالات تھے جنہیں کسی ابراہام کے بغیر واضح انداز سے الفاظ کا چولا پہنا دیا گیا تھا، وہ خیالات، جنہیں کوئی شخص بیان کر رہا تھا یا جنہیں وہ خود ہی متشکل کر رہا تھا۔

پیر نے جب بعد زماں ان خیالات کو یاد کیا، اس حقیقت کے باوجود کہ یہ خیالات ان تاثرات کے، جو اس روز اس کے ذہن پر مرتسم ہوئے تھے پیدا کردہ تھے، اسے یقین کامل تھا کہ ان کا اظہار کسی ایسی ہستی کے ذریعے ہوا ہے جو اس کی اپنی ذات سے، دورا تھی۔ اسے کچھ یوں محسوس ہوا کہ حالت بیداری میں وہ اس نوع کے خیالات کو سچے اور ان کا اظہار کرنے کی صلاحیت سے کبھی بہرہ ور نہیں رہا تھا۔

”انسانی آزادی تو ایشین خداوندی کے تابع ہوتی ہے لیکن اس متابعت کا مشکل ترین مرحلہ وہ ہوتا ہے جب انسان کو جنگ کی بھٹی میں سے گزرنا پڑتا ہے۔“ آواز نے کہا تھا۔ ”انسان سچا اور کھرا بھی بن سکتا ہے جب وہ مشیت ایزدی کے سامنے سر تسلیم خم کر دے۔ اس (ذات قدی) سے فرار ناممکن ہے۔ اور وہ سچے اور کھرے ہیں۔ وہ باتیں نہیں بناتے بلکہ عمل کرتے ہیں۔ وہ لفظ، جو زبان سے ادا ہو گیا، روپا ہے، لیکن جو عطا ادا نہیں کیا گیا، ہوتا ہے۔ انسان جب تک موت سے خائف رہتا ہے، کسی چیز پر تعجب حاصل نہیں کر سکتا، لیکن جو اس سے خوف نہیں کھاتا، وہ سب پر غالب آ جاتا ہے۔ اگر دکھ نہ ہوں، انسان کو کبھی معلوم نہ ہو سکے کہ اس کی صلاحیتوں کی انتہا کیا ہے، وہ اپنے آپ کو شناخت نہ کر سکے۔“ (پیر خواب میں سوچتا یا سنتا رہا۔) ”دشوار ترین کام اپنی روح میں کل کی معنویت

کو سبک کرنے کے قابل ہوتا ہے۔ نکل کو سبک کرنا؟“ اس نے اپنے آپ سے پوچھا۔ ”نہیں، سبک کرنا نہیں۔ خیالات میں سبکداری پیدا نہیں کی جاسکتی۔ تاہم انھیں اس طرح اکٹھا کیا جاسکتا اور قابلِ مصرف بنایا جاسکتا ہے۔ جس طرح گھوڑے کو گاڑی میں جوت کر دو نوں کو اکٹھا کر دیا جاتا اور قابلِ استعمال بنا دیا جاتا ہے۔ ضرورت بس اسی بات کی ہے! ہاں، گھوڑا گاڑی کی طرح آپس میں جوت دیا جائے، جوت دیا جائے۔“ میٹر نے دوبارہ اپنے آپ سے کہا۔ وہ دُوبد سے سرشار ہو رہا تھا۔ وہ محسوس کر رہا تھا کہ جو کچھ وہ کہنا چاہتا تھا، یہی الفاظ، صرف یہی الفاظ اس کو صحیح انداز سے بیان کر رہے ہیں اور انھوں نے اس سارے مسئلے کو جس نے اسے اذیت میں مبتلا کر رکھا تھا، حل کر دیا ہے۔

”ہاں، ہمیں چاہیے کہ ہم انھیں گھوڑا گاڑی کی طرح آپس میں جوت دیں، جوتنے کا وقت آگیا ہے۔“
 ”یوڑا یکسی لینسی، گھوڑے جوتنے کا وقت ہو گیا ہے، یوڑا یکسی لینسی، گھوڑے جوتنے کا وقت ہو گیا ہے!“
 کوئی آواز اس کے الفاظ دہرا رہی تھی۔ ”گھوڑے جوتنے کا وقت ہو گیا ہے، جوتنے کا وقت ہو گیا ہے۔“

یہ اس کے سانس کی آواز تھی۔ وہ اسے جگانے کی کوشش کر رہا تھا۔ سورج پوری آب و تاب سے میٹر کے چہرے پر چمک رہا تھا۔ اس کی نظریں غلیظ محسوس پر پڑیں۔ محسن کے عین درمیان میں سپاہی اپنے سریل گھوڑوں کو ہانی پلا رہے، در صدر دروازے میں سے چھکڑے باہر نکال رہے تھے۔ میٹر کو گھن آگئی۔ اس نے اپنی آنکھیں بند کیں اور بجست دوبارہ گاڑی کی نشست پر لیٹ گیا۔

”نہیں، یہ نہیں۔۔۔ یہ وہ نہیں جو میں دیکھنا اور سمجھنا چاہتا ہوں۔ میں وہ سمجھنا چاہتا ہوں جو مجھ پر خواب میں منکشف ہوا تھا۔ صرف ایک اور سیکنڈ کی دیر تھی اور میں سب کچھ سمجھ جاتا۔ مگر میں کیا کروں؟ سب کچھ ایک دوسرے کے ساتھ جوت دوں؟ لیکن میں سب کچھ کیسے جوت سکتا ہوں؟“ اور میٹر کو یہ جان کر بہت دکھ ہوا کہ اس نے خواب میں جو کچھ دیکھا اور سنا تھا، اس کی معنویت معدوم ہو چکی ہے۔

اس کے سانس، کوچوان اور ہوٹل کے مالک نے اسے بتایا کہ ایک فسر خبر لایا ہے کہ فرانسیسی موٹر ایک کی طرف پیش قدمی کر رہے ہیں اور ہاری افواج پیچھے ہٹ رہی ہیں۔

میٹر اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے گھوڑے جوتنے اور گاڑی اپنے پیچھے مانے کا حکم دیا۔ وہ خود پیدل ہی شہر میں سے گزرنے لگا۔

سپاہ شہر سے رخصت ہو رہی تھی اور تقریباً دس ہزار زخمیوں کو وہیں چھوڑے جا رہی تھی۔ یہ زخمی معنوں میں، مکانوں کے درپوں کے سامنے اور گلیوں میں، جہاں انھوں نے اپنے چھکڑوں کے ارد گرد جھکھٹا کر رکھا تھا، دکھائی دے رہے تھے۔ وہ چار رہے تھے، گالیاں بک رہے تھے اور ایک دوسرے سے ہاتھ پائی کر رہے تھے۔ میٹر نے ایک زخمی جرنیل کو، جسے وہ جانتا تھا، اپنی گاڑی میں، جو اس سے آگلی تھی، نشست پیش کی۔ سفر کے دوران میں اسے اپنے براؤں بہتی انا طول اور آندرے کے انتقال کی خبریں ملیں۔

پیر میں آگت کو ماسکو پہنچا۔ وہ ابھی بمشکل شہر کے دروازوں کے قریب پہنچا تھا کہ رستوپ جن کا ایجوٹ اسے ملے آگیا۔

”ہم ہر جگہ آپ کی تلاش میں مارے مارے پھر رہے ہیں۔“ ایجوٹ نے کہا۔ ”کاؤنٹ نوری آپ سے ملنے کے خواہش مند ہیں۔ ان کی درخواست ہے کہ ایک انتہائی اہم معاملے کے سلسلے میں آپ ان سے بلا تاخیر ملاقات فرمائیں۔“

پیر نے کمر گئے بغیر کرائے کی گاڑی پکڑی اور گورنر جنرل کے مسکن کی طرف چل پڑا۔ کاؤنٹ رستوپ جن اسی صبح ساکولنگی میں اپنے گرمائی بنگلے سے واپس آیا تھا۔ اس کا پیش والاں اور استقبالیہ کمرہ افسروں سے پناہ پڑا تھا، جنہیں یا تو بلا یا گیا تھا یا پھر وہ خود ہی ہدایات لینے چلے آئے تھے۔ واسلی کوف⁵ اور پلاٹوف پہلے ہی کاؤنٹ سے مل چکے تھے اور اسے تفصیل سے بتا چکے تھے کہ ماسکو کا دفاع ناممکن ہے اور شہر کورشن کے حوالے کرنا ہی ہوگا۔ اگرچہ شہر کے باشندوں سے یہ خبر چھپ کی گئی تھی، لیکن رستوپ جن کی طرح افسران۔ مختلف ٹکسوں کے سربراہان۔ کو خوب علم تھا کہ ماسکو غریب دشمن کی تحویل میں چلا جائے گا اور ذاتی ذمے داری سے بچنے کے لیے وہ رستوپ جن سے یہ دریافت کرنے چلے آئے تھے کہ انہیں اپنے اپنے ٹکسوں سے کیسے بچنا ہے۔ جب پیر استقبالیہ کمرے میں داخل ہوا تھا، فوج کا ایچی کاؤنٹ کے پرائیویٹ کمرے سے باہر نکل رہا تھا۔ اس پر سوالات کی حویلی بچھڑ ہوئی، ان کے جواب میں اس نے بے بسی سے ٹھنڈا بازو دھریا اور کمرے میں سے گزرتا ہوا ہر چلا گیا۔

استقبالیہ کمرے میں انتظار کے دوران میں پیر نے تنگی ہار کی نگاہوں سے مختلف حکام۔ بوڑھے اور نوجوان، فوجی اور غیر فوجی، ہم اور غیر ہم۔ پر، جو وہاں جمع تھے، نظر ڈالی۔ وہ سبھی پریشان اور آکر رہے خاطر دکھائی دے رہے تھے۔ وہ اپنی نشست سے اٹھا اور عہدے داروں کے ایک گروہ میں، جس میں اس نے اپنے ایک وقف کار کو پہچان لیا تھا، جا شامل ہوا۔ پیر نے علیک سلیک کرنے کے بعد دوبارہ اپنی باتوں میں مشغول ہو گئے۔

”اگر انہیں شہر سے باہر بھیج دیا جائے اور بعد میں دوبارہ واپس لے آیا جائے، تو اس سے کوئی فرق واقع نہیں ہوگا لیکن حالت کچھ اس قسم کے ہیں کہ یقین سے کچھ نہیں کہا جاسکتا۔“

”لیکن ادھر دیکھو، انہوں نے کیا لکھا ہے۔“ دوسرے نے مطبوعہ پرچے کی طرف جو اس کے ہاتھ میں تھا، اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”یہ اور بات ہے۔ یہ عوام کے لیے ہے۔“ پہلے نے جواب دیا۔

”یہ کیا ہے؟“ پیر نے پوچھا۔

”اودہ، ایک اور خیر نامہ۔“

ہیئر اسے لے کر پڑھنے لگا۔

”ان افوج سے، جو ان کی جانب بڑھ رہی ہیں، جلد از جلد ملنے کی خاطر، ہزیرین ہائی ٹس موڈیک میں سے گزر رہے ہیں اور انھوں نے اتنی مضبوط مورچہ بندیاں قائم کر لی ہیں کہ دشمن کے لیے انھیں روکنا آسان نہیں ہو گا۔ انھیں یہاں سے گولہ بارود سمیت اڑتا لیس تو نہیں بھیجی جا چکی ہیں اور ہزیرین ہائی ٹس نے اعلان فرمایا ہے کہ جب تک ان کے جسم میں خون کا آخری قطرہ موجود ہے، وہ ماسکو کا دفاع کرتے رہیں گے، بلکہ وہ شہر کے گلی کوچوں میں بھی لڑائی لڑنے کے لیے تیار ہیں۔ برادران من، اس بات سے قطعاً نہ گھبرائیں کہ عدالت ہائے انصاف بند کر دی گئی ہیں، ان کا یہاں سے منتقل کیا جانا ضروری تھا لیکن خاطر جمع رکھیں، ہم مفسدوں اور فتنہ پردازوں سے ہٹا اور انھیں سبق سکھانا جانتے ہیں۔ جب وقت آئے گا، مجھے شہر اور دیہات کے جبری اور دیر جو انوں کی ضرورت پیش آئے گی۔ میں ایک دو دن پیشتر طلبی نامے بھیج دوں گا لیکن فی الحال ایسی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ چنانچہ میں چپ ہوں۔ کلہاڑی بہت مفید ہتھیار ہے۔ شکاری برتھی بھی بری نہیں مگر سہ شامہ سب سے زیادہ موزوں رہے گا۔ فراموشی رائی کے گٹھے سے زیادہ وزنی نہیں ہوتا۔ کل میں ڈز کے بعد مادر خد و خد کا آئینہ رانی ایقویہ سینٹ کیئرین ہسپتال میں زخموں کے پاس لے جاؤں گا۔ وہاں ہم کچھ پانی کو تبرک بنائیں گے، اس سے وہ بھی چند دنوں کے اندر اندر شفایاب ہو جائیں گے۔ اب میری طبیعت بھی ٹھیک ٹھاک ہے۔ میری ایک آنکھ میں تکلیف ہو گئی تھی لیکن اب میں دونوں آنکھوں سے دیکھ سکتا ہوں۔“

”لیکن مجھے تو نوچیوں نے یہی بتایا تھا کہ شہر میں جنگ کرنا ناممکن ہے۔“ ہیئر نے کہا، ”اور یہ کہ ہماری پوزیشن۔“

”ہائل، اور ہم بھی تو یہی کہہ رہے ہیں۔“ پہلے شخص نے کہا۔

”اور اس کا کیا مطلب ہے؟“ میری ایک آنکھ میں تکلیف ہو گئی تھی لیکن اب میں دونوں آنکھوں سے دیکھ سکتا ہوں۔“ ہیئر نے پوچھا۔

”پرنس کی آنکھ میں گولہ بھنی نکل آئی تھی۔“ ایجوٹ نے مسکرا کر جواب دیا۔ ”اور جب میں نے انھیں بتایا کہ لوگ دریافت کرنے آرہے ہیں کہ انھیں کیا آزار ہے، تو وہ بہت پریشان ہوئے۔ کاؤنٹ، ہاں، خوب یاد آ رہا۔“ اس نے اچانک مسکراتے ہوئے ہیئر سے مخاطب ہو کر کہا: ”سنا ہے کہ آپ کو کچھ گھریلو پریشانیاں لاحق ہیں؟ معلوم ہوتا ہے کہ کاؤنٹس، آپ کی زوجہ محترمہ۔“

”مجھے اس بارے میں کچھ علم نہیں۔“ ہیئر نے بے نیازی سے کہا۔ ”لیکن آپ نے کیا سنا ہے؟“

”خیر، آپ کو معلوم ہی ہے کہ لوگ کیسی کیسی باتیں گھڑ لیتے ہیں۔ میں صرف وہی کچھ دہرا سکتا ہوں جو میں نے سنا ہے۔“

”اور آپ نے کیا سنا ہے؟“

”لوگ کہتے ہیں“ ایجوٹ نے اسی طرح مسکراتے ہوئے کہا، ”کہ کاؤنٹس، آپ کی زوجہ محترمہ، میرا ملک جانے کی تیاریاں کر رہی ہیں۔ میرا خیال ہے کہ یہ بڑی بکواس ہے۔“

”ممکن ہے۔“ میئر نے بے دھیانی سے اپنے گرد و پیش دیکھتے ہوئے کہا۔ ”اور وہ صاحب کون ہیں؟“ اس نے کوہاہ قامت، بزرگ سال شخص کی طرف، جس کی گھنی داڑھی اور بھوئی برف کی طرح صاف شفاف تھیں، اور جو صاف ستھرے نیلے کوٹ میں بلبوس تھا، اشارہ کر کے پوچھا۔

”وو؟ وو؟“ وہ کاروباری ہے۔ میرا مطلب ہے کہ وہ ہوٹل کا مالک ویریش چاگن ہے۔ میرا خیال ہے کہ آپ نے اعلان نامے کی کہانی سن لی ہوگی۔“

”اچھا، تو یہ ہے وہ ویریش چاگن؟“ میئر نے بوڑھے آدمی کے چہرے کو یوں بنور جانچتے ہوئے کہا جیسے وہ وہاں خداری کی علامت تلاش کر رہا ہو۔

”یہ وہ شخص خود نہیں ہے۔ یہ اس شخص کا، جس نے وہ اعلان نامہ تحریر کیا تھا، باپ ہے۔“ ایجوٹ نے کہا۔ ”وہ نوجوان زیر حراست ہے اور میرا خیال ہے کہ اسے اچھی خاصی مصیبت بھگتنا پڑے گی۔“

ایک پست قامت، سن رسیدہ شخص، جس نے سینے پر تمغہ سجا رکھا تھا اور ایک دوسرا سرکاری منصب دار، جو اصلاً جرمن تھا اور جس نے گلے میں صلیب لٹکائی ہوئی تھی، گروپ میں شامل ہوئے۔

”آپ کو معلوم ہے“ ایجوٹ نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا، ”یہ بڑی پیچیدہ کہانی ہے۔ اعلان نامہ کوئی دو ماہ قبل منظر عام پر آیا تھا۔ کاؤنٹ کو اس کے متعلق مطلع کیا گیا تھا۔ انھوں نے تفتیش کا حکم دے دیا۔ گادرلو ایوانج نے تحقیقات کا کام سنبھالا۔ اعلان نامہ پورے تریسٹھ ہاتھوں میں گزرا تھا۔ وہ ایک شخص کے پاس جاتا اور اس سے پوچھتا: ”تمہیں یہ کس نے دیا تھا؟“ ”خداں نے،“ وہ دوسرے کے پاس جاتا اور اس سے پوچھتا: ”تمہیں یہ کس نے دیا تھا؟“ خداں نے۔ اور یوں کرتے کرتے وہ اس نیم تعلیم یافتہ تجارت پیشہ شخص تک۔ جو آپ کو معلوم ہے کہ بالکل کما آدمی ہے۔ پہنچ گیا۔“ ایجوٹ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”اس سے سوال کیا گیا، تمہیں یہ کس نے دیا تھا؟ اور اصل بات یہ ہے کہ ہمیں خوب معلوم تھا کہ اسے یہ کس سے ملا تھا۔ اسے یہ صرف پست ہاٹر سے ملتا تھا۔ تاہم یہ بات بالکل عیاں تھی کہ ان دونوں نے آپس میں کوئی ساٹھ گانٹھ کر لی تھی۔ کسی نے بھی نہیں۔“ وہ کہتا ہے۔ ”یہ میں نے خود لکھا تھا۔“ اسے دھمکیاں دی گئیں، پیار دلا سے سمجھایا گیا لیکن وہ کل بھلا اپنی بات پر اڑا رہا اور یہی کہتا رہا: ”یہ میں نے خود لکھا تھا۔“ چنانچہ یہ معاملہ اسی صورت میں کاؤنٹ کے گوش گزار کر دیا گیا۔ کاؤنٹ نے اسے دہرایا۔ ”تمہیں یہ اعلان نامہ کس نے دیا تھا؟“ میں نے خود لکھا تھا۔ خیر، آپ کاؤنٹ کو تو جانتے ہی ہیں۔“ ایجوٹ نے غرور و سرکھ سے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”ان کا پارہ آسمان پر چڑھ گیا۔ اس شخص کی جسارت ملاحظہ فرمائیں۔ کس ڈھٹائی سے جھوٹ بول رہا ہے اور ٹس سے مس نہیں ہوتا!“

”ارے امیرا خیال ہے کہ کاؤنٹ اس معاملے میں کلیو چارلیف کو پھنسا چاہتے ہوں گے۔“ میئر نے کہا۔
 ”بالکل نہیں!“ ایجوٹنٹ نے گھبرا کر جواب دیا۔ ”اس معاملے سے قطع نظر کلیو چارلیف پہلے ہی اسے گناہوں
 کا رتکاب کر چکا تھا کہ اس کے لیے ان کا بار اثنا مشکل ہو گیا۔ یہی وجہ ہے کہ اسے شہر سے نکال دیا گیا۔ مگر اصل
 بات یہ ہے کہ کاؤنٹ آپ سے باہر ہو رہے تھے۔“ تم میں اتنی عقل کہاں کہ یہ خود لکھ سکو۔ وہ کہتے ہیں۔ وہ ہمبرگ
 گزٹ کا پرچہ جو میز پر پڑا تھا، اٹھاتے ہیں۔ اور کہتے ہیں، ”اصل حبارت یہ ہے کہ یہ تم نے خود نہیں لکھی تھی بلکہ
 ترجمہ کی تھی۔ اور ترجمہ بھی بہت بھدا ہے کیونکہ حق کے بچے، تمہیں فراموشی بھی نہیں آتی“ اور آپ کے خیال
 میں وہ کیا جواب دیتا ہے۔ نہیں۔ میں کوئی اخبار و اخبار نہیں پڑھتا۔ یہ میں نے خود ہی لکھا تھا۔“ اگر یہ بات ہے پھر
 تم غدار ہو۔ میں تم پر مقدمہ چلواؤں گا اور تمہیں پھانسی پر لٹکواؤں گا۔ اب بتاؤ، یہ تمہیں کس نے دیا تھا؟“ میں کوئی
 اخبار و خبر نہیں پڑھتا۔ یہ میں نے خود ہی لکھا تھا۔“ اور معاملہ یہیں اٹک گیا۔ کاؤنٹ نے اس کے باپ کو بھی برا
 بھیجا لیکن ڈھیت آدمی پھر بھی اپنی بات پراڑا رہا۔ اس پر مقدمہ چلا اور اسے قید با مشقت کی سزا سنائی گئی۔ اب اس کا
 باپ اس کی سفارش کرنے آیا ہے لیکن اس کا صاحبزادہ بڑا بد ذات شخص ہے۔ اس قسم کے لوگوں سے آپ بخوبی آگاہ
 ہیں۔ ادنیٰ دکاندار کی ہجڑی اولاد، پھنے خاں، نت نئی لڑکیاں پھنسنے کا شوقین، یہاں وہاں سے دو چار الفاظ سیکھ
 لیے اور اپنے تئیں سمجھ لیا کہ ہم افلاطون ہو گئے ہیں۔ آپ کو معلوم ہی ہے کہ باپ کا یہاں کا مینی مل پر معمولی سا
 ریستوران ہے۔ وہاں خداوند کا خاصا بڑا بقونہ ہے۔ ابقونہ میں خداوند کے ایک ہاتھ میں عصا اور دوسرے میں
 جواہرات سے مزین صلیبی گلوب ہے۔ اس کا صاحبزادہ یہ ابقونہ چند دنوں کے لیے اٹھا کر گھر لے گیا۔ معلوم ہے
 وہاں اس نے کیا کیا؟ اس نے کسی لٹنگے مصور کو بلایا۔“

11

بینی حکایت، بھی شر دعی ہوئی تھی کہ میئر کو گورنر جنرل نے طلب کر لیا۔

وہ کاؤنٹ رستوب چن کے سٹڈی روم میں چلا گیا۔ جب وہ کمرے میں داخل ہوا، گورنر جنرل ناک بھوں
 چڑھا رہا اور اپنے ہاتھ سے ہتی پیشانی اور آنکھیں مل رہا تھا۔ ایک پست قامت شخص اس سے کچھ کہہ رہا تھا لیکن
 جو مکالمہ میئر اندر آیا، وہ چپ ہو گیا اور باہر نکل گیا۔

”اخوا، تم تو چھپے رستم نکلتے! کیا حال ہیں تمہارے؟“ رستوب چن نے کوتاہ قامت شخص کے باہر چھ جانے
 کے بعد میئر سے علیک ملیک کرتے ہوئے کہا۔ ”ہم نے تمہاری شجاعت کی داستانیں سنی ہیں، لیکن میں نے تمہیں
 یہاں آئے کی جرمیت دی ہے، وہ اس لیے نہیں کہ میں ان کے بارے میں تم سے کچھ کہنا چاہتا تھا۔ آپس کی بات
 ہے، ”mon cher“ میں تم سے صرف یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ تم فری مین ہو؟“ اس نے ذرا ترش روئی سے کہا گویا یہ

کوئی ملامت انگیز بات تھی لیکن اس کے باوجود وہ اس کی خطا معاف کرنے پر تیار ہوا تھا۔

ہنٹر چپ رہا۔

"mon cher" میں بہت باخبر شخص ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ کہیں سے بھی اینٹ اکھڑو، اس کے نیچے سے ایک حد میں نکل آئے گا لیکن مجھے امید ہے کہ تمہارا شمار ان لوگوں میں نہیں ہوتا جو نئی نوع انسان کے تحفظ کے بہانے روں کی جڑیں کاٹنے کی پوری سعی کر رہے ہیں۔"

"ہاں، میں یقین ہوں۔" ہنٹر نے جواب دیا۔

"mon cher" دیکھا، میں نے کیا کہا تھا! تمہیں یقیناً معلوم ہوگا کہ سپر انسکی اور ماگ شکی جہاں سے گئے تھے انہیں وہیں واپس بھیج دیا گیا ہے۔ یہی سلوک کلیو چارلیف اور ان لوگوں کے ساتھ، جو مکمل سلیمانی کی قبر کی آڑ میں اپنے مادر وطن کے پیکل کو مسافر کرنے کی سعی کر رہے تھے، کیا جا چکا ہے۔ تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ اس کی کچھ وجوہ تھیں اور اگر ہمارے پوسٹ آفس کا ڈائریکٹر خطرناک آدمی نہ ہوتا، میں اسے یونہی شہر سے نہ نکال دیتا۔ میرے علم میں آیا ہے کہ شہر سے باہر نکلنے کے لیے تم نے اسے گاڑی مہیا کی تھی اور چند کاغذات، جو اس نے تمہیں بحفاظت اپنے پاس رکھنے کے لیے دیے تھے، تم نے انہیں بطور امانت اپنے پاس رکھا ہوا ہے۔ میں تمہیں پسند کرتا ہوں اور تمہیں کسی قسم کا گزند نہیں پہنچانا چاہتا۔ چونکہ تمہاری عمر مجھ سے نصف ہے، میں باپ کی طرح تمہیں مشورہ دوں گا کہ تم اس نورا کے آدمیوں سے قطع تعلق کرو اور خود بھی حتی الامکان جلد از جلد یہاں سے کہیں باہر چلے جاؤ۔"

"لیکن کاؤنٹ، کلیو چارلیف کا جرم کیا تھا؟" ہنٹر نے پوچھا۔

"یہ میرا معاملہ ہے اور تمہیں اس بارے میں اعتراض کرنے کا کوئی حق حاصل نہیں۔" رستوپ چین نے گد پھاڑ کر کہا۔

"اگر اس پر پولیس کے اعلانات نامے کی تشہیر کرنے کا الزام ہے، تو اسے ثابت نہیں کیا جاسکا۔" ہنٹر نے (رستوپ چین کی جانب دیکھے بغیر) کہا۔ "اور دیریش چاگن۔"

"اچھا، اگر ذکر چل ہی نکلا ہے، پھر سنو!" رستوپ چین نے ناک بھونچتے اور پہلے کی نسبت کہیں زیادہ لڑائی آوار میں چلاتے ہوئے اسے ٹوک دیا۔ "دیریش چاگن ملک حرام اور خدا ہے وہاں سے وہی سزا ملے گی جس کا وہ مستحق ہے۔" اس نے ایک ایسے شخص کی، جسے کوئی بھولی بھری تذلیل یاد آگئی ہو، خصوصیت اور کہنے سے کہا۔ "مگر میں نے تمہیں یہاں دوسروں کے معاملات کے بارے میں گفتگو کرنے کے لیے نہیں بلایا۔ تمہیں میں مشورہ دیا۔ یا حکم، اگر تمہاری ترجیح یہی ہے۔ دینا چاہتا ہوں۔ تم سے میں یہی کہوں گا کہ کلیو چارلیف جیسے اشخاص سے اپنے تمام تعلقات ختم کر دو اور شہر سے نکل جاؤ۔ میں ہر اس شخص کا دماغ درست کر دوں گا جس نے۔" پھر غائب ہوا۔

احساس ہوا کہ وہ بزدل و خوف پر، جس نے کسی جرم کا ارتکاب نہیں کیا تھا، برس رہا ہے۔ اس نے دوستانہ انداز سے ہنٹر کا ہاتھ پکڑا اور فراموشی میں بولا: "ہم پر مصیبت عظمیٰ نازل ہوا چاہتی ہے۔ ان حالات میں ہر کدو سے، جو موسم

اٹھائے مجھ سے ملنے چلا آتا ہے، جی حضوری گفتگو نہیں کر سکتا۔ بعض اوقات میرا سر لٹو کی طرح گھومنے لگتا ہے۔ خیر، mon cher، اب تمہارا ذاتی طور پر کیا کرنے کا ارادہ ہے؟“

”جی کچھ بھی نہیں۔“ میٹر نے نہ نظریں اوپر اٹھائیں اور اس کے چہرے پر جو سوچ بچار جھلک رہا تھا نہ اس میں کوئی تبدیلی کی۔ بس ویسے ہی جواب دے دیا۔
کاؤنٹ کے ہاتھ پر شکنیں پڑ گئیں۔

”mon cher، میرا دوستانہ مشورہ ہے کہ حتی الامکان جلد ز جلد یہاں سے نکل جاؤ۔ بس مجھے تم سے ہی کہنا تھا۔ وہ شخص، جو کانوں سے سن لیتا ہے، کتنا خوش نصیب ہوتا ہے۔ مائی ڈیئر فیلو، خدا حافظ۔ ارے ہاں“ اس نے میٹر کو پیچھے سے آواز دی۔ ”یاد آیا۔ کیا یہ درست ہے کہ کاؤنٹس سوسائٹی آف جیزس کے پادریوں کے پھندے میں پھنس گئی ہے؟“

میٹر نے کوئی جواب نہ دیا بلکہ وہ غصے سے پھنکارنا رستوپ چن کے کمرے سے باہر نکل آیا۔ جتنا غصہ آج اسے آ رہا تھا، زندگی بھر کا ہے کو آیا ہوگا۔



میٹر کے کمرے پہنچنے سے پہلے ہی خاصا اندھیرا ہو چکا تھا۔ اس شام آٹھ مختلف اشخاص اسے ملنے آئے۔ ان میں کمیٹی کا سیکرٹری، اس کی میڈیا پرائیسن کا کرٹل، اس کا سٹیوارڈ، اس کا بٹلر اور چند سائل شامل تھے۔ ان سب کو اس سے کوئی نہ کوئی کام تھا جو اسے پٹانا تھا۔ ان کے مسائل نہ تو میٹر کی سمجھ میں آئے اور نہ اسے ان میں کوئی دلچسپی تھی۔ وہ محض اس لیے جوابات دیتا رہتا کہ وہ ان سے جان چھڑ سکے۔ جب آخر کار وہ کیل رہ گیا، اس نے اپنی بیوی کا خط کھولا اور پڑھنے لگا۔

”وہ۔۔۔ میٹری کے سپاہی... پرنس آندرے ہلاک ہو گیا... معمر آدمی... انسان سچا اور کمر جھکی بن سکتا ہے جب وہ مشیت ایزدی کے سامنے سر تسلیم خم کر دے... دکھ ناگزیر ہے... ہر چیز کا مفہوم... جوت دینا چاہیے... میری بیوی شادی کر رہی ہے... آدمی کو چاہیے کہ وہ بھول جائے اور سمجھنے کی کوشش کرے...“ اور وہ کپڑے تبدیل کے بغیر بستر پر جا کر اور پلک جھپکنے میں خواب خرگوش میں کھو گیا۔

جب وہ ٹھکی صبح بیدار ہوا، اس کا بٹلر اسے مطلع کرنے آیا: ”کاؤنٹ رستوپ چن نے یہ معلوم کرنے کے لیے کہ آپ شہر سے جا چکے ہیں یا جانے کی تیاریاں کر رہے ہیں، خاص پولیس افسر بھیجا تھا۔“

کوئی ایک درجن اشخاص، جنہیں میٹر سے کوئی نہ کوئی کام تھا، ڈرائنگ روم میں اس سے ملاقات کا انتظار کر رہے تھے۔ اس نے جھٹ پٹ ہاس تبدیل کیا لیکن ان سے ملاقات کے لیے ڈرائنگ روم میں جانے کے بجائے وہ عقیق پورچ میں سے گزرتا مین گیٹ سے باہر نکل گیا۔

وہ اب غائب ہوا کہ جب تک ماسکو تباہ و برباد نہ ہو گیا، وہ اپنے گھر کے کسی فرد کو نظر نہ آیا اور نہ کسی کو یہ معلوم ہو سکا کہ وہ کہاں ہے حالانکہ اسے تلاش کرنے کے لیے کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہیں کیا گیا تھا۔

12

رستوف یکم ستمبر، یعنی دشمن کے شہر میں داخل ہونے سے ایک روز پہلے تک، ماسکو میں مقیم رہے۔ چاہے قازقوں کی دہلیس کی رجسٹر میں شامل ہونے اور اس کے یلایا ترکوف، جہاں رجسٹر کی تربیت ہو رہی تھی، جانے کے بعد کاؤنٹس پر پریشانی کے دورے پڑنے لگے۔ یہ احساس کہ اس کے دونوں بیٹے فوج میں ہیں دونوں کے اس کے سہیہ عاطفت سے دور ہو چکے ہیں، آج یا کل دونوں میں سے کوئی بھی۔ بلکہ اس کی ایک سہیلی کی بیٹوں کی طرح دونوں ہی۔ ہلاک ہو سکتا ہے، ان گرمیوں کے دوران میں تکلیف دہ صراحت کے اس کے ذہن میں ابھر رہا تھا۔ اس نے نگران کو واپس لانے کے لیے تنگ و دو کی، خود پیتا کے پیچھے جانا یا اسے پیٹرز برگ میں کہیں تعینات کرانا چاہا، لیکن یہ تمام صورتیں ناممکن تھیں۔ پیتا صرف اسی صورت میں واپس آ سکتا تھا کہ اس کی رجسٹر بھی ادھر آتی۔ دوسری صورت یہ تھی کہ اسے کسی دوسری رجسٹر میں، جو باقاعدہ جنگ میں شریک تھی، تبدیل کر دیا جاتا اور یوں اس کی دایس کی راہ ہموار ہو جاتی۔ نکولائی فوج میں کہیں خدمات سرانجام دے رہا تھا اور اس خط کے بعد، جس میں اس نے پریس، ریاستہائے اپنی ملاقات کا تفصیل سے حال بیان کیا تھا، اس کے بارے میں کوئی خبر نہیں آئی تھی۔ کاؤنٹس کو بے خوابی کی شکایت لاحق ہو گئی تھی اور اگر اسے نیند آتی بھی تو وہ بس یہی خواب دیکھتی رہتی کہ اس کے دونوں بیٹے ہلاک ہو گئے ہیں۔

متحدہ صلاح مشوروں اور گفتگوؤں کے بعد کاؤنٹ کو آخر کار ایک ترکیب سوچ گئی۔ وہ اس کے ذریعے کاؤنٹس کی پریشانیوں کا کسی حد تک مداوا کر سکتا تھا۔ اس نے پیتا کا دہلیس کی رجسٹر سے بڑو خوف کی رجسٹر میں، جو ماسکو کے نزدیک زیر تربیت تھی، تبادلہ کر لیا۔ اگرچہ پیتا کو اب بھی فوج میں ہی رہنا تھا، کاؤنٹس کو اتنی تس ہو گئی کہ اس کا کم از کم ایک بیٹا اس کی آنکھوں کے سامنے رہے گا اور اسے امید ہو گئی کہ وہ پیتا کے معاملات، کچھ اس بچے سے ترتیب دے سکے گی کہ اسے کہیں جانا نہیں پڑے گا بلکہ وہ اسے ہمیشہ ایسے مقامات پر، جہاں اس کے جنگ میں شریک ہونے کا کوئی امکان نہیں ہوگا، تعینات کرتی رہے گی۔ جب تک نکولائی اکیلا فوج کی زد میں تھا، کاؤنٹس کو یہی محسوس ہوتا رہا (اور اس بارے میں وہ ہر دم اپنے آپ کو مطمئن کرتی رہی) کہ وہ اپنے تمام دوسرے بچوں کے مقابلے میں اپنے پہلو ٹھہری کے بیٹے کو زیادہ چاہتی ہے۔ لیکن جب اس کا چھوٹا بیٹا، جو اب بالائی تھا اور پڑھنے لکھنے میں کودتے، جو ہر وقت گھر میں چیزوں کی توڑ پھوڑ کرتا رہتا اور ہر شخص کے لیے ویسا جان بھارتا، وہی پیتا، جس کی ناک چھوٹی اور چپٹی تھی، جس کی سیاہ آنکھوں میں ہر وقت شوخی اور شرارت بھری رہتی تھی، اور جس کے تازہ گلہائی گالوں پر ہنر خط کے آثار نمودار ہونا شروع ہو گئے تھے۔ جب وہ ان لیے تڑپنے، خوشامد اور ظالم مردوں میں،

جو کسی چیز کے متعلق جھگ کر رہے تھے اور بظاہر اس سے لطف اندوز ہو رہے تھے، جاملا، پھر اس کی ماں کو اپنی ساری اولاد کے مقابلے میں اس سے زیادہ، کہیں زیادہ پیار ہو گیا۔ اس کے چہیتے پیتا کے ماسکو واپسی کا وقت جس دن قریب آتا گیا، کاؤٹنس کے اضطراب میں اتنا ہی زیادہ اضافہ ہونے لگا۔ اسے محسوس ہونے لگا کہ وہ اس پرست لہجے کی آمد سے پہلے ہی ملک عدم سدھار جائے گی۔ سو نیا کی ہی نہیں، بلکہ اپنی عزیز از جاں مناشا، یہاں تک کہ اپنے شوہر کی موجودگی بھی، اسے گھٹنے لگی۔ ”مجھے بھرا ان سے کیا لینا ہے، مجھے صرف پیتا چاہیے!“ وہ سوچتی۔

اگست کے آخری دنوں میں رستوفوں کو نکولائی کا ایک اور خط موصول ہوا۔ اس نے یہ خط دارا نیز صوب سے، جہاں اسے نئے گھوڑے حاصل کرنے کے لیے بھیجا گیا تھا، تحریر کیا تھا۔ لیکن اس خط نے کاؤٹنس کے خدشات کو دور کرنے میں کوئی مدد نہ دی۔ یہ جان کر کہ نکولائی خطرے کی زد سے باہر نکل چکا ہے، وہ پیتا کے بارے میں اور بھی متوش رہنے لگی۔

اگرچہ جس اگست تک وہ تمام ہوگ، جن سے رستوفوں کی صاحب سلاست تھی، ماسکو کو خیر باد کہہ چکے تھے اور اگرچہ ہر شخص نے کاؤٹنس کو قائل کرنے کے لیے پورا زور لگا دیا کہ انھیں حتیٰ الامکان جلد از حد وہاں سے رخصت ہو جانا چاہیے، کاؤٹنس کسی کی نہیں مانتی تھی۔ اس نے صاف صاف کہہ دیا کہ جب تک اس کا نور نظر، سرور قلب، رنج دلارا پیتا واپس نہیں آ جاتا، وہ وہاں سے ہٹنے کا نام تک نہیں لے گی۔ خدا خدا کر کے وہ اٹھائیس تاریخ کو پہنچ ہی گیا۔ جس مریضانہ جوشیے پیار و محبت سے ماں نے اس کا خیر مقدم کیا، اس سے سولہ سالہ افسر کو کوئی خوشی نہ ہوئی۔ اس کا ارادہ تو یہی تھا کہ وہ کبھی اسے اپنی نظرد سے اوچھل نہیں ہونے دے گی، پھر بھی اس کی تمام تر کوشش یہی تھی کہ اس کے اس عزم کی بھنک پیتا کے کانوں تک نہ پہنچے۔ تاہم پیتا اس کی نیت بھانپ گیا۔ اسے جہکی طور پر یہ اندیشہ لاحق ہو گیا کہ کہیں اپنی ماں کی موجودگی میں اس پر ”کمزوری غلبہ نہ پائے“ اور وہ ”عورتوں کا مارو یہ اختیار کر لے“ (جیسا کہ وہ اپنے دل میں سوچتا تھا)، وہ اس سے سرد مہری کا برتاؤ کرے اور اس کے سامنے آنے سے گریز کرنے لگا۔ اپنے ماسکو کے قیام کے دوران میں وہ محض مناشا سے نہتی رہا۔ اس کے لیے اس کا دل ہمیشہ برادرانہ پیار سے، جو خاص نوعیت کا تھا اور پرستش کی حد تک پہنچ چکا تھا، لبریز رہا۔

چونکہ ہل انکاری کاؤٹ رستوف کی کھٹی میں داخل ہو چکی تھی، چنانچہ 28 اگست تک ان کی روانگی کا کوئی انتظام نہ ہو سکا۔ ان کا گھر لیوسا مان ڈھونے کے لیے ریازان اور ماسکو کی چاکیروں سے جو چھکڑے آتا تھے، وہ بھی تمیں تاریخ سے پہلے نہ پہنچے۔

اٹھائیس اگست تک ماسکو میں بڑی گہما گہمی کا سماں رہا۔ ہر روز ہزاروں افراد، جو بارودینو میں دفنی ہوئے تھے، دروگو سیلوف دروازے میں سے ماسکو کے اندر مائے جاتے اور شہر کے مختلف علاقوں میں پہنچائے جاتے رہے۔ دوسرے دروازوں میں سے ہزاروں گاڑیاں اور چھکڑے شہر کے باسیوں اور ان کے اموال و املاک کو باہر لے جاتے رہے۔ رستوف چین کے خبرناموں کے باوجود، یا ان کے حقیق یا ان کے عمل دخل کے بغیر، انتہائی عجیب و غریب

اور ایک دوسری کے قضا متضاد افواہیں شہر میں گردش کرتی رہیں۔ بعض لوگ کہتے تھے کہ کسی کو شہر سے نکلنے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ ان کے برعکس دوسرے یہ دعویٰ کرتے تھے کہ کلیساؤں سے ایقوٹے بنالیے گئے ہیں اور ہر شخص کو شہر چھوڑنے پر مجبور کر دیا جائے گا۔ کچھ لوگوں کے مطابق بارودینو کے بعد ایک اور زلزلہ ہو چکی ہے اور اس میں فرانسیسیوں کا ہتھکنڈا نکال دیا گیا ہے، جب کہ دوسروں کے بقول ساری روپیہ لونچ ملیا بیٹ ہو چکی ہے۔ کچھ کا اندھا تھا کہ ماسکولیشیا، جس کی قیادت کلیسا کی حکام کر رہے ہیں، تین پرست جاری ہے جب کہ دوسرے سرگوشیوں میں بتاتے پھر رہے تھے کہ آرج بشپ اگستین کو شہر سے نکلنے سے منع کر دیا گیا ہے، غدار گرفتار کر لیے گئے ہیں، کسان اودھم مچاتے پھر رہے ہیں اور ان لوگوں کو، جو شہر چھوڑ کر جا رہے ہیں، لوٹ رہے ہیں، وغیرہ وغیرہ۔

لیکن یہ سب زبانی جمع خرچ تھا جب کہ اصل حقیقت (اگرچہ فلی میں کونسل کا اجلاس، جس میں ماسکو کے اتراک کا فیصلہ کیا گیا تھا، ابھی تک منعقد نہیں ہوا تھا) یہ تھی کہ وہ لوگ جو شہر چھوڑ کر بھاگ رہے تھے اور وہ جو رہیں مقیم تھے، دونوں، بے شک وہ کھسے ماسکو کا قرار نہیں کرتے تھے، یہ محسوس کرتے تھے کہ، سکو کو پشینا دشمن کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا جائے گا اور، انھیں حتیٰ الامکان جلد از جلد وہاں سے نکل جانا اور اپنے اموال کو بچا لینا چاہیے۔ عام تاثر یہی تھا کہ ایک روز آنا فانا سب کچھ زیر و زبر ہو جائے گا اور زبردست تبدیلیاں سروں پر سنڈلاری ہیں لیس ستمبر کی پہلی تاریخ تک حالات کا دھارا جوں کا توں بہتا رہا اور کچھ بھی تبدیل نہ ہوا۔ اس مجرم کی طرح، جسے پچانسی کے تختے کی جانب لے جایا جا رہا ہو اور جو جانتا ہے کہ ایک آدھ منٹ بعد اس کی زندگی کا لازماً خاتمہ ہو جائے گا لیکن وہ بھر بھی اپنے گرد و پیش دیکھتا رہتا ہے اور اس کے سر پر جو ٹوپی میز می رکھی ہوتی ہے، اسے سیدھی کرتا رہتا ہے، یعنی ماسکو بھی اپنے آپ اپنی جانی پہچانی ذکر پر چلتا رہا حالانکہ اسے معلوم تھا کہ اس کی تباہی کی گھڑی کوئی دور نہیں جب اس کی زندگی کے تمام رویے، حتیٰ اور تسلیم شدہ حالات تیس تیس ہو جائیں گے۔

ماسکو پر قبضے سے پیشتر جو تین دن گزرے، ان کے دوران میں سارا رستوف گھرانہ روزمرہ کی مختلف انواع کی سرگرمیوں میں منہمک رہا۔ خاندان کا سربراہ کاؤنٹ رستوف اپنی گاڑی میں مسلسل شہر میں گھومتا اور جوانو اہیں گردش کر رہی ہوتیں، انھیں اکٹھا کرتا رہا۔ جب وہ گھر میں ہوتا، اپنی روانگی کی تیاریوں کے سلسلے میں مٹی اور عجلانہ ہدایات دیتا رہتا۔

کاؤنٹس، جو اشیا کو چھانٹنے اور بندھوانے کے امور کی نگرانی کرتی اور ہر شخص پر نزلہ کرتی رہتی، متواتر پیتا کا تعاقب کرتی رہتی لیکن وہ کبھی اس کے ہاتھ نہ آتا اور اپنا سارا وقت ناسا کی معیت میں گزار دیتا۔ اس پر ماں اپنی بیٹی سے حسد کرتی اور علیٰ بھنتی رہتی۔ صرف سو نیا واحد ہستی تھی جو سامان بندھوانے کا عملی لریفہ سرانجام دے رہی تھی لیکن سو نیا گزشتہ چند روز سے غیر معمولی طو پر کھی کھی، ورا داس اداں رہنے لگی تھی۔ نکولا کی کے اس خط کی، جس میں اس نے پرنس ماریا کے ساتھ، اپنی ملاقات کی تفصیل بیان کی تھی خواہدگی کے دوران میں کاؤنٹس نے اس کی موجودگی میں اپنی مسرت کا کھلے بندوں اظہار کیا تھا کیونکہ اس کا خیال تھا کہ اس کے بیٹے اور پرنس ماریا کی اس تعانی ملاقات

میں خدائی ہاتھ شامل تھا۔

”جب نٹاشا کی بلکونسکی کے ساتھ سگائی ہوئی تھی،“ کاؤٹس نے کہا تھا، ”سچ پوچھیں مجھے قطعاً کوئی خوش نہیں ہوئی تھی، لیکن میری ہمیشہ یہ آرزو رہی ہے کہ نگولائی پرنس ماریا سے شادی کر لے اور میرا دل کہتا تھا کہ وہ یہ شادی ضرور کرے گا۔ اور یہ کتنی خوش کن بات ہوگی!“

سو نیا محسوس کرتی تھی کہ یہ بات درست ہے کہ دستوفوں کے حالات میں صرف ایک ہی صورت میں بہتری آسکتی ہے کہ نگولائی کسی متوزل خاتون سے شادی کر لے اور اس ضمن میں پرنس سے جوڑ نہایت موزوں ہے۔ لیکن اس قسم کا تصور خود اس کے اپنے لیے بہت تلخ تھا۔ تاہم اپنے حزن و ملال کے باوصف یہ اس کے سبب اس نے گھریلو سامان کا چھانٹو نے اور بندھوانے کے مشکل معاملات کی نگرانی کی ذمہ داری اپنے کندھوں پر سلی اور سارا سارا دن مشغول رہنے لگی۔ جب کسی نوعیت کی ہدایات دینے کی نوبت آتی، کاؤٹس اور کاؤٹس نوکروں چاکروں کو اس کی جانب بھیج دیتے۔ اس کے برعکس پیتا اور نٹاشا اپنے والدین کی مدد تو کیا کرتے، الٹا ہر ایک کے لیے وبال جان بنے رہے اور نادانستہ ان کے کاموں میں رکاوٹ ڈالتے رہے۔ تقریباً سارا دن گھرانے کے بھاگتے قدموں، شور و شغب اور بے ساختہ قہقہوں کی گواہیوں سے گونجتا رہا۔ وہ اس سے نہیں قہقہے لگاتے اور شور و غل بپا کرتے تھے کہ قہقہے لگانے اور غل غپ ڈالنے کا کوئی جواز تھا بلکہ اس لیے کیونکہ خندہ آرائی اور شگفتہ مزاحی ان کے خمیر میں رچ بس چکی تھی۔ جو کچھ بھی وقوع پذیر ہوتا، اس میں انھیں کہیں نہ کہیں سرسرت کا پہلو نظر آ جاتا۔ پیتا کی خوشی کا اس لیے کوئی ٹھکانا نہ تھا کیونکہ جب وہ گھر سے رخصت ہو جاتا تھا، وہ ابھی محض لڑکا تھا اور جب واپس آیا (جیسا کہ ہر شخص اسے بتاتا تھا) وہ خود نو جوان آدمی کے روپ میں ڈھل چکا تھا، کیونکہ وہ گھر آچکا تھا، کیونکہ وہ بیل یا ترسکوف کو، جہاں کسی قسم کی جلد لڑائی کا کوئی خطرہ نہیں تھا، خیر باد کہہ چکا تھا اور ماسکو، جہاں ہر دم یہ دھڑکا لگا رہتا تھا کہ لڑائی اب ہوئی کہ اب ہوئی، پہنچ چکا تھا۔ لیکن اس کی شگفتہ روئی کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ نٹاشا کی، جس کی وہ ہر دم نقل اتارنا رہتا تھا، سرسرت سے ہاتھیں کھلی رہنے لگی تھیں۔ نٹاشا اس لیے خوش تھی کیونکہ وہ خاصا طویل عرصہ طویل و معصوم رہی تھی اور جو چیز اس کے غم و اندوہ کا باعث بنی تھی، اب اس کی یاد دمانے کے لیے کچھ ہاتی نہیں رہا تھا۔ وہ اس لیے بھی سرور و دل شاد تھی کیونکہ اس کے پاس ایک ایسی ہستی تھی جو اس سے دیوانہ دار پیار کرتی اور ایک طرح سے اس کی پرستش کرتی تھی۔ دیوی دیوتاؤں کی طرح دوسروں سے پرستش کراؤدہ چکنائی (lubricant) تھی جو اس کی جسمانی مشین کے پہیوں کے لیے نہایت ضروری تھی تاکہ وہ ہچکولے کھائے بغیر ہموار طریقے سے آگے چلتے رہیں، اور پیتا اس کی پرستش کرتا تھا۔ لیکن سب سے بڑھ کر وہ اس لیے شاداں و فرحاں تھی کیونکہ جنگ ماسکو کے دروازوں پر دستک دے رہی تھی، محقریب شہر کے قریب و جوار میں برپا ہوا چاہتی تھی، ہتھیار تقسیم ہو رہے تھے، ہر شخص ادھر ادھر بھاگ بھاگ پھرتا تھا اور عمومی اعتبار سے کوئی غیر معمولی چیز وقوع پذیر ہو رہی تھی اور جو چیز غیر معمولی ہو، وہ ہمیشہ پہچان پذیر، خاص طور پر جوانوں کے لیے توجہ لکھل ہی پہچان پذیر ہوتی ہے۔

نو کروں چاکروں در کسانوں کی، جو اپنے اپنے چھکڑے لے کر آئے تھے، پوری فوج تھی۔ ان کی باتوں کی دوازیں اور قدموں کی چاپ صحن اور سارے گھر میں گونج رہی تھی۔ کاؤنٹ صبح کا گھر سے باہر گیا ہوا تھا۔ ادھر گھر میں جو شور و غل اور ہنگامہ مچا تھا، اس سے کاؤنٹس کے سر میں درد ہونے لگا تھا۔ وہ سر کے میں بھیگی پٹی اپنے سر پر باندھے نئی نشست گاہ میں لیٹی ہوئی تھی۔ چٹا گھر پر نہیں تھا۔ وہ ایک دوست سے ملنے چلا گیا تھا۔ وہ اس کے ساتھ لیٹی سے کسی ایسی رجسٹ میں، جرجنگ میں شریک تھی، جاؤں کرانے کا منصوبہ بنا رہا تھا۔ سونیا بال روم میں تھی۔ وہ اپنی نگرانی میں چٹنی اور بلور کے برتن بند حواری تھی۔ نسا شاپنے اجڑے بجڑے کمرے میں فرش پر بیٹھی تھی۔ اس کے چادروں اور ڈریس، ربن اور پکے بکھرے پڑے تھے۔ وہ ٹھنکی باندھے فرش کو دیکھ رہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں بال پر پہننے کا پرانا ڈریس تھا۔ اس کا فیشن اب متروک ہو چکا تھا لیکن یہ وہی ڈریس تھا جو اس نے ہئیرز برگ میں اپنے دلین بال میں پہنا تھا۔

اولن بال میں پہنچا تھا۔
 نشانہ کا تمبیر اسے کچھو کے لگا رہا تھا کہ جب گھر میں ہر شخص مصروف ہے، وہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھی ہے۔
 صبح کے دوران میں اس نے متعدد مرتبہ کچھ نہ کچھ کرنے کی سعی کی جس سے دوسروں کو کچھ مدد مل جاتی لیکن اس قسم
 کے کام اسے ایک آنکھ نہیں بھاتے تھے اور جب تک کسی کام میں اس کا صحیح معنوں میں جی نہ لگتا، وہ کام کرنا اس
 کے بس کی بات نہ تھی۔ جب چینی کے برتن باندھے جا رہے تھے وہ سو نیا کے ساتھ چٹی رہی۔ وہ ہاتھ ٹاننا چاہتی
 تھی لیکن بہت جلد اس نے یہ ارادہ ترک کر دیا اور اپنی چیزیں باندھنے واپس اپنے کمرے میں چلی گئی۔ پہلے پہل
 اسے یہ خیال بہت سہانا معلوم ہوا کہ وہ اپنے تمام ڈریس اور ربن نوکرائیوں میں تقسیم کر دے، لیکن پھر جو کچھ باقی
 بچا رہا، جب اسے باندھنے کی نوبت آئی، تو اسے یہ کام اکتا دینے والا نظر آیا۔

”دنیا عاقل ہی بات دھرواڈیڑ، ہاتھ دھو گی نا؟“

”دنیا شائتم ہی باتدھ دو اڈیر، ہاتدھ دو کی نانا“

اور جب دیر شانے یہ سب کچھ کرنے کی آٹا نانا ہا ہی بھری، ہنا شانے اپنا پرانا بال ڈریس ہاتھوں میں پکڑا اور ٹرٹ پر بیٹھ گئی۔ وہ ایسی چیزوں کے، جن کا ان اشیاء سے، جو اس وقت اس کے خیالات میں سہلی جانا چاہیے تھیں، قطعاً کوئی تعلق نہیں تھا، خواب دیکھنے لگی۔ اپنے ان خوابوں سے وہ اس وقت بیدار ہوئی جب ہاتدھ کمرے سے اسے خادہ وں کے ٹرٹ باتیں کرنے اور ان کے عقبی پورج کی طرف طیز تیز تہ مول چلنے کی آواز جس سہلی دہیں۔

نشاٹاٹھ کر کھڑی ہو گئی اور کھڑکی میں سے باہر جھانکنے لگی۔ پھکڑوں کی، جن میں زخمی مددے ہوئے تھے، بہت بڑی قطار باہر سڑک پر رک گئی تھی۔

نوکرانیاں، وردی پوش خدمت گار، نرسیں، باورچی، کوچوان، برتن مانجنے والیاں، سبھی صدر دروازے پر کھڑے نکلنے والے زخمیوں کو دیکھ رہے تھے۔

نشاٹاٹھ نے سفید چھتری رومال سر پر ڈالا، دونوں ہاتھوں سے اس کے سرے پکڑے اور سڑک کی جانب بھاگنے لگی۔ بوڑھی منتظمہ خانہ (ہاؤس کیپر) ماورا کز می نیشٹا صدر دروازے پر کھڑے ہجوم میں سے نکلی اور ایک چھکڑے کی طرف، جس کے اوپر پزیزون کے ریشے کے ٹاٹ کا پردہ تھاموا تھا، چل دی۔ چھکڑے کے، ندر ایک دروازے لیتا ہوا تھا۔ وہ اس سے باتیں کرنے لگی۔ شاٹ، جو ابھی تک رومال کے سرے پکڑے ہوئے تھی، ٹہراتے پڑے چند قدم آگے بڑھی، رک کی اور ہاؤس کیپر کی باتیں سننے لگی۔

”تو تمہارا ماسکو میں کوئی نہیں؟“ ماورا کز می نیشٹا نے پوچھا۔ ”تمہیں کسی گھر میں جگہ مل جائے، تو آرام سے رہو گے۔۔۔ مثلاً یہ ہمارا گھر ہے۔۔۔ مالک باہر جا رہے ہیں۔“

”پتا نہیں وہ اجازت دیں گے بھی یا نہیں۔“ انسر نے مری ہوئی آواز میں جواب دیا۔ ”وہ ادھر ہمارے کمانڈنگ افسر ہیں۔ ان سے پوچھ لو۔“ اور اس نے ایک ہٹے کئے۔ میجر کی طرف، جو پھکڑوں کی قطار سے آگے واپس سڑک پر جا رہا تھا، اشارہ کیا۔

نشاٹاٹھ نے زخمی افسر کی خوف زدہ آنکھوں میں جھانک کر دیکھا اور جھٹ پٹ۔ میجر کی جانب چل پڑی۔ ”زخمی ہمارے گھر میں ٹھہر سکتے ہیں؟“ اس نے پوچھا۔ میجر اپنا ہاتھ اٹھا کر ٹوپی تک لے گیا اور مسکراتے لگا۔

”مدموزیل، آپ کے ٹھہرانا چاہتی ہیں؟“ میجر نے آنکھیں سکیڑتے اور مسکراتے ہوئے پوچھا۔ نشاٹاٹھ نے دھمے لہجے میں اپنا سوال دہرایا۔ حالانکہ وہ ابھی تک اپنے رومال کے سرے پکڑے ہوئے تھی، لیکن اس کے اظہار میں اور چہرے پر اتنی سنجیدگی اور متانت تھی کہ میجر نے مسکراتا بند کر دیا۔ پہلے اس نے کچھ ہوا جیسے اپنے آپ سے پوچھ رہا ہو کہ یہ کس حد تک ممکن ہے اور پھر اس نے ہاں میں جواب دے دیا۔

”ہاں، کیوں نہیں؟ وہ ٹھہر سکتے ہیں!“ اس نے کہا۔ نشاٹاٹھ نے اپنے سر کو ذرا سا خم دیا۔ پھر وہ ماورا کز می نیشٹا کی طرف، جو زخمی انسر کے قریب کھڑی تھی اور لم آلود لہجے میں اس کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کر رہی تھی، متوجہ ہوئی۔

یہ ٹھہر سکتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ ٹھہر سکتے ہیں؟“ نشاٹاٹھ نے زیر لب کہا۔ وہ چھکڑا، جس میں افسر لیتا ہوا تھا، ہانک کر رستوں کے صحن میں پہنچا دیا گیا اور پوارس کا یا سٹریٹ کے بعض دیگر باسیوں کی دغوت پر زخمیوں کے درجنوں چھکڑے گھروں کی دلیزیں پار کرنے لگے۔

صاف نظر آ رہا تھا کہ اپنے روزمرہ کے معمول سے ہٹ کر اب جو نسا کو نئے لوگوں سے واسطہ پڑا، اس پر اسے بہت خوشی ہو رہی تھی۔ وہ اور مادرا کز می بیشنا حتی الامکان زیادہ سے زیادہ زخمی اپنے صحن میں لانے کی کوشش کر رہی تھیں۔

”مام ہمیں آپ کے پاپا کو بتادینا چاہیے۔“ مادرا کز می بیشنا نے کہا۔
 ”فکر نہ کرو، فکر نہ کرو۔“ خراس سے کیا فرق پڑتا ہے؟ ایک ہی دن کی تو بات ہے۔ وہ ہم ڈرائنگ روم میں گزار سکتے ہیں۔ اپنے کمرے ہم انھیں دے سکتے ہیں۔“
 ”بہنی، کیا بات کرتی ہو؟ اگر ہم انھیں بغلی حصہ نوکروں کی رہائش گاہیں اور بڑی زس کا کمرہ بھی دینا چاہیں، پھر بھی ہمیں اجازت لینا ہوگی۔“
 ”اچھا، میں پوچھ لیتی ہوں۔“

نسا ٹالیک جھپک گھر میں چلی گئی اور بچوں کے بل چلتی نشست گاہ کے دروازے کے، جو نیم دائیہ، قریب کچا گئی۔ اندر سے سر کے اور ہوف میز ڈرائس کی مہک آ رہی تھی۔
 ”ماما، آپ سو رہی ہیں؟“

”یہاں کوئی کیسے سو سکتا ہے؟“ کاؤنٹس نے غنودگی کے عالم میں جو ابھی ابھی اس پر طاری ہوئی تھی، آنکھیں کھولتے ہوئے کہا۔

”ماما ڈرائنگ!“ نسا نے اپنی ماں کے قریب جھکتے اور اپنا گال اس کے گال سے لگاتے ہوئے کہا۔ ”میں شرمندہ ہوں۔ میں کبھی دوبارہ یہ حرکت نہیں کروں گی۔ میں نے خواہ مخواہ آپ کو جگا دیا، مجھے مادرا کز می بیشنا نے بھیجا ہے۔ اصل میں وہ کچھ زخمی لوگوں۔ افسروں۔ کو یہاں لائے ہیں۔ آپ انھیں یہاں ٹھہرنے کی اجازت دے دیں گی؟ ان کا کوئی ٹھکانا نہیں۔ مجھے معلوم ہے کہ آپ انھیں اجازت دے دیں گی!“ اس نے یہ سب کچھ ایک ہی سانس میں کہہ دیا۔

”کون افسر؟ کسے یہاں لایا گیا ہے؟ مجھے کچھ سمجھ نہیں آیا۔“ کاؤنٹس نے کہا۔
 نسا ٹالیک پڑی۔ کاؤنٹس کے لبوں پر بھی خفیف مسکراہٹ آ گئی۔
 ”مجھے معلوم تھا کہ آپ انھیں آنے دیں گی۔ میں ابھی جاتی ہوں اور انھیں بتاتی ہوں۔“ نسا نے اپنی ماں کا ہوسہ ریا، چھلانگ لگائی اور دروازے کی جانب بھاگ پڑی۔

دالان میں اس کا سامنا اپنے باپ سے ہو گیا۔ وہ بری خبر کے ساتھ گھر لوٹا تھا۔
 ”ہم ضرورت سے زیادہ عرصہ یہاں کئے رہے ہیں!“ وہ غیر شعوری طور پر جھلایا ہوا تھا۔ ”کلب بند ہو گیا ہے اور پولیس جارہی ہے۔“

”پاپا، میں نے چند زخموں کو گھر میں ٹھہرنے کی دعوت دی ہے۔ آپ کو اعتراض تو نہیں؟“ نسا نے کہا۔

”نہیں۔ کیا فرق پڑتا ہے؟“ کاؤنٹ نے بے دھیانی سے جواب دیا۔ ”لیکن یہ فردی بات ہے۔ میری تم سے درخواست ہے کہ معمولی باتوں کے چکر میں نہ پڑو۔ سامان باندھنے بندھوانے میں ہاتھ بٹاؤ اور یہاں سے نکل چلو۔ ہمیں یہاں سے جانا ہوگا۔ کل تک لازماً جانا ہوگا۔“

اور کاؤنٹ نے اس سے ملتی جلتی ہدایات اپنے بٹلر اور دوسرے نوکروں کو دیں۔

پتیا ڈنر کے وقت گھر پہنچا اور جو خبریں وہ سن کر آیا تھا، انھیں بیان کرنے لگا۔ اس نے بتایا کہ آج کل لوگ کریملن سے ہتھیار لارہے ہیں، وراگرچہ رستوپ چین کے خبرنامے میں یہی کہا گیا تھا کہ وہ خطرے کا اعلان ایک دو دن پہلے کر دے گا، شہر میں ہر کس ونا کس کو معلوم ہے کل سچی ہو کر تین پریت پہنچا ہے۔ خیال ہے کہ وہاں گھسان کارن پڑے گا۔

کاؤنٹس کا بیٹا جب یہ باتیں بڑے جوشیے و ردولہ انگیز انداز سے سنا رہا تھا، وہ کپکپانے لگی تھی اور اس کے منہ پر ہوائیاں اڑنا شروع ہو گئی تھیں۔ وہ سمجھ گئی کہ اگر اس نے پتیا کو اس لڑائی میں شرکت سے باز رکھنے کے لیے ذرا بھی لب کشائی کی (وہ جانتی تھی کہ یہ موقع دستیاب ہونے پر وہ کتنا خوش ہے)، وہ شیوہ سرا دہائی، آن اور وطن کے بارے میں کوئی بات کہنے لگے گا۔ کوئی بے معنی، بھلی اور مردانہ بات، جس کی تردید کرنا ناممکن ہوگا اور اس (کاؤنٹس) کے سارے منصوبے خاک میں مل جائیں گے۔ چنانچہ اس امید پر کہ وہ پتیا کو اپنا محافظ اور سلامتی کا ضامن بنا کر اپنے ساتھ لے جاسکے گی، اس نے اپنے بیٹے کے سامنے اپنی زبان بند رکھی۔ لیکن ڈنر کے بعد وہ کاؤنٹ کو ایک طرف لے گئی اور اس سے منت سماجت کے انداز میں کہنے لگی: ”مجھے فوراً اور اگر ممکن ہو تو رات ہی، یہاں سے لے چلو۔“ جہاں تک عورت کے پیار کا تعلق ہے، وہ جلی عیاری سے کام لیتی ہے۔ چنانچہ کاؤنٹس نے بھی کہا، جس نے اس وقت تک ذرا بھی گھبراہٹ کا اظہار نہیں ہونے دیا تھا۔ ”اگر ہم آج ہی روانہ نہ ہوں، خوف سے میری جان نکل جائے گی۔“ اور وہ بناوٹ سے کام نہیں لے رہی تھی، اب وہ واقعی ہر چیز سے خائف تھی۔

14

مادام شوں نے، جو اپنی بیٹی سے ملنے گھر سے باہر گئی ہوئی تھی، چلتی پرتیل کا کام کیا۔ اس نے میاں بسکا یا سٹریٹ میں، کھال کی دکان کے باہر جو منظر دیکھا تھا، اس کی تفصیل بیان کر کے اس نے کاؤنٹس کے اندیشوں کو مزید بڑھا دے دی۔ اس نے واپس کے لیے جس سڑک کا انتخاب کیا تھا اس پر اس کے لیے گزرنا محال ہو گیا کیونکہ دکان کے سامنے شرابی جھوم دنگا فساد کر رہا تھا۔ چنانچہ اس نے گاڑی پکڑی اور بخلی گلی میں سے گھر واپس آئی۔ راستے میں کہوٹان نے اسے بتایا کہ لوگ شراب کے چوبلی پیے تو ڈنر ذکر کھول رہے ہیں کیونکہ انھیں ایسا کرنے کا حکم ملا ہے۔

ڈنر کے بعد سارا رستوف گھر آنا بڑے ذوق و شوق سے پہنچتا اپنا سامان باندھنے اور روانگی کی تیاریاں کرنے لگا۔ مگر کاؤنٹ میں ایسا ایکی کام کرنے کا جذبہ پیدا ہو گیا۔ وہ بھگم بھاگ کبھی صحن میں آنا اور کبھی پھر اتنی

ہی پھرتی سے اندر چل جاتا۔ وہ چلا چلا کرتا بڑا توڑ نوکروں چاکروں، جو پہلے ہی خاصی تیزی دکھا رہے تھے، ڈر لیدہ ہدایات دے رہا تھا اور ان پر مزید تیزی سے کام کرنے کا زور دے رہا تھا۔ ممکن میں کام کی نگرانی چبانے اپنے ذمے لے لی۔ کاؤنٹ کے متضاد احکام نے سونیا کو الجھاؤ میں ڈال دیا اور اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے اور کیا نہ کرے۔ خدمت گار کروں میں بھاگے پھر رہے، آپس میں ٹوٹکار کر رہے اور شور و غل مچا رہے تھے۔ نٹاشا بھی اسی دالہانہ جوش و خروش سے، جو وہ ہر اس کام میں دکھاتی تھی جسے وہ اپنے ہاتھ میں لیتی تھی، مصروف عمل ہو گئی۔ شروع شروع میں سامان باندھنے کے کام میں اس کے عمل دخل کو مشکوک نگاہوں سے دیکھا گیا۔ کسی شخص کو بھی یہ توقع نہیں تھی کہ وہ شوخی و شرارت کے علاوہ کچھ اور بھی کر سکتی ہے۔ چنانچہ اس کی ہدایات پر سنجیدگی سے دھیان نہ دیا گیا، لیکن اس نے اپنی ہدایات پر عمل کروانے کے لیے اپنے اصرار اور جوش و خروش کا مظاہرہ کیا، بلکہ بعض اوقات اسے اتنا غصہ آیا کہ وہ قریب قریب روٹھ گئی، مگر آخر کار وہ ان سے اپنی بات منوانے میں کامیاب ہو گئی۔ اس کا پہلا کارنامہ، جس کی تکمیل کے لیے اسے ایڑی چوٹی کا زور لگانا پڑا لیکن جس نے اس کا اختیار مستعمل کر دیا، قالینوں کا بندھوانا تھا۔ کاؤنٹ رستوف کے گھر میں بیٹس بہ ایرانی قالینوں اور باتھ روم گولڈا پر دلوں کا اچھا خاصا ذخیرہ تھا۔ جب نٹاشا نے آتما زکار کیا، بال روم میں در خاصے بڑے صندوق پڑے تھے۔ ان کے ڈھکن کھلے تھے۔ ایک میں چینی کے برتن اور دوسرے میں قالین، بند تھے اور تقریباً بھرے ہوئے تھے۔ میزوں پر چینی کے مزید برتن پڑے تھے۔ ابھی مزید برتن نعمت خانے سے لائے جاتا تھے۔ ان کے لیے تیسرے صندوق کی ضرورت تھی، اور نوکر یہ پتے لگے ہوئے تھے۔

”سونیا، بھڑو۔ ہم یہ سب کچھ دو میں ہی بند کر سکتی ہیں۔“ نٹاشا نے کہا۔

”بی بی جی، ناممکن۔ ہم پہلے ہی کوشش کر چکے ہیں۔“ بٹلر نے کہا۔

”نہیں، ڈرا ایک منٹ بٹلر۔“

اور نٹاشا کاغذوں میں لپٹی پلیٹیں اور ڈشیں صندوق سے باہر نکالنے لگی۔

”ڈشیں قالینوں کے ساتھ اس صندوق میں رکھ دیں۔“

”اگر ہم صرف قالین ہی تین صندوقوں میں رکھنے میں کامیاب ہو گئے، تو بڑے جوش قسمت ہوں گے۔“

بٹلر نے کہا۔

”نہیں۔ ذرا بٹلر، اور نٹاشا بڑی پھرتی اور مہارت سے چیزیں چھانٹنے لگی۔“ ان کی ہمیں ضرورت

نہیں۔“ اس نے ساختہ کیف چند پلیٹوں کے متعلق کہا۔ ”اور یہ ہاں۔“ انھیں لا رہا قالینوں کے ساتھ رکھنا چاہیے۔“

اس نے ساختہ سیکسنی ڈشوں کے متعلق کہا۔

”نٹاشا، جانے دوا“ کچھ نہ کر دوا، ہم سب کچھ بند کر لیں گے۔“ سونیا نے سرزنش کی۔

”بی بی جی کی عمر ہی کیا ہے؟“ بٹلر پکارا۔

لیکن نٹاشا نے ہار نہ مانی۔ اس نے تمام چیزیں باہر نکال لیں اور انھیں پھرتی سے دوبارہ صندوقوں میں رکھنے

لگی اس نے فیصلہ کر لیا کہ گھنٹیاردی قالین اور غیر ضروری چینی کے برتن لے جانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ جب صندوقوں سے تمام اشیاء نکال لی گئیں، وہ انھیں دوبارہ رکھنے لگے۔ اور ہوا یہ کہ کتنی چیزیں، جنھیں ساتھ لے جانے کی ضرورت نہیں تھی، چھٹا کر علیحدہ کر دی گئیں تو باقی قیمتی سامان دونوں صندوقوں میں سما گیا۔ صرف اس صندوق کا جس میں قالین تھے ڈھکن بند نہیں ہو رہا تھا۔ اس میں سے ایک در چیزیں نکالی جاسکتی تھیں لیکن ناشا اپنی مرضی سنوانے پر تلی ہوئی تھی۔ وہ بار بار چیزیں الٹی پلٹتی، انھیں دوبارہ رکھتی اور نیچے گھسیڑنے کی کوشش کرتی۔ اس نے بظہر اور پیتا سے جس کی مدد حاصل کرنے میں وہ کامیاب رہی تھی۔ ڈھکن دہرایا اور خود بھی بے جگر سے رو رہا تھا۔

”ناشا، اتنا ہی کافی ہے۔“ سونیا نے کہا۔ ”میں نے مان لیا کہ تم ٹھیک کہتی تھیں۔ بس اوپر کا قالین باہر نکال لو۔“

”میں نہیں نکالوں گی!“ ناشا نے کہا۔ اس نے ایک ہاتھ سے اپنے چہرے سے، جس پر پسینہ بہہ رہا تھا، بال پیچھے ہٹائے اور دوسرے سے قالین نیچے دبانے لگی۔ ”پیتا، تم بھی زور لگاؤ۔“ اس نے کہا، ”تم بھی۔ اور ذرا اور!“ اس نے با آواز بلند کہا۔

قالین ہار مان گئے اور ڈھکن بند ہو گیا۔ ناشا خوشی سے تالیاں بجانے اور منمنانے لگی۔ اس کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں، لیکن یہ کیفیت صرف ایک آدھ سیکنڈ جاری رہی۔ وہ فی الفور نئے کام میں جت گئی۔ اب نوکر چاکر بھی اس پر پوری طرح اعتماد کرنے لگے۔ جب انھوں نے کاؤنٹ کو بتایا کہ ناشا ایچنا نے اس کی بعض ہدایات سنوان کر دی ہیں، اس نے کوئی برائہ نہ کیا۔ اب ملازمین اس سے یہ دریافت کرنے آئے گئے کہ آیا اس کے خیال میں فلاں چھکڑا پوری طرح لد چکا ہے اور آیا اس پر رے سے باندھے جاسکتے ہیں۔ ناشا کی نگہ رانی کا یہ فائدہ ہوا کہ کام خاصی تیز رفتاری سے ہونے لگا، قالین اشیاء نکالی جانے اور انتہائی قیمتی چیزیں کم سے کم جگہ میں بند کی جانے لگیں۔ اگرچہ وہ اس روز گئی رات تک جانتھانی سے کام میں جتے رہے، پھر بھی وہ سب کچھ نہ باندھ سکے۔ کاؤنٹس کو نیندا آگئی۔ کاؤنٹ نے روٹنگی اگلے دن تک، ٹھادی اور خود بھی سو گیا۔

سونیا اور ناشا لباس تبدیل کیے بغیر نشستیں کرے میں لیٹ گئیں۔

اس شب ایک اور زخمی گاڑی میں پوارسکا یا سٹریٹ لایا گیا اور ماورا کڑی نیشہ، جو صدر دردازے پر کھڑی تھی، سے اٹھو، کرستوفوں کے صحن میں لے آئی۔ اس کا خیال تھا کہ یہ لارنا کوئی اہم شخص ہوگا۔ اسے کالاٹس میں لایا گیا تھا۔ اس کی گاڑی کا چھجا اوپر اٹھا دیا گیا تھا اور اسے چاروں اطراف سے برساتی سے ڈھانپ دیا گیا تھا۔ ڈرائیور کے برابر بکس پر پرتمکنت وردی پوش خدمت گار بیٹھا ہوا تھا۔ اس سے پچھلے چھکڑے میں ایک ڈاکٹر اور دو سپاہی آ رہے تھے۔

”آپ ہمارے گھر آ جائیں۔ آئیں نا۔ مالک جا رہے ہیں اور سارا مکان خالی ہو جائے گا۔“ بڑھاپے خدمت گار سے کہا۔

”اچھا، شاید۔“ اس نے آہ بھرتے ہوئے کہا۔ ”ہمیں امید نہیں کہ ہم انھیں زندہ سلامت گھر لے جائیں گے۔ ماسکوں میں ہمارا اپنا گھر ہے۔ لیکن یہاں سے بہت دور۔ اور اب وہاں رہ بھی کوئی نہیں رہا۔“

”تشریف لائیں۔ مالک کے گھر میں اللہ کا دیا سب کچھ ہے۔ آئیں، تشریف لائیں۔“ ہورا کڑی بیٹھانے کہا۔ ”صاحب کی حاست واقعی بہت خراب ہے؟“ اس نے پوچھا۔

خدمت گارنے مایوسی کے عالم میں اپنا ہاتھ لہرایا۔

”کوئی امید نہیں۔ ہمیں ڈاکٹر سے پوچھنا ہوگا۔“ اور بوڑھا خدمت گار بکس سے نیچے اترا اور پچھلے پتھرے

کی جانب چل دیا۔

”بہت اچھا۔ ڈاکٹر نے کہا۔“

بوڑھا خدمت گار کا ماش کی طرف لوٹ آیا۔ اس نے اندر جھک کر دیکھا اور یاس سے سر ہلانے لگا۔ پھر اس نے کوچوان کو حکم دیا کہ وہ گاڑی کو صحن کے اندر لے چلے اور وہ خود مایور کڑی بیٹھانے کے پاس آکھڑا ہوا۔

”یا یسوع مسیح!“ وہ بڑبڑائی اور ان سے بولی کہ وہ ڈنچی کو گھر کے اندر لے چلیں۔ ”مالک کوئی اعتراض نہیں کریں گے۔۔۔“ اس نے کہا۔

مگر صورت حال کا تقاضا یہ تھا کہ ڈنچی کو اوپر کی منزل پر جانے سے احتراز کیا جائے۔ چنانچہ وہ اسے بظنی ھے میں لے گئے اور اسے اس کمرے میں، جو مادام شمس کے تصرف میں تھا، لٹا دیا۔
ڈنچی شخص پر انس آندے بلکوسکی تھا۔

15

ماسکو کے آخری دن کا سورج طلوع ہوا۔ خزانہ صبح کا آسمان صاف تھا اور دھوپ چمک رہی تھی۔ اس روز اتوار تھا اور عام اتواروں کی طرح عبادت کے لیے ہر جگہ گرجاؤں کی گھنٹیاں بج رہی تھیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ بھی تک کسی بھی شخص کو یہ اندازہ نہیں ہوا کہ شہر پر کیا قیامت گزرنے والی ہے۔

شہر کی معاشرتی کیفیت کیا تھی، اس کا اظہار صرف دو علامتوں سے ہوتا تھا: چھوٹی بستی یعنی مفلوک، الحال طبنے کی سبے چینی اور اشیاء کی قیمتیں۔ اس روز کارخانوں کے مزدور، گھریلو غلام اور کسان بڑے بڑے ہجوم در ہجوم تین پرست کی جانب چل پڑے۔ وہاں کلرکوں، دینی مدارس کے طلباء اور شرفاء کی اچھی خاصی تعداد ان ہجوموں میں شامل ہو گئی۔ رستوں پر جن کا، جو اپنی شکل دکھانے میں ناکام رہا، کچھ دیر انتظار کرنے اور دلوں میں یہ یقین کر لینے کے بعد، کہ ماسکو کا سقوط ہوا چاہتا ہے، وہ تتر بتر ہونے لگے اور سے خانوں اور رستورانوں کا رخ کرنے لگے۔ اس روز قیمتیں بھی صورت حال کی غمازی کر رہی تھیں۔ ہتھیاروں، چھڑوں، گھوڑوں اور اشرافیوں کی قیمتیں بڑھتی رہی

جب کہ کاغذی نوٹوں اور اشیائے تعیش کی گرتی رہیں۔ چنانچہ دو پہر تک متعدد ایسے ریٹرا بانوں کی مثالیں سامنے آنے لگیں کہ وہ جو قیمتی سامان، مثلاً کپڑے کے تھان، ڈھورے ہیں، ان کا کرایہ وصول کرنے کی بجائے ان میں سے نصف شیائے اپنے پاس رکھ رہے ہیں۔ کسانوں کے گھوڑے پانچ پانچ سو روپے میں بکنے لگے جب کہ زرخیز آبنوں اور کانسی کی اشیاء کی وہ بے قدری ہوئی کہ کوئی بھی انھیں خاطر میں نہیں لاتا تھا۔

رستوفون کے متین، سنجیدہ اور قدیم اوضاع گھر میں زندگی کے تمام سابقہ احوال کے انہدام کا مشکل احساس ہوتا تھا۔ ان کے ہاں گھریلو غذاؤں کی جرفوج ظفر موج تھی، اس پر نئے حالات کا جو اثر ہوا، اس کا، ظہار صرف اتنا ہو کہ رات کے دوران میں ان میں سے تین کہیں غائب ہو گئے، لیکن سرقہ کسی چیز کا نہ ہوا۔ اور جہاں تک اس کی املاک کی قدر و قیمت کا تعلق ہے، کسانوں کے جو تیس چھکڑے ان کی زرعی جاگیروں سے آئے تھے، وہ بذات خود اصول خزانہ ثابت ہوئے اور دوسروں کے رشک و حسد کا سبب بنے۔ لوگوں نے ان کے لیے انھیں بڑی بڑی رقم پیش کیں۔ رستوفون کو گھوڑوں اور چھکڑوں کے لیے نہ صرف بڑی بڑی رقم کی پیشکشیں موصول ہوئیں بلکہ گزشتہ شام اور یکم تبصر کی ساری صبح ان کے صحن میں اردلیوں اور نوکروں چاکروں کا، جنھیں زخمی افسروں نے بھیجا تھا، تاننا بندھا رہا اور زخمی افسر خود بھی گھسٹے گھسٹے رستوفون اور پڑوسیوں کے گھروں سے، جہاں انھیں ٹھہرایا گیا تھا، ہر آئے اور ملازموں کی منت و حاجت کرنے لگے کہ انھیں گاڑیوں اور چھکڑوں میں بٹھالیا جائے تاکہ وہ ماسکوسے باہر نکل سکیں۔ بلکہ، جس کے پاس ان درخواستوں کو پہنچایا گیا، اگر چہ زخمیوں سے ہمدردی حتمی تھا لیکن اس نے جی کڑا کر کے ان درخواستوں کو مسترد کر دیا۔ اس کا یہ کہنا تھا کہ وہ اس قسم کی درخواستوں کو کاؤنٹ تک پہنچانے کا کبھی حوصلہ نہیں کر پائے گا۔ زخمیوں کو پیچھے چھوڑنا کتنا ہی تاسف انگیز بھی، لیکن یہ امر روز روشن کی طرح عیاں تھا کہ اگر ایک چھکڑا دے دیا گیا، پھر کوئی وجہ نہیں کہ دوسرا یا تیسرا اور یوں کرتے کرتے آخری چھکڑا اور اس کے بعد اپنی گاڑیاں بھی کیوں۔ زخمیوں کے حوالے کر دی جائیں۔ تیس چھکڑے تمام زخمیوں کو بچانے کے لیے کافی نہیں ہوں گے اور قیامت صغریٰ کے دوران میں، جن کا سامنا سب کو کرنا پڑ رہا تھا، آدمی کو اپنا اور اپنے خاندان کا سوچنا پڑتا ہے۔ بلکہ اپنے مالک کی جانب سے یوں استدلال کر رہا تھا۔

اس صبح جاگنے کے بعد کاؤنٹ الیا آندر بیچ اپنی خواب گاہ سے دبے پاؤں باہر نکلا کہ کہیں کاؤنٹس کی جیسے صرف تڑکے نیند آئی تھی، آنکھ نہ کھل جائے۔ وہ بغوشی ریشمی ڈریسنگ گاؤن پہنے پورچ میں آیا۔ مدے ہوئے چھکڑے صحن میں کھڑے تھے۔ گاڑیاں زینے کے قریب پہنچا دی گئی تھیں۔ بلکہ بیرونی دروازے پر کھڑا تھا۔ ایک ادھیڑ عمر اردلی اور ایک زرد و نو جوان افسر سے، جس کا بازو گلے کی پٹی میں لٹک رہا تھا، باتیں کر رہا تھا۔ بلکہ جب اپنے آکا کو دکھا، اس نے دونوں کی جانب واضح اور واجب التحیل اشارہ کیا کہ دونوں وہاں سے چلے جائیں۔ ”ہونہد، واسیج، سب تیاریاں کھل ہو گئیں؟“ کاؤنٹ نے اپنا گنجا سر کھجاتے ہوئے پوچھا۔ اس نے اردلی اور افسر پر شفقانہ نظر ڈالی (کاؤنٹ ہمیشہ نئے چہرے دیکھنا پسند کرتا تھا) اور اپنی گردن کو ذرا سا خم دیا۔

”یوٹا ایکسی لینسی، ہم چٹکی بجاتے گھوڑے جوت سکتے ہیں۔“

”بہت خوب۔ جونہی کاؤٹشس بیدار ہوئیں اور خداوند کی مرضی ہوئی، ہم چل پڑیں گے، ہمدردان، کیا بات ہے؟“ اس نے افسر کی جانب متوجہ ہو کر مزید کہا۔ ”آپ میرے مکان میں مقیم ہیں؟“

افسر نزدیک آگیا اور ایک کیلی اس کا چہرہ مال سرخ ہو گیا۔

”کاؤنٹ خدا کے لیے... مجھے اپنے کسی چھکڑے کے کوٹے کھدے میں جکدے دیں! میں بالکل مالی ہاتھ ہوں... مجھے سامان کے ساتھ سفر کرنے میں کوئی اعتراض نہیں...“

افسر نے اپنی بات ختم بھی نہ کی تھی کہ اردولی اپنے افسر کی جانب سے وہی التجا دہرانے لگا۔

”بالکل، بالکل!“ کاؤنٹ نے تعجیل سے کہا۔ ”مجھے بہت خوشی ہوگی، بہت خوشی ہوگی۔ داسلچ تم انتظام کر رہا۔ ایک دو چھکڑے خالی کرالو... مثلاً وہ... یا... خیر، جس کی بھی ضرورت ہو... کاؤنٹ نے بہم سا حکم دے دیا۔ لیکن شکرے کے طور پر افسر کا چہرہ جس طرح تھمتانے لگا، اس نے حکم پر ہر تصدیق ثبت کر دی۔ کاؤنٹ نے اپنے ارد گرد نظر دوڑائی۔ اسے ہر جگہ۔ صحن، صددروازوں، بنگلی حصے کے درپوں میں۔ دُخی اور اردولی دکھائی دے۔ سب کی نگاہیں اس پر جمی ہوئی تھیں اور وہ پورچ کی جانب آرہے تھے۔

”یوٹا ایکسی لینسی ہاپ گیلری میں تشریف لے چلیں۔“ ہٹلر نے کہا۔ ”تصویروں کے تعلق کیا حکم ہے؟“

کاؤنٹ اس کے ساتھ اندر چلا گیا۔ وہ زخمیوں کی، جوان کے ساتھ جانا چاہتے تھے، درخواستیں قبول کرنے کے تعلق اپنا حکم دہرانا جا رہا تھا۔

”خیر، تم جانتے ہو کہ ہم کچھ سامان اتار سکتے ہیں۔“ اس نے دُخمے اور رازدارانہ لہجے سے کہا جیسے اسے اندیشہ ہو کہ کہیں اس کی بات دوسروں کے کانوں میں نہ پڑ جائے۔

نوبے کاؤٹشس بیدار ہو گئی اور ماتر یونا تھو فوننا، جو مالکہ کی شادی سے پہلے اس کی ذاتی خادہ تھی اور اب اس کے لیے ایک قسم کی چیف پولیس دوسن کے فرائض سرانجام دیتی تھی، اسے یہ بتانے آئی کہ مادام شوہر غصے سے لال پکی ہو رہی ہے اور یہ کہ چھوٹی بیٹیوں کے گر، لی ڈریس غالباً پیچھے نہیں چھوڑے جاسکتے۔ پچھ گچھ کرنے پر کاؤٹشس کو معلوم ہو کہ مادام شوہر اس لیے خفا ہے کہ کیونکہ اس کا ٹرک چھکڑے سے اتار دیا گیا ہے۔ ویسے بھی تمام چھکڑوں کی رسیاں کھولی جارہی تھیں اور سامان، اتاراجار ہاتھ تاکہ زخمیوں کے لیے، جنہیں کاؤنٹ نے اپنی سادگی کی بنا پر ساتھ لے جانے کی ہامی بھری تھی، جگہ پائی جاسکے۔ کاؤٹشس نے اپنے شوہر کو بلا بھیجا۔

”مائی ڈیر، کیا معاملہ ہے؟ میں نے سنا ہے کہ سامان اتاراجار ہا ہے۔“

”ma chere، تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ میں اسی سلسلے میں تم سے بات کرنا چاہتا تھا... ڈیر لائل کاؤٹشس...“

میرے پاس ایک افسر آیا تھا... وہ سب ہاتھ جوڑ رہے ہیں کہ میں انہیں زخمیوں کے لیے چند چھکڑے دے دوں...

چند اشیا ہی کا تو معاملہ ہے، انھیں با آسانی بعد میں بھی خریدا جاسکتا ہے۔ لیکن سوچو، اگر انھیں یہیں بھونڈ دیا گیا، پھر ان کا کیا بنے گا!... وہ یہاں عین ہمارے صحن میں ہیں۔ ہم نے خود انھیں یہاں آنے کی دعوت دی تھی... اور ان میں بھی افسر بھی ہیں.. ma chere تم جانتی ہو، میرا واقعی یہ خیال ہے.. کہ انھیں اپنے ساتھ لے چلیں۔ آخر جلدی کیا ہے؟“

کاؤنٹ، جیسا کہ اس کی عادت تھی، جب بھی روپے پیسے کا معاملہ ہوتا، ہمیشہ ڈرتے جھکتے بات کرتا۔ اب بھی وہ اسی انداز سے گفتگو کر رہا تھا۔ کاؤنٹس اس بچے سے خوب آگاہ تھی۔ یہ غیر متغیر طور پر ہمیشہ ایسے منصوبے کا، جو اس کے بچوں کے مفادات کے لیے مضرت رسا ہوتا، پیش خیمہ ہوتا تھا: مثلاً کسی نئی گیلری یا پورے گاؤ کی تعمیر کی پرائیویٹ تھئیریا آرکسٹرا کا افتتاح۔ چنانچہ اس قسم کے ذرے سبھی لہجے میں جس بات کا ڈھکا چھپایا کھڑا ہوتا، وہ ہمیشہ اس کی مخالفت کرنا اپنا فرض گردانتی۔

اس نے جھٹ پٹ ایسا انداز اختیار کر لیا جیسے وہ اپنی قسمت پر صبر بردش کر ہو بیٹس دل میں سخت اذیت محسوس کر رہی ہو اور اپنے شوہر سے بولی:

”کاؤنٹ، میری بات سنیں۔ آپ معاملات میں ایسی بد نظمی کرتے ہیں کہ گھر میں کچھ نہیں بچا۔ اور اب آپ ہماری۔۔۔ سب بچوں کی۔۔۔ املاک کو ڈرے کے ڈیر میں پھینکنا چاہتے ہیں! کیوں؟ آپ نے خود مجھے بتایا تھا کہ اس گھر میں جو ساز و سامان ہے، اس کی قیمت ایک لاکھ روٹل ہے۔ مائی ڈیئر، میں آپ کی بات نہیں مان سکتی، میں اس پر مصدا نہیں کر سکتی۔ آپ کا جو جی چاہے، کہیں، لیکن رخیوں کی دیکھ بھال حکومت کا کام ہے۔ انھیں یہ معلوم ہے۔ سامنے والے لاپوختوں کو لیں۔ دو روز قبل وہ سب کچھ یہاں سے لے گئے تھے۔ یہ ہے دوسرے لوگوں کا حاس۔ صرف ہمیں اس قسم کے ذمہ ہیں۔ اگر آپ کو میرا خیال نہیں، کم از کم اپنے بچوں کا خیال کر لیں۔“

کاؤنٹ نے بے چارگی کے عالم میں فضا میں ہاتھ بلند کیے اور کچھ کہے بغیر باہر نکل گیا۔

”پاپا، کیا بات ہے؟“ ننا شانے، جو اس کے پیچھے پیچھے اپنی اماں کے کمرے تک آئی تھی، پوچھا۔

”کچھ نہیں۔ یہ تمہارا مسئلہ نہیں!“ کاؤنٹ جھٹ کر بڑبڑایا۔

”لیکن میں سن چکی ہوں“ ننا شانے نے کہا۔ ”ماما کو کیا اعتراض ہے؟“

”تم اس پھٹے میں کیوں ٹانگ اڑا رہی ہو؟“ اس کے باپ نے جلا کر کہا۔

ننا شا کھڑکی کی جانب چل دی اور سوچنے لگی۔

”پاپا، برگ بھٹی ہمیں ملے آرہے ہیں۔“ اس نے درپے میں سے باہر جھانکتے ہوئے کہا۔

وردی پر چسپاں کر رکھے تھے اور وہ ابھی تک فوج دوم کے اوس ڈویژن کے نائب کمانڈر کے چیف آف سٹاف کے اسٹنٹ کے پرسکون اور طمانیت بخش عہدے پر فائز تھے۔

وہ یکم جنوری کو چھٹی پر ماسکو آیا تھا۔ اسے ماسکو میں کوئی کام نہیں تھا، لیکن اس نے دیکھا کہ فوج کا ہر شخص ماسکو جانے کے لیے، جہاں معلوم ہوتا تھا کہ انھیں کوئی نہ کوئی کام ہے، چھٹی لے رہا ہے، اس نے بھی خاندانی اور ذاتی امور کی دیکھ بھال کے لیے چھٹی کی درخواست دینا ضروری خیال کیا۔

برگ اپنے سر کے گھراپنی صاف ستھری اور بنی سنوری ٹم ٹم میں آیا۔ اس میں روح متند اور توانا چٹکے گھوڑے، جو عین عین ایک خاص پرس کے گھوڑوں سے مشابہ تھے، جتے ہوئے تھے۔ محن میں جو چٹکے کھڑے تھے، اس نے انھیں بغور دیکھا اور جب وہ سڑکیاں چڑھ رہا تھا، اس نے صاف ستھرا جیسی رمال نکال اور اس میں گرہ باندھ دی۔²¹

وہ ہلکے پھلکے لیکن بے قرار قدم اٹھاتا تھا۔ استقبالی کمرے سے ڈرائنگ روم میں داخل ہوا، کاؤنٹ سے نکل کر ہوا، شاہ اور سوتیلے کے ہاتھوں پر بوسہ دیا اور بہ بھلت ”ڈیئر ماما“ کی طبیعت کے بارے میں دریافت کرنے لگا۔
 ”طبیعت، اس زمانے میں!“ کاؤنٹ نے ہا آواز بلند کہا۔ ”چھوڑ دو، ہمیں کوئی خبر نہ ہو۔ فوج پیچھے مٹ رہی ہے یا کوئی اور بڑائی ہوگی؟“

”پاپا، ہمارے وطن کی تقدیر کا فیصلہ خدائے مہربان کے ہاتھوں میں ہے۔ فوج میں شجاعت کا جذبہ کوٹ کوٹ کر کھرا ہوا ہے اور ابھی لوگ کچھ کرنے کے لیے بے تاب ہیں اور اب بھی اس کے رہنما جلاس کر رہے ہیں۔ کوئی نہیں جانتا کہ آگے کیا ہوگا لیکن، پاپا، میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ فوج کے جذبہ شجاعت کو، جو از حد قدیم سے اس کا طرہ امتیاز چلا آ رہا ہے اور جس کا انھوں نے۔ جس کا انھوں نے۔ جس کا اس نے (اس نے اپنی تصحیح کی) چھبیس تاریخ کی لڑائی میں مظاہرہ کیا تھا، الفاظ میں بیان کرنا ناممکن ہے۔ پاپا، میں آپ کو یقین دلاتا ہوں“ (اس نے بالکل اسی انداز سے اپنے سینے پر دو ہتھ مارا جس طرح اس نے ایک جرنیل کو، جس نے بیحد ہی تقریر کی تھی، ارے دیکھا تھا۔ لیکن برگ سے اس سلسلے میں ذرا تاخیر ہو گئی۔ اسے یہ دو ہتھ ”روسی فوج“ کے الفاظ کے ساتھ مارنا چاہیے تھا۔) ”میں لگی لپٹی رکھے بغیر آپ کو تار ہا ہوں کہ ہم کمانڈر جوانوں کو ہڈ شیریں تو کیا دیتے، انکا ہمیں انھیں روکنے میں بڑی رقت پیش آئی۔... جی ہاں، انھوں نے جو شجاعانہ کارنامے سرانجام دیے، اس سے پرانے قوتوں کی بہادری کی داستانیں تازہ ہو گئیں۔“ اور وہ تڑپوتا چلا گیا۔ ”میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اپنے دستوں کے سربراہ کی حیثیت سے جنرل بارکے زوتولی ہر دم اپنی جان ہتھیلی پر لیے پھرتے رہے۔ ہماری کوروا میں کوہر نصیبات تھی۔ آپ خود صورت حال کا تصور کر سکتے ہیں!“

اور برگ طوطے کی طرح لڑائی کے متعلق وہ سب سنی سنائی باتیں، جو اسے یاد رہ گئی تھیں، دہرانے لگا۔ شاہ اس باتوں کا نہیں جمائے دیکھ رہی تھی جیسے وہ وہاں کسی مسئلے کا جواب تلاش کر رہی ہو۔ اس کی اس لگا ہوا توجہ سے وہ ہٹنا گیا۔

”بہ اعتبار مجموعی ہمارے ردی سو رماؤں نے جس رستی کا مظاہر کیا، اس کا لحاظ میں احاطہ نہیں کیا جاسکتا اور نہ اس کی تعریف و توصیف ممکن ہے!“ برگ نے تناشاک کی جانب اچھتی نظروں سے یوں دیکھتے ہوئے کہا جیسے وہ اس کی رضا جوئی کے لیے بے قرار ہو اور اس کی منہمک نگاہوں کے جواب میں لبوں پر تبسم لے آیا۔ ”دوس ما سکو میں نہیں ہے۔“ تو اپنے سپیوتوں کے قلوب میں رچا بسا ہے۔ کیوں پایا، ایسا نہیں؟“ اس نے کہا۔

اس لیے کاؤنٹر نشستی کمرے سے ڈرائنگ روم میں آئی۔ اس کی صورت پر پڑ مردگی اور خشکی بری رہی تھی۔ برگ جھٹ پٹ اٹھ کر کھڑا ہو گیا، اس نے اس کا ہاتھ چوما، اس کی صحت کے بارے میں پوچھ اور وہیں کھڑا رہا۔ ہمدردی کے اظہار کے طور پر وہ محض اپنے سر کو ادھر ادھر جنبش دینے لگا۔

”بیچ پوچھیں، ماما، یہ ایام ہر ردی کے لیے بھاری ہیں۔ لیکن آپ کیوں پریشان ہیں؟ ابھی وقت ہے، آپ آسانی سے یہاں سے نکل سکتے ہیں۔“

”سمجھ میں نہیں آتا کہ ان نوکروں کے ارادے کیا ہیں؟“ کاؤنٹر نے اپنے خاوند کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔ ”انہوں نے ابھی ابھی مجھے بتایا ہے کہ فی الحال کچھ بھی تیار نہیں۔ کسی کو سب کچھ اپنے ہاتھ میں لے لینا چاہیے۔ جب اس قسم کی فساد پڑتی ہے، متذکا یاد آتا ہے۔ یہ معاملہ ختم ہوتا نظر نہیں آتا۔“

کاؤنٹر کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن اس نے بڑی مشکل سے اپنے آپ کو روک لیا۔ وہ کرسی سے اٹھا اور دروازے کی جانب چل دیا۔

دریں اثنا برگ اپنا رومال نکال چکا تھا۔ وہ اپنی ناک چھسکنا چاہتا تھا کہ اس کی نظر گانٹھ پر پڑی۔ اس نے کچھ سوچا اور پر معنی انداز سے سر کو جنبش دی۔

”پاپا، میں آپ سے کچھ مانگنے آیا ہوں۔“ اس نے کہا۔
”ہم۔۔۔“ کاؤنٹر کا واحد جواب تھا۔

”میں ابھی ابھی یسوپوف کے گھر کے سامنے سے گزر رہا تھا،“ برگ نے ہستے ہوئے کہا، ”کہ سٹیوارڈ میں اس شخص کو جانتا ہوں، بھاگتا بھاگتا باہر آیا اور مجھ سے پوچھنے لگا کہ میں کچھ خریدنا چاہوں گا۔ میں عرض کر دیا کہ میں محض تجسس کی خاطر اندر چلا گیا۔ وہاں مجھے آرائشی الماری اور ڈرائنگ ٹیبل نظر آئے۔ آپ کو خوب یاد ہوگا کہ دیر کیا چاہتی تھی اور اس بارے میں تو ہماری ٹوٹو میں بھی ہوئی تھی۔“ (جب برگ نے الماری اور ڈرائنگ ٹیبل کا ذکر چھیڑا، غیر شعوری طور پر اس کے لہجے میں طمانیت جھلکنے لگی جو اس امر کی عین تھی کہ اپنی دانست میں وہ اپنے گھریلو معاملات جس قابل تحسین انداز سے چلا رہا تھا، اس پر وہ بے حد خوش ہے۔) ”الماری بہت خوبصورت ہے۔ درازیں آسانی سے کھل جاتی ہیں۔ اس میں خفیہ انگریزی دراز ہے۔ دیر کی دیر سے تمنا ہے کہ اس قسم کی الماری اس کے پاس بھی ہو۔ میں اسے یہ تحفہ دے کر حیران کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے صحن میں چھکڑے دیکھے تھے۔ میں ایک مجھے عنایت کر دیں۔ میں اس کے مالک کو منہ مانگی رقم دے دوں گا اور۔۔۔“

کاؤنٹ کے ماتھے پر ہل پڑ گئے اور اس نے کھٹکار کر اپنا کلاماف کیا۔

”کاؤنٹس سے پوچھ لو۔ میں نے حکم نہیں دیتا۔“

”اگر آپ کے لیے کوئی مشکل ہو، پھر تکلیف نہ کریں۔“ برگ نے کہا۔ ”میں صرف ڈیڑھ دیر کی خاطر فریڈ

چاہتا تھا۔“

”تم سب جہنم میں جاؤ۔ جہنم میں، جہنم میں، جہنم میں!“ معمر کاؤنٹ نے چلا کر کہا۔ ”میرا سر گھوم رہا ہے!“

اور وہ گمرے سے باہر نکل گیا۔

کاؤنٹس روئے لگی۔

”ہاں، ماہ، یہ ایام واقعی بہت کٹھن ہیں!“ برگ نے کہا۔

نٹاشا اپنے باپ کے ساتھ باہر نکل گئی۔ پھر جیسے اس کے لیے کسی معاملے کے بارے میں فیصلہ کرنا دشوار ہو

رہا ہو، وہ پہلے تو اپنے باپ کے پیچھے باہر گئی، پھر واپس مڑی اور دوڑتی بھاگتی میڑھیوں سے نیچے اترے لگی۔

پیتا پورج میں تھا۔ وہ نوکروں میں ہتھیار تقسیم کر رہا تھا۔ انھیں ان کے ساتھ ماسکوں سے باہر جانا تھا۔ لہے

ہوئے چھکڑے ابھی تک محن میں کھڑے تھے۔ دو کی رسیاں کھولی جا چکی تھیں اور ایک پر ایک زخمی انفر اپنے اردلی

کی مدد سے سوار ہو رہا تھا۔

”تمہیں معلوم ہے کہ معاملہ کیا ہے؟“ پیتا نے نٹاشا سے پوچھا۔

نٹاشا جانتی تھی کہ وہ یہ معلوم کرنا چاہتا ہے کہ ان کے والدین میں بھگڑا کس بات پر ہوا ہے۔ وہ چپ رہی۔

”اس لیے کیونکہ پاپا تمام چھکڑے زخمیوں کو دینا چاہتے تھے۔“ پیتا نے کہا۔ ”والیج نے مجھے بتایا تھا۔ میرے

خیال میں۔“

”میرے خیال میں“ نٹاشا قریب قریب چیخ رہی تھی، ”میرے خیال میں یہ سب کچھ نہایت کمزور، گھٹاؤنا اور

نظرت انگیز ہے۔“ اس نے اپنے بھائی کو غیظ و غضب سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”اتنا... پتا نہیں کیا کیا ہم سب

جرمنوں کی طرح گھٹیا لوگ ہیں؟“

نٹاشا ہلکیوں سے اس کا گلا کپکپانے لگا اور اس اندیشے کے پیش نظر کہ کہیں اس کے غصے کی قوت کمزور یا

ضعیف نہ ہو جائے، وہ مڑی اور اندھا دھند میڑھیاں پھلاتے لگی۔

برگ کاؤنٹس کے قریب بیٹھا تھا اور پیرانہ احرام کی نمائش سے، سے تسلی دما سادینے کی کوشش کر رہا تھا۔

کاؤنٹ ہاتھ میں پامپ پکڑے کمرے میں چکر لگا رہا تھا۔ اتنے میں نٹاشا، جس کی غصے سے شکل بگڑ رہی تھی، بگولے

کی طرح کمرے میں داخل ہوئی اور بلاتا خیریاں کی طرف لپکی۔

”یہ نرمی رفاقت ہے! پر لے رہے کا گھٹیا پن ہے!“ وہ پوری قوت سے پٹا رہی تھی۔ ”آپ سے یہ توقع

نہیں تھی کہ آپ اس قسم کا حکم دیں گی!“

برگ اور کاؤٹنس کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ ہو کیا رہا ہے۔ ٹنگ ٹنگ دیرم، دم نہ کشیدم، وہ تصویر حیرت بننے لگی باندھے اسے دیکھنے لگے۔ کاؤٹن درتپے کے قریب کھڑا تھا لیکن اس کے کان ادھر ہی تھے۔

”ماما، یہ ناممکن ہے۔ دیکھیں، صحن میں کیا ہو رہا ہے؟“ اس نے چلا کر کہا۔ ”وہ ہمیں رو جائیں گے۔“
”کیا ہوا تمہیں؟“ وہ کون ہیں؟ کیا چاہتی ہو؟“

”میں زخمیوں کی بات کر رہی ہوں! ماما، آپ ایسا نہیں کر سکتیں! یہ شرم ناک بات ہے!۔ ماما ڈارلنگ، یہ اخلاقیات درست نہیں ہے۔ مجھے معاف کر دیں، ڈیئر سٹ۔۔۔ ہمیں یہ سب چیزیں کیا کرنا ہیں۔ صرف یہ دیکھیں کہ وہاں کیا ہو رہا ہے۔ ماما، ہم یہ نہیں کر سکتے۔“

کاؤٹن گردن گھمائے بغیر متاشا کی گفتگو سن رہا تھا۔ اس نے ناک سڑکی اور اپنا منہ کھڑکی کی طرف کر لیا۔ کاؤٹنس نے غور سے اپنی بیٹی کی طرف دیکھا۔ اسے احساس ہوا کہ بیٹی کو ماں سے کتنی شرم آرہی ہے۔ وہ کچھ گئی کہ اس پر بھالی کیفیت کیوں طاری ہے اور اسے یہ تفہیم بھی ہو گئی کہ اس کا شوہر کیوں اس سے نظریں چرا رہا ہے اور وہ پریشانی کے عالم میں اپنے گرد و پیش دیکھنے لگی۔

”اف، جو جی میں آئے، کرو! کیا میں کسی کے کام میں مغل ہو رہی ہوں؟“ اس نے کہا۔ وہ اپنی اسفورد ہار نہیں ماننا چاہتی تھی۔

”ماما، ڈارلنگ، مجھے معاف فرمادیں!“

لیکن کاؤٹنس نے اپنی بیٹی کو دھکیل کر پرے کر دیا اور خود کاؤٹن کے پاس چلی گئی۔

”mon cher، آپ جس طرح مناسب سمجھیں، کریں۔۔۔ آپ جانتے ہیں کہ مجھے ان باتوں کی سمجھ کہاں۔“
اس نے نگاہیں جھکائے خطا کارانہ انداز سے کہا۔

”چوزے۔۔۔ چوزے مرغی کو سبق پڑھا رہے ہیں۔۔۔“ کاؤٹن بڑبڑایا۔ خوشی سے اس کی آنکھوں میں آنسو پھٹکنے لگے اور وہ اپنی بیوی سے، جسے اس کی پھاتی میں اپنا منہ چھپا کر صحیح معنوں میں مسرت ہونے لگی تھی، ہنسل مگر ہو گیا۔

”پاپا! ماما! میں جا کر دیکھوں؟ اجازت؟“ متاشا نے با آواز بلند کہا۔ ”جن چیزوں کی ہمیں واقعی ضرورت ہے، وہ ہم اب بھی اپنے ساتھ لے جاسکتے ہیں۔“

کاؤٹن نے سر سے اشارہ کیا اور متاشا ایک دم نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ وہ اچکتی پھدکتی باں روم میں سے گزرتی استقبالیہ کمرے میں پہنچی اور وہاں سے وہ اسی تیزی سے، جس تیزی سے وہ بچپن میں آنکھ پھٹی بھانپنے بھاگا کرتی تھی، میڑھیاں اترتی صحن میں پہنچ گئی۔

نو کروں چا کروں نے متاشا کے گرد گمیر ڈال دیا۔ لیکن جو عجیب و غریب حکم وہ لے کر آئی تھی، اس پر اصرار

یقین نہیں آ رہا تھا تا آنکہ کاؤنٹ نے بنفس نفیس اپنی بیوی کے نام پر ان ہدایات کی تصدیق نہ کر دی کہ ٹرنک واپس سٹور روم میں پہنچا دیے جائیں اور چھکڑوں سے زخموں کے سپرد کر دیے جائیں۔ جس طرح پندرہ منٹ پہلے انھیں اس بات میں کوئی تباہت نظر نہیں آ رہی تھی کہ زخمی چھوڑ دیے جائیں، درگزر یو سائنز کا دلیا جائے، اسی طرح اب انھیں نئی ہدایات عجیب معلوم نہیں ہو رہی تھیں بلکہ اس کے برعکس انھیں کوئی دوسری راہ عمل ممکن ہی نظر نہیں آتی تھی۔ چنانچہ وہ اپنے کام میں بڑے ذوق و شوق سے جت گئے۔ انھیں یہ سب کچھ عین فطری دکھائی دے رہا تھا۔

پورا گھر نا، گویا اس بات کی علامت کرنے کے لیے کہ انھوں نے یہ کام پہلے کیوں نہ کیا، پورے جوش و خروش سے زخموں کو چھکڑوں میں سوار کرانے میں مصروف ہو گیا۔ فوجی گھنٹے گھنٹاتے کمروں سے باہر گئے اور چھکڑوں کے ارد گرد ہجوم کرنے لگے۔ ان کے چہرے بے شک پہلے تھے لیکن اب وہ مسرت سے دمک رہے تھے۔ خبر پھیل گئی کہ دستوں کے چھکڑوں میں جگہ مل سکتی ہے، چنانچہ اڑوں پڑوں کے مکانات میں متیم زخموں نے ان کے گمن پر یقار کر دی۔ بعض بھر دھین ان سے استعجا کرنے لگے کہ چھکڑوں سے ٹرنک نہ اتارے جائیں، بلکہ انھیں محض ان کے اوپر بیٹھنے کی اجازت دے دی جائے۔ لیکن جب ایک مرتبہ سامان اتارنے کا سلسلہ شروع ہو گیا، اسے رد نہ کیا سکا۔ اب اس بات کی کوئی اہمیت نہیں رہ گئی تھی کہ تمام کی تمام یا نصف شیاو ہیں چھوڑی جا رہی ہیں۔ چھتی کے برتنوں، کاشی کی اشیا، تصویروں اور آئینوں سے بھرے بکس، جنھیں گزشتہ شب اتنی احتیاط سے باندھا گیا تھا، گمن میں ادھر ادھر بکھرے پڑے تھے، لیکن اس کے باوجود ان کی پیہم یہی کوشش تھی کہ فلاں فلاں چیز اتار لی جائے تاکہ زخموں کے لیے ایک اور، ایک اور، مزید ایک اور چھکڑا خالی ہو جائے اور وہ اپنی سہی میں کامیاب رہیں۔

”ہمارے پاس چار مزید آدمیوں کی گنجائش ہے۔“ سٹیوارڈ نے کہا۔ ”وہ میرا چھکڑا لے سکتے ہیں، ورنہ ان کا کیا بنے گا؟“

”جس چھکڑے میں میری وارڈ روم ہے، وہ انھیں دے دو۔“ کاؤنٹس نے کہا۔ ”وہ شا میری گاڑی میں بیٹھ سکتی ہے۔“

انماری اتار لی گئی اور چھکڑا پڑوں کے چوتھے مکان سے زخمی اٹھانے کے لیے بھیج دیا گیا۔ نوکروں چاکروں سمیت گھر کے تمام افراد کی خوشی سے باچھیں کھلی جا رہی تھیں۔ ناشا کی مسرت کا کوئی ٹھکانا نہ تھا۔ ایسا سرد اسے کافی مریص سے نہیں ملا تھا۔

”اسے کس سے باندھیں؟“ ایک نوکر نے پوچھا۔ وہ ایک گاڑی کے پیچھے تنگ پائیدان پر ٹرنک حائے کی کوشش کر رہا تھا۔ ”ہمیں کم از کم ایک چھکڑا رکھ لینا چاہیے۔“

”اس میں کیا ہے؟“ ناشا نے پوچھا۔

”کاؤنٹ کی کتابیں۔“

”اسے رہنے دو۔ واسیلج سفہاں لے گا۔ اس کی ضرورت نہیں۔“

نشن مسافروں سے کھپا کھچ بھر چکی تھی۔ مسئلہ یہ تھا کہ کاؤنٹ بیوٹرالینج (پیتا) کہاں بیٹھے گا۔

”ڈرائیور کے ساتھ۔ پیتا، تم ڈرائیور کے ساتھ بیٹھ جاؤ۔ بیٹھ جاؤ گے نا؟“ نتاشا نے با آواز بلند پوچھا۔ اس تمام عرصے کے دوران میں سونیا بھی مصروف رہی تھی لیکن اس کی مسامی کامرکزہ محو نتاشا سے قطعاً مختلف تھا۔ جو اشیا چھوڑ جانا تھیں، کاؤنٹس کی خواہش کے مطابق وہ انھیں سینت بیست کر رکھ رہی اور ان کی فہرست بنانا بھی تھی۔ وہ اب بھی اس بات کا پورا اہتمام کر رہی تھی کہ جتنی زیادہ سے زیادہ اشیا ساتھ لے جائی جاسکتی ہیں، لے جائی جائیں۔

17

دو بجے روپہر تک رستوفوں کی چاروں گاڑیاں ٹھسا ٹھس لد چکی اور صدر دروازے پر روانگی کے لیے تیار کھڑی تھیں۔ ایک ایک کر کے چھکڑے، جن میں زخمی سوار تھے، قطار بنائے محکم سے باہر آنے لگے۔

سونیا اور ایک خادمہ بے حد کشادہ اور سرب فلک گاڑی کے پائیدان پر کھڑی کاؤنٹس کے لیے آرام دہ نشست بنانے سنوارنے میں مصروف تھیں کہ ناگہ سونیا کی نظر اس کالاش پر پڑی جس پر پرنس آندرے لیٹا ہوا تھا اور جو پورچ میں سے گزر رہی تھی۔

”یہ کالاش کس کی ہے؟“ اس نے گاڑی کی کھڑکی میں سے جھد نکلتے ہوئے پوچھا۔

”ایس، بی بی جی، آپ نے نہیں سنا؟“ خادمہ نے جواب دیا۔ ”زخمی پرنس۔ انھوں نے رات یہاں گھر میں گزاری تھی اور اب وہ ہمارے ساتھ جا رہے ہیں۔“

”کون ہیں یہ؟ کیا نام ہے ان کا؟“

”وہی ہمارے سابقہ منگیتر، پرنس بلکونسکی!“ خادمہ نے زور سے آہ بھری۔ ”سنا ہے کہ وہ آخری دسوں پر ہیں۔“ سونیا نے گاڑی سے چھانگ لگائی اور کاؤنٹس کی جانب بھاگی۔ کاؤنٹس ٹوپی پہنے اور شال اوڑھے سڑک کے لیے تیار ہو چکی تھی اور تھکے ماندے انداز سے ڈرائنگ روم کے چکر کاٹ رہی تھی۔ وہ گھر کے دیگر افراد کا انتظار کر رہی تھی تاکہ روایت کے مطابق وہ قبل از سفر وہاں اکٹھے ہو جائیں اور بند دروازوں کے پیچھے خاموشی سے دعا کریں مانگیں۔ نتاشا کمرے میں نہیں تھی۔

”maman، سونیا نے کہا۔ ”پرنس آندرے یہاں ہیں۔ وہ زخمی ہیں اور زندگی کی آخری گھڑیاں گزر رہے

ہیں۔ وہ ہمارے ساتھ جا رہے ہیں۔“

کاؤنٹس کو سخت دھچکا لگا اور وہ حیرت سے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگی۔ اس نے مضبوطی سے سونیا کا بازو پکڑا اور اپنے گرد و پیش نگاہیں دوڑانے لگی۔

”نناشا؟“ اس نے زیر لب کہا۔

ان ابتدائی لحات کے دوران میں ان دونوں کے لیے خبر کا صرف ایک ہی مفہوم تھا۔ وہ اپنی نناشا کو جانتی تھیں۔ یہ آدی ان دونوں کو پسند تھا لیکن انھیں اس سے کتنی ہی ہمدردی کیوں نہ تھی، اس کے مقابلے میں اس اطلاع کا نناشا پر کیا اثر ہوگا، اس کا خوف کہیں زیادہ ورنہ تھا۔

”نناشا کو ابھی نہیں معلوم مگر وہ ہمارے ساتھ جا رہے ہیں،“ سونیائے کہا۔

”تم نے کہا تھا کہ لب مرگ ہے؟“

سونیائے اثبات میں گردن ہلا دی۔

کاؤنٹس نے سونیا کو اپنے بازوؤں میں لے لیا اور زارو قطار رونے لگی۔

”خداوند کے ڈھنگ²² معلوم کرنا ہمارے بس کی بات نہیں ہے!“ اس نے سوچا۔ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ

مشیت ایزدی اپنی قدرت کا ملکہ کا اظہار اس سب کچھ میں، جو وقوع پذیر ہو رہا تھا، کر رہی ہے۔

”اما، سب تیاریاں مکمل ہو گئی ہیں۔... کیا بات ہے؟“ نناشا کہہ کڑے لگاتی بھاگی آ رہی تھی۔ شوخی اور شگفتگی

اس کی نسناس سے پھوٹ رہی تھی۔

”کچھ نہیں۔“ کاؤنٹس نے جواب دیا۔ ”اگر سب تیاریاں مکمل ہو گئی ہیں، پھر آؤ، چلیں۔“

اپنے مضطرب چہرے کو چھپانے کے لیے کاؤنٹس اپنے سینٹر بیگ پر جھک گئی۔ سونیا نناشا سے بغل گیر ہونے

اور اس کے رخسار چومنے لگی۔ نناشا اسے خطر تحسین دیکھنے لگی۔

”کیا بات ہے؟ کیا ہوا؟“

”کچھ نہیں۔ کچھ نہیں۔...“

”کوئی بہت بری خبر، میرے متعلق؟... بات کیا ہے؟“ نناشا وجدانی لہجے میں اصرار کر رہی تھی۔

سونیا نے زور سے آہ بھری اور اپنی زبان بند رکھی۔ کاؤنٹ، دام شوش، ماورا کز می بیٹا اور واسیچ زراٹنگ روم

میں داخل ہوئے۔ جب سب دروازے بند ہو گئے، وہ بیٹھ گئے اور ایک دوسرے کی جانب دیکھے بغیر کئی لمحے خاموش

رہے۔

سب سے پہلے کاؤنٹ اٹھا۔ اس نے گہری اور لمبی سانس لی اور ایٹھونے کے سامنے اپنے سینے پر صلیب کا

نشان بنانے لگا۔ دوسروں نے اس کی تقلید کی۔ پھر کاؤنٹ نے ماورا کز می بیٹا اور واسیچ سے معافہ کیا۔ ان دونوں

نے ماسکو میں ہی ٹھہرے رہے تھے اور جب انھوں نے کاؤنٹ کا ہاتھ تھام کر اس پر بوسہ دیا، اس نے انھیں تھکی دی

اور تسلی دلا سے۔ وہ پیر کے چند مبہم الفاظ کہے۔ کاؤنٹس عبادت کے کمرے میں چلی گئی۔ سونیائے اسے ایقونوں

کے سامنے، جو کہیں کہیں دیواروں پر لٹکے رہنے دیے گئے تھے، (انتہائی قیمتی ایقونے، جن کے ساتھ خاندانی روایات

وابستہ تھیں، ساتھ جا رہے تھے۔)، جھکے ہوئے پایا۔

جو نوکر چاکر ساتھ جا رہے تھے۔ ان سب کو پیتانے تلواروں اور نیزوں سے مسلح کر دیا تھا۔ وہ چٹلوں کی مہرباں اونچے بوٹوں میں ٹھونسے، پیشیاں اور کمر بند کسے، ان ملازمین سے جنہیں پیچھے چھوڑ جا رہا تھا، پورچ اور کچن میں وداع ہو رہے تھے۔

جیسا کہ ہمیشہ سے ہوتا چلا آیا ہے، بوقتِ روانگی متعدد اشیاء بھول گئیں یا غلط جکسوں میں بند ہو گئیں اور خدمت گاروں کو، جنہوں نے کاؤنٹس کو سوار ہونے میں مدد دینا تھی، گاڑی کے دروازے اور پائیدان کے دونوں اطراف کھڑے ہو کر خاصی دیر انتظار کرنا پڑا جب کہ خادماؤں کی کٹن ڈھونڈ رہیں اور مکان اور گاڑیوں کے مابین مختلف بندلوں کی آمد و رفت بھی جاری رہی۔

”جب تک ان کی زندگی ہے، یہ سدا کچھ نہ کچھ بھولتے ہی رہیں گے!“ کاؤنٹس نے کہا۔ ”تم جانتی ہو کہ میں اس طرح نہیں بیٹھ سکتی۔“

اور دنیا شمار ونی صورت بنائے اور راست بھینچے، کہ کہیں اس کے منہ سے جواب نہ نکل جائے، کو در گاڑی میں داخل ہوئی اور نیکیے وغیرہ دوبارہ درست کرنے لگی۔

”اف، یہ تو کر چاکر!“ کاؤنٹ نے کہا۔

بوڑھ کو جوان یشیم واحد شخص تھا جس پر کاؤنٹس کو اعتبار تھا کہ وہ ڈھنگ سے گاڑی چلاتا ہے۔ وہ بکس پر بیٹھ گیا۔ اس نے اتنا بھی نہ کیا کہ ذرا یہ دیکھ لیتا کہ اس کے عقب میں کیا ہو رہا ہے۔ تیس سال کے تجربے نے اسے یہ سکھ دیا تھا کہ ابھی انہیں یہ کہنے میں، کہ ”چلو، خداوند ہماری مدد فرمائے!“ کچھ وقت لگے گا، بلکہ یہ کہنے کے بعد بھی اسے کم از کم دوسرے دروازے کا جائے گا کیونکہ کوئی نہ کوئی چیز رہ جائے گی اور اس کا منگوایا جانا ضروری ہوگا۔ اس کے بعد کاؤنٹس جنس جنس گاڑی سے سر باہر نکالے گی اور اسے خداوند کا واسطہ دے گی کہ وہ پہاڑی سے اترتے وقت گاڑی احتیاط سے چلائے۔ اسے یہ سب کچھ معلوم تھا، چنانچہ وہ گھوڑوں کی نسبت (خاص طور پر مشکلی فالکن جو قریب تھا، زمین پر ٹھوکریں مار رہا اور لگام کا دہانہ چب رہا تھا) کہیں زیادہ صبر و تحمل سے انتظار کر رہا تھا۔ آخر کار سب لوگ بیٹھ گئے، پائیدان لپیٹ دیا گیا، دھماکے سے دروازہ بند ہو گیا، جو سفری بکس رہ گیا تھا، منگوایا جا چکا اور کاؤنٹس نے جو کچھ کہنا تھا، کہا جا چکا تھا، تب یشیم نے آہستہ سے ہیٹ اتار اور اپنے سینے پر صلیب کا نشان بتایا۔ اس سوار معادن اور دیگر تمام ملازمین نے اس کی تقلید کی۔

”خداوند ہماری مدد فرمائے!“ اس نے ہیٹ پہنتے ہوئے کہا۔ ”چلو!“

اس سوار معادن نے گھوڑوں کو چابک دکھایا، دائیں طرف کے گھوڑے نے اس کے کالر کو جھکادیا، اوپر کے سپرنگ چڑھائے اور کوچ جموں نے لگی۔ جب کوچ جھٹکے کھاتی صحن سے غیر سوار سڑک پر آئی، وردی پوش ملازم نے جست لگائی اور چلتی گاڑی کے بکس پر سوار ہو گیا۔ دوسری گاڑیاں بھی اسی طرح جھٹکے کھاتی ان کے پیچھے پیچھے چل پڑیں اور جلوس کی شکل میں سڑک پر چلنے لگیں۔ جب گاڑیاں سامنے کے گرجے کے بالقابل گزریں، تمام

گاڑیوں کے مسافروں نے اپنے سینوں پر صلیب کے نشانات بنائے۔ جن ملازمین نے ہسکوس ہی قیام کرنا تھا، وہ مسافروں کو، لوداخ کہنے گاڑیوں کی دونوں جانب پیدل چل رہے تھے۔

ناتشا کو اب جس قسم کے پرسترس احساس کا تجربہ ہو رہا تھا، اس سے قبل کبھی نہیں ہوا تھا۔ وہ گاڑیوں کے قریب بیٹھی تھی اور نکلنے والے اجڑے اور پر ہیجان شہر کی دیواروں کو، جو پیچھے رہتی جا رہی تھیں، دیکھ رہی تھیں۔ کبھی کبھار وہ گاڑی کی کھڑکی سے سر ہار نکالتی، کبھی پیچھے اور کبھی آگے نظریں دوڑاتی اور اسے اپنے سامنے چمکڑوں کی، جن میں زخمی فوجی سوار تھے، اور جوان کے آگے آگے جا رہے تھے، تھار دکھائی دیتی۔ تقار میں تقریباً سب سے آگے اسے پرنس آندرے کی کالاش کی چھت، جو اوپر اٹھی ہوئی تھی نظر آ سکتی تھی۔ اسے معلوم ہی نہیں تھا کہ اس میں کون سا سوار ہے لیکن ہر بار جب وہ جلوں کو نکلتی، اس کی نگاہیں اسی گاڑی کو تلاش کرنے لگتیں۔ وہ جانتی تھی کہ یہ سب سے آگے ہوگی۔

کھردرو (محلے) کی نکت سکایا، پرستانیا اور پرنوونسکایا سڑکوں سے رستوں کی گاڑیوں سے ملتی جلتی گاڑیوں کے متعدد دیگر قافلے برآمد ہونے لگے اور جب وہ سادوایا سٹریٹ میں داخل ہوئے، ساری سڑک پر دود گاڑیاں اور چمکڑے ایک دوسرے کے برابر برابر چل رہے تھے۔

جب وہ سفاریف مینار کا چکر کاٹ رہے تھے، ناتشا، جس کی تجسس، مستعد اور چمک لگاہیں پیدل اور گاڑیوں میں سوار لوگوں کا جائزہ لے رہی تھیں، اچانک تعجب اور سرست سے چلا اٹھی۔

”خدا لیا! ہانا، سونیا، دیکھو، دیکھو۔ یہ تو وہی ہیں؟“

”کون؟ کون؟“

”دیکھو، یہ واقعی بزدل خوف ہیں!“ ناتشانے با آواز بلند کہا۔ وہ اپنا سر گاڑی کی کھڑکی سے باہر نکالتے ہوئے تھی اور نکلنے والے لیے ترنگے اور محم شمیم شخص کو دیکھ رہی تھی۔ اس شخص کے جسم پر کوچوں کا کوٹ تھا لیکن اس کی چال ڈھال اور طور طریق سے صاف معلوم ہوتا تھا کہ اس نے بھی ضرور بدل رکھا ہے مگر صاف اس کا تعلق جفہ اشرف سے ہے۔ وہ سفاریف مینار کی محراب کے نیچے سے گزر رہا تھا اور اس کے ساتھ ایک زرد وادہ بے ریش پست قامت شخص، جو مونے کھردروے اوٹی کوٹ میں بلوئیں تھا، چل رہا تھا۔

”یہ واقعی بزدل خوف ہیں۔ انھوں نے کوچوں کا کوٹ پہنا ہوا ہے اور ان کے ساتھ کوئی عجیب الہیت نکلتا شخص ہے۔“ ناتشانے کہا۔ ”لو دیکھ لو، خورد دیکھ لو!“

”نہیں، یہ وہ نہیں ہیں! کیوں احمقانہ باتیں کر رہی ہو؟“

”ہانا، میں سرکٹوانے کے لیے تیار ہوں۔“ ناتشانے تکیسی آواز سے چلاتے ہوئے کہا۔ ”رہی شرط؟ میری

بات مانیں، سیدھی ہیں! روکو! گاڑی روکو!“ اس نے کوچوان سے کہا۔

لیکن کوچوان رک نہیں سکتا تھا کیونکہ پیش چانسکایا سٹریٹ سے مزید گاڑیاں آ رہی تھیں اور لوگ چلا چلا کر

”اف، مجھ سے مت پوچھیں، مت پوچھیں! خود مجھے کچھ پتا نہیں۔ کل... مگر نہیں! خدا حافظ، خدا حافظ۔“ وہ بڑا ہلکا سا بڑا وقت ہے! وہ گاڑی کے پیچھے ہو گیا اور فٹ پاتھ پر چڑھ گیا۔

مناشیانے اپنا سر کانی دیر تک کھڑکی میں سے باہر نکالے رکھا۔ اس کا چہرہ ہر سرت، ہر بھری اور قدرے متغیر نہ مسکراہٹ سے دمک رہا تھا۔

18

چیز جب دو روز پیشتر اپنے گھر سے غائب ہوا تھا، وہ اس وقت سے اب تک اپنے اگلی جہانی محسن آئی اور سب ایسی درج باز دینف کے خالی مکان میں مقیم رہا تھا۔ بات کچھ یوں ہوئی۔

اپنی ماسکورا ایسی اور رستوپ چن سے ملاقات کے بعد جب وہ اگلی صبح بیدار ہوا، اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کہاں ہے اور اس سے تقاضا کیا کیا جا رہا ہے۔ اور پھر جب اسے یہ اطلاع پہنچائی گئی کہ اس کے جو ملاقاتی استقبال کمرے میں بیٹھے ہیں، ان میں ایک فرانسیسی بھی شامل ہے جو اس کی بیوی کاوش میلینا واسیلیووا کا خط لے کر آیا تھا، اس پر یک دم اسی بوکھلاہٹ اور بے چارگی کا احساس غالب آ گیا، جس کا وہ اکثر شکار رہتا تھا۔ اسے محسوس ہوا کہ اب سب کچھ ختم ہو گیا ہے، کوئی کل سیدھی نہیں رہی، ہر چیز الٹ پٹ ہو چکی ہے، کرہی کرہی ہو رہی ہے، کوئی صحیح ہے نہ غلط، مستقبل جھاڑ جھنکار ہے اور صورت حال سے بھٹکارے کی کوئی سبیل نہیں۔ غیر فطری انداز سے مسکرتے اور اپنے آپ سے بڑبڑاتے وہ بے چارگی کی تصویر بننے پہلے تو صوفے پر بیٹھ گیا، پھر اٹھا، دروازے کی جانب بڑھا اور پٹ کی درز میں سے استقبال کمرے میں جھانک کر دیکھنے لگا۔ تب باہری کے عالم میں سر ہلاتا وہ اس آیا اور کتاب اٹھا کر درق کر دانی کرنے لگا۔ اس کا سٹیوارڈ دوسری مرتبہ اسے یہ بتائے آیا تھا کہ جو فرانسیسی اس کی اہلیہ کا خط لے کر آیا ہے، اس سے ملنے کے لیے بہت کھپ رہا ہے، وہ فوری ملاقات کرنا چاہتا ہے خواہ یہ ایک منٹ ہی کی کیوں نہ ہو۔ اس نے اسے یہ بھی بتایا کہ کوئی شخص باز دینف کی بیوہ کا پیغام لے کر آیا ہے کہ چونکہ وہ خود گاؤں جا رہی ہے، اس لیے وہ چاہتی ہے کہ میٹر اس کے شوہر کی کتابیں اپنی تحویل میں لے لے۔

”ہاں، ہاں، ابھی آیا، ذرا ٹھہرو۔ یا نہیں... یا نہیں... نہیں، جاؤ اور ان سے کہو کہ میں ابھی حاضر ہوا۔“

میٹر نے کہا۔

لیکن جو مٹی سٹیوارڈ کمرے سے باہر نکلا، میٹر نے اپنا ہیٹ، جو میز پر پڑا تھا، اٹھایا اور دوسرے دروازے میں سے گزرتا سفیدی روم سے باہر نکل گیا۔ غلام گردش خالی تھی۔ وہ اس میں سے گزرتا بننے کے پاس پہنچا۔ اس کی بھویں تپتی ہوئی تھیں اور وہ دونوں ہاتھوں سے اپنی پیشانی رگڑ رہا تھا۔ وہ نیچے اترنے لگا اور میٹروں کے مابین پہلے چہترے پر پہنچا۔ ہال پورٹر سامنے کے دروازے کے قریب کھڑا تھا۔ چہترے سے دوسرا زینہ بھی دروازے کی جانب اترتا تھا۔ وہ میٹر حیاں نیچے اترتا اور صحن کی طرف چلنے لگا۔ کسی نے اسے دیکھا نہیں تھا، لیکن سڑک پر متعدد

گاڑیاں کھڑی تھیں اور جونکی وہ صدر دروازے پر پہنچی، کوچوان اور گیٹ کیپر دونوں کی نظریں اس پر پڑیں اور انھوں نے ٹوپیاں اتار کر اسے سلام کیا۔ پیئر اس امر سے آگاہ تھا کہ ان کی نگاہیں اس پر مرکوز ہیں اور اس سے شرم مرتفع کا، جو دوسروں کی نظروں سے بچنے کے لیے اپنا سر جھاڑی میں چھپا لیتا ہے، رد یہ اختیار کر لیا۔ اس نے سر جھکایا، رفتار بڑھائی اور تیز تیز چلے لگا۔

اس صبح جو اسور اس کی نوری توجہ کے متقاضی تھے، ان میں اسے بازو دیف کی کتابیں اور کاغذات چھانڈا اہم ترین کام معلوم ہوا۔

اس نے اولین گاڑی، جو اسے نظر آئی، کرائے پر لی اور کوچوان سے کہا کہ وہ اسے Patriarch's Ponds لے چلے جہاں بازو دیف کا مکان واقع تھا۔

وہ مڑ کر اپنے گرد و پیش لدے ہوئے چھکڑوں کی طویل قطاروں کو، جو چاروں اطراف سے نکل نکل کر ماسکو سے باہر جا رہے تھے، دیکھتا اور اپنے بھاری بھر کم جسم کا توازن برقرار رکھنے کی کوشش کرتا رہا تاکہ وہ کہیں دروغی سے، جس کی چوبیس ڈھیلی تھیں، باہر نہ گر پڑے۔ وہ اس بچے کی طرح، جو سکول سے بھاگ آیا ہو، سرور و مطمئن تھا اور اسی کیفیت میں کوچوان سے ہاتھ ملانے لگا۔

کوچوان نے اسے بتایا کہ آج کریملن میں ہتھیار تقسیم کیے جا رہے ہیں اور کل لوگوں کو عین پریت گٹ کے آگے بھیج دیا جائے گا اور وہاں زبردست لڑائی ہوگی۔

جب وہ Patriarch's Ponds پہنچے، میئر کو مکان پہنچانے میں، جہاں وہ کچھ عرصے سے گیا نہیں تھا، کچھ دشواری پیش آئی۔ وہ صدر دروازے کے قریب پہنچا۔ اس کی دستک کے جواب میں زبردو بے ریش بوڑھ کمرام باہر آیا، جسے اس نے پانچ سال قبل ترڑھوک میں آئی اوسٹ بازو دیف کی معیت میں دیکھا تھا۔

”کوئی گھر ہے؟“ میئر نے پوچھا۔

”یورژیکسی لینسی، موجودہ حالت کے پیش نظر سو دیا وائیوونا اور بچے اپنی دیکھی جاگیر پر، جو کہ ترڑھوک میں ہے، چلے گئے ہیں۔“

”میں بہر حال اندر آنا چاہتا ہوں۔“ میئر نے کہا۔ ”مجھے کتابیں الٹ پلٹ کر دیکھنا ہیں۔“

”ضرور شریف لائیں۔ آپ کے لیے اس گھر کے دروازے ہمیشہ کے لیے کھلے ہیں۔ میرے مرحوم آقا۔ خداوند انھیں کروٹ کروٹ جنت نعیب کرے۔ کے بھائی ماکارالکسی وچ نے ہمیں رہنے کا فیصلہ کیا ہے۔ لیکن، حضور، آپ جانتے ہیں کہ بدمذہب و خالص ضعیف ہو چکے ہیں۔“ یورژیکسی ملازم نے کہا۔

میئر کو معلوم تھا کہ اس کے محسن کا بھائی نیم پاگل اور عادی بے انوش ہے۔

”ہاں، ہاں، مجھے معلوم ہے۔“ میئر نے کہا اور وہ مکان کے اندر داخل ہو گیا۔

ایک گنج، دروازہ قامت شخص، جس کی ناک سرخ تھی اور جو ڈربنگ گاؤن اور پاؤں میں صرف موزے پہنے

ہوئے تھا، پیش داناں میں کھڑا تھا۔ میٹر کو دیکھ کر وہ غصے میں کچھ بڑبڑایا اور پاؤں پختا غلام گردش میں ملنے لگا۔
 ”حضور، کبھی یہ بڑے صاحب رباغ ہوا کرتے تھے، لیکن آپ جانتے ہیں کہ اب یہ ضعیف ہو گئے ہیں۔“
 گیراسم نے کہا: ”آپ سنڈی روم رکھنا چاہتے ہیں؟“ جب سے یہ بند ہوا ہے، کسی نے اسے جھینزا نہیں۔ سو نیا دانیلووا
 نے مجھے حکم دیا تھا کہ آپ کے ہاں سے کوئی صاحب تشریف لائیں، تو میں یہ کتابیں اس کے حوالے کر دوں۔“

میٹر تیرہ و تار و سنڈی روم میں چلا گیا۔ اپنی محسن کی زندگی میں جب اسے اس کمرے میں آنے کا اتفاق ہوا
 تھا، اس پر کچی طاری ہو جایا کرتی تھی۔ آئی اوسف باز دیف کے انتقال کے بعد کسی نے بھی اس کمرے میں قدم
 نہیں رکھا تھا۔ ہر چیز پر گرد کی تھیں جھی ہوئی تھیں اور دروازے پر پہلے کی نسبت کہیں زیادہ افسردگی چھائی تھی۔

گیراسم نے دروازے کا صرف ایک پٹ کھولا اور دبے پاؤں باہر چلا گیا۔ میٹر نے کمرے کا چکر لگایا اور اس
 الماری کے سامنے، جس میں مسودے دھرے ہوئے تھے، جا کھڑا ہوا۔ اس نے ایک مسودہ، جو کبھی جماعت کی
 اہم ترین اور مقدس ترین دستاویزات میں شمار ہوتا تھا، باہر نکالا۔ یہ سکاٹ لینڈ کی لاجوں کے خود مرتبہ قوانین میں
 سے چند ایک پر مشتمل تھا۔ اس پر باز دیف کے حواشی اور تشریحات قلم بند تھیں۔ وہ گرد آلود میز کے سامنے بیٹھ گیا،
 اس نے دستاویزات اپنے سامنے رکھیں، انھیں کھونا اور بند کر دیا۔ پھر اس نے انھیں ایک طرف دھکیل دیا، اپنا سر
 کھنی پر نکایا اور سوچ بچار میں مستغرق ہو گیا۔

گیراسم نے متعدد مرتبہ دبے پاؤں کمرے کے اندر جھانک کر دیکھا اور اسے ہر بار میٹر اسی شکل میں نظر آیا۔
 دو سے زیادہ گھنٹے گزر گئے۔ گیراسم نے جرات سے کام لیا، وہ دروازے کے قریب پہنچا اور اس نے اس کی
 توجہ مبذول کرانے کے لیے قدرے بلند آواز میں کچھ کہا، تاہم میٹر کو اس کی آواز سنائی نہ دی۔

”یوہا کیسی لینسی، کو چران کی چھٹی کر دوں؟“

”ارے، ہاں!“ میٹر نے چونک کر اور عجلت سے اٹھتے ہوئے کہا۔ ”سنو“ اس نے گیراسم کے کوٹ کا ہٹن
 پکڑتے اور بوڑھے کی جانب، جس کی آنکھیں فریڈ مسرت سے منور اور غم ناک ہو رہی تھیں، دیکھتے ہوئے مزید کہا:
 ”سنو، تمہیں معلوم ہے کہ کل لڑائی ہونے والی ہے۔“

”جی، لوگ کہتے تو یہی ہے۔“ گیراسم نے جواب دیا۔

”میری تم سے بس یہی درخواست ہے کہ کسی کو مت بتانا کہ میں کون ہوں اور جو کچھ میں کہتا ہوں، بس چپ
 چاپ وہی کرتے جانا۔“

”جی، حضور۔“ گیراسم نے کہا۔ ”آپ کچھ کھانا پینا پسند فرمائیں گے؟“

”نہیں، لیکن مجھے تم سے کچھ اور چاہیے۔ میں چاہتا ہوں کہ تم مجھے دیہاتوں کے کپڑے اور ایک پستول لا
 دو۔“ میٹر نے غیر متوقع طور پر شرما تے ہوئے کہا۔

”جی، حضور۔“ گیراسم نے ایک منٹ سوچنے کے بعد جواب دیا۔

ہیئر نے بقیہ دن اکیلے اپنے محسن کے شادی روم میں گزارا۔ وہ بے چینی سے کمرے کے چکر کاٹتا اور اپنے کپ سے باتیں کر رہا۔ اس رات اس کا بستر وہیں لگا دیا گیا۔

گیر اسم کو اپنی زندگی کے دوران میں بے شمار عجیب و غریب اشیاء سے واسطہ پڑ چکا تھا چنانچہ وہ نے جب اس گھر میں ڈیرا ڈال لیا، اسے مطلقاً کوئی حیرت نہ ہوئی۔ اس نے اس صورت حال کو بہ سکون قلب تسلیم کر لیا بلکہ بظاہر وہ خوش تھا کہ اسے کسی کی خدمت کا موقعہ میسر آ رہا ہے۔ اس نے اسی شام ہیئر کے لیے کوچرائوں کا کوٹ اور ٹوپی حاصل کر لی۔ اس نے یہ سوچ تک نہیں کہ آخر ان اشیاء کی ضرورت کیا ہے۔ اور وعدہ کیا کہ وہ اگلے روز اس کے بے پستول بھی لے آئے گا۔ اسی شام ماکارا لیکسی وچ غلام گردش میں پاؤں بٹختا ایک دو مرتبہ شادی روم کے دروازے تک آیا اور وہاں کھڑے ہو کر دل جو یا نہ امدار سے ٹکٹکی باندھ کر ہیئر کو دیکھتا رہا، لیکن جو بھی ہیئر کا رخ اس کی طرف ہوا، اس نے ڈریسنگ گاون اپنے جسم کے ارد گرد لپیٹا، اس پر شر میلی اور غصیلی نظر ڈالی ورنہ ہیئر سے روٹھ کر ہو گیا۔ اور رستوفوں سے ہیئر کا سامن تب ہوا جب وہ کوچرائوں کا کوٹ پہنے، جو گیر اسم اس کے لیے لایا تھا، اور جسے اس نے دھواں دے کر دیائی مادوں سے صاف کیا تھا، اس کی معیت میں پستول خریدنے سٹارٹیف مارکیٹ جا رہا تھا۔

19

کوٹوزوف نے ریڈان روڈ تک براستہ ماسکو پسائی کا حکم یکم ستمبر کو جاری کیا۔

ہر اول دستوں نے اسی رات کوچ کیا۔ وہ کسی قسم کی تعیل کے بغیر آہستہ آہستہ ثابت قدمی سے سفر کرتے رہے، مگر بوقت سحر جب وہ دروگو میلوف پل کے قریب پہنچے اور اس کی دوسری سمت چڑھائی چڑھنے اور گلی کوچوں میں آنے جانے والوں کے راستے میں مزاحم ہونے لگے، ان پر عقب سے دوسری فوجوں کے بے پناہ ہجوم کا دباؤ بڑھنے لگا، تب غیر واجب جلد بازی اور خوف و ہراس ان پر غالب آ گیا۔ سبھی پل، دریا کے پایاب راستوں اور کشتیوں پر پل پڑے۔ خود کوٹوزوف شہر کے عقبی گلی کوچوں میں گاڑی دوڑاتا ماسکو کی دوسری سمت پہنچ سکا۔

دو ستمبر کو صبح دس بجے دروگوئی لون مضافات میں صرف عقبی سیاہ کی چند محسوس باقی رہ گئی تھیں، ورنہ بھیڑ بڑھا ختم ہو چکا تھا۔ فوج ماسکو کی دوسری سمت اور اس سے آگے نکل چکی تھی۔

اسی وقت۔ دو ستمبر کی دس بجے صبح نیولین اپنی افواج کے مابین ہلکونا پہاڑی پر کھڑا انگلی باندھے اپنے سامنے کا منظر دیکھنے میں لگو تھا۔ چھبیس اگست سے دو ستمبر تک، یعنی بارہ دینوں کی لڑائی سے فرانسیسیوں کے ماسکو میں داخلے تک اس ہنگامہ خیز اور یہ دگار ہفتے کے ہر روز خزاں کا غیر معمولی موسم فضا پر محیط رہا جب آفتاب بلندی پر نہیں بلکہ نشیب پر آویزاں ہوتا ہے اور موسم بہار کی نسبت زیادہ حرارت خارج کرتا ہے، جب ہر چیز صاف شفاف اور غیر کدور فضا میں یوں دیکھنے لگتی ہے کہ آنکھیں چندھیا جاتی ہیں ورنہ معطر خزاں ہوا میں سانس لینے سے بھیڑے تازہ دم اور توانا ہو جاتے ہیں، جب راتیں بھی نیم گرم ہو جاتی ہیں اور جب ان تاریک اور خوشبودار راتوں کے دوران میں طغائی

ستارے پیہم ٹلک رہے گرتے، ہمیں ڈراتے اور محفوظ کرتے ہیں۔

دو تمبر کو دس بجے صبح موسم کی یہ کیفیت ابھی تک برقرار تھی۔ نور سحر کی سچ درجہ طلسم انزا تھی۔ بکلیاں پھاڑی پر کمرے ہو کر دیکھنے سے اپنے دریا، انگلستانوں اور کلیساؤں سمیت ماسکو کا وسیع و عریض منظر کہہ یوں دکھائی دے رہا تھا جیسے وہ کوئی جیتی جاگتی شے ہو اور سورج کی روشنی میں اس کے گنبد اور برجیاں ستاروں کی طرح چمکلا رہی تھیں۔

اس انجینی شہر کا، جس کا طرز تعمیر انوکھا اور بے ٹکا تھا اور ایسا کہ اس نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا، نظارہ کرنے پر پولین کے قلب میں قدرے حاسد شدہ اور اضطراب انگیز تجسس پیدا ہو گیا۔ انسانوں کو اس طرح کے تجسس کا احساس تب ہوتا ہے جب وہ زندگی کی کسی ایسی ان جانی صورت کا، جو ان کی موجودگی کو خاطر میں نہیں لاتا، تصور دھیان میں لاتے ہیں۔ کچھ یوں معلوم ہوتا تھا کہ اس شہر کی رگ رگ میں زندگی دھڑک رہی ہے۔ ایسی غلامی، جن کا الفاظ میں احاطہ کرنا تو مشکل ہے لیکن وہ موجود ضرور ہوتی ہیں وہ دور ہی سے ہمیں ذی حیات اشیا کو مرہ اور بے جان چیزوں سے میسر کرنے میں مدد دیتی ہیں۔ پولین کو بھی شہر میں زندگی کی دھڑکنوں کا سراغ مل سکتا تھا۔ کچھ یوں کہنا چاہیے کہ ایک لحاظ سے اس نے اس عظیم اور حسین شہر کو سانس لینے محسوس کیا۔

"Cette ville asiatique aux innombrables eglises, Moscou la sainte. La

voila donc enfin, Cette fameuse ville! Il etait temps."

پولین نے کہا اور گھوڑے سے اترتے ہوئے اس نے حکم دیا کہ ماسکو کا نقشہ اس کے سامنے بچھا دیا جائے اور اس کے ترجمان اللوینینی ڈاؤن سیدے ول کو اس کے پاس لایا جائے۔

"وہ شہر جو غنیم کے قبضے میں چلا جائے،" لکل اس دو شیزہ کی مانند ہوتا ہے، جس کی آبرو لوٹ لی گئی ہو۔" اس نے سوچا۔ (وہ یہ بات قبل ازیں سمولنسک میں سچ کوف سے کہہ چکا تھا۔) اور اس نقطہ نظر سے یہی بار اس شرعی حسن کو، جو اس کی ٹکا ہوا کے سامنے جلوہ افروز تھا، نمٹا کر دیکھنے لگا۔ خود اسے یہ بات عجیب محسوس ہو رہی تھی کہ اس کی اس آرزو کی، جو وہ مدتوں سے دل میں پال رہا تھا، لیکن جو بظاہر ناممکن الحصول نظر آتی تھی، بالآخر تکمیل ہوئی ہے۔ صبح کی شفاف روشنی میں وہ شہر سے نقشے کی طرف اور نقشے سے واپس شہر کی جانب دیکھنے لگا۔ وہ ایک ایک تفصیل کی تصدیق کر رہا تھا اور یہ یقین کہ اب یہ اس کے قبضے میں ہے، اس کے دل میں مل جل چکا تھا اور اس پر بہت طاری کر رہا تھا۔

"لیکن بجز اس کے اور ہو بھی کیا سکتا تھا؟" اس نے عالم محویت میں سوچا۔ "یہ دار الحکومت میرے قدموں تلے پڑا ہے اور اپنے مقدر کا انتظار کر رہا ہے۔ ایسا اندراب کہاں ہے اور وہ کیا سوچ رہا ہے؟ مخیر العقول، خوبصورت اور پر شکوہ شہر! مخیر العقول اور پر شکوہ لمحہ! اب وہ میرے بارے میں کس انداز سے سوچتے ہیں؟" اس نے اپنے فوجی جوانوں کو دھیان میں لا کر سوچا۔ "یہ ہمارا شہر۔ ان سب تشکیک پسندوں کا انعام۔" اس نے اس لوگوں کو، جو اس

لا تعداد کلیساؤں کا یا ایشیا کی شہر ماسکو مقدس آخر کار ہم یہاں پہنچے ہیں۔ یہ ہے وہ شہر، آکاں شہر اللہ انداز ہوئے کا انتہائی عجیب۔"

کے قریب تھے اور ان دستوں کو، جو اس کی طرف آرہے تھے اور صف بندی کر رہے تھے، سرسری نگاہوں سے دیکھنے ہوئے سوچا۔ ”میرا ایک لفظ، میرے ہاتھ کی ایک جنبش، زاروں کے اس قدیم دارالسلطنت کو نیست و نابود کر سکتی ہے لیکن مفتوحین کے لیے میرا جذبہ ترحم جھٹ پٹ بیدار ہو جاتا ہے۔ مجھے دریا دلی اور صحیح معنوں میں عظمت کا اظہار کرنا چاہیے۔ لیکن نہیں،“ اچانک اس کے ذہن میں خیال گزرا، ”یہ بات صحیح نہیں ہو سکتی کہ میں واقعی، سکون ہوں۔ تاہم وہ میرے قدموں تلے پڑا ہے اور دھوپ میں اس کے گنبد اور صلیبیں جگمگا اور تھر تھرا رہی ہیں۔ لیکن میں اس کے ساتھ کوئی جو رد تعذبی نہیں کروں گا۔ بربریت اور استبداد کی ان قدیم یادگاروں پر میں منصف مزاجی اور غفور و درگزر کے عظیم الفاظ کندہ کروں گا۔ اور یہی وہ رویہ ہے جو ایکساندر کے لیے سب سے زیادہ راج فرما ہوگا۔ میں اسے خوب جانتا ہوں۔“ (جو کچھ وقوع پذیر ہوا تھا، نیولین کے نزدیک اس کی معنویت صرف یہ تھی کہ یہ ایک نمد سے اس کا ذاتی مقابلہ تھا۔) ”کریملن۔ ہاں، وہ رہا کریملن، ہاں۔ میں اس کی رفعتوں سے انیس منصفانہ قوانین فراہم کروں گا، میں انھیں نئی تہذیب کا مفہوم سکھاؤں گا اور بویاروں²⁴ کے ساتھ ایسے حسن سلوک سے پیش آؤں گا کہ ان کی نسلیں اپنے فاتح کو پیر و محبت سے یاد کریں گی۔ میں ان کے وفد کو بتاؤں گا کہ میں نے جنگ چاہی تھی، نہ چاہتا ہوں، میں نے جنگ محض ان کے دربار کی غلط پالیسی کے خلاف کی ہے۔ میں ایک نذر کو عزیز گردانتا ہوں اور اس کا احترام کرتا ہوں، اور میں، سکون میں اپنے اور اپنی، تو ام کے شایان شاں امن کی شرائط قبول کر لوں گا۔ جنگ نے جو رخ اختیار کیا ہے، مجھے اس سے فائدہ اٹھانے کی خواہش نہیں اور یوں میں کسی معزز فرماں رواں کی خودداری کو کوئی ٹھیس نہیں پہنچاؤں گا۔ بویارو! میں ان سے کہوں گا، مجھے جنگ کی کوئی تمنا نہیں، میں تو اپنی تمام رعایا کے لیے امن اور خوشحالی کا متمنی ہوں۔ بہرحال مجھے معلوم ہے کہ ان کی موجودگی مجھ پر وجدانی کیفیت طاری کر دے گی اور جیسا کہ میں ہمیشہ کرتا آیا ہوں، میں ابہام سے پاک، پرتا شیر اور پروقار گنگو کروں گا۔ لیکن کیا یہ صحیح ہے کہ میں ماسکو میں ہوں؟ ہاں، وہ سامنے واقع ہے۔“

”بویاروں کو میرے پاس لے آؤ۔“ اس نے اپنے عملے سے مخاطب ہو کر کہا۔

ایک جرنیل ذرق برق دردیوں میں ملیں ایچوٹخوں کی جماعت کی معیت میں فی الفور بویاروں کو بلانے کے لیے گھوڑا دوڑانے لگا۔

دو گھنٹے گزر گئے۔ نیولین دو پہر کا کھانا کھا چکا تھا اور دوبارہ ہنگوٹا یا پہاڑی پر اسی جگہ کھڑا وفد کا انتظار کر رہا تھا۔ اس نے بویاروں کے سامنے جو تقریر کرنا تھی، وہ اس کے ذہن میں واضح صورت اختیار کر چکی تھی۔ نیولین کی اپنی دانست میں اس کی یہ تقریر وقار اور عظمت و جلالت سے مرصع تھی۔

ماسکو کے متعلق اس نے جس دریا دلی کا مظاہرہ کرنے کا ارادہ کیا تھا، وہ آپ ہی اس کی رو میں بہہ گیا۔ اس نے اپنے تختیل میں *une reunion dans le palais des Czars* کے، جن میں روسی زعماء اور فرانس

کے دربار پوسا کے ساتھ کندھے سے کندھا ملا کر بیٹھیں گے، انعقاد کے ایام کا تعین بھی کر لیا تھا۔ ذہنی طور پر اس گورنر کا، جو لوگوں کے قلوب موہ لینے کے فن سے آگاہ تھا، نام بھی سوچ لیا تھا۔ یہ معلوم ہو جانے کے بعد کہ ماسکو میں متحد خیراتی ادارے موجود ہیں، اس نے یہ تہیہ کر لیا تھا کہ وہ ان سب کو فاضلی سے مستفیض کرے گا۔ اس نے یہ سوچ لیا تھا کہ جس طرح افریقہ میں اسے عبا پہننا اور مسجد میں بیٹھنا پڑا تھا، یہاں ماسکو میں اسے لارڈوں کے امدار میں روپیہ پانی کی طرح بہانا ہوگا۔ اور روسیوں کے قلوب کو فیصلہ کن طریق سے سخر کرنے کے لیے اس نے یہ ٹھکان لیا کہ وہ ان تمام خیراتی اداروں پر جلی حروف میں یہ الفاظ کندہ کرا دے گا یہ ادارہ میری پیاری ماں کے نام منسوب کیا جاتا ہے۔ نہیں صرف اتنا کافی ہوگا۔

MAISON DE MA MERE — تمام فرانسیسیوں کی طرح اس کے لیے یہ تصور کرنا بھی ممکن نہیں تھا کہ "ma chere, ma pauvre, ma tendre mere" کے بغیر بھی دوسروں کو متاثر کیا جاسکتا ہے۔
 "لیکن کیا میں واقعی ماسکو میں ہوں؟ ہاں، یہ میرے سامنے تو واقع ہے۔ لیکن دفنہ آنے میں تاخیر کیوں کر دی ہے؟" سے تعجب ہو رہا تھا۔

دریں اثنا، امپراطور کے عملے کے عقب میں مارشل اور جرنیل سرگوشیوں میں صلاح مشورے کر رہے تھے۔ ان کے رنگ فق تھے، در چہروں پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ جن لوگوں کو دفن لانے کے لیے بھیجا گیا تھا، وہ یہ خبر لائے تھے کہ ماسکو خالی ہو چکا ہے اور تمام باشندے، بیشتر پیدائشی، شہر چھوڑ کر جا چکے ہیں۔ وہ اشخاص، جو آپس میں تبادلہ خیالات کر رہے تھے، بہت پریشان اور مضطرب تھے۔ انھیں پریشانی اس بات کی نہیں تھی کہ شہر کے باقی وہاں سے فرار ہو گئے تھے (بے شک بذات خود یہ حقیقت بہت سنگین تھی)۔ انھیں جس مسئلے نے حواس باختہ کر دیا تھا، وہ یہ تھا کہ امپراطور کو اس کی اطلاع کیسے دی جائے۔ تاکہ وہ یہ محسوس نہ کریں کہ وہ ایک قسم کی ناخوشگوار صورت حال میں، جسے فرانسیسی ridicule کہتے ہیں، پھنس گئے ہیں۔ کہ وہ اس تمام عرصے کے دوران میں بویاروں کا بے سود انتظار کرتے رہے ہیں اور یہ کہ شرابیوں کے بے ہنگم ہجو سوں کے علاوہ شہر میں عملاً کوئی شخص نہیں رہا۔ بعض کا خیال تھا کہ جیسے جیسے کسی نہ کسی قسم کا وفد اکٹھا کرنا کاملاً ضروری ہے جب کہ دوسروں کو اس سے اتفاق نہیں تھا۔ وہ کہتے تھے کہ امپراطور کو احتیاط اور سلیقے سے خبر بد کے لیے تیار کیا جائے اور پھر اصل حقیقت ان کے گوش گزار کر دی جائے۔

"انھیں بہر حال بتانا تو پڑے گا ہی۔" عملے کے بعض ارکان نے کہا۔ "mais messieurs..."

صورت حال یوں اور بھی کڈھ ہوئی تھی کیونکہ امپراطور دہلی کے جن منصوبوں پر عمل کرنا چاہتا تھا، ان پر غور و فکر کرنے کے بعد اب وہ بچھے ہوئے نقشے کے سامنے چکر کاٹ رہا تھا۔ چلتے میں وہ کبھی کبھار اپنی آنکھوں کے

غلام نامہ اور۔

"مائی ڈیر، میرے پیارے، مائی ڈیر اما (پیاری ماں) ... معذرت فرمائیے"

but my lords (لیکن حضرات)

اوپر ہاتھ سے سایہ کرتا اور اپنے چہرے پر فخر و مباہات کا تبسم سجائے ماسکو کی طرف جانے والی شاہراہ کو بغور دیکھنے لگتا۔

”لیکن یہ ناممکن ہے۔۔۔“ نیولین کے عملے کے ارکان تکرار کیے جا رہے تھے۔ وہ اپنے کندھے اچکاتے کر اس بھیاں تک لفظ — la ridicule کو اپنی زبان پر لانے کی جرأت سے اپنے آپ کو عاری پاتے۔

تاہم اس پر اظہار نے، جو اس بیکار انتظار سے اکتا چکا تھا اور جس کی ادا کارانہ جبلت سے پکار پکار کر بتا رہی تھی کہ طوالت کھینچ جانے کے سبب پر شکوہ لمحہ اپنے جاہ و جلال سے محروم ہوتا جا رہا ہے ہاتھ سے اشارہ کیا۔ اشارائی توپ کا دھڑکا ہوا اور حملہ آور فوج آگے بڑھنے اور تورکا ہوگا اور وردگو میلو ف دروازوں میں سے شہر کے اندر داخل ہونے لگی۔ ان سب کی بھی کوشش تھی کہ وہ دوسروں سے آگے نکل جائیں۔ کوئی تیز تیز چل رہا تھا، کوئی دلی لگا رہا تھا اور کوئی سر پیٹ بھاگ رہا تھا۔ یوں ان کی رفتار تیز سے تیز تر ہوتی جا رہی تھی۔ گرد و غبار کے بادلوں اٹھنے لگے اور وہ ان میں چھپنے لگے۔ ان کے شور و غل سے کانوں کے پردے پھٹے جا رہے تھے اور نصف مرتعش ہو رہی تھی۔ جس قسم کی دھن نیولین کے فوجی دستوں پر سو رہی تھی، اس کی پلیٹ میں وہ خود بھی آگئی۔ اس نے گھوڑا پکڑا اور ان کے ساتھ وردگو میلو ف گیٹ پہنچ گیا۔ یہاں وہ دوبارہ گھوڑے سے نیچے اتر آیا اور وفد کے انتظار میں خامی دیر تک کامیرکولیو کی فصیل کے قریب ادھر ادھر چکر کاٹتا رہا۔

20

دریں اثنا ماسکو خالی ڈھنڈا رہن چکا تھا۔ یوں شہر میں اب بھی لوگ موجود تھے۔ غالباً آبادی کا پچاسواں حصہ بچے رہ گیا تھا۔ لیکن شہر خالی تھا اور یہ اسی طرح خالی تھا جس طرح شہد کی مکھیاں کا چھتا ملک کی عدم موجودگی کے سبب خالی اور مرگ پذیر ہو جاتا ہے۔

بے ملکہ چھتا درج حیات سے بیکر عاری ہوتا ہے، بے شک سطحی نظروں سے دیکھنے میں یہ دوسرے چھتوں کی طرح زندگی سے بھرپور دکھائی دیتا ہے۔

دوپہر کی دھوپ کی حدت میں شہد کی مکھیاں بے ملکہ چھتے کے اوپر اسی خوش دلی سے منڈلاتی پھرتی نظر آتی ہیں جس طرح وہ ذی حیات چھتوں کے اوپر منڈلاتی دکھائی دیتی ہیں۔ وہ اسی انداز سے اڑتی، اس کے اندر آتی و باہر جاتی ہیں اور دور سے شہد کی مکھیاں بھی محسوس ہوتی ہے، لیکن آدمی کو اس کا ذرا احتیاط سے جائزہ لینے کی ضرورت ہے اور اسے صاف معلوم ہو جائے گا کہ اس میں زندگی کی کوئی رمتی باقی نہیں رہی۔ مکھیوں کے اندر داخل ہونے، و باہر نکلنے کا انداز وہ نہیں ہوتا جو پہلے تھا اور مکھیاں پالنے والے شخص کو اس بات کا شدت سے احساس ہونے لگتا ہے کہ آواز اور مکھیاں دونوں میں پہلے کی نسبت نمایاں فرق آگیا ہے۔ جب وہ بیمار چھتے کی دیوار کو کھٹکھٹاتا ہے تو ہزاروں مکھیاں بجائے اس کے کہ پہلے کی طرح آنا نا متفقہ رد عمل کا اظہار کریں، جھنجھٹاتی ہوئی آئیں، تہدید کی انداز سے اپنے

پروں کو پھیلائیں اور انھیں بہ سرعت جھلاتے کنگنائی اور زندہ و توانا غنٹناہٹ پیدا کریں، ان کی کھوکھلی اور بے ربط جھنڈناہٹ جوا چڑھتے کے مختلف حصوں سے آتی ہے، اس کا استقبال کرتی ہے۔ اس نے چپے تک پہنچنے کے لیے جو بیڑمی لگائی ہوتی ہے، اس پر کھڑے ہونے پر بجائے اس کے کہ اسے اندر سے حسب سابق شہد اور زہری سہانی خوشبو آئے، اور (کھینوں کے) جم غفیر کی حرارت سانس بن کر اس کے نٹھوں میں گھسے، ہوتا کیا ہے، ویرانی اور بوسیدگی کی بھک شہد کی مہک سے غلط ہو کر باہر آتی ہے۔ کمریں جھکائے اور خطرے کی گھنٹیاں بجاتے چوکیدار، جو چھتے کے دروازے کے لیے اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کرنے کے لیے تیار رہتے ہیں، اب ان کا نام ونگٹان بھی کہیں نظر نہیں آتا۔ کھولتے پانی کی کنگناہٹ سے مشابہ چھتے کے اندر رونق اور مصروفیت کی مظہر جو دھیمی اور مہوار جھنڈناہٹ سنائی دیا کرتی تھی، اب وہ ناپید ہو چکی ہے اور اس کی جگہ بد نظمی کی بے ترتیب اور کثرت سرسراہٹ نے لے لی ہے۔ شہد میں لتھری سیاہ لمبوتری قزاق کھیاں ڈرتی کہتی وز دیدہ انداز سے اڑتی چھتے کے اندر گھسیتی اور باہر نکلتی پھر رہی ہیں سدہ ڈمک نہیں مارتیں بلکہ رنگتی رنگتی خطرے سے پرے ہٹ جاتی ہیں۔ پہلے شہد سے لہدی پھندی کھیاں چھتے میں داخل ہوتی اور خالی ہاتھ باہر آ جاتیں۔ اب وہ باہر آتی ہیں تو مدی پھندی ہوتی ہیں۔ کھیاں پالنے والے زریں خانہ کھولے ہوئے اور چھتے کے نچلے حصے پر نظر دوڑاتا ہے۔ پہلے مشقت سے ٹوٹا ہوا سیاہ اور چمکیلی کھیاں بڑے بڑے تھمر سے بنائے، ایک دوسری کے پروں سے چمٹے، فرش کے اوپر لگی رہتی اور سخت شاذ کی غیر مختتم جھنڈناہٹ پیدا ہوا باہر نکالتی رہتی تھیں، اب ان کے بجائے چمرائی اور گھٹتی کھیاں چھتے کے فرش اور دیواروں پر بے دلی سے یا منہد گھومتی نظر آتی ہیں۔ صاف ستھرے انداز سے موسم سے بڑے فرش پر، جس کی اڑیں چوشر پھڑ پھڑاتے پر سنائی کرتے تھے، اب موسم کے ٹکڑے، غلاظت، مردہ کھیاں اور وہ کھیاں، جو زندگی کی آخری سانسیں بے روی ہیں اور جن کے لیے الہا ٹانگیں ہلانا بھی دشوار ہے، ادھر ادھر بکھری پڑی ہیں۔ کسی نے انھیں وہاں سے ہٹانے کا کوئی تردد نہیں کیا۔

کھیاں پالنے والا بالائی خانہ کھولتا ہے اور چھتے کے اوپر کے حصے کا جائزہ لیتا ہے۔ کھینوں کی بیوستہ مٹوں کے بجائے جو چھتے کے دندانے دار خانوں کے باریک سوراخ کو بند رکھتی اور نومولود احسام کو حرارت پہنچاتی رہتی تھیں، اسے خالوں کی فن کارانہ اور پیچیدہ ساخت تو ضرور نظر آتی ہے لیکن ان کی سابقہ شان و شوکت کا کوئی نشان بھی نظر نہیں آتا۔ ہر چیز آلائش زدہ ہے اور غفلت کی شکار ہے۔ سیاہ قزاق کھیاں چھپ چھپ کر لوٹ کی تلاش میں تیزی سے ادھر ادھر بھاگی پھر رہی ہیں جب کہ گھر کی نگران پست قامت کھیاں، جن کے ابدان اور جذبے یوں مرجھا چکے ہیں جیسے وہ بہت بوڑھی ہو گئی ہوں، ادھر ادھر رنگتی پھر رہی اور قزاقوں کی مزاحمت کرنے کے لیے کچھ نہیں کر رہی کیونکہ ان کی انگلیں مرجھی ہیں اور ان کے زندہ رہنے کے احساسات ختم ہو چکے ہیں۔ زکھیاں، چھوٹی اور بڑی بھڑیں، تیسے، بھونڈ اور تسلیاں بے مقصد ادھر دھر پھڑ پھڑاتی اور پھتے کی دیواروں سے گراتی پھر رہی ہیں۔ یہاں وہاں خانوں میں، جن میں شہد اور نومولود مردہ کھیاں پڑی ہیں، کبھی کبھار غصیلی جھنڈناہٹ سنائی دے جاتی ہے۔ کبھی کبھار ایک دو کھیاں، عادت اور اضطراری جذبے کے دباؤ کے تحت نومولودوں کے خانے صاف کرتی دکھائی

روی دستے دو بجے صبح سے دو بجے دوپہر تک ماسکو میں سے گزرتے رہے اور اپنی رو میں شہر چھوڑ کر جانے والے باشندوں اور زخمیوں کی آخری کھینچوں کو بھی بہا لے گئے۔

اس نقل و حرکت کے دوران میں سب سے زیادہ بھیڑ بھڑکا کا مینی، مسکوا اور یوٹن، پلوں پر رہا۔

جب فوجی دستے کریمین کے گرد چکر کاٹ کر گزرنے کے لیے دو حصوں میں منقسم ہو کر مسکوا اور کا مینی پلوں پر ہجوم کیے ہوئے تھے، فوجی جوانوں کی خاصی بڑی تعداد نے اس بھیڑ بھاڑ اور تاخیر سے فائدہ اٹھایا۔ دو آنکھ چرا کر دے پاؤں پلوں سے واپس مڑنے اور واسیلی بٹارنی چرچ کے قریب سے گزر کر باردنسکی گیٹ میں سے ہوتے پہاڑی پر چڑھ کر ریڈ سکوائر²⁶ پہنچنے لگے۔ ان کی کوئی وجدانی صلاحیت انھیں بتا رہی تھی کہ ادھر جو کچھ بھی ہاتھ لگا، اسے یہاں سے اٹھا کر لے جانا کوئی مشکل امر نہیں ہوگا۔ جس قسم کے ہجوم دکانوں پر ”سیل“ کے دفن میں دیکھنے میں آتے ہیں، بازار کے رستوں اور گلیوں میں جمع ہو گئے۔ لیکن اب نہ دکانداروں کی ٹیٹھی اور رسی آوازیں گاہکوں کو اندر آنے کی دعوت دے رہی تھیں، نہ خوانچہ فروش شیریں تانیں لگا رہے تھے اور نہ وہاں رنگ برنگے اور رتی برق ملبوسات زیر تن کیے خواتین کے جھگمگاتے تھے۔ اب وہاں وردیوں اور اور کوٹوں میں بیویں صرف سپاہی تھے۔ انھوں نے اپنے ہتھیار پھینک پھاٹک دیے تھے۔ وہ مسقف گلیوں خالی ہاتھ داخل ہوتے اور دے پاؤں لمبے پھندے واپس آتے۔ دکاندار اور ان کے کارندے (جو اب خال خال رہ گئے تھے) فوجیوں کے مابین یوں بھاگے پھر رہے تھے جیسے ان کی سسکی گم ہو گئی ہو۔ وہ دکانوں کے تالے کھولتے، انھیں دوبارہ بند کرتے اور خود ہی اپنا مال بھولیاں بھر بھر کر باہر لاتے۔ بازار کے سامنے چوک میں فوجیوں کو ایک مقام پر اکٹھا کرنے کے لیے چلی اپنے محل بجا رہے تھے، لیکن گلیوں کی آوازیں لوٹ مار کرنے والے جوانوں کو جمع کرنے کے بجائے دور سے دور تر بھاگاؤی تھیں۔ دکانوں اور گلیوں میں فوجی جوانوں میں وہ اشخاص بھی، جن کے سر منڈے ہوئے تھے اور جنھوں نے سزا یافتہ قیدیوں کے سر کی کوٹ پہن رکھے تھے، گھل مل گئے تھے۔ دو افسران، جن میں سے ایک نے وردی پر سکارف پیٹا ہوا تھا اور جو سر کی کوٹ گھوڑے پر سوار تھا، اور دوسرا ورد کوٹ پہنے ہوئے اور پیدل تھا، الینکا سٹریٹ کی عکاز پر کھڑے بائیں کر رہے تھے۔ ایک تیسرا افسر سر پٹ گھوڑا اوڑھاتے ان کے پاس آیا۔

”جسٹس نے حکم دیا ہے کہ ان لوگوں کو لازماً بلا تاخیر بھاگ دیا جائے۔ ان کی حرکتیں شرمناک ہیں۔ آدھے جوان ادھر ادھر تڑپ رہے ہوئے ہیں! تم، تم کہاں جا رہے ہو؟ اور تم؟“ اس نے پیادہ فوج کے تین سپاہیوں سے، جو اپنی بندوقیں پھینک کر اور اپنے اوپر کوٹوں کے نچلے حصے اوپر اٹھائے اس کے قریب سے آنکھ بچا کر مسقف بازار میں گھسنے کی کوشش کر رہے تھے، چلا کر کہا۔ ”بد معاشوں، رک جاؤ!“

”خود دیکھ لو۔ ذرا نہیں روک کر دکھاؤ؟“ دوسرے افسروں میں سے ایک نے بھاگ کر جواب دیا۔ ”کچھ نہیں

ہو سکتا! ہمارے لیے صرف ایک ہی صورت باقی رہ گئی ہے کہ بیشتر اس کے کہ باقی بھی لگام چھڑا کر بھاگ نکلیں، ہم تیزی سے آگے نکل چلیں۔“

”ہم آگے کیسے جاسکتے ہیں؟ وہ پل پر پھنسے ہوئے ہیں۔ آگے جانے کا راستہ ہی نہیں ملتا۔ کیا یہ بہتر نہیں ہوگا کہ ان کے دوراں کے مابین حصار بنایا جائے تاکہ باتوں کو بھاگنے سے روکا جاسکے۔“

”آگے جاؤ اور انھیں وہاں سے بھگاؤ!“ سینئر افسر نے چلا کر کہا۔

جس افسر کی وردی پر سکارف تھا، وہ گھوڑے سے اترا، اس نے ایک ٹیلی کو بلیڈ اور وہ مسقف راہداری میں، جس کے دونوں اطراف دکانیں تھیں، داخل ہو گیا۔ چند ایک جوان ہجوم کی صورت میں بھاگنے لگے۔ ایک دکاندار، جس کے رخساروں پر ناک کے نزدیک پھنسیاں تھیں اور جس کے فریبہ چہرے سے ظاہر ہوتا تھا کہ یہ شخص ٹھٹھے داغ کا مالک، پنا آلو سیدھا کرنے کے لیے جمع تفریق کا، ہر اور کٹ جیتی ہے، طمطراق سے بازو لہراتا، بکلت افسر کے پاس پہنچا۔

”حضور!“ اس نے کہا۔ ”دیا کریں، ہمیں بچائیں، آپ کی نوازش ہوگی۔ ہم خیس نہیں ہیں۔ ہم چھوٹی سونے خدمت کے لیے ہر وقت تیار ہیں، یہ ہمارے لیے باعث سعادت ہے۔ آئیں، تشریف لائیں، میں آپ کی خدمت میں کپڑے کا تھان، اگر حضور پسند فرمائیں، تو وہ تھان پیش کرنے کے لیے تیار ہوں۔ ہمارے لیے باعث سعادت ہوگا۔ مگر یہ جو کچھ ہو رہا ہے، یہ تو نری ڈیکتی ہے۔ حضور، دیا کریں، کم از کم اتنی دیر کے لیے یہاں سنتری کھڑے کر دیں کہ ہم اپنی دکانیں ہی بند کر سکیں۔“

متحدہ دکانداروں نے افسر کے گرد گھیرا ڈال دیا۔

”ہونہ، جی جی کرنے کا فائدہ؟“ ان میں سے ایک دبیلے پتلے شخص نے کہا۔ جس کا چہرہ کرخت تھا۔ ”ہم شخص کا سر کٹ جائے، وہ یہ واویلا نہیں کرتا، ہائے میرے بال،“ پھر وہ شخص، جہاں افسر کھڑا تھا، وہاں سے پیچھے ہٹا اور اپنے بازو کو زور زور سے لہراتے با آواز بلند پکارنے لگا۔ ”جو جی چاہے، اٹھاؤ!“

”ایوان سید ورج، تمہیں اس قسم کی باتیں کرنا زیب نہیں دیتا!“ پہلے دکاندار نے غصے سے چلا کر کہا۔

”حضور، اندر تشریف لے چلیں۔“

”باتیں؟ ہونہ۔“ دبیلے پتلے آدمی نے چیخ کر کہا۔ ”یہاں میری تین دکانیں ہیں۔ ان میں ایک، گھر وٹل کا مال بھرا ہوا ہے۔ جب فوج چلی جائے گی، اسے بچایا جاسکے گا؟ نہیں، بھائیو، خدا کی مشیت انسانوں کے ہاتھ میں نہیں ہے!“

”حضور، آئیں، تشریف لائیں!“ پہلے دکاندار نے دوزانو ہو کر کہا۔

افسر شش و پنج میں پڑ گیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے اور کیا نہ کرے۔ اس کا چہرہ چغلی کھار ہوا تھا کہ اسے فیصلہ کرنے میں دشواری پیش آرہی ہے۔

”یہاں میرا کیا کام؟“ اس نے اچانک چہ کر کہا، گھوڑے کو ایڑ لگا کر اور تیزی سے مشف گلی میں سے گزرنے لگا۔

ایک کھلی دکان سے ہاتھ پائی اور گالی گلوچ کی آوازیں سنائی دینے لگیں اور جب اس کے قریب پہنچا، ایک سرمنڈے شخص کو، جس نے سر مٹی دیہاتی کوٹ جین رکھا تھا، دھکا دے کر باہر پھینک دیا گیا۔ یہ شخص دہرا ہو گیا اور، فسر اور دکانداروں کے قریب سے گزرتا آگے بھاگ گیا۔ جو فوجی جون دکان کے اندر تھا، اس پر جھپٹ پڑا لیکن عین اسی لمحے اس زبردست ہجوم سے، جو سکواپل پر کٹھا ہو گیا تھا، ہولناک جھپٹ بند ہونے لگیں اور افسر چوک کی جانے بھاگنے لگا۔

”کیا ہوا؟ کیا ہوا؟“ وہ پوچھنے لگا لیکن اس کا ساتھی پہلے ہی سر پر پاؤں رکھے واسکی بلا ٹرنی جیج کے قریب سے گزرتا ادھر دوڑا جا رہا تھا جدھر سے شور و غل کی آوازیں آرہی تھیں۔

فسر اپنے گھوڑے سے اترا اور اس کے پیچھے چل پڑا۔ جب وہ پل کے نزدیک پہنچا، اس نے دیکھا کہ دو توپیں گاڑیوں سے علیحدہ ہو گئی ہیں، پیادہ سپاہی پل عبور کر رہے ہیں، متعدد پھنڈے لٹے پڑے ہیں، چند اشخاص کے چہروں پر وحشت نیک رہی ہے اور کچھ فوجی جوان قہقہے مگ رہے ہیں۔ توپوں کے نزدیک گاڑی کھڑی تھی۔ اس میں دو گھوڑے جتے ہوئے تھے۔ گاڑی کے پیچھے چار روسی انسل شکاری کتے تھے۔ ان کے گلوں میں بٹے تھے۔ وہ درے سے پہیوں سے چمٹے ہوئے تھے۔ گاڑی میں اثنا سامان لدا ہوا تھا کہ چھوٹی موٹی پہاڑی بن گئی تھی، اور سامان کے کے عین اوپر بچوں کی کرسی کے قریب جس کی ٹانگیں فضا میں صعل تھیں، ایک دیہاتی عورت بیٹھی تھی۔ عورت کی جان پر بنی ہوئی تھی اور اس نے اپنے دادیلے سے آسمان سر پر ٹھہرکھا تھا۔ افسر کو اس کے دنگھانے بتایا کہ عورت اور ہجوم اس لیے جیج چنگھڑ رہے ہیں کیونکہ جب جنرل بر، لون، ادھر سے گزرا اور اسے یہ معلوم ہوا کہ جوان چھپ چھپا کر بھاگ رہے اور دکانوں میں لوٹ مار مچا رہے ہیں، جب کہ غیر فوجی لوگ پل پر بھیڑ لگائے ہوئے ہیں، وہ آگ بگولا ہو گیا۔ اس نے گاڑیوں سے دو توپیں اتروائیں اور یوں ظاہر کرنے لگا جیسے وہ پل پر گولہ باری کرنا چاہتا ہو۔ ہجوم گاڑیوں کو الٹا پلٹا، ایک دوسرے کو ٹھوکریں لگاتا، پاؤں تلے پکلتا اور دیوانہ وار جھپٹ بلند کرتا پل پار کر گیا۔ یوں راستہ صاف ہو گیا اور فوجی آگے بڑھنے لگے۔

دریں اثنا جہاں تک اصل شہر کا تعلق ہے، وہ خاں ہو چکا تھا۔ گلیوں میں شہید ہی کوئی متفنس نظر آتا ہوگا۔ دروازے اور دکانیں سب بند تھیں۔ صرف کہیں کہیں ہوٹلوں کے قریب وجوار میں کسی اسکے کے شرابی کے غل غپاڑے یا گانے کی آواز سنائی دے جاتی۔ سڑکوں اور گلیوں سے گاڑیاں حنقا ہو چکی تھیں اور قدموں کی چاپ نایاب۔ پورا سکایا شریٹ کاملاً سنسان اور ویران تھی۔ رستوں کے گھر کے وسیع و عریض محن میں گھس اور لید کے ڈمیر لگے ہوئے تھے اور کوئی

ذی روح نظر نہیں آتا تھا۔ بڑے ڈرائنگ روم میں، جس میں فرنیچر، پردے اور دیگر آرائشی اشیاء جوں کی توڑ مدہنے دی گئی تھیں، صرف دو اشخاص — یارڈ پورٹر اگناٹ اور داسلیج کا پوتا مشکا، جو گھر کے چھوٹے موٹے کام کرتا تھا۔ اپنے دادا کے ساتھ ماسکو میں ہی ٹھہر گیا تھا۔ موجود تھے۔ مشکا نے کھدی کارڈ کھول لیا تھا اور اس کی اگلی اٹارنی پر سے اس کے تار چھیڑ رہی تھی۔ یارڈ پورر دونوں ہاتھ کپھوں پر رکھے قد آدم آئینے کے سامنے کھڑا تھا اور دل جی سے مسکرا رہا تھا۔

”بہت مزے دار ہے! کیا خیال ہے، چچی اگناٹ؟“ چھوکرے نے ایک ایک دنگی دونوں ہاتھوں سے سارے پردوں کے تختے پر ضرب لگاتے ہوئے کہا۔

”خوب، خوب!“ اگناٹ نے جواب دیا۔ اپنے چہرے پر مسکراہٹ پھیلتی دیکھ کر وہ خود مبہوت ہو رہا تھا۔ ”بد تمیز! بے شرم! بے حیا!“ ماورا کزی نیشٹا نے دھاڑتے ہوئے کہا۔ وہ یوں بے پاؤں کمرے میں داخل ہوئی تھی کہ انھیں کانوں کان خبر نہ ہو سکی۔ ”اس بھینسے کو دیکھو، اپنا ہاتھ دیکھ کر کیا کہیں گے؟ میں نکال رہا ہوں! تو تم یہ کرنے یہاں آئے ہو! ادھر سارا کام یوں کاتوں پڑا ہے اور داسلیج بے چارے کا جوڑ جوڑ درد کر رہا ہے۔ ٹھہرو، میں تمہاری خبر لیتی ہوں!“

اگناٹ نے دنت نکالنا بند کیا، پتی چٹی درست کی اور آنکھیں جھکائے چپ چپ باہر نکل گیا۔ ”حالہ میں نے تو محض ہاتھ لگایا تھا۔“ چھوکر کہنے لگا۔

”آوارہ گرد! یہ ہاتھ داتھ لگانا چھوڑو۔“ ماورا کزی نیشٹا نے دھمکی آمیز انداز سے ہاتھ لہراتے ہوئے کہا۔

”چاؤ، دادا کے لیے سادہ چڑھا دو۔“

ماورا کزی نیشٹا نے کلا دی کارڈ سے گرد پونچھی، اسے بند کیا، گہری آہ بھری، کمرے سے باہر نکلا اور دروازے پر تالا لگا دیا۔

صحن میں پہنچ کر وہ رک گئی اور سوچنے لگی کہ ب اے کہاں جانا چاہیے: ”تو کروں کے کوارٹروں میں جا کر داسلیج کے ساتھ چائے پیوں یا سنو روم میں جا کر ایشیا سمیٹوں جو ابھی تک ادھر ادھر بکھری پڑی ہیں۔“

گلی میں کسی کے تیز تیز چلنے کی چاپ سنائی دی۔ کوئی شخص صدر دروازے پر رکا۔ اس کا ہاتھ کھٹکا جھماکا اور اسے کھولنے کی کوشش کر رہا تھا۔

ماورا کزی نیشٹا کیٹ کی جانب چل دی۔

”کس سے ملنا ہے؟“

”کاوٹنٹ۔ الیا آندرچ رستوف۔“

”لوہر آپ کون ہیں۔“

”ایک افسر۔“ میں ان سے فوراً ملنا چاہتا ہوں۔“ خوشگوار شعلیت روسی آواز نے جواب دیا۔

اور کز می نیشنا نے تال کھولا اور تقریباً اٹھارہ سالہ نوجوان افسر جس کا چہرہ بیضوی اور ساخت کے اعتبار سے رستونوں سے اچھا خاصا ملتا جلتا تھا، محسن میں داخل ہوا۔

”حضور، وہ تو تشریف لے جا چکے ہیں۔ وہ کل شام روانہ ہوئے تھے۔“ ماورا کز می نیشنا نے شفقت سے کہا۔
نوجوان افسر گیٹ کے قریب کھڑا تھا۔ وہ یہ فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا کہ وہ وہیں کھڑا رہے یا غر چلا جائے۔
”اف، یہ تو بہت برا ہوا!“ اس نے زبان ہنساتے ہوئے کہا۔ ”مجھے کل آنا چاہیے تھا۔ کیسی غلطی ہوئی!“
ماورا کز می نیشنا نوجوان افسر کے جانے پہچانے رستونی خدوخال، اس کے بوسیدہ کوٹ اور پٹے پرانے بوٹوں کا اظہارِ کرم و ہمدردی سے چائزہ لے رہی تھی۔

”آپ کو کاؤنٹ سے کیا کام تھا؟“ اس نے پوچھا۔

”اچھا، خیر... اب کیا ہو سکتا ہے!“ اس نے ذرا جھلا کر کہا اور اپنا ہاتھ یوں گیٹ پر رکھا جیسے وہ وہیں جانا چاہتا ہو۔

وہ ایک بار پھر شش و پنج میں پڑ گیا۔

”بات دراصل یہ ہے،“ وہ ایک ایک کی بولنے لگا، ”میں کاؤنٹ کا قرابت دار ہوں۔ وہ مجھ پر ہمیشہ شفقت فرماتے رہے ہیں اور یہ بات تو آپ کو بھی معلوم ہو گئی ہوگی“ اس نے بلا جھجک شگفتہ دلی سے مسکراتے ہوئے کوٹ اور بوٹوں پر نظر ڈالی، ”کہ میرے کپڑے تار تار ہو رہے ہیں اور ہاتھ میں دھڑکی بھی نہیں۔ میں کاؤنٹ سے مدد مانگنے آیا تھا۔“
”حضور، آپ ایک منٹ، بس ایک منٹ انتظار فرمائیں...“ وہ بولی۔

جونی افسر نے دروازے سے ہاتھ اٹھایا، وہ واپس مڑی اور اپنی بوڑھی ٹاگوں کو تیزی سے گھسیٹتی محسن

مک سے گزرتی نوکروں کے کوارٹروں کی طرف چل پڑی۔
جب ماورا کز می نیشنا اپنا کو رٹریک جاب بھاگی جاری تھی، نوجوان افسر سر جھکائے محسن میں ادھر ادھر چکر لگا رہا تھا۔ اس کے لبوں پر ہلکا سا تبسم تھا اور وہ بار بار اپنے بوسیدہ بوٹوں کو دیکھ رہا تھا۔

”کتنا برا ہوا، انکل سے ملاقات ہی نہ ہو سکی۔ یہ بڑھیا کتنی جھمی ہے“ اور اپنی رجسٹر تک پہنچنے کے لیے

میں مختصر ترین راستہ کس سے پوچھوں گا؟ وہ اب تک لازماً گورڈسکی گیٹ پر پہنچ گئی ہوگی۔“ اس نے سوچا۔

اسنے میں ماورا کز می نیشنا مکان کے کونے میں نظر آئی۔ وہ جھنجھٹ ضرور رہی تھی لیکن اس کے چہرے پر غم و ہمت لپک رہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں لپٹا پٹا پارواں تھا۔ ابھی وہ افسر سے چند قدم دور تھی کہ اس نے رومال کھولا

بچیس 25 روٹل کا سفید نوٹ نکالا اور جھٹ پٹ افسر کو تھا دیا۔
”گر ہر ایکس لینسی گھر پر ہوتے... رشتے دار ہونے کے ناتے... وہ ضرور بالضرور... مگر یہ جو بروقت آن

پڑا ہے...“ ماورا کز می نیشنا گڑ بڑا رہی تھی اور اس کے منہ سے پوری بات نہیں نکل رہی تھی۔
افسر نے نہ پس و پیش کیا اور نہ جلد بازی دکھائی، اس نے بس نوٹ پکڑا اور اس کا شکریہ ادا کرنے لگا۔

”اگر کاؤنٹ گھر ہوتے...“ ماورا کز می بیشنا معذرت خواہانہ انداز سے بڑبڑائی۔ ”حضور، یہ سوا صبح آپ کے حامی و ناصر ہوں! خداوند آپ کو صحیح سلامت رکھیں!“ اس نے گردن جھکا کر اور اسے الوداع کرتے ہوئے کہا۔ افسر مسکراتا اور اپنا سر ہلاتا، جیسے اسے اپنے آپ پر ہنسی آرہی ہو، سوئی گلیوں میں تیز تیز دوڑتا یا آواز کی سمت بھاگنے لگا تاکہ وہ اپنی رجسٹری سے جا ملے۔

لیکن ماورا کز می بیشنا کچھ دیر غم ناک آنکھوں کے ساتھ ہند گیٹ کے قریب کز می راہی۔ وہ محویت کے عالم میں اپنے سر کو ادھر ادھر گھما پھر رہی تھی، اجنبی نو عمر افسر کے لیے اس کے دل میں یکا یک ماورا نہ شفقت اور امدادی کے جذبات موجزن ہو گئے تھے۔

23

وار وار کا محلے کی ایک مکمل عمارت سے، جس کی پچلی منزل میں ریستوران اور مے خانہ تھا، نشے میں دھت لوگوں کے دنگا فساد کرنے اور گانے گانے کی آوازیں آرہی تھیں۔ ایک تنگ اور غلیظ کمرے میں میزوں کے سامنے نچلے پرکار خانوں کے دس بار مزدور بیٹھے تھے۔ وہ مخمور و مدہوش تھے۔ ان کے اجسام پسینے میں نہاتے ہوئے تھے، ان کی آنکھیں چندھی ہو رہی تھیں اور ان کے منہ کھلے ہوئے تھے، وہ کوئی گیت نرا چیز گارہے تھے۔ ان کی آوازیں بے بری، اٹل اور بے جوڑ تھیں۔ صاف نظر آ رہا تھا کہ وہ اس لیے نہیں گارہے کیونکہ انھیں نغمہ سرائی کی خواہش تھی، بلکہ وہ محض اس لیے اپنے گلے پھاڑ رہے تھے کیونکہ وہ یہ ثابت کرنا چاہتے تھے کہ انھیں نشا چھپی طرح چڑھ چکا ہے اور وہ خوب مزے کر رہے ہیں۔ ان میں سے ایک شخص، جو نو جوان اور دراز قد تھا، جس کے ہل سنہری تھے اور جو صاف ستھرے نیلے کوٹ میں ملبوس تھا، دوسروں کے اوپر چڑھا کھڑا تھا۔ سیدھی اور ستواں ناک کے سبب اس کا چہرہ خوبصورت ہو سکتا تھا بشرطیکہ اس کے لب باریک، بھنے ہوئے اور پھڑکتے نہ ہوتے اور اس کی آنکھیں بے زور، غصیلی در ایک جگہ ٹھہری ہوئی نہ ہوتیں۔ وہ ان کے اوپر کھڑا تھا اور بظاہر کوئی خیال اس کے ذہن پر قابض تھا کیونکہ وہ نہایت سنجیدگی اور ورستی سے اپنے ایک سفید بازو سے، جس کی آستیں کہنی تک چڑھی ہوئی تھیں، تال دے رہا تھا جب کہ وہ اپنی غلیظ انگلیاں غیر فطری انداز سے پھیلائے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کے کوٹ کی آستیں بار بار نیچے ڈھلک جاتی اور وہ ہر بار بائیں ہاتھ سے اسے نہایت احتیاط سے دوبارہ اوپر اڑس دیتا جیسے اس کے سفید نیلے بازو کا، جسے وہ لہرا رہا تھا، برہنہ رہنا نہایت ضروری تھا۔ گانے کے بیچ میں ہاتھ پائی کرنے اور پیچھے چلانے کی آوازیں پورچ اور غلام گردش میں سنائی دینے لگیں۔ دراز قد نو جوان نے اپنا بازو لہرایا۔

”رک جاؤ!“ وہ تنک نہ انداز سے چلایا۔ ”لڑکو، باہر دنگا ہو رہا ہے!“ اور وہ اپنی آستیں اوپر اڑستا ہر پورچ کی طرف چل دیا۔

مزدور اس کے پیچھے پیچھے باہر نکل آئے۔ یہ لوگ دراز قد نو جوان کی قیادت میں صبح سے ریستوران میں

شراب نوشی کر رہے تھے۔ وہ ریسٹوراں کے مالک کے لیے کارخانے سے چند کھالیں لائے تھے اور اس کھمبہ کے عوض ان کی تواضع شراب سے کی گئی تھی۔ پڑوس کے لوہار خانے کے چند آہن گروں کے کانوں میں ریسٹوراں میں دھماچو کڑی مچنے اور رنگ رلیاں منائے جانے کی آوازیں پڑیں۔ انھیں خیال گزرا کہ شاید وہاں لوٹ مار ہو رہی ہے۔ چنانچہ انھوں نے ٹھان لیا کہ وہ بھی دھونس سے اندر داخل ہو جائیں گے۔ اس کا نتیجہ پورج میں جھگڑے کی شکل میں برآمد ہوا۔

ریسٹوراں کا مالک دروازے پر ایک لوہار سے مختتم گفتگو رہا تھا اور عین اس وقت جب کارخانے کے مزدور باہر آئے، لوہار نے اپنے آپ کو مالک ریسٹوراں سے جھڑپ تو لیا لیکن وہ منہ کے بل فٹ پاٹھ پر گر پڑا۔ ایک، دروازہ دروازے کی جانب لپکا اور اس نے ریسٹوران کے مالک کو اپنی چھاتی سے دھکا دے دیا۔ جس نوجوان نے اپنی آستین اوپر چڑھ رکھی تھی، اس نے لوہار کے منہ پر گھونسا مارا اور ہانگوں کی طرح چلانے لگا:

”لوکو، اوھر آؤ! یہ ہمارے آدمیوں کی دھناتی کر رہے ہیں!“

اس ٹامیں پہلا لوہاراٹھ کر کھڑا ہو چکا تھا۔ اس نے اپنے خراش رسیدہ چہرے کو چھیل ڈالا تاکہ اس سے خون بہنے لگے اور پھر با آواز بلند دایلاپا کرنے لگا:

”مدا قتل! آدمی کا خون ہو گیا! مدا!“

”خداوند، رحم! مار دیا، وہ مار دیا! آدمی جان سے گیا۔ قتل ہو گیا!“ ایک عورت، جو قریبی دروازے سے دوڑتی باہر آئی تھی، چلا کر کہہ رہی تھی۔

لوہان لوہار کے گرد ہجوم اکٹھا ہو گیا۔

”لوگوں کو لوٹ لوٹ کر تمھارا دل نہیں بھرا؟ ان کے کپڑے تک اترا دے۔“ کسی نے ریسٹوران کے مالک سے کہا۔ ”اور اب تم نے آدمی بھی قتل کر دیا ہے! قاتل، خونی!“

دراز قد نوجوان میٹرھیوں پر کھڑا تھا۔ وہ، پتی چندھی آنکھیں کھلا پھرا کر کبھی ریسٹوران کے مالک کو اور کبھی لوہار کو دیکھنے لگا۔ گویا سوچ رہا ہو کہ اسے ان میں سے کس کے ساتھ ہاتھ پائی کرنا چاہیے۔

”خونی!“ اس نے اچانک چلا کر ریسٹوران کے مالک سے کہا۔ ”لوکو، اس کے ہاتھ پاؤں باندھ دو!“

”مجھے باندھو گے، تم مجھے باندھو گے!“ مالک ریسٹوران نے دھاڑتے ہوئے کہا اور جو آدمی اس کی طرف لپکے تھے، اس نے انھیں پرے دھکیل دیا۔ پھر اس نے جلت سے اپنی ٹوپی اتاری اور سے نیچے پھینک دیا۔

جیسے اس کا یہ فعل کسی پراسرار اور منحوس معنویت کا حامل ہو، کارخانے کے مزدور، جو اس کے گرد گھبراڈال رہے تھے، کو ملک کی کیفیت میں جہاں تھے، وہیں رک گئے۔

”بچو، مجھے قانون آتا ہے، خوب آتا ہے! میں یہ معاملہ پولیس کمشنر کے سامنے پیش کروں گا۔ تمھارا خیال

ہے کہ میں ان کے پاس نہیں جاؤں گا؟ تمہیں ان دنوں لوگوں کے گھروں اور ہوٹلوں میں ڈاکے مارنے کی اجازت نہیں مل گئی؟“ ریسٹوران کے مالک نے اپنی ٹوپی اٹھاتے ہوئے چلا کر کہا۔

”آؤ، چلیں!.. آؤ، چلیں!“ ریسٹوران کے مالک اور دراز قد نو جوان نے یکے بعد دیگرے کہا، اور دونوں اکٹھے سڑک پر چلتے گئے۔

لوہاں لوہاں لوہاں کے برابر برابر چلتے لگا اور دوسرے تمام لوگ ان کے پیچھے ہو گئے۔ وہ سب باتیں کر رہے تھے۔

مارسیکا سٹریٹ کے کٹڑ پر، خاصے بڑے مکان کے سامنے، جس کے کواڑ بند تھے اور جس پر جفت ساز کا سائن بورڈ لٹک رہا تھا، تقریباً اٹھارہ بیس جفت ساز کھڑے تھے۔ ان کے اجسام دیلے پتلے اور نحیف دتار تھے۔ ان کے چہروں پر اسی ٹپک رہی تھی۔ وہ دوڑ آں اور بوسیدہ کوٹ پہنے ہوئے تھے۔

”وہ ہمیں معقول مزدوری کیوں نہیں دیتا؟“ ایک لاغر محنت کش، جس کی داڑھی چھدری اور بھوس تنی ہوئی تھیں، کہہ رہا تھا۔ ”وہ ہمارا خون نچوڑ لیتا ہے۔ پھر کچھ لیتا ہے کہ حساب برابر ہو گیا! وہ سارا ہفتہ ہمیں ہزار روپے دکھاتا رہا اور اب ہمیں چکمدے کر خود نو د گیارہ ہو گیا ہے۔“

جب اس کی نظر ہجوم اور لوہاں لوہاں پر پڑی، وہ چپ ہو گیا اور کبھی جفت ساز تحس کی خاطر راہ چلتی بھڑ میں شامل ہو گئے۔

”آپ لوگ کہاں جا رہے ہیں؟“

”تھانے، اور کہاں؟“

”کیا ہمارے ساتھیوں کو سچا سچ مار پڑی تھی؟“

”تمہارا کیا خیال ہے؟ خود دیکھ لو کہ لوگ کیا کہہ رہے ہیں!“

سوالات و جوابات کا تبادلہ ہونے لگا۔ ریسٹوران کے مالک نے ہر آن بڑھتے ہجوم کا فائدہ اٹھایا۔ وہ پیچھے رہ گیا اور واپس اپنے ریسٹوران چلا گیا۔

دراز قد نو جوان کو علم نہ ہو سکا کہ اس کا دشمن غائب ہو چکا ہے۔ وہ اپنا بد ہوش باز دلہرا تا اور ہجوم کی توجہ اپنی طرف مبذول کرنا مسلسل بولتا چلا گیا۔ بیشتر لوگوں نے اس کے گرد گھیرا ڈال رکھا تھا جیسے انھیں تو قہ ہو کہ ان کے اذہان میں جو سوالات ابھر رہے ہیں، وہ ان کے جوابات فراہم کر دے گا۔

”وہ مجھے حکم دکھا دے۔ مجھے قانون بتا دے۔ سخر حکم کس مرض کی دوا ہیں! سچی بھائیو، میں نے ٹھیک کہا تھا؟“ لاٹبا نو جوان کہہ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر اتنی ہلکی مسکراہٹ تھی کہ بشکل نظر آتی تھی۔ ”اس کا خیال ہے یہاں کوئی حاکم نہیں؟ حاکموں کے بغیر گاڑی کیسے چلے گی؟ اگر وہ نہ ہوں، پھر ہمیں لوٹنے والوں کی کی نہیں رہے گی؟“

”فضول باتیں بنانے کا فائدہ؟“ ہجوم کی دوسری جانب سے آواز سنائی دی۔ ”تمہارا خیال ہے دوا کو

بوٹی چھوڑ جائیں گے؟ کوئی شخص تمہیں اتو بنا رہا ہے۔ درتم اس کے پیچھے لگ گئے ہوا کیا یہاں فوجیوں کی کوئی کمی ہے؟ وہ اُسے اندر نہیں دیں گے۔ حاکموں کا یہی تو کام ہے۔ تمہارے لیے بہتر یہی ہے کہ جو کچھ لوگ کہہ رہے ہیں، اسے دھیان سے سنو۔“ ہجوم میں سے بعض لوگوں نے مائے نوجوان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

چاکا ٹاؤن کی دیوار کے قریب ایک اور ٹولی، ایک شخص کے گرد، جو کھر درے اون کا کوٹ پہنے ہوئے تھا، ملنے بنائے کھڑی تھی۔ اس شخص کے ہاتھ میں کاغذ تھا۔

”یوکار۔ وہ یوکار پڑھ رہے ہیں۔۔۔ یوکار پڑھ رہے ہیں!“ ہجوم میں لوگوں کی آوازیں بلند ہونے لگیں اور وہ سبھی فرمان خواں کی جانب بھاگنے لگے۔

موئے کھر درے کوٹ میں ملبوس شخص اکتیس اگست کا خبرنامہ پڑھ رہا تھا۔ جب ہجوم اس کے گرد گھیرا بنانے لگا، وہ بدحواس ہو گیا لیکن لائے نوجوان کے، جو بھیڑ میں راستہ بناتا تیزی سے اس کے قریب پہنچ چکا تھا، سے ملے لے پردہ ایک ہار پھر کپکپاتی آواز میں شروع سے خبرنامہ پڑھنے لگا۔

”ان بد معاشوں کا قلع قمع کرنے کے لیے فوج کو لہذا ہم پہنچانے کے سلسلے میں کل صبح سویرے میں ہزیرین ہائی نس“ (ہزیرین ہائی نس، مائے نوجوان نے سنجیدگی سے دہراتے ہوئے کہا۔ اس کے ماتھے پر شکنیں اور چہرے پر مسکراہٹ تھی۔) ”سے صبح مشورہ کرنے جا رہا ہوں۔ یہ بدکار، جو ہمارے وطن میں آگئے ہیں، انہیں جہنم رسید کرنے اور ان کا نام و نشان مٹانے کے لیے۔“ فرمان خواں پڑھتا گیا، در پھر رک گیا، (”دیکھا“) لوجوان نے جذبہ کاسرائی سے مغلوب ہو کر با آواز بلند کہا، ”وہ آپ کے سامنے ہر چیز صاف صاف بیان کر رہا چاہتا ہے۔“ ”ہم بھی سمجھ نہ سکتے ضرور کریں گے۔ میں ڈنر کے وقت تک وہیں آ جاؤں گا، پھر ہم کل کام میں جت جائیں گے، اسے پایہ تکمیل تک پہنچائیں گے اور انہیں نیست و نابود کر دیں گے۔“

آخری الفاظ مکمل خاموشی سے سنے گئے۔ مایوسی کے عالم میں لائے نوجوان کا منہ لگ گیا۔ معلوم ہوا تھا کہ اختتامی جلسے کسی کی سمجھ میں نہیں آتے ہیں۔ یہ جملہ کہ ”میں ڈنر کے وقت تک وہیں آ جاؤں گا،“ فرمان خواں اور سامعین دونوں کو خاص طور پر بہت برا لگا تھا۔ لوگوں کی ذہنی کیفیت بہت بلند ہو چکی تھی اور یہ جملہ اتنا پامال اور قابل فہم تھا کہ ہر کوئی آسانی سے اسے سمجھ سکتا تھا۔ یہ بات تو ان میں سے کوئی بھی کہہ سکتا تھا، اعلیٰ حکام حو فرمان اور اعلان جاری کرتے ہیں، ان میں اس قسم کی کوئی چیز نہیں آنا چاہیے تھی۔

وہ سب افسردہ اور خاموش کھڑے تھے۔ لائے نوجوان نے اپنے ہونٹ ہلائے اور ذرا آگے پیچھے جھولا۔ ”کیوں نہ اس سے پوچھ لیا جائے؟ وہ رہا وہ خود۔۔۔ وہ ادھر اکیوں نہ اسی سے پوچھ لیں؟ اور خورتائے گا۔۔۔“ چانک ہجوم میں آوازیں سنائی دینے لگیں، اور سب کی توجہ چیف آف پولیس کی گاڑی کی طرف مبذول ہو گئی۔ گاڑی دو گھوڑ سوار فوجیوں کی حفاظت میں چوڑک کی جانب آرہی تھی۔

یوکار (Ukar): زار کا فرمان یا اعلان، جو بجائے خود قانون کے مترادف ہوتا تھا۔ مگر بڑی میں اسے kase کہتے تھے۔

چیف آف پولیس نے اس صبح کاؤنٹ رستوپ جن کے حکم کی تعمیل میں دریائی بھروں اور کشتیوں کو زراعت کر دیا تھا اور اس خدمت کے معاوضے کے طور پر اسے خاصی سوئی رقم، جو اس وقت اس کی جیب میں تھی، اٹھا لی تھی۔ اب اس نے ہجوم کو اپنی طرف بڑھتے دیکھا۔ اس نے کوچوان کو گاڑی روکنے کا حکم دیا۔

”یہ کون لوگ ہیں؟“ اس نے ان اشخاص سے، جو ڈرتے جھپکتے اکیسے اکیسے اس کی دروٹکی کی طرف آرہے تھے، ڈانٹ کر پوچھا۔ ”میں پوچھتا ہوں، یہ بھیڑ کیسی ہے؟“

”حضور، یہ...“ موسے کھر دے اون کے کوٹ میں ملیوں کلرک کہنے لگا، ”حضور، ہزار کیسی لینسی کاؤنٹ کے اعلان کی پیروی میں یہ لوگ خدمات سرانجام دینا چاہتے ہیں، یہ اپنی جانوں کی قربانی دینے سے بھی دریغ نہیں کریں گے۔ یہاں دنگا فساد نہیں ہو رہا بلکہ جیسا کہ ہزار کیسی لینسی کاؤنٹ نے فرمایا ہے...“

”کاؤنٹ کہیں نہیں گئے، وہ یہیں ہیں۔ آپ لوگوں کے بارے میں حکم جاری کر دیا جائے گا۔“ چیف آف پولیس نے جواب دیا۔ ”چلو، گاڑی چلاؤ!“ اس نے کوچوان کو حکم دیا۔

ہجوم رک گیا اور جن لوگوں نے افسر کی بات سنی تھی، ان کے گرد کٹھا ہونے لگا۔ ہر کوئی دروٹکی کی طرف، جو چل پڑی تھی، آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگا۔

دریں اثنا چیف آف پولیس نے اپنے گرد پیش نظر ڈالی۔ اس کے منہ پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ اس نے کوچوان سے کچھ کہا اور گھوڑا ہواسے باتیں کرنے لگا۔

”دوستو، ہمارے ساتھ ہاتھ ہو گیا! آئیں، ہم خود کاؤنٹ کے پاس چلتے ہیں!“ لانے کوچوان نے گلاباڑ کر کہا۔

”وہ جانے نہ پائے! وہ ہمیں جواب دے! اسے روکو!“ ہجوم میں سے آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ آپس میں اونچے اونچے باتیں کرتے اور چیف آف پولیس کا تعاقب کرتے وہ ب یا کا ٹریٹ کی سمت چل پڑے۔

”دیکھو، یہ بڑے لوگ۔ اشراف اور تجار۔ سب چلے گئے ہیں اور ہمیں موت کے منہ میں دھکیل رہے ہیں۔ کیوں؟ ہم آخر کیا ہیں۔ کتے؟“ ہجوم میں یکے بعد دیگرے مختلف آوازیں کہے جا رہی تھیں۔

نیکم تمبر کی شرم کو کوٹو زوف سے ملاقات کرنے کے بعد کاؤنٹ رستوپ جن واپس آ گیا۔ وہ غصے سے جل بھن کر کباب ہو رہا تھا کیونکہ اسے جنگی کونسل کے اجلاس میں شرکت کی دعوت نہیں دی گئی تھی، اس نے شہر کے دفاع کے لیے امداد کی جو پیشکش کی تھی، اسے نظر انداز کر دیا گیا تھا اور پھر کمپ میں یہ جو بالکل نیا اور انوکھا نقطہ نظر کہ شہریوں کا سکون اور حب الوطنی کا والہانہ جذبہ نہ صرف ثانوی اہمیت کا حامل ہے بلکہ کاملاً غیر متعلق اور بے وقت

بھی ہے۔ اس کے سامنے آیا، اس نے بھی اسے دم بخود کر دیا تھا۔ ان تمام باتوں سے اس کے دل کو سخت نہیں لگی، اسے ان میں اپنی ہنک کا پہلو نظر آیا اور وہ بالکل بھونچکا رہ گیا۔ چنانچہ وہ واپس ماسکولوٹ آیا۔

پھر کے بعد وہ لباس تبدیل کیے بغیر صوفے پر بیٹ گیا۔ رات بارہ اور ایک بجے کے درمیان اسے مقاصد نے جگادیا جو کو تو زونف کا خط لے کر آیا تھا۔ خط میں کہا گیا تھا کہ چونکہ فوج ماسکو کی دوسری جانب ریازان روڈ کے آس پاس جا رہی ہے، چنانچہ وہ تھی مہربانی فرمائے کہ شہر میں سپاہ کی رہنمائی کرے کے لیے پولیس افسران بھیج دے۔ کاؤنٹ رستوپ جن کے لیے یہ کوئی نئی اطلاع نہیں تھی۔ اس کے سامنے جو مختلف شواہد آئے تھے، ان سے اسے یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ ماسکو کا دفاع نہیں کیا جائے گا۔ گزشتہ روز پٹکونایا پنازی پر کو تو زونف سے اس کی جو ملاقات ہوئی تھی، نہ صرف اس سے اس کا عندیہ ملا تھا، بلکہ بارودینو کی لڑائی کے بعد جتنے بھی جرنیل ماسکو آئے تھے، ان سب نے بیک زبان یہی کہا تھا کہ دوبارہ خم کر لڑائی کرنا ناممکن ہو گا اور اس کے بعد رستوپ جن کی منظوری سے سرکاری امداد راتوں کو شہر سے باہر منتقل کی جاتی رہیں اور نصف آبادی شہر چھوڑ کر چلی گئی۔ پھر بھی اس اطلاع نے، جو محض رقعے کی صورت میں اسے پہنچائی گئی تھی اور جو کو تو زونف کے حکم پر منتقل تھی، اور وہ بھی ایک ایسی شب، جب وہ پہلی مرتبہ ڈھنگ سے سویا تھا لیکن اس کی نیند میں خلل اندازی کر دی گئی تھی، اسے حیران بھی کیا اور غصہ بھی دلایا۔ اس زمانے میں کاؤنٹ رستوپ جن سے جو فعال سرزد ہوئے، اپنی یادداشتوں میں ان کی توضیح کرتے ہوئے دوبارہ تکرار کرتا ہے کہ ان ایام میں اس کے سامنے دو مقاصد تھے۔ ماسکو میں امن چھپنے کی فضا بحال رکھنا اور شہریوں کی روانگی میں غلٹ دکھانا۔ اگر رستوپ جن کے ان دو ہرے مقاصد کو صحیح تسلیم کر لیا جائے تو اس کا ہر عمل بے دارغ معلوم ہو گا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ پھر مقدس نشانیاں، برہمنوں کے خیمات، اسلحہ جات، گولہ بارود اور غلے کے ذخائر کیوں منتقل نہ کیے گئے؟ شہر کے ہزاروں باشندوں کو اس غلط فہمی میں، کہ ماسکو کا ہر قیمت پر دفاع کیا جائے گا، مبتلا کر کے کیوں فریب دیا گیا؟ کیا یوں انھیں جاہلی کے غار میں نہیں دھکیلا گیا؟ کاؤنٹ رستوپ کا جواب یہ ہے: ”ماسکو میں امن و سکون کی فضا بحال رکھنے کی خاطر۔“ اگر یہی بات تھی تو پھر سرکاری دفاتر سے ڈھیروں بے سود دستاویزات، لے بیخ کا غبارہ اور دیگر اشیائیں منتقل کی گئیں۔ کاؤنٹ رستوپ جن اس کی وضاحت بدیں الفاظ کرتا ہے ”تاکہ شہر میں کچھ بھی باقی نہ رہے۔“ آدمی بس اتنا مفروضہ مٹانے کے لیے امن عامہ کو خطرہ لاحق ہے، پھر ہر فعل جائز قرار دیا جاسکتا ہے۔

فرانس کے عہدِ خویش کے دوران میں تمام گھناؤنی کارروائیاں امن عامہ کے نام پر کی گئی تھیں۔ پھر 1812 میں ماسکو کے امن عامہ کے بارے میں کاؤنٹ رستوپ جن کے خدشات کی اساس کیا تھی؟ یہ مفروضہ کیوں تراشا گیا کہ بغاوت کا امکان موجود ہے؟ شہر کے باشندے باہر جا رہے تھے اور ان کی جگہ سپاہی اختیار کرنے والی فوج سے رہی تھی، اس سے فساد کا اندیشہ کیوں محسوس ہوا؟ جب بھی روس کے کسی شہر میں غنیم کی فوج داخل ہوئی، کبھی کسی نے یہ نہیں سنا کہ ماسکو یا ملک کے کسی دوسرے

مقام پر بغاوت یا اس سے متعلق جلتی کوئی چیز رونما ہوئی ہے۔ کیم اور دو ستمبر کو ماسکو میں ابھی تک دس ہزار افراد موجود تھے اور سوائے اس ہجوم کے جو گورنر جنرل کے محل کے احاطے میں جمع ہوا تھا۔ اور یہ لوگ بھی اس لیے آئے تھے کہ خود اس نے انھیں اکسایا تھا۔ کہیں کچھ نہیں ہوا تھا۔ بارودینو کی ٹرائی کے بعد جب یہ بات یقینی یا بہر حال امکانی ہو گئی تھی کہ ماسکو کا دفاع نہیں کیا جاسکے گا، اگر رستوپ چن ہتھیاروں اور خبرناموں کی تقسیم کے ذریعے لوگوں کو جذبات بھڑکانے کے بجائے شہر سے تیرکات، گولہ بارود و روپیہ پیسہ باہر منتقل کرنے کے، تدابیر کرنا اور ان کو صف صاف بتا دینا کہ شہر دشمن کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا جائے گا، پھر یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہو جاتی، کہ جس اندیشے میں کہ لوگ دنگا فساد کریں گے۔ وہ مبتلا ہے، اس کا کوئی خاص جواز موجود نہیں ہے۔

رستوپ چن جو شیلا، جند باز، شگفتہ مزاج اور خود اعتماد شخص تھا۔ وہ ہمیشہ انتظامیہ کے اعلیٰ ترین طبقوں سے متعلق رہا۔ وہ محبت الوطن ضرور تھا لیکن جن لوگوں کے متعلق اس کا خیال تھا کہ وہ ان پر حکومت کر رہا ہے، وہ انھیں مطلق سمجھ نہ پایا۔ اپنی دانست میں وہ چونکہ رسی قلب کا گورنر تھا، چنانچہ وہ اسی دن سے، جس روز دشمن سولسک میں داخل ہوا، بکھنے لگا کہ وہ قومی جذبات کے دھارے کو جس طرف چاہے، موڑ سکتا ہے۔ ہر سرکاری منتظم کی طرح اس کا بھی یہ خیال تھا کہ ماسکو کے شہریوں کے خارجہ افعال وہی معین کرتا ہے۔ اس نے اسی پر اکتفا نہ کیا بلکہ وہ یہ بھی سمجھنے لگا کہ اپنے خبرناموں اور اشتہاروں کے ذریعے وہ ان کے ذہنی رویوں کی بھی تشکیل کر رہا ہے حالانکہ یہ خبرنامے اور اشتہار ایسی بازاری اور میانہ زبان میں تحریر کیے جاتے تھے جس کا استہساں لوگ اپنے اپنے طبقے میں بھی محبوب تصور کرتے ہیں اور ان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ اعلیٰ حکام اسے کیوں استعمال کر رہے ہیں۔ ایک ایسے رہنما کا، جو عوام الناس کو اپنے پیچھے لگا سکتا ہو، بہتم بالشان کردار کرنے پر کاؤنٹ رستوپ چن کو اتنا سرور حاصل ہوا اور اسے اس کا انفا جگا پڑ گیا کہ اسے یہ علم ہی نہ ہو سکا کہ اس نوع کی حرکات سے اجتناب کرنا اور کسی قسم کے سوراپن کی نمائش کیے بغیر ماسکو خالی کرنا وقت کی اہم ضرورت ہے۔ اسے اچانک احساس ہوا کہ اس کے پاؤں تلے زمین کھسک رہی ہے لیکن وہ قطعی سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ کیا کرے اور کیا نہ کرے۔ اگرچہ اسے معلوم تھا کہ ماسکو ایک نہ ایک دن چھوڑنا پڑے گا مگر آخری لمحے تک اسے یہ یقین نہ آیا کہ واقعی ایسا ہوگا، چنانچہ اس نے اس ضمن میں کسی طرح کی کوئی تیاری نہ کی۔ شہر کے باشندوں نے اس کی خواہش کے علم الرغم ترک سکونت کی اور اگر سرکاری دفاتر دوسرے مقامات پر منتقل ہوئے، تو سرکاری عہدے داروں کے اصرار پر ہوئے، اس نے بادل ناخواستہ ان کی بات مانی۔ وہ اس کردار میں، جو اس نے اپنے لیے تخلیق کیا تھا، پوری طرح مستغرق تھا۔ اُن اشخاص کی طرح، جنھیں قدرت نے قوی قوت مثیلہ و دبیٹ کی ہوئی ہے، اسے مدتوں پہلے معلوم تھا کہ ماسکو کا دفاع نہیں کیا جائے گا، لیکن یہ علم محض اس کے ذہن میں مقید تھا، اپنے قلب کی گہرائیوں میں اسے اس کا کوئی یقین نہیں تھا اور یوں وہ اپنے آپ کو نئی صورت حال کے تقاضوں کے مطابق نہ ڈھال سکا۔

اس کی تمام مشقت طلب اور زوردار سرگرمیوں (یہ الگ بات ہے کہ یہ کتنی بار آدھیں یا لوگوں نے ان سے

کتا اتر قبول کیا) کا محور صرف یہ تھا کہ فرانسیسیوں سے خود اسے جو نفرت تھی، وہی عوام الناس کے قلوب میں ابھر دی جائے اور وہ اس کی ذات پر اعتقاد کرنے لگیں۔

لیکن جب حالت نے اپنی صحیح تاریخی وسعت اختیار کر لی، جب فرانسیسیوں سے نفرت کے اظہار کے لیے زبانی کلامی و عادی ناکافی ثابت ہونے لگے، جب لڑائی کے ذریعے بھی اس نفرت کا اخراج ناممکن ہو گیا، ماسکو کو جو واحد سوال درپیش تھا، جب اس کے سلسلے میں خود اعتمادی کسی کام نہ آئی، جب ماسکو کی ساری آبادی، جیسے اس نے ایک کر لیا ہو، اپنی تمام املاک چھوڑ چھاڑ اور اپنے اس منہ پر روپے سے اپنے توئی جذبے کی قوت ثابت کر کے، جرقہ درجوق شہر سے باہر نکل گئی ہو، تب وہ کردار، جو رستوپ چین نے اپنے لیے منتخب کیا تھا، ایک ایسی بے معنی ہو گیا۔ اسے یک دم محسوس ہوا کہ وہ اکیلے ہے، ناتواں ہے اور مستحکم خیز ہے، اور اس کے کھڑے ہونے کے لیے زمین نہیں ہے۔

جب رستوپ چین کو کو تو زوف کا سرد مہرا نہ اور واجب التعمیل رفقہ وصول کرنے کے لیے جگایا گیا، وہ اپنے آپ کو جتنا زیادہ تصور وار گردانتا، اسے اپنے آپ پر اتنا ہی زیادہ غصہ آنے لگا۔ جو کچھ (اشیائے ملکیت) خاص طور پر اس کی تحویل میں دیا گیا تھا اور جسے اسے باہر منتقل کر دینا چاہیے تھا، ابھی تک ماسکو میں پڑا تھا اور اسے اب باہر لے جانے کا کوئی امکان باقی نہیں رہا تھا۔

”یہ کس کا تصور ہے؟ معاملات نے جو یہ صورت اختیار کی ہے، اس کی ذمہ داری کس پر عائد ہوتی ہے؟“ وہ سوچ رہا تھا۔ ”مجھ پر نہیں، یقیناً مجھ پر نہیں! میں نے سب تیاریاں مکمل کر لی تھیں۔ ماسکو پوری طرح میری گرفت میں تھا اور اب انھوں نے ہماری کیا گت بنائی ہے! پاجی! بد معاش! غدار!“ اس نے سوچا لیکن باقی، بد معاش اور غدار کون تھے، وہ ان کی واضح طور پر نشان دہی نہ کر سکا مگر وہ ان لوگوں پر، جو کوئی بھی وہ تھے، نفرس بھیجے پر مجبور تھا کیونکہ اس کی دانست میں یہی لوگ اس باطل اور داہیات صورت حال کے جس میں وہ اپنے آپ کو پارہا تھا، ڈسے دار تھے۔ اس ساری رات کاؤنٹ رستوپ چین حکام، جن کی خاطر ماسکو کے تمام علاقوں سے لوگ اس کے پاس آ رہے تھے، جاری کرتا رہا۔ جو اشخاص ہر دم اس کے گرد گھیرا ڈاسے رکھتے تھے، انھوں نے کبھی اسے اتنا افسردہ اور بے چارہ نہیں دیکھا تھا۔

”یہ پیر ایکسی لینسی، صوبائی رجسٹرار کے محکمے سے کوئی شخص آیا ہے، ڈائریکٹر ہدایات، نگ رہے ہیں۔۔۔ پار یوں کی مجلس منتظر سے، سینٹ سے، یونیورسٹی سے، لاوارث بچوں کے ادارے سے۔۔۔ نائب اسقف سے اٹھی۔۔۔“ قلندر صاحب پوچھ رہے ہیں۔۔۔ قائریر گیڈ کے بارے میں تپ کا کیا حکم ہے؟ جیل کے داروزن دریافت کر رہے ہیں۔۔۔ پائل خانے کے سپرنٹنڈنٹ۔۔۔ ”ساری رات اس قسم کے استفسارات کاؤنٹ تک پہنچائے جاتے رہے۔۔۔“ ان استفسارات کے وہ بہنہ کر جو بات دیتا رہا۔ اس کے روپے سے مترشح ہو رہا تھا کہ اب اس سے حکم لینے کی ضرورت نہیں رہی، یہ کہ کسی نے اس کی تیاریوں پر، جو اس نے اتنی احتیاط سے کی تھیں، پانی پھیر دیا ہے اور اب جو کچھ وقوع پذیر ہوگا، اس کی تمام تر ذمہ داری کسی نہ کسی کو اپنے سر لینا ہوگی۔

”اس اجتن کو بتا دو کہ وہ جہاں ہے، وہیں رہے اور اپنی دستاویزوں کی حفاظت کرے۔“ اس نے رجسٹر کے محکمے کے استفسار کے جواب میں کہا۔ ”ان ذریعہ بریگیڈ والوں نے کیا بک بک لگا رکھی ہے؟ ان کے پاس گھوڑے ہیں۔ وہ ولادی میردخ ہو جائیں۔ وہ انھیں یہاں فرانسیسیوں کے لیے تو چھوڑ کر نہیں جاسکتے!“

”یوٹرا یکسی لینس، پاگل خانے کے پرنٹنڈنٹ آئے ہیں۔ آپ کا کیا حکم ہے؟“

”میرا حکم؟ سب چلے جائیں۔ پاگلوں کے رے کھول دیں اور انھیں شہر میں کھلا چھوڑ دیں۔ اگر پاگل ہماری فوجوں کے کمانڈر مقرر ہو سکتے ہیں، پھر خداوند کی مرضی یہی ہو سکتی ہے کہ ان پاگلوں کو بھی رہا کر دیا جائے۔“

جب اس سے دریافت کیا گیا کہ جیل کے سزایافتہ قیدیوں کا کیا کیا جائے، اس نے وارڈن سے غصے سے چلا کر کہا:

”تمہارا خیال ہے کہ میں تمہاری حفاظت کے لیے دو ہٹ سین فوج مہیا کر دوں گا۔ کہاں ہے یہ فوج؟ ان سب کو چھوڑ دو۔ بس!“

”یوٹرا یکسی لینس، ان میں سے بعض سیاسی قیدی ہیں۔ میس کوف، ویریش جاگن۔“

”ویریش جاگن، کیا اسے ابھی تک پھانسی پر نہیں لٹکایا گیا؟“ رستوپ چین نے دھاڑتے ہوئے پوچھا۔

”اسے میرے پاس لاؤ!“

25

صبح ہو گئی اور فوجی شہر میں سے گزرنے لگے۔ جو شہری کاؤنٹ سے ہدایات لینے کے خواہش مند تھے، نو بجے تک وہ بھی اپنے ان ارادوں سے دست کش ہو چکے تھے۔ جو لوگ شہر سے باہر منتقل ہو سکتے تھے، وہ اپنی مرضی سے عازم سفر ہونے لگے اور جو لوگ وہیں ٹھہرے رہے، فیصلہ کر رہے تھے کہ اب انھیں کیا کرنا چاہیے۔

کاؤنٹ نے اپنی گاڑی میں گھوڑے جو تھے کا حکم دیا۔ اس کا ارادہ سا کولنگی جانے کا تھا۔ وہ ہاتھ پر ہاتھ دھڑی روم میں بیٹھا تھا۔ وہ بالکل چپ چاپ تھا اور اس کی طبیعت سخت متعصب ہو رہی تھی۔

امن اور سکون کے زمانے میں ہر تنظیم کو یہ زعم ہوتا ہے کہ اس کی ذریعہ عمل پورے معاشرے کا کارخانہ محض اس کی مساعی کے طفیل چل رہا ہے۔ اسے یہ جو شعور ہوتا ہے کہ اس کی ذات بے مثل و بے بدل ہے، وہی اس کی بھنوں اور کوششوں کا انعام ہوتا ہے۔ جب تک تاریخی سمندر غیر متلاطم اور پرسکون رہتا ہے، تنظیم ملاح، جو اپنی کمزور ناتواں کشی عوام الناس کے جہاز سے منتقلی کر کے اس کے ساتھ چمٹا اور آگے چلا رہتا ہے، فطری طور پر یہ تصور کرنے لگتا ہے کہ جس جہاز کے ساتھ وہ چپکا ہوا ہے، وہ اسی کی سعی سے متحرک ہے۔ لیکن طوفان ذرا اٹھا نہیں، سمندر ذرا متلاطم ہوا نہیں اور غظیم جہاز کو ہچکولے ذرا آنا شروع ہوئے نہیں، پھر اس قسم کی خام خیالی ممکن نہیں رہتی۔ جہاز اپنی زبردست اور آزاد قوت کے بل بوتے پر آگے چلا رہتا ہے، جس رسی سے کشتی کو جہاز کے ساتھ منسلک کر دیا

تھا، اب وہ اس تک پہنچ ہی نہیں پاتی اور منتظم بقا رکھل اور منبع قوت بننے کے بجائے بے بضاعت، غیر اہم، گزر رہا اور بے کار شخص شخص بن جاتا ہے۔

رستوپ جن بھی کچھ محسوس کر رہا تھا اور اسی سبب وہ جھلایا ہوا تھا۔

میں اسی دم، جب ایکونٹ کاؤنٹ کو بتانے آیا کہ گاڑی تیار ہے، چیف آف پولیس، جسے ہجوم نے روک لیا تھا، پہنچ گیا۔ دونوں آدمیوں کے چہرے، ترے ہوئے تھے، در چیف آف پولیس نے یہ بتانے کے بعد کہ اس نے کاؤنٹ کے احکام کی تعمیل کر دی ہے، اسے مطلع کیا کہ اس کے احاطے میں لوگوں کا بہت بڑا ہجوم جمع ہو گیا ہے اور وہ اس سے ملنا چاہتا ہے۔

جواب میں ایک لفظ کہے بغیر رستوپ جن اٹھ کر کھڑا ہو گیا، تیز تیز دم اٹھاتا اپنے روشن اور ٹھٹھا ہاتھ سے آراستہ ڈرائنگ روم میں سے گزرتا بالکنی کے دروازے تک پہنچا، چٹخنی پر ہاتھ رکھا اور چھوڑ دیا۔ پھر وہ در پہچ کی سمت بڑھا۔ وہاں سے اسے ہجوم کا منظر بہتر طور پر دکھائی دے رہا تھا۔ لائیاں جو ان آگے کھڑا تھا، وہ کبھی صورت بنائے اپنے بازو قضا میں لہرا رہا اور باتیں کر رہا تھا۔ لہو لہان لوہار مغموم صورت بنائے اس کے قریب کھڑا تھا۔ بند کھڑکیوں میں سے آواروں کی بھٹھنا ہٹ سنائی دے رہی تھی۔

”گاڑی تیار ہے؟“ رستوپ جن نے در پہچے سے پیچھے ہٹتے ہوئے پوچھا۔

”جی ہاں، پوڑا ایکسی لینسی۔“ ایکونٹ نے جواب دیا۔

رستوپ جن دوبارہ بالکنی کے دروازے کے قریب چلا گیا۔

”لیکن یہ چاہئے کیا ہیں؟“ اس نے چیف آف پولیس سے پوچھا۔

”پوڑا ایکسی لینسی، وہ کہتے ہیں کہ وہ آپ کے احکام کی تعمیل کرنے اور فرانسیسیوں سے گریز کے لیے تیار

ہیں، اور وہ غداری کے بارے میں کوئی نعرہ لگا رہے تھے۔ لیکن، پوڑا ایکسی لینسی، یہ ہجوم ہے بڑا سرکش۔ میں نے

بڑی مشکلوں سے اس سے چند چھڑایا۔ پوڑا ایکسی لینسی، اگر اجازت ہو تو میں یہ عرض کروں۔“

”آپ جاسکتے ہیں، مجھے آپ کے مشوروں کی ضرورت نہیں۔ مجھے معلوم ہے کہ مجھے کیا کرنا ہے!“ رستوپ

جن نے غصے سے چلا کر کہا۔

وہ بالکنی کے دروازے کے قریب کھڑا ہجوم کو دیکھتا رہا۔ ”یہ ہے جو انھوں نے روی کے ساتھ کیا ہے! یہ ہے

جو انھوں نے میرے ساتھ کیا ہے!“ رستوپ جن نے سوچا۔ اس کی روح میں غصے کا یہ طوفان، جس پر قابو پانا

اس کے لیے ناممکن تھا، موج زن ہو رہا تھا۔ یہ غصہ کسی ایسے شخص کے، جس پر، جو کچھ ہو رہا تھا، اس کا الزام دھرا جا

سکے، خلاف تھا۔ جیسا کہ گرم مزاج لوگوں کے ساتھ اکثر ہوتا ہے، ابھی وہ قریانی کا بکر، جس پر وہ اپنا عتاب نازل کر

سکتا، تلاش کر رہا تھا، وہ خود ہی اپنے غصے میں جل بھن کر کباب ہونے لگا۔ ”ہونہ، تو یہ“ مگنے۔ کینوں، رزیلوں کی

بھیڑ، معاشرے کی چھٹ“ وہ ہجوم پر نگاہیں جمائے سوچ رہا تھا۔ ”اجڈ، گنوار، رڈیل، اپنی کم عقلی کے سبب خواہ مخواہ

ساقی انٹرنیٹ

PDF BOOK COMPANY



Muhammad Hushain Syakir

0305-6406067

Sidrah Tahir

0334-0120123

Muhammad Saqib Riyaz

0344-7227224

مشتعل ہو رہے ہیں۔ انھیں قربانی کا بکرا چاہیے۔“ اس نے لائے شخص کو بازو دلہراتے ہوئے دیکھ کر سوچا اور یہ خیال اس لیے اس کے ذہن میں آیا کیونکہ وہ خود کسی قربانی کے بکرے کی، جس پر وہ اپنا غصہ جھار سکتا، تلاش میں تھا۔
 ”گاڑی تیار ہوگئی؟“ اس نے دوبارہ پوچھا۔

”جی ہاں، یوڑا کیسی لینسی۔ وریٹش چاگن کے بارے میں آپ کا کیا حکم ہے؟ وہ پورچ میں انتظار کر رہا ہے۔“ ایجوٹنٹ نے کہا۔

”آہ!“ رستوپ چن نے یوں کہا جیسے اسے اچانک کچھ یاد آ گیا ہو۔
 اس نے شتابی سے دروازہ کھولا اور پر عزم قدم ٹھٹھا بالکنی میں آ گیا۔ ایک ایک باتوں کی جھینٹا ہٹ ختم ہو گئی، ٹوپیاں اور ہیٹ اتر گئے اور تمام نگاہیں کاؤنٹ کی جانب اٹھ گئیں۔

”جوانو! آداب عرض!“ کاؤنٹ نے جست اور بلند لہجے سے کہا۔ ”آپ کی تشریف آوری کا شکریہ۔ میرا بھی آپ کی خدمت میں حاضر ہوتا ہوں، لیکن پہلے ذرا ایک شریعت سے فیٹ میں۔ ہمیں اس پانی کو، جو ماسکو کی اس بربادی کا ذمے دار ہے، سزا دینا ہوگی۔ آپ میرا انتظار کریں!“

کاؤنٹ نے کھٹاک سے دروازہ بند کیا اور پہلے کی طرح تیز تیز قدم اٹھاتا کمرے میں واپس چلا گیا۔
 ہجوم اطمینان اور پسندیدگی کی فضا میں کھسک پھسک کر رہ گیا۔

”دیکھتے جاؤ، وہ ان سب بد معاشوں سے نیٹ لے گا۔ تم کہتے تھے کہ فرامیسی... وہ سب کمر اکھٹا ہمیں دکھادے گا۔“ ہجوم میں شامل لوگ کہہ رہے تھے جیسے وہ اعتبار کے فقدان کے لیے ایک دوسرے کو لعنت ملامت کر رہے ہوں۔

چند منٹ بعد ایک انفر تیز تیز چلتا سامنے کے دروازے میں سے باہر آیا، اس نے حکم دیا اور گھوڑ سواروں نے صفیں بنائیں۔ ہجوم بالکنی سے پیچھے ہٹ آیا اور پورچ کی طرف بڑھنے لگا۔ رستوپ چن غصیلے اور لمبے لمبے آگ بھرتا پورچ کی جانب آ رہا تھا۔ وہ اپنے گرد و پیش یوں نظریں گھما پھرا رہا تھا جیسے وہ کسی کو تلاش کر رہا ہو۔

”کہاں ہے وہ؟“ اس نے آگ بگولا ہو کر پوچھا۔ ابھی یہ اتفاقاً اس کے منہ سے نکلے ہی تھے کہ اس کی نگاہ ایک نوجوان شخص پر پڑی۔ یہ شخص دو گھوڑ سواروں کے مابین مکان کے کونے کے قریب پہنچ چکا تھا۔ اس کی گردن پتلی تھی اور اس کا نصف سر، جسے سوئڈ دیا گیا تھا، چھوٹے چھوٹے بالوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ وہ پھنپھناتا ٹیلا کوٹ، جس کے اندر لومڑی کھال کا اسٹر لگا ہوا تھا اور جو کسی زمانے میں بہت نفیس اور شاندار ہوگا، پہنے ہوئے تھا۔ اس کی غلیظ پتلون موٹے اور کھردرے کپڑے کی بنی ہوئی تھی اور یہ وہی تھی جو عام طور پر سزایافتہ مجرموں کو پہنائی جاتی تھی۔ اس نے یہ پتلون اپنے پتلے اور بے پالش جوتوں میں، جن کی ایڑیاں گھس چکی تھیں، اڑس رکھی تھی۔ اس کی لاغر اور کمزور ہانگوں میں بھاری بیڑیاں تھیں۔ اس سے اس کے لیے صحیح انداز سے قدم اٹھانا دشوار ہو رہا تھا اور اس کا جہاں پاؤں پڑتا، وہ اسے وہیں رکھتا چلا آ رہا تھا۔

”آہا!“ رستوپ جن نے غلٹ سے اس نوجوان سے نظریں پرے ہٹائے اور پورے دس منٹ کے چلے جسے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: ”اسے وہاں کھڑا کر دو!“

اپنی بیڑیاں جھنجھٹاتا نوجوان بدقت ادھر بڑھا جدھر اشارہ کیا گیا تھا۔ اس نے دو مرتبہ اپنی لائیو گردن دائیں بائیں گھمائی، ایک انگلی سے کوٹ کا تنگ کار، جو اس کا گلا چھیل رہا تھا، سیدھا کیا۔ پھر اس نے گہری آہ بھری، ہاتھوں سے یوں اشارہ کیا جیسے وہ اپنی قسمت پر قانع ہو۔ اس کے ہاتھ اتنے نرم و نازک تھے کہ وہ کسی مزدور کے نہیں ہو سکتے تھے۔ اس نے انھیں ایک دوسرے کے اوپر پیٹ پر رکھ لیا۔

نوجوان کو سیڑھیوں پر کھڑا ہونے میں چند سیکنڈ لگے۔ اس دوران میں مکمل سکوت طاری رہا۔ مجمع کے صرف قطبی حصے میں، جہاں ایک ہی جگہ لوگ آگے آنے کے لیے دھکم پیل کر رہے تھے، آہوں، کراہیوں، اور غراہیوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔

رستوپ جن ناک بھوں چڑھائے اپنے ہاتھ سے اپنا چہرہ مسل رہا تھا اور نوجوان کے سیر میوں پر پہنچنے کا انتظار کر رہا تھا۔

”روستوا“ اس نے کھٹکھٹاتی آواز میں کہا۔ ”یہ شخص۔۔۔ ویریش چاگن۔ وہ بد معاش ہے جو اسکو کی تباہی کا ذمہ دار ہے!“

سموری استر کے کوٹ میں ملبوس نوجوان اعانت شعار انداز سے سر جھکائے کھڑا تھا۔ اس نے اپنے ہاتھ ایک دوسرے کے اوپر پیٹ پر رکھے ہوئے تھے۔ اس کا جسم قدرے فیدہ تھا۔ اس کا بے حد دبلا پتلا اور ناقہ زدہ نوجوان چہرہ، جس کی نصف منڈی ہوئے سرے سے شکل بگاڑ دی تھی اور جس پر باس کی پرچھائیاں چھائی ہوئی تھیں، نیچے ڈھلکا ہوا تھا۔ کاؤنٹ کے اولین الفاظ پر اس نے اپنا سر آہستہ آہستہ اوپر اٹھا یا جیسے وہ کچھ کہا چاہتا ہو یا کم از کم اس سے نظریں ملانا چاہتا ہو، لیکن رستوپ جن نے اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ نوجوان کے کان کے پیچھے ایک نیلی ورید پھولی اور اس کی لائیو اور دہلی گردن پر رسی کی طرح نظر آنے لگی، اور ایک ایسی اس کا چہرہ تھماتے لگا۔ تمام نگاہیں اس پر مرکوز تھیں۔ اس نے ہجوم پر نظر درڑائی اور سے ان کے چہروں پر جو تاثرات دکھائی دیے، جیسے ان سے اس کی ہمت بندھ گئی ہو، وہ ڈراتے جھکتے اور اسی سے مسکرایا، پھر اس نے اپنا سر دوبارہ جھکا لیا اور اپنی بے چینی کو چھپانے کے لیے سیر میوں پر اپنے پاؤں آگے پیچھے گھسیٹنے لگا۔

”اس نے اپنے زار اور اپنے وطن سے غداری کی ہے۔ یہ بونا پارت سے ملا ہوا ہے۔ تمام روسیوں میں یہ واحد شخص ہے جس نے روس کے نام پر بٹال لگایا ہے اور صرف اسی کی وجہ سے اسکو تباہی کے غار میں گر رہا ہے۔“ رستوپ جن نے حیکھے اور پرسکون لہجے میں کہا۔ اچانک اس نے ویریش چاگن کو، جو حسب سابق عجز و انکسار کی تصویر بنا کھڑا تھا، سرسری نگاہوں سے دیکھا اور جو کچھ اسے نظر آیا، اس نے جیسے اس پر جون طاری کر دیا ہو، اس نے اپنا بازو دفعتاً بلند کیا اور تقریباً جیتے ہوئے لوگوں سے بولا۔ ”اس سے جیسے مناسب سمجھیں، سلوک کریں اس سے

آپ کے حوالے کرتا ہوں!“

لوگ خاموش رہے۔ وہ محض دھکم پیل کرتے ایک دوسرے کے قریب سے قریب تر ہونے لگے۔ دھکوں اور باؤنا قابل برداشت ہوتا جا رہا تھا۔ اس ”گل گھوٹو“ اور حضرت رساں فضا میں سانس لینا آگے یا پیچھے حرکت کرنا اور اس دوران میں کسی ان جانی، مبہم اور مہیب چیز کے وقوع پذیر ہونے کی توقع کرنا، یہ سب کچھ اذیت ناک ہوتا جا رہا تھا۔ وہ لوگ، جو سب سے آگے کھڑے تھے، انھوں نے، جو کچھ ان کے سامنے ہو رہا تھا، دیکھ اور سنا تھا، وہ حرم کے حرم آنکھیں پھاڑے اور منہ کھولے، تنک دیدم دم نہ کشیدم کی تصویر بنے کھڑے تھے۔ ان کی پوری کوشش یہ تھی کہ ان پر پیچھے سے جو دباؤ پڑ رہا ہے، وہ اس کے سامنے ڈٹے رہیں اور اپنی جگہوں پر کھڑے رہیں۔

”مار، رکر اس کا کچھ مر نکال دو۔ اس خدا رکنا نام و نشان تک متا دو، اسے تناسو قح نہ دو کہ یہ روی کے نام پر بٹا گا سکے!“ رستوپ جن نے جلا کر کہا۔ ”اس کی بوٹی بوٹی کر دو! یہ میرا حکم ہے!“

ہجوم نے رستوپ جن کے اصل الفاظ پر اتنا دھیان نہ دیا جتنا کہ اس کے غضب ناک لہجے پر۔ لوگ کراہے، آہیں بھرتے آگے بڑھے لیکن پھر رک گئے۔

”کاؤنٹ!“ ویریش چاگن کی ڈری سہی لیکن ڈر لائی آواز نے اس وقتی سکوت کو توڑ دیا۔ ”کاؤنٹ! ہم دونوں کے اوپر ایک خدا ہے۔“

اس نے اپنا سراو پر اٹھایا اور ایک بار پھر اس کی پتلی گردن پر ورید میں خون بھر گیا اور وہ پھول گئی۔ اس کے چہرے پر تیزی سے ایک رنگ آنے اور دوسرا جانے لگا۔ وہ جو کچھ کہنا چاہتا تھا، سے ختم نہ کر سکا۔

”اس کی نکالوٹی کر دو! میں حکم دیتا ہوں!“ رستوپ جن نے دوبارہ گلا پھاڑتے ہوئے کہا۔ اچانک اس کا چہرہ اتنا ہی پیلا پڑ گیا جتنا کہ ویریش چاگن کا تھا۔

”گواریں نکال لو!“ گھوڑ سواروں کے افسر نے اپنی شمشیر سونتتے ہوئے حکم دیا۔

ہجوم میں کھڑے لوگوں کو ایک بار پھر زور زور سے دھکے پڑنے لگے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ لوگ، جو آگے کھڑے تھے، اب وہ تاب مقاومت نہ لاسکے اور لڑکھڑاتے گرتے پڑتے آگے کھسکنے لگے، جہاں تک کہ وہ پورچا کے زینے کے بالکل قریب پہنچ گئے۔ لانا ناوجوان چہرہ پتھر یل بنائے اور یا زور کو سیدھا اوپر اٹھائے اب ویریش چاگن کے قریب کھڑا تھا۔

”اس پر گواریں چلا دو!“ گھوڑ سواروں کا افسر پھٹکا رہا۔

اور ایک فوجی جوان نے، جس کا آتش غضب سے چہرہ بگڑ گیا تھا، اپنی شمشیر کے کند سرے سے ویریش چاگن کے سر پر ضرب لگائی۔

”اے!“ حیرت و استعجاب سے ویریش چاگن کی کھٹی کھٹی چیخ نکل گئی۔ وہ دہشت کے عالم میں اپنے گرد و پیش نظریں دوڑانے لگا جیسے اس کی سمجھ میں نہ آ رہا ہو کہ اس کے ساتھ یہ سلوک کیوں کیا گیا ہے۔

استعجاب و دہشت کی ایسی ہی کراو ہجوم میں گردش کرنے لگی۔
 ”یا خداوند!“ کسی کی ملول آواز سنائی دی۔

دیریش چاگن کے منہ سے حیرت و استعجاب کی جو پکار نکلتی تھی، (اس نے اس پر اکتفا نہ کیا)، اس کے بعد اس نے درو کی تاب نہ لا کر دلدوز چیخ بلند کی اور یہی چیخ اسے لے ڈرلی۔ انسان جذبات پر، جواب تک ہجوم کی راہ میں دیوار بنے ہوئے تھے، اتحاد یا دہڑا کہ ان پر قابو رکھنا ناممکن ہو گیا۔ اچانک بند ٹوٹ گیا۔ جب ایک دفعہ جرم کا آغاز ہو گیا، اس کا شکیں تک پہنچنا ناگزیر تھا۔ لعنت ملامت کی دل خراش کراہیں ہجوم کے غضب ناک اور بھونانہ شور و غل میں غرق ہو گئیں۔ ساتویں اور آخری طوفانی موج کی طرح، جو جہز کو پرزے پرزے کر دیتی ہے، بھیڑ کے عقب سے جو آخری، ورنہ قابل مقاومت ہرا بھری، جو بھی اس کے سامنے آیا اسے اپنے ساتھ بہ کر لے گئی اور سب اس کی لپیٹ میں آ گئے۔

گھوڑ سوار ایک اور ضرب لگانے کی تیاری کر رہا تھا کہ دیریش چاگن خوب دہشت سے پیچھے چلاتے اور اپنے سر کو دونوں ہاتھوں سے ڈھانپتے ہجوم کی طرف بھاگ اٹھا۔ لیوترے نوجوان نے، جس کے ساتھ وہ جا کھڑا تھا، اس کی مہین گردن کو اپنی گرفت میں لے لیا اور وحشیانہ انداز سے چٹخا چلاتا دھکم پیل کرتے ہجوم کے، جس پر جنون جاری ہو چکا تھا، نیچے گر پڑا۔

بعض لوگ دیریش چاگن اور دوسرے لیوترے نوجوان کو پیٹنے اور ان کے نیچے دھڑلے لگے۔ وہ لوگ، جو پاؤں تلے کپلے جا رہے تھے، اور جو محض لالچے نوجوان کو بچانے کی کوشش کر رہے تھے، چیخ پکار کرنے لگے، لیکن اس چیخ پکار کا صرف ایک ہی نتیجہ برآمد ہوا کہ ہجوم کی دیوانگی میں مزید اضافہ ہو گیا۔ خاص وقت گزر جانے کے بعد ہی گھوڑ سوار کا رخانے کے لیے لہان اور نیم مردہ مزدور کو چھڑانے میں کامیاب ہو سکے۔ ہجوم نے جس کام کا بیڑا اٹھایا تھا، گرچہ وہ اسے جلد تاخیر انجام تک پہنچانے کے لیے مضطرب نہ ہو سکا، مگر ان لوگوں کو، جو دیریش چاگن کو گھونے اور ٹھنڈے مار رہے تھے، اس کا گلا گھونٹ رہے تھے اور اس کے جسم کا قیہ بنانے میں مصروف تھے، اسے موت کے منہ میں دھکیلنے میں خاصہ وقت صرف کرنا پڑا۔ ان پر چاروں اطراف سے بازو پڑا تھا۔ اس دہشت کی تاب نہ لا کر وہ بیچ میں جھولنے لگتے اور یوں ان کے لیے اسے ہلاک کرنا یا زندہ چھوڑ دینا ناممکن ہو جاتا۔

”کیوں نہ اس پر کلہاڑی کا وار کیا جائے؟... اس کا کچھ سر نکال دو۔ غدار، حرم زوالے نے یوں کوچ کیا!... ابھی سانس لے رہا ہے۔ ڈھیٹ ہڈی ہے... اپنے کیے کی سزا پا رہا ہے... کلہاڑی چلا کر دیکھو... ابھی مرا نہیں؟“ صرف تب جب خنجر نے ہاتھ پاؤں مارنا ترک کر دیا، اس کی ہائے دوائے بند ہو گئی اور موت کی طویل اور نیکی تلی کھڑکڑاہٹ شروع ہو گئی، ہجوم میں شامل لوگ، جو منہ کے بل پڑی لہان لاش کے گرد حصار بنائے ہوئے تھے، تیزی سے ادھر ادھر ہٹنے لگے۔ ہر شخص باری باری اس کے قریب جاتا، جو کچھ کیا گیا تھا، اسے دیکھا، خوف و دہشت سے مغلوب ہو جاتا، کانوں کو ہاتھ لگاتا، توبہ توبہ کرتا، ہکا بکا دوسروں کو دھکیلتا اور پیچھے ہٹ جاتا۔

”یا خداوند! یہ لوگ فرے درندے ہیں اور خج کیسے سکتا تھا؟“ ہجوم میں باتیں ہو رہی تھیں۔ ”بھی اس کی عمر سی کیا تھی، پمسیں بھی نہیں بھیگی ہوں گی! ضرور کسی تاجر کا تخت جگر ہوگا۔ کس قسم کے لوگ ہیں یہ!... سنا ہے کہ یہ اصل آدمی تھا بھی نہیں۔ کیا مطلب کہ اصل آدمی نہیں تھا؟... اف، خداوند! گناہوں سے قطعاً نہیں ڈرتے...“ اسی لوگ اب کف افسوس مل رہے تھے اور لاش پر، جس کی سین گردن تقریباً نیم بریدہ، چہرہ نیلا اور خون و خاک سے آلودہ تھا اور جوان کی نگاہوں کے سامنے پڑی تھی، ترس کھا رہے تھے۔

ایک سختی اور نرض شناس پولیس افسر نے، یہ سمجھتے ہوئے کہ ہزار کیسی لینسی کے احاطے میں لاش کی موجودگی نازیبا ہے، گھوڑ سواروں کو حکم دیا کہ وہ اسے گھسیٹ کر گلی میں لے جائیں۔ زرہ بکتر سے لینس دو گھوڑ سواروں نے زخموں سے چور اور مسخ شدہ ٹانگیں پکڑیں اور لاش کو زمین پر گھسیٹنے لگے۔ لمبی گردن پر خون اور کچھڑ میں لتھڑے ہوئے نیم منڈے سر کا رخ، جب وہ زمین پر گھسٹ رہا تھا، کبھی ایک طرف اور کبھی دوسری طرف ہو جاتا۔ لاش کو دیکھ کر ہجوم دبکتے اور پیچھے ہٹنے لگا۔

جب ویریش چاگن نیچے گرا اور ہجوم وحشیانہ انداز سے جینٹا چلاتا اس پر پل پڑا، رستوپ جن کا رنگ یک دم فق ہو گیا کاٹو تو بدن میں لہو نہیں، بجائے اس کے کہ وہ عقبی دروازے کی طرف جاتا جہاں اس کی گاڑی کھڑی تھی، وہ لمبے لمبے قد اٹھ تا غلام گردش میں، جو زریں منزل کے کمروں کی جانب جاتی تھی، چلتے لگا۔ اس کا سر جھکا ہوا تھا اور اسے کچھ معلوم نہیں تھا کہ وہ کہاں جا رہا ہے اور کیوں۔ کاؤنٹ کا چہرہ زرد ہو چکا تھا اور اس کا مچلا جبراً مضطربانہ انداز سے جس طرح پھڑک رہا تھا، اس کے لیے اس پر قابو پانا ممکن نہیں رہا تھا۔

”یوٹرا کیسی لینسی، اس طرف... آپ کہاں تشریف لے جا رہے ہیں؟ حضور، اس طرف...“ اس کے عقب میں کوئی ڈری سہی اور کپکپان آواز کہہ رہی تھی۔

کاؤنٹ رستوپ جن میں جواب دینے کی ہمت نہیں تھی۔ اس کی کالا ش عقبی دروازے کے قریب کھڑی تھی۔ ہجوم کی چیخ پکار، جو دور سے آرہی تھی، وہاں بھی سنائی دے رہی تھی۔ وہ جلت سے گاڑی میں بیٹھ گیا اور کوچرانا سے کہنے لگا کہ وہ اسے سا کول نکلیں اس کے دیہی مکان پر لے چلے۔

جب وہ میاں ہنسکا یا سٹریٹ میں داخل ہوئے اور ہجوم کے شور و غل کی آوازیں آتا بند ہو گئیں، کاؤنٹ کو پشیمان نے آگھیرا۔ اپنے ماتحتوں کے سامنے اس نے جس گھبراہٹ و خوف کا مظاہرہ کیا تھا، وہ اسے یاد آنے لگا اور وہ اس پر عدم اطمینان کا اظہار کرنے لگا۔ یہ noi polloi بہت خوفناک۔ بہت نفرت انگیز ہیں۔“ اس نے فرانسیسی میں اپنے آپ سے کہا۔ ”بھیڑیوں کی طرح ان کی تشنگی بھی صرف اس سے ہو سکتی ہے...“ کاؤنٹ، ہم دونوں کے اوپر ایک خدا ہے۔... اچانک ویریش چاگن کے یہ الفاظ اس کے کانوں میں گونجنے لگے۔ اسے جھرجھری آگئی اور اس کی طبیعت کدھر ہو گئی۔ لیکن یہ کیفیت محض عارضی تھی اور کاؤنٹ رستوپ جن حقارت سے اپنے اوپر مسکرایا۔ ”مجھے

دوسری ذمے داریاں نبھانا تھیں، ہجوم کو ٹھنڈا کرنا تھا۔ قلاح عام کے لیے کئی دیگر اشخاص مٹ چکے ہیں اور مٹ رہے ہیں۔ "اور وہ ان سماجی فرائض کے متعلق سوچنے لگا جو اس کے خاندان کی، اس شہر کی، جو اس کی تحویل میں دیا گیا تھا، اور خود اس کی ذات کی طرف سے اس پر عائد ہوتے تھے۔ جب اس نے اپنی ذات کا تصور کیا، تو اس نے اپنی آپ کو فیور داسیلی وچ رستوپ چس نہیں گردانا (اس نے اس بات کو پتھر کی لکیر سمجھ لیا تھا کہ فیور داسیلی وچ رستوپ جن پنے آپ کو *le bien public* کی بھینٹ چھارہا ہے۔) بلکہ اسکو کا گورنر جنرل کا کم جواز کا نمائندہ خیال کیا جسے زار نے اختیارات کلی تفویض کیے تھے۔ "اگر میں خالی خولی فیور داسیلی وچ ہوتا، پھر میرا طریق کار مختلف ہوتا لیکن گورنر جنرل کی حیثیت سے اپنی زندگی اور وقار کا تحفظ کرنا میرا فرض بنتا تھا۔"

اب جب کہ ہجوم کی لرزہ خیز چیخیں اس کے کانوں سے ٹکرانا بند ہو گئی تھیں، اپنی گاڑی کے پچیلے پیرگوں پر ہلکے پھلکے انداز سے جھولتے جھلاتے رستوپ جن جسٹانی طور پر پرسکون ہو گیا اور جیس کہ ہمیشہ سے ہوتا چلا آیا ہے، جسٹانی تسکین دماغ کو ایسے عقلی دناکل، جو ضمیر کو مطمئن کر سکیں، ڈھونڈنے پر کساتی ہے۔ رستوپ جن کو جس خیال نے اطمینان فرہم کیا، وہ کوئی نیا نہیں تھا۔ جب سے یہ عالم رنگ و بود وجود میں آیا ہے، اور انسانوں نے ایک دوسرے کے گھلے کاٹنے کے کام کا آغاز کیا ہے، جس کسی نے بھی اس قسم کے جرم کا ارتکاب کیا ہے، اس نے سدا اسی خیال میں۔ "*le bien public*" دوسرے لوگوں کی مفروضہ بھائی۔ پناہ ڈھونڈی ہے۔

وہ شخص، جو شدید جذبات کی رو میں بہہ کر کوئی قدم نہیں اٹھاتا، اسے کبھی مظلوم نہیں ہوتا کہ یہ بھائی ہے کیا۔ لیکن وہ شخص، جس نے کسی جرم کا ارتکاب کیا ہوتا ہے، اسے ہمیشہ پورا یقین ہوتا ہے کہ یہ بھائی کہاں ہے۔ اور رستوپ جن کو اب اس کا علم ہو چکا تھا۔

وہ جس فعل کا مرتکب ہوا تھا، اس کے متعلق سوچ بچار کرنے کے دوران میں آپے آپ کو ہنت لامت کرتا تو دور کی بات ہے، وہ الٹا اطمینان قلب محسوس کرنے لگا کہ اس نے مجرم کو سزا دینے اور ہجوم کو ٹھنڈا کرنے کے اس موقع سے کامیابی سے قائدہ اٹھایا۔

"ورپیش چاگن پر مقدمہ چلایا گیا تھا اور اسے سزائے موت سنائی گئی تھی۔ "رستوپ جن نے سوچا (حالانکہ سیٹیٹ نے اسے محض قید با مشقت کی سزا دی تھی)۔ "وہ جاسوس اور غدار تھا۔ جب تک اسے سزا نہ مل جاتی، میں اسے چھوڑ نہیں سکتا تھا۔ اور یوں میں نے ایک تیرے دو شکار کر لیے: میں نے ہجوم کو شکار ورپیش کر کے ٹھنڈا کر دیا اور مقصد کو اس کے اپنے کیے کی سزا دے دی۔"

اپنے وہی مکان پر پہنچ کر کاؤنٹ اپنے گمریلو کاموں میں مصروف ہو گیا اور اس کا سکون قلب پوری طرح لوٹ آیا۔

آدھ گھنٹے بعد وہ سڑکوں کی کے میدان میں برق رفتاری سے اپنی گاڑی دوڑا رہا تھا۔ اس کا ذہن ساہتہ

واقعات کے بارے میں قطعاً نہیں سوچ رہا تھا بلکہ اب اس کی توجہ مستقبل اور آئندہ واقعات پر مرکوز تھی۔ اس کی سٹرل یا ڈرائیو تھا۔ اسے بتایا گیا تھا کہ کو تو زوف دیں کہیں ملے گا۔ کاؤنٹ رستوپ جن اپنے ذہن میں ان چل گئی اور جن و تشنچ سے بھرپور باتوں کی ریہرسل کر رہا تھا جو وہ کو تو زوف کو سنانا چاہتا تھا کیونکہ اس نے سے فریب دیا تھا۔ وہ اس شاطر و عیار بوڑھے درباری کو محسوس کرادے گا کہ دارالسلطنت کو اس کے حال پر چھوڑ دینے سے صواب کا جو پھاڑ ٹوٹے گا اور روس کو جس کا مل تباہی کا سامنا کرنا پڑے گا (جیسا کہ رستوپ جن کا اس بارے میں خیال تھا) اس کی تمام تر ذمے داری اس کے پیر نہ کدھوں پر ہوگی۔ وہ کو تو زوف سے جو کچھ کہنا چاہتا تھا، اس کے بارے میں نیکی سوچتے ہوئے وہ گاڑی میں اپنی شست پر بیٹھا شدت جذبات سے اتنا مغلوب ہوا کہ بل کھانے اور خشم ناک نگاہوں سے اپنے چاروں اطراف دیکھنے لگا۔

سا کول کی کے میدان پر ہو کا عام ملائی تھا۔ صرف ایک کونے میں محتاج گھر اور پاگل خانے کے سامنے سفید لباس پہنے لوگوں کی ٹولیاں نظر آرہی تھیں جب کہ ان سے مشابہ چند دیگر اشخاص شور و غل کرتے اور زور زور سے بازو اور ہاتھ لہراتے ایسے دیکھے بے مقصد ادھر ادھر گھوم پھر رہے تھے۔

ان میں سے ایک سیدھا اس سڑک کی جانب، جس پر کاؤنٹ رستوپ جن کی گاڑی جا رہی تھی، بھاگا آ رہا تھا۔ ان پاگلوں کو جنھیں کھلا چھوڑ دیا گیا تھا، خاص طور پر اس شخص کو، جو ان کی طرف دوڑا آ رہا تھا، کاؤنٹ، اس کا کوچوان اور اس کے محافظ مسخ سوار تشویش ورتجسس کے ملے جلے مبہم احساس سے دیکھنے لگے۔

اس کی لابی اور ملی پتلی ٹانگیں، جتنا تیز دوڑ سکتی تھیں، اتنا تیز دوڑتا وراہن ڈریسنگ گاؤن پھڑپھڑاتا، اپنی نگاہیں رستوپ جن پر جمائے، وہ کرخت آواز میں چلا اور اسے رکنے کے اشارے کر رہا تھا۔ پاگل کے گبیہر اور شدت جذبات سے مغلوب چہرے پر، جس پر یہاں وہاں داڑھی کے بالوں کے اونچے نیچے کچھے تھے، وحشت برس رہی اور زردی کھنڈ رہی تھی۔ اس کی سیاہ بنوری آنکھیں، جن کی سفیدی زعفران کی طرح ہار گئی تھی، دیوانگی سے گھوم رہی تھیں۔

”میں کہتا ہوں، ٹھہرنا! کو“ کانوں کے پردے پھاڑ دینے والی آواز جلد ہوئی ورنہ ایک بار پھر ہاتھوں اور بازوؤں سے اشارے کرتا تاکید لہجے میں چیخنے چلانے لگا۔ اس کا دم پھول رہا تھا۔

وہ کالاش کے قریب پہنچ گیا اور اس کے ساتھ ساتھ دوڑنے لگا۔
 ”وہ تین مرتبہ مجھے قتل کر چکے ہیں اور تین مرتبہ میں مردوں کی دنیا کی سے واپس آیا ہوں۔ انھوں نے مجھے سنگسار کیا، مجھے صلیب پر چڑھایا... میں پھر زندہ ہو جاؤں گا۔ میں پھر زندہ ہو جاؤں گا۔ انھوں نے میرا جسم کا بونی کر دیا ہے... مملکت خداوند بروز بر ہو جائے گی... میں تین مرتبہ اسے ملیا سیٹ کر دوں گا اور تین مرتبہ اس کی تیر لہ کر دوں گا۔“ وہ چلا چلا کر کہہ رہا تھا۔ اس کی آواز کرخت سے کرخت تر ہوتی جا رہی تھی۔

دیکھتے ہی دیکھتے کاؤنٹ رستوپ جن کا رنگ بیضیہ سی طرح فق ہو گیا جس طرح اس وقت ہوا تھا جب جھوم

نے ویش چاگن پر جڑھائی کر دی تھی۔ اس نے تند دوسری طرف پھیر لیا۔

”ہیز چو۔ اور تے۔ زبا“ اس نے لڑکھڑاتی آواز میں کوچوان سے کہا۔

گازی میدان میں سرپٹ بھاگنے لگی لیکن کاؤنٹ رستوپ چن کو دور فاصلے سے جونی اور پاس انگیز چلیں سنائی دیتی رہیں جب کہ اسے اپنے سامنے موٹے جھوٹے اون کے کوٹ میں لمبوس ”نڈار“ کے منجھ، رہشت ذرا اور خون چکاس چہرے کے سوا اور کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔

اگرچہ یہ ذہنی تصویر جاں کی چیز تھی لیکن رستوپ چن کو اب محسوس ہوا کہ اس کے نقوش اس کے قلب پر بہت گہرے کندہ ہیں۔ اس پر یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہو گئی کہ وقت اس یاد کے خونی نقوش کبھی نہیں دھندلا سکے گا بلکہ اس کے برعکس وہ جتنا زیادہ عرصہ زندہ رہے گا، اتنے ہی زیادہ سفاکانہ اور مستحکم انداز سے یہ اس کے دس کو چھلنی کرتی رہے گی۔ اسے ابھی تک یہی محسوس ہو رہا تھا کہ اس کے اپنے الفاظ ”اس کی نگاہوں کی گرد میں حکم رہتا ہوں!“ کی آواز اس کے کانوں میں گونج رہی ہے۔

”میں نے یہ الفاظ منہ سے کیوں نکالے؟ وہ ناگہاں کسی نہ کسی طرح ادا ہو گئے۔ مجھے انہیں کہنا نہیں چاہیے تھا۔“ اس نے سوچا۔ ”پھر کچھ بھی وقوع پذیر نہ ہوتا۔“ جس سلسلے سوار نے پہلی ضرب رسید کی تھی، اسے اس کا چہرہ نظر آیا۔ ابتدا اس چہرے پر خوف و ہراس ہو رہا تھا، پھر یہ اچانک خون آشام ہو گیا۔ سور کے استر سے خرین کوٹ پہنے نوجوان کے خدوخال پر جو ساکت اور ڈری سبکی ملامت نمودار ہوئی تھی، وہ ابھی اس کی نگاہوں کے سامنے گھومتی گئی۔ لیکن میں نے جو کچھ کیا، اپنی مرضی سے نہیں کیا، مجھے یہ مجبوراً کرنا پڑا، میرے لیے اور کوئی چارہ کاری نہیں تھا۔۔۔“

اجھوم، نڈار۔۔۔ فلاح عامہ۔۔۔“ وہ سوچ رہا تھا۔



نوج ابھی تک یاد زار، پل پر جھوم کیے ہوئے تھے۔ دن گرم تھا۔ چپس چپس اور آرزو، کو تو زوف پل کے قریب بیچ پر بیٹھا تھا اور اپنے چھانٹے سے ریت پر لکیریں بنا رہا تھا کہ ایک کالاش کھڑکھڑاتی اور شور مچاتی گئی تھی اس کے پاس آئی۔ ایک شخص جس جرنیل کی وردی پہنے اور اپنی ٹوپی پر کھنی سجائے کو تو زوف کے قریب پہنچا۔ اس کی آنکھیں، جن میں کبھی غم اور کبھی خوف جھلکتے لگتے، بے چینی سے آگے پیچھے گھوم رہی تھیں۔ اس نے فراموشی میں اس سے کچھ کہا۔ یہ شخص کاؤنٹ رستوپ چن تھا۔ اس نے کو تو زوف کو بتایا کہ ملک کا در السلطنت ماسکونا پیدا ہو چکا ہے اور وہاں نوج کے علاوہ اور کچھ باقی نہیں رہا۔

”اگر یوئر ہائی لس نے مجھے یہ یقین نہ دلایا ہوتا کہ آپ ماسکو سے لڑائی کے بغیر دست بردار نہیں ہوں گے تو

حالات مختلف ہوتے اور یہ سب کچھ (وقوع پذیر نہ ہوتا۔“

کو تو زوف نے رستوپ چن کی طرف یوں دیکھا جیسے وہ جو کچھ اس سے کہا گیا تھا، اس کا مفہوم سمجھ نہ سکا ہو

اور وہ اس خاص مفہوم کو جو اس وقت اس شخص کے، جو اس سے مخاطب ہوا تھا، چہرے پر لکھا ہوا تھا، پڑھنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہا ہو۔ رستوپ چن پراگندہ ذہن ہو گیا اور اس نے خاموشی اختیار کر لی۔ کوٹوزوف کی تجسس نگاہیں ابھی تک رستوپ چن کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ اس نے اپنے سر کو ہلکی سی جنبش دی ورنہ کسی آواز میں دلا: ”نہیں، میں ماسکو سے لڑائی کے بغیر دست بردار نہیں ہوں گا۔“

کوٹوزوف نے جب یہ الفاظ کہے، کیا وہ کسی بالکل ہی مختلف چیز کے بارے میں سوچ رہا تھا یا یہ جانے ہوئے کہ یہ بے معنی ہیں، اس نے جان بوجھ کر کہے تھے، بہر حال رستوپ چن نے کوئی جواب نہ دیا اور وہ مثالی سے پیچھے ہٹ گیا۔ اور اس سے بھی زیادہ حیرت انگیز یہ بات تھی کہ ماسکو کے گورنر جنرل، کاؤنٹ رستوپ چن، نے قازقوں کا چھانٹا اٹھایا، پل کی طرف بڑھا اور جن گاڑیوں نے وہاں راستہ روک رکھا تھا، ان کے مابین چنچا ہلاتا اپنی گاڑی ہانکنے لگا۔

26

کوئی چار بجے۔ پہر موغا کے دستے، ماسکو میں داخل ہونے لگے۔ سب سے آگے درٹم برگ کے ہوزاروں کا دستہ تھا۔ ان کے پیچھے پیچھے شاہ نیپلز بنفس نہیں آ رہا تھا۔ اس کے ساتھ ایجوٹوں کی فوج ظفر موج تھی۔ موغا آرباط سنٹر کے قریب، جو کرامائی سینٹ نکولس کے گرجے سے زیادہ دور نہیں، رک گیا اور ہراول دے نے شہر کے ”قلعے“ ³⁴ la Krem in کو جس حالت میں پایا تھا، اس کے متعلق اس کی رپورٹ کا انتظار کرنے لگا۔ شہر کے باسیوں کی، جنہیں ماسکو میں چھوڑ دیا گیا تھا، ایک ٹولی موغا کے گرد اکٹھی ہو گئی۔ وہ اس لمبے ہال والے اجنبی کمانڈر کو، جو طوائف تمغوں اور پردوں سے لدا پھندا تھا، ڈرتے شرماتے، نگاہیں گاڑے، حیرت و خیر سے دیکھ رہے تھے۔

”میں پوچھتا ہوں، یہ ان کا زار ہے؟۔ برا تو نہیں؟“ لوگ دھیمی آوازوں میں ایک دوسرے سے کہہ رہے تھے۔

ایک ترجمان نے ایک معمر قلی سے پوچھا کہ کریملن زیادہ دور تو نہیں۔ قلی کو ایک تو ادا مانوس پوسٹانی لہجے سے چکرا دیا، دوسرے اسے اندازہ ہی نہ ہو سکا کہ ترجمان ردی بول رہا ہے۔ چنانچہ قلی مطلق سمجھ نہ سکا کہ اس سے کہا کجا جا رہا ہے اور وہ دوسروں کے پیچھے جا چھپا۔

موغا، جو گھوڑے پر سوار تھا، ترجمان کے قریب آیا اور اس سے کہنے لگا: ”ان سے پوچھو کہ روی نوں کہاں ہے۔“ ایک ردی سمجھ گیا کہ ان سے کیا پوچھا جا رہا ہے اور متعدد آوازیں بیک وقت جواب دینے لگیں۔ ہراول دستے کا ایک افسر گھوڑا دوڑاتا موغا کے پاس آیا اور اس نے اسے بتایا کہ قلعے کے دروازوں میں رکاوٹیں کھڑی ہیں اور غالباً فوج وہاں گھات میں بیٹھی ہے۔

”اچھا!“ سوغا نے کہا۔ پھر وہ اپنے ایک ایجوٹ کی طرف متوجہ ہوا اور اسے حکم دیا کہ دروازوں پر گولہ باری کرنے کے لیے چار ہلکی توپیں آگے بھیج دی جائیں۔

فوج کا جو کالم سوغا کے پیچھے تھا، اس میں سے توپ خانہ برآمد ہوا اور خاصی تیز رفتاری سے آگے بڑھنے لگا۔ جب وہ آرمیڈ سٹریٹ کے ساتھ ساتھ چلا وزوڈیٹھ کا سٹریٹ کے آخر سے سرے پر پہنچا، وہ رک گیا اور چوک میں صف بندی کرنے لگا۔ متعدد فرانسیسی افسروں نے اپنی نگرانی میں مختلف جگہوں پر توپیں نصب کرائیں اور درمیانی سے کریملن کا جائزہ لینے لگے۔

کریملن میں شام کی عبادت کے لیے گھنٹیاں بج رہی تھیں اور گھنٹیوں کی اس آواز نے فرانسیسیوں کو الجھوڑ میں ڈال دیا۔ انھوں نے سمجھا کہ گھنٹیاں اس لیے بجتی جا رہی ہیں تاکہ لوگوں کو اطلاع مل جائے، اور وہ اپنے اپنے ہتھیار سنبھال لیں۔ پیدل فوج کے چند جوان کٹافیا گیٹ کی سمت بھاگے۔ اس کے آرمیڈ سٹریٹوں اور تختوں کا پردہ تھا ہوا تھا۔ جوئی ایک افسر اپنے چند جوانوں کے ساتھ دروازے کی طرف لپکا، دروازے کے نیچے سے قدیم الموضع رہتی بندوق کی دو گولیاں سنسنائی آئیں۔ توپوں کے قریب ایک جرنیل کھڑا تھا۔ اس نے باؤں بلند افسر کو کوئی حکم دیا اور وہ اس کے ساتھی پیچھے ہٹ گئے۔

دروازے کی سمت سے تین مزید گولیوں کی آواز سنائی دی۔

ایک گولی ایک فرانسیسی فوجی کی ٹانگ کو چھوتی ہوئی آگے نکل گئی اور رکاوٹ کے عقب سے مختلف لوگوں کے پیچھے چلانے کی عجیب آوازیں سنائی دیں لگیں۔ فرانسیسی جرنیل، افسروں اور جوانوں کے چہروں پر جرجر پر سکون شکنگی نمایاں تھی، معاً اس کی جگہ، جیسے انھیں اس کا حکم دیا گیا ہو، عزم و اشہاک نے لے لی کہ وہ سرکہ آرائی کرنے اور مصائب برداشت کرنے کے لیے پوری طرح تیار ہیں۔ مارشل سے لے کر معمولی سپاہی تک ان سب کے لیے یہ ٹھنڈی ڈوڈیٹھ نکالیا لکھوایا سر دیکیں، کٹافیا تروٹسکی گیٹ ہمیں تھے بلکہ یہ ایک فیامیدان جنگ تھا جہاں لاریب خون کی ندیاں بہہ سکتی تھیں۔ وہ سب لڑائی کے لیے سر بکھ ہو گئے۔ دروازے کے عقب سے شور و غل کی آوازیں قہم گئیں۔ توپیں آگے بڑھ دی گئیں۔ توپچیوں نے توپوں کے فٹیلوں سے راکھ بھاڑی۔ ایک افسر نے فائرنگ کا حکم دیا اور ٹوٹ کر مختلف سمتوں میں بکھر جانے والے دو گولے کے بعد دیکرے سنسنائی آئے، دروازے کے پھروں اور

ہمہنروں اور تختوں پر مشتمل چوٹی رکاوٹ سے ٹکرائے، اور چوک کے اوپر دھوئیں کے دوداں لہریں بنانے لگے۔ پتھر پلے کریملن کے اوپر گولے داغے جانے کی صدائے بازگشت کو ختم ہوئے ایک دو سیکنڈ کی گزرے ہوں گے کہ فرانسیسیوں کو اپنے سردوں کے اوپر عجیب و غریب آواز سنائی دی۔ ہزاروں کوئے دیواروں سے اڑنے اور انھوں نے فضا میں دائرہ بنالیا۔ وہ قافوں قافوں کر رہے اور پر شور انداز سے اپنے پر پھڑپھڑا رہے تھے۔ جین اسی دم دروازے سے اکلوتی انسانی پکار بند ہوئی اور دھوئیں میں ایک آدمی کی، جس کا سر سگا اور جس کے جسم پر سباد بھاتی کوٹ تھا، شکل دکھائی دی۔ اس نے اپنی دستی بندوق اٹھائی اور فرانسیسیوں پر نشانہ بندہ کیا۔ اسی لمحے افسر نے اپنا

فائرنگ کا حکم پھر دہرایا اور دو توپوں اور ایک دستی بندوق کے دانے جانے کا شور مچا ہیک وقت بلند ہوا۔ دروازہ کھلا
دھوئیں میں چھپ گیا۔

اس کے بعد دروازے کے پیچھے مزید کوئی چیز حرکت کرتی نظر نہ آئی اور فرانسیسی فوج کے پیادہ جوان اور ان
دروازے کی جانب بڑھنے لگے۔ دروازے میں تین زخمی اور چار ہلاک شدگان پڑے تھے۔ دو آدمی دیہالی کوٹ
پینے دیوار کے ساتھ ساتھ زنا میں کاسٹریٹ کی سمت بھاگے جا رہے تھے۔

”انہیں پرے ہٹا دو۔“ افسر نے غمخیزوں اور لاشوں کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ اور فرانسیسی فوجی
سپاہیوں نے زخمیوں کو کٹھکانے لگانے کے بعد لاشیں دیوار کے پار پھینک دیں۔

یہ آدمی کون تھے، کسی کو کچھ معلوم نہیں تھا۔ ان کے متعلق بس یہی کہا گیا: ”انہیں پرے ہٹا دو۔“ چنانچہ انہیں
اٹھا کر ایک طرف پھینک دیا گیا لیکن بعد میں اٹھا لیا گیا تاکہ وہ گل سرخ بد بونہ بنے لگیں۔ بیچ واحد سرخ ہے جس
نے ان کے بارے میں چند خوبصورت الفاظ تحریر کیے ہیں: ”قسمت کے مارے، مقدر کے بیٹے، یہ اشخاص کسی طور
مقدس قلعے کے اندر گھس آئے۔ انہوں نے اسلحہ خانے سے بندوقیں اٹھائیں اور فرانسیسیوں پر گولیاں چدائیں۔ ان
میں سے چند ایک کوششیں روں سے جہنم داخل کر دیا گیا اور کریملن کو ان کے وجود سے پاک کر دیا گیا۔“

سوغہ کو اطلاع پہنچادی گئی کہ راستہ صاف کر دیا گیا ہے۔ فرانسیسی دروازوں میں داخل ہو گئے اور سینیٹ
(Senate) سکوائر میں خیمے نصب کرنے لگے۔ سپاہی سینیٹ ہاؤس سے کرسیاں باہر پھینکنے اور لاؤ جلاے لگے۔
دوسرے دستے کریملن میں سے گزر کر ماروسیکا، لیب یا نکا اور پیکرو کا سڑکوں پر خیمے گاڑنے لگے اور چند ایک
نے وزڈویشیکا، نکولسکا یا اورتورسکا سڑکوں پر ڈیرے ڈال لیے۔ چونکہ کسی بھی گھر کا مالک کہیں دکھائی نہ دیا، اس
لیے دستور کے مطابق فوجیوں کو مکینوں کے ساتھ نہ ٹھہرایا گیا بلکہ انہیں خیموں میں ہی رکھا گیا۔

اگرچہ فرانسیسیوں کی حالت پتلی تھی، ان کی وردیاں تار تار ہو رہی تھیں، فائرنگ اور تھکاوٹ نے انہیں
غڈ حال کر دیا تھا، ان کے اجسام میں کوئی خاص جان نہیں رہ گئی تھی اور وہ اپنی اصل تعداد سے صرف ایک تہائی رہ
گئے تھے، اس کے باوجود وہ ماسکو میں نظم و ضبط سے داخل ہوئے۔ یہ منہل اور خستہ حال فوج تھی لیکن اس کے چار حائل
روپے میں کوئی کمی نہیں آئی تھی، یہ اب بھی لڑنے مرنے کے لیے تیار تھی اور اپنے حریفوں کے لیے خطرے کی گھانٹی
ہوئی تھی۔ لیکن یہ فوج صرف اس وقت تک فوج رہی جب تک یہ اپنے مختلف پڑاؤوں میں قیام کے نئے منتشر نہیں ہو
گئی۔ جو فوجی رہنمائی مختلف ٹکڑیوں میں بنیں اور فوجی متحمل لیکن خالی گھروں کے مابین منتشر ہوئے، فوج ہمیشہ ہمیشہ
کے لیے ہاتھ سے جاتی رہی اور اس کی جگہ آدھا تیر اور آدھا تیر قسم کی چیز وجود میں آ گئی۔ یہ جن لوگوں پر مشتمل تھی، وہ
عام شہری تھے نہ فوجی، بلکہ ان پر جنہیں عرف عام میں قزاق کہا جاتا ہے، کانگوان ہوتا تھا۔ چنانچہ جب پانچ چھ ہفتوں
کے قیام کے بعد ان لوگوں کی ماسکو سے روانگی عمل میں آئی، ان کی صورت فوج کی نہیں رہ گئی تھی، بلکہ وہ محض قزاقوں
کی بھیڑ بن چکے تھے۔ وہ سب کے سب ایسی اشیاء سے، جوان کی دانست میں قیمتی یا مفید نہیں رہے پھندے تھے۔

جب وہ اسکو سے رخصت ہوئے، ان میں سے ہر شخص کا مقصد، جیسا کہ اب تک ہوتا رہا تھا، تسخیر ملک نہیں تھا، بلکہ جو کچھ اس کے ہاتھ، یا تھا، اسے اپنی تحریل میں رکھنا تھا۔ اس بندر کی طرح، جو اپنا پنچہ صراحی کے تنگ دہانے میں ڈال دیتا ہے اور چند گری دار میوے سیٹھنے کے بعد اس ڈر سے منگی نہیں کھولتا کہ کہیں مال غنیمت ہاتھ سے نہ جاتا رہے اور ہوس پنی بربادی کا باعث آپ بن جاتا ہے، ماسکو سے کوچ کے وقت فرانسیسیوں کا ملیر میٹ ہونا ان کا مقصود بن چکا تھا کیونکہ وہ اپنی لوٹ اپنے ساتھ گھسیٹتے لے جا رہے تھے۔ جس طرح بندر کے لیے منگی بھر میوہ چھوڑنا ناممکن تھا، ایسے ہی اس سے، جو انھوں نے لوٹا تھا، دستبردار ہونا ان کے لیے ناممکن تھا۔ جب کوئی فرانسیسی رحمت ماسکو کے کسی محلے میں داخل ہوتی، دس منٹ کے اندر اندر یہ کیفیت ہو جاتی کہ ایک بھی انفرام عام سپاہی ڈھونڈے سے نہ ملے۔ مکانوں کے در پچوں میں سے فوجی اور در کوٹ، در ہنسی جوتے پہنے دی مختلف کردوں میں اگلے گہلے پھرتے اور ہنسنے نظر آتے تھے۔ تہہ خانوں اور ستوروں میں وہ اشیائے خورد و نوش پر ہاتھ صاف کرتے، صحنوں میں، اصطبلوں اور گیراجوں کے تارے کھولتے یا توڑتے، باورچی خانوں میں آگ جلاتے اور اپنی آستینیں چڑھائے آگوندے مڈل روٹیاں پکاتے اور مختلف قسم کے سالن تیار کرتے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ بچوں اور عورتوں کو ڈراتے دھمکاتے، بہلاتے پھساتے یا انھیں محفوظ کرتے۔ اس قسم کے آدمی رکائوں، مکانوں، غرضیکہ ہر جگہ بکثرت نظر آتے۔ لیکن فوج؟ اس کا اب کہیں نام و نشان نہیں تھا۔

فرانسیسی کمانڈروں نے پے در پے احکام جاری کیے۔ ان میں فوجیوں کو شہر میں منتشر ہونے اہلیان ماسکو کے ساتھ تشدد دانہ رد یہ اختیار کرنے اور ہر قسم کی لوٹ مار کرنے کی سختی سے ممانعت کی گئی تھی۔ اس کے ساتھ یہ اعلان کیا گیا کہ شام کو سب کی حاضری ہوا کرے گی۔ لیکن اس نوعیت کے تمام اقدامات کے باوجود جونا، جو ابھی کل تک منظم فوج کی شکل میں مربوط تھے، مہموں اور خالی شہر میں، جو اشیائے تنجشت اور سامان اکل و شرب سے بڑھا، رندنا تے پھرتے رہے۔ جس طرح بھوکے موشیوں کا ریوز بخر کھیت میں گزرتے وقت اکٹھا رہتا ہے لیکن جونہی وہ کسی ہری بھری چراگاہ میں داخل ہوتا ہے، اس پر قابو پانا ناممکن ہو جاتا ہے اور ہر موٹی جدھر سینگ سمائے، اودھر چل پڑتا ہے، ایسے ہی اس فوج کے افراد اس متول شہر کے مختلف علاقوں میں دور دور تک پھیل گئے۔

ماسکو اپنے مکینوں سے خالی ہو چکا تھا اور فوجی اس میں یوں منجذب ہو گئے جس طرح پانی ریت میں ہو جاتا ہے۔ وہ کریملس سے، جہاں وہ سب سے پہلے پہنچے تھے، مختلف سمتوں میں بکھر گئے۔ گھوڑ سوار کسی تجارت پیشہ شخص کے خالی مکان میں داخل ہوتے۔ وہاں تمام ضروریات زندگی موجود ہوتیں۔ اصطبل اور فالتو کھوڑے بھی مل جاتے، تاہم ان کا دل نہ بھرتا اور وہ ملحقہ مکان کی طرف چل پڑتے، جو ابھیں بہتر معصوم ہوتا۔ بہت سوں نے کئی کئی مکان ہتھیا لیے۔ وہ چاک سے ان پر اپنا نام تحریر کرتے اور ان کی خاطر دوسری کمپنیوں سے تو لوٹیں میں بلکہ ہاتھ پائی تک کرتے فوجی سپاہی جو بھی کسی جگہ پڑاؤ ڈالتے، شہر دیکھنے کلی کو چوں کی طرف بھاگ اٹھتے اور جب انھیں معلوم ہوتا کہ مکین ہر چیز جوں کی توں چھوڑ گئے ہیں، ان کی رائیں لپکتے لپکتے اور وہ یوں نہ دانہ ان غارتوں کی جانب، جہاں

سے بیش قیمت، شاید ادا مٹھائی جاسکتی تھیں، لپکنا شروع ہو جاتے۔ انسر جوانوں کو روکنے ان کے پیچھے پیچھے جاتے لیکن غیر ارادی طور پر خود بھی اسی رو میں بہہ جاتے۔ کبھی بازار کی دکانیں بکھیریں اور دوسری گاڑیوں سے اٹی ہوئی تھیں، اور جرنیل اپنے لیے کوچیں اور کالائیں منتخب کرنے کے لیے جوق در جوق ادھر کا رخ کرنے لگے۔ شہر کے باشندوں کی ایک حقیر تعداد وہیں رہ گئی تھی، وہ اس میدان پر، کہ وہ یوں لوٹ مار سے محفوظ رہیں گے، انکا مذاک افسروں کو اپنے گھروں میں مدعو کرنے لگے۔ دھن دولت کی وہاں بہرہ گیری۔ معلوم ہوتا تھا کہ یہ کبھی ختم نہیں ہو سکے گی۔ شہر کے جن حصوں پر فرانسیسی قابض تھے، ان کے ارد گرد متعدد ایسے علاقے تھے جہاں ابھی تک کسی کے قدم نہیں پہنچے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ وہاں اس سے بھی زیادہ مال و منال ہاتھ آئے گا اور یوں ماسکونوچ کو زیادہ سے زیادہ اپنی لپیٹ میں لیتا گیا۔ جس طرح جب خشک زمین پر پانی اٹھیل جاتا ہے، پانی اور خشک زمین دونوں غائب ہو جاتے ہیں، صرف کچھ بانی رہ جاتا ہے، ایسے ہی جب ناقہ کش فوج متحمل خالی شہر میں داخل ہوئی، نہ شہر ہانڈوچ۔ ہر طرف آگ بھڑک رہی تھی یا شیریں کی ٹولیاں گشت کر رہی تھیں۔³³



ماسکونوچل کر راکھ کا ڈھیر ہو گیا۔ فرانسیسی اس کا لڑم۔ au patriotisme feroce de Rostopchine۔ دھرتے ہیں جب کہ روسی فرانسیسیوں کی بربریت کو اس کا ڈھیر وار ٹھہراتے ہیں، تاہم ماسکونوچ آتش زدگی کسی فرد واحد یا چند اشخاص کے ٹوٹے کے کھاتے میں نہیں ڈالی جاسکتی۔ ماسکونوچ لیے نذر آتش ہوا کیونکہ اس میں ایسے حالات پیدا کر دیے گئے تھے کہ ان میں ہر وہ شہر، جس کی تعمیر جنگ و خشت کے بجائے لکڑی سے عمل میں آئی ہو۔ اس بات سے قطع نظر کہ شہر میں ایک سو تیس گھنٹا نا رائج موجود تھے یا نہیں۔ ناگزیر طور پر راکھ کا ڈھیر بن جاتا۔ جس طرح لکڑی کی چھیلوں کا ڈھیر، جو متواتر کئی دن تک شعلوں کی زد میں رہے، لازماً جل کر خاکستر ہو جاتا ہے، بعینہ مترکہ ماسکونوچ نے جل کر رکھ ہونا ہی تھا۔ جو شہر چوبی عمارتوں پر مشتمل ہو، بھلے وقتوں میں بھی، جب اس کے باشندے اپنے گھروں میں مقیم ہوں اور محکمہ پولیس اپنے فرائض سرانجام دے رہا ہو، بمشکل کون دن ایسا گزرتا ہے جب اس میں کہیں نہ کہیں آگ کے شعلے بھڑک نہ اٹھتے ہوں، وہ نذر آتش ہونے سے کیسے بچ سکتا ہے جب اس کے کمین اسے خالی کر چکے ہوں اور ایسے فوجی اس پر قابض ہوں جو ہر طرف پائپ پیتے پھرتے ہوں، بینیت سکور میں بینیت کی کرسیاں جلا کر الوداد روشن کرتے ہوں اور دن میں دو مرتبہ اپنے لیے کھانا پکاتے ہوں؟ زمانہ امن میں آپ کسی بھی ضلع کے چند دیہات میں فوج کا محض عارضی پڑاؤ ڈالوادیں، پھر آپ کو معلوم ہوگا کہ اس ضلع میں آگ لگنے کے واقعات میں یک دم اضافہ ہو گیا ہے۔ ان حالات میں ایک ایسے شہر میں، جس کی عمارتیں چوبی ہوں، جس کے باقی اسے اس کے حال پر چھوڑ کر جا چکے ہوں اور جس پر غیر ملکی فوج کا قبضہ ہو چکا ہو وہاں آگ لگنے

کے امکانات کتنے زیادہ بڑھ جائیں گے؟ ایسے میں *Le patriotisme feroce de Rostopchine* اور فرانسیسیوں کی بربریت خارج از بحث ہے۔ ماسکو فوجیوں کے ہاتھوں، چوٹوں اور لالہ دلوں اور قہقہوں کے سپاہیوں کی، جو ایسے گھروں میں مقیم تھے، جو ان کے اپنے نہیں تھے، لاپرواہیوں سے نذر آتش ہوا۔ اگر کہیں دانستہ آتش زنی کی واردات ہوئی بھی (اور یہ امر خاصا مشکوک ہے کیونکہ بادی النظر میں کوئی وجہ ایسی دکھائی نہیں دیتی کہ کوئی شخص اس قسم کی حرکت کا مرتکب ہوتا کیونکہ آگ بہر حال تکلیف دہ اور مضرت دہاں ہوتی ہے) تو اسے سبب قرار نہیں دیا جاسکتا کیونکہ آتش گیر مادوں کے بغیر بھی یہی کچھ ہوتا۔

رستوپچین کی جارحانہ اور سفاکانہ حب الوطنی پر الزام دھرنے سے فرانسیسیوں کی اور شہر پسند ہونا پارت کو ذمے دار ٹھہرانے سے یا چند سال بعد اپنے عوم کے ہاتھوں مجاہدانہ مشعلیں تھماتے سے روسیوں کی اناہ کی خواہش ہی تسکین کیوں نہ ہوتی، یہ قیاس نہ کرنا ناممکن ہے کہ آتش زدگی کا یہ براہ راست سبب نہیں تھا کیونکہ ماسکو کا نذر آتش ہونا اسی طرح یقینی تھا جس طرح اس شہر کا رخانے یا مکان کا، جس کے مالک اسے چھوڑ کر جا چکے ہوں اور جس میں جنسیوں کو قیام کرنے اور اپنا دال دلیا پکانے کی کھلی چھٹی حاصل ہو، خفا کستر ہونا لازمی امر ہے۔ ٹھیک ہے کہ ماسکو کو اس کے اپنے شہریوں نے آگ کی بھینٹ چڑھایا لیکن انھوں نے نہیں جو وہاں مقیم رہے تھے بلکہ انھوں نے جو اس سے منہ موڑ گئے تھے۔ جب ماسکو پر دشمن کا قبضہ ہو گیا، وہ برلن، وینا یا دوسرے شہروں کی طرح کوئی نقصان اٹھانے سے محض اس لیے نہ بچ سکا کیونکہ اس کے باشندے مہمان نوازی کی روایت پر عمل کرتے ہوئے شک رونی لے کر فرانسیسیوں کی خدمت میں حاضر ہونے اور شہر کی چابیاں ان کے سپرد کرنے کے بجائے اسے چھوڑ کر چلے گئے تھے۔

27

فرانسیسیوں کا شہر میں جو انحطاط عمل میں آرہا تھا، اس کا دائرہ کار مسلسل بڑھتا اور پھیلتا رہا۔ تاہم جس حصے میں دیر مقیم تھا، وہاں تک وہ دسمبر کی شام کو ہی پہنچ سکے۔

گزشتہ دو دن تہائی اور اس قسم کے غیر معمولی حالات میں گزارنے کے بعد دیر کی ذہنی کیفیت دیوانگی کی حدوں کو چھوئے لگی تھی۔ اس کے دماغ پر صرف ایک ہی دھن سوار تھی۔ اسے خود معلوم نہیں تھا کہ اسے اس خیال نے کب یا کس طرح پوری طرح اپنی گرفت میں لے لیا تھا لیکن اب اسے نہ ماضی کی کوئی چیز یاد تھی اور نہ حال کی کسی چیز کی سمجھ تھی۔ اسے اپنے گرد و پیش جو نظر آتا یا سنائی دیتا تھا، اسے یوں معلوم ہوتا جیسے یہ کوئی خواب کا حصہ ہو۔

حیرت گھر سے محض اس لیے بھاگتا تھا کیونکہ وہ زندگی کے سچے درجے تقاضوں سے، جنہوں نے اسے اپنے جال میں پھانس لیا تھا اور جن کی اس حالت میں، جس میں وہ اس وقت تھا، گراں گھوٹا اس کے بس کی بات نہ تھی، فرار حاصل کرنا چاہتا تھا۔ وہ آئی اوسف، لیکسی وچ کے ہاں بظاہر اس کی کتابیں اور کاغذات چھانٹنے گیا تھا لیکن اصل حقیقت کچھ اور تھی۔ وہ وہاں اس لیے گیا تھا کیونکہ وہ زندگی کے پر آشوب ہنگاموں سے نجات کی کوئی صورت ڈھونڈنا

چاہتا تھا۔ اس کے ذہن میں بارڈیف کی جو یادیں تھیں، وہ متین، پرسکون اور ابدی خیانت کی دنیا سے وابستہ تھیں اور یہ چیزیں اس پر اضطراب الجھاؤ کے جس میں وہ اپنے آپ کو پھنسا ہوا محسوس کر رہا تھا قطعی برعکس تھیں۔ اسے پرسکون پناہ کی تلاش تھی اور یہ اسے آئی اوس، لکسی دج کے سنڈی روم میں میسر آ گئی۔ جب وہ سنڈی روم کے مرگ آہا سکوت میں اپنے محسن کی گرد آلود میز پر کہنیاں نکائے بیٹھا تھا، اس کے ذہن میں گزشتہ چند روز کی پرسکون اور معنی خیز یادیں اور تاثرات پیہم کیے بعد دیگرے ابھرنے لگے۔ ان میں بارودینو کی لڑائی کی یادیں خاص طور پر شامل تھیں اور ان نسانوں کی، جن کی تصاویر اس کی روح پر نقش تھیں اور جو اس کی نظر میں وہ یہ تھے، صدائت شتوری، سادگی اور کس بل کے مقابلے میں اسے اپنی بے وقوفی اور بطلت کا مبہم سا احساس ہوا۔ جب گیراسم نے اسے اس کی بحوث سے جگایا، اس کے ذہن میں خیال آیا کہ وہ ماسکو کے عوامی دفاع میں، جس کے متعلق سے معلوم تھا کہ اس کا مصوبہ بنایا جا چکا ہے، حصہ لے گا۔ اور اسی مقصد کے پیش نظر اس نے گیراسم سے مطالبہ کیا تھا کہ وہ اسے وہابی کوٹ اور پستول لا کر دے۔ اس نے اسے رازدارانہ طور پر یہ بھی بتایا تھا کہ اس کا ارادہ اپنی شناخت پوشیدہ رکھنا اور آئی اوس کے گھر میں مقیم رہنے کا ہے۔ پھر تہائی، اور عدم مصروفیت (بیکر نے متعدد میسجوں کے مسودوں پر اپنی توجہ مرکوز کرنے کی کوشش کی لیکن وہ ہر بار ناکام رہا) کے پہلے روز کے دوران میں اس کا ذہن بار بار مبہم انداز سے اس خیال کے نیولین کے نام کے ساتھ اس کا نام پر اسرار انداز سے غسلک ہے اور یہ بات بڑی معنویت کی حامل ہے۔ کی طرف پلٹتا رہا، جو پہلے بھی اس کے ذہن میں آچکا تھا۔ یہ خیال کہ اس (یعنی russe Besuhol) کے مقدر میں the Beast (یعنی نیولین) کے اختیارات و قوت کو ختم کرنا لکھا جا چکا ہے، ابھی تک محض ان چند پنوں میں سے ایک تھا، جو اپنے پیچھے کوئی نشان چھوڑے بغیر دبے پاؤں اس کے ذہن میں گردش کر رہے تھے۔

جب میٹر کوٹ خرید چکا (اس نے اسے محض ماسکو کے عوامی دفاع میں شریک ہونے کے لیے خریدا تھا) اس کا سامنا دستوفوں سے ہو گیا ورنہ شائے اس سے دریافت کیا ”آپ ماسکو میں ہی ٹھہریں گے؟ بہت خوب“ اس کے ذہن میں یہ خیال بجلی کے کوندے کی طرح پکا کہ اگر ماسکو دشمن کے قبضے میں چلا بھی جائے، پھر بھی اس کا وہاں قیام کرنا اور جو فعل سرانجام دینا اس کا مقدر بن چکا ہے، اسے پاپیہ تکمیل تک پہنچانا واقعی عظیم کارنامہ ہوگا۔ اگلے روز اس کے ذہن میں صرف ایک ہی خیال گردش کر رہا تھا کہ وہ کوئی دقیقہ نہیں انکار سکے گا اور اس دنیا میں جو کچھ یہ کر رہے ہیں، وہ اس سے کم تر پر قاعدت نہیں کرے گا۔ اسی ادھیڑ بن میں وہ اجوم کے ساتھ نین پرت پہنچ گیا۔ لیکن جب وہ مکان میں واپس آیا، اسے یقین ہو چکا تھا کہ ماسکو کا دفاع نہیں کیا جائے گا۔ اسے اچانک محسوس ہوا کہ جو بات از میں مشترک مکان کے دائرے میں نظر آتی تھی، اب اس کا سرانجام دینا کامل واجب اور ناگزیر ہو گیا ہے۔ اسے اپنی شناخت چھپ کر ماسکو میں ہی ٹھہرنا چاہیے، کسی نہ کسی طرح نیولین تک رسائی حاصل کرنا اور اسے کیفر کردار تک پہنچانا چاہیے۔ چنانچہ یوں یا تو خود اسے موت سے ہمتا رہا ہو جانا چاہیے یا پھر سارے یورپ کے مصائب کا، جو اس کے خیال کے مطابق سراسر نیولین کے پیدا کردہ تھے، خاتمہ کر دینا چاہیے۔

1809 میں ایک جرمن طالب علم نے ہونا پارت کو ہلاک کرنے کی جو کوشش کی تھی، بیئر کو اس کی ساری تفصیلات کا علم تھا، اور اسے یہ بھی معلوم تھا کہ اس طالب علم کو گولی مار دی گئی تھی۔ اپنے اس منصوبے کو عملی جامہ پہنا کے سلسلے میں اسے جن خطرات کا سامنا تھا، انھوں نے اس کے جذبات کو اور بھی برا بھلا کر دیا تھا۔

یکساں شدت کے حامل دو جذبات اسے کشاں کشاں اس مقصد کی طرف دھکیلے لیے جا رہے تھے۔ اس کا پہلا احساس یہ تھا کہ عام جتنا کے پیش نظر اس کے لیے دکھ سہنا اور قربانی دینا لازمی ہو گیا ہے۔ یہی وہ جذبہ تھا جس نے پچیس تاریخ کو اسے سوڈینک کا رخ کرنے اور وہاں سے میدان جنگ کے اس حصے میں، جہاں گھساں کارن پڑ رہا تھا، جانے پر کسپا تھا، اور اسی نے اسے گھر سے فرار ہونے، ہر قسم کے تعیشات اور آسائشوں پر، جو اس کی گھٹی میں پڑ چکی تھیں، دست مار کر لبس تبدیل کیے بغیر سخت صوفے پر سونے اور وہاں کھانا، جو گیر اسم کھاتا تھا، کھانے کی ترغیب دی تھی۔ اس کے دوسرے جذبے کا تعلق اس مبہم اور مخصوص ردی عقارت سے تھا، جو ہر اس چیز سے جو روایتی، مصنوعی اور مستند ہو، روبرو رکھتے ہیں۔ یہ انفاظ دیگر روی ہر اس چیز کو، جو انسانوں کی اکثریت کو دنیا کی بہترین شے نظر آتی ہے، پائے استحقاق سے ٹھکرا دیتے ہیں۔ بیئر کو اس عجیب و غریب اور مسکون احساس کا تجربہ سلاہو داخل میں ہوا تھا جب اسے اپنا ایک محسوس ہوا کہ دولت، طاقت اور زندگی کا۔ وہ اشیاء جن کے حصول اور تحفظ کے لیے انسان سر دھڑکی بازی لگا دیتے ہیں۔ اگر کوئی مول ہے تو وہ صرف اس سرت کے برابر ہے، جو انھیں تباہ کر حاصل ہوتی ہے۔

یہ وہی انصہراری جذبہ ہے جو رضا کارانہ طور پر بھرتی ہوئے وے شخص کو اپنی آخری دمزی شراب نوشی پر صرف کرنے اور شراب میں دھت آدمی کو بظاہر بے سبب آکینے اور درپچوں کے شیشے توڑنے پر اکسانا ہے حالانکہ اسے معلوم ہوتا ہے کہ اسے یہ حرکت اتنی مہنگی پڑے گی کہ اس نقصان کا ارالہ کرنے کے لیے اس کی جیب میں جو پیسا دھپلا ہے، اسے اس سے یکسر محروم ہونا پڑے گا۔ یہ وہ جذبہ ہے جو انسان سے ایسے ایسے افعال سرانجام دلانے کا سبب بنتا ہے جو (عام آدمیوں کے نقطہ نظر سے تو) مجنونانہ کھائی دیتے ہیں، لیکن دراصل وہ اس کے ذاتی اختیار اور قوت کی آزمائش ہوتے ہیں اور زندگی کے ایسے اعلیٰ ارفع معیار کی، جو عام انسانوں کی رسائی سے بہت دور ہوتا ہے، موجودگی کی شہادت دیتے ہیں۔

جس روز سلاہو داخل میں بیئر کو اس احساس کا اولیس بار تجربہ ہوا، سو وہ دن اور یہ دن، وہ مسلسل اس کے زیر اثر رہا لیکن صرف اب کہیں اسے اس سے کامل اطمینان ہوا۔ مزید برآں، سو جو دہائیے میں بیئر کو اپنے منصوبے میں ان اقدامات سے، جو وہ اس سمت میں پہلے ہی کر چکا تھا، تقویت حاصل ہوئی اور انھوں نے اسے اس سے دست بردار ہونے سے روک رکھا۔ وہ اپنے گھر سے فرار ہوا، اس نے رہنمائی کوٹ اور ہسپتال خریدے، اور دستوں کے سامنے اعلان کیا کہ وہ ماسکو میں ہی ٹھہرا رہے گا۔ چنانچہ دوسروں کی طرح اگر اس نے اب ماسکو چھوڑا، تو اس کے یہ حرم، فعل نہ صرف بے معنی بلکہ ردی اور معشک بھی قرار پائیں گے (اور یہ وہ نکتہ تھا جس کے بارے میں وہ

بہت زیادہ حساس تھا۔

جیسا کہ ہمیشہ ہوتا ہے، ہیئر کی جسمانی حالت اس کی ذہنی کیفیت سے میل کھاتی تھی۔ موٹا جھونا کھانا، جس کا وہ عادی نہیں تھا، دوڑ کا، جو وہ ان دنوں جیتا تھا، سے انگور اور سگاردوں کی عدم دستیابی، میلا کچین اور غیر تبریل شدہ لباس، اور تقریباً پوری دوراتوں کی، جو اس نے گزشتہ چار اور پچیس کے ہیئر گزری تھیں، بے خرابی۔ ان سب باتوں نے مل کر اسے اعصابی چڑچڑے پن میں، جو دیوانگی کی سرحدوں کو چھوتی تھی، مبتلا رکھا۔



سہ پہر کے دن چھکے تھے۔ فرانسیسی پہلے ہی ماسکو میں داخل ہو چکے تھے۔ ہیئر کو اس کا علم تھا لیکن کوئی عملی قدم اٹھانے کے بجائے وہ محض اپنے منصوبے کے متعلق سوچتا اور اس کی چھوٹی سے چھوٹی جزئیات پر غور و فکر کرتا رہا۔ اپنے تخیل میں وہ نیولین کو کوئی ضرب پہنچانے یا اسے ہلاک کرنے کے بارے میں کوئی واضح تصویر نہ بنا سکا لیکن جہاں تک اس کے اپنے فقاہونے اور اولو اعزمانہ انداز سے تکالیف برداشت کرنے کا تعلق ہے، اس کے بارے میں اس کے ذہن میں کوئی الجھاؤ نہیں تھا اور وہ غیر معمولی صراحت اور فسر دگی سے اس پر تفصیل سے سوچ بچار کرتا رہا۔

”ہاں، مجھے سب کی خاطر اسی لیے اس منصوبے کو پایہ تکمیل تک پہنچانا یا خود فنا ہو جانا ہوگا!“ اس نے سوچا۔

”میں وعدہ کرتا ہوں کہ میں اس تک رسائی حاصل کروں گا... اور پھر اچانک، پستوں سے یا خنجر سے؟ مگر یہ بات اتنی اہم نہیں۔ تمہیں یہ سزا میں نہیں بلکہ مثبت ایجنڈی دے رہی ہے۔ میں اسے بتاؤں گا۔“ ہیئر نے ان الفاظ کو، جو اس نے نیولین سے اسے ہاک کرتے وقت کہنا تھے، دھین میں لاتے ہوئے سوچا۔ ”ہونہ، تو پھر بکڑ لو مجھے اور چڑھا دو پھانسی!“ وہ سوچتا اور اپنے آپ سے باتیں کرتا رہا۔ اس کے چہرے پر اداسی ضرور چھائی ہوئی تھی لیکن اس پر غم بھی جھلک رہا تھا اور اس نے اپنا سر نیچے جھکا رکھا تھا۔

جب ہیئر کمرے کے درمیان میں کھڑا ان خطوط پر سوچ رہا تھا، سٹڈی روم کا دروازہ کھلا اور ایلینز پراکار ایکسی وچ کی شکل نمودار ہوئی۔ ماکارائیکسی وچ قبل ازیں ڈراڈرا سہا سہا دکھائی دیتا تھا لیکن اب اس کی کایا پلٹ چکی تھی۔ اس کے ڈریسنگ گاؤن کے بٹن کھلے تھے اور وہ نیچے کی طرف دھک رہا تھا۔ اس کا چہرہ سرخ اور ساج ہو رہا تھا۔ وہ لریب نشے میں عرق تھا۔ ہیئر کو دیکھ کر پہلے تو وہ ہنستا یا لیکن جب اس نے ہیئر کو یوں بھیجے دیکھتے ہیں اس کی چوری پکڑی گئی ہو، وہ ایک دم شیر ہو گیا اور اپنی لاغر ٹانگوں پر لڑکھڑاتا کمرے کے وسط کی طرف بڑھا۔

”ان کی ترکی تمام ہو گئی ہے!“ اس نے رازدارانہ انداز سے گلو گرفتہ آواز میں کہا۔ ”میں بتائے دیتا ہوں کہ میں ان کے سامنے سر نہیں جھکاؤں گا۔ میں بتائے دیتا ہوں... حضور، میں نے ٹھیک کہا یا نہیں؟“

وہ چپ ہو گیا۔ پھر ناگاہ اس کی نظر میر پر رکے پستول پر پڑی۔ اس نے حیرت انگیز پھرتے سے اسے بڑھ کر اسے اٹھایا اور غلام گردش میں بھاگنے لگا۔

میرا سم اور دربان نے، جو ماکارالیکسی وچ کا تہ تب کر رہے تھے، اسے پیش دالان میں روک لیا اور اس سے پستول واپس لینے کی کوشش کرنے لگے۔ ہیئر بھی غلام گردش میں آ گیا۔ اسے نیم پاگل بوڑھے شخص پر ترس بھی آیا اور اس سے گھٹن بھی محسوس ہوئی۔ ماکارالیکسی وچ تیوریاں چڑھائے پستول سے چمٹا رہا اور پوری کوشش کرتا رہا کہ دوسرے سے چھین نہ سکیں۔ پھر اس نے کرخت آواز میں یوں چیخ مار کر کچھ کہا جو بظاہر اس کے خیال کے مطابق نہایت دلولہ انگیز تھا۔

”تھیار، تھیار اٹھاؤ! تختے کھڑے کرو اور ان کا راستہ روک لو انہیں، تم یہ نہیں لے سکو گے!“ اس نے بھیچروں کا پورا زور لگا کر چلاتے ہوئے کہا۔

”حضور، اب جانے دیں، کافی ہو گئی ہے، کافی ہو گئی ہے، اب جانے دیں اچھوڑ دیں، حضور، جناب۔۔“

میرا سم نے احتیاء سے ماکارالیکسی وچ کو کٹائی سے پکڑتے اور اسے دروازے کی جانب لے جانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

”تم کون ہو؟ بونا پارت؟۔۔۔“ ماکارالیکسی وچ نے چیخ کر پوچھا۔

”حضور، یہ آپ کے لیے ٹھیک نہیں ہے۔ آپ اپنے کمرے میں تشریف لے چلیں، آپ تھک چکے ہیں۔

لائیں، پستول مجھے دے دیں۔“

”ذلیل، حرام خور، بھاگ جاؤ! ست نکاؤ ہاتھ مجھے ایسے دیکھتے ہو؟“ ماکارالیکسی وچ نے چلاتے اور پستول فضا میں لہراتے ہوئے کہا۔ ”ان کے راستے میں تختے کھڑے کر دو!“

”انہیں پکڑ لو!“ میرا سم نے دربان کے کان میں کہا۔

انہوں نے ماکارالیکسی وچ کو بازوؤں سے پکڑا اور اسے گھسیٹ کر دروازے کی جانب لے گئے۔

پیش دالان ہاتھ پائی اور نشے سے چور ہانپتی کاپیتی کرخت اور ناشستہ آوازوں سے گونجنے لگا۔

اچانک پورچ میں ایک اور تیکھی نسوانی آواز کی گونج سائی دل اور ہاؤرچن بھگتی لپکتی پیش دالان میں داخل ہو گئی۔

”وہ آگئے! رحیم وکریم خداوند!۔۔۔ یا خداوند! وہ جا رہیں، گھوڑوں پر!“ وہ چیخ چیخ کر کہہ رہی تھی۔

میرا سم اور دربان نے ماکارالیکسی وچ کو چھوڑ دیا اور اس سکوت میں، جو اس کے بعد غلام گردش میں چھا گیا تھا، بیرونی دروازے پر متحد ہاتھوں کے دستک دینے کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔

ویٹریہ فیصدہ کرچکا تھا کہ جب تک وہ اپنے منصوبہ کو عمل جامہ نہیں پہنا لیتا، وہ کسی شخص کو نہ تو اپنی ذات کے بارے میں کچھ بتائے گا اور نہ یہ کہ اسے فرا نہیں آتی ہے۔ وہ اب غلام گردش کے نیم و دروازے کے پاس کھڑا تھا اور یہ ارادہ کر

رہا تھا کہ جو نئی فرانسیسی اندر داخل ہوئے، وہ ادھر ادھر روپوش ہو جائے گا، مگر فرانسیسی آگے اور پیچھے جہاں گھڑا تھا، وہیں کھڑا رہا۔ غیر مغلوب تجسس نے اسے ہلنے نہ دیا۔

وہ دو تھے۔ ایک افسر، دروازہ قامت، خور و دربان کا بچہ، دوسرا بظاہر معمولی شکاری یا اردلی، کوٹاہ کا متاد بپا، دھوپ میں جھلس ہوا۔ اس کے گال بچکے ہوئے تھے اور اس کے چہرے پر مُردنی چھائی ہوئی تھی۔ افسر آگے آگے رہا تھا۔ وہ چیٹری پر جھکا ہوا تھا اور قدرے لنگڑا رہا تھا۔ جب وہ چند قدم اٹھ چکا وہ رک گیا۔ بظاہر معلوم ہوتا تھا کہ وہ یہ فیصلہ کر چکا ہے کہ یہ مکان ٹھیک ٹھاک ہے۔ وہ سپاہیوں کی جانب، جو صدر دروازے میں کھڑے تھے، متوجہ ہوا اور انھیں بلند اور حکمانہ انداز سے علم دینے لگا کہ وہ گھوڑے دیں روک لیں۔ جب وہ اس کام سے فارغ ہو گیا، اس نے اپنی کبھی کوخم دیا، دھونس آمیز انداز سے بازو سے اشارہ کیا، مونچھوں پر ہاتھ پھیرا، دراپنی ٹوپی کو خفیف سا مچھو۔

"Bonjour, la compagnie!" اس نے مسکراتے دراپنے گرد و پیش نظریں دوڑتے ہوئے شگفتگی سے کہا۔

کسی نے جواب نہ دیا۔

"Vous etes le bourgeois?" افسر نے گیراسم سے پوچھا۔

گیراسم افسر کا منہ تکتے لگا۔ وہ مضطرب بھی تھا اور تجسس بھی۔

"Quarter, quartier, logement." افسر نے قلیل البخشہ آدمی پر لطف و کرم کی نگاہیں ڈالتے ہوئے کہا۔

"Les Francais sont de bons enfants. Que diable! Voyons! Ne nous fachons pas mon vieux!"

اس نے تھر تھر کانپتے اور چپ سادھے گیراسم کے کدھے کو تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ "ہونہہ، اس گھر میں کسی کو بھی فرانسیسی نہیں آتی؟" اس نے ایک بار پھر فرانسیسی میں پوچھا۔ اس نے ادھر دھردھ دیکھا اور اس کی آنکھیں پتھر کی آنکھوں سے چار ہو گئیں۔

پیئر دروازے سے پرے ہٹ گیا

افسرایک بار پھر گیراسم کی طرف متوجہ ہو۔ اس نے اسے حکم دیا کہ اسے مکان کے کمرے دکھائے جائیں۔ "مالک یہاں نہیں ہیں۔ میں سمجھتا نہیں۔ میں آپ کی۔" گیراسم نے الفاظ کی ترحیب تبدیل کرتے ہوئے انھیں زیادہ قابل فہم بنانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

افسر، بھل تک مسکرائے جا رہا تھا۔ اس نے اپنا ہاتھ گیراسم کی ناک کے سامنے پھیلا دیا۔ اس سے وہ یہ ظاہر

• سب کو آداب

• یہاں کے مالک تم ہو؟

• مکان، مکان۔ رہائش کے لیے جگہ۔ فرانسیسی بھلے مانس ہیں۔ کیا مصیبت ہے ابزرگوبانے دیں، عرصہ تنوک دیں۔

کرنا چاہتا تھا کہ وہ بھی اس کی بات نہیں سمجھا، اور وہ لنگڑاتے لنگڑاتے اس دروازے کی جانب، جہاں بیئر کھڑا تھا، چل پڑا۔ بیئر وہاں سے ہٹا اور کہیں راہ پوش ہو جانا چاہتا تھا کہ ناگاہ اس کی نگاہ ماکارالیکسی وچ پر پڑی جو ہاتھ میں پستول پکڑے باورچی خانے کے کھلے دروازے میں کھڑا تھا۔ ماکارالیکسی وچ نے پاگلوں کی عیاری سے کام لیا، بغور فرامیسی کو دیکھا، پستول اوپر اٹھا اور شست باندھ لیا۔

’اے آگے تختے کھڑے کر دو!‘ نشے سے دھت شخص نے لیلی دبانے کی کوشش کرتے ہوئے ہنسا کر کہا۔ چیخ کی آواز سن کر فرامیسی ادھر مڑا اور اسی ٹائپے بیئر نے مخور آدمی کو دیوچ لیا۔ عین اس وقت جب بیئر نے پستول پکڑا اور اس کا رخ اوپر کی طرف کیا، ماکارالیکسی وچ آخر کار لیلی دبانے میں کامیاب ہو گیا۔ ایسا شور بلند ہوا کہ انہیں محسوس ہوا کہ ان کے کانوں کے پردے پھٹ جائیں گے اور اس کے ساتھ ہی وہ سب دھوکے کے باؤں میں چپ گئے۔ فرامیسی کا رنگ فق ہو گیا اور وہ دروازے کی طرف بھاگ پڑا۔

بیئر اپنا یہ ارادہ بھول گیا کہ وہ رخصتا نہیں ہونے دے گا کہ اسے فرامیسی آتی ہے۔ اس نے پستول چھین لیا اور اسے فرش پر پھینک دیا۔ پھر وہ انسر کی طرف بھاگا اور اس سے فرامیسی میں پوچھنے لگا:

’بڑی زحمت تو نہیں ہوئی؟‘

’میرا خیال ہے کہ نہیں،‘ انسر نے اپنے سر پر پکا جاتزا لیتے ہوئے کہا، ’لیکن اس مرتبہ میں بال بال بچا۔‘ اس نے دیوار کے اکھڑے پلستر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مزید کہا۔ ’کون ہے یہ شخص؟‘ اس نے بیئر کو درشت نگاہوں سے گھورتے ہوئے کہا۔

’جو کچھ ہوا ہے، اس سے مجھے بہت دکھ پہنچا ہے۔‘ بیئر نے جھٹ پٹ کہا۔ اس نے جو کردار ادا کرنے کا ارادہ کیا تھا، اسے وہ مطلق بھول چکا تھا۔ ’یہ پاگل ہے۔ اس بد نصیب کو یہ معلوم ہی نہیں کہ وہ کیا کر رہا تھا۔‘

انسر ماکارالیکسی وچ کے قریب آیا اور اسے کار سے پکڑ لیا۔

ماکارالیکسی وچ منہ کھولے دیوار کے ساتھ لگا کھڑا تھا۔ وہ یوں جھول رہا تھا جیسے اسے نیند آ رہی ہو۔

’بڑی ساش! تمہیں اس کا خیال زہ بھگتا پڑے گا۔‘ فرامیسی نے اسے چھوڑتے ہوئے کہا۔ ’تج کے بعد ہم فرامیسی بہت رحمیں ہو جاتے ہیں لیکن ہم غداروں کو معاف نہیں کرتے۔‘ اس نے طرح دار لیکن پر زور انداز سے ہٹا باز دہراتے ہوئے کہا تاہم اس کے چہرے بشرے پر جو قاتل جھلک رہا تھا، اس سے متوجہ ہو رہا تھا کہ آثار مجھے نہیں۔

بیئر فرامیسی میں انسر کو قاتل کرنے کی کوشش کرتا رہا کہ وہ ہوش پاگل سے باز پرس کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ فرامیسی پہلے تو منہ لٹکائے چپ چاپ منتارہا، پھر ایک ایسی مسکراتی لگا اور بیئر کی طرف متوجہ ہو گیا۔ وہ ایک دو سیکنڈ اسے بغور دیکھتا رہا۔ پھر اس کا ردیہ ضرورت سے زیادہ سنجیدہ ہو گیا اور اس کے چہرے سے نظر آنے لگا کہ وہ بہت جذباتی ہو رہا ہے۔ اس نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا۔

’تم نے میری جان بچائی ہے۔ تم لازماً فرامیسی ہو گے!‘ اس نے کہا۔

فرانسیسی کے لیے یہ نتیجہ اخذ کرنا کہ صرف فرانسیسی ہی کوئی عظیم کارنامہ سرانجام دے سکتے ہیں، بالکل بدیہی بات تھی اور اس کی تیرہویں لائن، جنٹ کے پکتان موسیو عام بال (Ramba le) کی زندگی بچانا واقعی عظیم کارنامہ تھا۔

تاہم یہ منطق اور اس پر مبنی افسر کا اعتقاد خواہ کتنا ہی غیر متنازعہ کیوں نہ سمجھا جاتا، اس کے غبارے سے ہوا نکالنا مناسب سمجھا۔

”میں روسی ہوں!“ اس نے مختصر جواب دیا۔

”ارے جاؤ، یہ بات کسی اور سے کہنا“ فرانسیسی نے مسکراتے اور پیٹر کی ناک کے سامنے اپنی انگلی لہرانے ہوئے کہا۔ ”اس بارے میں تم عنقریب مجھے سب کچھ بتاؤ گے اور میں بہت غور سے سنوں گا۔ پنے ہم وطن سے مل کر مجھے بہت خوشی ہوئی ہے۔ خیر، اب یہ بتاؤ کہ اب ہم اس شخص کا کیا کریں؟“ اس نے پیٹر سے پوچھا جیسے بھائی بھائی سے کوئی بات پوچھتا ہو۔

اس کا لہجہ اور نگاہیں کہہ رہی تھیں کہ پیٹر بے شک فرانسیسی نہ ہو لیکن جب اسے ہندوئیں انسانی لقب موصول ہو گیا، پھر اسے یقیناً اس سے دست بردار ہونے کی کوشش نہیں کرنا چاہیے۔ اس کے آخری سوال کے جواب میں پیٹر نے ایک بار پھر اسے بتایا کہ ماکارالکسی وچ کون ہے اور یہ کہ اس کی آمد سے ذرا قبل بدہوش پاگل نے کس طرح اس کا بھرا ہوا پستول اڑایا تھا اور وہ کس طرح اسے اس سے واپس لینے میں ناکام رہے تھے کیونکہ انھیں اس کا دلت ہی نہیں مل سکا تھا۔ اس نے افسر سے درخواست کی کہ وہ اسے کوئی سزا دے۔

فرانسیسی نے اپنا سینہ پھلایا اور نوابی انداز سے اپنا ہاتھ لہرایا۔

”تم نے میری جان بچائی ہے۔ تم فرانسیسی ہو۔ تم مجھے کہتے ہو کہ میں اسے معاف کر دوں؟ میں تمہاری درخواست مان لیتا ہوں۔ اس شخص کو یہاں سے لے جاؤ۔“ اس نے اپنے بچے پر زور دے کر تیز بات کرنے ہوئے کہا۔ پھر اس نے اس آدمی کا، جسے اس نے زتی دے کر فرانسیسی بنادیا تھا کیونکہ اس نے اس کی جان بچانا تھی، بازو تھامنا اور اس کے ساتھ کمرے میں چلا گیا۔

محکم میں جو فوجی کھڑے تھے، انھوں نے جب گولی چلنے کی آواز سنی، وہ یہ معلوم کرنے کہ کیا ہو رہا ہے، پیش دالان میں آگئے اور کہنے لگے کہ وہ مجرموں کو سزا دینے کے لیے تیار ہیں لیکن افسر نے انھیں سختی سے روک دیا۔

”جب تمہاری ضرورت پیش آئے گی، تمہیں بلا لیا جائے گا۔“ اس نے کہا۔

فوجی وہاں چلے گئے۔ دریں اثناء اردلی، جو موقع پا کر باورچی خانہ دیکھنے چلا گیا تھا، دوبارہ اندر آگیا اور افسر کے پاس جا کھڑا ہوا۔

”پکتان، باورچی خانے میں سوپ اور مٹھی ہوئی ران پڑی ہے۔ حکم ہو تو آپ کی خدمت میں حاضر کر دوں؟“ اس نے کہا۔

”ہاں، اور کچھ ہے انگوڑے لے آؤ۔“ پاکستان نے جواب دیا۔

29

جب فرانسیسی افسر میجر کے ہمرہ کمرے کے اندر چلا گیا، سو فریڈرک کرنے ایک بار پھر اسے یہ یقین دمانا کہ وہ فرانسیسی نہیں ہے، اپنا فرض گردانا اور اسے بتایا کہ وہ وہاں سے جانا چاہتا ہے، لیکن افسر نے اس کی ایک نہ سنی۔ اس کا رویہ انتہائی شائستہ، خوش خلق، متواضع اور بھلنسا نا تھا، اور میجر نے اس کی جو جان بچائی تھی، اس پر وہ اتنے سچے دل سے اس کا ممنون تھا کہ میجر اس کی درخواست مسترد کرنے کا حوصلہ نہ کر سکا، اور وہ جس اولین کمرے میں داخل ہوئے تھے، وہ اس کے ساتھ وہیں بیٹھ گیا۔ میجر نے جو بار بار اتر اڑاؤں کی تھاکہ وہ فرانسیسی نہیں ہے، بظاہر پاکستان اسے سمجھ نہیں پڑا تھا۔ یہ بات اس کے فہم و ادراک میں نہیں آ رہی تھی کہ کوئی شخص اس قابلِ تحسین لقب کو مسترد کیسے کر سکتا ہے۔ وہ محض کندھے اچکا کر رہ گیا اور یوں کہ اگر میجر واقعی روی سمجھے جانے پر مصر ہے، تو پھر یونہی سکی، تاہم جہاں تک اس کے اپنے جذبات کا تعلق ہے، اس کے دس میں اس کے لیے ہمیشہ تشکر کے جذبات موج زن رہیں گے کیونکہ اس نے اس کی جان بچائی تھی۔

گرد و رت نے اس شخص کو دوسروں کے جذبات سمجھنے کی ذرا سی صلاحیت بھی ودیعت کی ہوئی اور اس نے اسے اپنے ہم نشین کے احساسات کا خفیف سا علم بھی ہوتا، غالباً میجر اسے چھوڑ کر جا چکا ہوگا، لیکن اپنی ذات کے علاوہ وہ جس شگفتہ انداز سے ہر دوسری چیز کے بارے میں بے حس تھا، اس نے میجر کے ہاتھ پاؤں، بندھ دینے اور وہیں بیٹھا رہا۔

”فرانسیسی یا ہمیں بدلے دے دیں“ اس نے میجر کے نفس، اگرچہ گندے، ہلہ اس اور اس کی انگلی پر انگلی کو منظر غائر دیکھتے ہوئے کہا، ”میری زندگی تمہاری سر ہون بخت ہے، اور میں تمہاری طرف دوستی کا ہاتھ بڑھاتا ہوں۔“ فرانسیسی دو باتیں۔ ہنگ اور خدمت۔ کبھی فراموش نہیں کرتے۔ میں تمہاری طرف دوستی کا ہاتھ بڑھاتا ہوں۔ میں اس سے زیادہ کچھ نہیں کہہ سکتا۔“

افسر کی آواز، اس کے چہرے کے تاثرات اور اس کی حرکات و سکنات میں اتنی نیک بختی اور شرافت (اس لفظ کے فرانسیسی معنوں میں) تھی کہ میجر نے غیر شعوری طور پر جسم کا جواب جسم سے دیا اور جو ہاتھ اس کی جانب بڑھایا گیا تھا، اس نے اسے اپنے ہاتھ میں لے لیا اور اسے دبائے لگا۔

”تیرھویں لائٹ رجمنٹ کا کمیشن عام ہل ورسا تو ہیں ستمبر کے واقعے کے بعد Legion d' Honneur کا Chevalier“ اس نے اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا۔ اسے اتنی خاطر جمع تھی کہ اس کی مسکراہٹ، جس نے اس کے ہونٹوں کو شکن آلود بنادیا تھا، دبائے دیتی نہیں تھی۔ ”کیا اب آپ پرانے مہربانی مجھے یہ بتانے کی دھمت گوارا کریں گے کہ اس جوانی کی گولی جسم میں گھسیڑے ایسبوسٹس میں لیے ہوئے کی بجائے مجھے یوں خوش گوار انداز

سے کس ذات بابرکات سے ہم کلام ہونے کا شرف حاصل ہو رہا ہے؟“

شرمانے اور کوئی نام گھڑنے کی کوشش کرنے کے بعد میئر نے جواب دیا کہ وہ یہ بتانے سے معذرت ہے کہ کون ہے۔ وہ اپنا شخص کیوں پوشیدہ رکھنا چاہتا تھا، وہ اس کی وجوہ بیان کیا ہی چاہتا تھا کہ فرانسیسی نے اسے لوک دیا۔

”خیر، جانے دیں،“ وہ پکارا تھا۔ ”میں سمجھ گیا۔ آپ کوئی افسر ہیں... شاید سٹاف افسر۔ آپ ہمارے خانہ آتھیں، رائٹ چکے ہیں۔ اس سے میرا کوئی تعلق نہیں۔ میں اپنی زندگی کے لیے آپ کا ممنون احسان ہوں۔ میرے لیے یہی کافی ہے۔ میں سرتاپا آپ کی خدمت کے لیے حاضر ہوں۔ آپ کا تعلق اشراف سے ہے؟“ اس نے اپنی بات ختم کرتے ہوئے کہا۔ اس کی آواز میں استفسار کی ہلکی سی جھلک تھی۔

میئر نے اپنا سر جھکا دیا۔

”آپ کا مسیحی نام؟ وہ بھی آپ بتانا چاہیں تو۔ اس سے زیادہ میں کچھ پوچھنا نہیں چاہتا۔ موسیو میئر، جی کہ نا آپ نے؟۔ بہت اعلیٰ، میں بس یہی معلوم کرنا چاہتا تھا۔“

جب ران، آلیٹ، ساوار، ووڈکا، اور کچھ انگوری شراب آگئی، جو فرانسیسی کسی تہہ خانے سے لائے تھے، عام ہال نے میئر کو شرکت طعام کی دعوت دی اور خود جھٹ پٹ کسی صحت مند اور بھوک سے نڈھال شخص کی طرح حیرانہ کھانے پر ٹوٹ پڑا۔ وہ اپنے مضبوط دانتوں سے خوب چب چبا کر لقمے نگل رہا اور بار بار ہونٹ چٹا رہا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ تعریفی کلمات بھی کہتا جا رہا تھا: ”بہت اعلیٰ، بہت لذیذ،“ دیکھتے ہی دیکھتے اس کا چہرہ سرخ اور پیٹے سے شربور ہو گیا۔ میئر کو بھوک لگی تھی اور وہ برصاوت اور فست دعوت میں شریک ہو گیا۔ سوریل (اردل) نیم گرم پانی لے آیا اور اس نے سرخ انگوری شراب کی بوتل اس میں رکھ دی۔ باورچی خانے میں اسے کو اس کی بوتل مل گئی۔ وہ اسے بھی اٹھالیا تاکہ وہ اس کا ذرا مزہ لے سکے۔ فرانسیسی اس مشروب سے پہلے ہی آشنا تھے اور وہ اس کا نام بھی رکھ چکے تھے۔ وہ اسے *limonade de cochon* کہتے تھے۔ سوریل (Morel) نے اس کا ذکر جیسے الفاظ میں کیا۔ مگر چونکہ کیتان کے پاس انگوری شراب تھی (یہ ان کے پاس کو آتے ہاتھ لگی تھی)، اس نے کو اس سوریل کے لیے پھوڑ دی اور خود سفید فرانسیسی شراب بوردو (Bordeaux) سے شغل کرنے لگا۔ اس نے بوتل کے گرد ستر خوان لپیٹا اور اپنے اور میئر کے لیے شراب انڈیلنے لگا۔ کیتان کی اشتہار فیع ہو چکی تھی اور شراب نے اسے مزید پانی چوبند کر دیا۔ طعام کے دوران میں وہ مسلسل دھرا دھرا ہنسنے لگا۔

”جی، موسیو میئر، آپ نے چونکہ مجھے اس پاگل کے ہاتھوں مرنے سے بچایا ہے... چنانچہ منتف کے طور پر بڑھیا سوم ہتی میرے ذمے ہے، یہ میں آپ کی نذر کردوں گا۔ آپ کو معلوم ہے کہ میرے جسم میں پہلے ہی گولیوں کی کمی نہیں ایک تو یہاں ہے، یہ مجھے وکرام میں لگی تھی۔“ (اس نے، بچے پہلو کو چھوا)۔ ”میری یہ سولسک میں۔“

(اس نے اپنے رخسار پر زخم کے نشان کی طرف اشارہ کیا۔) "اور ایک اس ٹانگ میں ہے۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ یہ حرکت کرنے میں متاثر ہے۔ یہ میں نے سات تاریخ کو اسکووا کی عظیم لڑائی میں کھائی تھی۔ Sacra Dieu! واقعی بڑی زبردست لڑائی تھی! آپ کو یہ ضرور دیکھنا چاہیے تھی۔ آگ کا طوفان۔ بلا خیر تھا! میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ آپ لوگوں نے ہمارا سخت مقابلہ کیا۔ آپ اس پر غور کر سکتے ہیں۔ اور ma parole اس خراش کے باوجود جو مجھے وہاں آئی تھی، میں اس طرح کی لڑائی میں دوبارہ حصہ لینے کے لیے تیار ہوں۔ جس لوگوں نے یہ موقع گنوا دیا، مجھے ان پر ترس آتا ہے۔"

"میں وہاں تھا،" پیئر نے کہا۔

"ارے نہیں۔ واقعی؟ یہ تو اور بھی اچھا ہوا!" فرانیسی نے کہا۔ "آپ وقتاً فوقتاً وارڈن ہیں۔ جو لوگ عظیم مورچے پر متعین تھے، انھوں نے پامردی سے مقابلہ کیا اور ہمیں ناکوں چنے چوڑیے۔ مجھ پر خدا کی پھٹکار، اگر اس میں کوئی مبالغہ ہو۔ میں نے اس مورچے پر تین مرتبہ حملہ کیا۔ یہ بات اتنی ہی صحیح ہے جتنی کہ یہ کہ میں یہاں بیٹھ ہوں۔ تین مرتبہ ہم توپوں کے عین نزدیک پہنچ گئے لیکن تینوں ہی بار ہمیں یوں پیچھے دھکیل دیا گیا جیسے ہم گوشت پوست کے نہیں بلکہ گھٹتے کے سپاہی ہوں۔ موسیو پیئر، یہ بہت دلچسپ مقابلہ تھا۔ خدا کی قسم، آپ کے توپوں کی کارکردگی شان تھی۔ میں نے ان کی صفیں یکے بعد دیگرے نصف درجن مرتبہ بالکل قریب سے دیکھیں، وہ یوں قدم سے قدم ملا کر چلتے تھے جیسے پیرٹ کر رہے ہوں۔ بڑی آں ہاں تھی ان کی امارے شاہنشاہ، جو کھولے کمرے میں قہر کرنا جانتے ہیں، پکارا اٹھے، "آخر میں باوریں ہمب مردانہ تو!، خوب، بہت خوب! تو آپ ہمارے ہم پیشہ بھائی ہیں!" وہ ذرا کی ذرا رکا اور مسکرایا۔ "یہ تو اور بھی اچھا ہوا، موسیو پیئر، یہ تو اور بھی اچھا ہوا! لڑائی میں خونخواروں اور مدہ جبینوں کے۔" (اور اس نے آنکھ ماری اور وہ مسکرانے لگا۔) "یہ ہوتے ہیں فرانیسی، کیوں موسیو پیئر؟"

پکستان اتنا ملتسار، کند ذہن، مطمئن و شاد اور بھولا تھا کہ پیئر نے اسے ہشاش بشاش انداز سے دیکھتے ہوئے جو ب میں تقریباً آنکھ ماری۔ غالباً لفظ "ماز بردار" نے پکستان کے خیالات کا رخ ماسکو کے حالات کی طرف موڑ دیا۔ "بریکمیل تذکرہ، یہ تو فرامی، کیا یہ درست ہے کہ، اسکو کی تمام خواتین شہر چھوڑ گئی ہیں، بڑی آٹ ٹانگ کی حرکت ہے۔ آخر انھیں ڈر کس بات کا تھا؟"

"اگر روسی پیرس میں داخل ہو جائیں، فرانیسی خواتین شہر سے چلی نہیں جائیں گی؟" پیئر نے سوال کیا۔ "آہا ہا! واہ خوب!" وہ پکارا اٹھا۔ وہ دس کھول کر ہنسا اور اس نے پیئر کے کندھے پر دھپکا ہارا۔ "پیرس؟..."

لیکن پیرس۔ پیرس۔

خدا یا

my word قسم ہے مجھے اپنے قول کی

”دیا کا بہترین شہر ہے۔“ پیٹر نے اس کی ادھوری بات مکمل کر دی۔

پکتان نے نگاہ اٹھ کر پیٹر کی طرف دیکھا۔ اس کی یہ عادت تھی کہ فقرہ بیچ میں چھوڑ دیتا اور اپنی منہ سکرانی خوش باش نگاہیں گاڑ کر گھورنے لگتا۔

”واہ اگر آپ نے مجھے یہ نہ بتایا ہوتا کہ آپ روسی ہیں تو میں حفا کہہ سکتا تھا کہ آپ پیری ہیں! آپ میرے مجھے معلوم نہیں کہ کیا۔۔“ اسے یہ خراج تحسین پیش کرنے کے حدود خاموش ہو گئی اور ایک بار پھر اسے ٹنگی باندھ کر دیکھنے لگا۔

”میں پیرس ہو آیا ہوں۔ میں نے وہاں چند سال گزارے تھے،“ پیٹر نے کہا۔

”بالکل، اس میں کس کا فرق شک سے۔ پیرس۔ جو شخص پیرس کے بارے میں کچھ نہیں جانتا، حیوانوں سے کیا گزرا ہے۔ پیری کو آپ میوں دور سے پہچان سکتے ہیں۔ پیرس تالما ہے، دوشینو ہے، پوئیے ہے، سوسہوں ہے، خیبانوں کا شہر ہے۔“ اور یہ دیکھتے ہوئے کہ اس نے بات کی تان جس جملے پر توڑی ہے، وہ تو بالکل ہمسما ہے، اس نے غلٹ سے مزید کہا: ”کل عالم میں صرف ایک ہی پیرس ہے۔ آپ پیرس ہو بھی آئے، پھر بھی روسی رہے۔ خیر، اس سے پیری نگاہوں میں آپ کی قدر و قیمت کم نہیں ہوئی۔“

کچھ تو اس سے نوشی کا اثر تھا جو پیٹر نے کی تھی، پھر اس نے اپنے افسردہ خیالات کا تانا بانا بناتے امام تھاکر گزارے تھے، چنانچہ وہ اس نفس بکھ اور بھٹلے مانس شخص کی باتوں سے محظوظ ہوئے بناندرہ سکا۔

”آپ کی خواتین کا ذکر مکرر ہو جائے۔ سنا ہے، وہ حسین و جمیل ہیں۔ ادھر فرانسیسی فوجیں شہر میں داخل ہوئیں اور ادھر وہ گھاس کے میدانوں میں جا چھپیں، بالکل واہیات حرکت ہے! ان روشنراؤں نے کتنا خوبصورت موقع کھو دیا ہے! اب تمہارے دیہاتی کسان۔ خیر، چھوڑو، مید و مری بات ہے۔ لیکن آپ تو مہذب انسان ہیں، آپ کو ہمارے متعلق اس سے بہتر علم ہونا چاہیے تھا۔ ہم نے ویانا، برلن، میڈرڈ، نیپلز، روم، وارسا۔ سب دنیا کے چندہ شہر ہیں، اپنے اپنے ممالک کے دارالسلطنت۔ ہم نے ان پر قبضہ کیا۔ ایک عالم ہم سے خوف کھاتا ہے لیکن ہم سے محبت کی جاتی ہے۔ ہمیں جاننا بری بات نہیں ہے۔ پھر ہمارے امپراطور۔“ اس نے کہا شروع کیا مگر پیٹر نے اسے ٹوک دیا۔

”امپراطور؟“ پیٹر نے دہرایا، اور اچانک اس کے چہرے پر افسردگی اور شرمساری کے آثار نمودار ہو گئے۔

”کیا امپراطور...؟“

”امپراطور؟ وہ سر تا پا دیارد، شفیق، منصف مزاج، ولدادہ نظم، عبقری ہیں۔ میں سچ کہہ رہا ہوں کہ وہ یہ سب کچھ ہیں۔ یہ باتیں، میں، غم بیل، آپ کو بتا رہا ہوں۔ آٹھ سال قبل بالکل یہی شخص، جسے آپ اپنے سامنے دیکھ رہے ہیں، اس کا دشمن تھا۔ میرا پاپ emigre کاؤنٹ ہے۔ لیکن اس شخص نے مجھے کلام سن کر بیا، میں

پوری طرح اس کی گرفت میں آ گیا۔ وہ فرانس کو شان و شکوہ اور جاہ و جلال کا حوالہ دہ پہنچا رہا تھا، میں اس سے آنکھیں نہ چرا سکا۔ جب مجھے صحیح معنوں میں یہ احساس ہوا کہ اس کا مقصد کیا ہے، جب میں نے دیکھا کہ وہ میرے بے پھولوں کی بیج بچھا رہا ہے، آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ میں نے اپنے آپ سے کہا: یہ تو بادشاہوں جیسے کام ہیں! اور میں نے اپنا تن من اس کے سپرد کر دیا۔ جو ہوتا تھا، وہ ہو چکا، اب اسے مٹایا نہیں جا سکتا۔ ارے ہاں 'mon cher' وہ تمام زمانوں کا، خواہ ان کا تعلق ماضی سے ہو یا مستقبل سے، عظیم ترین انسان ہے۔

”کیا وہ ماسکو میں ہیں؟“ میئر نے ڈرتے جھینپتے پوچھا۔ اس کی زبان لاکھڑا رہی تھی۔

فرانسیسی تازہ گیا کہ دل میں لازماً کچھ کالا ہے، تاہم وہ مسکرا پڑا۔

”نہیں، ان کی تشریف آوری کل ہوگی۔“ اس نے جواب دیا اور اپنی بات جاری رکھی

اتح میں گیٹ سے متعدد اشخاص کے چہنچہ چلانے کی آوازیں سنائی دیں، لگیں اور ان کی گفتگو کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ موریل اندر آیا اور اس نے کپتان کو اطلاع بہم پہنچائی کہ ورلیم برگ کے چند ہزار آگے ہیں اور وہ اسی محن میں، جہاں کپتان کے گھوڑے بندھے ہیں، اپنے گھوڑے باندھنا چاہتے ہیں۔ مشکل یہ آن پڑی تھی کہ ہزاروں کو جو کچھ فرانسیسی میں کہا جا رہا تھا، وہ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

غلام بال نے ان کے سینئر تان کمشنڈ افسر کو بلایا، در بڑی درشتی سے اس سے پوچھا کہ اس کا تعلق کس رجمنٹ سے ہے، اس کا کمانڈنگ افسر کون ہے اور اسے یہ حق کس نے دیا ہے کہ جس مکان پر پہلے ہی کسی اور کا قبضہ ہو چکا ہے، اس پر پناہ دعوئی جتائے۔ جرمن کی فرانسیسی ایسی دیکھی تھی۔ اس نے پہلے دو سوالات کے جواب میں اپنی رجمنٹ اور اپنے کمانڈنگ افسر کے نام بتا دیے۔ لیکن تیسرے سوال کے، جو اس کی سمجھ میں نہیں آیا تھا، جواب میں اپنی ٹوٹی پھوٹی فرانسیسی کے چند الفاظ ملا کر جرمن زبان میں بتایا کہ وہ اپنی رجمنٹ کا کوارٹر ماسٹر ہے اور اس کے کمرے نے اسے حکم دیا ہے کہ وہ اس گلی کے تمام مکانات کو اپنے قبضے میں لے لے۔ وینر کو جرمن آتی تھی۔ جرمن جو کچھ کہہ رہا تھا، اس نے اس کا ترجمہ کپتان کو سنایا اور کپتان نے جو جواب دیا، اس کا مفہوم جرمن کو بتایا، جرمن سے جو کچھ کہا گیا، جب اس کا مطلب اس پر واضح ہو گیا، وہ اپنے دعوے سے دست بردار ہو گیا اور اپنے آدمیوں کو کہیں اور بے گیا۔ کپتان پورچ میں چل گیا اور ہا آواز بلند چند احکام دیے لگا۔

جب وہ کمرے میں واپس آیا، اس نے دیکھا کہ میئر سر تھکے اسی جگہ بیٹھا ہے۔ اس کے چہرے پر غم و اندوہ کے آثار نظر آ رہے تھے، اور وہ واقعی اذیت میں مبتلا تھا۔ جونہی کپتان باہر نکلا اور وہ اکیللا رہ گیا، یک دم اس کے ہوش ٹھکانے آ گئے اور وہ جس صورت حال میں پھنس گیا تھا، اس کا اسے احساس ہونے لگا۔ بات یہ نہیں تھی کہ ماسکو پر غیروں کا قبضہ ہو گیا تھا اور نہ یہ کہ مسرت سے سرشار یہ فاتحیں اس کے مالک بن بیٹھے تھے، وہ اس کے ساتھ مرنے والے انداز سے پیش آ رہے تھے۔ فی نفسہ یہ باتیں تکلیف دہ ضرور تھیں لیکن فی الحال یہ اس کے بے اتنی کرب ناک نہیں

تھیں جتنا کرب ناک اس کا یہ احساس تھا کہ وہ کمزور اور ناتوان ہے۔ سے انگور کے چند جام جو اس نے لٹوئے تھے اور وہ گنگو، جو اس نے اس خوش طبع شخص کے ساتھ کی تھی، اس ہمہ گیر افسردگی کی کیفیت کو، جو گزشتہ چند روز سے اس پر طاری تھی اور جو اس کے منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے ناگزیر تھی، کا نور کرنے کے لیے کافی ثابت ہوئی۔ پستول، خنجر، ورد بھائی کوٹ، سبھی کچھ تیار رکھ تھا۔ نیولین کو اگلے روز شہر میں داخل ہونا تھا۔ میٹر کو ب بھی یہ یقین تھا کہ اس موذی کو موت کے گھاٹ اتارنا کار ثواب ہے اور اس سے عامۃ الناس کا بھلا ہوگا۔ لیکن اب اسے یہ محسوس ہونے لگا تھا کہ وہ اپنے رادے کو پایہ تکمیل تک نہیں پہنچ سکے گا۔ اس نے پورا زور لگایا کہ وہ اپنی کمزوری کا اعتراف نہ کرے لیکن اسے یہ مدغم سی آگاہی تھی کہ وہ اس پر غائب نہیں آسکتا اور یہ کہ ماضی قریب میں اس کے دل میں انتقام، خفیہ قتل اور قربانی ذات کے جو بھیا تک خیالات در آئے تھے، پہلے ہی شخص سے ملاقات کے بعد پورے ہو گئے تھے۔

پستان کمرے کے اندر آیا۔ وہ قدرے لنگڑا رہا اور کوئی دھن گنگنا رہا تھا۔

فرانسیسی کی بسیار گوئی، جوازیں پیسٹر بیٹر کے لیے خاصی پر لطف تھی، اب اسے زہر معصوم ہونے لگی۔ وہ دھن جو وہ گنگنا رہا تھا، اس کی چال اور اس کا مونچھوں کو بل دینے کا انداز، اب سبھی اس کے اعصاب پر سوار ہو رہے تھے۔

”میں ابھی اور فوراً یہاں سے چل جاؤں گا۔ میں اس کے ساتھ مزید یک لفظی بات بھی نہیں کروں گا۔“

میٹر نے سوچا۔ لیکن جب وہ اس قسم کی باتیں سوچ رہا تھا، وہ اپنی جگہ سے ہٹا تک نہیں، وہیں بیٹھا رہا۔ صنف و ناتوانی کے عجیب و غریب احساس نے اسے کرسی پر چپکائے رکھا۔ وہ اٹھنا اور جانا چاہتا تھا لیکن وہ اپنی جگہ سے ایک انچ بھی حرکت نہ کر سکا۔

اس کے برعکس پستان شگفتہ خاطر نظر آ رہا تھا۔ اس نے دو مرتبہ کمرے کے آر پار چکر کاٹے۔ اس کی آنکھیں جھگڑ رہی تھیں اور وہ اپنی مونچھوں کو یوں تاؤ دے رہا تھا جیسے وہ کسی بڑے لطف خیال پر مسکرا رہا ہو۔

”درلم برگیوں کا کرٹل خا صا دلچسپ آدمی ہے،“ اس نے رائے زنی کی۔ ”ہے جرمن۔۔۔ اس کے بار جو اچھا آدمی ہے۔۔۔ ایسے ہے جرمن۔“ وہ میٹر کے سامنے بیٹھ گیا۔ ”تو آپ کو جرمن بھی آتی ہے، واقعی؟“

میٹر مہربان سے دیکھا رہا۔

”جائے پناہ کی جرمن کیا ہے؟“

”جائے پناہ۔“ میٹر نے دہرایا۔ ”جائے پناہ کی جرمن unterkunft ہے۔“

”اس کا تلفظ کیا ہے؟“ پستان نے عجلت سے کہا۔ اس کے بچے میں قدرے بے اعتمادی تھی۔

”unterkunft، میٹر نے دوبارہ کہا۔

”آنٹر کوف (unterkoff)“ پستان نے کہا اور ہنسی مسکراتی شرارتی آنکھوں سے تاؤ پر تلے ہاتھ کر میٹر کو دیکھا رہا۔ ”یہ جرمن بھی رے کاٹھ کے الو ہیں۔“ اس نے اپنی بات حتم کرتے ہوئے کہا۔ ”آپ کا کیا خیال ہے؟“

موسیو بیٹر؟ چلیں چھوڑیں، آئیں، ماسکو کی ارغوانی شراب کی ایک آدھ بوتل اور پچھیں۔ ٹھیک؟ موسیو بیٹر مگر کر دے گا۔ موسیو بیٹر؟ اس نے شگفتگی سے آواز دی۔

موسیو بیٹر ہمتیاں اور انگوری شراب کی بوتل لے آیا۔ موسیو بیٹر کی روشنی میں جب پکتان کی نظر بیٹر کے چہرے پر پڑی، اسے اپنے ہم نشین کے چہرے پر اندوہ و تکلیف کے آثار نظر آئے اور وہ بہت حیراں ہوا۔ غام بال منگر ہو گیا اور اس کے دل میں جی ہمدردی کے جذبات امنڈ آئے۔ وہ بیٹر کے قریب آیا اور اس کے اوپر جھک گیا۔

”نصیب دشمنوں، یہ اداسی کیسی؟“ اس نے بیٹر کو ہاتھ سے چھوتے ہوئے کہا۔ ”کیا اس خادم سے کوئی گستاخی ہو گئی؟ نہیں، ایسا نہیں ہو سکتا۔ کیا آپ کو مجھ سے کوئی شکایت ہے؟“ اس نے بیٹر سے پوچھا۔ ”شاید اس کا سبب موجودہ صورت حال ہے؟“

بیٹر نے کوئی جواب نہ دیا لیکن اس نے شگفتانہ انداز سے فریسی کو دیکھا۔ اسے اس کے چہرے پر جو ہمدردی کی جھلک دکھائی دی تھی، اس نے اس کا دل سوم کر دیا تھا اور وہ خوش ہو گیا۔

”Parole d'honneur، میں آپ کا جو ممنون احسان ہوں، اس کا تو ذکر ہی کیا، مجھے آپ واقعی پسند ہیں۔ میرے لائق کوئی خدمت؟ آپ حکم فرمائیں، بندہ حاضر ہے۔ میں آپ کی خاطر جان بھی دے سکتا ہوں۔ میں یہ سب کچھ دل پر ہاتھ رکھ کر کہہ رہا ہوں!“ اس نے اپنی چھاتی کو ٹھونکتے ہوئے کہا۔

”شکریہ“ بیٹر بڑبڑایا۔

پکتان نے اسے اسی طرح ہمدردانہ انہماک سے نگہنگی باندھ کر دیکھتے ہوئے کہا جس طرح اس نے اس وقت اسے دیکھا تھا جب اس نے ”پناہ گاہ“ کی جرمن معلوم کرنا چاہا تھا اور اچانک اس کا چہرہ کھل اٹھا۔

”خیر، اس صورت میں آپ کے ساتھ دوستی کا جام پینا چاہتا ہوں!“ اس نے شگفتہ روئی سے کہا اور وہ دو گلاسوں میں انگوری شراب اٹھیلے لگا۔

بیٹر نے گلاس پکڑا اور غناغت چڑھا گیا۔ غام بال نے بھی پناہ گاہ خالی کر دیا۔ اس نے ایک بار پھر بیٹر کا ہاتھ ربایا اور میز پر کہنی ٹکارتی۔ اس کے رویے سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ حقیر اور مسموم ہے۔

”ہاں، میرے دوست، اس نے اپنی گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔ ”قسمت کی دیوی سن سوجی ہے، گھڑی میں تولہ گھڑی میں ماشہ۔ کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں آیا ہوگا کہ میں ایک روز فوج کی ملازمت اختیار کروں گا اور یونا پارٹ کے، جیسا کہ ہم انھیں ان دونوں کہا کرتے تھے، ذریعوں کا پکتان بن جاؤں گا۔ تاہم دیکھ لیں، میں ان کی معیت میں یہاں ماسکو میں موجود ہوں۔ mon cher، میں یہ عرض کر دوں،“ اس نے ایک ایسے شخص کے، جو لمبی کتھانٹانے کی تیاریاں کر رہا ہو، گپیور اور بچے تلے لہجے میں کہا، ”کہ ہمارا خاندان فرانس کے قدیم ترین خاندانوں میں شمار ہوتا ہے۔“

تسم ہے مجھے اپنی عزت کی۔

اس نے جس صاف گو، بے ریا، بے تصنع اور بھولے بھالے انداز سے پیئر کو اپنے اسراف، بچپن، لڑکپن اور شباب، اپنے عزیز واقارب اور اپنے خانگی اور مالی معاملات کی کہانی سنائی، وہ صرف کوئی فرانسیسی ہی بیان کر سکتا ہے۔ اس بیان میں لاریب "ma pauvre mere"، ہم کردار ادا کر رہی تھی۔

"لیکن یہ سب چیزیں زندگی کا محض ماحول فراہم کرتی ہیں۔ اصل چیز محبت ہے۔ محبت! کیوں مہمیدار، میں نے ٹھیک کہا نا؟" اس کی تنگنگی میں ہر آنا، اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ "ایک اور گلاس؟"

پیئر ایک بار پھر پنا گلاس غنا غٹ پی گیا اور اس نے تیسری مرتبہ پنا گلاس بھر لیا۔
"Oh, les femmes, les femmes!" اور کپتان نم ناک آنکھوں سے پیئر کو تنگنکی باندھ کر دیکھنے اور اپنی محبتوں اور عاشقوں کے قصے بیان کرنے لگا۔

ایک تو کپتان ویسے ہی خوب رو تھا، اس کے چہرے پر اطمینان و دل جمعی جھلک رہی تھی اور اس پر سے خرمی کے ذکر پر اس کا لب و لہجہ دالہانہ مسرت اور جوش و خروش سے معمور تھا۔ ان سب باتوں سے یہی معلوم ہوتا تھا کہ اس کے عاشقوں کی تعداد اچھی خاصی ہوگی اور واقعتاً یہ تعداد کافی زیادہ تھی۔ اگرچہ اس کے عاشقوں کی تمام کہانیوں پر وہ شہوت پرستی، جس میں فرانسیسیوں کو محبت کی مخصوص دلکشی اور شہریت نظر آتی ہے، سایہ فگن تھی، تاہم اس نے اپنی کہانی کچھ اس انداز سے سنائی جیسے اسے سو فیصد یقین ہو کہ اس کی ذات ہی وہ واحد ذات تھی جس نے محبت کی تمام لذتوں کو پرکھا، چکھا، درجوان سے صحیح معنوں میں لطف اندوز ہوئی تھی، اور اس نے عورتوں کے سراپے کچھ ایسے رجھ لینے والے انداز سے بیان کیے کہ پیئر پوری دلچسپی سے سنتا رہا۔

صاف ظاہر تھا کہ جس محبت (Lamour) کا فرانسیسی اسے جوش و خروش سے ذکر کر رہا تھا، وہ ڈونار ان اور سیدھی سادی محبت نہیں تھی جو پیئر نے کبھی اپنی بیوی کے لیے محسوس کی تھی اور نہ یہ وہ رومانی محبت تھی (جس کے شعلوں کو وہ ابھی تک ہوا سے رہا تھا) جو وہ نساٹا کے لیے محسوس کرتا تھا۔ عام بادل ان دونوں انواع کی محبتوں کو حقارت کی نظر سے دیکھتا تھا۔ اس کے نزدیک ان میں سے ایک اجڑ گنواروں کا خاصہ تھی اور دوسری گوڑھ مغزوں کا۔ فرانسیسی کی نظروں میں جو Lamour قابل تحسین تھی، وہ اصلاً اس کے عورت کے ساتھ غیر فطری تعلقات اور عدم مطالبہ کی نظر سے دیکھتا تھا۔ اس کے خیال میں یہی چیز جذبے کو صحیح دلکشی بخشتی تھی۔

چنانچہ اس نے ایک پینتیس سالہ نسوں سا زمار کیتر کے ساتھ اپنے معاشقے کی رقت انگیز داستان بیان کی۔ موصوف نے صرف مارکیتر کے ساتھ عشق پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ اس کے ساتھ ساتھ اس نے سحر آفریں مارکیتر کی چندے آفتاب چند ماہتاب سترہ سالہ بھولی بھالی اور معصوم دختر کو بھی اپنے دام الفت میں گرفتار کر لیا۔ ان بیٹی ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر اسے سر آنکھوں پر بٹھاتیں اور دونوں میں اسے اپنی طرف راغب کرنے کے لیے

براہر کی دوڑ لگی ہوئی تھی۔ منجم کارماں نے ہتھیار ڈال دیے۔ اس نے اپنے ہاتھوں اپنی محبت کی چٹا جلائی اور شادی کے لیے اپنی بیٹی اپنے عاشق کو پیش کر دی۔ اگرچہ یہ سارا معاملہ ماضی کی بھولی بسری یاد بن چکا تھا لیکن اب بھی اس کے ذکر سے کپتان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ پھر اس سے ایک دردناک سنایا۔ اس میں خاندان نے عاشق کا اور خود اس نے جو کہ عاشق تھا۔ خاندان کا کردار سنبھال لیا تھا۔ اس کے بعد تو قصوں کا طومار بندھ گیا اور اس نے جرمنی کی، جہاں ”پناہ گاہ“ کو unter kunitz کہتے ہیں، جہاں خاندان Sauer kraut کھاتے ہیں، وہ جہاں کی دو شیرازوں کے باپ کچھ زیادہ ہی سنہری ہوتے ہیں، یادیں تازیں کرتے ہوئے چند غریبہ دکھایات سنائیں۔

اور آخر میں اس نے پولینڈ میں اپنی تازہ ترین مہم کا قصہ سنایا۔ یہ قصہ اس کے دہن میں ابھی تک پوری طرح محفوظ تھا۔ جب وہ یہ سن رہا تھا، اس کا چہرہ ہنستا رہا اور وہ بار بار ہاتھوں سے اشارے کر رہا تھا۔ اس نے بتایا کہ اس نے کسی طرح ایک پولستانی کی جان بچائی تھی (جانیں بچانے کے واقعات کپتان کی کہانیوں کی بکثرت آتے تھے)۔ پولستانی نے اپنی سحر ساز زوجہ جو بہ باطن پیس پر فریفتہ تھی، اس کی تحویل میں دے دی اور خود نرالیسی فوج میں بھرتی ہو گیا۔ کپتان خوش قسمت تھا سحر ساز پولستانی خاتون اس کے ساتھ فرار ہونا چاہتی تھی مگر کہن در بدو نکلا۔ اس نے ان الفاظ کے ساتھ کہ ”میں نے آپ کی جان بچائی تھی اور اب آپ کی عزت بھی لوٹا رہا ہوں“ اسے اس کے شوہر کو واپس کر دیا۔ یہ الفاظ دہرائے گئے بعد کپتان نے اپنے آنسو پونچھے اور اپنے آپ کو زور سے جھٹک دیا جیسے وہ اس کمزوری کو جو اس پر تھا، نگیز یاد کے ساتھ اس پر غالب آ رہی تھی، فرمون کر دینا چاہتا ہو۔

جب رات خاصی گزر چکی ہو تو دورے آتشیں بھی اپنا رنگ دکھا رہی ہو، ایسے میں مردوں کا جیسا کہ کٹر دیر ہوتا ہے، پھر بھی کپتان کی باتیں سننا رہا اور جو کچھ اس سے کہہ جا رہا تھا، اگرچہ وہ اسے سن اور سمجھ رہا تھا، لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ اپنی ذاتی یادوں میں کھویا رہا، جو کسی وجہ سے ایک ایسی اس کے ذہن میں بلبلا کرنے لگی تھیں۔ معاشقوں کی یہ داستانیں سننے سننے سے غیر متوقع طور پر ناشائستہ کے ساتھ اپنی محبت کی یاد آنے لگی۔ اس کے ساتھ مناظر کا ایک سلسلہ اس کے ذہن میں ابھرنے لگا اور وہ دل ہی دل میں ان مناظر کا غام بال کے قصوں کے ساتھ موازنہ کرنے لگا۔ جب کپتان معشوق اور لڑخ کے مابین کشمکش بیان کرنے لگا، مختاریف بیٹار کے قریب اپنی مرکز محبت کے ساتھ آخری ملاقات کی ذرا در تفصیل پیر کی نگاہوں کے سامنے گھومنے لگی۔ اس وقت اس ملاقات نے اس پر کوئی خاص اثر نہیں چھوڑا تھا۔ اور وہ دن اور یہ دن، اس نے اس کے بارے میں کبھی سوچا بھی نہیں تھا، لیکن اب اسے محسوس ہونے لگا کہ یہ ملاقات ایک نوع کی شعریت اور اہمیت سے محروم تھی۔

”بیوتر کر لودج، اوہر آئیں، ہم نے آپ کو پہچان لیا ہے۔“ اس کے یہ الفاظ اب بھی اس کے کانوں میں گونج رہے تھے۔ اس کی آنکھیں، اس کی مسکراہٹ، اس کی ستری ٹوپی اور اس کے نیچے اس کے پریشان بالوں کی لٹ دکھائی دے رہی تھی۔۔۔ در اسے ان تمام چیزوں میں کوئی ایسی بات، جو کسی نہ کسی طرح رقت انگیز اور حسرت ناک تھی، نظر آ رہی تھی۔

سھر سار پوستانی خاتون کا قصہ سننے کے بعد کپتان نے بیئر سے سوال کیا: ”کیا آپ کو بھی کبھی اپنی محبت کی خاطر یوں اپنی بھینٹ دینے کی تحریک ہوئی ہے؟ یا قانونی شوہر کے ساتھ رقابت کا کوئی تجربہ ہوا ہے؟“

بیئر کے سامنے یہ سوال چیلنج بن کر آیا۔ اس نے پنا سر اٹھایا اور وہ اچانک ان خیالات کو جن سے اس کا ذہن معمور تھا، بیان کرنے کی ضرورت محسوس کرنے لگا۔ وہ بالائے تفصیل بتاتے گا کہ عورت کے ساتھ محبت کے مختلف اس کے تصورات قدرے مختلف ہیں۔ اس نے بتایا کہ اس نے اپنی ساری زندگی میں صرف ایک عورت کے ساتھ محبت کی ہے اور وہ اب بھی صرف اسی کے ساتھ محبت کرتا ہے لیکن وہ کبھی اس کی نہیں ہو سکتی۔

”tiensl“ کپتان نے اظہار تعجب کیا۔

تب بیئر نے اسے بتایا کہ وہ کس طرح اوائل شباب سے اس عورت کے ساتھ محبت کرتا چلا آیا ہے لیکن وہ کبھی اسے اپنا بنانے کے متعلق سوچنے کا حوصلہ نہ کر سکا کیونکہ وہ بالکل ہی نوخیز ہے اور رہا وہ خود، وہ ناجائز اولاد تھا اور خاندانی نام سے محروم۔ بعد ازاں جب اسے نام بھی مل گیا اور ڈھیروں دولت بھی، وہ پھر بھی اس کے بارے میں سوچنے کی جرأت نہ کر سکا کیونکہ وہ اس سے بے پناہ پیار کرتا ہے اور اسے تمام مخلوق، بالخصوص اپنے آپ سے، بلند سمجھتا ہے۔

جب بیئر، تنا کچھ کہہ چکا۔ اس نے کپتان سے پوچھا کہ آیا وہ اس کی بات سمجھ رہا ہے۔ کپتان نے کچھ اس قسم کا عندیہ دیا جس کا مفہوم یہ بنتا تھا کہ وہ بھلے اس کی بات نہ سمجھتا ہو لیکن بیئر سے اس کی یہی التجا ہے کہ وہ اپنی کہانی جاری رکھے۔

”اقلاطونی محبت۔ شیخ جلی کے منصوبے...“ وہ بڑبڑایا۔

یہ اس شراب کا اثر تھا، جو اس نے پی تھی، صاف گوئی کی انگلیخت یا یہ خیال کہ یہ آدمی ان اشخاص کو، جس کا اس کہانی سے تعلق بنتا تھا، نہ جانتا ہے، ورنہ کبھی جاں سکے گا، یا ان تمام باتوں کا مجموعی نتیجہ تھا، بہر حال واقعہ یہ ہے کہ بیئر کی زبان چنچی کی طرح چلنے لگی۔ بے نوشی سے اس کی زبان میں قدرے لکنت ضرور آگئی تھی اور یوں معلوم ہوتا تھا کہ اس کی روشن و تاباں آنکھیں دور کہیں ماضی میں جھانک رہی ہیں لیکن وہ بولتا چلا گیا اور اپنی پوری داستان حیات سناتا رہا: اپنی شادی، نسا شا کی اس کے بہترین دوست کے ساتھ محبت، نسا شا کی اس کے ساتھ بے وفائی اور نسا شا کے ساتھ خود اس کے اپنے سیدھے سادے تعلقات، اس نے کچھ بھی نہ چھپایا بلکہ غام ہل کے زور دے کر اس نے وہ دوسری باتیں۔ معاشرے میں اپنا مقام بلکہ اپنا نام بھی۔ جو ابتدا میں اس نے پردہ خفا میں رکھنے کی کوشش کی تھی، گل دیں۔

بیئر کی کہانی میں کپتان کو کسی بھی دوسری چیز کی نسبت جس بات نے سب سے زیادہ متاثر کیا، وہ یہ حقیقت تھی کہ وہ بے حد اسیر کبیر شخص تھا، ماسکو میں اس کے داخل نما مکانات تھے اور پھر بھی وہ ماسکو سے فرار ہوئے بغیر یہ

سب کچھ تیار چکا تھا، اس نے صرف اپنا نام اور معاشرے میں اپنا مقام چھپایا تھا۔

رات کافی بیت چکی تھی۔ وہ دونوں اٹھے اور باہر گلی میں نکل گئے۔ شب نیم گرم اور تندرے رونمائی تھی۔ مکان کے بائیں طرف بیوترو کا سٹریٹ میں پہلی آگ کی، جو ماسکو میں، چائیک بھڑک اٹھی تھی، اب نظر آرہی تھی۔ دائیں جانب دور آسمان پر ادھیں راتوں کا چاند معلق تھا اور فلک کی دوسری جانب وہ دم دار ستارہ، جو بیوترو کے ذہن میں اس کی محبت کے ساتھ مسلک تھا اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ چمک رہا تھا۔ گبراسم، بادرنی اور دوفرا نیسی گیٹ پر کھڑے آپس میں چہلیں کر رہے اور ہنس رہے تھے۔ وہ دو مختلف زبانوں میں گفتگو کر رہے اور ایک دوسرے کی بات قطعاً سمجھ نہیں رہے تھے، پھر بھی وہ قہقہے لگا رہے تھے۔ شہر میں جو آگ جل رہی تھی، وہ اس کی نودیکر رہے تھے۔

دس بج و عریض شہر میں کہیں دور، بہت دور آگ لگی ہوئی تھی لیکن اتنے فاصلے پر وہ بالکل معمولی معلوم ہو رہی تھی اور اس سے قطعاً یہ اشارہ نہیں مل رہا تھا کہ یہ بہت بڑے خطرے کی علامت ہے۔

ہندو بالہ، ستاروں سے مزین، آسمان، چاند، دم دار ستارہ اور آگ کی لو، بیوترو نے یہ سب کچھ غور سے دیکھا اور اسے اپنے اندر مسرت بخش اور نرم و نازک جذبہ نگراٹیاں لیتا محسوس ہوا۔ "یہ سب کچھ کتنا خوبصورت اور دل آویز ہے انسان کو اس سے زیادہ اور کیا چاہیے؟" اس نے سوچا۔ اور چائیک اسے اپنا عزم یاد آگیا اس کا سر گھومنے لگا اور وہ خود کو اتنا کمزور و ناتواں محسوس کرنے لگا کہ وہ باڑ کے ساتھ کھڑ گیا کہ کہیں وہ نیچے نہ گر پڑے۔ اپنے نئے درست سے اجازت چاہے بغیر وہ گیٹ سے پیچھے ہٹنے لگا، لڑکھڑاتے قدموں چلا اپنے کمرے میں آیا، مونس نے پرلین اور پلک جھپکنے میں نیند کی آغوش میں چلا گیا۔

30

دسمبر کو جو اولین آگ بھڑکی، ماسکو کے بھگوڑے شہریوں اور پسپائی اختیار کرنے والے فوجیوں کو اس کی مختلف مرکزوں سے نظر آئی۔ اس موقع پر ان کے قلوب میں جو جذبات ابھرے، وہ بھی متنوع اقسام کے تھے۔ رستوفوں، دوران کے قافلے نے وہ رات ماسکو سے چودہ میل دور پیش پچی میں گزاری۔ وہ نیم تمبر کو اتنی تاخیر سے روانہ ہوئے تھے، سڑک پر فوجیوں اور گاڑیوں کا تناہمکھی تھا اتنی زیادہ اشیاء بھول گئی تھیں اور انھیں لانے کے لیے مازموس کو واپس بھیجنا پڑا تھا کہ انھوں نے یہ فیصلہ کر لیا کہ وہ پہلی رات ماسکو سے صرف تین میل دور کسی مقام پر گزاریں گے۔ اگلی صبح وہ دیر سے جا کے اور سفر کے دوران میں انھیں بار بار تاخیر کا سامنا کرنا پڑا چنانچہ وہ پیش پچی کلاں سے آگے نہ جاسکے۔ اس رات دس بجے تک رستوف اور بخردین، دوران کے ساتھ سفر کر رہے تھے، اس قصبے کے مکانوں اور محلوں میں ڈیرے جما چکے تھے۔ اپنے اپنے آقاؤں کی ضروریات فراہم کرنے کے بعد رستوفوں کے ملازموں اور جوانوں، اور زخمی افسروں کے اردلیوں نے کھانا کھایا، گھوڑوں کو نہ چارو ڈالا اور پودوں میں آگئے۔

قریبی مکان میں رابیف سکی کا ابجوسٹ لینا ہوا تھا۔ اس کی کلئی کی ہڈی ٹوٹ چکی تھی۔ درد کی شدت نے

اسے بے حال کر دیا تھا اور وہ مسلسل ہائے دائے کر رہا تھا۔ خزانہ شب کی تاریکی میں اس کی کرہیں مہیب آوازیں پیدا کر رہی تھیں۔ اس نے گزشتہ رات رستوفوں کے ساتھ ایک ہی صحن میں گزاری تھی۔ کاؤنٹس کا دعویٰ تھا کہ اس کی چیخ پکار کی وجہ سے وہ پلک تک جھپکا نہیں سکی تھی اور وہ میتش جی میں نسبتاً کم آرام دو مکان میں محض اس لیے نکل ہوئی ہے کیونکہ وہ زخمی شخص سے اپنا پنڈ چھڑانا اور اس سے دور رہنا چاہتی ہے۔

چانک رات کی تاریکی میں ایک ملازم کو ادنیٰ کوچ کے اوپر، جو پورچ کے سامنے کھڑی تھی، ایک اور آگ کی لود کھائی دی۔ ایسی ہی ایک لود پہلے ہی خاصی ریر سے نظر آ رہی تھی اور ہر شخص کو معلوم ہو گیا تھا کہ میتش جی خرد صل رہا ہے۔ ان کا خیال تھا کہ اسے، مانوف کے قاتلوں نے آگ لگائی ہوگی۔

”دوستو، ادھر دیکھو، ایک اور آگ!“ اردلی نے توجہ دلائی۔

سبھی کی نگاہیں ادھر مبذول ہو گئیں۔

”ہاں، سنا ہے کہ مانوف کے قاتلوں نے میتش جی خرد کو نذر آتش کر دیا ہے۔“

”نہیں۔ یہ میتش جی خرد نہیں ہے! وہ تو بہت دور ہے۔“

”یہ لازماً اسکو ہوگا!“

دو آدمی پورچ سے باہر نکلے، انھوں نے کوچ کا چکر کاٹا اور دوسری طرف سیڑھیوں پر بیٹھ گئے۔

یہ آگ تو بہت دور ہے اور بائیں طرف نظر رہی ہے۔ کیوں؟ میتش جی ادھر ہے اور یہ بالکل دوسری سمت ہے۔“

کئی مزید اشخاص پہلے دو کے پاس آ گئے۔

”دیکھو، کتنی تیزی سے پھیل رہی ہے!“ ایک نے کہا۔ ”دوستو، یہ آگ، سکو میں ہی کہیں لگی ہے۔ یہ بات

شوٹ چیوسکی مکمل میں لگی ہوئی ہے یا پھر رگوڑسکی میں۔“

کسی نے اس کی بات کا جواب نہ دیا اور کچھ دیر بھی چپ چاپ اس جی زبردست آگ کو، جو در فاصلے پر بھڑک رہی تھی، ٹانگی باندھے دیکھتے رہے۔

کاؤنٹ کا وردی پوش ملازم دانیلو تیریتچ (جسے سب بڑے میاں کہتے تھے)، اس گروہ کے پاس آیا اور چلا کر مشکا سے کہنے لگا۔

”ارے گھٹو، گھٹو، یہ تو منہ پھاڑے کیا دیکھ رہا ہے؟... ابھی کاؤنٹ آؤ زائیں گے اور وہاں جلا رہا ہے نہ

پرمدہ۔ جاؤ اور جاکر کاؤنٹ کے کپڑے جھاڑ پونچھ کر تیار رکھو۔“

”میں تو پانی لینے باہر آیا تھا۔“ مشکا نے کہا۔

”دانیلو تیریتچ، کیا خیال ہے؟ معلوم ہوتا ہے کہ آگ ماسکو میں لگی ہوئی ہے۔ ہے نا؟“ ایک خدمتگار

نے پوچھا۔

دانیلو تیرینچ نے کوئی جواب نہ دیا اور کافی دیر تک بھی خاموش رہے۔ شعلے جھملائے رہے اور روشنی دور تک پھیل گئی۔

”خداوند رحم فرمائے... ہوا اور یہ جنگ موسم...“ ایک در شخص نے کہا۔

”دیکھو، کتنی تیزی سے پھیل رہی ہے۔ اف، خداوند اب تو کڑے بھی اڑنے لگے ہیں۔ خداوند ہم غریب گنتہ گاروں پر رحم فرما!“

”وہ اسے بجھا دیں گے، ڈر مت!“

”سے کون بجھائے گا؟“ دانیلو تیرینچ، جواب تک خاموش کھڑا تھا، کہنا سنا دیا۔ اس کی آواز دھیمی تھی اور معلوم ہوتا تھا کہ وہ جو کچھ کہہ رہا ہے، سوچ کچھ کر کہہ رہا ہے۔ ”بھائیو، یہ، اسکو ہے۔“ اس نے کہا۔ ”ہماری، اور ماسکو، سفید...“ اس کی، دوزخ کھڑا گئی اور وہ ایک دم بڑھے آدمیوں کی طرح سسکیاں مینے اور آنسو بہانے لگا۔ اور وہ جس خیرہ کن روشنی کو دیکھ رہے تھے، معلوم ہوتا تھا کہ اس کا مہبوم سمجھنے کے لیے انھیں اسی کا، تظار تھا۔ آپیں، دعاؤں کے الفاظ اور معمر کا ڈنٹ کے دردی پوش دم کی سسکیاں سنائی دینے لگیں۔

31

دردی پوش دم اندر چلا گیا اور اس نے کاؤنٹ کو اطلاع دی کہ ماسکو جل رہا ہے۔ کاؤنٹ نے اپنا ڈرنک گاڑن پہنا اور خود دیکھنے باہر نکل آیا۔ سونیا اور مارام شوکی، جنھوں نے، ابھی تک اپنے لباس تبدیل نہیں کیے تھے، اس کے ساتھ تھیں۔ ننا شا اور کاؤنٹس اکیلی اندر رہ گئیں۔ (چیتا اب خاندان کے ساتھ نہیں تھا۔ وہ اپنی رجمنٹ کے ساتھ، جو ⁴⁴تروڈنٹا کی طرف کوچ کر رہی تھی، آگے جا چکا تھا۔)

کاؤنٹس نے جب سنا کہ ماسکو شعلوں کی لپیٹ میں آچکا ہے، وہ بھوٹ بھوٹ کر روئے لگی۔ ننا شا یقینوں کے نیچے بیٹھ پر (اس جگہ جہاں وہ آمد پر ڈھیر ہو گئی تھی) بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کا چہرہ نرد تھا اور وہ سامنے خدا میں گھور گھور کر دیکھ رہی تھی۔ اس کے باپ نے جو کچھ کہا تھا، اس پر اس نے کوئی توجہ نہیں دی تھی، اس کا دھیان تین مکان پر سے ایجنٹ کی مسلسل ہانے دانے پر لگا ہوا تھا۔

”کتنی بھیا تک آگ ہے!“ سونیا نے صحن سے واپس آ کر کہا۔ وہ سردی اور خوف سے کپکپا رہی تھی۔ ”مجھے یقین ہے کہ ماسکو جل کر بھسم ہو جائے گا۔ آسمان پر مہیب سرخی چھائی ہوئی ہے۔ ننا شا، تم بھی دیکھو۔“ جنھیں کھڑکی میں سے سب کچھ نظر آ جائے گا۔“ اس نے اپنی کزن سے کہا۔ وہ بڑے صبر و تحمل سے اس کا اصرار بٹانے کی کوشش کر رہی تھی۔

لیکن ننا شا اس کی جانب یوں تک رہی تھی جیسے اس کی سمجھ میں بالکل نہ آ رہا ہو کہ اس سے کیا کہا جا رہا ہے اور اس نے ایک بار پھر اپنی نگاہیں اس کو نے پر، جہاں سٹوڈنٹ، تھا، جمادیں۔ جو اس بات کی یہ کیفیت اس پر صبح سویرے

سے ہی جاری تھی جب سونیا نے کسی ناممکن التوجیہ سبب کے باعث، جس پر کاؤنٹس کو تعجب بھی ہوا اور جھلاہٹ بھی آئی، نٹاشا کو پرنس آندرے کے زخموں اور ان کے ساتھ سفر کرنے والے فسرروں کی نظار میں اس کی موجودگی کے متعلق بتانا ضروری سمجھا۔ کاؤنٹس کو سونیا پر جو قصہ آیا، نٹاشا یزکھی کسی پر نہیں آیا ہوگا۔ سونیا روٹی اور معافی مانگتی رہی اور اب، جیسے وہ اپنے جرم کی تلافی کرنا چاہتی ہو، وہ پہلے کی نسبت دو چند پنی کزن کی طرف متوجہ تھی۔

”نٹاشا، دیکھو، کتنی ہولناک آگ لگی ہے!“ اس نے کہا۔

”کیا جل رہا ہے؟“ نٹاشا نے پوچھا۔ ”ارے ہاں، ماسکو۔“

اور اس نے پتارخ یوں کھڑکی کی طرف کر لیا جیسے وہ سونیا سے جان بھی چھڑانا چاہتی ہو اور اس کے جذبات کو نہیں بھی نہ پہنچانا چاہتی ہو لیکن اس کے دیکھنے کا انداز کچھ اس قسم کا تھا کہ صاف معلوم ہوتا تھا کہ وہ کچھ بھی نہیں دیکھ سکتی اور اس کے بعد اس نے اپنی سابقہ وضع دوبارہ اختیار کر لی۔

”لیکن تم نے یہ دیکھی تو ہے نہیں!“

”ہاں، میں واقعی دیکھ چکی ہوں۔“ نٹاشا نے کچھ ایسے بچے سے کہا جیسے وہ اس سے التجا کر رہی ہو کہ وہ اسے تنگ نہ کریں اور اسے اس کے حال پر چھوڑ دیں۔

کاؤنٹس اور سونیا پر واضح ہو گیا کہ نٹاشا جس کیفیت میں سے گزر رہی ہے، اس میں ماسکو، ماسکو کی آتش رلی اس کے لیے کوئی معافی نہیں رکھتی۔

کاؤنٹ واپس آگیا، اور پارٹیشن کے پیچھے لیٹ گیا۔ کاؤنٹس نٹاشا کے پاس پہنچی اور اس نے اپنے ہاتھ کی پشت اس کے سر پر پھیری۔ اس کی یہ عادت تھی کہ جب کبھی اس کی بیٹی کی طبیعت غلیل ہوتی، وہ اسی طرح اس کا سر سہلایا کرتی تھی۔ پھر اس نے یہ دیکھنے کے لیے کہ کہیں اسے بخار تو نہیں، اپنے ہونٹ اس کی پیشانی پر رکھ دیے اور آخر کار وہاں بوسہ ثبت کر دیا۔

”تمہارا جسم بخ ہو رہا ہے۔ تم سر سے پاؤں تک کاپ رہی ہو۔ بہتر ہے کہ تم لیٹ جاؤ۔“ اس نے کہا۔

”لیٹ جاؤں؟ بہت اچھا، لیٹ جاتی ہوں۔ میں بھی لیٹ جاتی ہوں۔“ نٹاشا نے کہا۔

اس صبح جب نٹاشا کو بتایا گیا کہ پرنس آندرے ان کے ساتھ سفر کر رہا ہے، اس نے ابتدائے محض سوالات پوچھنے پر اکتفا کیا وہ کہاں جا رہے ہیں؟ وہ کیسے زخمی ہوئے؟ ان کی حالت تشریش ناک ہے؟ کیا میں انہیں دیکھ سکتی ہوں؟ لیکن جب اسے بتایا گیا کہ وہ اسے نہیں دیکھ سکتی کیونکہ اسے خاصے گہرے زخم آئے ہیں تاہم اس کی زندگی کو کوئی خطرہ نہیں، اس نے سوالات پوچھنا بلکہ لب کشائی کرنا ہی بند کر دیا۔ صاف عیاں تھا کہ وہ جو کچھ اسے چاہیے ہیں، اسے اس پر کوئی اعتبار نہیں اور اسے یہ یقین ہو چکا ہے کہ وہ گھما پھرا کر جس طرح بھی بات کرے، اسے کیا جوابات دیے جائیں گے۔ وہ سارا دن کوچ کے کونے میں ساکت اور چپ چاپ بیٹھی رہی تھی۔ اس کی بیٹی بھی آنکھیں جس انداز سے خلا کو گھورتی رہی تھیں، کاؤنٹس اس سے بخوبی آگاہ تھی اور اس سے بے حد خوف زدہ۔ اور

اب بھی وہ اسی انداز سے اس معمولی مکاں میں بیٹھ کر بیٹھی تھی۔ وہ سر نہ ہواٹے مغموم واداس کی ادھڑکن میں مصروف تھی، کوئی منصوبہ بنا رہی تھی یا پہلے ہی کسی فیصلے پر پہنچ چکی تھی۔ اتنا تو کاؤٹس جان گئی تھی لیکن یہ فیصلہ کیا تھا، اس کے بارے میں اسے کچھ بھی معلوم نہیں تھا اور یہی وہ چیز تھی جس سے اس کا دل بیٹھ چار ہاتھ اور اسے خوف نے اپنے آہنی شکنجے میں جکڑ لیا تھا۔

”نشا، ڈارنگ، کپڑے بدل لو، اور میرے بستر پر لیٹ جاؤ۔“ (مرن کاؤٹس کے لیے پلنگ پر بستر بچھایا گیا تھا۔ مادام شوس اور دونوں لڑکیوں نے فرش پر گھاس بچھا کر لیٹنا تھا۔)

”نہیں، ہا، میں یہیں گھاس پر لیٹ جاؤں گی۔“ نشا نے بھٹا کر جواب دیا۔ وہ اٹھی، کھڑکی کے پاس گئی اور اسے کھول دیا۔

ایکویٹ کی ہائے دائے کھڑکی میں سے اور بھی واضح طور پر سنائی دینے لگی۔ اس نے اپنا سر جھکایا اور کھڑکی میں سے ماہر نکالا۔ رات کی ہوا مرطوب تھی۔ کاؤٹس نے دیکھا کہ وہ مسکیاں لے رہی ہے اور اس کے بازو اور مہینا نشانے بے طرح کانپ رہے ہیں۔ نشا کو معلوم تھا کہ جو شخص ہائے دائے کر رہا ہے، وہ پرنس آندرے نہیں ہے۔ سے معلوم تھا کہ جس احاطے میں وہ خود مقیم ہیں، اسی میں پرنس آندرے قیام پزیر ہے۔ وہ پوری کی دوسری طرف کی عمارت میں تھا، لیکن اس پر بھول اور پیہم ہائے دائے سے اس کی اپنی مسکیاں ٹکنا شروع ہو گئی تھیں۔ کاؤٹس نے سوچا سے نگاہوں کا تبادلہ کیا۔

”لیٹ جاؤ، ڈارنگ، لیٹ جاؤ، جانی، ڈارنگ!“ کاؤٹس نے نشا کے کندھے پر زری سے ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ”آؤ نا، اور یہاں پلنگ پر لیٹ جاؤ۔“

”جی ہاں، جی ہاں، ابھی آئی۔“ نشا نے کہا اور وہ اپنے چینی کوٹ کے بند کھولنے لگی۔

جب وہ اپنا ڈریس اتار اور ڈریسنگ کوٹ پہن چکی، وہ بستر پر، جو فرش پر بچھایا گیا تھا، آلتی پالتی، مار کر بیٹھ گئی۔ اس نے اپنے پار یک بالوں کی مینڈھی کندھے کے اوپر سے اگلی جانب جھٹکائی، اسے کھولا، اس کی لائبرائی اور آئینہ کا رانگلیوں نے ان بالوں کو پھرتی اور مشائقی سے عین شروں میں تقسیم کیا، انہیں گوندھا اور مینڈھی دوبارہ باندھ لیا۔ اس دوران میں اس کی گردن کا دنا دائیں سے بائیں اور بائیں سے دائیں طرف گھومتی رہی لیکن اس کی بے چین، مضطرب اور پھٹی پھٹی نگاہیں اسی غیر متبدل شدت سے اپنے سامنے ٹھنکی باندھے دیکھتی رہیں۔ جب وہ شبیلہاں پہن چکی، وہ چپ چاپ گھاس کے اوپر بیٹھی چادر کے اس کنارے پر، جو دروازے کے قریب تر تھا، اڑھلک گئی۔

”نشا، تم درمیان میں لیٹ جاؤ۔“ سونیا نے کہا۔

”نہیں، میں یہیں ٹھیک ہوں۔“ نشا بڑبڑائی۔ ”تم بھی لیٹ جاؤ۔“ اس نے ٹاؤکھا کر کہا اور اپنا منہ بجلی

میں چھپا لیا۔

کاؤٹس، مادام شوس اور سونیا نے جھگڑت سے، اپنا اپنا لباس تبدیل کیا اور لیٹ گئیں۔ ایقونوں کے سامنے ٹھنکا

لیمپ چل رہا تھا اور کمرے کو صرف وہی روشن کر رہا تھا۔ لیکن محسوس میں اس آگ کی، جو بیڑہ میل در میتش جی ہر دس بھڑک رہی تھی، چٹکا چوندروشتی پھیلی ہوئی تھی اور ایجوٹس کی لگاتار چیخ پکار کے علاوہ، جو ابھی تک سنائی دے رہی تھی، سڑک کے پار ایک سے کدے سے، جس میں، مانوف کے قازق یزور شمشیر داخل ہو گئے تھے، نٹے میں ہور لوگوں کے غل غپاڑے کی آوازیں آرہی تھیں۔

نشا کا کافی دیر تک ان آوازوں کو، جو احاطے کے اندر اور باہر سے اس کے کانوں تک پہنچ رہی تھیں، سنتی رہی۔ بے حس و حرکت بیٹھی رہی۔ پہلے اس نے اپنی اماں کو آہیں بھرتے، دھانکے مانگتے اور پٹنگ کو اس کے نیچے چڑھانے، پھر مادام شوس کے جانے پہنچانے سیٹیاں بجاتے خروٹوں اور سونیا کی مدھم سانسوں کی آوازیں سنیں۔ کائنات نے نشا کو آواز دی۔ نشا مادام ساوٹھے پڑی رہی۔

”ماما، سیرا خیال ہے کدہ سو گئی ہے۔“ سونیا نے کان پھوسی کی۔

مختصر خاموشی کے بعد کائنات نے پھر کچھ کہا لیکن اب کسی نے اسے جواب نہ دیا۔

کچھ دیر میں نشا کو اپنی اماں کی باقاعدہ سانسوں کی آواز سنائی دینے لگی۔ اگر چہ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ اس کا ننھا منہ برہنہ پاؤں، جو لحاف سے باہر نکل گیا تھا، ننگے فرش پر غرغرت ہو گیا ہے، اس نے اپنی جگہ سے اٹنی حرکت نہ کی۔

کسی شگاف میں کوئی جھینگریوں۔ چبھارہا تھا جیسے وہ کل عالم پر اپنی فتح کا جشن منا رہا ہو۔ دورناصلے پر کسی مرٹھ نے بانگ دی اور قریب سے دوسرے کا جواب آیا۔ سے کدے میں شور و غل مچ گیا۔ صرف ایجوٹس کی ہائے دائے سنائی دے رہی تھی۔ نشا اٹھ کر بیٹھ گئی۔

”سونیا، سو گئی ہو؟... ماما؟“ اس نے زیر لب کہا۔

اسے لگا کہ کوئی بھاری بھر کم چیز زور زور سے مکان کی دیواروں سے ٹکرا رہی ہے اور اس کے یوں گرا لے سے تاں راد آوازیں پیدا ہو رہی ہیں۔ یہ دراصل اس کے اپنے دل کی، جو دہشت، وحشت و رجبت سے پھل جا رہا تھا، بلند آہنگ دھڑکن تھی۔

اس نے دروازہ کھولا، دو بے پاؤں دہلیز پار کی، اور ٹھنڈی مرطوب زمین پر پاؤں رکھا۔ ٹھنڈی ہوائ نے اسے اپنی لپیٹ میں لے لیا اور تازہ دم محسوس کرنے لگی۔ راستہ ٹٹولتے اس کا برہنہ پاؤں ایک خفتہ شخص سے جا ٹکرایا۔ وہ اس کے اوپر سے کود گئی اور اس نے اس کا نیچے کا، جس میں پرنس آندرے لیٹا ہوا تھا، دروازہ کھولا۔ کمرے میں اندر تھا۔ دور کونے میں پٹنگ کے قریب، جس پر کوئی آدمی لیٹا ہوا تھا، بیچ پر چربی کی موسم بنی پڑی تھی۔ اس کا فٹیلہ خاصا موٹا تھا اور سنگ رہا تھا۔

نشا صبح سے ہی، جب سے پرنس آندرے کے زخموں اور اس کی وہاں موجودگی کے بارے میں جاننا چاہتا تھا، ٹھنڈن چکی تھی کہ خواہ کچھ بھی ہو، وہ اس سے ملاقات ضرور کرے گی۔ وہ یہ تو نہیں جانتی تھی کہ یہ ملاقات کیوں ضروری

ہے لیکن وہ اتنا جانتی تھی کہ یہ ملاقات خود اس کے اپنے لیے باعث اذیت ہوگی اور اس سے اسے اور بھی یقین ہو گیا کہ یہ لہجہ بدیہ ہے۔

وہ سارا دن یہ میدان لیتی رہی کہ وہ اس رات اس سے ملاقات کر سکے گی لیکن جب وہ ساعت آہنی کے دس پر دہشت طاری ہو گئی کہ پتا نہیں اسے وہاں دیکھنے کو کیا ملے۔ اس کی صورت سب سے ہو چکی تھی، کس حد تک؟ اس کا باقی کیا سچا ہے؟ کیا وہ اس ایجوٹنٹ کی طرح پیہم آہ دہکا کر رہ ہوگا؟ ہاں، وہ بالکل اسی کی، منہ ہوگا۔ اس کے تخیل میں وہ مجسم دہشت ناک آہ دہکا تھا۔ جب اسے کونے میں میں غیر واضح صورت دکھائی دی اور اس نے غلطی سے اس کے گھٹنوں کو، جو کہیں کے نیچے اوپر اٹھے ہوئے تھے، کندھے سمجھ لیا، اس کے ذہن میں لرزہ خیز جسم کا خاکہ ابھر اور وہ دہشت کے عالم میں، مندر بہت سہکت کھڑی رہی۔ لیکن ایک خطراری جذبے نے، جسے جھٹکا اس کے بس کی بات نہیں تھی، اسے آگے گھسیٹ لیا۔ اس نے پہلے ایک تھکاؤ قدم آگے بڑھایا اور پھر دوسرا۔ اس نے اپنے آپ کو کمرے کے درمیان میں پایا۔ وہاں سفری سامان کے ڈھیر لگے ہوئے تھے۔ ایٹونوں کے نیچے تپوں پر ایک اور شخص۔ یہ تموخن تھا۔ لیٹا ہوا تھا۔ دود دوسرے۔ ڈاکٹر اور وردی پوش ملازم۔ ٹرٹ پر دراز تھے۔

وردی پوش ملازم اٹھ کر بیٹھ گیا اور اس نے زیر لب کچھ کہا۔ تموخن، جو دشمنی؟ جنگ میں ارد کی وجہ سے جاگ رہا تھا، سفید شیمز، ڈریسنگ کوٹ اور شینڈل پیپے لڑکی کے اجنبی ہیرو کے کواٹھیں بھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگا۔ وردی پوش ملازم کی خواب آلود اور خوف زدہ پکار۔ ”کیا ہے؟ کیا چاہتی ہو؟“۔ نے محض نسا شا کی رفتار بڑھانے کا کام کیا اور وہ بہ سرعت اس جسم کی طرف بڑھی جو کونے میں پڑا تھا۔ اگرچہ وہ جسم انسانی شکل و صورت سے اس قدر غیر مشابہ تھا کہ اسے دیکھ کر دل پر ہول طاری ہوتا تھا، وہ اسے دیکھنے پر تکی ہوئی تھی۔ وہ وردی پوش ملازم سے آگے نکلی، موسم تکی کا گل نیچے گرا اور اسے پرنس آندرے واضح طور پر نظر آ گیا۔ وہ ہاتھ پھیلائے بستر پوش پر لیٹا ہوا تھا اور بالکل دیرا ہی نظر آ رہا تھا جیسا وہ اسے ہمیشہ دیکھتی رہی تھی۔

وہ بالکل دیرا ہی تھا جیسا کہ وہ ہمیشہ ہو کرتا تھا۔ تاہم بخار کی وجہ سے اس کے چہرے کی تہماہٹ، اس کی آنکھوں کی، جو فوراً مسرت سے اس پر گڑی ہوئی تھیں، چمک دمک، اور خاص طور پر اس کی گردن کی، جو اس کی شینڈل قیص کی نچلی جانب ڈھلکے ہوئے کار کے اوپر نظر آ رہی تھی، بچوں کی سی ملاحت نے اسے نرالی انداز سے وہ غفلت مصومیت عطا کر دی تھی جو نسا شا نے اس سے پہلے اس میں کبھی نہیں دیکھی تھی۔ وہ اس کے قریب پہنچی اور بھرتیلے، چکلیے اور دیشیزانہ انداز سے اس کے سامنے دوڑ نو ہو گئی۔

وہ مسکرایا اور اس نے اپنا ہاتھ اس کی جانب بڑھا دیا۔

جس روز بارودینو کے میدان جنگ کے ڈریسنگ شیشن میں پرنس آندرے کو دوبارہ ہوش آیا، اس کے بعد سات ایام

گزر چکے تھے۔ اس تمام مدت کے دوران میں وہ تقریباً مسلسل نیم بے ہوش رہا تھا۔ ڈاکٹر کی رائے کے مطابق اس کے بخار اور نثریوں کی سوجن کی وجہ سے، جو زخمی ہو گئی تھیں، یہ بات یقینی ہو گئی تھی کہ وہ جان نہیں ہوسکے گا۔ تاہم ساتویں روز اس نے سرے لے لے کر چائے کے ساتھ توکس کھیا اور ڈاکٹر نے دیکھا کہ اس کا بخار کم ہو گیا ہے۔ وہ اس صبح دوبارہ ہوش میں آیا تھا۔ ان کی ماسکو سے روانگی کے بعد پہلی رات خاصی گرم تھی اور پرنس آندرے کا دل میں ہی بیٹا رہا تھا لیکن میتھس جی میں اس نے خود تقاضا کیا تھا کہ اسے مکان کے اندر لے جایا جائے اور چائے پلائی جائے۔ اٹھا کر لے جائے جانے کے دوران میں اسے جوازیت پہنچی، اس نے اس کی چیخیں نکال دیں اور دوبارہ بے ہوش ہو گیا۔ جب اسے عارضی قیام گاہ میں بستر پر لٹایا گیا، وہ کافی دیر آنکھیں موندے بے حس حرکت لیتا رہا۔ پھر اس نے آنکھیں کھولیں اور نرمی سے سرگوشی کی: ”چائے نہیں لے گی؟“ اس نے روزمرہ کی اس معمولی تفصیل کو جو اس طرح یاد رکھا، اس سے ڈاکٹر ہنگامہ کارہ گیا۔ اس نے پرنس آندرے کی نبض دیکھی اور اسے یہ دیکھ کر تعجب ہی ہوا اور افسوس بھی کہ یہ پہلے کی نسبت بہتر ہو گئی ہے۔ وہ غیر مطمئن اس لیے تھا کیونکہ وہ تجربے سے جانتا تھا کہ پرنس آندرے زندہ نہیں رہ سکتا ورنہ یہ کہ اگر اس کا اب انتقال نہ ہوا، اسے بعد میں پہلے کی نسبت زیادہ اذیت ناک موت کا سامنا کرنا پڑے گا۔ پرنس آندرے کے ساتھ جو شخص سفر کر رہا تھا، وہ اس کی رجسٹر کا سرخ ناک والا میجر تموخن تھا۔ وہ ماسکو میں اس کا ہم رکاب ہوا تھا۔ اسے پارو دینو کی لڑائی میں ٹانگ پر زخم آیا تھا اور اس کے ساتھ اسے بھی لے جایا جا رہا تھا۔ ان کے ہمراہ ڈاکٹر، پرنس آندرے کا وردی پوش ملازم، اس کا کوچوان، دروازہ دلی تھے۔

پرنس آندرے کو چائے پیش کی گئی۔ وہ اُسے بڑے شوق سے پیتا اور اپنی بے چین و مضطرب ٹانگوں سے اپنے سامنے دروازے کی جانب دیکھتا رہا جیسے وہ کچھ سمجھنے یا یاد کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔

”مجھے اور نہیں چاہیے۔ تموخن کہیں ہے؟“ اس نے پوچھا۔

تموخن بیچ کے کنارے کے ساتھ ساتھ کھسکتا اس کی طرف بڑھا۔

”یوٹرا کیسی لینس! میں یہاں ہوں۔“

”تمہارا زخم کیسا ہے؟“

”میرا؟ جناب، میں بالکل ٹھیک ہوں۔ مگر آپ کی طبیعت کیسی ہے؟“

پرنس آندرے دوبارہ سوچ بچار میں کھڑا جیسے، پناہ خانہ کھنگال رہا ہو۔

”یہاں کوئی کتاب مل سکتی ہے؟“

”کیسی کتاب؟“

”انا جیل اور بعد۔ میرے پاس نہیں ہے۔“

ڈاکٹر نے وعدہ کیا کہ وہ یہ اس کے لیے کہیں سے ڈھونڈ لائے گا اور پرنس سے دریافت کرنے لگا کہ اب اس کی طبیعت کیسی ہے۔ دراصل اسے کیا محسوس ہو رہا ہے۔ پرنس آندرے نے اس کے تمام سوالات کے جوابات ہوش مند

لیکن بے دلی سے دیے۔ اس کے بعد اس نے کہا کہ چونکہ اسے بے کفی اور شدید درد ہو رہا ہے، اس لیے وہ چاہتا ہے کہ اس کے نیچے گاؤں تک لے دیا جائے۔ ڈاکٹر وروڑی پوش ملازم نے اور کوٹ، جس میں وہ لیٹا ہوا تھا، اوپر اٹھایا۔ اس کے زخم میں پیپ پڑ چکی تھی، کھانگڑ چکی تھی، اور اس سے بسانہ خارج ہو رہی تھی۔ دونوں نے اس پر مس بنایا۔ ڈاکٹر نے اس ہونٹ تک جگہ کا بغور سناٹہ کیا۔ کسی چیز نے اسے سخت ٹکرا کر دیا۔ اس نے مرہم پیٹی میں چند تھلے لیاں کیں اور زخمی کو اٹھا کر دیا۔ اس پر وہ بلبلانے لگا اور دوبارہ بے ہوش ہو گیا۔ اس پر ہڈی کی کیفیت ظاہر ہو گئی۔ وہ ان سے بار بار تقاضا کر رہا تھا کہ وہ فوراً کتاب لائیں اور اس کے بچے کے نیچے رکھ دیں۔

”اس سے تمہارا کی بگڑے گا؟“ وہ کہہ رہا تھا۔ ”کہہ جو دیا کہ یہ میرے پاس نہیں ہے۔ جائیں نا، مہربانی فرمائیں درے آئیں۔ ایک منٹ کے لیے یہی لیکن میرے نیچے رکھ دیں۔“ وہ دل دراز میں التجا کر رہا تھا۔
ڈاکٹر ہاتھ دھوئے غلام گردش میں چلا گیا۔

”تم لوگوں میں ضمیر نام کی کوئی شے باقی نہیں رہی،“ اس نے وروڑی پوش ملازم سے کہا، جو اس کے ہاتھوں پر پانی انڈیل رہا تھا۔ ”ادھر میں نے ایک آدھ سیکنڈ کے لیے اپنی نگاہ ادھر ادھر کی نہیں۔ اور، درحتم لوگوں نے اسے جھٹ پٹ زخم پر مٹایا نہیں۔... وہ اتنی اذیت میں مبتلا ہے کہ سمجھ میں آتا کہ وہ اسے برداشت کیسے کر رہا ہے!“
”خداوند یسوع مسیح کی قسم، میں یہی سمجھا کہ ہم نے ان کے نیچے کچھ رکھ دیا ہے۔“ وروڑی پوش ملازم نے کہا۔
پرنس آندرے کہاں تھا اور اس پر کیا ہوتی تھی، اس کا احساس اسے پہلی مرتبہ اس وقت ہو جب اس کی کالاش میٹش جی رکی۔ تب اسے یاد آیا کہ وہ کس طرح زخمی ہوا تھا۔ درد کے باعث وہ ایک بار پھر اس وقت بے ہوش ہو گیا تھا جب اسے اٹھا کر مکائیچے کے اندر لے جایا جا رہا تھا۔ یہاں وہ دوبارہ ہوش میں آ گیا۔ جب وہ چائے پی رہا تھا، اس کے دوران میں اسے دوبارہ وہ سب کچھ، جو اس پر ہوتا تھا، یاد آنے لگا۔ اسے انتہائی واضح طور پر دو ساعت یاد آ گئی جب ڈرینگ شیمن کے عہد ایک ایسے شخص کے، جس سے اسے شدید نفرت تھی، مصائب دیکھ کر اس کے ذہن میں نئے خیالات، جو سرت کی نوید سنار ہے تھے، در آئے تھے اور یہ خیالات اگرچہ مبہم اور غیر واضح تھے۔ لیکن انھوں نے ایک بار پھر اس کی روح پر قبضہ کر لیا تھا۔ سے یاد آیا کہ اب اس کے پاس سرت کا نیا سر جشمہ ہے اور یہ کہ اس کی یہ سرت کسی نہ کسی طور انا جیل اور بعد سے منسلک ہے۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے کتاب، لگی تھی۔ لیکن جس انداز سے اسے سنا یا گیا تھا، اس سے اسے تکلیف پہنچنا شروع ہو گئی تھی اور جب اسے دوبارہ اٹایا گیا، اس سے اس کا ذہن منتشر ہو گیا، اور صرف رات کے کامل سکوت میں وہ تیسری مرتبہ ہوش میں آیا۔ اس کے ارد گرد تمام لوگ کچھ غراب تھے۔ غلام گردش کے پار کوئی جھینگڑا چہرہ نہ تھا۔ گلی میں کوئی شخص گانا گارہا اور شور مچا کر رہا تھا۔ میز، القونوس اور دیواروں پر تل پختے سرسرا رہے تھے۔ خزاں کی خاصی سوئی کبھی غراب سے بچنے پر گری اور اس کے قریب چربی کی موسم جی کے، جس کے قتلے نے کھنسی کی صورت اختیار کر لی تھی، اور گرد پھڑپھڑانے لگی۔

اس کی ذہنی کیفیت عام انسانوں کی ہی نہیں رہی تھی۔ محنت مند آدمی کو، مطلقاً پر یک وقت بہت سی باتیں یاد

آتی، محسوس ہوں اور سوچھتی ہیں لیکن اس میں اتنی طاقت، درقوت ارادی ہوتی ہے کہ وہ خیالات یا واقعات کا کوئی تسلسل منتخب کریتا ہے اور اسی پردہ اپنی ساری توجہ مرکوز کرتا ہے۔ صحت مند شخص انتہائی استغراق کے عالم میں بھی کسی شخص سے، جو اس سے ملاقات کی غرض سے آتا ہے، شائستگی سے بات کرنے کے لیے اپنا سلسلہ خیالات جوڑ سکتا ہے اور اس کے بعد اسے دوبارہ جوڑ سکتا ہے۔ لیکن اس مفہوم میں پرنس آندرے ٹارٹل کیفیت میں نہیں تھرتھرتا اس کی تمام ذہنی صلاحیتیں پہلے کی نسبت کہیں زیادہ واضح اور فعل تھیں لیکن وہ اس کی قوت ارادی سے الگ نکل رہا ہے۔ ایک ہی وقت میں انتہائی غیر متجانس خیالات اور تصورات اسے ذہنی طور پر مصروف رکھتے۔ بعض اوقات اس کا ذہن اچانک اتنی قوت، صراحت، گہرائی اور گیرائی سے کام کرنے لگتا کہ تندرستی کے زمانے میں بھی اس نے نہیں کیا تھا، پھر ایک ایسی کی ذہنی مصروفیت میں کوئی غیر متوقع خیال رخسہ ڈال دیتا اور اس میں اتنی سکت رہتی کہ وہ دوبارہ اپنے تصورات کا سلسلہ جوڑ سکتا۔

”ہاں، مجھ پر ایک نئی مسرت۔ مسرت جو انسان کا ناقابل انتقال حق ہے۔ کا انکشاف ہوا تھا۔“ اس نے پرسکون مکالمے کی نیم تاریکی میں لیٹے لیٹے اور بے چین و مضطرب نگاہوں سے اپنے سامنے ٹنگے ہاتھ کر دیکھتے ہوئے، اپنے آپ سے کہا۔ ”وہ مسرت جو مادی قوتوں کی رسائی سے بالاتر ہے اور ان مادی اور خارجی اثرات سے، جو انسان پر اپنا عکس ڈالتے ہیں، متاثر نہیں ہوتی، صرف روح کی مسرت ہے اور محبت کرنے والوں کے ہی حصے میں آتی ہے۔ اسے محسوس کرنا ہر انسان کے بس میں ہے لیکن اس کی واضح صورت تشکیل کرنا اور اسے ودیعت کرنا صرف خدائی فعل ہے۔ لیکن خداوند نے اسے کیسے ودیعت کیا اور اس کا بیٹا کیوں۔“

اور خیالات کے اس سلسلے میں ایک دم شعل واقع ہو گیا اور پرنس آندرے کو (یہ جانے بغیر کہ یہ واقعہ کیا حقیقت) نرم و گداز سرگوشیاں کرتی آواز سنائی دی جو اپنے بچے تھے آہنگ کے ساتھ مسلسل ”توتی۔ توتی۔ توتی۔ توتی۔ توتی۔ توتی۔“ کا درد کر رہی تھی۔ اس زریب موسیقی کی آواز کی سنگت میں اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس کے چہرے پر، اس کے عین درمیان ہی حصے پر باریک سونیوں پر تھیلینوں کی اشیری عمارت اٹھائی جا رہی ہو۔ اس کے دماغ پر خیال گزرا کہ اسے نہایت احتیاط سے اپنا توازن برقرار رکھنا چاہیے (حالاںکہ یہ بہت مشکل کام تھا) کہیں یہ دماغی عمارت دھڑم سے نیچے نہ گر پڑے۔ تاہم کبھی یہ عمارت نیچے گرنے لگتی اور کبھی مدھم مدھم موسیقی کی آواز کی سنگت میں اوپر اٹھنا شروع ہو جاتی۔ ”یہ بڑھ رہی ہے، پھیل رہی ہے، اونچی ہو رہی ہے، کشادہ ہو رہی ہے!“ پرنس آندرے اپنے آپ سے کہہ رہا تھا۔ جب وہ موسیقی کی مدھم تانیں سن رہا تھا اور اسے یہ محسوس ہو رہا تھا کہ سونیوں کی یہ عمارت اوپر اٹھ رہی اور اگر دیکھ لیں تو یہ، بیچ بیچ میں اسے موسیقی کے گرد و پیش روشنی کا سرخ ہوا نظر آنے لگتا اور اسے دل چٹوں کی سرسراہٹ اور مکھی کی، جو غڑپ سے کبھی اس کے نیچے اور کبھی اس کے چہرے پر کرتی تھی، بھبھکاہٹ سنائی دینے لگتی ہے۔ جب بھی مکھی اس کے چہرے سے ٹکراتی، اسے جلن کا احساس ہونے لگتا لیکن وہ یہ دیکھ کر جرات نہ جاتا کہ اگرچہ یہ عین اس حصے سے، جہاں سے عمارت کی تعمیر شروع ہوئی تھی، ٹکراتی ہے، وہ اسے منہدم نہیں کرتی۔

لیکن اس کے علاوہ ایک اور اہم چیز تھی اور یہ دروازے کے قریب کوئی سفید چیز۔ ابوالہوں کا بھروسہ تھی اور یہ بھی اس کے ذہن پر بوجھ بنی ہوئی تھی۔

”لیکن یہ شاید میز پر میری قمیض ہے،“ پرنس آندرے نے سوچا۔ ”اور وہ میری ٹانگیں ہیں اور وہ دروازہ ہے لیکن یہ ہمیشہ پھیلتا اور بند کیوں ہوتا رہتا ہے اور یہ ڈوٹی۔ ڈوٹی۔ ڈوٹی اور ڈوٹی۔ ڈوٹی۔ ڈوٹی۔ کانی ہو چکی ہے، رک جاؤ خدا کے لیے خاموش ہو جاؤ“ پرنس آندرے نے غڈ حال ہو کر پُر زور التجا کی۔ اچانک اس کے ذہن سے بادل چھٹ گئے اور جذبہ و خیال سٹج پر تیرنے لگے۔ سب کچھ غیر معمولی انداز سے توانا اور واضح تھا۔

”ہاں، محبت۔“ (اس نے دوبارہ سوچا۔ اور اس کی اس سوچ میں کوئی ابہم نہیں تھا، کوئی الجھاؤ نہیں تھا۔) ”لیکن وہ محبت نہیں جس کے پیچھے کوئی غرض کارفرما ہوتی ہے، جس کا مقصد کسی چیز کا حصول ہوتا ہے یا اس کا کوئی سبب ہوتا ہے، بلکہ وہ محبت، جس سے میں پہلی بار اس وقت آشنا ہوا جب میں نے موت کے تجربے میں سے گزرے کے دوران میں اپنے دشمن کو دیکھا اور مجھے اس پر (غصہ نہیں بلکہ) پیارا آیا۔ میں نے محبت کا وہ جذبہ، جو روح کا اصل خمیر ہوتا ہے اور جس کا کوئی معروض نہیں ہوتا، محسوس کیا، اور وہی روحانی سرور اب دوبارہ محسوس کر رہا ہوں۔ اپنے پڑوسی سے محبت کرنا، اپنے دشمن سے محبت کرنا، ہر چیز سے محبت کرنا۔ خداوند سے، دشمن جن گورتوں میں وہ جلوہ گر ہوتا ہے، ان سے محبت کرنا ہے۔ وہ شخص، جو آپ کو عزیز ہو، اس سے نہائی محبت کی جا سکتی ہے لیکن دشمن سے محبت کرنے کے لیے ہمیں الوہی محبت درکار ہوتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ جب مجھے محسوس ہو کہ میں اس شخص سے بڑا کرتا ہوں تو مجھے اتنی بے پایاں مسرت ہوئی۔ اس کا کیا بھنا؟ کیا وہ زندہ ہے؟... انسانی محبت نفرت میں تبدیل ہو سکتی ہے لیکن الوہی محبت غیر متبدل ہے۔ کوئی بھی چیز حتیٰ کہ خود موت بھی اسے ناپائیدار کر سکتی ہے۔ یہ تو روح کا صحیح خمیر ہے۔ تاہم میں نے زندگی میں کتنے لوگوں سے نفرت کی ہے؟ اور ان سب میں سے کسی سے نہ مجھے اتنی محبت ہوئی اور نہ نفرت جتنی کہ اُس سے۔“

اور اس نے اپنے ذہن میں ناسا کی واضح صورت بنائی۔ لیکن اب کے اس کے ذہن میں ناسا کا جو ہولی ابھرا وہ ماضی کی ناسا نہیں تھی۔ ماضی کی ناسا صرف دکاشی کا مرتع تھی اور اس کی یہی دکاشی اسے مسرت سے سرشار کر دیتی تھی۔ اب پہلی مرتبہ وہ اس کی روح کو بھی اپنے تصور میں لایا۔ اور یوں وہ اس کے جذبات و احساسات، اس کے دکھ، اس کی شرمساری اور اس کی اندامت کی تفہیم کر سکا اور پہلی مرتبہ اس کی سمجھ میں آیا کہ اس نے، اسے مسٹر دکر کے اس پر کتنا ظلم کیا تھا، اس سے قطع تعلق کر کے اس پر کیا ختم ڈھایا تھا۔ ”کاش میرے لیے یہ ممکن ہوتا کہ میں ایک بار پھر اس کی صورت دیکھ سکتا! صرف ایک بار اس کی آنکھوں میں جھانک سکتا اور کہہ سکتا۔“

”پتی۔ پتی۔ پتی، اور تتی۔ تی۔ رنداؤں!“ غراب سے کبھی مگری اور ایک ایکی پرنس آندرے کی توجہ ایک دوسری دنیا، حقیقت اور ہڈ بان کی دنیا کی طرف متقل ہو گئی۔ وہاں کوئی عجیب و غریب چیز منظر عام پر آ رہی تھی۔

”اس“ سے یہاں مراد ناسا ہے

عمارت اب بھی اوپر ہی، اوپر اٹھتی جا رہی تھی اور منہدم نہیں ہوئی تھی، کوئی چیز اب بھی پھیل رہی تھی، موسم قیاسیہ سرخ ہاے کے حصار میں اب بھی جل رہی تھی اور قیصر سے مشابہ ابو الہول دروازے کے قریب پڑا تھا۔ یہ سب چیزیں تو موجود تھیں لیکن اب ان کے علاوہ کوئی اور چیز چرچرائی، باد نسیم کا ہلکا پھلکا جھونکا آیا اور دروازے پر کوئی نہ سفید ابو الہول نمودر ہوا۔ یہ وہاں کھڑا تھا اور اس بو الہول کا چہرہ نتاشا کے، جس کے بارے میں ادائیگی ابھی سوچا رہا تھا، چہرے کی طرح زردی مائل اور اس کی آنکھیں اس کی آنکھوں کی طرح چمک رہی تھیں۔

”اور یہ ددائی ہدیان کتنا تکلیف دہ ہے!“ پرنس آندرے نے سوچا۔ وہ اپنے تخیل کے پردے پر اس چہرے کے نقول کھینچ دینا چاہتا تھا۔

لیکن وہ چہرہ خیالی نہیں، اصلی تھا اور وہ اس کے سامنے ڈٹا رہا۔ وہ اس کے قریب سے قریب تر آنا جا رہا تھا۔ پرنس آندرے خالص خیال کی سابق دنیا میں لوٹ جانا چاہتا تھا لیکن وہ ناکام رہا اور ہدیان نے ایک بار ہمارے اپنی مملکت میں گھسیٹ لیا۔ سرگوشیاں کرتی نرم دلصیف آواز کی سریلی بھنکنا ہٹ جا رہی تھی۔ کوئی چیز سڑ رہی تھی، پھیل رہی تھی اور چہرہ اس کے سامنے تھا۔ پرنس آندرے نے یہ یاد کرنے کے لیے کہ یہ کون ہے، اپنی تمام توانائیاں مجتمع کر لیں۔ اس نے خفیف سی حرکت کی اور ایکایکی اس کے کانوں میں گھنٹیاں بجنے لگیں، آنکھوں میں غبار آگیا اور اس آدمی کی طرح، جو پانی میں ڈوب رہا ہو، وہ اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھا۔ جب اس کے اوسان بحال ہوئے، نتاشا، وہی جیسی جاگتی نتاشا، جس پر وہ سب لوگوں سے زیادہ اپنی بیٹی، خالص، الوہی محبت، اجال پر مشکف ہوئی تھی، نثار کرنا چاہتا تھا، اس کے سامنے دوزانو ہو رہی تھی۔ اسے احساس ہوا کہ یہ حقیقی، جیسی جاگتی نتاشا ہے اور اسے کوئی تعجب نہ ہوا بلکہ وہ چپ چاپ خوشی سے جھونسنے لگا۔ نتاشا گھٹنوں پر جھکی ہوئی تھی۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ اس کے پاؤں زمین میں گڑ گئے ہیں اور وہ اپنی جگہ سے حرکت نہیں کر سکتی۔ وہ فلکی باندھے سے دیکھ رہی تھی اور اپنی سسکیوں پر قابو پانے کی سر توڑ کوشش کر رہی تھی۔ اس کا چہرہ زرد اور سکت تھا، اس کی صرف ٹھوڑی اور ہونٹ قدرے سرخ تھیں۔

پرنس آندرے نے اطمینان کی سانس لی، وہ مسکرایا اور اس نے اپنا ہاتھ آگے بڑھا دیا۔

”تم؟“ اس نے کہا۔ ”زہے نصیب!“

نتاشا نے ٹھکرتی لیکن حزم و احتیاط سے اس کے اور قریب آگئی۔ وہ ابھی تک گھٹنوں کے بل جھکی ہوئی تھی۔ اس نے ہوشیاری سے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا، اپنا چہرہ اس کے اوپر جھکایا اور اس پر دھڑا دھڑاہٹ سے ٹپ کرنے لگی لیکن اس کے لب اسے بمشکل چھو رہے تھے۔

”مجھے معاف کر دیں!“ اس نے اپنا سر اٹھاتے اور اس پر اپنی نگاہیں گاڑتے سرگوشی کی۔ ”مجھے معاف کر دیں؟“

”میں تم سے محبت کرتا ہوں!“ پرنس آندرے نے کہا۔

”مجھے معاف...“

”معانی کس بات کی؟“ پرنس آندرے نے استفسار کیا۔

”میں نے جو کچھ کیا ہے مجھے... مجھے اس کی معاف...!“ نٹاشا نے لڑکھڑائی زبان سے کہا۔ اس کی آواز اتنی مدھم تھی کہ بمشکل سائی دیتی تھی۔ وہ غلٹ سے اس کے ہاتھوں کو اپنے بوسوں سے ڈھانپنے لگی۔ اس کے ہونٹ ان کے ساتھ ہمایت ملاحت سے مس ہو رہے تھے۔

”لیکن میں تم سے پہلے کی نسبت زیادہ... بہتر محبت کرنے لگا ہوں۔“ پرنس آندرے نے اس کا چہرہ دوپہ اٹھاتے ہوئے کہا۔ وہ اس کی آنکھوں میں جھانکنا چاہتا تھا۔

وہ آنکھیں، جن میں خوشی کے آنسو چھلک رہے تھے، اسے ڈرتے جھپکنے دیکھ رہی تھیں۔ ان میں درد مندی تھی اور پرسرت محبت۔ نٹاشا کا دہلا پتلا، نررد چہرہ، متورم ہونٹوں سمیت، رعنائی سے عاری تھا۔ دیکھنے میں یہ بھی تک معلوم ہوتا تھا۔ لیکن پرنس آندرے نے اس چہرے کو رکھا ہی نہیں۔ وہ صرف روشن دہاں آنکھیں، جو خوبصورت تھیں، دیکھ رہا تھا۔ انھیں اپنے عقب میں باتوں کی آواز سنائی دی۔

وردی پوش ملازم پیو تراب پوری طرح بیدار ہو چکا تھا۔ اس نے ڈاکٹر کو جگایا۔ تھوخن، جو اپنے بے لباس جسم کو چادر میں اچھی طرح لپیٹے اور ہاتھ پاؤں سمیٹے، گٹھڑی ہانپتی پڑا تھا، ٹانگ میں درد کے باعث بالکل سونہیں سکا تھا، اس کے قریب جو کچھ ہو رہا تھا، وہ کافی دیر سے اسے بغور دیکھ رہا تھا۔

”اس کا کیا مطلب ہے؟“ ڈاکٹر نے اپنے فرش بستے سے اٹھتے ہوئے کہا۔ ”مارام، مہربانی فرمائیں اور تشریف لے جائیں۔“

کاؤنٹس کو اپنی بیٹی کی غیر حاضری کا علم ہو چکا تھا۔ اس نے (اس کی تلاش میں) اپنی خادمہ بھیجی تھی۔ وہ بھی اب وہاں پہنچ گئی تھی اور دروازے پر دستک دے رہی تھی۔

ایک ایسے شخص کی طرح، جو نیند میں چنے پھرنے کا عادی ہو، نٹاشا بھی ہڑبڑ کر اپنے ہوش دواس میں آگئی۔ وہ باہر نکل گئی اور اپنے کمرے میں پہنچنے کے بعد روتی دھوتی اپنے بستر پر گر پڑی۔



اس دن کے بعد اپنے بقیہ سارے سفر کے دوران میں دستوف جہاں کہیں رکتے یا شب بھری کے لیے پڑا کرتے، نٹاشا زخمی بلکونسکی کی ہانپی کے ساتھ چٹنی رہتی اور ڈاکٹر کو یہ قرار کرتے ہی بن پڑی کہ وہ کبھی یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ کوئی نوجوان لڑکی اسے تحمل کا مظاہرہ کر سکتی ہے یا کسی زخمی شخص کی تیمارداری میں اتنی مہارت رکھا سکتی ہے۔ اگرچہ کاؤنٹس کو یہ سوچ سوچ کر بہت وحشت ہوتی تھی کہ پرنس آندرے راستے میں ہی اس کی بیٹی کے بازوؤں میں دم دے دے گا (جس کا ڈاکٹر کے خیال کے مطابق کافی احتمال تھا)، وہ نٹاشا کی مخالفت نہ کر سکی۔ اگرچہ اس کے دل میں یہ خیال آتا تھا کہ زخمی شخص اور نٹاشا کے مابین محبت سیر تعلقات کی تجدید سے ان کی سابقہ

سگائی، بشرطیکہ وہ صحت یاب ہو گیا، بحال ہو سکتی ہے، کسی نے بھی۔ اور پرنس آندرے اور نتاشا نے تو بالکل ٹھیک نہیں۔ اس کا کوئی ذکر نہ کیا۔ زندگی اور موت کا مسئلہ، جو حل نہیں ہو رہا تھا اور جو یلکونسکی کو ہی نہیں بلکہ سارے روس کو اپنی پیٹ میں لیے ہوئے تھا، اس قسم کے تمام امور کے راستے میں رکاوٹ بنا ہوا تھا۔

33

تین ستمبر کو پیر تاخیر سے جاگا۔ اس کے سر میں درد ہو رہا تھا۔ لباس تبدیل کیے بغیر وہ جن کپڑوں میں سویا تھا، اس کے بدن کو چھیل رہے تھے اور ایک بہم س خیال کہ گزشتہ روز اس سے کوئی شرم ناک حرکت سرزد ہوئی تھی، اس کے لیے سوہانہ روح بنا ہوا تھا۔ یہ شرم ناک حرکت اس کی وہ گفتگو تھی جو اس نے گزشتہ روز کیپٹن عام ہال کے ساتھ کی تھی۔ اس کی گھڑی پر گیارہ بج رہے تھے لیکن عجیب بات یہ تھی کہ باہر اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ پیر اٹھا، اس نے پی آئیکھیں ملیں اور جب اس کی نظر پستول پر پڑی جس کے دستے پر نقش و نگار بنے ہوئے تھے اور جسے گرام نے دبا ہا میز پر رکھ دیا تھا اسے یاد آیا کہ وہ کہاں ہے اور اسے اس روز کیا کرنا ہے۔

”لیکن مجھے تاخیر نہیں ہوگئی؟“ اس نے سوچا۔ ”نہیں، وہ یقیناً دو پہر سے پہلے ماسکو میں داخل نہیں ہوگا۔“ پیر نے اس روز کیا کرنا تھا، اس کے بارے میں اس نے اپنے آپ کو سوچنے کا موقع نہ دیا، البتہ اس نے عمل کرنے میں پھرتی کا مظاہرہ کیا۔ اس نے اپنے کپڑوں کی شکنیں دور کیں، پستول اٹھایا اور راہ روانہ ہوا چاہتا تھا کہ پہلی مرتبہ سے یہ خیال آیا کہ وہ کھلے بندوں ہاتھوں میں پستول اٹھائے گلی کو چوں میں یقیناً نہیں جاسکے گا۔ تاہم پستول بڑے کوٹ میں بھی چھپانا مشکل ہوگا۔ یہ تو ہو ہی نہیں سکتا کہ وہ پستول اپنی پیٹی میں رکھ لے یا بازو کے نیچے دبا لے اور کسی کی اس پر نظر نہ پڑے۔ مزید برآں، پستول سے گولی چلائی جا چکی تھی اور اسے اتنا موقع نہیں مل سکتا تھا کہ وہ اس میں نئی گولی بھر لے۔ ”کوئی بات نہیں، خنجر سے کام چل جائے گا۔“ اس نے اپنے آپ سے کہا حالانکہ جب وہ اپنے منصوبے کی تکمیل کے متعلق سوچ رہا تھا، وہ ایک سے زیادہ مرتبہ اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ 1809 میں جس طالب علم نے پتولین کو ہلاک کرنے کی کوشش کی تھی، اس کی بڑی غلطی یہ تھی کہ اس نے خنجر استعمال کیا تھا۔ لیکن چونکہ نظر یہ آتا تھا کہ پیر کا بڑا مقصد تھا اپنے منصوبے کو پایہ تکمیل تک پہنچانا نہیں تھا جتنا اپنے آپ پر یہ ثابت کرنا تھا کہ وہ اس سے دست بردار نہیں ہوگا بلکہ اس کو تکمیل کرنے کے لیے اس سے جو کچھ من پڑا، وہ اسے کر گزروے گا۔ چنانچہ اس نے بہ بخلت کند اور کھدرا خنجر اٹھایا، اسے سبز نیام میں، جو اس نے پستول کے ساتھ خاریف، رکت سے خرید ا تھا، ڈالا اور اسے اپنی واسکٹ کے نیچے چھپایا۔

اپنے دیہاتی کوٹ کے اوپر پٹکا باندھنے اور سر پر نیچی ٹوپی رکھنے کے بعد پیر غلام کرڈش میں چلے گا۔ اس کی پوری کوشش تھی کہ وہ شہر کی قسم کی آواز پیدا کرے اور نہ اس کی کپتان سے غصہ بھڑ ہو اور یوں وہ باہر گلی میں نکل گیا۔ جس آگ کو اس نے گزشتہ روز اتنی بے توجہی سے دیکھا تھا، وہ رات کے دوران میں خاصی پسین بجی تھی۔

ماسکو کے مختلف عداوتوں میں آگ بھڑک رہی تھی کیرج رو (Carriage Row) دریا کے پار، بازو اور پارسکا یا سٹریٹ کی عمارتیں، مسکو دریا میں بھرے اور درگومیلوف پل کے قریب عمارتی ٹکڑی کے ٹال، سبکی دھڑ، دھڑا جل رہے تھے۔

پیٹر نے بغلی گلی کو چوں میں سے گزر کر پارسکا یا سٹریٹ پہنچنا اور وہاں سے آرمیاٹ سٹریٹ کے ساتھ ساتھ چلتے چلتے کرامائی سینٹ نکولا کے گرجے میں داخل ہونا تھا۔ اس نے فیصلہ کیا تھا کہ وہ اپنے منصوبے کی تکمیل اسی مقام پر کرے گا۔ اکثر مکانوں کے صدر دروازوں پر تالے پڑے ہوئے تھے اور ان کے در پہچے اور دروازے بند تھے۔ گلی کو چوں سنساں تھے۔ فضا میں دھواں اور آتش زنی کی بو پھیلی ہوئی تھی۔ وقتاً فوقتاً اس کی ردیوں سے، جن کے چہروں پر خوف اور پریشانی جھلک رہی تھی، مٹھ بھینر ہو جاتی۔ فرانسیسی سڑک کے عین بیچوں بیچ چل پھر رہے تھے۔ ان کے انداز سے یہ مترشح ہو رہا تھا جیسے وہ شہر میں نہیں بلکہ کپ میں ہوں۔ روسی اور فرانسیسی دونوں ہی پیٹر کو بہ نگاہ حیرت دیکھتے تھے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ اس کا بڑا طویل القامت در بھاری بھر کم تھا۔ دوسرے اس کے چہرے اور چہلے سے یہ عائد یہ ملتا تھا کہ وہ سخت اذیت میں مبتلا ہے اور اپنے خیانات میں اتنا منہمک ہے کہ اگر کوئی اس کے قریب آیا، وہ بے نیچے جھڑک کر اس کے پیچھے پڑ جائے گا۔ پھر وہی اس لیے بھی اسے گھور گھور کر دیکھ رہے تھے کہ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس کا تعلق کس طبقے سے ہو سکتا ہے۔ فرانسیسی جب اسے دیکھتے وہ اس بے بوکھا جاتے کیونکہ دوسرے ردیوں کے برعکس، جو انھیں خوف یا تجسس کی نگاہوں سے دیکھ رہے تھے، پیٹر ان کی طرف توجہ ہی نہیں دے رہا تھا۔ ایک مکان کے گیٹ کے سامنے تین فرانسیسی حضردیوں کو کچھ سمجھانے کی کوشش کر رہے تھے۔ انھوں نے پیٹر کو روک لیا اور اس سے پوچھنے لگے کہ آیا اسے فرانسیسی آتی ہے۔

پیٹر نے نفی میں سر ہلایا اور آگے چل دیا۔ ایک اور بغلی گلی میں ایک سنتری نے، جو گوہر بارود کے سبز چھڑے کے قریب پہرہ دے رہا تھا، سے ہا آواز بلند پکارا لیکن صرف اسی وقت، جب آواز تہدید آمیز انداز سے دہرائی گئی اور بدوق کے اوپر اٹھائے جانے کی کھٹاک سنائی دی، اسے اندازہ ہوا کہ اسے مخالف سمت کے فٹ پاتھ پر چلنا چاہیے۔ وہ اپنے گرد و پیش کچھ دیکھ رہا تھا نہ سن۔ وہ اپنا عزم مہم یوں اٹھائے اٹھائے پھر رہا تھا جیسے یہ کوئی انجینی اور بھیانک چیز ہو۔ وہ جلدی میں تھا کیونکہ اسے یہ اندیشہ لاحق ہو رہا تھا کہ کہیں وہ اسے گنودے۔ لیکن اپنی اس ذہنی کیفیت کو اس مقام تک، جدھر وہ جا رہا تھا، یوں کاتوں پر قرار رکھنا اس کے مقصد میں نہیں تھا۔ اگر راستے میں کوئی ایسی چیز، جو اس کے عزائم کی تکمیل میں رکاوٹ بن سکتی تھی، نہ بھی دوسرا پڑے ہوئی ہوتی، تو بھی وہ اپنے منصوبے کو کلی جامہ نہ پہنا سکتا کیونکہ پولین کو مضائقہ ہی درگومیلوف سے کریمین پہنچنے کے لیے آرمیاٹ میں سے گزرے چار گھنٹے سے اوپر ہو چکے تھے۔ اب وہ شاہی سٹڈی روم میں بیٹھا تھا۔ وہ سخت صحت مند تھا اور آگ بجھانے والوٹ مار کا سد باب کرنے اور مقامی باشندوں کی ڈھارس بندھانے کے لیے جو فوری اقدامات کیے جا

ضروری تھا، ان کے متعلق تفصیلی اور قطعی احکام صادر کر رہا تھا۔ مگر پتھر کو اس بارے میں کچھ معلوم نہیں تھا۔ اس نے روز جس کام کے کرنے کا بیڑا اٹھایا تھا، اس کا دھیان پوری طرح اسی میں لگا ہوا تھا اور وہ اس اذیت میں جھکتا جس کا تجربہ صرف انہی لوگوں کو ہوتا ہے جو ایسا کام کرنے پر مقرر رہتے ہیں جس کا انجام دینا ان کے لیے ناممکن ہوتا ہے۔ ناممکن اس لیے نہیں کیونکہ کام فی نقبہ دشوار ہوتا ہے بلکہ اس لیے کیونکہ یہ ان کی اپنی فطرت سے کوئی میل نہیں کھاتا۔ اسے اذیت اس لیے ہو رہی تھی کیونکہ اسے یہ خوف کھائے جا رہا تھا کہ کہیں وہ عین موقع پر کمزوری کا شکار نہ ہو جائے اور یوں اس کی پاداش میں اپنی عزت نفس سے ہاتھ دھو بیٹھے۔

اگرچہ وہ نہ کچھ دیکھ رہا تھا اور نہ سن، وہ اپنی جبلت کے زور پر صحیح راستے پر چلتا رہا۔ چنانچہ وہ ان بھلی گلی کوچوں میں، جو پوارسکا یا سٹریٹ میں جا ملتے تھے، ادھر ادھر نہ بھٹکا۔

وہ جوں جوں اس سڑک کے قریب آتا گیا، توں توں دھوکے کا بادل ہر جگہ دبیز ہوتا گیا اور اسے آگ کی تپش بھی محسوس ہونے لگی۔ کہیں کہیں آگ کے شعلے مکانوں کی چھتوں کے عقب میں لہرتے بل کھاتے اور اٹھ رہے تھے۔ ان گلیوں میں اس کا سامنا مزید لوگوں سے ہوا اور یہ لوگ کہیں زیادہ مضطرب تھے۔ اگرچہ پتھر کو محسوس ہو رہا تھا کہ اس کے ارد گرد کوئی غیر معمولی چیز وقوع پذیر ہو رہی ہے لیکن اسے یہ اندازہ نہ ہو سکا کہ وہ آگ کے نزدیک پہنچ رہا ہے۔ پوارسکا یا سٹریٹ ایک جانب خا صے وسیع و عریض کھلے میدان اور دوسری جانب پرنس گروڈنسکی کے محل نما مکان کے باغات میں گھری ہوئی تھی۔ جب پتھر میدان کے بچوں بیچ ایک پگڈنڈی پر جا رہا تھا، اسے اچانک اپنے قریب کسی عورت کے زارد قطار رونے کی آواز سنائی دی۔ اسے یوں جھٹکا لگا جیسے وہ خواب سے بیدار ہوا ہو۔ وہ ٹھٹک گیا اور اس نے اپنا سر اوپر اٹھایا۔

پگڈنڈی کے ایک جانب گروڈنسکی اور دوسری جانب جھلسی ہوئی گھاس پر ہر قسم کی گھریلو اشیاء کے پلنگ، پروں سے بھرے ہوئے کاف، سجادہ، ایلوے اور ٹرنک۔ ڈھیر لگے ہوئے تھے۔ زنکوں کے قریب زمین پر ایک لاغرا، تمام عورت، جو جوانی کی حدود پار کر چکی تھی اور جس کے لمبے بالائی دانت باہر کو نکلے ہوئے تھے، سیاہ چٹا اور ٹوپی پہنے بیٹھی تھی۔ اس عورت پر نشہ کی سی کیفیت طاری تھی اور اس کا جسم آگے پیچھے جھول رہا تھا۔ وہ بڑا رانی اور آنسو ہا رہی تھی۔ دس دس بارہ سال کی دو ٹھنی منی بچیاں، جن کے ابدان میلی کچی سکرنوں اور ہاتھوں میں ڈھپے ہوئے تھے اور جن کے زرد اور خوف زدہ چہروں پر بوکھا ہٹ نمایاں تھی، ٹھٹکی ہاندھے اپنی ماں کو دیکھ رہی تھیں۔ سب سے پھوٹا بچہ، تقریباً سات ساڑھے ساڑھے، اوور کوٹ اور بہت بڑی ٹوپی، جو بٹھا ہوا اس کی اپنی نہیں تھی، پہنے ہوئے تھا۔ بڑھی نرس کے بازوؤں میں جیج چلا رہا تھا۔ غلیظ نو عمر خد مہ، جس کی ٹانگیں برہنہ تھیں، ٹرنک پر بیٹھی تھی۔ اس کے زردی مائل بھورے بال، جن کے سرے آگ سے تھلس چکے تھے، نیچے ٹک رہے تھے اور وہ ان کی ایک لٹ ہاتھ میں پکڑے سوٹکھ رہی تھی۔ اس عورت کا خیدہ اور پست قامت شوہر سوں ملازم کی وردی میں ملبوس تھا۔ اس کی سونٹھیں ساج کی شکل کی تھیں۔ چونکہ ٹوپی کے نیچے اس کا چہرہ ہر قسم کے تاثرات سے عاری تھا۔ اس کے بے

سنورے بال اس کی کنپٹیوں پر نظر آ رہے تھے۔ وہ رنگوں کو، جو ایک دوسرے کے اوپر بڑے تھے، چھانٹ رہا اور ان کے نیچے سے چند لمبوسات یا ہر گھسیٹ رہا تھا۔

جوتھی اس عورت نے میٹر کو دیکھا، وہ قریب قریب اس کے پاؤں پر گر پڑی۔

”خداوند کریم۔ نیک دل سبکی بھائی!۔ حضور، مجھے بچائیں، میری مدد فرمائیں!“ اس نے آہوں اور سسکیوں کے مابین کہا۔ ”میری ننھی! میری بیٹی، میری سب سے چھوٹی بیٹی پیچھے رہ گئی ہے۔ آگ میں جل کر راکھ ہو گئی ہے۔ اول۔ اول۔ اول۔ میں نے اسی لیے تمہیں پالا پوسا تھا۔ اول۔ اول۔ اول!“

”ماریا نکول، چپ کرو۔“ اس کے شوہر نے کہا۔ ”اسے ضرور ہمیشہ لے گئی ہوں گی۔ درد مندہ اور کہاں ہو سکتی ہے؟“ اس نے مزید کہا۔ وہ اجنبی کے سامنے صرف اپنی برکت کرانا چاہتا تھا۔

”تم آدمی نہیں، عفریت ہو! انسانیت کے نام پر دھبہ ہوا!“ عورت نے آتش غضب سے جل بھن کر کہا۔ ایک ایسی اس کے ”نسو بھگم گئے۔“ تمہارے سینے میں دل نہیں۔ تمہیں اپنی اولاد سے کوئی پیر نہیں۔ اگر کوئی اور شخص ہوتا، وہ اس کو آگ کے شعلوں سے ضرور بچا کر لے آتا۔ لیکن یہ؟ یہ پتھر کا بنا ہوا ہے۔ یہ زندہ آدمی ہے اور نہ باپ ہے۔ حضور، آپ نیک انسان ہیں۔“ وہ سسکیں بھرتی اور تیز تیز بولتی میٹر کی بات متوجہ ہوئی۔ ”پڑوسیوں کے مکان میں آگ لگی اور ہوا سے ہماری طرف سے آئی۔ خادمہ چلائی۔ آگ! اور ہم اپنی چیزیں سمیٹے دوڑ پڑے۔۔۔ بس ہم یہی کچھ باہر نکال سکے۔ الفونے، میرا جہیز کا پلنگ۔ باقی سب کچھ جل گیا، ہم نے بچوں کو بچا، لیکن ننھی کا تیا کا کچھ بچا نہیں چل رہا۔ ہائے، میرے خدایا! اول۔ اول۔“ وہ پھر سسکیاں لینے لگی۔ ”میری ننھی، میری ننھی، میری بھاری گڑیا اہائے، وہ جل گئی، بھسم ہو گئی!“

”مگر اسے آپ نے چھوڑا کہاں تھا؟“ میٹر نے دریافت کیا۔

اس کے چہرے پر ہمدردی اور دلچسپی کے آثار دیکھ کر عورت کو امید مندہ چلی کہ یہ شخص اس کی مدد کرے گا۔

”حضور، خداوند آپ کا بھلا کرے!“ اس نے چلا کر کہا، ”وہ اس کی ٹانگوں کے ساتھ چٹ گئی۔“ میرے

محسن، مجھے اس مصیبت سے نکال لیں۔ آہیں کا پھٹال، اٹھو اور انھیں رستہ بتاؤ۔“ وہ نو عمر خادمہ پر برس پڑی۔ وہ چلا رہی تھی اور غصے کے عالم میں اس کا منہ پورے کا پورا کھل گیا اور یوں اس کے لیے دانتوں کی مزید نائش ہونے لگی۔

”مجھے راستہ بتا دو، ہاں، راستہ بتا دو۔ میں۔ کچھ کرتا ہوں!“ میٹر نے ہانپتے ہوئے تیزی سے کہا۔

غیظ نو کرانی ٹرنک کے عقب سے آگے آئی، اس نے پنی لٹ اور پر کی، ٹھنڈی سانس بھری اور اپنی گھٹی ہوئی ٹانگوں پر چلتی میٹر کے آگے ہو گئی اور پگھلنے والی عبور کرنے لگی۔

میٹر کو یوں محسوس ہوا جیسے طویل بے ہوشی کے بعد وہ اچانک دوبارہ زندہ ہو گیا ہو۔ اس کی آنکھیں زندگی کی حرارت سے چمکنے لگیں۔ اس نے اپنا سر اوپر اٹھایا اور لمبے سے اور تیز تیز قدم، ٹھٹھا لڑکی کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ اس نے آگن واحد میں اسے جا بیا اور پوار سکا یا مشریت پر پہنچ گیا۔ ساری سڑک سیاہ دھوئیں کے باد میں بٹی ہوئی تھی۔

کہیں کہیں آگ کے شعلے دھوئیں کی دیہیز چادر کو پھاڑ کر اوپر اٹھ رہے تھے۔ زبردست آگ کے سامنے سب حسب مخلوق اکٹھی ہو چکی تھی۔ سڑک کے درمیان میں ایک فرانسیسی جرنیل کھڑا تھا اور جو لوگ اس کے ارد گرد گھیرا ہلے ہوئے تھے، وہ ان سے کچھ کہہ رہا تھا۔ سڑک خد مدہ کی معیت میں اسی جانب آ رہا تھا لیکن فرانسیسی سپاہیوں نے اسے روک لیا۔

”on ne passe pas!“ ایک شخص نے با آواز بلند کہا۔

”انگل، اس طرف۔“ ملازمہ چلائی۔ ”ہم نکولینوں کے مکان میں سے گزر رہی ہیں جیسے جائیں گے؟“
سڑک واپس سڑا۔ وہ گا ہے بگا ہے چھوٹی موٹی چھانگ لگا دیتا تا کہ وہ ملازمہ سے پیچھے نہ رہ جائے۔ سڑک نے بھاگ کر سڑک پار کی، بائیں طرف گلی میں سڑی اور تین مکان گزرنے کے بعد وہ تیری سے دائیں جانب کے گن میں داخل ہو گئی۔

”قریب ہی ہے۔“ اس نے کہا اور بھگم بھاگ صحن عبور کرتے اس نے چوٹی باڑ میں گیٹ کھولا۔ وہاں رک گئی اور اس نے ہاتھ سے عمارت کے چھوٹے چوٹی حصے کی طرف، جہاں زبردست آگ بھڑک رہی تھی، اشارہ کیا۔ ایک حصہ گر چکا تھا اور دوسرا دھڑا دھڑا جل رہا تھا۔ کمزریوں کے شگافوں میں سے اور چھت کی ٹکڑیوں سے آنکھیں چندھیا دینے والے شعلے نکل رہے تھے۔

جونہی سڑک چھوٹے گیٹ کے قریب پہنچا، سنا تپتی ہوا کا جھونکا اس کی طرف لپکا اور وہ غیر ارادی طور پر ہچکے ہٹ گیا۔

”کہاں ہے؟ تمہارا مکان کہاں ہے؟“ اس نے پوچھا۔

”اوپر اوپر۔“ لڑکی نے واویلا کرتے ہوئے چوٹی عمارت کی طرف اشارہ کیا۔ ”دوہ۔ ہم وہیں رہا کرتے تھے۔۔۔ ہماری جان، ہماری ننھی کاتیا، میری ننھی مالکہ۔۔۔ یقیناً تو جل کر رکھ ہو چکی ہوگی۔۔۔ اوپر۔۔۔ اوپر۔۔۔“ آسمان نے دہائی دی۔ آگ کو دیکھ کر اسے محسوس ہوا کہ اسے بھی اپنے جذبات کا لڑا اظہار کرنا چاہیے۔
سڑک چھوٹے چوٹی حصے کی طرف بھاگا لیکن آگ کی حد اتنی شدید تھی کہ وہ چکر کاٹنے پر مجبور ہو گیا۔ وہ خاصے بڑے مکان کے سامنے پہنچ گیا۔ ابھی اس مکان کے صرف ایک حصے میں چھت کے نیچے آگ لگی تھی اور وہ جل رہا تھا۔ فرانسیسیوں کا خاصا بڑا جوم اس کے آس پاس اکٹھا ہو چکا تھا۔ پہلے پہل سڑک بھگم بھاگ کر یہ لوگ، جو مکان سے کوئی چیز گھسیٹ کر باہر لا رہے تھے، کیا کرنا چاہتے ہیں لیکن جب اس نے اپنے روبرو ایک فرانسیسی فوجی کو ایک دھقان کو کندہ شمشیر سے پیٹتے اور اس سے لومڑی پوتین کا کوٹ چھیننے کی کوشش کرتے دیکھا، اسے بہم سا اندازہ ہوا کہ وہ لوٹ مار کر رہے ہیں لیکن اس کے پاس اس قسم کی باتوں کے متعلق سوچنے کا وقت نہیں تھا۔
گرتی دیواروں اور چھتوں کی دھڑا دھڑی اور کھڑکھڑاہٹ، شعلوں کی شوش اور چھن چھن، جوم کی جھیلی

جج پکار، دھوکے کا منظر جو کبھی گاڑھے سیاہ بادلوں کی شکل میں نیچے ہی نیچے منڈلانے لگتا اور کبھی آگ کی لپٹوں سے مل کر بصورت جھاگ اوپر لہرانے لگتا، کہیں کہیں سرخ شعلوں کے پشاورے (جو برس معلوم ہوتے جیسے سنہری مچھلیاں دیواروں پر رنگ رہتی ہوں)۔ ان سب نے چاروں اطراف کی جھاگ دوڑ سے ل کر میٹر کے ذہن کو اسی بیجاں خیر انداز سے متاثر کیا جس طرح آتش عظیم عام طور پر کیا کرتی ہے۔ تاہم میٹر کے ذہن پر اس کا اثر خاص طور پر شدید ہو کیونکہ آگ کے منظر کو دیکھ کر اسے آٹا فانا یہ احساس ہوا کہ وہ خیالات، جو آسیب کی طرح اس کے دماغ پر سوار تھے، اسے ان سے چھٹکارا مل گیا ہے۔ وہ اپنے آپ کو نو جون، خوش باش، باعزم اور پھر خٹا محسوس کرنے لگا۔ وہ چوٹی عمارت کی دوسری جانب بھاگا۔ وہ دوڑتا دوڑتا اس جھم سے میں، جو ابھی تک صحیح سلامت کھڑا تھا، داخل ہونا چاہتا تھا کہ، سے اپنے سر کے تقریباً اوپر متعدد، شخاص کے پیچھے چلانے کی آوازیں سنائی دیں۔ اس کے ساتھ ہی ترخ سے کوئی چیز چٹختی اور سے اپنے بالکل قریب کسی بھاری چیز کے گرنے کی جھنجھٹ سنائی دی۔

میٹر نے نگاہ اٹھا کر اوپر دیکھا اور اسے مکان کی کھڑکیوں میں چند فر، ایسی نظر آئے، جنہوں نے دروازدار لماری، جو دھات کی اشیاء سے بھری ہوئی تھی، نیچے پھینکی تھی۔ بعض دوسرے فر ایسی فوجی، جو نیچے کھڑے تھے لماری کے قریب آئے۔

”یہ شخص کیا چاہتا ہے؟“ ایک فرانسیسی نے میٹر کی جانب اشارہ کرتے ہوئے با آواز بلند کہا۔

”اس مکان کے اندر ایک بیگی ہے۔“ میٹر نے چلا کر فرانسیسی میں کہا۔ ”تم نے کوئی بیگی دیکھی ہے؟“

”یہ کیا کہہ رہا ہے؟ چلو، نکلو یہاں سے۔“ متعدد اشخاص نے دھاڑتے ہوئے کہا اور ایک سپاہی، جسے بظاہر یہ اندیشہ تھا کہ کہیں میٹر ان سے کوئی چاندی یا کانسی کی چیز نہ چھین لے، تہدید کی انداز سے اس کی طرف بڑھا۔

”بیگی؟“ اوپر سے ایک فرانسیسی چلایا۔ ”مجھے باغ میں کسی کی منہاٹ سنائی دی تھی۔ شاید یہ چھوکری اسی کی ہے۔۔۔ ہمیں انسانیت سے کام لینا چاہیے۔“

”کہاں ہے؟ کہاں ہے یہ؟“ میٹر نے پوچھا۔

”وہاں۔ ادھر۔“ کھڑکی سے فرانسیسی نے مکان کے عقبی باغیچے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”ٹھہرو، میں آ رہا ہوں۔“

اور چند سیکنڈ بعد سیاہ چٹم فرانسیسی نے، جس نے خالی خالی فیص بہن رنگی تھی اور جس کے رخسار پر دھجی چٹکی ہوئی تھی، واقعی کھڑکی سے نیچے جھد جگ لگا دی، اس نے میٹر کے کندھے پر چٹکی دی اور اس کے ہمراہ باغیچے کی جانب بھاگنے لگا۔

”دوستو، جلدی کرو“ اس نے اپنے ساتھیوں سے چلا کر کہا۔ ”پیش بروحتی جارہی ہے؟“

مکان کے عقب میں بھاگتا ہوا فرانسیسی پگڈنڈی کی طرف لپکا جس پر ریت پھٹی ہوئی تھی، اس نے میٹر کا بازو دیکھتے ہوئے اس کی توجہ مدد درجہ کی طرف دلائی۔ وہاں ایک تین سالہ ننھی لڑکی، جس کے گلے میں گلابی

فراک تھ، باغیچے کے بیچ کے نیچے پڑی تھی۔

”وہ رہی تمھاری چھو کڑی۔“ فرانسیسی نے کہا۔ ”موتو، خدا حافظ۔ ہم سب کو ایک دوسرے کی مدد کرنا چاہیے، آخر ہم سب نے ایک روز مرنا ہے۔“ اور فرانسیسی واپس اپنے ساتھیوں کی طرف بھاگ گیا۔ خوشی سے میٹر کا دم پھول گیا۔ وہ ننھی ننھی بچی کی طرف لپکا اور اس نے سے اپنے ہاتھوں میں، ٹھٹھا جاہ۔ لیکن بچی، جس کا چہرہ زرد اور جوشکل و صورت سے خنزیر کی مریضہ دکھائی دیتی تھی، اچھی کور دیکھتے ہی اپنی ماں کی طرح غیر دلکش انداز سے چیخنے چلانے اور وہاں سے بھاگنے کی کوشش کرنے لگی۔ تاہم میٹر نے اسے دبوچ لیا اور اپنے باروؤں میں اٹھا لایا۔ وہ پوری قوت سے چیخنے، اپنے ننھے منے ہاتھوں کی مدد سے میٹر کے باروؤں سے آزاد ہونے اور اپنے ہوشوں سے (اس کے سر سے رل بہہ رہی تھی) انھیں کاٹنے کی سعی کرنے لگی۔ میٹر پر اس قسم کی دہشت اور کراہت کا احساس غائب آنے لگا جیسا اسے کسی غلیظ اور بدبودار چھوٹے جانور کے لمس سے ہوتا تھا۔ اسے اپنے اوپر قابو پانے کے لیے بڑی کوشش کرنا پڑی ورنہ شاید وہ بچی کو وہیں بیچ دیتا ورنہ اسے، ٹھٹھے ٹھٹھے بڑے مکان کی طرف بھاگتے لگا۔

تاہم وہ جس راستے سے آیا تھا، اس پر واپس جانا ممکن نہیں تھا۔ خادمہ آنسکا کا دور دور تک کہیں نام و نشان تک نظر نہیں آ رہا تھا۔ میٹر نے ترحم اور حقارت کے مے جھے جذبات سے بچی کو، جس کا بدن گیل تھا اور جو دلہیز جینیں مار رہی تھیں، جس قدر ممکن ہوا، پیار سے اپنے ساتھ چمٹائے رکھا اور کسی دوسرے رستے کی تلاش میں باغ میں سے گزرنے لگا۔

34

مختلف مکانوں کے محض پھلانگنا اور مختلف سمت کی گلیاں عبور کرنا اپنا ننھا سنا بوجھ اٹھائے جب میٹر پوآنسکا یا سٹریٹ کے کنارے گرد و نسل کی باغات میں پہنچا، وہاں انسانوں کی اتنی بھیڑ اور اشیاء کے جنھیں مختلف مکانوں سے گھسیٹ گھسٹ کر باہر لیا گیا تھا، اتنے ڈھیر لگے تھے، کہ وہ پہلے پہل اس جگہ کو پہچان نہ سکا۔ روسی خاندان کے علاوہ، جنھوں نے اپنے کاٹھ کباڑ سمیت وہاں پناہ لے رکھی تھی، وہاں انواع و اقسام کے طبوسات پہنے متعدد فرانسیسی فوجی سپاہی بھی موجود تھے۔ میٹر نے ان کی طرف کوئی دھیان نہ دیا۔ اسے سول ملازم کا خاندان ڈھونڈنے کی جلدی تھی تاکہ وہ بچی کو اس کی ماں کے حوالے کر سکے، خود واپس جاسکے اور کسی دوسرے کونپے میں مدد دے سکے۔ میٹر کو محسوس ہو رہا تھا کہ ابھی اسے اور بہت کچھ کرنا ہے اور جلدی کرنا ہے۔ آگ کی تپش اور بھگ روڑ کی وجہ سے اس کا چہرہ تھماتے لگا تھا اور کسی دوسرے موقع کی نسبت اسے اس وقت جوانی، جوش و اشتیاق اور عزم صمیم کا احساس، جس کی پیٹ میں رہ تب آیا تھا جب وہ بچی کو بچانے بھاگا تھا، کہیں زیادہ شدت سے ہو رہا تھا۔

بچی کا رونا دھونا اب بند ہو چکا تھا۔ وہ اس کے بازو پر بیٹھی تھی۔ اس کے ننھے منے ہاتھ اس کے کوٹ کے

ساتھ چمٹے ہوئے تھے درود، اپنے چاروں طرف کسی چھوٹے جنگلی جانور کی طرح دیکھ رہی تھی۔ پیٹر ہلکے ہلکے مسکرتا گا ہے گا ہے اس پر سرسری نگاہ ڈال لیتا۔ اس کا خیال تھا کہ اسے اس ڈرے سبب، نئے نئے زرد چہرے پر ہلٹ انگیز معصومیت سے ملتی جلتی کوئی چیز نظر آرہی ہے۔

اسے اس جگہ جہاں اس نے سول ملازم اور اس کی بیوی کو چھوڑا تھا، دونوں میں سے کوئی بھی نظر نہ آیا۔ جھوم میں میں تیز تیز چلتے اور ان لوگوں کے، جن سے اس کی مڈھ بھینٹ ہوتی، چہروں کا بغور جائزہ لیتے پیٹر کی نگاہ غیر شعوری طور پر کسی چار جیائی یا آرٹینی خاندان پر پڑ گئی۔ یہ خاندان خوبصورت شرقی مددخال کے مالک پیرائے ماں مرد، جس نے بھینٹ کی پوسٹین کا تہ کوٹ اور نئے بوٹ پہنے ہوئے تھے، اسی وضع کی سن رسیدہ عورت اور نو عمر دوشیزہ پر مشتمل تھا۔ سب سے آخری۔ نو عمر دوشیزہ۔ اپنے کمان کی طرح کے خمدہ دہروؤں، اپنی لطیف رنگت اور اپنے کتابی، شہابی اور ہر قسم کے جذبات سے عاری چہرے کی غیر معمولی خوبصورتی کے باعث اسے شرقی حسن و جمال کا کامل مرقع معلوم ہوئی۔ جھوم اور اپنے ادھر، دھڑکھڑے سامان کے بیچ میں بیٹھی، بھڑکیلے سائن کا فرغل پہنے اور سر پر بنفش رد مال سجائے وہ نرم دنازک اور بدلیسی پردے کی، جسے اپنی سرزمین سے اکھڑ کر برف پر پھینک دیا گیا ہو، یا دلا رہی تھی۔ وہ بڑھیا سے ذرا پیچھے چند گھڑیوں پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے لاٹھی پلوں کے نیچے، پنی بادم کی شکل کی سیاہ غزالی نکھیں اپنے سامنے زمین پر گاڑ رکھی تھیں۔ بظاہر وہ اپنے حسن سے آگاہ معلوم ہوتی تھی اور اسی بنا پر خوف زدہ تھی۔ پیٹر اس کا چہرہ دیکھ کر اتنا متاثر ہوا کہ چوبی ہاڑ کے ساتھ ساتھ تیز تیز چلتے اس نے متعدد بار پیچھے مڑ کر اس پر نگاہ ڈالی۔ جب وہ ہاڑ کے آخری سرے پر پہنچا اور جن لوگوں کی اسے تلاش تھی انھیں کہیں نہ پایا، وہ رک گیا اور اپنے گرد پیش دیکھنے لگا۔

بازوؤں میں بیچی اٹھائے پیٹر اور بھی نمایاں ہو گیا تھا اور دوسروں کا، جن میں مرد اور عورتیں دونوں شامل تھیں، ایک گردہ اس کے ارد گرد اکٹھا ہو گیا۔

”محترم، آپ کا کوئی ساتھی کھو گیا ہے؟ شکل و صورت سے تو آپ کسی اونچے خاندان کے فرد معلوم ہوتے ہیں، ہیں نا؟ یہ بچی کس کی ہے؟“

پیٹر نے بتایا کہ بچی کسی عورت کی ہے۔ وہ سیاہ بارے میں بیویں تھی اور اپنے دوسرے بچوں کے ساتھ بالکل اسی جگہ بیٹھی تھی۔ اس نے پوچھا کہ آیا کوئی شخص اسے جانتا ہے اور یہ کہ وہ کہاں جا چکی ہے۔

”واہ، یہ لڑکا آنٹی روف ہوں گے۔“ بوزے صاحب پارسی نے ایک چمک روکسان عورت سے مخاطب ہو کر کہا۔ ”خداوند رحم فرمائے، خداوند رحم فرمائے“ اس نے پیشہ دراندہ گھن گرج سے کہا۔

”آنٹی روف؟ نہیں۔“ عورت نے کہا۔ ”بالکل نہیں۔“ نفی روف آج صبح سویرے چلے گئے تھے۔ یہ یا تو ”ریا کول سیونا کی بچی ہوگی یا ایوانوفوں کی۔“

”وہ کہتا ہے، کسی عورت، اور، ریا نکور، سیونا عام عورت تھوڑے اسی ہے، وہ تو میڈی ہے۔“ ایک گھریلو غلام

نے حاشیہ آرائی کی۔

”انہیں جانتے ہو؟ دھان پان جسم، بڑے بڑے دانت۔“ میئر نے کہا۔

”یہ بالکل ماریا کو لائیوٹا ہی ہے۔ جب یہ بھیڑیے ہم پر جھپٹے تھے، وہ لوگ باغ میں چلے گئے تھے۔“ کسان عورت نے فرانسیسی فوجیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”خداوند، ہم پر رحم فرما!“ نائب پادری نے اعانی لہجے سے کہا۔

”آپ اس طرف تشریف لے جائیں، وہ ادھر ہیں۔ وہ رہتی وہ، وہ داویل کر رہی ہے، اپنے آپ پر نہیں ہے!“ کسان عورت نے مزید کہا۔ ”ہاں، وہ رہی وہ، ادھر، بالکل سامنے۔“

لیکن میئر کا دھین اس عورت کی بات پر نہیں تھا۔ چند قدم دور جو کچھ ہو رہا تھا، کچھ سیکندوں سے اس کی توجہ اس طرف مبذول ہو چکی تھی۔ وہ آرمینی خاندان اور دو فرانسیسی فوجی سپاہیوں کو، جو اس کے قریب جا چکے تھے، بغور دیکھ رہا تھا۔ ایک فوجی نائے قد کا تیز طرار شخص شخص تھا۔ اس نے نیلا کوٹ پہنا ہوا تھا اور اس کے اوپر اسے بٹی کی جگہ رسی باندھی ہوئی تھی۔ اس کے سر پر شبیہ ٹوپی تھی اور اس کے پاؤں نیچے تھے۔ دوسرا، جس کی شکل و صورت نے میئر کی توجہ کو خاص طور پر اپنی جانب مبذول کرایا تھا، لانا اور لاغر تھا۔ اس کے کندھے خیدہ، بال بھروسے چال سست اور چہرہ احمق نہ تھا۔ اس نے مونے اور کمر درے اونٹنی دھاگے کا کوٹ، ٹیلی پتلون اور ٹوٹے پھوٹے بڑے بڑے ہسی بوٹ پہنے ہوئے تھے۔ نیلے کوٹ میں ملبوس برہنہ پاست قامت فرانسیسی آرمینیوں کے پاس پہنچا، ان سے کچھ کہا اور آؤ دیکھا نہ تاؤ، اس نے جھٹ بوڑھے کی ٹانگیں پکڑیں۔ بوڑھا حتی الامکان طراز چند اپنے بوٹ اتارنے لگا۔ دوسرا سپاہی، جیسوں میں ہاتھ ڈالے، آرمینی دوشیزہ کے سامنے جا کھڑا ہوا اور چپ چاپ ٹکٹکی باندھ کر اسے دیکھنے لگا۔

”اے، ادھر یہ بچی پکڑنا۔“ میئر نے بچی کو کسان عورت کی طرف بڑھاتے ہوئے حکم نہ انداز سے کہا۔

”اس بچی کو اس کے ماں باپ کے پاس لے جاؤ۔ اسے وہیں چھوڑ آؤ۔“ اس نے بچی کو، جو چیخے چلانے لگی تھی زمین پر لٹاتے اور تقریباً گلا پھاڑتے ہوئے کہا، اور دوبارہ فرانسیسیوں اور آرمینیوں کو دیکھنے لگا۔

بوڑھا اب نیچے پاؤں بیٹھا تھا۔ فرانسیسی نے ابھی ابھی اس سے دوسرا بوٹ پکڑا تھا اور اب وہ دونوں جوتوں میں ایک دوسرے سے نگرار رہا تھا۔ بوڑھے نے گلوگیر آواز میں کچھ کہا لیکن میئر کو جو کچھ ہو رہا تھا، اس کی بخش جھٹک دکھائی دی۔ اس کی ساری توجہ موٹا جھوٹا اونٹنی کوٹ پہنے فرانسیسی پر مبذول تھی۔ یہ فرانسیسی اس عرصے کے دوران میں جھوٹا جھوٹا جوان دوشیزہ کے قریب پہنچ چکا تھا اور جیسوں سے ہاتھ نکال کر اس کی گردن اپنی گرفت میں سے پکڑا تھا۔ حسین و جمیل آرمینی دوشیزہ لانی پلکیں جھکائے بلے جے بغیر اسی انداز سے بچی جگہ بیٹھی رہی۔ اب معلوم ہوتا تھا کہ فوجی جو کچھ اس کے ساتھ کر رہا ہے، اس نے اسے نہ دیکھا ہے اور نہ محسوس کیا ہے۔

میئر اور فرانسیسیوں کے مابین جو چند قدموں کا فاصلہ تھا، جب تک وہ اسے ملے کرنا، ماننا، ترقی دوشیزہ کا

نیکلس کھسوٹ چکا تھا۔ لڑکی نے اپنا گلا پکڑا اور پوری ٹوٹ سے دلدوز چنچ ماری۔

”اس لڑکی کو چھوڑ دو!“ میٹر نے لہجے اور خمیدہ ٹوچی کو کندھوں سے پکڑتے اور اسے ایک طرف دھکا دیتے ہوئے غصیلی اور بھڑائی ہوئی آواز سے کہا۔

سپاہی گر پڑا، جوں توں کر کے اٹھا اور بھاگ پڑا۔ مگر اس کے ساتھی نے بوٹ نیچے پھینکے، اپنی ٹکوار پر ہاتھ رکھا اور تہدید کی انداز سے میٹر کی جانب بڑھا۔

”ہونہر، سنھرو، یہاں ٹٹ کھٹیاں نہیں چلیں گی!“ وہ دہاڑا۔

میٹر غصے سے، تنا کھول رہا تھا کہ اسے تن بدن کا ہوش نہ رہا اور اس کی ٹوٹ میں دس گنا اضافہ ہو گیا۔ وہ برہنہ ٹوچی کی طرف بڑھا اور میٹر اس کے کہ وہ اپنی ٹکوار سونت سکے، اس نے اسے زمین پر پٹخ دیا اور اس پر گھونسوں کی بارش کر دی۔ جھوم نعرہ دئے تحسین بلند کرنے لگا اور اسی دم حیرہ بردار فرانسیسی گھوڑ سواروں کا گشتی دستہ سڑک کا سوز کا شاد ہاں پہنچ گیا۔ وہ تیزی سے آگے بڑھے اور انھوں نے میٹر اور فرانسیسی کے گرد گھیرا ڈال دیا۔ اس کے بعد کیا ہوا، میٹر کو کچھ یاد نہ رہا۔ اسے صرف اتنا معلوم تھا کہ وہ کسی کی پٹائی کر رہا تھا اور خود اس سے پٹ رہا تھا، یہ کہ آخر کار اس کے ہاتھوں میں ہتھکڑی پہنا دی گئی، فرانسیسی فوجیوں کے ایک گروہ نے اسے اپنے نرے ٹیس لے لیا اور اس کی جامہ تلاشی لی۔

”لیٹیننٹ، اس کے پاس فخر ہے۔“ میٹر نے دلیں، غلط سنے۔

”ہائیکس، ہتھیار!“ فسر پکارا۔ اور اس نے برہنہ پافر انسیسی کی جانب، جسے میٹر کے ساتھ گرفتار کر لیا گیا تھا، متوجہ ہو کر کہا۔ ”بہت خوب۔“ یہ بات یاد رکھنا اور فوجی عدالت کو بتانا۔“ اس کے بعد وہ میٹر سے مخاطب ہوا اور پوچھنے لگا: ”فرانسیسی بولتے ہیں؟“

میٹر نے اپنے ارد گرد خونخوار نظروں سے دیکھا اور کوئی جواب نہ دیا۔ اس کا چہرہ مازنا بھیا تک ہو گا کیونکہ افسر نے زیر لب کچھ کہا اور چار مزید گھوڑ سوار آگے بڑھے۔ وہ میٹر کے دونوں جانب کھڑے ہو گئے۔

”فرانسیسی بولتے ہیں؟“ افسر نے اپنے اور میٹر کے مابین فاصلہ برقرار رکھتے ہوئے اپنی بات پھر دہرائی۔

”ترجمان کو بلاؤ۔“

سولین روسی لباس پہنے ایک کوتاہ قامت شخص عام سپاہیوں کی صف سے آگے بڑھا۔ اس کے لباس، ٹوڑے ٹنگو سے میٹر جھٹ پٹ پہچان گیا کہ وہ ماسکو کی دکانوں میں کام کرنے والا کوئی فرانسیسی سبزی فروش ہے۔

”یہ کوئی عام شخص معلوم نہیں ہوتا۔“ ترجمان نے میٹر کو غور دیکھتے ہوئے کہا۔

”ادنیہ! مجھے تو یہ کوئی آتش زن معلوم ہوتا ہے۔“ افسر نے کہا۔ ”اس سے پوچھو کہ یہ ہے کون۔“

”آپ کون ہیں؟“ ترجمان نے فرانسیسی لہجے میں روسی بولتے ہوئے کہا۔ ”آپ کو افسر کے سوال کا جواب دینا ہو گا۔“

”میں کون ہوں؟ یہ میں تمہیں نہیں بتاؤں گا۔ میں تمہارا اسیر ہوں۔ مجھے لے چلو۔“ میٹر نے پانک فراٹھی میں کہا۔

”اوہو!“ افسر قہر آؤدنگا ہوں سے دیکھتا بڑبڑایا۔ ”اچھا، پھر چلو!“

گھوڑ سواروں کے ارد گرد لوگوں کا جمگھٹا ہو چکا تھا۔ چیچک روکسن عورت بھی اٹھائے میٹر کے قریب کھڑی تھی۔ جب گشتی دستہ روانہ ہونے لگا، وہ آگے بڑھی۔

”مائی ڈیئر، یہ لوگ تمہیں کہاں لے جا رہے ہیں؟“ اس نے کہا۔ ”اور یہ ننھی منی پکی ننھی منی پکی۔ کرہ ان کی ہوئی، پھر میں اس کا کیا کروں؟“

”یہ عورت کیا چاہتی ہے؟“ افسر نے دریافت کیا۔

میٹریوں نظر آ رہا تھا جیسے وہ نشے میں ہو۔ جس پکی کو اس نے بچایا تھا، اسے دیکھ کر اس کی مسرت دوچند ہو گئی۔ ”یہ کیا چاہتی ہے؟“ وہ چلا کر بور۔ ”وہ میرے پاس میری ننھی منی پکی لا رہی ہے۔ اسے میں نے بھی، بھی، گگ کے شعلوں سے بچایا ہے۔“ اس نے کہا۔ ”خدا حافظ!“

اور قطعاً یہ جانے بغیر کہ اس نے یہ بے مقصد جھوٹ کیوں گل دیا تھا، وہ فاتحانہ شاں سے فراٹھی نوچوں کے مابین چلتے لگا۔

فراٹھی جرنیل روڈنوس نل (Durosnel) کے احکام پر جو فراٹھی گشتی دستے لوٹ مار روکنے اور سب سے بڑھ کر آتش زنیوں کو گرفتار کرنے کے لیے روانہ کیے گئے تھے، یہ ان میں سے ایک تھا۔ اس روز اعلیٰ فراٹھی حکام عام خیل یہ تھا کہ ماسکو میں آگ لگنے کے جو واقعات ہو رہے ہیں، ان کے پس پردہ آتش زنیوں کا ہاتھ ہے۔ تلف مرکوں پر گشت کرنے کے بعد اس گشتی دستے نے پانچ مزید دی۔ ایک دکاندار، مذہبی مدرس کے دو طالب علم، ایک کسان اور ایک خانگی غلام اور متعدد دیگر اشخاص، جو لوٹ مار میں مصروف تھے، گرفتار کر لیے۔ جب انہیں رات گزارنے کے لیے زوبو کی بند پر واقع وسیع و عریض مکان میں، جو بطور حوانات ستمناں کیا جا رہا تھا لایا گیا میٹر کو دوسروں سے الگ تھلگ کر دیا گیا اور اس پر سخت پہرا بٹھا دیا گیا۔

چوتھی کتاب

حصہ اول

۱

اس عرصے کے دوران میں پیٹرز برگ کے اونچے حلقوں میں رومانسٹیف، فرانسیسیوں، ماریا لیوڈرڈ، ناہزار یوج، اور دوسرے لوگوں کے گروہوں کے مابین پیچیدہ نوعیت کی جنگ برپا تھی۔ اگرچہ اس میں پہلے کی نسبت کہیں زیادہ شدت آچکی تھی لیکن وہ حسب معمول لہجوں، نچوڑوں کی، ہنسناسٹ میں ڈوب چکی تھی۔ تاہم پیٹرز برگ کی آرام طلب اور عیش کوش زندگی، جسے زندگی کے صرف واسطوں اور پرچھائیوں سے واسطہ تھا، اپنے لگے بندھے انداز سے جاری تھی۔ چنانچہ روسی قوم، اب جن خطرات اور مشکلات میں گھر چکی تھی، اس کا اندازہ کرنے کے لیے کہیں زیادہ کوشش درکار تھی۔ وہی استقبالیہ اور بال تھے، وہی فرانسیسی تھیں، وہی درباری مفادات اور سرکاری محکموں میں وہی گروہ بندیاں اور سازشیں۔ صرف اعلیٰ ترین حلقوں میں اصل صورت حال کی نزاکت اور مشکلات کو ذہن میں رکھنے کی سعی کی جاتی تھی۔ ان صبر آزما حالات میں دونوں امپراطوریں^۱ جو مختلف رویے اپنائے ہوئے تھیں، لوگ صرف سرگوشیوں میں ان کا تذکرہ کرتے تھے۔ مادرملکہ ماریا لیوڈرڈ کو ان تعلیمی اور فلاحی اداروں کی، جو اس کی سرپرستی میں چل رہے تھے، بہبود کی بہت فکر تھی۔ اس نے حکم دیا کہ انھیں قازان منتقل کر دیا جائے۔ (ان اداروں کا سامان پہلے ہی باندھا جا چکا تھا) تاہم جب امپراطورہ ایلزا وٹا الیکسیوینا سے دریافت کیا گیا، "آپ کیا حکام صادر فرماتا چاہیں گی؟" تو اس نے اپنے مخصوص جذبہ حب الوطنی سے جواب دیا کہ وہ سرکاری اداروں کے بارے میں کوئی ہدایات نہیں دے سکتی کیونکہ یہ معاملات فرماں روا کے مملکت کے حیثیت اختیارات میں آتے ہیں، لیکن جہاں تک اس کی اپنی ذات کا تعلق ہے، وہ سب سے آخر میں پیٹرز برگ کو خیر باد کہے گی۔

آٹنا پادلونا کے ہاں چھبیس گت کو، عین اس روز جب بارودی نوک لڑائی جاری تھی، محفل منعقد ہوئی۔ اس محفل کی سب سے بڑی کشش یہ تھی کہ اس میں اس مراسلے کی، جو اسکو کے عزت مآب بشپ نے زار کوینٹ سرگی کے ایجنے کے ساتھ ارسال کیا تھا، خواندگی ہونا تھی۔ یہ خند کیسائی اور حب الوطنانہ باغث کا شوق تصور کیا گیا تھا۔ پرنس واسیلی نے، جس کے فن خطابت کی بڑی دھوم تھی (وہ امپراطورہ کے ہاں بھی ایک سے زیادہ مرتبہ اس کی خواندگی کر چکا تھا)، اسے پڑھ کر سنانا تھا۔ اس کا کمال یہ تھا کہ وہ بلند اور مترنم لہجے سے الفاظ کی ادائیگی کرتا تھا۔

کبھی اس کے لہجے میں اتنی یاس ہوتی کہ وہ فریاد کرتا نظر آتا اور کبھی اس میں نوحہ خراں کی ملاکت درآتی۔ اہم جہاں تک معافی کا تعلق ہے، وہ ان کی رشتی برابر بردہ نہ کرتا۔ وہ کس لفظ کو فریاد کنناں کے اور کس کو نوحہ خراں کے انداز سے ادا کرتا، یہ محض اتفاق کی بات ہوتی۔ جیسے کہ آٹنا پاولوونا کی محفوں کا بدلی دستور تھا، یہ خزانہ کی سیاسی اہیت کی حامل تھی۔ اس شام متعدد شخصیات کی آمد متوقع تھی۔ مقصد انھیں ان کے فرانسیسی تھیٹروں میں جانے پر شرمندہ کرنا اور ان کے دلوں اور دماغوں میں حب الوطنی کے جذبات ابھارنا تھا۔ لوگوں کی ابھی خاصی تعداد پہلے ہی پہنچ چکی تھی لیکن جب آٹنا پاولوونا نے دیکھا کہ وہ تمام اشخاص، جن کی موجودگی وہ ضروری تصور کرتی تھی، ابھی تک نہیں آئے، اس نے خواندگی موخر کر دی اور عمومی گفتگو چلنے دی۔

پیٹرز برگ میں اس دن کی اہم ترین خبر کاؤنٹس بزدخود کی علالت تھی۔ اس کی طبیعت چند روز قبل غیر متوقع طور پر بگڑ گئی تھی۔ وہ متعدد محفوں میں، جنھیں وہ اپنی موجودگی سے رونق بخشا کرتی تھی، شریک نہیں ہو سکی تھی، اور نے میں آیا تھا کہ وہ کسی بھی شخص کو اپنے گھر آنے کی اجازت نہیں دے رہی۔ پیٹرز برگ کے نائی گری ڈکڑوں کی بجائے، جوت م طور پر اس کی خدمت میں حاضر ہوا کرتے تھے، اس نے اپنے آپ کو ایک اطالوی ڈاکٹر کی تحویل میں دے دیا تھا۔ وہ اس کا کسی نئے اور غیر معمولی طریقے سے علاج کر رہا تھا۔

یہ بات ہر کہہ دم کے علم میں تھی کہ اس کی علالت کا سبب وہ مشکل تھی جو سے بیک دلت دوشوہروں کے ساتھ نکاح کرنے کے سبب سے پیش آرہی تھی اور یہ کہ اطالوی علاج کا مقصد اس مشکل کا دور کرنا تھا۔ تاہم آٹنا پاولوونا کی موجودگی میں کسی شخص کی یہ مجال نہیں تھی کہ وہ اس قسم کا کوئی خیال اپنے دل میں بھی لائے، یہ ظاہر کرنا کہ وہ اس کے متعلق جانتا ہے تو بہت دور کی بات تھی۔

”سنا ہے کہ بے چاری کاؤنٹس کی طبیعت سخت خراب ہے۔ ڈاکٹر کا خیال ہے کہ وہ جمع الصدر میں مبتلا ہے۔“

”جمع الصدر؟ یہ تو بڑا نامراد مرض ہے!“

”سنا ہے کہ وہ جمع الصدر کی وجہ سے رقیبوں میں صلح ہو گئی ہے۔“

لفظ ”جمع الصدر“ مزے لے لے کر دہرایا گیا۔

”سنا ہے کہ بوڑھے کاؤنٹ کی حالت بہت ابتر ہے، دیکھ کر ترس آتا ہے۔ جب ڈاکٹر نے اسے بتایا کہ مرض

بہت خطرناک ہے، وہ بچوں کی طرح ہلک ہلک کر رہا۔“

”اوہ، اس سے تو بڑا زبردست نقصان ہوگا۔ کیا من موہنی خاتون ہے“

”تم نوگ بے چاری کاؤنٹس کی باتیں کر رہے ہو؟“ آٹنا پاولوونا نے ایک ٹولی کے مابین بیٹھے ہوئے کہا۔

”میں نے اس کی علالت کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی غرض سے آدمی بھیجا تھا۔ مجھے بتایا گیا ہے کہ

اب اس کی حالت قدرے بہتر ہے۔ وہ، اس میں کلام نہیں کہ پوری دنیا میں اس سے بڑھ کر آپ کو سحر انگیز خاتون

نہیں ملے گی۔“ اس نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ اپنی اس گرم جوشی پر وہ خود مسکرا رہی تھی۔ ”گو ہمارا تعلق

مختلف کیسوں سے ہے لیکن یہ بات مجھے اس کی وہ تحسین کرنے سے نہیں روکتی، جس کی وہ مستحق ہے۔ بے چاری قسمت کی بیٹی ہے!“ آتنا پاولوونا نے مزید کہا۔

یہ فرض کرتے ہوئے کہ کاؤنٹس کی علالت پر اسرار کا جو پردہ پڑا ہوا تھا، آتنا پاولوونا نے اپنے ان الفاظ سے اسے قدرے سرکا دیا ہے، ایک ناعاقبت اندیش نوجوان نے جرأت و عداوت سے کام لے کر تعجب کا اظہار کیا کہ نائی گرامی ڈاکٹر دل کو بلایا تک نہیں گیا اور ان کے بجائے کاؤنٹس کا علاج کوئی عطائی کر رہا ہے، اسے اندیشہ تھا کہ کہیں وہ کوئی خطرناک ادویات تجویز نہ کر دے۔

”ہو سکتا ہے کہ تمہیں مجھ سے بہتر معلومات حاصل ہوں۔“ آتنا پاولوونا نے نا تجربہ کار نوجوان کو زہرا لود نگاہوں سے گھورتے ہوئے بے اعتنائی سے جواب دیا۔ لیکن مجھے انتہائی مستند ذرائع نے بتایا ہے کہ یہ ڈاکٹر غیر معمولی طور پر ہوشیار اور پڑھا لکھا شخص ہے۔ وہ ملک سپانیہ کا ذاتی معالج ہے۔“

اس نوجوان کو چاروں شانے چت گرانے کے بعد آتنا پاولوونا ایک دوسری ٹولی کی طرف متوجہ ہوئی۔ وہاں ہلین آسٹریوؤں کے متعلق گفتگو کر رہا تھا۔ اپنی پیشانی پر شکن ڈالنے کے بعد وہ بظاہر کوئی پھرکتا ہوا جملہ کہہ کر دوبارہ پرسکون ہونا چاہتا تھا۔

”مجھے تو یہ بہت مزے کی چیز معلوم ہوتا ہے۔“ اس نے ایک سفارتی مراسلے کی طرف، جو یوایا ارسال کیا گیا تھا، اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ [اس مراسلے کے ساتھ چند آسٹریو پرچم جنہیں وٹ گین شائین نے فرانسیسیوں سے چھینا تھا، بھیجے گئے تھے۔ وٹ گین شائین کو بیئر برگ میں ”پیوٹر پرل کا سیرڈ“ کہا جانے لگا تھا۔]

”کیا؟ کیا کہا؟“ آتنا پاولوونا نے کہا۔ وہ اس کے ظرفانہ جملے کو پہلے بھی سن چکی تھی۔ اب جو اس نے مداخلت کی تو اس کا اثر یہ ہوا کہ سامعین نے چپ سا رہ لی۔

اور ہلین نے سفارتی مراسلے کے، جو اس کے اپنے ذہن کی پیداوار تھیں، مندرجہ ذیل اصل الفاظ دہرائے:

”امپراطور یہ پرچم،“ اس نے کہا، ”یہ دوستانہ پرچم، جو بھٹک گئے تھے اور غلط شاہراہ پر پائے گئے تھے، واپس کر رہا ہے۔“ اس نے اپنی پیشانی کی شکنیں دہر کرتے ہوئے کہا۔

”وچسپ، دلچسپ،“ پرنس واسیلی نے کہا۔

”شاید یہ شاہراہ وار سا جاتی ہے۔“ پرنس ایپولیت نے غیر متوقع طور پر بآواز بلند کہا۔

تمام لوگوں کی نگاہیں اس کی طرف اٹھ گئیں۔ کسی کی سمجھ میں نہ آیا کہ اس کا مطلب کیا تھا۔ پرنس ایپولیت نے بھی اپنے گرد و پیش یوں دیکھا جیسے وہ بہت محفوظ ہو رہا ہو۔ دوسرے لوگوں کی طرح خود اسے بھی یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ کیا کہنا چاہتا تھا۔ اپنی سفارتی ملازمت کے دوران میں اس کے مشاہدے میں یہ چیز آئی تھی کہ جو باتیں اضطراری پر کہہ دی جاتی ہیں، وہ بذلہ سنجی کا شاہکار ثابت ہوتی ہیں، چنانچہ وہ ہر موقع پر پہلی بات، جو اس کے ذہن میں آتی تھی، کہہ دیتا تھا۔ ”ممکن ہے اس مرجہ کی بات بہت اچھی ثابت ہو۔“ وہ سوچتا۔ ”اگر ایسا نہ بھی ہوا، پھر بھی ان میں

سے کوئی نہ کوئی شخص اس کا کوئی نہ کوئی مفہوم نکال ہی لے گا! "پرنس ایپولیت کے جیسے کے بعد جو کنڈھب خاموش چھائی، اس کے دورن میں وہ آدمی، جس کی حسب اوطنی مطلوبہ معیار پر پوری نہیں اترتی تھی اور جس کا آٹا دلوونا کو، انتظار تھا۔ کمرے میں داخل ہونا۔ سنا پادلوونا اسے دیکھ کر مسکرائی اور وہ پرنس ایپولیت کی جانب انگلی ہرستے ہوئے پرنس واسیلی سے ملتی ہوئی کہ وہ مسودے کی، جو روموم بقیوں کے سامنے میز پر پڑا تھا، خواندگی شروع کرے۔ سب حاضرین خاموش ہو گئے۔

"واما تبار، عالی قدر، امپراطور معظم" پرنس واسیلی نے درشت لہجے سے آغاز کیا۔ اس نے اپنے سامعین کی طرف کچھ اس انداز سے دیکھا جیسے وہ دریافت کرنا چاہتا ہو کہ کسی کو اس سے اختلاف تو نہیں اور وہ اس کے برعکس کہتا تو نہیں چاہتا، لیکن کسی نے کچھ نہ کہا۔ "ماسکو، ہمارا قدیم پایہ تخت، تبارِ عظم، اپنے مسیحا کو خوش آمدید کہتا ہے" اس نے اچانک لفظ اپنے پر خاص زور دیا۔ بالکل اسی طرح جس طرح ماں اپنے جو شیلے بیٹوں کو خوش آمدید کہتی ہے اور ان سے بغل گیر ہوتی ہے۔ "دھند کے جو بادل اکٹھے ہو رہے ہیں، ان میں سے اسے (ماسکو) آپ کے مہذبوں کی درخشانی دتابانی نظر آتی ہے اور وہ دفور سرت سے نغمہ سرا ہوتا ہے: "ہو عشنا مبارک ہیں وہ جو قدم رنجہ فرماتے ہیں!" پرنس واسیلی نے آخری الفاظ یوں ادا کیے جیسے وہ نوحہ پڑھ رہا ہو۔

پلیسین نے نہایت انہماک سے اپنے ناخنوں کا معائنہ کیا اور سامعین میں سے متعدد اشخاص مغرب دکھائی دیے جیسے انھیں تعجب ہو کہ ن سے کیا خطا سرزد ہو گئی ہے۔ آٹا پادلوونا نے اگلے الفاظ بالکل اس عورت کی طرح، جو عشائے ربانی پر متدہی مزہ میں مناجات پڑھتی رہتی ہے، ہنسی ادا کر دیے:

"اگر گستاخ اور ڈھیٹ جو لیت... وہ زیر لب کہہ رہی تھی۔

پرنس واسیلی نے اپنی خواندگی جاری رکھی:

"اگر گستاخ اور ڈھیٹ جو لیت فرانس کی سرحدوں سے نکل کر مملکت روس کو محصور کرتا ہے اور اپنی جلو میں موت کی دشتیں اور دشتیں لاتا ہے، کوئی پروا نہیں، سیدھا سادا عقیدہ، جو روسی داؤد کا قلہ خن ہے، چشم زدن میں اس کے خونخوار تکبر سمیت اس کا سراڑ اڑے گا۔ تقدس مآب سینٹ سرجی کا یہ یقین نہ جو ہمارے وطن عزیز کی نلاج و بہبود کے لیے اتنا سرگرم عمل ہے، یوزر اپرمل میچٹکی کی خدمت اقدس میں پیش کیا جا رہا ہے۔ میں بہت دکھ سے یہ عرض کرتا ہوں کہ میرے ضعف اور ناتوانی نے، جو روز بروز بڑھتے جا رہے ہیں، مجھے اس قابل نہیں چھوڑا کہ میں خود آپ کی بارگاہ میں حاضر ہو سکوں اور آپ کی انتہائی واجب الاحترام اور بابرکات ذات کی زیارت کر کے اپنے دل کو شھدک پہنچا سکوں۔ میں بھیم قلب گڑگڑا کر خداوند کے حضور دعا کرتا ہوں کہ قادر مطلق راست مندوں کے درجات بلند فرمائے اور یوزر میچٹکی کی آرزوؤں کو اپنے فضل و کرم سے شرف قبولیت بخشے۔"

"Quelle force! Quel style!" قاری اور مصنف دونوں کی یکساں تعریف میں آوازیں بلند ہوئیں۔

اس نصاحت اور بلاغت نے آئنٹاپاولونا کے مہمانوں کو سرشار کر دیا اور ان کے اندر نئی روح پھونک دی۔ وہ خاصی دیر تک اپنی مادر وطن کے حالات کے بارے میں آپس میں بحث و تحقیق کرتے رہے اور اگلے چند روز کے اندر جوڑائی لڑی جانا تھی، اس کے نتیجے کے متعلق مختلف قیاسات کے گھوڑے دوڑاتے رہے۔

”آپ دیکھیں گے کہ کل زار کی سال گرہ پر ہمیں خبر مل جائے گی۔“ آئنٹاپاولونا نے کہا۔ ”میرا دل کہتا ہے کہ خیر خوش کن ہی ہوگی۔“

2

اور سچی بات یہ ہے کہ آئنٹاپاولونا نے جو پیش گوئی کی تھی، وہ صحیح ثابت ہوئی۔ اگلے روز اس پر طور کی سال گرہ کے اعزاز میں محل میں خصوصی عبادت کا انتظام کیا گیا تھا، اس کے دوران میں پرنس ویکٹورسکی کو شاہی گرجے سے باہر بلایا گیا اور اسے کوتوزوف کا مراسلہ پہنچایا گیا۔ کوتوزوف نے اپنی یہ رپورٹ لڑائی کے روزنامہ مارینوف کے مقام پر لکھی تھی اور اس نے اطلاع دی تھی کہ روسی ایک قدم بھی پیچھے نہیں ہٹے، یہ کہ فرانسیسیوں کے نقصانات ہمارے نقصانات سے کہیں زیادہ ہیں اور یہ کہ وہ یہ مراسلہ میدان جنگ سے غلٹ میں رقم کر رہا ہے اور اسے اتنا وقت نہیں مل سکا کہ وہ تازہ ترین معلومات اکٹھی کر سکتا۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا گیا کہ فتح لازماً روسیوں کی ہوئی ہوگی۔ چنانچہ گرجے سے باہر نکلے بغیر جھٹ پٹ خالق کائنات کا شکر ادا کیا گیا کہ اس نے (روسیوں کو) اپنی نصرت سے سرفراز کیا اور (انہیں) فتح سے ہم کنار کیا۔

آئنٹاپاولونا کی پیش گوئی کی تکمیل ہو گئی اور اس روز تمام شہر میں فرحت بخش تعطیل کی کیفیت طاری رہی۔ ہر شخص کو یقین تھا کہ ہمیں فتح کا مل نصیب ہوئی ہے اور اس میں کسی چوٹ و چرا کی گنجائش نہیں ہے۔ بعض لوگوں نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ پولین قیدی بنالیا گیا ہے، اسے تخت سے معزول کر دیا گیا ہے اور فرانس میں نیا حکمران مقرر کر دیا گیا ہے۔

وہ واقعات جو بیسیوں میل دور پیش آتے ہیں، درباری ماحول میں اور اتنی دوری سے ان کی وسعت اور قوت کا صحیح اندازہ لگانا انتہائی دشوار ہوتا ہے۔ عمومی واقعات کا تا نا بانا ناگزیر طور پر کسی انفرادی وقوعے کے گرد تشکیل پاتا ہے۔ چنانچہ اب درباریوں کو جو خوشی ہو رہی تھی، اس کا تعلق جتنا اس چیز سے تھا کہ فتح حاصل ہو گئی ہے، اتنا ہی اس حقیقت سے بھی تھا کہ (فتح کی) خبر زار کی سال گرہ کے موقع پر موصول ہوئی ہے۔ یہ بالکل ایسے ہی تھا کہ کوئی ایسی چیز جس کا آدمی کو سانپ ہونے لگا، کامیابی سے ترتیب دے دی گئی ہو۔ کوتوزوف نے اپنی رپورٹ میں چند ہلاک شدگان کا ذکر بھی کیا تھا اور دوسرے لوگوں کے علاوہ ان میں جج کوٹ، باگ راتیاں اور گوتائی سوف کے نام بھی درج کیے تھے۔ جہاں تک دفعے کے افسوس ناک پہلو کا تعلق ہے، یہاں پشیرز برگ کی دنیا میں ایک بار پھر وہ ناگزیر طور پر صرف ایک وقوعہ۔ گوتائی سوف کی ہلاکت۔ پر مرکوز تھا۔ ہر شخص اسے جانتا تھا، ہزار اسے پسند کرتا تھا۔ وہ نوجوان تھا

اور دلچسپ تھا۔ اس روز باہمی ملاقاتوں کے دوران میں لوگ بد میں اتفاق ایک دوسرے سے گفتگو کرتے تھے۔
 ”کیا حیرت انگیز اتفاق ہے! عین عبادت کے دوران میں خوش خبری موصول ہوئی! لیکن کوتائی سوف کی موت کتنا بڑا صدمہ ہے! حیف بھد حیف! دل پر چھریاں پھل گئیں!“

”میں نے کوتا زوف کے متعلق آپ کو کیا بتایا تھا؟“ پرنس واسیلی پیغمبرانہ فخر و اہتمام سے کہتا تھا۔ ”میں نے ہمیشہ یہی کہا کہ وہ واحد شخص ہے جس میں نبوین کو شکست دینے کی صلاحیت ہے۔“

لیکن اگلے روز فوج سے کوئی خبر اخبار موصول نہ ہوئی اور عام لوگوں کے اذہان میں تفکرات سر اٹھنے لگے۔ امید و بیم کی کیفیت میں زار جس اذیت میں مبتلا تھا، درباریوں کو اس اذیت سے اذیت ہو رہی تھی۔

”زار زار کی حالت کا اندازہ تو لگائیں!“ وہ کہہ رہے تھے اور گزشتہ روز کی طرح کوتا زوف کی تعریف و ستائش میں رطب اللسان ہونے کے بجائے اب وہ اسے مدحیوں سارے تھے کہ اس نے امپراطور کو پریشانوں میں مبتلا کر دیا ہے۔ پرنس واسیلی اب اپنے ممدوح کے بارے میں ڈینگیں مارنے سے گریز کرنے لگا اور جب بھی کما نڈرا نجیف کا ذکر آتا وہ چپ رہ جاتا۔

مزید برآں، گویا کہ کائنات کی ہر چیز پیٹرز برگ کے اشراف کو پریشانوں اور خدشات میں مبتلا کرنے کے لیے ادھار کھائے بیٹھی ہو، شام کے قریب ایک اور ہول ناک خبر کا اعلان ہو گیا۔ کاؤنٹس بزدخود کا ایک اس روز فر مرض سے، جس کے بارے میں باتیں بنا کر لوگوں کو بہت طف آتا تھا، انتقال ہو گیا ہے۔ بڑے بڑے اجتماعات میں ہر کس و ناکس یہ سرکاری کہانی دہراتے نہ تھکتا کہ کاؤنٹس پر وجع الصدر کا شدید دورہ پڑا اور وہ اس سے جان بڑھ ہوئی۔ تاہم بے تکلف احباب کے حلقوں میں کچھ اس قسم کی تفصیلات منظر عام پر آنے اور گفتگو کا موضوع بنے گی نہیں کہ ملکہ ہسپانیہ کے ذاتی معالج نے خاص نتائج حاصل کرنے کے لیے خاص قسم کی ادویات کی حقیقت خور کیس تجویز کی تھیں لیکن ہیلین مجوزہ حدود سے سجدہ کر گئی، اس نے ادویات کی خاصی بڑی مقدار نگلی اور وہ کسی قسم کی مدد ملنے سے پہلے ہی جاں بحق ہو گئی۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ سممر کاؤنٹ کو اس کے بارے میں شکوک لاحق ہوئے اور وہ ہو گئے تھے، ورنہ دوسری یہ کہ اس کے شوہر (وہی ”بد ذات، آوارہ، در بد چلن“ میٹر) نے اس کے خط کا جواب نہیں دیا تھا۔ کہا جاتا تھا کہ پرنس واسیلی اور سممر کاؤنٹ اطالوی ڈاکٹر کے خلاف کارروائی کرنا چاہتے تھے لیکن سو خزانہ کرے بد قسمت کاؤنٹس کے کچھ ایسے خطوط دکھائے کہ انھوں نے جھٹ پٹ سا معاملہ ٹھپ کر دیا۔

لوگوں کی گفتگو عام طور پر تین افسوس ناک موضوعات پر۔ امپراطور کے لیے اطلاعات کی عدم دستیابی، کوتائی سوف کی ہلاکت اور ہیلین کا انتقال۔ سرگورہ رہتی تھی۔

کوتا زوف کے مرض کی وصولی کے چوتھے روز ماسکو کا ایک جاگیردار پیٹرز برگ پہنچا اور جنگل کی آگ کی طرح سارے پیٹرز برگ میں یہ خبر پھیل گئی کہ ماسکو فرانسیسیوں کے حوالے کر دیا گیا ہے۔ یہ خبر بہت بھانگ تھی! زار بڑی مصیبت میں پھنس گیا تھا! کوتا زوف پر غداری کا ٹھپا لگ چکا تھا اور پرنس واسیلی، جوازیس پیٹرس اس کی تعریفیں

کر رہا نہیں تھکتا تھا، اب یہ سب کچھ بھول بھال ان لوگوں سے، جو اس کی بیٹی کے انتقال پر اس کے پاس تعزیت کرنے آتے تھے، گفتگو کے دوران میں یہ کہنے لگا کہ اس اندھے اور بدتماش بڑھے سے اس کے علاوہ اور کسی چیز کی توقع کی ہی نہیں جاسکتی تھی۔ (ویسے اگر آپے غم میں اسے وہ سب کچھ، جو وہ اس سے پہلے کہا کرتا تھا، یاد نہیں رہا تھا تو وہ قابل معافی تھا۔)

”مجھے تو اچنبھ اس بات پر ہو رہا ہے کہ روس کی تقدیر اس قسم کے آدمی کے ہاتھوں میں تھما دی گئی۔“
جب تک خبر سرکاری نہیں تھی، اس کے بارے میں شک و شبہ کرنا ممکن تھا لیکن چوبیس گھنٹے بعد کاؤنٹ سٹوپ چن کی طرف سے مندرجہ ذیل اطلاع موصول ہوئی۔

”پرنس کوٹوزوف کے ایجوٹنٹ نے مجھے ایک مراسلہ دیا ہے۔ اس میں مطالبہ کیا گیا ہے کہ فوج کو ریا زان روڈ تک بحفاظت پہنچانے کے لیے پولیس افسر بھیج دیے جائیں۔ وہ کہتے ہیں کہ وہ نہایت انسوں سے ماسکو کو اس کے حال پر چھوڑ رہے ہیں۔ کوٹوزوف کے طرز عمل نے دارالسلطنت اور آپ کی مملکت کا فیصلہ کر دیا ہے۔ قوم کو جب یہ معلوم ہوگا کہ وہ شہر، جو روس کی عظمت کی نمائندگی کرتا ہے اور جس میں آپ کے بزرگوں کے اجساد خاکی دفن ہیں، دشمن کے قبضے میں چل گیا ہے، وہ سرتاپا کاپے لگے گی۔ میں فوج کے پیچھے جا رہا ہوں۔ میں نے یہاں سے سب کچھ باہر بھجوا دیا ہے اور اب میرے لیے صرف ایک ہی کام رہ گیا ہے کہ مادر وطن کی حاست زار پر آنسو بہا رہا ہوں۔“
اس مراسلے کی وصولی کے بعد امپراطور نے پرنس ولکنسکی کو مندرجہ ذیل شاہی مکتوب کے ساتھ کوٹوزوف کے پاس بھیجا:

”پرنس میخائیل الاری اوٹاویچ، مجھے اتیس اگست سے آپ کی طرف سے کوئی خبر موصول نہیں ہوئی۔ دریں اثنا مجھے کیم تمبر کو براستہ یاروسلاول ماسکو کے گورنر جنرل کی فرستادہ یہ تکلیف دہ اطلاع ملی کہ آپ نے فوج کے ساتھ ماسکو چھوڑ دینے کا فیصلہ کیا ہے۔ اس خبر نے مجھ پر جواثر کیا ہوگا، اس کا آپ بخوبی اندازہ کاسکتے ہیں اور آپ کی خاموشی نے میرے حشر میں اضافہ کر دیا ہے۔ میں اس مکتوب کے ساتھ ایجوٹنٹ جنرل ولکنسکی کو بھیج رہا ہوں تاکہ آپ سے صحیح صحیح معلوم کیا جاسکے کہ فوج کی حالت کیا ہے اور وہ کون سی وجوہات تھیں کہ آپ یہ اذیت ناک فیصلہ کرنے پر مجبور ہوئے۔“

3

ماسکو سے رست برداری اختیار کیے جانے کے نو روز بعد کوٹوزوف کا ایٹمی مصدقہ رپورٹ لے کر، کہ ماسکو کیوں پھوڑنا پڑا اور پیرزیرگ پہنچا۔ ایٹمی فرانسیسی تھا اور اس کا نام میشو (Michaud) تھا۔ اسے روسی نہیں آتی تھی اور وہ تھا بھی غیر ملکی، لیکن خود اس کے اپنے بقول وہ ”بدل و جان“ روسی تھا۔

امپراطور نے سے بلاتا خیر اپنے محل کے، جو کامینی (Kamenny) جزیرے پر واقع تھا، سٹڈی روم میں

اذن باریابی بخشا۔ میٹو جنگ چھڑنے سے قبل کبھی ماسکو نہیں گیا تھا اور اسے روکی زبان کا ایک لفظ بھی نہیں آتا تھا۔ لیکن جب وہ ماسکو کی آتش زنی کی، جس کے شعبوں نے اس کا راستہ منور کر دیا تھا، خبر لے کر (جیسا کہ اس نے تحریر کیا) "notre tres gracieux souverain" کی خدمت میں حاضر ہوا، اسے محسوس ہو رہا تھا کہ اس کے دل روناٹ شدید طور پر متاثر ہو چکے ہیں۔

موسیو میٹو کی جھنجھڑا ہٹ کا باعث جو چیز بنی تھی، اگرچہ وہ اس بات سے، جو روسیوں کے عم و اندرہ کا سبب بنی تھی، مختلف تھی، تاہم جب اسے زار کے سنڈی روم میں پہنچایا گیا، اس کے چہرے پر کچھ اس طرح کا غلاب تھا کہ پیرا طور نے جھٹ پٹ سوال کیا:

"کرمل، میرے لیے بری خبر مائے ہو؟"

"عالی جاہ، بہت بری۔" میٹو نے آہ بھرتے اور اپنی نظریں جھکاتے ہوئے کہا۔

"L'abandon de Moscou."

"کیا انھوں نے لڑے بغیر میرا قیدی در اسد طنت دشمنوں کے حوالے کر دیا ہے؟" اس نے جلدی سے پوچھا۔ ایک ایک اس کا چہرہ لال انگارا ہو گیا۔

میٹو نے نہایت احترام کے ساتھ کوتوروف کا پیغام اس کے سپرد کر دیا۔ اس میں کہا گیا تھا کہ ماسکو سے پہلے لڑائی لڑنا ناممکن ہو گیا تھا اور چونکہ اب اس کے سامنے دو ہی راستے رہ گئے تھے کہ وہ ماسکو ورنوچ دووں گنوادے یا صرف ماسکو، چنانچہ سے مجبوراً مؤخر الذکر سے ہاتھ اٹھانا پڑے۔

اپر طور میٹو کی طرف دیکھے بغیر چپ چاپ منتارہا۔

"دشمن شہر میں داخل ہو گیا ہے؟" اس نے پوچھا۔

"جی ہاں، عالی جاہ، لیکن، سکواب تک راکھ کا ڈھیر بن چکا ہوگا۔ جب میں وہاں سے روانہ ہوا تھا، وہ پورے کا پورا شعلوں کی لپیٹ میں آچکا تھا۔" میٹو نے بڑے پر زور لہجے سے جواب دیا لیکن جب اس نے نگلٹھا کر اپر طور کی جانب دیکھا، تو وہ بے حد شپٹایا کہ یہ اس نے کیا کہہ دیا ہے۔

اپر طور کی سانس اکھڑ رہی تھی اور وہ دھوکئی کی طرح چل رہی تھی۔ اس کا زیریں لب کپکپاے لگا اور اس کی خوبصورت نیلی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔

لیکن یہ کیفیت صرف ایک ثانیہ رہی۔ اچانک اس کے ہاتھ پر بل پڑ گئے جیسے وہ اپنی کمزوری پر توجہ دنا ب کھارہ ہو۔ اس نے اپنی گردن اوپر اٹھائی اور پر استقلال لہجے سے گویا ہوا:

"کرمل، جو کچھ ہو رہا ہے، اس سے معصوم ہونا ہے کہ مشیت ایزدی ہم سے عظیم قربانیوں کا مطالبہ کر رہی

۔ بے کریم انفس فرماں روا

۔ ماسکو کا راک

ہے۔ میں تمام امور میں اس کی مشیت کے سامنے سر تسلیم خم کرنے کے لیے تیار ہوں۔ مگر میثو، یہ تو بتاؤ کہ جب تم وہاں سے رخصت ہوے، میری فوج کی، جب اس نے ذرا سی مزاحمت کیے بغیر میرے قدم کی راز المسطت کو دشمن کے قبضے میں جاتے دیکھا، (دہنی) کیفیت کیسی تھی؟ کیا تم نے بے حوصلگی کے آثار دیکھے؟“

جب میثو نے دیکھا کہ امپراطور کا سکون لوٹ آیا ہے، وہ مطمئن ہو گیا لیکن وہ اس کے دونوں اور نوکینے سوال کا جواب دینے کے لیے پوری طرح آمادہ نہیں تھا۔

”غالی جاہ! کیا آپ مجھے بلا کم و کاست بات کرنے کی، جو فوجیوں کا دتیرہ ہوتا ہے، اجازت مرحمت فرمائیں گے؟“ اس نے مہلت حاصل کرنے کے لیے کہا۔

”کرٹل، میں ہمیشہ اسی چیز کا تقاضا کرتا رہا ہوں۔“ امپراطور نے جواب دیا۔ ”مجھ سے کچھ نہ چھپاؤ۔ میں صحیح صحیح جانا چاہتا ہوں کہ حانات کس نہج پر چر رہے ہیں۔“

میثو دریں اثنا اپنا جواب سوچ چکا تھا۔ وہ مؤدبانہ انداز بھی اختیار کیے رکھنا چاہتا تھا اور قدرے سخن سازی بھی برتا چاہتا تھا۔ اس کے لبوں پر خفیف سا تبسم، جو بمشکل نظر آسکتا تھا، آیا اور اس نے عرض کیا: ”غالی جاہ! جب میں وہاں سے روانہ ہوا تھا، کمانڈروں سے لے کر ادنیٰ سپاہیوں تک، تمام فوج کے منہ لٹکے ہوئے تھے اور وہ ربر دست خوں و دہشت میں جھلا تھے۔“

”کیوں؟ کس لیے؟“ امپراطور نے درشتی سے اس کی بات کاٹ کر کہا اور اس کی پیشانی شکن آلود ہو گئی۔ ”صحبت سے گھبرا کر میرے روی دل چھوڑ بیٹھے ہیں؟ نہیں، کبھی نہیں!“

میثو نے جو جملہ سوچا تھا، اس کے ادا کرنے کے لیے اسے بس اسی کا انتظار تھا۔ ”غالی جاہ!“ اس نے مؤدبانہ شکستگی سے کہا: ”انھیں ڈر صرف اس بات کا ہے کہ کہیں یور میجسٹری اپنی طبعی ٹیکو خصلی سے مار نہ کھا جائیں اور صلح پر آمادہ ہو جائیں۔ ورنہ جہاں تک ان کا اپنا تعلق ہے، ان کا خون کھول رہا ہے اور وہ نہایت بے قراری سے اس لمحے کا، جب انھیں دوبارہ نبرد آزما ہونے کا موقع ملے گا، انتظار کر رہے ہیں۔“ ردی قوم کے اس ناسخدے نے کہا: ”اور وہ اپنی زندگیوں کا نذرانہ پیش کر کے یہ ثابت کرنے کے لیے بے چین ہیں کہ وہ آپ کے کتنے جاں نثار ہیں۔۔۔“

”اٹھا!“ امپراطور نے کہا۔ اس کا اطمینان لوٹ آیا تھا اور اس کی آنکھوں میں شفقت جھلک رہی تھی۔ اس نے میثو کے شانے پر تھکی دی اور بولا: ”کرٹل تم نے مجھے میرا اطمینان قلب لوٹا دیا ہے۔“

اس نے اپنا سر جھکالیا اور کچھ دیر خاموش بیٹھا رہا۔ ”خیر، اب تم فوج میں واپس چلے جاؤ۔“ اس نے تن کر بالکل سیدھے بیٹھتے ہوئے کہا۔ اس نے میثو پر شاہانہ لیکن مشفقانہ نظر ڈالی اور بولا: ”میرے دلیر اور شجاع فوجی جوانوں۔ بلکہ جہاں کہیں بھی تم جاؤ، میری تمام رعایا۔ کو بتاؤ کہ جب میرے پاس ایک بھی فوجی نہیں بچے گا، میں پھر بھی ہار نہیں، نوں گا۔ میں اپنے چہیتے اشراف اور

معزز کسانوں کی قیادت کا فریضہ خود سنبھال لوں گا، اور اپنی مملکت کے تمام وسائل بروئے کار لاؤں گا۔ جو کہ میرے دشمن سمجھتے ہیں، میرے حیطہ اختیار میں اس سے کہیں زیادہ سمجھ ہے۔“ امپراطور نے کہا۔ اس کے جوش و خروش میں ہر لفظ اضافی ہوتا جا رہا تھا۔ ”لیکن اگر مالک ارض و سماں نے لوح محفوظ پر یہ تحریر کر دیا ہے،“ امپراطور نے جذبات سے کانپتے ہوئے اپنی خوبصورت اور شفیق آنکھیں آسمان کی جانب اٹھائیں اور اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا، ”میرے خاندان کا اپنے بزرگوں کے تحت پر جلوہ افروز ہونے کا وقت ختم ہو گیا ہے، میں اپنے زیر اختیار تمام اسلحہ کو پوری طرح استعمال کرنے کے بعد اپنی داڑھی یہاں تک برصحاؤں گا،“ (زار نے پناہ تھ اپنی بھائی پر کہا) ”اپنے دینی تریں کسانوں میں شامل ہو جاؤں گا اور ان کے ساتھ آلو کھا کر گزارہ کر لیا کروں گا لیکن اپنے وطن اور اپنی عزیز از جان قوم کے ہاتھوں پر جن کی قربانیوں کی قدر کرنا مجھے آتا ہے، کلنک کا دیکھا نہیں لگنے دوں گا۔“

یہ الفاظ مضطرب لہجے سے ادا کرنے کے بعد امپراطور نے ایک دم اچانک دوسری طرف پھیر لیا جیسے وہ میٹرو سے اپنے آنسو، جو اس کی آنکھوں میں اسٹنڈ آئے تھے، چھپانا چاہتا ہو۔ وہ اٹھ اور اپنے سنڈی روم کے انتہائی خفی سرے کی سمت چل دیا۔ وہاں وہ خاصی دیر کھڑا رہا۔ پھر وہ بے لہجے ڈگ بھرتا واپس آیا، اس نے میٹرو کی کلا کی پکڑی اور اسے زور سے بھینچا۔ اس کا نرم و گداز اور خوبصورت چہرہ تہمتار ہا تھا اور اس کی آنکھیں عزم اور آتش غضب سے دھبے رہی تھیں۔

”کنٹرل میٹرو، میں یہاں جو کچھ کہہ رہا ہوں، اسے بھلانا نہیں۔ شاید کسی روز تمہیں یہ باتیں یاد آئیں اور تم اپنے دل میں خوشی محسوس کرو۔۔۔ نیوین یا میں،“ امپراطور نے اس کی چھاتی کو چھوتے ہوئے کہا۔ ”اب ہم دونوں بیک وقت تخت نشین نہیں رہ سکتے۔“ اب میں اس کی فطرت سمجھ گیا ہوں، وہ مجھے دوبارہ فریب نہیں دے سکے گا۔“ اور امپراطور کی گفتگو میں دوبارہ وقفہ آ گیا۔ اس کی پیشانی کی لکیریں گہری ہوتی جا رہی تھیں۔

میٹرو نے، جو، ”گرچہ غیر ملکی تھ لیکن بیدل و جان روستی تھا،“ جب یہ الفاظ سنے اور اسے امپراطور کی آنکھوں میں عزم صمیم کی جھلک نظر آئی، اسے اس باوقار موقع پر یوں محسوس ہوا (جیسا کہ اس نے بعد میں بیان کیا) کہ وہ ”خوشی سے دیوانہ“ ہو جائے گا، اور اس نے اپنے درروسی حوام کے، جن کا وہ اپنے آپ کو نمائندہ تصور کرتا تھا، جذبات کو بدیں الفاظ بیان کیا:

”عالی جاہ!“ اس نے کہا، ”یور مجبشتی نے اس وقت قوم کے شان و شکوہ اور یورپ کی نجات کو تنہی بنا دیا ہے!“ امپراطور نے سر کی جنبش سے میٹرو کو رخصت ہونے کا اشارہ دیا۔

ہم جو اس زمانے میں سانس نہیں لے رہے جب آدھا دس دشمن کے قبضے میں جا چکا تھا، اسکو کے باشندے دور دراز کے صوبوں میں بھاگے جا رہے تھے وہ مادر وطن کے دفاع کے لیے جبری لام بندی کا سلسلہ جاری تھا، یہ تصور

کرنے لگتے ہیں کہ ادنیٰ و اعلیٰ تمام روسی قربانیاں دینے، مادر وطن کا تحفظ کرنے یا اس کی بربادی پر آنسو بہانے میں مصروف تھے۔ اس زمانے کے تمام قصے کہانیاں اور بیانات بلا استثناء روسیوں کی حب الوطنی، قربانی و ایثار، مایوسی و ناامیدی، کرب و اندوہ اور اولواغزی و جرأت سے بھرے پڑے ہیں۔ لیکن درحقیقت ایسا تھا نہیں۔ ہمیں یہ سب کچھ اس لیے نظر آتا ہے کیونکہ ہم اس دور کے محض عمومی نوعیت کے تاریخی مسائل کو نگاہوں کے سامنے رکھتے ہیں اور اس عہد کے لوگوں کے حوزہ آتی اور انسانی مفادات تھے، انھیں خاص طور میں نہیں مانتے۔ لیکن یہی بات یہ ہے کہ کسی بھی زمانے کے لوگوں کے لیے اپنے ذاتی مفادات عمومی نوعیت کے مسائل سے کہیں زیادہ اہم ہوتے ہیں کیونکہ انھیں کی وجہ سے ان عمومی مسائل کو، جو ملک و قوم سے بحیثیت مجموعی متعلق ہوتے ہیں، کبھی محسوس نہیں کیا جاتا۔ بلکہ درحقیقت ان کی موجودگی سے اغماض ہرنا جاتا ہے۔ واقعات کس نہج پر جا رہے تھے، لوگوں کی اکثریت کو اس سے کوئی سروکار نہیں تھا بلکہ بیشتر آبادی زیادہ تر اس فکر میں غلط رہتی تھی کہ ان کے فوری ذاتی مفادات کا کیا بنے گا اور صرف یہی لوگ تھے جن کی مصروفیات اس زمانے میں نہایت مفید ثابت ہوئیں۔ وہ اشخاص، جنہوں نے حالات کی عمومی نہج کو سمجھنے کی کوشش کی اور ذاتی ایثار و اولواغزی کے بل بوتے پر اس میں شریک ہونے کی کوشش کی، وہ معاشرے کے انتہائی ناکارہ ارکان تھے۔ انھیں ہر شے زیر و زبر ہوتی نظر آتی تھی اور انھوں نے عمومی فلاح و بہبود کے لیے جو کچھ کیا، وہ بالکل احمقانہ اور بے کار ثابت ہوا۔ میٹر اور ما، ٹون کی رجنٹیں اس کی مثال ہیں۔ انھوں نے روسی دیہات میں لوٹ مار کی اور نو جوان لڑکیاں بچیوں کے لیے جو کپڑا بنی تھیں، وہ اسے چھین کر لے جاتیں اور یوں یہ کپڑا کبھی زخموں تک نہ پہنچ پاتا، علیٰ ہذا القیاس۔ وہ لوگ بھی، جنھیں فلسفیانہ موشگافیاں بھگانے اور اپنے جذبات کے اظہار کرنے کا شوق تھا، جب روس کے اس زمانے کے حالات کو زیر بحث لاتے، لامحالہ اپنی گفتگوؤں میں منافقت اور دروغ گوئی کے عناصر داخل کر دیتے یا پھر ان اشخاص پر، جن پر ان چیزوں کے، جن کا ذمے دار کسی کو بھی نہیں ٹھہرایا جاسکتا تھا، خواہ مخوہ الزامات لگانے، کچڑا چھالنے اور ان کے خلاف اپنے بغض کی نمائش کرنے لگتے۔ وہ قانون جو ہمیں علم کے پیڑ کے پھل کا ذائقہ چکھنے کی ممانعت کرتا ہے، تاریخی واقعات میں خاص طور پر آشکار ہوتا ہے۔ صرف غیر شعوری فعل شر آور ہوتا ہے اور وہ شخص، جو کسی تاریخی واقعے میں کردار ادا کرتا ہے، کبھی اس کی اہمیت نہیں سمجھتا اور اگر وہ سمجھنے کی کوشش کرتا ہے، تو پھر وہ اس پر اثر انداز ہونے کی اہلیت کھو بیٹھتا ہے۔

اس زمانے میں روس میں جو دو قعات ظہور پذیر ہو رہے تھے، جو اشخاص ان میں جتنا زیادہ حصہ لے رہے تھے، ان کی اہمیت ان کے لیے اتنی ہی زیادہ ناقابل فہم تھی۔ اسکو سے دور دورا واقع صوبہات اور میٹرز برگ میں لیتوانیا کی وردیوں میں ملیوس خواتین و حضرات روس اور اس کے قدیم دارالسلطنت کی تقدیر پر کٹھ آٹھ آنسو بہاتے تھے اور اپنی قربانیوں اور اس نوع کی دیگر چیزوں کا ڈھنڈورا پیٹتے رہتے تھے، لیکن جہاں تک فوج کا تعلق ہے جو ماسکو کو چھوڑ کر جا رہی تھی، اس کے افراد ماسکو کے بارے میں شاید ہی بات کرتے یا سوچتے تھے اور جب وہ مڑ کر آتش زنی کا منظر دیکھتے تھے، ان میں سے کوئی بھی خدا کو حاضر ناظر جان کر یہ قسم نہیں کھاتا تھا کہ وہ فرانسیسیوں سے

انتقام لے گا۔ ان سب کی سوچوں کا محور اپنی تنخواہ، اٹکا پراڈ، کینٹین میں کام کرنے والی دوشیزہ ماتریشوکا اور اسی قبیل کی دوسری باتیں ہوتی تھیں۔

نگولائی رستوف نے اپنے وطن کے دفاع میں جو فعال اور خاصے طویل عرصے تک حصہ لیا تھا، وہ کسی قربانی کے خیال سے نہیں بلکہ محض اتفاقاً لیا تھا کیونکہ جس زمانے میں اس نے فوجی ملازمت اختیار کی تھی، اس کے دوران میں جنگ چھڑ گئی تھی۔ اس کا حاصل یہ ہوا کہ روس میں جو کچھ وقوع پذیر ہو رہا تھا، اس پر وہ نہ تو کسی قسم کی بڑی کا اظہار کرتا تھا اور نہ افسردہ کن نتائج خذ کرتا تھا۔ اگر اس سے پوچھا جاتا کہ روس کی موجودہ صورت حال کے بارے میں اس کی کیا رائے ہے، تو اس کا جواب ہوتا کہ اس کے متعلق سوچنا اس کا کام نہیں، اس مقصد کے لیے کوڈزوف اور دوسرے لوگ موجود ہیں، تاہم اس نے یہ ضرور سنا ہے کہ دھنوں کو فکری اور دوسرے لوازمات کے سلسلے میں جو نقصانات برداشت کرنا پڑے ہیں، ان کی پوری طرح تلاشی کی جانا ہے اور یہ کہ جنگی کارروائیاں ابھی مزید کچھ عرصہ جاری رہیں گی۔ ان حادثات میں اگر دوسرے میں سے رجنٹ کی کمان سونپ دی گئی، تو اسے کوئی تعجب نہیں ہوگا۔ مسئلے کے بارے میں اس قسم کا انداز فکر اختیار کرنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب یہ اعداں کیا گیا کہ ڈیڑھ دن کے لیے نئے گھوڑے درکار ہیں اور ان کی فراہمی کا بندوبست کرنے کے لیے اسے دارا نیر بمبجا جا رہا ہے تو اسے نہ صرف یہ کہ کوئی افسوس نہ ہوا کہ اسے متوقع لڑائی میں حصہ لینے کی سعادت سے محروم کیا جا رہا ہے بلکہ ان اس کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا۔ اس نے اپنی اس خوشی کو چھپانے کا کوئی ترڈ نہ کیا اور نہ اس کے رفقاء کو اس کی خوشی پر کوئی اعتراض تھا۔ بارودینو کی لڑائی سے چند روز پیشتر نگولائی کو ضروری رقم اور پروانہ جات موصول ہو گئے۔ اس نے چند ہوناز پہلے ہی بھیج دیے اور اس کے بعد وہ ڈاک کے گھوڑوں کے ساتھ خود روانہ ہو گیا۔

ایک ایسے علاقے سے، جسے فوج، اس کی چارہ اور چھینا اکٹھا کرنے والی جماعتوں، رسد گاڑیوں اور چلتے پھرتے ہسپتالوں نے اجاڑ دیا تھا، جان چھڑا کر نگولائی جب اس خطہ زمین میں داخل ہوا جہاں عسکری جوں، فوٹی گاڑیوں اور لشکری پڑاؤوں کے غلیظ آثار کی جگہ کسان مردوں اور عورتوں کے دیہات، لگان، زمین کے بڑے بڑے مکانات، زرعی قطعات، جن میں ڈھور ڈنگر گھاس چرتے پھرتے تھے، اور ڈاک کی چوکیاں قائم تھیں، جن میں مشی مصدئی اونگھ رہے تھے، تو اسے جو خوشی ہوئی، اس کا اندازہ صرف وہی لوگ لگا سکتے ہیں جنہیں یہ معلوم ہو کہ فعال ملازمت کے دوران میں مسلسل کئی کئی ماہ فوجی، حول میں زندگی بسر کرنا کیا معانی رکھتا ہے۔ دیویوں خوش رہا تھا جیسے اس نے یہ سب کچھ پہلی بار دیکھا ہو۔ جس چیز نے اسے خاص طور پر حیران اور خوش کیا، وہ نوجوان اور صحت مند خواتین کا یہ منظر تھا کہ اب ان میں سے ایک ایک کے ارد گرد دس بارہ بارہ افسران منڈلا نہیں رہے تھے۔ یہ عورتیں بھی خوش تھیں کہ راہ چلتا افسران کے ساتھ انسی مذاق کر رہا ہے۔

نگولائی وارانیزو رات کو پہنچا۔ خوشی اس کی نس نس سے پھوٹ رہی تھی۔ وہ ہوٹل میں چلا گیا۔ وہاں اس نے ان تمام اشیاء کا آڑہ ریا، جن سے دمکپ میں اتنا عرصہ محروم رہا تھا۔ اگلے روز اس نے خوب رگڑ رگڑ کر شیونائی،

فوجی وردی زیب تن کی اور مقامی حکام سے ملاقات کرنے چل پڑا۔

(مقامی) پیشیا کا کمانڈر سویمین جرنیل تھا۔ وہ بزرگ آدمی تھا اور بظاہر اپنے عسکری عہدے اور مرتبے سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ اس نے نکولائی کا اکھڑ انداز سے استقبال کیا (اس کا خیال تھا کہ یہ مخصوص فوجی انداز ہے)۔ وہ بڑے جارحانہ انداز سے اس سے یوں پوچھ گچھ کرنے لگا جیسے یہ اس کا حق ہو۔ وہ اس کے کسی جواب پر پسندیدگی کا اظہار کرتا، اور کسی پر ناک بھوں چڑھاتا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ حالات کا رخ جانچنے کی کوشش کر رہا ہے۔

پیشیہ کے کمانڈر سے وہ گورنر کے پاس چلا گیا۔ گورنر کو تاہ قامت، پھر تیز، خوش خلق، ورسید ہمارا شخص تھا۔ اس نے نکولائی کو گھوڑوں کے ان فارموں کے متعلق بتایا، جہاں سے گھوڑے دستیاب ہو سکتے تھے۔ اس نے شہر کے گھوڑوں کے سوداگر اور شہر سے چودہ میل دور ایک زمیندار کا پتہ دیا، جس کے پاس بہترین گھوڑے تھے، اس نے وعدہ کیا کہ وہ اس کی ہر ممکن مدد کرے گا۔

”تم کا ڈنٹ ایلیا آندرچک کے صاحبزادے ہو؟ میری بیوی کی تمہاری والدہ کے ساتھ گہری دوستی تھی۔ ہم ہر جمعرات کو گھر پر ہوتے ہیں۔ آج جمعرات ہے، چنانچہ بلا تکلف ہمارے ہاں چلے آؤ۔“ گورنر نے کہا جب نکولائی رخصت ہونا چاہ رہا تھا۔

گورنر سے رخصت لینے کے بعد نکولائی نے، پنی گاڑی کے لیے جھٹ پٹ ڈاک کے گھوڑے کرائے پر لیے اور اپنے کو ارٹرماسٹر کی معیت میں بہ سرعت رفتار اس زمیندار سے ملنے چل دیا۔ جو گھوڑوں کے فارم کا مالک تھا، دارانیو میں اپنے قیام کے ابتدائی مرحلے میں نکولائی کو ہر کام آسان اور خوشگوار معلوم ہوا اور جیسا کہ عام طور پر ہوتا ہے کہ اگر آدمی کی طبیعت حاضر ہو اور اس کی ذہنی کیفیت ثقافت ہو، ہر کام با آسانی اور بطریق احسن سرانجام دیا جاسکتا ہے، یہ بات نکولائی پر بھی صادق آرہی تھی۔ اس کے کسی کام میں کوئی رکاوٹ نہیں پڑ رہی تھی۔

زمیندار سابقہ گھوڑ سوار فوجی نکلا۔ وہ غیر شادی شدہ تھا، شکاری تھا اور گھوڑوں کا نبض شناس اور تدریسی۔ اس کے ہاں خوبصورت خلوت کردہ، سو سالہ مصالے دار برنڈی، ہنگری کی کہنے سے انگور اور پر شکوہ گھوڑے تھے۔ مختصر تبادلہ خیالات کے بعد نکولائی نے چھ ہزار روپے کے عوض سترہ بہترین (سانڈ) گھوڑے خرید لیے۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ نوج کے لیے جوئے نگر گھوڑے خریدے گا، یہ ان کے لیے نمونے کا کام دیں گے۔ ڈٹ کر کھانا کھائے اور ہنگری کی شراب قدرے ضرورت سے زیادہ پینے کے بعد دستوف نے زمیندار سے، جس سے اب وہ دوستانہ تعلقات استوار کر چکا تھا، معافہ کیا اور پورے اطمینان و سرور سے انتہائی گھٹیا سڑکوں پر بے پناہ رفتار سے سفر کرنے لگا۔ وہ بار بار کوچوان پر زور دے رہا تھا کہ وہ اپنی رفتار اور تیز، اور تیز کرے تاکہ وہ اس محفل میں، جس کا اہتمام گورنر کر رہا تھا، وقت پر پہنچ سکے۔

نکولائی نے لباس تبدیل کیا، سر پر ٹھنڈا پانی ڈالا، جسم پر سنٹ (scent) چھڑکا اور گورنر کے ہاں پہنچ گیا۔ اسے ذرا تاخیر ضرور ہو گئی تھی تاہم وہ دل ہی دل میں یہ مقولہ دہرا رہا تھا کہ ”نہ پہنچنے سے تاخیر سے پہنچنا بہتر ہے۔“

یہ اجتماعی رقص کی محفل نہیں تھی اور نہ رقص کے بارے میں کچھ کہا گیا تھا تاہم ہر شخص جانتا تھا کہ کارٹر یا ہوزارہ کل دی کارڈ پر والز اور سکاٹش رقص کی دھنیں بجائے گی اور رقص بھی ہوگا۔ چنانچہ تمام لوگ اجتماعی رقص میں شرکت کرنے کے ملبوسات پہن کر آئے تھے۔

1812 میں قصبائی زندگی کا پہلے حسب معمول رواں دواں تھا۔ واحد فرق صرف یہ آیا تھا کہ ماسکو سے متعدد حصول خاندانوں کی آمد کی وجہ سے تصبات میں نئی روح پھٹک گئی تھی اور وہاں پہلے کی نسبت کہیں زیادہ چمک دک اور چہل پہل نظر آنے لگی تھی۔ جیسا کہ روس میں ہر جگہ ہو رہا تھا، لوگوں کو تانچ و عواقب کی قطعاً کوئی پروا نہیں رہی تھی، عمومی انداز فکر یہ ہو گیا تھا ”بابر بہ پیش کوش کہ علم دوبارہ نیست۔“ جو ہونا ہے ہوتا رہے گا، جو لکھا تھا میں ہے، اس سے کیوں نہ لطف، ٹھیکہ جائے۔ یا اس ہمہ محافل میں گپ شپ کے موضوعات ناگزیر طور پر تبدیل ہو گئے تھے۔ پہلے لوگ موسم اور باہمی دوستوں اور شناسا احباب کی باتیں کیا کرتے تھے، اب اس کی جگہ ماسکو، فوج اور پولیس نے لے لی تھی۔

گورر کے سہانوں کا تعلق وارنیز کے اعلیٰ ترین طبقتوں سے تھا۔

محفل میں خواتین اب بھی خاصی تعداد میں موجود تھیں۔ ان میں سے متعدد وہ شخصیں جن سے وہاں سکون رائف تھا۔ لیکن جہاں تک مرد شرفاء کا تعلق ہے، ان میں سے ایک بھی ایسا نہیں تھا جو کسی لحاظ سے تمنہ سینٹ جارج یا فٹ اور با، خلاق، بامروت اور شکتہ ہوزار کا دست رستوف سے لگا کھا سکتا۔ مردوں میں ایک اطالوی قیدی شامل تھا۔ جو فرانسیسی فوج میں خدمات سرانجام دیتا رہا تھا، نکولائی کو محسوس ہوا کہ اس قیدی کی موجودگی نے روسی ہیرو کی حیثیت سے اس کی اپنی اہمیت بڑھادی ہے۔ کچھ یوں معلوم ہوتا تھا کہ اطالوی ایک جیتی جاگتی ٹرائی ہے (جو روسیوں کے ہاتھ آگئی تھی)۔ محفل میں موجود ہر شخص کے چہرے بشرے سے یہی تاثر مترشح ہو رہا تھا۔ وہ اس (اسیر) افر کے ساتھ دوستانہ لیکن بادقار و رلیے دیے انداز سے پیش آیا۔

جونہی نکولائی ہوزاروں کی وردی میں ملبوس سینٹ دورے انگو کی خوشبوئیں بکھیرتا، اندر داخل ہوا اور بقول ”نہ پہنچے سے تاخیر سے پہنچنا بہر حال بہتر ہے“ خود بھی کہہ اور متعدد دوسرے اشخاص سے بھی سن چکا، لوگوں کی، ابھی خاصی بھیڑ نے اس کے گرد گھیرا ڈال دیا۔ تمام نگاہیں اسی پر مرکوز تھیں اور اسے معا احساس ہوا کہ صوبے میں اسے موزوں مقام۔ سب کا منظور نظر۔ حاصل ہو گیا ہے۔ اس مقام پر فائز ہونا ہمیشہ ہی پر لطف رہا ہے لیکن طویل عمر و میوں کے بعد تو اس کا نشہ ہی کچھ اور تھا۔ ڈاک چوکیوں، دیہاتی ہونٹوں اور زمیندار کے خلوت کدے میں خاندانیں اس کی ادنیٰ توجہ پر پھولے نہ ساتی تھیں لیکن یہاں گورنر کی ضیافت میں بھی لا تعداد نو عمر شادی شدہ حسینائیں اور پری تمثال نوخیز دوشیزائیں (جیسا کہ اسے محسوس ہوا) بڑی بے تابی سے اس کی نگاہ التفات کی منتظر تھیں۔ نوجوان خواتین اور اہل زمیندار اس سے عشوہ طرازیوں کر رہی اور اس سے پیار و محبت کی چنگیں بڑھانے کی سعی کر رہی تھیں۔ جہاں تک بزرگ خواتین کا تعلق ہے، ان کی پہلے دن سے ہی یہ کوشش تھی کہ وہ کسی نہ کسی طرح اس سے

نوجوان ہوزار کو شادی کے بندھنوں میں باندھ دیں اور اسے گھر بسانے پر مجبور کر دیں۔ ان میں گورنر کی بیوی بھی شامل تھی۔ اس نے رستوف کا استقبال قریبی قرابت دار کی حیثیت سے کیا اور اسے نکولس کے نام سے خطاب کیا۔
 کارینینا بیو ترودانے واقفانہ انداز اور سکاٹش رقص کی دھنیں بجا رہیں اور جب رقص کا آغاز ہوا، نکولائی نے اپنی مہارت سے مفصلات کے اعلیٰ طبقے کے افراد کے قلوب حریص موہ لیے۔ وہ جب عدیم المثال بے باکی اور بے تکلفی سے رقص کر رہا تھا، اس نے ن سب کو درمیان حیرت میں ڈال دیا۔ جس انداز سے اس نے اس روز رقص کیا، اس پر وہ خود بھی متحجب تھا۔ اس نے ماسکویں کبھی اس طرح رقص نہیں کیا تھا اور اس قسم کا انتہائی بے باک اور بے تکلف انداز خود اس کی اپنی نظروں میں نازیدار اور معیوب ٹھہرتا لیکن یہاں یہ ضروری محسوس ہوا کہ وہ انھیں کسی ایسی چیز سے متخیر کر دے جو غیر معمولی ہو، کوئی ایسی چیز، جو مفصلات کے لیے تو بالکل نئی ہو لیکن جسے وہ یہ ماننے پر مجبور ہو جائیں کہ دارالسلطنت میں یہ معمول کی بات ہے۔

اس شام کے دوران میں نکولائی نے اپنی توجہ زیادہ تر ایک صوبائی انسری بیوی پر مرکوز رکھی، جس کا جسم بھرا بھرا اور نرم و گداز، چہرہ روشن جمال، آنکھیں نیلی اور باں سنہری تھیں۔ وہ نوجوان، جو چسکا لے رہے ہوں، بڑی سادگی سے اس بات پر ایمان لے گئے ہیں کہ دوسروں کی بیویاں انھیں کے لیے تخلیق ہوئی ہیں۔ رستوف کی بھی کچھ بھی کیفیت تھی۔ چنانچہ وہ اس خاتون کے ساتھ چپکارا اور اس کے شوہر کے ساتھ کچھ اس طرح کا دوستانہ برتاؤ کرتا رہا جیسے دونوں کے مابین کوئی مفاہمت ہو گئی ہو اور اس سلسلے میں کوئی بات کیے بغیر وہ اچھی طرح سمجھ گئے ہوں کہ نکولائی اور اس شخص کی شریک حیات کی آپس میں خوب سمجھ گئی۔ تاہم آثار یہ بتا رہے تھے کہ شوہر کو اس سے اتفاق نہیں اور اس نے رستوف کے ساتھ رکھائی سے پیش آنے کی کوشش کی۔ لیکن رستوف کی بے تکلفانہ سادگی اتنی بے پایاں تھی کہ بعض اوقات میاں بھی اس کی خوش طبعی کے سامنے سینہ سپر ہو جاتا، مگر جب محفل کے اختتام پر بیوی کے چہرے پر پہلے کی نسبت کہیں زیادہ تہمتا ہٹ، ورنہ بشت نظر آنے لگی، خاوند بیلا پڑ گیا اور وہ پہلے سے زیادہ بچھ گیا۔ کچھ یوں معلوم ہو رہا تھا کہ ان دونوں کو قدرت نے بشت کی جو تھوڑی بہت مقدار عطا کی ہے، اس میں بیوی کا حصہ بڑھ گیا ہے، اور اسی تناسب سے شوہر کا کم ہو گیا ہے۔

5

نکولائی جسم کو قدرے آگے جھکائے بازوؤں والی کرسی پر دراز تھا۔ وہ ریٹھی بالوں اور روشن جمال چہرے والی خاتون کے عین اوپر جھکا ہوا تھا اور کچھ اس انداز سے اس کی تعریفوں کے پل باندھ رہا تھا جس کا حقیقت سے دور دور کا بھی تعلق نہیں تھا۔

اپنی ٹانگوں کو، جن پر اس نے گھوڑ سواری کی تنگ بر جس پہنی ہوئی تھی، بانگین سے ہلاتے جھلاتے، پاروں اطراف سینٹ کی خوشبوئیں نکھیرتے اور اپنی خوبروہم نشیں کی تعریف میں زمین و آسمان کے قد بے ملاتے، اپنے منہ

میں سٹھو بنتے اور اپنی سڈول ٹانگوں کی، جن پر اس نے بالکل صحیح سائز کے بوٹ پہنے ہوئے تھے خمیس کرتے نکولائی اسے بتا رہا تھا کہ اس کا اردو وارانیز کی ایک خاص خاتون کو اڑا لے جانے کا ہے۔
”وہ کیسی ہے؟“

”حسن کی بیوی، سحر طراز۔ اس کی سٹکھیں“ (نکولائی نے اپنی نگاہیں اس پر گاڑ دیں) ”ٹیلگوں، چہرہ رشک، قمر اور اس کا جسم“ (اس نے اس کے سر اُپے پر نظر ڈالی) ”زیانا کے جسم کی مانند ہے۔“
خاندان کے قریب آیا اور مشہور کر اپنی بیوی سے پوچھنے لگا کہ وہ کیا باتیں کر رہے ہیں۔
”اٹھا، نکلیا ایوانچ!“ نکولائی نے احتراماً کھڑے ہو کر ہا آواز بلند کہا

اور وہ کچھ اس انداز سے جیسے اس کی خواہش ہو کہ جس قسم کا مذاق وہ کر رہا تھا، نکلیا ایوانچ بھی اس میں برابر کا شریک ہو جائے، اسے بتانے لگا کہ اس کا رادہ منہری بالوں والی حسینہ کو اڑا لے جانے کا ہے۔
دونوں میاں بیوی مسکرانے لگے۔ میاں کی مسکراہٹ گنیمت اور بیوی کی ہنسی تھی۔
گورنر کی مردوت پسند بیوی ان کے قریب آئی۔ اس کے چہرے پر ناپسندیدگی کے آثار تھے۔
”نکولس، آؤ آؤ! کتنا اگن تیونا تمہیں ملنا چاہتی ہیں۔“ اس نے یہ نام کچھ اس لہجے سے لیا کہ دستوف چشم زدن میں بھانپ گیا کہ آؤ! مگر تیونا کوئی اہم شخصیت ہے۔ ”نکولس، آؤ! تم نے کہا تھا کہ میں تمہیں اس نام سے پکارکتی ہوں۔
”کہا تھا؟“

”بالکل، ma tante، لیکن یہ محترمہ ہیں کون؟“

”آؤ! کتنا اگن تیونا مال و اتمنیو! اس نے ہمارے بارے میں اپنی بھانجی سے کہ تم نے کیسے اس کی جان بچائی تھی... مٹا ہے... بوجھ سکتے ہو؟“

”میں نے تو بے شمار لوگوں کو بچایا ہے!“

”اس کی بھانجی، پرنس بلکوسکا یا۔ وہ یہاں اپنی خالہ کے ساتھ وارانیز میں ہے۔ ارے تم شراکیوں رہے ہو؟ ہائیں کہیں تم۔“

”نہیں، بالکل نہیں۔ ma tante — میں آپ کو یقین دلاتا ہوں...“

”بہت خوب، بہت خوب ارے، کیسے لڑ کے ہو تم؟“

گورنر کی بیوی اسے ایک دراز قدم اور بہت بھاری بھر کم کہن سال خاتون کے پاس لے گئی، جس نے سر پر نیلا رد مال اوڑھ رکھا تھا۔ وہ پرنس ماریا کی خالہ ماں دمنیو تھی۔ وہ دولت میں کھیلتی تھی مہال بچوں کے جھنجھٹ سے آزاد تھی اور بیوی کے دن گزار رہی تھی۔ اس نے اپنی ساری عمر وارانیز میں چاؤ کی تھی۔ وہ ابھی ابھی شہر کی نامی گراں ہستیوں کے ساتھ تاش کی بازی سے فارغ ہوئی تھی۔ جب دستوف اس کے پاس پہنچا، وہ اٹھ کر کھڑی ہو چکی اور

بازی کے بعد اپنا حساب کتاب چکارہ ہی تھی۔ وہ اپنی سسکھیں بھینچتے اس کا درشتی اور سنجیدگی کے ساتھ سرنا پا جائز لینے لگی اور اس کے ساتھ ساتھ اس جرنیل کو حسیں سناتی رہی، جس نے اسے مات دی تھی۔

”mon cher، تم سے مل کر بہت خوشی ہوئی ہے۔“ اس نے نکولائی کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔
”مجھے امید ہے کہ تم مجھے ملنے آؤ گے۔“

بارعہب مسمر خاتون نے پرنس ماریا اور اس کے مرحوم باپ کے بارے میں، جسے وہ بظاہر پسند نہیں کرتی تھی، چند مختصر کلمات کہے اور نکولائی (مستحوم ہوتا تھا کہ وہ بھی اس کی نگاہوں میں چھپائیں ہے) سے دریافت کرنے لگی کہ اس کے پاس پرنس آندرے کی کوئی خبر ہے۔ اس کے بعد ایک بار پھر اس نے اسے اپنے گھر آنے کی دعوت دی اور اسے وہاں سے ٹھٹھے کا شرہ کر دیا۔

نکولائی نے آنے کا وعدہ کیا اور جب وہ سلام کرنے جھکا، اس کا چہرہ دوبارہ سرخ ہو گیا۔ پرنس ماریا کے ذکر پر دستوف کو یوں محسوس ہوا کہ وہ جھینپ رہا بلکہ ڈر رہا ہے کیوں؟ یہ وہ خود بھی نہ سمجھ سکا۔

جب نکولائی مائل دیکھو اسے مل کر واپس آیا، وہ ایک بار پھر رقص کرنا چاہتا تھا لیکن گورنر کی کوتاہ قامت اہلیہ نے، پنا فریہ اور گداز ہاتھ اس کی آستین پر رکھا اور اس سے کہا کہ وہ اس سے کچھ گفتگو کرنا چاہتی ہے۔ وہ اسے اپنے نشستے کمرے میں لے گئی۔ وہاں جو دو گ موجود تھے، وہ جھٹ پٹ وہاں سے باہر نکل گئے تاکہ وہ کہیں ان کی تہائی میں نکل نہ ہوں۔

”mon cher، تم جانتے ہو،“ گورنر کی اہلیہ نے اپنے ننھے ننھے شیفٹ چہرے پر سنجیدگی بکھیرتے ہوئے کہا،
”کہ یہ تمہارے لیے سو دروں رشتہ ہوگا۔ کیا تم یہ چاہو گے کہ اس کا انتظام میں کر دوں؟“
”ma tante، کس سے؟“ نکولائی نے پوچھا۔

”میں پرنس سے تمہارا رشتہ کرادوں گی۔ کا ترینا پیو تر و نالائی کا نام لیتی ہے لیکن میں کہتی ہوں، نہیں۔
کاڈنٹ، چاہو تو میں سلسلہ جنابی کر دوں؟ تمہاری اہلی بہت مشکور ہوں گی۔ سچی، وہ بہت پرکشش لڑکی ہے۔ اور اس کی شکل اتنی گئی گزری نہیں۔۔۔“

”بالکل نہیں!“ نکولائی نے یوں کہا جیسے اسے یہ تصور ہی بہت ناگوار گزرا ہو۔ ”ma tante، میں سچے فوجی کی طرح اپنے آپ کو کسی پر ٹھونستے نہیں اور جوں جائے، اسے کبھی ٹھکراتا نہیں۔“ جو کچھ وہ کہہ رہا تھا، دستر اس کے کہ اسے اس پر غور کرنے کا موقع ملا، اس نے کہہ دیا۔

”لیکن تمہیں یاد رکھنا چاہیے کہ یہ ایسا معاملہ نہیں کہ اسے مذاق میں اڑا دیا جائے۔“

”بالکل نہیں!“

”ہاں، ہاں۔“ گورنر کی بیوی نے یوں کہا جیسے وہ اپنے آپ سے ہم کلام ہو۔ ”لیکن mon cher، ایک

بات اور تم اس سرخ باؤں والی خاتون سے کچھ زیادہ ہی ستمی ہو رہے ہو۔ دیکھو، خاندان بے چارہ منہ چھپاتا پھر رہا ہے، سچ۔“

”ابھی نہیں۔ ہم دونوں میں تو بڑی گاڑھی چھٹنے لگی ہے۔“ نکولائی نے بھولپن سے جواب دیا۔ اس نے یہ سوچا ہی نہیں تھا کہ جودل لگی اس کے لیے اتنی خوشگوار ہو سکتی ہے، دوسرے کے لیے وہ اور تو سب کچھ ہو سکتی ہے خوشگوار ہرگز نہیں۔

”لیکن یہ میں نے گورنر کی اہلیہ سے کیا حلقہ نہ بات کہہ دی؟“ سپر پر اچانک نکولائی کو خیال آیا۔ ”دراہ اور واقعی رشتہ طے کرانے میں مصروف ہو جائے گی۔ اور سونیا۔؟“

اور جب وہ گورنر کی اہلیہ سے اجازت لے رہا تھا، وہ مسکرائی اور ایک بار پھر اس سے کہنے لگی: ”اچھا، پھر یاد رکھنا!“ اب اس سے رہ نہ گیا، اور وہ اسے ایک طرف لے گیا۔

”ma tante، ذرا سنیں۔ سچ بات یہ ہے۔۔۔“

”mon cher، کیا بات ہے؟ آؤ، ذرا یہاں بیٹھ جاتے ہیں۔“

اچانک نکولائی کے دل میں خواہش، اضطرابی تحریک، ابھری کہ وہ اپنا راز دل (جو وہ کبھی اپنی والدہ، بشیرہ یا کسی دوست کو نہ بتاتا) اس کے خاتون کے سامنے کہہ دے، جو اس کے لیے قریباً، جتنی تھی۔ بعد ازاں جب اس نے اس صاف گوئی کو یاد کیا جس کا اس سے کسی نے تقاضا کیا تھا اور نہ جس کی وہ کوئی توجیہ کر سکتا تھا، تاہم اس کے لیے انتہائی اہم نتائج کی حامل تھی، اسے یوں محسوس ہوا۔ جیسا کہ اس قسم کی مثالوں میں ہر شخص کو محسوس ہوتا ہے۔ کہ اس پر احمقانہ ترنگ سوار ہو گئی تھی۔ تاہم صاف گوئی کے اس دورے نے بعض دیگر بے وقعت اور حقیر واقعات کے ساتھ مل کر اس کے اور اس کے تمام خاندان کے لیے نہایت دور رس نتائج پیدا کیے۔

”ma tante، بات دراصل یہ ہے کہ maman کافی عرصے سے مجھ پر زور دے رہی ہیں کہ میں کسی صاحب حیثیت ووشیزہ سے شادی کر لوں لیکن مجھے روپے کی خاطر بیاہ کرنے کے تصور سے بھی گھن آتی ہے۔“

”آہاں، یہ بات میں اچھی طرح سمجھ سکتی ہوں۔“ گورنر کی اہلیہ نے کہا۔

”لیکن پرنس بلکونسکایا۔۔۔ یہ دوسرا معاملہ ہے۔ میں آپ سے سچ عرض کر رہا ہوں، پہلی بات تو یہ ہے کہ میں انہیں بہت پسند کرتا ہوں، مجھے ان میں کشش محسوس ہوتی ہے اور پھر ان حالات میں۔ اتنے عجیب، نڈاڑے۔ ان سے ملنے کے بعد میرے ذہن میں اکثر یہ خیال آیا ہے کہ یہ تقدیر ہے، خاص طور پر اگر آپ یہ یاد کریں کہ maman طویل مدت سے انہی خطوط پر سوچتی چلی آرہی ہیں لیکن میری ان سے پہلے کبھی ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ حالات نے ہمیشہ کچھ ایسا رخ اختیار کیا کہ ہماری ملاقات نہ ہو سکی۔ اور پھر جب تک ناشکی ان کے بھائی کے ساتھ مگنی برقرار رہی، میرا ان کے ساتھ شادی کرنے کا سواں پر سوچنا بھی خارج از بحث تھا۔ پھر کرنا خدا کا کیا ہوا

کہ میری ان کے ساتھ عین ان ایام میں ملاقات ہوئی جب مناشا کی سنگائی ٹوٹ چکی تھی... خیر، پھر سب کچھ... آپ سمجھ گئی ہیں نا؟... میں نے ان باتوں کا ذکر نہ کسی سے کیا ہے اور نہ کروں گا۔ صرف آپ سے..“

گورنر کی اہلیہ نے مومنیت کے اظہار کے طور پر اس کی کہنی دبائی۔

”آپ میری کزن سونیا کو جانتی ہیں؟ میں اس سے محبت کرتا ہوں۔ میں اسے شادی کرنے کا قوس دے چکا ہوں اور میں اپنے قوس کی پاسداری کروں گا۔... پھر آپ سمجھ گئی ہیں نا کہ اس بات کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ۔“

”گورنر نے لڑکھڑائی زبان سے کہا اور اس کا چہرہ دل سے سرخ ہو گیا۔

”Mon cher mon cher، مسائل سے عہدہ برآ ہونے کا یہ خوب انداز ہے! دیکھو، سونیا کے پاس پھوڑی کوڑی بھی نہیں اور تم خود کہتے ہو کہ تمہارے پاپا کے حالات بالکل دیگر گوں ہیں۔ پھر تمہاری ماں کا کیا بنے گا؟ وہ شاید جان برباد ہو سکیں۔ ایک بات تو یہ ہوئی۔ پھر سونیا۔ اگر اس لڑکی کے سینے میں دل ہے، اس کے لیے یہ کس قسم کی زندگی ہوگی؟ تمہاری اماں مایوسی کی اتھارہ کھائیوں میں، خاندان کے سارے معاملات چرچٹ... نہیں، mon cher، تمہیں اور سونیا کو ان چیزوں کی سمجھ ہونا چاہیے۔“

گورنر نے چپ رہا۔ اس کے لیے یہ دلائل وجہ تسکین تھے۔

”پھر بھی، ma tante، ایسا نہیں ہو سکتا۔“ اس نے مختصر خاموشی کے بعد ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے کہا۔

”بھلا وہ ازبک، پرنس مجھے قبول کریں گی بھی؟ ایک اور بات بھی ہے، وہ اس وقت سوگ من رہی ہیں۔ ایسی باتیں سوچنا چھٹا نہیں۔“

”تمہارا خیال ہے کہ میں تمہاری چٹ منگنی پٹ بیوہ کرا دوں گی؟ عقل کے ناخن لو، ہر کام کرنے کا طریقہ ہوتا ہے۔“ گورنر کی اہلیہ نے کہا۔

ma tante، آپ کو مناشا ملکی کافن آتا ہے؟“ گورنر نے اس کے فریگداز منھے بنے ہاتھ پر ہنسٹ کرتے ہوئے کہا۔

6

رسٹوف سے ملاقات کے بعد ماسکو پہنچنے پر پرنس ماریا کو دہاں اپنا بھتیجا، اس کا بیٹا اور پرنس اندرے کا خط ملا۔ خط میں اسے ہدایت کی گئی تھی کہ وہ دارا ایزہ میں چلی جائے، جہاں ان کی خالہ ماں دتھیو ا رہتی تھی۔ سفر کے انتظامات، اپنے بھائی کے بارے میں پریشانی، نئے لوگوں کے ساتھ نئے گھر میں زندگی کی ترتیب دہندہ، اپنے برادر زادے کی تعلیم کا بندوبست، ان تمام باتوں نے مل جل کر پرنس ماریا کے دل میں ترغیب سے ملے جلے جذبے کا گلا گھونٹ دیا، جس نے اسے اپنے باپ کی علالت کے دوران میں اور اس کے انتقال، اور خاص طور پر رسٹوف سے ملاقات کے بعد، اذیت میں مبتلا کر رکھا تھا۔ وہ ملول تھی، مغرور تھی اور اب پرسکون، حول میں اسے اپنے باپ کی وفات، جو

اس کے ذہن میں ریس کے زوال سے وابستہ تھی، اور بھی شدت سے محسوس ہونے لگی۔ اس کی طبیعت اکھڑی اکھڑی رہنے لگی۔ اسے مسلسل یہ غم کھائے جا رہا تھا کہ اس کا ایک ہی قریبی عزیز اس کا بھائی، باقی وہ گویا ہے اور وہ بھی سخت خطرے میں گھرا ہوا ہے۔ پھر اسے اپنے بھتیجے کی تعلیم و تربیت کی فکر بھی تھی۔ وہ ہمیشہ یہی سمجھتی رہی کہ یہ بڑا مشکل کام ہے، اور وہ اس کی اہل نہیں۔ تاہم اپنے قلب کی گہرائیوں میں وہ خود سے مطمئن تھی کہ نیکو وہ جانتی تھی کہ وہ اپنے ذاتی خوابوں اور خواہشوں کا گلہ گھونٹ چکی ہے، جو رستوف کی آمد سے اس کے نہاں خانہ دل میں سر اٹھانے کے قریب تھیں۔

محفل کے اگلے روز گورنر کی اہلیہ، مل وٹسویا کے گھر پہنچی اور خالہ کے ساتھ اپنے منصوبے کے بارے میں گفتگو کرنے کے بعد اس نے اظہار خیال کیا کہ اگرچہ موجودہ حالات کے پیش نظر کسی منگنی کی تقریب کے انعقاد کے متعلق سوچا بھی نہیں جاسکتا، تاہم شے کی لڑکی کی ملاقات ہونا چاہیے اور انھیں ایک دوسرے کو جاننے کا موقع فراہم کیا جانا چاہیے۔ جب خالہ نے رضامندی دے دی، گورنر کی اہلیہ پرنس ماریا کی موجودگی میں رستوف کی باتیں کرنے اور بڑھ چڑھ کر اس کی تعریفیں کرنے لگی۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ جب پرنس کا ذکر آیا، وہ بے طرح جھینپ گیا اور اس کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔ پرنس ماریا یہ باتیں سن کر خوش نہیں ہوئی، الٹا اسے دکھ یا پچاس کی داخلی ہم آہنگی تلبٹ ہو گئی اور ایک بار پھر آرزوئیں، شکوک، مل مت نفس اور امیدیں سر اٹھانے لگیں۔

رستوف کی آمد سے قبل جو دروازے گزرے، ان کے دورن میں پرنس ماریا ہمہ وقت اس ادھیر میں مصروف رہی کہ اسے اس کے ساتھ کس قسم کا رویہ اختیار کرنا چاہیے۔ پہلے تو اس نے یہ فیصلہ کیا کہ جب وہ اس کی خالہ سے ملنے آئے گا، وہ ڈرائنگ روم کا رخ ہی نہیں کرے گی۔ اتنے شدید سوگ کی حالت میں اس کے لیے مہمانوں کا استقبال کرنا مناسب نہیں ہوگا۔ پھر اس نے سوچا کہ اس (رستوف) نے اس کے لیے جو کچھ کیا تھا، اس کے بعد اگر وہ اس قسم کا رویہ اپنائے گی تو یہ بدتمیزی ہوگی۔ تب اسے خیال آیا کہ اس کی خالہ اور گورنر کی اہلیہ خود اس کے اپنے اور رستوف کے بارے میں کچھ امیدیں پال رہی ہیں (ان کے الفاظ اور وقتاً فوقتاً ان کی نگاہیں اس شے کو تقویت پہنچاتی تھیں)۔ مگر اس نے اپنے آپ سے کہا: ”میں تو ازل کی پاپن ہوں تبھی تو میں ان خواتین کے بارے میں اس طرح سوچتی ہوں۔ ان سے قطعاً یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ میری موجودہ حالت کے پیش نظر جب میں انکی سوگ منارہی ہوں، وہ یہ رشتہ طے کرانے کا خیال بھی اپنے دل میں لائیں گی کیونکہ اس سے میرے آپ کی یاد کی بلکہ خود میری اپنی، توہین ہوگی۔“ پرنس ماریا نے تصور کیا: ”فرض کریں، میں ان سے ملنے چلی جاتی ہوں، وہ مجھ سے اور میں ان سے کیا کہوں گی؟“ اس نے ان الفاظ کا حاطہ کرنے کی کوشش کی جو رستوف اس سے اور وہ اس سے کہے گی۔ اسے دونوں کے جملے بھی تو غیر مناسب طور پر سرد مہر معلوم ہونے لگتے اور کبھی معافی سے بھرپور۔ اور سب سے بڑھ کر اسے یہ خوف کھائے جا رہا تھا کہ جو نہی وہ اس سے ملے گی، اس پر بڑھلا ہٹ طاری ہو جائے گی اور اس کے دل کی بات اس کے چہرے پر عیاں ہو جائے گی۔

لیکن جب اتوار کو کلیسا سے واپسی کے بعد دردی پوش ملازم ڈرائنگ روم میں اطلاع دینے آیا کہ ”کاؤنٹ رستوف تشریف لائے ہیں“، پرنس نے کسی قسم کی بوکھلاہٹ کا اظہار نہ کیا، صرف اس کے چہرے پر قدرے حیرت کی سرخی دوڑ گئی اور اس کی آنکھوں میں نئی چمک آ گئی۔

”خالہ! آپ اس سے ملی ہیں؟“ وہ پرسکون لہجے میں پوچھنے لگی۔ وہ خود حیران تھی کہ ظاہری طور پر اس میں یہ دل جیسی اور بے ساختگی کہاں سے آ گئی ہے۔

جب رستوف کمرے میں داخل ہوا، پرنس ماریا نے گھڑی کی گھڑی اپنی گردن نیچے جھکالی جیسے وہ مہمان کو تہی مہلت دینا چاہتی ہو کہ وہ اس کی خالہ سے علیک علیک کرے اور پھر عین اس وقت، جب گولائی اس کی جانب متوجہ ہوا، اس نے پناسر اوپر اٹھایا اور بہ چشم فروزاں اس کی نگاہوں کا سامنا کیا۔ وہ اپنی نشست سے ذرا اوپر اٹھی (اس کی حرکات میں رعنائی اور رکھ رکھاؤ تھا)، خندہ روئی سے اپنا مہین اور نرم و نازک ہاتھ اس کی طرف بڑھایا اور ایک ایسی آواز میں، جو اویس بار نئے، عمیق اور نسوانی لہجے سے لرز رہی تھی، باتیں کرنے لگی۔ مادموئیل بوغین کا، جو کمرے میں موجود تھی، حیرت و استعجاب سے منہ کھلے کا کھلے رہ گیا۔ اس امر کے باوصف کہ وہ سردوں پر ڈورے اٹنے کے فن میں یکتا تھی لیکن جس شخص کو وہ اپنے دام تزویر میں پھانسا چاہتی، اس سے ملاقات پر وہ بھی اس سے بہتر کارکردگی کا مظاہرہ نہ کر سکتی۔

”یا تو سیاہ رنگ اس پر خاص طور پر پھیلتا ہے یا پھر مجھے پتا ہی نہیں چل سکا اور یہ واقعی پہلے کی نسبت زیادہ جاذب نظر ہو گئی ہے اور سب سے بڑھ کر۔ کیا savoir faire ہے، کیا رعنائی ہے!“ مادموئیل بوغین نے سوچا۔ اگر پرنس ماریا سوچ بچار کر سکی تو اس میں جو تبدیلی آئی تھی، اسے دیکھ کر وہ مادموئیل بوغین سے بھی زیادہ ششدر رہ جاتی۔ جونہی اس کی نظریں اس پیرے اور محبوب چہرے پر پڑیں، کسی نئی حیرت و توت نے اسے اپنی گرفت میں لے لیا اور اسے اپنے قول و فعل میں بے ساختگی برتنے پر مجبور کر دیا۔ جس لمحے رستوف کمرے میں داخل ہوا، پرنس ماریا کا چہرہ مقطب ہو گیا۔ یہ بالکل ایسے ہی تھا جیسے نقش و نگار سے مزین فانوس، جب اندر سے روش کیا جاتا ہے، جگمگا اٹھتا ہے اور غیر متوقع طور پر اس کے مختلف خانوں کی نازک، نفیس اور پیچیدہ رنگین آرائش کی، جو اس وقت تک بھونڈی، شکم اور بے معنی نظر آتی تھی، دم بخود کر دینے والی خوبصورتی آشکار ہو جاتی ہے۔ اس کا آلائشوں سے پاک، روحانی، داخلی کرب جس سے وہ اب تک دوچار رہی تھی، پہلی مرتبہ سطح پر نمودار ہوا۔ اس کی تمام روحانی جستجوئیں، اس کا ذہنی اضطراب، نیکی اور فضیلت کے لیے اس کی ساری مبالغہ، اس کی عاجزی اور فرد تنی، ایثار و قربانی اور محبت۔ یہ سب کی سب ان تابندہ آنکھوں، مہین مسکراہٹ اور اس کے نرم و لطیف چہرے کے ہر ریشے میں جھلکار رہی تھیں۔

رستوف نے یہ سب کچھ اتنا واضح طور پر دیکھا جیسے وہ اسے جسم جنم سے جانتا ہو۔ اسے محسوس ہوا کہ جو مستی

اس کے سامنے موجود ہے، ہر اس ہستی سے، جس سے وہ انہیں مشترک ملا تھا، قطعی مختلف اور برتر ہے، بلکہ خود اس سے بھی بہتر ہے۔

ان کی گفتگو سیدھی سادی، ہر قسم کے الجھاؤ سے پاک اور عام فہم تھی۔ باقی لوگوں کی طرح انھوں نے بھی جنگ کے متعلق باتیں کیں اور اس ضمن میں انھیں جن آلام میں سے گزرنا پڑا، ان کے ذکر میں دوسروں کی طرح انھوں نے بھی غلو سے کام لیا۔ ان کی گزشتہ ملاقات بھی زیر بحث آئی۔ یہاں نکولائی نے موضوع تبدیل کرنے کی کوشش کی۔ انھوں نے گورنر کی شفقت اہلیہ اور اپنے عزیز واقارب کی باتیں کیں۔

پرنس ماریا نے اپنے بھائی کے متعلق گفتگو کرنے سے احتراز کیا، بلکہ جو بھی اس کی خالہ پرنس سندس کا نام اپنی زبان پر لائی، اس نے ماتوں کا رخ کسی در طرف پھیر دیا۔ صاف معلوم ہو رہا تھا کہ روس کے مصائب کے ذکر میں وہ بناوٹ سے کام لے سکتی ہے لیکن اس کا بھائی اس کے اتنا قریب تھا کہ اس کے ذکر میں وہ سچی اعزاز پہن سکتی ہے اور نہ اپنانے پر مائل ہے۔ نکولائی سے اس کا یہ رویہ چھپا نہ رہ سکا کیونکہ وہ اپنی عادت کے برعکس اس کی ایک ایک بات پر ایک ایک ارا کا باریک بینی سے مشاہدہ کر رہا تھا اور جو کچھ اس نے دیکھا، اس سے وہ یہ نتیجہ اخذ کر چکا تھا کہ پرنس ماریا کی شخصیت غیر معمولی ہے اور زندگی میں ایسے لوگوں سے روز روز ملاقات نہیں ہوتی۔

جب دوسرے لوگ نکولائی سے پرنس ماریا کے متعلق بات کرتے تھے، وہ کانوں کان سرخ ہو جاتا تھا اور اسے عجیب طرح کی خفت محسوس ہونے لگتی (اس کا ذکر کرنے پر پرنس ماریا کی بھی بالکل یہی کیفیت ہو جاتی تھی)۔ بلکہ جب وہ خود اس کے بارے میں سوچتا، تب بھی اس کی یہی حالت ہو جاتی تھی، تاہم اس کی موجودگی میں اسے کسی نوع کی قطعاً کوئی گھبراہٹ نہ ہوئی۔ اگرچہ وہ خوب سوچ سمجھ کر آیا تھا کہ ”آج میں فداں بات کروں گا اور اس مرتبے سے کروں گا۔“ لیکن جب موقع آیا، وہ اپنے آپ کو اس طرح کے رٹے رٹائے جملوں تک ہی محدود نہ رکھ سکا بلکہ جو بات بھی اس کے دھیان میں آئی، اس نے اس کا نہایت روانی اور بر جستگی سے اظہار کر دیا۔

جب اس مختصر ملاقات کے دوران میں کچھ دیر کے لیے خاموشی چھا گئی، جیسا کہ ایسے مواقع پر، جہاں بچے ہوں، لوگ ہمیشہ کرتے ہیں، نکولائی پرنس سندس کے نو عمر بیٹے کی طرف متوجہ ہوا۔ وہ اسے بہہ نے پھلانے اور اس سے پوچھنے لگا کہ آیا وہ ہوزار بننا پسند کرے گا۔ اس نے بڑے کو اپنے بازوؤں میں اٹھایا اور پرنس ماریا کو ایک نظر دیکھنے کے بعد خوش باش انداز سے ادھر ادھر گھمانے لگا۔ وہ ایسی نگاہوں سے، جن میں ملائمت، مسرت اور جھینپ تھی، بچے کو، جس سے اسے پیار تھا، اس شخص کے، جس سے اسے محبت تھی، بازوؤں میں دیکھتی رہی۔ نکولائی نے اسے یوں دیکھتے دیکھتے یہ اور ایسے جیسے وہ اس کی معنویت سمجھ گیا ہو، سرور و انبساط سے اس کا چہرہ تہمتانے لگا اور وہ نیک نیت لیکن چنچل انداز سے اس کے دھڑا دھڑبو سے لینے لگا۔

چونکہ پرنس ماریا ابھی تک سوگ منا رہی تھی، اس لیے وہ بڑے لوگوں کی محفل میں شریک نہیں ہوتی تھی، اور نکولائی نے اس کے ہاں دوبارہ جانا مناسب نہ سمجھا۔ تاہم گورنر کی بیوی رشتہ طے کرانے کے کام میں جاتی رہی۔

پرنس ماریا نکولائی کی اور نکولائی پرنس ماریا کی جو تعریفیں کرتا، وہ انھیں اور دونوں کے احساسات و جذبات ایک سے دوسرے تک پہنچاتی رہی۔ اس کا اصرار تھا کہ نکولائی پرنس ماریا کے سامنے اپنے عزائم کا ظہار کر دے۔ اس مقصد کے پیش نظر اس نے عبادت صبح سے قبل بشب کے گھر میں دونوں کی ملاقات کا اہتمام کیا۔

اگرچہ رستوف نے گورنر کی بیوی کو صاف صاف بتا دیا تھا کہ وہ پرنس ماریا کے سامنے اس قسم کی کوئی بات نہیں کہے گا، اس نے آنے کا وعدہ کر لیا۔

جس طرح ٹلٹ میں رستوف نے اپنے آپ کو اس چیز کو، جسے ہر شخص صحیح تصور کرتا تھا، صحیح تسلیم کرنے میں کسی قسم کے شک و شبہ میں مبتلا نہیں ہونے دیا تھا، اگرچہ اب اس کے ذہن و قلب میں مختصر لیکن سچی کشمکش ضرور ہوئی کہ وہ اپنی زندگی کو اپنی سمجھ بوجھ کے مطابق ترتیب دے یا حالات کے دھارے کے سامنے پیر انداز ہو جائے، اس نے اب بھی بعید موقوفہ انداز کے راستے کو منتخب کرنے میں ہی عاقبت جانی اور اس قوت کے آگے سر تسلیم خم کر دیا، جس کے متعلق اسے احساس تھا کہ وہ اسے یوں اپنے ساتھ بھائے بے جا رہی ہے کہ وہ اس کے ساتھ زور آزمائی نہیں کر سکتا۔ وہ جانتا تھا کہ سونیا کے ساتھ عہد و پیمان باندھنے کے بعد پرنس ماریا کے سامنے اپنے جذبات کا اظہار کرنا پرلے درجے کی کمینگی ہوگی اور وہ جانتا تھا کہ اس سے کمینگی کا ارتکاب کبھی نہیں ہو سکے گا۔ لیکن وہ یہ بھی جانتا تھا (یا کم از کم اپنے دل میں محسوس کرتا تھا) کہ حالات کی قوت اور ان لوگوں کے سامنے ہتھیار زائل کر دینے صرف یہ کہ وہ کوئی غلط کام نہیں کر رہا بلکہ کوئی نہایت ہم فریضہ۔ اتنا اہم کہ اس نے زندگی میں اس سے اہم تر کوئی کام نہیں کیا ہوگا۔ سرانجام دے رہا ہے۔

اگرچہ پرنس ماریا سے ملاقات کے بعد خطا ہری طور پر اس کے طرز حیات میں کوئی فرق نہیں آیا تھا لیکن اپنی سابقہ تفریحات میں اب اسے خاک مٹف نہ آتا اور وہ اکثر اپنے آپ کو اسی (پرنس ماریا) کے متعلق سوچتا پاتا۔ لیکن اس نے اس کے بارے میں کبھی اس انداز سے نہیں سوچا جس انداز سے وہ ان تمام نوجوان خواتین کے بارے میں، جن سے اس کی ملاقات اونچے طبقے کی محافل میں ہوتی تھی، سوچا کرتا تھا، اور نہ ب و سونیا کے متعلق تا دیر سوچتا اور سوچتا بھی تو پہلے کی طرح اس پر وجد کی کوئی کیفیت طاری نہ ہوتی۔ تقریباً تمام ذی عزت اور راست باز نوجوانوں کی مانند وہ ان میں سے ہر نوجوان خاتون کا یوں تصور باندھتا کہ وہ مستقبل میں اس کی بیوی بنے گی اور اس کے ساتھ اس کی شادی شدہ زندگی کیسے گزرے گی، اس کے تمام مناظر۔ ڈریسنگ گاؤن، ساواو کے پیچھے بیوی، بیوی کی گاڑی، maman اور پاپا کے ساتھ نشے منے بچے، اس کی بیوی کے ساتھ بن کاروبار، وغیرہ وغیرہ۔ اس کی نگاہوں کے سامنے گھوم جاتے، اور مستقبل کی ان تصویروں سے اسے لطف آتا۔ لیکن جب وہ پرنس ماریا کے متعلق سوچتا، جس کے ساتھ وہ اس کی سگائی کرنے پر کمر بستہ ہو چکے تھے، وہ مستقبل کی شادی شدہ زندگی کا کوئی نقشہ ترتیب نہ دے سکتا۔ اگر وہ کوشش کرتا بھی، تو اسے یہ سب کچھ غیر موزوں اور باطل مضموم ہونے لگتا، اس سے صرف اس کی بے چینی میں اضافہ ہوتا۔

بارودینو کی لڑائی اور اس لڑائی میں ہمارے جو لوگ زخمی یا ہلاک ہوئے تھے، ان کی وحشت ناک خبر سنا کر ہر جس دار اندیشہ چنچلی اور اس وحشت ناک خبر نے سب کے دل ہل دیے کہ ماسکو ہاتھ سے جاتا رہا ہے۔ پرنس ماریا نے اپنے بھائی کے زخمی ہونے کی خبر اخباروں میں پڑھی ضرور تھی لیکن اس بارے میں اسے کوئی مصدقہ اطلاع نہیں ملی تھی۔ چنانچہ وہ خود اس (بھائی) کی تلاش میں جانے کی تیاریاں کرنے لگی۔ (پرنس ماریا کے ان ارادوں کی اطلاع نکولائی کو دوسروں سے ملی تھی، خود اس کی اس سے دوبارہ ملاقات نہیں ہوئی تھی۔)

رستوف نے جب بارودینو کی لڑائی وراثت ایک ماسکو کی خبر سنی، اسے نہ مایوسی نے گھیرا اور نہ اس پر غیظ و غضب، انتقام یا اس نوع کا کوئی دوسرا جذبہ سوار ہوا لیکن ایک ایسا ایک دار اندیشہ کی کسی بھی چیز میں اس کے لیے دلچسپی اور لطف کا کوئی سامان نہ رہا، بلکہ الٹا اسے اکتاہٹ ہونے لگی۔ اس کا ضمیر اسے تقریباً کچھ کے لگانے لگا اور اس کی طبیعت میں انتہا بخش پیدا ہو گیا۔ جو گفتگو میں وہ مستاء اس میں اسے ریاکاری کی بو آتی۔ اسے علم نہیں تھا کہ وہ ان واقعات کے بارے میں کیا رائے قائم کرے اور اسے محسوس ہوتا تھا کہ جب وہ واپس راجنٹ میں جائے گا، تبھی ہر چیز اس پر واضح ہوگی۔ وہ گھوڑے خریدنے کے کام میں جلدت دکھانے لگا اور اکثر اپنے ملزم اور کوارٹر ماسٹر پر خواہ مخواہ برسنے لگا۔ نکولائی کی روانگی سے چند روز پیشتر کسی روسی نٹج کے موقع پر کلیسا میں خصوصی نماز شکرانہ کا اہتمام کیا گیا۔ اس میں شریک ہوا۔ وہ گورنر کے قدرے پیچھے کھڑا تھا۔ پوری عبادت کے دوران میں اس کے چہرے پر عسکری متانت چھائی رہی، ورنہ انتہائی متنوع موضوعات کے بارے میں سوچتا رہا۔ جب عبادت ختم ہو گئی، گورنر کی بیوی نے ہاتھ کے اشارے سے اسے بلایا۔

”تم پرنس سے ملے ہو یا نہیں؟“ اس نے ایک خاتون کی طرف، جو طاقتور موسیقی کی دوسری جانب کھڑی تھی، سر کو جنبش دیتے ہوئے کہا۔

اس نے چشم زدن میں پرنس ماریا کو پہچان لیا۔ اس کے چہرے کا ایک رخ اس کے ہیٹ کے نیچے نظر آ رہا تھا لیکن وہ اس کے چہرے سے اس کی اتنی شناخت نہ کر سکا جتنا خواستگاری، حزم اور ہیٹ کے احساس سے جو سما اس پر حاوی ہو گیا تھا۔ بظاہر یہی نظر آتا تھا کہ پرنس، ماریا اپنے خیالات میں مستغرق ہے۔ وہ گرجے سے نکلنے سے پہلے آخری بار اپنے سینے پر صلیب کا نشان بتا رہی تھی۔

نکولائی حیرت و استعجاب سے ٹھٹھکی باندھ کر اس کے چہرے کو دیکھنے لگا۔ یہ وہی چہرہ تھا جو وہ پہلے دیکھ چکا تھا۔ اس پر وہی عمومی شائستہ داخلی، روحانی کرب نمایاں تھا لیکن اب یہ بالکل نئی قسم کی روشنی سے درخشاں دتا ہوا تھا۔ اس پر غم و محن، دعا اور امید کچھ اس طور جھلک رہے تھے کہ آدمی متاثر ہوئے ہوا نہیں رہ سکتا تھا۔ جس طرح پہلے اس نے اس کی موجودگی میں کسی قسم کی ہلچل یا ہمت کا مظاہرہ نہیں کیا تھا، وہ ایک بار پھر گورنر کی بیوی سے شہہ لینے کا انتظار کیے بغیر

اس کی طرف چل پڑا اور اپنے آپ سے یہ پوچھنے بغیر کہ اس کا گرجے کے اندر اس سے یوں مخاطب ہونا صحیح اور مناسب ہے بھی یا نہیں، اسے بتانے لگا کہ وہ اس کے مصائب کے بارے میں سن چکا ہے اور دل کی گہرائیوں سے اس کے ساتھ ہمدردی کرتا ہے۔ جو نبی نکولائی کی آواز پرنس ماریا کے کانوں میں پڑی، وہ اپنا دکھ سکھ بھولی گئی اور اس کا سارا چہرہ نمایاں انداز سے تھمتانے لگا۔

”پرنس، میں ایک بات آپ کے گوش گزار کرنا چاہتا ہوں،“ رستوف نے کہا، ”اور وہ یہ ہے کہ اگر پرنس آندری کولائی درج بقید حیات نہ ہوتے، ان کا نام لازماً سرکاری گزٹ میں چھپتا کیونکہ وہ کرمل ہیں۔“

پرنس نے نگاہیں اٹھا کر اس کی جانب دیکھیں۔ اس کی مطلق سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے لیکن اس کے چہرے پر جو ہمدردی جھلک رہی تھی، اس نے اس کا جی خوش کر دیا۔

”اور مجھے بے شمار اشخاص کے متعلق معلوم ہے کہ انھیں، ہم کا نکلا (سرکاری گزٹ میں اسے شل کہا گیا تھا) لگا، وہ یا تو موقع پر ہی ہلاک ہو گئے یا پھر انھیں بالکل معمولی زخم آئے۔“ نکولائی نے کہا۔ ”ہمیں ابھی خبر کی، میرا دھنا چاہیے اور مجھے یقین ہے کہ۔“

پرنس ماریا نے اسے ٹوک دیا۔

”اف، یہ کتنی ہیبت۔“ وہ بولنے لگی لیکن اس کے اضطراب نے اسے اپنی بات ختم نہ کرنے دی۔ اس نے کمال رعنائی سے اپنا سر اس کے سامنے جھکا دیا (اس کی موجودگی میں اس کی ہر حرکت میں رعنائی اور زیبائی ہوتی تھی)، اور اس پر تشکر و امتنان کی نگاہ ڈالتے اپنی خالہ کے پیچھے پیچھے چل دی۔

اس شام نکولائی کسی سے ملنے نہ گیا بلکہ گھوڑوں کے تاجر کا حساب کتاب چکانے اپنی قیام گاہ پر ہی ٹھہرا رہا۔ جب وہ اپنے کام سے فارغ ہوا، رات اتنی ہیبت چکی تھی کہ کسی کے ہاں جانے کا وقت نہیں رہا تھا لیکن اتنی بھی گہری نہ ہوئی تھی کہ وہ سونے کی غرض سے بستر پر دراز ہو جاتا۔ وہ خاصی دیر تک اپنے کمرے میں چکر لگاتا اور اپنی زندگی کے بارے میں سوچتا رہا۔ یہ کام وہ شاید ونا در ہی کرتا تھا۔

سمولنسک کے قریب پہلی ملاقات کے دوران میں پرنس ماریا نے اس پر خوشگوار اثر چھوڑا تھا۔ ایک تو ن کی ملاقات اتنے غیر معمولی حالات میں ہوئی، پھر ایک مرتبہ اس کی ماں نے بھی اس سے کہا تھا کہ اس کے بے پردہ سوز دل رہے گا۔ ان باتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اپنے خیالوں میں اس میں خصوصی دلچسپی لینے لگا۔ جب دارانیو میں اس کی اس سے دوبارہ ملاقات ہوئی، اس نے اس پر جو تاثر چھوڑا، وہ نہ صرف خوشگوار تھا بلکہ قوی بھی تھا۔ اس مرتبہ اسے اس میں جو خاص قسم کا اخلاقی حسن نظر آیا، اس نے اس کے دل پر گہرا اثر کیا، تاہم وہ وہاں سے روانگی کی تیاریاں کر رہا تھا اور اسے اس خیال سے قسماً کوئی ملال نہیں ہوا تھا کہ دارانیو کو خبر بد کہنے سے وہ پرنس کو دیکھنے کے موقع سے محروم ہو جائے گا، لیکن اسے محسوس ہوا کہ اس صبح اس کی کمرے میں جو اچانک اس سے ملے بھٹک رہی تھی، وہ یوں اس کے دل پر راسخ ہو گئی ہے کہ اس کے اطمینان قلب کے لیے ٹھیک نہیں ہے۔ اس کا زرد، نرم و لطیف اور

اور اس چہرہ، اس کی درخشاں آنکھیں، اس کی کول اور عنائی سے بھرپور حرکات و سکنات اور خاصی طور پر وہ محبت اور ملائم افسردگی، جو اس کے سرے خدو خال میں جاری و ساری تھی، اسے بے چین و مضطرب کر رہی تھی اور اس کے دل میں ہمدردی کے جذبات پیدا کر رہی تھی۔ مردوں میں اسے جن اشخاص کے چہروں پر بے تکلیف روحانی زندگی کا پرتو نظر آتا، وہ اسے برداشت نہ کر پاتا (یہی وجہ ہے کہ وہ پرنس سندرے کو پسند نہیں کرتا تھا)۔ وہ اسے خفاقت سے فلسفہ آرائی یا تخیل پسندی کہتا تھا۔ لیکن پرنس ماریا کی افسردگی کامل روحانی دنیا کی گہرائی منکشف کرتی تھی۔ یہ دنیا اس کے لیے اجنبی تھی اور اسی لیے اتنی پرکشش کہ وہ بے اختیار اس کی طرف کھنچا چلا جا رہا تھا۔

”بڑی بخیرالعقول لڑکی ہے! صحیح معنوں میں فرشتہ صفت!“ اس نے اپنے آپ سے کہا۔ ”میں آزاد کیوں نہیں؟۔ سو نیا سے قول و قرار کرنے کی جلدی کیا تھی؟“ اور وہ غیر ارادی طور پر ان دونوں کے مابین سوار نہ کرنے لگا۔ ایک میں روحانی و صاف کا، جن سے وہ خود بھی دامن تھا، فقدان اور دوسری میں ان کی فراوانی۔ اس نے یہ تصور کرنے کی کوشش کی کہ اگر وہ آزاد ہوتا، پھر معاملات کی صورت کیا ہوتی۔ وہ کس طرح سے شادی کی تجویز پیش کرتا اور وہ کس طرح اس کی رفیقہ حیات بن جاتی لیکن نہیں، وہ اس قسم کی خیال آرائی نہیں کر سکتا۔ اس کا دل بیٹھنے لگا اور اس کے ذہن میں کوئی واضح تصویر نہ ابھر سکی۔ بدلتوں پہلے اس نے مستقبل میں سوئے کے ساتھ زندگی بتانے کی تصویر بنائی تھی اور یہ سب کچھ محض اس لیے سیدھا سادا اور غیر مبہم تھا کیونکہ اس کے متعلق ہر پہلو سے سوچا جا چکا تھا اور وہ سو نیا کو اچھی طرح جانتا تھا۔ لیکن پرنس ماریا کے ساتھ مستقبل کیسے ہوگا، اس کی ذہن میں تصویر بنانا ناممکن تھا کیونکہ وہ اسے سمجھتا نہیں تھا، اس سے صرف محبت کرتا تھا۔

سو نیا کے بارے میں وہ جو خواب دیکھا کرتا تھا، وہ نثر انگیز ہوتے تھے اور ان سے ایک قسم کے کھلنڈرے بن کا تاثر جھلکتا تھا۔ مگر پرنس ماریا کے بارے میں خوب بننا مشکل تھا اور اس میں اسے قدرے خوف بھی محسوس ہوتا تھا۔ ”کیا انداز تھا عبادت کا؟“ وہ سوچ رہا تھا۔ ”معلوم ہوتا تھا کہ اس کی ساری روح عبادت میں جذب ہو گئی ہے۔ ہاں، اس قسم کی عبادت پہاڑوں کو ہلا دیتی ہے اور مجھے یقین ہے کہ اس کی عبادت، زمانہ توں ہو گئی ہوگی۔ جو کچھ میں چاہتا ہوں، میں اس کے لیے دعا کیوں نہیں کرتا؟“ اس نے یک دم اپنے آپ سے پوچھا۔ ”میں کیسے چاہتا ہوں؟“ رمتنگاری۔ میں چاہتا ہوں کہ سو نیا مجھے آزاد کر دے۔۔۔ وہ ٹھیک کہتی تھی۔“ گورنر کی اہلیہ نے جو کچھ کہا تھا اس نے سے یاد کرتے ہوئے سوچا۔ ”سو نیا سے شادی کر کے کلفت کے عداوہ کچھ ہاتھ نہیں آئے گا۔ ابھیں اور بکھیڑے، اماں کی کبیہہ خا طری، کاروباری مشکلات، بگھتیاں اور بگھتیاں اور بیت ناک ابھار دے! عداوتیں مجھے اس سے محبت نہیں۔ اس طرح نہیں جس طرح کہ ہونا چاہیے۔ یا خداوند! مجھے اس اذیت ناک اور مایوس کن صورت حال سے چھٹکارا دلانا!“ وہ ایک ایسی دعا مانگنے لگا۔ ”ہاں، دعا کو ہزاروں کو ہلاکتی ہے لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ آدمی ایقان کی دولت سے مالا مال ہو ورنہ اس طرح دعا مانگنے جس طرح بچپن میں نسا شاہ اور میں مانگا کرتے تھے کہ برف چینی میں تبدیل ہو جائے اور پھر بہتے بہتے جمن میں آجائے تاکہ ہم اس سے لطف اندوز ہو سکیں۔“

ہیں، سب میں حقیر اور بے وقعت اشیاء کے لیے دعا نہیں مانگ رہا۔“ اس نے اپنا پائپ کوٹے میں رکھتے اور ہاتھ ہاندھے ایقونوں کے سامنے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ اور پرنس ماریا کے تصور نے اس کا دل پکھلادیا اور وہ اس طریقے سے دعا مانگنے لگا کہ کافی عرصے سے نہیں مانگی تھی۔ اس کی آنکھیں آبدیدہ ہو گئیں اور اس کا گلارندھ گیا کہ لاوردشکا چند کاغذات اٹھائے کمرے میں داخل ہوا۔

”اتو کی دم، جب میں نے تمہیں بلایا ہی نہیں، تم منہ اٹھائے اندر کیوں چلے آ رہے ہو؟“ نکولائی نے ہر جھلک پناو یہ تبدیلی کرتے ہوئے کہا۔

”گورنر کی طرف سے۔“ لاوردشکا نے خواب آلود آواز میں کہا۔ ”ان کا ایلچی آیا ہے۔ آپ کا خط بھی ہے۔“

”بہت اچھا، شکریہ۔ تم جاسکتے ہو۔“

نکولائی نے دونوں خطوط ٹھہریے۔ ایک اس کی ماں کا تھا اور دوسرا سونیو کا۔ اس نے انہیں ان کے طرز تحریر سے پہچان لیا۔ اس نے پہلے سونیو کا خط کھولا۔ اس نے محض چند سطور پڑھی تھیں کہ اس کے چہرے کا رنگ فق ہو گیا اور خوف و سرت سے اس کی آنکھوں کی پتلیاں پھیل گئیں۔

”نہیں، یہ ممکن نہیں ہے!“ وہ پاؤں بلند پکارا تھا۔

اس کے لیے چپ چاپ بیٹھے رہنا ناممکن ہو گیا۔ وہ دونوں ہاتھوں میں خط پکڑے اور اسے پڑھتے کمرے میں چکر لگانے لگا۔ اس نے اس پر سرسری نظر ڈالی، ایک مرتبہ پڑھا اور پھر دوسری مرتبہ، بچے کندھے اچکائے، بازو ہوا میں اچھالے اور کمرے کے درمیان میں ساکت وصاست کھڑا ہو گیا۔ اس کا منہ کھلاتھا اور وہ غلنگی ہاندھے دیکھ رہا تھا۔ وہ جو کچھ اس اعتماد کے ساتھ کہ خداوند اس کی سنے گا، دعا میں مانگ رہا تھا، وہ اب پورا ہو چکا تھا، لیکن نکولائی اتنا ششدر ہوا جیسے یہ کوئی انہونی، اور ناشدنی بات ہو، جیسے اسے اس کی کوئی توقع نہ ہو، جیسے کہ یہی حقیقت کہ یہ سب کچھ اتنا جھٹ پٹ ہوا، یہ ثابت کرنے کے لیے کافی ہو کہ یہ خدا کی، جس سے وہ دعائیں مانگ رہا تھا، طرف سے نہیں ہوا بلکہ محض اتفاق ہو گیا ہے۔

وہ گرا، جس نے اسے بے دست و پا بنا رکھا تھا اور جو بظاہر یوں معلوم ہوتی تھی کہ کانے کئے گی نہیں، سونیو کے اس خط سے، جس کا کوئی سان گمان نہیں تھا اور جس کے لیے (اس کا یہی خیال تھا) اس نے کوئی التجا نہیں کی تھی، قطع ہو گئی تھی۔ اس نے لکھ لکھا کہ انہوں نے حال ہی میں جو مصائب جھیلے ہیں، رستوں کو عملاً اپنی ماسکو کی تمام جائیداد سے جس طرح ہاتھ دھونا پڑے ہیں اور کاؤٹنس یہ جو بار بار تقاضا کرتی رہتی ہے کہ نکولائی کو پرنس بلکونسکا یا سے شادی کر لینا چاہیے، پھر گزشتہ کچھ عرصے سے وہ خود اس کے ساتھ جس سردمہری اور بے اعتنائی سے پیش آتا رہا ہے، ان تمام باتوں سے مل ملا کر اسے یہ فیصلہ کرنے پر مجبور کر دیا ہے کہ اس نے اس کے ساتھ جو عہد و پیمان کیا تھا، وہ اس سے اسے خلاص کر دے اور اسے مکمل آزادی دے دے۔

میرے لیے یہ سوچنا ہی نہایت تکلیف دہ امر ہے (اس نے تحریر کیا تھا) کہ میں اس خانہ میں، جس نے میرے ساتھ اتنا اچھا سلوک کیا ہے، نفاق مارنچ دالم کا سبب بنوں اور میرے بچہ کا اس کے علاوہ اور کوئی مقصد نہیں کہ میں جن لوگوں سے محبت کرتی ہوں، ان کے لیے مسرت فراہم کروں۔ جتنا بچہ، ٹوکس، میں تم سے اتنا کرتی ہوں کہ تم اپنے آپ کو مجھ سے آزاد سمجھو اور یہ بھی جان لو کہ سب باتوں کے باوجود مجھ سے بڑھ کر تم سے کوئی سچی محبت نہیں کر سکتا۔

نھاری سونا

دونوں خطوط تردنتا کے مقام سے تحریر کیے گئے تھے۔ کاؤنٹس نے اپنے خط میں ماسکو میں اپنے آخری ایام، روانگی، استنش زدگی اور اپنی ساری جائیداد کے اتلاف کی رواداد بیان کی تھی۔ اس نے اس خط میں یہ بھی لکھا تھا کہ پرنس سمندے زخمی ہو چکا ہے اور دوسرے زخمیوں کے ساتھ ان کے ہمراہ سفر کر رہا ہے، اس کی حالت نازک ہے لیکن ڈاکٹر کا کہنا ہے اب اس کے سنبھلنے کی امید کچھ بڑھ گئی ہے، سونیا اور نتاشا اس کی حیران داری کر رہی ہیں۔ اگلے روز نکولائی نے اپنی والدہ کا خط اٹھایا اور پرنس ماریا سے ملنے چل پڑا۔ اس جیسے کے کہ "نتاشا اس کی تیمارداری کر رہی ہے" امرکائی مطالب کیا ہو سکتے تھے، دونوں نے ان کے بارے میں ایک لفظ بھی نہ کہا۔ تاہم یہی خط کا اعجاز تھا کہ نکولائی اچانک پرنس سے اتنا بے تکلف ہو گیا جیسے وہ جہنم جہنم سے ایک دوسرے کے رفیق ہوں۔ اگلے صبح کاؤنٹ رستوف نے پرنس ماریا کو یاروسلاول کے سفر پر روانہ کیا اور چند روز بعد خود اپنی رجسٹری میں شامل ہونے کی غرض سے چل پڑا۔

8

نکولائی کے نام سونیا کا خط، جو اس کی دعاؤں کے جواب میں موصول ہوا تھا، تردنتا کے مقام سے لکھا گیا تھا۔ اسے جس چیز نے یہ تحریر کرنے کی تحریک دی تھی، وہ یہ تھی کہ یہ خیال کہ نکولائی کو کسی مسئول دوشیزہ سے شادی کرنا چاہیے، کاؤنٹس کے ذہن پر کاہن کی طرح سوار ہو گیا تھا۔ وہ اٹھتے بیٹھتے اسی کا ورد کرتی رہتی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ اس شادی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ سونیا ہے اور کاؤنٹس کے گھر میں، خاص طور پر اس وقت سے جب رستوف کا وہ خط موصول ہوا تھا، جس میں اس نے باگو چارانو میں پرنس ماریا سے اپنی ملاقات کی تفصیل بیان کی تھی، اس کی زندگی روز بروز تلخ سے تلخ تر ہوتی جا رہی تھی۔ کاؤنٹس کو جب بھی موقع ملتا، وہ طنز و تہلیل کے تیر چلانے یا کوئی ایسی بات کہنے سے نہ چوکتی، جس سے سونیا کی خودداری کو ٹھیس پہنچ سکتی تھی۔

لیکن ماسکو کو خیر باد کہنے سے چند روز بعد مشترکہ حالات کی رفتار سے اتنی پریشان اور دلی کیر ہوئی کہ اس نے سونیا کو بدایا اور اس کی زجر و توبخ کرنے اور اس سے کسی قسم کا مطالبہ کرنے کے بجائے اس سے دل فگار راہ انداز اور

آہدیدہ آنکھوں سے التجا کرنے لگی کہ وہ قربانی دے اور خاندان نے اس کے لیے جو کچھ کیا ہے، اس کا معاوضہ یوں ادا کرے کہ نکولائی کے ساتھ اپنی سگائی ختم کر دے۔

”جب تک تم مجھ سے یہ وعدہ نہیں کرئیں، مجھے لمحہ بھر قمر نہیں آئے گا۔“ اس نے کہا۔

سونیا کی شدت جذبات سے حالت غیر ہو گئی اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اس نے آنکھوں، آہوں اور سسکیوں کے مابین کہا کہ وہ سب کچھ کرے گی، سب کچھ کرے کے لیے رضامند ہے لیکن اس نے کوئی دھوکہ وعدہ نہ کیا کیونکہ اس سے جس چیز کا تقاضا کیا جا رہا تھا وہ اس کی ہائی بھرنے کے لیے تلبی طور پر اپنے آپ کو آمادہ نہ کر سکی۔ جس خاندان نے اس کی پرورش و پرورش کی تھی، وہ اس کی خاطر قربانی دینے کے لیے اپنے آپ کو مجبور پاتی تھی۔ دوسروں کے لیے قربانیاں دینا سونیا کی فطرت ثانی بن چکی تھی۔ گھر میں اس کا مقام کچھ ایسا تھا کہ وہ محض قربانی دے کر ہی اپنی قدر و قیمت جتا سکتی تھی اور وہ نفس کشی اور اپنے حقوق سے دست برداری کی عادی ہو گئی تھی۔ اس نے بے تک جتنی قربانیاں دی تھیں، انھوں نے اسے اس حقیقت الامری سے آگاہ کر دیا تھا کہ انھوں نے نہ صرف دوسروں بلکہ خود اس کی اپنی نگاہوں میں اس کی قدر و قیمت بڑھادی ہے اور اس احساس پر اس کا دل خوشی سے جھوم اٹھتا۔ یوں وہ خود کو نکولائی کے لیے، جسے وہ دنیا کی ہر چیز سے بڑھ کر پیار کرتی تھی، ذریعہ مزا اور سنبھلنے لگتی۔ لیکن اب اس سے جس نوع کی قربانی کا مطالبہ کیا جا رہا تھا، اس کا مطلب اسی چیز سے دست برداری اختیار کرنا ہوگا جو اس کی ان قربانیوں کا پورا اصلہ تھا اور جس سے اس کی تمام زندگی عبارت تھی۔ اور پہلی بار سے ان لوگوں پر غصہ آیا جنھوں نے اس کی محض اس لیے دست گیری کی تھی تاکہ وہ اسے مزید کرب ناک آزمائشوں میں سے گزار سکیں۔ اسے نشانہ پر رشک آتا تھا جسے کبھی اس قسم کے تجربوں سے گزارنا نہیں پڑا تھا، جسے کبھی قربانی دینے کی ضرورت پیش نہیں آئی تھی، بلکہ جب وہ دوسروں کو اپنے لیے قربانی دینے کے لیے مجبور کرتی تب بھی ہر کسی کی آنکھ کا تارانی رہتی تھی۔ ورسونیا کو پہلی مرتبہ احساس ہوا کہ اسے نکولائی سے جو پاکیزہ اور خاموش محبت ہے، اس کی وجہ سے اس کے اندر ایسا پر جوش جذبہ پرورش پا رہا ہے جو اصول، نیکی یا مذہب سے زیادہ قوی ہے اسی جذبے کے زیر اثر سونیا نے، جس کی دست گیری کی زندگی نے اسے اخلاقی پسند بنا دیا تھا، کاؤنٹس کو مبہم عمومی اصطلاحوں میں جواب دینے کے بعد اس سے مزید گفتگو کرنے سے احتراز برتا اور دل میں تہیہ کر لیا کہ جب تک نکولائی سے اس کی ملاقات نہیں ہو جاتی، وہ انتظار کرے گی۔ اس کے پیش نظر جو خیال تھا، وہ یہ نہیں تھا کہ وہ اسے آزادی دے دے گی بلکہ اس کے برعکس وہ اسے دوا کی طور پر اپنے ساتھ نکھن کرنا چاہتی تھی۔

اسکو میں رستونوں کے آخری ایام کی گہما گہمی اور خوف و رہشت نے ان افسردہ خیالات کا گلا گھونٹ دیا تھا جو سونیا کے دل و دماغ پر کابوس کی طرح سوار رہتے تھے۔ وہ خوش تھی کہ عملی مصروفیات میں اسے ان سے پناہ مل گئی ہے، مگر جب سے اپنے گھر میں پرنس آندرے کی موجودگی کا علم ہوا، اس مر کے باوجود کہ اسے نشانہ اور اس (پرنس آندرے) پر اصلی اور کھر ترس آیا تھا، وہ اس پر مسرت اور توجہ مانہ جذبے کی گرفت میں آ گئی کہ خداوند سے

نکولائی سے علیحدہ کرنے کا ارادہ نہیں رکھتا۔ وہ جانتی تھی کہ ناسا کو پرنس آندرے کے علاوہ اور کسی شخص سے محبت نہیں ہے اور اس نے اس سے محبت کرنا کبھی ترک نہیں کیا ہے۔ وہ جانتی تھی کہ اگر ان ہولناک حالات میں انھیں یک جا کر دیا جائے، وہ ایک بار پھر دیو، نہ وار، ایک دوسرے کی محبت میں گرفتار ہو جائیں گے اور پھر نکولائی اس قربت دوری کے سبب، جو ان کے مابین استوار ہوگی، پرنس ماریا کے ساتھ شادی نہیں کر سکے گا۔ ماسکو کے آخری اور سفر کے ابتدائی ایام کے دوران میں جو وحشت ناک واقعات ظہور پذیر ہوئے، ان کے باوجود یہی وہ جذبہ ہی ہے کہ وہ آگئی تھی کہ قدرت مطلقہ اس کے ذاتی معاملات میں دخل دہر رہی ہے۔ جس نے سو نیا کے دل کی سر جھکی ہوئی کلی کھلا دی۔ رستوفوف نے سفر کے دوران میں تر و نتا خانقاہ میں پورے دن قیام کیا۔

خانقاہ کے ہوٹل میں انھیں تین کمرے تفویض کر دیے گئے۔ ان میں سے ایک میں پرنس آندرے، جس کی حالت اس روز بہتر تھی، منیم ہو گیا۔ ناسا اس کے پاس بیٹھی تھی۔ کاؤنٹ ورکاؤٹس باحقہ کمرے میں موجود تھے اور مؤدبہ انداز سے خانقاہ کے منتظم (prior) کے ساتھ، جو اپنے پرانے شناساؤں اور محسنوں سے ملنے آیا تھا، معروف گفتگو تھے۔ سو نیا بھی وہیں تھی۔ وہ اس تجسس میں کھلی جا رہی تھی کہ پرنس آندرے اور ناسا کیا باتیں کر رہے ہیں۔ اسے دروازے کی جھری میں سے ان کی باتوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ پرنس آندرے کے کمرے کا دروازہ کھلا اور ناسا باہر آئی۔ اس کی کیفیت بھائی ہو رہی تھی۔ اس نے دیکھا ہی نہیں کہ وہاں راہب موجود ہے۔ وہ اس کا استقبال کرنے، ٹھہ کر کھڑا ہو گیا تھا اور اپنے بازو کو فراخ آستین سے ڈھانپ رہا تھا۔ ناسا سیدھی سو نیا کے پاس گئی اور اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

”ناسا، کیا سوچ رہی ہو؟ ادھر آؤ“ کاؤنٹس نے کہا۔

ناسا دعا لینے راہب کے قریب ہو گئی۔ راہب نے اسے مشورہ دیا کہ وہ استمداد کے لیے خداوند اور خانقاہ کے مربی سینٹ¹² سے رجوع کرے۔

جو بھی راہب رخصت ہوا، ناسا نے اپنی سہیلی کا ہاتھ پکڑا اور اس کے ساتھ خالی کمرے میں چلی گئی۔

”سو نیا، سنی ہو، وہ زندہ رہیں گے۔ زندہ رہیں گے نا؟“ اس نے کہا۔ ”میں کتنی خوش ہوں اور کلفت زدہ بھی کتنی! سو نیا ڈارلنگ، ہر شے جوں کی توں ہے۔ کاش، وہ صرف زندہ رہیں۔ ان کا انتقال نہیں، کیونکہ کیونکہ... اور ناسا کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔

”ہاں، مجھے معلوم تھا! شکر خداوند!“ سو نیا بڑبڑائی۔ ”وہ زندہ رہیں گے۔“

سو نیا اپنی سہیلی سے کم مضطرب نہیں تھی۔ اس میں جتنا مؤخر الذکر کے خدشات اور اذیتوں کو دخل تھا ان کا اس کے ذاتی خیالات کو، جن میں وہ کسی کو اپنا ہم راز نہیں بناتی تھی، ہلکتے اور سکتے وہ ناسا کی بلائیں اپنے در اسے تسلیاں دینے لگی۔

”کاش، وہ زندہ رہے!“ اس نے دل میں سوچا۔

رہنے دھونے، باتیں کرنے اور سوچ چھنے کے بعد دونوں سہیلیاں پرس آندرے کے کمرے میں دروازے تک گئیں۔ ننا شانے اسے نہایت احتیاط سے کھولا اور کمرے میں جھانکنے لگی۔ نیم دروازے کے قریب سونیا اس کے پہلو میں کھڑی تھی۔

پرس آندرے میں نکیوں کے سہارے لیٹا ہوا تھا۔ اس کا چہرہ زرد اور آنکھیں بند تھیں۔ وہ انہیں باقاعدہ سانس لیتا نظر آ رہا تھا۔

”اف، ننا شا!“ سونیا نے تقریباً چیختے ہوئے کہا۔ اس نے اپنی کزن کا ہاتھ اپنی گرفت میں جکڑ لیا اور دروازے سے پیچھے ہٹ گئی۔

”کیا؟ کیا ہوا؟“ ننا شانے پوچھا۔

”نیرہ۔ یہ وہی۔“ سونیا نے کہا۔ اس کا رنگ فق ہو چکا تھا اور ہونٹ لرز رہے تھے۔

ننا شانے دیکھے سے دروازہ بند کر دیا اور سونیا کے ساتھ کھڑکی کے قریب چلی گئی۔ وہ ابھی تک سمجھ نہیں پاتی تھی کہ سو خرا لڑکے کیا بتانے کی سعی کر رہی ہے۔

”تمہیں یاد ہے۔“ سونیا نے کہا۔ اس کے چہرے پر سنجیدگی اور خوف جھلک رہا تھا۔ ”تمہیں یاد ہے کہ جب میں نے تمہاری خاطر آئینے میں دیکھا تھا۔ کمرے پر اترا دیا میں؟ تمہیں یاد ہے میں نے کیا دیکھا تھا؟“

”ہاں، ہاں!“ ننا شانے چلا کر کہا۔ اس کی آنکھوں کی پتلیاں پھیل گئیں اور اسے دھندلا سا یاد آنے لگا کہ سونیا نے کچھ اس قسم کی بات کہی تھی کہ پرس آندرے لیٹا ہوا ہے۔

”تمہیں یاد ہے؟“ سونیا نے اپنا سلسلہ کلام جاری رکھا۔ ”میں نے اس وقت انہیں دیکھا تھا اور اس بارے میں کبھی کو، تمہیں وردنیا شا کو بھی بتایا تھا۔ میں نے انہیں بستر پر لیٹے دیکھا تھا۔“ اس نے ایک تفصیل پر، جو وہ بیان کر رہی تھی، انگلی لہراتے ہوئے کہا۔ ”میں نے دیکھا کہ ان کی آنکھیں بند ہیں۔ ان کا جسم بے رحم گلابی لحاف میں لپٹا ہوا تھا اور ان کی مٹھیاں بچنی ہوئی تھیں۔“ اس نے اپنی بات ختم کرتے ہوئے کہا۔ وہ اپنے آپ کو یقین دلا رہی تھی کہ جو کچھ وہ کہہ رہی تھی اس کی ایک ایک تفصیل میں وہی سچی جو اس نے دیکھی تھی۔

درحقیقت تب اس نے کچھ بھی نہیں دیکھا تھا، بلکہ جو بات پہلے اس کے ذہن میں آئی، وہی اس نے بیان کر دی تھی۔ لیکن جو کچھ اس نے تب گھڑ تھا، کسی بھی دوسری یاد کی طرح اب اسے اپنی برحقیقت نظر آ رہا تھا۔ اسے نہ صرف وہ کچھ یاد آیا جو اس نے انہیں بتایا تھا۔ یہ کہ اسے مڑ کر اسے دیکھا تھا اور وہ مسکرایا تھا اور وہ کسی سرخ سی چیز میں لپٹا ہوا تھا۔ بلکہ اب اسے پختہ یقین ہو چکا تھا کہ تب اس نے دیکھا بھی، دو مردوں کو بتایا بھی تھا کہ اس کا جسم گلابی لحاف میں ڈھکا ہوا ہے۔ ہاں، گلابی۔ اور یہ کہ اس کی آنکھیں بند ہیں۔

”ہاں، ہاں، یہ گلابی تھا۔“ ننا شانے کہا۔ اسے یقین ہونا چاہا تھا کہ اسے یاد ہے کہ اس نے گلابی ہی کہا تھا اور اسے رو یا کامیہ جزا انتہائی غیر معمولی اور پراسرار معلوم ہو رہا تھا۔

”لیکن اس کا مطلب کیا ہے؟“ اس نے سوچتے ہوئے کہا۔

”اف، مجھے کچھ معلوم نہیں۔ یہ سب کچھ بے حد عجیب ہے!“ سونیا نے اپنا سر پکڑتے ہوئے کہا۔
چند منٹ بعد پرنس آندرے نے گھنٹی بجائی اور نسا شا اس کے پاس چلی گئی۔ لیکن سونیا، جس پر وہ جہاں بھی جان
کی کچھ ایسی کیفیت طاری تھی، جس کا ازیں بیشتر اسے کبھی تجربہ نہیں ہوا تھا، کھڑکی کے قریب کھڑی رہی اور جو کچھ
ہوا تھا، اس کے نرے پن کے بارے میں سوچتی رہی۔



اس روز فوج کو خطوط ارسال کرنے کا موقع میسر تھا اور کاؤنٹس اپنے بیٹے کے نام خط لکھ رہی تھی۔
”سونیا۔“ کاؤنٹس نے، جب اپنی بھانجی کو اپنے قریب سے گزرتے دیکھ، خط سے نظریں اٹھ کر کہی۔
”سونیا، تم نکولینکا کو کچھ نہیں لکھو گی؟“

اس نے اپنا سواں نرم اور لرزتی آواز میں پوچھا تھا اور سونیا نے ان تھکی تھکی نگاہوں میں، جو جیسے کے اوپر
جھانک رہی تھیں، وہ سب کچھ پڑھ لیا، جس کا کاؤنٹس ان الفاظ کے ذریعے اظہار کرنا چاہتی تھی۔
ان نگاہوں میں منت سماجت تھی، بھیک مانگنے کی مجبوری پر شرمندگی کا احساس تھا،، نکار کا خوف تھا اور اگر بہ
انکار ہو گیا، پھر ان میں ایسی نفرت کے بھڑکنے کا احتمال تھا جو کبھی نہیں مٹ سکے گی۔
سونیا کاؤنٹس کے پاس پہنچی، نیچے تھکی اور اس نے اس کے ہاتھ پر بوسہ دیا۔
”ہاں، maman، میں لکھتی ہوں۔“

اس روز جو کچھ وقوع پذیر ہوا اور خاص طور پر جس پر اسرار انداز سے اس کے رویا کی تعبیر صحیح ثابت ہوئی، اس
سے سونیا بہت متاثر ہوئی، اس پر یہی فی کیفیت طاری ہو گئی اور اس کا دل سو م ہو گیا۔ اب جب کہ اسے معلوم ہو چکا
تھا کہ پرنس آندرے کے ساتھ نسا شا کے تعلقات کی تجدید نکولائی کی پرنس ماریا کے ساتھ شادی کی راہ میں مزاحم ہو
گی، اسے یہ احساس ہونے لگا کہ اس کا قریبی کا جذبہ، جس کی وہ اتنی خوگر چکی تھی اور جس کے سہارے اسے دنیا
رہنا، چھا لگتا تھا، پھر لوٹ آیا ہے۔ اپنے اس احساس سے اس کا دل جھومنے لگا۔ اسے خوشی اس بات کی تھی کہ وہ
تہایت عانی ظرفی کا مظاہرہ کر رہی ہے اور اس نے اسی کیفیت میں وہ دل کو تسخیر دینے والا خط تحریر کر دیا۔ تحریر کے
دوران میں بار بار اس کے آنسو نکل آتے اور اس کی مٹلیں سیاہ آنکھوں میں دھندلاہٹ آجاتی اور لکھائی کا کام رک
جاتا۔ کہ نکولائی کو جب وہ موصول ہوا، وہ بھونچکا رہ گیا۔

جس اسرار اور سپاہیوں نے بیئر کو راست میں لیا تھا، انھوں نے فوجی حوامات میں، جہاں وہ اسے لے گئے تھے،

اس کے ساتھ معاہدہ برتاؤ کیا لیکن اس کے ساتھ ہی انہوں نے اس کا احترام بھی کیا۔ انہوں نے اس کے ساتھ جو رویہ اختیار کیا، اس سے یہ عہد یہ ملتا تھا کہ انہیں یقین نہیں ہے کہ وہ کون ہے (ہو سکتا ہے وہ کوئی اہم شخص ہی ہو)، لیکن حال ہی میں اس کے ساتھ ان کا جو جھگڑا ہو تھا، اس پر انہیں اس سے عہد بھی تھا۔

تاہم جب اگلی صبح گارڈ کی تبدیلی عمل میں آئی، میئر کو محسوس ہوا کہ نئی گارڈ۔ انسروں اور جوانوں دونوں۔ کو اس میں ذرا دلچسپی نہیں جو ان لوگوں کو تھیں جنہوں نے اسے گرفتار کیا تھا۔ اور نئی بات یہ ہے کہ جو لوگ اگلی صبح ڈیوٹی پر آئے، انہیں دیہاتی کوٹ میں بلبوس اس ہٹے کئے، بھاری بھر کم اور منہ زور شخص میں، جس نے لوٹ مار کرنے والے فوجی جوان اور عسکری دستے کے ساتھ اتنا زبردست مقابلہ کیا تھا اور جس نے بچی کی جان بچانے کے بارے میں وہ دھمکریں الفاظ ادا کیے تھے، کوئی خاص بات نظر نہ آئی۔ انہیں وہ رویہ قید یوں میں جنہیں اعلیٰ حکام کے پر کسی وجہ سے گرفتار کیا درحوالات میں ڈالا گیا تھا، محض بسرستہ دکھائی دے رہا تھا۔ انہیں میئر میں اگر کوئی قابلِ اعتبار بات نظر آئی بھی، تو یہ تھی کہ وہ گھبرائے یا شرمائے بغیر پورے اسہاک سے اپنی سوچوں میں مستغرق تھا، پھر اس کا فریسیسی، جو انہیں حیران کن حد تک خوبصورت معلوم ہوئی، بولنے کا انداز تھا۔ تاہم، اسے اسی روز دوسرے مشہور اشخاص کے ساتھ، جنہیں حراست میں لیا گیا تھا، بند کر دیا گیا کیونکہ اسے جس علیحدہ کمرے میں رکھا گیا تھا، وہ کسی انسر کے لیے درکار تھا۔ میئر کے ساتھ جو رویہ نظر بند کیے گئے تھے، ان سب کا تعلق انتہائی نچلے طبقے سے تھا۔ وہ سب بھنب گئے کہ وہ اشرف میں سے ہے۔ یوں ان میں سے کوئی بھی اس کے قریب نہ پھٹکا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہوئی کہ وہ فریسیسی بولتا تھا۔ میئر جب انہیں اپنا مذاق اڑاتے سنتا، وہ غم گین ہو جاتا۔

اسی شام میئر کو معلوم ہوا کہ تمام قیدیوں (جن میں لاریب و خود بھی شامل تھا) پرائش زنی کے اہرام میں مقدمہ چلے گا۔ تیسرے روز اسے دوسروں کے ہمراہ ایک اور عدالت میں لے جایا گیا۔ وہاں ایک فریسیسی جرنیل بیٹھا تھا، جس کی سفید موچھیں تھیں، دو کرنیلوں اور چند دیگر فریسیسیوں کے ساتھ، جن کی استیجوں پر بیٹے جہاں تھے۔ دوسروں کی طرح میئر سے بالکل صحیح انداز سے، جو رواجا قیدیوں کے ساتھ تفتیش کے دوران میں اختیار کیا جاتا ہے، کرید کرید کر پوچھا گیا کہ وہ کون ہے، کہاں گیا تھا اور کس مقصد کے پیش نظر گیا تھا، وغیرہ وغیرہ۔

اس پوچھ بچھ کے دوران میں معاملے کے اصل پہلو کو نظر انداز کر دیا گیا اور یوں اس اصل پہلو کے دریافت کیے جانے کے امکان کو دائمی طور پر خارج کر دیا گیا اور جس طرح مقدمے کی کارروائی کے دوران میں عموماً ہوتا ہے، سوالات پوچھنے کا وہ حد مقصد صرف ایک ایسا ذریعہ تلاش کرتا تھا جس کے ذریعے ججوں کی یہ خواہش تھی کہ وہ ملزموں کے جوابات کچھ اس انداز سے حاصل کریں جو مطلوبہ نتیجہ تک پہنچے یعنی انہیں مجرم ٹھہرانے میں مدد و معاون ثابت ہو۔ جوئی میئر کوئی ایسی بات کہنا شروع کرتا جو اس مقصد کے حصوں کے لیے نامساعد ہوتی، اسے بولنے تو دیا جاتا لیکن اس کی بات پر کوئی دھیان نہ دیا جاتا اور یوں وہ جو کچھ کہتا، بالکل بیکار جاتا۔ مزید برآں میئر کو وہی کچھ محسوس ہو رہا تھا جو ملزم مقدمے کے دوران میں ہمیشہ محسوس کرتا ہے۔ وہ اس انجھن میں گرفتار تھا کہ اس سے یہ سوالات

کیوں پوچھے جارہے ہیں۔ اسے یہ احساس ہو رہا تھا کہ اس سے جس خاص انداز سے سو بات پوچھے جارہے ہیں اس سے وہ یہ ظاہر کرنا چاہتے ہیں کہ وہ اس کے ساتھ بڑی گرم فرمائی سے پیش آ رہے ہیں یا سروت بہت دے رہے ہیں۔ وہ جانتا تھا کہ وہ ان لوگوں کے قبضہ و تدبیر میں ہے، اسے بزدل شمشیر یہاں لایا گیا ہے، مجھ بزدل شمشیر نے انھیں اس سے ان سوالات کے جوابات اگلوانے کا حق دیا ہے اور یہ کہ اس کا رد و انکسار کا واحد مقصد اسے مجرم ٹھہرانا ہے۔ چونکہ ان کے پاس اسے مجرم قرار دینے کا اختیار حاصل ہے اور اس کی خواہش بھی یہی ہے، چنانچہ مصلحت کے تحت پوچھ چکے کرنے اور مقدمہ چلائے جانے کا جو ڈھونگ رچانا جا رہا ہے، وہ غیر ضروری ہے۔ صاف ظاہر تھا کہ جواب خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہو، نتیجہ سزا کی صورت میں ہی نکلے گا۔ جب میٹر سے دریافت کیا گیا کہ گرفتاری کے وقت یہ کیا کر رہا تھا، اس نے قدرے دردناک انداز سے جواب دیا کہ اس نے ایک بچی کو شعلوں سے بچایا تھا اور وہ اسے اس کے دامدین کو لوٹانے کی سعی کر رہا تھا۔ اس نے لوٹ مار کرنے والے شخص کے ساتھ دھینگا مشی کیوں کی تھی؟ میٹر کا جواب تھا کہ وہ ایک خاتون کی ”محافظت“ کر رہا تھا اور جس خاتون کی بے حرمتی کی جارہی ہو اس کی ”محافظت“ کرنا ہر مرد کا فرض ہے۔ اور یہ کہ انھوں نے اسے ٹوک دیا کیونکہ (ان کے خیال کے مطابق) وہ سوسور سے ہٹ گیا تھا۔ وہ زیر آتش مکان کے، جہاں گویا ہوں نے اسے دیکھا تھا، کیا کر رہا تھا؟ اس نے جواب دیا کہ وہ یہ دیکھنے گیا تھا کہ ماسکو میں کیا ہو رہا ہے۔ انھوں نے دوبارہ اسے ٹوک دیا۔ انھوں نے یہ نہیں پوچھا تھا کہ وہ کہاں گیا تھا۔ سوال یہ تھا کہ وہ آگ کے قریب کیا کر رہا تھا؟ ”تم کون ہو؟“ انھوں نے پہلے سوال کا، جس کا اس نے جواب دینے سے انکار کر دیا تھا، اعادہ کرتے ہوئے دریافت کیا اور اس نے ایک بار پھر پناہ منقطع دہرایا کہ وہ اس سوال کا جواب دیئے سے قاصر ہے۔

”اسے ذہن میں رکھیں۔ اس کی یہ حرکت بڑی نامعقول ہے، سخت نامعقول۔“ سفید موٹھوں اور سرخ چہرے والے جرنیل نے کڑھائی سے کہا۔

چوتھے روز زبردستی فیصل کے قریب متعدد عمارتیں آگ کی پیٹ میں آگئیں۔ میٹر اور تیرہ دیگر اشخاص کو کریمائی گھاٹ کے نزدیک ایک تاجر کے مکان کے کچھ خانے میں منتقل کر دیا گیا۔ جب وہ گلی کو چوں میں سے گزر رہے تھے، دھوئیں کی دجہ سے، جو سارے شہر کو اپنی لپیٹ میں لیے معلوم ہوتا تھا، دجہ سے میٹر کے لیے سانس لینا دوبھر ہو گیا۔ چاروں اطراف آگ کے مناظر دکھائی دے رہے تھے۔ ماسکو کے اندر آتش ہو جانے کی کیا اہمیت تھی، وہ سمجھ نہ سکا۔ چنانچہ جب کہیں اسے آگ دکھائی دیتی، وہ دہشت سے مغلوب ہو جاتا۔

اس نے کریمائی گھاٹ کے قریب کچھ خانے میں مزید چار روز گزارے۔ اس دوران میں اسے فراہمی فوجیوں کی باتوں سے معلوم ہوا کہ جو لوگ وہاں نظر بند ہیں وہ فیصلے کے منتظر ہیں اور، رشل یہ فیصلہ کسی بھی لمحہ نہ سکتا ہے۔ یہ رشل کون تھا، میٹر کو فوجیوں سے معلوم نہ ہو سکا۔ ان کے نزدیک وہ بظاہر کوئی عالی منصب اور پراسرار

با اختیار شخص تھے۔

اٹھ ستمبر سے قبل کے، جب قیدیوں کو دوبارہ پوچھ گچھ کے لیے لے جایا گیا، یہ بہتہ کی ایام بیکر کے لیے سخت ترس تھے۔

10

اٹھ ستمبر کو کچھ خانے میں ایک افسر آیا۔ گارڈ اس کے ساتھ جس احترام سے پیش آئی، اس سے معلوم ہوتا تھا کہ یہ کوئی خاصا بلند مرتبہ شخص ہے۔ اس شخص کے، جو غالباً شاف افسر تھا، ہاتھ میں فہرست تھی۔ وہاں جو روپی موجود تھے، وہ ان کے نام پکارنے لگا۔ جب بیکر کی باری آئی، تو اس نے کہا: ”وہ شخص، جو اپنا نام نہیں بتاتا۔“ اس نے تساہل اور بے توجہی سے قیدیوں پر نظر ڈالی اور گارڈ کے انچی رچ افسر کو حکم دیا کہ وہ انھیں بارش کی خدمت میں پیش کرنے سے پہلے ان کی شہلاتی دھلائی کرائے اور انھیں صاف ستھرے کپڑے پہنادے۔

ایک گھنٹے بعد فوجیوں کا دستہ نمودار ہوا اور بیکر کو تیرہ دوسرے اشخاص کے ہمراہ دیو پچی فیڈ پٹا دیا۔ اس روز بارش کے بعد مطیع صاف تھا، دھوپ نکلی ہوئی تھی اور فضا غیر معمولی طور پر تھری تھری تھی۔ دھوکے کے بادل اس دن کی طرح، جب اسے زیور کی فصیل کے گارڈ ہاؤس سے منتقل کیا گیا تھا، نیچے نہیں جھکے ہوئے تھے بلکہ پرے ہٹا کر پاکیرہ فضا میں دیر اٹھ رہے تھے۔ اب تند تیز آگ کے شعلے نظر نہیں آ رہے تھے تاہم ہر سمت سے دھوکے کے مرغولے جاب فلک بلند ہو رہے تھے۔ جہاں تک بیکر کی نظر کام کر سکتی تھی، سارا، سکود سبج دھوکے میں بھسم شدہ کھنڈر دکھائی دے رہا تھا۔ محلوں کے محلے نیست و نابود ہو چکے تھے، صرف مشو، چینیوں کی دیواریں یا پتھر کے مکانات کی کالک شدہ دیواریں کھڑی تھیں۔

بیکر کی باندھے کھنڈرات دیکھتا رہا۔ جو محلے اس کے جانے پہچانے تھے، اب وہ اس سے پہچانے نہیں جا رہے تھے۔ کہیں کہیں اسے وہ گرجے دکھائی دیے، جو آگ کی لپیٹ میں نہیں آئے تھے۔ کربلس کو بھی کوئی گزند نہیں پہنچا تھا اور اس کی سفید عمارتیں درخشاں صلی پر اپنے میناروں اور (زار) ایوان اعظم کے گھنٹہ گھر سمیت ”لشکارے“ مار رہی تھیں قریب ہی نو دویو پچی کانونٹ کا گنبد جگمگا رہا تھا اور اس کی کھنڈیوں کی مترنم آواز نے بیکر کو یاد دلایا کہ آج اتوار ہے اور کنواری مریم کی عید میلاد کا دن۔ لیکن اس تہوار کو منانے والوں کا دور دور تک کوئی نظر نظر نہیں آ رہا تھا۔ ہر طرف سوختہ کھنڈرات تھے اور چند ایک روسی، جو انھیں راستے میں دکھائی دیے، آشفست حال اور خوف زدہ لوگ تھے۔ وہ جوئی لڑائیسیوں کو دیکھتے، فوراً روپوش ہونے کی کوشش کرتے۔

اس میں کوئی کلام نہیں کہ روسی ٹیشن ناراج اور چاہ دیر باد ہو چکا تھا، لیکن بیکر کو غیر شعوری طور پر محسوس ہو رہا تھا کہ وہی نظم کی جگہ بالکل مختلف اور بے پوچ فرانسیسی نظم قائم ہو چکا ہے۔ اسے اس کا احساس ان فوجیوں کی شکلیں دیکھ کر ہوا، جو باقاعدہ صفیں بنائے اسے اور دوسرے مجرموں کو اپنی حفاظت میں لیے شادمانی اور مستعدی سے قدم

اٹھتے چل رہے تھے۔ اسے اس کا اندازہ اس بلند مرتبہ فرانسیسی افسر کو دیکھ کر ہوا، جو درگھوڑوں والی گاڑی میں طے طے سے بیٹھا تھا۔ (اس کی گاڑی ایک فوجی ہانک رہا تھا اور یہ انھیں راستے میں ملی تھی۔) اسے یہ جنرل موہن کی شگفتہ دھنوں سے، جو کھیت کی بائیں جانب سے ہوا کے دوش پر ان کے کانوں تک پہنچ رہی تھیں، سن کر محسوس ہوا۔ اور اسے اس کی تفہیم خاص طور پر قیدیوں کی اس فہرست سے ہوئی تھی جو اس فرانسیسی افسر نے، جو اس صبح نمودار ہوئے تھے، پڑھ کر سنائی تھی۔ میئر کی گرفتاری فوجیوں کے ایک گروہ کے ہاتھوں عمل میں آئی تھی، پھر اسے درجنوں دوسرے اشخاص کے ہمراہ ایک مقام سے دوسرے مقام پر منتقل کیا گیا تھا اور اسے کچھ یوں لگا تھا جیسے شاید وہ اسے بھوں کے میں یا انھوں نے اس کی شناخت کسی اور شخص کے ساتھ گڈ کر دی ہے۔ لیکن نہیں، ایسا نہیں تھا۔ اس نے اچھٹک کے دوران میں جو جوابات دیے تھے، وہ گھوم گھما کر اس تو صوفی جملے کی صورت میں واپس آ گئے تھے: ”وہ شخص جو اپنا نام نہیں بتاتا۔“ اور وہ اسے اسی تسمیہ کے ساتھ، جو اسے، تنہا بھیا تک معلوم ہوتا تھا، کہیں اور لے جا رہے تھے۔ ان کے چہروں سے بلا کی خود اعتمادی بھٹک رہی تھی کہ میئر اور دوسرے قیدی بالکل وہی لوگ ہیں، جو انھیں مطلوب ہیں اور یہ کہ وہ انھیں صحیح مقام کی طرف لے جا رہے ہیں۔ میئر کو محسوس ہوا کہ وہ کوئی حقیر اور بے وقعت کھانچ ہے جو کسی مشین کے بہیوں کے بیچ میں گر پڑی ہے۔ اسے اس مشین کی ساخت کے بارے میں تو کچھ پتا نہیں تھا لیکن وہ ضرور جانتا تھا کہ وہ بالکل صحیح طریقے سے کام کر رہی ہے۔

اسے اور دیگر مجرموں کو دیویتیکی فیائڈ کے دائیں جانب خاصے بڑے مکان میں لے جایا گیا، جس کے ساتھ بیچ و عرض باغیچہ ملحق تھا اور جو کانوٹ سے زیادہ دور نہیں تھا۔ یہ پرنس شیر باؤف کا مکان تھا۔ یہاں وہ اکثر بطور مہمان آیا کرتا تھا۔ اسے فوجیوں کی گفتگو سے اندازہ ہوا کہ اب اس پر ”ڈیوک آف ایک موٹل مارشل“ داؤد کا بیٹا ہے۔ انھیں دروازے پر پہنچا دیا گیا اور ایک ایک کر کے اندر لے جایا گیا۔ جو لوگ اندر گئے، ان میں میئر چھٹا تھا۔ اسے ڈیوڈ بھی، شیش راہداری اور پیش دالان میں سے گزرا گیا۔ یہ سب اس کے جانے پہچانے تھے۔ بالآخر وہ ملڈی روم میں، جو خاصا طویل اور جس کی چھت قدرے نیچی تھی، پہنچ گئے۔ دروازے کے باہر ایک ایکوٹ کھڑا تھا۔ کمرے کے بالکل آخری سرے پر داؤد بیٹھا تھا۔ اس کی ٹاک پر چشمہ تھا اور وہ میئر کے اوپر جھکا ہوا تھا۔ میئر چلتے چلتے اس کے بالکل قریب پہنچ گیا۔ داؤد بظاہر کسی دستاویز کا، جو اس کے سامنے میز پر پڑی تھی، مطالعہ کر رہا تھا۔ اس نے نگاہیں اوپر اٹھائے بغیر مدھم آواز میں پوچھا

”کون ہو تم؟“

میئر خاموش رہا کیونکہ وہ ایک لفظ بھی دا کرنے کے قابل نہیں تھا۔ اس کے نزدیک داؤد بعض فرانسیسی جرمن نہیں تھا بلکہ ایک ایسا شخص تھا جو اپنی سفاکی کے سبب بدنام تھا۔ اس کے جذبات سے، رسی چرے کو، داؤد کی سخت گیر سکول ماسٹر کی طرح بیٹھا تھا۔ وہ کچھ عرصہ صبر تحمل سے بیٹھنے اور جواب کا انتظار کرنے کے آدھ تھا۔ دیکھنے ہوئے میئر کو محسوس ہوا کہ ایک سیکنڈ کی تاخیر اس کے لیے مہلک ثابت ہو سکتی ہے، لیکن اسے معلوم نہیں تھا کہ وہ کس

کہا۔ اس نے اولین تفتیش کے دوران میں جو کچھ کہا تھا، وہ اسے دہرائے کے لیے بچے آپ کو آمادہ نہ کر سکا لیکن اپنے مقام اور مرتبے کا انکشاف کرنا خطرناک بھی تھا اور سبکی آمیز بھی۔ وہ مہربلب کھڑا رہا۔ لیکن بیشتر اس کے کہ وہ کسی نیچے پر پہنچتا، داؤد نے اپنا سراو پراٹھایا، چشمہ پیشان پر دھکیلا اور اپنی آنکھیں میڑھی کرتا اسے دیکھنے لگا۔

”میں اس شخص کو جانتا ہوں،“ اس نے سرد مہر اور سوچے سمجھے لہجے میں کہا۔ نظر آتا تھا کہ اس کا مقصد میڑ کو مرعوب کرنا ہے۔

میڑ کی کمر پر جو کچھ کی طرح تھی، اب اس نے اس کے سر کو نیچے کی طرح کس لیا۔

”جرنیل، آپ مجھے نہیں جانتے، میری آپ سے کبھی ملاقات نہیں ہوئی۔“

”یہ وہی جاسوس ہے،“ داؤد نے ایک اور جرنیل سے، جسے میڑ نے دیکھا نہیں تھا، مخاطب ہو کر میڑ کو ٹوک دیا۔

داؤد نے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ غیر متوقع طور پر اپنی آواز میں کھٹک پیدا کرتے میڑ تیز تیز بولنے لگا:

”non, monseigneur,“ اسے ایک ایک یاد آ گیا تھا کہ داؤد ڈیوک ہے۔ ”non, monseigneur“

آپ مجھے نہیں جانتے۔ میں پیشیا کا افسر ہوں اور ماسکو سے باہر نہیں گیا۔“

”تمہارا نام؟“ داؤد نے دہرایا۔

”بروٹوف۔“

”میرے پاس کیا ثبوت ہے کہ تم جھوٹ نہیں بول رہے۔“

”موسیو! میڑ نے چل کر کہا۔ میڑ کا لہجہ متعجب نہ تھا، غصیل نہیں۔

داؤد نے اپنی نگاہیں اوپر اٹھائیں اور اسے تجسساً نظر دے دیکھے لگا۔ وہ دونوں کئی سیکنڈ تکلی باندھے ایک دوسرے کے ساتھ نگاہوں کا تبادلہ کرتے رہے اور انہی نگاہوں نے میڑ کی جان بچا دی۔ جنگ اور عدالتی کمرے کے حالات کے قطع نظر نظروں کے اس تبادلے نے دونوں آدمیوں کے مابین انسانی روابط استوار کر دیے۔ اس وقت ان دونوں کو سہم طور پر لاتعداد اشیاء کا ادراک ہوا اور انھیں احساس ہوا کہ وہ دونوں آدمی کی اولاد ہیں اور بھائی ہیں۔

جب داؤد نے، کاغذات سے، جن پر انسانوں کی زندگیوں اور ان کے معاملات کی بصورت، اعداد و صراحت کی گئی تھی، نگاہیں اوپر اٹھائیں، اسے پہلی نظر میں میڑ محض ایک اور کیس معلوم ہوا اور اس نے میڑ کی خلش محسوس کیے بغیر اسے گولی سے اڑے جانے کا حکم سنایا ہوتا لیکن اب اسے وہ انسان دکھائی دیا۔ اس نے لٹخہ بھر کے لیے سوچا۔

”تم یہ کیسے ثابت کر سکتے ہو کہ تم سچ بول رہے ہو؟“ داؤد نے سرد مہری سے پوچھا۔

میڑ کو عام بات یاد آئی اس نے اس کا نام، ہر جنت، ہرگز اور وہ مکان بتایا جہاں وہ مل سکتا تھا۔

”تم جو کہتے ہو، وہ ہو نہیں۔“ داؤد مصر رہا۔

کا پتی، بڑ کھڑائی، دواز میں میڑ اپنے بیانات کی صحت کے ثبوت پیش کرنے لگا۔

لیکن اس لمحے ایک ایجوٹنٹ اندر آیا اور اس نے داؤد کے کان میں کچھ کہا۔

ایجوٹنٹ جو خبر لایا تھا، داؤد اچانک اس پر کھل اٹھا اور اپنی وردی کے بٹن کھولنے لگا۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ بیٹر کو بالکل بھول گیا ہے۔

جب ایجوٹنٹ نے اسے قیدی کے بارے میں یاد دہان کرائی، اس کی تیوری پر ہل پڑ گئے۔ اس نے بیٹر کی جانب گردن گھمائی اور سر کے شرے سے کہا کہ وہ اسے بار لے جائیں۔ لیکن وہ اسے کہاں لے جائیں گے، یہ بیٹر کو معلوم نہیں تھا۔ کیا وہ اسے بجھی خانے لے جائیں گے یا قتل، جس کی طرف اس کے ساتھیوں سے، جب وہ دیویتی فیلڈ عبور کر رہے تھے، اشارہ کر کے بتایا تھا؟

اس نے اپنی گردن گھمائی اور دیکھا کہ ایجوٹنٹ ایک اور سوال پوچھ رہا ہے۔
”ہاں، بالکل“ داؤد نے کہا۔

”لیکن اس“ ”ہاں“ کا کیا مطلب تھا، بیٹر کو معلوم نہیں تھا۔

بیٹر کو کچھ یاد نہ رہا کہ اس کے بعد وہ کہاں گیا تھا، کیسے گیا تھا، راستہ طویل تھا یا مختصر۔ اس کے حواس قفل ہو چکے تھے اور اس پر بوکھلاہٹ طاری تھی۔ سے اپنے گرد و پیش کچھ بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ بس دوسروں کی طرح اس کی ٹانگیں متحرک تھیں اور جب وہ رکتے، وہ بھی رک جاتا۔

اس سارے عرصے کے دوران میں اس کے ذہن پر بس، ایک ہی خیال سوار رہا۔ کون۔ کون تھا وہ، جس نے فی الحقیقت اسے سزائے موت دی تھی؟ یہ اس کشن کے، جنہوں نے اس سے اولین پوچھ گچھ کی تھی، ارکان تو نہیں ہو سکتے تھے۔ ن میں سے ایک بھی ایسا نہیں تھا جس نے اس خواہش کا اظہار کیا ہو اور غائبان کے ایب کرنے کا ارکان بھی نہیں تھا۔ یہ داؤد بھی نہیں تھا۔ اس نے تو اسے ایسے انسانی انداز سے دیکھا تھا! اگر ایک آدھ ساعت اور گزر جاتی، ممکن ہے کہ داؤد کو یہ احساس ہو جاتا کہ وہ غلطی کے مرتکب ہو رہے ہیں۔ لیکن عین اسی دم ایجوٹنٹ آنا وارد ہوا اور اس نے دخل در معقولات کر دی۔ اور بظاہر ایجوٹنٹ کے عزائم برے نہیں تھے حاکم کہ وہ اندر آئے سے احتراز کر سکتا تھا۔ پھر اسے کون سوائے دار لے جا رہا، اسے ہلاک کر رہا اور اس کی، بیٹر کی، اس کی تمام یادوں، اسنگوں، امیدوں اور خیالوں سمیت، زندگی کے درپے ہو رہا ہے؟ یہ کون کر رہا ہے؟ بیٹر کو محسوس ہوا کہ کوئی بھی شخص یہ کام نہیں کر رہا۔ اس کا ذمے دار نظام۔ باہمی طور پر پے درپے مربوط واقعات کا ظہور ہے۔

یہ کسی نوع کا نظام ہے جو اسے۔ بیٹر کو۔ موت کے گھاٹ اتار رہا ہے، اسے اس کی زندگی سے، ہر جگہ سے، محروم کر رہا ہے، اسے نیست و نابود کر رہا ہے۔

گیا۔ وہاں وہ لٹھ نصب تھی، جس کے ساتھ آدی کو باندھ کر زندہ جہاد دیا جاتا تھا یا اسے گولی ماری جاتی تھی۔ لٹھ سے پرے تازہ تازہ کھدا ہوا گڑھا تھا۔ اس کے قریب مٹی کا ڈھیر پڑا تھا اور لوگوں کا خاص بڑا ہجوم نیم دائرہ بنائے کھڑا تھا۔ ہجوم میں ردی خال خال ہی تھے۔ یہ زیادہ تر پولین کے فوجیوں پر مشتمل تھا، جو اس وقت ڈیوٹی پر نہیں تھے۔ ان میں جرمنی، اطالوی، فرانسیسی بھی شامل تھے اور انھوں نے طرح طرح کی وردیاں پہنی ہوئی تھیں۔ لٹھ کے دائیں بائیں فرانسیسی فوجیوں کی صفیں تھیں۔ انھوں نے نیلی وردیاں، جن کے شانوں پر فیتے چسپاں تھے، اوپے بوٹ اور ش کوٹو پیاں پہن رکھی تھیں۔

محرم فہرست کے مطابق قطار میں کھڑے تھے۔ (بیئر چھٹے نمبر پر تھا۔) انھیں لٹھ کے قریب پایا گیا۔ اچانک ان کی دونوں جانب متعدد ٹبل بجنے لگے۔ ان کی آواز پر بیئر کو یوں محسوس ہوا جیسے اس کی روح جردی طور پر فوج کھسوتی گئی ہو۔ وہ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے عاری ہو گیا۔ وہ صرف دیکھ اور سن سکتا تھا اور اس کی صرف ایک ہی خواہش باقی رہ گئی تھی۔ کہ یہ بھیا تک چیز، جسے وقوع پذیر ہونا ہے، جلد از جلد وقوع پذیر ہو جائے۔ اس نے اپنے گرد و پیش اپنے ساتھیوں پر نظر ڈالی اور ان کے چہروں کا بخور جائزہ لیا۔

قطار میں سب سے آگے دوسرا یافتہ قیدی کھڑے تھے۔ ان کے سر منڈے ہوئے تھے۔ ایک لمبوتر اور بدلتا تھا۔ دوسرے کا رنگ سانولا، جسم گھٹیلّا، بال موٹے اور لمبے اور ناک چھٹی تھی۔ نمبر ۱۰ خاکی غلام تھا۔ اس کی عمر بیسٹالیس سال کے لگ بھگ، باں کچھڑی اور جسم بھاری اور خوب پلا ہوا تھا۔ چوتھا کسان تھا۔ اس کی شکل وجیہ دائرہ بھری بھری اور ہلکی زرد اور آنکھیں سیاہ تھیں۔ پانچواں مل مزدور تھا۔ وہ اٹھارہ سالہ لاغر نو خیز لڑکا تھا اور وہ ڈھیلے ڈھالے کوٹ میں ملبوس تھا۔

بیئر نے فرانسیسیوں کو آپس میں صلاح مشورے کرتے خا کہ انھیں ایک ایک کر کے یا جوڑوں کی صورت میں گولی ماری جائے۔ "جوڑے بنا کر" بیئر افسر نے سردمہر اور سپاٹ بجے سے کہا۔ سپاہیوں کی صفوں میں ابھل پیدا ہوئی۔ صاف معلوم ہو رہا تھا کہ وہ عجلت کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔ اس طرح نہیں جس طرح جو ان اس حکم کی، جو ان کی سمجھ میں آتا ہے، تعمیل کرنے میں شتابی دکھاتے ہیں، بلکہ اس طرح جس طرح وہ اس کام کو، جو ہوتا تو ضروری ہے لیکن وہ انھیں نہ سمجھ میں آتا ہے اور نہ پسند، پٹانے میں جلد بازی کرتے ہیں۔

ایک فرانسیسی افسر، جس کے گلے میں سکارف تھا، قیدیوں کی قطار کے دائیں طرف آیا اور اس نے فرانسیسی اور ردی دونوں زبانوں میں سزا کا حکم پڑھ کر سنایا۔

فرانسیسی فوجیوں کے جوڑے بحر مومن کے قریب آئے اور افسر کے حکم پر دوسرا یافتگان کو، جو قطار میں سب سے آگے تھے، پرے لے گئے۔ جب سزا یافتگان لٹھ کے قریب پہنچے، وہ وہاں رک گئے۔ جب وہاں تھیلے لائے جا رہے تھے، وہ اپنے گرد و پیش گرم مٹیوں دیکھ رہے تھے جیسے زخمی پرندہ قریب آئے شکاری کو دکھاتا ہے۔ ان میں سے ایک اپنے سینے پر بار بار صلیب کا نشان بناتا رہا، جب کہ دوسرا اپنی کمر کمر چٹا اور اپنے ہونٹوں پر تبسم نمودار چیز پیدا

کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ پھرتی سے نگھیاں گھماتے فوجی ان کی آنکھوں پر پٹیاں باندھنے لگے۔ اس کے بعد انھوں نے ان کے سر تھیلوں میں لپیٹ دیے اور انھیں لٹھ کے ساتھ باندھ دیا۔

ایک درجن ماہر شاہی دستہ بدوقیہ اٹھائے پر اعتماد اور تپے تپے قدم اٹھاتے صفوں سے باہر آئے اور راٹھ سے آٹھ قدم ادھر رک گئے۔ دیگر نے اپنا منہ دوسری طرف پھیر لیا تاکہ جو کچھ ہونے والا تھا وہ اسے دیکھ نہ سکے۔ ایک ایک چٹاخ پٹاخ اور گھن گرج سنائی دی۔ اسے یہ آوازیں بجلی کی مہیب سے مہیب کڑک سے زیادہ پر شور محسوس ہوئیں۔ نص میں دھواں تھا اور فرانسیسی فوجی، جن کے ہاتھوں میں ریشہ اور چہروں پر پیلاہٹ تھی، گڑھے کے نزدیک کچھ کر رہے تھے۔

دو در قیدی آگے لے جائے گئے۔ ان کی نگاہیں بھی سی طرح چپ چاپ اپنے تحفظ کے لیے ایل کر رہی تھیں۔ انھوں نے غلطی باندھ کر تماشائیوں کی جانب دیکھا، لیکن بے سود۔ کیا ہونے والا تھا، بظاہر وہ اسے سمجھ پا رہے تھے ورنہ انھیں اس کا یقین آ رہا تھا۔ انھیں اس کا اس لیے یقین نہیں آ سکا تھا کیونکہ صرف وہی جانتے تھے کہ زندگی ان کے لیے کیا معانی رکھتی ہے۔ نتیجتاً انھیں سمجھ آ رہا تھا اور نہ یقین کہ یہ ان سے کیوں چھینی جا رہی ہے۔

ایک بار پھر بیئر نے ادھر نہ دیکھنے کی کوشش کی، ورنہ اپنا منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ ایک بار پھر زبردست دھماکے کی آواز فضا میں گونجی اور اسی لمحے اسے دھواں، خون اور فرانسیسیوں کے، جو لٹھ کے قریب دوبارہ کچھ کر رہے تھے اور ان کے ہاتھ ایک دوسرے سے ٹکرا رہے تھے، زرد اور خوف زدہ چہرے نظر آئے۔ دیگر کی سانس دھونکی کی طرح چل رہی تھی اور اس نے اپنے گرد و پیش نظر دوڑائی جیسے وہ پوچھ رہا ہو "اس کا کیا مطلب ہے؟" یہی سوال ان تمام نگاہوں میں، جن سے اس کی نظریں ٹکرائیں، بھٹک رہا تھا۔

تمام ردیوں، تمام فرانسیسی فوجیوں اور افسروں کے چہروں پر اسے بلا استثنا وہی تشویش، دہشت اور کھٹک نظر آئی جو اسے اپنے قلب میں محسوس ہو رہی تھی۔ "لیکن جو کچھ یہاں ہو رہا ہے، کون کر رہا ہے؟ جس اذیت میں میں مبتلا ہوں، اسی میں یہ ہیں۔ کون؟ کون؟" کوندے کی طرح یہ خیال اس کے ذہن میں لپکا۔

"چھپا سوں یونٹ کے نشانہ بنی۔ آگے آئیں"، کسی نے چلا کر کہا۔

پانچواں قیدی، جو بیئر سے آگے تھا، اکیلا باہر لے جایا گیا۔ بیئر کو اندازہ نہ ہوسکا کہ اس کی جان بچاؤ کی ہے اور یہ کہ اسے اور دوسروں کو جنھیں چھوڑ دیا گیا تھا، محض اس لیے وہاں لایا گیا تھا تاکہ وہ دوسروں کو گولی سے اڑائے جانے کا منظر دیکھ سکیں۔ جو کچھ اس کے سامنے ہوا، اس کی اس پر جو دہشت سوار ہوئی، اس میں ہر دم اضافہ ہوتا رہا تھا، مسرت اور تسکین کا احساس عنقا ہو چکا تھا۔ جو کچھ وہاں ہو رہا تھا وہ اسے بس غلطی باندھے دیکھے جا رہا تھا۔ پانچواں شخص، جس نے ڈھیلا ڈھماکوت پہنا ہوا تھا، کارخانے کا مزدور تھا۔ جوئی انھوں نے اس پر ہاتھ رکھے اور دہشت سے اچھل کر پیچھے ہٹ گیا اور بیئر کے ساتھ چھٹ گیا۔ (بیئر پر کچلی طاری ہوئی اور اس نے بڑی مشکلوں سے اپنے آپ کو اس سے چھڑایا۔) اس نوجوان سے چلا نہیں جاتا تھا۔ انھوں نے اسے بازوؤں سے پکڑ لیا اور کھینچے

گئے۔ وہ چیخ چلا اور شور و غل کر رہا تھا۔ جب وہ اسے لٹھ کے قریب لے گئے، وہ ایک سخت خاموش ہو گیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی بات اچانک اس کی سمجھ میں آ گئی ہو۔ پتا نہیں اسے یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ اس کا جینا چلنا لا حاصل ہے یا اسے یہ خیال آ گیا کہ وہ لوگ اسے ہلاک نہیں کر سکیں گے، بہر حال وہ لٹھ کے ساتھ کھڑا ہو گیا اور انتظار کرنے لگا کہ دوسروں کی طرح اس کی آنکھوں پر بھی پٹی باندھ دی جائے۔ وہ زخمی درندے کی طرح جھلگاتی آنکھوں سے اپنے گرد و پیش دیکھنے لگا۔

بیئر کے لیے اب دوسری طرف منہ پھیرنا اور اپنی آنکھیں میچنا ناممکن ہو گیا تھا۔ اس پانچویں قتل پر باقی جہم کی طرح اس کا تجسس، اور بیجان نقطہ عروج تک پہنچ گیا۔ پہلے چار اشخاص کی مانند یہ نوجوان بھی پر سکون دکھائی دے گا۔ وہ اپنا ڈھیلا ڈھلا کوٹ اپنے جسم پر کسے اور ایک پاؤں کو دوسرے پاؤں سے کھرپنے لگا۔

جب وہ اس کی آنکھوں پر پٹی باندھنے لگے، اس نے خود ہی گرہ، جو اس کے سر کی پشت میں چھرا ہی تھی، درست کی۔ پھر جب انھوں نے اس کی پشت خون آلود لٹھ کے ساتھ لگا کر اسے کھڑا کیا، اس نے پیچھے ٹیک لگالی اور جب اسے یہ صورت کڈھب نظر آئی، اس نے اپنا جسم سیدھا کیا، اپنے پاؤں ایک دوسرے کے برابر لگائے اور آرام سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا۔ بیئر نے اپنی نظریں اس پر جمائے رکھیں اور وہ اس کی معمولی سے معمولی حرکت پر بھی دھیان دیتا رہا۔

حکم لازماً دیا گیا ہوگا، اس کے بعد آٹھ دستی بندو قوں کے چلنے کی آواز سنائی دی ہوگی، لیکن اس کے بعد بیئر خواہ کتنی ہی کوشش کیوں نہ کرتا، اسے یاد نہ آ سکتا کہ اس نے گولی چلنے کی معمولی آواز بھی سنی تھی۔ اسے صرف یہ دکھائی دیا کہ کارخانے کا مزدور دران رسیوں پر، جنھوں اسے تمام رکھ تھا، ڈھلک گیا ہے، وہ جگھوں سے خون کا فوارہ بہہ نکلتا ہے، ڈھلکتے جسم کے بوجھ تلے رسیاں ٹوٹ گئی ہیں اور نوجوان شخص یوں گرنے لگا جیسے وہ گر نہ رہا ہو بلکہ بیٹھ رہا ہو۔ اس کا سر غیر فطری انداز سے ایک جانب جھک گیا اور اس کی ٹانگ اس کے جسم کے نیچے خمیدہ ہو گئی۔ بیئر لٹھ کی جانب بھاگ پڑا۔ کسی نے اسے نہ روکا۔ مل مزدور کے ارد گرد زرد و اور خوف زدہ لوگ کھڑے کچھ کر رہے تھے۔ داڑھی مونچھوں والے ایک ادھیڑ عمر فرانسیسی کا، جب وہ رسیاں کھوں رہا تھا، نچلا جڑا کپکپا رہا تھا۔ جسم نیچے ڈھیر ہو گیا۔ فوجیوں نے اسے غمت اور بھونڈے انداز سے کھینچا اور گڑھے میں دھکیل دیا۔

ان سب کو واضح طور پر اور بلا شک و شبہ معلوم تھا کہ وہ مجرم ہیں، اس لیے انھیں اپنے جرائم کی نشانیوں جلد از جلد ڈھانپ دینا چاہئیں۔

بیئر نے گڑھے میں جھانکا اور دیکھا کہ مل مزدور گڑھے میں لیٹا ہوا ہے۔ اس کے گھٹنے اس کے سر کے ساتھ لگے ہوئے تھے اور اس کا ایک بازو دوسرے سے ادنچا تھا، اور وہ بازو مسلسل پھڑک رہا تھا، کبھی اوپر اٹھ رہا اور کبھی نیچے گر رہا تھا۔ اس کے جسم پر بیلچوں سے مٹی ڈالنے کا کام پہلے ہی شروع ہو چکا تھا۔ ایک نوجوان نے غصیل اور اذیت زدہ آواز میں چد کر بیئر سے کہا کہ وہ پیچھے چل جائے، لیکن اس کی بات بیئر کی سمجھ میں نہ آئی۔ وہ لٹھ کے قریب

منڈلاتا رہا اور کسی نے اسے وہاں سے نہ ہٹایا۔

جب گڑھا پر ہو گیا، حکم کی آواز گونجی۔ پیئر کو واپس اس کی جگہ لے جایا گیا اور فرانسیسی فوجی، جو لٹھ کے دونوں اطراف کھڑے تھے، قدرے مڑے اور بچے تھے قدموں سے وہاں سے چل پڑے۔ چوبیس ماہر شاکی، جو دائرے کے درمیان میں کھڑے تھے، جب ان کی کہنیاں ان کے برابر سے گزرے لگیں، اپنی بندوقیں، جو خالی ہو چکی تھیں، تھامے دوڑنے لگے اور اپنی اپنی جگہوں پر واپس چلے گئے۔

پیئر مہربت نگاہوں سے ان ماہر شاکیوں کو دیکھتا رہا، جو دائرے سے جوڑوں کی صورت میں بھاگے تھے۔ ایک کے سوا بھی دو بارہ اپنی اپنی کہنی میں شامل ہو گئے تھے۔ ایک نو جوان سپاہی، جس کا رنگ بالکل فاقہ ہو چکا تھا، شا کوٹولی پیچھے، حلق چکی تھی اور بندوق زمین پر پڑی تھی، اب بھی گڑھے کے قریب اسی جگہ کھڑا تھا، جہاں سے اس نے گولی چلائی تھی۔ وہ اس شخص کی طرح، جو نشے سے چور ہو، ڈگمگایا اور اپنے آپ کو گرنے سے بچانے کے لیے چند قدم آگے بڑھا اور پھر پیچھے ہٹا۔ ایک مسمران کمشنڈ افسر صفوں سے باہر بھاگا، اس نے اسے کھائی سے بکرا اور اسے گھسٹا، پس اپنی کہنی میں لے گیا۔ روسیوں اور فرانسیسیوں کا ہجوم چھٹنے لگا۔ سب خاموش سر جھکائے واپس جا رہے تھے۔

”آگ لگانے کا کیا انجام ہوتا ہے، وہ انھوں نے دیکھ لیا ہے۔ اب وہ مہربت پکڑیں گے۔“ ایک فرانسیسی نے تبصرہ کیا۔

پیئر نے نگاہ گھبراہٹ سے دیکھا۔ وہ کوئی فوجی جوان تھا اور جو کچھ کہ گیا تھا، اس سے بند پھرنے کے لیے تسکین کا کوئی ذریعہ ڈھونڈنے کی کوشش کر رہا تھا، لیکن جو بات اس نے شروع کی تھی، اسے ختم کیے بغیر اس نے مایوسی کے عالم میں بازو لہرایا اور اپنی راہ چل پڑا۔

12

مزانے موت کی تکبیر کے بعد پیئر کو دوسرے قیدیوں سے علیحدہ کر دیا گیا اور اسے تنہا ایک تنگ، دراز اور غلیظ گرجے میں محبوس کر دیا گیا۔

دن ڈھلے پہرے پر ماسورناں کمشنڈ افسر دو سپاہیوں کی معیت میں اندر آیا اور اس نے اسے بتایا کہ اسے معافی دے دی گئی ہے اور اب اسے جنگی قیدیوں کی باریک میں پہنچا دیا جائے گا۔ پیغام سمجھے بغیر پیئر اپنی جگہ سے اٹھا اور فوجیوں کے ساتھ چل پڑا۔ وہ اسے کھلے میدان کی بائیں جانب لے گئے۔ وہاں چھلے ہوئے شہزادوں لٹھوں اور کڑیوں کو یوں توں جوڑ جا کر چند سہبان کھڑے کر دیے گئے تھے۔ وہ اسے ایک سہبان کے اندر لے گئے۔ تاریکی میں بگ بگ بگ بگ کے ارد گرد جمع ہو گئے۔ وہ یہ سمجھے بغیر کہ وہ کون ہیں، وہاں کیوں ہیں یا اس سے کیا چاہتے ہیں، ہونٹوں کی طرح انھیں بکنے لگا۔ ان کے الفاظ اسے ضرور سنائی دے رہے تھے لیکن وہ ان کا

منہدم سمجھنے سے قاصر تھا۔ اس کے لیے ان کے نہ کوئی معافی تھے اور نہ ان کا اس سے کوئی تعلق۔ وہ اس سے جو سوالات پوچھتے تھے، وہ ان کے جوابات تو دے دیتا تھا لیکن اسے قطعاً معلوم نہیں تھا کہ ان جوابات کو کون لوگ سن رہے ہیں یا وہ ان کے کیا مطالب اخذ کر رہے ہیں۔ وہ ان کے چہروں اور شکلوں کو دیکھتا اور وہ اسے یکساں انداز سے بے محنتی دکھائی دیتے۔

بیکر نے جب سے انسانوں کو ان انسانوں کے ہاتھوں، جنہیں یہ کام کرنے کا کوئی شوق نہیں تھا، قتل ہوئے کا مہیب منظر دیکھا تھا، اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کی روح کا مین سپرنگ (بڑی کمانی)، جس پر ہر چیز کا انحصار تھا اور جو ہر چیز یوں بنا کر پیش کرتا تھا جیسے وہ جیتی جاگتی ہو، اچانک ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہو گیا ہو اور بے سود بلے کا ڈھیر بن گیا ہو۔ اگرچہ خود اسے اس کی آگئی نہیں تھی، لیکن کائنات کی صحیح نظم و ترتیب، انسانیت، اپنی روح اور خدا پر اس کا ایمان، کبھی کبھار غارت ہو چکا تھا۔ وہ اس طرح کی ذہنی کیفیت میں پہلے بھی گزر رہا تھا لیکن اتنی شدت کے ساتھ کبھی نہیں۔ ماضی میں جب کبھی اس نوع کے شکوک و شبہات اس کے ذہن پر حملہ آور ہوتے تھے تو ان کا سبب اس کی پتی غلطیاں اور حماقتیں ہوتی تھیں اور اسے محسوس ہوا کرتا تھا کہ وہ ان شکوک اور مایوسیوں کا دریاں اپنی ذات میں تلاش کر سکتا ہے۔ تاہم اب اسے احساس ہو رہا تھا کہ خود اس سے کوئی خطا سرزد نہیں ہوئی، پھر بھی دنیا اس کی نظروں کے سامنے مسما ہو گئی ہے اور صرف بے محنتی کھنڈرات باقی رہ گئے ہیں۔ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ زندگی پر اسے جو یقین تھا، اس کی بازیابی اب اس کے بس میں نہیں رہی۔

تاریکی میں آدمی اس کے ارد گرد کھڑے تھے۔ غالباً اس میں کوئی بات تھی جس میں انھیں دلچسپی تھی۔ وہ اسے کچھ بتا رہے تھے، اس سے کچھ پوچھ رہے تھے، پھر وہ اسے کہیں لے گئے اور آخر کار اسے معلوم ہوا کہ وہ سائبان کے کونے میں پہنچ گیا ہے۔ یہاں وہ لوگوں میں محصور تھا۔ وہ اس رہے اور آپس میں باتیں کر رہے تھے۔

”اور چنانچہ میرے دوستو... خود پر بس جو...“ سائبان کے دوسرے کونے میں کوئی شخص کہہ رہا تھا اور وہ لفظ جیسے پر خاص زور دے رہا تھا۔

دیوار کے قریب پرانی کے ڈھیر پر ساکت و خاموش بیٹھے بیکر اپنی آنکھیں کھلی کھول کر بند کرتا۔ لیکن وہ جو فکری انھیں بند کرنا، مل مزدور کا بھی یک چہرہ۔ چونکہ اس چہرے پر سادگی ٹپک رہی تھی، اس لیے یہ اور بھی مہیب معلوم ہو رہا تھا۔ اور متاثر قاتلوں کی صورتیں، جو داخلی اضطراب کی بنا پر اور بھی ڈراؤنی ہو گئی تھیں، اس کے سامنے تیرے لگتیں۔ وہ جھٹ پٹ اپنی آنکھیں کھول دیتا اور خالی خالی انداز سے اپنے گرد پیش اندھیرے میں گھورنے لگتا۔

اس کے قریب ایک پست قامت شخص خیدہ شکل بنائے بیٹھا تھا۔ اسے اس کی موجودگی کا احساس پہنچنے کی شدید بوسے ہوا۔ وہ جب حرکت کرتا، یہ اس کے جسم سے خارج ہونے لگتی۔ یہ آدمی تاریکی میں اپنی ہانگوں کے ساتھ کچھ کر رہا تھا اور اگرچہ بیکر کو اس کا چہرہ نظر نہیں آ رہا تھا، اسے محسوس ہو رہا تھا کہ وہ مسلسل اچھتی نگاہوں سے

اسے دیکھ رہا ہے جب بیڑ کی آنکھیں ندھیرے سے مانوس ہو گئیں، اس نے دیکھا کہ یہ شخص اپنی ہاتھوں سے پیٹیاں اتار رہا ہے اور وہ جس طریقے سے یہ کام کر رہا تھا، اس سے بیڑ کو اس میں دلچسپی پیدا ہو گئی۔

ڈوری کھولنے کے بعد، جس سے ٹانگ کے ارد گرد پٹی بندھی ہوئی تھی، اس نے احتیاط سے اس کا گولہ بنایا اور بیڑ پر اچھتی نظر ڈالنے کے بعد دوسری ٹانگ پر کام کرنے میں جست گیا۔ ابھی اس کا ایک ہاتھ پہلی ڈوری پر ٹھہرا ہوا تھا کہ اس کا دوسرا ہاتھ دوسری ٹانگ کے ارد گرد بندھی ڈوری کھولنے میں مصروف ہو گیا۔ اس طرح اس نے تیز، پھر تلی اور چکر دار حرکات سے، جن میں بڑی وقفہ نہیں آتا تھا، ٹانگ کی تمام پٹیاں اتار دیں اور انہیں اپنے سر کے اوپر دیوار میں نصب کھونٹیوں پر ٹانگ دیا۔ پھر اس نے چاقو نکالا، اس سے کچھ کاٹا، چاقو بند کیا، اسے سر ہانے کے نیچے رکھا، آرام سے اپنے بازو اپنے گھٹنوں کے گرد حائل کیے، جو اوپر، نیچے ہوئے تھے اور نیچے، بندھ کر سیدھا بیڑ کو دیکھنے لگا۔ بیڑ کو اس شخص کی پھر تلی اور چکر دار حرکات، اپنے کونے میں با ترتیب اور با سلیقہ انتظامات، بلکہ اس کی برو میں بھی کسی خوشگوار، فرحت بخش اور کمال شے کا احساس ہونے لگا اور وہ اس پر سے اپنی نگاہیں نہ اٹھا سکا۔

”حضور، آپ کو بڑے مضامین جھیلنے پڑے ہیں، درست؟“ ایک لخت پس قامت شخص نے دریافت کیا۔ اس سپاٹ لہجے میں اتنی سادگی اور ترحم تھا کہ گو بیڑ نے جواب دینا چاہا لیکن اس کا جڑا کاٹنے اور اس کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔ پست قامت شخص نے بیڑ کو اتنا موقع ہی نہ دیا کہ وہ اپنی پراگندہ خیالی کا مظاہرہ کر سکا بلکہ جھٹ پٹ، سی خوشگوار لہجے میں مزید کہنے لگا:

”دوست، کڑھنے کا کوئی فائدہ نہیں۔“ اس نے نرم و رشفقت آمیز لہجے میں کہا جس میں بوڑھی کسان عورتیں باتیں کرتی ہیں۔ ”دوست کڑھنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ دکھ تکلیف گھڑی دو گھڑی۔ جتے ہیں لیکن زندگی تاباد جاری رہتی ہے۔ مائی ڈیر، یونہی سسلہ چلتا رہتا ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ ہماری یہاں خوب بھر رہی ہے۔ ویسے ان لوگوں میں اچھے بھی ہیں ورنہ بے بھی۔“ اس نے کہا اور پھرتی سے گھٹنوں کے بل حزا، اٹھا اور سنبان کی دوسری جانب چل پڑا۔

”آبا بابا! لنگی، تو پھر واپس آگئی؟“ بیڑ کو وہی آواز سانبان کے دوسرے سرے سے آتی سائی دی۔ ”بد ذات، تو تو آگئی ہے اتو میں تجھے ماد ہوں! ہونہ! اچھا، اچھا! کانی ہو گیا ہے، اب جانے دو۔“ اور فوجی سپاہی ایک چھوٹی سی کتیا کو، جو اس پر اچھل رہی تھی، پرے دھکیلتے ہوئے، پنی جگہ واپس آگیا اور بیٹھ گیا۔ وہ جیتھڑے میں لیٹی کوئی چیز ہاتھوں میں پکڑے ہوئے تھا۔

”محترم، انھیں ذرا چکھ کر دیکھیں۔“ اس نے مؤدبانہ لہجے، جو اس کے شروع میں استعمال کیا تھا، دوبارہ اختیار کرتے ہوئے کہا اور جیتھڑا کھولتے ہوئے بیڑ کو چند بھنے ہوئے آلو تھما دیے۔ ”ڈیر میں ہمیں سوپ ملا تھا لیکن ان آلوؤں کا جواب نہیں!“

بیڑ نے دن بھر کچھ نہیں کھایا تھا اور آلوؤں کی خوشبودار سے انتہائی خوشگوار محسوس ہوئی۔ اس نے سپاہی کا شکریہ

اور کیا، اور انہیں کھانے لگا۔

”آپ انہیں اس طرح کیوں کھا رہے ہیں؟“ سپاہی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”انہیں یوں کھائیں۔“
اس نے آلو پکڑا، اپنا کھٹکے، مارشکاری چاقو کھولا، پتیلی پر آلو رکھ کر دوسری ٹکڑوں میں کاٹا، پیٹھ سے
کچھ نمک ان پر چھڑکا اور انہیں دیکر کو تھار دیا۔

”آلو جواب ہیں!“ اس نے اپنی بات دہرائی۔ ”آپ انہیں اس طرح کھانے کی کوشش کریں۔“
پیٹر نے سوچا کہ اس نے ایسی لذیذ چیز پہلے کبھی نہیں کھائی تھی۔
”اوہ، میں ٹھیک ٹھاک ہوں۔“ اس نے کہا۔ ”لیکن انہوں نے ان بے چاروں کو کیوں گولی مار دی؟ آخری
کی عمر بمشکل بیس سال ہوگی۔“

”ٹٹ، ٹٹ، کتنا بڑا گناہ، کتنا بڑا گناہ!“ پست قد آدمی عجلت سے یوں کہا جیسے الفاظ سدا اس کے منہ میں
تیار رہتے ہوں اور انکل پچوڑ قند لگا کر باہر نکل آتے ہوں۔ اس نے اپنی بات جاری رکھی، ”اور یہ آپ ماسکو میں
کیوں ٹھہرے ہو؟“

”میرا خیال تھا کہ وہ اتنی جلدی نہیں آسکیں گے۔ میں محض اتنا ٹھہرا رہا۔“ پیٹر نے کہا۔
”بھائی جان، آپ ان کے ہتھے کیسے چڑھ گئے؟ انہوں نے آپ کو اپنے گھر سے پکڑا تھا؟“
”نہیں، میں آگ کا منظر دیکھنے باہر نکلا تھا۔ انہوں نے وہیں سے مجھے پکڑ لیا، اپنے ساتھ لے گئے اور مجھ پر
آتش زنی کے الزام میں مقدمہ کھڑا کر دیا۔“

”جب (عدالتوں میں) فیصلے ہوتے ہیں، نا انصافی بھی ہو جاتی ہے۔“ چھوٹے آدمی نے خیال آرائی کی۔
”اور آپ یہاں کافی دنوں سے ہیں؟“ پیٹر نے آخری آلو چباتے ہوئے کہا۔
”میں؟ انہوں نے مجھے پچھلے اتوار پکڑا تھا۔ وہ مجھے ماسکو کے ایک ہسپتال سے لائے تھے۔“
”آپ فوجی ہیں؟“

”ہم آپشیر ان رجمنٹ کے سپاہی ہیں۔ میں بخار سے بچک رہا تھا۔ انہوں نے کبھی ہمیں کچھ نہیں بتایا۔ ہم
وہاں لگ بھگ بیس تھے۔ ہمارے ذہن دگمان میں بھی نہیں آیا تھا۔ ہم نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا۔“
”جب آپ اپنے آپ کو یہاں دیکھتے ہیں، آپ کو اذیت محسوس ہوتی ہے؟“

”بالکل، مائی ڈیئر، بالکل۔ میرا نام پلاطون ہے اور خاندانی نام کارائیف۔“ اس نے مزید کہا۔ بظاہر وہ پیٹر
کے لیے آسانی فراہم کرنا چاہتا تھا کہ اس سے اس سے مخاطب ہونے میں کوئی دقت نہ پیش آئے۔ ”رجمنٹ کے آدمی
مجھے ”شکرہ“ کہتے ہیں۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ آپ تکلیف محسوس نہ کریں؟ ماسکو۔ شہروں کی ماں ہے۔ یہ کیسے ہو سکتا
ہے کہ آپ یہ سب کچھ دیکھیں بھی اور غمگین بھی نہ ہوں؟ کیڑا گو بھی کا پھول آہستہ آہستہ کترتا رہتا ہے لیکن اپنا کام
مکمل کرنے سے پہلے نسا ہو جاتا ہے۔ ہمارے بزرگ ہمیں یہی بتایا کرتے تھے۔“ اس نے بالکل اپنی بات میں

اضافہ کیا۔

”کیا؟ کیا کہا آپ نے؟“ بیٹر نے پوچھا۔

”کس نے؟ میں نے؟ میں کہتا ہوں: ماورچہ خلیم فلک در چہ خیال۔“ کارا تائیف نے جواب دیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اس نے دوبارہ وہی دہرایا ہے جو وہ اس سے پہلے کہہ چکا تھا اور چشم زدن میں مزید کہنے لگا: ”حضرت آپ کے باپ دادا کی کوئی جا گیر ہے؟ اپنا کوئی مکان؟ آپ لازماً خوش نصیب انسان ہوں گے! گھر میں بیوی ہوگی؟ اور آپ کے بوڑھے ماں باپ زندہ ہوں گے؟“ اس نے دریا فست کیا۔

اگرچہ وہاں تاریکی اتنی زیادہ تھی کہ بیٹر کے لیے کچھ دیکھنا مشکل تھا لیکن اسے محسوس ہوا کہ بوڑھا سپاہی جب یہ سوالات پوچھ رہا تھا، دھیمی دھیمی، شفیق مسکراہٹ سے اس کے ہونٹ سکڑ گئے ہوں گے معلوم ہوتا تھا کہ اس بات کا دکھ ہوتا ہے کہ بیٹر والدین، خاص طور پر ماں، کی شفقت سے محروم ہے۔

”صداح مشورے کے لیے شریک حیات، پرتپاک خیر مقدم کے لیے خوشداسن، لیکن آدی کی اپنی ماں سے بڑھ کر کوئی ہستی یہ ری نہیں ہوتی۔“ اس نے کہا۔ ”خیر، کوئی بچے دے؟“ وہ اپنی کہتا چلا گیا۔

بیٹر نے ایک بار پھر جب منفی جواب دیا، یوں لگا کہ اسے سخت دکھ ہوا ہے اور اس نے جھٹ پٹ کہا۔

”خیر، فکر نہ کریں۔ آپ ابھی جوان ہیں۔ خداوند نے چاہا تو بچے بھی ہو جائیں گے۔ صرف صبرمندی سے رہیں۔“

”لیکن اب تو کوئی فرق نہیں پڑتا۔“ بیٹر کہے بغیر نہ رہ سکا۔

”اف، میرے بھائی، کوئی نہیں جانتا کہ مقدر میں کیا لکھ ہے؟“ پلاطون نے ترکی بہ ترکی جواب دیا، بھکاری کی گدڑی یا جیل کی غلو بتیں۔“

وہ پچھلے امار کر بیٹھ گیا اور کھنکار کر گلا صاف کرے لگا۔ معلوم ہوتا تھا کہ لمبی داستان سنانے کی فکر میں ہے۔

”خیر، پیارے دوست، بات کچھ یوں تھی۔ میں ابھی اپنے گھر میں رہتا تھا۔“ اس نے ابتدا کی۔ ”ہمارا کھانا چیتا گھرنا تھا۔ خدا کا دیا سب کچھ تھا۔ زمین کافی تھی۔ کسانوں کی حالت اچھی تھی۔ ہمارا گھرا یا تھا کہ خدا کا شکر ادا کرنا واجب ہو جاتا ہے۔ جب ہم نعل کی کٹائی کرنے جاتے، ہم اباسیت ساتھ ہوتے۔ ہم اصلی کسان تھے۔ پھر ایک روز...“

اور پلاطون کارا تائیف طول طویل کہانی سنانے لگا کہ کس طرح ایک روز وہ ستشی نکڑی کے حصول کے لیے کسی دوسرے شخص کے ذخیرے میں چلا گیا، کسی طرح رکھوالے کے ہتھے چڑھا، کس طرح اس کی کوزوں سے پانی ہوئی، اس پر مقدمہ چلا اور اسے فوج میں خدمات سرانجام دینے پر بھیج دیا گیا۔

”خیر، میرے بھائی!“ اور مسکراہٹ سے اس کا ہجہ تبدیل ہو گیا۔ ”ہمارا خیال تھا کہ ہم پرافتاد پڑی ہے لیکن اصلایہ رحمت ثبات ہوئی۔ اگر مجھ سے یہ گناہ سرزد نہ ہوا ہوتا تو فوج میں میرے بھائی کو جانا پڑتا۔ اور آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ میرا یہ بھائی مجھ سے چھوٹا ہے اور پانچ بچوں کا باپ ہے۔ میرا کیا ہے، میں نے تو صرف بیوی

بیچے چھوڑی ہے۔ میری ایک ننھی منی بیٹی تھی لیکن میرے فوج میں آنے سے پہلے ہی وہ خدا کو پیاری ہو چکی تھی۔ میں ایک مرتبہ چھٹی پر گھر گیا اور آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ وہ پہلے کی نسبت کہیں زیادہ خوشحالی کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ بازار مویشیوں سے بھرا ہوا تھا۔ عورتیں گھر پر تھیں۔ دو بھائی روڑی کرنے باہر گئے ہوئے تھے۔ صرف سب سے چھوٹا میٹا کیونکہ گھر پر تھا اور میرے باپ نے مجھ سے کہا: میرے سارے بچے میرے لیے برابر ہیں۔ انکی خواہ کسی کی ٹوٹے، چوٹ میرے دس پر پڑتی ہے۔ اگر انھوں نے فوج میں بھرتی کے لیے پلاطون کے بال نہ کانے ہوتے، میٹا کیلاد کو جانا پڑتا۔ اس نے ہم سب کو کٹھا کیا۔ آپ یقین کریں گے؟ اور اس نے ہم سب کو ایقتونوں کے سامنے کھڑا کر دیا۔ میٹا کیلاد اس نے کہا، اُدھر آؤ اور اس کے قدموں پر جھک جاؤ اور ہاں، چھو کری، تو بھی اپنا سر جھکا دے، اور میرے پوتو، پوتو، تم بھی۔ سمجھ گئے؟ اس نے کہا۔... تو حضور، بات کچھ یوں ہے۔ نقد بر کی اپنی وجوہات ہوتی ہیں لیکن ایک ہم ہیں کہ ہر وقت حرف گیری کرتے رہتے ہیں اور شکایتوں کے طومار باندھتے رہتے ہیں۔... یہ وہ ٹھیک نہیں ہے، غلط ہے۔ دوست، ہماری سرٹ آبی جال (drag-net) کے پانی کی مانند ہے: جال کو کینچیں۔ یہ پھیل جائے گا۔ باہر نکالیں۔ خالی ہوگا! اس کا حال بس یہی ہے۔“

اور پلاطون نے پرالی پر اپنے جینے کا انداز بدل لیا۔

مختصر خاموشی کے بعد وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

”خیر، میرا خیال ہے کہ آپ کو نیند آرہی ہے۔“ اس نے کہا۔ وہ اپنے سینے پر صلیب کے نشان بنانے اور بار بار دہرانے لگا:

”مولا یسوع مسکا، یہ پیر و سرشد نکولا، فردلا اور لاورا! مولا یسوع مسکا یا پیر و سرشد نکولا، فردلا اور لاورا! مولا یسوع مسکا، ہم پر رحم فرما، ہماری دشگیری کر اور ہمیں اپنی پناہ میں لے لے!“ اس نے اپنی دعا ختم کرتے ہوئے کہا۔ اس کے بعد وہ فرش پر سجدہ کر پڑا ہوا، اٹھا، کھڑا ہو کر دیر پر لی پر بیٹھ گیا۔ ”اس کا حال بس یہی ہے۔ خداوند، مجھے پتھر کی طرح ٹا اور ذہل روٹی کی طرح اٹھا۔“ وہ بڑبڑایا۔ پھر وہ لیٹ گیا اور اپنا جسم کوٹ میں ڈھانپنے لگا۔

”یہ آپ کیا دعا پڑھ رہے تھے؟“ پیر نے پوچھا۔

”ہونہ؟“ پلاطون بڑبڑایا جس کی ٹانگیں نیند سے بوڑھیں ہو رہی تھیں، بڑبڑایا۔ ”میں کیا کہہ رہا تھا؟ میں

خداوند سے دعا مانگ رہا تھا۔ آپ دعا نہیں مانگتے؟“

”بالکل۔ مانگتا ہوں۔“ پیر نے کہا۔ ”لیکن آپ یہ فردنا اور لاور کی کیا بات کر رہے تھے؟“

”جی، ہئی!“ پلاطون نے فوراً جواب دیا۔ ”وہ گھوڑوں کے محافظ ولی ہیں۔ ہمیں ان بے چارے مویشیوں

پر بھی رحم کھانا چاہیے۔ ذرا اس ننھی منی حرفہ کو دیکھیں، بالکل سکڑی پڑی ہے۔ ننھی منی کتیا، سکڑا سمٹ کر اپنے جسم کو حرارت پہنچا رہی ہے!“ کا رانا حیف نے کتیا کے، جو اس کے قدموں کے نیچے لیٹی ہوئی تھی، بدن کو سہلاتے ہوئے کہا اور ایک بار پھر پہلو بدل کر سو گیا۔

کہیں دور قاصدے پر چنم چاغ، در شور و غل کی آوازیں سنائی دیں۔ سائبان کے شگافوں میں سے آگ کی غبرگن روشنی نظر آرہی تھی لیکن اس کے اندر تاریکی اور خاموشی کا راج تھا۔ میٹر کافی دیر تک کروٹیں بدلتا رہا۔ بندھن کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ تاہم وہ آنکھیں کھولے پلاطون کے، جو ائدھیرے میں اس کے قریب لینا ہوا تھا، با آہنگ خراٹے سنتے رہا اور اسے محسوس ہونے لگا کہ وہ دنیا، جو چکنا چور ہو چکی تھی، ایک بار پھر اس کی روح میں انگڑائیاں لے رہی ہے لیکن اب اس میں نیا حسن آگیا تھا اور وہ نئی اور مستحکم بنیادوں پر استوار تھی۔

13

میٹر کو جو سائبان تفویض ہوا اور جہاں اس نے چار ہفتے گزارے، وہاں جو دوسرے قیدی تھے، ان میں تین فوجی جوان، تین افسر اور دو غیر فوجی عہدیدار تھے۔

بعد ازاں جب کبھی وہ انھیں یاد کرتا، ان کی محض دھندلی دھندلی صورتیں اس کی نگاہوں کے سامنے آئیں۔ صرف کاراٹائیف ایک ایسا شخص تھا جس کا نقش اس کے دل پر بیٹھ چکا تھا۔ اس کی شکل اسے واضح طور پر یاد تھی اور یہ یاد اس کے لیے بیش بہا سرمایہ بن گئی تھی۔ ہر وہ چیز—شفتی ورتو عدیل—جو سرتاپا ردی کہلائی جاسکتی تھی، وہ اس کا بیٹا جاگتا نمونہ تھا۔ جب اگلے روز پو پھٹے میٹر کی نظر اپنے پڑوسی پر پڑی تو اس کے اولین تاثر کی دکر وہ کوئی گول منوں شخص ہوگا، پوری طرح تصدیق ہو گئی۔ فرانسیسی فوجی کوٹ، جس کے گرد اس نے رسی بطور بیٹی باندھی ہوئی تھی، ٹوپی اور زیرفون درخت کی چھال کے جوتوں میں اس کا پورا جسم گول مٹول تھا۔ اس کا سر کلاماً گول تھا۔ اس کی پشت، چھاتی، کندھے اور بازو، جنھیں وہ ہر وقت یوں اٹھائے رکھتا جیسے وہ ابھی کسی نہ کسی سے بٹل کیر ہو جائے گا، گول تھے، اور اس کا دوستانہ تبسم اور بڑی بڑی، نرم و لطیف بھوری آنکھیں گول تھیں۔

آزمودہ کار فوجی کی حیثیت سے اس نے جن جن مہسوں میں حصہ لیا تھا اور ان کے متعلق اس نے جو کہانیاں سنائی تھیں، ان سے مترشح ہوتا تھا کہ اس کی عمر پچاس برس سے تجاوز کر چکی ہے۔ خود اسے قطعاً معلوم نہیں تھا کہ اس کی عمر کیا ہے اور اس کا تعین کرنا اس کے بس کی بات نہیں تھی۔ لیکن اس کے موتیوں کی طرح صاف شفاف دانت، جو جب بھی وہ ہنستا—اور یہ حرکت وہ اکثر کرتا—، رونم داندروں کی صورت میں دکھائی دینے لگتے، بالکل ٹھیک ٹھاک اور صحت مند تھے۔ اس کی داڑھی میں یا سر پر ایک بھی سفید بال نہیں تھا اور جب آری اس کے سراپے پر نظر ڈالا تو وہی محسوس ہوتا کہ اس کا جسم، چکیلا، مضبوط اور گھٹیللا ہے اور وہ ہر قسم کی مصوہتیں برداشت کرنے کی ہمت سے بہرہ ور ہے۔ اس امر کے باوجود کہ اس کے چہرے پر باریک باریک جھریاں نمودار ہو چکی تھیں، وہاں شباب اور مصوہت جھلک رہی تھی، اور جب وہ بات کرنا سپاٹ لہجے کے باوجود اس کے منہ سے پھول جھڑکتے لیکن اس کی گفتار کی سب سے بڑی خصوصیت اس کی بے ساختگی اور برجستگی تھی۔ یہ بالکل واضح تھا کہ جو کچھ وہ کہتا ہے کبھی دالا ہوا، اس میں اس کی سوچ کا کوئی دخل نہیں ہوتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس کے سامعین اس کی گفتار کی تیز رفتاری اور برجستگی کی تاب نہ

لا سکتے اور وہ اس کی بات ماننے پر مجبور ہو جاتے۔

اسیری کے ابتدائی ایام میں اس نے کچھ اس نوع کی جسمانی قوت اور پھرتی کا مظاہرہ کیا کہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ تھکن اور عیال جیسے الفاظ کے مفہیم سے نا آشنا ہے۔ ہر رات لیٹنے سے پہلے وہ دعا کرتا: ”مجھے پتھر کی طرح لٹا اور ڈبل روئی کی طرح ٹھٹھا۔“ اور ہر صبح بیدار ہونے کے بعد وہ اپنے شانوں کو جھٹکاتا اور کہتا ”لیٹو تو سٹڑ جاؤ، اٹھو تو جسم کو جھٹکے دو۔“ اور واقعہ یہ ہے کہ جب وہ لیٹتا، بالکل چتر بن جاتا اور اسے اپنے گرد و پیش کی کوئی سادھ بدھ شہرتی، اور جب وہ جاگتا، اسے اپنے بدن کو محض جھٹکا دینے کی ضرورت پیش آتی اور وہ بالکل اسی طرح جھٹ پٹ ہر کام کے لیے تیار ہو جاتا جس طرح بچے آنکھیں کھولتے ہی کھیل کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔ اسے ہر کام کرنا آتا تھا اور اگر اس کا کام اتنا چھٹا نہیں ہوتا تھا، تو اتنا برا بھی نہیں ہوتا تھا۔ وہ سبزیاں اور گوشت بھونتا، روٹیاں پکاتا، کپڑے سینتا، رندہ پھیرتا اور جوتوں کی مرست کرتا۔ وہ ہمہ وقت مصروف رہتا، صرف رات کو باتیں کرتا (باتیں کرنے میں اسے بہت لطف آتا) اور گانے گاتا۔ وہ گویوں کے، جنھیں معلوم ہوتا ہے کہ ان کا گانا سنا جا رہا ہے، انداز میں نہیں گاتا تھا بلکہ پرندوں کی طرح چچھاتا تھا، محض اس لیے کیونکہ اس کے لیے اس جسم کی آوازیں نکالنا اتنی ضروری تھا جتنا کہ دوسروں کے لیے انگریزی بینا یا ٹھلنا ضروری ہوتا ہے۔ اور اس کے حلق سے جو آوازیں نکلتیں، وہ شیریں، غم آلود اور قریب قریب نسوانی ہوتیں اور ایسے مواقع پر اس کے چہرے پر گہرے سنجیدگی طاری ہو جاتی۔

وہ اسیری کے ایام میں سے گزر رہا تھا اور اس نے اپنی داڑھی کھلی چھوڑ دی تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ ہر اجنبی اور عسکری چیز سے، جو اس پر زبردستی لا دوئی گئی تھی، اپنا دامن چھڑا چکا ہے اور اس نے غیر شعوری طور پر اپنے سابقہ عقائد کی طور طریقے دوبارہ اپنالے ہیں۔

”میں فوجی ضرور ہوں لیکن اس وقت چھٹی پر ہوں۔ چنانچہ میں اپنی قمیص بر جس کے اندر نہیں ٹانگتا، باہر رکھتا ہوں،“¹⁵ وہ کہا کرتا۔

اس نے فوجی سپاہی کی حیثیت سے جو زندگی گزاری تھی، اس کے بارے میں باتیں کرنا اسے پسند نہیں تھا۔ تاہم وہ شکوہ شکایت نہیں کرتا تھا اور بڑے فخر سے بتاتا رہتا تھا کہ فوجی ملازمت کے ان تمام برسوں کے دوران میں اسے کبھی کوڑوں کی سزا نہیں ملی تھی۔ وہ جو کوئی قصہ کہانی بیان کرتا، اس کا تعلق اس کی زندگی کے اس دور سے ہوتا جب بقول اس کے وہ ”عیسائی“¹⁶ کی طرح رہ رہا تھا۔ اپنی دہقانی زندگی کی یہ یادیں بظاہر اسکے لیے بہت قیمتی تھیں۔

اپنی گفتگو میں وہ جن ضرب الامثال کو بار بار استعمال کرتا، عام فوجیوں کے برعکس ان میں بیشتر بھونڈی، عامیانہ یا تہذیب کے دائرے سے باہر نہ ہوتیں بلکہ عموماً یہ وہ لوگ کہاوتیں ہوتیں کہ اگر انھیں سیاق و سباق سے الگ کر دیا جائے تو وہ معنی و مفہوم سے عاری معلوم ہونے لگتی ہیں لیکن اگر انھیں موقع محل کی مناسبت سے استعمال کیا جائے، تو ان سے عمیق عقل و دانش کا اظہار ہوتا ہے۔

کسی گزشتہ موقع پر اس نے جو کچھ کہا ہوتا، وہ دوسری مرتبہ عموماً اس کے بالکل برعکس بات کرتا لیکن پھر بھی دونوں

ہی باتیں درست ہوتیں۔ اسے باتیں کرنا پسند تھا اور وہ باتیں کرتا بھی خوب تھا۔ وہ اپنی گفتگو کو پیار کی ایسی اصطلاحات اور روایتی ضرب الامثال سے مزین کرتا کہ بیٹر سوچنے لگتا کہ وہ یہ سب کچھ خود ہی گمڑ رہا ہے۔ لیکن اس کی گفتگو سب سے بڑی دلکشی یہ تھی کہ جب وہ انتہائی معمولی واقعات کا بھی ذکر کرتا۔ ان میں اکثر وہ ہوتے جو خود بیٹر کے مشاہدے میں آئے ہوتے تھے لیکن اس نے ان پر کوئی توجہ نہیں دی ہوتی تھی۔ ان میں پروکار خوبصورتی در آتی۔ کبھی کبھار ایک فوجی سپاہی جی بھر کر خیالی داستانیں (یہ سب ایک جھسی ہوتیں) سناتا۔ انھیں سن کر اسے بہت لطف آتا۔ مگر سب سے زیادہ اسے حقیقی زندگی کے واقعات سننا سنا مرغوب تھا۔ جب کبھی اسے اس قسم کے قصے سننے کو ملے، وہ خوشی سے مسکراتے لگتا۔ کبھی کبھار وہ ایک آدھ لقمہ دے دیتا یا کوئی سوال پوچھ بیٹا۔ اس سب کچھ کا مقصد یہ ہوتا کہ جو کچھ اس کے سامنے بیان کیا جا رہا ہے، وہ اس میں سے اپنے لیے کوئی خوبصورت اخلاقی پہلو تلاش کر سکے۔

بیٹر کی نظروں میں وابستگیوں، دوستیوں اور محبتوں کے جو سفہ ہمیتھے، کارا تالیف ان سے نا آشنا تھا۔ لیکن وہ ہر اس شے سے، خاص طور پر انسانوں سے، جن سے روزمرہ زندگی میں اس کا واسطہ پڑتا تھا، پیار کرتا تھا، ان سے ہمدردانہ سلوک کرتا تھا، کسی خاص، انسان سے نہیں، بلکہ ان تمام انسانوں سے، جن کے ساتھ اس کا، تھا قائل جول ہو جاتا تھا۔ اسے اپنی کتیا، اپنے ساتھیوں، فرانیسیوں اور بیٹر سے، جو اس کا بڑا دوست تھا، محبت تھی۔ کار تالیف بیٹر کے ساتھ جس شفقانہ اور محبت آمیز انداز سے پیش آتا تھا (یوں جبلی طور پر وہ بیٹر کی روحانی زندگی کو خرم خمیں پیش کرتا تھا)، اس کے باوجود اسے محسوس ہوتا تھا کہ انھیں اگر ایک دوسرے سے الگ ہونا پڑا، تو اسے ایک لمحے کے لیے بھی کوئی دکھ نہیں ہوگا۔ اور کار تالیف کے بارے میں بیٹر بھی یہی محسوس کرنے لگا۔

دوسرے تمام قیدیوں کی نگاہوں میں کار تالیف محض معمولی سپاہی تھا۔ وہ اسے ”شکرہ“ یا ”پلا توٹنا“ کہتے، نیک نیتی اور بے ریاکی سے اس کے ساتھ دل لگی کرتے اور چھوٹے موٹے کام کروانے کے لیے اسے ادھر ادھر بھیجتے رہتے، لیکن بیٹر کی نظروں میں وہ سدا وہی رہا جو وہ اسے پہلی رات دکھائی دیا تھا، سادگی اور صداقت کے جو ہرگز کا اتھہ، نا قابل فہم، کھرا دانگی چلتا پھرتا مرقع۔

چلا صون کار تالیف کو اپنی دعاؤں کے علاوہ اور کوئی چیز زبانی یاد نہیں تھی۔ وہ جب کسی بات کا آغاز کرتا، معلوم ہوتا کہ اسے مطلق پانچ نہیں کہ وہ اسے کیسے ختم کرے گا۔

بعض اوقات، بیٹر اس کی باتوں کے مفہوم سے یوں چونک جاتا کہ وہ اسے دہرانے کے لیے کہتا۔ لیکن اس نے ایک ثانیہ قبل جو کچھ کہا ہوتا، وہ اسے دوبارہ کبھی یاد نہ کر پاتا۔ بالکل اسی طرح وہ بیٹر کو اپنے پسندیدہ گانے کے بول کبھی نہ بتا سکا۔ پیاری اماں، برچ کا چھوٹا درخت اور میں گھٹنا جا رہا ہوں جیسے لفاظ اور تراکیب کا وہ ذکر تو ضرور کرتا لیکن ان میں نہ کوئی ربط ہوتا اور نہ ان کے کوئی معانی نکلتے۔ وہ سیاق و سباق سے ماوراء لفاظ کو نہ سمجھ سکتا اور نہ ان کی معنویت اس پر آشکار ہوتی۔ اس کا ہر قول اور ہر فعل ایک ایسی قوت کا مظہر تھا جس کی اسے کوئی تفہیم نہیں تھی، اور یہی اس کی زندگی تھی۔ مگر خود اس کی اپنی نظروں میں علیحدہ وجود کی حیثیت سے اس کی زندگی کے کوئی معانی نہیں

بچے تھے۔ اس میں معافی تبھی پیدا ہوتے جب یہ نکل کا جزو ہو جاتی اور اس کا اسے ہمہ وقت احساس رہتا۔ اس کے اقوال اور افعال اس سے اسی سلاست، بے ساختگی اور ناگزیر انداز سے سرزد ہوتے جس طرح بھول سے خوشبو نکلتی ہے۔ کسی غلط یا فعل کو اگر الگ الگ کر کے دیکھا جاتا تو اس کی قدر و قیمت یا اہمیت کا اسے کوئی اندازہ نہ ہو سکتا۔

14

جب پرس ماریا کو نکول کی کے ذریعے معلوم ہوا کہ اس کا بھائی رستوفز کے ساتھ یاروسلاول میں ہے، تو اس بات کے وجود کو اس کی خالہ نے اسے رد کرنے کی بہت کوشش کی، وہ بڑے توقف اس کے پاس جانے کے لیے تیار ہو گئی۔ وہ نہ صرف خود وہاں جا رہی تھی بلکہ اپنے بھتیجے کو بھی اپنے ساتھ لے جا رہی تھی۔ سفر آسان تھا یا مشکل، ممکن تھا یا ناممکن، اس نے اس کے بارے میں نہ کچھ پوچھا اور نہ کچھ جانے کا تردد کیا۔ اس کی دانست میں اس کا یہ فرض بنتا تھا کہ وہ نہ صرف خود اپنے بھائی کے، جو غالباً اپنی زندگی کی آخری گھڑیاں گن رہا ہے، پاس پہنچے بلکہ اس کے بیٹے کو بھی اس تک پہنچانے کے لیے جو کچھ اس سے بینا پڑے، کرے۔ چنانچہ اس نے سامان سفر باندھنا شروع کر دیا۔ اگر پرس آندرے نے بذات خود اس کے ساتھ کوئی رابطہ قائم نہیں کیا تھا، تو پرس ماریا کے نزدیک اس کی وجہ یہ ہو سکتی تھی کہ وہ اتنا کمزور ہو گیا ہوگا کہ اس کے لیے خط تحریر کرنا ناممکن نہ رہا ہوگا یا پھر اس نے یہ سوچا ہوگا کہ سفر اتنا طویل ہے کہ اس کی ہمشیرہ کے لیے کٹھن اور بڑے خطر ثابت ہو سکتا ہے۔

چند دنوں میں پرس ماریا کی روانگی کی تیاریاں مکمل ہو گئیں۔ اس کا کاروان سفر بھاری بھر کم اور کشادہ خانہ ڈالنی کوچ، برتسکا اور سامان کے چھوٹے پر مشتمل تھا۔ مادموزیل بوٹین، نکوشکا اور اس کا بیٹا، اس کی اپنی بوڑھی نرس، تین خدائیں، بچوں اور نوجوان وردی پوش ملازم اس کے ساتھ ہو لیے۔ اس کی خالیہ نے اپنا قاصدان کے ہمراہ کر دیا۔ سیدھا راستہ، سکومیں سے جاتا تھا لیکن ادھر جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا، چنانچہ پرس ماریا جو راستہ اختیار کرنے پر مجبور ہوئی، وہ چکر کاٹ کر لپیتسک، ریازان، ولادی میر اور شویا میں سے گزرتا تھا۔ یہ راستہ بے حد لمبا، دشوار اور صعبو جوں سے بھر پور تھا کیونکہ اس پر ڈاک کے گھوڑے آسانی سے دستیاب نہیں ہوتے تھے۔ ریازان کے قریب، جہاں سننے میں آیا تھا کہ فرانسیسی دیکھنے میں آئے ہیں، یہ واقعاً خطرناک بھی تھا۔

اس صبر آزمایہ سفر کے دوران میں مادموزیل بوٹین، دیبل اور پرس ماریا کے نوکر چاکر اس کی ہمت، حوصلے اور توانائی کو دیکھ کر اس کی پکاراٹھے۔ وہ سب سے آخر میں سوتی، سب سے پہلے بیدار ہوئی اور کوئی مشکل اس کی راہ کھولتی نہ کر سکتی۔ یہ اس کی جائے نشانی اور ہمت کا اعجاز تھا کہ اس کے رفیقان سفر کے حوصلے بھی جوان ہو گئے اور وہ دوسرے ہفتے کے ختام پر یاروسلاول کے نواح میں پہنچ گئے۔

دارانیہ میں قیام کے آخری ایام پرس ماریا کی زندگی کا انتہائی مسرت بخش زمانہ تھا۔ اسے رستوف سے جو محبت تھی، سب اس پر خدا سے کوئی پریشانی تھی اور نہ ذاتی طور پر کوئی اذیت ہوتی تھی۔ اس نے اس کی ساری ابروح کو سرشار

کر دیا تھا، یہ اس کی ذات کا اثاثہ حصہ بن چکی تھی اور اب وہ اس کے خلاف کوئی جدوجہد نہیں کرتی تھی۔ حالیہ دنوں میں اسے یقین ہو چکا تھا۔ اگرچہ اس نے کبھی کبھار لفظوں میں اس کا اظہار نہیں کیا تھا۔ کہ وہ محبت کرتی ہے اور اس سے محبت کی جارہی ہے۔ نکو مائی کے ساتھ اپنی آخری ملاقات کے دوران میں، جب وہ اسے یہ بتانے کے لیے آیا تھا کہ اس کا بھائی رستوفوں کی معیت میں ہے، اس نے اپنے آپ کو اس کا قائل کیا تھا۔ اگرچہ اس بات کا امکان ضرور تھا کہ پرنس آندرے کی (اگر وہ صحت یاب ہو گیا) نیشا سے دوبارہ سگائی ہو سکتی ہے، لیکن اس سے اس کے بارے میں اشارتاً بھی ایک لفظ تک نہیں کہا تھا، البتہ پرنس ماریا کو اس کے چہرے کے تاثرات سے اندازہ ہو کہ وہ ان خطوط پر سوچ ضرور رہا ہے۔ تاہم اس امکان کے باوجود اس کے اپنے متعلق اس کے رویے۔ خواستگاروں، نرم خویہ اور محبت آمیز۔ میں نہ صرف کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی بلکہ پرنس ماریا کو بعض اوقات محسوس ہوتا کہ ان کے باہن جو خاندانی روابط ہیں، وہ ان پر بہت خوش ہے کیونکہ ان کی وجہ سے اسے اپنی محبت کے آزادانہ، ظہار کا موقع مل جاتا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ اس کی زندگی میں یہ پہلا اور واحد موقع آیا ہے جب وہ کسی کی محبت میں گرفتار ہوئی ہے اور اسے محسوس ہوتا تھا کہ اسے اپنی محبت کا جواب محبت سے مل رہا ہے اور حالت کی اس نیک پروہ سرور مطمئن تھی۔

لیکن اپنی داخلی زندگی کے ایک دائرے میں اسے جو یہ مسرت حاصل ہو رہی تھی، وہ اسے اپنے بھائی کے بارے میں مشوش ہونے سے نہ روک سکی۔ اس کے عکس اس روحانی طراست کے طفیل اسے ذہنی طور پر اپنی زندگی اور فراغت مل گئی کہ وہ جی بھر کر اس کی فکر کر سکے۔ دارا نیر سے بوقت روانگی وہ تنہا شہر کرب میں متلاشی کہ جن لوگوں نے اسے رخصت کیا، انھیں اس کے مغسول و متکسر چہرے کو دیکھ کر یقین ہونے لگا کہ منزل مقصود پر پہنچنے سے پہلے ہی اس کی طبیعت نا ساز ہو جائے گی۔ لیکن سفر کے دوران میں اسے جن مشکلات اور آزمائشوں کا سامنا کرنا پڑا، ان سے وہ بحسن و خوبی عہدہ برآ ہوئی اور یوں اس کا دھیان بٹ گیا، اسے غم و اندوہ سے کافی حد تک نجات مل گئی اور (ذہنی طور پر) خاصی تقویت حاصل ہو گئی۔

جیسا کہ عام طور پر سفر کے دوران میں ہوتا ہے، پرنس ماریا صرف خود سفری کے بارے میں سوچتی رہتی تھی اس کا مقصد کیا تھا، وہ اس کے ذہن سے نکل چکا تھا، مگر جب وہ یاروسلاو کے قریب پہنچے، یہ خیال کہ جہاں "جارہی ہے وہاں کس قسم کے حالات اس کے منتظر ہوں گے، مستقبل کی کسی تاریخ کو نہیں بلکہ بالکل اسی شام کو۔ اس کے ذہن میں گردش کرنے اور اس کے لیے سوہان روح بننے لگا۔

یہ دریافت کرنے کے لیے رستوف یاروسلاو میں کہاں مقیم ہیں اور پرنس آندرے کی طبیعت کبھی ہے پرنس ماریا نے اپنا اچھی پہلے ہی ادھر روانہ کر دیا تھا۔ جب اس کی بھاری بھر کم کوچ قصبے کے دروازے میں داخل ہو رہی تھی، اچھی واپس آ رہا تھا۔ اس نے جب پرنس ماریا کا چہرہ، جس پر وحشت اور مردنی چھائی ہوئی تھی، کمر کی میں سے دیکھا تو اس کا کلیجہ دھک سے رہ گیا۔

"یوڑا کیسی لینی، میں نے ہر چیز معلوم کر لی ہے۔ رستوف چوک میں ایک تاجر بردگلوں کے مکان میں

قیام پذیر ہیں۔ یہ مکان دریائے والگا کے کنارے پر واقع ہے اور یہاں سے کوئی خاص دور نہیں ہے، اپنی نے بتایا۔
پرنس ماریا پر کپکپاہٹ طاری تھی اور وہ نگاہیں گاڑے مستفسر نہ انداز سے اسے دیکھتے جارہی تھی۔ اس کی
سمجھ میں نہیں رہا تھا کہ جس بات کو جاننے کے لیے وہ اتنی بے قرار ہے، وہی وہ اسے کیوں نہیں بتا رہا کہ اس کا
بھائی کیا ہے؟ اس کی طرف سے سوال پوچھنے کا فریضہ، دموزیل یوشین نے سرانجام دیا۔
”اور پرنس؟“

”ہر ایک کی لینسی اسی مکان میں مقیم ہیں۔“

”اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ سلامت ہیں۔“ پرنس ماریا نے دل میں سوچا اور دھیمی آواز سے پوچھا: ”ان
کی طبیعت کیسی ہے؟“
”نوکر بتاتے ہیں کہ ان کی حالت یوں کی توں ہے۔“

”حالت یوں کی توں ہے۔“ اس کا مطلب کیا تھا، پرنس نے نہیں پوچھا۔ اس نے سات سالہ گولشکا پر، جو
اس کے روبرو بیٹھا تھا اور قصبے کو دیکھ کر خوش ہو رہا تھا، عاجزانہ تقریباً غنی، نظر ڈالی اور پنا سر نیچے جھکا لیا، اور جب
نک کھڑکھڑاتی، ہچکولے کھاتی اور دائیں بائیں جھولتی بھاری بھر کم کوچ نہ گئی، اس نے اسے اوپر نہ اٹھایا۔
کھٹاکھٹ پائیدان نیچے کھسکا۔

کوچ کا دروازہ کھلا۔ بائیں طرف پانی کشادہ دریا۔ اور دائیں طرف پورج تھا۔ گیٹ پر چند اشخاص۔
لوکر چاکر اور ایک نوجوان دوشیزہ۔ موجود تھے۔ دوشیزہ کا چہرہ گلابی تھا اور اس کی یہ زلفیں سینڈھی میں بندھی ہوئی
تھیں۔ وہ مسکرا رہی تھی۔ پرنس ماریا کو محسوس ہوا کہ اس کی مسکراہٹ ناگوار طور پر مصنوعی ہے۔ (یہ سوچا تھی۔)
پرنس ماریا دوڑتی دوڑتی میٹرھیاں چڑھنے لگی۔ ”آئیں، اندر آجائیں!“ دوشیزہ نے سی بناوٹی تبسم سے کہا۔ اور
پرنس ماریا نے رکھا کہ وہ ہال میں پہنچ گئی ہے۔ اس کے سامنے ایک ادھڑ عمر خاتون، جس کے خدو خال سے
شرقت ٹپک رہی تھی، تیز تیز قدم اٹھاتی اس کا استقبال کرنے چلی آ رہی تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ اسے دیکھ کر بہت
متاثر ہوئی ہے۔ یہ کاؤٹس تھی۔ وہ پرنس ماریا سے بغل گیر ہو گئی اور سے دھڑا دھڑا چومنے لگی۔
”Mon enfant!“ اس نے زیر لب کہا۔

”Je vous aime et vous connais de puis long temps.“

بچے اضطراب کے باوجود، جو پرنس ماریا پر طاری تھا، اسے اندازہ ہو گیا کہ ہونہ ہو یہ کیا کاؤٹس ہے اور اسے
اس سے لازماً کچھ نہ کچھ کہنا چاہیے۔ اسے قطعاً کچھ معلوم نہیں تھا کہ یہ کیوں کر ہوا، بہرحال اس نے اسی لہجے میں،
جس سے خود اسے مخاطب کیا گیا تھا، کسی نہ کسی طور فرانسس میں ہی چند شائستہ نکلات ادا کر دیے اور پھر پوچھنے لگی:
”وہ کیسے ہیں؟“

”میری بچی، تم مجھے بے حد عزیز ہو اور میں تمہیں مدتوں سے جانتی ہوں۔“

”ڈاکٹر کہتا ہے کہ اب فکر کی کوئی بات نہیں۔“ کاؤنٹس نے کہا، لیکن ان الفاظ کی اور گنگی کے دوران میں ہی اس کی نگاہیں آسمان کی جانب اٹھ گئیں۔ اس کے اس رویے سے اس کے الفاظ کی تردید ہو گئی۔

”وہ کہاں ہیں؟ میں ان سے مل سکتی ہوں؟“ پرنس نے دریافت کیا۔

”کیوں نہیں، پرنس، مائی ڈیئر، کیوں نہیں! یہ ان کا صاحب زادہ ہے؟“ کاؤنٹس نے ٹکڑا کی جانب اشارہ کر دیا۔

”خیر، اندر آیا تھا، متوجہ ہو کر کہا۔“ ہم سب کی رہائش کا بندوبست کر لیں گے۔ مکان خاصا بڑا ہے۔ ساخا، کتنا پیارا بچہ ہے!“

کاؤنٹس پرنس ماریا کو ڈرائنگ روم میں لے گئی۔ وہاں سوئیٹا ماداموزیل یوغین کے ساتھ باتیں کر رہی تھی۔ کاؤنٹس بچے سے لاڈ پیا کر کے اور اسے پچکارنے لگی۔ کاؤنٹ بھی پرنس کا استقبال کرنے اندر آ گیا۔ پرنس ماریا نے جب اسے آخری بار دیکھا تھا، اس کے مقابلے میں وہ اب خاصا بدن چمکا تھا۔ تب وہ چاقو بند، ہشاش ٹاش اور پراعتماد نظر آیا تھا مگر اب اس کی حالت قابل رحم تھی۔ وہ بوڑھا ہو گیا تھا اور اس کے چہرے پر سراسیمگی برس رہی تھی۔ جب تک وہ پرنس ماریا سے باتیں کرتا رہا، وہ اپنے گرد و پیش یوں دیکھتا رہا جیسے ہر کہہ دہشتہ پوچھ رہا ہو کہ آیا وہ صحیح طریقے سے کام کر رہا ہے۔ ماسکو اور اپنی جائیداد کی بربادی کے بعد اسے جس طرح اپنے لگے بندھے معمول سے دستکش ہونا پڑا، اس کا اس پر اتنا شدید اثر ہوا تھا کہ معلوم ہونے لگا کہ وہ اپنی اہمیت کے احساں سے بھی محروم ہو گیا ہے اور محسوس کرنے لگا ہے کہ ب زندگی میں اس کے لیے کوئی مزید مدت نہیں رہا۔

پرنس ماریا ذاتی طور پر بڑی پریشان اور مضطرب تھی۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ وہ حتی الامکان جلد از جلد بھائی کے پاس پہنچ جائے اور وہ اس بات پر بیچ و تاب کھا رہی تھی کہ اس وقت جب اس کی واحد آرزو اپنے بھائی سے ملاقات کرنا ہے، یہ لوگ اس کے راستے کی دیوار بن گئے ہیں، اسے خوش کرنے کے لیے طرح طرح کے جنس کر رہے ہیں اور اس کے بھتیجے کی جھوٹی تعریفیں کر رہے ہیں۔ ان تمام امور کے باوجود پرنس نے اس کا، جو اس کے گرد و پیش ہو رہا تھا، جائزہ لیا اور اسے احساس ہوا کہ وہ جس قسم کے نئے ماحول میں پہنچ گئی ہے، اس کا تقاضا ہے کہ وہ وقتی طور پر اس سے سمجھوتا کر لے۔ وہ جانتی تھی کہ ایسے بغیر گزارہ نہیں اور اگرچہ یہ اس کے لیے تکلیف دہ تھا لیکن اسے ان لوگوں سے کوئی پر خاش نہیں تھی۔

”یہ میری بھانجی ہے۔“ کاؤنٹ نے سونیا کا تعارف کرتے ہوئے کہا۔ ”میرا خیال ہے کہ آپ کی اس سے کبھی ملاقات نہیں ہوئی۔“

پرنس ماریا سونیا کی طرف متوجہ ہوئی۔ اس کے دل میں اس لڑکی کے خلاف عناد کا جو جذبہ پیدا ہوا تھا، اس نے اسے کچننے کی کوشش کی اور اس کا منہ چوم لیا۔ تاہم، اسے تکلیف دہ حد تک یہ محسوس ہو رہا تھا کہ جو کچھ خود اس کے اپنے دل میں ہے، اس میں اور ان لوگوں کی، جو اس کے ارد گرد موجود ہیں، وہی کیفیت کے، جین اسے غیج جاکل ہے۔

”وہ کہاں ہیں؟“ اس نے ایک مرتبہ پھر پوچھا۔ اب کے اس کے مخاطب وہ بھی تھے۔

”وہ بھلی منزل میں ہیں۔ مناشا ان کے پاس ہے۔“ سونیا نے جواب دیا اور اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ ”ہم نے یہ معلوم کرنے کے لیے کہ اس وقت ملاقات مناسب رہے گی، خادمہ بھیج دی ہے۔۔۔ پرس، آپ بہت جھک گئی ہوں گی؟“

پرس ماریا جھنجھلا گئی اور اس کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔ اس نے اپنا منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ وہ کاؤتس سے دوبارہ پوچھنا ہی چاہتی تھی کہ اس کا کمر کہاں ہے کہ دروازے کے قریب ہلکے پھلکے اور تیز رفتروں کی تقریباً خوش و خرم آہٹ سنائی دی۔ پرس نے مڑ کر دیکھا اور اسے مناشا۔ جو مدتوں قبل ماسکو کی ملاقات کے دوران میں اسے سخت ناپسند آئی تھی۔ دکھائی دی۔ وہ قریب قریب دوڑتی کمرے میں داخل ہو رہی تھی۔

ابھی اس نے مناشا پر بمشکل سرسری نظر ڈالی ہو گی کہ اسے اندازہ ہو گیا کہ غم و اندوہ میں وہ اس کی بچی رہتی اور بیٹھا دوست ہے۔ وہ اٹھی اور اس سے منے سر پٹ بھاگی۔ وہ اس سے بغل گیر ہو گئی اور اس کے شانے پر سر رکھ کر ٹپ ٹپ آنسو بہانے لگی۔

جونہی مناشا کو، جو پرس آندرے کے سرہانے بیٹھی تھی، پرس ماریا کی آمد کا علم ہوا وہ چپکے سے اٹھی اور تیز قدموں، جن کی چاپ میں پرس ماریا کو شکستہ لگی، چلتی اس کے پاس آ گئی۔

جب وہ دوڑتے دوڑتے ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی، اس کے پریشان و مضطرب چہرے پر صرف ایک ہی تاثر نمایاں تھا اور یہ تاثر اس بے پایاں محبت کا تھا جو اسے اس سے، پرس ماریا اور ہر اس چیز سے تھی جس کا تعلق اس شخص سے تھا جس سے اسے محبت تھی۔ اس تاثر میں دردمندی تھی، دوسروں کی خاطر تکالیف جھیلنے کا جذبہ تھا اور تنہا سے ان کی خدمت کرنے کی آرزو تھی۔ صاف عیاں تھا کہ اس وقت مناشا کے دل میں اپنی ذات یا پرس آندرے کے ساتھ اپنے ذاتی تعلقات کے متعلق سوچ کا شائبہ تک نہیں تھا۔

پرس ماریا نے یہ سب کچھ اپنے حساس وجدان کی مدد سے بیک نظر بھانپ لیا اور اس کے کندھے پر سر رکھ کر یوں برائی رہی کہ اس کے دکھ کا اظہار بھی ہوتا رہا اور اس اظہار سے اس کی تسکین کا سامان بھی بہم پہنچتا رہا۔

”اری، آؤ ان کے پاس چلتے ہیں۔“ مناشا نے کہا اور اسے دوسرے کمرے کی طرف لے گئی۔

پرس ماریا نے اپنا سر اٹھایا، آنکھیں پرٹپٹیں اور پھر مناشا کی طرف متوجہ ہوئی۔ اسے محسوس ہوا کہ وہ اس سے سب کچھ معلوم کر لے گی اور جان لے گی۔

”کیسے...“ اس نے اپنی بات کا آغاز کیا لیکن وہ بیچ میں ہی رک گئی۔

اسے محسوس ہوا کہ نہ اس کا سوال اور نہ اس کا جواب الفاظ کے قالب میں ڈھالا جاسکتا ہے۔ جو کچھ وہ جانتا چاہتی ہے، مناشا کا چہرہ اور آنکھیں اسے زیادہ واضح اور بہتر انداز سے بتا سکتی ہیں

مناشا نے اپنی نگاہیں اس پر مرکوز کر رکھی تھیں لیکن معلوم ہوتا تھا کہ اس پر خوف کا غلبہ ہے اور وہ اس شک و شبہ میں مبتلا ہے کہ آیا اسے وہ سب کچھ، جو خود اسے معلوم ہے، بتا دینا چاہیے یا نہیں۔ کچھ یوں نظر آ رہا تھا کہ ان

درخشندہ آنکھوں کے سامنے، جو چھیدتی ہوئی اس کے دل کی گہرائیوں تک پہنچتی جا رہی تھیں، سچ، پورے، جیسا کہ خود اس نے دیکھا تھا، بیان نہ کرنا ناممکن ہے۔ اور ایک ایسی اس کے سب سے تھرائے، اس کے چہرے پر بھدی لکیریں، جنہوں نے اس کا حیدر بگاڑ دیا، نمایاں ہو گئیں۔ اس نے اپنا چہرہ اپنے دونوں ہاتھوں میں ڈھانپ لیا اور سسکیاں بھرنے لگی۔

پرنس ماریا سمجھ گئی۔

لیکن وہ اب بھی پرامید تھی اور اگرچہ اسے اپنے الفاظ میں کوئی یقین نہیں تھا، اس نے پوچھ ہی لیا۔
 ”مگر ان کا زخم کیسے ہے؟ ان کی عمومی حالت کیسی ہے؟“
 ”تم۔ تم خود دیکھ لو گی۔“ نٹاشا صرف اتنا ہی کہہ سکی۔

وہ کچھ دیر ٹخلی منزل میں اس کے کمرے کے نزدیک بیٹھی رہیں تاکہ وہ اپنے آنسوؤں کو روک سکیں اور اس کے کمرے میں جانے سے پہلے اپنا سکون بحال کر سکیں۔

”ان کی حالت کی روش کیا رہی ہے؟ ان کا زخم... کب سے بگڑنا شروع ہوا؟ یہ کب ہوا؟“ پرنس ماریا نے پوچھا۔

نٹاشا نے بتایا کہ شروع میں شدید بخار اور جان لیوا درد نے، جس میں وہ مبتلا تھا، اس کی حالت تشریش ہاک بنا دی تھی، تاہم جب وہ تروکتا پہنچے، اسے افاقہ ہونے لگا۔ اس وقت ڈاکٹر کو صرف ایک بات۔ نٹاشا (gangrene) کا اندیشہ تھا۔ تاہم یہ خطرہ بھی ٹل گیا ہے۔ جب وہ بارہویں دن پہنچے، زخم میں ایک بار بھر پپ پڑنے لگی (نٹاشا اس قسم کی باتیں جانتی تھی) اور ڈاکٹر نے بتایا کہ پپ پڑنے کا عمل اپنی فطری سیعاد پوری کرنے کے بعد ختم ہو جائے گا۔ اس کے بعد بخار ہونے لگا لیکن اس کا خیال تھا کہ یہ خطرناک نہیں۔

”لیکن دروازہ قبل“ نٹاشا نے اپنی سسکیاں دبانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا، ”یہ کیفیت اچانک ہو گئی۔ مجھے نہیں معلوم کہ کیوں، مگر میرا مطلب کیا ہے، یہ تم خود دیکھ لو گی۔“

”وہ کمزور ہو گئے ہیں؟ غر ہو گئے ہیں؟“ پرنس ماریا نے پوچھا۔
 ”نہیں۔ یہ بات نہیں۔۔۔ صورت حال اس سے کہیں بدتر ہے۔ تم دیکھ لو گی۔ ہائے ماریا، وہ ہے حد انتہا

ہیں۔ وہ زندہ نہیں رہ سکتے، زندہ نہیں رہ سکتے کیونکہ۔“

جب نٹاشا نے اپنے معمول کے انداز سے دروازہ کھولا اور پرنس ماریا کو پہلے اندر جانے دیا، پرنس کی ہچکچاہٹ گئیں اور اس کا گلہ رندہ گیا۔ اگرچہ اس نے اپنے آپ کو تیار کرنے کی سعی کامل کی تھی اور اب بھی اس کی بیجا کوشش

تھی کہ اس کے جذبات کا شیرازہ منتشر نہ ہونے پائے، وہ جان بچی تھی کہ جب اس کی نظر اس پر پڑے گی، اسے اپنے آنسوؤں پر اختیار نہیں رہے گا۔

نشا نے جو یہ کہا تھا کہ ”یہ کیفیت اچانک ہوگی“، تو وہ اس کا مطلب سمجھ گئی تھی۔ اس نے اس کا مفہوم یہ یہ تھا کہ وہ اچانک ڈھیلا پڑ گیا ہے اور اس کے مزاج کی یہ نرمی اور عاجزی اس امر کی علامت ہے کہ موت کی آمد آ رہی ہے۔ جب وہ دروازے کی جانب قدم بڑھا رہی تھی، اس نے اپنے تخیل میں اپنے بچپن کے آندر پوش کے چہرے کا تصور یاد کیا۔ جس سے وہ اپنے ایام طفولیت میں خوب آشنا تھی۔ اس وقت اس چہرے پر نرمی، ملائمت، نازگی اور درمندی جھلکا کرتی تھی لیکن بعد کے سالوں میں یہ آثار سناڑی وہاں کبھی دکھائی دیے۔ چنانچہ جب کبھی اس کے یہ اوصاف غور کرتے، وہ بے حد متاثر ہوتی۔ وہ جانتی تھی کہ بستر مرگ پر جس طرح اس کے باپ نے اس کے ساتھ بڑے ملائم اور شیریں لہجے سے باتیں کی تھیں، وہ بھی اس کی تقلید میں اسی انداز سے گفتگو کرے گا، وہ اسے برداشت نہیں کر پائے گی اور اس کی موجودگی میں ہی بھوٹ بھوٹ کر رونے لگی گی۔ تاہم جلد پاؤں پر یہ تو ہونا ہی ہے اور وہ کمرے کے اندر چلی گئی۔ اس کی کوتاہ بین آنکھیں جوں جوں اس کی شکل واضح طور پر دیکھنے اور اس کے خدوخال پہچاننے لگیں، توں توں اس کی سسکیاں بلند سے بلند تر ہوتی چلی گئیں۔ پھر اسے اس کا چہرہ نظر آیا اور اس کی نظریں اس کی نظروں سے ٹکرائیں۔

وہ تکیوں کے سہارے دیوان پر لیٹا ہوا تھا۔ وہ ڈریسنگ گاؤن میں ملبوس تھا جس کا، ستر گلہری کی پوسٹین کا تھا۔ وہ سوکھ کر کانٹا ہو چکا تھا اور اس کے چہرے پر زردی کھڑی تھی۔ وہ اپنے ایک مہین اور سفید شفاف ہاتھ میں رومال پکڑے ہوئے تھے جب کہ وہ دوسرے سے باریک باریک مونچھوں کو، جو اس نے اگلی تھیں، سہلارہا تھا۔ جب وہ اندر آئیں، اس کی نگاہیں ان پر مرکوز ہو گئیں۔

جب پرس مار یا نے اس کے چہرے کو دیکھا اور اس کی نظریں آپس میں متضام ہوئیں، اس کے قدموں کی رفتار ڈھیلی پڑ گئی، آنسو خشک ہو گئے اور سسکیاں ٹھم گئیں۔ جو بھی اسے اس کے چہرے اور آنکھوں کے تاثرات رکھائی دیے، وہ ہم نگی اور یکا یک اپنے آپ کو مجرم تصور کرنے لگی۔

”لیکن میں نے کیا جرم کیا ہے؟“ اس نے اپنے آپ سے پوچھا۔ ”کیونکہ تم زندہ ہو درزخوں کے بارے میں سوچ رہی ہو، جب کہ میں...“ اس کی سر دمہ اور سخت گیر نظروں نے جواب دیا

جب وینسا شا اور اپنی ہمشیرہ کا عہد اجازتہ لے رہا تھا اس کی عیش قلقلی میں، جو بظاہر کسی خارجی وجود کی طرف نہیں بلکہ قدرے اس کی اپنی ذات پر مرکوز نظر آتی تھی، ایک طرح کا خاصانہ تاثر ہو رہا تھا۔

”ماری، کیسی ہو؟ تم یہاں کیسے پہنچ گئی ہو؟“ اس نے ایک ایسی داز میں پوچھا جو اتنی ہی پرسکون اور متعلق تھی جتنی کہ اس کی ٹانگی۔

اگر اس نے کچھ اس طرح چیخ ماری ہوئی جیسے وہ ہر چیز سے مایوس ہو گیا ہو، پرس مار یا اتنی دہشت زدہ نہ

ہوتی جتنی وہ اس کے لہجے سے ہوتی۔

”کوئی لاش کا اپنے ساتھ لائی ہو؟“ اس نے اسی پرسکون اور ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں پوچھا۔ صاف نظر آرہا تھا کہ وہ اپنا حافظہ تازہ کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔

”آپ کیسے ہیں؟“ پرنس ماریا نے پوچھا۔ وہ خود متعجب تھی کہ وہ کی کہہ رہی ہے۔

”مائی ڈیئر، یہ سوال تمہیں ڈاکٹر سے پوچھنا چاہیے۔“ اس نے جواب دیا۔ وہ بظاہر خوش خلق بننے کی سعی کر رہا تھا اور صرف ہونٹوں سے بات کر رہا تھا۔ (صاف عیاں تھا کہ وہ جو کچھ کہہ رہا تھا، اوپر سے دس سے کہہ رہا تھا۔ اس کا ذہن کہیں اور بھٹک رہا تھا۔) اس نے کہا۔

”مائی ڈیئر، تمہاری آمد کا شکریہ۔“

پرنس ماریا نے اس کا ہاتھ دبایا۔ وہ یہ دباؤ برداشت نہ کر سکا اور اسے قدرے جھرجھری آگئی۔ وہ چپ تھا۔ وہ سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ وہ کیا کہے۔ دو روز قبل اس میں جو تبدیلی آئی تھی، وہ اسے سمجھ گئی تھی۔ اس کے الفاظ، اس کے لہجے اور اس کی قریب قریب محاصرہ نہ نظر میں تمام دنیوی علاقے و اشیاء سے وہ بیگانگی، جو زندوں کو اتنی دہشت ناک معلوم ہوتی ہے، محسوس کی جاسکتی تھی۔ صاف عیاں تھا کہ زندہ اشیاء کو سمجھنا اس کے لیے ناممکن ہو گیا ہے، بلکہ بھی یوں معلوم ہوتا تھا کہ وہ ان کی تفہیم میں اس لیے ناکام نہیں ہوا کیونکہ وہ اس صلاحیت سے محروم ہو چکا ہے بلکہ اس لیے کیونکہ وہ کچھ دور۔ جو زندہ نہیں سمجھتے اور نہ سمجھ سکتے ہیں۔ سمجھنے لگا ہے اور جس میں وہ کاملاً جذب ہو چکا ہے۔

”ہاں، تم دیکھ رہی ہونا کہ قضا و قدر نے ہمیں کیسے عجیب و غریب انداز سے اکٹھا کر دیا ہے۔“ اس نے مہر سکوت توڑتے ورنٹاشا کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”یہ ہر وقت میرا خیال رکھتی ہیں۔“

پرنس ماریا نے اس کی بات منی لیکن اسے اپنے کانوں پر یقین نہ آیا۔ پرنس آندرے جیسا احساس اور تپن القلب شخص اس لڑکی کے سامنے، جس سے وہ محبت کرتا ہے اور جو اس سے محبت کرتی ہے، اس قسم کی بات کیسے کہہ سکتا ہے؟ اگر اسے زندہ رہنے کی آس ہوتی، وہ یہ الفاظ اس نوع کے سرد مہر، درجہ احت کش لہجے سے کبھی ادا نہ کر سکتا۔ اگر اسے یہ معلوم نہ ہوتا کہ اس کا انجام قریب ہے تو یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ اس کے بارے میں ہمدردی کی ایک دھڑکی بھی محسوس کرنے میں یوں ناکام رہتا، اس کی موجودگی میں اس کی طرح کی بات کہہ بھی کیسے سکتا؟ ان، توں کی صرف ایک ہی توضیح ہو سکتی ہے کہ وہ ہر شے سے لاتعلقی ہو چکا ہے، اس لیے تعلق کیونکہ اس پر کہیں زیادہ اہمیت کی حامل کوئی چیز منکشف ہو چکی ہے۔

ان کے مابین جو گفتگو ہو رہی تھی، وہ بے نظم اور جوش و جذبے سے جاری تھی اور اس میں خواہ مخواہ بار بار وقفے

جاتے تھے۔

”ماری براستہ ریازان آئی ہے،“ ورنٹاشا نے کہا۔

پرنس آندرے کو احساس ہی نہ ہو سکا کہ ورنٹاشا نے اس کی ہمشیرہ کو ماری کہا ہے اور خود ورنٹاشا کو اس کا ورنٹ

اسے اس (پرنس آندرے) کی موجودگی میں اس نام سے پکارنے کے بھرہو۔
 ”واقعی؟“ اس نے کہا۔

”اسے لوگوں سے معلوم ہوا تھا کہ، سکو کو حلا کر رکھ کا ڈھیر بنایا جا چکا ہے اور اس (ماسکو) کی حالت ایسی ہے
 گویا۔۔“

نشاٹ رک گئی۔ گھنگو کرنا ممکن تھا۔ بظاہر وہ سننے کی کاوش کر رہا تھا تاہم اس سے یہ کام ہونے پر ہوا تھا۔
 ”ہاں، سن ہے کہ وہ، جل کر رکھ کا ڈھیر بن چکا ہے۔ بہت برا ہوا۔“ اس نے سیدھا اپنے سامنے غنگو کی باندھ کر
 دیکھتے اور بے دھیانی سے اپنی سونچوں کو سہراتے ہوئے کہا۔

”اور ہاں ماری، تو تمھاری کاؤنٹ نکولائی سے ملاقات ہو چکی ہے؟“ پرنس آندرے نے یک لخت کہا۔ نظر
 یہ پتا تھا کہ وہ ان کا دل رکھنے کے لیے کچھ نہ کچھ کہنے کی کوشش کر رہا ہے۔ ”اس نے یہاں خط بھیجا تھا اور لکھا تھا کہ
 وہ تمھیں بہت پسند کرنے لگا ہے۔“ وہ سادگی اور سکون سے کہنا چلا گیا۔ دکھائی دیتا تھا کہ زندگیوں کے لیے اس کے
 الفاظ جس پیچیدہ معنویت کے حامل ہیں، وہ اس کا ادراک کرنے سے قاصر ہے۔ ”اگر تم بھی اسے پسند کرتی ہو تو
 بہت، چچی بات ہوگی۔ تم اس سے شادی کر سکو گی۔“ اس نے قدرے تیزی سے مزید کہا، گویا وہ اس بات پر خوش
 ہو کہ جو کچھ وہ کہنا چاہتا تھا، وہ کہنے کے لیے بالآخر اسے الفاظ مل گئے ہیں۔

جو کچھ اس نے کہا پرنس ماریا نے سن لیا لیکن اس کے لیے ان الفاظ کے اور کوئی معانی نہیں تھے، سوائے اس
 کے کہ ان سے اس امر کا مزید ثبوت ملتا تھا کہ وہ دنیاوی عداوت سے کتنا دور ہو چکا ہے۔
 ”میرے متعلق بات کرنے کی کیا ضرورت تھی؟“ پرنس ماریا نے کہا اور نشاٹ کو چٹنی لگا ہوں سے دیکھا۔
 نشاٹ کو آگئی تھی کہ وہ سے دیکھ رہی ہے لیکن خود اس نے پلٹ کر اس کی طرف دیکھنے سے احتراز کیا۔ ایک بار
 پھر تینوں خاموش تھے۔

”آندرے، کیا آپ پسند کریں گے۔“ پرنس ماریا نے اچانک لڑکھڑاتی زبان سے کہا۔ ”کیا آپ نکولائی
 سے ملنا پسند کریں گے؟ وہ ہمیشہ آپ کے متعلق باتیں کرتا رہتا ہے۔“
 پرنس آندرے کے چہرے پر پہلی مرتبہ ہلکی سی مسکراہٹ، جو بمشکل نظر آرہی تھی، دکھائی دی، لیکن پرنس ماریا
 جو اس کے چہرے سے خوب شناسا تھی، یہ دیکھ کر دہشت زدہ رہ گئی کہ اس کی یہ مسکراہٹ اپنے بچے کے لیے محبت یا
 انبساط کا اظہار نہیں تھی بلکہ ایک طرح کی شریفانہ طنز تھی۔ وہ جان گئی کہ اس نے اس کے ذریعے اسے یہ بتا دیا ہے:
 ”تم نے میرے جذبات کو جاننے کے لیے خری حربہ استعمال کر ہی لیا۔“
 ”ہاں، نکولائی سے مل کر مجھے بہت خوشی ہوگی۔ وہ ٹھیک ہے نا؟“

جب ٹکولشکا کو پرنس آندرے کے پاس لایا گیا، وہ خوف زدہ لگا ہوں سے ٹکٹل ماندھ کر اپنے باپ کو دیکھنے لگا مگر رو یا نہیں کیونکہ کوئی دوسرا شخص رو نہیں رہا تھا۔ پرنس آندرے نے اسے چومایا لیکن بظاہر اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ اس سے کیا کہے۔

جب وہ نو عمر بچے کو دہرا سے دوسرے کمرے میں لے گئیں، پرنس ماریا ایک بار پھر اپنے بھائی کے پاس آئی اور اس نے اسے بوسہ دیا۔ اب اس میں اپنے، تسو ضبط کرنے کی مزید سکت نہیں رہی تھی اور وہ بے اختیار رونے لگی۔ وہ بڑے اشہاک سے اسے دیکھنے لگا۔

”تم ٹکولشکا کے لیے رو رہی ہو؟“ اس نے پوچھا۔

پرنس ماریا نے روتے روتے اپنے سر کو جنبش دی۔

”ماری، تمہیں انجیل مقدس کی وہ آیا۔“ اس نے کہنا شروع کیا، پھر دفعتاً خاموش ہو گیا۔

”آپ نے کیا کہا تھا؟“

”کچھ نہیں۔ تمہیں یہاں رونا نہیں چاہیے۔“ اس نے اسے اسی سرد مہر انداز سے دیکھتے ہوئے جواب دیا۔



جب پرنس ماریا رونے لگی تھی، وہ سمجھ گیا تھا کہ وہ اس کے لیے رو رہی ہے کیونکہ ٹکولشکا بن باپ کے رہ جائے گا۔ اور کسمانے ور پورا زور لگانے لگا کہ کسی طرح زندگی کی طرف دوبارہ لوٹ آئے اور ان کے نقطہ نظر سے حالات کا جائزہ لے سکے۔

”ہاں، انھیں یہانسوس ناک معلوم ہوگا۔“ اس نے سوچا۔ ”مگر یہ بات ہے کتنی سادہ!“

”قضائی پرندے نہ بیج بڑتے ہیں، نہ فصل کاٹتے ہیں، پھر بھی تمہارا آسمانی باپ انھیں دانہ لگا کھاتا ہے۔“

اس نے اپنے آپ سے کہا اور یہی بات وہ پرنس ماریا سے کہنا چاہتا تھا۔ ”لیکن نہیں، وہ اس کی تفسیر اپنے غلام

سے کریں گی اور اصل بات کی تہہ تک نہیں پہنچ سکیں گی۔ وہ سمجھتی ہی نہیں کہ ان کے یہ جذبات، جنہیں وہ اتنی تہہ کی

نگاہ سے دیکھتی ہیں۔ ہمارے وہ تمام خیالات جو ہمیں اتنے اہم معلوم ہوتے ہیں۔ دراصل کسی اہمیت کے حامل

نہیں۔ ہم ایک دوسرے کو نہیں سمجھ سکتے۔“ اور وہ خاموش رہا۔



پرنس آندرے کا نو خیز بیٹا سات سال کا تھا۔ وہ بمشکل حروف کی شناخت کر سکتا تھا اور اس کا علم تقریباً صفر تھا۔ اس

دن کے بعد اسے چکی میں پسنا پڑا، اسے علم، تجربہ اور بصیرت حاصل ہوئی۔ لیکن جو کچھ اس نے بعد میں حاصل کیا

اگر اس وقت اس کی ہانک میں ہوتا تو بھی اس نے اپنے باپ، پرنس ماریا اور نانا شا کے ماہین جو منظر دیکھا، اسے

اس کی معنویت کا اس سے زیادہ صحیح اور زیادہ عمیق ادراک نہ ہوتا جتنا کہ تب ہو گیا تھا۔ وہ اسے مکمل طور پر سمجھ گیا تھا اور جب وہ آنسو بہائے بغیر کمرے سے باہر نکلا، وہ سیدھا ناشا کے پاس آیا جہاں اس کے پیچھے پیچھے آرہی تھی، اور شرابے شرابے اپنی خوبصورت اور متفکر آنکھوں سے اسے دیکھنے لگا۔ پھر اس کا بالائی ہونٹ، جو دیرپا ٹھہ گیا تھا، کھل گیا، اس نے پتا اس کے جسم کے ساتھ لگا یا اور رونے لگا۔

اس دن سے وہ دیرال اور کاؤٹس سے، جو اس کی ناز برداریاں کرتی رہتی تھی، کٹنی کٹرانے اور پہلو پھانے لگا۔ وہ باتو خلوت گزیر رہتا یا پھر راتے جھجکتے پرس مار یا ناشا کے چہا جاتا جس سے وہ اپنی پھوچگی سے بھی زیادہ محبت کرنا معلوم ہوتا تھا، اور اپنے شرمیلے اور خاموش انداز سے ان کے ساتھ جھٹ جاتا۔

جب پرس مار یا اپنے بھائی کے کمرے سے باہر آئی، ناشا کے چہرے نے جو کچھ اسے بتایا تھا، وہ سے بخوبی سمجھ چکی تھی۔ وہ اب ناشا کے ساتھ اپنے بھائی کی بولی، صحت کے بارے میں امید افزا باتیں نہیں کرتی تھی۔ وہ اس کے دیوان کے قریب بیٹھنے کے لیے اس سے باری لیتی، تسونہ بہتی بلکہ سسل دما ئیں مانگتی رہتی۔ اس کی مدد ہر دم اس ہستی سے، جو یزال ہے اور ہمارے فہم دادرک سے بالا، اور جو اتنے محسوس انداز سے قریب الگ شخص کے اوپر متزلزل رہی تھی، لو لگائے رکھتی۔

16

پرس آنڈرے کو نہ صرف یہ معلوم تھا کہ وہ چراغ سحری ہے بلکہ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ یہ چراغ تیزی سے بجھتا جا رہا ہے نصف کے قریب بجھ چکا ہے۔ اسے یہ وقوف تھا کہ وہ دنیوی اشیاء سے بیگانہ ہو چکا ہے اور اسے اپنا وجود عجیب و غریب اور مسرور کن انداز سے ہلکا پھلکا لگنے لگا تھا۔ جو کچھ توغ پذیر ہوتا تھا، وہ اس کا بہ صبر تحمل اور بلا تردد منتظر تھا۔ وہ مہیب، ابدی، ان جانی اور دوست چیز، جو کچھ بھی وہ تھی۔ جس کی موجودگی کی اسے پوری زندگی آگہی رہی تھی۔ اب اس کے بالکل قریب تھی اور جس عجیب و غریب انداز سے اسے اپنے وجود کے ہلکا پھلکا ہونے کا تجربہ ہوا تھا، اسی کی بنا پر یہ تقریباً قابل تفہیم بن گئی اور ٹھوس صورت، اختیار کر گئی تھی...



مانس میں موت کے تصور سے ہی اس کے پسینے چھوٹنے لگتے تھے۔ سے دومرتبہ اس اذیت ناک احساس۔ موت کی، اختتام کی دہشت کا۔ تجربہ ہو چکا تھا لیکن اب یہ خوف اس کے لیے معانی کھو چکا تھا۔ پہلی مرتبہ تب اسے اس کا احساس ہوا تھا جب گولا تو کی طرح اس کے سامنے کھوٹا تھا اور اس نے کھیت، جس کی فصل تازہ تازہ کٹی تھی، جھاڑیوں اور آسمان کی جانب دیکھا تھا اور وہ جان گیا تھا کہ وہ موت کے رد پر دکھڑا ہے۔ زخمی ہونے کے بعد جب وہ دوبارہ ہوش میں آیا تھا، چشم زدن میں اس کی روح کے اندر اندکی، بے تید محبت

کی کوئیل پھوٹ پڑی تھی اور اسے محسوس ہونے لگا تھا کہ وہ زندگی کے بندھنوں سے، جو زنجیر پائین جاسکتے ہیں، آزاد ہو گیا ہے۔ تب اسے موت کا خوف رہا تھا اور نہ خیال۔

زخمی ہونے کے بعد اس نے تنہائی، اذیت اور جزوی ہندیان کے جو محسوس کئے تھے، ان کے دوران میں اس نے، بدی محبت کے اصول کے بارے میں، جس کا اس پر نیا نیا انکشاف ہوا تھا، جتنا زیادہ گہرائی میں جا کر سوچا تھا، اتنا ہی زیادہ وہ وہ غیر شعوری طور پر زندگی کو تیار کرتا چلا گیا تھا۔ ہر شخص اور ہر شے سے محبت کرنے کی خاطر ہمیشہ اپنے آپ کو قربان کر دینے کا مطلب یہ نہیں تھا کہ صرف کسی خاص شخص سے محبت کی جائے یا صرف انسانی حیات کی خاطر زندہ رہا جائے۔ اور محبت کا یہ اصول جتن زیادہ اس کے دل و دماغ میں رچتا اور اس کے رگ و پے میں سرایت کرتا چلا گیا تھا، وہ اتنا ہی زیادہ زندگی سے قطع تعلق کرتا چلا گیا تھا اور اتنے ہی زیادہ مکمل انداز سے اس نے اس ہیبت ناک رکاوٹ کو، جو محبت کی عدم موجودگی میں زندگی اور موت کے، مابین سدا راہ بن کر کھڑی ہو جاتی ہے، تھیں نہیں کر دیا تھا۔ اس پہلے دور میں، جب کبھی اسے یہ یاد آیا کہ اسے مرنا ہوگا، اس نے اپنے آپ سے یہی کہا تھا: ”کیوں نہیں؟ بھلا اس سے بہتر بات اور کیا ہوگی؟“

لیکن میٹش جی میں وہ رات گزارنے کے بعد جب وہ نیم ہندیائی کیفیت میں اسے دیکھ چکا، جس کے تعلق اس کے دل میں یہ شدید تمنہ تھی کہ وہ اس کے سامنے آ جائے، محبت کے خاموش آنسو بہا چکا اور اس کا ہاتھ اپنے لبوں پر دبا چکا، ایک خاص عورت کے لیے محبت ایک بار پھر غیر محسوس طریقے سے اس کے دل میں سرایت کرنے اور زندگی کے ساتھ اس کا رشتہ دوبارہ جوڑنے لگی۔ اور مسرت بخش در پریشان کن خیالات سے ستانے لگے۔ اس نے وہ یاد کیا، جب اس نے ڈرینگ شیشن میں کوراگس کو دیکھا تھا، مگر تب اس کے دل میں جن احساسات نے مراغبا تھا، اب وہ انھیں اپنے اوپر جاری نہ کر سکا۔ اسے یہ سوال کہ ”آبادہ (کوراگن) زندہ ہے؟“ اذیت رہنے لگا لیکن وہ اس کے متعلق استفسار کرنے کا حوصلہ نہ دکھاسکا۔



اس کی حالات اپنا میعادِ جسمانی سفر پورا کرتی رہی۔ لیکن ناشائے نے جب یہ کہا تھا: ”یہ کیفیت اچانک ہوگی۔“ تو اس کا اشارہ جس کیفیت کی طرف تھا، وہ پرس مار یا کی آمد سے دو روز قبل ظہور پذیر ہوئی تھی۔ یہ ممات و حیات کے مابین آخری روحانی کشمکش تھی اور اس میں ممات فاتح قرار پائی تھی۔ اسے غیر متوقع طور پر پتا چلا کہ اس محبت کی بدلت ہو اسے ناشائے ہوئی ہے، زندگی اس کے لیے بیش بہا ہے اور انجانے غیر پہچانے آئندہ سے دو چار ہونے سے پہلے رہشت کی ایک آخری یلفا رہی، گواہی بخار جس نے بالآخر مات کھ جانا تھا۔

یہ کیفیت بوقتِ شام رونما ہوئی۔ ڈنر کے بعد اسے حسب معمول معمولی بخار ہو گیا تھا۔ اس کے خیالات میں کوئی الجھاؤ نہیں تھا اور وہ اتنے واضح تھے کہ قطر تاتے ہوئے نہیں۔ سوئی میز کے قریب بیٹھی تھی سدا اور تھیں رنگ

ایکا ایکی ہے پناہ مسرت کا احساس اس پر غالب آ گیا۔
 ”واہ، واہ، آگئی ہے!“

اور حقیقتاً سنا بھی بھی کمرے میں داخل ہوئی اور سونیا کی جگہ پر بیٹھی تھی۔

جب سے اس نے اس کی تیار داری شروع کی تھی، اسے ہمیشہ جلی طور پر اس کی موجودگی کی اسی طرح آگاہی ہوتی رہی تھی۔ وہ بازوؤں والی کرسی پر بیٹھی تھی، جو وہاں ترچھی پڑی تھی تاکہ موسم ہتی کی روشنی میں تک نہ پہنچ سکے اور زنانہ جراثیم بن رہی تھی۔ (ایک روز پرنس، اندر سے کے منہ سے نکل گیا تھا کہ کوئی شخص بھی اس بڑھی نرس کی طرح، جو مریض کے سر پر بیٹھی زنانہ جراثیم بن رہی تھی، تیار داری نہیں کر سکتا۔ جراثیم بننے کے عمل میں کوئی بات ضرور ہے کہ مریض کو بڑی تسکین ملتی ہے۔ چنانچہ اس کے بعد سنا سنا نے جراثیم بننا سیکھ لیا۔) سنیاں اس کی بتی پتلی اور مرمت سے حرکت کرتی انگلیوں میں کٹکنا رہی تھیں۔ اس کا مغموم و متفکر چہرہ، جو ایک طرف جھکا ہوا تھا، اسے واضح طور پر نظر آ رہا تھا۔ وہ اپنی جگہ سے ذرا سا ہلی، اور اون کا گونا گونا اس کی گود سے نیچے ٹھک گیا۔ وہ گھبرا گئی اور اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ اس نے اچھتی نگاہ اس پر ڈالی، موسم ہتی کے سامنے اپنے ہاتھ کا پردہ بنایا بھٹا، پچھلے اور پھر تیلے انداز سے نیچے تھکی، گولا ٹھایا اور دوبارہ پہلے کی طرح بیٹھ گئی۔

وہ حرکت کیے بغیر اس پر نگاہیں گاڑے رہا۔ اس نے دیکھا کہ نیچے جھکنے کے بعد وہ لمبی اور گہری سانس لینا چاہتی ہے لیکن اس نے ایسا کرنے سے احتراز برتا اور بڑے نظم و ضبط سے سانس لیتی رہی۔
 تروتسا خانقاہ میں انھوں نے ماضی کے بارے میں باتیں کی تھیں اور اس نے اسے بتایا تھا کہ اگر وہ زندہ رہا، وہ اپنے زخم کے لیے ہمیشہ خدا، دند کا شکر ادا کرتا رہے گا کیونکہ یہ زخم ہی تھا جس نے انھیں دوبارہ ملادیا تھا لیکن اس کے بعد انھوں نے پھر کبھی مستقبل کا ذکر نہ کیا۔

”کیا یہ ہو سکتا تھا... یا نہیں؟“ اس نے اس کی جانب دیکھتے اور آہنی سلاخیوں کی کٹ کٹ سننے سوچا۔
 ”تقدیر نے عجیب و غریب انداز سے ہمیں اسی لیے ملایا تھا کہ میں زندگی کو ہی خدا حافظ کہہ دوں؟ زندگی کی صداقت مجھ پر اسی لیے منکشف کی گئی ہے کہ مجھ پر یہ ظاہر کیا جاسکے کہ میں نے ساری زندگی بطلان میں گزاری ہے؟ میں دنیا کی کسی بھی چیز کی نسبت اس (سناشا) سے زیادہ پیار کرتا ہوں۔ اگر میں اس سے محبت کرتا ہوں، پھر مجھے کیا کرنا ہوگا؟“ اس نے اپنے آپ سے پوچھا اور غیر رادکی طور پر اس کی کراہ نکل گئی۔ یوں کراہنے کی عادت سے اپنے مصائب و آلام کے دور میں ہوئی تھی۔

اس کی آواز سن کر سناشا نے اپنی جراب نیچے رکھ دی اور اس کی طرف جھک گئی۔ جب اسے اچانک اس کی آنکھیں جھگڑائی دکھائی دیں، وہ ہولے ہولے اس کی طرف گئی اور اس کے اوپر خمیدہ ہو گئی۔

”آپ سو نہیں رہے؟“

”نہیں، میں تمہیں کافی دیر سے دیکھ رہا ہوں۔ میں نے تمہاری آنکھوں کی گہرائی میں موجودگی میں مجھے

جس قسم کی شیریں طمانیت جس روشنی... کا احساس ہوتا ہے، کسی اور کی موجودگی میں نہیں ہوتا۔ میں خوشی کے آخر
بہا سکتا ہوں۔“

نشا اس کے اور قریب ہو گئی۔ دُجدا اور مسرت سے اس کا چہرہ دمک رہا تھا۔

”نشا، میں تم سے حد سے زیادہ محبت کرتا ہوں۔ مجھے دنیا کی کسی اور شے سے اتنی محبت نہیں تھی کہ تم سے
ہے۔“

”اور میں...“ اور ایک سیکنڈ کے لیے اس نے اپنا منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ ”لیکن حد سے زیادہ کیوں؟“
اس نے پوچھا۔

”حد سے زیادہ کیوں؟ خیر، تمہارا اپنا کیا خیال ہے؟ تم اپنے دس میں، اپنے دل کی گہرائیوں میں کیا محسوس
کرتی ہو؟ کیا میں زندہ رہوں گا؟ تمہارا کیا خیال ہے؟“

”مجھے اس کا یقین ہے، یقین ہے“ نشا نے تقریباً چیختے اور پر جوش انداز سے اس کے دلوں ہاتھ پٹے
ہاتھوں میں پکڑتے ہوئے کہا۔

وہ چندے خاموش رہا۔

”یہ کتنی اچھی بات ہوگی؟“ اس نے اس کا ہاتھ پکڑا اور اس پر بوسہ ثبت کر دیا۔

نشا خوش بھی تھی اور مضطرب بھی۔ ایک دم اسے احساس ہوا کہ اس سے کچھ حاصل نہیں ہوگا، اسے سکوت
چاہیے۔

”لیکن آپ سوئے نہیں۔“ اس نے اپنی خوشی کو دباتے ہوئے کہا۔ ”سونے کی کوشش کریں، پلیز“
پرنس آندرے نے اس کا ہاتھ دمایا اور چھوڑ دیا۔ وہ موسمِ بہار کے پاس چلی گئی اور بالکل اسی طرح بیٹھ گئی جس
طرح وہ پہلے بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے دو مرتبہ مڑ کر اس کی جانب دیکھا اور دونوں مرتبہ اس کی جھمکائی آنکھیں جو
اسی پر مرکوز تھیں۔ اس نے تہیہ کر لیا کہ وہ اپنی جرب بنے گی اور اس سے پہلے ہرگز اس کی طرف نہیں دیکھے گی۔
اور اس کے بعد اس نے واقعی اپنی آنکھیں بند کر لیں اور وہ سو گیا۔ وہ بالکل تھوڑے سے کے لیے سوا اور
گھبرا کر جاگ گیا۔ اسے ٹھنڈے پسینے آرہے تھے۔

جب اس کی آنکھ لگی تھی، وہ ابھی تک اسی موضوع۔ حیات و ممات، لیکن زیادہ تر ممات کے بارے میں
سوچ رہا تھا، جس میں اس کا دماغ ہمیشہ الجھا رہتا تھا۔ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ وہ اس کے قریب تر پہنچ گیا ہے۔
”محبت؟ محبت کیا ہے؟“ اس نے سوچا۔ ”محبت موت کے راستے میں رکاوٹ بن جاتی ہے۔ محبت زندگی
ہے، وہ سب کچھ، وہ ہر چیز، جو میں سمجھ سکا ہوں، محض اس لیے سمجھ سکا ہوں کیونکہ میں محبت کرتا ہوں۔ ہر وہ چیز جو
موجود ہے، اس لیے موجود ہے کیونکہ میں محبت کرتا ہوں۔ سب کچھ صرف محبت سے منسلک ہے۔ محبت خدا ہے اور
اگر میں مر جاتا ہوں، اس کا مطلب یہ ہوگا کہ میں۔ محبت کا ایک ذرہ۔ ہمہ گیر اور ابدی سرچشمے کی طرف لوٹ

جاؤں گا۔“

یہ خیالات اسے تسکین بخش معلوم ہوئے۔ لیکن یہ محض خیالات تھے۔ ان میں کسی چیز کا فقدان تھا۔ وہ ضرورت سے زیادہ ایک طرف اور ذاتی ضرورت سے زیادہ تجریدی اور پراگندہ تھے۔ اور وہ اسی سابقہ اضطراب اور ابہام کا شکار ہو گیا۔ اسے نیند آگئی۔

اس نے خواب میں دیکھا کہ وہ فی الواقع جس کمرے میں تھا، اسی میں بیٹا ہوا ہے، لیکن وہ زخمی نہیں ہوا بلکہ صحیح سلامت ہے۔ لہذا وہ لوگ، حقیر اور غیر اہم لوگ، اس کے سامنے نمودار ہوتے ہیں۔ وہ ان کے ساتھ بائیں کرتا ہے، کسی معمولی مسئلے پر ان سے بحث کرتا ہے۔ وہ وہاں سے کسی اور جگہ جانے کے لیے پرتل رہے ہیں۔ پرنس آندرے کو مبہم طور پر اندازہ ہوتا ہے کہ یہ سب کچھ بے وقعت اور غیر اہم ہے، اسے ان سے کہیں زیادہ وقیع اور اہم مسائل درپیش ہیں۔ لیکن وہ باتیں کرتا رہتا ہے اور سطحی، کھوکھلی ہڈی لہجے سے انھیں حیران پریشان کر دیتا ہے۔ یہ تمام لوگ بتدریج، غیر محسوس انداز سے غائب ہونا شروع ہو جاتے ہیں اور ان کی جگہ واحد مسئلہ۔ بند دروازہ۔ لے لیتا ہے۔ وہ اٹھ کھڑا ہوتا ہے اور دروازے کی چٹنی چڑھانے اور اس پر تالا لگانے کے لیے اس کی طرف بڑھتا ہے۔ ہر چیز کا انحصار اس بات پر ہے کہ وہ وقت پر تالا لگانے میں کامیاب ہوتا ہے یا نہیں۔ وہ چل پڑتا ہے، تیز تیز قدم اٹھانے کی کوشش کرتا ہے لیکن اس کی ٹانگیں جواب دے جاتی ہیں، وہ حرکت نہیں کرتیں اور اگرچہ اسے معلوم ہے کہ وہ دروازہ بند کرنے کے لیے وقت پر نہیں پہنچ سکے گا، وہ دیوانہ وار اپنی ساری توانائیاں بروئے کار لاتا ہے۔ اذیت ناک خوف اسے اپنی گرفت میں لے لیتا ہے، وہ یہ خوف موت کا خوف ہے۔ یہ دروازے کی اوٹ میں کھڑی ہے۔ جب وہ بے کسی کے عالم میں اور بے ہنگم انداز سے دروازے کی جانب رینگ رہا تھا، اس منوں چیز نے اس سے پہلے ہی دروازے کے خلاف زور آزمائی شروع کر دی تھی اور زبردستی اندر داخل ہونے کی کوشش کر رہی تھی۔ کوئی غیر انسانی چیز۔ موت۔ ہزار اندر داخل ہو رہی ہے، اسے لازماً روکا جانا چاہیے۔ وہ دروازہ پکڑ لیتا ہے اپنا پورا زور لگا دیتا ہے تاکہ اسے کھلنے سے روک سکے۔ اب اسے تالا لگانا ممکن نہیں رہا۔ لیکن اس کی کارشیں کمزور دلتا تو اسے اور بے اثر ہیں اور وہ دہشت، گھبراہٹ اور ہراس سے دروازے کو اتنی قوت سے دھکیلتی ہے کہ وہ کھل جاتا ہے اور دوبارہ بند ہو جاتا ہے۔

وہ ایک بار پھر اسے باہر سے دھکا دیتی ہے۔ وہ آخری بار کوشش کرتا ہے، فوق البشر انداز سے زور لگاتا ہے لیکن اس کی تمام سعی بے کار ثابت ہوتی ہیں۔ دروازے کے دونوں پٹ چرچے اے بغیر کھل جاتے ہیں۔ وہ اندر داخل ہو جاتی ہے۔ یہ موت ہے اور پرنس آندرے کی موت واقع ہو جاتی ہے۔

لیکن میں اس لمحے جب اس کی موت واقع ہوئی، پرنس آندرے کو یاد آیا کہ وہ تو سویا ہوا تھا اور میں اس لمحے جب اس کی موت واقع ہوئی، اس نے زور لگایا اور وہ بیدار ہو گیا۔

”ہاں، وہ موت تھی۔ میری موت واقع ہو گئی تھی۔ اور میں بیدار ہو گیا۔ ہاں، موت بیدار کی ہے!“

دراپکا ایک ہی اس کی روح روشنی میں سیرب ہو گئی اور وہ نقاب جو اس کے اور غائب کے مابین حائل تھا، اس کی روحانی بصیرت کے سامنے سے ہٹا لیا گیا۔ اسے محسوس ہوا کہ وہ قوتیں جو اس کے اندر محسوس تھیں، آواز ہو گئی ہیں اور تب سے اس عجیب و غریب ہلکے پھلکے پن نے، جو وہ اپنے اندر محسوس کر رہا تھا، دوبارہ اس کا ساتھ نہ چھوڑا۔ جب ٹھنڈے پسینے میں نہاتے وہ بیدار ہوا اور اس نے دیوان پر جنبش کی، مٹا شا اس کے قریب آئی اور پوچھنے لگی: ”کیا بات ہے؟“ اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ کچھ نہ سمجھ سکا، بس عجیب انداز سے اسے دیکھ رہا۔ یہ تھا جو پرنس ماریا کی آمد سے دو روز قبل پیش آیا تھا۔ جیسا کہ ڈاکٹر کا کہنا تھا اس دن سے بخار، جو اس کے جسم کو گھلا رہا تھا، بے قابو ہو گیا اور اس نے مہلک صورت اختیار کر لی۔ تاہم ڈاکٹر جو کچھ کہتا تھا، مٹا شا کو اس میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اسے محض ہولناک نفسیاتی علامتیں نظر آ رہی تھیں اور اس کے نزدیک وہ کہیں زیادہ قابل اعتبار نہیں۔ اس روز نیند سے بیداری پرنس آندرے کے لیے زندگی سے بیداری کا آغاز ثابت ہوئی۔ روحانی مدت زندگی کی تھی اس کے تناسب سے یہ بیداری اسے کچھ زیادہ طویل محسوس نہ ہوئی بلکہ کہنا چاہیے کہ بس اتنی ہی طویل تھی جتنی خواب دیکھنے میں گزری مدت کے مقابلے میں نیند سے بیداری معصوم ہوئی تھی۔



اس نسبتاً سست رو بیداری میں کوئی چیز نہ ہولناک تھی اور نہ پر تشدد۔

اس کے آخری ایام اور گھڑیاں سیدھے سادے عام انداز سے گزر گئیں۔ پرنس ماریا اور مٹا شا، جو ہر دم اس کی پیٹی کے ساتھ جڑی رہتی تھیں، دونوں کو یہی گمان گزرا۔ وہ نہ روئیں اور نہ ان پر کبھی طاری ہوئی۔ اور بالآخر ان خود انھیں محسوس ہونے لگا کہ وہ اس کی نہیں (اب وہ کہاں تھا، وہ تو کہیں اور جا چکا تھا) بلکہ اس کی قریب تر کیا با۔ اس کے جسم کی خدمت کر رہی ہیں۔ اس چیز کا ان دونوں کو اتنی شدت سے شعور تھا کہ وہ موت کے خارجی اور ہیبت ناک پہلو سے متاثر نہ ہوئیں اور انھیں اپنے غم میں مزید گھٹنے کی ضرورت محسوس نہ ہوئی۔ وہ نہ اس کی موجودگی میں اور نہ اس سے پرے روتی تھیں اور نہ اس کے متعلق آپس میں کوئی بات کرتی تھیں۔ انھیں محسوس ہو رہا تھا کہ جو کچھ وہ سمجھ پاتی ہیں، اسے الفاظ میں بیان کرنا ناممکن ہے۔

اس سے (گناہوں کا) اعتراف کرایا گیا اور اسے پاک روٹی کھلائی گئی۔ ہر شخص سے وداع کرنے آیا۔ جب اس کے بیٹے کو اس کے پاس لایا گیا، اس نے اپنے لب اس کے لبوں پر چپ کر دیے اور پھر اپنا منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ اس نے یہ اس لیے نہیں کیا کیونکہ اسے دکھ ہو رہا تھا یا ترس آرہا تھا (پرنس ماریا اور مٹا شا اس کا معلوم سمجھ گئیں)، بلکہ محض اس لیے کیونکہ اس کا خیال تھا کہ اس سے جو توقع کی گئی تھی، وہ اس نے پوری کر دی ہے۔ لیکن جب اس سے کہا گیا کہ وہ بچے کے سر پر ہاتھ پھرے اور اس کے حق میں دعائے خیر کرے، اس نے وہی کیا جو اس سے کہا گیا تھا۔ اس کے بعد اس نے اپنے گرد پیش یوں دیکھا جیسے پوچھ رہا ہو کہ اس کے کرنے کا کوئی کام رہا تو نہیں گیا۔

جب اس پر جان کنی کی کیفیت طاری ہوئی اور اس کی روح نے نفس حضری سے پرواز کی، پرنس ماریا اور نائشا دونوں وہاں موجود تھیں۔

جب نفس کو بے حس و حرکت پڑے اور ان کی آنکھوں کے سامنے ٹھنڈے ہوتے کچھ دیر بیت گئی، پرنس ماریا نے پوچھا: ”قصہ ختم ہو گیا؟“

نائشا اس کے قریب گئی، اس نے میت کی آنکھوں میں جھانک کر دیکھا اور پھرتی سے انھیں بند کر دیا۔ اس نے انھیں بند تو کر دیا لیکن انھیں چوما نہیں، بلکہ وہ اس چیز۔ اس کے جسم۔ کے ساتھ چٹ گئی جو اسے سب سے زیادہ اس کی یاد دلاتی تھی۔

”وہ کہاں چلے گئے ہیں؟ وہ اب کہاں ہیں؟...“



جب میت جسے نہایا اور کفن پہنچایا جا چکا تھا، میز پر تالوت میں پڑی تھی ہر شخص اسے وداع کرنے آیا۔ وہ بھی رو رہے تھے۔

کوشکا اس لیے رو رہا تھا کیونکہ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا اور اسی وجہ سے اس کا دل پھٹنی ہو رہا تھا۔ کاؤنٹس اور سونیا اس لیے آنسو بہا رہی تھیں کیونکہ انھیں نائشا پر ترس آ رہا تھا اور کیونکہ اس کا وجود پائی نہیں رہا تھا۔ رہا کاؤنٹ، اسے اس لیے رونا آ رہا تھا کیونکہ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ اس کا اپنا انجام قریب آ گیا ہے اور بہت جلد اسے بھی اسی ہیبت ناک راستے پر چلنا ہوگا۔

نائشا اور پرنس ماریا بھی رو رہی تھیں لیکن وہ اس لیے نہیں رو رہی تھیں کہ انھیں ذاتی طور پر کوئی دکھ پہنچا تھا۔ وہ اس لیے رو رہی تھیں کہ موت کے اس سادہ اور باوقار اسرار کے سبب، جو ان کے رو پر ظہور ہو تھا، ان کی روحوں پر جذباتی پہچان اور ہیبت طاری ہو گئی تھی۔

انسان کسی بھی واقعے کی تمام وجوہ کا ادراک نہیں کر سکتا لیکن توجوہ کی تہہ تک پہنچنے کی خواہش اس کی روح میں فطریاً موجود ہوتی ہے۔ جو واقعہ بھی پیش آتا ہے اس کے پیچھے متعدد اور پیچیدہ حالات کارفرما ہوتے ہیں۔ ان حالات کو اگر ایک دوسرے سے الگ الگ کر دیکھا جائے، تو ان میں سے ہر ایک اس واقعے کی وجہ معلوم ہونے لگتا ہے۔ چنانچہ عقل انسانی حالات کے تعدد اور پیچیدگیوں کی تحقیق کیے بغیر وجہ سے مشابہ جو ظن و تخمین سب سے پہلے اس کے سامنے آتا ہے، اسے جھپٹ لیتی ہے اور فتویٰ صادر کر دیتی ہے کہ ”بس وجہ یہی ہے۔“

تاریخی واقعات کے سلسلے میں جو (جن میں انسانوں کے فعال مشاہدے کا موضوع بنتے ہیں) قدر کم تر بن ظن و تخمین لگایا گیا، وہ یہ تھا کہ یہ دیوتاؤں کی مرضی تھی۔ بعد میں یہ ان اشخاص کی، جو واقعات میں سب سے نمایاں ہوتے ہیں اور جنہیں تاریخ کے ہیرو قرار دیا جاتا ہے، مرضی بن گئی۔ لیکن اگر ہم کسی بھی تاریخی واقعے کی سطح کے نیچے جھانک کر دیکھیں، اور اس سارے جم غفیر کے افعال کو اپنی مرضی کے تابع بنانا تو کجا، تاریخی ہیرو خود اس کی مرضی کے تابع ہو جاتا ہے۔ ممکن ہے کہ آپ کا خیال یہ ہو کہ تاریخی واقعات کی تشریح اس انداز سے کی جائے یا اس سے، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ لیکن اس شخص کے، جو یہ کہتا ہے کہ مغربی اقوام نے مشرق کی سمت اس لیے کوچ کیا کیونکہ نیولین یہ چاہتا تھا اور اس شخص کے، جو یہ کہتا ہے کہ یہ اس لیے ہوا کیونکہ ایسا ہونا ہی تھا، مابین ان فرق عظیم پایا جاتا ہے جو ان اشخاص کے، جو یہ کہتے ہیں کہ زمین ساکن ہے اور سیارے اس کے گرد گھومتے ہیں اور ان اشخاص کے، جو یہ کہتے ہیں کہ ”ہمیں یہ تو معلوم نہیں کہ کسی چیز نے زمین کو اپنی جگہ تمام رکھا ہے۔ لیکن ہمیں یہ ضرور معلوم ہے کہ زمین اور دیگر سیاروں کی حرکت معین کرنے کے قوانین موجود ہیں،“ مابین پایا جاتا ہے۔ تمام وجوہات میں سے ایک وجہ کے سوا کسی تاریخی واقعے کی نہ کوئی وجہ ہوتی ہے اور نہ ہو سکتی ہے۔ لیکن واقعات کو جو قوانین متعین کرتے ہیں،“ لازماً موجود ہوتے ہیں۔ ان میں سے بعض قوانین کی بابت ہم بالکل لاعلم ہیں اور بعض کے سلسلے میں ہمارے اندازوں کی مار رہے ہیں۔ ان قوانین کا انکشاف صرف تبھی ممکن ہوگا جب ہم بالآخر کسی شخص کی مرضی میں وجہ دریافت کرنے کی کوشش ترک کر دیں گے، بالکل اسی طرح جس طرح سیاروں کی حرکت کے قوانین کی دریافت تبھی ممکن ہوئی جب

انسان اس تصور سے، کہ زمین ساکن ہے، دست بردار ہوا۔



مورخین کے مطابق بارودینو کی لڑائی، ہاسکو پر دشمن کے قبضے اور اس کی آگ سے تباہی کے بعد 1812 کی جنگ کا اہم ترین و قدریہ ازاں سے کالوگا شاہراہ اور وہاں سے تاروتینو کمپنک روڈی فوج کی نقل و حرکت تھی۔ اس نقل و حرکت کو دریائے کراسنایا پکھرا کے پار "فلینک مارچ" کے گمراہ کن نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ مورخین عبقریت کے اس کارنامے کا سہرا مختلف کمانڈروں کے سر باندھتے ہیں اور صحیح معنوں میں اس سہرے کا مستحق کون ہے، اس بارے میں ان میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ غیر ملکی مورخین بھی۔ بلکہ فرانسیسی مورخین بھی۔ جب اس فلینک مارچ کا ذکر کرتے ہیں تو روڈی کمانڈروں کی عبقریت کا اعتراف کرتے ہیں تاہم یہ سمجھنا انتہائی دشوار ہے کہ مسکری مصنفین اور ان کی دیکھ ریکھی دوسرے لوگ بھی، اس مخصوص فلینک مارچ کو، جس نے روڈی کو بچا یا اور پولین کا بیزا فرق کیا، کسی فرد واحد کے فکر عمیق کا نتیجہ قرار دینے پر کیوں مصر ہیں۔

اول یہ سمجھنا ہی مشکل ہے کہ اس فلینک مارچ میں عبقریت در بصیرت کا دخل ہی کیا ہے کیونکہ یہ تفہیم کرنے کے لیے جب فوج عملوں کا نشانہ بن رہی ہو، تو اس کے لیے بہترین صورت یہ ہے کہ وہاں چلی جائے جہاں رسد کی فراوانی ہو، کسی خاص ذہنی کاوش کی ضرورت نہیں ہے، اور ایک تیرہ سالہ کنڈوزین جھوکر بھی یہ قیاس آرائی کر سکتا ہے کہ جب 1812 میں فوج نے ہاسکو سے پسپائی اختیار کی، اس کے لیے بہترین صورت یہی ہو سکتی تھی کہ وہ کالوگا روڈ چلی جاتی۔ چنانچہ اول تو یہ سمجھنا ہی ناممکن ہے کہ مورخین نے منطق کے کس اصول کے تحت یہ نتیجہ اخذ کر لیا کہ یہ چار گہری دانش مندی کی حامل تھی۔ دوم، یہ سمجھنا تو اور بھی دشوار ہے کہ وہ روڈی کی نجات اور فرانسیسیوں کے زوال کو اس چال سے کیونکر منسوب کرتے ہیں، کیونکہ اگر اس چال سے پیشتر، اس کے رو بہ عمل آنے کے دوران میں یا اس کے بعد دیگر واقعات پیش آئے ہوتے تو یہ (چال) روڈیوں کے لیے جاہ کن اور فرانسیسیوں کے لیے سودمند ثابت ہو سکتی تھی۔ اگر روڈیوں کی حالت واقعی اس مارچ کے ساتھ ہی بہتر ہونا شروع ہو گئی تھی، تو اس سے کسی طرح بھی یہ ثابت نہیں ہوتا کہ یہ مارچ ہی اس بہتری کا سبب تھا۔

دوسری قسم کے حادثات میں یہ مارچ راسی فوج کو کسی قسم کا فائدہ پہنچانے میں ناکام ہی نہ رہتا بلکہ انہماک کی تباہی کا سبب بن جاتا۔ اگر ہاسکو جل کر خاکستر نہ ہوتا، پھر کیا ہوتا؟ اگر موغاروڈیوں کا نشانہ راہ نہ کھوتا؟ اگر نپولین ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھتا پھر؟ اگر جیسا کہ بے شک سین اور بارکلی ڈتوں نے مشورہ دیا تھا، روڈی فوج کراسنایا پکھرا کے کنارے لڑائی کے لیے صف آرا ہو جاتی تو؟ اگر فرانسیسی، جب روڈی پکھرا ندی کی دوسری جانب کوچ کر رہے تھے، حملہ کر دیتے پھر؟ نپولین نے جس توانائی کا مظاہرہ سولنسک میں کیا تھا، اگر بعد ازاں تاروتینو پہنچنے پر وہ اس کے دوسروں جیسے سے بھی حملہ کر دیتا، پھر؟ اگر فرانسیسی پیٹرز برگ پر چڑھائی کر دیتے، پھر؟۔۔۔ اگر ان میں سے

کوئی بھی امکانی صورت پیش آجاتی تو وہی فینک مارچ، جو نجات کا سبب بنا، تباہی کا موجب بن سکتا تھا۔
تیسرا اور مشکل ترین نکتہ یہ ہے کہ تاریخ کے طالب علم جات بوجھ کر یہ سمجھنے سے پہلو تکی کرتے ہیں کہ اس فلک
کوچ کو کسی شخص واحد سے منسوب نہیں کیا جاسکتا، کسی نے اس کا پیشگی اندازہ نہیں لگایا تھا اور فلکی سست پہل کی
طرح یہ اپنی کامل صورت میں کسی کو سمجھائی نہیں دیا تھا بلکہ۔۔۔ لختہ بہ لختہ، قدم بہ قدم، واقعہ بہ واقعہ۔۔۔ انتہائی مختلف
انواع کے بے شمار واقعات کے نتیجے کے طور پر ظہور پذیر ہوا اور اپنی کامل صورت میں صرف اسی وقت نظر آیا جب
اس کی تکمیل ہو چکی تھی اور یہ ماضی کا حصہ بن چکا تھا۔

فلی میں جو کونسل منعقد ہوئی تھی، اس میں تمام کمانڈروں کے اذہان میں صرف یہی خیال سما رہا تھا کہ پہلا
کے لیے بالکل سیدھا راستہ (یعنی تشرنی روڈ) اختیار کیا جائے۔ اس کے ثبوت میں یہ شہادت موجود ہے کہ کونسل کی
اکثریت نے اس کے حق میں ووٹ دیا تھا، وراس سے بھی اہم بات یہ ہے کہ کونسل کے اجلاس کے بعد کمانڈر انچیف اور
شعبہ رسد کے انچارج لانسکوائے کے مابین جو گفتگو ہوئی تھی، وہ بچے بچے کو معلوم ہے۔ لانسکوائے نے کہا، ڈرائیفر
کو مطلع کیا تھا کہ فوجی رسد زیادہ تر تولا اور ریازان کے صوبوں میں دریائے اوکا کے کنارے مختلف مقامات پر جمع
کی گئی ہے اور اگر فوج نے تشرنی روڈ کے ساتھ ساتھ پہلا اختیار کی تو دریائے اوکا، جس کا پٹ بہت چوڑا ہے، اسے
اپنی رسد سے الگ تھلگ کر دے گا کیونکہ سردیوں کا آغاز ہو جانے کے بعد اس دریا کو عبور نہیں کیا جاسکتا۔ پہلی
کے لیے جو راستہ۔۔۔ تشرنی روڈ۔۔۔ بتدا منتخب کیا گیا تھا، وہ بالکل فطری معلوم ہوتا تھا۔ اس سے گریز کرے کی بڑی
ضرورت پیش آئی، یہ اس کی پہلی علامت ہے۔ فوج ریازان روڈ کے اڑوس پڑوس، زیادہ تر جنوب اور اپنی رسد کے
مقامات کے قریب تر کوچ کرتی رہی لہذا ان فرانسیسیوں کی بے غمی (انہیں یہ معلوم ہی نہ ہو سکا کہ درمی فوج
کہاں چلی گئی ہے)، تولا کے اسلحہ ساز کارخانوں کے دفاع کے متعلق تشویش و رعب سے بڑھ کر اپنی رسد کے
مقامات کے قریب رہنے کے فوائد نے فوج کو مزید جنوب کی طرف جانے پر مجبور کر دیا اور وہ تولا روڈ پر چل پڑی۔
جب مجبوری کے کوچ نے فوج کو پاکھرانڈی کے پار تولا روڈ پر ڈال دیا، ردی کمانڈروں نے قصبہ پوولسک میں
قیام کرنے کا ارادہ کر لیا۔ اس وقت ناروتنیو میں پوزیشن سنبھالنے کا خیال بھی ان کے ذہان میں نہیں آیا تھا۔ تاہم
لا تعداد واقعات نے جن میں فرانسیسی سپاہ کا، جوازیس عید شتر ردی فوج سے ٹکڑ چکی تھی، از سر نو منظر عام پر آنا، سرے
کے لیے صف آرائی کے منصوبوں کا بنایا جانا اور سب سے بڑھ کر صوبہ کا لوگا میں رسد کا بہتات سے مہیا ہونا، مثال
تھے، ہماری فوج کو مجبور کر دیا کہ وہ پہلے سے بھی زیادہ جنوب کی طرف چلی جائے، تولا روڈ عبور کرے، کا لوگا روڈ
پہنچے اور وہاں سے ناروتنیو کا رخ کرے۔ (ناروتنیو ان سرکوں کے، جن کے ساتھ ساتھ رسد کے ڈپو قائم تھے، مابین
واقع تھا۔) جس طرح صحیح صحیح یہ جانا مشکل ہے کہ ماسکو سے دست برداری اختیار کرنے کا فیصلہ کب ہوا یا کس نے کیا
تھا، اسی طرح یہ دھڑی کرنا بھی کہ ناروتنیو جانے کا فیصلہ کب ہوا یا کس نے کیا، ناممکن ہے۔ لا تعداد مختلف عناصر کے
منہ سے شہود پر آنے کے بعد ہی، جب فوج وہاں پہنچ گئی، لوگوں نے اپنے آپ کو یہ یقین دلانا شروع کیا کہ یہی داچر

ہے جس کی انھیں خواہش تھی اور جس کی انھوں نے پیش بینی کر لی تھی۔

2

مشہور سینگ مارچ صرف اس چیز پر مشتمل تھا۔ ردی فوج، جو عہد آوروں سے بچنے کے لیے سیدھے سرخ پپ ہو رہی تھی، جو فرانسسی سپاہ کی پیش قدمی رکھی، اپنے اصل اور سیدھے راستے سے ہٹ گئی اور جب اسے معلوم ہوا کہ اس کا تعاقب نہیں ہو رہا، وہ نظر ثانی اس علاقے کی طرف، جہاں رسد وافر مقدار میں دستیاب تھی، کھینچی چلی گئی۔

اگر ہم یہ تصور کرنے کے بجائے کہ ردی فوج کی قیادت ناٹو روزگار کمانڈروں کے ہاتھوں میں تھی، صرف ایک ایسی فوج کا، جس کا کوئی قائد نہیں تھا، نقشہ ذہن میں جمائیں، پھر یہ سوچیں کہ اس فوج نے کیا کیا ہوتا۔ یہ فوج صرف اتنا کرتی کہ وہ اس خطے میں، جہاں رسد فراوان مقدار میں دستیاب تھی اور جو ملک کا زرخیز زمیں اور خوشحال تریں علاقہ تھا، نیم دائرہ بناتی واپس ماسکو کی طرف چل پڑتی۔

نرتنی روڈ سے ریازان، تولا اور کالوگا شاہراہوں کی جانب یہ نقل و حرکت اتنی فطری تھی کہ ردی فوج کا ساتھ چھوڑنے اور لوٹ مار کرنے والے بھی اسی سمت میں بھاگنے لگے اور دارالسلطنت پیٹرز برگ کے حکام نے بھی کوٹوروف سے یہی راستہ منتخب کرنے کا مطالبہ کیا۔ تاروتینو بچنے پر کوٹوروف کو زار کا مراسلہ ملا۔ اس میں اسے ایک طرح کی جھاڑ پلائی گئی تھی کہ وہ فوج کو ریازان روڈ کیوں لے گیا تھا اور اسے کالوگا روڈ کے با متقابل عین اس مقام پر، جہاں وہ زار کا خط پہنچنے سے پہلے ہی پڑاؤ ڈال چکا تھا، قبضہ کرنے کا حکم دیا گیا تھا۔

بارودینو کی لڑائی اور ہم نے مجموعی طور پر ردی فوج کو جس سمت میں پسپا ہونے پر مجبور کر دیا تھا، وہ اس جانب بھاگتی رہی۔ جب خطرہ ٹل گیا اور بھاگنے کی ضرورت ختم ہو گئی کیونکہ اب اس کا تعاقب نہیں ہو رہا تھا، فوج نے وہ پوزیشن، جو (ان حالات میں) اس کے لیے فطری تھی، اختیار کر لی۔

کوٹوروف کا وصف، جیسا کہ کہا جاتا ہے، یہ نہیں تھا کہ اس نے عبقریت کی حامل حربی چال چلی تھی بلکہ اس کا کمال یہ تھا کہ وہ واحد شخص تھا جس نے جو کچھ توقع پذیر ہو چکا تھا، اس کی محنویت سمجھ لی تھی۔ وہ واحد آدمی تھا جس نے ان ایام میں فرانسسی فوج کی عدم مشغولیت کا صحیح مفہوم اخذ کیا۔ وہ واحد شخص تھا جو یہ دعویٰ کرتا رہا کہ بارودینو کی لڑائی میں روسیوں کو فتح حاصل ہوئی تھی۔ صرف وہی۔ کمانڈر انچیف کی حیثیت سے اس سے یہ توقع کی جاسکتی تھی کہ وہ جارحانہ کارروائیوں کی حمایت کرے گا۔ ایک آدمی تھا جس نے ردی فوج کو بے سود جھڑپوں میں الجھنے سے روکنے کے لیے وہ سب کچھ کیا جو اس کے بس میں تھا۔

بارودینو میں جو درندہ زخمی ہوا تھا، وہیں پڑا تھا جہاں راہ فرار اختیار کرنے والے شکاری نے اسے چھوڑا تھا، مگر آیا وہ ابھی تک زندہ اور توانا تھا یا محض مکرر کر رہا تھا، شکاری کو اس کا کوئی علم نہ ہو سکا۔ ایسا کیسی اس درندے کی کراہیں سنائی دے لگیں۔

رُخی درمے (فرانسیسی فوج) کے کراہنے اور اس کی حالت کے تشویش ناک صورت اختیار کر جانے کا اندازہ اس بات سے ہوا کہ اس نے صلح کے لیے سلسلہ جہانی کا آغاز کیا اور اس ضمن میں لوہسٹوں کو تباہ و برباد کر کوٹوزوف کے پڑاؤ میں بھیج دیا۔

پولین نے اپنی معمول کی خود اعتمادی کے ساتھ، کہ جو کچھ وہ سوچتا ہے درست ہوتا ہے، کوٹوزوف کو جواب میں لفظ اس کے ذہن میں آئے، تحریر کر دیے حالانکہ وہ بالکل بے معنی تھے۔

موسیولی پرنس کوٹوزوف (اس نے تحریر کیا) میں آپ کے ساتھ باہمی ریسی کے مختلف مسائل کے بارے میں تبادلہ خیالات کرنے کے لیے اپنا ایک ایجوٹنٹ جنرل بھیج رہا ہوں۔ پور ہائیٹس سے میری التجا ہے کہ یہ آپ سے جو کچھ عرض کرے، خاص طور پر جب یہ آپ کے ادب و احترام کے بارے میں، جو آپ کے بے پیرے دس میں کافی عرصے سے موجود رہا ہے، جن خیالات و جذبات کا اظہار کرے، آپ اس کا اعتبار کریں۔ چونکہ اس خط کا اور کوئی مقصد نہیں ہے، چنانچہ، موسیولی پرنس کوٹوزوف، میں خداوند سے دعا گو ہوں کہ وہ آپ کو اپنے مقدس اور کریمانہ حفظ و امان میں رکھے۔

پولین۔

ماسکو، 30 اکتوبر 1812

کوٹوزوف نے جواب دیا

اگر میرے متعلق کسی کے دل میں یہ خیال بھی آگیا کہ میں نے اس قسم کا سمجھنا کرنے کی پائل کی تھی، ہمارے اخلاف مجھ پر ہمیشہ سخت نیچے رہیں گے میری قوم کا جذبہ اس وقت یہی ہے۔

تاہم اپنی سپاہ کو غنیمت پر حملہ کرنے سے روکنے کے لیے وہ اپنے تمام اختیار رات بروتے کا رہنما رہا۔ اس مہینے نے، جو فرانسیسیوں نے ماسکو میں لوٹ مار کرنے میں اور روسیوں نے تار و تار میں پڑاؤ ڈال کر خاموش پڑے رہنے میں گزارا، دونوں فوجوں کی اضافی قوت (جذبے اور تعداد دونوں اعتبار سے) میں تہریل پیدا کر دی، اور اس کے نتیجے کے طور پر روسی سپاہ کی برتری واضح ہو گئی۔

اگرچہ روسیوں کو فرانسیسیوں کی حالت اور تعداد کے متعلق کوئی معلومات حاصل نہیں تھیں، جنہی یہ تبدیلی رونما ہوئی، لا تعداد علامتوں نے حملہ کرنے کی ضرورت اجاگر کر دی۔ علامت یہ تھیں، لوہسٹوں کا امن مشن، تار و تار میں دوسرے

کی فردانی فرانسیسیوں کی عدم مشغولیت، دربدنگی کے بارے میں اطلاعات (جو چاروں طرف سے موصول ہو رہی تھیں) ہمارے دستوں کی نفری میں روز بروز اضافہ خوشگوار موسم: طویل آرام (جس سے روکی جوان لطف اندوز ہو چکے تھے اور اس کا نتیجہ یہ نکلا تھا کہ جس کام کے لیے انھیں بھرتی کیا گیا تھا، وہ اسے سرانجام دینے کے لیے بے صبر ہو رہے تھے)۔ یہ جاننے کا تجسس کہ فرانسیسی فوج میں، جیسے تھے عرصے سے دیکھا نہیں گیا تھا، کیا ہو رہا ہے، ہماری بیرونی چوکیوں کی جرأت و دلیری (اس کا مظاہرہ فرانسیسیوں کے بالکل قریب رکھی کر کے کیا جا رہا تھا)، فرانسیسیوں پر کسانوں اور گوریلا دستوں کی آسان فتوحات (ان کی وجہ سے دوسروں میں رشک و حسد کے جذبات ابھر رہے تھے)، انتقام کی خواہش (جب تک فرانسیسی ماسکو میں مقیم رہے، یہ تمام روکی قلوب میں بھڑکتی رہی) اور سب سے بڑھ کر یہ دھندہ شعور کہ فوجوں کی اضافی قوت تبدیل ہو چکی ہے اور اب ندریں ہمارے ہاتھ میں آ چکی ہیں (یہ شعور ہر فوجی جوان کے ذہن میں نمودار ہوا تھا)۔ یوں مخالف افواج کی اضافی قوت میں انھوں تبدیلی آ چکی تھی اور پیش قدمی ناگزیر ہو گئی تھی۔ جس طرح جب منٹ کی سوئی پورے دائرہ کا سفر مکمل کر لیتی ہے، گھنٹہ نشانے لگتا ہے، بعینہ ان علامتوں نے تبدیلی کا گہر بجا شروع کر دیا تھا۔ اس تبدیلی کا عکس اور نچے حلقوں کی مصروفیات، باتوں اور شکایتوں میں نظر آنے لگا تھا۔

3

روکی فوجوں کی کمین کو تو زوف اور اس کے شاخ کے ہاتھوں میں تھی اور ادھر پیٹرز برگ سے امپراطور اپنے احکام ارسال کرتا رہتا تھا۔ اتر اکب ماسکو کی خبر پیٹرز برگ پہنچنے سے پہلے ہی پوری مہم کا تفصیلی منصوبہ بنایا اور کو تو زوف کو اس کی رہنمائی کے لیے بھیجا جا چکا تھا۔ اگرچہ یہ منصوبہ اس مفروضے پر ترتیب دیا گیا تھا کہ ماسکو ابھی تک ہمارے قبضے میں ہے، (کو تو زوف کے) شاخ نے اس پر صدمہ دیکر وہ اسے لائحہ عمل کے طور پر قبول کر لیا۔ البتہ کو تو زوف نے صرف یہ تبصرہ کیا کہ جو منصوبہ دور بیٹھ کر بنائے جائیں، انھیں عملی جامہ پہنانا مشکل ہوتا ہے۔ چنانچہ ان مشکلات کو، جن کے پیش آنے کا احتمال ہو سکتا تھا، دور کرنے کے لیے اسے تازہ ہدایات ارسال کر دی گئیں۔ اسی پر اکتفا نہ کیا بلکہ مزید عملہ بھی روانہ کر دیا گیا، جس کا کام کو تو زوف کی سرگرمیوں کی نگرانی کرنا اور ان کے متعلق رپورٹیں بھیجنا تھا۔

علاوہ ازیں روکی افواج کی پوری اعلیٰ کمین کی از سر نو تنظیم کی گئی۔ وہ عہدے پر کیے جانا تھے، جو ہاگ راتیاں (جو ہاگ ہو گیا تھا) اور بارکے (جو ناراض ہو گیا تھا اور فوج سے ریٹائر ہو چکا تھا) نے خالی کیے تھے۔ اس مسئلے کو کہ آیا ب کی جگہ الف اور د کی جگہ ب یا اس کے برعکس لف کی جگہ دو غیر ہم کی تعیناتی بہتر رہے گی، سنجیدہ غور و فکر کا مستحق سمجھا گیا۔ اس قسم کی تبدیلیوں سے الف یا ب کی تسلی تو شاید ہو جاتی لیکن اسے پیش یوں کیا گیا جیسے ان سے کچھ زیادہ حاصل کرنا مقصود تھا۔

کو تو زوف اور اس کے چیف آف شاخ، بے جگ سین کے، بین خاصیت، امپراطور کے بالاعتماد افسروں

کی موجودگی اور ان نئے تبادیوں و تقرریوں کا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ مختلف گروہوں کے مابین سازشوں کا سلسلہ معمول سے زیادہ پیچیدہ صورت اختیار کر گیا۔ انف ب کی ب ب ج کی اور ج د کی ہر ممکن طریقے اور انداز سے مانگ کھینچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ جوڑ توڑ کی ان تمام کارروائیوں میں سازش کا موضوع عام طور پر یہ ہوتا تھا کہ جنگ کیسے لڑی جائے۔ یہ اشخاص بڑے عم خولش یہ سمجھتے تھے کہ جنگ کی لگام ان کے ہاتھوں میں ہے حالانکہ جنگ ان لوگوں سے بال بال اپنے ناگزیر راستے پر جا رہی تھی۔ اس راستے کی ان کی تجاویز کے ساتھ کوئی مطابقت نہیں تھی، اسے تو عوام کا بنیادی رویہ متعین کر رہا تھا۔ یہ تمام تجاویز ایک دوسری سے متضاد و متصادم تھیں اور صرف اونچے حلقوں میں انھیں آئینہ پیش آنے والے واقعات کا عکاس تصور کیا جاتا تھا۔

”پرنس میخائیل الاری اوٹاویچ“ زار نے دواکتوبر کو ایک مراسلے میں تحریر کیا جو کوٹوزوف کو تار و خیم کی لڑائی کے بعد موصول ہوا:

ماسکو دسمبر سے دشمن کے قبضے میں ہے۔ تمھاری آخری رپورٹوں پر میں تاریخ مندرجہ تھی۔ اس عرصے کے دوراں میں نہ صرف یہ کہ دشمن کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی گئی اور قدیم دور السلطنت کو چھڑانے کی کوئی کوششیں نہیں ہوئی، بلکہ تمھاری آخری رپورٹوں کے مطابق تم مزید پیچھے پسپا ہو گئے ہو۔ سر پوٹوف پر ہی غنیم کے دستوں کا قبضہ ہو چکا ہے اور تو لا خطرے کی زد ہے جہاں مشہور و معروف اسمہ خانہ، جرنل جے ایے انتھائی ضروری ہے۔ جنرل دنٹ ٹینگے روڈے کی (فرستادہ) اطلاعات سے مجھے معلوم ہوا ہے کہ دشمن کی ایک کور جس کی نفری دس ہزار ہے، پیٹرز برگ روڈ کی طرف بڑھ رہی ہے۔ دوسری جس کی تعداد ہزاروں افراد ہے، دستروں کو گھیرے میں لے رہی ہے۔ تیسری ولادی میر روڈ پر نقل و حرکت کر رہی ہے۔ چوتھی نے، جس کی تعداد اور قوت اچھی خاصی ہے، روز اور موڈیک کے مابین ڈیرے ڈال دیے ہیں۔ خود نیولین ابھی پچیس تاریخ تاریخ کو ماسکو میں تھا۔ اس تمام اطلاعات کے پیش نظر، جب دشمن کی افواج بڑی بڑی کلڑیوں میں منقسم ہو چکی ہیں اور جب نیولین اور اس کے گارڈ ابھی ماسکو میں ہیں، کیا یہ ممکن ہے کہ دشمن کی وہ فوج، جو تمھارا سامنا کر رہی ہے، اتنی طاقتور ہے کہ تم اس کے خلاف کوئی کارروائی کرے سے عاجز ہو؟ اس کے برعکس یہ فرض کیا جاسکتا ہے کہ اغلباً چند دسے یا زیادہ سے زیادہ ایک کو تمھارا تعاقب کر رہی ہے اور دشمن کی یہ سپاہ اس فوج سے، جو تمھاری تحویل میں ہے، کہیں کمزور ہے۔ قرائن سے یہی نظر آتا ہے کہ گرم ان مواقع سے فائدہ اٹھاتے تو تم اس پر حملہ کر کے اسے ملایمیٹ کر سکتے یا کم از کم اسے پسپائی اختیار کرنے پر مجبور کر سکتے تھے ورنہ صوبوں کے، جس پر اسے وقت غنیم قابض ہے، خاصے بڑے حصوں پر دوبارہ قبضہ کر سکتے تھے، اور اس طرح تو لا اور اندرون ملک دیگر قصبوں کو جو خطرہ لاحق ہے، اس کا دفعہ کر سکتے تھے۔ اگر دشمن کسی بھی تعداد میں اپنی فوج کے کسی حصے کا رخ پیٹرز برگ کی طرف موڑنے اور یوں دار السلطنت کے لیے

جس سپاہ کی معقول نفری جمع رکھنا ناممکن ہے، خطرے کا سبب بننے میں کامیاب ہو گیا، تو اس کی ذمہ داری سراسر تمھارے سر ہوگی، کیونکہ اگر تم اس فوج کو، جو تمھارے سپرد کی گئی ہے، صحیح طریقے سے استعمال کرو، عزم مصمم اور زور شور سے اپنا فرض نبھادو، تو تمھارے پاس اتنے درائع ہیں کہ تم کسی مزید جانی کا تدارک کر سکتے ہو۔ یاد رکھو کہ تم نے ابھی تک ماسکو کے ہاتھ سے نکل جانے کا جواب دیا ہے جس پر سارا ملک سوگوار ہے۔ تمہیں تجربہ ہو چکا ہے کہ میں تمہیں انعامات و اکرامات سے نوازنے کے لیے آمادہ رہتا ہوں۔ اس آمادگی میں کوئی کمی نہیں آئے گی ٹیکل مجھے اور روس کو تم سے یہ توقع کرنے کا حق حاصل ہے کہ تم جوش و جذبہ اور استقامت کا مظاہرہ کرو گے اور کامیابی حاصل کرو گے۔ تمھاری ذہانت، عسکری صلاحیتیں اور تمھاری زیرکمان افواج کی حرارت و دلیری امید دلاتی ہیں کہ تم عتقرب کامیاب سے ہمکنار ہو گے۔

لیکن یہ فطریہ اس امر کی واضح عداوت تھا کہ پیٹرز برگ میں بھی متخالف افواج کی اضافی قوت کا احساس ہونے لگا تھا۔ ابھی راستے میں ہی تھا کہ دشمن سے ایک جھڑپ ہو گئی کیونکہ اب کوئزوف فوج کو چار خانہ کارروائی کرنے سے باز نہیں رکھ سکا تھا۔

2 اکتوبر کو ایک قازق نے جس کا نام شاپووالوف تھا اور جو گشتی دستے کا رکن تھا، ایک خرگوش ہلاک اور دوسرا زخمی کر دیا۔ زخمی خرگوش کے تعاقب میں وہ جنگل میں بہت دور نکل گیا اور پھرتے پھرتے غیر متوقع طور پر سونا کے بصرے کے قریب پہنچ گیا جو کسی قسم کے پھرے کے بغیر وہاں پڑاؤ ڈالے ہوئے تھا۔ قازق نے ہنس اس کراپنے ساتھیوں کو بتایا کہ وہ فرانسیسیوں کے ہتھے چڑھنے سے بال بال بچا۔ ایک لیفٹیننٹ نے بھی یہ کہانی سنی اور اس نے اپنے کمانڈر کو جاسنا کی۔

قازق کو بلایا گیا اور اس پر جرح کی گئی۔ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر قازق انسران چند گھوڑے پکڑا چاہتے تھے لیکن ان میں سے ایک نے جس کی اعلیٰ حکام سے شناسائی تھی، ایک جرنیل کو، جو شاف میں شامل تھا، اس واقعے کی اطلاع دے دی۔ حال ہی میں شاف کے ارکان کے باہمی تعلقات انتہائی کشیدہ ہو چکے تھے۔ چند روز پیشتر شاف کا ایک رکن جنرل بریٹانوف بے شک سین کے پاس گیا تھا اور اس نے اس سے التجا کی تھی کہ وہ کمانڈر انچیف پر اپنا اثر و رسوخ استعمال کرے اور اسے حملہ کرنے کے لیے آمادہ کرے۔

”اگر میں تمہیں چاہتا ہوں تو مجھے خیال آتا کہ تم جس چیز کا مطالبہ کر رہے ہو، تم درحقیقت وہ چاہتے نہیں ہو۔ میرا صرف مشورہ دینے کا دیر ہے اور ہر سیرین ہائی نس یقیناً اس کے بالکل است کام کرنے کے لیے تیار ہو جائیں گے۔“ جو خبر قازق لایا تھا اور جس کی گشتی دستے نے تصدیق کر دی تھی، اس بات کا ثبوت تھی کہ جسے کی مناسب گھڑی آگئی ہے۔ کس کر بندھا ہوا تار ڈھیل ہو گیا، چرخیاں گھر گھر کرنے اور گھنٹہ نشانے لگا۔ اپنے تمام تر ظاہری اقتیارات، دانش، تجربے اور علم کے باوجود کوئزوف نے بے شک سین (جو زار کوئی رپورٹیں ارسال کرتا رہتا تھا) کے

رہتے، ان خواہشات، جو عام مفروضے کے مطابق اسپر اطور کی تھیں، اس اطلاع، جو قازق لایا تھا اور اس نصاب، جس کا اظہار تمام جرنیلوں نے یکساں انداز سے کیا تھا، غور کیا اور اس نے وہ کام کرنے کا، جو اس کی اپنی نظروں میں بے سود اور ضرور رساں تھا، حکم دے دیا اور اس حقیقت پر، جو تکمیل تک پہنچ چکی تھی، مہر تصدیق ثبت کر دی۔

4

بے تنگ سین کا رقبہ اور قازق کی رپورٹ کہ فرانسیسیوں کا میسرہ پہرے کے بغیر ہے، اس امر کی محفل آخری علامتیں تھیں کہ حملہ کرنا ناگزیر ہو گیا ہے اور اس کام کے لیے اکتوبر کی پانچ تاریخ طے پا گئی۔

چار تاریخ کی صبح کو تو زوف نے انوائج کی تقسیم و ترتیب کے منصوبے پر دستخط کر دیے۔ ٹول نے اسے براہ کرم یہ مالوف کو سنایا اور اسے ہدایت کی کہ وہ ضروری انتظامات کرے۔

”بہت اچھا، بہت اچھا۔ فی الحال میرے پاس وقت نہیں ہے۔“ یہ مالوف نے کہا اور باہر نکل گیا۔ ٹول نے تقسیم و ترتیب کا جو منصوبہ بنایا تھا، وہ بہت اچھا تھا۔ اسٹریٹس کی طرح ہر چیز کاغذ پر تحریر کر دی گئی تھی۔ ویسے اس مرتبہ جرمن زبان استعمال نہیں کی گئی تھی۔

”پہلے کالم ان ان مقامات کی طرف اور دوسرا ان ان مقامات کی طرف کوچ کرے گا“ وغیرہ وغیرہ۔ کاغذ پر یہ تمام کالم مقررہ اوقات پر متعین مقامات پر پہنچ جاتے ہیں ورنہ دشمن کا قلع تلع کر دیتے ہیں۔ جیسا کہ تقسیم و ترتیب میں عام طور پر ہوتا ہے، ہر چیز قابل تحسین انداز سے سوچی گئی تھی اور جیسا کہ عموماً ہوتا ہے ایک بھی کالم صحیح وقت پر صحیح مقام پر نہ پہنچ سکا۔

جب ضرورت کے مطابق منصوبے کی نقول تیار ہو گئیں، ایک افسر کو حکم دیا گیا کہ وہ انھیں یہ مالوف کو پہنچا دے تاکہ وہ حجاز بزرگ کو علی جامہ پہنچا سکے۔ یہ افسر نو جوان تھا، اس کا تعلق ہارس گارڈز سے تھا اور وہ کو تو زوف کا اردن افسر تھا۔ جو مشن اس کے سپرد کیا گیا تھا، اس پر بہت خوش تھا۔ وہ یہ مالوف کی قیام گاہ کی طرف چل پڑا۔

”وہ کہیں باہر گئے ہوئے ہیں،“ یہ مالوف کے اردنی نے جواب دیا۔

ہارس گارڈز کا افسر اس جرنیل کے ہاں چلا گیا، جہاں یہ مالوف اکٹرا پایا جاتا تھا۔

”نہیں، وہ یہاں نہیں آئے اور نہ خود جرنیل اندر ہیں۔“ اسے بتایا گیا۔

انسرایک بار پھر گھوڑے پر سوار ہوا اور کسی اور کے ہاں چل دیا۔

”نہیں، وہ اندر نہیں ہیں۔“

”خدا کرے کہ اس تاخیر کے لیے مجھے ذمے دار نہ ٹھہرایا جائے کیا مصیبت ہے،“ افسر نے سوچا۔

وہ سارے پڑاؤ کے چکر کاٹا بھرا۔ ایک شخص نے اسے بتایا کہ اس نے یہ مالوف کو چند جرنیلوں کے ساتھ

گزر رہے دیکھا ہے۔ دوسروں نے خیال ظاہر کیا کہ وہ لازماً اپنی قیام گاہ پر واپس پہنچ گیا ہوگا۔ افسر نے کھانا کھانے

کے لیے کہیں ر کے بغیر شام کے چھ بجے تک اپنی تلاش جاری رکھی۔ نہ برمالوف ملا ورنہ کوئی بتا سکا کہ وہ کہاں مل سکا ہے۔ اپنے ایک رفیق کار کے ہاں جلدی جلدی کچھ زبردستی کرنے کے بعد افسر دوبارہ ہراول دستوں میں میلورا دورج کو تلاش کرنے نکل پڑا۔ میلورا دورج بھی نہ ملا لیکن یہاں اسے بتایا گیا کہ وہ جنرل کیلن کے ہاں بال میں شریک ہونے گیا ہے اور انڈیا برمالوف بھی وہیں ہے۔

”مگر کہاں؟“

”ارے ادھر، پچھلیے میں۔“ ایک کازنک افسر نے در کسی رئیس کے وہی مکان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”کیا۔ ہماری صفوں کے پار؟“

”ہماری دورجمنیں بیرونی چوکیوں کی طرف بھیج دی گئی ہیں اور وہاں آج خوب دادیں دے رہی ہیں صحیح معنوں میں مزے لیے جا رہے ہیں۔ درجینڈ میں۔ تین گلوکاروں کے طائفے ہیں۔۔۔“

افسر ہماری صفوں کے پار پچھلیے چلا گیا۔ ابھی وہ دورجی تھا کہ اس کے کانوں میں فوجی جوانوں کے رقص کی دل آویز اور پچھلی دھنوں کی آوازیں پڑنے لگیں۔ وہ کورس گار ہے تھے۔

”چرا۔۔۔ گا ہوں میں۔۔۔ چرا۔ گا گا ہوں میں؟“ نٹھے کے ساتھ ساتھ سیٹیاں بچ رہی تھیں اور تورمان کی آوازیں چیخ چھاڑے میں ڈوب رہی تھیں۔

جوں جوں افسر منتہا گیا، توں توں اس کے جوش و خروش میں اضافہ ہوتا گیا۔ لیکن اسے یہ خوف بھی کھائے جا رہا تھا کہ اسے اہم حکم پہنچانے کی جو ذمہ داری سونپی گئی تھی، اس سے عہدہ برآ ہونے میں تاخیر کا الزام اس کے سر آئے گا۔ اب تقریباً نو بج چکے تھے۔ وہ گھوڑے سے اتر اور خاصے بڑے دیہی مکان کے، جو فرانسیسی اور روسی صفوں کے مابین یوں کا توں کھڑا رہا تھا، پورج کی طرف پیدل چل پڑا۔ پیش دالان اور ریفریشمنٹ روم میں باروردی ملازمین اشیائے خورد و نوش اٹھائے ادھر ادھر گھوم پھر رہے تھے۔ گلوکاروں کے طائفے درپچوں کے نیچے کھڑے تھے۔ افسر کو اندر آنے کی اجازت مل گئی اور اسے چشم زدن میں فوج کے بڑے بڑے جنرل وہاں اکٹھے نظر آ گئے۔ ان میں برمالوف کی بھاری بھر کم اور بارعب شخصیت بھی شامل تھی۔ ان سب کے کانوں کے من کھلے تھے۔ ان کے چہرے دغما رہے تھے اور ان سے جوش و خروش کا اظہار ہوتا تھا۔ وہ نیم دائرہ بنائے کھڑے، دیکھ کر قہقہے لگا رہے تھے۔ کمرے کے درمیان میں ایک پست قامت اور خوب رو جرنیل، جس کا چہرہ سرخ تھا، پھرتی اور جوش و جذبہ سے tropak رقص کر رہا تھا۔

”کھی، کھی، واہ، واہ، واہ، واہ، واہ، واہ، واہ، واہ!“

ایسے موقع پر اتنا اہم کام لے کر پہنچنے پر افسر اپنے آپ کو دوہرا مجرم تصور کرنے لگا اور وہ شاید انتظار کرنے کو ترجیح دیتا لیکن اس پر ایک جرنیل کی نظر پڑ گئی اور یہ سن کر کہ وہ کس سلسلے میں آیا ہے، اس نے برمالوف کو مطلع کر دیا۔

برمالوف تیوریاں چڑھائے آگے آیا، افسر نے جو کچھ کہا تھا، اس نے وہ سنا اور ایک لفظ کہے بغیر اس سے

کا عقدات وصول کر لیے۔

”وہ محض اتفاقاً تو ادھر نہیں گیا ہوگا، کیا خیال ہے تمہارا؟“ ہارس گارڈز کے ایک افسر نے پوچھا، جرنیلان میں شامل تھا۔ ”ارے بالکل نہیں۔ اس نے یہ حرکت جان بوجھ کر کی کیونکہ وہ کانوینشن کو مصیبت میں پھانسا چاہتا ہے۔ کل جو گڑبڑ ہوگی وہ تم خود دیکھو گے۔“

5

اگلی صبح نجیف و نزار، بڑھا پھوس کو تو زوف تڑکے ہی بیدار ہو گیا۔ اس نے عبادت کی، وردی پہنی اور اس گنگی کے ساتھ کہ اسے لڑائی کی نگرانی کرنا ہے جسے وہ پسند نہیں کرتا تھا، اپنی کالاش میں سوار ہوا اور تاشاد کا گاؤں سے نکل پڑا۔ جو تاروتینو سے ساڑھے تین میل دور تھا، اس مقام کی طرف، جہاں حملہ کرنے والے دستوں نے جمع ہونا تھا۔ وہ ادھمکنے لگتا، پھر جاگ پڑتا اور دائیں طرف قارنگ کی، جو شاید یہ ظاہر کر سکے کہ لڑائی کا آغاز ہو گیا ہے، ”دائیں سننے کی کوشش کرنے لگتا۔ مگر چاروں اطراف خاموشی کا دور دورہ تھا۔ مرطوب اور ہادلوں میں مستور غزنی صبح طلوع ہو رہی تھی۔ جب کو تو زوف تاروتینو پہنچا، اس نے سواروں کو اپنے گھوڑوں کو پانی پلانے کے لیے اس سڑک کے جس پر وہ خود آ رہا تھا، پارے جاتے دیکھا۔ کو تو زوف نے اپنی چند ہی آنکھوں سے ان پر نظر ڈالی، ”پنی گاڑی روکی اور ان سے پوچھنے لگا کہ ان کا تعلق کس رجمنٹ سے ہے۔ وہ اس کالم کا حصہ تھے جسے بہت دیر پہلے کا زیر ہونا اور شجوان مارنے میں مصروف ہونا چاہیے تھا۔

”شاید کوئی غلطی ہو گئی ہے،“ بوڑھے کمانڈر انجیف نے سوچا۔

لیکن ذرا ہی آگے اسے یہ وہ رجمنٹیں نظر آئیں۔ ان کے ہتھیار ایک جگہ ڈھیر کی صورت میں پڑے تھے اور نوجوان جاگتے پہنے اپنا دلایا پکانے اور سوختی لکڑی ڈھونڈنے میں مصروف تھے۔ اس نے ایک افسر کو بلایا۔ اس نے اسے بتایا کہ انھیں پیش قدمی کرنے کا کوئی حکم نہیں ملا۔

”یہ کیسے۔“ کو تو زوف نے کہا شروع کیا لیکن اس نے اپنے آپ کو رد کیا اور ستر افسر کو بلا بھیجا۔

وہ اپنی کالاش سے نیچے اتر آیا اور انتظار کے دوران میں اپنا سر جھکائے اور زور زور سے سانس لیتا آگے بچے چکر لگاتا رہا۔ جب آئی نہیں آیا، جو جنرل سٹاف کا افسر تھا اور جسے اس نے بدیا تھا، کو تو زوف خیمے سے لال بھولا ہو گیا، اسے لیے نہیں کہ اس غلطی کا التزام اس افسر پر عاید ہوتا تھا بلکہ اس لیے کیونکہ اس کی نظروں میں وہ عظیم ضرورت تھا کہ وہ اس پر اپنا غصہ جھاڑ سکتا تھا۔ کپکپاتے ہانپتے بوڑھے آدمی پر غیظ و غب کا وہ دورہ پڑ گیا جس میں وہ بعض اوقات زمین پر لوٹنے پوٹنے لگتا تھا۔ وہ نیچے جھاڑ کر آئی نہیں کے چھپے پڑ گیا، کے لہر لہرا کر اسے دھمکیاں دینے، اس پر چیخنے چٹکھانے اور اسے ننگی گالیاں دینے لگا۔ ایک اور افسر، کمپنن برورن کا بھی یہی حشر ہوا جو سراسر بے قصور تھا اور جو محض اتفاق سے ادھر آ نکلا تھا۔

”یہ تم کس قسم کے Canaille ہو؟ میں سب کی کھالیں ادھر وادوں گا! لپے، لٹکے کہیں کے!“ اس نے زبانی ہوئی آواز میں چلا کر کہا۔ اس کی ٹانگیں لڑکھڑانے لگی تھیں۔ لیکن وہ ابھی تک اپنا بازو دھرائے جا رہا تھا۔

اس کی جسمانی حالت قابل رشک نہیں تھی۔ اب وہ مزید برتر ہو گئی تھی۔ وہ کمانڈر مچیف تھا، ہزیرین ہائی نس کہلاتا تھا اس کے متعلق ہر شخص یہ کہتا تھا کہ جو اختیارات اسے حاصل ہیں، آج تک روس میں کسی شخص کو نہیں ملے اور اس کا حال یہ ہو گیا کہ وہ ساری فوج کا نشانہ تضحیک بن گیا۔ ”آج مجھے عبادت ختم کرنے میں اتنی جلد بازی نہیں کرنا چاہیے تھی اور نہ چھوٹی چھوٹی ہزیریات پر غور کرنے کے لیے ساری رات جاگتے رہنا چاہیے تھا!“ اس نے سوچا۔ ”جب میں محض نو آموز انسرتھا، کسی شخص کی مجال نہیں تھی کہ وہ میرا اس طرح مذاق اڑاتا۔۔۔ اور اب!“ وہ صبح معنوں میں اپنے جوڑ جوڑ میں درد محسوس کرنے لگا جیسے اسے جسمانی سزا ملی ہو اور وہ غصے اور اذیت سے چیخیں مارتے۔ بہت جلد اس کی ہمت جواب دینے لگی اور اپنے گرد پیش نظر میں دڑ لانے کے بعد اسے محسوس ہونے لگا کہ وہ اتنا زیادہ کچھ کہہ گیا ہے جو اسے کہنا نہیں چاہیے تھا۔ وہ اپنی کالاش میں سوار ہو گیا اور چپ چاپ واپس چلا گیا۔

جب ایک مرتبہ اس کا غبار نکل گیا، اسے دوبارہ غصہ نہ آیا۔ وہ ناتوانی سے اپنی آنکھیں جھپکاتا تمام عذر اور تاویہیں سنتا رہا (یہ مالوف اسے اگلے روز تک ملتے رہا۔) بے جنگ سین کا نوؤٹس اور ٹول نے اصرار کیا کہ جس منصوبے پر عمل درآمد کے سلسلے میں گڑبڑ ہو گئی ہے، اسے اگلے روز بروئے کار لایا جانا چاہیے اور کوئزرف کو ایک بار پھر ان کی ہاں میں ہاں ملانا پڑی۔

6

اگلے روز شام تک فوجی دستے اپنے اپنے متعینہ مقامات پر جمع ہو گئے اور رات کے دوران میں پیش قدمی کرنے لگے۔ یہ خزانہ رات تھی۔ آسمان پر گہرے اور بادل چھائے ہوئے تھے لیکن پانی نہ برسا۔ گرچہ زمین مرطوب تھی مگر اس پر کچھ نہیں تھی ورنہ فوجی دستے کسی قسم کی آواز پیدا کیے بغیر آگے بڑھتے رہے۔ صرف کبھی کبھار توپوں کے ٹکرانے کی ہلکی آواز سنائی دے جاتی۔ جوانوں کو اونچے لہجوں میں باتیں کرنے، پائپ پینے یا آگے جانے کی ممانعت تھی اور ان کی کوشش بھی تھی کہ وہ گھوڑوں کو بھی ہنہانے سے باز رکھیں۔ مہم کی رازداری نے اس کی جاذبیت میں اضافہ کر دیا تھا۔ کوچ کے دوران میں جوانوں کے چہروں پر شگفتگی اور زندہ دلی جھلک رہی تھی۔ متعدد کام یہ فرض کرتے ہوئے کہ وہ اپنی منزل مقصود پر پہنچ گئے ہیں۔ رک گئے۔ انھوں نے اپنے ہتھیاروں کے نیچے ڈھیر لگا دیے اور خود ٹھنڈی زمین پر بیٹھ گئے۔ دوسرے (اور یہ اکثریت میں تھے) ساری رات چلتے رہے اور بظاہر اس مقامات پر، جہاں انھیں نہیں جانا چاہیے تھا، پہنچ گئے۔

کاؤنٹ آرلوف۔ دینی سوف واحد شخص تھا جو اپنے قازقوں (ان کا دستہ سب سے کم، ہم تھا) کی معیت میں

صحیح وقت پر صحیح جگہ پہنچا۔ وہ اور اس کے ساتھی اس راستے رک گئے جو ستر و میدا دو گاؤں سے قصبہ دتروہ کی طرف جاتا تھا۔

جب پو پھٹنے لگی، کاؤنٹ کارلوف۔ دینی سوف کو، جسے اونگھ آگئی تھی، جگا ریا گیا۔ فرانسیسی فوج کا ایک ہلکا اس کی خدمت میں پیش کیا گیا۔ وہ پوینا تو سکی کی کور کا پولستانی سار جنٹ تھا اور اس نے پولستانی زبان میں انھیں بتایا کہ وہ اپنی فوج سے اس لیے فرار ہوا ہے کیونکہ ملازمت میں اس کے ساتھ اچھا سلوک نہیں ہوا تھا۔ اسے مدتوں پہلے (کمشنڈ) افسر بنا دیا جانا چاہیے تھا کیونکہ وہ ان سب سے زیادہ دلیر تھا لیکن وہ ابھی تک سار جنٹ ہی تھا۔ اب وہ انھیں اس لیے چھوڑ کر آیا ہے کیونکہ وہ ان سے بدلہ لینا چاہتا ہے۔ اس نے بتایا کہ جہاں وہ ہیں، موغاشب گڑاں کے لیے وہاں سے صرف پون ہیل دور قیام پذیر ہے اور اگر وہ انھیں صرف سو جوانوں پر مشتمل حفاظتی دستہ فراہم کر دیں، وہ اسے زندہ بچڑائے گا۔ کاؤنٹ آرلوف۔ دینی سوف نے اپنے ساتھی افسروں کے ساتھ صلاح مشورہ کیا۔ پیشکش اتنی دلکش تھی کہ اسے ٹھکرانا ممکن نہیں تھا۔ ہر شخص نے جانے کے لیے رضا کارانہ اپنے آپ کو پیش کر دیا کیونکہ وہ سبھی کوشش کرنے کے حق میں تھے۔ خاصے لمبے بحث مباحثے اور تو تومیں میں کے بعد طے پایا کہ بھر جنر گرینکوف اور دو دوقازق رہنمیں پولستانی بھگوڑے کے ساتھ جائیں گے۔

”ٹھہرو، یاد رکھو۔“ کاؤنٹ آرلوف۔ دینی سوف نے سار جنٹ کو رخصت کرتے ہوئے کہا: ”اگر تم نے مجھ سے جھوٹ بولا ہے، میں تمہیں کتے کی موت مراد دوں گا۔ لیکن جو کچھ تم نے کہا ہے، اگر وہ سچ ثابت ہوا، پھر تمہیں ہر اشرفیاں انجام میں ملیں گی۔“

سار جنٹ نے کوئی جواب نہ دیا اور عزم بالجزم کے ساتھ گھوڑے پر سوار ہو گیا اور گرینکوف کے ساتھ ہل پڑا۔ جس کے جون جھٹ پٹ اکٹھے ہو گئے تھے۔ وہ جنگل میں غائب ہو گئے۔ کاؤنٹ آرلوف۔ دینی سوف صبح سویرے کی سردی میں کانپ رہا تھا اور جو کچھ وہ اپنے ذمے داری پر کر رہا تھا، اس نے اسے بھالی کیفیت میں جلا کر دیا تھا۔ وہ گرینکوف کو خدا حافظ کہنے کے بعد جنگل سے واپس آ گیا اور مڑ کر حریف کے پڑاؤ کو دیکھنے لگا۔ جو صبح کی سپیدی اور پڑاؤ کے بچتے ہوئے لادوؤں کی پر فریب روشنی میں نظر آنے لگا تھا۔ ہمارے دوسرے کالوں کو اس کے دائیں ہاتھ کھلی دھواں پر نظر آنا چاہیے تھا۔ اس نے اس سمت میں دیکھا۔ اگرچہ یہ کالم بہت فاصلے سے دکھائی دے جاتا چاہیے تھے مگر ان کا دور دور تک کوئی نشان نہیں تھا۔ اسے محسوس ہونے لگا کہ فرانسیسی پڑاؤ میں ہل ہل شروع ہو گئی ہے اور اس کے اس مشاہدے کی تصدیق اس کے تیز نظر ابجوتٹ نے کر دی۔

”اف، واقعی بہت دیر ہو گئی ہے!“ کاؤنٹ آرلوف۔ دینی سوف نے پڑاؤ کو بخور دیکھتے ہوئے کہا۔ اور جیسا کہ اکثر ہوتا ہے کہ جو نہی وہ شخص، جس پر ہم نے اعتبار کیا ہوتا ہے، نظروں سے اوجھل ہوتا ہے، ہمیں گھد بدی ہونے لگتی ہے کہ کہیں ہمارے ساتھ ہاتھ ہی نہ ہو گیا ہو۔ کاؤنٹ آرلوف۔ دینی سوف کے ساتھ بھی ایسا ہوا۔ اسے تو بالکل غیر مبہم طور پر یقین ہو گیا کہ سار جنٹ فریب کا تھا، وہ اس سے جی بھر کر جھوٹ بول گیا ہے اور

خدا معلوم دونوں رجمنٹوں کو کہاں لے گیا ہے۔ ان رجمنٹوں کی عدم موجودگی میں حملے کا سارا منصوبہ غارت ہو جائے گا۔ کوئی اتنے بڑے عسکری انبوه میں اس کے کمانڈر ٹیچف کو بردستی کیسے اٹھ کر سکتا ہے؟

”مجھے یقین ہے کہ یہ بد معاش ہمیں جیل دے گیا ہے“ کاؤنٹ نے کہا۔

”انھیں اب بھی واپس بلایا جاسکتا ہے۔“ اس کے ایک شاف افسر نے کہا۔ دشمن کے پڑاؤ کی طرف دیکھتے ہوئے کاؤنٹ آرلوف۔ دینی سوف کی طرح اس کے دل میں بھی اس مہم کے بارے میں شبہات سر اٹھانے لگے تھے۔

”ہا! واقعی؟ تمہارا کیا خیال ہے؟ انھیں جانے دینا چاہیے یا نہیں؟“

”آپ انھیں واپس بلانا چاہتے ہیں؟“

”ہاں نہیں واپس بلا لاؤ، واپس بلا لاؤ“ کاؤنٹ آرلوف۔ دینی سوف نے اپنی گٹری کی طرف دیکھ کر اپنا مک فیصلہ کرتے ہوئے کہا۔ ”اس کام میں بہت تاخیر ہو جائے گی۔ پہلے ہی اچھی خاصی روٹنی ہو چکی ہے۔“

اور ایجوٹنٹ گریکوف کے پیچھے جنگل میں سرپٹ گھوڑا دوڑانے لگا جب گریکوف واپس آ گیا، کاؤنٹ آرلوف۔ دینی سوف اس مہم کو منسوخ کرنے، پیادہ کالوں کا، جو ابھی تک نظر نہیں آئے تھے، بے سود انتظار کرنے اور پھر دشمن کے اتنا قریب ہونے کی وجہ سے پہچانی کیفیت میں مبتلا ہو چکا تھا (اس کے تمام عسکریوں کی بھی یہی حالت تھی)۔ اس نے حملہ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

”سوار ہو جاؤ!“ اس نے سرگوشیوں میں حکم دیا۔

عسکریوں نے اپنی اپنی پوزیشنیں سنبھال لیں اور اپنے سینوں پر صلیب کے نشانات بنانے لگے۔

”آگے بڑھو! خدا تمہارا حامی و ناصر ہو!“

”ہر۔ را۔ ل۔ ا!“ نعرے سے جنگل گونجنے لگا اور قازق اپنی شمشیریں آگے جھکائے یکے بعد دیگرے یوں آگے بڑھنے لگے جیسے کوئی انھیں بوری سے باہر انڈیل رہا ہو۔ انھوں نے ہتے مسکراتے عدی کے اوپر چھلانگیں لگائیں اور پڑاؤ کی جانب بھاگنے لگے۔

جس اولین فرانسیسی سپاہی کی نظر قازقوں پر پڑی، مایوسی اور خوف کے عالم میں اس کی چیخ نکل گئی۔ پڑاؤ میں افراتفری برپا ہو گئی۔ نیم غنودہ اور نیم برہنہ لوگ گنگنا لیں، رتی بندوقیں چھوڑ چھاڑ، جس کا بدھرم نہ سہیا، ادھر بھاگ پڑے۔

فرانسیسی اپنے پیچھے کیا چھوڑ گئے تھے یا قازقوں کے گرد پیش کیا پڑا تھا، اگر وہ اس کی پروا نہ کرتے، انھوں نے سوغا کو پکڑ لیا ہوتا اور جو کچھ وہاں موجود تھا، وہ بھی ان کے قبضے میں آ جاتا۔ افسروں نے ان سے بھی کچھ کرانے کی کوشش کی لیکن ایک بار جب ماں غنیمت اور قیدی قازقوں کے ہاتھ لگ گئے، انھیں وہاں سے ہلانا ناممکن ہو گیا۔ کسی نے احکام کی پروا نہ کی۔ پرچموں کے علاوہ پندرہ سو قیدی، اڑتیس ہندوقیں اور قازقوں کے نقطہ نظر سے اہم ترین۔ گھوڑے، زمینیں، جھولیں اور ایسی ہی دیگر اشیاء قبضے میں آ گئیں۔ ان سب اشیاء کو سیٹا، قیدیوں اور ہندوقوں کو

سنجھا، اور مال غنیمت کو تقسیم کرنا تھا۔ خوب شور و غل ہوا، اور آپس میں سر پہنٹول تک ٹوہنت پہنچ گئی۔ قاندری ساری توجہ اس کام پر مرکوز تھی۔

چونکہ فرانسیسیوں کا تعاقب نہیں کیا گیا تھا، وہ از سر نو اکٹھے ہونے در صف بندی کرنے لگے۔ اس کے بعد انہوں نے فائرنگ شروع کر دی۔ کاؤنٹ آرلوف۔ دینی سوف نے۔ جو ابھی تک پیادہ کالوں کا انتظار کر رہا تھا، مزید پیش قدمی نہ کی۔

دریں اثنا تقسیم و ترتیب کے مطابق کہ ”پہلے کالم روانہ ہوگا“ وغیرہ وغیرہ، درپرگز کالوں کے دے، جن کی کم ن بے نگ سین کے ہاتھوں میں تھی، ورجن کی رہنمائی ٹول کے ذمے تھی، مناسب وقت پر روانہ ہو چکے تھے اور معمول کے مطابق کہیں نہ کہیں تو پہنچ گئے لیکن اس جگہ نہیں، جہاں انھیں پہنچنے کا حکم دیا گیا تھا۔ جیب کی میٹھ ہوتا ہوا آیا ہے، جون روانہ تو خوش خوش ہوئے تھے مگر اب ان کے قدم مست پڑ گئے تھے اور بے اطمینانی کا اظہار ہونے لگا تھا۔ کسی کو کچھ پتا نہیں چل رہا تھا کہ وہ کہاں جا رہے ہیں اور بالآخر وہ پیچھے مڑنے لگے۔ ایکوینٹ اور جریل اور دوسرے گھوڑے دوڑاتے پھر رہے تھے، چیچ چنگھاڑ رہے تھے، غصے سے لال پیلے ہو رہے تھے اور آپس میں جھگڑ رہے تھے اور کہہ رہے تھے: ”ہم غلط سمت میں آئے ہیں اور ہمیں ویر بھی ہوگئی ہے۔“ وہ ایک دوسرے سے دشنام طرازی کر رہے تھے اور انجام کار نقل و حرکت کی خاطر گے بڑھنے لگے۔ ہم کہیں نہ کہیں تو پہنچیں گے ہی!“ اور وہ واقعی کہیں تو پہنچ ہی گئے لیکن اس جگہ نہیں جہاں انھیں پہنچنے کا حکم دیا گیا تھا۔ در چند ایک جو آخر کا صحیح مقام پر پہنچے بھی تو انکی تاخیر سے کہ ان کا آنا نا برابر ہو گیا۔ صرف اتنا ہوا کہ وہ اپنے اوپر فائرنگ کرانے عین وقت پر آ گئے۔ ٹول، جس نے اس لڑائی میں وہی کردار ادا کیا جو دوسرے روز نے اسٹریٹس میں کیا تھا، جاں فشانی سے ادھر ادھر گھوڑا دوڑے پھرتا رہا لیکن وہ جہاں بھی گیا، اسے معاملات زیر و زیر نظر آئے۔ یوں پھرتے پھرتے جنگل میں اس کا سامنا (جرل) باگودت کی کور سے ہو گیا۔ دن خاصا چڑھ گیا تھا جب کہ باگودت کی کور کو اس سے بہت پہلے کاؤنٹ آرلوف۔ دینی سوف کے دستے کے ساتھ جانا چاہیے تھا۔ اس ناکامی پر ٹول کے تن بدن میں آگ لگ گئی اور یہ فرض پورا کرتے ہوئے کہ کوئی نہ کوئی تو اس ناکامی کا ذمے دار ہوگا، وہ سر پٹ گھوڑا دوڑاتے کور کا ٹڈر کے پاس پہنچا اور سے سخت ست سنانے لگا۔ اس نے تو اسے یہ بھی کہہ دیا کہ اسے گولی مار دینا چاہیے۔ جزل باگودت دھیمے مزاح کا سخت کوشاں اور تجربہ کار لڑاکا سپاہی تھا۔ اس تاخیر، افراتفری اور متفد احکام نے اس پر بھی جھلاہٹ طاری کر دی تھی۔ یہ دیکھ کر کہ اپنے مزاج کے برعکس وہ بھی طیش میں آ گیا ہے، ہر شخص کی سٹی گم ہو گئی۔

”میرا کسی بھی شخص سے درس لینے کا کوئی ارادہ نہیں، تاہم کسی بھی دوسرے شخص کی طرح میں موت کو گلے لگا جانتا ہوں۔“ اس نے کہا اور ایک ہی ڈویژن کے ساتھ آگے بڑھ گیا۔

آگے بڑھتے بڑھتے جب یہ جری جرنیل غنیمت کی فائرنگ کی زد میں آیا، وہ رکا نہیں بلکہ اپنے جوانوں کے ساتھ مزید آگے چلا گیا۔ اپنی بیجانی کیفیت میں اس نے یہ سوچا ہی نہیں کہ شخص ایک ڈویژن فوج کے ساتھ میدان

کارزار میں کودنے سے کچھ حاصل بھی ہوگا یا نہیں۔ غصیل کی کیفیت میں میں اسے جن چیزوں کی ضرورت تھی، وہ صرف فطرہ، توپوں کے گولے اور بندوں کی گولیاں ہی تو تھیں۔ گولیوں کی پہلی بوچھاڑ میں ایک گولی اس کے جسم کے پار ہو گئی اور وہ وہیں ڈھیر ہو گیا۔ اس کے متعدد جوت بھی اس کے ساتھ کھیت رہے۔ اس کی ڈویژن چندے فائرنگ کا سامنا کرتی رہی مگر حاصل کچھ بھی نہ ہوا۔

7

دریں، ٹاٹا ایک اور کالم کو سامنے سے فرانسیسیوں پر حملہ کر دینا چاہیے تھا لیکن اس کالم کے ساتھ کوتوزوف تھا۔ وہ خوب جانتا تھا کہ اس لڑائی سے، جس کا ڈول اس کی مرضی کے خلاف ڈا، گیا تھا، فر تفری اور انتشار کے علاوہ اور کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ چنانچہ جہاں تک اس کے بس میں تھا، اس نے اپنی سپاہ پیچھے روکے رکھی اور کوئی پیش قدمی نہ کی۔ کوتوزوف نے پست قامت سرئی گھوڑے پر چپ چاپ چلتا رہا۔ سے حملے کی جو تجویز بھی پیش کی جاتی، وہ اس کا بڑے دھیمے لہجے سے جواب دے دیتا۔

”لفظ محمد ہر وقت آپ لوگوں کی زبان پر رہتا ہے۔ لیکن آپ حضرات یہ نہیں سوچتے کہ ہم میں پیچیدہ چالیں چلنے کی سکت نہیں ہے۔“ اس نے میلورادو وچ سے کہا، جس نے حملہ کرنے کی اجازت مانگی تھی۔
”آپ لوگ آج صبح سوغا کو قیدی نہ بنا سکے اور نہ وہاں وقت پر پہنچ سکے۔ اب کرنے کو کچھ نہیں رہا،“ اس نے ایک اور جرنیل کو جواب دیا۔

جب کوتوزوف کو مطلع کیا گیا کہ فرانسیسیوں کے عقب میں اب دو پولستانی بنا لیں ہیں جب کہ قازقوں کے بیان کے مطابق ازیں جیشتر ایک بھی نہیں تھی، اس نے تڑپھی نگاہوں سے ریالوف کی طرف دیکھا جس سے اس نے گزشتہ روز کلام نہیں کیا تھا۔

”ادھر یہ لوگ ہر وقت حملہ، حملہ، حملہ کی رت لگائے رکھتے ہیں اور طرح طرح کے منصوبے پیش کرتے رہتے ہیں لیکن جب عمل کا وقت آتا ہے، کچھ بھی تیار نہیں ہوتا اور دشمن، جسے پیٹنگی طالع مل چکی ہوتی ہے، مناسب انتظامات کر لیتا ہے۔“

یہ الفاظ سن کر ریالوف نے اپنی آنکھیں سکیڑیں اور اس کے لبوں پر خفیف مسکراہٹ آ گئی۔ اسے معلوم تھا کہ جہاں تک اس کا اپنا تعلق ہے، طوفان گزر چکا ہے اور کوتوزوف ٹھن، تنا اشارہ دے کر مطمئن ہو جائے گا۔
”وہ مجھے نشانہ بنا کر محظوظ ہو رہا ہے،“ ریالوف نے ریف سکی کے، جو اس کے قریب کھڑا تھا، کھٹے کو ٹھوکا لگائے ہوئے ذریعہ کہا۔

اس کے کچھ ہی دیر بعد ریالوف کوتوزوف کے قریب آیا اور بعد حرام کہنے لگا۔
”یوہا کیسی لینسی، ابھی کچھ نہیں بگڑا۔ دشمن بھی گیا نہیں۔ مگر آپ حملے کا حکم دے دیں، ورنہ گارڈز کو

بارود کی بوتلک سونگھنے کا موقع نہیں ملے گا۔“

کو تو زوف نے کوئی جواب نہ دیا تاہم اسے جب اطلاع ملی کہ موغا کی سپاہ پیچھے ہٹ رہی ہے، اس نے اُمے بڑھنے کا حکم دے تو دیا لیکن وہ ہر سو گز چلنے کے بعد یون یون گھسنے کے لیے رک جاتا۔

آرلوف۔ دینی سوف کے قازق جو کچھ کر چکے تھے، ساری لڑائی کا حاصل اس سے زیادہ کچھ نہ نکلا۔ ہائی فوژا کے سینکڑوں آدمی محض مفت میں گنوا دیے گئے۔

البتہ اس لڑائی کا یہ نتیجہ ضرور برآمد ہوا کہ کو تو زوف کو ایک تہفہ سے، جو ہیرے سے مرصع تھا، نوازا دیا گیا۔ بے یگ سین کو چند جواہرات و ایک ہزار روپل انعام میں عطا ہو گئے۔ دوسرے جرنیوں کو اپنے اپنے مہرے کے مطابق تسلی بخش اعزازات مل گئے اور جھڑپ کے بعد شاف میں مزید تبدیلیاں کر دی گئیں۔

”ہمارے ہاں کام ہمیشہ ایسے ہی ہوتا ہے۔ ہر چیز اچھل پھل کر دی جاتی ہے۔“ روی افسروں اور جرنیلوں نے تاروتیو کی لڑائی کے بعد رائے ظاہر کی۔ جیسا کہ آج کل لوگ کرتے ہیں انھوں نے اپنی اس رائے کا اظہار کھلے لفظوں میں تو نہ کیا البتہ اتنا ضرور اشارہ دے دیا کہ کوئی احمق شخص غلطیوں پر غلطیاں کیے جا رہا ہے۔ ورنہ جہاں تک ان کا اپنا تعلق ہے، وہ تمام معاملات مختلف انداز سے سنبھال لیتے۔ تاہم جو لوگ اس قسم کی باتیں کرتے ہیں، یا تو انھیں معصوم ہی نہیں ہوتا کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں، یا پھر وہ اپنے آپ کو یدہ دانستہ فریب دیتے ہیں۔ کوئی لڑائی بھی۔ خواہ یہ تاروتیو میں لڑی گئی ہو، بارودینو میں یا اوسٹرنس میں۔ اس طرح نہیں لڑی جاتی جس طرح کہ منصوبہ سازوں کو اس کی توقع ہوتی ہے۔ یہ تو حالت کے تقاضوں کے مطابق اپنا رخ متعین کرتی ہے۔

لڑائی کی تاریخ اختیار کرے گیا، اس کا انحصار آزادانہ کام کرنے والی لائقہ اذوتوں (کیونکہ آدی لڑائی کے دوران میں، جہاں مسئلہ حیات و ممات کا ہوتا ہے، جتنا آزاد ہوتا ہے، اتنا کہیں بھی نہیں ہوتا) پر ہوتا ہے اور اس کے رخ کا کبھی پیشگی انداز نہیں لگایا جاسکتا اور یہ کبھی کسی واحد قوت کے فیصلوں یا ہدایات کے مطابق متعین نہیں کیا جاسکتا۔ اگر مختلف رخوں میں چلائی جانے والی بہت سی قوتیں بیک وقت اپنے اپنے انداز میں کسی معین قالب پر شرائط ہوں تو قالب جس رخ پر چلے نکلے گا وہ ان میں سے کسی بھی قوت کا راستہ نہ ہوگا۔ وہ ہمیشہ ایک درمیانی بلکہ یوں کہیے، مختصر ترین راستہ اختیار کرے گا، وہی راستہ جس کی نرا سجدگی یہ کائنات میں قوتوں کے متواری الاطال کا ارتکاب ہے۔

سورٹین، بالخصوص قراسی سورٹین نے جس طرح واقعات کو بیان کیا ہے، اگر ان میں ہمیں جتکیں اور لڑائیاں کسی پیشگی طے شدہ منصوبے کے مطابق پایہ تکمیل تک پہنچتی نظر آتی ہیں تو ان سے جو واحد نتیجہ ہم اخذ کر سکتے ہیں، وہ یہ ہے کہ یہ بیانات صحیح نہیں ہیں۔

تاروتیو کی لڑائی سے بظاہر اس ہدف کی، جو نول کے پیش نظر تھا، تخصیص نہیں ہوئی۔ اس نے فوج کی تقسیم، ترتیب کا ایک منصوبہ بنایا تھا اور وہ اس منصوبے کے مطابق لڑائی لڑنا چاہتا تھا۔ جہاں تک اس کا اپنا تعلق تھا، اس کے

ذہن میں اس قسم کی کوئی بات نہیں تھی جیسا کہ کاڈسٹ آرلوف۔ ریخی سوف کے ذہن میں آئی (دوسوفا کو قیدی بنانا چاہتا تھا)، نہ وہ پوری فرانسیسی فوج کو، ایک ہی طے میں نہیں نہیں کرنا چاہتا تھا (جیسا کہ بے لگ سین اور دوسروں نے شاید سوچا ہو)، نہ اس کا مقصد اس افسر کا مقصد تھا جو لڑائی میں محض شہرت اور ناموری کے نام چاہتا تھا اور نہ اس کا ہدف قازقوں (جو مال غنیمت وہ حاصل کر چکے تھے، وہ اس پر اکتفا نہیں کر رہے تھے بلکہ مزید ہاتھ مارنا چاہتے تھے) کے ہدف سے کوئی مطابقت رکھتا تھا، وغیرہ وغیرہ۔ اگر لڑائی کا مقصد واقعی وہی تھا جو نتیجے کی شکل میں ہمارے سامنے آیا اور جس کے اس زمانے کے تمام روسی متنبی تھے۔ فرانسیسیوں کو روس سے باہر دھکیلنا اور ان کی فوج کو نیست و نابود کرنا۔ پھر یہ بالکل ظاہر ہے کہ تاروتینو کی لڑائی (محض اس لیے کہ اس میں جو کچھ ہو، اس کی منصوبے کے ساتھ کوئی مطابقت نہیں تھی) سین سین وہی چیز تھی جس کی جنگ کے اس مرحلے میں ضرورت تھی اس لڑائی کا فی الواقع جو نتیجہ برآمد ہوا، اس سے زیادہ بر محل اور باموقع نتیجے کا تصور کرنا مشکل ہی نہیں، بالکل بھی ہے۔ کم سے کم طاقت صرف کرنے اور کامل انتشار و فراتفری کے مابین معمولی نقصانات اٹھانے کے بعد ساری جنگ کے انتہائی اہم نتائج حاصل کر لیے گئے: پسپائی پیش قدمی میں تبدیل ہو گئی، فرانسیسیوں کی کمزوری آشکار ہو گئی اور پولین کی فوجوں کو راہ فرار اختیار کرنے کے لیے جس دھکے کی ضرورت تھی، رو دے دیا گیا۔



پولین de la Moscowa کی شاندار فتح کے بعد ماسکو میں داخل ہوتا ہے۔ اس کی فتح کے بارے میں کوئی شبہ نہیں کیا جاسکتا کیونکہ میدان کارزار فرانسیسیوں کے قبضے میں چھوڑ دیا جاتا ہے۔ روسی پسپا ہو جاتے ہیں اور اپنا دار السلطنت اس کے حال پر چھوڑ جاتے ہیں۔ ماسکو، جس میں اشیائے خورد و نوش، ہتھیاروں اور گولہ بارود کی فراوانی ہے اور جس کی دولت بے حد و حساب ہے، پولین کے قبضے میں چلا جاتا ہے۔ روسی فوج، جو قوت کے اعتبار سے فرانسیسی فوج کا صرف نصف ہے، پورے مہینے کے دوران میں ایک بھی جارحانہ کارروائی کرنے کی کوشش نہیں کرتی۔ پولین کی پوزیشن اس سے زیادہ بدلتا رہتی نہیں سکتی۔ وہ بچی بچی روسی فوج پر دہشت سے حملہ کر سکتا ہے اور اسے نیست و نابود کر سکتا ہے، اپنے حق میں صلح کے لیے مذاکرات کر سکتا ہے اور انکار کی صورت میں پیٹرنز برگ کی طرف کوچ کر سکتا اور اس کے لیے خطرہ بن سکتا ہے اور اگر اس میں کسی وجہ سے ناکامی ہوتی ہے مونسک یا ولنا دیس جاسکتا ہے یا ماسکو میں ہی قیام پذیر رہ سکتا ہے۔ الغرض فرانسیسی فوج اس وقت جس بدلتا پوزیشن میں تھی، اسے برقرار رکھنے کے لیے کسی غیر معمولی عبقریت کی ضرورت نہیں تھی۔ صرف انتہائی سیدھے سارے اور آسان ترین اقدامات اٹھانے جانا چاہیے تھے: عسکریوں کو بوٹ مار کرنے سے روکا جانا، گرم بیوسات اور دیوایا تیار کرائی جائیں (ماسکو میں اتنا کپڑا موجود تھا کہ تمام فوج کی ضروریات پوری ہو سکتی تھیں) اور روس کی فراہمی کا منظم طریقے سے بندوبست کیا جانا (خود ماسکو۔ فرانسیسی بارود بنگو کو سکوا کہتے تھے۔

فرانسیسی مصنفین کا بیان ہے کہ اس وقت ماسکو میں اتنی اشیائے خورد و نوش موجود تھیں کہ چھ مہینے فوج کا گزر رہا ہو سکتا تھا۔ اس کے باوجود نابغوں کے نابینے نیولین نے، جسے مورخین کے دعوؤں کے مطابق فوج پر مکمل کنٹرول حاصل تھا، ان میں سے ایک بھی کام نہ کیا۔

اس نے نہ صرف ان میں سے کوئی کام نہ کیا بلکہ اس کے برعکس اس نے ان راستوں میں سے، جو اس کے سامنے کھلے تھے، صرف وہ منتخب کیا جو انتہائی احمقانہ اور تباہ کن تھا۔

اس کے سامنے متعدد مختلف صورتیں موجود تھیں۔ وہ سر دایاں ماسکو میں گزرا سکتا تھا۔ پیٹرز برگ یا نین بوگور کا رخ کر سکتا تھا یا نسبتاً ذرا زیادہ شمالی یا جنوبی راستہ اختیار کر کے واپس جاسکتا تھا (مثلاً وہ اس سڑک پر، جس پر بعد میں کوٹوزوف اپنی فوج لے گیا، سفر کر سکتا تھا)۔ مگر اس نے حقیقتاً جو کچھ کیا، اس سے زیادہ احمقانہ اور تباہ کن بات کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ وہ اکتوبر تک ماسکو میں پڑا رہا۔ یوں اس نے فوج کو شہر میں موٹ، مار کرنے کا موقع فراہم کیا۔ پھر کچھ جیس جیس کے بعد کہ اسے، ماسکو میں کچھ فوج چھوڑنا چاہیے یا نہیں، وہ شہر سے نکل گیا اور لڑائی لڑے بغیر کوٹوزوف کے قریب پہنچ گیا۔ اس کے بعد وہ دائیں جانب مڑا اور اتنی دور چلا گیا کہ مال یا در سلاطین پہنچ گیا۔ یہاں بھی اس نے نہ غنیم کی صفوں میں شگاف ڈالنے اور نہ اس سڑک کو، جس پر کوٹوزوف نے سفر کیا تھا، اختیار کر کے کوئی کوشش کی، اس کے برعکس وہ موثر سبک سمولنسک سڑک پر پڑ گیا، جو بالکل حصار ہو چکی تھی۔ جیسا کہ انجام کار ثابت ہوا، فوج کے لیے اس سے زیادہ احمقانہ یا ضرر رساں اقدام اور کوئی ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ اگر نیولین کا مقصد اپنی فوج کو غیبت و نابود کرانا تھا، ردی فوج اس ضمن میں کیا کرتی، اسے تو چھوڑیں، حربیات کا ہوشیار زمین، ہر جگہ ایسے اقدامات تجویز نہ کر سکتا جو بے خطا انداز سے اور مکمل طور پر اس مقصد کو پورا کر سکتے۔

نیولین نے، جسے نابغہ روزگار کہا جاتا ہے، یہی کیا۔ لیکن یہ دعویٰ کرنا کہ نیولین نے اپنی فوج اس لیے تباہ کر دی کیونکہ وہ اسے تباہ کرانا چاہتا تھا یا اس لیے کیونکہ وہ انتہائی احمق تھا، اتنا ہی خلاف انصاف ہوگا جتنا یہ ادعا کرنا غلط ہوگا کہ وہ اپنی فوج کو اس لیے ماسکو لایا کہ وہ اسے وہاں لانا چاہتا تھا یا یہ کہ وہ انتہائی ہوشیار اور نابغہ روزگار شخص تھا۔ دونوں صورتوں میں اس کے ذاتی افعال اسی طرح کسی اہمیت سے معرکے سے کسی مصوبی سے معمولی سپاہی کے۔ وہ محض ان قوانین کی، جنہوں نے اس واقعے کا شمعین کیا، متابعت کر رہے تھے۔

جب مورخین یہ کہتے ہیں کہ نیولین کی صلاحیتوں کو ماسکو میں زنگ لگنا شروع ہو گیا تھا (محض اس لیے کیونکہ نتائج نے اس کے افعال کو صحیح ثابت نہیں کیا تھا)، تو وہ بالکل غلط بیانی سے کام لیتے ہیں۔ نیولین نے، جب کہ وہ اس سے پہلے کرنا چلا آیا تھا اور جیسا کہ اس نے بعد میں 1813⁸ میں کیا، اپنی ساری قابلیت اور توانائی اپنی اور اپنی فوج کی بہتری کے لیے صرف کر دی۔ مصر، اطالیہ، آسٹریا اور پریشیا کی طرح اس کی یہاں بھی کارروائیاں کم تھیں کہ نہیں تھیں۔ تاہم ہم یقین کے ساتھ یہ بات نہیں کہہ سکتے کہ مصر میں۔ جہاں چالیس صدیاں⁹ اس کے شکوہ و جلال کا مشاہدہ کر رہی تھیں۔ اس کی عبقریت کس حد تک بے عیب تھی کیونکہ وہاں اس نے جتنے بھی کارنامے سر انجام

دیے، وہ کلہم صرف فراسیسوں نے بیان کیے ہیں۔ ہم آسٹریا اور پریشیا میں اس کی عبقریت کا ہی کہہ نہیں کر سکتے کیونکہ ہمیں اپنی معدومات کے لیے قرآنسیسی یا جرمن مہاور پر انحصار کرنا پڑتا ہے اور جب پوری کور کی قسم کا مقابلہ کیے بغیر ناقابل فہم انداز سے سپر انداز ہو جاتی ہو اور محاصرہ بھی نہ ہو، پھر بھی قلعوں کے قلعے اس کے رحم و کرم پر چھوڑ دیے جاتے ہوں، پھر جرمنوں کو لایا کہ اس جنگ کی، جوان کی سرزمین پر بڑی گئی، توضیح کے لیے اس کی عبقریت کو تسلیم کرنا ہی پڑے گا۔

لیکن خدا کا شکر ہے کہ ہمارے لیے پنی خجالت کی پردہ پوشی کے لیے اس کی عبقریت کو تسلیم کرنا ضروری نہیں ہے۔ ہم نے اس معاملے کا سیدھے سادے اور راست نما انداز سے جائزہ لیے کی قیمت چکانی ہے اور ہم اس حق سے دست بردار نہیں ہوں گے۔

ماسکو کے قیام کے دوران میں اس نے جو کچھ کیا، وہ اتنا ہی تحیر انگیز اور پرازدہانت تھا جتنے کہ کسی اور مقام پر اس کے افعال تھے۔ داخلے کے دن سے رو، گئی کی گھڑی تک وہ حکم پر حکم دیتا رہا اور منصوبے پر منصوبہ بناتا رہا۔ شہر کے باشندوں یا کسی وفد کی عدم موجودگی اس کے حوصلے پست نہ کر سکی۔ مسئلہ اپنی فوج کی بہبود کا ہوا اپنے دشمنوں کی کارروائیوں کا، روسی عوام کی فلاح کا ہوا پیرس میں معاملات کی دیکھ بھل کا، یا متوقع امن کی شرائط سے متعلق متفصیلات کا، اس کی نظروں سے کچھ بھی اور جھل نہیں تھا۔

9

جہاں تک عسکری امور کا تعلق ہے، نیپولین نے ماسکو میں داخل ہونے کے معاہدہ جنرل سیاسی تائی کو روسی فوج کی نقل و حرکت پر نظر رکھنے کے لیے سخت احکام دیے، مختلف شاہراہوں پر فوجی کوریں روانہ کیں اور کوٹورڈف کو ڈھونڈنے کا فریضہ موعا کے سپرد کیا۔ پھر اس نے کریملن کے دفاع کو مضبوط بنانے کے لیے سوچ سمجھ کر ہدایات دیں اور اس کی ساری سرزمین پر مستقبل کی جنگ لڑنے کا شاندار منصوبہ بنایا۔

جہاں تک سفارتی امور کا تعلق ہے، اس نے کیپٹن یا کوولیف کو بجایا (کیپٹن یا کوولیف کو لوٹ لیا گیا تھا۔ وہ چھتھروں سے بدن ڈھانپے پھر رہا تھا۔ وہ ماسکو سے ٹکنا چاہتا تھا لیکن اس کی سمجھ میں نہیں رہا تھا کہ کیسے؟) اور اس کے سامنے، پنی پالیسی اور نیاضی پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔ امپراٹور الیکساندر کے نام ایک مکتوب تحریر کیا جس میں اس نے اپنے دوست اور بھائی کو یہ بتانا اپنا فرض گردانا کہ رستوپ چین ماسکو کے امور سلطنت سے نٹنے میں کام رہا ہے اور یا کوولیف کو پیٹرز برگ روانہ کر دیا۔

پھر اس نے اسی طرح اپنے خیالات اور درباری کی وضاحت مٹھمن¹² کے سامنے کی اور اس بوڑھے شخص کو بھی مذاکرات کے لیے پیٹرز برگ بھیج دیا۔

اس کے بعد اس نے اپنی توجہ قانونی اور عدالتی امور کی طرف مبذول کی۔ مختلف مقامات پر آگ بھڑکنے

کے واقعات رونما ہو رہے تھے۔ اس نے فوراً حکم دیا کہ بحرموں کو تلاش کیا جائے، اور انھیں کون مار دی جائے۔ شریپندر ستوپ جن کو یہ سزا ملی کہ اس کے ذاتی مکان کو نذر آتش کر دیا گیا۔

انتظامی امور کے سلسلے میں اس نے ماسکو کو آئین عطا کیا اور اس کے حکم پر شہر میں بلدیہ کا قیام عمل میں لایا گیا۔ اس کے بعد اس نے مندرجہ ذیل اعلان جاری کیا

ماسکو کے شہریو!

آپ کے مصائب گہم ہیں لیکن ہر میچکشی دی اسپر رائنڈ کنگ ان کا خاتمہ کرنے کے متنبی ہیں۔ بہت نامک مشاغل نے آپ پر یہ واضح کر دیا ہوگا کہ وہ حکم عدولی اور جرم کی کیا سرادبے ہیں۔ بدلتی ختم کرنے اور عامتہ مناس کو تحفظ فراہم کرنے کے لیے سخت اقدامات کیے گئے ہیں۔ خود آپ میں سے بدلتی انتظامیہ منتخب کر لی گئی ہے۔ اسی انتظامیہ پر آپ کی بلدیہ یا شہری حکومت مشتمل ہوگی۔ یہ آپ کا خیال رکھے گی اور آپ کی ضروریات اور آپ کے مفادات کی نگرانی کرے گی۔ اس کے ارکان کا اختیاری نشان سرخ رہن ہوگا۔ یہ شانوں کے آر پار پہنا جائے گا، اور شہر کا میئر سفید کمر بند بھی استعمال کرے گا۔ تاہم جب یہ ارکان ڈیوٹی پر نہیں ہوں گے وہ سرخ رہن صرف ہائیکم بازو پر پہنیں گے۔

شہر کی پولیس سابقہ نظام کے مطابق ہی منظم کی گئی ہے اور اس کی چوکی کی بدولت امن و امان کی صورت حال پہلے ہی بہتر ہو گئی ہے۔ حکومت نے دو کمشنر جنرل یا پولیس چیف مقرر کیے ہیں۔ شہر کے مختلف وارڈوں میں میں کمشنر یا پولیس انسپکٹر تعینات کیے گئے ہیں۔ آپ ان کی شناخت، سفید رہن سے کر سکیں گے جو وہ اپنے ہائیکم بازو کے گرہ پر نہیں گئے۔ مختلف مسالک کے متعدد گرہے گھلے ہیں اور اس میں مذہبی رسوم و عبادت کی ادائیگی کا سلسلہ بلر دک ٹوک جاری ہے۔ آپ کے شہر کے باشندے ہر روز اپنے گھروں کو واپس آ رہے ہیں اور انھیں امداد اور تحفظ فراہم کرنے کے احکام جاری کیے جا چکے ہیں کیونکہ ان کے مصائب نے انھیں ان کا مستحق بنادیا ہے۔ حکومت نے یہ اقدامات شہر میں امن و امان کی بجائے اور آپ کے حاحات کو ستوارنے کی غرض سے کیے ہیں۔ اور اس مقصد کے حصول کے لیے یہ ضروری ہے کہ آپ اپنی کوششوں سے انھیں تقویت پہنچائیں۔ ممکن ہو تو ان مصائب کو جو آپ کو اٹھانا پڑے ہیں، بھول جائیں اور یہ امید کریں کہ قسمت آپ پر پہلے کی نسبت کم سختی کرے گی۔ آپ یقین کریں کہ ان لوگوں کو جو آپ کی جانوں اور بچے کھچے مال و اسباب کو نقصان پہنچانے کی کوشش کریں گے، انھیں لازماً اٹل اور شرمناک موت کا سامنا کرنا پڑے گا اور آخری بات یہ ہے کہ آپ کے اذہان میں اس بارے میں قطعاً کوئی شک و شبہ نہیں ہونا چاہیے کہ ان (جان و مال) کا ہر قیمت پر تحفظ کیا جائے گا کیونکہ یہ عظیم ترین اور منصف ترین فرماں رواں کا منشا ہے۔ سپاہیو اور شہریو! آپ کا تعلق خواہ کسی بھی قوم سے ہو۔ عوامی اعتماد (کی انصاف) جو

کسی بھی مملکت کی خوش حالی کا طبع ہوتا ہے، دوبارہ قائم ہو جانے دیں۔ بھائیوں کی طرح رہیں، ایک دوسرے کی امداد کریں اور ایک دوسرے کو تحفظ فراہم کریں، بد معاشرے کے عزائم کو خاک میں ملانے کے لیے متحد ہو جائیں۔ فوجی اور سول حکام کے احکام کی تعمیل کریں اور بہت جلد آپ کے انسور بہتا بند ہو جائیں گے۔

جہاں تک فوج کا تعلق ہے، نیپولین نے حکم دیا، کہ وہ ماسکو میں باری باری داخل ہوں، لوٹ مار کریں اور اشیائے خور و نوش اکٹھی کریں تاکہ بعد میں فوج کی ضروریات پوری کی جاسکیں۔

مذہب کے بارے میں نیپولین نے حکم دیا کہ پادریوں کو واپس لایا جائے اور گرجا گھروں میں عبادت کا سلسلہ بحال کروایا جائے۔

تجارتی سرگرمیاں بحال کرنے اور فوج کو رسد پہنچانے کے سلسلے میں مندرجہ ذیل اعلان جگہ جگہ چپاں کر دیا گیا۔

اعلان

ماسکو کے امن پسند شہریو، دست کار و اور محنت کشو، جنہیں ملک شہیدہ ہارنے گھیر گھاؤ کر شہر سے باہر دھکیل دیا اور دھرتی کے تر بتر کاشت کارو، جنہیں بے جا خوف و ہراس اپنے کھیتوں کے قریب نہیں آنے دیتا، سنو! اس دارالسلطنت میں امن و سکون بحال ہو رہا ہے اور نظم و نسق دوبارہ قائم کیا جا رہا ہے۔ یہ احساس کرتے ہوئے کہ ان کے ساتھ عزت و احترام کا سلوک ہو رہا ہے، آپ کے ہم وطن بڑے اعتماد کے ساتھ اپنی بنیاد گاہوں سے باہر آرہے ہیں۔ ان کے یا ان کے اسوال کے خلاف جو بھی تشدد و تشدد کا رویہ ہوتا ہے، اس پر فی الفور توجہ دی جاتی ہے اور اس قسم کی حرکت کے مرتکبوں کو بلا تامل خیر سزا دی جاتی ہے۔ ہر میچل ڈمپر و پنڈنگ اس کا تحفظ کرتے ہیں، اور آپ میں سے کسی کو بھی، سوائے ان کے جو ان کے احکام کی خلاف ورزی کرتے ہیں، اپنا دشمن نہیں سمجھتے۔ وہ آپ کے مصائب و آلام کا خاتمہ کرنے اور آپ کے گھربار اور خاندان آپ کو لوٹانے کے خواہش مند ہیں۔ چنانچہ ان کے فیض رساں اقدامات کو عمل جامہ پہنانے میں ہاتھ بٹائیں اور بلا خوف و خطر ہمارے پاس چلے جائیں۔ شہر یو، پورے اعتماد کے ساتھ اپنے گھروں میں واپس آ جائیں، آپ کو بہت جلد اپنی ضروریات پوری کرنے کے ذرائع میسر آ جائیں گے! جفاکش کارمگر و اور پیشہ ور، اپنے اپنے کام پر لوٹ آئیں، آپ کی دکانیں، درمکان، جن کی گادیں حفاظت کر رہی ہیں، آپ کا انتظار کر رہے ہیں اور آپ کو آپ کی محنت کا پورا پورا معاوضہ دیا جائے گا۔ اور کسانو، آپ بھی جنگوں سے، جہاں آپ دہشت کے سبب پیچھے ہوئے ہیں، کسی قسم کے اندیشے میں مبتلا ہوئے بغیر اپنے گھروں میں واپس آ جائیں۔ یقین رکھیں، سبب چھپے ہوئے ہیں، کسی قسم کے اندیشے میں مبتلا ہوئے بغیر اپنے گھروں میں واپس آ جائیں۔ یقین رکھیں، آپ کو مکمل تحفظ فراہم کیا جائے گا۔ شہر میں منڈیاں قائم کر دی گئی ہیں اور کسان اپنے فالتو ذخائر اور پیداوار

وہاں لاسکتے ہیں۔ یہ کہ انہی نروخت کی پوری آزادی حاصل ہو، حکومت نے مندرجہ ذیل اقدامات کیے ہیں۔

1۔ آج کے دن سے کسانوں، کاشتکاروں، دیہاتوں اور ماسکو کے مضافات کے باشندوں کو درمیرہ

منڈیوں—ماخوذ یا سٹریٹ اور پوسٹل مارکیٹ—میں بد خوف و خطر ہر قسم کی اشیاء لانے کی اجازت ہوگی۔

2۔ اس سے شیا کی قیمتوں پر جن پر فروخت کنندہ روزیداروں کو متفق ہوں گے، خریدی جائیں گی۔ تاہم اگر

فروخت کنندہ کو مناسب قیمت نہ ملے، اسے جواروں کی اپنی شیا اپنے گاؤں واپس سے جانے کی اجازت ہوگی۔

3۔ ہر ہفتے اتوار اور بدھ کے روز بڑی منڈیاں لگائیں گی۔ ان ایام میں چٹکڑوں کی حفاظت کے لیے تھر سے

باہر مناسب فی صوبہ پر کافی تعداد میں فوجی دستے تعینات کیا جائیں گے۔ 4۔ منڈیوں کے اختتام پر بھی اسی

قسم کے اقدامات کیا جائیں گے تاکہ کسانوں ان کے گھوڑوں اور گاڑیوں کو واپسی کے سفر کے دوران میں

کسی نوع کی دقت کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ 5۔ عام تجارت کی بحالی کے لیے فوری اقدامات کیے جائیں گے۔

شہر و دیہاتوں کے باسیوں، کاریگر و اور پیشہ ور، آپ کا تعلق خواہ کسی بھی قوم سے ہو۔ آپ سے

بیدرخواست کی جاتی ہے کہ آپ ہر منجیٹی اسپر رائیڈ کنگ کے پدرانہ منصوبوں کو عملی شکل دیں اور عوامی بھلائی

کے مقصد کو آگے بڑھانے میں ان کا ہاتھ بنائیں۔ اپنا احترام و اعتماد ان کے قدموں میں بچھا دیں اور

ہمارے ساتھ ایک جمہوری کی فتنہ تخلیق کرنے میں کسی قسم کی سستی نہ کریں۔

عسکریوں و رعایت الناس کے جوصلے بلند کرنے کے لیے فوج کا باقاعدگی سے معائنہ کیا جاتا، سماجی لی جاتی اور اعزازات تقسیم کیے جاتے۔ شہریوں کی ڈھارس بندھانے اور ان کی رل جوئی کرنے کے لیے امپراطور گھوڑے پر گلی کو چوں کے چکر لگاتا اور سرکاری امور میں مشغولیت کے باوجود تھیٹروں میں، جو اس کے حکم پر قائم کیے گئے تھے، ڈرامے دیکھنے جاتا۔

جہاں تک مختیر کاموں کا، جو فرماں رواؤں کا اعلیٰ ترین وصف سمجھتے جاتے ہیں، تعلق ہے، پولین ان میں بھی کسی سے پیچھے نہیں تھا ورنہ سب کچھ، جو اس کے بس میں ہوتا، لازماً کرتا تھا۔ اس نے خیراتی اداروں پر الفاظ ¹³ Maison de ma Mere کتدہ کرا دیے۔ یوں اس نے فرماں روا کی فیاضی کا رشتہ فرزندانہ سعادت مندی سے جوڑ دیا۔ وہ لقیط خانے ¹⁴ گیا اور جن یتیم بچوں کی جائیں اس نے بچی کی تھیں، انہیں اپنے سفید ہاتھ جوڑنے کی اجازت مرحمت فرمائی۔ اس نے طوطیوں کے ساتھ باتیں کیں اور اس نے، جیسا کہ تیغ فصاحت کے دریا بہاتے ہوئے لکھتا ہے، حکم دیا کہ فوجیوں کو جعلی روپی کرنسی میں، جو اس نے تیار کرائی تھی، ادائیگی کی جائے۔

انک ایسے فعل سے، جو خود اس کے دور فرانسسی فوج کے شایاں شل تھا، ایسے اقدامات کو مؤثر بناتے ہوئے

میں یہ عمارت اپنی ماں کے نام منسوب کرتا ہوں۔

اس نے ان لوگوں میں جن کے گھربار بھسم ہو گئے تھے، امداد تقسیم کرائی۔ لیکن چونکہ خوراک اتنی بیش بہا نہ تھی کہ اس سے غیر ملکیوں کو، جو زیادہ تر دشمنوں پر مشتمل تھے، نواز نہیں جاسکتا تھا، بیروین نے انہیں رقوم فراہم کرنے کو ترجیح دی تاکہ وہ ان سے باہر سے اشیائے خورد و نوش خرید سکیں اور یوں ان میں کاغذ کے روٹل ہانٹ دیے گئے۔

جہاں تک عسکری امور کا تعلق ہے، فوجی فرائض سے غفلت برتنے اور لوٹ مار کرنے والوں کو سخت سزا دی گئی ہے۔

10

لیکن یہ بات بہت عجیب معلوم ہوتی ہے کہ یہ اقدامات، کوششیں اور منصوبے۔ اس قسم کے حالات میں ان سے ملتے جلتے جرائمات اور مساعی کی جاتی ہیں اور جو منصوبے بنائے جاتے ہیں، یہ ان سے کسی طرح فروز نہیں ہے۔ اصل معاملے پر کسی طرح، اثر انداز نہ ہو سکے۔ ان کا حال گھڑیوں کی اس سرینوں کی طرح تھا، جس کا اگر ڈائیل کے نیچے مشینری سے رابطہ منقطع کر دیا جائے، تو وہ چرخوں کو مصروف کیے بغیر بے مقصد اور امن مانے طریقے سے گھومتی رہتی ہیں۔

جہاں تک عسکری مسائل کا تعلق ہے، گو اس کے منصوبے کو باقیہ روزگار شخص کی تحقیق کہا جاتا ہے اور نتائج کے متعلق بدیں الفاظ اظہار خیال کرتا ہے: ”اس کی عبقریت نے اس سے زیادہ عمیق، دانش مندانہ اور قابل تحسین چیز کبھی وضع نہیں کی تھی۔“ اور وہ یہ ثابت کرنے کے لیے کہ عبقریت کے اس شہکار کو چار اکتوبر سے نہیں بلکہ سول اکتوبر سے منسوب کرنا چاہیے، موسیو فین¹⁵ کے ساتھ مناظرے میں الجھ جاتا ہے۔ اس منصوبے پر نہ تو کبھی عمل ہوا اور نہ ہو سکتا تھا کیونکہ یہ صورت حال کے حقائق سے کوئی تعلق نہیں رکھتا تھا۔ کہ مجلس کے ذریعہ کو مصبوط بنانے کا منصوبہ، جس کی خاطر *la Mosquée* (جیسا کہ نیولین داسیلی بلاڈینی کلیسا کو پکارتا تھا) کو زمین بوس کیا جاتا تھا، بالکل ہی بیکار ثابت ہوا۔ کہ مجلس کے نیچے سرنگ بچھانے سے صرف اتنا ہوا کہ نیولین کی جو یہ خواہش تھی کہ جب ہاسکوس اس کی روانگی عمل میں آئے، کہ مجلس کو دھماکوں سے اڑا دیا جائے گا، پوری ہو گئی۔ اس کا رویہ بالکل اس نیچے کا تھا، جو چاہتا ہے کہ جس فرش پر گرنے سے وہ زخمی ہوا ہے، اس کی خوب پٹائی کی جائے۔ روسی فوج کے تعاقب کرنے کا، جس کی نیولین کو اتنی فکر تھی، وہ نتیجہ برآمد ہوا جس کی ڈھونڈنے سے مثال نہیں ملتی۔ فرانسیسی جرنیلوں کا ساتھ ہزار افراد پر مشتمل (روسی) فوج سے رابطہ منقطع ہو گیا اور وہ اس کا اتنا چاٹا معلوم کرنے میں بری طرح ناکام ہوئے۔ اور نتائج کے بقول بالآخر موغا کی مہارت، اور بظاہر عبقریت، اسی کام آئی اور ساتھ ہزار افراد کی فوج یوں ڈھونڈ لی جیسے مٹاس

کے ڈھیر میں سے سوئی تلاش کی جاتی ہے۔

رے سفارتی امور، نیو یارک کے تمام دسٹریکٹس نے طلبہ امن اور یا کوولیف (جس کی سب سے بڑی خواہش یہ تھی کہ اسے کسی طرح اور رکاوٹ اور سواری مل جائے)، دونوں کے ساتھ بڑا فیاضانہ اور منصفانہ سلوک کیا تھا، دھڑے کے دھڑے رہ گئے۔ ایک سالہ اندر نے نہ تو ان ایلیٹیوں سے مذاقات کی اور نہ اس پیغام کا، جو یہ لائے تھے، کوئی جواب دیا۔

مطلوبی امور کا حال یہ ہے کہ بلڈ یہ کے قیام کے باوجود لوٹ مار کی روک تھام نہ کی جاسکی اور اس کا فائدہ ان محدودے چند اشخاص کو ہوا جو اس بلڈ یہ میں کام کرتے تھے۔ وہ نظم و نسق بچا کر کے بہانے خود ہاسکو میں لوٹ مار کرنے لگے اور اپنی جائیدادوں کا تحفظ کرنے میں کامیاب ہو گئے۔

جہاں تک مذہبی امور کا تعلق ہے، مصر میں پولین کے مسجد میں جانے سے منع آسانی سے مل گیا تھا۔ یہاں اس قسم کے کوئی نتائج برآمد نہ ہوئے۔ دو تین پادریوں نے، جو ہاسکو میں مل گئے تھے، پولین کی خواہشات کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کی لیکن ان میں سے ایک کے، جب وہ عبادت گزار ہاتھ، ایک فرانسیسی سپاہی نے تھنر دے مارا اور دوسرے کے بارے میں ایک فرانسیسی فسر نے رپورٹ دی: ”مجھے جو پادری ملا، میں نے اسے دعائے عثمانیہ ربانی پڑھنے کی دعوت دی۔ اس نے گرجے کی صفائی کی اور اسے متقل کر دیا۔ اسی رات دروازے دوبارہ زبردستی کھولے گئے، قفل توڑ دیے گئے، کتابیں پھاڑ دی گئی اور اسی قسم کی دیگر تخریبی کارروائیوں کی گئیں۔“

تجارت کا یہ حشر ہوا کہ جفاکش کارمگروں اور کسانوں کے نام جو اعلان نامہ جاری ہوا، اس کا کوئی جواب نہ ملا۔ جفاکش کارمگروں کا تو کہیں نام و نشان بھی نہ ملا اور کسان ان کمشنروں پر، جنہوں نے اپنے اعلان ناموں کے ساتھ شہر سے خاصی دور باہر جانے کی جرأت کی، بل پڑے اور ان کی نکال پٹی کر ڈالی۔

عوام اور سپاہ کی تفریح کے لیے جو تھیمز شروع کیے گئے، انھیں بھی کوئی کامیابی نہ ہوئی۔ جو تھیمز کریمین، اور پوزنیا کوف ہاؤس میں قائم کیے گئے تھے، انھیں فوراً بند کرنا پڑا کیونکہ اداکاروں اور اداکاروں کو لوٹنے کا سلسلہ چل نکلا تھا۔

مختیرانہ کارروائیاں بھی مطلوبہ نتائج حاصل کرنے میں ناکام رہیں۔ اصلی اور جعلی کاغذی نوٹ، جن کی ہاسکو میں بھرمار ہو گئی تھی، اپنی قدر و قیمت کھو بیٹھے۔ جو فرانسیسی مال غنیمت سمیٹنے میں مصروف تھے، انھیں سونے کے علاوہ کسی اور چیز سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ نہ صرف یہ کہ جعلی نوٹوں کی، جنہیں پولین نے اتنی دریاوی سے ضرورت مندوں تقسیم کیا تھا، کوئی قدر و قیمت نہیں تھی، سونے کے مقابلے میں چاندی بھی اپنی معیاری قیمت کھو بیٹھی۔

یہ کہ حکام جو احکام جاری کرتے تھے، وہ قطعاً غیر موثر ثابت ہوتے تھے، اس کی اچھی سی مثال دینے والی مثال یہ ہے کہ پولین کی کوششوں کے باوجود لوٹ مار کا سلسلہ جاری رہا اور نظم و نسق بھی بحال نہ کیا جاسکا۔ فوجی حکام نے جو رپورٹیں پیش کیں، ان میں سے چند ایک مندرجہ ذیل ہیں۔

لوٹ اور دکنے کے احکام کے باوجود اس کا سلسلہ جاری ہے۔ نظم و نسق ابھی تک بحال نہیں ہو سکا اور کوئی تاجر بھی ایسا نہیں ملے گا جو جائز طریقے سے کاروبار کرتا ہو۔ صرف لشکر کے بنے کاروبار چلانے کی جرأت کرتے ہیں اور وہ سرحد مال فروخت کرتے ہیں۔

میرے وارڈ میں تیسری کور کے سپاہیوں کی لوٹ مار جاری ہے۔ بدقسمت باشندے تہہ خانوں میں چپے ہوئے ہیں، وہ ان کی ہتھیاری اشیا لوٹنے پر ہی اکتفا نہیں کرتے بلکہ تکی سنگدلی کا مظاہرہ کرتے ہیں کہ انہیں اپنی شمشیروں سے زخمی بھی کر جاتے ہیں۔ میں نے اس قسم کے متعدد واقعات اپنی آنکھوں سے دیکھے ہیں۔

سوئے اس کے کہ سپاہی لوٹ مار کر رہے ہیں، اور کوئی اطلاع نہیں ہے۔ 9، کتوبر

قزاقی اور لوٹ مار کا سلسلہ جاری ہے۔ ۱۱ مارے وارڈ میں چوروں کا گروہ مصروف عمل ہے۔ ان کا طاقت سے قلع قمع کیا جانا ضروری ہے۔

امیرا طور اس بات پر بے حد ناراض ہیں کہ لوٹ مار کی ممانعت کے سخت احکام کے باوجود ٹھیرے گارڈز مسلسل کریملن کی جانب آتے دکھائی دے رہے ہیں۔ گزشتہ شب اور اس دور اولڈ گارڈز نے جس لاکھنویت کا مظاہرہ کیا اور لوٹ مار کی جو حرکات کیں، وہ پہلے کی نسبت کہیں زیادہ تھیں۔ امیرا طور کو یہ کچھ کرانہائی ملال ہو رہا ہے کہ ان کی حفاظت کے لیے جو منتخب سپاہی متعین کیے گئے تھے اور جنہیں دوسروں کے سامنے نظم و ضبط کی مثال پیش کرنا چاہیے تھی، اس حد تک نافرمانی کرنے لگے ہیں کہ جن تہہ خانوں اور گروہوں میں فوج کے لیے رسد رکھی جاتی ہے، وہ ان کے بھی تالے توڑ لیتے ہیں۔ دوسرے اس حد تک خطرات کے گروہوں میں گر چکے ہیں کہ وہ پہرے پر ماسور سنتریوں اور افسروں کے حکام کی تعمیل کرے سے انکار کر دیتے ہیں وہ ان کے ساتھ دشنام طراری کرنے اور انہیں مارنے پیٹنے سے بھی گریز نہیں کرتے۔

محل کے کریڈٹ مارشل نے (گورنر نے تحریر کیا) سخت شکایت کی ہے کہ بار بار منع کرنے کے باوجود سپاہی تمام احاطوں میں بلکہ امیرا طور کے در پہلوں کے سامنے بھی حوائج ضروریہ سے فارغ ہوتے رہتے ہیں۔

یہ فوج، ان سویٹشوں کے ریوڑ کی مانند تھی جو رسد ترا کر بھاگ اٹھتے ہیں اور دین گھاس اور چاراء جو انہیں فائدہ بخشی سے بچا سکتا ہے، پاؤں تلے روند ڈالتے ہیں۔ جوں جوں ماسکو میں اس کے قیام کا عرصہ راز ہوتا جا رہا تھا، توں توں اس کا شیرازہ بکھرتا جا رہا تھا اور وہ اپنی طاقات سے محروم ہوتی جا رہی تھی۔

لیکن یہ وہاں سے ہلی نہیں۔ اسے فرار کی صرف اسی وقت سوجھی جب سولنسک شاہراہ پر اس کی باربرداری کے گازیوں کے پکڑے

جانے اور تاروتیو میں معرکہ پہ ہونے کی خبروں سے اس میں خوف و ہراس پھیل گیا۔ تاروتیو کی لڑائی کی خبر غیر متوقع طور پر نیولین کو اس وقت ملی جب وہ فوجی دستوں کا معائنہ کرنے میں مصروف تھا۔ اس اطلاع نے جیسا کہ تیج ہمیں بتاتا ہے، اس کے دل میں روسیوں کو سزا دینے کی خواہش بیدار کر دی اور اس نے جیسا کہ ساری فوج مطالبہ کر رہی تھی، روانگی کا حکم جاری کر دیا۔

ماسکو سے فرار کے وقت فوجی، پناہ سارا ماں غنیمت اپنے ساتھ لے گئے۔ نیولین نے بھی پناہ والی (resort) اپنے ساتھ لے جانا تھا۔ مال و اسباب سے لدے پھندے چھکڑوں کو دیکھ کر، جو فوج کی آزادانہ نقل و حرکت میں رکاوٹ بن رہے تھے، (بقول تیج) نیولین پر جیت طاری ہو گئی۔ تاہم اپنے تمام تر جنگی تجربے کے باوجود اس نے فوجی چھکڑوں کو نذر آتش کرنے کا حکم نہ دیا حالانکہ ماسکو کی طرف کوچ کے دوران میں وہ ایک خاص مارشل کے چھکڑوں کے ساتھ اس قسم کا سلوک کر چکا تھا۔ وہ کالاشن اور عام گاڑیوں کو، جن پر فوجی سوار تھے، دیکھتا اور کہتا: ”یہ تو بہت اچھی بات ہوئی۔ یہ گاڑیاں سامانِ رسد، بیماروں اور زخمیوں کو لے جانے میں، ستمیں ہو سکتی ہیں۔“

اس فوج کی حالت اس زخمی درندے کی حالت سے مشابہ تھی جسے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی آخری گھڑی پہنچی ہے لیکن جسے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ وہ کر کیا رہا ہے۔ نیولین اور اس کے فوجیوں کے ماسکو میں داخل ہونے اور ان کے تباہی کے غار میں گرنے کے درمیانی وقفے کے دوران میں ان کی چالوں اور مقاصد کا مطالعہ کرنا مہلک طور پر زخمی درندے کی اچھل کود اور کپکپاہٹ کا مطالعہ کرنے کے مترادف ہے۔ جب زخمی درندے کو سربراہٹ سائی دیتی ہے، کثرت اوقات وہ سیدھا شکاری کی بندوق کی طرف بھاگتا ہے، آگے لپکتا ہے، پیچھے ہٹتا ہے اور یوں خود ہی برقی رفتار سے اپنے انجام کو قریب سے آتا ہے۔ نیولین پر جب ساری فوج کا دباؤ پڑا، تو اس نے یہی کیا۔ تاروتیو کی لڑائی کی سربراہٹ نے درندے کو خوف و ہراس میں مبتلا کر دیا اور وہ سرعت رفتار سے گولی کی طرف بھاگا، شکاری کے قریب پہنچا، واپس مڑا، پھر آگے بھاگا اور دوپہرہ واپس مڑا، اور کسی بھی جنگلی درندے کی طرح اس ناموافق اور پرخطر راستے پر چل پڑا، جو شکاری کا جاننا پیچھا تھا اور جہاں وہ آسانی سے اس کی پوسنگھ کر اس کی موجودگی کا پتا لگا سکتا تھا۔

اس تمام عرصے کے دوران میں نیولین نے، جسے ہمارے سامنے اس ساری نقل و حرکت کے قائد کے طور پر پیش کیا جاتا ہے (یعنی اس طرح جس طرح جہاز کے اگلے حصے پر نصب چوہی بمسردہ شیوں کو اس کا ناخدا معلوم ہوتا ہے)، اس بچے کا رویہ اپنائے رکھا جو گاڑی کے اندر لگی بیٹی کو بکڑ کر یہ سمجھنے لگتا ہے کہ وہی گاڑی چلا رہا ہے۔

چھ اکتوبر کو صبح سویرے جیٹر سائبان سے باہر آیا، واپس مڑا، دروازے کے قریب رکا اور ایک کتیا کے ساتھ، جس کا نڈکوتا، جسم لمبا، رنگ تقریباً آدھا، ٹانگیں چھوٹی اور گھٹنوں کے قریب ڈرامیز تھیں، چہلیں کرنے اور کھیلنے رک

عیا۔ کیا اس کے ارد گرد اچھل کود کر رہی تھی۔

اس منحنی کتیا نے ان کے ساتیوں میں ڈیڑا ڈال دیا تھا اور وہ رات کو کاراٹائی کے قریب سوتی تھی۔ مگر چودہ بعض اوقات شہر میں منہ گشت کرنے نکل پڑتی تھی لیکن وہ ہمیشہ اپس آ جاتی تھی۔ اس کا غاٹا کبھی کوئی، لک نہیں تھا اور نہ اب تھا اور نہ اس کا کوئی نام تھا۔ فرانسیسی اسے azor قصہ گو سپاہی Femgalka، اور کاراٹائی اور دوسرے Grey یا Floppy کہتے تھے۔ یہ بات کہ اس کا نہ کوئی، لک تھا، نہ نام، نہ نسل اور نہ کوئی خاص رنگ، اس خیر بآوردی کتیا کو قطعاً پریشان نہیں کرتی تھی۔ اس کی روئیں دار دم کلنی کی طرح دائرہ بنائے سیدھی کھڑی رہتی تھی۔ اس کی میڑھی میڑھی ٹانگیں اس کے اتنے تسلی بخش طریقے سے کام آتی تھیں کہ وہ اکثر اوقات اپنی ایک کھچلی ٹانگ بڑی آن اور عنائی سے اوپر اٹھ لیتی اور اپنی بقایا تین ٹانگوں پر یوں آسانی سے اور تیزی سے ادھر ادھر بھاگتی پھرتی جیسے اسے اپنی چاروں ٹانگیں استعمال کرنے سے عار آتی ہو۔ وہ ہر چیز سے محفوظ ہونے کا طریقہ ڈھونڈ لیتی۔ کبھی وہ خوشی سے سنناں قلاباریاں کھاتی پھرتی، کبھی سجدہ اور پر فکر صورت بنائے دھوپ سینکے لگتی، کبھی کوئی لکڑی کا کڑا یا تنکا ٹھاتی اور اس کے ساتھ کھیلنا شروع کر دیتی اور کبھی یونہی کہ کڑے لگاتی پھرتی۔

بیکر کا لباس اب غلط، بوسیدہ ورتا رہا تھا (یہ اس کی اپنی سابقہ پوشاک کی واحد بچی بچی نکالی تھی)، فوجی ہتھکڑیاں، جس کے پانچوں پردہ حرارت حاصل کرنے کی غرض سے کاراٹائی کے مشورے پر ہی باندھ دیا تھا، اور دیہاتی کوٹ وٹوپی پر مشتمل تھا۔ اس عرصے کے دوران میں جسمانی اعتبار سے بیکر میں کافی تبدیلیاں رونما ہو گئی تھیں۔ اگرچہ وہ اب بھی خاصا تنومند اور توانا نظر آتا تھا کہ یہ نصف اسے خاندان سے ورثہ ملا تھا لیکن وہ اب پہلے کی طرح کیم کیم نہیں تھا۔ واڑھی اور مونچھوں نے اس کے چہرے کے زریں حصے کو ڈھاپ لیا تھا اور اس کے لائے، ڈالیدہ ہال، جن میں جوئیں ہی جوئیں تھیں، اس کے سر کے گرد یوں بٹے رہتے تھے جیسے اس نے ٹوپی، اوڑھ رکھی ہو۔ اس کی آنکھوں میں عزم اور سکون جھلکے لگاتے۔ معلوم ہوتا تھا کہ اب وہ جاندار انداز سے چوکس ہیں۔ ماضی میں اس کی آنکھوں نے کبھی اس قسم کا تاثر نہیں دیا تھا۔ پہلے انھیں دیکھ کر ہی محسوس ہوتا تھا کہ یہ شخص کامل اور مست الوجود ہے مگر اب یوں دکھائی دینے لگا تھا کہ وہ عمل اور مدافعت کے لیے آ رہا ہے اور اس میں اس کی اہمیت بھی ہے۔ اس کے پاؤں ننگے تھے۔

بیکر کبھی اپنے سامنے میدان کو، جس میں اس روز گاڑیاں اور سوار گزر رہے تھے، دیکھنے لگا، اور کبھی اس کی نظریں دریا کے پار اٹھ پر ٹک جاتیں۔ پھر وہ کتیا کا، جو اسے جھوٹ موت کاٹنے کا ڈرامہ رچا رہی تھی، جائزہ لینے لگتا۔ پھر اپنے برہنہ پاؤں کا، جنھیں وہ خوشی کے عالم میں کبھی ادھر ادھر کبھی ادھر منتقل کرنا چاہتا تھا، اور ان کے غلط موڑنے انگوٹھوں کا مشاہدہ کرتے لگتا۔ وہ جب بھی اپنے ننگے پاؤں دیکھتا، اس کے چہرے پر شرمیلی اور شگفتگی نمودار ہو جاتی۔ اپنے برہنہ پاؤں کو دیکھ کر اسے وہ سب کچھ، جس کا اسے ان ہتھکڑیوں کے دوران میں تجربہ ہوا تھا، اور جو اس نے سیکھا تھا یاد آ جاتا اور اس کی یہ یادیں اس کا دل خوش کر دیتیں۔

گزشتہ چند روز سے موسم معتدل اور مطلع صاف چلا آ رہا تھا۔ صبح کو البتہ ہلکا پالا ضرور پڑتا تھا۔ یہ وہ موسم تھا جسے فرانسیسی Ete de st. Martin¹⁸ اور (روسی؟) 'بڑی بوڑھیوں کی گرمیاں' کہتے ہیں۔

ماہر کھلی فضا میں دھوپ میں حرارت کا، حساس ہوتا تھا۔ صبح کے پالے کی تقویت بخش مازگی کے ساتھ مل کر جو ابھی تک فضا میں موجود تھی، یہ حرارت خاص طور پر فرحت بخش تھی۔

دور دراز ایک ہر چیز پر، وہ طلسمی، ہو رہی چمک دمک تھی جو صرف انھی خزانہ ایام میں نظر آتی ہے۔ دور دراز پر گاؤں، گرجے اور وسیع و عریض سفید مکانوں سمیت کجنگک پہاڑیاں دکھائی دے رہی تھیں۔ بے برگ درخت، ریت، پتھر اور اینٹوں کے مکانات، گرجے کے سبز کلس اور سفید مکانوں کے ز دیوں کے پیردنی خطوط شفاف فضا میں غیر فطری انداز سے چمک رہے اور واضح طور پر نظر آ رہے تھے۔ جہاں میز اور قیدیوں کے سببان تھے، ان کے بالکل قریب کل نہ عمارت کے، جس پر فرانسیسی قابض تھے، جانے پہچانے آثار دیکھے جاسکتے تھے۔ وہاں چوبی باڑ کے ساتھ lilac کے پودے کھڑے تھے۔ ان کے چوں کی زمر دیں رنگت ابھی تک جوں کی توں برقرار تھی۔ اس بے باور، تھری تھری، ساکن اور درخشندہ فضا میں یہ نیم سوختہ اور تباہ شدہ مکان بھی، جو اب آلود موسم میں بھد اور ڈراؤنا معلوم ہوتا تھا، اتنا خوبصورت تھا کہ آنکھوں میں ٹھنڈک پڑتی محسوس ہوتی تھی۔

ایک فرانسیسی کارپورل اپنے کوٹ کے ٹن لاپرواہی سے بند کیے، سر پر شینہ ٹوپی اوڑھے اور منہ میں چھوٹا پائپ دبائے سائبان کی ٹکڑیوں میں آیا اور دوستانہ انداز سے آنکھیں جھپکاتا میئر کے پاس پہنچا۔

”جی، موسیو، کرل،“ (فرانسیسی میئر کو اسی نام سے پکارتے تھے)، ”کیا شاندار دھوپ ہے! معلوم ہوتا ہے بہار آگئی ہے۔“

اور کارپورل نے دروازے کے ساتھ ٹیک لگالی اور میئر کو پائپ پیش کرنے لگا۔ اگرچہ میئر ہمیشہ انکار کرتا رہتا تھا، وہ اپنی پیکلش دہراتا رہتا تھا۔

”ایسے موسم میں آدمی کتنی چاہتا ہے کہ وہ رخت سفر باندھے اور چل پڑے...“ اس نے بات شروع کی۔ میئر نے اس سے پوچھا کہ اس نے فرانسیسیوں کی روگنی کے بارے میں کیا سنا ہے اور کارپورل نے اسے بتایا کہ تقریباً ساری سپاہ کوچ کر رہی ہے اور قیدیوں کے متعلق ہدایات اسی روز متوقع ہیں۔ میئر کے سائبان میں ایک روسی سپاہی، جس کا نام سکا لونف تھا، قریب الگ تھا۔ میئر نے کارپورل سے دریافت کیا کہ اس کا کیا کرنا چاہیے۔ کارپورل نے جواب دیا کہ میئر کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، ایسے مریضوں کے لیے ان کے پاس چلتے پھرتے اور مستقل دونوں طرح کے ہسپتال موجود ہیں اور مجموعی طور پر حکام نے ہر ممکن صورت حال سے نپٹنے کا سامان کر رکھا ہے۔

”اس کے علاوہ، موسیو کرل، آپ جانتے ہیں کہ آپ کو کیپٹن سے صرف ایک لفظ کہنے کی ضرورت ہے۔“

ارخ، وہ... وہ ایسا آدمی ہے جو کبھی کچھ نہیں بھولتا۔“

کارپورل جس کیپٹن کا ذکر کر رہا تھا، وہ اکثر ویر کے ساتھ گپ شپ لڑا کرتا تھا اور اسے ہر قسم کی رعایتوں سے نوازتا رہتا تھا۔

”دیکھو سینٹ ٹامس۔“ اس نے ایک روز مجھ سے کہا، گرل پڑھا لکھا آدمی ہے اور فرانسیسی بولتا ہے۔ وہ ردی نواب ہے، تقدیر کے چکر میں آگیا ہے لیکن آدمی جی دار ہے۔ اسے کمرے کھولنے میں تیز کرنا آتا ہے۔۔۔ اگر اسے کسی چیز کی ضرورت پیش آئے، بس اسے میرے پاس بھیج دینا۔ میں اسے انکار نہیں کروں گا۔ اگر آدمی خود تعلیم یافتہ ہو، پھر وہ تعلیم یافتہ اور شستہ لوگوں کی قدر کرتا ہے۔ موسیو کرل، میں یہ سب کچھ آپ کے بھسے کے لیے بتا رہا ہوں۔ اگلے روز جو صورت حال پیش آئی۔ اگر آپ بیچ میں نہ پڑنے، معاملہ بہت بگڑ جاتا۔“

اس طرح کچھ دیر مزید گپ شپ کرنے کے بعد کارپورل رخصت ہو گیا۔ (اس نے جس معاملے کی طرف اشارہ کیا تھا، وہ قیدیوں اور فرانسیسی سپاہیوں کے مابین جھگڑا تھا۔ اس میں ویر اپنے ساتھیوں کو سمجھانے بھانے میں کامیاب رہا تھا۔)

بعض قیدیوں نے ویر کو کارپورل کے ساتھ باتیں کرنے دیکھ لیا تھا۔ وہ جھٹ پٹ اس کے پاس آئے، اور پوچھنے لگے کہ وہ کیا کہہ رہا تھا۔ ویر کو فوج کی، سکو سے روٹنگی کے بارے میں جو کچھ بتایا گیا تھا، جب وہ اسے اپنے ساتھیوں کو بتا رہا تھا، ایک ناخراہ اندام، زرد رور اور در ماندہ حال فرانسیسی سپاہی ان کے پاس آیا۔ اس نے ثمراتے گھبراتے تیزی سے سدھام کے انداز میں انگلیاں پیشانی تک اٹھائیں اور ویر سے پوچھنے لگا کہ آیا سپاہی ”پلا تو شے“ جسے اس نے تیس سلائی کے لیے دی تھی، ساجان میں ہی ہے۔

فرانسیسی سپاہیوں میں کپڑا اور بوٹوں کا چمڑا پچھلے ہفتے ہی تقسیم کیا گیا تھا اور انھوں نے یہ اشیاء سدائی کے لیے قیدیوں کے سپرد کر دی تھیں۔

”میرے عزیز دوست، تیار ہے، تیار ہے۔“ کاراٹامیف نے اسے مطلع کیا۔ وہ ابھی ابھی دروازے کے قریب آیا تھا۔ اس کے ہاتھ میں صاف ستھرے انداز سے تہہ کی ہوئی قمیص تھی۔ نیم گرم موسم کی وجہ سے اور کام کی سہولت کی غرض سے کاراٹامیف نے پتلون اور بوسیدہ قمیص کے علاوہ، جس کا رنگ دھوئیں کی کانک کی طرح سیاہ تھا، اور کچھ نہیں پہنا ہوا تھا۔ اس کے بال کارکنوں کے انداز میں ریز فون کی چھال کی رسی سے بندھے ہوئے تھے اور اس کا گول مٹول چہرہ معمول سے زیادہ گول مٹول اور ہر از شفقت نظر آ رہا تھا۔

”دودھ دودھ ہی ہے۔ میں نے جسے کا دودھ کیا تھا اور میں نے دودھ پورا کر دکھایا ہے۔ یہ رسی آپ کی قمیص“ پٹاٹون نے مسکراتے ہوئے کہا اور اس نے جو قمیص بنائی تھی، اس کی قمیص کھول دیں۔

فرانسیسی نے بے چینی سے، دھڑا دھڑ نظریں دوڑائیں اور پھر ایسے جیسے وہ تہذیب پر قابو پالنے کی کوشش کر رہا ہو، اس نے اپنی وردی اتار دی اور قمیص پہن لی۔ وردی کے نیچے وہ اپنے دبے پتلے اور زرد جسم پر چکنی پھوس دار ریشمی واسٹ پہنے ہوئے تھا، مگر وہاں قمیص نام کی کوئی شے نہیں تھی۔ صاف نظر آ رہا تھا کہ اسے ڈراس بات کا تھا کہ جو قیدی اسے دیکھ رہے ہیں، اس کی حالت پر ہنس پڑیں گے۔ اس نے برق رفتاری سے اپنا سر قمیص کے اندر گھسوا دیا۔ کسی قیدی نے ایک لفظ تک نہ کہا۔

”آپ کے بالکل پوری آئی ہے!“ پلاٹون بار بار کہے جا رہا اور قمیص کو نیچے کھینچتا جا رہا تھا۔

فرانسیسی نے جب اپنا سر اور بار قمیص میں داخل کر لیا، وہ اپنی ٹکاپیں اوپر اٹھائے اسے اور اس کی سیٹوں کا بغور جائزہ لینے لگا۔

”عزیز دوست، آپ جانتے ہیں کہ یہ درزی کی دکان تو ہے نہیں اور جیسا کہ نوگ کہتے ہیں میرے پاس منج قسم کے اوزار بھی نہیں۔ اگر آپ کا اوزار منج نہ ہو، آپ جوں بھی نہیں مار سکتے۔“ پلاٹون نے اپنی گوں مٹول ہنسی ہنستے ہوئے کہا۔ اس میں شک نہیں کہ وہ اپنے کام سے بہت خوش تھا۔

”C'est bien, c'est bien, merci“ فرانسیسی نے کہا۔ ”لیکن کچھ نہ کچھ کپڑا تو بیچ ہی گیا ہوگا۔“ ”جب یہ آپ کے جسم پر قریب سے جم جائے گی، یہ در بھی سوزاں نظر آنے لگے گی۔“ بظاہر وہ ابھی تک اپنے ہاتھ کے کام کی تحسین کر رہا تھا۔ ”آپ اس میں بہت چمکے لگیں گے اور آپ کو آرام بھی بہت رہے گا۔“ ”Merci, merci, mon vieux... اور بقیہ کپڑے؟“ فرانسیسی نے ایک بار پھر کہا۔ اس نے مسکراتے ہوئے ایک ٹوٹ نکالا اور کاراٹائیف کے حوالے کر دیا۔ ”اب جو کچھ بچا ہے، مجھے دے دو۔“

خیر بھانپ گیا کہ فرانسیسی جو کچھ کہہ رہا ہے، پلاٹون جان بوجھ کر اس کے متعلق انجان بنا ہو رہا ہے اور وہ مداخلت کیے بغیر انہیں دیکھتا رہا۔ فرانسیسی نے کاراٹائیف کو جو پیسے دیے تھے، اس نے ان کے لیے اس کا شکریہ ادا کیا اور اپنے کام کے گن گاتا رہا۔ فرانسیسی بچے کچھ ٹکڑوں کی راپیسی کا تقاضا کرتا رہا اور اس نے خیر سے کہا کہ وہ جو کچھ کہہ رہا ہے، وہ اس کا ترجمہ کر دے۔

”اس نے پیٹلے کیا کرنا ہیں؟“ کاراٹائیف نے پوچھا۔ ”ہمارے تو کچھ کام ہی آ جاتے، ہم انہیں ہانگوں پر ہی لیٹ لیں گے، خیر کوئی پروا نہیں۔“

اچانک کاراٹائیف کا منہ لٹک گیا۔ اس نے اپنی قمیص کے اندر سے ٹکڑوں کی پوٹلی نکالی اور فرانسیسی کی طرف دیکھے بغیر اسے تھادی۔

”راہری قسمت!“ وہ بڑبڑایا اور راپیسی چل پڑا۔

• ٹھیک ہے، ٹھیک ہے، شکر یہ

• شکر یہ، شکر یہ، میرے دوست (بڑے میاں)

فرانسیسی نے کپڑے پر نظر ڈالی، کچھ دیر سوچا، پھر اس نے استفہامیہ انداز سے میٹر کی طرف دیکھا اور گویا کہ
 میٹر نے اسے نظروں ہی نظروں میں اسے کچھ بتا دیا ہو، شرمندگی سے اس کا چہرہ سرخ ہو گیا اور اس نے جی بھی آواز سے
 پکارا:

”پلا تو شے، ادھر آؤ۔۔۔ پلا تو شے! یہ تم اپنے پاس ہی رکھ لو!“ اس نے کہا اور جہاں کاراٹایف کو وہیں کر
 دیں۔ اس کے ساتھ ہی وہ مڑا اور تیزی سے باہر نکل گیا۔

”کیا بات ہے اویکھیں نا!“ کاراٹایف نے اپنے سر کو جھٹکا رہتے ہوئے کہا۔ ”لوگ کہتے ہیں کہ یہ کافر
 ہیں۔ لیکن یہ تو کافر نہیں، اس کی بھی روح ہے۔ بزرگ ٹھیک ہی کہتے تھے، جس ہاتھ پر پسینا آتا ہے وہ کھلا (خنی)
 ہاتھ ہوتا ہے، خشک ہاتھ بندھشی (کنجوس) ہوتا ہے۔ اس کی اپنی کمرنگل تھی، پھر بھی اس نے یہ مجھے واپس کر دیے۔“
 کاراٹایف فکر مسدا انداز سے مسکرایا، اور کچھ دیر نگاہیں گاڑے کپڑے کے ٹکڑے دیکھا رہا۔

”لیکن، مائی ڈیئر، ان سے ٹانگیں اچھی طرح ڈھک جائیں گی۔ اس نے کہا اور ساتباں میں واپس چلا گیا۔

12

دوڑ کے قیدی بنائے جانے کے بعد چار ہفتے گزر چکے تھے۔ اگرچہ فرانسیسیوں نے اسے انہروں کے سائبان میں منتقل
 کرنے کی پیشکش کی تھی، وہ عام سپاہیوں کے سائبان میں ہی مقیم رہا، جہاں انہوں نے اسے پہلے روز بھیجا تھا۔

انسان احتیاج، عسرت اور تنگ دستی کو جس انتہائی حد تک برداشت کر سکتا ہے، اس کو کے آتش زور اور جلا شدہ
 شہر میں میٹر کو اس کا تجربہ ہو رہا تھا۔ لیکن ایک تو اس کی صحت، چھٹی اور کاٹھی مضبوط تھی (جس کا اسے اس وقت تک کوئی
 احساس نہیں تھا) اور دوسرے اور اس سے بھی بڑی بات یہ ہوئی کہ یہ احتیاجات اور تنگ دستیوں اتنے دے پاؤں اور
 اس قدر بتدریج انداز سے اس کی زندگی میں داخل ہوئیں کہ یہ بتانا مشکل ہو گیا کہ ان کا آغاز کب ہوا۔ چنانچہ اپنی اس
 حالت پر وہ نہ صرف یہ کہ گدھا نہیں بلکہ اسے عسرت برداشت کرتا رہا۔ اور بالکل یہی وہ زمانہ تھا جب اسے وہ سکون
 ”سودہ خاطر“ اور اطمینان قلب، جس کے لیے وہ اتنے عرصے سے بیکار ہاتھ پاؤں مار رہا تھا، نصیب ہو گیا۔ اپنی
 زندگی کے دوران میں وہ مختلف طریقوں سے اس ذہنی سکون اور داخلی ہم آہنگی کے، جسے وہ ہارورنوں کی نژاد میں
 سپاہیوں میں دیکھ کر اتنا متاثر ہوا تھا، حصول کے لیے کوششیں کرتا رہا تھا۔ اس نے اسے مخیر کاموں میں، فزک میسری
 میں، شہری زندگی کی عیاشیوں اور طرب سنجیوں میں، شرب و کباب میں، ایثار ذات کے دلیرانہ کارناموں میں اور ناشا
 کے لیے اپنی رومانی محبت میں ڈھونڈنا چاہا تھا۔ اس نے اسے تعقل اور فلسفیانہ مباحث میں تلاش کیا تھا۔ لیکن اس
 کی تمام مساعی اور تجربات نے اسے ناکامی کے سوا اور کچھ نہیں دیا تھا۔ اور اب اسے یہ ذہنی طرہ نیت اور داخلی
 ہم آہنگی، جب اس نے اس کے متعلق سوچا تک نہیں تھا، موت کی ہونا کیوں کے ذریعے عسرت و تنگ دستی کے
 ذریعے اور جو کچھ سے کاراٹایف میں نظر آیا تھا، اس کے ذریعے حاصل ہو گئی۔ ان دہشت ناک لمحات نے بہت

میں اسے تب گزرتا پڑا تھا جب لوگوں کو قتل میں گولیاں ماری جا رہی تھیں، ان پریشان کن خیالات و حساسات کو جو ماضی میں سے بے انتہا اہم معلوم ہوتے تھے، ایک ہی طے سے (یا گویا کہ) اس کے تخیل اور حافظے سے ہمیشہ کے لیے کھرچ دیا گیا تھا۔ اس کے دل میں کبھی یہ خیال تک نہ آیا کہ اسے روس، جنگ، سیاست یا پولین کے بارے میں سوچ بچار کرنا یا ان کے متعلق فکر مند ہونا چاہیے۔ اس پر بات واضح ہو گئی تھی کہ اس کا ان تمام چیزوں میں مطلق کوئی دخل نہیں ہے، کسی نے اسے ان معاملات کا محاکمہ کرنے کو نہیں کہا، چنانچہ وہ ان کے متعلق کوئی ٹیڈ کون بات نہیں کہہ سکتا۔ ”روس، اور موسم گرما کا۔ آگ اور پانی کی طرح۔ آپس میں کوئی میل نہیں۔“ وہ کاراٹائیٹ کے الفاظ، جو غیر معمولی انداز سے تسکین بخش تھے، دہراتے ہوئے سوچتا۔ اپنا پولین کو قتل کرنے کا منصوبہ اور مکاشفہ کے حیران کے پراسرار اعداد کا حساب اب اسے نہ صرف بالکل بے معنی بلکہ مضحکہ خیز بھی نظر آیا۔ اپنی بیوی پر اسے جو غصہ آیا کرتا تھا اور ہر دم جو یہ فکر لاحق رہتی تھی کہ کہیں اس کے نام کو بتا نہ لگ جائے، اب اسے محسوس ہونے لگا کہ یہ تو بالکل معمولی اور حتمی باتیں تھیں۔ اسے کیا پڑی تھی کہ وہ اس فکر میں مبتلا ہوتا رہتا کہ وہ محورت یہاں یا وہاں اپنی پسند کی زندگی بسر کر رہی ہے؟ کسی شخص کے لیے۔ خاص طور پر اس کے اپنے لیے۔ اس بات کی کیا اہمیت ہے کہ انھیں معلوم ہو گیا ہے یا نہیں کہ اس کا نام کا ڈنٹ بزدل خوف ہے۔

اس کی پرنس آندرے کے ساتھ جو گفتگو ہوئی تھی، وہ اسے اکثر یاد کرتا اور اپنے دوست کے ساتھ اتفاق کرتا۔ فرق بس یہ تھا کہ وہ پرنس آندرے کے خیالات کی تعبیر ذرا مختلف انداز سے کرتا۔ پرنس آندرے کا یہ ایمان تھا اور وہ اس کا اظہار کرنے سے چوکتا بھی نہیں تھا کہ مسرت منی چیز ہے لیکن وہ یہ بات ذرا تلخ اور طنزیہ انداز سے کہتا تھا، گویا کہ وہ درحقیقت یہ کہہ رہا ہو کہ ہمارے قلوب پر مثبت مسرت کی آرزو محض اس لیے نقش کر دی گئی ہے تاکہ ہم ہمیشہ اذیت پہنچتی رہے اور اس کا حصوں کبھی ممکن نہ رہے۔ لیکن پھر اس کی سچائی ہر قسم کے ذہنی شکوک کو، اور اسے طاق رکھ کر تسلیم کرنا تھا۔ آرام و مصائب کی عدم موجودگی، بنیادی ضروریات کی تکمیل اور نتیجتاً اپنے پیشے۔ یعنی بے طرز حیات۔ کے انتخاب میں آزادی، پھر کو محسوس ہوتا تھا کہ اگر آدمی کو یہ چیزیں میسر آجائیں تو وہ مسرت کی انتہائی بلندیوں کو چھو سکتا ہے اور زندگی میں یہاں پہلی مرتبہ اسے کھانے، پینے، سونے، اپنے آپ کو گرم کرنے اور اپنے ہم جنسوں کے ساتھ گفتگو کرنے میں صحیح لطف آیا اور ان کی اصل قدر و قیمت معلوم ہوئی کیونکہ اب وہ کھانا اس لیے تھا کیونکہ اسے بھوک لگتی تھی، پیتا تھا کیونکہ اسے پیاس لگتی تھی، سوتا تھا کیونکہ اسے نیند آتی تھی، اسے حرارت کی ضرورت محسوس ہوتی تھی کیونکہ اسے سردی لگتی تھی اور وہ باتیں کرتا تھا کیونکہ اس کا باتیں کرنے اور انہی آواز سننے کو جی چاہتا تھا۔ اب جب کہ پیرا جی خوراک، صفائی ستھرائی کے لوازمات اور آزادی سے محروم ہو چکا تھا، اسے معلوم ہوا کہ اگر آدمی کی یہ ضروریات پوری ہو جائیں تو اسے کامل مسرت مل سکتی ہے۔ رہا چٹنے یعنی طرز حیات کا انتخاب، تو اب جب کہ یہ انتخاب محدود ہو چکا تھا، اسے یہ معاملات نا آسان نظر آیا کہ وہ یہ بھول گیا کہ اگر زندگی کی آسانئوں کی بہتات ہو جائے تو آدمی کو اپنی ضروریات کی تسکین ہو جانے سے جو غفلت ملتا ہے، وہ جاتا رہتا ہے اور اگر پیشے کے

انتخاب میں ضرورت سے زیادہ آزادی میسر آ جائے۔ اسے یہ آزادی اپنی تعلیم اور سماجی حیثیت کی وجہ سے حاصل ہوئی تھی۔ تو پیشے کا انتخاب لائیکل طور پر دشوار ہو جاتا ہے اور پیشہ اختیار کرنے کی خواہش ہی نہیں بلکہ امکان بھی ناپید ہو جاتا ہے۔

ب. بیئر ہر وقت صرف یہ خواب دیکھتا رہتا تھا کہ اسے کب آزادی حاصل ہوگی۔ تاہم اسیری کے اس مہینے کے دوران میں اسے جن پُر شدت اور مسرت سے بحرِ پُر تحسّات کا تجربہ ہوا، جن کی دوبارہ دریافت ناممکن تھی، اور سب سے بڑھ کر اسے جو کامل طہِ نیت اور مکمل راضی آزمائشی ملی، صرف یہیں ہی، وہ بعد ازاں تاحیات اس کا ذکر پورے جوش و خروش سے کرتا رہا۔

اپنی اسیری کے پہلے روز بیئر جب علی صبح بیدار ہوا، وہ پوچھے اپنے ساتھیوں سے باہر نکلا اور اس نے نوویوچی کا نوٹ کے قُبے اور صلیبیں، جو ابتداً نسبتاً تاریک تھیں، گرد آلود گھاس پر سفید بخستہ شبنم، گھنگھریلوں کی، بھرداں چوٹیاں اور مل کھاتے دریا کے، جو دور قمری آفاق میں غائب ہو رہا تھا، درختوں سے گھرے ہوئے کنارے دیکھے، جب اسے تازہ ہوا کا جھونکا محسوس ہوا اور Jackdaws کو ماسکوسے کھیتوں کے پار اڑتے سنا، اور جب بعد ازاں مشرق سے روشنی نمودار ہوئی اور سورج کا گولہ فاتحانہ انداز سے بدن کی کوٹ سے باہر آیا اور قُبے، صلیبیں، بخستہ شبنم، دریا اور جمیدی آفاق دھوپ میں جگمگانے لگے، بیئر کو زندگی میں نئی دھند اور مسرت اور قوت کا وہ احساس ہونے ہونے لگا جس سے وہ ازیں پیشتر نا آشنا تھا۔

اور یہ احساس نہ صرف اس کی اسیری کی بقیہ مدت کے دوران میں اس کے ساتھ رہا بلکہ جوں جوں اس کی مشکلات میں اضافہ ہوتا گیا، یہ مضبوط سے مضبوط تر ہوتا گیا۔

ساتھان میں بیئر کی آمد کے فوراً بعد ہی اس کے ساتھی اسیروں نے اس کے متعلق جو اٹلی رائے قائم کی تھی، اس نے اس کے ہر کام کرنے کے لیے مستعدی اور اخلاقی چوکسی کے احساس کو مزید قوی بنادیا۔ وہ مختلف زبانیں جانتا تھا، فرانسیسی اس کا احترام کرتے تھے، وہ، نکلے جانے پر ہر چیز (اسے افسروں کا تین ردِ بدل فی ہفتہ ادا دُٹس ملا تھا) سادگی اور پھرتی سے دوسروں کو دے دیتا تھا، اپنے ساتھی قیدیوں کے ساتھ نرمی اور شفقت سے پیش آتا تھا، وہ زبردست جسمانی قوت کا مالک تھا (اس کا مظاہرہ اس نے سپاہیوں کے سامنے اٹلیوں سے دیواروں میں کیلیں ٹھونک کر کیا)۔ اور اس میں کام کیے بغیر ساکن بیٹھے رہنے اور سوچ بچار میں مصروف رہنے کی صلاحیت تھی (اس کی یہ صلاحیت دوسروں کے لیے ناقابلِ فہم تھی)۔ ان اوصاف کی بنا پر وہ عام سپاہیوں کو قدرے براہِ رسد اور برتر فکرتی معلوم ہوتا تھا۔ اس کی عین میں وہی خوبیاں۔ اس کی جسمانی قوت، زندگی کی آسائشوں کے متعلق اس کا حقیر آمیز رویہ، اس کی غیر حاضردماغی اور سادگی۔ اگر عملی دنیا میں اس کے لیے ضرور رساں نہیں تھیں، تو بھی اس کے لیے رکاوٹ اور ندامت کا باعث ضرور بنتی تھیں، اب انہوں نے ہی اسے ان لوگوں کے مابین ہیرو کا درجہ دے دیا، اور بیئر کو

محسوس ہوا کہ ان کی اس رائے نے اس کے کندھوں پر ڈسے داریاں مار دی ہیں۔

13

فرانسیسیوں کا انخلا چھ اور سات اکتوبر کی درمیانی رات کو شروع ہوا۔ باورچی خانے اور سامان مہار کر دیے گئے، چھکڑوں پر ماں و اسباب لاد دیا گیا اور فوجی دستے اور سامان کی گاڑیاں کوچ کرنے لگیں۔

سات بجے صبح ایک فرانسیسی فوجی قافلے کے سپاہی سروں پر شا کوٹو پیلا پہنے، دست بند و قیاس، سفری تھیں اور وزنی بوریاں اٹھائے سامانوں کے سامنے کھڑے تھے۔ وہ روانگی کے لیے تیار تھے اور ان کی شگفتہ فرانسیسی گفتگو، جس میں وہ گاہے بگاہے گایوں کی آمیزش کر رہے تھے، تم صفوں میں سنائی دے رہی تھی۔

سامان میں تمام لوگوں نے کپڑے اور جوتے بہن لیے تھے اور چٹیاں کس لی تھیں۔ اب وہ محض روانگی کے حکم کے منتظر تھے۔ صرف لاغر اندام، نحیف، دزار اور زرد رویہار سپاہی، سکا لوف، جس کی آنکھوں کے گرد حلقے بن چکے تھے، اپنے کونے میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے خدا و در کوٹ پہن تھا اور نہ بوٹ۔ اس کی آنکھیں، جو اس کے استخوانی چہرے پر بہت نمایاں تھیں، اپنے ساتھیوں کو مستفسرانہ انداز سے گھور رہی تھیں لیکن کوئی بھی اس کی طرف توجہ نہیں دے رہا تھا، وروہ باقاعدہ وقفوں سے کراہنے لگتا تھا۔ نظریہ آ رہا تھا کہ اس کی آہوں کا سبب اس کی تکلیف (وہ بچپن میں مبتلا تھا) نہیں تھی بلکہ اسے دکھ اور خوف اس بات کا تھا کہ وہ اکیلا رہ جائے گا۔

حیر اپنی کمر کے گرد چٹی کے بجائے رسی باندھے دو پاؤں میں وہ جوتے پہنے، جو کارا نامیف نے اس کے لیے بنائے تھے (چھڑا ایک فرانسیسی سپاہی، اپنے جوتوں کی مرمت کے لیے چائے کی پیٹیوں سے اکھاڑ کر لایا تھا)، بیمار آدمی کے پاس گیا اور آلتی پالتی مار کر اس کے قریب بیٹھ گیا۔

”سکا لوف، تمہیں معلوم ہے کہ وہ سب کے سب نہیں جا رہے۔ ان کا یہاں ہسپتال ہے۔ تم ہماری نسبت غالباً بہتر ہو گے،“ حیر نے کہا۔

”اف خدایا اس سے تو میری موت واقع ہو جائے گی“ اف خدایا!“ سپاہی نے نسبتاً ونچی آواز سے کراہتے ہوئے کہا۔

”میں ابھی جاتا ہوں، ورا یک بار پھر ان سے پوچھتا ہوں،“ حیر نے اٹھتے اور سامان کے دروازے کی طرف جاتے ہوئے کہا۔

ابھی وہ دروازے کے قریب پہنچا ہی ہوگا کہ وہی کارپورل، جس نے ایک روز پیشتر اسے پاپ پیش کیا تھا، دو اور سپاہیوں کے ساتھ وہاں آ گیا۔ کارپورل اور سپاہی سفری وریوں میں ملبوس تھے۔ ان کی پشتوں پر سفری تھیلے لٹک رہے تھے اور انھوں نے سروں پر شا کوٹو پیلا، جن کے فیتے ان کی ٹھوڑیوں پر بندھے ہوئے تھے، اوڑھ رکھی تھیں۔ ٹوپیاں پہننے سے ان کے شہا چہرے ناشا سر دکھائی دینے لگے تھے۔

کارپورل کو دروازہ بند کرنے کا حکم ملا تھا۔ باہر نکالے جانے سے پہلے قیدیوں کی کنتی ہونا تھی۔
”کارپورل، اس بیمار آدمی کا کیا بنے گا؟“ میئر نے پوچھا۔

لیکن ابھی اس نے اپنی بات ختم کی تھی کہ اس کے دل میں دوسرے پیدا ہو گیا کہ یہ وہی کارپورل ہے جسے وہ جانتا تھا۔ یہ کوئی اور شخص ہے کیونکہ کارپورل اس وقت اپنے آپ سے بالکل مختلف نظر آ رہا تھا۔ مزید برآں، جس وقت میئر انتظار کر رہا تھا، اچانک دونوں اطراف سے طبل کی تیکھی ڈھم ڈھم سنائی دی۔ میئر کا سوال سن کر کارپورل کی بھویں تن گئیں اور اس نے بے معنی گالی بکتے کھٹاک سے دروازہ بند کر دیا۔ سائیکل میں نیم تاریکی چھا گئی اور دونوں اطراف کے طبلوں کی آوازوں میں مریض کی کراہیں ڈوب گئیں۔

”پھر آگئی! وہ پھر آگئی!“ میئر نے اپنے آپ سے کہا اور غیر ارادی طور پر اس کی کچکی چھوٹ گئی۔ کارپورل کے تبدیل شدہ چہرے میں، اس کے لب و لہجے میں، طبلوں کے دلوں کو دہل دینے والوں کے پردے پھاڑ دینے والے شور و غل میں، میئر نے اس پر اسرار، جابر و متمرّد قوت کی، جو لوگوں کو ان کی مرضی کے خلاف اپنے ہم جنسوں کا قتل کرنے پر اکساتی اور مجبور کرتی ہے، شہادت کر لی۔ یہ وہی قوت تھی جس کا اس نے قتل میں لوگوں کو گولیوں سے ہلاک کرنے کے موقع پر مشاہدہ کیا تھا۔ اس قوت سے خوف کھانا یا اس سے بچنے کی کوشش کرنا اور ان اشخاص کی، جو اس کے آلہ کار کی حیثیت سے خدمات سرانجام دیتے ہیں، منت حاجت کرنا یا ان کے پاؤں پڑنا بیکار تھا۔ یہ بات میئر کی سمجھ میں آ چکی تھی۔ آدمی کے بس میں اب یہی تھا کہ وہ انتظار کرے اور براہ راست کرے۔ وہ دوبارہ علی شخص کے قریب نہ گیا اور نہ اس نے اس کی جانب مڑ کر دیکھا۔ وہ سائیکل کے دروازے کے قریب خاموش گھڑاناک بھوں چڑھاتا رہا۔

جب دروازہ کھلا اور قیدی بھینروں کے ریوڑ کی طرح بے ترتیب ہجوم بنائے دروازے میں پھنس گئے، میئر دھکے دیتا آگے بڑھا اور اسی کیپٹن کے پاس پہنچا جس کے متعلق کارپورل نے اسے یقین دلایا تھا کہ وہ اس کی خاطر سب کچھ کرنے کو تیار ہو جائے گا۔ کیپٹن نے بھی سفری دروی زیب تن کر رکھی تھی۔ میئر کو اس کے ٹھنڈے چہرے پر بھی (جابر و متمرّد قوت کی) وہی ملامت نظر آ گئی، جس کی شہادت اس نے کارپورل کے الفاظ اور طبلوں کی ڈھم ڈھم سے کی تھی۔

”چلو، چلو!“ کیپٹن کہہ رہا تھا۔ وہ بری طرح چپیں نہیں ہو رہا اور قیدیوں کا، جن کی اس کے قریب بھینر لگتی جا رہی تھی، بغور جائزہ لے رہا تھا۔

میئر جانتا تھا کہ اس کی مساعی لا حاصل رہیں گی، پھر بھی وہ اس کے پاس چلا گیا۔
”ہونہر، کیا ہے؟“ اس نے پوچھا۔ وہ میئر کو یوں دیکھ رہا تھا جیسے اس نے پہچانائی نہ ہو کہ وہ کون ہے۔

میئر نے اسے بیمار آدمی کے متعلق بتایا۔
”وہ چل سکتا ہے، یعنی کہیں کا؟“ کیپٹن نے کہا۔ ”چلو، چلو!“ وہ میئر کی طرف دیکھے بغیر قیدیوں کو حکم دیتا رہا۔

”وہ چل نہیں سکتا، وہ آخری گھڑیاں گن رہا ہے۔“ پیئر نے پھر بات شروع کی۔

”ذرا مہربانی فرمائیں۔“ کیپٹن نے عیظہ غضب سے چلاتے اور بھجوسیں سکیتے ہوئے کہا۔

دھم۔ دھا۔ ڈھم۔ ڈھا۔ ڈھل۔ دھڑا۔ دھڑکھڑکا رہا ہے تھے اور دیگر کو اندازہ ہو گیا کہ پراسرار قوت پوری طرح ان لوگوں کو اپنی گرفت میں لے چکی ہے اور اب مزید کچھ کہنا سننا بیکار ہے۔

قیدیوں میں جو افسر تھے، انھیں عام سپاہیوں سے علیحدہ کر دیا گیا اور انھیں آگے چلنے کا حکم سنا دیا گیا۔ افسروں کی تعداد تقریباً تیس تھی۔ میئر بھی انھیں میں شامل تھا۔ سپاہیوں کی نفری تین سو تھی۔

افسردہ دوسرے سائبانوں سے آئے تھے اور دوسرے کے سارے بیٹر کے لیے اجنبی تھے۔ ان کے ملبوسات اس کے، اپنے لباس سے کہیں بہتر تھے۔ انھوں نے اسے اور اس کے عجیب و غریب جوتوں کو لا تعقی اور شے کی نظروں سے دیکھا۔ اس سے کچھ ہی فاصلے پر ایک بھاری بھر کم۔ مہجر چار ہاتھا، جس کا چہرہ زرد، پھولا پھولا اور کبیدہ تھا۔ وہ قازانی ڈریسنگ گاؤن میں ملبوس تھا، جس پر اس نے بیٹی کے بجائے تولیہ باندھ رکھا تھا۔ بظاہر یہی معلوم ہوتا تھا کہ اس کے ساتھی حیدی اس کا احترام کرتے ہیں۔ اس نے اپنا ایک ہاتھ، جس میں تمباکو کی تھیلی تھی، سینے کے اوپر ڈریسنگ گاؤن کے اندر گھسیڑ رکھا تھا اور وہ دوسرے ہاتھ سے پائپ کی ڈنڈی مضبوطی سے پکڑے ہوئے تھا۔ مہجر کا دم پھول چکا تھا اور وہ بار بار پھونکیں مار رہا تھا۔ بیچ بیچ میں وہ ہر شخص پر غزائے اور اس کے بارے میں شکوہ شکایت کرنے لگتا کیونکہ اس کا خیال تھا کہ اسے دھکے دیے جا رہے ہیں اور دوسرے لوگ خواہ مخوہ تیزی دکھا رہے ہیں حالانکہ تیزی دکھا کر کہاں جاتا ہے اور بے جا حیران ہو رہے ہیں جب کہ حیران ہونے کی کوئی بات ہی نہیں ہے۔ ایک اور شخص، ایک دین پتلہ ناٹا افسر، ہر شخص سے کچھ نہ کچھ کہے جا رہا اور قیاس رائیاں کرتا جا رہا تھا کہ اب انھیں کہاں لے جایا جائے گا اور وہ اس رو رہا کہاں تک جانے میں کامیاب ہوں گے۔ ایک سرکاری کارندہ، جس کے جسم پر فوج کے ٹکڑے رسد کی وردی اور پاؤں میں فلیٹ بوٹ تھے، سڑک کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک بھاگا پھر رہا تھا۔ اس کی کوشش تھی کہ وہ ماسکو کے کھنڈرات کے مناظر اچھی طرح دیکھ لے۔ جو سوختہ علاقے اس کے مشاہدے میں آتے تھے، وہ ان کے متعلق دوسروں کو بتاتا جاتا تھا کہ اب وہ شہر کا فلاں محلہ اور اب فلاں محلہ دیکھ سکتے ہیں۔ ایک تیسرا افسر، جو لہجے کے اعتبار سے پولستانی معلوم ہوتا تھا، ٹکڑے رسد کے کارندے سے اختلاف کرنے لگا اور دعوے سے کہتا کہ وہ ماسکو کے مختلف علاقوں کی شناخت کرنے میں غلطیوں کا ارتکاب کر رہا ہے۔

”یہ تم کس بات پر جھگڑ رہے ہو؟“ میجر نے بھٹا کر پوچھا۔ ”یہ لگتا ہے یا دلاس، اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟“
 شمسین نظر نہیں آتا کہ سب کچھ جل کر راکھ بن چکا اور یوں ختم ہو چکا ہے؟۔ تم دھکے کیوں دے رہے ہو۔ مڑ کر
 کافی چوڑی نہیں؟“ اس نے ایک آدمی سے، جو اسے قلعہ دھکے نہیں دے رہا تھا، پیچھے مڑ کر کہا۔

”ہائیں، ہائیں، ہائیں! انھوں نے یہ کیا کر دیا ہے؟“ چاروں اطراف قیدی سوختے اور غم سوختے کھنڈرات دیکھ دیکھ کر ہائے دلے پکار رہے تھے۔ ”زامک واسچہ محلے، اور زبور محلے، اور کرہ سلسن میں... دیکھو، آج بھی نہیں رہ

عیا۔۔ ہاں میں نے تمہیں بتایا نہیں تھا کہ دریا کے پار سارا علاقہ خاکستر ہو گیا ہے۔ اب خود دیکھ لو، بالکل جل چکا ہے۔
 ”ہونہہ، تمہیں معلوم ہے کہ یہ خاکستر ہو چکا ہے، پھر اس کے متعلق باتیں ہانے کا فائدہ؟“ میجر نے کہا۔
 جب وہ خاموشی محفلے (یہ ماسکو کے ان معدودے چند محفلوں میں شامل تھا، جو جلنے سے بچ گئے تھے) میں
 بیک گر جے کے قریب پہنچے، قیدیوں کا سارا ہجوم ایک طرف مٹ گیا۔ وہ سب برا بھلا کہنے اور شدید نفرت کا اظہار
 کرنے لگے۔

”اف، سوتروں کے بچے!.. کافروں کی اولاد... ہاں، یہ ماش ہے، کچی بات ہے کہ لاشی ہے۔ اور
 انہوں نے اس کے چہرے پر کالک مل دی ہے! حرام زادے!“
 میجر بھی کھسکتا کھسکتا گرے کے قریب پہنچ گیا۔ وہاں وہ چیز موجود تھی جو ان مغالطات کا باعث بنی تھی۔ یہ
 گر جے کی باڑ کے ساتھ جھکی ہوئی تھی۔ میجر کو یہ دھندلی دھندلی نظر آئی۔ اسے اپنے ساتھیوں کے، جنہوں نے
 اسے زیادہ واضح انداز سے دیکھا تھا، الفاظ سے معلوم ہوا کہ یہ کوئی نسائی لاش ہے۔ کسی نے اس کے منہ پر کالک
 مل دی تھی اور وہ اسے دیوار کے ساتھ کھڑا کر گیا تھا۔
 ”چلو، آگے چلو، لعنت ہو تم پر!.. چلو، آگے چلو!.. تیس ہزار شیطانو!“ انہوں نے محاذ گارڈ کو منقذات
 لڑھکاتے سنا اور فرانسیسی سپاہیوں نے قیدیوں کو، جو ماش دیکھنے کھڑے ہو گئے تھے، ہانکنے کے لیے اپنی ٹکواریں
 مونت لیں۔

14

اپنے محافلوں کی معیت میں قیدی ایسے خاموشی محفلے کے گلی کوچوں میں گزر رہے تھے۔ ان کے پیچھے گاڑیاں اور
 چھکڑے آرہے تھے، جو اس قافلے کے سپاہیوں کی ملکیت تھے۔ لیکن جب داخلہ دینی اشیاء کی دکانوں کے قریب
 پہنچے، وہ آرٹلری کی توپ گاڑیوں کے، جو کھچا کھچ لہدی ہوئی تھیں، لمبے چڑے حلوں میں پھنس گئے۔ ان توپ
 گاڑیوں کے بیچ میں کہیں کہیں کوئی نجی گاڑی بھی نظر آ جاتی تھی۔
 وہ سب کے سب ہل پر رک گئے اور جو گاڑیاں اور لوگ آگے تھے، ان کے گزرنے کا انتظار کرنے لگے۔
 ہل سے قیدیوں کو اپنے آگے اور پیچھے حرکت پذیر چھکڑوں کا تائبندھا ہوا نظر آ رہا تھا۔ دئیں طرف، جہاں کالوگا
 روزنیں کو جتنی باغات کے گرد چکر کاٹتی تھیں، تاحد نظر فوجی ہی فوجی اور چھکڑے ہی چھکڑے دکھائی دے رہے تھے۔ یہ
 (جزل) برا آگنے کی کور کے دستے تھے۔ یہ باقی سب سے پہلے روانہ ہوئے تھے۔ ان کے عقب میں دریہ کے کنارے
 کے ساتھ ساتھ اور کامٹی ہل کے پارے (Ney) کی سپاہ اور گاڑیاں تھیں۔
 داؤد کے دستے، جن کی تحویل میں قیدی تھے، کریمائی ہل پر سے گزر رہے تھے اور ان میں سے چند ایک
 پہلے ہی کالوگا روڈ پر پھیل چکے تھے۔ تاہم سامان کے چھکڑوں کا سلسلہ اتنا طویل تھا کہ برا آگنے کے قافلے کی گاڑیوں

کی آخری قطار ابھی، سکو سے نکل کر کالوگا روڈ پر پہنچنے نہیں پائی تھی کہ لے کی سپاہ کے ہراول دستے گریٹ اورنگا سٹریٹ سے برآمد ہونا شروع ہو گئے۔

کریمیا کی پل عبور کرنے کے بعد قیدیوں پر گاڑیوں اور فوجیوں کا اتحاد باؤ پڑنے لگا کہ وہ ایک وقت میں صرف چند قدم ہی چل سکتے۔ وہ رکتے اور پھر آگے چل پڑتے۔ جب وہ چند سو قدموں کا فاصلہ، جو پل کو کالوگا روڈ سے جدا کرتا ہے (اس میں انھیں ایک گھنٹے سے زیادہ صرف کرنا پڑا)، طے کر چکے اور اس چوک میں پہنچے جہاں کالوگا روڈ اور زامسک وریچیا محلے کی سڑکیں ملتی ہیں، وہ رگ گئے اور ایک دوسرے میں پھنس کر کھڑے ہو گئے۔ اس چوراہے پر انھیں کئی گھنٹے یونہی کھڑے رکھا گیا۔ سمندر کی گھن گرج کی طرح چاروں اطراف سے گاڑیوں کے پیروں کی کھڑکھڑاہٹ، قدموں کی رپ رپ اور گالی گلوچ سے بھرپور غصیلی آوازیں جہنم سنائی دے رہی تھیں۔

مگر ایک نیم سوختہ مکان کی دیوار کے ساتھ بچکا کھڑا اور شور و غل کو سنتا رہا جو اس کے تشیل میں جیلوں کی دھم دھم میں جذب ہو رہا تھا۔

منظر کا بہتر انداز سے مشاہدہ کرنے کے لیے متعدد قیدی افسر نیم سوختہ مکان کی اس دیوار کے اوپر چڑھ گیا، جس کے ساتھ بیئر ٹنک لگائے کھڑا تھا۔

”بھینسی بھیڑ ہے!... ان جھوموں کی طرف دیکھو، انھوں نے گجنا لوں پر بھی سہاں لا دیا ہے! اور ادھر دیکھو۔ پوشتینس!..“ وہ جلا جلا کر کہہ رہے تھے۔ ”ذرا دیکھو تو سہی، یہ گدھ کیا کچھ لوٹے لے جا رہے ہیں! ادھر دیکھو، اس شخص نے اپنے چھکڑے کے پیچھے کیا درکھا ہے؟۔ ارے، یہ تو ایقونوں کی دھنیاں ہیں۔ خدا کی قسم... یہ مازماجرمن ہوں گے۔ اور وہ شخص کون ہے؟ اپنا ہی کوئی کسان معلوم ہوتا ہے۔ حری کہیں کا! اور اس شخص کو دیکھو، کتنا ادا پھندا ہے۔ اس سے تو چلا بھی نہیں جاتا۔۔۔ اف، میرے خدایا، وہ دروہکیاں بھی اڑالائے ہیں! وہ نظر آیا؟۔ وہ جوان ٹرکوں پر بیٹھا ہے۔ خدایا!.. ان میں دھینگا مشتی شروع ہو گئی ہے!..“

”یہ ہوئی نابات، ماردا اس کی تھو تھنی پر۔ اس کی تھو تھنی پر! اگر یہی حال رہا، پھر ہم شام پڑنے سے پہلے روانہ بھی نہیں ہو سکیں گے۔ دیکھو، ادھر دیکھو۔ یہ مازماجرمن کے ہوں گے، واہ واہ، ما جواب گھوڑے ہیں، مونوگرام کے ساتھ تاج کا نشان بھی نقش ہے اچھا پھر تارکناں نظر آتا ہے!.. اس شخص کا بھاری بھر کم تھپلا کر گیا ہے اور اسے پتا بھی نہیں چلا!.. مارکٹائی شروع ہو گئی ہے!.. اس عورت نے شیر خوار بچہ اٹھا رکھا ہے اور اس کی شکل بھی اتنی بری نہیں۔ بی بی، میرا خیال ہے کہ یوں کوئی تمھیں روکے گا بھی نہیں... ذرا دیکھو تو سہی، یہ سلسلہ شیطان کی آنت کی طرح دراز ہوتا جا رہا ہے؟ کہیں رکنے کا نام ہی نہیں لیتا روٹی چھو کر یوں، خدا کی قسم، بالکل روٹی ہیں! گاڑیوں میں۔ کیا مترے سے ڈٹی بیٹھی ہیں!“

جیسا کہ خاصو کی گرجے کے سامنے ہوا تھا، قیدیوں میں ایک بار پھر تجسس کی لہر دوڑ گئی اور وہ، رامار سڑک پر آگے بڑھنے لگے۔ بیئر کے ساتھیوں کو جس چیز میں دلچسپی پیدا ہو گئی تھی، وہ اپنے قد کی بدولت ان کے سروں کے

اوپر ہی اوپر اسے دیکھنے میں کامیاب رہا۔ گولہ بارود کی گاڑیوں کے مابین تین کارائٹائیں پھنسی ہوئی تھیں۔ ان میں سرخی پاؤں لگائے اور بھڑکیے ملید سات پہنے عورتیں ایک دوسری میں ٹھنسی بیٹھی تھیں اور ٹیکھی آوازوں میں جھلا جھلا کر کچھ کہہ رہی تھیں۔

جب سے بیڑے پر اسرار قوت کو مختلف صورتوں میں جلوہ گر ہوتے پھیلاتا تھا، اسے کوئی چیز بھی نہ تو دلاش، جس کا چہرہ مذاقا کالاکر دیا گیا تھا، نہ یہ عورتیں، جنہیں یہاں سے نکل بھاگنے کی جلدی تھی اور نہ ماسکو کے سوتے کنڈرات۔ عجیب یا بھیا تک معلوم نہیں ہوتی تھی۔ چنانچہ اب جو کچھ بھی وہ دیکھتا تھا، اس کا اس پر کوئی خاص اثر نہیں ہوتا تھا۔ کچھ یوں نظر آتا تھا کہ اس کی روح کسی صبر آرماءد جہد میں گزرنے کی تیاریاں کر رہی ہے اور کسی ایسے ہاتھ کو، جو اسے مستحکم کر دے، قبول کرنے سے انکاری ہے۔

عورتوں کی گاڑیاں آگے نکل گئیں۔ ان کے پیچھے مزید گاڑیاں، سپاہی، گولے بارود کے چھکڑے، سپاہی، گاڑیاں، گولے بارود کے چھکڑے، سپاہی، آتے رہے۔ گاہے گاہے عورتیں بھی نظر آ جاتیں۔

بیڑے نے ان لوگوں کو ان کی انفرادی حیثیت سے نہیں پہچانا، وہ صرف ان کی عمومی نقل و حرکت کا مشاہدہ کر رہا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ کوئی نا دیدہ قوت ان تمام انہوں اور گھوڑوں کو ان کی مرضی کے خلاف آگے دھکیل رہی ہے۔ اس ایک گھنٹے کے دوران میں، جب بیڑا انہیں دیکھ رہا تھا، اسے یہی محسوس ہو کہ ان سب پر، جو مختلف گلی کرچوں سے چلے آ رہے تھے، صرف ایک ہی دھن سوار ہے کہ وہ حتی الامکان جلد از جلد یہاں سے نکل جائیں۔ وہ ایک دوسرے کے ساتھ دھکم دھکا کر رہے تھے ان کے جذبات کا مادا اہل رہا تھا اور ان کی آپس میں دھینکا مشتی شروع ہو گئی تھی۔ ان کے سفید دانت چمک رہے تھے، ابرو تنے ہوئے تھے اور وہ ایک دوسرے کے ساتھ مقلحات کا تبادلہ کر رہے تھے۔ ہر چہرے پر ایک ہی قسم کا ناقابل انت اندیش عزم اور مردہر سفاکی کی جھلک رہی تھی۔ اور یہاں چیزیں تھیں جو بیڑے نے صبح اس وقت، جب طبل بج رہے تھے کارپورل کے چہرے پر دیکھی تھیں۔

جب قافلے کا کمانڈنگ افسر اپنے جوانوں کو مجتمع کرنے میں کامیاب ہوا، اس سے شام ہو چکی تھی۔ دو چہینے جھانستے اور دھینکا مشتی کرتے چھکڑوں کے بیچ میں گھس گیا اور جب قیدی چاروں اطراف سے گھیرے میں آ گئے، وہ او اس کے ساتھ ہی انہیں ہانکتے کا لوگا روڈ پر نکل آئے۔

وہ کہیں رکے اور آرام کیے بغیر بہت تیز تیز چلتے رہے اور صرف اس وقت رکے جب سورج غروب ہونے لگا تھا۔ چھکڑے ایک دوسرے کے قریب کھڑے کر دیے گئے درو چیوں نے شب ہری کی تیاریاں شروع کر دیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ ہر شخص جھلا ہٹ اور بے اطمینانی کا مارا ہوا ہے۔ چاروں اطراف سے نادیر گالیوں، قسموں، معاندانہ شور و غل اور مار کٹائی کی آوازیں آتی رہیں۔ یک گاڑی جو قافلے کے عقب میں آ رہی تھی، ایک چھکڑے سے ٹکرائی اور اس نے اپنا ہم اس میں پھنسا دیا متعدد جوان بھاگے بھاگے آئے، انہوں نے گھوڑوں کو یک طرف دھکیلا اور ان کے سراں پر ڈنڈے برسائے لگے۔ دوسرے آپس میں الجھ گئے اور بیڑے نے دیکھا کہ ایک جرمن کوارٹے دشمنی ہو

گیا ہے۔

جب یہ لوگ روانہ ہوئے تھے، انھیں آگے جانے کی اتنی جلدی اور شوق تھا کہ معلوم ہوتا تھا کہ ان کے سروں پر کوئی بھوت سوار ہو گیا ہے، مگر اب جب وہ خزانہ شام کے سرد دھندلکے میں کھیتوں کے عین بیچ میں ڈیرے ڈالے پڑے تھے، یوں نظر آنے لگا جیسے انھیں شدید جھٹکا لگا ہے، ان کی اچانک آنکھ کھل گئی ہے اور ان سب کو ایک ہی قسم کے ناخوش گوار احساس کا تجربہ ہو رہا ہے۔ ”ہائیں، ہم یہ کیا کر بیٹھے ہیں!“ اب جب کہ وہ رک گئے تھے، قرائن سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ یہ سمجھ گئے ہیں کہ انھیں ابھی تک یہ معلوم ہی نہیں کہ وہ کہاں جا رہے ہیں اور یہ کہ ان کی جان آسانی سے نہیں چھوٹے گی، بلکہ انھیں راستے میں بے شمار مصائب اور مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا۔ بوقت روانگی قیدیوں کے ساتھ محافطوں کا ردیہ اچھا نہیں تھا لیکن یہاں پڑاؤ میں وہ ان کے ساتھ اور بھی بدسلوکی سے پیش آنے لگے۔ یہاں پہلی مرتبہ قیدیوں کو گھوڑوں کا ماس کھانے کو ملا۔

فسروں سے لے کر ادنیٰ سے ادنیٰ سپاہیوں تک سب کا ردیہ کچھ اس قسم کا تھا کہ معلوم ہوتا تھا کہ انھیں قیدیوں کے ساتھ کوئی ذاتی عناد ہے۔ پہلے وہ ان کے ساتھ جس دوستانہ انداز سے پیش آتے رہے تھے، ان کا یہ سلوک اس کے بالکل متضاد تھا۔

ان کی اس عداوت میں اس وقت اور بھی اضافہ ہو گیا جب قیدیوں کی کشتی کے دوران میں یہ معلوم ہوا کہ ماسکو سے روانگی پر جو افراتفری مچی تھی، اس کے دوران میں ایک روسی سپاہی، جس نے در دقونج کا بہانہ کیا تھا، فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ میئر نے دیکھا کہ ایک فرانسیسی ایک اور روسی سپاہی کو کھنٹ اس لیے بیدردی سے پیٹ رہا ہے کہ وہ بھٹک کر سڑک سے کچھ زیادہ ہی پرے چلا گیا تھا اور اس نے اپنے دوست کیپٹن کو ایک نان کمشنڈ افسر کو جھاڑ پلاتے اور دھمکیاں دیتے سنا کہ قیدی کے بھاگ جانے پر اس کا کورٹ مارشل کیا جائے گا۔ جب نان کمشنڈ افسر نے یہ عذر پیش کیا کہ قیدی بیمار تھا اور چلنے پھرنے سے معذور، افسر نے جواب دیا کہ حکم یہ تھا کہ جو لوگ پیچھے رہ جائیں، انھیں گولی مار دی جائے۔ میئر کو عسوس ہوا کہ وہ اندھی قوت، جو قتل میں اس پر غالب آگئی تھی لیکن جس کا اسیری کے دوران میں اسے کوئی احساس نہیں ہوا تھا، ایک بار پھر اس کے وجود کو اپنے شکنجے میں کس جکلی ہے۔ یہ اسے خوف زدہ کر رہی تھی لیکن اسے یہ بھی محسوس ہو رہا تھا کہ یہ بدکت خیز قوت اسے کچلنے کی جتنی زیادہ کوشش کرتی ہے، اس کی اپنی قوت حیات اس کے باطن کے اندر اتنی ہی زیادہ مضبوط رہتی جا رہی ہے۔

میئر نے رائی کے آنے کے سوپ کے ساتھ گھوڑے کا گوشت کھایا اور اپنے ساتھیوں کے ساتھ گپ شپ کرتے لگا۔

انھوں نے ماسکو میں جو کچھ دیکھا تھا، فرانسیسی ان کے ساتھ جو ظالمانہ سلوک کر رہے تھے، پیچھے رہ جانے والوں کو گولی مار دینے کا جو حکم دیا گیا تھا اور جو انھیں بھی سنا دیا گیا تھا، میئر اور دوسرے لوگوں نے ان باتوں کے متعلق آپس میں کوئی تبادلہ خیالات نہ کیا۔ ان کی حالت جس طرح دم بدم بد سے بدتر ہوتی جا رہی تھی، معلوم ہوتا

تھا کہ اس کا تو ذکر کرنے کے لیے انھوں نے خاص طور پر عانی حوصلگی، سنا جلتے پن اور شگفتہ مزاحی کا نقاب اوڑھ لیا ہے۔ انھوں نے بھولی بسری باتوں کو تازہ کیا، کوچ کے دوران میں جو سچک مناظر ان کے مشاہدے میں آئے تھے، ان کا عارہ کیا لیکن انھوں نے اپنی موجودہ قابل رحم حالت کا بھولے سے بھی ذکر نہ کیا۔

سورج کبھی کا غروب ہو چکا تھا۔ آکاش پر کہیں کہیں ستارے ٹٹمارہے تھے، اُتی پر، جہاں مکمل طلوع ہو رہا تھا، کچھ اس طرح سرخ لوبھڑک اٹھی جیسے کہیں زبردست آگ لگ گئی ہو، اور سر میں دھند میں عظیم الشان امیر کوہ عیب و عریب انداز سے، آگے پیچھے جھولنے لگا۔ پیٹر انڈھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے اپنے نئے ساتھیوں کو شب بخیر کہا اور الاؤں کے بیچ میں سے چلتا سڑک کے دوسرے کنارے پہنچ گیا، جہاں اسے بتایا گیا تھا کہ وہ قیدی ٹھہرے گئے ہیں۔ اس کا ات کے ساتھ باتیں کرنے کو جی چاہتا تھا۔ سڑک پر اسے فرانسیسی سنتری نے روک لیا اور اسے حکم دیا کہ وہ واپس چلا جائے۔

پیٹر واپس تو آ گیا لیکن وہ الاؤ کے قریب اپنے ساتھیوں کے پاس نہ گیا بلکہ ایک چھڑے کے جس میں سے گھوڑے کھول لیے گئے تھے اور جہاں کوئی تنفس نہیں تھا، نزدیک چلا گیا۔ وہ آلتی پالتی مار کر چھڑے کے یک پس کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گیا اور سر جھکائے اپنے خیالات میں مستغرق کافی دیر تک ماکت بیٹھا رہا۔ ایک گھنٹے سے اوپر گزر گیا۔ کوئی شخص بھی اس کے سکون میں دخل نہ ہوا۔ چانک وہ اتنے زور زور سے اور اتنی خوش طبعی سے کھلکھلا کر ہنسنے لگا کہ تمام لوگ حیرت و استعجاب کے عالم میں اپنے چاروں اطراف دیکھنے اور سوچنے لگے کہ بظاہر یہ تنہا شخص کون ہے جو اتنی زندہ دلی سے قہقہے لگا رہا ہے۔

”ہا، ہا، ہا!“ پیٹر ہنس رہا تھا۔ اور اس نے ہا آواز بلند اپنے آپ سے کہا ”اس سپاہی نے مجھے گزرنے نہ دیا۔ انھوں نے مجھے پکڑ لیا اور بند کر دیا۔ انھوں نے مجھے قیدی بنا رکھا ہے۔ یہ مجھے کون ہے؟ مجھے؟ مجھے۔ میری غیر فانی روح اہا، ہا، ہا!“ اور وہ ہنستا رہا، ہنستا رہا، یہاں تک کہ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

ایک آدمی اٹھا اور یہ دیکھنے آیا کہ یہ عجیب اور کچھ دشیم آدمی اکبیا کس چیز پر ہنس رہا ہے۔ پیٹر نے ہنسا بند کر دیا۔ وہ اٹھا، اس شخص کے قریب سے گزرتا آگے نکل گیا اور اپنے ارد گرد پیش دیکھنے لگا۔

وسیع دھریض، بے پایاں شبینہ پڑاؤ، جس میں کچھ دیر پہلے الاؤں میں لکڑیاں چڑھ رہی تھیں اور باتوں کی جھنجھٹا ہٹ گونج رہی تھی، خاموش ہو چکا تھا۔ الاؤں کے سرخ شعلے ماند پڑ گئے تھے اور آگ آہستہ آہستہ بجھتی جا رہی تھی۔

دو پر درخشاں آسمان پر چودھویں کا چاند اپنی پوری آب و تاب سے آویزاں تھا۔ کیمپ کی حدود سے پرے جنگل اور کھیت، جو پہلے نظروں سے اوجھل تھے، اب دور سے دکھائی دینے لگے تھے۔ ان کھیتوں اور جنگلوں کے پار تابندہ تھلکھلاتا، ٹٹٹا تا اُفق لگا ہوں کو اپنی طرف دعوت دے رہا تھا۔ پیٹر آسمان پر دیر، بہت دیر، ٹٹٹاتے اور پیچھے ہٹتے ستاروں کو بغور دیکھتا رہا۔

”یہ سب کچھ میرا ہے، یہ سب کچھ میرے اندر ہے اور یہ سب کچھ میں ہوں!“ اس نے سوچا۔ ”اور انھوں نے یہ سب کچھ بکڑ اور اسے سائبان کے اندر، جسے شہتیراں سے محصور کر دیا گیا تھا، بند کر دیا۔“ وہ مسکرایا اور اپنے ساتھیوں کے قریب لیٹنے اور مرنے کے لیے واپس چل پڑا۔

15

اکتوبر کے اوائل میں پیرلین نے صلح کی تجاویز کے ساتھ ایک اور ایلچی کو تورتوف کے پاس بھیجا۔ اس نے نند بیانی سے کام لیتے ہوئے مراسلے میں مقام تحریر یا سکو لکھا حاراً لکھ دیا وہ اس وقت کا لوگاروڈ پر سفر کر رہا تھا اور جہاں کو تورتوف نے ذریعے ڈاں رکھے تھے، وہاں سے کوئی خاص دور نہیں تھا۔ کو تورتوف نے اس مراسلے کا بھی وہی جواب دیا جو اس نے پہلے مراسلے کا دیا تھا جو لو غسٹوں لایا تھا۔ اس نے لکھا کہ صلح کا سواں ہی پیدا نہیں ہوتا۔

اس کے ایک دو روز بعد جنرل درو خوف کے گوریلے دستوں کی، جو تارتوینو کے بائیں جانب کارروائیاں میں مصروف تھے، رپورٹ موصول ہوئی کہ چند فرانسیسی رجمنٹیں فملسکایا (گاڈس) کے آس پاس دیکھی گئی ہیں۔ ان کا تعلق جنرل بغوسیئے (Broussier) کی ڈویژن سے ہے اور چونکہ باقی فرانسیسی فوج کے ساتھ ان کا رابطہ قطع ہو چکا ہے، اس لیے ان کا با آسانی قلع قمع ہو سکتا ہے۔ سپاہی اور افسر ایک بار پھر زور شور سے عملی کارروائی کا مطالبہ کرنے لگے۔ تارتوینو کے مقام پر جو آسان فتح حاصل ہوئی تھی، شائف کے جرنیلوں کو یاد آگئی اور ان کا جوش و خروش ابلنے لگا۔ انھوں نے کو تورتوف سے اصرار کیا کہ درو خوف کی تجویز پر عمل کیا جائے۔ کو تورتوف کا خیال تھا کہ جارحانہ کارروائی کی ضرورت نہیں۔ تاہم نتیجہ ناگزیر طور پر مفاہمت کی صورت میں برآمد ہوا۔ بغوسیئے پر حملہ کرنے کے لیے مختصر جمعیت روانہ کر دی گئی۔

عجیب اتفاق ہے کہ یہ فریضہ، جو انتہائی کٹھن اور اہم ثابت ہوا، دختورتوف کے سپر کیا گیا۔ دختورتوف معسرا مزاج پست قامت جرنیل تھا۔ کسی (مورخ) نے بھی اس کا ذکر اس انداز سے نہیں کیا کہ وہ جنگی منصوبے ترتیب دیتا تھا، رجمنٹوں کے آگے دوڑتا تھا اور توپوں پر تمغوں کی بارش کرتا تھا، وغیرہ وغیرہ۔ سب لوگوں کا یہی خیال تھا اور وہ کہتے بھی یہی کہتے تھے کہ وہ ضعیف الارادہ اور بصیرت سے محروم شخص ہے۔ لیکن اوسٹریٹس سے 1893 تک روسیوں اور فرانسیسیوں کے مابین جتنے معرکے پاہوتے ہیں، جہاں کہیں بھی مشکل صورت حال پیدا ہوتی ہے، ہمیں کمان ہمیشہ اس کے ہاتھ میں نظر آتی ہے۔ اوسٹریٹس کے معرکے میں وہ وگڈ ڈیم سے سب سے آخر میں روانہ ہوتا ہے۔ اس کے چاروں اطراف بھکڑ رہی ہوئی ہے۔ لوگ فر رہ رہے ہیں یا ہٹا ہٹ رہے ہیں اور عقب میں ایک جرنیل بھی نظر نہیں آ رہا، لیکن وہ ہے کہ رجمنٹیں اکٹھی کر رہا ہے اور جو کچھ بچایا جاسکتا ہے، بچانے کی کوشش کر رہا ہے۔ وہ بخار میں پھنک رہا ہے لیکن میں ہزار آدمی لے کر نیولین کی پوری فوج کے خلاف نبرد آزما ہونے اور سمونسک کا دفاع کرنے چل پڑتا ہے۔ سمونسک میں سے بالآخر فگیٹ کے قریب شدت بخار میں ذرا اٹکھ آ

جاتی ہے کہ اس کے کان میں شہر پر گولہ باری کی آواز پڑتی ہے، وہ فوراً جاگ جاتا ہے۔ اور سولسک سردار ان غنیم کے خلاف ڈنار ہوتا ہے۔ بارو وینو کی لڑائی میں جب باگ راتیاں ہلاک ہو جاتا ہے، ہمارے میسرے کے نوے (90) فیصد جوان ہلاک یا زخمی ہو جاتے ہیں اور فرانسیسی آرٹلری اپنی ساری فائرنگ کا رخ اسی طرف کر دیتی ہے، کوٹوروف نے اس جانب پہلے کسی اور شخص کو بھیج کر جس غلطی کا ارتکاب کیا تھا، وہ اس کا ارتکاب کرے میں دیر نہیں کرتا۔ وہ جھٹ پٹ اس "ضعیف لاراوہ اور بے بصیرت" شخص کو ادھر روانہ کرتا ہے کیونکہ اس کے علاوہ کوئی اور سوروں آدمی نظر نہیں آتا۔ پست قاست، نرم خود بخوروف وہاں جاتا ہے اور بارو وینو کی لڑائی ردی فوج کا تنظیم کریں سراپہ بن جاتی ہے۔ نظم و نشر دونوں میں بے شمار ہیروؤں کی شاں میں زمین آسمان کے تلاب ملے گئے ہیں لیکن دخوروف کی تعریف میں شاید ہی کسی نے ایک آدھ لفظ کہا ہوگا۔

اور یہ دخوروف ہی ہے جسے پہلے فامنسکیا اور وہاں سے مالا یو سلاوٹس بھیجا جاتا ہے جہاں فرانسیسیوں کے خلاف آخری لڑائی لڑی گئی اور یہیں سے لاریب فرانسیسی فوج کی شکست و ریخت کا آغاز ہوا۔ جنگ کے اس دور کے بے شمار عبقریوں اور ہیروؤں کی تعریفوں کے پلے بانڈھے جاتے ہیں لیکن بجا ہے کہ کوئی شخص بھول کر بھی دخوروف کا نام لے لے اور اگر اس کا کہیں ذکر کیا بھی جاتا ہے تو محض خانہ پرہی کے لیے اور وہ بھی بڑے سہم انداز سے۔ مورخوں و رو قانع نگاروں کی یہی خاموشی اس کی خوبیوں کا منہ بولنا ثبوت ہے۔

جو شخص مشین کی ساخت نہیں سمجھتا، اس کے لیے یہ تصور کرنا دشوار ہے کہ مشین کا اہم ترین پرزہ واکٹل نہیں جوتا تھا اس میں گر پڑتی ہے اور ادھر ادھر اچھل رہی اور اس کے کام میں رکاوٹ بن رہی ہوتی ہے بلکہ چراغ بردانی (Cogwheel) ہے جو شور و غل پیدا کیے بغیر سس گھومتا رہتا ہے۔

دس، کتوبر یعنی اس روز جب دخوروف فامنسکیا کی آدمی مسافت طے کر چکا تھا اور جو احکام اسے ملے تھے، ان کی ایماندارانہ انداز سے تعمیل کرنے کے لیے ارستودوگاؤں میں رک گیا تھا، پوری فرانسیسی فوج سرینوں کی طرح کبھی چلتی اور کبھی رکتی اس جگہ پہنچ گئی، جہاں موقعاً پڑا ڈوڈل رکھا تھا۔ بظاہر تو یہی دکھائی دیتا تھا کہ اس کا ارادہ معرکہ آرائی کرنے کا ہے لیکن وہ ایسا کی اور کسی ظاہری وجہ کے بغیر یا کسی طرف مڑ گئی اور کالوگارڈ پر چڑھ گئی۔ یہاں سے اس کا رخ فامنسکیا کی طرف ہو گیا، جہاں اس وقت تک صرف بغوسے قیام پذیر تھا۔ اس وقت دخوروف کی کان میں درد و خوف کے گوریلوں کے علاوہ صرف دو اور پھوٹے پھوٹے دستے تھے۔ ان دستوں کے کمانڈر گنر اور سیلاون تھے۔

گیارہ اکتوبر کی شام کو سیلاون ارستودوگاؤں کو اڑھائی پہنچا۔ اس کے ساتھ فرانسیسی گارڈز کا ایک گرفتار شدہ سپاہی تھا۔ قیدی نے بتایا کہ اس روز جو سپاہ فامنسکیا پہنچی تھی، وہ ساری فرانسیسی فوج کا ہر اول ہے اور پو میں اس کے ساتھ ہے۔ اس نے یہ اطلاع بھی دی کہ تمام کی تمام فوج چار روز قبل ماسکو کو خیر باد کہہ چکی تھی۔ اسی شام ایک گھریلو غلام، جو بارو وینک سے آیا تھا، یہ خبر لایا کہ اس نے بہت بڑی فوج قصبے میں داخل ہونے دیکھی تھی۔ دخوروف

کے دستے کے چند قازقوں نے اطلاع دی کہ نھوں نے فرانسیسی گاڑوں کو بارود سک کی طرف کوچ کرتے دیکھا ہے۔ ان کی تمام اذیت سے یہی نتیجہ اخذ ہوتا تھا کہ جہاں انھیں ایک ڈویژن فوج سے ٹکڑا بھیڑ ہونے کی توقع تھی، وہاں اب پوری فرانسیسی فوج پہنچ چکی ہے۔ یہ فوج ماسکو سے غیر متوقع سمت — پرانی کالوگا روڈ — سے سفر کرتی آئی تھی۔ دستوروف کوئی کارروائی کرنے سے گریزاں تھا کیونکہ اس پر یہ واضح نہیں تھا کہ ان حالات میں اس پر کیا اثر ہوگا۔ فاسنسکا یا پر حملہ کرنے کا حکم ملا تھا لیکن اس وقت وہاں صرف جنرل بغوسیے موجود تھا جب کہ اب وہاں ساری فرانسیسی فوج مجتمع ہو چکی تھی۔ یہ مالوف اپنی صوابدید کے مطابق کارروائی کرنا چاہتا تھا لیکن دستوروف نے صاف انکار کر دیا۔ اس کا اصرار تھا کہ اسے اس معاملے کی اطلاع ہر سرین ہائیٹس کو دینا اور اس سے (تازہ) ہدایات حاصل کرنا ہوں گے۔ چنانچہ (کمانڈر انچیف کے) سٹاف کے نام مراسلہ بھیجے کا فیصلہ ہو گیا۔

اس مقصد کے لیے ایک باصلاحیت، فسر بال خودی تیوف کو منتخب کیا گیا۔ تحریری مراسلے کے علاوہ اس نے سارے معاملے کے متعلق زبانی رپورٹ بھی پیش کرنا تھی۔ بال خودی تیوف کو مراسلہ اور ہدایات بوقت نیم شب ملیں اور وہ ایک قازق اور فالتو گھوڑوں کے ساتھ سرپٹ جنرل سٹاف کی طرف بھاگنے لگا۔

16

یہ موسم خزاں کی نیم گرم اندھیری رات تھی۔ چار دن سے پانی برس رہا تھا۔ دو مرتبہ گھوڑے تبدیل کرنے، اور نہیں کیچڑا کر چھپ چکی سڑک پر ڈیڑھ گھنٹے میں بیس میل سرپٹ دوڑانے کے بعد بال خودی تیوف تقریباً دو بجے لیتا شیوکا (گاؤں) پہنچ گیا۔ ایک جھونپڑی نما مکان کے، جس کی جھنڈی کی باڑ پر ”جنرل سٹاف“ کی تختی لٹک رہی تھی، وہ گھوڑے سے نیچے اترا، لگام چھوڑ دی اور تار یک راہداری میں داخل ہو گیا۔

”ڈیوٹی جرنیل، ابھی اور اسی وقت، نہایت ہی اہم پیغام ہے!“ اس نے کسی شخص سے، جو گھبرا گیا تھا اور خرخرارہا تھا، چلا کر کہا۔

”ان کی طبیعت آج شام سخت خراب ہو گئی تھی۔ وہ تین راتیں سو نہیں سکے تھے۔“ اردلی نے سرگوشیوں میں احتجاج کرتے ہوئے کہا۔ ”بہتر ہے کہ پہلے کیپٹن کو جگائیں۔“

”پیغام اشد ضروری ہے۔ جنرل دستوروف نے بھیجا ہے۔“ بال خودی تیوف نے اندھیرے میں کھلے دروازے کی طرف رستہ ٹٹولتے ہوئے کہا اور ایک کمرے میں، جس میں اردلی اس سے پہلے جا چکا تھا اور کسی کو جگا رہا تھا، داخل ہو گیا۔

”جناب عالی، جناب عالی! اپنی۔“

”کیا؟ کیا؟ کس کا؟“ کسی نے اوجھکتے ہوئے کہا۔

”دستوروف اور ایلسی پیتر وچ (یہ مالوف) کی طرف سے۔ پولین فاسنسکا یا پہنچ گیا ہے۔“ بال خودی تیوف

نے کہا۔ اسے اندھیرے میں کچھ نظر نہیں آ رہا تھا کہ کون بول رہا ہے لیکن اس نے آواز سے فرض کر لیا کہ وہ (جنرل) کانودٹسن ہی ہوگا۔

جس شخص کو جگا یا گیا تھا، اس نے جہاں کی اور ہاتھ پاؤں اکڑائے (تا کہ پٹھے جاگ جائیں)۔
 ”میں انھیں جگانا نہیں چاہتا۔“ اس نے کوئی چیز ٹٹلاتے ہوئے کہا۔ ”وہ ہمارا آدمی ہیں اور (جو کچھ تم کہہ رہے ہو) ہو سکتا ہے وہ محض انوادی ہی ہو۔“

”(میرے پاس) یہ مراسلہ ہے۔“ بالخودی تی ٹوف نے کہا۔ ”مجھے حکم ہے کہ میں یہی، غور ڈیٹی ٹریٹل کو پہنچا دوں۔“

”ذرا ٹھہرو، میں موسم بتی چلاتا ہوں۔۔۔ بلعنوان، یہ تم چیزیں کہاں چھپا دیتے ہو؟“ اس شخص نے، جو اپنے ہاتھ پاؤں کھینچ کھینچ رہا تھا، اردلی سے کہا۔ وہ کانودٹسن کا ایجوٹڈ شریٹن تھا۔ ”مل گئی ہے، مل گئی ہے۔“ اس نے مزید کہا۔

اردلی چھتاں رگڑ رہا تھا اور شریٹن ہاتھوں سے ٹٹول ٹٹول کر شخ ڈھونڈ رہا تھا۔

”عجیب مصیبت ہے! کیڑوں موزوں کی اولاد! اس نے نفرت سے کہا

شعلوں کی روشنی میں بالخودی تی ٹوف کو شریٹن کے نوخیز چہرے کی جھلک دکھائی دی۔ شریٹن کے ہاتھ میں جھوٹا شمع دان تھا اور ایک دوسرا شخص کو نے میں سویا پڑا تھا۔ یہ کانودٹسن تھا۔

جب گندھک کے ٹکڑوں کے، جنھیں چھتاں سے سلکایا گیا تھا، شعلے پہلے خیلے اور پھر سرخ ہو گئے، شریٹن نے چربی کی شمع جلائی۔ تل چٹے، جوا سے کتر رہے تھے، فرار ہو گئے۔ اور ایچی کی طرف دیکھنے لگا۔ بالخودی تی ٹوف کے تمام کیڑوں پر کچھڑی کیچڑ تھا اور اس نے آستین سے منہ پونچھ کر اسے بھی میلا کر لیا تھا۔

”آپ کو یہ اطلاع کس نے دی ہے؟“ شریٹن نے لفافہ پکڑتے ہوئے پوچھا۔

”اطلاع قابل اعتبار ہے۔“ بالخودی تی ٹوف نے جواب دیا۔ ”تید یوں، قازقوں اور مخمروں، سبھی نے یکساں

بیان دیا ہے۔“

”پھر تو مجبوری ہے۔ انھیں جگانا ہی ہوگا۔“ شریٹن نے کہا۔ وہ اٹھا اور خوابیدہ شخص کی طرف چل پڑا جو ٹپنی

اوڑھے ٹاسے بڑے فوجی اور کوٹ کے نیچے لیٹا ہوا تھا۔ ”ہیو تروچ آ“ اس نے پکارا۔ (کانودٹسن نے کوئی حرکت

نہ کی۔) ”آپ کو ہیڈ کوارٹرز یا دیکھا جا رہا ہے؟“ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کے یہ الفاظ اسے

یقیناً جگا دیں گے۔

اور ہوا بھی یہی۔ شبینہ ٹپنی میں ملفوف سر جھٹ پٹ اور اٹھا۔ کانودٹسن کے خوبصورت چہرے پر، جس کے رخسار بخار کی وجہ سے شہتارے تھے، گھڑی کی گھڑی کچھ اس قسم کا تاثر ہو رہا ہو جیسے وہ کہیں ”دور، بہت دور،

خوابوں کی دنیا میں کھویا ہوا ہو۔ پھر وہ آنا قانا چونک پڑا اور اس کے چہرے پر معمول کے مطابق سکون اور غیر متزلزل

عزم جھلکنے لگا۔

”اچھا، یہ کیا ہے؟“ اس نے بھیجا ہے؟“ اس نے جھٹ پٹ پوچھا لیکن اس کے سبب میں تعجب کا شائبہ بھی نہیں تھا اور وہ روشنی میں آنکھیں جھپکاتے لگا۔

افسر کی رپورٹ سننے کے دوران میں اس نے مراسلہ کھولا اور سے پڑھنے لگا۔ اس نے مراسلے کی خواندگی بمشکل ختم کی ہوگی کہ اس نے اپنی ٹانگیں، جولابی جربوں میں لیٹی ہوئی تھیں، مٹی کے فرش پر نیچے اتاریں اور بوٹ پہننے لگا۔ پھر اس نے شینہ ٹوپی اتاری، کنگھی سے کپٹیوں پر بال درست کیے اور ٹوپی دوبارہ پہن لی۔

”تمہیں یہاں پہنچنے میں زیادہ دیر تو نہیں لگی؟ آؤ، ہر سیرین ہائی ٹس کے پاس چلتے ہیں۔“

کانوڈنسن فی الفور سمجھ گیا کہ مراسلہ انتہائی ہم ہے اور ذرا سا وقت بھی ضائع نہیں کیا جاسکتا۔ اس نے نہ ہوا اور نہ اپنے آپ سے پوچھا کہ خبر اچھی ہے یا بری۔ اسے اس میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ جنگ کے سارے معاملے کے بارے میں اس کا رویہ نہ تو تعقل اور نہ دانش کے، بلکہ کسی اور چیز کے تابع تھا۔ اس کے دل میں یہ پختہ یقین تھا، اگرچہ اس نے کبھی اس کا اظہار نہیں کیا تھا، کہ سب ٹھیک ٹھاک ہو جائے گا، لیکن آدمی کو اس پر انحصار نہیں کرنا چاہیے اور اس کا ذکر تو بالکل ہی نہیں کرنا چاہیے بلکہ اسے محض اپنا کام کرتے رہنا چاہیے اور یہ وہ کرتا تھا اور اپنی ساری توانائیاں اس پر صرف کر دیتا تھا۔

معلوم ہوتا ہے کہ 1812 کے نام نہا، ہیروؤں، بارنگیوں، رالیف سکیوں، ریما لودنوں، پلاٹونوں اور میلارادوچوں کی فہرست میں دختوروف کی طرح پیوٹروویچ کانوڈنسن کا نام بھی محض اخلاقاً درج کر لیا گیا ہے۔ دختوروف کی طرح اس کی بھی شہرت یہی تھی کہ وہ محدود قابلیت اور علم کا مالک ہے۔ دختوروف کی طرح اس نے بھی کبھی جنگی منصوبے نہیں بنائے تھے لیکن وہ ہمیشہ اس جگہ، جہاں صورت حال مشکل تر ہوئی تھی، پایا جاتا تھا، اور جس روز اسے ڈیوٹی جرنیل مقرر کیا گیا تھا، اسی دن سے اس نے یہ عادت بنالی تھی کہ وہ دروازہ کھول کر سوتا تھا اور اس نے حکم دے رکھا تھا کہ جو بھی کوئی اچھی آئے، اسے فوراً جگا دیا جائے۔ لڑائی کے دوران میں وہ مستحضر اس جگہ، جہاں فائرنگ ہو رہی ہوئی تھی، موجود ہوتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ کوٹوزوف اسے ڈانٹتا رہتا تھا اور اسے ہی ڈپر بھیجنے سے خوف کھاتا تھا۔ اور دختوروف کی طرح کانوڈنسن بھی غیر نمایاں چرخ زندانی تھا جو کسی قسم کا شور و غل یا کڑکڑاہٹ کے بغیر مشین کا اہم پرزہ بن جاتا ہے۔

کانوڈنسن مرطوب اور تاریک رات میں اپنے چھوٹے نما مکان سے باہر آیا۔ وہ جیس بہ جیس ہوتا تھا۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ اس کے سر درد میں اضافہ ہو گیا تھا۔ دوسرے اس کے ذہن میں یہ ناخوشگوار خیال گردش کرنے لگا کہ معلوم نہیں کہ شاف، بالخصوص بے لگ سین کا، جس کا تارہ تینوی لڑائی کے بعد سے کوٹوزوف سے اینٹ کتے کا ہیر چل رہا تھا، رد عمل کیا ہو۔ وہ تجویز پر تجویز پیش کریں گے لڑیں گے، جھگڑیں گے، احکام جاری کریں گے اور پھر ان پر قلم بھیر دیں گے۔ اور یہ پیش اندیشگی اس کے لیے ناگوار تھی حالانکہ وہ جانتا تھا کہ یہ صورت حال ناگزیر ہے۔

اور واقعتاً ہوا بھی جی۔ ٹول نے جسے وہ یہ خبر پہنچانے گیا تھا، جھٹ پٹ اس جرنیل کے سامنے، جو اس کے ساتھ قیام پذیر تھا، اپنے نظریات کی تشریح بیان کرنا شروع کر دی تا آنکہ کانوٹسٹن کا، جو خاموشی سے اس کی تقریر من رہا تھا، پچھلے صبر لبریز ہونے لگا، اور اس نے سے یاد درایا کہ انھیں ہر سیرین ہائی لٹ کے پاس جانا چاہیے۔

17

قلم من رسیدہ اشخاص کی طرح کو تو زوف کو اس رات کوئی خاص نیند نہ آئی۔ وہ دن کے دوران میں اکثر اوقات غیر متوقع طور پر اوجھٹنے لگتا لیکن رات کو جب وہ اپنا لباس تبدیل کیے بغیر بستر پر لیٹا تھا، نیند اس کی نگاہوں سے کوسوں دور بھاگ جاتی اور وہ اپنی گھڑیاں سوچنے میں گزار دیتا۔

چنانچہ اب بھی وہ اسی انداز سے اپنے پلنگ پر دراز تھا۔ اس نے پٹے بے چوڑے اور بھاری بھر کم سر کو، جس کی شکل مسح ہو چکی تھی، اپنے لٹھے اور گداز ہاتھوں سے سہارا دے رکھا تھا۔ اس کی ایک آنکھ اندھیرے میں جھانک رہی تھی اور وہ خود سوچ بچار میں مستغرق تھا۔

جب سے بے نگ سین نے، جو زار کے ساتھ خط کتابت کرتا رہتا تھا اور جس کا کسی دوسرے شخص کی نسبت سٹاف پر زیادہ اثر تھا، اس کے قریب پھٹکنا بند کر دیا تھا، کو تو زوف نے لا حاصل جارحانہ کارروائیوں میں اپنی پوری قیادت کرنے کے بارے میں کم فکر کرنے لگا تھا۔ باروتین کی بڑائی میں اور اس سے ایک روز پہلے کے دقے سے اسے جو سبق ملا تھا، اسے اب تک اس کی کسک محسوس ہو رہی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ دوسروں نے اس سے کچھ اثر قبول کیا ہوگا۔

”انھیں یہ سمجھ لینا چاہیے“ اس نے سوچا، ”کہ ہم صرف اسی صورت میں پٹ سکتے ہیں کہ ہم جارحانہ کارروائیوں میں ملوث ہو جائیں۔ صبر تحمل اور وقت میرے دو شمع اور دلیر ساتھی ہیں۔“ وہ جانتا تھا کہ سیب کی رنگت جب تک سبز ہو، اسے توڑنا نہیں چاہیے، پکنے پر یہ خود بخود گر پڑے گا۔ اگر آپ سیب کے پکنے سے پہلے اسے توڑیں گے، آپ سیب بھی خراب کریں گے، درخت کا بھی ستیاناس کریں گے اور اپنے دانت بھی کھٹے کریں گے۔ تجربہ کار شکاری کی طرح وہ جانتا تھا کہ درندہ زخمی ہو چکا ہے۔ بالکل اسی طرح جس طرح کہ رومی فوج کی پوری قوت اسے زخمی کر سکتی تھی۔ لیکن آیا اسے جو زخم آیا ہے، وہ کاری ہے یا نہیں، ابھی اس سوال کا جواب دیا جاتا تھا۔ لغسٹون اور بارٹھلمی (Barthelemy) اس کے پاس (اپنی بنا کر) بھیجے گئے تھے اور ادھر گوریلوں نے، سے اپنی اطلاعات فراہم کی تھیں۔ ان حقائق سے اسے تقریباً یقین ہو گیا تھا کہ زخم مہلک ہے، تاہم ابھی مزید ثبوت درکار تھا اور اس کے لیے ضروری تھا کہ انتظار کیا جائے۔

”یہ بھگ کر رکھنا چاہتے ہیں کہ یہ اسے کتنا نقصان پہنچا سکتے ہیں۔ درمیر کرو، تم خود کچھ ہو گے۔ چلوں اور حملوں کی یہ غیر ختم گفتگو“ اس نے سرچا۔ ”کس ہے“ اپنی ٹوپی میں سرخاب کا پر لگانے کے لیے اپنے تپ کر دوسروں

سے نمایاں بنانے کے لیے جیسے لڑائی نہ ہوئی، دلچسپ فوجی مشقیں ہوئیں اور بالکل چوس کی مانند ہیں۔ سن سے اگر پوچھا جائے کہ ہوا کیا ہے تو وہ کوئی سمجھدار نہ جواب دینے سے قاصر رہیں گے کیونکہ وہ تو صرف یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ وہ کتنی چھی طرح لڑ سکتے ہیں۔ لیکن اصل نکتہ اب یہ نہیں ہے۔

”اور یہ حضرات کیسی کیسی اچھوتی اور انوکھی تجاویز میرے سامنے پیش کرتے رہتے ہیں! جب یہ دو تین
 احکام صورتوں کے متعلق سوچ لیتے ہیں“ (اس کے ذہن میں وہ عمومی منصوبہ تھا جو اسے پیٹرز برگ سے بھیجا گیا
 تھا) ”یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ انھوں نے سب کچھ سوچ لیا ہے۔ لیکن احتمالی صورتیں ایک دو تھوڑے ہوتی ہیں، ان کی
 تعداد تو گنی ہی نہیں جاسکتی۔“

یہ حل طلب سول کہ بارودینوں میں جو زخم پہنچایا گیا تھا، وہ کاری ہے یا نہیں، پورے ایک مہینے سے کوئٹہ زون کے ذہن میں گھللا رہا تھا۔ ایک طرف فرانسیسی ماسکو پر قبضہ کر چکے تھے۔ دوسری طرف روسی کمانڈر انچیف کو یہ پتہ یقین ہو چکا تھا کہ وہ ضرب، جو اس نے اور روسی قوم نے اپنی پوری قوت صرف کر کے لگائی تھی، رائجاں نہیں جاسکتی، وہ لازماً کاری ہوگی۔ لیکن بہر حال ثبوت درکار تھے اور ان کا وہ ایک مہینے سے انتظار کر رہا تھا۔ لیکن انتظار کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔ وہ بہت انتظار کر چکا تھا اور اس کے صبر کا یہ نہ چھلکا چاہتا تھا۔ بے خواب راتوں کے دوران میں وہ بستر پر لیٹے لیٹے بالکل وہی کچھ کرنے لگا تھا جس کے لیے وہ نو جوان جرنیلوں کو مطعون کرتا رہتا تھا۔ مکانی طور پر کس کس قسم کی صورتیں پیش کیں تھیں، وہ ان کا اسی طرح تصور باندھتا رہتا تھا جس طرح کہ اس سے کم عمر کے لوگ کرتے تھے لیکن فرق یہ تھا کہ وہ ان پر کسی قسم کے مفروضوں کی بنیاد نہیں رکھتا تھا اور نہ وہ اس کے ذہن میں دو دو تین تین کے حساب سے آتی تھیں بلکہ اس کے نزدیک ان کی تعداد ہزاروں تک پہنچتی تھی۔ اور وہ جتنا زیادہ سوچتا تھا، اسکا نات کی تعداد میں اتنا ہی زہادہ اضافہ ہوتا جاتا تھا۔ پولین کی فوج اجتماعی طور پر یا ٹکڑیوں میں بٹ کر ویر و برگ کے خلاف، خود اس کے اپنے خلاف اور اس کی فوج کو دائیں یا بائیں طرف گھیرے میں لینے کے سلسلے میں جو چالیں چل سکتی اور کارروائیاں کر سکتی تھی، وہ ان تمام کا جائزہ لیتا رہتا۔ اس نے اس امکان (اور اس سے وہ سب سے زیادہ خائف تھا) کے بارے میں بھی سوچا کہ اس سے بچنے کے لیے پولین خود اسی کا ہتھیار استعمال کر سکتا ہے۔ یعنی وہ ماسکو میں اپنا قیام بڑھا سکتا، ویر ویر دیکھنے کے لیے کہ وہ خود کیا اقدام کرتا ہے، انتظار کر سکتا ہے۔ کوئٹہ زون کے ذہن میں یہ بات بھی آئی کہ پولین کی فوج براستہ میدین^{۱۹} اور خخخ خوف واپس جاسکتی ہے، لیکن ایک بات، جس کا وہ پیشگی اندازہ نہ لگا سکا، وہی وقوع پذیر ہوگئی۔ ماسکو سے روانگی کے بعد سفر کے پہلے گیارہ دنوں کے دوران میں فرانسیسی فوج نے کچھ اس قسم کی بھاگڑ اور انفراتفری کا مظاہرہ کیا جیسے وہ اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھی ہو اور اس پر تیش کے دورے پڑنے لگے ہوں، اور یہی وہ بھگدڑ تھی جس نے اس چیز۔ فرانسیسیوں کی کامل جہی اور ہلاکت۔ کو، جس کا اس نے ابھی تک سوچنے کا حوصلہ نہیں کیا تھا، ممکن بنادیا۔ بغوسیے کی ڈویرٹان کے بارے میں درد خوف کی رپورٹ، پولین کی فوج کی معوبتوں کے متعلق گوریلوں کی اطلاعات، ماسکو سے روانہ ہونے کے لیے فوجوں کے اکٹھا کیے

جانے کی انواریں۔ ان تمام امور و واقعات سے اس مفروضے کی تصدیق ہو رہی تھی کہ نرانیسی فوج شاہی کے کنارے تک پہنچ چکی ہے اور وہ بھاگنے کی تیاریاں کر رہی ہے۔ لیکن یہ محض مفروضات تھے۔ یہ نسبتاً کم عمر اشخاص کو تو اہم نظر آ سکتے تھے لیکن کو تو زوف کو نہیں۔ اپنے ساتھ سالہ تجربے کی بنا پر اسے معلوم تھا کہ انہوں پر کتنا انحصار کرنا چاہیے۔ وہ جانتا تھا کہ انسان جب کسی چیز کی آرزو کرتے ہیں، وہ تمام شواہد کو بڑی چابک دستی سے اس طرح ترتیب دے لیتے ہیں، کہ جو کچھ وہ چاہتے ہیں، وہ اس کی تائید اور تصدیق کرتے نظر آتے ہیں لیکن ان حالات میں جو شواہد ان کی خواہش کے خلاف جاتے ہیں، انھیں وہ نہایت آسانی سے نظر انداز کر دیتے ہیں۔ کو تو زوف اس کی جتنی زیادہ امید کرتا تھا، وہ اتنا ہی زیادہ شک میں گرفتار ہونے لگتا تھا۔ اس کی تمام ذہنی صلاحیتیں محض ایک مسئلے پر صرف ہو رہی تھیں۔ اس کے نزدیک باقی سب کچھ زندگی کے عام معمول کے مطابق تھا۔ وہ اپنے شانے کے ارکان کے ساتھ جو گفتگو میں کرتا تھا، تاروتینو میں قیام کے دوران میں مادام ڈسٹیل²⁰ کے نام جو خطوط تحریر کرتا تھا، ان حالات اور تمنوں کی جو تقسیم کرتا تھا، پیئرز برگ کے حکام کے ساتھ جو خط کتابت کرتا تھا، وغیرہ وغیرہ، یہ سب سرگرمیاں عام معمولات کا حصہ تھیں۔ مگر فرانسیسیوں کی شاہی، جس کا صرف اسے پیشگی اندازہ تھا اس کی دہ دلی تمنا تھا۔

گیارہ اکتوبر کی شب وہ اپنی کہنی سر کے نیچے رکھے لیٹا ہوا تھا اور اس کے متعلق سرج بچار میں غرق تھا۔ ماحقہ کمرے میں اچھل ہوئی اور اسے قدموں کی چاپ پٹائی دی۔ ٹوس، کانوٹسن اور بالٹوویٹ نوٹ اندر آ پھٹے تھے۔

”یہہ، کون ہے؟ اندر آ جاؤ، اندر آ جاؤ! کیا خبر لائے ہو؟“ فیلڈ مارشل نے انھیں آواز دی۔ وردی پوش ملازم شمع روشن کرنے لگا۔ اس کے دوران میں ٹوس نے سے مرا سے کے مدد رجات سے سگاہ کیا۔ ”کون لایا ہے یہ؟“ کو تو زوف نے کہا۔ تنے میں شمع جل گئی اور اس کی روشنی میں ٹول یہ دیکھ کر بہت حائر ہوا کہ اس کے چہرے پر سرد مہر درشتی جھلک رہی ہے۔

”یوئز ہائی نس، اس بارے میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں۔“

”اسے اندر بلاؤ، اسے اندر بلاؤ!“

کو تو زوف اپنی ایک ٹانگ بستر سے باہر نکالے بیٹھا تھا اور اس کی بھاری بھر کم تو بد اس کی دوسری ٹانگ پر، جسے اس نے دوہرا کر رکھا تھا، آرام کر رہی تھی۔ اس نے اپنی کو بہتر طور پر دیکھنے کے لیے اپنی صحیح سلامت آنکھ ہل بھینچ جیسے اسے اسید ہو کہ جو کچھ وہ جانتا چاہتا ہے، وہ اس طرح اس کے چہرے پر پڑھ سکے گا۔

”میرے دوست، بولو، مجھے بتاؤ“ اس نے اپنی قمیص کو جس کے ٹن کھلے ہوئے تھے، سینتے ہوئے اپنی ٹیٹف اور بوڑھی آواز میں بالٹوویٹ نوٹ سے کہا۔ ”قرب آ جاؤ، قرب آ جاؤ۔ یہ میرے لیے تم کیا خبر لائے ہو؟“

”ایں؟ پند لین، سکو سے نکل آیا ہے؟ تمہیں یقین ہے؟ ایں؟“

بالٹوویٹ نوٹ کو جو اطلاعات پہنچائے کا حکم دیا گیا تھا، وہ شروع سے ان کی تفصیلات بیان کرنے لگا۔

”جلدی، جلدی ہو، جدی! مجھے ذہیت نہ پہنچی“ کوٹوزوف نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔

بالخود ہی زوف نے ایک، ایک بات اس کے گوش گزار کر دی۔ اس نے جو کچھ کہنا تھا، جب کہہ چکا، وہ چپ ہو گیا اور حکم کا انتظار کرنے لگا۔ ٹول کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن کوٹوزوف نے اسے روک دیا۔ اس نے خود کچھ کہنے کی کوشش کی۔ اس کے چہرے پر تبدیلیاں رونما رونے لگیں اور وہاں جھریاں نمودار ہو گئیں۔ اس نے ٹول کی جانب اپنا بازو دلہرایا اور کمرے کی مخالف سمت چل پڑا، جہاں تاریکی میں القونوس کی غیر واضح صورتیں دکھائی دے رہی تھیں۔

”میرے مول، میرے خالق، تو نے ہماری دعائیں سن لی ہیں۔“ اس نے اپنے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسری میں پھنساتے ہوئے کپکپاتی آواز میں کہا۔ ”روس بچ گیا۔ مول، میں تیرا شکر ادا کرتا ہوں!“ اور اس کی آنکھوں سے اشک رواں ہو گئے۔

18

جب کوٹوزوف کو فرانسیسیوں کی ماسکو سے روانگی کی خبر ملی، اس دن سے صبح کے اختتام تک، اس کی تمام سرگرمیاں اپنے فوجی دستوں کو دشمن پر، جو تباہی کے غار میں لڑھک رہا تھا، بے سود حملے کرنے، اس کے خلاف گھاتیں لگانے اور اس کے ساتھ بھڑپیں مول لینے سے روکنے پر مرکوز ہو گئیں۔ اس سلسلے میں وہ اپنے اختیارات، مکر و فریب، منت سماجت، غرضیکہ ہر طریقہ اور ٹھکانڈا بروئے کار لایا۔ دستوروف مال یا روسلانس چلا جاتا ہے لیکن کوٹوزوف اصل فوج کے ساتھ خاصا عرصہ وہیں پڑا رہتا ہے اور حکم دیتا ہے کہ کالوگا خالی کرالیا جائے۔ اس کا خیال ہے کہ ہو سکتا ہے کہ انھیں اس قصبے سے آگے تک پسپا اختیار کرنا پڑے۔

ہر جگہ کوٹوزوف پسپا ہوتا جاتا ہے لیکن غنیمت اس کی پسپائی کا انتظار کیے بغیر مخالف سمت بھاگتا جاتا ہے۔

نیولین کے مورخین ہمارے سامنے تاروتینو اور مال یا روسلانس میں اس کے ماہرانہ داؤد و پیچ کا نقشہ کھینچتے ہیں اور پھر قیاس آرائیاں کرتے ہیں کہ اگر وہ زرخیز اور مٹوں جنوبی صوبوں میں گھسنے میں کامیاب ہو جاتا، پھر کیا ہوتا۔

لیکن اس بات سے قطع نظر کہ نیولین کے ان جنوبی صوبوں میں پیش قدمی کرنے کے راستے میں کوئی چیز مزاحمت نہ تھی (روسی فوج نے سڑک کھلی چھوڑ دی تھی)، مورخین یہ بات بھول جاتے ہیں کہ دنیا کی کوئی طاقت اس کی فوج کو نہیں بچا سکتی تھی کیونکہ اس میں ناگزیر تباہی کے جرائم سرایت کر چکے تھے۔ وہ فوج۔ جسے ماسکو میں نرا دل مقدار میں رسد میسر آ چکی تھی لیکن جس نے اسے محفوظ کرنے کے بجائے پاؤں تلے کچل دیا تھا اور جو سونسک پہنچنے کے بعد، شیاے خورد و نوش کا ذخیرہ کرنے کے بجائے انھیں لوٹنے میں مصروف ہو گئی تھی، وہ فوج کالوگا میں کس طرح اپنی کھوئی ہوئی طاقت دوبارہ حاصل کر سکتی تھی کیونکہ کالوگا میں جو روسی آباد تھے، وہ اہلیان ماسکو سے مختلف نہیں تھے اور وہاں کی آگ بھی انہی خصوصیات کی حامل تھی کہ جس چیز کو بھی لگائی جاتی، اسے بھسم کر دیتی؟

یہ فوج کہیں بھی اپنی کھوئی ہوئی طاقت بحال نہیں کر سکتی تھی۔ کچھ ایسے تھا جیسے بارودینو کی لڑائی اور ماسکو کی

لوٹ کر کے بعد اس میں شکست و ریخت کے کیسائی حنا صردا داخل ہونے لگے تھے۔

وہ جو پہلے فوج تھی، اب افراد میں مٹ چکی تھی ورنہ افراد اپنے قائدین کے ہمراہ بھاگے بکھر رہے تھے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ جائیں، تو کہاں جائیں۔ پولین اور اس کے تمام شکاریوں کے قلوب میں صرف ایک ہی خواہش موجزن تھی کہ وہ سب کے سب یاس و ناامیدی کی جس دلدل میں پھنس گئے ہیں (اور جس کا انھیں احساس بھی تھا، بے شک دھندلا دھندلا ہی کہی)، اس سے جلد از جلد چھڑکارا حاصل کر لیں۔

چنانچہ نوبت یہاں جا رسید کہ، لایا رسلوٹس کے اجلاس میں جب جرمنل مھوٹ موٹ بر ظاہر کر رہے تھے کہ وہ آپس میں صلاح مشورہ کر رہے ہیں اور بھانت بھانت کی بوسوں بوسوں رہے تھے، سب سے آخر میں جس شخص نے رائے دی، وہ منہ پھٹ جھڑپ ہو تو تھا اور اس نے لگی لپٹی رکھے بغیر وہ بات کہہ دی جو ہر شخص کے ذہن میں تھی۔ "ہمارے سامنے صرف ایک ہی صورت باقی رہ گئی ہے کہ یہاں سے حتیٰ الامکان جلد از جلد نکل جائیں۔" اس کے ان الفاظ نے سب کی زبانیں گنگ کر دیں اور جس بات کو وہ بھی صحیح تسلیم کرتے تھے، اس کے خلاف کوئی شخص، حتیٰ کہ خود پولین بھی، لب کشائی نہ کر سکا۔

اگرچہ ہر شخص جانتا تھا کہ ان کے لیے روس سے نکلنا ناگزیر ہو چکا ہے، اس کے باوجود انھیں یہ تسلیم کرنے میں عار محسوس ہو رہا تھا کہ پسپائی کے بغیر چارہ نہیں۔ اس احساس شرمندگی پر غالب آنے کے لیے انھیں کسی خارجی دھچکے کی ضرورت تھی اور مناسب وقت پر اس دھچکے کا بھی اہتمام ہو گیا۔ اور یہ، جیسے کہ فریسی کہا کرتے تھے، Tehouma de l'Empereur کا نعرہ تھا۔²²

جرمنیوں کے اجلاس کے اگلے روز صبح سویرے پولین گھوڑے پر سوار ہوا اور دستوں کا معائنہ کرنے اور رابطہ و متوقع لڑائی کے میدان کا جائزہ لینے کے بہانے اپنے چند مارشلوں اور محافظوں کی جہوں میں اپنے لشکر کی صفوں میں چکر لگانے لگا۔ قارقوں کی، ایک پارٹی کا، جو مال غنیمت کی تلاش میں ادھر ادھر گھوم رہی تھی، اتفاقاً اس طور سے آگے سامنا ہو گیا۔ انھوں نے اسے قریب قریب پکڑی لیا تھا لیکن پولین کو قارقوں کے ہتھے چڑھنے سے جس چیز نے بچایا، وہ وہی تھی جو فرانسیسیوں کی تباہی کا موجب بن رہی تھی، یعنی مال غنیمت کی ہوس۔ تاروتیو کی طرح یہاں بھی قارقوں نے لوٹ مار شروع کر دی اور یوں انھوں نے اپنے حریف کو بچانے کا موقع فراہم کر دیا۔ انھوں نے پولین کو تو نظر انداز کر دیا اور خود مال غنیمت سیٹھنے میں مصروف ہو گئے۔ پولین اپنی جان بچا کر بھاگنے میں کامیاب ہو گیا۔

اگر les enfants du Don خود اس کی اپنی فوج کے بیچ میں سے اتنی آسانی سے اچکنے میں کامیاب ہو سکتے تھے، پھر یہ واضح ہو گیا کہ اب جلد از جلد قریب تر جانی پہچانی سڑک تک پہنچنے کے علاوہ اور کوئی صورت باقی نہیں رہ گئی تھی۔ پولین اب چالیس سال کا ہو چکا تھا اور اس کی توانہ نکل آتی تھی۔ اب اس میں وہ بھرتی

ہو یا سکا ان کے بیٹے (یعنی تازن جو زیادہ تر اس کے کنارے آباد تھے)۔

اور بے خوف جرات نہیں رہی تھی جو کبھی ہوا کرتی تھی۔ وہ اشارہ سمجھ گیا اور قانونوں نے اسے جس طرح ڈرایا تھا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسے موتوں کے ساتھ اتفاق کرنے میں کوئی ہچکچاہٹ نہ ہوئی اور جیسا کہ مورخین ہمیں بتاتے ہیں، اس نے سمولنسک روڈ پر موڈریک کی سمت پسپا ہونے کا حکم جاری کر دیا۔

یہ درست ہے کہ پولیس نے موتوں کی رائے سے اتفاق کیا اور یہ بھی درست ہے کہ فوج پسپا ہوئی، لیکن اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ پسپائی کا سبب پولیس کا حکم بنا، بلکہ جو چیز سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ جو قوتیں ہاری فوج پر اثر انداز ہو رہی تھیں در اسے موڈریک (سمولنسک) روڈ اختیار کرنے پر مجبور کر رہی تھیں، وہ بیک وقت اسے بھی اپنے اثر میں لے رہی تھیں۔

19

جب انسان دیکھتا ہے کہ وہ حرکت کر رہا ہے تو وہ اپنے اس تحریک کا ہمیشہ کوئی نہ کوئی جواز ڈھونڈ لیتا ہے۔ انسان سینکڑوں میل کا فاصلہ بھی طے کر سکتا ہے اگر سے یہ یقین ہو کہ ان سینکڑوں میل کے ختم پر کوئی اچھی چیز اس کی منتظر ہے۔ اس کے پاس موعودہ زمین کا ماننا امکان ہونا چاہیے، تبھی وہ اپنا سفر جاری رکھ سکتا ہے (ورنہ اس کی ہمت راستے میں ہی جواب دے جائے گی)۔ جب فرانسیسیوں نے روس پر چڑھائی کی، ان کی موعودہ زمین، سکو تھی لیکن جب وہ پسپا ہوئے، تو یہ ان کا آبائی وطن تھی۔ مگر یہ آبائی وطن بہت دور تھا اور وہ آدمی جسے چھ سات سو میل کا سفر درپیش ہوا اسے اپنے ذہن سے آخری منزل کا خیال نکالنا اور دل میں یہ طے کرنا ہوگا ”آج میں تیس میل چلوں گا، کسی جگہ ٹھہروں گا اور وہاں رات گزاروں گا۔“ سفر کے پہلے مرحلے کے دوران میں یہ مقام آرام اس کی آخری منزل اس کی نگاہوں سے اوجھل کر دیتا ہے۔ اس کی تمام امیدیں اور خواہشیں محض اسی (مقام) پر مرکوز ہو جاتی ہیں۔ در ہر شخص میں فرد فرداً جو جلی انگلیں نظر آتی ہیں، وہ ہجوم میں حد سے زیادہ بڑھ جاتی ہیں۔

فرانسیسیوں کے لیے، جو پرانی سمولنسک روڈ پر سفر کر رہے تھے، آخری منزل۔ اپنی آبائی سرزمین۔ بہت ہی زیادہ دور تھی اور ان کی فوری منزل، جس کی طرف ان کی امیدیں اور خواہشیں، جو ہجوم میں بے پناہ حد تک بڑھ چکی تھی، کشاں کشاں لیے جا رہی تھیں، سمولنسک تھی۔ اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ انھیں معلوم تھا کہ وہاں کثیر الشمار رسد ورتا زہ دم فوج ان کی منتظر ہے اور نہ کسی نے انھیں اس قسم کی بات بتائی تھی (اس کے برعکس خود پولیس بھی اور فوج کے اعلیٰ، فسران بھی جانتے تھے کہ وہاں رسد کم یاب ہے)، بلکہ اس کا سبب یہ تھا کہ یہ واحد چیز تھی جو انھیں آگے جانے اور اپنی موجودہ مشکلات کو برداشت کرنے کی ہمت اور حوصلہ دے سکتی تھی۔ نتیجتاً وہ جو جانتے تھے اور جو نہیں جانتے تھے، دونوں ہی یکساں طور پر اپنے آپ کو فریب دے رہے تھے اور سمولنسک کی طرف یوں بڑھ رہے تھے جیسے یہی موعودہ سرزمین ہو۔

جب ایک مرتبہ فرانسیسی شاہراہ پر چڑھ گئے، وہ اپنی مقررہ منزل کی طرف بھاگنے میں سمجھ اس قسم کی ہمت کا

مظاہرہ کرنے لگے کہ آدمی اسے دیکھ کر حیران پریشان رہ جاتا اور ان کی رفتار تو اتنی تیز تھی کہ کسی نے کاہے کو دیکھ لیا ہی ہوگی۔ مشترکہ انجنت کے علاوہ، جس نے انھیں بصورت هجوم متحد کر رکھا تھا اور جو انھیں قوت اور وصلے کی خاص مقدار فراہم کر رہی تھی، ان کی بہت بڑی تعداد بھی ان کے لیے مددگار ثابت ہو رہی تھی اور انھیں اکٹھا کیے رکھے ہوئے تھی۔ جیسا کہ قانون کشش ثقل کا تقاضا ہے، ان کا جم کبیر انفرادی انسانی ذرات کو اپنی طرف کھینچنے لے جا رہا تھا۔ وہ تعداد میں سینکڑوں ہزار تھے لیکن وہ یوں حرکت کر رہے تھے جیسے وہ واحد قوم ہوں۔

ان میں سے ہر شخص کی صرف ایک ہی خواہش تھی کہ وہ ہتھیار ڈال دے اور قیدی بن جائے تاکہ اس کو اٹلا اور خوف و دہشت سے بچنے کی کوئی صورت پیدا ہو جائے۔ لیکن ایک طرف ان کی اس مشترکہ انجنت کی قوت انھیں ایک ہی سمت بہ جانب سمولنسک، جو ان کا منزل مقصود تھا۔ کھینچے جا رہی تھی اور دوسری طرف یہ حقیقت تھی کہ فریجی کو رکھی کپنی کے سامنے سپر انڈاز نہیں ہو سکتی تھی۔ اگرچہ فرانسیسی ادنیٰ ترس قابل قبول عدد پر اپنی فوج سے پیچھے ہونے اور ہتھیار ڈالنے کے مواقع سے فائدہ اٹھانے میں تامل نہیں کرتے تھے لیکن، ایسے مواقع بار بار نہیں آتے تھے۔ ایک تو ان کی تعداد بہت زیادہ تھی، دوسرے وہ بصورت جمعیت برق رفتاری سے سفر کرتے تھے۔ چنانچہ کسی کے پھڑکنے کے مکانات بہت محدود ہو جاتے تھے۔ یہ فرانسیسی جم کبیر تیزی سے آگے نکل جانے کے لیے جس طرح اپنی نرم توانائیاں صرف کر رہا تھا، اس نے روسیوں کے لیے ان کی رفتار میں رخنہ انداز ہونا نہ صرف مشکل بلکہ ناممکن بنا دیا تھا۔ جب کسی جسم میں شکست و ریخت کا عمل شروع ہوتا ہے، کوئی بھی مشینیں اختصار اس عمل کی رفتار ایک خاص حد سے زیادہ تیز نہیں کر سکتا۔

برف کا ڈل آنا فائدہ نہیں دیکھا جاسکتا۔ اس کے لیے وقت کی خاص ميعاد مقرر ہے اور جب تک یہ ميعاد پوری نہ ہو جائے، آپ جتنی حرارت چاہیں، استعمال کر لیں، برف کا ڈلا پگھلے گا نہیں۔ اس کے برعکس حرارت کی مقدار میں جتنا زیادہ اضافہ ہوگا، باقی ماندہ برف اتنی ہی زیادہ سخت ہو جائے گی۔

روسی کمانڈروں میں صرف کو تو زوف۔ یہ بات سمجھتا تھا۔ جب سمولنسک روڈ کے ساتھ ساتھ فرانسیسیوں کی ہسپائی نے فرار کی واضح شکل اختیار کر لی، کانوٹسن نے گیارہ اکتوبر کی رات کو جس چیز کا مشکلی اندازہ لگایا تھا، وہ تو سچ پڑا ہوا ہونے لگی۔ روسی فرانسیسی فوج کے تمام اعلیٰ افسروں کو گھیرے میں لینے، انھیں پکڑنے، گرفتار کرنے، ہتھکڑیاں دینے اور یوں کارہائے نمایاں سرانجام دینے کے لیے مرے جا رہے تھے اور وہ سبھی چلا چلا کر اردوئی شروع کرنے کا مطالبہ کر رہے تھے۔

جسے کو روکنے کے لیے صرف کو تو زوف نے اپنے تمام اختیارات (اور کمانڈر انچیف کے یہ اختیارات محدود ہوتے ہیں) استعمال کیے۔

وہ اس وقت انھیں، جیسا کہ اب ہم کہہ سکتے ہیں، یہ نہیں کہہ سکتا تھا "ان سے ایجنے، ان کے راجے میں مزاحم ہونے، اپنے آدمی مروانے اور ان بد قسمت مصائب کے ماروں کا قتل عام کرنے کی ضرورت کیا ہے؟ جب

ان کی فوج کی ایک تہائی نفری ماسکو سے واما تا تک کے سفر کے دوران میں کسی لڑائی کے بغیر ہی ناپید ہو گئی ہے، پھر
 کسی کارروائیوں کا فائدہ؟ اس کی بجائے اس نے اپنی تمام عمر کے دوران میں جو حکمت دانائی حاصل کی تھی، اس
 نے اسے بردہ کے کارماتے ہوئے انھیں وہ کچھ بتایا جو وہ سمجھ سکتے تھے۔ اس نے انھیں بتایا کہ بعض اوقات سنہری پل
 آپ کی اپنی تباہی کا سبب بن جاتا ہے۔ اس کی باتیں سن کر وہ اس کا مذاق اڑانے اور اس پر بہتان باندھنے لگے۔
 انھوں نے آؤدیکھانہ تاؤ، بس زخمی درندے پر، جس پر زرع کاغذ لم طاری تھا، پل پڑنے کی جلدی کی اور اس کی جاکوئی
 کرنے اور خوشی کے شادیا نے بجانے لگے۔

یرمالوف، میلورا اور ورج، پلاٹوف اور دوسروں نے جب ویازما کے آس پاس اپنے آپ کو فرانسیسیوں کے
 قریب پایا، وہ ان کے دستوں کا ایک دوسرے سے رابطہ مسقطع کرنے اور ان پر حملہ کرنے کی خواہش پر قابو نہ پا
 سکے۔ بجائے اس کے کہ وہ اپنے ارادوں سے کوتاہی کو مطلع کرتے، انھوں نے کورا کا قتل خانے میں بند کیا اور
 اسے بھیج دیا۔

اگرچہ کوتاہی نے فوج کو رد کرنے کی پوری کوشش کی، کسی نے اس کی نہ سنی۔ ہمارے لشکریوں نے فرانسیسیوں
 پر حملہ کر دیا اور ان کے راستے میں مزاحم ہونے کی کوشش کرنے لگے۔ ہمیں بتایا جاتا ہے کہ ہماری پیادہ رتھیں
 طلبوں کی تھاپ اور موسیقی کی لے پر آگے بڑھیں۔ انھوں نے ہزاروں قتل کیا اور ان کے اپنے جوان ہزاروں میں
 قتل ہوئے۔

لیکن جہاں تک پسائی کا تعلق ہے۔ نہ تو کسی کوروکا جاسکا ورنہ کسی کا رخ دوسری طرف موڑا جاسکا۔ اور
 جہاں تک فرانسیسی فوج کا تعلق ہے، اس نے خطرے کی بوسہ نگہتے ہوئے اپنی صفیں ایک دوسرے کے قریب کر لیں
 اور اگرچہ اس کے جوان متواتر فرار ہوتے رہے، سولسک کی جانب اس کا ہلکتا غیر سفر جاری رہا۔

باردینو کی بڑی، ماسکو پر فرانسیسیوں کا قبضہ اور کسی مزید تصادم کے بغیر فرانسیسیوں کا ارادہ ان سب کو تاریخ کے انتہائی سبق آموز واقعات میں شامل کیا جاسکتا ہے۔

تمام سوریہ میں اس بات پر متفق ہیں کہ ممکناتوں اور قوموں کی ایک دوسرے کے ساتھ کشمکش کا خارجی اظہار جنگوں کی صورتوں میں ہوتا ہے اور یہ کہ ممکناتوں اور قوموں کی سیاسی قوت بالکل اسی نسبت سے بڑھتی یا گھٹتی ہے جس نسبت سے انھیں جنگ میں کامیابی یا ناکامی ہوتی ہے۔

اس قسم کی تاریخی روداد خواہ کتنی ہی عجیب کیوں نہ نظر آئے کہ کسی بادشاہ یا امپراطور کا کسی دوسرے بادشاہ یا امپراطور سے جھگڑا ہو، اس نے فوج اکٹھی کی، دشمن کے خلاف برسرِ پیکار ہوا تین، پانچ یا دس ہزار افراد کو، موت کے کھٹ اتارا، لڑائی جیتی اور پوری سلطنت اور قوم کو، جو لاکھوں یا کروڑوں افراد پر مشتمل ہوتی ہے، اپنا مطیع و منقاد بنالیا، اور یہ بات خواہ کتنی ہی ناقابلِ فہم کیوں نہ ہو کہ فوج کی شکست۔ جس کی تعداد قوم کی کل تعداد کے سواں حصے کے برابر بھی نہیں ہوتی۔ لوگوں کو اطاعت قبول کرنے پر مجبور کر دیتی ہے، لیکن تاریخ کے حقائق (جہاں تک ہمیں معلوم ہیں) اس بیان کی صداقت کی تصدیق کرتے ہیں کہ کسی فوج کی کسی دوسری فوج کے خلاف زیادہ یا کم کامیابی اس قوم کی طاقت میں اضافے یا تخفیف کا بنیادی سبب یا کم از کم اہم علامت بن جاتی ہے۔ ایک فوج کو کامیابی نصیب ہوتی ہے اور معاف تاج قوم کے حقوق میں اضافہ ہو جاتا ہے اور اس کے مقابلے میں بریت خوردہ قوم کو نقصانات اٹھانا پڑتے ہیں۔ ایک فوج شکست سے دو چار ہوتی ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ قوم شکست کی وسعت کے تناسب سے اپنے حقوق سے محروم ہو جاتی ہے۔ اور اگر اس کی فوج مکمل شکست کھ جاتی ہے، تو کم کا غلام بن جاتی ہے۔

تاریخ کے مطابق عہد عتیق سے لے کر موجودہ زمانے تک یہی کچھ ہوتا چلا آیا ہے، نیز لہجہ کی تمام جنگیں اس اصول کی تصدیق کرتی ہیں۔ جس نسبت سے آسٹرویائی فوج شکست کھاتی ہے، اسی تناسب سے آسٹریا کو اپنے حقوق سے محروم ہونا پڑتا ہے اور فرانس کے حقوق اور طاقت میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ چین اور آسٹریا کے مقامات پر فرانسیسیوں کی فتوحات پر شیا کے آزادانہ وجود کا خاتمہ کر دیتی ہیں۔

لیکن اچانک 1812 میں ایک نئی صورت حال وجود میں آتی ہے۔ فرانسیسی، سکو کے قریب فتح سے ہم کنار ہوتے ہیں اور ماسکو پر ان کا قبضہ ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد کوئی مزید لڑائی بھی نہیں ہوتی لیکن وجود روس کا ختم نہیں ہوتا، اس کے برعکس پہلے چھرا کھاندر پر مشتمل فرانسیسی فوج اور اس کے بعد خود نیپولین فرانسیسی عتقا ہو جاتا ہے۔ تاریخی اصول کو صحیح ثابت کرنے کے لیے حقائق کو توڑ مروڑ کر یہ دعویٰ کرنا کہ بارودینز کی لڑائی کے بعد میدان جنگ روسوں کے ہاتھ رہا یہ کہ فرانسیسی فوج کے ماسکو سے انخلا کے بعد متعدد لڑائیاں ہوئیں، اور انھیں کے سبب نیپولین کی سپاہ ملبا میٹ ہوئی، تاریخ کا منہ چڑانے کے برابر ہے کیونکہ حقائق اس کے بالکل برعکس ہیں۔

بارودینو میں فرانسیسیوں کی فتح کے بعد نہ صرف یہ کہ ایک بھی عام لڑائی نہیں ہوئی بلکہ کوئی ایسی جھڑپ بھی جسے اہم کہا جاسکے نہیں ہوئی۔ اس کے باوجود فرانسیسی فوج کا وجود ختم ہو گیا۔ اس کے معانی کیا ہوئے؟ اگر اس قسم کا کوئی واقعہ چین کی تاریخ میں پیش آیا ہوتا، تو ہم شاید یہ کہتے: ”چھوڑیں، یہ تاریخی سچائی نہیں ہو سکتی۔“ (دب کوئی چیز مورخ کے خود ساختہ معیار پر پوری نہیں اترتی، وہ اسی قسم کی ہیرا پھیریوں سے کام لیتا ہے۔) اگر معاملہ کسی معرکہ جھڑپ کا ہوتا جس میں فوجیوں کی صرف محدود تعداد نے حصہ لیا ہوتا، تو ہم سے ایک استثناء قرار دے سکتے تھے۔ لیکن ہم اس واقعے سے آنکھیں نہیں چرا سکتے، یہ ہمارے آبا کی آنکھوں کے سامنے پیش آیا اور ان کے نزدیک یہ ان کے وطن کی بقا و رننا کا مسئلہ تھا، پھر یوں بھی یہ معلوم جنگوں میں اہم ترین ہے۔

1812 کی جنگ کے ننانے نے۔ بارودینز کی لڑائی سے فرانسیسیوں کے اخراج تک۔ یہ ثابت کر دیا کہ اگر سب ایک لڑائی جیت جاتے ہیں تو اس کا نتیجہ لازماً یہ نہیں نکلے گا کہ آپ نے ملک بھی تسخیر کر لیا ہے بلکہ یہ بھی نہیں کہا جاسکتا کہ تسخیر کا امکان ہی پیدا ہو گیا ہے۔ اس نے یہ ثابت کر دیا کہ وہ طاقت، جو عوام کے مقدر کا فیصلہ کرتی ہے نہ فاتحین کے پاس ہوتی ہے اور نہ فوجوں اور لڑائیوں میں اسے ڈھونڈا جاسکتا ہے، بلکہ یہ کہیں اور ہی ہوتی ہے۔

فرانسیسی مورخین فرانسیسی فوج کی ماسکو سے روانگی سے قبل کی حالت بیان کرتے ہوئے دعویٰ کرتے ہیں کہ Grande Armée میں سب کچھ ٹھیک ٹھاک تھا، صرف گھوڑ سوار سپاہ، توپ خانے اور بار برداری کے دستوں کی حالت کچھ تلی تھی کیونکہ گھوڑوں اور جانوروں کے لیے چارہ دستیاب نہیں تھا۔ اس مصیبت کا کوئی علاج نہیں تھا کیونکہ اس علاقے کے کسانوں نے خشک گھاس فرانسیسیوں کے سپرد کرنے کے بجائے اسے نذر آتش کرنا زیادہ بہتر خیال کیا۔

فتح کے بعد عموماً جو نتائج برآمد ہوتے ہیں، وہ یہاں ظہور پذیر نہ ہوئے کیونکہ الف، ب، ج، اور اس جیسے ہزاروں دوسرے کسانوں نے، جنھیں حب الوطنی کا جذبہ چھو کر نہیں گزر رہا تھا۔ جب فرانسیسی ماسکو خالی کر گئے، تو لوٹ مار کی غرض سے اپنے چھکڑوں سمیت شہر میں آدھمکے تھے۔ اپنی گھاس ماسکو لانے سے گریز کیا حالانکہ انھیں بہت اچھی قیمتیں پیش کی گئی تھیں۔

آئیں، ہم دو شخص کا تصور ذہن میں لائیں، جو شمشیر زنی کے فن کے قواعد کے مطابق ڈویل ٹرنے لگے ہیں۔ وہ کچھ دیر سے آپس میں مقابلہ کر رہے ہیں اور ایک دوسرے کے واروں کو خالی دے رہے تھے۔ اچانک ایک حریف کو احساس ہوتا ہے کہ وہ زخمی ہو گیا ہے۔ اب اس کی سمجھ میں یہ بات آ جاتی ہے کہ یہ مذاق نہیں ہے بلکہ مرگ و حیات کا مسئلہ ہے۔ وہ اپنی شمشیر نیچے پھینک دیتا ہے اور سب سے پہلے جوڑ بٹا اس کے ہاتھ آ جاتا ہے، اٹھ لیٹا ہے اور اسے نضا میں لہرا نے لگتا ہے۔ آئیں، پھر ہم یہ فرض کرتے ہیں کہ جس مبارز نے اپنا مقصد حاصل کرنے کے لیے اتنی دانائی سے بہترین اور سادہ ترین ہتھیار استعمال کیا، اسے یک وقت شجاعت اور روایت کا بھی پاس تھا۔ تاہم وہ حقائق پر پردہ ڈالنا چاہتا ہے اور یہ دعویٰ کرنے لگتا ہے کہ اس نے شمشیر زنی کے فن کے قواعد کی پابندی کرتے ہوئے اپنی فتح شمشیر کے زور پر حاصل کی ہے۔ آپ خود اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اس قسم کی ڈویل کی یہ کہانی ہمارے لیے کتنی ناقابل فہم اور بے زہرا گندہ خیالی ہوگی۔

وہ شمشیر زن، جس نے ڈویل فن کے قواعد کے مطابق ٹرنے پر اصرار کیا، فریسی فوج تھی۔ اس کے جس حریف نے تلوار پھینک کر ڈنڈا اٹھ لیا تھا، روسی قوم تھی۔ جو کچھ ہوا، جن لوگوں نے اس کی توجہ شمشیر زنی کے اصولوں کے مطابق کرنے کی کوشش کی، وہ وہ مورخین ہیں جنہوں نے اس واقعے کے بارے میں تصانیف قلم بند کی ہیں۔ سمونسک کی آتش زنی کے بعد ایک ایسی جنگ شروع ہوئی جس میں روایتی جنگوں سے کوئی مشابہت نہیں پائی جاتی۔ قصبوں اور دیہاتوں کی آتش زنی، ہرڑائی کے بعد پٹی، بارودینو کی ضرب، اس کے بعد پھر پٹی، ماسکو کا تاراک اور آتش زدگی، قزاقوں و رشیروں کی کارروائیاں، باروداوی کی گاڑیوں پر قبضے، گوریل جنگ۔ یہ سب چیزیں قواعد سے انحرافات تھے۔

نپولین کو اس کا شعور تھا اور جب اس نے ماسکو میں شمشیر زنی کے صحیح اصولوں کی پاسداری شروع کی اور اپنے خطاب حریف کی شمشیر کی جگہ اس کا ڈنڈا اٹھتے دیکھا، وہ مسلسل کو تو زوف اور امپراطور الیسا ندر سے احتجاج کرتا رہا کہ جنگ تمام سلسلہ قواعد کے خلاف لڑی جا رہی ہے (جیسے لوگوں کو موت کے گھاٹ اتارنے کے بھی کوئی قواعد ہوتے ہیں)۔ فرانسیسیوں کے اعتراضات کے باوجود کہ جنگ میں قواعد کی پابندی نہیں کی جا رہی اور اس حقیقت کے باوجود کہ اعلیٰ مناصب پر فائز بعض روسیوں کو ڈنڈا اٹھانا قدرے عجیب معلوم ہوا۔ (دہچانے تھے کہ ¹en ²en ³en ⁴en ⁵en ⁶en ⁷en ⁸en ⁹en ¹⁰en ¹¹en ¹²en ¹³en ¹⁴en ¹⁵en ¹⁶en ¹⁷en ¹⁸en ¹⁹en ²⁰en ²¹en ²²en ²³en ²⁴en ²⁵en ²⁶en ²⁷en ²⁸en ²⁹en ³⁰en ³¹en ³²en ³³en ³⁴en ³⁵en ³⁶en ³⁷en ³⁸en ³⁹en ⁴⁰en ⁴¹en ⁴²en ⁴³en ⁴⁴en ⁴⁵en ⁴⁶en ⁴⁷en ⁴⁸en ⁴⁹en ⁵⁰en ⁵¹en ⁵²en ⁵³en ⁵⁴en ⁵⁵en ⁵⁶en ⁵⁷en ⁵⁸en ⁵⁹en ⁶⁰en ⁶¹en ⁶²en ⁶³en ⁶⁴en ⁶⁵en ⁶⁶en ⁶⁷en ⁶⁸en ⁶⁹en ⁷⁰en ⁷¹en ⁷²en ⁷³en ⁷⁴en ⁷⁵en ⁷⁶en ⁷⁷en ⁷⁸en ⁷⁹en ⁸⁰en ⁸¹en ⁸²en ⁸³en ⁸⁴en ⁸⁵en ⁸⁶en ⁸⁷en ⁸⁸en ⁸⁹en ⁹⁰en ⁹¹en ⁹²en ⁹³en ⁹⁴en ⁹⁵en ⁹⁶en ⁹⁷en ⁹⁸en ⁹⁹en ¹⁰⁰en ¹⁰¹en ¹⁰²en ¹⁰³en ¹⁰⁴en ¹⁰⁵en ¹⁰⁶en ¹⁰⁷en ¹⁰⁸en ¹⁰⁹en ¹¹⁰en ¹¹¹en ¹¹²en ¹¹³en ¹¹⁴en ¹¹⁵en ¹¹⁶en ¹¹⁷en ¹¹⁸en ¹¹⁹en ¹²⁰en ¹²¹en ¹²²en ¹²³en ¹²⁴en ¹²⁵en ¹²⁶en ¹²⁷en ¹²⁸en ¹²⁹en ¹³⁰en ¹³¹en ¹³²en ¹³³en ¹³⁴en ¹³⁵en ¹³⁶en ¹³⁷en ¹³⁸en ¹³⁹en ¹⁴⁰en ¹⁴¹en ¹⁴²en ¹⁴³en ¹⁴⁴en ¹⁴⁵en ¹⁴⁶en ¹⁴⁷en ¹⁴⁸en ¹⁴⁹en ¹⁵⁰en ¹⁵¹en ¹⁵²en ¹⁵³en ¹⁵⁴en ¹⁵⁵en ¹⁵⁶en ¹⁵⁷en ¹⁵⁸en ¹⁵⁹en ¹⁶⁰en ¹⁶¹en ¹⁶²en ¹⁶³en ¹⁶⁴en ¹⁶⁵en ¹⁶⁶en ¹⁶⁷en ¹⁶⁸en ¹⁶⁹en ¹⁷⁰en ¹⁷¹en ¹⁷²en ¹⁷³en ¹⁷⁴en ¹⁷⁵en ¹⁷⁶en ¹⁷⁷en ¹⁷⁸en ¹⁷⁹en ¹⁸⁰en ¹⁸¹en ¹⁸²en ¹⁸³en ¹⁸⁴en ¹⁸⁵en ¹⁸⁶en ¹⁸⁷en ¹⁸⁸en ¹⁸⁹en ¹⁹⁰en ¹⁹¹en ¹⁹²en ¹⁹³en ¹⁹⁴en ¹⁹⁵en ¹⁹⁶en ¹⁹⁷en ¹⁹⁸en ¹⁹⁹en ²⁰⁰en ²⁰¹en ²⁰²en ²⁰³en ²⁰⁴en ²⁰⁵en ²⁰⁶en ²⁰⁷en ²⁰⁸en ²⁰⁹en ²¹⁰en ²¹¹en ²¹²en ²¹³en ²¹⁴en ²¹⁵en ²¹⁶en ²¹⁷en ²¹⁸en ²¹⁹en ²²⁰en ²²¹en ²²²en ²²³en ²²⁴en ²²⁵en ²²⁶en ²²⁷en ²²⁸en ²²⁹en ²³⁰en ²³¹en ²³²en ²³³en ²³⁴en ²³⁵en ²³⁶en ²³⁷en ²³⁸en ²³⁹en ²⁴⁰en ²⁴¹en ²⁴²en ²⁴³en ²⁴⁴en ²⁴⁵en ²⁴⁶en ²⁴⁷en ²⁴⁸en ²⁴⁹en ²⁵⁰en ²⁵¹en ²⁵²en ²⁵³en ²⁵⁴en ²⁵⁵en ²⁵⁶en ²⁵⁷en ²⁵⁸en ²⁵⁹en ²⁶⁰en ²⁶¹en ²⁶²en ²⁶³en ²⁶⁴en ²⁶⁵en ²⁶⁶en ²⁶⁷en ²⁶⁸en ²⁶⁹en ²⁷⁰en ²⁷¹en ²⁷²en ²⁷³en ²⁷⁴en ²⁷⁵en ²⁷⁶en ²⁷⁷en ²⁷⁸en ²⁷⁹en ²⁸⁰en ²⁸¹en ²⁸²en ²⁸³en ²⁸⁴en ²⁸⁵en ²⁸⁶en ²⁸⁷en ²⁸⁸en ²⁸⁹en ²⁹⁰en ²⁹¹en ²⁹²en ²⁹³en ²⁹⁴en ²⁹⁵en ²⁹⁶en ²⁹⁷en ²⁹⁸en ²⁹⁹en ³⁰⁰en ³⁰¹en ³⁰²en ³⁰³en ³⁰⁴en ³⁰⁵en ³⁰⁶en ³⁰⁷en ³⁰⁸en ³⁰⁹en ³¹⁰en ³¹¹en ³¹²en ³¹³en ³¹⁴en ³¹⁵en ³¹⁶en ³¹⁷en ³¹⁸en ³¹⁹en ³²⁰en ³²¹en ³²²en ³²³en ³²⁴en ³²⁵en ³²⁶en ³²⁷en ³²⁸en ³²⁹en ³³⁰en ³³¹en ³³²en ³³³en ³³⁴en ³³⁵en ³³⁶en ³³⁷en ³³⁸en ³³⁹en ³⁴⁰en ³⁴¹en ³⁴²en ³⁴³en ³⁴⁴en ³⁴⁵en ³⁴⁶en ³⁴⁷en ³⁴⁸en ³⁴⁹en ³⁵⁰en ³⁵¹en ³⁵²en ³⁵³en ³⁵⁴en ³⁵⁵en ³⁵⁶en ³⁵⁷en ³⁵⁸en ³⁵⁹en ³⁶⁰en ³⁶¹en ³⁶²en ³⁶³en ³⁶⁴en ³⁶⁵en ³⁶⁶en ³⁶⁷en ³⁶⁸en ³⁶⁹en ³⁷⁰en ³⁷¹en ³⁷²en ³⁷³en ³⁷⁴en ³⁷⁵en ³⁷⁶en ³⁷⁷en ³⁷⁸en ³⁷⁹en ³⁸⁰en ³⁸¹en ³⁸²en ³⁸³en ³⁸⁴en ³⁸⁵en ³⁸⁶en ³⁸⁷en ³⁸⁸en ³⁸⁹en ³⁹⁰en ³⁹¹en ³⁹²en ³⁹³en ³⁹⁴en ³⁹⁵en ³⁹⁶en ³⁹⁷en ³⁹⁸en ³⁹⁹en ⁴⁰⁰en ⁴⁰¹en ⁴⁰²en ⁴⁰³en ⁴⁰⁴en ⁴⁰⁵en ⁴⁰⁶en ⁴⁰⁷en ⁴⁰⁸en ⁴⁰⁹en ⁴¹⁰en ⁴¹¹en ⁴¹²en ⁴¹³en ⁴¹⁴en ⁴¹⁵en ⁴¹⁶en ⁴¹⁷en ⁴¹⁸en ⁴¹⁹en ⁴²⁰en ⁴²¹en ⁴²²en ⁴²³en ⁴²⁴en ⁴²⁵en ⁴²⁶en ⁴²⁷en ⁴²⁸en ⁴²⁹en ⁴³⁰en ⁴³¹en ⁴³²en ⁴³³en ⁴³⁴en ⁴³⁵en ⁴³⁶en ⁴³⁷en ⁴³⁸en ⁴³⁹en ⁴⁴⁰en ⁴⁴¹en ⁴⁴²en ⁴⁴³en ⁴⁴⁴en ⁴⁴⁵en ⁴⁴⁶en ⁴⁴⁷en ⁴⁴⁸en ⁴⁴⁹en ⁴⁵⁰en ⁴⁵¹en ⁴⁵²en ⁴⁵³en ⁴⁵⁴en ⁴⁵⁵en ⁴⁵⁶en ⁴⁵⁷en ⁴⁵⁸en ⁴⁵⁹en ⁴⁶⁰en ⁴⁶¹en ⁴⁶²en ⁴⁶³en ⁴⁶⁴en ⁴⁶⁵en ⁴⁶⁶en ⁴⁶⁷en ⁴⁶⁸en ⁴⁶⁹en ⁴⁷⁰en ⁴⁷¹en ⁴⁷²en ⁴⁷³en ⁴⁷⁴en ⁴⁷⁵en ⁴⁷⁶en ⁴⁷⁷en ⁴⁷⁸en ⁴⁷⁹en ⁴⁸⁰en ⁴⁸¹en ⁴⁸²en ⁴⁸³en ⁴⁸⁴en ⁴⁸⁵en ⁴⁸⁶en ⁴⁸⁷en ⁴⁸⁸en ⁴⁸⁹en ⁴⁹⁰en ⁴⁹¹en ⁴⁹²en ⁴⁹³en ⁴⁹⁴en ⁴⁹⁵en ⁴⁹⁶en ⁴⁹⁷en ⁴⁹⁸en ⁴⁹⁹en ⁵⁰⁰en ⁵⁰¹en ⁵⁰²en ⁵⁰³en ⁵⁰⁴en ⁵⁰⁵en ⁵⁰⁶en ⁵⁰⁷en ⁵⁰⁸en ⁵⁰⁹en ⁵¹⁰en ⁵¹¹en ⁵¹²en ⁵¹³en ⁵¹⁴en ⁵¹⁵en ⁵¹⁶en ⁵¹⁷en ⁵¹⁸en ⁵¹⁹en ⁵²⁰en ⁵²¹en ⁵²²en ⁵²³en ⁵²⁴en ⁵²⁵en ⁵²⁶en ⁵²⁷en ⁵²⁸en ⁵²⁹en ⁵³⁰en ⁵³¹en ⁵³²en ⁵³³en ⁵³⁴en ⁵³⁵en ⁵³⁶en ⁵³⁷en ⁵³⁸en ⁵³⁹en ⁵⁴⁰en ⁵⁴¹en ⁵⁴²en ⁵⁴³en ⁵⁴⁴en ⁵⁴⁵en ⁵⁴⁶en ⁵⁴⁷en ⁵⁴⁸en ⁵⁴⁹en ⁵⁵⁰en ⁵⁵¹en ⁵⁵²en ⁵⁵³en ⁵⁵⁴en ⁵⁵⁵en ⁵⁵⁶en ⁵⁵⁷en ⁵⁵⁸en ⁵⁵⁹en ⁵⁶⁰en ⁵⁶¹en ⁵⁶²en ⁵⁶³en ⁵⁶⁴en ⁵⁶⁵en ⁵⁶⁶en ⁵⁶⁷en ⁵⁶⁸en ⁵⁶⁹en ⁵⁷⁰en ⁵⁷¹en ⁵⁷²en ⁵⁷³en ⁵⁷⁴en ⁵⁷⁵en ⁵⁷⁶en ⁵⁷⁷en ⁵⁷⁸en ⁵⁷⁹en ⁵⁸⁰en ⁵⁸¹en ⁵⁸²en ⁵⁸³en ⁵⁸⁴en ⁵⁸⁵en ⁵⁸⁶en ⁵⁸⁷en ⁵⁸⁸en ⁵⁸⁹en ⁵⁹⁰en ⁵⁹¹en ⁵⁹²en ⁵⁹³en ⁵⁹⁴en ⁵⁹⁵en ⁵⁹⁶en ⁵⁹⁷en ⁵⁹⁸en ⁵⁹⁹en ⁶⁰⁰en ⁶⁰¹en ⁶⁰²en ⁶⁰³en ⁶⁰⁴en ⁶⁰⁵en ⁶⁰⁶en ⁶⁰⁷en ⁶⁰⁸en ⁶⁰⁹en ⁶¹⁰en ⁶¹¹en ⁶¹²en ⁶¹³en ⁶¹⁴en ⁶¹⁵en ⁶¹⁶en ⁶¹⁷en ⁶¹⁸en ⁶¹⁹en ⁶²⁰en ⁶²¹en ⁶²²en ⁶²³en ⁶²⁴en ⁶²⁵en ⁶²⁶en ⁶²⁷en ⁶²⁸en ⁶²⁹en ⁶³⁰en ⁶³¹en ⁶³²en ⁶³³en ⁶³⁴en ⁶³⁵en ⁶³⁶en ⁶³⁷en ⁶³⁸en ⁶³⁹en ⁶⁴⁰en ⁶⁴¹en ⁶⁴²en ⁶⁴³en ⁶⁴⁴en ⁶⁴⁵en ⁶⁴⁶en ⁶⁴⁷en ⁶⁴⁸en ⁶⁴⁹en ⁶⁵⁰en ⁶⁵¹en ⁶⁵²en ⁶⁵³en ⁶⁵⁴en ⁶⁵⁵en ⁶⁵⁶en ⁶⁵⁷en ⁶⁵⁸en ⁶⁵⁹en ⁶⁶⁰en ⁶⁶¹en ⁶⁶²en ⁶⁶³en ⁶⁶⁴en ⁶⁶⁵en ⁶⁶⁶en ⁶⁶⁷en ⁶⁶⁸en ⁶⁶⁹en ⁶⁷⁰en ⁶⁷¹en ⁶⁷²en ⁶⁷³en ⁶⁷⁴en ⁶⁷⁵en ⁶⁷⁶en ⁶⁷⁷en ⁶⁷⁸en ⁶⁷⁹en ⁶⁸⁰en ⁶⁸¹en ⁶⁸²en ⁶⁸³en ⁶⁸⁴en ⁶⁸⁵en ⁶⁸⁶en ⁶⁸⁷en ⁶⁸⁸en ⁶⁸⁹en ⁶⁹⁰en ⁶⁹¹en ⁶⁹²en ⁶⁹³en ⁶⁹⁴en ⁶⁹⁵en ⁶⁹⁶en ⁶⁹⁷en ⁶⁹⁸en ⁶⁹⁹en ⁷⁰⁰en ⁷⁰¹en ⁷⁰²en ⁷⁰³en ⁷⁰⁴en ⁷⁰⁵en ⁷⁰⁶en ⁷⁰⁷en ⁷⁰⁸en ⁷⁰⁹en ⁷¹⁰en ⁷¹¹en ⁷¹²en ⁷¹³en ⁷¹⁴en ⁷¹⁵en ⁷¹⁶en ⁷¹⁷en ⁷¹⁸en ⁷¹⁹en ⁷²⁰en ⁷²¹en ⁷²²en ⁷²³en ⁷²⁴en ⁷²⁵en ⁷²⁶en ⁷²⁷en ⁷²⁸en ⁷²⁹en ⁷³⁰en ⁷³¹en ⁷³²en ⁷³³en ⁷³⁴en ⁷³⁵en ⁷³⁶en ⁷³⁷en ⁷³⁸en ⁷³⁹en ⁷⁴⁰en ⁷⁴¹en ⁷⁴²en ⁷⁴³en ⁷⁴⁴en ⁷⁴⁵en ⁷⁴⁶en ⁷⁴⁷en ⁷⁴⁸en ⁷⁴⁹en ⁷⁵⁰en ⁷⁵¹en ⁷⁵²en ⁷⁵³en ⁷⁵⁴en ⁷⁵⁵en ⁷⁵⁶en ⁷⁵⁷en ⁷⁵⁸en ⁷⁵⁹en ⁷⁶⁰en ⁷⁶¹en ⁷⁶²en ⁷⁶³en ⁷⁶⁴en ⁷⁶⁵en ⁷⁶⁶en ⁷⁶⁷en ⁷⁶⁸en ⁷⁶⁹en ⁷⁷⁰en ⁷⁷¹en ⁷⁷²en ⁷⁷³en ⁷⁷⁴en ⁷⁷⁵en ⁷⁷⁶en ⁷⁷⁷en ⁷⁷⁸en ⁷⁷⁹en ⁷⁸⁰en ⁷⁸¹en ⁷⁸²en ⁷⁸³en ⁷⁸⁴en ⁷⁸⁵en ⁷⁸⁶en ⁷⁸⁷en ⁷⁸⁸en ⁷⁸⁹en ⁷⁹⁰en ⁷⁹¹en ⁷⁹²en ⁷⁹³en ⁷⁹⁴en ⁷⁹⁵en ⁷⁹⁶en ⁷⁹⁷en ⁷⁹⁸en ⁷⁹⁹en ⁸⁰⁰en ⁸⁰¹en ⁸⁰²en ⁸⁰³en ⁸⁰⁴en ⁸⁰⁵en ⁸⁰⁶en ⁸⁰⁷en ⁸⁰⁸en ⁸⁰⁹en ⁸¹⁰en ⁸¹¹en ⁸¹²en ⁸¹³en ⁸¹⁴en ⁸¹⁵en ⁸¹⁶en ⁸¹⁷en ⁸¹⁸en ⁸¹⁹en ⁸²⁰en ⁸²¹en ⁸²²en ⁸²³en ⁸²⁴en ⁸²⁵en ⁸²⁶en ⁸²⁷en ⁸²⁸en ⁸²⁹en ⁸³⁰en ⁸³¹en ⁸³²en ⁸³³en ⁸³⁴en ⁸³⁵en ⁸³⁶en ⁸³⁷en ⁸³⁸en ⁸³⁹en ⁸⁴⁰en ⁸⁴¹en ⁸⁴²en ⁸⁴³en ⁸⁴⁴en ⁸⁴⁵en ⁸⁴⁶en ⁸⁴⁷en ⁸⁴⁸en ⁸⁴⁹en ⁸⁵⁰en ⁸⁵¹en ⁸⁵²en ⁸⁵³en ⁸⁵⁴en ⁸⁵⁵en ⁸⁵⁶en ⁸⁵⁷en ⁸⁵⁸en ⁸⁵⁹en ⁸⁶⁰en ⁸⁶¹en ⁸⁶²en ⁸⁶³en ⁸⁶⁴en ⁸⁶⁵en ⁸⁶⁶en ⁸⁶⁷en ⁸⁶⁸en ⁸⁶⁹en ⁸⁷⁰en ⁸⁷¹en ⁸⁷²en ⁸⁷³en ⁸⁷⁴en ⁸⁷⁵en ⁸⁷⁶en ⁸⁷⁷en ⁸⁷⁸en ⁸⁷⁹en ⁸⁸⁰en ⁸⁸¹en ⁸⁸²en ⁸⁸³en ⁸⁸⁴en ⁸⁸⁵en ⁸⁸⁶en ⁸⁸⁷en ⁸⁸⁸en ⁸⁸⁹en ⁸⁹⁰en ⁸⁹¹en ⁸⁹²en ⁸⁹³en ⁸⁹⁴en ⁸⁹⁵en ⁸⁹⁶en ⁸⁹⁷en ⁸⁹⁸en ⁸⁹⁹en ⁹⁰⁰en ⁹⁰¹en ⁹⁰²en ⁹⁰³en ⁹⁰⁴en ⁹⁰⁵en ⁹⁰⁶en ⁹⁰⁷en ⁹⁰⁸en ⁹⁰⁹en ⁹¹⁰en ⁹¹¹en ⁹¹²en ⁹¹³en ⁹¹⁴en ⁹¹⁵en ⁹¹⁶en ⁹¹⁷en ⁹¹⁸en ⁹¹⁹en ⁹²⁰en ⁹²¹en ⁹²²en ⁹²³en ⁹²⁴en ⁹²⁵en ⁹²⁶en ⁹²⁷en ⁹²⁸en ⁹²⁹en ⁹³⁰en ⁹³¹en ⁹³²en ⁹³³en ⁹³⁴en ⁹³⁵en ⁹³⁶en ⁹³⁷en ⁹³⁸en ⁹³⁹en ⁹⁴⁰en ⁹⁴¹en ⁹⁴²en ⁹⁴³en ⁹⁴⁴en ⁹⁴⁵en ⁹⁴⁶en ⁹⁴⁷en ⁹⁴⁸en ⁹⁴⁹en ⁹⁵⁰en ⁹⁵¹en ⁹⁵²en ⁹⁵³en ⁹⁵⁴en ⁹⁵⁵en ⁹⁵⁶en ⁹⁵⁷en ⁹⁵⁸en ⁹⁵⁹en ⁹⁶⁰en ⁹⁶¹en ⁹⁶²en ⁹⁶³en ⁹⁶⁴en ⁹⁶⁵en ⁹⁶⁶en ⁹⁶⁷en ⁹⁶⁸en ⁹⁶⁹en ⁹⁷⁰en ⁹⁷¹en ⁹⁷²en ⁹⁷³en ⁹⁷⁴en ⁹⁷⁵en ⁹⁷⁶en ⁹⁷⁷en ⁹⁷⁸en ⁹⁷⁹en ⁹⁸⁰en ⁹⁸¹en ⁹⁸²en ⁹⁸³en ⁹⁸⁴en ⁹⁸⁵en ⁹⁸⁶en ⁹⁸⁷en ⁹⁸⁸en ⁹⁸⁹en ⁹⁹⁰en ⁹⁹¹en ⁹⁹²en ⁹⁹³en ⁹⁹⁴en ⁹⁹⁵en ⁹⁹⁶en ⁹⁹⁷en ⁹⁹⁸en ⁹⁹⁹en ¹⁰⁰⁰en ¹⁰⁰¹en ¹⁰⁰²en ¹⁰⁰³en ¹⁰⁰⁴en ¹⁰⁰⁵en ¹⁰⁰⁶en ¹⁰⁰⁷en ¹⁰⁰⁸en ¹⁰⁰⁹en ¹⁰¹⁰en ¹⁰¹¹en ¹⁰¹²en ¹⁰¹³en ¹⁰¹⁴en ¹⁰¹⁵en ¹⁰¹⁶en ¹⁰¹⁷en ¹⁰¹⁸en ¹⁰¹⁹en ¹⁰²⁰en ¹⁰²¹en ¹⁰²²en ¹⁰²³en ¹⁰²⁴en ¹⁰²⁵en ¹⁰²⁶en ¹⁰²⁷en ¹⁰²⁸en ¹⁰²⁹en ¹⁰³⁰en ¹⁰³¹en ¹⁰³²en ¹⁰³³en ¹⁰³⁴en ¹⁰³⁵en ¹⁰³⁶en ¹⁰³⁷en ¹⁰³⁸en ¹⁰³⁹en ¹⁰⁴⁰en ¹⁰⁴¹en ¹⁰⁴²en ¹⁰⁴³en ¹⁰⁴⁴en ¹⁰⁴⁵en ¹⁰⁴⁶en ¹⁰⁴⁷en ¹⁰⁴⁸en ¹⁰⁴⁹en ¹⁰⁵⁰en ¹⁰⁵¹en ¹⁰⁵²en ¹⁰⁵³en ¹⁰⁵⁴en ¹⁰⁵⁵en ¹⁰⁵⁶en ¹⁰⁵⁷en ¹⁰⁵⁸en ¹⁰⁵⁹en ¹⁰⁶⁰en ¹⁰⁶¹en ¹⁰⁶²en ¹⁰⁶³en ¹⁰⁶⁴en ¹⁰⁶⁵en ¹⁰⁶⁶en ¹⁰⁶⁷en ¹⁰⁶⁸en ¹⁰⁶⁹en ¹⁰⁷⁰en ¹⁰⁷¹en ¹⁰⁷²en ¹⁰⁷³en ¹⁰⁷⁴en ¹⁰⁷⁵en ¹⁰⁷⁶en ¹⁰⁷⁷en ¹⁰⁷⁸en ¹⁰⁷⁹en ¹⁰⁸⁰en ¹⁰⁸¹en ¹⁰⁸²en ¹⁰⁸³en ¹⁰⁸⁴en ¹⁰⁸⁵en ¹⁰⁸⁶en ¹⁰⁸⁷en ¹⁰⁸⁸en ¹⁰⁸⁹en ¹⁰⁹⁰en ¹⁰⁹¹en ¹⁰⁹²en ¹⁰⁹³en ¹⁰⁹⁴en ¹⁰⁹⁵en ¹⁰⁹⁶en ¹⁰⁹⁷en ¹⁰⁹⁸en ¹⁰⁹⁹en ¹¹⁰⁰en ¹¹⁰¹en ¹¹⁰²en ¹¹⁰³en ¹¹⁰⁴en ¹¹⁰⁵en ¹¹⁰⁶en ¹¹⁰⁷en ¹¹⁰⁸en ¹¹⁰⁹en ¹¹¹⁰en ¹¹¹¹en ¹¹¹²en ¹¹¹³en ¹¹¹⁴en ¹¹¹⁵en ¹¹¹⁶en ¹¹¹⁷en ¹¹¹⁸en ¹¹¹⁹en ¹¹²⁰en ¹¹²¹en ¹¹²²en ¹¹²³en ¹¹²⁴en ¹¹²⁵en ¹¹²⁶en ¹¹²⁷en ¹¹²⁸en ¹¹²⁹en ¹¹³⁰en ¹¹³¹en ¹¹³²en ¹¹³³en ¹¹³⁴en ¹¹³⁵en ¹¹³⁶

کہ فرانسیسیوں نے 1813⁴ میں کیا۔ وہ قوم بہت خوش اقبال ہے جو آزمائش کی گھڑی میں یہ پوچھے بغیر کہ دوسروں نے اس سے مشابہ صورتوں کے سے کیا قواعد وضع کیے ہیں، سیدھے سادے اور ماہرانہ انداز سے، جو پہلا ڈٹا اس کے ہاتھ آتا ہے، اٹھ لیتی ہے اور ضرب پر ضرب لگاتی چلی جاتی ہے تا آنکہ اس کی روح میں جو احساس ہلک اور انتقامی جذبہ بھرا ہوتا ہے، وہ سرد ہو جاتا ہے اور اس کی جگہ تھرت اور رحم کے جذبات لے لیتے ہیں۔

2

جنگ و جدل کے نام نہاد قواعد سے جو انحرافات کیے جاتے ہیں، ان میں نمایاں ترین اور سودمند ترین وہ کارروائی ہے جو دور دور بکھرے ہوئے گروہ ان لوگوں کے خلاف کرتے ہیں جو بڑی فوج بنا کر اور آپس میں بہت قریب را کر لڑنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ اس قسم کی کارروائی ہمیشہ ان جنگوں میں، جو قومی روپ دھار لیتی ہیں، دیکھنے میں آتی ہے۔ اس طرح کی کارروائیوں میں لوگوں کا ایک گروہ دوسرے گروہ کے خلاف برسر پیکار نہیں ہوتا۔ اس کے برعکس لوگ چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں بٹ جاتے ہیں اور جہاں کہیں انھیں موقع ملتا ہے، وہ عیسیدہ عیسیدہ حملے کرتے رہتے ہیں۔ اگر حریف برتر ہو اور اس سے انھیں خطرہ لاحق ہوا، تو وہ جھٹ پٹ بھاگ جاتے ہیں اور جو نئی دوبارہ موقع ملے، پھر حملہ کر دیتے ہیں۔ ہسپانیہ میں گوریلوں نے، کاکیشیا میں پہاڑی قبیلوں نے اور 1812 میں روسیوں نے یہی کچھ کیا۔

لوگ اس قسم کی لڑائی کو ”گوریل جنگ“ کہتے ہیں اور فرض کر لیتے ہیں کہ جب انھوں نے اس کا نام رکھ دیا ہے، پھر ہر چیز خود بخود واضح ہو جانا چاہیے۔ لیکن اس قسم کی جنگ کسی قسم کے قواعد کے تحت نہیں لڑی جاتی بلکہ مصالحتات کے ایک جانے پہچانے کلیے کی، جسے بے خطا تصور کیا جاتا ہے، براہ راست نفیض کرتی ہے۔ کلیہ یہ کہتا ہے: حملہ آور فریق کو اپنی تمام افواج ایک مقام پر مرکوز کر لینا چاہئیں تا کہ وہ بوقت لڑائی اپنے حریف سے زیادہ مضبوط ہو۔

گوریل جنگ (جیسا کہ تاریخ ہمیں بتاتی ہے، ہمیشہ کامیاب رہتی ہے) اس کلیے کے بالکل الٹ کارروائی کا نام ہے۔ یہ تناقض اس لیے پیدا ہوتا ہے کیونکہ عسکری سائنس یہ مفروضہ قائم کر لیتی ہے کہ فوج کی قوت اس کی تعداد کی نسبت سے ہوتی ہے۔ عسکری سائنس کہتی ہے کہ جتنی زیادہ فوج کی تعداد ہوگی اتنی ہی زیادہ اس کی قوت ہوگی۔

— Les gros bataillons ont toujours raison —

عسکری سائنس کا محوہ مادہ دعویٰ بالکل ایسے ہی ہے جیسے میکانیات میں مقدار حرکت (مومینٹم) کی تعریف محض مقدار مادہ (mass) کے حوالے سے کر دی جائے اور یہ اعلان کر دیا جائے کہ متحرک جسم کی مقدار حرکت اس کی مقدار مادہ (یا حجم) کی برابری یا نا برابری کے حساب سے مساوی یا غیر مساوی ہے۔

لیکن مومینٹم (مقدار حرکت) مادے کی مقدار (mass) اور دلائی (جسم کی خاص سمت میں رفتار) کے

حاصل ضرب کے برابر ہوتا ہے۔

چنانچہ عسکری معاملات میں فوج کی قوت اس کی تعداد (mass) اور کسی نامعلوم شے ایکس (x) کے حاصل ضرب کے برابر ہوتی ہے۔

تاریخ میں ایسی بے شمار مثالیں موجود ہیں جن سے یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ فوج کا حجم اس کی قوت سے کوئی مطابقت نہیں رکھتا اور ہمیں چھوٹی فوجیں بڑی فوجوں کو شکست دیتی نظر آتی ہیں۔ عسکری سائنس کا جب ان مثالوں سے سامنا ہوتا ہے، وہ مبہم انداز سے اس نامعلوم عنصر کی موجودگی تسلیم کر لیتی ہے اور وہ سے کبھی افواج کی بندی تقسیم و ترتیب میں، کبھی بہتر ہتھیاروں میں اور کبھی (بلکہ زیادہ تر) کمانڈروں کی عبقریت میں ڈھونڈنے لگتی ہے لیکن ان تمام عناصر کو گنونا نے کے بعد بھی وہ نتائج، جو تاریخی حقائق کے مطابق ہوں، حاصل نہیں ہوتے۔

اس نامعلوم ایکس کو معلوم کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ ہم اس باطل نقطہ نظر کو (جو محض "ہیردوں" کی بات کی تسکین کے لیے گھڑا گیا ہے)، کہ جنگ کے دوران میں اعلیٰ حکام جو ہدایات صادر کرتے ہیں، وہ مؤثر ثابت ہوتی ہیں، ترک کر دیں۔

یہ نامعلوم ایکس فوج کا جذبہ ہوتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں اسے یوں بیان کیا جاسکتا ہے کہ وہ افراد، جن پر فوج مشتمل ہوتی ہے، وہ کس حد تک کم یا زیادہ۔ لڑنے اور خطرہ مول لینے کے لیے تیار ہیں۔ اس بات سے قطع نظر کہ وہ کسی عبقری کی قیادت میں لڑ رہے ہیں یا غیر عبقری کی، دو ضمنی بنا کر لڑ رہے ہیں یا نہیں، ڈنڈوں سے لڑ رہے ہیں یا رانگلوں سے، جو یک منٹ میں تیس گولیاں اگل سکتی ہے، وہ لشکر کی جنہیں لڑنے کا شوق ہوتا ہے، خود ہی اپنے ارد گرد ایسے حالات پیدا کر لیتے ہیں جو لڑائی میں ان کے لیے نہایت سارگار ثابت ہوتے ہیں۔

فوج کا جذبہ وہ عنصر ہے کہ اگر اسے اس کی تعداد (mass) سے ضرب دے دی جائے، تو اس کی (صحیح) قوت دریافت ہو جائے گی۔ اس نامعلوم عنصر کی۔ فوج کا جذبہ۔ اہمیت کی تعریف اور توضیح کرنا سائنس کے لیے مسئلہ بنا ہوا ہے۔

یہ مسئلہ بھی حل ہو سکتا ہے کہ اگر ہم ان حالات کو۔ فوج کی تقسیم و ترتیب کے لیے کمانڈر کا منصوبہ، آلات حرب اور دیگر فوجی ساز و سامان وغیرہ۔، جن کے اندر یہ جذبہ مصروف عمل نظر آتا ہے، اس مانے اور بے اصولی کے انداز سے اس نامعلوم ایکس کا بدل بنانا چھوڑ دیں کیونکہ اس میں ہماری غلطی یہ ہوتی ہے کہ ہم انہیں ہم عنصر سمجھ لیتے ہیں۔ ہمیں اس نامعلوم ایکس کو وہی کچھ ماننا اور تسلیم کرنا ہوگا جو کہ درحقیقت وہ ہے۔ خطرہ مول لینے کی کم دہش فعال خواہش۔ صرف تبھی معلوم تاریخی حقائق کو (حسابی) مساوات کے ذریعے ظاہر کر کے اور اس نامعلوم عنصر کی اضافی اقدار کا موازنہ کر کے ہم فی نفسہ اس نامعلوم کی تعریف اشریح کر سکیں گے۔

اس اشخاص، جنہیں اور ڈویژنیں پندرہ اشخاص، رجمنٹوں یا ڈویژنوں کا صفایا کر دیتی ہیں۔ یعنی ان سب کو ہلاک کر دیتی یا گرفتار کر لیتی ہیں۔، جب کہ خود انہیں صرف چار سے ہاتھ رہنا پڑتا ہے۔ چنانچہ ایک فریق کو چار

کا اور دوسرے فریق کو پندرہ کے پندرہ کا نقصان برداشت کرنا پڑتا ہے۔ اس طرح چار پندرہ کے برابر ہوسے اور ہم انھیں 14 ایکس = 15 وائی لکھ سکتے ہیں۔ یوں 15.4: وائی 1 ایکس ہوا یا بہ الفاظ دیگر ایکس کا جو تعلق وائی سے ہے، وہی پندرہ کا چار سے ہے۔ اگرچہ اس مساوات سے نامعلوم عنصر کی مقدار معلوم نہیں ہوتی، لیکن یہ دونوں معلوم کے مابین تناسب ضرور بتا دیتی ہے۔ گونا گوں تاریخی اکائیوں (لڑائیوں، جنگوں، زمائے جنگ) کو ان مساوات کے ذریعے ظاہر کر کے اعداد کے لیے سلسلے تک پہنچا جاسکتا ہے جن میں قوانین موجود ہوں گے اور کسی نہ کسی وقت انھیں دریافت کیا جاسکے گا۔

مصافیات کا یہ اصول کہ فوج کو حملہ بصورت ہجوم (mass) کرنا چاہیے لیکن پسپائی کے لیے چھوٹے چھوٹے گروہوں میں بٹ جانا چاہیے، نادانستہ طور پر اس صداقت کی تصدیق کرتا ہے کہ فوج کی قوت اس کے جذبے پر منحصر ہوتی ہے۔ جہاں قارنگ ہو رہی ہو، وہاں تک آدمی کو لے جانے کے لیے سمندر و کئی کی نسبت زیادہ نظم و ضبط (ڈسپلن) کی ضرورت پیش آتی ہے اور اس ڈسپلن کا حصول تبھی ممکن ہے اگر عسکری کندھے سے کندھا ملا کر آگے بڑھیں۔ لیکن یہ اصول فوج کے جذبے کو خاطر میں نہیں لاتا، چنانچہ یہ پیہم مغالطہ ثابت ہوتا ہے اور حقائق کے ساتھ، جب سپاہ کے جذبے میں کمی پیش واقع ہوتی ہے (جیسا کہ تمام قومی جنگوں میں ہوتا ہے)، نمایاں تغیر پیش کرتا ہے۔

1812 میں جب فرانسیسی پہاڑ ہو رہے تھے، اگرچہ مصافیات کے اصولوں کے مطابق انھیں اپنا دفاع کرنے کے لیے چھوٹے چھوٹے گروہوں میں تقسیم ہو جانا چاہیے تھا، وہ بصورت ہجوم (mass) اکٹھے ہو گئے کیونکہ فوج کا جذبہ اتنا گرچکا تھا کہ صرف حجم ہی ان میں یک جہتی برقرار رکھ سکتا تھا۔ اس کے برعکس (مصافیات کے اصولوں کے مطابق) روسیوں کو بصورت ہجوم ان پر حملہ کرنا چاہیے تھا لیکن فی الحقیقت وہ چھوٹے چھوٹے گروہوں میں بٹ گئے کیونکہ ان کا جذبہ اتنا بند ہو چکا تھا کہ اشخاص احکام کے بغیر انفرادی حیثیت سے فرانسیسیوں کو ضربیں پہنچانے لگے اور کسی کو یہ ضرورت محسوس نہ ہوئی کہ وہ انھیں مصائب اور خطرات کا سامنا کرنے کے لیے مجبور کرے۔

3

یہ نام نہاد گوریلا جنگ فرانسیسیوں کے سولنسک میں داخل ہونے کے بعد شروع ہوئی۔ چیشر اس کے کہ حکومت اس جنگ کو سرکاری طور پر تسلیم کرتی، قازق اور کسان غنیم کے ہزاروں لشکریوں کو ان میں کچھ لوٹ مار کی غرض سے بڑی فوج سے بچھڑ گئے تھے اور کچھ چارے چبنے کی تلاش میں ادھر ادھر نکل گئے تھے۔ موت کے گھاٹ اتار چکے تھے۔ قازقوں اور کسانوں نے انھیں اسی جہلی انداز سے قتل کیا جس طرح کتے کسی بھگے ہوئے پاگل کتے کو گھیر گھار کر اور پریشان کر کے، مار دیتے ہیں۔ دینس داویدوف⁷ اپنی روسی جبلت کے ساتھ پہلا شخص

تھا جس نے اس خوفناک ڈنڈے کی، جو عسکری قواعد کے علی الرغم فرانسیسیوں کو ملیا سیت کر رہا تھا، اہمیت کو پہچانا اور جنگ کے اس طریقہ کار کو باقاعدہ بنانے کے سلسلے میں جوار لیسن قدم اٹھایا گیا، اس کا سہرا اسی کے سر بندھتا ہے۔ چوہیں اگست کو داویدوف کا پہلا گوریلا دستہ منظم کیا گیا اور اس کے بعد دوسروں کی تشکیل شروع ہو گئی۔ جوں جوں اہم آگے بڑھتی گئی تو ہاتھوں ان دستوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا۔

گوریلوں نے Grande Armee (عظیم فوج) کو تدریجاً تباہی سے دوچار کیا۔ انھوں نے مرجھے ہوئے درخت (فرانسیسی فوج) کے تنوں کو، جو از خود گر پڑے تھے، جھاڑو سے صاف کر دیا اور بعض اوقات وہ خود درخت کو بھی جھنجھوڑ دیتے تھے۔ اکتوبر میں جب فرانسیسیوں نے سولنسک کی طرف بھاگنا شروع کیا، ان جھنجھوڑوں کی تعداد سینکڑوں ہو چکی تھی۔ وہ سب کے سب حجم اور خصوصیات کے اعتبار سے ایک دوسرے سے مختلف تھے اور ان میں جو لوگ شامل تھے، وہ بھی بھانت بھانت کے تھے۔ ان میں سے چند ایک نے تو باقاعدہ فوج کی شکل صورت اختیار کر لی۔ ان کے پیادہ اور گھوڑ سوار دستے تھے، باقاعدہ شائف تھا اور انھیں زندگی کی ضروریات اور سہولیات بھی میسر تھیں۔ بعض محض قازق گھوڑ سواروں پر مشتمل تھے اور بعض محض کہیں کی ایٹ کہیں کا روڈا کرد تھے۔ ان میں پیرس، گھوڑ سوار، یہ زمیندار اور کسان شامل تھے اور ان کی موجودگی کا کسی کو خاص غلم بھی نہ ہوسکا۔ ایسے ہی ایک جتنے نے، جس کی تیرت کوئی مناسب پادری کر رہا تھا، ایک ماہ کے اندر اندر سینکڑوں قیدی پکڑ لیے۔ پھر ایک عورت داسیدیا تھی۔ وہ ایک دیہاتی مگھیا کی بیوی تھی۔ اس نے سینکڑوں فرانسیسیوں کو موت کی فیئر سلا دیا۔

اکتوبر کے آخری ایام میں یہ گوریلا جنگ پورے زوروں پر تھی۔ اگرچہ ابتدائی مرحلے میں یہ بے قاعدہ دستے اپنی دلیری اور نڈرتا پر خود حیران و ششدر تھے، پھر بھی ان پر ہر دم یہ خوف سوار رہا کہ فرانسیسی انھیں اپنے گھیرے میں لے لیں گے، اور قیدی بنا لیں گے۔ وہ گھوڑوں سے زمینیں اتارے بغیر جنگوں میں چھپ رہے، گھوڑوں سے شاؤں اکی نیچے اترتے اور ہر وقت توقع رکھتے کہ ان کا تعاقب کیا جائے گا۔ یہ دو راب گزر چکا تھا۔ اکتوبر کے اوائل تک اس جنگ نے واضح صورت اختیار کر لی تھی اور ہر شخص جاں چکا تھا کہ فرانسیسیوں کے خلاف کس طرح کا خطرہ مول لیا جا سکتا ہے اور کس طرح کا نہیں۔ دستوں کے صرف وہی کمانڈر، جو اپنے شائف، فیسروں کی معیت میں نقل و حرکت کرتے تھے اور قواعد کے مطابق اپنے اور فرانسیسیوں کے مابین معقول فاصلہ رکھتے تھے اب بھی بعض چیزوں کو ناممکن خیال کرتے تھے۔ جہاں تک چھوٹے جھنجھوڑ کا تعلق ہے، وہ اپنی کارروائیوں کا آغاز بہت پہلے کر چکے تھے اور فرانسیسیوں کا کافی دنوں تک قریب سے مشاہدہ کر چکے تھے۔ چنانچہ وہ بعض ایسی چیزیں بھی، جن کے متعلق بڑے دستوں کے کمانڈر سوچ بھی نہیں سکتے تھے، قابل عمل سمجھتے تھے۔ قازق اور کسان، جو فرانسیسیوں میں گھستے رہنے تھے، سب سب کچھ ممکن خیال کرنے لگے تھے۔

دینی سوف انھیں بے قاعدہ فوجیوں میں شامل تھا۔ اس کا چنا تھا تھا۔ پائیس اکتوبر کو اس کے جتنے کے گوریلوں کا جوش و خروش اپنی انتہا کو پہنچ چکا تھا۔ دینی سوف اور اس کے ساتھی صبح سویرے سے متحرک تھے۔ وہ سارا دن جنگ

میں چھپے، جو شاہراہ کے ساتھ ساتھ واقع تھا، فرانسیسیوں کے بہت بڑے قافلے کو، جس میں گھوڑا سوار فوج کے سزا و سامان کی گاڑیاں اور روکی تیرکی شامل تھیں، دیکھ رہے تھے اور جس قدر ممکن تھا، وہ ان کے قریب رہتے اور ان کے ساتھ ساتھ آگے چلتے جا رہے تھے۔ یہ قافلہ باقی فوج سے بچھڑ چکا تھا اور جیسا کہ تجربوں اور قیدیوں کی زبانی بھی تصدیق ہوگئی، خاصے بڑے حفاظتی دستے کے ساتھ سمولنسک جا رہا تھا۔ نہ صرف دینی سوف اور ولوخوف (جو خود بھی ایک چھوٹے جتنے کا سربراہ تھا ورنہ دینی سوف کے قریب سرگرم عمل تھا) کو بلکہ بعض بڑے دستوں کے کمانڈروں کو، جن کے اپنے سٹاف تھے، بار برداری کے اس قافلے کی موجودگی کا علم تھا اور دینی سوف کے الفاظ میں وہ ”اس کے لیے اپنے دانت تیز کر رہے تھے۔“ ان میں سے دو کمانڈروں۔ ایک پولستانی اور دوسرا جرمن۔ نے تقریباً بیک وقت اسے دعوت دی کہ بار برداری کے اس قافلے پر حملہ کرنے کے لیے وہ ان کے ساتھ مل جائے۔

”نہیں دوست، میری جمعہ جمعہ آٹھ دن کی پیدائش نہیں ہے۔“ اس نے ان پیغامات کو پڑھنے کے بعد کہا اور اس نے جرمن کو لکھا ”میری دلی خواہش تھی کہ اتنے بہادر اور مشہور جرنیل کی قیادت میں خدمات سرانجام دے کی سعادت نصیب ہوتی، لیکن کیا کیا جائے، میں پہلے ہی پولستانی جرنیل کی، تختی قبول کر چکا ہوں، چنانچہ آپ کی قیادت میں کام کر کے جو خوشی حاصل ہوتی، مجھے اس سے مجبوراً دستکش ہونا پڑ رہا ہے۔“ اس نے اسی قسم کا جواب پولستانی جرنیل کو بھیج دیا اور اسے اطلاع دے دی کہ وہ جرمن جرنیل کی، تختی میں کام کر رہا ہے۔

معاملات کو یوں نبھانے کے بعد دینی سوف اور ولوخوف نے یہ تہیہ کر لیا کہ وہ اعلیٰ فئروں کو اطلاع دیے بغیر اپنے چھوٹے چھوٹے جتنوں کے ساتھ اس قافلے پر حملہ کریں گے اور اسے پکڑ لیں گے۔ بائیس اکتوبر کو یہ قافلہ میکولینو گاؤں سے شام شیوگاؤں کی طرف سفر کر رہا تھا۔ دونوں تریوں کے، مین سڑک کی بائیں جانب بڑے بڑے جنگلات تھے۔ اگرچہ بعض مقامات پر یہ جنگلات سڑک سے پون میل یا اس سے زیادہ ہٹ جاتے تھے لیکن دوسری جگہوں پر یہ سڑک کے بالکل ساتھ مل جاتے تھے۔ دینی سوف اور اس کے ساتھی سرار ان جنگلوں میں چلتے رہے۔ بعض اوقات وہ ان جنگلوں میں خاصا پیچھے چلے جاتے لیکن بعض اوقات وہ بالکل ان کے کناروں پر آ جاتے لیکن متحرک فرانسیسیوں کو کبھی اپنی نگاہوں سے اوٹ نہ ہونے دیتے۔ اس صبح دینی سوف کے جتنے کے قازقوں نے دو چمکڑے، جن پر زینیں لدی ہوئی تھیں، پکڑ لیے تھے اور انھیں جنگل میں لے گئے تھے۔ یہ چمکڑے میکولینو سے کچھ ہی دور، جہاں جنگل سڑک کے بالکل قریب آ گیا تھا، کچھڑ میں پھنس گئے تھے۔ اس سے شام تک وہ فرانسیسیوں کی نقل و حرکت کا بغور جائزہ لیتے رہے لیکن انھوں نے ان کے ساتھ کسی قسم کی چھیڑ خانی کرنے سے احتراز کیا۔ دینی سوف چاہتا تھا کہ انھیں خوف و ہراس میں مبتلا کیے بغیر خاموشی سے شام شیوگاؤں پہنچے دیا جائے اور پھر ولوخوف (جسے اس شام مشورے کے لیے شام شورو سے پون میل دور جنگل کے رکھوالے کے جھونپڑے میں آنا تھا) کے ساتھ مل کر علی الصبح فرانسیسیوں پر حملہ بول دیا جائے اور جس طرح برف کا تودا آنا نا پھاڑ سے نیچے لڑھکتا ہے اور کسی کو بھاگنے کی مہلت نہیں دیتا، اسی طرح ان پر دو اطراف سے اچانک حملہ کیا جائے، ایک ہی ضرب سے ان کے پاؤں

اکٹاڑ دیے جائیں اور سب کو پکڑ لیا جائے۔

انہوں نے اپنے عقب میں میکولینوسے کوئی ڈیڑھ میل آگے چھ تانڑ کھڑے کر دیے تاکہ اگر فرانسیسیوں کے کوئی نئے کالم آرہے ہوں، تو وہ ان کی اطلاع دے سکیں۔

اسی طرح شام شیود سے آگے دلو خوف نے سڑک کی نگرانی کرنا تھی تاکہ یہ معلوم کیا جاسکے کہ دوسرے فرانسیسی دستے کتنے فاصلے پر ہیں۔ ان کا اندازہ تھا کہ باربردری کا قافلہ جدرہ سوغوس پر مشتمل ہے۔ دینی سوف کے پاس درسو آدمی تھے اور تقریباً اتنے ہی دلو خوف کے جتھے میں شامل تھے۔ لیکن یہ عددی فرق دینی سوف کا حوصلہ بہت نہ کر سکا۔ وہ صرف یہ جاننے کا متنبی تھا کہ فرانسیسیوں کے قافلے میں کس قسم کے دستے شامل ہیں اور یہ معلوم کرنے کے لیے اسے ایک عدد 'زبان'۔ یعنی غنیم کے قافلے کا کوئی شخص۔ پکڑنا تھی۔ چکڑوں پر اس صبح کا حمدائی جلد بازی میں کیا گیا تھا کہ ان کے ساتھ جو فرسیسی تھے، وہ بھی مارے گئے تھے، صرف ایک چٹھی لڑکا جس کی ابھی میس بھی بھیجنے نہیں پائی تھیں، زندہ ہاتھ آیا تھا، درجہ وہ قافلے سے پھڑچکا تھا، اس لیے وہ اس کے بارے میں کچھ بھی نہ بتا سکا۔

دینی سوف کا خیال تھا کہ اگر اس نے دوسری مرتبہ حملہ کیا، تو عین ممکن ہے کہ سارا قافلہ خیردار ہو جائے اور وہ یہ خطرہ مول لینے کے لیے تیار نہیں تھا۔ چنانچہ اس نے اپنے ساتھیوں میں سے ایک کسان۔ تھون شیرہائی۔ کو شام شیود بھیجنے کا فیصلہ کیا تاکہ وہ جس طرح بن پڑے، فرانسیسی کوارٹر ہاؤسز میں سے، جنہیں بطور ہراؤں آگے روانہ کر دیا گیا تھا، کسی ایک کو پکڑنے کی کوشش کرے۔

4

یہ خزاں کا نیم گرم بارانی دن تھا۔ آسمان اور افق دونوں کا رنگ گدے لے پانی کی طرح کا تھا۔ بعض اوقات یوں معلوم ہونے لگتا کہ دھند نیچے اتر رہی ہے اور بعض اوقات تیز اور ترچھی بارش ہونے لگتی۔

دینی سوف نے پشیمینے کا چٹا اور سمور کی ٹوپی، جس سے پانی نیچے بہہ ہاتھ، پہن رکھی تھی۔ وہ انفرادی امیل گھوڑے پر سوار تھا، جس کے دونوں پہلو اندر کودھنے ہوئے تھے۔ اپنے گھوڑے کی طرح، جو اپنا سر اور کونیاں بچلی جانب ڈھلکائے ہوئے تھا، وہ بھی ترچھی اور موسلا دھار بارش میں سکڑا سٹا ہوا تھا اور بے چینی سے اپنے سامنے جھانک رہا تھا۔ اس کے چہرے پر، جو دبل ہو چکا تھا اور چھوٹی، گھنٹی اور سیاہ دائرہ میں سے ڈھنچا ہوا تھا، خوشنوت برس رہی تھی۔

(ب) دینی سوف کے ہمراہ اس کا قازق حلیف ایسول لودانسکی تھا۔ دینی سوف کی طرح اس کے جسم پر بھی پشیمینے کا چٹا اور سمور کی ٹوپی تھی۔ وہ صحت مند، خوبصورت، درجہ کش ڈان گھوڑے پر سوار تھا۔ ایسول لودانسکی کا جسم لمبا ٹانگا اور تختے کی طرح چوڑا تھا۔ اس کے بال بھورے، چہرہ دروازہ، اور آنکھیں چمکی

اور چھوٹی تھیں۔ اس کے چہرے، انداز نشست و برخاست، اور چال ڈھال سے مترشح ہوتا تھا کہ یہ آدمی اسیہ اور خود اعتماد ہے۔ اگرچہ یہ بتانا تو مشکل تھا کہ ایک گھوڑے اور سوار کی کون سی خصوصیت اسے دوسرے سے ممتاز کرتی ہے لیکن ایک نظر دیکھ کر یہ کہا جاسکتا تھا کہ جہاں تک دینی سوف کا تعلق ہے، وہ پانی میں شرابور ہو رہا ہے، اس پر بے چینی نے غلبہ پارکھا ہے اور وہ محض ایک ایسا شخص مظلوم ہو رہا ہے، جو گھوڑے پر بس بیٹھا ہوا ہے۔ اس کے برعکس ایسول کو کوئی پریشانی نہیں تھی اور ہمیشہ کی طرح سسودہ خاطر تھا۔ وہ بس گھوڑے پر بیٹھا ہوا آدمی نہیں تھا بلکہ وہ اور گھوڑا ایک ہی وجود بن گئے تھے، ایک ایسا وجود جو درہری قوت (سوار اور گھوڑے دونوں کی) کا، لگ تھا۔

ان سے ذرا آگے ایک کسان گا بیٹھ جا رہا تھا۔ وہ بیدل تھا اور بارش میں بالکل تر تھا۔ وہ دیہاتیوں کا خاکستری کوٹ اور سفید ٹوپی پہنے ہوئے تھا۔

ان کے ذرا پیچھے ایک مریل اور سوکھے سڑے کرغیزی تھو پر، جس کی دم جہازی اور ایال لمبی تھی اور جس کے منہ سے خون بہہ رہا تھا، ایک نوجوان افسر، جو نیلے فرانسیزی کوٹ میں بیوس تھا، سوار تھا۔

اس کے برابر بربریک ہوزار رہا تھا۔ اس کے پیچھے ہمسیدہ فرانسیزی وردی اور نیلی ٹوپی پہنے ایک لڑکا گھوڑے کی سرین پر بیٹھا اور اس کے ساتھ چپکا ہوا تھا۔ سردی سے لڑکے کے ہاتھ سرخ ہو رہے تھے اور وہ اپنے نیچے پاؤں کو حرارت پہنچانے کے لیے انھیں زور زور سے گھما پھرارہا تھا۔ اس کے ابروؤں کے باں کھڑے تھے اور وہ حیران حیران نگاہوں سے اپنے ارد گرد دیکھ رہا تھا۔ یہ وہی فرانسیزی ٹیلی لڑکا تھا جو اس روز صبح پکڑا گیا تھا۔

ان سب کے پیچھے جنگل کے کچے، تنگ، گھبے اور کٹے پھٹے راستے کے ساتھ ساتھ تین تین چار چار کی ٹولیاں بنائے ہوئے اور ان کے قاذق آ رہے تھے۔ ان میں سے بعض پشیمین کے چٹوں اور بعض فرانسیزی اور کوٹوں میں ملبوس تھے۔ چند ایک نے اپنے سروں پر گھوڑوں کی بھولیں پیٹ رکھی تھیں۔ اس بات سے قطع نظر کہ گھوڑے کیت تھے یا تیلہ، موسسا دھار بارش میں سبھی مشکئی معلوم ہو رہے تھے۔ عجیب بات یہ تھی کہ اس کی ایالوں کے نیچے، جوں سے مسلسل پانی ٹپکی جانب گر رہا تھا، ان کی گردنیں بالکل دلی تلی دکھائی دے رہی تھیں۔ گھوڑوں سے بادلوں کی صورت میں بھاپ اڑا اٹھ رہی تھی۔ ملبوسات، زینیں، رنگا میں۔ غرضیکہ ہر چیز زمین اور ٹوٹے ہوئے پتوں کی طرح، جو جگہ جگہ نیچے بکھرے پڑے تھے، تر، تر، دہنی اور پھسلاواں ہو چکی تھی۔ آدمی سکڑے سننے بیٹھے تھے اور کوشش کر رہے تھے کہ پانی جگہ سے بالکل نہ بلبس تاکہ پانی کے جو قطرے رس رس کر ان کی جہدوں تک پہنچ چکے تھے، وہ ذرا گرم ہو جائیں اور مزید ٹھنڈا پانی ان کی نشستوں، گھٹنوں یا گردنوں تک رسائی حاصل نہ کر سکے۔ قاذقوں کی قطار کے پیچوں سے دو چٹکڑے، جنھیں فرانسیزی گھوڑے اور قاذقوں کے سب، جن پر زینیں کسی ہوئی تھیں، بکھج رہے تھے، درختوں کے ٹھٹھوں اور شاخوں پر کھڑکھڑاتے چلے آ رہے تھے۔ جب وہ گڑحوں اور کھڈوں کے اوپر سے گزرتے، پانی اچھال دیتے اور چھینٹے اڑتے اڑتے دور تک چلے جاتے۔

دینی سول کے گھوڑے نے راستے میں پانی کے کھڈے سے بچنے کے لیے ناگاہ جھوک کھائی اور اپنے سوار کا گلٹا

درخت سے نکل ادا یا۔

”ارے، شیطان کے بچے!“ دینی سوف غضب ناک ہو کر چلے اور اس نے دانت کچکپاتے ہوئے گھوڑے کو غنیمت جیسا کہ سید کیا۔ مار کھا کر گھوڑا اچھلا اور خود اپنے اوپر اور اپنے ساتھیوں کے اوپر بکھڑکے چھینے اڑانے لگا۔ ایک تو چھ جوں پانی برس رہا تھا اور ادھر پیٹ میں چوبیس درڑ رہے تھے (ان میں سے کئی نے سمجھ سے کچھ نہیں کھایا تھا)۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دینی سوف کا مزاج برہم ہونے لگا۔ مگر اس سے بھی بڑی بات یہ تھی کہ اسے ابھی تک دلو خوف کی کوئی خبر نہیں ملی تھی اور جس شخص کو اس نے ”زبان“ پکڑنے کے بھیجا تھا وہ بھی ہنوز واپس نہیں آیا تھا۔ ”بار برداری کے قافلے پر حمد کرنے کا اس طرح کا موقع ہمیں اور نہیں ملے گا۔ اس پر تنہا ملے ہوئے کچھ زیادہ ہی خطرناک ہے لیکن اگر ہم نے اپنا منصوبہ ایک دن کے لیے بھی ملتوی کر دیا، کوئی بڑا گوریلا دستہ ہماری آنکھوں کے سامنے اسے اچک لے گا۔“ دینی سوف نے سوچا۔ وہ پیچھے سامنے چھ نکلا جا رہا تھا اور قلعہ کر رہا تھا کہ دلو خوف کا اچھی اب آیا، کہ اب آیا۔

جب دینی سوف جنگل میں ایک ایسے راستے پر پہنچا جس کے ساتھ ساتھ وہ دینیل طرف خاصا دور تک دیکھ سکتا تھا، وہ رک گیا۔

”کوئی آ رہا ہے۔“ اس نے کہا۔

ایسول نے اس سمت میں دیکھا، جس طرح دینی سوف نے اشارہ کیا تھا۔

”یہ تو وہ ہیں۔ ایک افسر اور دوسرا اس کا قارق۔ لیکن یہ مفروضہ قائم نہیں کیا جاسکتا کہ یہ خود کئی ہی ہے۔“ ایسول نے کہا۔ وہ اس قسم کے الفاظ، جنہیں قارق نہیں جانتے تھے، استعمال کرنے کا بہت شوقین تھا۔

دونوں گھوڑوں پر، جوڑ حلو ان سے نیچے اتر رہے تھے، نگاہوں سے اور جھل ہو گئے لیکن چند منٹ بعد وہ دوبارہ نظر آنے لگے۔ آگے آگے افسر آ رہا تھا۔ اس کا گھوڑا تھکے ماندے انداز سے بھاگ رہا تھا اور وہ اپنا چابک بے دریغ استعمال کر رہا تھا۔ اس کے بال پریشان تھے اور وہ خود پانی میں شربور ہو رہا تھا۔ اس کی پتلون آہستہ آہستہ کھسکی کھسکی گھٹنوں پر اکٹھی ہو گئی تھی۔ اس کے پیچھے پیچھے اس کا قارق، جو رکابوں میں پاؤں پھسائے کھڑا تھا، آ رہا تھا۔ افسر بالکل نوخیز چھو کر تھا۔ اس کا چوڑا چمکا چہرہ گلابی اور اس کی آنکھیں تیز اور ہشاش بشاش تھیں۔ وہ گھوڑا دوڑاتا دینی سوف کے پاس پہنچا اور اس نے گیندا لٹکانے سے تمنا دیا۔

”بھڑل کی طرف ہے،“ افسر نے کہا۔ ”معافی چاہتا ہوں کہ میں اسے خشک حالت میں آپ تک نہ پہنچا سکوں۔“

دینی سوف نے تیوریاں چڑھتے لفافہ پکڑا اور کھول دیا۔

”وہ بار بار ہمیں ڈراتے رہے کہ راستہ بہت خطرناک ہے،“ افسر نے، جب دینی سوف مراسد پرانے میں مصروف تھا، ایسول سے مخاطب ہو کر کہا۔ لیکن کماروف۔ ”اس نے اپنے قارق کی طرف اشارہ کیا۔“ کماروف اور میں تیار تھے۔ ہمارے پاس دو دو پستول ہیں۔ مگر یہ کون ہے؟“ اس نے، یا ایکی فرا نیسی چلی گئے کو دیکھتے

ہوئے کہا۔ ”قیدی؟ آپ لوگ پہلے ہی کارروائی کر چکے ہیں؟ میں اس سے بات کر سکتا ہوں؟“

”رستوف اپنیا!“ دینی سوف نے مراسلہ پڑھنے کے بعد ہا آواز بلند کہا۔ ”ارے، تم نے بتایا کیوں نہیں کہ تم کون ہو؟“ اور اس نے خندہ روئی سے اپنا ہاتھ افسر کی طرف بڑھا دیا۔

افسر بیتارستوف تھا۔

تمام راستہ بیتارینی سوف کے ساتھ بالغ اشخاص اور فسرور کے شایان شاں رویہ اپنانے کی سبیلیں سوچتا رہا تھا۔ وہ اس کے ساتھ اپنی سابقہ واقفیت کا کوئی حوالہ دینا نہیں چاہتا تھا۔ لیکن جو نہیں دینی سوف اسے دیکھ کر سکرایا، وہ کھل اٹھا اور اس کے ساتھ شرماتے لگا۔ وہ اپنے افسرانہ اطوار بھول گیا اور بتانے لگا کہ وہ کس طرح فرانسیسیوں کے بربر گھوڑا دوڑاتا آیا تھا، جب اسے یہ فریضہ سونپا گیا، وہ کتنا خوش ہوا تھا اور وہ کیسے پہلے ہی دباڑا کے قریب ایک جھڑپ میں حصہ لے چکا تھا اور ایک ہوزار نے کس طرح وہاں کار نمایاں سرانجام دیا تھا۔

”خیر، تم سے مل کر مجھے بہت خوشی ہوئی ہے،“ دینی سوف نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا اور اس کے چہرے پر پہلے کی طرح پریشانی جھلکنے لگی۔

”ہائیکل فیک لیسٹج؟“ اس نے ایسول سے مخاطب ہو کر کہا۔ ”اسے پھر اسے جرمن نے بھیج دیا ہے۔ یہ اس کی ماتحتی میں کام کر رہا ہے۔“

اور دینی سوف نے ایسول کو بتایا کہ اس مراسلے میں، جو ابھی بھی اس کے حوالے کیا گیا تھا، جرمن جرنیل نے اپنی سابقہ درخواست کا وعدہ کیا تھا کہ بار برداری کے قافلے پر حملہ کرنے کے لیے انھیں آپس میں مل جانا چاہیے۔ ”گر ہم نے کل تک اس پر قبضہ نہ کیا، وہ ہماری آنکھوں کے عین سامنے اسے ہم سے چھین لے گا۔“ اس نے اپنی بات ختم کرتے ہوئے کہا۔

جب دینی سوف ایسول سے باتیں کر رہا تھا، بیتارینی سوف کے مرد مہراندہ لہجے سے مضطرب ہو گیا۔ اور اس نے فرض کر لیا کہ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کی پتلون کی حالت ٹھیک ٹھاک نہیں ہے۔ وہ دزدیدہ انداز سے اسے اپنے ارد گرد کے نیچے چھپانے اور اس کے ساتھ ساتھ، جس قدر ممکن ہو، اس کی روپیہ اختیار کیے رکھنے کی کوشش کرنے لگا۔ ”یوئز آئر، میرے لیے کیا حکم ہے؟“ اس نے سیلوٹ کے انداز میں اپنا ہاتھ اوپر اٹھاتے اور انجوائنٹ اور جرنیل کا تماشہ جس کے لیے وہ راستے میں رہبر سل کرتا آیا تھا، دوبارہ دہراتے ہوئے کہا۔ ”یا مجھے یوئز آئر کے ساتھ ٹھہرنا ہوگا؟“

”حکم؟“ دینی سوف نے سوچتے ہوئے کہا۔ ”خیر، کیا تم کل تک ٹھہر سکتے ہو؟“

”جی ہاں، بالکل... میں آپ کے ساتھ ٹھہر سکتا ہوں؟“ پیتا نے چیخ کر کہا۔

”لیکن تمہارے جرنیل نے تم سے کیا کہا تھا؟ فی الفور واپس آنے کے لیے؟“ دینی سوف نے پوچھا۔

پیتا شرمایا۔

”انہوں نے مجھے کوئی ہدایات نہیں دی تھیں۔ میرا خیال ہے کہ میں ٹھہر۔“ اس نے مستفسرانہ انداز سے پوچھا۔
”پھر ٹھیک ہے،“ دینی سوف نے کہا۔

اور اپنے آدمی کی طرح متوجہ ہو کر اس نے ایک ٹولی کو حکم دیا کہ وہ جنگل کے رکھوالے کے گھونپڑے کے قریب چلی جائے جہاں انھیں رکنا تھا، اور کرغیزی گھوڑے پر سوار فسر (جو بجوسٹ کے فرائض سرانجام دیتا تھا) سے کہا کہ وہ جائے اور معلوم کرے کہ دلو خوف کہاں ہے اور کیا وہ اس شام آئے گا بھی یا نہیں۔ دینی سوف کا ہنا ارادہ ایسول اور پیتا کے ساتھ جنگل کے کنارے تک جانا اور شام شیوہ بچنے کا تھا تا کہ وہ فرانسیسی پڑاؤ کی جس پر انہوں نے اگلے روز حملہ کرنا تھا، ترتیب، یعنی آنکھوں سے دیکھ سکے۔

”خیر، بزرگوار،“ اس نے کسان گائیڈ سے کہا، ”ہمیں شام شیوہ لے چلو۔“

دینی سوف، پیتا، ایسول، متعدد قازقوں اور اس ہوزار کی، جس کی تحویل میں قیدی تھا، معیت میں بڑی کے پار بائیں طرف جنگل کے کنارے کی سمت میں گھوڑا بڑھانے لگا۔

5

بارش تھم چکی تھی، صرف دھند بڑ رہی تھی یا درختوں سے پانی کے قطرے گروہے تھے۔ دینی سوف، پیتا اور ایسول چپ چاپ کسان کے پیچھے پیچھے جا رہے تھے۔ کسان کے سر پر سفید ٹوپی تھی اور اس کے پاؤں کی انگلیاں اہری کی طرف نکلی ہوئی تھیں۔ وہ اپنے زیر نون کی چھان کے جوتوں میں جڑوں اور گیسے جوتوں پر کسی قسم کی آواز پیدا کیے بغیر اچھلتا کودتا انھیں جنگل کے کنارے کی جانب لیے جا رہا تھا۔

وہ ڈھلوان کی چوٹی پر رکھا، اپنے گرد و پیش نگاہ دوڑائی، اور اس طرف، جدھر پتوں اور پودوں کا پردہ نہٹا کم گھٹا تھا، چل پڑا۔ وہ ایک اوک کے درخت کے قریب، جس نے ابھی تک اپنے پتے نہیں کرائے تھے، سر کن کھڑا ہو گیا اور پر اسرار انداز سے ہاتھ سے اشارے کرتا انھیں اپنی طرف بلائے لگا۔

دینی سوف اور پیتا اس کی جانب چل پڑے۔ جس جگہ کسان کھڑ تھا، وہاں سے فرانسیسیوں کو دیکھا جاسکتا تھا۔ جنگل سے ذرا ہی آگے ڈھلوان کی اترائی میں تاج کی فصل ریتج کا کھیت تھا۔ ایک بڑی کے پار، جس کے کنارے بالکل سیدھے کھڑے تھے، دائیں طرف ایک چھوٹا سا گاؤں اور جاگیردار کا مکان تھا۔ اس مکان کی چھت ٹٹکتی تھی۔ گاؤں میں، مکان میں، باغیچے میں، کنوئیں کے ارد گرد، جو بڑے بڑے پڑوں، سارے نیلے پر اور اس سڑک کے ساتھ ساتھ جو پل سے گاؤں کو جاتی تھی اور پانچ سو گز سے زیادہ دور نہیں تھی، پہاڑی تک جھلپاتی رھد میں لوگوں کے جھوم نظر آ رہے تھے۔ وہ ایک دوسرے کے ساتھ کسی ایسی زبان میں جو رسی نہیں تھی، باتیں کر رہے اور گھنٹوں کو، جو پتے چھکڑوں کے ساتھ پہاڑی پر چڑھنے کے لیے رو رہے تھے، بچکا رہے تھے۔ ان کی آوازیں صاف صاف سنا کی دے رہی تھیں۔

”قیدی کو ادھر لے آؤ“ دینی سوف نے فرانسیسیوں سے نگاہیں اٹھائے بغیر تتریا باز پر سب کہا۔

ایک قازق گھوڑے سے اتر کر اس نے قیدی لڑکے کو اٹھایا، زمین پر کھڑا کیا اور پھر سے دینی سوف کے پاس لے گیا۔ دینی سوف نے فرانسیسیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لڑکے سے پوچھا کہ سامنے کی سپاہ کون سی ہے اور اس کے پرے کون سی؟ لڑکے نے اپنے تاج بستہ ہاتھ جیبوں میں گھسیڑے، نگاہیں اوپر اٹھائیں، ڈرتے کانپتے دینی سوف کی طرف دیکھا، اور جو کچھ وہ جانتا تھا، وہ من و عن بتانے کی ظاہری خوش ہوش کے باوجود رد و لید، جوابات دینے لگا۔ جو کچھ دینی سوف پوچھ رہا تھا، وہ اس کی محض توثیق کرتا جا رہا تھا۔ دینی سوف تیوریاں چڑھاتا اس سے پرے چلا گیا اور اپنی قیاس آرائیوں کے متعلق ایسول کو آگاہ کرنے لگا۔

چلتا کبھی چلتی کبھی دینی سوف کو، کبھی ایسول کو اور کبھی گاؤں میں اور سڑک پر فرانسیسیوں کو دیکھنے لگتا۔ وہ بار بار گردن گھماتا اور کوشش کرتا کہ کوئی اہم چیز چھوٹنے نہ پائے۔

”دلو خوف آئے نہ آئے ہمیں کوشش لازماً کرنا ہوگی... کیا خیال ہے؟“ دینی سوف نے کہا۔ خوشی سے اس کی آنکھیں جگمگاری تھیں۔

”یہ بہت مناسب جگہ ہے،“ ایسول نے کہا۔

”ہم اپنے پیادہ ساتھیوں کو نیچے۔ دلدل کے قریب۔ بھیج دیں گے،“ دینی سوف نے اپنی بات جاری رکھی۔ ”وہ ریگتے ریگتے باغیچے تک پہنچ جائیں گے۔ تم وہاں سے اپنے قازقوں کے ساتھ گھوڑوں پر چلو گے۔“ اس نے گاؤں کے پار جنگل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”اور میں یہاں سے پنہ ہوا اردوں کے ساتھ روانہ ہوں گا۔ حد متی گولی کے چلنے۔“

”اس گھاٹ کے قریب جانا مناسب نہیں رہے گا۔ رہاں دلدل ہے۔“ ایسول نے کہا۔ ”گھوڑے کچھڑ میں پھنس جائیں گے۔ ہمیں مزید بائیں طرف جانا ہوگا۔“

جب وہ آہیں میں سرگوشیاں کر رہے تھے، جو ہڑ کے قریب ڈھلوان میں گولی چلنے کی آواز سنائی دی، دھڑکیں کا پہلے ایک اور پھر دوسرا مرغولہ بلند ہوا اور سینکڑوں بڑھاپے ہر خوش باش فرانسیسیوں کی آوازیں آنے لگیں۔ وہ سبھی بیک زبان چیخ چلا رہے تھے۔ دینی سوف اور ایسول فوراً پیچھے ہٹ گئے۔ وہ ان کے اتنا قریب تھے کہ انہیں خیال گزرا کہ شاید اس غل غپاڑے اور نہ مڑنگ کا سبب وہ خود ہیں تاہم گولیوں کے چلنے اور فرانسیسیوں کے چیخ پکار کرنے کا ان سے دور کا بھی واسطہ نہیں تھا۔ پہاڑی کے نیچے کوئی غنص، جو کسی طرح کے سرخ لباس میں ملبوس تھا، دلدل میں بھاگا آ رہا تھا۔ صاف ظاہر تھا کہ فرانسیسی اسی پر گولیاں چل رہے ہیں، اور اسی کو دیکھ کر چیخ پکار کر رہے ہیں۔

”ہائیں، یہ تو ہمارا تیغون ہے!“ ایسول نے کہا۔

”اے، وہی ہے! بالکل وہی ہے!“

”پکا بد معاش ہے!“ دینی سوف نے کہا۔

”وہ بیچ نکلے گا!“ ایسول نے کہا۔

وہ جس آدمی کو تینوں کہہ رہے تھے، وہ دوڑتا دوڑتا مدی تک پہنچ چکا تھا۔ وہاں پہنچے ہی اس نے پانی میں چھانگ لگا دی۔ پانی فضا میں اچھل اور تینوں کچھ دیر کے لیے اس میں غائب ہو گیا۔ پھر وہ چاروں ہاتھ پاؤں استعمال کرتے کتے کے اوپر چڑھا اور سر پٹ بھاگنے لگا۔ بھگنے سے اس کی شکل کچھ یوں ہو گئی تھی جیسے اس کے جسم پر کسی نے سیاہ رنگ پھیر دیا ہو۔ جو فرانیسیسی اس کا تعاقب کر رہے تھے، رک گئے۔

”بڑا پھر تیرا ہے!“ ایسول نے کہا۔

”لنگا ہے!“ دینی سوف نے پہلے کی طرح جھل کر کہا۔ ”اور یہ تا عمر یہ کہاں رہا ہے؟“

”یہ کون ہے؟“ پیتا نے پوچھا۔

”یہ ہمارا پناستون ہے۔ میں نے اسے زبان پکڑنے کے لیے بھیجا تھا۔“

”بالکل، بالکل،“ دینی سوف کے پہلے ہی غلط پڑ پیتا نے یوں سر ہلاتے ہوئے کہا جیسے اسے سب کچھ معلوم ہو گیا ہو حالانکہ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا تھا۔



تینوں شرباتی جتھے کے انتہائی کارآمد آدمیوں میں شامل تھے۔ وہ دریائے گوات کے نزدیک پکڑ دسک گاؤں سے آیا تھا۔ اپنی گوریلا کارروائیوں کے آغاز میں دینی سوف پکڑ دسک گیا تھا۔ اس نے معصوم کے مطابق گاؤں کے کھیا کو طلب کیا، اور اس سے پوچھا تھا کہ اسے فرانیسیسیوں کے بارے میں کیا کچھ معلوم ہے۔ عام دیہاتی کھیاؤں کی طرح اس کھیا کا رویہ بھی کچھ ایسا تھا جیسے وہ اپنا دفاع کرنا چاہتا ہو۔ اس نے کانوں کو ہاتھ لگایا اور کہا: ”نہ صاحب نہ مجھے تو کچھ بھی معلوم نہیں ہے، میں نے نہ کچھ دیکھا ہے اور نہ سنا ہے۔“ لیکن جب دینی سوف نے اسے سمجھایا کہ اس کا مقصد فرانیسیسیوں کو ہلاک کرنا ہے اور اسی لیے وہ اس سے پوچھ رہا ہے کہ ان میں سے کوئی بھگ کر اھر تو نہیں آ نکلے، تو کھیا نے جواب دیا کہ بعض ”شیرے“ یقیناً آئے تھے لیکن اس قسم کے امور سے صرف تینوں شرباتی نمٹتا ہے۔ دینی سوف نے تینوں کو اپنے پاس بلایا۔ اس نے اس کی کارروائیوں کی تعریف کی۔ اس کے بعد اس نے کھیا کی موجودگی میں زار اور وطن کے ساتھ وقاداری اور فرانیسیسیوں سے نفرت (جو اس کے خیال میں ہر روزی کے دل میں ہونا چاہیے تھی) کے بارے میں چند کلمات کہے۔

”ہم فرانیسیسیوں کو کوئی گزند نہیں پہنچاتے،“ تینوں نے کہا۔ صاف نظر آ رہا تھا کہ وہ دینی سوف کی باتوں میں کرگم ہو گیا ہے۔ ”ہم چند لڑکوں نے تفریح ضرور کی تھی۔ وہ شیرے تھے۔ ہم بے پند رہے ہیں کو اگلے جہان پہنچایا تھا۔ اس کے علاوہ ہم نے انہیں اور کوئی تکلیف نہیں دی تھی۔“

دینی سوف جب اگلے روز پکڑ دسک سے روانہ ہوا، وہ اس کسان کے متعلق سب کچھ بھول بھال چکا تھا۔

لیکن اسے اطلاع دی گئی کہ تجوں اس کی پارٹی کے ساتھ تھی ہو گیا ہے اور اصرار کر رہا ہے کہ وہ اسے اپنے ساتھ لے چلیں۔ دینی سوف نے اجازت دے دی۔

شروع شروع میں تجوں اناؤ جانے، پانی ڈھونے، مردہ گھوڑوں کی کھمیں اور اویٹرنے وغیرہ جیسے کٹھن اور کھردرے کام کی کرتا تھا لیکن اس نے بہت جلد ثابت کر دیا کہ اسے گوریلا جنگ پسند ہے اور اس کا طبی میاں بھی اسی طرف ہے۔ رات کے وقت وہ مالی غنیمت کی تلاش میں نکل جاتا اور کچھ نہ کچھ فرانسیسی ملبوسات اور ہتھیار لے آتا۔ جب اسے حکم دیا جاتا کہ وہ فرانسیسی قیدی بھی لائے، تو وہ ایک دو وہ بھی پکڑ لاتا۔ دینی سوف نے اس کی مشقت طلب کاموں سے، جو وہ کر رہا تھا، چھٹی کرادی اور جب کبھی خود رکی پر نکلتا، اسے بھی اپنے ساتھ لے جانے لگا۔ اس نے اسے قاذقوں میں شامل کر لیا۔

تجوں کو کھڑسوار کی پسند نہیں تھی۔ وہ جہاں بھی جاتا، ہمیشہ بیدل جاتا لیکن وہ گھڑسواروں سے کبھی پیچھے نہ رہا۔ اس کے ہتھیاروں میں سکون¹⁰ (اسے وہ مذاقا اپنے ساتھ اٹھائے پھرتا تھا)، پائیک¹¹ اور کلہاڑی شامل تھے۔ مؤخر الذکر وہ اسی طرح استعمال کرتا تھا جس طرح بھیڑیا، اپنے دانت استعمال کرتا ہے۔ وہ اس سے اپنی پوستیں کی ٹوپی سے ہٹو نکال لیتا بڑی بڑی ہڈیاں چر کر دیتا، لکڑیاں کاٹتا اور اس کا دستہ پکڑ کر چھوٹے چھوٹے کیل اور تپچے بناتا۔ وہ یہ تمام کام پوری صحت اور صفائی سے کرتا۔ اسے نہ تو کوئی وقت پیش آتی اور نہ اس سے کوئی معمولی سے معمولی غلطی سرزد ہوتی۔ دینی سوف کے بیروکاروں میں اسے خصوصی اور غیر معمولی مقام حاصل تھا۔ جب کوئی ایسا کام درپیش ہوتا جو کڑایا کر یہہ ہوتا، مثلاً کندھارے کر چھکڑے کو کچھڑے سے نکالنا، دم پکڑ کر گھوڑے کو دندل سے باہر کھینچنا اور اس کی کھال اویٹرنے، فرانسیسیوں کے مابین چوری چھپے گھسنا یا ایک دن میں تیس تیس میل بیدل چھنا۔ ہر شخص ہتے ہوئے تجوں کی طرف اشارہ کرنے لگتا۔

”اس شیطان کا کچھ نہیں بگڑے گا۔ اس کی کانٹھی گھوڑے کی طرح مضبوط ہے،“ وہ اس کے متعلق کہتے۔ ایک مرتبہ وہ ایک فرانسیسی کو پکڑنے کی کوشش کر رہا تھا۔ فرانسیسی نے اس پر گولی چلا دی اور اس کا چوڑنڈی کر دیا۔ اس کا زخم، جس کا وہ اندر یا ہر طرف دوڑ کا پھڑک کر علاج کرتا تھا، سارے دستے کے لیے مختلف مذاق کا موضوع بن گیا، اور خود تجوں اس قسم کے مذاق میں جی جان سے شریک ہوتا تھا۔

”کیوں دوست، مزہ آیا؟“ آخر انھوں نے تمھاری کھنچائی کر ہی دی!“ قازق اس کے ساتھ دل لگی کرتے۔ تجوں عموماً لوٹنے پوٹنے اور طرح طرح کی شکلیں بنانے لگتا جیسے اسے بہت تکلیف ہو رہی ہو۔ وہ یوں بنے لگتا جیسے اس کا خوں کھول رہا ہو اور وہ فرانسیسیوں کو انتہائی مضحکہ انداز سے بے نقطہ سنانے لگتا۔ اس واسطے کہ تجوں پر صرف اتنا اثر ہوا کہ وہ شاذ و نادر ہی کوئی قیدی پکڑ کر لاتا۔

تجوں جیسے کاسب سے زیادہ جی دار اور کام کا آدمی تھا۔ حملے کے مواقع تلاش کرنے میں اس سے بڑھ کر کوئی پھرتی کا مظاہرہ نہ کر سکتا اور نہ اس سے زیادہ کوئی فرانسیسی پکڑ سکا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قاذقوں نے اسے اپنی دل لگی

کانٹا نہ بنالیا اور اس نے یہ گردار خوشی قبول کر لیا۔

اب گزشتہ رات تینوں کو ”زبان“ پکڑنے کے لیے شرم شیوہ بھیجا گیا تھا۔ لیکن یہ تو بیوجہ ہوئی کہ ایک قیدی پکڑنے سے اس کی تسلی نہ ہوئی یا پھر وہ رات بھر سوید رہا، تاہم وہ دن کے وقت دیگٹار، یگٹار، فرانسسیوں کے میں بیچ میں گھس گیا اور جیسے کہ دینی سوف پہاڑی سے دیکھ چکا تھا، انھوں نے ”دریافت“ کر لیا تھا۔

6

فرانسسیوں کو اتنا قریب دیکھ کر دینی سوف ان پر اگلے روز ہتھ بوسے کا پختہ فیصلہ کر چکا تھا۔ وہ کچھ دیر ایسول کے ساتھ اس موضوع پر باتیں کرتا رہا۔ اس کے بعد اس نے گھوڑا سوار اور واپس چل دیا۔

”جلو، دوست، اب ہم چلتے ہیں اور پکڑے وپڑے سکھاتے ہیں،“ اس نے چپا سے کہا۔

جونہی وہ رکھوالے کے جھوپڑے کے قریب پہنچے، دینی سوف رک گیا اور جنگل میں جھانکنے لگا۔ درختوں کے پتوں بیچ ایک آدمی، جس کے بدن پر چھوٹا کوٹ، پاؤں میں زیز فونی جوتے اور سر پر قازنی ٹوپی تھی، اپنی بڑی ہاتھوں سے با آسانی لمبے لمبے تدم اٹھا تا اور اپنے لاسے ہار دھنڑ میں لہراتا اس کی ست میں چلا آ رہا تھا۔ اس کے کندھے پر مسکون اور کمر بند میں کلہاڑی لٹک رہی تھی۔ جونہی اس کی نگاہ دینی سوف پر پڑی، اس نے برکت کوئی چیز جھاڑیوں میں پھینک دی، اپنے پانی سے شرابور سیٹ کو اس کے ڈھیلے ڈھالے کنارے سے پکڑا، اور اپنے کندھ کی طرف بڑھا۔ یہ تینوں تھا۔ اس کا تھریوں، ور چچک کے داغوں سے بھرا ہوا چہرہ اپنی پھوٹی تھوٹی اور ہلکی ہوئی آنکھوں سے اطمینان بخش شکستگی سے دمک رہا تھا۔ اس نے اپنی گرن اور پراٹھا رکھی تھی اور وہ دینی سوف کو یوں ٹانگیں ہاتھ کر دیکھ رہا تھا جیسے وہ اپنے ہنسی دہانے کی کوشش کر رہا ہو۔

”ہونہہ، یہ تم کہاں چسے گئے تھے؟“ دینی سوف نے پوچھا۔

”کہاں؟ فرانسسیوں کے پیچھے اور کہاں؟“ تینوں نے بھری لیکن شیریں اور دھمی آواز میں جواب دیا۔

”یہ تمہیں دن دیہاڑے ریگتے پھرنے کی کیا سوجھی تھی؟ گدھا کہیں کا، خیر، تم کسی کو پکڑ کر کیوں نہیں لائے؟“

”میں نے ایک پکڑا تو تھا۔“

”کہاں ہے وہ؟“

”دیکھیں، میں نے اسے روشنی کی پہلی لکیر نمودار ہونے پر پکڑا تھا،“ تینوں نے کہا۔ اس نے اپنے پاؤں، جس کی انگلیوں باہر کو نکلی ہوئی تھیں اور جن میں اس نے زیز فونی کے جوتے پہنے ہوئے تھے، اچھی طرح پھیل لیے۔ ”اور میں اسے جنگل میں لے گیا۔ پھر میں نے دیکھا کہ یہ کام کا آدمی نہیں ہے۔ چنانچہ میں نے بہتر سمجھا کہ ایک اور... جو ذرا زیادہ کام کا ہو، پکڑ لاؤں۔“

”دیکھا؟ پکا بد معاش ہے؟ یا نکل پکا بد معاش؟“ دینی سوف نے ایسول سے کہا۔ ”تم پہلے کو کیوں نہ لائے؟“

”اسے لانے کا فائدہ کیا تھا؟“ تجنوں نے غصے سے کھولتے ہوئے جھٹ پٹ بات کاٹتے ہوئے کہا۔ اس سے کچھ حاصل نہ ہوتا۔ آپ کا خیال ہے مجھے پتا نہیں کہ آپ کو کیا چاہیے؟“

”کیس دھونسیا ہے!... خیر؟“

”میں دوسرے کی تلاش میں نکل گیا۔“ تجنوں نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”میں اس طرح جنگل میں ریختا چلا گیا اور پھر نیچے بیٹ گیا۔“ وہ یہ کھانے کے لیے کہ اس نے یہ سب کچھ کیسے کیا تھا، وہ ایک دم پھرتی اور صفائی سے زمین پر لیٹ گیا۔ ”ایک ادھر آٹکلا اور میں نے اس پر جھپٹ مار دیا۔ اس طرح۔“ اور تجنوں نے جنم زدن میں چھلنگ لگائی اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ”میں کہتا ہوں، کرنل کے پاس چلو۔ وہ گلا پھاڑ پھاڑ کر چپچپ مارنے لگتا ہے اور اچانک وہاں چار اور آ جاتے ہیں۔ وہ اپنی تلواریں سونتیتے ہیں اور تیری سے میری طرف بڑھتے ہیں۔ چنانچہ میں کلبھاری کھڑا ہوں اور ان پر اس طرح جھپٹتا ہوں۔ کیا ارادے ہیں؟“ ملک پوچھتا ہوں۔ یسور، آپ مدد کرے۔ کافی ہوگئی ہے!“ تجنوں نے با آواز بلند کہا۔ اس نے اپنی چھاتی آگے بڑھائی اور تہدیدي انداز سے ناک بھوں چڑھانے لگا۔

”ارے ہاں، ہم نے تمہیں پہاڑی سے پانی کے گڑھوں میں چھانگلیں مار کر بھگتے دیکھا تھا،“ ایسول نے اپنی جگہ گاتی آنکھیں سکینے ہوئے کہا۔

پتیا کا زور زور سے ہنسنے کو جی چاہتا تھا لیکن اس نے دیکھا کہ دوسروں نے قہقہہ لگانے سے گریز کیا ہے، چنانچہ وہ بھی چپ رہا۔ وہ تیزی سے کبھی تجنوں، کبھی ایسول اور کبھی دینی سوف کے چہرے کو نکتے لگتا لیکن اس کی سمجھ میں کچھ نہ آتا کہ یہ سب کیا ہے۔

”اجتی مت ہوا“ دینی سوف نے غصے سے کھنستے ہوئے کہا۔ ”تم پہلے کیوں نہ آئے؟“

تجنوں ایک ہاتھ سے اپنی کمر اور دوسرے سے اپنا سر کھجانے لگا، اور دیکھتے ہی دیکھتے اس کا چہرہ دکنے اور اس پر احمقانہ مسکراہٹ پھیلنے لگی۔ اس کا منہ کھل گیا اور سامنے ایک شکاف، جو ایک دانت نکل جانے کی وجہ سے بن گیا تھا، ظاہر ہو گیا (یہی وجہ ہے کہ اسے شرباتی۔ بوڑا۔ کہا جاتا تھا)۔ دینی سوف مسکرانے لگا اور پتیا خوش دلی سے کھلکھلا کر ہنسنے لگا۔ خود تجنوں بھی اس ہنسی میں شامل ہو گیا۔

”لیکن وہ کسی کام کا نہ تھا،“ تجنوں نے کہا۔ ”اس کے کپڑے۔ بالکل ہی گئے گزرے تھے! میں اسے کہے اسکا تھا؟ پرزہ، پھر وہ بد تیز بھی بہت تھا۔“ مسکراتے ہوئے کہتا ہے، ”میں خود جرنیل کا بیٹا ہوں، میں نہیں جاؤں گا۔“

کہتا ہے۔

”تم بالکل جشی ہوا“ دینی سوف نے کہا۔ ”میں اس سے کچھ پوچھا۔“

”مگر میں نے اس سے سواں جواب کہے تھے۔“ تجنوں نے کہا۔ ”وہ کہتا ہے۔ مجھے کوئی خاص پتا نہیں ہے۔ ہماری تعداد تو بہت زیادہ ہے، وہ کہتا ہے۔ لیکن بیشتر لوگ نکمے ہیں۔ اصلی فوجی نہیں ہیں۔ وہ کہتا ہے۔ ان کے

سامنے ذرا زور سے چلاؤ رہا کہتا ہے، ”اور تم ان سب کو پکڑ لو گے۔“ تیخون نے غصے سے دیکھا اور سب باکی سے دینی سوف کی آنکھوں میں آنکھیں ڈاس کر اپنی بات ختم کرتے ہوئے کہا۔

”جب تمہیں بے بھاؤ کی پڑیں گی۔ تمہیں سبق مل جائے گا کہ انتہاء حرکتیں کرنے کا نتیجہ کیا ہوتا ہے!“ دینی سوف نے بید روی سے کہا۔

”مگر آپ اس قدر بگڑ کیوں رہے ہیں؟“ تیخون نے احتجاج کیا۔ ”جیسے میں نے آپ کے یہ فرامیسی بھی دیکھے ہی نہیں! ذرا اندھیرا چھائیے دیں، پھر دیکھیں۔“ آپ کو جو کچھ چاہیے، میں لے آؤں گا۔ اگر آپ چاہیں، میں تمہیں بھی لاسکتا ہوں۔“

”اچھا، آؤ چلیں۔“ دینی سوف نے کہا۔ رکھو لے کے جھونپڑے تک وہ سارا راستہ منہ بند کیے رہا اور ناک بھونچتا رہا۔

تیخون پیدل ہی ان کے پیچھے پیچھے چلتا رہا۔ پیمانے کا زقوں کو بوتلوں کی ایک جوڑی کے متعلق، جو اس نے جھانپوں میں پھینک دی تھی، اس کے ساتھ ہنسی مذاق کرتے اور اس کا مستحکم اڑانے سنا۔

تیخون کی کہانی سن کر اور اس کی مسکراہٹ دیکھ کر پیتا پر جو ہنسی کا دورہ پڑا تھا، جب وہ اس سے سنبھلا، اچانک کوندے کی طرح اس کے ذہن میں یہ خیال لپکا کہ تیخون نے آدمی کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا اور اس پر اس کی طبیعت متغض ہونے لگی۔ اس نے سڑ کر طفل نہایتی طبعی کی طرف دیکھا اور اس کے دل پر سخت چوٹ لگی۔ تاہم اس کی یہ کیفیت محض لمحاتی تھی۔ اس نے یہ ضروری سمجھا کہ وہ اپنا سراٹھا کر چلے اپنا حوصلہ قائم رکھے اور آئندہ روز کی جھڑپ کے بارے میں ایسول سے اہم آدمی کے انداز سے سوال و جواب کرے تاکہ اسے ان لوگوں کے سامنے، جن کے ہاتھ وہ اپنے آپ کو پڑھا تھا، کھسیانا نہ ہونا پڑے۔

جس انسر کو دلخوف کا اتنا پتا معلوم کرنے کے لیے بھیجا گیا تھا، وہ یہ خبر لے کر آیا کہ دلخوب بالکل ٹھیک ٹھاک ہے اور غمگین اب ان سے آملے گا۔

دینی سوف کا چہرہ فی الفور کھل اٹھا۔ پھر اس نے پیتا کو اپنے پاس بلایا۔

”ادھر آؤ اور مجھے اپنے بارے میں بتاؤ،“ اس نے کہا۔

اپنے والدین کی ماسکو سے روانگی کے بعد پیتا نے ان سے رخصت لی اور اپنی رجسٹر میں جا شامل ہوا۔ کوئی زیادہ دن ٹھیک گزرے تھے کہ ایک جرنیل نے، جو خاصے بڑے گورنر کے کاکٹڈ تھا، اسے اپنا پارٹنر مقرر کر دیا۔ جب سے اسے کمشنر مل گیا تھا، خاص طور پر جب سے وہ فعال فوج میں شامل ہوا اور دنیا کی لڑائی میں شریک ہوا تھا، اس پر مسلسل وجہ کی کیفیت طاری رہنے لگی تھی کہ وہ جواں ہو گیا ہے اور دنور مسرت سے اسے ہر دم یہ شوق لگا رہتا تھا

کہ حقیقی رستی کا کارنامہ سرانجام دینے کا کوئی موقع ہاتھ سے جا بے نہ پائے۔ اس نے فوج میں جو کچھ دیکھا اور اسے جو تجربہ حاصل ہو، اس پر وہ بے پناہ خوش تھا لیکن اس کے ساتھ اسے ہمیشہ حسد رہی کہ انتہائی جرات اور سرفروشی کے کارنامے وہاں سرانجام دیے جاتے ہیں جہاں اتفاق سے وہ خود موجود نہیں ہوتا، اور جہاں وہ نہیں ہوتا تھا، وہاں پہنچنے کی اسے ہمیشہ جلدی ہوتی تھی۔

ایکس، کتوبر کو جب اس کے جرنیل نے کسی شخص کو دینی سوف کے پاس بھیجنے کی خواہش کا اظہار کیا، پتہ پتہ اتنے دلدوز انداز سے جانے کی التجا کی کہ جرنیل انکار نہ کر سکا۔ لیکن جب وہ پتہ پتہ کو رخصت کر رہا تھا، اسے دیا زامیں اس کا احتیاطی طرز عمل یاد آ گیا۔ اسے جہاں بھیجا گیا تھا، وہاں پہنچنے کے لیے بجائے اس کے کہ وہ سڑک کے ساتھ ساتھ جاتا، وہ سرپٹ گھوڑا دوڑتا میدان جنگ میں عین وہاں پہنچ گیا جہاں فرانسیسیوں کی فائرنگ ہو رہی تھی اور وہاں اس نے پستول سے دو گولیاں بھی داغ دیں۔ اس واقعے کو دھیان میں رکھتے ہوئے جرنیل نے پتہ پتہ کو واضح الفاظ میں حکم دیا کہ دینی سوف خواہ کیسی ہی جھڑپ کے منصوبے بنائے، اس نے اس میں شریک نہیں ہونا ہے۔ چنانچہ یہی وجہ تھی کہ جب دینی سوف نے اس سے پوچھا تھا کہ وہ بھہر سکتا ہے تو شرمندگی کے احساس سے اس کا رنگ لالوں لال ہو گیا تھا اور وہ ذہنی طور پر پریشان ہو گیا تھا۔ جب تک چٹا جنگل کے کنارے تک نہیں پہنچا تھا، اس کا ارادہ یہی تھا کہ وہ جرنیل کی ہدایات پر لفظاً اور معناً عمل کرے گا اور فوراً واپس آ جائے گا۔ مگر جب اس نے فرانسیسیوں کو رکھا، تنخون سے ملا اور اسے معلوم ہوا کہ اس رات یقیناً حملہ ہوگا، اس نے اسی جلد بازی سے، جس سے نوجوان اپنے فیصلے تبدیل کر لیتے ہیں، تہیہ کر لیا کہ اس کا جرنیل، جس کا وہ اب تک احترام کیا کرتا تھا، وہاں جرمنا ہے، اصل ہیرو دینی سوف ہے، ایسول اور تنخون بھی ہیرو ہیں اور یہ کہ اگر اس نازک گھڑی میں وہ ان کا ساتھ چھوڑ گیا، تو یہ بڑی شرمناک حرکت ہوگی۔

جب دینی سوف، پتہ پتہ اور ایسول گھوڑوں پر رکھوا لے کے جھوپڑے میں پہنچے، اندھیر چھانے لگا تھا۔ ٹھٹ ٹھٹ کی مدھم روشنی میں گھوڑے، جن پر زمیں کسی ہوئی تھیں، قازق اور ہوزار نظر آ رہے تھے۔ قازقوں اور ہوزاروں نے جنگل کے بیچ کھلے میدان میں کام چلاؤ پناہ گاہیں کھڑی کر لی تھیں اور اب وہ جنگل کی گھاٹی میں، جہاں سے فرانسیسیوں کو دھواں نظر نہیں آ سکتا تھا، ان کو دہکار رہے تھے۔ جنگ جھوپڑے کے دروازے پر یک قازق، اپنی آستینیں چڑھائے بھیڑ کا گوشت کاٹ رہا تھا۔ جھوپڑے کے اندر تین افسر کواڑ کی میز پر بیٹھے تھے۔ چپانے اپنے گھیرے کپڑے اتارے، خشک کرنے کے لیے انھیں اپنے قازق کے حوالے کیا اور جھٹ پٹ ڈرنیل لگانے میں افسروں کا ہاتھ بٹانے لگا۔

دس منٹ میں سیر تیار ہو گئی اور اس پر کپڑا بچھا دیا گیا۔ میز پر دوڑ کا ارم کی بوتل، سفید ذیل روٹی، بھنا ہوا گوشت اور نمک رکھ دیا گیا۔ افسروں کے ساتھ میز پر بیٹھ کر اور اپنی چکنی انگلیوں سے لذیذ چربیائے گوشت کو توڑتے ہوئے چپا سرت کے ساتویں آسمان پر پہنچ چکا تھا۔ اس کے دل میں سب انسانوں کے لیے بیگانہ محبت کا چشمہ پھوٹ پڑا۔

تھا اور نتیجتاً اسے یقین ہو گیا کہ دوسرے بھی اس کے ساتھ اسی قسم کا پیار کرتے ہیں۔

”واسلی دیمترج، اگر میں آپ کے ساتھ مزید ایک روز ٹھہر جاؤں“ اس نے دینی سوف سے کہا، ”تو کوئی خاص ہرج تو نہیں ہوگا؟ آپ کا کیا خیال ہے؟ یا ہوگا؟“ اور اس کے جواب کا انتظار کیے بغیر خودی سے سوسا کا جوب دینے لگا: ”آپ کو معلوم ہے کہ مجھے حکم دیا گیا تھا کہ میں پتہ لگاؤں اور میں پتہ لگا رہا ہوں۔ صرف اتنی مہربانی فرمائیں کہ مجھے عین۔ اصل۔ مجھے، نعاس وغیرہ کی کوئی پروا نہیں۔ میں صرف یہ چاہتا ہوں۔“

چٹانے اپنے دانت بھینچے، سر پھچھلی جانب جھکایا، بازو دھریا اور اپنے گرد و پیش نظر روزانی ”اصل چیز...“ دینی سوف نے مسکراتے ہوئے اس کے الفاظ دہرائے۔

”مجھے کسی چیز کی مطلق کمان دے دیں تاکہ میں واقعی... کمان کر سکوں۔“ چٹانے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”آپ کے لیے اس سے کیا فرق پڑے گا؟... ارے، آپ کو چاقو چاہیے؟“ اس نے ایک افرکی طرف، جو گوشت کا قتلہ کاٹنے کی کوشش کر رہا تھا، متوجہ ہو کر کہا۔

اس نے اسے اپنا جیبی چاقو دے دیا۔ افر کو چاقو پسند آیا۔ اور اس نے اس کی قمیص کی۔

”اسے اپنے پاس رکھ لیں۔ میرے پاس اس جیسے اور بہت ہیں۔“ چٹانے شربتے ہوئے کہا۔ ”اف خدایا میں تو بھول ہی گیا تھا۔“ اس نے ایک دم چلا کر کہا۔ ”میرے پاس بہت عمدہ مشکی ہے۔ رونے کے بغیر کشش۔ ہمارے ہاں نئے آدی نے کنٹین کا دھند استیصال ہے۔ اس کے پاس اس قسم کی اعلیٰ ترین اشیاء ہوتی ہیں۔ اس سے میں نے اس پاؤڈر مشکی خریدا تھا۔ مجھے بیٹھی چیزیں بہت پسند ہیں۔ آپ کو چاہیے؟“

چٹا بھاگتا بھاگتا پابز ”گلی“ میں اپنے قازق کے پاس گیا اور چند تھیلیاں اٹھا لایا۔ ان میں تقریباً پانچ پاؤڈر مشکی تھا۔

”حضرات، شوق فرمائیں۔ کچھ نہ کچھ تو ضرور لیں۔ آپ کو کافی بات تو نہیں چاہیے؟“ اس نے ایول سے مخاطب ہو کر پوچھا۔ ”میں نے اپنی کنٹین سے خریدا تھا۔ بہت بڑھیا ہے۔ اس کے مالک کے پاس نہایت عمدہ اشیاء ہوتی ہیں اور وہ بہت دیانت دار ہے اور یہ بہت بڑی بات ہے۔ میں یقیناً آپ کو بھیج دوں گا۔ شاید آپ کے جنتون ٹھیک کام نہیں کر رہے، شاید وہ گھس گھس کر اپنی افادیت کھو بیٹھے ہیں۔ کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے۔ میں اپنے ساتھ چند ٹیک لایا ہوں۔ یہ رہے وہ۔“ اور اس نے انھیں ایک ایک دکھایا۔ ”اس میں سو چھتائی ہیں۔ بہت سستل گئے تھے۔ جتنے جی چاہے، لے لیں اور کر پسند آئیں تو بے شک سارے ہی رکھ لیں۔“

اچانک چٹا کو یہ سوچ کر پریشانی ہونے لگی کہ اس کی زبان فیچی کی طرح چل رہی ہے۔ وہ چپ ہو گیا اور شرم سے اس کے چہرے کی رنگت سرخ ہونے لگی۔

اس نے سوچنے کی کوشش کی کہ کہیں اس سے کوئی اور حفات تو سرزد نہیں ہوئی اور دن بھر کے واقعات یاد کرنے کے بعد اس کے ذہن میں فرانسیسی پٹی لڑکے کا خیال آیا۔

”ہم سب تو یہاں خوب مزے میں ہیں، مگر اس کا کیا جانا انھوں نے اس کے ساتھ کیا کیا ہے؟ کیا انھوں نے اسے کچھ کھانے کو دیا ہے؟ کیا انھوں نے اس کے ساتھ برا سلوک کیا ہے؟“ وہ یہ سب کچھ جانا چاہتا تھا مگر چھماقوں کے متعلق اتنا کچھ کہنے کے بعد اس کی زبان کو تال لگ گیا تھا اور اب اسے بات کرتے خوف آرہا تھا۔

”پوچھنے کو تو میں پوچھ ہی لوں،“ اس نے سوچا، ”لیکن یہ کہیں گے، چونکہ یہ خود لڑکا ہے اس لیے دوسرے لڑکے پر ترس کھا رہا ہے، کل میں انھیں دکھا دوں گا کہ میں بالک ہوں یا... چنانچہ اگر میں پوچھ بیٹھ تو مجھے کوئی شرمندگی تو نہیں ہوگی؟“ پیتا نے سوچا۔ ”خیر مجھے کوئی پروا نہیں۔“ اس کا چہرہ کانوں تک سرخ ہو گیا اور اس پر خوف و دہشت نے غلبہ پایا۔ وہ افسروں کے چہروں پر طنز کے آثار تلاش کرنے لگا اور آخر کار اضطرابی طور پر اس کی زبان کھل ہی گئی۔

”میں قیدی لڑکے کو بلالوں... اور اسے کچھ کھانے کو دے دوں... شاید...؟“ اس نے کہا۔

”ہاں، ہاں، کیوں نہیں؟ بیچارہ چھوٹا سا تو ہے،“ دینی سوف نے کہا۔ بظہر اسے اس یاد دہانی میں کوئی شرم ناک بات نظر نہ آئی۔ ”اس کا نام ونساں بوسے ہے۔ اسے بلالو۔“

”میں جاتا ہوں،“ پیتا نے کہا۔

”ہاں ہاں، بے چارہ چھوٹا سا تو ہے،“ دینی سوف نے دوبارہ کہا۔

جب دینی سوف نے یہ الفاظ کہے، پیتا دروازے میں کھڑا تھا۔ وہ افسروں کے بیچ میں سے کھٹکتا کھٹکتا دینی سوف کے بالکل قریب پہنچ گیا۔

”بڑے بھائی، آپ کی اس عنایت کے لیے مجھے آپ سے گلے ملنا چاہیے!“ اس نے با آواز بلند کہا۔ ”اور، آپ کتنے اچھے ہیں، کتنے مہربان ہیں!“

اور دینی سوف سے معافی کرنے کے بعد وہ باہر محسن کی طرف بھاگ گیا۔

”بوسے انسان!“ وہ دروازے کے قریب کھڑے ہو کر چلا یا۔

”جناب، کیا چاہیے؟“ کسی کی اندھیرے میں آواز سنائی دی۔

پیتا نے جواب دیا کسا ہے وہ فرانسیسی لڑکا چاہیے جسے اس روز قیدی بنایا گیا تھا

”اخوا، ویسینی؟“ کسی کی اندھیرے میں آواز سنائی دی۔

لڑکے کے نام ونساں کو قازق ازیں ویشتر ہی ویسینی اور کسان سپای ویسینا¹³ میں تبدیل کر چکے تھے۔ ان

دونوں ناموں سے بہار اور تر دتاڑگی کا تاثر ابھرتا تھا اور یہ نوخیز لڑکے کی شکل و صورت پر صادق آتا تھا۔

”وہ یہاں الاؤ کے پاس آگ تاپ رہا ہے۔ ویسینا یا... ویسینی“ تاریکی میں ان کی آوازیں آگے پیچھے

گوںج رہی تھیں اور وہ سبھی نہیں رہے تھے۔

”بڑا تیز لوٹا ہے۔“ ایک ہوزار نے کہا جو پیتا کے قریب کھڑا تھا۔ ”کچھ دیر ہوئی ہم نے اسے کچھ کھانے کو

دیا تھا۔ بھوک سے اس کا برا حال تھا۔“

اندھیرے میں قدموں کی چاپ سنا کی وی اور چلی لڑکا دروازے کی طرف آنا دکھائی دیا اس کے نکلے پاؤں کچھڑ کے چھینے اڑا رہے تھے۔

"Ah, C'est vous!" پتالے کہا۔

"Voulez-vous manger? N'ayez pas peur, on ne vous fera pas de mal"

اس نے لڑکے کے ہاتھ پر پیار سے ہاتھ رکھتے اور شربت پیتے ہوئے سر پر کہا۔ "Entrez entrez." "Merci, monsieur" چلی لڑکے نے کیک پاتی، مقرر باہر گانا آواز میں کہا اور وہ دروازے کی چوکت پر اپنے کچھڑ آلود پاؤں صاف کرنے لگا۔

چلی لڑکے سے بہت کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن اس میں اس کی جرأت نہیں تھی۔ وہ اس کے قریب دروازے کے اندر متذبذب کھڑا تھا۔ پھر اس نے اندھیرے میں لڑکے کا ہاتھ پکڑا اور اسے وہاں لے لگا۔ "اندرا آ جاؤ، اندرا آ جاؤ۔" اس نے نرمی سے کانٹا پھوسی کرتے ہوئے کہا۔

"اف، سمجھ میں نہیں آتا کہ میں اس کے لیے کیا کروں!" پتالے سوچا اور اس نے دوبارہ کھولتے ہوئے لڑکے کو پہلے اندر جانے دیا۔

جب چلی لڑکا جھوپڑے میں پہنچ گیا، پتالے اس سے کچھ فاصلے پر بیٹھ گیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اس پر زیادہ توجہ دینا وقار کے منافی ہوگا لیکن اس کی جیب میں جو رقم تھا، وہ اس پر اپنی انگلیاں پھیرتا رہا اور سوچتا رہا کہ یہ لڑکے کو دینا باعث شرم تو نہیں ہوگا۔

8

دینی سونے کے حکم پر چلی لڑکے کو کچھ دوڑکا اور بھنا ہوا گوشت دے دیا گیا۔ اس کے بعد اسے روٹی کوٹ پہنا دیا گیا تاکہ اسے دوسرے قیدیوں کے پاس بھیجنے کی بجائے پتی ٹولی میں رکھ جائے۔ دریں اثنا دلوفوف پہنچ گیا اور چلی لڑکے کو توجہ دینی لڑکے سے دوسری طرف مبذول ہو گئی۔

چلی لڑکے کی روٹی فوج میں غیر معمولی شجاعت اور فراموشیوں کے ساتھ اس کے سہا کا تہ دیے کی بے شمار کہانیاں سن چکا تھا۔ چنانچہ جوئی دلوفوف جھوپڑے میں داخل ہوا، اس کی نگاہیں اس پر مرکوز ہو گئیں اور وہ انھیں دوسری طرف ہٹانے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ تاہم وہ تن کر سیدھا بیٹھ رہا اور کچھ اس قسم کا پوچھنے لگا جیسے وہ خود بھی دلیری میں کسی سے کم نہ ہو۔ وہ یہ سب کچھ اس لیے کر رہا تھا تاکہ وہ یہ ظاہر کر سکے کہ وہ دلوفوف جیسے شخص کی

تم آجھے!

"کچھ کھانے کو چاہیے؟ دروست، وہ تمہیں کچھ نہیں کہیں گے۔"

"اندرا آ جاؤ، اندرا آ جاؤ۔"

شکر یہ ہو سکیں۔

صحبت میں بیٹھنے کے لیے ناموزوں شخص نہیں۔

پتلا دلو خوف کی سادہ وضع قطع دیکھ کر ششدر رہ گیا۔

دینی سوف قازقوں کے کوٹ میں ملبوس تھا۔ وہ بارش تھا اور اس کے سینے پر کرامات سینٹ کونا کا یقونہ آویزاں تھا۔ اس کے رویے اور گفتگو کے انداز سے مترشح ہوتا تھا کہ وہ غیر معمولی حیثیت کا آدمی ہے۔ لیکن دلو خوف، جو ہاسکو میں اپنے جسم پر ایرانی ملبوسات کی نمائش کیا کرتا تھا، اب اپنی شکل و صورت سے گارڈز کا انتہائی فرض شناس اور پابند شمار شخص دکھائی پڑتا تھا۔ اس کی دائرہ می سوچھ بالکل صفحہ چٹ تھیں۔ وہ گارڈز کا کوٹ، جس کے اندر اوں بھری ہوئی تھی، پہنے ہوئے تھا۔ اس کے کالج میں آرڈر آف سینٹ جارج (تمغہ) آویزاں تھا۔ اس کے سر پر عام فوجی ٹوپی سیدھی رکھی ہوئی تھی۔ اس نے اپنا ہتھینے کا اور در کوٹ کمرے کے ایک کونے میں تار، کسی شخص سے علیک سلیک کیے بغیر سیدھا دینی سوف کے پاس گیا اور اس سے ذریعہ تجویز مسئلے کے بارے میں سوال جواب کرنے لگا۔

دینی سوف نے اسے بار برداری کے قافلے، بڑے فوجی دستوں کے عزائم، جیتا کی رسالت سے موصول شدہ پیغام اور دونوں جرنیلوں کے نام اپنے جوابات کے بارے میں اسے مطلع کیا۔ اس کے بعد اس نے اسے ان معلومات سے آگاہ کیا جو اسے فرنیسی قافلے کے متعلق حاصل ہو چکی تھیں۔

”یہ تو سب ٹھیک ہے لیکن ہمیں یہ معلوم ہونا چاہیے کہ ان کے ساتھ کس قسم کی فوج ہے اور اس کی تعداد کتنی ہے؟“ دلو خوف نے کہا۔ ”ہمیں جا کر دیکھنا ہوگا۔ ان کی تعداد معلوم کیے بغیر ہم کسی قسم کی کارروائی کا آغاز نہیں کر سکتے۔ میں ہر کام مناسب طریقے سے کرنا چاہتا ہوں۔ آپ حضرات میں سے کوئی شخص میرے ساتھ گھوڑے پر فرانیسی پڑاؤ میں جانا چاہے گا؟ میں قاتل ووردی لایا ہوں۔“

”میں۔ میں۔ میں آپ کے ساتھ چلوں گا!“ پیتا نے چلا کر کہا۔

”تمہارے جانے کی کوئی خاص ضرورت تو نہیں ہے؟“ دینی سوف نے دلو خوف سے مخاطب ہو کر کہا۔ ”اور

جہاں تک اس کا تعلق ہے، اسے تو میں کسی قیمت پر بھی جانے نہیں دوں گا۔“

”میں تو جانا چاہوں گا!“ پیتا نے احتجاج کیا۔ ”میں کیوں نہ جاؤں؟“

”کیونکہ اس کی کوئی وجہ نہیں۔“

”میرا خیال ہے کہ آپ برا نہیں، میں گے کیونکہ... میں جا رہا ہوں، بس قصہ ختم۔ آپ مجھے اپنے

ساتھ لے چلیں گے نا؟“ اس نے دلو خوف کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔

”کیوں نہیں؟“ دلو خوف نے بے دھیانی سے جواب دیا۔ وہ دراصل پٹی لڑکے کا چہرہ غور سے دیکھنے میں مگن تھا۔

”یہ لوٹہ بہت دنوں سے تمہارے پاس ہے؟“ اس نے دینی سوف سے پوچھا۔

”یہ آج ہی بکڑا گیا تھا لیکن اسے کچھ معلوم نہیں ہے۔ اسے میں اپنے پاس ہی بٹھرا رہا ہوں۔“

”اوہ، اور باقیوں کا کیا کرتے ہو؟“ دلو خوف نے دریافت کیا۔

”باتیں کرنا ہوں؟ انھیں حکام بالہ کے پاس بھیج دینا ہوں اور رسید لے لیتا ہوں۔“ دینی سوف نے چانک تھمتاتے ہوئے کہا۔ ”میں پورے اعتماد کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ میرے ضمیر پر کسی قسم کا بوجھ نہیں کہہ سکتا میرے ہاتھ یک بھی آدی کے خون سے رنگین نہیں ہوئے۔ نوکی کی حیثیت سے اپنی عزت کو دفاع دار۔ میں ذرا صاف گوئی سے کام لے رہا ہوں۔ راعدار بنانے کے بجائے کیا یہ بہتر نہیں کہ آپ حفاظتی دستے کی تحویل میں تیس قیدی شہر بھیج دیں؟ بلکہ اگر تین سو بھی ہوں تو بھی کیا مشکل ہے؟“

”ضمیر دیر کی باتیں اگر یہ سوہ سالہ چھوٹا کاؤنٹ کرے تو اسے زیب دیں گی۔“ دلوفوف نے سردہر حقارت سے کہا۔ ”لیکن سب دلت آگیا ہے کہ ان تم طور طریقوں پر عنت بھیج دو۔“

”یہ میرا نام بیچ میں کیوں آگیا؟ میں نے تو کچھ بھی نہیں کہا تھا، صرف اتنا عرض کیا تھا کہ میں لارما آپ کے ساتھ چوں گا۔“ چپانے شرماتے شرماتے کہا۔

”دوست، میں اور تم اتنا کچھ دیکھ چکے ہیں کہ اب ہمیں اس قسم کی خوش، غلچوں کا سفاہرا کرنے کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں۔“ دلوفوف جان بوجھ کر ایک ایسے موضوع پر، جس کے متعلق اسے معلوم تھا کہ دینی سوف اس کے ذکر پر تلمسائے گا، باتیں کیے جا رہا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ اسے اس میں خاص لطف آرہا ہے۔ ”بھلا یہ تو تباہ کن نم نے یہ لوٹا کیوں رکھ چھوڑا ہے؟“ اس نے اپنے سر کو نا پسندیدگی کے انداز سے جنبش دیتے ہوئے کہا۔ ”اسی سے کہہ سکتے ہیں کہ تمہیں ترس آتا ہے؟ ہمیں تمہاری ان رسیدوں کا پتا ہے۔“ تم سو آدی بھیجتے ہو اور وہاں صرف تمہیں پہنچتے ہیں۔ باقی راستے میں یا تو بھوک سے مر جاتے ہیں یا ہدک کر دیے جاتے ہیں۔ تو پھر کیا یہ بہتر نہیں کہ انھیں یہیں ٹھکانے لگا دیا جائے؟“

ایسول نے اپنی ہلکی رنگت کی آنکھیں پھینچتے ہوئے پسندیدگی کا ظہار کیا۔

”اصل نکتہ یہ نہیں ہے۔ یہاں اس بارے میں کوئی بحث نہیں ہو سکتی۔ میں ان کے خون کو اپنے ضمیر کا بوجھ نہیں بنانا چاہتا۔ تم کہتے ہو کہ وہ راستے میں مر جاتے ہیں۔ بہت اچھا۔ لیکن ان کی موت میں میرا کوئی ہاتھ نہیں ہوتا۔“

دلوفوف ہنس پڑا۔ ”تمہارا خیال ہے وہ مجھے یا تمہیں بونٹی چھوڑ دیں گے؟ انھیں میں سے زیادہ مرتبہ مجھے پکڑنے یا ہلاک کرنے کا حکم دیا جا چکا ہے۔ اگر وہ مجھے۔ یا تمہیں بھی۔ پکڑنے میں کامیاب ہو گئے تو وہ تمہارے تمام تر شجاعانہ رویے کے باوجود بال توقف ہمیں قریب تر میں درخت پر لٹکا دیں گے۔“ وہ رک گیا۔ ”خیر، چھوڑ دو، ہمیں اپنا کام شروع کر دینا چاہیے۔ میرے قازق سے کہو کہ وہ میرے گھوڑا اٹھالائے۔ میرے پاس دو فرانسیسی دروہاں ہیں۔ اچھا، تو تم میرے ساتھ آرہے ہو؟“ اس نے چپا سے پوچھا۔

”میں؟ ہانکل، ہانکل۔ یقیناً۔“ چپانے دینی سوف کی طرف دیکھتے ہوئے با آواز بلند کہا اس کا چہرہ تھمتانے لگا اور اس کے قریب قریب آنسو نکل گئے۔

جب دلوفوف قیدیوں کو ٹھکانے لگانے کے بارے میں دینی سوف سے متوجع کر رہا تھا، چپا کو بھر دینی بے چینی

وربے کلی محسوس ہونے لگی تھی۔ ایک بار پھر اسے واضح طور پر سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ان کی گفتگو کا موضوع کیا ہے۔ اگر بالغ، حافل اور مشہور لوگ اس طرح سوچتے ہیں، پھر وہ ٹھیک ہی سوچتے ہوں گے، ٹھیک ہی سوچتے ہوں گے، اس نے سوچا۔ ”لیکن سب سے بڑی بات یہ ہے کہ دینی سوف کے دل میں ایک سچے کے لیے بھی یہ خیال نہیں بیٹھنا چاہیے کہ میں اس کا، تحت ہوں اور وہ جس طرح چاہے، مجھے حکم دے سکتا ہے۔ میں دلوخوف کے ساتھ نازا فرانسیزی کمپ میں جاؤں گا۔ اگر وہ جاسکتا ہے، تو میں بھی جاسکتا ہوں۔“

دینی سوف نے پتیا کو ہر ممکن طریقے سے روکنے کی کوشش کی لیکن اس کا ایک ہی جواب تھا کہ وہ کوئی کام انکل چچو نہیں کرنا بلکہ خوب سمجھ کر اور صحیح طریقے سے کرتا ہے اور اس نے ذاتی خطرے کی کبھی پروا نہیں کی۔

”کیونکہ یہ بات تو آپ بھی مانیں گے کہ اگر ہمیں یقین سے یہ معلوم نہ ہو کہ ان کی صحیح تعداد کیا ہے تو ہمیں شدید سینکڑوں جانوں کی قربانی دینا پڑے اور ہم تو صرف دو ہیں۔ علاوہ ازیں میرا جانے کو بہت جی چاہتا ہے اور میں یقیناً جاؤں گا، چنانچہ مجھے روکنے کی کوشش نہ کریں۔“ اس نے کہا۔ ”اس سے صورت حال بگڑے گی ہی۔“

9

فرانسیسی اور کوٹ ورشا کو پہننے کے بعد پتیا اور دلوخوف گھوڑوں پر سوار ہوئے اور جنگل کے اس حصے کی طرف چل پڑے، جو درختوں سے خالی تھا اور جہاں سے دینی سوف نے فرانسیسی پڑاؤ کا جائزہ لیا تھا۔ انھوں نے گپ اندھیرے میں جنگل عبور کیا اور ایک گھاٹی میں اتر گئے۔ جب وہ پہاڑی کے دامن میں پہنچے، دلوخوف نے قازقوں کو، جون کے ساتھ آ رہے تھے، وہیں، تنگ رکنے کا حکم دیا اور خاصی تیز رفتار سے سڑک کے ساتھ ساتھ چل کی جانب چل پڑا۔ پتیا، جس کا دل بیچوں اچھل رہا تھا، اس کے برابر برابر آ رہا تھا۔

اگر ہم پکڑے گئے، میں زندہ ان کے ہاتھ نہیں آؤں گا۔ میرے پاس پستوں ہے۔“ پتیا نے سرگوشی کی۔

”رومی مت بولو،“ دلوخوف نے بہ غفلت زیر لب کہا اور انھیں، سی لفظے ملکار ”Qui vive“ اور ساتھ ہی دینی بندوق کی ٹک سنائی دی۔

پتیا بدحواس ہو گیا اور اس نے اپنے پستول کو مضبوطی سے پکڑ لیا۔

”Lanciers du 6-me“ دلوخوف نے جواب دیا۔ اس نے اپنے گھوڑے کی رفتار نہ تیزی کی اور نہ ہلکی۔

تاریکی میں چل پر سنتری کا دھندلا سایہ دکھائی دیا۔

”Mot d'ordre?“

کون ہے؟

چشمی رجمنٹ کے خیزہ بردار سوار

پاک ورڈ (وہ لفظ جو فرانس اور بعض دوسرے داروں میں اپنے آدمیوں کی شناخت کے لیے مقرر کر لیا جاتا ہے۔)

دلوخوف نے گھوڑے کی گام کھینچ لی اور خرابیاں خرابیاں آگے بڑھا۔

"Dites donc, le Colonel Gerard est ici?" اس نے پوچھا۔

"Mot d'ordre?" سنتری نے جواب دیے بغیر راستہ روکتے ہوئے دوبارہ پوچھا۔

"Quand un officier fait sa ronde, les sentinelles ne demandent pas le

mot d'ordre..."

دلوخوف نے اچانک لاس پیلے ہوتے ورسیدھے سنتری پر چڑھائی کرتے ہوئے کہا۔

اور سنتری کے، جو ایک طرف ہٹ گیا تھا، جواب کا انتظار کیے بغیر وہ خرابیاں خرابیاں پہاڑی پر چڑھ گیا۔

اندھیرے میں کسی آدمی کی دھندلے شکل کو مرکز پار کرتے دیکھ کر دلوخوف نے اسے روک لیا اور اس سے پوچھنے لگا کہ کون ہے اور افسران کہاں ہیں۔ یہ شخص عام سپاہی تھا اور کندھے پر بوری اٹھائے جا رہا تھا۔ وہ رکا، دلوخوف کے گھوڑے کے قریب آیا، اس نے دوستانہ انداز سے گھوڑے کو تھپکی دی اور سیدھے سادے انداز سے بتانے لگا کہ کون ہے اور افسران دائیں طرف ذرا اور اونچائی پر فارم (فارم سے اس کی سربراہی کے زمیندار کا مکان تھا) کے صحن میں ہیں۔

مرکز کے ساتھ ساتھ، جس کے دونوں اطراف اردوؤں کے ارد گرد فرانسیسوں کی گنگنائیں مٹی جاسکتی تھیں، مزید آگے چلتے ہوئے دلوخوف زمیندار کے مکان کے صحن کی جانب مڑ گیا۔ اس نے گھوڑے پر بیٹھے بیٹھے گیٹ پار کیا، صحن میں پہنچ کر نیچے اترا اور بہت بڑے دھکتے لادو کے پاس پہنچا، جس کے ارد گرد متعدد اشخاص بیٹھے تھے اور زبردور سے باتیں کر رہے تھے۔ آگ کے کنارے دھچپے میں کچھ ابل رہا تھا اور ایک سپاہی جس کے سر پر بچھنے دار ٹوپی اور جسم پر نینا کوٹ تھا، اس کے سامنے جھکا ہوا تھا۔ آگ کی روشنی میں اس کی شکل واضح طور پر دکھائی دے رہی تھی۔ وہ دھچپے میں ram rod¹⁴ پھیر رہا تھا۔

"وہ بہت کڈھب آدمی ہے۔ اس سے کچھ اگلوانا بہت دشوار کام ہے،" ایک افسر، جو آگ کی دوسری جانب تارکی میں بیٹھا ہوا تھا، کہہ رہا تھا۔

"وہ انھیں جُل دے کر کل آئے گا،" دوسرے نے ہنستے ہوئے کہا۔

انھیں جب دلوخوف اور چٹا کے قدموں کی چاپ سنائی دی، وہ دونوں خاموش ہو گئے اور اندھیرے میں جھانک جھانک کر ان کی طرف دیکھنے لگے۔ دلوخوف اور چٹا گھوڑوں کی لگامیں تھامے آگ کی جانب آ رہے تھے۔

"Bonjour messieurs!" دلوخوف نے صاف اور کھٹاک دار آواز میں کہا۔

یہ بتاؤ، کرنل بیفاغ یہیں ہیں؟

جب فرد در دُور پر نکلتے ہیں، سنتری ان سے پاس در دُور نہیں پوچھتے۔

حضرات، آداب عرض

جو، آگ کی دوسری جانب سڑے میں بیٹھے تھے، ان میں بل چل چکی اور ایک افسر، جس کی گردن لائی تھی، الڈ کا چکر کاٹا دلو خوف کی طرف آیا۔

کلے مال (Clement)، تم؟“ اس نے پوچھا۔ ”بھئی آدمی۔“ لیکن اسے نورانی اپنی غلطی کا احساس ہو گیا اور وہ خاموش ہو گیا۔ اس نے ماتھے پر تھرے بل ڈال کر دلو خوف کا، جنٹیوں کی طرح استقبال کیا اور اس سے پوچھنے لگا: ”میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟“

دلو خوف نے بتایا کہ وہ در اس کا ساتھی اپنی رجسٹر کو ڈھونڈنے کی کوشش کر رہے ہیں اور ان میں سے کسی شخص سے خاص طور پر مخاطب ہوئے بغیر پوچھنے گا۔ ”آپ میں سے کسی صاحب کو چھٹی رجسٹر کا کچھ انا پتا معلوم ہے؟“ کوئی شخص بھی اسے کچھ نہ بتا سکا اور چٹا کو محسوس ہونے لگا کہ افسران انھیں مخاصمت اور شک و شبہ کی نظروں سے دیکھ رہے ہیں۔

کئی سیکنڈ خاموشی چھائی رہی۔

”اگر آپ کا خیال تھا کہ آپ کو سپر مل جائے گا، تو آپ بہت دیر سے آئے ہیں۔“ ایک شخص نے، جو لاڈ کے عقب میں ڈرافٹ پر تھا، دہلی دہلی ہنسی ہنسنے ہوئے کہا۔

دلو خوف نے جواب دیا کہ انھیں بھوک نہیں ہے اور انھیں اسی رات مارنا آگے جانا ہے۔

اس نے اپنا گھوڑا، اس سپاہی کے حوالے کیا جو ریگچے میں سراخ پھیر رہا تھا اور خود بھی گردن والے افسر کے قریب اکڑوں بیٹھ گیا۔ افسر نے دلو خوف کے چہرے سے نظریں نہ اٹھائیں اور اس سے دوبارہ پوچھنے لگا کہ اس کا تعلق کس رجسٹر سے ہے۔ دلو خوف نے یوں ٹکا ہر کیا جیسے اسے سوال سنائی نہ دیا ہو اور اس نے جواب دینے سے گریز کیا۔ تاہم اس نے جیب سے چھوٹا سا فرانسیسی پائپ نکالا، اسے سلگایا اور افسروں سے پوچھنے لگا کہ آگے راستے میں قازقوں کا خطرہ تو نہیں۔

”یہ قازق تو جگہ جگہ موجود ہیں،“ آگ کی دوسری جانب کے افسر نے جواب دیا۔

دلو خوف نے کہا کہ قازقوں سے خطرہ اسے اور اس کے ساتھی جیسے بھٹکے اور پھڑپھڑے ہوئے اشخاص کو ہے اور دریافت طلب انداز سے مزید کہنے لگا کہ وہ غائب کسی بڑے دستے پر حملہ کرنے کی جرأت نہیں کریں گے۔ کسی نے کوئی جواب نہ دیا۔

”اب وہ یقیناً اٹھ کھڑا ہوگا،“ چٹا ہر لمبے لمبی سوچ رہا تھا۔ وہ الڈ کے قریب کھڑا گنگلوں رہا تھا۔ لیکن دلو خوف نے گنگلو، جو بند ہو چکی تھی، دوبارہ شروع کر دی۔ اس نے بلا جھجک پوچھ لیا کہ ان کی پٹالین میں کتنے آدمی ہیں، بنا بیوروں کی کل تعداد کتنی ہے اور ان کے پاس قیدی کتنے ہیں۔ روسی قیدیوں کے بارے میں دریافت کرتے ہوئے دلو خوف نے کہا:

”ان لاشوں کو ساتھ ساتھ گھسیٹے پھرنا کتنا دشمن اور کریم کام ہے! بہتر ہے کہ ان سوردوں کو گولی مار دی جائے۔“

اور وہ اتنے عجیب و غریب انداز سے کھلکھلا کر ہنسنے لگا کہ چٹا کارل بیٹھنے لگا۔ سے خیال آیا کہ اب فرانسیسی اس کی اصلیت بھانپ جائیں گے، اور وہ غیر راہی طور پر ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔

لیکن دلوخوف کی رائے ورنہ کسی نے کوئی رد عمل ظاہر نہ کیا اور ایک فرانسیسی افسر، جوان کی نظروں سے اوجھل تھا (وہ اور کوٹ میں لپٹا پڑا تھا)، سرگوشیوں میں اپنے ساتھی سے کچھ کہنے لگا۔ دلوخوف اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور اس نے سپاہی کو آواز دی جو ان کے گھوڑوں کی لگامیں پکڑے کھڑا تھا۔

”یہ ہمارے گھوڑے واپس کریں گے یا نہیں؟“ چٹا نے سوچا اور وہ خیلی طور پر خود بخود دھک کر دلوخوف کے قریب ہو گیا۔

گھوڑے لوٹا دیے گئے۔

”حضرات، شب بخیر“ دلوخوف نے کہا۔

چٹا بھی ”Bonsor“ کہنا چاہتا تھا لیکن اس کے منہ سے ذرا سی آواز بھی نہ نکل سکی۔ افسران آہیں میں کانٹا پھوسپاں کر رہے تھے، ورنہ دلوخوف نے گھوڑے پر، جو نچلا نہیں کھڑ ہو رہا تھا، سوار ہونے میں غامی دیر لگا دی۔ پھر وہ بہت آہستہ آہستہ صحن سے باہر نکل آئے۔ چٹا دلوخوف کے برابر آ رہا تھا۔ اس کا مئی تو بہت چاہتا تھا کہ پیچھے مڑ کر دیکھے کہ کہیں فرانسیسی ان کا تعاقب تو نہیں کر رہے، لیکن وہ اس کا حوصلہ نہ کر سکا۔

جب وہ دوبارہ سڑک پر آئے، دلوخوف کھسے دیہاتی علاقے کی طرف واپس جانے کے بجائے گاؤں کے بچوں کی گزرنے لگا۔ ایک جگہ وہ رک گیا اور سننے لگا۔

”تمہیں کچھ سنائی دیا؟“ اس نے پوچھا۔

چٹا نے روکی آواز میں پچپان لیں اور اسے روکی قیدیوں کی اپنے لافوں کے اور گرد و مندی رندوں کی دھمکیوں کی دہرائی دی۔ چٹا اور دلوخوف پہاڑی سے نیچے اترے اور پل پر پہنچ گئے۔ وہ سنتری کے قریب سے گزرے۔ سنتری نے ان سے ایک لفظ تک نہ کہا اور منہ پھلایا۔ ادھر ادھر گھر متارہا۔ وہ گھنٹی میں، جہاں قازقی ان کے منتظر تھے، پہنچ گئے۔

”اچھا، اب خدا حافظ۔ دینی سوف کو بتا دینا۔ سویرے پہلی گولی کی آواز پر“ دلوخوف نے کہا۔ وہ اپنے گھوڑے کو ہمیشہ لگا یا چاہتا تھا کہ چٹا نے اسے بازو سے پکڑ لیا۔

”اوہ!“ اس نے گلہ پھر کر کہا۔ ”آپ کتنے بڑے ہیرو ہیں! لا جواب! طیس القدر! مجھے آپ سے کتنی محبت ہے!“

”ٹھیک ہے، یار، ٹھیک ہے“ دلوخوف نے کہا لیکن جیسے چھوڑ نہیں رہا تھا اور دلوخوف نے اندھیرے میں دیکھا کہ وہ جھکا ہوا ہے، ورنہ اس سے بغل گیر ہونا چاہتا ہے۔ دلوخوف نے اس کا ہوس لیا اور نہیں پڑا۔ اس نے اپنا گھوڑا سوار اور رات کے اندھیرے میں غائب ہو گیا۔

شب بخیر۔

جب پتیا رکھوالے کے جھونپڑے کے قریب پہنچا، اسے دینی سوف دروازے پر مل گیا۔ وہ اسی کا انتظار کر رہا تھا۔ اور ستر دروازے پریشان بھی تھا اور اپنے آپ کو کوس بھی رہا تھا کہ اس نے پتیا کو آ کر جانے ہی کیوں دیا۔

”خداوند کا شکر ہے!“ اس نے چلا کر کہا۔ ”خداوند کا شکر ہے!“ اس نے پتیا کی وجد آفریں کہانی سننے ہوئے دوبارہ کہا۔ ”لیکن تمہارا ستیاناس ہو، تمہاری وجہ سے مجھے بالکل خینڈ نہیں آئی، اخیر، خداوند کا شکر ہے۔ اب یٹ جاؤ، ہم صبح ہونے سے پہلے اب بھی چپکلی لے سکتے ہیں۔“

”جی نہیں!“ پتیا نے کہا۔ ”مجھے خینڈ نہیں آرہی۔ عداوہ انریں، میں اپنے آپ کو جانتا ہوں۔ اگر میں سو گیا، پھر میرا خدا ہی حافظ۔ ایک اور بات یہ ہے کہ مجھے لڑائی سے پہلے سونے کی عادت نہیں ہے۔“

پتیا کچھ دیر جھونپڑے کے اندر بیٹھا رہا۔ وہ اپنی مہم کی تفصیلات یاد کر کے بہت خوش ہو رہا تھا اور اگلے روز کیا ہو گا، اس کا اپنے ذہن میں واضح نقشہ بنا رہا تھا۔ جب اس نے دیکھا کہ دینی سوف سو گیا ہے، وہ اٹھا اور باہر چلا گیا۔ باہر ابھی خاصا اندھیرا تھا۔ بارش تھم چکی تھی لیکن درختوں سے ابھی تک پانی کے قطرے گر رہے تھے۔ دکھوالے کے جھونپڑے سے کچھ ہی دور قازقوں کی عارضی جھونپڑیاں اور ان کے بندھے ہوئے گھوڑوں کی شکلیں دکھائی دے رہی تھیں۔ جھونپڑے کے عقب میں دو چھکڑے اور ان کے قریب ان کے گھوڑے کھڑے تھے۔ نیچے گھاٹی میں بھتے ہوئے الاؤں میں کوئلے ابھی تک دھک رہے تھے۔ سارے کے سارے قازق اور ہوزار سوئے نہیں تھے۔ کہیں کہیں سے کانچھوسیوں سے ملتی جلتی آوازیں آرہی تھیں اور وہ درختوں سے گرنے والے قطروں اور گھوڑوں کی جگالی کی آوازوں میں مدغم ہو رہی تھیں۔

پتیا باہر آ گیا، اس نے اندھیرے میں جھانک کر دیکھا اور چھکڑوں کے پاس چلا گیا۔ کوئی شخص چھکڑوں کے نیچے خراٹے لے رہا تھا۔ ان کے ارد گرد گھوڑے، جن پر زینیں کسی ہوں تھیں، کھڑے تھے اور جیٹی کھ رہے تھے۔ پتیا نے اندھیرے میں اپنا گھوڑا پہچان لیا۔ اسے وہ کاراباخ¹⁵ کہتا تھا (حالانکہ بہ اعتبار نسل یہ یوکرینی تھا) اور اس کے قریب چلا گیا۔

”اچھا، کاراباخ اکل ہم کچھ کام کریں گے!“ اس نے پیار سے اپنی ناک گھوڑے کی ناک اور تھوٹھنی سے رگڑی اور اس کا بوسہ لیا۔

”جناب، آپ سوئے نہیں؟“ ایک قازق نے پوچھا۔ وہ چھکڑے کے نیچے بیٹھا تھا۔

”نہیں، میں تمہارا نام لینا چاہتا ہوں؟“ ٹھیک؟ تمہیں معلوم ہے کہ میں ابھی ابھی آیا ہوں۔ ہم فراموشی پر لاؤ میں گئے تھے۔“

اور پتیا نے قازق کو نہ صرف مہم کی تمام تفصیلات بتائیں بلکہ اس نے اسے یہ بھی بتایا کہ وہ کیوں گیا تھا اور یہ

کردہ انکل پنچو انداز سے کام کرنے کے بجائے اپنی زندگی کو خطرہ میں ڈالنا کیوں بہتر سمجھتا تھا۔
”بہر حال آپ کو کچھ آرام کر لینا چاہیے،“ قازق نے کہا۔

”نہیں، مجھے اس کی عادت ہو چکی ہے۔“ جیتا نے کہا۔ ”تمہارے ہستونوں کے چتراتی ٹھیک ٹھاک ہیں؟
”نہیں تو نہیں گئے۔ میں اپنے ساتھ چند ایک لایا تھا۔ تمہیں چاہئیں؟ ایسے ہیں تو لے لو۔“
قازق نے چمکڑے کے نیچے سے اپنا سر باہر نکالا۔ وہ جیتا کو اچھی طرح دیکھنا چاہتا تھا۔
”کیونکہ میں ہر کام صحیح انداز سے کرنے کا عادی ہوں،“ جیتا نے کہا۔ ”بعض لوگ تیرلی کے بغیر انکل بچو
کام کرتے ہیں اور بعد میں پچھتاتے ہیں۔ مجھے یہ پسند نہیں ہے۔“
”ٹھیک،“ قازق نے کہا۔

”ارے ہاں، ایک اور بات۔ میرے عزیز دوست، ذرا اتنی تکلیف کرو کہ میری کموڈوراسان پر چڑھادو،
یہ کند ہو گئی ہے۔“ (لیکن جیتا اپنا جھوٹ مکمل نہ کر سکا۔) ”یہ کبھی تیز نہیں کی گئی۔ تم کر سکتے ہو؟“
”بالکل کر سکتا ہوں۔“

لیٹھا چیف اٹھا، درگتھڑٹٹو نے لگا۔ آن کی آن میں جیتا کوسان پر فوادی حربی آواز سنائی دینے لگی۔ وہ پھکڑے
پر چڑھ گیا اور اس کے کنارے پر بیٹھ گیا۔ قازق پھکڑے کے نیچے کموڈور تیز کر رہا تھا۔
”جوان ضرور ہے ہیں؟“ جیتا نے پوچھا۔

”کچھ سوراہے ہیں، کچھ۔ ہماری طرح۔ جاگ رہے ہیں۔“

اس لڑکے کا کیا حال ہے؟

”وہ سستی؟ وہ ادھر گھاس پر لیٹا ہوا ہے۔ پہلے تو وہ بہت ڈرا ہوا تھا لیکن اب گھوڑے بچ کر سوراہے اور
بہت خوش تھا۔“

جیتا خاصی دیر غاموش رہا اور مختلف آوازیں سنتا رہا۔ اسے تاریکی میں قدموں کی آہٹ سنائی دی اور ایک دھندلا
دھندلا صورت نظر آئی۔

”یہ تم کیا تیز کر رہے ہو؟“ اس شخص نے پھکڑے کے قریب آ کر پوچھا۔

”ان صاحب کی شمشیر۔“

”ٹھیک ہے،“ اس شخص نے کہا۔ جیتا کے خیال میں وہ کوئی ہوزار تھا۔ ”پیالہ تمہارے پاس تو نہیں رہ گیا تھا؟“
”ہجے کے پاس پڑا ہے۔“

ہوزار نے پیالہ اٹھا لیا۔ ”دن نکلنے ہی والے ہوگا،“ اس شخص نے ہنسی لیتے ہوئے کہا اور واپس چلا گیا۔
جیتا کو معلوم ہوا چاہیے تھا کہ وہ جنگل میں ہے، دینی سون کے جتنے میں ہے، سڑک سے پون میل دور ہے،
گراہیسیوں سے چھینے ہوئے پھکڑے پر بیٹھا ہے جس کے نزدیک گھوڑے بندھے ہوئے تھے، اس پھکڑے کے نیچے

قازق لیٹا چیف اس کی شمشیر تیز کر رہا ہے، اس کے دائیں طرف جو بہت بڑا سیاہ دھبہ ہے، وہ رکھواسے کا جھونپڑ ہے، نیچے بائیں طرف دکھتا ہوا مقام بجھتا ہوا لاد ہے، جو آدمی ابھی ابھی بیالہ لے کر گیا تھا، پیاسا ہوا رہا تھا۔ مگر وہ ان تمام باتوں کو نہ جانتا تھا۔ دور رہنا چاہتا تھا۔ وہ طسمی مملکت میں، جہاں کوئی چیز حقیقت سے لگا نہیں کھاتی، پہنچ چکا تھا۔ ممکن ہے کہ بڑا سیاہ دھبہ درحقیقت جھونپڑا ہی ہو لیکن یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ یہ کوئی اتھاہ غار ہو جو تحت الارض تک پہنچ جاتا ہو۔ ممکن ہے کہ سرخ جگہ ادا ہو لیکن یہ کسی دیو قامت عفریت کی آنکھ بھی تو ہو سکتی ہے۔ شاید وہ، یعنی چیتا، واقعی پھکڑے پر بیٹھا ہوا ہے اور عین ممکن ہے کہ وہ قطعاً پھکڑے پر نہ بیٹھا ہو بلکہ کسی سرخسک مینار پر چڑھ چکا ہو اور اگر وہ نیچے گر پڑا تو ہو سکتا ہے کہ زمین پر پہنچنے سے پہلے وہ پورا دن یا پورا مہینہ فضا میں ہی اڑتا رہے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ وہ سداگو پرواز رہے اور کبھی نیچے نہ پہنچ سکے، پھکڑے کے نیچے شاید قازق لیٹا چیف بیٹھا ہے لیکن یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ وہ دھرتی کا شفیق تریں، بہادر تریں، حیرت انگیز تریں، عظیم تریں انسان ہو جس کے بارے میں کسی کو کچھ معلوم ہی نہ ہو۔ وہ شخص، جو پانی لینے آیا تھا اور واپس گھٹی میں چلا گیا تھا، ممکن ہے ہوا اور یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ وہ گھٹی میں گیا ہی نہ ہو بلکہ غائب ہو گیا ہو، فضا میں تحلیل ہو گیا ہو اور اس کا وجود عدم وجود میں چکا ہو۔

اب چیتا کو خواہ کچھ ہی کیوں نہ نظر آتا، اسے قطعاً کوئی حیرت نہ ہوتی۔ وہ طسمی مملکت میں پہنچ چکا تھا اور وہاں ہر چیز ممکن تھی۔

اس نے نگاہیں اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھا۔ زمین کی طرح آسمان بھی طسمی مملکت بن چکا تھا۔ مطلع صاف ہو رہا تھا اور درختوں کی چوٹیوں پر بدلوں کی ٹکڑیاں یوں بھگی بھری تھیں جیسے وہ ستاروں کے چہروں سے نقاب الٹ رہی ہوں۔ بعض اوقات یوں معلوم ہونے لگتا کہ بدیاں چھٹ بھگی ہیں اور نظروں کے سامنے تھرے تھرے سیاہ آسمان کا خاصا بڑا قلعہ نمودار ہو جاتا۔ کبھی یوں دکھائی دیتا کہ سر کے اوپر آسمان بلند سے بلند تر ہوتا جا رہا ہے اور کبھی وہ اتنا نیچے آ جاتا معلوم ہوتا کہ ایسے لگتا ہے جیسے آدمی اس تک پہنچ سکتا اور اسے ہاتھ سے چھو سکتا ہے۔

چیتا کی آنکھیں بند ہونے لگیں اور اس کا جسم قدرے جھول گیا۔

درختوں سے پانی کی بوندیں گر رہی تھیں۔ باتوں کی دھیمی دھیمی بھینسناہٹ سنائی دینے لگی۔ گھوڑے ہنہانے اور ایک دوسرے کے ساتھ ٹکرانے لگے۔ کوئی شخص خراسان بھرنے لگا۔

کھٹ کھٹ، کھٹ کھٹ، کھٹ کھٹ، کھٹ کھٹ، کھٹ کھٹ... سان پر شمشیر سنسار ہی تھی اور ایک ایک چیتا کو خوش آنک اور سریلے آرکسٹرا کی آواز سنائی دی۔ وہ کسی اجنبی، شیریں، پروتار مناجات کی دھن بجا رہا تھا۔ اگرچہ چیتا نے نہ تو کبھی موسیقی کی تعلیم پائی تھی اور نہ اس نے کبھی اس کے بارے میں سوچا تھا لیکن وہ اتنا ہی کن دس تھا جتنی کہ بنا شا اور گولائی سے تو کہیں زیادہ۔ چنانچہ جو نغمہ اچانک اس کے کانوں میں رس گھولنے لگا تھا، اس میں اس کے لیے خصوصی سازگی اور دلکشی تھی۔ موسیقی کی آواز بلند سے بلند تر ہوتی جا رہی تھی۔ نغمے میں وسعت آتی جا رہی تھی اور وہ کبھی ایک ساز سے اور کبھی دوسرے سے نکلنے لگتا۔ جو کچھ بچ رہا تھا، وہ کثرت الصوت (fugue) ¹⁷ نغمہ تھا۔

پتا کے فرشتوں کو بھی معلوم نہیں تھا کہ fugue کیا ہوتا ہے۔ ہر سائز۔ کبھی وائکن، کبھی ہارن، لیکن وائکن اور ہارن سے کہیں زیادہ۔ نفیس اور پاکیزہ۔ اپنا پارٹ ادا کر رہا تھا اور پشتر اس کے کہ ایک سار کی دھن انجام تک پہنچتی ہو وہ دوسرے سار کی آواز میں، جو تقریباً یہی دھن شروع کر دیتا، مدغم ہو جاتی۔ دوسرے کے بعد تیسرا اور تیسرے کے بعد چوتھا آواز میں آواز ملنے لگتا اور پھر سب مل کر ایک زباں ہو جاتے، وہ دوبارہ، لگ الگ ہو جاتے اور اس کے بعد پھر مدغم ہو جاتے۔ کبھی سنجیدہ کلیسا کی راگ چھڑ جاتا اور کبھی فتح و نصرت کا درخشندہ تابندہ نغمہ بجے لگتا۔

”افوہ، میں ضرور کوئی خواب دیکھتا رہا ہوں گا،“ پتا نے اگلی جانب جھوک کھاتے ہوئے سوچا۔ یہ میرے کانوں تک محدود ہے۔ شاید یہ میری اپنی تخلیق کردہ موسیقی ہے، غیر میری موسیقی، جاری رہو اور اب!“

اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور مختلف سمتوں سے آوازیں، جیسے وہ کہیں بہت دور سے آرہی ہوں، سرکش ہونے لگیں۔ وہ بڑھتے بڑھتے نعمات میں ڈھل گئیں، علیحدہ علیحدہ ہونے اور ایک بار پھر پس میں گھل مل کر اسی شریں اور سنجیدہ مناجات کی صورت اختیار کر گئیں۔ ”وہ، مزہ آگیا۔ یہ اتنی ہی دلکش اور خوبصورت ہیں جتنی کہ مجھے پسند ہیں اور جتنی میں چاہتا ہوں! پتا نے اپنے آپ سے کہا۔ وہ اس عظیم الشان آرکسٹرا کو ہدایات دینے کی کوشش کرنے لگا۔ ”اب خاموش ہو جاؤ... جیسے دھیمے ختم ہو جاؤ!“ اور آوازیں اس کا حکم بجالائیں۔ ”اب ادب!“ اور لو لگی، اور تیز ہو چڑا، اتنی کہ روح خوشی سے سرشار ہو جائے!“ اور نامعلوم گہرائیوں سے آوازیں، ٹخنے اور پھپھنے لگیں اور دل پر وجد طاری کرنے لگیں۔ ”آواز، اب آپس میں مل جاؤ!“ پتا نے حکم دیا۔ بہت دور سے، سے پہلے مردوں کی اور پھر عورتوں کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ وہ بتدریج بلند سے بلند تر ہوتی جا رہی تھیں، جہاں تک وہ نقطہ عروج تک پہنچ گئیں۔ پتا پر وجد بھی طاری تھی اور بہت بھی اور اس کی روح اس حیرت انگیز حس سے ہر اب ہورہی تھی۔

اور یہ آوازیں اکثری مارچ کی دھنوں، درختوں کے پتوں سے گرتی پالی کی بوندوں کی ٹپ ٹپ اور اور سنسنائی شمشیر کی کھٹ کھٹ، کھٹا کھٹ میں مدغم ہو گئیں۔ گھوڑے ایک بار پھر پس میں الجھے اور نہہانے لگے لیکن اب کے انھوں نے آہنگ میں کوئی گڑبڑ نہیں کی بلکہ اس کا جزو بن گئے۔

پتا کو کچھ معلوم نہیں تھا کہ یہ سب کچھ کتنا عرصہ جاری رہا، واقف اس سے لطف ایتار ہا۔ وہ خود تو لطف اندوز ہو ہی رہا تھا لیکن اسے افسوس بھی ہو رہا تھا کہ اس لطف اندوزی میں کوئی دوسرا شخص اس کا شریک نہیں تھا۔ اسے لیتا چیف نے جگادیا۔

”یہ رہی جناب، بالکل تیار ہے۔ کسی بھی فراہمی کے اس سے دو ٹوکے کیے جاسکتے ہیں۔“

پتا نے آنکھیں کھول دیں۔ ”اجانا نمودار ہو رہا ہے۔ واقعی جالانودار ہو رہا ہے!“ اس نے با آواز بلند کہا۔ گھوڑے، جو پہلے ٹکا ہوں سے ارجھل تھے، اب سر سے دم تک نظر آ رہے تھے، درنگی پٹی شاخوں کے بیچ میں آبی روشنی جھللائے لگی تھی۔ پتا نے اپنے آپ کو ہلایا، جلدیا، نیچے چھلک لگائی، جب سے روئل نکالا اور لیتا چیف کے حواسے کر دیا۔ پھر اس نے اپنی شمشیر کو نیام میں بند کرنے سے پہلے آزمائش کی خاطر نص میں ہرایا۔ قاتل اپنے

گھوڑے کھول رہے تھے اور کانٹھوں کے بند باندھ رہے تھے۔

”کمانڈر آگئے!“ لیٹا چیف نے کہا۔

دینی سوف رکھوالے کے جھونپڑے سے باہر نکلا۔ اس نے پتیا کو بلایا اور اسے تیار ہونے کا حکم دیا۔

11

جوانوں نے نیم تاریکی میں اپنے اپنے گھوڑوں کی شناخت کی، کانٹھوں کے بند کس کر باندھے اور اپنی کمپنی تشکیل کر لی۔ دینی سوف رکھوالے کے جھونپڑے کے قریب کھڑا آخری ہدایات دے رہا تھا۔ جتنے کے سینکڑوں پیادہ سپاہی کچھڑ میں چھپ چھپ کرتے سڑک کی طرف بڑھے گئے۔ پلک جھپکنے میں وہ درختوں اور صبح سویرے کی دھند میں غائب ہو گئے۔ ایسول نے قازقوں کو اپنی طرف سے ہدایات دیں۔ پتیا اپنے گھوڑے کی لگام تھامے کھڑا تھا اور بے مبری سے سوار ہونے کے حکم کا انتظار کر رہا تھا۔ پانی کے چھپا کے مارنے کے بعد اس کا چہرہ، خاص طور پر اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ اسے اپنی ریڑھ کی ہڈی میں سردی کی لہر دوڑتی محسوس ہوئی اور اس کا سارا جسم یوں کپکپانے اور تھر تھرانے لگا جیسے اسے تال دی جا رہی ہو۔

”تیار یاں ہو گئیں؟“ دینی سوف نے پوچھا۔ ”چھا، گھوڑے آئے۔“

گھوڑے نکال لیے گئے۔ دینی سوف اپنے قازق پر گرم ہونے لگا کیونکہ اس کی زمین کے بند ڈھیلے تھے۔ اس نے اسے بے نقط سناٹیں اور گھوڑے پر سوار ہو گیا۔ پتیا نے رکاب میں پاؤں رکھ لیے۔ گھوڑے نے، جیسا کہ اس کی عادت تھی، کچھ اس قسم کی حرکت کی جیسے وہ اس کی ٹانگ کا ٹٹا چاہتا ہو لیکن پتیا نے جست لگائی اور کانٹھی پر بیٹھ گیا۔ اسے یہ احساس ہی نہیں رہا تھا کہ اس کا اپنا بھی وزن ہے۔ اس نے پیچھے مڑ کر ہزاروں پر نظر ڈالی جو اس کے عقب میں تاریکی سے نکل کر آگے جا رہے تھے، دراپنا گھوڑا بڑھا کر دینی سوف کے قریب آیا۔

واسکی دمترج، میرے زے کوئی کام لگا دیں۔ مہربانی فرمائیں۔ خدا کے لیے...! اس نے کہا۔

معلوم ہوتا تھا کہ دینی سوف بالکل بھول چکا ہے کہ وہاں پتیا نام کا کوئی شخص بھی موجود ہے۔ اس نے گردن گھما کر اسے سرسری نگاہوں سے دیکھا۔

”میرا صرف ایک ہی مطالبہ ہے،“ اس نے درشتی سے جواب دیتے ہوئے کہا، ”کہ میرا حکم مانتے رہو ورنہ میں بھی آگے دھم دھکا کرنے کی کوشش نہ کرو۔“

اس نے پتیا سے مزید ایک لفظ بھی نہ کہا اور سارا راستہ چپ چاپ چلتا رہا۔ جب وہ جنگل کے کنارے پہنچے، کھلے کھیتوں میں روشنی واضح طور پر مسودار ہو چکی تھی۔ دینی سوف نے، یسوں کے کانوں میں کچھ کہا اور قازق پتیا اور دینی سوف سے آگے نکلنے لگے۔ جب وہ سب آگے چلے گئے، دینی سوف نے گھوڑے کو مہینز گایا اور پہاڑی سے نیچے اترنے لگا۔ گھوڑے اکڑا دیں ہو گئے اور اپنے سواروں سمیت پھسلتے پھسلتے نیچے وادی کی طرف جانے لگے۔ پتیا

دینی سوف کے ہم رکاب رہے۔ اس کے سارے جسم کی کپکپ ہٹ میں مردم اضافہ ہوتا تھا۔ ہاتھ۔ اچھلا بڑھتا جا رہا تھا اور صرف دور کی اشیا ابھی تک دھند میں لگا ہوں سے اوچھل تھیں۔ جب دینی سوف وادی میں پہنچا، اس سے پیچھے مڑ کر دیکھا اور گردن کے اشارے سے اپنے قریب ترین قازق کو بلایا۔

”سگن!“ اس نے کہا۔

قازق نے اپنا بازو وار پراٹھایا اور وادی میں گولے چلنے کی آواز گونجی۔ پلک جھپکنے میں سر ہٹ بھاگتے گھوڑوں کی ٹاپیں اور مختلف اطراف سے آوازیں سنائی دینے لگیں۔ اور اس کے بعد مزید گولیاں چلیں۔

گھوڑوں کی ٹاپوں اور چیخ پکار کی آوازیں سنتے ہی پیتا نے اپنے گھوڑے کو چابک دکھایا، اس کی بائیں اٹھلی چھوڑی اور دینی سوف کی، جو گلہ پھڑپھڑا کر اسے اپنی طرف بل رہا تھا، پروا کیے بغیر سر ہٹ اگے بھاگنے لگا۔ جس وقت گولی چلائی گئی تھی، پیتا کیوں محسوس ہوا کہ اچانک مطلع خاصا ہو گیا ہے جتنا کہ وہ پہرہ کو ہوتا ہے۔

وہ اپنا گھوڑا اٹل کی جانب دوڑنے لگا۔ اس کے آگے آگے قازق جا رہے تھے۔ ان کی رفتار بے حد تیز تھی۔ بل پر پیتا کا تصادم ایک قازق سے ہو گیا جو پیچھے رہ گیا تھا، لیکن وہ آگے نکل گیا۔ اسے اپنے سامنے فوجی سپاہی۔ اس کے خیال میں یہ فرانسیسی تھے۔ نظر آئے۔ وہ سڑک کے پار دائیں سے بائیں بھاگ رہے تھے۔ ان میں سے ایک کچھڑ میں پھسل گیا اور اس کے گھوڑے کے کمر در تلے آ گیا۔

قازق ایک جھوپڑے کے گرد اکٹھے ہو گئے تھے اور وہاں کچھ کر رہے تھے۔ جھوم کے درمیان میں سے خوفناک چیخ بلند ہوئی اور پیتا کو جو سب سے پہلے چیز نظر آئی، وہ کسی فرانسسی کا زرد چہرہ اور کپکپاتا جڑ تھا۔ دوبرنگی کا ڈنڈا، جس سے اس کا نشانہ لیا گیا تھا، مضبوطی سے پکڑے ہوئے تھا۔

”ہرا!۔۔۔ ساتھیو۔۔۔ ہمارا۔۔۔“ پیتا چلایا اور اپنے ہیجان زدہ گھوڑے کی بائیں ڈھیلی چھوڑتا سر ہٹ گاؤں کی طرف بھاگنے لگا۔

اسے اپنے آگے گولیوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ قازق، ہوزار اور خستہ حال روسی قیدی، جو سڑک کے دونوں اطراف سے بھاگتے آئے تھے، ابھی چیخ چلا رہے تھے اور اس شور و غل میں کان بڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ ایک فرانسیسی، جو شکل و صورت سے جی دار آدمی معلوم ہوتا تھا، جس کے جسم پر نیلے رنگ کا کوٹ تھا، جس کا سر تنگ تھا، چہرہ کپکپا رہا تھا اور جس کی بھوئی تھی، ہوزاروں کا حملہ رک رہا تھا۔ جس وقت پیتا گھوڑا دوڑاتے رہا، پہنچا، فرانسیسی نیچے گر چکا تھا۔ ”واہری قسمت، ایک بار پھر سونچ ہاتھ سے نکل گیا“ پیتا کے ذہن میں کوندے کی طرح قیاس آیا اور وہ آتش پا اس جگہ پہنچ گیا جہاں دھڑا دھڑا فائرنگ ہو رہی تھی۔ گولیاں دسیندر کے اس مکان کے صحن سے آرہی تھیں، جہاں وہ گزشتہ رات دوبرخوف کے ساتھ گیا تھا۔ وہ فرانسیسی باغیے میں، جس میں سبے تھاش جھاڑیاں اگی ہوئی تھیں، جعفری کی باز کے پیچھے ڈٹے ہوئے تھے اور کازنوں پر، جو گیت کے قریب ٹھکھٹا کیے ہوئے تھے، گولیاں چلا رہے تھے۔ پیتا گھوڑا دوڑتا گیت تک پہنچا۔ وہاں اسے دوبرخوف کا، جو چیخ چیخ

کر اپنے آدمیوں کو احکام دے رہا تھا، مہتری مائل، مرد چہرہ نظر آیا۔

”گھوم پھر کر ادھر چلے جاؤ، وہاں وہ سپاہیوں کا انتظار کرو!“ وہ اپنے پیچھے پڑوں کا پورا زور لگا کر کہہ رہا تھا۔

”انتظار؟... ہر۔۔۔!“ پیتا نے پوری قوت سے نعرہ لگایا اور ایک سیکنڈ کے بغیر ادھر، جدھر سے فارم کی آوازیں آرہی تھیں اور جہاں دھواں دبیز تر رہتا تھا، سر پٹ بھاگتا چلا گیا۔ متعدد بندوقوں کے بیک وقت داغے جانے کی آواز سنائی دی، سنسناتی گولیاں نکلیں، دیر بعد سے کسی چیز سے ٹکرائیں۔ دلوخوف اور قازق گھوڑے دوڑاتے پیتا کے پیچھے صحن میں داخل ہو گئے۔ چند فرانسیسیوں نے تھرتھراتے گاڑھے دھوئیں میں اپنے بازو نیچے گرا دیے اور قازقوں سے ملنے جھڑپوں سے باہر آ گئے جب کہ دوسرے دامن کوہ میں جو ہڑکی طرف بھاگ گئے۔ پیتا گھوڑا صحن میں سر پٹ دوڑاتا پھر رہا تھا لیکن ہاتھوں کو پکڑنے کے بجائے وہ اپنے دونوں ہاتھ عجیب و غریب انداز سے تیز تیز گھما رہا تھا۔ اس کا جسم مسلسل ایک طرف کھسکا اور کانٹھی سے دور ہوتا جا رہا تھا۔ بھاگتے بھاگتے اس کے گھوڑے کا پاؤں الاؤ پر جا پڑا جس کے کونے ابھی تک دھک رہے تھے۔ وہ وہیں رک گیا اور پیتا دھڑام سے مٹی زمین پر گر پڑا۔ اگرچہ اس کا سر بے حس و حرکت تھا، قازقوں کو اس کے ہاتھ اور کانٹھیں یوں گھومتی رکھائی دیں جیسے اس پر شیخ کا دورہ پڑ رہا ہو۔ گولی اس کی کھوپڑی چیرتی نکل گئی تھی۔

ایک سینئر فرانسیسی افسر سے، جو اپنی شمشیر پر سفید رومال باندھے مکان سے باہر آ گیا تھا، جس نے تھہر ڈانے کا اعلان کر دیا تھا، بات چیت کرنے کے بعد دلوخوف گھوڑے سے نیچے اترا اور پیتا کے پاس پہنچا جو ہلکا پھیلے زمین پر ساکت پڑا تھا۔

”مارا گیا!“ اس نے تیوریاں چڑھاتے ہوئے کہا اور دینی سوف سے ملنے، جو اسی کی جانب آ رہا تھا، گیٹ کی طرف چل پڑا۔

”کیا؟ ہلاک ہو گیا؟“ دینی سوف پیتا کے جسم کو لاریب بے جان انداز سے پڑے دیکھ کر چلایا۔ اس نے اسے دور سے ہی پہچان لیا تھا۔

”مارا گیا!“ دلوخوف نے اپنے الفاظ کچھ یوں دوبارہ دہرائے جیسے ان کی ادائیگی سے اسے اطمینان حاصل ہو گیا ہو اور وہ تیزی سے (فرانسیسی) قیدیوں کی طرف چل پڑا۔ قازق اس سے زیادہ تیز نکلے، وہ پہلے ہی قیدیوں کے گرد حصار بنا چکے تھے۔ ”ہم ان کے ساتھ کوئی رو رعایت نہیں کریں گے۔“ اس نے چل کر دینی سوف سے کہا۔ دینی سوف نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ پیتا کے قریب آیا، گھوڑے سے نیچے اترا اور اس نے اس کے خون آلود اور کچڑ سے لٹھڑے ہوئے چہرے کا رخ اپنی طرف کیا جس کا اڑی بیستر ہی رنگ سفید ہو چکا تھا۔

”مجھے ٹھکی چیزیں ہمیشہ ہی پسند رہی ہیں۔ بہت اچھا متعلق ہے۔ ہمارا لے لیس...“ اس کے الفاظ یاد آئے۔

اور قازقوں نے حیرت سے مڑ کر پیچھے دیکھا۔ انھیں کچھ اس طرح کی آواز سنائی دی جیسے کسی کتے کی خوف

سے چیخ مکل گئی ہو۔ یہ چیخ ریٹی سوف کی تھی۔ چیخ مارتے ہی ریٹی سوف تیزی سے پیچھے ہٹا، جعفری کی باز کی طرف گیا اور اسے مضبوطی سے پکڑ لیا۔

ریٹی سوف اور دلو خوف نے جن روی قیدیوں کو رہائی دلائی، ان میں دیگر بڑا خوف بھی تھا۔

12

ما سکو سے اپنے سارے سفر کے دوران میں فرانسیسی حکام نے قیدیوں کی جماعت کو، جن میں بیٹر شامل تھا، مزید کوئی حکم نہ دیا۔ ما سکو سے یہ جماعت جن فوجی دستوں اور سامان کے چمکڑوں کے ساتھ روانہ ہوئی تھی، 22 اکتوبر سے پہلے ہی یہ ان سے علیحدہ ہو چکی تھی۔ جن چمکڑوں پر سکٹ اور رس لہے ہوئے تھے، اور جو سفر کی ابتدا کی منزلوں میں ان کے ساتھ تھے، ان میں سے نصف کا زق پکڑ کر لے جا چکے تھے اور بقیہ نصف آگے نکل چکے تھے۔ جو سوار گھوڑوں سے اتر کر ان کے آگے آگے پیدل چل رہے تھے، ان میں سے ایک بھی باقی نہیں رہا، وہ بھی کے سبکی غائب ہو چکے تھے۔ شروع کے یام میں قیدیوں کو اپنے آگے جو توپ خانہ نظر آتا تھا، اب اس کی جگہ مارشل جونو (Junot) کے ہار برداری کے لاتعداد چمکڑوں کے قافلے نے لے لی تھی۔ ان کی حفاظت ویسٹ فالپ کے فوجی کر رہے تھے۔ قیدیوں کے عقب میں گھوڑ سوار فوج کے ساز و سامان کی گاڑیاں آ رہی تھیں۔

دیاز مائیک فرانسیسی فوج تین کالموں میں چلتی رہی لیکن اس کے بعد اس نے ہجوم کی صورت اختیار کر لی۔ اسکو سے رو، گلی کے بعد بیٹرنے پہلے پڑاؤ میں جس بد نظمی کی علامتیں دیکھی تھیں، وہ اب اپنی آخری حدوں کو چھو رہی تھی۔ جس سڑک کے ساتھ ساتھ وہ سفر کر رہے تھے، اس کے دونوں کناروں پر جگہ جگہ گھوڑوں کی لاشیں پڑی تھیں۔ فستہاں جوان، جو مختلف رجمنٹوں سے پھرنے لگے تھے اور پیچھے روئے تھے، مسلسل ادھر ادھر ہوتے رہے۔ کبھی وہ سفر کرتے کالم میں شامل ہو جاتے اور کبھی دوبارہ پیچھے رہ جاتے۔

سفر کے دوران میں خطرے کی علامت گھنٹیاں بجائی جاتی رہیں۔ حفاظت دہشت کے سپاہی اپنی دہشت بندوبست اٹھاتے، گولیاں چلاتے، پوری رفتار سے بھاگتے اور ایک دوسرے کو پاؤں سے پھل دیتے۔ اس کے بعد وہ پھر اکٹھے ہو جاتے اور ایک دوسرے سے گالی گلوچ کرنے لگتے کہ خواہ مخواہ خوف دہراں پھیلا رہا ہے۔

یہ تینوں یونٹ۔ گھوڑ سواروں کے ساز و سامان کے چمکڑے، قیدیوں کی جماعت اور جونو کا ہار برداری کا قافلہ۔ ابھی تک اکٹھے سفر کر رہے تھے مگر ہر گروپ کے کچھ نہ کچھ افراد متواتر غائب ہو رہے تھے اور ان کی تعداد تیزی سے کم ہوتی جا رہی تھی۔

جہاں تک گھوڑ سواروں کے ساز و سامان کے چمکڑوں کا تعلق ہے، ابتدا میں ان کی تعداد ایک سو بیس تھی۔ اب ان میں سے صرف ساٹھ رہ گئے تھے، باقی یا تو چھن چکے تھے یا پھر انھیں راستے میں ہی چھوڑ دیا گیا تھا۔ جونو کے بھی بعض چمکڑے یا تو پکڑے گئے تھے یا انھیں بھی پیچھے چھوڑنا پڑا۔ تین چمکڑوں پر مارشل داؤد کی کور سے بھاگے

ہوے سپاہیوں نے حملہ کر دیا اور انھیں بھگا کر لے گئے۔ جرمیوں کی باتوں سے میٹر کو معلوم ہوا کہ قیدیوں کی نسبت چھکڑوں کے اس قافلے کی حفاظت کے لیے زیادہ بڑی گارد لگائی گئی ہے اور یہ کہ ان کے ایک ساتھی جرمی سپاہی کو خود مارشل کے حکم پر گولی مار دی گئی تھی کیونکہ اس کا ایک نقری چچا اس شخص کے سامان سے برآمد ہوا تھا۔

ان دونوں یونٹوں کے مقابلے میں قیدیوں کی تعداد میں کہیں زیادہ کمی واقع ہوئی تھی۔ اسکو سے جو تین سو تیس افراد روانہ ہوئے تھے، اب ان میں سے سو سے بھی کم باقی رہ گئے تھے۔ حفاظتی دستے کے بے گھوڑ سواروں یا جونو کے سامان کی نسبت قیدیوں کا بوجھ زیادہ تکلیف دہ تھا۔ یہ بات تو ان کی سمجھ میں آتی تھی کہ کاٹھیاں یا جونو کے بچے کی نہ کسی کام آ سکتے ہیں لیکن یہ کہ سردی اور بھوک کے ستائے ہوئے سپاہی اپنے ہی جیسے سردی اور بھوک کے مارے ہوئے رومی قیدیوں پر، جن کی سردی سے قلعی جمتی جا رہی تھی اور جو چلتے چلتے سڑک پر گر پڑتے تھے (اس صورت میں انھیں حکم تھا کہ وہ انھیں گولی مار دیں)، پہرہ دیتے رہیں، حکام کا یہ رویہ نہ صرف ان کے لیے ناقابل فہم تھا بلکہ قابل فخر بھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ حفاظتی دستے کے فوجیوں کو یہ اندیشہ لاحق ہوئے گا ہے کہ وہ خود جن برے حالات میں سے گزر رہے ہیں، ان سے کہیں ان کے قلوب گداز نہ ہو جائیں اور وہ ان قیدیوں پر ترس نہ کھانے لگیں اور یوں اپنی ابتر حالت کو مزید ابتر بنالیں۔ چنانچہ وہ ان قیدیوں کے ساتھ زیادہ سے زیادہ سختی کرنے اور ان کے ساتھ بد مزاجی سے پیش آنے لگے۔

درد گویہ میں قافلے کے فوجی سپاہیوں نے قیدیوں کو تو اضمحل میں بند کر دیا اور خود اپنے ہی سامان رسد کو موٹے چل دیے۔ بعض قیدیوں نے دیوار کے نیچے سیندھ لگائی اور نکل بھاگے مگر پکڑے گئے اور انھیں گولی مار دی گئی۔ ماسکو سے روگنی پر افسروں کو باقی قیدیوں سے علیحدہ کر لیا گیا تھا لیکن یہ انتظام زیادہ دیر نہ چل سکا اور ختم کرنا پڑا۔ جو بیدل چل سکتے تھے، وہ سب اکٹھے چلتے تھے اور تیسری منزل کے بعد میٹر دوبارہ کاراٹامیف کے ساتھ چلا۔ کاراٹامیف کے ساتھ میٹر بھی ٹانگوں اور کاسی رنگت والی کتیا بھی تھی جس نے اسے اپنا لک منتخب کیا تھا۔

ماسکو سے کوچ کے تیسرے روز کاراٹامیف اس ہی میں مبتلا ہو گیا جس نے اسے ماسکو میں ہسپتال میں رکھا تھا۔ وہ جوں جوں کمزور ہوتا گیا، میٹر توں توں اس سے دور رہنے لگا۔ وہ ایسا کیوں کرتا تھا، اس کی وجہ تو اسے خود بھی معلوم نہیں تھی لیکن جب کاراٹامیف کی حالت خراب ہونے لگی، میٹر کو اس کے قریب جانے کے لیے ہوا پھارنا پڑتا تھا۔ تاہم جب وہ اس کے پاس جاتا بھی اور کاراٹامیف کی دھیمی دھیمی کراہیں، جو وہ پڑاؤں میں پڑے پڑے نکالتا رہتا تھا، اس کے کانوں میں پڑتیں اور اس کے جسم سے جو بو خارج ہوتی، اس کی ناک میں گھس جاتی وہ وہاں سے اٹھ جاتا اور اس کا خیال بھی اپنے دس میں نہلاتا۔

جب میٹر سائبان میں مقید تھا، اس نے اپنے دل سے نہیں بلکہ اپنے پورے وجود سے یہ بات سمجھی تھی کہ انسان مسرت کے لیے تخلیق کیا جاتا ہے، یہ مسرت اس کے اپنے اندر موجود ہوتی ہے اور انسان کی فطری ضروریات پوری ہونے پر حاصل ہو جاتی ہے اور یہ کہ ناخوشی کا باعث احتیاج نہیں بلکہ بہتات جتنی ہے۔ اور اپنے اس گزشتہ

تین ہفتوں کے سفر کے دوران میں اس پر ایک اور نئی اور تسکین بخش صداقت کا انکشاف ہوا تھا کہ دنیا میں کوئی بھی چیز ایسی نہیں جس سے آدمی کو خوف کھانے کی ضرورت ہو۔ اس نے یہ سیکھ لیا تھا کہ جس طرح کوئی صورت حال ایسی نہیں جس میں انسان خوش اور مطمئن آزاد رہ سکتا ہو، اسی طرح کوئی صورت حال ایسی نہیں جس میں اسے ناخوش یا آزاد رہنے کی ضرورت پیش آئے۔ اسے معلوم ہوا کہ مصائب اور آزادی کی اپنی حدود ہوتی ہیں اور یہ حدود بہت جلد آ جاتی ہیں۔ جو آدمی پھولوں کی بیج پر سوتا ہے، اگر ایک پتی بھی مسلی جائے تو اسے اتنی ہی تکلیف پہنچتی ہے جتنی کہ خود سے تنگی مرطوب زمین پر لیٹنے سے ہوتی ہے کہ ایک پہلو کو تو سردی لگ رہی ہے جب کہ دوسرے کو حرارت مل رہی ہے۔ گئے دنوں میں جب وہ تنگ جوتے پہن کر قہص کیا کرتا تھا تو بھی اس کی حالت اتنی ہی کرناک ہوئی تھی جتنی کہ اس وقت تھی جب اسے ننگے پاؤں چلنا پڑ رہا تھا (اس کے جوتے مدتوں پہلے ٹوٹ چکے تھے)، جن پر جگہ جگہ چھالے پڑے ہوئے تھے۔ اس پر یہ راز کھلا کہ جب اس نے اپنی بیوی سے شادی کی تھی (اس کا خیال تھا کہ اس نے یہ شادی اپنی مرضی سے کی تھی)، تب بھی وہ اسی طرح آزاد نہیں تھا جس طرح کہ وہ اب نہیں ہے جب سے رات کو اصطبل میں منقفل کر دیا جاتا ہے۔ ان تمام چیزوں میں سے، انھیں اس نے بعد میں اپنے مصائب کا نام دیا اور جن کا اس وقت اسے شاید ہی کبھی احساس ہو ہوگا، بدترین چیز یہ تھی کہ اس کے پاؤں ننگے تھے، زخمی ہو چکے تھے اور ان کی بوئیاں پھٹ گئی تھیں۔ (اسے گھوڑے کا گوشت لذیذ اور مقوی معلوم ہوتا تھا۔ وہ تنک کی بجائے جو روہ استعمال کرتے تھے، اس میں شورے کی بو بھی خوشگوار لگتی تھی۔ سردی بھی کڑا کے کی نہیں پڑ رہی تھی بلکہ دن کے وقت سفر کے دوران میں جسم ویسے ہی گرم رہتا تھا اور رات بھر لاد جلتے رہتے تھے۔ جوئیں اس کا خون ضرور پیتی تھیں لیکن وہ اس کے بدن کو حرارت پہنچانے میں مدد بھی دیتی تھیں۔) شروع شروع میں جو چیز اس کے بے برداشت کرنا دشوار تھی، وہ اس کے پاؤں کی حالت تھی۔

سفر کے دوسرے روز جیٹر جب لاد کی روشنی میں اپنے پاؤں کا جائزہ لے چکا، اسے خیال آیا کہ اس کے لیے شاید ایک قدم بھی اٹھنا دشوار ہوگا لیکن جب سب لوگ اٹھ کر کھڑے ہو گئے، وہ لنگڑا ہوا لنگڑا ہوا اس کے ساتھ چلنے لگا اور جب اس کا جسم گرم ہو گیا، اسے درد کا احساس بھی جا تا رہا۔ شام کو اس کے پاؤں کی حالت اور بھی ہست و خراب نظر آنے لگی۔ تاہم اب وہ انھیں دیکھنے سے گریز کرتا اور دوسری چیزوں کے بارے میں سوچنے لگا۔

انسان کے اندر زندہ رہنے اور مصائب کی بھٹی میں سے گزر کر بچ رہنے کی کتنی قوت ہے، اس کا اندازہ جیٹر کو صرف اب ہوا۔ اسے یہ بھی معلوم ہوا کہ انسان میں فطرتاً یہ صلاحیت موجود ہے کہ وہ اپنی توجہ ایک چیز سے دوسری چیز کی طرف منتقل کر کے بالکل اسی طرح اپنا تحفظ کر سکتا ہے جس طرح سیفٹی والو بالکر کرتا ہے کہ جوئی بھاپ (شیم) کا دباؤ خاص حد سے بڑھتا ہے، وہ فالتو بھاپ خارج کر دیتا ہے۔

جو تیزی پیچھے رہ جاتے تھے، انھیں کس طرح گوں مار کر ہلاک کر دیا جاتا تھا جیٹر نے اس قسم کی کوئی چیز نہ دیکھی اور نہ سنی حالانکہ ایک سو سے زیادہ افراد کو اسی طرح فنا کے گھاٹ اتارا جا چکا تھا۔ کارا تاہم روز بروز کمزور

سے کمزور تر ہوتا جا رہا تھا اور لاریب اس کا بھی یہی انجام ہونا تھا لیکن پیر اس کے بارے میں کبھی کچھ نہیں سوچتا تھا اور اپنے متعلق تو وہ اس سے بھی کم سوچتا تھا۔ اس کے حالات جتنے زیادہ سنگین اور مستقبل جتنا زیادہ بھیاںک ہوتا جا رہا تھا، اس کے ذہن میں جو خوش کن اور تسکین بخش خیالات، یادیں اور ٹھیلے آتے تھے، وہ اس کی موجودہ، بتر حالت سے اتنے ہی زیادہ ماورا ہوتے جا رہے تھے۔

13

بائیں تاریخ کو بوقت درپہر پیر اپنے پاؤں اور نامور زمین پر نظر میں جمائے گدلی اور پھسلواں سڑک پر چڑ پہاڑی پر چڑھ رہا تھا۔ کبھی کبھار وہ نگاہیں اٹھ کر جانے پہچانے ہجوم کو دیکھ لیتا، جو اس کی ذات کا اتنا ہی حصہ بن چکا تھا جتنے کہ اس کے پاؤں تھے۔ نیز مٹی ٹانگوں اور اوردی رنگت والی کتیا سڑک کے کنارے کنارے اچھلتی کودتی چلی آ رہی تھی۔ بعض دقات وہ اپنی پھرتی اور اطمینان کا ثبوت دینے کے لیے اپنی ایک پھپھلی ٹانگ اور اٹھالیتی اور تن ٹانگوں پر بھدکنے لگتی۔ اس کے بعد وہ دوبارہ چاروں ٹانگوں پر دوڑنا شروع کر دیتی اور ان کو وڈ پر، جو مردار و بچ رہے ہوتے، بھونکنے لگتی۔ بونی کتیا کی جلد اور بال ماسکو کی نسبت کہیں زیادہ چمکیلے ہو گئے تھے اور اس کے مزاج میں کہیں زیادہ شگفتگی آگئی تھی۔ چاروں اطراف مختلف حیوانات کی لاشیں پڑی تھیں۔ انسانوں سے لے کر گھوڑوں تک کی۔ جو کئے مڑنے کے مختلف مراحل سے گزر رہی تھیں۔ چونکہ انسانوں کی وجہ سے بھیڑیے قریب نہیں بھٹک سکتے تھے، کتیا پیٹ بھر کر کھا سکتی تھی۔

صبح سے بارش ہو رہی تھی، اور اگرچہ بظاہر یہی نظر آ رہا تھا کہ یہ کسی بھی وقت ختم سکتی ہے اور مطلع صاف ہو سکتا ہے لیکن مختصر وقفے کے بعد یہ پہلے کی نسبت زیادہ زوروں سے پڑنے لگی۔ تریتر سڑک مزید پانی جذب نہیں کر سکتی تھی اور اس کی لیکوں میں پانی ٹالوں کی طرح بہہ رہا تھا۔

پیر دائیں بائیں نظریں دوڑاتا، تین تین کر کے اپنے قدموں کو گستا اور، پنی انگلیوں پر ان کا حساب ملاتا چلا جا رہا تھا۔ وہ دس ہی دل میں ہ دلوں سے مخاطب ہوتا اور بار بار ان سے کہتا: ”ہر سو، اور ہر سو، جی بھر کر ہر سو!“ بظاہر وہ یہی سمجھ رہا تھا کہ وہ کچھ نہیں سوچ رہا لیکن اس کے باطن کی گہرائیوں میں اس کی روح کسی اہم اور تسکین بخش چیز کا تصور باندھ رہی تھی۔ یہ چیز انتہائی دقیق روحانی استخراج تھا اور یہ اس نے گزشتہ رات کا راتانیف کی گفتگو سے کیا تھا۔

گزشتہ رات پیر پڑاؤ میں اداؤ کے قریب بیٹھا تھا۔ آگ بجھنے اور پیر کو شند محسوس ہونے لگی تھی۔ وہ بچی جگہ سے اٹھا اور اگلے اداؤ کے پاس چلا گیا۔ وہاں ابھی تک آگ خوب بھڑک رہی تھی اور وہیں پلٹون کا راتانیف اپنے سر اور سارے جسم کو اپنے اوور کوٹ سے، جیسے یہ کوئی پادریوں کا چٹا ہو، ڈھانپنے بیٹھا تھا اور اپنی خوشگوار اور متاثر کن آواز میں، جو ضعف و نفاہت کی وجہ سے کمزور دنا تو اس ہو گئی تھی، قیدی سپاہیوں کو، یک کہانی سنا رہا تھا جو پیر

ازیں جیستر من چکا تھا۔ رات ڈھل چکی تھی اور یہ وہ سے تھا جب کارا تانیف کا بخار عام طور پر اتر چکا ہوتا تھا اور وہ خاص طور پر ہشاش بشاش نظر آنے لگتا تھا۔ جب میٹر آگ کے قریب پہنچا اور اس نے چاٹون کی کزور اور سرینہ آواز سنی اور اس کے رقت انگیز چہرے کو دیکھا جو آگ کی روشنی میں منور ہو گیا تھا۔ ایک لخت اس کے دل پر تیراگ۔ اس شخص پر اسے جو ترس آیا، اس نے خود اسے خوف میں مبتلا کر دیا اور عین ممکن ہے کہ وہ وہاں سے چھپت ہو جاتا لیکن پڑاؤ میں اور کوئی لڑ نہیں تھا۔ چنانچہ وہ وہیں بیٹھ گیا اور کوشش کرنے لگا کہ اس کی نظر چاٹون پر نہ پڑے۔

”اچھ، تمھاری طبیعت کیسی ہے؟“ اس نے پوچھا۔

”میری طبیعت کیسی ہے؟ اگر ہم بیماری پر جزبہ ہونے لگیں، خداوند ہمیں موت نہیں عطا کرے گا۔“ کارا تانیف نے کہا اور جھٹ پٹ اپنی کہانی، جو وہ سن رہا تھا، دوبارہ شروع کر دی۔

”چنانچہ، بھائی۔“ اس نے آغاز کیا۔ اس کے زرد اور مرل چہرے پر مسکراہٹ اور اس کی آنکھوں میں غصوں قسم کی پرستردہ تھی۔ ”چنانچہ، بھائی۔“

میٹر کو یہ کہانی خاصے عرصے سے معلوم تھی۔ کارا تانیف اسے کیلے کوئی نصف دو جن مرتبہ سنا چکا تھا اور وہ جب بھی یہ کہانی سنا تا تھا، بڑے جوشیلے اور جذباتی انداز سے سنا تا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ اسے اس کے سنانے میں خاص لطف محسوس ہو رہا ہے۔ کہانی سے اچھی طرح آگاہ ہونے کے باوجود میٹر اسے یوں سن رہا تھا جیسے یہ کوئی نئی چیز ہو اور اس کے سنانے کے دوران میں کارا تانیف کو جس پر سکون، بہت دسرت کا تجربہ ہو رہا تھا، وہ اپنے آپ میٹر کو منتقل ہو رہا تھا۔

یہ کہانی ایک بوڑھے سوداگر کی تھی۔ وہ اپنے خاندان کے ساتھ پارسانی اور خدا خونی کی زندگی بسر کر رہا تھا۔ ایک روز کرنا خدا کا کیا ہوا کہ وہ اپنے ایک دولت مند تاجر دوست کے ساتھ میلہ دیکھنے چلا گیا۔ ان دونوں نے ایک ہوٹل میں قیام کیا اور دونوں بستر استراحت پر دراز ہو گئے۔ اگلی صبح معلوم ہوا کہ دولت مند تاجر کا گلا کٹ چکا ہے اور اس کا روپیہ پیسہ لٹ چکا ہے۔ بوڑھے سوداگر کے بچے کے منچے سے اک خون آلود چھری برآمد ہوئی۔ اس پر مقدمہ چلایا گیا، اسے کوڑے لگائے گئے اور اس کے ننھے چیر دیے گئے۔ کارا تانیف کے الفاظ میں ”یہ سب کچھ قاعدے کے مطابق تھا۔“ اور اسے قید با مشقت کی سزا سنائی گئی۔

”چنانچہ، میرے بھائی،“ (میٹر کہانی کے اس مقام پر پہنچا تھا) ”دس یا دس سے زیادہ سال گزر گئے۔ بوڑھا آدمی قید با مشقت بھگت رہا ہے۔ وہ راضی برضا ہے۔ اور ہونا بھی یہی چاہیے۔ اور کبھی کوئی برکام نہیں کرتا۔ وہ خداوند سے صرف ایک ہی دعا کرتا ہے کہ وہ سے موت دے دے۔ خیر، ایک روز تمام قیدی ایک جگہ بیٹھے ہو جاتے ہیں، جیسا کہ ہم یہاں، بیٹھے بیٹھے ہیں۔ اس میں بوڑھا سوداگر بھی شامل ہے۔ وہ ایک دوسرے کے ساتھ باتیں کرنے لگتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ انھیں کس کس جرم کی سزا ملی ہے اور وہ خداوند کی نگاہوں میں کیوں گنہگار ہیں۔ ایک نے ایک آدمی کی اور دوسرے نے دو آدمیوں کی جان لی تھی، تیسرے نے ایک مکان کو آگ لگائی تھی جب کہ

ایک اور خالی خوں آوارہ گرد تھا اور اس نے کچھ بھی نہیں کیا تھا۔ بڑے میاں آپ نے کیا کیا تھا؟ وہ بوڑھے آدمی سے پوچھتے ہیں۔ آپ یہاں کیوں ہیں؟ میرے پیارے بھائیو، اس نے کہا، میں اپنے ورد و دوسرے کے گناہوں کی سزا بھگت رہا ہوں۔ مگر میں نے نہ تو کسی کی جان لی ہے اور نہ کسی کا دل لوٹا ہے۔ میں نے صرف ایک ضرورت مند بھائی کی مدد کرنے کی کوشش کی تھی۔ میرے بھائیو، میں سودا کرتا تھا اور میرے پاس خداوند کا دیا بہت کچھ تھا۔ اور اس پر جو کچھ بیتا تھا، وہ انھیں سب کچھ تفصیل سے بتانے لگا۔ جہاں تک میرا اپنا تعلق ہے، اس نے کہا، مجھے کی چیز کا ملال نہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ خداوند میرے نفس کو سدھارنا چاہتا تھا۔ مجھے صرف اپنی بوڑھی بیوی اور بچوں کا افسوس ہے۔ اور بوڑھے کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ اب ہوا یہ کہ جس شخص نے دوسرے سوداگر کو گھکانے لگا یا تھا، عین ان لوگوں کے بیچ میں تھا۔ بڑے میاں یہ کہاں کا واقعہ ہے؟ وہ پوچھتا ہے۔ کب اور کس صبح؟ اور اس نے اس کے متعلق ایک ایک بات تفصیل سے پوچھی۔ اس کے دل پر سخت جوت لگی۔ چنانچہ وہ اسی حالت میں بوڑھے کے قریب آیا۔ اور اس کے پاؤں پر گر پڑا! بڑے میاں، محض میری وجہ سے آپ کو یہ دکھ اٹھنا پڑا۔ میں سولہ آنے بیچ عرض کر رہا ہوں! آپ کو بالکل ناجائز مزاملی۔ دوستو، اس نے کہا، اس آدمی کو خواہ مخواہ ایذا نہیں دی جا رہی ہیں۔ یہ جرم میں نے کیا تھا۔ اس نے بوڑھے سے مخاطب ہو کر کہا۔ اور جب آپ سوائے پڑے تھے، میں نے چھری آپ کے بچے کے نیچے رکھ دی تھی۔ بڑے میاں، مجھے معاف کر دیں۔ اس نے گڑ گڑا کر کہا۔ میں یسوع مسیح کا واسطہ دیتا ہوں!“

کارا تانیف رک گیا۔ وہ مسکرا رہا تھا اور خوشی اس کی رگ رگ سے پھوٹ رہی تھی۔ اس نے اناؤ کی طرف بغور دیکھا اور لکڑیاں سیٹ دیں۔

”اور بوڑھے آدمی نے کہا، خداوند تمھیں معاف کر دے گا۔ اس کی نظروں میں ہم سب گنہگار ہیں اور میں اپنے گناہوں کی سزا بھگت رہا ہوں۔ اور وہ زار و قطار رونے لگا۔ خیر، میرے دوستو، تمھارا کیا خیال ہے؟“ کارا تانیف نے مزید کہا اور وجد آور مسرت سے اور بھی یوں کھل گیا جیسے کہاں کی ساری دلکشی اور اصل نکتہ اس بات میں مضمر تھا، جو وہ اب کہنے دار تھا۔ ”میرے دوستو، تمھارا کیا خیال ہے؟“ قاتل حکام کے پاس گیا اور اس نے ان کے سامنے اعتراف کیا: ”میرے ضمیر پر چھ انسانوں کے قتل کا بوجھ ہے۔“ (وہ بہت بڑا پاپی تھا۔) لیکن مجھے سب سے زیادہ افسوس اس ضعیف شخص کا ہوا ہے۔ اسے میری وجہ سے ناجائز مصائب برداشت نہ کر دیں۔ اس نے جو جو اعترافات کیے تھے وہ سب لکھ لیے گئے اور کاغذات مناسب طریقے سے حکام باپا کی خدمت میں بھیج دیے گئے۔ جہاں کاغذات بھیجے گئے تھے، وہ جگہ بہت دور تھی۔ چنانچہ کارروائی کے شروع ہونے میں یعنی کاغذات کی خانہ پرل میں حکام نے بہت زیادہ وقت صرف کر دیا، مگر آخر کار یہ زار تک پہنچ گئے۔ کچھ عرصے کے بعد زار کا فرماں آگیا ”سوداگر کو رہا کر دیا جائے اور اس کے لیے جو معاوضہ تجویز کیا گیا ہے، وہ اسے ادا کر دیا جائے۔“ کاغذات پہنچ گئے اور بوڑھے کی ڈھنڈیا پڑ گئی۔ بوڑھا کہاں ہے، وہی جو ناجائز اور خواہ مخواہ سزا بھگت رہا ہے؟ زار کا حکم آ گیا ہے۔

اور وہ سے تلاش کرتے رہے؟ "کارا تانیف کا جہز اکاٹھنے لگا۔ لیکن خداوند اسے پہلے ہی معاف کر چکا تھا۔ اور وہ اسے پیارا ہو چکا تھا۔ تو یہ ہوا، میرے پیارے دوستو "کارا تانیف نے اپنی بات ختم کرتے ہوئے کہا۔ وہ کافی دیر خاموش بیٹھا رہا اور مسکرا مسکرا کر اپنے سامنے ہنسنے لگا۔

اور بیٹر کے دل کا کنول کھل اٹھا لیکن یہ فی نفسہ کہانی کا اثر نہیں تھا بلکہ یہ کہانی کی پراسرار ہیبت اسے مٹاتے ہوئے کارا تانیف کا چہرہ جس پر وہ تار مسرت سے دھکنے لگا تھا، وہ اور اس کی اس مسرت کی باطنی معنویت تھی، جس نے اسے یہ خوشی عطا کی تھی۔

14

"A vos places" "آجائے آواز گونجی۔

قافلے کے فوجیوں اور قیدیوں میں مدوح پرورد ہچل بچل گئی، اور سب لوگوں کو قہقہہ بندھ گئی کہ کوئی شاہ انگیز اور پردقار چیز وقوع پذیر ہوا چاہتی ہے۔ چاروں طرف حکم کی آوازیں بلند ہونے لگیں اور بائیں جانب سے طرح دار وردیوں میں ملبوس سواروں کا جھنڈا قیدیوں کے گرد چکر کاٹتا اپنے عمدہ گھوڑے روڑا بنا خود را ہوا۔ اعلیٰ حکام کی آمد پر لوگوں پر کھنچاؤ کی جو کیفیت طاری ہو جاتی ہے، وہ یہاں بھی ہر چہرے پر دکھائی دے رہی تھی۔ قیدیوں کی بھیڑ ایک جگہ کٹھنی ہو گئی اور انھیں سڑک کے پار دھکیل دیا گیا۔ قافلے کے فوجیوں نے صفیں ترتیب دے لیں۔

"L'Empereur! L'Empereur! Le marechal de duc!"

طرح دار گھوڑ سوار ابھی بمشکل گزر رہے ہوں گے کہ ایک گاڑی، جسے چھ سوڑے گھوڑے کھینچ رہے تھے، کھڑکیوں سے نکل گئی۔ وینٹر کو ایک شخص کی، جس کے سر پر ٹکڑا بیٹ تھا اور جس کے بھرے بھرے خوبصورت سفید چہرے پر مہمانیت کھیل رہی تھی، جھلک نظر آئی۔ یہ کوئی، رشل تھا۔ جب اس کی نگاہیں وینٹر کے نو مند اور بادعجب جسم پر پڑیں، اس نے تیوریاں چڑھالیں اور منہ دوسری طرف پھیر لیا۔

وینٹر کو اس کی نظروں میں ہمدردی کے آثار دکھائی دیے لیکن اسے محسوس ہوا کہ وہ انھیں چھپاے کی کوشش کر رہا ہے۔

مار برداری کے، نیچر ج برنیل نے اپنے لاغر گھوڑے کو چابک رسید کیا اور گاڑی کے پیچھے پیچھے بھاگنے لگا۔ اس کے سرخ چہرے پر تردد کے آثار نمایاں تھے۔ متعدد افسران ٹولی بنا کر کھڑے ہو گئے اور ان کے ارد گرد فوجی سپاہیوں کی بھیڑ جمع ہو گئی۔ ہر شخص کے چہرے پر پہچانی کیفیت اور پریشانی ہو رہی تھی۔

"اس نے کیا کہا تھا؟ اس نے کیا کہا تھا؟" وینٹر نے انھیں ایک دوسرے سے پوچھتے سنا۔

مضمین بنانا۔

ابھر طور! مارشل اڈیوک!

جب مارشل گزر رہا تھا، تمام قیدی بے ترتیب ہجوم کی صورت میں اکٹھے ہو گئے تھے اور بیٹر کی نظر کارا تائیہ پر پڑ گئی تھی۔ اس نے اس صبح اسے نہیں دیکھا تھا۔ وہ اپنے پھوٹے دور کوٹ میں برج کے درخت کے ساتھ جگ لگائے بیٹھا تھا۔ اس کے چہرے پر ابھی تک وہی مسرت جھلک رہی تھی جو گزشتہ رات تاجر کی، جسے بے گناہ جھگڑا پڑی تھی، کہانی سنانے کے دوران میں وہاں رقص تھی لیکن اب وہ پروتار سکون سے دمک بھی رہا تھا۔ کارا تائیہ نے اپنی گول گول شفیق آنکھیں بیٹر کی طرف منتقل کر دیں۔ اب وہ اشکوں سے بریز تھیں۔ وہ لاریب بیٹر سے کچھ التجا کر رہی تھیں۔ بظاہر یوں معلوم ہوتا تھا کہ وہ بیٹر سے کچھ کہنا چاہتا ہے مگر بیٹر کو دوسوں نے گھیر لیا۔ وہ جھوٹ موٹ یوں ظاہر کرنے لگا جیسے اسے معلوم ہی نہ ہو سکا ہو کہ اس کی نگاہیں کیا کہہ رہی ہیں اور وہ جھٹ پٹ وہاں سے پرے ہٹسک گیا۔

جب قیدی دوبارہ روانہ ہوئے، بیٹر نے ایک بار پھر پیچھے مڑ کر دیکھا۔ کارا تائیہ ابھی تک سڑک کے کنارے برج کے درخت کے نیچے بیٹھا تھا۔ دوفرانسیسی اس کے بالکل قریب کھڑے تھے اور آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ بیٹر نے دوبارہ پیچھے مڑ کر نہ دیکھا اور لنگڑاٹا لنگڑاٹا پہاڑی پر چڑھنے لگا۔

عقب میں اس مقام سے، جہاں کارا تائیہ بیٹھا تھا، گولی چسنے کی آواز آئی۔ بیٹر نے اسے وضع طور پرنا لیکن عین اس لمحے اسے یاد آیا کہ اس نے ابھی تک یہ حساب نہیں لگایا کہ سولنک کتنی منازل دور ہے۔ اس نے یہ حساب مارشل کی آمد سے پہلے شروع کیا تھا۔ اس نے گنتی دو بارہ شروع کر دی۔ اتنے میں دوفرانسیسی، جن میں سے ایک کے ہاتھ میں سولنگ گن تھی، بیٹر کے قریب سے دوڑتے آگے نکل گئے۔ دونوں کے رنگ فق تھے۔ ان میں سے ایک نے ڈرتے ڈرتے بیٹر پر سرسری نگاہ ڈالی۔ وہ بیٹر کو اس کے چہرے پر اس سے ملتا جلتا نظر آیا جو اس نے مشکل میں نوجوان فوجی کے چہرے پر دیکھا تھا۔ بیٹر نے فوجی جوان کی طرف دیکھا اور اسے یاد آیا کہ یہ تو وہی شخص ہے جس نے دو روز پیشتر آگ پر اپنی قمیص خشک کرتے کرتے جھلس لی تھی اور انھوں نے بری طرح اس کا مذاق اڑا ہوا تھا۔ ان کے پیچھے، جہاں کارا تائیہ بیٹھا تھا، کتیا رقت انگیز آواز میں چیخنے چلنے لگی۔ ”حق کی بیٹی، یہ چلا کیوں رہی ہے؟“ بیٹر نے سوچا۔

اس کے ساتھی قیدیوں نے بھی، جو اس کے ساتھ ساتھ چل رہے تھے، اس کی طرح مڑ کر اس جگہ کی طرف جہاں گولی چلائی گئی تھی اور کتیا بھونک رہی تھی، دیکھنے سے احتراز کیا مگر ان سب کے چہرے گھبراہٹ سے تھے۔

گھڑ سواروں کے ساز و سامان سے لدے پھندے چھکڑے، مارشل کی بار برداری کی گاڑیاں اور تیدی شام شدہ گاؤں میں رک گئے۔ تمام لوگ الاؤں کے ارد گرد جمع ہو گئے۔ پیر آگ کے قریب چلا گیا۔ وہاں اس نے گھوڑے کا بھنا ہو کوشت کھایا اور آگ کی طرف پشت کر کے نیچے لیٹ گیا۔ چشم رون میں اسے قید آگئی۔

بالکل اسی طرح کی نیند تھی جیسی اسے بارود رینو کی لڑائی کے بعد موڈریک میں آئی تھی۔

ایک بار پھر حقیقی واقعات اس کے خوابوں میں گنڈ ہو گئے اور ایک بار پھر کوئی، وہ خود یا کوئی اور شخص اس کے خیالات و تصورات کو الفاظ کا جامہ پہنانے لگا۔ درحقیقت یہ وہی خیالات و تصورات تھے جو موڈریک میں اس کے ذہن میں دوڑتے تھے۔

”زندگی (ہی) سب کچھ ہے۔ زندگی خداوند ہے۔ ہر چیز تبدیل ہوتی، ورگے پچھے حرکت کرتی رہتی ہے اور یہ حرکت خداوند ہے اور جب تک زندگی ہے، الوہیت کے قوف میں راحت ہے۔ زندگی سے محبت کرنا خداوند سے محبت کرنا ہے۔ مشکل ترین اور بابرکت ترین کام اپنے مصائب، ناواسب مصائب، سکد وراں میں زندگی سے پیار کرنا ہے۔“

”کارا نامیف!“ میٹر کے ذہن میں آیا۔

اور، بکا ایکی اس کے سامنے مدتوں کافر اسوش کر دہ شریف النفس بوڑھا آدمی، جو سوئٹزر لینڈ میں اسے جغرافیہ کے اسباق دیا کرتا تھا، یوں آکھڑ ہوا جیسے وہ جیتا جاگتا انسان ہو۔ ”نمبروا“ پست قامت بوڑھے نے کہا اور اس نے میٹر کو گلوب (globe) دکھایا۔ یہ گلوب جیتے جاگتے اور تھر تھراتے گیند کی مانند تھا جس کی کوئی مستقل اہل نہیں ہوتی۔ اس کی ساری کی ساری سطح قہروں پر مشتمل تھی، جنہیں خوب اچھی طرح دبا کر یک جا کر دیا گیا تھا۔ یہ ظہرے ادھر ادھر متحرک تھے اور ایک دوسرے سے جگہیں تبدیل کر رہے تھے۔ اس میں سے بہت سے کبھی مل کر ایک ہو جاتے یا کبھی ایک پھٹ کر بہت سوں میں منقسم ہو جاتا۔ ہر قطرہ پھیلنے اور حتی الامکان زیادہ سے زیادہ جگہ گھیرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ تاہم دوسرے بھی اس سے پٹا نہیں رہنا چاہتے تھے، وہ بھی یہی جنگ دو کر رہے تھے۔ وہ اسے بھینچتے، بعض اوقات اسے غیبت و نابود کر دیتے اور بعض اوقات خود اس میں جذب ہو جاتے۔

”یہ زندگی ہے،“ بوڑھے استاد نے کہا۔

”دکتنی آسان اور واضح!“ میٹر نے سوچا۔ ”مجھے اس کا پہلے علم کیوں نہ ہوا؟“

”مرکز میں خداوند ہے، اور ہر قطرہ پھیلنے کی سعی کرتا ہے تاکہ وہ اسے (خداوند کو) انتہائی مکث حد تک منکسر کر سکے۔ اور یہ یڑھتا ہے، پھیلتا ہے، دوسروں میں جذب ہوتا ہے، سطح سے غائب ہو جاتا ہے، گہرائیوں میں ڈوبتا ہے اور دوبارہ نمودار ہو جاتا ہے۔ یہی کچھ کارا نامیف کے ساتھ ہوا۔ وہ پھیلا اور قہروں سے اوچھل ہو گیا۔ میرے بچے، تم سمجھ گئے نا؟“ استاد نے دریافت کیا۔

”سمجھ گئے؟ لعنت ہو تم پر!“ کوئی آد زگوخی اور میٹر کی آنکھ کھل گئی۔

اس نے اپنا سر اوپر اٹھایا اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔ ایک فرانیسی، جس نے ابھی بھی ایک روی سپاہی کو دھکیں کر پسے کر دیا تھا، باکڑوں بیٹھا گوشت کا پارچہ بھون رہا تھا، جو اس نے بندوق صاف کرنے والی سلاخ پر ٹانک رکھا تھا۔ اس نے اپنی آستینیں اوپر چڑھا رکھی تھیں اور اس کے سرخ نیسے ہاتھ، جن پر بائوں کی بہتات تھی، اپنی چھوٹی چھوٹی

انگلیوں کے ساتھ نہایت مشاتی سے سلاخ گھما پھرا رہے تھے۔ دہکتے ہوئے کوکوں کی روشنی میں اس کا سالواں، آزرده چہرہ، دوشمن آلود پیشانی صاف نظر آ رہی تھی۔

”اے کوئی فرق نہیں پڑتا!“ اس نے اچانک ایک سپاہی کی طرف، جو اس کے پیچھے کھڑا تھا متوجہ ہو کر کہا۔
”بد معاش، لیرے! دفع ہو جاؤ!“

سلاخ کو گھماتے پھرتے فرانسیسی نے بیئر کو آفسردہ نگاہوں سے دیکھا۔ بیئر نے منہ دوسری طرف پھیر لیا اور اندھیرے میں بھانکنے لگا۔ ایک رومی قیدی، وہی سپاہی جسے فرانسیسی نے پرے دھکیل دیا تھا، آگ کے قریب بیٹھا اپنے ہاتھ سے کوئی چیز تھپک رہا تھا۔ بیئر نے ذرا غور سے دیکھا۔ یہ اودی رنگت کی کتیا تھی، اور سپاہی اس کی دم ہلا جلا رہا تھا۔

”اے، یہ آگئی...“ بیئر نے کہا۔ ”اور پلاط۔“ اس نے کچھ کہنا چاہا لیکن وہ اپنی بات مکمل نہ کر سکا۔
ایکاکی یادیں، ہجوم در ہجوم اس کے ذہن میں کلہبانے اور آپس میں خطہ مسطہ ہونے لگیں۔ درخت کے نیچے بیٹھے پلاطون کا اسے دیکھنے کا انداز، اس جگہ سے گولی چلنے کی آواز، کتیا کا وادید، اس کے قریب بھاگتے ہوئے دو فرانسیسیوں کے مجرم چہرے، دھواں اگھلتی ہندوق، موجود پڑاؤ سے کاراٹا بیف کی غیر حاضری اور یہ امر کہ کاراٹا بیف ہلاک ہو چکا ہے، اس کے ذہن میں جانشیں ہوا چاہتا تھا کہ اسے معلوم نہ ہو سکا کہ کہاں سے ایک شام کی یاد جو اس نے کیف میں اپنے مکان کے برآمدے میں ایک خوب روپولستانی خاتون کے ساتھ گزری تھی، اس کے دماغ میں آگھسی، اور اس نے اس روز کے واقعات و تاثرات کا آپس میں تعقیق قائم کیے یا ان سے کوئی نتائج نہ کیے بغیر اپنی تنکھیں بند کر لیں اور موسم گرما کے وہابی مناظر، نہانے دھونے کے عمل اور اس، یہی تھر تھرنے گلوب کی یادوں میں گڈنڈ ہو گئے، اور وہ کسی بے جان شے کی طرح پانی میں غرق ہونے لگا یہاں تک کہ اس پانی نے اس کے سر کو پوری طرح اپنی لپیٹ میں لے لیا۔



طلوع آفتاب سے قبل شور و غل اور سنسنائی گولیوں کی آوازوں نے اسے جگا دیا۔ فرانسیسی سپاہی اس کے قریب سے آگے بھاگے جا رہے تھے۔

”قازق!“ ان میں سے ایک نے چد کر کہا اور ایک ٹاپے بھر دسیوں کے ہجوم نے بیئر کو گھیر لیا۔
کافی دیر تک اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ اس کے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ سے اپنے چاروں اطراف اپنے سانھی خوشی کے آنسو بہاتے اور سسکیاں بھرتے نظر آئے۔

”بھائیو، پیارو، دوستو!“ بوڑھے سپاہی قازقوں درہور اروں سے گلے مل رہے اور چلا چلا کر کہہ رہے تھے۔
قیدیوں کے درگردہ اور اروں اور قازقوں کا ہجوم اکٹھا ہو گیا۔ وہ والہانہ انداز سے انھیں ہوسات، بوٹ اور

ذیل روئیاں پیش کر رہے تھے۔ بیٹران کے مابین جیتھ آنسویہ تا در سکیاں بھرتا رہا۔ شدت جذبات سے اس کا گلہ رندھ چکا تھا اور اس کے منہ سے ایک لفظ بھی نہیں نکل رہا تھا۔ جو پہلا سپہی اس کے قریب آیا، وہ اس سے بغل گیر ہو گیا اور دو تے دو تے اس کا منہ جوڑنے لگا۔



دلوخوف زمیندار کے خستہ مکان کے گیٹ پر کھڑا رہا۔ اس نے غیر مسلح فرانسیسیوں کے ہجوم کو اپنے پاس سے گزرنے اور باہر نکل جانے دیا۔ جو کچھ ہوا تھا، اس نے فرانسیسیوں کو بیجان میں جلا کر دیا تھا اور وہ آپس میں زور شدہ باتیں کر رہے تھے۔ جب وہ دلوخوف کے، جو چھاننے سے اپنے ہاتھوں کی گرد جھاڑ رہا اور انھیں سرد ہر اور پھر لی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا، قریب سے گزرتے، انھیں اس کی نگاہوں میں امید کی کوئی کرن نظر نہ آئی اور وہ خاموشی اختیار کر لیتے۔ دلوخوف کا ایک قازق دوسری طرف کھڑا تھا۔ وہ تیل یوں کی گنتی کر رہا تھا۔ جب سینکڑا پورا ہو جاتا، وہ چاک سے گیٹ پر نشان لگا دیتا۔

”کتنے؟“ دلوخوف نے پوچھا۔

”دوسرا سینکڑا چار ہا ہے۔“ اس نے جواب دیا۔

”Filez, filez!“ دلوخوف کہے جا رہا تھا (اس نے یہ لفظ فرانسیسیوں سے سیکھا تھا) اور جب اس کی نگاہیں فرانسیسی کی نگاہوں سے چار ہوتیں، ان میں سفاکی جھلکنے لگتی۔

دینی سوف، جس کا سرنگا در چہرہ انسرہ تھا، قازقوں کے، جو پیارستوف کی لاش اٹھائے جا رہے تھے، پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔ قازقوں نے باغیچے میں گڑھا کھود لیا تھا اور اب ان کا رخ اسی کی جانب تھا۔

16

28 اکتوبر سے پامایڈ نے لگا اور اس دن سے فرانسیسیوں کے فرارے اور بھی الم ناگ صورت اختیار کر لی۔ دیاتو کٹاکے کی سردی کے ہاتھوں لٹا ہو رہے تھے یا پڑاؤوں میں الاؤوں کے قریب بیٹھ بیٹھ کر اپنے آپ کو بھون اور ہاک کر رہے تھے، جب کہ گاڑیاں، جنھیں سموری لہادوں میں مستور کو چوان چلا رہے تھے، اسی طور پر بادشاہوں اور ڈیوکوں کا مال غنیمت لادے ان سے آگے نکلتی جا رہی تھیں، تاہم فرانسیسی فوج کے فرار اور انتشار کا جو عمل ماسکو سے بوقت رو، لگی شروع ہوا تھا، وہ اصل اس طرح جاری رہا۔

ماسکو سے ویا زنا پہنچتے پہنچتے 73 ہزار افراد پر مشتمل فرانسیسی فوج کی (ان میں گارڈز شامل نہیں۔ انھوں نے ساری جنگ کے دوران میں لوٹ مار کے علاوہ اور کوئی کام نہیں کیا تھا۔) نفرتی کھینٹے کھینٹے صرف چھتیس ہزار رہ گئی حالانکہ مختلف

لڑائیوں میں جواشخاص ہلاک ہوئے تھے، ان کی تعداد پانچ ہزار سے زیادہ نہیں بنتی تھی۔ اگر اس کو تدریجی عمل کا ابتدائی مرحلہ تصور کر لیا جائے، پھر اس کے بعد درجہ وار جو کچھ ہوا، اس کا ریاضیاتی اعتبار سے بالکل صحیح صحیح انداز لگایا جاسکتا ہے۔ سروی کی شدت کی کمی بیشی، ردیوں کے تعاقب، سڑکوں کی رکاوٹوں یا کسی بھی دوسری بیان کردہ صورت حال سے قطع نظر، اسکو سے ویا زما، ویا زما سے سمولنسک، سمولنسک سے بیریزینا اور بیریزینا سے الٹا سٹاک فرانسیسی سپاہ اسی نسبت سے گھٹتی اور تباہ ہوتی رہی۔ بجائے اس کے کہ فرانسیسی فوج ویا زما سے آگے بھی تین ہی کامیوں میں سفر کرتی، اس کی ساری نفری آپس میں خلط مدط ہو گئی، وراں نے هجوم کی صورت اختیار کر لی، اور آخر تک اس کی یہی کیفیت رہی۔ اس سلسلے میں سچائی نے اپنے اپسر اطور کو مندرجہ ذیل رپورٹ ارسال کی (ویسے ہمیں معلوم ہے کہ جب کمانڈنگ افسران فوج کی حالت بیان کرتے ہیں، وہ کس طرح سچائی سے انحراف کرتے ہیں):

گزشتہ دو تین دنوں کے سفر کے مختلف مراحل کے دوران میں مجھے مختلف گوروں کی حالت کا مشاہدہ کرنے کا موقع ملا ہے۔ میں نے جو کچھ دیکھا ہے، اس کی یور میجسٹی گور پورٹ پیش کرنا پتا فرض گردانتا ہوں۔ تقریباً ساری کی ساری سپاہ انتشار و ربدنگی کا شکار ہو چکی ہے۔ قریب قریب ہر رجمنٹ کی یہ کیفیت ہے کہ اس کی صرف جو تھائی نفری اپنے پرچم تلے سز کر رہی ہے۔ جہاں تک باقی افراد کا تعلق ہے، وہ خود ک تلاش کرنے کی امید میں اور نظم و ضبط کی پابندیوں سے بچنے کے خیال سے جدھر منہ اٹھاتے ہیں، چل پڑتے ہیں۔ عام طور پر ان سب کا یہ خیال ہے کہ سمولنسک ایک ایسا مقام ہے جہاں انھیں سنبھال لیا جاسکتا ہے۔ گزشتہ چند دنوں کے دوران میں متعدد جوانوں کو اپنے ہتھیار اور کارتوس پھینکتے دیکھا گیا ہے۔ یور میجسٹی بالآخر کیا کرنا پسند کریں گے، اس سے قطع نظر یور میجسٹی کی سپاہ کے حالات صرف اسی صورت میں بہتر بنائے جاسکتے ہیں کہ تمام فوج کو سمولنسک میں اکٹھا کر لیا جائے۔ اور وہاں اولین اقدام یہ کیا جائے کہ گھوڑوں کے بغیر گھڑ سوار دستوں، غیر ضروری مال و اسباب، توپ خانے کے سامان، جو موجودہ لشکر کی ضروریات سے کہیں زیادہ ہے، اور اس قسم کی دوسری اشیاء سے چھٹکارا حاصل کیا جائے۔ بھوک اور تھکاوٹ نے جوانوں کا کچھ مر نکال دیا ہے۔ اور انھیں محض چند روز کے آرام ہی کی نہیں، بلکہ جسم و جاں کا رشتہ برقرار رکھنے کے لیے، خوراک کی بھی (اشد) ضرورت ہے۔ ان گزشتہ چند ایام کے دوران میں بے شمار اشخاص سڑکوں پر پڑاؤں میں موت سے ہم غم غم ہو چکے ہیں۔ حالات روز بروز مسلسل بدستہ بدتر ہوتے جا رہے ہیں اور اندیشہ لاحق ہونے لگا ہے کہ اگر ان کی اصلاح کی کوئی سبیل نہ کی گئی، پھر لڑائی کی صورت میں ہم اپنی سپاہ کو کنٹرول نہیں کر سکیں گے۔

فرانسیسی گرتے پڑتے جب اپنے خوابوں کی موعودہ سرزمین، سمولنسک پہنچے، وہ خوراک کے حصول کے لیے ایک دوسرے کو موت کے گھاٹ اتارنے اور اپنی ہی رسد کو لوٹنے لگے۔ اور جب سب کچھ لٹ پٹ چکا، وہ مزید آگے بھاگنے لگے۔

وہ آگے جاتے رہے تھے۔ لیکن انھیں یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ کہاں اور کیوں جا رہے ہیں۔ اور اس نامعلوم زمین کو تو بالکل معلوم نہیں تھا کہ وہ ایسا کیوں کر رہے ہیں کیونکہ اسے حکم دینے والا کوئی نہیں تھا۔ تاہم اس کی اور اس کے حواریوں کی عادات میں سرسوفرق نہ آیا وہ بدستور احکام، مراسلے، رپورٹیں اور فرمان دے کر ہم تحریر کرتے رہے، ایک دوسرے سے *Prince d'Eckmuhl, mon cousins sire roi de Naples* جیسے القابات و خطابات سے مخاطب ہوتے اور اس قسم کی دوسری باریکیوں میں الجھے رہے۔ لیکن یہ احکام اور رپورٹیں محض کاغذی کارروائیاں تھیں، ان پر عمل کوئی نہیں کرتا تھا کیونکہ انھیں عملی جامہ پہنا یا ہی نہیں جاسکتا تھا۔ اور اگرچہ وہ ایک دوسرے کو سمجھتی، ہائی نس، کزن وغیرہ کہتے رہتے تھے، وہ بھی محسوس کر رہے تھے کہ وہ بد بخت اور قابل نفرت لوگ ہیں کیونکہ وہ بے شمار برائیوں کے مرتکب ہوئے ہیں اور اب اپنے کیے کا پھل پارہے ہیں۔ فوج کے بارے میں اپنی جھوٹ موت کی تشویش کے باوجود ہر شخص صرف اپنی ذات کے متعلق سوچ رہا تھا۔ کہ ہمارے اپنے آپ کو جلد از جلد کیسے نکالیں، اور بچے یا جاسکتا ہے۔

17

ماسکو سے دریائے سیمن تک پسپائی کے دور میں فرانسیسی اور روسی فوجوں کی نقل و حرکت آنکھ بھولی کے (روسی) کھیل سے مشابہ تھی۔ اس کھیل میں ہوتا یہ ہے کہ دو کھلاڑیوں کی آنکھوں پر پٹیاں باندھ دی جاتی ہیں۔ ان میں سے ایک کبھی کبھار گھٹی بچا دیتا ہے تاکہ دوسرے کو اس کا پتا نشان معلوم ہو جائے۔ شروع شروع میں وہ یہ گھٹی بے دھڑک بجاتا رہتا ہے، لیکن جب وہ مشکل میں پھنس جاتا ہے، پھر وہ چپکے سے اوہرا دھڑکنے کی کوشش کرتا ہے اور اکثر اوقات جب وہ یہ سمجھ رہا ہوتا ہے کہ وہ حریف کے قابو میں آنے سے بچا گیا ہے، وہ دوڑتا دوڑتا میدان اس کے بازوؤں میں آگرتا ہے۔

ابتداء میں جب فرانسیسی فوج ابھی کا لوگاروڈ کے آس پاس تھی، وہ ہانگ دہل چلتی رہی، لیکن بعد ازاں جب اس نے سمولنسک روڈ پر سفر شروع کیا، اس نے اپنی گھٹی کا فلن کس کر پکڑ لیا اور کثرت اوقات جب وہ یہ سمجھنے لگی تھی کہ وہ بچ نکلنے میں کامیاب ہو رہی ہے، وہ میدان میں روکے پاس سے ٹکرا جاتی۔

فرانسیسی جس تیزی سے بھاگے جا رہے تھے اور روسی جس عجلت سے ان کا تعاقب کر رہے تھے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ گھوڑے ٹڈھال ہو گئے۔ چنانچہ دشمن کے ٹھور ٹھکانے کے متعلق معلومات حاصل کرنے کی غرض سے جو اصل

دریچہ۔ گھڑسواروں کی رکی۔ کام آتا ہے، وہ دستیاب نہ رہا۔ مزید برآں دونوں افواج جس توڑ اور سرعت سے اپنی پوزیشنیں تبدیل کرتی رہیں، اس کا انجیم یہ ہوا کہ جو معلومات حاصل ہوئیں، وہ ہمیشہ بعد از وقت ثابت ہوئیں۔ اگر ایک روز یہ اطلاع ملتی کہ کل دشمن قلعہ مقام پر دیکھا گیا ہے، تو تیسرے دن، جب اس اطلاع پر عمل ہو سکتا تھا، معلوم ہوتا کہ وہ دو دن کے فاصلے پر حریہ آگے نکل گیا ہے اور اب بالکل مختلف مقام پر پہنچ گیا ہے۔

ایک فوج بھاگ رہی تھی اور دوسری اس کا تعقب کر رہی تھی۔ سمولسک سے آگے فرانسیسیوں کے سامنے متحدہ سرزمین موجود تھیں۔ آدمی کو خیال آتا ہے کہ اپنے چار روزہ قیام کے دوران میں انھوں نے غنیمت کا ناچ معلوم کر لیا ہوگا، کوئی سودمند منصوبہ وضع کر لیا ہوگا اور کوئی نئی بات سوچ لی ہوگی۔ لیکن چار دن کے آرام کے بعد کسی قسم کی چال تدبیر یا منصوبے کے بغیر بھڑد بارہ پٹے پٹے راستے پر دوڑنے لگی۔ انھوں نے دائیں دیکھا نہ بائیں، بلکہ قدیم ترین۔ اور بدترین۔ شہراہ پر، جو کراستایا در اور شاہیں سے گزرتی ہے، ہو لیے۔

فرانسیسیوں کو توقع تھی کہ دشمن سامنے سے نہیں، بلکہ عقب سے حملہ کرے گا، چنانچہ انھوں نے اپنی پسائی کی رفتار مزید تیز کر دی۔ اس کوشش میں کچھ گروہ بہت آگے نکل گئے اور کچھ خاص پیچھے رہ گئے۔ یوں مختلف گروہوں کے مابین فاصلہ بڑھنے لگا اور بڑھتے بڑھتے چوبیس گھنٹے تک پھیل گیا۔ سب سے آگے اسپر طور، اس کے پیچھے (مختلف محروسہ ممالک کے) بادشاہ اور ان کے پیچھے ڈیوک تھے۔ روسی فوج کا خیال تھا کہ نیولین دریائے دنیپر عبور کرنے کے بعد دائیں طرف مڑ جائے گا۔ اور اس کے لیے واحد معقول راستہ بھی یہی تھا، چنانچہ وہ خود دائیں طرف مڑ گئی اور کراستایا کے قریب شاہراہ پر چڑھ گئی۔ وہ یہاں آنکھ پھولی کے کھیل کی طرح فرانسیسیوں کی ہمارے ہر اہل دستوں سے ٹکھ بھڑ ہو گئی۔ فرانسیسیوں کو جب یوں غیر متوقع طور پر دشمن کا سامنا کرنا پڑا، ان کی مت ماری گئی۔ اور وہ جہاں تھے، خوف و ہراس کے عالم میں وہیں رک گئے۔ اس کے بعد وہ دوبارہ بھاگنے لگے لیکن اپنے ان ساتھیوں کو، جو عقب میں تھے، دشمن کے رحم و کرم پر چھوڑ گئے۔ تیس دن تک فرانسیسی فوج کی مختلف ٹکڑیاں۔ پہلے وائسرائے (موغا)، پھر داؤد اور اس کے بعد نے (Ney) کے دستے۔ لگ انگ روسی فوج سے متصادم ہوتی رہیں۔ ان سب نے ایک دوسرے کا ساتھ چھوڑا، اپنے سامان اور توپ خانوں سے ہاتھ اٹھایا، اپنے نصف آدمیوں سے منہ موڑا اور دم دبا کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ روسیوں سے بچنے کے لیے وہ نیم دائرہ بناتے دائیں طرف مڑے اور صرف راتوں کو سفر کرنے لگے۔

نے سب سے آخر میں تھا۔ وہ اس لیے پیچھے رہ گیا تھا کیونکہ وہ بارڈر سے سمولسک کی فصیلیں گزر رہا تھا۔ (فصیلیں کسی کا کچھ نہیں بگاڑ رہی تھیں اور نہ کسی کے راستے میں مزاحمت تھیں۔ فرانسیسیوں کی اپنی حالت خاصی خستہ خراب تھی۔ اس کے باوجود یا اس کی وجہ سے وہ اس فرس کو، جسے انھوں نے خود نقصان پہنچایا تھا، سزا دینا چاہتے تھے۔) نیولین سے وہ اور شاہین پہنچ کر ملا۔ اس کی کورس ہزار افراد پر مشتمل تھی لیکن کراستایا کی جھڑپ کے بعد اس کے ساتھ صرف ایک ہزار اشخاص رہ گئے۔ وہ باقی نفری اور توپیں وہیں چھوڑ آیا، چوری چھپے راتوں کو سفر کرتا رہا اور اس

نے دریائے دینیپر ایک ایسے مقام سے عبور کیا جہاں جنگل خاصا گھنا تھا۔

اور شاہ انھوں نے ولنا کا رخ کیا۔ متعاقب سپاہ کے ساتھ ان کا ابھی تک آنکھ پھولی کا ٹھیلہ باری تھا۔ جب وہ دریائے بیرینا کے کنارے پہنچے، وہ ایک بار پھر ژولیدہ لکری کا شکار ہو گئے۔ بہت سے دریائیں ڈوب گئے۔ بہت سوں نے ہتھیار ڈال دیے لیکن جو دریا عبور کرنے میں کامیاب ہو گئے، وہ تیزی سے اگے بھاگتے رہے۔ ان کے سپریم کمانڈر نے سواری کوٹ پہنا، سچ پر سوار ہوا اور اپنے ساتھیوں کو چھوڑ چھاڑ کر، کیا ہی ہوا ہو گیا۔ باقیوں میں سے جو بھاگ سکتے تھے، بھاگ گئے، جن میں بہت نہیں رہی تھی، انھوں نے یا تو ہتھیار ڈال دیے یا سرکھپ گئے۔

18

مہم کا یہ حصہ فرانسیسیوں کے فرار پر مشتمل ہے۔ اس کے دوران میں انھوں نے اپنے آپ کو نشت و ہود کرنے کے لیے وہ سب کچھ کیا جو ان کے بس میں تھا۔ اس تاریخ سے، جب انھوں نے کاوگا روڈ پر سفر کا آغاز کیا، اس تاریخ تک، جب ان کا قافلہ انھیں چھوڑ چھاڑ کر بھاگ گیا، اس بے ترتیب جھوم کی ایک بھی نقل و حرکت ایسی نہیں ہے جو سمجھ میں آتی ہو۔ چنانچہ آدمی کو خیال آتا ہے کہ ان مورخین کو، جو انہوں کے افعال کو فرد واحد کی مرضی کا نتیجہ قرار دیتے ہیں، مہم کے اس دور میں اپنا نظریہ منطبق کرنا ناممکن معلوم ہوا ہوگا۔ لیکن نہیں۔ مورخین نے اس مہم کے بارے میں کتابوں کا پھاڑ بٹا رہا ہے۔ ان سب میں ہمیں یہ بتایا گیا ہے کہ نیولین نے فوج کی کیسے تقسیم و ترتیب کی، کیسی کیسی چالیں چلیں، فوج کی رہنمائی کے لیے کیسے کیسے منصوبے وضع کیے اور، دشمنوں نے کس نوعیت کی عسکری عبقریت کا مظاہرہ کیا۔ نیولین نے جب دلا یا دوسروں سے پسپائی کا آغاز کیا، اسے ایک ایسی سڑک تک رسائی حاصل تھی، جو ایک ایسے علاقے سے گزرتی تھی جہاں رسد بکثرت دستیاب تھی اور اس کی متوازی شاہراہ تک، جس پر بعد ازاں کوئزوف نے اس کا تعاقب کیا۔ اس کی یہ پسپائی قطعی غیر ضروری تھی اور اس نے اس کے لیے جو سڑک منتخب کی، وہ بالکل تباہ و برباد ہو چکی تھی۔ تاہم ہمیں یہ سمجھایا جاتا ہے کہ پسپائی اور شاہراہ کا انتخاب دونوں گہری سوچ و بچہ کا نتیجہ تھے۔ سولنسک سے اور شاہ تک اس کی پسپائی کے پیچھے بھی اسی قسم کے عسقی غور و فکر کا ذکر کیا جاتا ہے۔ پھر کہ سنیا میں اس کی رستی کی دوستان بیان کی جاتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ وہاں وہ نیم سے نیچے لڑنے اور ذاتی طور پر کمان سنبھالنے کے لیے تیار تھا۔ اس نے برج کی چھتری پکڑ لی اور اعلان کیا:

"J'ai assez fait l'empereur, il est temps de faire le general."

اس نے یہ الفاظ کہے، فوج کو، جو مختلف ٹکڑیوں میں بٹ چکی تھی، مقدر کے حوالے کیا اور خود بلا توقف سر پر

پاؤں رکھ کر بھاگ کھڑا ہوا۔

"امپراطور کی حیثیت سے تو میں خاصے طویل سے لڑائیں سرانجام دے رہا ہوں۔ اب وقت آ گیا ہے کہ میں جرنیل بن کر بھی دکھائوں۔"

پھر ہمیں مارشلوں، بالخصوص (Ney) کے حوصے، جرأت و رعالی ظرفی کی داستان سنائی جاتی ہے۔ اس کی عالی ظرفی یہ تھی کہ اس نے اپنے پرچم، توپ خانہ اور نوے فیصد لشکری پیچھے چھوڑے اور خود راتوں کو جنگوں میں مل کھاتے راستوں پر چلتا اور چوری چھپے دریائے ڈینیپر عبور کرتا اور شاہاگ گیا۔

اور اس سلسلے میں آخری بات یہ ہے کہ یہ عظیم امپراطور اپنی دیر فوج کو بیچ مندر حار میں چھوڑ کر قطعی طور پر رار ہو گیا، لیکن مورخین اس کے اس فعل کو بھی عظیم کارنامہ اور بقریت کا شاہ کار بنا کر پیش کرتے ہیں۔ اس کا یہ قطعی گزار بھی، جسے عام زبان میں پرلے درجے کی ذلت کہا جائے گا، مورخین کی نگاہ میں حق بجانب ٹھہرتا ہے۔

جب تاریخی استدلال کے چک دار دھماگوں کو مزید کھینچنا ممکن نہیں رہتا، مورخین کسی نہ کسی طرح ان افعال پر بھی، جو ان چیزوں کے جنہیں بنی نوع انسان سمجھتا ہے، اور منصفانہ بھی، قرار دیتے ہیں، قطعی متفرد ہوتے ہیں، "عظمت" کا نشان ثبت کر دیتے ہیں کیونکہ "عظیم" کبھی خوار کار نہیں ہوتا، انتہائی مہلک غلطی کے لیے بھی اسے تصور دار نہیں ٹھہرانا چاہیے۔

"C'est grand!" مورخین فیصلہ سنا دیتے ہیں اور اس کے ساتھ ہی نیکی اور بدی کا وجود ختم ہو جاتا ہے، صوف "grand" اور "pas grand" باقی رہ جاتے ہیں۔ grand نیک ہے اور pas grand بد۔ ان کی سمجھ بوجھ کے مطابق grand بعض مخصوص قسم کے چوپایوں کی خصوصیت ہے جنہیں وہ "ہیرڈ" کا نام دیتے ہیں۔ جب نیدلین گرم سواری کوٹ پہن کر گزار ہو کر گھر پہنچ جاتا ہے اور اپنے رفقا اور دوسرے لوگوں کو جنہیں وہ (اپنی دانست میں) خود وہاں لایا تھا، نیست و نابود ہونے کے لیے چھوڑ دیتا ہے، اپنے اس فعل کو وہ "que c'est grand" گردانتا ہے اور اس کی آتما شانت ہو جاتی ہے۔

"Du sublime au ridicule il n'y a qu'un pas."

وہ کہا کرتا تھا (وہ اپنے آپ کو جلیل تصور کرتا تھا۔) اور پورے پچاس سال سے پوری دنیا یہی جگالی کے

جاری ہے:

"Sublime! Grand! Napoleon le Grand!"

Du sublime au ridicule il n'y a qu'un pas!

اور کسی اللہ کے بندے کو بھونے سے بھی یہ خیال نہیں آتا کہ اس عظمت کو، جو راستی اور ناراستی کے پیمانے پر پورا نہیں اترتی، تسلیم کرنا یا اعتراف کرنے کے برابر ہے کہ آپ خود لاتے ہیں اور بے پناہ حد تک گھٹیا اور اذول ہیں۔

وہ عظیم ہے۔

وہ عظیم۔

وہ عظیم کارنامہ تھا۔

From the sublime to the ridiculous there is only one step. جلیل اور مضحک کے مابین صرف ایک قدم

کا فاصلہ ہوتا ہے۔

۱۷۔ اے اے جنہیں یسوع نے نیکی اور بدی کا معیار فراہم کر دیا ہے، دنیا کی کوئی چیز بھی ایسی نہیں جس کے لیے ہمارے پاس پینا نہ ہو اور جہاں سادگی، نیکی و صداقت عدم موجود ہوں، وہاں عظمت بھی موجود نہیں ہو سکتی۔

19

وہ کون سا روسی ہے جسے 1812 کی مہم کے آخری دور کی روداد پڑھے کے بعد تاسف، عدم اطمینان اور پریشان کے ہاؤنگلو اور احساس کا تجربہ نہیں ہوا ہوگا؟ کون ہے جس نے اپنے آپ سے یہ نہیں پوچھا، جب ہماری تیوں انواج کو عددی برتری حاصل تھی اور انھوں نے فرانسیسیوں کو گھیرے میں لے لیا تھا، جب بے ترتیب، فائدہ کٹ اور ناپست فرانسیسی ہجوم اور درہجوم تھیا رڈال رہے تھے اور جب (جیسا کہ مورخین ہمیں بتاتے ہیں) روسیوں کا مقصدی فرانسیسیوں کو روکنا، ان کے نرار کے راستے منقطع کرنا اور ان سب کو زیرِ حراست لینا تھا، پھر ان سب کو پکڑنا میامیٹ کیوں نہ کیا گیا؟

روسی فوج نے عددی کمتری کے باوجود، رودینو میں فرانسیسیوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا تھا لیکن جب فرانسیسیوں کو پکڑنا اس کا مقصد قرار پایا اور وہ انھیں تین اطراف سے اپنے گھیرے میں لے چکی، پھر وہ پناستھ حاصل کرنے میں کیوں ناکام رہی؟ کیا فرانسیسی ہم سے اتنا ہی زیادہ برتر تھے کہ ہماری سپاہ، جو تعداد اور وصلے کے اعتبار سے ان سے کہیں بہتر حالت میں تھی، انھیں شکست دے نہ سکی؟ ایسا کیوں ہوا اور کیسے ہوا؟

تاریخ (یا اس نام سے جو چیز بھی منسوب ہے) ان سوالات کے جواب میں کہتی ہے کہ اس کی وجہ یہ تھی کہ کوٹوزوف، تراسوف، چگاگوف یا فلاں فلاں جرنیل فلاں فلاں چال چلنے میں ناکام رہے۔

لیکن انھوں نے یہ چالیں کیوں نہ چلیں؟ اگر وہ پہلے سے طے شدہ منصوبے پر عمل کرنے میں ناکام رہے، ان پر مقامات کیوں نہ چلائے گئے، اور انھیں سزائیں کیوں نہ دی گئیں؟ تاہم اگر ہم یہ تسلیم کر بھی لیں کہ کوٹوزوف، چگاگوف اور دیگر شخصیات روسی ناکامیوں کے ذمہ دار تھے، پھر بھی یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ جب کرانایا اور بیریزیا دونوں مقامات پر ہمیں عددی برتری حاصل تھی، فرانسیسی فوج اپنے امپراطور، بادشاہوں اور بادشاہوں سمیت پکڑی کیوں نہ گئی حالانکہ روسیوں کا مقصد ہی یہی تھا؟

روسی عسکری مصنفین اس عجیب و غریب صورت حال کی وضاحت بدیں الفاظ کرتے ہیں، "اس کا سبب یہ تھا کہ کوٹوزوف نے جارجیہ کا رودائی کرنے کی ممانعت کر دی تھی۔" ان کا یہ دعویٰ بالکل لاجینی اور بے نکاہے کیونکہ ہمیں معلوم ہے کہ کوٹوزوف دیار ما اور تاروتیو کے مقامات پر پہنچنے کو جسے کرنے سے روک نہیں سکا تھا۔

روسی فوج جس نے کم تر تعداد کے باوجود بارودینو میں دشمن کا، جب وہ اپنی قوت اور وسائل کے ساتھ میدان میں اتر ا تھا، پھر کس نکال دیا تھا۔ پھر اس نے کرانایا اور بیریزیا میں اپنی برتر تعداد کے باوجود فرانسیسیوں کے غیر منظم ہجوموں سے کیوں شکست کھائی؟²²

اگر روسیوں کا مقصد نیپولین وراس کے مارشلوں (کے راستے) کا انقطاع کرنا اور انھیں گرفتار کرنا تھا۔ اور یہ مقصد نہ صرف ناکام بنا دیا گیا بلکہ اس کے حصول کی تمام کوششوں پر بڑے توہین آمیز انداز سے پانی بھردیا گیا۔ پھر ہم کے اس دور کو اگر فرانسیسی اپنی فتوحات کا سلسلہ بنا کر پیش کرتے ہیں، تو وہ ٹھیک ہی کرتے ہیں اور وہی مورخین کا یہ دعویٰ کہ اس دور میں کامرانیاں ہمارے حصے میں آئی تھیں، غلط ٹھہرتا ہے۔

روی عسکری مصنفین جہاں تک منطقی تقاضوں کا ساتھ دے سکتے ہیں، ان نتائج کو تسلیم کر لیتے ہیں، اور وہ جرات دہیری، جان نثاری وغیرہ کے متعلق شاعرانہ طرز بیان اختیار کرنے کے باوجود بادل ناخواستہ یہ ماننے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ ماسکو سے فرانسیسیوں کی پسپائی نیپولین کے یہ فتوحات اور کوئزوف کے یہ شکستوں کے سلسلے پر محیط ہے۔

لیکن قومی پندار کو کامل ایک طرف رکھنے کے بعد آدمی محسوس کرتا ہے کہ اس نتیجے میں تضاد پایا جاتا ہے، کیونکہ فرانسیسیوں کی فتوحات کے سلسلے نے انھیں بالکل نیست و نابود کر دیا جب کہ روسیوں کی شکستیں دشمن کی کامل تباہی اور ان کے اپنے وطن کی آزادی کا، عث بنیں۔

اس تضاد کی وجہ یہ ہے کہ مورخین نے فرانس روائوں اور جرنیلوں کے خصوصاً یادداشتوں پر مبنی کتابوں، مختلف رپورٹوں اور منصوبوں وغیرہ کی مدد سے واقعات کا مطالعہ کرنے کے بعد 1812 کی مہم کے اس دور کے ساتھ ایک مفرد وابستہ کر دیا، جس کا حقیقتاً کوئی وجود نہیں تھا۔ مبینہ طور پر یہ مقصد نیپولین، اس کے مارشلوں اور فوج کا انقطاع اور گرفتاری تھا۔

اس قسم کا مقصد نہ کبھی تھا اور نہ کبھی ہو سکتا تھا کیونکہ اس قسم کا مقصد بالکل لایعنی ہوتا اور اس کا حصول قطعی ناممکن۔ یہ لایعنی اس لیے تھا کیونکہ

اول: نیپولین کی غیر منظم فوج پوری ممکنہ رفتار سے بھاگ رہی تھی، یعنی وہ بالکل وہی کام کر رہی تھی جو ہر روز اس سے کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ جب فرانسیسی سرعت رفتار سے بھاگ ہی رہے تھے، پھر ان کے خلاف تمام انواع کی کارروائیاں کرنے سے حاصل کیا ہوتا؟

دوم: جن لوگوں کی تمام توانائیاں بھاگنے پر مرکوز تھیں، ان کے راستے میں رکاوٹیں کھڑی کرنا احمقانہ فعل ہوتا۔ سوم: فرانسیسی فوج کو ملیا میٹ کرنے کے لیے اپنے جوانوں کی قربانی دینا لایعنی اور فضول حرکت ہوتی کیونکہ کسی بھی سڑک پر رکاوٹیں کھڑی نہ ہونے کے باوجود اور کسی خارجی مداخلت کے بغیر ہی وہ اتنی تیزی سے ہے آپ کو تباہ کر رہی تھی کہ وہ جب دبیر کے مہینے میں سرحد پار کرنے میں کامیاب ہوتی، اس کی تقریاً اصل تعداد کا صرف سواں حصہ رہ گئی تھی۔

چہارم: امپراطور، بادشاہوں اور لوگوں کو قیدی بنانے کی خواہش کرنا احمقانہ بات ہوتی۔ جیسا کہ ان زمانے کے انتہائی تجربہ کار اور منجھے ہوئے سفارت کاروں (یوزف ڈیسیٹخ اور دیگر) نے صحیح اندازہ لگایا، ان کی

گرفتاری روئے کے لیے حد درجہ شرمندگی اور خفت کا باعث بنتی۔ پوری فرانسیسی کوراکر فائدہ کرنے کی خواہش اس سے بھی زیادہ اچھلتا ہوتی کیونکہ خود ہماری فوج جب کراستایا پہنچی، گھٹتے گھٹتے آدمی روگنی تھی اور فرانسیسی کوراکر بحفاظت مانے کے لیے پوری ڈویشن درکار ہوتی اور حالت یہ تھی کہ خود ہمارے جوانوں کو ہمیشہ پورا دشمن نہیں ملتا تھا اور قیدی پہلے ہی فاقوں میں رہ رہے تھے۔

جن لوگوں نے عقل خرچ کر کے پولین (کے فرار کے راستے) کا انقطاع کرنے اور اسے زیر حراست لینے کے مفروضہ منصوبے بنائے، ان کی حالت اس باغبان کی مانند تھی جو مویشیوں کے روڑ کو، جو اس کے گل بوٹیوں کو پاؤں تلے روند رہا ہوتا ہے، اپنے باغ سے نکالنے کے بعد ان کی بٹائی شراب کر دیتا ہے۔ باغبان کا رویہ کچھ فرار دینے کے لیے صرف یہی دلیل دی جاسکتی ہے کہ وہ بہت طیش میں آ گیا تھا۔ لیکن جن لوگوں نے یہ بیان کر دیا کہ منصوبے تجویز کیے، ان کے حق میں تو یہ دلیل بھی نہیں دی جاسکتی کیونکہ کیریاں، جڑنے سے ان کا اپنا کوئی نقصان نہیں ہوا تھا۔ اچھا نہ کارروائی ہونے کے علاوہ پولین اور اس کی فوج کا انقطاع دیسے بھی ناممکن تھا۔

اول یہ اس لیے ناممکن تھا کیونکہ جیسا کہ تجربہ ہمیں بتاتا ہے کہ میدان جنگ کے دو تین میل کے دائرے کے اندر مختلف رجمنٹوں کی نقل و حرکت کو منصوبے کے عین مطابق بنانا ناممکن ہوتا ہے، چنانچہ براحتی کہ چاکوف، کوتوزوف اور وٹ گٹ شفائین معینہ وقت پر معین مقام پر ایک دوسرے کے ساتھ "میں گے، اتنا بعید تھا کہ ناممکن کی حدود میں داخل ہو جاتا ہے۔ اسی لیے کوتوزوف کو، جب اسے پیٹرز برگ کے کام کا ارسال کر دیا کہ منصوبہ ملے یہ کہنا پڑا کہ فوجوں کی تقسیم و ترتیب کے بارے میں جو منصوبے دوران تادم مقامات پر پیش کرے جائیں، مطلوبہ نتائج حاصل کرنے میں نامکام رہتے ہیں۔

دوم: یہ اس لیے ناممکن تھا کیونکہ پولین کی فوج جس سرعت رفتار سے واپس جا رہی تھی، اسے روکنے کے لیے اس فوج سے، جو روسیوں کے پاس تھی، نسبتاً کہیں بڑی فوج درکار ہوتی۔ سوم: یہ اس لیے ناممکن تھا کیونکہ عسکری اصطلاح "منقطع کرنا" بالکل بے معنی ہے۔ آدمی ذیل روٹی کا ٹکڑا تو قطع کر سکتا ہے، فوج کو نہیں۔ فوج کو منقطع کرنا۔ یا اس کے راستے میں رکاوٹ کھڑی کرنا ناممکن سی بات ہے کیونکہ گرفتاری سے بچنے کی گنجائش ہمیشہ موجود رہتی ہے۔ رائیں بھی آتی ہیں جب کچھ بھی نظر نہیں آ سکا۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کا محض کراستایا اور بیرینا کی مثالوں سے ہی عسکری منصوبہ سازوں نے اقرار کر لیا ہوگا۔ جس طرح اہل قتل کو صرف اسی صورت میں پکڑا جاسکتا ہے کہ وہ آئے اور آرام سے آپ کے ہاتھ پر بیٹھ جائے۔ یہی صورت فوجیوں کا ہے۔ انھیں صرف تبھی گرفتار کیا جاسکتا ہے اگر وہ گرفتار ہونے پر راضی ہو جائیں اور جرموں کی طرح حربی اصولوں اور چالوں کے مطابق ہتھیار ڈالنے پر تیار ہو جائیں۔ مگر فرانسیسیوں نے جب یہ اندازہ لگایا کہ گرفتاری دینے سے انھیں کچھ حاصل نہیں ہوگا تو انھوں نے بالکل صحیح اندازہ لگایا تھا کیونکہ وہ جس طرح فرار کے دوران میں وہ سردی اور بھوک سے مر رہے تھے، گرفتاری کی صورت میں بھی ان کا یہی حال ہوتا تھا۔

چہارم (اور یہ بڑی وجہ ہے) یہ اس لیے ناممکن تھا کیونکہ جب سے دنیا وجود میں آئی ہے، کوئی جنگ لڑنے سے زیادہ ہول ناک حادثات میں، جو 1812 میں کا رخ ہوا تھے، نہیں لڑی گئی۔ روسی فوج نے فرانسیسیوں کے قوتِ قرب میں بڑی چوٹی کا زور لگایا۔ اس سے زیادہ وہ کچھ نہیں کر سکتی تھی اور اگر کرتی تو اپنے آپ کو تباہ کر لیتی۔ تاروتو سے کر سنایا تک کوچ کے دوران میں یہ بچہ ک ہزار افر دے محروم ہو گئی۔ کوئی بیمار پڑ گیا اور کوئی ادھر ادھر کھٹک گیا۔ یہ تعداد خاصے بڑے صوبائی شہر کی آبادی کے برابر ہے۔ یوں آدمی نفری لڑائی لڑے بغیر ہی سپاہ کا ساتھ چھوڑ دیا۔ اور مہم کا یہی وہ دور ہے۔ جب فوج کے پاس بوتلوں اور پوسٹن کے کوٹوں کی قلت تھی، رسل کا توڑا تھا اور دوڑ کا نایاب تھا جب اسے مہینوں سے راتیں تقریباً صفر درجہ حرارت میں برف پر پڑاؤوں میں گزارنا پڑ رہی تھیں۔ جب دن صرف سٹھ یا آٹھ گھنٹوں پر محیط ہوتا تھا اور باقی وقت رات کا سہ رہتا تھا جس کے دوران میں ڈسپلن موثر انداز سے قائم نہیں رکھا جاسکتا۔ جب فوجی جوانوں کو چند گھنٹوں کے لیے نہیں، جیسے کہ لڑائی میں ہوتا ہے، بلکہ متواتر مہینوں سے موت (اور موت ڈسپلن کی پابند نہیں ہوتی) کے منہ میں دھکیلا جا رہا تھا اور سردی اور فاقہ کشی کی وجہ سے انھیں اپنا ایک ایک منٹ موت کے خلاف جان بوجھ و جہد میں صرف کرنا پڑ رہا تھا، جب نصف فوج صرف ایک مہینے کے دوران میں لقمہ اجل بن گئی۔ ادھر مورخین ہمیں یہ بتاتے ہیں کہ مہم کے اس دور میں میلورادوچ کو ایک جانب سے، چگا کوف کو دوسری جانب سے اور تر، سوف کو کسی اور جانب سے (گھنٹوں گھنٹوں برف کی چل کر) فلیک مارچ کرنا چاہیے تھا، یا فداں جرنیل کو (فلاں مقام پر) فرانسیسیوں کو "بھگت فاش" اور فلاں کو ان کا "انقطاع" کرنا چاہیے تھا، وغیرہ وغیرہ۔

روسیوں نے، جن کی نصف تعداد موت کا شکار ہو گئی تھی، قوم کے شایانِ شان نتیجہ حاصل کرنے کے لیے سب کچھ کیا جو وہ کر سکتے تھے یا انھیں کرنا چاہیے تھا اور انھیں محض اس لیے قصور وار نہیں ٹھہرایا جاسکتا کیونکہ دوسرے روسی اپنے گرم اور آرام دہ کمروں میں بیٹھے نجا دیز پیش کر رہے تھے کہ انھیں وہ کچھ کرنا چاہیے جو کہ ناممکن تھا۔ حقائق اور تاریخی داستانوں کے مابین یہ عجیب و غریب اور ہمارے ناقابلِ فہم تناقضات محض اس لیے جنم لیتے ہیں کیونکہ مورخین نے اس موضوع پر خامہ فرسائی کرتے وقت خود واقعات کی تاریخ نہیں لکھی بلکہ مختلف جرنیلوں کے خوش آئند احساس و جذبات کی ترجمانی کر دی ہے یا ان کی خوب صورت تقریروں کو نئے اشعار کا لبادہ پہنا دیا ہے۔ میلورادوچ نے کیا کہا، اس یا اس جرنیل کو کیا کیا اعزازات عطا ہوئے، اس یا اس کا غررے کیا قیاس آرائی کی، ان مورخین کو یہ باتیں زیادہ اہم اور دلکش معلوم ہوتی ہیں، لیکن انھیں سچا س ہزار انسانوں میں، جو ہپتالوں میں ایڑیاں رگڑتے رہے یا منوں مٹی سے دفن دیے گئے، دلچسپی کا کوئی پہلو نظر نہیں آتا کیونکہ ان کے سوا کہ ان کا تحقیقات کے دائرے میں نہیں آتے۔

تاہم ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم جرنیلوں کی رپورٹوں اور منصوبوں کو اٹھا کر ایک طرف رکھ دیں اور ان ہزاروں اشخاص کی، جنہوں نے ان واقعات میں براہِ راست حصہ لیا تھا، نقل و حرکت پر توجہ دیں اور وہ تمام مسائل جو ان میں پیش

بائبل نظر آتے تھے، بہت آسانی سے حل ہو جائیں گے اور ان میں قطعاً کوئی الجھاؤ اور پیچیدگی نظر نہیں آئے گی۔
 نپولین اور اس کی فوج کے ”انقطاع“ کرنے کا خیال دس بارہ اشخاص کے علاوہ کسی اور کے ذہن میں نہیں آیا تھا۔ اس قسم کے منصوبے یا مقصد کا کوئی وجود نہیں ہو سکتا تھا کیونکہ یہ لامتناہی تھا اور عمل اس کا حصول ناممکن تھا۔
 قوم کے سامنے صرف ایک ہی مقصد تھا، اپنی سرزمین سے حملاً آروں کو نکالا جائے۔ بنیادی طور پر یہ مقصد اپنے آپ حاصل ہو گیا کیونکہ فرانسیسی زہر ہونے لگے تھے اور ضرورت صرف اس بات کی تھی کہ ان کے اس فرار میں کوئی رکاوٹ نہ ڈالی جائے۔ ثانیاً، یہ گوریلا جنگ سے حاصل ہو گیا جو فرانسیسیوں کو بیست دہائیوں سے کر رہی تھی۔
 ثالثاً اس کا حصول یوں بھی ممکن ہو گیا کہ روسی فوج فرانسیسیوں کا تقاب کر رہی تھی اور اگر ان کا فرار رک جاتا تو وہ اپنی طاقت استعمال کرنے کے لیے تیار تھی۔

روسی فوج کو بالکل اسی طرح کا ردائی کرنا تھی جس طرح بھگتے جانور کے لیے چھٹا استعمال ہوتا ہے۔
 اور تجربے کا رکھ جواں جانتا ہے کہ بھگتے ہوئے جانور کے سر پر ضرب لگانے کی نسبت دھمکی کے طور پر چمٹنے کا اٹھائے رکھنا زیادہ بہتر ہے۔

حصہ چہارم

۱

جب آدمی اس جانور کو دیکھتا ہے، جو چار کئی کی حالت میں ہو، وہ دہشت کی گرفت میں آ جاتا ہے۔ ایک چیز، جو خود اس سے مشابہ ہوتی ہے، عین اس کی آنکھوں کے سامنے معدوم ہو رہی ہوتی ہے۔ اپنا وجود کھو رہی ہوتی ہے۔ لیکن جب موت سے ہم کنار ہونے والی مخلوق انسان ہو اور انسان بھی وہ، جو آپ کو دوسروں سے پیارا ہو، آپ کی موجودگی میں اس کی زندگی کے چراغ کے گل ہونے پر آپ پر جو دہشت سوار ہونا ہوتی ہے، وہ تو ہوتی ہی ہے، اس کے علاوہ آپ کو محسوس ہوتا ہے کہ آپ کے اندر کچھ ٹوٹ گیا ہے اور آپ کو روحانی گھاؤ آیا ہے۔ جسمانی گھاؤ کی طرح یہ گھاؤ بھی بعض اوقات مہلک ثابت ہوتا ہے، اور بعض اوقات مندل ہو جاتا ہے مگر یہ ہمیشہ اندر ہی اندر ڈکنا رہتا ہے اور جوئی کسی اذیت ناک خارجی لمس سے اس کا واسطہ پڑتا ہے، یہ اندر کی طرف سٹ جاتا ہے۔

پرنس آندرے کے انتقال کے بعد ناسا اور پرنس ماریا دونوں یکساں اسی طرح محسوس کرتی تھیں۔ ان کے دل بچھ چکے تھے اور انہوں نے موت کے خوف کے سامنے، جو ہر وقت ان کے سروں پر منڈلاتا رہتا تھا، اپنی ہچکچاہٹیں سچائی تھیں۔ یوں وہ زندگی کا سامنا کرنے کا حوصلہ کھو بیٹھی تھیں۔ ان کی پوری کوشش یہی ہوتی تھی کہ وہ کسی ایسی چیز کے، جو ذرا بھی درشت یا تکلیف دہ ہوتی، قریب بھی نہ پہنچیں۔ ہر چیز۔ گلی میں تیری سے گزرتی ہوئی گاڑی، ڈر کے لیے بلا واخ و مد کا استفسار کہ کون سا ڈرائیو نکالا جائے اور سب سے بدتر ہمدردی کے غیر مخلصانہ اور رسمی بول۔ چلتا پر تھکی کا کام کرتے، زخم ہرے کر جاتے، ہلکے آمیز معلوم ہوتے اور اس اشد ضروری سکوت میں غل جاتے، جس میں وہ دونوں گبیہر، ایبٹ ناک کیسائی موسیقی، جو ابھی تک ان کے تخیلات میں گونج رہی تھی، سن رہی ہوتی اور ان پر اسرار، بے کنار مناظر میں جو ایک لحظہ کے لیے ان کی نگاہوں کے سامنے وا ہو گئے تھے، جھانکنے میں رکاوٹ بن جاتے۔

صرف اسی وقت، جب انھیں تنہائی میسر آتی، وہ اس طرح کی دست دراز یوں اور اذیت ناک چھیڑ خانیوں سے محفوظ و مامون ہوتیں۔ وہ ایک دوسرے کے ساتھ بھی شاذ ہی بات کرتی تھیں اور جب کرتی بھی تھیں، تو انتہائی غیر اہم موضوعات کے متعلق اور مستقبل کے بارے میں تو بالکل ہی کوئی شرہ بھی کرنے سے گریز کرتی تھیں۔ مستقبل کے کسی امکان کا اعتراف کرنا انھیں اس کی یاد کی توجہ میں معدوم ہوتا تھا۔ اس سے بھی بڑھ کر وہ بہت

حرم و احتیاط سے ہر اس چیز کا، جس کا مروجہ کے ساتھ کسی نوع کا بھی کوئی تعلق نہ تھا، ذکر کرنے سے پہنچی رہتی تھیں۔ انھیں یوں نظر آتا تھا کہ جو کچھ ان پر مینا ہے اور جس کچھ کے تجربے میں سے انھیں گزرنے پڑا ہے، اسے الفاظ میں بیان کرنا ناممکن ہے۔ اور اس کی زندگی کی تفصیلات کا ہر حوالہ اس بھید کے، جو ان کی نگاہوں کے سامنے پایہ تکمیل تک پہنچا تھا، شکوہ و جلال اور تقدس کی بے حتمی کے مترادف ہے۔

وہ اب باتوں میں جس طرح پیہم ضبط و نفس سے کام لے رہی تھیں، جس طرح ہر اس بات سے، جو اس کے ذکر پر ملتی ہو، مسلسل اور یرمندانہ انداز سے پہنچی کر رہی تھیں۔ انھوں نے اپنے لیے ایک حد قائم کر لی تھی کہ وہ اس سے آگے نہیں بڑھیں گی اور بات کہہ کر سے کیوں نہ آ رہی ہو، وہ اس حد پر پہنچ کر مازمارک جاتی تھیں۔ اس کا انجام یہ ہوا کہ جو کچھ وہ محسوس کر رہی ہو تھیں، وہ اور صحت اور صراحت کے ساتھ ان کے ادہان میں روشن ہو جاتا۔

جس طرح خالص اور کامل مسرت ناپید ہے، اسی طرح خالص اور کامل غم کا بھی کوئی وجود نہیں۔ حالات و واقعات نے پرس مار یا کو، ایک ایسے مقام پر لا کھڑا کیا تھا کہ وہ اپنے معاملات میں کامل خود مختار اور اپنے سپاہ و سپید کی بلا شرکت غیرے مالک بن چکی تھی۔ پھر وہ اپنے برادر اور اوسے کی سرپرست، اور اس کی رہتی ماں تھی، چنانچہ زندگی کے تقاضوں نے اسے غم و اندوہ کی دنیا سے، جس میں وہ گزشتہ دو ہفتوں سے رہ رہی تھی، پہلے باہر نکلنے پر مجبور کر دیا۔ اسے عزیز و اقارب کے خطوط مل رہے تھے، اسے ان کے جوابات دینا تھے۔ جس کمرے میں ٹھکانا ٹھہرایا گیا تھا، وہ مرطوب تھا اور وہ کھانسنے لگا تھا۔ ان کے (گھر بیو)، سور کے بارے میں اطلاعات سے پس آل پانچ یا دو سلاول آ پہنچا تھا۔ اس کا مشورہ اور تجویز یہ تھی کہ وہ واپس ماسکو چلی چلے، دزد و بزد کا شریٹ میں ان کے مکان کو کوئی گزند نہیں پہنچا تھا، صرف معمولی مرمتوں کی ضرورت تھی۔ زندگی ساکن نہیں کھڑی رہتی اور آدمی کے لیے رہنا ضروری ہے۔ اگرچہ سوچ بچار کی الگ تھلگ ملکیت سے، جس میں پرس، ریو، بٹک، بودو، باش اختیار کیے ہوئے تھے، باہر نکلنا اس کے لیے تکلیف دہ تھا، ورنہ شا کو اس کے حال پر چھوڑ کر جانے سے افسوس اور تقریباً شرم محسوس ہو رہی تھی، زندگی کے معمولات اور تفکرات کا تقاضا یہ تھا کہ وہ ان پر توجہ دے اور اپنے منشا کے علی الرغم سے ان کے سامنے تسلیم خم کرنا پڑا۔ اس نے آل پانچ کے ساتھ حسابات کا جائزہ لیا، اپنے بھتیجے کے بارے میں دیہال سے علاج مشورے کیے اور ماسکور وائے ہونے کے لیے انتظامات اور تیاریاں شروع کر دیں۔

نماش تنہا رہ گئی اور جب سے پرس مار یا نے اپنی روانگی کی تیاریاں شروع کی تھیں، وہ اس سے بھی کئی کاٹنے لگی تھی۔

پرس مار یا نے کاؤٹنس سے درخواست کی کہ وہ متا شا کو اس کے ہمراہ ماسکو جانے کی اجازت دے دے۔ ماں باپ دونوں نے اپنی رضا مندی کا اظہار کر دیا کیونکہ وہ دیکھ رہے تھے کہ ہر گزرتے دن کے ساتھ ساتھ ان کی جینی کی جسمانی حالت بد سے بدتر ہوتی جا رہی ہے۔ انھیں مہ تھی کہ تہہ ملی آب و ہوا اور ماسکو کے ڈکنروں کے مشورے اس کے لیے سودمند رہیں گے۔

جب یہ تجویز نتاشا کے سامنے رکھی گئی، اس نے صاف انکار کر دیا۔ ”میں کہیں نہیں جاؤں گی۔ مہربانی فرمائیے اور مجھے میرے حال پر چھوڑ دیں۔“ اس نے کہا اور کمرے سے باہر بھاگ گئی۔ اس کے لیے اپنے آنسوؤں کو روکنا مشکل ہو رہا تھا۔ اس کے ان آنسوؤں سے غم و اندوہ کا کم اور جھلکا ہٹ اور خفگی کا زیادہ اظہار ہو رہا تھا۔

جب نتاشا کو محسوس ہوا کہ پرنس ماریا اس کا ساتھ چھوڑ گئی ہے اور وہ اپنے رنج و محن میں اکیلی رہ گئی ہے، وہ اپنا بیشتر وقت اپنے کمرے میں گزارنے لگی۔ وہ صوفے کے ایک کونے پر گھٹڑی بن کر بیٹھ جاتی، اپنی اعصاب زد انگلیوں سے کوئی چیز مسلاتی یا ٹکڑے ٹکڑے کرتی رہتی اور اپنے سامنے جس چیز پر اس کی نگاہ پڑتی، ٹکٹل باندھ کر اسے دیکھنے لگتی۔ یہ تہائی سے اذیتیں پہنچتی، اس کا کچھ سرنگاں دیتی، لیکن یہ اس کی ضرورت تھی۔ جو نئی کوئی شخص کمرے میں داخل ہوتا، وہ جھٹ پٹ بیدار ہو جاتی، اپنی پوزیشن تبدیل کرتی، کوئی کتاب یا سلائی کی چیز اٹھ لیتی اور بے مہرلی سے دخل انداز کیے جانے کا انتظار کرنے لگتی۔

اسے ہر دم یہی محسوس ہوتا کہ وہ اس چیز کی، جس پر اس کی روحانی نظر۔ ایسے پر ہیبت استفسار سے، جو اس کی ہمت و قوت سے کہیں بڑھ کر تھا۔ مرکوز ہے، کسی بھی لمحے تنہیم کرنے، اس کے اندر جھانکنے میں کامیاب ہو سکتی ہے۔ دسمبر کے اواخر میں ایک روز نتاشا، جو سوکھ کر کاٹا ہو چکی تھی، سیاہ اون ڈریس میں ملیوں، لاپرواہی سے باؤں کی مینڈھی بنائے صوفے کے کنارے پر پھسکر امارے بیٹھی تھی۔ عالم اضطراب میں وہ اپنے چمکے کے سرور کو کبھی مروڑنے اور کبھی سیدھا کرنے لگتی۔ اس کی نگاہیں درد زے کے ایک کونے پر جمی ہوئی تھیں۔

وہ ٹکٹلی باندھے گویا اس جگہ کو، جہاں زندگی کا دوسرا کنارہ۔ وہ چل گیا تھا، دیکھ رہی تھی اور زندگی کا وہ کنارہ جس کے متعلق اس نے پہلے کبھی سوچا بھی نہیں تھا اور جو اسے اتحاد اور غیر احتمالی معلوم ہوتا تھا، اب زندگی کے اس کنارے کے مقابلے میں، جہاں یا تو محض سونا پن اور ویرانی ہے اور یا دکھ ہی دکھ اور اہانت ہی اہانت ہے، کہیں زیادہ قریب، قابل تنہیم اور جانا پہچانا دکھائی دے رہا تھا۔

وہ ٹکٹلی باندھے اس دنیا میں، جہاں اسے معلوم تھا کہ وہ موجود ہے، جھانک رہی تھی لیکن جس طرح وہ اس دنیا میں نظر آتا تھا، اس کے علاوہ وہ اپنے ذہن میں اس کی اور کوئی تصویر بنانے سے قاصر تھی۔ وہ سے بچنے اسی طرح دیکھ رہی تھی جس طرح کہ وہ میتیش چی، تروکتا در اور یاروسلاول میں اسے دیکھتی رہی تھی۔

اس نے اس کا چہرہ دیکھا، اس کی آواز سنی، اس کے الفاظ اور اپنے الفاظ دہرائے جو اس نے اس سے کہے تھے۔ بعض لحاظ کے دوران میں وہ ان الفاظ کا تصور کرنے لگتی جو ہو سکتا ہے اس نے کہے ہوں اور ہو سکتا ہے کہ نہ کہے ہوں لیکن جن کے کہے جانے کا پورا امکان تھا۔

وہ آرام کر سی پر اپنے مٹھلیں چنے میں، جس کے اندر پوسٹین کا استر لگا ہوا تھا، لیٹا ہوا ہے۔ اس کا سر اس کے مہین اور زرد ہاتھ کا سہارا لیے ہوئے ہے۔ اس کا سینہ خوفناک حد تک کھوکھا ہے، اس کے کندھے اور پر کو اٹھے ہوئے ہیں اور وہ قدرے اگلی جانب جھکا ہوا ہے۔ اس کی پیل بیٹانی پر کیمرہ سودا رہتی ہے اور غائب ہو جاتی ہے۔ اس کے

ہونٹ بھیچے ہوئے ہیں اور اس کی آنکھیں جھگڑ رہی ہیں۔ اس کی ایک ٹانگ رتی رتی رتی سے لرز رہی ہے لیکن یہ رزش بمشکل دکھائی دیتی ہے۔ ناشا کو معلوم ہے کہ اس کی روح فرسہ درد کے ساتھ کھینچا ہوا ہو رہی ہے۔ ”یہ کس قسم کا درد ہے؟ یہ انھیں کیوں چٹ گیا ہے؟ وہ کیا محسوس کر رہے ہیں؟ یہ انھیں کتنی اذیت پہنچا رہا ہوگا؟“ ناشا نے سوچا۔ وہ ڈر گیا کہ وہ اسے دیکھ رہی ہے۔ اس نے اپنی نظریں اوپر اٹھائیں اور لیوں پر سکرابٹ لائے بغیر بوسے لگا: ”ایک بات بڑی بھیانک معلوم ہوتی ہوگی کہ آدمی اپنے آپ کو اذیت میں مبتلا شخص کے ساتھ نرمی کر لے۔ یہ تو دائمی تعذیب نظر آتی ہوگی۔“ اور وہ غٹنگلی باندھ کر اسے دیکھنے لگا۔ ناشا کو اس کی غٹنگلی دوبارہ دکھائی دیتی ہے۔ اور اس نے حسب معمول پیشتر اس کے کہ وہ اپنے جواب کے متعلق کچھ سوچ سکتی، جھٹ پٹ کہا: ”یہ سدا نہیں رہ سکتا۔ یہ جاری نہیں رہے گا۔ آپ ٹھیک ہو جائیں گے۔ پوری طرح ٹھیک ہو جائیں گے۔“

اس نے جس طرح تب اسے دیکھا تھا، اسی طرح وہ اب اسے دیکھ رہی تھی اور جو کچھ اس نے تب محسوس کیا تھا، اپنے تخیل میں دوبارہ اسی طرح محسوس کر رہی تھی۔ اس کے الفاظ سن کر وہ تب جس طرح تادیب مفہوم و محزون اور درشت انداز سے اسے دیکھتا رہا تھا، وہ اسے یاد آ گیا اور اس کی غٹنگلی میں جو اٹھا ہوا یوں اور زبرد تو بخ تھی، وہ اس کا معہوم سمجھ گئی۔

”میں یہ مان گئی تھی“ اس نے اپنے آپ سے کہا، ”کہ اگر وہ ہمیشہ اسی طرح اذیت میں مبتلا رہے، تو یہ بڑی بھیانک بات ہوگی۔ میں نے یہ بات اس وقت اس لیے کہی تھی کیونکہ میں انہیں بتانا چاہتی تھی کہ یہ بات ان کے لیے بھیانک ہوگی لیکن انھوں نے اس کا یہ مطلب اخذ کیا کہ یہ بات میرے لیے بھیانک ہوگی۔ وہ اس رقت ابھی زندہ رہنا چاہتے تھے۔ وہ موت سے خائف تھے۔ اور میں نے اپنی بات بڑے بے ہنگم اور حقانہ انداز سے کہی۔ میرا مطلب ہرگز یہ نہیں تھا، میں بالکل مختلف چیز کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ اگر میں وہ کہہ دیتی جو میں سوچ رہی تھی تو مجھے یہ کہنا چاہیے تھا اگر میری نگاہوں کے سامنے ان پر ہر وقت جاں کنی کا علم طاری رہے، لگا تار جاری رہے، جو کچھ کہ میں اب ہوں، اس کے مقابلے میں تب میں کہیں زیادہ خوش ہوتی۔ اب۔ اب تو کچھ بھی نہیں رہا۔ کوئی شخص نہیں رہا۔ کیا انھیں معلوم تھا؟ نہیں، انھیں معلوم نہیں تھا اور نہ کبھی معلوم ہوگا۔ اور اب اس کا کبھی بدوا نہیں ہو سکے گا، کبھی نہیں۔“

اور ایک بار پھر وہ اس سے وہی الفاظ کہہ رہا تھا لیکن اس مرتبہ ناشا نے اسے اپنے تخیل میں مختلف جواب دیے۔ اس نے اسے ٹوک دیا اور بولی: ”آپ کے لیے بھیانک ہوگی، میرے لیے نہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ میرے لیے زندگی میں آپ کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ اور آپ کے ساتھ اذیت میں مبتلا ہونا میرے لیے زندگی کی سب سے بڑی راحت ہوگی۔“ اور اس نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور اسے بعینہ اسی طرح دبانے لگا جس طرح اس نے موت سے چار روز پہلے اس ہول ناک شام کو دبا یا تھا۔ اور وہ اپنے تخیل میں وہ نرم، کوئل اور محبت بھرے الفاظ، جو وہ اس وقت کہہ سکتی تھی، لیکن صرف اب کہہ رہی تھی ”میں آپ سے۔ آپ سے محبت کرتی ہوں، آپ سے محبت کرتی ہوں۔“ وہ کہے جا

رہی تھی، وہ کیکپار ہی اور اپنے ہاتھ مسل رہی تھی، ورشد یذاذیت کے عالم میں اپنے دانت بھیج رہی تھی۔

غم و اندوہ کی تلخ و ترش حلاوت اس پر غائب آگئی اور اس کی آنکھوں میں آنسو چھلکنے لگے۔ ایک کی اس نے اپنے آپ سے پوچھا: ”یہ میں کس سے ماتیں کر رہی ہوں؟ وہ کہاں ہیں اور اب وہ کیا ہیں؟“

اور ایک بار پھر ہر چیز بے رنگ اور اذیت ناک گشتی میں الجھ گئی۔ اس کی پیشانی شکن آلود ہو گئی اور اس نے پورا زور لگا کر، اتنا کہ اس کی رگیں تن گئیں، اس نے اس دنیا میں، جس میں وہ تھ، جھانکنے کی کوشش کی۔ ”درہاں۔ ہاں۔“ میں یقیناً اب سڑ کی تہ تک پہنچ جاؤں گی۔“ اس نے سوچا۔ لیکن عین اس لمحے، جب سے یہ محسوس ہو رہا تھا کہ غیر فہم آشکار ہوا چاہتا ہے، دردانہ کے ہینڈل کے زور سے کھڑکھڑائے جانے کی آواز تکلیف دہ انداز سے اس کے کانوں سے ٹکرائی۔ اس کی حاذق دنیا اپنی مالک کی پردا کیے بغیر کمرے میں آدھمکی۔ اس کے چہرے پر ہوا پاں اڑ رہی تھیں۔

”اپنے پاپا کے پاس چلیں۔ فوراً، ابھی!“ اس نے عجیب و غریب اور بیجا فی سب سے کہا۔ ”مصیبت بیو تراچ۔ خط۔“ وہ بمشکل کہہ پائی اور اس کی ہچکی نکل گئی۔

2

نشاں ان دنوں نہ صرف ہر کس دنیا کس سے الگ تھلگ رہنے کی آرزو مند تھی بلکہ اپنے خاندان کے ارکان کے ساتھ خاص طور پر بیگانگی برتنے لگی تھی۔ وہ بھی۔ اس کا باپ، اس کی ماں، اور سونیا اس کے اتنے قریب تھے اتنے جانے پہچانے تھے، تنے روزمرہ کی چیز تھے کہ وہ جو کچھ کہتے یا محسوس کرتے، اسے یہی لگتا کہ وہ اس دنیا کی، جس میں وہ حالیہ دنوں میں مقید ہو گئی تھی، بے حرمتی کر رہے ہیں۔ وہ نہ صرف اس سے نا تعلق ہو گئی تھی بلکہ ان کے ساتھ ایک طرح کا محض صمانہ برتاؤ بھی کرنے لگی تھی۔ اس نے بیو تراچ اور مصیبت کے اغاظ سے ضرور لیکن وہ ان کے مفہوم کی تہ تک پہنچنے میں ناکام رہی۔

”کیسی مصیبت؟ انھیں کیا مصیبت پیش سکتی ہے؟ وہ اپنی جانی پیو پی، تھمسی پٹی، پیش یا افتادہ زندگی بسر کر رہے ہیں، اور بس!“ اس نے اپنے آپ سے کہا۔

جب وہ بال روم میں داخل ہوئی، اس کا باپ دوڑتا دوڑتا اس کی والدہ کے کمرے سے باہر آ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر جھریاں نمایاں ہو رہی تھیں ورنہ آنسوؤں میں بھیگا ہوا تھا۔ صاف نظر آ رہا تھا کہ وہ کمرے سے بھاگا تھا اس لیے باہر نکل آیا تھا کیونکہ وہ اپنی سسکیوں کو، جو اس کا گلہ گھونٹ رہی تھیں، مزید نہیں روک سکتا تھا وہ کھل کر رونا اور اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنا چاہتا تھا۔ جب اس کی نظر نشا شا پر پڑی، اس نے بے بسی سے اپنے بازوؤں سے اشارہ کیا، اس کا بدن بید بخنوں کی طرح کانپنے لگا، اس کی کرب ناک چیخیں نکل گئیں اور اس کے نرم و گداز گول منہ چہرے کی شکل مسخ ہو گئی۔

”پت۔ پتیا۔ جاؤ، جاؤ۔ وہ۔ وہ بلا رہی ہے۔“ درود بچوں کی طرح بلکتا، اپنی کمرورنگ ٹانگوں پر لڑکھڑا کر کے قریب پہنچا اور ہاتھوں میں چہرہ چھپاتا اس پر تقریباً گر پڑا۔

اچانک مناشا کو یوں محسوس ہوا جسے اسے بجلی کا جھٹکا لگا ہوا کسی نے اس کے دل پر گھونسا رو دیا ہو۔ اس کے وجود کے اندر درد کی شدید ٹیسس اٹھنے لگیں اور اسے اپنے باطن میں کوئی چیز چرتی، کر جی کر پچی ہونے لگی۔ اسے یوں محسوس ہونے لگا جیسے اس پر چاں کنی کا عالم طاری ہو گیا ہو۔ بلکہ درد کی اس اذیت ناک ٹھنسن کے ساتھ اسے یوں لگا جیسے اسے اس ٹھنسن سے، جو اس کے دل و دماغ پر بوجھ بنی ہوئی تھی اور جس نے زندگی کے ساتھ اس کا رشتہ منقطع کر رکھا تھا، نجات مل گئی ہو۔ اپنے باپ کی حاست دیکھ کر اور درد دارے کے عجب میں اپنی ماں کی خوف ناک اور کدھت چیخ سن کر وہ ایک لخت اپنے آپ کو اور اپنے غم کو بھول گئی۔

وہ اپنے باپ کی جانب بھاگی لیکن اس نے کمرورنگ ٹانگوں، اندازے اس کی ماں کے درد دارے کی طرف ہاتھ ہاتے ہوئے اسے ادھر جانے کا اشارہ کیا۔ پرنس ماریا، جس کا رنگ فق ہر چکا اور جزا کپکپ رہا تھا، کاؤٹنس کے کمرے سے باہر آئی۔ اس نے مناشا کا ہاتھ پکڑا اور اس سے کچھ کہا۔ مناشا نے اسے دیکھ کر اس کی بات سنی۔ وہ ہتھ پادروارے کی طرف لپکی، ایک لپٹنے کے لیے رکی جیسے اس کی اپنے وجود کے ساتھ کشش ہو رہی ہو اور پھر اپنی ماں کی جانب دوڑ پڑی۔

کاؤٹنس عجیب و غریب بے ہنگم انداز سے صوفے پر لیٹ ہوئی تھی اور اپنا جسم اڑائے دیوار سے سر کر رہی تھی۔ سو نیا اور خادمائیں اسے ہانڈوں سے پکڑے ہوئے تھیں۔

”مناشا! مناشا!... مناشا!“ کاؤٹنس نے چیختے ہوئے کہا۔ ”یہ صحیح نہیں ہے۔ صحیح نہیں ہے۔ وہ جھوٹ بول رہے ہیں۔ مناشا!“ اس نے دس دوز چیخ ماری، درد دوسروں کو پرے دھکیں دیا۔ ”چلے جاؤ، سب چلے جاؤ۔ یہ صحیح نہیں ہے! ہلاک ہو گیا۔ کیا بکو اس ہے! ہا، ہا، ہا... یہ صحیح نہیں ہے!“

مناشا کرسی کے قریب دوڑا تو ہو گئی، اپنی ماں کے اوپر چلی اور اس نے اسے اپنے ہانڈوں میں قلمبیا۔ اس نے غیر متوقع قوت کے ساتھ اسے اوپر اٹھایا، اس کے چہرے کا رخ اپنی طرف کیا اور اس کے ساتھ جھٹ گئی۔

”ماما! ڈارلنگ! میں یہاں ہوں، ڈیئر سٹ ماہ!“ وہ مسلسل کہتی رہی۔

اس نے اپنی ماں کو چھوڑا نہیں بلکہ نرمی سے اس کے ساتھ جھڈا زما کی کرتی رہی۔ اس نے بچے اور گرم پانی لانے کا حکم دیا۔ اپنی ماں کے ڈریس کے بٹن کھولے اور اسے پھاڑ ڈالا۔

”ماما! ڈیئر سٹ، ڈارلنگ!.. ماہ، میری جان!“ وہ بھی التوا بڑبڑاتی رہی اور اس کے سر، ہاتھوں اور چہرے پر ہوسوں کی بارش کرنے لگی، اور خود اسے اپنے آنسو، جنہیں روکنا ناممکن ہوتا جا رہا تھا، اپنی ناک اور چہرے پر ٹپ ٹپ گرتے محسوس ہونے لگے۔

کاؤٹنس نے اپنی بیٹی کا ہاتھ دبایا، اپنی آنکھیں بند کر لیں اور کچھ دیر کے لیے خاموش ہو گئی۔ ایک وہ خلاف

معمول سرعت سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس نے خالی خالی نگاہوں سے اپنے گرد و پیش کا جائزہ لیا اور جب اس کی نظریں نناشا پر پڑیں، وہ پوری قوت سے اس کا سراپے سینے سے چمٹانے لگی۔ پھر اس نے اپنی بیٹی کا چہرہ، جو دکھ سے جھرجھرا رہا تھا، اپنی طرف گھمایا اور تادیر اس کی آنکھوں میں دیکھتی رہی۔

”نناشا، تم مجھ سے محبت کرتی ہو؟“ اس نے نرم و لطیف در پر اعتماد انداز سے سرگوشی کی۔ ”نناشا، تم تو مجھے فریب نہیں ددگی؟ تم مجھے سب کچھ سچ سچ بتا دو گی؟“

نناشا نے، جس کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں، اس کی جانب دیکھا۔ اس کی نظروں میں محبت ہی بہت تھی لیکن ان میں منت سماجت بھی تھی کہ وہ معافی کی خواستگار ہے۔

”اما، ڈیئر سٹ۔“ وہ بار بار کہہ رہی تھی۔ وہ اپنی محبت کی پوری طاقت صرف کر رہی تھی تاکہ وہ حد سے زیادہ غم کو، جو اس کی جان جو سکھم میں ڈال رہا تھا، خود سمیٹ سکے۔

اس کی ماں یہ ماننے سے صاف انکار کی تھی کہ وہ اپنے چہیتے بیٹے کے بغیر جو عین عالم شباب میں ہلاک ہو گیا تھا، زندہ رہ سکتی ہے۔ اس نے حقیقت کے خلاف بے سود ہاتھ پاؤں مارتے مارتے ایک بار پھر ہڈیاں میں پناہ لے لی۔ نناشا کو کچھ یاد نہ ہا کہ وہ رات، وہ رات یا اس سے گلدن اور انگلی رات کیسے گزرے۔ وہ نہ سوئی، نہ نہ اس نے ماں کی ہنسی چھوڑی۔ معلوم ہوتا تھا کہ اس کی صابر اور ان تھک محبت نے اس کی ماں کو پوری طرح اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے۔ اس کی یہ محبت نہ کسی چیز کی وضاحت کر رہی تھی، نہ نہ کسی قسم کا اطمینان دلا رہی تھی لیکن وہ اسے زندگی کی طرف واپس بلا رہی تھی۔

تیسری رات کاؤنٹس چند منٹوں کے لیے پرسکون ہو گئی۔ نناشا نے اپنا سر اس کے صوفے کے بازو سے ٹکا دیا اور اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ صوفہ چرچا ایا اور نناشا نے اپنی آنکھیں کھول دیں۔ کاؤنٹس بستر پر بیٹھی تھی اور نرم لہجے میں باتیں کر رہی تھی۔

”میں کتنی خوش ہوں کہ تم واپس آ گئے ہو؟ تم تھک گئے ہو گے؟ چائے پیو گے؟“ نناشا اس کے قریب ہو گئی۔ ”تم کتنے خوبصورت ہو گئے ہو! امر داگی کا پیکر معلوم ہوتے ہو!“ کاؤنٹس نے اپنی بیٹی کا ہاتھ پکڑتے ہوئے اپنی بات جاری رکھی۔

”اما، میرا آپ کیا کہہ رہی ہیں...؟“

”نناشا، وہ جاچکا ہے، وہ سب اس دنیا میں نہیں رہا!“

وہ اپنی بیٹی سے ہم آغوش ہو گئی اور پہلی مرتبہ اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

نہ ہوئی۔ وہ سمجھ گئے کہ صرف وہی اپنی ماں کو مجنونانہ مایوسی کی انتہا گہرائیوں میں گرے سے بچا سکتی ہے۔ ننا شاہنشاہ اپنے اپنی ماں کے کمرے سے باہر نہ نکلی۔ وہ وہیں آرام کریں پر سو جاتی، اسے کھلاتی پانی اور اس سے بے تکان باتیں کرتی رہتی کیونکہ اس کی کوئل اور نرم دلطیف آواز واحد شے تھی جس سے کاؤنٹس کے عصاب کو تسکین ملتی تھی۔ اس کی ماں کی روح کو جو گھوڑا آیا تھا، وہ کبھی مندرل نہ ہو سکا۔ چنا کی موت اس سے اس کی آدمی زندگی چھین کر لے گئی تھی۔ جب خبر موصول ہوئی، وہ پیچاس برس کی تازہ دم اور بظاہر صحت مند عورت تھی۔ ایک مہینے کے بعد وہ اپنے کمرے سے اس حالت میں باہر آئی کہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ نیم مردہ ہے اور زندگی میں اس کے لیے کوئی کشش باقی نہیں رہ گئی ہے۔ وہ بوڑھی ہو گئی تھی۔ تاہم وہی زخم، جس نے کاؤنٹس کو گورنار سے پہچا دیا تھا، ننا شاہ کے لیے نئی زندگی کا پیام لایا۔

روحانی زخم، جو روحانی جسم کے کپچی کپچی ہونے کے سبب آتا ہے، جسمانی زخم کی، مند ہوتا ہے۔ بظاہر بہت بہت عیب معلوم ہوتی ہے، لیکن اسی کی طرح اس کے کنارے ہندرتج آئیں میں مل جاتے ہیں اور اس کا اندل ہو جاتا ہے۔ تاہم روحانی اور جسمانی دونوں قسام کے زخم صرف داخلی حیات بخش قوت کے ٹھیک مندرل ہو سکتے ہیں۔ بالکل اسی طرح ننا شاہ کا زخم مندرل ہوا۔ اسے یقین ہو چکا تھا کہ اس کی زندگی کا انجام قریب ہے۔ لیکن غیر متوقع طور پر اپنی ماں سے اس کی محبت نے اسے بتا دیا کہ زندگی کا جوہر۔ محبت۔ ابھی اس کے اندر فعال ہے۔ محبت بیدار ہو گئی، زندگی نے انگڑائی لی۔

پرنس آندرے کے آخری ایام نے پرنس ماریہ اور ننا شاہ کو ایک لڑی میں پر دیا تھا۔ اس تار و غم و غم و غم و غم نے ان میں مزید یگانگت پیدا کر دی۔ پرنس ماریہ نے اپنی روائی ملتی کر دی اور وہ ننا شاہ کی یوں خبر گیری کرنے لگی جیسے وہ کوئی بیمار بچی ہو۔ ننا شاہ نے جو تین ہفتے اپنی ماں کے کمرے میں گزارے تھے، انہوں نے اس کی صحت کی بنیادیں ہلادی تھیں۔

ایک روز پرنس، ماریہ نے دیکھا کہ ننا شاہ عین دوپہر کے وقت یوں کپکپا رہی ہے جیسے اسے بخار ہو۔ وہ اسے اپنے کمرے میں لے گئی اور اسے پلنگ پر لیٹنے کے لیے مجبور کر دیا۔ ننا شاہٹ تو گئی، مگر جب پرنس ماریہ پرے کر دیے اور خود باہر جانے لگی، اس نے اسے واپس بلایا۔

”ماریہ، مجھے نیند نہیں آرہی۔ میرے پاس بیٹھ جاؤ۔“

”تم تھک چکی ہو۔ کوشش کرو کہ تمہیں نیند آجائے۔“

”نہیں، نہیں۔ تم مجھے یہاں کیوں لائی ہو۔ وہ میرا چہرہ ہی ہو گی۔“

”ان کی حالت بہت بہتر ہے۔ آج وہ بالکل اسی طرح باتیں کر رہی تھیں جس طرح وہ عام طور پر کیا کرتی تھیں۔“

”ننا شاہ نیم تاریک کمرے میں بستر پر لیٹ گئی اور بغور پرنس، ماریہ کا چہرہ دیکھنے لگی۔

”کیا یہ ان سے مشابہ ہے؟“ ننا شاہ نے سوچا۔ ”ہاں، ہے بھی اور نہیں بھی۔ اس میں کون اچھوت اور انوکھی

بات ہے جو مجھ اسی سے مخصوص ہے۔ یہ کوئی بالکل نئی اور ان جانی ہستی ہے، اور یہ مجھ سے محبت کرتی ہے۔ اس کے دل میں کیا ہے؟ کامل اچھائی۔ لیکن یہ ہے کیا؟ یہ سوچتی کیا ہے؟ اس کی میرے حلق کیا رائے ہے؟ اہل یہ خوبصورت دد شیرہ ہے۔“

”ماشا۔“ اس نے جھجکتے جھپٹتے پرنس ماریا کا ہاتھ اپنی طرف کھینچتے ہوئے کہا۔ ”ماشا، تم یہ تو نہیں سوچیں کہ میں بد ہوں۔ سوچتی ہو؟ ماشا، ڈارلنگ، مجھے تم سے کتنا پیار ہے کیوں نہ ہم بچی وردلی سہیلیاں بن جائیں؟“

ورنہ ماشا نے اپنے بازو پرنس ماریا کے گلے میں جھانک کر دیے، وہ بے تحاشا اس کا چہرہ اور ہاتھ چومنے لگی۔

ماشاکے جذبات کے اس اظہار پر پرنس ماریا کو عجیب بھی آیا اور خوشی سے اس کے دل کا کنول بھی کھل گیا۔

وہ اس دن دن دونوں کے مابین اس کوئل اور جویشی دوستی نے جنم لیا جو صرف خواتین کے مابین پائی جاتی ہے۔ وہ لگاتار ایک دوسرے کو چومتی اور آپس میں پیار بھری باتیں کرتی رہتیں اور پناہ مشترقت ایک دوسرے کی صحبت میں گزارتیں۔ اگر ایک باہر چلی جاتی، دوسری بے کل ہو جاتی اور ترنت اس کے پاس پہنچ جاتی۔ انہیں خلوت کی نسبت ایک دوسرے کی ہم نشینی میں زیادہ سکون ملا۔ دونوں کے مابین دوستی سے بڑھ کر تعلقات استوار ہو گئے۔ زندگی کا یہ مفرح احساس صرف ایک دوسرے کی محبت میں ہی ممکن تھا۔

بعض اوقات وہ گھنٹوں خاموش رہتیں اور بعض اوقات جب وہ رات کو بستروں میں تھکتیں، ہاتھوں کا سہہ شروع ہو جاتا اور صبح تک جاری رہتا۔ وہ زیادہ تر ان چیزوں کی باتیں کرتیں جو وہ توں پہلے ماضی کا حصہ بن چکی تھیں۔ پرنس ماریا اپنے بچپن، اپنی ماں، اپنے باپ اور اپنے خوابوں کی باتیں کرتی اور ماشا نے، جو گئے دنوں میں تنہیم کے لاپرواہانہ اور پراٹھینان فہدان کے باعث ریاضت ورتوئل کی زندگی اور سچی ایثار کی شہریت سے کموں دور بھاگتی رہی تھی، یہ محسوس کرتے ہوئے کہ اب وہ پرنس ماریا کے ساتھ چاہت کے رشتے میں بندھ چکی ہے اپنے ماضی سے بھی محبت کرنا اور زندگی کا وہ پہلو بھی، جس کا ازیں مشتر اس کے ذہن میں کوئی تصور نہیں تھا، سمجھنا سیکھ لیا۔ اس نے یہ کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ عاجزی اور نفس کشی کا اطلاق اپنی ذات پر بھی ہونا چاہیے کیونکہ وہ دوسری قسم کی سرستیں ڈھونڈنے کی عادی ہو چکی تھی، تاہم جب اسے یہ اوصاف، جو ماضی میں اس کے لیے ناقابل تفہیم تھے، دوسری میں نظر آئے، وہ انہیں سمجھنے اور ان پر دیدہ دل شمار کرنے لگی۔ جہاں تک پرنس ماریا کا تعلق ہے، اس نے جب ماشا سے اس کے بچپن اور اوائل عمری کے قصے سنے، اس کی نگاہوں کے سامنے بھی زندگی کا نیا پہلو۔ زندگی اور اس سے لطف اندوز ہونے میں یقین آشکار ہو گیا۔ جو پہلے کبھی اس کی سمجھ میں نہیں آیا تھا۔

وہ اب بھی اس کا ذکر کرنے سے اجتناب برتن تھیں کیونکہ انہیں یہ خوف دامن گیر رہتا تھا کہ اپنے رنج و جلیل جذبات کو الفاظ کا جامہ پہن کر وہ انہیں غم کر دیں گی (انہیں یہی محسوس ہوتا تھا)۔ مگر اس خاموشی کا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ وہ آہستہ آہستہ سے بھولنے لگیں (حالانکہ اگر کوئی دوسرا شخص ان سے یہ بات کہتا، تو انہیں کبھی یقین نہ آتا)۔

ماشاکے ماضی اور اس کے جسمانی اعتبار سے تنی کمزور ہو گئی تھی کہ ان سب کو اس کی صحت کی فکر لگی رہتی تھی اور اس

کی اس فکر سے وہ بہت خوش ہوتی تھی۔ مگر بعض اوقات اس پر نہ صرف موت بلکہ بیماری، خراب صحت اور اپنی خوبصورتی سے محروم ہونے کا خوف غالب آ جاتا۔ جب کبھی اس کی نظر اپنے برہنہ بازو پر پڑتی اور اسے بخور دیکھتی، وہ اس کی باغری پر ششدر رہ جاتی، یا پھر جب وہ صبح کے وقت آگینے میں اپنا مہین، زرد اور پیلا چہرہ دیکھتی، اسے یہ بالکل بھیاںک نظر آتا۔ وہ سوچتی کہ اسے ایسا ہی ہونا چاہیے لیکن اس کے باوجود بے پایاں اداسی اس کا گھراؤ کر لیتی۔

ایک روز جب وہ جلد جلد سڑھیاں چڑھ رہی تھی، اس کا دم پھول گیا۔ چشم رون میں اسے نیچے اترنے اور تیزی سے دوبارہ اوپر چڑھنے کا بہانہ مل گیا۔ وہ اپنی توانائی کا امتحان لینا اور نتیجہ دیکھنا چاہتی تھی۔

ایک اور مرتبہ جب اس نے دنیا کا بدلنا چاہا، بڑی بوڑھیوں کی طرح اس کی آواز لرزے اور جھٹکتی گئی۔ اسے اسے (حالانکہ اسے اس کے قدموں کی آواز سنائی دے رہی تھی) پاٹ دار آواز سے پکارا جس سے وہ گانا گایا کرتی تھی اور خود ہی اپنی آواز کو دھیان سے سنا۔

اسے نہ شبہ ہوا اور نہ اس کے خیال میں یہ ممکن تھا لیکن کچھ کی ناقابل عبور تہ کے نیچے، جس نے اس کی روح کو ڈھانپ رکھا تھا، پہلے ہی گھس کی نرم و نازک کوٹلیں پھوٹنا شروع ہو گئی تھیں۔ اس کوہوں نے پھل پھول کر اپنی جائیداد شاہی سے اس کے غم و اندوہ کو، جو اس کو بچے بوجھ تلے دبائے ہوئے تھا، اس طرح ڈھانک لینا تھا کہ اس نے نظروں سے اوجھل ہو جانا اور بالآخر فراموش ہو جانا تھا۔ زخم اندر سے مندل ہونا شروع ہو گیا تھا۔

جنوری کے اختتام پر پرنس ماریا ماسکورو اندہ ہو گئی اور کاؤنٹس نے اصرار کیا کہ وہ بھی اس کے ساتھ چلی جائے اور وہاں ڈاکٹروں سے مشورہ کرے۔

4

روسی فوج فرانسیسیوں پر ٹوٹ پڑنے، ان کا رستہ کاٹنے وغیرہ کے لیے بے قرار ہو رہی تھی۔ کوٹوروف نے اسے روکنے کی بہتری کوشش کی لیکن اس کا کچھ بس نہ چلا۔ چنانچہ ویاژنیا میں تصادم ہو گیا۔ اس تصادم کے بعد فرانسیسی دوبارہ بھاگنے اور روسیوں کا تعاقب کرنے لگے، مگر کرمانیا تک دونوں کے مابین کوئی لڑائی نہ ہوئی۔ فرار کی رفتار تھی تیز تھی کہ روسی فرانسیسیوں کا ساتھ نہ دے سکے اور پیچھے رہ گئے۔ سواروں اور توپ خانوں کے گھوڑے بیمار پڑنے اور ہلاک ہونے لگے، اور فرانسیسیوں کی نقل و حرکت کے بارے میں جو اطلاعات موصول ہوئی تھیں، وہ ناقابل اعتبار ہوتی تھیں۔

تقریباً ستائیس میل فی یوم کے لگاتار سفر نے روسیوں کا آج کل کا کچھ مرگال رہ گیا تھا کہ وہ اس سے زیادہ تھک جاسکی نہیں سکتے تھے۔

روسی فوج تھکاوٹ سے کتنا مذہال ہو چکی تھی، اس کا اندازہ لگانے کے لیے صرف اس حقیقت کی اہمیت کا اعتراف کرنا ضروری ہے کہ تاروتیو سے روانگی کے موقع پر اس کی فہری ایک تھکی۔ مگر راستے میں صرف پانچ ہزار

فراہ ہلاک یا زخمی ہوئے اور ایک سو سے کم قیدی بنے، لیکن جب یہ کراسنایا پہنچی، اس کی تعداد صرف پچاس ہزار رہ گئی تھی۔

روسی تعاقب کی تیز رفتاری ہماری فوج کے لیے اتنی ہی تباہ کن تھی جتنا کہ فرانسیسیوں کا فراہان کی فوج کے لیے تھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ روسی فوج کا سفر رضا کارانہ تھا، فرانسیسی سپاہ کی طرح اس کے سر پر کامل تباہی کی کوادر نہیں لٹک رہی تھی۔ پھر جو روسی اپنی فوج سے ہچکڑ جاتے، وہ اپنے ہی لوگوں کے مابین موجود ہوتے۔ اس کے برعکس جو فرانسیسی پیچھے رہ جاتے، وہ دشمن کے ہتھے چڑھ جاتے۔ پولین کی سپاہ میں جو تخفیف ہو رہی تھی، اس کی بڑی وجہ اس کی نقل و حرکت کی تیزی تھی۔ اس کا ناقابل تردید ثبوت یہ ہے کہ روسی فوج میں بھی اس سے ملتی جلتی تعداد میں کی دفع ہو رہی تھی۔

تاریخ نویس اور دیانما کی طرح کوٹوزوف کی تمام صداقتیں اور توانائیاں، جہاں تک اس کا بس چلتا تھا، اس امر پر مرکوز تھیں کہ فرانسیسیوں کی نقل و حرکت کی مہلک رفتار میں کسی قسم کی کوئی کھنڈت نہ ڈالی جائے (حالانکہ پیٹرز برگ کے حکام اور فوج کے جنرل یہی چاہتے تھے)، بلکہ اسے مزید تیز کیا جائے اور اپنی فوج کی نقل و حرکت کی رفتار میں کمی لائی جائے۔

برقی رفتار پیش قدمی کے باعث فوجیوں کو جس طرح کی تھکاوٹ برداشت کرنا پڑی اور جو نقصانات برداشت کرنا پڑے، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ رفتار میں پہلے کی سی تیزی برقرار نہ رہی لیکن رفتار کو کم کرنے کے لیے کوٹوزوف کے ہاتھ ایک اور وجہ بھی آ گئی۔ روسی فوج کا اہم مقصد فرانسیسی فوج کا تعاقب تھا۔ مگر وہ کون سی سڑک اختیار کریں گے، یہ کسی کو معلوم نہیں ہوتا تھا۔ چنانچہ ہماری سپاہ ان کے جتنا زیادہ قریب پہنچتی تھی، اسے اتنا ہی زیادہ وقفہ دے کرنا پڑتا تھا۔ فرانسیسیوں کے تعاقب میں ان کے اور اپنے مابین کچھ فاصلہ رکھ کر ہی وہ ان ٹیز می میز می لکیروں کے بیچ، جو غنیمت بناتا جا رہا تھا، سیدھا راستہ نکال سکتی اور اس تک پہنچ سکتی تھی۔ ہمارے جنرل جتنی بھی بڑا کارانہ چاہیں تجویز کرتے تھے، ان میں جوانوں کو ایزادی سفر طے کرنے پر مجبور ہونا پڑتا تھا حالانکہ واحد معقول طریقہ یہ تھا کہ انہیں کم سے کم فاصلے کا سفر کرنا پڑے۔ ماسکو سے وٹا تک ساری مہم کے دوران میں کوٹوزوف کی تمام تر مساعی کا مقصد اسی قسم کا طریقہ کار وضع کرنا رہا۔ وہ یہ کام بے قاعدگی یا وقفوں وقفوں سے نہیں، بلکہ اتنے تسلسل سے کر رہا تھا کہ اس نے ایک بار بھی اس سے انحراف نہ کیا۔

کوٹوزوف استدلال با علم (سائنس) کے بل پر نہیں، بلکہ اپنے کاٹا روئی قلب و روح سے وہی کچھ جانتا اور محسوس کرتا تھا جو ہر روسی عسکری جانتا اور محسوس کرتا تھا کہ فرانسیسی پٹ پٹکے ہیں، دشمن فراہ ہو رہا ہے اور اسے لازماً (وطن کی سرزمین سے) باہر دھکیل دینا چاہیے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ اسے اپنے عام فوجیوں کی طرح اس صدمہ و مشکلات کا بھی اندازہ تھا جو ایک ایسی مہم نے کھڑی کر دی تھیں جس کی سال کے اس موسم میں تیز رفتاری کی مثال دھوٹے سے نہیں ملتی۔

مگر اب جب کہ کسی قسم کی معرکہ آرائی بھیانک اور بے معنی چیز بن چکی تھی، جرنیل (خاص طور پر وہ جو ردی نہیں تھے)، جو اپنا قد بڑھا نا، دنیا کو ششدر کرنا اور کسی نہ کسی وجہ سے ایک آدھ بادشاہ یا ڈیوک کو گرفتار کرنا چاہتے تھے، رائے دینے لگے کہ لڑائی کرنے اور کسی نہ کسی پر فتح پانے کا یہ انتہائی سوزوں وقت ہے۔ جب وہ بکے بعد مگرے مختلف قسم کی چالیں چلنے کی تجاویز پیش کرتے، کو تو زوف ٹھٹھل کندھے جھٹک کر وہ جانتا کیونکہ ان کے منصوبوں کو جن عسکریوں نے عملی جامہ پہنا تھا، ان کے پاس مناسب جوتے تھے نہ مناسب کپڑے، وہ نیم ناقد کشی میں مبتلا تھے، لڑائی کے بغیر ان کی تعداد کم ہو کر نصف رہ گئی تھی اور انھیں سرحد تک پہنچنے کے لیے اس مسافت سے، جو وہ پہلے ہی طے کر چکے تھے، کہیں زیادہ طویل مسافت ماننا تھی۔

جرنیوں کی اپنی ٹوپوں میں سرخاب کے پرگانے، چالیں چلنے، دشمن میں جھپٹے اور اس کا راستہ منقطع کر کے کی یہ خواہش اس وقت خاص طور پر نمایاں ہو کر سامنے آئی تھی جب روسیوں کی اللہ نافر، نیسی فوج سے ٹھو بھڑ ہو جاتی تھی۔

یہی کچھ کر سنایا میں ہوا۔ انھیں امید تھی کہ یہاں انھیں فرانسیسیوں کے تین کالوں میں سے ایک مل جائے گا، لیکن کرنا خدا کا یہ ہوا کہ یہاں ان کا ٹکراؤ خود بخود یمن سے ہو گیا جو سولہ ہزار کی نفری کے ساتھ سز کر رہا تھا۔ کو تو زوف نے اس تباہ کن تصادم سے بچتے اور اپنے دستوں کو محفوظ رکھنے کی ہری کوشش کی لیکن اس کے باوجود تھکاوٹ سے بھر رردی فوج کے جوان تین دن تک فرانسیسیوں کے بے ترتیب غول کا قتل عام کرتے رہے۔

فوج نے تشنیم و ترتیب کا منصوبہ تحریر کیا: ”پہلا کالم فلاں فلاں مقام کی طرف پیش قدمی کرے گا۔“ ذخیرہ ذخیرہ۔ اور حسب معمول کچھ بھی منصوبے کے مطابق نہ ہوا۔ پرنس یوہین آف درٹم برگ پہاڑی سے فرانسیسیوں کے ہجوم پر، جو اس کے قریب سے بھاگے جا رہے تھے، مسلسل فائرنگ کرتا رہا۔ اس نے ٹک ٹک کی لیکن یہ ٹک نہ آئی۔ روسیوں سے بچنے کے لیے فرانسیسی خربزہ ہو گئے۔ وہ رات کو جنگل میں جا چپے اور جہاں تک ممکن ہو پھر کاٹ کر فرار ہوتے رہے۔

میسوراد ووج نے۔ جو اپنے کو *chevalier sans peur et sans reproche* کہلاتا تھا اور جسے فرانسیسیوں کے ساتھ مذاکرات کرنے کا بڑا شوق تھا، جو ہمیشہ اعلان کرتا رہا تھا کہ اسے اپنے دستوں کے رسد کے معاملات میں قطعاً کوئی دلچسپی نہیں ہے اور جو، جب کبھی اس کی ضرورت پیش آتی، کہیں ملتا ہی نہیں تھا، اس کے پاس اپنے اچھی نیچے اور ان سے مطالبہ کیا کہ وہ اپنے ہتھیار ڈال دیں۔ وہ وقت ضائع کرتا اور اسے جو حکام دیے گئے تھے، انھیں عملی جامہ پہنانے سے گریز کرتا رہا۔

”لڑو، میں یہ کالم تمھیں تحفظ پیش کرتا ہوں،“ اس نے گھوڑے پر اپنے سواروں کے قریب پہنچ کر اور اس کی توجہ فرانسیسیوں کی جانب مبذول کراتے ہوئے کہا۔

اور سو اپنے استخوانی گھوڑوں کو، جو بمشکل قدم اٹھ سکتے تھے، مہینوں، ور شمشیروں سے ٹپو کے لگاتے کالمی طرف، جو انھیں تحفظ پیش کیا گیا تھا، گرتے پڑتے بڑھے۔ اور یہ کالم کیا تھا؟ برف گزیدہ، نرودت زدہ اور فاقہ کش فرانسیسیوں کی بے ترتیب بھیڑ تھی اور اس کالم نے، جو انھیں تحفظ پیش کیا گیا تھا، جھٹ پٹ اپنے ہتھیار پھینکے اور اسیری کے لیے رضا مند ہو گئے کیونکہ وہ یہ کام بد توں سے کرنا چاہتے تھے۔

کراسنایا میں انھوں نے چھبیس ہزار قیدی اور سینکڑوں گن جن میں پکڑیں۔ ایک چھڑی بھی ان کے ہاتھ آئی۔ انھوں نے آؤدیکھانہ تار، ایک جھپکنے میں اسے "عصائے مارشل" کا نام دے دیا اور آپس میں بھگڑنے لگے کہ نمایاں ترس کا ذکر کی کس کی رہی ہے۔ اگرچہ انھیں افسوس تھا کہ وہ نیولین، کسی مارشل یا اسی طرح کے کسی ہیرو کو گرفتار نہیں کر سکے ہیں وراپنی اس ناکامی کے لیے وہ ایک دوسرے، بالخصوص کوٹوزوف کو، مورد الزام ٹھہراتے تھے، پھر بھی وہ اپنے کارنامے پر پھولے نہ مہاتے تھے۔

یہ اشخاص، جو اپنے جذبات کی رو میں بہہ گئے تھے، انتہائی پر مدلل قانون جبر کے کور چشم آکے کار تھے لیکن اپنے آپ کو ہیرو تصور کر رہے تھے اور سمجھ رہے تھے کہ وہ انتہائی قابل تحسین اور شاندار کام سرانجام دے رہے ہیں۔ کوٹوزوف پر عانیہ نکتہ چینی کرتے تھے اور کہتے تھے کہ وہ مہم کے آغاز ہی سے انھیں نیولین کو سیامیٹ کرنے سے روکتا رہا ہے، اسے اپنی نفسانی خواہشات پورا کرنے کے علاوہ اور کسی چیز میں دلچسپی نہیں، وہ کپڑوں کے کارخانوں کے قریب و جوار سے آگے جانے کو تیار نہیں ہوتا کیونکہ اسے وہاں بہت آرام محسوس ہوتا ہے، اس نے کراسنایا میں پیش قدمی اس سے روک دی تھی کیونکہ جب اسے معلوم ہوا کہ نیولین خود وہاں موجود ہے، اس کے اوسان بالکل ہی خطا ہو گئے، اس کی غائبی اس کے ساتھ خفیہ مفاہمت ہو گئی ہے اور وہ اس سے رشوت وصول کر چکا ہے، وغیرہ وغیرہ۔

کوٹوزوف کے صرف معاصرین ہی جذبات کی رو میں بہہ کر اس قسم کی گفتگو نہیں کرتے تھے، متاخرین اور تاریخ نے نیولین کو تو سر آنگھوں پر بٹھایا ہے اور اسے grand کہا ہے۔ جہاں تک کوٹوزوف کا تعلق ہے، اس کے بارے میں غیر ملکیوں کا توئی یہ ہے کہ وہ مکار و بد چمن، حیاش اور محقق و نزار سازی درباری تھے لیکن خور روسیوں کے نزدیک وہ نہر اللہ اللہی تھے نہ اللہ اللہی، وہ اسے محض کٹھ پتلی سمجھتے ہیں اور اسے صرف اس سے مفید مطلب گردانتے ہیں کیونکہ اس کا نام مردی تھا۔

1812-1813 کے دوران میں کوٹوزوف پر سنگین غلطیاں کرنے کے الزامات کھلم کھلا لگائے جاتے رہے۔ امپراطور اس سے ناخوش تھا۔ اور تاریخ کی ایک ہزارہ ترین کتاب، جو اعلیٰ ترین حکام کے ایماء پر لکھی گئی تھی، کہہ گیا کہ کوٹوزوف مکار و درباری دروغ گو تھا، نیولین کا نام سنتے ہی اس کے پیٹے پھوٹنے لگتے تھے اور اس نے کراسنایا اور ہیرزینا میں جن

مہلک غلطیوں کا ارتکاب کیا، اس کا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ ردی فوج کو فرانسیسیوں پر فتح پانے سے جو شان و شوکت حاصل ہوتی، وہ اس سے محروم ہو گئی۔

یہ ہے مقدر، عظیم اشخاص۔ grands hommes۔ کانٹن جنھیں ردی ذہن قبول نہیں کرتا بلکہ انھیں چنے اور مام تہا انت نون کا، جو مشیت ایزدی کا اور اک کرنے کے بعد اپنی مشیت کو اس کے تابع بنا دیتے ہیں۔ انھیں شخص اس لیے جو ہم کی نفرت و حقارت کا نشانہ بننا پڑتا ہے کیونکہ انھیں اعلیٰ تر قوانین کا شعور ہوتا ہے۔

یہ بات کتنی عجیب اور ہوناک ہے کہ ردی مورخین تاریخ کے تھیریزیں آلہ کار نہ لیں تو، جو بلا دینی کے دونوں میں بھی انسانی عزت و وقار سے بے رحمی رہا، بڑھ چڑھ کر تعریف و تحسین کرتے ہیں اور اس پر جی جان سے فدا ہوتے ہیں، لیکن انھیں کو تو زوف۔ وہ شخص جس نے 1812 کے دور میں اپنے نرائٹس کی اننگی کے سلسلے میں شروع سے آخر تک، بارودینو سے ولتا تک، گفتار اور کردار کے اعتبار سے ایک مرتبہ بھی اپنے آپ سے بے وفائی نہیں کی، جو ایثار اور قربانی ذات کی ایک ایسی مثال پیش کرتا ہے جو تاریخ میں شاد و نامدار ہی ملتی ہے اور موجود واقعات کی مستقبل میں کیا اہمیت ہوگی، اس کا حال میں درک کرتا ہے۔ انھیں کو تو زوف کوئی پسیکسی اور قابل رحم چیز نظر آتا ہے اور جب وہ اس کا اور 1812 کا ذکر کرتے ہیں، ہمیشہ یہی محسوس ہوتا ہے کہ ان واقعات کے بارے میں وہ قدرے منفعل اور شرمسار ہیں۔

(مورخین کے) اس (ردیہ) کے باوجود کسی ایسی تاریخی ہستی کا، جس نے اپنی ساری صلاحیتیں اور قوتیں اسے استقلال اور تسلسل سے واحد ہدف کے حصول پر لگا دی ہوں، ہر اس لگانا محال ہے اور کسی ایسے ہدف کا، جو پوری قوم کے لیے سرمایہ افتخار اور اس کے منشا سے اتنا اہم آہنگ ہو، تصور تو اور بھی مشکل ہے۔ پھر تاریخ میں کسی مثال تو شاید ڈھونڈنے سے بھی نہ ملے کہ کسی تاریخی شخصیت کا ہدف اتنی کامیابی سے مکمل ہوا ہو جتنا کہ وہ ہوا، جس پر کو تو زوف نے اپنی تمام سماعی مرکز کر رکھی تھیں۔

کو تو زوف نے کبھی، اس قسم کی بڑ نہیں ہانگی کہ ”چالیس صدیاں اہرام سے نیچے جھٹک رہی ہیں“ نہ اس نے کبھی ان قربانیوں کا، جو اس نے وطن کی خاطر دیں، ذکر کیا اور نہ اس نے کبھی یہ بتایا کہ وہ کیا کر چکا ہے یا اس کا کیا کرنے کا عزم ہے۔ اصولاً وہ کبھی اپنے متعلق بات نہیں کرتا تھا وہ نڈل کی پیتا تھا اور نہ بے کی کوشش کرتا تھا۔ وہ ہمیشہ انتہائی سیدھا سادا اور عام آدمی دکھائی دیتا تھا، اپنی بیٹیوں اور مدام ڈیہل کے نام خطوط لکھتا رہتا تھا، نادلوں کی درق گردانی کرتا تھا، خوب روخوانی کی صحبت پسند کرتا تھا، جریلوں، افسروں اور سپاہیوں کے ساتھ ایسی مذہبی کرتا تھا اور جو لوگ اس کے ساتھ بحث کرنے کی کوشش کرتے تھے، کبھی ان کی تردید نہیں کرتا تھا۔ جب کاؤنٹ دستوب چن سریت گاڑی دوڑانا یا وڈاپل پر کو تو زوف کے پاس پہنچا، اپنی رہنمائی سے اس کو کی چٹنی کا محرم ٹھہرایا اور کہا: ”آپ نے وعدہ نہیں کیا تھا کہ آپ لڑائی کے بغیر ماسکو سے ہاتھ نہیں اٹھائیں گے؟“ اگرچہ ماسکو پہلے ہی ترک کیا جا چکا تھا، کو تو زوف نے جواب دیا: ”میں لڑائی کے بغیر ماسکو سے ہاتھ نہیں اٹھاؤں گا۔“ جب

آراک چیف ذرا کا یہ پیغام لے کر پہنچا کہ بریالوف کو نوپ خانے کا سربراہ مقرر کر دینا چاہیے، کو تو زلف نے جواب دیا ”ہاں، میں بھی یہی سوچ رہا تھا۔“ حالانکہ ایک ٹائیپسٹر وہ اس کے بالکل الٹ کہہ چکا تھا۔ مگر ستوپ جن ماسکو کی تباہی ویر بادی اس کے کھاتے میں ڈالتا تھا، تو اس سے اس کی صحت پر یا خود ستوپ جن کی صحت پر کیا اثر پڑتا تھا؟ یہ بات کہ نوپ خانے کا سربراہ کو تو مقرر ہوتا ہے، اس کے نزدیک اس کی اہمیت تو در بھی کم تھی۔

اس مرد ضعیف نے۔ جسے زندگی کے تجربے نے یہ یاد کرادیا تھا کہ خیالات اور الفاظ اپنے الی انصر کا اظہار کرنے کے لیے انہوں کی مدد ضرور کرتے ہیں لیکن انھیں عمل پر آمادہ نہیں کرتے۔ اوپر کی مثالوں میں ہی نہیں اس طرح کی بے معنی باتیں یا الفاظ نہیں کہے بلکہ جب کبھی ضرورت پیش آتی، وہ اس قسم کی پھل جھڑیاں اور شگوفے، جو سب سے پہلے اس کے ذہن میں وارد ہو جاتے تھے، چھوڑتا رہتا تھا۔

لیکن اس امر کے باوجود کہ یہ آدمی الفاظ کے استعمال کے بارے میں اتنا غیر محتاط تھا، اس نے اپنے فرائض کی انجام دہی کے دوران میں اپنی زبان سے ایسا ایک لفظ بھی نہ کہا جو اس مقصد وحید سے، جس کے حصول کے لیے وہ جنگ کے سارے عرصے میں کام کرتا رہا تھا، مطابقت نہ رکھتا ہو۔ اگرچہ اسے یہ تلخ یقین تھا کہ وہ جو کچھ کہے گا، اسے سمجھا نہیں جائے گا اور وہ اپنے اصل خیالات کا اظہار کرنے میں محتال بھی رہتا تھا، اس کے باوجود اس نے انتہائی مختلف حالات میں ایک سے زیادہ مرتبہ ان کا اظہار کرنے میں کوئی ہچکچاہٹ نہ دکھائی۔ اس کے اس رویے کی ابتدا بارودینو کی لڑائی سے ہوتی ہے۔ وہ واحد شخص تھا جو یہ دعویٰ کرتا تھا کہ بارودینو کی لڑائی میں روس کو فتح حاصل ہوئی ہے۔ وہ مرتے دم تک اس ادعا سے دست بردار نہ ہوا اور اس کا زبانی اور اپنے مراسلوں اور رپورٹوں میں بار بار اعادہ کرتا رہا۔ وہ واحد شخص تھا جو سرعام کہتا تھا کہ سقوط ماسکو سقوط روس نہیں ہے۔ اس کی جو تجاویز لوغستان سے کر آیا تھا، ان کا اس نے یہ جواب دیا۔ صلح کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کیونکہ اس وقت میری نوم کی مرضی یہی ہے۔ فرانسیسیوں کی پسپائی کے دوران میں وہ واحد شخص تھا جو یہ کہتا تھا: ہماری چالیس بے سود ہیں، ہرگز ہماری خواہشات سے بڑھ کر خود بخود تکمیل کے مرحلے طے کر رہی ہے: یہ کہ ہمیں دشمن کو ”پل زریں“ پیش کرنا چاہیے (اور انھیں اپنے آپ کو خود ہی تباہ کر لینے دینا چاہیے) یہ کہ تار دینیو، دیا ز ما اور کراسنایا کی لڑائیوں میں سے کسی کی بھی ضرورت نہیں تھی: یہ کہ مرحلہ تک پہنچنے کے لیے ہمیں اپنی زیادہ سے زیادہ فٹری بچانا چاہیے اور یہ کہ وہ دس فرانسیسیوں کے عوض ایک بھی روسی کی قربانی نہیں دے گا۔

اور یہ درباری، جیسا کہ ہمیں بتایا جاتا ہے کہ وہ بس یہی کچھ تھا، جو زار کو خوش کرنے کے لیے آراک چیف کے سامنے دروغ گوئی سے کام لیتا ہے، وہ واحد شخص تھا جس نے دلنا میں یہ کہا۔ حالانکہ اپنی اس بات سے اسے راز کی ناراضگی مول لینا پڑی۔ کہ مرحلہ پار جنگ کا سلسلہ جاری رکھنا بیکار اور ضرور رساں ہے۔

یہ کہ اس نے اپنے زمانے میں واقعات کی اہمیت کا ادراک کر لیا تھا، اس کا ثبوت محض اس کے الفاظ سے ہی نہیں ملتا۔ اس کے تمام اعمال۔ کسی قسم کے خفیف ترین انحراف کے بغیر۔ واحد اور سہ جہتی مقصد کے حصول کے

لیے وقف تھے (1) فرانسیسیوں کے ساتھ ٹکر لینے کے لیے اپنی تمام فوج کو ایک مقام پر مجتمع کرنا (2) انہیں شکست دینا اور (3) انہیں روڈس سے باہر نکالنا۔ اور اس کی کوشش یہی رہی کہ عوام الناس اور فوج کو حتی الوسع کم سے کم مصائب سے دوچار ہونا پڑے۔

اس تاخیر پسند کو تو زوف نے، جس کا ماٹو ”مہر و تکل در وقت“ تھا اور جو حالانہ اور ناماقبت اندیشانہ کارروائیوں کا کٹر مخالف تھا، بارودینو میں دشمن کا ڈٹ کر مقابلہ کیا اور اس عقیدے کے لیے بے مثال شہیدگی سے تیار ہاں کہیں۔ یہ کو تو زوف، جس نے اوسٹریٹس کا معرکہ چاہنے سے پہلے ہی یہ اعلان کر دیا تھا کہ اس میں ہمیں شکست ہوگی، واحد شخص تھا جو، جرنیوں کے اس یقین کے، کہ بارودینو میں ہمیں شکست کا سد رکھنا پڑا اور اس حقیقت کے، کہ فتح حاصل ہونے کے باوجود فوج کو پسپا ہونا پڑا، علی الرغم اور ہر شخص کی رائے کے خلاف آخر دم تک یہ دعویٰ کرتا رہا کہ بارودینو میں ہمیں کامیابی ملی ہے۔ وہ واحد شخص تھا جو پسپائی کے دوران میں یہ اصرار کرتا رہا کہ اب لڑائیاں لڑنے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا، لہذا ان سے استراحت واجب ہے، نئی جنگ شروع نہیں ہونا چاہیے اور روڈس کی سرحدوں کے پار نہیں جانا چاہیے۔

سب جب کہ یہ تمام واقعات اور ان کے نتائج و عواقب ہمارے سامنے ہیں، ان کی معنویت سمجھنا آسان ہے لیکن شرط یہ ہے کہ ہم ان مقاصد کو، جو زیادہ سے زیادہ ایک درجن اشخاص کے اذہان میں موجود تھے، عوام الناس سے منسوب کرنا چھوڑ دیں۔

پھر یہ کیسے ممکن ہوا کہ یہ بوڑھا شخص واحد آدمی تھا جس نے عمومی رائے کی مخالفت کرتے ہوئے قوم کے لیے واقعات کی معنویت کو اتنے صحیح طریقے سے سمجھ لیا کہ اپنی ملازمت کے دوران میں اس نے ایک مرتبہ بھی اس سے روگردانی نہ کی؟

اپنے زمانے کے واقعات کی صحیح تفہیم کرنے کی اس غیر معمولی صلاحیت سے وہ اس لیے بہرہ ور ہوا کیونکہ اس نے جس جذبے سے اپنی قوم کی مشکلوں اور احساسات سے اپنے آپ کو ہم آہنگ کیا، وہ پائیدار ہوتے تھا۔ چونکہ عوام الناس نے اس معتبوب بوڑھے شخص کے اندر اس جذبے کو پہچان لیا تھا، اس لیے انہوں نے زار کی خور ہشات کے علی الرغم اسے اس عجیب و غریب انداز سے قومی جنگ میں اپنا نام نہاد منتخب کر لیا اور صرف یہی وہ جذبہ تھا جس نے اسے بلند ترین انسانی مقام پر پہنچا دیا جہاں سے اس، کمانڈر انچیف، نے اپنے تمام اختیارات لوگوں کو قتل یا ملیا میٹ کرنے کے لیے نہیں، بلکہ انہیں بچانے اور ان پر ترس کھانے کے لیے وقف کر دیے۔

اس سیدھے سادے، منکسر المزاج اور چٹانچرخ معنوں میں عظیم انسان کو یورپی ہیرو لوگوں کے نام نہاد رہنما کے سانچے میں، جو تاریخ کی ایجاد ہے، نہیں ڈھالا جاسکتا۔ چیچوں اور کاسہ لیسوں کے نزدیک کوئی آدمی بھی عظیم نہیں ہو سکتا کیونکہ چیچوں اور کاسہ لیسوں کے عظمت کے اپنے تصورات ہوتے ہیں۔

5 نومبر اس لڑائی کا، جسے کراسنایا کی لڑائی کہا جاتا ہے، پہلا دن تھا۔ اس روز جرمنیوں کو جن مقامات پر متعین کیا گیا تھا، وہاں تو نہ گئے لیکن آپس میں خوب الجھتے اور تو تو میں میں کرتے رہے، اور ایجنٹوں کو متضاد حکام دے کر دھڑا دھڑ بھجتے رہے۔ یوں کرتے کرتے شام آگئی اور یہ بالکل واضح ہو گیا کہ دشمن ہر جگہ رادفرار اختیار کر رہا ہے، چنانچہ لڑائی ہو سکتی ہے اور نہ ہوگی۔ جب حالت نے یہ اختیار کیا، کو تو زوف نے کراسنایا کو خیر باد کہا اور ویرا چلا گیا، جہاں اس روز ہیڈ کوارٹر منتقل کر دیا گیا۔

اس روز پار تو خوب پڑا تھا لیکن مطلع صاف تھا۔ کو تو زوف اپنے قریب کوتاہ قامت سفید گھوڑے پر سوار تھا۔ اس کے پیچھے پیچھے آزرده اور نامطسین جرمنیوں کی فوج ظفر صوج تھی۔ وہ سب شاف میں شامل تھے۔ ان کے منہ لٹکے ہوئے تھے اور وہ آپس میں چہ میگوئیاں کرتے آ رہے تھے۔ سڑک کے ساتھ ساتھ فرانسیسی (اس روز سات ہزار کی گرفتاری عمل میں آئی تھی) ٹولیوں کی صورت میں پڑاؤ کے اداؤں کے ارد گرد سڑے بیٹھے تھے، درہنگ باپ رہے تھے۔ دبرایا کے قریب مفلوک الحال قیدیوں کا بہت بڑا گروہ سڑک کے کنارے فرانسیسی توپوں کی طویل قطار کے سامنے کھڑا تھا۔ ان قیدیوں کے جو کچھ بھی ہاتھ لگا، انھوں نے اسے اپنے ابدان کے ارد گرد پیٹ لیا تھا، ان سے اپنے زخموں پر پٹیاں باندھ لی تھیں۔ ان کی باتوں کی بھنبھتاہٹ دور سے سنائی دے رہی تھی۔ کمانڈر انجیف کی آمد پر وہ سب خاموش ہو گئے اور تمام نگاہیں کو تو زوف پر مرکوز ہو گئیں۔ کو تو زوف کے سر پر سفید ٹوپی، جس پر سرخ ربن آویزاں تھا، رکھی ہوئی تھی۔ اس کے جسم پر اور در کوٹ تھا۔ اس اور در کوٹ میں اون بھری ہوئی تھی اور اس کے شانے ابھرے ہوئے تھے۔ وہ سڑک پر چھل قدمی کے انداز سے چل رہا تھا اور ایک جرمن اسے بتا رہا تھا کہ تو ہیں اور قیدی کہاں سے پکڑے گئے ہیں۔

معلوم ہوتا تھا کہ کو تو زوف اپنی ادھیڑ بن میں کھویا ہوا ہے اور جو کچھ جرمن کہہ رہا ہے، اسے سن نہیں رہا۔ اس نے ناراضگی کے انداز سے اپنی آنکھیں بھیجنے لیں اور نہایت توجہ اور انہماک سے قیدیوں کو دیکھنے لگا جو خاص طور پر قابلِ رحم منظر پیش کر رہے تھے۔ اکثر قیدیوں کی ناکیں اور رخسار پامال گئے سے خراب ہو چکے تھے اور یوں ان کی شکلیں مسخ ہو رہی تھیں۔ آنکھیں تو تقریباً سبھی کی سرخ اور پھولی ہوئی تھیں، اور زخموں کی وجہ سے ان میں پیپ پڑ چکی تھی۔ فرانسیسیوں کا ایک گروپ سڑک کے بالکل قریب کھڑا تھا اور ان کے دوپا ہی۔ ان دونوں میں سے ایک کا چہرہ پھنسیوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ اپنے ہاتھوں سے کچے گوشت کا پارچہ نوچ رہے تھے۔ انھوں نے جس سرسری انداز سے اپنے پاس سے گزرنے والے سواروں کو دیکھا اور اس سپاہی نے جس کے چہرے پر پھنسیاں ہی پھنسیاں تھیں، جس غضب آلود اور بدخواہانہ طریقے سے ناک بھوں چڑھائی، منہ دوسری طرف پھیرا اور جو کچھ وہ کر رہا تھا، اسے دوبارہ کرنے لگا، اس میں ایک قسم کی حیوانیت پائی جاتی تھی اور اس کے اس رویے کو دیکھ کر دوسروں کو وحشت ہونے لگی۔

کو تو زوف بڑی توجہ سے ورکانی ویرنگ ان دونوں سپاہیوں کو دیکھا رہا۔ اپنے ماتھے پر مزید بل ڈالتے اور آنکھیں مزید بھینچتے اس نے کچھ سوچتے ہوئے اپنا سر ہل دیا۔ ایک دوسری جگہ اس نے ایک دیسی سپاہی کو ہنستے، ایک فرانسیسی سے دوستانہ انداز سے کچھ کہتے اور اس کے کندھے پر تھپکی دیتے دیکھا۔ کو تو زوف نے پٹی دو، رو، رو دی شکل بنائی اور پنا سر ہل دیا۔

”کیا؟ کیا کہا آپ نے؟“ اس نے جرنیل سے پوچھا جو ابھی تک اپنی رپورٹ سن رہا تھا۔ جرنیل کا ٹڈا بچیف کی توجہ چند پرچموں کی طرف لارہا تھا جو فرانسیسیوں سے چھینے گئے تھے اور پری ابراؤٹینسکی رجسٹر کے سامنے نصب تھے۔

”اٹھا، پرچم!“ کو تو زوف نے بڑی مشکلوں سے اس خیالات کو جن میں مستغرق تھا، جھٹکتے ہوئے کہا۔ اس نے بے دھیانی سے اپنے گرد و پیش دیکھا۔ چاروں اطراف سے ہزاروں نگاہیں اسے ٹھٹھکی ہاندھے دیکھ رہی تھیں۔ سبھی لوگوں کو توقع تھی کہ وہ کچھ نہ کچھ ضرور کہے گا۔

وہ پری ابراؤٹینسکی رجسٹر کے سامنے رک گیا۔ اس نے آہ بھری اور اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ ٹاف کے ایک رکن نے سپاہیوں کو، جو پرچم تھامے کھڑے تھے، آگے آنے اور انھیں کمانڈر بچیف کے آس پاس نصب کرنے کا اشارہ کیا۔ کو تو زوف چند سیکنڈ خاموش رہا اور پھر بڑی بے دلی سے ان فرمائش کے سامنے، جو اس کی حیثیت نے اس پر عاید کر دیے تھے، جھٹکتے ہوئے اس نے اپنی گردن اوپر اٹھائی اور تقریر کرنے لگا۔ سردوں کے ہجوم نے اس کے ارد گرد گھیراؤں لیا۔ اس نے ان لوگوں کے حلقے کو بغور دیکھا اور ان میں سے کئی ایک کو پہچان لیا۔

”میں آپ سب کا شکریہ ادا کرتا ہوں!“ اس نے سپاہیوں سے مخاطب اور سردوں کی جانب دوبارہ توجہ ہو کر کہا۔ اس کے چاروں اطراف جو سکوت چھایا ہوا تھا، اس میں اس کے الفاظ واضح طور پر سائی دے رہے تھے۔ ”آپ لوگوں نے جس جاں نشانی اور وفاداری سے خدمات سرانجام دی ہیں، میں اس کے لیے آپ سب کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ فتح مکمل ہو گئی ہے اور روس آپ کو فراموش نہیں کرے گا۔ میری خدائے دعا ہے کہ وہ آپ کو سدا ایسے ہی عز و وقار اور شان و شکوہ سے سرفراز کرتا رہے!“

وہ رکا اور اس نے اپنے ارد گرد نگاہ دوڑائی۔

”نیچے کرو، اسے سر سمیت نیچے کرو!“ اس نے ایک سپاہی سے کہا جس نے فرانسیسی جھنڈا جو پکڑے ہوئے تھا اور جس پر فرانسیسی نشان، عقاب، کندہ تھا نادانستہ پری ابراؤٹینسکی رجسٹر کے پرچموں کے سامنے جھکا دیا تھا۔ ”اسے اور نیچا کرو، ورنہ ہاں، یہ ہوئی نہ بات، جو انو ہتر!“ اس نے اپنی ٹھوڑی کو تیزی سے اوپر اٹھ گھماتے سپاہیوں سے مخاطب ہو کر کہا۔

”ہتر۔ ہتر۔ را!“ ہزاروں فلک شگاف آوازیں گونجنے لگیں۔

جب سپاہی نعرے لگا رہے تھے، کو تو زوف اپنی زمین پر آگے کی طرف جھکا اور اس کی آنکھوں میں نرم دھام

اور قدرے طنزیہ چمک آگئی۔

”جوانو، مجھے...“ غبرے بازی ختم ہونے پر اس نے کہا۔

ایچانک اس کی آواز اور چہرے کے تاثرات تبدیل ہو گئے۔ اب کے کمانڈر اچیف نہیں بلکہ ایک عام آدمی بول رہا تھا، جو اپنے ساتھیوں کو کوئی اہم بات مانا چاہتا تھا۔

افسردہ کے ہجوم اور جوانوں کی صفوں میں عام ہل چل نمودار ہو گئی۔ وہ کچھ کہنا چاہتا تھا، اسے سننے کے لیے سبھی ہمتیں گمش ہو گئے۔

”جوانو، مجھے معلوم ہے کہ تمہیں مشکلات کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے لیکن کیا کیا جائے، اس کا کوئی علاج نہیں۔ ہمت اور حوصلے سے کام لیں۔ یہ مصیبتیں اب زیادہ عرصہ نہیں رہیں گی۔ ہم اپنے مہمانوں کو رخصت کر دیں گے اور پھر ہم آرام کریں گے۔ زار تمہاری خدمات فراموش نہیں کریں گے۔ بے شک تمہیں مصائب جھیننا پڑے ہیں لیکن پھر بھی تم اپنے وطن میں ہو، جب کہ یہ۔ تم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہو کہ ان کا کیا حشر ہوا ہے۔“ اس نے قیدیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”ان کی حالت گئے گزرے سے گئے گزرے سے بھکاری سے بھی بدتر ہے۔ جب یہ طاقت ور تھے ہم نے ہار نہیں مانی، مگر اب ہم ان پر ترس بھی کھ سکتے ہیں۔“ سخریہ بھی انسان ہیں۔ کیا خیال ہے، جوانو؟“ اس نے اپنے گرد و پیش دیکھا اور جو کچھ اس نے کہا تھا، اسے اس کے ساتھ ان پر استقلال، مؤدب اور متعجب نظروں میں ہمدردی چھلکتی دکھائی دے گی۔ کیرتی کے نرم و لطیف جسم سے اس کا چہرہ روشن سے روشن تر ہوتا جا رہا تھا اور اس کے اس جسم سے اس کی آنکھوں اور ہونٹوں کی رگیں کچھ اس طرح کھینچ گئیں کہ وہاں ستاروں کے جھرمٹ کی طرح جھریاں اکٹھا ہو گئیں۔ وہ رک گیا اور اس نے اپنے سر کو یوں جھکا لیا جیسے اس کی سمجھ میں نہ آ رہا ہو کہ کیا کہے اور کیا نہ کہے۔

”تاہم پھر بھی سوال پیدا ہوتا ہے کہ انہیں یہاں بلایا کس نے تھا؟ ان کے ساتھ جو ہوا، ٹھیک ہوا۔“ وہ ہڑا۔“ اس نے چانک اپنی گردن اوپر اٹھا کر با آواز بلند کہا۔

اور پوری مہم کے دوران میں وہ پہلی مرتبہ اچانک لہراتے اور سر پٹ گھوڑا دوڑتے وہاں سے آگے نکل گیا۔ اس کے عقب میں جوانوں نے منہیں توڑ ڈالیں اور وہ کھلکھلا کر ہستے اور زور زور سے ”ہڑا“ کے نعے بلند کرنے لگے۔ کوئزرف کے الفاظ عام سپاہیوں کے بمشکل چلنے پڑے تھے۔ لیڈ مارشل نے کیا کہا تھا، کوئی بھی شخص اسے جتنی طور پر بھی انداز سے دہرا نہیں سکتا تھا۔ لوگوں کو اس اتنا معلوم تھا کہ اس کی تقریر کا آغاز نہایت سنجیدہ اور گہمراہ انداز سے ہوا تھا لیکن آخر میں اس نے بوڑھے آدمی کی کھلی ڈلی اور بے ریا باتوں کی صورت اختیار کر لی تھی۔ لیکن اس تقریر کے مین السطور جو خلوص جھٹک رہا تھا اور اس میں پر شکوہ کامیابی کا جو احساس شامل تھا، اس میں دشمن کے لیے جو رحم کا جذبہ اور ہمارے مقصد کے برحق ہونے کا شعور۔ جس کا اظہار پیرانہ سال شخص نے اسے سوز و انداز سے نیک دلائل و شام کے ذریعے کیا تھا۔ شامل تھا، اسے نہ صرف سمجھ لیا گیا بلکہ وہ ہر سپاہی کے اپنے دل کی آواز بھی تھا اور انہوں نے

اس کا اظہار پر سرت نعروں سے کیا جوتا دیر جاری رہے۔

جب بعد ازاں ایک جرنیل نے کمانڈر انچیف سے دریافت کیا: ”آپ کی کالاش مشینوں کی بات؟“ جو بے دینے کی کوشش میں کوتاہی کی، جو بہت متاثر دکھائی دیتا تھا ہلکی ہلکی گئی۔

7

کراٹیا کی لڑائی کے آخری روز، آٹھ نومبر کو، جب لشکر کی شب بیری کے لیے اپنی عارضی قیام گاہوں میں واپس آئے، ٹھٹ پٹے کا وقت ہو رہا تھا۔ سارا دن ہوا بند رہی اور پالا حمر رہا تھا۔ بچ بچ میں ہلکی ہلکی برف باری بھی ہوتی رہی تھی۔ شام کے قریب مٹھ صاف ہونے لگا۔ برف کے گالوں کے درمیان میں سے سیاہ، ارغوانی، ستاروں بھرا آسمان نظر آنے اور سردی میں اضافہ ہونے لگا۔

پیادہ بندو قچیوں کی ایک رجمنٹ، جو تاروتینو سے تین ہزار افراد کی نفری کے ساتھ روانہ ہوئی تھی، درجس کی تعداد صرف نو سو رہ گئی تھی، عارضی قیام گاہ (شہرہ کے کنارے ایک گاؤں) میں سب سے پہلے پہنچی تھی۔ جن کو انٹر ماسٹروں نے رجمنٹ کا استقبال کیا، انھوں نے بتایا کہ تمام جھونپڑے مردہ اور غلیل فرانسیسوں، گھڑسواروں اور سٹاف افسروں سے کچھ بچے بھرے ہوئے ہیں، صرف رجمنٹ کا گھر کے لیے ایک جھونپڑا خالی ہے۔

کرٹل نے گھوڑا اڑھایا اور اس جھونپڑے میں چلا گیا۔ رجمنٹ پیادہ گاؤں میں سے گزرتی آخری جھونپڑوں کے قریب پہنچی وہ وہاں اپنے ہتھیاروں کا ڈھیر لگا دیا۔

کسی عظیم الجثہ اور کثیرالاعضاء عفریت کی طرح رجمنٹ اپنا ٹھٹ بنانے اور کھانا تیار کرنے لگی۔ سپاہیوں کی ایک یونٹ گرتی پڑتی، گھٹنوں گھٹنوں برف میں دھنسی، گاؤں کے مشرق میں جنگل کی طرف چل پڑی۔ کچھ ہی دیر کے بعد وہاں سے کلہاڑیوں اور تلواروں کے ساتھ ضربیں لگانے، بھونکنے کے نیچے گرنے اور مس ہنس کر ہنس کرے کی آوازیں آنے لگیں۔ دوسری یونٹ رجمنٹ کے پھلکڑوں اور گھوڑوں کے، مین، جنھیں ایک جگہ اکٹھا کر دیا گیا تھا، دے گئے، دررکس بسکٹ نکالتے اور جانوروں کو چارہ پیسٹا کھلانے میں مصروف ہو گئی۔ دوسری یونٹ گاؤں میں کھڑی۔ اس کے جواں سٹاف افسروں کے لیے رہائش کا بندوبست کرنے، فرانسیسوں کی مائیں باہر گھسیٹنے، مال ڈھلانے کے لیے تختے اور خشک لکڑی ڈھونڈنے، اور یوں توں اپنی پناہ گاہیں کھڑی کر کے لیے چھتوں سے شہنشاہ ڈنڈے، سارے اور گھاس پھوس کھدینے لگے۔

گاؤں کے آخری سرے پر جھونپڑوں کے عقب میں تقریباً پندرہ سپاہی ایک سائبان کی، جس کی چھت پہلے ہی اتاری جا چکی تھی، ٹھٹ کی خاصی اونچی دیوار ہلانے جلانے اور گھٹنے مزاحمت سے چھٹے چدنے میں مصروف تھے۔ ”جیسا ہیا، زور لگاؤ بھینا، زور لگاؤ، سب مل کر زور لگاؤ“ وہ سب چیخ چلا رہے تھے، دررات کی تاریکی میں، خاصی بڑی دیوار، جس میں برف اور پالا جما ہوا تھا، جھولنے اور چرچانے لگی۔ اس کے زیریں ڈنڈوں کی چٹانے پانچ

میں ہر س اٹھانے لگا۔ بالآخر دیوار میں بوس ہو گئی اور اس کے ساتھ ہی وہ سپاہی بھی، جو اس کے ساتھ زور آزمائی کر رہے تھے، نیچے گر پڑے، اونچی چیخیں بند ہوئیں اور ان کے بعد ہر شور قہقہے گونجنے لگے۔

”دور مل کر پکڑو!۔ یہاں ذرا چھید کر دو!۔ بس ٹھیک ہے۔ یہ تم دھکے کیوں دے رہے ہو؟“

”ہاں، سب مل کر! نہیں، ذرا ٹھہرو۔ کچھ گانا نا بھی ہونا چاہیے۔ کیا خیال ہے، دوستو؟“

کبھی خاموش ہو گئے۔ ایک نرم دگر، ز، مخمیس اور شیریں آواز گونجی اور گانا گانے لگی۔ تیسرے بند کے اختتام پر جب ’سردھیم‘ ہو، اور آواز چپ ہو گئی، تیس آوازیں بیک وقت چٹکھاڑنے لگیں، ”اور۔ اور۔ اور۔ اور، یہ کھسنے لگی ہے اسبل کر! زور لگاؤ، دوستو، زور لگاؤ!“

لیکن ان کی متحدہ کوششوں کا کوئی خاص نتیجہ برآمد نہ ہوا، ٹھٹھ بڑبشکل ایک آدھ گچ کھسکایا جاسکا اور اس کے بعد جو خاموشی چھٹی، اس میں ان کے ہاپنے کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔

”چھٹی کمپنی والو، شیطانو، روز خیو، کہاں جا رہے ہو تم؟ یہ تم کھڑے منہ کیا تک رہے ہو!۔ ذرا ہاتھ دلاؤ کبھی تمہیں بھی ہماری ضرورت پڑے گی۔“

چھٹی کمپنی کے تقریباً بیس جوان، جو گاؤں کی طرف جا رہے تھے، ان کے ساتھ شامل ہو گئے اور جعفری کی تقریباً پینتیس فٹ لمبی ورسات فٹ اونچی دیوار گاؤں کی گلی میں گھسیٹی جانے لگی۔ دیوار ڈگر گارہی، ہنپتے آدمیوں کو اپنے بوجھ تلے دبا رہی اور ان کے کندھوں کو چھلنی کے لیے جا رہی تھی۔

”چلتے چلو، چلتے چلو، چلو!۔ دیکھو، تمہارے ہاتھ سے چھوٹ رہی ہے۔ رک کیوں گئے؟ ہاں ٹھیک ہے۔“ شگفتہ اور بے سخی مغالطات کا سلسلہ رکنے میں نہیں آ رہا تھا۔

”یہ کیا ہو رہا ہے؟“ سارجنٹ۔ سمجھ کی تھکانہ آواز گونجی۔ وہ اتنا قابو جھٹھکتے آدمیوں کے سروں پر پہنچ گیا تھا۔ ”یہاں شاف کے لوگ موجود ہیں، خود بڑے جرنیل اس جھونپڑے میں تشریف فرما ہیں۔ ہر زبانو، شیطانو میں تمہیں سبق سکھا دوں گا!“ اس نے چلاتے ہوئے کہا اور جواولین شخص اس کی زد میں آیا، اس نے پوری قوت سے اس کی پشت پر گھونر سید کر دیا۔ ”کیا تم شور شرابا کم نہیں کر سکتے؟“

جوانوں کو سانپ سونگھ گیا اور ان کی زبانیں گنگ ہو گئیں۔ جس شخص نے گھونر کھایا تھا، اس نے اپنے نون آلہ چہرے پر ہاتھ بھیرا، گھونر نکلنے سے وہ منہ کے بل ٹھانڈے سے نکل گیا تھا اور یوں اس نے اپنا چہرہ پھیل پھیلایا تھا۔ ”اس شیطان کے بچے کو گھونر مارنا آتا ہے۔ میرا منہ ہولناک ہو گیا ہے!“ اس نے سارجنٹ سمجھ کے جانے کے بعد ڈرے سے انداز سے سرگوشی کرتے ہوئے کہا۔

”تمہیں اچھا نہیں لگا؟ یہ بھی خوب رہی!“ کسی نے اس کا مذاق اڑاتے ہوئے کہا اور سپاہی زہرے بولنے آگے ہی آگے چلتے رہے۔

تاہم جب وہ گاؤں سے باہر نکل گئے، وہ پہلے کی طرح پھر زور شور سے بولنے اور بچ بچ میں دی ہے مئی

گالیاں اگلنے لگے۔

وہ جس جھوپڑے کے سامنے سے گزرے تھے، وہاں افسران اعلیٰ جمع تھے اور بڑے ذوق و شوق سے دن بھر کے واقعات پر تبصرہ آرائی کر رہے اور اگلے روز کی چائیں سوچ رہے تھے۔ دائرے کا راستہ کاٹنے اور اسے گرفتار کرنے کے لیے بائیں جانب فلیٹک ہارچ کی تجویز پیش کی گئی تھی۔

جس وقت شکری جعفری کی دیوار گھسیٹ کر اپنے لیے پر پتہ، کھانا پکانے کے لیے جگہ جگہ آگے بڑھ رہی تھی، لکڑی چٹخنے اور برف پکھلنے لگی تھی۔ پڑاؤ میں برف پاؤں تلے روندی جا چکی تھی اور دھرا دھر گھومتے پھرتے سپاہیوں کے سائے رقص کر رہے تھے۔

جا بجا کھانڈیاں اور تیشے چل رہے تھے۔ سب کچھ احکام کے بغیر ہو رہا تھا۔ رات کے لیے لکڑیوں کے ڈھیر لگائے جا چکے تھے۔ افسروں کے لیے عارضی پناہ گاہیں کھڑی کی جا چکی تھیں، پانی بنانے کے لیے دیگھے بڑھائے جا چکے تھے اور ہتھیار اور دوسرا سامان ترتیب سے رکھا جا چکا تھا۔

شہلی ہوا سے بچنے کے لیے آٹھویں کیسی کے جوانوں نے جعفری کی دیوار نیم رزے کی شکل میں کھڑی کر دی اسے سہارا دینے کے لیے اس کے ساتھ دستی بندوقیں ایستارہ کر دی گئیں اور اس کے سامنے لاکھڑا دیا گیا۔ (10 بجے) رات کی نوبت بجا دی گئی، حاضری لگائی گئی، کھانا کھایا گیا اور وہ رات گزارنے کے لیے آگ کے لیے اور گردا کھٹے ہونے لگے۔ کچھ لیٹ گئے، کچھ اپنے جوتے مرمت کرنے، کچھ پائپ پینے اور بعض آگ کی تپش میں جوتے مارنے کے لیے اپنے کپڑے اتارنے لگے۔

8

ان ایام میں جب روسی سپاہیوں کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ ان کے پاس گرم پٹوں اور پوستنی کوٹوں کی کمی تھی، منی اٹھارہ درجہ حرارت³ میں سردیوں پر چھت ناپید تھی اور کئی اوقات ناکانی خوراک حتیٰ تھی کیونکہ ٹکڑے سرد تیز رفتاری میں فوج کا ساتھ نہیں دے سکتا تھا۔ ایسے میں آدمی کو خیال آتا ہے کہ وہ بے پناہ افسردگی اور دل شکنگی کا منظر پیش کرتے ہوئے گئے۔

لیکن صحیح صورت حال اس کے بالکل برعکس تھی۔ فوج جس رندہ دلی اور شگفتگی کا مظاہرہ کر رہی تھی، وہ اس نے کبھی بہترین عسکری اور مادی حالات میں بھی نہیں کیا ہوگا۔ اس کی وجہ یہ حقیقت تھی کہ وہ اٹھائیس، جو کئی درجے دکھاتے یا کم حوصلگی کا مظاہرہ کرتے تھے، آئے روز فوج سے بچھڑتے رہتے تھے اور اب صرف وہ لوگ، جو جسمانی اور اخلاقی لحاظ سے سپاہ کے ماتھے کا جھومر تھے، باقی رہ گئے تھے۔

کسی اور جگہ کی نسبت آٹھویں کمپنی کے ٹھکانے کے عقب میں کہیں زیادہ لشکری جمع تھے۔ ان کے ساتھ دسار حٹ

مبھڑ بیٹھے تھے اور دوسروں کے متھے میں ان کا اناؤ کھیں زیادہ شدت سے بھڑک رہا تھا۔ پناہ کے پیچھے بیٹھے کا استحقاق حاصل کرنے کے لیے سوختنی لکڑی لانا ضروری تھا۔

”ارے، کیف، تم کہاں گم ہو گئے تھے۔ بیٹھو ہر کے ہتھے تو نہیں چڑھ گئے تھے؟ جاؤ اور مزید لکڑیاں لانا۔“ ایک سپاہی ہے، جس کا چہرہ اور لباس سرخ تھے، چلاتے ہوئے کہا۔ دھوکے کی وجہ سے وہ اپنی آنکھیں میز می می کر رہا اور انھیں برق رفتاری سے جھپکا رہا تھا لیکن آگے سے پیچھے نہیں ہٹ رہا تھا۔ ”اور تم، Jackdaw، تم بھی تو کچھ لانا۔“ اس نے ایک اور سپاہی پر عرب گانٹھتے ہوئے کہا۔

سرخ بالوں والا شخص نہ تو سار جنت تھا اور نہ کارپورل۔ لیکن چونکہ وہ سخت جان اور جنگش تھا، اس لیے دوسروں پر، جو اس سے کمزور تھے، عرب جھاڑتا اور حکم چھاتا رہتا تھا۔ وہ آدمی، جسے Jackdaw کہا گیا تھا، دبا پٹا درپست قامت تھا، اور اس کی ناک تیکھی اور سخت تھی۔ وہ فرماں برداری سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور حکم کی تعمیل میں جایا ہی چاہتا تھا کہ آگ کی روشنی میں لکڑیاں ٹھٹھائے ایک نوجوان سپاہی کا چہرہ اور خوبصورت جسم نظر آ گیا۔

”ادھر لے آؤ۔ یہ ہوئی نایات۔“

انھوں نے لکڑیوں کے ٹکڑے کیے، آگ پر ان کا ڈھیر لگایا، پھر ان پر پھونکیں مارنے اور اپنے اور کونوں کے کونوں سے انھیں ہوا بھانے لگے۔ شعلے سب سے اور لکڑیاں جتنے لگیں۔ سپاہی آگ کے قریب ہو گئے اور اپنے پائپ جلائے لگے۔ نوجوان خوب رو سپاہی، جو لکڑیاں لایا تھا، دونوں ہاتھ کولھوں پر رکھے اس جگہ، جہاں وہ کھڑا تھا، پھرتی اور مستعدی سے اپنے ٹھنڈے پاؤں پیٹنے لگا۔

”آہ، پیاری، سن، شبنم ٹھنڈی اور شفاف ہے، لیکن بندوچی کے لیے، وہ گانا گانے لگا لیکن لفظ کے ہر ٹکڑے پر یوں آواز نکالتا جیسے وہ گانیں بلکہ کھانس رہا ہو۔“

”ارے ارے، دیکھو، تمہارے تیلے پرواز کیا چاہتے ہیں؟“ سرخ بالوں والے شخص نے چلاتے ہوئے کہا۔ اس نے دیکھ لیا تھا کہ رقاص کے ایک جوڑے کا تالا ڈھیل ہو چکا ہے اور پھڑ پھڑا رہا ہے۔ ”کیا زبردست ناچا ہے؟“ رقاص رک گیا، اس نے تیلے کا ڈھیل ٹکڑا اکھیچ کر الگ کیا اور آگ میں پھینک دیا۔

”دوست، تم ٹھیک تھے؟“ اس نے کہا۔ وہ نیچے بیٹھ گیا، اپنے تھپے سے فرانسیسی نیپے کپڑے کی کترن نکالی اور اسے اپنے پاؤں کے اوپر باندھ لیا۔ ”ان کا ستیا ناس بھاپ میں ہوتا ہے؟“ اس نے اپنے پاؤں آگ کی طرف بڑھاتے ہوئے مزید کہا۔

”وہ مفرب ہمیں نئے دینا شروع کر دیں گے۔ وہ کہتے ہیں کہ انھیں، ایک دفعہ گھساؤ تو سہی، پھر وہ دودھ نئے ہانٹ دیں گے۔“

”تمہیں معلوم ہے کہ وہ کتے کا تخم پیو تراف واقعی پیچھے رہ گیا ہے؟“ ایک سار جنت مبھڑنے کہا۔

کوئے سے ملتا جلتا سیاہ اور خاکستری پرندہ

ساقی انٹرنیٹ کتب

PDF BOOK COMPANY



Muhammad Hushain Syakir

0305-6406067

Sidrah Tahir

0334-0120123

Muhammad Saqib Riyaz

0344-7227224

”میں اتنا عرصہ اس کی نگرانی کرتا رہا،“ دوسرے نے جواب دیا۔
”خیر، وہ بالکل نکمہ سپاہی تھا۔“

”سنا ہے کہ کل صبح کے دوران میں تیسری کمپنی کے نو آدمی غائب تھے۔“
”جب آدمی کے پاؤں جم کر برف ہو جائیں، وہ چسپاں کیسے؟“
”کیا؟ احتمالاً باتیں مت کرو!“ سار جنت میجر نے کہا۔

”شاید تم بھی یہی سوچ رہے ہو!“ ایک بوڑھے آدمی نے اس شخص کی، جس نے برف گزید، پاؤں کا ذکر کیا تھا، سرزنش کرتے ہوئے کہا۔

”آپ کا کیا خیال ہے؟“ تیکسی ٹاک والے شخص نے، جسے Jackdaw کہتے تھے، اچانک آگ کی دوسری جانب سے اپنی گردن اٹھاتے جھپٹتی اور لرزتی آواز میں کہا۔

”گر آدمی فرہ اور صحت مند ہو، وہ ان حالات میں دبلا ہو جائے گا، لیکن وہ جو پہلے ہی مارا گیا، وہ مرے گا نہیں تو ور کیا کرے گا! اب مجھے ہی دیکھ لیں، مجھ میں ڈرا سی جان باقی نہیں رہی!“ اس نے ایک دم بڑی دلیری کا مظاہرہ کرتے ہوئے سار جنت میجر سے کہا۔ ”انھیں کہیں کہ وہ مجھے ہسپتال بھیج دیں۔ گھٹے سے میرا جوڑ جوڑ درد کر رہا ہے۔ اب میں دوسروں کا مزید ساتھ نہیں دے سکتا۔“

”چھوڑو یا، کافی کچھ کہہ لیا ہے،“ سار جنت میجر نے اطمینان سے جواب دیا۔

سپاہی چپ ہو گیا اور اس نے مزید کچھ نہ کہا۔ باتوں کا سلسلہ چلا رہا۔

”آج بے شمار فرانسیسی پکڑے گئے ہیں، لیکن ان میں سے ایک کے بھی پاؤں میں وہ، جسے آپ اصلی بوٹ کہتے ہیں، نہیں تھا۔“ ایک سپاہی نے گفتگو کا نیا موضوع چھیڑتے ہوئے کہا۔

”ان کے بوٹ قازقوں نے چھین لیے ہیں۔ ہم کرنل کے لیے جھوپڑے کی صفائی کر رہے تھے اور ادھر وہ اس کام میں مصروف تھے۔ انھیں دیکھ کر بڑا ترس آتا تھا۔“ رقصاں نے کہا۔ ”وہ جب انھیں الٹا پلٹا رہے تھے، معلوم ہوا کہ بھی ایک زندہ ہے۔ کیا آپ یقین کریں گے کہ وہ اپنی بولی میں کچھ بڑبڑا رہا تھا۔“

”مگر وہ صاف ستھرے لوگ ہیں،“ پہلے آدمی نے اپنی بات جاری رکھی۔ ”میں کی رنگت بالکل سفید ہے۔ برنج کے تے کی طرح سفید۔ اور بعض تو اتنے اچھے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے کہ شراف ہیں۔“

”تو تمہیں کیا توقع تھی؟ وہاں ہر طبقے کے لوگ فوج میں بھرتی کیے جاتے ہیں۔“

”لیکن ہم جو کچھ کہتے ہیں، اس کا ایک لفظ بھی ان کے منہ نہیں پڑتا۔“ رقصاں نے ہنس کر کہا۔

”جیسے اس کی سمجھ میں نہ آ رہا ہو کہ ایسا کیوں ہے۔“ میں نے اس سے پوچھا کہ تمہارا بادشاہ کون ہے؟ اور وہ جواب

میں صرف بڑبڑاتا رہا۔ عجیب لوگ ہیں!“

”یہ تو واقعی بڑی عجیب بات ہے،“ اس شخص نے، جو اس کی سفید رنگت پر حیران پریشان ہوا تھا، اپنی بات

جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”موڑ بیک کے آس پاس کے کسان بتا رہے تھے کہ انھوں نے مردوں کو دفنانا شروع کر دیا ہے۔ تمہیں بتا ہی ہے کہ وہاں لڑائی ہوئی تھی۔ خیر، یہ مردے وہاں پورے ایک مہینے سے پڑے تھے، اور کسان نے مجھے بتایا۔ ”بھائی“ یہ کاغذ کی طرح صاف ستھرے اور سفید ہوویں۔ ان کے جسموں سے باریک کی پونچھے آؤسے پر دوسری بو کوئی نہ آؤسے۔“

سب چپ تھے۔

”یہ ان کی غذا کے سبب ہوگا،“ سر رہنمائی مہجر نے کہا۔ ”وہ شیرادوں کی طرح رہتے تھے۔“ کسی نے اس کی تردید نہ کی۔

”موڑ بیک کا وہ کسان، جہاں لڑائی شروع ہوئی تھی، ہمیں بتا رہا تھا کہ دس گاؤں سے آدمی بلائے گئے ہیں، انھیں مردے ڈھونڈتے ڈھونڈتے بیس بائیس دن ہو گئے ہیں اور وہ ابھی تک ان سب کو اٹھ نہیں سکے۔ اور بے بھیڑیے، وہ کہتا تھا۔“

”وہ اصلی لڑائی تھی،“ ایک بوڑھے سپاہی نے کہا، ”یاد رکھنے کے قابل۔ مگر اس کے بعد۔ اس کے بعد کچھ بھی نہ رہا صرف دکھاوے کی لڑائیاں ہو رہی ہیں۔“

”خیر، دادا، آپ جانتے ہیں کہ کل ہم نے ان کا پیچھا کیا تھا مگر ان کے ساتھ کوئی مقررہ نہ ہو سکا۔ جونکی ہم ان کے قریب پہنچے، وہ ہتھیار بھینکنے اور گھٹنوں پر جھک کر گزرنے لگے۔ ”معافی، معافی!“ وہ چیخ چیخ کر کہہ رہے تھے۔ مگر یہ صرف ایک واقعہ ہے۔ سنا ہے کہ پلاٹوف نے دو دفعہ پولیس کو پکڑ لیا تھا، پر آپ کو معلوم ہے کہ اسے صحیح ظلم نہیں آتا تھا۔ وہ اسے پکڑ ضرور لیتا تھا، مگر وہ اس کے ہاتھ نہیں آتا تھا، کچھ پکھیر وین جاتا تھا اور پھر سے اڑ جاتا تھا۔ اور اسے مارنے کی کوئی صورت نہیں۔“

”کائس لیف، تمہاری شکل بتاتی ہے کہ تم پر لے درجے کے جھوٹے ہو۔“

”کیا مطلب، جھوٹا؟ ہونہا! یہ سولہ آنے ٹھیک ہے۔“

”خیر، اگر وہ میرے ہاتھ آ جاتا، میں اسے ضرور پکڑ لیتا، ورنہ اسے زمین میں گاڑ دیتا، بالکل اسی طرح جس طرح کھونٹا گاڑا جاتا ہے۔ ذرا سوچو، اس کی وجہ سے کتنے لوگ مرے ہیں!“

”چھوڑ دیا، اب ہم تھک رہے ہیں، اب وہ یہاں دوبارہ نہیں آئے گا،“ ایک معرپاہی نے جمالی لیتے ہوئے کہا۔

گنگو سست پڑنے لگی اور سپاہی مونسے کی تیاریاں کرنے لگے۔

”ان ستاروں کو دیکھو، کیسے چمک رہے ہیں! معلوم ہوتا ہے کہ غورتوں نے دھبے ہوئے کپڑے سوکھنے کے لیے آسمان پر بچھ دیے ہیں،“ ایک جوان نے کہکشاں کو دیکھ کر اپنے تعجب کا اظہار کیا۔

”بیٹے، یہ اس بات کی نشانی ہے کہ اگلے سال فصل خوب ہوگی۔“

”ہمیں سمجھ اور کلکڑی کی ضرورت پڑے گی۔“
 ”چچا گرم کر دو تو آگ بجھنے لگے ہے، عجیب سی صورت ہے۔“
 ”اف، خداوند!“

”یہ تم دھکے کیوں دے رہے ہو؟ آگ صرف تمہارے لیے ہے؟ ہونہ، کیسے بچ کر بڑا ہوا ہے!“
 اس کے بعد جو خاموشی چھائی، اس میں ان لوگوں کے، جو سو گئے تھے، خزانے کو بچنے لگے۔ دوسرے اپنے
 آپ کو گرم رکھنے کے لیے پہلو بدلتے رہے اور کبھی کبھار آپس میں ایک آدھ غلط کامیابی کر لیتے۔ کوئی سونامی کے
 فاصلے پر ایک اور آلہ تھا۔ وہاں سے خوش ہواش تھپتھپوں کی زبردست گونج آتی سنائی دی۔
 ”اس پانچویں کمپنی کو دیکھو، کیسے دھاڑ رہے ہیں!“ ایک سپاہی بولا۔ ”اور ہیں بھی کتنے زیادہ۔“
 ایک آدمی اٹھا اور پانچویں کمپنی کی طرف چل دیا۔
 ”وہاں بڑی رونق لگی ہوئی ہے،“ اس نے واپس آ کر کہا۔ ”کہیں سے دو فرانسیسی آگئے ہیں۔ ایک کی تو قتل
 جم چکی ہے۔ دوسرا بڑا چمک رہا ہے، گانے گا رہا ہے، واقعی!“
 ”واہ، چلو چل کر دیکھتے ہیں۔“
 دوسرا سپاہی پانچویں کمپنی کی طرف چل پڑے۔

9

پانچویں کمپنی کا پڑا جنگل کے عین کنارے پر تھا۔ برف کے بالکل بچ میں زبردست الاؤ چل رہا تھا۔ وہ اس نے
 درختوں کی شاخوں کو، جنہیں منجھد شبنم نے ڈھانک رکھا تھا، منور کر دیا تھا۔
 آدھی رات کے قریب پانچویں کمپنی کے جوانوں کو برف پر قدموں کی رپ رپ اور شاخوں کی تڑائی پڑتی
 سنائی دی۔

”دوستو، رہ پچھا!“ ایک آدمی نے کہا۔

آوازیں سننے کے لیے سب کے کان کھڑے اور گردنیں اوٹنی ہو گئیں۔ آگ کی حیر روشنی میں دو انڈی ٹینکس،
 جو عجیب و غریب ملبوسات میں مستور تھیں اور ایک دوسرے کے ساتھ جڑی ہوئی تھیں، دکھائی دیں۔
 وہ دونوں فرانسیسی تھے اور جنگل میں چھپے ہوئے تھے۔ وہ آگ کے قریب آگئے اور بیٹھی ہوئی، آوازوں میں
 کسی کی زبان میں، جو پھپھوس کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی، کچھ کہنے لگے۔ ان میں سے ایک دوسرے سے لہا تھا۔
 اس کے سر پر افسروں کی ٹوپی تھی اور معلوم ہوتا تھا کہ اس کے جسم میں نام کو جان نہیں رہی۔ آگ کے قریب پہنچ کر
 اس نے بیٹھنے کی کوشش کی لیکن زمین پر گر پڑا۔ دوسرا ہٹا کٹا ٹاپ ہی تھا۔ اس نے اپنے سر کے گرد وہل باندھ رکھا
 تھا اور وہ دوسرے سے ٹکڑا تھا۔ اس نے اپنے ساتھی کو اٹھایا اور اس کے منہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کچھ کہا۔

سپاہیوں نے دونوں فرانسیسیوں کو اپنے گھیرے میں لے لیا، بیمار کے نیچے اور کوٹ بچھا دیا گیا اور دونوں کے لیے پورج اور دوڑ کاے آئے۔

درماندہ مضحکہ خیز فرانسیسی افسر کا نام غام باں تھا اور دوسرا شخص جس کے سر کے گرد رومال بندھا ہوا تھا، اس کا اردلی موریل تھا۔

جب موریل دوڑ کا پی چکا اور پورج کھ چکا، وہ چائیک غیر فطری طور پر چھپھانے اور دم لیے بغیر سپاہیوں کے ساتھ باتیں کرنے لگا حالانکہ انھیں مطلق چٹا نہیں چل رہا تھا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ غام بال نے کچھ کھانے سے انکار کر دیا اور کہنی پر سر رکائے آگ کے قریب چپ چاپ لیٹا اور خالی خالی نگاہوں سے روسیوں کو دیکھتا رہا۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ گاہے بگاہے اس کی بسی آہ نکل جاتی اور وہ دوبارہ خاموش ہو جاتا۔ موریل نے اس کے شانوں کی طرف اشارہ کیا۔ وہ سپاہیوں کو سمجھانا چاہتا تھا کہ غام بال افسر ہے اور اسے اپنے جسم کو گرم کرنے کے لیے حرارت کی ضرورت ہے۔ ایک روسی افسر نے، جو پھرتا پھرتا ادھر آ نکلا تھا، یہ دریافت کرنے کے لیے کرنل کے پاس ایک آدمی بھیجا کہ آیا وہ اسے جھونپڑے میں ٹھہرا لے گا تاکہ وہ اپنے جسم کو گرم کر سکے۔ پیغام رساں نے واپس آ کر بتایا کہ کرنل نے حکم دیا ہے کہ فرانسیسی افسر کو اس کے پاس بھیج دیا جائے۔ انھوں نے غام بال سے کہا کہ وہ اس کے ساتھ چل جائے۔ وہ اٹھ کر کھڑا تو ہو گیا، مگر جب اس نے چپنے کی کوشش کی، اس کی ہمت جواب دے گئی اور اس کی ٹانگیں لڑکھڑانے لگیں۔ وہ گرا ہی چاہتا تھا کہ قریب کھڑے ایک سپاہی نے اسے تھام لیا۔

”تو آپ جانا نہیں چاہتے؟“ ایک سپاہی نے غام بال کی طرف تمسخرانہ انداز سے آنکھ مارتے ہوئے کہا۔
”الحق مسخرہ!... یہ مذاق کرنے کا وقت ہے؟ مٹی کے مادھو، عقل کے ناخن لو! تم زے مٹی کے، دھو ہو... میں ٹھیک کہہ رہا ہوں!“ متعدد آوازیں مسخرے سپاہی کو جھڑکتی سنائی دیں۔

انھوں نے غام بال کے گرد حصار بنایا اور سے دو اشخاص کے بازوؤں پر، جو انھوں نے ایک دوسرے کے اوپر آ پار رکھ لیے تھے، نکا دیا۔ وہ اسے اسی طرح اٹھائے جھونپڑے کی طرف چل دیے۔ رستے میں غام بال نے اپنے بازوؤں کی گردنوں میں جھانک کر دیے اور بار بار غم آلود لہجے میں کہنے لگا۔

"Oh, mes braves, oh mes bons, mes bons amis! voila des hommes! Oh, mes braves, mes braves bons amis!"

اور وہ بچے کی طرح ایک شخص کے گلے لگ گیا۔

موریل وہیں بیٹھا رہا۔ وہ ہٹا کٹ پست قامت فرانسیسی تھا۔ اس کی آنکھیں سوچ چکی تھیں اور ان سے پانی بہہ رہا تھا۔ اس کے گلے میں زنا نہ چھتا تھا اور اس نے دیہاتی عورتوں کی طرح اپنی ٹوپی کے گرد رومال باندھ رکھا تھا۔ صاف نظر آ رہا تھا کہ وہ نشے میں ہے۔ اس نے اپنا ایک بازو اپنے قریب پیٹھے سپاہی کے گلے میں ڈال رہا اور

آپ بہت بہادر لوگ ہیں! آپ بہت مہربان اور ہم درد دوست ہیں! صبح سنوں میں مرد ہیں! بہادر، مہربان اور ہم درد دوست!

کھر دہری اور شکستہ آواز میں فرانسسی گیت گائے لگا۔ سپاہی کو لہوں پر ہاتھ رکھائے بغور دیکھ رہے تھے۔
 ”تھہر دو، ذرا ٹھہرو۔ ہمیں سمجھاؤ کہ یہ کیسے چلتا ہے۔ میں بہت جلد اس کا تیز لگا لوں گا! کیسے چلتا ہے؟“
 اس شخص نے کہا۔ وہ خود گویا بھی تھا اور ٹھہرنا بھی۔ جس کے گلے میں موریل نے بازو انکار کئے تھے۔

Vive Henri Quatre,

Vive ce roi vaillant!

موریل نے آنکھ مارتے ہوئے بول اٹھایا۔

Ce diable a quatre...

”Vivarikat Vit-seruvary! Sedyabyaka!...“ سپاہی نے بازو ہراتے ہوئے (بے معنی) نکالی
 میں آواز سے آواز مدائی، لیکن اس نے دھن حقیقتاً سمجھ لی تھی۔

”واہ واہ! خوب، خوب! شاہاش!“ سر زمین کے پر جوش نثرے گونج رہے تھے۔ موریل کے چہرے پر شکنیں
 نمودار ہوئیں اور وہ ان کے ساتھ ہنسنے لگا۔

”ہاں بھائی، گاتے جاؤ! گاتے جاؤ!“

Qui ont le triple talent,

De boire de battre,

Et d'être un vert galant...

”یہ بھی بہت اچھا معلوم ہوتا ہے! ہاں زائیتایف، اب تم۔“

”Kiu...+Kiu...“ زائیتایف نے رکیں پھیلا کر بڑی مشکلوں سے ڈانٹ نکالی۔ ”Kiyu+u+u...“

وہ پورا زور لگا رہا تھا اور اپنے ہونٹ سمیٹتا جا رہا تھا۔

”le-trip-la-la-de-bu-de-bat-eh-de-tra-va-ga-lal!“ وہ گارہ تھا۔

”واہ واہ! کیا بات ہے! بالکل فرانسی کی طرح! واہ!... خوب! کچھ اور کھاؤ گے؟“

”اسے کچھ اور پورج دے دو۔ جب فالتوں پر لوہا آجائے، پھر پیٹ بڑی مشکل سے بھرتا ہے۔“

انھوں نے اسے مزید پورج دے دیا۔ موریل نفس پڑا اور اس نے تیسرا پیانا شروع کر دیا۔ تمام سپاہی اسے
 دیکھ رہے اور خوشی سے دیوانے ہوئے جا رہے تھے۔ بوڑھوں نے اس قسم کی معمولی باتوں میں دلچسپی لینا اپنے وقار

ہنری چہارم (فرانس کے شاہی ماندارن بورغوس کا بانی) زندہ باد، وہ دیر و شہاں بادشاہ، زندہ باد! (فرانسیسی گیت)

وہ مجسم شیطان

وہ سرجہت صلاحیت کا، لک تھا۔

شراب نوشی کے لیے، مردم آزمائی کے لیے،

جان جو کموں میں ڈالنے کے لیے

کے مٹانی تصور کی۔ وہ الاء کی دوسری جانب لیٹے ہوئے تھے، تاہم کبھی کبھار ایک آدھ اپنی کہنی کے سہارے اوپر اٹھتا اور سکر کر موریل پر ایک نظر ڈال لیتا۔

”بہر حال وہ بھی ہمارے جیسے انسان ہیں،“ ایک شخص نے اور کوٹ اپنے جسم کے گرد لپیٹتے ہوئے کہا۔
 ”افسوس کی بھی جڑیں ہوتی ہیں، جیسی وہ پھلتی پھوٹی ہے۔“
 ”میرے مولا! مولا اتنے ستارے! پالے کی نشانیاں...“
 خاموشی چھا گئی۔

ستارے، جیسے انھیں معلوم ہو کہ انھیں کوئی نہیں دیکھ رہا، سیاہ آسمان پر اٹکیں کرتے گئے۔ وہ کبھی ٹھٹھانے، کبھی جھٹھلانے اور کبھی جھگڑانے لگتے۔ یوں نظر آتا تھا جیسے وہ ایک دوسرے سے کسی پرستار کی بات کہتے سنتے مل مصروف ہوں۔

10

فرانسیسی فوج ریاضی کے سلسلہ تدریج کی باتا عددی کے ساتھ آہستہ آہستہ غائب ہوتی جا رہی تھی۔ اور دریائے بیریزنا کو عبور کرنے کے دوران میں وہ جس طرح نیست و نابود ہوئی، اگرچہ اس کے متعلق اتنا کچھ لکھا جا چکا ہے، مگر وہ اس کی بربادی کی محض درمیانی کڑی تھی، ہم کا قطعاً فیصلہ کن واقعہ نہیں ہے۔ اگر اس کے بارے میں اتنا کچھ تحریر کیا گیا ہے یا ابھی تحریر کیا جا رہا ہے، تو جہاں تک فرانسیسیوں کا تعلق ہے، ان کے نزدیک اس کی وجہ محض یہ ہے کہ ان کی فوج کے بعد دیگرے جن آفات و آلام کا سامنا کرتی چلی گئی تھی، وہ دریائے کے شکستہ پل پر اپنا ایک ایک لٹھے میں ایک ایسے لم ناک منظر پر پہنچ ہوئے جو انست انداز سے ذہنوں پر نقش ہو گیا۔ جہاں تک روسیوں کا تعلق ہے، اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ پیٹرز برگ میں۔ جو جنگ کے میدانوں سے اتنا دور تھا۔ پوین کو دریائے بیریزنا کے گیدی پھندے میں پھانسنے کا منصوبہ تیار کیا گیا تھا (اور یہ منصوبہ ایک بار پھر بنوئل نے بنایا تھا)۔ تمام لوگوں کو پکا یقین تھا کہ سب کچھ منصوبے کے مطابق طے پا جائے گا اور اسی لیے وہ یہ اصرار کرتے رہے کہ فرانسیسی فوج صرف دریائے بیریزنا کو عبور کرنے کے دوران میں تباہی سے دوچار ہوئی۔ تاہم حقائق اس کے برعکس ہیں۔ اعداد و شمار سے واضح ہو جاتا ہے کہ فرانسیسیوں کو دریائے بیریزنا عبور کرنے کے دوران میں آدمیوں ورتوپوں کا اتنا اختلاف نہیں اٹھانا پڑا جتنا کہ انھیں کراشنا یا میں برداشت کرنا پڑا تھا۔

دریائے بیریزنا کے واقعے کی واحد اہمیت اس حقیقت میں مضمر ہے کہ اس نے فیصلہ کن ورشک و شبہ سے باہر انداز سے یہ ثابت کر دیا کہ دشمن کی پپنی میں رکاوٹیں ڈالنے کے تمام منصوبے مغالطے پر مبنی تھے اور واضح طور پر عمل یہی تھا کہ حریف کا سامنے کی طرح صرف تعاقب کیا جائے (کوٹوروف اور عام سپانی اسی کو اختیار کرنے کا ایک قسم کی سخت کڑی ہوئی۔

تقاضا کرتے رہے تھے)۔ فرانسیسی جہوم درجہوم بھاگے جا رہے تھے، ان کی رفتار میں ہر آن اضافہ ہوتا جا رہا تھا اور ان کی تمام توانائیاں خاص منزل مقصود تک پہنچنے میں صرف ہو رہی تھیں۔ وہ کسی دشمنی اور کسی کی طرف سے دوڑے جا رہے تھے اور ان کے اس برق رفتار فرار کو روکنا ممکن نہیں تھا۔ اس کی شہادت ان انتظامات سے نہیں جو دیواروں کو عبور کرنے کے لیے کیے گئے تھے، بلکہ جو کچھ پلوں پر ہوا، اس سے ملتی ہے۔ جب ٹی ٹوٹ گئے، غیر مسلح فوجی، ہاسکو سے آنے والے لوگ، عورتیں اور بچے، جو بار برداری کے فرانسیسی قاتلوں کے ہمراہ سفر کر رہے تھے، اعانت قبول کرنے کے بجائے کبھی *Vis inertiae* کے اصول کے تحت ایک دوسرے کو دھکیلتے کشیدیں اور برف سے ڈھکے ہوئے پانی کی طرف تیزی سے لپکتے گئے۔

ان کے بھاگنے کی (اضطرابی) خواہش خالی از معقولات نہیں تھی۔ بھگوڑوں اور متعاقبین دونوں کی حالت یکساں ناگفتہ تھی۔ اپنے ساتھیوں کے ساتھ رہنے کی صورت میں ہر شخص یہ توقع کر سکتا تھا کہ موت ضرورت اسے ان کی مدد حاصل ہو جائے گی اور اسے یہ بھی تسلی تھی کہ وہ اپنی کمر میاں ہے۔ لیکن وہ لوگ، جو روسیوں کے سامنے سپر انداز ہوتے تھے، حالت تو ان کی بھی خستہ ہی رہتی تھی لیکن ان کے ساتھ ایک مزید ستم یہ ہوتا تھا کہ جب ضروریات زندگی کی تقسیم کا وقت آتا، انھیں ٹپا ٹپا سا پرکھا جاتا۔ فرانسیسیوں کو یہ بتانے کی ضرورت نہیں تھی کہ روسی قیدیوں کو بچانے کی خواہ کتنی ہی خواہش کیوں کریں، پھر بھی نصف بھوک اور سردی سے ہلاک ہو رہے ہیں (دیے خود روسیوں کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ ان قیدیوں کا کریں کیا)۔ وہ محسوس کرتے تھے کہ ایسا ہونا ناگزیر ہے، اس کے علاوہ اور کوئی صورت ممکن ہی نہیں۔ انتہائی درد مند اور رحم دل کمانڈر اور دوسرے لوگ، جو قیدیوں کے ساتھ حس سلوک کرنا چاہتے تھے۔ بلکہ وہ فرانسیسی بھی، جو روس کی مذہمت کر رہے تھے۔ اسیروں کے لیے کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ فرانسیسی (قیدی) ان مصائب و مشکلات کی، جن کا سامنا روسیوں کو کرنا پڑ رہا تھا، تاب نہ لا کر نا ہو رہے تھے۔ اپنے بھوکے سپاہیوں کے، جن کی ہمیں ضرورت تھی، مونہوں سے لقمے چھین کر فرانسیسیوں کے۔ بے شک نہ ان سے کسی ضرر کا اندیشہ تھا، نہ ان سے کسی کو نفرت تھی اور نہ ان کا کوئی قصور تھا، سیدھی سادہ بات، اتنی تھی کہ ان کی کسی کو ضرورت نہیں تھی۔ سپرد کرنا ممکن نہیں تھا۔ چند روسیوں نے یہ بھی کر دکھایا لیکن ان کی تعداد نہ ہونے کے برابر تھی۔ فرانسیسیوں کے عقب میں یقینی بربادی تھی، سامنے امید۔ وہ اپنی کشتیاں جا چکے تھے۔ ان کے پاس بھاگنے کے علاوہ نجات کی کوئی اور صورت نہیں تھی اور فرانسیسیوں کی پوری قوت اس، جنگی ارادہ پر مرکوز تھی۔

بچے کھچے فرانسیسی جتنا زیادہ آگے بھاگتے تھے، خاص طور پر ریپے ہیروینا (کے واقعے) کے بعد، جس سے (منصوبہ ہیٹلر بزرگ کے نتیجے کے طور پر) روسیوں نے اتنی امیدیں وابستہ کر رکھی تھیں، ان کی حالت اتنی ہی زیادہ خستہ و خراب ہوتی جاتی تھی اور روسی کمانڈروں کے، جو ایک دوسرے اور بالخصوص کوٹوزوف کو سردار الزم ٹھہرا رہے تھے، جذبات اتنے ہی زیادہ بھڑکتے جاتے تھے۔ ان کمانڈروں کو یہ یقین تھا کہ ہیٹلر بزرگ نے ہیروینا کے سلسلے میں جو منصوبہ بنایا تھا، اس کی ناکامی کا ذمے دار کوٹوزوف کو ٹھہرایا جائے گا، چنانچہ وہ اس پر زیادہ سے زیادہ

اور وہ بھی کھلے عام، عدم اطمینان کا اظہار کرنے اور اسے حقارت و تمسخر کا نشانہ بنانے لگے۔ البتہ اس حقارت و تمسخر کا اظہار مؤدبانہ انداز سے کیا جاتا تھا اور یوں کوٹوزوف کے لیے یہ دریافت کرنا بھی کہ آخر اسے ہی تصور دار کیوں ٹھہرایا جا رہا ہے، ناممکن ہو جاتا۔ وہ اس کے ساتھ سنجیدگی کا رویہ اختیار نہیں کرتے تھے۔ جب وہ اسے کوئی رپورٹ پیش کرتے یا اس سے کوئی منظوری حاصل کرنا چاہتے، یوں معلوم ہوتا جیسے وہ کوئی پر ملاں رسم اد کر رہے ہوں لیکن اس کی پیٹھ پیچھے وہ ایک دوسرے کو آنکھیں مارتے اور قدم قدم پر اسے گمراہ کرنے کی کوشش کرتے رہتے تھے۔

چونکہ یہ لوگ اس بوڑھے آدمی کو سمجھنے سے قاصر تھے، انھوں نے اپنے اس مفروضے کو کہ اس کے ساتھ بات کرنا بیکار ہے، اس مسئلہ تسلیم کر لیا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ ان کے منصوبوں کی گہرائی اور گیرائی تک پہنچنا اس کے بس کی بات نہیں ہے ورنہ اگر اس کے سامنے کوئی تجویز پیش کی جائے تو وہ جو ب میں کسی ”پل زریں“ کا حوالہ دے گا یا یہ کہے گا کہ جیتھز دل میں بلوس لوگوں کے ساتھ سرحد پار کرنے کا خیال بھی ذہن میں نہیں لانا چاہیے، وغیرہ وغیرہ۔ یہ سب کچھ پہلے سن چکے تھے (انھیں اس کی باتیں خالی خالی الفاظ معلوم ہوتیں)۔ جو کچھ وہ کہتا تھا (مثلاً رسم کا انتظار کرنا ضروری ہے یا سپاہیوں کے پاس بوٹ نہیں ہیں)، اتنا سیدھا سا دہوتا تھا اور جب کہ جو کچھ وہ تجویز کرتے تھے، اس پر جج اور پراز ذہانت ہوتا تھا کہ انھیں واضح طور پر یقین ہونے لگا کہ بڑھ پالکل پھوس ہو گیا ہے اور اس کی مست ماری گئی ہے جب کہ وہ خود ناسمجھے ہیں لیکن کیا کیا جائے ان کے پاس قیادت سمجھانے کا اختیار نہیں۔

اور جب ذہین و فطین یڈمرل اور پیٹرز برگ کا ہیرووٹ گین حنائن فوج میں پہنچ گیا، مثلاًف کے ارکان کی یہ ذہنی کیفیت اور الزام تراشیوں کی مہم اپنے عروج پر پہنچ گئی۔ کوٹوزوف یہ سب کچھ دیکھتا تھا لیکن وہ محض آہ بھر کر رہ جاتا یا صرف کندھے اچکا دیتا۔ ہیریزینا کے واقعے کے بعد وہ صرف ایک مرتبہ جلال میں آیا اور اس نے بے گم سین کے نام، جوزار کو علیحدہ رپورٹیں بھیجتا رہتا تھا، مندرجہ ذیل نوٹ تحریر کیا:

یوزاکیسی لیننسی، چونکہ آپ پر بار بار بیماری کے حملے ہو رہے ہیں، اس لیے برائے مہربانی اس خط کے موصول ہونے پر دایس کا لوگا تشریف لے جائیں اور وہاں ٹھہرنے کے بعد خراپہ ریل سمجھنی کے مزید احکام اور پرواہی تقرری کا انتظار فرمائیں۔

لیکن بے شک سین کی موتونی، بھی عمل میں آئی ہی تھی کہ گریڈڈ یوک کونستانتین پاؤلویچ، جس نے ابتدائی مہم میں حصہ لیا تھا اور جسے کوٹوزوف نے فوج سے نکال دیا تھا، آدھکا۔ اس نے آتے ہی کوٹوزوف کو مطلع کیا کہ زار اس بات سخت خفا ہے کہ ہماری افواج کو بالکل معمولی کامیابیاں حاصل ہوئی ہیں اور ان کی پیش قدمی کی رفتار بھی خاصیست ہے۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ خود امپراطور چند دنوں تک فوج کے ساتھ آئے گا۔

بوزہا کوٹوزوف جتنا فوجی امور کا ماہر تھا، اتنا ہی درباری معاملات کا رمز شناس تھا۔ یہی کوٹوزوف سمجھنے

اگست میں راز کی خواہشات کے علی الرغم کمانڈر انچیف منتخب کیا گیا تھا، جس نے گریٹر ڈیوک اور ولی عہد کو فوج سے نکال دیا تھا، جس نے اپنے اختیارات کو بروئے کار لاتے ہوئے امپراطور کی مرضی کے خلاف ماسکو کو اس کے حال پر چھوڑنے کا حکم دیا تھا۔ فی الفور سمجھ گیا کہ اب اس کا انجام قریب ہے، اس کا کردار ختم ہو چکا ہے اور اس کے مفروضہ اختیارات اس کے پاس نہیں رہے۔ اسے ان باتوں کی تنہیم محض وہ بار کے روپے سے نہیں ہوئی۔ ایک طرف تو سے یہ معلوم تھا کہ جس عسکری مہم میں اس نے اپنا کردار ادا کیا ہے، اپنے انجام کو پہنچ چکی ہے اور اسے محسوس ہو رہا تھا کہ اس کا فریضہ پورا ہو گیا ہے۔ دوسری طرف اسے یہ آگاہی بھی ہونے لگی کہ اس کا بوڑھا جسم حکم کا شکار ہو رہا ہے اور اسے اب جسمانی آرام کی ضرورت ہے۔



29 نومبر کو کوتوزوف ولنا۔ اس کے بقول ”میرا پیارا ولنا“۔ میں داخل ہوا۔ اپنی ملازمت کے دوران میں وہ دوسرے ولنا کا گورنر رہ چکا تھا۔ اس متحول شہر میں جسے کوئی گزند نہیں پہنچا تھا، اسے پرانے دوست مل گئے اور پرانے تعلقات کی تجدید ہو گئی۔ ان کے علاوہ اسے زندگی کی آسائشیں، جن سے وہ اتنے طویل عرصے سے محروم رہا تھا، میرا آگئیں۔ اس کے گرد و پیش جو جذبات بھڑک رہے تھے، جہاں تک انہوں نے اجازت دی اس نے یک نیت توجہ اور مملکت کے تفکرات سے منہ موڑ لیا اور وہی پرسکون روش، جس کا وہ عادی تھا، اختیار کر لی جیسے جو کچھ شروع پذیر ہو رہا تھا اور اقلیم تاریخ میں ابھی تک جو کچھ پایہ تکمیل تک پہنچایا جانا تھا، اس سب کا اس سے اب کوئی تعلق نہ ہو۔

جولوگ دشمن پر چڑھ روڑنے اور اس کے راستے میں رکاوٹیں کھڑی کرنے کے پر جوش حادی تھے، ان میں چگا گوف شامل تھا۔ اس نے پہلے یونان اور پھر دارسا میں حریف کو مٹا دینے کی پامیں چٹنے کی تجاویز پیش کی تھیں، لیکن جہاں اسے بھیجا جاتا تھا، وہاں جانے کے لیے کبھی تیار نہ ہوتا تھا۔ اس چگا گوف کی شہرت یہ تھی کہ وہ زار سے بے دھڑک گفتگو کرتا ہے اور یہ چگا گوف سمجھتا تھا کہ کوتوزوف اس کے زیر احسان ہے کیونکہ 1811 میں اسے کوتوزوف کے علم کے بغیر ترکی کے ساتھ صلح کا معاہدہ طے کرنے کے لیے بھیجا گیا تھا اور جب اسے معلوم ہو کہ صلح نامے پر پہلے ہی دستخط ہو چکے ہیں، اس نے زار کے سامنے تسلیم کر لیا کہ اس کا سہرا کوتوزوف کے سر بندھتا ہے۔ ولنا کے قلعے میں، جہاں کوتوزوف نے قیام کرنا تھا، سب سے پہلے جس شخص نے اس سے ملاقات کی وہ یہی چگا گوف تھا۔ بحریہ کی غیر رسمی وردی پہنے، جس میں سکاٹس جیکرنگ رہا تھا، اور لڑائی بغل میں دبائے اس نے کاز سے موصولہ رپورٹ اور شہر کی چابیاں کوتوزوف کے سپرد کیں۔ کوتوزوف پر جن الزامات کی بوجھاؤ ہو رہی تھی، وہ ان سے بخوبی آگاہ ہو چکا تھا اور اس کے ساتھ اس کا رویہ اس پر از حقارت احترازی طرز عمل کا کامل نمونہ تھا جو نوجوان ترے بہترے بڑھے سے روار کھتے تھے۔

چگا گوف کے ساتھ گفتگو کے دوران میں کوتوزوف نے بر سیل تذکرہ اسے بتایا کہ اس کی چینی کے غروفوں

سے مدی ہوئی گاڑیاں، جو باری سوف کے مقام پر دشمن کے قبضے میں چلی گئی تھیں، کسی قسم کے نقصان کے بغیر چھڑا لی گئی ہیں اور اسے ٹوٹا دی گئی ہیں۔

”آپ جو کچھ کہہ رہے ہیں اس کا مطلب یہ نکلتا ہے کہ یہاں میرے پاس کھانے پینے کا کوئی برتن ورنہ نہیں۔ اس کے برعکس میں آپ کے لیے ہر چیز، بلکہ اگر آپ ضیافت کرنا چاہیں اس کا تمام سامان بھی مہیا کر سکتا ہوں، چنگا گوف نے غصے سے پھنکارتے ہوئے کہا۔

وہ اپنے ایک ایک لفظ سے اپنی راست بازی ثابت کرنے پر تلا ہو تھا اور نتیجتاً اس نے یہ تصور کر لیا کہ کوٹوروف کے ذہن پر بھی یہی دھن سوار ہوگی۔

کوٹوروف نے جواب میں کندھے اچکائے، گھٹنے اور کایاں انداز سے مسکرایا اور بولا:

”میرا مطلب وہی ہے جو میں کہہ چکا ہوں۔“

زار کی خواہشات کے علی الرغم کوٹوروف نے فوج کا بیشتر حصہ دلنا میں روک دیا۔ جو لوگ اس کے قریب تھے، کہتے تھے کہ اس شہر میں اپنے قیام کے دوران میں وہ غیر معمولی طور پر تن آسانی برتنے لگا تھا اور جسمانی اعتبار سے ضعف کا شکار ہو گیا تھا۔ وہ فوج کے امور پر بادل ناخوستہ توجہ دیتا تھا اور اس نے بیشتر معاملات اپنے جرنیلوں کی صوابدید پر چھوڑ دیے تھے۔ زار کی آمد سے قبل اس کے پاس جتنا تھوڑا بہت وقت تھا، اسے وہ سرسبز بھولوب میں صرف کرنے لگا۔

زار اپنے عملے کے ہمراہ۔ کاؤنٹ طالسٹائی، پرنس ولکونسکی، آراک چیف اور دیگر اشخاص۔ سات دہائیوں پہلے بزرگ سے رمانہ ہوا اور گیارہ تاریخ کو دن پہنچ گیا۔ وہ اپنے سفری سیلج میں سیدھا قلعے میں چلا گیا۔ کڑا کے کی سردی اور بے پناہ کھربے کے باوجود پوری وردی میں لمبوں تقریباً سو جرنیلوں اور ستاف افسروں کے علاوہ سمبولو کی رجمنٹ کی گارڈ آف آنر قلعے کے سامنے صف آرا ہو گئی۔

زار کی آمد سے قبل سہا ہی گاڑی میں، جس کے گھوڑے پسینے میں شرابور تھے، ایک اچھی پہنچا اور اس نے پیچھے ہٹوں کا پورا زور لگا کر چیتے ہوئے کہا: ”وہ تشریف لارہے ہیں۔“ کانوٹسین بھاگا بھاگا پیش دالان میں گیا اور اس نے کوٹوروف کو، جو پورٹ کی کونٹری میں بیٹھا انتظار کر رہا تھا، اطلاع بہم پہنچی۔

ایک منٹ بعد بلند قامت بوڑھا پوری وردی پہنچے، سینے پر اپنے تمام حقے اور اعزازات سجائے اور اپنی ٹونڈی سکارف لپیٹے بھدے قدم اٹھاتا پورج میں داخل ہوا۔ اس نے اپنا ہلّاں شکل کا ہیٹ سر پر رکھا، دستا نے ہاتھ میں پکڑے اور وہ بڑی مشکلوں سے میڑھیوں سے نیچے اترنے لگا۔ نیچے پہنچ کر اس نے رپورٹ ہاتھ میں تمام لی جواس نے امپراطور کے لیے تیار کی تھی۔

لوگ ادھر ادھر بھاگے بھر رہے تھے اور آپس میں سرگوشیوں میں باتیں کر رہے تھے۔ اتنے میں ایک اور سہا ہی گاڑی برق رفتاری سے آئی اور اس کے بعد سیلج نمودار ہوئی۔ تمام نگاہیں اس پر مرکوز ہو گئیں۔ امپراطور اور ولکونسکی

کی شکلیں دور سے ہی نظر آنے لگی تھیں۔

پچاس سالہ عادت کے باعث اس سب کچھ کا بوڑھے جرنل پر جسمانی اعتبار سے خاصا پریشان کن اثر پڑا۔ اس نے مضطربانہ انداز سے تونڈ پر ہاتھ پھیرا، ہیٹ درست کیا، اپنے حواس کو مجتمع کیا، تن کر پیدا کھڑا ہوا اور چونکی مہر اطور سلج سے نیچے اترا، اپنی نگاہیں اس کی جانب اٹھائیں، اسے رپورٹ پیش کی اور اپنے بچے تلے اور انتہائی مودبانہ انداز سے گفتگو کرنے لگا۔

زار نے عاجزانہ نگاہوں سے اس کا سر سے پاؤں تک جائزہ لیا، ایک لمحوں کے لیے اس کی پیشانی پر شکنیں نمودار ہوئیں لیکن ہنس نے پلک جھپکنے میں اپنے اوپر قابو پا لیا۔ وہ ہاتھ پھیلے آگے بڑھا اور اس سے بوڑھے جرنل کو گلے لگا لیا۔ ایک بار کسی دیرینہ تاثر، جو اس کے ذہن پر نقش ہو چکا تھا اور طائرانہ خیالات کی روکی وجہ سے جن کا اس کے انتہائی ذاتی جذبات سے تعلق تھا۔ کو تو زوف پر اس معاملے کا حسب معمول اثر ہوا اور اس کی جگہ ہی جیج نکل گئی۔

زار نے افسروں و رسمہ نوؤں کی رجمنٹ کے جوانوں سے ملک ملک کی اور ایک بار پھر بوڑھے آرمی کا ہاتھ دباتے اس کے ساتھ قلعے کے اندر چھا گیا۔

جب امپراطور فیلڈ مارشل کے ساتھ تہارہ گیا، اس نے دشمن کے تعاقب میں جس سمت رول کا مظاہرہ کیا تھا اور کراسنیا اور بیریزینا میں جن غلطیوں کا ارتکاب کیا تھا، ان پر اپنے عدم اطمینان کا اظہار کیا اور اسے محکمہ غیر میں اپنی مستقبل کی مہم کے بارے میں اپنے ارادوں سے آگاہ کیا۔ کو تو زوف نے کوئی جواب دینے یا تبصرہ کرے سے انحرز کیا۔ اس کے چہرے پر وہی اطاعت شعارانہ اور خالی خالی تاثر، جس سے اس نے سات سال قبل اور سترلس کے میدان جنگ میں امپراطور کے احکام سے جھے، دوبارہ نمودار ہو گیا۔

جب کو تو زوف سنڈی روم سے باہر آیا اور سر جھکائے بھاری اور بھدے قدم اٹھاتا ہاں روم میں سے گزرا تھا، ایک آواز نے اسے روک لیا۔

”یوزیرین ہائی نس“ کسی نے کہا۔

کو تو زوف نے اپنی گردن اوپر اٹھائی اور کافی دیر تک کاؤنٹ طالطان کی، جو تقریبی کشتی پر کوئی چھوٹی سی چیز رکھے اس کے سامنے کھڑا تھا، آنکھوں میں جھپٹکا رہا۔ معلوم ہوتا تھا کہ کو تو زوف کی سمجھ میں نہیں آ رہا کہ اس سے کس بات کی توقع کی جا رہی ہے۔

اچانک یوں دکھائی دیا کہ اسے یاد آگیا ہو۔ اس کے نزدیک اسے چہرے پر مہین جسم نمودار ہوا جو ہشکل نظر آ رہا تھا۔ وہ احترامی انداز سے ذرا سا جھکا اور اس نے کشتی پر مہی چیز اٹھالی۔ یہ آرڈر آف پینٹ جارج چھٹے کا تھا۔

اسکے روز فیلڈ مارشل نے ضیافت اور بال کا اہتمام کیا۔ امپراطور نے اپنی موجودگی سے اسے روٹی پیش کی۔ کو تو زوف کو

آرڈر آف سینٹ جارج مل چکا تھا، زار اسے اعلیٰ ترین اعزاز عطا کر چکا تھا لیکن بچے کو معلوم تھا کہ امپراطور فیلڈ مارشل سے خوش نہیں ہے۔ تمام آداب و تکلفات ملحوظ رکھے گئے لیکن ہر کھدومہ جتنا تھا کہ بڑھا قصور وار ہے اور اس نے اپنی نااہلی ثابت کر دکھائی ہے۔ امپراطورہ کیستھرین کے عہد کی قائم کردہ روایت کے مطابق جب کوٹوزوف نے بال روم میں داخل ہوتے ہی حکم دیا کہ چھینے ہوئے پرچم امپراطور کے قدموں پر جھکا دیے جائیں، امپراطور نے برا سامنے بنالیا اور وہ زیر لب کچھ بڑبڑایا جو لوگ اس کے قریب تھے انھیں ”بڑھا مسخرہ“ کے الفاظ سنائی دیے۔

دن میں زرکی ناراضگی میں اس لیے بھی خاص طور پر اضافہ ہو گیا تھا کیونکہ نظریہ آ رہا تھا کہ کوٹوزوف آئندہ ہم کی اہمیت سمجھ نہیں سکا یا سمجھنا نہیں چاہتا۔

اگلی صبح جب زار نے ان افسروں سے یہ کہا جو اس کے ارد گرد جمع تھے: ”تم نے روس کی کوئی بلکہ یورپ کی بھی بچالیا ہے، تو ہر شخص سمجھ گیا کہ جنگ ابھی ختم نہیں ہوئی۔

کوٹوزوف واحد شخص تھا جس نے اس سے اتفاق کرنے سے انکار کر دیا۔ وہ کھلے بندوں کہتا تھا کہ نئی جنگ سے روس کی پوزیشن نہ تو بہتر ہوگی اور نہ اس کی عظمت و جلال میں کوئی اضافہ ہوگا، بلکہ اس سے معاملات بگڑیں گے ہی اور اس کے خیال کے مطابق روس جس بلند و بالا مقام پر فائز ہو چکا ہے، اس سے وہ نیچے آ جائے گا۔ اس نے زار کو قائل کرنے کی کوشش کی کہ نئے رگروٹ بھرتی کرنا ممکن نہیں ہوگا۔ لوگوں کو جن مشکلات و مصائب میں سے گزرنا پڑ رہا تھا، اس نے ان کا اور اس قسم کی دوسری باتوں کا بھی ذکر کیا۔

فیلڈ مارشل کے اس رویے کے پیش نظر اسے فطری طور پر آئندہ جنگ کی راہ کار و ڈا اور رکاوٹ تصور کی گئی۔ معمر شخص کے ساتھ تصادم سے بچنے کے لیے وہی عیوں و بیاں طریق کار اختیار کیا گیا جو اوٹمنز میں خود اس کے اور روسی مہم کے آغاز پر بار کھلے کے ساتھ برتا گیا تھا۔ یعنی امپراطور نے تمام اختیارات اپنے ہاتھ میں لے لیے اور یوں کانڈرا چیف کو تبدیلی کے بارے میں اطلاع دے کر اسے پریشانی میں مبتلا کیے بغیر اسے بے دست و پا بنا دیا گیا۔

اس مقصد کے پیش نظر اس کے شاف کی بتدریج تنظیم نو شروع ہو گئی۔ اس کے حقیقی اختیارات ختم کر دیے گئے اور انھیں امپراطور کو منتقل کر دیا گیا۔ ٹول، ایرمالوف اور کانوٹس کو نئے عہدوں پر تعینات کر دیا گیا۔ اب ہر کس دہائی فیلڈ مارشل کی صغی اور اس کی زوال پذیر صحت کے بارے میں بڑھ بڑھ کر باتیں بنانے لگا۔

اور اس کی صحت کو خراب ہونا ہی چاہیے تھا تا کہ اس کی جگہ اس کے جانشین کا تقرر عمل میں لایا جاسکے اور چکی بات یہ ہے کہ اس کی صحت واقعی بگڑتی جا رہی تھی۔

اور جس فطری، سیدھے سادے اور تدریجی انداز سے کوٹوزوف نے ترکی سے پیٹرز برگ واپسی پر پیشہ بھرنا کرنے کے لیے وزارت خزانہ میں فرائض انجام دینا شروع کر دیے تھے اور جب اس کی ضرورت محسوس ہوئی، اس نے دوبارہ فوج میں شمولیت اختیار کر لی تھی، اب جب کہ اس کا کام ختم ہو چکا تھا، بعینہ اسی طرح نیااد کار، جس کی

ضرورت محسوس کی جا رہی تھی، اس کی جگہ لینے آگیا۔

1812 کی جنگ روسیوں کے نزدیک قومی اہمیت کی حامل تو تھی ہی، اور وہ اسے کبھی نرموشی کرنے کے لیے تیار نہیں تھے لیکن اس نے، ایک اور اہمیت۔ یورپی اہمیت اختیار کرنا تھی۔ پہلے اقوام نے مغرب سے مشرق کی طرف کوچ کیا تھا اور اب انھوں نے مشرق سے مغرب کی طرف نقل و حرکت کرنا تھی۔ اور اس نئی جنگ کے لیے نئے رہنما کی ضرورت تھی اور اس قائد کے اوصاف، نظریات اور محرکات کو تو زوف کے اوصاف و نظریات سے مختلف ہونا چاہیے تھا۔

جس طرح روسی کی نجات اور عظمت و جلال کے لیے کو تو زوف ضروری تھا، اسی طرح انعام کی مشرق سے مغرب کی طرف نقل و حرکت اور روس کی قومی سرحدوں کی تشکیل نو کے لیے الیکسندر اول ناگزیر تھا۔

یورپ، توازن قوت یا پولیس کا مفہوم کیا ہے، کو تو زوف کی سمجھ میں کبھی نہ سکا۔ وہ ان تمام امور کو سمجھ سکتا ہی نہیں تھا۔ دشمن کو نیست و نابود کرنے، روسی سرزمین کو آزاد کرانے اور اپنے وطن کو شان و شکوہ کے ہم عروج تک پہنچانے کے بعد روسی قوم کے نمائندے کے لیے روسی کی حیثیت سے کام کرنے کے لیے کچھ نہیں رہ گیا تھا۔ اس کے لیے صرف ایک ہی کام رہ گیا تھا کہ وہ اگلے جہان کوچ کر جائے اور وہ اگلے جہان کوچ کر گیا۔

12

جب کہ عموماً ہوتا ہے، میٹر کو قیدی کی حیثیت سے جن جسمانی احتیاجات اور ذہنی کھچاؤ کا سامنا کرنا پڑا تھا اس نے ان کے پورے اثرات کو اب اپنے مصائب کے ختم ہونے پر ہی محسوس کیا۔ رہائی دلائے جانے کے بعد وہ لوریل چلا گیا اور جب وہ تیسرے روز وہاں سے کیف جانے کی تیاریاں کر رہا تھا، اس کی صحت، جناب دسے گئی اور وہ تین ماہ بستر عیالت پر پڑا رہا۔ ڈاکٹروں کے بقول وہ ”مرض صفرا“ میں مبتلا ہو گیا تھا اور اس امر کے باوجود کہ وہ اس کا علاج کرتے، اس کی فصد کھولتے اور اسے ادویات نکلنے پر مجبور کرتے رہے، وہ صحت یاب ہو گیا۔

اپنی رہائی کے وقت سے بیمار پڑنے تک اس پر جو کچھ جتا تھا، اس کے ذہن پر اس کا کوئی واضح تاثر ثبت نہیں ہوا تھا۔ اسے محض اتنا یاد رہا کہ مطلع ہر وقت ابراہام اور تارک رہتا تھا، کبھی چند رے لگتا اور کبھی برف باری شروع ہو جاتی تھی۔ جہاں تک اس کی ذات کا تعلق ہے، اسے اپنے اندر شدید تکلیف محسوس ہوتی اور اس کے پاؤں اور پہلوؤں میں ہر وقت درد رہتا۔ اسے دھندلا دھندلا یہ بھی یاد تھا کہ اس کے گرد پیش مصائب و آلام کے مارے لوگ تھے، افسروں اور جرنیلوں کا تجسس جو اسے تنقیش کی بجلی میں سے گزرا رہے تھے، اسے ہر سال کرنا تھا اور اسے سواری اور گھوڑے تلاش کرنے میں وقتوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا لیکن ان سب سے بڑھ کر جو بات اسے یاد تھی، وہ یہ تھی کہ وہ اس تمام عرصے کے دوران میں سوچنے اور محسوس کرنے کی مٹا جیتوں سے عاری ہو چکا تھا۔

اپنی رہائی کے بعد اسے پتہ چلا کہ اس کی لاش نظر آئی تھی۔ اسی روز اسے یہ بھی معلوم ہوا کہ ہاروین کی لڑائی

کے اختتام پر کوئی ایک ماہ زندہ رہنے کے بعد پرنس آندرے حال ہی میں یاروسلاول میں رستوفوں کے مکان میں انتقال کر چکا ہے۔ اور دینی سوف نے، جس نے اسے یہ خبر سنائی تھی، بڑھیل تذکرہ اس سے ہیلین کی موت کا بھی ذکر کر دیا۔ اس کا خیال تھا کہ بیٹر کو اس کی اطلاع بہت عرصہ پہلے مل چکی ہوگی۔ اس وقت بیٹر کو یہ تمام باتیں محض عجیب معلوم ہوئیں اور وہ ان واقعات کی اہمیت سمجھنے میں ناکام رہا۔

اس وقت اس کے ذہن پر صرف ایک ہی دھن سوار تھی کہ وہ ان مقامات سے، جہاں انسان بے دردی سے ایک دوسرے کو موت کے گھاٹ اتار رہے تھے، حتیٰ الوسع جلد از جلد کہیں دور چلا جائے، کوئی پرسکون مامن تلاش کرے تاکہ وہ اپنی صحت بحال کر سکے اور ان تمام عجیب و غریب نئی باتوں پر، جو اس کے علم میں آئی تھیں، غور و فکر کر سکے۔ لیکن جونہی وہ اوریل پہنچا، اسے بیماری نے آگھیرا اور جب علامت کے بعد اس کے ہوش و حواس بحال ہوئے، اسے اپنے دو ملازم، تیریشی اور واسکا، جو ماسکو سے آئے تھے، اپنی خدمت پر مامور نظر آئے۔ سب سے بڑی پرنس بھی، جو ایلٹیس میں اس کی جاکیر پر رہائش اختیار کیے ہوئے تھی، اس کی علامت کی خبر سن کر اس کی حیران داری کرنے پہنچ گئی۔

رو بہ صحت ہونے کے یام کے دوران میں وہ رفتہ رفتہ ہی ان تاثرات سے، جن کا وہ گزشتہ چند ماہ سے عادی ہو چکا تھا، جان چھڑا سکا اور اس خیال کو اپنے ذہن میں بٹھاسکا کہ اب سے کوئی شخص اگلے روز آگے چلنے پر مجبور نہیں کر سکے گا اور نہ اسے نرم و گرم بستر سے محروم کر سکے گا اور یہ کہ اسے اس کا ڈر، چائے اور سپر یقیینا ملتا رہے گا۔ تاہم کافی مدت تک اسے اپنے خوابوں میں یہی نظر آتا رہا کہ وہ ابھی تک فرانسیسیوں کی اسیری میں ہے۔ اسی طرح اپنی آزادی حاصل ہونے کے بعد اسے پرنس آندرے کے انتقال، اپنی بیوی کی رحلت اور فرانسیسیوں کی جابھی و ہر بادی کی جو خبریں سنائی گئی تھیں، وہ ان کی اہمیت ہندرتج ہی سمجھ سکا۔

آزادی کا۔ کامل اور غیر منفک آزادی، جو انساں کو فطرتاً و دلیحت ہوتی ہے اور جس کا اسے ماسکو سے روگی کے بعد پہلے پڑاؤ میں شعور ہوا تھا۔ پرسرت احساس اپنے رو بہ صحت ہونے کے یام کے دوران میں بیٹر کی رگ و گ میں سما گیا۔ اس کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب سے یہ معلوم ہوا کہ یہ داخلی آزادی، جو خارجی حادثات کے تابع نہیں رہی تھی، گویا کہ خارجی آزادی کے بے اضافی ماحول فراہم کر رہی ہے۔ اس عجیب و غریب قصبے میں اس کی کوئی جان تھی نہ پہچان، یہاں وہ تنہا تھا۔ کوئی شخص نہ اس سے کسی چیز کا ثقافت کرتا تھا اور نہ اسے کہیں جانے پر مجبور کرتا تھا۔ جو کچھ وہ چاہتا تھا، اسے مل رہا تھا۔ گئے دنوں میں اپنی بیوی کا تصور اس کے لیے ہمیشہ سوہان روح بن رہا تھا۔ اب اس کے لیے قطعاً باعث آرزوگی نہیں رہا تھا کیونکہ اب خود اس کا اپنا وجود باقی نہیں رہا تھا۔

”واہ، کیا خوب اکتنا شاندار!“ وہ کہتا جب انتہائی صاف ستھری میز، جس پر لذیذ اور اشتہا آور گائے کے گوشت کا سوپ دھرا ہوتا، دکھیں کر اس کے قریب لائی جاتی، جب وہ رات کو نرم گداز اور صاف ستھرے بستر پر دراز ہوتا یا جب اسے یہ یاد آتا کہ اب نہ اس کی بیوی رہی ہے اور نہ فرانسیسی۔ ”واہ، کیا خوب اکتنا شاندار!“

اور اپنی پرانی عادت کے زیر اثر وہ اپنے آپ سے سوال پوچھنے لگا: "خیر، اب اس کے بعد؟ اب میں کیا کروں گا؟" اور وہ ترت اپنے آپ کو جواب دیتا: "کچھ نہیں، میں زندہ رہوں گا۔ کتنی شاندار بات ہے!"

یعنی وہی سوال۔ زندگی کا مقصد۔ جو ماضی میں اس کے ذہن پر کایوں کی طرح سوار رہا تھا اور جس کا وہ ہمیشہ جو ب ڈھونڈنے کی کوشش کرتا رہا تھا لیکن کبھی کامیاب نہیں ہو سکا تھا، اب اس کے لیے اپنا وجود کھوپچا تھا۔ مقصد حیات کی تلاش محض اتفاقاً یا عرضی طور پر ختم نہیں ہوئی تھی، بلکہ اسے یہ بھی محسوس ہو رہا تھا کہ اب اس کے لیے اس کا کوئی وجود نہیں رہا اور اس کا دوبارہ اس کے سامنے نہ آ سکتا تھا۔ مقصد حیات کی عین مٹن۔ یہی عدم موجودگی تھی جس نے اسے سزا دی کا، جس سے اس کی موجودہ شادمانی مشکل ہوئی تھی، مکمل اور فرحت افزا احساس بخشا۔

اسے مقصد کی ضرورت اس لیے نہیں رہی تھی کیونکہ اب وہ ایقان کی دہشت سے بالامال ہو چکا تھا۔ اس کا یہ ایقان کسی قسم کے بندھے کے قواعد، مجموعہ عقائد یا غیر استدلالی اصولوں میں نہیں بلکہ الظاہر والباطن، الحی والقیوم اور لایزال خدا میں تھا۔ ماضی میں وہ اسے ان مقاصد میں، جو وہ اپنے لیے متعین کیا کرتا تھا، تلاش کیا کرتا تھا۔ مقصد کی تلاش محض خدا کی تلاش تھی، اور اپنی اسیری کے دوران میں اسے ایک ایسی الفاظ، استرلاب کے ذریعے نہیں، بلکہ بلا واسطہ احساس سے، جیسا کہ بدلتوں پہلے اس کی آیت نے اسے بتایا تھا، معلوم ہوا، خدا یہاں، وہاں اور ہر جگہ موجود ہے۔ اپنی اسیری کے زمانے میں اس پر انکشاف ہوا کہ جس معمار کائنات کا فری مین اقرار کرتے تھے، اس کی نسبت کارا تا حیف کا خدا عظیم تر، لامحدود تر، ناقابل اور اک تر ہے۔ وہ اپنے آپ کو اس شخص کی مانند محسوس کر رہا تھا جو دور دراز فاصلے میں جھانکنے کے لیے اپنی آنکھوں پر زور ڈال رہا ہوتا ہے لیکن یک دم اسے حساس ہوتا ہے کہ جس چیز کو وہ تلاش کر رہا ہے، وہ تو عین اس کے پاؤں تلے موجود ہے۔ وہ اپنی ساری زندگی لوگوں کے سروں کے اوپر دیکھتا رہا تھا، حالانکہ اسے اپنی آنکھوں پر دباؤ ڈالنے بغیر اپنے سامنے رکھنا پڑتا ہے۔

ماضی میں وہ کسی بھی چیز کے بارے میں یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ عظیم ہے، لافانی ہے اور لامتناہی ہے۔ اسے صرف اتنا محسوس ہوتا رہا تھا کہ یہ ضرور کہیں نہ کہیں موجود ہوگی اور وہ اس کی تلاش کرتا رہا تھا۔ جو کہ اس کے نزدیک تھا اور قابل تنہیم تھا، اسے وہ سب محدود، حقیر، پیش پا افتادہ اور بے معنی معلوم ہوتا تھا۔ اس نے اپنے لیے فانی دور بین مہیا کر لی تھی اور دور فاصلے پر دستہ لگوں میں جو حقیر، معمولی اور پیش پا افتادہ چیزیں بھی مستور ہوتی تھیں، اسے وہ اس لیے عظیم اور لامحدود معلوم ہونے لگی تھیں کیونکہ وہ واضح طور پر کھائی نہیں دیتی تھیں۔ یورپی زندگی سیاست، فری میسنری، فلسفہ اور فلذاحی کام اسے اسی انداز سے نظر آتے رہے۔ لیکن اس وقت بھی کمزوری کے لحاظ سے وہ جیسا کہ وہ انھیں گردانتا تھا، اس کا ذہن اس فاصلے سے بھی اشیاء کی تہہ تک پہنچنے میں کامیاب ہو جاتا تھا اور اسے وہاں بھی وہی ادھیچاپن، دنیا داری، اہلی اور بھلیت نظر آ جاتی تھی۔

لیکن اب جب کہ اس نے ہر چیز میں عظمت، ابدیت اور لامحدودیت دیکھا، یہاں تک کہ اس کے مشاہدے کے لیے، اس کے متعلق اپنے تصور سے لطف اندوز ہونے کے لیے اس نے نظر بٹا دیا اور اس دور بین کو جس سے

وہ بے تک لوگوں کے سروں کے اوپر جھانکتا رہا تھا، ٹھا کر ایک حرف رکھ دیا اور مزے لے لے کر اپنے گروہ کی ہر آن بدلتی لافانی طور پر غصیم، ناقابل ادراک اور استغناء زندگی کا جائزہ لینے لگا۔ اور وہ جتنا اپنے قریب تر دکھتا تھا، اس کے انبساط و اطمینان قلب میں اتنا ہی اضافہ ہوتا جاتا تھا۔ کس لیے؟ یہ بھی ایک سوال، جو ماضی میں اس کے تمام ذہنی حصاروں کی اینٹ سے اینٹ بجاتا رہا تھا، اب اس کے لیے ناموجود ہو چکا تھا۔ کس لیے؟ اس سوال کا سیدھا سا جواب اب اس کے قلب و روح میں ہر دم تیار رہتا تھا کیونکہ کوئی خدا موجود ہے، وہ خدا جس کی مرضی کے بغیر انسان کے سر سے ایک باں بھی نیچے نہیں گر سکتا۔

13

خارجی طور پر بیئر میں شاید ہی کوئی تبدیلی رونما ہوئی ہوگی۔ دیکھنے میں وہ بالکل ویسا ہی نظر آتا تھا جیسا کہ وہ پہلے تھا۔ پھر وہ غیر حاضر دماغ بھی پہلے ہی کی طرح تھا اور بظاہر یہ معلوم ہوتا تھا کہ اس کا دھیان اس چیز میں نہیں جو اس کی نگاہوں کے سامنے موجود ہے بلکہ کسی ایسی چیز میں ہے جو اس کی خاص اپنی ہے۔ اس کی سابقہ اور موجودہ شخصیت میں فرق یہ آیا تھا کہ ماضی میں جو کچھ اس کے سامنے موجود ہوتا تھا یا جو کچھ اس سے کہا جاتا تھا، جب اسے یہ احساس ہوتا کہ اسے اس کا علم نہیں ہو سکا، وہ ردی، سورتی شکل بنائے ابروؤں پر مٹی ڈالنے لگتا اور کچھ اس قسم کا تاثر دینے لگتا تھا جیسے وہ دور فاصلے پر کسی چیز کو پہچاننے کی کوشش کر رہا ہو لیکن کامیاب نہیں ہو رہا۔ اب بھی جو کچھ اس سے کہا جاتا تھا اس کے سامنے موجود ہوتا، وہ اس پر کوئی خاص دھیان دیتا نظر نہیں آتا تھا، لیکن اب جو کچھ اس کے سامنے موجود ہوتا، اس سے کہا جاتا، وہ اسے خفیف اور قدرے طنزیہ مسکراہٹ سے سنتا یا دیکھتا تھا حالانکہ بظاہر یہی نظر آتا تھا کہ اس کی آنکھیں اور کان کسی بالکل مختلف چیز پر لگے ہوئے ہیں۔ اب تک وہ مہربان اور رحم دل لیکن ناشادور بخود شخص دکھائی دیتا تھا، چنانچہ لوگ اس سے کئی کترانے پر مائل رہتے تھے۔ اب اس کے لبوں پر ہر دم *Jolie de vivre* کی مسکراہٹ رقصاں رہتی اور اس کی آنکھوں سے دوسروں کے لیے ہمدردی جھلکتی رہتی اور وہ یہ پوچھتی نظر آتی تھی: ”کیا وہ میری طرح مطمئن ہیں؟“ اور لوگوں کو اس کی صحبت میں لطف محسوس ہونے لگا۔

ماضی میں وہ لمبی چوڑی گفتگو کیا کرتا تھا، تمہیں کرتے کرتے جوش میں آ جاتا تھا اور دوسروں کی بات ٹانڈی سنتا تھا۔ اب گفتگو کے دوران میں اس پر شاید ہی کبھی بیجانی کیفیت طاری ہوتی ہوگی اور اسے دوسروں کی باتیں سننے کا سلیقہ آ گیا تھا۔ چنانچہ لوگ اسے بڑے شوق سے اپنے بہتائی ذاتی اور عقلی راز بھی بتانے لگے۔

پریس، جس نے بیئر کو کبھی پسند نہیں کیا تھا اور اس کے ساتھ خصوصی خفا سماتہ رویہ اپنائے رکھتی تھی کیونکہ بوڑھے کاؤنٹ کی وفات کے بعد وہ اپنے آپ کو اس کے زیر احسان محسوس کرتی تھی، اب یہی پریس اریبل تھا۔ جہاں وہ یہ عزم لے کر آئی تھی کہ وہ بیئر پر ثابت کر دے گی کہ اس کے ”ناشکرے پن“ کے باوجود وہ اس کی

تیار داری کرنا اپنا فرض سمجھتی ہے۔ مختصر قیام کے بعد یہ دیکھ کر حیران بھی ہوئی اور جھجھکی بھی کہ وہ اس کی گرویدہ ہو چکی ہے۔ حیرت نے پٹی پھوپھی کی ناز کی نگاہوں میں چنے کے لیے کچھ بھی نہیں کیا تھا، اور شخص دلچسپی سے اس کے طہر طریقوں کا مشاہدہ کرتا رہا۔ ماضی میں پرنس کو ہمیشہ یہی محسوس ہوتا رہا کہ دیگر اس کے ساتھ لابی انداز سے پیش آتا ہے اور اس کا مذاق اڑاتا ہے۔ چنانچہ وہ جس طرح دوسروں کے ساتھ کرتی تھی، جب اس کے پاس بھی آئی، اپنے آپ میں سمٹ جاتی اور اسے ہمیشہ اپنی فطرت کا چار حاشہ پہنوا ہی دکھاتی رہتی۔ تاہم اب اسے محسوس ہونے لگا کہ وہ اس کے قلب کے عمیق ترین گوشوں تک رسائی حاصل کرنے اور انھیں سمجھنے کی کوشش کر رہا ہے اور وہ ابتدا بے اعتبارانہ اور بعد میں تشکرانہ انداز سے اس کے سامنے اپنی سیرت کے غلطی اور مشفقانہ پہر آشکار کرتے لگی۔

عیار سے عیار شخص بھی پرنس کے شباب کے بہترین دور کی یادیں تازہ کر کے اور ان کے ساتھ ہمدردی جتا کر تنی کامیابی سے یوں دبے پاؤں اس کا اعتماد حاصل نہیں کر سکتا تھا۔ تاہم دیگر کی ہر کاری صرف اس بات پر مشتمل تھی کہ وہ تلخی حیات کی ڈسی ہوئی، آرام کوٹی کی زندگی سے کوسوں دور بھگنے والی، سخت گیر اور (اپنے انداز کے مطابق) غیور و خوددار پرنس کی انسانی صفات منظر عام پر لا کر خوشی محسوس کرتا تھا۔

”ہاں، جب یہ بد فطرت لوگوں کے نہیں، بلکہ میرے جیسے لوگوں کے زیر اثر ہوتا ہے، یہ نہایت ہی اچھا اور نفیس آدمی بن جاتا ہے۔“ پرنس نے سوچا۔

تیر میں جو تغیر رونما ہوا تھا اسے، اس کے ملازمین نے بھی۔ تیر پٹی اور وارکا۔ اپنے انداز سے بھانپ لیا۔ انھوں نے دیکھا کہ وہ پہلے کی نسبت کہیں زیادہ ”نردہ“ ہو گیا ہے۔ اپنے آقا کا لباس تبدیل کرنے اور سے شب بخیر کہنے کے بعد تیر پٹی اس امید میں اس کے کپڑے اور بوٹ پکڑے وہیں کھڑا رہتا کہ وہ اس سے باتیں کرنے لگے گا اور پھر یہ بھنپ کر کہ تیر پٹی گپ شپ لڑنا چاہتا ہے، عام طور پر اسے اپنے کمرے میں ٹھہرائے رکھتا۔

”خیر، یہ بتاؤ، تم اپنے کھانے پینے کا بندوبست کیسے کرتے تھے؟“ وہ اس سے پوچھا۔

اور تیر پٹی ماسکو کی بربادی اور مرحوم کاڈنٹ کا ذکر لے بیٹھا اور مٹنے کا نام تک نہ لیا۔ وہ بازو پر کپڑے لٹکائے خاصی دیر تک یا خود باتیں کرتا رہتا اور یا پھر دیگر کے قصے سنتا رہتا۔ اس کے دل میں یہ احساس موجزن ہونے لگتا کہ اسے اپنے آقا کا قرب حاصل ہو گیا ہے اور اس کے دل میں اس کے لیے پیار کے جذبات امنڈ آتے۔ اور یہی کچھ سوچتے اور محسوس کرتے وہ بالآخر ہر چلا جاتا۔

جوڈاکٹر دیگر کا علاج کر رہا تھا، اسے روزانہ دیکھنے آتا تھا۔ اگرچہ معالج کی اشیئت سے وہ یہ جتنا اپنا فرض سمجھتا تھا کہ اس کا ایک ایک سنٹ بہت قیمتی ہے اور مصائب زدہ انسانوں کے لیے وقف ہے، وہ دیگر کے پاس گھنٹوں بیٹھا رہتا اور اسے مریضوں کے ہارے میں اپنے پسندیدہ قصے کہیں سنا تا اور ان کی عادات و خصال اور کردار پر تبصرے کرتا رہتا۔

”ہاں، اس آدمی سے۔ جوان لوگوں سے، جن کے ہم قصبات میں عادی ہوتے ہیں، بالکل مختلف ہے۔“

باتیں کرنے میں بہت لطف آتا ہے۔“ وہ میٹر کے متعلق کہا کرتا۔

ادریل میں اتفاق سے فرانسیسی فوج کے متعدد قیدی موجود تھے اور ڈاکٹران میں سے ایک کو، جو نوجوان اطالوی افسر تھا، میٹر سے ملانے اپنے ساتھ لے آیا۔

یہ افسر اکثر آنے جانے لگا۔ وہ میٹر کے ساتھ جس محبت بھرے انداز سے پیش آتا، پرس اس پر اس کا مذاق اڑاتی۔

یہ اطالوی افسر صرف تبھی خوش و خرم نظر آتا تھا جب وہ میٹر سے ملنے آسکتا، اس سے باتیں کر سکتا، اسے اپنے ماضی، اپنی گھریلو زندگی اور اپنی محبت کے بارے میں بتا سکتا، اور فرانسیسیوں، بالخصوص پیرین، کے خلاف اپنے دل کا غبار نکال سکتا۔

”اگر تمام روسی ذرا بھی آپ جیسے ہیں،“ وہ میٹر سے کہا کرتا، ”پھر اس قوم کے خلاف جنگ کرنا گستاخی اور بے حرستی کا مرتکب ہونا ہے۔ حالانکہ آپ نے فرانسیسیوں کے ہاتھوں اتنے زخم اٹھائے ہیں، آپ کے دل میں ان کے خلاف ذرا بھی بغض نہیں ہے!“

میٹر نے اٹھ لوی کا دل محض اس لیے جیت لیا تھا کیونکہ وہ اس کی فطرت کے بہترین پہلو کو اجاگر کرنے اور تحسین کرنے میں کامیاب رہا تھا۔

ادریل میں میٹر کے قیام کے آخری دنوں میں اس کا پرانا فری میسن واقف کار کاؤنٹ ولارسکی، جس نے 1807 میں اسے لاج میں متعارف کرایا تھا، اسے ملنے آیا۔ ولارسکی نے ایک متمول روسی دوشیزہ سے، جو صوبہ ادریل میں وسیع عریض جاگیروں کی مالک تھی، شادی کی تھی اور وہ خود قصبے کے محکمہ رسد میں ایک عارضی اسامی پر فائز تھا۔ اگرچہ وہ کبھی جگہ جگہ دوست نہیں رہے تھے لیکن جب ولارسکی کو معلوم ہوا کہ میٹر اس قصبے میں مقیم ہے، اس سے ملاقات کرنے چلا آیا اور آتے ہی اس قسم کی دوستی اور بے تکلفی جتانے لگا جس کا اظہار عموماً لوگ دیرانے میں ایک دوسرے ملنے کے بعد کرتے ہیں۔ ولارسکی ادریل میں یوریت کی زندگی گزار رہا تھا اور وہ اپنے ملنے کے آدمی اور، جیسے کہ اس کا خیال تھا، اپنی جیسی دلچسپیوں کے شخص سے مل کر کھل اٹھا۔

لیکن وہ بہت جلد یہ دیکھ کر بہت متعجب ہوا کہ میٹر زمانے سے خاصا پیچھا رہ گیا ہے اور، جیسا کہ اس نے اپنے دل میں سوچا، وہ سرد مہری ورنائیت کی دلدل میں پھنس چکا ہے۔

نائی ڈیئر فیلو، تم تو بالکل دقیانوسی ہوتے جا رہے ہو، اس نے کہا۔

اس کے باوجود ولارسکی کو احساس ہوا کہ اسے ماضی کی نسبت اب میٹر کی صحبت میں زیادہ لطف آ رہا ہے۔ وہ ہر روز اس سے ملنے آنے لگا۔ جہاں تک میٹر کا اپنا تعلق ہے، وہ جب بھی ولارسکی کو دیکھتا اور اس کی باتیں سنتا اسے یہ امر بہت عجیب اور ناقابل یقین معلوم ہوتا کہ کچھ ہی عرصہ قبل وہ خود اس جیسا ہوا کرتا تھا۔ ولارسکی شادی شدہ تھا۔ اس کا بیشتر وقت خاندان معاملات پھٹانے، اپنی اہلیہ کی جائیداد کی دیکھ بھال کرنے اور

سرکاری فرائض سرانجام دینے میں صرف ہوتا تھا۔ وہ ان تمام مصروفیات کو زندگی کے راستے کے اوڑھے تصور کرتا تھا۔ اس کی نگاہوں میں وہ سب قابلِ تحقیر تھیں کیونکہ ان کا مقصد اس کی اپنی اور اس کے خاندان کی فلاح و بہبود تھا۔ عسکری، انتظامی، سیاسی اور میسجی مسائل مسلسل اس کی توجہ اپنی طرف مبذول کرانے میں پہنچے اور وہ ان میں عجیب و غریب لیکن خوب جانی پہچانی صورت حال کو اپنے پرسکون، پر لطف اور پر تشنہ انداز سے، جو اب اس کی فطرتِ ثانیہ بن چکا تھا، دیکھتا رہتا۔

دلارنگی، پرنس، ڈاکٹر اور دوسرے لوگوں کے ساتھ، جن سے اب اس کی ملاقات ہوتی رہتی تھی، دیگر کے تعلقات میں ایک نئی چیز ابھر کر سامنے آئی اور اس سے اسے ان تمام لوگوں کی خیر خواہی حاصل ہو گئی۔ یہ نئی چیز اس امر کا اقرار تھا کہ محض الفاظ سے کسی شخص کے عقائد کو تبدیل کرنا ناممکن ہے اور اب وہ یہ بھی تسلیم کرنے لگا تھا کہ ہر شخص کو اپنے انداز سے سوچنے، محسوس کرنے اور اشیا کا جائزہ لینے کا حق حاصل ہے۔ ہر آدمی کے نظریات کی یہ جائز انفرادیت، جس سے کبھی بیڑ تنگ یا پریشان ہوتا رہتا تھا، اب اس کی ہمدردی کی اساس بن گئی جو وہ دوسرے لوگوں کے لیے محسوس کرتا تھا اور اس دلچسپی کی، جو وہ ان میں لیتا تھا۔ ان لوگوں کے نظریات اور ان کی زندگیوں میں جو تنوع اور بعض اوقات مکمل تضاد، در ایک اور دوسرے شخص کے مابین جو فرق پایا جاتا ہے، سے دیکھ کر حیرت مفلوظ ہوتا اور وہ نرم و ملائم اور پر تشنہ انداز سے مسکراتے لگتا۔

عملی مسائل میں بیڑ کو اب مرکز ثقل بن گیا۔ جس سے وہ پہلے محروم تھا۔ ماضی میں تمام مسائل زور خاص طور پر جب دولت مند شخص کی حیثیت سے اس سے روپے پے کے جو مطالبات کیے جاتے تھے، کثرت سے پریشانی اور اضطراب میں مبتلا کر دیتے تھے اور اسے ان کا کوئی حل نہیں سوچتا تھا۔ ”دون یا دون؟“ وہ اپنے آپ سے پوچھتا رہتا تھا۔ ”میرے پاس روپیہ ہے اور اسے اس کی ضرورت ہے لیکن کسی اور کو اس کی اس سے بھی زیادہ ضرورت ہے۔ سب سے زیادہ ضرورت مند کون ہے؟ شاید دونوں ہی نکار ہیں۔“ گئے دنوں میں وہ اس قسم کے تمام قباحت کا حل تلاش کرنے میں ناکام رہتا تھا اور جو لوگ اس سے مانگتے آتے تھے، جب تک اس کے پاس دیے کو کچھ ہوتا تھا وہ انھیں دیتا رہتا تھا۔ اپنی جائیداد کے سلسلے میں بھی اسے عین عین اسی طرح کی الجھن کا سامنا رہتا تھا۔ ایک شخص اسے ایک اور دوسرا کوئی دوسرا طریق کار تجویز کرتا اور اس کی سمجھ میں نہ آتا کہ وہ کیا کرے اور کیا نہ کرے۔ اب وہ یہ دیکھ کر ششدر رہ گیا کہ آج کل اسے ان تمام مسائل کے سلسلے میں نہ تو کوئی الجھن ہوتی ہے اور نہ وہ کسی طرح کے شکوک و شبہات میں مبتلا ہوتا ہے۔ اب اس کے اندر ایک منصف مانگز میں ہو گیا تھا اور وہ کسی ایسے

کلیے کی رو سے، جس سے وہ خود واقف تھا، فیصلہ صادر کر دیتا تھا کہ اسے کیا کرنا اور کیا نہیں کرنا چاہیے۔ جہاں تک مسائل زور کا تعلق تھا، ان کے سلسلے میں وہ اب بھی ہمیشہ کی طرح لا پرواہ اور قنصل شعار تھا لیکن اب وہ پورے اعتماد سے کہہ سکتا تھا کہ اسے کیا کرنا اور کیا نہیں کرنا چاہیے۔ پہلا موقع، جب اسے اس نئے منصف سے

رجوع کرنا پڑا، تب آیا جب ایک فرانسیسی قیدی، جو بہ اعتبار عہدہ کرنل تھا، اس سے ملنے آیا، اور اپنے کارناموں کا تفصیل سے ذکر کرنے کے بعد اس نے جس بات پر تان توڑی، وہ ایک نوع کے مطالبے کے مترادف تھی کہ میئر اسے چار ہزار فرانک عطا کرے تاکہ وہ میرٹم اپنے بیوی بچوں کو بھیج سکے۔ میئر نے کسی دقت یا کوشش کے بغیر اسے کور جواب دے دیا اور وہ یہ دیکھ کر بہت حیران ہوا کہ جو کام غیر معمولی طور پر مشکل نظر آیا کرتا تھا، کتنا آسان اور سیدھا سادا ہے۔ عین اسی لمحے، جب اس نے کرنل کا مطالبہ ماننے سے انکار کیا تھا، اس نے یہ تہیہ کر لیا کہ اوریل سے اپنی روانگی کے موقع پر اسے کوئی ایسی ترکیب سوچنا چاہیے جس سے وہ اطالوی افسر کو کچھ رقم، جس کی اسے بظاہر ضرورت تھی، قبول کرنے کی ترغیب دے سکے۔ یہ کہ عملی مسائل کے بارے میں اس کے رویے میں استحکام آیا ہے، میئر کو اس کا مزید ثبوت اپنی بیوی کے قرضے چکانے اور ماسکو کے پڑوس میں اپنے مکان کی تعمیر نو کے ضمن میں اپنے فیصلے سے مہیا ہو گیا۔

اس کا سٹیوارڈ اسے ملنے اور مل آگیا۔ میئر نے اس کے ساتھ اپنی تخفیف شدہ آمدنی کا حساب لگا کر سٹیوارڈ کے تخمینے کے مطابق ماسکو کی آتش زنی سے میئر کو تقریباً بیس لاکھ روپے کا نقصان برداشت کرنا پڑا تھا۔ میئر کے آنسو پونچھنے کے لیے سٹیوارڈ نے اسے حساب کتاب کر کے بتایا کہ ان نقصانات کے باوجود اس کی آمدنی میں کمی کے بجائے اضافہ ہو سکتا ہے بشرطیکہ وہ اپنی بیوی کے قرضوں کی ہتھکڑیاں بے باقی کرنا اس کا فرض نہیں بناتا تھا، ادائیگی کرنے سے انکار کر دے اور ماسکو میں اپنے محل اور ماسکو کے قریب اپنے دیہی پنکھ کی تعمیر نو سے ہاتھ کھینچے۔ کیونکہ ان عمارتوں کی محض دیکھ بھال پر ہی اس کے اسی ہزار روپے سالانہ اٹھ جاتے تھے اور حاصل کچھ بھی نہیں ہوتا تھا۔ ”ہاں بھائی، تم ٹھیک کہتے ہو۔“ میئر نے شگفتہ روئی سے کہا۔ ”مجھے ان سب کی بھلا کیا ضرورت ہے؟ جا ہونے کے بعد میں پہلے سے زیادہ امیر ہو گیا ہوں۔“

لیکن جتوری میں ماسکو سے سادھج آیا اور اس نے اسے ماسکو کے حالات کے بارے میں آگاہ کیا۔ اس نے اسے ان اخراجات کی تفصیل بھی بتائی جو میرتیمیرت کے تخمینوں کے مطابق اس کے شہری اور دیہاتی مکانوں کی تعمیر نو پر اٹھنا تھے۔ وہاں امور کے بارے میں کچھ اس طرح گفتگو کر رہا تھا جیسے یہ پہلے ہی طے ہو چکے ہوں۔ انھی ایام کے دوران میں اسے پرنس واسیلی اور پیٹرز برگ میں اپنے دوسرے واقف کاروں کے خطوط ملے۔ ان سب میں اس کی بیوی کے قرضوں کا ذکر تھا۔ اور میئر اس نتیجے پر پہنچا کہ سٹیوارڈ کے مشورے غلط ہیں جن پر اسے ان میں جو شتر بہت خوش ہوئی تھی، اسے پیٹرز برگ جا کر اپنے بیوی کے معاملات کو نبھانا اور ماسکو میں (اپنے مکانات کی) کی تعمیر نو کرنا چاہیے۔ ایسا کرنا کیوں ضروری تھا، یہ تو اسے معلوم نہیں تھا لیکن اسے یقین ہو چکا تھا کہ سے ایسا کرنا چاہیے۔ اس کے اس فیصلے کا نتیجہ یہ ہو گا کہ اس کی آمدنی میں تین چوتھائی کمی ہو جائے گی لیکن وہ محسوس کر رہا تھا کہ سے یہ کام کرنا ہو گا۔

دلارنگی ماسکو جا رہا تھا اور وہ دونوں اکٹھے سفر کرنے پر رضامند ہو گئے۔

اوریل میں بحالی صحت کے اس تمام عرصے کے دوران میں میئر کو آزادی، زندگی اور مسرت کا صحیح معنوں میں

لفط محسوس کرنے کا تجربہ ہوتا رہا، لیکن سفر کے دوران میں جب وہ وسیع و عریض دنیا میں داخل ہوا اور اس نے سینکڑوں نئے چہرے دیکھے، اس کا یہ لطف ودوبار ہو گیا۔ اپنے سارے سفر میں اسے یوں محسوس ہوتا رہا جیسے وہ کوئی سکول کا طالب علم ہو جو چھٹیوں میں ادھر ادھر گھوم پھر رہا ہے۔ ہر شخص۔ ڈاک گاڑی کا کوچمان، ڈاک چوکی کا منتظم، سڑک پر اور دیہاتوں میں چلتے پھرتے کسان۔ سب اس کی نگاہوں میں نئی اہمیت اختیار کر گئے۔ دلار کی موجودگی، جو روس کی غربت اور جہالت اور یورپ کے مقابلے میں اس کی پسماندگی پر نگاہ ڈال کر آشکارا سمجھ کرنا جا رہا تھا، جیسے کی مسرت میں محض اضافے کا موجب بن رہی تھی۔ جہاں دلار کی کو صرف فردنی دکھائی دے رہی تھی، پھر کو وہاں غیر معمولی حیات پرورتوئی اور قوت۔ وہ قوت، جس نے ان بسیط و معنوں اور برقیوں کے بیچ میں اس متجانس، انوکھی اور بے مثال قوم کی زندگی کو رواں دواں رکھا ہوا تھا۔ نظر آرہی تھی۔ دلار کی جو کچھ کہہ رہا تھا، وہ اس کی تردید نہیں کرتا تھا بلکہ بظاہر اس سے اتفاق کرتا نظر آتا تھا۔ یہ ظاہری اتفاق بحث مباحثے سے، جس کا حاصل کچھ نہ ہوتا، پہلو بیچنے کا آسان ترین طریقہ تھا۔ وہ اس کی باتیں سنتا اور خوش دلی سے مسکرا دیتا۔

14

جس طرح یہ وضاحت کرنا دشوار ہے کہ جب چیونٹوں کا دھوکڑا اڑتا ہے، ان میں بعض وہاں سے کٹھ کبڑا اٹھتے اور لاشیں اٹھائے کیوں اور کہ ہر بھاگنا شروع کر دیتی ہیں، یہ بعض تیز قدموں کیوں واپس آتے، ایک دوسرے سے دھکم پیل کرنے، ایک دوسرے سے آگے نکل جانے کی کوشش کرنے اور ایک دوسرے سے ٹھٹھکھا ہونے لگتی ہیں۔ اسی طرح یہ وضاحت کرنا بھی بہت مشکل ہے کہ فرانسیسیوں کی اس تمام سے، جسے ماسکو کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا، بردارنگی کے بعد روسیوں کے وہاں جوق در جوق واپس آنے کا سبب کیا تھا لیکن جب ہم چیونٹیوں کو اپنے تباہ شدہ دھوکڑے کے آس پاس جھوم جھوم اکٹھا ہوتے دیکھتے ہیں، مثلاً کئی کئی دھوکڑوں کا اپنی عزم و توانائی و رڈ حیرتوں تعداد ثابت کرتی ہے کہ اگرچہ دھوکڑا سہرا ہو چکا ہے، کوئی غیر فائدہ پر، غیر مرئی چیز، جو دھوکڑے کی اصل قوت ہے، ابھی موجود ہے۔ یہی اکتوبر کے مہینے میں ماسکو کی کیفیت تھی۔ اگرچہ وہاں کسی حکومت، کسی کلیسائی نظام اور کسی مقدس شے کا وجود باقی نہیں رہا تھا، لیکن ماسکو ہی ماسکو تھا جو وہ اگست کے دوران میں تھا۔ سب کچھ برباد ہو چکا تھا تاہم کوئی غیر مرئی مگر طاقت ور اور غیر فائدہ پر چیز اب بھی موجود تھی۔

دشمن کے ماسکو سے انخلاء کے بعد چاروں اطراف سے جو لوگ بھاگ بھاگ یہاں پہنچے، ان کے مقاصد متنوع اور ذاتی، اور شروع میں یہاں اور خرد خرمانہ تھے۔ ان سب میں صرف ایک جذبہ تحریک مشترک تھا: وہ اس جگہ، جسے ماسکو کہا جاتا تھا، پہنچنا اور وہاں اپنی سرگرمیوں کا آغاز کرنا چاہتے تھے۔ ایک ہفتے کے اندر اندر چند ہزار باشندے ماسکو پہنچ چکے تھے اور اگلے ہفتے ان کی تعداد کچھ ہزار ہو گئی۔ یہ سلسلہ اسی طرح چلتا رہتا آگے 1813 کے موسم خزاں تک شہر کی آبادی 1812 سے بھی تجاوز کر گئی۔

سب سے پہلے جو روسی ماسکو میں داخل ہوئے، وہ ونٹ لینگے روڈے کے قازقوں، قریب و جوار کے دیہاتوں کے کسانوں اور شہر کے ان باشندوں پر، جو آس پاس چھپے ہوئے تھے، مشتعل تھے۔ جب واپس پہنچنے والے روسیوں نے دیکھا کہ شہر ٹپٹ چکا ہے، اپنی باری پر خود انھوں نے لوٹ مار شروع کر دی۔ جس کام کی ابتدا فرانسیسیوں نے کی تھی، وہ انھوں نے جاری رکھا۔ کسانوں کے چھکڑے قافلہ در قافلہ آتے ورتا سکو کے تباہ ویراں مکانوں اور گلی کوچوں میں جو کچھ باقی رہ گیا تھا، اسے لاد کر چتے بننے۔ قازق جو کچھ اٹھ سکتے تھے، اٹھا کر اپنے کیمپوں میں لے گئے۔ جہاں تک شہر کے باسیوں کا تعلق ہے، دوسروں کے گھروں سے جو اشیاء ہاتھ آئیں، ان پر اس بہانے قبضہ کر لینے کہ وہ اپنا سامان اکٹھا کر رہے ہیں۔

لیکن لوٹ مار کرنے والے ولین جتھوں کے بعد دوسرے اور تیسرے ٹولے بھی آنا شروع ہو گئے۔ جنوں ان کی تعداد بڑھتی گئی، توں توں لوٹ مار مشکل سے مشکل تر ہوتی گئی اور واضح صورتیں اختیار کرنے لگی۔ جب فرانسیسی ماسکو میں داخل ہوئے تھے، انھیں شہر خالی ملا تھا تاہم باقاعدہ شہری زندگی کے لوازمات۔ تجارت، صنعت و حرفت، تعلیمات، مقامی حکومت اور مذہب کی مختلف شاخیں۔ موجود تھے۔ یہ ادارے بے جان ضرور تھے لیکن ان کا وجود ختم نہیں ہوا تھا۔ منڈیاں، دکانیں، گودام، تاج خانے، بازار سب اپنی جگہ قائم تھے اور ان میں سے بیشتر سامان کے ذخائر سے بھرے پڑے تھے۔ کارخانے اور ورکشاپیں تھیں۔ سامان ٹیش و ٹرٹ سے بھرا تھا اور جوہریں تھیں، ہسپتال، قید خانے، سرکاری دفاتر، گرجا گھر اور کلیسے تھے۔ فرانسیسیوں کے قیام کی مدت جتنی طوالت پکڑتی گئی، شہر کی یہ صورتیں اتنی ہی تباہ ہوئی جتنی گئیں تاکہ بالآخر ہر چیز لوٹ مار کا شکار ہو گیا اور بے جان منظر پیش کرنے لگی۔

جیسے جیسے فرانسیسیوں کی لوٹ مار کا سلسلہ دراز سے دراز تر ہوتا گیا، ویسے ویسے شہر کی دولت اور اس کی لوٹ مار کرنے والوں کی قوت و توانائی کم سے کم تر ہوتی چلی گئی۔ لیکن درلسا طنت میں روسیوں کی واپسی کے بعد ان کی لوٹ مار کا سلسلہ جتنا طویل اور ان کی تعداد میں جتنا اضافہ ہوتا گیا، شہر کی دولت اتنی ہی تیزی سے بڑھنے اور عام زندگی اتنی ہی سرعت سے سمٹنے پر آنے لگی۔

لوٹ مار کی غرض سے آنے والوں کے علاوہ بھانت بھانت کے دیگر لوگ بھی دار ہوئے گئے۔ بعض لوگوں کو تجسس کھینچ لیا تھا، بعض سرکاری فرائض سرانجام دینے آئے تھے و بعض۔ گھروں کے مالک پوری، اعلیٰ و ادنیٰ حکومتی کارندے، تاجر، اہل حرفہ اور کسان۔ ذاتی مفادات کے پیش نظر چلے آئے تھے۔ سبھی جوت در جوت، قافلہ در قافلہ، یوں پہنچ رہے تھے جیسے خون دل کی طرف بہت چلا آتا ہے۔

جو کسان لوٹ مار کرنے کی نیت سے خالی چھکڑوں کے ساتھ شہر آ جا رہے تھے، ایک ہفتے کے اندر اندر حکام نے انھیں روکنا اور انھیں کلی کوچوں سے لاشیں اٹھانے پر مجبور کر دیا۔ جب دوسرے کسانوں کو معلوم ہوا کہ ان کے بھائی بندوں کی کوششیں ناکام بنا دی گئی ہیں، وہ گندم، جئی اور خشک گھاس لانے لگے۔ ان کا آپس میں سخت مقابلہ

ہونے لگا اور قیمتیں سابقہ دور سے بھی کم ہو گئیں۔ لوہار اور زرگھان زیادہ مزدوری کی امید میں ہر روز چھوڑ چھوڑا سکو پہنچنے لگے۔ نئے مکانات کی تعمیر اور پرانے اور سوختہ شدگان کی مرمتیں شروع ہو گئیں۔ تاہر اپنا کاروبار سبیلوں اور رضی دکانوں میں کرنے لگے۔ رستورن اور ٹائباٹیوں کی دکانیں نیم سوختہ عمارتوں میں کھل گئیں۔ پادریوں نے ان متعدد گرجوں میں، جو آتش زنی سے بچ گئے تھے، عبادت کا سلسلہ شروع کر دیا۔ گرجاؤں کا جو مینلٹ بٹھ گیا تھا، اس کی کمی عطیات سے پوری کر لی گئی۔ سرکاری ٹیکسوں نے پتی بانات سے ڈھنکی میزوں اور ٹائلوں کے کابک چھوٹے چھوٹے کمروں میں سجالیے۔ فرانسیسی جو سامان اپنے پیچھے چھوڑ گئے تھے، اٹلی حکام اور پولیس نے ان کی تقسیم کا بندوبست کر دیا۔ بعض گھروں کے متعلق معلوم ہوا کہ ان میں دیگر مکانوں سے، یا کیا سامان داخل ہوا تھا۔ یہ موجود ہے، جب اسے اٹھا کر کریمین کے گرانو دیاٹائل میں لے جایا جانے لگا، ان کے مالکوں کو شکایت، حق ہوئی کہ ان کے ساتھ نا انصافی ہو رہی ہے، جب کہ دوسروں کا صراحتاً تھا کہ چونکہ فرانسیسی مختلف مقامات سے سامان لٹا، ٹھا کر اس مکان میں جمع کرتے رہے ہیں، اس لیے یہ تمام کا تمام، ایک مکان کے سپرد کرنا انصاف کے تقاضوں کے منافی ہوگا۔ لوگ پولیس سے گالی گلوچ کرنے لگے اور اسے رشخیں دینے لگے۔ آتش زنی میں انھیں جو نقصانات اٹھانا پڑے تھے، وہ اس کا تخیل دس دس گنا بڑھا کر پیش کرنے اور امداد کے طالب ہونے لگے۔ اور کاؤنٹ رستوپ چن اپنے اعلان نامے تحریر کرنے لگا۔

15

میر جنوری کے اختتام پر، سکو پہنچا اور اپنے مکان کے ایک حصے میں، جسے کوئی گزند نہیں پہنچا تھا، قیام پذیر ہو گیا۔ اس نے کاؤنٹ رستوپ چن اور اپنے متعدد دیگر احباب کے ساتھ، جرماسکو، اپس آگئے تھے، ملاقاتیں کیں اور دوسرے بعد پیئرز برگ جانے کا منصوبہ بنایا۔ ہر شخص فتح کا جشن منا رہا تھا۔ گوشت پکا ہوا تھا مگر وہ اب زمر نو پیدا ہونے لگا تھا اور اس میں زندگی رواں دواں ہو چکی تھی۔ میر کو دیکھ کر ہر شخص خوش ہوتا تھا۔ ہر کوئی اس سے ملاقات کرنا اور پوچھنا چاہتا تھا کہ اس نے کیا کچھ دیکھا ہے۔ میر ان سب کے ساتھ انتہائی خوش خلقی سے پیش آتا لیکن اب وہ جنسی طور پر خاصا محتاط ہو گیا تھا اور منہ سے کوئی ایسی بات نہیں نکالتا جس پر بعد میں قائم رہنا مشکل ہو جائے۔ اس قسم کے تمام سوالات۔ مثلاً اب آپ کا کہاں بود و باش اختیار کرنے کا ارادہ ہے؟ کیا آپ اپنے مکانات کے سرے سے تعمیر کرائیں گے؟ آپ پیئرز برگ کب جا رہے ہیں اور اگر میں آپ کو ایک بار مل دوں، آپ برا تو نہیں مانیں گے؟ خواہ سنجیدہ ہوتے یا غیر سنجیدہ، اس کا یہی جواب ہوتا: ”ہاں، شاید“ میرا خیال ہے۔“

اسے معلوم ہوا تھا کہ رستوف کا سردار میں ہیں لیکن مٹاشا کا خیال اسے شاید ہی کبھی آیا ہوگا اور اگر کبھی آیا بھی تو محض بھولے سرے ماضی کی خوشگوار یاد کے طور پر۔ وہ اپنے آپ کو نہ صرف معاشرتی ذمے دار یوں سے بلکہ اس احساس سے بھی، جو اس کے خیال کے مطابق اس نے جانتے بوجھے ہوئے اپنے دل میں بسایا تھا، آزاد محسوس

کر رہا تھا۔

ماسکو میں اپنی آمد کے تیسرے روز اسے درویش کوئیوں کی زبانی معلوم ہوا کہ پرنس ماریا ماسکو میں ہے۔ پرنس آندرے کی موت، مصائب اور آخری ایام کے بارے میں کثرت سچا رہا تھا اور اب یہ تمام باتیں اسے سرکاری صراحت سے اس کے ذہن میں گھومنے لگیں۔ ذہن پر یہ سننے کے بعد کہ پرنس ماریا ماسکو میں ہے اور درویش کا مشریت میں اپنے ذاتی مکان میں رہائش پذیر ہے۔ جو تباہ ہونے سے بچ گیا تھا۔ وہ اسی شام اسے ملنے چل دیا۔ جب میٹر اپنی گاڑی میں پرنس ماریا کے مکان کی طرف جا رہا تھا، وہ راستے میں پرنس آندرے اس کے ہاتھ اپنی دوستی اور اس کے ساتھ اپنی مختلف ملاقاتوں، خاص طور پر آخری کے متعلق سوچتا رہا، جو بارودینز میں ہوئی تھی۔

”کیا یہ ممکن ہے کہ اس کا انتقال اسی تلخ ذہنی کیفیت میں ہوا ہو؟ کیا یہ ممکن ہے کہ موت سے پہلے اس پر زندگی کے معانی منکشف نہ ہوئے ہوں؟“ وہ سوچ رہا تھا۔ اسے کارا تاہیف اور اس کی موت یا دائی اور وہ خیر ارادی طور پر دونوں اشخاص کے مابین موازنہ کرنے لگا۔ وہ ان کے مختلف ہونے کے باوجود اتنے مماثل تھے، اس لیے کہ اسے دونوں سے محبت تھی، دونوں نے زندگی گزار لی تھی دراب وہ دونوں ہی راہی ملک عدم ہو چکے تھے۔

میٹر کی گاڑی جب معمر پرنس کے مکان کے قریب پہنچی، اس کی ذہنی کیفیت انتہائی سنجیدہ ہو چکی تھی۔ مکان صحیح سلامت تھا۔ کہیں کہیں ٹوٹ پھوٹ کے آثار ضرور نظر آرہے تھے لیکن اس کی عمومی حالت میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ جس بوڑھے دردی پوش خدمت گار نے میٹر کا استقبال کیا، اس کے چہرے پر درشتی برس رہی تھی جیسے وہ بہمان کو باور کرانا چاہتا ہو کہ گھر کے معمول میں کوئی فرق نہیں آیا۔ اس نے اسے مطلع کیا کہ پرنس ماریا اپنے اپارٹمنٹ میں تشریف لے جا چکی ہیں اور صرف اتوار کو ہمہ نوس سے ملاقات فرماتی ہیں۔

”انھیں میری آمد کی اطلاع پہنچا دو۔ شاید وہ مجھ سے ملاقات کر لیں،“ میٹر نے کہا۔

”بہت اچھا، حضور،“ اس شخص نے جواب دیا۔ ”پورٹر بیٹ گیلری میں تشریف رکھیں۔“

چند منٹ بعد خدمت گار دیال کی معیت میں واپس آگیا۔ دیال نے سے بتایا: ”پرنس کو آپ سے مل کر بہت خوشی ہوگی۔ وہ معافی چاہتی ہیں کہ وہ آپ کا ریکی انداز سے استقبال نہیں کر سکتیں۔ آپ اوپر ان کے اپارٹمنٹ میں تشریف لے چھیں۔“

اسے پرنس جس کمرے میں ملی، اس کی چھت قدرے نیچی تھی اور وہاں صرف ایک موسم تکی چل رہی تھی۔ کمرے میں پرنس کے علاوہ ایک سیاہ پوش خاتون موجود تھی۔ میٹر کو یاد آیا کہ پرنس کے ساتھ ہمیشہ صاحبہ رہی ہیں، مگر یہ خواتین کون تھیں، یہ اسے نہ کبھی معلوم ہوا اور نہ یاد رہا۔ ”یہ لازماً اس کی کوئی نہ کوئی صاحبہ ہی ہوگی،“ اس نے سیاہ پوش خاتون کو اچھتی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے سوچا۔

پرنس اس کا استقبال کرنے کے لیے جھٹ پٹ اٹھ کر کھڑی ہو گئی اور اس نے اپنا ہاتھ آگے بڑھا دیا۔

”ہاں،“ وہ جب اس کے ہاتھ پر بوسہ دے چکا، وہ اس کے تبدیل شدہ چہرے کا بغور جائزہ کے بعد ہلکی سی

ہماری دوبارہ ملاقات یوں ہوئی تھی۔ وہ اکثر، بلکہ سبھی دوسروں تک آپ کا ذکر کرتے رہے۔ ”وہ کبھی جلی گئی اور اس کے ساتھ ساتھ وہ ایک قسم کے تذبذب سے، جو اس وقت بیٹر کو عجیب معلوم ہوا، بیٹر سے لگا ہوا تھا کراچی ریفیٹ کی جانب دیکھنے لگی۔

”جب مجھے معلوم ہوا کہ آپ کو چھڑا لیا گیا ہے، مجھے سب سے بد خوشی ہوئی۔ بہت مدت کے بعد کوئی اچھی خبر سننے کو ملی تھی۔“

پرنس نے ایک بار پھر اپنی ریفیٹ کی طرف نظر ڈالی اور اب وہ پیسے سے بھی زیادہ مضطرب دکھائی دے رہی تھی۔ وہ کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن بیٹر نے دخل اندازی کر دی۔

”ذرا تصور کر۔ مجھے اس کے بارے میں کچھ بھی معلوم نہیں تھا۔“ اس نے کہا۔ ”سیراخیال تھا کہ وہ ہلاک ہو گیا ہوگا۔ مجھے جو کچھ معلوم ہے وہ میں نے محض دوسروں کی زبانی سنا ہے۔ مجھے صرف اتنا پتا چل سکا کہ اس کی اللہ فارستونوں سے مدد بھیڑ ہو گئی تھی۔ قسمت کے رنگ ڈھنگ فرالے ہیں!“

بیٹر کی زبان قینچی کی طرح چل رہی تھی اور وہ بڑے جوش و خروش سے گفتگو کر رہا تھا۔ اس نے اپنی لگاؤوں سے مصاحبہ کو دیکھا۔ اس کی نظریں اس کے چہرے پر مرکوز تھیں اور وہ بڑے انہماک اور توجہ سے اس کی باتیں سن رہی تھی۔ اس کے انداز سے دوستی اور پناہیت بھٹک رہی تھی اور وہ یوں دکھائی دے رہی تھی جیسے وہ بہت سے رازوں کی امین ہو۔ اور جیسا کہ اکثر ہوتا ہے کہ جب آپ بات کر رہے ہوں اور کوئی دوسرا شخص آپ کو اس انداز سے دیکھ رہا ہو، آپ کو احساس ہونے لگتا ہے کہ وہ آپ کی گفتگو میں کوئی رکاوٹ نہیں ڈالے گا۔ بیٹر کو محسوس ہوا کہ یہ سیاہ پوش مصاحبہ دل، دیر، رحم دل اور دوست نواز شخصیت کی مالک ہے اور وہ جس بے پروا کوک انداز سے پرنس سے گفتگو کر رہا ہے، اس میں کوئی رشتہ نہیں ڈالے گی۔

لیکن جب اس نے رستونوں کا نام لیا، پرنس ماریا کی بے چینی اور اضطراب اور بھی نمایاں ہو گیا۔ اس نے ایک بار پھر تیزی سے پہلے بیٹر کو اور پھر سیاہ پوش خاتون کی جانب دیکھا، اور بولی۔

”آپ نے اسے پہچانا نہیں؟“

بیٹر نے ایک بار پھر مصاحبہ کے زرد، مہین چہرے، سیاہ آنکھوں اور نرالی دہن پر نظر ڈالی۔ کوئی ہستی، جو اس کے اتنی قریب، اسے اتنی عزیز تھی، کوئی ہستی، جو رستونوں سے فراموش ہو چکی تھی، جو محض دل ربا ہی نہیں تھی بلکہ اس سے بڑھ کر تھی، منہمک نکاہوں سے محکم کی باندھے اسے دیکھ رہی تھی۔

”نہیں، یہ وہ نہیں ہو سکتی!“ اس نے سوچا۔ ”یہ درشت، مسرت بیزار، لاغر، زرد چہرہ، جو اتنا عمر رسیدہ نظر آ رہا ہے، اس کا نہیں ہو سکتا۔ یہ مجھے محض اس کی یاد دلاتا ہے۔“

لیکن عین اس لمحے پرنس ماریا نے کہا:

”نشا شا!“

اور منہ ہکٹا ہوں واما چہرہ مسکرایا۔ جس طرح وہ دروازہ، جو قبا یوں کے زنگ آلود ہونے کی وجہ سے بڑی مشکل، کوشش اور زور لگانے سے کھلتا ہے، اسی طرح یہ مسکراہٹ بھی بڑی مشکل، کوشش اور زور لگانے پر آئی تھی۔ اس کھلے دروازے میں سے میٹر کی جانب معطر جھونکا لپکا اور اس کے انگ انگ کو ایسی مسرت سے سرشار کر گیا، جس سے وہ مدتوں سے نا آشنا تھا اور جس کے بارے میں وہ۔ خاص طور پر وہ اس لمحے۔ سوچ بھی نہیں رہا تھا۔ یہ جو لے کی طرح آیا، اسے اپنی پیٹ میں لیا اور اس پر پوری طرح غالب آ گیا۔ جب وہ مسکرائی، شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہ رہی۔ یہ ناشائستگی تھی اور وہ اس سے محبت کرتا تھا۔

اس اولین لمحے کے دوران میں میٹر نے غیر ارادی طور پر اس کے، پرنس، ریا کے اور خود اپنے سامنے ایک ایسے راز سے پردہ ہٹا دیا جس سے وہ خود بھی آگاہ نہیں تھا۔ خوشی سے اس کا چہرہ تھمتانے لگا لیکن اس پر شدید اذیت بھی سا یہ فلک تھی۔ اس نے اپنے اضطراب کو پھپھانے کی کوشش کی مگر وہ اسے پوشیدہ رکھنے کی جتنی جدوجہد کر رہا تھا، وہ اتنے ہی صریح واضح انداز سے۔ اتنے صریح و واضح کہ کسی قسم کے کوئی الفاظ بھی اس کا یوں اظہار نہیں کر سکتے تھے۔ اپنے آپ پر، اس پر، اور پرنس ماریا پر منکشف کر رہا تھا کہ وہ اس سے محبت کرتا ہے۔

”نہیں، یہ محض اس لیے ہوا کیونکہ مجھے اس سے ملاقات کی قطعاً کوئی توقع نہیں تھی،“ میٹر نے سوچا۔ لیکن جو گفتگو وہ پرنس ماریا سے کر رہا تھا، اس نے جونہی اسے دوبارہ شروع کرنا چاہا، اس نے ایک بار پھر اچھٹی نگاہوں سے مناشا کی طرف دیکھ لیا۔ اس کا چہرہ پہلے سے بھی زیادہ تھمتانے لگا، اور پہلے سے بھی کبھی زیادہ شدید اضطراب، جس میں مسرت اور خوف کی آمیزش تھی، اس پر غالب آ گیا۔ وہ اپنی گفتگو میں الجھاؤ کا شکار ہونے لگا اور اپنی بات کہتے کہتے بچ میں رک گیا۔

میٹر ناشا پر توجہ دینے میں اس لیے ناکام رہا تھا کیونکہ یہ بات اس کے دہم گماں میں بھی نہیں آئی تھی کہ اس کی اس سے وہاں ملاقات ہو سکے گی، اور وہ اسے پہچان اس لیے نہ سکا کیونکہ گزشتہ ملاقات کے بعد کے عرصے میں وہ بے حد تبدیل ہو چکی تھی۔ وہ لاغر اور زرد ہو گئی تھی۔ تاہم اسے ناقابل شناخت اس چیز نے نہیں بنایا تھا۔ وہ ناقابل شناخت اس لیے تھی کیونکہ جب وہ کمرے میں داخل ہوا اور اس نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا، وہاں تمام نام کی کوئی علامت نہیں تھی جتنا کہ انیس بیسٹر اس کی آنکھیں زندگی کی دہلی دہلی مسکراہٹ سے ہر دم تاباں درویش رہتی تھیں۔ اب یہ آنکھیں صرف پراںہاک اور شفق تھیں، اور پرنس لٹا لٹا سے سوال پوچھتی نظر آ رہی تھیں۔

”یہ میرے ہاں قیام کرنے آئی ہے،“ پرنس، ریا نے کہا۔ ”کاؤنٹ اور کاؤنٹس چند دنوں میں یہاں پہنچ جائیں گے۔ کاؤنٹس کی حالت اتنی بگلی ہے کہ انھیں دیکھ کر کلیجہ منہ کو آنے لگتا ہے۔ لیکن ناشا کا ڈاکٹر سے ملنا ضروری تھا۔ ان کا اصرار تھا کہ یہ میرے ساتھ چلی آئے۔“

”ہاں، ایسا خاندان، جو تاشا دتہ ہو، کہاں ہے؟“ میٹر نے تاشا سے مخاطب ہو کر کہا۔ ”تمہیں معلوم ہے کہ یہ واقعہ عین اس روز، جب ہمیں رہائی دلائی گئی، پیش آیا تھا؟ میں نے اسے نہ کہا تھا، کتنا پارازٹ کا تھا!“

تاشا نے نگاہیں اٹھ کر اس کی جانب دیکھیں۔ اس کی بات کے جواب میں اس کی آنکھوں کی پتلیاں پھیل گئیں اور وہ روشن و تاباں ہو گئیں۔

”ذی قسلی دلا سا کیسے دے؟ مناسب الفاظ نہ سوچتے ہیں، نہ منہ سے ادا ہو سکتے ہیں!“ میٹر نے ظہار پرس کرتے ہوئے کہا۔ ”آخر اتنے شات درنو جوان کو موت آئی ہی کیوں؟ اس کی تونس نس سے زندگی پھوٹی تھی!“

”آپ نے درست فرمایا۔ اگر آدمی کا کوئی ایمان نہ ہو، اس زمانے میں زندہ رہنا اور بچر ہو جائے، پرس مارنے کے خیال ظاہر کیا۔

”بالکل، بالکل، تم بالکل صحیح کہتی ہو!“ میٹر نے ذل اندازی کرتے ہوئے کہا۔

”یہ صحیح کیوں ہے؟“ تاشا نے میٹر کی آنکھوں میں تجسس نہ جھانکتے ہوئے کہا۔

”یہ تم نے کیوں کیوں کہا؟“ پرس مارنے کہا۔ ”جو (چیز) ہماری خطرے، اس کا محض تصور۔“

تاشا پرس مار یا کی بات کے ختم ہونے کا انتظار کیے بغیر دوبارہ مستفسر انداز سے میٹر کی جانب دیکھنے لگی۔

”اور کیونکہ“ میٹر نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا، ”صرف وہی شخص، جس کا یہ ایمان ہو کہ ہماری زندگی کسی خدا کے تابع ہے، اس قسم کے نقصان کو، جیسا کہ اسے... اور تمہیں... اٹھانا پڑا پھیل سکتا ہے۔“

تاشا نے کچھ کہنے کے لیے اپنا منہ کھولا لیکن وہ یک دم رک گئی۔

میٹر دفعتاً اس سے پرے ہٹ گیا اور ایک بار پھر پرس مار یا سے مخاطب ہو کر اس سے اپنے دوست کے آخری ایام کے بارے میں پوچھنے لگا۔

میٹر کا ذہن انتشار ب تقریباً عطا ہو چکا تھا لیکن اس کے ساتھ ہی اسے یہ بھی نظر آ رہا تھا کہ وہ اپنی سالانہ کڑاوی سے بھی ہاتھ دھو چکا ہے۔ اسے محسوس ہوا کہ کوئی اس کی ایک بات اور ایک ایک حرکت کا محاکہ کر رہا ہے اور یہ وہ جگہ تھا جس کا فیصلہ روئے زمیں کی تمام اشیاء سے زیادہ اہم تھا۔ اب جب وہ گنگو کر رہا تھا، تل تل کر کر رہا تھا اور ساتھ ہی یہ بھی سوچتا جا رہا تھا کہ اس کے الفاظ کا تاشا پر کیا اثر مترتب ہو رہا ہے۔ وہ اسے حوش کرنے کے لیے عموماً کوئی بات نہیں کہہ رہا تھا لیکن جو کچھ اس کے منہ سے نکل رہا تھا، وہ اس پر اس نقطہ نظر سے سوچ ضرور رہا تھا۔

جیسا کہ اس قسم کی صورتوں میں عموماً ہوتا ہے، پرس مار یا بد دل با خواست میٹر کو پرس اندرے کی اس حالت کے بارے میں بتانے لگی جس میں اس نے اسے دیکھا تھا۔ تاہم میٹر کے سوالات، اس کی پرجوش اور بے چین نگاہوں، اس کے جذبات سے کپکپاتے چہرے نے بتدریج اسے ان تھیلیات کا، جن کو یاد کرنے سے وہ اپنی خاطر مدتی تھی، ذکر کرنے پر مجبور کر دیا۔

”ہاں، ہاں، اور پھر...“ میٹر اپنا جسم اس کی جانب جھکائے اور پوری توجہ سے اس کی کہانی سننے ہوئے کہا

”ہاں، ہاں، پھر اسے سکون مل گیا؟ اور اس کا دل گداز ہو گیا؟ وہ بہ دل و جان صرف ایک ہی چیز کے لیے جدوجہد کرتا رہا تھا۔ کہ وہ سرتاپا نیکی کا مجسمہ بن جائے۔ چنانچہ وہ موت سے خائف نہیں ہو سکتا تھا۔ اگر اس میں کوئی کوتاہیاں تھیں، تو وہ اس کی اپنی پیدا کردہ نہیں تھیں۔ تو اس کا دل گداز ہو گیا؟ کتنی خوشی کی بات ہے کہ اس سے تمہاری دوبارہ ملاقات ہو گئی!“ اس نے اچانک مناشا کی جانب توجہ مبذول کرتے اور اسے اشک بگودا نگہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ مناشا کا چہرہ پھر پھرا، اس کی پیشانی پر شکنیں نمودار ہوئیں اور اس نے ایک ٹاپے کے لیے اپنی نگاہیں جھکا لیں۔ وہ ذرا کی ذرا ہچکچائی کہ اسے کچھ کہنا چاہیے یا نہیں۔

”ہاں، یہ بڑی خوش کامیابی تھی!“ اس نے مدھم اور تھر تھراتی آواز میں کہا۔ ”میرے لیے یہ واقعی بہت بڑی راحت تھی۔“ ”دہر کی۔“ ”اور انھوں۔“ انھوں نے مجھے بتایا کہ جب میں ان کے کمرے میں داخل ہوئی، وہ عین اس وقت بالکل اسی چیز کی آرزو کر رہے تھے۔ ”مناشا کا گلزار بندھ گیا۔ اس کا چہرہ شرم و حیا سے لالوں لال ہو گیا اور وہ اپنی مٹھیوں سے اپنے گھٹنے زور زور سے دبائے لگی۔ پھر اس نے بڑی کوشش سے، جو صاف نظر آرہی تھی، اپنے چہرہ پر قابو پایا، اپنا سراو پر اٹھایا اور حیرتیز بولے لگی۔

”جب ہم ماسکو سے روانہ ہوئے، ہمیں ان کا مطلق علم نہیں تھا۔ مجھ میں ان کے متعلق پوچھنے کا حوصلہ نہیں تھا۔ پھر اچانک سوینا نے بتایا کہ وہ ہمارے ساتھ سفر کر رہے ہیں۔ مجھے کچھ معلوم نہیں تھا۔ میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ ان کی حالت کیسی ہے، میری تو صرف ایک ہی تمنا تھی کہ میں انھیں دیکھ سکوں، ان کے قریب جا سکوں،“ اس نے کپکپاتے اور زور زور سے سانس لیتے ہوئے کہا۔

اور انھیں اپنی گفتگو میں کسی قسم کی مدد و نصرت کا موقع دیے بغیر وہ انھیں وہ سب کچھ بتانے لگی جس میں سے اسے اپنے سفر و یار و سہل دل میں قیام کے تین ہفتوں کے دوران میں گزرنا پڑا تھا۔ اس نے ابھی تک کسی سے ان باتوں کا ذکر نہیں کیا تھا۔

دیر منہ کھولے اس کی باتیں سن رہا تھا اور اس کی آنکھوں میں آنسو جھلک رہے تھے۔ اس دوران میں دونوں پر س آندہ رہے، نہ موت اور نہ باتوں کے متعلق، جو وہ سن رہی تھی، سوچ رہا تھا۔ وہ بس اس کی کتھاسن رہا تھا اور اس کے سننے میں وہ جس کرب میں سے گزر رہی تھی، اس پر اسے اس پر ترس آرہا تھا۔

پرس بار یا مناشا کے قریب بیٹھی تھی۔ اپنے ”سور و کسے“ کی کوشش میں اس کی پیشانی شکن آلود ہو رہی تھی۔ اپنے بھائی اور مناشا کی محبت کے آخری ایام کی داستان وہ پہلی بار سن رہی تھی۔

صاف نظر آرہا تھا کہ ان کرب ناک مگر بہر حال پر مسرت دنوں کے متعلق گفتگو کرنا مناشا کی ضرورت تھی۔ وہ باتیں کیے جا رہی تھیں اور اپنے انتہائی ذاتی احساسات میں نہایت معمولی معمولی تفصیلات کی آمیزش کرتی جا رہی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ اس کی گفتگو کبھی ختم نہیں ہوگی۔ متعدد مرتبہ وہ ایک ہی بات دو دو بار دہراتی رہی۔ اسنے میں دروازے پر دیہال کی آواز سنائی دی۔ وہ پوچھ رہا تھا کہ آیا نکلنا کاشب بخیر کہنے سکتا ہے۔

”بس یہی کچھ تھا۔ سب کچھ...“ متاثر ہو کر کہا۔

جوئی ٹکڑے کا اندر داخل ہوا، وہ ترست اٹھ کھڑی ہوئی اور اس نے دروازے کی جانب دوڑ لگا دی جو پردوں میں مستور تھا۔ اسے دروازہ نظر نہ آیا اور اس کے بازو سے اس کا سر ٹکرا گیا۔ اس کی ہلکی سی چیخ نکل گئی جس میں نیم درد اور نیم سالی تھا، اور وہ بھاگتے بھاگتے باہر چلی گئی۔

وہ جس دروازے میں سے غائب ہوئی تھی، میز سے بغیر دیکھنے لگا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ سے اچانک اس دنیا میں شدید اکھاڑنے کا احساس کیوں ہونے لگا ہے۔
پرنس، ریا نے اس کی اپنے بھتیجے کی جانب، جو کمرے میں آچکا تھا، توجہ دلاتے ہوئے اسے اس کی محویت سے جگا دیا۔

شدید جذبات کے اس لمحے کے دوران میں دیگر گوشکا کا چہرہ دیکھ کر جو اس کے باپ کے چہرے سے اتنا مشابہ تھا، دیکھ کر اس قدر متاثر ہوا کہ بچے کو چومنے کے بعد وہ ایک ایسی اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور رستے کی طرف چل پڑا۔ وہ پرنس، ریا سے اجازت لینا چاہتا تھا لیکن وہ اسے جانے نہیں دے رہی تھی۔
”نہیں، میں اور متاثر بعض اوقات دو بجے سے پہلے نہیں سوتی۔ لہذا آپ تشریف رکھیں۔ میں پر منگوائی ہوں۔ آپ نیچے چلیں، ہم ابھی آتی ہیں۔“

میز کے کمرے سے نکلنے سے پہلے پرنس، ریا نے اس سے کہا:
”اس نے ان کے متعلق پہلی مرتبہ اس قسم کی باتیں کی ہیں۔“

17

میز کو کشادہ اور چکا چوند روشن ڈائننگ روم میں پہنچا دیا گیا۔ چند منٹ بعد اسے قدموں کی چاپ سنائی دی اور پرنس، ریا متاثر کی معیت میں کمرے میں داخل ہوئی۔ اگرچہ متاثر کا چہرہ پیسے کی طرح رشت اور گھیر دکھائی دے رہا تھا، وہ پرسکون ہو چلی تھی۔ سنجیدہ، متین اور قلمی گفتگو کے بعد ماحول پر جو اسی اور بوجھلتا چھ جاتی ہے، تیوں کو اس کا تجربہ ہو رہا تھا۔ یہ وہ عالم تھا جب سابقہ گفتگو کو از سر نو شروع کرنا ناممکن ہوتا ہے، چھوٹی چھوٹی اور عام باتیں کرنا مناسب معلوم نہیں ہونا لیکن بات کرنے کی خواہش اپنی جگہ موجود ہوتی ہے اور چپ رہنا محض قسطنطنیہ رکھائی رہتا ہے۔ وہ چپ چاپ ڈائننگ ٹیبل کے قریب چھپے چھپے درمی پوش خدمت گاروں نے کرسیاں پیچھے کھینچیں اور دوبارہ میز کے ساتھ لگا دیں۔ میز نے اپنا ٹیپکین پھیرا یا اور مہر سکوت توڑنے کا تہیہ کرتے ہوئے متاثر اور پرنس، ریا کی طرف دیکھا۔ کچھ یوں نظر آ رہا تھا کہ اسی لمحے وہ دونوں بھی اسی نتیجے پر پہنچ چکی ہیں۔ دونوں کی آنکھیں جنگ رعبی تھیں اور یہ چمک بتا رہی تھی کہ وہ اپنی اپنی جگہ مطمئن ہیں اور انھیں یہ اعتراف کرنے میں کوئی ہچکچاہٹ نہیں کہ زندگی میں غم و اندوہ ہی کا راج نہیں، اس میں سرست بھی پائی جاتی ہے۔

”کاونٹ، آپ ووڈ کا سے شوق فرماتے ہیں؟“ پرنس ماریا نے پوچھا اور اس کے ان الفاظ سے ایسا لگا کہ اس کی اداسیاں کا فور ہو گئیں۔ ”اب آپ ہمیں اپنے بارے میں کچھ بتائیں، اس نے کہا۔“ آپ کے متعلق ناقابل یقین کہانیاں گردش کر رہی ہیں۔“

”ہاں،“ میئر نے لطیف طنز یہ انداز سے، جواب اس کی فطرتِ ثانیہ بننا جاری رکھا، مسکراتے ہوئے کہا۔ ”خود مجھے بھی بڑے بڑے عجوبے۔ ایسی ایسی باتیں جو میں نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچی ہوں گی۔ سننے کو ملتے ہیں۔ ماریا ابراہاموڈنا نے مجھے اپنے گھر آنے کی دعوت دی اور میرے ساتھ جو کچھ جیتا تھا یا بیٹھا چاہیے تھا، اس کے متعلق مجھے آگاہ کرتی رہی۔ متحیرانہ سہجائی نے بھی میری رہنمائی کی اور مجھے سمجھایا کہ مجھے اپنے تجربہ کیسے بیان کرنا چاہئیں۔ ان تمام باتوں سے میں نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ دلچسپ آدمی بننا بہت آسان کام ہے (اور میں اب دلچسپ آدمی ہوں)۔ لوگ مجھے مدعو کرتے ہیں اور مجھے خود میرے متعلق بتاتے ہیں۔“

”ناشا مسکرائی۔ وہ کچھ کہنا چاہتی تھی۔“

”ہم نے سنا ہے“ پرنس ماریا اس سے پہلے بول پڑی، ”کہ آپ کا ماسکو میں بیس لاکھ کا نقصان ہوا ہے۔ کیا یہ صحیح ہے؟“

”لیکن میں پہلے کی نسبت۔ چند امیر ہو گیا ہوں،“ میئر نے کہا۔

اگرچہ اپنی بیوی کے ترغیب ادا کرنے اور تعمیر نو کا کام شروع کرنے کے فیصلے کے بعد میئر کے عادات تبدیل ہو گئے تھے، لیکن اس کا پھر بھی یہی دعویٰ تھا کہ وہ پہلے کی نسبت تین گنا متمول ہو چکا ہے۔

”جو چیز مجھے یقیناً حاصل ہوئی ہے، وہ آزادی ہے،“ اس نے سنجیدگی سے کہنا شروع کیا لیکن کچھ سوچ کر اس نے اپنی بات ادھوری ہی چھوڑ دی۔ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ گفتگو کے اس موضوع سے ناسیت کی بوا کر رہی ہے۔

”آپ اپنے مکان دوبارہ تعمیر کر رہے ہیں؟“

”ہاں، سادہ سادہ کا مشورہ ہے کہ مجھے یہ کام لازماً کرنا چاہیے۔“

”یہ بتائیں کہ جب آپ ابھی ماسکو میں تھے، آپ کو کاونٹس کے انتقال کی خبر نہیں ملی تھی؟“ پرنس ماریا نے پوچھا لیکن اسی دم اس کے چہرے کی رنگت سرخ ہو گئی کیونکہ اس کا خیال تھا کہ اس نے ”آزادی“ مل جانے کا جوش کرا کیا تھا، اس کے بعد معا بعد اس قسم کا سواں پوچھنا اس کے الفاظ کو ایسے معانی پہنانے کے مترادف ہے جو ناگوار اس کے دس میں نہیں تھے۔

”نہیں،“ معلوم ہوتا تھا کہ پرنس ماریا نے آزادی کے متعلق اس کے اشارے کو جو معانی پہنائے تھے، اگر ان میں کوئی کھیا ہے پن کی بات تھی، تو وہ اس سے بے خبر تھا۔ ”مجھے یہ خبر اور مل میں ملی تھی۔ مجھے اس سے کتنا کہ کچھ، تم لوگ اس کا اندازہ بھی نہیں کر سکتے۔ ہم کوئی مثالی جوڑا نہیں تھے،“ اس نے ناشا کی طرف دیکھتے ہوئے اس کے چہرے پر یہ تجسس بھانپتے ہوئے کہ وہ اپنی بیوی کے متعلق کس قسم کی گفتگو کرے گا، غلٹ سے مزید کہا، ”لیکن اس کی

موت نے مجھے ہلا کر رکھ دیا۔ جب دو آدمیوں میں جھگڑا ہوتا ہے، ہمیشہ دونوں ہی قصور وار ہوتے ہیں۔ جب ایک کا رشتہ حیات منقطع ہو جاتا ہے، دوسرے کو اپنا جرم اپجانی گنہگار معلوم ہونے لگتا ہے۔ پھر اس قسم کی موت... کامل تہی، کوئی ساتھی نہیں، سگی نہیں، کوئی تسلی کے دیوہور کہنے والا نہیں! مجھے اس پر بہت، بلکہ بہت زیادہ ترس آیا۔

”تو آپ ایک بار پھر eligible pari بن گئے ہیں؟“ پرس ماریا نے کہا۔

جیئر کارنگ جبر بہونی کی طرح سرخ ہو گیا اور وہ کافی دیر یہی کوشش کرتا رہا کہ وہ ناشا کی طرف نہ دیکھے، مگر جب اس نے اپنی نگاہوں سے اس کو دیکھنے کی ہمت کی، اسے اس کے چہرے پر سرد مہری، درشتی، یہاں تک کہ حقارت بھی نظر آئی جیسا کہ اسے خیال گزرا۔

”لوگ کہتے ہیں کہ آپ کی پولیس سے ملاقات ہوئی تھی اور آپ نے اس سے گنگو کی تھی، براہی؟“ پرس ماریا نے دریافت کیا۔

جیئر ہنس پڑا۔

”بالکل نہیں، ایک مرتبہ بھی نہیں، کبھی نہیں! معصوم ہوتا ہے کہ ہر شخص یہ سمجھتا ہے کہ قیدی بننے کا مطلب یہ ہے کہ آپ پولیس کے مہمان بنے جا رہے ہیں۔ نہ صرف یہ کہ میں نے اسے کبھی دیکھا نہیں میں نے تو اس کا کبھی ذکر بھی نہیں سنا تھا۔ میرا تعلق بہت نیچے سطح کے لوگوں سے تھا!“

پھر اختتام کو پہنچ گیا اور جیئر کو جس نے شروع میں اپنی اسیری کے بارے میں گفتگو کرنے سے معذرت کرنی تھی، ایسا کرنے پر آمادہ کر لیا گیا۔

”لیکن یہ بات تو درست ہے کہ آپ ماسکو میں اس بے نظیر گئے تھے کیونکہ آپ پولیس کو دھمک کر بچا چکے تھے، درست ہے نا؟“ ناشا نے قدرے مسکراتے ہوئے دریافت کیا۔ ”جب ہماری ملاقات سفاریف ٹار کے قریب ہوئی تھی، میں تبھی بھانپ گئی تھی۔ یاد ہے؟“

جیئر نے اعتراف کیا کہ یہ بات درست ہے اور یہی وہ مقام تھا جہاں سے پرس ماریا اور اس سے بھی زیادہ ناشا کے سوالات نے اسے ان حالات کی جان میں سے اسے گزرنا پڑا تھا، انہیں بتانے کے راستے پر ڈال دیا۔

شروع شروع میں اس کا لہجہ، جس کی اسے ہر شخص، بالخصوص اپنے ساتھ ہتھیار کر کے کی عادت پڑ گئی تھی، نرم و لطیف اور تندرے طعنے پر تھا۔ تاہم جب وہ ان گھناؤنے واقعات اور مصائب کا، جن کا اس نے مشاہدہ کیا تھا، تذکرہ کرنے لگا، وہ غیر شعوری طور پر جذبات کی زد میں بہہ گیا اور ایک ایسے شخص کی طرح، جو اپنی فحاشی کے فوکیلے اثرات کو یاد کرتے اپنے آپ کو دوبارہ ان کے تجربے میں سے گزرتا محسوس کرتا ہے، گھٹنے گھٹنے اندازتے بولنے لگا۔

پرس ماریا اپنے چہرے پر نرم و لطیف تبسم سجائے کبھی جیئر اور کبھی ناشا کو دیکھنے لگتی۔ اس ساری حکایت کے

کنواری لڑکیوں کے لیے سوزوں پر

دوران میں اسے صرف بیٹر اور اس کی اچھائیوں ہی نظر آئیں۔ ناشا اپنی کہنی پر جھکی ہوئی تھی اور کہانی کے دوران میں اس کے چہرے کے تاثرات میں مسلسل تبدیلیاں رونمائی ہوتی رہیں۔ اس کی نگاہیں ہمدقت بیٹر کے چہرے پر مرکوز رہیں اور اس نے ایک مرتبہ بھی انھیں وہاں سے نہ اٹھایا۔ معلوم ہوتا تھا کہ جو کچھ وہ بیان کر رہا ہے، اس کے ساتھ ساتھ وہ خود بھی اس تجربے میں سے گزر رہی ہے۔ نہ صرف اس کی نظریں بلکہ اس کی ہائے وائے اور مختصر سوالات بھی بیٹر کو جتا رہے تھے کہ جو کچھ وہ ابلاغ کرنا چاہتا ہے، وہ اسے پوری طرح سمجھ رہی ہے۔ یہ عین تھا کہ وہ نہ صرف اس کی، جو وہ بیان کر رہا تھا بلکہ اس کی بھی، جسے وہ بیان کرنا تو چاہتا تھا لیکن جس کے بیان کے لیے اسے موزوں الفاظ نہیں مل رہے تھے، تفہیم کر رہی ہے۔ بچے اور عورت کا واقعہ، جس کا اس نے دفاع کرنے کی کوشش کی تھی، اس نے مندرجہ ذیل انداز میں بیان کیا:

”یہ منظر دہشت ناک تھا۔ ایسے بچے بھی تھے جن کا کوئی پرسان حال نہ تھا، لوگ انھیں چھوڑ بھاگے تھے، بعض تو شعلوں میں۔ ایک کو تو میری نظروں کے سامنے گھسیٹ گھساٹ کر باہر لایا گیا۔ بعض عورتیں ایکی تھیں جن کے اجسام سے چیزیں اتار لی گئیں، ان کی بالیاں نوچ لی گئیں۔“

بیٹر کے چہرے پر شرم و حیا کی سرخی دوڑنے لگی اور وہ ہچکچانے لگا۔

”پھر گشتی دستہ آ گیا۔ وروہ تمام لوگ۔ مرد حضرات۔ جو لوٹ مار میں ملوث نہیں تھے، گرفتار کر لیے گئے۔ میں بھی انھیں میں شامل تھا۔“

”میں یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ آپ سب کچھ نہیں بتا رہے۔ آپ نے لازماً کچھ نہ کچھ کیا ہوگا،“ ناشا نے کہا اور رک گئی۔ ”میرا مطلب ہے کہ کوئی اچھا کام۔“ اس نے مزید کہا۔

بیٹر اپنی داستان سناتا رہا۔ جب اس نے ”مقتل“ کا ذکر کیا، وہ تفصیلات گول کرنا چاہتا تھا لیکن ناشا کا اصرار تھا کہ وہ سب کچھ بتائے اور کسی چیز کو نہ چھوڑے۔

بیٹر کاراٹامیف کا تذکرہ کرنے لگا لیکن رک گیا۔ یہاں تک پہنچتے پہنچتے وہ کرسی سے ٹھکڑا ہوا تھا اور کمرے میں چکر لگانے لگا تھا۔ ناشا اپنی نگاہوں سے اس کا تعاقب کر رہی تھی۔

”نہیں! جو کچھ میں نے اس ناخوندہ۔ سیدھے سادے آدمی سے سیکھا، وہ تم نہیں سمجھ سکتیں۔“

”بتائیں نا، بتائیں نا، ضرور بتائیں!“ ناشا نے کہا۔ ”اب وہ کہاں ہے؟“

”انھوں نے اسے مارڈال، میری آنکھوں کے تقریباً سامنے۔“

اور بیٹر کپکپاتی آواز میں انھیں پسپائی کے آخری ایام، کاراٹامیف کی علالت اور اس کی موت کے بارے میں بتاتے لگا۔

بیٹر انھیں اپنی سرگزشت سناتا رہا۔ اس نے یہ کہانی اس طرح پہلے کسی کو نہیں سنائی تھی اور نہ خود اپنے ذہن میں کبھی اس کی یاد تازہ کی تھی۔ اسے جن حادثات میں سے گزرنا پڑا تھا، معلوم ہوتا تھا کہ اس کی معنویت اس پر بآغوش

ہوری ہے۔ اب جب کہ وہ یہ سب کچھ ناشا کے سامنے بیان کر رہا تھا، اسے اپنی دگ دگ میں وہ نادر الوجود خوشی دروڑی محسوس ہو رہی تھی جس کا سروں کو اس وقت احساس ہوتا ہے جب ان کی سامعین خواتین ہوتی ہیں۔ تیز طراز خواتین نہیں، جو جب کوئی بات سن رہی ہوتی ہیں، اس ارادے سے سن رہی ہوتی ہیں کہ جو کچھ وہ سن رہی ہیں، اسے اپنے ذہنوں کو جلد دینے کے لیے یاد رکھ سکیں اور جب موقع ملے، اسے دوسروں کے سامنے دہرائیں یا اسے اپنے کسی تصور کے مطابق ڈھال سکیں یا اس پر کوئی تبصرہ کر سکیں جو انہوں نے اپنی ننھی منی ذہنی درکشاپ میں چار کیا ہوتا ہے، بلکہ وہ خوشی، جو ان صدق شعار خواتین سے حاصل ہوتی ہے، جنہیں اس میں سے جس کا اظہار مرد ان کے سامنے کرتے ہیں، منتخب کرنے اور اسے اپنی ذات میں جذب کرنے کا ملک ہوتا ہے۔ ناشا غیر شعوری طور پر ہمدست گوش تھی۔ میٹر کا ایک ایک لفظ، اس کی آواز کی خیف سے خیف تر قرار ہٹ، اس کی، جتنی نظر، اس کے چہرے کے چھوٹے سے چھوٹے پنچے کی پھڑپھڑاہٹ کوئی چیز ایسی نہیں تھی جس پر اس نے دھیاں نہ دیا ہوگا۔ وہ نامکمل الفاظ راستے میں اچک لیتی اور انہیں سیدھا اپنے قلب میں جس کے دروازے، لے جاتی اور میٹر کی تمام ذہنی اور جسمانی ذہنوں کے مقام پر بھانپ جاتی۔

پرس مار یا اس کی داستان سمجھ رہی تھی اور اپنے دل میں اس کے ساتھ ہوردی محسوس کر رہی تھی، مگر اسے کچھ اور بھی نظر آرہا تھا، اور اسی پر اس کی ساری توجہ مرکوز تھی۔ اسے ناشا اور جگر کے، بین محبت کا امکان دکھائی دینے لگا تھا اور اس تصور نے، جس کا است، وہیں باراندازہ ہو رہا تھا، اس کا دل بار بار باغ کر دیا۔

صبح کے تین بج چکے تھے۔ وردی پوش ملزمن گھیر اور اداں چہروں کے ساتھ سونم تہاں تبدیل کرنے آئے لیکن کسی نے ان پر کوئی توجہ نہ دی۔

میٹر کی کہانی اپنے اختتام کو پہنچ گئی اور وہ خاموش ہو گیا۔ ناشا کی چمکتی دکتی آنکھیں ابھی تک اس پر مرکوز تھیں جیسے وہ ابھی کوئی مزید بات، جو اس نے شیدان کی جھوڑی تھی، سمجھنے کی کوشش کر رہی ہو۔ جگر پر بوکھلاہٹ طاری تھی لیکن وہ خوش تھا اور کبھی کبھار بڑی ذہنائی سے اس پر اچھتی نظر ڈال لیتا اور سوچنے لگتا کہ گنگو کا موضوع تبدیل کرنے کے لیے اب اسے کیا کہنا چاہیے۔ پرس مار یا چپ تھی۔ کسی کے ذہن میں یہ خیال نہ آیا کہ صبح کے تین بج چکے ہیں اور انہیں سوچنا چاہیے۔

”لوگ قسمت کے شاکی رہتے ہیں کہ انہیں ادھار و مصائب کی بھٹی میں سے گزرنا پڑا،“ وہ نے خیال آرائی کرتے ہوئے کہا، ”لیکن اگر اس لمحے مجھ سے پوچھا جائے کہ میں وہی رہنا پسند کروں گا جو میں تیری بننے سے پہلے تھا یا میں یہ سب کچھ دوبارہ جھینے کو ترجیح دوں گا، لامحالہ میرا جواب یہ ہوگا: مجھے امیری اور گھوڑوں کا گوشت منظور ہے، خدا! مجھے اس سے محروم نہ کریں۔“ جب ہمیں جانی پہچان راہوں سے اٹھا کر پرے پھینک دیا جاتا ہے، ہم سمجھتے ہیں کہ ہمارے ہاتھ پلے کچے نہیں رہا، لیکن جو کچھ نیا اور اچھا ہوتا ہے، اس کا آغاز تبھی ہوتا ہے (جب ہم ان لگتے جانی راہوں پر چلتے ہیں)۔ جب تک سانس ہے، مسرت کا فقدان نہیں۔ ہمارے سامنے بہت کچھ ہے، بہت زیادہ

کچھ ہے۔ یہ بات میں تم سے کہتا ہوں، اس نے نتاشا کی جانب متوجہ ہو کر کہا۔

”جی ہاں، بالکل، بالکل،“ اس نے کوئی بالکل مختلف جواب دیتے ہوئے کہا۔ ”مجھے بھی سوائے اس کے کہ میں ہر چیز کے تجربے میں سے دوبارہ گزرنا چاہتی ہوں، کسی اور چیز کی تمنا نہیں۔“

بیزئر نگاہیں گاڑ کر اسے دیکھنے لگا۔

”ہاں، مجھے اس کے علاوہ اور کسی چیز کی تمنا نہیں،“ نتاشا نے اپنی بات دہرائی۔

”نہیں، نہیں؟“ بیزئر نے چیختے ہوئے کہا۔ ”اگر میں زندہ سلامت ہوں اور زندہ رہنے کی آرزو کر رہا ہوں تو اس میں میرا کوئی قصور نہیں۔ اور نہ تمہارا۔“

ایکایک کر نتاشا نے اپنا سر جھکایا، دونوں ہاتھوں سے پنا چہرہ ڈھانپا اور زار و قطار رونے لگی۔

”نتاشا، کیا ہوا؟“ پرنس ماریا نے پوچھا۔

”کچھ نہیں، کچھ نہیں،“ اس نے جواب دیا اور اپنے آنسوؤں کے بیچ بیئر کو دیکھ کر مسکرائی۔ ”شب بفریب سونا چاہیے۔“

بیزئر اٹھ کھڑا ہوا اور رخصت ہو گیا۔



نتاشا حسب معمول پرنس ماریا کے ساتھ اس کے بیڈروم میں چلی گئی۔ بیزئر نے انہیں جو کچھ بتایا تھا، وہاں وہاں اس کے متعلق تبادلہ خیالات کرنے لگیں۔ تاہم پرنس نے بیزئر کے بارے میں کسی قسم کی رائے ظاہر کرنے سے اجزایا اور نتاشا بھی اس معاملے میں خاموش رہی۔

”اچھا، ماری، شب بخیر،“ نتاشا نے کہا۔ ”ہم ان کا“ (اس کی مراد پرنس آندرے تھا) ”ذکر اس بے نہیں کرتیں کیونکہ ہمیں یہ اندیشہ لاحق رہتا ہے کہ اس طرح ہم اپنے جذبات پیدا کریں گے۔ تاہم مجھے اکثر خیال گزرتا ہے کہ اس طرح ہم انہیں فراموش کرتی جا رہی ہیں۔“

پرنس ماریا کی سسکی ٹگل گئی اور اپنی اس سسکی سے اس نے یہ اعتراف کر لیا کہ نتاشا جو کچھ کہہ رہی ہے، ٹھیک کہہ رہی ہے لیکن جوا لفاظ اس نے استعمال کیے تھے، اسے ان سے اتفاق نہیں تھا۔

”کیا فراموش کرنا ممکن ہے؟“ اس نے پوچھا۔

”آج اس بارے میں ساری باتیں کر کے مجھے بہت فائدہ ہوا ہے، دل کا سارا غبار نکل گیا ہے۔ پچھلے مشکل اور تکلیف دہ ضرورتیں لیکن اچھی تھیں۔ بہت اچھی،“ نتاشا نے کہا۔ ”مجھے یقین ہے کہ یہ واقعی ان سے بہت کرتے تھے، جیسا میں نے انہیں سب کچھ بتا دیا۔ کیا یہ ٹھیک تھا؟“ اس نے اچانک شرمسار ہوتے پوچھا۔

”بیزئر کو بتانا؟ ارے ہاں، بالکل، وہ کتنے نفیس اور شہ آدی ہیں!“ پرنس ماریا نے کہا۔

”ماری تمہیں معلوم ہے کہ؟“ اچانک مناشا نے نٹ کھٹ انداز سے مسکراتے (پرنس ماریا نے اس قسم کی مسکراہٹ مدتوں سے اس کے چہرے پر نہیں دیکھی تھی) اضطرابی طور پر کہا۔ ”کچھ یوں نظر آتا ہے کہ یہ کسی نہ کسی طرح کچھ اتنے یا کم صاف، بے شکن اور تازہ و زردین گئے ہیں۔ جیسے ابھی ابھی ہاتھ سے دھل دھلا کر ہر نکلے ہوں؟ تم میرا مطلب سمجھتی ہو نا؟ میرا مطلب ہے کہ اخلاقی ہاتھ سے... کیا یہ درست نہیں؟“

”ہاں؟“ پرنس ماریا نے کہا۔ ”یہ بے حد سدھر گئے ہیں۔“

”اپنے چھوٹے کوٹ اور خوشی بالوں کے ساتھ... بالکل پیسے... عین مین پیسے جیسے دوسرے ہاتھ سے باہر آ رہے ہوں... یا پابعض اوقات۔“

”اب میں سمجھ گئی ہوں کہ وہ“ (پرنس آندرے) ”ان سے زیادہ کسی اور کو کیوں پسند نہیں کرتے تھے؟“ پرنس ماریا نے کہا۔

”ہاں، درودہ ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں۔ سنا ہے کہ جب مراد ایک دوسرے سے قطعاً مختلف ہوں۔ تو وہ ایک دوسرے کے بہتر دوست ثابت ہو سکتے ہیں۔ یہ بات بالکل صحیح ہوگی۔ واقعی اس کی ان سے راسی بھی مشابہت نہیں، یا ہے؟“

”نہیں، مگر یہ بہت بڑا جواب آ رہی ہیں۔“

اچھا، شب بخیر۔“ مناشا نے کہا۔

اور اس کے چہرے پر وہی شوخ اور بڑے از شرارت مسکراہٹ یوں تیرتی رہی جیسے اسے وہاں رکھ کر بھلا دیا گیا ہو۔

18

میکر کو اس رات بہت دیر تک نیند نہ آ سکی۔ وہ اپنے کمرے میں چکر کاٹتا رہا۔ کبھی وہ تیوریاں پڑھا لیتا اور کسی وقت مسئلے کے بارے میں سوچ بچار کرنے لگتا، کبھی وہ کندھے اچکانے لگتا اور کسی کرب کے ذریعہ اس کے رگ پٹھے کھینچنے لگتے، اور کبھی وہ عالم مسرت میں مسکراتے لگتا۔

وہ پرنس آندرے، مناشا اور ان کی محبت کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ کبھی وہ اس (مناشا) کے ماضی سے حسد کرنے لگتا، کبھی اسے اپنے اس جذبے پر مذمت ہونے لگتی اور وہ اپنے آپ کو فحش طاعت کرنے لگتا، اور پھر خود ہی اپنی تقصیر معاف کر دیتا۔ صبح کے چھ بج چکے تھے اور وہ ابھی تک اپنے کمرے میں چکر کاٹ رہا تھا۔

”اگر اس کے علاوہ اور کوئی صورت نہیں، پھر کرنا کیا ہوگا؟ کرنا کیا ہوگا؟ پھر یقیناً یہی کرنا ہوگا،“ اس نے اپنے آپ سے کہا۔ اس نے بائیل اپنا لباس تبدیل کیا اور بستر میں گھس گیا۔ وہ خوش بھی تھا اور مضطرب بھی لیکن اس کے تمام شکوک اور ہچکچاہٹیں کا فور ہو چکی تھیں۔

”ہاں، اس قسم کی خوشی بے شک عجیب اور ناممکن نظر آتی ہے لیکن مجھے اسے اپنی بیوی بنانے کے لیے ہر ممکن

کوشش کرنا چاہیے۔“

چند روز پیشتر میئر نے بروز جمعہ پیٹرز برگ جانے کا منصوبہ بنایا تھا۔ جب جمعرات کی صبح اس کی آنکھ کھلی، سادیلج سامان باندھنے کے سلسلے میں اس کا مشورہ دینے آیا۔

”پیٹرز برگ؟ پیٹرز برگ؟ کیا رکھا ہے وہاں؟ کون ہے وہاں؟“ اس نے سوچے سمجھے بغیر پوچھا جیسے وہ اپنے آپ سے باتیں کر رہا ہو۔ ”اگرے ہاں، اس سب کچھ کے وقوع پذیر ہونے سے پیشتر میں نے کسی ہمارے پیٹرز برگ جانے کا ارادہ کیا تھا۔“ اسے یاد آیا۔ ”لیکن کیوں؟ اور شاید میں چلا ہی جاؤں۔ یہ کتنا اچھا اور سمجھدار آدمی ہے ہر چیز کا خیال رکھتا ہے!“ اس نے سادیلج کے بوڑھے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے سوچا۔ ”اور اس کی مسکراہٹ کتنی دل فریب ہے!“

”اچھا، سادیلج، تمہیں اب بھی اپنی آزادی کی خواہش نہیں؟“ میئر نے اس سے پوچھا۔

”یوٹرا ایکسی لینسی، میں آزادی لے کر کیا کروں گا؟ جب مرحوم کاؤنٹ، خدا انہیں جنت نصیب کرے، زندہ تھے، ہمارا اچھا بھلا گزارہ ہو رہا تھا، اور آپ سے بھی ہمیں کوئی شکایت نہیں ہوئی۔“

”مگر اپنے بچوں کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے؟“

”یوٹرا ایکسی لینسی، بچوں کی بھی اچھی بھلی نبھ جائے گی۔ اگر آپ جیب آقا مل جائے، پھر ڈر کس بات کا؟“

”لیکن، میرے وارث؟“ میئر نے سمجھایا۔ ”فرض کرو، میں چانک شادی کر لیتا ہوں۔ در سوچو، ایسا

مکمل ہے،“ اس نے غیر ارادی طور پر مسکراتے ہوئے مزید کہا۔

”یوٹرا ایکسی لینسی، اگر اجازت ہو تو میں عرض کرنے کی جسارت کروں گا کہ یہ تو بہت ہی اچھی بات ہوگی۔“

”یہ شخص اس معاملے کو کتنا معمولی سمجھتا ہے!“ میئر نے سوچا۔ ”اے معلوم ہی نہیں کہ اس کے نتائج و عواقب

کتنے بھیانک، کتنے خطرناک ہو سکتے ہیں۔ جلد بازی سے کام لویا تاخیر برتو۔ نتیجہ تو خوفناک ہی نکلا ہے!“

”یوٹرا ایکسی لینسی، پھر کیا حکم ہے؟ کل آپ کی روانگی ہوگی؟“ سادیلج نے پوچھا۔

”نہیں، میں اسے ذرا ملتوی کرنا چاہتا ہوں۔ میں تمہیں بعد میں بتا دوں گا،“ میئر نے کہا اور سادیلج کو مسکراتے

دیکھ کر سوچنے لگا۔ ”کتنی عجیب بات ہے کہ اب میرے لیے کوئی پیٹرز برگ نہیں ہے اور یہ کہ سب سے پہلے وہ دوسرا

مسئلہ طے ہونا چاہیے۔ غالباً اسے اچھی طرح معلوم ہے اور خواہ مخواہ بننے کی کوشش کر رہا ہے۔ کیا مجھے اس سے بات

کرنا اور یہ دیکھنا چاہیے کہ اس کی کیا رائے ہے؟“ میئر نے سوچا۔ ”نہیں، کسی اور وقت یہی۔“

ناشتے پر میئر نے اپنی پھوپھی زاد کو بتایا کہ وہ گزشتہ روز پرنس ماریا سے ملنے گیا تھا اور وہاں اس کی ملاقات

”آپ کے خیال میں کس سے۔“ نسا شارستووا“ سے ہوئی تھی۔

پرنس کارل کچھ اس قسم کا تھا جیسے وہ سمجھتی ہو کہ میئر (بوڑھی) آتنا سیمپو نووا سے کسی زیادہ غیر معمولی ہستی

سے قائل کر نہیں آیا ہوگا۔

”آپ سے جانتی ہیں؟“

”پرنس سے میری ایک مرتبہ ملاقات ہوئی تھی، اس سے جواب دیا: ”میں نے سنا ہے کہ اس کا رشتہ نوجوان رستوف سے کرانے کی کوششیں ہو رہی ہیں۔ رستوفوں کے بھاگ جاگ جائیں گے۔ سنا ہے کہ وہ بالکل کنگال ہو گئے ہیں۔“

”نہیں، میرا مطلب تھا کہ آپ ناشر رستوف کو جانتی ہیں۔“

”میں نے ان دنوں اس کا قصہ سنا تھا۔ بڑا افسوس ناک معاملہ تھا!“

”نہیں، یہ سمجھ ہی نہیں رہی... یا پھر بن رہی ہے،“ کوئر نے سوچا۔ ”بہتر ہے کہ اس سے بھی کوئی بات نہ کی جائے۔“

پرنس کا تش نے بھی اس کی سفری ضروریات اٹھا کر لی تھیں۔

”یہ سب لوگ کتنے مہربان ہیں!“ کوئر نے سوچا۔ ”حیرت کی بات یہ ہے کہ یہ اس معاملے کے ضمن میں ایک ایسے وقت تکلیف اٹھا رہے ہیں جب انھیں یقیناً اس میں کوئی دلچسپی نہیں ہو سکتی۔ اور یہ سب کچھ میرے لیے۔ میری خاطر کیا جا رہا ہے۔ ہے نا تعجب انگیز بات!“

اسی روز چیف آف پولیس آیا اور اس نے کوئر کو دعوت دی کہ وہ اپنا نمائندہ گرانویر تھائل بھیج دے تاکہ وہ ان اشیاء کو اکٹھا کر سکے، جو ان کے مالکوں کو لوٹائی جانا تھیں۔

”اور یہ شخص بھی،“ کوئر نے چیف آف پولیس کے چہرے کی طرف غور دیکھتے ہوئے سوچا۔ ”یہ کتنا شہرہ خلاق اور خوش شکل افسر ہے اور کتنا مہربان! ذرا سوچیں کہ اب کتنی معمولی معمولی باتوں کے پریشان ہو رہا ہے! پھر بھی لوگ کہتے ہیں کہ یہ یہاں دار نہیں ہے اور رشوتیں وصول کرتا ہے! کتنی فضول باتیں ہیں! اعداد و ازیں وہ رشوتیں وصول نہ کرے، تو اور کیا کرے؟ اس کی تربیت ہوئی ہی اس انداز سے ہے۔ اور باقی لوگ بھی تو جی بکھ کرتے ہیں۔ مگر اس کا چہرہ کتنا نظر نو اور شفیق ہے! اور جب وہ میری طرف دیکھتا ہے، مسکراتے لگتا ہے!“

ڈنر کا وقت ہو رہا تھا۔ پرنس ماریا کی طرف چل پڑا۔

جب اس کی گاڑی گلی کو چوں میں سوختہ مکانوں کے بچے کچے کچے گھر کے قریب سے گزر رہی تھی، وہ کھنڈرات کی خوبصورتی دیکھ کر حیران رہ گیا۔ چھتوں پر چینیوں کی قطاروں، درختوں کے سوختہ عداؤں کی شکستہ دھندل دیواروں کی، جو تاحدنگاہ پھیلی ہوئی تھیں، دل کشی اور حسن دیکھ کر اسے دریائے رائے اور کولوی ام¹⁰ یاد آئے۔ راستے میں اسے جو کچھ جوان اور ان کے مسافر، نئے مکانوں کے بے ٹکڑی چہرے، بڑھئی، خواجہ فروش عورتیں اور دکھدار نظر آتے، سبھی ہشاش بشاش چہروں اور چمکتی دکتی آنکھوں سے سے اپنا استقبال کرتے دکھائی دیتے اور یہ کہتے معلوم ہوتے:

”اے وہ، وہ آگیا ہے! اب ہم دیکھیں گے کہ اس کی آمد کا کیا نتیجہ نکلتا ہے۔“

جب پرنس ماریا کے گھر پہنچا، اسے اچانک شلوک نے گھیر لیا اور وہ سوچنے لگا، ”کیا میں واقعی کل رات

یہاں آیا تھا؟ کی میں واقعی نتاشا سے ملا اور اس سے باتیں کی تھیں؟ شاید یہ سب کچھ میرے تخیل کا کیا دھرا ہے؟ اگر میں اندر گیا، شاید مجھے کوئی بھی نہ ملے۔“ لیکن اس نے بمشکل کمرے میں قدم رکھا ہوگا کہ اسے ایک دم احساس ہوا کہ وہ اپنی آرا دی سے محروم ہو چکا ہے اور اس احساس کی بنا پر اسے یہ کامل آنکھی ملی کہ وہ وہاں موجود ہے۔ وہ گزشتہ رات کی طرح اسی سیاہ ڈریس میں لمبوس تھی جو ہلکے ہلکے بل کھاتا نیچے ٹپک رہا تھا، اور اس کے ہاں بھی اسی انداز سے سنورے ہوئے تھے۔ پھر بھی وہ وہیں تھی جو وہ گزشتہ رات تھی بلکہ کافی مختلف تھی۔ جب وہ گزشتہ روز آیا تھا، اگر تب بھی وہ اسی طرح نظر آتی، پھر وہ اسے پیچھے نئے میں قہقہا نا کام نہ رہتا۔

وہ بالکل ایسی تھی جب اس نے تب جب وہ ابھی تقریباً بچی تھی اور جب بعد ازاں وہ پرنس آئندے کی منگیت تھی۔ اسے دیکھتے تھے۔ اس کی آنکھوں میں تیز، استفہامی روشنی جگمگا رہی تھی۔ اس کے چہرے سے انیسیت اور عیب و غریب قسم کی شرارت نکل رہی تھی۔

پیئر نے ان کے ساتھ ڈنر کھایا۔ وہ ساری شام وہیں گزار دیتا لیکن پرنس ماریا نے شام کی عبادت میں شریک ہونے گر۔ جے جانا تھا اور پیئر ان کے ساتھ چل پڑا۔

اگلے روز پیئر جلدی آگیا، اس نے ان کے ساتھ کھانا کھایا اور ساری شام وہیں بیٹھا رہا۔ گرچہ پرنس ماریا اور نتاشا اپنے مہمان کو دیکھ کر ماریب خوش ہوتی تھیں اور اگرچہ پیئر کی زندگی کی تمام دلچسپیوں کا ٹور دہی مکان تھا، انھوں نے جو کچھ کہنا تھا، شام ہوتے ہوتے، وہ سب کا سب کہہ چکے تھے۔ اب گفتگو ایک پیش پا افتادہ موضوع سے دوسرے تک منتقل ہونے لگی اور اکثر اوقات اس میں لمبے لمبے وقفے آنے لگے۔ پیئر کو وہاں بیٹھے بیٹھے تنہا رہنا چکی تھی کہ پرنس ماریا اور نتاشا آپس میں نگاہوں کا تبادلہ کرنے لگیں۔ بظاہر وہ حیران و پریشان تھیں کہ وہ کب رخصت ہوگا۔ پیئر یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا لیکن وہ اٹھ کر نہیں جاسکتا تھا۔ وہ پریشان کن اور کڈھب صورت حال میں پھنس گیا تھا، پھر بھی وہ دھرتا جمائے وہیں بیٹھا رہا کیونکہ اس کے لیے اٹھنا اور رخصت ہونا ناممکن ہو چکا تھا۔

پرنس ماریا نے جب دیکھا کہ یہ صورت حال ختم نہیں ہوگی، وہ دوسروں سے پہلے اٹھ کر کھڑی ہو گئی اور درد کے بہانے خدا حافظ کہنے لگی۔

”نو آپ کل پیئر بزرگ جا رہے ہیں؟“ اس نے کہا۔

”نہیں، میں کہیں نہیں جا رہا، پیئر نے پٹ جواب دیا۔ اس کے لہجے میں حیرت بھی تھی اور قدرے فکری بھی۔“

”ارے ہاں، پیئر بزرگ؟ کل۔ لیکن میں ابھی خدا حافظ نہیں کہوں گا۔ میں کل پھر آؤں گا، شاید تمہیں میرے ذمے کوئی کام لگانا یاد آجائے؟“ اس نے مزید کہا اور اس کے چہرے کی رنگت قرمزی ہو گئی۔ وہ پرنس ماریا کے رد و کفر تھا لیکن جانے کا نام تک نہیں لے رہا تھا۔

نتاشا نے اسے اپنے ہاتھ تھمایا، شب بھر کہا اور باہر نکل گئی۔ تاہم پرنس ماریا جانے کے بجائے وہیں آرام کرسی پر ڈھیر ہو گئی اور اپنی جھیل کی طرح گہری اور درخشاں آنکھوں سے اسے بغور دیکھنے لگی۔ اس کے چہرے پر

شجید کی جھلک رہی تھی۔ تاہم اس سے قبل اس کے خدو خال سے جو تھکن ٹپک رہی تھی، اب اس کا وہاں دور دور تک کوئی نشان نہیں تھا۔ اس نے عمیق اور طویل آہ بھری جیسے وہ غویل گفتگو سننے کے لیے تیار ہو رہی ہو۔
جو بھی مناشا کمرے سے باہر نکلی، میسر کا زانی خافشا اور اضطراب ختم ہو گیا اور اس کی جگہ ہر شوق جوش و جذبے نے لے لی۔

اس نے پھرتی سے پتلی کرسی پر بس ماریا کے قریب کر لی۔

”ہاں، میں تمہیں بتانا چاہتا تھا،“ اس نے اس کی نگاہوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا جیسے انہوں نے اس سے کچھ کہا ہو۔ ”پرنس، میری مدد کرو۔ مجھے کیا کرنا ہوگا؟ کیا میں امید باندھ سکتا ہوں؟ پرنس، مائی ڈیئر فرینڈ، مجھے سب کچھ معلوم ہے۔ میں جانتا ہوں کہ میں اس کے قابل نہیں؟ مجھے معلوم ہے کہ یہ وقت بات کرنے کے لیے مناسب نہیں ہے۔ لیکن میں اس کا بھائی بننا چاہتا ہوں۔ نہیں، میرا مطلب یہ نہیں ہے۔ مجھے کچھ کہا نہیں جاتا۔“
”بات کچھ اس طرح ہے،“ وہ دوبارہ بولتے لگا۔ صاف نظر آ رہا تھا کہ اسے اپنے اوپر قابو پانے اور بار بار گفتگو کرنے میں وقت پیش آرہی ہے۔ ”یہ تو مجھے معلوم نہیں کہ میں نے کب اس سے محبت کرنا شروع کیا، لیکن میں نے اپنی ساری زندگی میں سی سے، صرف اسی سے، محبت کی ہے۔ مجھے اس سے اتنی محبت ہے کہ میرے لیے اس کے بغیر زندگی کا تصور بھی محال ہے۔ میں فی الحال اس سے شادی کی درخواست تو نہیں کر سکتا لیکن یہ خیال کہ شاید وہ کسی روز میری بیوی بن جائے اور میں شاید یہ موقع۔ یہ موقع۔ کہیں گونا گوں ٹھوں۔ مجھے کسی کل چین نہیں لینے دیتا۔ مجھے بتاؤ، کیا میں امید کر سکتا ہوں؟ مجھے بتاؤ کہ مجھے کیا کرنا ہوگا؟ ڈیئر پرنس!“ اس نے ہمدرد خاموشی کے بعد، جب اس نے کوئی جواب نہ دیا، اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے مزید کہا۔

”آپ نے جو کچھ کہا ہے، میں اسی کے بارے میں سوچ رہی ہوں،“ پرنس ماریا نے کہا۔ ”میں صرف اتنا کہوں گی کہ آپ نے جو کچھ کہا، صحیح ہے، فی الحال اس سے محبت کے متعلق گفتگو کرنا۔“
پرنس ماریا رک گئی۔ وہ یہ کہنا چاہتی تھی کہ محبت کے متعلق گفتگو کرنا ممکن ہے لیکن وہ رک اس بے گئی کیونکہ اس نے گزشتہ دو دنوں کے دوران میں مناشا میں جو تبدیلی دیکھی تھی، اس سے یہ عندیہ ملا تھا کہ اگر میٹر نے اپنی محبت کا اقرار کیا تو اس سے اس کی سہیلی کے جذبات کو نہ صرف یہ کہ کوئی ٹھیس نہیں پہنچے گی بلکہ یہی نو دہائی جز ہے جس کی وہ سب سے زیادہ آرزو مند ہے۔

”اس سے فی الحال بات کرنا... مناسب نہیں ہوگا۔“ پھر بھی پرنس نے کہہ دی دیا۔

”لیکن مجھے کیا کرنا ہوگا؟“

”یہ مجھ پر چھوڑ دیں،“ پرنس ماریا نے جواب دیا۔ ”مجھے معلوم ہے۔“

میسر پرنس ماریا کی آنکھوں میں جھانک رہا تھا۔

”اچھا؟... اچھا؟...“ اس نے کہا۔

”مجھے معلوم ہے کہ وہ آپ سے محبت کرتی ہے۔ آپ سے محبت کرنے لگے گی،“ پرنس ماریا نے اپنی تصحیح کی۔
ابھی اس کی بات مکمل بھی نہیں ہوئی تھی کہ پیٹر اچیل کرکھڑا ہو گیا۔ اس کے چہرے پر خوف کے سرسے لہرا رہے تھے اور اس نے پرنس کا ہاتھ مضبوطی سے پنی گرفت میں لے لیا۔

”تمہیں یہ خیال کیسے آیا؟ تمہارے خیال میں میں میدان کر سکتا ہوں؟ واقعی؟“

”ہاں، مجھے اس کا یقین ہے،“ پرنس ماریا نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”اس کے والدین کو خط لکھ دیں۔ ہائی مجھ پر چھوڑ دیں۔ جب مناسب وقت آئے گا، میں اسے بتا دوں گی۔ میرا جی چاہتا ہے کہ ایسا ہو جائے اور میرا دل گواہ دیتا ہے کہ ایسا ہو جائے گا۔“

”نہیں، ایسا نہیں ہو سکتا! میں کتنا خوش ہوں! نہیں، یہ ممکن نہیں ہے۔ میں کتنا خوش ہوں! نہیں، یہ ممکن نہیں!“ پیٹر پرنس ماریا کا ہاتھ چومے اور بار بار کہے جا رہا تھا۔

”آپ پیٹرز برگ چلے جائیں، یہ بہترین بات ہوگی۔ اور میں آپ کو خط لکھ دوں گی،“ اس نے کہا۔
”پیٹرز برگ؟ یہاں سے چلا جاؤں؟ بہت اچھا، میں چلا جاؤں گا۔ لیکن کیا میں کل آ سکتا ہوں اور آپ سے ملاقات کر سکتا ہوں؟“

پیٹر اس کے روز خدا حافظ کہنے آیا۔ نانا میں وہ چلبلا ہٹ تو نہیں تھی جو گزشتہ روز دیکھنے میں آئی تھی، مگر جب پیٹر اس کی آنکھوں میں جھانکتا اسے محسوس ہونے لگتا کہ وہ ناپید ہو رہا ہے، اب نہ اس کا اپنا کوئی وجود رہا ہے، نہ نانا اور نہ کسی اور چیز کا، صرف سرت ہی سرت موجود ہے۔ ”کیا یہ ممکن ہے؟ نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔“ وہ اس کی ہر گواہی ہر اشارے اور ہر لفظ پر، جو اسے خوشی سے سرشار کر رہا تھا، اپنے آپ سے کہتا۔

جب خدا حافظ کہتے اس نے اس کا دایا پتلا اور نازک ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا، وہ کچھ دیر اسے تھامے رکھنے سے باز نہ رہا۔

”کیا یہ ممکن ہے کہ یہ ہاتھ، یہ چہرہ، یہ آنکھیں، نسوانی دلکشی کا یہ تمام خزانہ، جو اب میرے لیے اتنا نکھار اور عجیب ہے۔ کسی روز ہمیشہ ہمیشہ کے لیے میرا اپنا ہو جائے گا، میرے لیے اتنا ہی جان پہچانا بن جائے گا جتنا کہ میں اپنے آپ کے لیے ہوں؟... نہیں، ایسا نہیں ہو سکتا!“

”کاؤنٹ، خدا حافظ،“ اس نے اس سے کہا۔ ”مجھے آپ کی واپسی کا شدت سے انتظار رہے گا۔“ اس نے کاناپھوڑی کے انداز میں مزید کہا۔

اس کے یہ سیدھے سادے الفاظ، اس کے دیکھنے کا انداز اور اس کے چہرے کے تاثرات اگلے دو مہینوں کے لیے پیٹر کے لیے غیر ختم یادوں، تشریکوں اور بے دردی کے خوابوں کا موضوع بن گئے۔ ”مجھے آپ کی واپسی کا شدت سے انتظار رہے گا۔“ بالکل، اس نے بالکل یہی الفاظ کہے تھے، لیکن اس نے یہ کہے کیسے تھے؟ مجھے بالکل یاد ہے۔ ”مجھے آپ کی واپسی کا شدت سے انتظار رہے گا۔“ وہ، میں کتنا خوش ہوں۔ یہ مجھے کیا ہو رہا ہے؟ میں کتنا

خوش ہوں! "خیر اپنے آپ سے کہتا رہتا تھا۔

19

ہسپین کے ساتھ محبت کے اظہار کے دوران میں خیر کو خیر کی جو کک محسوس ہوا کرتی تھی اب اس کے دل و دماغ میں اس کا شائبہ بھی نہیں تھا۔

اس وقت جب وہ اپنے آپ سے یہ کہتا تھا "اف، میں نے یہ کیوں نہ کہا؟" یا "مجھے کس چیز نے یہ کہنے پر کسایا 'Je vous aime' اسے اس حد تک شرمندگی محسوس ہونے لگی تھی کہ اس کا جی سلانا شروع ہو جاتا تھا، لیکن اب ان لفظ کو بار بار دہرانے سے اسے قطعاً کسی قسم کی خفت کا احساس نہیں ہوتا تھا اس کے برعکس اب وہ اپنے تخیل میں ہر وہ لفظ جو خود اس نے یا نسا شائے کہا تھا بار بار دہراتا تھا، اس کے خدا خال کے یک ایک ریشے اور اس کی مسکراہٹ کی ایک ایک تفصیل کو دھیان میں لاتا تھا۔ وہ کسی چیز کو نظر انداز کرنے یا کسی بات کا غاف کرنے کا خواہش مند نہیں تھا، بلکہ جو کچھ تھا، جیسا تھا، بس اسے جوں کا توں دہراتا رہتا تھا۔ اس نے جو کچھ کرنے کا ارادہ کیا تھا، اس کے درست یا نادرست ہونے کے بارے میں اس کے ذہن میں دنی برادرشہ نہیں تھا۔ کبھی کبھار صرف ایک بھیا تک شک اس کے دماغ میں سر اٹھانے لگتا۔ "کیا یہ سب کچھ خوب تو نہیں ہے؟ کیا پرس ہریا کو غلطی تو نہیں لگی؟ کیا میں حد سے زیادہ خود بین یا خود اعتماد تو نہیں؟ میں تو مجھے پورا یقین ہے۔ لیکن اگر پرس ہریا اسے غادیتی اور جواب میں وہ مسکرانے لگتی ہے اور کہتی ہے، 'کیسی عجیب بات ہے، وہ یقیناً اپنے آپ کو مغالطے میں جمل کر رہے ہیں۔ کیا انھیں اندازہ نہیں ہے کہ وہ محض انسان ہیں دوسرے انسانوں کی طرح عام ذاتی انسان۔ جب کہ میں بالکل مختلف مخلوق ہوں، بلند و برتر آستی ہوں؟"

خیر کا یہ واحد شک بار بار اس کے ذہن میں آتا اور اسے ڈستار دے گا۔ اس نے کسی قسم کا منصوبہ بنانے کا حراز کیا۔ جس خوشی کا اسے انتظار تھا، وہ اتنی ناقابل یقین تھی کہ اگر سے یہی حاصل ہو جائے اس کے بعد اسے کسی چیز کی تمنا باقی نہیں رہ جائے گی۔ اس کے ساتھ باقی سب کچھ ختم ہو جاتا ہے۔

پر مسرت اور غیر متوقع جنون نے، جس کے متعلق خیر کو یقین تھا کہ وہ اس کا لی نہیں اسے اپنے شکے میں کس لیا تھا۔ اسے یوں لگ رہا تھا کہ زندگی کے سارے مفاہیم۔ نہ صرف اس کے اپنے بلکہ ساری دنیا کے۔ اس کی اپنی محبت اور نسا شائے اس کے ساتھ محبت کرنے کے مکان میں مٹ گئے ہیں۔ بعض اوقات وہ سوچنے لگتا کہ ہر شخص صرف ایک ہی فکر میں۔ اس کی مستقبل کی مسرت۔ غلغلے اور پہچان ہے۔ بعض اوقات اسے یوں محسوس ہونے لگتا کہ دوسرے لوگ اس کی کامیابی پر اتنے ہی خوش ہو رہے ہیں جتنا کہ وہ خود ہے لیکن وہ اپنی اس خوشی کو محض چھپنے کی کوشش کر رہے ہیں اور بہانہ یہ بنا رہے ہیں کہ وہ دوسرے کاموں میں مصروف ہیں۔ اسے ان کے

میں تم سے محبت کرتا ہوں۔

ایک ایک لفظ اور ایک ایک اشارے میں یہی احساس ہوتا کہ وہ اس کی خوشی کی طرف اشارے کر رہے ہیں۔ جن لوگوں سے اس کی مدد بھڑھائی ہوئی، وہ انہیں اپنی شاداں و فرحان اور پر معنی نظروں و سرکراہٹوں سے یوں متحیر کر دیتا جیسے اس کے اور ان کے مابین کوئی خفیہ مفاہمت ہو چکی ہے۔ لیکن جب اسے یہ اندازہ ہوتا کہ لوگوں کو شاید اس کی سرت سے آگئی نہیں ہے، وہ دل و جان سے ان پر ترس کھانے لگتا اور اس کا جی چاہتا کہ وہ کسی نہ کسی طرح انہیں سمجھا دے کہ جن مصروفیات میں وہ الجھے ہوئے ہیں، وہ بالکل بے تکی، مہمل اور فضول ہیں اور آدمی کو زیب نہیں دیتا کہ ان پر توجہ صرف کرے۔

جب اسے مشورہ دیا جاتا کہ اسے سول سروں میں شامل ہو جانا چاہیے یا اس مفردے پر، کہ عوامی فلاح و بہبود کا انحصار فداں مسئلے یا فلاں واقعے پر ہے، جنگ یا سیاسی امور کو زیر بحث لایا جاتا، وہ پھرے پر غم و ملانم اور پرانز حتم قسم سجائے دوسروں کی باتیں سننا رہتا اور اپنے عجیب و غریب تبصروں سے انہیں ہکا بکا کر دیتا۔ اس زمانے میں وہ تمام لوگوں کو۔ انہیں بھی، جن کے بارے میں اس کا خیال تھا کہ وہ زندگی کا صحیح مفہوم (یعنی جو کچھ وہ محسوس کر رہا تھا) سمجھتے ہیں ورنہ کوتاہ بختوں کو بھی، جن کے اذہان میں اس قسم کا کوئی تصور نہیں تھا جذبات کی اس تیز روشنی میں، جو خود اس کے اندر فروزاں تھی، دیکھتا تھا اور اسے کسی نوع کی کوشش کیے بغیر جھٹ پٹ ہر شخص میں، جس سے اس کی ملاقات ہوتی تھی، وہ سب کچھ نظر آ جاتا تھا، جو اس کی ذات کا قابل ستائش اور قابل محبت پہلو ہوتا تھا۔

جب اس نے اپنی مرحوم بیوی کے کاغذات اور معاملات کا جائزہ لیا، اسے اس پر بہت ترس آیا۔ اس کے علاوہ اس کے دل میں اور کسی قسم کا جذبہ نہ ابھرا۔ اسے رہ رہ کر یہ خیال آ رہا تھا کہ جس نوع کی کامل سرت اب اس کے حصے میں آئی ہے، اس سے وہ سدا نا آشا رہی۔ رہا پرس و ایسی، اگرچہ اسے نیا عہدہ اور نیا اعزاز مل چکا تھا وہ وہ حد سے زیادہ کبر و نخوت کا مظاہرہ کر رہا تھا، اسے وہ قابل رحم، قابل ترس اور بے ضرر آدمی نظر آیا۔

اپنی بعد کی زندگی کے دوران میں بیٹراپنے، اس انتہائی پر سرت جنون کے زمانے کو یاد کرتا رہتا۔ اس نے اس دور میں تسالوں اور حالات کے متعلق جو آراء قائم کی تھیں، انہیں وہ بحیات صحیح گردانتا رہا۔ اس نے بعد ازاں نہ صرف یہ کہ انہیں ترک نہ کیا، بلکہ اس کے برعکس جب کبھی وہ کسی طرح کے شے میں گرفتار ہوتا یا اسے کسی داخلی کشمکش کا سامنا کرنا پڑتا، وہ انہی خیالات کی طرف رجوع کرتا جن کا وہ جنون کے زمانے میں پابند تھا اور وہ ہمیشہ صحیح ثابت ہوتے۔

”ممکن ہے کہ میں اس زمانے میں بہت عجیب و غریب یا محکمہ خیز نظر آتا رہا ہوں“ وہ سوچا کرتا، ”لیکن میں اتنا پاگل نہیں تھا جتنے کہ میں نظر آیا کرتا تھا۔ اس کے برعکس کسی دوسرے زمانے کی نسبت میں اس وقت زیادہ عقیدہ، زیادہ باشعور اور زیادہ باہمیرت تھا اور زندگی کی جن چیزوں اور باتوں کا سمجھنا ضروری ہے، میں انہیں خوب سمجھتا تھا کیونکہ... میں خوش تھا۔“

بیٹر کی دیوانگی یہ تھی کہ اب وہ لوگوں سے محبت کرنے سے پہلے ان کے ذاتی اوصاف، جنہیں وہ ان کی ”اجلی

ہفتا کہتا تھا، دریافت کرنے کا انتظار نہیں کرتا تھا، اس کا دل محبت سے چھلک رہا تھا اور وہ سب لوگوں سے محبت کر کے محبت کرنے کے ناقابل تردید اسباب دریافت کرنے میں کبھی ناکام نہ رہا۔

20

اس پہلی شام بیٹر کی روانگی کے بعد جب ناشا نے باجیس کھاتے اور شرارت آمیز انداز سے مکرانے پرس ماریا سے کہا تھا ”وہ بالکل یوں، نظر آتے ہیں جیسے ابھی ابھی ہاتھ سے باہر آئے ہوں... اور اپنے چھوٹے گوٹ اور خشکی بالوں۔“ اسی دم کوئی مخفی اور نامعلوم چیز، جس کی خوراک اسے کوئی آگہی نہیں تھی لیکن جو ناقابل مقاومت تھی، ناشا کی روح میں انگڑائیاں لینے لگی۔

اس کی ایک ایک چیز۔ اس کا چہرہ، اس کی آواز، اس کی چال، اس کی دھال، اس کی چٹان۔ ایسا کی مقلب ہو گئی۔ وہ بیدار دیکھ کر متعجب ہو گئی کہ قوت حیات اور امید مسرت سطح پر نمودار ہو چکی ہیں اور تشنگی کا مطالبہ کرنے لگی ہیں۔ ناشا کے ساتھ جو کچھ بیٹا تھا، معلوم ہوتا تھا کہ اس اوین شام سے اس کی، دیں اس کے ذہن سے محو ہونے لگی ہیں۔ اب اسے اپنی صورت حال کے متعلق کوئی شکوہ، کوئی شکایت نہیں رہی تھی، وہ اپنے ماضی کے بارے میں منہ سے ایک لفظ بھی نہیں نکالتی تھی اور مستقبل کے سلسلے میں سہانے منصوبے بنانے سے خوف نہیں کھاتی تھی۔ وہ بیٹر کے متعلق شاید ہی کوئی بات کرتی تھی، لیکن جب پرس ماریا اس کا ذکر کرتی، مدت مدید سے بھی ہوئی روشنی اس کی آنکھوں میں فروزں ہو جاتی اور اس کے ہونٹ عجیب و غریب جسم سے لیزے تریجھے ہونے لگتے۔

ناشا میں جو تبدیلی رونما ہوئی تھی، اسے دیکھ کر پرس ماریا پہلے تو حیران ہوئی، مگر جب اس کا مفہوم اس پر عیاں ہوا، وہ رنجیدہ ہو گئی۔ ”کیا سے میرے بھائی سے اتنی معمولی محبت تھی کہ وہ اتنی جلدی بھول گئی؟“ وہ اس تبدیلی کے متعلق سوچتے سوچتے اپنے آپ سے پوچھتی مگر جب وہ ناشا کے پاس آئی، اسے اس پر نہ کوئی غصہ آتا اور نہ وہ اسے کسی طرح بھی مورد الزام ٹھہرتی۔ قوت حیات کی نو بیداری، جس نے ناشا کو اپنی گرفت میں لے لیا تھا، بظاہر اتنی زور آور تھی اور خود لڑکی کے لیے اتنی غیر متوقع، کہ اس کی موجودگی میں پرس ماریا کو محسوس ہونے لگتا کہ اسے اپنے دل میں بھی اسے لعنت ملامت کرنے کا کوئی حق حاصل نہیں۔

ناشا اتنے کامل اور بے ریا انداز سے اس نئے جذبے کے سامنے ہر انداز ہوئی کہ اس نے اس حقیقت پر، کہ اب وہ مفہوم و محزوں نہیں بلکہ شادمان و مسرور ہے، پردہ ڈالنے کی کوئی کوشش نہ کی۔

جب پرس ماریا اس رات بیٹر سے گفتگو کرنے کے بعد واپس اپنے کمرے میں آئی، ناشا اسے دہلیز پر مل گئی۔

”انھوں نے کوئی بات کی ہے؟ ہاں؟ کی ہے؟“ وہ بار بار پوچھ رہی تھی۔

اور ناشا کے چہرے پر مسرت اور اس کے ساتھ ہی پر ملال تاثر ہو گیا، جو اس کی مسرت کے لیے

معذرت خواہی کرتا دکھائی دے رہا تھا۔

”میں دردازے کی آڑ سے سنا چاہتی تھی لیکن مجھے معلوم تھا کہ تم مجھے بتا دو گی۔“

نشا جس انداز سے نگلتی باندھے پرس ماریا کے چہرے کو دیکھ رہی تھی، بے شک وہ قابل فہم اور متاثر کن تھا اور اس کی پریشانی و اضطراب دیکھ کر پرس ماریا کو افسوس بھی ہوا، تاہم ایک ٹاپے کے لیے اس کے لٹاؤ اس کے دل کو بھروح کر گئے۔ اسے اپنا بھائی اور اس کی محبت یاد آ گئی۔

”لیکن اب کیا ہو سکتا ہے؟ بات اس کے بس کی نہیں ہے،“ پرس ماریا نے سوچا۔

اگرچہ اس کے چہرے پر ملاں اور درشتی جھلک رہی تھی، اس نے وہ سب کچھ، جو نہ کرنے کہا تھا، نشا کو بتلایا۔ جب نشا نے سنا کہ پیئرز برگ جا رہا ہے، اسے زمین آسمان گھومتے نظر آئے۔

”پیئرز برگ!“ اس نے یوں دہرایا جیسے اس کے پلے کچھ نہ پڑا ہو۔

لیکن پرس ماریا کے چہرے پر کرب کے آثار دیکھ کر اور ان کی وجوہ سمجھتے ہوئے وہ اپنے آپ پر قابو نہ رکھ سکی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

”ماری!“ اس نے کہا، ”مجھے بتاؤ کہ میں کیا کروں؟ سیری اس خوف سے جان نکلی جا رہی ہے کہ کہیں میں بد تو نہیں ہوں! تم جو کچھ کہو گی، میں وہی کروں گی، کہونا۔“

”تم ان سے محبت کرتی ہو؟ تمہیں ان سے محبت ہے؟“

”ہاں!“ نشا نے سرگوشی کی۔

”پھر دیکھو رہی ہو؟ میں تمہاری خاطر خوش ہوں،“ پرس ماریا نے کہا۔ وہ نشا کے آنسوؤں سے اتنا متاثر ہوئی کہ اس نے اسے دل سے معاف کر دیا۔

”لیکن یہ ابھی نہیں ہوگا۔ کسی دن۔ صرف اتنا سوچو کہ جب میں ان کی بیوی بن جاؤں گی اور تم نکولس سے شادی کر لو گی، ہم کتنے خوش ہوں گے۔“

”نشا، میں نے تم سے کہا تھا کہ یہ بات اپنی زبان پر نہ لایا کرو۔ چھوڑو اسے، آؤ، ہم کھانے کے مشغول باتیں کرتے ہیں۔“

”میں صرف یہ جانتا چاہتی ہوں کہ آخر انہیں پیئرز برگ جانے کی کیا ضرورت تھی؟“ نشا نے اچانک پوچھا اور پھر عجلت سے خود ہی اپنے سوال کا جواب دینے لگی۔ ”پر نہیں، نہیں، انہیں ضرور جانا چاہیے۔۔۔ کیوں ماری؟ انہیں ضرور۔“



1812 کی جنگ کو ختم ہوئے سات سال گزر چکے تھے۔ یورپی تاریخ کا طوفانی موجوں سے چھلکا سمندر اپنے ساحلوں کے اندر اتر چکا اور پرسکون نظر آنے لگا تھا، مگر پراسرار قوتیں (پراسرار اس لیے کیونکہ جو قوانین ان کے افعال متعین کرتے ہیں، ہم ان سے ناہمد ہیں)، جو بنی نوع انسان کو متحرک کرتی ہیں، اپنا عمل جاری رکھے ہوئے تھیں۔ اگرچہ تاریخ کے سمندر کی سطح ٹھہری ٹھہری اور غیر متحرک دکھائی دے رہی تھی، انسانوں کی نقل و حرکت وقت کے بہاؤ کی طرح بلا روک ٹوک جاری رہی۔ لوگوں کے مختلف اتحاد و جدوجہد میں آئے اور ناپید ہو گئے۔ وہ حالات، جن کی بنا پر سلطنتوں کی تشکیل اور تحلیل ہوتا تھا اور جنہیں اقوام کی اکھاڑ پھینچ اور انتشار کا سبب بنتا تھا، تیاری کے مراحل میں سے گزر رہے تھے۔

تاریخ کا سمندر پہلے کی طرح طوفانی جھکڑوں کے تھپڑوں سے ایک ساحل سے دوسرے ساحل تک نہیں دھکیلا جا رہا تھا بلکہ یہ اپنی گہرائیوں میں اندر ہی اندر بل کھا رہا اور بل رہا تھا۔ تاریخی ہستیوں کو سوجھیں پہلے کی طرح ایک ساحل سے اٹھا کر دوسرے ساحل تک نہیں لے جا رہی تھیں؛ معلوم ہوتا تھا کہ اب وہ گردب کی طرح یک ہی مقام پر گھوم رہی ہیں۔ تاریخی شخصیات، جو پہلے افواج کی قیادت کرتی تھیں اور جو جنگوں، مہموں اور لڑائیوں کے احکام دے کر عام لوگوں کی نقل و حرکت کو منظم کرتی تھیں، اب سیاسی اور سفارتی اتحادوں، تو، زمین اور صحاروں کے ذریعے طوفانی نقل و حرکت کا انعکاس کر رہی تھیں۔

مورخین تاریخی ہستیوں کی اس مصروفیت کو رجعتِ قہری کہتے ہیں۔ ان تاریخی شخصیات نے جو کردار ادا کیا تھا، اس کا ذکر کرتے ہوئے یہ مورخین انہیں کڑی تنقید کا نشانہ بناتے ہیں کیونکہ ان کا خیال ہے کہ وہ اس چیز کا، جسے وہ رجعتِ قہری کہتے ہیں، سبب بنے تھے۔ ایک نذر اور نبولین سے لے کر مادام ڈستیل، بیوٹی اس ایشینگ، رفی، ہٹا تو بیغیاں اور اس عہد کے باقی مشہور و معروف اشخاص تک، ان کی سخت گیر انصاف کی کرسی کے سامنے سے گزرتے ہیں، ترقی پر رجعت پسندی کے پیمانے پر جانچے اور پرکھے جاتے ہیں، اگر وہ رجعت پسندی کے مجرم قرار پاتے ہیں، انہیں سرانستہ جاتی ہے اور کردہ ترقی کے علم بردار

ثابت ہوتے ہیں ان کی تجربت ہو جاتی ہے۔

مورخین کے بیانات کے مطابق اس زمانے میں روس میں بھی رجعت پسندی کو فروغ حاصل ہوا اور ان کی نگاہوں میں اس کا سب سے بڑا مجرم الیکساندر اوس ہے۔ وہی الیکساندر اول، جس کی وہ تحسین بھی کرتے ہیں کیونکہ اس نے اپنی حکومت کے ابتدائی دور میں لبرل خیالات کی حوصلہ افزائی کی تھی اور روس کو بچا رکھا۔
 روس کے غالب علم مضمون نگار سے لے کر عالم فاضل مورخ تک روس کے دانش ور طبقے میں آپ کو ایک شخص بھی، یا نہیں ملے گا جو الیکساندر پر اپنی حکومت کے آخری عہد کے دوران میں غلط کام کرنے کے الزام میں سنگ باری نہ کرتا ہو۔

”اسے اس طریقے سے کام کرنا چاہیے تھا۔ فلاں معاملے میں اس کا کردار قابل تحسین تھا لیکن فلاں معاملے میں اس نے بڑی نااہلی کا مظاہرہ کیا۔ اپنی حکومت کے ابتدائی دور اور 1812 کے سال کے دوران میں اس نے بڑی سوجھ بوجھ کا مظاہرہ کیا لیکن اس نے پوینڈ کو،⁴ ٹین⁵ عطا کر کے، اتحاد مقدس⁵ کی داغ بیل ڈال کر، اختیارات آراک چیف کے حوالے کر کے، پہلے گائٹس⁶ اور اس کی سرپرست اور بعد ازاں شش کول⁷ اور ہوتی انسان کی حوصلہ افزائی کر کے اس نے سنگین غلطیوں کا ارتکاب کیا۔ اس نے فعال افواج کے معاملات میں دخل ہرکارہ سیمو نو اسکی رجسٹ⁸ توڑ کر دانش مندی کا ثبوت نہیں دیا۔

مورخین اپنے اس زعم میں، کہ انھیں معلوم ہے کہ انسانیت کی بھلائی کس چیز میں مضمر ہے، سے جو ملوث مٹاتے ہیں، ان کی تفصیل بیان کرنے کے لیے درجن صفحات درکار ہیں۔

ان کی ان دشنام طرازیوں کا مطلب کیا ہے؟

کیا الیکساندر کے وہ افعال۔ اس کی حکومت کے ابتدائی عہد کے لبرل منصوبے، اس کی پولیس کے خلاف جدوجہد، اس کی ثابت قدمی، جس کا اظہار اس نے 1812 کے دوران میں کیا۔ جن کی مورخین تعریفیں کرتے ہیں تھکتے، انہی مصدور کی۔ وہ ماحول جس میں اس نے آنکھ کھولی، تعلیم حاصل کی اور زندگی گزری اور جس نے اس کی شخصیت کی، وہ جیسی کیسی بھی تھی، تشکیل کی۔ اور جنہوں نے اس سے وہ افعال۔ مثلاً اتحاد مقدس کی تکمیل، پوینڈ کی بحالی اور 1820 کی رجعت پسندانہ کارروائیاں۔ سرزد کرائے، جن کی وجہ سے مورخین اسے گردن زدنی قرار دیتے ہیں، پیداوار نہیں؟

ان نکتہ چینیوں کی اصل غایت کیا تھی؟

الیکساندر اول تاریخ کا اہم کردار تھا۔ وہ انسانی طاقت کے نمونہ طور پر بند ترین مقام پر فائز ہو چکا تھا اور تاریخ کا چکا چوند روشنیوں کا نقطہ ہا سکہ تھا۔ وہ ریشہ و دینوں، مکاریوں، خوشامدی رویوں اور خود فریبیوں، جو طاقت، اقتدار کا اجڑا لائیٹنگ ہیں، جیسے طاقتور ترین اثرات کا نشانہ بنا ہوا تھا۔ یورپ میں جو کچھ ہو رہا تھا اس کے متعلق اسے زندگی کے ہر لمحے میں اپنی ذمہ داریوں کا احساس رہا تھا۔ وہ کوئی داستانِ کردار نہیں تھا، بلکہ دوسرے لوگوں کی

مرح بیٹا جگت گوشت پوست کا انسان تھا۔ اس کے اپنے ذاتی خصائل، عادات اور جذبات تھے، حسن، صداقت اور اچھائی سے وہ اپنے انداز سے متاثر ہوتا تھا۔ پھر یہ وہ شخص تھا جس میں حسن سیرت کا فقدان نہیں تھا (مورخین اس سلسلے میں اس پر کوئی الزام نہیں دھرتے)۔ اسے مطعون صرف اس لیے کیا جاتا ہے کیونکہ آج سے پچاس سال قبل انسانوں کی فلاح و بہبود کے متعلق اس کا تصور وہ نہیں تھا جو موجودہ زمانے کے کسی پروفیسر کا ہوتا ہے جو ابتداء شباب سے پڑھنے پر بھانے کا مشغلہ۔ یعنی کتابوں کا مطالعہ اور ان کے جدید، جدیدہ نکات کی نقول تیار کرنا، لیکچر دینا اور درس و تدریس میں مصروف رہنا۔ اختیار کر لیتا ہے۔

لیکن اگر ہم یہ فرض بھی کریں کہ عام لوگوں کی بھلائی جس چیز میں مضمر ہے، اس کے متعلق ایسا ندر کا نقطہ نظر صحیح نہیں تھا پھر لا محالہ ہمیں یہ بھی فرض کرنا پڑے گا کہ آج جو مورخ ایسا ندر کا ہی کہہ کر رہا ہے، خاص مدت گزر جانے کے بعد انسانوں کی بھلائی کے متعلق اس کا نقطہ نظر بھی غلط قرار پائے گا۔ یہ مفروضہ اس لیے اور بھی نظری اور ناگزیر ہے کیونکہ جب ہم تاریخ کے آگے بڑھنے کے عمل کا جائزہ لیتے ہیں، ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ انسانوں کی فلاح و بہبود کے متعلق نقطہ نظر سال بہ سال تبدیل ہوتا رہتا ہے؛ جو بات آج سے دس سال قبل اچھی معلوم ہوتی تھی، آج وہ عمل نظر ٹھہرتی ہے اور جو عمل نظر تھی، اب وہ لائق تحسین قرار پاتی ہے۔ پھر مصنف مصنف میں بھی اختلاف پایا جاتا ہے، جو بات ایک کے نزدیک درست ہے، وہ دوسروں کی نگاہوں میں غلط ہے۔ تاریخ ہمیں یہ بھی بتاتی ہے کہ اچھا کیا ہے، برا کیا ہے، اس کے بارے میں ایک ہی زمانے کے اشخاص کے نقطہ ہائے نظر ایک دوسرے کے متضاد ہو سکتے ہیں۔ بعض لوگوں کے نزدیک اتنا مقدس کا قیام اور پولینڈ میں آئیں کا نفاذ اچھی چیزیں تھیں، اور وہ ان کی وجہ سے الیکس ندر کی تعریفیں کرتے تھے، جب کہ دوسروں کے نزدیک یہ بری تھیں، اس لیے وہ اس پر کتہ چینی کرتے تھے۔ ایسا ندر اوس یا نیپولین کے افعال اور مصروفیتیں سود مند تھیں یا ضرر رساں، اس کے متعلق حتیٰ رائے قائم کرنا ناممکن ہے کیونکہ سود مند کیا تھا یا ضرر رساں کیا تھا، اس کے متعلق ہم قطعی انداز سے کچھ نہیں کہہ سکتے۔ اگر کوئی کارروائی کسی شخص کو خوش کرنے میں ناکام رہتی ہے، تو اس کی وجہ محض یہ ہے کہ اچھائی کو ماننے کے لیے اس کے پاس جو محمد دیکھنا ہے، سیاسی پر پورا نہیں اترتی۔ مسئلہ 1812 کے ماسکو میں میرے مکان کے تحفظ کا ہو یا روسی افواج کے شکوہ و جلال کا، پیٹرز برگ یا دوسری یونیورسٹیوں کے فروغ کا، پولینڈ کی آزادی، یورپ میں توازنِ طاقت یا یورپی روشن خیالی کی خاص قسم کا، ”جسے ترقی“ کہا جاتا ہے۔ میرے نزدیک یہ سب باتیں اچھی ہو سکتی ہیں، اس کے باوجود میرے لیے یہ تسلیم کیے بغیر اور کوئی چارہ کار ہی نہیں کہ ان اہداف اور مقاصد کے علاوہ تاریخی شخصیت کے افعال کے بعض عمومی مقاصد بھی ہو سکتے ہیں جو میرے فہم کی رسائی سے دور ہیں۔

چلیں ہم یہ فرض کر لیتے ہیں کہ وہ چیز، جسے سائنس کہا جاتا ہے، تمام تضادات کو ہم جگ کر سکتی ہے اور اس کے پاس درست اور نادرست کے مابین امتیاز کرنے کا غیر متغیر پیمانہ موجود ہے جس کی مدد سے تاریخی شخصیات اور

واقعات کو جانچا پرکھا جاتا ہے۔

چلیں، ہم یہ فرض کر لیتے کہ الیکساندر کے لیے ہر کام مختلف طریقے سے سرانجام دینا ممکن تھا۔ ہم یہ فرض کر لیتے ہیں کہ اس کے لیے۔۔۔ لوگوں کی تجاویز کے مطابق، جو اسے اپنی نکتہ چینیوں کا ہدف بناتے رہتے ہیں اور جو انسانوں کی نقل و حرکت کے قطعی مقاصد کو جاننے کے دعوے دار ہیں۔ قومیت، آزادی، مساوات اور ترقی (میر خیال ہے کہ ان سے سب باتوں کا احاطہ ہو جاتا ہے) کے اس پروگرام کے مطابق، جو اس کے موجودہ زمانے کے ناقدین اسے فراہم کرنا پسند کرتے، امور حکومت نپٹانا ممکن تھا۔ ہم یہ بھی فرض کر لیتے ہیں کہ یہ پروگرام قابل عمل تھا، اس نے میں مرتب کر لیا گیا تھا اور الیکساندر نے اسے عملی جامہ پہنا دیا تھا۔ اگر یہ سب کچھ ہو جاتا، پھر ان تمام لوگوں کی، جو حکومت کے رجحانات کی مخالفت کرتے تھے، سرگرمیوں کا سامان سرگرمیوں کا جو مورخین کی نگاہوں میں خوش آمد اور سود مند تھیں، کیا بنتا۔ ان سرگرمیوں کا کوئی وجود نہ ہوتا، یوں زندگی کی چھل پہل ختم ہو جاتی اور ہر طرف مردنی چھا جاتی۔

اگر ہم نے یہ تسلیم کر لیا کہ انسانی زندگی نقص کے تابع بنائی جاسکتی ہے، پھر زندگی کے امکانات نیست و نابود ہو جائیں گے۔

2

اگر مورخین کی طرح ہم یہ فرض کریں کہ عظیم لوگ مخصوص مقاصد۔ روس یا فرانسیسیوں کی عظمت و سر بلندی، یورپ میں توازن طاقت انقلاب کے اصولوں کی نشر و اشاعت، جمہوری ترقی یا اس قسم کی کسی دوسری چیز۔ کے حصول کے لیے انسانوں کو آمادہ عمل کرتے ہیں، پھر اتفاق اور عبقریت جیسے تصورات کا سہارا لے بغیر تاریخی حقائق کی تشریح و تعبیر کرنا ناممکن ہو جاتا ہے۔

اگر انیسویں صدی کے آغاز کی یورپی جنگوں کا مقصد روس کی توسیع و اس کے اثر و رسوخ میں اضافہ کرنا ہوتا، پھر اس مقصد کی تکمیل ان تمام سابقہ جنگوں اور یورشوں کے بغیر ممکن تھی۔ اگر مقصد فرانس کی توسیع ہوتا، پھر اسے انقلاب یا امپریاٹوریہ کے بغیر پروان چڑھایا جاسکتا تھا۔ اگر مقصد خیالات کی نشر و اشاعت ہوتا، پھر یہ فوجیوں کے بجائے چھاپے خانوں کی امداد سے زیادہ موثر انداز سے حاصل کیا جاسکتا تھا۔ اگر مقصد تہذیب کی ترقی ہوتا، پھر یہ بات آسانی سے سمجھ میں آ جاتی ہے کہ انسانوں اور ان کی مملکت کو تباہ و برباد کیے بغیر تہذیب کو تیزی سے پھیلانے کے نسبتاً بہتر اور زیادہ کارگر ذرائع موجود تھے۔

پھر حاکمات یوں وقوع پذیر کیوں ہوئے؟ اور کیوں نہ ہوئے؟

کیونکہ وہ وقوع پذیر ہوئے ہی یوں۔ ”اتفاق نے صورت حال کو جنم دیا، عبقریت نے اسے استعمال کیا۔“

تاریخ کا ٹوٹی ہے۔

مگر اتفاق کیا ہے؟ عبقریت کیا ہے؟

الفاظ اتفاق اور عبقریت کسی ایسی چیز پر، جو واقعتاً موجود ہو، دلالت نہیں کرتے، چنانچہ یہ سمجھنا یا سمجھانا کہ وہ اصدا ہیں کیا، بہت مشکل ہے۔ یہ دونوں مظاہر کی تفہیم کے خاص مرحلے کی محض نشان دہی کرتے ہیں۔ میں نہیں جانتا کہ ایک خاص واقعہ کیوں ظہور پذیر ہوتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ میرے لیے اس کا جاننا ممکن نہیں ہے: چنانچہ میں جاننے کی کوشش نہیں کرتا اور میں اتفاق کا ذکر لے بیٹھتا ہوں۔ مجھے کوئی قوت ایسے سانچے، جو عام انسانی فعالیتوں کے دائرہ اختیار میں نہیں ہوتے، معرض وجود میں لاتی نظر آنے لگتی ہے۔ ایسا کیوں ہوتا ہے، یہ میری سمجھ میں نہیں آتا اور میں عبقریت کی گردان شروع کر دیتا ہوں۔

بھیڑوں کے ریورڈ کو وہ بھینڑ، جسے گلہ بان علیحدہ باڑے میں بند کرتا ہے، علیحدہ خوراک کھاتا ہے اور جو اس طرح دوسروں سے دگنا نرخ ہو جاتی ہے، لازماً عبقری نظر آئے گی۔ اور یہ واقعہ کہ اس بھینڑ کو عام بھینڑوں کے باڑے کے بجائے علیحدہ باڑے میں بند کیا جاتا ہے، اسے دوسروں کی نسبت زیادہ جی ڈغیرہ کھلائی جاتی ہے، جب یہ مخصوص بھینڑ خوب سوئی ہو جاتی ہے اور اسے گوشت کے حصول کی خاطر ذبح کر دیا جاتا ہے، تو باقی بھینڑوں کو یہ اتفاقات کے غیر معمولی سلسلے کے ساتھ عبقریت کا بخجگ معلوم ہونے لگتا ہے۔

لیکن بھینڑوں کو صرف یہ کرنا چاہیے کہ وہ اس تصور سے، کہ جو کچھ ان کے ساتھ کیا جاتا ہے، وہ محض ان کے بھینڑوی متہد کو پران چڑھانے کے لیے کیا جاتا ہے، چھٹکارا حاصل کر لیں، انھیں صرف یہ تسلیم کر لینا چاہیے کہ جو کچھ ان کے ساتھ پیش آتا ہے، اس کے ایسے مقاصد بھی ہو سکتے ہیں جو ان کے فہم و دراک سے بالا ہیں، پھر وہ فی الفور سمجھ جائیں گی کہ جو کچھ اس بھینڑ پر، جس خوب کھلا کر موٹا کیا جاتا ہے، گزرتی ہے، اس میں ایک قسم کی یکساں اور ارتباط پایا جاتا ہے۔ اگر ان میں یہ معلوم کرنے کی، کہ اسے کس مقصد کے لیے موٹا کیا گیا ہے، صلاحیت نہ ملے گی، انھیں کم از کم یہ ضرور معلوم ہو جائے گا کہ جو کچھ اس بھینڑ کے ساتھ ہوا، محض اتفاقات نہیں ہوا، پھر انھیں اتفاق اور عبقریت جیسے تصورات کی طرف رجوع کرنے کی ضرورت نہیں رہے گی۔

صرف اس دعوے سے کہ جو مقصد ہمیں فی الفور قابل تفہیم معلوم ہوتا ہے، ہم اسے حقیقتاً سمجھ گئے ہیں، دست برد رہے اور یہ تسلیم کرنے کے بعد ہی کہ قطعی مقصد ہماری تفہیم سے ماورا ہے، ہم تاریخی شخصیات کی زندگیوں میں منطقی تسلسل کو دریافت کر سکیں گے۔ پھر ہم اس نتیجے پر پہنچ جائیں گے کہ اتفاق اور عبقریت فالتو الفاظ ہیں۔ ہمیں صرف اتنا اتر کر کرنا ہوگا کہ یورپی اقوام کی جو تھل تھل ہوئی، اس کا مقصد ہمیں معلوم نہیں، ہمیں محض سنگین حقائق کا علم ہے۔ وہ قتل و غارت جو پہلے فرانس میں اور اس کے بعد اطالیہ، افریقہ، پرشیا، آسٹریا، ہسپانیہ اور روس میں ہوا۔ اور یہ کہ لوگوں کی نقل و حرکت، جو پہلے مغرب سے مشرق کی جانب اور پھر مشرق سے مغرب کی جانب ہوئی، وہی ان تمام واقعات کا بلب لباب اور مقصد ہے، پھر ہمیں نہ صرف یہ کہ پولین یا الیکساندر میں غیر معمولی اوصاف یا عبقریت ڈھونڈنے کی ضرورت نہیں رہے گی بلکہ ہم انھیں دوسرے انسانوں کی طرح عام انسان ہی سمجھنے

لگیں گے اور ہمارے لیے انھیں کچھ اور تصور کرنا ناممکن ہو جائے گا۔ اور ان چھوٹے چھوٹے واقعات کی جھڑپاں انھیں دو کچھ بنادیا جو کچھ کہ وہ تھے، تشریح و توضیح کے لیے اتفاق کا سہارا لینا تو دور کی بات رہی، یہ ظہر من الشمس ہو جائے گا کہ ان چھوٹے چھوٹے واقعات کا ظہور پذیر ہونا تقاضائے فطرت تھا۔

اگر ہم اس دعوے سے دستبردار ہو جائیں کہ ہمیں قطعی مقصد کا علم ہے، پھر یہ بات ہماری سمجھ میں آجائے گی کہ جس طرح یہ تصور نہیں کیا جاسکتا کہ کوئی پورا ان پھولوں یا بیجوں کے علاوہ، جن کے لیے یہ سوزنوں ہوتا ہے، کسی دوسری قسم کے پھول یا بیج پیدا کر سکتا ہے، اسی طرح کسی ایسے دو اشخاص کا جو اپنے تمام تر خاندانی اور دوسرے حالات و کوائف کی بنا پر اس کام کے لیے، جس کی تکمیل نیولین اور الیکساندر کے مقدر میں لکھی جا چکی تھی، زیادہ سوزنوں ہوتے، تصور بھی ناممکن ہے۔

3

انیسویں صدی کے آغاز میں یورپ میں جو واقعات رونما ہوئے، ان کی اساسی اور اہم ترین خصوصیت یورپی قوم کے بہتعداد کثیر لوگوں کی پہلے مغرب سے مشرق اور پھر مشرق سے مغرب کی جانب جنگجو یا نقل و حرکت ہے۔ اس نقل و حرکت کا آغاز مغرب سے مشرق کی طرف ہوا۔ ماسکو جیسے دور دراز مقام تک اپنی جارحانہ پیش قدمی کو رہنمائی لانے کے لیے مغربی اقوام کے لیے لازمی تھا کہ وہ اپنے آپ کو ایسے لشکر جبار کے قالب میں ڈھالیں کہ جب ان کا تصادم مشرق کے سامنے گروہ سے ہو، وہ اسے برداشت کر سکیں۔ تمام مسئلہ روایات اور قواعد کو پس پشت ڈال دیں ان کی عسکری نقل و حرکت کے دوران میں ان کا سربراہ ایک ایسا شخص ہو جو تمام دیہات کاریوں، قزاقوں اور خون ریزیوں کو، جن کا ارتکاب ان کی پیش قدمی کرنے کے لیے لازمی تھا، ان کے اور خود اپنے سامنے حق بجانب قرار دے سکے۔

اس قضیے کی ابتدا انقلاب فرانس سے ہوتی ہے۔ پرانا گروہ، جو وسعت اور تعداد کے اعتبار سے اتنا بڑا نہیں تھا، لمبا میٹ ہو جاتا ہے۔ پرانے رواجوں اور روایتوں کو ختم کر دیا جاتا ہے۔ رفتہ رفتہ نئی وسعتوں کا حال گروہ وجود میں آتا ہے۔ نئی روایات اور نئی رسوم کو پروان چڑھایا جاتا ہے اور ایک ایسا شخص تیار کیا جاتا ہے جو آئندہ کی نقل و حرکت کا سربراہ ہوگا اور جو کچھ کیا جانا ہے، اس کی ذمہ داری قبول کرے گا۔

فرانس کے تمام شورش پسند اور فتنہ پرداز گروہوں میں سے ایک شخص، جو عقائد، رسوم، و روایات سے نفی رکھتا ہے، جس کا نام نہیں اور جو فراموشی بھی نہیں، منظر عام پر نمودار ہوتا ہے اور اپنے آپ کو ان میں سے کسی ایک کے بھی ساتھ وابستہ کیے بغیر اتفاقات کی بدولت، جو بظاہر عجیب و غریب معلوم ہوتے ہیں، نمایاں مقام حاصل کر لیتا ہے۔ اس کے رفتائے کار کی نا اہلی اور جہالت، اس کے مخالفوں کی کمزوری اور بے ملزنی، اس کی دروغ گوئیوں کی بے باکی اس کی خیرہ کن اور پر اعتماد و مگر محدود صلاحیت، سبھی اس کے لیے سازگار ثابت ہوتی ہیں اور اسے انھار

فوج کا سربراہ بنارتی ہیں۔ اس فوج کے، جو اسی دوراندہ کی جاتی ہے، سپاہیوں کی ذمہ داری اور مہارت، اس کے جنی لفوں کا اس کے خلاف لڑنے سے پس و پیش، اور اس کی اپنی ہچکناہ جسارت اور خود پسندی اسے عسکری شہرت دلانے میں مدد ثابت ہوتی ہیں۔ لاتعداد دنام نہاد اتفاقات ہر جگہ اس کی جلو میں رہتے ہیں۔ وہ فراموشی حکمرانوں کی ناراضگی مول لیتا ہے لیکن یہی ناراضگی انجیام کار اس کے لیے سود مند ثابت ہوتی ہے۔ وہ قضا و قدر کے پہلے سے معین کردہ رستے سے بچ نکلنے کی کوشش کرتا ہے لیکن ناکام رہتا ہے۔ اسے روک میں ملازمت دینے سے انکار کر دیا جاتا ہے اور ترکی میں اس کی ملازمت حاصل کرنے کی تمام مسائل لا حاصل ثابت ہوتی ہیں۔ اٹالیہ میں جنگوں کے دوران میں متعدد مواقع ایسے آتے ہیں جب اس کی تباہی میں کوئی کسر باقی نہیں رہ جاتی لیکن ہر بار وہ غیر متوقع طور پر بچ نکلتا ہے۔ مختلف سفارتی تقاضوں کے پیش نظر روسی افواج، جو اس کے وقار کو ملیا میٹ کرنے کی صلاحیت سے بہرہ ور ہیں، یورپی منظر پر اس وقت تک نمودار نہیں ہوتیں جب تک وہ وہاں سے چل نہیں جاتا۔

اطالیہ سے واپسی کے بعد اسے معلوم ہو جاتا ہے کہ پیرس کی حکومت زوال کے مرحلے طے کر رہی ہے۔ چنانچہ جب اس کا خاتمہ عمل میں آتا ہے، ناگزیر طور پر وہ تمام اشخاص، جو اس میں شامل تھے، نیست و نابود ہو جاتے ہیں۔ اتفاق سے اسے اس بڑے خطرہ صورتحال سے دامن چھڑانے کا موقع مل جاتا ہے کہ اسے بے مقصد اور احمقانہ مہم پر افریقہ بھیج دیا جاتا ہے۔ ایک بار پھر نام نہاد اتفاق اس کا ساتھ دیتا ہے۔ ناقابل ترمیم مالٹا گولی چلائے بغیر اس کے قدموں پر ڈھیر ہو جاتا ہے اور اس کے انتہائی ناقابل اندیشہ منصوبے پر کامیابی کی ہر شے ہو جاتی ہے۔ دشمن کا بحری بیڑا، جو بعد ازاں ایک کشتی بھی گزرنے نہیں دیتا، اتنا بے خبر ہے کہ اس کی پوری فوج کو چپکے سے جگ نکلنے کا موقع مل جاتا ہے۔ افریقہ میں تقریباً غیر مسلح مقامی باشندوں کو لگا تار قلم دسم کا نشانہ بنایا جاتا ہے، درن کے ساتھ ہر قسم کی شرمناک حرکات وادارگیں جاتی ہیں لیکن وہ لوگ، جو ان جرائم کا ارتکاب کرتے ہیں، خاص طور پر ان کا قائد، اپنے آپ کو یقین دلاتے ہیں کہ ان کے یہ کارنامے سنہری حروف سے لکھے جانے کے قابل ہیں۔ اس کے نزدیک شرم و شوکت اسی کا نام ہے اور وہ اپنے آپ کو سیزار اور سکندر اعظم سے کم تر نہیں سمجھتا۔

شان و شوکت اور عظمت کا یہ آدرش۔ جو اس بات پر مشتمل ہے کہ آدمی جو کچھ خود کرتا ہے، صرف یہ کہ اسے اس میں کوئی خرابی، غلطی یا برائی نظر نہیں آتی، بلکہ ہر جرم، جس کا وہ ارتکاب کرتا ہے، وہ اس کے لیے فخر و مہابت کا باعث بن جاتا ہے اور وہ اس کے ساتھ ناقابل تنہیم، مافوق الفطرت اہمیت دہشتہ کرتا ہے۔ اس آدرش کو، جس نے قضا و قدر کے منشا کے مطابق اس شخص اور اس کے حالیوں موابوں کی رہنمائی کرتا ہے، اپنی نمو کے لیے افریقہ میں نہ خیر زمین مل جاتی ہے۔ وہ جو کچھ کرتا ہے، کامیابی سے ہم کنار ہوتا ہے۔ طاغوت اس کے قریب نہیں پھٹکا، قیدیوں کے ظالمانہ انداز سے قبل عام کا ذمے دار اسے نہیں ٹھہرایا جاتا اور پھر وہ اپنے ساتھیوں کو مصائب و اذیتوں میں چھوڑ چھاڑ بچوں کی طرح جس غیر محتاط، غیر معقول اور ناشائستہ انداز سے افریقہ سے روانہ ہوتا ہے، اس پر بھی اسے حسین و توصیف کا سزاوار ٹھہرایا جاتا ہے اور دشمن کا بحری بیڑا اسے دوبارہ کھسک جانے کا موقع فراہم کر دیتا ہے۔

جب وہ اپنی بھرمانہ کارروائیوں میں کامیابی کے نشے سے سرشار پیرس لوٹتا ہے، ری پبلکن حکومت کا، جو ایک سال قبل سے تباہ و برباد کر سکتی تھی، انتشار اپنی انتہا تک پہنچ چکا ہوتا ہے۔ اگرچہ اس کے پاس نہ کوئی منصوبہ ہے اور نہ اس نے اپنے کردار کی، جو اس نے ادا کرنا ہے، کوئی تیاری کی ہوتی ہے، مگر چونکہ اس کا گروہ بندیوں سے دامن صاف ہے، اس لیے ان حالات میں اس کی موجودگی اسے محض بندیوں تک پہنچانے میں ہی سازگار ثابت ہو سکتی ہے۔ اس کے پاس کوئی منصوبہ نہیں۔ وہ ہر چیز سے خائف ہے لیکن پرنیاس اس پر چھٹا مارتی ہیں اور اسے حکومت سازی میں شریک ہونے پر مجبور کرتی ہیں۔

تاہم اس کے پاس شین دشوکت اور عظمت کا آدرش ہے (اسے اس نے اطالیہ اور مصر میں پروان چڑھایا تھا)، وہ مادے انداز سے اپنی ستائش کرتا ہے، بڑی جسارت اور ڈھٹائی سے جرائم کا ارتکاب کرتا ہے اور کھلے بندوں جھوٹ بولنے پر شرمندہ نہیں ہوتا۔ چنانچہ وہ واحد شخص ہے جو اسے، جو کیا جاتا ہے، حق بجانب ٹھہرا سکتا ہے۔ اس کی اس مقام کے لیے، جو اس کا منتظر ہے، ضرورت ہے۔ چنانچہ اسے اس کے ارادے کے علی الرغم، اس کے تذبذب، اس کی کسی منصوبے سے تہی دامن اور ان تمام کبیرہ غلطیوں کے باوجود جن کا وہ مرتکب ہوتا ہے، اس سازش میں، جس کا مقصد اقتدار پر قبضہ کرنا ہے، گھسیٹ لیا جاتا ہے، ورسائش کامیابی سے ہم کنار ہو جاتی ہے۔ اسے جیسے تیسے قانون ساز ادارے کے اجلاس میں دھکیل دیا جاتا ہے۔ اس کے ہاتھ پاؤں پھول جانے ہیں اور وہ بھاگنے کی کوشش کرتا ہے کیونکہ اسے محسوس ہوتا ہے کہ اس کے ساتھ بے وفائی ہوئی ہے۔ وہ بے ہوشی کا ڈرامہ رچاتا ہے اور بے معنی باتیں کرتا ہے۔ اس کی یہ بے معنی باتیں اس کی تباہی کا جب بنتا چاہیے نہیں لیکن فرانس کے حکمران، جو کبھی بادقار اور ڈرف نگاہ ہوا کرتے تھے، معلوم ہوتا ہے کہ ان کا کردار ختم ہو چکا ہے، چنانچہ وہ اس سے بھی زیادہ منتشر خیالی کا شکار ہو جاتے ہیں اور اپنے اقتدار کو بچانے اور اس شخص کو کچلنے کے لیے انھیں جو کچھ کہا جائے تھا، وہ اسے زبان پر لانے میں ناکام ہو جاتے ہیں۔

اتفاق، لاکھوں کروڑوں اتفاقات، اسے اقتدار سے بہرہ ور کر دیتے ہیں اور تمام لوگ، جیسے وہ آپس میں سمجھوتہ کر چکے ہوں، اس اقتدار کی توثیق کرنے کے لیے دست تعاون بڑھا دیتے ہیں۔ اتفاق فرانس کے حکمرانوں کا، جو اس کے آگے پانی بھرتے ہیں، کردار متشکل کرتا ہے۔ اتفاق روس کے زار پاول اول کا کردار، جو اس کا اقتدار تسلیم کر لیتا ہے، تشکیل کرتا ہے۔ اتفاق اس کے خلاف سازش کی تدبیر نکالتا ہے۔ یہ سازش نہ صرف ناکام رہتی ہے بلکہ اس کے اقتدار کو استحکام بخشنے دیتی ہے۔ اتفاق ڈیوک آف آلیغیاں کو اس کی تحویل میں دے دیتا ہے اور غیر متوقع طور پر اسے اسے ہلاک کرنے پر اکساتا ہے۔ یوں وہ انتہائی ٹھوس اور قابل قبول دلائل سے بھوم کو بارگرا دیتا ہے کہ اسے اس کا حق حاصل ہے کیونکہ اس کے پاس طاقت ہے۔ اگرچہ وہ انگلستان پر حملہ کرنے کے لیے اپنے تمام وسائل مجتمع کر لیتا ہے (اگر وہ یہ حملہ کرتا، وہ دل ریب تباہی کے غار میں گر جاتا) مگر اتفاق کچھ ایسا چکر بلاتا ہے کہ اسے اپنے منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کا ارادہ ترک کر دیتا ہے اور ناگہانی طور پر میک اور آسٹریوں کے خلاف

چڑھائی کر دیتا ہے۔ وہ خدا کے بندے لڑے بغیر ہتھیار ڈال رہتے ہیں۔ اتفاق اور عقیقت اور سائنس کے میدان میں اسے فتح دے دیتے ہیں، اور اتفاق کا کرشمہ مدحکہ فرمائیں کہ تمام لوگ، نہ صرف فریسی بلکہ سارے یورپی۔ اگر یزوں کے ماسوا جو سکند، پیش آنے والے واقعات میں کوئی حصہ نہیں لیتے۔ اس کے ہم نوا بن جاتے ہیں۔ وہ اس کے جرائم کے سلسلے میں اپنی ساری نفرتیں اور کراہتیں فرموش کر دیتے ہیں اور اس کی حاکیت، اس کے خطاب، جو اس نے خود ہی اپنے آپ کو عطا کیا ہوتا ہے اور اس کے شان و شوکت اور عظمت کے آدرش کے سامنے، جو ان سب کو شاندار اور معقول نظر آتا ہے، گھٹنے ٹیک دیتے ہیں۔

مغربی قوتیں 1805، 1806، 1807 اور 1808 کے دوران میں شرق کی طرف متعدد بار جارحانہ یلغار کرتی ہیں۔ کچھ معلوم ہوتا ہے جیسے وہ عزائم اور صلاحیتوں کی آزمائش کرنا اور آئندہ کی نقل و حرکت کی تیاریاں پایہ تکمیل تک پہنچانا چاہتی ہوں۔ انسانوں کی جس فوجی جمعیت نے فرانس میں تشکیل پائی ہوتی ہے، 1811 میں جب وسطی یورپ کے مختلف ممالک کے باشندے اس میں شامل ہو جاتے ہیں، وہ ہجوم بے کراں کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ جوں جوں اس جمعیت کے حجم میں اضافہ ہوتا جاتا ہے، توں توں اس شخص کے، جو اس نقل و حرکت کا سربراہ ہے، اقتدار کے جائز ہونے کا جواز ملتا جاتا ہے۔ اس عظیم نقل و حرکت سے پہلے دس سال کا جو عرصہ گزرتا ہے، اس کے دوران میں یہ آدمی یورپ کے تمام تاج داروں کے ساتھ تعلقات استوار کر لیتا ہے۔ دیا کے ان ٹکڑوں خلائی اور بے توقیر حکمرانوں کے پاس اپنا کوئی آدرش نہیں جو عقل کے معیار پر پورا اترتا ہو، جس سے وہ نیولین کے شان و شوکت اور عظمت کے بے معنی آدرش کا ٹوڑ کر سکتے ہوں۔ وہ اپنی بے وقعتی کی نمائش کرنے کے لیے ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش کرتے ہیں اور بھاگ بھاگ اس سے شرف باریابی حاصل کرتے ہیں۔ عظیم آدمی کی خوشنودی حاصل کرنے کی غرض سے شاد پریشیا پٹی بیوی اس کی خدمت میں بھیج دیتا ہے۔ سٹریا کا امپر طور یہ بات اپنے لیے سرمایہ عزت و اختیار تصور کرتا ہے کہ یہ شخص قیصر کی بیٹی کو اپنے بستر کی زینت بناتا ہے۔ پوپ، جو ان تمام امور کا جنھیں اقوام مقدس تصور کرتی ہیں، نگہبان ہے، اس عظیم آدمی کا رتبہ بلند کرنے کے لیے اسے غائب کا نذرانہ پیش کرتا ہے۔ خود نیولین اپنے آپ کو اپنے کردار کی ادائیگی کی تیاری کے لیے اتنا کچھ نہیں کرتا جتنا کہ وہ لوگ، جو ہر وقت اس کے آگے پیچھے پھرتے رہتے ہیں، اس کی جو توقع پذیر ہو رہا ہے اور جو توقع پذیر ہوا ہے، ذمے داری سنبھالنے کی تحریص دیتے ہیں۔ اس کا کوئی اقدام، کوئی فریب کاری، کوئی حیدہ سازی ایسی نہیں جسے عظیم کارنامہ بنا کر پیش کرنے میں اس کے یہ حواری ایک منٹ کی بھی تاخیر رو رکھتے ہوں۔ جرمنوں کو اس کی عزت افزائی کرنے کے لیے اس سے زیادہ موزوں اور کوئی طریقہ نہیں سوچتا کہ وہ جینا اور اور عشق کے مقامات پر اپنے ہی خلاف اس کی فتوحات کا جشن منائیں۔ نہ صرف وہ خود عظیم ہے بلکہ اس کے آباؤ اجداد، اس کے بھائی، اس کے سوتیلے بیٹے اور اس کے سارے لے بھی عظیم ہیں۔ اس کے پاس جو تھوڑی بہت عقل رہ گئی ہے، اسے اس سے بھی محروم کرنے اور اس سے اپنا مہیب اور ڈراؤنا کردار ادا کرانے کے سلسلے میں کوئی دقیقہ فراغت نہ کرنا۔ جب وہ تیار ہو جاتا

ہے، افواج بھی تیاری کے مراحل طے کر چکی ہوتی ہیں۔

یلغار کا سلسلہ ب جانب مشرق شروع ہو جاتا ہے اور اپنی آخری منزل۔ ماسکو۔ پہنچ جاتا ہے۔ دارالسلطنت پر قبضہ کر لیا جاتا ہے۔ روسی افواج کو جو نقصانات برداشت کرنا پڑ رہے ہیں، وہ غنیم کی سپاہ کو اوٹسٹکس سے سارے واکرام تک کہیں بھی اٹھانا نہیں پڑے تھے۔ تفاق، در عبقریت، جواب تک اتنے تسلسل سے اسے یکے بعد دیگرے فتوحات سے ہم کنار کراتے چلے آئے تھے اور اسے قہر و قدر کی پہلے سے معین کردہ منزل تک پہنچ چکے تھے، یکدم اس کا ساتھ چھوڑ جاتے ہیں اور اتفاقات معکوس کا۔ بارود یوشکس کے کام سے بے کر بخیر اور ان شعلوں تک، جنہوں نے ماسکو کو جلا کر راکھ کر دیا۔ نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ اب عبقریت کہیں ڈھونڈے سے نہیں ملتی، اس کی جگہ بے مثال حقائق و در فرد مائیکو کا اظہار ہونے لگتا ہے۔

حملہ آور راہ فرار اختیار کرتے ہیں، واپس مڑتے ہیں و سر پر پاؤں رکھ کر دوبارہ بھاگنا شروع کر دیتے ہیں۔ اب اتفاقات پویلین کا ساتھ نہیں دیتے بلکہ مسلسل اس کے خلاف مصروف عمل رہتے ہیں۔

پہلے نقل و حرکت مغرب سے مشرق کی جانب ہوئی تھی اور اب نقل و حرکت معکوس مشرق سے مغرب کی طرف شروع ہو جاتی ہے۔ دونوں میں زبردست مشابہت پائی جاتی ہے۔ جیسا کہ 1805، 1807، اور 1809 میں ہوا تھا، مشرق سے مغرب کی جانب کی عظیم نقل و حرکت سے قبل بھی، ابتدائی اور محتاط کوششیں روئے کار لائی جاتی ہیں۔ بالکل اسی طرح لوگ لٹل چل کر بے حد و حساب بڑے گردہ تشکیل کرتے ہیں، اسی طرح وسطی یورپ کے باشندے اس میں شمولیت اختیار کرتے ہیں، اسی طرح عین درمیان میں تذبذب کا مظاہرہ ہوتا ہے اور اسی طرح ہر آن بڑھتی ہوئی رفتار کے ساتھ منزل تک رسائی حاصل کی جاتی ہے۔

پیرس، جو کہ منزل مقصود ہے، اب پاؤں تلے پڑا ہے۔ پویلین کی حکومت اور فوج کو نیست و نابود کر دیا جاتا ہے۔ پویلین کی بذات خود کوئی اہمیت باقی نہیں رہ جاتی۔ اب اس کے تمام افعال اور کارروائیاں صریحاً فرومایہ اور کامل رحم ہیں۔ لیکن ایک بار پھر وہ ناقابل تشریح اتفاق دخل انداز ہوتا ہے۔ اتحادیوں کو پویلین سے بے پناہ نفرت ہے اور وہ اسے اپنے مصائب و آلام کا ذمے دار ٹھہراتے ہیں۔ جب وہ اسے طاقت اور اختیار سے محروم کر دیتے ہیں، اس کے جرائم اور عیاریوں کا بھانڈا بچ چورا ہے پھوڑ چکے ہیں، انھیں وہ وہی نظر آتا چاہیے تھا جیسا کہ وہ دس سال قبل اور ایک سال بعد۔ دائرۃ قانون قزاق۔ دکھائی دیا۔ لیکن سے اتفاق کی بوائے کہیں کہ کسی کو بھی اس چیر کا خیال تک نہ آیا اور اسے جزیرے میں، جو فرانس سے صرف دو دن کے بحری فاصلے پر واقع ہے بھیج دیا جاتا ہے۔ کسی وجہ سے اسے اس کی ملکیت فروغے دیا جاتا ہے، اسے محض مہیا کر دیے جاتے ہیں اور لاکھوں کی رقم اس کی تحویل میں دے دی جاتی ہیں۔

قوموں کا سیلاب تھمنا شروع ہو جاتا ہے۔ بحر عظیم کی لہریں پیچھے ہٹ جاتی ہیں اور اپنے عقب میں پر سکون سطح چھوڑ

جاتی ہیں۔ اس سطح پر سفارت کار، جو اپنے تئیں سمجھتے ہیں کہ یہ سکون ان کی مساعی کے طفیل ہوا ہے، چھوٹے چھوٹے
بھنور بنانے لگتے ہیں۔

لیکن پرسکون سمندر دوبارہ متلاطم ہو جاتا ہے۔ سفارت کار خیال کرنے لگتے ہیں کہ توڑوں کا یہ نیا دباؤ ان
کے خدشات کا شاخسانہ ہے۔ وہ اپنی حکومتوں کے مابین جنگ کی پیش گوئی کرتے ہیں۔ انہیں صورت حال
درخشاں معلوم ہوتی ہے۔ لیکن جو لہر انہیں اٹھتی اور بل کھاتی محسوس ہوتی ہے، وہ ادھر سے، جدھر سے انہیں اس کے
آنے کی توقع ہوتی ہے، نہیں آتی۔ یہ لہر والی لہر ہے جو پہلے بھی اٹھی تھی اور اسی مقام سے۔ جہاں سے یہ
پہلے نمودار ہوئی تھی، دوبارہ نمودار ہوتی ہے۔ یہ مغرب سے اٹھنے والی آخری لہر ہے۔ اس کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ
سفارت کاروں کی نگاہوں میں جو مسائل لائیکل تھے، وہ حل ہو جاتے ہیں اور اس زمانے کی عسکری نقل و حرکت کا
خاتمہ ہو جاتا ہے۔

وہ شخص، جس نے فرانس کی اینٹ سے اینٹ بجادی تھی، کسی سازش اور سپاہیوں کے بغیر واپس فرانس پہنچ
جاتا ہے۔ کوئی بھی محاذ اسے زیر حراست لے سکتا ہے لیکن عجیب، تھاق پیش آتا ہے۔ ایک بھی شخص اس کے راستے
کی دیوار نہیں بنتا۔ بلکہ سبھی کے سبھی، جو کل اسے پھنکار کرتے تھے اور ایک ماہ کے اندر تکرار دوبارہ اسے پھنکار کر
گئے، اس کا دیوانہ وارا استقبال کرتے ہیں اور اس کے تدموں میں بچھ بچھ جاتے ہیں۔

آخری اجتماعی ایکٹ کا جواز پیش کرنے کے لیے ابھی اس آدمی کی ضرورت ہے۔

ایکٹ دکھایا جاتا ہے۔ ایکٹرا اپنے کردار کا آخری حصہ ادا کرتا ہے۔ اسے لباس اتارنے اور سرخی پاؤں صاف
کرنے کا حکم ملتا ہے۔ اس کے بعد اس کی مزید ضرورت باقی نہیں رہے گی۔

اور کئی سال گزر جاتے ہیں، ان کے دوران میں یہ شخص اپنے جزیرے پر عالم تنہائی میں اپنی قابل رحم مٹھک
تمثیل خود اپنے سامنے پیش کرتا رہتا ہے۔ وہ شرم ناک انداز سے ریشہ دوانیاں کرتا ہے اور دروغ بانیوں سے اپنے
اعمال کو صحیح ثابت کرنے کی، حالانکہ اب ان کا جواز پیش کرنے کی کوئی ضرورت نہیں رہی، تنگ درو میں مصروف
رہتا ہے۔ وہ دنیا کو دکھا رہا ہے کہ جب تک کوئی ناریدہ ہاتھ اس کی اس کے فعل میں رہنمائی کرتا رہا، جسے لوگ
ظلمی سے اسے اس کی طاقت محمول کرتے رہے، اصل میں تھا کیا۔

سٹیج نیچر، جو ڈرامے کو اس کے ختم تک پہنچا چکا ہے اور اداکار کو اس کے ڈرامائی لمبوسات اور میک اپ
سے محروم کر چکا ہے، اسے ہمارے سامنے اس کے اصلی روپ میں پیش کرتا ہے۔

”دیکھا آپ نے کہ آپ کن چیزوں کو صحیح مانتے رہے ہیں! اور اصل میں تھا کیا، اسے آپ اب دیکھ سکتے ہیں،
وہ آپ کے سامنے کھڑا ہے! اب آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ آپ جس نقل و حرکت میں حصہ لیتے رہے ہیں، اس کا باعث
وہ نہیں، میں تھا۔“

لیکن نقل و حرکت کی قوت سے لوگوں کی آنکھیں اتنی چندھیا چکی تھیں کہ وہ طویل مدت گزر جانے کے بعد

ی اصل حقیقت بھانپ سکے۔

الیکساندر اول کے کردار میں جو مشرق سے مغرب کی جانب نقل و حرکت معکوس کا سربراہ تھا، کہیں زیادہ مستقر اور محکم تھی۔ اور اس نے جو کچھ کیا، اس کا کیا جانا، ٹل تھا۔

جس شخص نے دوسروں پر تفوق حاصل کرنا اور مشرق سے مغرب کی جانب نقل و حرکت معکوس کی قیادت کرنا ہے، اسے کن صفات سے بہرہ ور ہونا چاہیے؟

اس شخص میں انصاف پسندی کا مادہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہونا اور اسے یورپی معاملات میں ہمدردی کے حساب سے سرشار ہونا چاہیے، لیکن اس کی ہمدردی ذاتیات سے مترا اور گھٹیا مفادات کی آکٹوس سے مصفا ہونا چاہیے۔ اسے اپنے ہم سروں۔ اپنے عہد کے دیگر حکمرانوں اور بادشاہوں۔ پر اخلاقی برتری حاصل ہونا چاہیے، اور اسے نیولین کے خلاف ذاتی شکایت ہونا چاہیے اور الیکساندر اول میں یہ تمام صفات موجود ہیں۔ اس کی زندگی میں لاتعداد نام نہاد اتفاقات۔ اس کی تعلیم و تربیت اور اس کی اس کے ابتدائی دور کی لبرلزم، اس کے مشیر، جو اس کے گرد حصار بنائے رکھتے تھے، اوسٹرلٹس، ٹلزٹ اور انورٹ۔ دخیل رہے ہیں اور انھیں کی بددست وہ اپنا کرانا کرنے کے قابل ہوتا ہے۔

قومی جنگ کے دوران میں وہ غیر فعال رہتا ہے کیونکہ اس کی ضرورت پیش نہیں آتی لیکن جو نئی عام یورپی جنگ کی ضرورت واضح صورت اختیار کرتی ہے، وہ وقت مہینہ پر اپنا مقام سنبھال لیتا ہے، اقوام یورپ کو متحد کرتا ہے اور منزل کی جانب ان کی رہنمائی کرتا ہے۔

منزل آجاتی ہے۔ 1815 کی جنگ کے اختتام پر وہ انسانی طاقت کے بلند ترین مقام پر فائز ہوجاتا ہے۔ اس طاقت کو کس طرح استعمال کرتا ہے؟

الیکساندر اول وہ شخص ہے جس نے یورپ میں مصالحت کنندہ کا کردار ادا کیا، جو اپنی حکومت کے رد اول سے اپنی رعایا کی فلاح و بہبود کے لیے کوشاں رہا، جو اپنے وطن میں لبرل اصلاحات کا اولین علم بردار تھا، اب جب کہ وہ گرم مکتہ اختیار است کا مالک نظر آتا ہے اور یوں اس کی رعایا کے حالات زندگی بہتر کرنے کے امکانات ظاہر ہونے لگے ہیں۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب نیولین جدا وطنی کے دوران میں ہیچ گناہ اور باطن منصوبے وضع کر رہا ہے کہ اگر اس سے اقتدار نہ چھٹتا، تو اسے انوں کی بھلائی کے لیے وہ کیا کچھ کر رہا ہوتا۔ الیکساندر اول کو، جو اپنا فرض ادا کر چکا ہے اور اسے اپنے اوپر خدا کا ہاتھ محسوس ہوتا ہے، اچانک مفروضہ اختیار و اقتدار کی بے وقعتی کا اندازہ ہوجاتا ہے، وہ اس سے منہ موڑ لیتا ہے اور اسے قابل غریب لوگوں کے سپرد کردیتا ہے جن سے وہ گھن کھاتا ہے اور کہتا ہے

”اپنے لیے نہیں، اپنے لیے نہیں، لیکن تیرے نام پر۔“¹⁷ میں بھی آپ باقی لوگوں کی طرح انسان ہوں۔

مجھے انسانوں کی طرح زندہ رہنے اور اپنی روح اور خدا کے متعلق سوچنے دیں۔“

جس طرح سورج اور آتھر کا ہر ذرہ اپنی ذات میں جرمِ کامل ہے اور اس کے ساتھ ساتھ گل کا، جواتا ہیٹھ ہے کہ انسان کے فہم و ادراک سے ماوراء ہے، محض جزو ہے، اسی طرح ہر شخص اپنے باطن میں اپنے اپنے مقاصد اٹھائے پھرتا ہے اور اس کے باوجود کہ اس کے یہ مقاصد محض ذاتی نوعیت کے ہیں، وہ انھیں اس لیے اٹھائے پھرتا ہے تاکہ عمومی مقصد کی، جو انسان کے لیے ناقابلِ تفہیم ہے، تکمیل ہو سکے۔

شہد کی مکھی جب پھول پر منڈلاتی ہے، بچے کو ڈنک، مردہتی ہے۔ چنانچہ بچہ مکھیوں سے ہراساں ہو جاتا ہے، اور پکار اٹھتا ہے کہ مکھی کا کام لوگوں کے ڈنک مارنا ہے۔ شاعر مکھی کو پھول کے کونرے سے رک پتے دیکھ کر دہد میں آجاتا ہے اور پکار اٹھتا ہے کہ مکھی کا کام پھولوں کا رس چوڑنا ہے۔ شہد کی مکھیاں پالنے والا جب مکھی کو زنگل (polien) اکٹھے کرتے اور چھتے میں لے جاتے دیکھتا ہے، پکار اٹھتا ہے کہ مکھی کا کام شہد اکٹھا کرنا ہے۔ مکھیوں کی افزائش کرنے والا ایک دوسرا شخص، جس نے جھنڈ کا غور سے مطالعہ کیا ہوتا ہے، پکارتا ہے کہ مکھی زنگل مکھیوں کے بچوں کو غذا فراہم کرنے اور ملک مکھی کو توانا کرنے کے لیے جراتی ہے۔ ہر نباتیت دیکھتا ہے کہ مکھی اتنی ہے، ز پھول کا زنگل اکٹھا کرتی اور اسے دوسرے پودے کے پتہ نگل میں داخل کر دیتی ہے۔ یوں وہ مؤخر الذکر کو بار آور بناتی ہے۔ اسے مکھی کے وجود کا یہی مقصد نظر آتا ہے۔ ایک اور، ہر پودوں کو زنگل سے آلودہ ہونے کا مشہد کرتا ہے۔ اسے معلوم ہوتا ہے کہ مکھی اس کام میں مدد دیتی ہے اور وہ کہہ سکتا ہے کہ مکھی کا یہی مقصد ہے۔ لیکن مکھی کس مقصد کے لیے وجود میں آئی ہے؟ یہ پہلے، دوسرے یا تیسرے فعل کی جو انسان کو دکھائی دیتا ہے، انہی مدای سے ختم نہیں ہو جاتا۔ ممکنہ مقصد کے انکشاف کے لیے عقل انسانی جتنی بلند یوں پر پہنچتی ہے، اتنا ہی زیادہ یہ واضح ہونے لگتا ہے کہ حتمی مقصد ہمارے فہم و ادراک سے بالا ہے۔

شہد کی مکھی کی زندگی کے دیگر مظاہر حیات سے کیا تعلق ہے، انسان اس کے بارے میں محض قیاس آرائی کر سکتا ہے، اس سے زیادہ اس کے بس میں کچھ نہیں۔ اور یہی مات تاریخی شخصیات اور اقوام کے مقصد پر صادق آتی ہے۔

5

نشاٹا کی بزدل خوف سے شادی، جو 1813 میں انجام پائی، رستوفوں کی پرانی نسل کے لیے آخری خوش آئند واقعہ تھا۔ اسی سال کاؤنٹ لیا۔ تدریج رستوف کا انتقال ہو گیا اور جیسا کہ ہمیشہ سے ہوتا چلا آیا ہے باپ کی موت کے بعد خاندان کا شیرازہ بکھر گیا۔

سال گزشتہ کے واقعات۔ ماسکو کی آتش زدگی، شہر سے فران پرلے آندرے کا انتقال، نساٹا کی یاس، چٹا کی ہلاکت اور بوڑھی کاؤنٹس کا رنج و غم۔ سبھی یکے بعد دیگرے کاؤنٹ کو بچہ کے لگاتے رہے۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ ان واقعات کا مفہوم سمجھ نہیں رہا یا ان کا سمجھنا اس کے بس میں نہیں رہا۔ اس نے عملاً سر تسلیم خم کر دیا تھا جیسے سے توقع ہو کہ وہ مزید چرکوں سے جان بچائیں ہو سکے گا یا، انھیں دعوت دے رہا ہو کہ وہ آئیں اور اس کا خاتمہ کر دیں۔ اب کبھی

وہ ہر اسات، پریشاں اور بدحواس دکھائی دیتا اور کبھی غیر فطری انداز سے چپکنے اور نٹے نٹے منصوبے بناتے لگتا۔
 جناش کی شہری کے انتظامات نے اسے کچھ عرصہ مصروف رکھا۔ وہ ذہنوں اور سپروں کے احکام دیتا اور
 ہشاش بشاش نظر آئے کی بین کوشش کرتا۔ ماضی میں اس کی شگفتگی جس طرح دوسروں میں سرایت کراتی اور انہیں شگفتہ
 بنا دیتی تھی، اب اس میں وہ بات نہیں رہی تھی اور اپنی تاثیر سے محروم ہو چکی تھی۔ اس کے برعکس بیان لوگوں میں، جو
 اسے جانتے اور اس سے محبت کرتے تھے، اس کے لیے کھلے رحم کے جذبات ابھارتی تھی۔

خیر اور اس کی دہن کی روانگی کے بعد وہ ڈھے گیپ اور ڈپریشن کی شکایت کرنے لگا۔ چند روز میں اس کی
 طبیعت بگڑنے لگی، دور وہ بستر سے لگ گیا۔ ڈاکٹر کے تسلی دل سوس کے باوجود اسے شروع میں ہی احساس ہو گیا تھا کہ
 اب اسے دوبارہ اٹھن نصیب نہیں ہوگا۔ دو ہفتے کیڑے تبدیل کیے بغیر کاؤنٹس اس کی ہڈی سے لگ کر بیٹھی رہی۔ ہر
 مرتبہ جب وہ اسے دو دار دیتی، وہ خاموشی سے اس کے سر پر بوسہ دیتا اور اس کی سسکیاں ٹھل جاتیں۔ پٹی زندگی
 کے آخری روز اس نے اپنی بیوی اور غیر حاضر بیٹے سے معافی مانگی کہ اس نے ان کی جاسید، دلوں تللوں میں اڑا
 دی ہے۔ اس کا یہی گناہ عظیم اس کے ضمیر پر بوجھ بنا ہوا ہے۔ مقدس روٹی اور شراب پھینکنے کے بعد اور سر پر آخری مس
 کرانے کے بعد وہ چپ چاپ انتقال کر گیا۔ اس سے اگلے روز رستوفوں کے کرائے کے مکان میں مرحوم کی خزانہ
 رسومات میں شریک ہونے کے لیے ملنے ملانے والوں کا ہجوم جمع ہو گیا۔ وہ درست، جو اکثر اس کے گھر دوش
 اڑانے اور رقص کرنے آیا کرتے تھے، اب یکجان ہو کر ضمیر کی کک محسوس کرنے لگے اور جیسے وہ اپنے آپ کو بچ
 ثابت کرنے کے جتن کر رہے ہوں، کہنے لگے:

”بھلے وہ آدمی کیسا ہی تھا، تھا شریف النفس۔ آج کل ایسے لوگ کہاں ملتے ہیں... اور ہم میں سے کون ہے
 جو یہ دعویٰ کر سکے کہ وہ خامیوں سے مبرا ہے!“

عین اس وقت جب کاؤنٹ کے مالی معاملات اتنے الجھ گئے تھے کہ یہ تصور کرنا ناممکن ہو گیا تھا کہ اگر وہ مزید
 ایک سال زندہ رہا پھر کیا ہوگا، وہ ایک لحظہ انتظار کر گیا۔

جب نکلوانی کو اپنے باپ کی وفات کی خبر ملی، وہ روسی فوج کے ساتھ پیرس میں تھا۔ اس نے جھٹ پٹ اپنی
 ملازمت سے استعفیٰ دیا، اس کی منظوری کا انتظار کیے بغیر چھٹی لی ورن سکور ورن ہو گیا۔

کاؤنٹ کے مالی معاملات کا اس کی موت کے ایک مہینے کے اندر اندر بھانڈا پھوٹ گیا۔ چھوٹے چھوٹے
 قرضوں کی، جن کے متعلق کسی کو سان گمان بھی نہیں تھا، بھاری مجموعی مالیت نے ہر شخص کو ہتک بکا کر دیا۔ قرضوں کی
 رقوم اس کی جاگیر اور جائیداد کی مالیت سے دگنا بنتی تھیں۔

دوسروں اور رشتہ داروں نے نکلوانی کو مشورہ دیا کہ وہ اپنی وراثت سے دست برداری کا اعلان کر دے۔
 لیکن نکلوانی کو یہ اقدام اپنے باپ کی یادوں پر، جو اس کے نزدیک مقدس تھیں، کلک کا نیکا معلوم ہوا۔ چنانچہ اس
 نے دست برداری کے متعلق کوئی بات سننے سے صاف انکار کر دیا۔ اس نے وراثت اور اس کے ساتھ تعلق رکھنے والے

کرنے کی ذمہ داری قبول کر لی۔

جب تک کاؤنٹ بقید حیات رہا، اس کی پہل پسند نیک فطرت قرض خواہوں کو مبہم لیکن پرزور انداز سے متاثر کرتی رہی اور انھیں کبھی اس کے سامنے دم مارنے کی مجال نہ ہوئی مگر اب انھوں نے نکولائی کا گھراؤ کر لیا اور سب بیک وقت اپنے اپنے دعویٰ پر اصرار کرنے لگے۔ جیسا کہ اس قسم کے معاملات میں ہمیشہ سے ہوتا چلا آیا ہے، مختلف اشخاص کے مابین اختلافات سر اٹھانے لگے کہ سب سے پہلے وصولی کا حق کے حاصل ہے اور ہنر کا جیسے لوگ، جن کے پاس تحفظ دے گئے پر نوٹ تھے، اب جم چڑھ کر قسم کے قرض خواہ ثابت ہونے لگے۔ نکولائی کو کوئی مہلت نہ دی گئی اور نہ سے سکون سے کچھ سوچنے کا موقعہ فراہم کیا گیا اور جو اشخاص بوڑھے کاؤنٹ پر، جو ان کے نقصانات (گراٹھیں نقصانات کہا جاسکتا ہے) کا ذمہ دار تھا، ترس کھاتے تھے، اب بے دردی سے بظاہر بے تصور وارث کا، جس نے رضا کارانہ ان کی ادائیگیوں کرنے کی ذمہ داری اپنے سر لے لی تھی، ناک میں دم کرنے لگے۔

نکولائی جو منصوبہ بھی بناتا، اس میں اسے ناکائی کا منہ دکھنا پڑتا۔ جاگیر اور جائیداد اصل قیمت سے کوئی قیمت پر فروخت ہوئیں اور نصف قرضوں کی ادائیگی ابھی باقی تھی۔ جن قرضوں کو وہ جاگروں سے لے لیا تھا، ان کو بے باقی کرنے کے لیے اس نے اپنے بہنوئی بزدل کی طرف سے تیس ہزار روپے کی رقم کی پیشکش قبول کر لی۔ اور باقی، انداز قرضوں کی عدم ادائیگی کی بنا پر جیل بھیجے جانے کے امکان سے بچنے کے لیے جیسا کہ قرض خواہ، ہم کیاں دے رہے تھے اس نے دوبارہ سرکاری ملازمت اختیار کر لی۔

فوج میں، جہاں پہلی اسامی خالی ہونے پر اسے کرنل کے عہدے پر فائز کر دیا جاتا، وہاں جانا خارج زحمت تھا کیونکہ اس کی ماں اسے زندگی کا آخری سہارا سمجھتے ہوئے اس کے ساتھ چلی ہوئی تھی۔ چنانچہ اس امر کے باوجود کہ سے ماسکو میں ان لوگوں کے مابین، جو بھلے دنوں میں اس سے ملنے ملتے رہتے تھے، رہنے میں تال تھا اور سول ملازمت سے نفرت تھی، اس نے ماسکو کے ایک سرکاری محکمے میں عہدہ قبول کر لیا، اپنی دردی، جو اسے جی جان سے پیاری تھی، اتار کر ایک طرف رکھ دی اور اپنی ماں اور سونیا کے ساتھ شہر کے ایک نسبتاً مغلوک احوال محلے کے چھوٹے سے مکان میں اٹھ آیا۔

اس زمانے میں مناسٹا اور پیٹر پیٹرز برگ میں رہائش پذیر تھے اور انھیں نکولائی کے حالات کا واضح طور پر کوئی خاص علم نہیں تھا۔ اپنے بہنوئی سے رقم ادھار لینے کے بعد نکولائی نے اپنی مغلی اور تنگ دستی کو جو اس کا پیچھا نہیں چھوڑ رہی تھیں، ان سے چھپانے کی پوری کوشش کی تھی۔ اس کے حالات کی اپنی ایک وجہ اور بھی تھی۔ اسے اپنی بارہ سو روپے کی تنخواہ میں نہ صرف اپنا گزارہ کرنا اور سونیا کے اخراجات برداشت کرنا تھے بلکہ اپنی ماں کی ضروریات کا کچھ اس طور خیال رکھنا تھا کہ اسے ان کی غربت کا کوئی احساس نہ ہو سکے۔ کاؤنٹس پر تعیش اشیاء کے بغیر، جن کی وہ بچپن سے عادی تھی، زندگی کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔ اپنے بیٹے کی مشکلات کا اندازہ لگائے بغیر وہ مسلسل کسی دوست کو دہانے کے لیے گاڑی (جس کا رکھنا اب ان کے بس میں نہیں رہا تھا)، اپنے لیے کھانے کی کوئی مزید چیز، اپنے

بیٹے کے لیے بے انگور یا نانا شاہو نیا یا خود گولائی کے لیے کوئی خداف تو فتح تھخہ خریدنے کے لیے رقوم کے مطالبات کرتی رہتی تھی۔

سونیا گھر کا کام کاج کرتی تھی، اپنی خاصہ کی خدمت کرتی تھی، اس کے نانا اٹھاتی تھی، اس کے ان کے بعض وعداوت کو برداشت کرتی تھی اور بوڑھی کاڈنٹس سے خاندان کی غربت چھپانے کے لیے گولائی کی مدد کرتی تھی۔ سونیا گولائی کی اس کے لیے جو کچھ کر رہی تھی، اس کے لیے وہ اپنے آپ کو اس کا زیر احسان تصور کرتا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ اس کی تلافی کیسے کرے گا۔ وہ اس کے صبر و تحمل خلوص اور اندھے پیار کی قدر تو کرتا تھا لیکن اس سے دور رہنے کی کوشش بھی کرتا تھا۔

معصوم ہونا تھا کہ وہ دل ہی دل میں اسے ملاست کرتا رہتا ہے کیونکہ اس کا طرز عمل اتنا بے عیب تھا کہ اسے کسی طور پر، بھدا نہیں کہا جاسکتا تھا۔ جن اوصاف کی بنا پر لوگوں کو عزت و احترام کا مستحق ٹھہرایا جاتا ہے، وہ اس میں بدرجہ اتم موجود تھے لیکن یہ بھی اسے اس سے محبت کرنے پر آمادہ نہ کر سکے۔ اسے ہر دم یہی محسوس ہوتا رہتا کہ وہ اس کی جتنی زیادہ قدر کرتا ہے، اس سے اس کی محبت اتنی ہی کم ہوتی جاتی ہے۔ جب اس نے اسے خط لکھا تھا اور اپنی طرف سے تمام بندھنوں سے آزاد کر دیا تھا، اس نے اس کے الفاظ کو لغوی معنوں میں لے لیا تھا اور اب اس کا رویہ کچھ اس قسم کا ہو گیا تھا، جیسے ان دونوں کے مابین جو کچھ بیٹا تھا، وہ زمانہ قدیم کی کوئی بھولی بسری بات ہو اور کسی صورت میں بھی اس کی تجدید نہیں ہو سکتی۔

گولائی کے حالات بد سے بدتر ہوتے جا رہے تھے۔ اپنی تنخواہ میں سے کچھ پس انداز کرنے کی امید نہیں رہی ثابت ہو رہی تھی۔ بچت کرنا تو دور کی بات تھی، الناسے اپنی ماں کی فرمائشوں سے عہدہ برآ ہونے کے لیے چھوٹے موٹے قرضے اٹھانا پڑ رہے تھے۔ اسے اس مصیبت سے چھٹکارے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی۔ کسی متبادل خاتون سے شادی کرنے کے تصور ہی سے، جیسا کہ اسے اس کی رخصتے دار خواتین سمجھاتی رہتی تھیں، اسے گھن آتی تھی۔ نجات کی دوسری صورت۔ اس کی ماں کی موت۔ اس کے کبھی ذہن میں نہ آئی۔ اسے کسی چیز کی تڑپ نہیں رہی تھی، کسی چیز کی امید نہیں رہی تھی اور نہ ہی اس پر شکوہ شکایت لائے بغیر اپنے حالات کو برداشت کر کے اسے اپنے قلب کی گہرائیوں میں ایک نوع کی سنگین اور پر مدال تسکین کا تجربہ ہوتا رہتا تھا۔ وہ اپنے پرانے دوستوں سے، جو اس سے ہمدردی کرتے اور امداد کی کرب ناک پیشکشیں کرتے رہتے تھے، کتنی کتراتے کی کوشش کرتا تھا، ہر قسم کی تقریحات اور کھیل تماشوں سے دور بھاگتا تھا، اور گھر میں بھی اپنی ماں کے ساتھ ناش کی بازی لگانے، خاموشی سے کمرے میں پھر کاٹنے اور، ایک کے بعد دوسرا پاپ پیٹنے کے علاوہ اور کچھ نہیں کرتا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنی اداسی اور آزر و گی کو بردہرار رکھنے کے لیے نہایت حزم و احتیاط سے داخلی جنگ لڑ رہا ہے اور صرف یہی چیز اسے اپنے تعبیر حالات سے عہدہ برآ ہونے میں اس کی مدد کر رہی تھی۔

جائزوں کے آغاز پر انس مار یا ماسکو گئی۔ شہر میں جوائیاں اور خیریں گردش کر رہی تھیں، ان میں سے سب سے رستوں کے حالات سے آگاہی ہوئی اور اسے یہ بھی معلوم ہوا کہ کس طرح بیٹا جیسا کہ لوگ کہہ رہے ہیں، اپنی ماں کی خاطر سولی پر لٹکا ہوا ہے۔

”مجھے ان سے بالکل اسی چیز کی توقع تھی،“ انس مار یا نے اپنے آپ سے کہا۔ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ اسے اس سے جو محبت ہے، اس سے اس کی توثیق ہو گئی ہے اور اس پر وہ بے حد مسرور تھی۔ اس کی رستوں کے ساتھ جو بے تکلفی تھی اور جس نے اسے تقریباً ان کے گھر کا ایک فرد بنا دیا تھا اسے ذہن میں مانتے ہوئے اس نے فیصلہ کیا کہ ان سے ملاقات کرنا اس کا فرض بنتا ہے لیکن جب اسے وارا نیئر میں کولائی کے ساتھ بے تعلقات کی نوعیت یاد آئی، وہ دوسووں میں گھر گئی اور اسے اس کے ہاں جانے کے خیال سے وحشت ہونے لگی۔ تاہم ماسکو میں پٹی آمد کے چند ہفتے بعد وہ ان سے ملنے چلی گئی حالانکہ اس کے لیے اسے پٹی طبیعت پر جبر کرنا پڑا تھا۔

سب سے پہلے اس کی نگہ ٹی سے ملیک ملیک ہوئی کیونکہ اس کے کمرے میں سے گزرے بغیر کاؤنٹس کے کمرے میں جانا ناممکن تھا۔ انس مار یا کو توقع تھی کہ اس سے مذاہم بھڑھوتے ہی وہ مکمل اٹھے گا لیکن اس پر نظر پڑتے ہی اس کے چہرے پر مسرور مہری، روکھا پن اور نخوت پھلکنے لگی۔ اس نے اس سے پہلے اسے اس کیفیت میں کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اس نے اس سے اس کی خیر خیریت دریافت کی، اسے اپنی ماں کے کمرے میں لے گیا اور ابھی ابھی وہاں بیٹھے پانچ منٹ بھی نہیں گزرے ہوں گے کہ اٹھ کر باہر چلا آیا۔

جب انس مار یا کاؤنٹس کے کمرے سے برآمد ہوئی، کولائی نے ایک بار پھر اس کا نہیاں طور پر برمی اور لیے دیے انداز سے استقبال کیا اور اسے دروازے تک پہنچانے یاہر آیا۔ جب اس نے اس کی ماں کی صحت کے بارے میں کوئی بات کی، اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ ”اس سے تمہیں کیا؟ مجھے میرے حال پر چھوڑ دو،“ اس کی نظریں کہتی دکھائی دے رہی تھیں۔

”آخر یہ یہاں کیا ٹوہ لگاتے پھر رہی ہے؟ یہ چاہتی کیا ہے؟“ مجھ سے یہ mesdames اور ان کی مرؤتیں قطعاً برداشت نہیں ہوتیں!“ اس نے سونیا کی موجودگی میں با آواز بلند کہا۔ صاف نظر رہا تھا کہ انس مار یا کی نگہ اس کی بعد اسے اپنی جھنجھٹا ہٹ پر قابو پانے میں مشکل پیش آرہی ہے۔

”اف، نکولس، آپ کیسی ہاتھی کر رہے ہیں؟“ سونیا نے قدرے بلند آہنگ لہجے سے کہا۔ ویسے اس کے دس میں لڈو پھوٹ رہے تھے اور اس سے اپنی مسرت چھپائے چھپ نہیں رہی تھی۔ ”دو تکی نیک دل ہیں اور mamañ

جملہات۔ mesdames۔ رام کی جمع ہے اور بعض اوقات غیر شادی شدہ خواتین کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔

”اماں۔

ان پر اتنے صدمے ڈاری ہوتی رہتی ہیں۔“

گولائی سے کوئی جواب نہ دیا اور پرنس کے دوبارہ ذکر سے احتراز کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ ہم اس کی آمد کے بعد بوڑھی کاؤتس ہر روز اس کا بار بار تذکرہ لے بیٹھتی۔

وہ اس کی تعریفوں کے پل باندھتی، اپنے بیٹے سے اصرار کرتی کہ اسے لازماً اس سے ملنے جانا چاہیے اور خود بھی اس سے ملاقات کی خواہش کا بار بار اظہار کرتی لیکن وہ جب بھی اس کا نام زبان پر لاتی، اس کا مزاج ہمیشہ برا ہو جاتا۔

جب گولائی کی واسدہ پرنس کا ذکر چھیڑتی، وہ خاموش رہنے کی کوشش کرتا اور اس کی یہ خاموشی اسے برا فرد خیال کر دیتی۔

”وہ بہت لائق فائق اور قابل تعریف لو جو ان خاتون ہے،“ وہ کہا کرتی۔ ”تمہیں اس کے ہاں جانا اور اس سے ملاقات کرنا چاہیے۔ اس سے تمہیں کم از کم کسی شخص سے تو ملنے ملنے کا موقعہ میسر آ جائے گا۔ میں یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ صرف ہماری شکلیں دیکھ کر تم پر زبا بولنے لگے ہو گے۔“

”مگر، ماما، میں لوگوں سے قطعاً ملنا نہیں چاہتا۔“

”تمہیں تو لوگوں سے میل ملاپ کا بڑا شوق ہوتا تھا اور اب صرف ایک ہی رٹ لگائے چاہے ہو۔ میں کسی سے ملنا ملنا نہیں چاہتا۔ مائی ڈیئر، مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ تم آخر چاہتے کیا ہو؟ گھڑی میں تم بول رہے ہو اور گھڑی میں پکارنے لگتے ہو کہ تمہیں لوگوں سے ملنا جتنا پسند نہیں۔“

”پر میں نے تو کبھی نہیں کہا کہ میں بول رہا ہوں۔“

”خیر، تم نے خود ہی تو کہا تھا کہ تم اس کی صورت بھی دیکھنا پسند نہیں کرتے۔ وہ بہت اچھی لڑکی ہے اور تم اس کے ہمیشہ گرویدہ رہے ہو۔ اب یہ نہیں کہہ چاؤں کہ تمہارے دماغ میں کیا نکاس گھس گیا ہے۔ تم مجھ سے باتیں چھپاتے رہتے ہو۔“

”نہیں، ماما، بالکل نہیں۔“

”اگر میں تمہیں کوئی ناگوار کام کرنے کو کہتی تو۔ لیکن میں تو صرف یہ کہہ رہی تھی کہ تمہیں جو اپنا اس کے گھر ضرور جانا چاہیے۔ خیر، میرا خیال ہے کہ محض شائستگی کا تقاضا یہی ہے، اچھا، مجھے جو کچھ کہنا تھا، میں نے کہہ دیا ہے، اب میں مزید ایک لفظ بھی نہیں کہوں گی کیونکہ اب تم اپنے راز اپنی ماں سے بھی چھپانے لگے ہو۔“

”بہت اچھا، گر آپ کی یہی خواہش ہے، میں چلا جاؤں گا۔“

”خیر، میرے لیے یہ کوئی اہم بات نہیں ہے۔ میں تو صرف تمہارے بھلے کا سوچ رہی ہوں۔“

گولائی نے آہ بھری، ”دانتوں سے مونچھوں کو کاٹا اور اپنی ماں کی توجہ کسی دوسری چیز کی طرف مبذول کرانے کے لیے (تاتر کے کھیل) پیشکش کے لیے پتہ بچھا دیا۔“

یہی گفتگو اگلے روز، اس سے اگلے روز اور پھر اس سے اگلے روز دہرائی گئی۔

رستونوں کے ہاں چکر لگانے اور غیر متوقع طور پر گوری کے سردمہرہ ایسے کامنا کرنے کے بعد پرس بدیا نے اپنے آپ سے اعتراف کیا کہ وہ ملاقات کے لیے پہل نہ کرنے کی خواہش میں حق بجانب تھی۔

”مجھے اس کے علاوہ کسی اور چیز کی توقع ہی نہیں تھی“ اس نے اپنی مدد کے لیے اپنے چندار کو آواز دیتے ہوئے کہا۔ ”میرا اس سے کوئی تعلق واسطہ نہیں، میں تو محض بزرگ کا وٹلس سے، جو ہمیشہ مجھ پر بہتان رانی ہیں اور جن کے میں بے شمار حسانات کے بوجھ تلے دبی ہوئی ہوں، ملنے لگی تھی۔“

لیکن اس قسم کی نکتہ آفرینیوں سے اس کے دل کو تسلی نہ ہوئی۔ وہ جب کبھی اس ملاقات کے متعلق سوچتی، پشیمانی سے ملتا جلتا جذبہ اس کے دل کی کلی کو کھلا دیتا۔ اگرچہ وہ اپنے نہاں خلیہ قلب میں تہیہ کر چکی تھی کہ وہ کبھی دوبارہ رستونوں کے گھر کا رخ نہیں کرے گی اور اس سارے معاملے کو فراموش کر دے گی، اسے ہر دم یہی محسوس ہوتا رہتا کہ وہ کڈھب اور گول سول صورت حال میں پھنس گئی ہے۔ جب وہ اپنے آپ سے پوچھتی کہ آخر اسے پریشانی کس بات کی ہے، وہ یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہو جاتی کہ اس کا باعث اس کی رستون سے ملاقات ہے۔ ”انھوں نے میرے ساتھ جو رکی اور سردمہرہ رو یہ اپنایا، اس کا ان کے میرے متعلق جذبات سے کوئی تعلق نہیں (اس کا مجھے یقین ہے) بلکہ اس کی تہہ میں کوئی اور بات پوشیدہ ہے۔ یہ بات کیا ہے، مجھے اس کا سراغ لگانا ہو گا ورنہ مجھے سکون نہیں مل سکے گا۔“

ایک روز بیچ جاڑوں میں جب وہ مٹھڑی روم میں بیٹھی اپنے بھتیجے کے اسباق کی نگرانی کر رہی تھی، اسے اطلاع بہم پہنچائی گئی کہ رستون ملنے آیا ہے۔ یہ خبر سن کر اس نے پختہ عزم کر لیا کہ وہ کسی طور پر تو اپنے دل کی کیفیت ظاہر ہونے دے گی اور نہ کسی قسم کے اضطراب کو اپنے قریب پہنکنے دے گی۔ اس نے مادموزیل بوغین کو بلایا اور اس کے ساتھ نیچے ڈرائنگ روم میں چلی گئی۔

وہ رستون کے چہرے کو آؤ لین سرسری نگاہوں سے دیکھتے ہی سمجھ گئی کہ وہ محض شائستگی کے نقاشے پرے کرنے کے لیے آیا ہے اور اس نے تہیہ کر لیا کہ وہ اس کے ساتھ جس لمحے میں بات کرے گا، وہ خود بھی وہی اختیار کرے گی۔ وہ کاؤٹش کی صحت، مشترکہ دوستوں اور وقف کاروں اور جنگ کی تازہ ترین خبروں کے متعلق تبادلہ خیالات کرتے رہے اور جب مجلسی آداب کے تقاضوں کے مطابق دس منٹ گزر گئے جب مہمان رخصت ہو سکتا ہے، گوری خدا حافظ کہنے کے لیے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

پرس نے مادموزیل بوغین کے تعاون سے گفتگو کا مرحلہ اچھی خاصی کامیابی سے طے کر لیا تھا لیکن عین آخری لمحے پر، جب گوری جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہو گیا تھا، وہ اس قسم کی باتیں کر کے جن میں اسے نام کو بھی دلچسپی نہیں تھی، اتنا تھک چکی تھی اور یہ سوچ رہی تھی کہ آخر زندگی میں اتنی کم خوشی صرف اسی کے حصے میں کیوں آئی ہے، کہ اس پر غائب و غی نے غلبہ پالیا اور وہ اپنی جگہ بت بنی بیٹھی رہی۔ اس کی درخشاں آنکھیں قفل کی مانند مسانے دیکھ رہی تھیں اور اسے یہ اندازہ ہی نہ ہو سکا کہ وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا ہے۔

نکھوڑائی نے اچھتی لگا ہوں سے اسے دیکھا اور یہ خطا ہر کرنے کے لیے کہ اس نے اس کے استغفری کو دیکھا ہی نہیں، اس نے مادسوزیل بوغین سے کچھ کہا اور ایک بار پھر حائرانہ نظریں پرنس ماریا پر ڈالیں۔ وہ یوں کی توں بے حس و حرکت بیٹھی تھی اور اس کے نرم و شفقت چہرے سے گہرے دکھ کا اظہار ہو رہا تھا۔ اسے ایک دم اس پر ترس آ گیا اور اسے مبہم سا احساس ہونے لگا کہ اس کے چہرے پر جو دکھ جھٹک رہا ہے، اس کا باعث شاید وہ خود ہی ہے۔ اس کا جی ہا ہوتا تھا کہ وہ اس کی مدد کرے، اس سے کوئی خوشگوار بات کہے لیکن اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کہے تو کیا کہے۔

”پرنس، خدا حافظ!“ اس نے کہا۔

وہ ہڑبزا گئی، اس کا چہرہ سرخ ہو گیا اور اس نے لمبی آہ بھری۔

”اور، معافی چاہتی ہوں،“ اس نے یوں کہا جیسے وہ ابھی ابھی نیند سے بیدار ہوئی ہو۔ ”کاؤنٹ، آپ مل بھی دیے!... اچھا، پھر خدا حافظ! اور، کاؤنٹس کا کٹھن...“

”ایک منٹ ٹھہریں، میں ابھی لاتی ہوں،“ مادسوزیل بوغین نے کہا اور کمرے سے باہر نکل گئی۔

وہ دونوں خاموش بیٹھے رہے اور کبھی کبھار اچھتی لگا ہوں سے ایک دوسرے کو دیکھ لیتے۔

”جی، پرنس۔“ نکھوڑائی نے آخر کار اس انداز سے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”ہماری باگو چارافون میں جو پہلی ملاقات ہوئی تھی، یوں معلوم ہوتا ہے جیسے یہ کل کی بات ہو۔ لیکن تب سے پلوں کے نیچے کتنا ہی پانی بہہ چکا ہے! اس وقت ہم سب کو یہی محسوس ہوتا تھا کہ ہم پر مصائب کے پہ ڈنٹ پڑے ہیں۔ تاہم جہاں تک میرا اپنا تعلق ہے، میں اس وقت کو داپس بلانے کے لیے کیا کچھ دینے کو تیار نہیں ہوں!۔ لیکن اسے بلانا ناممکن ہے۔“

پرنس کی درخشاں آنکھیں اس کے چہرے پر مرکوز تھیں اور وہ اسے غور دیکھ رہی تھیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ اس کے الفاظ کا ڈھکا چھپا مفہوم سمجھنے کی کادش کر رہی ہے۔ وہ جانتا چاہتی تھی کہ اس کے اس کے اپنے ہارے میں کیا جذبات ہیں۔

”جی ہاں،“ اس نے کہا۔ ”لیکن کاؤنٹ، آپ کے پاس ماضی پر آنسو بہانے کی کوئی وجہ نہیں۔ جہاں تک میں آپ کی موجودہ زندگی کا اندازہ لگا سکی ہوں، مجھے تو یہی نظر آتا ہے کہ آپ اسے یاد کر کے مطمئن ہو جاتے ہوں گے کیونکہ آپ نے ایسا روبرو بانی کی جو روش۔“

”مجھے آپ کی تحسین قبول نہیں،“ اس نے چپ ٹک اسے ٹوکتے ہوئے کہا۔ ”اس کے عکس میں تو ہر دم سچ آپ کو ملامت کرتا رہتا ہوں۔ خیر، یہ کسی لی فل سے بھی دلچسپ یا خوش سمند موضوع نہیں۔“

اس کے چہرے پر دوبارہ وہی سرد مہری اور رکھ پین جھٹکے لگا۔ لیکن پرنس ماریا نے اس شخص کی، جسے وہ جانتی تھی اور جس سے وہ پیار کرتی تھی، ایک جھٹک دیکھ لی تھی۔ چنانچہ جو کچھ وہ اب کہہ رہی تھی، اسی شخص سے کہہ رہی تھی۔

”میرا خیال تھا کہ آپ مجھے یہ کہنے کی اجازت دے دیں گے،“ اس نے کہا۔ ”آپ اور میں۔ آپ کا خاندان اور میں ایک دوسرے کے اتنا قریب آ گئے تھے کہ مجھے خیال آیا کہ آپ میری ہمدردی کو بے عمل تصور نہیں کریں گے،

لیکن میں غلطی پر تھی۔" اور ایک ایک کی اس کی آواز کپکپانے لگی۔ "مجھے معلوم نہیں کہ کیوں،" اس نے اپنے جذبات پر قابو پاتے ہوئے کہا، "لیکن آپ بالکل مختلف نظر آتے ہیں اور..."

"کیوں: کی ایک ہزار ایک وجوہ ہو سکتی ہیں۔" اس نے غلطیوں پر غصہ کر دیا۔ "پر غصہ کرنا درست ہے کہ نہیں؟" پرس، آپ کا شکریہ۔" اس نے ملائمت سے مزید کہا۔ "بعض اوقات بڑی مشکل پیش آ جاتی ہے۔"

"تو یہ ہے کیوں! تو یہ ہے کیوں" کسی باطنی آواز نے پرس ماریا سے کہا۔ "مجھے ان سے جو محبت ہوئی تھی، وہ ان کی محض خوش باش، شفیق اور بے ریا آنکھوں اور چہرے اور ان کی ظاہری رعبہ شکل و صورت سے ہی نہیں ہوئی تھی بلکہ میں نے ان کی عالی منش، پر عزم اور ایثار کیش روح کو بھی پہچان لیا تھا،" اس نے بے آپ سے کہا۔ "یہ اب مظلوم احوال میں اور میں متمول... ہاں، یہی وجہ ہے... ہاں، اگر یہ بات نہ ہوتی..." اور اس کے سابقہ نرم و ملائم انداز کو یاد کرتے اور اس کے شفیق اور غم آلود چہرے کو دیکھتے ہوئے اسے ایک لمحہ اس کی سرد مہری کا سبب معلوم ہو گیا۔

"لیکن، کاؤنٹ، کیوں، آخر کیوں؟" اس نے لاشعوری طور پر اس کے قریب کھٹکتے ہوئے با آواز بلند پوچھا۔
"مجھے بتائیں، مارنا بتائیں!"

وہ چپ تھا۔

"کاؤنٹ، میں آپ کی یہ کیوں نہیں سمجھ سکی،" اس نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "لیکن میرا دل بہت بوجھل ہے... مجھے اس کا اعتراف کرنے میں کوئی ہاک نہیں۔ آخر کوئی وجہ تو ہوگی جو آپ مجھے اپنی سابقہ رفاقت سے محروم کرنا چاہتے ہیں۔ اور اسی چیز سے میرے دل کو تکلیف پہنچ رہی ہے۔" اس کی آواز رندہ رہی اور اس کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔ "زندگی میں میرے حصے میں اتنی کم خوشیاں آئی ہیں کہ کوئی ضیاع بھی میری برداشت سے باہر ہے... میں معافی چاہتی ہوں، خدا حافظ!" اچانک ہندوٹ گئے، اس کی آنکھوں سے اشکوں کا سیل رواں ہو گیا اور وہ دروازے کی جانب چل پڑی۔

"پرس، ٹھہریں، خدا کے لیے" وہ اسے روکنے کی کوشش کرتے ہوئے چلایا "پرس!"
اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ وہ چند سیکنڈ پتھر کے بت بنے ایک دوسرے کی آنکھوں میں جھانکتے رہے اور وہ جو ناممکن اور دور دراز معلوم ہوتا تھا، ایک ایک ممکن، اٹل اور بہت قریب دکھائی دینے لگا۔

1814 کے جڑوں میں نکولائی نے پرس ماریا سے شادی کر لی اور اپنی ماں، بیوی اور سونیا کے ساتھ، لڈلز خٹل ہو گیا۔

اپنی بیوی کی جائیداد کا معمولی سے معمولی حصہ فروخت کیے بغیر اس نے چار سالوں میں اپنے تمام تر فیسے بے باقی

کر دیے۔ اپنے ایک کزن کے انتقال پر اسے اس کی وراثت میں سے کچھ حصہ موصوف ہو گیا اور اس سے سوئٹزرلینڈ کا ادھر بھی واپس کر دیا۔

مزید تین برسوں کے دوران میں اس نے اپنے معاملات کچھ اس خوبی سے سمجھائے کہ وہ 1820ء میں بالکل سے ملحق ایک نسبتاً چھوٹا فارم خریدنے میں کامیاب ہو گیا اور اپنی ترویج کی آبائی جاگیر کے دوبارہ حصول کے لیے جس کا وہ ہر دم خواب دیکھتا رہتا تھا۔ گنت و شنید شروع کر چکا تھا۔

اس نے جاگیر کا انتظام و انصرام ضرورت کے تحت سنبھالا تھا لیکن قلیل مدت میں سے فارمنگ کا کچھ ایسا چرکا پڑ گیا کہ یہ اس کی پسندیدہ اور تقریباً واحد مصروفیت بن گئی۔

نکولائی سیدھا سا وکسان تھا۔ اسے جدتوں سے، خاص طور پر وہ جو انگلستان سے آرہی دررواج پارٹی تھیں، کوئی رغبت نہیں تھی۔ وہ زراعت کے متعلق نظری رسائلوں اور کتابچوں کا مذاق اڑاتا۔ اسے گھریلو ٹیکسٹائل قائم کرنے، پیداوار کے بہتے طریقے اختیار کرنے اور قیمتی بیج خریدنے میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ اپنے آپ کو زراعت کے کسی خاص شعبے تک محدود نہ کرتا۔ وہ کسی ایک حصے کا نہیں بلکہ مجموعی طور پر سارے فارم کا مفاد پیش نظر رکھتا۔ اس کے خیال میں اہم ترین چیز زمین کی بائز و جن، فضا کی، کسبجین، خاص قسم کے آلات کٹ و درزی یا قدرتی کھادیں نہیں تھیں بلکہ وہ کسان تھے جو زمین پر کام کرتے تھے۔ جب نکولائی نے فارمنگ کا کام سنبھالا اور اس نے اس کے مختلف شعبوں کا جائزہ لینا شروع کیا، یہ کسان تھا جس پر اس نے خصوصی توجہ مبذول کی۔ اس کی نظر میں کسان محض آلہ نہیں تھا بلکہ وہ خود اپنی ملت غائی اور اس کا حکم تھا۔ شروع شروع میں اس نے کسانوں کا یہ نظریہ تسلیم کیا اور یہ سمجھنے کی کوشش کرتا رہا کہ وہ چاہتے کیا ہیں اور ان کے نزدیک کام کرنے کے بہترین طریقے کیا ہیں۔ وہ جھوٹ بوٹ تو یہ ظاہر کرتا تھا کہ وہ انھیں احکام و ہدایات دے رہا ہے جب کہ فی الحقیقت وہ ان سے ان کے طور طریقے، نئی گفتگو کے ڈھنگ اور اچھائی اور برائی کے بارے میں ان کے بیانے معلوم کر رہا اور انھیں اپنے اندر جذب کر رہا ہوتا تھا۔ جب سے کسانوں کے اطوار اور آرزوؤں سے آشنائی ہو گئی، جب اس نے ان کی زبان میں گفتگو کرنا اور ان کے الفاظ کے ڈھکے چھپے معانی اخذ کرنا سیکھ لیا اور یوں جب وہ اپنے آپ کو ان جیسا محسوس کرنے لگا، صرف تبھی وہ ان کے ساتھ پورے اعتماد سے بیٹھنے لگا۔ یہ الفاظ دیگر ان کی طرف سے اس پر جو فرائض عائد ہوتے تھے، انھیں نبھانے لگا۔ اور نکولائی کے نظم و نسق کے نہایت شاندار نمائندگی برآمد ہوئے۔

املاک کا انتظام اپنے ہاتھوں میں لینے کے بعد اس نے کسی خداداد بصیرت کے طفیل فی الفور اور بے خطا انداز سے بالکل انھیں اشخاص کو سلف، گاؤں کے نمبردار اور نماحدے مقرر کیا کہ اگر کسانوں کو اپنی مرضی کا اختیار ہوتا، وہ بھی انھیں کو منتخب کرتے اور ان لوگوں کو تبدیل کرنے کی کبھی ضرورت پیش نہ آئی۔ کھاد کی کیمیائی خصوصیات کا تجزیہ کرنے اور آمدنی و اخراجات (وہ حساب کتاب کا ذکر طریقیہ انداز سے کیا کرتا تھا) کے تخمینے لگانے سے قبل اس نے یہ معلوم کیا کہ کسانوں کے پاس مویشی کتنے ہیں اور اس نے تمام ذرائع سے ان کی تعداد میں اضافہ کیا۔ وہ کسانوں کے

خاندان کو منقسم نہیں ہونے دیتا تھا بلکہ اس کی کوشش ہوتی تھی کہ وہ حتی الامکان مل جل کر رہیں۔ وہ کامل الوجود عیاش، بدکردار اور کمزور لوگوں کے ساتھ حتی سے پیش آتا تھا اور انہیں برابری سے خارج کرنے کے لیے کوشاں رہتا تھا۔ اسے کسانوں کے چارے اور غلے کی فصلوں کی بوئی اور کٹائی کی اتنی ہی پیچھا رہتی تھی جتنی کہ خود اپنی فصلوں کی۔ اور بہت کم ایسے زمیندار تھے جو اپنی فصلوں کی بوئی اور کٹائی اتنی جلدی یا اتنے منافع بخش طریقے سے کرتے تھے جتنا کہ وہ۔

اسے گھریلو سازمین کے، جنہیں وہ ”زنگس“ کہتا تھا، معاملات میں دخل اندازی ناپسند تھی اور ہر شخص یہ کہتا تھا کہ وہ انہیں ڈھیل دے کر ان کی عادات بگاڑ رہا ہے۔ جب کسی گھریلو غلام کے متعلق کوئی فیصلہ خاص طور پر سے سزا دینے کا معاملہ درپیش ہوتا، وہ ہمیشہ ڈانوں ڈال رہتا اور گھر میں ہر شخص کی رائے طلب کرنے لگتا۔ لیکن جب کسی کسان کی جگہ کسی گھریلو غلام کی فوج میں جبری بھرتی ممکن ہوتی، وہ ذرا بھی جیس جیس کا مظاہرہ نہ کرتا۔ جہاں تک کسانوں سے عہدہ برآ ہونے کا تعلق ہے، وہ پورے عہدہ کے ساتھ ان سے بات کرتا اور کسی معاملے میں بھی کسی قسم کی اچھکی ہٹ نہ دکھاتا۔ وہ جانتا تھا کہ وہ جو حکم بھی دے گا، چند ایک کے علاوہ اسے باقی سب کی رضامندی حاصل ہو جائے گی۔

وہ ذاتی پسند یا ناپسند کی بنا پر کسی شخص سے سختی کرتا تھا، نہ اسے سزا دیتا تھا اور نہ کن کی سوچ میں کسی سے نرمی برتا تھا یا اسے انعام و کرام سے نوازتا تھا۔ وہ یہ تو نہیں جانتا تھا کہ ”کیا کرنا چاہیے یا کیا نہیں کرنا چاہیے“ کے اپنے کا اس کے پاس پیمانہ کیا ہے لیکن اس کے دل و دماغ میں اس کے بارے میں کوئی الجھاؤ نہیں تھا اور وہ مستقل مزاجی سے اس کے مطابق عمل کرتا تھا۔

جب اسے کسی ناکامی یا بے قاعدگی پر غصہ آتا، وہ کہہ کرتا: ”یہ ہمارے روی کسان...“ اور تصور کرنے لگتا کہ وہ انہیں برداشت نہیں کر سکتا۔

تاہم وہ ”ہمارے ان روی کسانوں“ سے یہ دل و جاں محبت کرتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ نہ صرف ان کے طور طریقے سمجھنے میں کامیاب رہا بلکہ اس نے قارمگ کے وہ طریقے بھی اختیار کر لیے جو صنعت بخش تھے۔

کاؤنٹس ماریا، اپنے شوہر کے اس بے پایاں شوق کو اپنا رقیب تصور کرتی تھی۔ اسے لال اس بات کا تھا کہ وہ اس میں اس کی ساجھے دار نہیں بن سکتی۔ یہ دنیا اس کے لیے بہت انہمی اور دردناک تھی۔ چنانچہ اس کے شوہر کو جو سر تن اور کلفتیں ملتی تھیں، وہ ان کی تقسیم کرنے سے قاصر تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ بڑے بڑے اٹھنے اور ساری صبح کھیتوں یا کھلیوں میں فصلوں کی بوئی، کٹائی یا گہائی کرنے کے بعد جب وہ اس کے ساتھ چائے پینے آتا ہے تو وہ اتنا خوش، تیز طرز اور جوشیلا کیوں نظر آنے لگتا ہے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ، تو کی بریشیں جیسے کفایت شعار اور کھاتے پیتے کسان کی، جو اپنے گھر والوں کے ساتھ ساری ساری رات بے لے ڈھونڈ رہا تھا، تعریفوں کے لہجے کیوں باندھتا ہے یا جب یہ بتاتا ہے کہ خود اس نے دوسروں سے بہت پہلے اپنے بڑے لڑکے میں

اٹھ کر رہے ہیں، تو اس پر دجہ آفریں مسرت کیوں طاری ہو جاتی ہے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ جب جلی کے نوخیز پودوں پر، جو گرمی میں جل بھن رہے اور عطش عطش پکا رہے ہوتے ہیں، گرم اور بھاری ہرکھا برسنے لگتی ہے، وہ کھڑکی میں سے چھٹانگ لگا کر، دربرآمدے میں کھڑے ہو کر کیوں اپنی مونچھوں سے مسکرانے اور خوشی سے آنکھیں جھپکاتے لگتا ہے۔ اور یہ بات بھی اس کی سمجھ میں نہیں آتی تھی کہ جب گھاس یا فصل کی کٹائی یا گہائی کے دوران میں ہوائیں تہدید آمیز بادلوں کو اڑ کر دور لے جاتی ہیں اور وہ تھمتاتے اور دھوپ میں جھلے ہوئے چہرے، پسینہ بہانے جسم اور جھینے نا اور افسستین کی پتیوں اور بنجروں کی خوشبو سے مسکتے سر کے ساتھ گھرا آتا ہے تو جھکتا ہوا کیوں کہتا ہے: ”خیر، اگر ایک دن اور مل گیا، میرا اور کسانوں کا غلہ محفوظ ہو جائے گا“ اور یہ چیز اس کے بالکل پلے نہیں پڑتی تھی کہ اپنی رقتی اقلی اور اس کی خواہشات کا پیشگی اندازہ لگانے کی صلاحیت سے بہرہ ور ہونے کے باوجود وہ جب کسانوں یا ان کی بیویوں کی جانب سے، جو کسی کام سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے اس سے سفارش کرانے کے درپے رہتی تھیں، اسے کوئی عرضداشت پیش کرتی ہے، تو وہ تقریباً ہٹیلہ کیوں ہو جاتا ہے۔ گلوں، جس کا رویہ اس کے ساتھ اتنا محبت آمیز اور درستانہ ہوتا ہے، آخر اتنی ہٹ دھرمی سے اس کی بات ماننے سے کیوں انکار کر دیتا ہے؟ وہ بڑی خشکی سے اس سے التجا کرنے لگتا ہے کہ ان محاسنات سے اس کا کوئی تعلق نہیں، وہ اس پھندے میں اپنی ناگہانہ اڑایا کرے۔ وہ محسوس کرنے لگتی کہ اس کی اپنی ایک علیحدہ دنیا ہے جس سے وہ دیوانہ وار محبت کرتا ہے، اور جس کے قوانین و ضوابط اس کی سمجھ سے بالاتر ہیں۔

بعض اوقات اسے سمجھنے کی کوشش میں وہ اس کے ساتھ اس کے کام کے بارے میں گفتگو کرنے لگتی اور اسے بتاتی کہ وہ اپنے زرعی غلاموں کی فلاح و بہبود کے سلسلے میں کتنی کھکھیڑیں اٹھا رہا ہے، تو وہ جھنجھلا جاتا اور جواب دیتا: ”بالکل نہیں۔ اس قسم کی کوئی بات کبھی میرے ذہن میں نہیں آتی۔ میں ان کی بھلائی کے لیے ذرا بھی تردد نہیں کرتا اپنے ہمسائے کے ساتھ نیکی کرنا وغیرہ۔ اونہ، یہ سب روحانی خرافات اور بڑی بوڑھیوں کے روایتی اعتقادات ہیں! میں تو صرف یہ کرنا چاہتا ہوں کہ ہمارے بچوں کو کبھی کا سہ گدائی نہ پکڑنا پڑے اور میری خوشی ہے کہ جب تک میں زندہ ہوں، ہمارے حالات میں کوئی کمی نہ آئے، وہ ڈھنگ سے چلتے رہیں۔ بس! اور اس مقصد کے لیے کڑا ڈسپلن اور نظام اپنانا نہایت ضروری ہے۔ بس اتنی اسی بات ہے!“ وہ بڑے یقین و اعتماد کے ساتھ اپنی مٹھیاں بچھتے ہوئے کہتا: ”اور ہاں، یہ مقصد بھی حاصل ہو سکتا ہے، اگر عدل و انصاف سے کام لیا جائے۔“ وہ اپنی بات میں اضافہ کرتے ہوئے کہتا: ”کیونکہ اگر کسان بھوکا ہے اور اس کے پاس صرف ایک گھوڑا ہے اور وہ بھی مرل اور ضعیف دنا تو اس پھر وہ، اپنے لیے مفید ہے نہ میرے لیے۔“

اور اس میں کوئی شک نہیں کہ چونکہ گولائی کبھی اس واسطے میں گرفتار نہیں ہوتا تھا کہ وہ نیکی کی خاطر دوسروں کے لیے کچھ کر رہا ہے، چنانچہ وہ جو کچھ کرتا تھا ہمیشہ بار آور ثابت ہوتا تھا۔ اس کی دولت میں تیزی سے اضافہ ہوتا تھا۔ اڑوس پڑوس کے جاگیرداروں کے زرعی غلام آتے اور اس کے پاؤں پڑتے کہ وہ انھیں خرید لے اور اس کے

انسان کے کافی عرصے گزرنے کے بعد بھی کسان اس کے نظم و نسق کا بڑے احترام سے ذکر کرتے رہے۔ ”وہ صحیح تھا تھے۔ کسانوں کی بہتری پہلے اور اپنی بعد میں۔ اور ہاں، وہ کسی قسم کی بے تکلفی یا زور و عایت کے قائل نہیں تھے۔۔۔۔۔ ہاں، وہ صحیح آقا تھے۔“

۵

جاگیر کے نظم و نسق کے سلسلے میں ایک بات یہ تھی، جس سے وہ عاجز آچکا تھا، کہ غصہ اس کی ناک پر دھرا رہتا تھا اور اس کی گھونٹوں کے آزادانہ استعمال کی پرانی عادت، جو اس نے ہزاروں سے لیکھی تھی، جوں کی توں برقرار تھی۔ شروع شروع میں تو اسے اس میں کوئی برائی نظر نہ آئی لیکن اپنی شادی کے دوسرے سال نادیدہ مزار کے اس طریقے کے متعلق اس کی رائے اچانک تبدیل ہو گئی۔

گر میوں کے دوران میں اس نے ایک روز باگوچارانو کے نمبردار کو بلایا۔ یہ شخص درون کے انتقال کے بعد اس اسامی پر تعینات ہوا تھا اور اس پر دھوکا دہی، بددیانتی اور بے قاعدگیوں کے متعدد الزامات تھے۔ گولائی اس سے پوچھ گچھ کرنے پورج میں چلا گیا اور نمبردار کے ابتدائی جوابات کے بعد گھونٹوں اور جینوں کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ جب وہ لہجہ کرنے اپنی بیوی کے پاس آیا، جو کشیدہ کاری کے فریم پر جھکی ہوئی تھی اور حسب معمول اسے اپنی دن بھر کی کارروائی بتانے لگا، اس نے دوسری باتوں کے علاوہ سرراہے باگوچارانو کے نمبردار کا بھی ذکر کر دیا۔ کاؤٹس ماریا کی رنگت پہلے تو سرخ ہوئی اور پھر پیلی پڑ گئی۔ وہ سر جھکائے اور ہونٹ پیچھے پٹھی رہی، اور اس نے کوئی جواب نہ دیا۔

”کیسا گستاخ بد معاش ہے!“ وہ اس کا محض نام یاد آنے پر بھڑک اٹھا۔ ”اگر اس نے مجھے بتا دیا ہوتا کہ وہ ٹٹے میں بدعوش ہے اور اسے کچھ نظر نہیں آرہا۔ لیکن ماری، کیا بات ہے؟ تمہیں کیا ہوا؟“ اس نے اچانک پوچھا۔ کاؤٹس ماریا نے اپنے سر جھکا لیا اور کچھ کہنے کی کوشش کی لیکن اس نے غلٹ سے اسے دوبارہ نیچے جھکایا اور اس کے ہونٹ ایک بار پھر بھیج گئے۔

”جان من، کیا بات ہے؟“

کاؤٹس ماریا کے جب بھی آنسو ٹپکتے، اس کی معمولی شکل و صورت حسین و جمیل نظر آتی لگتی۔ وہ دردناک جھجھکاہٹ کی حالت میں کبھی نہیں روتی تھی۔ اسے رونا صرف اس وقت آتا تھا جب اسے کوئی ملال ہوتا یا اسے کسی پر ترس آ رہا ہوتا۔ اور جب وہ روتی تھی، اس کی درخشاں آنکھوں میں کچھ ایسی کشش پیدا ہو جاتی کہ بڑے بڑے دوس کے قلوب موم ہو جاتے اور انھیں اس کے سامنے سر تسلیم خم کرتے ہی بنتی۔

جب نکولس نے اس کا ہاتھ پکڑا، وہ اپنے اوپر قابو نہ رکھ سکی، اور زار و قطار رونے لگی۔ ”نکولس، میں نے آپ کو دیکھا تھا۔ وہ غلطی پر تھا لیکن آپ۔ نکولس، آپ نے کیوں۔“ اور اس نے اپنا چہرہ

ہاتھوں میں چھپالیا۔

گولائی چپ رہا لیکن اس کا خیرہ لالوں لال ہو گیا۔ وہ اس کے پہلو سے اٹھا اور کمرے میں چکر لگانے لگا۔ جانتا تھا کہ وہ روکیوں رہی ہے لیکن وہ فی الفور اپنے آپ کو اس کی رائے سے متفق نہیں کر سکتا تھا کیونکہ جس چیز کا وہ بچپن سے عادی چلا آ رہا تھا اور جو اس کے نزدیک روزمرہ کا معاملہ تھی، وہ اس کے نزدیک سب سے بڑی بات تھی۔ ”یہ نری جذباتیت ہے، بڑی بوڑھیوں کا خرافاتی توہم ہے یا وہ ٹھیک کہتی ہے؟“ وہ اپنے سب سے بڑے ہاتھ پر پشتر اس کے اس مسئلے کا وہ خود کوئی فیصلہ کر سکتا، اس نے ایک بار پھر اس کے چہرے کو، جس پر خون و طالع اور محبت ٹپک رہی، سرسری نگاہوں سے دیکھا اور ایک لحظہ اسے احساس ہوا کہ وہ ٹھیک کہتی ہے اور یہ کہ وہ خود ہی اپنے ساتھ زیادتی کا مرتکب ہو رہا ہے۔

”ماری!“ اس نے اس کے قریب جا کر نرمی سے کہا، ”یہ حرکت دوبارہ کبھی نہیں ہوگی۔ میں وعدہ کرتا ہوں۔ کبھی نہیں۔“ اس نے کسی چھوٹے بچے کی طرح معافی مانگتے ہوئے دوبارہ کہا۔

کاؤنٹس ماریہ کے آنسو تھے کہ تھمتے ہی نہیں تھے بلکہ اب ان کی روانی میں اور بھی اضافہ ہو گیا۔ اس نے بے شوہر کا ہاتھ پکڑا اور اسے چومنے لگی۔

”گولس، یہ آپ کی انگلی کی کائنات کب ٹوٹا تھا؟“ اس نے موضوع تبدیل کرنے کے لیے کہا۔ وہ اپنے خاوند کی انگلی کی طرف دیکھ رہی تھی جس میں وہ انگلی پیسنے ہوئے تھا۔ اس انگلی میں لے اوٹوں کے سر کا نقش آویزاں تھا۔

”آج صبح۔ اس وقت جب اوہ، ماری، مجھے اس کی مت یاد دلاؤ!“ اور ایک بار پھر اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ ”میں تم سے پکا وعدہ کرتا ہوں کہ آئندہ یہ حرکت کبھی نہیں ہوگی۔ اور یہ مجھے ہمیشہ یاد دلاتی رہے گی۔“ اس نے شکستہ انگلی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

اور اس کے بعد جب کبھی دیہاتی نمبرداروں یا بیجروں سے گفتگو کے دوران میں نوبت گر، گرمی تک پہنچی اور لوگوں کی کو اپنا خون جوش کھاتے محسوس ہوتا یا اس کی مٹھیاں بھینچنے لگتیں، وہ اپنی انگلی مرد نے لگا اور اس شخص کے سامنے، جس نے اسے اشتعال دلایا ہوتا، اپنی نگاہیں جھکا لیتا، تاہم سال میں دو ایک مرتبہ وہ سب کچھ بھول بھال جاتا، پھر وہ رونی صورت بنائے اپنی بیوی کے پاس جاتا، اس کے سامنے (اپنی غلطی کا) اعتراف کرتا اور ایک بار پھر وعدہ کرتا۔ ”بس یہ آخری مرتبہ ہے، آئندہ ایسا نہیں ہوگا۔“

”ماری، تم مجھے ضرور حقارت کی نظروں سے دیکھتی ہوگی۔ لھیک ہے نا؟“ وہ کہتا۔ ”میں ہوں ہی اس بات۔“

”اگر آپ سمجھتے ہیں کہ آپ اتنے مضبوط نہیں کہ اپنے دیرقاہور کھسکیں، پھر جتنی جلدی ہو سکے وہاں سے اٹھ جایا کریں اور کہیں اور چلے جایا کریں، کہیں اور چلے جایا کریں۔“ وہ اپنے شوہر کو تسلی دینے کے لیے غم گین لہجے سے جواب دیتی۔

صوبے کے شرفاء میں گولائی کی عزت تو ہوتی تھی لیکن اسے پسند نہیں کیا جاتا تھا۔ وہ اپنے طبقے کے لوگوں

کی مقامی سیاست میں کوئی دلچسپی نہیں لیتا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بعض کی نگاہوں میں وہ خود بین اور دوسروں کے نزدیک وہ احمق تھا۔ موسمِ بہار میں فصلوں کی بوائی سے لے کر موسمِ خزاں میں ان کی کٹائی تک اس کی ساری سرگرمیوں کا محور اس کی زمین ہوتی تھی۔ خزاں کے دوران میں وہ اسی باضابطہ سنجیدگی کے ساتھ شکار میں مصروف ہو جاتا اور ایک یا بعض اوقات دو ماہ کے لیے اپنے کتوں کے ساتھ باہر چلا جاتا۔ سردیوں میں وہ اپنی دوسری جاگیروں کا دورہ کرتا یا کتا نہیں پڑھ کر اپنا وقت گزارتا۔ وہ زیادہ تر تاریخی کتب کا مطالعہ کرتا اور ان کی خرید پر ہر سال مقررہ رقم صرف کرتا۔ جیسا کہ وہ کہا کرتا تھا، وہ ”سنجیدہ کتا بوں کی لائبریری“ بنانا چاہتا تھا اور اس نے یہ اصول وضع کر لیا تھا کہ وہ جو کتاب بھی خریدے گا، اس کا مطالعہ ضرور کرے گا۔ وہ متین صورت بنائے اپنی لائبریری میں بیٹھا پڑھتا رہتا۔ شروع میں اس نے اس کام کو اپنے اوپر بطور فرض عائد کیا تھا لیکن وقت کے ساتھ ساتھ یہ اس کی عادت بنا گیا اور اسے اس میں خاص قسم کا لطف آنے لگا۔ اسے محسوس ہونے لگا کہ وہ ”سنجیدہ کام“ میں مشغول ہے۔ اپنے کاروباری دوروں کے ماسواہ سردیوں کا بیشتر وقت اپنے افرادِ خانہ کے ساتھ گھر پر گزارتا تھا۔ وہ خاندان کے ہر مشغلے اور بچوں کی اپنی ماں کے ساتھ مصروفیات میں برابر کا حصہ لیتا تھا۔ وہ بتدریج اپنی بیوی کے قریب سے قریب رہتا گیا اور اس کی ذات میں نت نئے اوصاف تلاش کر لیتا تھا۔

سوئیاں کی شادی کے وقت سے ہی ان کے ساتھ رہ رہی تھی۔ تاہم اس کے اور سوئیا کے بیچ جو کچھ گزرا تھا، وہ شادی سے پہلے ہی اپنی بیوی اس کے متعلق بلا کم و کاست بتا چکا تھا۔ اس نے اپنے آپ کو سوئیاں، مٹھریاں، اپنی کزن کی بڑھ چڑھ کر تعریفیں کیں اور پرنس ماریا سے انتہائی کراہ اس کے ساتھ پیار اور شفقت کا برتاؤ کرے۔ نکولائی نے سوئیا کے ساتھ جو زیادتی کی تھی، کاؤٹس ماریا کو اس کا پورا پورا حساس تھا اور وہ خود کو مجرم گردانتی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ اس کی دولت نکولائی کے انتخاب پر اثر انداز ہوئی ہے۔ اسے سوئیا میں کوئی خالی نظر نہیں آتی تھی اور وہ اس کی گرویدہ ہونے کی بھرپور کوشش کرتی تھی لیکن کامیاب نہ ہو سکی۔ بلکہ اسے اکثر عکسوں ہوتا کہ اس کے دل میں اس کے خلاف بغض اور عداوت ہے اور وہ اپنے اس جذبے کو جھٹک نہ سکی۔

ایک روز وہ اپنی سہیلی نناشا سے سوئیا اور اس کے ساتھ اپنے غیر متصفانہ رویے کے متعلق باتیں کر رہی تھی۔ ”تمہیں معلوم ہے،“ نناشا نے کہا، ”تم تو ہمیشہ نائیل کی ملاوت کرتی رہتی ہو۔ اس میں ایک عبارت ہے

اور یہ سوئیا پر پوری طرح صادق آتی ہے۔“

”واقعی؟“ کاؤٹس ماریا نے حیرت ہو کر پوچھا۔

”جس کے پاس ہے،“ سے دیا جائے گا اور جس کے پاس نہیں ہے اس کے پاس جو ہے۔“ وہ بھی اس سے

لے لیا جائے گا۔ ”یاد آیا؟“ یہ وہ ہے جس کے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔ کیوں؟ مجھے معلوم نہیں ہے۔ اس میں شاید انانیت کا فقدان ہے۔ مجھے معلوم نہیں ہے۔ لیکن اس سے لے لیا گیا ہے سب کچھ لے لیا گیا ہے۔ مجھے بعض اوقات اس پر سبے پناہ ترس آتا ہے۔ مجھے اس بات کی شدید فکر رہتی تھی کہ نکولس اس سے شادی کر لے گا لیکن میرا

ماتھ ہمیشہ ٹھنکتا رہتا تھا کہ ایسا ہوگا نہیں¹⁹۔ وہ بے اثر پھول ہے۔ تھیں معلوم ہے کہ اس طرح کے پھول شراہیری کے پودوں پر پائے جاتے ہیں۔ بعض اوقات اسے دیکھ کر مجھے بے حد دکھ ہوتا ہے اور بعض اوقات مجھے محسوس ہوتا ہے کہ جس طرح میں یا تم محسوس کرتی ہو، وہ اس طرح محسوس ہی نہیں کرتی۔“

اگرچہ کاؤٹنس ماریا نے ناشا کو سمجھایا تھا کہ انا جیل کی حد رت کا مفہوم کچھ اور ہے لیکن وہ اپنی سہیلی کی تشریح و تفسیر سے متفق ہوئے بناندرہ سکی۔ واقعتاً نظر یہی آتا تھا کہ سونیا کو اپنی پوزیشن تکلیف دہ معلوم نہیں ہوتی، وہ سب اثر پھول کی طرح اپنی قسمت پر قانع تھی۔ کچھ یوں دکھائی دیتا تھا کہ اسے افر و خانہ کی بجائے بحیثیت مجموعی پورے خاندان سے زیادہ لگاؤ ہے۔ بی کی طرح اس نے اپنے آپ کو افراد سے نہیں بلکہ گھر سے وابستہ کر لیا تھا۔ وہ کاؤٹنس کی خدمت کرتی، بچوں کے آگے پیچھے رہتی، ان سے چونچلے کرتی اور ان کی عادتیں بگاڑتی، اور ہمیشہ چھوٹے سولے کام، جنہیں انجام دینے کا اسے خاص درجہ حاصل تھا، کرنے کے لیے ہمدردت تیار رہتی تھی۔ لیکن اس کی تمام خدمات کو معمول کی بات سمجھا جاتا تھا اور اس کے عوض میں اس سے شکریے کے رد و بول بھی شاید ہی کوئی کہتا ہوگا۔ بالذات میں گھر کی تعمیر، اگرچہ اس پیمانے پر تو نہیں جس پر بوڑھے پرنس نے سے بنایا تھا، تاہم اسے سب سے کی گئی۔

تعمیر کا کام سنگی ترشی کے دنوں میں شروع ہو، تھا، اس لیے اس میں ضرورت سے زیادہ سادگی کا خیال رکھا تھا۔ مکان بے شک بہت وسیع و عریض تھا تاہم اس کی چوبی تعمیر پرانی سنگی بنیادوں پر ہی کی گئی اور دیواریں صرف اندر سے پلستر کی گئیں۔ کشادہ کمروں کے فرش ڈیل کے تھے اور سادہ سخت صوفے، بازوؤں والی کرسیاں اور میز اپنے برچوں کی لکڑی سے اپنے ہی غلام ترکھانوں سے بنائیں۔ مکان کے ساتھ گھریلو ملازمین کے کمرے اور مہمانوں کے پارٹمنٹ تعمیر کیے گئے۔ بعض اوقات رستونوں اور بلکونسکوں کے رشتے داروں کے پورے خاندان سولہ سولہ گھوڑوں اور درجنوں نوکروں کے ساتھ براجمان ہو جاتے اور مہینوں ہٹنے کا نام نہ لیتے۔ اس کے علاوہ سال میں چار مرتبہ میزبان اور اس کی اہلیہ کے نام دنوں اور سالگرہ پر ایک ایک دو دو دنوں کے لیے تقریباً سو سو مہمان بھی آ جاتے۔ سال کے بقیہ مہینوں کے دوران میں زندگی اپنے غیر شکستہ معمولی کے مطابق چلتی رہتی، روزمرہ کے دھندے جاری رہتے اور جاگیر کی پیداوار سے ناشتوں، پنجوں، ڈنروں اور سپروں کا سلسلہ رواں دواں رہتا۔

یہ سینٹ نکولائی کے تہوار سے ایک روز پہلے 5 دسمبر 1820 کا ذکر ہے۔ اس سال خاشا، اپنے شوہر اور بچوں کے ہمراہ، اوائل خزاں سے اپنے بھائی کے ہاں مقیم تھی۔ جیڑ اپنے کسی کام کے سلسلے میں پیٹرز برگ گیا ہوا تھا۔ وہ روانگی سے قبل بتایا گیا تھا کہ وہ تین ہفتوں کے بعد واپس آجائے گا لیکن وہ وہاں سات ہفتے مقیم رہا اور اب کسی بھی لمحے اس کی آمد متوقع تھی۔

پانچ دسمبر کو بڑا خوف خاندان کے علاوہ نکلوانی کا پرانا دوست ریٹائرڈ جنرل واسلی دتترچ دیٹی سوف رستونوں کے ہاں ٹھہرا ہوا تھا۔

نکلوانی کو معلوم تھا کہ چھ تاریخ کو، اس کے نام دن، جب گھر مہمانوں سے بھرا ہوگا اس سے یہ توقع کی جائے گی کہ وہ پناہ ناری چیخا تارے گا، فراک کوٹ اور نوک دارنگ جوتے پہنے گا، گاڑی میں سوار ہوگا اور نئے کرے، جو اسی نے تعمیر کر یا تھا، جائے گا، اپنے مہمانوں کا، جو سے مبارک باد دینے آئیں گے، استقبال اور خاطر تواضع کرے گا، اور ان کے ساتھ شرفاء کے انتخاب²² اور فصلوں کے بارے میں تبادلہ خیالات کرے گا۔ یہ سب تو ٹھیک تھا، تاہم اس کا خیال تھا کہ یوم پیدائش سے پہلا دن اسے اپنے روایتی انداز سے گزرنے کا حق حاصل ہے۔

ڈنر سے پہلے اس نے ریٹائرڈ جان جاگیر کے، جو اس کی بیوی کے بھتیجے کی ملکیت تھی، ہیٹ کے ساتھ اس کے مالی امور کا جائزہ لیا، دو کاروباری خطوط تحریر کیے اور امانت گوداموں، سوبیشوں کے بازوؤں اور گھوڑوں کے اصطبلوں کا چکر لگایا۔ چونکہ اگلے روز بڑے سینٹ کا دن تھا اور اس موقع پر توقع کی جاتی تھی کہ لوگ خوب ڈٹ کر بیٹیں گے، ورنشے میں غرق ہو جائیں گے، چنانچہ اس صورت حال کے تدارک کے لیے اس نے احتیاطی تدابیر اختیار کیں۔ ان تمام مصروفیتوں میں اسے اتنی تاخیر ہو گئی کہ اسے اپنی بیوی کے ساتھ خلوت میں گفتگو کرے کا موقع نہ مل سکا۔ وہ سیدھا ڈنر ٹیبل پر پہنچ گیا اور لمبی میز کے سامنے جس کے ارد گرد جس اشخاص کے بیٹھنے کی گنجائش تھی، اپنی نشست سنبھال لی۔ میز پر، اس کی والدہ، اس کی بزرگ رفیقہ، کیووا، اپنے بیٹوں، بچوں، ان کی گورنرس اور ٹیوٹر سمیت اس کی بیوی، اپنے ٹیوٹر کے ہمراہ اس کا بھتیجا، سونیا، دینی سوف، اپنے تین بچوں اور ان کی گورنرس کی معیت میں متاٹھا، مرحوم پرنس کا میر تقی میرات بوڑھا میخانیل ایوانچ، جو ریٹائرمنٹ کے بعد ہانڈل میں ہی زندگی کے بقیہ ایام گزار رہا تھا، موجود تھے۔

کاڈنٹس، ریا اس کے سامنے میز کی دوسری جانب بیٹھی تھی۔ جونہی اس کے شوہر نے اپنی نشست سنبھالی اور جس انداز سے اپنا ٹیکن اٹھایا اور جس طرح یک لخت اپنا گلاس اور جام سے، جو اس کے سامنے پڑے تھے، پیچھے دھکیلے، وہ سمجھ گئی کہ اس کا مزاج، اس طرح برہم ہے جس طرح کہ بعض اوقات۔ خاص طور پر سوپ سے پہلے۔ جب وہ فارم سے سیدھا ڈنر ٹیبل پر آتا تھا، اس کا ہوتا تھا۔ کاڈنٹس، ریا اس کی اس ڈنٹی کیفیت سے بخوبی آشنا تھی اور اگر اس وقت اس کا اپنا مزاج شگفتہ ہوتا، وہ خاموشی سے انتظار کرتی رہتی تا آنکہ وہ اپنے پیالے میں سوپ ڈال لیتا۔ اس کے بعد ہی وہ اس سے گفتگو شروع کرتی اور عام طور پر کچھ اس بھب سے بات کرتی کہ اسے تسلیم کرتے ہی بن پڑتی کہ اس کی خفگی بے سبب ہے۔ لیکن آج وہ اس قسم کا رویہ اختیار کرنا بھول گئی اور اسے یہ سوچ کر شدید دکھ ہوا کہ وہ اس کے ساتھ خواہ مخواہ ناراض ہے۔ اس نے اس سے دریافت کیا کہ وہ کہاں رہا۔ اس کے بعد اس نے پوچھا کہ آیا فارم پر سب کچھ ٹھیک ٹھیک ہے۔ وہ جس لہجے میں بات کر رہی تھی، وہ بالکل غیر نظری تھا۔ اس پر نکلوانی جھنجھلا گیا اور اس نے روکے پن سے جواب دیا۔

”تو میرا تھا ٹھیک ہی ٹھنکا تھا۔“ پرنس ماریا نے سوچا۔ ”لیکن یہ مجھ سے خفا کیوں ہیں؟“

اسے اس کے بچے میں ایک طرح کی خاصیت اور گفتگو فہم کرنے کی خواہش جھلکتی نظر آئی۔ وہ جانتی تھی کہ اس کا اپنا لہجہ غیر فطری نظر آ رہا ہے لیکن وہ اس سے متعدد مزید سوالات پوچھنے سے گریز نہ کر سکی۔

دیٹی سوف کے طفیل گفتگو نے بہت جلد عمومی رخ اختیار کر لیا اور اس میں گفتگو آگئی۔ جب وہ دسترخوان سے اٹھے اور بوڑھی کاؤنٹس کا شکریہ ادا کرنے اس کے پاس گئے، کاؤنٹس ماریا نے اپنا ہاتھ اپنے شوہر کی طرف بڑھایا، اس کا ہوسہ لیا اور اس سے پوچھنے لگی کہ وہ اس سے ناراض کیوں ہے۔

”تمہارے ذہن میں ہمیشہ عجیب و غریب باتیں کھلبلاتی رہتی ہیں۔ اسے بھی تمہارے ساتھ ناراض ہونے کا خیال تک میرے دماغ میں نہیں آیا،“ اس نے جواب دیا۔

مگر کاؤنٹس ماریا نے لفظ ”ہمیشہ“ کے یہ معنی خذ کیے ”ہاں، میں ناراض ہوں کیوں؟ میں اس کا جواب دینا ضروری نہیں سمجھتا۔“

نکولائی اور اس کی بیوی کے مابین اتنی ہم آہنگی اور یگانگت تھی کہ سوینا اور بوڑھی کاؤنٹس کو بھی، جو دونوں ان سے جلتی تھیں اور ان کے مابین اختلاف کی خلیج حائل کر کے خوش ہو جاتیں، ان پر طعنہ زنی کرنے کا کوئی موقع ہا تھا نہ آتا۔ تاہم ان میں بیوی کے مابین بھی بعض اوقات ایک دوسرے سے خاصیت ہوئی جاتی۔ ایک دوسرے کی صحبت میں، نہایت سرسٹ و شادمانی کے یام گزارتے گزارتے انھیں عناد اور مغائرت کے جذبات اپنی پلیٹ میں لے لیتے۔ اس قسم کے لحاظ زیادہ تر اس زمانے میں آتے جب پرنس ماریا امید سے ہوتی اور اس وقت وہ اسی کیفیت میں سے گزر رہی تھی۔

”اچھا، messieurs et mesdames،“ نکولائی نے گفتگو اور خوش طبعی کا مظاہرہ کرتے خاص بلندہ آواز سے کہا۔ (کاؤنٹس ماریا کو محسوس ہوا کہ وہ یہ سب کچھ اس کے جذبات کو ٹھیس پہنچانے کے لیے کر رہا ہے۔) ”میں آج صبح چھ بجے سے بھاگا پھر رہا ہوں۔ کل کا دن میرے لیے خاصا سخت ہوگا۔ چنانچہ آج میں آرام کرنا چاہتا ہوں۔“ اور اپنی بیوی سے ایک بھی لفظ کہے بغیر وہ چھوٹے سنگ روم میں چلا گیا اور صوفے پر لیٹ گیا۔

”ہمیشہ ایسے ہی ہوتا ہے۔“ کاؤنٹس ماریا نے سوچا۔ ”وہ میرے عداوت سے باتیں کرتے ہیں۔ میں سمجھ گئی... میں سمجھ گئی۔ میں انھیں، خاص طور پر جب میری یہ حالت ہو، گھناؤنی معلوم ہوتی ہوں۔“ وہ آہستہ آہستہ اپنے جسم کا، جو ہر روز پھیلتا جا رہا تھا، اور اپنے زرد، سوکھے سڑے چہرے کا، جس پر اس کی آنکھیں معمول سے بڑی دکھائی دے رہی تھیں، جائزہ لیتے لگی۔

اسے ہر بات۔ دیٹی سوف کے فلک شکناف قہقہے اور غل غپاڑا رنشاٹ کی ٹرڑ اور سب سے بڑھ کر سوینا کا اسے دیکھنے کا انداز۔ ناگوار محسوس ہو رہی تھی۔

کاؤنٹس ماریا کو جب غصہ آتا تھا، تو وہ سب سے پہلے سوچا کہ اس کا سبب ٹھہراتی تھی۔
وہ کچھ دیر مہمانوں کے پاس بیٹھی رہی۔ وہ کیا کہہ رہے تھے، اس کا ایک لفظ بھی اس کے منہ نہیں پڑ رہا تھا۔
پھر وہ انھی اور نرسوں میں چلی گئی۔

بچے، ایک گاڑی میں، جو کرسیاں جوڑ کر بنائی گئی تھی، بیٹھے ہوئے تھے اور ”ہم ماسکو جا رہے ہیں“ کہیل
رہے تھے۔ انھوں نے اسے بھی اپنے ساتھ بیٹھنے کی دعوت دی۔ وہ بیٹھ تو گئی اور کچھ دیر ان کے کہیل میں شریک بھی
رہی، لیکن اپنے خاوند اور اپنے ساتھ اس کی غیر معقول ہارننگل کا تصور اس کے لیے یکم سو باہا روم بنا رہا۔ وہ انھی
اور بدقت تمام بیٹیوں کے بل چلتی چھوٹے سنگ روم کی طرف چل دی۔

”شاید وہ سو نہیں رہے اور ہم اس معاملے کو گفتگو کے ذریعے سلجھا سکتے ہیں، اس نے اپنے آپ سے کہا۔
اس کا بڑا بیٹا آندروشا اپنی ماں کی نقل، مارتا اور بیٹیوں کے بل چلا اس کے پیچھے پیچھے آگیا لیکن پرنس ماریا
کو اس کے یوں چلے آنے کا کوئی احساس نہ ہوا۔

”Chere Marie“ سوینے نے، جس سے ڈرائنگ روم میں مڈھ بھڑ ہو گئی تھی، اس سے مخاطب ہو کر کہا۔
”میر خیال ہے کہ وہ سو رہے ہیں۔ انھیں اتنی تھکاوٹ جو ہو گئی تھی۔ کہیں آندروشا انھیں جگانہ دے۔“ (اس کی
شکل دیکھ کر پرنس ماریا کو محسوس ہوا: ”یہ میرا بیچپنا ہی نہیں چھوڑتی، میں جہاں بھی جاتی ہوں، وہیں آ جکتی ہے۔“)
کاؤنٹس ماریا نے پیچھے مڑ کر دیکھا اور جب اس کی نظر آندروشا پر پڑی، اسے احساس ہوا کہ سو رہا ٹھیک کہتی
ہے لیکن محض اسی وجہ سے اس کا چہرہ غصے سے لال بھوکا ہو گیا اور وہ بڑے جیس انداز سے کوشش کرنے لگی کہ اس کی
زبان سے کوئی تلخ ترش بات نہ نکل جائے۔ وہ منہ بند رکھنے میں کامیاب تو ہو گئی مگر سوینا پر توجہ دینے کے امکان
سے بچنے کے لیے اس نے آندروشا کو ہاتھ سے شہرہ کیا کہ وہ کسی قسم کا شور وغل پیدا کیے بغیر اس کے پیچھے پیچھے چلا
آئے اور خود دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ سوینا دوسرے دروازے سے باہر نکل گئی۔

جس کمرے میں نکولائی سو رہا تھا، وہاں سے اس کی سانسوں کی ہر قاعدہ آوازیں آرہی تھیں جن کے زیر و بم
میں معمولی سے معمولی تغیر سے اس کی بیوی، بخوبی آشنا تھی۔ جب وہ کان لگائے یہ آوازیں سن رہی تھی، وہ اپنے تخیل
میں اس کی بے خشک اور خوبصورت پیشانی، اس کی مونچھیں اور اس کا پورا چہرہ دیکھ سکتی تھی جس کا وہ اکثر رات کے
سکوٹ میں، جب وہ سو یا پڑا ہوتا تھا، جائزہ لیتی رہتی تھی۔ اچانک نکولائی نے کردت بدلی اور کھٹار کر گلاب کیا۔
میں اس لمحے ہر دروازے پر آندروشا کی آواز گونجی

”پاپا، ماما یہاں کھڑی ہیں!“

کاؤنٹس کی جان ہوا ہو گئی، اس کی رنگت پیلی پڑ گئی اور وہ بدحواسی کے عالم میں بچے کو اشارے کرے لگی۔
بچہ خاموش ہو گیا اور ایک لمحے کے لیے خاموشی چھا گئی جو اس کے لیے عذاب سے کم نہ تھی۔ وہ جانتی تھی کہ اگر
نکولائی کو کچھ نیند سے جگا دیا جائے، تو وہ جلال میں آ جاتا ہے۔ ایک بار پھر اسے دروازے میں سے اس کے

دوبارہ کھنکار کر گلا صاف کرنے اور کروٹ بدلنے کی آواز سنائی۔ اس کے ساتھ ہی وہ غصیل آواز سے دہاڑا:

”ایک منٹ آرام نہیں ملتا۔ ماری تم ہو؟ اسے یہاں کیوں لائی ہو؟“

”میں تو دیکھنے آئی تھی اگر مجھے معلوم ہی نہ ہو سکا... میں معافی چاہتی ہوں۔“

نکولائی کھانسا اور اس نے مزید کچھ نہ کہا۔

کاؤنٹس ماریا پیچھے ہٹ گئی اور بچے کو واپس نرمسری میں لے گئی۔ پانچ منٹ بعد منی سیہ چشم سرسارہ ہٹا، جو اپنے باپ کی چہیتی تھی، اپنے بھائی سے یہ معلوم ہونے کے بعد کہ پاپا چھوٹے سنگ روم میں محو سڑاقت ہیں بھاگتی دوڑتی اپنے باپ کے پاس چلی گئی اور اس کی ماں کو پتا بھی نہ چل سکا۔ منی سیہ چشم بچی نے بے درمیاں چہرہ اتار دروازہ کھولا، اپنی ننھی منی تو امانا نگوں سے پھرتی سے آگے بڑھی اور جس پہلو پر اس کا باپ لیٹا ہوا تھا۔ وہ اپنی پشت اس کی طرف کیے گئے ہوئے تھا۔ اس کا جائزہ لینے کے بعد بچوں کے بل کو پراٹھی اور اس کے ہاتھ پر جو اس کے سر کے نیچے تھا، بوسہ ثبت کر دیا۔ نکولائی نے کروٹ بدلی۔ اس کے چہرے پر نرم و ملائم جسم بکھرا ہوا تھا۔

”ناشا، ناشا!“ کاؤنٹس ماریا نے خوف زدگی کے عالم میں دروازے کی دھڑکی سے ریل ب کہا: ”پاپا سونا چاہتے ہیں۔“

”نہیں، ماہ بالکل نہیں۔“ چھوٹی بچی نے پورے اعتماد سے کہا۔ ”وہ نہیں رہے ہیں۔“

نکولائی، ٹھہ کر بیٹھ گیا۔ اس نے اپنے پاؤں فرش پر نکائے اور اپنی بیٹی کو بازوؤں میں سمیٹ لیا۔

”ناشا، اندر آ جاؤ۔“ اس نے اپنی بیوی سے کہا۔

کاؤنٹس ماریا اندر چلی گئی اور اپنے خاوند کے قریب بیٹھ گئی۔

”میں نے دیکھا ہی نہیں کہ یہ میرے پیچھے پیچھے آرہی ہے۔“ اس نے ڈرتے جھپکتے کہا۔ ”میں نے صرف“

نکولائی نے اپنی بیٹی کو ایک بازو سے تھامے اپنی بیوی کی طرف دیکھا اور اس کے معذرت خواہانہ انداز کو دیکھ کر اپنا دوسرا بازو اس کی کمر کے گرد حائل کر دیا اور اس کے بالوں کو چوم لیا۔

”ماما کا بوسہ لے دوں؟“ اس نے ناشا سے پوچھا۔

ناشا شرمائی اور مسکراتے لگی۔ ”ایک بار پھر!“ اس نے اس مقام کی طرف، جہاں نکولائی نے بوسہ ثبت کیا تھا، تھکسانہ انداز سے اشارہ کرتے ہوئے حکم دیا۔

”مجھے معلوم نہیں کہ تم نے یہ کیسے فرض کر لیا کہ میرا موڈ خراب ہے۔“ اس نے اس سوال کا جواب دینے ہوئے کہا جو اسے معلوم تھا کہ اس کی بیوی کے ذہن میں ہے، جواب دیتے ہوئے کہا۔

”آپ تصور بھی نہیں کر سکتے کہ جب آپ اس طرح نظر آتے ہیں، مجھے کتنی کوفت ہوتی ہے، کتنے کلاپے کا احساس ہونے لگتا ہے۔ مجھے ہمیشہ محسوس ہوتا رہتا ہے کہ۔“

”ماری، چپ کر، کیا فضول باتیں بے بیٹھی ہو! تمہیں شرم نہیں آتی؟“ اس نے چپکتے ہوئے کہا۔

”مجھے ہمیشہ یہی محسوس ہوتا رہتا ہے کہ آپ مجھ سے محبت نہیں کر سکتے، کہ میں اتنی بد صورت... ہمیشہ... اور اب... اور اب میری یہ حالت...“

”کتنی نامعقول ہوتی ہیں! ہم ان سے، جو خوش فہم ہیں، محبت نہیں کرتے بلکہ خوش فہم وہ ہوتے ہیں جن سے ہم محبت کرتے ہیں۔ یہ تو صرف مالوینا²⁴ جیسی عورتیں ہوتی ہیں جن سے محبت اس لیے کی جاتی ہے کہ وہ حسین و جمیل ہیں۔ لیکن کیا میں اپنی بیوی سے محبت کرتا ہوں؟ نہیں، میں اس سے محبت نہیں کرتا لیکن... مجھ میں آتا کہ میں تمہیں کیسے سمجھاؤں۔ لیکن جب تم موجود نہیں ہوتیں یا جب ہمارے، میں اس قسم کی کوئی چیز حائل ہو جاتی ہے، مجھے محسوس ہونے لگتا ہے کہ میں کہیں کھو گیا ہوں، بے دست و پا ہو گیا ہوں۔ کیا میں اپنی انگلی سے محبت کرتا ہوں؟ نہیں، مجھے اس سے کوئی محبت نہیں لیکن ذرا اسے کانٹے کی کوشش کرو!“

”میں خود اس طرح کی نہیں ہوں لیکن میں آپ کا مطلب سمجھ گئی ہوں تو آپ مجھ سے نفرت نہیں ہیں؟“

”بے حد نفرت!“ اس نے مسکراتے ہوئے کہا اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے انگلیوں سے اپنے بال درست کیے اور کمرے میں گھومنے پھرنے لگا۔

”ماری، تمہیں معلوم ہے کہ میں کیا سوچ رہا ہوں؟“ اس نے کہنا شروع کیا۔

”جب کہ ان کے، میں صلح ہو گئی تھی، وہ نے الفور اپنی بیوی کی موجودگی میں با آواز بلند سوچنے لگا۔ اس نے یہ تک نہ پوچھا کہ آیا وہ سننے کے لیے مائل ہے۔ اس کے نزدیک اس کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ اس کے ذہن میں ایک خیال آ گیا تھا، اس لیے وہ بھی اس کی مالک تھی۔ اور اس نے اسے بتایا کہ وہ بیڑ کو یہاں پہر تک قیام کرنے کے لیے رضا مند کرنا چاہتا ہے۔

جب تک اس کی بات ختم نہ ہوئی، وہ سنتی رہی۔ اس نے کچھ رائے زنی کی، اور اپنی باری آواز بلند سوچنے لگی۔ اس کی سوچوں کا محور اس کے بچے تھے۔

”اس میں ابھی سے عورت کے آثار نظر آنے لگے ہیں،“ اس نے نشاٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرانسس میں کہا۔ ”آپ ہم عورتوں کو ماست کرتے رہتے ہیں کہ ہم منطقی نہیں ہیں۔ یہ وہی ہماری منطق۔ میں کہتی ہوں: ”پاپا سونا چاہتے ہیں۔“ اور وہ کہتی ہے: ”نہیں، بالکل نہیں، وہ جس رے ہیں۔“ اور وہ بالکل ٹھیک کہتی تھی۔“

فرانسس ماریا نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”بالکل، بالکل!“

اور گولائی نے اپنی بیٹی کو اپنے مضبوط دھونا باز دلوں میں اٹھایا، اوپر فضا میں اچھالا اور اپنے کندھے پر بٹھالیا۔ اس نے اس کی ہاتھیں پکڑیں اور کمرے میں چکر لگانے لگا۔ باپ بیٹی دونوں کے چہروں پر بے فکر سرت رقصاں تھی۔

”مگر آپ جانتے ہیں کہ آپ شاید نا انصافی کے مرتکب ہو رہے ہیں۔ آپ کو اس کے ساتھ کچھ زیادہ ہی پیار ہے،“ اس کی بیوی نے فرانسس میں سرگوشی کی۔

”ہاں، مگر میں کیا کر سکتا ہوں؟... میں کوشش کرتا ہوں کہ اس کا اتنا کھل اظہار نہ کروں...“
 عین اسی لمحے انھیں دروازہ کھلنے اور کسی کے ہال اور پیش دامن میں چلنے کی آواز سنائی دی۔ معلوم ہوتا تھا کوئی
 باہر سے اندر آیا ہے۔
 ”کوئی آیا ہے۔“

”مجھے یقین ہے کہ یہ بیٹر ہوں گے۔ میں جا کر دیکھتی ہوں۔“ کاؤنٹس، ماریانے کہا، اور کمرے سے باہر نکل گئی۔
 جب وہ چلی گئی، نگولائی اپنی بیٹی کو کندھے پر اٹھائے کمرے میں دوڑنے اور حظ اٹھانے لگا۔ جب اس کی
 سانس پھولنے لگی، اس نے عجلت سے بیٹی کو، جس کا ہنسی سے برہاں ہو رہا تھا، نیچے اتارا اور اپنے سینے سے چمکالیا۔
 اپنی اچھل کود سے اس کا دھیان رقص کی طرف مبذول ہو گیا، ورنہ اپنی بیٹی کے گون گون سننے سے پرست چہرے
 کو دیکھ کر سوچنے لگا کہ جب وہ بڑھاپے کی دہلیز پر رک جائے گا، وہ کیسی نظر آیا کرے گی۔ وہ اسے ی فل میں لے جایا
 کرے گا اور اس کے ساتھ اسی طرح مازور کا ڈانس کیا کرے گا جس طرح اس کا باپ اپنی بیٹی کے ساتھ ڈنیل کو پر
 رقص کیا کرتا تھا۔

”وہی میں، نکوس، وہی ہیں۔“ چند منٹ بعد کاؤنٹس ماریانے واپس آ کر اطلاع دی۔ ”اب ہماری مناشا
 میں نئی روح پھنک گئی ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ وہ کس طرح کھلی جا رہی اور اتنا عرصہ غیر حاضر رہنے پر انھیں کس طرح
 ڈنٹ ڈپٹ رہی تھی؟ خیر، آؤ چلیں، جلدی کریں، چلیں نا بھئی! اب تم دونوں ایک دوسرے کا چہرہ چھوڑ دو۔“ اس
 نے اپنی بیٹی کی طرف، جو اپنے باپ کے بازوؤں سے چٹنی ہوئی تھی، دیکھتے ہوئے مسکرا کر کہا۔
 کاؤنٹس ماریا سٹنگ روم میں رک گئی۔

”مجھے کبھی کبھی یقین نہ آتا کہ زندگی میں، اتنی خوشی نصیب ہو سکتی ہے،“ اس نے اپنے آپ سے زہر بول کہا۔
 اس کا چہرہ مسرت سے کھل اٹھا مگر اس کے ساتھ ہی اس کی آنکھیں گئی۔ اس کی آنکھوں میں ایک طرح کا پرسکون
 ملا، جھٹک رہا تھا جیسے، اسے محسوس ہو رہا ہو کہ اس خوشی کے علاوہ، جس کا اسے تجربہ ہو رہا تھا، ایک اور نوع کی خوشی
 موجود ہے جس کا حصول اسی زندگی میں ناممکن ہے، اور جس کے متعلق وہ اس وقت غیر راوی طور پر سوچ رہی تھی۔

مناشا کی شادی 1813 کے اداکل بہار میں ہوئی تھی اور 1820 تک وہ تین بیٹیوں اور ایک بیٹے کی، جس کی سے
 شدید آرزو تھی اور جسے وہ اب اپنا دودھ پلا رہی تھی، ماں بن چکی تھی۔ اس کا تین وٹو ش پھیل گیا تھا اور وہ خاصی فربہ ہو گئی
 تھی۔ اب اس چوڑی پٹلی اور مضبوط کمانھی کی لہجہ ان ماں میں اس دلی پتلی اور شوخ و چٹیل مناشا کو، جروہ کھی ہوا
 کرتی تھی، پہچاننا مشکل تھا۔ اس کے خدو خال پہلے کی نسبت زیادہ وضع صورت اختیار کر چکے تھے اور اس کے
 تیوروں میں ایک طرح کا ظہر آوا، ملائمت، اور سکون جھلکنے لگا تھا۔ اس کے چہرے پر ہر دم جو چہرہ ہٹ رقص راتنی

تھی اور جو پہلے اس کی اصل دلکشی متشکل کی کرتی تھی، اب ناپید ہو چکی تھی۔ اب اس کا صرف چہرہ اور جسم نظر آتا تھا۔ جہاں تک اس کی روح کا تعلق ہے، اب اس کا اظہار مشکل ہی ہوتا ہوگا۔ اس کو دیکھ کر آدمی کے دل میں جو تاثر نقش ہوتا تھا، وہ یہ تھا کہ یہ عورت صحت مند، دلکش اور شرم آور ہے۔ آتش کہن اب شاذ ہی اس کے اندر روشن ہوتی تھی۔ ایسا صرف تبھی ہوتا تھا جب اس کا خاندان، جیسا آج ہوا، طویل غیر حاضری کے بعد گمراہی آتا تھا، جب اس کا کوئی علیل بچہ صحت یاب ہوتا تھا، جب وہ اور کاؤنٹس، ماریا پرنس آندرے کی باتیں کرتی تھیں (وہ اپنے شوہر کی موجودگی میں پرنس آندرے کا کبھی نام تک نہیں لیتی تھی کیونکہ اس کا خیال تھا کہ وہ پرنس آندرے کی یادوں پر حسد کے انگاروں پر لوٹنے لگتا ہے)، یا پھر ان گنے چنے مواقع پر، جب کوئی چیز اسے غم سرائی کی ترغیب دیتی تھی (ایسے شادی کے بعد وہ کم کم ہی گاتی تھی)۔ ان محدودے چند لحظات کے دوران میں جب یہ پرنا شعلہ اس کے گول اور بھرے بھرے جسم میں جگمگاتا تھا، وہ پہلے کی نسبت کہیں زیادہ پرکشش نظر آنے لگتی تھی۔

جب سے نناشا کی شادی ہوئی تھی، وہ اور اس کا خاندان، سکو، بیٹرز برگ، اسکو کے قریب اپنی جاگیر یا اس کی ماں۔ ایسی نکوائی کے گھر میں رہتے چھپے آئے تھے۔ نوجوان کاؤنٹس بردخود اونچے طبقے کی کھانوں میں شاذ و نادر ہی نظر آتی تھی اور جن لوگوں سے اس کی وہاں ملاقات ہوتی تھی، وہ اسے کوئی خاص پسند نہیں کرتے تھے کیونکہ وہ نہ ملنسار تھی اور نہ کسی کی خوشنودی حاصل کرنے کی کوشش کرتی تھی۔ بات یہ نہیں تھی کہ نناشا کو تنہائی پسند تھی۔ اسے معدوم ہی نہیں تھا کہ اسے یہ پسند ہے یا نہیں بلکہ اس کا خیال تھا کہ اسے یہ پسند نہیں۔ لیکن اس کے دل، اس کی رچکیاں، بچوں کی پرورش و پرورش اور اپنے شوہر کی زندگی کے ایک ایک لمحے میں اس کی رفاقت، ایسی چیزیں تھیں جن کی بنا پر وہ سمجھتی تھی کہ جب تک وہ کھانوں میں گھومنا پھرنا ترک نہیں کرے گی، وہ اپنے فرائض سے عہدہ برا نہیں ہو سکے گی۔

وہ تمام لوگ، جو اسے اس زمانے سے جانتے تھے جب ابھی اس کی شادی نہیں ہوئی تھی، اس میں یہ تبدیلی دیکھ کر انگلیاں دانتوں میں دبالتے تھے جیسے ان کا واسطہ کسی بخیر اعتدال اور غیر معمولی چیز سے پڑ گیا ہو۔ صرف ستر کاؤنٹس کو، جس کی مادرانہ جبلت اسے بتاتی رہتی تھی کہ نناشا کی کمون مزدوری کا سبب محض یہ ہے کہ اسے شوہر اور بچوں کی ضرورت ہے۔ اور خود نناشا نے بھی ایک مرتبہ اتر اڈا یا میں یہی بات مذاق سے زیادہ شبیدگی سے کہی تھی۔ اسے ان لوگوں کی، جو اس کی بیٹی کو کبھی سمجھ نہیں پائے تھے، حیرت دیکھ کر اچنبہ ہوتا تھا اور وہ مسلسل کہتی رہتی تھی ”مجھے ہمیشہ معلوم تھا کہ وہ مثالی بیوی اور ماں بنے گی۔“

”صرف ایک بات ہے کہ وہ اپنے شوہر اور بچوں کی محبت میں تمام حدود پھلنگ جاتی ہے۔“ کاؤنٹس مزید کہتی۔ ”چنانچہ یہ صریحاً احقانہ بن جاتی ہے۔“

نناشا اس سنہری اصول کو، جس کی آٹھوں گانٹھ کیت لوگ، بالخصوص فرانسیسی، تلفیں کرتے رہتے ہیں، جون کی نوک پر نہیں مارتی تھی۔ یہ اصول کہتا ہے: ”شادی کے بعد بوجوان لڑکی کو اپنی باتیں ڈھیلی نہیں کرنا چاہئیں۔“

(رقص، موسیقی، سلائی کڑھائی جیسے فنون میں) اپنی مہارتوں سے صرف نظر نہیں کرنا چاہیے۔ اسے دیشیزگی کے زمانے سے بھی زیادہ اپنی شکل و صورت کا خیال رکھنا اور اپنے آپ کو اپنے خاوند کے لیے تھائی جاذب نظر اور کشش بناتے رہنا چاہیے۔ جتنا کہ وہ شادی سے پہلے اس کے لیے ہوتی تھی۔ اس کے برعکس ناشا اپنی تمام سرگرمیوں سے، جن میں سے ایک۔ اس کی گلوکاری۔ غیر معمولی طور پر موثر تھی، دست بردار ہو گئی تھی۔ اس نے اسے ترک کیا ہی اس لیے تھا کیونکہ اس میں، جتنی بے پناہ کشش تھی کہ لوگ دیوانہ وار اس کی طرف کھینچے جاتے تھے۔ وہ اس بات کی قطعاً کوئی پروا نہیں کرتی تھی کہ اس کے اطوار دوسروں کی نگاہوں میں پسندیدہ ہیں یا نہیں، اس کی گفتگو موقع محل کے مطابق اور مبالغوں سے محسوس ہوتی تھی۔ نہ اسے ذاتی ترغیب و آرائش میں کوئی دلچسپی رہ گئی تھی اور نہ وہ اپنے آپ کو کچھ اس انداز سے اپنے خاوند کے سامنے پیش کرنے کا، کہ وہ ہمہ وقت اسی پر منحصر رہے، کوئی شوق پالتی تھی۔ وہ یہ بھی تردد نہیں کرتی تھی کہ وہ اپنے خاوند سے جو مطالبات کرتی ہے، کہیں ان کے پورا کرنے میں اس کے آرام میں تو کوئی خلل نہیں پڑے گا یا اسے کسی قسم کی پریشانی تو لاحق نہیں ہوگی۔ درحقیقت وہ ان میں سے ہر اصول کی وجوہات سمجھتی رہتی تھی۔ اسے محسوس ہوتا تھا کہ پہلے وقتوں میں دوسروں کے قلوب و نظر میں گم کرنے کے لیے اس کی جبلت جن قسموں کاریوں اور عشوہ طرازیوں کو اختیار کرنے کی ترغیب دیتی تھی، اب اس کے خاوند کو مستحکم و معلوم ہوں گی۔ وہ اوئیں سمجھے۔ سے بدد و جان اپنے شوہر کے سامنے سرنگوں ہو چکی تھی اور اپنی فطرت اور روح کا کوئی گوشہ ایسا نہیں تھا جو اس نے اس کے سامنے بے نقاب نہ کر دیا ہو۔ اسے محسوس ہوتا تھا کہ ان کے درمیان جو رشتہ ہے، وہ ان روحانی اور شعری جذبات کے، جنہوں نے اسے (میز کو) اس کی طرف مائل کیا تھا، ہمارے قائم نہیں بلکہ اس کا وجود کسی درجہ کا سرہون مست ہے جس کی توضیح مشکل ہے لیکن جو اتنا ہی مضبوط ہے جتنا کہ اس کی اپنی روح اور جسم کا رشتہ۔

اپنے خاوند کو رجھانے کے لیے مختلف طریقوں سے اپنا بالوں کو نکھارنا، نرم و ملائم بنانا اور انھیں لمبا کرنا، فیشن ایبل ملبوسات پہننا اور روحانی گانے گانا اسے اتنا ہی عجیب لگتا جیسے وہ یہ ساری ترغیب و آرائش خود اپنے آپ کو رجھانے کے لیے کر رہی ہو۔ دوسروں کی خاطر اپنی زیب و زینت کرنے میں اسے شاید لطف آتا۔ یہ وہ نہیں جانتی تھی، لیکن اس کے لیے اس کے پاس کوئی وقت نہیں تھا۔ اس نے اپنے گلوکاری، اپنے ملبوسات یا اپنی گفتگو میں زبان و بیان کی نزاکتیں پیدا کرنے کے معاملات میں جو بے توجہی برتا کر شروع کر دی تھی، تو اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ اس کے پاس اس طرح کے کاموں کے لیے قطعاً کوئی فرصت نہیں تھی۔

سب لوگ اس حقیقت سے کماحقاً گاہ ہیں کہ آدمی میں کسی چیز میں، خواہ وہ بظاہر کتنی ہی حقیر و معمولی کون نہ ہو، تین من سے جذب ہونے کی صلاحیت موجود ہے اور یہ بات بھی سمجھی جانتے ہیں کہ کوئی چیز بھی جتنی حقیر اور معمولی نہیں ہوتی کہ اگر آدمی اس پر اپنی پوری توجہ مبذول کر دے، وہ لامحدود وسعتیں اختیار نہ کر سکے۔ وہ چیز، جس میں ناشا سر تا پا غرق ہو چکی تھی، وہ اس کا خاندان تھا۔ ایک اس کا شوہر تھا۔ اس کا اس نے اس

طرح خیال رکھنا تھا کہ وہ جس دن اسی کا اور گھر کا ہو کر رہ جائے۔ دوسرے اس کے بچے تھے۔ انھیں اس نے پیٹ میں اٹھائے ٹھہرائے پھرنا، جنم دینا، ایسا دودھ پلانا اور پالنا پونا ہوتا تھا۔

وہ جس چیز میں مستغرق تھی، وہ جتنا زیادہ، اپنے دماغ سے ہی نہیں بلکہ اپنی پوری روح اور اپنے پورے وجود کے ساتھ، اس کی گہرائی میں جاتی تھی، وہ اس کی نگاہوں کے سامنے اتنی ہی زیادہ وسعت پذیر ہو جاتی تھی اور اس سے عہدہ برآ ہونے کے لیے اسے اپنی صلاحیتیں اتنی ہی طاقتوں اور ناکانی معلوم ہونے لگتی تھیں۔ چنانچہ اس نے ان سب کو اسی ایک چیز پر مرکوز کر دیا تھا۔ پھر بھی اسے اتنا وقت نہیں ملتا تھا کہ وہ اس سب کچھ کو، جو اس کی نگاہوں میں لابدی تھا، پایہ تکمیل تک پہنچا سکتی۔

آج کی طرح اس زمانے میں بھی عورتوں کے حقوق، میاں بیوی کے تعلقات، ان کی آزادیوں اور حقوق کے بارے میں بحثیں اور مناظرے ہوتے تھے، ڈھونڈ ڈھونڈ کر دماں لائے جاتے تھے لیکن آج کی طرح انھیں ابھی مسائل کا نام نہیں دیا گیا تھا۔ بات یہ نہیں تھی کہ نسا کو ان میں دلچسپی نہیں تھی بلکہ حقیقت یہ تھی کہ اس کی سمجھ میں ہی نہیں آتا تھا کہ یہ چیزیں ہیں کیا۔

آج کی طرح اس زمانے میں بھی یہ مسئلہ صرف ان لوگوں کا درد مرتھے جنھیں شادی میں اس تہذیب کے علاوہ، جو بیاہے جوڑے ایک دوسرے سے حاصل کرتے ہیں، اور کچھ نظر نہیں آتا۔ بہ الفاظ دیگر وہ شادی کی ابتدائی بات سے تو آگاہ ہیں لیکن اس کی اصل غایت—خاندان—سے بے خبر ہیں۔

اس قسم کے مباحثے و رسوالیات، جو اس سوال سے مشابہ ہیں کہ آدمی اشیائے خور و نوش سے زیادہ سے زیادہ لذت کس طرح حاصل کر سکتا ہے، ان لوگوں کے لیے، جو یہ سمجھتے ہیں کہ خور و نوش کا مقصد اس غذائیت کا حصول ہے جو یہ فراہم کرتی ہے، اور شادی کا مقصد خاندان کا قیام ہے، نہ تب موجود تھے اور نہ اب موجود ہیں۔ اگر خور و نوش کا مقصد جسم کو فہم فراہم کرنا ہے تو اس شخص کو جو اپنی ضرورت سے دگنی خوراک کھاتا ہے، لذت تو شاید زیادہ مل جاتی ہوگی لیکن اس طرح وہ اپنا مقصد حاصل نہیں کر سکے گا کیونکہ اس کا معدہ دگنی خوراک ہضم نہیں کر سکے گا۔

اگر شادی کا مقصد خاندان کا قیام ہے، پھر اس شخص کو جو متعدد بیویاں یا شوہروں کا جنسی ہے، تہذیب تو غائب بہت مل جائے گا مگر اس صورت میں اس کا کوئی خاندان وجود میں نہیں آئے گا۔

اگر خوراک کا مقصد حصول غذائیت ہے اور شادی کا مقصد خاندان کی تنصیب ہے، پھر مسئلہ صرف یہ ہے کہ آدمی کو صرف اتنی خوراک کھانا چاہیے جتنی کہ اس کا معدہ ہضم کر سکتا ہے، اسے اس سے زیادہ کے قریب بھی پہنچنا نہیں چاہیے اور مرد کو صرف ایک عورت اور عورت کو صرف ایک مرد سے نکاح کرنا چاہیے تاکہ خاندان وجود میں آ سکے۔ نہ مرد کو ایک سے زیادہ عورتوں کی اور نہ عورت کو ایک سے زیادہ مردوں کی ضرورت ہے۔ نسا کو خاندان کی ضرورت تھی، اسے خاندان مل گیا اور اس خاندان نے اسے بچے فراہم کر دیے۔ اور سے نہ صرف یہ کہ کسی اور یا بہتر خاندان

کی ضرورت محسوس نہ ہوئی بلکہ جب اس کی تمام روحانی توانائیاں اس خاوند اور خاندان کی خدمت پر مرکوز تھیں تو یہ تصور کر سکتی تھی اور نہ اسے یہ تصور کرنے میں کوئی دلچسپی تھی کہ اگر حالات مختلف ہوتے، پھر کیا ہوتا۔

نشا کا دوسرے لوگوں کی صحبت میں ٹھٹھے بیٹھنے کا قطعاً کوئی چسکا نہیں تھا لیکن اس چیز کے فقدان نے اس کی نگاہوں میں اپنے رشتہ داروں، اپنے بھائی اور کاؤنٹس، بریاء، اپنی ماں و رسوئیاں۔ کی صحبت کی قدر و قیمت بڑھا دی۔ اسے ان لوگوں کی موجودگی میں صحیح لطف آتا تھا کیونکہ اسے ان کے سامنے کوئی تکلف نہیں برتنا پڑتا تھا، وہ ان کے پاس رمری سے لمبے لمبے ڈگ بھرتی اس حالت میں آسکتی تھی کہ وہ ڈریسنگ گاؤن میں بلبوس ہے، سر کے بال پریشان ہیں اور ہاتھ میں پوترا (nappy) ہے جس پر سبز کی بجائے زرد دھبے پڑے ہیں لیکن چہرے پر مسرت و شادمانہ جھلک رہی ہے کیونکہ یہ لوگ اسے اطمینان دل سکتے ہیں کہ بچے کی حالت بہتر ہے۔

نشا اپنے بارے میں اس حد تک غفلت کا شکار بن چکی تھی اور اس کا لباس، اس کا ہال بنانے کا انداز، اس کی بے بکل باتیں اور اس کا جلا پ۔ وہ سوئیا سے، گورنس سے اور ہر عورت سے، خواہ وہ خوبصورت ہو یا بد صورت، حد کرتی تھی۔ اس کے دوستوں کے مابین مسلسل مذاق کا موضوع بنے رہتے تھے۔ عام رائے یہ تھی کہ بیٹر اپنی جود کا غلام ہے اور اس کا اشاروں پر رقص کرتا ہے، اور یہ بات بالکل ٹھیک تھی۔ اپنی شادی کے ابتدائی ایام میں ہی نشا نے اپنے دعاوی بتا دیے تھے۔ بیٹر اپنی بیوی کی یہ رائے، کہ اس کے یک ایک بچے کی مالک وہ خود اور اس کا خاندان ہے، بن کر بہت حیران ہوا کیونکہ اس کے لیے یہ بالکل نئی بات تھی۔ اپنی بیوی کے مطالبات نے اسے مستحضر کر دیا لیکن ان سے اس کی اننا کوسکیں بھی ملی اور اس نے اس کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا۔

بیٹر کی لڑیاں برداری اتنی مکمل تھی کہ کسی دوسری عورت کے ساتھ چھلپیں کرنا یا جھوٹ موت کی محبت جتنا تو بہت دور کی بات تھی، اس میں تو اتنا بھی دم خم نہیں تھا کہ اس کے ساتھ بات کرتے وقت ذرا مسکرا ہی دے، اور نہ اس میں اتنا حوصلہ تھا کہ وہ بخیر معقول وجہ محض تنزیحاً کلب میں ڈنر کر آئے، ترنگ میں آکر یوہی رقم خرچ کر ڈالے یا کاروباری مصروفیات۔ ان مصروفیات میں اس کی بیوی اس کے دانش ورانہ مشاغل بھی شامل کرتی تھی۔ وہ بھیں سمجھتی تو بالکل نہیں تھی لیکن انھیں اہمیت بہت دیتی تھی۔ کے عداوہ کسی اور عذر کی بنا پر زیادہ دیر گھر سے غیر حاضر رہ سکے۔ اس کے عوغ میں بیٹر کو یہ حق حاصل تھا کہ وہ اپنے گھر میں اپنی ہی نہیں بلکہ سارے خاندان کی زندگی جس نچ سے چاہے ترتیب دے سکتا تھا۔ اپنے گھر میں نشا اپنے خاوند کی باندی تھی اور جب وہ سنڈی روم میں لکھنے پڑھنے کے کام میں مصروف ہوتا تھا، گھر کا ہر فرد بچوں کے بل چلتا تھا۔ بیٹر جب بھی کسی چیز کے لیے ڈراسی رغبت یا میلان کا غصہ دیتا، فوراً اس کی خدمت میں حاضر کر دی جاتی۔ اس نے خواہش کا اظہار کیا نہیں کہ نشا نے اسے پورا کرنے کے لیے دوڑ لگائی نہیں۔

گھر کا پورا نظم و نسق مالک کے مفروضہ احکام، یعنی اس کی خواہشات کے مطابق چلتا تھا۔ نشا ان کا بڑا اندازہ لگانے کی کوشش کرتی رہتی تھی۔ ان کے طرز حیات، ان کے رہائش مقامات، ان کے دوست احباب اور

تعلقات، نشا کی مصروفیات، بچوں کی پرورش پر راحت۔ ان تمام امور میں دھڑکی نہ صرف بیان کردہ بلکہ ان خواہشات کا بھی، جن کا اندازہ نشا شا اس کی گفتگوؤں سے لگاتی رہتی تھی، خیال رکھا جاتا تھا۔ وہ اس کی خواہشات کی بنیادی باتوں کو بالکل صحیح طریقے سے مستحکم کرتی تھی، اور جب ایک مرتبہ وہ ان نتائج پر پہنچ جاتی تھی، پھر وہ بڑے استقلال سے ان سے چٹنی رہتی تھی اور جب خود دھڑکی اپنے ارادوں میں کسی نوع کی تبدیلی لانے کی خواہش کرتا تھا، وہ اسی کے ہتھیاروں سے اس کا مقابلہ کرتی تھی۔

چنانچہ ایک مشکل وقت میں، جسے دھڑکی فراموش نہیں کر سکا، جب اپنی پہلی بچی کی پیدائش کے بعد، جو بالکل دھماکا پان تھی، تین مختلف انائیں آزائی گئیں اور نشا پریشانیوں سے بیمار پڑ گئی، دھڑکی سے ایک روز اسے دوسو کے خیالات سے آگاہ کیا جن سے وہ خود متفق تھا کہ دودھ پلانے کے لیے اناؤں کی خدمات حاصل کرنا بالکل غیر فوری اور ضرر رساں بات ہے۔ نشا نے اس بات کو پہلے باندھ دیا۔ جب پہلی بچی پیدا ہوئی، اپنی ماں، ڈکٹروں اور اپنے شوہر کی بھی مخالفت کے باوجود۔ وہ سمجھی اس کے بچوں کو اپنا دودھ پلانے کے اس لیے مخالف تھے کیونکہ یہ چیز اس زمانے میں نہ کسی نے سنی تھی اور نہ گئی تھی اور معجزہ تصور کی جاتی تھی۔ وہ اپنی مرضی کرنے پر تلی رہی اور اس نے اپنے سارے بچوں کو خود اپنا دودھ پلایا۔

اکثر یہ ہوتا کہ جھنجھل ہٹ کے محلات میں میاں بیوی میں جھج جھج ہو جاتی لیکن نگرار کے خامے دلوں بعد دھڑکی یہ دیکھ کر حیران بھی ہوتا اور خوش بھی کہ اس کی بیوی لفظاً بھی اور عملاً بھی اسی خیال کو جس کے خلاف اس نے زور شور سے جھگڑا کیا ہوتا تھا، عملی جامہ پہن رہی ہے تاہم جھگڑے کی گرامری کے دوران میں وہ جن فالتو اور بیکار محض باتوں کا اضافہ کر دیتا تھا، انھیں نظر انداز کر دیا گیا ہے۔

شادی کے سات سات بعد دھڑکی کو سرت بخش اور پختہ یقین ہو گیا کہ وہ بر آدی نہیں ہے۔ اسے اس کا احساس یوں ہوا کیونکہ اسے اپنی بیوی کی ذات، اعمال اور رویوں میں اپنا ہی عکس دکھائی دیتا تھا۔ جہاں تک اس کا اپنا تعلق ہے، اسے یہ احساس ستا تا رہتا تھا کہ اس کی ذات میں اچھائیاں اور برائیاں کچھ اس طرح آپس میں متداخل وہ غم ہو گئی ہیں کہ انھیں ایک دوسری سے الگ کرنا ناممکن ہے مگر اسے اپنی بیوی میں اپنی ذات کا صرف وہی حصہ، جو واقعی اچھا تھا نظر آتا تھا کیونکہ ہر وہ چیز، جو کاملاً اچھی نہیں ہوتی تھی، مسترد کر دی جاتی تھی۔ اس کی یہ سوچ کسی منطقی خیال کا نہیں بلکہ کسی بالکل دوسری چیز کا۔ بلا واسطہ، پر اسرار غور و فکر۔ نتیجہ تھی۔

رستوفوف کے ہاں قیام کے دوران میں کوئی دو ماہ قبل دھڑکی کو کسی پرنس یوور کا خط ملا تھا۔ اس خط میں اس سے پیٹرز برگ پہنچنے کی استدعا کی گئی تھی کیونکہ کسی سوسائٹی کے، دھڑکی جس کے سر کردہ بانٹوں میں شامل تھا، بعض اہم امور کے متعلق، جن پر ارکان تشویش میں مبتلا تھے، بحث و تمحیص ہونا تھی۔

خط پڑھنے کے بعد ننا شانے (وہ اپنے شوہر کے تمام خطوط پڑھا کرتی تھی) خود تجویز پیش کی کہ گودہ اس کی عدم موجودگی کو شدت سے محسوس کرے گی، اسے میٹرز برگ کا دورہ کرنا چاہیے۔ اگرچہ اسے اپنے شوہر کے تحریری اور وائٹورائٹ مشاغل کی مطلق کوئی سمجھ نہیں آتی تھی، وہ انھیں زبردست اہمیت دیتی تھی اور اس پر ہر دم یہ خوف سوار رہتا تھا کہ کہیں وہ اس کی ان مصروفیات میں رکاوٹ تو نہیں بن رہی۔ خط پڑھنے کے بعد جب میٹرنے اصرار سمجھتے اس پر استغیابی نظر ڈالی، اس نے اپنا رد عمل یوں ظاہر کیا کہ وہ اس سے جانے کی التجائیں کرنے لگی لیکن اس نے ایک شرط لگا دی کہ وہ اپنی واپسی کی واضح تاریخ بتائے اسے چار ہفتوں کی چھٹی مل گئی۔

اس کی واپسی کی جو تاریخ طے ہوئی تھی، اسے بیتے دو ہفتے گزر چکے تھے۔ تب سے ننا شاپر خوف و دہشت، ڈپریشن اور جھنجھلاہٹ کے دو درے پڑ رہے تھے۔

دینی سوف، جواب ریٹائرڈ جرنیل تھا اور موجودہ حالات سے قطعی غیر مطمئن، انھیں دو ہفتوں کے دوران میں پہنچا تھا۔ وہ ننا شاپر کو دیکھتا تھا اور یوں ملول و متعجب ہوتا تھا جیسے وہ کسی ایسی چیز کی، جو کبھی بہت محبوب ہو کر گئی تھی، بدیست مشابہت دیکھ رہا ہو۔ معلوم ہوتا تھا کہ یہ عورت، جس نے کبھی اسے اپنے سحر میں پھانس لیا تھا، یورین اور پڑمردگی کی شکار ہے، ہاتوں کے انکل و ٹچو جو بات دیتی ہے اور صرف زسری کے متعلق گفتگو کرتی ہے۔ اسے اس میں نہ کچھ اور نظر آیا اور نہ اس نے اس کی زبان سے کچھ اور سنا۔

ننا شا اس سارے عرصے کے دوران میں غم و غصے کی آگ میں جلتی بجھتی رہی۔ جب اس کی ماں، بھائی، سونا یا کاؤٹش مار یا بیئر کی دکالت کرتے اور اس کی واپسی کی تاخیر کے اسباب گھڑتے، اس کا مزاج اور بھی گرم ہو جاتا اور اس کے غم و اندوہ میں مزید اضافہ ہو جاتا۔

”یہ بحث سب سے زری نکو اس ہیں۔ بالکل داہیات۔ ان کا کوئی اور چہرہ نہیں۔ اور یہ سوسائٹیاں تو عقل سے بالکل کوری ہیں!“ اور وہ بالکل انہی معاملات کو، جن میں وہ بے پناہ اہمیت دیتی تھی، بر گیدنا شروع کر دیتی۔

اور اپنے دل کا غبار نکالنے کے بعد وہ اپنے اکلوتے بیٹے چیتا کو دودھ پلانے زسری چلی جاتی۔ جب وہ تین ماہ کی ننھی منی جان اس کی پھاتوں سے لپٹی ہوتی اور اسے اس کے ہونٹوں کی حرکت اور اس کی ننھی منی ہانک کی منمنناہٹ محسوس ہوتی، اسے ان سے بڑھ کر اور کوئی چیز اتنی تسکین بخش اور معقول نظر نہ آتی۔ وہ ننھی جان اس سے کہتی: ”تم خفا ہو، تم حاسد ہو، تم اس سے بدلہ لینا چاہتی ہو اور تم خوف زدہ ہو، لیکن یہاں میں ہوں۔ اور میں ہی وہ ہوں!“ اور یہ بات ناقابل تردید تھی، یہ سچ ہی نہیں تھی بلکہ اس سے کچھ زیادہ ہی تھی۔

بے قراری کے اس دو ہفتوں کے دوران میں ننا شانے تسکین کے لیے اتنی زیادہ مرتبہ اس طفل شیر خوار کی طرف رجوع کیا اور اس پر اتنی زیادہ توجہ دی کہ اسے ضرورت سے کہیں زیادہ دودھ چلاتی رہی اور یوں وہ بیمار پڑ گیا۔ اس کی علالت پر اس کے ہوش و حواس گم ہو گئے تاہم بالکل بھی وہ چیز تھی جس کی اسے ضرورت تھی۔ اس کی نگہداشت کرنے سے اس کے لیے خاندان کے متعلق اپنی تشویش برداشت کرنا آسان ہو گیا۔

جب سامنے کے دروازے پر پتھر کی سلج کی آواز سنائی دی، وہ بچے کو دودھ پلا رہی تھی اور بڑھی نرس، جسے اپنی مالکہ کو خوش کرنے کا کراتا تھا، چہرے پر تبسم سجائے برق رفتاری سے کمرے میں داخل ہو گئی۔
 ”وہ آگئے؟“ نتاشا نے سرگوشیوں میں پوچھا۔ وہ ہلکے ڈرتی تھی کہ کہیں بچہ، خند سے جس کی آنکھیں پرجھل ہو رہی تھیں، جاگ نہ جائے۔

”مادام، آقا تشریف لے آئے ہیں،“ نرس نے کان پھری کی۔
 نتاشا کی کیفیت بھجائی ہوئی اور غیر ارادی طور پر اس کا پاؤں ہلنے لگا۔ مگر جست لگا کر اٹھنے اور بھاگ کر باہر جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ بچے نے اپنی مہین آنکھیں کھولیں اور اس کی طرف یوں دیکھنے لگا جیسے پوچھ رہا ہو، ”تم یہیں ہو؟“ اور ایک بار پھر مزے مزے اپنے ہونٹ چٹکانے لگا۔

نتاشا نے نہایت حرم و احتیاط سے اپنی چھائی چھڑائی، بچے کو دو ایک بار آگے پیچھے جھٹایا، پھر اسے نرس کے حوالے کیا اور تیزی سے دروازے کی طرف بڑھی۔ لیکن وہاں پہنچتے ہی وہ رک گئی اور پیچھے مڑ کر یوں دیکھ جیسے اس کا ضمیر اسے مامت کر رہا ہو کہ وہ اپنی خوشی کی خاطر بچے کو یوں اچانک چھوڑ بھاگی ہے۔ نرس اپنی کہیاں بلند کیے بچے کو پالنے کے جنگلے سے اوپر، ٹھہری تھی۔

”جی، مادام، آپ تشریف لے جاسکتی ہیں، بالکل تشریف لے جاسکتی ہیں۔ کوئی فکر نہ کریں، تشریف لے جائیں،“ وہ سرگوشیوں میں کہہ رہی تھی۔ اس کے اندازِ تکلم میں وہی بے تکلفی جھلک رہی تھی جو، لکھ اور نرس کے مابین استوار ہو جاتی ہے۔

نتاشا ہلکے پھلکے قدم اٹھتی پیش دالان کی طرف بھاگی جا رہی تھی۔ دینی سوف کو، جو ہاتھ میں پائپ پکڑے منڈی روم سے باہر آ رہا تھا، پہلی مرتبہ پرانی نتاشا دوبارہ نظر آئی۔ رخشندہ دشادانِ رودنی کے سیلاب نے اس کے چہرے کی ہیئت ہی تبدیل کر دی تھی۔

”وہ آگئے ہیں!“ اس نے اس کے قریب سے برق رفتاری سے گزرتے ہوئے لغو بلند کیا اور دینی سوف کو محسوس ہوا کہ خود اسے بھی خوشی ہو رہی ہے کہ پتھر، جسے وہ پسند نہیں کرتا تھا، آ گیا ہے۔

نتاشا جب بھاگتی دوڑتی پیش دالان میں داخل ہوئی، اسے پوسٹن کے کوسٹ میں لین لمبا ٹنگا ٹفص نظر آیا جو اپنا سکارف کھینچ رہا تھا۔

”دہی ہیں! واقعی دہی ہیں! وہ آگئے ہیں!“ اس نے اپنے آپ سے کہا اور سرعت سے بھاگتے ہوئے وہ اس سے بغل گیر ہو گئی اور اس کا سراپنی چھاتیوں میں بھینچ لیا۔ پھر وہ پیچھے ہٹی اور ٹنگا باندھ کر اس کے سرخ و سپید اور سرور چہرے کو دیکھنے لگی جو نخبستہ کہرے سے ڈھکا ہوا تھا۔

”ہاں، یہ وہی ہیں، خوش و مطمئن...“
 اچانک اسے وہ اذیت ناک گھڑیاں یاد آئیں، جو اس نے اس کے انتظار میں گزشتہ دو ہفتوں کے دوران

میں بتائی تھیں۔ جس خوشی سے اس کا چہرہ جگمگا رہا تھا، وہ غائب ہو گئی۔ اس کے اردوؤں پر ہل پڑ گئے، ضبط کا بند ٹوٹ گیا اور ملا متوں اور تلخ الفاظ کے سیلاب نے بیئر کو اپنی پیٹ میں لے لیا۔

”ہاں، آپ کے لیے تو سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہے، جیسی تو آپ اتنے خوش ہیں۔ آپ جھکے اڑاتے رہے ہیں، عیش کرتے رہے ہیں۔ لیکن میں؟ میرے بارے میں کیا خیال ہے؟ کم از کم بچوں کا ہی کچھ خیال کیا ہوا۔ میں دودھ پلا رہی ہوں۔ میرا دودھ خراب ہو گیا۔ چیتا سوت کے دروازے پر پہنچ گیا۔ لیکن آپ؟ آپ کو کیا آپ تو مزے کر رہے تھے، ہاں، مزے۔۔۔“

بیئر جانتا تھا کہ وہ قصور دار نہیں ہے، وہ اس سے پہلے آہی نہیں سکنا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ یہ طوفان غیظ و غضب ناروا ہے اور یک دو منٹ میں فرو ہو جائے گا۔ لیکن سب سے بڑی بات یہ تھی کہ وہ جانتا تھا کہ وہ خود بے حد خوش ہے۔ اس کا سکر نے کوئی چاہتا تھا لیکن وہ ایسا کرنے کا سوچ بھی نہیں سکنا تھا۔ اس کے چہرے پر بے چارگی اور خوف جھلک رہا تھا، اور اس نے طوفان کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا۔

”میں سچ کہتا ہوں کہ میرا اس سے پہلے آنا ممکن نہیں تھا۔ چیتا کیسا ہے؟“

”وہ اب ٹھیک ہے۔ اب چلیں! آپ کو شرم نہیں آتی؟ کاش آپ کو معلوم ہوتا کہ آپ کے بغیر میری کیا حاست ہوئی! میں نے کس عذاب میں یہ وقت گزارا!“

”تم ٹھیک ہو؟“

”چلیں، اب چلیں!“ اس نے اس کا بازو چھوڑے بغیر کہ۔ اور وہ دونوں اپنے اپارٹمنٹ کی طرف چل پڑے۔ جب گولائی در اس کی بیوی بیئر کو ڈھونڈنے نکلے، انھیں وہ ترسری میں ملا۔ وہاں وہ اپنے شیر خوار بچے کو، جو دوبارہ جاگ گیا تھا، اپنے بھری بھر کم دائیں ہاتھ پر اچھال جھدار ہاتھ۔ بچے کے، جس کا بے دانت منہ کھلا تھا، چوڑے چکے چہرے پر خوشی کی مسکراہٹ تھی۔ طوفان بہت مدت پہلے ختم چکا تھا۔ ناشا کے چہرے پر دھوپ کی جگمگاہٹ تھی۔ وہ نگاہیں گاڑے اپنے خاوند اور بچے کو دیکھ رہی تھی اور مسرت سے اس کی باپھیں کھلی جا رہی تھیں۔

”آپ پرس فیور سے جو کچھ کہنا چاہتے تھے، سب کہہ دیا؟“ ناشا پوچھ رہی تھی۔

”ہاں، بالکل۔“

”آپ دیکھتے ہیں کہ وہ اپنی گردن بلند کر سکتا ہے۔“ (ناشا کی مراد بچہ تھا) ”لیکن اس نے میری توجہ جان لی ہو کر دی تھی!۔۔۔ اور آپ کی پرس سے ملاقات ہوئی؟ کیا یہ ٹھیک ہے کہ وہ۔۔۔ کی محبت میں گرفتار ہے؟“

”ہاں، کیا تم تصور کر سکتی ہو۔“

اس مقام پر گولائی اور پرس مایہ ندر، خل ہوئے۔ بیئر ابھی تک بچے کو بازوؤں میں اٹھائے ہوئے تھا۔ وہ اسی حال میں نیچے جھکا، اس نے ان سے بوسے لیے اور ان کے سوالات کے جوابات دیے۔ اگرچہ انھیں ایک دوسرے کے ساتھ بہت سی دلچسپ باتوں کے بارے میں تبادلہ خیالات کرنا تھا لیکن نظریہ آ رہا تھا کہ فی الحال انھیں

بچے کو ہی جو ٹوپی کے نیچے جھولتے ڈنگ گاتے سر کے ساتھ میسر کی تمام توجہ کو اپنی طرف مبذول کیے ہوئے تھا، مہم شروع گفتگو بنانا پڑے گا۔

”کتنی پیارا ہے!“ پرس مار یا نے بچے کی طرف دیکھتے اور اس کے ساتھ لڑ پیا، کہتے ہوئے کہا۔ ”گولس، ایک بات میری سمجھ میں نہیں آتی،“ اس نے اپنے خاندان کی طرف مڑتے ہوئے حریفہ کہا۔ ”آخر آپ کو ان ننھے ننھے انتہائی خوبصورت انجریوں میں کوئی کشش کیوں نظر نہیں آتی۔“

”ہاں، بالکل نظر نہیں آتی۔ میں ان کی طرف، کل ہو ہی نہیں سکتا“ گولائی نے سر دھری سے بچے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”گوشت کا لوتھڑا ہی تو ہے۔ چھوڑ دو میسر، آؤ چلیں۔“

”اس کے باوجود وہ بہت محبت کرنے والے باپ ہیں،“ کاؤتس مار یا نے اپنے شوہر کا رفاع کرتے ہوئے کہا۔ ”لیکن وہ یہ محبت ایک دوسرا کے بعد جتلاتے ہیں۔“

”اور ادھر جیسے کتنی شاندار رہا ہیں۔“ فاسٹا نے کہا۔ ”وہ کہتے ہیں کہ ان کا ہاتھ بنائی بچوں کے بیٹھنے کے لیے ہے۔ دیکھ لو۔“

”اونہ، صرف اس کے لیے نہیں۔“ میسر نے اچانک ہنستے ہوئے کہا اور پھر تلی سے بچہ دوبارہ نرس کو تھما دیا۔

12

جیسا کہ ہر بڑے گھرانے میں ہوتا ہے، بالڈلز میں متعدد چھوٹی چھوٹی دینی نہیں آباد تھیں جو یک دوسرے سے قطعا مختلف تھیں۔ اگرچہ ان میں سے ہر ایک کی اپنی اپنی انفرادیت تھی اور وہ دوسروں کے معاملات میں دخل نہیں دیتی تھیں لیکن وہ سب آپس میں مل کر ہم آہنگ کل میں ڈھل جاتی تھیں۔ گھر میں جو بھی واقعہ پیش آتا، وہ انہیں ہانک ہوتا یا خوش آئند، وہ ان سب دنیاؤں کے لیے اہم ہوتا تھا لیکن اس پر خوشی منانے یا آنسو بہانے کی وجہ ہر ایک کی اپنی اپنی ہوتی تھیں اور یہ وجوہ دوسروں کی وجوہ سے مختلف ہوتی تھیں۔

چنانچہ میسر کی آمد اہم اور خوش آئند واقعہ تھا اور اس سے بھی متاثر ہوئے تھے۔

جب میسر واپس آیا، نوکر چاکر جو اپنے آقاؤں کے انتہائی قابل اعتبار منصف ہوتے ہیں کیونکہ وہ انہیں ان کے الفاظ یا احساسات و خیالات سے نہیں جانچتے جن کا وہ اظہار کرتے ہیں، انہیں جانچتے بلکہ ان کے افعال اور زندگی کے متعلق رویوں کو دیکھ کر فیصلہ بناتے ہیں۔ اس لیے خوش تھے کیونکہ وہ جانتے تھے کہ جب وہ آتا ہے، ان کا آقا اپنی جاگیر اور املک کا ہر روز چکر لگاتا ترک کر دیتا ہے، اس کے مزاج میں ٹھنڈاؤ آ جاتا ہے، وہ خوش رہتا ہے اور دوسرا کے ساتھ شفقت اور مہربانی کا برتاؤ کرتا ہے۔ وہ اس لیے بھی مسرور تھے کیونکہ انہیں دعوت کے روز توقع سے بڑھ کر اعلیٰ تحائف ملنا تھے۔

گورنرس اور بچے اسے دیکھ کر اس لیے خوش تھے کیونکہ گھرانے کی تفریحی اور دیگر تقریبات میں جس طرح وہ

انہیں شامل کرتا تھا، کوئی اور نہیں کرتا تھا۔ صرف وہی کلاوی کارڈ پر 'ecossaise' (اسے اس بھی ایک دھن بھانا آتی تھی!) کو بجا سکتا ہے جس کے متعلق اس کا دعویٰ تھا کہ اس کی سنگت میں ہر قسم کا رقص کیا جاسکتا ہے، جاسکتا ہے۔ پھر ان سب کو یہ بھی یقین تھا کہ وہ ان کے لیے تحائف لایا ہوگا۔

ہلکے بھورے گھونگر یا لے بالوں اور خوبصورت آنکھوں والے کولین کا بلکونسکی، جو اب پندرہ سال کا دبلا پتلا، نازک اندام اور ذہین لڑکا تھا، خوشی سے پھوٹا نہیں سہا رہا تھا کیونکہ 'انگل پیئر' جیسا کہ وہ اسے کہا کرتا تھا، اس کی والہانہ محبت اور تحسین کا مرکزی نقطہ تھا۔ سے پیئر سے جو محبت تھی، وہ کسی نے اس کے دل میں نہیں بٹھائی تھی اور اس کی پیئر سے ملاقات بھی شاذ و نادر ہی ہوتی تھی۔ اس کی پھوپھی اور سرپرست کاؤنٹس ماریا نے پوری کوشش کی تھی کہ جس طرح وہ خود اپنے شوہر سے محبت کرتی ہے، اسی طرح کولین کا بھی اس سے محبت کرنے لگے۔ کولین کا اپنے انکل کو پسند تو کرتا تھا تاہم اس کی اس پسند میں قدرے حقارت کی بھی آمیزش ہوتی تھی۔ ایستہ پیئر کی وہ پرستش کرتا تھا۔ اپنے انکل کولین کی طرح نہ تو ہوزار بننا چاہتا تھا اور نہ اسے (تمغہ) سینٹ جارج حاصل کرنے والوں کی فہرست میں اپنا نام شامل کرانے کا شوق تھا۔ وہ پیئر کی طرح پڑھا لکھا، عقل مند اور شفیق انسان بننے کا خواہش مند تھا۔ پیئر کی موجودگی میں اس کا چہرہ ہمیشہ خوشی سے دھنک رہتا اور جب پیئر اس سے محبت ہوتا، وہ شرماتا، اس کا چہرہ سرخ ہو جاتا اور اسے اپنا دم رکنا محسوس ہوتا۔ پیئر جو کچھ کہتا تھا، وہ اس کا ایک ایک لفظ بغور سنتا اور بعد ازاں دیریں کی مدد سے تنہا اسے یاد کرتا اور اس کے مفادیم پر غور کرتا۔ پیئر کی سابقہ زندگی اور 1812 سے قبل کے زمانے کی اس کی آرزو (اس کے متعلق اس نے اتفاقہ طور پر دوسروں کی ادھوری باتیں سن کر اپنے ذہن میں مبہم، رومانی تصویر بنائی تھی)، اس کی اسیری، نسا شا (جس کا وہ خود بھی خاص طور پر گرویدہ تھا) سے اس کی محبت اور سب سے بڑھ کر پیئر کی اس کے باپ سے، جو اسے یاد نہیں تھا، دوستی۔ ان تمام باتوں نے مل ملا کر پیئر کو اس کی نگاہوں میں، میر واور سینٹ ہٹا دیا تھا۔ وہ اپنے باپ اور نسا شا کے بارے میں اوجھڑا دھڑکے سے جو باتیں سنتا تھا، پیئر جس جوش و جذبے سے مروجہ کا ذکر کرتا تھا، نسا شا جس پر از ملاحت احرام سے اس کے متعلق گفتگو کرتی تھی، ان سے کولین کا نے، جو محبت کی ہوتی ہے، کے بارے میں خود کچھ کچھ سوچنے سمجھنے لگا تھا، اپنے ذہن میں یہ خیال بٹھالیا کہ اس کا باپ نسا شا سے محبت کرتا تھا اور یہ کہ جب وہ بستر مرگ پر دراز تھا، اس نے اسے اپنے دوست کے سپرد کر دیا تھا۔ یہ باپ، جس کی لڑکے کے ذہن میں کوئی یاد نہیں تھی، اس کے لیے دیوتا کا وجود رکھتا تھا۔ اسے تصور میں لانا محال تھا لیکن وہ جب بھی اس کے متعلق سوچتا تھا، اس کے دل پر آری چل جاتی تھی اور وجد آفریں مسرت اور غم سے اس کی آنکھوں میں آنسو اُمڈ آتے تھے۔ چنانچہ پیئر کی واپسی پر لڑکا بھی خوش تھا۔

گھر میں جو مہمان مقیم تھے، وہ بھی پیئر کو دیکھ کر خوش ہو گئے کیونکہ وہ جس محفل میں بیٹھتا تھا، اسے گرمادیتا تھا۔ اس کی بیوی تو رہی ایک طرف، مگر کے سبھی بالغ افراد اس کی آمد پر بہت مسرور تھے کیونکہ وہ ایک ایسا رشتہ تھا

جس کی موجودگی زندگی کی گاڑی کو زیادہ ہموار اور پرسکون انداز سے رواں دواں رکھنے میں مددگار ثابت ہوتی تھی۔ بڑی بیبیوں اس سے اس لیے خوش تھیں کیونکہ وہ ان کے لیے تحائف لے کر آتا تھا لیکن انہیں اس سے بھی بڑی خوشی اس بات کی تھی کہ اب سناٹا اپنے حواس میں آجائے گی۔

بیٹر ان مختلف دنیاؤں کے رویوں کو سمجھتا تھا اور اس نے ان کی توقعات پوری کرنے میں کوئی تاخیر نہ کی۔ مگر چہ وہ انتہائی غائب دماغ اور بھٹکڑ آدمی تھا، وہ ایک فہرست کی مدد سے، جو اس کی بیوی نے تیار کی تھی، ہر چیز خرید لیا تھا، وہ ان اشیاء کو بھی، جن کی خریداری اس کی ساس اور برادر نسبتی نے اس کے ذمے لگائی تھی، منہ ہوام یا میلوڈا کے ڈریس کے لیے کپڑا اور اپنے بھتیجیوں کے کھونے مانا بھولا تھا۔

پتی شادی کے ابتدائی ایام میں، جب اس کی بیوی اس سے یہ توقع کرتی تھی کہ وہ ان اشیاء کو یاد رکھے گا جن کی خریداری کی اس نے ہامی بھری ہوتی تھی، تو اسے یہ بات بہت عجیب معلوم ہوتی تھی اور جب بھی غیر حاضری کے دوران میں اسے کچھ بھی لانا یاد نہ رہا، اس کی بیوی نے جس گھبراہٹ سے اپنی ماراٹنگلی کا اظہار کیا، اس نے اسے ہنگامہ کر دیا۔ لیکن وقت کے ساتھ ساتھ وہ اس کا عادی ہوتا چلا گیا۔ وہ جانتا تھا کہ سناٹا اپنے لیے کبھی کبھی نہیں مانگتی اور جب وہ خود رضا کارانہ پیشکش کرتا ہے، تب صرف دوسروں کی فرمائشوں کی تکمیل اس کے ذمے لگاتی ہے۔ یوں اسے گھر کے ہر فرد کے لیے تحائف کی اس خریداری میں غیر متوقع اور بچکانہ مطلق آنے لگا اور اب وہ کچھ بھی نہیں بھولتا تھا۔ اب اگر اسے اپنی بیوی کی نکتہ چینی کا سامنا کرنا پڑتا تھا، تو صرف اس بات پر کہ وہ ضرورت سے زیادہ اشیاء خرید لاتا ہے اور یوں فضول خرچی کا مرتکب ہوتا ہے۔ سناٹا اپنی ذات اور لباس کے بارے میں لاپرواہی برتنی تھی اور بن ٹھن کر نہیں رہتی تھی۔ (دوسرے لوگوں کی نگاہوں میں یہ اس کی خامیاں لیکن بیٹر کے نزدیک یہ اس کی خوبیوں تھیں۔) سناٹا نے اپنی اس ”خامیوں“ میں اب جزیری کا بھی اضافہ کر لیا۔

جب سے بیٹر نے ایک سے خاندان کے، جس کا حجم سال بہ سال بڑھتا جا رہا تھا، سربراہ کی حیثیت سے زندگی گزارنا شروع کی تھی، اس کے اخراجات میں اضافہ ہوتا چاہیے تھا لیکن وہ یہ دیکھ کر بہت خیران ہوا کہ اب وہ پیسے کی نسبت آدھے رو گئے ہیں اور اس کے مالی معاملات میں، خاص طور پر اس کی پہلی بیوی کے قرضوں کی وجہ سے، جو فزور آیا تھا، حساب ہی میں ان میں بہتری کے آثار نمودار ہونے لگے ہیں۔

اخراجات زندگی اس لیے کم ہو گئے تھے کیونکہ اب ان پر قدغنیں لگ چکی تھیں۔ اس قسم کا طرز حیات، جو آدمی کو جب اور جہاں اس کا جی چاہے، جانے یا مختلف کام کرنے کی جارت دیتا ہے، اور جو نہایت ہنگامہ خیز ہے، اس کے اختیار میں نہیں رہا تھا اور سناٹا اب اس کی کوئی آزادی نہ رہی تھی۔ بیٹر کو محسوس ہوتا تھا کہ اب اس کا طرز زندگی مستقل طے ہو چکا ہے، اس میں تاہمین حیات کوئی تبدیلی نہیں آئے گی اور اسے تبدیل کرنا اس کے بس میں نہیں رہا ہے۔

چنانچہ یہ نیا انداز کفایت شعار نہ ثابت ہوا۔

چندے پر مسرت اور تبسم سجائے بیٹر اپنی خرید کردہ اشیاء کی چھائی کر رہا تھا۔

”اس کے متعلق کیا خیال ہے؟“ اس نے دکاندار کی طرح ڈریس کا کپڑا پھیلاتے ہوئے کہا۔
 ننا شانے، جو اپنی بڑی بیٹی کو گھنٹے پر نکالتے اس کے سامنے بیٹھی تھی، اپنی جنگلاتی آنکھیں لپٹے خاندان سے
 ان اشیاء کی طرف منتقل کیں جو وہ اسے دکھا رہا تھا۔

”یہ پائیڈو کے لیے ہے؟ بہت خوبصورت ہے۔“ اس نے کپڑے کو ٹٹول کر اس کی کوالٹی کا اندازہ لگایا۔
 ”ایک روئل فی آر شین²⁵ ہوگا۔“
 میٹر نے اسے قیمت بتائی۔

”بہت زیادہ ہے!“ ننا شانے حاشیہ آر کی کی۔ ”خیر، maman! درہے بہت خوش ہوں گے آپ کو چاہیے
 تھا کہ آپ میرے لیے یہ نہ لاتے۔“ اس نے کنگھی تمام طلائی کلب کی، جس پر موتی جڑے ہوئے تھے اور جس کا تیار کیا
 فیشن چلا تھا، تجسین کرتے ہوئے کہا۔ وہ اپنی مسکراہٹ چھپانا چاہتی تھی لیکن ناکام رہی۔
 ”مجھے آدیل نے درغلا یا تھا۔ وہ بار بار اصرار کرتی رہی کہ مجھے یہ سازنا خریدنا چاہیے،“ میٹر نے اپنی منگائی پیش
 کی۔

”میں اسے پہنوں گی کب؟“ ننا شانے اسے جوڑے میں پھانتے ہوئے کہا۔ ”چلیں، جب ہم شام کھا کر
 میں لے جانا شروع کریں گے، کام آئے گا۔ شاید اس وقت تک اس کا فیشن چلنا رہے۔ آئیں، اب چلیں۔“
 تھکے سمیٹنے کے بعد وہ پہلے زمری میں درپھر معمر کاؤنٹس کے پاس چلے گئے۔

جب میٹر اور ننا شا بفلوں میں پارسل دبائے ڈرائنگ روم میں داخل ہوئے، کاؤنٹس صپ معمول بائیو
 کے ساتھ بیٹھی پوچھنے کھیل رہی تھی۔

کاؤنٹس ساٹھ سے اوپر نکل چکی تھی۔ اس کے بالوں میں اچھی خاصی سفیدی بھلنے لگی تھی۔ اس کے سر پر جوڑی
 تھی، اس میں جھل لیں تھیں اور یہ جھل لیں اس کے چہرے کے ارد گرد لٹک رہی تھیں۔ اس کے چہرے پر جھل لیں پڑ
 چکی تھیں، اوپر کا ہونٹ نیچے جانب ڈھلک چکا تھا، اور اس کی بصارت میں فرق آ گیا تھا۔

اپنے بیٹے اور شوہر کی مختصر عمر میں کے بعد دیگرے مسمات کے بعد اسے محسوس ہونے لگا تھا کہ سے اتفاقاً
 دنیا میں بھلا دیا گیا ہے۔ اب اسے زندگی کا نہ کوئی مقصد نظر آتا تھا اور نہ اس میں کوئی دلچسپی رہ گئی تھی۔ وہ کھاتی تھی،
 پیتی تھی یا آنکھیں کھولے بیٹی رہتی تھی لیکن وہ زیست کر نہیں رہی تھی۔ زندگی اب اس پر اپنا کوئی نقش نہیں چھوڑتی
 تھی۔ اسے اس میں سکون کے علاوہ اور کسی چیز کی تمنا نہیں رہ گئی تھی اور یہ سکون اسے صرف موت ہی فراہم کر سکتی تھی
 لیکن جب تک موت نہیں آتی اسے بہر طور جینا تھا، یعنی اپنا وقت اور حیات قوتیں کسی مصرف میں لانا تھیں۔ ایک ایسی
 خصوصیت، جو صرف نو عمر بچوں اور بہت ہی بوڑھے اشخاص میں نظر آتی ہے، وہ اس کا بدربجائیم اظہار کرتی تھی۔ اس کا
 دہرہ کسی بدیہی مقصد کے بغیر تھا لیکن اپنی فعالیتوں اور میلانات کو بروئے کار لانے کی ضرورت اپنی جگہ موجود تھی۔

اسے کھانا، سونا، سوچنا، بولنا، ہر دنا، کچھ دسی کام کرنا اور کبھی کبھار اپنے غصے کی نمائش کرنا پڑتی تھی، علی ہذا القیاس، اور یہ سب اس لیے کیونکہ اس کا معدہ تھ، دماغ تھ، عضلات و اعصاب تھے، اور ایک عدد جگر تھ۔ جب لوگ زندگی کی توانائیوں سے سرشار ہوتے ہیں، کسی خارجی محرک کے زیر اثر اپنی جدوجہد کا رخ کسی مقصد کے حصول کی طرف موڑ دیتے ہیں اور اس جدوجہد کے دوران میں ان اعضاء کے افعال کا مقصد ان کی نگاہوں سے اوجھل ہو جاتا ہے لیکن کاؤٹس کو کوئی خارجی محرک مصروف عمل نہیں کرتا تھا۔ وہ باتیں اس لیے کرتی تھی کیونکہ جسمانی طور پر اس کے لیے اپنی زبان اور پیچھے ہٹنے کو استعمال کرنا ضروری تھ۔ وہ اس طرح رہتی تھی جس طرح بچے روتے ہیں کیونکہ انھیں ناک سڑکنے کی ضرورت لاحق ہوتی ہے، وغیرہ وغیرہ۔ توانا اور صحت مند لوگوں کو جو چیز آخری مقصد معلوم ہوتی ہے، اس کے لیے محض بہانہ تھی۔

چنانچہ سویرے سویرے۔ خاص طور پر اگر اس نے گزشتہ روز کوئی زیادہ ہی مرغ چیز کھائی ہوتی۔ اسے خشکی کا اظہار کرنے کی ضرورت محسوس ہونے لگتی، اور اس مقصد کے لیے وہ آسانی سے دستیاب بہانہ۔ ہائیڈوا کا بہرہ لینا۔ منتخب کر لیتی۔

وہ کمرے کے دوسرے کونے سے مدھم آواز میں کہنا شروع کرتی۔

”ماکی ڈیٹر، معلوم ہوتا ہے کہ آج کا دن ٹیٹا زبادہ گرم ہے،“ وہ بڑبڑاتی۔

اور جب مادام بائیلووا جواب دیتی: ”یقیناً، یقیناً وہ آگئے ہیں۔“ وہ بڑبڑاتی: ”خدا یا، یہ کتنی بہری اور اچھی ہے!“ دوسرا بہانہ اس کی نسوار تھی۔ کبھی یہ اسے بالکل ہی شک اور کبھی مرطوب دکھائی دیتی اور کبھی وہ کہتی کہ اسے ہار یک نہیں چسایا گیا۔ جھنجھلاہٹ اور خشکی کے ادا دوروں کے بعد اس کے چہرے پر زردی کھنڈ جاتی۔ اس کی خادماؤں کو سب خطا علامتوں سے معلوم ہو جاتا تھا کہ بائیلووا کب دوبارہ بہری ہو جائے گی، کب نسوار مرطوب یا کاؤٹس کا چہرہ کب دوبارہ پیل پڑ جائے گا۔ جس طرح اپنے چڑچڑے پن سے جھٹکارا حاصل کرنے کے لیے اسے کوئی نہ کوئی بہانہ درکار ہوتا تھا، اسی طرح اسے اپنے سوچنے سمجھنے کی بچی بچی صلاحیتوں کے اظہار کے لیے کوئی عذر چاہیے ہوتا تھا اور یہ مقصد ٹیشنس کے کھینس سے پورا ہو جاتا تھا۔ جب سے رونے کی خواہش ہوتی، مرحوم کاؤٹس بہانہ بن جاتا۔ جب اسے پریشان ہونے کی ضرورت پڑتی، نکور لی اور اس کی صحت آڑے آتے۔ جب اس کے سر میں کوئی کینہ توڑ بات کہنے کا سودا سماتا، کاؤٹس ماریا بہانہ بن جاتی۔ جب اس کے صوتی اعضاء (Vocal organs) کو درد ش کی ضرورت محسوس ہوتی (اور یہ ضرورت عام طور پر ڈنر کے بعد تاریک کمرے میں قبول کرنے کے بعد تقریباً سات بجے پیش آتی)، تو اس کا عذر یہ ہوتا کہ وہ اپنے عزیزوں کو کچھ بھولی بری باتیں سنانا چاہتی ہے، حالانکہ یہ کسی بچی اور پیش پا افتادہ باتیں متعدد بار انھی لوگوں کو سنا چکی ہوتی تھی۔

اگر چہ بڑھیا کی کیفیت کو گھر کا ہر فرد سمجھتا تھا لیکن کلمے بندوں کوئی اس کا ذکر نہیں کرتا تھا اور اس کی ضروریات پوری کرنے کے لیے کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی جاتی تھی۔ صرف کبھی کبھار گولائی، جیڑ، نٹا شا اور کاؤٹس ماریا کے

درمیان اداس، نیم متبسم نگاہوں کا جو تبادلہ ہوتا، اس سے صاف معلوم ہو جاتا کہ وہ اس کی حالت سے آگاہ ہیں۔ مگر ان کی نگاہیں کچھ اور بھی کہتی تھیں وہ یہ کہتی تھیں کہ وہ زندگی میں اپنا کردار کھو چکی ہے، جو کچھ انھیں ظرا رہا ہے، وہ اس کی مکمل شخصیت نہیں ہے اور کسی روز خود ان کا اپنا حشر بھی یہی ہوگا، یہ کہ انھیں اس کی خواہشات کے سامنے سر تسلیم خم کر کے اور اپنے اوپر قابو پا کر خوشی ہوتی ہے وہ یہ کہ کبھی وہ انھیں اتنی عزیز ہوا کرتی تھی اور انھیں کی طرح اس کی نس نس سے زندگی کی کرنیں پھوٹا کرتی تھیں لیکن اب انھیں اس پر ترس آتا ہے۔

Memento mori، "یہ نگاہیں کہتی تھیں۔"

گھر کے صرف وہی افراد، جو ذاتاً کٹھوریا احمق تھے، یا پھر ننھے منے بچے، اس کی یہ کیفیت سمجھنے میں ناکام رہتے تھے اور اس سے دور دور رہتے تھے۔

13

جب میٹر اور اس کی بیوی ڈرائنگ روم میں داخل ہوئے، کاؤنٹس کو ڈھنی درزش کرنے کے لیے پیشکش کھیلنے کی جوں پڑی ہوئی تھی، اب وہ پھر بس کی ضرورت محسوس کر رہی تھی اور چٹا نیچہ (، گرچہ اس نے انھیں الفاظ کی، جن سے وہ میٹر یا سوتے بننے کا، جب وہ کچھ دنوں کی غیر حاضری کے بعد واپس آتے تھے، استقبال کرتی تھی، جگالی کرتے ہوئے کہا، "ٹھیک وقت پر مائی ڈیسر، ٹھیک وقت پر آئے ہو۔" بسیں بہت دنوں سے تمہارا انتظار تھا۔ خیر، خداوند کا شکر ہے کہ تم گھر پہنچ گئے ہو!" اور اس نے اپنے تھکاف اپنے ایک اور گھسے پٹے ہوئے جملے سے وصول کیے، "ٹھیک بنات خود کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ خیر، تمہارا شکر یہ کہ تم مجھے جیسی بڑھیا کا خیال رکھتے ہو۔" صاف نظر رہا تھا کہ اس موقع پر میٹر کی آمد پسند نہیں آئی تھی کیونکہ اس کی توجہ تاش کے پتوں سے ہٹک گئی تھی۔ جب وہ اپنی پیشکش کی گیم ختم کر چکی تب ہی وہ تھکاف کی طرف متوجہ ہوئی۔ یہ تھکاف ان اشیاء پر مشتمل تھے۔ ایک تاش کے چورا کا ڈبا، جو اعلیٰ کاریگری اور بہارت کا نمونہ تھا، ایک کپ ساختہ سیونے بمعدہ ڈھکن جس پر گڈرینوں کی تصویر نقش تھی، ورسوار کی طلائی ڈبہ جس پر کاؤنٹ کی تصویر بنی ہوئی تھی (میٹر نے یہ تصویر پیٹرز برگ کے ایک تصویر چہرہ تصور سے بنوائی تھی)۔ کاؤنٹس کا بڑے عرصے سے اس قسم کی ڈبیا کے لیے جی لپی رہا تھا لیکن چونکہ اس وقت اس کا رے کو جی نہیں چاہتا تھا، اس نے لاپرواہانہ انداز سے تصویر پر طائرانہ نظر ڈالی اور یوں اس کی توجہ کا مرکز پتوں کا ڈبا ہی رہا۔

"مائی ڈیسر، شکریہ تم نے میرا اس خوش کر دیا ہے،" اس نے ہمیشہ کی طرح کہا۔ "مگر سب سے بہترین چیز یہ ہے کہ تم اپنے آپ کو لے آؤ ہو۔ میں نے ایسی بات کبھی دیکھی نہ سی ہے۔ تمہیں اپنی بیوی کو خوب ڈانٹ پڑنا چاہیے! بھلا تم یقین کر دو گے کہ جب تم کہیں چلے جاتے ہو، یوں معلوم ہونے لگتا ہے کہ اس پر جنوں بھوتوں نے قبضہ کر لیا۔"

لفظی ترجمہ: "یاد رکھیں آپ نے مرنا ہے۔" یہ الفاظ اس چیز (مثلاً کھوپڑی یا ایسی لاشی چیز جو موت کی علامت ہوتا ہے) کے بارے میں دیکھ کر ان کو موت یا فنا یاد آجائے، استعمال کیے جاتے ہیں۔

ہے۔ اسے نہ کچھ بھگتی دیتا ہے اور نہ کچھ یاد دہاتا ہے۔“ وہ حسب معمول اپنی پرانی راگنی الہی راہی۔ ”آنا سترفینا“ اس نے اپنی رفیقہ کی طرف متوجہ ہو کر کہا، ”دیکھو، میرا بیٹا میرے لیے چٹوں کا کیب خوبصورت ڈبلا ہوا ہے۔“

مادام بائیلوونائے تحائف کی تعریف کی اور اپنے ڈریسنگ کابینہ کا کچھ کر تو دہ جاسے میں پھون نہیں ہماری تھی۔ اگرچہ میٹر، نناشا، نکوماکی اور کاؤٹس ماریا نے ایک دوسرے سے بہت کچھ کہا سنا تھا لیکن وہ یہ باتیں بڑھی کاؤٹس کی موجودگی میں نہیں کر سکتے تھے۔ اس لیے نہیں کہ اس سے کوئی چیز چھپائی جاتی تھی بلکہ اس کی وہ یہ تھی کہ وہ زمانے سے اتنا پیچھے رہ گئی تھی کہ اگر وہ اس کے سامنے گفتگو کرتے، انھیں غیر متعلقہ باتوں کے جوابات دینا پڑتے اور جو چیز پہلے ہی بار بار دہرائی جاتی تھی، اس کی خاطر اسے پھر دہرائنا پڑتا تھا۔ فلاں آدمی کا انتقال ہو گیا ہے، فلاں نے شادی کر لی ہے۔ وہ سنتی تھی اور فوراً بھول جاتی تھی۔ تاہم وہ ڈرائنگ روم میں ہمارے کے روگردیشیے جانے پڑتے رہے اور میٹر کاؤٹس کے مختلف سوالات کے جوابات دیتا رہا کی پرس و سیل بڑھا ہوا گیا ہے؟ کیا کاؤٹس ماریا الیکسیوینا نے دعا سہام بھیجا ہے اور ابھی تک انھیں یاد کرتی ہے؟ اور وہ اس قسم کی دوسری باتیں، جن میں کسی کو بلکہ خود اسے بھی کوئی دلچسپی نہیں تھی، پوچھتی رہی۔

اس قسم کی گفتگو، جس میں اگرچہ کسی کو دلچسپی نہیں تھی لیکن اس سے سمجھ نہیں چھڑایا جاسکتا تھا، جانے کے سارے عرصے کے دوران میں چلتی رہی۔ خاندان کے سارے افراد گول میز کے گرد، جس پر سہو رو دھرا تھا، بیٹھے تھے (جانے کی تقسیم کا سارا انتظام سوچا کے ہاتھ میں تھا)۔ بچے اپنے بیٹروں اور گورنرس کے ساتھ پہلے ہی جانے لے چکے تھے اور ملحقہ کمرے سے ان کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ ڈرائنگ روم میں ہر شخص اپنی معمول کی نشست سنبھالے ہوئے تھا۔ نکولائی ستود کے قریب ایک چھوٹی میز کے سامنے بیٹھا تھا۔ اس کی بازوئی کتاب لگا (پکلی ملک کی بیٹی)، جس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھیں اس کے کاما سرنگی چہرے پر پہلے سے بھی کہیں زیادہ نمایاں ہو رہی تھیں، اس کے قریب آرام کرسی پر لیٹی ہوئی تھی۔ دینی سوف، جس کے گھونگھریاے بالوں، مونچھوں اور گل پھولوں میں سفیدی جھلکے لگی تھی، جرنیل کا چست کوٹ پہنے، جس کے بٹن کھلے تھے، اپنے کاؤٹس ماریا کے قریب فروکش تھا۔ میٹر اپنی بیوی اور کاؤٹس کے درمیان میں بیٹھا تھا اور ایسے موضوعات پر، جن کے متعلق اسے معلوم تھا کہ بڑھیا کو ان میں دلچسپی ہو سکتی ہے اور وہ انھیں سمجھ بھی سکتی ہے، گفتگو کر رہا تھا۔ وہ اونچے طبقے کی سطحی دلچسپیوں اور بڑھیا کے ان معاصرین کے متعلق، جن سے ان کا حلقہ متشکل ہوتا تھا، باتیں کر رہا تھا۔ (بڑھیا کا یہ حلقہ کبھی حقیقتاً جیتا جاگتا اور واضح گرد پ ہوا کرتا تھا مگر اب اس کے ارکان ادھر ادھر بکھر چکے تھے، اسی کی طرح اپنی زندگیوں کی آخری گھڑیاں بتا رہے تھے اور انھوں نے اپنے زمانہ شباب میں جو کچھ بویا تھا، اس کی فصل کی آخری بالیاں اکٹھی کر رہے تھے۔

بڑھیا کے نزدیک اس کے انھیں معاصرین سے اصل اور قابل توجہ دنیا متشکل ہوتی تھی۔) نناشا کو میٹر کے جوش و خروش سے اندازہ ہو کہ اس کا سفر بہت دلچسپ رہا ہے اور یہ کہ اس نے انھیں بہت کچھ بتاتا ہے جو وہ کاؤٹس کے سامنے بیان نہیں کر سکتا تھا۔ دینی سوف، جو خاندان کا رکن نہیں تھا، میٹر کی اس دوراندیشی

کو نہ سمجھ سکا اور چونکہ وہ خود حانات سے مطمئن نہیں تھا، اس لیے وہ بار بار میئر سے اصرار کرتا۔ ہا کہ وہ اسے آراک چیف اور بائبل سوسائٹی کے متعلق بتائے اور یہ بھی بتائے کہ سمیونووسکی رجسٹر پر کیا گزرا۔ ایک دوسرے میئر اس کے بہکادے میں آگیا دران مہضوعات کے متعلق اس سے گفتگو کرنے لگا لیکن نکولائی اور ستاشا نے اسے دوبارہ پڑی پڑھا دیا اور وہ اس سے پرنس ایوان اور ماریا، انتونودنا کی صحت کے بارے میں پوچھنے لگے۔

”لیکن گوسنر²⁸ اور مارام تاناوینووا²⁷۔ ان کی اطمینان کا ردائیاں اسی طرح جاری ہیں؟“ دینی سوف نے پوچھا۔
”بالکل جاری ہیں!“ میئر نے کہا۔ ”بلکہ حالت پہلے سے بھی بدتر ہو گئی ہیں! بائبل سوسائٹی کا عمل دخل ساری حکومت میں سرایت کر چکا ہے!“

”mon cher ami، کیا کہہ؟“ کاؤنٹس نے پوچھا۔ وہ اپنی چائے ختم کر چکی تھی اور کھانے کے بھاب بھاتریش مزاجی کے اظہار کے لیے بہانہ تلاش کر رہی تھی۔ ”یہ تم حکومت کے بارے میں کیا کہہ رہے تھے؟“
”maman، آپ جانتی ہیں کہ پرنس الیکساندر گالتس نے ایک سوسائٹی قائم کی ہے اور لوگ کہتے ہیں کہ اسے بہت اثر و رسوخ حاصل ہو گیا ہے،“ نکولائی نے، جسے باتوں کا اپنی ماں کی زبان میں ترجمہ کرنے کا ہر آنا تھا، دخل اندازی کرتے ہوئے کہا۔

”آراک چیف اور گالتس“ میئر نے کوتاہ نمشی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا، ”اب محض حکومت ہیں اور حکومت بھی کیسی؟ انھیں ہر جگہ بس سازشیں اور ریشہ دانیوں ہی نظر آتی ہیں اور وہ ہر چیز سے خوف زدہ ہیں۔“
”لیکن پرنس الیکساندر نکولائی وچ کی خطا کیا ہے؟ وہ انتہائی قابلِ توقیر انسان ہیں۔ بھسے لوں میں میری ماں، انتونودنا کے ہاں اس سے ملاقاتیں ہوتی رہی ہیں۔“ کاؤنٹس نے شکایتی سہجے سے کہا۔ اور جب اس نے دیکھا کہ کمرے میں سب لوگ چپ سادھے بیٹھے ہیں، وہ اور بھی ناراض ہو گئی۔ ”آج کل ہر شخص کو نکتہ چینی کا بڑا شوق چریا ہو ہے۔ بائبل سوسائٹی۔ اس میں کیا حرابی ہے؟“ اور وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی اور (اس کے ساتھ باقی لوگ بھی کھڑے ہو گئے تھے) وہ منہ پھلائے سنگ روم میں اپنی میز کی طرف چل پڑی۔

اس کی روانگی کے بعد ماحول پر جو قدرے افسردہ کن خاموشی چھائی، اس میں بالحد کمرے سے بچوں کی باتوں اور تہقہوں کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہاں کوئی مسرت بخش جوشیلی بات ہو رہی ہے۔
”ختم! ختم!“ تنہی ستاشا کی شاداں و فرحان چیخ سب سے بلند تھی۔

میئر نے کاؤنٹس، ماریا اور نکولائی کے ساتھ نگاہوں کا تبادلہ کیا۔ (اس نے ستاشا سے ایک لمحے کے لیے بھی اپنی نظر میں نہیں ہٹائی تھیں) اور خوشی سے مسکرانے لگا۔

* میرے عزیز دوست۔

** اماں

*** مائسن

”یہ تو بڑی پیاری آواز ہے!“ اس نے کہا۔

”اس کا مطلب ہے کہ آٹنا کارونا نے اپنی جرب ختم کر لی ہے!“ کاؤنٹس مارے کہا۔

”میں دیکھ کر آتا ہوں۔“ میئر نے جست لگاتے ہوئے کہا۔ ”تمہیں معلوم ہے کہ میں اس غریب آواز کا خاص طور پر کیوں دلدادہ ہوں؟“ اس نے دروازے کے قریب رکھتے ہوئے کہا۔ ”یہ ہمیشہ پہلی چیز ہوتی ہے جو مجھے بتاتی رہتی ہے کہ سب ٹھیک ٹھاک ہے۔ آج جب میں واپس آ رہا تھا، میری گاڑی بھول جوں گھر کے قریب آئی گئی، توں میری بے چینی میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ پھر جب میں پیش دلائل میں داخل ہوا، مجھے آندروں کا کھٹکنا تا قہقہہ سنائی دیا اور میں جان گیا کہ سب ٹھیک ٹھاک ہے۔“

”مجھے معلوم ہے، مجھے معلوم ہے کہ تم اس طرح کیوں محسوس کرتے ہو؟“ گورائی نے کہا۔ ”لیکن میں تمہارے ساتھ بالکل نہیں جاؤں گا۔ یہ جراثیم مجھے بطور تحفہ مٹا دیں، اور اس طرح ملنا جیسے مجھے معلوم ہی نہ ہو کہ یہ میرے لیے ہیں۔“

میئر بچوں کے پاس چلا گیا اور قہقہوں اور شور و غل کی آوازیں پہلے سے بھی زیادہ بلند ہو گئیں۔

”آٹنا کارونا، دھڑا آئیں۔“ میئر کی آواز کہتی سنائی دی۔ ”ادھر آئیں، یہاں کمرے کے درمیان میں۔ یہ حکم ہے۔ ایک، دو، اور جب میں تین کہوں... یہ ٹھیک ہے۔ تم وہیں کھڑے ہو، درمیان میں آ جاؤ۔“ میئر نے کہا اور کمرے میں کامل سکوت چھا گیا۔ ”تین“ اور بچوں کی وجہ آخریں دیکھوں سے کمرے کے دروازے پر ہلنے لگے۔

”دو ہیں، دو ہیں!“ وہ چلا چلا کر کہہ رہے تھے۔

اور واقعی جرب میں دو ہی تھیں۔ انھیں آٹنا کارونا نے کسی خفیہ طریقے سے، جو صرف اسے ہی معلوم تھا، بیک وقت ایک ہی سلاخیوں پر بنا تھا اور جب وہ مکمل ہو گئیں، اس نے بچوں کی موجودگی میں بڑے قاتلانہ انداز سے ایک کر دوسری میں سے باہر نکال لیا۔

14

اس کے کچھ ہی بعد بچے شب بخیر کہنے آئے۔ انہوں نے سب کے بوسے دیے، بیونروں اور گورنوں نے جھک کر سلام کیا اور وہ سب باہر چلے گئے۔ صرف دیبل اور اس کا شاگرد وہیں ٹھہرے رہے۔ دیبل نے لڑکے کے کان میں کہا:

”آؤ، پیچھے چلیں۔“

”نہیں، موسیو دیبل، میں اپنی پھوپھی سے درخواست کروں گا کہ وہ مجھے یہیں رکھنے کی اجازت دے دیں۔“

بلکونسکی نے بھی کانٹا پھوسی کرتے ہوئے جواب دیا۔

”matante، مجھے یہیں رکھنے کی اجازت مرحمت فرمائیں۔“ اس نے اپنی پھوپھی کے پاس جا کر کہا۔

”پھوپھی جان۔“

اس کے چہرے پر منت سماجت، بے چینی اور مسرت جھلک رہی تھی۔ کاؤنٹس ماریا نے اسے طائرانہ نگاہوں سے دیکھا اور بیٹر کی جانب دیکھنے لگی۔

”جب آپ یہاں موجود ہوتے ہیں، اس کا ملنے کو جی نہیں چاہتا۔“

”موسیو دیل، میں اسے سیدھا آپ کے پاس لے آؤں گا۔ شب بخیر۔“ بیٹر نے سوستانی ٹیڈر سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا اور مسکراتے ہوئے نکولینکا کی طرف متوجہ ہو گیا۔ ”ابھی سم دونوں کی کوئی ملاقات نہیں ہوئی ہے۔ یہ یوں یوں بڑا ہو رہا ہے، توں توں بالکل اسی کی طرح ہوتا جا رہا ہے، اس نے کاؤنٹس ماریا کی طرف گردن کھماتے ہوئے کہا۔

”پاپا کی طرح،“ لڑکے نے پوچھا۔ اس کے چہرے کی رنگت بالکل سرخ ہو گئی اور وہ بڑے انہماک سے بیٹر کی طرف دیکھنے لگا۔

بیٹر نے ہاں میں سر ہلادیا اور اس نے اپنا سلسلہ کلام دوبارہ وہیں سے، جہاں سے یہ بچوں کی آمد پر منقطع ہوا تھا، شروع کر دیا۔ کاؤنٹس ماریا کوئی ادنیٰ چیز بن رہی تھی۔ نانا خا اپنے شوہر برنگا ہیں گاڑے بیٹھی تھی۔ نکولائی اور دیٹی سوف اٹھ کر کھڑے ہو چکے تھے۔ انھوں نے اپنے اپنے بائیں منگوائے، انھیں اپنے اپنے منہ میں دبایا اور بیٹر پر سوالات کی بوچھاڑ کرتے مزید چائے لینے سونیا کی طرف چل دے جس کی شکل پر اضطراب برسر رہا تھا لیکن جو استقلال سے سداوار کے پاس ڈٹی ہوئی تھی۔ گھونگر یا لے بانوں والے نازک اندام لڑکا ایک کونے میں بیٹھا تھا۔ اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں اور کسی کا اس کی طرف دھیان نہیں جا رہا تھا۔ وہ کبھی کبھار اپنے گھونگر بیلا سر، جو اس کی مہین گردن کے اوپر جوکار کے دوہرے کیے جانے کے باعث صاف نظر آرہی تھی، نکا ہوا تھا، موڑ کر بیٹر کی جانب دیکھنے لگتا، کپکپانے اور زیرب اپنے آپ سے کچھ کہنے لگتا۔ صاف معلوم ہو رہا تھا کہ اسے بالکل نئے، اور طوفانی جذبات کا تجربہ ہو رہا ہے۔

گھنٹوکار خا اعلیٰ سرکاری حلقوں کے سیکنڈ لوں کی طرف مڑ گیا جنھیں لوگوں کی، کثرت داخلی سیاست کا انتہائی دلچسپ پہلو تصور کرتی ہے۔ دیٹی سوف، جو حکومت سے غیر مطمئن تھا کیونکہ اسے اپنی ملازمت میں مایوسیوں سے دوچار ہونا پڑا تھا، پیٹرنز برگ کی ان باتوں کو، جو اس کی نگاہوں میں حقائق تھیں، توجہ سے سن رہا اور خوش ہو رہا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ تلخ و ترش تبصرے بھی کرتا جا رہا تھا۔

”پیرا نے رمانے میں اگر آپ کچھ بننا چاہتے تھے، آپ کو جرمن ہونا چاہیے تھا۔ اب آپ کو تاتاریوں اور مادام کروڈے کے اشاروں پرنا چنا اور ایکارٹس ہارڈن اور اس کے مریدوں کی کتابوں کا مطالعہ کرنا ہوگا۔ اس سے تو بہتر ہے کہ بے چارے ہونا پارت کو دوبارہ کھل کھینے کا موقع دے دیا جائے۔ وہ ان کے ذہنوں سے سب خرافات نکال دے گا۔ یہ بات کبھی سوچی بھی جاسکتی تھی کہ سمیونو کی رجسٹر کی کمان شوارٹس جیسے شخص کو سونپ دی جائے گی۔“ اس نے دہاڑتے ہوئے کہا۔

نکولائی اگرچہ ہر چیز میں قصص تلاش کرنے کی طرف مائل نہیں تھا، تاہم حکومت پر نکتہ چینی کرنا اسے بھی بدلتا

اور موزوں طرز عمل نظر آیا۔ الف کو فلاں محکمے کا وزیر اور ب کو فلاں صوبے کا گورنر جنرل مقرر کر دیا گیا ہے، یا زار نے یہ کہا ہے اور فلاں فلاں وزیر نے یہ کچھ اور، اس کے نزدیک انتہائی اہم امور تھے۔ چنانچہ اس نے ان امور میں دلچسپی لی اور بیئر سے سوال جواب کرنا اپنا فرض گردانا۔ یوں دینی سوف اور گولائی جو سوالات پوچھتے تھے، ان کی وجہ سے اعلیٰ سرکاری حلقوں کے بارے میں گفتگو کا معیار عام گپ شپ سے خاصا اونچا رہا۔

لیکن شناس کو، جسے اپنے خاوند کے طور طریقوں اور خیالات سے کھٹا آگایا تھی، احساس ہوا کہ بیئر کافی دیر تک گفتگو کا رخ کسی اور سمت پھیرنا اور اپنے خیالات کا جن کے بارے میں وہ شدت سے محسوس کرتا تھا اور جن کے متعلق وہ اپنے نئے دوست پرنس فیودور سے مشورہ کرنے پر زور کر رہا تھا، اظہار کرنا پڑتا ہے لیکن کامیاب نہیں ہو رہا۔ چنانچہ اس نے اس کی مدد کرنے کا تہیہ کر لیا اور اس سے پوچھنے لگی ”پرنس فیودور کے ساتھ آپ کے معاملات 30 ملے ہو گئے؟“

”یہ کیا قصہ ہے؟“ گولائی نے پوچھا۔

وہی مرغ کی ایک ہی ٹانگ۔“ بیئر نے اپنے گرد و پیش نظریں دوڑاتے ہوئے کہا۔ ”ہر شخص بھی راگ الاپے جا رہا ہے کہ حالات اتنے خراب ہو چکے ہیں کہ انھیں یوں کاتوں نہیں چھوڑا جا سکتا اور تمام قلعوں لوگوں کا فرض بنتا ہے کہ وہ حتیٰ الامکان ان کے توڑ کی کوشش کریں۔“

”اور قلعوں ہوگ کی کر سکتے ہیں؟“ گولائی نے قدرے غفلت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ”کیا یہ جاسکتا ہے؟“

”خیر، یہ...“

”آؤ، سنڈی روم میں چلتے ہیں۔“

شناس کو، جو کافی دیر سے اپنے شیر خوار بچے کے بلاوے کی خطر تھی، فرس کی آواز سنائی دی اور وہ نرسری کی طرف چل گئی۔ کاؤنٹس ماریا بھی اس کے پیچھے پیچھے چل دی۔ مرد سنڈی روم میں چلے گئے اور گولائی کا بلکونسلر اپنے بھوپہ کی نظروں سے بچتا بچتا چپکے سے کمرے میں کھسک آیا اور در بچے کے قریب تاریک گوشے میں رانینگ ٹیبل کے سامنے بیٹھ گیا۔

”خیر، آپ کے خیال میں اب کیا کرنا چاہیے؟“ دینی سوف نے پوچھا۔

”یک اور بے سرو پا اور تہی مغز منصوبہ!“ گولائی نے گرہ لگائی۔

”بات یہ ہے۔“ بیئر بیٹھا نہیں بلکہ کمرے میں چکر لگا رہا۔ ”بھی وہ رک جاتا، کبھی الفاظ اس کے منہ سے پوری طرح ادا نہ ہو پاتے اور وہ تلانے لگتا، اور کبھی وہ ہاتھوں اور بازوؤں سے اشارے کرتے لگتا۔“ بیئر بزرگ میں صورت حال یہ ہے: زار نے ہر چیز سے کنارہ کشی اختیار کر لی ہے۔ وہ سر تا پا سربت میں ڈوب چکا ہے۔“ (بیئر اب سربت کسی شخص میں بھی برداشت نہیں کر سکتا تھا۔) ”وہ صرف سکون و آشتی کا شہسہ ہے۔ اور اسے یہ سکون ان لوگوں میں ہی مل سکتا ہے جن کا کوئی دین ایمان نہیں، خمیر نہیں اور جو ہر چیز کو کانتے اور اس کا گھا گھونٹتے پھر رہے

ہیں۔ ان لوگوں سے میری مراد، گنہگار، راک چیف اور ان کے چسپے چاہتے ہیں۔ تم مجھ سے اتفاق کرو گے۔“ اس نے نکولائی سے مخاطب ہو کر کہا، ”اگر تم خود اپنی زمینوں کی دیکھ بھال نہیں کرو گے اور صرف سکون و آسائش کے پیچھے بھاگتے رہو گے، تو تمہارا بیٹا جتن زیادہ سنگ دل ہوگا، تمہارا نکولائی ہی آسانی سے سیدھا ہو جائے گا۔“

”یہی کہ ہر چیز کا ستیاناس ہو رہا ہے۔ عدالتوں میں بندھیر مچ رہی ہے۔ فوج میں کورٹوں کی مزاؤں کے علاوہ در رہ ہی کیا گیا ہے، عسکری ہستیوں میں ڈرل پر زور ہے یا پھر جبری مشقت کی جارہی ہے۔ تہذیب اور روشن خیالی کا قلع قمع کیا جا رہا ہے۔ جو شخص ذرا نوجوان ہے اور جسے اپنی عزت کا ذرا پاس ہے اسے عقوبت کی چنگ میں پس رہا ہے۔ ہر شخص کو نظر آ رہا ہے کہ یہ سلسلہ تادیر جاری نہیں رہ سکتا۔ دباؤ اتنا شدید ہے کہ کچھ نہ کچھ لازماً ٹوٹ کر رہے گا۔“ بیٹر نے کہا۔ (اس کا انداز ان لوگوں کا تھا جو جب سے حکومتیں وجود میں آئی ہیں، یہی کچھ کہتے چلے آ رہے ہیں۔) ”میں نے پیئرز برگ میں انھیں ایک بات بتائی۔“

”کسے؟“ دینی سوف نے پوچھا۔

”آپ کو معلوم ہے کہ کسے؟“ بیٹر نے معنی خیز نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”پرنس لیو دور اور ان سب لوگوں کو۔ کلچر اور خیراتی کاموں کی حوصلہ افزائی کرنا بہت اچھی بات ہے۔ یہ مقصد بہت بھلا ہے، لیکن موجودہ حالات کی اور چیز کے متقاضی ہیں۔“

اس موقع پر نکولائی کو احساس ہوا کہ اس کا بھتیجا کمرے میں موجود ہے۔ اس کے چہرے پر حال آگیا اور وہ لڑکے کے پاس گیا۔

”تم یہاں کیا کر رہے ہو؟“

”کیوں نہیں؟ اسے بیٹھ رہے دو۔“ بیٹر نے نکولائی کو کلائی سے پکڑتے اور اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”میں نے انھیں بتایا کہ اتنا کافی نہیں ہے اب کسی اور چیز کی ضرورت ہے۔ آپ کسی چیز کے دفاع پذیر ہونے کا انتظار کر رہے ہیں مگر دریں اثنا جس تاریکی کی ضرورت سے زیادہ دباؤ پڑ رہا ہے، وہ کسی بھی لمحے ٹوٹ سکتا ہے۔ جب بھی لوگوں کو یہ توقع ہونے لگے کہ تباہی ناگزیر ہے، حتیٰ الوسع زیادہ سے زیادہ لوگوں کو آپس میں تعاون اور عام تباہی کے خلاف مزاحمت کرنا چاہیے۔ قوم کے نوجوان طبقے کو دائم تدریس میں پھنس رہا ہے اور اسے بد عنوانیوں کی راہ پر ڈالا جا رہا ہے۔ کسی کو عورت، کسی کو احزاب و اکرام، کسی کو اُدنیے عہدے یا روپے پیسے کا لالچ دیا جا رہا ہے اور وہ سبھی اس ٹولے میں شامل ہوتے جا رہے ہیں۔ جہاں تک میرے اور آپ جیسے آزاد طبع، آزاد ذہن اور آزاد و وسیع کردار افراد کا تعلق ہے۔ ایسے لوگ اب کہیں بھی نظر نہیں آتے۔ میں نے ان سے کہا: اپنی سوسائٹی کا دائرہ وسیع کرنا، order کو واحد خوبی تصور نہ کرو بلکہ آزادی اور عمل پر زور دو۔“

نکولائی منہ پھلائے اپنے بھتیجے سے پرے ہٹ گیا، اس نے تنگ مزاجی سے کرسی تھکی اور اس پر بیٹھ گیا۔ وہ کبھی کبھار بے قراری سے غزاتا اور اس کی پیشانی کی شکلیں دروازہ ہوجاتیں۔

”لیکن عمل کس بات پر؟“ اس نے چلاتے ہوئے پوچھا۔ ”اور تم حکومت کے متعلق کیا رویہ اپناؤ گے؟“

”وہی جو مؤنہدین کا ہوتا ہے۔ اگر حکومت جازت دے دے، پھر سوسائٹی کو خفیہ رکھنے کی ضرورت نہیں رہ جاتی۔ نہ صرف یہ کہ ہم حکومت کے معاند نہیں بلکہ ہم تو سچے قدرت پسندوں۔ صحیح معنوں میں شرفاء کی جماعت ہیں۔ اس کا مقصد محض کسی پوگا چیف³² کو منظر عام پر آنے نہ دینا، میرے اور تمہارے بچوں کے قتل عام کو روکنا اور آرک چیف کے راستے میں دیوار کھڑی کرنا ہے تاکہ وہ مجھے کسی فکری ہستی میں نہ بھیج سکے۔ ہم سب مشترکہ بھلائی اور عام لوگوں کے تحفظ کے لیے ایک دوسرے سے تعاون کر رہے ہیں۔“

”ہاں، لیکن یہ ہے تو خفیہ جماعت، چنانچہ مخاصم اور خطرناک تھہری، اس سے خبر کی توقع نہیں جاسکتی۔“ نکولائی نے کہا۔ اس کی آواز لحظہ بہ لحظہ بلند سے بلند تر ہوتی جا رہی تھی۔

”کیوں؟ کیا ٹوگٹ ہٹ، جس نے یورپ کو بچایا تھا؟“ (اس زمانے میں لوگوں میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ براہ اعلان کر سکتے کہ یورپ کو روس نے بچایا ہے۔) ”کسی خطرناک چیز کی پیدوار تھی؟ ٹوگٹ ہٹ نکولائی کا اتحادی ہے، اس کا مطلب اخوت، محبت، یا ایسی اند دے۔۔۔ یہ دہی کچھ ہے جس کا مسیح نے صلیب پر چڑا دیا تھا۔“

نشاہت جو اس گفتگو کے دوران میں واپس آچکی تھی، شاداں و فرحاں اپنے خاندان کو دیکھ رہی تھی۔ اسے خوشی اس بات کی نہیں تھی جو وہ کہہ رہا تھا۔ اس میں تو اسے دلچسپی بھی نہیں تھی کیونکہ اسے یہ بات بالکل سیدھی سادی معلوم ہو رہی تھی اور وہ اسے بہت مدتوں سے جانتی تھی۔ (اسے یہی معلوم ہو رہا تھا کیونکہ اسے اس کا سرچشمہ۔ ہیٹر کا قلب و روح، جہاں سے یہ نکل رہی تھی، معلوم تھا۔) وہ خوش اس کے پر جوش اور پرشوق چہرے کو دیکھ کر ہر رائی تھی۔

لڑکا، جس کی دہلی پتلی گردن، دوہرے کیے ہوئے کار سے باہر نکلی ہوئی تھی اور جسے ہر کوئی فراموش کر چکا تھا، ہیٹر کو دیکھ کر اور بھی زیادہ خوش ہو رہا تھا۔ ہیٹر کا ایک ایک لفظ اس کے دل پر نقش ہو رہا تھا۔ اس کی مضطرب اور بے چین انگلیاں ادھر ادھر حرکت کر رہی تھیں، وہ بے دھیانی میں اس سے اپنے پھوپھا کی مہرنگانے کی لاکھ دو تلوں کا ڈبا ٹوٹ گیا۔

”یہ وہ نہیں ہے جو آپ سمجھ رہے ہیں۔ جرمن ٹوگٹ ہٹ وہ ہے جو میں بتا رہا ہوں اور یہی چیز میں بھلا رہا ہوں۔“

”نہیں، میرے دوست، ٹوگٹ ہٹ ان سماج خوروں کے لیے تو ٹھیک ہوگا لیکن مجھے اس کی سمجھ نہیں آ رہی۔ مجھ سے تو یہ صحیح طریقے سے ادا بھی نہیں ہوتا۔“ دینی سوف نے بلند آہنگ اور جادو نہ بچے سے دخل اندازی کرتے ہوئے کہا۔ ”میں مانتا ہوں کہ یہاں کے حالات بہت دگرگوں ہیں اور ہر چیز میں بد عنوانی سرایت کر چکی

ہے۔ پھر بھی تمہارا یہ ٹرگسٹ ہنٹ میری سمجھ میں نہیں آ رہا اور نہ مجھے اس کی پروا ہے۔ رہا ہنٹ، (بغاوت) یہ دہرا معاملہ ہے۔ یہاں میں تمہاری تائید کرتا ہوں۔“

میئر مسکرا دیا، جتنا شائے لگی لیکن گولائی نے میئر کو یہ سمجھنے کی ذمہ داری سنبھال لی کہ کسی انقلاب و انقلاب کی توقع نہیں کی جاسکتی اور وہ جس خطرے کی نشان دہی کر رہا ہے، وہ اس کے اپنے ذہن کی پیداوار ہے۔ میئر اس کے برخلاف دلائل دے رہا تھا۔ چونکہ اس کی ذہنی اور استدلالی صلاحیتیں کہیں زیادہ برتر تھیں اور وہ اس کی نسبت کہیں زیادہ آسانی سے دلائل کا انبار لگا سکتا تھا، گولائی کو بہت جلد احساس ہو گیا کہ وہ پٹ رہا ہے۔ اس پر اس کے غصے میں مزید اضافہ ہو گیا کیونکہ اپنے دس میں اسے کامل یقین تھا کہ اس کی رائے بالکل ٹھیک ہے۔ وہ اس نتیجے پر اپنی عقل سے نہیں بلکہ عقل سے کہیں زیادہ طاقتور چیز کی مدد سے پہنچا تھا۔

”میں ایک بات تمہیں بتائے دیتا ہوں،“ اس نے اٹھتے اور اپنی مضطرب اور پھڑپھڑاتی انگلیوں سے ہاں پائپ کوٹنے میں کھڑا کرنے کی کوشش کرتے اور آخر کار جھٹکا کر اسے پرے پھینکتے ہوئے کہا، ”کہ میں اسے ثابت نہیں کر سکتا۔ تم کہتے ہو کہ یہاں سب کچھ بوسیدہ اور متحضر ہو چکا ہے، اور بغاوت کے آثار نمودار ہو رہے ہیں۔ مجھے یہ کہیں نظر نہیں آتے۔ تم یہ بھی کہتے ہو کہ تمہارا حلف وفاداری مشروط ہے۔ اس کا میرے پاس یہ جواب ہے جیسا کہ تمہیں معلوم ہے کہ تم میرے بہترین دوست ہو لیکن، اگر تم نے کوئی خفیہ جماعت بنائی اور حکومت کے خلاف کسی کارروائی میں۔ خواہ اس کی نوعیت کیسی ہی ہو۔ شریک ہوئے، میں جانتا ہوں کہ میرا فرض حکومت کی اطاعت کرنا ہے اور اگر آراک چیف نے مجھے حکم دیا کہ میں تمہارے خلاف کسی سکواڈرن کی قیادت کروں اور تمہیں جہس نہر کروں، تو میں یک سینڈ کے لیے بھی کسی تذبذب کا مظاہرہ نہیں کروں گا اور یہ کرگزاروں گا۔ اور تم اس بارے میں جتنے چاہو، جی بھر کر دلائل دیتے رہو۔“

اس کے بعد محض پرکٹھن خاموشی چھا گئی۔ سب سے پہلے نتا شانے اسے توڑا، اور وہ اپنے حائل کارخانہ کرنے اور اپنے بھائی کو آڑے ہاتھوں لینے لگی۔ اس کا دفاع کمزور تھا، اور اس سے انٹری پن پکٹا تھا، لیکن وہ اپنا مقصد حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئی۔ گفتگو دوبارہ شروع ہو گئی، تاہم گولائی کے خاصانہ سچے سے جوئے خوشگوری پیدا ہوئی تھی، وہ سب تائید ہو گئی۔

جب وہ پرکھانے کے لیے اٹھ کر کھڑے ہوئے، گولینیکا بکونسکی، جس کا چہرہ دپیا تھا لیکن آنکھیں چمک رہی تھیں، میئر کے پاس پہنچا۔

”انگل میئر، آپ.. نہیں، اگر پاپا زندہ ہوتے، تو وہ آپ سے مذاق کرتے؟“ اس نے پوچھا۔

اور میئر کو یک لخت احساس ہوا کہ گفتگو کے دوران میں اس لڑکے کے ذہن میں خیالات و جذبات کا کتنا غیر معمولی،

• دیلی سوف نے جرمن لفظ bund (اتحاد) کو روسی لفظ bunt (ہنگامہ، فساد، بغاوت) میں تبدیل کر دیا ہے اور پس رو منویت پر کر دی ہے۔

پچیدہ، طاقت ور اور آزادانہ عمل جاری رہا ہوگا، اور جو کچھ اس کی زبان سے نکلا تھا، اسے یاد کرتے ہوئے اسے افسوس ہوا کہ اس نوجوان نے وہ سب کچھ سن لیا۔ تاہم اس کی تسلی کے لیے اسے کچھ نہ کچھ جو سب دیتے ہی بن پڑی۔
”ہاں، میرا خیال ہے،“ اس نے بادل، درخواست کیا اور سنڈی روم سے باہر نکل گیا۔

لڑکے کی نظر نیچے پڑی اور اسے پہلی مرتبہ احساس ہوا کہ اس نے اشیاء کا کیا ستیاناس کر دیا ہے۔ شرمندگی سے اس کا رنگ سرخ ہو گیا اور وہ نکولائی کے قریب گیا۔

”انکل، میں آپ سے معافی کا خواستگار ہوں۔ مجھ سے یہ سب کچھ... غیر ارادی طور پر ہو گیا،“ اس نے شکستہ قلموں اور لاکھ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔
نکولائی غصے سے ہڑبڑا گیا۔

”ٹھیک ہے، ٹھیک ہے،“ اس نے ٹکڑے نیچے پھینکتے ہوئے کہا۔
اور صاف نظر آ رہا تھا کہ اسے اپنے غیظ و غضب پر قابو پانے میں مشکل پیش آرہی ہے، تاہم وہ لڑکے سے پرے ہٹ گیا۔

”تمہیں یہاں نہیں آنا چاہیے تھا،“ اس نے کہا۔

15

سپر پر سیاست اور سوسائٹیوں کی کوئی بات نہ ہوئی۔ اب گفتگو کا موضوع۔ جو نکولائی کو سب سے زیادہ پسند تھا۔
1812 کی یادیں بن گئیں۔ یہ موضوع دینی صوف نے چھیڑا تھا اور اس کے متعلق دیکر کی باتیں خاص طور پر دلچسپ اور پُرلطف تھیں۔ سپر کے اختتام پر خاندان کے افراد انتہائی دوستانہ، حوں میں ایک دوسرے سے الگ ہوئے۔
سنڈی روم میں کپڑے تبدیل کرنے اور شیوارڈ کو، جو اس کا انتظار کر رہا تھا، بات دینے کے بعد نکولائی ڈریسنگ گاؤن پہنے بیڈ روم میں چلا گیا۔ وہاں اس کی بیوی ابھی تک لکھنے کی میز پر بیٹھی تھی۔

”ہماری، کیا لکھ رہی ہو؟“ نکولائی نے پوچھا۔
کاؤنٹس کے چہرے پر سرخی دوڑ گئی۔ اسے اندیشہ تھا کہ جو کچھ وہ لکھ رہی ہے، اسے اس کا شوہر سمجھ پائے گا نہ پسند کرے گا۔

جو کچھ وہ لکھ رہی تھی، اسے وہ اپنے خاوند سے چھپائے کو ترجیح دیتی لیکن ساتھ ہی وہ خوش بھی تھی کہ اس نے اس کا راز دریافت کر لیا ہے اور اب اسے بتانا ہی ہوگا۔

”نکولس، یہ میری ڈائری ہے۔“ اس نے اسے نیلی نوٹ بک تھمادی جو غیر لرر یہ ہاتھ سے چلی حروف میں تحریر کی گئی صہارتوں سے پر تھی۔

”ڈائری؟...“ نکولائی نے قدرے طعنیہ انداز سے کہا اور ڈائری پکڑ لی۔

یہ فرامیسی میں تھی۔

چار دسمبر، آج صبح جب اندر دشا (اس کا بڑا بیٹا) بیدار ہوا، وہ کپڑے تبدیل نہیں کرنا چاہتا تھا اور مادہ سوزیل
لوٹیسے نے مجھے بلا بھیجا۔ وہ کسی کا کہا نہیں مان رہا تھا اور ضد کر رہا تھا۔ میں نے دھمکیاں آڑا لیں۔ لیکن ان کا
نتیجہ صرف یہ برآمد ہوا کہ وہ پہلے سے بھی زیادہ غصہ کھانے لگا۔ پھر میں نے معاملات اپنے ہاتھ میں لے
لیے۔ میں نے اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا اور دوسرے بچوں کو جنگا نے میں نرس کی مدد کرنے لگی۔ اندر دشا
کو میں نے بتایا کہ مجھے اس سے کوئی محبت نہیں ہے۔ وہ کافی دیر چپ چاپ کھڑا رہا جیسے سوچ رہا ہو کہ یہ کیا
ہو گیا۔ پھر اس نے پلنگ سے چھلانگ لگائی، اپنی شبینہ قمیص میں بھاگتا میرے پاس آیا اور بے تحاشا رونے
لگا۔ مجھے اسے چپ کرانے میں کافی وقت لگا۔ صاف معلوم ہو رہا تھا کہ اسے جس بات سے اذیت پہنچ رہی
ہے، وہ اس کا یہ احساس تھا کہ اس نے مجھے ناراض کر لیا ہے۔ میں نے شاہ کو اسے اس کا کارڈ دے دیا۔ وہ
ایک بار پھر زار زار رونے اور مجھے چومنے لگا۔ پھر سے آدی اس سے سب کچھ کرا سکتا ہے۔

”اس کارڈ کا کیا مطلب ہے؟“ نکولا کی نے پوچھا۔

”میں شام کو بڑے بچوں کو ان کے رویے اور طرز عمل پر نمبر دیتی ہوں۔“

نکولا کی نے روشن دتا باں آنکھوں میں، جو اس پر سرکوز تھیں، جھانک کر دیکھا اور دوبارہ صفحے الٹ پٹ
کرنے اور انہیں پڑھنے لگا۔ ڈائری میں ہر وہ چیز مندرج تھی جو ماں کے نزدیک بچوں کی زندگیوں میں اہم تھی۔
ان باتوں سے جو وہ درج کرتی تھی، ایک تو اس کے کردار پر روشنی پڑتی تھی، اور دوسرے تدریسی طریقوں پر عمومی
خیالات کا اظہار ہوتا تھا۔ بیشتر مندرجات انتہائی معمولی تفصیلات پر مشتمل تھے لیکن ماں یا باپ، جب کہ وہ پہلی بار
اپنے بچوں کے متعلق ڈائری پڑھ چکا تھا، ایسا نہیں سمجھتے تھے۔

پانچ دسمبر کا اندراج اس طرح تھا:

دستر خوان پر تیار کردہ کھڑ اور ضدی تھا۔ پاپا نے کہا کہ اسے پڑھنا نہیں ملے گی اور اسے دی بھی نہیں گئی۔
جب دوسرے کھارے تھے، اس کا منہ لٹکا ہوا تھا، وروہ انہیں نندیدوں کی طرح دیکھ رہا تھا۔ میرا خیال ہے کہ
اگر بچوں کو پیشی چیزوں سے محروم رکھا جائے، تو ان میں محض حرص و ہوس بڑھتی ہے۔ مجھے نکولا کی کو یہ بات
بتانا ہوگی۔

نکولا کی نے کاپی نیچے رکھ دی اور اپنی بیوی کی جانب دیکھنے لگا۔ درمیاں آنکھیں اسے استغہای ندر سے غفلت

باندھے دیکھ رہی تھیں: "نہیں یہ ڈائری پسند آئے گی یا نا پسند؟ وہ بلا شک و شبہ وہ اسے پسند ہی نہیں کریں گے بلکہ اپنی بیوی کی تحسین بھی کریں گے۔"

"سے غالباً اتنی باریکیوں میں نہیں پڑنا چاہیے تھا یا شاید اسے لکھنے کی کوئی ضرورت ہی نہیں تھی،" نکولائی سوچ رہا تھا۔ لیکن اس سلسل اور اس تھک روحانی کاوش نے، جس کا واحد مقصد اپنے بچوں کی اخلاقی اصلاح تھا، اس کا دل باغ باغ کر دیا۔ اگر نکولائی اپنے حساسات کا تجزیہ کر سکتا اسے معلوم ہو جاتا کہ اسے اپنی بیوی کے ساتھ جو نرم و دھم، مستحضرانہ اور یقینی محبت تھی، اس کی اساس اس کے اسی جذبہ ہیبت پر تھی جو اس کے دل میں اس کی روحانیت اور اس رفیع و برتر اخلاقی دنیا کو دیکھ کر پیدا ہوتی تھی جس میں وہ تو رہتی تھی لیکن جو خود اس کی رسائی سے دور تھی۔

اسے اس بات پر ناز تھا کہ اس کی بیوی اتنی ذہین، سمجھ دار اور نیکو کار ہے۔ وہ روحانی اقلیم میں اس کے مقابلے میں اسے اپنی بے بضاعتی کا پورا احساس تھا۔ اس سے بھی بڑھ کر، سے خوش اس امر پر تھی کہ اس قسم کی روح کی مالک خاتون۔ صرف اس کی ہے بلکہ اس کی اپنی ذات کا حصہ ہے۔

"مائی ڈیر سٹ، مجھے یہ بہت، بہت پسند آئی ہے!" اس نے معنی خیز نظروں سے دیکھتے ہوئے اپنا فیصلہ سنایا اور مختصر وقفے کے بعد مزید کہا "آج میں نے، جیسی خاص بد تمیزی کا مظاہرہ کیا۔ تم سنڈی روم میں موجود نہیں تھیں۔ میری اور میری نکرار ہو گئی اور مجھے اپنے غصے پر قابو نہ رہا لیکن اسے قائل کرنا تھا ہی ناممکن ہے جتنا کہ کسی بچے کو! سمجھ میں نہیں آتا کہ اگر سنا شا اسے اپنی مٹھی میں نہ رکھے، پھر اس کا بے گام کیا؟ بھلا تم تصور کر سکتی ہو کہ وہ پیٹرز برگ کیوں گیا تھا؟... انھوں نے ایک جوا۔"

"ہاں، مجھے معلوم ہے، سنا شا نے مجھے بتایا تھا۔"

"اچھا، تو تحسین معلوم ہے،" نکولائی نے کہا۔ بحث انکر کی محفل یاد پر ہی اس کا خون دوبارہ کھولنے لگا تھا۔ "اس نے مجھے قائل کرنے کی کوشش کی کہ ہر راست باز آدمی کا یہ فرض بنتا ہے کہ وہ حکومت کی مخالفت کرے حالانکہ وفاداری، اور فرض شناسی کا حلف۔ مجھے انسوس ہے کہ تم وہاں موجود نہیں تھیں۔ ہوا یہ کہ وہ سب کے سب دینی سوچ اور سنا شا بھی۔ مجھ پر برسے گئے... سنا شا تو نری احمق ہے۔ ہمیں یہ تو معلوم ہے کہ وہ اسے اپنی ٹھنکی پر بچاتی پھرتی ہے لیکن جب بحث و تحسین ہوتی ہے، خود ڈاٹ کوئی بات جو جھجکتی نہیں۔ بس جو کچھ وہ کہتا ہے اس کی جنگاں کر دیتی ہے۔" نکولائی نے اس کا قابل مزاحمت میلان کے سامنے، جو ہمیں اپنے عزیزوں اور پیاروں پر کتہ چینی کی ترغیب دیتا ہے، سیر انداز ہوتے ہوئے مزید کہا۔

نکولائی کو معلوم نہیں تھا کہ جو کچھ وہ سنا شا کے بارے میں کہہ رہا تھا، لفظ بہ لفظ اس کے الہی بیوی سے تعلقات پر منطبق ہوتا تھا۔

"ہاں، یہ تو میرے مشاہدے میں آیا ہے،" کاؤٹس ماریا نے کہا۔
 "جس میں نے انھیں بتایا کہ فرض اور حلفیہ وفاداری کو سب پر فوقیت حاصل ہے، وہ خدا معلوم جواب میں کیا کہنے

اور ثابت کرنے لگا۔ افسوس، تم وہاں موجود نہیں تھیں۔ تم کیا کہتے ہیں؟

”میری رائے میں آپ سولہ آنے ٹھیک تھے۔ میٹر کہتے ہیں کہ ہر شخص مصیبت میں مبتلا ہے، اسے ایذا نہیں پہنچائی جا رہی اور بدعنوان بنایا جا رہا ہے اور یہ کہ ہمسائے کی مدد کرنا ہمارا فرض بنتا ہے۔ لارمب وہ کہتے بالکل ٹھیک ہیں،“ کاؤنٹس ماریانے کہا۔ ”لیکن وہ بھول جاتے ہیں کہ ہمارے اپنے قریب بھی کچھ لوگ ہیں، ان کے ہم پر حقوق ہیں اور خود خداوند نے بھی ہمیں ان کے متعلق فرائض کے بارے میں آگاہ کیا ہے، یہ کہ ہم اپنے آپ کو خطرے میں ڈال سکتے ہیں لیکن اپنے بچوں کو نہیں۔“

”بالکل ٹھیک، بالکل ٹھیک۔ عین عین یہی بات میں نے میٹر سے کہی تھی،“ نکورٹی نے کہا۔ اسے واقعی یقین تھا کہ اس نے بالکل یہی بات کہی تھی۔ ”لیکن وہ اپنی رائے پر۔ ہمسائے سے محبت اور عیسائیت۔ اصرار کرنا رہا۔ وروہ یہ سب باتیں نکولینکا کی موجودگی میں کرتا رہا جو سٹڈی روم میں آگیا تھا اور بیٹھا میری چیزیں توڑتا رہا تھا۔“

”نکورٹی، آپ کو معلوم ہے کہ مجھے اکثر نکولینکا کے بارے میں بڑی پریشانی رہتی ہے،“ کاؤنٹس ماریانے کہا۔ ”وہ غیر معمولی طور پر ذہین اور سمجھ دار لڑکا ہے اور مجھے ہمیشہ دھڑکا رہتا ہے کہ میں اپنے بچوں کی خاطر اسے نظر انداز کرتی رہتی ہوں۔ ہم سب کے اپنے بچے ورہستے دار ہیں مگر اس کا تو کوئی بھی نہیں۔ وہ ہمیشہ الگ تھلک اپنے خیالات میں مستغرق رہتا ہے۔“

”میرا خیال ہے کہ تمہیں اس کی وجہ سے اپنے آپ کو لامنت کرنے کی ضرورت نہیں۔ وہ مائیں جو ٹوٹ کر اپنے بچوں سے پیار کرتی ہیں، وہ بھی ان کے لیے اتنا کچھ نہیں کرتیں جو تم نے اس کے لیے کیا ہے اور اب بھی کر رہی ہو۔ اور ہاں، میں خوش ہوں کہ تم یہ سب کچھ کر رہی ہو۔ وہ اچھا لڑکا ہے، پچھلا لڑکا ہے!“ نکولائی نے دہراتے ہوئے کہا حالانکہ یہی طور پر اسے اس سے کوئی گناؤ نہیں تھا لیکن وہ ہمیشہ یہ ماننے کے لیے وہ اچھا لڑکا ہے، تیار رہتا تھا۔

”پھر بھی میں وہ تو نہیں ہوں جو ماں ہو سکتی ہے،“ کاؤنٹس ماریانے کہا۔ ”مجھے محسوس ہوتا رہتا ہے کہ میں وہ نہیں ہوں اور یہی، حساس میرے دل کو مسوتا رہتا ہے۔ وہ بہت نفیس لڑکا ہے لیکن میں اس کے متعلق اندیشوں میں گھری رہتی ہوں۔ اگر اسے دوست ور ساتھی مل جائیں، اس کے حق میں بہت اچھا رہے گا۔“

”خیر، اب اس میں زیادہ دیر نہیں لگے گی۔ میں انگلی گرمیوں میں اسے پیٹرز برگ لے جاؤں گا،“ نکولائی نے کہا۔ ”ہاں، میٹر ہمیشہ خواب دیکھتا رہتا ہے۔ دور ہمیشہ خوب دیکھتا رہے گا۔“ اس نے سٹڈی روم کے مہلتے کی طرف، جس نے صاف معلوم ہوتا تھا کہ اسے ذہنی طور پر پریشان کر دیا تھا، دوبارہ پلٹتے ہوئے کہا۔ ”خیر، یہ میرا مسئلہ نہیں کہ وہاں کیا ہو رہا ہے۔ اگر آراک چیف اور دوسرے لوگ بد معاش ہیں، مجھے اس سے کیا؟ میرا مسئلہ تو یہ تھا کہ جب میں نے شادی کی، میرا بال بال قرضے میں جکڑا ہوا تھا اور مجھے جیل بھجوائے جانے کی دھمکیاں مل رہی تھیں اور ادھر میری ماں تھی کہ اسے نہ کچھ نظر آتا تھا اور نہ وہ کچھ سمجھتی تھی۔ پھر تم ہو، ہمارے بچے ہیں، ہمارے معاملات ہیں۔ جب میں صبح سے شام تک زمینوں پر کام کرتا یا دفتر میں سفر ماری کرتا رہتا ہوں، تو کیا یہ سب کچھ میں اپنی

خوشی کی خاطر کرتا ہوں؟ نہیں مجھے معلوم ہے کہ مجھے محنت مشقت کرنا ہوگی تاکہ میری ماں آرام سے رہ سکے، میں تمہارے احسانات کا بدلہ چکا سکوں اور یہ بات یقینی بناسکوں کہ غربت کی جس دلدل میں میں پھنس گیا تھا، ہمارے بچے اس سے محفوظ رہیں۔“

پرس ماریا اسے بتانا چاہتی تھی کہ انسان صرف روٹی کے سہارے زندہ نہیں رہتا اور یہ کہ وہ اس کام کو ضرورت سے زیادہ اہمیت دیتا ہے لیکن وہ جانتی تھی کہ سے یہ بات بالکل نہیں کہنا چاہیے اور اس سے حاصل بھی کچھ نہیں ہوگا۔ اس نے صرف اتنا کہیا کہ اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا اور اس پر بوسہ ثبت کر دیا۔ نکواری نے اس کے اس انداز کو اس کی محض پسندیدگی اور اپنے خیالات کی توثیق تصور کیا۔ اور چند منٹ خاموشی سے غور و فکر کرنے کے بعد وہ با آواز بلند سوچنے لگا۔

”ماری، تمہیں معلوم ہے کہ“ اس نے کہا، ”ایم مٹرو فانچ“ (وہ اس کا ایک شیور، رز تھا) ”آج تاہوف جاگیر سے واپس آیا ہے۔ وہ مجھے بتاتا ہے کہ اب ہمیں جنگلات کے لیے اسی ہزار روٹل پیش کیے جا رہے ہیں۔“ اور نکواری بڑے جوشیلے انداز سے اترادنا یا جاگیر دو بارہ خریدنے کے امکانات کے متعلق گفتگو کرنے لگا۔ اس کا خیال تھا کہ اب اس میں زیادہ تاخیر نہیں ہوگی۔ ”اگر مجھے زندگی کے مزید دس سال مل گئے، میں بچوں کو ان کی ضروریات کے مطابق کافی کچھ بھی کر دوں گا۔“

کاؤنٹس، ماریا اپنے خاوند کی باتیں سنتی رہی، جو کچھ وہ کہہ رہا تھا، وہ اچھی طرح سمجھ رہی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ جب وہ اس بلند آہنگ انداز سے سوچتا ہے، وہ اس سے ہمیشہ پوچھتا رہتا ہے کہ وہ بھلا کیا کہہ رہا تھا اور اگر اسے معلوم ہو جائے کہ اس کا دھیان کسی اور طرف ہے، وہ تھکنا لگتا ہے۔ لیکن اسے اس کی باتوں پر توجہ دینے کے لیے اپنے آپ کو مجبور کرنا پڑتا تھا کیونکہ جو کچھ وہ کہہ رہا ہوتا تھا، اس میں اسے نام کو بھی دلچسپی نہیں ہوتی تھی۔ وہ اسے دیکھ رہی تھی اور گرچہ یہ بات پوری طرح تو درست نہیں تھی کہ اس کا دھیان کسی اور طرف تھا، تاہم اس میں کوئی کلام نہیں کہ اس کے احساسات کہیں اور بھٹک رہے تھے۔ اسے اس شخص کے ساتھ، جس کے متعلق اس کا خیال تھا کہ جو کچھ وہ سمجھتی ہے، وہ اسے کبھی سمجھ نہیں سکے گا، ملائم اور اطاعت شعارانہ محبت تھی۔ اور چونکہ جو کچھ وہ سمجھتی تھی، وہ اسے کبھی سمجھ نہیں پاتا تھا، معلوم ہوتا تھا کہ یہی چیز اس کے ساتھ اس کی محبت کو اور شدید بنا دیتی ہے اور اس میں گرم جوش ملائمت کی چاشنی کا اضافہ کر دیتی ہے۔ اس احساس کے علاوہ، جس میں وہ سر تا پا غرق تھی اور جو اس کے خاوند کے منصوبوں کو پوری طرح سمجھنے میں حارح ہو رہا تھا، ایسے خیالات، جن کا جو کچھ وہ کہہ رہا تھا، اس سے کوئی تعلق نہیں بناتا تھا، اس کے ذہن میں برق رفتاری سے گردش کر رہے تھے۔ اس کی سوچوں کا محور اس کا بھتیجا تھا (اس کے شوہر نے بیٹر کی گفتگو کے دوران میں اس کی جس پہچانی کیفیت کا ذکر کیا تھا، اس نے اس کے دل و دماغ پر گہرا اثر چھوڑا تھا) اور اسے اس کی حلیم اور حساس فطرت کے مختلف پہلو یاد آنے لگا۔ اپنے نتیجے کے متعلق سوچتے سوچتے اس کا دھیان اپنے بچوں کی طرف چلا گیا۔ اس نے اس کا موازنہ ان کے ساتھ نہیں کیا بلکہ وہ یہ موازنہ

اپنے بچوں کے متعلق اپنے احساسات اور اس کے متعلق اپنے احساسات کے مابین کرنے لگی، اور اسے یہ کچھ کر دیا
ہوا کہ گولینکا کے متعلق اس کے احساسات میں کسی چیز کا فقدان ہے۔

بعض اوقات اسے خیال گزرتا کہ اپنے بچوں اور گولینکا کے مابین اس کے احساسات کا فرق ان کی عمروں
کے مابین تفاوت کی پیداوار ہے، لیکن وہ اپنے آپ کو اس کا مجرم تصور کرتی تھی اور اب اس نے دل میں قسم کھائی کہ
وہ غلطی کرنے کی کوشش کرے گی اور ناممکن کو ممکن بنا دے گی۔ وہ اس زندگی میں اپنے شوہر، اپنے بچوں، گولینکا
اور جس طرح مسکا نے بنی نوع انسان سے محبت کی تھی، اسی طرح اپنے ساتھی انسانوں سے محبت کرے گی۔ کاڈنٹس
ماریا کی روح سدا ماحدود، اندی اور مطلق ذات تک رسائی کی آرزو کرتی رہتی تھی، چنانچہ اسے کبھی سکون نہیں ملا
تھا۔ اس کے چہرے پر کچھ اس قسم کی درشتی جھلکتی رہتی تھی جیسے اس کی روح، جو جسم کے بوجھ تلے دبی ہوئی تھی،
بندوبالا اور مخفی اذیت میں مبتلا ہو۔ گولینکا کی باندھ کر اسے دیکھنے لگا۔

”میرے خدا یا، اگر یہ فوت ہوگئی، ہمارا کیا بنے گا؟ جب اس کے چہرے پر اس قسم کے تاثرات نمایاں ہوں
لگتے ہیں، میرے دل میں اسی قسم کے دوسرے سراٹھانے لگتے ہیں!“ اس نے سوچا۔ وہ ایقوے کے رو برو دھڑک رہا
گیا اور شبینہ دعا مانگنے لگا۔

16

جب ناسا اور میٹر کو تنہائی میسر آئی، وہ بھی آپس میں بالکل اسی طرح گفتگو کرنے لگے جس طرح کہ صرف ہمار
بیوی ہی کر سکتے ہیں۔ بالفاظ دیگر وہ ایک ایسے طریقے سے، جو منطق کے تمام اصولوں کی نفی کرتا ہے اور جس
میں مقدمات (کبریٰ و صغریٰ)، استحضارات اور نتائج سے کوئی مدد نہیں لی جاتی، یوں، اپنے خیالات کا باہمی تبادلہ
کرنے لگے کہ گو وہ بہت تیز تیز باتیں کر رہے تھے، انھیں ایک دوسرے کا مدعا سمجھنے میں کوئی دشواری پیش نہ
آئی۔ ناسا اپنے خاوند کے ساتھ اس قسم کی گفتگو کی اتنی عادی ہو چکی تھی کہ گر میٹر باتوں کے دوران میں منطق
طرز بیان اختیار کر لیتا، تو اسے یہ اس کی امر کی واضح علامت معلوم ہونے لگتا کہ ان دونوں کے مابین لازماً کہیں
نہ کہیں کوئی نہ کوئی کڑ بڑ ہوگئی ہے۔ جب وہ ٹھنڈے دل و دماغ سے عقلی دلائل کے بل بوتے پر کوئی نتیجہ ثابت
کرنے لگتا اور اس کی مثال پر عمل کرتے ہوئے وہ خود بھی اسی راہ پر چل نکلتی، اس کا ہاتھ ٹھٹھکنے لگتا کہ اب ان کے
درمیان جھگڑا ہو کر رہے گا۔

جونہی وہ دونوں بیوی میں اکٹھے ہوئے، ناسا، جس کی سرور و محبت سے ستکھوں کی چٹلیاں پھیل رہی تھیں،
کھسکتے کھسکتے اس کے بالکل قریب ہوگئی۔ اس نے ایک لمحہ اس کا سر پکڑا، اپنی چھاتیوں سے لگایا، بھینچا اور کہنے لگی
”اب آپ میرے ہیں، صرف میرے، اب میں آپ کو جانے نہیں دوں گی۔“ اور اسی لمحے ان دونوں کے مابین وہ
گفتگو شروع ہوگئی جو منطق کے تمام قوانین کے یکسر برعکس تھی، اس لیے برعکس کیونکہ اس کے دوران میں بالکل بالکل

مختلف موضوعات پر ایک وقت زیر بحث آنے لگے۔ متعدد موضوعات پر ایک وقت گفتگو واضح تفہیم میں کوئی رکاوٹ نہ بنی بلکہ یہ اس بات کی واضح نشانی تھی کہ وہ ایک دوسرے کو اچھی طرح سمجھتے ہیں۔ جس طرح خواب میں اس احساس کے ماسوا، جو خواب پر حادی ہوتا ہے، ہر چیز غیر حقیقی، بے ربط اور متغیر ہوتی ہے، اسی طرح خیالات کے اس تباد لے میں، جو منطق کے تمام قوانین کی غی کر رہا تھا، سیاں بیوی جو الفاظ استعمال کر رہے تھے، وہ بذات خود منطقی اور واضح نہیں تھے لیکن انھیں جو جذبہ راگوار ہا تھا، وہ مربوط اور الجھاؤ سے پاک تھا۔

نشا نے میٹر کو بتایا کہ اس کے بھائی کے گھر کے معمولات کیسے چل رہے ہیں، اپنے شوہر کے بغیر اس کی حالت کتنی خستہ و خراب رہی ہے، وہ جی نہیں رہی تھی بلکہ محض گھسٹ رہی تھی اور وہ ماریا کی پہلے سے بھی کتنی زیادہ گرویدہ ہو چکی ہے کیونکہ وہ خود اس کی نسبت ہر لحاظ سے کہیں بہتر ہستی ہے۔ اس نے ماریا کی برتری کا قرار پرے خلوص سے کیا تھا، لیکن اس نے بین اسطور یہ بھی جتلا دیا کہ میٹر کی نگاہوں میں ماریا یا کسی دوسری عورت کے مقابلے میں ترجیح خود اسے ہی حاصل رہے گی۔ وہ اب جب کہ وہ پیٹرز برگ میں اتنی زیادہ تعداد میں دوسری عورتوں سے مل کر آیا ہے، وہ یہ چاہے گی کہ وہ اپنے اس عہد کا ر سر نو قرار کرے۔

چنانچہ میٹر نے اسے بتایا کہ پیٹرز برگ میں خواتین کی موجودگی میں اسے شام کی مجلس اور ڈنر کتنے ناگوار گزرتے رہے ہیں۔

”مجھ میں عورتوں کے ساتھ گپ شپ لڑانے کا سلیقہ باقی نہیں رہا،“ اس نے کہا۔ ”مجھے ہمیشہ بڑی کوفت ہوتی رہی، خاص طور پر اس لیے بھی کیونکہ میں بے حد مصروف تھا۔“

نشا نے اسے بڑے غور سے دیکھا اور کہنے لگی

”ماریا واقعی بہت نفیس ہے! جس طرح وہ بچوں کو سمجھتی ہے، اس پر قریب ہونے کو جی چاہتا ہے! معلوم ہوتا ہے کہ اسے ان کی ردحوں میں جھانکنے کا ملکہ حاصل ہے۔ مثلاً کل تیرا ضد کر رہا تھا۔“

”وہ بالکل اپنے باپ پر گویا ہے!“ میٹر بیچ میں بول پڑا۔

نشا کو معلوم تھا کہ اس نے تیرا کی نکو لئی سے مشابہت کے بارے میں یہ بات کیوں کہی ہے۔ اپنے برادر نسبتی سے تو تیرا کی یاد اس کے لیے نا خوشگوار تھی اور وہ جانا چاہتا تھا کہ نشا کا اس بارے میں کیا خیال ہے۔

”نکو لئی کی کمزوری یہ ہے کہ جب تک کسی بات کو عمومی سند نہیں مل جاتی، وہ کبھی اس سے متفق نہیں ہوتا۔ مگر میں سمجھتی ہوں کہ آپ جن چیزوں کو تیرا کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، ان سے نئے رستے کھتے ہیں،“ اس نے میٹر کا جملہ جو اس نے کبھی استعمال کیا تھا، دہراتے ہوئے کہا۔

”نہیں،“ چکی بات یہ ہے کہ نکو لائی کے لیے خیالات اور مباحث محض تفریح طبع کی چیزیں ہیں۔ بلکہ قریباً نصف اوقات میں،“ میٹر نے کہا۔ ”یہاں وہ نا بھری کی اسٹیمی کر رہا ہے اور اس نے یہ اصول بنا لیا ہے کہ جب تک وہ

سابقہ خرید کردہ کتاب نہیں پڑھ لے گا، ہرگز نئی نہیں خریدے گا۔ سسوندی،³⁵ زوسو اور نوٹس کی³⁶ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”تم جانتی ہو کہ میں نے کس طرح۔“ وہ اپنی نکتہ چینی کو قدرے نرم بنانا چاہتا تھا لیکن ناتاشا نے یہ جتانے کے لیے کہ اس کی ضرورت نہیں ہے۔“ سے ٹوک دیا۔

”تو آپ سمجھتے ہیں کہ اس کے لیے خیالات محض تفریح طبع کی چیز ہیں۔“

”ہاں، اور میرے لیے باقی سب کچھ محض تفریح طبع کی چیزیں ہیں۔ جب تک میرا بیٹرز برگ میں قیام رہا، مجھے ہر شخص یوں نظر آتا رہا جیسے میں انھیں خواب میں دیکھ رہا ہوں۔ جب میں کسی خیال میں مستغرق ہو جاتا ہوں، مجھے باقی سب کچھ تفریح اوقات معلوم ہوتا ہے۔“

”مجھے بہت افسوس ہے کہ جب آپ بچوں سے مل رہے تھے، میں وہاں نہیں تھی!“ ناتاشا نے کہا۔ ”سب سے زیادہ کون خوش تھا؟ لسا، میں دعوے سے کہہ سکتی ہوں۔“

”ہاں۔“ بیٹر نے جواب دیا اور جو کچھ اس کے ذہن میں تھا، دوبارہ اس پر بات کرنے لگا۔ ”نکس کی کہتا ہے کہ ہمیں سوچنا نہیں چاہیے لیکن مجھ سے ایسا نہیں ہو سکتا۔ علاوہ ازیں، جب میں بیٹرز برگ میں تھا، مجھے محسوس ہوتا تھا (یہ بات میں تم سے کہہ سکتا ہوں) کہ اگر میں وہاں نہ ہوتا تو سارا معاملہ گڑبڑ ہو جاتا۔ ہر شخص پٹی بات منوانے پر تلا ہو تھا۔ لیکن میں ان سب کو متحد کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ پھر میرے خیالات میں کوئی الجھاؤ نہیں، وہ بالکل سیدھے سارے ہیں اور آسانی سے سمجھ میں آ سکتے ہیں۔ تم جانتی ہو کہ میں یہ نہیں کہتا کہ ہمیں اس یا اس چیز کی مخالفت کرنا چاہیے۔ ممکن ہے کہ ہم غلطی پر ہوں۔ لیکن جو کچھ میں کہتا ہوں، وہ یہ ہے: وہ لوگ جنہیں راستی سے پیار ہے، انھیں ایک جھنڈے۔ فعال کو کاری کا جھنڈا۔ تلے متحد ہو جانا چاہیے۔ پرنس سر جی نفیس آدمی ہے اور ہوشیار بھی۔“

ناتاشا کو بیٹر کے خیالات کی عظمت کے بارے میں کوئی شبہ نہ ہوتا لیکن ایک بات اسے پریشان کر رہی تھی: ”کیا یہ شخص، جو معاشرے کے لیے اتنا ہم ہے، جس کا کوئی بدل نہیں، میرا خاوند بھی ہو سکتا ہے؟ یہ کیسے ہو گیا؟“

اسے یہ بات کچھ صحیح نہیں معلوم ہوتی تھی اور وہ اس بارے میں اپنے وسوسوں کا اظہار اس سے کرنا چاہتی تھی۔ ”وہ کون لوگ ہیں جو یہ فیصلہ کر سکتے ہیں کہ وہ دوسروں سے زیادہ سمجھ دار اور ہوشیار ہے؟“ اس نے اپنے ذہن میں ان تمام اشخاص کا، جن کا بیٹر احترام کرتا تھا، جائزہ لیتے ہوئے اپنے آپ سے پوچھا۔ وہ جو باتیں کہتا رہا تھا، ان سے اندازہ لگاتے ہوئے وہ اس نتیجے پہنچی کہ جن لوگوں کو وہ عزت کی نگاہوں سے دیکھتا ہے، ان میں چارٹون کاراٹامیف سرفہرست ہے۔

”آپ کو معلوم ہے کہ میں کیا سوچ رہی تھی؟“ اس نے پوچھا۔ ”چارٹون کاراٹامیف کے متعلق۔ وہ کس

طرح سوچتا؟ آپ جو کچھ کہہ رہے ہیں، وہ اسے پسند کرتا؟“

• بیٹر کہتا ہے چاہتا تھا کہ ٹول کی ایک طرف تو انقلاب مستحقین کی کتابیں پڑھتا ہے، دوسری طرف عملی زندگی میں رجعت پسندی آ رہی ہے۔

بیشتر یہ سوال سن کر ذرا بھی حیرت نہ ہوا وہ سمجھ گیا تھا کہ اس کی بیوی کے خیالات کی رد میں مست میں جا رہی ہے۔
 ”پلاطون کا راتامیف؟“ اس نے کہا اور گہرے سوچ بچار میں کھو گیا۔ صاف معلوم ہو رہا تھا کہ وہ یہ تصور کرنے کی کوشش کر رہا ہے کہ اس معاملے میں کاراٹامیف کی کیا رائے ہوتی۔ ”ہاں اس کی سمجھ میں نہ آتی... یا شاید وہ سمجھ ہی جاتا۔“

”مجھے آپ سے بے پناہ پیار ہے!“ ناشا نے یک نعت با آواز بلند کہا۔ ”بے پناہ“ بے حد حساب“
 ”نہیں، اسے یہ بات پسند نہ آتی،“ ڈیکٹر نے غور و فکر کے بعد کہا۔ ”وہ جس چیز کو پسندیدگی کی نظروں سے دیکھتا، وہ ہماری خاندانی زندگی ہے۔ وہ ہمیشہ ہر چیز میں خوش اسلوبی سکون اور مسرت و صوفیانہ ہوتا تھا اور میں بڑے فخر سے اس سے کہہ سکتا تھا ’ذرا ہماری طرف دیکھو۔‘... بری یہ بات کہ تمہیں میری غیر حاضری بہت ناگوار گزرتی ہے تو میں اگر تمہیں یہ بتاؤں کہ مفارقت کے بعد مجھے تم سے اور بھی محبت ہو جاتی ہے، تو تم شاید یقین نہیں کرو گی۔“
 ”ہاں، میں کہنا یہ چاہتی تھی۔“ ناشا نے اپنی بات دربارہ شروع کرتے ہوئے کہا۔

”نہیں، بات یہ نہیں ہے۔ کوئی لمحہ ایسا نہیں گزرتا جب میں تمہاری محبت اپنے دل میں محسوس نہیں کرتا اور کوئی شخص اس سے زیادہ محبت نہیں کر سکتا۔ لیکن جدائی کے بعد یہ خاص الخاص چیز بن جاتی ہے۔ غیر، تمہیں معصوم ہی ہے۔“ اس نے اپنی بات ختم نہ کی کیونکہ ان کی نگاہوں نے، جن کا ایک دوسرے سے آسنا سا منہ ہو رہا تھا، باقی سب کچھ کہہ دیا تھا۔

”لوگ کہتے ہیں کہ بہترین مسرت سنی مومن کے دنوں اور شادی کے ابتدائی دور میں ملتی ہے۔ بالکل بالکل یعنی اور وہیات بات ہے!“ ناشا نے اچانک اونچے لہجے میں کہا۔ ”اس کے برعکس، بہترین کادنت تو اب آیا ہے۔ صرف آپ کہیں جایا نہ کریں! آپ کو یاد ہے کہ ہم آپس میں کیسے جھگڑا کرتے تھے؟ اور غلطی ہمیشہ میری ہوتی تھی، ہمیشہ میری اور ہمارا جھگڑا کس بات پر ہوتا تھا۔ مجھے تو کچھ یاد بھی نہیں۔“

”ہمیشہ ایک ہی بات،“ ڈیکٹر نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”جس۔“

”مت لیں اس کا نام! مجھ سے برداشت نہیں ہوتا۔“ ناشا نے کہا اور اس کی آنکھیں بے مہر اور تقاضا کی حرارت سے دھکنے لگیں۔ ”آپ اس سے بے تھے؟“ اس نے قدرے توقف کے بعد پوچھا۔
 ”نہیں، اگر میری اس سے ملاقات ہو بھی جاتی، میں اسے پہچان نہ پاتا۔“

وہ کچھ دیر خاموش رہے۔

”وہ، آپ کو معلوم ہے کہ جب آپ مٹھی روم میں باتیں کر رہے تھے، میری نظریں آپ پر لگی ہوئی تھیں۔“
 ناشا نے مہر سکوت توڑتے ہوئے کہا۔ ان دونوں کے مابین جڑ کشیدگی پیدا ہو گئی تھی، صاف معلوم ہو رہا تھا کہ وہ اسے دور کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔ ”آپ دونوں۔ آپ اور بچے“ (اس کا اشارہ اپنے بیٹے کی طرف تھا)۔ ”کے مابین وہی مشابہت ہے جو مٹر کے دو دانوں میں ہوتی ہے۔ ارے، میرے واپس جاے کادنت ہو گیا۔... میرا

دودھا تر رہا ہے۔ آپ کو چھوڑتے مجھے دکھ ہو رہا ہے۔

ایک بار پھر دونوں کئی لمحے خاموش رہے۔ پھر اچانک ان کی نظریں چار ہوئیں اور دونوں بیک وقت ہونے لگے۔ میٹر کے لمبے میں خود اطمینان اور جوش و خروش جھٹک رہا تھا جب کہ مناش خوشی سے مسک رہی تھی۔ شروع شروع دونوں ہی بیک وقت ہوئے تھے لیکن دونوں ہی رک گئے تاکہ دوسرے کو اپنی بات ختم کرنے کا موقع مل سکے۔

”نہیں، تم کیا کہنا چاہتی تھیں؟ کہو، کہنا۔“

”نہیں، آپ۔ میری بات بالکل لایعنی تھی۔“

میٹر نے جو بات شروع کی تھی وہ اس نے ختم کر دی۔ میٹر بزرگ میں اپنی کامیابی پر اسے جواطمینان اور خوشی ہوئی تھی، یہ اس کا ثمرہ تھا۔ اس وقت اسے محسوس ہو رہا تھا کہ روسی معاشرے اور کل دنیا کو ایک نئی جہت دینے کے لیے اسے منتخب کر لیا گیا ہے۔

”میں صرف یہ کہنا چاہتا تھا کہ ایسے تمام خیالات، جو بدست ستانج پیدا کرتے ہیں، ہمیشہ سیدھے سادے اور عام فہم ہوتے ہیں۔ میری خواہش صرف یہ ہے کہ اگر بد فطرت اور بد کردار لوگ متحیر ہو سکتے اور وقت بن سکتے ہیں، پھر راست باز لوگ بھی یہی کریں۔ دیکھ، کتنی سیدھی سادی بات ہے؟“

”ہاں۔“

”اور تم کیا کہنا چاہتی تھیں؟“

”ارے کچھ نہیں، کچھ نہیں۔ بالکل لایعنی بات۔“

”خیر، جو کچھ بھی ہو، اب کہہ ڈالو۔“

”ارے، کچھ نہیں، واقعی کچھ نہیں،“ مناشا کے چہرے پر اب پہلے سے بھی زیادہ درخشاں تبسم پھیل چکا تھا اور اس کا رو آس رو آں دھنکے لگا تھا۔ ”میں تو صرف پیتا کے بارے میں بتانا چاہ رہی تھی۔ آج لگتا ہے بیٹے میرے پاس آئی اور وہ ہنسنے لگا، اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور وہ میرے ساتھ چمٹ گیا۔ میں یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ اس کا خیال تھا کہ وہ اس طرح چھپ رہا ہے۔ وہ بے حد پیارا بچہ ہے! ارے، وہ رد رہا ہے۔ اچھا، خدا حافظ۔“

اور وہ کمرے سے باہر نکل گئی



دیس اشاعتی محل میں کولین کا بلکوسکی کے کمرے میں حسب معمول چھوٹا لپ جل رہا تھا۔ (لڑکے کو اند میرے سے ڈرا تار ہوتا تھا اور وہ اسے اس کے اس خوف سے چھٹکارا نہیں دلا سکے تھے۔) دیوال چار تکیوں کے اوپر سرنگاے سو رہا تھا اور اس کی رومی ناک سے تال میل سے خراٹوں کی آوازیں نکل رہی تھیں۔ کولین ابھی ابھی ہڑا کر جاگا تھا۔ وہ ٹھنڈے پسینے میں نہایا ہوا تھا۔ اس کی آنکھیں پوری طرح کھلی تھیں اور وہ ٹھنڈی بانڈھے سیدھا سامنے دیکھ رہا تھا۔

تھا۔ اسے ڈراؤ نے خواب نے جگایا تھا۔

اس نے خوب میں دیکھا کہ وہ اور انکل بیٹر اس قسم کے خود (ہیلست)، جس کی تصویر اس کی پلویارک³⁸ کی کتاب ”متوازی زندگی“ میں تھی، پہنے ہوئے ہیں اور بہت بڑے لشکر کی قیادت کر رہے ہیں۔ فوج توجھے سفید دھاگوں پر مشتمل تھی۔ ان دھاگوں سے ساری نفاصہ سورتھی۔ یہ دھاگے کڑی کے دھاگوں کی، خند تھے جو موسم خزاں میں، دھرا دھرا ڈرتے پھرتے ہیں۔ دیساں انھیں *le fil de la vierge* کہا تھا۔ ان کے سامنے شان و شوکت تھی۔ وہ بھی ان دھاگوں سے بالکل مشابہ تھی لیکن ان سے قدرے مضبوط تھی۔ وہ اور دیگر ٹوپر دانتے اور بہت خوش تھے۔ وہ لحظہ بہ لحظہ اپنی منزل کے قریب سے قریب تر ہوتے جا رہے تھے۔ اچانک وہ دھاگے، جو انھیں اڑائے لیے جا رہے تھے، ڈھیلے پڑنے اور آپس میں الجھنے لگے۔ ان کے سامنے انکل نکولائی کھڑا تھا۔ اس کا چہرہ درشت اور انداز تہدید آمیز تھا۔

”یہ تمھاری حرکت ہے؟“ اس نے چند ٹولے پھولے ٹکسوں اور ماکھ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”میں تم سے محبت کرتا تھا لیکن میں آراک چیف کے حکم کا بندہ ہوں اور تم میں سے جس سے ایک بھی قدم آگے بڑھایا، میں اسے ہلاک کر دوں گا۔“ نکولینکا نے بیٹر کی تلاش میں اپنے گرد و پیش دیکھا لیکن بیٹر اب وہاں نہیں تھا، اس کی جگہ اس کا باپ۔ پرنس آندرے۔ وہاں کھڑا تھا۔ اس کے باپ کی کوئی شکل تھی نہ صورت، لیکن وہ وہاں موجود تھا۔ جب نکولینکا نے اسے دیکھا، محبت نے اس کی قوت سلب کر لی، اسے محسوس ہونے لگا کہ وہ بالکل بے بس ہو چکا ہے اور اس کے جسم میں نہ ہڈیاں ہیں اور نہ گودا۔ اس کے باپ نے اسے تھپکا یا، سہلایا، اسے تسلیاں دیں اور اس کی حالت پر ترس کھایا لیکن انکل نکولائی ان کے قریب سے قریب تر آتا جا رہا تھا۔ نکولینکا کو دہشت نے اپنے شکنجے میں جکڑ لیا اور اس کی آنکھ کھل گئی۔

”میرے دادا“ اس نے سوچا (اگرچہ گھر میں پرنس آندرے کے دو پورٹریٹ تھے لیکن نکولینکا کبھی اپنے ذہن میں اس کی کوئی تصویر نہ بنا سکا۔) ”میرے پاپا میرے پاس ہیں۔ انھوں نے مجھے سہلایا اور پیار کیا تھا۔ وہ میرے ساتھ خوش تھے۔ انھوں نے انکل بیٹر کو پسند فرمایا تھا۔ جو کچھ انکل بیٹر کہیں گے، میں وہی کروں گا۔ سو بیس سیو³⁹ لائے اپنا ہاتھ جلا لیا تھا، اس قسم کا کوئی واقعہ میرے ساتھ کیوں نہیں پیش آتا؟ میں جانتا ہوں کہ میرے سب گھر والے چاہتے ہیں کہ میں تعلیم حاصل کروں اور میں حاصل کروں گا۔ لیکن کوئی روز آئے گا جب میں اسے عمل کروں گا، پھر میں کوئی کام کروں گا۔ میں خداوند سے صرف ایک چیز کا طلب گار ہوں، جو کچھ بیٹر مارک (کی کتاب) کے آدمیوں کے ساتھ پیش آیا، وہی میرے ساتھ پیش آئے۔ جو کچھ انھوں نے کیا تھا، میں بھی کروں گا، بلکہ بہتر انداز سے کروں گا۔ ہر شخص مجھے جاننے لگے گا، مجھ سے محبت کرے گا اور میری تحسین کرے گا۔“ اچانک نکولینکا کو محسوس ہوا کہ اس کے سینے میں آہیں اٹھ رہی ہیں اور وہ رونے لگا۔

"Etes vous indispose" اسے دیال کی آواز سنائی دی۔

"Non" نکولینکا نے جواب دیا وروہ دوبارہ ہنسی پر لیٹ گیا۔

"وہ نیک اور مہربان ہیں اور میں ان کا شیدائی ہوں،" اس نے دیال کے متعلق سوچا۔ "لیکن انکل جیکر آدھے
کتنے لہ جواب آدی ہیں! اور میرے والد؟ پاپا، پاپا، ہاں، میں کوئی نہ کوئی کارنامہ ایسا ضرور سرانجام دوں گا کہ وہ بھی
مطمئن ہو جائیں۔"

تاریخ کا موضوع اقوام اور بنی نوع انسان کی حیات ہے۔ بنی نوع انسان تو بہت دور کی بات ہے، کسی واحد قوم کی زندگی کو بھی گرفت میں لانا اور اغماظ کا جامہ پہنانا۔ صحیح سمجھ بیان کرنا۔ ناممکن نظر آتا ہے۔

کسی قوم کی زندگی کو، جو بظاہر گرفت میں نہیں آتی، گرفت میں لانے اور بیان کرنے کے لیے مورخیں قدیم نے یکساں سیدھا سادا طریقہ اختیار کیا۔ وہ انفرادی اشخاص کی، جو لوگوں پر حکومت کرتے تھے، سرگرمیوں کو موضوع بحث بنا لیتے تھے اور سمجھ لیتے تھے کہ ان کی سرگرمیوں میں حیث الجماعت پوری قوم کی سرگرمیوں کا عکس کر لیتی ہیں۔

رہے یہ سوالات: ان افراد نے اقوام کو اپنی خواہشات کے مطابق کس طرح عمل کرنے پر مجبور کیا اور خود ان افراد کے منشا کی رہنمائی کس نے کی؟ قدما نے پہلے سوال کا جواب ایک ایسے دیوتا یا معبود کے، جو اقوام کو چنیدہ اشخاص کی مرضی کے تابع بنا دیتا ہے، وجود کا اقرار کر کے دیا۔ دوسرے سوال کے جواب میں انھوں نے کہا کہ یہی معبود ان چنیدہ اشخاص کی رہنمائی کرتا ہے تاکہ ان مقاصد کی، جنہیں مقدر کیا جا چکا ہے، تکمیل ہو سکے۔

قدما کا خیال تھا کہ اس عقیدے کی، کہ معبود بنی نوع انسان کے معاملات میں براہ راست دخل ہوتا ہے، جسیم کر لینے سے یہ سوالات خود بخود حل ہو جاتے ہیں۔

جدید تاریخ کے نظریے میں ان دونوں دعاوی کو مسترد کر دیا گیا ہے۔

بادی النظر میں تو یہی خیال گزرے گا کہ حقد میں کے اس عقیدے کو، کہ انسان کسی دیوتا کا محکوم ہے یا اقوام کی کسی پیشگی طے شدہ مقصد کی طرف رہبری کی جاتی ہے، مسترد کر دینے کے بعد جدید تاریخ اقدار کے محض عکاس ہر کی ہی نہیں، بلکہ ان وجوہ کا بھی، جو اس اقتدار کو وجود میں لاتی ہیں، مطالعہ کرے گی۔ لیکن جدید تاریخ نے اس کا بیڑا نہیں اٹھایا۔ اگرچہ وہ نظری اعتبار سے قدما کے موقف کو مسترد کر چکی ہے مگر عملاً دراصل ابھی تک ان ہی کی لکیر پیٹنے جا رہی ہے۔

اب یہ تو نہیں کہا جاتا کہ انسان خدا کی طرف سے عطا کردہ اختیارات سے بہرہ ور ہیں اور مشیت خداوندی ان کی براہ راست رہبری کرتی ہے۔ اس کی بجائے جدید تاریخ نے غیر معمولی اور نوق البشر صلاحیتوں کے مالک، ہیرو

تراش لیے ہیں یا مطلق احسان شہنشاہوں سے اخبار نویسوں تک ہر درجے اور صنف کے ہیرو لے کھڑے کر دیے ہیں اور دھوکئی یہ ہے کہ عوام کی رہنمائی کا فریضہ یہ لوگ سرانجام دیتے ہیں۔ یہودی، یونانی یا رومی اقوام کے خدا کی طرف سے مقرر کردہ مقاصد کی بجائے، جو قدما کی نظروں میں بنی نوع انسان کے مقاصد قرار پاتے تھے، جدید تاریخ فراموشی، جرمن یا انگریز قوم کی صلاح و بہبود یا جب یہ بہت اونچا سوچتی ہے، تمام انسانوں کی (جن سے عام طور پر مراد وہ اقوام ہوتی ہیں جو ایک بڑے براعظم کے چھوٹے سے ٹکڑوں مغربی گوشے میں آباد ہیں) فلاح و بہبود اور تہذیب و آرائستگی اپنے مقاصد بنالیتی ہے۔

جدید تاریخ نے کوئی نیا تصور، جو قدما کے عقاید کی جگہ لے سکا، پیش کیے بغیر ان کا نظریہ مسترد کر دیا ہے۔ بظاہر مورخین بادشاہوں کے الٰہی اختیار کے دعوے کو جھٹلاتے نظر آتے ہیں اور متقدمین کی طرح "تقدیر" کے قائل بھی معلوم نہیں ہوتے۔ ان کا رد یہ صورت حال کا منطقی تقاضا ہے لیکن حقیقتاً پہنچتے وہ بھی اس ہی نتائج پر ہیں کہ اس کے لیے وہ راستہ مختلف اختیار کرتے ہیں۔ یہ الفاظ دیگر وہ یہ تسلیم کرتے ہیں کہ ۱۔ قوموں کی قیادت اراد کرتے ہیں اور ۲۔ ایک منزل مقصود موجود ہے اور اقوام اور بنی نوع انسان اس کی جانب بڑھ رہے ہیں۔

مکس² سے یگل³ تک تمام جدید مورخین بظاہر ایک دوسرے سے اختلاف کرتے نظر آتے ہیں اور دیکھے میں ان کے خیالات میں تباہی پائی جاتا ہے، لیکن اصل ان کی تصنیفات کی سرس انھی دو قدیم اور اٹل مفروضوں پر قائم ہے۔ اول: مورخ ان افراد کی جنہوں نے اس کے خیال کے مطابق انسانوں کی رہنمائی کی ہے اور اس سے اپنی بات منوئی ہے (ایک مورخ صرف شاہی حکمرانوں، فوجی کمانڈروں اور وزیروں کو اس زمرے میں شمار کرتا ہے، جب کہ دوسرا حکمرانوں کے علاوہ شعلہ بیان مقررین، علماء و فضلاء، مصلحین، شعراء اور فلسفیوں کو بھی شامل کر لیتا ہے)۔ سرگرمیوں بیان کرتا ہے۔ دوم: مورخین یہ فرض کر لیتے ہیں کہ جس منزل مقصود کی جانب اقوام کی رہنمائی کی جاتی ہے، وہ اس سے آگاہ ہیں۔ یک کے نزدیک یہ رومی، ہسپانوی یا فرانسیسی امپراطور یہ کی سرفرازی ہے۔ دوسرے کے خیال میں یہ حریت، مساوات اور خاص قسم کی تہذیب ہے جس کا سک دنیا کے ایک چھوٹے سے خطے موسوم بہ یورپ میں چل رہا ہے۔

1789 میں پیرس میں بے چینی کا آغاز ہوتا ہے۔ یہ بڑھتی ہے، پھیلتی ہے اور اقوام کی مغرب سے شرق کی جانب نقل و حرکت میں اظہار کا راستہ بنالیتی ہے۔ اس نقل و حرکت کا رخ بار بار شرق کی طرف موڑا جاتا ہے۔ شرق سے مغرب کی طرف جوابی نقل و حرکت ہوتی ہے اور دونوں کا آپس میں تصادم ہو جاتا ہے۔ 1812 میں مغرب سے شرق کی سمت میں نقل و حرکت اپنی انتہا کی حد۔ ماسکو پر منہج ہوتی ہے۔ پھر نقل و حرکت کا رخ شرق سے مغرب کی طرف ہو جاتا ہے۔ دونوں میں حیرت انگیز ممانعت پائی جاتی ہے۔ دوسری نقل و حرکت چین میں پہلی نقل و حرکت کی طرح وسطی یورپ کی اقوام کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے۔ درانہیں اپنے ساتھ بہا لے جاتی ہے۔ جوابی نقل و حرکت پہلی حرکت کے نقطہ آغاز پر۔ پیرس پر منہج ہوتی ہے اور اس کا زور ٹوٹ جاتا ہے۔

چوبیس سال پر محیط اس زمانے میں لاتعداد کھیت بلا کاشت چھوڑ دیے جاتے ہیں، مکانوں کو نذر آتش کر دیا جاتا ہے، تجارت اپنی جہت تبدیل کر لیتی ہے، لاکھوں انسان ترک وطن کرتے ہیں، لڑکت و کشت کا شکار ہوتے ہیں یا مال و دولت سے تجوریاں بھر لیتے ہیں اور لاکھوں عیسائی، جو اپنے پڑوسی سے محبت کے اصول کا دم بھرتے ہیں، ایک دوسرے کو موت کے گھاٹ اتار دیتے ہیں۔

اس سب کچھ کا مطلب کیا ہے؟ ایسا کیوں ہوا؟ آخر وہ کون سی چیز تھی جس نے ان لوگوں کو مکانات نذر آتش کرنے اور ایک دوسرے کو ہلاک کرنے کی ترغیب دی؟ کس طاقت نے انسانوں کو یہ طرز عمل اختیار کرنے پر مجبور کیا؟ ان واقعات کی وجوہ کیا تھیں؟ یہ بالکل جلی، سیدھے سادے اور اہمائی جائز سوالات ہیں، جو بنی آدم، جب انھیں اس زمانے کی یادگاروں اور قصے کہانیوں سے واسطہ پڑتا ہے، اپنے آپ سے پوچھتے ہیں۔

ان سوالات کے جوابات کے لیے ہم علم تاریخ کی طرف، جس کا مقصد اقوام اور انسانوں کو اپنے آپ کو جاننا سکھانا ہے، رجوع کرتے ہیں۔

اگر تاریخ حقدارین کے نظریے سے جٹی رہتی تو وہ کتنی معبود نے اپنے بندوں کو جز یا سزا دینے کے لیے نبولین کو انتظار سے سرفراز فرمایا اور اپنے الوہی مقصد کی تکمیل کے لیے اس کے منشا کی رہنمائی کی۔ اور یہ جواب کافی اور ثنائی ہوتا۔ آپ نبولین کی الوہی معنویت کو، نہیں یا نہ مانیں، لیکن وہ شخص جو اس کو مانا ہے، اس کے لیے اس زمانے کی تاریخ قطعاً ناقابل فہم نہیں ہوگی اور نہ اسے اس میں کوئی تافض نظر آئے گا۔

لیکن موجودہ تاریخ اس طریقے سے جواب نہیں دے سکتی۔ سائنس حقدارین کے اس تصور کو صحیح تسلیم نہیں کرتی کہ خدا یا دیوتا بندوں کے امور میں براہ راست دخل ہوتا ہے، چنانچہ تاریخ کو جواب ہائے دیگر دینا ہوں گے جب تاریخ کا تیارہ رسہ فکر ان سوالات کے جوابات دیتا ہے، تو وہ کہتا ہے: ”آپ مظلوم کرنا چاہتے ہیں کداس نقل و حرکت کا مطلب کیا ہے، اس کا سبب کیا چیز بنی اور کون سی طاقت ان واقعات کو ظہور میں لائی؟“ تو سنیں۔

”کوئی چہار دہم ہزار مسکبر اور خردماغ شخص تھا۔ اس کی فلاں نکلاں داستانیں تھیں اور فلاں فلاں اس کے وزیر تھے اور وہ فرانس پر پڑے گھٹی طریقے سے حکومت کرتا تھا۔ لوئی کے جانشین بھی کمزور لوگ تھے اور ان کا حکومت کرنے کا انداز بھی بڑا شرمناک اور گھٹیا تھا۔ اور ان کے فلاں فلاں چہیتے اور فلاں فلاں داستانیں تھیں۔ مزید برآں، اس زمانے میں بعض اشخاص کتابیں تحریر کر رہے تھے۔ انھارویں صدی کے اختتام پر پیرس میں کوئی دو درجن اشخاص اکٹھے ہوئے اور وہ اس قسم کی گفتگو کرنے لگے تمام انسان آزاد اور برابر ہیں۔ ان تمام باتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ فرانس کے طول و عرض میں لوگ ایک دوسرے کو یہ تیغ کرنے اور فنا کے گھاٹ اتارنے لگے۔ انھوں نے بادشاہ کو بھی نہ بخشا اور بہت سے دوسرے لوگوں کی طرح اس کی بھی گردن مار دی۔ اس زمانے میں فرانس میں ایک نابینا بزرگ شخص۔ نبولین۔ موجود تھا۔ اس نے ہر شخص کو اپنا مطیع بنالیا۔ یوں کہیں کہ چونکہ وہ بہت بڑا عتقری تھا، اس لیے اس نے لوگوں کی بہت بڑی تعداد کو ہلاک کر دیا۔ کسی وجہ سے وہ افریقہ کیوں کا قتل عام کرنے چل پڑا۔ اس نے ان افریقیوں کو اتنی بڑی تعداد میں

قتل کیا اور اس کام میں ایسی ہوشیاری اور چالاکی کا مظاہرہ کیا کہ جب وہ فرانس واپس آیا، اس نے ہر شخص کو حکم دیا کہ وہ اس کی اطاعت کرے اور ہر شخص اس کی اطاعت کرنے لگا۔ اس نے اپنے آپ کو امپراطور بنایا اور ایک بادشاہ اٹالیا، آسٹریا اور پریشیا میں لوگوں کو قتل کرنے چل پڑا۔ ان ممالک میں بھی اس نے بے شمار اشخاص کو ہلاک کر دیا۔ اور روس میں ایک امپراطور الیکساندر تھا۔ اس نے یورپ میں نظم بحال کرنے کا عزم کر لیا، چنانچہ وہ پولین کے خلاف برسر پیکار ہو گیا۔ لیکن 1807 میں اس نے اچانک پولین سے دوستی گانتھ لی تاہم 1811 میں وہ دوبارہ اس سے جھگڑ پڑا۔ اس کے بعد دونوں نے لاتعداد اشخاص کو ہلاک کرنے کا شغل اختیار کر لیا۔ پولین نے چھ لاکھ فوج اکٹھے کیے اور روس پر چڑھائی کر دی۔ اس نے ماسکو تھیر کر لیا لیکن اس کے بعد وہ ایک دم ماسکو سے بھاگ کر اہولہا اس کے فرار کے بعد امپراطور الیکساندر نے شٹائن⁵ اور دوسرے لوگوں کے مشورے پر یورپ کے دشمن کے خلاف یورپی ممالک کو متحد کیا۔ پولین کے تمام اتحادی دیکھتے ہی دیکھتے اس کے دشمن بن گئے اور اس نے جزیرہ ایسی افواج مجتمع کی تھیں، وہ ان پر چڑھ دوڑے۔ اتحادیوں نے پولین پر فتح پائی، پیرس میں داخل ہوئے اور انھوں نے پولین کو تخت سے دست بردار ہونے پر مجبور کر دیا۔ انھوں نے اسے جزیرہ ایلہا میں بھیج دیا۔ اور اس حقیقت کے باوجود کہ پانچ سال قبل ہر شخص کہتا تھا (اور ایک سال بعد کہے گا) کہ وہ قزاق اور قانون کا بھگوت ہے، انھوں نے اسے امپراطور کے خطاب سے محروم نہ کیا اور اس کے ساتھ پورے عزت و احترام کا برتاؤ کیا۔ تب لونی ہڑ دہم، جوں وقت تک فرانسیسیوں اور اتحادیوں دونوں کے لیے محض نشانیہ تھیک تھا، حکومت کرنے لگا۔ جہاں تک پولین کا تعلق ہے، اس نے پہلے تو *garde vieille* کے سامنے آنسو بہائے، پھر تخت سے دست برداری کا اعلان کیا اور جلد وطن ہو گیا۔ پھر عیار اور چٹتر باز مدبروں اور سفارت کاروں نے (خاص طور پر ہالی غائب نے، جو مشہور بازوؤں والی کرنا پر کسی دوسرے سے پہلے بیٹھنے اور اس طرح فرانس کی سرحدوں کی توسیع کرانے میں کامیاب ہو گیا) وہاں میں مذاکرات کا اہتمام کیا اور یوں انھوں نے، قوام کو خوش یا ناخوش کر دیا۔ اچانک بادشاہوں اور سفارت کاروں میں جھگڑا ہوتے ہوتے رہ گیا۔ وہ ایک دوسرے کو ہلاک کرنے کے لیے اپنی اپنی افواج کو حکم دیا ہی چاہتے تھے کہ پولین ایک بٹالین کی معیت میں فرانس پہنچ گیا اور فرانسیسی، جو ایک منٹ پہلے اس سے نفرت کا اظہار کرتے تھے، بلا تاخیر اس کے سامنے سرنگوں ہو گئے۔ اس پر اتھ دی بادشاہ جلاں میں آگئے اور انھوں نے فرانس کے خلاف دوبارہ علم جنگ بند کر دیا۔ انھوں نے نابغہ روزگار پولین کو شکست دی، ایک ایک کی اسے قزاق ٹھہرایا اور پینٹ ہیلیا کے جزیرے پر بھیج دیا۔ جلد وطن اپنے وطن عزیز و اقارب اور محبوب فرانس سے دور، بہت دور، اس چٹانی جزیرے پر ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر گیا اور اپنے عظیم کارناموں کی میراث آئندہ نسلوں کے لیے چھوڑ گیا۔ جہاں تک یورپ کا تعلق ہے، وہاں رجعت قہقری کا عمل شروع ہو گیا اور مطلق، لعان حکمران ایک بار پھر اپنی اپنی رعایا پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑنے لگے۔

اگر آپ یہ سمجھیں کہ یہ تاریخی واقعات پر طنز یا ان کا مصنف خاکہ ہے تو آپ غلط کریں گے۔ اس کے برعکس یہ ان متضاد جوابات کی، جو سوالات سے بننے اور انھیں صحیح طریقے سے حل کرنے سے قاصر ہیں، نرم و ملائم شخص ہے۔ یہ جوابات تمام مورخین کی کتابوں میں پائے جاتے ہیں۔ ان مورخین میں سبھی اقسام کے لوگ شامل ہیں۔ وہ جنہوں نے محض اپنی یادداشتیں پر قلم کیں، وہ جو محض انفرادی ممالک کی تاریخ لکھتے ہیں، وہ جو تاریخ کو عالمی نقطہ نظر سے دیکھتے ہیں اور جو اس عہد کی تاریخ، ”کلچر“ کے حوالے سے (یہ تاریخ کی نئی قسم ہے) بیان کرتے ہیں۔ یہ جوابات ہمیں اس لیے عجیب و غریب اور مبہمل نظر آتے ہیں کیونکہ جدید تاریخ بہرے آدمی کی طرح ایسے سوالات کے، جو کسی نے اس سے نہیں پوچھے، جوابات دینے پر اصرار کرتی ہے۔

اگر تاریخ کا مقصد بنی نوع انسان اور اقوام کی حرکت، تدریجی ترقی یا ارتقاء کی تفصیل بیان کرنا ہے، تو اس ضمن میں جو پہلا سوال۔ اگر اس کا جواب فراموش نہ کیا جائے، پھر باقی سب کچھ ناقابل فہم بن جائے گا۔ پوچھا جانا چاہیے، وہ مندرجہ ذیل ہے:

”وہ کون سی قوت ہے جو انسانوں کو متحرک کرتی ہے؟“

جدید سورس بڑا زور لگانے اور خون پسینہ بہانے کے بعد اس کا جواب یہ دیتا ہے کہ نیولین نابغہ عظیم تھا، لوئی چہارم بہت متکبر تھا یا فلاں اشخاص نے فلاں کتب تحریر کی تھیں۔

ہو سکتا ہے کہ یہ سب کچھ بالکل اسی طرح ہو اور عام آدمی اس سے شغف ہونے کے لیے رضامند ہے، لیکن جو سوال پوچھا گیا تھا، یہ اس کا جواب نہیں ہے۔ یہ سب باتیں بڑی دلچسپ ہو سکتی ہیں بشرطیکہ ہم ایک ایسی الوہی قوت کو، جو اپنے وجود کے لیے کسی کی محتاج نہ ہو، تسلیم کر لیں اور یہ مان لیں کہ وہ نیولین، لوئیس یا مصنفین کے ذریعے متواتر اقوام کی رہنمائی کر رہی ہے۔ لیکن ہم اس قسم کی قوت کو تسلیم نہیں کرتے اور چنانچہ نیولین، لوئیس اور مصنفین کے متعلق بات کرنے سے پہلے ہمیں ان اشخاص اور اقوام کی حرکت یا تدریجی ترقی کے، مابین جو تعلق پایا جاتا ہے، وہ دکھایا جانا چاہیے۔

اگر الوہی قوت کی جگہ کسی دوسری قوت کو دیا جاتا ہے، پھر اس امر کی وضاحت ہونا چاہیے کہ یہ نئی قوت کس چیز پر مشتمل ہے کیونکہ تاریخ کی ساری دلچسپی کا محور یہی قوت ہے۔

تاریخ یہ فرض کرتی معلوم ہوتی ہے کہ یہ قوت عیاں بالذات ہے اور ہر شخص اس سے آگاہ ہے لیکن اسے معلوم سمجھنے کی ہر خواہش کے باوجود ہر وہ شخص، جو متعدد تاریخی تصنیفات کا مطالعہ کر چکا ہو، یہ شک کے بغیر نہیں رہ سکتا کہ آیا اس قوت سے، جس کی ہر سورس اپنے اپنے انداز سے تفہیم کرتا ہے، ہر کہہ دہہ واقعی آگاہ ہے؟

سوانح نگاروں اور انفرادی قوام کے مورخین کے خیاب میں یہ قوت ایسی طاقت ہے جو حکمرانوں اور ممبروں میں خفی طور پر موجود ہوتی ہے اور ان کی ذات کا لائینگ جزو ہوتی ہے۔ ان لوگوں نے جو کچھ لکھا ہے، اس کے مطابق کوئی واقعہ محض اس لیے ظہور پذیر ہوتا ہے کیونکہ کسی نیولین، کسی الیکساندر یا عمومی طور پر ان اشخاص کا، جن کی داستان ہائے حیات وہ قلم بند کر رہے ہوتے ہیں، منشا یہی تھی۔ اس قسم کے مورخین اس سوال کے، کہ وہ کون سی قوت ہے جو واقعات کے منظر عام پر آنے کا موجب بنتی ہے، جو جوابات دیتے ہیں وہ صرف اسی صورت میں تسلی بخش ہو سکتے ہیں جب کسی واقعے کو صرف ایک ہی مورخ نے بیان کیا ہو۔ لیکن جوئی واقعے کو بیان کرنے والے مورخین کی تعداد ایک سے زیادہ ہو جائے، ان کا تعلق بھی مختلف اقوام سے ہو اور ان کے نظریات بھی ایک دوسرے سے مختلف ہوں۔ پھر وہ جو جوابات مہیا کریں گے وہ لی اغور معانی سے محروم ہو جائیں گے کیونکہ وہ اس قوت کی تفسیر صرف مختلف بلکہ اکثر ایک دوسرے سے متضاد انداز سے کرتے ہیں۔ ایک مورخ دعویٰ کرتا ہے کہ نماں واقعہ نیولین کی قوت کے قلیل ظہور پذیر ہوا جب کہ دوسرا اسے الیکساندر کی قوت کا کرشمہ قرار دیتا ہے اور تیسرا اسے کسی تیسرے شخص کی قوت سے منسوب کر دیتا ہے۔ مزید برآں، اس قسم کے مورخین جب اس طاقت کی، جس پر کسی شخص کا اقتدار مبنی ہوتا ہے، وضاحت شروع کرتے ہیں وہ ایک دوسرے کی تردید کرنے لگتے ہیں۔ سچ، جو بونا پارت کا مداح ہے، کہتا ہے کہ نیولین کے انداز کی اساس اس کی ٹکو کاری اور عبقریت تھی۔ اس کے برعکس لاس نے¹⁶ کا، جو ری ہینکس نظریات کا حامی ہے، دعویٰ ہے کہ یہ اس کی منافقت اور اس کی لوگوں کو اٹوٹو بنانے کی مہارت پر مبنی تھا۔ چنانچہ اس قسم کے مورخین باہمی طور پر ایک دوسرے کے نظریات کی ہی بیخ کنی نہیں کرتے، بلکہ اس قوت کے، جو واقعات کو مندرجہ ذیل لانے کا موجب بنتی ہے، تصور کی بھی بیخ کنی کر دیتے ہیں اور تاریخ کے بنیادی سوال کا کوئی جواب فراہم نہیں کرتے۔ وہ مورخین، جو تاریخ کو عالمی نقطہ نظر سے دیکھتے ہیں اور تمام قوم کا ذکر کرتے ہیں، یہ تسلیم کرتے نظر آتے ہیں کہ اس قوت کے متعلق جو واقعات کی موجب بنتی ہے، مختص مورخین کے نظریے میں منطقی مغالطہ پیدا ہوتا ہے۔ وہ اسے ایسی قوت (یا اقتدار)، ان متعدد طاقتوں کا حاصل جمع ہوتا ہے جو مختلف جہتوں میں سرگرم عمل ہوتی ہیں۔ جب عالمی نقطہ نظر کے حامل مورخین (جنہیں عمومی مورخین کہا جاتا ہے) کسی جنگ کی تفصیلات بیان کرتے ہیں یا یہ بتاتے ہیں کہ فلاں قوم کی گردن میں غلامی کا طوق کیسے پڑا، وہ زیر بحث واقعے کا سبب کسی شخص واحد کے اقتدار (یا طاقت) میں تلاش نہیں کرتے بلکہ یہ دیکھتے ہیں کہ واقعے سے متعلق مختلف اشخاص نے باہمی طور پر ایک دوسرے کے افعال کو کس طرح متاثر کیا اور اسی تعامل میں وہ واقعے کی وجہ کا کھوج لگاتے ہیں۔

بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ اس نقطہ نظر کے مطابق تاریخی شخصیات کی قوت (یا اقتدار) کو، جو بے شمار طاقتوں کا حاصل ضرب ہوتی ہے، ایسی قوت (یا اقتدار) جوئی نفسہ واقعات کو جنم دیتی ہو تسلیم نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن اکثر دستخط صورتوں میں ہوتا ہے کہ عمومی مورخین ابھی تک قوت (یا اقتدار) کے تصور کو ایک ایسی طاقت کے طور پر، جوئی نفسہ واقعات کو جنم دیتی ہے، تسلیم کیے جا رہے ہیں۔ اور واقعات کے ساتھ اس کا وہی تعلق قائم کیے جا رہے ہیں جو

علت کا حصول سے ہوتا ہے۔ ہم ان سورنٹین کو ایک لمحے کے دوران میں تو یہ کہتے دیکھتے ہیں کہ تاریخی شخصیت اپنے زمانے کی پیداوار ہوتی ہے اور اس کا اقتدار (یا قوت) مختلف طاقتوں کا حاصل۔ لیکن اگلے ہی لمحے ان کے نزدیک یہ اقتدار (یا قوت) ایک ایسی طاقت بن جاتی ہے جوئی نفسہ و قہت کو جسم دیتی ہے۔ مثلاً گرونیس¹¹، شلوئر¹² اور دوسرے، یک جگہ تو یہ ثابت کرتے ہیں کہ بولین انقلاب (فرانس) 1789 کے فکائر و غیرہ کی پیداوار تھا اور دوسری جگہ یہ دھول بیٹنا شروع کر دیتے ہیں کہ 1812 کی مہم اور بعض دوسرے واقعات، جنہیں وہ پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھتے، بعض پوین کے گمراہ غشا کی پیداوار تھے اور یہ کہ 1789 کے اصل تصورات وانکار پوین کے سن کی سورج کی نذر ہو گئے۔ انقلاب کے تصورات اور اس عہد کے عمومی حراج نے پوین کے اقتدار (یا قوت) کو جنم دیا لیکن پوین کے اقتدار نے انقلاب کے تصورات اور اس عہد کے عمومی حراج کا گلا گھونٹ دیا۔

یہ عجیب و غریب تناقض اتھاتی و قہ نہیں ہے۔ اس سے نہ صرف قدم قدم پر ہمارا واسطہ پڑتا ہے بلکہ عمومی سورنٹین کی کتابوں کی کتابیں ایسے ہی تناقضات کے پورے سلسلے پر مشتمل ہوتی ہیں۔ یہ تناقضات محض اس لیے پیدا ہوتے ہیں کیونکہ یہ سورنٹین تجربے کے میدان میں داخل تو ہو جاتے ہیں لیکن آگے بڑھنے کی بجائے پیچ میں رک جاتے ہیں۔ وہ طاقت، جو مختلف طاقتوں کے باہم دیگر اکٹھے ہونے سے وجود میں آتی ہے، اس کے وجود میں آنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ یہ جن اجزائے ترکیبی کے اختلاط کا نتیجہ ہے، ان کا مجموعہ حاصل جمع کے برابر ہو۔ عمومی سورنٹین اس شرط کو کبھی خاطر میں نہیں لاتے۔ نتیجتاً حاصل جمع طاقت کی تشریح کرنے کے لیے وہ ناکافی اجزاء ترکیبی کے علاوہ، یک اور طاقت کو، جس کی وہ کوئی وضاحت نہیں کرتے لیکن جو حاصل جمع کو متاثر کرتی ہے، تسلیم کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

مختص سورنٹین جب 1813 کی مہم یہ بورغ بولوں کی حکومت کی بحالی کا ذکر کرتے ہیں تو وہ لگی پٹی رکھے بغیر یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ الیکساندر کا غشا ان واقعات کے ظہور پذیر ہونے کا سبب بنا۔ لیکن عمومی سورنٹین مختص کی رائے کی تردید کرتے ہوئے یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ 1813 کی مہم اور بورغ بولوں کی حکومت کی بحالی صرف الیکساندر کے غشا کا نتیجہ نہیں تھی بلکہ ان میں غشائیں، میٹرش¹³، مادام ڈسٹیل¹⁴، ہلی غاں¹⁵، فٹے¹⁶، شاتوبیال¹⁷ اور دوسرے لوگوں کی سرگرمیوں کا ہاتھ بھی تھا۔ وہ پیش طور پر الیکساندر کے غشا کو اس کے اجزائے ترکیبی۔ ہالی غاں، شاتوبیال اور دیگر۔ میں تقسیم کر دیتا ہے لیکن صاف ظاہر ہے کہ ان اجزاء ترکیبی کا۔ شاتوبیال، ہالی غاں، مادام ڈسٹیل اور دیگر۔ حاصل جمع یعنی ان کا تعامل مجموعی نتیجہ کے، جو لاکھوں فرانسیسیوں کے بورغ بولوں کی طاقت کی صورت میں ظہور پذیر ہوا، برابر نہیں ہے۔ یہ درست ہے کہ شاتوبیال، مادام ڈسٹیل اور دوسروں نے ایک دوسرے سے بعض الفاظ کہے۔ ان الفاظ نے ان کے باہمی تعلقات کو ضرور متاثر کیا ہوگا لیکن ان سے لاکھوں انسانوں کی اطاعت کی کوئی توضیح نہیں ہوتی۔ چنانچہ اس بات کی وضاحت کرنے کے لیے کہ ان اجزائے ترکیبی کا تعامل لاکھوں لوگوں کی اطاعت کی شکل میں کیسے برآمد ہوا۔ یعنی اجزائے ترکیبی کی طاقتوں نے، جو معینہ مقدار الف کے

برابر ہیں، مجموعی نتیجہ جو ایک ہزار الف کے برابر ہے، کیسے برآید کیا۔ سورخ اسی طاقت۔ قوت (یا اقتدار) کا، جس کا وہ ازیں مشترکان کر چکا ہے، سہارا لینے اور اسے طاقتوں کا حاصل جمع تسلیم کر لینے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ اسے یہ ماننا پڑتا ہے کہ ایک ایسی طاقت موجود ہے جس کی وہ تشریح نہیں کرنا جو حاصل جمع پر اثر انداز ہوتی ہے۔ عمومی مورخین بالکل یہی کچھ کرتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وہ نہ صرف متخصص مورخین کی بلکہ خود اپنی بھی تردید کرتے رہتے ہیں۔

دیہاتی لوگ، جنھیں واضح طور پر یہ معلوم نہیں ہوتا کہ بارش کیوں ہوتی ہے، جب انھیں بارش کی خواہش ہوتی ہے تو وہ یہ کہتے ہیں: ”ہوائیں بادل اڑائے لیے جا رہی ہیں۔“ اور جب انھیں صاف موسم درکار ہوتا ہے تو وہ کہتے ہیں: ”ہوا چل پڑی ہے، لگتا ہے بارش ہوگی۔“ یہی حال عمومی مورخین کا ہے۔ انھیں جب مناسب معلوم ہوتا ہے یا جب یہ بات ان کے نظریات پر منطبق ہو جاتی ہے تو وہ کہتے ہیں کہ اقتدار (یا قوت) واقعات کا نتیجہ ہے، لیکن دوسرے مواقع پر، جب انھیں اس کے برعکس بات کرنا ہوتی ہے تو وہ کہتے ہیں کہ اقتدار (یا قوت) واقعات کو جنم دیتا ہے۔ مورخین کا ایک تیسرا طبقہ ہے۔ یہ کلچر (ثقافت) کے نام نہاد سورخ ہیں۔ وہ عمومی مورخین کے، جو بعض اوقات litterateurs اور grandes dames کو واقعات کو جنم دینے والی طاقتوں کی حیثیت سے تسلیم کر رہے ہیں، نقش قدم پر چلتے ہوئے اس طاقت کی اور بھی مختلف طریقے سے تشریح کرتے ہیں، انھیں اس حیر میں، جسے کلچر کا نام دیا جاتا ہے، ذہنی فعالیت نظر آتی ہے۔

کلچر کے مورخین کا مل استقامت کے ساتھ اپنے مؤرخین۔ عمومی تاریخ کے مصنفین۔ کا تعلق کرتے ہیں کیونکہ اگر تاریخی واقعات کی تشریح اس طرح کی جاسکتی ہے کہ فلاں اور فلاں شخص سے ایک دوسرے کے ساتھ فلاں اور فلاں قسم کا برتاؤ، کیا پھر ان کی تشریح یوں کیوں نہیں ہو سکتی کہ فلاں فلاں اشخاص نے فلاں فلاں کتابیں لکھیں؟ ہر اہم واقعہ کے ساتھ جو تعداد نشانیاں وابستہ ہوتی ہیں، ان میں سے یہ مورخین تابع عقل سرگرمیوں (ذہنی و عقلی فعالیت) کی نشانی منتخب کر رہے ہیں اور چلا چلا کر اعلان کرنے لگتے ہیں کہ واقعے کا سبب یہی تابع عقل سرگرمیاں ہیں۔ لیکن ان کی یہ ثابت کرنے کی، کہ واقعات کا سبب لوگوں کی تابع عقل سرگرمیوں اور قوموں کی سرگرمیوں کے مابین کوئی تعلق موجود ہوتا ہے اور اس بات سے متفق ہونا تو قطعی ناممکن ہے کہ بنی نوع انسان کے انفعال عقلی سرگرمیوں کے تابع رہے ہیں کیونکہ بے شمار واقعات اس مفروضے کی تردید کرتے ہیں (مثلاً انقلاب فرانس کیلئے) اس میں جس سنگدلانہ انداز سے انسانی خون بہایا گیا، وہ نظریہ مساوات انسانی کا شاخصہ تھا۔ پھر تعداد طمانہ جنگیں لڑیں گئیں یا لوگوں کو پھانسیوں پر چڑھایا گیا اور یہ سب کچھ محبت کا درس دینے کے نتیجے کے طور پر ظہور پذیر ہوا۔

چلیں، ہم یہ تسلیم کر لیتے ہیں کہ ان مصنفین کی کتابیں جن پر کاراندہ دلائل سے بھری پڑی ہیں، وہ سب درست

ہیں، ہم یہ بھی تسلیم کر لیتے ہیں کہ اقوام پر کسی غیر متعین قوت کا، جسے خیال (idea) کہا جاتا ہے، مکہ چلتا ہے، لیکن تاریخ کے اہم دور بنیادی سوال کا جواب پھر بھی نہیں ملتا، ابھر بار شاہوں کے اقتدار اور مشیروں اور دوسرے لوگوں کے اثر و رسوخ کے ساتھ ساتھ، جسے سب سے پہلے عمومی مورخین نے موضوع بحث بنایا ہے، ہمیں ایک اور نئی طاقت۔ خیال۔ کا ذکر کرنا پڑے گا۔ اس نئی طاقت۔ خیال۔ کا عوام الناس سے کیا تعلق ہے، یہ بات وضاحت طلب ہے۔ آدمی یہ بات تو سمجھ سکتا ہے کہ چونکہ پولین کے پاس اقتدار تھا، اس لیے فلاں واقعہ ظہور پذیر ہو گیا۔ کچھ کوشش کے بعد آدمی یہ بات بھی تسلیم کر سکتا ہے کہ پولین اور بعض دیگر اثر و احوال مل جل کر کسی واقعے کے پیش آنے کا سبب بنے لیکن ایک کتاب نے، جس کا نام "Le Contrat Social" ¹⁸ ہے، فریسیس میں یہ اثر کیسے ڈال دیا کہ وہ ایک دوسرے کے گلے کاٹنے لگے، یہ بات اس وقت تک سمجھ میں نہیں آسکتی جب تک اس تعلق کی، جو اس نئی طاقت کا واقعے کے ساتھ اتنا قائم ہو گیا ہے، تشریح نہیں کر دی جاتی۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ان تمام لوگوں کے مابین جو یک دوسرے کے معاصر ہوتے ہیں، ایک تعلق موجود ہوتا ہے، چنانچہ جس طرح انسانی تحریکوں اور تجارت، صنعت و حرفت، باغبانی یا کسی بھی دوسری چیز کے مابین جس کا آپ نام لینا چاہیں، تعلق تلاش کیا جاسکتا ہے، اسی طرح انسانوں کی تابع تعلق سرگرمیوں اور ان کی تاریخی تحریکوں کے مابین بھی کسی نہ کسی نوع کا تعلق دریافت کرنا ممکن ہے، لیکن کچھ کے سوا ان لوگوں کی تابع تعلق سرگرمیوں کیوں پوری تاریخی تحریک کا سبب یا اظہار نظر آتا ہے، آسانی سے سمجھ میں آنے والی بات نہیں۔ صرف مندرجہ ذیل امور نے انھیں یہ نتیجہ اخذ کرنے پر آمادہ کیا ہوگا:

1- چونکہ تاریخ علم فاضل اشخاص قلم بند کرتے ہیں، اس لیے ان کے لیے یہ سوچنا بالکل فطری اور خوشگوار بات ہے کہ ان کے طبقے کے لوگوں کی سرگرمیاں انسانی تحریکوں کے لیے بنیاد فراہم کرتی ہیں۔ اگر تاجر کسان یا فوجی سپاہی اس قسم کا دعویٰ کریں تو ان کے لیے بھی یہ بات عین فطری اور خوشگوار ہوگی (تاہم وہ یہ دعویٰ ختم نہیں ہیں کیونکہ تاجر اور فوجی سپاہی تاریخ کی کتابیں تحریر نہیں کرتے۔)

2- روحانی اشغال، روشن خیالی، تہذیب، کلچر، خیالات و افکار سبھی مبہم اور غیر واضح تصورات ہیں اور ان کی آڑ میں ایسے عقائد یا آسانی سے متحمل کیے جاسکتے ہیں جن کے مبہم اور بھی غیر متعین ہوسے ہیں اور جنہیں یوں کسی بھی نظریے میں بے تامل متعارف کرایا جاسکتا ہے۔

اس سوال کو تو جانے دیں کہ اس قسم کی تاریخ کی کتابوں کی اصلی قدر و قیمت کیا ہے (ممکن ہے کہ بعض لوگوں کے مفاد کے لیے یہ مفید اور کارآمد ہوں)، کلچر کی تاریخیں، جن کے عمومی تاریخیں زیادہ سے زیادہ قریب آگے کی کوشش کر رہی ہیں، محض اس حقیقت کے پیش نظر قابل ذکر ہیں کہ وہ واقعات کے اسباب کے طور پر مختلف مذاہم، فلسفیانہ اور سیاسی نظریات کی سنجیدگی اور باریک بینی سے جہاں پہلک تو ضرور کرتی ہیں لیکن انھیں جو نئی کسی اصلی تاریخی واقعے (مثلاً 1812 کی مہم) سے واسطہ پڑتا ہے، وہ غیر ارادی طور پر اسے قوت کے استعمال کا نتیجہ قرار دینے

لگتی ہیں۔ بلکہ صاف صاف کہہ دیتی ہیں کہ یہ ہم نیولین کے منشا کی پیداوار تھی۔ پھر کے مورخین جب اس قسم کی بات کہتے ہیں، وہ غیر شعوری طور پر اپنی تردید آپ کرنے لگتے ہیں اور وہ یہ ثابت کر دیتے ہیں کہ ان کی دفع کردہ نئی طاقت کسی طرح بھی تاریخی واقعات کی تشریح نہیں کرتی اور یہ کہ تاریخ کی تشریح، صرف اسی قوت کا جسے وہ بظاہر تسلیم نہیں کرتے، ذکر کر کے ہی ہو سکتی ہے۔

3

ریل کا انجن حرکت کر رہا ہے۔ ایک شخص سوال اٹھاتا ہے۔ ”اسے کون متحرک کرتا ہے؟“ کساں اس کا جواب دیتا ہے۔ ”سے شیطان حرکت دے رہا ہے۔“ دوسرا شخص کہتا ہے ”یہ اس لیے حرکت کر رہا ہے کیونکہ اس کے پیچے گھوم رہے ہیں۔“ تیسرا دعویٰ کرتا ہے: ”حرکت کا سبب وہ دھواں ہے جسے ہوا اڑائے لیے جا رہی ہے۔“

کساں کو جھٹلانا ممکن نہیں ہے۔ جو شخص اسے جھٹلانا چاہے گا، سے اس کے سامنے یہ ثابت کرنا پڑے گا کہ شیطان کا کوئی وجود نہیں ہے یا کسی دوسرے کساں کو اسے یہ سمجھانا پڑے گا کہ انجن کو حرکت شیطان نہیں بلکہ کوئی جرمین دے رہا ہے، صرف تبھی جب انھیں یہ معلوم ہوگا کہ ان کی باتوں میں تضاد ہے، ان پر یہ رد کھلے گا کہ وہ دونوں غلط ہیں۔ لیکن وہ شخص، جو یہ دلیل دیتا ہے کہ انجن اس لیے حرکت کر رہا ہے کیونکہ پیچے گھوم رہے ہیں، وہ اپنی تردید آپ کر رہا ہے، کیونکہ جب ایک مرتبہ اس نے تجربہ شروع کر دیا، اسے آگے جانا اور یہ بتانا ہوگا کہ پیچے کیوں گھوم رہے ہیں۔ اور جب تک وہ یہ دریافت نہیں کر لیتا کہ انجن کی حرکت کا سبب بالکر میں بھپ کا دباؤ ہے، اسے سبب دریافت کرنے کی جستجو سے ہاتھ اٹھانے کا کوئی حق حاصل نہیں۔ جو شخص یہ تو ضیح کرتا ہے کہ انجن کی حرکت کا باعث وہ دھواں ہے جسے ہوا عقبی رخ اڑائے لیے جا رہی ہے، وہ یہ سمجھ گیا ہے کہ یہیوں کا نظریہ مسئلہ حل نہیں کرتا۔ چنانچہ اسے جو پہلی خصوصیت نظر آتی ہے، وہ اسے اپنے ذہن میں بٹھا لیتا ہے اور اپنی باری آنے پر اسے بطور توجیہ پیش کر دیتا ہے۔

انجن کیوں حرکت ہے، اس کی تشریح صرف تبھی ممکن ہے کہ ایک ایسی طاقت کا تصور کیا جائے جو زیر مشاہدہ حرکت سے پوری مناسبت رکھتی ہو۔

قویں ہر وقت متحرک رہتی ہیں، وہ آگے بڑھتی یا پیچھے ہٹتی ہیں۔ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ اس کو سمجھنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ ایک ایسی طاقت کا تصور کیا جائے جو قوموں کی پوری حرکت سے مناسبت رکھتی ہو۔

تاہم اس تصور کو پیش کرنے کے لیے مختلف مصنفین ایک دوسری سے بالکل ہی مختلف طاقتوں کا ذکر کر لے لگتے ہیں لیکن وہ جن جن طاقتوں کو اپنی بحث کا موضوع بناتے ہیں، ان کی زیر مشاہدہ تحریک سے کوئی مناسبت نہیں ہوتی۔ جس طرح کساں کو انجن میں شیطان دکھائی دیتا ہے، اسی طرح بعض مصنفین کو ہیردوں میں ایک ایسا طاقت نظر آئے لگتی ہے جو انھیں خلقی طور پر ودیعت ہوئی ہوتی ہے۔ کچھ کے نزدیک یہ طاقت یہیوں کی حرکت کی طرح

متعدد دوسری طاقتوں کا حاصل ہوتی ہے، اور بعض کو یہ دھڑکیں کی طرح، جسے ہوا ازلے لے لے جارہی ہے، یہی ہوتی
کاوشوں کا اثر معلوم ہوتی ہے۔

جب تک تاریخوں کا موضوع صرف انفرادی اشخاص۔ وائیزر ہول یا سکندر اعظم، لوٹھر ہوس یا والٹر۔
رہیں گے اور ان قسم۔ کا مل تمام کے تمام۔ لوگوں کو، جو واقعے میں شریک ہوتے ہیں، زیر بحث نہیں لایا جائے گا،
اس طاقت کو، جو دوسرے لوگوں کو، اپنی سرگرمیوں کا رخ کسی خاص مقصد کے حصول کی طرف موڑنے پر مجبور کرتی ہے،
کسی فرد واحد سے منسوب نہ کرنا ناممکن ہے۔ اور اس قسم کا واحد تصور، جس سے سور نہیں آگاہ ہیں، وہ اقتدار (یا قوت)
کا تصور ہے۔

یہ تصور وہ واحد ذریعہ ہے جس کی مدد سے تاریخ کے مواد سے، اس انداز سے جس طرح اس کی فی زمانہ
تشریح و تعبیر کی جاتی ہے، پیدا جاسکتا ہے اور جو شخص، جیسا کہ نکل نے کیا، تاریخی مواد سے مہمہ بردار ہونے کے کسی
دوسرے طریقے کو دریافت کیے بغیر اس ذریعے سے منہ موڑ لیتا ہے، وہ اپنے آپ کو اس سے نپٹنے کے واحد طریقے
سے محروم کر لیتا ہے۔ تاریخی واقعے کی تشریح کے لیے اقتدار (یا قوت) کے تصور کی ضرورت بہترین انداز سے عمومی
تاریخ کے مصنفین اور کلچر کے مورخین خود ثابت کر دیتے ہیں۔ وہ دونوں اقتدار کے تصور کو مسترد کرنے کا کرتے ہیں
لیکن ناگزیر طور پر وہ قدم قدم پر اسی کی طرف رجوع کرتے ہیں۔

نئی نوع انسان کی تحقیق و تفتیش کے سلسلے میں اب تک تاریخ و زمانہ اوقات کی۔ اس میں کاغذی نوٹ اور
دھاتی سکے دونوں شامل ہیں۔ مانند ہی ہے۔ سوانحی اور قومی تواریخ نیز کاغذی ہیں۔ جب تک کاغذی نوٹوں کے
متعلق یہ سوال نہ اٹھایا جائے کہ ان کے پیچھے ضمانت کیا ہے وہ چلتے رہتے ہیں، لوگ انھیں قبول کرتے رہتے ہیں اور
وہ پنا مقصد پورا کر جاتے ہیں۔ ان سے کسی کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا بلکہ فائدہ ہی ہوتا ہے۔ یہی حال اس سوانحی اور
قومی تواریخ کا ہے۔ ان میں جو نظریات بیان کیے جاتے ہیں، جب تک ان پر انگلی نہیں اٹھائی جائے گی، یہ بکتی رہیں
گی، لوگ انھیں پڑھتے رہیں گے اور یہ اپنا مقصد پورا کرتی رہیں گی۔ ان سے کسی کا کچھ بگڑے گا نہیں، مانند ہی ہوگا۔
مگر ہم صرف اتنا کریں کہ یہ پوچھنا بھروسہ جائیں کہ ہیروداٹس کا نشانہ قات کو کس طرح قسم دیتا ہے، تیغ اور اس کی
قبیل کے دیگر مصنفین کی تاریخیں دلچسپ و سبقت آموز بھی معلوم نہیں ہوں گی بلکہ ان میں شعریت کی چاشنی بھی مل
جائے گی۔ لیکن جس طرح کاغذی نوٹوں کی صحیح قدر و قیمت کے متعلق اس سے شکوک و شبہات اٹھنے لگتے ہیں کہ ان کا بنانا
آسان ہے، لہذا یہ ضرورت سے زیادہ بنا دیے جاتے ہیں یا پھر اس لیے کیونکہ لوگ انھیں سونے میں تبدیل کرانے
کی کوشش نہیں کرتے۔ اس قسم کی تواریخ کی صحیح قدر و قیمت کے متعلق اس لیے شکوک و شبہات سراٹھانے لگتے ہیں
کیونکہ یہ بہت زیادہ تعداد میں لکھی جاتی ہیں یا کوئی شخص کمال سادگی سے پوچھ بیٹھتا ہے کہ پولین کو کس طاقت نے یہ
کرے کے قابل بنایا؟ دوسرے الفاظ میں وہ تفہیم کے مروجہ زر کاغذی کو کھڑے سونے میں تبدیل کرنا چاہتا ہے۔
عمومی تواریخ کے مصنفین اور کلچر کے مورخین ان لوگوں کی مانند ہیں جو زر کاغذی کے عیوب کو پیش نظر رکھتے

ہوے اسے سونے کی نسبت کسی گھٹیا دھات کے سکوں سے تبدیل کرانا چاہتے ہوں۔ اس قسم کے سکے گھٹنا تو سنے ہیں لیکن اس سے زیادہ وہ کچھ نہیں کر سکتے۔ زر کاغذی سے ناواقف دھوکا کھا سکتے ہیں لیکن ان گھٹیا دھات کے سکوں سے کسی کو بھی اُلٹو نہیں بنایا جاسکتا۔ جس طرح سونا صرف تبھی سونا ہے جب اسے محض تبادلہ اشیاء کے لیے استعمال نہ کیا جائے بلکہ اس کا کوئی صحیح مصرف تلاش کیا جائے۔ اسی طرح عمومی مورخین صرف اسی وقت قدر کی نگاہ سے دیکھے جاسکیں گے جب وہ تاریخ کے اس بنیادی اور انتہائی ہم سوال کا جواب فراہم کر دیں گے، قوت (یا اقتدار) کیا ہے؟ عمومی مورخین اس سوال کے متضاد جوابات دیتے ہیں جب کہ کچھر کے مورخین اس سوال کو اٹھا کر پرے پھینک دیتے ہیں اور کسی بالکل ہی مختلف چیز کا جواب دینے لگتے ہیں۔ جس طرح نقلی سونے کے سکے صرف اسی قوم میں مروج ہو سکتے ہیں جس کے افر داسے سونا ماننے پر تیار ہو جائیں یا پھر ان لوگوں میں ان کا چین ہو سکتا ہے جو جاہل مطلق ہوتے ہیں اور جنہیں سونے کی ماہیت کا کوئی علم نہیں ہوتا۔ اسی طرح عمومی مورخین اور کچھر کے مورخین کو جو تاریخ کے بنیادی سوالات کے جوابات دینے میں ناکام رہتے ہیں، صرف یونیورسٹیوں میں یا ایسے لوگوں میں جنہیں بقول ان کے اپنے ”سنجیدہ کتب کے مطالعے“ کا شوق ہوتا ہے، مقبولیت حاصل ہو سکتی ہے، اور اس طرح وہ اپنے بعض مقاصد حاصل کر سکتے ہیں۔

4

متقدمین کو یقین تھا کہ خدائی مرضی سے کسی قوم کے منشا کو کسی سنجیدہ شخص کے تابع بنادیا جاتا ہے اور اس سنجیدہ شخص کی مرضی کو دیوتا یا معبود کے تابع کر دیا جاتا ہے۔ تاریخ نے اس نظریے کو تو مسترد کر دیا ہے لیکن جب تک وہ ان دونوں سے ایک چیز کا انتخاب نہیں کرتی، وہ تصادف کے بغیر ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھ سکے گی: یا تو وہ مقدمین کے اس عقیدے کو تسلیم کر لے کہ معبود انسانی معاملات میں دخل ہوتا ہے، یا پھر وہ اس طاقت کے مفہوم کی جسے قوت یا اقتدار کہا جاتا ہے اور جو تاریخی واقعات کو جنم دیتی ہے، غیر مبہم تشریح کرے۔

متقدمین کے عقیدے کی طرف رجوع کرنا ناممکن ہے کیونکہ سے پاش پاش کیا جا چکا ہے۔ چنانچہ اقتدار (ی قوت) کا مطلب کیا ہے، اس کی تشریح کرنا ضروری ہو گیا ہے۔

”نہو میں نے فوج بھرتی کی اور اسے جنگ کرنے کا حکم دیا۔“ ہم اس بیان سے مانوس ہو چکے ہیں۔ چنانچہ ہر نقطہ نظر ہمارے اذہان میں اختراع ہو چکا ہے کہ جب ہم سے یہ سوال پوچھا جاتا ہے: ”نہو میں کی زبان سے چند الفاظ نکلنے کے بعد چھوٹا کھ انسان جنگ پر کیوں آمادہ ہو گئے؟“ تو وہ ہمیں بے معنی اور احتیاط معلوم ہونے لگتا ہے۔ ”بھئی، اس کے پاس اقتدار تھا، چنانچہ اس نے جو حکم دیا، اس پر عمل ہوا۔“ ہمارا جواب ہوتا ہے۔

اگر ہم یہ یقین کر لیں کہ اقتدار خدا کی دین ہے، پھر یہ جواب تسلی بخش ہوگا۔ لیکن جو نہیں، ہم اسے تسلیم کرنے سے انکار کرتے ہیں، یہ طے کرنا ضروری ہو جاتا ہے کہ یہ اقتدار، جو ایک شخص کو دوسروں پر حاصل ہوتا ہے، کیا ہے؟

یہ اقتدار کسی قوی آدمی کا کسی کمزور آدمی پر جسمانی غلبہ تو نہیں سکتا۔ ایسا غلبہ جس کی سائنس ہر کوئی میں¹⁹ قوت کی طرح جسمانی طاقت کے استعمال یا استعمال کی دھمکی پر ہوتی ہے۔ اور نہ اس کی اساس اخلاقی قوت کے غلبہ پر ہو سکتی ہے جیسا کہ بعض مورخین جو یہ کہتے ہیں کہ تاریخ کی سرکردہ شخصیات بہرہ دہوں کے قالب میں ڈھلی ہوتی ہیں کیونکہ انھیں قلب و دماغ کی غیر معمولی صلاحیت موسوم بہ عبقریت ودیعت ہو چکی ہوتی ہے، اپنی سادگی کی بنا پر سمجھتے دکھائی دیتے ہیں۔ اس اقتدار (یا قوت) کی اساس اخلاقی طاقت پر نہیں رکھی جاسکتی کیونکہ یونین جیسے شخص کا، جن کے اخلاقی اوصاف کے بارے میں اختلاف رائے پایا جاتا ہے، ذکر چھوڑیں، تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ لوئی یا زوہلم یا میٹرنش جیسے لوگ بھی، جو اپنے جیسے لاکھوں لوگوں پر حکومت کرتے تھے، کسی خاص اخلاقی اوصاف سے بہرہ ور نہیں تھے، اس کے برعکس عمومی اعتبار سے وہ ان لوگوں سے، جن پر وہ حکومت کرتے تھے، کئی لحاظ سے بہ اعتبار اخلاقی کم تر تھے۔

اگر اقتدار کا سرچشمہ اس شخص کے، جو اس کا مالک ہے، نہ جسمانی اور نہ اخلاقی اوصاف میں موجود ہے، پھر یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ اسے کہیں اور۔ اقتدار پر فائز شخص کے عوام الناس کے ساتھ تعلقات میں تلاش کرنا پڑے گا۔

علم قانون (Jurisprudence) میں، اقتدار کا بالکل یہی مفہوم اخذ کیا جاتا ہے۔ علم قانون تاریخ کا bureau d' échange²¹ ہے اور تاریخ کے تصور اقتدار کو خالص سونے میں تبدیل کرے کی ذمہ داری دیتا ہے۔ اقتدار عوام کا اجتماعی منشا ہے۔ سے رضا با اظہار یا رضا بالسلطنت کے ذریعے ان کے چنیدہ حکمرانوں کو منتقل کر دیا جاتا ہے۔

علم قانون کے درجے میں جو اس بات پر غور و فکر کرتا ہے کہ ریاست اور اس کے اقتدار کی تشکیل کیسے ہونا چاہیے (اگر یہ تشکیل واقعی ممکن ہے)، یہ سب کچھ غیر مبہم طور پر واضح ہے، لیکن اس کا اطلاق اصل تاریخ پر کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ اقتدار (قوت) کی تعریف کی وضاحت کر دی جائے۔

ریاست اور اقتدار کے متعلق علم قانون کا انداز فکر وہی ہے جو متقدمین کا آگ کے بارے میں تھا۔ یعنی وہ اسے ایک ایسی چیز سمجھتا ہے جو مطلقاً موجود ہے۔ لیکن تاریخ کی نگاہوں میں ریاست اور اقتدار بالکل اسی طرح محض مظاہر ہیں جس طرح جدید فزکس کے نزدیک آگ عنصر نہیں بلکہ مظہر (phenomenon) ہے۔

تاریخ اور علم قانون کے نقطہ ہائے نگاہ کے اس بنیادی اختلاف سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ علم قانون ان امور پر تو کمال کی رائے میں اقتدار ہے کیا (وہ اسے غیر متغیر اور وقت کی قیود سے آزاد تصور کرتا ہے) اور اس کی تشکیل کیسے ہونا چاہیے، تفصیل سے بحث کرتا ہے لیکن تاریخ جو یہ سوال اٹھاتی ہے کہ وقت کے ساتھ ساتھ اقتدار میں جو تبدیلیاں آتی رہتی ہیں ان کا کیا مفہوم بنتا ہے، وہ اس کا کوئی جواب نہیں دے سکتا۔

• بیورو آف ایکس چینج۔ وہ دکان یا ادارہ جو ایک ملک کی کرنسی کو کسی دوسرے ملک کی کرنسی میں تبدیل کرنے کا کام کرتا ہے۔

اگر اقتدار عوام کے اجتماعی منشا کا نام ہے جو ان کے حکمرانوں کو منتقل کر دیا جاتا ہے، تو کیا پوچھا جیف عوام کے منشا کا نمائندہ تھا؟ اگر نہیں، پھر پولیس اوس کیوں تھا؟ پولیس سوم،²² جب سے بولون میں گرفتار کیا گیا، مجرم کیوں تھا؟ اور وہ، جنہیں اس نے بعد میں زندانوں میں ڈالا، مجرم کیوں تھے؟

کیا کھلتی انتخابات۔ جن میں بعض اوقات صرف دو یا تین اشخاص شریک ہوتے ہیں۔ لوگوں کا منشا حکمران کو منتقل کر دیتے ہیں؟ کیا بین الاقوامی تعلقات میں عوام ان اس کا منشا بھی ان کے فاتح کو منتقل ہو جاتا ہے؟ کیا 1808 میں رائن کی کنفیڈریشن کا منشا پولیس کو منتقل ہو گیا تھا؟ کیا 1809 میں، جب ہماری افواج فرانسیسیوں کے ساتھ مل کر آسٹریا کے خلاف برسر پیکار ہوئی تھیں، بروی عوام کا منشا پولیس کو منتقل ہو گیا تھا؟ ان سوالات کے تین مختلف طریقوں سے جوابات دیے جاسکتے ہیں۔

1- یہ تسلیم کر لیا جائے کہ عوام کا منشا حکمران یا حکمرانوں کو، جنہیں انھوں نے چنا ہوتا ہے، ہمیشہ غیر مشروط طور پر منتقل ہوتا ہے۔ چنانچہ ایک مرتبہ جو شخص یا اشخاص برسر اقتدار آگئے، ان کے خلاف ہر نئی قوت کے ظہور اور اس کے خلاف ہر قسم کی جدوجہد کو اصل قوت (برسر اقتدار شخص یا اشخاص) کی نافرمانی تصور کیا جائے۔

2- یہ تسلیم کر لیا جائے کہ عوام کا منشا حکمرانوں کو مشروط طور پر منتقل ہوتا ہے اور یہ شرائط غیر مبہم اور معلوم ہوتی ہیں اور یہ بتایا جائے کہ حکمرانوں کے اختیارات پر جو قدغنیں لگائی گئی ہیں، یا ان کے ساتھ جو ٹکڑے لگیے ہوئے ہیں، ان کے اختیارات ہی کو جو ختم کر دیا گیا ہے، اس کی وجہ یہ تھی کہ حکمرانوں نے ان شرائط کو، جن کے تحت انھیں اقتدار منتقل ہوا تھا، پورا نہیں کیا تھا۔

3- یہ تسلیم کر لیا جائے کہ عوام کا منشا حکمرانوں کو منتقل تو مشروط طور پر ہی ہوتا ہے لیکن شرائط غیر واضح اور مبہم ہوتی ہیں۔ چنانچہ متعدد حکمرانوں کے برسر اقتدار آنے، کشمکش میں گرفتار رہنے اور زوال سے دوچار ہونے کی وجہ یہ تھی کیونکہ انھوں نے ان نامعلوم اور غیر واضح شرائط کو، جن کی بنا پر عوام کا منشا دوسروں سے انھیں منتقل ہوا تھا، مکمل طور پر یا جزوی طور پر پورا نہیں کیا تھا۔

یہ ہیں وہ تین طریقے جن کے ذریعے مورخین عوام کے اپنے حکمرانوں کے ساتھ تعلقات کی وضاحت کرتے ہیں۔

بعض مورخین۔ وہی سوانحی اور تنقیدی مورخین، جن کا ذکر پہلے ہی ہو چکا ہے۔ جب اپنی سادگی کی وجہ سے اقتدار کے مفہوم کے مسئلے کو سمجھنے میں ناکام ہو جاتے ہیں، یہ یقین کرتے نظر آنے لگتے ہیں کہ عوام کا منشا غیر مشروط طور پر تاریخی شخصیات کو منتقل ہو جاتا ہے اور چنانچہ جب وہ کسی خاص ریاست کو زیر بحث لاتے ہیں، وہ یہ فرض کر لیتے ہیں کہ مخصوص قوت (برسر اقتدار شخص یا طبقہ) واحد، مطلق اور حقیقی قوت ہوتی ہے اور جو دوسری طاقت اس کی مخالفت کرتی ہے، وہ قوت نہیں ہے، بلکہ قوت کی نافرمان ہے۔ محض تشدد ہے۔

ان کا یہ نظریہ تاریخ کے قدم ترس اور پراسن زمانوں کے حالات بیان کرنے کے لیے تو موزوں ہے، لیکن

اس میں قباحت یہ ہے کہ جب اس کا اطلاق اقوام کی زندگیوں کے پیچیدہ اور طوفانی ادوار پر کیا جاتا ہے جن کے دوروں میں مختلف قوتیں بیک وقت ابھرتی اور ایک دوسرے کے خلاف ہر سر بیکار ہوتی ہیں، تو مسودوں بادشاہت کو جائز سمجھنے والے مسودے یہ ثابت کر دے گا کہ کنونشن²⁵، ڈائریکٹری اور ہونا پارٹ قانونی اعتبار سے جائز مقتدرہ کے محض باغی تھے۔ اس کے برعکس وہ مسودے، جو جمہوری تصورات میں یقین رکھتا ہے یہ استدلال کرے گا کہ کنونشن ہی صحیح معنوں میں اختیارات کی جائز مانگ تھی، جب کہ وہ، جو پیوپل کا حامی ہے، اس کی ہر اظہار کو جائز ٹھہرائے گا اور باقی سب کو مقتدرہ کے باغی قرار دے گا۔ یہ ظاہر ہے کہ یہ مسودے جن نوع کی تاویل کرتے ہیں وہ باہمی طور پر متناقض ہیں۔ وہ بالکل ہی نوع پر یکساں کر سکتی ہیں، کسی اور کو نہیں۔

یہ تسلیم کرتے ہوئے کہ تاریخ کا یہ نظریہ باطل ہے، مسودے کا ایک طبقہ یہ کہتا ہے کہ تدارک کی اس عوام کے منٹ کا اپنے حکمرانوں کو مشروط انتقال پر قائم ہونا ہے اور یہ کہ تاریخی قاعدین کو جو اقتدار ملتا ہے، وہ اس شرط پر ملتا ہے کہ وہ اس پر دگر، م پر عمل کریں گے جو عوام کے منشا نے رضا بالسلطنت سے انھیں تجویز کیا ہوتا ہے، مگر یہ مسودے نہیں بتاتے کہ یہ پروگرام کن چیزوں پر مشتمل ہوتا ہے اور جب بتاتے بھی ہیں تو ایک دوسرے کی تردید کرنے لگتے ہیں۔

کسی قوم کی ترقی کی منزل مقصود کس چیز سے متشکل ہوتی ہے، اس کے متعلق ہر مسودے کا اپنا نظریہ ہوتا ہے اور اسی کے مطابق وہ اپنے ذہن میں فرانس یا کسی دوسرے ملک کے شہریوں کی عظمت، ثروت، حریت یا روشن خیالی کے پروگرام کے خاکے کا تصور باندھتا ہے۔ اس پروگرام — چھپیں ہم یہ تسلیم کر لیتے ہیں کہ اس قسم کا کوئی عمومی پروگرام موجود ہوتا ہے — کی نوعیت کے بارے میں مختلف مسودے کی آراء میں جو تضادات پائے جاتے ہیں، گرا نہیں نظر انداز کر دیا جائے، تو بھی تاریخ کے حقائق تقریباً ہمیشہ ہی اس نظریے کی تردید کرتے نظر آئیں گے۔

اگر شرط، جن کے تحت اقتدار کی منتقلی عمل میں آئی جاتی ہے، لوگوں کی ثروت، حریت یا روشن خیالی ہیں، پھر یہ کیسے ممکن ہوا کہ لوئی چہارم اور ”خونناک“ ایوان²⁶ تو اپنے عہد ہائے حکومت آرام دہ سکون سے گزار دیتے ہیں۔ کوئی ان کا بال بھی بیکا نہیں کرتا جب کہ لوئی شانزدہم اور چارلس اول²⁷ کے اپنے ہی عوام ان کے سرکٹ دیتے ہیں؟ اس سوال کا اس طرح کے مسودے یہ جواب دیتے ہیں کہ لوئی چہارم کے افعال کا حلیہ جو پروگرام کے مطابق تھے، لوئی شانزدہم کو بھگتنا پڑا۔ لیکن سوال پیدا ہوتا ہے کہ لوئی چہارم یا لوئی شانزدہم کیوں بچ گئے اور نزل لوئی شانزدہم پر ہی کیوں گرا؟ اصل کے بجائے دوسرے حکمرانوں کے خلاف جو اس قسم کا رد عمل ظاہر ہوتا ہے، وہ کس عوامل کی بنا پر ہوتا ہے؟ ان سوالات کے نہ کوئی جوابات ہیں اور نہ ہو سکتے ہیں۔ پھر یہ نقطہ نظر اس بات کی بھی کوئی وضاحت نہیں کرتا کہ اجتماعی منشا صدیوں تک بعض حکمرانوں اور ان کے دربار کی تحویل میں کیوں رہتا ہے اور پھر ایک ایسی پچاس سال کے عرصے کے دوران میں یہ باری باری کنونشن، ڈائریکٹری، پیوپل، الیکشن اور لوئی شانزدہم اور اس کے بعد دوبارہ پیوپل، شاغل دہم لوئی فلپ²⁹، ری پبلک حکمت اور پیوپل سوم کو کیوں منتقل ہوتا رہا ہے؟

اس مختصر عرصے کے دوران میں، جب بین الاقوامی تعلقات، فتوحات، اور اتحادوں کی وجہ سے صورت حال

بہت پیچیدہ ہوتی جا رہی تھی، عوام کا منشا جس تیز رفتاری سے ایک فرد سے دوسرے فرد کو منتقل ہوتا رہا، مورخین جب اس کی تشریح و تفسیر کرنے بیٹھتے ہیں، وہ بادلِ ناخواستہ ہی کہی، بہر حال یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ ان میں سے بعض صورتوں میں عوام کا منشا باقاعدہ طریقے سے ان کے حکمرانوں کو منتقل نہیں ہوا۔ بلکہ ان میں سے بعض لوگ کسی سفارت کار، بادشاہ یا پارٹی رہنما کی عیاری، ہڈکاری، حماقت یا کمزوری کی وجہ سے محض اتفاقاً حکمران بن گئے۔ چنانچہ یہ مورخین تاریخ کے بیشتر واقعات کو۔ خاندان جنگیوں، انقلابات، فتوحات۔ عوام کے منشا کی آزادانہ منتقلی کا نتیجہ قرار نہیں دیتے بلکہ وہ یہ دعا کرتے ہیں کہ یہ واقعات اس لیے پیش آئے کیونکہ کسی فرد واحد یا چند افراد کے منشا نے غلط رخ اختیار کر لیا۔ یہ الفاظ دیگر یہ کہہ جا سکتے ہیں کہ دوسرے لوگوں نے ناجائز طریقوں سے اقتدار پر قبضہ کر لیا۔ چنانچہ ان مورخین کو بھی ایسے واقعات، جو ان کے نظریات پر پورے نہیں اترتے، نظر تو آ جاتے ہیں لیکن وہ انہیں مستثنیات قرار دے دیتے ہیں۔

یہ مورخین اس نباتیات کے ماہرین کی مانند ہیں جو یہ مشاہدہ کرنے کے بعد کہ بعض پودوں کے پتے جب پھوٹتے ہیں تو ابتداً دو پتیاں نمودار ہوتی ہیں اور حسبِ یکی دونوں پتیاں بڑھ کر بڑا پودا بنتی ہیں، یہ دعویٰ کرنے لگیں کہ ہر وہ چیز جو اگتی اور نشوونما پاتی ہے، اپنا آغاز دو ہی پتیوں سے کرتی ہے اور جن پودوں۔ باس، لکسی، بلکہ ادک بھی، جس کی تناور ہونے کے بعد دو پتیوں سے قطعاً کوئی مشابہت نہیں رہتی۔ کی شروعات دو پتیوں سے نہیں ہوتی اور نظریے سے محض انحراف ہیں۔

تیسرے طبقے کے مورخین یہ اعتراف کرتے ہیں کہ عوام کا منشا مشروط طور پر تاریخی شخصیات کو منتقل ہوتا ہے لیکن یہ شرط کیا ہوتی ہے، ہمیں ان کے بارے میں کوئی علم نہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ تاریخی رہنماؤں کے پاس اقتدار محض اس لیے ہوتا ہے کیونکہ وہ عوام کے منشا کو، جو انھیں منتقل ہو چکا ہوتا ہے، پایہ تکمیل تک پہنچاتے ہیں۔ لیکن اگر اس طاقت کی مالک جو عوام کو متحرک کرتی ہے، مالک تاریخی شخصیات نہیں، بلکہ خود عوام ہیں، پھر ان رہنماؤں کی کیا اہمیت رہ جاتی ہے؟

یہ مورخین ہمیں بتاتے ہیں کہ تاریخی شخصیات عوامی منشا کو منعکس کرتی ہیں۔ ان رہنماؤں کی سرگرمیاں عوام کی سرگرمیوں کی نمائندگی کرتی ہیں۔

مگر اس صورت حال میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا ان رہنماؤں کی تمام سرگرمیاں عوام کے منشا کے اظہار کا ذریعہ بنتی ہیں یا ان کا محض ایک خاص پہلو یہ کام سرانجام دیتا ہے؟ اگر رہنماؤں کی تمام سرگرمیاں (اعمال و افعال) جیسا کہ بعض مورخین فرض کر لیتے ہیں، عوام کے منشا کے اظہار کا بذریعہ بنتی ہیں، پھر پولین اور کینٹن جیسے حکمرانوں کی زندگیوں کے بارے میں کتابیں ان کے درباروں کے سیکنڈلوں کی جن چھوٹی سے چھوٹی تفصیلات سے پر ہیں، انھیں تو ہم کی سرگرمیوں کا اظہار کہنا چاہیے، جو صاف ظاہر ہے کہ بالکل لغو بات ہے۔ لیکن اگر جیسا کہ بعض ماہرِ فلسفہ مورخین یقین سے دعویٰ کرتے ہیں، تاریخی شخصیات کی سرگرمیوں کا کوئی پہلو ہی عوام کی زندگی کو منعکس

کرتا ہے، پھر سب سے پہلے ہمیں یہ معلوم کرنا پڑے گا کہ قوم کی زندگی کس چیز پر مشتمل ہوتی ہے۔ اس طبقے کے مورخین کو جب اس مشکل کا سامنا کرنا پڑتا ہے، وہ حتیٰ الامکان زیادہ سے زیادہ واقعات کا

احاطہ کرنے کے لیے انتہائی متعلق، غیر مرئی اور محسوس تجرید وضع کر لیتے ہیں اور پھر اس تجرید کو انسانی نقل و حرکت کا مقصد قرار دے دیتے ہیں۔ انتہائی عام تعصبات، جنہیں تقریباً سارے مورخین اختیار کر رہے ہیں، یہ ہیں حریت، مساوات، روشن خیالی، ترقی، تہذیب اور ثقافت۔ اس قسم کی کسی تعصبات کو گھڑ کر اور اسے نئی نوع انسان کی سرگرمیوں کا مقصد قرار دے کر مورخین ان اشخاص کا۔ بادشاہان، وزرا، جرنیلوں، مصنفین، مصلحین، پوپ، حکامانوں سے جنہوں نے اپنے پیچھے سب سے زیادہ یادگاریں چھوڑی ہوئی ہیں، اس نقطہ نظر سے مطالعہ شروع کر دیتے ہیں کہ ان کے خیال کے مطابق ان شخصیات نے زیر بحث تجرید کو آگے بڑھانے یا اس کی راہ میں روڑے اٹھانے میں کس حد تک موثر کردار ادا کیا۔ لیکن چونکہ یہ کہیں ثابت نہیں ہوتا کہ نئی نوع انسان کا نصب العین حریت، مساوات، روشن خیالی یا تہذیب و ثقافت ہے، اور چونکہ حاکموں اور مبنی آدم کو روشن خیالی اور تہذیب کی راہ دکھانے کے دعوے داروں کے ساتھ عوام کا رشتہ محض اس تنازعہ فیہ مفروضے پر مبنی ہے کہ عوام کا اجتماعی غنا ہمیشہ ان اشخاص کو، جو ہماری توجہ اپنی طرف مبذول کرانے میں کامیاب رہتے ہیں، منتقل ہوتا رہتا ہے، چنانچہ ہوتا یہ ہے کہ ان لاکھوں انسانوں کی سرگرمیوں کو جو ترک سکونت کر کے ایک مقام سے دوسرے مقام پر منتقل ہوتے رہتے ہیں، مکانات کو کنڈر آتش کرتے ہیں، کاشتکاری سے منہ موڑ دیتے ہیں اور ایک دوسرے کو بے دردی سے موت کے گھاٹ اتارتے ہیں، ان دس بارہ اشخاص کی، جو مکانات کو آگ نہیں لگاتے، جنہیں قبرستان سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا اور نہ جن کا قتل و غارت سے کوئی تعلق بنتا ہے، سوانح حیات میں کوئی جگہ نہیں دی جاتی۔

تاریخ اسے ہر موڑ پر ثابت کرتی ہے۔ اٹھارویں صدی کے اختتام پر مغربی اقوام جس بے چینی کا شکار ہوئیں اور انہوں نے جاپ شرق جو کوچ شروع کیا، کیا اسے لوں چار دہم، پانزدہم، شانزدہم، ان کی دشاؤں اور وزیروں کی سرگرمیوں، یانچوین، روسو، ریڈرو، بو، غشائی اور دوسروں کی زندگیوں کی تفصیل بتا کر بیان کیا جاسکتا ہے؟ کیا روسی عوام کی قازان اور سائبریا کی جانب نقل و حرکت کی تشریح خوف ناک ایران کی مرینہ مذہبیت اور اس کی کرہسکی کے ساتھ خط کتابت سے ہو جاتی ہے؟

صلیبی جنگوں کے دوران میں یورپی لوگوں نے مشرق کی طرف جو کوچ کیا، کیا اس کی تشریح گورنمنٹ اور اس کی قبیل کے دوسرے لوگوں، سویڈوں اور ان کی دشاؤں کی زندگیوں اور سرگرمیوں کے بیان سے ہو جاتی ہے؟ کسی مقصد اور کسی قیادت کے بغیر، وارہ گردوں اور پطرس راہب کی معیت میں اقوام نے مغرب سے مشرق کی جانب جو سفر کیا، وہ ہمارے لیے ابھی تک ناقابل فہم ہے۔ اور یہ بات تو بالکل ہی سمجھ میں نہیں آتی کہ جب تاریخی شخصیات اس نقل و حرکت کا عقلی اور مذہبی مقصد۔ یروشلم کی آزادی۔ واضح طور پر بیان کر چکی تھیں، اسے ختم کیوں کر دیا گیا۔ پوپ، بادشاہ اور فوجی ہم جیسے مختلف اقوام کے باشندوں پر زور دے رہے تھے کہ انہیں مقدس سرزمین کو آزاد کرانے

کے لیے کمر ہمت باندھ لینا چاہیے لیکن لوگ تھے کہ کانوں کو ہاتھ لگا رہے تھے کیونکہ وہ نامعلوم وجہ جس نے انھیں ادھر جانے کی ترغیب دی تھی، اب موجود نہیں رہی تھی۔ مورخین نے گود فٹے اور سنے شگروں کی داستانیں تو رقم کر دی ہیں لیکن یہ انھیں لوگوں کی داستانیں ہیں، جہاں تک عوام، الناس کی زندگی اور عزائم کا تعلق ہے، ان کا کچھ پتا نہیں چلتا۔

مصنفین اور مصلحین کی سوانح ہائے حیات تو اقوام کی زندگی پر اور بھی کم روشنی ڈالتی ہیں۔

کلچر کی تاریخ ہمیں کسی مصنف یا مصلح کے مہیجات، اس کے حیات زندگی اور خیالات سے آگاہ کرتی ہے۔ ہمیں یہ تو معلوم ہو جاتا ہے کہ لٹو تھر گرم مزاج تھا اور اس نے یہ اور یہ بات کہی، رد سو کی پراعتماد نہیں کرتا تھا اور اس نے فلاں اور فلاں کتاب لکھی لیکن ہمیں یہ معلوم نہیں ہوتا کہ تحریک اصلاح مذہب کے بعد لوگوں نے ایک دوسرے کا قتل عام کیوں کیا یا انھوں نے انقلاب فرانس کے دوران میں ایک دوسرے کو گلوٹین پر کیوں پڑھایا۔

مگر ہم دونوں اقسام کی تاریخوں کو یک جا کر دیں جیسے کہ جدید ترین مورخین کرتے ہیں، ہمیں حکمرانوں اور قلم کاروں کی تاریخیں تو مل جائیں گی لیکن عوام کی زندگیوں کی تاریخ پھر بھی ہاتھ نہیں آئے گی۔

5

اقوام کی زندگی محدودے چند اشخاص کی زندگیوں میں شامل نہیں ہوتی کیونکہ ان اشخاص اور اقوام کے مابین تعلق دریافت نہیں کیا جاسکا۔ یہ نظریہ کہ یہ تعلق کسی قوم کے اجتماعی منش کی خاص تاریخی شخصیات کو منتقلی پر مبنی ہے ابا مفروضہ ہے جسے تاریخ کی شہادت سے ثابت نہیں کیا جاسکا۔

عوام الناس کے، اجتماعی منش کی تاریخی شخصیات کو منتقلی کا نظریہ عام قانون کے دائرے میں تو شاید بہت کچھ واضح کر سکے اور شاید اس کے مقاصد کے لیے ضروری ہے، لیکن جو غیبي انقلابات، فتوحات یا خانہ جنگیوں کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ یعنی جب تاریخ کی ابتدا ہوتی ہے، تاریخ پر اس کا طلاق کرنے سے کسی چیز کی وضاحت نہیں ہوتی۔ یہ نظریہ محض اس لیے ناقابل تردید معلوم ہوتا ہے کیونکہ عوام الناس کے منش کی منتقلی کے عمل کی تصدیق نہیں ہو سکتی اور تصدیق اس لیے نہیں ہو سکتی کیونکہ ایسا کبھی ہوا ہی نہیں۔

اس امر سے قطع نظر کہ واقعے کی نوعیت کیا ہے اور اس کے وقوع پذیر ہونے میں کس کا ہاتھ ہے، یہ نظریہ ہمیشہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ اس واقعے میں قیادت فلاں شخص نے کی تھی کیونکہ اجتماعی منش اسے تفویض ہو چکا تھا۔ یہ نظریہ تاریخ کے سوالات کے جوابات دیتا ہے، وہ اس شخص کے جوابات سے ملتے جلتے ہیں جو موسیٰوں کے ریوڑ کی حرکات کا مشاہدہ کرنے کے بعد لیکن چراگاہ کے مختلف حصوں میں گھاس کی کی بیٹی یا گلہ بان کے ہنکارے کی طرف دھیان دیے بغیر یہ فیصلہ صادر کر دے کہ موسیٰ جس سمت میں جا رہے ہیں، اس سے جا رہے ہیں کیونکہ جو موسیٰ اتفاق سے ان سب کے آگے ہے، وہ ادھر جا رہا ہے۔

”ریورٹ اس لیے اس سمت میں جا رہا ہے کیونکہ جو سوشلٹی سب سے آگے ہے اور ان کی قیادت کر رہا ہے، وہ انہیں ادھر لیے جا رہا ہے اور دوسرے تمام مویشیوں کا اجتماعی منشا اس رہنما کی تحویل میں آچکا ہے۔“ اس قسم کا جواب پہلے زمرے کے مورخین دیتے ہیں وہی جو یہ فرض کر لیتے ہیں کہ قدار کی منتقلی غیر شرطہ ہوتی ہے۔

”اگر ریورٹ کی قیادت کرنے والے سوشلٹی تبدیل ہو جاتے ہیں، تو ایسا اس لیے ہوتا ہے کیونکہ تمام سوشلٹی یہ دیکھنے کے بعد کہ ان کا رہنما اس سمت میں، جو پورے ریورٹ نے مل کر منتخب کی ہوتی ہے، لے جا رہا ہے یا نہیں، اپنا اجتماعی منشا ایک رہنما سے دوسرے رہنما کو منتقل کر دیتے ہیں۔“ یہ جواب ان مورخین کا ہوتا ہے جو یہ فرض کر لیتے ہیں کہ عوام الناس کا اجتماعی منشا چند شرائط کے تحت، جنہیں وہ معلوم تصور کر لیتے ہیں، حکمرانوں کو تفویض ہو چکا ہوتا ہے۔ (مشاہدے کے اس طریقے میں اکثر ہوتا یہ ہے کہ مشاہد اس سمت سے، جسے وہ خود ترجیح دیتا ہے، متاثر ہو کر ان اشخاص کو رہنما سمجھ بیٹھتا ہے جو عوام انسان کے سمت تبدیل کرنے کی وجہ سے اب آگے نہیں رہتے بلکہ کسی پہلو پر یا بعض اوقات عقب میں بھی، نظر آنے لگتے ہیں۔)

”اگر اگلے سوشلٹی مسلسل تبدیل ہوتے رہتے ہیں اور سارے ریورٹ کی سمت یکم تغیر سے دوچار ہوتی رہتی ہے، تو اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ کسی سطحین سمت میں جانے کے لیے ریورٹ نے اپنا منشا ان مویشیوں کے سپرد کر دیا ہوتا ہے جو ہماری توجہ اپنی طرف مبذول کر لیتے ہیں اور یہ دیکھنے کے لیے کہ ریورٹ کس سمت میں جا رہا ہے، ہمیں ان تمام مویشیوں کی، جو ریورٹ کے چاروں اطراف چلتے نظر آتے ہیں، نقل و حرکت کا جائزہ لینا ہوگا۔“ یہ ادھر تیسرے زمرے کے مورخین کا ہے جو بدشادوں سے لے کر صحافیوں تک تمام تاریخی کرداروں کو اپنے زمانے کے ترجمان سمجھتے ہیں۔ عوام الناس کے منشا کی منتقلی کا نظریہ بعض الفاظ کا میر پھیر ہے۔ جیسا کہ وہ اس جگہ پہنا دیا گیا ہے۔

تاریخی واقعات کا موجب کون ہوتا ہے؟ قوت (یا قدار)۔

اقتدار کیا ہے؟ اقتدار عوام انسان کے اجتماعی منشا کا نام ہے جو فرد واحد کو تفویض کر دیا جاتا ہے۔

عوام الناس کا منشا کس شرط پر فرد واحد کو منتقل ہوتا ہے؟ اس شرط پر کہ وہ شخص عمومی طور پر تمام لوگوں کے منشا کا اظہار کرے۔

یعنی اقتدار اقتدار ہے۔ یعنی قدار ایک ایسا لفظ ہے جس کے معانی ہمیں معلوم نہیں۔



اگر انسانی علم کا دائرہ تجربی سوشلٹی بھارتک محدود ہوتا، پھر علم قانون اقتدار (قوت) کی جو توضیح کرتا ہے، اس کو تنقید کی کسوٹی پر پرکھنے کے بعد بنی نوع انسان اس نتیجے پر پہنچ جاتے کہ اقتدار بعض ایک لفظ ہے اور حقیقتاً اس کا کوئی وجود نہیں ہے۔ لیکن واقعات کو جانچنے پر کھنے اور سمجھنے کے لیے انسان کے پاس تجربی استدلال کے علاوہ ایک اور اوزار ہے۔ تجربہ (experience)۔ ہے۔ اس کی وساطت سے وہ اپنے غور و فکر کے نتائج کی تصدیق کر سکتا ہے۔ اور

تجربہ ہمیں بتاتا ہے کہ اقتدار خالی خوبی لفظ نہیں ہے بلکہ ایک ایسی چیز ہے جو حقیقتاً موجود ہوتی ہے اور سب کو نظر آنی رہتی ہے۔

اس حقیقت کا تذکرہ ہی کیا کہ انسانوں کی کسی بھی اجتماعی سرگرمی کے ذکر میں اقتدار کا تصور نہ مانا جائے گا، تاریخ اور معاصر واقعات کے مشاہدے دونوں سے اقتدار کا وجود ثابت ہوتا ہے۔

جب کوئی واقعہ ظہور پذیر ہوتا ہے، ایک شخص یا چند اشخاص منظر عام پر نمودار ہو جاتے ہیں۔ بظاہر یہی نظر آتا ہے کہ واقعات انھیں کے منشا کے طفیل ظہور پذیر ہوا ہے۔ پولیس سوم فرمان جاری کرتا ہے، اور فرانسیسی عازم میکسیکو³⁸ جاتے ہیں۔ پرشیا کا بادشاہ اور ہسپارک³⁹ احکام جاری کرتے ہیں اور فوج بومبیا میں داخل ہو جاتی ہے۔ پولیس علم دیتا ہے اور فوج روس میں ٹھس جاتی ہے۔ الیکسندر اول حکم دیتا ہے اور فرانسیسی بومبوں کی اطاعت قبول کر لیتے ہیں۔ تجربہ ہمیں سکھاتا ہے کہ جب کبھی کوئی واقعہ پیش آتا ہے، اسے ہمیشہ کسی فرد واحد یا متعدد افراد کے منشا سے، جنہوں نے فرمان جاری کیا ہوتا ہے کہ ایسا ہونا چاہیے۔ منسلک کر دیا جاتا ہے۔

مورخین انسانی امور میں الوہی مداخلت کو تسلیم کرنے کی اپنی پرانی عادت کے مطابق دہنے کا سبب کسی شخص کی مرضی کے اظہار جسے اقتدار دیت ہو ہوتا ہے، میں تلاش کرنے لگتے ہیں لیکن اس مفردے کی تصریح نہ عقل سے ہوتی ہے اور نہ تجربے سے۔

ایک طرف غور و فکر (عقل) سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ آدمی اپنے جس منشا کا۔ اس کے الفاظ۔ اظہار کرتا ہے، محض جزو ہے اور چنانچہ کسی ناقابل تفہیم اور فوق الفطرت طاقت۔ معجزے۔ کو فرض کیے بغیر یہ تسلیم کرنا ممکن ہو جاتا ہے کہ الفاظ لاکھوں، اشخاص کی نقل و حرکت کا فوری سبب بن سکتے ہیں۔ دوسری طرف اگر ہم یہ تسلیم کر لیں کہ الفاظ واقعات کا سبب بن سکتے ہیں، تاریخ ثابت کرتی ہے کہ تاریخی شخصیات کے منشا کے اظہار سے بہتر صورتوں میں کوئی خاص نتیجہ برآمد نہیں ہوتا یعنی ان کے احکام کو اکثر عملی جامہ نہیں پہنایا جاتا اور بعض اوقات تو وہ جس چیز کا حکم دیتے ہیں، اس کے بالکل برعکس ظہور پذیر ہوتا ہے۔

انسانی معاملات میں الوہی مداخلت کو تسلیم کیے بغیر ہم قوت (یا اقتدار) کو واقعات کا سبب تسلیم نہیں کر سکتے۔ تجربہ کے نقطہ نگاہ سے اقتدار محض وہ تعلق ہے جو کسی شخص کے منشا کے اظہار اور دوسروں کے ذریعے اس منشا کی تکمیل کے مابین موجود ہوتا ہے۔

اس تعلق کی شرائط کی تصریح کرنے سے پہلے ہمیں معبود کے نہیں بلکہ انسان کے حواس سے منشا کے اظہار کا تصور قائم کرنا پڑے گا۔

اگر احکام دیئے اور اپنی منشا (مشیت) کا اظہار کرنے والا معبود ہے (جیسا کہ پرانے مکتبہ فکر کی تاریخ ہمیں یقین دلاتی رہتی ہے)، پھر یہ مشیت اپنے اظہار کے لیے کبھی وقت (زمان) کی محتاج نہیں ہو سکتی اور نہ کوئی زمانہ وہی چیز اس کے اظہار کا سبب بن سکتی ہے کیونکہ معبود پر دہنے کا کوئی اختیار نہیں ہوتا۔ لیکن جب ہم ان احکام کا

جوانوں کے منشا کا۔ جنھیں وقت کے اندر کام کرنا پڑتا ہے اور جنھیں ایک دوسرے سے ربط و ضبط رکھنا پڑتا ہے۔ اظہار ہوتے ہیں، ذکر کرتے ہیں، تو ہم اگر احکام کا واقعات کے ساتھ تعلق سمجھنا چاہتے ہیں تو ہمیں دو شرائط کو پھر سے مانگو کرنا ہوگا 1۔ جو واقعات پیش آتے ہیں اور جو شخص احکام دیتا ہے، ان دونوں کا وقت کے ساتھ غیر مقطوع تعلق ہوتا ہے۔ یہ وہ شرط ہے جس کی ہر وہ چیز، جو قریب پڑ رہی ہے، تابع ہوتی ہے۔ (دوسرے الفاظ میں کہی چیز وقت سے آزاد نہیں ہو سکتی۔) 2 اس شخص کے، جو احکام دیتا ہے اور ان اشخاص کے مابین، جو اس کے احکام کو عملی جامہ پہناتے ہیں، ناگزیر تعلق ہوتا ہے۔

6

صرف معبود کی، جو وقت کا تابع نہیں ہوتا، مشیت کے اظہار کی واقعات کے پورے سلسلے سے، جو سببوں یا صدیوں پر محیط ہوتا ہے کوئی نسبت ہو سکتی ہے، اور صرف معبود ہی، جو کسی کا محتاج نہیں ہوتا، اپنی مشیت واحدہ کے ذریعے نہ نوں کی حرکت کی سمت کا تعین کر سکتا ہے۔ رہا انسان، وہ وقت کے تابع ہوتا ہے اور بذات خود واقعے میں شریک ہوتا ہے۔

جب ہم پہلی شرط کو۔ جس کا تعلق وقت ہے۔ جسے پہلے نظر انداز کر دیا گیا تھا، دوبارہ دہنا گرتے ہیں، تو ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ کسی سابقہ حکم کے بغیر کسی بھی نئے حکم کی تعمیل نہیں ہو سکتی۔ یہ سابقہ حکم ہی آخری حکم کی تعمیل کو ممکن بناتا ہے۔

کوئی حکم نی اسد یہہ منظر عام پر نہیں آتا (اس کے لیے کسی خارجی قوت کا ہونا ضروری ہے) اور نہ یہ واقعات کے پورے سلسلے پر حاوی ہوتا ہے۔ ہر حکم کسی دوسرے حکم کا شاخسانہ ہوتا ہے، یہ واقعات کے پورے سلسلے کا احاطہ نہیں کرتا بلکہ اس کا تعلق کسی واقعے کے محض ایک لمحے سے ہوتا ہے۔

مثلاً جب ہم یہ کہتے ہیں کہ پوینن نے افواج کو جنگ شروع کرنے کا حکم دے دیا، تو ہم کے بعد دیگرے دیے جانے والے احکام کے، جن کا ایک دوسرے کے ساتھ گہرا تعلق تھا، پورے سلسلے کو ایک ہی جیسے میں سو دیتے ہیں۔ پوینن روس پر حملے کی کمان نہیں کر سکتا تھا اور نہ اس نے کیا۔ ایک روز اس نے حکم دیا کہ فلاں فلاں مراسلے تحریر کیے جائیں اور انھیں ویانا، برلن اور پٹرز برگ بھیج دیا جائے۔ اگلے روز اس نے بعض فرمان اور احکام بری اور بحری افواج اور محکمہ رسد کو بھجوانے کا اہتمام کیا۔ یوں یہ سلسلہ چلا رہا تھا آنکھ ان احکام کی تعداد اناکھوں تک پہنچ گئی اور ان کا یہ سلسلہ واقعات کے اس سلسلے کے، جو فرانسیسی فوجوں کی روس پر چڑھائی پر ختم ہوا، عین مطابق تھا۔

پوینن اپنے سرے عہد حکومت کے دوران میں انگلستان پر حملہ کرنے کے سبب میں احکام جاری کرتا رہا اور وہ اس مہم کی تیاری پر جتنا وقت اور کوشش صرف کرتا رہا، اتنا اس نے کسی اور مہم پر نہیں کیا تھا، لیکن اپنے پورے عہد حکومت میں اس نے ایک مرتبہ بھی اس منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کی کوئی سعی نہ کی، اس کی بجائے اس نے

روس پر حملہ کر دیا حالانکہ روس وہ ملک تھا جس کے ساتھ اتحاد میں غسلک ہونے کو وہ سوومند قرار دیتا تھا (اسپے اس یقین کا وہ بار بار اعادہ کرتا رہا) اگر اس نے انگلستان پر حملہ نہیں کیا اور محض روس کو اپنا نشانہ بنانے پر اکتفا کیا تو اس کی وجہ یہ تھی کہ پہلی صورت میں اس کے احکام کی رفتار اور واقعات کی رفتار میں کوئی مطابقت نہیں تھی جب کہ دوسری صورت میں تھی۔

حکم کی تعمیل یقینی بنانے کے لیے یہ ضروری ہے کہ حکم وہ دیا جائے جس کو عملی جامہ پہنانا ممکن ہو۔ لیکن یہ چاہنا ممکن ہے کہ کس حکم پر عمل درآمد کرایا جاسکتا ہے اور کس پر نہیں۔ یہ بات نہ صرف نیوین کے روس پر حملے کے، جس میں لاکھوں افراد نے حصہ لیا، بارے میں صحیح ہے بلکہ انتہائی سادہ اور غیر پیچیدہ واقعے پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے کیونکہ دونوں صورتوں میں لاکھوں رکاوٹیں پیدا ہو سکتی ہیں جو حکم کی تعمیل میں حراجم ہو سکتی ہیں۔ ہر حکم، جس کی تعمیل ہوتی ہے، ان لاتعداد احکام میں سے، جو بلا تعمیل رہ جاتے ہیں، ایک ہوتا ہے۔ تمام ناممکن احکام کی واقعات کی رفتار سے کوئی مطابقت نہیں ہوتی اور یوں ان کی تعمیل نہیں ہو پاتی۔ صرف قابل عمل احکام آپس میں مل کر یکے بعد دیگرے احکام کا سلسلہ بنتے ہیں اور چونکہ وہ واقعات کی رفتار کے مطابق ہوتے ہیں، اس لیے ان پر عمل بھی ہو جاتا ہے۔

ہم غلط طور پر جو یہ تصور کر لیتے ہیں کہ واقعے کا سبب وہ حکم ہوتا ہے جو اس کے وقوع پذیر ہونے سے پیشتر بنا جاتا ہے، تو اس کی وجہ یہ ہے کہ جب کوئی واقعہ ظہور پذیر ہو جاتا ہے، تو ہم ان ضروری احکام میں سے، جو واقعے سے پیشتر جاری ہوتے ہیں، چند ایک کو جو واقعات سے مطابقت رکھتے ہیں اور جن پر عمل ہو چکا ہوتا ہے، اپنی توجہ مرکوز بناتے ہیں اور دوسروں کو، جن پر عمل نہیں ہو پاتا کیونکہ ان پر عمل ہو ہی نہیں سکتا تھا، فراموش کر دیتے ہیں۔ علاوہ ازیں اس معاملے میں ہماری غلطی کا بڑا باعث یہ حقیقت ہے کہ واقعات تو لاتعداد پیش آتے ہیں، ان میں کوئی چھوٹا ہوتا ہے اور کوئی بڑا، اور یہ ہوتے بھی متنوع (جب فرانسیسی فوجیوں نے روس پر یغمار کی تھی تو یہی کچھ ہوا تھا)، مگر جب ہم تاریخ رقم کرنے بیٹھتے ہیں، ہم ان واقعات کے پورے سلسلے کی اس نتیجے کے مطابق، جو انھوں نے پیدا کیا ہوا ہے، تعمیم کر کے واحد واقعے میں ڈھال دیتے ہیں اور اس سے ملتی جھتی تعمیم کر کے احکام کے پورے سلسلے کو یوں یک جا کر دیتے ہیں کہ وہ منشا کا واحد اظہار بن جاتے ہیں۔

ہم کہتے ہیں کہ نیوین روس پر حملہ کرنا چاہتا تھا اور اس نے یہ حملہ کر دیا۔ تاہم اصل حقیقت یہ ہے کہ نیوین جو کچھ کرتا کرتا رہا، ہمیں اس میں کوئی ایسی چیز نہیں ملتی جو اس کی اس خواہش کے اظہار سے ذرا بھی مشابہ ہو۔ ہمیں جو کچھ معلوم ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ وہ یا تو انتہائی مختلف النوع اور غیر واضح احکام دیتا رہا یا پھر اپنے منشا کا ہم اندازے اظہار کرتا رہا۔ اس کے جن احکام پر عمل نہ ہو سکا، وہ لاتعداد سلسلوں پر مشتمل ہیں اور احکام کے جس واحد سلسلے کو، جس کا تعلق 1812 کی ہم سے ہے، عملی جامہ پہنایا جاسکا، اسے بھی جو عملی جامہ پہنایا گیا، وہ اس سے نہیں تھا کہ یہ احکام دوسرے احکام سے، جن کی تعمیل نہ ہو سکی، کسی لحاظ سے مختلف تھے بلکہ اس لیے کیونکہ احکام کا یہ خاص سلسلہ ان واقعات کے، جو فرانسیسیوں کے روس میں داخل کا باعث بنے، سلسلے کے عین مطابق تھا۔ یہ بالکل ایسے ہی تھا جیسے نقش ساز

تختی (stencil) کی مدد سے نقوش یا حروف چھاپنے کے کام میں ہوتا ہے۔ تختی حروف یا نقوش اس لیے نہیں چھاپتی کہ رنگ اس کے اس یا اس رخ پر یا کسی خاص طریقے سے لگایا جاتا ہے بلکہ اس لیے کیونکہ تختی پر جو نقوش یا حروف کھدے ہوتے ہیں، ان پر رنگ اچھی طرح بھردیا جاتا ہے۔

چنانچہ جب ہم وقت کے اندر واقعات کے ساتھ احکام کے تعلق کا جائزہ لیتے ہیں، جس میں معلوم ہوتا ہے کہ کوئی حکم کسی صورت میں بھی کسی واقعے کا سبب نہیں بنتا۔ حکم اور واقعات دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں، مگر ایک عدم موجود ہو، دوسرے کا بھی کوئی وجود نہیں ہو سکتا۔

یہ باہمی انحصار کیا ہے، اسے سمجھنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ ہر وہ حکم، جو مبنی نہیں بلکہ انسان ارتقا ہے، جن دو شرائط کے تابع ہے، ان میں دوسری شرط بحال کر دی جائے۔ یعنی یہ تسلیم کر لیا جائے کہ جو آدمی حکم جاری کرتا ہے، وہ واقعے میں، زما شریک ہوتا ہے۔

لکائنہ رکابان اشخاص کے ساتھ عین من یکی وہ تعلق ہے، جو "اقتدار" (یا "قوت") کہلاتا ہے۔ اس تعلق کو یوں بیان کیا جاسکتا ہے:

مشترکہ کارروائی کے لیے انسان ہمیشہ خاص نوعیت کے کردہ بنائیتے ہیں۔ مشترکہ کارروائی کے مقاصد کی ہونا چاہئیں، اس بارے میں اختلافات ہو سکتے ہیں لیکن کارروائی میں حصہ لینے والوں کا باہمی تعلق ہمیشہ جوں کا توں رہتا ہے، اس میں کوئی تبدیلی نہیں آتی۔

مشترکہ کارروائی کے لیے جو لوگ گردہ بناتے ہیں، ان کے مابین کچھ اس قسم کا تعلق استوار ہو جاتا ہے کہ اکثریت تو کارروائی میں براہ راست شریک ہوتی ہے لیکن اقلیت کا کردار قار اور راست نہیں ہوتا۔ ان تمام گردہ ہوں میں، جو لوگ مشترکہ کارروائی کے لیے تشکیل کرتے ہیں، نمایاں ترین اور واضح ترین مثال فوج پیش کرتی ہے۔

ہر فوج مختلف مراتب کے حامل اشخاص پر مشتمل ہوتی ہے۔ سب سے زیادہ تعداد ادنیٰ ترین رتبے کے ملازمین۔ عام سپاہیوں۔ کی ہوتی ہے۔ ان کے بعد ان سے رتبے کے اعتبار سے قدرے بلند لوگ۔ کارپول ورنان کمشڈ افسر۔ آتے ہیں اور ان کی تعداد اول الذکر کے مقابلے میں خاصی کم ہوتی ہے۔ ان سے بھی اونچے افسر تعداد میں اور بھی کم ہوتے ہیں اور یہ سلسلہ چلتے چلتے اعلیٰ ترین عسکری کمان تک پہنچ جاتا ہے اور یہ صرف ایک شخص میں مرکوز ہوتی ہے۔

فوجی تنظیم کا صحیح طور پر مخروطے (cone) سے موازنہ کیا جاسکتا ہے۔ اس کا زیریں حصہ، جس کا قطر سب سے بڑا ہوتا ہے، عام سپاہیوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ مخروطے کی طرح اس سے اوپر کا حصہ، جو فوج کے اگلے درجے کے لوگوں پر مشتمل ہوتا ہے، بتدریج تنگ ہوتا جاتا ہے اور یوں تنگ ہوتے ہوئے بالکل چوٹی تک پہنچ جاتا ہے اور یہ نقطہ کمانڈر انچیف کی نمائندگی کرتا ہے۔

سپاہی، جن کی تعداد سب سے زیادہ ہوتی ہے، زیریں حصے اور اساس کی تشکیل کرتے ہیں۔ جہاں تک عام سپاہی کا تعلق ہے وہ فخر اور شمشیر گھونپتا ہے، لوگوں کے سر قلم کرتا ہے اور اعضا کا قہ ہے، لگیں لگاتا اور لوٹا کرنا ہے۔ وہ ان تمام کارروائیوں کے لیے اپنے سے اوپر کے اشخاص کے احکام وصول کرتا ہے لیکن خود کبھی کوئی حکم نہیں دیتا۔ نان کمشنڈ افسر (یہ افسر سپاہیوں کے مقابلے میں بہت کم ہوتے ہیں) ان کارروائیوں میں سپاہی سے کم حصہ لیتا ہے لیکن خاص تعداد میں احکام ضرور دیتا ہے۔ کمشنڈ افسر براہ راست کارروائی میں نان کمشنڈ افسر سے بھی کم شریک ہوتا ہے لیکن احکام اس سے کہیں زیادہ دیتا ہے۔ جرنیل کچھ بھی نہیں کرتا، بس فوج کی کارروائی کرتا ہے اور خود شاؤ و نادر ہی کبھی کوئی ہتھیار استعمال کرتا ہے۔ کمانڈر انچیف براہ راست کبھی کسی کارروائی میں شریک نہیں ہوتا۔ کثیر التعداد افواج کی نقل و حرکت کے بارے میں محض عمومی احکام جاری کرتا ہے۔ زراعت ہو، تجارت ہو، یا کوئی انتظامی محکمہ۔ انسان جہاں بھی مشترکہ کارروائی کے لیے گروہ بندی کرتے ہیں، افراد کے، مین اسی قسم کا تعلق استوار ہو جاتا ہے۔

چنانچہ محروم طے کے تمام متصل حصوں کو۔ فوج، کسی انتظامی یا سرکاری ادارے کے زیریں تریں سے اعلیٰ تریں تمام درجوں کو۔ مبالغہ آمیز انداز سے ایک دوسرے سے علیحدہ کیے بغیر ہم ایک ایسا قانون دریافت کر رہے ہیں جس کے ذریعے انسان مشترکہ کارروائی کرنے کے لیے کچھ اس طرح آپس میں تعلقات قائم کر کے متحد ہوجاتے ہیں کہ جو اشخاص کارروائی میں جتنا زیادہ براہ راست شریک ہوتے ہیں، ان کی تعداد اتنی ہی کم ہوتی ہے، اور ان کے پاس حکم دینے کا اختیار اتنا ہی کم ہوتا ہے، اس کے برعکس وہ اشخاص، جو کارروائی میں براہ راست جتنا کم حصہ لیتے ہیں، ان کی تعداد اتنی ہی کم ہوتی ہے اور ان کے پاس حکم دینے کا اختیار اتنا ہی زیادہ ہوتا ہے۔ اس طریقے سے اعلیٰ تریں درجے سے اعلیٰ تریں درجے تک پہنچ جاتے ہیں اور اس اعلیٰ تریں درجے یا مقام پر جو شخص فائز ہوتا ہے اس کا براہ راست کارروائی میں سب سے کم حصہ ہوتا ہے اور باقی تمام اشخاص کے مقابلے میں وہ اپنی توانائی زیادہ دوسروں کو احکام دینے کے لیے وقف کر دیتا ہے۔

ان اشخاص کے، جو احکام دیتے ہیں اور ان اشخاص کے مابین جو احکام کی تعمیل کرتے ہیں، یہی وہ تعلق ہے جس میں اس تصور کی، جسے اقتدار (طاقت) کہا جاتا ہے، اصل روح مضمر ہوتی ہے۔

وقت کی، جس کے اندر تمام واقعات ظہور پذیر ہوتے ہیں، شرط بحال کرنے کے بعد ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ حکم کی تعمیل صرف تبھی ممکن ہے جب واقعات کے سلسلے کے ساتھ اس کا تعلق بنتا ہو۔ اسی طرح ان اشخاص کے، جو احکام دیتے ہیں اور ان اشخاص کے مابین، جو ان احکام کی تعمیل کرتے ہیں، تعلق کی، یہی شرط بحال کرنے کے بعد ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ خود صورت حال کی نوعیت ہوتی ہی کچھ اس طرح کی ہے کہ جو اشخاص احکام دیتے ہیں، وہ عملی کارروائی میں کم سے کم حصہ لیتے ہیں اور ان کی سرگرمیوں کا دائرہ محض احکام دینے تک محدود ہوتا ہے۔

جب کوئی واقعہ ظہور پذیر ہوتا ہے، لوگ اس کے متعلق مختلف آراء اور امیدوں کا اظہار کرنے لگتے ہیں، اور چونکہ واقعہ بہت سے اشخاص کی اجتماعی کارروائی کا نتیجہ ہوتا ہے، ان میں سے ایک آراء رائے یا امید کا پورا ہونا، خواہ تقریباً ہی کسی امر یقینی ہے۔ چنانچہ ان میں سے جب کوئی رائے پوری ہو جاتی ہے، اسے واقعے کے ساتھ یوں منسلک کر دیا جاتا ہے کہ وہ واقعے کے ظہور پذیر ہونے سے پہلے کا حکم دکھائی دینے لگتی ہے۔

چند اشخاص شہر گھسیٹ رہے ہیں۔ اسے کب اور کیسے گھسیٹنا ہے، اس کے متعلق ان میں سے ہر ایک اپنی اپنی رائے کا اظہار کرتا ہے۔ وہ شہر گھسیٹ کر مقررہ مقام پر لے جاتے ہیں۔ ہوتا یہ ہے کہ ان میں سے کسی ایک شخص نے جو کچھ کہا ہوتا ہے، یہ کام اس کے مطابق پایہ تکمیل تک پہنچ جاتا ہے۔ یوں سمجھیں کہ اس نے حکم دیا تھا۔ یہاں ہمیں حکم اور اختصار اپنی ابتدائی صورت میں نظر آتے ہیں۔

جو شخص اپنے بازوؤں کے ساتھ سب سے زیادہ زور لگا رہا تھا، وہ جو کچھ کر رہا تھا، اس کے بارے میں وہ دوسروں کی نسبت سب سے کم سوچنے کے قابل تھا، نہ وہ یہ تصور کر سکتا تھا کہ ان کی اس مشترکہ کارروائی کا نتیجہ کیا برآمد ہوگا اور نہ وہ کوئی حکم دینے کی اہلیت سے بہرہ ور تھا۔ وہ شخص، جو زیادہ تر حکم دے رہا تھا، چونکہ اس کا بیشتر وقت اور صلاحیتیں لفظی اور زبانی مصروفیت پر صرف ہو رہی تھیں، اس لیے اسے باقیوں کی نسبت براہ راست دستی کام کرنے کا کم موقع ملا۔

جب انسانوں کا خد صابڑا گروہ اپنی سرگرمیوں کا محور کوئی مشترکہ منصوبہ بنالیتا ہے، پھر ان کے مابین یہ تقسیم کار اور بھی واضح صورت اختیار کر لیتی ہے کیونکہ وہ اشخاص، جن کی سرگرمیاں ہدایات اور احکام دینے تک محدود ہوتی ہیں، اصل کام میں براہ راست بہت کم حصہ لیتے ہیں۔

جب کوئی شخص اکیلا کام کرتا ہے، اس کے ذہن میں چند ایسی باتیں ہوتی ہیں جن میں وہ ہمیشہ پیش نظر رکھتا ہے کیونکہ اسے یہ پختہ یقین ہوتا ہے کہ انہیں باتوں نے ماضی میں اس کے انہماک کی رہنمائی کی تھی، یہی اس کے موجودہ افعال کا جو ز پیش کرتی ہیں اور یہی اس کی اپنے مستقبل کے منصوبے وضع کرنے میں مدد دیتی ہیں۔

بالکل اسی انداز سے انسانوں کے گروہ ان اشخاص کو، جو براہ راست کارروائی میں شریک نہیں ہوتے، ایسے موقع فراہم کر دیتے ہیں کہ وہ اس کام کے بارے میں، جو مشترکہ طور پر کر رہے ہوتے ہیں، غور و فکر کریں، اس کا جواب ڈھونڈیں اور (اس کی کامیابی یا ناکامی کے متعلق) قیاس آرائیاں کریں۔

معلوم یا نامعلوم وجوہ کے پیش نظر اگر انہیں کسی ایک دوسرے کو ذبح اور ملیا میٹ کرنے لگتے ہیں۔ یہ واقعہ پیش تو آگیا لیکن اس کا جو ز کیا تھا، اس کی وضاحت ضروری تھی۔ چنانچہ اس کا جواز یہ گھڑا گیا کہ یہ حریت، مساوات اور فرانس کی بہبود کے لیے ناگزیر تھا۔ لوگ ایک دوسرے کی گردنیں ناپائند کر دیتے ہیں اور اس کا جواز یہ پیش کیا جاتا

ہے کہ اس قسم کی حرکتوں سے ہاتھ اٹھانا اس لیے ضروری تھا تاکہ اختیارات کی مرکزیت قائم کی جاسکتی، یورپ کے خلاف مدافعت استوار کی جاسکتی اور اس قسم کے دوسرے کام پایہ تکمیل تک پہنچائے جاسکتے۔ لوگوں کا مغرب سے مشرق کی جانب کوچ شروع ہو جاتا ہے اور وہ اپنے ہم جنسوں کو موت کے گھاٹ اتارنے لگتے ہیں۔ اس واقعے کو جائز ٹھہرانے کے لیے فرانس کی سطوت، انگلستان کی کمینگی اور اس قسم کی دوسری خوشنما ترکیبوں اور اصطلاحوں کا استعمال شروع ہو جاتا ہے۔ تاریخ ہمیں بتا رہی ہے کہ واقعات کی یہ توجیہات عمومی مفہوم سے عاری اور ہامہ دگر متضاد ہوتی ہیں۔ جیسے مثال کے طور پر یہ بات بالکل ناقابل فہم اور متناقض ہے کہ آپ ایک شخص کے حقوق کو تسلیم کر لیں لیکن اس کے نتیجے کے طور پر اسے ہلک کر دیں یا آپ تذلیل تو انگلستان کی کرنا چاہتے لیکن خون لاکھوں روسیوں کا بہاتے ہیں۔ تاہم اپنے زمانے میں ان توجیہات کی لازماً بڑی اہمیت ہوتی ہے۔

اس قسم کی توجیہات ان شخصوں کو جو واقعات کا سبب بنتے ہیں، اخلاقی ذمہ داری سے خلاصی دلاتی ہیں۔ اپنے زمانے میں یہ وہی کام کرتی ہیں جو چاروب نما آلے، جنھیں ریل کی پٹری سے برف ہٹانے کے لیے انجن کے آگے لگایا جاتا ہے، سرانجام دیتے ہیں۔ وہ آدمی کے رستے سے اس کی اخلاقی ذمہ داریاں ہٹا رہی ہیں۔ ان توجیہات کے بغیر اس سادہ ترین سواں کا، جو تاریخ کے ہر واقعے کا جائزہ لینے کے دوران میں پیدا ہوتا رہتا ہے، کوئی جواب مہیا نہیں ہو سکے گا لاکھوں انسان جنگ و قتال جیسے اجتماعی جرائم کا ارتکاب کیوں کرتے ہیں؟ یورپ کی موجودہ سیاسی اور معاشرتی زندگی نے جو پیچیدہ صورتیں اختیار کر لی ہیں، کیا ان کی موجودگی میں کوئی شخص کسی ایسے واقعے کا تصور کر سکتا ہے جسے بادشاہوں، وزیروں، قانون ساز اداروں یا اخباروں نے تجویز نہ کیا ہو، یا اس کا حکم اور فرمان نہ جاری کیا ہو؟ کیا کوئی ایسی اجتماعی کارروائی سے جس کا راز سیاسی اتحاد، حب الوطنی توازن طاقت یا تہذیب کے حوالے سے نہ دیا جاسکتا ہو؟ چنانچہ جو واقعہ بھی ظہور پذیر ہوتا ہے، ناگزیر طور پر کسی خوش کے ساتھ، جس کا اظہار کیا جا چکا ہو، تہ بوقت اختیار کر لیتا ہے اور جب اسے جواز مل جاتا ہے، وہ کسی شخص کا احادی چند اشخاص کے منشا کا روپ دھار لیتا ہے۔

جہ زخواہ کسی سمت میں چلے، اس کے پیش حصے کے پانی سے ٹکرانے سے جو لہر ابھرے گی، وہ ہمیشہ اس کے آگے رہے گی۔ جو لوگ جہاز پر سوار ہیں، انھیں سمندر میں جو واحد حرکت نظر آئے گی، وہ اسی لہر کی حرکت ہوگی اس لہر کی حرکت کا بغور جائزہ لینے اور اس کا جہاز کی حرکت سے موازنہ کرنے کے بعد ہی ہم اپنے آپ کو قائل کر سکیں گے کہ یہ سراسر جہاز کے آگے بڑھنے سے مشروط ہے اور یہ کہ ہم سے غلطی کا ارتکاب اس حقیقت کی بنا پر ہوا کہ ہم خود غیر محسوس طور پر متحرک تھے۔

اگر ہم تاریخی شخصیات کے آگے بڑھنے کے عمل کا لحاظ بہ لحاظ مشاہدہ کریں (یعنی جو کچھ توغ پذیر ہوتا ہے، اس کی ناگزیر شرط۔ وقت کے اندر حرکت کا تسلسل۔ پیش نظر رکھیں) اور تاریخی شخصیات کے عوام اناس کے ساتھ تعلق کو نظر انداز نہ کریں، ہمیں یہاں بھی وہی کچھ نظر آئے گا (جو کچھ ہمیں لہر کے سلسلے میں دکھائی دیتا تھا)۔

جب جہاز ایک ہی سمت میں چلتا رہتا ہے، اس سے آگے ہر میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوگی، وہ مسلسل جوں کی توں رہے گی لیکن جو بھی جہاز اپنا رخ تبدیل کرتا ہے، یہ بھی تبدیل ہو جائے گی۔ تاہم جہاز جس طرف چاہے، اپنا رخ تبدیل کر لے، ہر اس کی حرکت کا پیشگی، اندازہ لگائے گی اور یوں ہمیشہ ہی اس کے آگے آگے رہے گی۔ خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہو جائے، نظر ہمیشہ یہی آئے گا کہ پہلے سے اس کا صحیح صحیح اندازہ لگایا جا چکا اور اس کے وقوع پذیر ہونے کا فرمان جاری ہو چکا ہے۔ جہاز جس طرف چاہے، مڑ جائے، بہرتی، بل کھاتی اور جھگ اڑاتی لہو جو نہ توجہ زکار رخ متعین کرتی ہے اور نہ اس کی رفتار میں کوئی اضافہ کرتی ہے، اسے گی ہمیشہ اس کے آگے ہی، اور دور سے ہمیں یہی معلوم ہوتا رہے گا کہ یہ نہ صرف اپنے آپ حرکت کر رہی ہے بلکہ جہاز کی حرکت کا باعث بھی یہی ہے۔



تاریخی شخصیات اپنے منشا کا اظہار مختلف احکام، فرامین اور فرمودت کے ذریعے کرتی ہیں۔ مورخین ان کے ان احکام کا، جن کا واقعے سے تعلق بنتا ہے، جائزہ لیتے ہیں اور یہ مفروضہ قائم کر لیتے ہیں کہ واقعات ان احکام کے تابع تھے۔ لیکن خود واقعات اور اس تعلق کا، جو تاریخی شخصیات کا عوام الناس سے بنتا ہے، جائزہ لینے کے بعد ہمیں معلوم ہو چکا ہے کہ تاریخی شخصیات، دوران کے احکام واقعات کے تابع ہوتے ہیں۔ اس استخراج کا ناقابل تردید ثبوت اس حقیقت میں موجود ہے کہ خود کہتے ہی احکام کیوں نہ دیے جائیں، واقعہ اس وقت تک ظہور پذیر نہیں ہوتا جب تک اس کے دیگر اسباب موجود نہ ہوں۔ لیکن جو بھی کوئی واقعہ، خواہ یہ کیوں نہ ہو۔ رونما ہوتا ہے، پھر مختلف اشخاص کی متعدد خواہشات میں سے، جن کا بار بار اظہار کیا جاتا ہے، چند ایک لازماً ایک ایسا مل جائیں گی جو اپنے مفہوم اور ادائیگی کے وقت کے اعتبار سے ایسے احکام دکھائی دینے لگیں گی جن کا تعلق واقعے سے ثابت ہوتا ہے۔

اس نتیجے پر پہنچنے کے بعد ہم تاریخ کے ان دو انتہائی ضروری اور بنیادی مولات کے براہ راست اور مثبت جوابات دے سکتے ہیں:

(1) اقتدار (قوت) کیا ہے؟

(2) کون سی طاقت عوام کو متحرک کرتی ہے؟

(1) اقتدار وہ تعلق ہے جو کسی خاص شخص کا دوسرے اشخاص سے ہوتا ہے۔ اس میں ہوتا یہ ہے کہ یہ شخص اجتماعی کارروائی کے ضمن میں جتنی زیادہ آراء کا اظہار کرتا ہے، جتنی زیادہ تیس آراء یوں کرتا ہے، وہ اس کے حق میں جتنے زیادہ دماک دیتا ہے، اس (کارروائی) میں اس کا اپنا حصہ اتنا ہی کم ہوتا ہے۔

(2) بعض مورخین سمجھتے ہیں کہ اقتدار تابع تغیر سرگرمیاں یا دونوں مل کر اقوام کو متحرک کرنے کا باعث بنتی ہیں لیکن حقیقتاً ایسا نہیں ہے۔ اقوام کو جو چیزیں متحرک کرتی ہیں، وہ ان تمام لوگوں کی، جو واقعے میں شریک ہوتے ہیں، سرگرمیاں ہوتی ہیں۔ یہ لوگ اس انداز سے آپس میں اشتراک کرتے ہیں کہ جو اشخاص واقعے

میں جتنا زیادہ براہ راست حصہ لیتے ہیں، ان کی ذمہ داری اتنی ہی کم ہوتی ہے۔ اس کے برعکس جو اشخاص واقعے میں جتنا کم براہ راست حصہ لیتے ہیں، ان کی ذمہ داری اتنی ہی زیادہ ہوتی ہے۔

اخلاقی اعتبار سے واقعے کا سبب وہ شخص بنتا ہے جو اقتدار کا مالک ہوتا ہے اور جسمانی اعتبار سے اس کا سبب وہ اشخاص ٹھہریں گے جو صاحب اقتدار کے سامنے سر تسلیم خم کر دیتے ہیں لیکن چونکہ اخلاقی سرگرمی کا جسمانی سرگرمی کے بغیر تصور بھی ناممکن ہے، چنانچہ واقعے کا سبب نہ ایک فریق بنتا ہے نہ دوسرا، بلکہ دونوں مل کر اس کو جنم دے مالتے ہیں۔

بالفاظ دیگر سبب کے تصور کا اطلاق ان مظاہر پر نہیں ہوتا جن کا ہم جاننا نہ لے رہے ہیں۔

آخری تجزیے میں ہم غیر ختم دائرے میں داخل ہو جاتے ہیں۔ یہ وہ انتہائی آخری حد ہے جہاں انسانی عقل و فکر کی ہر قلم رو، اگر وہ اپنے موضوع کے متعلق غیر سنجیدہ رویہ اختیار نہیں کرنا چاہتی، لازماً پہنچ جاتی ہے۔ کُل حرارت پیدا کرتی ہے اور حرارت سے بجلی پیدا ہوتی ہے۔ جواہر (atoms) ایک دوسرے کو اپنی طرف کشش کرتے ہیں اور جواہر ایک دوسرے سے دور بھاگتے ہیں۔

بجلی اور حرارت اور مختلف جواہر کے تعامل (interaction) کا ذکر کرتے ہوئے ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ ایسا کیوں ہوتا ہے، اور ہم کہہ دیتے ہیں کہ ایسا اس لیے ہے کیونکہ اس کے علاوہ کسی دوسری صورت کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا، اسے ایسا ہی ہونا چاہیے کیونکہ یہ قانون ہے۔ اسی بات کا تاریخی مظاہر پر اطلاق ہوتا ہے۔ جنگیں یا انقلابات کیوں وقوع پذیر ہوتے ہیں؟ ہمیں کچھ معلوم نہیں۔ ہمیں صرف اتنا معلوم ہے کہ ان میں سے کسی ایک کو برپا کر کے لیے لوگ خاص شکل میں اکٹھے ہو جاتے ہیں اور اسی شکل میں وہ مل جل کر کام کرتے ہیں، ورنہ ہم کہتے ہیں کہ ایسا اس لیے ہوتا ہے کیونکہ اس کے علاوہ کسی دوسری صورت کا تصور ناممکن ہے یا بالفاظ دیگر کیونکہ یہی قانون ہے۔

8

اگر تاریخ کا تعلق محض خارجی مظاہر سے ہوتا، اس سیدھے سادے اور غیر مبہم قانون تک پہنچنا ہی کافی ہوتا اور ہمارا استدلال ختم ہو جاتا۔ لیکن قانون تاریخ کا تعلق انسان سے ہے۔ مادے کا ذرہ ہمیں یہ نہیں بتا سکتا کہ سے نہیں معلوم کہ کشش و غافلہ کا قانون کیا ہے اور یہ کہ آیا یہ قانون صحیح ہے یا غلط۔ لیکن انسان، جو تاریخ کا موضوع ہے، صاف صاف کہتا ہے: میں آزاد ہوں، اور چنانچہ میں قوانین کے تابع نہیں ہوں۔

اگرچہ انسان کی خود اختیاری (free will) کے مسئلے کو تاریخ میں کھول کر بیان نہیں کیا جاتا لیکن اس کی موجودگی کا احساس قدم قدم پر ہوتا ہے۔

تمام سنجیدہ فکر مند شخص کو غیر ارادی طور پر اس مسئلے کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ تاریخ میں جتنے بھی تضادات و ابہامات پائے جاتے ہیں اور اس نے جو بھی غلط راستہ منتخب کیا ہے، اس کی وجہ محض یہ ہے کہ اس مسئلے کو حل نہیں کیا گیا۔

اگر ہر شخص اپنی مرضی کا مختار ہوتا، یعنی وہ جو اس کا جی چاہتا، کر سکتا، ساری تاریخ غیر مربوط واقعات کا سلسلہ ہوتی۔

اگر ایک ہزار سال کے دور میں دس لاکھ میں سے ایک شخص کے پاس بھی ایسا مرضی سے عمل کرنے کا اختیار ہوتا، یعنی وہ جو اس کا جی چاہتا، کر سکتا، تو یہ بات واضح ہو جاتی کہ اس قوانین کی، جو انسانی افعال کو معین کرتے ہیں، خلاف ورزی میں اس کا ایک بھی آزادانہ فعل تمام انسانوں کے لیے کسی طرح کے قوانین کی موجودگی کے امکان کو نیست و نابود کر دیتا۔

لیکن اگر انسانی افعال کو معین کرنے کے لیے ایک بھی قانون موجود ہے، پھر خود اختیاری کا کوئی وجود نہیں ہو سکتا کیونکہ اس صورت میں انسانی اختیار اس قانون کے تابع ہوگا۔

خود اختیاری کا مسئلہ اسی تضاد سے پیدا کیا ہے۔ قدیم ترین زمانوں سے بہترین انسانی رہنما اس مسئلے میں الجھے رہے ہیں اور قدیم ترین زمانوں سے ہی اسے انتہائی بردست اہمیت حاصل رہی ہے۔

مسئلہ یہ ہے کہ مشاہدے کے موضوع کی حیثیت سے انسان کو۔ دینی، تاریخی، اخلاقی، فلسفیانہ۔ خواہ کسی بھی نقطہ نظر سے دیکھا جائے، ہمارا واسطہ ایک ایسے آفاقی قانون جبر سے ہوتا ہے جس کے۔ باقی تمام موجودات یا کی طرح۔ وہ تابع ہے۔ لیکن جب ہم انسان کو اپنے داخل میں سے دیکھتے ہیں۔ یعنی جب ہم انسان کو ذات کے بارے میں اپنے داخلی شعور کے موضوع کی حیثیت سے پرکھتے ہیں۔ ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ ہم آزاد ہیں۔

یہ داخلی شعور وقوف ذات (self-cognition) کا، جو عقل سے بالکل علیحدہ اور آزاد ہے، ہرچشمہ ہے۔ اپنی عقل کے ذریعے انسان اپنی ذات کا مشاہدہ کرتا ہے لیکن صرف شعور کے ذریعے اسے اپنی ذات کا عرفان حاصل ہوتا ہے۔

شعور ذات کے بغیر نہ تو کوئی مشاہدہ کیا جاسکتا ہے اور نہ عقل کے کسی استعمال کا تصور ممکن ہے۔ کسی چیز کا مشاہدہ کرنے، اسے سمجھنے اور اس سے نتائج اخذ کرنے کے لیے انسان کو سب سے پہلے یہ شعور ہونا چاہیے کہ وہ زندہ ہے۔ انسان کو اپنے زمرہ ہونے کا شعور صرف اس حقیقت سے ہوتا ہے کہ اس کے دل میں اپنی مرضی کرنے کی خواہش پیدا ہوتی ہے، یعنی اسے اپنے اختیار (volition) کا شعور ہوتا ہے۔ لیکن انسان اپنی مرضی کی، جو اس کی زندگی کی بنیادی، مرکزی اور انتہائی اہم چیز کی تفکیر کرتی ہے، یوں شناخت کرتا ہے (اور وہ صرف شناخت ہی کر سکتا ہے) کہ وہ آزاد ہے۔

اگر انسان اپنے آپ کو اپنے مشاہدے کا موضوع بنالے (مثلاً وہ یہ دیکھے کہ اسے کھانا کھانے کی لازماً ضرورت کیوں پیش آتی ہے، اس کا دل اس کیسے کام کرتا ہے یا اسی قسم کی کوئی دوسری چیز)، اسے معلوم ہوگا کہ اس کی

کسی چیز کے بارے میں خود فیصلہ کرنے کی قوت۔ اگر بڑی میں یہ لفظ نہیں کی وضاحت سے لائین لفظ volition (جو خود = volition) کسی چیز کے بارے میں خود فیصلہ کرنے کی قوت۔ لیکن یہ روی میں بھی اس کی کوئی شکل مرعوب ہو

مرضی ایک مستقل قانون کے تابع ہے اور یہ قانون جس توڑ سے اس کی مرضی کی رہنمائی کرتا رہتا ہے، وہ اس سے بھی سمجھے گا کہ یہ اس کی مرضی کو محدود کرتا ہے لیکن کسی چیز کو محدود بھی کیا جاسکتا ہے مگر وہ بتدا آزاد ہو۔ انسان کو اپنی مرضی محض اس لیے محدود نظر آتی ہے کیونکہ، سے یہ شعور ہی نہیں کہ یہ آزاد ہونے کے علاوہ کچھ اور بھی ہو سکتی ہے۔ آپ کہتے ہیں: ”تم آز نہیں۔“ لیکن میں نے اپنا آزاد اوپر اٹھالیا ہے اور اب میں اسے پیچھے کرنا چاہتا ہوں۔ ہر شخص سمجھتا ہے کہ یہ غیر منطقی جواب ردی کا ناقابل تردید ثبوت ہے۔

یہ جواب ایسے شعور کا اظہار ہے جو عقل کے تابع نہیں ہے۔

اگر آزادی کا شعور علم ذات کا عینہ اور خود مختار سرچشمہ نہ ہوتا، یہ تعقل اور تجربے (experience) کے تابع ہوتا لیکن حقیقتاً اس قسم کی متابعت کا کوئی وجود نہیں ہوتا، یہ تصور بھی نہیں کیا جاسکتا کہ یہ موجود ہو سکتی ہے۔

پے در پے تجربے (experiments) کرنے اور سوچ بچار کی بھٹی میں سے گزرنے کے بعد ان پر یہ انکشاف ہوتا ہے کہ مشاہدے کے موضوع کی حیثیت سے وہ بعض قوانین کے تابع ہے اور اسے ان کی اطاعت کرنا پڑتی ہے۔ جب ایک مرتبہ اسے کششِ ثقل اور غیر نفوذ پذیری⁴¹ کے قوانین سے آگاہی ہو جاتی ہے، وہ ان کے سامنے سر تسلیم خم کر دیتا ہے اور کبھی ان کے خلاف مزاحمت نہیں کرتا۔ لیکن تجربوں اور غور و فکر کا یہ سلسلہ اس پر یہ ثابت کر دیتا ہے کہ اسے اپنے داخل میں جس کامل آزادی کا شعور ہوتا ہے، وہ ناممکن ہے اور یہ کہ اس کا ہر فعل اس کی نامہنی ساخت، اس کے کردار اور ان محرکات کے، جو اسے کچھ کرنے کے لیے اکساتے ہیں، تابع ہوتا ہے۔ تاہم تجربات و ردائل انسان کو جن نتائج تک پہنچاتے ہیں، وہ ان کے سامنے کبھی سر تسلیم خم نہیں کرتا۔

تجربے اور استدلال سے یہ جاننے کے بعد کہ پتھر نیچے گرتا ہے، انہی کو یہ یقین ہو جاتا ہے کہ یہ بات بالکل صحیح ہے اور وہ اس کے متعلق کسی شک و شبہ کا اظہار نہیں کرتا۔ اسے یہ توقع ہوتی ہے کہ اس نے جو قانون دریافت کیا ہے، تمام صورتوں میں اسی کے مطابق عمل ہوگا۔

لیکن اسی طرح فیصلہ کن انداز سے یہ جاننے کے باوجود کہ اس کی مرضی قوانین کے تابع ہے، وہ ان کا نہ یقین کرتا ہے اور نہ کر سکتا ہے۔

تجربہ اور سوچ بچار انسان پر خواہ کتنی ہی مرتبہ یہ کیوں نہ ثابت کر دے کہ جن حالات میں اور جس کردار کے ساتھ اس نے ایک کام کیا تھا، انہی حالات میں اور اسی کردار کے ساتھ وہ بعینہ وہی کچھ کرے گا جو اس نے پہلے کیا تھا، تاہم انسان کو اس کا یقین نہیں آتا اور وہ سمجھنے لگتا ہے کہ انہیں حالات میں اور اسی کردار کے ساتھ وہ جو کچھ چاہے اور جس طرح چاہے، کر سکتا ہے، چاہے کہ وہ ہزاروں مرتبہ بھی کوشش کرے، نتیجہ وہی نکلے گا جو پہلی بار برآمد ہوا تھا۔

تجربے اور استدلال سے، خواہ کتنے ہی ناقابل تردید انداز سے کسی شخص پر، خود وہ باشعور جو بابے شعور پر ثابت کیوں نہ کر دیا جائے کہ جب حالات بالکل مماثل ہوں اور ان میں مویرا بر برق نہ ہو، عمل کی درمختلاف راہوں کا

تصور کرنا ناممکن ہے، وہ بھی محسوس کرتا ہے کہ اس بے معنی تصور کے بغیر کہ وہ آزاد ہے اس کے ذہن میں زندگی کی کوئی تصویر آتی ہی نہیں۔ اسے محسوس ہوتا ہے کہ یہ بات نوا کتنی ہی ناممکن کیوں نہ ہو، ہے یہ ایسی ہی ہے کیونکہ آزادی کے اس تصور کے بغیر اس کے لیے نہ صرف زندگی کی تفہیم کرنا ناممکن ہوگا بلکہ اس کے لیے ایک لمحے کے لیے بھی زندہ رہنا ناممکن ہوگا۔

وہ زندہ نہیں رہ سکتے گا کیونکہ زندگی کے بارے میں اس کی تمام انگلیوں، اور پچھپیوں کا محور محض یہ ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ آزادی کے لیے ہاتھ پیر مارتا رہے، رات اور غربت، شہرت اور گناہی، ماکیت اور محکومی، توانائی اور ناتوانی، صحت اور علالت، تہذیب اور جہالت، کام اور فراغت، شکم سیری اور قاذ کشی، خیر اور شر، آزادی کے محض اعلیٰ ترین ادنیٰ تر درجات ہیں۔

آزادی سے محروم شخص کا تصور صرف زندگی سے محروم شخص کی حیثیت سے ہی کیا جاسکتا ہے۔ جس طرح عقل کے لیے یہ تصور کرنا ناممکن ہے کہ ایک ہی وقت میں دو کام سرانجام دیے جاسکتے ہیں یا علت کے بغیر معلول کا وجود ہو سکتا ہے، اسی طرح اسے آزادی کا تصور بے سنی ناقض معلوم ہوتا ہے۔ اگر یہ بات ہے تو اس سے صرف یہ ثابت ہوتا ہے کہ شعور عقل کے تابع نہیں ہے۔

آزادی کا یہ غیر متوازن، ناقابل تردید شعور۔ جو کسی تجربے یا استدلال کے تابع نہیں ہے، جسے تمام مفکرین تسلیم اور بلا استثناء ہر کس و ناتواں محسوس کرتا ہے اور جس کے بغیر انسان کا کوئی تصور ممکن نہیں ہے۔ سواں کا دوسرا پہلو تشکیل کرتا ہے۔

انسان قادر مطلق، علیم و خیر اور رحیم و کریم خدا کی تخلیق ہے۔ مگر وہ، جس کا تصور انسان کے آزادی کے شعور سے پیدا ہوتا ہے، کیا ہے؟ یہ مسئلہ دینیات کا ہے۔

انسان کے اعمال عمومی اور غیر متغیر قوانین کے، جنہیں اعداد و شمار کے ذریعے بیان کیا جاسکتا ہے، تابع ہیں۔ معشرے کی طرف سے انسان پر کیا ذمہ داری عاید ہوتی ہے جس کا تصور اس کے آزادی کے شعور کے تصور کا نتیجہ ہے؟ یہ مسئلہ علم قانون کا ہے۔

انسان کے اعمال اس کی طبعی خصلت و سیرت اور ان محرکات کا، جو اس پر اثر انداز ہوتے ہیں، نتیجہ ہوتے ہیں۔ خمیر اور نیکی و بدی کا احساس، جو آزادی کے شعور کا تہ ہے، کیا ہے؟ یہ مسئلہ اخلاقیات کا ہے۔

بنی آدم کی عمومی زندگی کے تعلق سے انسان اس قوانین کا، جو زندگی کو متعین کرتے ہیں، تابع معلوم ہوتا ہے لیکن اگر اسی انسان کو اس تعلق سے علیحدہ کر دیا جائے، تو وہ آزاد نظر آنے لگتا ہے۔ اقوام اور بنی آدم کی سابقہ زندگی کے بارے میں کیا رائے قائم کی جائے؟ انسان کے آزادی یا غیر آزاد افعال کا نتیجہ؟ یہ مسئلہ تاریخ کا ہے۔

صرف ہمارے اس ہم چوہ دیگرے نیست رہانے میں جب جہالت کے حالات و درتیں ہتھیار کی بدولت۔۔۔ مطہرہ مساوی کی وسیع پیمانے پر اشاعت و ترویج۔ علم کو عام مقبولیت حاصل ہو رہی ہے، خود اختیاری کا مسئلہ ایک ایسی

سطح پر جس پر خود مسئلہ موجود نہیں رہ سکتا، رکھا گیا ہے۔ ہمارے عہد میں نام نہاد ”ترقی یافتہ“ اشخاص کی کڑی رائے۔ یعنی اجوم جہا۔ علوم طبعی کے ماہرین کی تحقیقات کا، جو سارے مسئلے کے حل کے لیے اس کے صرف ایک پہلو تک محدود ہیں، نتیجہ (صحیح) تسلیم کر لیا ہے۔

وہ کہتے ہیں، لکھتے ہیں اور چھاپتے ہیں کہ روح اور آزادی کا کوئی وجود نہیں کیونکہ انسان کی زندگی کا اظہار اس کے عضلات کی حرکات سے ہوتا ہے اور عضلاتی حرکات اعصاب کی فعلیت سے مشروط ہوتی ہیں۔ روح اور آزادی کا اس لیے کوئی وجود نہیں کیونکہ کسی نامعلوم زمانے کے دوران میں ہم بوزنوں سے انسان بنے تھے۔ جب وہ برافٹ کرتے ہیں انھیں یہ قطعاً معلوم نہیں ہوتا جس قانون جبر کو وہ اب عضویات (فزیالوجی) اور تقابلی حیویات کی حدود سے ثابت کرنے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہے ہیں، اسے ہزاروں سال قبل نہ صرف تمام مذاہب اور تمام مفکرین نے تسلیم کر لیا تھا بلکہ انھوں نے اس سے کبھی انکار نہیں کیا۔ ان کی سمجھ میں یہ بات آتی ہی نہیں کہ اس معاملے میں طبعی علوم کا کردار اس کے صرف ایک پہلو پر روشنی ڈالنے تک محدود ہے۔ کیونکہ اگر مشاہدے کے نقطہ نظر سے عقل اور مشاوماغ کی محض ریرشیں (secretions) ہیں اور اگر انسان ارتقا کے عمومی قانون کا اتباع کرتے ہوئے کسی نامعلوم زمانے کے دوران میں ادنیٰ جانوروں سے ترقی کر کے ہی اوپر آیا ہے، یہ سب کچھ صرف نئے زاویے سے اس صداقت پر مبر تصدیق ثابت کرتا ہے جس کا تمام مذہبی اور فلسفیانہ نظریات ہزاروں سال سے قرار کرتے چلے آئے ہیں۔ کہ عقل کے نقطہ نظر سے انسان قانون جبر کا تابع ہے، لیکن وہ مسئلے کے، جس کا آزادی کے شعور پر مبنی ایک دوسرے مخالف رخ ہے، حل کو ایک انج بھی آگے نہیں بڑھاتا۔

اگر انسان کسی زمانے میں بوزنوں سے وجود میں آیا تھا، تو یہ بات اتنی ہی قابل فہم ہے جتنی کہ یہ کہ کسی معلوم زمانے میں اسے مٹھی بھر مٹی سے تخلیق کیا گیا تھا (پہلی صورت میں نامعلوم مقدار وقت ہے، دوسری میں ابتدائے آفرینش)۔ رہا یہ سوال کہ انسان کے آزادی کے شعور کو قانون جبر کے ساتھ، جس کے وہ تابع ہے، کس طرح ہم آہنگ کیا جائے تو اسے تقابلی عضویات یا حیوانیات کی مدد سے حل نہیں کیا جاسکتا کیونکہ مینڈک، خرگوش اور بندر میں ہمیں صرف عضلاتی اور اعصابی فعالیتیں نظر آتی ہیں جب کہ انسان میں عضلاتی اور اعصابی فعالیتوں کے علاوہ شعور بھی موجود ہوتا ہے۔ ماہرین فطرت اور ان کے حاشیہ بردار، جن کا خیال ہے کہ وہ اس مسئلے کو حل کر رہے ہیں، ان پلستر کاروں کی مانند ہیں جنھیں گر بجے دیواروں کی ایک جانب پلستر کرنے پر گنا دیا جائے مگر وہ نگران کی عدم موجودگی سے قائم و دائم کر ضرورت سے زیادہ جوش و خروش کا مظاہرہ کرتے ہوئے درجوں، پتھروں، دوڑ و رک اور زیر تکمیل دیواروں پر بھی پلستر کر دیں اور خوشی سے پھولے نہ سمائیں کہ پلستر کاروں کے اپنے نقطہ نظر سے ہر چیز ہموار اور صاف تھری ہو گئی ہے۔

جبر و اختیار کے اس مسئلے کو حل کرنے کے سلسلے میں تاریخ کو دوسرے علوم پر، جنہوں نے اس میں دلچسپی لی ہے اور اسے سلجھانے کی کوشش کی ہے، یہ تفریق حاصل ہے کہ اس کے رد ایک اس مسئلے کا تعلق انسان کی خود اختیاری کی اصل روح سے نہیں بلکہ اس بات سے ہے کہ ماضی میں اور بعض خاص حالات میں اس خود اختیاری نے اپنے آپ کو حقیقتاً جو آشکار کیا، اسے ہم پیش کس طرح کرتے ہیں۔

اس سوال کے سلسلے میں دوسرے علوم کے مقابلے میں تاریخ کا مقام دہی ہے جو تجربی علوم کے مقابلے میں تجرباتی علوم کا ہے۔

اس اعتبار سے تاریخ کا موضوع، انسان کا ارادہ ہے بلکہ ہمارا اسے پیش کرنے کا انداز ہے۔

چنانچہ جبر اور اختیار کے مابین عدم موفقت کی بنا پر جو ناقابل حل جیتاں سامنے آتا ہے، وہ تاریخ کے لیے اس طرح موجود نہیں ہے جس طرح کہ دینیات، اخلاقیات اور فلسفے کے لیے ہے۔ تاریخ انسانی زندگی کو پیش کرنے کے اس انداز کا جائزہ لیتی ہے جس میں ان دونوں تناقضات کی یک جہتی پہلے ہی وقوع پذیر ہو چکی ہے۔ حقیقی زندگی میں ہر تاریخی واقعہ، ہر انسانی فعل تناقض کے کسی احساس کے بغیر مبہم اور واضح انداز سے سمجھ لیا جاتا ہے حالانکہ ہر واقعہ جزوی طور پر جبری اور جزوی طور پر آزاد معلوم ہوتا ہے۔

جبر و اختیار کس طرح یک جا ہوتے ہیں اور دونوں تصورات کی اصل روح کس چیز سے تشکیل پاتی ہے، اس مسئلے کو حل کرنے کے لیے دوسرے علوم جو راستہ اختیار کرتے ہیں، فلسفہ تاریخ اس کے مخالف راستہ اختیار کر سکتا ہے اور اسے کرنا بھی چاہیے۔ خود جبر اور اختیار کے تصورات کی تعریف (و تشریح) کرنے اور پھر زندگی کے مظاہر کو ان تعریفات (و تشریحات) کے مطابق ترتیب دینے سے پہلے تاریخ کو جبر و اختیار کی تعریف (و تشریح) واقعات کے اس وسیع و عریض ذخیرے کی روشنی میں کرنا چاہیے جس سے دو پوری طرح آگاہ ہے اور جو ہمیشہ نئی دونوں عناصر کے محتاج ہوتے ہیں۔

آدنی واحد ہو یا متعدد، ان کے افعال کو خواہ کسی انداز سے پیش کیا جائے، ہم ہمیشہ یہی سمجھتے ہیں کہ ان کے افعال جزوی طور پر اختیار اور جزوی طور پر قانون جبر کا نتیجہ ہیں۔

ہم قوام کے ترک سکونت کا ذکر کر رہے ہیں یا وحشی قبائل کی یلغاروں کا، نہ لیس سویم کے فرمانوں کا یا اس شخص کے، جو ایک گھنٹہ قبل سیر پر نکلا تھا، متعدد راستوں میں سے کسی ایک راستے کے انتخاب کا ہمیں کہیں معمولی سا تعداد بھی نظر نہیں آتا۔ ان لوگوں کے افعال کس حد تک جبر کے تابع اور کس حد تک اختیار کی پیداوار ہیں، ہمیں اس کا واضح حساس ہو جاتا ہے۔

اختیار کی حد کیا ہے، اس کے متعلق ہمارے نقطہ نظر میں اکثر اختلاف پایا جاتا ہے کیونکہ ہر شخص مظاہر (و واقعات)

کا اپنے انداز سے جائزہ لیتا ہے لیکن ہمیں ہر انسانی فعل میں یکساں انداز سے جبر و اختیار کی خاصیت کی جانچ کرنی ہے۔ ہر اس فعل میں، جس کی ہم تفتیش کرتے ہیں، ہمیں خاص مقدار میں جبر اور خاص مقدار میں اختیار کا روبرو رکھنا دیتا ہے اور ہمیشہ یہی ہوتا ہے کہ جس فعل میں ہمیں اختیار جتنا زیادہ نظر آتا ہے، جبر اتنا ہی کم ہو جاتا ہے اور جس فعل میں جبر جتنا زیادہ ہوگا، اختیار اتنا ہی کم ہوگا۔

جبر سے اختیار کا تناسب اس نقطہ نظر کے مطابق، جس سے ہم کسی فعل کا جائزہ لیتے ہیں، گھٹتا بڑھتا رہتا ہے لیکن یہ تناسب ہمیشہ معکوس ہوتا ہے۔

ایک شخص ڈوب رہا ہے۔ وہ (جان بچانے کے لیے) کسی دوسرے شخص کو اپنی گرنٹ میں لے لیتا ہے اور اسے نیچے کھیٹ لیتا ہے۔ ایک ماں بھوکی ہے۔ وہ اپنے بچے کو روکھ پلاتے پلاتے ٹٹوٹا ہو جاتی ہے اور حوراک جبر لیتی ہے۔ ایک آدمی کو تربیت کے ذریعے نظم و ضبط کا خوگر بنا دیا جاتا ہے۔ وہ حکم ملتے ہی کسی نیتے شخص کو موت کے گھاٹ اتار دیتا ہے۔ یہ تمام لوگ اس شخص کو، جسے ان حالات کا جن میں سے یہ گزر رہے ہیں، علم ہے کہ کم تصور و نظر آتے ہیں یعنی اس کے خیال میں، انہیں آزادی عمل کم حاصل ہے اور وہ قانون جبر کے زیادہ تابع ہیں، مگر اس شخص کو، جسے ان کے حالات سے کوئی آگاہی نہیں تھی اور جسے یہ معلوم نہیں تھا کہ آدمی خود ڈوب رہا تھا، بھوکی تھی اور سپاہی احکام کا پابند تھا، وہ زیادہ آزاد دکھائی دیتے ہیں۔ اسی طرح ایک اور شخص ہے۔ اس نے بیس سال قبل قتل کا ارتکاب کیا تھا اور تب سے وہ معاشرے میں پرامن اور بے خطا زندگی گزار رہا ہے۔ وہ اس شخص کے مقابلے میں، جس نے اس کے جرم کا جائزہ اس کے ارتکاب کے گلے روز ہی لیا تھا، اس شخص کو، جو اس کے جرم کا اس کے ارتکاب کے بیس سال کا عرصہ گزرنے کے بعد جائزہ لے رہا ہے، قانون جبر کا زیادہ تابع نظر آتا ہے۔ اس طرح کسی پاگل، مدہوش یا انتہائی مشتعل شخص کا ہر فعل اس شخص کو، جو فاعل کی ذہنی کیفیت سے آگاہ ہے، اس شخص کی نسبت، جسے اس سلسلے میں کچھ بھی معلوم نہیں ہے، آزاد کم اور جبری زیادہ نظر آتا ہے۔ ان تمام صورتوں میں آزادی کے تصور میں، اس نقطہ نگاہ کے مطابق، جس سے فعل کا جائزہ لیا جا رہا ہو، اضافہ یا تخفیف ہو جاتی ہے اور اس کا تناسب سے جبر کے تصور میں تخفیف یا اضافہ ہو جاتا ہے۔ چنانچہ جبر کا پلڑا جتن بھاری ہوگا، آزادی کا ٹکڑا ہلکا ہوگا۔ اس کے برعکس جبر کا پلڑا جتن ہلکا ہوگا، آزادی کا، اتنا ہی بھاری ہوگا۔

مذہب، انسانوں کی عام سوجھ بوجھ، علم قانون اور خود تاریخ جبر و اختیار کے مابین اس تعلق کو یکساں سمجھتے ہیں۔ ان تمام امور میں، جن کے سلسلے میں جبر و اختیار کے مابین تناسب کے متعلق ہمارے تصور میں کمی بیشی ہوتی رہتی ہے، بلا استثناء تین باتیں قابل توجہ ہیں۔

(1) جو آدمی فعل سرانجام دیتا ہے، اس کا خارجی دنیا سے تعلق۔

(2) اس کا وقت (زمان) سے تعلق۔

(3) اس کا ان وجوہ سے، جو فعل کا باعث بنیں، تعلق۔

(1)

انسان کا خارجی دنیا کے ساتھ کیا تعلق ہے، ہم جس نسبت سے اس کی تفہیم کر پائیں گے اسی نسبت سے ہماری قوت فیصلہ متاثر ہوگی۔ دوسرے الفاظ میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ ہمارے فیصلے کا انحصار اس بات پر ہوگا کہ آدمی کا ہر اس چیز کے ساتھ، جو اس کے گرد و پیش موجود ہے، جو تعلق ہے، ہم اسے کتنے واضح انداز سے سمجھتے ہیں، کم یا زیادہ؟ چیزوں پر اس انداز سے (یعنی ان کے خارجی دنیا سے تعلق کے حوالے سے) سوچ بچار کرنے کے بعد ہی ہم پر یہ بات آشکار ہوتی ہے کہ وہ بنے والا آدمی اس آدمی کی نسبت، جو جنگ زمین پر کھڑا ہے، آزاد کم ہے اور جبر کے زیادہ تابع ہے۔ اس سے ہمیں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ شخص، جو کشمکش آبادی میں رہائش پذیر ہے، اور خاندانی، سرکاری یا کاروباری فرائض میں جکڑا ہوا ہے، اس شخص کی نسبت، جو دوسروں سے، لگ تھلگ تنہائی کی زندگی بسر کر رہا ہے، انادریب آزاد کم اور، جبر کا پابند زیادہ ہوگا۔ اگر ہم کسی شخص کو تنہا تصور کریں، اپنے ماحول سے اس کے کسی تعلق کو خاطر میں نہ لائیں، ہمیں اس کا ہر فعل آزاد معلوم ہوگا۔ لیکن اگر ہم اس کے گرد و پیش کی کسی بھی چیز سے اس کے تعلق کو پیش نظر رکھیں۔ یہ چیز کوئی بھی ہو سکتی ہے، کوئی شخص، جس سے وہ گفتگو کرتا ہے، کتاب، جس کا وہ مطالعہ کرتا ہے، کام، جس میں وہ مصروف ہے، بلکہ وہ ہوا بھی، جس میں وہ سانس لیتا ہے یا روشنی، جو اس کے ارد گرد کی اشیاء پر پڑتی ہے، اس کے ساتھ اس کے تعلق کا جائزہ لیں، ہمیں یہ معلوم ہوگا کہ ان میں سے ہر ایک صورت اس پر اثر انداز ہوتی ہے اور اس کی فعالیت کے کم از کم ایک پہلو پر اپنا حکم چلاتی ہے۔ اور ہمیں یہ اثرات جتنی زیادہ کثیر تعداد میں نظر آئیں گے، وہ ہمیں اتنا ہی کم آزاد دکھائی دے گا اور جس جبر کے وہ تابع ہے وہ اتنا ہی زیادہ واضح معلوم ہونے لگے گا۔

(2)

دوسری صورت میں ہمارے نتائج اس بات سے متاثر ہوں گے کہ انسان کا دنیا کے ساتھ زمانی تعلق کتنا واضح ہے۔ یعنی وقت کے دوران میں انسان کا فعل جو مخصوص مقام حاصل کرتا ہے، اس کے متعلق ہمارا ادراک کتنا واضح اور بین ہے۔ یہی وہ صورت ہے جو انسان اول کے ہیرو کا باعث بنتی ہے، جس کے نتیجے میں نسل انسانی وجود میں آتی ہے اور بظاہر اتنی بھی آزاد نظر نہیں آتی جتنا کہ آج کوئی آدمی شادی کرنے کے معاملے میں آزاد معلوم ہوتا ہے۔ یہی وہ صورت ہے جو اس امر کی توضیح کرتی ہے کہ ان انسانوں کی، جو صدیوں پہلے زندگی گزار رہے تھے، وہ جو وقت کی وساطت سے میرے ساتھ خشک ہیں، زندہ گیسا اور افعال مجھے اسے آزاد نظر نہیں آسکے جتنے کہ کسی معاصر شخص کے کیونکہ اس معاصر شخص کی زندگی اور افعال کے نتائج ابھی مجھے معلوم نہیں۔

اس صورت میں جبر اور اختیار کے متعلق ہمارے تصور کی کم یا بیش وسعت کا انحصار وقت کی کم یا بیش مدت پر

ہے جو فعل کی انجام دہی اور اس کے بارے میں ہمارے محاکے کے درمیان گزرا ہے۔

اگر میں اس فعل کا، جو میں نے ایک لمحہ قبل بالکل ان حالات میں، جو میرے موجودہ حالات کے تقریباً مماثل

تھے، سرانجام دیا تھا، جائزہ لوں، مجھے اپنا یہ فعل لاریب آزد معلوم ہوگا لیکن اگر میں اس فعل کا، جو میں نے ایک قبل سرانجام دیا تھا، جائزہ لوں، تو اب چونکہ میرے حالات مختلف ہو گئے ہیں، میں یہ تسلیم کیے بنا نہیں رہ سکتا کہ اگر وہ فعل سرانجام نہ دیا گیا ہوتا، تو اس کے بہت سے نتائج، جو سودمند، خوش گوار، بلکہ ضروری ثابت ہوتے، برآمد ہوتے۔ اگر میں کسی ایسے فعل کو، جو بہت عرصہ پہلے، دس سا یا اس سے زیادہ مدت قبل، سرانجام دیا گیا تھا، وہاں میں لاؤں تو اپنے اس فعل کے نتائج مجھ پر اور بھی زیادہ واضح شکل میں ظاہر ہوں گے اور میرے لیے یہ تصور کیا مشکل ہو جائے گا کہ اگر وہ فعل سرانجام نہ دیا گیا ہوتا، پھر کیا ہوتا۔ میری یادداشت جتنا زیادہ پیچھے جائے گی، اور یہاں تک ہی بات ہے۔ میں اپنا ہی کہہ جیتے زیادہ عرصے کے لیے ملتوی کرتا ہوں، اپنے فعل کی آزادی کے متعلق میرا عقیدہ اتنا ہی زیادہ متزلزل ہو جائے گا۔

تاریخ میں بھی بالکل یہی عمل کارفرما ہوتا ہے، چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ انسانوں کے عمومی حالات میں ان کی خود اختیاری جو حصہ لیتی ہے، اس کے بارے میں ہمارے عقائد میں بہت اختلاف پایا جاتا ہے۔ اپنے زمانے کا کوئی واقعہ ہمیں لامحالہ ان، شخاص کا، جو اس سے متعلق ہوتے ہیں، کیا دھرا معلوم ہوتا ہے۔ لیکن وہ واقعہ، جو بہت مدت قبل ظہور پذیر ہوا تھا، اس کے سلسلے میں ہمارے پاس اتنا وقت ہوتا ہے کہ ہم اس کے نتائج و عواقب کے متعلق جو ناگزیر تھے، سوچ سکیں۔ چونکہ ہم نے یہ نتائج خاص عرصہ سوچ بچار کرنے کے بعد اخذ کیے ہوتے ہیں، چنانچہ ان کے علاوہ کوئی دوسری چیز ممکن ہی نظر نہیں آتی۔ واقعات کی تحقیق و تفتیش کے سلسلے میں ہم جتنا زیادہ پیچھے جائیں گے، وہ اتنے ہی کم بے قاعدہ نظر آئیں گے۔

آسٹریا اور پرشیا کی جنگ ہمیں بلاشبہ ہمارے عیاں راندہ رویے کا نتیجہ معلوم ہوتی ہے۔ (موجودہ دور سے) اس طرح کی مزید مثالیں بھی دی جاسکتی ہیں۔

نیدرلینڈ جنگیں ہمیں اب بھی ان کے ہیردوں کے منشا کا نتیجہ معلوم ہوتی ہیں (اگرچہ اس بارے میں یقین قدرے ڈھلک چکا ہے)، لیکن جب ہم صلیبی جنگوں تک پہنچتے ہیں، ہمیں وہ ایک ایسا واقعہ نظر آتا ہے جو تاریخ میں واضح مقام حاصل کر چکا ہے اور جس کے بغیر یورپ کی جدید تاریخ کا تصور بھی محال ہے، حالانکہ صلیبی جنگوں کے وقائع نگاروں کو وہ واقعہ محض بعض افراد کے منشا کا نتیجہ معلوم ہوتا تھا۔ جہاں تک اقوام کی ترکیب و سکوت کا تعلق ہے، آج یہ بات کسی شخص کے وہم و گمان میں بھی نہیں آتی کہ یورپ کی تین نوآئیاں کی جنگ کا نتیجہ ہے۔ تاریخ میں ہمارے مشاہدے کا موضوع وقت کے اعتبار سے جتنا زیادہ پیچھے ہوتا جاتا ہے، ان لوگوں کے، جن کا تعلق واقعے سے تھا، منشا کی آزادی اتنی ہی زیادہ مشکوک نظر آنے لگتی ہے اور جبر کا قانون اتنا ہی زیادہ آشکار ہونے لگتا ہے۔

(3) تیسرا عنصر، جو ہمارے محاکے پر اثر انداز ہوتا ہے، وہ یہ ہے کہ ہم سبب کے، جن کا عقل مطالبہ کرتا ہے، غیر ختم سلسلے کو کس حد تک اپنے فہم و ادراک کی گرفت میں لا سکتے ہیں۔ اسباب کے اس سلسلے میں ہر قابل فہم واقعے (اور چنانچہ ہر انسانی فعل) کا، جو کچھ بہت چکا ہے، اس کے نتیجے (معلول) اور جو کچھ پیش آنے والا

ہے، اس کی وجہ (علت) کے طور پر اپنا واضح مقام ہونا چاہیے۔

یہ اسی اصول کا صدقہ ہے کہ ہم عضویاتی، نفسیاتی اور تاریخی قوانین سے جو مشاہدے سے اخذ کیے جاتے ہیں اور جن کے ذریعے انسان کو کثرت دل کیا جاتا ہے، جتنا بہتر طور پر آگاہ ہوتے ہیں اور فعل کی عضویاتی، نفسیاتی اور تاریخی وجوہ کو جتنے زیادہ صحیح انداز سے سمجھتے ہیں، اور ہمارے زیر تفتیش فعل جتنا زیادہ سادہ اور اس کے مائل کا مبالغہ اور کردار جتنا زیادہ کم پیچیدہ دکھائی دیتا ہے، ہمیں اپنے اور دوسروں کے افعال جبر کے اتنے ہی زیادہ تابع و راجع ہی کم آزاد معلوم ہوتے ہیں۔

جب ہمیں کسی فعل کی۔ وہ اچھا ہو یا برا، یا ان دونوں میں سے کچھ بھی نہ ہو، یعنی اس کا خالقیت سے کوئی واسطہ نہ ہو۔ علت کی قطعاً کوئی تفہیم نہیں ہوتی، ہم اس کے ساتھ خود اختیار کی خاصیت کی بڑی مقدار منسوب کر دیتے ہیں۔ جرم کے سلسلے میں ہم شدت سے اس فعل کی سزا کا مطالبہ کرنے لگتے ہیں۔ نیک کام کے سلسلے میں ہم اس کی خوبی بڑھا چڑھا کر پیش کرتے ہیں۔ لیکن وہ کام، جو اچھا ہے نہ برا اس میں ہمیں کہیں زیادہ انفرادیت، انج اور آزادی دکھائی دینے لگتی ہے۔ لیکن فعل کی لا تعداد وجوہ میں سے ہمیں اگر ایک کا بھی علم ہو جائے، ہمیں فی الفور ایک خاص نوعیت کے جبر کا حساس ہونے لگتا ہے اور جرم کی سزا دینے، نیک کام کرنے کی خوبی کا اعتراف کرنے اور پرانے فعل کو آزاد قرار دینے پر ہمارا اصرار کم ہو جاتا ہے۔ یہ کہ مجرم نے خراب اخلاق ماحول میں پرورش پائی تھی، اس لیے ہماری نگاہوں میں اس کے جرم کی شدت کم ہو جاتی ہے۔ ماں باپ کا ایثار یا ایسا ایثار جس میں غلطی کا شکار ہو، خود بخود کے ایثار کے مقابلے میں زیادہ قابلِ تفہیم ہے اور اس لیے خواہ مخواہ کے ایثار کے مقابلے میں ہمدردی کا کم مستحق اور خود اختیار کی کم نتیجہ معلوم ہوتا ہے۔ اگر ہمیں یہ معلوم ہو جائے کہ کسی مرتے باجاعت کے بانی یا کسی موجد کا راستہ کس چیز نے ہموار کیا تھا، ہم اس سے کوئی زیادہ متاثر نہیں ہوتے۔ اگر ہمارے پاس مثالوں کا حیطہ خاصا وسیع ہو، اگر ہمارا مشاہدہ مسلسل انسانوں کے افعال کی علت و معلول کے مابین باہمی تعلق تلاش کرنے پر مرکوز ہے، ہمیں ان کے افعال جبر کا جتنا زیادہ اور خود اختیاری کا جتنا کم نتیجہ معلوم ہوں گے، ہم علت اور معلول کو اتنے ہی زیادہ صحیح انداز سے آپس میں منسلک کر سکیں گے۔ اگر وہ افعال جن کا جائزہ بیا جا رہا ہے، سیدھے سادے ہیں اور اس قسم کے افعال کافی زیادہ تعداد میں ہمارے زیر مشاہدہ ہیں، ان کے ناگزیر ہونے کے متعلق ہمارا تصور، در بھی غیر مشروط ہو جائے گا۔ بددیانت باپ کے بیٹے کا بددیانت کردار، کسی عورت کی بداعتمادی، جو بری صحبت میں پھنس گئی ہو، اصلاح یافتہ شرابی کی دوبارہ سے نوشی اور اس قسم کے دیگر افعال۔ ہم ان کی وجوہ سے جتنا زیادہ اچھی طرح واقف ہوں گے، یہ ہمیں اتنے ہی کم آزاد نظر آئیں گے۔ اگر وہ شخص جس کے افعال کا ہم جائزہ لے رہے ہیں، بچوں، پانگوں یا ضعیف معقولوں کی طرح ذہنی ارتقا کے بالکل ابتدائی مراحل میں سے گزر رہا ہو، ہمیں جنہیں فعل کی وجوہ اور زیر بحث ذہانت اور کردار کی سادگی کا علم ہے، فی الفور جبر کا عنصر اتنا زیادہ اور خود اختیاری اتنی کم نظر آئے گی کہ جو بھی ہمیں اس وجہ کا علم ہوگا جو فعل کا باعث بنی، ہم اس کے نتیجے کی پیش گوئی کر سکیں گے۔

تمام قوانین و ضوابط بہ تسلیم کرتے ہیں کہ ایسے حالات موجود ہوتے ہیں کہ جرم کا بار مجرم پر نہیں ڈالا جاسکتا اور وہ اس بات کا تقاضا کرتے ہیں کہ سزا میں نرمی برتی جائے۔ اس رعایت کی توجیہ (منطقی اساس) انھیں نہیں منصر سے کی جاتی ہے۔ وہ فرد جس کے فعل کا محاسبہ کیا جا رہا ہے، اپنے فعل کا کس حد تک ذمے دار ہے، کیا زیادہ؟ اس سوال کے جواب کا انحصار ان باتوں پر ہے کہ ان حالات کا، جن میں اس نے اپنا فعل سرانجام دیا تھا، ہمیں کتنا علم ہے، کم یا زیادہ؟ فعل کے ارتکاب اور اس کی تحقیق کے درمیان جو مدت گزری ہے، وہ کتنی ہے، کیا زیادہ؟ اور پھر جو وہ فعل کی انجام دہی کا باعث بنیں، انھیں ہم کس حد تک سمجھ سکے ہیں، کم یا زیادہ؟

10

چنانچہ جبر و اختیار کے متعلق ہمارا تصور کسی شخص کے خارجی دنیا کے ساتھ کم یا زیادہ تعلق، وقت کے اعتبار سے کم یا زیادہ دوری یا ان وجوہ پر، جو ہمیں اس کی زندگی کے کسی واقعے میں کارفرما نظر آتی ہیں، کم یا زیادہ انحصار کے مطابق گھٹتا بڑھتا رہتا ہے۔

چنانچہ اگر ہم مشاہدے کے لیے کسی شخص کی زندگی کا وہ مقام منتخب کریں جہاں اس کے خارجی دنیا کے ساتھ تعلقات بہترین طور پر معلوم ہوں، جہاں فعل کی سرانجام دہی اور ہمارے محاسبہ کے مابین وقفہ حتیٰ الامکان طویل تر ہو، اور جہاں فعل کی وجوہ حتیٰ الامکان سہل ترین انداز سے دستیاب ہوں، ہم زیادہ سے زیادہ جبر اور کم سے کم خود اختیاری کے تصور تک پہنچ جائیں گے۔ اس کے برعکس اگر ہم اپنے مشاہدے کے لیے کسی ایسے شخص کو منتخب کریں جس کا خارجی حالات پر انحصار حتیٰ الامکان کم سے کم ہو اور اس کے اس فعل کی، جو وقت کے اعتبار سے دور زمانے سے قریب ترین زمانے میں سرانجام دیا گیا ہو، وجوہ ہمیں قطعاً معلوم نہ ہوں، ہم کم سے کم جبر اور زیادہ سے زیادہ خود اختیاری کے تصور تک پہنچ جاتے ہیں۔

اس قسم کی باتوں سے کہ اس شخص کے خارجی دنیا سے تعلق کا ہمیں واضح طور پر علم ہے یا ہم اس تعلق کا کھوج لگانے میں قطعاً ناکام رہے ہیں، فعل کے ارتکاب اور اس پر محاسبہ کے دوران میں وقفہ طویل تر ہے یا مختصر تر، یا فعل کی وجوہ قابل تفہیم ہیں یا ناقابل تفہیم، اور پنا نقطہ نظر بار بار تبدیل کرنے کے باوجود ہم یہ دعویٰ نہیں کر سکتے کہ دونوں میں سے کسی ایک معاملے میں بھی جبر زیادہ کارفرما ہے یا خود اختیاری کا عمل دخل زیادہ ہے۔

(1) ہم ایک ایسے شخص کا، جو خارجی دنیا کے اثرات سے مستثنیٰ ہو، تصور باندھنے کے لیے خواہ کتنا ہی زور لگائیں، یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ آپ شپیس میں بھی رہیں اور آزادی کا بھی سوچیں۔ آدمی کا ہر فعل، جو وہ انجام دیتا ہے، ناگزیر طور پر اس کے گرد و پیش اور اس کے جسم سے مشروط ہوتا ہے۔ میں اپنا ہاتھ اوپر اٹھاتا ہوں اور اسے نیچے چھوڑ دیتا ہوں۔ مجھے اپنا فعل آزاد دکھائی دیتا ہے۔ لیکن جب میں اپنے آپ سے پوچھتا ہوں، کیا میں

• شپیس (Space) کا ترجمہ عام طور پر مکانات یا خانے بسیط کیا جاتا ہے۔ کائنات کی ہر موجود چیز میں اپنی جاتی ہے

اسے ہر سمت میں اٹھا سکتا ہوں؟ تو مجھے معلوم ہوتا ہے کہ میں نے سے جس سمت میں اٹھایا ہے، وہاں میرے گرد و پیش کی اشیاء یا میرے اپنے جسم کی ساخت میرے اس فعل میں کم سے کم مزاحمت ہوتی ہے۔ اگر میں نے تمام ممکنہ سمتوں میں سے خاص سمت کا انتخاب کیا، تو اس کی وجہ یہ تھی کہ اس طرف رکاوٹ سب سے کم تھی۔ میرے فعل کے کامل آزاد ہونے کے لیے یہ ضروری تھا کہ اس کا کسی طرح کی رکاوٹ سے قطعاً کوئی واسطہ نہ پڑتا۔ کسی ایسے آدمی کا، جو مطلقاً آزاد ہو، تصور قائم کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ ہم اسے لفظاً بسط (پلیس) سے ماوراء تصور کریں اور یہ ناممکن ہے۔

(2) ہم محاکمے کے وقت کو ارتکابِ فعل کے وقت کے خواہ کتنا ہی قریب کیوں نہ لے آئیں، ہم وقت سے ماوراء آزادی کا تصور کبھی نہیں کر سکتے۔ کیونکہ اگر میں کسی ایسے فعل کا، جو ایک سیکنڈ قبل انجام دیا گیا تھا، جائزہ لوں، تو بھی مجھے یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ یہ آزاد نہیں تھا کیونکہ یہ وقت کے اس لمحے کے ساتھ، جس کے دوران میں اسے سرانجام دیا گیا تھا، منسلک ہے۔ کیا میں اپنا بازو اوپر اٹھا سکتا ہوں؟ میں اسے اوپر اٹھاتا ہوں، لیکن میں اپنے آپ سے پوچھتا ہوں: کیا میں اس لمحے کے دوران میں، جو پہلے ہی گزر چکا ہے، اپنا بازو اوپر اٹھانے سے گریز کر سکتا تھا؟ اپنے آپ کو یہ یقین دلانے کے لیے کہ ہاں میں گریز کر سکتا تھا، میں اسے اگلے لمحے اوپر نہیں اٹھاتا۔ مگر میں اپنے آپ کو جو اس فعل کے انجام دینے سے روک رہا ہوں، اس کا پہلے لمحے سے، جب میں نے سوال پوچھا تھا، کوئی تعلق نہیں۔ وہ لمحہ گزر چکا ہے کیونکہ اسے روکنا میرے اختیار سے باہر ہے اور اب یہ بازو نہ وہ بازو ہے جسے میں نے اوپر اٹھا دیا تھا اور نہ میرے گرد و پیش کی فضا وہ فضا ہے جس میں میں نے اسے اوپر اٹھایا تھا۔ وہ لمحہ، جس میں (بازو کو) پہلی حرکت دی گئی تھی، بیت چکا ہے اور اسے وہی بلانا ناممکن ہے۔ اس لمحے کے دوران میں صرف ایک ہی حرکت (یا کام) کر سکتا تھا اور میں جو حرکت (یا کام) بھی کرتا، وہ صرف ایک ہی ہو سکتی تھی۔ رہی یہ بات کہ ایک لمحے بعد میں نے اپنا بازو اوپر نہیں اٹھایا، اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ میں اس لمحے کے دوران میں بھی اسے اوپر اٹھانے سے گریز کر سکتا تھا اور چونکہ ایک وقت میں میں صرف ایک ہی حرکت (یا کام) کر سکتا ہوں، چنانچہ میں نے اس لمحے کے دوران میں جو کچھ کیا، اس کے علاوہ اور کچھ ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ اسے آزاد تصور کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ اس کا تصور زمانہ حال میں کیا جائے جو ماضی و مستقبل کے مابین حد بندی کرتا ہے۔ یعنی جس کا وقت سے کوئی تعلق نہیں اور یہ ناممکن ہے۔

(3) کسی فعل کی وجود کی تفہیم میں جو مشکلات حائل ہوتی ہیں، انہیں کتنا ہی بڑھا چڑھا کر پیش کیا جائے، کامل آزادی یعنی وجہ کی عدم موجودگی کا تصور کبھی ہمارے ذہن میں نہیں آ سکتا گا۔ جب آدمی کوئی فعل سرانجام دیتا ہے، وہ اس کا پہلے ارادہ کرتا ہے۔ اس نے یہ ارادہ کیوں کیا، اس کی کچھ نہ کچھ وجہ ہوتی ہیں۔ ان وجوہ تک ہماری رسائی کتنی ہی ناممکن کیوں نہ ہو، عقل کا اولین تقاضا یہی ہوتا ہے کہ وجہ فرض کی جائے اور اس کا کھوج لگایا جائے کیونکہ وجہ کے بغیر کسی واقعے کا تصور ناممکن ہے۔ میں وجہ سے، اور کوئی فعل سرانجام دینے کے

لیے اپنا بازو اور پر اٹھاتا ہوں، لیکن میری یہ خواہش کہ میں بلا وجہ کوئی فعل سرانجام دینا چاہتا ہوں، میرے اس فعل کی وجہ ہے۔

چلیں ہم یہ تصور کر بیٹے ہیں کہ کوئی ایسا شخص، جو تمام اثرات سے سراسر مستثنیٰ ہے، موجود ہے اور ہم اس کے ایک ایسے اہم فعل کا، جو حال ہی میں سرانجام دیا گیا ہے اور جس کے متعلق ہم یہ فرض کر لیتے ہیں کہ اس کے پیچھے کوئی وجہ نہیں تھی، جائزہ لے رہے ہیں، اگر ہم جبر کے عنصر کو گھٹنا کر خفیف تر یا متعدد رنگ، جو صفر کے برابر ہوتی ہے، لے آئیں، پھر بھی ہم انسان کے کامل ارادہ ہونے کا تصور قائم نہیں کر سکتے، کیونکہ وہ چیز، جو خارجی دنیا سے متاثر نہ ہوتی ہو، وقت کی قید سے آزاد ہو اور جوہ سے بے نیاز ہو، انسان نہیں ہو سکتی۔

اسی طرح ہم کسی ایسے شخص کا، جو آزادی سے بالکل ہی داماں ہو، کبھی تصور نہیں کر سکتے۔

(1) ہم ان مکانی حالات کے متعلق جن میں انسان مقیم ہے، اپنے علم میں خواہ کتنا ہی انتہا کر میں، یہ علم کبھی مکمل نہیں ہو سکتا کیونکہ ان حالات کی تعداد اسی طرح لامحدود ہے جس طرح کہ خود خدائے بسیط (ہیس) رہتا ہی ہے۔ چنانچہ جب تک ان تمام حالات کی، جو انسان کو متاثر کر سکتے ہیں، تعریف (دو شیخ) نہیں کی جاتی، مطلق جبر کا کوئی وجود نہیں ہو سکتا اور آزادی کی خاص مقدار موجود رہتی ہے۔

(2) ہم جس فعل کا جائزہ لے رہے ہیں، اس کے ارتکاب اور اس پر محاکمے کے اوقات کے مابین کا صد خود کوئی زیادہ بڑھادیں، یہ دورانیہ محدود رہے گا جب کہ دلت غیر محدود ہے، اور چنانچہ اس اعتبار سے بھی مطلق جبر کا کوئی وجود نہیں ہو سکتا۔

(3) کسی فعل کی وجہ کے سلسلے تک ہمیں خواہ کتنی ہی رسائی کیوں نہ حاصل ہو جائے، پورے کا پورا سلسلہ کبھی ہماری دسترس میں نہیں آسکے گا کیونکہ یہ غیر ختم ہے۔ چنانچہ ایک بار پھر ہم مطلق جبر کا تصور قائم نہیں کر سکتے۔

علاوہ ازیں مابقا خود مختاری کو گھٹنا کر صفر کے برابر لانے کے بعد ہم بعض صورتوں میں۔ مثلاً بزرگ آدمیاں بچہ در رحم مادر یا ضعیف العقل شخص۔ خود مختاری کی کامل عدم موجودگی کو تسلیم کر بھی لیں، تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہم انسان کے تصوری کو، جس کا ہم جائزہ لے رہے ہیں، ملیا میٹ کر دیں گے کیونکہ اگر خود مختاری کا کوئی وجود نہیں، پھر انسان کا بھی کوئی وجود نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ کسی ایسے شخص کا تصور جو کامل قانون جبر کے تابع ہو اور جسے مطلق کوئی آزادی حاصل نہ ہو، انتہائی ناممکن ہے جتنا کہ کامل طور پر آزاد آدمی کا تصور۔

چنانچہ ایسے انسانی فعل کا، جو سراسر قانون جبر کے تابع ہو اور جس میں آزادی کا شائبہ تک نہ پایا جاتا ہو، تصور کرنے کے لیے ہمیں یہ فرض کرنا پڑے گا کہ ہمیں فضا کے لامتناہی حالات، وقت کے لامتناہی دورانیے اور وجوہات کے لامتناہی سلسلے کا علم ہے۔

کسی ایسے آدمی کا، جو مطلقاً آزاد ہو اور قانون جبر کے تابع نہ ہو، تصور کرنے کے لیے ہمیں یہ تصور کرنا پڑے گا کہ یہ شخص بالکل تنہا ہے اور زمان و مکان، دور و وجوہ کی قید سے آزاد ہے۔

پہلی صورت میں اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ خود مختاری کے بغیر جبر کا وجود ہو سکتا ہے، تو ہمارے لیے جبر کی تعریف خود قانون جبر سے کرنا ممکن ہوتا۔ یعنی مواد کے بغیر محض ایست کا تصور کیا جاسکتا۔

دوسری صورت میں اگر جبر کے بغیر خود مختاری کا وجود ہو سکتا تو ہم زمان و مکان اور وجوہ کی تہ سے مادہ خود مختاری کا تصور کر سکتے اور چونکہ یہ غیر مشروط اور لامحدود ہوتی، اس لیے فی نفسہ یہ لاشے ہوتی یعنی ایست کے بغیر محض مراد ہوتی۔

عمومی اعتبار سے ہم پھر ان دو سہاریات تک پہنچ جاتے۔ زندگی کے ناقابل تفہیم جوہر اور اس جوہر کی تعریف کرنے والے قوانین۔ جن پر کائنات کے بارے میں انسان کے سارے نقطہ نظر کی تشکیل ہوتی ہے۔ عقل کہتی ہے کہ 1۔ فضائے بسیط (سپیس) مارے کی تمام شکلوں کے ساتھ، جو اسے مرنے بناتے ہیں، رتنا ہی ہے، اس کے علاوہ اس کا اور کوئی تصور ذہن میں آ ہی نہیں سکتا۔ 2۔ وقت ایک لمحے کے توقف کے بغیر بتدریج آگے ہی آگے بڑھتا رہتا ہے، اس کے علاوہ اس کا اور کوئی تصور ذہن میں آ ہی نہیں سکتا۔ 3۔ علت و معلول کے مابین تعلق کی نہ کوئی ابتدا ہے اور نہ کوئی انتہا۔

شعور کہتا ہے۔ 1۔ صرف میں ہی میں ہوں اور باقی جو کچھ موجود ہے، وہ صرف میں ہے، لہذا میں میں تمام فضائے بسیط شامل ہے۔ 2۔ میں روں وقت کو حال کے ثابت (fixed) لمحے سے مپتا ہوں، صرف اسی لمحے میں مجھے یہ آگے ہی آگے ہوتی ہے کہ میں زندہ ہوں، لہذا میں وقت (زمان) سے ماوراء ہوں۔ 3۔ میں علت (وجہ) سے آزاد ہوں کیونکہ میں اپنے آپ کو اپنی زندگی کے ہر لمحہ ہر کی علت سمجھتا ہوں۔

عقل جبر کے قوانین بیان کرتی ہے۔ شعور خود اختیاری کی حقیقت کا اظہار کرتا ہے۔ آزادی، جس پر کوئی چیز قدغن نہیں لگاں اور نہ اسے محدود کرتی ہے، دانتے ہے، جس کی جانچ پرکھ کی جاتی ہے اور جبر وہ شے ہے جو جانچ پرکھ کرتی ہے۔ آزادی مواد ہے، جبر ایست ہے۔

وقوت کے دونوں ذرائع کو، جو آپس میں مواد اور ایست کی طرح منسلک ہیں، ایک دوسرے سے علیحدہ کرنے کے بعد ہی ہم آزادی اور جبر کے ان تصورات تک پہنچتے ہیں جس میں وہ دونوں ماہی طور پر ایک دوسرے سے کوئی علاقہ نہیں رکھتے اور علیحدہ علیحدہ ہونے کے سبب ناقابل فہم بن جاتے ہیں۔

ان دونوں کو صرف یک جا کرنے کے بعد ہی ہمیں انسان کی زندگی کا واضح تصور ملتا ہے۔ ان دونوں تصورات سے، جو اپنے امتزاج سے باہمی طور پر ایک دوسرے کی ایست اور مواد کی حیثیت سے تعریف (و توضیح) کرتے ہیں، علیحدہ زندگی کا کوئی تصور ممکن نہیں۔

ہمیں انسانی زندگی کے بارے میں جو کچھ معلوم ہے، وہ صرف یہ ہے کہ اختیار کا جبر کے ساتھ یعنی شعور کا عقل کے قوانین کے ساتھ کوئی خاص تعلق ہے۔

ہمیں فطرت کی خارجی دنیا کے متعلق جو کچھ معلوم ہے، وہ محض یہ ہے کہ فطرت کی قوتوں کا جبر کے ساتھ یعنی

زندگی کے جوہر کا عقل کے قوانین کے ساتھ کوئی خاص تعلق ہے۔

فطرت کی عظیم طاقتیں ہمارے دائرے سے باہر ہیں اور ہمیں ان کا شعور نہیں ہے۔ ہم ان طاقتوں پر کششِ ثقل، جمود (inertia)، برق، غریزی قوت (vital force) وغیرہ کہتے ہیں لیکن انسان میں ہمیں زندگی کی طاقت کا شعور ہے اور ہم سے خود اختیاری کہتے ہیں۔

لیکن جس طرح ہم کششِ ثقل کی طاقت کو، جو فی نفسہ ناقابلِ تفہیم ہے لیکن محسوس ہر شخص کو ہوتی ہے، صرف اس حد تک سمجھ سکتے ہیں جس حد تک ہم قوانینِ جبر کو، جن کے یہ تابع ہے، سمجھتے ہیں (ہمارا یہ علم اس ابتدائی درجہ سے کہ تمام اجسام کا وزن ہوتا ہے، نیوٹن کے قوانین تک محدود ہے)، اسی طرح خود اختیاری کی طاقت، جو فی نفسہ ناقابلِ تفہیم ہے لیکن جس سے آگاہ ہر کوئی ہے، صرف اس حد تک ہمارے لیے قابلِ ادراک ہے جس حد تک ہم قوانینِ جبر کا علم ہے جس کے یہ تابع ہے (اور ہمارا یہ علم اس حقیقت سے شروع ہوتا ہے کہ ہر شخص کو موت آنی ہے اور وہ معاشیات اور تاریخ کے انہماکی پیچیدہ قوانین تک جا پہنچتا ہے)۔

سارا علم زندگی کے جوہر (essence) کو محض عقل کے قوانین کے تحت لانے کا نام ہے۔

دوسری ہر طاقت سے انسان کی خود اختیاری اس لحاظ سے مختلف ہے کہ انسان کو اس کا براہِ راست شعور ہے لیکن عقل کی نگاہوں میں یہ کسی دوسری طاقت سے کسی طرح بھی مختلف نہیں ہے۔ کششِ ثقل، برق یا کیمیائی اfinity (affinity) کی طاقتوں کے مابین جو اعتبار کیا جاتا ہے، وہ اس لیے کیا جاتا ہے کیونکہ عقل ان کی الگ الگ تعریف (دو توجیح) کرتی ہے۔ اسی طرح عقل انسان کی خود اختیاری کی طاقت اور فطرت کی دوسری طاقتوں کے مابین جو حدِ فاصل کھینچتا ہے، وہ اس تعریف سے متعین ہوتی ہے جو عقل اس کی کرتی ہے۔ خود اختیاری، جس کا جبر سے کوئی تعلق نہ ہو، عقلی حس کا عقل کے قوانین سے، جو اس کی تعریف (دو توجیح) کرتے ہیں، کوئی نسبت نہ ہو، کسی اعتبار سے بھی کششِ ثقل، حرارت یا اس طاقت سے، جو چیزیں اگاتی ہیں، مختلف نہیں ہے۔ کیونکہ زندگی کا محض لمحاتی، ناقابلِ تعریف حس (sensation) ہے۔

جس طرح اس طاقت کا، جو اجسامِ فلکی کو متحرک رکھتی ہے، ناقابلِ تعریف جوہر، اور حرارت، و برق یا کیمیائی الگ الگ طاقتوں یا غریزی طاقت کا ناقابلِ تعریف جوہر، فلکیات، نزع، کیمسٹری، نباتیات اور حیوانیات وغیرہ کا موضوع تشکیل کرتا ہے، اسی طرح خود اختیاری کی طاقت کا جو ہر تاریخ کا مواد تشکیل کرتا ہے۔ لیکن جس طرح ہر علم (سائنس) یہ دیکھنے کی کوشش کرتا ہے کہ زندگی کا جوہر کس کس طرح اپنے آپ کو ظاہر کرتا ہے، جب کہ فی نفسہ جوہر صرف مابعد الطبیعیات کا موضوع بن سکتا ہے، اسی طرح تاریخ یہ جائزہ لیتی ہے کہ انسان کی خود اختیاری کی طاقت زمانہ مکان کی متعین کردہ حدود کے اندر رہتے اور علت پر انحصار کرتے کس کس طرح اپنے آپ کو ظاہر کرتی ہے جب کہ فی نفسہ خود اختیاری مابعد الطبیعیات کا موضوع ہے۔

تجرباتی علوم کی وساطت سے جو کچھ ہمیں معلوم ہوتا ہے، ہم اسے قوانینِ جبر کہتے ہیں۔ جو ہمیں معلوم نہیں

ہوتا ہے ہم غریزی طاقت (vital force) کا نام دیتے ہیں۔ زندگی کا جو ہر کیا ہے؟ کچھ تو ہمیں معلوم ہے لیکن کچھ ہمیں معلوم نہیں ہے۔ غریزی طاقت اس نامعلوم بقایا کا اظہار ہے۔

یہی حال تاریخ کا ہے۔ جو کچھ ہمیں معلوم ہو جاتا ہے، اسے ہم قوانین جبر کہہ دیتے ہیں اور جو ہمیں معلوم نہیں ہوتا، اسے ہم خود اختیاری قرار دے دیتے ہیں۔ تاریخ کے نزدیک خود اختیاری محض ایک ایسا قلم ہے جس کا مفہوم انسانی زندگی کے وہ قوانین ہیں جنہیں ہم نہیں جانتے۔

11

تاریخ یہ جائزہ لیتی ہے کہ انسان کی خود اختیاری زبان و مکاں کی حدود کے اندر رہے اور علت پر انحصار کرتے کسی کس طرح اپنے آپ کو ظاہر کرتی ہے، یہ الفاظ دیگر یہ اس آزادی کی تعریف (و توضیح) عقل کے قوانین کے ذریعے کرتی ہے۔ چنانچہ تاریخ اسی حد تک علم (سائنس) ہے جس حد تک یہ خود اختیاری ان قوانین سے متعین ہوتی ہے۔

انسان کی خود اختیاری کو ایک ایسی طاقت تسلیم کرنا، جو واقعات پر اثر انداز ہونے کی اہلیت سے بہرہ ور ہو، یعنی قوانین کے تابع نہ ہو، تاریخ کے لیے وہی بات ہوگی جیسے فلکیات میں یہ تسلیم کر لیا جائے کہ کوئی آزاد طاقت اجرام فلکی کو متحرک کر رہی ہے۔

اس قسم کا معروضہ قوانین یعنی کسی بھی قسم کی سائنس کے وجود کے امکان کو ٹپٹ کر دے گا۔ اگر آزادانہ حرکت کرنے والا ایک بھی جسم موجود ہے، پھر کیپلر اور نیوٹن کے قوانین کی نفی ہو جاتی ہے اور جرم فلکی کی حرکت کا کوئی تصور باقی نہیں رہ جاتا۔ مگر ایک بھی یہاں فعل، جو خود اختیاری کا نتیجہ تھا، موجود ہے، پھر کسی بھی تاریخی قانون کا وجود نہیں ہو سکتا اور نہ تاریخی واقعات کا کوئی تصور قائم کیا جاسکتا ہے۔

تاریخ کا واسطہ انسانی منشا کی حرکت کے خطوط سے ہے۔ ان خطوط کا ایک سرانہ معلوم میں مستور ہے، جب کہ دوسرے سرے پر یہ شعور ہے کہ انسان کی خود اختیاری زمانہ حال میں عمل پذیر ہوتی ہے، یہ زمانہ مکان میں مقید ہوتی ہے اور اس کے رو بہ عمل ہونے کا انحصار علت پر ہوتا ہے۔

حرکت کا یہ میدان ہماری نگاہوں کے سامنے جتنا زیادہ پھیلتا جاتا ہے، حرکت کے قوانین اتنے ہی زیادہ واضح ہوتے جاتے ہیں۔ ان قوانین کو دریافت کرنا اور ان کی تعریف (و توضیح) کرنا تاریخ کا مسئلہ ہے۔

جس نقطہ نظر سے علم تاریخ اب اپنے موضوع کا مطالعہ کرتا ہے۔ وہ واقعات و مظاہر کی وجوہ خود اختیاری میں تلاش کرتا ہے۔ اس کی مدد سے ان قوانین کی سائنسی تشکیل ناممکن کام ہے، کیونکہ انسان کی خود اختیاری کو خواہ کتنا ہی محدود کر دیا جائے، جو بھی ہم اسے ایک ایسی طاقت کی، جو کسی قانون کی تابع نہیں ہے، حیثیت سے تسلیم کرتے ہیں، قانون کا وجود ناممکن ہو جاتا ہے۔

خود اختیاری کے اس عنصر کو اتنا کم کرنے، تا کم کرنے کہ صرف خفیف ترین قدری باقی رہ جائے یعنی

اسے بے حد حساب چھوٹی مقدار تصور کرنے کے بعد ہی ہم اپنے آپ کو یہ یقین دلا سکیں گے کہ جو بات مطلقاً ناقابل حصول ہیں اور پھر وہ بات تلاش کرنے کی بجائے تاریخ تاریخی قوانین کی دریافت اپنا مسئلہ حل کرے گی۔

ان قوانین کی تلاش بدلتی ہوئی شروع ہو گئی تھی۔ فکر کے نئے اسالیب، جنہیں تاریخ کو زما اپنانا چاہیے، جمع کیے جا رہے ہیں۔ اس کے ساتھ خود جہی کا عمل بھی جاری ہے۔ پرانی قسم کی تاریخ جو سدا واقعات کی دہرولی چیز پھاڑ کرتی اور انہیں مختلف اجزاء میں منقسم کرتی رہی ہے، اب اس خود جہی کی طرف مائل ہو رہی ہے۔

تمام انسانی علوم نے یہی راستہ اختیار کیا ہے۔ تمام علوم میں صحیح ترین علم، ریاضی، نے انتہائی چھوٹی مقداروں تک پہنچنے کے بعد قطعیت کا یہ عمل ترک کر دیا ہے اور اب اس نے نامعلوم، انتہائی چھوٹی مقداروں کو سالم مقداروں میں تبدیل کرنے کا عمل شروع کر دیا ہے۔ تسبیح کا تصور ترک کرنے کے بعد ریاضی تو، نہیں، یعنی خلیفہ ترین عناصر کے مشترک اوصاف، تلاش کرنے لگی ہے۔

دوسرے علوم بھی غور و فکر کا یہی راستہ، اگرچہ اس کی شکل مختلف ہے، اختیار کر رہے ہیں۔ نیوٹن نے جب کشش ثقل کا قانون مدون کیا، اس نے یہ نہیں کہا کہ سورج یا زمین میں کشش کا وصف پایا جاتا ہے اس نے صرف یہ کہا کہ بڑے سے بڑے اجسام سے لے کر چھوٹے سے چھوٹے، جسم تک کا وصف یہ ہے کہ وہ ایک دوسرے کو اپنی طرف کھینچتے ہیں یعنی اس نے اس سوال کو کہ، جسم حرکت کیوں کرتے ہیں، اٹھا کر ایک طرف رکھ دیا اور بے انتہا بڑے جسم سے لے کر انتہائی چھوٹے جسم تک میں جو مشترک وصف پایا جاتا ہے، اسے بیان کر دیا۔ طبعی علوم بھی کچھ کرتے ہیں۔ جہی وہ تسبیح کے چکر میں نہیں پڑتے، صرف قوانین تلاش کرتے ہیں۔ تاریخ بھی اسی راستے پر چل پڑی ہے۔ اگر تاریخ کا موضوع اقوام اور بنی نوع انسان کی زندگی ہے، افراد کی زندگیوں کے واقعات کا بیان نہیں، اسے بھی تسبیح کے تصور کو اٹھ کر ایک طرف رکھنا اور ایسے قوانین کو، جو خود اختیاری کے مساوی اور غیر متغیر طور پر ایک دوسرے سے مربوط انتہائی چھوٹے عناصر میں مشترک طور پر موجود ہیں، تلاش کرنا ہوگا۔

12

جونہی کوپرنیکس کا قانون دریافت ہو گیا، محض اس حقیقت کے اعتراف سے کہ گھومتی زمین ہے، راز نہیں، قدمائے اپنے اذہان میں کائنات کا جو نقشہ ترتیب دیا تھا، وہ اسی وقت ملیا میٹ ہو گیا۔

اگر اس قانون کو غلط ثابت کر دیا جاتا، اجسام کی حرکت کے بارے میں پرانے تصورات کو برقرار رکھنا شاید ممکن ہوتا۔ لیکن اس کو غلط ثابت کیے بغیر بطلیموسی دنیاؤں کا مطالعہ جاری رکھنا ناممکن معلوم ہوتا۔ تاہم کوپرنیکس کے قانون کی دریافت کے بعد بھی بطلیموسی دنیاؤں کا مطالعہ کافی مدت جاری رہا۔

جونہی کسی شخص نے یہ کہا اور ثابت کر دکھایا کہ پیدائش یا جرائم کی شرح ریاضیاتی قوانین کے تابع ہے، حکومت کی یہ مادہ شکل مخصوص جغرافیائی، سیاسی یا معاشی حالات متعین کرتے ہیں، یا دھرتی کے ساتھ اس کے

باسیوں کے مخصوص تعلقات اقوام کے ترک سکونت کا باعث بنتے ہیں۔ اسی وقت وہ اساسات، جن پر تاریخ کی عمارت کھڑی کی گئی تھی، صدا منہدم ہو گئیں۔

ان نئے قوانین کو غلط ثابت کر کے تاریخ کا سابقہ نقطہ نظر برقرار رکھنا شاید ممکن ہوتا، لیکن جب تک انھیں غلط ثابت نہیں کیا جاتا، تاریخی واقعات کا اس طرح مطالعہ جاری رکھنا جیسے وہ کسی شخص کی خود مختاری کی سن مانی پیداوار ہوں، ناممکن معلوم ہوگا۔ کیونکہ اگر بعض جغرافیائی، نسلی، ثقافتی یا معاشی حالات کے نتیجے کے طور پر ملاں یا اقسام کی حکومت قائم ہوگئی یا بعض اقوام کی ترک سکونت عمل میں آئی، پھر ان، شخاص کی، جنہیں بظاہر اس طرح کی حکومت کے قیام یا ترک سکونت کا باعث بنا کر پیش کیا جاتا ہے، خود، قیاری کو ان واقعات کا سبب نہیں ٹھہرایا جاسکتا۔

اس کے باوجود شاریات، جغرافیہ، معاشیات، ثقافتی لسانیات اور ارضیات کے قوانین کے پہلو بہ پہلو قدیم تاریخ کا مطالعہ جاری ہے۔ حالانکہ یہ قوانین ان اصولوں کی جن پر یہ (قدیم تاریخ) کاربند ہے، تکذیب کرتے ہیں۔ طبعی علوم میں جدید و قدیم تصورات کے، مابین تضاد کافی مدت تک اور بڑی ڈھٹائی سے جاری رکھا گیا۔ دینیات پرانے نظریات کی پاسبان تھی اور وہ نئے نظریات کے علم برداروں کو الزام دیتی تھی کہ وہ مکاشفہ کی پامالی کے مرتکب ہو رہے ہیں لیکن جب صداقت نے کامیابی کے جھنڈے گاڑ دیے، دینیات نے پہلے کی طرح نئی زمین پر اپنی عمارت استوار کر لی۔

تاریخ کے جدید اور قدیم تصورات کے، مابین کشمکش بھی خاصے طویل عرصے سے جاری ہے اور فریقین میں سے کوئی بھی، اپنے موقف سے ایک رخ پیچھے ہٹنے کو تیار نہیں ہے۔ یہاں بھی دینیات اسی انداز سے قدیم نظریات کی پاس داری کر رہی ہے اور جدید نظریات کے علم برداروں پر مکاشفہ کو پامال کرنے کا الزام لگا رہی ہے۔ دونوں صورتوں میں اور دونوں اطراف یہ کشمکش جذبات مشتمل کرتی ہے اور صداقت کا گدگھوٹتی ہے۔ ایک فریق کو یہ اندیشہ اور خوف لاحق ہو رہا ہے کہ وہ عمارت جو صدیوں میں تعمیر کی گئی تھی، وہ ڈھل رہی ہے جب کہ دوسرے فریق کے سر میں تباہی کا سودا سمایا ہوا ہے۔

ان لوگوں کو، جو طبعی علوم کی ابھرتی ہوئی صداقتوں کے خلاف محاذ بنائے ہوئے تھے، یہ محسوس ہوتا تھا کہ اگر انھوں نے ان صداقتوں کو تسلیم کر لیا، ان کا خدا، تخلیق کائنات اور لون کے بیٹے یسوع⁴⁷ کے بچنے پر ایمان نہیں ہوسکتا۔ جہاں تک کوپرنیکس اور نیوٹن کے حامیوں کا۔ مثلاً والتیر۔ تعلق ہے، ان کا خیال تھا کہ فلکیات کے قوانین نے مذہب کا خاتمہ کر دیا ہے اور اس (والتیر) نے کشش ثقل کے قانون کو مذہب کے خلاف بطور اختیار استعمال کیا۔

بالکل اسی طرح اب یوں نظر آتا ہے کہ ہرے بس قانون جبر کو تسلیم کرنے کی دیر ہے اور روح، نیکی و بدی کے تصورات، مملکتی اور کیسائی اور رے، جنہیں ان تصورات پر تعمیر کیا گیا ہے، زمین بوس ہو جائیں گے۔ جس طرح والتیر نے اپنے زمانے میں کیا تھا، آج قانون جبر کے خواہ مخوہ کے حاکم اس قانون کو مذہب کے

خلاف بطور ہتھیار استعمال کرتے ہیں حالانکہ کوپریکس کے فلکیاتی قانون کی طرح تاریخ کا قانون جبرکیلی اور مکین اداروں کو بنا نہیں کرتا (یہ محض داہرہ ہے)، بلکہ ان بنیادوں کو جن پر یہ دوسرے قائم ہیں، زیادہ مضبوط بناتا ہے جیسا کہ فلکیات کے مسئلے کے ساتھ تب ہوا، یہی تاریخ کے مسئلے کے بارے میں جو اختلاف رائے پایا جاتا ہے، اس کی اساس اس مطلق اکائی کے، جو مرئی مظاہر کو، اپنے کے لیے پیانے کا کام دیتی ہے، تسلیم کرنے پابہ کرنے پر ہے۔ فلکیات میں یہ معیاری پیانہ زمین کی غیر حرکت پذیری تھی اور تاریخ میں یہ فرد کی آزادی۔ خود اختیاری۔ ہے۔

جیسا کہ فلکیات میں ہوا، زمین کی حرکت کو تسلیم کرنے میں جو دشواری پیش آرہی تھی، وہ یہ تھی کہ زمین کو سر کی اور سیاروں کو متحرک تسلیم کرنے سے ذہن میں جو حساس تقاضا پیدا ہوتا تھا اس سے دست بردار ہونا پڑتا تھا، اسی طرح تاریخ میں یہ تسلیم کرنا کہ فرد درمان درمکان اور تعلیم کے قوانین کے تابع ہے، اس چیز کے مترادف ہے کہ دل کو اپنی شخصیت کے آزاد ہونے کا جو بے ساختہ احساس ہوتا ہے، وہ اس سے دست بردار ہو گیا ہے۔ لیکن جس طرح فلکیات کے نئے نقطہ نظر نے کہا: ”یہ ٹھیک ہے کہ ہمیں زمین کی حرکت محسوس نہیں ہوتی لیکن اسے بے حرکت تسلیم کر کے ہم بالکل، حقد نہ نتائج اخذ کرنے کے مرتکب ہوں گے، تاہم اگر ہم یہ تسلیم کریں کہ یہ حرکت (جو ہمیں محسوس نہیں ہوتی) موجود ہے، تو ہم قوانین تک پہنچ جائیں گے۔“ اسی طرح تاریخ کا جدید نقطہ نظر کہتا ہے: ”یہ ٹھیک ہے کہ ہمیں اپنی متابعت محسوس نہیں ہوتی لیکن اگر ہم یہ تسلیم کر لیں کہ ہم آزاد ہیں، ہم محض حقد نہ نتائج اخذ کریں گے، تاہم اگر ہم یہ عترف کر لیں کہ ہم خارجی دنیا، زمان درمکان اور تعلیم کے تابع ہیں، ہماری قوانین تک رسائی ہو جائے گی۔“ پہلی صورت میں قفائے محیط میں غیر حقیقی یا حرکتی کے تحسس سے دست برداری اختیار کرنا پڑتا تھا اور ایسی حرکت کو، جو ہمیں محسوس نہیں ہوتی، تسلیم کرنا پڑتا تھا۔ یعنی موجودہ معاملے میں یہ ضروری ہے کہ ہم اس آزادی کے، جو موجود نہیں، تصور سے دست بردار ہو جائیں اور اس متابعت کا، جس کا ہمیں شعور نہیں، اقرار کریں۔

ضمیمہ

”جنگ اور امن“ کے متعلق چند باتیں

(طالسطائی کا یہ مضمون 1868 میں ایک جریدے ”ریشن آرکائیوز“ میں شائع ہوا تھا۔)

اس کتاب کی، جس پر میں نے زندگی کے بہترین حالات میں پانچ ساں مسلسل اور غیر معمولی طور پر سخت محنت کی ہے، اشاعت پر میں اس کے متعلق اپنا نقطہ نظر بیان کرنا اور اس طرح ان غلط فہمیوں کا جو قاری کے ذہن میں پیدا ہو سکتی ہیں، ازراہ کرنا چاہتا ہوں۔ میں نہیں چاہتا کہ اس کتاب کے قارئین کو اس میں کوئی ایسی بات نظر آئے یا وہ اس میں کوئی ایسی بات تلاش کریں جو میں کہنا نہیں چاہتا تھا یا جسے میں کہنے سے قاصر رہا ہوں اور میں اس کی وجہ اس چیز کی طرف، جو میں کہنا تو چاہتا تھا لیکن کتاب کے الفاظوں کے پیش نظر پوری شرح و بسط سے بیان نہ کر سکا، مبذول کرنا چاہتا ہوں۔ نہ تو میرے پاس اتنا وقت تھا اور نہ مجھ میں اتنی صلاحیت تھی کہ جس بات کا میں نے بیڑا اٹھایا تھا، اس کا میں پوری طرح احاطہ کر سکتا، اور اب میں ایک شخص جیسی جریدے کی مہمان نوازی کا فائدہ اٹھا کر ان لوگوں کے سامنے، جنہیں اس میں کوئی دلچسپی ہو سکتی ہے، مصنف کا نقطہ نظر (اگرچہ وہ مختصر اور نامکمل ہے) پیش کر رہا ہوں۔

(1) ”جنگ اور امن کیا ہے؟ (اسی معنوں میں) نہ تو یہ ناول ہے اور نہ نظم و ردیہ تاریخی و قانع نگاری تو بالکل ہی نہیں ہے۔ ”جنگ اور امن“ وہی کچھ ہے جسے مصنف اس شکل میں، جس میں اسے بیان کیا گیا ہے، بیان کرنا چاہتا تھا اور بیان کرنے کے قابل ہوا۔ فنی تخلیق میں ردیہ ہیئت سے غافل برتنے کے متعلق اس قسم کا اعلان، اگر یہ پیشگی سرچ سمجھا نہ ہو تا، اس طرح کی کوئی نظیر موجود نہ ہوتی، من مانا معلوم ہوتا۔ لیکن پوشمکن کے زمانے سے روسی ادب کی تاریخ پوری اصناف سے انحراف کی نہ صرف متعدد مثالیں فراہم کرتی ہے۔ بلکہ اس کے متضاد ایک بھی مثال پیش نہیں کرتی۔ گوگول کی ”بے جان روہیں“ (Dead Souls) سے دستبردیں کی ”مردوں کا مسکن“ (House of the Dead) تک اوسط درجے سے بلند ایک بھی نئی نثر پارہ ایسا نہیں ملے گا جس پر ناول، اپیک یا انسانی کی صنف کا موزوں، انداز سے اطلاق کیا جاسکتا ہو۔

(2) عہد کی خصوصیات: جب اس کتاب کا پہلا حصہ اشاعت پذیر ہوا، میرے بعض قارئین نے مجھے بتایا کہ اس میں واضح انداز سے بیان نہیں ہوئی۔ اس سررہش کا میرا جواب یہ ہے، لوگوں کو میرے ناول میں ایسا کہ جو خصوصیات۔ زرعی غلامی کی ہولناکیاں، بیویوں کے چار دیواری سے ہر نکلنے پر پابندی، بالغ بچوں کی کوڑوں سے پٹائی، سالتی کووا، وغیرہ وغیرہ۔ نظر نہیں آئیں، مجھے ان کا بخوبی علم ہے۔ لیکن میں نہیں سمجھتا کہ عہد کی یہ خصوصیات، جو جس طرح ہمارے تخیل میں موجود ہیں، اس طرح درست ہیں اور میں انہیں دہرانا نہیں چاہتا۔ خطوط، روزناموں اور دیات کا مطالعہ کرنے کے بعد مجھے اس قسم کی سفاکیاں، جیروہ دہتریں اور ہولناکیاں ان سے زیادہ نہیں ملیں جو ہمیں آج یا کسی دوسرے دور میں ملتی ہیں۔ اس زمانے میں بھی لوگ ایک دوسرے سے محبت کرتے ور خاں کھاتے تھے، صداقت و خیر کی جستجو کرتے تھے، جذبات کی راہیں بہت تھیں، اور اونچے طبقوں کے لوگ اسی قسم کی پیچیدہ ذہنی اور اخلاقی زندگی بسر کرتے تھے جس طرح کی وہ آج کل کرتے ہیں بلکہ ان میں سے بعض کا طرز حیات آج کے لوگوں سے بھی زیادہ شستہ اور مہذب تھا۔ اگر ہمیں اس عہد کی کج رویوں اور بھونڈے تشدد پر یقین آنے لگا ہے، تو اس کی وجہ محض یہ ہے کہ اس زمانے کی جو روایات، باداشتیں، کہانیاں اور ناواں ہمیں منتقل ہوئے ہیں، زیادہ تر تشدد اور سفاکانہ رویوں کی غیر معمولی صورتوں کا اندراج کرتے ہیں۔ یہ مفروضہ قائم کر لینا کہ اس عہد کی بالادست خصوصیت مفردہ پر دازی تھی، اتنا ہی خلاف انصاف ہے جتنا اس شخص کا، جسے پہڑی کے پار دیکھتے ہوئے درختوں کی چوٹیوں کے عل و اور کچھ نظر نہ آئے، یہ نتیجہ اخذ کر لینا کہ اس علاقے میں درختوں کے ماسوا اور کچھ ہے ہی نہیں۔ اس عہد کی (جیسا کہ ہر دور کے ساتھ ہوتا ہے) اپنی خصوصیات تھیں اور یہ خصوصیات باہر کی طبنے کی دوسری طبنوں کے ساتھ زبردست مغایرت، اس زمانے کے مذہبی فلسفے، تعلیمی ہوا تحیروں، فرانسیسی زبان استعمال کرنے کی عادت و راسی نوع کی دیگر باتوں کا نتیجہ تھیں۔ یہی وہ خصوصیات ہیں جنہیں میں نے مفردہ بھر پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

(3) روسی کتاب میں فرانسیسی زبان کا استعمال میری کتاب میں روسی اور فرانسیسی دونوں ہی بعض اوقات رہا اور بعض اوقات فرانسیسی کیوں بولتے ہیں؟ روسی کتاب میں لوگوں کو فرانسیسی بولتے اور لکھتے دیکھ کر سررہش کرنا ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص تصویری خاکے (پورٹریٹ) میں سیاہ و جبے (سائے)، جو فطرت میں موجود نہیں ہوتے، دیکھ کر مصور پر عن طعن کرنے لگے۔ مصور نے تصویری خاکے پر جو سایہ ابھارا ہے، مگر بعض لوگوں کو وہ سیاہ و جبے نظر آتے ہیں تو اس میں اس کا کوئی تصور نہیں۔ اسے صرف تبھی تصور دہر ٹھہرایا جائے گا اگر وہ یہ سایہ غلط یا گھٹیا انداز سے ابھارتا ہے۔ انیسویں صدی کے ابتدائی سالوں کا تذکرہ کرتے اور ایک خاص طبقے کے روسیوں، نیپولین اور بعض دوسرے فرانسیسیوں کی، جن کا اس عہد کی زندگی میں تباہ و برباد حصہ تھا، کردار نگاری کرتے ہوئے میں غیر ارادی طور پر کچھ زیادہ ہی متاثر ہو گیا اور یہ لوگ جس انداز سے

اپنے فرانسیسی طرز فکر کا اظہار کرتے تھے، اسے جوں کا توں تسلیم کر دیا۔ چنانچہ اس بات سے انکار کیے بغیر کہ میں نے موقلم سے جو سیاہ نشان لگائے ہیں، غالباً طیر صبح اور بھونڈے ہیں، میں ان لوگوں سے جنہیں پولیس کبھی فرانسیسی اور کبھی روسی بولتے آتے معلوم ہوتا ہے، صرف اتنا عرض کر دیا کہ وہ یہ سمجھنے کی کوشش کریں کہ انھیں یہ بات محض اس لیے احقانہ نظر آتی ہے کہ اس شخص کی طرح، جو ہڈی ٹوٹ دیکھ رہا ہے، انھوں نے بھی سارا چہرہ، جس پر روشیاں اور سائے دونوں موجود ہیں، دیکھنے کی بجائے، ناک کے نیچے سیاہ نشان ڈھونڈ نکال رہے۔

14. کتاب میں شخص کے نام: بلکونسکی، درویشکوی، ہلمین، کورامین اور دیگر نام جانے پہچانے روسی نام معلوم ہوتے ہیں۔ جب میں داستانی کرداروں کا تاریخی کرداروں سے آسان سا کرار ہاتھا، مجھے محسوس ہوا کہ اگر میں نے کسی کا ڈنٹ رستوپ چین کو کسی پرنس پرائسکی، ستریلیسکی یا اس قسم کے دیگر فرضی ناموں والے پرنسوں اور کاؤنٹوں سے ہم کلام ہوتے دکھایا، تو یہ نام کانوں کو بھلے معلوم نہیں ہوں گے۔ اگرچہ بلکونسکی یا درویشکوی یا ترویشکوی نہیں ہیں لیکن ان ناموں کی آداریں روسی امرا کے طبقے میں جانی پہچانی اور قدرتی معلوم ہوتی ہیں۔ میں اپنے تمام کرداروں کے لیے بزرگوار، دروستوف جیسے نام، جو سننے میں اجنبی اور غلط محسوس نہیں ہوتے، گھڑنے میں کامیاب نہیں ہو سکا اور اس مشکل پر قابو پانے کے لیے مجھے اس کے علاوہ اور کوئی چارہ کار نظر نہ آیا کہ میں ایسے نام، جن سے روسی کان صحیح سنوں میں آشنا ہیں، انکل پچولوں، دران کے چند حرف تبدیل کر دوں۔ میرے گھرے ہوئے اور اصل ناموں کے مابین جو مشابہت پائی جاتی ہے، اسے دیکھ کر اگر کسی شخص کے دس میں یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ میں مکالمے یا نکل اصل شخص کا تذکرہ کرنا چاہتا تھا، تو مجھے بہت افسوس ہوگا اور مجھے یہ افسوس خاص طور پر اس لیے بھی ہوگا کیونکہ اس ادبی فعالیت میں، جو اصلی اشخاص کی، جو اس دنیا میں موجود ہیں یا موجود رہے ہیں، خاک کشی پر مشتمل ہے اور اس فعالیت میں، جس میں میرا وقت گزر رہا، کوئی قدر مشترک نہیں ہے۔

ماریا دمتریوونا آخر دوسروں اور دینی سوف واحد کردار ہیں جنہیں میں نے غیر ادبی طور پر اور بلا سوچے سمجھے وہ نام دے دیے جو اس عہد کے دو خاص طور پر نمایاں اور پرکشش اشخاص کے ناموں سے مشابہ تھے۔ یہ میری غلطی تھی اور اس کا باعث ان دونوں ہستیوں کا اپنا مخصوص کردار بنانا، تاہم میری یہ غلطی ان کے محض تعارف تک محدود ہے، وہ میرے قارئین غالباً مجھ سے اتفاق کریں گے کہ ناول میں ان کی شخصیتوں کے ساتھ جو کچھ منسوب کیا گیا ہے، اس کی ان کی زندگی کے اصل حقائق سے کوئی مشابہت نہیں ہے۔ جس تک باقی کرداروں کا تعلق ہے، وہ تمام برابری و بندہ ہیں اور جہاں تک میرا تعلق ہے، میرے لیے ان کا روایتیاً حقیقتاً کوئی نمونہ موجود نہیں ہے۔

5. تاریخی واقعات کے بارے میں میرے اور دوسروں کے بیانات میں اختلاف، یہ اختلافات اتفاق نہیں، بلکہ ناگزیر تھے۔ جب کوئی مورخ اور کوئی فن کار کسی تاریخی عہد کا تذکرہ کرتا ہے، تو اس کے سامنے دو بالکل مختلف

اقسام کے فرائض ہوتے ہیں۔ جس طرح کوئی مورخ، اگر وہ کسی تاریخی شخصیات کو کامیاب بنانے اور زندگی کے مختلف پہلوؤں کے ساتھ اس کے جو تعلقات ہیں، ان کی پیچیدگی کو پوری شرح و بسط سے بیان کرنے کی کوشش کرے گا، تو وہ غلطی کرے گا، اسی طرح اگر فن کار اس شخص کی ہر دم تاریخی اہمیت جان کر کسی سعی کرتا ہے، تو وہ اپنا فرض نبھانے میں ناکام رہے گا۔ کو تو زون ہر وقت درمیان سے سسل نہیں رہتا۔ صدہ اسے سسل دشمن پر گاڑے رکھتا تھا اور نہ وہ ہمیشہ سفید گھوڑے کی پشت پر بیٹھا رہتا تھا۔ رستوب جن ہمیشہ مشعل سے ورنو کی باؤس کو آگ نہیں لگاتا رہتا تھا (اس نے درحقیقت یہ کام بھی نہیں کیا تھا) اور اس پر اطورہ مار یا فیوڈز ونا ہر وقت سوری کوٹ پہنے ضابطہ تعزیرات کی کتاب ہاتھ میں تھامے کھڑی نہیں رہتی تھی لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ عام لوگوں کے تخیل میں ان کی یہی تصاویر چٹریں ہیں۔

جب مورخ کسی مقصد کے حصول پر غور کرتا ہے، اسے یہ ہیردوں کا کارنامہ معلوم ہوتا ہے، لیکن فن کار کے نزدیک، جو آدمی کی زندگی کے تمام پہلوؤں کے ساتھ تعلقات کو زیر بحث لاتا ہے، نہ کوئی ہیرو ہو سکتا ہے اور نہ ہونا چاہیے۔

مورخ بعض اوقات صداقت کو مجبوراً توڑ دیتا ہے تاکہ وہ تاریخی شخصیات کے اعمال کو اس واقعہ تصور کے، جو اس نے اس کی ذات کے ساتھ منسوب کیا ہوتا ہے، تابع بنا سکے۔ اس کے برعکس فن کار کو اس تصور کا رد ہونا اپنے مسئلے کے لیے غیر مناسب معلوم ہوتا ہے اور وہ کسی اداکار کو نہیں بلکہ کسی انسان کو سمجھنے، درپیش کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

خود واقعات کے بیان میں یہ اختلاف اور بھی نمایاں اور ضروری ہو جاتا ہے۔

مورخ کو واقعے کے نتائج سے جب کہ فن کار کو امر واقعہ سے پنپنا ہوتا ہے۔ جب مورخ کسی لڑائی کا ذکر کرتا ہے، تو وہ کہتا ہے: "فداں اور فداں فوج کا میسرہ فلاں اور فلاں گاؤں پر حملہ کرنے کے لیے آگے بڑھایا گیا، اہل انہا نے دشمن کی صفوں کو تھپس تھپس کر دیا لیکن خود پیچھے ہٹنے پر مجبور ہو گیا۔ پھر گھڑ سوار فوج نے، جسے حملہ کرنے کے لیے بھیجا گیا تھا، غنیمت کو مغلوب کر لیا۔" وغیرہ وغیرہ۔ لیکن فن کار کے نزدیک یہ الفاظ معانی سے مخفی ہیں اور اسے ان کی روح تک نہیں پہنچتے۔ فن کار یا تو اپنے تجربے سے یا خطوط، یادداشتوں اور دوسروں کی بیان کردہ تفصیلات کی مدد سے واقعے کا اپنے ذہن میں خاکہ بناتا اور اس کی تفہیم کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اکثر اوقات (لڑائی کی مثال میں) یہ ہوتا ہے کہ فلاں یا فداں فوج کی کارروائی سے مورخ جو نتائج معصوم کرتا ہے، وہ فن کار کے اخذ کردہ نتائج کے بالکل برعکس ثابت ہوتے ہیں۔ دونوں کے اخذ کردہ نتائج میں جو تضاد پایا جاتا ہے، اس کی وضاحت ان اخذات سے بھی ہو جاتی ہے جن سے وہ استفادہ کرتے ہیں۔ جہاں تک مورخ کا تعلق ہے (لڑائی کی مثال جاری ہے)، اس کا بڑا ماحد کا نڈرا چیف اور کمانڈنگ افسروں کی رپورٹیں ہوتی ہیں۔ فن کار اس قسم کے ماحدوں سے کچھ حاصل نہیں کر سکتا، وہ سے کچھ نہیں بتاتے ورنہ اس کے سامنے کسی چیز کی وضاحت کرتے ہیں۔ اس سے بھی بڑی بات یہ ہے کہ

فن کار اس لیے ان سے منہ موڑ لیتا ہے کیونکہ ان میں اسے کذب بیانی کی، جو ناگزیر ہوتی ہے، بول آتی ہے۔ اس حقیقت کو تو چھوڑیں کہ لڑائی کے بعد دونوں فریق اسے ایک دوسرے سے تقریباً متساوی انداز سے پیش کرتے ہیں، رزم کے ہر بیان میں جھوٹ کی لازماً آمیزش ہوتی ہے اور اس دروغ گوئی کا سبب یہ ہوتا ہے کہ لڑائی میں جو لوگ شریک ہوتے ہیں، ان کی تعداد ہزاروں تک پہنچتی ہے وہ سیلوں لمبے محاذ پر بکھرے ہوتے ہیں اور خوف، شرم اور موت کے اثرات تلے شدید اخلاقی ہیجان کے تابع ہوتے ہیں لیکن ان کے اندر کو بیان چند الفاظ میں کرنا ہوتا ہے۔

لڑائیوں کے تذکروں میں عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ غلاں غلاں افواج کو نکلے غلاں مقامات پر حملہ کرنے کی غرض سے روانہ کیا گیا اور پھر انھیں واپس آنے کا حکم دے دیا گیا، وغیرہ وغیرہ۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس قسم کے بیانات میں گویا یہ فرض کر لیا جاتا ہے کہ اس نظم و ضبط کا جو پیرزادہ گراؤ پڑ پر ہزاروں انسانوں کو فرد واحد کے فضا کے تابع بنادیتا ہے، وہاں بھی وہی اثر ہوگا جہاں مسئلہ زندگی، ورموت کا ہوتا ہے۔ جس شخص نے کبھی جنگ میں شرکت کی ہو، وہ خوب جانتا ہے کہ یہ بات کتنی غیر صحیح ہے اس کے باوجود رپورٹوں کی جیودادی ضرورت کو بنایا جاتا ہے اور انھیں رپورٹوں پر عسکری داستانوں کی حد رتیں کھڑی کر دی جاتی ہیں۔ لڑائی کے فوراً بعد اس سے اگلے روز یا رپورٹیں تیار کرنے سے ایک دن پہلے فوج کی مختلف یونٹوں کے نامیں لکھو میں پھریں اور کسی بھی سپاہی اور سینئر یا جونیئر افسر سے پوچھیں کہ حامات کیسے رہے۔ ان لوگوں کو جو کچھ تجربہ ہوا اور انھوں نے جو کچھ دیکھا ہوگا، وہ آپ کو بلا کم و کاست بتا دیا جائے گا۔ ان کی باتیں سن کر آپ کے ذہن میں پر شکوہ، دیکھیدہ، بے پایاں طور پر مستوع، "فسرہ کن" وغیرہ واضح تصور پیدا ہوگا اور کسی شخص سے بھی۔ کمانڈر انچیف سے تو سب سے کم۔ آپ کو یہ معلوم نہیں ہو سکے گا کہ سارا معاملہ کیا تھا۔ دو تین روز بعد رپورٹیں جمع کرانے کا کام شروع ہو جاتا ہے۔ گفتار پسند ایسی اسکی باتیں سنانے لگتے ہیں جو انھوں نے کہیں دیکھی ہوتی ہیں نہ سنی۔ آخر میں ایک عمومی رپورٹ تیار کی جاتی ہے اور اس رپورٹ میں فوج کا عمومی نقطہ نظر تشکیل دیا جاتا ہے۔ ہر شخص اپنے شکوک و شبہات اور اعتراضات کا اس پر فریب لیکن واضح اور منطقی طور پر تعریفی رپورٹ سے تیار کر کے خوش ہو جاتا ہے۔ کسی بھی شخص سے، جو لڑائی میں شریک ہوا ہو، ایک دو ماہ بعد استفسار کریں، اب آپ کو اس کے بیان میں اس خام لیکن اہم مواد کا، جو پہلے اس کی باتوں میں موجود تھا، کوئی نشان نہیں ملے گا۔ اب اس کے جزیات رپورٹ کے مطابق ہوں گے۔ چنانچہ بارودینوں کی لڑائی کے بارے میں اس میں شریک جو شیے اور تیز طرار اشخاص نے جو باتیں مجھے بتائیں وہ ہر پہلو یکساں اور ایک جہتی تھیں۔ ان میں اور

* جب میرے ناول کے پہلے حصے میں شیون کر بن کی لڑائی کی قصیدہ شائع ہوئی، مجھے کسی شخص نے اس پر کوئی نوٹ یا جواب سورا ایف کارنگی کا تبصرہ نہ کیا۔ کمانڈر انچیف نے اپنے تبصرے (جس سے میرے یقین کی تائید ہوتی ہے) میں کہا تھا: "میں نے لڑائی کی اس سے زیادہ صحیح تفصیل اور کہیں نہیں پڑی۔ میں اپنے تجربے کی روشنی میں پورے دنوں سے کہہ سکتا ہوں کہ لڑائی کے دوران میں کمانڈر انچیف کے حکام کی تعمیل ناممکن ہے۔" (مصحف کا حاشیہ)

سورہ ایف کارنگی (1794-1866) کی جنگ میں شریک تھا۔ جب 1854-1855 میں طاغی کی اس سے ملاقات ہوئی۔ وہ کاکیشیا کا گورنر جنرل اور وہ اس کی فوج کا کمانڈر انچیف تھا۔ (مترجم)

میٹا نیلوڈسکی دانی لیوسکی، جھلک کا اور دوسرے اشخاص کی تیار کردہ جھوٹی رپورٹوں میں بال برابر فرق نہیں تھا۔ یہاں تک کہ ان کی تفصیلات میں بھی یکہ نیت تھی حالانکہ یہ باتیں کرنے والے عہدہ جنگ پر ایک دوسرے سے میوں دار تھے۔

سپینا پول کے سقوط کے بعد توپ خانے کے کمانڈر کرائی ژانودسکی نے مجھے فیصلہ شہر کے تمام رپورٹوں پر تعینات افسروں کی رپورٹیں بھیجیں اور حکم دیا کہ میں ان تمام مختلف رپورٹوں (یہ جس سے زیادہ تھیں) کو پیش نظر رکھ کر جامع رپورٹ تیار کروں۔ مجھے افسوس ہے کہ میں نے ان کی نقول نہ بنائیں۔ یہ ان سیدھی سادی، ناگزیر عسکری دروغ گوئیوں کی، جن سے رپورٹیں تیار کی جاتی ہیں، بہترین مثال ہوتی ہیں۔ میرا خیال ہے کہ میرے محدود ذہن، جنہوں نے یہ رپورٹیں تحریر کی تھیں، ان سطور کو پڑھ کر جب انھیں یہ یاد آئے گا کہ انھوں نے اعلیٰ افسر کے علم پر وہ کچھ لکھ دیا تھا، جس کا انھیں خود علم نہیں تھا، غوب نہیں گئے۔ جن لوگوں کو جنگ کا تجربہ ہے، وہ جانتے ہیں کہ وہی جنگ کے دوران میں تو اپنے فرائض بڑی جانفشانی اور اہلیت سے انجام دیتے ہیں لیکن جب معاملہ دلائل و گراف اور دروغ گوئی پر، جو اس مقصد کے لیے ناگزیر ہے، مبنی رپورٹیں لکھنے کا سنا ہے، وہ بالکل پھسندی رہ جاتے ہیں۔ ہر شخص جانتا ہے کہ ہماری افواج میں رپورٹیں اور سرسے تیار کرنے کا کام وہ اشخاص کرتے ہیں جن کی پیدائش غیر ممالک میں ہوئی ہوتی ہے۔

میں یہ سب کچھ یہ ثابت کرنے کے لیے کہہ رہا ہوں کہ عسکری رُداووں میں، جو فوجی موصوفین کے لیے ہمارا نراہم کرتی ہیں، دروغ بیانیوں کی آمیزش ناگزیر ہوتی ہے اور اس طرح میں یہ دکھانا چاہتا ہوں کہ تاریخی واقعات کی تفہیم میں فن کاروں و مورخوں کے، بین جو اکثر اختلافات رونما ہوتے ہیں، ان سے پیچھے کیوں چھڑایا نہیں جا سکتا۔ لیکن تاریخی واقعات کے بیان میں اس لازمی غلطی کے علاوہ مجھے اس عہد کی، جس سے میرا سرکار تھا، تاریخوں میں مبالغہ آرا طرز تحریر کی خاص قسم دیکھنے کو ملی ہے (یہ غالباً اختصار کی خاطر مختلف واقعات کو آپس میں مدغم کرنے اور ان واقعات کے الم ناک مفہوم کے ساتھ مطابقت پیدا کرنے کی عادت کا نتیجہ ہے) جس میں دروغ بانی اور کج رانی واقعات کے محض بیان تک محدود نہیں رہیں بلکہ انھوں نے ان کی تشریح و توضیح اور معنویت کو بھی اپنی پلیٹ میں لے لیا۔ جب میں اس عہد کے متعلق درخیم تاریخی کتب کا، جو تیغ اور میٹا نیلوڈسکی دانی لیوسکی نے سپرد قلم کی تھیں، مطالعہ کرتا ہوں، مجھے اکثر حیرانی اور پریشانی ہونے لگتی ہے کہ اس نوعیت کی کتابیں چھپاؤ اور پڑھی جاسکتی ہیں۔ اس بات سے قطع نظر کہ دونوں کتابوں میں یکساں واقعات کو ماخذوں کے حوالوں سے نہایت سنجیدہ اور معنی خیز لیکن ایک دوسرے سے کئی مختلف انداز سے پیش کیا گیا ہے، ان میں مجھے ایسی ایسی باتیں نظر آئیں جنہیں پڑھنے کے بعد میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میں افسوس یا روعوں کیونکہ مجھے یاد آ جاتا تھا کہ یہ اس عہد کے متعلق دقیق تفصیلات میں شمار ہوتی ہیں اور ان کے قارئین کی تعداد لاکھوں تک پہنچتی ہے۔ میں مشہور مصنف تیغ کی کتاب سے صرف ایک مثال کا حوالہ دلاؤں گا۔ یہ بتانے کے بعد کہ نیولین کس طرح اپنے ساتھ جعلی روسی نوٹ لایا تھا، وہ کہتا ہے:

Relevant l'emploi de ces moyens par un acte de

bienfaisance digne de lui et de l'armée française, il fit distribuer des secours aux incendiés. Mais les étant trop précieux pour être donnés longtemps à ces étrangers, la plupart ennemis, Napoléon aima mieux leur fournir de l'argent et il leur fit distribuer des roubles papier.

اگر میں اس عبارت کو متن سے علیحدہ پڑھوں میں ہکا بکارہ جاؤں، اس لیے نہیں کہ یہ اخلاقیات سے معریٰ ہے بلکہ محض اس لیے کیونکہ محض اس لیے کیونکہ یہ نری حماقت کا شاہکار ہے۔ لیکن اگر آپ پوری کتاب کا مطالعہ کریں تو آپ کو قطعاً کسی قسم کا اچھی نہیں ہوگا کیونکہ اس میں جس براہ راست مفہوم سے عاری مبالغہ آمیز لفاظی سے کام لیا گیا ہے، یہ اس کے عین مطابق ہے۔

چنانچہ فن کار اور مورخ کے وظائف قطعاً مختلف ہیں۔ لہذا اگر تاری کو واقعات یا اشخاص کے بیان میں میری کتاب کسی مورخ کی کتاب سے مختلف نظر آئے، تو اسے کوئی حیرانی نہیں ہونا چاہیے۔

لیکن فن کار کو یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ تاریخی شخصیات اور واقعات کے مقبول عام تصور کی اساس خیالی باتوں پر نہیں بلکہ تاریخی دستاویزات پر ہوتی ہے جنہیں جس حد تک مورخین یکجا کرنے اور ترتیب دینے میں کامیاب رہے ہوں۔ اگرچہ فن کاران دستاویزات کو مختلف انداز سے سمجھتا اور پیش کرتا ہے، مورخ کی طرف سے بھی تاریخی مواد سے رہنمائی حاصل کرنا چاہیے۔ میرے ناول میں جہاں بھی تاریخی شخصیات باتیں کرتی یا رو بہ عمل ہوتی ہیں، میں نے اپنی طرف سے کوئی چیز نہیں گھڑی بلکہ میں نے تاریخی مواد، جس کی میں نے کتاب کی تحریر کے دوران میں پوری، پھریری اکٹھا کر لی تھی، استعمال کیا ہے۔ میں یہاں ان کتابوں کے ناموں کے حوالے دینا ضروری نہیں سمجھتا، لیکن جو کچھ میں کہتا ہوں، اس کے ثبوت میں کسی وقت بھی ان کے حوالے دے سکتا ہوں۔

(6) چھٹی اور آخری بات، جو میرے نزدیک انتہائی اہم ہے، یہ ہے کہ میرے تصور کے مطابق تاریخی واقعات میں نام نہاد عظیم شخصیات کے ساتھ انتہائی خفیف اہمیت منسوب کی جانا چاہیے۔

اسنے الم ناک دور کا، جو اپنے واقعات کی اہمیت کے اعتبار سے اتنا لامال ہے، جو خود ہمارے زمانے کے اتنا قریب ہے اور جس کے متعلق تنی متنوع روایات ابھی تک بیان کی جا رہی ہیں، مطالعہ کرنے کے بعد مجھ پر یہ بین حقیقت آشکار ہوئی کہ ہماری عقل تاریخی روایات کی، جب وہ ظہور پذیر ہوتے ہیں، ادراک نہیں کر سکتی۔ یہ کہنا (اور ہر شخص کو یہ بات بہت آسان معلوم ہوتی ہے) کہ 1812 کے واقعات اس لیے پیش آئے کیونکہ نپولین یہ اعتبار مزاج تغلب پسند تھا اور اپسر طور ایکسا ندر کے جذبہ وطن پرستی میں کوئی جگہ نہیں تھی، اتنا ہی بے معنی ہے جتنا یہ اڑعا کرنا کہ وہی سلطنت کا سقوط اس لیے عمل میں آیا کیونکہ فلاں ناکندہ تراش اور وحشی شخص نے اپنی قوم کی مغرب پر چڑھائی کے دوران میں قیادت کی تھی یاں فلاں روی اپسر طور نے اپنی سلطنت پر سیتے سے حکومت نہیں کی تھی یا یہ کہ کوئی بہت بڑا شیلا، جسے ہموار کیا جا رہا تھا، اس لیے زمین بوس ہوا کیونکہ آخری مزدور نے اس پر کدال چلائی تھی۔

اس قسم کا واقعہ جس میں لاکھوں لوگ ایک دوسرے کے خلاف برسرِ پیکار ہوئے اور جس میں انہوں نے پانچ لاکھ اشخاص کو موت کے گھاٹ اتار دیا، کسی فرد واحد کے منشا کا نتیجہ نہیں ہو سکتا۔ جس طرح فرد واحد کے لیے نیچے ہموار کرنا ممکن نہیں تھا، اسی طرح فرد واحد پانچ لاکھ اشخاص کی اموات کا باعث کیسے بن سکتا تھا؟ لیکن یہ واقعہ کین پیش آیا؟ ایک سورغ کہتا ہے کہ اس کا سبب فرانسیسیوں کا چارہانہ جذبہ اور روسیوں کی حب الوطنی تھی۔ دوسرے جمہوری عن صرکو، جو پولین کے جتھے بیرون ملک اپنے ساتھ لائے تھے، اور روس کی یورپ کے ساتھ تعلقات قائم کرنے کی ضرورت کو، اس کا باعث قرار دیتے ہیں، وغیرہ وغیرہ۔ لیکن لاکھوں اشخاص ایک دوسرے کا کشت و خون کیوں کرنے لگے؟ انہیں ایسا کرنے کے لیے کس نے کہا یا تھا؟ بظاہر تو یہی نظر آتا ہے کہ اس میں سے ہر ایک کو یہ واضح طور پر معلوم تھا کہ اس سے کسی کو کچھ حاصل نہیں ہوگا بلکہ سب کے لیے بدترین ہی ثابت ہوگا۔ پھر انہوں نے اس کیوں کیا؟ اب جب کہ یہ لائینی واقعہ گزر چکا ہے، اس کی وجوہ کے بارے میں لاتعداد قیاس آرائیاں کی جاسکتی ہیں اور کی جارہی ہیں، لیکن ان وضاحتوں کی بے پناہ تعداد اور مقصد کے بارے میں ان سب کا تعلق صرف ایک ثابت کرتا ہے کہ وجوہات لاتعداد تھیں اور ان میں سے کوئی بھی واحد وجہ کہلانے کی مستحق نہیں۔

لاکھوں افرادے کیوں ایک دوسرے کو موت کے گھاٹ اتار حالانکہ جب سے دنیا وجود میں آئی ہے یہ بات معلوم ہے کہ ایسا کرنا جسمانی اور اخلاقی اعتبار سے معیوب فعل ہے؟ کیونکہ یہ قانون جبر کا تقاضا تھا اور اس کا کیا چاہنا ناگزیر تھا۔ اس فعل کو سرانجام دے کر انسانوں نے اس اساسی حیواناتی (zoological) قانون کی تکمیل کر دی جس پر شہد کی مکھیاں، جب وہ موسم خزاں میں ایک دوسرے کو ہلاک کرتی ہیں، عمل درآمد کرتی ہیں اور جوڑ جانوروں کے ایک دوسرے کو نیست و نابود کرنے کا موجب بنتا ہے۔ اس وہشت ناک سوال کا اور کوئی جواب نہیں دیا جاسکتا۔ یہ صداقت نہ صرف بدیہی ہے بلکہ ہر شخص کے شعور میں فطرتاً اس حد تک موجود ہے کہ اگر انسان کے اندر ایک اور جذبہ، جو اسے یقین دلاتا رہتا ہے کہ وہ ہر اس لمحے، جس کے دوران میں وہ کوئی فعل سرانجام دیتا ہے، آزاد ہے، جاری و ساری نہ ہوتا، اس کا ثابت کرنا لا حاصل ہوتا۔

جب ہم تاریخ کے بارے میں وسیع لتاظر نقطہ نظر اختیار کرتے ہیں، ہمیں ماریب ایک ابدی قانون کا، جس کے باعث واقعات ظہور پذیر ہوتے ہیں، یقین ہو جاتا ہے۔ لیکن جب ہم اس کا ذاتی نقطہ نظر سے جائزہ لیتے ہیں، ہمیں اس کے بالکل متضاد چیز کا یقین ہو جاتا ہے۔

وہ شخص، جو کسی دوسرے شخص کو ہلاک کرتا ہے، پولین، جو دریائے نیلین عبور کرنے کا حکم دیتا ہے، میں! آپ، جو فوج میں بھرتی کی درخواست پیش کرتے ہیں یا اپنے بازو کو اوپر اٹھاتے یا نیچے گراتے ہیں، سبھی کو لاریب اس بات کا یقین ہوتا ہے کہ ہمارا ہر فعل محقوق وجوہ اور ہماری اپنی خود اختیاری پر مبنی ہوتا ہے۔ اور یہ کہ اس کے کرنے یا نہ کرنے کا انحصار خود ہم پر ہوتا ہے۔ یہ یقین خلقی طور پر اس حد تک ہم سب میں موجود اور ہمارے لیے اتنا اصول ہوتا ہے کہ تاریخ کی شہادتوں اور جرائم کے اعداد و شمار (جو ہمیں دوسروں کے عمل میں آزادی کے فقدان

کا یقین دلاتے ہیں) کے باوجود ہم اپنی آزادی کے شعور کو اتنی توسیع دیتے ہیں کہ اس میں اپنے تمام اعمال شامل کر لیتے ہیں۔

یہ تضاد مایخ نظر آتا ہے۔ جب میں کوئی کام کرتا ہوں، مجھے یقین ہوتا ہے کہ میں اسے اپنی مرضی سے سرانجام دے رہا ہوں مگر جب میں یہ سوچتا ہوں کہ اس فعل کا بنی نوع انسان کی عمومی زندگی (اس کی تاریخی معنویت کے اعتبار سے) سے کیا تعلق ہے، تو مجھے یقین ہو جاتا ہے کہ اس فعل کا سرانجام دیا جانا پہلے سے مقدر تھا اور ناگزیر تھا، پھر غلطی کہاں ہوگی؟

ماضی میں سرانجام دیے گئے کام کی مفروضہ آزادانہ رجوع کے پورے سلسلے کو بعد میں فراہم کرنے کی انسان میں جو صداقت پائی جاتی ہے، اس کے جو نفسیاتی مشاہدے کیے گئے ہیں (میں اپنی کسی دوسری تحریر میں اس کی زیادہ تفصیل سے وضاحت کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں) ان سے اس مفروضے کی تصدیق ہو جاتی ہے کہ انسان کو جو یہ شعور ہے کہ وہ کسی خاص کام کرنے میں آزاد ہے، وہ غیر صحیح ہے، لیکن یہی نفسیاتی مشاہدے یہ ثابت کرتے ہیں کہ افعال کا ایک اور سلسلہ بھی ہے۔ ان افعال میں انسان کو آزادی کا شعور ان کی انجام دہی کے بعد ہی نہیں بلکہ اسی دم ہوتا ہے اور کسی قسم کے شک و شبہ کے بغیر ہوتا ہے۔ مادہ پرست جو جی چاہے، کہتے رہیں، اس کے باوجود میں ماریب کوئی کام، مگر اس کا تعلق محض میری اپنی ذات سے ہو، کر سکتا ہوں یا کرنے سے اجتناب برت سکتا ہوں۔ میں نے ماریب اپنی مرضی سے، چاہا یا زور دیا یا پراٹھا یا ہے یا نیچے کیا ہے۔ میں آنا یا لکھنا بند کر سکتا ہوں، آپ آنا یا لکھنا ترک کر سکتے ہیں۔ میں یقیناً اپنی مرضی سے، در تمام رکاوٹوں سے آزاد اپنے خیالات امریکا یا اپنے پسندیدہ ریاضیاتی مسئلے کی طرف منتقل کر سکتا ہوں۔ اپنی آزادی کا امتحان لینے کے لیے میں اپنا بازو دفن میں بلند کر سکتا اور اسے زبردستی نیچے کر سکتا ہوں۔ میں نے ایسا کر لیا ہے۔ لیکن میرے نزدیک ایک بچہ کھڑا ہے اور میں اپنا ہاتھ اس کے اوپر اٹھاتا ہوں اور اسی قوت کے ساتھ اسے نیچے کے سر سے نیچے کرنا چاہتا ہوں۔ میں یہ کام نہیں کر سکتا۔ ایک کتابچے کی طرف لپکتا ہے اور میں کتے کی طرف ہاتھ اٹھانے سے باز نہیں رہ سکتا۔ میں پریڈ میں شامل ہوں اور میں رجسٹر کی حرکت و سکنات کے مطابق عمل کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ جنگی کارروائی کے دوران میں میں اپنی رجسٹر کے ساتھ حملے میں شریک ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا یا جب میرے چاروں اطراف بھگدڑ مچی ہو، میں بھاگنے سے باز نہیں رہ سکتا۔ نہیں رہ سکتا۔ جب میں کسی ملزم کے وکیل کی حیثیت سے عدالت میں پیش ہوتا ہوں، مجھے جو کچھ کہنا ہوتا ہے، میں اسے کہے بغیر یا جانے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اگر کوئی مہکا میری آنکھ کی طرف آ رہا ہو، تو میں اسے جھپکائے بغیر نہیں رہ سکتا۔

چنانچہ افعال کی دو اقسام ہوں گی: بعض کا انحصار میرے منشا پر ہوتا ہے اور بعض کا نہیں اور وہ غلطی، جوتا قرض کا باعث بنتی ہے، محض اس وجہ سے سرزد ہوتی ہے کہ میں اپنے شعور آزادی کو (جو ہر اس فعل کے، جس کا تعلق میری انا، میرے وجود کی بلند ترین تجربہ سے ہوتا ہے، کا ملازم رکاب رہتا ہے) ایسے افعال کی طرف منتقل کر دیتا ہوں جو میں

نے دوسروں کی معیت میں سرانجام دیے ہوتے ہیں اور جن کا انحصار دوسروں کے غش و گل کا میرے غش سے متعلق ہونے پر ہوتا ہے۔ آزادی اور محکومی کی حدود متعین کرنا بہت مشکل ہے اور اس حدود کا تعین کرنا نفسیات کا واحد اور غیری مسئلہ ہے۔ لیکن ہماری زیادہ سے زیادہ آزادی اور ہماری زیادہ سے زیادہ محکومی کا اظہار جن صورتوں میں ہوتا ہے، ان کا مشاہدہ کرنے کے بعد ہم یہ دیکھے بغیر نہیں رہ سکتے کہ ہماری فعالیت جتنی زیادہ تجریدی اور چٹا چٹا دوسروں کی فعالیت سے جتنا کم منسلک ہوگی، یہ اتنی ہی زیادہ آزاد ہوگی۔ اس کے برعکس ہماری فعالیت دوسروں کی فعالیت سے جتنا زیادہ منسلک ہوگی، یہ اتنی ہی کم آزاد ہوگی۔

دوسروں کے ساتھ مضبوط ترین، بالکل ہی ناقابل تحلیل، انتہائی تکلیف دہ اور پائیدار رشتہ وہ ہے جسے دوسروں پر اختیار (اقتدار) کہا جاتا ہے لیکن اس کا صحیح مطلب دوسروں کی انتہائی زیادہ دست گیری (محکومی) ہے۔ اپنی اس کتاب کی تحریر کے دوران میں جب مجھے صحیح یا غلط اس بات کا پورا یقین ہو گیا تو قدرتی طور پر میں۔ جب میں 1805، 1807 اور خاص طور پر 1812 کے واقعات کا، جن میں قانونی مقدر انتہائی نمایاں، انداز سے کشاکش ہوتا ہے، ذکر کرنے بیٹھا۔ ان اشخاص کے، جو اپنی دانست میں یہ سمجھتے تھے کہ وہ واقعات کار خ متعین کر رہے ہیں لیکن جنہوں نے دوسرے شرکا کی نسبت انسانی فعالیت میں کم آزادی کا مظاہرہ کیا، افعال کے ساتھ کوئی اہمیت منسوب نہ کر سکا۔ مجھے ان لوگوں کی سرگرمیوں میں صرف اس لیے دلچسپی تھی کیونکہ ایک تو وہ یہ مثال پیش کرتے تھے کہ قانون مقدر، جو میرے خیال کے مطابق تاریخ کی رہبری کرتا ہے، کس طرح دوبہ کار ہوتا ہے۔ دوسرے ان کے افعال سے اس نفسیاتی قانون کی وضاحت ہوتی تھی جو آدمی کو مجبور کرتا ہے کہ اس نے جو کام انتہائی مجبوری کے عالم میں کیے ہوئے ہیں، بعد میں اپنے آپ پر یہ ثابت کرنے کے لیے کہ وہ اپنے اعمال و افعال میں بالکل خود مختار تھا، اپنے تخیل میں تصورات کا پورا سلسلہ گھڑ لے۔

• یہ بات قابل غور ہے کہ جن لوگوں نے 1812 کی جنگ کے بارے میں کچھ لکھا ہے، ان سب کو اس واقعے میں کوئی خاص اور خاص

تقدیر جتنی نظر آئی ہے۔ (حاطائی کا اپنا حاشیہ)

پہلی کتاب

حصہ اول

- 1- جینوآ اور لوکا انیسویں صدی میں اٹلیہ پندرہ خود مختار ریاستوں میں مقسم تھ۔ نیولین نے ان میں سے دو۔ جینوآ اور اور لوکا۔ پر جون 1805 میں قبضہ کر لیا۔ وہ خود دسمبر 1804 میں فرانس کا شہنشاہ بنا تھا۔
- 2- یونانپارٹ۔ نیولین کا خاندانی نام یونانپارٹ تھا لیکن آنا شیر راور اس کے حملے کے ارکان اسے از رہ تھیک "یونانپارٹ" (کارسیکا کا تعلق شہنشاہ) کہتے تھے۔ (ناموں پر نوٹ دیکھیں۔)
- 3- محض شب: اصل لفظ فرانسیسی زبان کا Solree ہے، جس کے معانی "شام" ہیں۔ جنگ عظیم دل سے قبل جب تفریح کے مواقع کم دست یاب تھے، مختلف اشخاص، بالخصوص خواتین، محافل شام منعقد کیا کرتے تھے۔ ان میں عموماً طبقہ، مرا کے افراد، ادیب، فن کار، سیاست دان اور دوسرے سرکردہ اصحاب شریک ہوتے تھے۔ ان محافل میں گپ شپ بھی ہوتی تھی، گانا بجانا بھی اور رقص بھی۔ یہ تمام امور شرکائے محفل خود ہی سرانجام دیتے اور یوں محفوظ ہونے کے مواقع فراہم کر لیتے۔ ایسی بعض محافل تاریخ میں یادگار حیثیت اختیار کر گئی ہیں۔
- 4- فلو۔ فرانسیسی لفظ grippel ہے اور روسی بول چاں میں یہی استعمال کرتے تھے۔
- 5- مراسلہ فرانس کے خلاف انگلستان، آسٹریا، برطانیہ اور پرشیا پر مشتمل ایک نیا اتحاد تشکیل پا رہا تھا۔ اس پر نیولین نے غیر متوقع طور پر انگلستان کو صلح کی پیشکش کر دی۔ مؤخر الذکر کی درخواست پر رارالیکسا بدر نے این۔ این۔ نواسلٹ سیف کو بطور مصالحت کنندہ روانہ کر دیا۔ نو دامت سیف ابھی برلن پہنچا تھا کہ جینوآ واپس نیولین کے قبضے کی خبر موصول ہو گئی اور وہ وہیں سے واپس لوٹ آیا۔
- 6- نوراسانپ یہاں اصل لفظ hydra استعمال ہوا ہے۔ یونانی دیوتا میں hydra آبی سانپ تھا۔ اس کے نوسر تھے۔ جب اس کا ایک سر کاٹا جاتا تو اس کی جگہ دسٹے اگ آتے۔ اسے ہر کولیس نے قتل کیا تھا۔
- 7- ہالٹا: بحیرہ روم کے اس جزیرے پر انگریزوں نے 1800 میں قبضہ کیا تھا۔
- 8- پرشیا: انیسویں صدی کے وسط تک موجودہ جرمنی خود مختار ریاستوں میں مقسم رہا۔ ان میں سب سے بڑی پرشیا تھی۔

- 9- ہارڈن برگ (Hardenberg) اور ہوگ ڈس (Haugwitz) دونوں پرشیا کے وزیر تھے۔ انھوں نے 1795ء اور 1805ء میں پوپین کے ساتھ معاہدوں پر دستخط کیے تھے۔ تاہم جلد ہی وہ فرانس کے خلاف جنگ پر آمادہ ہو گئے (آنا پولوناٹ کی اس تبدیلی قلب کو ماننے کے لیے تیار نہیں)۔ 1806ء میں پرشیا پوپین کے خلاف جنگ میں لڑا پڑا اور جےٹا (Jena) کے مقام پر شکست کھائی۔
- 10- روغان (Rohan)، فرانسیسی جاگیرداروں کا گھرانہ۔ اس خاندان کا ایک فرد رچی روغان فوجی خدمت سے رخصت ہو کر 1603ء میں ڈیوک بنایا گیا اور دوسرا لوئی رچی روغان 1777ء میں کارڈینل مقرر ہوا۔ انقلاب فرانس کے بعد وہ جرمنی بھاگ گیا۔
- 11- مونت موٹینسی (Montmorency) فرانسیسی جاگیرداروں کا قدیمی گھرانہ۔ اس کے بعض افراد اب بھی جنوبی امریکا کے مختلف ممالک میں اپنی عہدوں پر فائز ہیں۔
- 12- یقل میں آنا جانا اسے بچے مغرب گھرانوں کی لڑکیوں کو خاص عمر تک پہنچنے سے پہلے مخلوط محفلوں اور رقص و سرود کی مجلسوں میں شرکت کی اجازت نہیں ہوتی تھی۔ جب وہ عمر کی یہ حد عبور کر لیتی تھیں، پھر ان پر ناپید یہ پابندیاں ختم ہو جاتی تھیں۔ گھر سے اس طرح باہر نکلنے کو انگریزی میں Come out کہتے ہیں۔
- 13- (جواب کا سپر) لادائر سوئٹزر لینڈ کا مفکر، شاعر، مضمون نگار اور مذہبی رہنما۔ چہرہ شناسی پر اس کی کتاب بہت مقبول ہوئی تھی۔
- 14- صلیب عیسائیوں کا مقدس ترین نشان، جس پر ان کے عقیدے کے مطابق حضرت عیسیٰ کو ہاک کیا گیا تھا۔ اس لیے صلیب اٹھانا (to bear one's cross) کا مطلب مشکلات، ناخوشگوار صورت حال اور ناپسندیدہ فحش کو برداشت کرنا ہے۔
- 15- (سینٹ) پیئرز برگ: یہ پیٹرا عظمیٰ نے 1803ء میں آباد کیا تھا۔ 1914ء میں اس کا جرمن نام روسی زبان میں پیٹرز گراٹ اور 1924ء میں لینن گرڈ رکھ دیا گیا۔ سوویت یونین کے خاتمے کے بعد اس کا پرانا نام پیئرز برگ بحال کر دیا گیا ہے۔
- 16- ڈریس مغربی خواتین کا لباس، جس میں شلوکا (bodice) اور سکرٹ یکجا ہوتے ہیں۔
- 17- ڈیوک آف آف غیاں: اس نوجوان ڈیوک کا تعلق فرانس کے سابق شاہی خاندان بوربون سے تھا۔ اس پر الزام تھا کہ اس نے 1804ء میں پوپین کو قتل کرنے کی سازش میں حصہ لیا تھا۔ اسے اغوا کیا گیا، غیر جانبدار عدالت میں پیش کیا گیا، نیچے کا عدالت فوجی عدالت میں مقدمہ چلایا گیا اور گولی سے مار دیا گیا۔
- 18- مادام بوٹیک (Georges): مور فرانسیسی اداکارہ۔ ڈراموں میں حزیںہ کردار ادا کرتی تھی۔ 1808ء اور 1812ء کے درمیانی سالوں میں وہ پیئرز برگ اور ماسکو میں اپنے فن کے جوہر دکھاتی رہی۔ نقاشا کی اس سے ہمیں کے ڈرائنگ روم میں ملاقات ہوئی تھی۔ (دوسری کتاب، حصہ پنجم، باب 13)
- 19- گارڈزیا امپریل (شاہی) گارڈز روسی زار پیٹرا عظمیٰ نے، اپنی فوج پرشیا کے مہم کرنے پر مستحکم کی تھی۔ پرشیا کی فوجوں کی طرح اس نے بھی فوج کے اندر فوج تشکیل کی اور اسے امپریل گارڈز کا نام دیا۔ اس کے گھڑ سواروں کی سات

رہنمیں تھیں اور ان کی وفاداری براہ راست زار سے تھی۔ ہرر جنت کو کسی شخص یا جگہ کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا۔ دوسری کا نام ”ہرر کسٹی ر جنت“ تھا۔

20- کوٹوروف (1745-1813) روسی جرنیل، جو بعد میں افواج کا کمانڈر انچیف مقرر ہوا اور نیپولین کے خلاف لڑا، امپراطورہ کیٹھرین کے زمانے میں ترکوں کے خلاف جنگوں میں حصہ لے چکا تھا۔ ایک معرکہ میں سخت زخمی ہوا اور اپنی ایک آنکھ بھی گنوا بیٹھا۔ پیٹرز برگ کا گورنر جنرل مقرر ہوا لیکن امپراطور الیکسندر کسی بات پر ناراض ہو گیا اور وہ تین سال ریٹائر ہو گیا۔ پچاس ہزار افراد پر مشتمل جو افواج آسٹریا بھیجی جا رہی تھی، اب اسے دوبارہ اس کا سربراہ تعینات کر دیا گیا تھا۔

21- سوئی شاخزادہم: فرانسی بادشاہ، انقلاب فرانس، اسے اور اس کی ملکہ دونوں کو ہڑپ کر گیا۔

22- کاندے، ڈیوک آف آل غیل کے خاندان کا نام کاندے (Conde) تھا۔

23- بغومیر (1) انقلاب فرانس کے کچھ عرصے بعد 1795 میں پانچ ارکان پر مشتمل ادارے ہے، جسے ”ڈائریکٹری“ کا نام دیا گیا، عمان حکومت سنبھالی۔ نیپولین نے دو ڈائریکٹروں اور اپنے بھائی لوسیوں کی، جو پانچ سوارکان کی کونسل کا صدر تھا، مدد سے اٹھارہ بغومیر برطانیہ 9 نومبر 1798 کو اس کا تختہ الٹ دیا اور خود فرانس کا مطلق العنان حکمران بن گیا۔ امپراطور کا لقب اس نے بعد میں اختیار کیا، لیکن اس نے اپنے لیے قونصل (Consul) کا لقب اختیار کیا۔ (ب) انقلاب فرانس کے بانیوں نے 22 ستمبر 1792 سے نیا کیلنڈر نافذ کیا۔ بغومیر اس کا دوسرا ہیبتہ تھا۔

24- قتل عام، نیپولین نے ان قیدیوں کو، جن کی تعداد بارہ سو تھی، افریقہ میں نہیں بلکہ فلسطین کی بدرگاہ جافہ میں ترکی عثمانوں کے خلاف جنگ کے دوران میں قتل کیا تھا۔ بعض مورخین نے اسے انتقامی کارروائی قرار دیا ہے۔

25- آرکول، اس مقام پر نیپولین 1796 میں آسٹریا کی فوجوں کے خلاف صف آرا ہوا تھا۔ جنگ کے دوران میں جب اس کی فوجیں ہسپانی اختیار کرنے لگیں، اس نے پرچم چیمپا اور اپنی رہنمائی میں اپنی افواج دریا کے پار لے گیا۔

26- گواہ: روسیوں کے ہاں یہ رواج تھا کہ وہ ایک دوسرے سے شرط لگانے وقت آپس میں ہاتھ ملاتے تھے۔ غیر شخص گواہ کے طور پر ان کے ہاتھ ایک دوسرے سے علیحدہ کرتا تھا۔ (ناڈ)

27- سمسون (Samson) بائبل کے مطابق، اپنے زمانے کا قوتوریز انسان۔ قدیم یہودیوں کا ہیرو۔ (یرانا مہدنامہ: قصۃ ابواب، 14: 16)

28- رستوف، رستوف خاندان کے کثیر ارکان بلحاظ کردار و سطائی کے اپنے ہی خاندان کے مختلف ارکان سے ملے جلتے ہیں۔ کاؤنٹ الیہ رستوف مصنف کے دادا اور کاؤنٹس اس کی رادی سے مشابہ ہے۔ گولائی کے چند فصائیں اس کے اپنے باپ کے ہیں۔ نانا شا اس کی سالی تانیا پیرس اور دیر ایک دوسری سالی سے ملتی جلتی ہے۔ گولائی سے سونیا کے تعلقات میں طالع طائی کے باپ اور اس کی سرپرست تانیا ایرگلے کا یا کے مابین تعلقات کی مشابہت موجود ہے۔ (ناڈ)

29- رافیلوئی لوف، سودیت یونین کی جنوبی مشرقی اور پولینڈ کے صوبے گالیشیا کی جنوب مشرقی سرحد پر واقع تھا۔

30- یوم نام، مشرقی یورپ کے وہ باشندے، جو روسن کی تھوٹک تھے یا ایسٹرن آرٹھوڈوکس چرچ کے پیروکار تھے، عام طور

پراپنے بچوں کے نام کسی سینٹ کے نام پر رکھتے تھے۔ جس شخص کا نام جس سینٹ کے نام پر ہوتا، وہ اس سینٹ کے عرس کے موقع پر اپنے گھر ضیافت کا اہتمام کرتا۔ یوں اس روز کو یوم نام کہا جاتا تھا۔

31- ہوزار (hussars) ”ہس منظر“ دیکھیں۔

32- آخری فرائض۔ اس سے آنا میخائوونا کی مراد رسم تدفین سے۔ رومن کیتھولک ور مشرقی کلیسا میں اس رسم کے وقت عام آدمیوں کی بوقت نزع اور بادشاہوں کی بوقت تاجپوشی مقدس روشن سے مالش کی جاتی ہے۔

33- ویم پٹ جوئیئر ان رنوں (1805) برطانیہ کا وزیر اعظم تھا۔

34- بولن، برود پارا انگلستان کے ساحل پر فرانسیسی بندرگاہ۔

35- ویلیو، میئر شاغل (villeneuve): فرانسیسی ایڈمرل۔ فرانسیسی اور ہسپانوی بحری افواج کا کڈر۔ سے دلی کاؤنٹ نیلسن کی انگریزی بحریہ کے ہاتھوں 1805 میں سین کی جنوبی بندرگاہ ڈریٹا لگر کے مقام پر شکست ہوئی تھی۔

36- مدیرا، ایک قسم کی سفید انگوری شراب، جو پرنگال کے جزیرے واقع بحر قیونوس مدیرا میں کشید کی جاتی ہے۔

37- آخروسیووا، ریادستریوونا آخروسیووا ہے اعتبار کردار این۔ ڈی۔، فروسیووا (1753-1826) سے جو بے

زمانے میں ماسکو کے اعلیٰ حلقوں میں نمایاں مقام کی حامل تھی، خاصی مشابہت رکھتی ہے۔ (۱۰۱)

38- جرمن، برگ جرمن نژاد روسی تھا۔

39- قازق، قازق نسلآ تاتاری ہیں، ور زیادہ تر بحر اسود کے شمال میں آباد ہیں۔ ان کی ایک کثیر تعداد روس کی ریاست

ماسکو، لیتھو، نیا اور پوینڈ میں زرعی غلاموں کی حیثیت سے کام کرتی رہی۔ آہستہ آہستہ ان کے جوہر کھسے اور روسیوں

نے انھیں فوج میں بھرتی کرنا شروع کر دیا۔ گھڑسواری میں ان کا جواب نہیں تھا۔ زاروں نے انھیں اپنی اپنی

ریاستیں، جنھیں محدود اختیار حاصل تھے، قائم کرنے کی اجازت دے دی لیکن سترھویں اور اٹھارھویں صدی میں

جوں جوں روسی مملکت پھیلتی گئی، قازق اپنی آزادی سے محروم ہوتے گئے، تا آنکہ روسی انقلاب کے بعد کھیتی باڑی

کے جماعی فارم میں وہ اپنے الگ وجود سے بھی ہاتھ دھو بیٹھے۔

زاروں کے عہد میں قازق سمور کی ٹوپیاں، کھلے پاجامے اور مہمیزوں سے لیس جوتے پہنا کرتے تھے۔ ہر قازق کو

فوج میں بیس سال خدمات سرانجام دینا پڑتی تھیں اور ہر قبیلہ اپنی اپنی رحنت بھرتی کراتا تھا۔ پہلی جنگ عظیم کے

دورن میں تین لاکھ قازق روسی افواج میں شامل تھے۔ قازق چونکہ خوش شکل ہوتے تھے، دیکش وردیاں پہنے

تھے اور شوریدہ سری ان کے خمیر میں شامل تھی، اس لیے روسی زبان میں ان کے متعلق اعداد و صورت کہا جاتا

اور نادل تحریر کیے گئے ہیں۔

40- سواروف، الیکسندر واسیلی وچ سوروف (1729-1800)، روسی فیلڈ مارشل تھا۔ اس نے ترکوں (1787-1789)

(1789)، پولستانیوں (1794) اور اٹلی میں فرانسیسیوں (98-1799) کے خلاف جنگیں کیں۔ 1799 میں روسی

کا اتحادی آسٹریا اسے سامان رسد پہنچانے میں ناکام رہا اور اسے سوئٹزر لینڈ میں خاصی مشکلات کا سامنا کرنا

پڑا۔ پھر بھی اس کی بیس ہزار ہزار پر مشتمل فوج اسی ہزار فرانسیسیوں کے گھیرے میں سے نکلنے میں کامیاب ہوئی۔

- 41- ہوشن ٹاش کا کھیل۔ اس میں چار کھلاڑی شریک ہوتے ہیں اور دگڈیاں استعمال ہوتے ہیں۔
- 42- اجازت مشرقی کلیسا میں چھیرے، میسے۔ ظہیرے وغیرہ رشتے دار آئیں میں شادی نہیں کر سکتے۔ در اگر وہ اس قسم کی شادی کرنا چاہیں، انھیں کلیسے کے اعلیٰ ترین حکم، اسقف اعظم سے خصوصی اجازت لینا پڑتی ہے۔ (ماڈ)
- 43- ہنگلیز (anglaise): انگلستان کا ایک لوک رقص۔ اس میں رقاص ایک دوسرے کے سامنے دو قطاروں میں کھڑے ہو کر رقص کیا کرتے تھے۔ اس کی بے شمار زمیں یا چلت پھرتیں تھیں۔ ان زمیں کے نام عجیب و غریب اور من مہنے طریقے سے رکھے جاتے۔ ماڈ کا خیال ہے کہ خالسطائی نے ہنگلیز کے رموز پٹی خاندانی روایات سے تحصیل کیے تھے۔
- 44- چھیرہ بھین، مغرب میں لوگ اپنے مرحوم عزیز و قارب کی چھیرہ بھین خریدیں کرتے بلکہ پیشہ ور لوگوں یا نرموں کی خدمات حاصل کرتے ہیں انھیں undertakers کہتے ہیں۔ ہارے گورکن صرف قبر کھودتے ہیں لیکن undertakers میت کو تیار کرتے، اسے کفن پہناتے، تابوت میں بند کرتے، جنازے کے جلوں اور مذہبی رسوم کا اہتمام کرتے، اسے دفناتے، جلاتے اور قبر پر پھول چڑھاتے ہیں اور یوں کھی بکھ کرتے ہیں۔
- 45- کریم سف (Cream of tartar): اصل نام پوٹاشیم بائی ٹارٹریٹ (potassium bitartrate) ہے۔ دانوں یا سفوف کی شکل میں ملتا ہے۔ بیکنگ (baking) پاؤڈر اور جلاب کی ادویات میں استعمال ہوتا ہے
- 46- ائف ایقونائٹ: واحد ایقونہ (icon): حضرت عیسیٰ، حضرت مریم، فرشتے یا سینٹ کی تصویر یا چھوٹا مجسمہ ایقونہ کہلاتا ہے۔ مغربی یورپ کے رومن کیتھولک اور پروٹسٹنٹ مسالک ایقونوں کے مخالف ہیں۔ لیکن روس، یونان اور مشرقی یورپ کے ان مسالک میں، جہاں کے باشندے ایسٹرن آرتھوڈوکس مسلک کے پیروکار ہیں، ان کا عام رواج ہے گھروں کی بیرونی دائیں چوکھٹ کے قریب حضرت عیسیٰ اور پائیں چوکھٹ کے قریب حضرت مریم کے مجسمے نصب کیے جاتے ہیں۔ گھروں کے اندر تصاویر اور مجسمے دونوں رکھے جاتے ہیں۔ ایقونائٹ بہت مقدس تصور کیے جاتے ہیں اور ان کا حدود و حد احترام کیا جاتا ہے۔ لیکن ان کی پرستش نہیں ہوتی لیسکوف نے اپنی ایک کہانی میں ایقونوں کے متعلق طویل اور دلچسپ مصلوہت دی ہیں
- 46ب- والتیر کرسی: بیماروں کے لیے کرسی نما صوف۔
- 47- پرنس نکولا کی آئندہ یوچ بلکوسکی کے متعدد خصائص خالسطائی کے نانا نکولا کی سرگوبوچ وگوسکی سے مشابہ ہے۔ تاہم بعض لوگوں کا خیال ہے کہ وہ امپراطورہ کیترین کے عہد کے نامور ماہر حرب فیلڈ مارشل ایم ایف کامینسکی سے زیادہ ملتا جلتا ہے۔ پرنس ماریا خالسطائی کی والدہ ماریا نکولائی وگوسکا یا (مصنف ابھی دو سال کا تھا کہ اس کا انتقال ہو گیا تھا) کی مائیں ہے۔ بالڈن پرنس وگوسکی کے یا شاید پوسیاناسے، جو بعد میں خالسطائی کے جھے میں آیا مشابہ ہے۔
- 48- ایلووار، شمارہ روس کے ناول La Nouvelle Heloise کی طرف ہے۔ ناول کی ہیروئن کا نام بھی جولی ہے۔ ماڈ کا خیال ہے کہ خالسطائی کو پرنس ماریا اور جولی کے مابین خط کتابت کا تصور دوروی خواتین ایم اے وگودا اور وی آئی لانسکایا کے مابین مراسلت (1812 تا 1818) سے سوجھا تھا۔ خالسطائی نے اسے مسودے کی صورت میں پڑھا تھا۔

- 49- کلید اسرار اس کتاب کا پورا نام A Key to the Mysteries of Nature (کلید اسرار فطرت) ہے۔ اس کا مصنف ایک جرمن شخص اکارٹ شوٹن (1752-1803) تھا۔ اس کا موضوع سرشت تھا۔ 1805 میں اس کا اردی میں ترجمہ ہوا۔ عام لوگوں کے عدادہ میں خاص طور پر مقبول ہوئی۔
- 50- تصویرچہ (miniature) تھوٹے ستر کی پیشنگ۔ ایران اور مغل مصوری میں اس کے عام نمونے ملتے ہیں۔
- 51- کوچ چار پہیوں کی بند گھوڑا گاڑی۔ اس میں چار سے چھ گھوڑے جوتے ہیں۔
- 52- برتن کا یکہ روی ٹپ دار گاڑی۔ سے صرف ایک گھوڑا کھینچتا ہے۔
- 53- مک ہیل زمین کی فوج، مصر پر فارس جرمن نژاد روسی جرنیل وٹ گین شٹن کے فرانسیسی فوج پر مراطر بنی جانے کے بارے میں دریافت کر رہا ہے۔ روسی اور آسٹروی دستوں کے ہمراہ مک ہیل زمین شرقی جانب سے حملہ آور ہوا تاکہ پرشیا کو جنگ میں گھسیٹا جاسکے۔ طالعستانی شمالی سمت سے آگے بڑھے گا اور کوٹوزوف جنوبی روسی فوج اور بوریہ (جرمن ریاست) کی سپاہ کے ساتھ گالشیا (آسٹریا کے زیر قبضہ پولستانی صوبہ) میں محاذ آرائی کرے گا۔ شمالی اطالیہ میں آسٹروی فوج، ورسطی اسیہ میں روسی کور، جس میں برطانوی اور اطالیہ کی ریاست نیپلز کے دستے شامل ہوں گے، قیام کرے گی۔ (مابی)
- 54- زورک نویں صدی تک روس نام کا کوئی ملک موجود نہیں تھا۔ اسی صدی کے دوران میں موجود روس کے شمالی علاقوں میں سکندے نیویا (ناروے اور سویڈن) کے باشندے جنھیں دانی کنگ (روسی انھیں دارنگیائی یا روس کہتے تھے اور یہی ملک کے نام پرشیا یا روس کا سبب بنے) کہا جاتا ہے، روس پر حملہ آور ہونے لگے۔ زورک (Rurik) سکندے ہویا کا ایک نیم داستان قبائلی سردار تھا اور وہ 860 کی دہائی میں شمال مغربی روس کا حکمران تھا۔ اسے اندازاً روس کے شاہی خاندن کا بانی تسلیم کر لیا گیا (اب "روسی تاریخ" بھی دیکھیں)
- 55- پاتوکن، پرنس گرگوری الیکساندر وچ پاتوکن (1739-1791)، روسی سیاست دان اور جرنیل۔ امپراطور کاترین دوم اس کی معشوقہ تھی۔ ترکوں سے کریمیا اسی نے 1787-1791 کی جنگ میں تھپ ہوا تھا۔
- 56- سوغو، (Jean Victor Moreau) (1763-1813) فرانسیسی جرنیل۔ اس نے آسٹروی فوج کو شکست دی لیکن نیویا کے خلاف سازش کرنے کے الزام میں گرفتار ہوا اور ملک بدر ہوا۔
- 57- فریڈرک: فریڈرک ولیم دوم (1744-1797): شاہ پرشیا (1786-1797): اس نے دوسرے ممالک کے علاقوں کو تھپانے کی پالیسی بنائی تھی اور روس اور پرشیا کے مابین پوینڈ کی تقسیم میں خاصے رقبے پر ہاتھ مارا۔ آسٹریا کے ساتھ مل کر انقلابی فرانسیسی کے خلاف بھی محاذ بنایا۔
- 58- Hof's-kriegs-wurst-schnapps-Rath: کتاب و شراب کی جنگی کونسلیں۔ یہ کونسلیں کام کی باتیں کم کرنا تھیں اور ایک دوسرے پر نکتہ چینی زیادہ کرتی تھیں۔ البتہ کام دہیں کی تسکین کا سامان بھی پہنچانے میں بہت مستعد تھیں۔
- 59- پابلن: جرمن نژاد پی۔ اے۔ پابلن رار پاول کے عہد میں پیٹر برگ کا گورنر جنرل تھا اور پاول کے قتل میں بھی شریک تھا۔

- 60- اروف، یہ دو بھائی تھے اور فوجی عہدیدار۔ انھوں نے کمزور دل بیوٹر سوم کے خلاف کامیاب بغاوت کی اور اس کی بیوی امپراٹور گیتھرین دوم کو تخت نشین ہونے میں مدد دی۔
- 61- پاؤڈر مونکی (powder monkey) بحری جنگی جہازوں کا ملازم چھوکر۔ اس کا کام توپوں تک گولیہ بارود پہنچانا ہوتا تھا۔ اشارہ پولین کی کتاہ قاسمی کی طرف ہے۔
- 62- اچاکوف: دریائے ویچیر کے دہانے پر ترکوں کا قلعہ۔ کوٹوزف نے 1787-1791 کے دوران میں اس پر چڑھائی کی تھی۔
- 63- کاؤٹس روب دا کے دستہ: روسی میں روب کے معانی "دست" ہیں۔
- 64- میخائیل ال ری اوٹاویج: مراد کوٹوزوف ہے۔
- 65- لسبارڈ ہاؤس کا بانڈ: لسبارڈ ایک جرمن قبیلہ تھا۔ اس نے اٹلی کے شمالی علاقے پر قبضہ کیا، اس کا نام لسبارڈی رکھا اور وہاں اپنی حکومت قائم کی۔ اس کے ارکان مرتبہ اور بینک کا رتھے۔ اس کے افراد بینک کاری کے سلسلے میں سارے یورپ میں پھیل گئے۔ لندن کے عین وسط میں، جو برطانیہ کے سرمایہ کاروں اور بینک کاروں کا گڑھ ہے، ان کے نام پر آباد لسبارڈ سٹریٹ اب بھی موجود ہے۔

حصہ دوم

- 1- آرج ڈیچی آف آسٹریا 1453 سے آسٹریا کے شہزادے آرج ڈیوک (چیف ڈیوک) کہلاتے چلے آ رہے تھے۔ شاہی فرمان کے مطابق جو علاقہ آرج ڈیوک کی تحریل میں دیا جاتا تھا وہ آرج ڈیوک کہلاتا تھا۔ آسٹریا آج کل سمٹ کر چھوٹا سا ملک (کل رقبہ تیس ہزار مربع میل) رہ گیا ہے لیکن پہلی جنگ عظیم تک یہ روس کے بعد یورپ کا سب سے بڑا ملک تھا اور مملکت آسٹریا-ہنگری کے نام سے جانا جاتا تھا۔ اس میں آسٹریا اور ہنگری کے علاوہ چیکوسلواکیہ، پولینڈ، رومانیہ اور یوگوسلاویہ کے بیشتر علاقے شامل تھے۔ آرج ڈیوک آف آسٹریا عام طور پر ولی عہد سلطنت ہوتا تھا۔
- 2- البریڈو: جرمنی کی سرحد کے قریب ایک آسٹریائی قصبہ۔
- 2ب- کالاش (Calash): گھوڑ گاڑی۔ اس کے پیسے نیچے ہوتے ہیں اور چھت مرضی کے مطابق تاری اور چڑھائی جاسکتی ہے۔
- 3- کروشیائی کروشیہ (Croatia) کا باسی۔ کروشیہ پچھلے دنوں یوگوسلاویہ کا صوبہ تھا۔ اس زمانے میں یہ آسٹریائی-ہنگری سلطنت میں شامل تھا۔ اب اس نے آزادی اختیار کر لی ہے۔
- 4- اسماعیل: ایک ترکی قصبہ۔
- 5- ٹانگوں کی پٹیاں: فوجی سپاہی جرابوں کی بجائے ٹانگوں پر اولی پٹیاں باندھ کرتے تھے انگریز کے دور حکومت میں برصغیر میں بھی فوج اور پولیس دونوں میں لباس کا رواج تھا۔

- 6- کوارٹر ماسٹر فوجی عہدے دار، اس کا کام قیام گاہوں، درسد، وردیوں وغیرہ کی فرہی ہوتا ہے۔
- 7- اپنی گاڑیوں میں کونزوف کی سپاہ بہت سست رفتاری سے رادر یوٹوف سے آئی تھی۔ اور نیوین شراع تہریش دریائے رائن کے کنارے پہنچ گیا تھا۔ چنانچہ آشر دیوں نے روسیوں کی رفتار تیز کرنے کے لیے اپنی گاڑیاں فراہم کر دی تھیں۔ (ماڈ)
- 8- شا کو۔ ایک قسم کی لمبی مخروطی فوجی ٹوپی۔ اس کے سامنے چھجا اور اوپر پردوں کی کھٹی ہوتی ہے۔
- 9- اشرنی زاروں کے عہد میں روسی کا طلائی سکے "اسپرین" کہلاتا تھا۔
- 10- دیانا کی جانب میک کے ٹکست کھا جانے کے بعد کونزوف نے وپس دیانا کی جانب ہسپالی اختیار کی۔ راستے میں فرانسیسیوں نے جرنل موغا (Murat) کی زیر قیادت اس کی فوج پر متعدد حملے کیے لیکن اس نے ان سب کو پس کر دیا۔ 23 اکتوبر (پرانکیانڈر) کو اس نے طوفانی دریا ایفیس عبور کیا۔ موغا سارا دن ان روسی دستوں کو جو باگ رہتیاں (Bagration) کی قیادت میں تھے، ہراساں کرتا رہا۔ اس کی کوشش تھی کہ وہ دریا عبور نہ کرنے پائیں۔ راستے میں تو وہ انھیں روک نہ سکا، تاہم وہ روسی فوجوں کے تقریباً پہلو بہ پہلو چلنے کے قریب پہنچ گیا اور چلے کو اپنے قبضے میں لینے کے لیے لگ ورو کرنے لگا۔ جیسا کہ ناوس میں بیان کیا گیا ہے، روسی دستے دریا عبور کر گئے اور پاولو گرات ہوزر دل نے اسے کسی نہ کسی طرح آگ لگا دی
- جرنل موغا مصر میں نیپولین کے ساتھ تھا۔ جس بغاوت کے نتیجے میں نیپولین برسر اقتدار آیا، اس میں وہ بھی شامل تھا۔ 1800 میں اس نے نیپولین کی ہمشیرہ سے نکاح کیا اور 1808 میں نیپولین نے سے نیپلز کا بادشاہ بنادیا۔ تاہم اس خطبہ سے اس کی انگلیں پوری نہ ہوئیں اور وہ ہمیشہ غیر مطمئن رہا۔ حال اسطانی جگہ جگہ اس کے اس خطاب کا اثر انداز سے ذکر کرتا ہے۔
- 11- نا آخہ گھوڑا (Stallion) ہالغ گھوڑا۔ عام طور پر فزائش نسل کے کام آتا ہے۔
- 12- حرف بہ حرف۔ وہ لوگ جو کسی قانون، حکم یا معاہدے پر حرف بہ حرف (to the letter) عمل کرتے ہیں، وہ پنہلی دیکھتے کہ قانون، حکم یا معاہدے کا ثنایا روح کیا ہے، بلکہ صرف یہ دیکھتے ہیں کہ اس میں لکھا کیا ہے۔ وہ جو لکھا ہے، اسے پتھر کی لکیر سمجھتے ہیں اور صرف اسی کے مطابق عمل کرتے ہیں۔
- 13- گنجائیں اور گرہ پشاٹ: فرہنگ دیکھیں۔
- 14- ولادی میر (St. Vladimir) یا ولادی میر اعظم (1015-925) روس کا پہلا عیسائی حکمران۔ اس کا پایہ تخت کیف تھا۔
- 15- لم باغ وغیرہ اواخر اکتوبر میں ان تینوں مقامات پر جو جہز ہیں ہوئیں، ان میں روسی دستوں کی قیادت باگ رہتیاں اور فرانسیسیوں کے ہراول دست کی موغانے کی۔ تینوں جہزوں کا مقصد فرانسیسیوں کو قریب آنے سے روکنا تھا۔
- 16- جرنل فیلڈ مارشل: بعض ممالک میں یہ دونوں عہدے اکٹھے استعمال کیے جاتے ہیں۔
- 17- بوہیمیا: آج کل چیکوسلوواکیا میں شامل ہے۔ اس زمانے میں آشریا کے قبضے میں تھا
- 18- ملاقات دونوں حکمرانوں کے، مین یہ ملاقات اکتوبر 1805 میں برلن میں ہوئی۔ معاہدہ بھی طے پا گیا لیکن تین

کچھ نہ لگا۔

19- کامپونو میو (Campo Formio): شمالی اطالیہ کا ایک گاؤں یہاں فرانسیسیوں و آسٹریائیوں کے مابین 1797

میں ایک معاہدہ طے پایا تھا۔ اس کے تحت آسٹریا اپنے بعض علاقوں میں سے فرانس کے حق میں دست بردار ہو گیا تھا۔

20- بونا پارت، خود نیپولین فرانسیسی جزیرے کارسیکا میں پیدا ہوا تھا لیکن اس کے والدین اطالوی تھے۔ ان کا تعلق ایک

قدیم اطالوی خاندان بونا پارت (Buona parte) سے تھا۔ بونا پارت کی فرانسیسی شکل بونا پارت (Bonaparte)

خود نیپولین نے اختیار کی تھی۔ لیکن بعض روسی اسے ازراہ تنحیک بونا پارت ہی کہتے تھے۔ ناول کا آغاز بھی اسی طریقہ

نام سے ہوتا ہے۔ (ناموں پر نوٹ بھی دیکھیں)

21- مقدس ماضی میں یورپ کے بعض ملک اور دارے اپنے نام کے ساتھ لفظ مقدس (Holy) کا اضافہ کر لیتے تھے،

مثلاً مقدس رومی سلطنت (Holy Roman Empire) یا Holy Seel (پوپ کا صدر مقام)۔

22- ہریمبشٹی آف سارڈینیا، سارڈینیا بحیرہ روم میں اطالوی جزیرہ ہے۔ نیپولین نے اس پر 1796 میں قبضہ کیا تھا۔ اس

سے پہلے یہ آسٹریا کے ماتحت تھا۔

23- لندن اس زمانے میں سفارت کاروں کے بے لندن میں تعیناتی کوئی خاص کشش نہیں رکھتی تھی۔ پیرس، وینا، برلن،

ہیٹرز برگ وغیرہ کہیں بہتر شہر تصور ہوتے تھے۔

24- دون داس (Don Juan)، مغربی ادب کا ایک دستاویز کردار۔ اس کی ابتدا ہسپانوی ڈرامہ نگار ترسوز میلوٹا کے ایک

نکھیں سے ہوئی۔ رفتہ رفتہ دوسرے ادیبوں اور موسیقاروں نے اسے اپنایا۔ (فرانسیسی ڈرامہ نگار) مولیئر نے اس

کے بارے میں ڈرامہ، (آسٹریوی موسیقار) مونسارٹ نے اوپرا اور (جرمن شاعر) رچرڈ سٹراس نے نظم لکھی۔

روایت کے مطابق دون داس عورتوں کا شکاری تھا۔ وہ عورتوں کو درغلا تا، اپنی ہوس کا نشانہ بناتا اور پھر انھیں چھوڑ

دیتا۔ اس نے ایسی ہی ایک عورت کے باپ کو قتل کر دیا۔ چند مہینے بعد وہ ذرا بچھتا یا اور اس نے باپ کے مجسمے کو

دعوت پر اپنے گھر لایا۔ مجسمہ پہنچ گیا لیکن وہ اسے گھسیٹ کر جہنم میں لے گیا تاکہ اسے اس کے سابقہ گناہوں کی سزا

مل سکے۔ لارڈ ہارن اور جارج برنارڈ شا نے بھی اسے بالترتیب اپنی نظم اور کھیل کا موضوع بنایا لیکن یہاں وہ

شکاری کم ہے اور پیچیدہ زیادہ۔

25- ڈیو سٹیمینز، ڈیو سٹیمینز سکندر اعظم کے باپ فلپ کا ہم عصر تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اس سے زبردست مقرر آج تک پیدا

نہیں ہوا۔ شروع میں اس کی آواز کم زور تھی اور وہ ہلکا تا بھی تھا۔ اس نے اس کا علاج یہ کیا کہ پہاڑوں میں نکل

جاتا، منہ میں ٹکڑیاں ڈال لیتا اور تقریر کی مشق کرتا رہتا۔ رفتہ رفتہ وہ اپنے فہم کا بکھارے رازگار شخص بن گیا۔

26- سوراوی بل: سوراویا آج کل چیکو سلواکیا کا صوبہ ہے اور برس اس کا صدر مقام ہے۔

27- آرڈر آف ماریا ٹریا: تمغہ۔ ماریا ٹریا اپنے باپ چارلس ششم کی وفات کے بعد آسٹریا کی حکمران (آرچ ڈچس)

بن گئی۔ اس کا عہد حکومت 1740 سے 1780 تک محیط ہے۔ امپراطور فرانس اس کا پوتا تھا۔

28- جیمز لین: ایک سرکاری عہدیدار جس کے ذمے شاہی محل کے تمام امور کا انتظام و انصرام ہوتا ہے۔ جب

- 29- گاسکن: فرانس کے صوبے جاسکینی کا باشندہ۔
- 30- تولوں (Toulon): جنوب مشرق فرانس کی بندرگاہ اور بحری اڈہ۔ انقلاب فرانس کے بعد شاہ پرستوں کا گنہ گار 1793 میں نیولین نے، جب وہ توپ خانے کا کمیشن تھا، اس کا محاصرہ کیا اور اپنی پہلی عسکری کامیابی حاصل کی۔ اس کے نتیجے کے طور پر اسے جرٹیل بنا دیا گیا۔ فرانس سمندر سے بھی ایسے ہی خوب دیکھ رہا ہے۔
- 31- درنطنی: مصنف نے یہاں لفظ gasconade جس کے معنی شیخی خوری ہے، استعمال کیا ہے۔ جس طرح ہمارے ہاں شیخوں کی شیخی اور پٹھانوں کی ٹر مشہور ہے، اسی طرح گاسکنوں کے متعلق کہا جاتا ہے کہ انھیں شیخیں بگھارنے اور وہ کی کوڑی لانے میں یدِ طولی حاصل ہے۔ چنانچہ انھوں نے یورپی زبانوں کو لفظ gasconade بمعنی bravado's wagger'boas-fulness دیا ہے۔ (بحوالہ یونیورسل ڈکشنری اور اسٹریٹنڈ ورلڈ انسائیکلو پیڈیا)
- 32- طاسطائی نے یہ لفظ تیج (Thiers) کی کتاب Histoire du Consulate et de l'Empire سے نقل کیا ہے۔ 25 جلدوں پر مشتمل ہے۔ تیج کے حالات کے متعلق ”تتر“ (حصہ دوم) کا حاشیہ نمبر 9 دیکھیں۔
- 33- تولوں: اوپر حاشیہ نمبر 30 ملاحظہ فرمائیں۔
- 34- استراخان ٹوپی: بھیڑ کے بچوں کی پوشیم کی ٹوپی۔ استراخان دریا کے دو لگا کے کنارے روسی شہر ہے۔ یہاں جو پوشیم تیار کی جاتی ہے، اس پر پوشیم بھی ہوتی ہے۔
- 35- لہجہ شرقی تھا، باگ راتیاں سابقہ روسی ریاست (موجودہ آزاد ملک) چار جیا کا، جس کی سرحد شمالی ترکی سے ملتی ہے، جو انیسویں صدی تک ترکی ہی کا حصہ تھی، باشندہ تھے۔ باگ راتیاں چار جیاں کے قدیم حکمرانوں کا خاندانی نام تھا۔ (ماڈ)
- 36- بشکل مربع (Square) سامان کے بے بچ میں خالی جگہ کے ارد گرد آدمی کھڑے کر دیے جاتے تھے۔ ان کے چہرے اندر کو ہوتے تھے تاکہ وہ افسروں کے، جو خالی جگہ پر کھڑے ہوتے تھے، احکام سن سکیں۔
- 37- نیچے اترنے لگے: یہ وہ پوشیم تھی جس کے متعلق فرانسیسی مورخ تیج (Thiers) لکھتا ہے: ”روسوں نے جرأت اور شجاعت کا مظاہرہ کیا اور اس سے بھی بڑی بات یہ ہوئی اور یہ جنگ میں کم کم ہی ہوتی ہے کہ دو پیادہ نو بھیس بڑے عزم و ارادے کے ساتھ آگے بڑھ رہی تھیں۔ تصادم سے پہلے ان میں سے کوئی بھی ہار، مرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔“ اور سینٹ ہیلینا میں امیری کے دوران میں نیولین نے کہا: ”بعض روسی پٹالیوں نے کامل بے خوفی کا مظاہرہ کیا۔“ (طاسطائی کا اپنا حاشیہ بحوالہ ماڈ اور وزیر میری ایڈمنڈز)
- 38- وڈھ: فصلوں کی کٹائی کے بعد پودوں کے کچھ حصے کھیت پر باقی رہ جاتے ہیں۔ اس کھیت کو پنجابی میں ”وڈھ“ اور فارسی میں ”کاہبان“ کہتے ہیں۔

حصہ سوم

1- جنرل مین آف پیڈ جیمز: صاحب شاد۔ برطانیہ میں اسے لارڈ آف پیڈ جیمز کہتے ہیں۔

- 2- کونسلر آف سٹیٹ زاروں کے روس میں سول سروس کے گیارہ طبقوں میں سے پانچویں کا رکن۔ (ماڈ)
- 3- سٹیوارڈ جائیداد کا منتظم۔
- 4- چانسلر یہ یعنی لفظ Cancellarius سے مشتق ہے۔ یہ رومی شہنشاہ کا ایک طرح کا وزیر ہوتا تھا اور اسے Cancellarius اس لیے کہتے تھے کیونکہ وہ درخواست دہندگان کی کثیر تعداد سے بچنے کے لیے ایک قسم کی سکرین (Cancellus) کے پیچھے بیٹھ کر رہتا تھا۔ جرمنی اور آسٹریا کے آؤر نے اعظم آج بھی چانسلر کہلاتے ہیں۔
- 5- آزاد کسان عام طور پر روسی کسان مکمل طور پر جاگیرداروں کے دھم دکر م پر ہوتے تھے اور ایک قسم کے غلام ہوتے تھے۔ انھیں self کہا جاتا تھا۔ ان کے خاندان کا ہر فرد جو بھی گھنے جاگیردار کی خدمت کرتا تھا اور انھیں اور نہ ان کے اخلاف کو جاگیردار کی مرضی کے بغیر کہیں جانے یا زمین چھوڑنے کی آزادی ہوتی تھی۔ تاہم کسانوں کی ایک محدود تعداد ایسی بھی تھی جو جس جاگیردار کی چاہے زمین کاشت کرتے اور جب جی چاہتا، چھوڑ کر کہیں ور چلے جاتے۔ یہ حضرات کی بجائے زمین کا لگان ادا کرتے تھے۔ انھیں freemen (آزاد) کہا جاتا تھا۔
- 6- کارسیٹ (Corset) یورپی عورتوں کا ایک قسم کا چست زیر جامہ۔ کرا اور کوموں کے گرد یہ بالکل کسا ہوتا ہے۔ یہ پہنا اس لیے جاتا ہے تاکہ جسم تیار ہے اور سڈول نظر آئے۔
- 7- سٹیپ (step): روس میں یوکرین سے لے کر جنوب مغربی، سمیریا تک وسیع و عریض ہموار قطعہ زمین ہے۔ اسے سٹیپ کہا جاتا ہے۔ یہاں صرف گھاس اگتی ہے۔ درخت میلوں تک نظر نہیں آتا۔
- 8- ایلینا، ہیلین کا بیار کا نام۔
- 9- چیمبرلین (Chamberlain) وہ درباری جو شاہی کمرانے کے گھریلو امور کا ذمہ دار ہوتا ہے۔
- 10- رائن: مغربی یورپ کا طویل ترین دریا۔ یہ جرمنی کے جس علاقے میں بہتا ہے، اسے رائن لینڈ یا دادی رائن کہتے ہیں۔ یورپ کی تیس ترین اور مشہور ترین سفید شرابی یہیں کشید کی جاتی ہیں۔
- 11- ہیرس وہیلن، ہیلن دیوتاؤں کے دیوتاؤں اور یونانی ریاست سپارٹا کی ملکہ لیڈا کی بیٹی اور سپارٹا کے حکمران میلیس کی شریک حیات تھی۔ وہ اپنے زمانے کی حسین ترین عورت تصور ہوتی تھی۔ اسے فرائے (ترکی) کے شہزادے ہیرس نے اغوا کر لیا۔ اس پر یونانی ریاستوں اور فرائے کے مابین گھسان کارن پڑا۔ یہ جنگ دس سال جاری رہی۔ بالاخر یونانی کرد فریب سے جیت گئے۔ انھوں نے فرائے کو آگ لگا دی اور ہیلن کو اپنے ساتھ راہیں یونان لے گئے۔ یہ جنگ بارہ سو سال قبل مسیح پر پاہوئی تھی لیکن اتنی قصہ مشکوک ہے۔ یونانی شاعر ہومر کی شاہکار نظم Iliad اسی قصے پر مبنی ہے۔
- 12- گرین ہاؤس: اکثر یورپی ممالک میں سردیوں میں برف باری ہوتی رہتی درباریوں کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ اس لیے کیمپوں میں کوئی چیز اگائی نہیں جاسکتی۔ سبزیاں اور بعض ضروری پودے اگانے کے لیے گھروں سے ملحقہ باغات اور عوامی پارکوں میں خاص عمارتیں، جن کی دیواریں اور چھتیں شیشے کی ہوتی ہیں، بنائی جاتی ہیں۔ انھیں گرین ہاؤس کہتے ہیں۔

- 13- نیم غلام (serf) جاگیرداروں کے زرعی اور گھریلو کارندے۔ وہ اپنی مرضی سے مالک کی مزدمت چھوڑ نہیں سکتے تھے۔ انھیں یا تو کوئی دوسرا شخص خرید لیتا یا پھر انھیں اپنی آزادی کے لیے خاص رقم اور کرناجیٹی اور اس کی بھی عمر اجازت نہیں ملتی تھی۔ (حاشیہ نمبر 5 بھی دیکھیں)
- 14- ہیردنی عمارتیں: یورپی جاگیردار اپنی جاگیروں پر ہی اپنے محل تعمیر کیا کرتے تھے۔ محل سے قدرے فاصلے پر گاہنوں کے مکانات اور بیرونی عمارتیں ہوتی تھیں۔ یہ عمارتیں گوداموں اور اصطبلوں کے طور پر استعمال ہوتی تھیں۔
- 15- سکرین: غریبے ہوائوں سے بچنے کے لیے بیڑ کے چاروں اطراف مسہری نم پر وہ۔
- 16- حساسیت (sensitivity) دوسرے لوگ جو کچھ کہتے یا کرتے ہیں، اس سے ہا آسانی متاثر یا ناراض ہونے کا نشانہ
- 17- اسہامیونف رجسٹر طاسطائی نے اس ضخیم ناول میں بہت کم غلطیاں کی ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہاں اس سے بھول چوک ہوگئی ہے کیونکہ حصہ دل کے ساتویں باب میں ہمیں یہ بتایا تھا کہ یورس کا تیارالہ یکی لوف رجسٹ میں ہوا تھا۔ (ماڈ)
- 18- زار یوج: گریٹ ڈیوک زار یوج کانتشن، کمانڈر گارڈز۔ گریٹ ڈیوک روسی زار کے بیٹوں اور پوتوں کا خطاب ہوتا تھا اور اس کا ولی عہد، جو بھائی ہو یا بیٹا، زار یوج (زار کا بیٹا) بھی کہلاتا تھا۔ یہ گریٹ ڈیوک زار الیکندر کا بھائی تھا۔
- 19- الفانسے کارلودج: ہرگ جرمس نژاد روسی ہے۔ اس لیے اس کے نام میں روسی اور جرمن دونوں اجزائیں شامل ہیں۔
- 20- ہنس: ایک وحشی قوم تھی۔ اس نے چوتھی پانچویں صدی میں یورپ کو تاخت و تاراج کیا تھا۔ غیر جرمین اقوام جرمنوں کی حقارت سے ہنس کہتی ہیں۔
- 21- گلیشیا: وسطی یورپ کی ایک ریاست۔ بارہویں صدی میں روسیوں نے فتح کی اور چودھویں صدی میں پولینڈ کے قبضے میں آئی۔ انھیں چودھویں صدی میں آسٹریا نے، پچھلی مملکت میں شامل کر لی۔ جنگ عظیم اول کے بعد دوبارہ پولینڈ کی مل گئی۔ جنگ عظیم دوم کے بعد مشرقی گلیشیا روس کے حوالے کر دیا گیا۔
- 22- آرنوٹ: یورپ کے واحد مسلمان ملک البانیہ کے، جو سلطنت عثمانیہ کو بے قاعدہ رستے فراہم کیا کرتا تھا، "بانشوال کو ترک آرنوٹ (عائنا بھاڑے کے سپاہی) کہا کرتے تھے۔" (ماڈ)
- 23- ایسن (Essen) جرمنی کا شہر۔ انیسویں صدی میں صنعتی مرکز بن گیا تھا۔
- 24- وےروٹر (Weyrother): آسٹریوی چیف آف سٹاف۔
- 25- شوارٹسن برگ (Schwarzenberg) پرنس کارل وڈن شوارٹسن برگ۔ آسٹریوی جرمن۔
- 26- قونصل: انقلاب فرانس کے کچھ سالوں بعد 1795 میں نیا نظام حکومت وجود میں آیا۔ بادشاہت ختم کر دی گئی۔ پانچ سو افراد پر مشتمل کونسل منتخب ہوئی لیکن اصل اختیار پانچ اشخاص کے ہاتھ میں تھا۔ یہ ڈائریکٹر کہلاتے تھے اور ان کا نظام حکومت ڈائریکٹری۔ 1799 میں پولیس نے یہ نظام ختم کر دیا اور نیا نظام Consulate تشکیل دیا۔ وہ خود فرسٹ قونصل بن گیا۔ دوسرے وہ قونصل اس کے نائب تھے۔ بیس مئی 1804 کو اس نے امپراطور کا لقب اختیار کر لیا اور یوں یہ نظام بھی ختم ہو گیا۔

- 27- تھیٹریت (Theatricality) خود نمائی اور مصنوعی بوجھ، جو اداکاروں کے ساتھ منسوب کہا جاتا ہے۔
- 28- ال زاس (Alsace): مغربی جرمنی سے ملحق مشرقی فرانس کا خطہ۔
- 29- گریڈ مارشل، میرور بار۔
- 30- ہر (herr) جناب یا مسٹر کا ہم معنی جرمن لفظ۔
- 31- دمپ فن وغیرہ دمپ فن، لک ٹین شدن اور ہون لوئے (Honhenloe) جرمن نژاد، لائٹن (Langeron) فرانسیسی نژاد اور پرش پرش پوسٹانی نژاد روسی جرمن تھے۔ ماڈ کے مطابق پرش پرش کا پورا نام پرزے بزیوگی تھا۔ اس کا ذکر آگے آئے گا۔
- 32- کوئٹل ٹس وغیرہ یہ لڑائی، جس کا یہاں ذکر کیا جا رہا ہے، قصبے اوسترٹس کے قریب ہوئی۔ اس نام نے میں یہ علاقہ آسٹریائی مملکت کا حصہ تھا۔ اب یہ موجودہ چیکو سلوکیا کا حصہ ہے۔ آسٹریائی جرمن بولتے تھے، اس لیے شہروں اور قصبوں کے نام بھی جرمن تھے۔ چیکو سلوکیا نے یہ سارے نام تبدیل کر دیے ہیں۔ اب اوسترٹس کو سدادکوف اور برن کو برے ماڈ (برین گن یہیں ایجاد ہوئی تھی) کہتے ہیں۔ کوئٹل ٹس، سوکولٹس اور دوسرے قصبوں کے نام بھی تبدیل ہو چکے ہیں۔
- 33- پرنس آندرے جس مسئلے۔ "کہ موت آدمی کی عظیم ترین سہائی اور بہترین امیدوں پر پانی پھیر سکتی ہے"۔ اسے آنکھیں چرانے کی کوشش کر رہا ہے، ماڈ کے خیال کے مطابق اس نے سو سال بعد طالع طائی کی زندگی میں انقلاب برپا کر دیا تھا۔ تفصیل طالع طائی کی کتاب "اعتراف" (A Confession) کے باب سوم میں دیکھی جاسکتی ہے۔
- 34- خیابان تورسکایا، ماسکو کی سڑک۔
- 35- پیالہ (pan): یہ پیالہ قدیم طرز کی بند قلوں میں ہوتا تھا۔ اسی سے بخارہ (pan) flash in the (پانی ہندو کی طرح ابتدائی زور و شور دکھانے اور کوئی دیر پا اثر چھوڑے بغیر ختم ہو جانا) بنا۔
- 36- ہولہ برون طالع طائی نے اس لڑائی کی تفصیل جنگ شون براگرن کے نام سے بیان کی ہے (حصہ دوم ابواب نمبر 16 (215)۔
- 37- یوہانیا یوہانیا چند دھویں صدی تک آزاد ملک تھا۔ پندرہویں صدی میں پہلے یہ ہنگری اور پھر آسٹریائی سلطنت کا جزو بنا۔ جنگ عظیم اول کے اختتام پر اسے چیکو سلوکیا میں شامل کر دیا گیا۔ اب اس کا نام چےخی (Chechy) ہے۔
- 38- کرسکی روسی شہر کرسک کا باشندہ۔ اس شہر اور اس کے گرد و نواح کے علاقے کی اپنی رجسٹر تھی۔ بعد میں اس شہر نے یوں عالم گیر شہرت حاصل کی کہ یہاں روسیوں نے دوسری جنگ عظیم کے دوران میں ٹینکوں کی عظیم ترین لڑائی میں جرمنوں کو شکست دی تھی۔
- 39- سناج خور (sausage-eater)۔ سناج جانوروں کی آنتوں میں قیمہ اور مصالحے بھر کر بنائے جاتے ہیں۔ روسی جرمنوں کو "سناج خور" کہہ کر ان کا مذاق اڑاتے تھے۔
- 40- زار تسین میڈو پیٹرز برگ کی پریڈ گروڈ، نڈ۔ زار ایلکساندر اور کوتوزوف کے مابین یہ گفتگو ایک روسی مورخ میخائلسکی

دائیسکی کی کتاب "جنگ 1805" سے ہو بہر عقل کی گئی ہے۔ ستائیس گنگو کے دوران میں مشرق میں جس رد عمل سے کوئلہ کے بالائی ہونٹ کا پھڑپھڑنا اور اس کا پنے کندھے اچکا کا اظہار کرتے ہیں، وہ حاسطائی کی اپنی اخترا ہے۔ (ماڈ)

- 41- ہاتھ ہمارے ہاں بالشت کا بیان نہ تقریباً نو سوچ یا چار گروہ کے برابر ہوتا ہے۔ مغرب میں یہ چار سوچ (یا 760 میل میٹر) کے برابر ہوتا ہے، ورنہ عام طور پر گھوڑے کی، دنیا کی ظاہر کرنے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔
- 42- نائٹ (knight)۔ قروں وسطی میں یورپی ممالک میں بعض، شخص کو، جن کا تعلق اعلیٰ خاندانوں سے ہوتا تھا، جو سکوار کے دینی ور شجاعت میں اپنی مثال آپ سمجھے جاتے تھے، تربیت کے مختلف مراحل میں سے گزرنے کے بعد بادشاہ وقت خصوصی فوجی مناصب پر فائز کرتے تھے۔ انھیں نائٹ کہا جاتا تھا۔ ان کی بہت قدر افزائی ہوتی تھی اور وہ معاشرے میں عزت کی لگا ہوں سے دیکھے جاتے تھے۔
- 43- بند ڈیم۔ یورپ کے اکثر و بیشتر دریا کھنڈی ندی نامے ہیں۔ ان ندیوں پر بند بنا کر پانی روک دیا جاتا اور آٹا پیسے کی پن چکیاں چلائی جاتی تھیں۔

دوسری کتاب

حصہ اول

- 1- وارانیزو: ماسکو کے جنوب میں واقع ہے۔ یہاں گولائی رستوں اور پرس مار یا مکنوگیا کے مابین زندگی کی اہم ترین ملاقات ہوگی۔
- 2- جینر بریڈ (ginger bread) شیریں یک باسکٹ۔ بسکٹ عام طور پر کسی آدمی یا جانور کی شکل کے ہوتے ہیں اور ان میں ادک کی خوشبو شامل ہوتی ہے۔
- 3- دگی گھوڑا (trotter)۔ صاف یہ گھوڑا ایک قسم کی دوڑ جسے ہارنيس (harness) کہتے ہیں، دوڑایا جاتا ہے۔ اس دوڑ میں گھوڑے ایک ہلکی پھلکی رو پہیہ گاڑی بنام سکی (sulky) میں جس میں صرف ایک ہی نشست ہوتی ہے اور جسے صرف ایک ہی گھوڑا کھینچتا ہے، بٹے ہوتے ہیں۔
- 4- انگلش کلب: یہ کلب انھارویں صدی میں امیرا طورہ کیستھمن کے ذمے میں ماسکو میں شروع ہوا تھا۔ پیٹرز برگ کے دارالسلطنت قرار دیے جانے پر ماسکو کی حیثیت ثانوی ہو گئی تھی اور ماڈ کے الفاظ میں ماسکو پیٹرز برگ کا "غیر مرکزی حریف" بن گیا تھا۔ چنانچہ شہر کے امرا و دروہا اس کلب میں اکٹرا کھٹے ہوتے اور دلوں کے پھولے پھوڑا کرتے تھے۔
- 5- اسپاریکس (asparagus)۔ ایک قسم کا پودا جس کے پتے نہیں صرف شاخیں ہوتی ہیں۔ یہ شاخیں بہت لذیذ ہوتی

ہیں اور بطور سبزی استعمال ہوتی ہیں۔ پودے کی بوئی کے تین سال بعد یہ شاخیں کاٹی جا سکتی ہیں لیکن نئی شاخیں پھوٹنے کا عمل آٹھ دس سال جاری رہتا ہے۔

6- کھیرا (Cucumber) ہوتا کھیرے جیسا لیکن حجم میں اس سے خاصا بڑا ہوتا ہے۔ کھیرے کی طرح بطور سلاہ استعمال ہوتا ہے۔

7- تاج خروس: (Cockscomb) ایک پھول جو مرغ کی کلنی کی مانند ہوتا ہے۔

8- پٹی: patty

9- انڈے کی ساس (mayonnaise) انڈے کی زردی پیمینٹ کر اس میں تیل، سرکہ، لیوں کے رس کی آمیزش کر کے تیار کرتے ہیں اور کریم میں مد کر سلاہ کے اوپر اس کی تہہ جھاتے ہیں۔

10- sterlet: ایک قسم کی مچھلی جو بحیرہ کیسپین میں پائی جاتی ہے۔

11- کاؤنٹ رستوپچن وغیرہ: کاؤنٹ رستوپچن (1763-1826) نے بعد میں (جلد دوم) سکوکا گورنر جنرل اور کمانڈر انچیف مقرر ہونا ہے۔ پرنس یوری اولگاروکی زار پال کے عہد میں ماسکو میں کمانڈر انچیف رہ چکا تھا۔ کاؤنٹ آئی آئی مارکوف زارینہ کیسٹریں کے عہد کا جرنیل تھا۔ اے۔ این۔ دیاز بمسکی ایک اعلیٰ افسر اور مصنف پرنس پی۔ اے۔ دیاز بمسکی کا باپ تھا ورنی۔ اس۔ دالیوئیف ماہر آثار قدیمہ تھا۔

12- ڈریس کوٹ: وہ کوٹ جو خاص خاص مواقع پر پہنا جائے۔

13- قصیدہ: باگراتیاں کے اعزاز میں اس دعوت کا ذکر اس زمانے کے ایک شخص ایس۔ پی۔ ذخاریف نے اپنے روزنامے کے 4 مارچ 1806 کے اندراج میں کیا ہے۔ طالبائی نے اس میں کچھ اضافے، اپنی طرف سے کر دیے ہیں۔ قصیدہ ذرا بے ہنگم روسی زبان میں لکھا گیا تھا اور اس کا مصنف نکولوف 1806 تک چینیائی سے محروم ہو چکا تھا اور یوں وہ خود اسے پڑھ کر نہیں سنا سکتا تھا۔ (ماز)

14- ٹائی ٹس (81-39) ٹائی ٹس (Titus) سن 81-79 میں روم کا شہنشاہ تھا۔ اس نے 70 میں اپنے باپ کے ساتھ یہودیوں کی بغاوت کو فرو کیا، یروشلیم پر قبضہ کیا اور ہیکل سلیمانی کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ اسی کے عہد میں پرمیائی کا شہر لادے میں دبا تھا۔ اس کی موت کے بعد اسے "darling of human race" قرار دیا گیا اور "سینٹ" کے مرتبے پر فائز کیا گیا۔

15- رھنی اس (Rhipheus) ایک قسم کی بہت خوبصورت تفل۔

16- کوتوزوف: اس کوتوزوف کا کمانڈر انچیف کوتوزوف سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ (ماز)

17- سیکنڈ گزشتہ صدی کے اختتام تک یورپ کے تقریباً تمام بھی ممالک میں ڈوئل (duell) لڑنے کا رواج تھا۔ اگر کوئی شخص یہ سمجھتا کہ دوسرے شخص نے اس کی عزت پر حملہ کیا ہے، وہ اسے اپنے حمایتی کے، جسے سیکنڈ کہا جاتا تھا، ذریعے چیلنج بھیج دیتا۔ جس شخص کو چیلنج دیا جاتا، اسے یہ قبول کرنا پڑتا اور نہ اسے بدنامی کا سامنا کرنا پڑتا اور وہ لوگوں کی نگاہوں میں بزدل ٹھہرتا۔ ڈوئل کے انتظامات طریقہ کے سیکنڈ کرتے۔ ڈوئل شمشیر سے لڑی جاتے یا پستول سے، اس کا

اختیار اس شخص کو، جسے چیخ دیا جاتا، ہوتا تھا۔ عام طور پر ڈوئیل ٹیلف کے زخمی ہونے پر ختم ہو جاتی تھی لیکن بعض اوقات اس کا انجام ہلاکت بھی ہوتا۔ روسی زبان کا عظیم شاعر پوشکن عمر 38 سال ڈوئیل ٹیلف میں ہلاک ہوا۔ خود طالعہائی نے اپنے ہم عصر ناول نگار ترمکینف کو ڈوئیل کا چیخ دیا تھا۔

18- ناٹھول ناڈ کا بیان ہے کہ ناول کے ابتدائی مسودات میں طالعہائی نے بالکل واضح انداز سے بیان کیا تھا کہ ہمیں وراس کے بھائی ناٹھول کے مابین تریبا تعلقات تھے تاہم آخری مسودے میں اس نے تبدیلیاں کر دیں اور اب اس پارے میں صرف اشارے گنائے باقی رہ گئے ہیں۔

19- لوئی شٹزراہم (1754 تا 1793) فرانس کا بادشاہ۔ وہ اور اس کی ملکہ انقلاب فرانس کی جینٹ چڑھے۔

20- روبس پیے (Robespierre) (1758 تا 1794) انقلاب فرانس کا رہنما۔ اس نے انقلاب دشمنوں کو جن جنر گلوٹین پر چڑھا، اور اسی الزام میں خود بھی سزائے موت کا مستوجب ٹھہرا۔

21- وسطی اور شمالی مشرقی روس روس کے اس علاقے کو "گریٹ ریشیا" کہا جاتا ہے۔ یہیں کی زبان روس کی سرکاری زبان ہے۔

22- Fruschtique اصل جرمن لفظ fruhstuck (ناشتہ) ہے۔ ان پڑھ پاورجن نے اسے fruschtique بنا دیا۔

23- مولداوی: مولداویا (Moldavia) کا باشندہ۔ مولداویا، جس کا بیشتر حصہ روس نے 1812 میں رومینیہ سے چھڑا تھا، سوویت یونین کی ایک ری پبلک تھی۔ کئی نیف اس کا صدر مقام ہے۔ سوویت یونین کی شکست و ریخت کے بعد اب یہ بھی ایک آزاد مملکت کا روپ دھار چکی ہے۔

24- شیر خوار کے بال روس میں جب بچے کی رسم ادا کی جاتی تھی، پادری بچے کے چند بال کاٹ لیتا تھا اور انھیں چلن موسم بقی کے موسم سے چھنا دیتا تھا۔ اگر یہ موسم بچے کے پانی کے برتن میں، جس کی شکل پیالہ نما ہوتی تھی، ڈال دیا جاتا تو اسے بد شگونی تصور کیا جاتا۔ (ناڈ)

25- نپولین کے ساتھ جنگ۔ 1806 کے دوران میں نپولین سارا سال نئی جنگ کی تیاریاں کرتا رہا۔ اواخر عمر میں اس نے اورشٹ اور جینا کے مقامات پر ریشیا کی افواج کو شکست دی اور برلن پر قبضہ کر لیا۔ روسیوں کو کمک پہنچانے کا موقع ہی نہ مل سکا کیونکہ فریسی دریائے اسٹولا پر ان کا راستہ روک دیا گیا تھا۔ تاہم نئے خطے سے بچنے کے لیے زارا الیکساندر نے فوج اور پیشیا میں نئی بھرتی کا فرما جاری کر دیا۔ ماڈ کے بقول پیشیا کے 4/5 حصے کو ہندوؤں کے بجائے pikas (ایک قسم کی ہلم) سے مسلح کیا جاتا تھا۔

26- تہوار روز دواز دہم اس تہوار کو انگریزی میں Ep'hany اور بعض اوقات چھوٹی کرسمس بھی کہتے ہیں۔ (اس سے پہلے رات شب دواز دہم کہلاتی ہے۔ یہ تہوار کرسمس سے بارہ روز بعد چھ جنوری کو منایا جاتا ہے۔ عیسائیوں کا عقیدہ ہے کہ اس روز تین چیزیں وقوع پذیر ہوئیں: (1) حضرت عیسیٰ کو پتھر دیا گیا (2) تین مجوسی علماء کی آمد۔ انھوں نے حضرت عیسیٰ کے ظہور کی تصدیق کی (3) فلسطین کے قصبہ الجلیل میں ایک شادی ہوئی۔ شادی میں شرب ختم ہوئی۔ حضرت عیسیٰ نے پانی کے مشکوں کو شراب میں تبدیل کر دیا۔ یہ تہوار ان تینوں واقعات کی یاد میں منایا جاتا ہے۔

- 27- ٹائٹ۔ وہ شخص جو خواتین کی حفاظت اور حمایت اپنا فرض گردانتا ہو۔
- 28- pas de chale۔ رقص شمال: ایک قسم کا فرانسیسی رقص۔
- 29- ecossaise وغیرہ۔ ecossaise کے لفظی معانی سکا چستانی (وہ شخص یا چیز جس کا تعلق سکاٹ لینڈ سے ہو) ہیں۔ اصدا یہ سویتی کی دھس تھی۔ پھر اس کی لے پر جوشیہ رقص وجود میں آیا۔ سکاٹ لینڈ سے یہ دونوں چیزیں فرانس، جو اس زمانے میں بھی یورپ کا ثقافتی مرکز تھا اور فرانس سے یورپ کے باقی سر ملک میں پہنچیں۔
- anglaise (لفظی معانی انگلش) پر پہلی کتاب کے حصہ اوس میں پہلے اسی حاشیہ درج کیا گیا ہے۔ مازور کا پوینڈ سے شروع ہوا۔ یہ بھی سویتی کی دھن کا بھی نام ہے اور رقص کا بھی۔ دھن در رقص، دونوں بہت تیز اور جوشیے ہوتے ہیں۔
- 30- دہتی تاش (piquet) تاش کا ایک کھیل جو دو اشخاص کے مابین کھیلا جاتا ہے۔ اس میں اکا (جو تاش کا سب سے اونچا پیمانہ جاتا ہے) چھوڑ کر سب سے نیچے تمام پتے نکال دیے جاتے ہیں اور یوں پتے (32) ہتوں سے کھیلا جاتا ہے۔
- 31- زیورات کا ڈبا (انگلش Casket، فرنگی Cassette)۔ یہ ڈبا نقش ہوتا تھا۔ موجودہ کیسٹ اسی لفظ کی دین ہے۔
- 32- پرنوٹ۔ چنانچہ یہ لفظ کہاں سے آیا ہے۔ شاید پرائمیری نوٹ (promissory note) کو یگانہ ذکر بنایا گیا ہو۔ مگر بڑی میں اس قسم کے معاہدے کو IOU (I owe you) (میں آپ کا مقروض ہوں) بھی کہتے ہیں۔
- 33- پشنس (patience) تاش کا ایک کھیل۔ عام طور پر اسے صرف فرد واحد کھیلتا ہے۔
- 34- ساحرہ زنی سوف میں شاعر ورنہوین کے خلاف تحریک مزاحمت (1812) کے ہیرو اور ہیروئن (1784-1839) کے بعض اوصاف موجود ہیں لیکن یہ اشعار اس کے کام میں نہیں ملتے۔ (ماز)
- 35- بارکارول (barcarolle)۔ وینس کے، سمجھوں کا گیت۔ اس کی نقل میں جو دھن بنائی جائے، وہ بھی بارکارول کہلاتی ہے۔ اطالوی میں barca کشتی یا بجرے کو کہتے ہیں اور بارکارول (اطالوی barca ruolo) کشتی ران کو۔

حصہ دوم

- 1- مادام ڈسوزا، مادام ڈسوزا (1761-1838) ایک فرانسیسی ناول نگار تھی۔ اس کے جس ناول کا یہاں ذکر کیا گیا ہے، اس کا نام Emilie et Alphonse (ایملی اور الفنس) ہے۔ ماز کا بیان ہے کہ اسطفا نے ”جنگ اور امن“ کے ابتدائی مسودوں میں مادام ڈسوزا کے ساتھ ایک انگریز ناول نگار مسز (این) ریڈ کلف (1784-1823) کا بھی، جو ڈراؤ نے اور مہم جو یا ناول لکھا کرتی تھی، ذکر کیا تھا۔ اسطفا کی والدہ کی نسل اس دونوں خواتین کے ناول بہت ذوق شوق سے پڑھتی تھی۔
- 2- الٹا کر: ”روس کے زرعی غلام اور کسان اپنے چائے کے ٹک الٹا کر رکھتے تھے۔ یہ اس بات کا اشارہ ہوتا تھا کہ انھیں مزید چائے نہیں چاہیے۔“ (ہمارے قبائلی پٹھان بھی اسی روایت پر عمل کرتے ہیں مترجم)۔ ”روسی کسان اور زرعی غلام گڑ کی ڈلیں چائے میں حل نہیں کرتے تھے بلکہ پخت کی خاطر چمکیوں کے ساتھ تھوڑی تھوڑی کرتے

رہتے تھے۔“ (اڈ)

3- فری میسنوں کی برادری۔ ”روس میں فری میسنوں کی تحریک کا آغاز سترہویں صدی کے اخیرہ شمار میں صدی کے

آغاز میں ہوا۔ 1760 تک اسے شہر اعلیٰ حکام اس کے ارکان میں چکے تھے۔ میسنوں کی مقامی شاخ لائے کھلائی گئی اور اکثر و بیشتر روسی، جوں کا جرمن یا انگریزی جماعتوں سے تعلق تھا۔ (کتاب سوم کے آٹھویں باب میں جن نام نہاد سکاچستانی لاجوں کا ذکر آئے گا، وہ اصل جرمن ہی تھے۔) امپراطورہ کیتھرین نے 1790 میں ان لاجوں کو بند کر دیا تھا لیکن الیکساندر کے عہد حکومت میں تحریک پھر زندہ ہو گئی اور اس کے بہت دور رس اثرات مرتب ہوئے۔“ (اڈ)

4- نادی کوف۔ این آئی نادی کوف (1744 تا 1818) سرگرم فری میسن تھا۔ پیشے کے اعتبار سے وہ مکانی تھا اور نادی نغاری کا سخت مخالف۔ اسے 1792 میں قید کی سرپرستی لیکن کیتھرین کی وفات کے بعد 1796 میں رہا کر دیا گیا۔

5- مارتی نیست (Martinists): ایک فری میسنی مصنف ٹی۔ سی۔ دسار، مارتا (Martin) کے پیروکار۔ یہ لوگ مخفی سوم کو جدید زمانے کے حالات پر منطبق کرنے کے دعویدار تھے۔ نادی کوف (عاشیہ نمبر 4) نے، مارتا کی کتاب *Des erreurs et de la verite* (انماد وحقائق) کا روسی میں ترجمہ کیا تھا۔

6- ٹامس آکمپس (Thomas a Kempis) (1380 تا 1471) ایک جرمن راہب۔ اس کی دیہی تصنیف ”پیروانا مسیح“ (De Imitatione Christe) آج بھی پڑھی جاتی ہے۔

7- صرف سچ بولنا ہوگا۔ طالعہ کی سے فری میسنوں کی رسومات کی تفصیلات ماسکو کے رومانشیف میوزیم کی کتابیں اور مسودوں سے، جہاں کا بہت بڑا ذخیرہ موجود ہے، اخذ کی گئیں۔ 1866 کے ادوار میں اپنی اہلیہ کے نام خد میں اس نے لکھا تھا: ”کافی پینے کے بعد میں رومانشیف میوزیم چلا گیا اور وہاں تین بجے تک میسنوں کے دلچسپ مسواہ پڑھتا رہا۔ میں تمہیں بتا نہیں سکتا کہ ان کے مطالعہ کے بعد مجھ پر اضمحلال (depression) جس سے میں اب تک چھوٹا رہا نہیں پاسکا کیوں طاری ہو گیا۔ تکلیف دہ بات یہ ہے کہ یہ سب میسن فرے افس ہیں۔“ (اڈ) اور میں بھی پھل چوک میں فری میسنوں کی لاج تھی۔ اس کی پراسراریت کی وجہ سے عام لوگ اسے جادوگر کہہ کر دیتے تھے۔ ذرا التفار علی بھٹو کے عہد حکومت میں پاکستان میں فری میسن تحریک پر پابندی لگائی گئی کیونکہ اس کا ایک بڑا مقصد بیت المقدس میں بیکل سلیمان کی تعمیر نو بھی ہے۔ یوں اسے یہودیوں کی تحفہ تسلیم کہا جاتا۔ شرعاً میں اسے پاکستان آرٹس کونسل کی ثقافتی سرگرمیوں کا مرکز بنایا جانا تھا مگر جب نور شریف پہلی مرتبہ پنجاب کے وزیر اعلیٰ بنے ہوئے، انھوں نے اسے اپنا دفتر بنالیا۔ پرویز الہی نے چڑیا گھر کا کچھ حصہ بھی اس میں شامل کر لیا۔

B الف۔ مارتا (1743 تا 1793) (Jean paul Marat) فری میسنی صحافی اور انقلابی سیاستدان۔ تربیت کے اعتبار سے ڈاکٹر تھا اور سائنسی مفہمین اور کتب تحریر کیا کرتا تھا۔ 1789 میں اس نے ایک اخبار نکال دیا اور انقلاب کی حمایت کرنے لگا۔ وہ محنت کشوں کا پیرو تھا اور نیشنل کنونشن (جس نے بادشاہت کا خاتمہ کیا اور لوئی شانزدہم کو سزائے موت دی) کا رکن منتخب ہوا۔ ہم اس کے مخالفوں نے اسے قتل کر دیا۔

8- روسی میں اس کا تلفظ پوریس ہے۔

9۔ مجوزہ معاہدہ، یہ معاہدہ، جس کا یہاں ذکر کیا جا رہا ہے، فرانس اور پرشیا کے مابین طے پانا تھا اور آسٹریا نے اس کی پابندی کرنا تھی۔ اس سلسلے میں دونوں ممالک کے مابین اپریل 1807 میں برٹین سٹائن کے مقام پر گفتگو ہو رہی تھی۔ یہی یہ گفتگو جاری تھی کہ جون میں فریڈرک کا سرکہ پیش آگیا۔ اس سے پہلے 27 جنوری کو روسی فوجوں، جس کی کمان بے نگ سین کر رہا تھا اور فرانسیسی فوجوں کے، مابین پروئے سٹش آئی لڈ کے مقام پر جنگ، جس میں کسی فریق کا پتہ بھاری ثابت نہیں ہوا تھا، ہو چکی تھی۔ ان تمام باتوں کا نتیجہ روس اور فرانس کے امپراطوروں کے، مابین ملاقات کی (جس کا ذکر آگے باب نمبر 19 میں آئے گا) صورت میں نکلا۔ (یہی حاشیہ جات نمبر 15 اور 34 ملاحظہ فرمائیں۔)

10۔ عظیم دانش ور یہاں طاسطائی سے غائب پھر بھوں چوک ہوئی ہے۔ اسی باب میں چند سطور اور پڑنمرک کے ناظم الامور کو ”عظیم دانش ور“ کہا گیا تھا۔ یہاں منظم غالباً شیڈف ہے جس کا تعارف گونا گوں ”خوبیوں کا، لک“ کے طور پر کرایا گیا تھا۔

11۔ d'Urope: اس کا تلفظ ”یورپ“ ہو سکتا ہے۔

12۔ گلوگڈ ایک یورپی نصبہ ہے۔ آج کل پولینڈ میں ہے۔

13۔ فریڈرک (دوم) اعظم (1712-1786): پرشیا کا بادشاہ (1740-1786)۔ اس نے سات سالہ جنگ میں بچے حریفوں کو مات دی، اور پرشیا کو یورپ کی بڑی طاقتوں میں شمار کرایا۔ ولایت اور متعدد دیگر ادیب، شعرا اور فنکار اس کے دربار سے وابستہ تھے۔

14۔ چپل (Chapel) گرجا، کلیسا کا وہ مقام، جس کا اپنا نامہ معدہ ہوتا ہے، جہاں لگی یا انفرادی عبادت کی جاتی ہے اور بعض دیگر مذہبی رسوم کی ادائیگی ہوتی ہے۔ درگاہوں، رشتہ خاندانوں، خیلوں اور بعض اوقات گھروں میں چھوٹے کمرے تعمیر کر دیے جاتے ہیں یا عبادت کے لیے کمرے مخصوص کر دیے جاتے ہیں انہیں بھی چپل کہا جاتا ہے۔

15۔ ایلاڈ (پور) نام پروئے سٹش۔ آئی لڈ: ایک گاؤں (پہلے شرقی پرشیا، اور آج کل نوآزاد ملک ہائیلمبرگ میں شامل ہے)۔ یہاں روسی ورنرائسی فوجوں کے، مابین 27 جنوری 1807 کو لڑائی لڑی گئی۔ روسی فوجوں کی کمان بے نگ سین کر رہا تھا اور ان کے ایک تہائی جوان کھیت رہے۔ پندرہ مئی کو بھی بھاری نقصان اٹھانا پڑا۔ دونوں فریق فتح کے دعویدار تھے۔ (ادھر حاشیہ نمبر 9 دیکھیں۔)

16۔ پلسک پولینڈ کے دارالحکومت وارسا کے شمال میں ایک نصبہ۔

17۔ آسٹریلیا پولینڈ کا ایک اور نصبہ۔ وارسا کے شمال مشرق میں واقع ہے۔

18۔ کاسٹروما اور کریسیا: کاسٹروما ماسکو کے شمال مشرق میں اور کریسیا سابق روسی ریاست اور اب آزاد ملک یوکرین کا حصہ ہے کریسیا 1475 میں عثمانی ترکوں کے قبضے میں آیا۔ 1873 میں سے روس نے فتح کر لیا اور وہاں کے تاتاریوں کو جلا وطن کر دیا۔ عربی لفظ ”کریم“ سے بنا ہے۔

19۔ خانقاہ، سونوہ (Chantry) وہ خانقاہ، گرجا یا مائندہ مقدسہ، جہاں مروجہ عین کے لیے دعائے مغفرت مانگی جاتی ہے۔ ”روں میں سینٹ پیٹر اور سینٹ پال کے ایام ایک ہی تاریخ کو منائے جاتے ہیں، اس لیے جوڑ کے یہ دونوں سینٹ

مرلی تھے۔" (ماڈ)

20- فر (fir) سرو سے ملتا جلتا سدا بہار درخت۔ سعید فر تین سو فٹ بلند ہو جاتا ہے۔ موسیقی کے آلات بنانے میں بھی کام آتا ہے۔

21- برج نصف کرہ شمالی کا خوبصورت درکار آمد درخت۔ لکڑی اور پھلکادوں کام آتے ہیں۔ چھلکے سے دھریاں اور چھوٹی کشتیاں اور لکڑی سے فرنیچر بنتا ہے۔ یہ درخت برصغیر میں نہیں ہوتا تاہم کولنز (Collins) انگلش ڈکشنری کتب سے کہ لفظ 'برج' سنسکرت لفظ 'بھرج' (bhurja) سے مشتق ہے۔

22- مارشل (Marechal de la noblesse) شرفا ور پڑے زمینداروں کا منتخب نمائندہ۔ (ماڈ)

23- سمونسک، سکو کے جنوب مغرب میں روس کا نویں صدی سے اہم تجارتی مرکز۔ یہاں پولین کی سپاہ اور روسی فوج کے مابین گھمسان کارن پڑے گا۔

24- یخانو فو (سوجورہ نام مٹکونف)۔ ماسکوا اور سمونسک کے مابین ایک قصبہ۔

25- بال موٹڈیں: اٹھارہویں صدی کے اواخر میں اسپر اطورہ کی تحریک نے زرعی غلاموں کو عملاً جاگیرداروں کا غلام بنایا تھا۔ جاگیردار اپنے غلاموں کو طمانہ سے طمانہ مرادے سکتے تھے اور انھیں سائیر جلا وطن کر سکتے تھے۔ جس غلاموں کو سائیر یا بھیجا جاتا تھا، ان کے سرائیک طرف سے موٹڈ دیے جاتے تھے تاکہ اگر وہ فرار ہوں تو آسانی سے پکڑے جاسکیں (اے این وین اور ماڈ)۔

26- ہرڈر (Johann Gottfried Herder) (1744 تا 1803) جرمن فلسفی و شاعر۔ شروع میں کاتھولک کا شاگرد تھا اور بعد میں اس کا ناقد بن گیا۔ اس نے ایک قسم کی مذہبی نہایت پسندی (humanism) کو، جو اس کے شیکسپیر ہو مر اور بائبل کے مطالعے پر مبنی تھا، فروغ دیا۔

27- "اللہ لوگ" (God's folk) حاسطائی کی پھو بھی گاؤں میں ایکساندرا الی پچھا آہستہ سا کہ جس نے حاسطائی کی والدہ کے انتقال کے بعد اسے اور اس کے بہن بھائیوں کو اپنی تحویں میں لے لیا تھا، اس قسم کے نیم پاگل اور عجیب و غریب لوگوں کو، جو قریب قریب گھومتے پھرتے رہتے تھے، بہت پسند کرتی تھی اور اکثر ان کی خاطر مدارت کرتی رہتی تھی۔ یہ بے گھراور بے درخانہ بدوش لوگ زمانہ قدیم سے روس میں موجود ہیں۔ انھیں ارضی رشتوں سے کوئی تعلق و ربط نہیں ہوتا اور نہ ان کا کوئی پیشہ ہوتا ہے۔ بے نام خواہش انھیں جگہ بہ جگہ گھماتی پھرتی رہتی ہے۔ یہ جیسی نہیں ہوتے لیکن جیسیوں کی طرح گاؤں بہ گاؤں اور شہر بہ شہر پھرتے رہتے ہیں۔ ان کی ہادیہ پائی کا مفہوم کسی کو بھی معلوم نہیں۔ مجھے یقین ہے کہ اگر کوئی شخص ان سے پوچھ لے کہ وہ کہاں یا کیوں جا رہے ہیں، وہ کوئی جواب نہیں دے پائیں گے۔ اس کے علاوہ شاید اور کوئی ٹھوس وجہ نہیں ہوتی کہ وہ اپنے ماضی یا گھر کی یادوں (nostalgia) سے فرار حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ یہ خالصتاً روسی تجربہ ہے، اسے نہ الفاظ میں بیان کیا جاسکتا ہے نہ سمجھا یا جاسکتا ہے اور نہ کثر اس کا کوئی مقصد ہوتا ہے۔" (حاسطائی بحوالہ Alex de Gonge لائف اینڈ ٹائٹل آف راسپوتین)۔ حاسطائی نے اس قسم کا ایک کردار کریشا، جسے وہ روسی میں yurodivy (پاکباز بہ صوفی noly

(Idiot) کہتا ہے، اپنے نام Childhood ("بچپن") میں پیش کیا ہے۔ گرچہ کا جسم بھونڈا اور گندہ، آنکھیں دھشت زدہ اور گنگناہے ربط ہے۔ واسطائی نے ادائل عمری میں اس قسم کے لوگ اپنے گھرا زادیکھے ہوں گے۔

28 پرتوت، جنرل ایم۔ آئی پاتوف (1818-1775) روسی جرنیل سو روف اور کوتوزوف کے ساتھ مختلف جنگوں میں شریکہ ہا۔

29 ہارشل دیدی نو ایک فرانسیسی فوجی دشر۔

30 نہ دن لوں کو رسد فراہم کی گئی اور نہ گھوڑوں کے لیے چارہ چھینا ماڈ نے روسی مورخ مینے لوفسکی دایلفسکی کی کتاب "1807-06 کی جنگوں کی تفصیلات" کے حوالے سے لکھا ہے "موسم بہار میں اناج کی قلت نے ہائی کمان کو ناکس بنادیا اور فوجی نظامیہ میں جو خرابیاں رونہ ہونے لگی تھیں، وہ انھیں روکنے میں ناکام ہو گئے۔ یک مرتبہ بے نگ سین نے فوج میں وقہ کشی کی رپورٹ کے جواب میں لکھا 'برداشت کا ملکہ ہونا چاہیے۔ خود میرے ذر پر صرف تین کھانے ہوتے ہیں۔' شیاے خوردنوش خریدنے کے لیے رقم فراہم کردی حاتی لیکن جہاں خریدنے کے لیے، شیاہی موجود نہ ہوں، وہاں رقم کی کرتی۔ بعض اوقات جرنیل ایک دوسرے کی رسد کی گاڑیاں ہتھیا بیٹے اور بے نگ سین کے ہرادر دستے تک ڈنل رودنی شاید ہی کبھی پہنچتی۔ جو لوں کے جسم پھولنے اور اران کی اسوات ہونے لگیں۔ ہسپتالوں کا حال ناگفتنی تھا۔"

31 سوئی کا (Svay Ka)، اسے انگریزی میں quotes کہے ہیں۔ quot لڑے پاری کا چھل ہوتا ہے۔ یہ چھلا کھوٹی کے گرد پھینکا جاتا ہے۔ نمراس کھلاڑی کو ملے ہیں جو چھلا کھوٹی کے گرد پیٹنے میں کامیاب رہتا ہے۔

32 تکیانن یہ وہی تکیانن ہے جس نے رستوف کا پرس چرایا تھا۔ (کتاب اوں، حصہ اول، باب چہارم)

33 ہائفس (typhus)، ایک قسم کا متعدی بخار جسے مختلف اقسام کے جراثیم پسوڈس، جوڈس اور دیمک کے ذریعے پھیلتے ہیں۔ اس مرض میں شدید سر درد ہوتا ہے، بخار سے جسم پھٹکا ہے اور اس پر انخوانی داسے نکل آتے ہیں۔ مریض انفرادی کا شکار ہو جاتا ہے اور بعض اوقات اس پر ہڈیانی کیفیت بھی طاری ہو جاتی ہے۔

34 ٹلزٹ (Tilsit)۔ موجودہ نام سادسک (Sovetsk)۔ دریائے نیمن پر روسی میڈریشن کا تجارتی، صنعتی اور تہذیبی مرکز۔ پہلے یہ شہر مشرقی پریشیا میں شامل تھا۔ ٹلزٹ میں روسی اور فرانسیسی، پیرا طوروں کی تیرہ جوں کو جولامات ہرئی اس میں معاہدہ امن، جو پانچ سال برقرار رہنا تھا، طے پایا۔ دو گھنٹے کی اس ملاقات میں شاہ پریشیا کو بدعنوانی کیا گیا تھا۔ اگلے روز اسے مذکرات میں شامل تو کر لیا گیا لیکن پولین اس کے ساتھ بہت حقارت سے پیش آیا۔ ڈکے مطابق روسی رجسٹ کے پاس تقری برتن نہیں تھے۔ یوں وہ فرانسیسی رجسٹ کی طرح ٹھاٹ دار دعوٹ منعقد نہ کر سکے۔ (اوپر حاشی جات نمبر 9 اور 15 ملاحظہ فرمائیں)۔

35 خدمت گار خدمت گار سے مراد کوئی گھر لے قسم کا ملازم نہیں۔ یورپی ممالک کے بادشاہ امرا اور روسا کے خاندانوں کے افراد منتخب فوجی عہدوں پر تعینات کرتے تھے۔ انھیں جنٹل مین سو بجر (یا نامٹ) کہا جاتا تھا۔ لیکن ہر شخص نامٹ نہیں بن سکتا تھا۔ اسے مختلف مراحل میں سے گزرنا پڑتا تھا۔ نو عمر کے پہلے کسی نامٹ کی خدمت کرتے تھے (جیسے

- ہاں ہاں کاہوں اور کارنگروں کے شاگرد ہوتے ہیں، اس وقت یہ خدمت گار (page) کہلاتے تھے۔ اگر کے
 بعد squire بنتے تھے۔ پھر کہیں ماسٹ بننے کی باری آتی تھی۔
- 36- لیجن آف آئر: فرانس کا اعلیٰ ترین اعزاز۔
- 37- آرڈر آف سینٹ آندرے: نروے کے عہد کے روس کا اعلیٰ ترین اعزاز۔
- 38- گیلکس (واحد: gallus جمع: galluses) معلوم نہیں یہ انگریزی کا علاقائی لفظ جو gailows (پہاڑی کا تختہ) سے
 مشتق ہے، اردو میں کیسے داخل ہو گیا۔ مہذب انگریز اور امریکی braces استعمال کرتے ہیں۔ ویسے سب کیس کا
 رواج کم ہی رہ گیا ہے۔

حصہ سوم

- 1- ارفورٹ (Erfurt) وسط جرمنی کا ایک قدیم شہر۔ تجارتی اور صنعتی مرکز۔ اس کی یونیورسٹی میں، جو 1393 میں قائم ہوئی
 لیکن 1816 میں بند ہو گئی، پروٹسٹنٹ تحریک کے بانی مارٹن لوتھر نے تعلیم پائی تھی۔
- 2- چھٹکارا گت (quitrent) روسی جاگیرداروں کے کارندے عملاً ان کے غلام (serf) تھے۔ وہ نسل بہ نسل ان کی
 زمینوں پر کام کرتے اور کسی بھی دوسری جگہ نہ جاسکتے۔ چھٹکارا لگان کے نظام کے تحت انھیں ایک تعداد میں دے
 دیا جاتا، وہ اس پر بطور مزارع کام کرتے، جو بچت ہوتی، اس میں سے وہ مزید رقم مالک کو دیتے اور جب چند
 سالوں کے بعد وہ طے شدہ رقم ادا کر دیتے، انھیں اجازت ہوتی کہ وہ چاہیں تو خود مختار مزارع کی حیثیت سے سابق
 مالک کی زمینوں پر کاشتکاری کرتے رہیں، چاہے کہیں اور چلے جائیں۔
- 3- ریپازان: ماسکو کے جنوب مشرق میں واقع روسی شہر۔
- 4- باکس یورپی ممالک میں بارش سے بچنے کے لیے گاڑی میں سوار یوں کی نشستیں چاروں اطراف سے بند ہوتی تھیں
 اور اوپر چھت ہوتی تھی۔ کوچوں انگ نشست پر، جو سوار یوں کی نشستوں سے نسبتاً اونچی ہوتی تھی، بیٹھتا تھا۔ اسے
 باکس کہتے تھے۔
- 5- آلڈر: نصف کرہ شمالی کا بید سے ملتا جلتا درخت۔ زیادہ تر وادیوں میں پایا جاتا ہے۔
- 6- پرواز کرنے لگوں: "طالسطائی نے سات یا آٹھ سال کی عمر میں ٹھہرہ گز (چون فٹ) اونچی کھڑکی میں سے پرواز
 کرنے کی کوشش کی تھی اور جب وہ نیچے گرا، اندرون سر، جھجی خاصی چوٹیں آئیں۔" (ماز)
- 7- پیے راسکی: ایم۔ ایم۔ پیے راسکی (1772-1839) دیہاتی پادری کا بیٹا تھا۔ اس نے اپنی اصلاحیتوں کے لیے
 پرسول سروں میں زبردست اور بہ سرعت ترقی کی۔ 1818 میں وہ زار کا مشیر برائے داخلی امور مقرر ہوا۔ اس نے
 روس میں مالیاتی اور انتظامی امور میں اصلاحات کا بیڑا اٹھایا۔ اس کے 1809 کے منصوبے پر، جس میں دوسری
 اصلاحات تجویز کی گئی تھیں، صرف جزوی طور پر عمل ہوا۔ اس نے قوانین کی اصلاح کے لیے جو کمیشن مقرر کیا

پریس آندرے نے (آگے باب چھ میں اس کا ذکر آئے گا) اس پر کام کرنا ہے۔ پے رانسکی نے اصلاحات تو، نین کا مسودہ قوانین نپولین (Code Napoleon) سے اخذ کیا تھا۔ ماسکو کے حکام اور سرکردہ شہری، جن کی قیادت رستوپ چین کر رہا تھا، اس کے سخت خلاف تھے۔ رستوپ چین کہتا تھا کہ وہ روس کی بدروح (evil genius) اور فری میسنوں کا لیڈر ہے۔ اسے 1812 میں نپولین کے حملے سے ذرا پہلے نوکری سے نکال دیا اور شہر بدر کر دیا گیا۔

8- ایسسر (Assessor) شعبہ محصولات کا افسر۔ اس کا کام محصولات کی تخمین کرنا ہوتا تھا۔ سول سرورس کے گیارہ درجوں میں اس کا درجہ چھٹا اور ٹیسٹ کنٹرولر کا پانچواں ہوتا تھا۔ ایسسر بلحاظ عہدہ ایسٹینٹ کرنل ورسٹ کنٹرولر کے برابر ہوتا تھا۔

9- کنسل آف ٹیسٹ: ایک قسم کا قانون ساز ادارہ۔

10- آراک چیف (Arakcheyev)۔ کاؤنٹ الیکسی آراک چیف (1769-1834) زار الیسا ندر کا فوجی مشیر تھا۔ اس کی تقرری اس امر کی علامت تھی کہ اب زار اصلاحات سے تائب ہو چکا ہے اور رجعت پسند بن گیا ہے۔ آراک چیف کی بدنامی کا ایک سبب وہ عسکری بستیاں بھی تھیں جہاں کے باسیوں کو سخت تعزیری قوانین کے تحت فوجی خدمات بھی سرانجام دینا پڑتی تھیں اور ذراعت کا کام بھی کرنا پڑتا تھا، نہ صرف پوٹشکن اور اس کے معاصر وانشور بلکہ اکثر جرنیل بھی ان بستیوں کو سخت ناپسند کرتے تھے

11- ”سیلا آندرچ“۔ ”سیلا“ کا مطلب ”قوت“ ہے۔ چنانچہ ”سیلا آندرچ“ کا مفہوم ”زور آور آندرچ“ ہوا۔

12- کاؤنٹ (دی۔ پی) کوچو بی (1775-1834)۔ 1802 سے 1807 تک روس کا وزیر داخلہ رہا۔

13- امپراطورہ کیترین: امپراطورہ کیترین دوم (1729-1796)، جسے کیترین اعظم بھی کہا جاتا ہے، نسلاً جرمن شہزادی تھی۔ اس نے روس کے دی عہد سے جو 1762 میں پیتر سوم کے نام سے تخت نشین ہوا، شادی کی۔ پیتر سوم کمزور حکمران تھا۔ چند ہی مہینوں کے اندر کیترین نے اسے معزول کیا (اور بعد میں اسے مروا دیا) اور خود حکمران بن بیٹھی۔

اس کے عہد حکومت میں بہت سے علاقے فتح ہوئے اور روس میں مثال ہوئے۔ روس کا موجودہ نقشہ اسی کارہن منت ہے۔ اس کا سب سے بڑا ظلم یہ تھا کہ اس نے ان علاقوں (مثلاً یوکرین) میں بھی، جہاں زرعی غلاموں کا کوئی تصور نہیں تھا، یہ نظام رائج کر دیا۔ اب زرعی کارندے ”مالک کی اجازت کے بغیر کہیں نہیں جاسکتے تھے۔ جاگیرداران کا مالک بن گیا۔ اگرچہ اندازوں میں تھوڑا بہت اختلاف پایا جاتا ہے لیکن کہا جاتا ہے کہ اس کے عہد حکومت کے اختتام تک روس کی، دلی آبادی غلام بن چکی تھی اور یہ غلام، امریکا کے حبشی غلاموں کی سی زندگی گزارتے تھے۔“ (اے۔ این۔ ولسن)

14- مونتیس کیو (Charles Louis Montesquieu) (1689-1755): فرانسیس کا نامور ماہر قانون اور سیاسی

متفکر۔ اس کا شمار فرانسیسی روشن خیالی کی تحریک کے اولین اکابر میں ہوتا ہے۔ اس کی دو کتابیں بہت مشہور ہوئیں۔

”خطوط فارس“ (1721) میں بادشاہت کے نظام پر ڈھکی چھپی چوٹیں کی گئی ہیں، اور ”روح قوانین“ میں حکومت کی مختلف صورتوں کو بری بحث کیا گیا ہے۔ ماڈ کے بقول پے رانسکی خود بھی ”روح قانون“ کا مداح تھا۔

15- جینینین (565-483): ہارنطینی شہنشاہ (527-565)۔ اس نے روسی قوانین پر نظر ثانی کرائی اور نئے قوانین

جو اس کے نام پر شاید جتینیں کہلاتے ہیں، وضع کرائے۔ قسطنطنیہ کا مشہور زمانہ گرجا سینٹ صوفیہ، جو اب مسجد ہے، اسی کے عہد میں تعمیر ہوا تھا۔

16- گندھک، پودہ اور نمک ماڈ کے بقوں اس زمانے کے بعض رومی مسیحی گماری میں بہت دلچسپی لیتے تھے۔

17- فرقہ عقلیہ و جمہوریہ (Illuminati) اس فرقے کی بنیاد جرمنی کے ایک شہر دیر ہاپٹ میں سن 1776 میں رکھی گئی۔ فری میسنری کی طرح یہ بھی خفیہ فرقہ تھا۔ اس کے پیروکار جمہوریت اور روشن خیالی کا پرچار کرتے تھے، خدا کو ماننے تھے لیکن تنزیل (revelation) کے منکر تھے۔ 1785 میں حکومت نے اس فرقے پر پابندی لگا دی۔

18- تین دن "عالم لسطائی" سے چند مواقع پر کھلے بندوں تقریر کرنے کی کوشش کی تھی لیکن اس کا تجربہ بھی خوشگوار ثابت نہ ہوا۔ یہ واقعہ اس کے اسی قسم کے تجربے کی یاد دلاتا ہے۔ "ماڈ"

19- گارٹ روڈنٹسہیف 1807 میں روس کا وزیر خارجہ تھا۔ 1809 میں وہ چانسلر (وزیر اعظم) مقرر ہوا۔

20- کولین کوخ (Caulaincourt)، مارکوئیس ڈی کولین کوخ 1807 سے 1811 تک پیٹرز برگ میں فرانسیسی سفیر تھا۔

21- ارفورٹ (ادبیہ شیعہ نمبر 1 ملاحظہ فرمائیں)۔ یہ ملاقات 1808 کے موسم خزاں میں الیکساندر، نیپولین، اور شاہ پرٹیا کے مابین ہوئی تھی۔ اس میں نیپولین نے فرانس اور روس کے مابین معاہدے کی تجویز پیش کی تھی تاہم الیکساندر نے روسی عوام کے رد عمل کے پیش نظر یہ تجویز مسترد کر دی، "البتہ جب نیپولین نے یہ وعدہ کیا کہ وہ یورپی ممالک میں مداخلت نہیں کرے گا الیکساندر نے اسے فن لینڈ اور گمر ہو سکے تو دریائے ڈینیوب کے خطے میں ترکی کے علاقے پر قبضہ کرنے کی اجازت دے دی۔" (ماڈ)

22- پرنس ڈیئے (de Ligne)۔ (1735-1841) فرانسیسی فوجی افسر، سفارت کار اور مصنف۔ وہ کچھ عرصہ روس میں مقیم رہا اور امپریل طورہ کیتھرین کے دور میں کریمیا (1787) میں اس کے ساتھ رہا۔

23- آدونائی (Adona)، یہودی خدا کو آدونائی، Jehovah (یا یہو) کہتے ہیں۔ اصل عبرانی زبان میں خدا کے لیے چار حرفی لفظ (tetragrammaton) جسے انگریزی میں YHWH یا JHVH (Yahwah or Jehovan) لکھا جاتا ہے، مستعمل ہوتا ہے۔ چونکہ فری میسنری تحریک بنیادی طور پر یہودی دین کی پیداوار ہے، اسے پر اسرار بنانے کے لیے اس قسم کے الفاظ استعمال کیے گئے۔

24- الوہیم (Elohim) خدا کا ایک اور عبرانی نام۔ "پرانا عہد نامہ" میں یہ نام بار بار استعمال ہوا ہے۔ اصل یہ عبرانی لفظ Eloah (عربی اللہ) کی جمع ہے۔

25- نذر سلیمانی "پرانا عہد نامہ" میں ایک طویل ڈرامائی عشقیہ نظم شامل ہے۔ اسے عام طور پر حضرت سلیمان سے منسوب کیا جاتا ہے۔ اسے "گیتوں کا گیت" یا "غزل الغزلات" (Song of Songs) بھی کہا جاتا ہے۔

26- لیو دینا: کسی زمانے میں یہ بحیرہ بانگ کے کنارے آزاد مملکت تھی۔ آج کل اس کا کچھ حصہ سابق روسی ریاست تاتار اور کچھ استونیا میں شامل ہے۔ یوں اب اس کا نام بھی باقی نہیں رہا۔ (لتویا اور استونیا اب آزاد مملکتیں بن چکی ہیں۔)

27- جٹل مین: وہ شخص جس کا تعلق معاشرے کے اونچے اور نجیب طبقے سے ہو۔

28- لگاں، انیسویں صدی کے قلم عرصے میں روسی حکومت کا یہ دستور رہا کہ وہ جن اشخاص کو ن کی خدمات کے عوض انعام و اکرام دینا چاہتی تھی یا اپنے منظور نظر لوگوں کو نوارنا چاہتی تھی، انھیں بعض سرکاری زمینوں کا مکان وصول کرنے کا اختیار دے دیتی تھی۔ (ماڈ)

29- گھوگر پٹیاں (Curl papers) ایک قسم کے نرم مائٹ کاغذ۔ بالوں کو گھوگر یا لے بنانے کے لیے ان میں لٹیں خاص طریقے سے پیٹ دی جاتی ہیں۔

30- ایک جوڑ کو 'نشاہ بند ہاتھ' کے جوڑوں اور پوروں سے پہنے ٹار کر رہی ہے۔ انگلیوں کے جوڑ ان مہیوں کی، جن کے 31 رں ہوتے ہیں اور پوراں مہیوں کی، جن کے ایام 36 سے کم ہوتے ہیں، نمائندگی کر رہے ہیں۔ ماڈ کا خیال ہے کہ گشت تک پہنچنے کے لیے اسے درابہر پھیری کرنا پڑے گی

31- کاروینی (Maria Luigi Cherubin) (1760-1843): اطالوی موسیقار۔ وہ بنیادی طور پر ویولن کی موسیقی ترتیب دیتا تھا۔ اس نے زندگی کا بیشتر حصہ ورس میں گزارا۔

32- ماریا آنتونوونا، ماریا آنتونوونا تاتار شکینا (1779-1854): کانی عرصہ الگ انداز کی معشوقہ رہی۔

33- سر تشریفات (Master of Ceremonies) وہ عہدیدار جو سرکاری تقریبات، ضیافتوں اور رسمی مواقع پر تہیہ کی کلمات کہتا ہے، دوسرے مقررین کا تعارف کراتا ہے۔

34- گرورس (A.A. Gervais): وزارت خارجہ کا اعلیٰ کار و درپے رانسکی کا رشتے دار تھا۔

35- ماگنٹسکی (M.L. Magnitsky) (1778-1855): بے رانسکی کا دوست اور گٹھ جوڑ میں اس کا مددگار تھا۔ اسے 1812 میں جلا وطن کر دیا گیا تھا۔

36- ستالی پین (A.A. Stolypin): سینٹ کا ممبر اور امیر کیرزمیندار تھا۔

نوٹ: بیرن ایم اے کارف کی کتاب "حیات کا ڈنٹ ہے رانسکی" (1861) میں بے رانسکی کی بیٹی کی باراتیں بھی شامل ہیں، حالانکہ انھیں یہاں اپنے ڈھب سے استعمال کیا ہے اور خوب بھداڑ کی ہے۔ (ماڈ)

37- پورٹ: تیز سرخ دھیریں شراب۔ کھانے کے بعد پی جاتی ہے۔

38- نیولین کے اقدامات نیولین نے 1807 میں ہپ نوئی وپرتگان جزیرہ نما پر یورش کردی تھی۔ اگلے سال اس نے اپنے بھائی جوزف کو، جو اس وقت شاہ نیپلز تھا، فروی سندھم کی جگہ ہپ نیے کا بادشاہ بنادیا۔ تاہم 1810 میں برطانوی جرنیل ڈیوک آف انگلن کی فوج ورسپ نوئی گوریلوں نے فرانسیسیوں کا علاقہ بند کرنا شروع کر دیا اور 1813 میں انھیں مکمل طور پر ملک سے نکال باہر کیا۔

39- بوسٹن (boston) آکشن برج (auction bridge) سے ملتا جلتا شاکھیل۔ ماڈ کے مطابق یہ کھیل امریکا کی جنگ آزادی کے دوران میں فرانسیسی افسروں نے امریکی شہر بوسٹن (ریاست میساچوسٹس) میں ایجاد کیا تھا۔ آج کل عالمیہ کہیں بھی نہیں کھیل جاتا۔

40- ترکی میں ہلاک ہو گیا، ٹلزلٹ کا معاہدہ طے پا جانے کے بعد روسیوں نے ایک بار پھر سلطنت عثمانیہ کے خلاف کاکیشیا

اور دریائے ڈیوب کی وادیوں میں جنگ چھیڑ دی تھی۔ شروع میں انھیں خاصی ہزیمت کھانا پڑی۔ تاہم جب کوئٹہ دف کمانڈر انچیف مقرر ہو گیا، پھر انھیں کچھ کامیابیاں حاصل ہو گئیں۔

حصہ چہارم

- 1- کریمن چک سابق روسی ریاست یوکرین (اب آزاد ملک) کا (سج کل) ایک ریلوے چٹکشن۔ پہلے معمولی تقریر کی کیفیت۔ یوکرین کا صدر مقام اور سابق سوویت یونین کا تیسرا بڑا شہر۔ روایتاً عیسائیت کا گڑھ سمجھا جاتا ہے۔
- 2- کلیہ مربع متکوس (Inverse Squar Law)۔ اس کلیے کے تحت کشش ثقل، شعور (illumination) وغیرہ کی شدت قاصیے کے مربع (کسی عدد کو اسی عدد سے ضرب دینا، مثلاً تین کا مربع $3 \times 3 = 9$ ہوگا) کے تناسب متکوس (ایک چیز چشتی کم ہوگی، دوسری اتنی ہی بڑھ جائے گی) کے مطابق کم ہو جائے گی۔
- 3- رانی (Rye) ایک قسم کا نلہ، جو شمالی یورپ میں پیدا ہوتا ہے۔ کھایا بھی جاتا ہے اور اس سے وکی شراب بھی بنتی ہے۔
- 4- بک ویٹ (buckwheat) ایک قسم کا اناج۔ عام طور پر گھوڑوں اور مرغیوں کو کھلایا جاتا ہے۔ امریکا میں اس کی نکلیاں ناشتے میں کھائی جاتی ہیں۔ ناڑا، فصل کٹنے کے بعد پودوں کا جو حصہ زمین کے اوپر رہ جاتا ہے اسے یہاں میں ”مڈھ“ انگریزی میں stubble اور پلانٹس (plant) کے مطابق اردو میں ”ناڑا“ کہتے ہیں۔
- 5- شکار کے لیے۔ بہتر سحر نہیں ہو سکتی ”جس قسم کے سگ ہائے تازی یا شکاری کتوں کا یہاں ذکر کیا گیا ہے، وہ بھاگنے میں پھرتیلے نہیں ہوتے لیکن ان کی قوت شامہ بہت تیز ہوتی ہے۔ وہ اپنی قوت شامہ سے شکار کا کھوج لگاتے ہیں اور اسے گھیر گھر کر مظلوم بہست میں لے آتے ہیں۔ شکار کو پکڑنے اور ہلاک کرنے کا فریضہ بارزوی کتے (پچے حاشیہ نمبر 7 دیکھیں) سر انجام دیتے ہیں۔ بارزوی کتے کی قوت شامہ بہت معمولی ہوتی ہے اور شکار کا تعاقب بھی کرتا ہے جب وہ اسے دیکھ لیتا ہے۔ شکار اسے دکھانا پڑتا ہے تعاقب کرتے کرتے وہ بعض اوقات اس کی نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے، تب بھی شکاری کو اس کی توجہ اس کی طرف دلانا پڑتی ہے۔ اگر شکار مردہ ہونے کا ڈرامہ کرے، بارزوی کتے کے ہاتھ پاؤں پھول جاتے ہیں اور اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کرے اور کیا نہ کرے۔ (ماڈ) باب ششم میں اسی قسم کا ایک واقعہ بیان کیا جائے گا۔ تعاقب کے دوران میں خرگوش اچانک بیٹھ جائے گا اور بارزوی کتا اسے پکڑنے سے محترز رہے گا۔
- 6- بارزوی کتا ایک روسی کتا۔ اس کا قد کاٹھ خاص بڑا لیکن جسم نسبتاً دبلا ہوتا ہے۔ اس کا سر بگ اور نوک دار اور اس کے جسم پر سفید بال ہوتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ اس کی نسل بھیڑیے کے ملاپ سے چلی تھی۔ روسی زبان میں بارزوی کے معانی ”تیز رفتار“ ہیں۔ وپر حاشیہ نمبر 6 بھی دیکھیں۔
- 7- سرکیشیائی وہ چیز یا شخص جس کا تعلق سرکیشیا سے ہو۔ سرکیشیا تفتاز کے قریب روس کا ایک جنوب مغربی علاقہ ہے اور آبادی بھی زیادہ تر تفتازی ہے۔ کہتے ہیں کہ یہاں کے باشندے راجانی حسن و جمال کے مالک ہیں۔ کوہ تاف کی

پریاں بھی شاید نہیں کی تھیں۔

9- آرج ذیکن (archdeacon)۔ کلیسا، بالخصوص کلیسائے انگلستان کا ایک اعلیٰ عہدہ دار۔ یہ شپ (اسقف) کے نائب کے طور پر کام کرتا ہے۔

10- ”پڑ“ آج کل تو خیر تھریشر (thresher) کا زمانہ ہے لیکن کچھ عرصہ قبل بھوسے سے نالغ الگ کرنے کے لیے بیل اور دوسرے جانور استعمال ہوتے تھے اور جس جگہ یہ کام ہوتا تھا، اسے پنجابی میں ”پڑ“ اور انگریزی میں threshing floor کہتے ہیں۔ اردو کا متبادل کہیں سے نہیں مل سکا۔

11- بارڈو سرخ یا سفید انگوری شراب، جو فرانس کی جنوب مغربی بندرگاہ بارڈو (Bordeaux) کے ارد گرد کے علاقے میں کشید کی جاتی ہے۔

12- مسخرہ روس کے جاگیردار بادشاہوں کی طرح اپنے دیہاتی مکانوں میں مسخرے رکھا کرتے تھے اور یہ رواج انیسویں صدی کے آخر تک جاری رہا۔ ماڈ کا بیان ہے کہ 1862 میں جب حاکماتائی کی بیوی شادی کے بعد اس کے دیہی مسکن یا ستا پو پانا آئی، اسے وہاں آیشا ”دیکھی“ ملا جس کے متعلق حاکماتائی نے بعد میں نہایت ام ناک کہانی لکھی۔ یہ آلیٹ ایک قسم کا مسخرہ ہی تھا۔

13- سوا لوٹیل (Swallow tail) اسے ٹیل کوٹ یا ٹیلو (tails) بھی کہتے ہیں۔ کسی زمانے میں مکمل ایوننگ ڈریس کا جزو ہوتا تھا۔

14- ساؤنڈنگ بورڈ۔ ایک قسم کی پتلی تختی جو باجوں میں آواز کو بڑھانے کے لیے لگا دیتے ہیں۔

15- ٹگر بورڈ کٹار، داکٹن اور ان کی طرح کے دوسرے باجوں میں سخت لکڑی کی لمبی تختی، جس پر تاریں انگلیوں سے روکی جاتی ہیں۔

16- چھوٹی دینگن (wagonette)۔ گھوڑا گاڑی۔ اس کی عقی جانپ دوسروں کی نشستیں ہوتی تھیں۔ کوچوان اگلی جانب بیٹھتا تھا۔

17- دوشکی (doshky)۔ چار پہیوں کی گھوڑا گاڑی۔ اس کی چست نہیں ہوتی تھی۔ کسی زمانے میں روس میں عام چلتی تھی۔

18- ڈیٹر: افسانوی کردار نہیں بلکہ جیتا جاگتا انسان تھا۔ اس زمانے میں، اسکو میں موسیقی کی تعلیم دیا کرتا تھا۔ (ماز)

19- تیرہ درجے فارن ہائیٹ۔ اس زمانے میں روس میں فرانسیسی ماہر طبعیات ریچے دو ایومر (Reaumur) کا مقیاس اکثر اہل جوای کے نام سے مشہور ہے، مردوح تھا۔ اس پیمانے کے مطابق نقطہ تجمد صفر درجہ اور نقطہ کھولہ 80 درجے ہوتا ہے۔ یوں حاکماتائی نے منحنی تیرہ درجے فارن ہائیٹ کو منحنی تیس درجے رایومر لکھا ہے۔

20- مرغھا۔ واسنے اٹھالہ ڈوہ ان چیزوں کے ذریعے اپنی قسمت کا حال معلوم کرنا چاہتی تھی۔ ماڈ کے مطابق کرسک پر دانہ کھلانے کے بعد مرغھوں کو چلا پھرا کر قسمت کا حال معلوم کرنے کا عام دستور تھا۔

21- اوڈیسہ (Odessa)۔ بحیرہ اسود کے کنارے یوکرین کی بندرگاہ اور صنعت و حرفت، فنون اور سیاحت کا اہم مرکز۔ اسے چودھویں صدی میں تاتاریوں نے آباد کیا تھا۔ پھر یہ ترکوں کے قبضے میں آ گیا۔ اب یہ زبردست تیزی اڑ رہا ہے۔

- 22- مذعاسکر موجودہ نام (الاکاسی) جنوب مشرقی، فریقہ کا جزیرہ۔ 1896 میں فرانس کے ہتھے چڑھا، 1960 میں آزادی ملی اور 1975 میں جمہوریہ قرار دیا گیا۔
- 23- دو۔ دو (Aquarius or Water-Carrier) یا کنبر۔ علم نجوم میں آسمان کا گیارھواں بدن، اس میں سورج میں جنوری کو داخل ہوتا ہے اور، ٹھارہ فروری تک رہتا ہے۔ نقاشا جس ادھیرا کی دھن بجا رہی ہے، اس کا ام بھی Water-Carrier تھا اور یہ انتخاب اس کی موجودہ ذہنی کیفیت کے عین مطابق ہے۔
- 24- فیلڈ (John Field) (1782 تا 1837)۔ کرش یہ نونوا اور موسیقار۔ 1804 سے 1831 تک بیٹرز برگ میں مقیم رہا، وہ اپنی شبینہ دھنوں (nocturnes) جو شام یا رات کی کیفیت کو جا کر کرتی ہیں) کے لیے بہت مشہور۔ روسی ناول نگار اور شاعر پاسترناک نے اپنی خود نوشت سوانح میں لکھا ہے کہ فرانسیسی نژاد پوسٹالی موسیقار ٹوپاں (Chopin) نے نیلا کی دھنوں کو نئے معانی عطا کیے۔
- 25- سو گئی یہاں انگریزی مترجمین نے ٹگریزی لفظ mummer جو بدست خود فریبی لفظ mummar سے مشتق ہے، استعمال کیا ہے۔ فرانسیسی لفظ کے معنی to pantomime ہیں pantomime ایک قسم کا فاشوش ڈراما تھا۔ اس کا آغاز روم سے ہوا تھا۔ اس ڈرامے میں صرف ایک ہی اداکار سارے کردار دکھاتا تھا۔ جس منظر میں ساز بجائے جاتے اور گانے گائے جاتے تھے۔ mummer میلوں ٹیلیوں میں سوانگ بھر کر مزاحیہ حرکات سے لوگوں کے دل خوش کیا کرتے یا فاشوش ڈرامے کیا کرتے تھے۔ طاسطائی نے بھی شاید یہی لفظ استعمال کیا ہوگا۔
- 26- idiot یورپی زبانوں کا مشترک لفظ۔ نفسیات میں یہ اس شخص کو، جو ذہنی طور پر بسندہ ہو، کہتے ہیں (یونانی میں اس کے معنی 'عام آدمی' ہیں)۔ عام بول چال میں احمقہ نہ حرکت کرنے والے شخص کے لیے استعمال ہوتا ہے
- 27- ٹرویکا (Troika) ایک قسم کی سیاہی روسی گاڑی، جس میں دو کے بجائے تین گھوڑے پہلو پہلو جتے ہوئے ہیں۔
- 28- چوبی تختہ (runner)۔ برف گاڑیوں (sledges) میں پیوں کے بجائے ایک قسم کے تختے لگے ہوتے ہیں۔ گاڑی ان پر پھسلتی آگے بڑھتی ہے۔

حصہ پنجم

- 1- آئبیریائی جس کا تعلق آئبیریا سے ہو۔ یوں مشہور آئبیریا یورپ کا وہ جنوب مغربی علاقہ ہے، جو موجودہ ہسپانیہ اور پرتگال پر مشتمل ہے۔ لیکن کسی زمانے میں سابق روسی ریاست جارجیا کا مشرقی علاقہ بھی آئبیریا کے نام سے جانا جاتا تھا اور یہاں آئبیریا سے مراد یہی علاقہ ہے۔ یہاں عیسائیت چوتھی صدی عیسوی میں آئی۔ پہلے یہ گروانگ تھا۔ بارہویں صدی میں منگولوں نے اسے تاخت و تاراج کیا۔ 1555 میں ترکوں اور ایرانیوں نے آپس میں بان لیا۔ پہلے ڈیڑھ سو سال روس میں شامل رہا اور سودیت یونین کے حصے بن کرے ہونے کے بعد اب یہ ترک ملک بن گیا ہے۔ مشائن اسی علاقے کا باشندہ تھا۔

2- مارگو (margaux) فرانس کی جنوبی بندرگاہ بوردو کے قریب ایک گاؤں۔ کہا جاتا ہے کہ یہاں بہترین سرخ انگوری شراب کشید کی جاتی ہے اور اسی نام سے موسوم ہے۔

3- غیر شرعی حوالہ مستند نیپولین نے 1809 میں اپنی پہلی بیوی جوزیفین کے ساتھ اپنی شادی کا عدم ترادے دی کیونکہ اس کے بطن سے کوئی اولاد نہیں ہوئی تھی۔ اس کا یہ فعل ردِ سن کی تحویلک مسلک میں، جس کا وہ پیروکار تھا، ناجائز ٹھہرا کیونکہ اس مسلک میں میاں بیوی کے، جن طلاق نہیں ہو سکتی۔ بہر حال اس کے بعد نیپولین نے زارا الیسا اندر کی ہمیشہ آگاہ شادی کرنے کے لیے سلسلہ عہدانی کی لیکن جب ناکامی ہوئی، اس نے مارچ 1801 میں آسٹریا کی آرج ڈچس ماری لوئی سے نکاح کر لیا۔

4- چودہ جوں: یہ اشارہ تھا اس جنگ کی طرف ہے جو فرانسیسیوں اور ہسپانیوں کے مابین چودہ جوں 1809 کو ہوئی تھی اور اس کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا تھا۔

5- آسٹریا (تلفظ: آسٹری آ) لاج دور "مستلشیان من وسلوئی"۔ میسوں کی یہ دونوں لاجیں پیٹر برگ میں قائم تھیں اور ایک دوسرے کے خلاف سازشیں یوں کرتی تھیں کہ ایک دوسرے کی مذمت کرتی رہتی تھیں۔ (ماڈ) آسٹریا اصل میں انصاف کی یونانی دیوی ہے۔

6- اصلی سکائش غالیچہ: ایک غالیچہ، جس پر ملائمتی نشاناب بنے ہوئے تھے۔ ہر لاج کے ساز و سامان میں اس کی موجودگی ضروری تصور کی جاتی تھی۔ تمام لاجیں قدیم ترین اور انتہائی واجب الاحترام مین لاجوں سے اس قسم کے غالیچے، مشہور (چارٹر) دروسوم کے کتابچے حاصل کرنے میں ایک دوسرے سے سخت مقابلہ کرتی تھیں۔ (ماڈ)

7- کوڈے مار مار کر ہلاک کر دیا۔ اے۔ این۔ دسٹن کے بیان کے مطابق امپراطورہ کیٹرین نے جو مذہبی پالیسی اختیار کی، اس نے روس کو "دینی ریاست" (theocracy) میں تبدیل کر دیا۔ اب اس میں رواداری کی کوئی گنجائش باقی نہ رہی، اور جو لوگ اختلاف کرتے تھے، ان پر وہ مظالم ڈھائے گئے کہ ہسپانیہ میں عربوں کی حکومت کے خاتمے کے بعد مذہبی عدالتوں نے، جو "محدول" کے استیصال کے لیے قائم کی گئی تھیں، جو سفاکیاں روار کھی تھیں، ان کے سامنے وہ بھی مانہ پڑ گئیں۔

8 الف۔ ایک آف اولڈن برگ اس زمانے میں وسطی یورپ، بالخصوص جرمنی پھوٹی چھوٹی ریاستوں میں، جنہیں ڈچیاں (duchies) کہا جاتا تھا، بنا ہوا تھا۔ ہر ڈچی کا حکمران ڈیوک کہلاتا تھا۔ ایسی ہی ایک ڈچی جرمنی کی مشہور بندرگاہ نیہم برگ کے قریب، ہولڈن برگ تھی۔ اس کا ڈیوک امپراطور الیسا اندر کا برادر بستی تھی۔ نیپولین نے 1810 میں اس ڈیوک اور اس سے ملحقہ علاقوں پر اس لیے قبضہ کر لیا تھا کیونکہ اس نے برطانیہ کی ناکہ بندی کے لیے جو پر عظمی نظام (Continental System) قائم کیا تھا، اس نے اس کی خلاف ورزی کی تھی۔

8 ب۔ پوپ کی باری نیپولین نے 1801 میں پوپ پائس کے ساتھ یک معاہدہ کیا تھا۔ اس کے تحت اس نے پوپ کے کچھ علاقے، جن پر وہ قبضہ کر چکا تھا، پوپ کو واپس کر دیے اور اس کے عوض پوپ نے فرانسیسی حکومت کو آرج بشپ اور بشپ مقرر کرنے کا اختیار دے دیا۔ بعد میں معاہدے پر عمل درآمد کرنے میں مشکلات پیش آنے لگیں اور پوپ نے

- نپولین کا براعظمی نظام (اوپر کا حاشیہ دیکھیں) تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ پوپ نے 10 جون 1809 کو نپولین کو ردمن کیتھونک فرقتے سے خارج کر دیا اور نپولین نے 6 جولائی کو پوپ کو گرفتار کر کے جیل میں بند کر دیا۔
- 9- نغمہ دسرود کی ایستادہ محفل (promenade Concert) اس قسم کی محافل میں بعض حاضرین کو کھڑے رہنا پڑتا ہے۔
- 10- اشعار گوئی کے مقابلے (bouts-rimes): "غیر نسلیک قوافی۔ اسے قوافی، جو میثوب سے نسلیک ضہول۔ مترجہ ہر صدی سے وقتا فوقتا غیر نسلیک قوافی یا پسے سے سوچے ہوئے قوافی پر فی اہد یہ۔ شعر یا نظم کہنا ایک دلچسپ مشغلہ رہا ہے۔" کلیم ادین، حمد فرہنگ ادبی اصطلاحات مطبوعہ ترقی اردو بیورو، نئی دہلی۔
- 11- ہیراماسکو کے جنوب مشرق میں ایک روہی شہر۔
- 12- نیزہ نئی نوگورن: موجودہ روس کا دوسرا بڑا شہر۔ ماسکو کے مشرق میں دریائے وولگا اور دریائے اوکا کے سنگم پر واقع ہے۔ زاروں کے عہد میں یہاں بہت بڑا تجارتی سیلہ متفقہ ہوتا تھا۔ مشہور روسی لایب گور کی بیگم پیدا ہوا تھا اور سٹالن کے عہد میں (1923 میں) اسی کے نام پر اسے گور کی کہا جانے لگا۔ اب اس کا پرانا نام بحال کر دیا گیا۔
- 13- جیلوں اور قید خانوں میں پہنچ جاتی: "قیدیوں کو اکثر ضروریات زندگی سے محروم رہنا پڑتا اور ان کی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے ہاتھ بٹانا عیسائیوں کا مذہبی فریضہ تھا۔" (ماڈ)
- 14- روم (rum) ایک شراب جو گنے کے رس سے بنتی ہے۔
- 15- "مہا لعلی" اصل میں آخر و سودا تھا اور سوتیا کو جس ڈریس سیکر (وہ خاتون جو اپنے یا دوسری عورتوں کے لمبھات تیار کرتی ہے) کے ہاں لے جانا چاہتی تھی، وہ لرائیسی خاتون تھی اور اس کا نام Aubert Chalme تھا۔ آخر و سودا اسے مزاحیہ انداز سے ذہنی لفظ بنا دیتی ہے اور اس کا تلفظ روسی لفظ 'ober-sheima' جس کے معنی arch-rogue (پر لے رہے کا یا چھٹا ہوا بد معاش) ہیں، کرتی ہے۔ (ہنری گفرڈ)
- 16- سکوائر شہر کے گنجان آباد علاقوں میں ایچھے خاصے باغ کے چاروں اطراف اونچی اونچی رہائشی عمارت بنی ہوتی ہیں، انھیں سکوائر (square) کہتے ہیں۔ وسطی لندن میں ایسے متعدد سکوائر ہیں۔ ماسکو میں بھی ہوں گے۔
- 17- اونچے اور گھنے اصل میں بال بنانے کا یہ انداز فرانسیسی بادشاہ لوئی پانزدہم کی داشتہ مارکیزہ پانچہ دوغ نے اپنی دیکھا تھا اور اسی کے نام پر pam padour کہلاتا ہے۔ اس میں بالوں کے نیچے پیڑ رکھا جاتا ہے اور ان کی اس طرح تمس جھائی جاتی ہیں کہ وہ اونچے بھی اور گھنے بھی دکھائی دینے لگتے ہیں۔ بعد میں مرد بھی اس کی نقل اتارنے لگے۔
- 18- چولی (bodice) یورپی عورتوں کا پہناوا، جو کندھے سے کمر تک ہوتا ہے۔ شلوکا۔
- 19- پرامپٹر (prompter)۔ بعض اوقات ڈرامے کے دوران میں اداکار اپنے مکالمے بھول جاتے ہیں۔ سٹیج کے عقب سے انھیں ایک شخص لقمہ دیتا ہے۔ اسے پرامپٹر کہا جاتا ہے۔
- 20- ہارن (Ham) ایک ہاجیہ، جو جانوروں کے سینگوں سے بنایا جاتا اور منہ سے بجایا جاتا تھا۔ اب یہ دھات سے بننا ہے اور ایک نگلی پر، جس کا ایک سرانگ اور دوسرا فراخ ہوتا ہے، مشتمل ہوتا ہے۔
- 21- کنٹرا میں (Contra bass) اسے ڈبل میں بھی کہا جاتا ہے۔ وائکن خاندان کا سب سے بڑا ٹاٹ دار ہجہ۔

- عام طور پر کلاسیکی موسیقی میں استعمال ہوتا تھا، لیکن اب جاز اور ڈانس جینڈ میں بھی اس کا عمل دخل بڑھ گیا ہے۔
- 22- مصاحب خاص، یہاں تمام انگریزی ترجموں میں لفظ page (پیج) استعمال کیا گیا ہے۔ جیسا کہ اوپر (حصہ دوم کے حاشیہ نمبر 35) میں نکھاجا چکا ہے کہ پیج وہ نوجوان ہوتا تھا، جو ٹائٹ بننے کی تربیت لے رہا ہوتا تھا۔ انگریزی میں یہ لفظ بذریعہ فرانسیسی اعالوکی لفظ paggion سے، جو بذات خود یونانی لفظ paidion سے مشتق ہے، آیا ہے۔ ممکن ہے کہ روسی زبان میں بھی استعمال ہوتا ہو۔ ہمیں بورس کوپنا پیج اس لیے کہتی ہے کہ وہ اسے عشق و عاشقی کے رموز بتاتی رہی ہے؟
- 23- بجیرا (Gymbal)، بجیرے پیش کی چھوٹی کٹوریاں ہوتی ہیں۔ انھیں طبلے کے ساتھ ہاں دینے کے لیے دونوں ہاتھوں میں لے کر بجاتے ہیں۔ Gymbals پیتل کی پتلی پتلی مدور اشیاء ہوتی ہیں۔ انھیں چھڑی سے یا آپس میں ٹکرا کر آواز پیدا کی جاتی ہے۔
- 24- بارہ نیم سرتیوں کا سرگم (Chromatic scale)۔ سترن موسیقی میں سرگم (سکیل) بارہ سرتیوں یا سرتیوں کی تدریج ہوتی ہے۔ سکیل مختلف اقسام کے ہوتے ہیں لیکن بڑے دو میجر ورمائنر سکیل کہلاتے ہیں۔ ان میں سے ہر سکیل میں پانچ بڑے سراورد نیم سرتیاں ہوتی ہیں۔ کروئیک سکیل بارہ نیم سرتیوں پر مشتمل ہوتا ہے۔
- 25- نغمہ ہفتم (seventh)، موسیقی کا ایک سر۔
- 26- کاسٹیوم (Costume)، کسی خاص زمانے یا ملک کا سراپا مکمل لباس۔ بعض اوقات اس میں ہل بنانے کا انداز بھی شامل ہوتا ہے۔
- 27- مگلد لین۔ مریم مگلدنی ایک بدکار عورت تھی۔ اس نے بعد میں توبہ کر لی اور یوں بخشش کی مستحق ٹھہری۔ مغربی زبانوں میں لفظ مگلد لین ”اصلاح یافتہ کسی“ کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ لوس کی انجیل (نیا عہد نامہ) کے ساتویں باب کے آخر میں اس کا واقعہ یوں بیان ہوا ہے، پھر کسی فریسی نے اس سے درخواست کی کہ ”میرے ساتھ کھانا کھا۔“ پس وہ اس فریسی کے گھر جا کر کھانا کھانے بیٹھا تو دیکھو ایک بدچلن عورت، جو اس شہر کی تھی، یہ جان کر کہ وہ اس فریسی کے گھر میں کھانا کھانے بیٹھا ہے، سنگ مرمر کے عطر دان میں عطر رانی اور اس کے پاؤں کے پاس روتی ہوئی پیچھے کھڑی ہو کر اس کے پاؤں آنسوؤں سے بھگونے لگی اور اپنے سر کے بالوں سے ان کو پونچھ اور اس کے پاؤں بہت چومے اور ان پر عطر ڈالا۔ اس کی دعوت کرنے والا فریسی یہ دیکھ کر اپنے جی میں کہنے لگا کہ ”اگر یہ شخص نبی ہوتا تو جانتا کہ جو اسے چھوتی ہے، وہ کون اور کیسی عورت ہے کیونکہ بدچلن ہے“ ”یسوع نے جواب میں اس سے کہا۔“ اے شمعون، مجھے تجھ سے کچھ کہنا ہے، ”اس نے کہا۔“ اے استاد کہہ۔“ ”کسی ساہوکار کے دو قرض در تھے۔ ایک پانسو دینار کا، در دوسرا پچاس کا۔ جب ان کے پاس ادا کرنے کو کچھ نہ رہا، تو اس نے دونوں کو بخش دیا۔ پس ان میں سے کون اس سے زیادہ محبت رکھے گا؟“ شمعون نے جواب میں کہا، ”میری دانست میں وہ جسے اس نے زیادہ بخشا۔“ اس نے اس سے کہا، ”تو نے ٹھیک فیصلہ کیا۔“ اور اس عورت کی طرف پھر کر اس نے شمعون سے کہا، ”کی تو اس عورت کو دیکھتا ہے؟ میں تیرے گھر میں آیا۔ تو نے میرے پاؤں دھونے کو پانی نہ دیا مگر اس نے میرے پاؤں آنسوؤں سے بھگو دیے اور اپنے بالوں سے پونچھے۔ تو نے مجھ کو ہوسہ نہ دیا مگر اس نے جب سے میں

آیا ہوں، میرے پاؤں چومنا نہ چھوڑا تو نے میرے سر میں تیل نہ ڈالا مگر اس نے میرے پاؤں پر طعنا اڑا ہے اس لیے میں تجھ سے کہتا ہوں کہ س کے گناہ جو بہت تھے، معاف ہوئے کیونکہ اس نے بہت محبت کی مگر جس کے تھوڑے گناہ معاف ہوئے، وہ تھوڑی محبت کرتا ہے۔“

طال سلائی نے خط کشیدہ آیت میں زیم کر کے اسے اپنے مقصد کے لیے استعمال کر لیا ہے۔

28- چرچ آف ازیمپشن (Assumption) عیسائی عقیدے کے مطابق حضرت مریم کا جسمانی حالت میں بہشت میں پہنچایا جانا۔ اس واقعہ کی یاد میں 15 اگست کو مذہبی تہوار منایا جاتا ہے۔

29- تور (Tver): اسکو کے قریب ایک گاؤں۔

30- Ecosaise ایک قسم کے تیز سکاٹش رقص کی فرانسیسی شکل۔ فرانسیسی میں سکاٹ لینڈ کو Ecosse اور سکاٹش کو ecossais کہتے ہیں۔ مونٹ کے لیے ecosaise استعمال ہوتا ہے۔ (اوپر حصہ اول حاشیہ نمبر 29 بھی دیکھیں۔)

31- grossvater ایک جرمن رقص۔

32- گنتارا (abacus): کیلکولینز کی ایجا سے پہلے گنتی کے لیے گنتارا، جو ایک فریم، تاروں اور گولیوں پر مشتمل تھا، استعمال ہوتا تھا۔ بعض ملک میں اس پر بچوں کو گنتی بھی سکھائی جاتی تھی۔

33- مدیرا: ایک قسم کی سفید شراب، جو پرتگال کے زیر حکومت جزیروں کے مجموعے ”مدیرا“ (مثلاً مغربی افریقہ) میں بنائی جاتی ہے۔

34- کوڈرا بیٹھ جائیں: روسیوں کے ہاں یہی رواج تھا۔ (اڈ)

35- ستیوشکا: اس زمانے کی ماسکو کی مشہور و معروف چھپی گلوکارہ۔ (اڈ)

36- پے رانسکی... اچانک جلا وطنی اور مہینہ غداری: پے رانسکی پر حصہ سوم کے چوتھے باب میں پہلے ہی حاشیہ دیا جا چکا ہے۔

پے رانسکی خاصے بڑے عہدے پر فائز تھا لیکن اس سے کوٹا ہی یہ ہوئی کہ اس نے نہ تو اپنے دوست بنائے

اور نہ حمایتی۔ رقیبوں نے امپراطور الیکساندر سے چغلی کھائی، اور وائسلی سلطنت ان کے بھڑے میں آگیا اور 1812

میں پے رانسکی سائبیریا کے سرحدی گاؤں پریم میں جلا وطن کر دیا گیا۔ 1814 میں زار نے اسے نووگورڈ کے نزدیک

اپنی چھوٹی سی جاگیر پر آباد ہونے کی اجازت دے دی۔ ایک بار پھر اس کا ستارہ چمکا۔ 1816 میں اسے ”کوزا“

تین سال بعد سائبیریا کا گورنر مقرر کیا گیا۔ 1821 میں دو واپس پیٹرز برگ آگیا۔ زار نکولس اول کے عہد میں اسے

روسی قوانین کا حصہ مرتب کرنے کا حکم دیا گیا۔ انتقال سے کچھ عرصہ قبل اسے کاؤنٹ بنایا گیا۔

تیسری کتاب

حصہ اول

- 1- حاسطان نے اس جہد میں جنگ اور فلسفہ تاریخ کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کرنے کے لیے بار بار موضوع سے انحراف کیا ہے۔ یہ باب اس قسم کے پہلے انحراف پر مشتمل ہے۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ تیسری درجہ کی کتاب کا تقریباً چھٹا حصہ ان انحرافات سے پر ہے۔
- 2- براعظمی نظام: نپولین نے برطانیہ کا اقتصادی محاصرہ کرنے اور اپنی شرائط منوانے کے لیے بحیرہ بانگ سے بحرہ الہند تک اپنی تمام اتحادی اور طفلی ریاستوں کو 1806 میں برطانیہ سے تجارت کرنے کی ممانعت کر دی۔ اس کے جواب میں برطانیہ نے ان تمام ممالک کا اپنے طور پر اقتصادی مقابلہ کر دیا۔ اسے براعظمی نظام (Continental System) کہا جاتا ہے۔ بعد میں سنگٹنگ نے اس نظام میں دراڑیں ڈال دیں۔ روس بھی اس نظام کا مخالف تھا۔
- 3- میٹرنیچ (Furs von Metternich) (1773-1859): آسٹریکی سیاست دان۔ 1809 سے 1848 تک اپنے ملک کا وزیر خارجہ رہا۔ پہلے وہ نپولین کا حامی تھا اور اس نے نپولین کی شادی امپراطور آسٹریا کی بیٹی سے کرادی۔ بعد میں وہ نپولین کے خلاف ہو گیا۔
- 4- ڈیوک آف اوڈن برگ ورمہائیم: ان دونوں پر حواشی دوسری کتاب میں دیے جا چکے ہیں۔
- 5- تالیغال (Charles Talleyrand) (1754-1838): فرانسیسی سفیر اور سیاست دان۔ 1807 تک نپولین کا وزیر خارجہ رہا۔ بعد میں اس سے ناراض ہو گیا۔
- 6- بوربون خاندان (Bourbons): فرانس کا شاہی خاندان۔ 1589 سے 1792 تک برسر اقتدار رہا۔ پھر انقلاب فرانس نے اس کا تخت الٹ دیا۔
- 7- روس اور آسٹریا کا معاہدہ: اس کے تحت دونوں نے نپولین کے خلاف متحدہ محاذ بنانے کا فیصلہ کیا تھا لیکن 1807 میں ٹلزٹ کے مقام پر نپولین اور الیکسندر کے مابین جو معاہدہ طے پایا تھا، اس کی نفی کرتا تھا۔ جب نپولین کو اس کی بھٹک پڑی اور روس نے سمورے م 178 میں اس کی صفائی پیش کرنے کی کوشش کی۔
- 8- دجوبات نپولین نے روس پر چڑھائی کیوں کی، اس کی چند وجوہات یہ تھیں۔

نیولین اور الیکسندر دونوں ہی یورپ کی قیادت کے دعویدار تھے اور اسی نے دونوں کے مابین غلط فہمیوں کو جنم دیا۔ نیولین نے جب آسٹریا کے امپریٹور کی بیٹی سے شادی کی، لیکساندر کو یہ بات پسند نہ آئی۔ روس براعظمی نظام کا مخالف تھا۔ 1809 میں نیولین نے ایک معاہدے کے تحت مغربی گالیسیا کا علاقہ گریٹ ڈیچی آف وارسا کے پرکریا۔ اس سے الیکسندر کو خیال ہو کہ نیولین شاید پولینڈ کی مملکت جس کے بیشتر حصے پر روس قابض تھا، بحال کرنا چاہتا ہے۔ پھر نیولین نے الیکسندر کو خلافت عثمانیہ کے خلاف من مان کرنے کی اجازت دینے سے انکار کر دیا اور اختلاف کی ایک بڑی وجہ یہ ہوئی کہ نیولین نے ڈیوک آف اوڈن برگ کو، جو الیکسندر کا قریبی رشتے دار تھا، تخت و تاج سے محروم کر دیا تھا۔ (ولیم لیگر انسائیکلو پیڈیا آف ورلڈ ہسٹری)

9- ڈربسڈن: (مشرقی) جرمنی کا صنعتی شہر۔ اس زمانے میں یہ سیکسنی ریاست کا صدر مقام تھا۔ نیولین یہاں مٹی کے اداکل میں پہنچا تھا۔ یہاں دواپنے نئے اتحادیوں۔ امپریٹور آسٹریا، شاہ پرشیا (جسے متوقع جنگ میں شریک ہوے پر مجبور کیا گیا تھا)، شاہ سیکسنی اور بعض دیگر چھوٹے موٹے حکمرانوں کے ساتھ تین ہفتے مقیم رہا۔

10- پوزین (Posen) پولینڈ کے صوبے پوزنان (Poznan) کا صدر مقام۔ پوزین جرمن نام ہے۔ پولستانی صوبے کی طرح شہر کو بھی پوزنان کہتے ہیں۔ 1296 تک پولینڈ کے بارشا یہیں قیام پذیر رہے تھے۔

11- ٹورن (Thorn) پولستانی شہر ٹارون (Torun) کا جرمن نام۔

12- ڈانسگ (Danzig) پولستانی نام گدسک (Gdansk) ہے۔ سے انگریزی میں (Gdansk) لکھا جاتا ہے۔ بحیرہ بالٹک کے ساحل پر واقع ہے اور پولینڈ کا بحری اور صنعتی مرکز ہے۔ کیونسٹوں کے خلاف 1980 میں Solidarity کے نام سے جو تحریک شروع ہوئی، اور جس کی وجہ سے بعد ازاں مشرقی یورپ بشمول روس کا نقشہ تبدیل ہو گیا، اسی شہر سے اس کا آغاز ہوا تھا۔ ہٹلر نے بھی اس شہر پر حق جتایا تھا۔ نتیجہ؟ دوسری جنگ عظیم برپا ہو گئی۔

13- کونگش برگ (Königsberg) شمال مغربی روس کی ایک بندرگاہ۔ کسی زمانے میں مشرقی پرشیا کا صدر مقام تھا۔ آج کل اس کا نام کالین ان گراٹ (Kaliningrad) ہے۔

نوٹ: اوپر کے تمام شہر جن علاقوں میں واقع ہیں وہ کسی زمانے میں پرشیا (جرمنی) کا حصہ تھے۔ اسی لیے طالعستانی ان کے جرمن نام لکھتا ہے۔

14- الپ۔ نیمین (Niemn): مغربی روس کا ایک دریا۔ پچھلی صدی تک یہ روسی سلطنت کی مغربی سرحد کا کام دیتا تھا۔ راسی اسے ہیمل (Memel) کہتے ہیں۔ انگریزی میں سے Neman لکھا جاتا ہے۔

14ب۔ اس زمانے میں ہندوستان پر قبضے کے لیے انگریزوں و فرانسیسیوں میں چپقلش چل رہی تھی۔

15- برتھیے (Louis Alexandre Berthier) (1753-1815)۔ نیولین کا ایک جرنیل۔

16- سکوی (Muscovy) ریاست ماسکو۔ بارہویں سے سولھویں صدی تک قائم رہی۔ روس کا قدیم نام بھی یہی تھا۔

17- سیکس (Saxon): شمالی جرمنی کی ریاست سیکسنی (Saxony) کا باشندہ۔ انگریز زیادہ تر اسی اور دوسرے دو جرمن قبائل اینگلز (Angles) اور Jutes کی اولاد ہیں اور انگریزی زبان بھی انھیں قبائل کی بولیوں سے نکلی ہے۔

18- لیجن ڈ'آنر (Legion d' honneur)، فرانس کا سلسلہ اعزازات، جو نپولین نے 1802 میں شروع کیا۔ اس کے پانچ درجے ہیں: کمانڈر آف کریڈٹ، آفیسر، کمانڈر، چیف اور Chevalier۔ اس کا گریڈ ماسٹر صدر فرانس ہوتا ہے۔

19- وِلنا (Vilna)، سابق سوویت یونین کی ریاست اور اب آزاد ملک، تھو انیا کا صدر مقام۔ آج کل اس کا نام وِلنی اوس (Vilnius) ہے۔ کسی زمانے میں پولینڈ میں شامل تھا۔ 1795 میں روس کے قبضے میں آیا۔

20- تینوں افواج کے کمانڈر انچیف، فوج اول کا کمانڈر انچیف بارکے ڈتولی (1751-1818) فرانسیسی نژاد سکاٹ تھا۔ اس کے باوجود اچھا سپاہی بنے آئے۔ یہ وہیں پیدا ہوا۔ 1810 سے 1813 تک وزیر جنگ رہا۔ سمولنسک پر فرانسیسیوں کا قبضہ ہو جانے کے بعد اس کی جگہ کوٹوزوف کمانڈر انچیف مقرر ہوا۔ عظیم ترین روسی شاعر الیکساندر پوٹشکین اس کا بہت مداح تھا۔

جنوبی فوج کا کمانڈر انچیف باگ راتوں (جلداول میں عواشی ملاحظہ فرمائیں) تھا۔ آسٹریا کی سرحد کے قریب ریزرو فوج تشکیل دی جا رہی تھی۔ اس کا کمانڈر انچیف ایک اور روسی جرنیل تو رہا سوف تھا۔

21- آراک چیف، جلداول میں ماثیر دیا جا چکا ہے۔

22- پرس سالتی کوف (Saltykov)، ایک روسی جرنیل۔ بہ اعتبار منصب فیلڈ مارشل۔

23- کاؤنٹ بوگسٹون (Lauriston) 1812 میں نپولین کا روس میں سفیر۔ توپ خانہ سکول میں نپولین کا ہم سبق تھا۔ 1815 میں نپولین کے خلاف ہو گیا۔ لوئی شانزدهم نے اسے، رکوئس کا خطاب دیا اور مارشل کے عہدے پر ترقی دی تھی۔

24- پرنس کوراکن (Kurakin) فرانس میں روسی سفیر۔

25- ڈیوک آف ہاسر نو، نپولین کی حکومت کا ایک اعلیٰ نژاد عہدیدار۔

26- موغا (Joachim Murat) (1767-1815) فریمنی مارشل۔ اسے نپولین نے نیپلز کا بے اختیار بادشاہ (1808-1815) بنائے رکھا، لیکن وہ اپنے آپ کو کج فحاش کا بادشاہ سمجھتا رہا۔ نپولین نے 1800 میں اس کی ہمشیرہ سے شادی کی تھی۔ مزید تفصیل کتاب اول کے حصہ دوم میں دیکھیں۔

27- مارشل رازو (Louis Nicolas Davout Prince of Eckmuhl)، نپولین کی فوج کا مارشل۔ (تفصیل چوتھی کتاب حصہ اول ماثیر نمبر 13 پر دیکھیں۔)

28- مملوک رستن۔ نپولین مصر سے واپس پر اپنے ساتھ ایک شخص، جو بعد میں اس کا معتد بہار بطور باڈی گارڈ ساتھ لایا تھا۔ غالباً اس کا تعلق شہی مملوک، اندان سے تھا۔ ”جنگ اور امن“ کے تمام انگریزی تراجم میں اسے ”مملوک رستن“ ہی لکھا گیا ہے۔ اگرچہ سلطان کی کو عربی اور فارسی دونوں زبانیں آتی تھیں لیکن ”رستن“ نام کسی غلط فہمی کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ ایرانی نام ”رستم“ ہو۔

29- ہسی ہرٹ ہڈلیوں تک پھرنے والے نیچے ہرٹ۔ لن کا آغاز جرمنی کی ریاست ہسے (Hesse) سے ہوا۔

نیسویں صدی میں یہ سارے یورپ کی فوجوں میں مقبول ہو گئے۔

30- باتیں کرنے لگا۔ نیولین نے اس اور اس سے اگلے باب میں بالاشیف کے سامنے جو تقریریں کی ہیں ان کے عقد رائیسی مورخ تیج (Thiers) اور روسی مورخ میخائیلوؤسکی۔ دانیسویسکی کی تحریریں ہیں۔ تاہم سٹائی نے انہیں نیولین کی نخوت پسندی کو منظر عام پر لانے کے لیے نہایت چابک دستی سے استعمال کیا ہے۔ (۱۱)

31- پومیرانیا، وسطی یورپ کا ایک پر نالٹک۔ آج کل اس کا کچھ حصہ پولینڈ اور کچھ (مشرقی) جرمنی میں شامل ہے۔

32- اودر۔ (Oder) شرقی یورپ کا ایک دریا۔ چیکو سلواکیا کے پہاڑی خطے سے نکلتا ہے اور بحیرہ بالٹک میں جا کر رہتا ہے۔ پولینڈ اور (مشرقی) جرمنی کے مابین کچھ دور سرحد کا کام بھی دیتا ہے۔ پولینڈ میں اسے اودر کہا جاتا ہے۔

33- دستولا پولینڈ کا ایک دریا۔ گدنسک کے قریب بحیرہ بالٹک میں گرتا ہے۔ پولینڈ میں اسے ویسیوا کہا جاتا ہے۔

34- باڈن (Baden): جنوب مغربی جرمنی کی ایک (سابق) ریاست۔

35- ترکوں سے صلح کوٹوزوف نے چند فتوحات حاصل کرنے کے بعد مئی 1812 میں بحیروست (رومانیہ) میں ترکوں کے ساتھ صلح نامے پر دستخط کیے تھے۔

36- مولداویا (Moldavia) بحیرہ سودر، رومانیہ اور یوکرین کے مابین علاقہ۔ اس کا کچھ حصہ رومانیہ میں اور باقی روس کی ایک (سابق) ریاست مولداویا میں، جو اب ایک آزاد ملک بن چکا ہے، شامل ہے۔

37- دل کیا رومانیہ کا ایک صوبہ۔ 1387 سے 1659 تک ترکوں کے قبضے میں رہا۔

38- فن لینڈ۔ شمالی یورپ کا آزاد جمہوری ملک۔ اسے 1919 میں روس سے آزادی ملی تھی۔

39- غلیج بوتھنیا۔ بحیرہ بالٹک کا انتہائی شمالی بازو۔ سویڈن اور فن لینڈ کے مابین واقع ہے۔

40- شٹائین (Baron M.F.K. von Stein) (1757-1831) پہلے جرمن ریاست پرشیا کا وزیر تھا۔ نیومین نے اسے وہاں سے نکلوادیا۔ وہ ایلکساندر کی دعوت پر 1812 میں روس چلا آیا اور نیولین کے خلاف اتحاد بنانے کی سعی کرتا رہا۔ تفصیل کے لیے تہہ حدود حاشیہ 5 دیکھیں۔

41- آرم فیٹ (Count G.M. Armfelt) (1757-1814) سویڈن کا ممتاز جرنیل۔ بعد میں اس نے روس کی خدمت اختیار کر لی اور فن لینڈ کا نظم و نسق چلاتا رہا۔ پییرانسکی کے زوال میں اس کا بھی ہاتھ تھا۔

42- بے ٹک سین (Count L.A. Bennigsen) (1745-1826) دلنا ضلع (اوپرہ شیبہ نمبر 19 اور حصہ دل کا باب سوم ملاحظہ فرمائیں) کا چاکیردار۔ جون 1807 میں پرشیا کے مقام فریڈلانٹ (آج کل یہ روس میں شامل ہے اور اس کا نام پراونسک ہے) پر جن روسی فوجوں نے فرانسیسیوں سے شکست کھائی اور معاہدہ ٹلٹ کی راہ ہموار کی، اس کا کہنا ٹریسکی بے ٹک سین تھا۔ زارا ایلکساندر نے اس پر صحیح معنوں میں کبھی اعتبار نہ کیا کیونکہ یہ زار پاول سے اس کے قتل کی سازش میں ملوث تھا۔

43- وینٹزگے (Baron F.T. Wintzigerode) (1770-1818) جرمنی کی ریاست اسے کا شہرہ۔ 1793 سے روس کی ملازمت میں تھا۔ چونکہ نیولین نے اس کے آبائی وطن کو اپنی مملکت میں شامل کر لیا تھا، اس لیے ٹیکنیکل

، اعتبار سے وہ "فرانس کا بھگوڑا شہری" تھا۔

- 44- ہانڈل (Pohl) جرمن نژاد روسی جرنیل۔ جنگی ترکیبوں کا ماہر۔
- 45- برناڈوٹ (J.B.L. Bernadotte) نپولین کا سویڈی جرنیل۔ 1810 میں سویڈن کے تخت کا وارث منتخب ہوا۔
- 46- دیونا (Dvina)، شمال مغربی اور مغربی روس کا ایک دریا۔
- 47- دنیپر (Dnieper) مغربی روس کا دریا۔ پھر واسو میں گرتا ہے۔ سوئسک اسی کے کنارے پر وقیع ہے۔ سبائی کے اعتبار سے یورپ کا تیسرا طویل ترین دریا ہے۔
- 48- سرحدیں۔ دو ممالک بحال کر دینے کا یعنی پولینڈ کی از سر نو تشکیل کر دینے کا۔
- 49- بےس ایچ (J.B. Bessiers) (1768-1843) ڈیوک آف استیوا اور فرانس کا مارشل۔ اوسٹریس کی جنگ میں فریسی گھڑسوار فوج کا کمانڈر تھا۔
- 50- کوئین کوخ (دوسری کتاب کے حصہ سوم میں یہ حاشیہ دیا جا چکا ہے۔)
- 51- ہسپانیہ میں فرانسیسی ہزیمتیں خود نپولین تو شہابی اور مشرقی یورپ میں معرکوں رہا اور ہسپانیہ میں فرانسیسی فوجیں انگریزوں سے ہتھی رہیں تا آنکہ ڈیوک آف انگلین کی زیر قیادت انگریزی فوج نے 1812 میں مرکزی ہسپانیہ کے تاریخ شہر سلا مانکا اور اگست میں درالحکومت میڈرڈ پر قبضہ کر لیا۔
- 52 الف۔ براستہ پولٹاوا مشرقی یوکرین کا تاریخی شہر، درحقیقت مرکزی سترھویں صدی میں یہاں قازوق چھٹے رہے۔ روس کے زار پیٹر اعظم نے یہاں 1709 سویڈن کی فوجوں کو شکست دی تھی اور یوں ایک لحاظ سے جدید روسی مملکت کی بنیاد رکھی تھی۔ نپولین نے اس بارے میں بال شیف سے سوال پوچھا اور بال شیف نے اس کا جواب یہ کہہ دیا کہ اس کے متعلق ماذ کا خیال ہے کہ تاریخ میں ایسی کوئی شہادت نہیں ملتی۔
- 52 ب۔ چارلس رولز دہم (1682-1718) سویڈن کا بادشاہ تھا۔ اس نے 1707-09 کے دوران میں روس پر حملے کرنے کی حماقت کی جس کے نتیجے میں سویڈن کا ایک عظیم طاقت کی حیثیت سے خاتمہ ہو گیا۔
- 53- سیوے (Sevres) شمالی فرانس کا ایک شہر جہاں اعلیٰ قسم کے چینی کے ظروف، جو سیوے ظروف کہلاتے ہیں، بنتے ہیں۔
- 54- ورتھم برگ (Wurttemberg) جنوب مغربی جرمنی کی ڈپٹی۔ یہاں مراد وہاں کے ثواب خاندان سے ہے۔ آج کل اسے اور ہاڈن کو مارک جرمنی کی ہاڈن اور ورتھم برگ ریاست بنائی گئی ہے۔
- 55- وائمر (Weimar)، (مشرقی) جرمنی کا شہر۔ اٹھارویں اور انیسویں صدی میں جرمنی کا ثقافتی مرکز۔ جرمنی کے مشہور عالم ادیبوں گوٹے اور شلر کی اسی شہر سے نسبت تھی۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد نئی جرمن جمہوریہ کا آئین اسی شہر میں مرتب ہوا اور اس رعایت سے یہ جمہوریہ وائمر جمہوریہ کہلائی۔ شہر کی رعایت سے یہاں کے ڈیوک بھی وائمر کہلاتے رہے۔
- 56- مولداویا کی فوج کو توڑ دیا۔ مارچ 1811 میں اس کا کمانڈر انچیف مقرر ہوا تھا۔
- 57- دریسا، ایک روسی گاؤں۔ دریائے دیونا اور ایک ندی کے سنگم پر واقع ہے۔ یہاں قلعہ بند کیمپ قائم کرنے کا مقصد اس

سڑک کی، جو پیٹرز برگ جاتی تھی، حفاظت کرنا تھا۔

58- سپاہ دوم: اس کا کمانڈر انچیف باگ راتیاں تھا۔

59- پولستانی صوبے سمولنسک کے مغرب میں واقع صوبجات پولستانی صوبے تھے اور انھیں کئی سال قبل روس میں شامل کیا گیا تھا۔

60- زار یوج: زار کا دلی عہد زار یوج (لفظی معنی: زار کا بیٹا) کہلاتا تھا۔

61- پاؤلوچی (Marquis FO Paulucci) اطالوی جزیرے ساردینیا کا باشندہ۔ 1809 میں فرانسیسیوں کی حازمت چھوڑ کر روسیوں کے ساتھ ملا۔ کچھ عرصہ روس کی فوج اول کا چیف آف سٹاف رہا۔

62- دوں شوگن (Baron - J. Woizogen) (1774 تا 1845) پرشیا کا ایک جرنیل اور پھول کا ترجمان۔ 1807 سے 1815 تک روسی فوج کے جنرل سٹاف میں شامل رہا۔

63- ٹول (K.F. Toll) (1778-1842) جرمن نژاد روسی جرنیل۔ 1812 میں روسی فوج کا کوارٹر اسٹر جنرل تھا۔

64- جینا (Jena) (صحیح تلفظ یہ ہے) (مشرقی) جرمنی کا صنعتی شہر۔ دریائے سالے (Saale) کے کنارے واقع ہے۔ یہاں کی یونیورسٹی (سوسہ 1558) نے اٹھارویں صدی میں، جب فٹے (Fichte)، ایگل، فیلک (Schelling)، شلر اور شلیگل (Schlegel) اس میں پڑھاتے تھے، زبردست شہرت حاصل کی تھی۔

65- اورشٹ (Auerstadt)۔ (مشرقی) جرمنی کا ایک قصبہ:

نوٹ: ستن میں جس مہم کا حوالہ دیا گیا ہے وہ دو لڑائیوں پر مشتمل تھی۔ نیپولین نے یہ دونوں لڑائیاں یک وقت جینا اور اورشٹ میں پرشیا کے خلاف لڑیں۔ نیپولین کا سیلاب ہوا اور پرشیا اس کے زیر نگین آ گیا۔

66- سویسیانی (Swieclani): مغربی روس کا ایک قصبہ۔

67- تیرہ جون: ماڈ اور روز میری ایڈمنڈز کے تراجم میں تیرہ جولائی لکھا گیا ہے۔ باب 18 میں بھی یہی اختلاف پایا جاتا ہے۔

68- سالٹانوف (Saltanov) روس کا ایک قصبہ: یہاں جون 1812 میں روسیوں کی فرانسیسیوں سے جھڑپ ہوئی تھی۔

69- تھرموپلی (Thermopylae): وسطی یونان کا ایک درہ۔ یہاں 480 قبل از مسیح میں یونانیوں اور ایرانیوں میں جنگ ہوئی تھی۔ اس جنگ میں یونانیوں کو شکست ہوئی اور فوج کا بیشتر حصہ دم دبا کر بھاگ گیا۔ تاہم یونانی ریاست سپارٹا (Sparta) کے بادشاہ نے اپنی اور ایک دوسری شہری ریاست تھیسپیا (Thespieae) کی جنگی سپاہ کی مدد سے مقابلہ جاری رکھا۔ تمام لوگ مارے گئے لیکن باقی یونانیوں کے لیے مثال قائم کر گئے اور یونانی ایرانیوں کے خلاف عقول صفا آ رہے ہیں۔

70- کارڈٹ اوسٹریا: سلطان طالسلاطانی، روسی جرنیل اور فوج اول کا کور کمانڈر۔

71- ویلبسک (Vilebsk): سابق روسی ریاست اور اب آذربائیجان کا بندرگاہ۔ دریائے دون کے کنارے واقع ہے۔

72- سینٹ پیٹر (پطرس) حضرت عیسیٰ کے حواری۔ انھیں رومیوں کا پہلا بشپ سمجھا جاتا ہے۔ عیسائیوں کا عقیدہ ہے کہ انھیں تقریباً 67ء میں شہید کیا گیا اور روم میں دفن کیا گیا تھا۔ حضرت عیسیٰ کے بعد وہ عیسائیوں کے سب سے بڑے رہنما کے طور پر ابھرے۔

73- ایوم صیام سینٹ پیٹر کا یوم 29 جن کو منایا جاتا ہے۔ اس سے دو ہفتے قبل روزے رکھے جاتے ہیں۔

74- صبح تین بجے یورپی ممالک میں گرمیوں میں سورج بہت جلد طلوع ہوتا ہے۔ شمالی روس اور سوئیڈن میں صبح تین بجے دھوپ چمک رہی ہوتی ہے لیکن لوگ سوئے رہتے ہیں اور وقت پر ہی بیدار ہوتے ہیں۔

75- مجلس کلیسا (Synod)، کسی مسلک (Church) کے ارکان کی خصوصی کونسل۔ مذہبی مسائل پر غور و فکر کرے کے لیے اس کے اجلاس یا اتحاد کی سے منعقد ہوتے ہیں۔

76- چھوٹا پادری (Deacon) چرچ آف انگلینڈ، رومن کیتھولک اور یونانی (بشمول روسی) آرتھوڈوکس مسالک میں جو شخص گرجے میں مذہبی رسوم سرانجام دیتا ہے، اسے پادری (priest) کہتے ہیں۔ ذہن اس سے نچلے درجے پر ہوتا ہے۔

77- منجی رداں (Stole) کا مدار ریشمی سکارف۔ عبادت کے دوران میں ذہن بآئیں کندھے پر لیکن پادری اور بشپ دونوں کندھوں پر ڈالتے ہیں۔

78- اتوار تریلیٹ (Trinity Sunday): ستر کے بعد اٹھواں اتوار۔

79- عمالیتی بائبل کے مطابق حضرت اسحاق کے دو بیٹے تھے حضرت یعقوب اور عیسو۔ عیسو کا ایک پوتا عمالیتی تھا۔ اس کی اولاد عمالیتی کہلائی۔ جب حضرت موسیٰ بنی اسرائیل کو مصر سے نکال لائے تو ان کا عمالیتیوں سے جھگڑا ہو گیا۔ حضرت موسیٰ اپنا عصا لے کر میراڑ پر جا کھڑے ہوئے۔ جب تک وہ اپنا عصا اوپر اٹھائے رکھتے، بنی اسرائیل کا پلہ بھاری رہتا، جو غمی وہ عصا نیچے کرتے، عمالیتی غالب آنے لگتے۔ بنی اسرائیل نے بڑی مشکل سے عمالیتیوں کو شکست دی۔ (پرانا عہد نامہ خروج، باب 17)

80- مدیانی بائبل کے مطابق یہ ایک قدیم عربی قبیلہ تھا اور حضرت ابراہیم کے بیٹے مدیان سے اپنا سلسلہ نسب جوڑتا تھا۔ جس شخص کی بنی مغفورہ سے حضرت موسیٰ نے بھیڑ بکریاں چرا کر شادی کی، اس کا تعلق اسی قبیلے سے تھا (پرانا عہد نامہ خروج، باب دوم)۔ اس قبیلے کی بعد میں بنی اسرائیل سے ٹکس گئی، وہ "مڈی دی" کی طرح آتے اور غزوہ تک یہودیوں کی نصیبیں اور جانور سب کچھ لوٹ کر لے جاتے (پرانا عہد نامہ تفسا، باب ششم)

81- جدعون (Gideon) بنی اسرائیل کے ایک غریب گھرانے کا فرد تھا۔ پھر خداوند کی اس پر نظر کرم ہوئی۔ اس نے مرنگا پھرتنگا، اسرائیلی اس کے گرد جمع ہونے لگے اور آخر کار وہ مدیانوں کو شکست دینے میں کامیاب ہوا۔ (پرانا عہد نامہ تفسا، باب ششم)

82- جولیت (Goliath): بائبل کے مطابق ایک فلسطینی (فلسطینی) پہلوان۔ اس کا قد چھ ہاتھ ایک باشت تھا۔ اس کے سر پر پتیل کا خود ہوتا تھا۔ اس کی ذرہ پاٹھ ہزار شقال وزن تھا۔ اس کے بھالے کی چھڑاکی تھی جیسے جولا ہے کا

شہر۔ اس کے آہنی نیزے کے پھل کا وزن چھ سو مثقال تھا۔ اس نے اسرائیلیوں کو ہلکا کر رکھا اپنا بہترین جنگجو اس کے خلاف بھیجے۔ اگر وہ جیت تو اسرائیلی ان کا پانی بھریں گے، اگر وہ ہار گیا، پھر فلسطینی اسرائیلیوں کے خادم بن جائیں گے۔ اس کے مقابلے میں حضرت داؤد میدان میں اترے اور اس پر غالب آئے (پرانامہ عہد نامہ، سوئٹل باب 17)۔ قرآن مجید (سورہ نقرہ، رکوع 33) میں اس کا نام جالوت آیا ہے۔

83- 666ء کی رائے میں 666 کی میزان حاصل کرنے کے لیے e کی e کا، جر Empeur سے پہلے ازادی جاتی ہے، شمار کرنا ضروری ہے۔ میٹر quarante-deux کے ساتھ گڑ بڑ کرتا ہے، وہ اس کا مطلب مہیوں کی بجائے سال لیتا ہے اور اس کے ساتھ ہی وہ اس حقیقت کو بھی فراموش کر دیتا ہے کہ پولین اگست تک یہ لیس سال کا نہیں ہوگا (مغرب میں آدمی کی عمر میں اس کی تاریخ پیدائش کا خاص خیال رکھا جاتا ہے۔ اگر کوئی شخص یکم جنوری 1981 کو پیدا ہوتا ہے، وہ 1995 میں سارا سال چودہ سال کا ہی رہے گا، صرف یکم جنوری 1996 کو وہ اس کے بعد اس کی عمر چودہ سال گئی جائے گی۔) وہ فرانسیسی میں اپنے نام کے جے Besuho کرتا ہے، حالانکہ کتب چارم، باب 1، میں اسے Besuho لکھا گیا ہے۔

84- سینٹ جارج اس نام کا کوئی شخص تھا بھی یا نہیں، اس کے بارے میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ یورپ سے جو لوگ صیسی جنگیں لڑنے مشرق وسطیٰ آیا کرتے تھے، ان کا دعویٰ تھا کہ اسے رومی شہنشاہ Diocletianus کے، ج 284 تا 305ء سرافقت اور ہا، عہد حکومت میں ”شہید“ کیا گیا تھا۔ انگریز اس کا چلن عام کرنے میں بہت پیش پیش رہے اور انھوں نے بالآخر اسے اپنا محافظ (patron) سینٹ تسلیم کر لیا۔ بعد میں عالما رومی بھی اس کے معتقد ہو گئے۔

85- سینٹ جارج کا نیا محافظ نکو بائی رستوف، جسے سنہ سینٹ جارج ملا تھا۔

86- Champignon کھنسی (mushroom)

87- Toadstool سانپ کی چھتری۔ کھنسی، ورسناپ کی چھتری دونوں خورد ہو جاتے ہیں۔ کھنسی کھانے میں اندین لیکن سانپ کی چھتری زہریلی ہوتی ہے۔ (یورپ کے کسان آج کل کھنسیاں خود بھی اگاتے ہیں۔)

88- فرانسیسی بونا ماڈ کا کہنا ہے کہ اونچے طبقے میں فرانسیسی اتنی جڑ پکڑ چکی تھی کہ کٹر رومی مشرقا کو رومی نہ بولنا آتی تھی اور نہ لکھتا۔ ادھر عوام کا یہ حال کہ انھیں رومی کے علاوہ کوئی دوسری زبان آتی ہی نہیں تھی

89- کریملن (Kremlin)، رومی لفظ، Kremi، جو تاریخی زبان سے آیا تھا، کی فرانسیسی شکل۔ رومی زبان میں اس کا مطلب ”قلعہ“ ہوتا ہے۔ یہاں اس سے مراد اسکو کا ”قلعہ“ ہے، (جو اصل قلعہ نہیں، چار دیواری ہے اور اس کے اندر بے شمار عمارتیں ہیں) (نوٹ نمبر 34 دیکھیں)۔ اسے 1156ء میں تعمیر کیا گیا تھا اور اس میں مسلسل توسیع ہوتی رہی ہے۔ 1712ء سے 1918ء کے مابین کے زمانے کے مسود، جب پایہ تخت پیٹرز برگ منتقل ہو گیا تھا، یہ ہمیشہ روسی حکومت کا صدر دفتر رہا ہے۔ اس میں دیگر عمارتوں کے علاوہ دو عظیم الشان کلیں بھی داخل ہیں۔ حاشیہ نمبر 80 دیکھیں۔

90- کلیسائے مریم (Church of Assumption) حضرت مریم کے بہشت میں داخلے کو Assumption کہا جاتا

ہے۔ اس واقعے کی یاد میں 15 اگست کو گرجوں میں خاص تقریب منعقد کی جاتی ہے۔ اس واقعے کی یاد میں کلیسا بھی تعمیر کیے گئے ہیں۔ انھیں کلیسائے مریم یا Church of Assumption کہا جاتا ہے۔

حضرت جبرئیل جس روز حضرت عیسیٰ کے تجسد کے متعلق خوش خبری دیئے حضرت مریم کی خدمت میں حاضر ہوئے، اسے انگریزی میں Annunciation کہتے ہیں اور اس کی تقریب 25 مارچ کو منائی جاتی ہے۔ اس واقعے کی یاد میں بھی کلیسا تعمیر کیے جاتے ہیں۔ حاشیہ نمبر 89 میں جن دو کلیساؤں کا ذکر کیا گیا ہے، ان کے نام بھی ہیں۔ زائر محل سے کریمین میں واقع ”کلیسائے مریم“ میں گیا ہے۔

91- توپ زہر (Tsar-cannon) ایک بہت بڑی توپ۔ 1488 میں ڈھائی گنی تھی اور کریمین میں محفوظ کر دی گئی ہے۔

92- کواس (Kvass) دیر سے ملتا جلتا روٹی مشروب۔ روٹی یا جو سے بنتا ہے۔

93- بسکٹوں کی پلیٹ طاسطائی نے اپنے ناول ”جنگ اور امن“ کے بارے میں ایک مضمون تحریر کیا تھا۔ (یہ مضمون اس ترجمے کے آخر میں شامل ہے۔ مترجم) اس میں اس نے دعویٰ کیا تھا کہ اس نے اپنی کتاب میں جو کچھ لکھا ہے، وہ اس کے ثبوت میں شہادتیں پیش کر سکتا ہے لیکن جب ایک نقاد پرنس ویاژنسکی نے اس واقعے کے بارے میں ثبوت مانگا (پرنس ویاژنسکی کا خیال ہے کہ الیک ندراتنا شرمیلہ درقاعدے قانون کا پابند تھا کہ وہ اس قسم کی حرکت کر ہی نہیں سکتا تھا۔) تو طاسطائی آئیں بائیں شائیں کر کے رہ گیا اور کوئی حوالہ پیش نہ کر سکا۔ البتہ ایک کتاب میں کہا گیا ہے کہ الیک ندر نے اجوم میں تقسیم کرنے کے لیے پھل بیجے تھے۔ ممکن ہے طاسطائی کے ذہن میں یہی حوالہ ہو۔ (ڈی)

94- سلاو برائل، سکا کا ایک شاہی محل۔ اس محل میں اس روز جو کچھ ہوا، اس کی تفصیل مولوتے کے ایک گواہ سر جی گلسکا کی ”یادداشتوں“ سے اخذ کی گئی ہے۔ (ڈی)

95- مجلس عوام (States General = Les Etats-generaux) اصل میں یہ انقلاب سے قبل فرانس کی (پارلیمنٹ) مجلس قانون ساز کا نام تھا۔

96- عمرانی معاہدہ ایک معاہدہ جس کے تحت ذمے دار حکومت کی ضمانت کے عوض میں عوام اپنی بعض آزادیوں سے دستبردار ہو جاتے ہیں۔ انگریز فلسفیوں ہوبز (Hobbes) اور لوک (Locke) کے مطابق حکومت آمرانہ بھی ہو سکتی ہے لیکن روس کا اصرار ہے کہ حکومت کے لیے عوامی تائید ضروری ہے۔

حصہ دوم

1- تورانی (Scythian) یا سیتھی: سیتھی نسلا ہند یورپی باشندے تھے۔ پہلے سیاسیائے کوچک اور بعد میں بحیرہ اسود کے کنارے آباد ہوئے۔ حراجاؤہ خانہ بدوش تھے اور زیادہ تر خانہ بدوش ہی رہے۔ وہ گھڑ سواری اور تیر اندازی میں بہت ماہر تھے اور اسی مہارت کے ثمر بونے پر وہ یونانیوں اور ایرانیوں کے حملے پسپا کرتے رہے۔ تیسری صدی عیسوی میں وہ گوٹھوں (Goths) کا مقابلہ کر سکے اور بالآخر نابید ہو گئے۔ مولوی عبدالحق نے اپنے ڈکشنری میں سیتھیوں کو

تورانی کہا ہے۔

2- فرانسیسی زدہ ردی (Frenchified Russian) ماڈ کا خیال ہے کہ طاسلاطانی جولی کی فرانسیسی زدہ ردی کے ذریعے یہ ثابت کرنا چاہتا ہے کہ جوں کی حسب الوطنی سراسر مصنوعی ہے تاہم اس کا کہنا کیا جائے کہ اس فلسفے کی نوجواں ردی خواتین کو واقعی ردی نہیں آتی تھی۔ خود پر شکن کی تائیداً، جو "ذیلی طور پر ردی" ہے، جب Onegin کو دھکے پیٹھتی ہے تو فرانسیسی ہی استعمال کرتی ہے۔

3 شیڈ ٹانگوں کے بغیر عینک، جو دوسری عینک کے اوپر چڑھائی جاتی ہے۔

4- پوٹیمکن (Prince Grigory Alexandrovich Potemkin) ردی جرنیل اور سیاست دان۔

پوٹیمکن امپراطور کی تھریں کا معتمد، چیتا اور شریک خلوت تھا۔ اس کے علاوہ پوٹیمکن کی ایک اور داستان تھی۔ اسے "پٹی" "بھتیجی" کہا کرتا تھا۔ جب امپراطور کی تھریں نے طاسلاطانی کے ٹائپرس کو نائی دکنوٹسکی سے کہا، جسے "جگ" اور اسن "میں پرنس بلکونسکی کے روپ میں پیش کیا گیا ہے، کہا کہ وہ پوٹیمکن کی "بھتیجی" سے شادی کر لے، اس نے پٹ جواب دیا "اس نے یہ کیسے سوچ لیا کہ میں اس کی رکھیل سے یہ کہوں گا؟" (اسے این ڈسن)

5- زبوف امپراطور کی تھریں کا ایک درباری۔ پرنس آندرے کی بیوی سا (مرحومہ) کاؤش زبوا کا ذکر بہ لطافت میں کرتی رہتی تھی اور خوب مذاق اڑاتی تھی۔ کتاب دل کے حصہ اول کا آخری باب دیکھیں۔

6- آل پاچ نے گردن کو جھٹکا دیا: "روسیوں کی یہ عادت ہے کہ وہ حیرت، مایوسی، ملامت یا ناپسندیدگی کا اظہار کرنے کے لیے گردن کو دائیں بائیں جھٹاتے یا جھٹکاتے ہیں۔" (ماڈ)

7- داروگوو: ایک ردی قصبہ۔ سمولنسک سے صرف چند میل دور مشرق میں واقع ہے۔

8 اسوا یا ڈ سمولنسک کے قریب ایک اور ردی قصبہ۔

9- بشل (bushel)، خشک اور مائع شیا ماپنے کا پیمانہ۔ ایک بشل 2219.36 مربع انچ یا آٹھ گیلن کے برابر ہوتا تھا۔ بشل حب استعمال ہوتا تھا جب اشیاء توڑتے نہیں بلکہ ماپتے تھے۔

10- کوارٹر، کوارٹر کو عام طور پر کوارٹ (quart) کہا جاتا ہے۔ ایک کوارٹر چوتھائی گیلن یا 32.1 بشل کے برابر ہوتا تھا۔ آج کل کوارٹرز، بشل اور گیلن سب متروک ہو چکے ہیں۔ مائع اشیاء کے لیے ٹر (ایک گیلن میں تقریباً 4.55 لٹرز ہیں) اور خشک اشیاء کے لیے کلوکر م استعمال ہوتے ہیں۔

11- ڈریگون (Dragoon)، بعض یورپی ممالک کی گھڑ سوار فوج۔ اس کے اخیر اور سرتاپا مسلح ہوتے تھے۔

12- کارپ (Carp) خاصی بڑی مچھلی۔ دریا، نال اور جھیلوں میں پائی جاتی ہے۔

13- پلوٹارک (Plutarch)۔ (تقریباً 46-120)۔ ایک یونانی عالم و مصنف۔ وہ روم اور اتھنز دونوں کا شہری تھا۔ اس کی کتاب Paralel Lives میں، جس کے انگریزی ترجمے سے استفادہ کر کے فیکس پیٹر نے متعدد ڈرامے تحریر کیے، یونانی اور رومی سیاست دانوں و جرنیلوں کے تیس جوڑوں کے حالات زندگی اور کارناموں کو بیان کیا گیا ہے۔

14- "L'homme de beaucoup de merite": متعدد باعظیم خوبیوں کا مالک شخص۔ ماڈ کا خیال ہے کہ اس

سے مراد Joseph de Maistre ہے۔ یہ شخص 1803 سے 1821 تک پیئرز برگ میں جریرہ سارڈینیا (جو آج کل اطالیہ میں شامل ہے لیکن اس زمانے میں آراء ملک تھا) کا سفیر تھا۔ عالمانے نے پیئرز برگ کی مختلف محافل کا جو نقشہ کھینچا ہے اس میں اس نے Maistre کی کتب Soirees اور Correspondance diplomatique de St. Petersburg سے خاصی مدد لی ہے۔ Maistre کے خیالات و افکار جس طرح خود طاسطانی کی سوچ پر اثر انداز ہوئے، اس کا جائزہ مشہور برطانوی مورخ اور فلسفی ورنر کسٹورڈ یونیورسٹی کے سابق پروفیسر برلن (Sir Isaiah Berlin) نے، جو روس کی ریاست لتویا (جو اب آزاد ملک بن چکی ہے) میں پیدا ہوئے تھے، اپنے شہرہ آفاق کتابچے The Hedgehog and the Fox میں لیا ہے۔ (1978 میں برلن کا یہ کتابچہ ان کی کتاب Russian Thinkers میں شامل کر دیا گیا۔)

- 15- جون ماڈ ورنڈ میر کی ایڈمنڈز کے تراجم میں 24 اور 29 جولائی لکھا گیا ہے
- 16- آراک چیف وغیرہ۔ روسی حکومت کے عہدیدار۔ ان پر جلدوں میں حواشی دیے جا چکے ہیں۔
- 17- autocrat مطلقہ لفظ حکمران۔ مولوی عبدالحق کے مطابق روسی رار کا لقب Autocrat of all the Russians ہوتا تھا۔

18- جوکندے (Joconde) فرانسیسی مصنف لافانتیں (Jean de la Fontaine) (1621-1695) کی منظوم کہانی۔ اس نظم میں اس نے جنسی مناظر بے دھڑک بیان کیے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ لافانتیں آخر عمر میں مذہب کی طرف مائل ہو گئے تھے اور اس نے اس نظم کو اپنی تصنیف، نئے سے انکار کر دیا تھا۔

19- پلٹوف (General M I Platov) (1751-1818) قاری دستوں کا سربراہ۔ مشہور روسی جرنیلوں سواروف اور کوتوزوف کے ساتھ جنگوں میں شریک ہو چکا تھا۔

20- ڈان (Don)، جنوب مغربی روس کا دریا۔ اسے سیر کے ذریعے دریا کے دانگ سے ملا، جا چکا ہے۔

21- تمین بننے: "وقت کی گنتی میں طاسطانی نے شاذ ہی کوئی غلطی کی ہوگی لیکن یہاں اس سے یہ سہو ہو گیا۔ سوسنک پر پانچ اگست کو بم باری ہوئی اور اس روز (معر) پرنس اچھا بھلا تھا۔ پندرہ اگست کو اس کا انتقال ہو جاتا ہے۔ اس صورت میں وہ تمین بننے صاحب فراش نہیں ہو سکتا تھا۔" (مال)

22- جونی پر (Juniper) ایک قسم کی سدا بہار جھاڑی۔ اس کا تیل روا کا کام دیتا ہے اور جن (شراب) میں ڈالا جاتا ہے۔

23- پاول پیوتر وچ یا پاول اول کیستھرین اعظم اور پیوتر فیڈر وچ کا بیٹا۔ 1796 سے 1801 تک روس کا حکمران رہا۔ الگسا لگسا اندر اسی کا بیٹا تھا۔

24- پیوتر فیڈر وچ یا پیوتر سوم: پیٹر (روسی پیٹر) اعظم کا نواسہ۔ اپنی خالہ اڑبیٹھ کے انتقال پر 1762 میں روس کا زار بنا۔ وہ خود تو بالکل مٹی کا، دھو تھا لیکن اس کی جرمن بیوی سوفیا بہت تیز طرار عورت تھی۔ اس نے اس کی سادگی سے فائدہ اٹھ کر اسے پچھلے بعد فوجی انقلاب کے ذریعے معزول کر دیا اور خود کیستھرین دوم کے نام سے حکمران بن گئی۔ کچھ ہی دنوں کے بعد پیوتر سوم پر اسرار حالات میں ہلاک ہو گیا (عام خیال یہی ہے کہ اسے خود کیستھرین نے مروایا)

تھا۔ تاہم کسانوں نے یہ ماننے سے انکار کر دیا کہ بیترسوم ہلاک ہو چکا ہے۔ اس سے فائدہ اٹھا کر کئی جعلی بیوز میدان میں آ گئے۔ اس میں ایک قازق بھی تھا جس کا نام پوگا چیف تھا۔ اس نے 1773 اور 1775 کے مابین ہر سال اور وسطی دہائی کے علاقوں میں بغاوتوں کی رہنمائی کی۔ 1812 میں سمولنسک کے عدالتے میں بھی کسانوں نے خاصے ہنگامے کیے۔

25- زیر سطحی (undercurrents) وہ خیالات، خواہشات، آراء یا اندازے جن کا کھسے بندھاں اظہار نہیں کیا جاتا اور جن کے وجود کا بھی عام طور پر کوئی خاص علم نہیں ہوتا لیکن وہ لوگوں کے سوچ بچار اور رویوں کو متعین ضرور کرتے ہیں۔

26- خط ہری وجہ بھ ہر تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ باگو چارافو اور اس کے گرد و فواح کے دیہات کے کسان بلا سبب، بنا گریہ چھوڑ کر بھ گئے تھے لیکن انسان ہمیشہ اپنے حالات بہتر بنانے کی آرزو کرتا ہے اور اس کے لیے وہ کہیں بھی جانے کو تیار رہتا ہے۔ پھر روس کا Serfdom کا نظام تو اتنا ظالم تھا کہ اس سے بھٹکارا حاصل کرنے کے لیے کسان بڑے سے بڑا خطرہ مول لینے کے لیے تیار ہو جاتے ہوں گے۔ چنانچہ جب معمر پرنس اشغال کر گیا اور فرانسیسی فوجوں کی آمد کی وجہ سے سمولنسک کے علاقے میں بتری پھیل گئی، باگو چارافو کے کسانوں نے بھی اسے اپنے لیے ایک موقع تصور کیا اور پرنس ماریا کا حکم ماننے سے انکار کر دیا۔ ماریس کے نظریے (کہ انقلاب سرمدید و معاشرے کے مزدور لائیں گے) کے برعکس روسی کسانوں نے جس طرح کیونسٹ، انقلاب پیا کیا، اس کی وجہ بھی اسی روسی نظام (جو انیسویں صدی کے اواخر میں برٹش سرکاری طور پر ختم کر دیا گیا) کے مہلک اثرات ہی ہوں گے۔ یہ الگ بات ہے کہ کسوزم نے بھی کوئی خاص کمال نہ دکھایا اور 1991 میں روسیوں نے اس کا بھی دھڑن تختہ کر دیا۔

27- کمیون (Commune) مختصر انسانی (اکثر اوقات دیہاتی) جمیعت۔ اس کے، رکان کے مفادات مشترک ہوتے ہیں اور ان کی ملکیتیں بھی عموماً مشترک ہوتی ہیں۔

28- مراکش (Morocco) ایک قسم کا بکری کا نرم نفیس چمڑا۔ پہلے مراکش میں بنتا تھا۔ اب عام بنتا ہے بلکہ مصنوعی بھی بنتا ہے زیادہ تر جوئے بنانے اور کتابوں کی جلدیں یا بندھنے کے کام آتا ہے۔

29- جاگیردار کا مکان یورپی ممالک میں جاگیردار کی راضی کو Manor اور اس کے مکان (ایک قسم کا کل جس میں محل جاگیردار کی رہائش اختیار نہیں کرتا تھا بلکہ اس کی ضروریات کا سامان تیار کرنے والے مثلاً بڑھئی، لوہار، جولاہا، میرواگی وہیں رہتے تھے اور اسی مکان کے ایک حصے میں اس کی ورکشاپیں ہوتی تھیں) کو Manor house یا صرف Manor کہا جاتا تھا۔ یہ یورپ کی زبانوں کا مشترک لفظ ہے اور لاطینی لفظ manere (رہائشی جگہ) سے مشتق ہے۔

30- شادی سے، نکاح (روسی) آرٹھوڈوکس چرچ میں عورت کو اپنے بھائی کے برادر نسبتی یا بہن کے دیور اور چیلڈ سے شادی کی اجازت نہیں ہے۔ اگر نکاح کی پرنس آندری سے شادی ہو جاتی، تو پرنس ماریا رستوف کے ساتھ بیاہہ کر سکی۔ (ماڈ)

31- ہنری سین ہائی نس (His Serene Highness): اصل یہ الفاظ بعض یورپی ممالک کے شاہی خاندانوں کے بعض افراد کا ذکر کرنے کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔ (The Concise Oxford Dictionary of Current

(English)

32- روٹ اور نمک۔ روسیوں کا دستور ہے کہ جو شخص کسی نئی جگہ رہائش اختیار کرتا ہے، اس کی تو، ”روٹی اور نمک“ سے کی

جاتی ہے۔ تاہم نمک روٹی اور نمک کی جگہ اکثر کیک اور چاندی کی پلیٹ میں سفید باریک پھٹی پیش کی جاتی ہے۔ (ماڈ)

33- سن کی پتی۔ ”روسیوں میں یہ عام رواج تھا کہ اگر کان میں درد ہوتا، وہ اس میں سن کی پتی ٹھونس لیتے۔“ (روز بیری

ایڈمنڈز)۔

34- بارام ڈگانی (Stephanie Felicite, Madame de Genlis) (1748 تا 1830)، فرانسیسی ادیبہ۔

اٹھارہ سو سال کی عمر میں کاؤنٹ ڈگانی سے شادی ہوئی۔ 1870 میں Duchess of Chartres کی صاحبہ مقرر

ہوئی۔ اس عرصے میں وہ ڈچس کے خاندان کی داشتہ اور اس کے بچوں کی ”گورنر“ بنی رہی۔ بچوں کو پڑھاتے

پڑھاتے اس نے ان کی دلچسپی کی کہانیوں کی چند کتب تحریر کیں۔ پھر وہ باقاعدہ رومانی ناول نگار بن گئی۔ اس کی کتابوں

کی تعداد نوے (90) ہے۔ کوئٹہ وقف کی طرح نیو میں بھی اس کا مداح تھا اور اس نے اس کی پنشن بھی مقرر کی تھی۔

35- بخارست (Bucharest) روس کے پڑوسی ملک رومانیہ کا دارالسلطنت۔ اہل رومانیہ اسے بوکورشٹی (Bucuresiti)

کہتے ہیں۔

36- رست چک (Rustchuk)، رومانیہ کا ایک قلعہ۔ اس زمانے میں ترکی کے قبضے میں تھا۔

37- کارپشکا تچی، گی رن (Kar pushka Tchigirin)، اسکو کا گورنر جنرل رستوپ چن اپنے خیرناموں میں اس فرضی

کردار کو حب الوطنی کے ترجمان کی حیثیت سے پیش کرتا تھا۔

38- پوشکن (Vasil Lvovich Pushkin) (1768-1830) یہ پوشکن عظیم ترین روسی شاعر الیگزینڈر پوشکن کا

بچا تھا۔ شعر سازی میں اسے بڑا ملکہ حاصل تھا اور زیادہ تر اپنی طنزیہ نظم ”خطرناک مسابہ“ کی وجہ سے جانا جاتا ہے۔

جس کا پوشکن نے اپنے مظلوم ناول ”Eugene Onegin“ میں ذکر کیا ہے۔

39- Charon (کیرون) یونانی دیوتا میں مردوں کی رودیں زیر زمین (Hades میں) چلی جاتی ہیں۔ رستے میں

ایک دریا Styx آتا ہے۔ کیرون ملایا ہے اور وہ اپنی کشتی میں روحوں کو یہ دریا پار کرتا ہے۔

40- Galicism: کسی فرانسیسی ترکیب یا عمارے کا دوسری زبان میں استعمال۔ (پرانے زمانے میں فرانس کو Gau

کہا جاتا تھا اور اسی سے یہ لفظ بنا ہے۔)

41- جون آف آرک (Jeanne D Arc) (1412 تا 1431)، فرانسیسی ہیروئن۔ اس نے بارہ ہزار جوانوں

کی مدد سے انگریزوں (جو فرانس کے بعض علاقوں پر قابض تھے) کا تعلق بند کر دیا اور انھیں اور لینز کا محاصرہ اٹھانے

پر مجبور کر دیا۔ بعد میں کچھ فرانسیسیوں نے ہی اسے پکڑا اور انگریزوں کے پاس بیچ دیا۔ انگریزوں نے اسے جادوگری

اور بدعت کے الزام میں زندہ جلا دیا۔ 1920 میں اسے سینٹ کاوجہ دیا گیا۔

42- امیزن (Amazon)، یونانی دیوتا کے مطابق نسائی جنگجوؤں کی ایک قوم جو بحر اسود کے نزدیک ستیا میں رہتی تھی۔

کہا جاتا ہے کہ یہ عورتیں اپنے دائیں ہاتھ پر تیرکان چلانے میں آسانی رہے، اسی لیے

Amazon (a= بغیر mazos= پستان) کہلاتی تھیں۔

43- بیلایا تسرکوف (Belaya Tserkov) یوکرین کا ایک قصبہ دار السلطنت کیف کے قریب جنوب میں واقع ہے۔

44- مارام ڈسورا (Adelaide Marie-Emilie de Souza) (1761 تا 1836)، فرانسیسی ناول نگار۔ اس کا پہلا خاندان Count of Flahaut انڈیا کی جینٹ چڑھ گیا اور مارام ڈسورا نے تھیف و تالیف میں بڑا ڈھونڈ لی۔ اس نے دوسری شادی جیرس میں پرنگال کے دارالہام، رکوئیس آف ڈسوزا سے کی۔

45- دیانزا، ماسکو اور سولنسک کے مابین ریلوے جنکشن۔ بارودینو، جہاں روسیوں اور فرانسیسیوں کے مابین جد میں گھمسان کارن پڑا، مشرق میں اس کے بالکل قریب ہے۔

46- کاؤنٹ ڈنٹ ٹینگے روڈے، کاؤنٹ ڈنٹ ٹینگے روڈے پیٹریز برگ جانے والی شاہراہ کی حفاظت کرنے پر مامور تھا۔ 30 جولائی کو اس کی فرانسیسیوں کے ایک دستے سے مدد بھیجی ہوئی اور فرانسیسی پت گئے۔ تاہم اصل تاریخ ڈنٹ ٹینگے روڈے نہیں بلکہ وہ جریئل تھا جو روس کی عقیبی سپاہ کی کمان کر رہا تھا۔ (ماڈ)

47- لف۔ لے مچ (Franz Leppich) نے سچ و لندری با شندہ تھا۔ اس نے رستوب چین کو شیشے میں اتار لیا اور اسے ٹائل کر یا کدہ ایک ایسا غبرو تعمیر کر سکتا ہے جو فرانسیسیوں کی مت، ردے گا۔ اس نے 1811 میں نیولین کو اپنے دام میں پھنسانے کی کوشش کی تھی لیکن نیولین اس کی چالوں میں نہ آیا اور اس نے اسے اپنی سلطنت کی حدود سے باہر نکال دیا، تاہم وہی اس کے اچھے چڑھ گئے۔ حکومت نے اس منصوبے پر بہت بڑی رقم صرف کی اور وقت بھی بہت زیادہ کیا لیکن حاصل کچھ بھی نہ ہوا۔ نومبر 1812 میں آزمائش کے دوران میں غبارے سے گیس رسنے لگی اور لے مچ غائب ہوا کہ اس کا کہیں سراغ نہ ملا۔

47- ب۔ مازوئے پیس (Lobnoye Place) ماسکو میں وہ جگہ جہاں مجرموں کو کوڑے لگائے یا پھانسیاں دی جاتی تھیں۔ یہاں سید یز سکوار میں واقع تھی۔ ماڈ کے مطابق اس کے لفظی معنی "پیشانی کا مقام" ہیں اور یہ آرمی زبان کے لفظ gwagutha (سنی کی اردو نیمیل میں اسے گلکٹا لکھا گیا ہے اور انگریزی میں سے Golgotha تحریر کرتے ہیں) کا مترادف ہے۔ آرمی لفظ گلکٹا کے معنی "کھوپڑی" ہیں اور یہاں پہاڑی کا نام ہے جس کی شکل کھوپڑی سے ملتی جلتی تھی اور جہاں مسیح کو صلیب پر چڑھایا گیا تھا۔ "لاطینی میں اس کا ترجمہ Calvaria، جو انگریزی میں Calvary بن گیا، کیا گیا ہے۔

48- موژیسک (Mozhaisk) بارودینو کے قریب روسی قصبہ۔ ماسکو کے مغرب میں واقع ہے۔

49- سورچہ یہاں تمام انگریزی تراجم میں لفظ Redoubt ("ایک الگ تھلگ اور محفوظ جگہ جس میں فوجی سپاہی چھپ سکتے یا پھپھو کر داپس آسکتے ہیں") استعمال ہوا ہے۔ چونکہ یہ لفظ یورپ کی اکثر زبانوں (فرانسیسی اطالوی، لاطینی وغیرہ) میں مختلف شکلوں میں استعمال ہوتا ہے، اس لیے ہو سکتا ہے کہ روسی میں بھی موجود ہو۔ مولوی عبدالحق کی ڈکشنری میں اس کا ترجمہ "گڑھ" یا "سورچہ" اور "فین" کی ڈکشنری میں "رن گڑھ، سورچہ" یا "سورچہ" دیا گیا ہے۔ لفظ کا پورا مفہوم کسی میں بھی موجود نہیں۔ "سورچہ" عام فہم ہے، اس لیے میں نے اسی کو ترجیح دی ہے۔

50- بارودینو (Berodino) یا گنج ترودینو (روسی میں اگرودو Oodoo) کٹھے ہو چکے تھے تو عام طور پر پہلا O الف یا زبر کی آواز رہتا ہے۔ ماسکو اور سمولنسک کے مابین ایک قصبہ۔

51- تھا کہ بارودینو کا یہ خاکہ یا نقشہ طاہرہ کی نے خور بتایا تھا۔ وہ ستمبر 1867 میں دو دن اس علاقے میں مقیم رہا۔ اس نے ہر جگہ دیکھی بھالی دوران کسانوں سے، جو اس زمانے کو یاد کر سکتے تھے، باتیں کیں۔ اس نے دستیاب وسائل کا بھی بشور مطالعہ کیا اور پھر یہ خاکہ ترتیب دیا۔ بارودینو سے اس نے اپنی بیوی کے نام ایک خط تحریر کیا اور اس میں لکھا ”میں بارودینو کی بڑائی جس طرح بیان کروں گا، کسی نے اسے اس طرح بیان نہیں کیا۔“ (ماڈ)

52- پونیا توںکی (Poniatowski) پولین کی فوج کا ایک پوسٹانی جرنیل۔

53- یواروف (Uvarov) ایک روسی جرنیل۔

54- گورکی: یہ گورکی چھوٹا سا گاؤں ہے اور انیسویں صدی میں بھی گورکی ہی کہلاتا تھا۔ مشہور گورکی موجودہ روس کا دوسرا بڑا شہر ہے اور ماسکو کے شرق میں دریائے ولگا اور ادا کے سنگم پر واقع ہے۔ انیسویں صدی میں اس کا نام نژانی نوگورود (Nizhny Novgorod) تھا۔ کمیونسٹوں نے اسے گورکی بنادیا۔ اب پھر اس کا اصل نام بحال کر دیا گیا ہے۔

55- آئیمیریائی مادر خداوند: حضرت مریم کا القود۔ آئیمیریائی عداوتے تقفاز (کاکیشیا) کا قدیم خطہ ہے۔

56- جرمن زیادہ تر پرنسٹنٹ ہیں، اس لیے وہ روسی طرز کی عبادت میں شریک نہیں ہو سکتے تھے۔

57- مارین (S. N. Marin) مارین الیکسندر اول کا ایڈی کاٹنگ، دو کو تو زوب کا معاصر تھا۔ اس کی ادبی شہرت کا سبب یہ تھا کہ وہ بیروڈی اور سراجیہ نظمیں لکھتا تھا۔ جی۔ وی۔ کیراکوف فوج میں کپتان، جسکری سکول میں استاد اور حب الوطنی کے موضوع پر متعدد نثری نگشتیا کتابوں کا مصنف تھا۔ اس کا بہت مذاق اڑایا جاتا تھا۔ مارین نے اس کے متعلق جو نظم لکھی تھی، وہ ایک قسم کی پیشین گوئی تھی۔

تم ہمیشہ لکھتے رہو گے،

اپنے تاریخی کو یاد کرتے رہو گے

ان کا دم گھٹ جائے گا (مگر تم باز نہیں آؤ گے)۔

تم کو روکے پکچر بناتے رہتے ہو۔

ان پر حکم چلاتے رہتے ہو۔

تم رہو گے کیپٹن کے کیپٹن ہی۔ (ماڈ)

58- اندر میرے میں روشنی کی کرن تھی۔ یہاں تہذیبی غفلتوں کے ساتھ شعبہ باری کر رہا ہے۔ روسی میں روشنی کو Svelty کہتے

ہیں جب کہ کوئوزوف کے خطاب ہزیرین ہائی نس کے لیے لفظ Sveltyshiy (most serene) استعمال

ہوتا ہے۔ (ماڈ)

59- کلڈس ڈنس (Karl von Clausewitz) (1780 تا 1831) نامور عسکری نظریہ ساز اور مورخ۔ (اس نے

1812 کی جنگ کے بارے میں ایک کتاب بھی تحریر کی تھی۔ وہ پرشیا کا جرنیل تھا، لیکن اب اس نے روس میں ملازمت اختیار کر لی تھی۔

60- ویسٹ فالی (West Phalia: West Fallen)۔ سابقہ جرمن ریاست پرشیا کا صوبہ۔

61- جنگ کا مقصد قتل ہے، ماز کا خیاں ہے کہ پرنس آندرے نے اس باب میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے، وہ ہم کے مقاصد سے کچھ نہیں کھاتے، بلکہ وہ طاسطائی کے اپنے خیالات کے زیادہ قریب ہیں۔ طاسطائی نے بعد کے سالوں میں جنگ کی جو مطلقاً مذمت کی، یہ اس کا پیش خیمہ ہیں۔

62- سلاواٹکا ہسپانیہ کا صوبہ اور شہر۔ یہاں 10 جولائی 1812 (موجودہ کیلنڈر) کو انگریز جرنیل ڈیوک آف انگلن نے انگریزی، پرتگالی اور ہسپانوی افواج کی معیت میں فرانسیسی مکینڈر مارشل، غموں کو شکست دی تھی۔

63- اسپر اطورہ کا تختہ اس واقعے کی خود دہرائی سے تصدیق ہو جاتی ہے لیکن طاسطائی نے اسے جس انداز سے پیش کیا ہے، وہ نظریہ ہی نہیں بلکہ اس میں کچھ زیادتی کا عنصر بھی شامل ہے۔ طاسطائی کا زور اس بات پر ہے کہ پولین جنگ کے بارے میں بے چینی محسوس کر رہا تھا اور یہ ٹھیک بھی ہے (اس کا نسوار کی ڈیہ سنگھانا اس کی علامت ہے) تاہم بعض باتیں جس طرح بڑھا چڑھا کر پیش کی گئی ہیں (مثلاً ”دوبو سے“ ”نئے درباری پھرتی“ سے سرپوش ہٹا دیا) ”ہر حالوی کی طرح پولین میں بھی یہ خداداد منکھ موجود تھا“۔ ”ارغ“ ”تمام لوگ بچوں کے بل چلتے باہر نکل گئے۔“۔ اس آخری دعویٰ کا کوئی تاریخی ثبوت موجود نہیں۔ پولین نے کبھی یہ نہیں جانا تھا کہ اس کے امر بچوں کے بل چل کر اس کے حضور آئیں یا باہر جائیں)، انھوں نے اس سارے منظر کو مستحکم خیر بنادیا ہے۔ (ماڈ)

64- پوپ سکسٹس چہارم (1414-1484)۔ پوپ سکسٹس (Sixtus) کے نام سے موسوم ہوا، اطالوی میں اسے سسٹین (Sistine) کہا جاتا ہے۔ پوپ سکسٹس چہارم آرٹ کا بہت دلدادہ تھا۔ اس کے زمانے میں روم کا مشہور ترین کعبہ (Sistine Chapel)، جس کی چھت اور دیواروں پر، نیکل استخلو نے تصاویر بنائی تھیں، تعمیر ہو۔ لیکن اس کی ایک وجہ شہرت یہ بھی ہے کہ وہ بہت ”اقربا پرور“ تھا۔ اس نے اپنے بھتیجے کو، جو بعد میں جوہس دوم کے نام سے پوپ بنا، جائز دانا جائز طریقے سے آگے بڑھانے کے لیے، یڑی چوٹی کا زور لگایا۔ ”اقربا پروری“ کے لیے یورپی زبانوں کا لفظ nepotisma = nepotism، بھانجوں، بھتیجوں کی طرف داری کرنا (احالوی) nepotisme (فرانسیسی) اور nepotism (انگریزی) اس کی اس روش کے باعث معرض وجود میں آیا۔ طاسطائی نے متن میں حضرت مریم کی جس تصویر کا ذکر کیا ہے، اس کا نام Sistine Madonna (میڈونا، حضرت مریم کو کہتے ہیں) ہے اور اسی پوپ کی فرمائش پر بنی تھی۔

65- فریڈلانڈ: (Friedland) کسی زمانے میں یہ مقام پرشیا (جرمنی) میں شامل تھا، آج کل یہ روس کے قبضے میں ہے اور اس کا نام پراڈونسک ہے۔ یہاں 14 جون 1807 کو پولین کی سپاہ اور روسی فوج کے، جس کی کمان بے نگ سین کر رہا تھا، بڑائی لڑی گئی۔ روس ہار گیا اور یوں سپاہہ ٹلٹز کی راہ ہموار ہو گئی۔

66- ڈیوک آف ہلیچانگاں فرانسیسی مارشل (1769-1815)۔ اس کا نام Michel Ney تھا۔ ماسکو سے پشپاک کے بعد فرانسیسی فوج کے حقیقی دستوں کی کمان اس کے پاس تھی اور کہا جاتا ہے کہ اس کی قیادت کی وجہ سے فرانسیسی سپاہ

کمل تاجی سے بچ گئی۔ جب پولین کے دائروں میں شکست کھانے کے بعد فرانس میں بادشاہت دوبارہ بحال ہوئی، اس پر غداری کا الزام لگایا گیا اور اسے گولی سے ہلاک کر دیا گیا۔

67- پرنس پونیاٹوئسکی (Prince Poniatowski)، پولین کا ایک پولستانی کا غر

68- داسرائے موعا یعنی شاہ شہلےز۔ موعا (Murat) اور موعا (Morand) دو مختلف اشخاص ہیں۔

69- گاؤں۔ بارود بخو۔

70- چھ ستمبر 1812: پولین کی بہ تاریخ نئے کیلنڈر کے مطابق ہے۔ روسی پرانے کیلنڈر سے کام لیتے تھے، اس کے لیے اس روز اگست کی پچیس 25 تاریخ تھی۔

71- پیٹر اعظم (روسی میں پیٹر اعظم) (1672-1725) روسی زار (1682 تا 1725)، روسی کا عظیم ترین حکمران تصور کیا جاتا ہے اور اسی کے عہد میں روسی یورپ کے ایک عظیم ملک کے طور پر منصفہ شہرہ پرایا۔ اس نے ایک طرف ترکوں اور ایرانیوں سے پنجہ آزمائی کی اور دوسری طرف پولندا کے مقام پر پولین کی افواج کو شکست فاش دی، یوں اس نے روس کی سرحدیں بحیرہ بالٹک سے بحیرہ کیسپین تک پہنچا دیں۔ ہر روسی حکومت ایران یا پاکستان کے ذریعے گرم پانیوں تک پہنچنے کے لیے ہاتھ پاؤں مارتی رہی ہے، اس کا خواب سب سے پہلے اسی نے دیکھا تھا۔ ”روسی تاریخ“ کا باب بھی دیکھیں۔

72- سینٹ بارتھولومیو حضرت عیسیٰ نے جن بارہ اشخاص کو اپنے حوالہ کی مقرر کیا تھا، ان میں سے ایک سینٹ بارتھولومیو (عبرانی نام پر تلمائی) تھا۔ (نیا عہد نامہ، مرقس 18.3)۔ اسے انگریزی میں تیتھائل بھی کہا جاتا ہے۔ اس کا یوم 24 اگست کو منایا جاتا ہے۔

73-74- چارلس نهم (فرانسیسی شاغل) اور تیل عام چارلس نهم 1550 میں پیدا ہوا۔ وہ صرف دس سال کی عمر میں فرانس کا بادشاہ بن گیا لیکن اصل اختیار اس کی ماں کے پاس تھے۔ ماں بیٹے دونوں کو پروٹسٹنٹ (فرانس میں اکثریت روسن کیتھولک لوگوں کی تھی اور اب بھی ہے) مذہب کے پیروکاروں (جنہیں فرانسیسی میں Huguenot کہا جاتا تھا) سے اللہ واسطے کا بیر تھا۔ 24 اگست 1572 کو جب سینٹ بارتھولومیو کا یوم منایا جا رہا تھا، ان کے ایما پر فوجیوں اور غصیے لوگوں کے ہجوم نے بیرس میں تین ہزار پروٹسٹنٹوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ صوبوں میں جو لوگ ہلاک ہوئے، وہ ان کے عداوہ تھے۔ خود چارلس نهم تو دس سال بعد مر گیا لیکن یہ داغ اس کی پیشانی سے کبھی دھل نہ سکا۔

75- پانچ (Punch) ایک قسم کا مشروب، جو عام طور پر گرم پانی، چینی، لیموں اور مختلف قسم کے مصالحوں کی آمیزش سے بنایا جاتا ہے۔

76- لوری وغیرہ: پولین نے شان اطالیہ میں، سٹروئی فوجوں کو 1796 میں لوری اور 1800 میں مارنگو کے مقام پر شکست دی تھی۔ 1806 میں اس نے جرمن قصبے جینا میں پریشیا کی دھنائی کی ورسٹریا کے خلاف اپنی آخری لڑائی میں، بخو و اگرام (آسٹریائی قصبہ) کے مقام پر ہوئی، فتح حاصل کی تھی۔ آرکونا کی لڑائی بھی فرانس اور آسٹریا کے مابین ہوئی تھی اور یہاں 1797 میں پولین کا مہذب رہا تھا۔

77- tableaux vivants یہ tableau vivant کی جمع ہے۔ فرانسیسی میں اس کا مفہوم "زندہ تصویر" ہے۔ یہ دراصل ایک قسم کا مختصر ڈرامہ ہوتا ہے۔ اس میں کردار رنگارنگ کپڑے پہن کر سٹیج پر آتے ہیں، وہ کرتے کرتے کچھ نہیں، بس تصویر کی طرح چپ چاپ ساکن کھڑے رہتے ہیں۔

78- پیترا یوانو روج یعنی پرنس باگ راتیاں

79 الف۔ ڈیوک آف ورنم برگ رار پادل اور کا برورسٹی، وزرار ایک ندر کا، صوں ورنم برگ (Wuntemberg) جنوب مغربی جرمنی میں واقع ہے۔ یہاں کی ڈچی کا آغاز 1495 میں ہوا۔ 1806 میں یہاں بادشاہ قائم ہوئی اور وہ 1918 تک قائم رہی۔ اب یہ جرمن ریاست ہان ورنم برگ کا حصہ ہے۔

79 ب۔ دختر وف: انگسار پندرہوی جرمن۔ ط لٹائی نے اپنے اس ناول کی کتاب چہارم کے حصہ دوم (باب 15) میں اس کی بہت تعریف کی ہے۔

80- موغا کو قیدی بنایا گیا ہے یہ غیر غلط تھی، قیدی موغا نہیں بلکہ جنرل بونامی (Bonnamy) بنایا گیا تھا۔ اس نے جب ایک روسی سپاہی کی سنگین پنی چھاتی پر دیکھی وہ چلا کر بول "میں بادشاہ ہوں۔" اسے صحیح سلامت کو توفد کے پاس پہنچا دیا گیا۔ غلط خبر ایک مسخر نے، جو جیسی طور پر حراست کی خبر لگا پھاڑ پھاڑ کر سنارہ تھا، پھیلائی تھی۔ (ماڈ)

81- سینٹ ہیلینا (St Helena) ایک جزیرہ۔ افریقی ممالک انگولا اور نیجیریا کی سرحد کے قریب اسٹین جنوبی بحر اوقیانوس میں واقع ہے۔ کل رقبہ سینٹ لیس مربع میل ہے۔ نیولین نے اپنی زندگی کے آخری چھ سال اسی جزیرے پر انگریزوں کی حراست میں گزارے تھے۔ یہ جزیرہ ابھی تک برطانیہ کے قبضے میں ہے۔

82- کانگریس نیولین کا اثر رہ کانگریس آف ویانا کی طرف ہے۔ 1814 میں نیولین کو انگریزوں اور اس کے اتحادیوں نے ہسپانیہ میں پے در پے شکستوں سے دوچار کیا اور وہ فرانس کی طرف واپس آیا تو پیرس کے لوگوں نے بھی اس کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا۔ اتحادیوں کے اصرار پر اسے اطالیہ کے جزیرے نابیا جلا وطن کر دیا گیا اس کی اسی جلا وطنی کے دوران میں یورپی ممالک کے نمائندوں کی ویانا میں کانگریس منعقد ہوئی۔ اس کانگریس میں متحد چھوٹے چھوٹے ممالک کے علاوہ آسٹریا، پرشیا، برطانیہ، فرانس اور یورپ کے نمائندے شریک ہوئے۔ روس کی نمائندگی زار الیکساندر نے بذات خود کی۔ یہ کانگریس ستمبر 1814 سے جون 1815 تک جاری رہی اور اس میں مختلف ممالک کے مختلف علاقوں پر حقوق تسلیم کرے گئے۔

83- بٹاق مقدس (Holy Alliance) روس کے زار الیکساندر نے اس نام کا ایک معاہدہ 26 ستمبر 1815 کو جاری کیا تھا اس پر ابتدا میں آسٹریا کے امپراطور فرانس اول اور پرشیا کے شاہ فریڈرک ولیم سوم نے دستخط کیے۔ انگلستان کے شاہ جارج چہارم، ترکی کے سلطان اور پوپ نے تو اسے ماننے سے انکار کر دیا لیکن یورپ کے باقی ممالک کے حکمرانوں نے بھی بعد میں اس پر دستخط کر دیے۔ اس معاہدے کے تحت یورپی حکمرانوں نے اپنے تعلقات "عیسائیت کے اصولوں" کے مطابق استوار کرنا تھے۔ مورخین کے مطابق یہ معاہدہ مبہم اور سرے سے بیکار تھا۔ بعد میں انگریزوں اور ان کے تین اتحادیوں (روس، آسٹریا اور پرشیا) نے نیولین کی واپس کو روکنے کے لیے "چار فریقی معاہدہ" (Quadruple)

(Alliance) (میں نومبر 1815) کہ اور یوں حقائق مقدس کو بالکل بیکار بنا دیا۔

84- ہوریا کی وغیرہ: ہوریا اور میریا کے باشندے ہوریا کی ورثہ برگی کے ورثہ برگی اور میکسن برگ کے میکسن برگ تھے۔ یہ اس زمانے میں آزاد ریاستیں تھیں، آج کل جرمنی میں شامل ہیں۔

85- نیپلز کے باشندے۔ نیپلز 1270 سے 1860 تک آزاد مملکت تھا۔ آج کل یہ اطالیہ کا حصہ ہے۔ نیپلز اطالیہ کا خاصا بڑا شہر اور بندرگاہ بھی ہے۔

لیجی: لیجی کا باشندہ۔ لیجی فرانس کے شمال میں چھوٹا سا ملک ہے۔

رائن لینڈ: (مغرلی) جرمن کا تاریخی خطہ۔ یورپ کی بعض بہترین (انگوری) شرابییں یہیں بنتی ہیں۔ جرمنی کے بڑے بڑے کارخانے بھی، خاص طور پر فولاد کے، اسی علاقے میں ہیں۔

پیدمونٹی (Piedmont) شمال مغربی اطالیہ کا ایک خطہ۔

سوسٹا: سوسٹا لینڈ کا باشندہ۔ جینو: سوسٹا لینڈ کے شہر جینو کا پای۔ جینو ابھی ایک زمانے میں خود مختار ریاست تھی۔

تسکانی: طبریہ کے علاقے تسکانی (Tuscany) کا، جسے اطالوی میں تسکانا (Toscana) لکھا جاتا ہے، باشندہ

ہے۔ یہاں 1569 سے 1860 سے آزاد ریاست قائم رہی۔ اس کے مشہور ترین شہر فلورنس اور پیزا (یہاں خیدہ مینار

واقع ہے) ہیں۔ اطالیہ کے اتحاد کے بعد یہاں کی زبان سارے ملک کے لیے ذریعہ تعلیم اور سرکاری زبان قرار پائی۔

بریمن: ہیسرگ جرمنی کی بندرگاہیں۔ یہاں بھی اچیاں قائم تھیں۔

کالیش (Kalisch): وسطی پولینڈ کا شہر آج کل اسے Kalisz لکھا جاتا ہے۔

حصہ سوم

1- مغالطہ (sophism): منطق کی ایک اصطلاح (اردو میں اسے مضطرب بھی لکھا جاتا ہے)۔ وہ استدلال، جو بظاہر تو بہت خوش نما اور معقول معلوم ہوتا ہے لیکن غور سے دیکھا جائے بالکل بوجھل اور غلط نظر آئے گا۔

2- آخیلیس (Achilles): آخیلیس ہومر کی مشہور نظم Iliad کا نیم داستان کردار ہے۔ کہا جاتا ہے کہ وہ اپنے زمانے کا

عظیم ترین لڑاکا سپاہی تھا اور کوئی شخص بھی اسے شکست نہیں دے سکتا تھا۔ اس پر نہ تلو در اثر کرتی تھی اور نہ تیر۔ جب

وہ بھی بچہ ہی تھا کہ اس کی ماں Thetis نے، جو سمندری پری تھی، خواب میں دیکھا کہ اس کا بیٹا لڑائی میں مارا

جائے گا۔ چنانچہ وہ اسے نہلانے دریا Styx پر، جس کے متعلق یہ مشہور تھا کہ اس میں جو نہایا، سوا مر ہوا، لے گئی۔

اس نے اسے دریا میں غوطہ دیا لیکن اس کی ایڑی، جسے اس نے ہاتھ سے پکڑ رکھا تھا، خشک رہ گئی۔ اس نے ٹرائے کی

لڑائی میں اپنے سب سے بڑے مخالف جنگجو ہیکٹر (Hector) کو بھی ہلاک کر دیا لیکن جیرس کے ہاتھوں اپنی اسی

خشک ایڑی پر، جو اس کے جسم کا واحد فانی حصہ تھا، مسموم تیر لگنے سے مر گیا۔

3- بیریزینا (Berezina): روس کا ایک دریا۔ کل لمبائی 380 میل۔

- 4- فلی (Fili) ایک گاؤں۔ اس زمانے میں یہ ماسکو سے چار میل دور تھا۔
- 5- strategy اور tactics جنگی چالیں۔ ان دونوں الفاظ کا مطلب یہ ہے: میدان جنگ میں فوج کو کہاں کہاں متعین کیا جائے اور کون سے ہتھیار کہاں کہاں فراہم کیے جائیں تاکہ حریف پر غلبہ حاصل کیا جائے۔ ستر جنگی کمانڈر انچیف اس کا شاف بناتے ہیں اور ساری فوج کے لیے ہوتی ہے۔ tactics مقامی کمانڈر مقامی حالات کے مطابق اختیار کرتا ہے۔
- 6- یرمالوف (Yermolov) روسی فوج کا ایک جرنیل۔
- 7- ساراگوسا (Saragossa) ہسپانیہ کے اسی نام کے صوبے کا صدر کا مقام۔ ہسپانوی زبان میں اس کا نام صرغوسا (Zaragoza) ہے۔ آٹھویں سے بارہویں صدی تک یہ شہر اور صوبہ مسلمانوں کی تحویل میں رہے۔ عیسائیوں نے سب سے پہلے یہی خطہ مسلمانوں سے چھینا تھا اور پھر جدید ہسپانیہ کی بنیاد رکھی تھی۔ 1809-08 کی جنگ کے دوران میں فرانسیسیوں نے ”اس شہر کا دوا دوا تک کا صرا کیے رکھا اور انھیں اس پر قبضہ کرنے کے لیے ایک ایک مکان میں لڑنا پڑا۔“ (ماڈ)
- 8- کنجشک پہاڑیاں (Sparrow Hills)، سکو کے قریب ایک پہاڑی مقام۔ اسی طرح تین پریت (تین پہاڑیاں) بھی ایک مقام کا نام ہے۔
- 9- فرانسیسی میں اشعار بناؤں اس کے بعض اشعار پنے حواشی میں نقل کیے ہیں:

میں پیدا ہوا تار تار تھا	Je suis ne Tartare.
میں بننا رومی چاہتا تھا	Je voulais etre Romain
فرانسیسی مجھے وحشی کہتے ہیں	Les Francais m' a pelement barabar.
روسی۔ یوٹی راں دیں	Les Russes — Georges Dandin

نوٹ: یوٹی راں دیں مشہور فرانسیسی ڈرامہ نگار مولییر کے اسی نام کے ڈرامے کا تراجم کردار ہے۔

- 10- سوسائٹی آف جیسیس (Society of Jesus) رومن کیتھولک مذہب کا ایک فرقہ۔ سے ایک ہسپانوی پادری سینٹ، گنا مشس یوئیل (St Ignatius Loyola) نے 1534 میں قائم کیا تھا۔ اس کا بنیادی مقصد تحریک اصلاح مذہب کی، جو مارٹن لوتھر نے شروع کی تھی، کی نفی کرنا اور رومن کیتھولک مسلک کی حمایت کرنا تھا۔ اس فرقے کو عسکری خطوط پر ستوار کیا گیا تھا اور اس نے نئی دنیا اور برصغیر پاک و ہند میں عیسائیت کی تبلیغ کے سلسلے میں بہت کام کیا۔ رفتہ رفتہ یہ فرقہ اتنی طاقت حاصل کر گیا کہ مختلف حکومتوں کے لیے خطرے کا باعث بن گیا تا آنکہ پوپ کلمنٹ چہارم نے 1773 میں اس پر پابندی لگا دی لیکن 1814 میں اسے دوبارہ کام کرنے کی اجازت دے دی گئی۔ پوپ کے پابندی لگانے کے باوجود یہ فرقہ روس اور پرشیا میں باقاعدہ کام کرتا رہا اور کیتھرین اعظم کو اس کی فعال مخالفت بن گئی۔ تاہم 1813 میں اسے ماسکو اور پیٹرز برگ سے نکال دیا گیا اور 1820 میں سارے روس سے اس کا

قلع قلع کر دیا گیا۔

اس فرقے کے ارکان کو جزدیٹ (Jesuit) یا یسوی کہا جاتا ہے۔ یہ لوگ تادیوں کے بلائے ماہر ہوتے تھے۔ چنانچہ تادیوں باز یا ریاکار شخص بھی جزدیٹ کہلاتا ہے۔

11- Un Jesuite a robe courte (Jesuit in walking dress)۔ (لفظی ترجمہ: چھتے پھرتے لباس میں یسوی) یعنی وہ یسوی فرقے کا باقاعدہ پاروری نہیں تھا، لیکن اس کی تعلیمات کی تبلیغ ضرور کرتا تھا۔ عیسائیت میں رکی مذہبی تقریب میں کسی شخص کو پاروری بنایا جاتا ہے۔ تاہم وہ شخص جو تبلیغ اور دیگر مذہبی امور کا کام باقاعدہ پاروری بنے بغیر کرتا ہے، سے Layman (بے قاعدہ مذہبی رہنما) کہا جاتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ موسویہ لایغ اسی قسم کا رہنما تھا کیونکہ اس کا لباس پاروریوں کا نہیں بلکہ عام لوگوں کا (چلتا پھرتا لباس) تھا۔

12- قلب مقدس: (1) رومن کیتھولک مذہب میں حضرت عیسیٰ کے دل کو قلب مقدس (Sacred Heart) تسلیم کیا جاتا ہے۔ اسے ان کی قربانی کی علامت قرار دیا جاتا ہے اور اس سے نیاز مسدی جتنائی جاتی ہے۔ (2) بعض اوقات قلب مقدس خود حضرت عیسیٰ کی علامت کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔

13- abbe فرانس میں پہلے خاتوا کے سربراہ کو abbe (ایب) کہا جاتا تھا لیکن اب یہ لفظ بطور لقب ہر پاروری کے لیے استعمال ہوتا ہے اور یہاں بھی اس سے مراد پاروری ہی ہے۔

14- مقدس باپ (Holy Father) پوپ

15- ولسکی کوف (Vasilchikov) و پلاتوف (Platov) و فوجی انس۔

16- ورائیٹر (Vornetz)۔ ماسکو کے جنوب میں مسوہی نہیں، بلکہ شہر بھی ہے۔ گولائی رستوف اور پرنس ماریا کا عشق یہیں پیدا ہوا تھا ہے۔

17- آرج بٹشپ اوکسن اپنے زمانے کے مشہور مبلغ اے۔ وی۔ لوگ رادسکی (Vinogradsky) (1818-1766) کا راہب نام۔

18- ہرف میز ڈراپس (Hoffman's drops) ایک دوا جو کسی زمانے میں روس میں بہت استعمال ہوتی تھی۔ اس میں چالیس فیصد ایتھر سلفوری کس (ether sul phuricus) ایک قسم کی بے رنگ سیال شے اور ساٹھ فیصد الکحل ہوتی ہے۔ (ماڈ)

19- گوبلاں پردے، یہ پردے جنھیں انگریزی میں tapestry کہتے ہیں، بہت بھاری ہوتے تھے اور ان پر طرح طرح کی تصاویر یا تو چسپاں کر دی جاتی تھیں یا پھر بنائی کے دوران میں بن دی جاتی تھیں۔ گوبلاں (Gobelin) پیرس کا ایک کارخانہ تھا اور اس کے پردے بہت مشہور ہوئے تھے۔ عام طور پر ان پردوں سے دیواریں لدا چنی جاتی تھیں۔ انگلستان کی کاؤنٹی ڈاربی شائر کے دیگی محل ہارڈوک ہاں (Hardwick Hall) کی دیواریں پر یہ پردے اب بھی دیکھے جاسکتے ہیں۔ یہ پردے اس محل کی اولین مالکہ Boss of Hardwick نے اپنے ہاتھوں سے بنائے اور اس پر نقش و نگار کشید کیے تھے۔

20- آرڈر (Order) چند افراد کا کردہ، جنہیں بادشاہ وقت یا حکومت غیر معمولی خدمات سرانجام دینے پر خاص اعزازی سلسلے میں داخل کر لیتی ہے۔ ان افراد کو خاص قسم کا امتیازی نشان (insignia) پہننے کی اجازت ہوتی ہے۔ برطانیہ کا Order of Merit (O.M.) سب سے زیادہ مشہور ہے۔ ایک وقت میں صرف چوبیس اشخاص اس کے ارکان رہ سکتے ہیں۔

21- گر و باندھ دی چیزوں کو یاد رکھنے کے لیے کسی کپڑے میں گانٹھ باندھنے کا رواج کم از کم پنجاب کے دیہات میں اب بھی موجود ہے۔

22- خداوند کے ڈھنگ کاؤٹنس کے ذہن میں شادی کے متعلق روسی کلیسا کے احکام درجے ہیں۔ اگر پرنس آندرے کا انتقال ہو جاتا ہے پھر نکولائی رستوف کا راستہ صاف ہو جاتا ہے اور وہ پرنس ماریا بلکونسکی سے شادی کر سکتا ہے۔ اوپر حصہ دوم کا لوٹ نمبر 30 دیکھیں۔

23- Patriarch (بطریق، سقف)، ایسٹرن آرتھوڈوکس چرچ میں سکندریہ، اٹھارہ کیہ، قسطنطنیہ، یروشلیم، ماسکو، سرگیو اور رومانیہ کے بشپ اسقف کہلاتے ہیں۔ Patriarch's Pond، سکو کے ایک محلے کا نام ہے۔

24- بویار Boyar۔ روسی زار طبقہ اشراف کے جن افراد کو اپنے معاونین مقرر کرتے تھے، انہیں بویار (روسی Boyarin) کہتے تھے۔ روسی میں یہ لفظ قدیم ترکی زبان کے لفظ boila (حطاب) سے بنایا گیا تھا۔ ماڈ کا کہنا ہے کہ یہ لوگ پیٹرز اعظم کے زمانے میں اپنے اس استحقاق سے محروم ہو گئے تھے، چنانچہ یہ بھی لفظ متردک ہو گیا تھا لیکن پٹرلین کو اس کا کوئی علم نہیں تھا۔ یوں اس کا بویاروں کو بدلنے کا حکم عجیب لگتا ہے۔

25- نذر آتش کر دیتا ہے روسی عام طور پر شہد کی مکھڑوں کے چھتے درختوں کے تنوں کو کھوکھا کر کے ان کے اندر جاتے تھے اور جہان کی صفائی کرنا ہوتی تھی تو پرانے چھتے کو جلا دیا جاتا تھا۔ (ماڈ)

26- ریڈ سکوئر (Red Square)۔ ماسکو کا مشہور چوک۔ یہ شہر کے عین وسط میں واقع ہے اور آدھ میل سے زیادہ لمبا ہے۔ کریملن اسی چوک میں واقع ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ چوک کا نام زاروں کے عہد سے چلا آ رہا ہے، کیونٹوں کی اختراع نہیں۔

27- بازار مغربی زبانوں میں بازار کے معانی "شاپنگ ایریا" ہیں جو مختلف ٹھیکوں اور سڑکوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ متن سے معلوم ہوتا ہے کہ ماسکو کا کوئی خاص شاپنگ ایریا "باراز" کے نام سے موسوم تھا۔

28- سرمنڈے۔ جن قیدیوں کو جیل سے رہا کیا جاتا تھا، ان کے سر موٹا دیے جاتے تھے۔ (ماڈ)

29- یارڈ پرڈر ایک قسم کا دربان۔

30- سفید نوٹ اس زمانے میں کاغذی روپوں کی قیمت روپیلی روپوں سے کم ہوتی تھی۔ "ایک روپیلی روپوں ساڑھے تین کاغذی روپوں کے برابر ہوتا تھا۔" (ماڈ)

31- چائنا گورن (روسی Klay-gorod) ماسکو کا محلہ تھا۔ (ماڈ)

32- ولادی میر (Vladimir) ایک قصبہ۔ ماسکو کے شرق میں واقع ہے۔ ولادی میر (905-1015) روس کا پہلا

بیسائی سکراں تھا۔

33- سینٹ نکولایا نکولس (چوتھی صدی عیسوی کا باشندہ)۔ روسی ملاحوں اور بچوں کا محافظ سینٹ۔ کہا جاتا ہے کہ وہ ایشیائے کوچک کے قصبہ مائرہ (Myra) کا شپ تھا اور دعویٰ کیا جاتا ہے کہ اس کے بعض تبرکات طایہ کی بندرگاہ باری کے سینٹ نکورگرہ میں محفوظ ہیں۔ روایات کے مطابق اس نے تین فریب بچوں کو سونے کے تحائف دیے تھے تاکہ وہ اپنے بچے جبر فریبکیں۔ اس سے چھ دسمبر کو، جو اس کا یوم میلانت ہے، تحائف دینے کی رسم چلی۔ اب یہ تحائف 25 دسمبر کو دیے جاتے ہیں۔ بیسائی کرسمس کے روز اپنے بچوں کو جو تحائف دیتے ہیں، ان کے متعلق وہ انہیں یاد کرتے ہیں کہ یہ رات کو ایک نورانی دائرہ والے بزرگ چھوڑ گئے تھے۔ یہ بزرگ اصلاً یہی سینٹ نکورہ ہے۔ امریکہ اور برطانیہ میں اسے Santa Claus کہا جاتا ہے۔ کیوں؟ اس کی کوئی وضاحت نہیں کرتا۔ (میکلس انساٹیکلو پیڈیا)

34- (le Kremlin) "مالا سلطانی ہمیں یہ بتانا چاہتا ہے کہ روس کے متعلق فرانسیسیوں کی معلومات ناقص اور غلط تھیں۔ مثلاً یہاں وہ کہتا ہے کہ سوغا کریمین کو، جس کی جنگی دیواریں 1367ء کو ٹھکانی گئی تھیں، قلعہ تصور کرتا ہے۔ ممکن ہے کہ قرون وسطیٰ میں یہ واقعی قلعے کا کام دیتا ہو لیکن اس کی ساخت کچھ اس قسم کی تھی کہ یہ توپ خانے کی گولہ باری کے خلاف مدافعت نہیں کر سکتا تھا۔ کتاب چہارم، حصہ دوم، باب نهم میں نیپولین کو کریمین کا دفاع مضبوط بنانے کے سلسلے میں جو ہدایات دیتے دکھایا گیا ہے، اس کا ذکر بھی طنزیہ انداز سے کیا گیا ہے۔ 1812ء میں کریمین کی تفصیل محض ایک احاطے کا، جس کے اندر محلات، گرجے، عداوتیں اور سرکاری عمارتیں واقع تھیں، حصار کرتی تھی۔" (ماڈی پہلے بھی russe Basunof) وغیرہ کا سار قصہ، کتاب دل، باب 19 میں تفصیل سے آچکا ہے۔

36- ساتویں ستمبر کا واقعہ: باروین کی لڑائی اس زمانے میں روس میں مراد تقویم کے مطابق باروین کی لڑائی 26 اگست کو ہوئی تھی۔ مغربی تقویم (جواب ساری دنیا میں رائج ہے) کے مطابق اس روز ستمبر کی سات تاریخ تھی، اس لیے عام ہال اسے 7 ستمبر کا واقعہ قرار دیتا ہے۔

37- Chevalier of Legion de Honneur لیجن ڈانر کے سلسلہ اعزازات کے لیے کتاب سوم کا حصہ اول کا حاشیہ نمبر 18 دیکھیں۔

38- کواس (Kvass) بیئر سے ملتا جلتا روسی مشروب۔ رائی یا جو سے بنتا ہے۔

39- واگرام یہ قصبہ سٹریا کے دارالصحف ویانا کے شمال مشرق میں واقع ہے۔ یہاں فرانسیسیوں اور آسٹریوں میں پانچ اور چھ جولائی 1809ء کو لڑائی ہوئی تھی۔ نیپولین نے آسٹریائی فوجوں کو عبرت ناک شکست دی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ اس لڑائی میں جتنی توپیں استعمال ہوئیں، آج تک کسی لڑائی میں نہیں ہوئیں۔ (میکلس انساٹیکلو پیڈیا۔ ایڈیشن 1988) 40- لاسکودا (La Moskowa): فرانسیسی باروین کو لاسکودا کہتے تھے۔

41- تالما وغیرہ: تالما (Talma) امیہ ڈرامے نگھتا تھا، دھنیو (La Duchenois) ایکٹرس تھی، پوٹیر (Potier) مزارعہ اداکاری کرتا تھا اور سونبون (Sorbonne) پیرس کی مشہور یونیورسٹی ہے۔

42- مارکیز (marquise)۔ مارکیز (کازنٹ اور ڈیوک کے مابین نوابی خطاب) کی بیوی یا بیوہ۔ اگرچہ اسے marchioness کہتے ہیں۔ کپتان نے مارکیز اور اس کی دختر کا جو واقعہ بیان کیا ہے، جیسے وہی فرانسیسی ادیب موپساں کے ناول Bel-Ami کا موضوع ہے۔

43- (Saler kraut) سادر کرڈٹ: ایک قسم کا گوبھی کا جرمن اچار۔ یہ گوبھی گے قتلے ان کے اپنے ہی پانی میں جوش دے کر اور خیر اٹھا کر بنایا جاتا ہے۔

44- "تروکسا (Troitsa): سرجی ایوڈرڈنسکی (یہ جنگی) خانقاہ۔ اسے سینٹ سرجی سے قائم کیا تھا۔ یہ ماسکو سے چوالیس میل دور مشرق میں واقع ہے۔ جس قصبے میں یہ واقع ہے، آج کل اس کا نام زگورسک (Zogorak) ہے۔" (ماڈ) (کتاب چہارم کے حصہ اول کا حاشیہ نمبر 44 بھی دیکھیں)

چوتھی کتاب

حصہ اول

1- دونوں امپراطوریں۔ امپراطور ماریا فیودرنا زار پاپاں اول کی بیوی اور زار الیکساندر اول کی والدہ تھی۔ امپراطور الیکساندرا الیکساندر اول کی بیوی تھی۔ سوخرالڈ کرجرمن ریاست "ہاڈس کی شہزادی تھی اور اس نے شادی کے بعد اپنی روسی حب الوطنی کو پروان چڑھایا تھا۔" (ماڈ)

2- سینٹ سرجی (انگریزی میں St Sergius): (1314 تا 1392) روسی راہب۔ اس نے ماسکو کے قریب رادونو جنگل میں ایک مقام پر، جسے اب زگورسک کہتے ہیں، خانقاہ قائم کی تھی۔ یہ خانقاہ قلیل عرصے میں روسی کاروہانی اور مشنری مرکز بن گئی۔ اس سے قبل اکثر روسی خانقاہیں تاتاریوں نے بنے حملوں سے اجاڑ دی تھیں۔ یوں سینٹ سرجی روس میں خانقاہی نظام کا احیا کنندہ قرار دیا جاتا ہے۔ (کتاب سوم کے حصہ سوم کا نوٹ نمبر 44 دیکھیں)

3- وجع الصدر (angina of the Chest = angina pectoris): سینے اور بانئیں بازو کا شدید درد جو قلب کی شریانوں میں خون کی پوری مقدار نہ پہنچنے کے سبب ہوتا ہے۔ آج کل بائی پاس (bypass) کے ذریعے اس کا علاج ممکن ہو گیا ہے۔

4- آسٹروی پرچم وٹ گین فٹائمن تھا تو جرمن لیکن دور روسی فوج میں شامل تھا۔ اس نے روس کے ایک مقام پر توپول میں فرانسیسی فوج کو، جس کی قیادت جنرل اوری نات کر رہا تھا، شکست دی تھی اور فرانسیسیوں سے چند آسٹروی پرچم جھین لیے تھے۔ یہ لڑائی اٹھارہ اورانیس جون 1812 کو ہوئی تھی، اس وقت تک آسٹروی روسیوں کا ساتھ چھوڑ کر فرانسیسیوں سے مل چکے تھے۔

5- ہوشنا عبرانی لفظ ہے (انگریزی میں hosanna)۔ یورپی زبانوں میں یونانی اور لاطینی کی وساطت سے آیا۔

لفظی معنی "ہمیں بچائیں" ہیں۔ خدا اور مسیح کی حمد کے لیے بطور نعرہ استعمال ہوتا ہے۔

6- ردی داؤد کا قلاخن: جولیت (کتاب سوم حصہ اول حاشہ نمبر 82 دیکھیں) نے جب اسرائیلیوں کو لٹکارا، کوئی بھی اس کے مقابلے کے لیے نہ نکلا۔ آخر حضرت داؤد نے سے ردو ہاتھ کرنے کی تھنی۔ "اور اس نے اپنی لائیں اپنے ہاتھ میں لی۔ پانچ چکے پتھر"۔... اپنے جھولے میں ڈالے۔ "اور اس کا لائن اس کے ہاتھ میں تھا۔ فلسٹی (جولیت) نے۔ داؤد کو دیکھا اور سے ناچیر جانا کیونکہ وہ محض لڑکا تھا اور سرخ ردا اور نازک چہرہ کا تھا۔ داؤد نے اس فلسٹی سے کہا کہ تو تلوار، بھولا اور بھگی لیے میرے پاس آتا ہے۔ خداوند تلوار اور بھولے کے ذریعے سے نہیں بچاتا اس لیے کہ جنگ تو خداوند کی ہے اور وہی تم کو ہمارے ہاتھ میں کر دے گا۔ اور داؤد نے اپنے تھیلے میں ہاتھ ڈالا اور اس میں سے ایک پتھر لیا اور قلاخن میں رکھ کر اس فلسٹی کے ماتھے پر مارا اور وہ پتھر اس کے ماتھے کے اندر گھس گیا اور وہ زمین پر مٹے کے بل گر پڑا۔ سو داؤد اس قلاخن اور ایک پتھر سے اس فلسٹی پر غالب آیا اور اس فلسٹی کو مارا اور قتل کیا۔" حضرت داؤد کے پاس تلوار نہیں تھی۔ انھوں نے جولیت کی تلوار پکڑی، اسی سے اسے قتل کیا اور اس کا سر کاٹ ڈالا۔ (نچیل، نیا عہد نامہ، سولیکس 1۔ باب 17)

7- یاروسلاو (قشور دیکھیں) اپنے ضخیم ناول میں عاقل کی نے تاریخوں کی بہت کم غلطیاں کی ہیں اور، ڈ کے مطابق یہی اس سے یہ غلطی سرزد ہو گئی ہے۔ کو تو زوف نے یہ رپورٹ دراصل 25 اگست کو بھیجی تھی اور اس میں باگ راتیاں، ٹچکوف و کو تائی سوف کی ہدایت کی، جو اگلے روز لڑائی کے دوران میں ہوئی تھی پیش بندی کی گئی تھی، طاسطائی نے زار کے یوم پیدائش (12 دسمبر) کو اس کے نام دن (30 اگست) سے بھڑا دیا۔ پھر کاؤنٹ رستوپ چین کا مراسلہ، جس میں اس نے کو تو زوف کے خط کا جو سے کم اور دسمبر کی درمیانی شب کو دیا تھا۔ (باب نمبر 24، کتاب سوم، حصہ سوم)، ذکر کیا ہے، 4 ستمبر تک پتیر زبرگ نہیں پہنچ سکتا تھا۔

8- یاروسلاو (Yaroslav)، سکو کے تقریباً شمال مشرق میں ایک روسی شہر۔ بہت قدیم تجارتی اور (اٹھارویں صدی سے) پارچہ بانی کا مرکز چلا آرہا ہے۔ سکو سے زار کے بعد رستوفوں نے یہیں قیام کرنا اور یہیں پرنس آندرے نے داعی اجل کو لبیک کہنا ہے۔ پرنس ماریا نے وارانیر سے پانچ سو میل کا فاصلہ (وہ براستہ، سکو نہیں جاسکے گی) طے کر کے یہاں پہنچا ہے۔

9- ڈیانا (Diana): عصمت و عفت اور شکار کی حسین و جمیل کنواری ردی دیوی۔ اسے ماہتاب کی دیوی بھی کہا جاتا تھا۔

10- وسط ستمبر وارا میٹر، سکو کے جنوب میں 175 میل دور ہے۔ وہاں تک خبر پہنچنے پہنچتے تین ہفتے لگ ہی گئے ہوں گے۔ آج سے ساٹھ سال قبل بھی ماڈ نے ان سرگور، کی حالت ناگفتہ بہ بتائی تھی۔ "وارا میٹر کی سرگوریں آج بھی غیر معمولی طوفان پر خستہ و خراب ہیں۔"

11- وہ اب پورا ہو چکا تھا۔ ماڈ نے لکھا ہے کہ خود طاسطائی پر اسی قسم کی واردات گزری تھی۔ نوجوانی کے ایام میں وہ کاکیشیا میں جوئے میں خاصی بڑی رقم ہار گیا تھا۔ اس کے پاس پیسے نہیں تھے اور اس نے اقرار نامہ لکھ کر دے دیا۔ بعد میں اسے معلوم ہوا کہ اس کے لیے اس رقم کی ادائیگی ممکن نہیں۔ اس نے خستہ و خستہ سے دعا کی اور اگلے ہی دن

اسے اپنے بھائی نکولس کا خط موصول ہو کہ ایک چیچن (چیچن انگوٹش کا باشندہ۔ چیچن انگوٹش روسی فیڈریشن میں کاکیشیاں مسلم ریاست ہے، اور آج کل روس سے آزادی حاصل کرنے کی تگ دو کر رہی ہے)، جسے حاکم سطلانی سے بہت انس تھا، اس اقرار نامے کو دودیا رہ جیت چکا ہے اور نکولس کے دربارے اسے بھیج رہا ہے۔

12- مرلی سینٹ سینٹ سرجی۔ حلقہ کابانی۔ اوپر چارٹ نمبر 2 میں ذکر چکا ہے۔

13- مارشل داؤو (Davoul)، "آئی۔ ایس داؤو (1770-1823) دراصل "زیوک آف اورشٹ، (اورشٹ میں

فرانسیسیوں نے 1806 میں پرشیا کو فیصلہ کن شکست دی تھی)، اور پرنس آف ایک موئل تھا۔ نظم و ضبط کے معاملے میں وہ بہت سخت گیر تھا۔ اس کے ماتحت فوجی اس کا احترام تو کرتے تھے لیکن اسے پسند کوئی نہیں کرتا تھا۔ دوسرے مارشلوں میں وہ بے حد غیر مقبول تھا۔ " (ماڈ) رابرٹس، اندر اول کے ایٹلی پال سیف کی، جو یوٹن سے ملے ہوئے تھا، موغا کے بعد اس کی مڈھ بھیرا سی شخص سے ہوئی تھی۔ (کتاب سوم، حصہ اول، باب نمبر 5)

14- فرولا اور لاورا (Frola and Lavra)، فلورس (Fiorus) اور لاورس (Laurus) دو بھائی تھے۔ دونوں عیسائی

تھے۔ انھیں روسی امپراطور Diocletian (جو 1284-305 تک حکومت کرتا رہا اور جس نے عیسائیت اختیار نہیں کی تھی) نے شہید کر دیا تھا۔ یونانیوں اور روسیوں کی نگاہوں میں دونوں سینٹ ہیں اور کسان، جو انھیں غلامیوں سے پکارتے ہیں، انھیں گھوڑوں کے محافظ سینٹ تصور کرتے ہیں۔ " (ماڈ)

15- قیص باہر رکھتا ہوں " روسی کسان اپنی قیصیں اپنی چٹانوں یا برجوں کے اندر نہیں ٹانکتے، اوپر کھلی چھوڑ دیتے

ہیں۔ تاہم وہ اپنی کروس پریشیاں ماندھیتے ہیں، دوسری طرح انھیں بے قابو نہیں ہونے دیتے۔ اس کے برعکس فوجی سپاہی اپنی قیصیں اپنی چٹانوں کے اندر ٹانکتے ہیں " (ماڈ)

16- عیسائی۔ روسی زبان میں کسان کو krest' yanin اور عیسائی کو Khristianin کہتے ہیں لیکن کاراٹایف کے لحاظ

میں وہ گڈمڈ ہو جاتے ہیں اور کچھ معلوم نہیں ہوتا کہ وہ اپنے آپ کو کسان کہنا چاہتا ہے یا عیسائی۔ بچھے باب میں بھی یہی ملاحظہ۔

حصہ دوم

1- فلیٹک کوچ (flank march) فوج کا وہ کوچ، جو اصل راستے سے ہٹ کر کیا جائے۔

جب کو تو زوف ماسکو سے پسپا ہوا، تو اس نے ریازن روڈ اختیار کی تھی۔ پھر وہ دائیں طرف مڑ گیا اور باکراہی کے ساتھ ساتھ، جو دریائے مسکو کی معاون ندی ہے، چلنے لگا۔ اس کی اس چال کا مقصد درختوں جنوبی صوبوں اور تولا (ماسکو کے جنوب میں ایک قصبہ) میں اسلحہ ساز کارخانوں کا دفاع تھا۔ موغا کو دھوکا دینے کے لیے قازقوں کی دو رجمنٹیں ریازن روڈ پر ہی کوچ کرنی رہیں۔ چنانچہ موغا کو کچھ پتا نہ چل سکا کہ روسی فوج کہاں چلی گئی ہے۔ یوٹن ان دنوں ماسکو میں مقیم تھا، اسے بھی چودہ ستمبر (روسی کیلنڈر) تک اس کا اتنا پتا معلوم نہ ہو سکا۔ (ماڈ)

- 2- فلی کوئیل، مصنف نے اس کی تفصیل کتاب سوم حصہ سوم کے باب میں درج نہیں کیا ہے۔
 - 3- دریائے اوکا سردیوں میں دریائے اوکا (نقشہ دیکھیں) عبور نہیں کیا جاسکتا کیونکہ اس کی سطح پر برف کی ہلکی تہہ جم جاتی ہے۔ (ماڈ)
 - 4- لوئسٹون (Launston) ماڈ کا کہنا ہے کہ نیولین کا، پٹی لوئسٹون پانچ اکتوبر (23 ستمبر روسی کیلنڈر) کو صلح کی تجاویز لے کر کوٹوراف کی قیام گاہ کی طرف روانہ ہوا تھا، لیکن خط پر تاریخ خود ماڈ کے ترجمے میں بھی 30 اکتوبر درج ہے۔ ماسکو سے فرانسیسیوں کا انچلا 7 اکتوبر کو شروع ہوا (کتاب چہارم حصہ دوم باب 19)۔ ولیم لینگر (انسائیکلو پیڈیا آف ورلڈ ہسٹری) کے مطابق نیولین 19 اکتوبر (موجودہ کیلنڈر) کو ماسکو سے روانہ ہوا تھا۔ خط پر تین اکتوبر کی تاریخ کیوں درج ہوگئی، کسی نے بھی اس معنی پر روشنی نہیں ڈالی۔
 - 5- سر پوکوف (Ser pukhov)۔ تھبہ۔ ماسکو اور توپا کے درمیان میں واقع ہے۔ دستروف اور روزا بھی تھبہ ہیں اور ماسکو کے آس پاس واقع ہیں۔
 - 6- تورباں: یوکرینی تاردار بجا۔
 - 7- پوینا تو سکی: فرانسیسی فوج کا پولستانی جرنیل۔
 - 8- 1812-1813 کے روس پر تباہ کن حملے کے بعد جرمن اور کئی دوسرے اتحادی نیولین کا ساتھ چھوڑ گئے۔ نیولین کو اپنی فوجوں کو امرت منظم کرنا اور اپنے سابقہ اتحادیوں کے خلاف برسر پیکار ہونا پڑا۔ روسیوں کی امداد کے باوجود نیولین نے جرمنوں کو متعدد مقامات پر ذلت آمیز شکستوں سے دوچار کیا۔
 - 9- چالیس صدیاں مصر کی چار ہزار سالہ تہذیب کے متعلق یہ نیولین کے اپنے الفاظ ہیں۔ اس کا ذکر آگے ذرا تفصیل سے آئے گا۔
 - 10- سبیاں سیانی: نیولین کی فوج کا اطالوی جرنیل۔
 - 11- یاکوویف (Yakov-lev) یا کوویف روس کے اشراف میں سے تھا۔ اس کے ساتھ جو امداد تگوری، اس کا ذکر اس کے بیٹے ہرزن نے اپنی کتاب ”میری زندگی اور خیالات“ (1856) میں کیا ہے۔ (ماڈ کے مطابق حاسطائی نے یہ کتاب پڑھی تھی)۔ یاکوویف نے ماسکو سے نکلنے میں دیر لگا دی۔ وہیں اٹالیا فرانسیسی شہر میں داخل ہو گئے اور اس کا مکان شعلوں کی نذر ہو گیا۔ یاکوویف کا خاندان کوڑی کوڑی کا محتاج ہو گیا۔ یاکوویف کو، اطالوی زبان آتی تھی اور اسی زبان نے اسے فرانسیسی فوج کے ایک اطالوی افسر نے متعارف کر دیا۔ اطالوی افسر اسے فرانسیسی جرنیل
-
- ہرزن (Alexander Herzen) (1812-1870) (ہرزن اصلاً جرمن نام ہے۔ جرمن زبان میں اسے ہیرزن اور روسی میں گیرکسن کہتے ہیں) ہرزن سیاسی مفکر تھا اور اپنے انقلابی خیالات کی وجہ سے روسی حکومت کا مستحب رہا۔ 1834 اور 1842 کے درمیان میں اسے مقصدات سے ماہر نکلنے کی اجازت نہ ملی۔ 1848 میں وہ ملک نقل چھوڑ گیا اور زیادہ تر لندن اور پیرس میں مقیم رہا اور مختلف ناموں سے سیاسی جریدے شائع کرتا رہا۔ اس کی مشہور ترین کتاب Childhood, Youth and Exile جس کا ایک حصہ 1856 میں My Life and Thoughts کے نام سے شائع ہوا تھا، کلاسیک کا درجہ اختیار کر چکی ہے۔

مورخ تھے کہ جسے وہ پیرس کے دنوں سے جانتا تھا، پاس لے گیا۔ اسے پولین کی خدمت میں اس صورت میں پیش کیا گیا کہ اس کے کپڑوں پر میل کی تھیں جی ہوئی تھیں اور اس نے اپنا منہ ہاتھ بھی نہیں دھویا تھا۔ پولین نے اسے اس شرط پر، کہ وہ اس کا مکتوب زار تک پہنچا دے گا، اسے اسے بحفاظت نکلنے کی اجازت دی۔ جب وہ پیئرز برگ پہنچا، اسے آرک چیف کے مکان میں نظر بند کر دیا گیا اور ایک مہینہ رکھ گیا۔ اس کے بعد اسے رہا کر دیا گیا مگر چہ اس کی رہائی باعزت اور غیر مشروط تھی، اسے پیئرز برگ میں ٹھہرنے کی اجازت نہ مل سکی اور وہ صرف اپنے بھائی سے ملاقات کر سکا۔

12- ٹولمین (Ttolmin): اسکو کا ایک بزرگ شہری اور ایک قیم خانے کا مہتمم۔

13- Maison de ma Mere ”میں یہ عمر رست اپنی ماں کے نام منسوب کرتا ہوں۔“ طالسٹائی نے یہ الفاظ ایک رسالے ”ریشین آرکائیوز“ سے، جسے قائل اعتماد قرار نہیں دیا جاسکتا، لیے تھے۔ (ماڈ)

14- نقیہ خانہ (Foundling Hospital): وہ بچے، جنہیں اس کے ماں باپ چھوڑ دیں اور ان کے حسب سب کا پانہ چلے، foundlings کہلاتے ہیں۔

15- فین (Baron Agathon Fain): پولین کا سیکرٹری۔ اس نے 1812 کی جنگ کے بارے میں 1827 میں کتاب تحریر کی تھی۔

16- Ete de St. Martin: یورپ اور شمال مشرقی امریکہ میں 18 اکتوبر سے 11 نومبر کا موسم سفروں سمجھا جاتا ہے۔ اسے فرانسیسی اپنے محافظ سینٹ مارٹن (چوتھی صدی کا ایک فرانسیسی راہب، اس کا یوم گیارہ نومبر کو منایا جاتا ہے) کے نام پر سینٹ، رتن کا موسم، انگریز اسے سینٹ لوقس (انجیل کے کچھ حصوں کا مصنف اور فنکاروں اور ڈاکٹروں کا محافظ سینٹ، اس کا یوم اٹھارہ اکتوبر کو منایا جاتا ہے) کا موسم اور امریکی انڈین سر کہتے ہیں۔ ماڈ، روز میری ایڈمنڈ اور این ڈونیکن نے اس کا ترجمہ ”بڑی بوڑھیوں کی گرمیاں“ کیا ہے۔

17- سینٹ ٹامس: حضرت عیسیٰ کے پارہ میں سے ایک حواری۔ (اور ڈانچیل میں اسے تو، یا تو ام نکھا گیا ہے)۔ اسے ”تشکیکی ٹوما“ (”Doubting Thomas“) کہا جاتا ہے کیونکہ اس نے مسیح کو دیکھے بغیر ایمان لانے سے انکار کر دیا تھا۔ (نیا عہد نامہ، یوحنا، باب بیس، آیات 24-29)

18- برآغنے (Eugene de Beauharnais) (1781-1824): وائی کاؤنٹ برآغنے (جو امریکی جنگ آزادی اور فرانسیسی انقلاب دونوں میں حصہ لے چکا تھا) کا بیٹا اور پولین کا سوتیللا پسر (پولین نے وائی کاؤنٹ برآغنے کی بیوہ سے شادی کی تھی)۔ پولین نے 1805 میں اسے وائی کاؤنٹ سے سرائے مقرر کیا۔ وہ پولین کی روس کی ہم میں شامل تھا۔ اس کی ہمشیرہ نے پولین کے بھائی سے شادی کی اور ان کا بیٹا بعد میں پولین سوم کے نام سے فرانس کا بادشاہ بنا۔

19- میدین ور مخوف: یہ دونوں قصبے کالوگا کے شامل مغرب میں اس سڑک پر واقع ہیں جو موڈریک سولسک روڈ (جسے پولین نے باآ خراپہ مغرب کی طرف پسائی کے لیے تھیا رکھا) سے خاصا جنوب میں گزرتی ہے۔ (ماڈ)

20- سٹیل (Anne Louise Germaine Necker de Steel): (1766-1817) فرانسیسی تاجر اور

نقاد اور ادیبوں کی سرپرست۔ اس کا باپ جو سسٹزر بینڈ کا باشندہ تھا، مالیات کا ماہر، نپولین کا جانی دشمن اور انقلاب فرانس سے پیسے کی حکومت کے حامیوں کا شیر تھا۔ دام ذیستل بیرس میں رہتی تھی۔ 1807 میں نپولین نے اسے ملک بدر کر دیا۔ 1812 میں اس نے چھ ہفتے روس میں گزارے اور، رودیو کی لڑائی کے اگلے روز نین لیندر روانہ ہو گئی۔ پونٹس نے اس کی کتاب Dix années d' exil (جلد ہفتی کے دس سال) کی، جو 1821 میں اس کی وفات کے بعد شائع ہوئی تھی، خاصی تحریف کی ہے کیونکہ اس نے اس میں روس کا ذکر "احترام و احتیاط" سے کیا ہے۔ (ماڈ)

21- جنرل مولٹوں (General Mouton, Count of Lobau)، اس اجلاس میں، جو تیرہ اکتوبر (روسی کیلنڈر) کو منعقد ہوا تھا، جنرل مولٹوں آخری مقرر تھا۔

22- "le Houra de L'Em pereur"۔ اس پر بطور زندہ ہار۔ یہ نعرہ فرانسیسی نہیں بلکہ دشمن پر حسد کرتے وقت روسی لگایا کرتے تھے اور یہاں بھی قازقوں نے بلند کیا تھا۔

حصہ سوم

1- en quarte چوتھائی ٹھاٹ ٹھاٹ پٹا بازوں اور شمشیر زنوں کے میسٹرے (چوٹ لگانے یا بچنے کا انداز) کو کہتے ہیں۔ شمشیر زنی میں چوتھائی ٹھاٹ کی ایک دفاعی پوزیشن ہوتی ہے۔ اس میں وہ اپنے اندرونی ہاتھیں حصہ جسم کو حریف کا ہدف بننے سے بچنے کے لیے اپنا ہاتھ سینے کے برابر اونچا کر لیتا ہے۔ ہاتھ کا انگوٹھا اوپر کی جانب اٹھا ہوتا ہے اور ناخنوں کا رخ بائیں طرف کیا جاتا ہے، جب کہ شمشیر کی انی (نوک) کا رخ حریف کی آنکھوں کی طرف ہوتا ہے۔

2- en tierce (تین ٹھاٹ) شمشیر زنی میں دفاعی پوزیشن۔ اس میں شمشیر زن اپنے باہری جسم کو حریف کا ہدف بننے سے بچانے کی کوشش کرتا ہے۔ اس میں ہاتھ کو سینے کے برابر اٹھ کر پھلی کو پھلی یا پھلی جاب کر لیا جاتا ہے اور شمشیر کی انی کا رخ حریف کی آنکھوں کی طرف کیا جاتا ہے۔

3- en prime یہ بھی دفاعی پوزیشن ہے۔ اس میں شمشیر زن اپنے جسم کے اوپر سے حصے کو بچانے کے لیے اپنا ہاتھ سر کے برابر لاتا ہے اور پھلی الٹا لیتا ہے۔ شمشیر کی انی کا رخ پھلی جاب ہوتا ہے اور بازو کو (کہنی سے لے کر انگلیوں کی آخری پوروں تک) زمین کے متوازی جسم کے آر پار لایا جاتا ہے۔

4- 1813 یوں تو 1813 میں فرانسیسیوں نے خود نپولین اور اس کے دیگر جرنیلوں کی قیادت میں متحدہ لڑائیاں لڑیں، چند ایک میں انھیں کامیابی حاصل ہوئی اور چند ایک میں ناکامی، لیکن انھیں سب سے دلت آمیز شکست روس، پرشیا اور آسٹریا کی متحدہ فوج نے جرمنی کے شہر لپٹسگ (Leip zig) کے نواح میں سوہ سے انیس اکتوبر کی لڑائی میں دی۔ (نپولین خود اس لڑائی میں شریک نہیں تھا۔) اس لڑائی میں تیس ہزار سپاہی ہلک ہوئے۔ کچھ بھاگ گئے اور باقیوں نے اسی طرح ہتھیار فاقہ بین کو پیش کیے، جس طرح جزا نیازی نے ڈحا کہ میں پیش کیے تھے۔ (اسی لیے

طالع طائی کو طائر کا موقع ملا ہے۔

5- کاکیشیا کے پہاڑی قبائل کاکیشیا (قفقاز)۔ بحیرہ اسود اور بحیرہ کیسپس کے مابین کا علاقہ کاکیشیا یا قفقاز کہلاتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ایران، پاکستان، بھارت اور یورپ کے وہ باشندے، جو آریائی کہلاتے ہیں، اصل میں اس کے رہنے والے تھے۔ آج کل یہاں چائیس کے لگ بھگ نہ بولے جاتی ہیں اور مرحوم سوویت یونین کی کم از کم تین جمہوری ریاستیں۔ جارجیا، آرمینیا اور آذربائیجان۔ یہیں واقع ہیں۔ روس کا ان پر مکمل قبضہ آج سے تقریباً سو سال پہلے ہوا تھا لیکن اس سے پہلے اسے یہاں کے گوریلوں (گوریلا رہنماؤں) میں سب سے نمایاں نام امام تھاکل کا ہے) کی زبردست مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔ ماڈ کے مطابق خود طالع طائی روسی فوج کے ساتھ 1851 تا 1853 تک ان کے خلاف لڑا تھا۔ ہسپانیہ کے گوریلوں نے پولین کے زمانے میں فرانسیسیوں کے خلاف لڑتے رہے تھے۔

6- مقدار حرکت (مومینٹم Momenlum) کوئی متحرک جسم جس حساب سے حرکت کرتا ہے، اسے اس کی مقدار حرکت یا مومینٹم کہا جاتا ہے۔ کسی جسم (body) کا مومینٹم اس کی کیت (مقدار مادہ = mass) اور ولائی (جسم کی کسی خاص سمت میں رفتار) پر منحصر ہوتا ہے۔ یعنی "کسی متحرک جسم کا مومینٹم اس کی کیت (مقدار مادہ) اور ولائی کے حاصل ضرب کے برابر ہوتا ہے۔"

فرض کریں ایک چیز کا وزن پچیس کلوگرام ہے اور وہ چیر دو میٹر ن سیکنڈ کے حساب سے حرکت کر رہی ہے۔ اس کا مومینٹم $100 = 2 \times 50$ کلو گرام میٹر فی سیکنڈ ہوگا۔

7- داویدوف: داویدوف جیتا جاگتا انسان تھا اور اس نے گوریلا کارروائیوں کے بارے میں کتاب بھی لکھی تھی لیکن ماڈ کے بقول اسے ناول میں دینی سوف کے روپ میں پیش کیا گیا ہے۔

8- پوسٹانی جرنیل کی ماتحتی: "دینی سوف نے اپنی خود مختاری برقرار رکھنے کے لیے جس ترکیب کا سہارا لیا ہے، اس کا ذکر

داویدوف نے اپنی کتاب 'گوریلا کارروائیوں کی ڈائری' میں ایک دفعے کے بیان کے سلسلے میں کیا ہے۔" (ماڈ)

8-ب۔ ایسول ہوائسکی: یہاں جو کچھ بتایا جا رہا ہے حقیقت پر مبنی ہے۔ داویدوف (ناول میں دینی سوف) کی ابتدائی

کامیابیوں کے بعد کو تو زوف نے اسے دو قارق رجنٹس دے دی تھیں۔ لورانسکی قازقوں کے جانے پیچھے اور

مشہور خاندان ایوانسکی کی عام شکل ہے۔ ایسول (esaul) قازقوں کا کہنیں ہوتا تھا۔ (ماڈ)

Unbegaun نے اپنی کتاب Russian Surnames (آکسفورڈ یونیورسٹی پریس: 1972) میں بتایا ہے کہ

ایلیووانسکی (liovaysky) عام طور پر پادری ہوتے تھے۔

9- پلاستون (plastun): بحیرہ اسود کے ارد گرد باقازقوں میں بعض لوگ ماہر شناچی ہوتے تھے، انھیں پلاستون کہا جاتا تھا۔ یہ شناچی گھوڑوں پر سوار نہیں ہوتے تھے۔ ان قازقوں میں بے شمار لوگ ماسکو کے ارد گرد بھی آئے تھے۔

10- مسکٹون (musketoon) ایک قسم کی چھوٹی دستی ہندوق۔ اب کہیں استعمال نہیں ہوتی۔

11- پائیک (pike): ایک قسم کی لاشی جس کے سرے پر نوکیلا آہنی پلیٹ (پیکل) لگا ہوتا تھا۔

12- دیاب کی لڑائی: پولین کی سولسک کی جانب پسپائی کے دوران میں پہلی قابل ذکر لڑائی انیس اور پانچویں اکتوبر (1912)۔

تین نوہر) کو دیا تھا میں لڑی گئی تھی۔ میلور اور ورج کو اس میں شہزادہ فتح حاصل ہوئی تھی۔ کو لین کوخ نے اپنی یادداشتوں میں لکھا ہے۔ ”ہماری بد نظمی اور بد قسمتی کا آغاز اسی واقعے سے ہوتا ہے۔“ (ماڈ)

دینایا (vesenya): بیمار کے لیے روسی لفظ vesna ہے۔

13- ramrod ایک قسم کی پتلی سلاح جو پرانی قسم کی بندوتوں میں بارود ٹھونسنے کے کام آتی تھی۔ آج کل اس سے بندوتوں کی ٹالیاں صاف کی جاتی ہیں۔

14- کارہاخ جنوبی کاکیشیا کا ایک خطہ۔ یہ خطہ اپنے گھوڑوں کی وجہ سے بہت مشہور ہے۔ (ماڈ)

15- چنفاق (flint) ایک قسم کا پتھر۔ سے فولاد سے رگڑ کر آگ پیدا کی جاتی تھی۔ پرانے انداز کی بندوتوں میں گولیوں کی جگہ بارود استعمال ہوتا تھا۔ اس بارود کو آگے لگانے کے لیے گھوڑے میں چنفاق رکھا جاتا تھا۔ آج کل لائٹروں میں چنفاق استعمال ہوتا ہے۔

16- fugue، مغربی موسیقی میں جسے fugue کہا جاتا ہے، اس کا آغاز چھوٹی اور سادہ ڈھن سے ہوتا ہے۔ اس کے بعد راگ کی نوعیت کے ساتھ سے معمولی تغیر و تبدل کے ساتھ دوسرے گانگوں یا سازوں کی آوازوں میں دہرایا جاتا ہے۔

17- کہانی طاسطائی نے اس کہانی کو 1872 میں پھیلا کر تحریر کیا۔ اس کا نام ”خداوند کو صداقت کا علم ہوتا ہے لیکن وہ انتظار کرتا ہے“ رکھا۔ یہ اس کی ان دو کہانیوں میں شامل ہے جسے اس نے اپنی کتاب ”فن کیا ہے؟“ میں ”برے فن کے ذمے“ میں شمار نہیں کیا۔ اپنی باقی کہانیوں اور ناولوں کے متعلق اس کی رائے تھی کہ انھیں جلا دینا چاہیے۔

18- ”سمجھ گئے؟“ ”اور اگلے شباب میں طاسطائی کو خوابوں میں بہت دلچسپی ہوا کرتی تھی۔ اس نے یہ نظریہ اپنایا کہ خواب خواہ کتنے ہی پیچیدہ اور طویل کیوں نہ ہوں، وہ ہمیشہ اس وقت دکھائی دیتے ہیں جب آدمی بیدار ہو رہا ہوتا ہے اور انھیں خارجی آوازیں، یونٹیں یا تحسینات بھڑکتے ہیں۔“ (ماڈ)

19- کراسنایہ (Krasnoe) روسی قصبہ۔ سولنسک کے مغرب میں واقع ہے۔

20- اورشا (Orsha) بایکلو رڈس (جو پہلے سوویت یونین میں شامل تھا اور اب آزاد ملک بن گیا ہے) کا قصبہ۔ آج کل یہ بڑا ریوے جنکشن ہے۔

21- شکست کیوں لکھائی کراسنایہ کی لڑائی تین سے چھ نوہر (پندرہ سے ٹھارہ نوہر) 1812 تک ہوتی رہی۔ فرانسیسی افواج سولنسک سے بیریزینا کی طرف فرار ہو رہی تھیں کہ وہ کراسنایہ کے مقام پر روسیوں کے گھیرے میں آگئیں۔ وہ بے پناہ جانی نقصان اٹھانے کے بعد بیریزینا گئے۔ توڑنے میں کامیاب ہوئیں اور پولین کہیں ایک ہفتہ بعد دریا کے بیریزینا عبور کرنے میں کامیاب ہوئے۔

22- دمیستخ (Joseph, Comte de Maistre) 1753-1821 فرانسیسی نواب اور مصنف۔ انقلاب فرانس کے بعد اس نے جلاوطنی اختیار کر لی۔ وہ 1803 سے 1817 تک سینٹ پیٹرز برگ میں ساروویا کا سفیر رہا۔ اس نے تاریخ کے علاوہ سینٹ پیٹرز برگ کی محافل (Soirees) کے حعلق بھی ایک کتاب لکھی تھی۔

حصہ چہارم

- 1- رشوت: یہاں خود طالسٹی نے حاشیے میں "دسن کی ڈائری" تحریر کیا ہے۔ "سربراہرٹ دس (1777-1849) روسی فوج میں برطانیہ کا غیر سرکاری فوجی نمائندہ تھا۔ اس نے الیکساندر کو قائل کرے کے لیے کہ کوٹوزوف کو فوج سے چھٹی دے دینا چاہیے، چیف آف سٹاف بے نگ سین کے ساتھ ساز باز کی تھی۔ طالسٹی نے 1862 میں 'روسی پیٹریا' میں دسن کی ڈائری کے متعلق حصے پڑھ لیے ہوں گے۔" (ماڈ)
- 2- تازہ ترین کتاب یہاں طالسٹی جس کتاب کا حوالہ دے رہا ہے، وہ باگہانوویچ کی "سال 1812 کی تاریخ" ہے۔ اس کتاب کا ایک ذیلی عنوان یہ تھا۔ "کوٹوزوف کے کردار اور کراسن کی لڑائی کے غیر قسلی بخش نتائج کے بارے میں تاثرات۔"
- 3- متقی اٹھارہ درجہ حرارت یہ درجہ حرارت رایو مرعیس الحرات کے مطابق ہے۔ فارن ہائٹ مقیاس الحرات کے مطابق یہ متقی آٹھ درجے ہوگا۔
- 4- inertia force = vis inertiae: ماری اجسام (bodies) کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اگر دوسرا کن ہوں تو پنی جگہ سے ہلے نہیں، اور اگر یکساں رفتار سے متحرک ہوں تو رکے نہیں تاوقتیکہ ان پر کوئی خارجہ قوت اثر انداز نہ ہو۔ اسے فزکس کی زبان میں inertia (جمود) کہا جاتا ہے۔ inertia force (قوت جمود) وہ خیال یا فرضی قوت ہے جو متحرک جسم پر اس کی قوت کے مساوی قوت سے لیکن مخالف سمت کی طرف اثر انداز ہوتی ہے۔ (یہ نظریہ فرانسیسی ماہر ریاضی و طبیعیات Jean de Rond de' Alembert نے 1743 میں پیش کیا تھا۔) چونکہ فرانسیسیوں کو کوئی روکنے والا نہ تھا، وہ اپنے ہی زور پر آگے بڑھتے گئے، کچھ کشتیوں میں بیٹھ گئے اور کچھ برف سے ڈھکے دریا پر بڑھ گئے اور یوں ڈوب گئے۔
- 5- گرینڈ ڈیوک اورولی عہد کونستانتین پاولوویچ (1779-1831)، الیکساندر اول کا بھائی تھا۔ "روس کو اسٹریٹس کی لڑائی میں جو ہزیمت اٹھانا پڑی، اس کی کچھ ذمے داری اس پر بھی عاید ہوتی ہے۔۔۔ وہ ذاتی طور پر خاصا ہیرا آدمی تھا لیکن جنگ اور سیاست دونوں میں غلطیوں اور نااہلی کا مرکب ہوتا رہا۔ ایک پولستانی خاتون سے شادی کرنے کے بعد وہ تخت پر اپنے حق سے دستبردار ہو گیا اور اس کا بھائی نکولس الیکساندر اوں کا جانشین بنا۔" (ماڈ) "ہب" روس کی تاریخ "میں "دسمبری تحریک" بھی دیکھیں۔
- 6- آرڈر آف سینٹ جارج "ان تمغوں کا آغاز کیتھرین اعظم نے جنگ میں نمایاں کارکردگی کا اعتراف کرنے کے لیے 1769 میں کیا تھا۔ فرسٹ کلاس بہت اونچے درجے کا اعزاز تھا اور کبھی کبھار ہی دیا جاتا تھا۔" (ماڈ)
- 7- اوریل (Oral) ماسکو اور تولاس کے جنوب میں روسی قصبہ۔ آج کل ریلوے جکشن ہے۔
- 8- مادہ "روسی اس لفظ کو اس شخص کے لیے جس میں بناوٹ، تصنع اور دیا کاری نام کو بھی نہ ہو، استعمال کرتے ہیں۔"

9 دریا رائن (Rhine) یورپ کا اہم ترین دریا۔ ایک طرف یہ سوئٹزرلینڈ اور آسٹریا اور دوسری طرف جرمنی اور فرانس کے مابین حد بندی کا کام دیتا ہے، اور ہالینڈ میں سے گزرتا بحیرہ شمال (نارتھ سی) میں جا گرتا ہے۔ اس دریا کے ارد گرد کے مناظر بالخصوص جرمنی کے شہروں شٹس (Mainz) وربون کے مابین، اپنی خوبصورتی کے لیے شہرہ آفاق ہیں۔ جنگلات اور باغات کی بہتات ہے اور اس کے کناروں پر بے شمار قلعے اور گڑھیاں ایستادہ ہیں۔ تاہم آج کل کارخانوں نے اس کا حسن خاصا گہنا دیا ہے۔

10 کولوسیم (Colosseum) قدیم روم کا وسیع ترین بے چھت بیضوی تعمیر (amphi theatre) یا سٹیڈیم۔ یہ پہلی صدی عیسوی میں تعمیر ہوا۔ کہا جاتا ہے کہ اس کی تعمیر میں سنگ مرمر استعمال ہوا اور اسے سونے اور جواہرات سے مزین کیا گیا تھا۔ اس میں پچاس ہزار تماشا نویس کے بیٹھنے کی گنجائش تھی۔ رومی شہنشاہ اپنی فتوحات اور چھیڑوں کے جشن منانے کے لیے یہاں، شیروں، ہاتھیوں، رینگھوں اور دوسرے درندوں کو آپس میں لڑاتے تھے اور بعض اوقات انسانوں کو بھی ان سے مروا دیتے تھے۔ کچھ امتدادی زمانہ کے ساتھ اور کچھ لڑکوں کے سبب یہ تقریباً تباہ ہو چکا ہے لیکن بچے کچھے آثار اب بھی عظمت رفتہ کی یاد دلاتے ہیں۔

تتمہ

حصہ اول

1- پہوتی اس (photius) نو وکورد خانقاہ کا سربراہ تھا۔ ”اس نے 1820 میں لوگوں کو میسٹروں اور میزیت پسندوں، بائبل سوسائٹی اور دیگر تحریکوں کے، جو اس کے خیال کے مطابق لبرل ازم کو فرد فر دے رہی تھیں، ارکات کا مطلقہ بند کرنے پر اکسایا تھا۔... پہوتی اس ریاضت کیش راہب تھا اور اس نے مختلف مذہبی محیفوں کی مدد سے ایسی ایسی مایوس کن پیشین گوئیاں کہیں کہ ایک نذر پر خوف طاری ہو گیا۔ تاہم اس کا اثر دوسرے زیادہ عرصہ قائم نہ رہا۔“ (ماز)

2- شیلنگ (F.W.G. Schelling) (1775 تا 1854) اور فٹے (J.G. Fichte) (1762 تا 1814) عیسیت پسند جرمن فلسفی تھے اور لبرل ازم کا پرچار کرتے تھے۔ دونوں نے روسیوں کو کافی متاثر کیا تھا۔

3- شاتو بنیاں (Vicomte de Chateaubriand) (1768 تا 1868)۔ جب نیولین کے زوال کے بعد فرانس میں کچھ عرصے کے لیے پرانی بادشاہت دوبارہ بحال ہوئی تو دانی کاؤنٹ شاتو بنیاں نے اس میں وزارت اور سفارت کے فرائض سرانجام دیے۔ شاتو بنیاں اپنے زمانے کا جانا پہچانا رومانی مصنف بھی تھا۔ بارہ جلدوں پر مشتمل اس کی یادداشتیں اس کی وفات کے بعد شائع ہوئیں۔

4- پولینڈ کا آئین۔ 1814 اور 1815 میں ویانا کانگریس، جس میں یورپ کے تقریباً تمام ممالک کے حکمران یا ان کے نمائندے شریک ہوئے، منعقد ہوئی۔ اس میں آسٹریا اور پرشیا کو بہت سے نئے علاقے ملے، ہالینڈ کی بادشاہت

بجائے ہوئی، اگر ہنڈی آف وار سا پر روس کا حق تسلیم کیا گیا اسے ٹنگ ڈم آف پولینڈ کا نام دیا گیا اور زار اس کا بادشاہ بن گیا۔ تاہم زار نے پولینڈ کو اپنا آئین دیا۔ اس کے تحت پولستانی ملک کی سرکاری زبان قرار پائی، پولینڈ کے اپنے ادارے وجود میں آئے اور متحدہ فوج کی تشکیل ہوئی۔ تاہم 1830 کی بغاوت کے بعد پولستانیوں کے تمام حقوق سلب کر لیے گئے۔

5- اتحاد مقدس (Holy Alliance) یہ اتحاد 1815 میں آسٹریا، پرتگال اور روس کے مابین قائم ہوا تھا۔ جس معاہدے کے تحت یہ عمل قیام میں آیا تھا، اس پر برطانیہ، ترکی اور یورپ کے ماسواچپ کے تقریباً تمام حکمرانوں نے دستخط کیے تھے۔ بظاہر یہ امن کے لیے وجود میں آیا تھا لیکن بہت جلد یہ جوہر و مستبدان کا ذریعہ بن گیا۔

6- گولیتسن (Prince Golitsyn) وزیر تعلیم و روحانی امور۔

7- شیشکوف (Admiral Alexander Shishkov) (1754 تا 1841): ماہر جہن الماتو امی قانون و مدبر اور صدر اکیڈمی آف سائنسز۔ اس کی اوجہ شہرت یہ تھی کہ وہ روسی زبان کا کٹر موسیٰ اور فرانسیسی زبان اور طور طریقوں کا دشمن تھا۔

8- سمیونووی رجنٹ اس رجنٹ نے 1820 میں اپنے تخت گیر جرجن کا غدار کے خلاف بغاوت کر دی تھی، اس پر الیکساندر نے طیش کھا کر اسے توڑ دیا۔

9- حکمرانوں کی ناراضگی اتحاد فرانس کے بعد غریب چچے (Robespierre) (1758 تا 1794) حکومت کا سربراہ بنا۔ اسی نے معرکہ تولوں کے بعد نیولین کو ترقی دے کر جنرل بنایا تھا، لیکن اطالیہ کی مہم میں اپنی سنائی کرنے کے بعد نیولین اس کا مستوب بن گیا اور اس نے اسے ایک ماہ کے لیے جیل بھیج دیا۔ کیرل کوکات راہی آئی۔ 1795 میں شاہ پسندوں نے شورش بپا کی۔ نیولین اطالیہ کی بجائے پیرس میں موجود تھا، اس نے اس بغاوت کو فرو کرنے میں نمایاں کارکردگی کا مظاہرہ کیا اور وہ "ری پبلک کا نجات دہندہ" قرار پایا۔ یوں اس کا مقام پہلے سے بھی بلند تر ہو گیا۔

10- ترکی میں ملزمت: ماڈ کے مطابق نیولین نے فرانسیسی حکومت کے ایک کیشن کو درخواست دی تھی کہ اسے قسطنطنیہ بھیج دیا جائے تاکہ وہ خلافت عثمانیہ کے توپ خانے کو نئے خطوط پر استوار کر سکے۔

11- روسی افواج: سوارف کی زیر کمان روسی افواج نیولین کی افریقہ روانگی کے ایک سال بعد اطالیہ اور سوئٹزرلینڈ میں فرانسیسیوں کے خلاف برسر پیکار ہوئیں اور انھوں نے متعدد مقامات پر کامیابیاں حاصل کیں۔

12- مالٹا بحیرہ روم کا جزیرہ (رقبہ 122 مربع میل) بعد میں اس پر انگریزوں نے قبضہ کر لیا اور انھوں نے جنگ عظیم اولیٰ کے دوران میں مولانا محمود الحسن دیوبندی کو یہیں نظر بند رکھا۔ نیولین نے اس پر 12 جون 1798 کو قبضہ کیا تھا اور یہیں وہ یکم جولائی کو مصر پہنچا تھا۔

13- سازش ڈیوک آف اس غیاں، جس کا ذکر تاؤں کے پہلے باب میں آچکا ہے، فرانس کے شاہی خاندان یوگنوں کا فرد تھا۔ اس پر یہ الزام لگایا گیا تھا کہ 1804 میں جن لوگوں نے نیولین کو، جب وہ فرسٹ توٹھس تھا، قتل کرنے کی

سردار کی تھی، ان میں وہ بھی شامل تھا۔ سادش تو ناکام رہی (اور اس ناکامی نے نپولین کو امیر اطور کا خطاب اختیار کرنے کی ترغیب دی) البتہ آسٹریا کو ”غیر جانبدار علاقے“ سے ”الوا“ کرایا گیا، اس پر فوجی عدالت میں مقدمہ چلایا گیا اور اسے گولی سے اڑا دیا گیا۔

-14-

لکھوں کی رقم: نپولین کی روس سے پسائی کے بعد آسٹریا اور اس کے متعدد دیگر اتحادی اس کے خلاف ہو گئے اور انھوں نے روس کے اشتراک سے اس کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔ فرانسیسیوں کو متعدد مقامات پر شکستوں کا سامنا کرنا پڑا تاہم بعض لڑائیوں میں انھیں کامیابیاں بھی نصیب ہوئیں۔ اگرچہ نپولین کے مخالفین نے اسے صبح کی پیشکش کی اور اسے مطلع کیا کہ اگر وہ فرانس کی 1792 کی سرحدیں تسلیم کر لے پھر اس کے خلاف مزید جنگ نہیں کی جائے گی۔ تاہم نپولین اپنی تارہ ترین کامیابیوں سے اتنا مخمور ہو چکا تھا کہ اس نے اس پیشکش کو مسترد کر دیا۔ اس کے مخالفین نے خیل جنگ بھی دیا اور مارچ 1814 کے دوراں میں اسے سات مختلف مقامات پر شکست سے دوچار کر دیا۔ 30 مارچ کو مون مارغ تھے کے مقام پر جب اسے شکست ہوئی، اس کے مارشلوں اور جرنیلوں کے جوہلے ٹوٹ گئے اور انھوں نے اس کا مزید ساتھ دینے سے انکار کر دیا۔ 31 مارچ کو اتحادی بیڑوں میں داخل ہو گئے اور نپولین غیر مشروط پر تخت سے دست بردار ہو گیا۔ اتحادیوں نے اسے ایسا جزیرہ (یہ جزیرہ بحیرہ روم میں واقع ہے اور آج کل اطالیہ کا حصہ ہے) بھیج دیا۔ انھوں نے اسے بیس لاکھ فرانک کی رقم فراہم کی، ایسا جزیرے پر اس کا اختیار تسلیم کیا اور اسے اپنا شاہی خطاب برقرار رکھنے کی اجازت دے دی۔

-15-

یہ لہر، جب نپولین کو ایسا جزیرے پر بھیج دیا گیا، فرانس پر بولغ بول خانہ دان کا اقتدار بحال ہو گیا اور مختل لوئی شانزدہم کا ایک بھائی لوئی ہڑدہم کے نام سے بادشاہ بن گیا۔ ادھر اتحادیوں نے ستمبر 1814 اور جون 1815 میں دیا تا میں دو کانگریس منعقد کیں۔ ان کانگریسوں میں کئی معاملات میں اتفاق ہو، لیکن بعض میں اختلافات رونما ہوئے گئے۔ ان اختلافات سے یہ اندیشہ لاحق ہونے لگا کہ اتحادی آپس میں برسر پیکار ہو جائیں گے۔ فرانس کے لوگ بھی بولغ بول خانہ دان سے بےزار ہونے لگے۔ اتحادیوں کے اختلافات اور فرانسیسیوں کی بے اطمینانی کی خبریں نپولین تک پہنچ گئیں اور اس نے اپنے حمایتیوں کی بلا شیری پر دوبارہ فرانس کا رخ کیا۔ وہ چند ہوا آدمیوں کی معیت میں یکم مارچ 1815 کو کار بیکھا۔ جونوچ اس کی سرکوبی کے لیے بھیجی گئی، وہ اس کے ساتھ مل گئی اور وہ بیس مارچ کو فاتحانہ انداز سے بیڑوں میں داخل ہو گیا۔ لوئی ہڑدہم بھاگ گیا اور نپولین ایک بار پھر برسر اقتدار آ گیا۔ جب اتحادیوں نے یہ صورت حال دیکھی، انھوں نے اپنے اختلافات پس پشت ڈال دیے اور وہ دوبارہ فرانس کے خلاف صف آرا ہو گئے۔ جو یورپی ممالک اس اتحاد میں شامل ہوئے، ان میں روس، آسٹریا، پرتگال اور برطانیہ بھی شامل تھے۔ فرانسیسیوں کو متعدد مقامات پر رک اٹھانا پڑی۔ نپولین لڑتے لڑتے الجیم میں داخل ہو گیا۔ وہاں 18 جون 1815 کو وٹرلو کے میدان میں فرانسیسیوں اور اتحادیوں کے مابین جن کی سپاہ انگریزوں، ہالینڈیوں اور جرمنوں پر مشتمل تھی اور جن کی کمان ڈیوک آف ویلنگٹن کے ہاتھ میں تھی، زبردست سرکہ ہوا۔ نپولین کی فوج کو شکست ہوئی۔ اس نے امریکہ فرار ہونے کی کوشش کی لیکن پکڑا گیا اور اسے جنوبی بحر اوقیانوس کے جزیرے سینٹ

ہیدینا جلا وطن کر دیا گیا۔ (جس 5 مئی 1821 کو اس کا انتقال ہوا۔)

16- انیسویں صدی میں بے شمار لوگ اس خیر کے حامی تھے کہ الیکسندر اول 1825 میں رانی ملکہ عدم نہیں ہوا تھا بلکہ اس نے سائبیریا میں گوشہ نشینی اختیار کر لی تھی اور وہیں تارک الدنیا کی حیثیت سے 1866 میں وفات پائی تھی۔ (1927 میں جب اس کے سگی نابوت کو کھوا گیا، وہ واقعی خالی تھا۔) ماڈ کے مطابق طالعائی کا بھی یہی خیال تھا اور اس نے اپنی کہانی ”فیور کزیچ“ میں، جو اس کی وفات کے بعد شائع ہوئی، یہی بات بیان کی ہے

17- 1812 کے واقعات کی یاد میں الیکسندر اول کو جو تمغہ دیا گیا تھا، یہ الفاظ اس پر نقش تھے۔

18- لے اوکون (Laocoon): ہیلن کی باڑیابی کے لیے یونانیوں میں ٹرائے پر چڑھائی تو کر دی لیکن دس سال کی جنگ کے بعد بھی وہ شہر پر قبضہ کرنے میں ناکام رہا۔ جو متعدد رہ جنگ کے درمیانے حاصل نہ کر سکے، اسے انھوں نے جہاز سے پورا کر لے کر ترکیب سوچی۔ انھوں نے نکرزی کا دیو قیامت گھوڑ بنایا، اس کے پیٹ میں اپنے چند سوار، جنھوں نے رات کی تاریکی میں شہر کے دروازے کھولنا تھے، داخل کیے اور خود اپنے جہازوں میں بیٹھ کر ساحل سے پرے ہٹ گئے۔ ٹرائے والے سمجھے کہ یونانی بھاگ گئے ہیں اور کھلونا پیچھے چھوڑ گئے ہیں۔ وہ گھوڑے کو گھسیٹ کر شہر کے اندر آئے اور سے چوک میں کھڑا کر دیا۔ رات کو وہی ہو جو یونانیوں نے سوچا تھا۔ یونانی گھوڑے کے پیٹ سے باہر نکلے اور انھوں نے شہر کے دروازے کھول دیے۔ یوں ان کے ساتھی ٹرائے پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہو گئے۔

لے اوکون ٹرائے کے اپالود یونا کے مندر کا بیجاری تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اس نے ٹرائے کے لوگوں کو گھوڑے سے خبردار کر دیا تھا لیکن دد سمندری سانپ آئے اور انھوں نے اس ”جرم“ کی پاداش اسے اور اس کے دو بیٹوں کو ہلاک کر دیا۔

19- ایسا ہو گا نہیں بہت عرصہ پہلے 1806 میں جب سوئیڈن نے داؤخوف کے ساتھ شادی کی تجویز ٹھکرائی تھی، نتاٹانے اپنے بھائی سے کہا تھا: ”گولا کی، تم جانتے ہو۔ ناراض نہ ہونا۔ لیکن مجھے معلوم ہے کہ تم اس (سوئیڈن) سے شادی نہیں کرو گے۔ مجھے معلوم ہے، مجھے کیسے معلوم ہوا، یہ صرف خداوند کو معلوم ہے، لیکن میں پورے یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ تم اس سے شادی نہیں کرو گے۔“ دوسری کتاب، حصہ اول، باب گیارہ۔

20- ضرورت سے زیادہ سادگی: ”جس قسم کی سادگی کا یہاں ذکر کیا گیا ہے، وہ وہی ہے جو طالعائی کے گھریاں پالیانا میں (جسے ناول میں بالڈاز بنا کر پیش کیا گیا ہے) ہمیشہ پائی جاتی رہی۔ اگرچہ یہ داستان کے لیے طالعائی کے پُر تعیش گھر اور اس سادگی میں، جس کا وہ بعد کی زندگی میں پرچار کرتا رہا، جو تضاد لوگوں کو نظر آتا تھا، اس کے متعلق بہت کچھ لکھا گیا ہے، تاہم حقیقت یہی ہے کہ طالعائی کو تعیشت نہ کبھی پسند آئے اور نہ وہ ان کے چکر میں کبھی پڑا۔ ننگستان کے اکثر جاگیرداروں کے دیہاتی محلوں کے مقابلے میں یہ سنیا پالیانا کی کثرت شعارانہ سادگی بہت نمایاں ہو کر سامنے آتی ہے۔“ (ماڈ)

21- ذیل (deal) صنوبر (pine) یا فر (fir) یا اسی قسم کے دیگر درختوں کی لکڑی کے تختے۔ انھیں معیاری سائز کے مطابق کاٹا جاتا ہے۔

- 22- شرفا کا انتخاب۔ مقامی محکموں میں مختلف اسماء پر کرنے کے لیے یہ انتخابات وقت فوقتاً ہوتے رہتے تھے۔
- 23- کاؤٹس کا شکر یہ "روس میں ڈنر کے اختتام پر سیربان خاتون کا شکر یہ ادا کرنے کی روایت تھی۔ یہاں اگرچہ ستمبر کا ڈنٹس سیربان نہیں تھی، اس کا شکر یہ احترام ادا کیا گیا تھا۔" (ماڈ)
- 24- ماریٹا، ماریٹا (Marvina) کون تھی، اس کے حلقہ کیس سے معلومات حاصل نہیں ہو سکیں۔ ہو سکتا ہے کہ وہ مارین منرو کی طرح کی کوئی عورت ہو اور روس کی کسی لوک کہانی کی کردار۔
- 25- آرشین (archinebarshin) ناپ کا روسی پیمانہ۔ تقریباً 28 انچ (71 سینٹی میٹر) کے برابر ہوتا ہے۔ روسی میں یہ لفظ تاتاریوں کی وساطت سے ترکی سے آیا تھا۔
- 26- گوسنر (Johann Gossner) گوسنر جرمن پادری اور ریزنٹ کا عامل تھا۔ اسے 1817 میں پوریا سے جلا وطن کر دیا گیا اور وہ روس چلا آیا۔ یہاں وہ 1820 تا 1824 بائبل سوسائٹی (پرنٹسٹ فریٹے کی یہ جماعت مختلف ممالک میں بائبل چھپواتی، مختلف زبانوں میں تراجم کراتی اور تقسیم کرتی ہے) کا ڈائریکٹر رہا۔
- 27- مادام تاتوینووا (E F Tatawinova) مادام تاتوینووا نے ایک سبزی فریٹے کی بنیاد رکھی تھی اس فریٹے کے ارکان درویشوں کی طرح رقص کرتے اور حال کھیلتے تھے۔ مادام تاتوینووا کو 1837 میں ایک دور دراز خانقاہ میں بھیج دیا گیا اور اس کے ساتھ ہی اس کا فرقہ ختم ہو گیا۔ (ماڈ)
- 28- کرودے نر (Baroness Barbara Juliana Krudener)، (1764 تا 1825)۔ مادام کرودے نر سوویت یونین کی سابقہ ریاست (اب آزاد ملک) لتویا کے صدر مقام ریگا میں پیدا ہوئی۔ وہ جذباتی ناول نگار (اس کے ایک ناول کا نام Vairele ہے اور یہ 1803 میں شائع ہو تھا) اور سبزیٹ کی عامل تھی۔ الیکساندر اول سے اس کی ملاقات 1815 میں ہوئی تھی اور اس نے سے بے حد متاثر کیا تھا۔
- 29- ایکارٹس ہاؤس (Eckartschausen) سبزیٹ کا ایک جرمن عامل۔
- 30- معاملات: جن معاملات کو پرنس تھیودور کے حلقے کے مقاصد بنا کر پیش کر رہا ہے، وہ تقریباً وہی تھے جو دبیری تحریک کے رہنماؤں کے تھے ("روس تاریخ" کا باب دیکھیں)۔ ماڈ کا خیال ہے کہ دبیری تحریک کے رہنماؤں کا فری میسنوں کے ساتھ، جن کا طاسطائی نے "جنگ اور امن" کی دوسری کتاب کے حصہ دوم کے تیسرے چوتھے ابواب میں تفصیل سے ذکر کیا ہے، گہرا یاراء تھا۔
- 31- اس کا اندازہ: "اس عبارت کا حکومت مخالف لہجہ طاسطائی کے ابتدائی اور بعد کے خیالات میں تعلق قائم کرتا ہے۔" (ماڈ)
- 32- پوگاچیف (Emelyan Pugachev) پوگاچیف یورال کے قارتوں کا رہنما تھا۔ اس کی قیادت میں قارتوں اور کسانوں نے کیتریں اعظم کے عہد حکومت میں حکومت کے خلاف بغاوت کردی۔ یہ بغاوت جو 1773 میں یورال میں شروع ہوئی تھی، بتدریج دریائے ولگا کے علاقے تک پھیل گئی۔ حکومت نے بڑی مشکل سے اس پر قابو پایا۔ 1775 میں پوگاچیف پکڑا گیا اور سے گولی سے اڑا دیا گیا۔

33- ٹوگنٹ بنٹ (Tugendbund) مشہور جرمن فلسفی فحش نے اپنے ہم وطنوں میں وطنیت کا جذبہ بھروسے کے لیے 1807 اور 1808 میں چند پمچر (Addresses to German Nation) دیے۔ ان سے متاثر ہو کر چند انعام 1808 میں ایک سوسائٹی بنام ٹوگنٹ بنٹ (League of virtue = جماعت صالحین) تشکیل کی۔ اس کا مقصد لوگوں میں وطنیت کی رواج پھونکنا، انھیں بے لوث بنانا اور پریش کو یوین کی مدد صحت سے آزاد کرانا تھا۔ پریش کی حکومت نے 1809 میں اس پر پابندی لگا دی تاہم جماعت رپریش کام کرتی رہی۔ پریشا تو 1813 میں یوین کے جنگل سے آزاد ہو گیا مگر حکومت ٹوگنٹ بنٹ کے ارکان پر بدستور سختیاں کرتی رہی۔ ماڈ کے مطابق وینی سو ف جمن لفظ بنٹ (Bund = اتحاد) کو روسی لفظ بنت (bunt = ہنگامہ، فساد یا بغاوت) سے خط مدد کر کے اذیت پریدہ کر دے گا۔

34- ڈائری: ”یہاں کا ڈنٹس مارڈ کی ڈری سے جو واقعات دیے گئے ہیں وہ کافی حد تک طمسائی کی پٹی والدہ کی بھن کے بارے میں یادداشتوں سے ملتے جلتے ہیں۔ یہ یادداشتیں ابھی تک محفوظ ہیں۔“ (ماڈ)

35- سمونڈی (Jean Charles Sismondi) (1773 تا 1842)۔ سوستانی مورخ۔ اس نے یورپی تاریخ کے متعلق متعدد کتابیں تحریر کیں۔ اس کی تصنیف Literature du Midi de l'Europe (1813) کا اس راونے میں بہت شہرہ ہوا اور انگریز کی میں بھی ترجمہ کیا گیا۔

36- مونس کیو (Charles Montesquieu) (1689 تا 1757)۔ فرانسیسی بیرن۔ اس نے ملی زندگی کا آغاز سیاست سے کیا لیکن سکھیں خراب ہونے کی وجہ سے تحقیق و تصنیف کی طرف مائل ہو گیا۔ اس نے اپنی کتاب Lettres Persanes (1761) میں دو ایرانی مسافروں کی زبانی فرانسیسی معاشرے پر لطیف طنز کیں۔ Causes de la Grandeur des Romains et de leur Decandence (1734) اس کی بہترین تصنیف تصور کی جاتی ہے۔ تاہم اس کی ضخیم کتاب (De l'Esprit des Loix) بہت مقبول ہوئی اور دو سال سے بھی کم عرصے میں اس کے ایک ایڈیشن شائع ہوئے۔ وہ برطانوی آئین کو بہترین قرار دیتا تھا اور اس کی تصنیفات نے یورپی لوگوں کو بہت متاثر کیا۔

37- آپ اس سے ملے تھے؟ ”یہاں جس قسم کے ناواجب حسد کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، وہ طاسائی اور اس کی بچی کے باہمی تعلقات میں ہمیشہ بد مزگی کا سبب بنا رہا۔“ (ماڈ)

38- پلوتارک (Plutarch) (تقریباً 46 تا 120)۔ یونانی مورخ اور فلاسفر۔ اس کی مشہور ترین کتاب ”مستوازی زندگیوں“ (Parallel Lives) ہے۔ اس میں اس نے چالیس یونانی اور رومی شخصیتوں کی کردار کشی کی ہے۔ وہ ایک یونانی اور ایک رومی شخصیت کو لیتا تھا اور دونوں کا، اسی موارنہ کر کے ان کی داستان حیات قلم بند کرتا تھا۔

39- سکیولا (Mucius Scaevola)۔ قدیم روم کا داستان ہیرو۔ کہا جاتا ہے کہ روم کے ایک حریف حکمران مارک پورینا (ars Porsena) نے 509 ق م میں روم پر حملہ کر دیا۔ اس پر سکیولا کو بہت غصہ آیا اور اس نے پورینا کو قتل کرنے کا عزم باندھ دیا۔ وہ کسی طرح اس کے خیمے میں داخل ہو گیا اور اس نے غلطی سے اس کے سیکڑی کو قتل کر

رہا۔ وہ بکڑا گیا اور اسے پور سینا کی عدالت میں پیش کیا گیا۔ اس پر الزام یہ تھا کہ تین سو روپیہ نوجو لوہے نے پور سینا کو قتل کرنے کی سازش کی ہے اور یہ بھی ان میں شامل ہے۔ اسے دھمکی دی گئی کہ اگر اس نے اس ساری سازش سے نقاب نہ سرکایا، اسے سخت ایذائیں دی جائیں گی اور موت کے گھاٹ، تار دیا جائے گا۔ سکیو دلا نے اپنا ہاتھ آگ میں ڈال دیا۔ ہاتھ جل رہا یہاں تک کہ وہ بالکل بھسم ہو گیا۔ پور سینا اس کی دلیری سے اتنا متاثر ہوا کہ اس نے اسے رہا کر دیا۔ اس کے بعد پور سینا نے رومیوں سے صلح کر لی۔ ”سکیو دلا“ کے لغوی معانی ”کھبا“ (چپ دست) ہیں، در یہ روم کے ایک سرکردہ خاندان کا نام تھا۔ کہا جاتا ہے کہ ان لوگوں نے اپنے نام کی توضیح کرنے کے لیے یہ افسانہ تراش دیا۔

حصہ دوم

1- بادشاہوں کا الہی اختیار یا حق (Divine right (authority) of Kings) ایک سیاسی نظریہ۔ اس کے تحت بادشاہ اپنے اعمال کے لیے صرف خدا کے سامنے جواب دہ تھے کیونکہ ان کا یہ دعویٰ تھا کہ انھیں خود خدا نے لوگوں پر حکومت کرنے کے لیے منتخب کیا ہے۔ جہاں تک رعایا کا تعلق ہے، اس کا فرض بنتا ہے کہ وہ ان کے احکام کی پابندی و چراغی بجالائے اور ان کے کسی فعل پر اعتراض نہ کرے بلکہ حوصلہ کھدھ کرتے ہیں، اسے صحیح تسلیم کرے۔ یہ نظریہ شروع تو قرونِ وسطیٰ میں ہو تھا لیکن اسے صحیح فروغ سولہویں اور سترہویں صدی میں ہوا۔ انگلستان میں ستوارٹ خاندان کے بادشاہ اور فرانس میں لوئی چہارم اس کے بالخصوص علم بردار تھے۔

2- گیبن (Edward Gibbon) (1737-1794) انگریز مورخ۔ اس کی مشہور ترین کتاب "The History of the Decline and Fall of Roman Empire" (1776-1788) ہے۔

3- بکلی (Henry Thomas Buckle) (1821-1862) انگریز مورخ۔ کہا جاتا ہے کہ اس نے انسانی تہذیب کی تاریخ لکھنے کے لیے اٹھارہ زبانیں سیکھیں اور بائیس ہزار کتب پر مشتمل مائجربری بنائی۔ تاہم اس نے جس عظیم کام کا بیڑ اٹھایا تھا، اس کا صرف ایک حصہ "An introduction to the History of Civilization in England" (1857-1861) کے نام سے شائع ہو سکا۔ اس کی کمزور محنت نے باقی کام مکمل نہ ہونے دیا۔

4- لوئی چہارم (Louis XIV) فرانس کے بورگ بوس خاندان کا عظیم ترین حکمران۔ وہ پانچ سال کی عمر میں تخت نشین ہوا اور اپنی وفات (1715) تک حکومت کرتا رہا۔ اس نے اپنے حریفوں کے خلاف ہسپانیہ، ہالینڈ اور جرمنی میں تین جنگیں لڑیں۔ پہلی دو جنگوں میں، جو 1672-1678 اور 1688-1697 کے درمیان میں لڑی گئیں، اسے زبردست کامیابیوں حاصل ہوئیں اور اس کی دھاک سارے یورپ میں بیٹھ گئی۔ وہ پہلے ہی مستبد ترین حکمران تھا اور ان فتوحات نے اسے بالکل ہی "ہم چوہ دیگر نیست" بنا دیا اور وہ شاہوں کے الہی حقوق (حاشیہ نمبر 1) پر خداوند سے اصرار کرنے لگا۔ تیسری جنگ (1701-1713) میں اسے ذلت آمیز شکست ہوئی۔ ری جل گئی، پر اٹل نہ گیا۔ اس کا رویہ پہلے سے بھی زیادہ استبدادی ہو گیا۔ وہ عورتوں کا بھی زبردست شکاری تھا۔ 1685 میں اس

نے پتی پہلی بیوی کی وفات پر خوشہ ہسپانیہ کی دختر تھی، اپنی ایک دہشتہ سے شادی کر لی۔ تاہم اس میں ایک غریبی تھی۔ وہ فرانسیسی ادیبوں، مصوروں اور موسیقاروں کی دل کھول کر سرپرستی کرتا تھا۔ کارنیل، راسین، موریئر اور بلیو جیسے شہرہ آفاق ادیب اسی کے دربار سے وابستہ تھے۔

5- شٹائین (Baron Heinrich Friedrich Karl Stein) (1757-1831)۔ پرشیا کے بادشاہ فریڈرک ویلم سوم کا ماں شیر۔ اس نے جو مالی اور دیگر اصلاحات کیں، وہ بعد میں پرشیا (اور جرمنی) کی عظمت کی اساس بنیں۔ اس نے رریئل غلامی کو منسوخ کر دیا، طبقاتی اور جاگیرداری نظام ختم کیا، کسانوں کو زمین کا مالک بنایا، تجارت کو آزاد کیا اور اجارہ دار یوں کا خاتمہ کیا، میونسپل حکومت کا نظام قائم کیا اور فوج میں اصلاحات کیں۔ نیپولین نے اسے ملازمت سے نکلوا دیا، وہ آسٹریا چلا گیا لیکن جانے سے پہلے اپنی کتاب "Political Testament" چھپوا گیا۔ 1812 میں وہ سینٹ پیٹرز برگ چلا گیا اور اسی نے نیپولین کے خلاف متحدہ محاذ بنوایا۔ اس کے بعد نیپولین کے خلاف جتنے اقدامات ہوئے، ان سب کے پیچھے اسی کا دماغ کام کرتا رہا تھا۔

6- لوئی ہیرڈیم (1755-1824)؛ لوئی ہیرڈیم بوٹی شہزادہم کا، جو انقلاب فرانس کے بعد ہلاک کر دیا گیا تھا، بھائی تھا۔ انقلاب فرانس کے بعد وہ فرار ہو گیا اور مختلف ملکوں میں پھرتا پھراتا انگلستان پہنچ گیا۔ 1814 میں نیپولین کے اتحادیوں کے ہاتھوں شکست کھانے کے بعد اسے فرانس کا بادشاہ بنایا گیا۔ اس نے انقلاب کے حامیوں سے جن جن کر بد لے لیے اور سابقہ مذہب و شاہی روایات زندہ کرنے کی کوشش کی۔ اس سے نیپولین کی ایما سے واپس کی راہ ہموار ہو گئی۔ نیپولین کی دہڑلو میں شکست کے بعد وہ دوبارہ بادشاہ بنا لیکن اپنی حرکتوں سے باز نہ آیا اور مخالفوں کا ایک بار پھر قتل عام شروع ہو گیا۔ جب 1824 میں اس کا انتقال ہوا فرانسیسیوں نے اطمینان کی سانس لی۔

7- تالی غاں (Charles Maurice Talleyrand) (1754-1838)۔ فرانسیسی سیاست دان۔ اس نے اپنی عملی زندگی کا آغاز بحیثیت مذہبی رہنما کیا اور ترقی کرتے کرتے بشپ بن گیا۔ انقلاب فرانس کے بعد اس کا پاپ سے جھگڑا ہو گیا اور اسے رومن کیتھولک مذہب سے نکال دیا گیا۔ اب وہ سیاست میں سرگرم حصہ لینے لگا۔ چند ہی سالوں میں وہ انقلابی حکومت کا وزیر خارجہ مقرر ہو گیا۔ اس نے نیپولین کو برسرِ اقتدار لانے میں بڑا اہم کردار ادا کیا اور نیپولین نے اسے پرنس کا خطاب دیا۔ تاہم وہ نیپولین کے روس پر حملے کے خلاف تھا۔ یوں دونوں میں ان میں ہوا لگئی اور وہ نیپولین کے مخالف لوگوں کا سربراہ بن گیا۔ جب نیپولین اقتدار سے محروم ہوا، وہ نئی حکومت میں وزیر خارجہ بن گیا۔ دیا نا کانگریس میں اس نے کمال مہارت کا مظاہرہ کیا اور اتحادیوں سے فرانس کی 1792 کی سرحدیں منوانے میں کامیاب رہا۔ کہا جاتا ہے کہ وہ دھڑکی کی حد تک بد عنوان، بد کردار، خود غرض اور ورورغ گو تھا لیکن اس کے ساتھ وہ بے حد صبر، چابک دست اور انسانوں کا نباض تھا۔ وہ اپنی سفارت کاری سے اپنے اور اپنے ملک کے مفادات کا دفاع کرے میں کبھی ناکام نہ ہوا۔

8- دیا نا میں مذاکرات: یہ مذاکرات 1814 میں دیا نا کانگریس کے نام سے منعقد ہوئے تھے۔ ان میں یورپ کے تقریباً تمام ملک کے حکمران یا ان کے نمائندے شریک ہوئے۔ (فرانس کی نمائندگی تالی غاں نے کی)۔ اسے پہلے تو کسی

نے کوئی گھاس نہ ڈالی لیکن وہ اپنی فراست سے اپنے ملک کے حقوق منوانے میں کامیاب رہا۔) کانگریس میں دو کروپ بن گئے۔ ایک کی رہنمائی روس اور پرشیا اور دوسرے کی آسٹریا اور برطانیہ کر رہے تھے۔ فریقین میں جھگڑا ہوا ہی چاہتا تھا کہ فرانس پر چوبیسین کے دوبارہ قبضے کی خبر موصول ہوئی۔ انھوں نے اپنے اختلافات بالائے طاق رکھے اور نئے فتنے سے عہدہ برآ ہونے کے لیے پھر متحد ہو گئے۔ چوبیسین کی آخری شکست کے بعد 1815 میں دوسری ویاہا کنگریس منعقد ہوئی اور اس میں یورپی ممالک کی از سر نو مد بندی کی گئی۔

9 شیخ (Louis Adolphe Thiers) (1797-1877)۔ فرانسیسی سیاست دان اور مورخ۔ وہ دوسرے فرانس کا وزیر خارجہ اور ایک مرتبہ ملک کا صدر رہا۔ اس کی دو ضخیم کتابیں "Histoire de la Revolution Francaise" (10 Vol 1823-27) ("تاریخ، خطاب فرانس") اور "L' Histoire du Consulat et de l' Empire" (20 Vol. 1845-62) ("قونصلیت اور پیراموریہ کی تاریخ") ہیں۔ سو خرا ل ذکر میں زیادہ تر چوبیسین کے عہد حکومت کی داستان بیان کی گئی ہے۔ دونوں کتابیں ضخیم ضرور ہیں لیکن نقاد انھیں عظیم تسلیم نہیں کرتے کیونکہ ان کے مطابق ان میں غلط بیانیوں کی بھرمار ہے۔

10 لاس فیٹے (Pierre Lanfrey) (1828-1877) فرانسیسی مورخ اور ری پبلکن سیاست دان۔ اس کی مشہور ترین کتاب "Histoire du Napoleon" (5 vol. 1857-75) ہے۔ اس میں چوبیسین پر سخت تنقید کی گئی ہے۔

11 گروینس (George Gottfried Gervinus) (1805-1871) جرمن مورخ اور ادبی نقاد۔ کوٹلن اور ہائیڈل برگ یونیورسٹیوں میں تاریخ کا پروفیسر رہا اور 1848 میں قومی اسمبلی کا ممبر بھی منتخب ہوا۔ 1849 اور 1852 کے دوران میں اسی نے شیکسپیر کے ڈراموں پر سیر حاصل اور سرکٹہ الاراء تبصرے تحریر کیے (ان کا انگریزی ترجمہ 1862 میں شائع ہوا)۔ ماز کے بقول ماسلٹائی کو نہ اس کی تاریخ کی کتابیں پسند آئیں اور نہ اس کے شیکسپیر کے ڈراموں پر تبصرے۔

12 شلووسر (Friedrich Christoph Schlosser) (1776-1861) جرمن مورخ اور ہائیڈل برگ یونیورسٹی میں تاریخ کا پروفیسر۔ اس کی مشہور ترین کتاب "یونیورسل ہسٹری" ہے۔

13 میٹزفٹس تیسری کتاب، حصہ اول، حاشیہ نمبر 3 دیکھیں۔

14 مادام دیسل: چوتھی کتاب، حصہ دوم، حاشیہ نمبر 30 دیکھیں۔

15 تالی غاں: تیسری کتاب، حصہ اول، حاشیہ نمبر 5 دیکھیں۔

16 فٹھے (Johann Gottlieb Fichte) (1762-1814): جرمن فلسفی۔ اس نے فوق تجربی یا وجدانی عیسیت

(transcendental idealism) کے بارے میں اپنا نظریہ پیش کیا۔ اس پر الحاد کا الزام لگا اور یونیورسٹی آف

ہینا سے، جہاں وہ فلسفے کے شعبے کا صدر تھا، نکال دیا گیا۔ جرمنی میں چوبیسین کی فتوحات کے بعد اس نے "جرمن قوم کے نام خطابات" کا سلسلہ شروع کیا۔ امن قائم ہونے کے بعد اسے برلن یونیورسٹی میں ریکٹر مقرر کیا گیا۔

17 شاتوینیاں: تیسرا حصہ اول، حاشیہ نمبر 3 دیکھیں۔

18- "Le Contrat Social" ("عمرانی معاہدہ") فرانسیسی مصنف روسو کی شہرہ آفاق کتاب۔ اس کتاب کا آغاز اس مقدمے سے ہوتا ہے کہ معاشرے کی اساس اس ابتدائی معاہدے پر قائم ہے جس کی روسے انسان اس شرط پر کہ اسے تحفظ فراہم کیا جائے گا، اپنا منشا سب کے منشا کے تابع بنا دیتا ہے۔ کتاب میں جمہوری نظام حکومت اور عام حق رائے دہی کی پرزور دکاست کی گئی ہے۔ اسی کتاب میں سب سے پہلے حریت، مساوات اور اخوت کا نظریہ پیش کیا گیا اور یہی تینوں الفاظ انقلاب فرانس کا نعرہ بنے۔

19- ہرکولیس (Hercules)۔ ایک راستانی ہیرو۔ یونانی میں اسے ہیراکلیز (Heracles) کہا جاتا ہے۔ یونانی دیوتا کے مطابق وہ قوی ترین شخص تھا۔ ابھی وہ دودھ پیتا بچہ تھا کہ اس نے ایک بہت بڑے سانپ کو، جو اس کے پائے پر گھس آیا تھا، ہلاک کر دیا۔ دیوتاؤں نے اس کے ذمے بارہ مشکل ترین کام۔ ایک خوف ناک ہیر شیر، ایک نوسرے صفریت کو ہلاک کرنا، تیز ترین بارہ سنگھے اور ایک جنگلی سور کو پکڑنا، تین ہزار بیوں کے مسئلے کو، جو اس میں تیس سال سے رہ رہے تھے، صاف کرنا، آدم خور پرندوں کو ہلاک کرنا، ایک خوبصورت لیکن پاگل سانپ پر قابو پانا، انسانی گوشت پر پلنے والی گھوڑیوں کو قبضے میں لینا، مرد نما عورتوں (amazons) کی ملکہ کی بیٹی لانا، تین اجسام والی ہڈ کو موت کے گھاٹ اتارنا، بارہ طلائی سیب تلاش کرنا اور زیر زمین مردوں کی دنیا سے تین سرے کئے کو لانا لگائے اور اس نے اپنی جسمانی طاقت سے یہ تمام کام سرانجام دیے۔

20- لوئی یازدہم (Louis XI) (1423-1483) فرانس کا بادشاہ۔ وہ بچپن سے حکمرانی کے خواب دیکھتا تھا اور اس نے متعدد بار اپنے باپ کو تخت سے محروم کرنے کی سازشیں کیں۔ یوں اسے ملک بدر ہونا پڑا تاہم وہ 1481 میں بادشاہ بن ہی گیا۔ اس نے اپنے متعدد حریفوں کو شکستیں دیں لیکن اس کی کامیابیوں میں اس کی فوجی مہارت کی نسبت اس کی عیاری کا زیادہ ہاتھ تھا۔ وہ انھیں پیرس میں لڑاتا دوران کے علاقوں میں بغاوتیں کراتا رہتا تھا۔ اس کا مشیر اعلیٰ ایک حجام تھا اور اس پر ہر وقت موت کا خوف سوار رہتا تھا۔ تاہم وہ فنون لطیفہ اور علوم کا بڑا قدردان تھا اور اس نے تین یونیورسٹیاں قائم کیں۔

21- bureau d' exchange۔ وہ دفتر، دکان یا ادارہ جہاں، ایک ملک کی کرنسی دوسرے ملک کی کرنسی سے تبدیل کی جاتی ہے۔ ہمارے پاس یہ کام پہلے صرف بینک سرانجام دیتے تھے اب دوسرے لوگوں کو بھی اجازت مل گئی ہے۔

22- نپولین سوم: (1808-1873)۔ نپولین اول کا بھتیجا۔ نپولین کے اکلوتے بیٹے کی وفات (1732) پر "نپولین خاندان کا سربراہ بن گیا اور اپنے چچا کا تخت حاصل کرنے کی سازشوں میں مصروف ہو گیا۔ ایک بار تودہ گرفتار ہوئے سے بچ گیا اور امریکا بھاگ گیا۔ 1840 میں اس نے بولون کے مقام پر دوسری مرتبہ کوشش کی، اب کے وہ پکڑا گیا اور ایک قلعے میں تاحیات نظر بند کر دیا گیا۔ تاہم پانچ سال کی نظر بندی کے بعد وہ فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا اور انگلستان چل گیا۔ 1848 میں مزدوروں نے کامیاب انقلاب برپا کیا، وہ تیس لوٹ آیا اور قوی سبلی کارکن منتخب ہو گیا۔ اسی سال وہ ملک کا صدر منتخب ہوا اور 1851 کے انتخابات میں وہ دس سال کے لیے صدر چن کر گیا۔ لیکن 1852 میں اس نے اپنے آپ کو امپراطور قرار دے دیا۔ اس کا اہم ترین کارنامہ پیرس کی تعمیر نو ہے۔ اس نے مختلف

جنگیں بھی کیں۔ کریمیا اور اطالیہ میں تو اسے کامیابی ہوئی لیکن 1870 میں پریٹیا میں اسے ذلت آمیز شکست ہوئی، وہ گرفتار ہوا، تاج و تخت سے محروم ہوا، اور اس نے زندگی کے آخری سال جلاوطنی میں انگلستان میں گزارے۔

23- برون پورا نام Boulogne-sur-Mer ہے۔ دوبار انگلستان کے ساحل پر فرانسیسی بندرگاہ۔

24- کنفیڈریشن آف رائن (Confederation of the Rhine) 12 جولائی 1806 کو نپولین کی تحریک پر جرمنی کی

متحدہ ریاستوں کے حکمرانوں نے، جن میں بادشاہ، گریٹ بریٹین اور ڈیوک شامل تھے، یہ کنفیڈریشن بنائی تھی۔ یوں جرمنی کے بیشتر علاقے پر فرانس کی سیادت قائم ہو گئی۔

25- کنونشن، ڈائریکٹری دھیرہ: انتخاب فرانس اور نپولین کے عہد حکومت کے، جن کا دور مندرجہ ذیل میں تقسیم کیا جاتا ہے:

(1) Estates-General اور آئین سہرا سبلی (Counsituent Assembly) 5 مئی 1789 تا 30 ستمبر

1791 آئینی بادشاہت بحال رہی، تاہم اصل اختیارات اونچے درمیانے طبقے کے پاس تھے

(2) قانون ساز اسمبلی (Legislatif) یکم ستمبر 1791 تا 21 ستمبر 1792 بادشاہت کچھ عرصہ جاری رہی تاہم بعد میں معطل کر دی گئی۔ اختیارات نچلے طبقے کو منتقل ہونے لگے۔

(3) قومی کنونشن (Convention Nationale) 21 ستمبر 1792 تا 25 اکتوبر 1795: یہ انقلاب کا نقضہ عروج تھا۔ اس زمانے میں، اقتدار زیادہ تر نچلے طبقے کے پاس تھا۔ کنونشن نے، جسے نیا آئین مرتب کرنے کے لیے بلایا گیا تھا، پہلے بادشاہت کا خاتمہ کیا اور پھر بادشاہ کو سزائے موت دی۔ اس زمانے میں بے پناہ کشت و خون ہوا اور کنونشن اس ظلم و ستم کی تائید کرتی رہی۔ تاہم بعد میں اس نے تشدد کے مرتکبین کی حکومت کا تختہ الٹ دیا اس نے بیرونی دشمنوں کے خلاف بھی مزاحمت کی۔

(4) ڈائریکٹری (Directoire) 26 اکتوبر 1795 تا 9 اکتوبر 1799 درمیانے طبقے نے دوبارہ اقتدار پر قبضہ کر لیا۔ ملک میں پارٹیاں بننے لگیں، فوج مضبوط ہونے لگی اور بالآخر اس کی مدد سے نپولین نے انقلاب برپا کر دیا۔ اس دور حکومت کو ریپبلکین کہا جاتا ہے۔

(5) قونصلیٹ (Consulat) 25 دسمبر 1799 تا 20 مئی 1804: اس زمانے میں اقتدار میں فوجی اور غیر فوجی دونوں شریک تھے، تاہم اصل اختیارات ایک ہی شخص۔ نپولین۔ کے پاس تھے۔ طرز حکومت برائے نام ریپبلکین تھا۔

(6) (ایمپری) امپراطوریہ 20 مئی 1804 تا 11 اپریل 1814 اور یکم مارچ 1815 تا 22 جون 1815 نپولین کا بحیثیت امپراطور عہد حکومت۔

26- ”خوف ناک“ یا ”ہیبت ناک“ ایوان (Ivan the Terrible) یا ایوان چہارم (1531-1584) روس کا پہلا حکمران، جس نے رار کا لقب اختیار کیا۔ استرخان، قازان اور سمیریا اسی کے عہد حکومت میں روس کا حصہ بنے۔ اس نے امراء، جوبیار، کھانات تھے، سکوتوز اور نوگورد اور دوسرے علاقوں کے شہریوں پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑے اور غصے سے بے قابو ہو کر اپنے بیٹے کو بھی قتل کر دیا لیکن نین سال بعد ہی صدر اس کی موت کا باعث بنا۔ (”روسی تاریخ“ کا باب بھی دیکھیں)

- 27- چارلس اول (1600 تا 1649) برطانوی بادشاہ۔ اس کی پارلیمنٹ سے نکر ہو گئی۔ دونوں فریقوں کی اپنی اپنی فوج تھیں۔ چارلس کی فوج ہت گئیں۔ وہ پکڑ گیا اور اسے پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔
- 28- لوئی پندرہم (Louis XV) (1710 تا 1774): لوئی چہارم کا پوتا (لوئی چہارم کا بیٹا اور بڑا پوتا اس کی زندگی کے میں ہی فوت ہو گئے تھے)۔ اس کے عہد حکومت میں فرانس انگریزوں سے بار بار جٹا رہا، اور انگریزوں نے اس سے کینیڈا، ویسٹ انڈیز کے جزائر اور کئی دیگر مقبوضات چھین لیے۔ ایک تو جنگوں کے اخراجات، دوسرے لوئی پندرہم کی شاہ خرچیاں وہ اپنی داشتادوں پر روپیہ پانی کی طرح بہاتا تھا۔ اس نے پانچ سال میں اپنی ایک داشتہ کو اٹھارہ کروڑ لیور (ایک لیور آدھ سیر چاندی کے برابر ہوتا تھا) عطا کر دیے۔ نتیجہ؟ ملک دیوالیہ ہو گیا۔ خورشاہ چچک میں مبتلا ہو گیا اور جب مر، کسی نے اس کی موت پر آنسو بھی نہ بہایا ("le bien aimé")
- 29- شاہل دہم (Charles X) (1757 تا 1836) لوئی پندرہم کا پوتا۔ لوئی چہارم کے انتقال پر 1844 میں فرانس کا بادشاہ بنا۔ اس نے مطلق العنان بننا چاہا لیکن عوام نے معذرت کر دی۔ اسے تخت چھوڑنا پڑا۔ (2 اگست 1830) وہ پراگ چلا گیا اور وہیں پیسے سے انتقال کر گیا۔
- 30- لوئی فلپ (Louis Philippe) (1773 تا 1850) فرانس کا "عوامی" بادشاہ، کہ اس کا تعلق شاہی خاندان سے نہیں تھا۔ وہ ڈپرک کا بیٹا تھا لیکن خاندانی خطاب ترک کر کے عام شہری بن گیا تھا اور یوں عوام میں بہت مقبول ہو گیا۔ جب شاہل دہم تخت سے دست بردار ہوا، اسے بادشاہ "مختب" کر لیا گیا۔ اس کا شروع کا عہد حکومت بہت اچھا رہا اور عوام کی خوشحالی میں اضافہ ہوا۔ پھر اس کے داغ میں "اصلی بادشاہ" بننے کا شہس نے گا، اور وہ لوگ کی تحریر و تقریر کی آزادیاں چھیننے لگا۔ چنانچہ اس کے خلاف بھی بغاوت ہوئی اور وہ 1850 میں "سرسمجھ" کے زمرے نام سے انگلستان بھاگ گیا۔ اس کے عہد میں فرانس نے الجزائر پر قبضہ کرنا شروع کیا۔
- 31- درورو (Denis Diderot) (1713-1784) فرانسیسی مفکر اور مصنف۔ اس نے Encyclopedie (یہ کتاب) العلوم 28 جلدوں پر مشتمل تھی اور چودہ سالوں میں مکمل ہوئی) کے ذریعے روشن خیالی کی تحریک کو آگے بڑھانے میں ہاتھ بٹایا
- 32- بومارشانسکی (Pierre Beaumarchais) (1732-1799) فرانسیسی ڈرامہ نگار۔ اس نے اپنی تخلیقات میں جاگیرداری نظام پر زبردست چوٹیں کیں۔
- 33- کربسکی (Prince Andrei Kurbsky): (تقریباً 1528 تا 1583) کربسکی خوف ناک ایوان کا سب سے بڑا مخالف تھا اور لیتھوانیا میں اس کے دشمنوں سے جا ملا تھا۔ دونوں کے مابین خط کتابت کے ذریعے طویل مناظرہ ہوا تھا۔ روسی نقاد ڈی۔ ایس مرکل کا کہنا ہے کہ خوف ناک ایوان کو پمفلٹ لکھنے میں کمال کا ملکہ حاصل تھا، بلکہ وہ اس میدان کا مہتری تھا۔
- 34- گورنٹے (Godfrey of Bouillon)۔ (تقریباً 1061 تا جولائی 1100): گورنٹے بلجیم کے ایک کاؤنٹ کا بیٹا تھا اور خامسار لیر آدی تھا۔ وہ پہلی صلیبی جنگ میں شریک ہوا اور بہت جلد عیسائیوں کا رہنما بن گیا۔ جب صلیب

انوارج نے بیت المقدس فتح کر لیا، مگر وہ فلسطین کا بادشاہ قرار پایا۔

35۔ پطرس راہب (Peter the Hermit): پطرس راہب فرانس میں گیا دھویں صدی کے تقریباً وسط میں پیدا ہوا۔ وہ کچھ عرصہ فوج میں رہا، پھر راہب بن گیا۔ کہا جاتا ہے کہ وہ 1095 سے قبل زیارتوں کے لیے فلسطین گیا تھا۔ وہی پر وہ یورپ کے مختلف ممالک میں گھومنے دھیسائی زائرین پر مسلمانوں کے ”قلم رستم“ کی داستانیں پھیلنے اور لوگوں کو فلسطین پر حملہ کرنے کے لیے بھڑکانے لگا۔ اس نے کوئی تین لاکھ کا ہجوم اکٹھا کر لیا۔ پوپ کی اشیر باد بھی مل گئی۔ ان میں سے پہلے گروپ کو ہتھیار پہنچا دیے اور دوسرے کو ترکی اور تیسرے اور چوتھے کو ہنگری میں شکست دی گئی۔ پطرس نے است نہ ہاری۔ اب کے اس نے مختلف ممالک سے چھ لاکھ افراد پر مشتمل باقاعدہ فوج اکٹھی کی۔ بڑے بڑے جرمن بھی اس فوج میں شامل تھے۔ اس پانچویں صیہبی فوج نے آٹھ کیرہ کا محاصرہ کیا۔ یہ محاصرہ سات مہینے جاری رہا۔ جب کوئی کامیابی نہ ہوئی، اکثر لوگ واپس بھاگ گئے، ان میں پطرس بھی شامل تھا۔ واپس پر اس نے خانقاہ بنائی اور 1115 کے قریب اسی میں انتقال کر گیا۔

36۔ منی سنگر (Minnesinger): (لفظی معنی ”مبت کے گیت گانے والا۔“): چارھویں اور تیرھویں صدی میں جرمنی کے اونچے طبقے کے بعض اشخاص شاعر اور سنگیت کار ہوتے تھے۔ وہ باقاعدہ انجمنیں (guilds) بناتے، گیت لکھتے اور گاکر ایک دوسرے کا مقابلہ کرتے۔ چودھویں صدی میں کاریگروں کے طبقے کے شعراء (Meister Singers): مابہر شعراء) اپنا لوہا منوانے لگے، درحقی سنگروں کا زوال شروع ہو گیا۔

37۔ لوتھر (Martin Luther) (1438-1546): مارٹن لوتھر (جرمن زبان میں اس کے نام کا تلفظ لوٹر ہے) ایک جرمن راہب تھا۔ وہ 1510 اور 1511 میں روم میں مقیم رہا۔ وہاں پوپ اور رومن کیتھولک مذہب کے دوسرے رہنما جن بدعنوانیوں اور افعال شیعہ کے مرتکب ہو رہے تھے، انھیں دیکھ کر اسے سخت صدمہ پہنچا۔ وہ واپس جرمنی پہنچا، اس نے یہ سب باتیں کاغذ پر تحریر کیں اور یہ کاغذ ایک گرجے کے باہر لٹکا دیے، اس پر پوپ سخت ناراض ہوا اور اس نے لوتھر کو رومن کیتھولک مذہب سے نکال دیا۔ یوں پوپ میں تحریک اصلاح مذہب چل پڑی۔ چونکہ لوتھر اور اس کے ساتھی ے انہوں کے خلاف پروٹسٹ (احتجاج) کرتے تھے، اس لیے انھیں پروٹسٹنٹ کہا جانے لگا۔ رفتہ رفتہ یہ تحریک دوسرے ممالک میں بھی پھیل گئی اور لوگوں میں مذہبی فساد ہونے لگے۔ حکومتیں بھی ان کی زد میں آئیں اور مختلف ممالک کے مابین جنگیں بھی ہوئیں۔ شمالی آئر لینڈ میں رومن کیتھولکوں اور پروٹسٹنٹوں کے مابین حالی ہی تک فساد ہوتا رہا ہے۔

38۔ ہارزم میکسیکو۔ پولین سوم نے آسٹریا کے امپراطور فرانس یوزف (Franz Josef) کے بھائی فرڈی نینڈ میکسی میلین (1832 تا 1887) کو میکسیکو کا امپراطور بنوا دیا (وہ اپنی فوج کے ذریعے میکسیکو پر پہلے ہی قبضہ کر چکا تھا)۔ امریکہ کے احتجاج پر پولین سوم نے اپنی فوج واپس بلا لی۔ پھر میکسیکو کے باشندوں نے بغاوت کر دی۔ انھوں نے میکسی میلین کی فوج کو شکست دی اور اسے قتل کر دیا۔

39۔ بیسمارک (Prince Otto Bismark) پرشیا کا ”آپنی چائرس“ (وزیر اعظم) اور ملک کا عملاً حکمران۔ اس نے

1856ء میں آسٹریا کو زیر دست شکست دی اور اس کے بہت سے علاقے ہتھیا لیے۔ اس نے جرمنی کی مختلف ریاستوں کو متحد کیا اور جدید جرمنی کی بنیاد رکھی۔

40- یوہیمیا: آسٹریا امپراطوریہ کا صوبہ۔ بسمارک کی فوج نے سب سے پہلے اسی پر حملہ کیا تھا۔ آج کل یہ چیکوسلواکیہ میں شامل ہے (ویسے چیکوسلواکیہ اب خود دو ممالک میں تقسیم ہو چکا ہے)

41- غیر نفوذ پذیری (impermeability): ٹھوس چیز میں سے مائعات گزر نہیں سکتے۔ اس خصوصیت کو "غیر نفوذ پذیری" کہا جاتا ہے۔ یہ لفظ فزکس اور ارضیات میں استعمال ہوتا ہے۔

42- اٹلیا (Attila): (406-453) اٹلیا، جس کا نام سن کر یورپ کے لوگوں میں آج بھی دہشت طاری ہو جاتی ہے اور جسے وہ "خدا کی تازیانہ" کہتے ہیں، 434ء میں ہن قوم کا، جو بحیرہ کیسپین سے دریائے ڈینیوب تک کے علاقے میں آباد تھی، بادشاہ بنا۔ اس نے شمالی منگولی میں اپنا صدر مقام بنایا اور مختلف اقوام پر مشتمل زیر دست فوج تشکیل دی اور قلیل عرصے میں اس کی سلطنت شمالی یورپ بشمول جرمنی سے چین تک وسیع ہو گئی۔ ویدر ہرجا، تباہی و بربادی اس کی جلو میں ہوتی۔ 447ء میں اس نے بحیرہ اسود اور بحیرہ روم کے درمیان تمام علاقے کی اینٹ سے اینٹ بجادی اور مشرقی رومی امپراطور کو خراج ادا کرنے پر مجبور کر دیا۔ 451ء میں اس نے فرانس پر حملہ کر دیا لیکن شکست کھائی (اس لڑائی میں دو لاکھ آدمی کھیت رہے) اگلے سال اس نے اطالیہ کو روند ڈالا۔ پوپ نے بہت بڑی رقم دے کر روم کو بچائی سے بچایا۔ تاہم اٹلیا 453ء میں اپنا تک انتقال کر گیا، ہنوں کا شیرازہ بکھر گیا اور یورپ نے اطمینان کی سانس لی۔

43- کپلر (Johannes Kepler): (1571-1630) جرمن ماہر فلکیات اور جدید فلکیات کا باوا آدم۔ یہ بات تو پہلے ہی دریافت ہو چکی تھی کہ سیارے سورج کے گرد گھومتے ہیں۔ کپلر کے تین قوانین اس نظریے کی مزید وضاحت کرتے ہیں۔

44- نیوٹن (Sir Isaac Newton): (1644-1727) نابہر ریاضی و فزکس۔ کشش ثقل کا نظریہ اسی کی دریافت ہے۔

45- کوپرنیکس (Nicolaus Copernicus): (1473-1543) پولستانی ماہر فلکیات۔ پولستانی زبان میں اس کا نام Mikotaj Kopernik ہے۔ اس نے 1543ء میں یہ ثابت کیا کہ نظام شمسی کا مرکز زمین نہیں، سورج ہے اور یہ کہ زمین اور دوسرے سیارے سورج کے گرد گھومتے ہیں۔

46- بطلمیوس: بطلمیوس (Ptolemy) (تقریباً 90ء تا تقریباً 168ء)۔ بطلمیوس یونانی مصری تھا۔ اس کا اصل نام Claudius Ptolemaeus تھا۔ سب سے پہلے اسی نے یہ نظریہ پیش کیا تھا کہ زمین کائنات کا مرکز ہے اور یہ کہ سورج، چاند، سیارے اور ستارے اس کے گرد گھومتے ہیں۔ مسلمانوں نے اس کی کتابیں عربی میں ترجمہ کیں اور انہی کی وساطت سے یورپ میں پہنچیں۔ بطلمیوس فلکیات کے علاوہ جغرافیے کا بھی عالم تھا۔ کلبس اسی کی کتاب Geographike Hyphegesis سے متاثر ہو کر نئی دنیا کے سفر پر روانہ ہوا تھا۔

47- یثوع: حضرت موسیٰ علیہ السلام کے خادم نون کے بیٹے تھے۔ بائبل (پرانہ عہد نامہ، یثوع) کے مطابق خداوند نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وفات کے بعد یثوع کو یہودیوں کا سربراہ مقرر کیا اور انہیں ہم دیا کہ وہ اپنی

امت کو لے کر دریائے اردن کے پار جائیں کیونکہ خداوند نے بحیرہ قلزم سے دریائے فرات کے تک کا سارا علاقہ انہیں بخش دیا ہے۔ چنانچہ یثوع علیہ السلام اپنی امت کے ساتھ جل پڑے۔ جب وہ دریائے اردن کے قریب پہنچے، دریا میں سیلاب آیا ہوا تھا۔ یثوع علیہ السلام کے حکم پر بارہ کاہن، جو یہودیوں کے بارہ قبیلوں کی نمائندگی کرتے تھے، ”عہد کے صندوق“ لے کر دریا کے درمیان میں کھڑے ہو گئے۔ جنہیں ان کے پاؤں نکلے، دریا دو حصوں میں تقسیم ہو گیا اور بچ کی زمین خشک ہو گئی۔ یوں یہودی با آسانی دریا پار کر کے گئے اور ”موجودہ“ سرزمین پر قابض ہو گئے۔

ضمیمہ

- 1- سالتی کورا (Darya Nikolaevna Saltykova): (1730-1801): سالتی کورا، جو عام لوگوں میں سالتی چیخا (Saltychikha) کے نام سے مشہور تھی، خاصی بڑی زمیندار تھی۔ اس کے چھ سو زرعی غلام تھے۔ وہ انہیں خالصتہ سزائیں دیتی اور ایذا نہیں پہنچاتی تھی۔ یوں اس نے سات سال میں ایک سو اٹالیس اشخاص کو ہلاک کر ڈالا۔ وہ کچھ عرصہ تو رشوتوں اور خاندانی اثر و رسوخ کے بل بوتے پر اپنے کرتوتوں کی سزا بھگتے سے بچی رہی، تاہم 1776 میں اس کی شکایت اسپر اطورہ کی قمرین دوم تک پہنچی۔ سالتی کو اپر مقدمہ چلا جو کچھ سال جاری رہا اور آخر کار اسے سزائے موت ہوئی۔ بعد میں اس کی سزا میں تخفیف کر دی گئی۔ اس کی پہلے تو Piliory¹ میں کس کر عام لوگوں کے سامنے تشہیر و تذلیل کی گئی اور بعد میں اسے ہتایا عمر کے لیے راہبات کی خانقاہ میں بھیج دیا گیا۔
 - 2- ہرانوئسکی ہاؤس: سقوط ماسکو کے بعد جنرل ولسن، بے نگ سین اور ارمالوف رستوپ چین کے ساتھ شہر سے تیس میل دور دراندیشی اس کی جاگیر پر چلے گئے۔ یہ ثابت کرنے کے لیے کہ وہ پولین اور فرانسیسیوں کو قطعاً خاطر میں نہیں لاتا، رستوپ چین نے اپنے ہاتھوں سے اپنے محل نما مکان کو آگ لگا دی۔ ولسن لکھتا ہے: ”کسی قسم کی بحث یا کار تھی کیونکہ اس کا ارادہ اٹل تھا“۔
 - 3- سپیٹاپول: بحیرہ اسود کے ساحل پر بندرگاہ (روسی اسے سپیٹاپول کہتے ہیں) یہ سابق سوویت یونین کے علاقے کریمیا (روسی میں کرم Krym جو غالباً عربی الفاظ ”کرم“ اور ”کریم“ کی بگڑی شکل ہے) میں جو آج کل یوکرین میں شامل ہے واقع ہے۔ (کریمیا میں تاریکی آباد تھے لیکن روسیوں نے کچھ کو جنگ کریمیا اور باقیوں کو 1944 میں جنگ عظیم دوم کے دوران میں باہر نکال دیا) کریمیا پر 1475 میں سلطنت عثمانیہ اور 1783 میں روسیوں کا قبضہ ہوا۔ 1854-1855 کے دوران میں اتحادیوں (برطانیہ، فرانس اور سلطنت عثمانیہ) اور روسیوں کے مابین جنگ کریمیا ہوئی۔ اس جنگ میں طویل محاصرے کے بعد سپیٹاپول پر اتحادیوں کا قبضہ ہو گیا۔ طاسطائی اس جنگ میں شریک تھا۔
- 1- ایک قسم کا چربی کھجور اس میں سرادر ہاتھوں کے لیے سوراخ ہوتے تھے۔ اس میں خلا کار کو عام تذلیل و تشہیر کے لیے کس دیا جاتا تھا۔ یورپ کے تمام ممالک میں اس کا عام رواج تھا۔

کاؤنٹس لیونگولائی، راج طاہر سلطان (1828-1910)، دہلوی اردو میں پیدا ہوا۔ بیاہی سال دور حیات میں اس نے اتنا تحریری سرمایہ چھوڑا جو نوے جلدوں میں سما گا۔ اس نے ”جنگ اور اسکی“ جیسے عظیم رزمیہ کے ساتھ ”آئینہ کارینفا“ جیسا ناول بھی اپنی یادگار تصویرائے دنیا کی بہترین پریم کہانیوں میں شمار کیا گیا۔ اس کی کہانیاں، چھوٹے ناول، پھر ناول نگاری کو ترک کرنے کے بعد بطور معلم اور نظریہ ساز اس کی تحریروں کا دفتر سب اس داستان کے مختلف اجزاء میں جنمیں ہوئے سے ایک ایسے شخص کی تصویر ابھرتی ہے جو اپنے تمام تر تضادات اور بوجھوں سمیت آدمیوں میں امن کی ہی طاقت کا مظہر تھا۔ جارج سائز کے بقول ”طاہر سلطان کا قاتل تو وہی ہے لاؤلی رزمیہ نگاروں ہی سے ہو سکتا ہے۔“

شاید حمید 1928 میں لاہور، جالندھر کے ایک ٹاؤن پر جہاں کالوں میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم کے بعد لاہور آ گئے۔ گورنمنٹ کالج لاہور سے انگریزی میں ایم اے کیا اور اردو میں دہلی کے شعبے سے منسلک ہو گئے۔ پنجاب کے مختلف کالجوں میں پڑھایا اور 1988 میں گورنمنٹ کالج لاہور سے پروفیسر بنا کر ہوئے۔ شاید حمید ایک مایہ ناز مترجم ہیں۔ زمانہ طالب علمی ہی میں دہلی کا شعلی کی ہر دل عزیز کتاب ”پریشانی ہونا پیوڑ ہے، جینا تلخ ہے“ کا اردو ترجمہ کیا اور پھر دنیا بھر کے علم و ادب سے جتنی ہی عظیم کتابوں کا ترجمہ کر ڈالا۔ جین آسن کی ”کلیئر اور تعصب“، طاہر سلطان کی ”جنگ اور امن“، دستوفسکی کی ”گرا موڑوف بر اور ان“، ہیملٹون کی ”بورھا اور سمندر“ اور ایڈورڈ سعید کی ”فلسطین کا مسئلہ“ ان کے اردو تراجم کی چند مثالیں ہیں۔ شاید حمید کی زندگی کا سب سے بڑا کام دو ہزار سے زیادہ صفحات پر مشتمل انگریزی اردو لغت ہے جو زیر طبع ہے۔

شاید حمید 29 جنوری، 2018، گولاہور میں وفات پا گئے۔

